زندگی آمیز اور زندگی آموز ادب کا نمائندہ

۵۹ ، ۶۰

اکتوبر ۱۹۵۶ء

مرتبہ

محمد طفیل

اِدارۂ فروغِ اردو ۔۔ لاہور
(ایبک روڈ ۔ انارکلی)

مکاتیب نمبر

نقوش نے کئی اہم موضوعات پر نمبر چھاپے ہیں۔ جو اپنی اپنی حیثیت میں ضرور باقی رہیں گے۔ جن میں غزل نمبر، شخصیات نمبر اور افسانہ نمبر خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔
ادھر ایک سال سے ہم "مکاتیب نمبر" مرتب کر رہے ہیں۔ ہزاروں اہم اور تاریخی خطوط (غیر مطبوعہ) جمع کئے جا چکے ہیں۔ جن میں سرسید، حالی، اکبر، اقبال، مولانا محمد علی، ڈپٹی نذیر احمد، حکیم اجمل خاں، محسن الملک، وقار الملک، شبلی، سلیمان ندوی اور ابوالکلام آزاد ایسے تمام زندہ اور مرحوم مشاہیر کے بیسیوں ہی ادبی اور سیاسی خطوط ضروری حواشی کے ساتھ مرتب کئے جا چکے ہیں۔

ہمارا ارادہ ہے کہ خطوط کی شکل میں جتنا سرمایہ ادھر اُدھر بکھرا پڑا ہے وہ سب کا سب ایک جگہ جمع ہو جائے۔ تاکہ تمام علمی و ادبی اور سیاسی دستاویزیں یکجا ہو کر آنے والے حضرات کے بھی کام آئیں۔

اگر یہ سرمایہ اکٹھا نہ کیا گیا تو اس بات کا ڈر ہے کہ آئندہ قطعی ہی نہ ہو جائے ۱۹۴۷ء کے ہنگاموں میں ہمارا کتنا ہی قیمتی اور نایاب سرمایہ ضائع ہو چکا ہے۔ ویسے بھی علم و ادب کے انفرادی سرمائے سے اجتماعی سرمایہ اردو ادب کے تمام طالب علموں کے لئے مفید بھی ہوگا اور اس طرح محفوظ بھی ہو جائے گا۔

مجھے خدا کے فضل اور آپ کے تعاون سے پوری امید ہے کہ ہم پانچ ہزار سے کچھ زیادہ ہی نادر خطوط جمع کر لیں گے۔

میرے تمام احباب نے اس اہم خدمت کے سلسلے میں مجھ سے بھرپور تعاون فرمایا ہے۔ احباب کے تعاون ہی سے ہم نے ہزاروں نادر خطوط جمع کر لئے ہیں۔ جن پر ادارۂ نقوش کو ہمیشہ فخر رہے گا۔ متمنی ہوں کہ آپ کے پاس بھی جتنے زندہ اور مرحوم مشاہیر کے خطوط ہوں وہ سب (بذریعہ رجسٹری) مرحمت فرما دیں۔ میں اس نمبر کی تکمیل کے بعد وہ تمام خطوط بصد شکریہ واپس کر دوں گا۔ اگر اصل خطوط دینے میں تامل ہو تو ان کی نقل ہی عنایت فرما دیں۔
تمام اہم خطوط کو فوٹو آفسٹ سے شائع کیا جا رہا ہے۔

محمد طفیل

ترتیب

(ا)

* شخصیت نمبر حصہ اوّل صفحہ ۷۰۰ پر ختم ہوا تھا۔ یہ حصہ دوم کو صفحہ نمبر ۷۰۱ سے شروع کیا ہے۔

۱۹۵۴ء میں شخصیات نمبر کی پہلی جلد پیش کی گئی تھی اور اب ۱۹۵۶ء میں دوسری جلد۔ اس وقفے میں جتنے بھی دن رات گزرے، میں اُن میں اس نمبر کی ترتیب و تدوین سے غافل نہیں رہا۔

جس طرح پہلی جلد کے بعد، دوسری جلد کا اعلان کر کے میں نے آج سرخروئی حاصل کی ہے اسی طرح اب تیسری جلد کا بھی عزم ہے تاکہ میری جد و جہد کے باوجود، جو نمایاں شخصیتیں رہ گئی ہیں۔ وہ سب آ جائیں۔

اس ضخیم نمبر میں ایک دو مطبوعہ مضمون بھی شامل ہیں۔ لکھنے والوں سے زیادہ استفادہ نہ ہوا، ادھر پرچہ جلد مکمل نہ ہو سکا۔ دونوں کی مجبوریوں سے آپ درگزر فرمائیں۔

اس پرچے میں چند ایک مضمون، اصل موضوع سے ہٹ گئے ہیں اور بعض ایسے بھی ہیں جو حتمی طور پر مکمل نہیں کہے جا سکتے۔ مگر میں نے ان کی شمولیت بعض وجوہ سے ضروری سمجھی ــــ ترتیب وہی ہے جو پہلے حصے کی تھی۔

نقوش کا آئندہ شمارہ عام نمبر ہوگا ــــ اس کے بعد مکاتیب نمبر!

محمد طفیل

(۱)

رفتید ولے نہ از دلِ ما

(فیضی)

داغ دہلوی

جوش ملسیانی

غدر سے سات آٹھ سال پہلے جس نوجوان شاعر کی گرمیِ کلام کا چرچا دلی میں گھر گھر ہونے لگا اور جس کے بعض غیر فانی اشعار کی مقامی شعرا اور اساتذہ اور خود بادشاہ ظفر نے وجدانی کیفیت میں آکر داد دی وہ داغ دہلوی تھے ۔ جو آگے چل کر خان بہادر بلبلِ ہندوستان ناظم یار جنگ امیر الدولہ فصیح الملک استاد حضور بندگانِ عالی آصف جاہ نظام دکن کے القاب سے ملقب ہوئے ۔ اور جنہوں نے اپنی گراں مایہ شاعری ، حسنِ اخلاق اور وسیع المشرب ہونے کی وجہ سے اتنی قدر و عزت پائی کہ اردو نظم کی تاریخ میں اس کی مثال نہیں ملتی ۔

یہ نواب شمس الدین والیِ ریاست فیروز پور جھرکہ کے فرزند تھے ۔ ۱۸۳۱ء میں پیدا ہوئے ۔ صغر سنی ہی میں یتیم ہو گئے ۔ تو ان کی والدہ ان کو لے کر قلعہ معلٰے دہلی میں پناہ گیر ہو گئیں ۔ ان دنوں کی پریشانیاں اور یہ مصائب ایسے تھے ۔ کہ اگر آپ کی تعلیم ناقص رہ جاتی تو تعجب نہ تھا ۔ لیکن آپ کی والدہ ماجدہ نے آپ کی تعلیم پر اعلیٰ درجے کی کوشش فرمائی ۔ یہاں دن رات یہ شہزادوں کی صحبت میں رہے اور بیگمات کی گود میں پرورش پا کر سنِ بلوغ کو پہنچے ۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی زبان نہایت معتبر ، نہایت مستند اور ٹکسالی تسلیم کی گئی ۔ انہیں خود بھی اس امتیازی خصوصیت پر ناز تھا ۔ دیکھئے یہ شعر انہوں نے کس دعوے سے کہا ہے ؎

غیروں کا اختراع و تصرف غلط ہے داغؔ　　　اردو ہی وہ نہیں جو ہماری زبان نہیں

اسی زمانے میں ان کا کہا ہوا یہ شعر ؎

رخِ روشن کے آگے شمع رکھ کر وہ یہ کہتے ہیں　　　ادھر جاتا ہے دیکھیں یا ادھر پروانہ آتا ہے

مرزا غالب کو کسی نے سنایا تو وجد میں آ گئے ۔ شطرنج کی بازی چھوڑ کر دیر تک کیفیت کے عالم میں رہے اور پوچھا کہ یہ شعر کس نے کہا ۔

بحیثیت شاعر جب انہیں بادشاہ ظفر کے سامنے پیش کیا گیا تو ان کی عمر بیس سال کے قریب تھی ۔ قلعہ معلٰے کے شاہی مشاعرے میں خاص خاص شعرا ہی شامل ہوتے تھے ۔ عام لوگوں کو یہاں آنے کی اجازت نہ تھی ۔ مصرعِ طرح یہ تھا ۔ ع

عشق ———

کوئی دشمن نہیں ہے اپنا دشمن آپ ہم نکلے

اس زمین میں مرزا غالب کی غزل بھی ہے ساسانذہ پڑھ چکے تو داغ کو حضور میں پیش کیا گیا۔ تعارف ہو چکا۔ تو انہوں نے بھی طرحی زمین میں اپنی غزل سنانی شروع کی۔ اس غزل کا ایک شعر یہ ہے ؎

ہوئے مغرور وہ جب آہ میری بے اثر دیکھی   کسی کا اس طرح یارب نہ دنیا میں بھرم نکلے

یہ شعر سن کر تمام اہلِ دربار جھوم اٹھے۔ شاہ ظفر نے بھی داد دی اور فرمایا۔ کیا اچھی طبیعت پائی ہے۔

انہیں دنوں میں ان کا یہ شعر بھی تمام اربابِ ذوق کی زبان پر تھا ؎

مجھ کو کچھ حال تو کم بخت سُنا تو اپنا   لگ گئی چپ تجھے اے داغِ حزیں کیوں ایسی

اسی طرح یہ مطلع بھی جس میں دلِ بے تاب کی چار تشبیہیں ایک جگہ جمع کر دی ہیں بہت مقبول ہوا ؎

کس لیے پھر یہ ٹھہرتا دلِ بے تاب نہیں   شرر و برق نہیں شعلہ و سیماب نہیں

اگرچہ وہ بہت زندہ دل۔ بہت شگفتہ طبع۔ بہت بذلہ سنج اور شوخ طبیعت کے آدمی تھے مگر ان کے ایوانِ شخصیت کے سب سے بڑے ستون ان کی زندگی بخش شاعری۔ ان کی ڈھلی ہوئی اور بے تکلف ٹکسالی زبان اور اس ٹکسالی زبان میں ان کا تغزل یا معاملہ بندی یہی تین چیزیں ہیں جو ان کی عظمت و شہرت کے لیے پروانہ ثابت ہوئیں۔ انہی کی بدولت وہ صاحب طرز کہلائے اور انہی کے ذریعہ اتنی قدر و عزت پائی۔ اگر اس قدر و عزت کے اسباب میں اور باتیں بھی شامل ہیں مثلاً قلعہ معلےٰ میں رہنے کی وجہ سے درباری آداب سے آگاہی۔ ان کے اخلاقِ حمیدہ جو اُنہوں نے دلی کی پُرانی تہذیب اور شرفا سے سیکھے۔ ان کا وسیع المشرب ہونا۔ مگر یہ دوسرے درجے کی باتیں ہیں۔ بنیادی باتیں وہی ہیں جن کا ابھی ابھی ذکر ہوا۔

دلی ان کو عمر بھر نہیں بھولی۔ اس کی یاد میں ہمیشہ بے چین رہے۔ غدر کے مصائب اور دلی کی تباہی سے بیزار ہو کر بادلِ ناخواستہ اسے چھوڑنا پڑا۔ اس عالم میں جو غزل کہی اس کا ایک ایک شعر ان کے مجروح احساسات کا ترجمان ہے۔ یہ مطلع اسی غزل کا ہے ؎

تھا مرا نام و نشاں نام و نشانِ دہلی   یوں مٹا جیسے کہ دہلی سے گمانِ دہلی

اس مطلع کا پہلا مصرع دلی کی تباہی کا مکمل بیان اور اسی ضمن میں اپنی بربادی کی مکمل شرح ہے۔ اسی پر آشوب زمانے میں ان کا بہت سا ابتدائی کلام بھی تلف ہو گیا۔ دلی سے نکلے تو آنولہ ضلع بریلی میں وہاں کے ایک رئیس کے ہاں دو سال قیام پذیر رہے۔ انہوں نے حضرت داغ کی اتنی خاطر و مدارات کی کہ ان کے آلام و افکار بہت حد تک دور ہو گئے۔ آخر انہی کی وساطت سے رامپور پہنچے اور نواب یوسف علی خاں کی ادب نوازی و شعر فہمی سے مستفیض ہو کر فکرِ معاش سے فارغ ہو گئے۔

رامپور ان دنوں دلی اور لکھنؤ کا خلاصہ بنا ہوا تھا۔ دن رات شعر و شاعری کی محفلیں گرم رہتی تھیں۔ اسیرؔ۔ امیر مینائی۔ جلال لکھنوی۔ خواجہ قلق۔ تسلیم لکھنوی۔ منیر شکوہ آبادی یہ سب مشاہیر رامپور ہی میں جمع تھے۔ داغ نے یہاں آکر اس شگفتہ گلزار کو اور بھی پُر بہار بنا دیا اور یہاں خوب چمکے۔ نواب کلب علی خاں کے عہد میں بھی رامپور کی ادبی شان بڑھتی ہی چلی گئی اور اس کے ساتھ ساتھ حضرت داغ کی شاعرانہ قدر و منزلت بھی چار چند ہوتی گئی۔

غزل تو ان کا خاص میدان تھا ہی۔ باقی اصنافِ سخن پر حیرت انگیز قدرت حاصل تھی۔ قصائد میں بھی زبان کا وہی رنگ ہے۔ جو ان کی

میں ہے۔ دلی کی تباہی پر جو شہر آشوب لکھا۔ اسے پڑھ کر تو یہی کہنا پڑتا ہے کہ ؎
کاغذ پہ رکھ دیا ہے کلیجہ نکال کر

نہایت دردناک پیرائے میں واقعہ نگاری کا یہ کمال انہیں دوپہر کے ہاں کے سوا اور کہیں نہ ملے گی۔ قوتِ بیانیہ کا جو اظہار اس مسدس میں پایا جاتا ہے اسے دیکھ کر یہ ماننا پڑتا ہے کہ اگر وہ غزل کو چھوڑ کر نظم کی طرف متوجہ ہوتے تو اس میدان میں بھی مردِ میدان مانے جاتے۔

مرزا غالب نے آموں پر ایک نظم کہی ہے۔ انہوں نے بھی کہی ہے۔ اس میں بھی زبان کی حلاوت اور حسنِ بیان ان کی قوتِ بیانیہ کا شاہکار ہے۔ ان کے دوست میر نثار علی شہرت جب ایک مدت کے بعد ان سے ملے تو انہوں نے کہا کہ میں اگر آپ کے پائے کا شاعر ہوتا تو غزل کو چھوڑ کر اردو شاعری کا رخ نظم ہی کی طرف پھیر دیتا۔ اس کے جواب میں حضرت داغ نے جو کچھ فرمایا وہ سننے کے قابل ہے۔

کہنے لگے۔ تم سچ کہتے ہو لیکن کیا کروں۔ جو کام اپنے ذمے لے رکھا ہے وہی پورا نہیں ہوتا۔ انہوں نے پوچھا۔ وہ کام کیا ہے۔ فرمانے لگے کہ جس طرح کان سے جواہر نکلتے ہیں اسی طرح قلعۂ معلیٰ اور دلی میں سے اردو زبان نکلی ہے جس کے محاورے لعل و یاقوت کو بھی شرماتے ہیں۔ کوشش یہ ہے کہ دلی کی شستہ زبان تمام ہندوستان میں پھیل جائے۔ اور ہر شہر میں ایسی ہی اردو زبان بولی جائے۔ جیسی دہلی میں بولی جاتی ہے۔ گو مجھے اس کوشش میں بہت کامیابی ہوئی ہے۔ مگر ابھی اس امر کی تکمیل نہیں ہوئی۔ دو آدمی خاص اس امر کے لئے متعین کر رکھے ہیں کہ ہر روز کی ڈاک میں ہندوستان کے شہروں سے جو غزلیں اصلاح کے لئے آئیں وہ بعد اصلاح روانہ کر دی جایا کریں۔ اگر تمام ہندوستان کی زبان دہلی کے مطابق ہو جائے تو یہ بھی بہت بڑا کام ہے۔ شہرت صاحب گو اپنے خیالات کے پکے تھے۔ لیکن داغ صاحب کی یہ صائب رائے انہیں بہت پسند آئی اور مان لیا کہ وہ بہت بڑا کام کر رہے ہیں۔

اصلاح کا ذکر چلا ہے تو اس کی کچھ تفصیل بھی سن لیجئے۔ شاگردوں کی تعداد ڈیڑھ ہزار سے کم نہ تھی۔ ان کے نام اور پتے رجسٹر میں درج ہوتے رہتے تھے۔ ذات پات کی تمیز انہوں نے کبھی گوارا نہیں کی۔ ان کے شاگردوں میں بہت سے ہندو شعرا شامل تھے۔ وہ صاحب دیوان بھی ہوئے اور استاد بھی کہلائے۔ مثلاً پروفیسر نرائن پرشاد مہر گلیاوی جن کو نواب سائل نے جانشینیِ داغ کی سند بھی عطا کی تھی۔ اس اعزاز میں انہوں نے حضرت داغ کے دو تین اور شاگرد بھی شامل کر لئے تھے اور اس طرح بے خود دہلوی کی رنجش مول لی تھی۔ منشی حُب لال رعد گلیاوی۔ نادر کاکوروی اور راقم الحروف بھی اسی بیاض میں شامل ہیں۔

شاگردوں کی اتنی کثیر تعداد ان کی شاعرانہ شخصیت کا روشن ثبوت ہے۔ ان میں بہت سے اصحاب فارغ الاصلاح تھے۔ بہت سے ایسے تھے جو خود ہی اپنے آپ کو فارغ الاصلاح سمجھ بیٹھے تھے۔ پھر بھی ہر روز پندرہ بیس اصلاح طلب خطوط ڈاک میں پہنچتے تھے۔ بڑی بات یہ تھی کہ اصلاح کا کام ہمیشہ خود ہی کرتے تھے اور اپنے اُن فارغ الاصلاح پختہ گو شاعروں پر جو شرفِ ملاقات حاصل کرنے کے لئے آتے اور ہفتوں ان کی خدمت میں حاضر رہتے تھے۔ یہ کام ہرگز نہ چھوڑتے تھے۔ وہ عزیز غزل کے اشعار پڑھتے جاتے اور یہ اصلاح لکھواتے جاتے تھے۔ جو شعر ناقص ہوتا اسے قلم زد کرنے کے لئے کہہ دیتے اور جو اچھا ہوتا اسے سن کر کہہ دیتے کہ آگے پڑھو۔ وہ ڈیڑھ گھنٹے میں اس کام سے فارغ ہو جاتے تھے۔ ایک دو لفظوں ہی کی تبدیلی سے شعر میں روح پھونک دیتے تھے۔ مثلاً میرا ایک شعر یہ تھا ؎

حشر پہ آیا مرا دل نہ پہلو میں آیا ۔۔۔ پر تجھ کو پر نہیں معلوم کیوں کر آیا

مصرع ثانی میں پہلا لفظ بدل کر "ان" کر دیا (ان تجھ کو پر) اس تبدیلی سے ایک تو حشو کا لفظ خارج ہو گیا۔ دوسرے اس لفظ کی تکرار بھی اس مصرع میں بار گزرتی تھی وہ بھی نہ رہی۔ تعجب ہے کہ اس تبدیلی سے کلام میں رنگ پیدا ہو کر مصرع کی شان ہی کچھ اور ہو گئی۔

اس کام میں ایک خصوصیت یہ تھی کہ جب دام پور چھوڑ کر حیدر آباد پہنچے تو نواب میر محبوب علی خان آصف کی غزل بھی سر پر ممہر کا تھے

میں بہ غرضِ اصلاح آنے لگی۔ اس میں قابلِ ترمیم ٹکڑے کو قلم زد نہیں کرتے تھے۔ ترمیم کے الفاظ کر اوپر لکھ دیتے تھے۔ آدابِ شاہی کا تقاضا بھی یہی تھا
یہ کام ہمیشہ تنہائی میں بیٹھ کر کرتے تھے۔ پھر اصلاح شدہ کاغذ سربمہر کر کے چوب دار کے حوالے کر دیتے تھے۔ کسی اور شاگرد کو یہ معلوم نہ ہو سکتا تھا کہ اصل
شعر کیا ہے اور اصلاح کیا ہے۔ بعض دفعہ دن میں چار پانچ بار چوب دار سربمہر لفافہ لاتا اور اسی طرح سربمہر واپس لے جاتا۔ ان کے بعد یہ خدمت
حضرت جلیل کو سپرد ہوئی۔ تو وہ قابلِ ترمیم ٹکڑے کو قلم زد کرنے لگے۔ اس پر آصف صاحب نے جب یہ کہا کہ جلیل اصلاح دینا نہیں جانتے۔ تو وہ
بھی حقیقتِ حال سے آگاہ ہو کر متنبہ ہو گئے۔

نظامِ حیدر آباد کبھی کبھی رات کو خود بھی ان سے ملنے کے لئے آجاتے تھے۔ دربار میں بھی ان کو بیٹھنے کی اجازت تھی۔ اور یہ اعزاز خصوصی تھا۔
جو بہت کم اشخاص کو نصیب ہوتا تھا۔

پیرانہ سالی کا یہ عالم تھا کہ رام پور میں ایک مشاعرے کا اہتمام انہی کے سپرد تھا۔ درباری مصروفیتوں کی وجہ سے طرحی غزل کہنے کا موقع نہ ملا۔ مشاعرہ
منعقد ہوا۔ دیکھنے والوں نے دیکھا کہ پڑھنے والوں کے اچھے اشعار کی داد بھی دے رہے ہیں۔ مہمانوں کی خاطر مدارات اور مشاعرہ کے حسنِ انتظام
کی بھی نگرانی فرما رہے ہیں اور طرحی غزل بھی کہہ رہے ہیں۔

پڑھنے کا انداز اگرچہ تحت لفظ تھا۔ مگر بہت دل کش تھا۔ اس زمانے میں دیکھنے والوں نے ریاض خیرآبادی کے سوا کسی شاعر کو اس لوچ
جھلک سے پڑھتے نہیں دیکھا۔

ہر صاحبِ کمال کے حاسد ضرور ہوتے ہیں۔ ان کے کلام پر بھی ان کی زندگی میں اعتراض ہوتے رہے۔ وسط ہند کے ایک شخص نے اپنا نام
پردے میں رکھ کر اودھ اخبار میں بہت سے اعتراض شائع کئے، مگر ان کی مرنجاں مرنج طبیعت کا تقاضا ہمیشہ یہی رہا کہ خاموش رہیں۔ فرماتے تھے
کہ کوئی اس طرح خوش ہوتا ہے تو ہونے دو۔ یہی وجہ ہے کہ ان اعتراضات کا دندان شکن جواب ان کے قابل شاگرد نسیم بھرت پوری نے اپنے
جذبات سے اثر پذیر ہو کر کتابی صورت میں شائع کیا اور معترض کی خوب خبر لی۔ اس کتاب کا نام تازیانہ تھا۔ اور مضامین کی نوعیت کے لحاظ
سے بلاشبہ اسم بامسمیٰ تھی۔ صرف ایک مثال سن لیجئے۔ داغ صاحب کا مطلع یہ تھا ؎

دیکھئے گا یہ مزا حشر میں ہو جائے گا   آپ جو حکم کریں گے وہی ہو جائے گا

معترض کا قول یہ تھا کہ حکم کریں گے کی جگہ یہاں حکم دیں گے کہنا چاہئے۔ نسیم صاحب نے سعدیؔ کا یہ قطعہ بطور سند پیش کر دیا ؎

خواجہ با بندۂ پری رخسار   چوں بیاید بہ بازی و خندہ
چہ عجب گر چو خواجہ حکم (کند)   وے کشد بار ناز چوں بندہ

دوسرا اعتراض یہ تھا کہ داغ صاحب نے صیغہ قرار کے لئے فعل واحد استعمال کیا تھا۔ معترض نے کہا کہ جمع کا فعل آنا چاہئے۔ نسیم صاحب
نے جواب میں دو مثالیں پیش کر دیں۔

۱۔ آپ کو وسط ہند کی آب و ہوا موافق نہیں ہے۔
۲۔ وہاں کا آب و دانہ قسمت میں تھا۔

اس کے بعد یہ بھی لکھا کہ اصول و قواعد یا فن کی کسی بات پر اعتراض ہو تو سنا جا سکتا ہے۔ جس شخص نے بیگمات کی گود میں پرورش پائی
اور شہزادوں کی صحبت میں رہ کر جوان ہوا۔ وسط ہند کے رہنے والوں کو اس کی زبان پر اعتراض کرنے کا کوئی حق حاصل نہیں ہے۔

کلام کا بہت سا حصہ سہل ممتنع ہے۔ زبان کی بے تکلفی اور بیان کی صفائی کے لئے یہ ایک مطلع بطور مثال کافی ہے ؎

حضرتِ دل آپ ہیں جس دھیان میں   مر گئے لاکھوں اسی ارمان میں

کوئی خاص بات نہیں بتائی اور سب کچھ بتا دیا ہے۔
چھوٹے چھوٹے لفظوں سے بہت بڑا فائدہ اُٹھاتے تھے۔ یہ شعر دیکھئے ؎

تمہیں انصاف سے اے حضرتِ ناصح کہہ دو   لطف اِن باتوں میں آتا ہے کہ اُن باتوں میں

یہاں اِن اور اُن کا استعمال کتنا نادر ہے۔ اسی قسم کی اور بیسیوں خوبیاں ان کے کلام میں موجود ہیں۔ جن پر نقد و تبصرہ اس مضمون کے موضوع سے خارج ہے۔

اچھے شعر کی داد دینے میں بہت فراخ دل تھے۔ بہت سے اساتذہ کو دیکھا ہے کہ مشاعرے میں مہر بہ لب ہو کر بیٹھے رہتے ہیں اور کسی کو داد نہیں دیتے۔ اگر کوئی شاعر کسی کو مخاطب کر کے شعر پڑھتا ہے۔ تو تھوڑا سا سر ہلا دیتے ہیں اور بس۔ مگر حضرت داغ اچھے شعر کو سن کر بے تاب ہو جاتے تھے۔ اور مکرر پڑھواتے تھے۔ اگرچہ نومشق شاعروں کی حوصلہ افزائی بھی اسی عادت کا ایک حصہ تھی۔ مگر پھر بھی شاگردوں کو یہ تاکید تھی کہ صرف اصلاح شدہ غزل ہی مشاعرے میں پڑھا کریں اور ایسی ہی چیز رسالوں میں بھیجا کریں۔

طبیعت بہت انصاف پسند اور منکسر المزاج واقع ہوئی تھی۔ اس کی ایک مثال یہ ہے کہ ایک دفعہ حضرت ریاض خیرآبادی اپنے استاد حضرت امیر مینائی کی بیمار پرسی کے لئے حیدرآباد آئے اور کئی ہفتے وہاں ٹھہرے۔ کبھی کبھی حضرت داغ کی خدمت میں بھی نیاز مندانہ سلام کے لئے حاضر ہونے کا معمول رہا۔ ایک دن حاضر ہوئے تو حضرت داغ کے پاس چند احباب بھی بیٹھے تھے۔ رسمی گفتگو کے بعد داغ صاحب نے کچھ سنانے کی فرمائش کی۔ ریاض صاحب نے اظہارِ معذرت کیا اور کہا۔ آپ کے سامنے کیا پڑھوں۔ داغ صاحب نے احباب سے کہا کہ یہ ہم میں سے کسی کو بھی اپنا مخاطب صحیح نہیں سمجھتے۔ ریاض صاحب نے یہ پھبتی ہوئی طنز سن کر کہا کہ آپ تو مجھے شرمندہ کرتے ہیں۔ میں اپنے استاد کے سامنے بھی نہیں پڑھتا۔ آپ کا بھی ویسا ہی احترام کرتا ہوں۔ مگر یہ عذر قبول نہ ہوا۔ مزید اصرار پر ریاض صاحب نے مختصر سی زمین میں ایک غزل سنا دی۔ اس کے دو تین شعر یہ ہیں ؎

چین مر کر تہِ زمیں بھی نہیں   اب ٹھکانا مرا کہیں بھی نہیں
آہ کے ہوتے اشک کے چلتے   آسماں بھی نہیں زمیں بھی نہیں
چپ ہیں وہ سن کے میری عرضِ وصال   منہ سے ہاں بھی نہیں نہیں بھی نہیں
کون گرمائے تجھ کو اے دلِ سرد   جرعۂ آبِ آتشیں بھی نہیں

داغ صاحب نے بہت داد دی۔ بہت خوش وقت ہوئے۔ چند یوم کے بعد ریاض صاحب پھر ملاقات کے لئے آئے تو فرمایا کہ وہ زمین مجھے پسند آئی تھی۔ میں نے بھی غزل کہی ہے۔ مگر تمہاری غزل کے سامنے پست معلوم ہوتی ہے۔ فرمائش اور اصرار پر غزل سنانے لگے۔ ریاض صاحب لکھتے ہیں کہ غزل بلند پایہ تھی۔ مگر پھر بھی یہ فرمایا کہ مجھے پسند نہیں۔ یہ کہہ کر کاغذ میرے سامنے پھاڑ ڈالا۔
اس واقعہ کا آخری حصہ غلط ہو یا درست۔ پھر بھی ان کی انصاف پسندی اور فراخ دلی کا یہ پورا ثبوت پیش کرتا ہے۔
اپنے ہم عصروں کا بڑا احترام کرتے تھے۔ مثال میں یہ شعر کافی ہے ؎

[illegible] بہت دور لکھنؤ   ملتے امیر احمد و تسلیم بلا سے

اسی سلسلے میں حضرت امیر مینائی کا یہ شعر بھی قابلِ ذکر ہے۔ جس سے ظاہر ہے کہ ان کے ہم عصروں کا برتاؤ بھی ان کے ساتھ بہت مخلصانہ تھا۔

امیر اچھی غزل ہے داغ کی جس کا یہ مطلع ہے   بھویں تنتی ہیں خنجر ہاتھ میں ہے تن کے بیٹھے ہیں

آن سے نکلا۔ شان سے نکلا۔ اس زمین میں حضرت داغ کی ایک غزل ہے۔ حضرت امیر نے اس غزل کی تعریف بھی بے حد و انتہا کی تھی۔ احباب کو اس کا مطلع بھی سنایا تھا اور فرمایا تھا کہ اس مطلع کا جواب نہیں ہو سکتا۔ وہ مطلع یہ ہے ؎

خارِ حسرت بیاں سے نکلا   دل کا کانٹا زباں سے نکلا

حیدرآباد میں ایک مشاعرہ تھا۔ یہ خود تو شامل نہیں ہو سکے۔ ان کے کئی شاگرد شامل مشاعرہ تھے۔ ان کے خواجہ تاش سید ظہیر کا ایک مرصعی کام تھا۔ انہوں نے اصرار کیا کہ مجھے پڑھوا دیا جائے۔ مگر بار بار کہنے پر بھی مہتمم مشاعرہ نے احتراماً انہیں نہ پڑھوایا۔ اور کہا کہ آپ کے بعد کوئی اور شاعر پڑھنا گوارا نہ کرے گا۔ مشاعرہ خراب ہو گا۔ انہوں نے مزید اصرار کیا۔ مگر شنوائی نہ ہوئی۔ تو غصے میں دونوں غزلیں چاک کر ڈالیں اور چل دیئے مشاعرے میں سناٹا چھا گیا۔ مہتمم مشاعرہ نے باقی شعرا کی منت خوشامد کی اور ان کو پڑھوا دیا۔ داغ صاحب کو اس کا علم ہوا۔ تو اگلے دن ان سب شاگردوں کو ڈانٹا اور کہا کہ جب ظہیر صاحب نے غزل نہیں پڑھی اور اٹھ کر چلے گئے تو پھر تم نے یہ بے ادبی کیوں گوارا کی۔ تم بھی اٹھ کر چلے آتے۔ اس واقعہ سے ظاہر ہے کہ وہ اپنے ہم عصروں اور مشاہیر کا کتنا احترام کرتے تھے۔

رام پور میں ان کی شاعرانہ شخصیت کا یہ عالم تھا۔ کہ ہر مشاعرے پر چھا جاتے تھے۔ حضرت امیر مینائی خود کہا کرتے تھے کہ غزل پر محنت کرنے سے کیا فائدہ۔ مشاعرہ تو داغ ہی کے ہاتھ رہے گا۔ نواب کلب علی خاں والیٔ رام پور نے بارہا ایسا کیا۔ کہ خفیہ طور پر چند آدمی یہ معلوم کرنے کے لئے مقرر کر دیئے۔ کہ مشاعرہ ختم ہونے پر جب حاضرین رخصت ہوں۔ تو ان کی گفتگو مشاعرہ کے متعلق سنیں اور دیکھیں کہ وہ راستہ چلتے چلتے کس شاعر کی تعریف کرتے اور کس کے اشعار کو دہراتے ہیں۔ ان کی رپورٹ بھی ہمیشہ حضرت داغ ہی کے حق میں ہوتی تھی۔ اور لوگ انہی کے اشعار کو مزے لے لے کر پڑھتے پائے جاتے تھے۔ حیدرآباد میں بھی ان کے کلام کی مقبولیت کا یہی عالم تھا۔ اخیر عمر میں تو وہ پھیکا شعر بھی کسی مشاعرے یا اور کسی صحبت میں پڑھ دیتے تھے۔ تو اس پر بھی خاصی واہ واہ ہو جاتی تھی۔

حیدرآباد میں ان کی ابتدائی تنخواہ ۴۵۰ تھی۔ پھر ایک ہزار ہوئی۔ پھر ڈیڑھ ہزار۔ مگر ہر ایک ترقی روزِ اول ہی سے شمار کی گئی۔ ایک دفعہ انہیں پندرہ ہزار روپے اسی ترقی کے حساب میں ملے تھے۔ آئے دن کے انعامات و اکرامات اس کے علاوہ تھے۔ اپنے عزیزوں اور رشتہ داروں کی سرپرستی میں بھی بہت کچھ خرچ کرتے تھے۔ ایک دفعہ نظام حیدرآباد نے یہ سنا کہ داغ سات ہزار کے مقروض ہیں۔ انہوں نے یہ قرضہ ادا کرنے کے لئے کل رقم بھیج دی۔ ان کی منہ بولی بیٹی لاڈلی بیگم کا بھی وظیفہ مقرر تھا۔ یہ لڑکی دراصل ان کی سالی کی بیٹی تھی۔ جو بعد میں نواب سائل دہلوی سے بیاہی گئی اور ابھی تک بقیدِ حیات ہے۔

شاگردوں کی کثیر تعداد میں جیسے بیخود دہلوی۔ بیخود بدایونی۔ نوح ناروی۔ نواب سائل۔ رسا رام پوری۔ نسیم بھرت پوری۔ احسن مارہروی۔ طپش مارہروی۔ مہر گوالیاری۔ نواب عزیز یار جنگ۔ حضرت اقبال۔ فنا گلاؤٹھی۔ ناطق گلاؤٹھی۔ احسن سنبھلی۔ مبارک عظیم آبادی۔ متین مچھلی شہری۔ وجاہت جھنجھانوی۔ نادر دہلوی۔ رعد گوالیاری۔ ثاقب اور سب سے بڑھ کر یہ کہ خود نظام دکن شامل ہوں۔ تو اس سے بڑھ کر ان کی شاعرانہ عظمت کا ثبوت اور کیا ہو گا۔ کلام اس قدر مقبول ہوا۔ کہ اس گئے گزرے زمانے میں بھی ان کے صدہا اشعار لوگوں کی زبان پر ہیں۔ چار دیوان شائع ہوئے۔ گلزارِ داغ آفتابِ داغ اور مہتابِ داغ تو ان کی زندگی ہی میں منظرِ عام پر آ گئے تھے۔ اور تمام دنیائے ادب سے خراجِ تحسین وصول کر چکے تھے۔ مثنوی فریادِ داغ ان کے علاوہ ہے۔ چوتھا دیوان یادگارِ داغ ان کے بعد حضرت احسن مارہروی نے شائع کیا۔ اس کے علاوہ فصیح اللغات بھی ان کی زیرِ نگرانی مرتب ہو رہی تھی۔ مگر عمر نے وفا نہ کی اور ۱۳۲۲ھ یا فروری ۱۹۰۵ء میں دنیا سے رخصت ہو گئے۔ مزار حیدرآباد ہی میں ہے۔

ان کی وفات پر جا بجا ماتمی مضامین شائع ہوئے۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ صدمہ تمام دنیائے ادب میں شدت سے محسوس کیا گیا۔ بہت سے رسالوں اور اخباروں نے زوردار مضامین لکھے۔ تمام مشہور شعرائے وقت نے ماتمی نظمیں اور قطعات تاریخ دردناک پیرائے میں کہے ان میں حضرت اقبال، حضرت مضطر خیرآبادی اور حضرت ریاض خیرآبادی کی ماتمی نظمیں خاص طور پر قابلِ ذکر اور بہت بلند پایہ ہیں۔ نواب میرزا داغ (۱۳۲۲ھ) کے الفاظ بیشتر اصحاب کے قطعات تاریخ میں بطور توارد پائے جاتے ہیں۔ راقم الحروف نے دس بارہ شعر کا ایک قطعہ تاریخ کہا تھا۔ اس کا آخری مصرع جس میں مادۂ تاریخ ہے یہ تھا۔ ع

بلبلِ ہندوستاں آج اپنے گلشن میں نہیں

۲۲ ۱۳ ھ

اکبر الہ آبادی

عبدالماجد دریابادی

تھے معزز شخص لیکن ان کی لائف کیا لکھوں
گفتنی درج گزٹ باقی جو ہے ناگفتنی!

اکبر کا یہ الہامی شعر دوسروں کے حق میں جس حد تک بھی صحیح ہو، خود ان کے حق میں تو بہر حال صحیح نہیں۔ ان کے "درج گزٹ" حالات و معاملات تو گفتنی یقیناً ہیں، باقی جو گزٹ یا ہر یا مسل با ہر ہیں وہ بھی چاہے سب کے سب مثالی، معیاری، ملکوتی نہ ہوں پھر بھی ناگفتنی کہنے کے لائق تو کسی طرح بھی نہیں۔

یہ بھی تو فرما گئے ہیں ؎

اکبر کی برائی اچھائی پوچھ اس کے محلہ والوں سے
ہاں شعر وہ اچھا کہتے ہیں، دیوان تو ان کا دیکھا ہے

لیکن محلہ والوں کی شہادت ان شاء اللہ ان کی صفائی ہی میں گزرے گی۔ استغاثہ کو مدد ان سے ذرا نہ ملے گی۔

آگے بڑھنے سے پہلے یہ خوب سوچ سمجھ لیجئے کہ جن حضرت اکبر کو ہم آپ جاننے پہچاننے نکلے ہیں وہ اپنی پبلک زندگی میں ایک شاعر تھے اور خالص شاعر۔ اوّل بھی شاعر اور آخر بھی شاعر۔ جو سید اکبر حسین وکیل تھے اور پھر منصف ہوئے، سب جج ہوئے، عدالت خفیفہ کے جج ہوئے، ڈسٹرکٹ اور سشن جج ہوتے اور ہائی کورٹ کی ججی کی منزل تک پہنچتے پہنچتے رہ گئے۔ ان سے ہم کو آپ کو کوئی سروکار نہیں۔ ان سے اگر کچھ واسطہ ہے بھی تو بالواسطہ، اور بہت گھوم پھر کر ——— کہنے والے کہتے ہیں کہ ان کی سرکاری زندگی کا بھی رُخ روشن ہی رہا، صاف اور بے داغ رہا، کام جو کچھ کیا دیانت سے کیا، محنت سے کیا، قابلیت سے کیا، فہم سلیم کے ساتھ کیا۔ فرض کو فرض سمجھ کر کیا۔

شاعر کی ذاتی زندگی کو، شاعر کی شخصیت کو جب جانچا جائے گا تو اسے اسی کے پیمانہ سے ناپا جائے گا۔ یہ نہ ہو گا کہ جائزہ تو لے رہے ہوں ہم شاعر کا اور عینک لگا لیں پبلک لیڈر والی، عالم دین والی، مرشد طریقت والی۔

حضرت اکبر کے کلام سے جو واقفیت بلکہ گرویدگی اپنے بچپن ہی سے تھی۔ اس وقت سے کہ جب شعر سمجھنے کی معمولی سی تمیز بھی نہ تھی۔ لڑکپن بھر
سیتاپور اپنا وطن ثانوی رہا۔ سنہ ۱۹۰۹ء میں یہ ہوا کہ اکبر صاحب کے صاحبزادہ سید عشرت حسین ڈپٹی کلکٹر ہو کر سیتاپور آئے۔ ہماری ہی کوٹھی کے ایک حصہ
میں آکر اترے اور ہم لوگوں سے خوب خلا ملا ہو گیا۔ میں اس وقت لکھنؤ کالج میں پڑھنے آ چکا تھا۔ پھر بھی سیتاپور آمد و رفت کثرت سے رہا کرتی اور عشرت
صاحب اپنی 'صاحبیت' اور سن میں مجھ سے بہت بڑے ہونے کے باوجود مجھ پر بہت مہربان ہو گئے۔ بالکل 'بے تکلف' اور اس طرح حضرت
اکبر سے غائبانہ واقفیت کی بنیاد اسی وقت سے پڑ گئی۔ براہ راست تعارف پہلی بار اپریل سنہ ۱۹۱۲ء میں ہوا۔ میں بی۔ اے کا امتحان دینے الہ آباد گیا
اور وہیں عشرت منزل حضرت اکبر کی خدمت میں حاضری دی —— پہلی ملاقات کا منظر آج تک لوح حافظہ میں منقوش ہے۔ حضرت اکبر آرام کرسی
پر تشریف فرما تھے (عموماً یہی طریقۂ نشست تھا)، سامنے حقہ لگا ہوا تھا۔ میں ادب سے جا کر ایک چھوٹی کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس محبت و شفقت سے ملے
جیسے اپنے ہی خاندان کا کوئی شفیق بزرگ ملتا ہے۔ میرے عقائد اس وقت اسلام سے بالکل ہٹے ہوئے تھے اور یہ قدرۃً اکبر جیسے دیندار شخص کے لئے
مینا کشیدگی کا باعث ہو سکتا تھا اور پھر سن میں ہی اتنا فرق کہ وہ ۶۶ سال کے بزرگ سال خوردہ اور میں عمر کے بیسویں سال میں۔ اس پر بھی کوئی چیز اکبر کے
حسن اخلاق و شفقت بزرگانہ میں حائل نہ ہو سکی اور پہلی ہی ملاقات میں وہ مجھ سے ہر طرح بے تکلف ہو گئے۔

اس وقت سے لے کر وقت رحلت (ستمبر سنہ ۲۱ء) تک کہ کوئی ۱۰ سال کی مدت ہوتی ہے، اس بے کمال کو اچھا خاصہ قرب اس باکمال سے نصیب
رہا۔ سال میں دو چار بار شرف نیاز عموماً حاصل ہو جاتا۔ زیادہ تر لکھنؤ ہی میں اور دو بار الہ آباد میں اور ایک بار پرتاب گڑھ میں بھی حاصل ہوا اور خط و کتابت
بھی کثرت سے رہتی۔ یہاں جو کچھ عرض ہو گا عمر کے اس دور سے متعلق عموماً مشاہدہ یا براہ راست تجربہ ہی پر مبنی ہو گا۔ ہاں اس کے قبل کی بابت جو کچھ عرض ہو گا وہ
دوسروں ہی کی روایات و بیانات سے ماخوذ ہو گا۔

جسمانی حیثیت سے حضرت اکبر بہت ہی لاغر اور کچھ منحنی سے تھے۔ سقدح کی ہوئی آنکھوں پر عینک لگی ہوئی، داڑھی کچھ چھدری سی جس کے اکثر بال
سفید۔ چہرہ میں کوئی ایسی بات نہ تھی جو انہیں عوام سے ممتاز کرتی۔ آنکھوں میں ذرا چمک البتہ تھی۔ لباس بھی معمولی قسم کا پہنتے۔ سواری میں فٹن گاڑی رہتی۔
وراسی کو لے دے کے ایک علامت امارت کی سمجھ لیجئے۔ کوٹھی عشرت منزل انہی کی بنوائی ہوئی تھی۔ ایک لق و دق اور خوشنما قطع کی حویلی کسی زمانہ میں دوستوں
کے قہقہوں اور چہچہوں سے معمور، خوب آباد و پر رونق تھی لیکن اب تو خزاں رسیدہ اور ویران سی پڑی رہتی تھی۔ نہ دعوتیں نہ جلسے، نہ مشاعرے، نہ ملنے جلنے والوں
کا ہجوم۔ بس کبھی کبھی دو چار آدمی آ جاتے۔ کھانا بھی اوسط درجہ کا کھاتے، نہ بہت امیرانہ اور نہ بالکل غریبانہ۔ کھانے کی مقدار بہت کم ہوتی اور زیادہ روغنی اور
ثقیل غذاؤں سے بڑی احتیاط رکھتے۔ چائے وغیرہ کے بھی شوقین نہ تھے —— جوانی کی تصویروں میں البتہ دیکھا کہ خاصے وجیہہ تھے اور چہرہ بھرا ہوا رکھتے
تھے اور اس دور میں کھانا اور لباس بھی ذرا پرتکلف رہتا۔

عام طور پر افسردہ اور غمگین ہی رہا کرتے۔ ایک بڑے ہوشیار اور چہیتے لڑکے ہاشم نامے کا سنہ ۱۹۱۳ء میں، عین اس وقت جب وہ سبزہ آغاز ہو چلا تھا
تھا، انتقال ہوا اور اس کی ماں، حضرت اکبر کی محبوب بیوی، اس سے قبل ہی رحلت کر چکی تھیں۔ یہ چھوٹی بیگم تھیں۔ بڑی بیگم سے کبھی بنی ہی نہیں۔ شروع ہی
سے ان سے علیحدگی رہی۔ اسباب اور داخلی حالات کا اللہ ہی کو علم ہے بہرحال یہ تذکرے ہی حضرت اکبر کے لئے کوفت کا باعث تھے۔ یہ خانگی صدمے اور
پھر اس عمر میں دل بہلا دینے کے لئے خود ہی کیا کم تھے کہ بڑے صاحبزادہ (اور اب تو یہی ایک باقی رہ گئے تھے) کے عادات و اطوار اور پھر مذہبی عقائد نے
حضرت اکبر کو اور بھی فکر و تشویش میں ڈال رکھا تھا۔ بہو اور پورا [illegible] شیعہ گھرانے کا تھا اور اکبر اپنی ذات سے سخت قسم کے سنی۔ بہرحال اس طرح سے
فکر و اندوہ میں رہا کرتے۔

آخر میں صحت بھی بہت گر گئی تھی اور دنیا سے بیزار رہنے لگے تھے۔ طبیعت بڑی حساس واقع ہوئی تھی۔ گرمی، سردی، شور و غل ہر چیز کا اثر بہت زیادہ لیتے۔

معمولی اور ہلکے مضر غذاؤں سے بھی شدید نقصان کا وہم قائم کر لیتے۔ طبیب کو علاج میں خاصی دقت ہوتی۔ یہ اس کے تجویز کئے ہوئے نسخوں میں برابر نقص نکالا کرتے کہ فلاں دوا مجھے موافق نہیں آئے گی۔

ان خانگی حالات کے علاوہ ملکی و ملی انتشار بھی حضرت اکبر کی جمعیت خاطر کو پراگندہ کئے ہوئے تھا۔ دیکھ رہے تھے کہ مسلمان اپنے قدیم عقائد کو خیرباد کہہ کر تجدد، روشن خیالی، نیچریت اور فرنگیت کے سیلاب میں بہے چلے جا رہے ہیں، اور ان کے سے ذکی الحس شخص کو اس سے قلق ہونا بالکل قدرتی تھا۔ پھر سیاسی حیثیت سے بھی نہ انہیں یہ گوارا تھا کہ مسلمان بدستور انگریزوں کی سیادت و بالادستی قبول کئے پڑے رہیں اور نہ وہ حکومت سے مقابلے کے لئے گاندھی جی کے اصول اور کانگرس کے طریق کار سے متفق تھے اور مسلم لیگ بھی جیسی کہ وہ اس وقت تھی کچھ ان کی مرضی کے مطابق نہ تھی۔ یہ سارا سماں دیکھ کر وہ اندر ہی اندر کڑھتے اور گھٹ گھٹ کر رہتے، کھل کر کچھ کہنے کی یا اعلانیہ میدان عمل میں آ جانے کی نہ ہمت اپنے میں پاتے اور نہ اسے کچھ زیادہ مفید یا مناسب ہی سمجھتے۔ کوئی دوسرا ان کے خیالات و جذبات کی ترجمانی میں کچھ لکھ لکھا دیتا تو اس سے بہت خوش ہوتے، خوب اس کی پیٹھ ٹھونکتے اور خود بس اشارے کنایے اپنی شاعری میں کرتے رہ جاتے اور کلام کے چہرے پر مزاح، ظرافت کا نقاب اسی غرض و مقصد سے ڈالے رہتے۔ کہہ بھی تو گئے ہیں ؎

سرد موسم تھا ہوائیں چل رہی تھیں برفبار
شاہد معنی نے اوڑھا ہے ظرافت کا لحاف

ظرافت و شوخی کچھ تو اصلی و طبعی رنگ بھی تھا اور کچھ اس لئے بھی اختیار کیا کہ اس کی آڑ میں دل کی بھڑاس نکالنے کا پورا موقع مل جائے گا۔ وہی مرشد رومیؒ کی ہدایت پر عمل کہ "سر دلبراں، بیان کرنا بہ تفسیر یہ" حدیث دیگراں" کا اختیار کر دو۔

غرض ان کی مستقل افسردگی اور مستمر غمگینی، متعدد اور گوناگوں ذاتی و ملی حالات کے مجموعہ کا نتیجہ تھی۔ کوئی دوسرا ہوتا تو مزاج میں جھلاہٹ اور طبیعت میں چڑچڑا پن ضرور پیدا ہو جاتا۔ اکبر کے ہاں یہ کچھ نہ ہوا۔ البتہ ایک مستقل اداسی سی رہنے لگی اور غم غلط کرنے کا ایک نسخہ انہوں نے اپنی ظریفانہ شاعری کو بنا لیا۔ مجلسوں اور صحبتوں میں گفتگو بہت زیادہ نہ کرتے کہ دوسروں کو بولنے کا موقع ہی نہ ملے اور نہ ایسے خاموش رہتے کہ بس دوسرے ہی بولتے رہیں اور یہ چپکے سنتے ہی رہ جائیں۔ گفتگو میں خود بہت کم ہنستے۔ دوسروں کو البتہ ہنساتے رہتے۔ نظم تو گویا ان کے گھر کی کنیز تھی اور قافیے جیسے ہاتھ باندھے سامنے حاضر رہتے۔ شعر برجستہ اور فی البدیہہ کہہ ڈالتے۔ گفتگو عام تذکروں وقتی چرچوں کے علاوہ جب اپنی مرضی کے مطابق کرتے تو یا تو اپنا کلام سناتے اور یا پھر توحید و معرفت کا ذکر چھیڑ دیتے۔ آخر زمانہ میں ان کا سب سے دل پسند موضوع یہی تھا۔ لمبی تا طولانی گفتگو سے گھبراتے بات مختصر کرتے۔ اور جو بات کا بیشتر حصہ یا عارفانہ و حکیمانہ ہوتا اور یا پھر شعر و ادب کے کسی نکتہ پر مشتمل۔ مخاطب کی دلجوئی کا بڑا لحاظ رکھتے اور بحث و مباحثہ مذہبی کیا معنی، سیاسی علمی تک حتی الامکان کسی قسم کا نہ پیدا ہونے دیتے بلکہ جب دیکھتے کہ مناظرانہ رنگ آیا ہی چاہتا ہے تو کوئی لطیفہ یا چٹکلہ درمیان میں لا کر بات وہیں ختم کر دیتے۔

مذہبی عقائد میں بڑے پختہ تھے۔ معاصر علما میں سب سے زیادہ قائل و معتقد حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے تھے۔ عام عقیدت بھی دیوبند سے زیادہ تھی۔ عملاً بھی مذہب کا رنگ چھایا ہوا تھا۔ نماز اول وقت پڑھنے کا خاص اہتمام رکھتے اور وقت آنے کے منتظر و مشتاق رہا کرتے۔ بار بار گھڑی دیکھتے جیسے کوئی عازم سفر اسٹیشن جانے کے لئے گھڑی دیکھتا رہتا ہے۔ اپنے ملازموں وغیرہ کو ساتھ لے کر حتی الامکان چھوٹی سی جماعت کا بھی التزام رکھتے بلکہ نئے ملازم سے اسے رکھتے ہوئے کہہ بھی دیتے کہ تمہیں نماز میرے ساتھ پڑھنا ہو گی۔ میں نے اپنے الحاد سے نکلنے کے بعد جب پہلی بار نماز ان کے ساتھ پڑھی ہے تو بے انتہا خوش ہوئے۔ معلوم یہ ہوتا تھا کہ کوئی دولت خود انہی کو مل گئی ہے۔ نماز کے بعد پھر تلاوت قرآن مجید کے شائق نہیں عاشق تھے۔ دو دو وقت پابندی کے ساتھ قرآن پڑھتے۔ ایک بعد نماز فجر، دوسرے بعد نماز ظہر۔ عربی کی باضابطہ استعداد کچھ زیادہ نہ تھی۔ فرماتے تھے کہ مجھے جو کچھ عربی آئی

تلاوت قرآن کی مزاولت سے اب تو اب میں آیات قرآنی کا مفہوم بلا تکلف سمجھنے لگا ہوں۔

مذہبیت کی شدت کا یہ عالم تھا کہ ایک بار دہلی بستی نظام الدین اولیا میں جا کر خواجہ حسن نظامی کے مہمان ہوئے۔ درگاہ کے دروازہ ہی پر غالب کی تربت تھی۔ خواجہ صاحب نے بتا دیا۔ ان کے ساتھ فاتحہ پڑھنے چلے۔ مگر کچھ ہی دور چل کر رک گئے اور بولے کہ "میں نہیں جاؤں گا۔ یہ تو وہی ہے جو جنت کے لئے یہ شعر کہہ گیا ہے ؎

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن
دل کے خوش رکھنے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

ایسے شخص کی قبر پر میں فاتحہ نہیں پڑھوں گا۔ اللہ میاں اس کے ساتھ جو بھی چاہیں معاملہ کریں۔"

تصوف کے بڑے معتقد تھے۔ لیکن ان کا تصوف بھی خالص اسلامی طرز کا تھا، پیرزادوں اور درگاہ کے مجاوروں والا نہ تھا، چادر، گاگر، عرس، سماع سب سے بچتے اور ملفوظات و کرامات کے بھی کچھ زیادہ قائل نہ تھے، بس توحید کا رنگ غالب تھا اور اُسی کا اعتقاد برابر مستحضر رہتا۔ اپنے دوران قیام میں درگاہ حضرت نظام الدین اولیاؒ پر روزانہ حاضری دیتے لیکن کسی بدعتی نذر و نیاز وغیرہ میں شرکت نہ کرتے تھے۔ بس تربت کے پاس بیٹھ کر کلام مجید پڑھا کرتے۔ بزرگوں کے قصص و حکایات بھی بیان نہ کرتے۔ بلکہ میں ان کے آخری زمانہ میں جب نیا نیا حلقۂ تصوف میں داخل ہوا اور صوفیاء کی حکایات زیادہ بیان کرنے لگا تو اکبر صاحب انہیں حیرت ہی سے سنتے اور کبھی ایسے ایسے ٹیڑھے بینڈے سوال کر دیتے کہ بیان کرنے والا جھینپ کر رہ جاتا۔ ایک روز میں فرید الدین عطارؒ کی مثنوی "منطق الطیر" کا کوئی مقام جھوم جھوم کر سنا رہا تھا، پوچھ بیٹھے: "ان صاحب کا مذہب کیا تھا؟" میں بجائے داد و تحسین کے یہ سوال سن کر جہاں تھا وہیں رہ گیا۔

اس سے بھی بڑھ کر سنئے۔ میں نے مثنوی مولانائے روم کا مطالعہ نیا نیا کیا تھا اور اس سے بے حد متاثر ہوا تھا۔ مثنوی ہی کا ذکر و فکر ہر وقت کا مشغلہ تھا اور اسی نشہ میں چوبیسوں گھنٹے مست رہتا تھا۔ یہی تذکرے حضرت اکبر کے سامنے شروع کئے۔ ایک بار سنا، کچھ ہلکی سی داد دی۔ دوبارہ سنا، چپ ہو گئے۔ تیسری بار جب پھر یہی تذکرہ میں نے چھیڑا تو بول اٹھے "کیوں صاحب اللہ میاں بڑے ہیں یا آپ کے مولوی روم صاحب؟" میں نے کھسیانی ہنسی ہنس کر جواب دیا کہ "ظاہر ہے خدا سب سے بڑا ہے۔" بولے کہ "آپ کی زبان سے ہر بار مولانا روم ہی کی بڑائی سنی، اللہ میاں کی بڑائی ایک بار بھی نہ سنی اس لئے پوچھنا پڑا۔" پھر بولے کہ "اس طرح سوچئے کہ اللہ میاں اپنی قدرت و حکمت سے آپ کو مولوی روم تک لائے یا مولانا روم نے آپ کو خدا تک پہنچا دیا؟" ـــــ غیرت توحید اس درجہ غالب تھی کہ اس کے آگے ہر عقیدت، ہر محبت دب کر رہ گئی تھی۔

حد اور انتہا یہ ہے کہ نعتیہ مضامین کا سننا بہت دیر تک گوارا نہ کرتے اور جھٹ اس میں پیوند توحید کا لگا دیتے۔ ایک روز فضائل و مناقب رسولؐ کا تذکرہ جاری تھا۔ دو چار منٹ تک تو دلچسپی لی اس کے بعد بول اٹھے "جی ہاں! ہمارے اللہ میاں کی کاریگری کا کیا کہنا۔ دیکھئے ایسا جامع کمالات رسول پیدا کر دیا۔" ـــــ توحید کے بعد دوسرے نمبر پر محبوب موضوع تذکرۂ آخرت تھا۔ یہی ذکر خود بھی کرنا چاہتے اور دوسروں سے بھی سننا چاہتے۔ مگر ظاہر ہے کہ ان سے دلچسپی رکھنے والے لوگ ہی انہیں کتنے اور کہاں ملتے۔

اس سے خیال یہ نہ گزرے کہ اکبر کوئی خشک قسم کے انسان تھے۔ جی نہیں، گفتگو بڑی دلچسپ کرتے اور علمی، ادبی، سیاسی، معاشرتی ہر عنوان پر گفتگو فرما لیتے۔ انگریزی کی استعداد اچھی خاصی تھی اور علاوہ انگریزی اخبارات کے اونچی انگریزی کتابیں بھی پڑھتے رہتے۔ بیشک بڑے کتب بینوں میں ان کا شمار نہ تھا یعنی یہ نہ تھا کہ ہر وقت کتاب کے کیڑے بنے رہتے لیکن یہ بھی نہ تھا کہ اس مذاق سے کورے ہوں۔ مطالعہ میں اکثر فلسفہ کی کتابیں رکھتے خصوصاً مسائل فلسفہ کی اصطلاح یا سلسلے میں وہ انہیں اپنے صاحبزادہ سے مل جاتی۔ عشرت صاحب آخر کیمبرج کے گریجویٹ تھے اور وہ اپنا ساتھ [illegible]

کوتاہی نہیں فلسفیانہ کتابوں سے اپنے والد ماجد کو برابر باخبر رکھتے۔ پروفیسر میک ٹگرٹ (McTaggart) وغیرہ کی کتابیں میں نے پہلے پہل انھی کے ہاں دیکھیں۔ مذہب اور تصوف کی تائید میں خوب خوب نکتے ان لوگوں کے ہاں سے پیدا کر لیا کرتے۔ شاید ۱۹۱۵ء تھا جب میں نے برکلے (Berkeley) کے مکالمات کا اردو میں ترجمہ کیا۔ برکلے کے فلسفہ کا خلاصہ یہ ہے کہ "موجودیت" تحلیل ہو کر "معلومیت" پر پڑتی ہے اور اس کے سوا 'وجود' کا لفظ بے معنی ہے۔ اکبر اس فلسفہ کو سن کر بڑے خوش ہوتے اور فرمایا کہ "یہی تو ہمارے صوفیہ شروع سے کہتے آ رہے ہیں کہ سارے موجودات کا وجود بس علم باری ہی میں ہے"۔ ـــــ ایسے ایسے نکتے دن رات پیدا کرتے رہتے، پڑھتے کم تھے، سوچتے زیادہ تھے اور کتابی معلومات سے کہیں زیادہ تکیہ اپنے ذہن و دماغ پر رکھتے۔

گاندھی جی سے کچھ زیادہ حسنِ ظن نہیں رکھتے تھے اور نہ ان کی تحریک ترکِ موالات کے کچھ زیادہ قائل تھے۔ میرے دل و دماغ پر اس وقت گاندھی جی کی عقیدت و عظمت پوری طرح چھائی ہوئی تھی اور علی برادران تو ان کی صرف سیاسی رہنمائی اور سوجھ بوجھ کے قائل تھے لیکن میں انہیں روحانی پیشوا کے درجہ پر رکھنے لگا تھا۔ جولائی ۱۹۲۱ء میں (عین تحریکِ خلافت و ترکِ موالات کے شباب کے وقت) حضرت اکبر سے ملا اور لگا گاندھی جی کی روحانیت اور روحانی عظمت کے قصے بیان کرنے۔ کچھ دیر بعد حضرت اکبر فرماتے کیا ہیں کہ "کیوں صاحب! ان کی انجمن میں شریک ہونے کے لئے پہلی شرط تو توحیدِ الٰہی کی ضرور ہوگی" ـــــ اس کا جواب بن ہی کیا پڑتا۔

گفتگو میں نازک موقعوں پر لطیفہ گوئی سے خوب کام نکال لیتے۔ ۱۵ء، ۱۶ء میں یو۔پی کے چیف سیکرٹری مسٹر ریچرڈ برن تھے۔ بڑے صاحب اثر و اقتدار، فارسی کے ماہر اور اردو سے بھی واقف تھے۔ اکبر صاحب ملنے گئے تو ان سے بولا کہ "اب مسلمانوں نے بھی آزادی کے لئے بڑا ایجی ٹیشن شروع کر دیا ہے۔ آپ کیا کہتے ہیں؟" اکبر کو سچا جواب خلافِ مصلحت نظر آیا جھٹ سے بولے کہ "میں تو اور کچھ نہیں جانتا ہاں جانتا ہوں کہ "آدم زاد" ہیں جب تک 'دم' ہے 'آزاد' کہاں ہو سکتا ہے۔ 'آزاد' تو جبھی ہوگا جب 'دم' نکل جائے گا۔" انگریز حاکم کہاں تو غصہ میں تھا کہاں اس ادبی لطیفہ پر ہنس پڑا۔

دوسروں کو جیسا وہ ان کے خورد ہی کیوں نہ ہوتے روکتے ٹوکتے نہیں عموماً لطیف و شستہ پیرایہ اختیار کرتے۔ لکھنؤ میں ایک بار ایک جوان عمر سرکاری عہدہ دار ملنے آئے اور یہ حریتِ نسواں کے بڑے علمبردار تھے، اکبر صاحب کا مسلک دوسرا۔ آزادیِ نسواں کے مطالبہ کی تردید میں فرمایا کہ لوگ سید احمد خاں کو بڑا آزاد خیالی کا معلم بتلاتے ہیں لیکن عورتوں کی آزادی سے تو وہ بھی پناہ مانگتے تھے۔" وہ صاحب بیچ میں بول اٹھے کہ "سرسید کی رائے اس معاملہ میں تو بہت قابلِ ترمیم تھی۔" اکبر صاحب بغیر رکے اور اپنے سلسلۂ بیان کو اسی طرح جاری رکھتے ہوئے بولے "آپ نے سچ کہا سرسید کی رائے اس معاملہ میں کیا بہت سے معاملات میں قابلِ ترمیم تھی اور رائے و خیال کیا معنی وہ خود ہی قابلِ ترمیم تھے۔ دیکھئے زمانہ نے انہیں ترمیم کر دیا۔ وہ رخصت ہو گئے اور ان کی جگہ آپ کو پیدا کر دیا۔"

عقائد میں اتنے پختہ و متشدد ہونے کے باوجود مذہبی بحث و مباحثہ کیا معنی مذہبی تبلیغ بھی براہِ راست اور کھلم کھلا نہ کرتے بس اشاروں کنایوں میں کر جاتے۔ میرا دور الحاد تھا، ایک روز فرمایا "کیوں صاحب آپ نے تو کالج میں عربی لی تھی نا؟ اور عربی تو ایک اعلیٰ زبان ہے کیوں نہ اس سے مناسبت قائم رکھئے۔ جہاں اتنی انگریزی کتابیں پڑھتے رہتے ہیں وہاں چند منٹ کے لئے قرآن مجید کو بھی کھول کر بیٹھ جایا کیجئے۔ ادب کی بہترین کتاب تو اسے یورپ والے بھی تسلیم کرتے ہیں۔ بس اس کے ادب کا خیال کر کے دو چار صفحے اس کے روز پڑھ لیا کیجئے۔ جن آیتوں میں تشبہ پیدا ہوتا ہو انہیں جانے دیجئے اور سمجھ لیجئے کہ وہ آپ کے لئے نہیں۔ کسی نہ کسی آیت کا مضمون تو آپ کے دل کو بھی کھینچے گا۔ بس ایسی آیت جب آ جائے تو اس کی دو چار بار تکرار کر لیا کیجئے۔ اور آپ کے لئے کوئی قید وضو وغیرہ کی بھی نہیں؟" ـــــ یہ ایک نمونہ ہے ان کے حکیمانہ انداز تبلیغ کا [illegible]

گھٹنوں کی عافیت اسی طریقہ پر منحصر رہ گئے۔

شیعہ عقائد سے بالطبع بیزار تھے لیکن اس کے باوجود شیعوں میں ان کے ملنے والے اور مخلصین کثرت سے تھے۔ عزیز لکھنوی کو دل سے عزیز رکھتے تھے پھر راجہ صاحب محمود آباد وغیرہ سے بھی شیر وشکر تھے اور لکھنؤ جب آجاتے تو محشر، اثر وغیرہ شیعہ شعراء سے خوب خلا ملا رہتا — اور یہی حال ہندوؤں کے ساتھ تھا۔ ہندو احباب ان کے الٰہ آباد و لکھنؤ میں بہ کثرت تھے۔

اقبال کے ملی جوش سے پوری طرح متفق نہ تھے۔ ان کا ترانۂ حجازی نیا نیا نکلا تھا اس کا ذکر چلا۔ بولے "اقبال جوان آدمی ہیں سارا جہاں ہمارا" کہہ گئے۔ میں اس سن میں یہ ترنگ کہاں سے لا سکتا ہوں۔ میں تو یہی کہوں گا کہ سارا جہاں کیسا کچھ بھی ہمارا نہیں، "جو کچھ ہے سب خدا کا وہم و گماں ہمارا" اور پھر اس پر اور مصرعہ لگا کر اس کو قطعہ بنا دیا ؎

کالج میں ہو چکا جب امتحاں ہمارا ۔۔۔ سیکھا زباں سے کہنا ہندوستاں ہمارا

رقبہ کو کم سمجھ کر اقبال بول اٹھے ۔۔۔ ہندوستان کیسا، سارا جہاں ہمارا

لیکن یہ سب غلط ہے کہنا یہی ہے لازم ۔۔۔ جو کچھ ہے سب خدا کا، وہم و گماں ہمارا

اکبر پر ایک الزام یہ چلا ہوا ہے کہ ان کی جزرسی حدِ بخل تک پہنچی ہوئی تھی۔ ممکن ہے کہ جن لوگوں کا سابقہ ان سے چوبیسوں گھنٹہ کا رہتا تھا انہیں کچھ اس کی اصلیت دریافت ہوئی ہو لیکن اپنے تجربے کی حد تک تو کہہ سکتا ہوں کہ الزام غلط ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ اکبر مسرف نہ تھے اور بڑے فیاض اور عالی حوصلہ بھی وہ مشکل ہی سے کہے جا سکتے ہیں لیکن ان کے بخل کی کوئی شہادت میرے علم میں نہیں۔ خرچ کے موقع پر برابر خرچ ہی کرتے رہتے۔ دوست احباب کی دعوتیں کرتے رہتے اور مجھے تو الٰہ آباد یا پرتاب گڑھ جب طلب فرماتے تو کرایہ کے نام سے کوئی رقم ضرور بھیج دیتے۔

ذہانت و شوخی بلا کی تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ نہ مضمون، نہ الفاظ، نہ قافیہ کوئی چیز انہیں سوچنا ہی نہیں پڑتی تھی۔ سب کی سب پرا جمائے ہوئے حاضر ہیں۔ رنگِ کلام شروع ہونے کے ساتھ ساتھ عاشقانہ شروع ہی سے تھا۔ آخر عمر میں شوخی رفتہ رفتہ گھٹتی گئی اور معرفت اسی نسبت سے بڑھتی گئی۔ آخر عمر کے رنگ کا نمونہ یہ ہے ؎

ذہن شائق رہا ٹھکانے کا ۔۔۔ رنگ بدلا کیا زمانے کا

شوخیٔ عقل رہ گئی شک میں ۔۔۔ کٹ گئی عمر مفت بک بک میں

کر دیا دل کو این و آں نے تباہ ۔۔۔ مدد اے لا الٰہ الا اللہ

یہ نمونہ قطعہ کا تھا۔ غزل کے شعر بھی آخر عمر میں عموماً اس رنگ کے ہو گئے تھے ؎

زمیں تو کھود کر ہموار کر دی ہے کمپ میں شامل ۔۔۔ مگر ہاں آسماں کی کچھ پرانی شان باقی ہے

بہت آراستہ ہم کو کیا تعلیمِ مغرب نے ۔۔۔ بس اتنی ہی کسر سمجھو جو کچھ ایمان باقی ہے

سوا اس کے جو کچھ تھا ہو گیا سرکار میں داخل ۔۔۔ خدا کا نام باقی ہے ہماری جان باقی ہے

ہوئے نیکی سے بیگانہ تنزّل اس کو کہتے ہیں ۔۔۔ فرشتے ہو گئے رخصت فقط شیطان باقی ہے

طبیعت میں ابھی تبدیلی سے سیری نہیں پاتا
یہ سچ ہے کٹ گئے ہیں یا وہی لیکن رواں باقی ہے

وقار الملک

مولانا غلام رسول مہر

سرسیّد مرحوم کے رفیقانِ خاص بعض اپنے ہی عہد میں بے مثال نہ تھے بلکہ ان جیسی شخصیتیں کسی بھی عہد میں بہت ہی کم ملیں گی۔ محسن الملک، وقار الملک، حالی، شبلی، نذیر احمد، اعظم یار جنگ، ان میں سے کون سی شخصیت ہے، جو علم و فضل، مکارمِ اخلاق، وسعتِ نظر اور جذبۂ خدمتِ ملک و ملت میں انتہائی اونچے مقام پر فائز نہیں؟ لیکن ان میں سے وقار الملک محاسن کی فراوانی اور فضائل کی جامعیت کے اعتبار سے بہت ممتاز ہیں۔ میں نے شخصیتوں کے اس نظامِ شمسی پر جب کبھی غور کیا، ان میں سے دو کو بالکل یگانہ اور نادر پایا: ایک مولانا حالی اور دوسرے نواب وقار الملک۔ مولانا حالی بہت ہی پاکیزہ صفات انسان تھے۔ سراپا سوز و گداز، سراپا محبت و شفقت اور سراپا ایثار و انکسار، تاہم ان کا سلسلۂ عمل صرف علم و ادب اور شعر و سخن تک محدود تھا۔ وقار الملک کا دائرہ کار بہت زیادہ وسیع تھا۔ انہوں نے ہر مقام پر حسنِ عمل کے جو نقوش چھوڑے، ان کی آب و تاب اب تک ہر صاحبِ بصیرت کا دامنِ نگاہ اپنی طرف کھینچ رہی ہے اور جب تک فضائل کے اسلامی معیار اس دنیا میں قائم ہیں، یہ آب و تاب ماند نہیں پڑ سکتی۔

اُن کے انتقال پر مولانا سیّد سلیمان ندوی مرحوم نے "معارف" میں لکھا تھا:

> نواب محسن الملک کی وفات پر ہم نے تدبر و سیاست کا ماتم کیا۔ مولانا نذیر احمد کے مرنے پر سحر نگاری اور بزم آرائی کا مرثیہ پڑھا۔ مولانا شبلی کی موت پر ہم نے علم کے فقدان کا نوحہ کیا۔ مولانا حالی کو رخصت کرتے ہوئے ہم نے سخن وری اور نکتہ سنجی پر آنسو بہائے، لیکن نواب وقار الملک کی رحلت پر ہم قوم کا ماتم کرتے ہیں اور اولوالعزمانہ اخلاق کی گم شدگی پر فریاد۔

یہ احساسات بے شائبۂ ریب بالکل بجا اور درست تھے۔

میں نے نواب وقار الملک کو دسمبر [illegible]ء میں پہلی اور آخری مرتبہ دیکھا تھا، جب میں غالباً آٹھویں جماعت میں پڑھتا تھا۔ وہ ہوشیار پور

میں اسلامیہ ہائی سکول کا سنگِ بنیاد رکھنے کی غرض سے جالندھر سے آئے تھے۔ اُس زمانے میں جالندھر اور ہوشیارپور کے درمیان ریلوے لائن نہ تھی اور انہیں جالندھر میں ٹھہر کر گھوڑے گاڑی کے ذریعے سے ہوشیارپور جانا تھا۔ ہزاروں اکابر کے علاوہ طلبہ بھی استقبال کے لیے سٹیشن پر پہنچے ہوئے تھے۔ نواب صاحب نے سب سے معانقہ کیا۔ میرے ناچیز ناتھوں کو بھی یہ شرف حاصل ہوا۔ وہ منظر سینتالیس سال گزر جانے کے باوجود اب تک اس طرح آنکھوں کے سامنے تازہ ہے گویا کل پیش آیا تھا۔

قد زیادہ لمبا نہ تھا۔ جسم دُہرا اور گٹھا ہوا۔ اس وجہ سے وہ قدرے پست قامت نظر آتے تھے۔ رنگ سانولا، سر منڈا ہوا، چہرہ گول، مونچھیں ترشی ہوئیں، ڈاڑھی متوسط اور بالکل سفید۔ اُس وقت اُن کی عمر ستر سال کے قریب تھی۔ میں نے جب انہیں دیکھا تو سر پر سُرخ ترکی ٹوپی تھی، سبز سی گرم شیروانی اور پتلون پہن رکھی تھی۔ جو بھی ان سے معانقہ کرتا، بڑے تپاک، حسنِ اخلاق اور محبت و شفقت سے ملتے، لیکن چہرے پر متانت کا غلبہ تھا اور تبسم کی کوئی جھلک نمایاں نہ تھی۔

اُس زمانے کے استقبال ویسے شاندار نہ ہوتے تھے، جن کی رسم ہمارے ملک میں ترکِ موالات کے دور سے پڑی اور تکلفات میں برابر اضافہ ہوتا رہا۔ لیکن جالندھر میں وقار الملک کا استقبال بہت غیر معمولی جوش و سرگرمی سے کیا گیا۔ دُور تک اور دیر تک اُن پر پھولوں کی بارش ہوتی رہی۔

واضح رہے کہ اُس وقت مجھے وقار الملک کی عظیم الشان شخصیت اور ان کے مقامِ بلند کے متعلق کچھ علم نہ تھا لہٰذا تقریبِ استقبال میں شامل ہونے کی خوش نصیبی کا اندازہ نہ کر سکتا تھا۔ ہوش سنبھالا تو زندگی کے جن واقعات کو اپنے لئے سرمایۂ فخر سمجھتا رہا ہوں، اُن میں ایک یہ واقعہ بھی ہے۔

وقار الملک ۱۹ محرم ۱۲۵۷ھ (۱۴ - مارچ ۱۸۴۱ء) کو پیدا ہوئے۔ مشتاق حسین نام رکھا گیا۔ والد کا نام فضل حسین تھا، ذات کمبوہ، وطن سنبھل۔ والدہ امروہہ کی تھیں۔ مشتاق حسین صرف چھ مہینے کے تھے، جب ان کے والد نے وفات پائی۔ والدہ یتیم بچے کو لے کر امروہہ چلی گئیں اور یہی مقام مشتاق حسین کا وطن بن گیا۔ جو آگے چل کر وقار الدولہ وقار الملک نواب مشتاق حسین خاں بہادر انتصار جنگ بننے والے تھے۔

چھ سال کی عمر میں قرآن ختم کیا۔ کچھ عربی اور فارسی پڑھی۔ ۱۸۵۹ء میں دس روپے ماہانہ پر مدرّس بن گئے۔ پھر انکم ٹیکس کی محرری اور داخل باقی نویسی کی۔ بعد ازاں منصفی میں سررشتہ دار بن گئے۔ تحصیل داری کا امتحان بھی پاس کر لیا، لیکن ایک واقعے کے باعث جس کا ذکر آگے آئے گا، ملازمت سے استعفا دے دیا اور سرسید کی سفارش پر ریاست حیدرآباد میں چار سو روپیہ ماہانہ پر ملازم ہو گئے۔ وہاں سے بھی ایک مرتبہ بعض مقامی کشمکشوں کے باعث ملازمت سے جواب مل گیا تھا۔ دوبارہ بلائے گئے اور تھوڑی ہی دیر میں صوبۂ ورنگل کے صوبہ دار، پھر معتمدِ عدالت و کوتوالی بنے۔ سر آسمان جاہ بہادر کی وزارت میں پوری ریاست کا کاروبار عملاً انہی سے متعلق تھا۔ ہوگیا ۱۸۹۲ء میں پنشن لے کر وطن واپس آ گئے اور قوم کے تعلیمی و سیاسی کاموں میں حصہ لیتے رہے۔ انہی کی کوشش سے مسلم لیگ کی بنیاد پڑی۔ نواب محسن الملک کی وفات پر علی گڑھ کالج کے سکرٹری بن گئے۔ انہی کے عہدِ نظامت میں مسلم یونیورسٹی کی تجویز بروئے کار آئی۔ جولائی ۱۹۱۲ء میں ضعف اور علالت کے باعث استعفا دے دیا، لیکن قوم کے سیاسی مقاصد سے دلچسپی آخری دم تک جاری رہی۔ ۲۷ اور ۲۸ جنوری ۱۹۱۷ء کی درمیانی شب کو پونے دس بجے وفات پائی اور امروہہ میں دفن ہوئے۔

یہ حالاتِ زندگی کا سرسری مرقع ہے۔ میرا مقصد یہ نہیں کہ ان کے حالات تفصیلاً لکھوں، بلکہ اُن اولوالعزمانہ اخلاق کی چند جھلکیاں دکھانا چاہتا ہوں جو وقار الملک کی عظمت کا سرچشمہ تھے اور جن کی بنا پر حق شناسوں کے نزدیک ان کا ماتم قوم کا ماتم قرار پایا۔

وقار الملک نے ۱۸۵۹ء میں دس روپیہ ماہانہ کی مدرسی سے مستقل زندگی کا آغاز کیا تھا۔ اس وقت کسی کو اندازہ نہ ہو سکتا تھا کہ اس وجود میں خدا نے کیسی نادر صلاحیتیں ودیعت کی ہیں۔ سرسید علی گڑھ میں صدر الصدور کے عہدے پر مامور تھے، جب وقار الملک کو سررشتہ دار عدالت کی حیثیت میں ان کے ماتحت کام کرنا پڑا۔ سرسید علی گڑھ سے تبدیل ہو کر بنارس گئے تو وقار الملک کی سروس بک میں انہوں نے جو الفاظ لکھے، وہ اس عظیم الشان انسان کے گوناگوں اوصاف کا پہلا اعتراف تھا۔ فرماتے ہیں:

> منشی مشتاق حسین سررشتہ دار عدالت ہذا نہایت لائق، نہایت محنتی، نہایت کارگزار، نہایت فہیم اور نہایت زود نویس وخوش خط افسر ہے اس افسر کی دیانت داری پر مجھ کو ایسا یقین ہے، جیسا کہ اپنی موت پر . . . . جس عہدے پر یہ شخص نوکر ہے، اس سے بہت زیادہ بڑے عہدے کی نہایت عمدہ لیاقت اس میں موجود ہے۔

واضح رہے کہ سرسید حد درجہ متوازن رائے کے آدمی تھے اور ان کی طبیعت میں احتیاط بہت تھی، تاہم وہ وقار الملک کے یگانہ اوصاف سے اس قدر متاثر ہوئے کہ کوئی بھی وصف "نہایت" کی صفت کے بغیر بیان نہ کیا، حالانکہ اس وقت تک وقار الملک معمولی سررشتہ دار تھے، اور سررشتہ داری کے محدود دائرے میں ان کی تمام قابلیتیں ٹھیک ٹھیک بروئے کار نہ آ سکتی تھیں۔

علی گڑھ کے جج بریلے صاحب بھی وقار الملک کی لیاقت و محنت کے بہت معترف تھے۔ وہ تبدیل ہوئے تو ان کی جگہ مسٹر مارٹن جج مقرر ہو کر آئے۔ انہوں نے طے کر رکھا تھا کہ مسٹر بریلے کی ہر رائے سے اختلاف کریں گے یہاں تک کہ ہر اس شخص کو برا سمجھیں گے جو مسٹر بریلے کی نظروں میں اچھا تھا۔ چونکہ بریلے کی نظروں میں وقار الملک معزز تھے لہذا مارٹن صاحب نے موصوف کی سروس بک میں بے وجہ خراب ریمارک درج کر دیئے۔ وقار الملک کو اپنی راستی کا یقین تھا لہذا مارٹن صاحب سے کہا کہ یا تو ریمارک واپس لے لیجئے یا اس کے وجوہ بتایئے۔ مارٹن صاحب نے کوئی توجہ نہ کی تو وقار الملک نے باقاعدہ درخواست پیش کر دی، جس میں لکھا:

> ۱۔ عدالت کے تمام وکلاء، پورے عملہ اور حاضرین سے میرا حال دریافت کیا جائے۔
>
> ۲۔ میں نے اب تک جو کام کیا ہے، اس کا جائزہ لیا جائے۔
>
> ۳۔ میری تحریر کردہ کیفیتوں سے جن لوگوں کو نقصان پہنچا ہے، انہیں بلا کر میرے چال چلن کی صفائی کی تصدیق کر لی جائے۔ یہ طریقہ اگرچہ میرے لئے خطرناک ہے، لیکن تحقیقات کی غرض سے میں اس پر بھی راضی ہوں۔

مارٹن صاحب اس پر رضا مند نہ ہوئے تو وقار الملک نے کلکٹر کے سامنے درخواست پیش کر دی اور اس میں لکھا، تحقیقات سے جج کا اعراض خود ظاہر کرتا ہے کہ ریمارک صحیح نہیں، تاہم آپ بھی میرے پیش کردہ ذریعوں کے مطابق پوری چھان بین کرائیں۔ ہر طرح اطمینان ہو جائے تو یہ ریمارک میری سروس بک سے قلمزد کر دیا جائے۔

مشہور مثل ہے: آں را کہ حساب پاک است، از محاسبہ چہ باک۔ وقار الملک اپنی زندگی کے ابتدائی دور ہی میں اس کا عملی نمونہ بنے ہوئے تھے۔ ان کا عہدہ جج کے مقابلے میں بہت چھوٹا تھا تاہم سچی بات میں جج کا مقابلہ کرتے وقت ایک لمحے کے لئے بھی تامل نہ ہوا اور یہ اس زمانے کی بات ہے، جب انگریزوں کے سامنے کسی کو ایک لفظ بھی زبان پر لانے کا حوصلہ نہ تھا۔

۱۸۷۵ء میں وہ مسٹر کالون کلکٹر کے ماتحت کام کر رہے تھے۔ جب نماز کا وقت آتا، حسب معمول کے مطابق دفتر سے اٹھ کر مسجد میں چلے جاتے۔ کالون صاحب کو ان کا یہ طریقہ پسند نہ آیا۔ اس نے منع کیا تو انہوں نے کہا کہ نماز مذہباً مجھ پر فرض ہے۔ میں اسے چھوڑ نہیں سکتا۔ البتہ اس کی وجہ سے کام میں کوئی خلل پیدا ہو تو آپ مجھ سے جواب طلب کر سکتے ہیں۔ کالون کام سے قطع نظر کرتے ہوئے صرف نماز کا مخالف

تھا۔ مجبور ہو کر وقار الملک نے درخواست دے دی کہ یا تو ادائے نماز کے لئے تھوڑی سی غیر حاضری معاف کر دی جائے۔ یا غیر حاضری کے وقت کی تنخواہ کاٹ لی جائے یا چھ مہینے کی رخصت دی جائے۔ اگر ان میں سے کوئی بھی صورت منظور نہ ہو تو اس درخواست کو میرا استعفا سمجھ لیا جائے یعنی پندرہ سال کی ملازمت سے دست بردار ہونے پر وہ بے تکلف تیار ہو گئے، لیکن نمازیں تاخیر گوارا نہ کی۔

سرسید کو یہ حالات معلوم ہوئے تو وقار الملک کو لکھا:

> نماز جو خدا کا فرض ہے، اس کو ہم اپنی شامتِ اعمال سے جس خرابی سے ہو، ادا کریں یا قضا کریں، لیکن کوئی شخص اگر کہے کہ تم نماز نہ پڑھو، اس کا صبر ایک لمحہ بھی نہیں ہو سکتا۔ یہ بات سُنی بھی نہیں جا سکتی۔ میری سمجھ میں نماز نہ پڑھنا صرف گناہ ہے، جس کے بخشے جانے کی توقع ہے اور کسی شخص کے منع کرنے سے نہ پڑھنا یا سستی میں ڈالنا میری سمجھ میں کفر ہے، جو کبھی بخشا نہ جائے گا۔ تم کو پہلے ہی اپنی طرف سے ایسا طریقہ اختیار کرنا چاہئے تھا جو کبھی اس قسم کی بحث نہ آتی اور جب ایسا طریقہ اختیار نہیں کیا تو پھر لجلجانا اور گڑگڑانا اور حضور رخصت ہی دیں، تنخواہ کاٹ لیں کہنا واہیات تھا۔ تڑاق پڑاق استعفا دینا تھا اور صاف کہہ دینا تھا کہ میں اپنے عظیم الشان قادر مطلق کے حکم کی اطاعت کروں گا، نہ کہ آپ کی۔ کیا ہوتا؟ نوکری میسر نہ آتی۔ فاقہ مر جاتے، نہایت اچھا ہوتا۔

چھ مہینے کی رخصت ہی کے زمانے میں سرسید نے سر سالار جنگ وزیر اعظم حیدر آباد کو لکھا اور وقار الملک کے لئے حیدر آباد میں چار سو روپے ماہانہ کی ملازمت کا انتظام ہو گیا۔ لطف یہ کہ جس انگریز افسر نے نماز پر جھگڑا کر کے رخصت اور استعفےٰ تک نوبت پہنچائی تھی، اس نے آپ کی کارگزاری کے متعلق نہایت اچھی رائے دی اور اس میں اقرار کر لیا کہ وہ پابندی سے نماز پڑھتے تھے، مجھے تکلیف ہوتی تھی۔ وہ اپنی رائے بدلنے پر راضی نہ ہوئے، میں اس صورت کو قبول نہ کر سکتا تھا۔ اچھا ہوا کہ انہیں دوسری جگہ ملازمت مل گئی۔

حیدر آباد میں وہ بہت جلد ترقی کر کے محکمۂ عدالت و کوتوالی کے معتمد بن گئے اور ایک ہزار روپیہ ماہانہ تنخواہ مقرر ہو گئی۔ عدالت و کوتوالی کے صدر المہام یعنی وزیر متعلقہ نواب بشیر الدولہ تھے، جنہیں بعد میں آسمان جاہ کا خطاب ملا اور وہ مدار المہام بن گئے تھے۔ وقار الملک نے بہت جلد ان کا خاص اعتماد حاصل کر لیا۔ اس زمانے میں میر محبوب علی خاں نظام حیدر آباد کم سن تھے اور انتظامِ ریاست کے لئے کونسل آف ریجنسی بنی ہوئی تھی جس کے صدر امیر کبیر نواب شمس الامراء تھے۔ وہ نظام کے قریبی رشتہ دار ہوتے تھے۔ بشیر الدولہ ان کے بھتیجے تھے شمس الامراء کو ایک طرف سر سالار جنگ وزیر اعظم سے کاوش تھی، دوسری طرف بھتیجے سے مقدمہ بازی کا سلسلہ جاری تھی اور وہ ہر اس شخص کے مخالف تھے جو بشیر الدولہ اور سالار جنگ کے نزدیک معتمد علیہ تھا۔ اس وجہ سے وقار الملک ان کے عتاب کا ہدف بن گئے۔ ایک موقع پر وقار الملک رخصت لے کر وطن جاتے ہوئے گوالیار اترے اور وہاں کے انگریز ریذیڈنٹ کو بشیر الدولہ کا ایک ذاتی پیغام پہنچا دیا۔ اس بنا پر شمس الامراء کو ناراضگی کے اظہار کا بہانہ مل گیا اور سالار جنگ کو ریاست کے عمومی مصالح کی بناء پر یہی مناسب معلوم ہوا کہ وقار الملک کو ملازمت سے برخاست کریں۔

وقار الملک کے لئے یہ واقعہ سراسر تعجب انگیز تھا لیکن کچھ مدت بعد ایک دوست کے ذریعے سے سالار جنگ کی مجبوریوں کا علم ہوا تو بے تکلف لکھ دیا کہ میں اپنے فائدے کے لئے شمس الامراء اور سالار جنگ کے درمیان کسی کشمکش کا سزاوار نہیں ہو سکتا۔ مجھے اپنی برطرفی بہ دل و جان منظور ہے۔

نواب بشیر الدولہ کو جب یہ علم ہوا کہ وقار الملک صرف ان کے ایک ذاتی کام کی وجہ سے عتاب میں آئے اور ملازمت گنوائی تو فوراً پیغام

بھیجا کہ میں اتنی ہی تنخواہ پر اپنی جاگیر میں ملازم رکھتا ہوں۔ وقار الملک نے لکھ دیا کہ مجھے یہ منظور نہیں۔ اگر سالار جنگ کے یہاں کوئی اور مجھے موقوف کرتا تو میں نئی پیشکش قبول کر سکتا تھا۔ جب انہی کی وجہ سے مجھے نوکری ملی اور انہی نے موقوف کیا تو میری محبت اس امر کی مقتضی نہیں کہ میں حیدر آباد میں دوسری جگہ تعلق قبول کر لوں۔

وقار الملک ملازمت پر آمادہ نہ ہوئے تو نواب بشیر الدولہ نے لکھ بھیجا کہ آپ گھر میں بیٹھے رہیں ہم پانسو روپیہ ماہانہ وہاں بھیجا جائے گا۔ وقار الملک نے یہ پیش کش بھی قبول نہ کی اور لکھ دیا کہ میں نے نواب ممدوح کی کوئی ایسی بڑی خدمت انجام نہیں دی۔ جس کے معاوضے میں ان کا اس قدر نقصان جائز سمجھوں۔ آخر بشیر الدولہ نے وقار الملک کی صاحبزادی کے نکاح کی تقریب پر چار ہزار روپے کی رقم نیوتے کے طور پر بھیج دی۔ وقار الملک نے ایک عزیز دوست کی وساطت سے ضروری سمجھا کہ سالار جنگ سے استصواب کئے بغیر یہ رقم قبول نہ کریں۔ وہاں سے جواب آیا کہ روپیہ واپس کر دو۔ چنانچہ وقار الملک نے بے تامل واپس کر دیا۔ اس عزیمت عمل پر سر سالار جنگ نے لکھا کہ مولوی مشتاق حسین نے جو کچھ کیا وہ کسی دوسرے سے نہ ہو سکتا تھا۔ امید ہے کہ ایک دن وہ اپنے اس عمل نیک کا صلہ حاصل کریں گے۔

ان واقعات کے بعد سالار جنگ نے خود لکھا کہ میں چار سو روپے ماہ بہ ماہ آپ کو بھیجتا رہوں گا۔ آپ خاطر جمع رکھیں۔ حالات بدل جائیں گے تو آپ کو نعم البدل حاصل ہو گا اور اس امداد کو "بہ صیغۂ راز" رکھیں۔

وقار الملک کو سالار جنگ کا یہ خط ملا تو چار سو روپے کی پیش کش کے سلسلے میں دو باتیں عرض کیں: اوّل یہ کہ روپے کی مقدار کم کر دی جائے، اس لئے کہ میں کفایت سے گزارہ کر سکتا ہوں۔ دوسرے اسے قرض سمجھا جائے۔ زمانہ میری مساعدت کرے گا تو یہ قرض ادا کر دوں گا۔

سالار جنگ نے چند ہی روز میں سر رشتۂ مال کا دستور العمل وقار الملک کے پاس اصلاح و نظر ثانی کے لئے بھیج دیا۔ اس طرح ذاتی امداد سرکاری کارگزاری کی شکل اختیار کر گئی۔ اس وقت وقار الملک نے چار سو روپے ماہانہ کی رقم بہ اطمینانِ خاطر قبول کی۔

وقار الملک اخلاقی جرأت میں ضرب المثل تھے۔ جس زمانے میں سالار جنگ اعظم دولتِ آصفیہ کے مختارِ کل تھے۔ نواب بشیر الدولہ عدالت اور کوتوالی دونوں کے صدر المہام یا وزیر تھے اور وقار الملک ان کے ماتحت معتمدی (سکرٹری شپ) کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ سالار جنگ نے ایک معاملے کے متعلق وقار الملک کے سامنے اپنی رائے ظاہر کی اور فرمایا کہ اسی رائے کو اپنی رائے کے طور پر نواب بشیر الدولہ کے روبرو پیش کر دیں۔ وقار الملک اگرچہ سالار جنگ کے آوردہ تھے۔ اپنی ملازمت اور ترقی کو انہی کا احسان سمجھتے تھے لیکن صاف کہہ دیا کہ میری رائے یہ نہیں۔ سالار جنگ کو یہ امر طبعاً ناگوار گزرا۔ وقار الملک گھر واپس آئے تو فوراً ملازمت سے استعفاء پیش کر دیا اور حیدر آباد سے روانگی کے لئے تیار ہو گئے۔ سالار جنگ نے انہیں بلا کر اپنی غلطی کا اعتراف کیا اور کہا کہ واقعی اپنی رائے آپ پر ٹھونسنے کا مجھ کو کوئی حق نہ تھا۔

سالار جنگ وفات پا چکے تھے اور بشیر الدولہ سر آسمان جاہ کی مدار المہامی کا زمانہ تھا۔ وقار الملک وقتاً فوقتاً ان سے صاف صاف کہتے رہتے تھے کہ میں کسی خدمت میں حتی الامکان کوتاہی نہ کروں گا، لیکن مجھے ریاست میں ملازمت نواب سالار جنگ کی وجہ سے ملی اور میری عقیدت کا پہلا مرجع انہی کا خاندان ہے۔

سر آسمان جاہ بہت نیک دل، نیک مزاج اور شریف انسان تھے۔ بعض اوقات لوگ تملق و خوشامد سے کام لے کر ان سے ایسے احکام جاری کرا لیتے، جو انتظامی نقطۂ نگاہ سے مناسب نہ تھے۔ وقار الملک نے ایک عرضداشت ان کی خدمت میں پیش کی۔ اس میں صاف صاف لکھ دیا:

جن کو چور اور دشمن سمجھتے ہیں، ان کو بھی خدمتوں پر رکھا جاتا ہے۔ یہ اعلیٰ درجے کی کریم النفسی تو ہے یا یہ کہ ان کی خوشامدوں کا خیال کیا جاتا ہے یا طبیعت کی کمزوری ہے، لیکن اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اوّل قوت و انتظام ضعیف ہوتا ہے، دوم اسٹرنگ (سازباز) بڑھتی ہے، سوم دوسرے عہدہ داروں پر برا اثر پڑتا ہے۔ یہ

غلط طرزِ حکومت ہے اور انصاف کے خلاف ہے۔

وقار الملک سرسید کے بہت معتقد تھے۔ اور اُن کی بڑی عزت کرتے تھے، تاہم بیسیوں معاملات میں انہوں نے سرسید کی رائے سے بے تکلف اختلاف کیا۔ یہاں تک کہ ایک معاملے میں سرسید نے ان کے اختلاف پر ناراض ہو کر لکھ دیا:

> مجھ کو یقین تھا کہ آپ خدا کے الہام پر بھی اپنی رائے سے منحرف ہونے والے نہیں۔ جیسا کہ میں نے خود آپ کو لکھا تھا کوئی توقع برخلاف اس کے اگر میں کرتا تو میری حماقت تھی۔

کالج کے انتظامات سنبھال لینے کے بعد وقار الملک نے ایک بہت بڑا کارنامہ انجام دیا، جس کا اندازہ غالباً عام لوگوں کو نہیں۔ سرسید کے زمانے میں حالات مختلف تھے اور وہ کالج کی ترقی کے پیشِ نظر انگریز پرنسپل اور انگریزی سٹاف کی دلجوئی میں بہت مبالغہ فرماتے تھے۔ محسن الملک کے زمانے میں انگریزی سٹاف مختارِ مطلق بن گیا اور انتظامی معاملات میں سکرٹری یا ٹرسٹی بڑی حد تک بے دست و پا ہو گئے۔ وقار الملک نے چارج لیتے ہی ٹرسٹیوں کی حیثیت بحال کرنے کی کوشش کی۔ اس پر پرنسپل اور انگریزی سٹاف نے ایکا کر کے استعفوں کی دھمکی دے دی۔ یوپی کے گورنر نے انگریزی سٹاف کی تائید کی اور خاصی نازک صورتِ حال پیدا ہو گئی۔ وقار الملک نے ٹرسٹیوں کو ہم رائے بنا کر فیصلہ کرایا کہ جب تک انگریز پرنسپل اور انگریزی سٹاف انتظامی معاملات میں ٹرسٹیوں کی مختاری تسلیم نہ کرے گا اور ملازم کی حیثیت میں نہ رہے گا۔ وہ اطمینان سے نہ بیٹھیں گے۔ چنانچہ انہوں نے بڑی دانش مندی، تدبّر لیکن پوری استقامت سے اس معاملے میں کوششیں شروع کر دیں۔ یہاں تک کہ گورنر نے اپنی رائے بدل لی اور سٹاف وقار الملک کی رائے کے مطابق کام جاری رکھنے پر آمادہ ہو گیا۔ کالج کو انگریزی اثرات سے محفوظ کرنے کی یہ پہلی بڑی بروقت اور کامیاب کوشش تھی۔

وقار الملک کی سکرٹری شپ کے زمانے میں کالج کی مذہبی فضا بہت خوشگوار ہو گئی۔ انہوں نے ایک موقع پر طلبہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ نماز کی خوبی یا اس کا وجوب یا اس سے اخلاق کی اصلاح کا بیان مقصود نہیں، لیکن:

> یہ آپ سمجھ سکتے ہیں کہ اس امر کی نگہبانی کہاں تک میری اپنی ذمہ داریوں میں سے مہتم بالشان ہے۔ آپ یہاں کس غرض سے آتے ہیں؟ ظاہر ہے کہ تعلیم، اخلاق کی اصلاح اور آداب حاصل کرنے کے لئے ہیں۔ اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ آپ کی توجہ امورِ دینی کی طرف مائل کروں۔۔۔۔ آپ جانتے ہیں کہ زمانہ تغیر پذیر ہے۔ پرانوں کی جگہ نئے آتے ہیں۔ قومی عمارت کے پرانے ستون رخصت ہوتے جاتے ہیں اور اب یہ بار آپ کو اپنے کندھوں پر اٹھانا پڑے گا۔ یہ زمانہ آپ کی تحصیل کا ہے۔ یہی وہ زمانہ ہے کہ آپ آئندہ وقت کے لئے تیار ہوں۔ کوشش کیجئے اور سخت کوشش کہ آپ مسلمانوں کے اعلیٰ درجے کا نمونہ ثابت ہوں۔ وہ روش اختیار کیجئے اور ایسے پاک و صاف مذہبی طریقے پر چلئے کہ مسلمان آپ پر بھروسا کریں۔ حقیقت میں آپ کسی طرح قومی لیڈر نہیں ہو سکتے اگر آپ اسلامی شعار کے پابند نہیں۔

وقار الملک سے پیشتر نماز میں غیر حاضری پر جرمانے کا قاعدہ جاری تھا۔ موصوف نے نماز کا احترام ملحوظ رکھتے ہوئے یہ قاعدہ منسوخ کر دیا اور طلبہ سے خطاب کرتے ہوئے کہا:

> اس طرح نماز کا استخفاف ہوتا ہے، مگر یہ خیال نہ کرنا چاہئے کہ غیر حاضریٔ مسجد کے لئے اب کوئی سزا نہیں۔ سزا ہے اور وہ یہ ہے کہ جو صاحب حاضرِ مسجد نہ ہوں گے اور نماز کی پابندی نہ کریں گے ان کو کالج سے علیحدہ ہو جانا پڑے گا۔ میں یہ کسی طرح جائز نہیں رکھتا کہ ایک مچھلی سارے تالاب کو گندہ کر دے۔

وقار الملک اپنے ماتحت ملازموں کا خاص خیال رکھتے تھے۔ کوئی فوت ہو جاتا تو اس کے متعلق پوری معلومات بہم پہنچاتے۔ اس پر قرضہ ہوتا تو ادائیگی کا بندوبست کرتے۔ اس کے لڑکوں کے لئے وسائل معاش کا خیال رکھتے۔ غیر شادی شدہ لڑکیوں کی شادی کا انتظام کرا دیتے۔ بیواؤں کے لئے وظائف مقرر کرا دیتے۔

جب وہ ورنگل کے صوبہ دار تھے، ایک موقع پر دورہ کرتے ہوئے ایک گاؤں سے گزرے، جہاں ہیضہ پھیلا ہوا تھا۔ انہوں نے گاؤں کے قریب پہنچتے ہی سواری روک لی اور اپنے تمام ساتھیوں کو اجازت دے دی کہ جس کا جی چاہے آگے چلا جائے۔ خود ڈاکٹر کو لے کر صبح سات بجے گاؤں میں داخل ہوئے۔ تمام مریضوں کی دیکھ بھال کی۔ اُن کی تیمارداری اور علاج کا انتظام کرایا۔ ساڑھے تین بجے فارغ ہو کر جائے قیام پر پہنچے۔
ایک دورے میں ایک اہلکار جو ساتھ تھا کسی مقام پر بے پتا ہو گیا۔ وقار الملک نے منزل پر پہنچ کر پولیس اور سواروں کو چاروں طرف روانہ کر دیا۔ شام کے چار بجے تک اس کا پتا نہ مل سکا۔ وقار الملک نے اس وقت تک کھانا نہ کھایا۔

جب وہ حیدر آباد میں اعلیٰ عہدوں پر ممتاز تھے تو عوام اور اکابر سے ملاقات کے لئے الگ الگ جگہیں مقرر کر رکھی تھیں۔ جہاں عوام سے ملاقات کرتے تھے، وہ جگہ کوٹھی کے صحن میں پھاٹک کے قریب تھی۔ ایک شامیانہ نصب کرا لیا تھا اور نشست گاہیں خاصی پُر تکلف تھیں۔ جہاں اکابر سے ملاقات کرتے تھے، وہاں لکڑی کی معمولی کرسیاں پڑی رہتی تھیں۔ نماز سے فارغ ہوتے ہی عوام سے ملاقات کی جگہ پہنچ جاتے اور سب سے آزادانہ ملتے۔ ہر ایک کی بات توجہ سے سنتے۔ اس اثناء میں کوئی بڑا عہدہ دار آجاتا تو فرماتے کہ ملاقات کی جگہ چل بیٹھئے۔ عوام سے فارغ ہو کر بڑے لوگوں سے ملتے۔
وقار الملک کو اگرچہ بڑے عہدوں پر رہنے کا موقع ملا اور وہ خاصی بڑی تنخواہ پاتے تھے لیکن ان کی آمدنی کا بڑا حصہ عزیزوں اور غریبوں کی امداد یا قومی کاموں میں صرف ہوتا۔ خود عموماً تنگ دست رہتے اور سادگی میں گزارہ کرتے۔
وہ وقتاً فوقتاً اعلیٰ حضرت نظام کی پیشی میں جایا کرتے تھے۔ ایک موقع پر اعلیٰ حضرت نے ان کا چشمہ دیکھا تو فرمایا: مولوی صاحب! چشمے کا فریم تو بہت خراب ہے۔ وقار الملک نے عرض کیا:

پیر و مرشد! اگر اتفاق سے یہ چشمہ کہیں رہ جائے تو لوگ اسے لا کر دے دیں گے کیونکہ اس کی قیمت صرف چھ آنے ہے اور یہ مشتاق حسین کی آنکھیں ہیں۔

اعلیٰ حضرت نے نہایت قیمتی اور اعلیٰ درجے کا فریم بنوا کر وقار الملک کو مرحمت فرمایا۔ اسے انہوں نے کبھی استعمال نہ کیا اور ایک عزیز یادگار کے طور پر اپنے پاس رکھا۔
مستند بیان ہے کہ محسن الملک نے حیدر آباد میں اپنے لئے کوٹھی بنوائی تو اس کا فرنیچر ولایت سے تیار ہو کر آیا جس پر ستر ہزار روپے خرچ ہوئے۔ وقار الملک کو اپنا مکان بنوانے کی بھی استطاعت نہ ہوئی۔ سر آسمان جاہ کی تحریک پر اعلیٰ حضرت نے انہیں ایک کوٹھی عنایت فرما دی۔
جب وہ سر آسمان جاہ کے ساتھ علی گڑھ آئے تھے تو ان کی پتلون میں پیوند لگے ہوئے تھے۔
اُن کی طبیعت میں انکسار بہت تھا۔ اس سلسلے میں میں صرف ایک واقعہ پیش کروں گا۔ حیدر آباد میں کسی مسجد کے ایک نابینا کا کھانا ان کے ہاں سے مقرر تھا۔ ایک مرتبہ شدت سے بارش ہوئی۔ ملازم رات کا کھانا نابینا کو پہنچا نہ سکا۔ وقار الملک کو بڑی دیر میں معلوم ہوا تو خود گئے اور پیدل کھانا نابینا کے پاس لے کر گئے۔ وہ بھوکا بیٹھا تھا۔ بہت بگڑا اور خفا ہوا کہ آدھی رات کو روٹی لے کر آیا ہے۔ جا ہم نہیں کھاتے۔ وقار الملک نے بڑی خوشامد اور منت سماجت سے اسے راضی کیا اور کھانا کھلا کر واپس آئے۔ تاہم اس پر قطعاً ظاہر نہ ہونے دیا کہ خود کھانا لے کر آئے تھے۔
دوسروں کو مصیبت میں دیکھ کر بے اختیار اشکبار ہو جاتے۔ ایک مرتبہ علالت کے باعث پہاڑ پر چلے گئے۔ وہاں سنا کہ ان کی صوبہ داری میں بارش نہ ہونے کے باعث عوام کی حالت بہت خراب ہو گئی ہے اور غریبوں کے فاقے ہو رہے ہیں۔ فوراً پہاڑ سے واپس آئے۔ جمعہ کی نماز کے بعد

ایک چھپر کے نیچے بیٹھے ہوئے اطراف علاقہ کی رپوٹیں دیکھ رہے تھے، جو دور دراز کے علاقوں سے بھری ہوئی تھیں۔ کاغذات اٹھاتے، پڑھتے اور رکھتے جاتے۔ دو گھنٹے میں خدا کی رحمت سے ابر آیا۔ اس قدر پانی برسا کہ چھپر ٹپک پڑا اور وقار الملک بھیگ گئے۔ پھر اٹھے۔

یہ وقار الملک کے فضائل و مکارم کی صرف چند جھلکیاں ہیں، جو سرسری طور پر پیش کر دی گئی ہیں۔ انہیں سامنے رکھ کر غور فرمایئے کہ وہ کس درجہ نادر و یگانہ شخصیت کے مالک تھے۔ اُن کے انتظامی کارناموں پر بحث کے لئے ایک دفتر درکار ہے۔ بے شائبہ مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ دولت آصفیہ پچاس سال تک جس نظام حکومت پر چلتی رہی، اس کی ترتیب اور اجزا میں سب سے بڑا حصہ وقار الملک ہی کا تھا۔ انھوں نے حکومت کو خودسری کی بلندیوں سے اتار کر حقوقِ جمہور کی نگہبانی و پاس داری کی راہ پر لگایا اور اپنے حُسنِ عمل سے وہ نمونہ پیش کیا، جس کی مثالیں کسی بھی ملک میں بہت ہی کم ملیں گی۔ سرسید کے رفیقوں میں ایسے جامع اوصاف کا آدمی دوسرا کوئی نہ تھا۔

توپ گھڑیاں وغیرہ خوب بنانا جانتے ہیں۔ صاحب علم نہیں۔ وہ بھی مسلمانوں سے خوش نہ تھے اور اپنا وفادار خیال نہیں کرتے تھے بلکہ باغی سمجھتے تھے ان کا
ایسا سمجھنا کچھ بے جا نہ تھا اس لئے کہ سلطنت انہوں نے مسلمانوں سے لی تھی۔ اس لئے مسلمانوں سے بدگمان تھے اور بدگمان رہے۔ انہوں نے ابتدا میں جس
مکروفریب، جعلسازی، اندرونی سازشوں اور مکمتوں سے اپنا تسلط بڑھایا اور خاص کر اسلامی حکومتوں سے جو معاندانہ برتاؤ کیا اس نے مسلمانوں کے دلوں
میں ان کی طرف سے نفرت پیدا کر دی۔ ان کے چہیتے اول درجے میں پارسی اور دوسرے درجے میں ہندو تھے۔ مسلمانوں کو اپنے اعتقادات، تہذیب شائستگی
اور علم و فضل پر غرہ تھا۔ وہ اس ملک کے فاتح اور حاکم رہے تھے۔ انہوں نے ایک نئی تہذیب کی بنیاد ڈالی تھی جس نے ملک کی کایا پلٹ دی اور باوجود
زوالِ سلطنت کے انہوں نے اپنی انفرادیت کو قائم رکھا اور انگریز کے سامنے نہیں جھکے۔ وہ اسے حقیر اور نجس سمجھتے رہے۔

ہر دور کا ایک تقاضا ہوتا ہے۔ اس تقاضے کو سمجھنا اور سمجھ کر اپنے ماحول اور حالات کی رو سے اپنی تنظیم کرنا اس کارزار حیات میں سنبھلے رہنے
اور کامیاب ہونے کے لئے ضروری ہے۔ ہندو اس راز کو سمجھتے تھے۔ وہ اپنے ملک میں ایسے کئی دور دیکھ چکے تھے۔ ہندوستان میں مسلمانوں کے لئے
یہ پہلا موقع تھا۔ انہوں نے اس کی پروا نہ کی اور بالآخر اس کا خمیازہ بھگتنا پڑا۔ مسلمانوں میں دو چار ہی خاندان ایسے تھے جنہوں نے اس کشمکش کے ابتدائی
دور میں زمانے کے تیور پہچانے اور اپنی حیثیت اور وقار قائم رکھنے کے لئے بڑھے اور زمانے کا ساتھ دینے میں کچھ پس و پیش نہ کیا۔ ان میں ایک مولوی
سید حسین بلگرامی کا خاندان تھا جس نے ہوا کا رُخ دیکھ کر انگریزی حکومت کا تقرب حاصل کیا۔

بلگرام اودھ کا نہایت مردم خیز قصبہ ہے۔ اس خاک سے ایسے جلیل القدر عالم و فاضل اٹھے جن کے نام اپنے تبحر اور علم و فضل کی وجہ سے علمی
دنیا میں ہمیشہ یادگار رہیں گے۔ سید حسین کے دادا سید کرم حسین کو انگریزی توسل حاصل ہوا اور وہ بہ عہد نصیر الدین حیدر بادشاہ اودھ (۱۲۴۳ — ۱۲۵۲ھ)
سرکار اودھ کی طرف سے سفیر ہو کر کلکتے کے گورنر جنرل لارڈ بینٹنک کے دربار میں پہنچے۔ ان کی اولاد سید زین الدین حسین (والد سید حسین) اور سید اعظم الدین
حسین نے وارن ہیسٹنگز کے بنا کردہ مدرسہ عالیہ میں علوم مشرقیہ کی تکمیل کی اور ایسے زمانے میں جبکہ انگریزی پڑھنا حرام سمجھا جاتا تھا انگریزی بھی سیکھی۔ یہ
پہلے مسلمان شریف زادے تھے جو اس بدعت کے مرتکب ہوئے اور باقاعدہ انگریزی تعلیم حاصل کی۔

سید حسین کے چچا اعظم الدین حسین نے انگریزی حکومت میں بڑا اعزاز اور اعتماد حاصل کیا اور بڑی ذمہ داری کی خدمات پر مامور رہے۔ ابتدا میں
لارڈ بینٹنک کے اے ڈی کانگ اور ترجمان رہے۔ اس کے بعد وہ سندھ میں حکومت کی طرف سے بطور سفیر یا پولیٹیکل ایجنٹ امیران سندھ و افسر اعلیٰ جہاز رانی دریائے
سندھ متعین ہوئے۔ یہ عہدہ انگریزوں کے لئے مختص تھا۔ مگر امیران سندھ اپنے ملک میں انگریز کا آنا پسند نہ کرتے تھے۔ سندھ میں سیدوں اور پیروں
کی بے حد تعظیم و تکریم کی جاتی ہے اس لئے وہاں کے لوگ ان کا بہت احترام کرتے۔ ہاتھ چومتے اور قدم لیتے۔ نواب عماد الملک فرماتے تھے کہ وہ
کبھی کسی کے سامنے انگریزی کتاب نہ پڑھتے تاکہ لوگوں کو بدگمانی نہ ہو۔ اکثر سندھی ان کی خدمت میں تعویذ لینے کے لئے حاضر ہوتے تھے۔ اس لئے جب
کبھی کوئی عربی شعر یاد آتا یا آیت قرآنی تو وہ کاغذ پر لکھ کر ایک ٹوکری میں ڈال دیا کرتے تھے۔ جب لوگ تعویذ مانگنے آتے تو وہ اس ٹوکری میں سے نکال
نکال کر دے دیا کرتے۔ کچھ عرصے کے بعد کسی بدنفس نے یہ افواہ پھیلا دی کہ یہ شخص دراصل انگریز ہے، مسلمان بنا ہوا ہے۔ آدمی سننے کو سے پیچھے لوگوں
لگ گیا اور شورش برپا ہو گئی۔ اس سے ان کو جان کا خطرہ ہو گیا اور وہ راتوں رات جہاز میں بیٹھ کر نکل بھاگے۔ اس کے بعد وہ ڈپٹی کلکٹر و ناظم بندوبست
بہار بنے میں پرگنتی خدمت پر مامور ہوئے۔ دربار لیجسلیٹو کونسل بنگال کے ممبر نامزد ہوئے۔ حکومت نے سی۔ ایس۔ آئی کا خطاب عطا کیا۔

سید اعظم الدین حسین کے دوسرے بھائی سید زین الدین حسین نے محکمۂ مال میں ملازمت اختیار کی۔ ۱۸۴۰ء میں ڈپٹی کلکٹر اور ڈپٹی مجسٹریٹ کے
عہدے پر فائز ہوئے۔ اسی ملازمت کے دوران میں انہیں ایک مدت تک اضلاع بہار و بنگال میں رہنے کا اتفاق ہوا۔ چنانچہ مولوی سید حسین کی ولادت
بھی ہوا تا بھاگل پور ضلع گیا کے قصبہ صاحب گنج میں ہوئی۔ سید صاحب ۱۸۵۵ء میں پنشن لے کر ملازمت سے سبکدوش ہو گئے۔
مولوی سید حسین کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔ ابھی چھ سات برس کے تھے کہ ان کو عربی شروع کرائی گئی۔ وہ کہتے تھے کہ میری تعلیم کی ابتدا عربی سے

سے بعد فارغ ہو کر حساب اور اقلیدس بھی عربی میں پڑھی۔ چودہ پندرہ برس کی عمر میں وہ فارسی عربی کی تحصیل سے فارغ ہو کر بھاگلپور پہنچے اور بعد ازاں کلکتے کے انگریزی مدارس میں تعلیم پاتے رہے۔ ۱۸۶۱ء میں میٹریکولیشن کی سند حاصل کی۔ ۱۸۶۳ء میں درجہ اول میں آنرز کے ساتھ بی۔ اے میں کامیابی حاصل کی۔ ان کے والد کی خواہش تھی کہ وہ اپنے اثر سے کسی معقول سرکاری ملازمت میں منسلک کر دیں۔ لیکن نوجوان حسین نے جو کالج سے کورا ہی تازہ تازہ نکلا تھا اپنے علمی ذوق کی بنا پر اس سررشتے کو پسند کیا جو تمام سرکاری سررشتوں میں کم حیثیت سمجھا جاتا ہے اور ایک صدی گزرنے پر بھی اب تک ناقدر دانی کا شکار رہتا۔ اس لئے ڈپٹی کلکٹری پر معلمی کو ترجیح دی اور کیننگ کالج لکھنؤ میں عربی زبان کی پروفیسری قبول کر لی اور اس طرح انہیں لکھنؤ میں مستقل طور پر رہنے کا موقع مل گیا۔

اس دوران میں ان کو لکھنؤ کی معاشرت اور وہاں کی تہذیب و آداب و اشغال اور مذہبی رجحانات دیکھنے کا اچھا موقع ملا اور وہاں کے علماء و اکابر کی صحبتوں سے مستفید ہوئے۔ اس زمانے میں لکھنؤ شعر و سخن اور خاص کر مرثیہ گوئی کا مرکز تھا۔ ان تمام باتوں کا ایک قابل تعلیم یافتہ نوجوان پر اثر ہونا ضروری تھا۔ پروفیسری کے زمانے میں انہیں لکھنؤ ٹائمز کی اڈیٹری کے فرائض بھی انجام دینے پڑے۔ یہ اخبار تعلقداران اودھ کے مفاد و اغراض کی حمایت کے لئے جاری کیا گیا تھا۔ اس زمانے میں گورنمنٹ نے ہر سال تکالنی چاہی۔ اس سے تعلقداران اودھ کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ تھا۔ اس لئے تعلقدار اس تجویز کے سخت مخالف تھے۔ اخبار پائیر (جو نیم سرکاری اخبار سمجھا جاتا تھا) اس تجویز کی تائید میں بڑے زور دار آرٹیکل لکھے۔ لکھنؤ ٹائمز کے نوجوان اڈیٹر نے ان مضامین کا جواب لکھا اور گورنمنٹ کی تجویز پر سخت نکتہ چینی کی۔ ایسی نکتہ چینی اور وہ بھی تعلقداران اودھ کے اخبار میں، حکومت کے لئے ناقابل برداشت تھی۔ پروفیسر سید حسین معرض عتاب میں آ گئے اور انہیں اڈیٹری سے دست بردار ہونا پڑا۔ اب ان کی زندگی کا ایک نیا دور شروع ہوتا ہے۔ نواب سر سالار جنگ بہادر لارڈ نارتھ بروک کی ملاقات کے لئے کلکتہ تشریف لے گئے۔ وہاں سے واپسی میں سیر و سیاحت کرتے ہوئے لکھنؤ وارد ہوئے۔ گورنمنٹ آف انڈیا نے ان کی مہمانداری اسی شان سے کی جیسی خود مختار رؤسائے عظام کی کی جاتی تھی۔ کل گورنمان صوبجات ہند کو حکم پہنچ گیا تھا کہ ان کو اپنا مہمان سمجھیں۔ چنانچہ اسی غرض سے ریذیڈنٹ وقت مسٹر سانڈرس ہم رکاب تھے۔ لکھنؤ میں نواب صاحب جنرل ایل بیرو چیف کمشنر کے ہاں فروکش ہوئے۔ جنرل بیرو نے تعلقداران اودھ و دیگر امرائے شہر سے ملاقات کرائی منجملہ ان کے پروفیسر سید حسین کا تعارف بھی نواب صاحب سے کرا دیا اور ان کی علمی و ادبی قابلیت کی بہت کچھ تعریف کی۔ نواب سر سالار جنگ بہادر بہت مردم شناس اور قدر دان تھے اور ان اصلاحات کے پیش نظر جو وہ حیدرآباد کی ریاست میں کرنا چاہتے تھے ان کی یہ تمنا تھی کہ ہندوستان کے قابل اور تجربہ کار اشخاص کو اپنی ریاست میں کھینچ لائیں چنانچہ سید حسین سے ملنے کے بعد ان کو ریاست کی ملازمت کی ترغیب دی اور فرمایا کہ میں جب حیدرآباد واپس پہنچوں تو تم ضرور آؤ اور مجھ سے ملو۔ لیکن وہ حیدرآباد نہ گئے۔ ایک وجہ تو یہ تھی کہ فطرتاً ان کے مزاج میں استغنا تھا اور اس کا کچھ خیال نہ کیا۔ دوسری وجہ غالباً یہ معلوم ہوتی ہے کہ لوگ ریاست کی نوکری کو انگریزی ملازمت کے مقابلہ میں کم تر اور ناقابل اعتبار سمجھتے تھے۔ نواب سر سالار جنگ کو اس کی بڑی شکایت تھی اور جب وہ اس قسم کی کوئی بات سنتے تھے تو انہیں رنج ہوتا تھا کیونکہ انہوں نے اپنی ریاست کو منظم اور باضابطہ بنانے میں بڑی حکمت اور تدبر سے کام لیا تھا اور اس کام میں انہیں ایسی ایسی مشکلات سے مقابلہ کرنا پڑا ہوگا اس وقت تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ آخر خود نواب صاحب ہی نے اصرار کر کے بلا بھیجا۔ اس کے بعد بھی پس و پیش کرتے رہے اور آخر ۱۸۷۳ء میں حیدرآباد آئے اور آتے بھی تو تین مہینے کی رخصت لے کر۔ حیدرآباد پہنچے تو نواب سر سالار جنگ نے ان کے حال پر اس قدر شفقت اور عنایت فرمائی کہ وہ ہمیشہ کے لئے یہیں کے ہو گئے۔

ابتدا میں نواب صاحب نے انہیں اپنا پرسنل اسسٹنٹ (مددگار منشی) بنایا۔ یہ خدمت بڑے اعتماد کی تھی۔ ریاستوں کے ساتھ برٹش گورنمنٹ کا یہ معاہدہ تھا کہ وہ کسی انگریز کو بغیر اجازت گورنمنٹ آف انڈیا ملازم نہیں رکھ سکتے۔ اس وقت حیدرآباد میں انگریزی معتمد (سیکرٹری) ایک انگریز مسٹر اولیفنٹ تھا۔ گورنر جنرل لارڈ ڈلہوزی جو دیسی ریاستوں کا سخت مخالف تھا اور کئی ریاستوں کو ہڑپ کر چکا تھا۔ اس نے اس بنا پر کہ حیدرآباد گورنمنٹ کے مصارف کی رقم کئی سال سے ادا نہیں ہوئی تھی ریاست کے زرخیز علاقہ برار پر عارضی قبضہ کر لیا تھا۔ حضور نظام، ان کے امراء اور اہل حیدرآباد کو اس کا بہت صدمہ تھا اور یہ داغ ایسا تھا جو دولت آصفیہ کے دل پر آخر دم تک ہرا رہا اور ہر چند اس داغ کے مٹانے کی کوشش کی گئی زبردست مارے اور رونے نہ دے کا معاملہ تھا کامیابی نہ ہوئی۔

سر سالار جنگ نے اس مہم کا آغاز کیا۔ ان کی سب سے بڑی یہ آرزو تھی کہ یہ علاقہ انگریزی گورنمنٹ سے واپس لے لیا جائے۔ ان باتوں سے انگریزی گورنمنٹ بہت گرداں تھی۔ نواب سالار جنگ نے غدر کے زمانے میں انگریزی حکومت کے بچانے میں جو بے نظیر مدد کی تھی وہ ایسا بڑا احسان تھا کہ انگریز ان پر ہاتھ ڈالتے ہوئے جھجکتے تھے ورنہ کبھی کے ختم کر دیے جاتے۔ برار اور اسی قسم کے دیگر اہم معاملات کے متعلق مراسلت انگریزی میں ہوتی تھی اور سیکرٹری مسٹر اولی فینٹ انگریزی حکومت کو تُرکی بہ تُرکی جواب دیتے تھے۔ نزلہ بر عضوِ ضعیف ان پر برٹش گورنمنٹ کا عتاب نازل ہوا اور ان کو حیدرآباد چھوڑنا پڑا۔ مولوی سید حسین ان کے شریک معتمد و جائنٹ سیکرٹری ہونے کے گویا شریک جرم تھے۔ حیدرآباد میں جب یہ افواہ پھیلی کہ مولوی سید حسین بھی معرضِ عتاب میں ہیں اور چند روز کے بعد نکال دیے جائیں گے تو نواب سالار جنگ نے سُن کر فرمایا کہ سید حسین کے نکالے جانے سے پہلے میں خود اپنے عہدے سے استعفا دے دوں گا۔ اس سے نواب صاحب کی کمال قدر دانی کا اظہار ہوتا ہے۔ وہ مولوی سید حسین کو بہت عزیز رکھتے تھے اور ان پر کامل اعتماد کرتے تھے۔ ان کا حکم تھا کہ کوئی انگریزی مراسلہ اس وقت تک جاری نہ کیا جائے جب تک مولوی سید حسین کی نظر سے نہ گزر جائے۔

۱۸۷۶ء میں نواب صاحب نے یورپ کا سفر کیا تو مولوی سید حسین ان کے ہم رکاب تھے۔ واپسی پر مولوی صاحب کو اپنا پرائیویٹ سیکرٹری اور معتمد صیغۂ متفرقات مقرر فرمایا جس میں سر رشتۂ تعلیم اور بعض چھوٹے موٹے محکمے شامل تھے۔ ۱۸۸۴ء میں جب حضور نظام (میر محبوب علی خان) مسند نشین ہوئے اور سر لائق علی (عماد السلطنت) مدار المہامی پر سرفراز ہوئے تو ایک کونسل آف اسٹیٹ کا قیام عمل میں آیا جس کا مقصد اہم معاملات حکومت میں مشورہ دینا تھا۔ اس مجلس کے معتمد (سیکرٹری) مولوی سید حسین قرار پائے۔ اس کونسل کے میر مجلس خود بنفسِ نفیس اعلیٰ حضرت (میر محبوب علی خان) تھے۔ اس سال جشن نوروز میں ان کو علی یار خان مؤتمن جنگ کا خطاب عطا ہوا اور ۱۸۸۶ء میں بہ تقریب جشن نوروز عماد الدولہ اور ۱۸۹۰ء میں سالگرہ مبارک کے موقع پر عماد الملک کے خطاب سے سرفراز ہوئے۔

کرنل مارشل کی علیحدگی کے بعد ۱۸۸۹ء (۱۳۰۶ھ) میں مولوی صاحب اعلیٰ حضرت کے پرائیویٹ سیکرٹری مقرر ہوئے۔ اعلیٰ حضرت نے دستِ مبارک سے (اپنی زبان میں) ایک رقعہ مولوی صاحب کو لکھا جس کے الفاظ یہ ہیں:

"نواب عماد الملک بہادر۔ آپکے واسطے خدمت خانگی پرائیویٹ سیکرٹری کی مقرر کیا ہوں
جو اس خدمت کے واسطے کسی کو نہ سمجھا۔ ایسا قابل شخص انگریزی فارسی اردو اور بات
کو مخفی رکھنے والا۔ اور جو اس خدمت کی کارروائی ہوگی وہ آپ کے پاس لکھ کر بھجوا دونگا
یا خود آؤں گا۔ مگر آپ کل دس بجے صبح میں آکر حاضر رہنا۔"

(دستخط یا محبوب)

۱۰ رجمادی الثانی ۱۳۰۶ھ روز دوشنبہ شب سہ شنبہ

چند سال کے بعد ۱۹۰۲ء میں دوسرے مناصب سے کنارہ کش ہو کر وہ صرف ناظم تعلیمات (ڈائرکٹر پبلک انسٹرکشن، ممالک محروسہ سرکار عالی) کے عہدے پر متمکن ہوئے اور آخر تک اسی عہدے پر فائز رہے۔ یہ اگرچہ بعض اوقات اس سے بڑے مناصب پر سرفراز کیے گئے لیکن انہوں نے نظامت تعلیمات کو کبھی نہ چھوڑا اور ہر حال میں اپنے ساتھ لگائے رکھا۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ انہیں بالطبع تعلیم اور علم و ادب سے خاص لگاؤ تھا۔ دوسرے وہ یہ سمجھتے تھے کہ بڑے عہدوں پر للچائی ہوئی نظریں پڑتی ہیں اور اقتدار کے بھوکے سفارشوں اور سازشوں کی مدد سے ان کے حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ اہلیت و نااہلیت کوئی نہیں دیکھتا۔ نظامت تعلیمات ایک معمولی عہدہ ہے، تنخواہ بھی زیادہ نہیں اور قوت و اقتدار بھی واجبی ہی واجبی ہے بلکہ نہ ہونے کے برابر ہے۔ دوسرے یہ عہدہ دوسرے فوائد سے بھی محروم ہے۔ باوجود اس کے نواب عماد الملک کا وقار بوجہ علم و فضل اور اعلیٰ سیرت کے ایسا تھا کہ ان کے اعلیٰ افسر اور بڑے بڑے امراء و عہدہ دار ان کا احترام کرتے تھے۔ وہ تقریباً ۳۲ سال تک دوسری خدمات کے ساتھ بلا وقفہ اس عہدے پر رہے۔ ریاست حیدرآباد میں باقاعدہ

تعلیم کی بنیاد آپ ہی نے رکھی اور سررشتۂ تعلیم کی جدید تنظیم آپ ہی کے ہاتھوں ہوئی۔ مدارس اور طلبہ میں بہت کافی اضافہ ہوا۔ علاوہ اس فرضِ منصبی کے ان کے اثر اور صحبت سے حیدرآباد میں علمی ذوق کو بہت فروغ ہوا۔ صنعت و حرفت کے مدارس بھی ریاست میں آپ ہی نے قائم کئے۔ دیسی صنعت کے بڑے قدردان تھے۔

حیدرآباد میں ان کے علمی ذوق کی دو بڑی قابل یادگاریں ایسی ہیں جن کی افادیت اور اہمیت کبھی کم نہ ہوگی۔ ایک کتب خانہ سرکار عالی اور دوسرا دائرۃ المعارف۔ اس کتب خانہ کے لئے مطبوعہ کتب کے علاوہ نادر اور کمیاب قلمی کتابیں ایسی جمع کیں کہ اس کا شمار اس برِّعظیم کے بہترین کتب خانوں میں ہو گیا۔ یہ نادر مخطوطات زیادہ تر عربی زبان کی ہیں۔ ان میں سے بعض ایسی ہیں کہ جن کا کوئی دوسرا نسخہ دنیا کے کسی کتب خانے میں نہیں۔ قلمی کتاب کی دوسری چیزوں کی طرح کوئی خاص قیمت نہیں ہوتی۔ یہ قدردانی پر ہے۔ بعض وقت سودا کرنے میں اصل کتاب ہاتھ سے جاتی رہتی ہے اور اس کا پچھتاوا عمر بھر رہتا ہے۔ نواب عماد الملک کتابوں کے بڑے قدردان تھے اور اس قدردانی کا نتیجہ تھا کہ جب کوئی ایسی کتاب آ گئی تو لئے بغیر نہ چھوڑتے اور منہ مانگی قیمت دیتے۔ اس فیاضی کی بدولت کتاب فروش یا جن کے پاس کوئی اچھی یا نادر کتاب ہوتی ان کی خدمت میں حاضر ہوتے۔ جو لوگ کتاب کی قدر و قیمت سے واقف نہیں تھے وہ اس پر بہت جھنجھلاتے اور اسے اسراف سے منسوب کرتے اور طعن کرتے کہ مولوی صاحب سرکاری روپیہ ان چیزوں پر ضائع کرتے ہیں۔ چنانچہ ایک بار انہوں نے چار پانچ عربی کتابیں آٹھ ہزار روپے میں خریدیں اور جب رقم کی منظوری کے لئے مطالبہ مدار المہام سرکار عالی (نواب وقار الامرا) کی خدمت میں پیش ہوا تو کسی صاحب نے چپکے سے کہہ دیا کہ سرکار! مولوی سید حسین صاحب کی عادت ہے کہ وہ کتابیں خریدنے میں سرکاری روپیہ بیدردی سے خرچ کرتے ہیں اور جو جتنی قیمت مانگتا ہے دے دیتے ہیں۔ نواب عماد الملک کو بھی اس کی سن گن پہنچ گئی۔ انہوں نے مدار المہام سے کہا کہ کتابیں واپس فرما دی جائیں میں انہیں خود خرید لوں گا اور یورپ بھیج کر اس سے چار گنی قیمت وصول کر لوں گا۔ مدار المہام نواب وقار الامرا نے جو بہت بامروت، فیاض اور سیر چشم امیر تھے بہت معذرت کی اور فوراً رقم ادا کرنے کا حکم صادر فرمایا۔ ایک ایسا ہی واقعہ میرے سامنے پیش آیا۔ نواب عماد الملک نے کچھ کتابیں خریدیں اور رقم کی منظوری کے لئے ہوم آفس کو لکھا۔ سررشتۂ تعلیمات ہوم آفس کے ماتحت ہے۔ اس وقت ہوم سیکرٹری افضل العلما نواب حبیب اللہ خان (فرزند مولوی سمیع اللہ خان) تھے۔ انہوں نے دیکھا کہ بعض کتابیں جو مطبع نول کشور سے چند روپے میں مل سکتی ہیں ان کی قیمت ڈیڑھ ڈیڑھ اور دو دو سو روپے لکھی ہے تو انہیں تعجب ہوا اور لکھا کہ کتابیں ملاحظہ کے لئے بھیج دی جائیں۔ نواب عماد الملک نے لکھا کہ کتابیں کسی کے پاس نہیں جائیں گی جسے دیکھنا ہو یہاں آ کر دیکھے۔ ہوم سیکرٹری صاحب نے بے چون و چرا منظوری دے دی۔ نام کے افضل العلما صاحب کیا جانیں کہ ایک کتاب جو بازار میں دو چار روپے میں مل جاتی ہے وہی کتاب اگر مصنف کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہو یا اس کا کوئی قدیم صحیح نسخہ مل جائے تو اس کی قدر و قیمت کس قدر بڑھ جاتی ہے۔ اس طرح نواب عماد الملک نے نایاب کتابوں کا بڑا اچھا ذخیرہ سرکاری کتب خانہ میں جمع کر دیا۔

علمی لحاظ سے نواب صاحب کا دوسرا بڑا کام دائرۃ المعارف کا قیام ہے۔ اس کا مطبع بھی ہے۔ اس ادارے نے عربی کی بہت سے نادر کتابیں طبع و شائع کی ہیں۔ یہ ایسی کتابیں ہیں جن کے قلمی نسخے نایاب تھے اور دو ایک سے زیادہ دنیا میں کسی دوسری جگہ نہیں پائے جاتے تھے۔ اس کی قدر اور شہرت ہندوستان سے زیادہ عرب ممالک اور بلاد یورپ میں ہوئی۔ اس ادارے کا قیام ۱۳۰۶ھ (۱۸۸۸ء) میں ہوا۔ اس وقت پانچ سو روپے ماہانہ اس کے مصارف کے لئے مقرر ہوئے۔ اس کے بعد نواب صاحب کی تحریک پر اعلیٰ حضرت نے ۱۳۴۹ھ (۱۹۳۱ء) میں اسے ایک لاکھ روپیہ اور ما بعد سال بسال پانچ لاکھ روپے عطا فرمائے۔ بھارت کے ناجائز قبضے کے بعد ریاست حیدرآباد پر جو آفات نازل ہوئیں ان میں دو ایسی ہیں جن کا صدمہ کبھی نہیں بھول سکتے۔ ایک عثمانیہ یونیورسٹی کی تخریب اور دوسری دائرۃ المعارف کا خاتمہ۔ افسوس نواب عماد الملک کی یہ بے نظیر علمی یادگار ہمیشہ کے لئے ختم ہو گئی۔ لیکن اس نے جو قابل قدر کام کیا ہے وہ ہمیشہ یادگار رہے گا اور کبھی نہیں مٹ سکتا۔

نواب صاحب کو عربی زبان سے بے حد محبت تھی۔ دائرۃ المعارف اسی محبت کا نتیجہ تھا۔ مولوی عبد الحلیم شرر لکھتے ہیں:

مجھے ایک مدت تک بالذات ان کی دلنواز صحبتوں میں شریک ہونے کی عزت حاصل رہی ہے اور ان کے

طالب علمانہ مشاغل میں شریک ہو کر میں نے ان کے علم و فضل سے فائدہ اٹھایا ہے۔ اسی سلسلے میں مجھے ان کی واقفیت عامہ، ان کے مذاق اور ان کے اسلوب زندگی کا اندازہ کرنے کا بخوبی موقع ملا۔ شعراء کے کلام کا مطالعہ کرنے میں چند روز میں ان کے ساتھ شریک رہا اور نظر آیا کہ جیسی محققانہ و مبصرانہ نظر کلام عرب پر ان کی پڑتی ہے بہت کم کسی کی پڑتی ہے۔ سچ یہ ہے کہ میں نے انہیں ادب عربی میں یکتائے روزگار پایا۔ جاہلیت عرب کے سانچے اور خالص عربی مذاق کے دلدادہ ہیں۔ شعرائے جاہلیت کے کلام پر سر دھنتے ہیں اور مولدین کے کلام کو بالکل نہیں پسند کرتے۔"

حیدر آباد ایجوکیشنل کانفرنس کے خطبۂ صدارت میں آپ نے جامعۂ عثمانیہ کے ذکر کے دوران میں عربی زبان کی تعلیم کی خاص طور پر تاکید کی تھی۔ فرماتے ہیں:

"دوسرا امر جس کی طرف کارپردازان جامعہ علمیہ کی توجہ مبذول ہونی چاہئے وہ یہ ہے کہ اس جامعہ کے مسلمان طلبہ بطور دوسری زبان تعلیمی کے عربی کے اختیار کرنے پر مجبور کیے جائیں۔ اگر فقط اردو انگریزی پر اکتفا کیا گیا تو بجز ناکامی کے کچھ حاصل نہ ہوگا۔ دوسری یونیورسٹیوں کے کامیاب طلبہ سے آپ کے کامیاب طلبہ پیچھے رہ جائیں گے اور آپ کی ساری محنت اکارت جائے گی۔ طلبہ کو وہ پایۂ فضیلت نصیب نہ ہوگا جس کی ان کو اور ہم کو اور ان کی قوم کو ضرورت ہے۔ عربی زبان کو مختلف حیثیتوں سے ہم مسلمانوں پر حق محکم حاصل ہے۔"

اس کے بعد اس کی تفصیل بیان کی:

"میں نے اورنگ آباد میں کالج قائم کرنے کی تجویز کی تھی۔ نواب صاحب کی تائید و تحریک سے جلد منظوری حاصل ہو گئی۔ قیام کالج کے بعد آپ نے ان طلبہ کے لئے وظیفے مقرر کئے جنہوں نے عربی زبان لی تھی اور ہر سال بغیر یاددہانی یا تقاضے کے وقت پر میرے پاس چیک آجاتا تھا۔"

مولوی حبیب الرحمان خان شیروانی (نواب صدر یار جنگ) نے مرحوم نواب صاحب کے علم و ادب کے شغف کے متعلق اپنی ایک تقریر میں یہ واقعہ بیان فرمایا:

"جس سال آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس گجرات میں منعقد ہوئی، وہاں پرانی علمی کتابوں کی تباہی دیکھ کر میں نے ایک اپیل شائع کی کہ روپے کی امداد دے کر ان کتابوں کے خریدنے اور محفوظ کرنے کا انتظام کیا جائے۔ نواب عماد الملک بہادر مرحوم نے اپیل پڑھ کر خود لکھا کہ اپیل پڑھ کر کتابوں کی تباہی پر میں رو رہا ہوں۔ افسوس ہے کہ اس وقت میرے پاس روپیہ نہیں اس لئے ایک ہزار روپے کا چیک پیش کرتا ہوں۔ یہ تھی مرحوم کی کریم النفسی اور علم کی شیفتگی۔"

اسی طرح نواب اسحاق خان مرحوم سیکرٹری مدرسۃ العلوم مسلمانان علی گڑھ نے امیر خسرو کی تصانیف کی اشاعت کا اعلان کیا تو نواب عماد الملک بہادر نے بہت مسرت کا اظہار کیا اور مالی امداد کا بھی وعدہ فرمایا۔ اس قسم کے علمی و ادبی کاموں کی امداد کے لئے وہ بغیر طلب اور تقاضے کے آمادہ ہو جاتے تھے۔ وہ اس قسم کے تمام علمی کاموں میں بڑی خوشی اور فیاضی سے مدد دینے پر آمادہ ہو جاتے تھے۔ چنانچہ ۱۹۱۴ء میں نواب صاحب نے نواب محمد اسحاق خاں آنریری سیکرٹری مدرسۃ العلوم مسلمانان علی گڑھ کو خط لکھ کر امیر خسرو کی تصانیف کی نشر و اشاعت کی طرف توجہ دلائی جس کے بعض اقتباسات درج ذیل ہیں:

"جامعیت و تحقیق کے ساتھ بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ اسلامی ہندوستان میں کوئی مصنف ایسا نہیں گزرا ہے جس کی تصانیف اس درجہ اعلیٰ حفاظت و اشاعت ہوں جیسا کہ امیر خسرو ... اگر آپ کی کوشش سے

اس مشہورِ زمانہ عدیم النظیر مصنف کا پورا کلام نظم و نثر جمع ہو کر چھپ گیا تو یہ قوم کی ایک بڑی عظیم الشان خدمت ہوگی جس کا نفع غیر محدود ہوگا اور جو اس کے کرنے والوں کے نام کو بھی زندہ جاوید بنا دے گی۔
میں دولت مند نہیں ہوں۔ اگر میرے پاس دولت ہوتی تو میں اس کام کے لئے اس کو وقف کر دیتا۔
بایں ہمہ یہاں تک مجھ سے ہو سکے گا میں اس کام میں مالی مدد دوں گا اور اپنے احباب سے بھی کچھ رقم وصول کر کے بھیجوں گا۔ کام شروع کرنے کے لئے خود ایک ہزار روپے اس وقت دیتا ہوں اور بوقتِ ضرورت ایک ہزار اور دوں گا۔"

اس کے بعد نواب اسحاق خاں بالکل آمادہ ہو گئے۔ نواب عماد الملک نے دو ہزار روپئے سرکارِ عالی سے ساڑھے سات ہزار، نواب سالار جنگ سے ایک ہزار، مولوی انوار اللہ خان صاحب (فضیلت جنگ) سے پانسو کل گیارہ ہزار جمع کر کے بھیجے۔

اسی طرح وہ اہلِ علم کی مدد کرتے تھے اور جب کبھی ان کے علم میں آ جاتا کہ فلاں عالم کوئی مفید علمی کام کر رہا ہے تو سفارش کر کے حکومت سے امداد دلوانے میں دریغ نہ کرتے۔

مولانا محمود الحسن ٹونکی مرحوم ایک عالم متبحر تھے۔ علوم اسلامیہ پر ان کی نظر بہت وسیع اور گہری تھی۔ بہت روشن خیال اور نہایت زندہ دل اور خوش مزاج بزرگ تھے۔ وہ مصنفینِ اسلام پر ایک کتاب کیا انسائیکلوپیڈیا لکھ رہے تھے۔ ایک جلد مصر میں طبع ہوئی تھی اور وہاں کے علمانے اسے بہت پسند فرمایا تھا۔ دوسری جلد کی نوبت ابھی نہ آئی تھی کہ جنگِ عظیم کی آفت نازل ہوئی اور وہ مسودہ تلف ہو گیا۔ میں نے نواب عماد الملک بہادر سے اس کا تذکرہ کیا تو انھوں نے فوراً اعلیٰ حضرت حضور نظام کو لکھ کر منظوری حاصل کی اور مولانا کو حیدر آباد طلب فرما کر اس کام پر مامور کر دیا اور ایک معقول تنخواہ ان کے لئے مقرر ہو گئی اور ایک مختصر سا عملہ بھی دے دیا گیا۔ یہ بہت وسیع اور عظیم الشان کام تھا۔ مولانا دن رات اس میں مصروف رہتے تھے چند حصے دائرۃ المعارف میں طبع بھی ہوئے۔ باقی مجلدات عثمانیہ یونیورسٹی کے ادبی انبار میں پڑی سڑ رہی ہیں جن کا اب کوئی قدر دان نہیں۔ اس تصنیف کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ جب اس کے بعض حصے ڈاکٹر کرینکو کی نظر سے گزرے جو عربی علوم کے محقق فاضل تھے تو انہیں یقین نہ آتا تھا کہ اتنا بڑا اور ایسا مشکل کام ایک فردِ واحد کا کیا ہوا ہے۔

اسی طرح جب مولوی عبد الجبار خاں ملکاپوری نے دکن کی مبسوط تاریخ لکھنی شروع کی تو نواب صاحب نے سفارش کر کے دولتِ آصفیہ سے چھ ہزار روپے منظور کرا دئے۔

مولوی عبد اللہ خاں نے بعض بہت مفید علمی کتابیں چھپوا کر شائع کیں۔ ان کا مطالعہ بہت وسیع تھا اور کتب خانہ آصفیہ ہی میں رہتے تھے نواب صاحب نے ان کی سرپرستی فرمائی اور سرو آزاد اور مآثر الکلام جیسی کتابوں کی اشاعت پر اپنی جیب سے مختلف اوقات میں کئی ہزار روپے عنایت فرمائے اور اعلیٰ حضرت سے سفارش کر کے تاحیات پچاس روپے وظیفہ مقرر کرا دیا۔
ایسے ہی ایک دو صاحبوں کا جو علمی یا مذہبی کام کر رہے تھے میں نے ان سے ذکر کیا اور انھوں نے اعلیٰ حضرت سے سفارش کر کے منصب زمینی دوامی وظیفہ مقرر کرا دیا۔

طالب علموں کی اکثر مدد کرتے رہتے تھے اگر کسی تعلیم کے شوقین نادار طالب علم کی سفارش کی جاتی تو تعلیمی وظیفہ مقرر کر دیتے۔ ایک روز مجھ سے فرمانے لگے کہ دلی سے ایک نوجوان عبد الرؤف کا خط آیا ہے جو ابھی ابھی انگلستان سے بیرسٹری کی ڈگری لے کر آئے ہیں لیکن بوجہ کم استطاعتی اپنا کام شروع نہیں کر سکتے۔ انھوں نے مجھ سے مالی مدد طلب کی ہے۔ میں نے کہا یہ نوجوان میرن صاحب کے نواسے ہیں۔ ان کو اس کا علم نہ تھا۔ لیکن وہ اس نوجوان کے حسنِ تحریر سے اس قدر متاثر ہوئے کہ فوراً لکھ بھیجا کہ تمہیں کس قدر رقم کی ضرورت ہے اطلاع دو کہ اس کا انتظام کر دیا جائے۔ وہاں ایسے خودار

تشریف المغفرس رکھتے کر جواب میں لکھا۔ یہاں حسب دلخواہ انتظام ہو گیا ہے۔ آپ زحمت نہ فرمائیں۔ ایک روز مجھ سے پوچھنے لگے کہ ایسا معلوم ہوا ہے کہ جامعۂ عثمانیہ کے طلبہ کی ٹیم کھیلوں کے دورے پر جا رہی ہے۔ میں نے کہا ہاں فلاں فلاں مقام پر جائیں گے۔ یہ سننے کے بعد کئی سو روپیہ ان کے سفر خرچ کے لئے بھیج دیے۔

نواب صاحب کا ادبی ذوق اعلیٰ درجے کا تھا۔ فارسی اور عربی کے جیّد عالم تھے فرنچ خوب جانتے تھے اور انگریزی زبان پر حیرت انگیز قدرت تھی۔ وہ ایرانیوں سے فارسی میں اور عربوں سے عربی میں بلا تکلف گفتگو کرتے تھے۔ جب امیر امان اللہ خان ہندوستان آئے اور ان کے پروگرام میں علی گڑھ کالج کا معائنہ بھی تھا تو نواب محسن الملک نے امیر صاحب کی خدمت میں پیش کرنے کے لئے فارسی سپاس نامہ نواب عماد الملک بہادر ہی سے لکھوایا تھا۔ عربی ادب کے ذوق کے متعلق شررؔ صاحب کی رائے لکھ چکا ہوں کہ وہ جاہلیت کے شعراء کے سادہ اور پر جوش کلام کے بہت مداح تھے اور مولدین کا کلام پسند نہیں کرتے تھے۔ فارسی میں وہ شیخ سعدی کے بہت قائل تھے اور شیخ کی عاشقانہ شاعری کو حافظ کی شاعری پر ترجیح دیتے تھے۔ اردو میں لکھنؤ کی شاعری بہت ناپسند تھی۔ انہیں لفظی صنائع سے جس پر لکھنوی شاعری کا دار و مدار تھا اور عامیانہ خیالات سے بہت چڑ تھی۔ وہ کہتے تھے کہ ہماری زبانوں (اردو، فارسی، عربی) میں نثر لکھی ہی نہیں وہ ایک قسم کی شاعری یا نیم شاعری تھی۔ حالیؔ نے اردو کو متین نثر عطا کی جو علمی اور ادبی مضامین ادا کرنے کی قوت رکھتی ہے۔ میر انیس کی شاعری کے بہت مداح تھے اور ان کے کلام کے بعض اشعار جنہیں وہ ان کا شہ کار سمجھتے تھے زبانی یاد تھے اور کبھی کبھی سنایا کرتے تھے لیکن کہتے تھے میر صاحب بھی بعض اوقات لفظی رعایت اور صنائع بدائع سے دامن نہ بچا سکے۔ چنانچہ فرماتے تھے کہ میں نے میر صاحب سے پوچھا کہ آپ لفظی رعایتوں اور صنائع بدائع کو پسند کرتے ہیں تو انہوں نے جواب دیا "نہیں!" لیکن آخر لکھنؤ میں رہتا ہے۔ انگریزی زبان میں متعدد مقالے اور مضامین اور نظمیں جو انہوں نے مختلف اوقات میں لکھیں کتاب کی صورت میں شائع ہو گئی ہیں۔ اس مجموعہ میں ان کا وہ فاضلانہ مقالہ بھی ہے جو انہوں نے "اصطلاحاتِ علمیہ" پر تحریر فرمایا تھا۔ یہ آج سے تقریباً چوراسی پچاسی برس پہلے لکھا گیا تھا مگر اب بھی پڑھنے کے قابل ہے اور اس میں جو نکات اصطلاحات کے وضع یا ترجمہ کرنے یا اپنے قدیم الفاظ کو کام میں لانے کے متعلق بیان کئے ہیں اور انگریزی اصطلاحات کو بجنسہٖ اختیار کرنے کے خلاف جو بحث کی ہے اور اس مسئلہ کے متعلق بعض مختلف آراء پر جو تنقید فرمائی ہے اس کا مطالعہ اب بھی ہمارے لئے مفید ہو سکتا ہے۔ نواب صاحب کی انگریزی انشا پردازی کے نہ صرف ہمارے ملک کے تعلیم یافتہ بلکہ اہلِ زبان بھی معترف تھے۔ ۱۹۰۶ء میں مسلمانوں کا ایک وفد آغا خان کی سرکردگی میں لارڈ منٹو کی خدمت میں حاضر ہوا تھا۔ یہ مسلمانوں کا بہت اہم اور تاریخی وفد تھا جس میں ملک کے متعدد صاحب الرائے اور تمام صوبوں کے مسلمان شریک تھے۔ یہ وقت مسلمانوں کے لئے بہت نازک تھا۔ تقسیم بنگال کے بعد مسلمانوں میں عام طور پر مایوسی اور افسردگی چھائی ہوئی تھی۔ وفد کی تجویز نواب محسن الملک کے فکرِ رسا کا نتیجہ تھی جو اپنے وقت کے نہایت دور بین اور روشن خیال سیاست دان تھے۔ انہوں نے آغا خان کو گھیرا اور نواب عماد الملک کو بلا کر وہ ایڈریس لکھوایا جو وائسرائے کی خدمت میں پیش کیا جانے والا تھا۔

سیاست میں وہ سر سید احمد خان کے پیرو تھے۔ جب سر سید نے انڈین نیشنل کانگرس کی بعض وجوہ کی بنا پر مخالفت کی تو اس کی تائید میں ایک بہت پُر زور تحریر انگریزی زبان میں لکھ کر شائع کی۔ وہ انگریزی حکومت کو ملک کے حق میں باعثِ خیر و برکت سمجھتے تھے۔ پُرانے لوگ اکثر اسی خیال کے تھے۔ انہوں نے اپنے زمانے کی طوائف الملوکی اور دیسی حکومتوں کی بدنظمی، ابتری، ناانصافی، رشوت خواری، ظلم و جبر دیکھے تھے۔ انگریزوں نے ریلیں جاری کیں، تار گھر، ڈاک خانے بنائے، عدالتیں قائم کیں، لوٹ مار اور ظلم و جبر کا انسداد کیا، تعلیم پھیلائی اور مدرسے اور کالج اور یونیورسٹیاں قائم کیں۔ سفر کی آسانیاں پیدا ہو گئیں، انصاف ہونے لگا، امن و امان قائم ہو گیا۔ یہ سب کچھ دیکھ کر وہ انگریزوں سے بہت خوش تھے اور ان کی عقل و دانش اور انتظام و انصاف کی بہت تعریف کرتے تھے۔ ان بزرگوں کو ملک کے اقتصادی اور سیاسی معاملات سے کچھ بحث نہ تھی اور نہ وہ ان مسائل کو اچھی طرح سمجھتے تھے۔ یہ تو گیا جسٹس طاہر ... نے ایک خطبہ میں انگریزوں کی آمد کو مشیتِ ایزدی اور ملک کے حق میں باعثِ خیر فرمایا تھا۔ ... زندگی

یہی کہتے تھے۔ شروع شروع میں انڈین نیشنل کانگریس کا بھی یہی خیال تھا۔ اس وقت کانگریس والے صرف اتنا چاہتے تھے کہ انہیں حکومت میں حصہ دار کے عہدے ملیں اور حکومت کے نظم و نسق میں ان کا بھی دخل رہے۔ حالات کے مطالعہ اور اقتصادی اور سیاسی امور میں غور کرنے اور عملی تحریکوں میں حصہ لینے سے ان کا نقطۂ نظر بدل گیا۔ ہمارے بزرگ جو نیم اس قسم کے تھے اپنے پرانے خیال سے نہ ہٹے۔ ان میں بہت کم ایسے تھے جنہوں نے ملکی معاملات کو غور سے دیکھا ہو اور ان میں بصیرت حاصل کی ہو۔ مولوی قسم کے لوگ جو انگریزوں سے نفرت کرتے تھے اور ان کو مسلمانوں کا بدخواہ سمجھتے تھے ان کی نفرت کچھ تو مذہبی تعصب پر مبنی تھی اور کچھ اس وجہ سے کہ مسلمانوں کی حکومت اور وقار کو ان سے نقصان پہنچا تھا۔ یہ بات بہت دیر میں سمجھ میں آئی کہ انگریزی حکومت سے اصل نقصانات کیا پہنچے اور بعض اسے آخر تک نہ سمجھے۔ اس بارے میں نواب عماد الملک کا ذاتی خیال اس ایک جملے سے ظاہر ہوگا کہ جس زمانے میں وہ انڈین لیجسلیٹو کونسل کے ممبر تھے انہوں نے اپنی ایک تقریر میں کہا کہ ہمیں حکومت میں جنٹلمین کی ضرورت ہے۔ یہ وہی پرانا خیال ہے جس کا اظہار ہمارے بزرگ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ مقابلے کے امتحان میں ایسے ویسے کامیاب ہو کر آجاتے ہیں اور ہم پر حاکم بنا دیئے جاتے ہیں جو شریفانہ اطوار و آداب سے عاری ہوتے ہیں۔ نواب عماد الملک کو خاندانی شرافت کا بڑا خیال تھا اور اسے بہت اہمیت دیتے تھے۔ قصباتی شرفا اس معاملے میں بہت سخت ہوتے ہیں۔ گو انہیں بلگرام میں رہنے کا زیادہ اتفاق نہیں ہوا تھا تاہم قصباتی شرفا کی خو بو ان میں موجود تھی۔ ایک دن اتفاق سے میں ان کے ہاں گیا تو دیکھا ایک صاحب سے باتیں کر رہے ہیں۔ جب وہ رخصت ہو کر چلے گئے تو کہنے لگے یہ شخص شریف نہیں معلوم ہوتا۔ میں نے کہا بظاہر تو ایسا نہیں معلوم ہوتا۔ اچھے تعلیم یافتہ ہیں۔ کہنے لگے بعض الفاظ کا تلفظ غلط کر رہا تھا۔ مجھے یہ سن کر کسی قدر تعجب ہوا اور سوچنے لگا کہ یہ شرافت کی پرکھ بھی عجیب ہے۔ ایک مولانا حالی تھے جو کہہ گئے ہیں ؎

کچھ اور آؤ بن کر تم اے میر و مرزا
نہیں پوچھتے یاں حسب اور نسب کچھ

میں نے مولانا سے پوچھا "کچھ اور آؤ بن کر" سے کیا مراد ہے۔ فرمایا "مزدور"۔ دونوں اشراف ہیں اور قصباتی ہیں۔ ایک تو صرف وقت کے تقاضے کو بلکہ انسانیت کے تقاضے کو بھی سمجھتا تھا اور دوسرا قدیم رسم و راہ اور وضع کا پابند تھا۔ جہاں تھا وہیں رہا۔

امیرانہ شان سے رہتے تھے لیکن اس میں تصنع نہ تھا۔ عالی شان کوٹھی تھی اور اسی مناسبت سے اس کا فرنیچر اور سامان تھا۔ مزاج میں بہت نفاست تھی۔ صفائی کا بہت خیال رکھتے تھے۔ ریاست میں ان کا کوئی بہت بڑا عہدہ نہ تھا۔ لیکن نہ تو ملازمت میں اور نہ خدمت سے سبکدوش ہونے کے بعد بھی ان کی خودداری اور وقار ایسا تھا کہ تمام عہدہ دار اور امرا و وزرا ان کا بہت ادب و احترام کرتے تھے اور اس طرح ملتے تھے جیسے کوئی خورد کسی بزرگ سے ملتا ہے۔

ان کی امیرانہ شان و معاشرت اور ظاہری رکھ رکھاؤ اور رعب داب کو دیکھ کر لوگ ان کے پاس جاتے ہوئے گھبراتے تھے لیکن وہ بہت صاف دل با مروت اور منکسر المزاج تھے۔ خاص کر اہل علم سے مل کر بہت خوش ہوتے تھے اور بے تکلف علمی باتیں کرتے تھے۔ ایسے وقت میں کوئی اور شخص آجاتا تو ملنے سے صاف انکار کر دیتے۔ ایک بار کا ذکر ہے کہ ان کے فرزند نواب عقیل جنگ ان سے ملنے آئے۔ اس وقت نواب صاحب کے پاس مولوی ہاشم ندوی بیٹھے ہوئے تھے جو نواب صاحب کے کتب خانے کی ترتیب وغیرہ کا کام کرتے تھے۔ نواب عقیل جنگ نشست کے کمرے میں آئے تو مولوی صاحب سے مخاطب ہو کر کہنے لگے "کیا نیچے آپ کا جھٹکا کھڑا ہے؟" (جھٹکا دکن میں ایک ادنیٰ قسم کی سواری ہے۔) یہ سنتے ہی نواب صاحب سخت برہم ہوئے اور کہنے لگے "تم اہل علم کی توہین کرتے ہو۔ تم بھول گئے تمہارا باپ ایک زمانے میں جھٹکا پر چلتا تھا۔" غرض اس بری طرح ڈانٹا کہ وہ پانی پانی ہو گئے۔ عقیل جنگ کا منشا طعن کرنا نہ تھا۔ بات یہ ہے کہ مولوی صاحب کا جھٹکا پھاٹک کے دہلیز میں عین کے عین سامنے کھڑا تھا جس سے آنے جانے والوں اور دوسری سواریوں کو زحمت ہوتی تھی۔ غرض یہ کہ اس معاملے میں نواب عماد الملک بہت

سخت تھے۔ وہ علم کی قدر کرتے تھے خواہ صاحب علم کیسا ہی خستہ حال اور پھٹے پرانے کپڑوں میں ہو۔ وہ خود بھی طالب علم تھے اور باوجود اس مرتبہ پر پہنچنے کے ان کے مزاج میں طالب علمانہ سادگی موجود تھی اور ادبی علمی گفتگو میں ان کا انداز تخاطب بالکل ایسا ہی ہوتا تھا جیسے ایک طالب علم سے ہوتا ہے۔ اس وقت وہ فرق مراتب کا بالکل خیال نہیں کرتے تھے۔

اردو زبان و ادب سے انہیں خاص لگاؤ تھا چنانچہ حیدرآباد آنے کے دوسرے ہی سال ۱۸۸۴ء میں ایک ماہانہ اردو رسالہ "مخزن الفوائد" جاری کیا۔ یہ رسالہ دو سال تک جاری رہا۔ اس میں متعدد مضامین شائع ہوئے ان میں سے بیشتر سائنسی موضوع پر تھے۔ ہمارے تعلیم یافتہ حضرات کے شعار میں اب تک۔ یہ بات داخل ہے کہ آپس میں انگریزی میں بات چیت کرتے ہیں اور انگریزی میں خط و کتابت کرتے ہیں۔ نواب عماد الملک ہمیشہ اردو میں گفتگو کرتے تھے۔ ایسے لوگوں سے جن کی زبان اردو ہے یا جو اردو زبان جانتے تھے، انگریزی میں بات چیت کرنے کو بدتمیزی اور جہالت کا مظاہرہ خیال کرتے تھے۔ البتہ جب کسی ایسے شخص سے ملاقات ہوتی جو اردو نہیں جانتا تھا مثلاً ایرانی، عرب یا انگریز تو اس سے اس کی زبان میں باتیں کرتے تھے۔ ایک بار ایک صاحب جو پہلے برٹش انڈیا میں ایک اعلیٰ عہدے پر تھے اور بعد میں بھوپال میں وزیر ہو گئے تھے نواب صاحب سے ملنے آئے اور آتے ہی انگریزی میں گفتگو کرنی شروع کی۔ نواب صاحب نے فرمایا۔ میری زبان انگریزی نہیں اور نہ غالباً آپ کی ہے۔ کوئی انگریز آجاتا ہے تو میں اس سے مجبوراً انگریزی میں بات چیت کر لیتا ہوں ورنہ میں انگریزی زبان میں بات چیت کرنا ناپسند کرتا ہوں۔ وہ صاحب بہت شرمندہ ہوئے اور معذرت کرنی پڑی۔

وہ ہندوستان کے نظام تعلیم کو اس وجہ سے بھی ناپسند کرتے تھے کہ اس میں ذریعہ تعلیم انگریزی ہے۔ ان کی رائے میں یہ طریقہ نہ صرف حصول علم میں مانع ہے بلکہ اس کا اخلاق پر بھی برا اثر پڑتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ جامعہ عثمانیہ کے طرز تعلیم کے حامی تھے کہ اس میں ذریعہ تعلیم اردو ہے۔ چنانچہ ان خیالات کا اظہار انہوں نے اپنے خطبہ صدارت حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس منعقدہ حیدرآباد دکن ۱۹۱۷ء میں کیا ہے۔ جس کا مختصر اقتباس پیش کیا جاتا ہے:

"ثانوی مدارس میں ابتدا سے انگریزی شروع کر دی جاتی ہے جو ہمارے لئے ایک اجنبی اور نہایت ادق زبان ہے اور لڑکے مجبور کئے جاتے ہیں کہ تمام ابتدائی فنون مثل حساب جغرافیہ تاریخ وغیرہ کے اسی غیر مانوس زبان کے ذریعہ سیکھیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اپنی زبان سے کم و بیش ناواقف رہ جاتے ہیں اور انگریزی بھی اچھی طرح نہیں آتی۔ بیشتر تعداد طلبہ کو دس دس بارہ بارہ سال اسکول ہی کی حدود کے اندر صرف کرنے پڑتے ہیں۔ اس عرصۂ دراز میں ان کو کیا حاصل ہوتا ہے انگریزی قدرے قلیل سیکھ لیتے ہیں۔ انگریزی میں حساب کے معمولی سوالات کا جواب دے سکتے ہیں۔ . . جغرافیہ جانتے ہیں، اقطار دنیا کے نام جانتے ہیں، خاص خاص ملکوں کے مشہور و معروف شہروں، ندیوں، پہاڑوں کے انگریزی نام بتا سکتے ہیں اور نقشے میں ان کا نشان دے سکتے ہیں، یورپ خصوصاً انگلستان کی تاریخ کسی قدر جانتے ہیں، ہندوستان کی تاریخ سے بھی ایک حد تک واقف ہیں اور آپ کو بتا سکتے ہیں کہ جہانگیر ایک شرابی، سلطنت سے بے پروا اور اورنگ زیب ایک سخت متعصب و ظالم بادشاہ تھا۔ اپنی زبان سے بالکل واقف نہیں گو ٹوٹی پھوٹی بول لیتے ہیں مگر اپنی مذہبی زبان، اور بزرگوں کے علوم اور حالات سے بالکل نابلد ہیں۔ کالج میں چار پانچ سال تعلیم پانے کے بعد ان کی حالت میں زیادہ تغیر نہیں ہوتا۔ بجز اس کے کہ مغربی دنیا کے مقلد بن جاتے ہیں۔ ہر امر میں مغربی پیروی کرنا چاہتے ہیں۔ اپنے قومی اخلاق اور پاکیزہ تہذیب چھوڑ کر مغربی اخلاق اختیار کر لیتے ہیں۔ آپس میں گفت و شنید بات چیت سلام علیک سب انگریزی زبان میں کرنا ان کو بھاتا ہے۔ کھانا پینا انگریزی قسم کا پسند کرتے ہیں لباس انگریزی [illegible] [illegible] کے نام سے شرف بخشتے ہیں۔ اپنی زبان میں تحریر و تقریر کرتے ہیں تو اس میں بے تحاشا انگریزی

لغات کی بھرمار کر دیتے ہیں۔ بہتوں کو نماز جیسی اتنی عمر سے یاد نہیں۔ ایک صاحب کو میں نے سنا ہے
کلمہ توحید تک معلوم نہ تھا کہ کیا شے ہے اور کس کا نام ہے۔"

کالجوں میں انگریزی زریعۂ تعلیم کے متعلق فرماتے ہیں:

"اگر یہی طریقہ قائم رہا تو ہماری آبائی زبان یعنی اردو ایک جاہلانہ زبان رہ جائے گی اور عام طور پر ہمارے ہم قوم و
ہم وطن علوم مغربیہ سے ہمیشہ ناآشنا رہیں گے۔۔۔۔۔ اگر اس مبارک عثمانیہ یونیورسٹی یعنی جامعۂ عثمانیہ کو جس
میں خاص اردو زبان واسطۂ تعلیم علوم و فنون قرار دی گئی ہے حسب امید کامیابی ہوئی تو یہ عیب مٹ جائے گا
اور ہماری زبان قلیل عرصے میں دولت علمیہ سے مالا مال ہو جائے گی۔"

جب ۱۹۱۳ء میں انجمن ترقی اردو کا کام مجھے تفویض ہوا تو میں نے صدارت کے لئے نواب صاحب کا نام پیش کیا۔ انجمن کی مجلس انتظامی نے بالاتفاق منظور کیا اور حقیقت یہ ہے کہ ہر اعتبار سے کوئی دوسرا شخص ان سے بہتر ہمیں انجمن کی صدارت کے لئے نہیں مل سکتا تھا۔ انجمن کو ان سے علاوہ ادبی و علمی مشورے کے ہر قسم کی مدد ملی۔ مثلاً میں نے ایک دن عرض کیا کہ اگر آپ ہز ہائی نس آغا خان سے انجمن کی امداد کی تحریک فرمائیں تو امید ہے کہ معقول عطیہ مل جائے۔ کیونکہ وہ قومی اور علمی کاموں کی امداد میں بہت فیاض ہیں۔ انہوں نے فوراً کاغذ قلم لے کر فارسی زبان میں خط لکھ مارا۔ مگر آغا خان نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس زمانے میں آغا خان یورپ میں تھے۔ اس کے کچھ دنوں بعد ہی سید راس مسعود نے انگلستان کا قصد کیا۔ میں نے ان سے کہا آغا خان بھی آج کل وہیں تشریف رکھتے ہیں ذرا ان کو کھٹکھٹائیے گا۔ حضرت نے نواب عماد الملک کے خط کا جواب تک نہ دیا۔ سید صاحب سفر سے واپس آئے تو کہا۔ آغا خان سے ملا تھا۔ انہوں نے فرمایا کہ فلاں تاریخ کو بمبئی پہنچنے والا ہوں وہاں ملئے۔ چنانچہ اس تاریخ کو میں اور سید صاحب بمبئی پہنچے۔ معلوم ہوا کہ وہ پونا تشریف لے گئے ہیں اور یہ کہہ گئے ہیں کہ پونے آکر ملئے۔ میں نے سید صاحب سے کہا۔ بس آپ تشریف لے جائیے۔ مجھے معاف رکھئے۔ وہ گئے۔ ہز ہائی نس آغا خان تپاک سے ملے۔ انجمن کا معروضہ سماعت فرمایا۔ اپنے کارندۂ خاص کو بلایا۔ حکم دیا کہ انجمن کو ایک ہزار روپیہ ماہانہ کے حساب سے دس ہزار کا عطیہ ہماری طرف سے دیا جائے۔ اس نے فوراً یہ حکم اپنی نوٹ بک میں ٹانک لیا۔ اس کے بعد کئی بار یاد دہانی کی گئی جواب ندارد۔ بڑے آدمیوں کے وعدے ایسے ہی ہوتے ہیں۔ جو جتنا بڑا ہوتا ہے اس کے وعدے کے ایفا کو بھی اتنی ہی دیر لگتی ہے۔ میرے پاس ایسے بہت سے شاندار وعدے موجود ہیں۔ اس دنیا میں تو ان کی کچھ پوچھ گچھ نہ ہوگی۔ ایک روز داور محشر کے آگے پیش کرنے پڑیں گے۔

اسی طرح جب میں حیدرآباد سے وطن (شمالی ہند) جانے لگا تو نواب صاحب سے عرض کی کہ اگر مناسب ہو تو انجمن کی امداد کے سلسلے میں ایک خط نواب صاحب رام پور (نواب حامد علی خان) کے نام عنایت فرمایا جائے۔ آپ نے ایک خط فرماں روائے ریاست رام پور کے نام لکھ کر دیا جس میں انجمن کے کاموں کا مفصل ذکر تھا۔ میں نے یہ خط لے جا کر نواب صاحب کی خدمت میں پیش کیا۔ چند سطریں پڑھ کر اپنے معتمد خاص کے حوالے کر دیا۔ میں نے چاہا کہ انجمن کے متعلق کچھ عرض کروں لیکن انہوں نے نواب عماد الملک کی توصیف و ثنا شروع کر دی۔ وہ ان کا نام بڑے ادب سے لیتے تھے اور ان کی باتوں سے صاف معلوم ہوتا تھا کہ ان کو نواب عماد الملک سے خلوص ہے۔ وہ ملتجیانہ لہجے میں مجھ سے بار بار کہتے رہے کہ کسی طرح آپ انہیں یہاں لائیے مجھے بے حد مسرت ہوگی۔ میری بڑی تمنا ہے کہ وہ کچھ دن میرے پاس آ کر رہیں۔ میں نے کہا [illegible] ٹانگ کر جب سے صدمہ پہنچا ہے انہیں اٹھنے بیٹھنے میں بہت تکلیف ہوتی ہے۔ جب کسی سے ملاقات کرنی ہوتی ہے تو اپنے خاص کمرے سے پہیئے دار کرسی پر باہر آتے ہیں۔ ایسی حالت میں ان کا یہاں آنا محال ہے۔ کہنے لگے آپ کسی طرح انہیں بمبئی تک لے آئیے پھر میں بمبئی پہنچ کر نہایت آسائش و آرام کے ساتھ یہاں لے آؤں گا۔ غرض میں وہاں تین چار روز رہا۔ بہت خوشی سے ملتے۔ بلکہ بعض اوقات دور ہی سے دیکھ کر بڑے تپاک سے "آئیے آئیے مولوی صاحب آئیے" کہتے اور دیر تک ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہتے لیکن انجمن کا معاملہ کبھی بیچ میں نہ آنے دیتے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو غیر ضروری اور بے جا کاموں میں روزانہ ہزاروں روپے

صرف کر دیتے ہیں ۔

اورنگ آباد سے مجھے اکثر سرکاری کاموں یا محکمۂ تعلیم یا یونیورسٹی کی کمیٹیوں میں شرکت کے لئے حیدرآباد آنا پڑتا تھا۔ قیامِ حیدرآباد کے زمانے میں نواب صاحب سے ملتا رہتا تھا۔ ایک روز جو میں گیا تو چلتے وقت مجھ سے پوچھنے لگے کیا امپیریل بنک آپ کی قیام گاہ کے قریب ہے؟ میں نے کہا جی ہاں قریب ہی ہے۔ فرمایا یہ خط بنک میں بھجوا دیجئے گا۔ آخر زمانے میں وہ چلتے وقت کسی ایسے ملنے والے سے جو قابلِ اعتماد ہو اور جس سے بے تکلف ہو، رخصت کے وقت یہ پوچھ لیتے تھے کیا ڈاک خانہ آپ سے قریب ہے؟ اور جو وہ کہتا کہ قریب ہے تو وہ اپنے خط دے دیتے تھے کہ یہ ڈاک میں ڈلوا دیجئے گا۔ میں نے مکان پر آ کر خط بنک میں بھجوا دیا۔ دوسرے دن بنک نے مجھے اطلاع دی کہ نواب عماد الملک نے دو ہزار کا چیک انجمن کے نام پر بھیجا تھا جو انجمن کے حساب میں درج کر دیا گیا ہے۔ دوسرے دن جو میں ملنے گیا تو میں نے ان کا شکریہ ادا کیا۔ فرمایا اس کا اعلان نہ کرنا اور نہ کسی اخبار یا رپورٹ میں لکھنا۔ میں نے عرض کیا کہ یہ رقم انجمن کے حساب میں درج ہو گی تو سالانہ رپورٹ میں بھی ذکر آئے گا اور جیسے اور عطیات کا اعلان کیا جاتا ہے اس کا بھی کیا جائے گا۔ آپ جو منع فرماتے ہیں اس میں کیا مصلحت ہے۔ کنگ کوٹھی کی طرف اشارہ کر کے فرمایا وہ کہے گا مجھے کیوں نہیں دیا۔ اس کی تشریح کی ضرورت نہیں جو لوگ حضور نظام میر عثمان علی خان کی عادات و خصائل سے واقف ہیں وہ سمجھ گئے ہوں گے ۔

رسالہ اردو کو بالالتزام پڑھتے تھے۔ بعض اوقات بعض مضامین کے متعلق رائے یا مشورہ دیتے اور کبھی کبھی الفاظ کی صحت و غلطی کے متعلق رائے لکھ بھیجتے ۔

جب نواب یوسف علی خان سالار جنگ ثالث عہدہ مدار المہامی پر سرفراز ہوئے تو اس خیال سے کہ یہ نوجوان ہیں اور نظم و نسق ریاست کا تجربہ نہیں رکھتے نواب عماد الملک ان کے مشیر مقرر ہوئے۔ اس زمانے میں آپ نے ایک گشتی مراسلہ جاری فرمایا جس میں ممالک محروسہ سرکار عالی کے تمام دفاتر کو ہدایت کی کہ اردو مراسلوں میں بلا وجہ انگریزی الفاظ استعمال نہ کئے جائیں ۔

انہیں جھوٹ سے سخت نفرت تھی اور جھوٹے کو کبھی منہ نہیں لگاتے تھے۔ ہمارے شرفا مروت میں آ کر یا تالیفِ قلوب کی خاطر یا اس خیال سے کہ دل شکنی نہ ہو بات کو چھپاتے یا جھوٹ کے مرتکب ہوتے ہیں۔ یا ایسے کام کی حامی بھر لیتے ہیں جو وہ نہیں کر سکتے یا اس کا کرنا ان کے ضمیر کے خلاف ہے۔ اس کا نتیجہ کذب یا پشیمانی ہوتا ہے۔ نواب عماد الملک کا مسلک بالکل صاف تھا۔ جب وہ کسی کام کو نہیں کر سکتے تھے یا نہیں کرنا چاہتے تھے یا اسے اپنے اصول اور وضعداری کے خلاف سمجھتے تھے تو صاف انکار کر دیتے تھے۔ انہوں نے حیدرآباد آنے کے بعد جو مخزن الفوائد رسالہ نکالا تھا اس میں ان کا ایک مضمون "راستی و راست بازی" شائع ہوا تھا۔ اسے پڑھ کر ان کی سیرت سامنے آ جاتی ہے۔ وہ راست گفتاری اور صاف گوئی میں نیک نام نہیں بدنام تھے۔ ایک بار کا ذکر ہے کہ اعلیٰ حضرت میر محبوب علی خان نے برسبیل تذکرہ اپنے مصاحبوں اور اعلیٰ ارکانِ ریاست سے جو اس وقت حاضر تھے پوچھا کہ لوگوں کا میری نسبت کیا خیال ہے۔ ان مصاحبوں نے عرض کیا کہ رعایا حضور کی فیاضی، انصاف، قدردانی، سیاست [illegible] اور عالی دماغی کے بے حد مداح ہے۔ غرض ہر ایک نے تعریف کے پل باندھ دئے۔ نواب عماد الملک خاموش بیٹھے رہے۔ آخر اعلیٰ حضرت نے فرمایا۔ مولوی صاحب آپ نے کچھ نہیں کہا۔ نواب صاحب نے کہا "لوگ کہتے ہیں کہ آپ شراب پیتے رہتے ہیں، کام کی طرف بالکل توجہ نہیں کرتے، سرکاری کارروائیاں کئی کئی مہینے پڑی رہتی ہیں۔ ریاست کا انتظام خراب ہو رہا ہے"۔ یہ سننا تھا کہ دربار میں سناٹا چھا گیا۔ اعلیٰ حضرت فوراً اٹھ کر اندر چلے گئے۔ جن لوگوں نے ہمارے سابق بادشاہوں کے حالات پڑھے ہیں انہیں معلوم ہے کہ ان کے حضور میں خفیف سے اختلافات میں بھی جان کی خیر نظر نہیں آتی تھی۔ یہی حال دولت آصفیہ کے فرمانرواؤں اور ان کے خوشامدی مصاحبوں کا تھا۔ ایسی جسارت تو کجا خفیف سے خفیف اختلاف کی بھی مجال نہ تھی۔ اہلِ دربار مولوی صاحب کی یہ صاف بیانی سن کر دنگ

بیٹھے اور منتظر رہے تھے کہ دیکھئے اعلیٰ حضرت فرزندانِ قدرت کا کیا عتاب نازل ہوتا ہے۔ دوسرے روز اعلیٰ حضرت نے نواب عماد الملک کو یاد فرمایا۔ جب حاضر ہوئے تو فرمایا "آپ کو سب کے سامنے ایسا نہیں کہنا چاہیے تھا" نواب صاحب نے عرض کیا کہ "حضور نے سب کے سامنے دریافت فرمایا تھا۔ اگر میں سب کے سامنے ایک بات کہتا اور خلوت میں دوسری تو یہ جھوٹ اور منافقت ہوتی"۔ اعلیٰ حضرت جب اندر سے باہر تشریف لائے تھے تو ان کی ایک مٹھی بند تھی۔ نواب صاحب کا جواب سننے کے بعد اعلیٰ حضرت نے مٹھی کھولی اور الماس کی ایک بیش قیمت انگوٹھی عطا فرمائی۔ نواب صاحب کے فرزند نواب مہدی یار جنگ نے مجھے وہ انگوٹھی دکھائی تھی۔

اب آپ اس شریف النفس اور پر لطف فرمانروا کے فرزند اور جانشین آصف جاہ سابع میر عثمان علی خاں کا حال سنئے کہ اس نے نواب صاحب کی راست گوئی کا کیا صلہ عطا فرمایا۔ کوئی راجہ (یہ مجھے یاد نہیں رہا کہ مہاراجہ پٹیالہ تھا یا مہاراجہ نابھہ یا کوئی اور) ریاست کے مہمان تھے۔ اعلیٰ حضرت نے ان کے اعزاز میں اپنے محل میں ایک بڑا ڈنر دیا۔ کھانے کے بعد باتوں باتوں میں مسئلہ ازدواج پر بحث چھڑ گئی۔ اس میں کہیں اعلیٰ حضرت نے یہ کہہ دیا کہ اسلام میں اس بارے میں بہت سہولت اور آزادی ہے۔ نواب صاحب نے فوراً ٹوکا کہ یہ صحیح نہیں ہے "اسلام نے اس معاملہ میں ایسی کڑی شرطیں لگا رکھی ہیں کہ آدمی ایک سے زیادہ بیویاں نہیں رکھ سکتا۔" شاہ دکن کو اختلاف کی تاب کہاں۔ سخت برہم ہوئے اور طیش میں آ کر فرمایا "کہ آپ یہاں سے چلے جائیے۔" نواب صاحب فوراً اٹھ کر چلے آئے۔ دوسرے روز علی الصبح اعلیٰ حضرت کے معتمد پیشی غیاث الدین ناظر جنگ، نواب صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہا کہ اعلیٰ حضرت نے فرمایا ہے کہ آپ ریاست حیدرآباد سے چلے جائیے اور آپ کو کونسل آف اسٹیٹ کی معتمدی کی جو تنخواہ اب تک ملتی رہی ہے وہ بھی واپس کر دیجئے۔ نواب صاحب نے کہا کہ وہ رقم بطور امانت بنک میں جمع ہے۔ میں اس کا ایک حبہ بھی اپنے تصرف میں نہیں لایا۔ وہ آج ہی واپس کر دی جائے گی۔ اور اسی روز حیدرآباد کو الوداع کہہ کر پونا تشریف لے گئے۔ یہ شخصی حکومت کے فرمانرواؤں کا ادنیٰ نمونہ ہے۔ متلون، مغلوب الغضب، متکبر، بے اصول، گھڑی میں فرشتہ اور گھڑی میں شیطان۔ جو شخص انہیں یہ خط لکھتا ہے "عماد الملک بہادر فخر الاماثل والاقران۔ آپ کے ساتھ ہم کلامی و ہم طعامی نہ ہوئے ایک زمانہ گذر گیا ہے لہٰذا کل صبح میں بھی شریک ہو جائیں تو باعث مسرت ہے"۔ ایک خط میں نواب صاحب کے انڈیا کونسل سے مستعفی ہونے پر لکھتے ہیں "ایسی باوقعت عہدہ سے دفعۃً استعفا دے دینا تمام مسلمانانِ ہند کے لئے ایک بدقسمتی کا باعث ہے کیونکہ آپ جیسا مدبر، صاحب رائے، تجربہ کار، واقف اسرار پھر دوسرا شخص اس خدمت پر مقرر ہونا محالات سے معلوم ہوتا ہے......" یہ وہ الفاظ ہیں جن سے وہ اپنی ریاست کے بڑے سے بڑے امیر یا وزیر کو مخاطب نہیں کرتے وہی شخص ان کو جو ان کے استاد بھی ہیں، دربار سے نکال دیتا ہے اور دربار ہی سے نہیں حیدرآباد سے خارج البلد کر دیتا ہے۔

دوسرے روز جب صاحب ریذیڈنٹ کو معلوم ہوا تو وہ اعلیٰ حضرت سے ملے اور بہت افسوس کا اظہار کیا اور کہا کہ نواب عماد الملک معمولی شخص نہیں۔ مسلمانانِ ہند کے دلوں میں ان کی بڑی عزت و وقعت ہے اور حکومت ہند بھی ان کو بڑی عزت کی نظر سے دیکھتی ہے۔ ان کے ساتھ جو نازیبا برتاؤ ہوا ہے اس سے لوگوں میں آپ کی طرف سے بہت ناراضی اور بدگمانی پیدا ہو گئی۔ چنانچہ فوراً ان کو واپسی کا فرمان بھیجا گیا۔ وہ اس واقعہ سے بہت آزردہ خاطر ہو گئے تھے اور آنا نہیں چاہتے تھے لیکن اپنے فرزندوں اور احباب کے اصرار پر واپس آ گئے۔ جس روز حیدرآباد پہنچے تو اعلیٰ حضرت نے فوراً ملاقات کے لئے طلب فرمایا۔ نواب صاحب نے کہلا بھیجا کہ میں تھکا ہوا ہوں اس وقت نہیں آ سکتا۔ لیکن اعلیٰ حضرت نے جب بہت اصرار کیا تو وہ کنگ کوٹھی گئے۔ دور ہی سے بلند آواز میں جیسا کہ ان کا قاعدہ تھا، مائی ٹیچر مائی ٹیچر کہہ کر استقبال کیا۔

انجمن کی معتمدی کے ابتدائی زمانے میں میں نے ایک عرضداشت بغرض امداد انجمن پیشگاہ اعلیٰ حضرت میں پیش کی تھی۔ بابت [illegible]

مداومطلع ہوئے نواب صاحب کو اس کا علم ہوا بہت ناخوش ہوئے اور مجھے لکھا۔ اسے قبول نہ کیجئے۔ انکار کر دیجئے۔ ریاست کے خزانہ پر صاحب کا قبضہ ہے۔ اس وقت صدر المہام فائنس سر بجگنالاتھ لاکافسی تھے، انہیں نے اسے خلاف مصلحت خیال کیا کیونکہ آسامی بہت سی توقعات تھیں۔

حیدر آباد ہندوستان کی سب سے بڑی اور باعظمت ریاست تھی۔ اس کی تہذیب اور روایات خاص تھیں۔ ایک خوش حال تھے۔ سالار جنگ کے زمانے سے اس کے نظم و نسق میں بتدریج ترقی ہوتی گئی اور بیسویں صدی میں ہر اعتبار سے عروج کو پہنچ گئی۔ شخصی سلطنتیں سازشوں کا گھر ہوتی ہیں۔ یہ جنس یہاں خوب پھلتی پھولتی ہے۔ سر سالار جنگ بڑے مدبر تھے۔ وہ ریاست کے ہر شعبے پر نظر رکھتے تھے اور ہر عہدہ دار سے اس کی صلاحیت اور قابلیت کے مطابق کام لیتے اور ہر ایک کے کردار اور کام پر ایسی نظر رکھتے تھے کہ کسی کو اپنی حد سے تجاوز کرنے کی ہمت نہ ہوتی تھی۔ ان کی وفات کے بعد چشم نگراں اٹھ گئی اور سازشوں کا دروازہ کھل گیا۔ آپس کی کشمکش اور رقابت نے طرح طرح کی ریشہ دوانیوں کا بہانا اور حریف ایک دوسرے کو گرانے کے لئے کذب و افترا، بہتان اور اس سے بھی بدتر حربے استعمال کرنے سے نہ چوکتے تھے۔ سازشوں کا یہ جال ایسا پیچ در پیچ تھا کہ ماحول کے اثر یا ذاتی تعلقات کی بنا پر اس میں بعض ایسے اشخاص بھی پھنس جاتے تھے جن کا کوئی ذاتی فائدہ نہ ہوتا تھا۔ نواب عماد الملک کو اس قسم کی بعض سازشوں میں الجھانے کی بہت کوششیں کی گئیں لیکن وہ اپنے اصول پر قائم رہے اور ان کا دامن اس وقت بھی اور اس کے بعد بھی اس آلائش سے پاک صاف رہا۔

پاک ہیں آلائشوں میں بندشوں میں بے لگاؤ
رہتے ہیں دنیا میں سب کے درمیاں سب سے الگ

انہوں نے اپنے ذاتی رسوخ اور اقتدار سے کبھی اقربا نوازی اور یار فروشی کا کام نہیں لیا۔ ایک بار اعلیٰ حضرت مرحوم کسی وجہ سے اپنے پیشی سیکرٹری (نواب سر امین جنگ) سے ناخوش ہو گئے اور نواب عماد الملک کو لکھا کہ میں امین جنگ کی جگہ آپ کے فرزند محمد ہاشم کو مقرر کرنا چاہتا ہوں۔ نواب صاحب نے لکھا کہ وہ اس کام کے اہل نہیں۔ مناسب یہ ہوگا کہ حضور امین جنگ ہی کو ان کی سابقہ خدمت پر بحال فرمادیں۔ (منصب پیشی کی خدمت جو بعد میں صدر المہامی پیشی ہو گئی) ایسے اعزاز اور اقتدار کی خدمت تھی کہ ریاست کا کوئی دوسرا عہدہ دار اسے نعمت غیر مترقبہ سمجھ کر کبھی ہاتھ سے نہ جانے دیتا۔ ایک دوسرے موقع پر حضور نظام نے لکھا کہ میں آپ کے فرزند عقیل جنگ کو کوتوال شہر کی خدمت پر مامور کرنا چاہتا ہوں۔ اس زمانے میں کوتوال شہر کی قوت و اقتدار کا مقابلہ کوئی عہدہ دار تو کیا کوئی امیر یا وزیر بھی نہیں کر سکتا تھا۔ نواب صاحب نے صاف لکھ بھیجا کہ عقیل جنگ اس کام کے اہل نہیں، کسی دوسرے شخص کا انتخاب فرمایا جائے۔

ان کے سامنے اور ان کے بعد بہت سے بڑے بڑے اشخاص آئے اور چلے گئے۔ لیکن نواب عماد الملک نہایت عزت و آبرو کے ساتھ آخر تک حیدر آباد میں رہے اور ہر دور میں ان کا اعزاز پہلے سے زیادہ ہوتا رہا۔

برٹش انڈیا اور گورنمنٹ آف انڈیا میں بھی ان کا ایسا ہی اعزاز تھا۔ چنانچہ لارڈ کرزن نے جو یونیورسٹی کمیشن ہندوستان کی یونیورسٹیوں کے حالات کی تحقیق اور اصلاح کے لئے بصدارت مسٹر ریلے مقرر کیا تھا اس کے ایک رکن نواب صاحب بھی منتخب کئے گئے تھے۔ اس سلسلے میں پورے ہندوستان کا دورہ کیا۔ ۱۹۰۲ء میں بہ عہد لارڈ کرزن امپیریل لیجسلیٹو کونسل کے ممبر منتخب ہوئے۔ ۱۹۰۷ء میں لارڈ مارلے نے پہلی بار وزیر ہند کی کونسل کے لئے دو ہندوستانی ممبروں کا انتخاب کیا۔ ایک نواب عماد الملک تھے۔

محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے دو بار صدر منتخب ہوئے۔ ایک بار ۱۸۹۵ء میں میرٹھ کے اجلاس میں بزمانہ سر سید اور دوسری بار جب ۱۹۰۰ء میں کانفرنس کا اجلاس رامپور میں ہوا۔ ۱۹۱۶ء میں مدراس یونیورسٹی کے کانووکیشن (جلسۂ تقسیم اسناد) میں خطبۂ صدارت پڑھا۔

مجھے یہ دیکھ کر بعض اوقات تعجب ہوتا اور مزا بھی آتا (جس کا ذکر نہیں) کہ ابتدا میں جن بزرگوں نے انگریزی معاشرت کی گرویدگی کا اظہار کیا تھا اور اپنے رہنے سہنے میں بہت کچھ تبدیلی کر لی تھی وہ کیا اچھا ہی کھاتے تھے۔ سر سید احمد خان، نواب محسن الملک، نواب عماد الملک کے دسترخوانوں

میں نے یہی رنگ دیکھا۔ ظاہر ہے کہ انگریزی اُبلے ہوئے کھانوں میں وہ ذائقہ اور چٹخارہ کہاں جو ہمارے کھانوں میں ہے۔ اب تو لوگ وہ کھانے بھول گئے یا مذاق یاد نہیں، نہ ان کے پکانے والے رہے اور نہ پکانے والوں کے قدردان۔ اب جو کھانے کھائے جاتے ہیں وہ نہ انگریزی ہیں نہ مغلئی۔ یوں کھانا سب ہی کھاتے ہیں لیکن ان میں کتنے ہیں جو کھانے کا ذائقہ، لطافت اور آب و رنگ کا صحیح ذوق رکھتے ہوں۔ نواب عماد الملک بہت نفیس اور لذیذ کھانا کھاتے تھے۔ لیکن ان کے کھانے بہت مرغن ہوتے تھے۔ خدا جانے یہ لوگ یہ کھانے کس طرح ہضم کر لیتے تھے جبکہ کسی قسم کی ورزش کے بھی عادی نہ تھے۔ ایک بار وہ مجھے اپنے ساتھ وقار آباد لے گئے جہاں ان کا ایک اچھا سا باغ اور بنگلہ تھا۔ کھانا ان کے ساتھ کھانا پڑا۔ شب کے کھانے پر وہ بار بار ٹوکتے تھے کہ کیسے جوان ہو تم سے تو میں بڈھا ہی اچھا ہوں تم سے دُگنا کھاتا ہوں۔ ان کے اصرار پر بھی میں نے کھانا بہت احتیاط سے کھایا۔ لیکن یہ مرغن کھانا جس میں غذا بہت بھی تھی مجھے راس نہ آیا اور رات بھر بے چینی رہی۔ صبح ہوتے ہی میں نے وہاں سے نکل بھاگنے کی ٹھانی۔ مگر نواب صاحب نے جانے نہ دیا اور ٹھہرنے پر اس قدر اصرار کیا کہ میں مجبور ہو گیا۔ کھانا میرے سامنے آتا تو میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے تھے۔ نواب صاحب میرے کم کھانے پر ہنستے اور طعن کرتے تھے۔ انہیں کیا خبر کہ مجھ پر کیا بیت رہی ہے۔ تیسرے دن تو میں نے ایک نہ سنی اور حیدرآباد جا کر ہی دم لیا۔

نواب صاحب کھانا تو بہت اچھا کھاتے ہی تھے لیکن کھانے کی خوبی اور اس کی باریکیوں کو بھی خوب سمجھتے تھے۔ بعض چیزیں خود بھی پکاتے تھے۔ خاص ارہر کی دال جس میں مرچ کی لاگ دیتے تھے بہت لذیذ ہوتی تھی۔ قدردان بھی ایسے ہی تھے۔ ایک روز جو میں ان کے ہاں گیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ ایک صاحب ان کے ساتھ صوفے پر بیٹھے ہیں اور وہ ان سے بے تکلف باتیں کر رہے ہیں۔ جس وقت میں پہنچا تو نواب صاحب ان سے کھانے کی تعریف کر رہے تھے اور کہہ رہے تھے کہ شیخ جی چاول تم نے خوب پکائے تھے لیکن شکر نئی تھی۔ نئی شکر گرم ہوتی ہے۔ اس نے کہا آپ نے صحیح فرمایا۔ اس وقت پرانی شکر نہ مل سکی نئی استعمال کرنی پڑی۔ معلوم ہوا کہ یہ حضرت بکاول تھے۔ نواب صاحب کے ملاقاتیوں میں دو چار ہی ایسے تھے جو ان کے ساتھ ایک صوفے پر بیٹھ کر اس طرح باتیں کرتے۔ کمال کی قدر ہو تو ایسی ہو۔

ان کے خاص دوست اور ملنے والے بہت کم تھے۔ مگر جس سے رابطہ تھا وہ خلوص کے ساتھ تھا۔ وہ اہلِ علم سے مل کر بہت خوش ہوتے تھے اور ایسے اشخاص پر جن میں طالب علمانہ جستجو اور صحیح ذوق ہوتا بہت مہربان رہتے اور ان کے لئے جو کچھ بھی ممکن ہوتا کرنے کو تیار ہو جاتے تھے جن کا ذکر میں پہلے کر چکا ہوں۔

پرانے لوگوں میں ایک بات یہ بھی تھی کہ جس پر ایک بار اعتبار کر لیا بس اس کے ہو گئے۔ ہزار کوئی اس کے خلاف کہے وہ نہیں سنتے تھے۔ یہی کیفیت سر سید احمد خان کی تھی۔ اسی اعتماد کا نتیجہ تھا کہ ان کے انگریز کلارک نے ایک لاکھ کا غبن کر دیا۔ نواب صاحب کے دفتر میں ان کے ایک مددگار عبداللہ بیگ صاحب تھے۔ میں نے ایک روز نواب صاحب سے کہا کہ اس شخص کی دیانت مشتبہ ہے اور جہاں تک معلوم ہوا ہے یہ آدمی اچھا نہیں ہے۔ یہ سن کر بہت برہم ہوئے اور کہنے لگے جو ایسا کہتے ہیں وہ خود ایسے ہیں۔ وہ بہت اچھا آدمی ہے۔ لیکن تھوڑے ہی عرصے بعد جب دفتر کے حساب کی تنقیح ہوئی تو معلوم ہوا کہ وہ بہت سا سرکاری روپیہ اپنے تصرف میں لے آیا ہے اور غبن کے الزام میں خدمت سے برطرف کر دیا گیا۔ اس تذکرے سے یہ مقصد نہیں کہ ان کے معتمد علیہ ایسے ہی تھے۔ بعض اشخاص جن پر ان کو اعتماد تھا درحقیقت اپنی سیرت، کردار اور قابلیت کے اعتبار سے بہت قابلِ قدر تھے۔

مذہباً شیعہ تھے۔ لیکن اہلِ تشیع کے بعض عقائد مثلاً تبرے اور تقیے کے سخت مخالف تھے اور کہتے تھے کہ جاہلوں کے عقیدے ہیں۔ نواب امیر مرحوم (عماد علی خان) جیسا کہ میں اوپر لکھ چکا ہوں نواب عماد الملک بہادر کا بے حد ادب و احترام کرتے تھے۔ ایک ملاقات کے وقت جب ان کا ذکر آیا تو کہنے لگے کہ ایک بات میں ہمیں ان سے اختلاف ہے اور کسی طرح وہ اس معاملے میں ہم سے اتفاق کرنے پر آمادہ نہیں۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ یہ اختلاف معاملہ تقیے کا تھا۔ حالانکہ ہم نے بعض شیعہ علما اور نہایت قابل اور روشن خیال اشخاص کو یہ کہتے سنا ہے "التقیہ دینی و دین آبائی" کہ تقیہ

بے تعصب شخص تھے۔ کسی مذہب یا مذہبی فرقے سے متعلق کسی قسم کا تعصب نہیں رکھتے تھے۔ مولانا عبدالحلیم شرر لکھتے ہیں کہ "مولوی شبلی نعمانی مجھ سے کہتے تھے کہ میں نے الفاروق کو شائع کیا تھا اس کا ایک نسخہ نواب عمادالملک بہادر کی خدمت میں بھیجا اور ان سے خواہش کی کہ اس کی نسبت آپ اپنے خیالات ظاہر فرمائیں۔ اس کے جواب میں انہوں نے تحریر فرمایا کہ گزشتہ تیرہ سو برس میں صرف ایک شخص پیدا ہوا جس کا نام عمر ابن الخطاب ہے۔ "ان کی لائف لکھنا اسلام کی خدمت تھی جو آپ نے ادا کی۔" سررشتہ تعلیم بہت وسیع محکمہ ہے اور سینکڑوں آدمیوں کا تقرر ان کے ہاتھ میں تھا لیکن انہوں نے کبھی مذہبی پاسداری سے کام نہیں لیا۔ اس معاملہ میں بہت فراخ دل تھے۔ بعض عیسائی مشنریوں اور دوسرے غیر اسلامی اداروں کی جو اشاعت تعلیم کا کام کرتے تھے وقتاً فوقتاً مدد دیتے تھے۔

آخر زمانے میں انہیں مذہب سے خاص لگاؤ پیدا ہو گیا تھا۔ گفتگو میں اکثر محاسنِ اسلام کا ذکر کرتے تھے اور افسوس کیا کرتے تھے کہ لوگ اصول سے زیادہ فروع پر زور دیتے ہیں اور توہمات کو مذہب سمجھ رکھا ہے۔ کہتے تھے اصل اسلام اہلِ حدیث (وہابیوں) کا ہے۔ یہ اثر ان پر زمانہ طفولیت سے تھا جبکہ وہ اپنے والد کے ساتھ بنگال کے مختلف اضلاع میں رہے۔ اس زمانے میں شاہ اسمٰعیل شہید علیہ الرحمۃ کے بے لوث سرفروش داعی اور واعظ اشاعتِ اسلام کی خاطر بنگال کے اضلاع کا دورہ کرتے تھے۔ وہ کبھی کبھی ان کے ہاں آ کر مہمان رہتے اور ان کے والد ان کی بہت خاطر مدارات کرتے۔ نواب صاحب کہتے تھے کہ یہ لوگ کشتیوں میں سفر کرتے اور اسلام کی تبلیغ کرتے تھے۔ ان بزرگوں نے گاؤں کے گاؤں مسلمان کر لئے تھے۔ یہ نومسلم بڑے مخلص اور پکے مسلمان تھے۔ جس وقت نماز کا وقت آتا فوراً سب کام چھوڑ چھاڑ کر نماز کے لئے کھڑے ہو جاتے۔ مثلاً کھیت میں کوئی ہل چلا رہا ہے تو اذان سنتے ہی ہل جہاں تھا وہیں رہ جاتا یا کسی اور کام میں مصروف ہے تو کام جس نوبت پر ہے وہیں چھوڑ دیا جاتا۔ یہ اپنے عقائد میں بہت راسخ تھے۔ مجال نہ تھی کوئی شخص قبر پر پھول چڑھاتے یا اسی قسم کی کوئی اور بدعت کرے۔ اس بات پر بہت افسوس کرتے تھے کہ ان مخلص مجاہدوں کے بعد جب پنجاب کے جاہل اور دنیادار پیروں نے آنا شروع کیا تو بیچارے بنگالی مختلف قسم کے توہمات اور بدعتوں میں پھنس گئے۔ شاہ اسمٰعیل کے داعیوں کے تقوے اور سچے اسلامی جوش کے بہت قائل تھے۔ لڑکپن کا یہ اثر ان کے دل پر آخر عمر تک تازہ رہا۔

جیسا کہ میں نے ابھی لکھا ہے آخر زمانے میں اسلام کی حقانیت اور قرآن پاک کی تعلیم کی عظمت ان کا تکیہ خیال ہو گئی تھی۔ ان چیزوں کو وہ طرح طرح بیان کیا کرتے تھے۔ ایک روز مولانا انوار اللہ خان صاحب فضیلت جنگ، صدر الصدور سے قرآن مجید کی فصاحت کے بعض نکات بیان کر رہے تھے دوران گفتگو میں فرمایا کہ لوگوں نے الفاظِ قرآن پاک کی موسیقیت اور ترنم کی طرف بہت کم توجہ کی ہے اور اسی ضمن میں کہا کہ آیۃ الکرسی کے الفاظ میں ایسی عجیب ترتیب ہے کہ وہ پیانو پر ادا کئے جا سکتے ہیں۔ اسلام کی تبلیغ کو بہت بڑی اسلامی خدمت سمجھتے تھے۔ اسی بنا پر وہ خواجہ کمال الدین کی بہت عزت کرتے تھے اور خواجہ صاحب اور ان کے رفقاء نے تبلیغ کا کام جو مختلف ممالک میں کیا اس کے بہت ثنا خواں تھے۔ غالباً انہی کی تحریک پر سرکار سے خواجہ صاحب کو مالی امداد بھی دی گئی۔

ایک روز مجھ سے کہنے لگے کہ ہندوستان کا آئندہ سربراہ (لیڈر) مذہب کے بھیس میں آئے گا۔ کچھ مدت بعد جب گاندھی جی میدانِ سیاست میں جلوہ فرما ہوئے تو مجھے نواب صاحب کی پیشین گوئی یاد آئی۔ اس سے قبل انڈین نیشنل کانگریس انگریزی تعلیم یافتہ حضرات کے تصرف میں تھی۔ عوام سے کوئی رابطہ نہ تھا۔ گاندھی جی اپنی قوم کے مزاج کو خوب پہچانتے تھے۔ انہوں نے یک لخت اپنی طرزِ زندگی اس طرح بدل دی جیسے سانپ اپنی کینچلی بدل دیتا ہے۔ وہ ننگے سر ننگے پاؤں رہتے۔ گھٹنوں سے اوپر ایک عرق چی سی باندھ لیتے اور کندھے اور سینہ چھپانے کے لئے کھدر کا بڑا سا رومال یا چھوٹی سی چادر ڈال لیتے۔ اس کے بعد سے ان کی زندگی درویشانہ اور زاہدانہ ہو گئی اور وہ دفعتہً موہن داس کرم چند گاندھی سے "مہاتما گاندھی" ہو گئے۔ ہندو خلقت ان کی پوجا کرنے لگی اور ان کے ایک ایک لفظ کو الہام و وحی سمجھنے لگی۔ کانگریس کا دروازہ سب کے لئے کھل گیا۔ انگریزی کی جگہ ہندی، ہندوستانی اردو میں تقریریں ہونے لگیں۔ ہندو تو ہندو مسلمانوں کو خلافت کے لالے پڑے۔ ایسا لگا کہ ان کے سرگروہ اور علماء گاندھی جی کا دم بھرنے لگے۔ گاندھی جی نے مذہب کو سیاست

یہی ایسا ہوا کہ وہ مختصر سے ہی عرصے میں ہندوستان کے مادی اور روحانی پیشوا ہو گئے۔

خطوں کا جواب بالالتزام دیتے تھے اور اپنے قلم سے لکھتے تھے۔ کبھی دوسرے سے نہیں لکھواتے تھے اور کبھی ٹائپ مشین کا استعمال نہ کیا۔ اپنی تمام تحریریں اردو انگریزی سب خود لکھیں اور اپنے قلم سے لکھیں۔ ایسے زمانے میں بھی جب وہ ضعیف ہو گئے تھے اور کسی قدر ضعف بصارت کا بھی عارضہ تھا انہوں نے کبھی اپنے خط یا اپنی تحریر کسی دوسرے سے لکھوانی گوارا نہ کیں۔

میانہ قد، کھلا گندمی رنگ، خوبرو آدمی تھے۔ خضاب کرتے تھے، آخر زمانے میں ترک کر دیا تھا۔ سفید داڑھی بھلی معلوم ہوتی تھی۔ حقہ پیتے تھے، نوجوانی سے لگا رہتا تھا۔ سگرٹ سگار بہت ناپسند کرتے تھے۔ کہتے تھے جہاز کے سفر میں ایک بار سگرٹ سگار پینے کی کوشش کی۔ اس کی بو سے بہت تکلیف ہوئی اور حلق میں بھی خراش معلوم ہوئی۔ زبان میں ہلکی سی لکنت تھی۔ جامہ زیب تھے۔ ہمیشہ ہندوستانی یعنی حیدرآبادی لباس پہنتے تھے۔ جب ایگزیکیٹیو کونسل کے ممبر ہوئے تو لباس میں تبدیلی کرنی پڑی لیکن یہ تبدیلی عارضی تھی۔ انڈیا کونسل کے ممبر مقرر ہوئے اور لندن میں رہنا ہوا تو انگریزی لباس اختیار کرنا پڑا۔ ان کے قویٰ بہت اچھے تھے۔ صحت قابلِ رشک تھی۔ لندن میں ایک حادثے سے ٹانگ میں چوٹ آ گئی۔ زخم اچھا ہو گیا مگر ہڈی کا جوڑ ٹھیک نہ بیٹھا۔ اس سے انہیں اٹھنے بیٹھنے میں تکلیف رہتی تھی۔ اگر یہ صدمہ نہ ہوتا تو کئی سال اور زندہ رہتے۔ پھر بھی ۹۳ برس کی عمر پائی۔ کبھی کبھی بے تکلف دوستوں کے ساتھ شطرنج بھی کھیل لیتے تھے۔ کسی زمانے میں ستار کا بھی شوق تھا۔

ان کی یادگار یہ چند تصانیف ہیں:۔

۱۔ سوانح سر سالار جنگ۔ یہ نواب سر سالار جنگ کی مختصر سوانح عمری انگریزی زبان میں ہے۔ ۱۳۰۰ھ میں جو نواب صاحب کی وفات کا سال ہے لکھی گئی۔ سر سالار جنگ ان کے محسن تھے اور ان کا ذکر بڑے خلوص اور محبت سے کرتے تھے۔ کہتے تھے کہ سیاست دانی، معاملہ فہمی، مردم شناسی اور قدردانی میں اورنگ زیب کے بعد کوئی شخص ہوا ہے تو وہ سر سالار جنگ تھے۔ اس کا ترجمہ اردو میں بھی ہو گیا تھا۔

۲۔ DESCRIPTIVE SKETCHES OF THE NIZAM'S DOMINION اس میں ریاست حیدرآباد دکن کے جغرافی، تاریخی واقعات، انتظامی حالات، ریاست کی صنعت و حرفت وغیرہ کا دلچسپ بیان ہے۔ اس کتاب کی تالیف میں مسٹر ڈبلیو ولنٹ بھی شریک تھے۔ یہ کتاب دو ضخیم جلدوں میں ہے۔

۳۔ رسائل عماد الملک۔ اس میں نواب صاحب کے وہ تمام مضامین، خطبات و مقالات ہیں جو وقتاً فوقتاً اردو میں تحریر کیے۔

۴۔ انگریزی مضامین، مقالات، خطبات اور انگریزی نظموں کا مجموعہ۔

۵۔ قرآن پاک کا ترجمہ۔ یہ نواب صاحب کا سب سے اہم اور قابلِ قدر کام ہے۔ یہ ترجمہ آپ نے نہایت تحقیق و کاوش اور محنت سے کیا تھا اور اس کے لیے خاص اہتمام کیا تھا اور ایک بڑا ذخیرہ تفاسیر و احادیث اور لغات اور ملائے ادب کی تصانیف کا جمع کر لیا تھا۔ ان کی کوشش یہ تھی کہ ترجمے میں حتی الامکان اصل کی سی سادگی، شان اور قوت باقی رہے۔ مزاج میں بڑی احتیاط تھی۔ بہت غور و فکر کرتے اور ایک ایک لفظ کو جانچتے اور تولتے تھے۔ اس کے ساتھ لفظی پابندی کا بھی خیال رکھتے۔ ان کے پیشِ نظر بائبل کا انگریزی ترجمہ تھا۔ سولہ پاروں کا ترجمہ مکمل کر لیا تھا اور بعض پروف چھپوا بھی لیا تھا۔ نظرثانی کے وقت مولوی حمید الدین صاحب سے بھی مشورہ کرتے تھے۔ افسوس کہ بوجہ کبرسنی، ضعف بصارت اور ٹانگ کے صدمے کے یہ کام جو ان کے فضل و کمال کا بہترین نمونہ تھا جاری نہ رہ سکا۔

نواب عماد الملک بہادر کی شخصیت اس زمانے میں بعض اعتبار سے عجیب سی معلوم ہوگی۔ وہ مشرقی اور مغربی تہذیب کے جامع تھے۔ آدمی کو علم، دولت، آسائش و آرام محنت سے مل جاتا ہے لیکن صحیح ذوق بہت کم لوگوں کو نصیب ہوتا ہے۔ یہ دولت نہ علم سے ملتی ہے نہ مال و زر سے اور نہ محنت سے۔ صحیح ذوق زندگی کی چاشنی ہے۔ اس سے زندگی کے ہر شغل و شعبے میں ایک نرم اور سہانی سی روشنی آ جاتی ہے جو رواداری، اعتدال اور اطمینانِ قلب پیدا کر دیتی ہے اور باوجود نشیب و فراز اور گھمبیر گھاٹیوں کے سفرِ حیات کے طے کرنے میں بہت کچھ سہولت ہو جاتی ہے۔ حسنِ ذوق نواب عماد الملک کی زندگی کے تقریباً ہر پہلو میں پایا جاتا ہے۔ ان کی وضع اور ظاہری شان ایسی تھی کہ لوگ ان کے پاس جاتے ہوئے ہچکچاتے تھے۔ وہ ایسے لوگوں سے جو ذوقِ علم اور ذوقِ تہذیب سے عاری ہوتے گو دنیاوی حیثیت سے

ان کا پایہ کتنا ہی بلند ہو ملنے سے پاک تھے اور ایسے اصحاب سے ان کا ملنا دشوار اور ناپسند ہوتا تھا۔ لیکن اہل علم کی ملاقات سے بہت خوش ہوتے ان سے کھل مل کے باتیں کرتے۔ ان ملاقاتوں میں طالب علمانہ سادگی، خلوص اور ہمدردی پائی جاتی تھی۔ وہ غریب سے غریب عالم یا طالب علم کے مقابلے میں بڑے سے بڑے جاہل امیر کی کچھ حقیقت نہیں سمجھتے تھے۔ انھوں نے علم و ادب کی اشاعت، اہل علم اور علمی اداروں کی امداد و سرپرستی میں ہمیشہ فراخ دلی سے کام لیا اور اس سے ان کو بھی خوشی ہوتی تھی۔ وہ صادق القول، باوضع اور پابند اصول تھے۔ ان میں قدیم وضع اور جدید تہذیب کی بعض خوبیاں اس خوش اسلوبی سے باہم مل گئی تھیں کہ اس امتزاج نے ان کی روش زندگی میں ایک قسم کا حسن پیدا کر دیا تھا۔

ان کی صحبت غنیمتات میں سے تھی۔ اس میں مجلسانہ اور طالب علمانہ دونوں شانیں نظر آتی تھیں۔ اپنے زمانے کے پرانے حالات، اپنے بزرگوں کی خودداری، وضع داری اور شجاعت کے کارنامے اور ان کے توہمات، اسراف اور شیخی کے قصے بڑے مزے سے بیان کرتے تھے۔ ان کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ قدیم اساتذہ کے کلام پر بہت اچھی نظر تھی اور خاص صحبتوں میں ان کا منتخب کلام سناتے اور کبھی کبھی شعر کے محاسن و معائب پر تنقیدی نظر ڈالتے جسے دیکھ کر ان کے ذوق کی داد دینی پڑتی تھی۔ اگر کوئی ان چیزوں کو قلمبند کر لیتا تو وہ ایک نادر بیاض ہوتی۔ مولانا حالی نے کسی جگہ ذکر کیا ہے کہ مظہر جان جاناں نے اساتذہ کے کلام سے منتخب اشعار کا ایک مجموعہ مرتب کیا تھا جس کا نام "خریطۂ جواہر" تھا۔ اس کا ولی کی شاعری پر بہت اچھا اثر پڑا۔ پہلے صاحب ذوق اور پڑھے لکھے حضرات اپنے پاس ایک بیاض رکھتے تھے۔ جہاں کہیں کوئی اچھا شعر یا کوئی خیال یا کام کی بات نظر پڑی یا کوئی مجرب نسخہ ہاتھ لگا وہ جھٹ اپنی بیاض میں لکھ لیتے تھے۔ غرض نواب عماد الملک کی صحبت میں بعض اوقات ایسے علمی و ادبی نکات مل جاتے تھے جو گہرے مطالعہ اور فکر کا نتیجہ ہوتے تھے۔ ان کے علمی ذوق، علم و ادب کی سرپرستی اور صحبت سے جو فیض لوگوں کو پہنچا وہ ان کی تالیفات سے کہیں زیادہ استوار اور دور رس تھا۔

وہ جس خدمت پر مدت دراز تک فائز رہے اگرچہ اس میں ایک گونہ ترقی ہوئی لیکن جیسی ہونی چاہیے تھی وہ نہ ہو سکی۔ اس کا انہیں خود بھی اعتراف تھا۔ اس کی وجہ ہے۔ ان کاموں کے لئے جد و جہد کی ضرورت ہوتی ہے۔ اپنے سررشتہ کے منصوبوں اور تجویزوں کی منظوری کے لئے بہت سے جتن کرنے پڑتے ہیں۔ کبھی اپنے اعلیٰ افسروں سے مل کر اور ان کو خوش کر کے کام نکالنا پڑتا ہے اور کبھی لڑ جھگڑ کر اور اپنے رسوخ سے کام لے کر منظوریاں حاصل کرنی پڑتی ہیں۔ نواب عماد الملک اس قدر خوددار اور غیور اور اپنے اعلیٰ افسروں سے اس قدر بلند مرتبہ تھے کہ اس قسم کی ربط اور رواداری یا اپنے افسروں کی خوشنودی کی کوشش ان کے امکان سے باہر تھی۔

ان کے علم و فضل، وسیع معلومات، علمی و ادبی ذوق اور عربی، فارسی، انگریزی اور فرانسیسی زبانوں کے گہرے مطالعہ کو دیکھتے ہوئے ان کا علمی کام اس توقع سے کم ہے جو ان سے کی جاتی تھی۔ حیدرآباد کے اس وقت کے حالات اور ماحول کی آئے دن کی تغیرات نے بیزاری اور نئی طرز معاشرت نے تن آسانی پیدا کر دی تھی اور کام کا وہ ولولہ جو ابتدا میں تھا باقی نہ رہا۔ لیکن بے دریغ علمی سرپرستی، علمی فیض، فاضلانہ استغنا، اعلیٰ سیرت اور بے لوث کردار کی وجہ سے وہ دولت آصفیہ حیدرآباد دکن کی تاریخ میں ہمیشہ عزت کے ساتھ یاد رہیں گے۔

ڈاکٹر ضیاء الدین احمد

محمد حسین خاں زبیری

تذکرہ ہے لفٹننٹ کرنل ڈاکٹر سر ضیاء الدین احمد (علیگ) کے ٹی ۔ سی آئی ای ۔ ایم اے (کنٹب) پی ایچ ڈی (گوٹنجن) ڈی ایس سی (الٰہ آباد) سر آئزک نیوٹن اسکالر (کیمبرج) پروفیسر پرنسپل ایم اے او کالج پرو وائس چانسلر وائس چانسلر و ریکٹر مسلم یونیورسٹی علیگڈھ ممبر لیجسلیٹو اسمبلی ۔ ممبر آل انڈیا مسلم لیگ کونسل ممبر وائسرائے ڈیفنس کونسل کا

برصغیر ہند پاکستان میں جب مسلمانوں کی فتوحات شروع ہوئیں تو عرب، عراق، ایران وغیرہ ممالک سے اکثر قبائل بھی بغرض ملازمت و تجارت یہاں آنے لگے ان میں سے اکثر اسی ملک میں آباد ہو گئے ان ہی قبائل میں ایک عربی الاصل قبیلہ بھی تھا جس کی نسبت حضرت زبیرؓ سے کی جاتی ہے اس قبیلہ کے افراد سندھ ملتان ۔ پنجاب ۔ دہلی اور دہلی کے متصل علاقوں میں آباد ہوئے اور کمبوہ کے لقب سے مشہور ہوئے ۔ ان کی جو بستیاں دہلی میرٹھ، مراد آباد امروہہ سنبھل بریلی اور مارہرہ وغیرہ میں قائم ہوئیں ان میں زمینداریاں بھی تھیں اور شاہی ملازمت و اعزاز کا سلسلہ بھی جاری تھا ۔ ان میں بڑے بڑے علما، صوفیا، مصنفین، شعرا اور اطبا و مدبرین پیدا ہوئے جن کے کارناموں سے تاریخ کے صفحات بھرے پڑے ہیں ۔ مولانا غلام علی آزاد بلگرامی اپنی کتاب "خزانہ عامرہ" میں تحریر فرماتے ہیں کہ "خدمات شرعیہ دارالخلافہ دہلی مثل قضا وافتا اکثر بہ قوم کنبو تعلق داشت و دارد۔"

ڈاکٹر سر ضیاء الدین احمد کا تعلق بھی اسی قبیلے سے تھا ۔ وہ ۱۸۷۳ء میں بمقام میرٹھ پیدا ہوئے اسی سال ایم اے او کالج علیگڈھ کا سنگ بنیاد رکھا گیا ۔ اور اس مادر علمی کا وہ فرزند رشید جو اس کی خدمات کے لحاظ سے اپنے معاصرین اور رفقا میں فرد فرید ہے ساتھ ہی ساتھ اس عالم وجود میں منصۂ شہود پر آیا ۔ ڈاکٹر صاحب کے والد حافظ معین الدین احمد محکمۂ مال میں ملازم تھے اور انہوں نے تحصیلداری تک ترقی کی۔ وہ جو مثل ہے کہ ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات ڈاکٹر صاحب مشکل سے چار برس کے ہوں گے کہ ان میں یہ عادت تھی کہ گھر میں بچوں کے کھلونے جو ٹوٹ جاتے تھے ان کے ٹکڑے جمع کر کے ان کو پھر جوڑنے کی کوشش کرتے اور اکثر کامیاب ہو جاتے تھے ۔ جب عمر تعلیم کے قابل ہوئی تو میرٹھ کے قومی مدرسہ میں ان کا داخلہ کرایا گیا یہ مدرسہ مکتبی طرز کا تھا جسے اسی قبیلہ کے ایک بزرگ حافظ محمد مدوح اللہ خاں نے جاری کیا تھا

اس کے لئے جائداد وقف کردی تھی۔ یہاں ڈاکٹر صاحب کی ابتدائی تعلیم کا آغاز ہوا اسی مدرسہ میں مولوی بشیرالدین احمد بانی اسلامیہ انٹر کالج اٹاوہ وایڈیٹر اخبار "البشیر" بھی مدرس تھے اور وہ ڈاکٹر صاحب کے چچا تھے۔ ابتدائی تعلیم کے بعد گورنمنٹ ہائی اسکول میرٹھ میں داخل ہوئے ڈاکٹر صاحب کو ابتدا ہی سے ریاضی میں بہت شغف اور دلچسپی تھی گرمیوں کی راتوں میں جب صحن میں بیٹھتے تو انگلیوں اور ہتھیلی کے ذریعہ حساب کے سوال حل کرتے رہتے تھے۔ اور بسا اوقات رات کا بیشتر حصہ مطالعہ میں گزار دیتے تھے۔ چونکہ اوائل عمر ہی سے ضبط و نظم اور ترتیب اشیاء کا ملکہ فطری تھا اس لئے ان کے والد نے تیرہ سال کی عمر میں ہی تمام انتظام خانہ داری ان کے سپرد کر دیا تھا۔ وہ نہایت اہتمام سے اشیائے خانہ داری منگاتے اور تالا کنجی میں رکھتے تھے۔ الماری کے کواڑ پر الجبرا کے فارمولے لکھ دیئے تھے جب الماری کھولنے جاتے ایک نہ ایک فارمولا یاد کر لیتے تھے۔

جب وہ مڈل کلاس میں آ گئے جس کا امتحان بھی ان دنوں یونیورسٹی سے متعلق تھا تو ان کے ایک ہندو ہم جماعت نے فخریہ کہا کہ ضیاءالدین میرا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ وہ خاموش رہے اور اپنے کام میں مصروف لیکن جب امتحان کا وقت آیا تو ریاضی کے پرچے میں اقلیدس کے چار سوال تھے جن میں سے کوئی دو سوال کرنے تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے چاروں سوال نہایت عمدہ طور پر حل کئے اور لکھ دیا کوئی سے دو دیکھ لئے جائیں۔ اس طرح وہ اپنے حریف سے بازی لے گئے اوّل درجہ میں کامیاب ہوئے اور ریاضی و تاریخ میں امتیاز حاصل کیا۔

۱۸۸۹ء میں وہ ایم اے او کالج سے ملحقہ اسکول میں داخل ہوئے اور اپنے بڑے بھائی کے ساتھ جو پہلے سے وہاں پڑھتے تھے ہاسٹل میں داخل ہو گئے۔ یہاں ان کے نمایاں ہم جماعت سیٹھ یعقوب حسن مرحوم اور ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب تھے جب انٹرنس کے امتحان کا وقت قریب آیا تو اساتذہ میں خیال آرائیاں شروع ہوئیں کہ دیکھئے امتحان میں اوّل کون آتا ہے ہیڈ ماسٹر کا خیال تھا کہ یعقوب حسن اوّل آئے گا اور سیکنڈ ماسٹر عبدالحق کے متعلق قیاس آرائی کرتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب کا کسی کو خیال بھی نہ تھا۔ انہوں نے بھی یہ چہ میگوئیاں سن لیں اور اپنی محنت و کوشش میں اضافہ کر دیا۔ اور امتحان میں سب ساتھیوں پر بازی لے گئے اوّل درجہ میں کامیاب ہوئے ان کو کالج سے لینگ میڈل اور سررشتہ تعلیم سے سرکاری وظیفہ ملا۔ چونکہ اس وقت تک کالج میں سائنس کی تعلیم کا انتظام نہ تھا اور ڈاکٹر صاحب سائنس کورس لینا چاہتے تھے اس لئے مجبوراً علی گڑھ چھوڑ کر میور سنٹرل کالج الٰہ آباد میں داخل ہو گئے یہاں بھی انٹرمیڈیٹ اوّل درجہ میں نہایت امتیاز کے ساتھ پاس کیا اور سرکاری وظیفہ حاصل کیا۔ اس کے بعد وہ پھر علیگڈھ واپس آ گئے اور ۱۸۹۵ء میں اعلیٰ ریاضی کورس لے کر بی اے درجہ اوّل میں پاس کیا اور ان کو اس کے صلہ میں اسٹریچی میڈل دیا گیا۔

قومی بہبود کا جوش ان کے سینہ میں فطرت نے ودیعت کیا تھا چنانچہ اس کا مظاہرہ مختلف صورتوں میں طالب علمی ہی کے زمانے سے ہوتا رہتا تھا۔ چنانچہ میر ولایت حسین صاحب جو ان کے استاد تھے ایک موقع پر لکھتے ہیں کہ:۔

> "ڈاکٹر صاحب نے بی اے کی تعلیم کے زمانے میں ہی نمایاں ہونا شروع کر دیا تھا وہ کھیلوں میں بھی شریک ہوتے تھے اور علیگڈھ کی دوسری تحریکوں مثلاً ڈیوٹی سوسائٹی یا قیام مدارس کی تحریک میں حصہ لیتے تھے چنانچہ ان کی کوشش سے مارہرہ میں مدرسہ اسلامیہ اسکول قائم ہوا۔"

یہ قصبہ ایک قدیم مردم خیز بستی ہے جو کبھی مشرقی علوم کا گہوارہ تھا لیکن لوگوں کو جدید تعلیم سے نفرت تھی۔ یہاں کنبوہ اور سادات بلگرام کی آبادی نمایاں تھی۔ چونکہ علی گڈھ کے قریب واقع ہے ڈاکٹر صاحب نے ایجوکیشنل کانفرنس کی ایک قرارداد کے بموجب یہاں کا تعلیمی سروے کیا اور اپنے ذاتی اثر و رسوخ سے اپنے اعزا کو آمادہ کر کے یہاں ایک جدید مدرسہ قائم کرا دیا۔

بی اے کا امتحان دینے کے بعد ہی ڈاکٹر صاحب کا تقرر کالجیٹ اسکول میں بمشاہرہ سولہ روپیہ ماہوار اسسٹنٹ ماسٹری پر تقرر ہو گیا نتیجہ نکلنے کے بعد ان کو اسسٹنٹ پروفیسر ریاضی کی جگہ مل گئی جہاں پہلے چالیس روپیہ اور بعد کو ساٹھ روپیہ ماہانہ تنخواہ ہو گئی۔ سرسید نے

بجٹ رپورٹ میں ان کے متعلق تحریر کیا کہ:۔

"اگر وہ میتھیمیٹکس میں ترقی پا گیا اور اپنے تئیں ایک اچھا پروفیسر ثابت کر گیا اور ہمارے کالج میں رہے گا تو جہاں تک ممکن ہے ہم اس کی ترقی کا خیال رکھیں گے۔"

اس زمانے میں بی اے پاس کرنے کے بعد ڈپٹی کلکٹری کا عہدہ معراج ترقی خیال کیا جاتا تھا۔ کالج کی طرف سے پرنسپل نے ڈاکٹر صاحب کا نام اس عہدہ کے لئے گورنمنٹ میں بھیج دیا اور زوردار سفارش لکھی۔ پرنسپل اور ان کے اہل خاندان تو چاہتے تھے کہ وہ ڈپٹی کلکٹر بنیں لیکن وہ خود اسے ناپسند کرتے تھے اور کالج ہی میں رہ کر قوم کی خدمت کرنا چاہتے تھے غرض بڑی رد و کد کے بعد سب کو ڈاکٹر صاحب ہی کی رائے سے متفق ہونا پڑا اور انہوں نے ڈپٹی کلکٹری سے اپنا نام واپس لے لیا۔ جب وہ کالج میں مستقل پروفیسر ہو گئے تو سرسید نے ایک معاہدہ کا مسودہ تیار کیا جس کا مفہوم یہ تھا کہ کم از کم پانچ سال کالج کی ملازمت ترک نہیں کر سکیں گے جب یہ مسودہ ڈاکٹر صاحب کو دیا گیا کہ اس پر دستخط کر دیں تو انہوں نے سرسید کی خدمت میں عرض کیا کہ میرا مقصد تو اپنی پوری زندگی علیگڑھ میں صرف کرنے کا ہے۔ معاہدہ کی پابندی کو میں عار سمجھتا ہوں اور میرے خیال میں کسی معاہدہ کی بنا پر قومی خدمت نہیں کرنی چاہئے بلکہ اپنے خود اپنے دل کے تقاضے سے یہ اہم کام انجام دینا چاہیے۔ سرسید پر اس جواب کا ایسا اثر ہوا کہ انہوں نے فوراً اسی وقت معاہدہ کا مسودہ چاک کر دیا اور کہا کہ جاؤ کام کرو۔ ڈاکٹر صاحب کالج کی چاروں جماعتوں کو ریاضی پڑھاتے تھے۔ ۱۸۹۷ء کی بجٹ رپورٹ میں سرسید نے ان کے متعلق لکھا کہ:۔

"جو ٹرسٹی کہ روزمرہ کالج کے حالات دیکھتے ہیں وہ بخوبی واقف ہوں گے کہ ضیاء الدین احمد کے کالج میں ہونے سے طالبعلموں کو کس قدر علمی شوق بڑھتا جاتا ہے اور اس کا اس کالج میں رہنا طالب علموں کی ترقی تعلیم کے لئے کس قدر مفید ہے بالفعل یہ امر پیش آیا ہے کہ پرنسپل صاحب نے حسب قاعدہ دو طالب علموں کا نام ڈپٹی کلکٹری کے گورنمنٹ میں بھیجا ہے جن میں ایک ضیاء الدین احمد ہے اگرچہ اس کے دوستوں نے بہت ترغیب دی مگر خود ضیاء الدین احمد نے علمی شوق سے ڈپٹی کلکٹری کے مشغلہ سے علمی ترقی اور ہمارے کالج میں رہنے کو پسند کیا اور پرنسپل کو اطلاع کی کہ گورنمنٹ میں رپورٹ کر کے اس کا نام ڈپٹی کلکٹری سے خارج کرا دیا جائے پس ایسی حالت میں ضیاء الدین احمد ٹرسٹیوں کی توجہ کا بہ لحاظ قومی ترقی و تعلیم کس قدر مستحق ہے اور جب موقع ملے گا ٹرسٹی ضرور اس کی ترقی پر توجہ فرمائیں گے۔"

اس زمانے میں انٹرمیڈیٹ میں منطق کا مضمون لازمی تھا مگر پروفیسر آرنلڈ جو اس مضمون کو پڑھایا کرتے تھے مستعفی ہو کر لاہور چلے گئے تھے ان کے اور مضامین تو مختلف پروفیسروں میں تقسیم کر دیئے گئے لیکن اس مضمون کو کوئی پڑھانے پر آمادہ نہ ہوا۔ بجٹ میں جدید تقرر کی گنجائش نہ تھی اس لئے ایک سخت قسم کا تردد تھا اس موقع پر ڈاکٹر صاحب آگے بڑھے اگرچہ انہوں نے خود یہ مضمون نہ پڑھا تھا لیکن اس بار گراں کو اپنے ذمہ لے لیا۔ مطالعہ کے بعد پہلے نوٹ تیار کرتے اور پھر لکچر دیتے تھے اور بقول میر ولایت حسین "ایسی پڑھائی کہ امتحان یونیورسٹی میں اعلیٰ نمبروں سے طلبا پاس ہوئے۔" اور اس سال یونیورسٹی ممتحن کی رپورٹ یہ تھی کہ منطق کی تعلیم علی گڑھ میں بہترین ہوتی ہے۔

مسلمان طلبا عموماً ریاضی سے خائف رہتے تھے اور اس لئے انجینئری وغیرہ کی تعلیم سے انہیں واسطہ نہ تھا ڈاکٹر صاحب نے علاوہ اپنے فرائض منصبی کے یہ انتظام کیا کہ طلباء کی باقاعدہ تربیت و تعلیم کی جانے لگی اور وہ رڑکی انجینئرنگ کالج و نیز محکمہ جنگلات کے مقابلہ کے امتحانوں میں شریک ہونے لگے۔ انہوں نے اس کام کے لئے مساحت پر ایک کتاب بھی لکھ ڈالی۔ علاوہ ازیں امتحان کے قریب گھر پر پڑھایا کرتے تھے اور ہفتہ میں دو مرتبہ عموماً ان کے گھر رات کو ایک جلسہ ہوا کرتا تھا اور باتوں باتوں میں مشکل سے مشکل مسائل ریاضی اپنے طلباء کے ذہن نشین کر دیا کرتے تھے۔ اس قسم کے غیر معمولی کاموں کا انہوں نے کبھی کوئی معاوضہ طلب نہیں کیا۔

سرسید کی وفات کے بعد سرسید میموریل فنڈ کی بنا ڈالی گئی اور محمڈن یونیورسٹی کی تحریک شروع ہوئی ڈاکٹر صاحب نے اس سلسلے میں جس ایثار اور انہماک سے کام کیا اسے جاننے کے لئے محسن الملک کی تقریر کا اقتباس کافی ہے۔ نواب صاحب نے کہا کہ:-

سرسید کی ہمیشہ یہ خواہش رہی کہ کانفرنس کا اجلاس کلکتہ میں ہو لیکن تیرہ سال تک کسی قسم کی کامیابی نہ ہوتی آخر یہ قرار پایا کہ خاص آدمی کلکتہ بھیجا جائے پروفیسر ضیاءالدین احمد مسلمانوں پر جان دینے والا ایک شخص ہے جس کو ڈپٹی کلکٹری ملتی تھی لیکن اس نے محض قومی بھلائی کے خیال سے اس نوکری کو منظور نہیں کیا اور کالج میں سو روپیہ کی نوکری کر لی اور اس قلیل تنخواہ پر بیٹھا ہوا ہے اگر وہ ڈپٹی کلکٹر ہوتا تو اس وقت پانچ سو کی تنخواہ ہو جاتی۔ غرضیکہ ضیاءالدین آمادہ ہوئے کہ میں کلکتہ جاتا ہوں چنانچہ وہ تین ہفتہ تک برابر کلکتہ پڑے رہے کل خرچ اپنا کیا اور ایک حبہ کسی سے خرچ کے واسطے کالج یا کانفرنس سے نہیں لیا۔ اس ہمدرد قوم نے وہاں جا کر میموریل فنڈ کے لئے کوشش شروع کر دی لیکن وہاں یہ دشواری پیش آئی کہ کلکتہ میں سربرآوردہ مسلمانوں کی مختلف پارٹیاں ہیں ایک گروہ کی کوشش جو قومی بھلائی کے لئے کی جاتی ہے دوسرا گروہ اس لئے اس کو توڑنے کی فکر کرتا ہے کہ ہمارے فریق مخالف کی نیکنامی نہ ہو جائے۔ بہرنوع ہیں کہ رسیدیم آسماں پیداست۔ مسلمانوں کی باہمی نااتفاقی وہاں بھی موجود ہے لیکن پروفیسر ضیاءالدین احمد کے تین ہفتہ قیام کا نتیجہ ہوا کہ سرسید میموریل فنڈ کے چندہ کے لئے کمیٹی کی بنا پڑی اور وہاں کے سربرآوردہ اصحاب نے محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کو مدعو کرنے کی رائے دی غرض ۱۸۹۹ء میں کانفرنس کا اجلاس منعقد ہوا۔ لفٹنٹ گورنر تک نے اس جلسے میں شرکت کی اور مادی و اخلاقی لحاظ سے یہ اجلاس نہایت کامیاب اور نتیجہ خیز ثابت ہوا۔"

صاحبزادہ آفتاب احمد خاں کی تحریک سے کالج میں انجمن الفرض (ڈیوٹی سوسائٹی) قائم ہوئی تھی جس کا کام غریب طلبا کی امداد کے لئے روپیہ جمع کرنا تھا۔ طلبا اپنے تعطیل کے زمانے میں انفرادی طور پر جمع کرتے تھے اور انگریزی تعلیم کی طرف مسلمانوں کو رغبت دلاتے تھے اس انفرادی دریوزہ گری سے مالی حالت میں تو کچھ ترقی ہو جاتی تھی مگر اصل مقصد میں کامیابی نہ ہوتی تھی یعنی مسلمانوں میں انگریزی تعلیم کی ضرورت کا ذہن نشین کر دینا اور مسلمانوں کے خیالات کالج کی طرف سے درست کرنا۔ جس سال ڈاکٹر صاحب انجمن کے نائب امین مقرر ہوئے تو انہوں نے بجائے انفرادی کوشش کے طلبا کو مختلف مقامات پر وفود کی صورت میں روانہ کیا۔ تاکہ وہ بڑے بڑے شہروں اور قصبوں میں جلسے کریں اور کالج کے متعلق تقاریر کے ذریعے لوگوں پر ضرورت اور اہمیت کا اظہار کریں۔ اس سلسلے میں وہ اچھے لڑکوں کی تقریر کرنے کی صلاحیت کو تربیت کر کے ابھارتے تھے اور اچھے مقررین کے لئے انعام بھی مقرر کرتے تھے۔ ان وفود کا یہ نتیجہ نکلا کہ جہاں آٹھ سال میں ۱۸۹۷ء تک انجمن کو قریب پانچ ہزار روپیہ کے ملا تھا وہاں پانچ سال میں یعنی ۱۸۹۸ء سے ۱۹۰۲ء تک قریباً اکیس ہزار وصول ہوا۔ وہ انجمن سے بیس سال تک متعلق رہے۔ اس عہد میں انجمن کو تین لاکھ تریپن ہزار کی آمدنی ہوئی۔ انہوں نے اپنی آخری رپورٹ میں لکھا تھا کہ:-

"ڈیوٹی کا فرض ہے کہ وہ اس قدر سرمایہ جمع کرے جس سے مستقل طور پر کم از کم ایک ہزار طالب علم بلا کسی قسم کا خرچ کئے ہوئے تعلیم پا سکیں ورنہ خوف ہے کہ مسلمان پورے طور پر اس مجوزہ محمڈن یونیورسٹی سے فائدہ اٹھانے سے معذور رہیں گے۔"

وہ نادار اور ہونہار طلبا کی امداد کے لئے طرح طرح کی ترکیبیں سوچتے رہتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے بار بار پرنسپل اور کارکنان کالج پر زور دیا کہ نادار طلبا کو تعلیم اور اقامت کے اخراجات میں رعایت ملنی چاہئے چنانچہ ان کی مساعی بار آور ہوئیں اور رعایتی شرح جاری ہو گئی یعنی ان کا کل خرچ دس روپیہ ماہوار اور ایسے طلبا کا دس روپیہ ماہوار مقرر کر دیا گیا۔ تنخواہ کی کمی کے باعث اساتذہ مشکل سے ملتے تھے۔

لہذا ڈاکٹر صاحب کی کوشش سے یہ طے پایا کہ جو اساتذہ ہوسٹل میں رہنا پسند کریں ان سے صرف چھ روپیہ ماہانہ لیا جائے۔

(۲)

ڈاکٹر صاحب نے باوجود کثیر مشاغل و فرائض منصبی کے ۱۸۹۷ء میں کلکتہ یونیورسٹی سے اور ۱۸۹۸ء میں الٰہ آباد یونیورسٹی سے ایم اے کیا اور ۱۹۰۱ء میں الٰہ آباد یونیورسٹی سے ڈی ایس سی اوّل درجہ میں پاس کیا۔ مسٹر ماریسن پرنسپل نے اپنی سالانہ رپورٹ میں لکھا کہ:۔

"امتحانات یونیورسٹی کا ایک نتیجہ علیگڈھ میں نہایت اطمینان کا باعث ہوا ہے اور وہ یہ ہے کہ پروفیسر ضیاء الدین احمد نے ڈی ایس سی کا امتحان اوّل ڈویژن میں پاس کیا۔ ڈاکٹر ضیاء الدین نے کالج اور مسلمانوں کی قوم کے متعلق اس قدر کثیر فرائض اپنے ذمہ لئے ہیں کہ اس بات کا سمجھنا مشکل ہے کہ انہوں نے اپنے پرائیویٹ مطالعہ کے لئے کب وقت نکالا ہوگا لیکن انہوں نے ایسے طریقہ میں یہ وقت نکال لیا کہ وہ یونیورسٹی الٰہ آباد کی تعریف و توصیف کے مستحق ہوئے ہم یقیناً اس بات کی امید کر سکتے ہیں کہ ڈاکٹر ضیاء الدین کیمبرج میں تحصیل علوم کے لئے عنقریب انگلستان کے واسطے روانہ ہو سکیں گے اور اگرچہ علیگڈھ کی سوسائٹی کو ان کے چلے جانے سے نقصان پہنچے گا تاہم ہم میں ہر شخص اس بات کے خیال سے خوش ہوگا کہ ان کو موقع ملے گا کہ انگلستان جاکر اپنی اعلیٰ قابلیتوں کو اوّل درجہ کے مہندسین کی نگرانی میں اصلی علمی تحقیقاتوں میں صرف کریں اور جب کہ کیمبرج میں تین برس تعلیم پاکر کالج کو واپس آویں گے تو ہمارے ٹیچنگ اسٹاف کو بڑا استحکام حاصل ہوگا۔"

حکومت نے اعلیٰ تعلیم کے لئے ڈاکٹر صاحب کو وظیفہ دیا ان ہی دنوں سر آغا خاں نے تین ہزار روپیہ سالانہ کالج کے لئے منظور کئے لیکن اس رقم میں سے نصف ڈاکٹر صاحب کے لئے مخصوص کر دی تاکہ وہ یورپ میں زیادہ عرصہ رہ کر مزید قابلیت حاصل کر سکیں۔ اکتوبر ۱۹۰۱ء میں ڈاکٹر صاحب نے ٹرنٹی کالج کیمبرج میں داخلہ لیا اور وہاں سے ریاضی آنرز میں ڈگری حاصل کی تمام پاس شدہ اُمیدواروں میں ان کا نمبر اوّل تھا۔ ۱۹۰۴ء میں انہیں سر آئزک نیوٹن اسکالرشپ ملا وہ پہلے ہندوستانی تھے جنہیں یہ اعزاز حاصل ہوا۔ کیمبرج میں انہوں نے سید علی بلگرامی کی سرپرستی میں ایک مسلم سوسائٹی قائم کی جہاں ہفتہ میں دو بار کسی مشہور مسلمان کی زندگی اور کارناموں پر مضامین پڑھے جاتے تھے۔

ٹرنٹی کالج میں ایک لطیفہ یہ ہوا کہ جتنی بڑی داڑھی ڈاکٹر صاحب کی تھی اتنی ہی ان کے ٹیوٹر کی تھی۔ ایک دن ٹیوٹر نے کہا کہ یہ بڑی دلچسپ اور مضحکہ خیز بات ہے کہ یہ معلوم نہیں ہو سکتا کہ میں تمہارا ٹیوٹر ہوں یا تم میرے ٹیوٹر ہو۔ شرعی جواز معلوم کرکے ڈاکٹر صاحب نے اپنے ٹیوٹر کی خاطر داڑھی منڈوا دی لیکن وہاں سے فارغ ہونے کے بعد پھر رکھ لی جو آخر وقت تک رہی۔ دوسری عجیب بات اس دور کی یہ ہے کہ وہ حسب عادت عموماً امتحان سے قبل رات گئے تک مطالعہ میں مصروف رہا کرتے تھے اور جب سونے کا ارادہ کرتے تب بھی ریاضی کے مسائل دماغ میں گھومتے رہتے اور نیند نہ آتی۔ جب دو ہفتہ اسی طرح گذر گئے تو انہوں نے اپنے ٹیوٹر کے مشورہ سے ایک ماہر ڈاکٹر کی طرف رجوع کیا اس نے خوب معائنہ کرنے کے بعد رائے دی کہ فوراً ہندوستان واپس چلے جاؤ ورنہ دماغ خراب ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ ڈاکٹر صاحب یہ سن کر واپس چلے آئے اور اپنی قوت ارادی سے علاج شروع کیا اور یہ مشق بہم پہنچائی کہ جیسے ہی کتاب بند کرتے تمام مسائل دماغ سے خارج ہو جاتے اور خالی الذہن ہو کر سو جاتے اور جب کتاب کھولتے تو تمام مسائل پھر دماغ میں آجاتے۔ جب کئی ہفتہ اس کی مشق کر لی تو پھر اسی ڈاکٹر سے جاکر ملاقات کی اس نے پھر معائنہ کیا اور کہا اب حالت درست ہے ہندوستان جانے کی ضرورت نہیں۔ جب اسے یہ معلوم ہوا کہ کس طرح ڈاکٹر صاحب نے خود علاج کیا تو اس کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ یہ قوتِ ارادی کا کرشمہ آخر وقت تک رہا۔ جب چاہتے اور جتنے وقت کے لئے چاہتے سو جایا کرتے تھے اور بروقت بیدار ہو جاتے تھے۔ ۱۹۰۶ء میں انہوں نے گوٹنجن یونیورسٹی

جرمنی سے ہیئت میں پی۔ایچ۔ڈی کی ڈگری حاصل کی بعد ازاں پیرس اور اٹلی کی یونیورسٹیوں میں کچھ عرصہ مخصوص علوم کے ماہرین کے لکچروں کو سنا اور درس لیا۔ ان کی کامیابیوں کی اطلاعیں ہندوستان کے اخبارات میں شائع ہوتی رہتی تھیں اور اب ان کی واپسی کا زمانہ قریب آ رہا تھا حسن اتفاق سے ان کے کیمبرج کے ٹیوٹر ہندوستان میں محکمہ آثار قدیمہ کے ڈائرکٹر مقرر ہو گئے تھے انہوں نے ڈاکٹر صاحب کو ترغیب دی کہ وہ اسسٹنٹ ڈائرکٹر کا عہدہ قبول کر لیں لیکن ڈاکٹر صاحب نے انکار کر دیا۔ اس کے بعد ڈائرکٹر تعلیمات یو۔پی نے انسپکٹر مدارس کا عہدہ جس کا مشاہرہ ساڑھے سات سو سے شروع ہوتا تھا پیش کیا لیکن انہوں نے اسے بھی قبول کرنے سے انکار کر دیا اور نواب محسن الملک کو خط میں لکھا کہ:

"موجودہ اور آئندہ ہر قسم کی ملازمت کے لئے میری طرف سے آپ جو جواب دیں گے وہی میرا جواب ہوگا۔۔۔۔۔۔ آج مسٹر ڈی لافوس ڈائرکٹر آف پبلک انسٹرکشن کا باضابطہ خط میرے پاس پہنچا ہے جس میں انہوں نے بہ دلائل میرے انسپکٹری قبول کرنے پر زور دیا ہے میں نے بھی بہ دلائل اس سے انکار کر دیا۔"

سنہ ۱۹۰۱ء کے اواخر میں ڈاکٹر صاحب یورپ سے واپس ہوتے راستے میں مصر میں قیام کیا۔ یہاں جامعہ ازہر میں علمائے ہیئت سے درس لیا اور وہاں کے اخباروں میں ہندوستان یورپ اور مصر کی تعلیم پر کئی بصیرت افروز مضامین شائع کئے۔ ایک مضمون میں لکھا کہ:

مجھ کو جو اکثر اسلامی ممالک کے اہل قلم سے اور دیگر اکابرین سے ملاقات کے مواقع حاصل ہوئے ان سے جو گفتگو ہوئی اس سے میں اس یقینی نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اس وقت مسلمانان ہند دیگر ممالک اسلامیہ کے مسلمانوں سے زیادہ ترقی یافتہ ہیں اور اگر دنیا کے مسلمان کسی وقت ترقی کریں گے تو مسلمانان ہند ہی اس ترقی کا باعث ہوں گے اور علیگڈھ اس ترقی کا مرکز ہوگا۔

(۳)

اواخر سنہ ۱۹۰۱ء میں ڈاکٹر صاحب نے وطن کی طرف مراجعت کی اور ۱۱ر دسمبر کو براہ راست علیگڈھ پہنچے۔ نواب محسن الملک پرنسپل اور اساتذہ و طلبا نے پرجوش استقبال کیا اور جس گاڑی میں وہ سوار ہوئے اس کے گھوڑے کھول دئے گئے اور طلبا نے گاڑی کو کھینچ کر نواب محسن الملک کی کوٹھی تک پہنچایا۔ اب انہوں نے پروفیسر ریاضی کی حیثیت سے بڑے جوش و خروش و سرگرمی سے کام شروع کر دیا۔ کچھ عرصہ بعد الہ آباد یونیورسٹی کی پروفیسری انہیں پیش کی گئی جس کا مشاہرہ علیگڈھ کی نسبت تقریباً دوگنا تھا مگر انہوں نے اس پیش کش کو قبول کرنے سے انکار کیا۔

ڈاکٹر صاحب نے مصر میں متعدد پبلک لکچر تعلیم پر دئے تھے۔ تقاریر کے دوران میں انہوں نے مصریوں کو مشورہ دیا تھا کہ ان کی پسماندگی کا سبب برطانوی پالیسی ہے اور اس پالیسی پر انہوں نے سخت نکتہ چینی کی تھی مصریوں کو یہ بھی مشورہ دیا تھا کہ تعلیم کو عام کرنے کی کوشش کی جائے اسی پر ملک کی ترقی کا دارومدار ہے۔ ان کے یہ خیالات برٹش ہائی کمشنر مقیم مصر کو ناگوار گزرے اور انہوں نے دوران ملاقات میں ان کی تقاریر پر اعتراض کیا ڈاکٹر صاحب نے صاف طور پر کہہ دیا کہ میں اپنی رائے کے اظہار میں آزاد ہوں۔ یہ سب معاملات وائسرائے ہند کو واضح کر دئے گئے اور برطانیہ سے ہدایات جاری ہوئیں کہ ضیاءالدین کی خاص طور پر نگرانی کی جائے۔ اس کے خیالات باغیانہ ہیں۔

چنانچہ جب وہ ہندوستان واپس آئے تو یہاں کے حالات کا معائنہ کرنے کے بعد انہیں اپنے خیالات میں ترمیم کرنی پڑی تقسیم بنگال سے مسلمانوں کو سیاسی ترقی کا موقع ملا تھا۔ شملہ ڈیپوٹیشن کے نتائج کا انتظار تھا۔ لہٰذا مسلمان حکومت سے کسی طرح بگاڑ پیدا کرنا نہیں چاہتے تھے۔ چنانچہ ڈاکٹر صاحب نے بھی نواب محسن الملک کے مشورہ سے مصلحت وقت کا تقاضا دیکھتے ہوئے اپنی زبان بند رکھی۔ لیکن باوجود اس کے تین سال تک خفیہ پولیس ان کی نگرانی کرتی رہی۔ ان کے مکان سے تمام وہ تعلیمی لٹریچر جو وہ یورپ اور مصر سے لائے۔ چوری کرا لیا گیا۔ خفیہ پولیس کے اس افسر نے جو ان کا نگران تھا ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد ڈاکٹر صاحب سے اس چوری کا اقرار کیا۔

ڈاکٹر صاحب ان پروفیسروں میں نہ تھے کہ جن کی سرگرمیاں صرف کلاس روم تک محدود رہتی ہیں انہوں نے اپنے یورپ کے تجربے اور علم کی بنا پر ایجوکیشنل کانفرنس میں ابتدائی تعلیم کی اصلاحات سے متعلق ایک اسکیم پیش کی۔ انہوں نے تجویز کیا کہ میوزیم قائم کیا جائے اور اس کے ذریعہ بچوں کو تعلیم دی جائے علاوہ ازیں ایسے بڑی عمر کے لوگ جن کی تعلیم ادھوری رہ گئی ہے اور جو تعلیم کے شائق ہوں ان کے لئے مسلسل لیکچروں کا پروگرام مرتب کیا جائے۔ ابتدائی تعلیم مادری زبان ہی میں ہو اور عربی مدارس میں فارسی بھی اختیاری مضمون کے طور پر پڑھائی جائے۔ تاریخ اسلام بھی ایک الگ مضمون کی حیثیت سے پڑھائی جائے۔ انہوں نے خود علیگڑھ میں میوزیم اور کنڈر گارٹن اسکول قائم کیا۔ انہوں نے ایک اسکیم ایسی بھی تیار کی جس میں مذہبی تعلیم بچوں کو کنڈر گارٹن کے اصول پر دی جاسکتی تھی۔ کالج کے طلبا میں تعلیمی نقطۂ نگاہ سے مل جل کر سیر و سیاحت کا جذبہ پیدا کیا اور اس طرح ایسے اکسکرشن ہر سال ہونے لگے۔ انہوں نے یہ بھی تحریک کی کہ علی گڑھ میں ایک اولڈ بوائے کالونی قائم کی جائے تاکہ وہ لوگ مادر علمی کی خدمت کرسکیں چنانچہ اکثر نے علی گڑھ میں مکانات بنا کر سکونت اختیار کر لی۔

۱۹۱۱ء میں جنگ طرابلس اور پھر جنگ بلقان چھڑ گئی ترکوں کی امداد کے لئے ایک کمیٹی کالج میں قائم ہوئی جس کے صدر ڈاکٹر صاحب تھے۔ لڑکوں نے عمدہ کھانا اور عمدہ پہننا ترک کر دیا اس سے جو بچت ہوئی وہ ترکی فنڈ میں دے دی گئی ڈاکٹر انصاری کے طبی مشن کو بیش بہا امداد ملی اور کچھ طلبا نے اپنی خدمات پیش کیں۔ غرض ترکی امدادی فنڈ میں طلبا نے تقریباً ۴۵ ہزار روپیہ جمع کر دیا۔

۱۹۱۴ء میں جنگ عظیم چھڑ گئی۔ طلبائے علی گڑھ میں ترکوں سے ہمدردی اور سیاسی بیداری کا جذبہ زوروں پر تھا۔ حکومت ہند اس طرف سے خائف تھی لیکن نظم و ضبط قائم رہا۔ طلبا نے امپیریل ریلیف فنڈ کے لئے چندہ بھی جمع کیا اور ایمبولینس کور میں بھی خدمات انجام دیں۔

۱۹۱۷ء میں حکومت ہند نے کلکتہ یونیورسٹی کی تحقیقات کے لئے سڈلر کمیشن مقرر کیا اس کا ایک ممبر ڈاکٹر صاحب کو بھی مقرر کیا گیا چنانچہ دو سال تک ڈاکٹر صاحب علی گڑھ سے الگ رہے اور کمیشن کے کام میں منہمک رہے۔ میٹرک میں مسلمان طلبا کی ناکامی کے پست ترین اعداد و شمار سے انہیں شبہ ہوا اور انہوں نے تحقیقات شروع کی۔ بنگال بھر کے مختلف مراکز امتحان کی کاپیاں منگوا کر خود جانچا تو انہیں یقین ہو گیا کہ مسلمان طلبا ہندو متعصب ممتحنوں کا شکار ہوتے ہیں اور انہیں قصداً فیل کیا جاتا ہے کیونکہ اس زمانے میں طلبا امتحانوں کی کاپیوں پر نام لکھا کرتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب کی سفارش پر نام کے بجائے رول نمبر لکھے جانے لگے۔

۱۹۱۸ء میں کالج کے اندرونی خلفشار کے باعث انگریز پرنسپل اور اس کے ساتھ انگریز اساتذہ نے ملازمت سے استعفا دے دیئے جو منظور کر لئے گئے۔ اور جنوری ۱۹۱۹ء سے ڈاکٹر صاحب کا تقرر پرنسپل کے عہدہ پر ہوا۔

(۴)

کچھ عرصہ سے کالج کی حالت خراب سے خراب تر ہوتی جا رہی تھی۔ بجٹ کی حالت متزلزل تھی۔ انگریز اساتذہ کے چلے جانے سے حکام ضلع اور محکمہ تعلیم ناراض تھا۔ ادھر کالج کے ٹرسٹیوں اور اولڈ بوائز میں معرکہ آرائیاں ہو رہی تھیں۔ ان حالات میں ڈاکٹر صاحب نے پرنسپلی کا جائزہ لیا۔ ان حالات کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب مئی ۱۹۱۹ء میں کالج تعطیلات کے لئے بند ہوا تو تعداد طلبا صرف ۱۸۱ رہ گئی تھی۔ حالانکہ ایک وقت وہ بھی تھا کہ ۱۲ سو سے زاید طلبا تھے جن میں تقریباً ایک ہزار بورڈر تھے۔

حالانکہ ڈاکٹر صاحب کا تقرر مشروط ہوا تھا کہ جب تک انگریز پرنسپل ملے کام کریں۔ لیکن انہوں نے نہایت سرگرمی سے کام شروع کر دیا۔ سب سے پہلے حکومت کے عمال کی خوشنودی ضروری تھی تاکہ الحاق فسخ کرنے کی دھمکیاں اور گرانٹ بند کرنے کا خوف دور ہو سکے۔ ڈاکٹر صاحب نے گورنر صوبہ کو دعوت دی اور انہوں نے کالج کا معائنہ کر کے نہایت عمدہ خیالات کا اظہار کیا اور ایک ہزار اپنی جیب خاص سے عنایت فرمایا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کالج کی سالانہ آمدنی چوگنی ہو گئی۔ مرکزی حکومت کی گرانٹ کا روپیہ رکا ہوا تھا وہ اضافہ کے ساتھ وصول ہوا۔ کالج میں بیالوجی کا شعبہ

قائم کیا گیا - چنانچہ اس سال کی رپورٹ میں کالج کے آنریری سیکرٹری نے لکھا کہ :-

"جب میں سیکرٹری ہوا تو کالج میں خطرہ کا زمانہ تھا تمام یورپین اسٹاف فروری و مارچ میں جا چکا تھا ...... گزشتہ چند برسوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کالج تنزل کر رہا ہے پبلک میں یہ احساس تھا کہ گورنمنٹ اب اس کو نظر التفات سے نہیں دیکھتی جیسے کہ زمانہ سابق میں دیکھتی تھی چنانچہ اس احساس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تعداد طلبا میں کمی ہوتی گئی جب یکم مئی ۱۹۱۹ء کو کالج بند ہوا تو تعداد طلبا (۱۸۱) تھی کیونکہ اور طلبا امتحان دے کر جا چکے تھے کالج دوبارہ یکم اگست کو کھلا اور (۶۰۰) نئے داخلے ہوئے فروری ۱۹۲۰ء میں (۶۶۷) تک تعداد پہنچی جس میں (۶۲۰) بورڈر تھے - یہ اضافہ بڑی حد تک ڈاکٹر ضیاء الدین احمد کی ذاتی کوشش کا نتیجہ تھا - ساتھ ہی انجمن الفرض نے زیادہ مقدار میں قرضہ دیا - رعایتی شرح بھی جاری کی گئی اور (۱۵۰) طلبا اس شرح پر داخل ہوئے۔"

ٹرسٹیوں اور اولڈ بوائز ایسوسی ایشن نے ڈاکٹر صاحب کی خدمات کے اعتراف میں قراردادیں منظور کیں۔

کالج کی حالت کو پوری طرح سنبھلنے کا موقع نہیں ملا تھا کہ ترک موالات کا ہنگامہ اٹھ کھڑا ہوا اور کالج پر حملہ ہوا - یہ ایک سخت مصیبت کا وقت تھا ڈاکٹر صاحب چومکھی لڑائی لڑ رہے تھے حملہ اندر سے بھی اور باہر سے بھی - وہ رات دن کام کرتے تھے کبھی جلسے ہو رہے ہیں کبھی حکام سے مل رہے ہیں کبھی طلبا کے سرپرستوں کو خطوط لکھے جا رہے ہیں اپنے کارکنوں کو مختلف کاموں میں لگائے رہتے تھے - انہوں نے اوّل تو مولانا شوکت علی سے اگست ہی میں وعدہ لے لیا کہ علیگڑھ کو محفوظ رکھا جائے گا پھر جب اکتوبر میں حملہ آور آ پہنچے تو گاندھی جی کو یاد دلایا کہ آپ نے تو مارچ ہی میں وعدہ کر لیا تھا کہ طلباء کو ہدایت کریں گے کہ عملی سیاست میں حصہ نہ لیں انہوں نے جواب دیا ہنٹر کمیٹی کی رپورٹ اور ترکی شرائط صلح نے میری رائے پر گہرا اثر ڈالا ہے - مولانا محمد علی سے انہوں نے کہا تو می یونیورسٹی کی اسکیم کو میں اس شرط پر جاری کرنے کو تیار ہوں کہ اوّل تو اسے ہندوستان کے ماہرین تعلیم منظور کر لیں اور آپ علیگڑھ کالج کو چھوڑ دیں انہوں نے کہا ہم تو حکومت سے کسی قسم کا بھی تعلق نہیں رکھنا چاہتے - نتیجہ یہ ہوا کہ ڈاکٹر صاحب کی رات دن کی مساعی اور دوڑ دھوپ کی بدولت ۶۶۰ بورڈروں میں سے ۴۳۰ باقاعدہ پرنسپل سے اجازت لے کر گھروں کو روانہ ہو گئے - قومی یونیورسٹی کے لئے صرف ۱۰۰ طلبا رہ گئے - غرض ڈاکٹر صاحب نے نہ تو اسٹرائک کی نوبت آنے دی اور نہ کوئی تصادم آپس میں ہوا - انہوں نے زیادہ تر بار اولڈ بوائز پر ڈال دیا - تحریک کے مخالف علما سے تقریریں کرائیں - اشتعال آمیز باتوں سے قطعی پرہیز کیا - غرض اسی طرح ۲۶ اکتوبر کو کالج بند کر دیا گیا - جب دسمبر میں کالج کھلا تو وہ ترقی کر کے مسلم یونیورسٹی ہو گیا تھا - غرض ڈاکٹر صاحب کی دلیری، ہمت اور حسن تدبیر نے میدان مار لیا - یونیورسٹی کا دستور اساسی ڈاکٹر صاحب ہی کا تیار کیا ہوا تھا۔

(۵)

یکم دسمبر ۱۹۲۰ء کو ایک ناقص ایکٹ کے ذریعہ مسلم یونیورسٹی کا وجود عمل میں آیا - وائس چانسلر مہاراجہ صاحب محمود آباد نامزد کئے گئے - اور حکومت نے کورٹ کی تشکیل تک مکمل اختیارات مہاراجہ صاحب کو سونپ دئے - وہ ڈاکٹر صاحب کے سخت مخالف تھے انہوں نے ان کی پرنسپل کے تقرر پر بھی مخالفت کی تھی - اور اب بعہدہ وائس چانسلر کے عہدہ کے لئے وہ کسی انگریز کے متلاشی تھے اس وقت نہ کوئی انگریز اس بار کو اٹھانے کے لئے تیار تھا اور نہ کوئی مسلمان بھروسے کا مل سکا جو تمام حالات پر قابو پا سکے - مجبوراً ڈاکٹر صاحب ہی پرو وائس چانسلر بنا دیئے گئے - لیکن ہر معاملہ اور ہر کام میں مہاراجہ صاحب روڑے اٹکاتے تھے - اختیارات سب ان کے ہاتھ میں تھے اور وہ علیگڑھ سے اکثر غیر حاضر رہتے - ڈاکٹر صاحب کی ذمہ داریاں بے شمار لیکن اختیار کچھ بھی نہیں مگر ڈاکٹر صاحب جو علیگڑھ کی خدمت میں دھن کے پکے تھے ڈٹے رہے اور بقول میر ولایت حسین صاحب ” ڈاکٹر صاحب یونیورسٹی کے کام میں اپنے تعلیمی تجربہ اور اپنے اخلاق کی مدد سے راجہ صاحب کو

تک دیتے رہے۔"

مہاراجہ صاحب محمود آباد چونکہ یو پی گورنمنٹ میں ہوم ممبر بھی تھے۔ انہیں مجبوراً وائس چانسلری سے استعفا دینا پڑا کچھ دن نواب مزمل اللہ خان نے کام کیا لیکن دسمبر ۱۹۲۳ء میں صاحبزادہ آفتاب احمد خاں وائس چانسلر منتخب ہو گئے۔ اس انتخاب سے پہلے مہاراجہ صاحب نے صاحبزادہ صاحب کو ڈاکٹر صاحب کی طرف سے بدگمان کر دیا تھا چنانچہ انہوں نے بھی تعلیمی انتظام میں جس کی ذمہ داری ڈاکٹر صاحب پر تھی مداخلت شروع کر دی اور ایک ناگوار صورت پیدا ہو گئی۔ ان حالات سے مجبور ہو کر ڈاکٹر صاحب نے سولہ ماہ تک صبر و سکون سے حالات کا مقابلہ کرنے کے بعد استعفا دے دیا۔ ادھر یونیورسٹی کا جشن جوبلی ہونے والا تھا اور صاحبزادہ صاحب یہ محسوس کرتے تھے کہ بغیر ڈاکٹر صاحب کے کام چلنا ناممکن ہے انہوں نے ڈاکٹر صاحب کے خط کے جواب میں ایک طویل خط لکھا اور آخر میں یہ تحریر کیا کہ :-

"ہمارے ادارہ کی کامیابی ہر حالت میں اس امر کی مقتضی ہے کہ اس کو ان ریگولیشنوں کے ماتحت چلایا جائے جو تیار ہو چکے ہیں ...... اور اس معاملہ میں آپ کا اور صرف آپ کا تجربہ اور اثر نہایت ضروری ہوگا .... جوبلی کی کامیابی کا اثر قوم کی سیاسی تنظیم پر بہت گہرا پڑے گا .... آپ کا علیگڑھ کو ایسے موقع پر چھوڑنا ہماری امیدوں کے مخالف اور قومی مفاد کے خلاف ہوگا ...... میں آپ کا چھٹی تک پر جانا پسند نہیں کرتا لہذا آپ کا اشارہ جو استعفے کے متعلق ہے اس کو میں کبھی بھی خوش آمدید نہیں کہہ سکتا ——"

الغرض بڑی رد و قدح کے بعد ڈاکٹر صاحب نے استعفا واپس لے لیا اور جوبلی کے انتظام میں مصروف ہو گئے۔ ۲۵ دسمبر سے ۳۱ دسمبر ۱۹۲۵ء تک یہ تقریب جاری رہی۔ مسلم لیگ اور دیگر مختلف مسلم اداروں کے اجلاس بھی ہوئے۔ ہر مکتبۂ خیال کے مختلف زعما ایک جگہ جمع ہو گئے اور سات ہزار مسلمانوں کا ایک مرکز پر جمع ہو جانا حیرت انگیز امر تھا۔ ان ہی دنوں ہندو مسلم مناقشات کو ختم کرنے کا واحد حل ایک پمفلٹ کے ذریعہ تقسیم ملک کو بتایا گیا تھا یہ پمفلٹ اگرچہ "گاندھی جی کے نام کھلا خط" کے نام سے پہلے شائع ہو چکا تھا لیکن اسے اس موقع پر دوبارہ کتابی صورت میں شائع کیا گیا جس میں ملک کی مکمل تقسیم کی ایک اسکیم درج تھی۔ جوبلی کا یہ اہتمام و شان ڈاکٹر صاحب کی قوت تنظیم اور طلبا و اساتذہ کے اتحاد و ایثار اور جذبہ و جوش کا مظاہرہ تھا۔

مسلمانوں کا یہ اجتماع و جوش معاندین کو ایک آنکھ نہ بھایا اور اب یونیورسٹی کے خلاف معیار قابلیت اور تناسب نتائج کے متعلق پروپیگنڈا شروع ہوا اس میں سررشتۂ تعلیم کا انگریز ڈائرکٹر میکنزی اور یو پی کا مشہور ہندو اخباری لیڈر شریک تھے۔ اس سلسلے میں صاحبزادہ صاحب کی بعض تقاریر کو جو انہوں نے یونیورسٹی کی اندرونی بدنظمی کے متعلق مہاراجہ صاحب محمود آباد کو بدگمان کر دینے کی بنا پر کی تھیں بنیاد ٹھیرایا گیا۔ غرض صاحبزادہ صاحب اور ڈاکٹر صاحب کے نظریات میں اختلافات بڑھتے ہی گئے ان اختلافات کو ایک طرف تو ہوا دینے والے چند خود غرض علیگڑھ ہی میں موجود تھے۔ اس کے علاوہ حکومت کی سرپرستی بھی حاصل تھی۔ یہ اختلافات تو یوں ختم ہوئے کہ صاحبزادہ صاحب میدان سے ہٹ گئے اور دسمبر ۱۹۲۶ء میں ان کی میعاد ختم ہونے پر سر ولیم میرس گورنر یو پی کے ایما سے نواب سر مزمل اللہ خان کا انتخاب ہو گیا۔

لیکن جشن جوبلی میں مسلم لیگ کا اجلاس منعقد ہونا قائد اعظم اور دیگر زعما کا وہاں آنا صاحبزادہ آفتاب احمد خاں کا سوراج کی قرارداد کی تائید کرنا یہ سب امور ایسے تھے کہ صوبہ کے متعصب گورنر کو ایک آنکھ نہ بھاتے تھے وہ نہیں چاہتا تھا کہ مسلم طلبا میں سیاسی بیداری پیدا ہو وہ چاہتا تھا کہ تعداد طلبا محدود ہو اور اساتذہ میں انگریزوں کی اکثریت ہو چنانچہ اس نے ۱۹۲۳ء میں اپنی تقریر کے دوران جب کہ سپاس نامہ کا جواب دے رہا تھا صاف طور پر کہا کہ یونیورسٹی کی ترقی کے لئے ضروری ہے کہ آپ سر سید کے نصب العین کی طرف لوٹ جائیں

اور وائسرائے نے بھی ایک تقریر میں کہا کہ :-

"جو مراحل درپیش ہوں گے ان کے حل کرنے کے لئے آپ سرسید کے قائم کردہ اصولوں کو رہبر بنائیں گے"——

یونیورسٹی کی تاسیس کے دور میں یو پی گورنمنٹ کے وزیر تعلیم مسٹر چنتامنی تھے جو ایک متعصب ہندو تھے ان کا رویہ ہمیشہ غیر ہمدردانہ رہا ان کا آدمی سررشتۂ تعلیم کا ڈائرکٹر سیکنڈری تھا اسے نہ صرف یونیورسٹی سے بلکہ خاص طور پر ڈاکٹر صاحب سے پرخاش تھی کیونکہ صوبہ کی کونسل میں ڈاکٹر صاحب ہی ایک ماہر تعلیم تھے جو سیکنڈری کی تعلیمی پالیسی پر شدید نکتہ چینی کیا کرتے تھے۔ اس نے مخالفت شروع کی اور چنتامنی کا اخبار لیڈر یونیورسٹی اور ڈاکٹر صاحب کے خلاف مضامین شائع کرتا تھا۔ ادھر صاحبزادہ صاحب نے یونیورسٹی سے الگ ہوتے ہی ایک پمفلٹ یونیورسٹی کے انتظامات کے خلاف شائع کر دیا۔

ان حالات میں وائسرائے نے بیگم صاحبہ بھوپال کو جو یونیورسٹی کی چانسلر تھیں اور ایک تحقیقاتی کمیشن قائم کرنے کا پرزور مشورہ دیا۔ چنانچہ رحمت اللہ کمیٹی کا قیام عمل میں آیا۔ غرض رحمت اللہ کمیشن نے کام شروع کر دیا۔ باہمی اختلافات کیا بلکہ مخالفت کا برا ہو کہ بعض حضرات نے شہادت کے دوران میں بدترین رذائل کا اظہار کیا۔ اور وہ وہ الزام ڈاکٹر صاحب کے خلاف تراشے گئے کہ جن کے خیال سے نفرت کا جذبہ ابھرتا ہے۔ لیکن کمیشن کا کام خفیہ ہدایات کے مطابق ڈاکٹر صاحب کو ہٹانا مقصود تھا۔ ساری رپورٹ میں کہیں تعلیمی مسائل پر ایسی بحث نہیں ہے جس سے اصلاح کا پہلو نکلتا ہو۔ جو رطب و یابس ملا رپورٹ میں درج کر دیا گیا۔ کمزوریاں کونسی یونیورسٹی میں نہیں ہیں۔ اور ذمہ داری کسی کی ہو وہ سب ڈاکٹر صاحب کے ہی سر تھوپی گئی اور بمصداق طویلہ کی الا بلا بندر کے سر۔ سب کی پاداش میں ایک مخلص کارکن کو ذمہ دار ٹھیرایا گیا کیونکہ اس وقت کی حکومت کا منشا ہی یہ تھا۔ لیکن کمیشن کو ڈاکٹر صاحب کی قابلیت و خدمات کا اعتراف کئے بغیر چارہ ہی نہ تھا چنانچہ کمیشن رپورٹ کے آخر میں لکھا کہ :-

"ہم ڈاکٹر ضیاء الدین کی پختہ علمی قابلیت ان کی کالج اور بعد ازاں یونیورسٹی کی طویل خدمات اور علیگڈھ سے ان کے عمیق جذبہ محبت کے معترف ہیں لیکن ہم کو یہ بیان کرتے ہوئے افسوس ہوتا ہے کہ حالیہ مشکلات میں ان کے قریبی ... تعلقات کے پیش نظر ان کی خدمات کا یونیورسٹی میں جاری رہنا سلامت روی اور ترقی کی اس نئی روح کے منافی ہوگا جو کہ ادارہ کی آئندہ کامیابی کے لئے ضروری ہے۔ غالباً ڈاکٹر ضیاء الدین کے لئے بہترین راہ یہی ہوگی کہ وہ ریٹائر ہونے سے پہلے رخصت لے لیں"

ڈاکٹر صاحب نے رپورٹ دیکھنے کے بعد ۲۶ مارچ ۱۹۲۸ء کو وائس چانسلر کے سامنے اپنا استعفا پیش کر دیا۔ چونکہ اس خط سے جو ڈاکٹر صاحب نے لکھا تھا ان کی شخصیت اور کارناموں پر روشنی پڑتی ہے لہذا اُسے بے کم و کاست ہدیۂ ناظرین کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ وہ خط یہ تھا :-

۲۶ مارچ ۱۹۲۸ء

بخدمت جناب وائس چانسلر صاحب مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

مائی ڈیر نواب صاحب۔

۱۸۹۵ء میں بی اے کا امتحان پاس کرنے کے بعد میں ڈپٹی کلکٹری کے لئے نامزد ہوا مگر تھیوڈور بک نے اس کے مقابلہ میں مجھ کو اسسٹنٹ پروفیسری کی حیثیت سے اسٹاف میں شریک ہونے کا مشورہ دیا۔ میرے تقرر کے وقت سرسید علیہ الرحمتہ سے جو ملاقات ہوئی اس میں مجھ سے پانچ سال کی ملازمت کا اقرار نامہ لکھنے کا مطالبہ کیا گیا تھا مگر میں نے اس وقت عرض کیا کہ میرا ارادہ تو کالج میں تمام عمر خدمت کرنے کا ہے اس پر جو اقرار نامہ کا مسودہ انہوں نے میرے لئے خود لکھا تھا اسے پھاڑ ڈالا۔ ۱۹۰۱ء میں میں نے ڈی ایس سی کی ڈگری

ڈویژن میں حاصل کی جس کے بعد گورنمنٹ آف انڈیا نے مجھ کو انگلستان جانے کے لئے اسکالرشپ عطا فرمایا سنہ ۱۹۰۳ء میں میں نے ٹرنٹی کالج
کیمبرج سے ریسرچ کی ڈگری اور سنہ ۱۹۰۴ء میں سر اسحاق نیوٹن اسٹوڈنٹ شپ اور سنہ ۱۹۰۶ء میں میں نے گوٹنگن یونیورسٹی جرمنی سے پی ایچ ڈی
کی ڈگری حاصل کی میں یورپ میں ہی تھا کہ مجھ کو انسپکٹر مدارس کا عہدہ دیا جا رہا تھا۔ مگر میں نے اس سے انکار کر دیا وہاں سے واپسی پر میں علیگڈھ
میں سنہ [illegible] میں ریاضی کا پروفیسر مقرر ہوا سنہ ۱۹۱۰ء میں مسٹر سوئل کی ماتحتی میں میں سینیئر ٹیوٹر کیا گیا سنہ ۱۹۱۱ء میں مسلم یونیورسٹی کے کانسٹی ٹیوشن
کا پہلا مسودہ تیار کرنے کے لئے کانسٹی ٹیوشن کمیٹی کا سکریٹری مقرر ہوا۔ سنہ ۱۹۱۴-۱۵ء میں مسٹر سوئل کی عدم موجودگی میں ایم اے او کالج علیگڈھ
کا قائم مقام پرنسپل مقرر ہوا جنگ طرابلس جنگ بلقان اور مسجد کانپور کے واقعہ کی وجہ سے ہندوستان کے مسلمانوں میں ایک عام ہیجان
پیدا ہو گیا تھا جس کا اثر کالج کے طلبا پر بھی پڑا ان میں نہایت بے چینی ظاہر تھی اور ہماری درسگاہ میں ڈسپلن کا نام بھی باقی نہ رہا تھا۔ اپنی قائم
مقامی کے زمانے میں باوجود مخالف اثرات کے مجھے طلبا کے دلوں میں کالج کی عظمت قائم رکھنے میں کامیابی ہوئی۔

سنہ ۱۹۱۷ء میں کلکتہ یونیورسٹی کمیشن کا ممبر مقرر ہوا میری عدم موجودگی میں آنریری سیکریٹری بورڈ آف ٹرسٹیز اور یورپین اسٹاف
میں کچھ غلط فہمیاں پیدا ہو گئیں آخرکار یورپین اسٹاف نے استعفا دیدیا۔ سنہ ۱۹۱۹ء میں جب کمیشن سے فارغ ہو کر آیا تو کالج میں لڑکوں کی
تعداد (۱۸۰) رہ گئی تھی کالج کی شہرت کم ہو رہی تھی اولڈ بوائز نے یہ خیال کر کے کہ کالج کی قدیم روایات کا خاتمہ ہو چکا ہے علیگڈھ میں دلچسپی
لینی چھوڑ دی۔ نومبر سنہ ۱۹۱۹ء میں سر ہارکورٹ بٹلر کی تشریف آوری کے موقع سے فائدہ اٹھا کر میں نے قریب پانچ سو اولڈ بوائز کو مدعو کیا
اور ہز اکسلنسی کی خاص توجہ کو دیکھ کر ان میں بھی کالج کے معاملات سے دلچسپی پیدا ہو گئی۔ دوسرے سال تحریک ترک موالات کا حملہ ہوا اور
ایمانداری سے میرا یہ یقین تھا کہ اگر ایم اے او کالج نہ رہا تو مسلمانوں کی قوم کو سخت نقصان ہو گا اس انتشار کی حالت میں کالج کو بند کر
دیا گیا اور اس تعلیم گاہ کو بچانے کے لئے مسلم یونیورسٹی ایکٹ کا نفاذ کیا گیا تارکان موالات نے اپنی نیشنل یونیورسٹی ہماری یونیورسٹی کے متصل
قائم کر دی تھی میری راہ میں سخت دشواریاں حائل تھیں لیکن میں نے متواتر محنت اور جانفشانی سے والدین اور اولڈ بوائز کی ایک بڑی تعداد
کو مدعو کر کے ان کی مدد سے یونیورسٹی کے اقتدار کو قائم کر دیا میں نے اسٹرائک کی صورت کو بدل کر لڑکوں پر ان کی درسگاہ کی ذمہ داری
کا پورا بار ڈال دیا۔ جوبلی کے موقع پر جب کہ قریب سات ہزار مہمان ہندوستان کے ہر حصہ سے ایم اے او کالج کی پچاسویں سالگرہ کے منانے
کو جمع ہوئے تھے یہ اقتدار اور بھی مستحکم ہو گیا۔ اس وقت لوگوں نے بانی کالج کے کام کو جاری رکھنے کے لئے بہت دلچسپی کا اظہار کیا۔

یونیورسٹی کے قیام کے پہلے کئی سال تک نہ کوئی قوانین تھے اور نہ کوئی ضوابط تھے میں نے اپنی سالانہ رپورٹ میں جو فروری سنہ ۱۹۲۴ء
میں پڑھی گئی تھی مندرجہ ذیل فقرہ لکھا تھا۔

”جون سنہ ۱۹۲۳ء تک مسلم یونیورسٹی کے آرڈی ننس وصول نہیں ہوئے تھے اور اس کے قیام کے اول اٹھارہ ماہ تک
حکومت ہند نے وائس چانسلر کو پورا اختیار دے دیا تھا کہ کسی قسم کے آرڈی ننس یا ریگولیشن بنا لیں حتیٰ کہ قوانین کی جس
دفعہ کو چاہیں نظر انداز کر دیں یونیورسٹیوں کی تاریخ میں یہ پہلا موقع ہے کہ شخص واحد کو اور وہ بھی ایسے شخص کو جو موقع پر
موجود نہ ہو اس قدر عرصہ کے لئے اس طرح سے مطلق العنانی کے ساتھ اختیارات دے دئے جائیں بڑا معجزہ ہے۔ کہ
یونیورسٹی کا اس دوران میں خاتمہ نہ ہو گیا۔“

بد قسمتی سے مجھ کو اپنے زمانہ میں تین مشکلات کا مقابلہ کرنا پڑا (۱) آنریری سیکریٹری محمڈن کالج اور وائس چانسلر نے مجھ کو کافی
امداد نہیں دی اور اکثر موقعوں پر انہوں نے کھلم کھلا اسٹاف میں میرے خلاف پارٹیاں قائم کیں (۲) میرے دفتر میں کبھی لائق آدمی نہیں
ملے (۳) بعض ممبران اسٹاف نے میرے ساتھ مل کر کبھی کام نہیں کیا اور اکاڈمک کونسل میں میرے خلاف ایک مضبوط پارٹی بنا رکھی

رکھی۔ آپ نے اپنے عہدہ کا چارج لینے کے بعد نہایت نیک نیتی کے ساتھ اسٹاف میں اتحاد عمل پیدا کرنے کی کوشش کی مگر آپ کو معلوم ہے کہ کس طرح آپ کی کوششیں رائگاں گئیں۔

موجودہ کانسٹی ٹیوشن کے مطابق پرو وائس چانسلر پر درس گاہ کے ہر شعبہ کے متعلق پوری ذمہ داری ہے لیکن اس کو کسی ادنیٰ سے ادنیٰ نالائق اور لاپرواہ ممبر اسٹاف کی تنخواہ کے معمولی اضافہ کو بھی رد کرنے کا اختیار نہیں ہے۔ تمام باتوں کا دار و مدار وائس چانسلر کی مرضی پر ہے خواہ وہ پرو وائس چانسلر کی تجاویز کو اگزکٹو کونسل میں پیش کرے یا نہ کرے۔ سابق وائس چانسلر راجہ صاحب محمود آباد نے صاف احکام تحریری دیئے تھے کہ پرو وائس چانسلر کو کوئی اختیار نہیں ہے کہ وہ اپنی تجاویز اگزکٹو کونسل میں بلا واسطہ بھیج سکے اور اس پر اس وقت سے عمل ہو رہا ہے۔ پرو وائس چانسلر کی حیثیت "ڈکٹیٹر" کے بالکل برعکس ہے خدا کرے کہ میرے جانشین مجھ سے زیادہ خوش قسمت ہوں۔

لیکن میں سمجھتا ہوں کہ یونیورسٹی کے چلانے میں سب سے بڑی جو مشکل ہے وہ یہ ہے کہ پرو وائس چانسلر پر تمام ذمہ داریاں ہیں مگر اسے کوئی اختیار نہیں ہے اور وائس چانسلر کو تمام اختیارات حاصل ہیں۔ مگر اس پر ذمہ داری کچھ بھی نہیں ہے۔

ایم اے او کالج کے پرنسپل صحیح طور پر یا غلطی سے اپنے سابق طلبا کو ملازمتیں دلانا اپنا فرض خیال کرتے تھے تاکہ وہ مطمئن رہیں۔

نواب وقار الملک مرحوم کے مستعفی ہونے کے بعد سے میں نے اس فرض کو انجام دیا اور ایمانداری سے میں اس کو کالج کی روایات میں خیال کرتا تھا کہ جن کو سرسید علیہ الرحمۃ۔ نواب محسن الملک، مسٹر تھیوڈور بک اور سر تھیوڈور ماریسن نے قائم کیا تھا ان تمام صاحبان سے میرا گہرا تعلق رہا ہے اور ان کے ساتھ کام کرنے کا مجھے فخر حاصل ہے

میری رائے خواہ وہ غلط ہو یا صحیح ہمیشہ یہی رہی کہ گورنمنٹ سے خوشگوار تعلقات قائم رکھنا یونیورسٹی کے بنیادی مقاصد میں سے ایک مقصد ہے میں نے ہمیشہ نیک نیتی سے اس روایت کو برقرار رکھنے کی کوشش کی اگرچہ اس میں مجھ کو اکثر کامیابی نہیں ہوئی میرا اندازہ ممکن ہے کہ اکثر موقعوں پر غلط ہوا ہو اور ممکن ہے کہ اکثر میری رائے صحیح نہ ہوئی ہو لیکن میرے ذہن میں ہمیشہ ایک ہی خیال رہا ہے اور وہ یہ کہ جو کچھ میری سپردگی میں ہے اس کو بہترین مصرف میں لاؤں۔

۱۹۲۵ء سے میں پرو وائس چانسلری سے مستعفی ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔ ۲۷ ر اپریل ۲۵ء کو تیس سال ملازمت کرنے کے بعد میں نے سابق وائس چانسلر صاحب سے استدعا کی تھی کہ وہ اکتوبر ۲۵ء سے مجھ کو پرو وائس چانسلری کے فرائض سے سبکدوش کر دیں۔ لیکن انہوں نے ایک خط مورخہ یکم مئی ۲۵ء میں مجھ کو یونیورسٹی کے مفاد کے خیال سے استعفا دینے سے منع فرمایا۔

ایک سال بعد ۱۹۲۶ء میں انہوں نے میرے دوبارہ تقرر کی مندرجہ ذیل الفاظ میں سفارش کی:۔

"یونیورسٹی کو ایسے پرو وائس چانسلر کی ضرورت ہے جو قوم کی خاص ضرورتوں اور ملک کے مروجہ تعلیمی نظام سے واقف ہو اور پرو وائس چانسلر کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ ملک کے مختلف حصوں کے طلبا کے والدین سے ذاتی تعلقات ہوں۔
ڈاکٹر ضیاء الدین کی خاص لیاقت اور قابلیت میں یہ تمام اوصاف پائے جاتے ہیں"

صاحبزادہ آفتاب احمد خاں کے ریٹائر ہونے کے بعد میں نے آپ سے مئی ۱۹۲۷ء میں عرض کیا تھا کہ مجھ کو میرے موجودہ فرائض سے سبکدوش کر دیا جائے آپ نے مجھ سے زبانی فرمایا تھا کہ تحقیقاتی کمیٹی کی رپورٹ کے پیش ہونے تک میں توقف کروں۔

اس قدر عرض کر دینا بے جا نہ ہوگا کہ دوران قیام علیگڈھ میں مجھ کو مختلف محکموں کی ملازمت ملتی رہی ہے لیکن میں نے اپنی تقرری کے وقت جو وعدہ کیا تھا اس کا لحاظ کر کے میں نے ان کے قبول کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ اب مجھ کو پورے طور پر یقین ہو گیا ہے کہ میں یونیورسٹی کی بہتر خدمت اس سے اپنے باضابطہ تعلقات ختم کرنے سے زیادہ کر سکتا ہوں لہذا بغیر کسی پس و پیش کے اپنے استعفے کو پیش کر کے اپنا فرض

ادا کرتا ہوں اور آپ سے متمنی ہوں کہ جلد سے جلد جس طرح بھی ہو آپ اور اگزیکٹو کونسل مناسب سمجھے اسے منظور کر لیا جائے ——

آپ کا صادق

ضیاء الدین احمد

استعفا بصد اعتراف خدمات منظور کر لیا گیا اور اگزیکٹو کونسل نے طے کیا کہ "اس استحقاق رخصت کی بجائے جو کہ ان کو حاصل ہے چھ ماہ کی تنخواہ دی جائے جو نو ہزار روپیہ ہوتی ہے" —— لیکن ڈاکٹر صاحب نے بذریعہ ایک خط وائس چانسلر کو مطلع کیا کہ مجھے اس رقم کے لینے سے انکار ہے۔ انہوں نے لکھا کہ :-

"میں نے آپ کو اپنے استعفے کے دوران میں لکھا ہے کہ اس ادارہ کی خدمت میں میرا مقصد کام سے محبت اور فرض کی ادائیگی کو پورا کرنا رہا ہے اور میں نے اپنی تیس سال کی ملازمت میں کبھی فرلو حاصل نہیں کی اور نہ کبھی کالج کے زمانہ تعطیلات کو کسی کام میں لایا اور ہمیشہ ان بڑی تعطیلوں میں یونیورسٹی کے مفاد کی خاطر اپنے خرچ سے دورہ کرتا رہا اور میرا ضمیر مطمئن رہا کہ میں نے اپنا فرض پورا کیا ہے۔ یہی میرا انعام ہے میں آپ کا اور اگزیکٹو کونسل کا اس مہربانی کے لئے مشکور ہوں۔ لیکن مجھے افسوس ہے کہ میں کوئی فرلو یا اس زمانے کے حق رخصت کی تنخواہ قبول نہیں کر سکتا اور نہ میں اس چیز کو منظور کر سکتا ہوں جس کو میں اپنے زمانۂ ملازمت میں جائز نہیں سمجھتا تھا"——

بہرحال کمیشن کے قائم کرنے سے جو مقصد تھا یعنی مسلمانوں کی تعلیمی ترقی میں رکاوٹ ڈالی جائے اور ڈاکٹر ضیاء الدین کو الگ کر دیا جائے وہ حاصل ہو گیا۔ جس شان کے ساتھ ان کا استقبال یورپ سے واپسی پر کیا گیا تھا اس سے کہیں زیادہ دھوم دھام کے ساتھ انہیں رخصت کیا گیا۔ علیگڈھ سے رخصت ہونے کے بعد ایسے رہے کہ جیسے علیگڈھ سے کوئی واسطہ ہی نہیں دوست احباب سے خط و کتابت جاری رہتی تھی لیکن علیگڈھ کے نظم و نسق کے متعلق ایک حرف بھی نہیں ہوتا تھا۔ خدا نے انہیں غیر معمولی ضبط کا مادہ عطا کیا تھا یہ کام ہر ایک انسان کا نہیں ہے کہ اس طرح یک سُو اور بے تعلق ہو جائے۔

ڈاکٹر صاحب مئی ۲۸ء میں یورپ چلے گئے اس سفر کا مقصد تعلیم پر اپنی کتاب کے لئے مواد جمع کرنا تھا دوران قیام انگلستان میں دو لطیفے ہوئے جو قابل ذکر ہیں۔ ڈاکٹر صاحب سے لندن ٹائمز کے تعلیمی ایڈیٹر نے ملاقات کی۔ دوران ملاقات میں اس نے حیران ہو کر کہا کہ میری سمجھ میں یہ بات نہیں آئی کہ ۱۹۲۶ء میں تو مسلسل یہ صدا اٹھتی رہی ہندستان میں علیگڈھ سے بہتر کوئی یونیورسٹی نہیں لیکن چھ ماہ بعد ہی یہ کہا جانے لگا کہ اس سے بدتر کوئی ادارہ نہیں۔ عروج ترقی سے اترنے کے لئے کم سے کم پانچ سال کا عرصہ درکار ہے ڈاکٹر صاحب نے فوراً جواب دیا کہ ۱۹۲۵ء کی جوبلی اس کا سبب ہے۔ جب تک یونیورسٹی ترک موالات کا مقابلہ کرتی رہی حکومت تعریفیں کرتی رہی اور جب جوبلی پر تمام مسلم زعما ایک جگہ جمع ہو گئے تو حکومت کو خوف ہوا کہ اب پھر علیگڈھ مرکزی حیثیت حاصل کرنے والا ہے اس لئے قوت توڑنے کے لئے سب کچھ کیا گیا یونیورسٹی ویسی ہے جیسی تھی۔ دوسرا لطیفہ یہ ہے۔ کہ ایک روز سر ولیم میرس سابق گورنر یوپی نے جو کہ اب انڈیا کونسل کے ممبر تھے ڈاکٹر صاحب کو لنچ پر مدعو کیا دوران گفتگو میں انہوں نے ایک سوال کیا کہ علیگڈھ میں اب کچھ Troubles تو نہیں ہیں ڈاکٹر صاحب نے برجستہ جواب دیا آپ خود Troubles تھے آپ کے آنے کے بعد کچھ بھی نہیں۔

۱۹۳۰ء میں ڈاکٹر صاحب مرکزی اسمبلی کے انتخاب میں کامیاب ہو گئے اور اسمبلی میں پہنچ کر انہوں نے ملک و قوم کی بیش بہا خدمات کیں۔

ڈاکٹر صاحب کی سبکدوشی کے بعد سر راس مسعود کا انتخاب ہوا اور حیدری عہد کے بعد سر شاہ سلیمان کو کام سپرد کیا گیا جیسا کہ ایک

جماعت یونیورسٹی کے کاموں میں روڑے اٹکانے والی موجود تھی اس جماعت نے سر شاہ سلیمان اور سر راس مسعود جیسے نیک نفس لوگوں کو بھی چین سے نہ بیٹھنے دیا۔ اکثر مشاہیر قوم کو خیال پیدا ہوا کہ یونیورسٹی کی ترقی کے لئے ڈاکٹر صاحب کا وجود ناگزیر ہے۔ ادھر یوپی کے گورنر نے ڈاکٹر صاحب کو وائس چانسلری کے لئے آمادہ کرنا چاہا لیکن انہوں نے انکار کر دیا۔ بعد ازاں وائسرائے لارڈ ولنگڈن نے ڈاکٹر صاحب سے بوقت ملاقات اصرار کیا کہ وہ وائس چانسلری کے امیدوار بن جائیں۔ چنانچہ وہ مجبوراً راضی ہو گئے لیکن انہوں نے صاف طور پر کہہ دیا تھا کہ نواب صاحب بھوپال چانسلری سے ضرور الگ ہو جائیں گے اور انہیں میرا انتخاب قبول نہ ہو گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ انتخاب سے ایک روز قبل نواب صاحب بھوپال نے استعفا دے دیا۔ اور ڈاکٹر صاحب وائس چانسلر منتخب ہو گئے۔ اب یہ بڑا سخت سوال درپیش تھا۔ کہ چانسلر کون ہو نواب صاحب بھوپال کو خیال تھا کہ کوئی مناسب آدمی ان کے درجہ کا مشکل ہی سے ملے گا لیکن ڈاکٹر صاحب اور لارڈ ولنگڈن کے ذاتی اثر سے نظام دکن نے چانسلر بننا منظور کر لیا اور اگست میں باقاعدہ ان کا انتخاب ہو گیا۔ نواب محمد اسماعیل خاں کو شکست ہوئی۔ تین سال کے بعد ۱۹۳۶ء میں دوبارہ انتخاب ہونے لگا تو پھر اسماعیل خاں مقابلہ کے لئے کھڑے ہوئے لیکن اس مرتبہ چند اراکین کورٹ کو یہ معاملہ سپرد کر دیا گیا ان کے مشورہ سے دونوں دست بردار ہو گئے اور سر شاہ محمد سلیمان کا انتخاب ہو گیا۔ لیکن ۱۹۴۰ء میں شاہ صاحب کا انتقال ہو گیا اور پھر یہ مسئلہ پیش ہوا۔ ڈاکٹر صاحب کو پیش کیا گیا اس مرتبہ سر سکندر حیات خاں اور سر اکبر حیدری نے بڑے انتظام و زور شور سے ڈاکٹر صاحب کی مخالفت کی اور سر شیخ عبدالقادر کو پیش کیا۔ غرض اس مرتبہ بھی ڈاکٹر صاحب ہی کامیاب ہوئے۔ اس بات کی بھی کوشش کی گئی کہ گورنر جنرل کی منظوری حاصل نہ ہو سکے لیکن مخالفین اس میں بھی ناکامیاب ہوئے۔ الیکشن کے زور شور میں جب ووٹ کے لئے ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب سے درخواست کی گئی تو انہوں نے سر شیخ عبدالقادر مرحوم سے فرمایا کہ آپ نام واپس لے لیں تو اچھا ہی ہے کیونکہ الیکشن میں ضیاءالدین سے نہ شیطان جیت سکتا ہے اور نہ جبرائیل۔

اپریل ۱۹۳۷ء میں نظام کی والدہ کا انتقال ہو چکا تھا اب ڈاکٹر صاحب جون میں تعزیت کے لئے حیدرآباد گئے وہاں کے اخباروں میں ڈاکٹر صاحب کے خلاف سر اکبر حیدری کے زیر اثر بہت زہر اگلا جا چکا تھا۔ لیکن نظام نے نہایت اخلاق و مہربانی سے خیر مقدم کیا اور کئی مرتبہ شرف ملاقات بخشا اور بذریعہ فرمان علیگڈھ یونیورسٹی میں ایک مسجد "مسجد زہرا" کے نام سے تعمیر کئے جانے کا اعلان کیا۔

تیسری بار اپریل ۱۹۴۳ء میں ڈاکٹر صاحب کا انتخاب بلا مقابلہ عمل میں آیا۔

ڈاکٹر صاحب جانتے تھے کہ ان کی قوم تعلیم میں بہت پیچھے ہے اور اس وجہ سے ملک میں مسلمانوں کا وقار ختم ہو چکا ہے ملک کے نظم و نسق میں بھی انہیں جیسا چاہئے حصہ نہیں ملتا لہٰذا اس مقصد کے حصول کے لئے تعلیم کو عام کیا جائے اور تعلیم یافتہ لوگوں کی تعداد بڑھائی جائے۔ اور خصوصاً ٹکنیکل تعلیم کا مسلمانوں میں بالکل فقدان ہے لہٰذا اس طرف توجہ کرنی چاہئے۔ ہندو تمام سرکاری شعبوں پر حاوی ہیں اور وہ بوجہ تعصب مسلمانوں کو ملازمتوں میں گھسنے نہیں دیتے۔ اگر مسلمان سوچتے رہے کہ پیسہ کافی ہو تو کام شروع کیا جائے تو یہ ناممکن ہے جس طرح بن سکے ہر قسم کی تعلیم جاری کر دینی چاہئے جب ایک کام جاری ہو جائے گی تو لامحالہ قوم اور حکومت دونوں اس طرف توجہ دیں گے اور امداد حاصل ہو گی اور ہمارے اداروں سے تربیت یافتہ افراد جیسے بھی نکلیں گے کام سنبھال لیں گے انہی خام کاروں میں پختہ کار بھی نکل آئیں گے اسی نظریہ کے تحت انہوں نے اپنی وائس چانسلری کے دور میں متعدد شعبے اضافہ کرنے شروع کر دئے چنانچہ انجینئرنگ کالج، زراعتی کالج، ٹکنیکل کالج، میڈیکل کالج، ٹیچرز ٹریننگ کالج وغیرہ کی اسکیمیں تیار کرتے رہتے تھے اور حسب موقع ان اداروں کا اجرا بھی کیا گیا اگرچہ وہ چھوٹے پیمانے ہی پر ہوا۔ وہ مسلمانوں کو ہر شعبہ زندگی میں دوسروں کی محتاجی سے الگ دیکھنا چاہتے تھے۔ انہوں نے جنگ کے حالات سے فائدہ اٹھا کر عسکری تربیت کے لئے بھی ادارہ کھول دیا۔ طبیہ کالج اور انجینئرنگ کالج کے فارغ التحصیل طلبا نے مسلمانوں کی بیش بہا خدمات انجام دیں اور دے رہے ہیں انجینئرنگ کالج کے ان ہی انجینئروں نے پاکستان

میں آکر اس محکمہ کو سنبھالا۔

ڈاکٹر صاحب کو ہندوستان اور یورپ کے ممالک کے طرزِ تعلیم کے متعلق نہایت ہی وسیع معلومات تھیں اس ضمن میں شاید ہی اس ملک میں ان کے مقابلہ کا کوئی شخص نکلے۔ ان کا نظریہ تھا کہ تعلیمی اداروں کو زیادہ سے زیادہ اپنے کاروبار میں آزادی ملنی چاہئیے اور حکومت کو کم سے کم دخل انداز ہونا چاہئیے۔ اور جس قدر سہولتیں عوام کو پہنچ سکتی ہیں وہ پہنچائی جائیں تعلیم کسی خاص طبقہ کا اجارہ بن کر نہ رہ جائے۔

امتحانات کے مروجہ طریقہ کو بہت بُرا سمجھتے تھے ان کا خیال تھا کہ یہ طریقہ ظالمانہ ہے اور ان کے نزدیک ایک خاص وقت میں پرچہ حل کرا کر اور نمبر دے کر طالب علم کی کئی سال کی محنت پر آخری فیصلہ کر دینا غیر منصفانہ ہے کیونکہ ایک ہی پرچہ کو اگر مختلف ممتحن دیکھیں تو نتیجہ مختلف نکلتا ہے۔ ان کے خیال میں یہ بہتر تھا کہ اساتذہ کو طلباء کی روز بروز ترقی اور اہلیت و صلاحیت کا علم ہونا چاہئیے۔ مروجہ طریقہ امتحان ان کے نزدیک حافظہ کا امتحان تھا وہ طالب علم کی علمی اور دماغی ارتقا کا پیمانہ نہیں تھا۔ طالب علم کو پاس ہونے کے لئے نمبر حاصل کرنے تک وہ نرم رہتے تھے لیکن جوں جوں آگے بڑھتے سخت ہوتے جاتے تھے۔ وہ کہا کرتے تھے کہ اصول و قوانین انسان کے لئے بنائے گئے ہیں اور انسان ان سے بنائے ہیں اگر اصول و قوانین کی پابندی سے انسان کو نقصان کا اندیشہ ہو تو قوانین کو نظر انداز کر دینا چاہئیے انسان کو گرانا نہ چاہئیے انسان کے وضع کردہ قوانین خدائی قوانین نہیں ہیں۔ انہوں نے طریقہ امتحان پر ایک کتاب بھی لکھی تھی اور اس کے بعد سے ممتحن بننا چھوڑ دیا تھا۔

وہ چاہتے تھے کہ ایسے طلباء مسلمانوں میں پیدا ہوں کہ وہ خواہ کیسی ہی مصیبت میں گھر جائیں کبھی بددل نہ ہوں اور ہمت نہ ہاریں اور اپنے لئے راستہ بنائیں اسی لئے وہ رسمی درس و تدریس سے زیادہ تربیت پر زور دیتے تھے ان کا خیال تھا کہ طلباء میں ضبط و نظم بغیر کسی تعزیری کارروائی کے قائم کیا جائے اور اسی پر ان کا عمل تھا۔ ہونہار طلبا کے ساتھ ہر قسم کی مراعات کرتے تھے۔ اپنے شاگردوں کو نہایت شفقت سے کام کرنا سکھاتے تھے۔ ان کا دروازہ ہر وقت طلبا کے لئے کھلا رہتا تھا اور ملاقات میں کوئی روک ٹوک نہ تھی۔ ایم اے کے طلبا کو ہفتہ میں ایک بار مزید گھر پر مدعو کرتے تھے اور اس وقت نہ صرف ان کے مضمون کے متعلق بات چیت ہوتی بلکہ قومی مسائل پر بھی گفتگو ہوا کرتی تھی انہیں اپنے شاگردوں کے متعلق جزئیات تک سے واقفیت رہتی تھی اور اگر برسوں بعد بھی کوئی مل جاتا تو اپنی غیر معمولی قوت یادداشت کی بنا پر اس کے پرانے واقعات دہرا دیتے اس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ طلبا کو ان کے ساتھ فرزندانہ عقیدت ہو جاتی تھی۔ اس ضمن میں ایک نہایت دلچسپ واقعہ چودھری خلیق الزمان صاحب سے منسوب ہے۔ چودھری صاحب موصوف نے فرمایا کہ جنگ بلقان کے زمانے میں طلبا مسجد میں جلسے کرتے اور حکومت برطانیہ کے خلاف تقاریر ہوتیں۔ ایک دن یہ معلوم ہوا کہ کوئی شخص ان تمام باتوں کو مسٹر ٹول پرنسپل تک پہنچا دیتا ہے۔ اس کی چھان بین کے لئے چودھری صاحب ہی کے کمرہ پر مختلف ٹیموں کے کپتان اور یونین کے وائس پریذیڈنٹ جمع ہوئے اور قرآن شریف پر ہاتھ رکھ کر اپنی اپنی رائے دینے لگے کہ کون شخص مسٹر ٹول کو خبریں پہنچاتا ہے۔ ایک صاحب نے بتایا کہ رائڈنگ اسکول کے کپتان صاحب خبریں پہنچاتے ہیں۔ بعد ازاں یہ طے ہوا کہ چودھری صاحب رات ہی رات میں ایک اشتہار کا مسودہ تیار کر کے اور اسے اسکول کے بچوں سے اُلٹے ہاتھ سے لکھوا کر اس چغل خور کی قلعی کھولنے کے لئے مختلف مقامات پر چسپاں کرائیں چنانچہ چودھری صاحب نے ایسا ہی کیا صبح کو کپتان مذکور نے ان اشتہاروں کو نوچنا شروع کیا۔ شدہ شدہ یہ خبر ڈاکٹر صاحب کو بھی پہنچی اور چونکہ چودھری صاحب ہاؤس مانیٹر بھی تھے ان کے پاس آئے اور دریافت کیا کہ یہ اشتہار بازی کس کا کام ہے چودھری صاحب نے لاعلمی کا اظہار کیا اس کے بعد ڈاکٹر صاحب چلے گئے۔ چودھری صاحب فرماتے ہیں کہ سنہ ۱۹۲۶ء میں ایک دن ڈاکٹر صاحب نے اصرار سے انہیں دعوت پر بلایا ادھر ادھر کی باتوں میں انہوں نے ڈاکٹر صاحب سے دریافت کیا کہ آپ کو وہ اشتہار والا واقعہ یاد ہے فرمانے لگے ہاں خوب یاد ہے وہ کارگزاری تمہاری ہی تھی۔ لیکن میرے پاس کچھ ثبوت نہ تھا اس لئے میں کچھ نہ کر سکا۔ اس قسم کی باتیں درحقیقت ان کی کامیابی کا راز تھیں۔

انہیں اپنے طلبا پر زبردست بھروسہ اور اعتماد تھا۔ جب لارڈ لوتھین ہندوستان آئے تو تمام ملک کے طلبا نے جہاں بھی وہ گئے ان کے خلاف مظاہرے کئے۔ سر آغا خاں کی خواہش تھی کہ وہ علیگڑھ آئیں ڈاکٹر صاحب نے فوراً لارڈ لوتھین کو مدعو کر دیا۔ سب لوگ پریشان تھے کہ دیکھئے کیا ہوتا ہے طلبا کچھ ناشائستہ حرکت نہ کر بیٹھیں لیکن ڈاکٹر صاحب نے کہا ہمارے طلبا مسلمان ہیں اور انہیں اسلامی مہمان نوازی کا پاس ہے چنانچہ لارڈ موصوف آئے اور نہایت ضبط و نظم کے ساتھ ان کا خیر مقدم ہوا۔ کھانے کے بعد لارڈ نے طلبا کی تعریف کی ڈاکٹر صاحب نے جوابی تقریر میں فرمایا کہ :-

"میں آپ پر واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ طلبا کا زیادہ حصّہ آپ کی آمد کا مخالف تھا لیکن جب کارکنان کالج نے دعوت دے دی تو طلبا نے اپنی مخالفت پر آپ کے خیر مقدم کو ترجیح دی۔"

طلبا سے بعض اوقات ایسی حرکات سرزد ہو جاتی تھیں جن کی بنا پر وہ قانون کی زد میں آ سکتے تھے ڈاکٹر صاحب اس موقع پر وہی کرتے تھے جو ایک باپ کر سکتا ہے وہ کہا کرتے تھے کوئی باپ اپنی اولاد کو پولیس کے حوالے نہیں کر سکتا میں کیسے کر دوں۔ ان کا عقیدہ تھا جرم کی اصلاح اس قسم کی تعزیری سزا سے نہیں ہوگی طلبا جوانی کی ترنگ میں اگر کوئی غلطی کر بیٹھتے ہیں تو بعد میں ضرور پچھتاتے ہیں اگر پولیس کے حوالے کر دیا جائے اور سزا کرا دی جائے تو بہت ممکن ہے وہ عادی مجرم بن جائیں۔ چنانچہ وہ طلبا کو اس طرح بچا لیتے تھے ایسی متعدد مثالیں ان کی زندگی میں پیش آئیں اور وہ طلبا جنہیں انہوں نے اس طرح بچایا بعد میں سوسائٹی کے نہایت مفید افراد ثابت ہوئے۔ رسٹی کیشن کے نام سے انہیں چڑ تھی وہ قوم کے نوجوانوں کی آئندہ زندگی برباد کرنے کے سخت مخالف تھے۔ کسی طالب علم کا داخلہ اس وجہ سے نہیں روکا جاتا تھا کہ اس کے پاس پیسہ نہیں ہے ایسے طلبا کی وہ ضرور مالی امداد کرتے تھے۔ وہ اپنے طلبا کی مدد کرنا اپنا فرض سمجھتے تھے۔ فارغ التحصیل طلبا کو ملازمت دلانا ان کا روز مرہ تھا۔ کسی کی سفارش کرنے سے انکار کرنا وہ جانتے ہی نہ تھے کوئی دن ایسا جاتا ہوگا کہ کسی کی سفارش نہ کرتے ہوں انہوں نے بے شمار لوگوں کو برسر روزگار لگایا۔

وہ ۱۹۳۰ء سے ۱۹۴۷ء تک مرکزی اسمبلی کے ممبر رہے۔ قائد اعظم محمد علی جناح کی پارٹی سے متعلق رہے پہلے انڈی پنڈنٹ پارٹی میں اور پھر مسلم لیگ پارٹی میں۔ انہوں نے ریلوے۔ مالیات ٹیکس اور مزدوروں کے مسائل پر ماہرانہ اور عالمانہ بحثیں کیں۔ ۱۹۳۰ء میں سب سے پہلی تقریر ریلوے پر تھی اور ایسی پُر مغز تھی کہ ریلوے کے فائننشیل کمشنر کو شبہ ہوا کہ شاید کسی ریلوے کے افسر نے لکھی ہے ڈاکٹر صاحب کو جب اس کا علم ہوا تو انہوں نے دوران تقریر میں اس انگریز افسر کو مخاطب کر کے کہا کہ "آپ کا خیال غلط ہے کہ یہ تقریر کسی نے مجھے لکھ کر دے دی ہے اور میں نے تیار کر لی ہے میں نے آپ سے زیادہ مشکل امتحان پاس کئے ہیں مجھے ضرورت نہیں کہ کوئی میرے لئے تقریر لکھے میں دوسروں کو تقریر لکھ کر دینے کی قابلیت رکھتا ہوں"۔ معاشی مسائل پر بڑی وسیع نظر رکھتے تھے۔ حکومت کے مسلمان ملازمین کے معاملات میں بڑی دلچسپی اور انہماک سے بحث کرتے تھے۔ ان کا نظریہ تھا کہ مسلمانوں کی تنظیم جداگانہ ہو اور ان کے مفاد محفوظ رہیں۔

ان کی علمیت اور ہمہ دانی کا یہ عالم تھا کہ ریاضی ان کا مضمون ہی تھا لیکن فلکیات۔ معاشیات۔ جغرافیہ۔ تعلیمات غرض جس موضوع پر ضرورت ہوا اس کا سرسری مطالعہ کر کے اور اصول و نظریات کو سمجھ کر ایسی بحث کرتے تھے کہ ماہرین ان کے سامنے سپٹ پٹا جاتے تھے۔ یہ ظاہر وہ کھوئے کھوئے سے رہتے تھے۔ لیکن دماغ کی مشین ہر وقت چلتی رہتی تھی۔ اکثر ایسا دیکھا گیا کہ بڑے بڑے تجربہ کار کسی گتھی کو سلجھانے میں سر پکڑ کر بیٹھ گئے اور ڈاکٹر صاحب نے آن واحد میں سلجھا دیا۔ وہ کہا کرتے تھے کہ ریاضی کو مسلمانوں نے ہوّا سمجھ رکھا ہے مجھے اس طلسم کو توڑنا ہے۔ لکچر کے وقت ایسا معلوم ہوتا تھا کہ علم کا ایک دریا بہہ رہا ہے۔ بعض متبحر عالموں کو دیکھا ہے کہ وہ اپنے مخاطب کی قابلیت سے اپنے علم کا توازن پیدا نہیں کر سکتے۔ ڈاکٹر صاحب میں باوجود تبحر علمی یہ قابلیت تھی کہ طلبا کی مشکلات کا اندازہ

خوب کر دیتے تھے اور اکثر اپنی بلند علمی سطح سے نیچے اُتر آتے تھے۔ تاکہ مسئلہ طلبا کے ذہن نشین ہو جائے۔ ان کے لکچروں میں جہاں تک ممکن ہو لطائف و ظرائف ہوتے تھے تاکہ مضمون کی خشکی اسے غیر دلچسپ نہ بنا دے۔ باوجود عالی دماغی اور تبحر علمی کے ان میں طالب علمانہ جذبہ موجود تھا کہ کوئی بات جو انہیں معلوم نہ ہو ادنیٰ سے ادنیٰ آدمی سے دریافت کرنے میں انہیں تامل نہ ہوتا تھا اور نہ اس علمیت کا ان میں غرور تھا۔ وہ ایک معمولی کلرک یا اسکول ٹیچر کے ہاں دعوت میں اسی خوشی سے شریک ہوتے تھے جیسے وائسرائے کے محل میں۔ انہیں اپنی عظمت و اہمیت کا قطعی احساس نہ تھا۔ بعض اوقات معلوم ہوتا تھا کہ انہیں پوزیشن کا پاس نہیں مخاطب چھوٹا ہو یا بڑا سلام میں پیش قدمی کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ باوجود اس کے کہ وہ عرصہ تک یورپ میں رہے لیکن اپنے عادات و خصائل کے لحاظ سے وہ پورے مکمل ہندوستانی مسلمان تھے۔ چنانچہ کپڑوں کے معاملے میں کوئی اہتمام نہ تھا۔ کام کی ضروریات کی وجہ سے سوٹ پہنتے تھے لیکن اس سوٹ کی بے اعتنائی سے پتہ چلتا تھا کہ انہیں اس سے کوئی خاص لگاؤ نہیں ہے۔ عید بقر عید پر اور اعزا کی تقاریب میں وہ شیروانی پہنتے تھے اور پاجامہ غرض یہ کہ ڈاکٹر صاحب انتہا درجہ کے منکسر المزاج تھے۔ اپنے ماتحتوں کے دکھ سکھ میں برابر کے شریک رہتے تھے۔ اور طرح طرح امداد کرتے۔ مالی امداد گاہ بگاہ دیتے اور کبھی قرضہ کی صورت میں کر دیا کرتے تھے لیکن اس کی ادائیگی میں کبھی سختی نہ کی جاتی تھی۔

مہمان نوازی کا یہ عالم تھا کہ اکثر دعوتیں ہوا کرتی تھیں بڑی بڑی اور شاندار اور چھوٹی و معمولی لیکن ان کا اہتمام ایسا تھا کہ کم سے کم غم ہوتا تھا۔ ان کے پاس بیٹھ کر غم غلط ہو جاتا تھا۔ گاہ گاہ اپنے کنبہ کے افراد کو اور خصوصاً بچوں کو جمع کر لیتے تھے اس روز ان کی کوٹھی میں بڑی چہل پہل ہوتی تھی۔ بچوں کے ساتھ ہنسنے بولنے میں انہیں بڑا لطف آتا تھا۔ چائے ان کے ہاں بڑی بدمزہ اور خراب ہوتی تھی لیکن قہوہ اس قدر اعلیٰ درجہ کا بنتے تھے کہ اکثر احباب اس کی فرمائش کرتے تھے۔ اور قائد اعظم تو خاص طور پر قہوہ پر مدعو کئے جاتے تھے۔ انہوں نے اپنی لڑکی کی شادی میں اپنے اعزا کو مدعو کیا تھا اسی اندازے سے انتظام تھا۔ بعض طلبا نے سازش کی اور قریب سو طلبا بن بلائے مہمان جا پہنچے ڈاکٹر صاحب قطعی نہ گھبرائے بلکہ خوش ہوئے اور انہیں الگ بٹھایا تاکہ دوسرے دور کا انتظار کریں اتنی دیر میں فوراً انتظام مکمل ہو گیا تھا انہیں طالب علمی کے زمانے سے علیگڈھ کے ڈائننگ ہال کا نسخہ یاد تھا یعنی ایسے غیر متوقع حالات میں سالن میں شوربے کا اضافہ کر دیا جاتا۔

ان میں ایک خصوصیت تھی کہ ابھی ایک مسئلہ درپیش ہے اس پر غور و فکر ہو رہا ہے کہ یکایک کوئی دوسری قسم کا مسئلہ آ کھڑا ہوا تو وہ فوراً اس کی طرف ہمہ تن متوجہ ہو جاتے تھے نہ ان کا دماغ تھکتا تھا نہ ذہن میں اُلجھن پیدا ہوتی تھی جب کوئی بڑی سے بڑی اسکیم درپیش ہوتی تو ان کے سامنے اس کے تمام پہلو ہوتے اور معمولی سے معمولی جزئیات پر نظر رہتی ذہن ایسی تیزی سے کام کرتا تھا کہ جب کوئی ان کے ساتھ کام کرنے بیٹھتا تو مشکل ہی سے ان کا ساتھ دے سکتا تھا۔ یادداشت بڑے غضب کی تھی اور پھر یہی نہیں جس وقت جس چیز کو چاہتے یاد آ جاتی اور جب چاہتے اُسے بُھلا دیتے تھے۔

مخالفین کی ایک جماعت ہمیشہ ان کے درپے رہی لیکن وہ کبھی کسی سے انتقام لینا تو کجا اور اپنے مخالفین پر احسان کرتے تھے۔ جب ان کا انتخاب وائس چانسلری کے لئے ہوا تو نواب حمید اللہ خان والیٔ بھوپال نے چانسلری کے عہدہ سے استعفا دے دیا لیکن ڈاکٹر صاحب نے عسکری تربیت کا مرکز یونیورسٹی میں جاری کرتے وقت ان سے امداد کی استدعا کی اور تعلقات خوشگوار ہو گئے نواب صاحب علی گڈھ آئے مشورہ بھی دیا اور امداد بھی۔ مرکزی اسمبلی میں ملک کے غذائی مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے انہوں نے بھوپال کے غذائی نظم و نسق کی عمدگی کی مثال دی اور اس کی بہت تعریف کی۔ وہ کبھی کسی مخالف کی عزت کے درپے نہیں ہوتے تھے رحمت اللہ کمیشن کے صدر سر رحمت اللہ مرکزی اسمبلی میں اسپیکر شپ کے اُمیدوار تھے اور ڈاکٹر صاحب سے مدد کے طالب تھے ڈاکٹر صاحب نے کھلے دل سے ان کی امداد کی یہ وہ ہی کمیشن تھا جس نے ڈاکٹر صاحب کو علی گڈھ سے الگ کر دئے جانے کی سفارش کی تھی بعض اوقات عجیب

طلبا کسی معاملہ میں مخالفت یا ہڑتال کرنے پر تُل جاتے تو ان کے سامنے جانے کی کسی کو ہمت نہ ہوتی تھی مگر وہ اس وقت بھی بے دھڑک طلبا کے مجمع
میں گھس جاتے اور ایسی تقریر کرتے کہ سرکش سے سرکش بھی گردن جھکا دیتا اور وہ جو چاہتے ان سے منظور کرا لیتے تھے۔ ان کے مخالفین ان پر پارٹی
بازی کا الزام لگاتے تھے۔ پارٹیاں سب ہی نے بنائیں اور کوئی جمہوری ادارہ بغیر پارٹی نہیں چل سکتا۔ ان کا جرم صرف یہ تھا کہ ان کی پارٹی جیتتی
اور وں کی ہاری۔

ان کی کامیابی کا راز اس بات میں پوشیدہ تھا کہ دوسروں سے کام لینے کی ان میں صلاحیت تھی اور سب سے زیادہ یہ کہ خود لگاتار
مسلسل کام کرنے کی دھن تھی۔ ذہانت کے علاوہ ان میں جسمانی توانائی اور چستی اس غضب کی تھی کہ لگاتار گھنٹوں کام کر سکتے تھے جتنی زیادہ مشکلات
ہوتیں اتنا ہی تیزی سے انکا ذہن کام کرتا تھا اور کام کرنے کی قوت بہت بڑھ جاتی تھی۔ وہ دنوں سفر میں رہتے لیکن سفر سے واپس آتے ہی پہلے
دفتر کا رخ کرتے اور کام میں مصروف ہو جاتے تھے ان کے ساتھ کام کرنے والے اکثر عاجز آ جاتے تھے۔ ایک دفعہ ان کے ایک شاگرد رشید
نے ان سے کہا کہ آپ کی تقلید کرنا معمولی انسان کا کام نہیں ہے آپ نے غالباً جن مسخر کر رکھے ہیں ہنس کر فرمانے لگے جو توں خدا نے عطا کئے
ہیں۔ ان سے کام لینا چاہئے بس یہی جنات ہیں ان کو تابع کرنے کے لئے خلوص و محبت کی ضرورت ہے۔ ان کے سفر کا یہی حساب لگایا جائے
تو غالباً عمر کا ایک تہائی سفر میں گزرا۔ یہ سب کچھ علیگڈھ کے لئے تھا اسی کے لئے وہ یہ تکالیف برداشت کرتے تھے۔ سر سید علیہ الرحمتہ
کے بعد اگر کوئی ہستی تھی تو ڈاکٹر صاحب کی تھی کہ ادھر آپ علیگڈھ کا نام لیں اور فوراً ڈاکٹر صاحب کا نام ذہن میں نہ آئے یا ڈاکٹر صاحب
کا نام لے کر تو علیگڈھ آپ کے ذہن پر مسلط نہ ہو۔ مسلم یونیورسٹی اور ڈاکٹر صاحب کچھ لازم و ملزوم سے تھے۔ ان کے دل و دماغ پہ سب
سے زیادہ حاوی جو چیز تھی وہ علیگڈھ اور اس کی خدمت بعض مخالفین کا اعتراض تھا کہ اسمبلی کی ممبری سے علیگڈھ کے کام میں خلل پڑے
گا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہاں بھی وہ علیگڈھ ہی کی خدمت کے لئے گئے تھے یونیورسٹی کے بے شمار کام بنتے تھے۔ وہ جس قدر سفر یونیورسٹی
کے لئے کرتے تھے ایک پیسہ بھی سفر خرچ کا یونیورسٹی سے نہ لیتے تھے۔ اور جو کچھ یونیورسٹی کو ان کے دور میں حاصل ہوا وہ سب ان کے
ذاتی اثر کا نتیجہ تھا۔ میڈیکل کالج فنڈ کے لئے دو سال میں پچاس لاکھ روپیہ جمع کر دینا ان ہی کے بس کا کام تھا۔ سر سید کے بعد اگر کسی کو
چندہ جمع کرنے کا گر آتا تھا تو وہ ڈاکٹر صاحب ہی تھے۔ ہر جگہ ہر موقع پر ان کے دل میں یونیورسٹی کی لگن قوم کی تڑپ اور اپنے طلبا کے
لئے بے چینی رہتی تھی۔

قائد اعظم نے جب لیگ کے پرچم کے نیچے قوم کو مجتمع کر لیا اور مرکزی اسمبلی میں بھی مسلم لیگ پارٹی کی بنا ڈالی اس وقت ان کی دور رس
نگاہ ڈاکٹر صاحب ہی پر پڑی انہوں نے ڈاکٹر صاحب کے ذمہ پارٹی کی تنظیم کا کام کیا اور اس کا سکرٹری انہی کو بنایا اسی زمانے میں یونیورسٹی
کے لئے وائس چانسلر کا انتخاب ہونے والا تھا اور کورٹ کے ممبران کی اکثریت ڈاکٹر صاحب کو چاہتی تھی لیکن انہوں نے قائد اعظم کی خواہش
کا احترام کیا اور اس قومی خدمت کو اس پر ترجیح دی اور سر شاہ سلیمان کو بلا مقابلہ منتخب کرا دیا۔ ڈاکٹر صاحب چونکہ خود دھن کے پکے تھے
اور جس کام کے لئے کر کھڑے ہوتے تو اسے بلا خوف مخالفت پورا کر کے چھوڑتے تھے اسی وجہ سے انہیں قائد اعظم کی یہ ادا پسند تھی کہ جب
وہ کسی اصول یا پالیسی کو صحیح سمجھ کر اختیار کرتے تھے تو پھر کوئی چیز انہیں اپنی رائے سے نہیں ہٹا سکتی تھی اور جتنی مخالفت بڑھتی اتنا ہی ان
کا عزم مضبوط ہوتا تھا۔ چنانچہ وہ قائد اعظم کی سیاست پختگی رائے بلند کردار دیانت اور علو ہمتی کے بڑے مداح تھے۔ ڈاکٹر صاحب کا
عقیدہ تھا کہ اسلامی جمہوریت یہ ہے کہ پہلے صحیح سمجھ کر اپنا قائد چن لو اور پھر بے چون و چرا اس کا ساتھ دو۔ اختلاف ہو تو نجی طور پر بحث
کر لو لیکن عوام میں لیڈر کی ہمیشہ حمایت کرو۔ اسی جذبہ کے تحت وہ مسلم لیگ میں شریک ہوئے تھے۔ اور آخر وقت تک قائد اعظم کے
حامی و مددگار رہے۔

ڈاکٹر صاحب کا تعلق علیگڑھ سے کم و بیش ساٹھ برس رہا وہ علیگڑھ میں بہ حیثیت طالب علم آئے۔ مانیٹر ہوئے ٹیچر ہوئے۔ پروفیسر ہوئے۔ اسسٹنٹ ٹیوٹر ہوئے۔ ٹیوٹر ہوئے۔ پرنسپل ہوئے۔ پرو وائس چانسلر ہوئے۔ چانسلر ہوئے اور آخر میں ریکٹر ہوئے انہوں نے سرسید علیہ الرحمتہ سے تازیست علیگڑھ کی خدمت کا وعدہ کیا تھا اسے پورا کر دکھایا۔ علیگڑھ سے والہانہ محبت طلبا کی خیر سگالی اور اولد علی سے وفاداری ایسی خدمات ہیں جن کا دوست دشمن سب کو اعتراف ہے۔

علیگڑھ کی خدمات سے سبکدوش ہونے کے بعد ستر سال کی عمر میں وہ قوم کا جوان ہمت شیدائی ۱۹۴۷ء میں یورپ اور امریکہ تعلیمی ترقیوں کے مطالعہ اور مشاہدہ کی غرض سے وطن سے روانہ ہوا۔ امریکہ اور دیگر ممالک یورپ کا دورہ کیا۔ نومبر ۱۹۴۸ء میں واپسی کا ارادہ تھا کہ سر آغا خاں سے ملاقات کرنے کے لئے پیرس گئے وہاں سے لندن آتے ہوئے راستے میں فالج کا حملہ ہوا۔ نرسنگ ہوم میں داخل ہو گئے۔ وہاں ایک روز مسلمان نوجوانوں کو چائے پر مدعو کیا اور باوجود تکلیف کے ان سے کہا کہ آپ لوگ یہاں سے ہندوستان ہی واپس جائیں اور وہیں رہیں اگرچہ وہاں ملازمت نہیں ملے گی لیکن یہ خوشی کی بات ہے اسی وجہ سے آپ لوگ زراعت صنعت و حرفت اور صحافت کی طرف متوجہ ہوں گے۔ وفات سے ایک روز قبل اپنے معالج ڈاکٹر غیاث الدین صاحب کو پاس بلا کر کہا۔ کہ آپ اب ہندوستان جا کر کام کریں۔ اب آپ جیسے حضرات کی وہاں ضرورت ہے اب مسلمانوں کی تعلیم وہاں ایک اہم مسئلہ ہوگا۔

۲۳ دسمبر ۱۹۴۸ء کو گیارہ بج کر ۴ منٹ پر اس جہان فانی سے رحلت کی انا للہ و انا الیہ راجعون۔ دوسری و تیسری فروری ۱۹۴۸ء کی درمیانی شب میں تابوت براہ بحری جہاز علیگڑھ پہنچا۔ اور ۴ فروری کو سرسید علیہ الرحمتہ کے پہلو میں مغربی جانب دفن کیا گیا۔

ملک بھر میں کہرام مچ گیا اخبار و رسائل نے تعزیتی مضامین لکھے ہم صرف دو رسائل کا مختصر اقتباس دیتے ہیں معارف نے لکھا کہ:۔

مرحوم اس دور کی پیداوار تھے جب مسلمانوں پر مغربی تمدن مسلط تھا۔ اور اس کا سب سے بڑا مرکز علیگڑھ تھا۔ لیکن انہوں نے اس کا بہت کم اثر قبول کیا۔ اب تو ضعیفی کی عمر تھی وہ ہر زمانے میں نہ صرف عقیدے بلکہ ظاہری وضع قطع میں بھی مسلمان رہے۔ ان کی زندگی بڑی سادہ اور بے تکلف تھی ان کی سادگی میں ایک صاحب کمال کی شان بے نیازی پائی جاتی تھی۔ شخصی طور پر بھی ان سے لوگوں کو بڑے فوائد حاصل ہوئے ان کی ذات سے سینکڑوں غریب طالب علموں نے تعلیم حاصل کی اور انہوں نے بہتوں کو جن کا کوئی سہارا نہ تھا۔ ملازمتیں اور بڑے بڑے عہدے دلوائے۔

صدق لکھنؤ کے مدیر نے لکھا کہ:۔

موتیں اچھے اچھے مخلص مسلمانوں کی بھی کہنا چاہیئے کہ روز ہی ہوتی رہتی ہیں اور بعض یقیناً بہت ہی دردناک و قلق انگیز بھی ہوتی ہیں لیکن کچھ موتیں ایسی بھی ہوتی ہیں جو فرد واحد کی نہیں پوری جماعت کی پورے ادارہ کی موت کہی جا سکتی ہے علیگڑھ کے مرحوم ڈاکٹر سر ضیاء الدین احمد کی وفات اسی قسم میں آتی ہے . . . . بڑے ذی مروت اور بڑے ہی فیض رساں تھے دروازہ ہر علی گڑھی کے لئے ہر وقت کھلا رہتا تھا ہر اولڈ بوائے کے میزبان دوست اور دست گیر تھے۔ آمدنی کا بڑا حصہ طلبا ہی کے لئے وقف تھا۔ خدا معلوم کتنوں کو عہدے دلوائے کتنے بیروزگاروں کو روزگار سے لگایا کتنے بھوکوں کو کھلایا کتنوں کی سفارشیں کیں کتنوں کی خالی جیبیں اپنے پاس سے بھر بھر دیں . . . . .

بعض اہل صحافت نے جو مستقل پروپاگنڈا مرحوم کی مخالفت میں مہینوں بلکہ برسوں جاری رکھا اور جس نے ان کے ہر ہنر کو عیب ہی بنا کر رکھا وہ خود ہی ان کے حق میں کفارہ کا کام دے سکتا ہے۔ عجب نہیں اسی سے وہ بالکل

ڈھل گئے ہوں۔

اصنافِ سخن میں مدحت طرازی - مرثیہ، سلام اور قصیدہ سب ہی کچھ ہے لیکن ڈاکٹر صاحب کے جنازہ کے استقبال کے سلسلے میں شائع ہوئی جنازہ کی استقبالیہ نظم ایک جدت ہے ہم اسی نظم پر اس مضمون کو ختم کرتے ہیں ؎

استقبالیہ نظم از پروفیسر محمد حاذق صاحب ایم اے شعبہ فارسی مسلم یونیورسٹی

علیگڈھ تو نے کی ہے اہلِ ملت کی پذیرائی
ہوئی ہے تجھ میں ارکانِ حکومت کی پذیرائی

ترے ایوان میں آمد ہوئی اکثر امیروں کی
بڑے ارماں سے کیں تو نے مداراتیں امیروں کی

رئیسانِ وطن کا تو نے استقبال دیکھا ہے
شہانِ ذی حشم کا موکبِ اجلال دیکھا ہے

مگر یہ شان استقبال کی سب سے نرالی ہے
کہ آج اک تیرے شیدائی کی میت آنے والی ہے

سلامی کو صفیں استادہ ہیں اعیانِ ملت کی
کہ ہوگی پیشوائی زبدۂ ارکانِ ملت کی

بیاں کیا ہو حقیقت قوم کے اندوہ بے حد کی
کہ لاش آتی ہے یورپ سے ضیاء الدین احمد کی

وہ جس نے اپنی ہستی کو مٹایا قوم کی خاطر
پڑا جو بار وہ سر پر اٹھایا قوم کی خاطر

شکایت جس کے لب سے شکر بن کر برملا نکلی
وہ جس کے منہ سے اکثر گالیاں کھا کر دعا نکلی

بڑھاپے میں ملی تھی جس کو ہمت نوجوانوں کی
وہ جس کی خاکساری میں تھی رفعت آسمانوں کی

وہ جس کی عمر گزری میڈیکل کالج کی خواہش میں
دیا نقدِ حیات آخر اسی سودے کی کاہش میں

وہ جس نے خاک چھانی پائے مردی سے زمانے میں
فراہم کر دئے لاکھوں ہی کالج کے خزانے میں

وہ اپنا ڈاکٹر جو ماہرِ امراضِ ملت تھا
جو سچ مچ چارہ سازِ قوم تھا ناصحِ ملت تھا

دیارِ غیر میں جس کے لئے پیکِ اجل آیا
زمانہ میں شہیدِ علم کا جس نے لقب پایا

جسے سب سے فزوں تھا قوم کا غم بعدِ سید کے
جو تھا طلاب کا ہمدرد و ہمدم بعدِ سید کے

سن اے خاکِ لحد سن یہ امانت سونپی جاتی ہے
تجھے سارے مسلمانوں کی دولت سونپی جاتی ہے

قیامت تک اسے آغوش میں رکھ امن و راحت سے
کہ یہ خاکی جسد محروم آسائش تھا مدت سے

دعا ہے یہ کہ پلہ نیکیوں کا اس کا بھاری ہو
دمِ حشر اس کے سر پر سایۂ افضالِ باری ہو

رہا از بس کہ ملت کی ہوا خواہی سے کام اس کو
ملے جنت میں قربِ حضرتِ خیر الانام اس کو

نواب اعظم یار جنگ بہادر مولوی چراغ علی مرحوم

غلام پنجتن

انیسویں صدی کا ربع عرصہ گزرا تھا کہ انکے دادا کشمیر سے بسلسلۂ ملازمت پنجاب میں آئے۔ اور اس کے بعد میرٹھ میں مقیم ہوگئے۔ یہ بزرگ اُن معدودے چند مسلمانوں میں سے تھے جنہوں نے انگریزی تعلیم کو بدعت نہیں سمجھا اور اپنے فرزند خُدا بخش کو انگریزی پڑھائی لکھائی۔ اپنے والد کی طرح یہ بھی جوان عمری میں کمپنی بہادر کے ملازم ہوکر سرحدی ضلعوں ڈیرہ غازی خاں، بنوں وغیرہ میں محکمہ بندوبست میں خدمت انجام دیتے رہے، اس کے بعد مولوی خدا بخش صاحب ضلع سہارنپور کی کلکٹری میں ہیڈ کلرکی پر آگئے۔ چونکہ انہوں نے انگریزی وضع قطع اختیار کر لی تھی۔ لوگ انہیں کرانی کہنے لگے۔ مولوی خدا بخش صاحب ۳۵ برس کی عمر میں سہارن پور ہی میں ۱۹۰۶ء میں انتقال کر گئے۔ اُن کی والدہ اپنی بیوہ بہو اور چار کم سن پوتوں کو لے کر پھر میرٹھ آگئیں۔ ان چار یتیموں میں مولوی چراغ علی سب میں بڑے اور بارہ سال کے تھے جو آگے چل کر نواب اعظم یار جنگ بن کر آسمان ادب ہی پر نہیں چمکے بلکہ ریاست حیدر آباد کی تنظیم جدید میں جو سر سالار جنگ اول نے شروع کی تھی نمایاں مقام حاصل کیا اور آج تک ایک محلہ "چراغ علی لین" کے نام سے ان کا مسکن ہونے کی وجہ سے مشہور ہے۔

اس لاوارث گھرانے کو میرٹھ میں دوبارہ آئے ہوئے ایک سال بھی نہ گزرا تھا کہ وہ ہنگامہ شروع ہوگیا جس کو "غدر" کے نام سے یاد کیا جاتا رہا ہے حالانکہ وہ ایک سوچی سمجھی حکومت کو بدیسی قوت کے ہاتھوں سے چھین لینے کی مہم تھی جو مقررہ وقت سے پہلے شروع ہونے اور ڈسپلن قائم نہ رکھ سکنے کی وجہ سے ناکام رہی۔ ان سورماؤں میں نہ تو مذہبی جوش تھا اور نسلی تفریق جو قتل و غارت گری تو کیا ان لوگوں کو سبق دینا تک گوارا کرتی جو سرکار انگریزی کا اقتدار بڑھانے میں اپنی فلاح سمجھے ہوئے تھے۔ چنانچہ شہر میرٹھ ہی میں جہاں اس انقلاب کا زور رہا کسی نے اس گھر کی طرف رُخ بھی نہیں کیا۔ خون خرابا تو اس وقت عام ہوا جب لاہور سے سکھوں کی اور دکن سے نظام کی کمک شمالی ہند پہونچی اور کمپنی بہادر کا سکہ بٹھانے کی غرض سے ہندوستانیوں کو بُزدل بنانا اور مسلمانوں کا تختہ اُلٹنے اور انہیں ذلیل کرنا شروع ہوا۔ عوام تو کیا خواص میں جو خوف بٹھایا گیا اس کا اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ سرسید ایسے جری شخص کی ہمت نہ ہوئی کہ اس شورش کے متعلق جو معرکۃ الآرا تصنیف کی اس کا نام "رسالہ اسباب بغاوت" نہ رکھتا۔

۱۸۵۸ء اور اس کے بعد کے کئی سال ایسے گذرے کہ میرٹھ اور اس کے قریب و جوار میں کسی کو چین سے بیٹھنا نصیب نہ ہوا۔ ایسے میں

جیسی ایک مقیم کی تعلیم ہو سکتی ہے ظاہر ہے۔ اس زمانے میں طریقہ تعلیم بھی دوسرا تھا۔ نہ تعلیمی کمیشن بیٹھتے تھے نہ محکمہ تعلیمات تھا۔ نہ ہر برس نیا نصاب
سال کے سال شائع ہوتا تھا۔ نہ پبلک اسکولس تھے نہ شاندار عمارتوں والے کالج۔ جب مہدی علی، مشتاق حسین، چراغ علی، الطاف حسین حالی،
ذکاء اللہ، شبلی، نذیر احمد ایسے ادیبوں اور رہنماؤں کو دیکھتے ہیں تو یہ خیال ضرور آتا ہے کہ آخر ایسے ادیب اور صاحب فکر، اہل بصیرت ہماری
یونیورسٹیوں کی مکمل تعلیم کیوں نہ پیدا کر سکی۔ چٹائی پر دو زانو بیٹھ کر ادھوری تعلیم حاصل کر کے افکار کی دنیا میں گھس کر بصیرت، فنون ہمارے بزرگ
حاصل کر لیا کرتے تھے۔ اپنے دیگر ہم عصروں کی طرح چراغ علی کو اردو، فارسی اور انگریزی کی معمولی تعلیم حاصل کرتے ہی تلاش روزگار میں نکلنا پڑا۔
گورکھپور کی کمشنری میں ایک ضلع بستی نیا قائم ہوا تھا۔ چراغ علی وہاں جا کر بیس روپیہ ماہوار کے کلرک ہو گئے۔ دفتر کے بعد جو وقت ملتا اس میں کتابوں
کا مطالعہ کیا کرتے۔ ۱۸۶۷ء یا ۱۸۶۸ء میں ایک انگریز افسر جس کے ساتھ ان کے والد مرحوم پنجاب میں کام کر چکے تھے اودھ کا جوڈیشنل کمشنر ہو کر آیا۔
چراغ علی اسے ملنے گئے۔ اس نے ان کا تقرر اسّی روپیہ ماہوار کی جائداد نائب منصرمی پر جو اتفاق سے اس وقت خالی تھی فوراً کر دیا۔ اس طرح
بستی سے لکھنؤ پہنچے۔ اس زمانے تک انہوں نے اتنی علمی استعداد حاصل کر لی تھی کہ ان کے مضامین لکھنؤ کے رسالوں میں چھپنے لگے۔ لکھنؤ
میں آ کر انہیں اہل علم و فضل کی صحبت کا موقع ملا جس سے انہوں نے پورا فائدہ اٹھایا۔ پادری عماد الدین کی تاریخ محمدی کا جواب لکھ کر اسی زمانۂ
قیام لکھنؤ میں انہوں نے شائع کیا جو نہ صرف علمائے اسلام کو پسند آیا بلکہ سر سید احمد خاں نے جنہوں نے تہذیب کے محاذ میں ایک نئی روش اختیار کی تھی بڑی داد
دی۔ عام مسلمانوں نے اس کتاب کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ اور چراغ علی اب مولوی چراغ علی کہلائے جانے لگے۔ سر سید نے ان کی ذہانت
اور علمی شخصیت کی اتنی قدر کی کہ انہیں تہذیب الاخلاق میں مضمون لکھنے پر آمادہ کر لیا۔ اس طرح مولوی صاحب اسلام پر جو اعتراضات ہو رہے
تھے ان کے جواب دینے اور عیسائیوں کو اسلام اور اس کے پیغمبر کی خوبیوں سے واقف کرانے میں لگ گئے اور اسلامی فرقوں کی آپس
کی کج بحثی سے ہمیشہ دور رہے۔ چنانچہ یہ مشہور واقعہ ہے کہ مردم شماری کے نقشوں میں اپنی بیگم صاحبہ کو تو انہوں نے شیعہ لکھا ہے لیکن اپنے اور
اپنے بچوں کے نام سے آگے نقطہ لگا دیا۔

لکھنؤ سے ان کا تبادلہ سیتاپور ہو گیا۔ وہاں انہیں سر سید احمد خاں کے لکھنؤ آنے کی خبر ملی اور وہ سر سید سے ملنے لکھنؤ آئے۔
دونوں کا غائبانہ تعارف تو خطوط اور تہذیب الاخلاق کے مضامین کے ذریعہ سے ہو چکا تھا۔ رو برو کی یہ پہلی ملاقات تھی۔ آنکھیں چار ہوتے ہی وہ
مہدی علی اور مشتاق حسین کی طرح سر سید کی طرف کھنچے ہوئے چلے گئے۔ سر سید کو جس جوہر کی تلاش تھی وہ انہیں مل گیا۔ انہوں نے مولوی صاحب
کو سینے سے لگایا، سر پر بٹھایا اور خوب چمکایا۔ دوسرے مہینے ہی مولوی صاحب رخصت لے کر علی گڑھ پہنچے اور سر سید نے انہیں انگریزی اور
عربی کی مستند کتابوں کے مطالعے اور ان کے تراجم میں لگا دیا جن کی اس وقت مذہبی نکتۂ نظر سے ضرورت تھی۔ اس دور میں عیسائی مشنریوں کے ہاتھ
میں تبلیغی کاموں کے لیے سرمایہ ہونے کے علاوہ حکومت کی پوری تائید حاصل تھی۔ عیسائی مذہب میں داخل ہونے سے روحانی برکت حاصل
ہو یا نہ ہو اخلاقی حالت سدھرے یا نہ سدھرے مگر دنیاوی بہتری کا دروازہ ضرور کھل جاتا تھا۔ برہمو سماج اور اس کے بعد سوامی دیانند سرسوتی
کا آریہ سماج مشن اسی رجحان کے روک تھام کے لئے انتھک کوشش میں لگا ہوا تھا۔ پڑھے لکھے مسلمان نئے فلسفے کے شیدا بن کر اور اپنے پرانے دقیانوسی
عقائد سے چھوٹ کر رفتہ رفتہ مذہب میں داخل ہو کر جزو مذہب بن چکے تھے یا شبہ میں پڑے ہوئے تھے۔ مولوی صاحب نے اپنے محققانہ مضامین
میں وہ فلسفیانہ بحثیں اٹھائیں اور وہ مسئلے نئے رنگ میں حل کئے کہ سر سید کو ان کی ذات سے بڑی بڑی توقعات پیدا ہو گئیں۔ سب جانتے ہیں
کہ سر سید بعض معاملات میں بڑے ضدی تھے لیکن وہ ان لیڈروں میں نہ تھے جو شیخ سعدی کے

کس نہ آموخت علم تیر از من   کہ مرا عاقبت نشانہ نہ کرد

کے مصداق اپنے ساتھیوں کے حاسد ہوتے ہیں۔ ان کی ہمیشہ یہ کوشش رہتی تھی کہ ان کے ساتھ والے اونچے اٹھتے چلے جائیں اور ان کا

اپنی قابلیت اور اہلیت کے اظہار کے برابر موقعے ملتے رہیں۔ چند ہی دنوں میں چراغ علی صاحب کی جامع قابلیت اور وسعت نظری کا سرسید پر اتنا گہرا اثر پڑا کہ انہوں نے مہدی علی (محسن الملک) کے ذریعہ سر سالار جنگ کو اطلاع دی کہ جیسے شخص کی آپ کو تلاش تھی مجھے مل گیا۔ حیدرآباد کی تاریخ میں یہ بڑی نزاکت کا زمانہ تھا۔ سر سالار جنگ کی ۱۸۵۷ء کی شورش کے زمانے کی خدمات بھلائی جا رہی تھیں اور وہ سلطنت برطانیہ کی بدلی ہوئی پالیسی کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنے آقا کے دیرینہ وقار کو قائم رکھنے اور ریاست کے نظم و نسق کو جدید دور کے مطابق بہتر بنانے کی فکر میں لگے ہوئے تھے۔ جنرل سر رچرڈ میڈ فوجی خدمات کے علاوہ مختلف ممالک کا ڈپلومیٹک سفر بھی کامیابی سے ختم کر چکے تھے بعض حیثیت سے اُن کا اثر گورنمنٹ آف انڈیا میں تھا ان کو حیدرآباد کا ریذیڈنٹ بنا کر بھیجا گیا وہ سر سالار جنگ کو نیچا دکھانے کے جوڑ توڑ میں لگے ہوئے تھے اس ریشہ دوانی کے زمانے میں سر سالار جنگ نے مولوی صاحب کو فوراً حیدرآباد طلب کر لیا۔ اور سررشتہ مال میں محسن الملک کے مددگار کی حیثیت سے اُن کا تقرر چار سو ماہانہ پر کر دیا اور چند ماہ کے بعد ہی اُن کو سات سو ماہوار اسی عہدے کی تنخواہ ملنے لگی۔

سرسید کے مشن اور ان کے حواریین کے ساتھ جو عقیدت میری گھٹی میں پڑی ہے اس کو وقار عالی کردار مصنف اور اعلیٰ عہدے دار کے معاملے میں ایک اضافہ اور ہوا تھا کہ مولوی صاحب مرحوم کے فرزند محبوب علی جو ناظم لاسیکی کے عہدے سے ریٹائر ہوئے علیگڑھ کالجیٹ اسکول میں ۱۹۰۱ء میں میرے ہم جماعت تھے۔ ہم دونوں کی عمر اتنی نہ تھیں کہ اس سے زیادہ کچھ یاد رکھ سکیں کہ مرحوم بھاری بھرکم جسم، بڑے سر، بڑی آنکھوں والے تھے۔ اتنا خیال بھی ہے کہ بچوں کو بہت پسند کرتے تھے۔ بچے اُن سے ڈرتے نہ تھے اور وہ بچوں کی ناسمجھی کی باتوں سے دل بہلاتے تھے البتہ محسن الملک سے ان کے متعلق بہت سنتا رہا۔ محسن الملک کی یہ عادت تھی کہ کالج اور قوم کے کاموں سے جب وہ فارغ ہوتے تو اندر زنانے کے کمرے میں بیٹھ کر دادی صاحبہ مرحومہ سے جو عربی فارسی میں کافی دستگاہ رکھتی تھیں اپنے حیدرآباد کے پرانے ساتھیوں اور ہم عصروں کی اکثر باتیں کیا کرتے تھے اور اس طرح ہمیں مولوی چراغ علی صاحب نواب اعظم یار جنگ بہادر کی بہت سی خصوصیات معلوم ہوئیں۔ محسن الملک اعظم یار جنگ سے تقریباً سات سال بڑے تھے۔ اور بارہ سال بعد اس دُنیا سے رُخصت ہوئے آج پچاس پچپن برس کے بعد ہم ایسے خزاں رسیدہ کو سب سے زیادہ جو تکلیف ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ اس زمانے میں آپس کے اختلافات کے باوجود محبت و اخلاص تھا۔ جو آج مفقود ہے وہ بھلائیاں یاد رکھتے تھے اور ہم بُرائیاں۔ مثلاً علی گڑھ کے معاملات میں بعض امور میں نواب محسن الملک اور وقار الملک کا خصوصاً کالج میں انگریز اسٹاف کے معاملے میں اختلاف تھا لیکن جب میکڈانل نے جو اس وقت اس صوبے کے لفٹنٹ گورنر تھے ۱۹۰۰ء میں محسن الملک کے خلاف ہو گئے۔ تو نواب وقار الملک ہی سب سے زیادہ محسن الملک کیساتھ اُردو کی حمایت میں پیش پیش تھے۔ اسی طرح ان کی وفات کے بعد ۱۹۰۷ء سے ہمیں یہ محسوس ہوتا رہا کہ وقار الملک سے زیادہ ہمارے اس غم میں کوئی دوسرا شریک نہیں۔

محسن الملک جب معتمد مالگزاری تھے اور مولوی چراغ علی صاحب مرحوم اُن کے مددگار تھے جب وہ معتمد پولیٹیکل و فنانس ہوئے مولوی صاحب مرحوم کا تقرر ان کی جگہ معتمدی مال پر ۱۸۸۴ء میں ہوا۔ ان دونوں کی حیدرآباد میں یکجائی ہونے کے پہلے ہی سے محسن الملک مولوی صاحب مرحوم کی عربی و فارسی کی قابلیت اور طرز تحریر کے مداح ہی نہیں تھے بلکہ ان کو انگریزی زبان پر کافی عبور رکھنے والا اور اظہار خیال پر قادر سمجھتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ اس زمانے کے مسلمانوں میں ان کا نمبر نواب عماد الملک اور سر امیر علی سے کم نہ تھا۔ وہ مولوی صاحب کو ان دونوں ادیبوں سے زیادہ محنتی اور کھوجی خیال کرتے تھے۔ ان کی رائے میں مولوی صاحب تفریحی مشاغل اور ظاہری شان و شوکت کے اظہار سے بالکل بے نیاز تھے۔ انہیں نہ تحسین و تعریف کی پروا تھی نہ وہ مخالفت کی پروا کرتے تھے۔ نواب محسن الملک یہ بھی کہتے تھے کہ ان کے مددگاروں اور دوسرے عہدے داروں میں مولوی صاحب مرحوم ہی ایسے تھے جنہوں نے ان کے عروج کے زمانے میں کبھی ان کی ہاں میں

ہاں نہیں ملائی اور نہ کبھی انہیں یہ توقع ہوئی کہ سرکاری یا غیر سرکاری معاملات میں وہ ذاتی تعلقات یا ماتحتی کی وجہ سے اپنی رائے بدل دیں گے۔

سرکاری معاملات میں جب تک وہ مقدمے کے پورے حالات و واقعات سے واقف نہ ہو جائیں کبھی اپنی رائے کا اظہار نہیں کرتے تھے۔ وہ معاملے کی تہ کو اس درجہ کو پہونچ کر رائے تحریر کرتے تھے کہ کبھی بدلنے کی نوبت نہ آتی۔ ان کی اس حق پسندی اور بے لوثی کی اس درجہ شہرت ہو گئی تھی کہ ان تک بڑے سے بڑے افسر و بارسوخ آدمی کی سفارش پہونچانے کی کسی کو ہمت نہ پڑتی تھی۔ امیر، امراء، جاگیردار، والیان سمستان انہوں نے کبھی ان لوگوں سے ذاتی تعلقات بڑھانے کی یا ان کے ساتھ اُٹھنے بیٹھنے کی ضرورت نہ سمجھی اور چونکہ اُن سے مطلب برآری کی کسی کو توقع نہ تھی اس لئے مطلبی لوگ اُن سے نالاں رہتے تھے۔ وہ لوکل پالیٹکس سے الگ تھلگ رہتے تھے۔ باوجود اس کے انہیں نواب سر آسمان جاہ کے زمانۂ وزارت میں معتمد مالگذاری چھوڑ کر مساوی یافت پر گلبرگہ صوبہ داری پر جانا پڑا اور نواب وقار الملک گلبرگہ سے ان کی جگہ آئے کیونکہ سر آسمان جاہ کے لئے نواب وقار الملک کو حیدر آباد میں اس خدمت پر رکھنا ضروری تھا۔ اس وزارت میں مدار المہام وقت کے ناک کا بال سمجھے جاتے تھے۔ جب محسن الملک کو اپنے عہدے سے پولیٹکل و فنانس کی معتمدی سے ہٹنا پڑا تو اس جگہ پر نواب اعظم یار جنگ کو بلانا ہی پڑا۔

قبل اس کے کہ اُن کی انتظامی قابلیت اور معاملات سرکاری میں انہماک کا ذکر کیا جائے یہ بیان کر دینا مناسب ہوگا کہ جس علمی شغف اور تصنیف و تالیف کی دُھن میں انہیں حیدر آباد میں سنہ [illegible] میں آنے سے پہلے تھی اس میں یہاں آکر اور اضافہ ہی ہوا۔ وہ اپنے کتب خانے پر جتنی ان کی ماہوار آمدنی بڑھتی گئی زیادہ خرچ کرنے لگے۔ ان کے ڈھب کے ایک مولوی صاحب عبداللہ خاں ٹونکی مل گئے، جو ان کے لئے نایاب کتابیں مہیا کرتے اور علمی مباحث میں حصہ لیا کرتے۔ ان مولوی صاحب کو انہوں نے نادر اور قلمی کتابیں تلاش کر کے لانے کے لئے مصر تک بھیجا۔ وہ ماوقات گئے تک آرام کرسی پر لیٹ کر کتاب پڑھا کرتے تھے اور اکثر اسی کرسی پر اُن کی آنکھ لگ جاتی جب چونکتے تو پھر پڑھنے لگتے یا میز پر جا کر لکھنا شروع کر دیتے۔ وہ مشکل سے تین چار گھنٹے سوتے تھے۔ انگریزی ادب پر پوری قدرت حاصل کرنے کی غرض سے انہوں نے لیٹن اور گریک بھی سیکھلی تھی وہ انگریزی زبان میں ایسی شستہ عبارت لکھنے لگے تھے کہ مسٹر جسٹس محمود جو کسی کو بہت کم مانتے تھے کہتے تھے کہ مولوی صاحب کا دماغ ایسے ایسے مقامات پر پہونچ جاتا تھا جہاں عام محققین نہیں پہونچتے۔

فرائض منصبی کی ادائیگی کے علاوہ مولوی صاحب ریاست حیدر آباد کی ایک بڑی خدمت جاگیرات پر ایک مفصل کتاب لکھنا چاہتے تھے۔ اس کے لئے انہوں نے ہزاروں مسلیں دیکھ ڈالیں اور یہ معلوم کرنے کی کوشش کی کہ کون سی جاگیر کس کو کن شرائط کے ساتھ ملی اور پھر اس میں نسلاً بعد نسلٍ کیا تبدیلی ہوئی۔ جاگیر کا رقبہ کیا ہے جاگیردار کو کیا خدمت ریاست کی انجام دینا ہے۔ محاصل کیا ہے، کاشتکار اور دیگر باشندگان جاگیر کے حقوق اور ذمہ داریاں کیا ہیں دہانہ کیا ہے وصولی کا طریقہ کیا ہے ملاحظہ سرکاری دفاتر میں مواد نہ ملنے کی وجہ سے انہیں جاگیرداروں سے رجوع کرنا پڑا بعضوں نے تو اُن کے خطوط کا جواب تک نہیں دیا اور دل میں طرح طرح کے گمان کرنا شروع کئے۔ مجبوراً نواب صاحب مرحوم کو یہ کام ادھورا ہی چھوڑنا پڑا۔ اگر ان کے ہاتھوں جاگیرداری کی تاریخ مکمل ہو جاتی تو صفیا تعام وعطیات کی نئی الجھنوں اور جاگیرداروں کو آئے دن کے مقدمات کی پیروی سے نجات مل جاتی۔ اور جاگیرداروں کے ورثاء کو جو صعوبتیں اُٹھانا پڑیں اس سے چھٹکارا نصیب ہو جاتا۔

اُن کو سرکاری خط و کتابت میں "اشد ضروری" سے سخت نفرت تھی اور نہ کبھی وہ ایسے الفاظ سے متاثر ہو کر ایسی لفافوں کو فوراً کھول کر پڑھتے تھے۔ اس معاملے میں ان کی خشکی کا باعث یہ بھی تھا کہ وہ اپنے مفروضہ کام کو کبھی ٹال کر نہ رکھتے تھے۔ وہ دفتر میں زیادہ بیٹھنے کے عادی نہ تھے۔

سر سالار جنگ کا انتقال یکایک ایک ہی دن کی بیماری میں ۳۰ ربیع الثانی سنہ ۱۳۰۰ ہجری کو ہو گیا۔ اور مستقل انتظام ہونے تک مہاراجہ نرندر پرشاد کے سپرد صدارت کا کام کر دیا گیا اس وقت سے لارڈ رپن کے آنے اور مرحوم نظام کے تخت نشین ہونے تک مختلف امراء وزارت کا خواب دیکھتے

سبب یہ تھا کہ لائق علی خاں کا حق جتاتا تھا اور سر آسمان جاہ اور وقار الامراء کو اس منصب پر فائز دیکھنا چاہتا تھا۔ ہر طرف سے بڑے بڑے پیچیدگیاں پیدا ہونا
شروع ہو گئے۔ سر خورشید جاہ کا تو ایک دو جگہ نام بھی آ کر رہ گیا۔ مسٹر پامر اور رستم جی مہاراجہ کے لئے کوشش کرتے کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ محسن الملک اور
عماد الملک نے وراثتاً لائق علی خاں کو اپنے باپ کا قائم مقام وزارت پر بھی حکومت ہند سے منوا لینے کی ترکیبیں کرنا شروع کیں۔ پوری ریاست
بھر میں صرف مولوی چراغ علی اور نواب اکرام اللہ خاں دو شخصوں کا نام لیا جاتا ہے کہ ان کو ان جھگڑوں سے کوئی دور کا تعلق بھی نہ رہا۔
نواب اکرام اللہ خاں تو سر سالار جنگ کے مرتے ہی استعفا دے کر چلے گئے۔ اور چراغ علی نے سالار جنگ کی زندگی ہی میں جو کتاب
حیدر آباد دکن انڈر سر سالار جنگ لکھنا شروع کی تھی اپنے گھر بیٹھے خاموشی سے بغیر اس خیال کے کون وزارت کا مستحق قرار پا کر عنان حکومت اپنے
ہاتھ میں لیتا ہے۔ اس کتاب کی تکمیل میں مشغول رہے۔ سر سالار جنگ کو معلوم تھا کہ یہ کتاب لکھی جا رہی ہے اور اس کے کچھ جز چھپ بھی چکے تھے۔
لیکن اس کی اشاعت اور تکمیل اُن کے مرنے کے بعد عمل میں آئی اور انہی کے نام سے منسوب کی گئی۔ اس کتاب کی چار جلدوں میں تمام انتظامات
اور محکمے اور صیغوں میں جو اصلاحات ہوئیں ان کو مفصل بیان کیا گیا ہے۔ یہ ایک اہم مستند کتاب گذشتہ دور کی اور سر سالار جنگ کے زمانے تک
ختم کی جو تاریخی اور انتظامی معاملات پر ہے جو اس وقت بہت پسند کی گئی تھی اور انگریزی اخبارات نے تعریفانہ ریویو لکھے تھے۔ مسٹر کارڈری
ریذیڈنٹ نے مولوی صاحب موصوف کو ایک پرائیویٹ خط میں اس کی اشاعت پر مبارکباد دی تھی اور ان کی محنت اور لیاقت کی تعریف کی تھی
[illegible]ء کی ایڈمنسٹریشن Administration رپورٹ جس کی آج تک تعریف کی جاتی ہے بڑی تقطیع کے چھ سو سے زیادہ صفحات پر شروع سے
آخر تک انہی کی لکھی ہوئی تھی۔ یہ رپورٹ ایک تاریخی حیثیت رکھتی ہے اور سرکار انگریزی میں ریذیڈنسی سے مسٹر کارڈری کے تعریفی نوٹ کے
ساتھ بھیجی گئی تھی۔ ان کی ملازمت کے سلسلہ کا ایک اور بڑا کارنامہ حیدر آباد کا پہلا باقاعدہ تفصیلی بجٹ ہے جس کی جامعیت کے ساتھ ساتھ
اس کی اختصار اور صفائی بھی قابل تعریف قرار دی گئی۔ اس بجٹ کی خصوصیتوں کا آگے چل کر خود مسٹر کرالی کو اعتراف کرنا پڑا۔ مسٹر کرالی نواب وقار الامرا
کی وزارت کے زمانہ میں حیدر آباد پر کنٹرولر جنرل کی حیثیت سے مسلط کئے گئے تھے تاکہ وہ ناگوار حالات کی جو سکہ و چاندی کی فروخت اور عجیب
مصارف سے پیدا ہو گئے۔ اور جن کی وجہ سے آگے چل کر دو کروڑ قرضہ لینے کا سوال پیدا ہوا روک تھام ہو سکے۔ انہوں نے رپورٹ تیار کی اس میں
شاہی اخراجات کو بہت بڑھا چڑھا کر دکھایا اور اس پر بڑی کڑی تنقید کی اور نظم و نسق کے سررشتوں میں تخفیف مصارف کی بھی تحریک کی۔ مولوی
صاحب اس وقت فنانشل سیکرٹری تھے۔ ان کے کانوں میں جب یہ بھنک پڑی کہ ایک انگریز کو کنٹرولر جنرل بنا کر یہاں لانے کی ترکیبیں ہو
رہی ہیں اس کی روک تھام تو ان کی طاقت سے باہر تھی انہوں نے فنانس پر جو مستند کتابیں مل سکتی تھیں منگا کر دو ماہ میں اُن سب کو پڑھ
ڈالا جب مسٹر کرالی آ گئے اور ان سے سرکاری ملاقاتیں ہوئیں تو انہیں پتہ چلا کہ یہ موٹا حبشی نما اور بڑی بڑی آنکھوں والا کیسا آدمی علم جدید کے
مالیہ کے اُصولوں اور گورکھ دھندوں سے اُن سے زیادہ واقف ہے۔

مسٹر پلاؤڈن اس وقت ریذیڈنٹ تھے۔ انہوں نے سر آسمان جاہ سے وزارت کی کرسی خالی کرائی تھی محسن الملک اور وقار الملک کو
یکے بعد دیگرے ریاست سے باہر کرایا تھا۔ فتح نواز جنگ بھی علیحدہ کئے جا چکے تھے۔ نواب وقار الامراء بہادر کو وزارت پر لا کر ان کی جا بے جا
تائید کر رہے تھے۔ ایک طرف تو انہیں بڑھتے بڑھتے شاہی مصارف کا رونا تھا۔ اور دوسری طرف حضور نظام کو مجبور کر کے فلک نما خریدا جایا تاکہ اس
طرح وقار الامراء کا قرضہ ادا ہو سکے اور یہ الزام اُٹھ جائے کہ وزیر اس قدر قرض دار ہے۔ اگر مولوی چراغ علی کا دم نہ ہوتا تو ریلوے شیئرز جو لندن
میں محفوظ تھے بک ہی جاتے اور نظام اسٹیٹ ریلوے ہاتھ سے نکل جاتی۔ انہوں نے جمع و خرچ کا ایسا صاف اور واضح Ballance Sheet
تیار کیا کہ پلاؤڈن کو اس سے اتفاق کر کے تعریف کے ساتھ حکومت ہند کو بھیجنا ہی پڑا۔ انہیں ایک عرصے سے ذیابطیس کی شکایت تھی لیکن وہ
آرام لینا جانتے ہی نہ تھے ان پر اس مرض کا آخری زور جب شروع ہوا تو اس زمانے میں بھی وہ اپنے مشاغل میں مصروف رہے۔ آرام لیا تو ان کو آ

ہی نہ تھا ان کی گردن کے اوپری حصے پر ایک گلٹی نکل آئی، حیدرآباد کے مشہور سرجن ڈاکٹر لاری نے کئی مرتبہ شگاف دیا اور زہریلا مادہ نکالا لیکن وہ مرض اچھی ہی نہ ہوا۔ عمل کے بعد اور کمزور ہوتے گئے ان کے عزیز ان کو لے کر بمبئی گئے اور بہتر سے بہتر ڈاکٹروں کو دکھایا مگر جب انسان کا وقت آجاتا ہے کسی کی دوا کارگر نہیں ہوتی اور جہاں کی مٹی نصیبوں میں ہوتی ہے قسمت وہیں لے جاتی ہے ان کو بمبئی گئے ہوئے ایک ہفتہ بھی نہ گزرا تھا کہ داعی اجل کو لبیک کہہ کر وہیں دفن ہوگئے۔

جن خوبیوں اور خصائل کے وہ تھے ایسے انسان کم پیدا ہوتے ہیں وہ نہایت منکسر المزاج تھے نام ونمود کی ان کو خواہش نہ تھی۔ حتیٰ کہ وہ نواب اعظم یار جنگ بہادر خطاب ملنے کے بعد انہوں نے کبھی نوابی کی شان جو اس وقت تو آج سے بھی زیادہ جتائی جاتی تھی کبھی نہیں دکھائی۔ انہوں نے ہمیشہ مولوی چراغ علی کے نام سے منسوب ہونا ہی پسند کیا وہ اپنے ابتدائی زمانہ ملازمت میں جس طرح سے لوگوں سے ملتے تھے اسی طرح معتمدی کے زمانے میں بھی ملتے رہے۔ وہ اپنے دوستوں اور عزیز و اقربا کی نہایت خندہ پیشانی سے مدد کرتے رہے اور اس طرح سے مالی مدد کی کہ مدد حاصل کرنے والوں کو اپنی کم مائیگی کا احساس نہ ہو۔ روپیہ کو وہ واقعی ہاتھ کا میل سمجھتے تھے۔ نوکروں پر آقائی نہیں جتاتے تھے نہ کبھی سخت لفظ ان کے منہ سے نکلتا تھا اور نوکر کے قصور پر چاہے کتنا ہی وہ نقصان کرے غصے کا اظہار کرتے تھے۔ ذیابیطس کی شکایت کی وجہ سے اور پھر اس پر جاگنے کی عادت کی بنا پر رات کو کئی دفعہ پانی پینا پڑتا مگر وہ نوکر کو آواز نہیں دیتے خود ہی اُٹھ کر پی لیتے۔ جو لوگ ان کی طبیعت سے واقف تھے ان کی ناموش طبعی کی وجہ سے کچھ کا کچھ سمجھتے۔ وہ چونکہ اپنے وقت کی بہت قدر کرتے تھے اس لئے جو لوگ اُن سے ملنے آتے ان کو صرف مطلب کی بات ہی کہنے دیتے۔ جب سر سید کو ان کی وفات کی اطلاع ہوئی تو اُن کو جس قدر رنج ہوا وہ اس مضمون سے ظاہر ہے۔ جو تہذیب اخلاق کی اس سال کی جلد میں موجود ہے۔ سید صاحب لکھتے ہیں:۔

"افسوس۔ ہزار افسوس۔ صد ہزار افسوس کہ پندرھویں جون ۱۸۹۵ء کو نواب اعظم یار جنگ بہادر مولوی چراغ علی نے بمقام بمبئی چار ہفتے کی بیماری میں انتقال کیا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

"افسوس کہ پندرھویں تاریخ کو جبکہ ہم بعض کاغذات ان کے نام روانہ کر رہے تھے۔ اور خیر و عافیت چاہ رہے تھے اسی وقت انہوں نے بمبئی میں انتقال کیا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ حیدرآباد میں سالار جنگ اعظم نے انہیں بلایا تھا اس زمانے سے اس وقت تک متعدد انقلابات حیدرآباد میں ہوئے۔ اور پارٹیاں بھی قائم ہوئیں مگر ان کو بجز اپنے کام کے کسی سے کچھ کام نہ تھا۔ ان کو بجز اپنے کام اور علمی مشغلے کے یہ بھی معلوم نہ تھا کہ حیدرآباد میں یا دنیا میں کیا ہو رہا ہے۔"

"انگریزی زبان میں بھی انہوں نے کتابیں تصنیف کی ہیں۔ مذہب اسلام کے ایک فلاسفر حامی تھے۔ ہمارے بڑے دوست تھے۔ ایسی خوبیوں کے شخص کا انتقال کرنا ایسے زمانے میں کہ اُن کی عمر کچھ بھی زیادہ نہ تھی نہایت افسوس اور رنج کے لائق ہے۔ (انا للہ وانا الیہ راجعون) افسوس ہے کہ وہ مضمون اور لاحل سوال کا جواب جو انہوں نے تہذیب الاخلاق میں لکھنا چاہا تھا ناتمام رہ گیا اور اب اُمید نہیں کہ کوئی شخص اس لاحل سوال کو حل کر سکے گا۔"

وہ سوال جس کا ذکر اقتباس بالا میں ہے وہ ماہ پیشتر تہذیب الاخلاق میں شائع ہو چکا تھا اور یہ اعلان بھی ہو چکا تھا کہ اس کا جواب مولوی صاحب مرحوم لکھ رہے ہیں جو انگریزی میں کتاب کی شکل میں "العلوم الجدیدۃ والاسلام" کے نام سے شائع ہوگا سوال یہ تھا کہ اکثر لوگوں کی رائے میں یورپین علوم و فنون کی تعلیم عقائد اسلام سے برگشتگی پیدا کرتی ہے۔ اگر یہ صحیح ہے تو یورپین علوم و فنون کے ان مسائل اور ان کے دلائل کو بیان کرنا چاہیے جو اس برگشتگی کا باعث ہیں اور ان کتب دینیہ اور ان مقامات کا نشان ضروری ہے جن کو تعلیم میں داخل کرنے سے اس برگشتگی کی روک ہو سکے اور اگر یہ رائے صحیح نہیں ہے تو اس کی عدم صحت کا بیان جہاں تک ممکن ہو مفصل اور دلیل سے بیان کیا جائے۔

مذہبی تصانیف میں ان کی پہلی کتاب "تعلیقات" کے نام سے سنہ ۱۸۸۱ء میں لکھنؤ سے شائع ہوئی تھی اس میں انہوں نے پادری عماد الدین کی کتاب تاریخ محمدی کا جواب دیتے ہوئے یہ لکھا کہ اس کے ماخذ غلط ہیں حضرت عیسیٰ اور انجیل پر تفصیلی بحث کی تھی اس کے بعد انہوں نے انگریزی میں متعدد کتابیں "ریفارمز انڈر مسلم رول" "محمدی پوائنٹ" وغیرہ لکھیں۔ تحقیق الجہاد میں انہوں نے یہ ثابت کیا ہے کہ اسلام تلوار کے زور سے نہیں پھیلا۔ جہاد کی حقیقت بتلاتے ہوئے انہوں نے اسباب کو دکھایا ہے کہ پیغمبر اسلام کے زمانے میں جو لڑائیاں لڑی گئیں اس میں کفار کو قتل کرنا اور تلوار کے زور سے ان کو مسلمان کرنا مقصود نہیں تھا بلکہ وہ سب حالت مجبوری میں اپنے بچاؤ کے لئے لڑی گئیں۔ ایک اور کتاب میں انہوں نے اسلام کی دنیوی برکتیں دکھلائی ہیں۔ "ایام الناس" جو اُردو میں لکھا ہوا ایک چھوٹا سا رسالہ ہے اس میں اس اعتراض کو مٹایا ہے کہ قرآن میں کوئی بھی من گھڑت قصہ نہیں۔ اس کتاب کے لکھنے میں انہیں بڑی محنت برداشت کرنا پڑی ہوگی اور کافی دقتیں اُن کتابوں کے مہیا کرنے میں اُٹھانا پڑی ہوں گی جس پر انہوں نے استدلال کیا ہے۔ اس کتاب میں انہوں نے قدیم یونانی اور عبرانی مؤرخوں کے حوالے سے ان قوموں کا وجود ثابت کیا ہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے متعدد رسالے لکھے ہیں اور کئی کتابیں ناتمام حالت میں چھوڑ گئے۔ ان رسالوں میں "غلامی"، "تعدد ازدواج" بہت مشہور ہیں۔ سر ولیم میور نے جو قرآن پر اعتراضات کئے تھے اس کے جواب میں انہوں نے "ردِ شہادت قرآنی برکتب ربانی" لکھی تھی۔

مولوی امیر حسن صاحب مرحوم جو محسن الملک کے چھوٹے بھائی تھے جنہوں نے اپنی نامور بھائی کی کتاب "آیاتِ بینات" کا جواب "آیاتِ محکمات" کی تکمیل میں عمر کا بہت حصہ صرف کیا، فرماتے ہیں کہ مذہب پر کتاب لکھنے والوں میں جو روش مولوی صاحب مرحوم کی تھی اس کی بڑی خوبی یہ تھی کہ ان کے اعتراضات و جوابات سے یہ پتہ چلانا دشوار تھا کہ وہ سُنی ہیں یا شیعہ، مقلد ہیں یا غیر مقلد۔ وہ جہاں تک ہو سکتا قرآن ہی سے استدلال کرتے تھے۔ عام رائے یہ ہے کہ مولوی چراغ علی اپنے ہم عصروں میں سب سے زیادہ محقق اور وسیع النظر تھے۔ ان کی تقریباً سب کتابیں اسلام کی حمایت میں ہیں جس میں نہ لفاظی اور نہ عبارت آرائی ہے اور نہ خواہ مخواہ فصاحت و بلاغت دکھائی گئی ہے وہ واقعات کی تنقید و تنقیح صحیح نتائج کے استخراج اور معلومات علمی سے لبریز ہیں ظاہر ہے کہ ایسی تحریر میں جوش اور گرمی نہ ہوگی اور روکھی پھیکی سی ہوں گی جن سے نہ جذبات بھڑکیں گے اور نہ دل پھڑکیں گے اُن میں محض منطقی سرد مہری ہوگی۔ انہوں نے دُنیا کو اپنی تصنیفات سے دکھلا دیا کہ مذہب اسلام ہی ایک مذہب ہے جس میں ترکِ دُنیا و ترکِ لذّات کے بغیر روحانی ترقی کے مدارج طے کرنے کے ذرائع موجود ہیں۔ وہ ان عالموں میں سے تھے جن کو صحیح معنوں عالم باعمل کہا جاتا ہے۔ جو وہ کہتے تھے اس پر خود عمل بھی کرتے تھے۔ اُن کا ظاہر و باطن ایک تھا، وہ ایک شفیق باپ اور مخلص دوست تھے۔ ادائے حقوق میں وہ کامل تھے اور اپنی بات کے پکے۔ انہوں نے اپنی زندگی کا ایک لمحہ بیکار صرف نہیں کیا۔ وہ ایک ایسی مثال چھوڑ گئے جس کی پیروی کر کے دین اور دُنیا دونوں سنبھل سکتے ہیں۔

۷ امرداد سنہ ۱۳۰۴ء فصلی کے جریدہ اعلامیہ میں ان کی وفات پر مندرجہ ذیل اعلان شائع ہوا۔

> "نواب مدار المہام سرکار عالی نے نہایت درجہ افسوس کے ساتھ سُنا کہ مولوی چراغ علی صاحب اعظم یار جنگ بہادر معتمد مال و فنانس، سرکار عالی نے بتاریخ ہشتم امرداد سنہ ۱۳۰۴ء فصلی بروز شنبہ بمقام بمبئی جہاں وہ علیل ہو کر بغرض علاج و تبدیل آب و ہوا گئے تھے انتقال ہو گیا۔ مرحوم ایک نہایت لائق کارگذار، واقف کار، ذی علم، مستقل مزاج اور سنجیدہ عہدہ دار تھے۔ نواب مدار المہام سرکار عالی مکرر اظہار افسوس کرتے ہیں کہ طبقہ عہدہ داران میں سے مولوی چراغ علی صاحب مرحوم کے ایسے منتخب اور برگزیدہ شخص کے انتقال سے

درحقیقت بہت نقصان پہونچا ۔"

ان کا سوگ مسلمانوں نے ہر جگہ منایا اور انگریزی اور اُردو اخبارات میں تعزیتی مضامین چھپے اور ان کی قومی مذہبی اور ملکی خدمات کو سراہا گیا متعدد قطعے، تاریخیں اور نظمیں لکھی گئیں۔ "ہائے اعظم یار جنگ" سے اُن کے وفات کی تاریخ ۱۳۱۲ھ ہجری نکلتی ہے۔ مولانا حالی نے جو قطعہ لکھا تھا اس کے چند شعر جن سے مولوی چراغ علی مرحوم کی اس عظمت کا جو سر سید کے حواریں کے دل میں تھی پتہ چلتا ہے، یہ ہیں:۔

مستفید ان ہمہ نہ کردہ وا این معنی ہنوز	مشتے از گنجینۂ لعل و گہر پاشید و رفت
از سحاب فیض گلگش نا شدہ سیراب خلق	ساعتے برقِ یمانی از اُفق تابید و رفت
کرد نے آزار خلق احسان سلطانی ادا	نے وکس رنجید نے کس ازو رنجانید و رفت
یادران قوم را تا زیست یاور بود و یار	ہر چہ بتوانست در تائید شان کوشید و رفت

مسٹر سید محمود نے ان کی انتقال کی خبر سنتے ہی کہا :۔

حیف چراغ علی از دُنیا نہاں شد

اس سے ان کی وفات کی تاریخ سنہ عیسوی بھی نکلتی ہے۔ سید محمد واحد علی صاحب کاکوروی نے جو اُن کے ساتھ حیدرآباد میں کام کر چکے تھے تاریخ کہی :۔

"گھر شب چراغ بود نہ ماند"

مختصر یہ کہ مولوی چراغ علی نواب اعظم یار جنگ بہادر اُن ہستیوں میں سے تھے جو پیوند خاک ہو جانے کے بعد بھی زندہ رہتے ہیں۔ ان بزرگوں کی یاد آتے ہی مسلمانوں کو یہ نہ بھولنا چاہیئے کہ گو اُردو اُن کی مذہبی زبان نہیں ہے اور نہ اکیلے انہی کی بنائی ہوئی ہے۔ مگر اس کے مٹتے ہی سر سید، محسن الملک، وقار الملک، اعظم یار جنگ، حالی، شبلی، نذیر احمد، ذکا اللہ ایسے بزرگوں کو حقیقی موت آ جائے گی، اور اگلی نسل میں کوئی اُن کا نام بھی نہ سُن سکے گا ۔

خُدا وہ وقت نہ لائے!

نظامؔ رامپوری

شاد عارفی

انگڑائی بھی وہ لینے نہ پائے اُٹھا کے ہاتھ   دیکھا جو مجھ کو چھوڑ دیئے مسکرا کے ہاتھ

اگر آپ حیران نہ ہوں اور آپ میری پندرہ سالہ تحقیق و تلاش پر بھروسہ کرلیں تو میں آپ کو یہ اطلاع فراہم کرسکتا ہوں کہ اوپر دیئے ہوئے حضرت نظام کے مطلع میں پہلا مصرع حضرت نظامؔ رامپوری کا نہیں بلکہ نواب کلب علی خاں صاحب المتخلص بہ نواب کے فکر کا نتیجہ ہے جسے مرحوم نے محلسرائے کے کسی منظر سے متاثر ہو کر نظم کیا اور باہر آکر شعرائے دربار سے اس پر گرہ کی فرمائش کی۔ اپنے اپنے رنگ میں سبھی نے زور مارا مگر مصرع کا ما تعلق منچ کسی کی گرہ برداشت نہ کرسکا۔ چونکہ یہ مصرع حضرت نظام صاحب کے ڈھب کا تھا چنانچہ انہوں نے کہا، دیکھا جو مجھ کو چھوڑ دیئے مسکرا کے ہاتھ —— مصرع دست و گریبان ہو گیا تھا۔ اس لئے نواب صاحب نے اظہار خوشنودی کے طور پر اپنا مصرع یہ کہہ کر نظام رامپوری کو عطا کر دیا کہ یہ مصرع بھی تمہی لے لو اور حضرت نظام نے بھی کمی نہیں کی کیونکہ وہ کوئی جاگیر نہیں تھی جسے اوڑھا یا بچھایا جاسکتا —— اور پھر اس مطلع پر پہلی غزل کہی جو حضرت نظام صاحب کے دیوان کا حاصل ہے اور یہ بات درست معلوم ہوتی ہے کہ ہر دیوان میں ایک غزل اور ہر غزل میں ایک شعر بے پناہ ہوتا ہے۔ حالانکہ نظام رامپوری کی ایک اور غزل بھی حاصل دیوان ہے جس کا یہ مطلب ہوا کہ حضرت نظام کے دیوان میں دو غزلیں وہی خصوصیت رکھتی ہیں۔ جو کسی اور شاعر کے ہاں پورے دیوان میں ہوتی اُس غزل کا ایک مصرع یہاں سُنا دوں تفصیل بعد میں آئے گی۔ فرماتے ہیں ——

اُسے کیا بات تھی کیا بھول گیا

ۃ ہاں —— آپ میری اس اطلاع پر حیران ہوئے ہوں گے لیکن مجھے اپنی اس تحقیق پر کتنی پشیمانی ہوئی تھی بیان نہیں کرسکتا لیکن اس طرح حضرت نظام کے عقیدت مندوں کو ٹھیس لگی تھی لہٰذا اُن حضرت کو جن کے ذریعہ یہ پتہ چلا تھا۔ جو قدامت الوقت اور قدیمی قسم کے آدمی تھے اُن سے اس لئے بدگمان ہو کر کہ یہ مبالغہ تو نہیں فرما رہے ہیں میں نے بے ساختہ کہا تھا —— ارے بھئی . . . . . اس مطلع کا پہلا مصرع معہ ردیف و قافیہ انعام کے قدر ہو گیا ہے : وہی ملوک الکلام ” والی بات ہے۔ وہ کس طرح ؟ انہوں نے پوچھا —— تم بھی بھولو —— انگڑائی بھی وہ لینے نہ پائے ——

مضمون ادا ہو چکا ——— "آشنا کے ہاتھ" ——— پھلانگ لگا کر وقت جا کھڑا ہوا۔ بالکل یوں جیسے کوئی کہے۔ میں نے ناک سے پھول سونگھا ——— یا پھر۔ علی حزیں کا یہ مطلع دیکھو جس پر حضرت غالب نے بجا اعتراض کیا تھا۔

ز ترک تازئ آں نازنیں سوار ہنوز   کہ سبزہ می دمد انگشت زینہار ہنوز

پہلے مصرع میں "ہنوز" قطعاً کا واک اور زائد ہے۔ یعنی تو کہا ہے کہ مطلع ہی شاعر کی پول کھلتی ہے۔ بہرحال۔ جب میں آتش کی طرح جوان تھا اور میری شاعری اختر شیرانی کی معشوقہ کی طرح جوان العمر۔ تب مجھے حضرت نظام کا یہ مطلع سنایا گیا۔ میں اس وقت زوائد وغیرہ سے واقف نہ تھا۔ اس لئے پورے مطلع پر پھڑک گیا کیونکہ میری شاعری کی بنیاد بھی اس وقت "واقعات" اور "معاملوں" پر قائم تھی۔ مثلاً

——— چھپائی ہیں جس نے میری آنکھیں میں انگلیاں اس کی جانتا ہوں ——— وغیرہ

اس لئے حضرت نظام رامپوری کا دیوان دیکھنے کی فکر پڑی۔ بڑی تلاش کے بعد ایک مولوی قسم کے (چوکل ہٹے) شخص کے پاس دیوان ہونے کی خبر ملی۔ پہونچا ——— مگر وہ "مت کئے" سے تھے اس لئے پہلے تو صاف انکار کر گئے پھر میری التجاؤں پر کچھ پسیجے اور کہنے لگے کہ تم میرے سامنے دیکھ سکتے ہو گھر نہیں لے جا سکتے نہ اس کی نقل کر سکتے ہو۔ ایک شعر بھی نہیں۔ جی نہیں۔ اور انہوں نے دیوان بغل میں داب کر گھر چلنے کی ٹھانی۔ میں نے پھر عاجزی سے کام لیا تو ٹھیر گئے ——— یہ قلمی دیوان تھا۔ لکھائی بہت بری۔ کاغذ بھی بادامی اور گلا سڑا ——— چھ دن متواتر ایک ایک گھنٹہ مطالعہ کر کے بہت سے شعر یاد کر لئے اور روز ایک نوٹ بک پر گھر آ کر نقل کرتا رہا۔ جب اس طرف سے مطمئن ہوا تو ان اشعار کا بغور مطالعہ کیا۔ تو صاف ظاہر ہوا کہ حضرت نظام اپنے ماحول سے تنگ آ کر جو کچھ کہنا چاہتے تھے وہ شخصی حکومت کے خوف سے نہ کہہ سکے۔ اس لئے جگہ جگہ بات چبا گئے ہیں۔ مثلاً

——— ہم ایسے ہیں کہ جیسے کسی کا خدا نہ ہو ———

یا پھر

——— جیسے ہم بن بلائے بیٹھے ہیں ———

اب حال نظام کچھ نہ پوچھو   غم ہوگا تمہیں اگر کہوں گا

کچھ آپ کو خبر بھی ہے سید نظام کی   بیچارہ تنگ آ کے وطن سے نکل گیا۔ وغیرہم

حالانکہ بے چارے نے کبھی ترک وطن نہیں کیا نہ کر سکتے تھے۔ مگر اس طرح وہ اپنی التجاؤں کو حسن طلب سے آگے لے گئے تھے اور جیسا کہ مجھے تحقیق ہوا ان کی زندگی سخت مالی مشکلات کا شکار رہی۔ انتقادیات کا پہلا مضمون میاں نظام شاہ رامپوری پر ہے جس میں نیاز فتحپوری نے کسی تجسس سے کام نہیں لیا۔ ورنہ یہ کبھی نہ لکھتے کہ (جب میاں نظام شاہ کی شاعری کی خبر شہر میں عام ہوئی تو نواب نے انہیں بلایا اور منصب مقرر کر کے شعرائے دربار کا سلسلہ سے وابستہ کر دیا)۔ حیرت ہے کہ نیاز فتحپوری نے کس بنیاد پر منصب مقرر کرنے کا دعوےٰ کیا ہے جبکہ کوئی تحریری سند یا اسٹیٹ گزٹ وغیرہ میں اس کا کوئی سراغ نہیں ملتا۔ اس عبارت کے فوراً بعد انتقادیات میں ایک کھٹکتا ہوا جملہ اور بھی ہے کہتے ہیں (کہا جاتا ہے کہ میاں نظام شاہ نے اس کے بعد خود نواب سے فن شعر حاصل کیا) اس جملہ معترضہ کے صاف وہی معنی ہیں۔ جس میں اقتدار پسندی لکھنے والے کو دوسری جانب بہکائے جاتی ہے۔ سمجھ میں نہیں آیا کہ جس کا منصب ہو جو نواب کا شاگرد ہو اس کی زندگی اس قدر ناگفتہ رہی کہ بایدوشاید۔ مکان گرا تو بنا نہ سکے۔ مفلسی کی بنا پر بیوی ایک بچہ (لڑکا) لے کر اپنے گھر جا بیٹھی اور پھر زندگی بھر واپس نہ آئی۔ یہاں نیاز فتحپوری کو ایک اور ٹھوکر

گی ہے۔ کیونکہ وہ اپنے اعتقادیات میں لکھتے ہیں کہ سید نظام شاہ نے (ساری عمر تجرد میں بسر کی اور قلیل معاش پر نہایت صبر و توکل سے زندگی گزار دی) تعجب ہے کہ اپنے اعتقادیات میں نیاز فتحپوری منصب داری کا ذکر بھی کرتے ہیں اور تجرد کا بھی دعوے کرتے ہیں۔ لیکن قلیل معاش پر زندگی گزارنے کے متعلق اقرار کرتے ہیں۔ نواب کلب علیخاں صاحب نواب کا شاگرد اور قلیل معاش۔ منصب دار اور فاقے — ایسے متضاد بیانات ہیں جن سے شک گزرتا ہے کہ واقعہ یہ نہیں ہے جو احتیاطاً یا مصلحتاً درج اعتقادیات کیا گیا ہے۔ حقیقت جو میری تحقیق میں آئی جس کے راوی حتی الامکان معتبر تھے۔ کہتے ہیں کہ یہ سب کچھ غلط۔ اُن کا منصب و نصب کچھ نہیں تھا۔ جوانی میں اپنے والد سید احمد شاہ صاحب کی جگہ سواروں میں نوکر ہوئے تھے۔ مگر اپنے لا ابالی پن اور صوفیانہ روش اور شاعرانہ مزاج کے بنا پر یہ نوکری چھوڑ دی تھی۔ تنگ دستی کی وجہ سے بیوی عموماً پریشان رہتی تھی اور ایک لڑکے کی ماں بھی بن چکی تھی۔ اس لئے فاقے کرتے کرتے تنگ آکر گھر بیٹھ رہی اور سید نظام شاہ صوفی منش حضرات کی صحبت میں گزارتے رہے۔ بیوی کی جدائی اور اس کی یاد نے وہ تمام باتیں یا معاملے شعر میں ڈھالنے شروع کئے جو اُن پر گزرے تھے گویا یہ اشعار جن پر ادا بندی اور معاملہ بندی کی مہریں ہیں۔ سب اُن کے گھر والی سے متعلق ہیں۔ یہ میں نے اس لئے کہا کہ وہ انتہائی پاک باز قسم کے صوفی تھے۔ میں اس قسم کے دعوے کیوں کر رہا ہوں آپ گھبرائیں نہیں میں اُن کا معتبر راویوں کے ذریعہ ثبوت دوں گا۔ میں نے جس قدر وقت سید نظام شاہ کی زندگی پر لکھنے پر صرف کیا ہے اور جہاں جہاں قدرت نے خلاف توقع وہ اسباب فراہم کر دیئے۔ جو سید نظام شاہ پر لکھتے وقت کسی کو نصیب نہ ہوں اُن کے لئے میں مشیت اور اُن کرم فرماؤں کا شکرگزار ہوں جنہوں نے میری بڑی رہنمائی کی ورنہ میں تھک کر بیٹھ رہتا۔ یہ تو آپ جانتے ہوں گے کہ سید نظام شاہ حضرت بیمار شاگرد حضرت مومن کے شاگرد تھے۔ بعد میں صوفی علی احمد شاہ صاحب سے اصلاح لینے لگے —— مگر ایک سوال ہے جو برابر مجھے ستا رہا ہے وہ یہ کہ مولوی صوفی علی احمد شاہ صاحب ان اشعار پر کیا اصلاح دیتے ہوں گے جن کا تعلق معاملہ بندی اور "خلوت سرائے" سے ہے اس لئے ماننا پڑے گا کہ یہ سید نظام شاہ صاحب کی اپنی شدت ادا کا نتیجہ تھا۔ نیاز فتحپوری نے جن کو سب سے الگ بات کہنے میں اپنی شان نکلتی معلوم ہوتی ہے سید نظام شاہ کو جرأت سے متاثر یا ان کے رنگ میں کہنے والا بتایا ہے حالانکہ اُن کا رنگ یا تو میر سوزؔ سے ملتا جلتا ہے یا پھر نواب آصف الدولہ سے۔ اب میں ان تینوں شعراء کا کلام گڈمڈ کرکے آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں آپ خود اندازہ کریں گے کہ یہ ایک ہی شخص کا کلام ہے یا تین الگ الگ رجحانات طبع کا نتیجہ۔

جس کا تو آشنا ہوا ہوگا — اُس نے کیا کیا ستم سہا ہوگا
تیرا ملنا تو اک قیامت ہے — غیر کا حال کیا ہوا ہوگا
دردِ دل اپنا میں اُس شوخ سے کہتا لیکن — جو چھپانے میں مزا ہے نہیں اظہار کے بیچ

گھر جانے کا قاتل نے نرالا ڈھب نکالا ہے — ہر اک سے پوچھتا ہے اس کو کس نے مار ڈالا ہے
غیر سے کہتے ہیں وہ میرے ستانے کے لئے — ڈھونڈھ لیں گے ہم بھی کوئی دل لگانے کے لئے
رات دن یہ سوچ رہتا ہے میرے دل کے تئیں — اے خدا وہ یاں سے جا کر کس کا ہم خانہ ہوا

اُس پاس پھر گیا دلِ گمراہ کیا کروں — دم مارنے کی بات نہیں آہ کیا کروں
بے وہاں جائے بھلا ہم سے رہا جائے کہاں — دل سے اور اس بزم میں جانے کا مزہ جائے کہاں
نہ جی چاہے تھا جس کے پاس سے اک دم سرکنے کو — سو اس کے در پہ اب رخصت نہیں ہے سر ٹپکنے کو

ان اشعار کے مطالعہ سے بخوبی اندازہ ہوجاتا ہے کہ میر سوز۔ نظام شاہ اور نواب آصف الدولہ جو میر سوز کے شاگرد بھی تھے قریب قریب ایک ہی رنگ میں کہتے تھے۔ اوپر دئے ہوئے تین تین شعروں میں ہر پہلا شعر میر سوز کا ہے دوسرا شعر نظام رامپوری کا اور آخری شعر نواب آصف الدولہ کا ہے۔

عبدالشکور صاحب پرنسپل گورنمنٹ رضا ڈگری کالج رامپور نے "نظام رامپوری" کے نام سے جو مجموعہ شائع کردیا ہے اس میں موصوف نے بھی یہ بات مان لی ہے کہ نظام رامپوری کا ناظم رامپوری یعنی نواب یوسف علی خاں کا شاگرد ہونا محل نظر ہے۔ اور یہ کہ انہیں شاعر دربار ہونے سے کوئی مالی منفعت نہیں ہوئی۔ حتیٰ کہ انہوں نے نواب یوسف علی خاں صاحب ناظم اور نواب علی خاں صاحب نواب کی تعریفوں میں قصیدے تک کہے (قصیدے میں اُن کا رنگ بہت پھیکا ہے اور اُن پرشکوہ الفاظ سے خالی ہے جو قصیدے کی جان ہوتے ہیں) ان قصائد کا نتیجہ بھی صفر رہا ہوگا ورنہ وہ تنگیٔ معاش میں مبتلا نہ رہتے۔ چنانچہ انہوں نے یہاں تک کہا کہ مصرع

——— شب کو فرمائش سرکار نے سونے نہ دیا ———

سیّد نظام شاہ ۱۲۴۹ھ میں نواب احمد علی خاں صاحب بہادر کے عہد میں رام پور میں پیدا ہوئے۔ صحیح النسب سیّد تھے۔ ان کا سلسلہ بارھویں پشت میں حضرت شاہ عبدالقادر جیلانی رحمتہ اللہ علیہ سے ملتا ہے۔ نیلا تہبند باندھے رہتے تھے اور کبھی کبھی سیاہ بھی۔ خلیق۔ ملنسار اور متقی قسم کے صوفی تھے۔ تین صاحبزادگان وقت کا سودا سلف خریدنے پر یومیتی ملازم تھے۔ ان سے جو کچھ مل جاتا صبر و شکر کے ساتھ اس پر قناعت کرلیتے تھے ——— یہ قناعت کا لفظ مجبوری کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ ورنہ وہ کوئی باقاعدہ متشرع اور مذہبی آدمی نہ تھے۔ صوفی مزدور تھے لیکن صوفی اور فاقہ لازم و ملزوم نہیں رہے ہیں اور یہ کہ اگر وہ اتنے ہی نفس کُش تھے تو نواب یوسف علی خاں ناظم کے قصیدے کیوں لکھتے۔ نواب کلب علی خاں صاحب نواب کی مدح اور فرمائش سرکار کے سلسلے میں اپنی راتیں کیوں کالی کرتے۔ ظاہر ہے کہ اُن کو کبھی وہ فراغت نصیب نہ ہوئی جس کے وہ دربار سے متمنی تھے۔

سیّد قیصر شاہ میاں جو نظام شاہ کے ساتویں لڑکے تھے۔ (ان سے پہلے چھ لڑکوں کا انتقال ان کے سامنے ہی ہوگیا تھا) اور اپنی والدہ کے ساتھ تھانۂ پیلا تالاب پر رہتے تھے۔ جب میں اُن سے ملا ہوں تو وہ بہت ضعیف اور عسرت کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ وہ اپنے والد کی شاعری بابت قریب قریب کچھ نہیں جانتے تھے۔ خود پڑھے لکھے نہ تھے۔ اس لئے اپنے والد کی بے پروائی کے سخت شاکی تھے انہیں یہ قطعی معلوم نہیں تھا ان کے والد کو ناقدریٔ زمانہ نے اس بری طرح پیسا تھا کہ وہ یہ کہنے پر مجبور ہو گئے تھے۔

——— ہم ایسے ہیں کہ جیسے کسی کا خدا نہ ہو ———

ہاں ایک مثنوی کے بابت کہتے تھے جو اُن کی والدہ کے پاس تھی جسے کوئی صاحب دیکھنے کو مانگ کر لے گئے اور پھر واپس نہ لائے ——— ماسٹر امتیاز صاحب لکھنؤی ——— جو ڈرائینگ ماسٹر ہیں اور ایک اچھے آرٹسٹ بھی ایک روز میرے پاس میرا فوٹو لینے آئے، وہ اس پر قلمی عمل کرنا چاہتے تھے۔ باتوں باتوں میں نظام صاحب کا ذکر آگیا تو موصوف نے اپنے والد کے حوالے سے سیّد نظام شاہ صاحب کے بارے میں عجیب روایت بیان کی انہوں نے کہا کہ میرے والد جن کا اس عہد کی پسندیدہ ہستیوں میں شمار ہوتا تھا اپنا چشم دید حال بیان کرتے تھے کہ پہلے ہم لوگ بھی گھیر سیفی میں رہا کرتے تھے وہیں سیّد نظام شاہ صاحب کا آبائی مکان بھی تھا جس کو انہوں نے بیوی سے ناچاقی کے بعد قریب قریب ترک کردیا تھا صرف رات کو سونے کے لئے یہاں چلے آتے تھے اور دن بھر علی نور صاحب کی خدمت میں رہا کرتے تھے علی نور صاحب اس عہد کے ایک اچھے بزرگ تھے۔ اُن کا ایک لطیفہ بھی سنتے چلئے۔ افغانستان سے ایک مولوی علی قد صاحب سے بیعت کے لئے آئے۔ رمضان کا مہینہ تھا۔ جب یہ موصوف کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ خربوزہ کھا رہے تھے۔ افغانی مولوی نے دیکھتے ہی کہا۔ لاحول ولا قوۃ میں کیا سمجھ کر

آیا تھا اور میاں تو کچھ اور ہی دیکھ رہا ہوں ۔ علی نور صاحب اس پر مسکرائے اور کہا ۔ مولینا ۔ اللہ میاں تو روزہ نہیں رکھتا ۔ اتفاق بھی بلا کے تیز آدمی تھے ۔ کہنے لگے ۔ اللہ میاں روزہ تو نہیں رکھتا مگر وہ خربوزہ بھی نہیں کھاتا ہے ——— آپ اس جواب پر بڑے خوش ہوئے اور فوراً مرید کر لیا اور کہتے ہیں کہ تھوڑے ہی عرصہ میں دولت فقر سے مالا مال کر دیا ——— جب سید نظام شاہ کا انتقال ہوا تو صحیح نہیں کہا جا سکتا کہ وہ اس وقت علی نور صاحب کی قدموں میں تھے یا کسی اور مکان میں مگر یہ طے ہے کہ آن کا انتقال مسکونہ مکان میں نہیں ہوا اور انتقال کے بعد علی نور صاحب کے احاطے میں کہیں دفن ہوئے ۔ نیاز فتحپوری نے یہ جو کہا ہے کہ انتقال کے بعد سید نظام شاہ اپنے پیر علی احمد شاہ صاحب کے قدموں میں دفن کئے گئے قطعاً موضوعی حیثیت رکھتا ہے ۔ ماں تو کھنڈارا کے والد کا بیان ہے کہ جب میاں نظام کا انتقال ہوا تو امیر احمد صاحب مینائی نے آکر نظام صاحب کے مسکونہ مکان میں حکومت کی طرف سے ایک اور قفل ڈال دیا موحم کے بعد امیر مینائی نے ہی یہ مکان کھلا ۔ غزلیات کے مسودے اور کچھ اشعار جو دیواروں پر کوئلے سے لکھے ہوئے تھے نوٹ کئے اور ان کو مٹا کر چلے گئے ۔ پلنگ پیڑھی ان کی بیوی کو بھجوا دی موصوف نے یہاں ایک عجیب و غریب بات کہی ۔ مجھے چونکہ کسی حقیقت کو چھپانا مدنظر نہیں ہے اس لئے وہ سب کچھ بے کم و کاست بیان کرتا ہوں حالانکہ امیر صاحب مینائی میرے دادا استاد ہیں کیونکہ میں فصاحت جنگ حضرت جلیل کا شاگرد رہا ہوں ۔ ماسٹر کھنڈارا صاحب کے والد کا یہ خیال تھا کہ وہ اشعار جو امیر مینائی کے کلام میں نہیں کھپتے یہ وہی اشعار ہیں جو وہ نظام شاہ کے مکان سے اپنے ہمراہ لے گئے تھے ۔ میں نے جیسا سُنا تھا آپ سے بیان کر دیا اب یہ آپ پر ہے کہ اُسے قبول یا رد کر دیں ——— پھر بھی امیر مینائی سے اس قسم کی بدگمانی کی نسبت درست نہیں ۔ ابھی میں نظام شاہ صاحب سے متعلق کچھ لکھنے پر سوچ ہی رہا تھا کہ مردے از غیب بیروں آمد و کارے بکند ۔ کے طور پر ایک شخص میری غزل کا مطلع سُن کر پوری غزل حاصل کرنے کو آگئے ۔ یہ امیر مینائی خاندان کے قدیم خدمتگذاروں میں ہیں ۔ آن سے بھی سید نظام شاہ صاحب کا تذکرہ چھڑا تو وہ کھُل پڑے ۔ کہنے لگے کہ آپ حافظ بھُندو عرف پنڈت سے ملئے جو کٹرہ کوئیا محلّہ میں رہتے ہیں اور پھر انہوں نے پنڈت کے متعلق سب کچھ بطور خود بھی بتایا ۔ پنڈت اِن کے خاص دوستوں میں سے تھے ۔ یہ حافظ بھُندو اور پنڈت یہ کیا معاملہ ہے میں نے پوچھا تو انہوں نے کہا کہ پیغمبر پور میں ایک بزرگ رہتے تھے ۔ حافظ بھُندو نے ان کی کرامت کا امتحان لینے کے لئے پنڈت کا روپ دھارا اور حاضر ہوئے ۔ وہ بزرگ حقّہ پی رہے تھے ۔ حقّہ آگے بڑھا کر کہا ۔ پنڈت جی پیو ——— انہوں نے پنڈت ہونے کا عذر کیا تو فرمایا یہ تو ٹھیک ہے مگر ہمارے ہاں پنڈت اور شیخ سب برابر ہیں ۔ بہت عذر ہوا بس اب پی لو ——— راز کھُل گیا مگر یہ پنڈت کے نام سے ایسے مشہور ہوئے کہ لوگ اُن کا نام بھُول گئے ۔ تو ان پنڈت کو سید نظام شاہ صاحب سے والہانہ محبت تھی ہر وقت ان کی خدمت میں رہتے اور ہر شعر اور ہر غزل کے متعلقات انہیں یوں حفظ تھے جیسے وہ اُس کے حافظ ہوں ۔ ان پنڈت نے ہی لوگوں پر یہ راز فاش کیا تھا کہ انگڑائی بھی وہ لینے نہ پائے اُٹھا کے ہاتھ یہ مصرع نواب کلب علی خان کا مصرع تھا جس پر نظام رام پوری نے پہلے تو مصرع پہنچایا اور پھر پوری غزل کہی جو حاصل دیوان ہے ۔ پنڈت نے یہ بھی بتایا کہ آخر عمر میں ایک مہترانی جو گھر میں کمانے آئی تھی سید نظام شاہ صاحب اس سے محبت کرنے لگے تھے (مگر بے لوث اور پاک) پنڈت کا کہنا ہے کہ وہ مہترانی بھی بڑی مزاج شناس تھی ۔ جب نظام صاحب خاموش ہوتے یا کوئی شعر کہتے ہوتے تو وہ کوئی نہ کوئی چٹکی لے لیتی تھی اور نظام صاحب پھڑک جاتے تھے ——— ایک مرتبہ وہ بیمار پڑ گئی اور کئی دن تک نہ آئی تو آپ آبدیدہ بھی ہوئے اور اُس کی مزاج پُرسی کو اس کے گھر بھی تشریف لے گئے ——— پنڈت کہا کرتے تھے کہ آن کے کسی شعر میں محبوب کو ہاتھ لگانے کا ذکر نہیں ملتا ۔ یہی نظام صاحب کا کردار تھا ——— اور یہ بات قرین قیاس یوں بھی ہے کہ نظام صاحب کے ہاں چوما چاٹی کا کوئی شعر نہیں ملتا ۔ وہی رُکی تھمی کیفیت ۔ وہی احتیاط اور سکھ رکھاؤ جو ایک پاکباز شاعر کے ہاں ہوتا ہے نظام صاحب کا رنگ ہے ۔ سید نظام شاہ صاحب کے تین دیوان کتب خانہ سرکاری میں موجود ہیں ایک مطبوعہ اور دو قلمی ۔ قلمی اور مطبوعہ میں زمین آسمان کا فرق ہے کئی کارآمد اور اچھے اشعار مطبوعہ دیوان میں نہیں ہیں جس سے پتہ چلتا ہے کہ غالباً وہ دیوان کی اشاعت

کے بعد دستیاب ہوتے ہوں گے۔ مطلب یہ کہ نظام شاہ صاحب کا دیوان تو در اصل ایک ہی ہے مگر قلمی نسخوں میں بقیہ اشعار بطور ضمیمہ شامل ہیں۔ شعرائے دربار رامپور جن میں میرے دادا استاد امیر مینائی بھی شامل ہیں نے حتی المقدور نظام کو اُبھرنے سے روکا جس کے نتیجہ میں وہ درباری مشاعروں میں شریک تو ضرور ہوتے تھے مگر وہ منفعت حاصل نہ کر سکے جو ان کے حسب حال ہوتی۔ انتقال کے بعد یہ بھی نہ ہو سکا کہ اُن کی کلیات شائع کر دی جاتی چنانچہ امیر مینائی نے ترتیب دے کر ایک دیوان سرکاری کتب خانے میں داخل کر دیا اور بس۔ وہ تو یہ کہیے کہ قدرت رامپوری کو اس کا خیال آیا اور اُس نے بڑی جانفشانی کے بعد ان کی کلیات اور وہ اشعار جو زبان زد تھے جمع کر کے شائع کرا دئے۔ چند اشعار اور پیش کرتا ہوں ہو سکتا ہے کہ ان کا کچھ زیادہ تعلق ان کی زندگی سے نہ ہو مگر اچھے اشعار سننے میں حرج ہی کیا ہے۔

تم سے کچھ کہنے کو تھا بھول گیا ... ہائے کیا بات تھی کیا بھول گیا
خوش ہوں اس وعدہ فراموشی سے ... اُس نے ہنس کر تو کہا بھول گیا

انداز اپنا دیکھتے ہیں آئینہ میں وہ ... اور یہ بھی دیکھتے ہیں کوئی دیکھتا نہ ہو
کروٹ بدلنے میں جو دوپٹہ سرک گیا ... گھبرا کے دیکھتے ہیں کوئی دیکھتا نہ ہو

بے ساختہ نگاہیں جو آپس میں مل گئیں ... کیا منہ پہ اُس نے رکھ لئے آنکھیں چرا کے ہاتھ
بے اختیار ہو کے جو میں پاؤں پر گرا ... ٹھوڑی کے نیچے اس نے دھرا مسکرا کے ہاتھ
وہ زانوؤں میں سینہ چھپانا سمٹ کے ہائے ... اور پھر سنبھالنا وہ دوپٹہ چھڑا کے ہاتھ
دینا وہ اس کا ساغر مے یاد ہے نظام ... منہ پھیر کر اُدھر کو اِدھر کو بڑھا کے ہاتھ

سو تو رہیں جان ڈال کے انگڑائیاں نہ لو ... یاں آنکھ آپ کی ہے مقرر لگی ہوئی

کہتے ہیں سب یہ میری باتیں ہیں ... تجھ کو شاعر بنا دیا میں نے

اُس دست نگاریں کو ذرا میں نے چھوا تھا ... کس ناز سے کہنے لگے اُف چھوڑئے گیا ہاتھ

مرا کچھ حال دل کہنا اور اُس کا ... وہ کہنا چپکے سے مُنہ پھیر کر کچھ
یہاں کہتا ہوں کچھ میں ہائے قسمت ... وہاں کہہ دیتے ہیں بیٹھا میر کچھ
نظام ایسے ابھی شاداں نہ تھے تم ... خوشی کی دی کسی نے کیا خبر کچھ

کس نے کوسا تھا خدایا مجھ کو ... کہ تجھے عشق بتاں ہو جائے

پھر نہ کہنا کہ مجھے تم نے کہیں دیکھا ہے   سوچ لو جی میں کئی بار وہیں دیکھا ہے
گر کوئی پوچھے مجھے۔ آپ اسے جانتے ہیں   ہو کے انجان وہ کہتے ہیں کہیں دیکھا ہے

بعد رنجش وہ دل کے پوچھتے ہیں   ہم نہ ملتے تو آپ کیا کرتے

مری جانب سے تم کو دشمنوں نے خط یہ لکھے ہیں   بھلا ایسا میں لکھ سکتا ہوں یہ تحریر میری ہے

قاصد تری باتوں کا تو ہے اور ہی مطلب   ان باتوں کا خط میں کہیں مذکور نہیں ہے

ہمدم نہ کہہ وہ بات جو دل کو بری لگے   اس بیوفا سے گو مری رنجش ہزار ہے

مجھ میں ان میں جو کچھ کدورت ہے   جائے گی یہ ابھی نہیں جاتی

چھپ چھپ کے دیکھنے کا مزہ دیکھئے نظام   یہ خیر گذری اس کی ادھر کو نظر نہ تھی

شاد عظیم آبادی

سید حسن امام

خان بہادر سید علی محمد شاد (۱۲۶۲ — ۱۳۴۵ھ)

"خون لگا کر شہید" قسم کے بہاری کہے جانے والے مشاہیر میں شاد نہیں تھے بلکہ کئی پشتیں خاک بہار میں پیوند کر دینے کے بعد یہ گل سرسبد اگا تھا۔ میر و درد کی اپنی اپنی خصوصیتوں کا، دل پکڑ لینے والا مجموعہ تیار کرنے کی فطری صلاحیت انہی کو ودیعت ہوئی تھی۔ بہاری فقیر کی جھولی میں لعل و گوہر، ہزار بے قدری سے سہی مگر "شب چراغ" آنکھوں سے اوجھل کب رہ سکتا تھا؟ شاد پر زمانے کی نظریں پڑتی ہیں۔ دہلی اور لکھنؤ کا احترام اپنی اپنی جگہوں پر رکھنے کے بعد بھی شاد خود اپنی بہاری بولی پر نازاں تھے۔ بدقسمتی سے ان کو "نادان دوست" تو ملے مگر دانا دشمن تک نہ ملا۔ نتیجہ یہ کہ اُن کے اکثر "بول" بزبان غیر ترجمہ ہو گئے۔

شاد کی شخصیت بہت ہی اُلجھی ہوئی سی ہے۔ کیا باعتبار ذاتی توقعات اور اس کے ماحصل کے، یا ماحول اور اس کی اقتضا کی نسبت سے۔ ان باتوں کے شواہد اور اثرات ان کے کردار اور کلام میں صاف نظر آتے ہیں۔ ان کے فرمودات پر جہاں تک خیال آفرینی کی گئی ہے اس میں ان کی ذات کو معرض بحث میں لانے سے عموماً پرہیز کیا گیا ہے۔ اگر ناگزیر طرح پر ان کو زیر بحث لایا بھی گیا ہے تو اس میں معترفین نے علیل قسم کی غیر واجب احتیاطیں برتی ہیں اور معترضین بری طرح اپنا بھانڈا پھوڑ بیٹھے ہیں۔ ع۔ مردم ز غلط فہمی مردم، مردم۔ کہنے کا مستحق شاد سے بہتر کیا ہوگا۔ ماہنامہ ندیم گیا کا شاد نمبر بمعونت جناب حمید عظیم آبادی، میری ادارت میں شائع ہوا تھا۔ متکلم اسلام، شاد کو ثابت کرنے کے لئے مولانا مناظر احسن گیلانی مرحوم کا زور علم ہاتھ آگیا تھا مگر شاد کی شخصیت کی تابانی یا تاریکی کو اُجاگر کرنے کے لئے کوئی روشن ضمیر ہمت نہ کر سکا تھا۔ ایک کھلی وجہ اس کی یہ بھی ہو سکتی ہے کہ شاد کی ذات خود اپنے فرمودات کے حجابات سے باہر آنے کی کبھی عادی ہی نہیں ہو سکی چونکہ نگاہ بد بیں اکثر تاک میں رہتی تھی۔ لہذا ع۔ ہر کہ دیدن میل دارد در سخن بیند مرا۔ قول کسی کا بھی ہو مگر "زبان حال" شاد کی اس کی ہمنوا رہی۔ آج جب شاد شعرائے بہار کی حدوں سے پار اُتر کر صرف اُردو کے منفرد و سرآمد اساتذۂ سخن میں شمار ہونے لگے تو اُن کی شخصیت سے دلچسپی لی جا رہی ہے۔

شاد کے تالیف کردہ تذکرۃ الاسلاف کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے داداؤں میں بخط مستقیم کوئی ہستی غیر معمولی وجاہت

کی ہندوستان میں نہیں تھی۔ مصاحبت کے ذریعہ ننھیالوں میں مقتدر سادات تھے ہی مگر عجیب بات یہ ہے کہ مورثین اور وراثت کے مذہبی رجحانات ایک سے نہیں ہیں۔ جن نسبتوں سے شاد اپنا امتیاز قائم کرتے ہیں وہ سیادت سے گزر کر اتراک سے ملتی ہیں، یعنی علی وردی خاں صوبہ دار بہار، اڑیسہ و بنگال کے ذریعہ۔ ظاہر ہے کہ شاد کا سا حساس طبع اس کو بالکل نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔ پھر گلاؤ دے پر تیم، یہ ہوا کہ متاع خاندانی کا صرف تبرک ہی تبرک شاد تک پہنچا۔ ان کے قریبی رشتہ داروں میں، صرف فارغ البال ہی نہیں بلکہ کثیر الاملاک افراد بھی تھے، جن سے ہم چشمی برقرار رکھنی شاد کے ایسے نازک طبع کے لئے "بن کھائے سنگرام" سے کسی طرح کم نہ تھی۔ سادات بارہہ کی قرابتداریوں سے بھی شاد بہت دنوں مطمئن نہیں رہ سکتے تھے۔ بعشتہ کے پہلے ہی سے رائے عامہ بادشاہ گر بھائیوں کو معتوب کرنے لگی تھی۔ شاد کے ہوش سنبھالتے ہی غیر جانبدار تھا سادات کے آگے کی نئی پود اس بارے میں بلند آوازہ ہو چکی ہوگی۔ پھر انگریزی تسلط میں جو کارہائے نمایاں ان کے بڑوں نے کر دکھائے تھے مگر اس کے اجر "دہ دہ دینا" میں سے پھوٹی کوڑی بھی شاد کی قسمت نہ ہوئی۔ ان سب باتوں کو زیر نظر رکھتے تو ان کے بیدرد نکتہ چیں یوں مشق ستم نہ فرماتے ع

نہ آنکہ مجنوں را خرابیہائے خود، دیوانہ بود۔

اس پس منظر پر صرف سرسری نظر ڈالنے والے کا تاثر جب بعید از فہم ہے نہ خلاف توقع۔ تو پھر کون سی حیرت کی بات ہے کہ آنکھیں کھولنے کے بعد سے ان کو موند لینے کی رخصت پانے تک اسی پس منظر میں گزر بسر کرنے والا بھی اثر لئے بغیر نہ رہ سکا؟ آخر شاد بھی انسان ہی تو تھے۔ مگر اتنا بھی کسی نے غور نہ کیا اور نتیجے میں "الپیچ" ہی خم ٹھونک کر میدان میں نہیں کودا، بلکہ لکھنؤ والے مرزا محمد بیگ کی آخری منطق بھی اسی ذیل میں ہے۔ اگر شاد اپنی صلاحیتوں کے اعتبار سے صرف "شاگرد فریاد" ہوتے تو فغان و نالہ کرتے یونہی رہ جاتے اور کسی کو ان کی یاد بھی نہیں رہتی۔ مگر وہ تھے تلمیذ فطرت سب طرح کے جھٹکے سہار گئے۔ خزاں کے دورے گزر گئے مگر جب بھی بہار سازگار ہوئی تو کف گلفروش و دامن باغباں میں تر و تازہ نظر آتے۔

آبا و اجداد میں مذہبی دورنگی کوئی خاص بات نہیں ہوتی بشرطیکہ شاد بھی معمولی قسم کے آدمی ہوتے۔ لیکن ان کی صلاحیتیں ضامن تھیں کہ اس عامتہ الورود صورت حال سے بھی استفادہ کئے بغیر نہ رہیں گی۔ چنانچہ منظر عام پر اب تک آئے ہوئے ان کے کلام میں نوحہ کی قسم کی کوئی چیز نہیں ملتی۔ ان کے مراثی بھی اپنے انداز میں منفرد اس لئے ہیں کہ وہ بین و بکا کے چنداں قائل نہیں ہیں۔ اس صنف سخن میں جو فلسفیانہ طرز انھوں نے اختیار کیا ہے وہ ایسا ہے کہ مراثی گو اساتذہ میں وہ سب سے ممیز ہیں۔ ان کے مراثی کا مقبول عام نہ ہونا ان کی خوبیوں کی دلیل ہے۔ جہاں مراثی بذیل رسمیات مذہبی مروج ہیں وہاں کے مطالبات شاد پورے نہیں کرتے۔ اور جہاں ان کی مقبولیت مصدق ہے وہاں مراثی کا رواج نہیں۔ کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا کہ محنت برباد گئی۔ شاد اس سے بیخبر نہ تھے۔ مگر جو اصلاح ان کے پیش نظر تھی اس کو "دور کی کوڑی لانا" کہہ سکتے ہیں۔ آج زمانہ اعتنا نہ کرے مگر وہ دن دور نہیں جب ان کی اتباع بغیر چارہ نہ ہوگا۔ نثری خطبات شہادت تو اس ڈھرّے پر آچکے ہیں۔ منظومات میں شرماحضوری "رقت کے بند" سخت جانی کا ثبوت دے رہے ہیں لیکن فلسفیانہ استدلال آہستہ آہستہ قدم جما رہا ہے اور یہ سب شاد ہی کے مراثی کی آواز بازگشت ہے۔

شاد کی ایسی تحریریں نظر سے گزری ہیں جن کے سطحی مطالعے سے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بے اعتدالی کے ساتھ خودستائی کی جا رہی ہے، لیکن بین السطور غور کرنے سے پتہ چل جاتا ہے کہ اس بظاہر خودستائی کی تان جا کر ٹوٹتی ہے خود اپنے ہی مرثیہ پر۔ مکاتیب کے بارے میں ان کو کسی قسم کا خطرہ ہوتا ہی نہیں۔ اس لئے "دیوار ہم گوش دارد" کے ڈر سے جو بات وہ منہ سے نکالتے بھی نہیں تھے۔ وہ ان کا قلم "بر زبان" کئے رکھتا تھا۔ بعض بعض خطوط کے کچھ مفاہیم ایسے نکلتے ہیں جن کو نقاد کا مقصود واقعی باور کر لینا، خود اپنے ذوق سلیم کی تردید ہونی چاہیئے۔ شاد کے ایسا متین و متواضع شخص کن مجبوریوں میں گھر گیا ہوگا جب اس کا قلم ایسا بے قابو ہوگا۔ اس پر غور کرنے کی ضرورت تھی مگر اس حد درجہ میں پہنچا کون؟

شاد کی اس کمزوری سے کون انکار کر سکتا ہے کہ وہ محبت کے لیے بے چین رہتے تھے کہ ہاتھ بڑھتے ہی پہنچا پکڑ لینے والے کی پذیرائی میں بھی اکثر یہی فرمایا کرتے تھے ؎

مدتے آں دامنم گیرد بدست مدے پریشاں حالی و درماندگی

دھوکے پر دھوکا کھاتے رہنے کے بعد بھی "دوبارہ کی ہوس ہے" شاد پکارتے ہی چلے گئے۔ اس کا سبب ان کی عقل کی کمی نہیں بلکہ حسن ظن کی فراوانی!

رئیسوں کی اولاد ہونے کا بہت بڑا ثبوت انہوں نے یہ دیا کہ حاشیہ برداروں کی باتوں میں آگئے اور اپنے ہی اچھے برے میں تمیز کرنا بھول گئے۔ جہاں انہوں نے اشرفیاں لٹانے میں دریغ نہیں کیا، وہیں کوڑوں پر چھاپ لگانے میں عار بھی نہیں کی۔

شاد کی اخلاقی خوبیوں پر حرف گیری کے ستیاب کے لئے اس تصنیف نامرضیہ کو یکسو کر لینے پر کوئی آمادہ نہیں ہے کہ حضرت صفیر بلگرامی کو شاد نے استاد زمن، استاد فن یا استاد من لکھا تھا۔ بہرحال یہ فتنہ اس وقت اٹھایا گیا جب شاد دنیا سے اٹھ چکے تھے۔ چھیڑ یقینی شاد علیے ہی نے کی۔ اینٹ کا جواب پتھر سے دیا جا سکتا تھا مگر اس سے احتیاط کے باوجود قصہ کو طول دیا گیا۔ خلاصہ یہ کہ "از ماست کہ بر ماست"!

جہاں تک مجھے معلوم ہے شاد کی خانہ آبادی اور خانہ ویرانی ؏ "نہ شادی داد سامانے نہ غم آورد نقصانے" ہی قسم کی تھی۔ صرف ایک صاحبزادے سید حسین مرحوم کا مجھے علم ہے۔ باپ بیٹے کو یکجا دیکھ کر شاد کی حرماں نصیبی سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ عجیب عجیب قسم کے درد و اندوہ شاد کو قسمت ہوئے تھے۔ انہی کا ظرف تھا کہ صرف ہنس بول کر بسر کر لینے پر قادر نہ تھے بلکہ اب گور پہنچتے پہنچتے بھی حیات فریاد کی تسوید ختم کر کے مانے! اس کتاب کی تاریخی حیثیت جو بھی سہی مگر اخلاق و معاشرے کے سمجھنے میں اس کا بکار آمد ہونا ناقابل انکار ہے۔

"دلی، لکھنؤ کے بعد پٹنہ" ضرب المثل کا حکم رکھتا ہے۔ مرشد آباد کو اس گنتی میں کبھی لیا ہی نہیں گیا تا بدیگراں چہ رسد۔ آج پٹنہ چاہے جو کچھ بھی ہو جائے مگر شاد کی جوانی کے دنوں پٹنہ ایسا باغ بہار تھا کہ پورب دروازہ سے لے کر پچھم دروازہ تک گلستان سعدی کا باب پنجم سفر تھا اس سے سطح ارضی پر منتقل ہو کر جاندار ہوتا چلا گیا تھا۔ اگر "زر مستی" یا نعوذ باللہ "خر مستی" شاد کو کہیں سے چھو بھی گئی ہوتی تو یاران طریقت ایک کی دس لگائے بغیر کب مانتے ؟ ایسی ایسی گلتراشی کرتے کہ باغ شاد کے افسانے کی حقیقت نہیں رہتی۔ مگر یوں بھی باز آنے والے تھوڑے ہی تھے ؟ کھینچ ڈھونڈ کر ایک "گل بداماں بہار" کو شاخ پر چڑھا ہی دیا۔ خاندانی بن کے پیچھے پڑے۔ اس بارے میں شاد کے ماننے والوں کا سکوت ؏ کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے" کی غلط فہمی کو سکانے لگا۔ حالانکہ واقعہ میں ماقدر صرف اسی قدر تھا کہ ذات برادری سے نکالی ہوئی، گھنیوں کے پنجۂ ستم سے خوفزدہ، پناہ ڈھونڈتی آگئی تھی۔ شاد نے بیت کا ذکر کلمہ پڑھا دیا تو کیا غلط کیا ؟ مگر ؏ جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے، باغ تو سارا جانے ہے! کے باوجود محمد دِ الزام قرار پائیں تو کہنا ہی پڑے گا کہ ؏ بلبلم بر گلستاں اگر گلے وہ دامنم باشد!

خلاصہ یہ کہ ۱۲۶۵ھ ہجری مطابق ۱۸۴۶ء کا پیدا ۱۳۴۵ ہجری مطابق ۱۹۲۶ء کو دنیا سے اٹھ گیا اسی برس تک شاد رہا مگر سب نے اسی کو شاد پکارا ؎ برعکس تصور ہے مگر شاد کریں کیا مجبور ہیں مشہور اسی نام سے ہم ہیں

ان کی غزلوں کے بارے میں کچھ کہنے کی ضرورت ہی نہیں۔ ان کو جا سے اصرار ہے کہ ہم شاد کو کبھی مرنے ہی نہ دیں گے۔ اس میں شک کی گنجائش یوں بھی نہیں کہ اپنے مرنے کا یقین ہو تو مرا!!

نصیر حسین خیالؔ

شاہ ولی الرحمٰن ولیؔ کاکوی

آناں کہ وصف حسن تو تفسیر می کنند
خواب ندیدہ را ہمہ تعبیر می کنند

نقوش لاہور کے مدیر محترم کی فرمائش ہے کہ میں نواب سید نصیر حسین خیالؔ عظیم آبادی کی شخصیت پر نقوش کے شخصیات نمبر کے لئے ایک مضمون لکھوں۔ ان کا رجسٹرڈ خط موصول ہوا تو میں نے محض اس وجہ سے تعمیل ارشاد سے پہلو تہی کرنا چاہی کہ میں نواب صاحب کی شخصیت سے ذاتی واقفیت نہیں رکھتا۔ لیکن دوسرے ہی دن مدیر محترم کا تار ملا کہ مضمون جلد بھیجئے تو کسی نہ کسی طرح تعمیل ارشاد کے لئے تیار ہونا پڑا۔

نواب صاحب صوبۂ بہار کے ایک ممتاز و متقدر خاندان کے چشم و چراغ تھے اور ہندو پاک میں کون ایسا ہے جو ان سے واقف نہیں لیکن اگرچہ مجھ کو شاعری میں شادؔ مرحوم سے تلمذ حاصل ہے اور کم از کم تین سال تک ان کی صحبت سے مستفیض ہونے کا موقع ملا ہے جس کو تیس سال کا عرصہ گزر چکا، یہ امر واقعہ ہے اور بدقسمتی بھی کہ میں نے کبھی نواب صاحب کو دیکھا اور نہ ان کی گفتگو سنی، کیونکہ اس زمانے میں وہ کلکتہ میں قیام کرتے تھے اور میرے سامنے کبھی پٹنہ نہیں آئے۔

شخصیت نگاری ایک مستقل اور مشکل فن ہے اور اس کی تعمیر میں متعدد عناصر کارفرما ہیں۔ کسی کی شخصیت پر کوئی قلم نہیں اٹھا سکتا جب تک کہ اس نے اس شخص کو قریب سے نہ دیکھا ہو اور نہ اس کی صحبتوں سے لطف اندوز ہوا ہو اور اس کی شکل و صورت، خط و خال، رفتار و گفتار، عادات و اطوار، اخلاق و افعال اور سیرت و کردار سے کما حقہٗ واقف نہ ہو اور ان سب صفات کا تجزیہ نفسی نہ کر سکتا ہو۔ لہٰذا میرا یہ مقالہ گویا ایک ایسے خواب کی تعبیر ہے جس کو دیکھا ہی نہیں۔ تاہم کچھ نہ کچھ لکھنا بھی ضرور ہے کیونکہ مدیر محترم کو میں مایوس نہیں کرنا چاہتا۔ لیکن میری اس تحریر سے نواب صاحب کی شخصیت اجاگر نہیں ہو سکتی۔ یہ تصویر نہیں بلکہ خاکہ ہے اور زیادہ صحیح یہ ہے کہ خاکہ بھی نہیں بلکہ چند لکیریں ہیں۔

نواب خیالؔ صوبہ بہار ہی نہیں بلکہ ہندوستان کے مشاہیر میں سے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شخصیت ہنوز جاذب توجہ ہے۔ متعدد ارباب قلم نے مختلف اوقات میں نواب صاحب سے متعلق خامہ فرسائیاں کی ہیں۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے سب سے پہلے پروفیسر محفوظ الحق مرحوم نے

کے العصر میں ایک مقالہ سپرد قلم کیا تھا۔ جنوری ۱۹۳۵ء کے ندیم میں سید رضا قاسم صاحب مختار حسین آباد (پٹنہ) کا ایک مقالہ شائع ہوا تھا مئی ۱۹۵۱ء کے نگار میں بھی ایک مضمون شائع ہوا ہے۔ عرصہ ہوا معارف میں بھی کسی صاحب کا ایک مفید مقالہ شائع ہوا تھا جس میں نواب صاحب کے سفر مغرب سے متعلق دلچسپ بحث کی گئی تھی۔ اول الذکر تینوں مضامین میرے پیش نظر ہیں۔ ان میں سے تیسرے مضمون میں نواب صاحب کی ادبی خصوصیات سے بحث کی گئی ہے اور پہلے دونوں مضامین میں ان کے حالات زندگی اور خاندانی تعلقات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ انہی دونوں مضامین کی مدد سے یہ مقالہ ترتیب دے رہا ہوں اور اس میں کچھ مفید مباحث بھی شامل کر دئے گئے ہیں۔

نواب صاحب کا خاندان نہ صرف جاہ و ثروت بلکہ علم و فضل میں بھی ممتاز تھا۔ محفوظ الحق مرحوم کا بیان ہے کہ آپ کے مورث اعلیٰ عرب سے ایران کو منتقل ہوئے جہاں اس خاندان کو اتنا عروج حاصل ہوا کہ سید حسین فیروزی شاہ طہران ہو گئے اور ان کے پوتے کبیر المشائخ گورنر ہرات مقرر ہوئے کچھ عرصہ کے بعد اس خاندان نے ہندوستان کا رخ کیا اور اس کے اکثر ارکان صوبہ داری و وزارت کے درجہ تک پہنچے۔ عہد مغلیہ میں بھی اس خاندان نے اپنی قدیم عظمت و شان کو برقرار رکھا، چنانچہ قطب الملک نواب سید عبداللہ خاں اور امیر الامرا نواب سید حسین علی خاں ہندوستان کی تاریخ میں "سید برادران" اور "بادشاہ گر" کے القاب سے مشہور ہیں۔ ان دونوں بھائیوں نے کچھ ایسا اقتدار قائم کر لیا تھا کہ درحقیقت یہی حکمران تھے اور اس دور کے شاہانِ مغلیہ محض کٹھ پتلی بادشاہ تھے۔ صوبہ بہار سید حسین علی خاں کی جاگیر میں تھا اور وہ عرصہ تک عظیم آباد میں مقیم بھی رہے۔ نواب علی وردی خاں صوبہ دار بنگال و بہار بھی اسی خاندان کے ایک رکن تھے۔ اس خاندان کی چند اور شخصیتوں کا ذکر بھی ضروری ہے۔ ان میں سے اکثر کا ترجمہ تذکرہ گلزار ابراہیم مؤلفہ علی ابراہیم خاں خلیل عظیم آبادی میں موجود ہے۔ مثلاً نصیر الدولہ سید ہدایت علی خاں ضمیر بخشی الملک اسد جنگ بہادر صوبہ دار عظیم آباد تھے۔ ان کے صاحبزادے نواب غلام حسین خاں سیر المتاخرین کے مصنف تھے جو فارسی زبان میں تاریخ کی ایک مشہور کتاب ہے۔

اس خاندان کی دوسری شاخ نے پانی پت میں برگ و بار پیدا کئے جس کے گل سرسبز خواجہ حالی مرحوم تھے اور وہ شاد مرحوم کے ماموں ہوتے تھے۔ خواجہ محمد قاسم کے صاحبزادے صمصام الدولہ خان دوران امیر الامرا خواجہ محمد عاصم کا ذکر بھی اہم ہے۔ امیر الامراء نے میر محمد تقی میر کے لئے ایک روپیہ یومیہ مقرر کر دیا تھا جو انہیں تقریباً پانچ سال تک جاری رہا۔ ۶ ذیقعدہ ۱۱۵۱—ھ نادر شاہی حملہ میں بمقام کرنال امیر الامراء کو زخم کاری لگا اور وہ تیسرے دن انتقال کر گئے۔ ان کے صاحبزادے نواب اشرف خاں کے دو صاحبزادے تھے۔ احتشام الدولہ رستم علی خاں نواب بہادر رستم اور مرزا محمد حسن خاں مرزا۔ یہ دونوں بھائی انقلاب زمانہ سے مجبور ہو کر ترک وطن کر کے نواب سعادت علی خان بہادر کے ہمراہ صوبۂ بہار و بنگال کو روانہ ہوئے اور بنارس میں رہنے لگے۔ یہ دونوں سید فضائل علی خاں بیتاب ولد سید محمد علی خاں کے بھانجے تھے۔ یہ حضرات اسی خاندان کے افراد تھے۔

نواب خیال کی والدہ فاطمہ بیگم کے والد نواب سید محمد عیسیٰ خاں عیسیٰ اور آپ کی نانی عارفہ بیگم کے والد نواب سید مہدی علی خاں مہدی اور بھائی نواب سید جلال الدین حسین خاں تاثیر بھی شاعر تھے۔ آخر الذکر شاد مرحوم کے حقیقی ماموں تھے۔ نواب خیال کے دادا نواب سید محمد محسن خاں محسن اور نانا نواب سید محمد عباس خاں محسن نواب سید تفضل علی خاں تفضل کے صاحبزادے تھے۔ محسن کے صاحبزادے نواب سید نوروز حسین خاں اور نواب سید جعفر علی خاں تھے۔ نوروز حسین خاں کے صاحبزادے نواب سید نصیر حسین خاں خیال اور جعفر علی خاں کے صاحبزادے نواب سید صادق حسین خاں تمنائی تھے۔ شاد مرحوم نواب خیال کے حقیقی ماموں تھے۔

غرضیکہ یہ امر مسلم ہے کہ نواب خیال ایک جلیل القدر خاندان کے فرد تھے جس نے علم و ادب کی عظیم الشان خدمتیں کیں اور جاہ و اقتدار بھی حاصل کئے۔ آپ کی ولادت بقول پروفیسر محفوظ الحق ۱۸۵۱ء میں اور بقول رضا قاسم صاحب ۲۱ مارچ ۱۸—ء کو عظیم آباد پٹنہ کے محلہ حاجی گنج میں ہوئی۔ آپ کی عمر صرف تین سال کی تھی کہ باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا[1] اور آپ کی تربیت فاطمہ بیگم نے اپنے ذمہ لی۔ چند برسوں کے بعد انہوں نے

---

[1] والدہ ماجدہ حضرت شاد مرحوم [2] مضمون سید رضا قاسم صاحب

وہاں کیمبرج یونیورسٹی کی مشہور انجمن یونین میں اردو زبان کے متعلق تقریر کی اور ایک مضمون بھی لکھا جو اردو رسالہ "نوائے کیمبرج" میں شائع ہوا۔ پروفیسر براؤن سے بھی آپ نے ملاقات کی اور دونوں میں فارسی میں گفتگو ہوتی۔ دورانِ گفتگو میں ایران کا ذکر آگیا تو آپ نے پروفیسر براؤن کو دوبارہ سفرِ ایران کی ترغیب دی۔ پروفیسر براؤن نے جواب دیا کہ "حالا پیر شدم طاقت نہ دارم"۔ انگلستان کی سیر سے فارغ ہو کر آپ نے فرانس، بلجیم، جرمنی، اٹلی وغیرہ کی بھی سیر کی اور وہاں کے مشہور مقامات اور تعلیم گاہوں کو ملاحظہ فرمایا۔ اس کے بعد آپ مصر تشریف لے گئے جہاں زاغلول پاشا سے ملاقات ہوئی پھر انگورہ (ٹرکی) پہنچے جہاں اتاترک مصطفےٰ کمال پاشا سے نیاز حاصل ہوا۔

اردو زبان کی ترقی و ترویج کے لئے آپ نے نہ صرف مضامین لکھے اور اسکیمیں بنائیں بلکہ عملی حصہ بھی لیا۔ اسی غرض سے ۱۹۳۲ء کے اپریل میں دہلی تشریف لے گئے۔ واپسی میں دو روز گیا میں جناب انجم ایڈیٹر ندیم کے ہاں قیام کیا۔ دسمبر ۱۹۳۲ء میں آپ علی گڑھ تشریف لے گئے اور ۹ر دسمبر کو نواب احمد سعید خاں سے ملنے کو چھتاری روانہ ہوئے۔ ۱۱ر دسمبر کو وہیں آپ کے قلب میں درد اٹھا اور یہ درد ایسا مہلک ثابت ہوا کہ علاج کی بھی نوبت نہ آئی یہاں تک کہ چند ہی منٹ کے بعد روح پرواز کر گئی۔ آپ کی لاش کو نواب صاحب نے پٹنہ روانہ کر دیا جو ۱۲ر دسمبر کو حضرت شاد کے پہلو میں سپردِ خاک کی گئی۔

میں کہہ چکا ہوں[۱] کہ نواب صاحب ابتدا میں غزلیں کہتے تھے اور شاد عظیم آبادی سے انہیں تلمذ بھی حاصل تھا لیکن اگرچہ شاعری تو ترک ہو چکی تھی شاعرانہ ذوق مفلوج نہ ہوا تھا چنانچہ ستمبر ۱۹۰۹ء میں بادشاہ نواب عشرتی کے دولت کدے پر ایک عظیم الشان مشاعرہ منعقد ہوا جس میں کچھ طرحیں دی گئی تھیں اور بیرونِ صوبہ کے حضرات نے بھی شرکت کی تھی تو نواب صاحب بھی اس مشاعرے میں شریک تھے لیکن غزل نہیں پڑھی تھی۔

نواب صاحب نے صرف ایک اولاد چھوڑی، آپ کے صاحبزادے سید امیر نواب صاحب ہیں جو آج کل غالباً حیدرآباد میں مقیم ہیں۔

نواب صاحب نہایت ہی وجیہ و شکیل آدمی تھے، گندمی رنگ اور قد متوسط تھا، مونچھیں بڑی بڑی اوپر کو اٹھی ہوئی لیکن داڑھی استرے کی رہینِ منت تھی۔ طرزِ معاشرت مغربی اور اعلیٰ درجہ کا تھا۔ کبھی شیروانی استعمال کرتے تھے اور کبھی مغربی لباس لیکن ٹوپی ایک خاص قسم کی پہنتے تھے جس کے سامنے دو تین تام لگے ہوتے تھے۔ لباس کا خاص خیال اور شوق تھا اور جو لباس بھی پہنتے تھے اعلیٰ درجہ کا ہوتا تھا۔ نہایت ہی خلیق اور ملنسار تھے اور لوگوں کو ایک ملاقات میں گرویدہ کر لیتے تھے۔ اندازِ گفتگو نہایت دلکش تھا اور گفتگو میں بھی صحتِ زبان کا خاص خیال رکھتے تھے۔ مذہبی خیالات میں آزادی تھی بلکہ یہ کہنا نازیبا نہ ہوگا کہ ان کی زندگی پر مذہبی اثرات بالکل نہ تھے لیکن معلومات بہت وسیع تھیں اور وہ ہر فن پر گفتگو کر سکتے تھے خواہ وہ ادبی ہو یا علمی، مذہبی ہو یا سیاسی۔

داستانِ اردو ادبی حیثیت سے ضرور قابلِ قدر ہے لیکن تاریخی نقطۂ خیال سے مصنف کے اکثر نظریے محلِ نظر ہیں۔ اس کی چند مثالیں یہ ہیں۔

۱ ۔ نواب صاحب کا ارشاد ہے کہ "آپ کی (بابر کی) اردو کا یہ پہلا شعر جس وقت ظل اللہ کے منہ سے نکلا ہوگا تو نہ معلوم محفل کا کیا رنگ اور بابریوں کا کیا حال ہوا ہوگا، کتنی واہ واہ ہوتی ہوگی۔" بابر کا شعر یہ ہے ؎

مجکا نہ ہوا کچھ ہوسِ مانک و موتی
فقرا ہلیغہ بس بولغوسدر پانی و روتی

پھر یہ بھی فرماتے ہیں کہ "ہماری نظر جہاں تک ہے بابر سے قبل کسی نے اردو میں نظم کی ہمت و جرأت نہیں کی اس لئے جب تک اس کی تردید نہ ہو فردوس مکانی ہی اس کے موجد اور اس صنعت کے باوا آدم مانے جائیں گے۔" بابر ۱۵۲۶ء مطابق ۹۳۲ھ میں ہندوستان آیا تھا۔ مذکورہ بالا شعر

---

[۱] روایت مولوی سید عفت حسین عظیم آبادی۔

شاید اس کے بعد کہا ہوگا۔ لیکن مزید تحقیق کے بعد یہ حقیقت بے نقاب ہوئی ہے کہ شاہ میراں جی شمس العشاق (متوفی ۹۰۲ھ مطابق ۱۴۹۶ء) جو جانم کے والد تھے اس سے بہت قبل اردو میں تین نظمیں لکھ چکے تھے ایک کا نام "خوش نامہ" اور دوسری نظم کا نام "خوش نغز" ہے اور تیسری کا "شہادت الحقیقت" ہے۔

۲۔ نواب صاحب کا خیال ہے کہ فضلی کی وہ مجلس (۱۱۴۵ھ) اردو نثر کی پہلی مثال ہے۔ یہ آزاد کے خیال کی بازگشت ہے لیکن جدید تحقیق یہ ہے کہ خواجہ بندہ نواز گیسو دراز (۷۲۱ھ، ۸۲۵ھ) نے اردو میں دو رسالے لکھے تھے، معراج العاشقین اور ہدایت نامہ۔ معراج العاشقین شائع ہو چکی ہے۔ اس کا وجود ثابت کرتا ہے کہ وہ مجلس سے کم از کم سوا تین سو سال پیشتر اردو میں تصنیف موجود تھی۔

۳۔ نواب صاحب عمدۃ الملک نواب محمد امیر خاں انجام کی دو غزلیں پیش کرنے کے بعد رقم طراز ہیں کہ "عمدۃ الملک کی یہ دو غزلیں شاہد ہیں کہ وہ مجتہد زبان و فن ہے اور کسی کا مقلد کیسا سب اسی کے شاگرد و ریزہ خوار ہیں۔" اور انجام کے اس شعر کے متعلق ؎

نعش میری دیکھ کر مقتل میں یوں کہنے لگے
کچھ تو یہ صورت نظر آتی ہے پہچانی ہوئی

فرماتے ہیں کہ "ذرا زبان کو دیکھنا یہ دو سو برس کی اردو ہے۔ میاں ولی کیا کسی ولی نے بھی یہ زبان کی کرامت نہیں دکھائی۔"

انجام کا انتقال ۱۱۵۹ھ میں ہوا ہے۔ ولی گجراتی (یا دکنی) نے انجام سے چالیس سال قبل ۱۱۱۹ھ میں وفات پائی۔ اس وقت انجام اگر پیدا ہو چکے ہوں گے تو بہت کم سن ہوں گے۔ اب ذرا ولی کی زبان کی کرامت ملاحظہ ہو ؎

صد حیف کہ وہ یار مرے پاس نہ آیا — میرا سخن راست اسے راس نہ آیا
پھر میری خبر لینے وہ صیاد نہ آیا — شاید کہ مرا حال اسے یاد نہ آیا
زندگی جام عیش ہے لیکن — فائدہ کیا اگر مدام نہیں
جسے عشق کا تیر کاری لگے — اسے زندگی کیوں نہ بھاری لگے
اے ولی رہنے کو دنیا میں مقام عاشق — کوچۂ زلف ہے یا گوشۂ تنہائی ہے

انجام کی دونوں غزلیں میرے سامنے ہیں، ان میں زبان کی صفائی و روانی ہے مگر خیالات ہلکے پھلکے ہیں۔ ولی کے بعض اشعار میں اعلیٰ خیالات کی جھلک بھی پائی جاتی ہے مثلاً ؎

دشمن دیں کا دین دشمن ہے — راہزن کا چراغ رہزن ہے
صدق ہے آب رنگ گلشن دیں — پاکبازی ہے شمع راہ یقیں

۴۔ عمدۃ الملک انجام کو بیدل کا شاگرد لکھا ہے۔ اگر یہ شاگردی فارسی شاعری میں تھی تو ممکن ہے ورنہ انجام کا بیدل سے اردو شاعری میں اصلاح لینا محل نظر ہے، صرف دو اشعار بیدل کی طرف منسوب ہیں اس لیے وہ اردو کے شاعر ہرگز نہیں کہے جا سکتے۔ پھر دوسری جگہ نواب صاحب کا یہ ارشاد کہ انجام کسی کے مقلد نہیں شاگردی کی بنیاد کو منہدم کر دیتا ہے۔

۵۔ نواب صاحب انشا پردازی کے شوق میں کہیں کہیں صنعت ایہام سے بھی کام لیتے تھے۔ ایک جگہ ولی کی توہین کے لیے یہ جملہ فرماتے ہیں "ولی تاپتی ندی کے کنارے ٹاپتے رہے" یہ روش آزاد کی تھی، نواب صاحب بھی انہی کے مقلد تھے لیکن مورخانہ تحریروں میں ایسے جملہ کا استعمال ثقاہت و متانت کے خلاف ہے۔

۶۔ ایک جگہ فرماتے ہیں "یہ وہی بھاکا تھی جس میں اس (مہاتما بدھ) نے ایک عالم وجد و سرور میں کاشی اور گیا جی کے جنگلوں کے درمیان اپنے ساتھیوں اور چیلوں کو پکارا اور کہا کہ دھرم کرو دھرم کرو دھرم کا سکھ بھوگو دھرم کی ندی بہاؤ۔" اگر اس مفہوم کا کوئی جملہ مہاتما بدھ سے

زبان مبارک سے ادا کیا ہوگا تو وہ پالی زبان کا کوئی فقرہ ہوگا نہ کہ ایسی بھاشا میں جس کا اردو سے مشابہت ہے۔ ان الفاظ کے ساتھ مذکورۂ بالا فقرہ پالی زبان کا کیونکر ہو سکتا ہے۔

۷۔ اردو کے ابتدائی دور میں دو نوری گذرے ہیں، پہلا نوری عہدِ اکبری میں گزرا ہے جو فیضی کا معاصر تھا، دوسرا نوری ابوالحسن تاناشاہ کے عہد میں گزرا ہے اور تاناشاہ کے وزیر کے لڑکے کا معلم تھا۔ اسی نوری کا نام شجاع الدین تھا لیکن نواب صاحب نے اس نوری کو عہدِ اکبری سے وابستہ کر دیا ہے۔

۸۔ نواب صاحب نے بعض اچھے اچھے اشعار کو ملکہ نورجہاں بیگم اور شہزادی زیب النساء سے منسوب کر دیا ہے، مثلاً اس شعر کے متعلق وہ فرماتے ہیں کہ نورجہاں بیگم کا نتیجۂ فکر ہے ؎

دریں جگہ زخمِ جفا کو دلِ صد چاک میں ہم
دیکھیں گر کچھ بھی وفا اس دلِ بیباک میں ہم

اس پر نیاز فتح پوری نے صحیح تنقید کی تھی کہ اگر یہ شعر نورجہاں کا ہے تو یہ بھی ماننا پڑے گا کہ وہ آرزو سے اصلاح لیتی تھی۔

حقیقت یہ ہے کہ تنقید و تحقیق کی موجودہ روش خیال صاحب کی تحریروں میں مفقود نظر آتی ہے اور شاید وہ اس کی اہمیت کے بھی قائل نہ تھے۔

۹۔ نواب صاحب شاد عظیم آبادی کے حقیقی بھانجے تھے لیکن مولوی سید قدرت حسین عظیم آبادی (فرزند میر عنایت حسین امداد جو شاگردِ شاد تھے) سے یہ بات معلوم ہوئی کہ آخری ایام میں دونوں کے تعلقات خوشگوار نہ تھے اور کچھ کشیدگی پائی جاتی تھی۔ نواب صاحب نے شاد کی زبان کے متعلق صحیح رائے دی ہے کہ ان کی زبان نہ دہلوی تھی نہ لکھنوی بلکہ ایک خاص قسم کی زبان تھی۔ شاد کی شاعری کے متعلق حمید عظیم آبادی کا خیال ہے کہ اس پر حافظ کی شاعری کا پرتو تھا لیکن نواب صاحب نے ایک مکتوب میں حمید عظیم آبادی کو لکھا کہ اس کا ثابت کرنا آپ لوگوں کا کام ہے[1] اس کا مفہوم یہ معلوم ہوتا ہے کہ حمید صاحب کے خیال کو انہوں نے اہمیت نہ دی۔ تلامذہ شاد مُصر ہیں کہ وہ ہر صنفِ سخن کے مالک تھے۔ بے شک انہوں نے مراثی، رباعیات اور قصائد بھی لکھے تھے لیکن نواب صاحب کا خیال تھا کہ "وہ غزل کے سوا کسی اور صنفِ سخن کے مالک ہی نہ تھے" اس خیال سے میں بھی متفق ہوں۔

ممکن ہے کہ بعض لوگ یہ سمجھیں کہ نواب صاحب نے شاد کی زبان اور شاعری کے متعلق جو رائے ظاہر کی تھی وہ کشیدہ تعلقات کی بنا پر تھی لیکن یہ خیال صحیح نہیں۔ آپ نے شاد کے متعلق جو خیالات ظاہر کئے وہ سوءِ ظن پر نہیں بلکہ حسنِ ظن پر مبنی تھے اور یہ آزادیِ رائے، بیباکی تنقید اور حریتِ خیال کی مثال ہے۔

اس سلسلے میں ایک واقعہ بیان کرتا ہوں جس کو میں نے اپنے منجھلے بھائی شاہ منظور الرحمٰن اختر کاکوی (شاگردِ رشید شاد عظیم آبادی) سے سُنا ہے۔ شاد کی غزلوں کا انتخاب ہو رہا تھا۔ نواب خیال بھی اس مجلس میں شریک تھے اور بعض اشعار کے متعلق فرماتے تھے کہ میں نے یوں نہیں پڑھا سنا ہے۔ ایک روز سید صاحب (شاد کے صاحبزادے) نواب صاحب سے بگڑ گئے کہ آپ ابا جان کی غزلوں کو ترمیم و اصلاح سے خراب کر رہے ہیں۔ نواب صاحب بھلا کب چوکنے والے تھے، آپ نے بے ساختہ جواب دیا کہ تم کیا ہو تمہارے ابا جان کے سامنے بھی میں ٹوک دیا کرتا تھا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ اظہارِ خیال میں کسی کی شخصیت سے مرعوب نہیں ہوتے تھے۔

---

[1] مکتوب خیال مورخہ ۲۰ نومبر ۱۹۴۳ء بنام حمید عظیم آبادی مطبوعہ ندیم جولائی ۱۹۴۳ء

نواب صاحب کی شانِ ریاست، رکھ رکھاؤ اور مغربی طرزِ بود و باش سے متعلق بھی ایک واقعہ سن لیجیے ۱۹۳۲ء میں نواب صاحب گیا میں جناب انجم کے مہمان ہوئے تو آپ کے لیے کموڈ کا انتظام نہیں کیا گیا تھا۔ نواب صاحب کو انقباض پیدا ہوا اور آپ نے انجم صاحب سے مہذبانہ انداز کی شکایت کی۔

نواب صاحب کی شخصیت یقیناً ممتاز و بلند تھی۔ آپ نے ساری زندگی علم و ادب کی خدمت میں صرف کر دی۔ آپ کو اردو زبان سے عشق تھا۔ آپ کی انشا پردازی ایک خاص قسم کی تھی اگرچہ آپ آغا کے مقلد تھے لیکن پھر بھی آپ کی انفرادیت نمایاں تھی۔ جب تک اردو زبان زندہ ہے نواب صاحب کا کارنامہ مشعلِ راہ اور آپ کا نام نامی روشن رہے گا ؎

بعد از وفات تربتِ ما در زمیں مجو
در سینہ ہائے مردمِ عارف مزارِ ماست

امداد امام اثر

سید حسن امام

نواب شمس العلما سید امداد امام اثر عظیم آبادی۔

سنہ ۱۹۰۰ء کو بیسویں صدی میں شمار نہیں کیا جا سکتا اور انیسویں صدی میں بھی اس کو گننا برائے نام ہی ہوگا۔ اسی عجیب و غریب سال میں تھا کہ اس زمانہ کے مولوی امداد امام سے سابقہ پڑا تھا وہ بھی بذریعہ علاج۔ اس وقت تک پوچھئے تو میرا ان کا کوئی رشتہ ناطہ نہیں تھا۔ میری نانی کی سگی پھوپھی ان کی شریک زندگی ضرور تھیں مگر یہ بھی کوئی رشتے میں رشتہ ہوا؟ پھر بھی دو باتیں ان کو عام شخصیتوں سے ممتاز کرنے والی اس وقت بھی صاف محسوس ہوتی تھیں۔ اول یہ کہ پیشہ ور حکیم یا ڈاکٹر تو کسی وجہ سے نہیں تھے۔ دوسری بات یہ کہ باوجود ذہین خاندان کے علاج جاری نہ رہ سکا۔ چونکہ مولوی صاحب مشکل ہی سے ملتے تھے۔ اس آخری صورت حال سے اندازہ ہو گیا تھا کہ کچھ سیلانی سی طبیعت واقع ہوئی ہے۔ بزرگوں سے سننے میں آیا کہ ایک وقت ایسا بھی گزر چکا ہے کہ جناب نے اپنا ملبوس جوگیا رنگوا کر فقیری لے لی تھی، ریش مبارک بڑھا لی تھی۔ مونچھیں بھی حد و شرع شریف کے اندر رہتی تھیں۔ گرچہ یہ صورت دیرپا نہ رہی مگر نواب صاحب کا جذباتی ہونا ظاہر ہو گیا تھا۔ میں نے تو ہمیشہ ان کو لارڈ کچنر کا ہم شبیہہ ہی دیکھا۔ قد آور ان کو نہیں کہا جا سکتا البتہ کم گوشت ہونے کی وجہ سے نکلتا ہوا قد انہیں لانبا دکھاتا تھا۔ شان متانت و بردباری پر حرف لائے بغیر بے حد ہنس مکھ اور بامذاق تھے۔ آواز خاصی بھاری تھی مگر قہقہے باسماعت نہ ہو پاتے تھے۔ مجھے یاد نہیں آتا کہ کسی نے کبھی صحبت میں نواب صاحب کو دیکھا ہو اور انہوں نے کوئی ایسی بات نہ کہی ہو جس پر خود بھی ہنسے ہوں اور سننے والوں کو بھی ہنسنے پر مجبور نہ کر دیا ہو۔ ہنستے وقت ان کی آنکھوں میں ایسی چمک اور چہرہ پر وہی کیفیت کھیل جاتی تھی جو شریر بچوں کا حصہ ہوا کرتی ہے جبکہ اپنی شرارتیں کامیاب ہو جاتی ہیں! آپ کے اخلاق کی وسعت بسا اوقات خوش گواری کی حدوں سے باہر ہو جاتی تھی۔ اس کی مثال یہاں سمجھ کر نواب صاحب کے آگے عموماً سب ہی ان سے چھپتے رہا کرتے تھے۔ اگر کچھ افراد صحبت میں ان سے بڑے کبھی کبھار ہوتے تو وہ بھی نواب صاحب کا ادب ملحوظ خاطر رکھتے تھے۔ اب فرض کیجئے کہ نواب صاحب میرے یہاں محفل جمائے بیٹھے پھول برسا رہے ہیں کہ دفعتاً کوئی ایلچی کسی ضرورت سے آتا نظر آیا۔ نواب صاحب اس کی پذیرائی کے لئے گفتگو بند کر کے منتظر بیٹھے ہیں۔ اس سکوت کا سبب ابھی دریافت نہیں کیا جا سکا ہے کہ نواب صاحب مروتہ استادہ۔ ساری مجلس گھبرا کر کھڑی ہو گئی۔ ایلچی غریب خالی ہاتھ ہی بڑھتا چلا آیا۔ نواب صاحب نے بڑھ کر اس کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ وہ تو حیران پریشان

ہوکر رہ گیا۔ اب سب لوگوں کی سمجھ میں بات آئی۔ ایسے موقعوں پر یہی کرنا پڑتا تھا کہ سب دم بخود رہ جاتے کہ نواب صاحب کو خفیف ہونا پڑے۔ ہنستا ہنسانا ان کا ذوق تھا مگر ذرا سے میں متاثر ہو کر آنسوؤں سے منہ دھو لینا بھی ان کے لئے دشوار نہ تھا۔

نازک مزاجی ان کی مشہور تھی مگر میں نے کبھی نہیں دیکھا کہ بدمزاجی کا انہوں نے مظاہرہ کیا ہو۔ "قہر درویش برجان درویش" کو قول سے فعل میں لاتے ہوئے انہی کو دیکھا۔ شکار کا بے حد شوق ظاہر فرماتے تھے۔ مہاراج تکاری اور میر شفاعت حسین مرحوم اکثر اس مصیبت میں گرفتار ہوا کرتے تھے کہ نواب صاحب کو شکار کھلائیں۔ مصیبت کا لفظ میں نے دانستہ لکھا ہے۔ نازک مزاجی کا بڑا مظاہرہ شکار کے موقعوں پر ہوا کرتا تھا۔ پارٹی کا ہر فرد سہما ہوا رہتا تھا کہ دیکھئے کس غریب پر نزلہ گرتا ہے۔ یہ ڈر اس بات کا نہ ہوتا تھا کہ نواب صاحب مار پیٹ کریں گے یا بے نقط سنا کر کسی کی عزت اتار لیں گے۔ جی نہیں۔ ایسی کسی حرکت کا گمان بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اگر شیر وغیرہ درندوں میں سے کسی وحشی کے لئے مچان پر ٹولیاں بیٹھی ہیں تو نواب صاحب خود گولی چلائیں گے نہیں اور کسی نے شکار کو ہاتھ سے جاتے دیکھ کر سبقت کر دی تو بس قیامت آ گئی۔ نواب صاحب اس سے تو کیا خفا ہوں گے خود اپنے آپ سے خفا ہو کے بیٹھے ہیں۔ سارا لطف جاتا رہا۔ اسی طرح اگر پرندہ کا شکار ہے تو سمجھ لیجئے کہ شامت آ گئی اس شخص کی جس پر خاص توجہ صرف فرمائی نواب صاحب نے۔ اب اس غریب کو سوا اس کے چارہ نہیں کہ شکار کے نکات سیکھتا چلا جائے۔ نواب صاحب کے ساتھ ساتھ پرندے اتنا قریب کہ وہ سطح زمین یا شاخ شجر سے اڑ کر فضا میں پرافشانی کرنے لگے۔ بس پھر کیا تھا بندوق زمین پر دے ماری اور نواب صاحب بے انتہا غمزدہ شکستہ و مظلوم صورت بنائے وہیں ڈھیر ہو گئے۔ ہمراہی پر سارا الزام دھرا لازم آیا کہ اسی کے اناڑی پن سے شکار اڑ گیا۔ ہمراہی اگر سازآشنا ہوا تو وہ خود اپنی نا کردہ غلطیوں کا اعتراف کر لیتا تھا۔ نواب صاحب سے آئندہ پوری معلومات حاصل کرنے کا عزم اس نے ظاہر کیا نہیں کہ ممدوح الشان خود اس کی طرف سے معذرت خواہی فرمانے لگے۔ رسیدہ بود بلائے ولے بخیر گذشت! شکار پارٹی میں کبھی کوئی ایسی شخصیت اگر آ جاتی جو نواب صاحب کی افتادِ طبع سے واقف نہ ہوتی اور مرکزِ توجہ خاص بھی قرار پا جاتی تو اس خیال سے کہ زد میں وہ نہ آ جائے، گیا یہ جاتا کہ مصاحبین میں سے کسی کو پہلے سے تیار کر لیا جاتا تھا کہ اشارہ پاتے ہی سبے موقع بندوق داغ دے یا کوئی سی حرکت ایسی کر دے کہ شکار نہ ہو سکنے کا الزام اس کے سر عائد ہو سکے اور نیا مہمان مامون و محفوظ رہے۔

موضع گیا پہرا کو بتاتے ہیں کہ حضرت آثر عظیم آبادی کا مرزبوم تھا۔ ممکن ہے کبھی آبا و اجداد وہاں رہتے ہوں گے مگر سنا ہے گیا کہ ان کو کہیں کا بھی ہم نے تو نہیں دیکھا۔ ۱۹۰۶ء کا ذکر ہے۔ شہر گیا کی کچہری روڈ پر زمینداران ٹیکاری کی ملکیت سے ملحق کوٹھی پر جانب شمال ایک دو منزلہ مکان میں قیام فرما تھے۔ چند بزرگوں کے ساتھ حاضری کا موقع ملا۔ اطلاع کرائی گئی۔ بڑوں کی باہمی کھسر پھسر سے پتہ چلا کہ بغیر کسی قسم کی سوئے مزاجی کے زوجہ محترمہ سے بے نیاز ہو کر کسی بیگم کو ممتوعہ کر رکھا ہے۔ پردہ ہو جائے گا تو ہماری باریابی ہو گی چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ خیال ایسا آتا ہے کہ گلابی جاڑوں کی رات تھی کیونکہ کمرے کے اندر ہم سب بیٹھے تھے۔ کمرہ ہموار نہ تھا۔ گفتگو چلتے چلتے اس سوال پر آ گئی تھی کہ تیر نظر کے بسمل ہونے بغیر کامیاب تغزل ممکن ہے کہ نہیں؟ بالمقطع رائے یہی تھی کہ "ناممکن"۔ نواب صاحب کے اشعارِ غزل کے "تاثرات کے اعترافات مع مبالغہ نذر کئے گئے تو آپ نے انکشاف فرمایا کہ ہنگام عنفوانِ شباب جب آپ کے حضرت قبلہ گاہی کی تعیناتی دربھنگہ تھی تو وہاں کسی تقریب میں محفل گرم ہوئی تھی جس موقع پر ایک شمع محفل اپنی نگہ دے کر چل دی اور جناب آثر آج تک یہی کہنے پر مجبور ہیں کہ ع

سوختم لیک ندانم ز چہ عنوانم سوخت!

دربھنگہ کا ذکر آ ہی گیا تو ایک بھولی بسری کہانی اور ہو جائے۔ اسی شہر میں حضرت آثر اور حکیم یعقوب بیگ وارثی مرحوم و مغفور کی ملاقات ہوئی۔ مراسم بڑھے اور اس حد کو پہنچے کہ طرفین سے بیلک ببلک کی جگہ مغلظات سے تفریح کا انقلاب مرغوب ہو گئی۔ نواب صاحب نے "میمون قرقہ" منظوم فرما کر چھپوا دی۔ یہ ایک نظم مسلسل تھی جس کے قوافی طرح مار و دار وغیرہ تھے اور ردیف [illegible] رکھا تھا۔ ناظم کی قدرت [illegible]

حکیم صاحب کی مذمت کا کوئی پہلو لیے بغیر ان کا مضحک ترین حلیہ اس طرح نقشِ قرطاس ہو گیا تھا کہ اس نظمِ لطیف کو مطالعہ کرنے والے کے لئے اس کی ضرورت ہی نہیں رہتی تھی کہ حکیم صاحب کا سامنا ہوا اور کوئی اس کو بتاتے کہ "معجونِ طرفہ" سے مراد کیا تھی۔ پھر کمال یہ کہ نیچے بھی اس کو تکلف نہ ہوتا تھا کہ حکیم صاحب سے ڈٹ کر ملے اور اس بات کے اعتراف میں ذرا سا بھی مضائقہ سمجھے کہ "معجونِ طرفہ" پڑھ کر اس نے پہچانا ہے۔ ادھر حکیم صاحب کا یہ حال کہ "معجونِ طرفہ" کا نام سمعِ مبارک تک پہنچا نہیں کہ خود بدولت طرفہ تماشہ بن گئے۔ "تفریح القلوب" والا نسخہ کام میں لے آتے۔ بیچ بچاؤ نہ کی جائے تو لڑنا بڑا پولیس تک نوبت پہنچے بغیر نہ رہے۔ حکیم صاحب مہینوں میرے غریب خانہ پر تشریف رکھا کرتے۔ جب تک اپنا مکان نواب صاحب نے تعمیر نہ فرما لیا تھا۔ ہمارے قریب ہی اکثر و بیشتر کرایہ دار بن کر کسی نہ کسی مکان میں قیام فرمایا کرتے تھے۔ "معجونِ طرفہ" قطعی نایاب ہے۔ مشری گلی کوئی کاپی کہیں پڑی پڑائی مل بھی جائے تو حکیم صاحب کہاں کہ "گزیدہ و بخشیدہ"

سنہ ۱۹۰۹ء میں ہم خود کرایہ کے مکان میں رہنے پر مجبور ہو گئے۔ محلہ مراد پور میں منشی ولی اللہ مختار مرحوم کے صاحبزادے مسٹر نور اللہ حشمت مرحوم بیرسٹر ایٹ لا کا مکان میرے کرایہ میں تھا اور قریب ہی ڈاکٹر ملک فصیح احمد مرحوم کے مکان میں نواب صاحب معہ بیگم مقیم تھے۔ فرمایا کرتے تھے کہ خدا کی پسندیدہ ترین چیز آدم زاد کی دنیا ہے۔ دنیا کا بہترین حصہ ایشیا ہے۔ ایشیا کا انتخاب ہفت رقبہ ہندوستان ہے۔ ہندوستان کا اعلیٰ ترین صوبہ بہار، بہار کا اول نمبر علاقہ شہر گیا۔ گیا کا صحت مند و فرحت بخش حصہ وہ خطہ جہاں ڈاکٹر فصیح کا مکان واقع ہے۔ جب پھلگو ندی کے پار قصبہ مانگلو ہانپور کے دوسرے کنارے پر محلہ بنیاد گنج میں کوٹھی خرید کر کے اس کی درستگی نئے سرے سے کرا لینے کے بعد نواب صاحب یہاں اٹھ آئے تو پھر گیا تک تو وہی سلسلہ رہا مگر ڈاکٹر فصیح کے مکان کی ساری خوبیاں بھی اپنے ساتھ منتقل فرما لی تھیں۔ درمیان میں دوسرے مکانات کرایہ پر رہے تھے مگر ان کی ثنا و صفت اتنی نہیں ہوتی تھی۔ بہرکیف ذکر تھا سنہ ۱۹۰۹ء کا۔ میرے والد ماجد علیہ الرحمۃ علیل تھے اور علاج نواب صاحب سے رجوع تھا۔ بڑی شفقت سے پیش آتے تھے۔ کبھی صبح کبھی شام ایک وقت روزانہ کرم فرماتے تھے۔ ایک دفعہ اپنے مریض کو بہت خوش نہ پا کر نواب صاحب نے ایک اسفیر اودھ کے جاننے سفر کی روئیداد سنانی شروع کی۔ اس میں ایسے ایسے مضحک پہلو نکالے اور ان کو بیان کرتے وقت وہ وہ پینترے کئے کہ ہنستے ہنستے سب کا برا حال ہو گیا مگر مریض پر اچھا اثر ہوا۔ اس دن پتہ چلا کہ تمثیلی ادب پر قولاً فعلاً کتنی کامیابی کے ساتھ حاوی ہو سکتے تھے اگر اس کی طرف التفات فرماتے۔

نواب صاحب آلٹے ٹانگوں والے مگر سے ڈرتے تھے۔ کہیں نظر آجاتا تو فوراً بندوق طلب فرمایا کرتے تھے۔ بندوق تو کیا پیش کی جاتی کوئی شخص بڑھ کر مار دیا کرتا تھا۔ اطمینان ہو جانے کے بعد فرمایا کرتے تھے کہ مگر سے میں ڈرتا نہیں ہوں۔ اس کی کثافت ناقابلِ برداشت ہوا کرتی ہے۔ یہ الٹے ٹانگوں کو سکوڑتے ہوئے چلنے کی ضرورت ہی کیا؟

سنہ ۱۳-۱۹۱۲ء میں نیورہ جانا ہوا۔ نواب صاحب اتفاق سے وہیں مقیم تھے۔ یہ تو ممکن ہی نہیں تھا کہ ملے بغیر چلا آتا۔ قیام گاہ پر جس وقت پہنچا تو پیش دالان کے سائبان میں بیٹھے کچھ لکھ رہے تھے۔ دیکھ کر بڑے خوش ہوئے کہ خوب وقت پر آئے۔ دیکھو ہاتھیوں کے علاج پر رسالہ لکھ رہا ہوں۔ تم لوگوں کے یہاں کئی کئی ہاتھی ہیں۔ تمہارے کام کی چیز ہے۔ اور ساں جانتے رہے کہ بڑے پھنسے۔ مگر اب "سوکر دنی خویش آمدنی بہشت" "تاب لائے ہی بنے گی غالب" بھی جی میں کہتے بیٹھ گئے۔ "آئی بلا کو ٹال تو ہم نہ سکتے" مگر دل کو کیا کر سکتے تھے جو یہی رٹ لگائے تھا۔ اب اللہ کی کرنی کہ حسن امام صاحب کا صاحبزادہ بچپن سے لندن باشی تعطیلوں میں آیا ہوا کھیلتا کودتا آ پہنچا۔ نواب صاحب کی کرسی کی پشتیاں پکڑ کر کھڑا ہلنے لگا۔ اردو وہ غریب جانے نہیں۔ اس کی سمجھ میں کیا خاک آتا۔ تہذیب شائستگی اس کی بندروں والی، وہ کیا جانے مشرقی ادب آداب۔ اس کی طبیعت جو الجھی تو جہاں تک میرا حافظہ کام دیتا ہے یہی الفاظ تھے جو بے تکان اس کے منہ سے نکلے:

WHAT NONSENSE YOU ARE TALKING, GRANDPA, LIKE AN OLD FOOL.

"کیا اول فول بک رہے ہو دادا میاں، بڈھے بے وقوف کی طرح"

نواب صاحب کے چہرے پر ایک رنگ آتا تھا ایک جاتا تھا۔ بڑے ضبط سے کام لیا، مسودہ کو لے کر اٹھ کھڑے ہوئے اور وہاں سے رخصت ہو گئے۔ میرا پہچا تو پھولا مگر اس کی خوشی کجا۔ آج بھی یہ حال ہے کہ نواب صاحب کی اس وقت کی بے بسی یاد آتی ہے تو خدا یاد آتا ہے۔

اس سے پہلے یا اس کے کچھ دنوں کے بعد کا واقعہ ہے کہ نواب صاحب اپنے چھوٹے برادرِ نسبتی آنریبل جسٹس سید شرف الدین کی کوٹھی پر مولانا بانکی پوری شہر میں بیٹھے اپنی تازہ غزل سنا رہے تھے۔ بڑے لکھوں کے ساتھ شہر کے تقریباً جاہل ملک التجار منت خان بھی موجود تھے۔ قصہ آگے بڑھانے سے پہلے عرض کر دیا جائے کہ پٹنہ سٹی کے دو محلوں کی الگ الگ خصوصیت تھی۔ رانی پور کی کھڑکی نام کے علاقے میں جو کم سواد بستے تھے وہ "ڑ" کا تلفظ نہیں کر پاتے تھے گھوڑے کو "گھورا" رائے منت خان کے ساتھ بولتے تھے۔ برخلاف چوک وغیرہ دیگر علاقہ والے جہاں "ر" ہوتی وہاں بھی "ڑ" ہی سے تلفظ کرنے کے عادی تھے یہ سرکار کو سرکاڑ کہنے ہی کو شاندار تصور کرتے تھے۔ اس تصریح کے بعد اصل قصہ کی طرف رجوع کرتا ہوں۔

نواب صاحب نے شعر سنایا جس میں "زلف پیچ پیچ" سے متعلق خیال آفرینی ہوئی تھی۔ ادھر شعر تمام ہوا ادھر منت خان چہک ہی تو اٹھے:

"واہ سرکاڑ واہ۔ ایک تو جو لفظ اس پڑ سے مڑ پیچ" اس وقت بھی یہی ہوا کہ نواب صاحب کو جیسے سکتہ لگ گیا۔

انہی دنوں کے بعد ہی سننے میں آیا کہ شمس العلماء نے نکاحِ ثانی بجائے متعہ کر لیا ہے۔

۱۹۱۸ء میں نواب صاحب، مختار سینٹل پرشاد آنجہانی کے مکان میں مد محل ثانیہ کے قیام فرما تھے۔ موسم انتہائی گرم تھا، لوئیں چل رہی تھیں، فضا مدورجہ تپ رہی تھی۔ ہم لوگ زمین دوز تہ خانے میں پناہ گیر تھے کہ ٹھیک دوپہر کے وقت نوکر نے اطلاع دی کہ نواب صاحب پھاٹک پر تشریف لا چکے ہیں اور مجھ کو طلب فرما رہے ہیں۔ گھبرا کر تہ خانہ سے برآمد ہوا۔ دیکھتا کیا ہوں کہ پیادے اور شاگرد پیشہ مؤدب دست بستہ کھڑے لو سے جھلس رہے ہیں اس لئے کہ حسب الحکم پھاٹک جو پٹ کھلا پڑا تھا۔ پیادوں کے نشست کی بینچ پر نواب صاحب نزول اجلال فرما تھے۔ زندگی میں غالباً یہی پہلی اور آخری مرتبہ تھا کہ اس بینچ کی یہ عزت افزائی ہوئی۔ امتثالِ امر میں مجھے بھی پہلو میں عزت دہانی پڑی۔ یقین کیجئے گا کہ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ یہ ہو کیا رہا ہے۔ نواب صاحب نے بڑی سکینیت اور معصومیت کے ساتھ باور کرایا کہ وہ قطعی بے یار و بے مددگار صرف راقم آثم کے سہارے اس شہر میں رہتے ہیں۔ اگر میں بھی ممدوح الشان کی مدد و معونت نہ کروں گا تو پھر ان کی بے کسی کا کوئی چارہ نہ ہوگا۔ میں کہاں سے وہ الفاظ لاؤں جو میری دلی اور دماغی کیفیت کا صحیح اعادہ کر سکیں؟ مجھ پر کیا گزری اس وقت اس کو کوئی صرف سوچ سکتا ہو تو سوچ لے۔ میں خود بیان کرنے سے قاصر ہوں۔ یہ وہ اللہ تعالیٰ یہ کیسی بلند پایہ ہستی تھی جس کی خوشنودی حاصل کرنے کے متمنی حاکم حکام، راجے مہاراجے، رؤسا و امرا ہی نہیں تھے بلکہ علماء و فضلاء بھی اور وہ اپنے ایک کمترین عزیز مدعو سے پناہ طلب کر رہی تھی۔ کیا عالم ہوگا ناظرین کا آج بھی جب میں بیان کروں گا کہ اس "کوہ کندن" سے برآوردہ گیا؟ در حقیقت کیا تھی؟ معلوم یہ ہوا کہ نواب صاحب کو یکایک دھیان آیا تھا کہ چند نفر خدمتگار جو بروقت ملازمت میں تھے ان میں کسی کسی کی مدت سال و شش ماہ پوری ہو رہی تھی۔ خطرہ پیدا ہوا کہ ترکِ خدمت کرنے پر اگر آمادہ ہو گئے تو کیا ہوگا۔ ساتھ ہی دھارس بندھی اس خیال سے کہ اپنا ایک عزیز زمیندار ہے جس کے علاقوں میں مولا زادے وغیرہ قسم کے اسامی ہوں گے لہٰذا صرف خبردار کر دینے کے لئے زحمت فرمائی گئی تھی کہ خطرہ بذا حالت منتظرہ سے صورت عمل میں منتقل ہو تو میں خانہ پری کا سامان رکھوں۔

اسی زمانہ میں آنریبل مسٹر سید شرف الدین گورنمنٹ بہار کے ہوم ممبر کی حیثیت سے رانچی میں مقیم تھے کہ فالج میں مبتلا ہو کر گیا لائے گئے۔ بیمار ماموں کو دیکھنے سر علی امام گیا آئے۔ ابھی انہوں نے ماموں کی جگہ نہیں لی تھی۔ تھوڑی سی دیر میں سب کچھ کر لینا تھا لہٰذا سر علی فکر مند تھے کہ نواب صاحب سے ملے بغیر جانے کا خیال بھی نہیں کر سکتے پھر ڈر یہ بھی تھا کہ وہاں سے بروقت رخصت نہ ملی تو کیا ہوگا۔ نواب صاحب کی شفقت جو مجھ پر تھی اس کے لحاظ سے میرا انتخاب ہوا کہ سر علی کے ساتھ جاؤں اور ان کی ٹرین چھوٹنے سے پہلے ان کے اسٹیشن پہنچ جانے کی راہ نکالوں۔ اسی سینٹل پرشاد مختار والے مکان میں نواب صاحب مع متعلقین مقیم تھے جس وقت ہم لوگ پہنچے سب سے پہلے نواب صاحب وظیفہ میں مشغول تھے۔ سلام عرض کر کے ہم بیٹھے

سر علی تو زنانخانہ تشریف لے گئے، بیس منٹ تک وقت کی اطلاع کر دی۔ اس وقت تک نواب صاحب کے یہاں ایک صاحبزادی اور بڑا صاحبزادہ مسمّی حسین امام پیدا ہو چکے تھے، اسی بچے کو گود میں لے سر علی بیس منٹوں ہی میں باہر آئے اور کہنا ہی شروع کیا تھا کہ بچہ بڑا پیارا ہے۔ اس کو دے دیا جائے کہ مخصوص طریقے سے پرورش و تعلیم کی خدمت ہم انجام دیں۔ سر علی کا رنگ فق ہوا تھا۔ یہ بچہ صورت میں سر علی کی پوری پوری شباہت لئے ہوئے اور کھلتی ہوئی رنگت کا تھا۔ ابھی بات تمام بھی نہ ہو پائی تھی کہ نواب صاحب تسبیح رکھتے ہوئے مصلّے سے لپکے اور قریب قریب چھینتے ہوئے صاحبزادے کو لے لیا اور سر علی کو ٹرین پکڑنے کی ضرورت یاد دلا کر چلتا کر دیا۔ مجھے روک لیا۔ بڑے کمرے میں لے جا کر دیوار میں بنی ہوئی الماری کھولی۔ اس کے کئی درجے کتابوں سے بھرے تھے۔ استفسار فرمایا کہ تجھے معلوم ہے کہ یہ کتابیں کس علم کی ہیں؟ اظہار لاعلمی پر ارشاد ہوا کہ نجوم و فلکیات ان کا موضوع ہے۔ اس کے بعد کہنے لگے کہ "سر علی امام بڑے قیافہ شناس ہیں۔ پہلی ہی نظر میں انہوں نے تاڑ لیا کہ بچہ کیسا نصیبہ ور ہے۔ اسی لئے اس کو حاصل کرنے کے لئے خوشامدیں کر رہے تھے۔ ایسا کہیں ہو سکتا کہ میں بچہ کو ان کے حوالے کر دوں کہ اپنے جیسا کرسٹان بنا کر رکھ دیں۔ مجھے بابو جی ہمیشہ کہا کرتے تھے، بالو میرا یہ سن شادی کرنے کا تھا؟ مگر کرتا کیا؟ کہ آپ سرا کے امام باڑے اور قیسرہ کی مسجدیں ویران ہو گئیں۔ علی امام، حسن امام معہ بال بچوں کے کرستان ہو گئے۔ اس لئے مجھے شادی کرنی پڑی۔ نیت کا پھل خدا نے یہ دیا کہ اس بچے کا زائچہ وہی ہے جو سکندر ذوالقرنین کا تھا۔ اس وقت بھی اس طفل شیر خوار کی ماہانہ آمدنی علی امام، حسن امام کی مجموعی ماہانہ آمدنی سے زیادہ ہے" ——— افسوس کہ سن تمیز کو پہنچ کر یہ صاحبزادہ داغ دے گیا۔ انا للّٰہ... الخ۔ گڈ کے اندر اس کی قبر پیش نظر رہ کر نواب صاحب کا جینا حرام کئے دیتی تھی۔

ادھر کی سنئے کہ آنریبل مسٹر شرف الدین کا علاج یونانی ہو رہا تھا آگرہ سے حکیم محمد حیات خان اسی لئے بلائے گئے تھے۔ بند کمرے میں انگیٹھیاں سلگی ہوئی رکھی رہتی تھیں۔ مریض کو متلی بار بار ہو رہی تھی۔ مفلوج زدہ کا لباس تبدیل کرانا معصیت، حکیم صاحب کے بتائے کچھ بن نہیں رہی تھی ——— نواب صاحب کا دل موم کا تھا، برادر عزیز کی محبت میں اور بھی پگھلا جا رہا تھا۔ صبر کا پیمانہ چھلک پڑا، میز پر گھونسہ مار کر اٹھے اور یہ کہتے ہوئے سیدھے ہو لئے کہ تین گھنٹوں کے اندر متلی ختم نہ کر دی تو امداد امام نام نہیں۔ نواب صاحب کیا کہہ کر اٹھے تھے! اس کی تو چند مخصوص صاحبوں کو خبر تھی مگر ان کا تمتمایا ہوا چہرہ سبھوں نے دیکھ لیا تھا۔ اپنی اپنی بولی سب بولنے لگے۔ بیچارے حکیم صاحب کو یہ ستا ستا کر سہما رہے تھے کہ نواب صاحب غصہ میں بھرے گئے ہیں بس کوئی دم میں بھری بندوق لئے آئیں گے اور کسی نہ کسی کو نشانہ بنائے بغیر نہیں رہیں گے ——— حکیم صاحب کو اپنی جان سب سے زیادہ خطرہ میں معلوم ہوئی۔ وہ تو بوریا بستر سنبھال کھڑکی کی راہ آنریبل بشن پرشاد کے گھر جا براجے ——— نواب صاحب منٹ واپس آتے ہی انگیٹھیاں ہٹوا دیں۔ ذرا رہ کر کمرے کے کل در کھلوا دئے۔ تیمارداروں کی جان میں جان آئی۔ کچھ وقفہ کے بعد مریض کا پلنگ اٹھوا کر باہر سائبان میں لے آئے۔ مریض صاحب اپنے اخی معظم کی جذباتی طبیعت سے واقف تھے لہٰذا ان باتوں سے خوش ہونے کے بجائے کبیدہ خاطر ہی تھے۔ جب ان سے سوال ہوا کہ کیا کھانے کو جی چاہتا ہے تو اظہار ناراضگی کی خاطر فرمایا "کھیرا"۔ یہ جانتے ہوئے کہ فالج میں اس کی مضرت عیاں را چہ بیاں ہے۔ مگر نواب صاحب نے قطعی برا نہ مانا بلکہ بازار سے منگوا کر کھیرے کی قاش ہی پر سونٹھ چھڑک کر کھانے کو دیا۔ واقعی تین گھنٹہ کے اندر امتلاء کا نام بھی نہ رہا۔ اب باقاعدہ علاج شروع ہوا اور یوماً فیوماً فائدہ مترتب ہونے لگا۔ یہاں تک کہ اپنے پاؤں چل کر مولوی شرف الدین پٹنہ سدھارے۔ یہ معرکہ کا علاج نواب صاحب کی حذاقت کا ایک کھلا ثبوت تھا۔

اسی سال سر علی کا تقرر بجائے مولوی شرف الدین ہو گیا تھا۔ ڈپٹی مجسٹریٹ کے عہدے پر بحالی کے لئے درخواست دینے والوں میں میرے ایک محترم عزیز بھی تھے۔ مگر افواہ یہ تھی کہ سر علی اپنے کسی خاص عزیز کو اس کے لئے مختص فرما چکے ہیں لہٰذا کسی کی دال نہیں گلے گی۔ میرے قابل احترام عزیز میرے پاس تشریف لائے کہ آنریبل سر خواجہ محمد نور اور آنریبل بشن پرشاد سے اسناد حاصل کر دوں۔ نواب صاحب سے اس سلسلہ میں کچھ عرض معروض کی رائے دینے والا کوئی نہ تھا۔ خود میرا اپنا دل نہیں چاہتا تھا مگر "الغرض مجنون" کی وادی سے گزرے بغیر بعض وقت رہا بھی نہیں جاتا۔

جزئیات منداز کام سے جاسکتے تو تعجب کیا۔ نواب صاحب کی شفقت نگاہ پر بھروسا کر کے بیٹھے وہی پنسل پکڑا دیتا رہا ملکانی۔ نواب صاحب مسکرائے بیٹھے اسی انداز سے وظیفہ میں مشغول۔ نواب صاحب رامپور کا مکتوب کھلا پڑا تھا اور ممدوح الشان کا فرستادہ آموں کا ٹوکرا ابھی بند تھا۔ اور بادہ دلالت سے فراغ کے بعد باتیں شروع ہوئیں جس کا شعر و سخن سے سلسلہ ملا لینا دشوار نہ تھا۔ میں نے عرض کیا کہ بڑا محتاط استاد ہونے کے باوجود غالب ایک شعر میں ذرا بہک گئے۔ تعجب کے ساتھ دریافت فرمایا کہ کون سا شعر؟ عرض کیا ؎

پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق

آدمی کوئی ہمارا دمِ تحریر بھی تھا

یہ ظلم و نسق حاکمِ مطلق تبارک و تعالیٰ پر الزام تراشی ہے۔ فرشتوں کے خلاف احتجاج نہیں ہے۔ سن کر شاباش دی اور کہا کہ اتنی احتیاط کون کرتا ہے میں نے عرض کیا کہ خود حضور کا شعر اس سقم سے پاک ہے۔ بڑے تعجب اور شوق سے پوچھا کہ کون سا شعر؟ عرض کیا ؎

کیا جانے لکھا کرتے تھے کیا کاتبِ اعمال

دنیا میں تو یارب کبھی محشر نہ ہوا تھا

سنتے ہی، جذباتی آدمی تو تھے ہی، رو پڑے۔ بہت دعائیں دیں۔ حد یہ کر دی کہ کہنے لگے کہ تمام عمر جو کچھ لکھا پڑھا وہ سب جھک مارنے کے برابر ہے۔ جب خود نہ سمجھ پائے کہ جو کچھ لکھا ہے اس کا صحیح مطلب کیا ہے۔ بہ قسم فرمانے لگے کہ اس شعر کی یہ خوبی آج تک نہ سمجھ میں آئی تھی نہ آئندہ آنے والی تھی۔ اب ضد فرما کر مجھ سے وعدہ لینے لگے کہ بسم اللہ سے تائے تمت تک پورا دیوان آخر مطالعہ کر کے حضرت والا کو ایک ایک شعر کا مطلب سمجھاؤں۔ ع اے روشنیِ طبع تو بر من بلا شدی" کا مطلب عملی طور سے اسی دن سمجھ میں آیا۔ مجھ پر تو عذاب نازل ہوا مگر میرے عزیز محترم کا کام بن گیا۔ بڑی زوردار سند لکھ دی۔ کمشنر اور چیف سیکرٹری کے نام زبردست سفارشی خطوط تحریر فرما دیے۔ اسی پر بس نہیں کیا، پٹنہ کا قصد ظاہر فرما کر عزیز گرامی قدر کو سر علی سے ملا دینے کا وعدہ فرمایا۔ چنانچہ نواب صاحب جب پٹنہ پہنچے تو پلیٹ فارم پر میرے عزیز مکرم موجود تھے۔ فٹن کرایہ کی لے کر سوار ہوئے اور روانہ منزلِ مقصود ہوئے۔ عین راہ دریافت فرمایا کہ کلام آثر سے کچھ یاد ہے؟ حسنِ اتفاق کہ یہ اشعار ان کو یاد تھے ؎

ابھی ابھی رہنے دو کیوں سر پہ آفت لاتے ہو	دل کی الجھن بڑھتی ہے جب زلفوں کو سلجھاتے ہو
چھپ چھپ کر تم رات کو صاحب غیروں کے گھر جاتے ہو	کیسی ہے یہ بات کہو تو کیسے منہ دکھلاتے ہو
کیسا آنا کیسا جانا میرے گھر کیوں آؤ گے	غیروں کے گھر جانے سے تم فرصت کب کر پاتے ہو

اس سے بھی خوش ہوئے۔ سر علی کے گھر پہنچ کر آپ باہر ہی انتظار فرمانے لگے۔ چپراسی اردلی "سرکار سرکار" کہتے دوڑ پڑے اندر ڈرائنگ روم میں تشریف لے چلنے پر اصرار کرنے لگے مگر آپ نے ایک نہ سنی۔ صرف اطلاع کر دینے کو کہا۔ خبر ہوتے ہی خود سر علی دوڑے آئے تو آپ نے فرمایا کہ آج آپ کے باوا تشریف نہیں لائے ہیں بلکہ حکومت کے نمائندہ سے ایک شہری ملنے آیا ہے۔ یہ صاحبزادے میرے ساتھ ہیں اور انہی کی سفارش مجھے کرنی ہے۔ لائق و سعادتمند فرزند ارجمند نے سفارش کو "حکم" کے درجے پر رکھ کر وہی کیا جس پر یہی کہنا لازم آتا ہے کہ الولد سر لابیہ۔ نواب صاحب زندہ نہ سر علی امام مگر عمل خیر دونوں کے ہمیشہ بہار رہیں گے ؎

نیکی کن اے فلاں و غنیمت شمار عمر

زاں پیشتر کہ بانگ برآید فلاں نماند

اب جو واقعات لکھے جاتے ہیں ان کے سنین و ترتیب قبل و بعد کا صحیح تعین نہیں کر سکتا۔ رستاخیز ۱۹۴۷ء میں اوروں کی متاعِ حیات و مال و منال پر زوال آیا۔ میرا ایک ہی سرمایہ تھا یعنی حافظہ افسوس کہ وہی ضائع گیا۔ پرانی باتوں کے نقوش سطح دماغ پر گہرے بیٹھے تھے وہ بھی قابلِ شناخت

ہیں۔ بعد کی یادداشتیں خوب واضح نہیں رہی ہیں لہٰذا ان کی تصدیق کی ضرورت ہو سکتی ہے جس کا کوئی ذریعہ یہاں کراچی میں میسر نہیں۔

اب نواب صاحب شہر چھوڑ کر سندی پاروالی اپنی کوٹھی میں آباد۔ دوسرا صاحبزادہ کاظم امام پیدا ہو چکا مگر سال بھر کا بھی نہیں ہوا تھا کہ ایک دن اول وقت عصر ہو گا کہ بیگم اسپتال سے یہ بہت بے تکلف دوست ڈاکٹر پرفل گپتا اسسٹنٹ سرجن تیز قدم چلنے کی وجہ سے کچھ ہانپتے تشریف لائے اور جناب سول سرجن کی طلبی وہ بھی فوری سُنا کر مصر ہوئے کہ جس حال میں ہوں یونہی ان کے ہمراہ چلا چلوں۔ انہوں نے صرف یہ بتایا کہ آنگلہ سے کوئی بچہ لایا گیا ہے جس کا اپریشن کرنا فوراً لازمی ہے۔ بچہ کو کسی سے منسوب بتایا جاتا ہے جس کے نام میں امام ہے۔ چونکہ تم اسپتال سے قریب رہتے ہو اور تمہارے نام میں بھی امام ہے لہٰذا سول سرجن صاحب تمہاری اجازت سے مطمئن ہو کر آپریشن کرنا چاہتے ہیں۔ واضح باد کہ آنگلہ میں میرے عصبات بستے ہیں۔ ہمارا مدفن بھی اسی قصبے میں ہے لہٰذا میرا خیال نواب صاحب کی طرف نہ جا سکا۔ اسپتال پہنچ کر معلوم ہوا کہ یہ بچہ نواب صاحب کا نومولود صاحبزادہ کاظم امام ہے جس کے گلے میں پھندا پڑ گیا ہے۔ ایک غریب درزی نواب صاحب کے یہاں مقیم کپڑے سینے پر مامور تھا اسی نے عقل سے کام لیا۔ بچہ کو لے کر افتاں و خیزاں اسپتال لے آیا۔ اور کسی کا معاملہ ہوتا تو میں ذمہ داری لینے نہ لینے کے متعلق سوچ بچار کرنے لگتا مگر نواب صاحب کی نازک مزاجی اور دل کے آگے بدنام سہی میرے نزدیک ان کی ذات گرامی اعتماد کو سزاوار تھی لہٰذا میں نے بے تکلف آپریشن کی اجازت دے دی۔ آپریشن کامیاب ہوا۔ یورپین وارڈ کے ایک کمرے میں بچہ لا کر لٹا دیا گیا۔ نو دس مہینے کی جان، اپنے بھائی جان حسن امام صاحب کی ننھی سی تصویر اور وہی تیوری وہی آن بان ——— بلی متانت سے خاموش پڑا سو رہا تھا۔ خواب آور دواؤں کا اثر، گلے سے تیز سیٹی کی سی آواز جاری تھی۔ چونکہ نرخرے میں سوراخ کر کے اس قسم کا ٹیوب آر پار سوراخ والا بٹھا دیا گیا تھا جیسا ربڑ کے چوں چاں کرنے والی چڑیوں بطخوں میں آویزاں ہوا کرتا ہے۔ قریب مغرب نواب صاحب تشریف لائے۔ میرا ہاتھ پکڑ کر خوب روئے۔ کئی دن بچہ اسپتال میں رہا۔ ربر کی نلکی، نلکی کے سوراخ سے لگا دی جاتی تھی اور دودھ وغیرہ سیال قسم کی غذا پیٹ میں اتار دی جاتی تھی۔ کلکتہ سے یورپین نرس مس اسٹرلنگ بچہ کی خدمت کے لئے مقرر ہو کر آئی تھی۔ نواب صاحب کے ساتھ کئی کئی گھنٹے اسپتال میں بسر ہوتے تھے۔ کبھی بچے کو روتے نہ سنا۔ مسکرا لینے کے سوا کھل کر ہنستے بھی نہ دیکھا۔ اس کی عمر ہی کیا تھی ——— آپ چاہے اس کو میری خوش فہمی پر محمول فرمائیے مگر مجھے صاف معلوم ہوتا تھا کہ اپنی غیر معمولی و غیر متوقع فراست سے بچہ ہماری باتیں سمجھتا تھا۔ ایسا بچہ پھر آج تک دیکھنے میں نہ آیا۔ افسوس کہ گھر جا کر چند مہینے ہی زندہ رہا۔ اس کی موت نے نواب صاحب کو زندہ درگور کر دیا۔ انا للّٰہ ۔ ۔ ۔ ۔ الخ ۔

اب وہ زمانہ ہے کہ سر علی امام کو موئید الملک اور حیدر آباد کو مملکت آصفیہ کا صدر اعظم لکھا جاتا ہے۔ نواب صاحب بھی حیدر آباد گئے ہوئے تھے۔ ابھی واپسی کی خبر بھی نہیں تھی کہ ایک دن یاد نہیں کس ضرورت سے گیا کے ریلوے اسٹیشن سے باہر آتے ہی، ایک کرایہ کی گاڑی میں نواب صاحب بیٹھے نظر آئے۔ گاڑی کی چھت پر اسباب لدا ہوا تھا۔ سمجھ گیا کہ حیدر آباد سے مراجعت فرما رہے ہیں۔ اسی لئے بڑے ذوق و شوق سے ان کی طرف لپکا۔ اب تصور فرمائیے کہ صدرِ عالی شان گاڑی کے اندر اور میں عام شاہراہ پر گاڑی سے لگا کھڑا ہوں۔ خیر صلاح کیسی، حکم ہوا کہ بالو، ہنڈا لٹائیے۔ خود بھی دست بدعا ہو کر گڑگڑا کر فرماتے جاتے ہیں کہ یا اللہ ہم سب بڑے گنہگار ہیں اور ہر سزا کے لائق مگر واسطہ اپنی کریمی کا، اپنے نبی کریم صلعم اور ان کی آلِ اطہار علیہم السلام کا، میرے اعزا و اقارب، دوست احباب پر اور چاہے جو بھی مصیبت نازل ہو مگر حیدر آباد کسی کو جانا نہ ہو۔ کہئے بالو آمین ——— !

ایک دن کا واقعہ سنئے، غریب خانہ حسنین منزل کے دروازہ پر ایک کرایہ کی گاڑی آکر رکی۔ اس میں سے برآمد ہوئے نواب صاحب کی محل ثانیہ کے برادر معظم میاں منگو مرحوم، بایں ہیئت کذائی کہ نہ سر پر ٹوپی نہ پاؤں میں جوتے۔ "یا الٰہی خیر کیجیو" کہنے کے سوا اور کیا کرتا۔ خبر لائے کہ نواب صاحب سخت علیل ہیں اور فی الفور بلایا ہے۔ میں نے پوچھا کہ گاڑی پر لد کر آنے کی مہلت تھی مگر ٹوپی جوتی کی طرف دھیان دینے کی فرصت نہ تھی کیوں؟ غریب بلبلا اٹھا کہ نواب صاحب کی عجلت پسندی نے یونہی چل پڑنے پر مجبور کر دیا۔ پیادہ پا تمام راہ طے کی۔ پل پار کر کے گاڑی

پچھلی تحریر ساتھ ہو لیا۔ پیش خانہ دو سیڑھیوں کا اونچا سا تھا جس کے آگے سنگ بزوں کی سڑک سی تھی اسی پر پلنگ بچھا تھا اور کرسیاں پڑی تھیں۔ میں جب اس جگہ پہنچا تو دیکھا کہ دو آدمی دونوں بازوؤں کو سہارا دیتے ہوئے نواب صاحب کو ہوشیاری کے ساتھ سنبھالتے زنان خانہ سے اس پلنگ پر لا رہے تھے۔ صورت سے نواب صاحب واقعی بے حد علیل نظر آتے تھے۔ نقاہت بھی ایسی طاری تھی کہ جیسے چھ مہینوں کے فاقہ زدہ مریض کی ہوتی چاہیئے۔ نواب صاحب کی نوکر سے اتنی واقفیت کے باوجود بھی میں صاف دھوکا کھا ہی گیا۔ پلنگ پر دراز ہوتے ہی مخاطب فرمایا کہ بابو! بڑے وقت پر تم آگئے بس چند گھنٹوں کا میں مہمان ہوں۔ جانبر ہونے کی کوئی امید نہیں ہے۔ تم کو وصیت کرنے کے لئے بلایا ہے۔ اگر میری وصیت پوری کرنے کی حامی تم نے بھر لی تو میری جان آسانی سے نکلے گی اور روح آسودہ و مطمئن رہے گی۔ تم جانتے ہو کہ میرا سن شادی بیاہ کا نہ تھا مگر عزیز من میں کیا کرتا؟ کمر اوپر سر اسکے امام باڑے اور تبرہ کی مسجدیں ویران ہو گئیں۔ علی امام، حسن امام کرستان ہو گئے۔ کلمہ مذہب پڑھنے والا میری نسل میں نہ رہا۔ مجبوری شادی کر کے دوبارہ نسل جاری کرنی پڑی اب آخری وقت ہے۔ ادھر میں مرا ادھر علی امام، حسن امام بال بچوں پر قبضہ جمائیں گے اور اپنے جیسا کرستان بنائے بغیر باز نہ آئیں گے۔ لہٰذا بابو میری وصیت ہے کہ میرے بعد میرے بال بچوں کے والی و کفیل آپ ہوں۔ علی امام، حسن امام سے ان کا کوئی واسطہ نہ ہو۔ میں جانتا ہوں کہ آپ سنی ہیں، آپ کی تربیت میں میرے بچے شیعہ نہ رہ سکیں گے۔ یہ مجھے گوارا ہے، موحد و مسلمان تو رہیں گے، کرستان تو نہ ہو جائیں گے لہٰذا آپ زبان دیجئے کہ میری وصیت پر آپ عمل کریں گے وغیرہ وغیرہ۔ اس وقت مجھے ہومیوپیتھی کی ہوا بھی نہیں لگی تھی مگر بڑی دیدہ دلیری کے ساتھ میں نے نواب صاحب کا بکس دواؤں والا طلب کیا۔ جو شیشی ہاتھ آئی اسی میں سے کاغذ پر چند گولیاں نکال کر نواب صاحب کو دیں کہ پہلے ان کو نوش فرمائیے اس کے بعد جو وصیت کیا معنی حکم دیجئے گا اس کی تعمیل اپنی سعادت سمجھوں گا۔ بلا حیل و حجت دوا کھا کر استفسار فرمایا کہ تم کو بھی اس طریقۂ علاج میں درک حاصل ہے؟ فیضِ صحبت کو میں نے حیلہ بنایا۔ دوا کھاتے ہی پہلا کام یہ کیا کہ خوب کھنکھار کھنکھار کر تھوکا۔ لیٹے سے بیٹھے ہو گئے۔ فرمانے لگے بابو اہم سمجھ گئے۔ آپ نے لائیکوپوڈیم دیا ہے۔ لوگوں کی طرف مخاطب ہو تے کہہ دیکھی بابو کی حذاقت۔ میرے معدہ میں بلغم جمع ہو کر زہر پھیلا رہا تھا۔ اگر ذرا سی دیر اور اس کا تدارک نہ ہوتا تو میرا کام تمام تھا۔ اب نواب صاحب پوری طرح توانا و تندرست، خوش و خرم، چاق و چوبند تھے۔ پلنگ سے اٹھ کھڑے ہوئے مجھے ہاتھوں سے پکڑ کر لے چلے زنان خانہ کی طرف۔ ڈیوڑھی کے پردے کے پاس پہنچ کر شاید ان کو یاد آیا کہ ابھی وہ کس حال میں برآمد ہوئے تھے۔ لہٰذا تھوڑا سا اضمحلال اپنے پر طاری کر کے میرے شانے پر ہاتھ رکھ کر چلتے ہوئے اندر پہنچ گئے۔ محترمہ علیہ کبھی میرے سامنے نہ آئی تھیں۔ ان کے پاس پہنچ کر کافی مضمحل آواز میں فرما رہے تھے کہ بابو نے میری جان بچائی ہے، بابو کے قدم لو۔ وہ غریب یک دھماٹ ٹاٹ ٹک دیدم، دم نہ کشیدم۔ سمرتاج کے واسطے سے مجبور غیر محرم کو دیکھ کر ہٹ بھی نہیں سکتی تھیں۔ پھر عادی بھی تو تھیں کہ اپنی عمر سے بہت زیادہ سن و سال والے عزیزوں سے سامنا ہوا کرے۔ مجھے بھی "فہو نعم" باور کر کے دیکھا کیں۔ بعد کو معلوم ہوا کہ بیچاری اونچا سنتی تھیں اور نواب صاحب آواز کی نقاہت کا بیکار مظاہرہ بھی تو فرما رہے تھے —— بیگم صاحبہ ہنوز زندہ و سلامت ہیں۔

مذہب کے متعلق یہی نہیں کہ وہ اپنے شیعہ ہونے پر متشدد تھے بلکہ ہر صحیح الخیال کے متعلق اصرار فرماتے تھے کہ وہ بھی شیعہ ہے۔ سنیوں سے نفی کے اظہار میں بیباک تھے اور بڑی عجیب باتیں سنیوں سے منسوب کرتے تھے۔ بارہا ایسا ہوا کہ ایسی ہی کوئی بات انہوں نے سنیوں سے منسوب کی تو میں بغیر کسی لحاظ کے احتجاج کر دیا کرتا تھا کہ آخر ہم لوگ بھی تو سنی ہیں۔ ان واہی تباہی باتوں سے ہم کو واسطہ کیوں نہیں ہے؟ بڑی سادگی کے ساتھ اس پر کہتے کہ بابو خدا نہ کرے آپ کیوں سنی ہونے لگے۔ پلٹ کر میں بھی کہہ دیا کرتا تھا کہ جب ہم سنی نہیں ہیں تو آپ کہاں کے شیعہ؟ کبھی ان باتوں سے نہ تو کبیدہ خاطر ہوا کرتے، نہ بحث مباحثہ کو راہ دیتے نہ ابرو پر بل ڈالتے، نہ چہرے پر میل لاتے۔ یہاں تک کہ مسکراتے بھی نہیں۔ کہتے تو بس یہی کہ باتوں کا رخ پلٹ دیتے۔

"مجون طرفہ" کے سلسلہ میں نادر الکلامی کا بیان ہو چکا ہے۔ اس زمانہ کے بنگالیوں کی اردو میں ایک غزل موزوں فرمائی تھی جو ان کے احباب کو یاد ہو گئی تھی۔ اس میں کمال یہ ہے کہ موزونیت کے ساتھ مصارع پڑھے ہی نہیں جا سکتے جب تک بنگالیوں کا مخصوص تلفظ اپنایا نہ جائے چند اشعار جو یاد رہ گئے ہیں ملاحظہ ہوں ؎

غصے میں جو کھل جاتا ہے اصغور کا دھوتی — اس واسطے پتلون وہ دو چار سئے ہیں
کاگرسی اس دیس میں پوڑتا ہے ارے باپ — دن رات کلی لوگ یہاں پنکھا کئے ہیں
کورکا جو پیتا ہے کھڑا چوڑتا کے نیچے — اظہار میاں مولوی ہیں اور بی اے ہیں

واضح باد کہ تذکیر و تانیث کی طرف سے بے خیالی دانستہ ہے۔ بعض الفاظ کی ضروری تشریح یہ ہے:-
(۱) اصغور: اصغر (۲) کاگرسی: کیا گرمی (۳) پوڑتا: پڑتا (۴) پنکھا: پنکھا (۵) کورکا: چلم پینے کا ناریل (۶) چوڑتا: چھپروں کی اولتیاں (۷) بئے: بی۔ اے

ختم سخن یہ عرض کر دوں کہ اتنی زیادہ تفصیل سے ہر بات کو لکھنے کی ضرورت کا قائل جو نہ ہو اور اس سے انقباض خاطر حاصل کرے اس کے آگے بھی معذرت پیش کرنے کو میں ابھی تیار نہیں ہوں۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ بڑی ضروری ضروری تفصیلیں اور بحثیں تو میں نے ہنوز بروئے کار لائی ہی نہیں ہیں۔ تحریر ہذا کا تتمہ دوسری قسط میں نذر ہو گا۔ اس کے ملاحظہ کے بعد جزا و سزا جو تجویز ہو گی اس کا قبول کرنا میرا فرض ہو گا۔ فی الحال فقط بخیر، والسلامت۔

نواب صدر یار جنگ بہادر

(مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی)

مالک رام

نواب صدر یار جنگ بہادر سے میری ملاقات محض حسن اتفاق کا نتیجہ تھی، وہ بالعموم علی گڑھ یا حبیب گنج میں رہا کرتے تھے، میں دہلی سے آگے کبھی گیا ہی نہیں تھا۔ ان کا حلقۂ احباب مجھ ہیچ میرز و ہیچ مداں سے بہت بلند تھا، اور عمر کا جو فرق تھا وہ ظاہر ہی ہے۔ پس عام حالات میں اس بات کا بہت کم امکان تھا کہ ہم کبھی ایک دوسرے سے مل سکتے۔ لیکن اس کے باوجود ہم ملے۔

ہوا یہ کہ ۱۹۳۰ء میں مجھے غالب کی کتاب "سبد چین" دیکھنے کا شوق پیدا ہوا۔ یہ مختصر سا مجموعہ جس میں مشکل سے چھ سات سو شعر ہوں گے غالب نے اپنی زندگی کے آخری ایام یعنی ۱۸۶۷ء میں شائع کیا تھا، لیکن چونکہ اس کے بعد نہ یہ الگ کہیں سے چھپا، نہ کلیات ہی کے کسی ایڈیشن میں اسے شامل کیا گیا، اس لئے مدت سے نایاب ہو چکا تھا۔ غالب کی بعض اپنی تحریروں اور یادگار غالب میں اس کا ذکر موجود ہے، اور وہیں سے مجھے اس کا پتہ چلا تھا۔ میں نے ادھر اُدھر بعض احباب کی خدمت میں لکھا کہ اگر آپ کے پاس یہ کتاب ہو تو چند دن کے لئے مستعار عنایت فرمائیے۔ ہر جگہ سے یہی جواب ملا کہ نہ یہ ہمارے یہاں ہے نہ ہم نے اسے دیکھا ہے۔ البتہ مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم نے اتنا اضافہ کیا کہ نواب صدر یار جنگ بہادر کی خدمت میں لکھ کے پوچھو۔ ممکن ہے اُن کے کتب خانے میں اس کا کوئی نسخہ محفوظ ہو۔ چنانچہ میں نے ان کی خدمت میں لکھا۔ یا سے اکیلے تیر نشانے پر بیٹھا۔ ان کا جواب یہ مژدہ لایا کہ "سبد چین" کا ایک نسخہ میرے یہاں موجود ہے، یہ تھی تقریب تعارف۔

یہ گرمیوں کا ذکر ہے۔ میں ان ایام میں اپنے کام کے سلسلے میں شملے میں مقیم تھا۔ میں نے اُن سے درخواست کی کہ اگر ممکن ہو تو کتاب مجھے مستعار بھیج دی جائے۔ میں اس کی نقل لے کر اسے بحفاظت واپس کر دوں گا۔ اس پر انہوں نے فرمایا کہ آپ کہاں اتنی زحمت کریں گے۔ میں یہیں سے اُسے نقل کروا کے چند دن میں بھجوا دوں گا۔ چنانچہ پندرہ بیس دن کے بعد انہوں نے یہ نقل مجھے بھیج دی۔ آپ میری خوشی کا اندازہ نہیں لگا سکتے، میں نے اس کی تلاش میں پانچ چھ مہینے صرف کئے تھے اور تقریباً مایوس ہو چلا تھا۔ اگرچہ یہ چیز میرے خیال سے بہت کم حجم کی نکلی، تاہم کچھ بھی ہو غالب کا کلام تھا اور اتنا نایاب کہ بڑے بڑے صاحب ذوق حضرات کے کتب خانے اس سے خالی تھے۔ اور وہ خود اس سے ناواقف تھے۔ اس لئے میں جتنا فخر بھی کرتا کم تھا۔

انہوں نے جو نقل مجھے بھیجی اس میں بہت غلطیاں تھیں۔ اب میں یہ فیصلہ نہ کر پایا کہ آیا اصلی کتاب ہی اتنی غلط چھپی ہے یا نواب صاحب

کے کاتب نے بدلی ہی اصلاحیں دی ہیں۔ ان میں سے کتنی غلطیاں تو ایسی تھیں کہ میں نے خود ہی انکل سے انہیں درست کر لیا۔ پھر بھی کچھ ایسی رہ گئیں کہ ان کے سمجھنے سے قاصر رہا۔ ایک آدھ جگہ لفظ ہی لکھنے سے رہ گئے تھے۔ میں نے جب اس کا اظہار ان سے کیا تو جواب ملا کہ اگرچہ کاتب بہت محتاط آدمی ہے لیکن امکان ہے کہ اس سے غلطیاں ہوگئی ہوں۔ اس پر میں نے دل میں طے کیا کہ جب دہلی جانا ہوا تو ایک دن کے لئے علی گڑھ چلا جاؤں گا۔ اور اصلی نسخے سے اس کا مقابلہ کر کے درستی کر لوں گا۔ نواب صاحب مرحوم نے بھی مجھے دعوت دی کہ جب پہاڑ سے اتریں تو یہاں آئیے اور کتب خانہ دیکھ جائیے۔ یہ تو میری خواہش تھی۔ میں نے شکریہ ادا کرتے ہوئے آنے کا وعدہ کر لیا۔

اس کے تھوڑے دن بعد میں دہلی آیا۔ یہاں ایک دن اب یاد نہیں۔ کہ میں کون سی کتاب دیکھ رہا تھا کہ اس میں حکیم مومن خاں کے فارسی دیوان کا ذکر پڑھا۔ میں نے پھر ان کی خدمت میں لکھا کہ کیا آپ کے ہاں حبیب گنج میں مومن کا فارسی دیوان ہے۔ انہوں نے فوراً جواب دیا کہ ہاں، دیوان کا ایک نسخہ موجود ہے۔ لیکن اسے میں آپ کو بھیجوں گا نہیں۔ اپنا وعدہ وفا کیجئے۔ یہاں آئیے اور جو چاہئے لے جائیے۔ میں خود کتنے دن سے وہاں جانے کے لئے پر تول رہا تھا۔ لیکن مصروفیات اجازت نہیں دیتے تھے۔ اسی حیص بیص میں دو تین مہینے نکل گئے۔ آخر ایک سہ پہر کو میں نے بوریا بستر باندھا اور بغیر اطلاع دئے علی گڑھ پہنچ گیا۔ گاڑی وہاں مغرب کے بعد پہنچی تھی اور اچھا خاصا اندھیرا ہو چکا تھا۔ اس کے علاوہ جب میں علی گڑھ کے اسٹیشن پر اترا ہوں تو بوندیاں بھی پڑ رہی تھیں۔ اب میں نے خیال کیا کہ یوں بے اطلاع آنے میں غلطی ہوتی ہے۔ اگر وہ یہاں نہ ہوئے تو پھر۔ لیکن یہ خیال ایک لمحے سے زیادہ میرے دماغ میں رہا نہیں۔ ہائے کیا زمانہ تھا۔ دل نے کہا اگر نہ ہوئے تو کونسی قیامت آجائے گی، رات کی گاڑی سے واپس چلے جانا۔ بہرحال میں نے سواری لی اور چند منٹ میں میرس روڈ پر ان کی کوٹھی حبیب منزل میں جا پہنچا۔ وہ خود اس وقت موجود نہیں تھے۔ ملازم مجھے اندر جناب عبدالوحید خاں صاحب کے پاس لے گیا۔ میں نے آداب عرض کیا اور اپنا تعارف کرا کے خاموش ایک طرف بیٹھ گیا۔

نام آگیا ہے، اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ میں جناب عبدالوحید خاں صاحب کا تعارف کرا دوں۔

نواب صدر یار جنگ مرحوم نے اپنی عمر میں تین نکاح کئے۔ پہلی بیوی ان کے چچا حاجی محمد عبدالشکور خاں صاحب کی صاحبزادی تھیں، نواب صاحب مرحوم کے سب سے بڑے صاحبزادے خان بہادر حاجی مولوی محمد عبیدالرحمٰن خاں صاحب سلمہ اللہ تعالےٰ انہی بیگم کی اولاد ہیں۔ دوسری شادی بھی اپنے خاندان ہی میں ہوئی۔ یہ بیگم جناب محمد عابد خاں شیروانی رئیس بھیکم پور کی ہمشیرہ تھیں۔ نواب صاحب کا تیسرا نکاح جناب مولانا عبدالغنی خاں صاحب مئو قائم گنج (ضلع فرخ آباد) کی دختر نیک اختر جناب زینب بیگم صاحبہ سے ہوا۔ مولانا عبدالغنی خاں مرحوم مشہور کتاب ارمغان آصفی کے مصنف ہیں جس میں فارسی مصادر کے مصلوں کی اسناد کلام اساتذہ سے جمع کردی گئی ہیں۔ یہ کتاب آٹھ حصوں میں چھپ چکی ہے۔ اس کے علاوہ سواد عرب اور ایک تذکرہ شعراء فارسی بھی ان سے یادگار ہے۔ مولانا عبدالغنی خاں نواب صاحب کے استاد بھی تھے۔ انہوں نے فقہ اور حدیث اور تفسیر کی متعدد کتابیں ان سے پڑھی تھیں۔ یہی مولانا عبدالغنی خاں صاحب جناب عبدالوحید خاں صاحب کے والد بزرگوار تھے اور جناب زینب بیگم صاحبہ ان کی سگی ہمشیرہ تھیں۔ نفیس دلھن کے نام سے کبھی کبھی مضمون بھی لکھا کرتی تھیں۔ دو تین سال ہوئے کہ انتقال فرمایا۔

ایک اور بات یاد آگئی۔ غالب نے ایک غزل میں اپنے تمام مشہور فارسی گو معاصرین کا ذکر کیا ہے۔ قطعہ یہ ہے ؎

ہند را خوش نفسانند سخن ور کہ بود ۱ باد در خلوت شاں مشک فشاں از دم شاں

مومن و نیر و صہبائی و علوی وانگاہ ۲ حسرتی اشرف و آزردہ بود اعظم شاں

غالب سوختہ جاں گرچہ نیرزد بہ شمار ۳ ہست در بزم سخن ہم نفس و ہمدم شاں

یہاں دوسرے شعر میں علوی سے مراد مولوی عبداللہ خاں علوی ہیں۔ یہ علوی ہمارے مولانا عبدالغنی خاں صاحب کے حقیقی ماموں تھے۔ مولوی محمد اسمٰعیل شہید دہلوی کے شاگرد تھے اور سید احمد بریلوی سے بیعت تھے۔ طبابت میں بھی ید طولیٰ حاصل تھا۔ ۱۲۶۴ھ میں اپنے وطن ہی میں تپ محرقہ سے وفات پائی اور وہیں دفن ہوئے۔ صہبائی انہی کے شاگرد تھے۔ تاریخ وفات ہے "بنیاد سخن فتاد"

بات سے بات یاد آتی ہے۔ غالب کے نانا مرزا غلام حسین خاں آگرہ کے رؤسا میں سے تھے۔ غالب نے اپنی والدہ جناب عزت النساء بیگم صاحبہ کا نام صرف

ایک فارسی خط میں دیا ہے۔ جو انہوں نے آگرے ہی کے ایک صاحب خداداد خاں اسدان کے بڑے صاحبزادے ولی داد خاں کے نام لکھا ہے۔ اس خاندان کے غالب کی نصیال سے بھی دیرینہ تعلقات تھے۔ اسی سلسلے میں غالب نے یہ خط بھی لکھا ہے۔ اصلی خط کتب خانہ حبیب گنج میں موجود ہے۔ تو خیر ان خداداد خاں کے ایک اور صاحبزادے کریم داد خاں بھی تھے۔ ان کریم داد خاں کی اولاد میں چار بیٹے اور دو بیٹیاں ہوئیں۔ ان سب کے نام لکھنا تو غیر ضروری ہے۔ البتہ ان میں سے ایک صاحبزادی کا نام بسم اللہ بیگم تھا۔ یہ مولانا عبدالغنی خاں سے منسوب تھیں، اور جناب عبدالسعید خاں صاحب انہی بسم اللہ بیگم کے صاحبزادے ہیں۔ گویا یہ غالب کے مکتوب الیہ جناب خداداد خاں کی پوتی کے بیٹے ہوتے۔ غالب کے جس خط کا اوپر ذکر ہوا، وہ انہی نے نواب صاحب مغفور کو دیا تھا، جو اُن کے خاندانی کاغذات میں محفوظ تھا۔

یہ جملہ معترضہ بہت طویل ہی ہو چلا گیا۔ بہرحال جناب نواب صاحب نو بجے کے قریب مکان پر تشریف لائے۔ جونہی پہنچے انہیں میرے آنے کی اطلاع ملی۔ فوراً اس کمرے میں آئے جہاں ہم لوگ تھے۔ میں ایک طرف دیوار سے ٹیک لگائے دو زانو بیٹھا تھا۔ دروازہ کھلنے پر نظر اُٹھا کے جو دیکھتا ہوں تو وہ سامنے کھڑے تھے۔ اگرچہ میں نے انہیں پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا لیکن میں نے قیافے سے فوراً پہچان لیا۔ پہلے حلیہ سنیئے۔

پست قامت، قد کوئی چھ فٹ کے قریب۔ کسرتی جسم۔ سرخ و سپید رنگت۔ بڑی بڑی روشن آنکھیں۔ لمبی ستواں ناک خضاب لگی ہوئی بھرواں داڑھی۔ خضاب لگے کچھ دن ہو چکے تھے، کیونکہ جڑوں سے سپیدی جھلکنے لگی تھی۔ چہرے پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی، جس سے سامنے کے دانت نمایاں ہو گئے تھے، اور اُن کے پان کے شوق کے غماز تھے۔ جسم پر بند گلے کا شیروانی نما گرم کوٹ اور نیچے غرارہ اسی کپڑے کا پاجامہ تھا۔ سر پہ ٹوپی تھی، اور اس کے اوپر مفلر سے کی شکل میں سپید شال اوڑھے تھے۔ ایسے خوبصورت، اور وجاہت زیب آدمی میں نے بہت کم دیکھے تھے۔

بہت تپاک سے ملے اور اُٹھا کے اپنے ساتھ دوسرے کمرے میں لے گئے۔ برآمدے میں سے گزرتے ہوئے فرمایا، آپ نے خط کیوں نہ لکھا؟ اسٹیشن سے یہاں تک آنے میں تکلیف ہوئی ہوگی آپ کو؟ مکان تو آسانی سے مل گیا تھا؟ آپ نے لکھا ہوتا تو میں کسی کو اسٹیشن پر بھیج دیتا۔ غرض اسی طرح تابڑ توڑ انہوں نے تین چار سوال کر دیئے، لیکن لہجے میں کسی طرح کی عجلت اور گھبراہٹ نہیں تھی۔ بلکہ آواز بہت نیچی تھی، اور ایک ایک لفظ انہوں نے الگ الگ کہا، کمرے میں پہنچے تو چھوٹتے ہی فرمایا: میں تو آپ کو زیادہ عمر کا خیال کرتا تھا، آپ تو ماشاءاللہ بالکل جوان ہیں۔ میں نے عرض کیا، قبلہ جوانی کی بھی ایک ہی کہی، ساری عمر جس ماحول میں بسر ہوئی ہے، وہاں یہ معلوم ہی نہیں ہوا کہ جوانی کس چیز کا نام ہے۔ "غم عشق" تو خیر نہیں "غم روزگار" نے ہمیشہ پریشان رکھا، اس لئے دل جوانی ہی میں بوڑھا ہو گیا۔ کہنے لگے میں تو آپ کے فارسی کے ذوق پہ بہت حیران ہوا۔ ابھی "تشبیہات" کی فرمائش سے جو تعجب ہوا تھا وہی ختم نہیں ہوا پایا تھا کہ آپ نے مومن کے فارسی دیوان کے متعلق پوچھ بھیجا، پھر میری فارسی تعلیم کا حال پوچھا۔

فرمایا، میں مولانا سید سلیمان اشرف صاحب کے پاس گیا تھا، ایک مدت سے یہ معمول ہے کہ جب یہاں علی گڑھ آتا ہوں تو اگر وہ یہاں موجود ہوں تو شام کا وقت اُن کے ساتھ گزارتا ہوں، اور واپسی بالعموم عشا کی نماز کے بعد ہوتی ہے۔ آج معمول سے ذرا دیر ہو گئی۔ پھر ان کی تعریف اور علم و فضل سے متعلق چند کلمات کہے۔ اس کے بعد موضوع سخن بدل گیا، فارسی اور اردو علم و ادب پر گفتگو ہونے لگی۔ اسی طرح رات گئے تک ہم بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ میں دل میں شرمندہ ہو رہا تھا کہ خواہ مخواہ اُن کے آرام میں مخل ہو رہا ہوں، لیکن وہ اتنی محبت اور دلجمعی سے گفتگو فرما رہے تھے کہ اگر وہ اس میری بے وقت کی ہرزہ سرائی سے بے آرام بھی ہوئے تو انہوں نے قطعی کسی طرح اُسے ظاہر نہیں ہونے دیا۔ آخر آدھی رات کے قریب میں نے باتوں باتوں میں اشارہ کیا، تو نہایت لطف سے فرمایا۔ ارے آپ کی دلچسپ باتوں سے مجھے اس کا تو خیال ہی نہیں رہا کہ آپ سفر سے آئے ہیں۔ تھکے ماندے ہوں گے، اچھا اب آپ آرام کیجئے۔ کل صبح انشاءاللہ حبیب گنج چلیں گے۔ میں نے عرض کیا، یہ دو تین گھنٹے کا گاڑی کا سفر ہی کونسا ایسا سفر تھا کہ میں تھک جاتا۔ آپ کی تکلیف کا خیال ہو رہا ہے۔ بہرحال ہم نے ایک دوسرے سے شب بخیر کہا اور میں اپنے کمرے میں چلا آیا۔

اس دوران میں باہر بارش زیادہ سنجیدگی سے ہونے لگی تھی اور ساتھ ہی تیز ہوا بھی چل رہی تھی۔ بدقسمتی سے میرے کمرے کے ایک روشندان میں کچھ خرابی تھی۔

پوری طرح بند نہیں ہوا تھا اور ہوا سے اس کا پٹ کھٹکھٹاتا تھا۔ رات بھر اس بے ہنگم آواز کے باعث میں ٹھیک طرح سو نہیں سکا۔ خیر صبح کو اٹھا، حمام میں پانی گرم ہو رہا تھا۔ نہایا دھویا، ناشتے کے بعد ہم نواب صاحب کی موٹر پر حبیب گنج کے لئے روانہ ہوئے۔ اگرچہ بارش ختم ہو چکی تھی لیکن ہوا میں خاصی نمی تھی۔ اور دھوپ بھی خوب چمک گئی تھی۔ ڈرائیور کے علاوہ ہم تین آدمی تھے۔ نواب صاحب اور اُن کے مصاحب ملا احمد اور میں۔ نواب صاحب اور میں پچھلی طرف بیٹھے اور ملا احمد صاحب ڈرائیور کے برابر میں آگے بیٹھ گئے۔ سڑک بہت خراب تھی۔ اس کا اکثر حصہ پہلے ہی شکستہ سا تھا۔ رہی سہی کسر رات کی بارش نے پوری کر دی۔ گڑھوں میں پانی بھر گیا تھا اور جہاں پانی نہیں تھا وہاں کیچڑ ہو رہی تھی۔

گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے کے بعد ہم افتاں خیزاں حبیب گنج پہنچے۔ علی گڑھ سے ناشتہ کر کے چلے تھے اور دوپہر کے کھانے میں ابھی بہت دیر تھی اس لئے ہمارے پاس کافی وقت تھا۔ پہنچتے ہی نواب صاحب نے کتب خانہ کھولنے کا حکم دیا۔ مہتمم صاحب آ گئے۔ ملازموں نے کرسیوں کو جھاڑا پونچھا اور ہم داخل ہو گئے۔

اللہ اللہ! اب میں اپنے تاثرات کا حال کیا لکھوں۔ ہر طرف ہزاروں بیش قیمت کتابیں قرینے سے الماریوں میں چنی رکھی تھیں۔ غالب نے ایک جگہ لکھا ہے کہ اگر کسی پچھلے شاعر کے ہاں کوئی ایسا مضمون بندھ گیا ہے جو میرے یہاں بھی پایا جاتا ہے تو اس سے یہ خیال نہ کرو کہ میں اس سے توارد ہو گیا ہے بلکہ یقین جانو کہ اُس نے نہاں خانہ ازل سے میرے مضمون کی چوری کر لی تھی۔ کچھ ایسا ہی حال میرا اس وقت ہوتا ہے جب میں کسی جگہ کوئی اچھی کتاب دیکھتا ہوں۔ مجھے یوں لگتا ہے جیسے غلطی سے میرے حصے کی چیز یہاں آ گئی ہے۔ اور یہاں تو ایک دو نہیں ہزاروں کتابیں میرے اندر دگر پڑی تھیں؎

نہ فرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم
کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجا است

نواب صاحب کا عجیب عالم تھا۔ وہ ایک کتاب منگواتے۔ مجھے دکھاتے اور پھر اس کی خصوصیات گنوانا شروع کرتے۔ یہ ملک الشعراء طالب آملی کا دیوان ہے۔ اس میں بہت سا کلام خود طالب کے قلم سے لکھا ہوا ہے۔ اس طرف میری توجہ علامہ شبلی مرحوم نے دلائی تھی۔ میں نے جب یہ دیوان خریدا ہے تو محض قدامت اور کتابت کی خوبی کے باعث۔ لیکن انھوں نے اسے دیکھ کر لکھا کہ اس میں بہت سی تحریریں خود طالب کے ہاتھ کی ہیں۔ دیکھئے یہ شرح روشنائی کی تحریر طالب کی ہے۔
یہ مثنوی کا ایک قدیم نسخہ ہے۔ جہاں تک معلوم ہو سکا اس سے قدیم تر نسخہ جرمنی کے شہر میونخ (تصحیح تلفظ میونخ) ہے کے کتاب خانے میں ہے۔ جو اس سے کچھ برس پہلے کا لکھا ہوا ہے۔ یہ میرا نسخہ حضرت اورنگ زیب عالمگیر کے کتاب خانہ میں رہا ہے۔ یہ رہیں اُن کی مہریں۔ صاف پڑھا جاتا ہے ”محمد اورنگ زیب بادشاہ“۔

یہ شیخ سعدی کی بوستان ہے۔ اس پر اودھ کے تین بادشاہوں کی مہریں ہیں۔ نصیر الدین حیدر، امجد علی شاہ اور واجد علی شاہ۔
چند دن پہلے ایک تازہ فتوح آئی تھی۔ علامہ سعد الدین تفتازانی کی مطول۔ مہتمم سے کہہ کے اُسے منگوایا۔ اس کے شروع میں پانچ چھ سطریں اس شان سے لکھی تھیں کہ آدھی عبارت بہت قدیم اور مغشوش تھی اور باقی آدھی تازہ روشنائی معلوم ہوا کہ یہ حصہ خود نواب صاحب نے پورا کیا تھا۔ پاس ہی میز پر محدب شیشہ پڑا تھا۔ اٹھایا اور میرے ہاتھ میں دے کے فرمانے لگے۔ دیکھئے تو یہ عبارت پڑھ سکتے ہیں۔ میں رک رک کے پڑھنے لگا۔ آخر میں ”نور الدین بن اکبر شاہ غازی“ کے الفاظ تھے۔ گویا یہ خود جہانگیر کے ہاتھ کی تحریر تھی۔ اور اسی لئے انھوں نے مجھے اس کے پڑھنے کے لئے کہا تھا۔ بابر بادشاہ کے بیٹے کامران کا دیوان اس سے تھوڑے دن پہلے شائع ہوا تھا اس کے ساتھ چند ایسے صفحوں کے عکس دیے گئے ہیں جن پر مغل بادشاہوں کی تحریریں یا دستخط ہیں۔ میں اسے دیکھ چکا تھا۔ مطول کی یہ عبارت پڑھنے کے بعد میں نے کہا کہ جہانگیر کا یہ دستخط بالکل وہی ہے جو کامران کے دیوان میں ہے۔ یہ سن کر بہت مسرور ہوئے۔ اور کہا تو آپ نے کامران کا دیوان دیکھا ہے۔ پھر اسے بھی منگوایا اور ہم دونوں اُسے دیکھ دیکھ کے خوش ہوتے رہے۔

غرض ہم دوپہر تک اس بہشت نگاہ کے نظارے میں مشغول رہے۔ وہ کتاب نکلواتے اُسے دکھاتے اور اُس کی خصوصیات کی طرف اشارہ کرتے جاتے۔ اگر میں کوئی ایسی بات کہہ دیتا جس سے ان کی کسی طرح کی اہمیت واضح ہوتی تھی تو خوشی کا اظہار فرماتے۔ وہ مجھے کتابیں اس طرح دکھا رہے تھے جیسے میں کوئی بہت بڑا

منصب یا صاحب علم و فن ہوں۔ وہ بہر صورت سب سے پہلے اہرکرین کتاب پہ کتاب نکلوا رہے تھے گویا آج پہلی مرتبہ انہیں کوئی کتابوں کا قدرداں ملا ہو۔ اندر میں اپنی بے مائگی اور اُن کی قدر نوازی پہ عرق عرق ہوا جا رہا تھا۔ حضرت خواجہ میر درد علیہ الرحمتہ کا شعر ہے ؎

یاراں نہ مہربانی دانند ، ہر چہ دانند

ما خوب می شناسیم اے درد آنچہ ماییم

اصل بات یہ ہے کہ وہ بقضاۓ سب کچھ ہوتے ہوئے بھی اساسی اور بنیادی طور پہ علمی آدمی تھے۔ ان کی روح اور ذوق کی تسکین اگر ہوتی تھی تو کتابوں سے یا اصحاب علم اصحاب کی صحبت میں۔ جہاں کہیں انہیں یہ دونوں چیزیں میسر آجاتیں ان کا بیرونی پردہ جو بہر حال عارضی چیز تھی، اٹھ جاتا اور وہ اپنے اصلی روپ میں نمایاں ہو جاتے۔ میرے ساتھ بھی یہی معاملہ پیش آیا۔ میں جب ان سے ملا، تو وہ بے نقاب ہو گئے۔ صحیح یا غلط ان کے دل میں یہ خیال پیدا ہو گیا کہ میں بھی پڑھنے لکھنے کا شوق رکھتا ہوں اور کتابوں کا قدر دان۔ اس صورت میں عمر، مرتبہ، علم کا تفاوت کوئی اہمیت نہیں رکھتا تھا۔ اہم چیز یہ تھی کہ میں بھی ان کے خیال میں علم کا شوقین اور کتابوں کا رسیا تھا۔ یہی چیز ہم دونوں میں گویا قدر مشترک تھی۔ اس کے بعد بھلا یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ ایک ہم مشرب و ہم خیال شخص کے سامنے اپنا اندوختہ نہ رکھ دیتے۔ اس میں کسی حد تک جذبۂ تفاخر بھی شامل تھا۔ آپ نے بارہا دیکھا ہوگا، کہ آپ کا بچہ جب تک اپنا نیا کھلونا اپنے ہم جولیوں کو نہ دکھا لے اُسے چین نہیں آتا۔ اس کی تہہ میں بھی یہی بات ہے یعنی کسی ہم خیال کے ساتھ کھیلنے سے لطف اندوز ہونا اور اپنی ملکیت کا غرور اور اس کی نمائش کی خواہش۔

نواب صدر یار جنگ نے عمر بھر کی محنت سے یہ کتب خانہ جمع کیا۔ بدقسمتی سے یہ ایسی جگہ تھا، کہ وہاں تک پہنچنا آسان نہیں تھا۔ اس لئے بسا اوقات واقعی صاحب ذوق حضرات بھی وہاں جانے سے ہچکچاتے تھے۔ لیکن اگر کسی طرح نواب صاحب کو معلوم ہو جاتا، تو وہ دعوتیں دے دے کر انہیں بلاتے۔ اپنا مہمان رکھتے اور جب واقعی کوئی قدر دان مل جاتا، تو پھولے نہ سماتے۔

عربی کے مشہور شاعر متنبی نے ایک شعر میں اپنی دو دل پسند چیزوں کا ذکر یوں کیا ہے ؎

وخیرُ مقامٍ فی الدنیٰ سرجُ سابحٍ

وخیرُ جلیسٍ فی الزمانِ کتابٌ

یعنی دنیا میں بہترین نشست برق رفتار گھوڑے کی زین ہے اور زندگی میں بہترین ساتھی کتاب ہے۔

یہی دوسرا مصرع کتب خانے کا طغرا ہے۔ ربڑ کی ایک تکونی مہر میں یہ کندہ تھا اور جو کتاب یہاں داخل ہوتی اس پہ یہ مہر لگائی جاتی تھی۔

آخر ہم اندر سے نکل کر باہر کے برآمدے میں آکے بیٹھ گئے۔ یہاں دیوار پہ مختلف تصویریں، نقشے، مرقعے وغیرہ لٹک رہے تھے۔ ہندوستان کا ایک بڑا اور دلکش قلمی نسخہ تھا۔ جس میں ساتھ ساتھ مختلف علاقوں کی زرعی پیداوار اور حیوانات بھی تصاویر میں دکھائے گئے ہیں۔ مہاراجہ کرشن پرشاد مرحوم کو آخری زمانے میں مصوری کا بھی شوق ہوا تھا۔ یہاں اُن کی دستکاری کے بھی چند نمونے دیکھے۔ تصویریں فنی پہلو سے تو واجبی ہی سی تھیں۔ البتہ تبرک ضرور تھیں۔ شروع میں غالب کے جس خط کا ذکر آیا ہے، وہ بھی موجود تھا۔ اس خط کے آخر میں تاریخ تحریر ۱۸۶۳ء لکھی ہے، جو بداہتہً غلط ہے۔ دیر تک اس پہ بحث ہوئی کہ ٹھیک تاریخ کیا ہے۔ بہر حال کچھ فیصلہ نہ ہو سکا اور ہو بھی کیسے سکتا تھا۔ محض قیاس آرائی ہی تو تھی۔ ثبوت کیسے مہیا کیا جا سکتا تھا؟ ذکر غالب کے ساتھ میں نے غالب کی جس تصویر کا عکس دیا ہے وہ میں نے یہیں سے لی تھی۔

اتنے میں ظہر کا وقت ہو چلا تھا۔ فرمایا، اگر کھانے کے بعد مطالعے کیلئے کوئی کتاب لینی چاہیں تو نکلوا لیجئے۔ میں نے گزارش کی، کہ سید حسین کا مطبوعہ نسخہ دلا دیجئے تاکہ جو نقل آپ نے بھجوائی ہے اس سے مقابلہ کر سکوں۔ نیز سودا کا فارسی دیوان۔ کتابیں آئیں اور ہم باہر چلے آئے۔ میں اپنے کمرے کی طرف گیا اور وہ مسجد کی طرف۔

* سید حسین کی پہلی ۱۸۷۶ء والی اشاعت میں کتابت کی بہت غلطیاں رہ گئی تھیں، اور اس کے آخر میں غلط نامہ لگایا گیا تھا۔ سوء اتفاق سے جس سے مجھے والے نسخے سے یہ غلط نامہ غائب تھا۔ اس لئے میں پوری تصحیح نہ کر سکا۔ آخر میں نے یہ کام ہارڈنگ لائبریری دہلی کے نسخے کو دیکھ کر کیا تھا، ان کے بانہ بجود ہے۔

حبیب گنج میں پہنچا۔ میں فرنگی آدمیوں جانے والی لاریوں کے اڈے پر پہنچا۔ اب رستے کا حال کیا بیان کروں۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے پچھلے دس برس میں سڑک کی مرمت نہیں ہوئی۔ بلکہ اب اسے سڑک کہنا ہی غلط تھا۔ یوں سمجھئے کہ دونوں طرف کھیت تھے اور ان کے بیچ میں ایک خاصی چوڑی روش تھی جس پر بہت بار یک مٹی کی چادر بچھا دی گئی تھی۔ موٹر کے پیچھے پیچھے گرد و غبار کا ایک طوفان بپا ہوا تھا اور اگر بدقسمتی سے کہیں سامنے سے بھی کوئی لاری یا موٹر آ نکلتی تو پھر خود ہی تصور کر لیجئے کہ مسافروں پر کیا گزرتی ہوگی۔ سفر کا آخری ڈیڑھ دو میل کا ٹکڑا اکّے یا تانگے پر طے کرنا تھا۔ چنانچہ میں اڈے پر اترا اور ایک تانگے پر بستر رکھ کر آگے روانہ ہوا۔ لیکن یہ راستہ بھی اتنا خراب تھا کہ ہچکولوں کے مارے میری طبیعت خراب ہونے لگی۔ لا چار دو تین فرلانگ کے بعد میں اتر گیا۔ ہوا باقی مسافت میں نے پیدل پوری کی اور سامان تانگے پر آیا۔

میں ڈھائی تین بجے کے قریب حبیب گنج پہنچا۔ نواب صاحب مرحوم باہر کے مغربی برآمدے میں فرش پر بیٹھے حسب معمول تلاوت قرآن میں مشغول تھے میں مُلّا احمد صاحب کو آداب عرض کر کے خاموش بیٹھ گیا۔ جب تلاوت سے فارغ ہو گئے تو میں نے جھک کے سلام عرض کیا۔ چونکہ اب اونچا سننے لگے تھے اس لئے سنا نہیں۔ مُلّا احمد صاحب نے کہا کہ ذرا اونچا کہئے۔ چنانچہ میں نے منہ کان کے قریب لے جا کے خاصی اونچی آواز سے دوبارہ کہا آداب عرض کرتا ہوں۔ چونکہ غور سے دیکھا میں نے بھی نام نہیں بتایا اور چپ چاپ ان کے منہ کی طرف دیکھتا رہا۔ یک لخت پہچان کے سر فرط مسرت سے جھک گئے اور لپٹ لیا۔ اللہ اکبر اس وقت کی گرم جوشی سے اب تک لذت اندوز ہو رہا ہوں۔ معلوم ہوا کہ میرا تار انہیں موصول نہیں ہوا۔ ہوا یہ کہ چونکہ تار میں نے علی گڑھ کے پتے سے بھیجا تھا۔ وہاں سے جناب عبدالرحیم خاں صاحب نے آگے دستی روانہ کر دیا۔ چنانچہ میرے پہنچنے کے آدھ پون گھنٹہ بعد ایک شخص ڈاک لے کے آیا اسی میں تار بھی تھا۔

نواب صاحب نے ملازم کو حکم دیا، وہ پانی کا لوٹا، صابون، تولیا وغیرہ لے آیا۔ میں نے ہاتھ منہ دھویا۔ اتنی دیر وہ میرے پاس کھڑے رہے۔ پھر چائے آئی سب نے پی۔ چند منٹ بیٹھنے کے بعد عصر کی نماز کے لئے مسجد میں چلے گئے۔ جاتے ہوئے فرمایا مغرب کے بعد آپ کی پچھلے سات برس کی رام کہانی سنوں گا کہ کہاں کہاں رہے اور کیا کیا دیکھا۔ میں نے عرض کیا بسر و چشم۔ شام کے کھانے کے بعد ہم لوگ بڑے کمرے میں آ گئے۔ نواب صاحب اور مُلّا احمد صاحب۔ اگرچہ میں نے اس چھ سات برس میں شرق اوسط اور افریقہ کے تمام اسلامی ممالک کی سیر کی تھی لیکن زیادہ قیام مصر میں رہا تھا۔ کہنے لگے دیکھئے صاحب اردو میں گفتگو نہیں ہوگی آپ اتنے دن مصر میں رہے ہیں یقیناً عربی بہت اچھی بولتے ہوں گے۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں ایک بات کی وضاحت کر دوں۔

یوں کہنے کو تمام عربی ممالک کی زبان عربی ہے لیکن جب باہر سے کوئی ایسا شخص یہاں آئے جس نے ساری عمر عربی پڑھی ہو اور اپنے آپ کو عربی کا عالم سمجھتا ہو تو اگر وہ یہاں عام لوگوں سے بات چیت کرے تو بلا مبالغہ عرض کرتا ہوں کہ وہ ان کی سمجھنے اور انہیں اپنی سمجھانے میں بہت دقت محسوس کرے گا۔ بات یہ ہے کہ عام بول چال کی بولی کتابی زبان سے بالکل مختلف ہے۔ اس عوامی زبان (دارجہ) کے اپنے اصول ہیں۔ اس کی گرامر الگ ہے۔ اس کی لغات الگ ہے۔ اس کا لب و لہجہ الگ ہے۔ غیر ملکی عالموں کو تو چھوڑیئے کہ ان غریبوں نے سوائے کتابیں پڑھنے کے کسی کو کم بولتے سنا ہوگا۔ خود عربی ممالک کا یہ حال ہے کہ ایک مصری ایک عراقی کی بات سمجھنے میں مشکل محسوس کرتا ہے، حالانکہ دونوں عربی بولتے ہیں۔ ایک لطیفہ یاد آ گیا۔ میرے ایک مصری دوست ہیں، وہ کسی زمانے میں مارسیلز (فرانس) میں مصری قنصل تھے۔ مراکش کا علاقہ، فرانسیسی سلطنت کا حصہ ہے۔ ایک دن کچھ مراکشی باشندے کسی کام سے ان کے دفتر میں آئے۔ اب خیال رہے کہ مصر اور مراکش دونوں ملکوں کی زبان عربی ہے۔ فرمانے لگے قسم لے لو جو میں ان کی گفتگو کا ایک لفظ سمجھا ہوں۔ آخر ایک ترجمان بلانا پڑا، جو طرفین کی باتوں کا ترجمہ کرتا رہا اور اس طرح معاملہ طے ہوا۔ پھر ہر ایک جگہ کی بولی میں دخیل الفاظ ہیں۔ یعنی دوسری زبانوں کے لفظ۔ عربی میں ایسے رس بس گئے ہیں کہ لوگ انہیں بے تکلف بولتے ہیں اور قطعاً کوئی جھجک محسوس نہیں کرتے۔ نہ انہیں یہ معلوم ہی ہے کہ یہ عربی کا نہیں کسی غیر زبان کا لفظ ہے۔ مراکش اور تونس میں فرانسیسی اور ہسپانیہ کے لفظ آ گئے ہیں۔ مصر میں فرانسیسی اور اطالوی۔ اسی طرح عراق میں فارسی اور ترکی۔ اور یہی حال دوسری جگہوں کا ہے۔ اگر اس بیرونی آلائش سے کچھ محفوظ رہی ہے تو حجاز کی زبان۔ اگرچہ یہ بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکی۔ پھر یہ خرابی عوام ہی تک محدود نہیں بلکہ تعلیم یافتہ اور عالم لوگ بھی جب آپس میں بات چیت کریں گے تو اسی

عمل کسی کام سے اتنا تاثر ہوا ہے۔ لیکن ہمیں عجیب گھٹے سے سامنا ہوتے ہوتے دیر ہو گئی۔ جاڑوں کے دن پانچ بجے ہی خاصا اندھیرا ہو جاتا ہے۔ چنانچہ جب تک ہم طوس پہنچے روشنی اتنی کم ہو چکی تھی کہ تصویر اتروانے کا وقت نہیں رہا تھا۔ کہنے لگے کوئی بات نہیں پھر کسی وقت اتروا کر بھیج دوں گا۔ اگرچہ یہ افسوس ضرور رہے گا کہ آپ اس میں نہیں ہوں گے۔

راستے میں گرد و غبار کے طوفان کو دیکھ کے میں نے عرض کیا کہ اس دل بادل کو دیکھ کے فردوسی کے شعر کی حقیقت واضح ہو گئی ہے

ز بس گرد میداں کہ برشد بہ دشت،
زمیں شش شد و آسماں گشت ہشت

بہت مسرور ہوئے۔ پھر خود حافظے پر زور دے کر شاہنامے کے اسی مقام کے آٹھ دس شعر سنائے۔ میں ان کی یادداشت پر دنگ رہ گیا۔ اس وقت ان کی عمر ۸۰ کے پیٹے میں تھی۔ اور ظاہر ہے کہ شاہنامہ انھوں نے ایک زمانے سے نہیں دیکھا ہوگا۔ کوئی ایک آدھ شعر کسی جگہ سے حسب موقع پڑھ دینا کوئی کمال نہیں۔ یہ بات ہر کوئی کر سکتا ہے لیکن یوں اچانک ایک شعر سن کر آگے پیچھے کے شعر سنا دینا معمولی بات نہیں۔

مرحوم کی ایک عادت تھی کہ اگر وہ کسی بات کا جواب نہیں دینا چاہتے تھے تو عموماً خاموش رہتے یا کوئی اور ذکر چھیڑ دیتے۔ اس سفر میں بھی ایک اسی طرح کا تجربہ ہوا۔

مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم نے مولانا شبلی کی سوانح عمری "حیات شبلی" کے عنوان سے لکھی ہے۔ یہ کتاب ۱۹۴۳ء میں شائع ہوئی تھی۔ اس کا پورا مسودہ نواب صاحب مرحوم نے دیکھا تھا، اور انھوں نے اس پر جابجا اضافے کیے جو کتاب کے ساتھ چھپ گئے ہیں۔ اسی زمانے میں بابوں کو مشغلہ ہاتھ آیا، اور انھوں نے مختلف رسالوں میں شبلی اور عطیہ بیگم کے موضوع پر مضمونوں کا ایک تار باندھ دیا۔ بلکہ یاد پڑتا ہے کہ غالباً حیدرآباد ریڈیو سے ایک تقریر بھی اس موضوع پر نشر ہوئی تھی۔ جس وقت وہ شاہنامے کے شعر مجھے سنا رہے تھے میرا ذہن شعر العجم کی طرف منتقل ہو گیا۔ جس کے پہلے حصے میں مولانا شبلی نے کوئی سو صفحے پر شاہنامے پر سیر حاصل تبصرہ کیا ہے۔ شعر العجم اور شبلی سے مجھے شبلی اور عطیہ بیگم کا قصہ یاد آ گیا۔ اب مجھے شرارت اور تحقیق کی سوجھی۔ جن اصحاب نے حیات شبلی پڑھی ہے انہیں معلوم ہے کہ مولانا سید سلیمان نے اس سے متعلق ایک لفظ نہیں لکھا، حالانکہ یہ ایسی بات نہیں جسے یوں نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔ اگر اس میں کچھ اصلیت ہے تو اس کا برملا اعتراف کر لینا چاہیے تھا۔ کیونکہ اس سے مولانا شبلی کی عظمت اور وقار میں کسی طرح کی کمی نہیں ہوتی۔ اور اگر یہ غلط ہے تو پھر اس کی مدلل تردید کی ضرورت تھی۔ کیونکہ اگر آج یہ مسئلہ صاف نہ ہوا تو پھر قیامت تک نہیں ہوگا۔ اس وقت مولانا شبلی کے تلامذہ اور احباب اور تربیت یافتہ اصحاب ہمارے درمیان موجود ہیں جو اس موضوع پر ذمہ دارانہ اور واقف کارانہ انداز میں لکھ سکتے ہیں۔ بعد میں آنے والے تو بہرحال انہیں کے خوشہ چیں ہوں گے۔

ان ہی اعانتوں کے خیال سے میں نے ان سے سوال کیا کہ کیا آپ نے "حیات شبلی" میں کوئی فروگذاشت محسوس نہیں کی۔ پوچھا کیوں آپ کا اشارہ کس طرف ہے۔ میں نے کہا یہی عطیہ بیگم والے قصے پر بھی کچھ لکھنے کی ضرورت تھی۔ ہاں ہوں کر کے رہ گئے جس سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ اس سے متعلق گفتگو کرنے پر تیار نہیں۔ ادھر میں محض "بزرگاں گفتن خطا است" پر عمل کرنے کو تیار نہیں تھا۔ جرأت رندانہ سے کام لیتے ہوئے میں نے پھر کہا۔ مکاتیب شبلی میں آپ نے مولانا کے خط مہدی افادی کے نام تو ضرور پڑھے ہوں گے۔ جواب اثبات میں دیا۔ پھر پوچھا کہ کیا آپ نے مہدی افادی کے خطوط کا مجموعہ بھی دیکھا ہے۔ فرمایا، ہاں، ایک زمانہ ہوا دیکھا تھا۔ پھر کہا آپ نے کتاب خطوط شبلی بھی ضرور دیکھی ہوگی جس میں شبلی کے وہ خطوط ہیں جو انہوں نے عطیہ بیگم اور ان کی بہن کے نام لکھے تھے۔ فرمایا، ہاں یہ بھی بہت مدت ہوئی دیکھے تھے۔ اب میں نے ان تمہیدوں کے بعد سوال کیا کہ مہدی نے مولانا سید سلیمان ندوی کے نام ایک خط میں صاف لکھا ہے کہ مولانا شبلی کا مجھ سے پردہ نہیں تھا۔ آخر یہ کس بات کی پردہ داری تھی۔ کہنے لگے۔ مجھے یہ کتاب دیکھے اتنا زمانہ ہو گیا ہے کہ اب ٹھیک طور پر کچھ یاد نہیں۔ میں نے کہا، اچھا یوں ہی سہی لیکن آپ اصحاب کی یہ کامل خاموشی بھی تو شک پیدا کرنے والی ہے۔ آخر آپ لوگ کھل کے کیوں کوئی بات نہیں کرتے۔ کہنے لگے "فائدہ"۔ فائدہ یہ کہ اس سے دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو جائے گا۔ کل کے مؤرخ کے لیے روشنی مہیا ہو جائے گی اور اس کے لیے فیصلہ کرنے میں آسانی ہوگی۔ انھوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اب میں نے گستاخانہ جسارت سے کام لیتے ہوئے ایک اور

حربہ استعمال کیا۔ میں نے کہا قرآن کہتا ہے لاتکتموا الشھادۃ کسی سلسلے میں اگر تمہیں کوئی بات معلوم ہو تو اس کے اظہار سے مبتنی نہ کرو اور اسے مت چھپاؤ۔ اصحاب حضرات ہیں کہ سب کچھ جانتے ہوئے خاموش ہیں۔ اور پوچھنے پر بھی نہیں بتاتے۔ لیکن صاحب یہ حربہ بھی خالی گیا۔ وہ ہنس کے ٹال گئے۔ اتنے میں ہم علی گڑھ پہنچ گئے۔

میں شام کی گاڑی سے واپس دہلی چلا آیا۔ اس موقع پر آپ نے میری نوٹ بک میں تحریر فرمایا تھا۔

اے آمدنت باعث آبادی ما

ذکر تو بود زمزمۂ شادی ما

بفرمائش مالک رام صاحب بوقت ورود مکرر مقام حبیب گنج

فی البداہہ

اے مالکِ ملکِ وفائے یاراں

دل رام فرشتہ خدائت صد جاں

حبیب الرحمن صدر یار جنگ

حبیب گنج، ۲۷ فروری ۱۹۴۷ء

یہ میری اُن سے آخری ملاقات تھی۔ اس کے جلد بعد ہی میں دوبارہ ملک سے باہر چلا گیا۔ پہلے خط و کتابت برابر جاری رہی۔ لیکن پھر بہت بے قاعدگی پیدا ہو گئی بلکہ آخری سال میں تو بالکل بند ہو گئی تھی۔ لکھا کہ اب کچھ لکھتا ہوں تو انگلیاں درد کرنے لگتی ہیں۔ میں نے بھی بار خاطر ہونا پسند نہ کیا۔ جناب عبدالوحید خاں صاحب سے ان کی خیر برابر ملتی رہتی تھی۔ آخر ایک دن اُن کا خط ملا کہ ۱۱ اگست ۱۹۵۰ء کو جمعہ کے دن صبح کے سات بجے اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

(۳)

موت بنی آدم کی میراث ہے۔ اس سے مفر نہیں۔ وہ طبعی عمر گزار کر وہاں گئے جہاں ہم سب کو جانا ہے۔ وفات کے وقت عمر ۸۴ برس تھی۔ یعنی کتاب مقدس کی مقرر کردہ حد سے بھی ۱۴ برس زیادہ۔ تو اس پہلو سے کوئی افسوس نہیں۔ یہ مرحلہ! نے ٹل نہیں سکتا۔ ایک نہ ایک دن ضرور پیش آتا۔ وہ رئیس ابن رئیس تھے۔ لیکن انہوں نے اپنی عمر رئیسوں کی لغویات میں ضائع نہیں کی بلکہ علم کو اس طرح حاصل کیا جس طرح اس کا حق ہے۔ پھر ملک کے علم و عمل کا شاید ہی کوئی ایسا گوشہ ہو گا جو ان کی مادی یا معنوی اعانت سے شاد کام اور فیضیاب نہ ہوا ہو۔ یہ بھی قابل فخر بات ہے۔ لیکن افسوس ہے تو اس بات کا کہ اب ان سا انسان نہیں ملنے کا۔ جس دور کی وہ پیداوار تھے وہ دور ہی ختم ہو گیا۔ اب اُن کے سے انسان پیدا ہی نہیں ہوتے۔ ایک آدھ اور صورت جو اس دور کی یاد گار باقی ہے، وہ بھی جھلملاتی شمع ہے۔ ہوا کا ایک جھونکا آیا اور گل، اس کے بعد گھپ اندھیرا۔

زمانے نے اپنا ورق اُلٹ دیا ہے۔ آج محبت اور خلوص، دوستی اور وفا، اخلاق اور قدردانی، علم اور فن، دین اور دنیا، غرض ہر چیز کا مفہوم ہی بدل گیا ہے۔ مرحوم اس زمانے میں پیدا ہوئے۔ پہلے پھولے اور پروان چڑھے۔ جسے ہم ایک لفظ میں بیان کرنا چاہیں تو وضعداری سے بہتر کلمہ نہ ملے۔ وضعداری، ایک قانون، ایک ضابطہ کا نام تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ آپ جس طرح کسی شخص سے آج ملے ہیں اسی طرح آج سے پچاس برس بعد بھی ملیں گے۔ زندگی کا جو اصول آپ نے بنا لیا ہے اب کوئی طاقت آپ کو اس سے ادھر اُدھر نہیں کر سکتی۔ آپ کی دوستی بھی کسی اصول پر مبنی ہو گی، اور مخالفت بھی۔ یہ نہیں کہ جدھر کی ہوا ہوئی اسی طرف پھر گئے۔ اسے جم کر وفاداری بشرط استواری سے بھی تعبیر کر سکتے ہیں۔ مرحوم اسی اصول کی چلتی پھرتی تصویر تھے۔ اب یہ تصویر پھر نظر نہیں آئے گی۔ میر کا ایک شعر یاد آگیا۔ اسی پر ختم کرتا ہوں ؎

باتیں ہماری یاد رہیں پھر باتیں ایسی نہ سنیے گا

سب کہتے کسی کو سنیے گا تو دیر تلک سر دھنیے گا

علاّمہ عمادی

ابوالخیر مودودی

مستطیل سر اور کشادہ ابھری پیشانی کے عمادی صاحب بڑے جامع کمالات تھے۔ اسلامی علوم نقلی وعقلی کے حافظ، وسیع النظر مؤرخ، عربی فارسی اردو کے انشاء پرداز و ادیب، رنگین بیان وگرم لہجہ شاعر، کتاب میں دیدہ ور باقی امور میں جنتی۔ ان کا حافظہ طرفہ تماشا تھا: جیسے پہلی مرتبہ کے چلے ہوئے رستے پر ان کو چھوڑ دیجئے، رستہ بھول جائیں گے اور بغیر رہنمائی کے اپنے گھر واپس نہیں پہنچ سکیں گے۔ حد یہ ہے کہ ۱۸ء کے وبائی انفلوانزا میں رفیقۂ حیات نے ان کو زندگی کے رستے میں چھوڑا اور وہ یہ رستہ بھی بھول گئے۔ لیکن کتاب، کوئی بھی ہو، —— فسانۂ آزاد، کوچک باختر، نائیکا بھید یا کوک شاستر —— ایک دفعہ نظر سے گزر جانی شرط ہے، ناممکن ہے کہ اس کے مضامین ان کی یاد سے اوجھل ہو جائیں۔ بلکہ بعض خاص خاص جملے اور فقرے لفظ بلفظ یاد رہتے۔ مہینہ بھر ایک ہی چیز کھلا دیجئے، وہ شوق سے کھائیں گے، لیکن ایک ہی قسم کی کتابیں مسلسل پڑھے جائیں، یہ ناممکن تھا۔ تبدیل ذائقے کے لئے —— اور ذہنی ہضم کے لئے —— تیرتھ رام فیروزپوری کے ترجمے بھی پڑھتے تھے۔

عمادی صاحب کے نام سے، میں سب سے پہلے، امرتسر کے اخبار "وکیل" کے ذریعے واقف ہوا —— اور ابوالکلام صاحب کے نام سے بھی اولاً "وکیل" ہی کے ذریعے آنکھیں روشن ہوئی تھیں —— یہ میرے بدوِ شعور کی بات ہے۔ بیسویں صدی کے ابتدائی برسوں میں "وکیل" بڑا نامی گرامی اخبار تھا اور اس وقت کی صحافت میں اصابتِ رائے، متانت تحریر اور خوبی کے لحاظ سے بہت ممتاز تھا۔ عمادی صاحب اس کے اڈیٹر اور ابوالکلام صاحب کے جانشین تھے۔ شعور بڑھتا گیا اور عمادی صاحب سے واقفیت بڑھتی گئی: "الندوہ" کے پرانے پرچوں[1] میں اعجاز القرآن اور ابن خلدون وغیرہ پر ان کے مضامین اور سب اڈیٹری میں ان کا نام نظر آیا۔ یہاں بھی وہ سب اڈیٹری میں ابوالکلام صاحب کے جانشین تھے پھر "وکیل" کی ادارت کے ساتھ ان کی تراوشِ قلم سے "تہذیب الاخلاق" کے نام سے ایک ماہنامہ[2] نکلنے لگا۔ جس میں نقلی علوم کے پہلو بہ پہلو مسلمانوں

---

۱ ۱۹۰۶ء — ۱۹۰۸ء

۲ یہ رسالہ بھی وکیل لمیٹڈ کے زیر اہتمام نکلتا تھا۔

کے عقلی و اکتشافی علوم پر بلند پایہ محققانہ مضامین شائع ہوتے تھے۔ اس زمانے میں انہوں نے اتنا لکھا کہ اب معلوم ہوتا تھا بند ٹوٹ گیا ہے۔ شعور نے چند منزلیں اور طے کیں تو ان کے ایک عربی ماہنامے "البیان" پر آگاہی ہوئی[1]۔ یہ ماہنامہ عمادی صاحب کی ادارت میں لکھنؤ سے سنہ ۱۹۰۳ء میں نکلا، جسے وہ ۱۹۱۰ء تک کامیابی سے چلاتے رہے۔ اسی زمانے میں ایک خاص بات یہ سنی کہ وہ ملکی علماء میں پہلے شخص تھے جنہوں نے بیرونِ ہند کی صحافت سے ناطہ جوڑا، اور مصر و بیروت کے رسائل و اخبارات میں مضامین لکھے۔ "البیان" اسی تعارف کے سہارے نکلا تھا۔ پھر جب "الہلال" نکلا تو کچھ دنوں بعد "وکیل" کی لوح سے ان کا نام رخصت ہو گیا، اور معلوم ہوا کہ ابوالکلام صاحب نے عمادی صاحب کو "الہلال" کی سلکِ ادارت میں بٹھا لیا ہے۔ "الہلال" سے ظفر علی خاں صاحب نے ان کو "زمیندار" میں کھینچا، اور پھر دو تین برس کے وقفے کے بعد ان کا نام ظفر علی خاں صاحب کے نیم رسالے "ستارۂ صبح" میں شریک مدیر کی حیثیت سے نمودار ہوا۔ صحافت میں غالباً یہ ان کی آخری نمود تھی۔

یہ معرفت بہت بھاری بھر کم تھی، لیکن عمادی صاحب کی علمی فضیلت کا ایک بے نمود واقعہ دفعتہً اس وقت میرے سامنے آیا جب میں دارالترجمے سے متعلق ہو کے حیدرآباد جا رہا تھا۔ طبّی مشورے کی غرض سے حکیم اجمل خاں صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا، حکیم صاحب نے فرمایا: "وہاں ایک بڑے فاضل شخص عمادی صاحب بھی ہیں۔ سفیر کابل ۱۸۹۹ء سے تاریخ ابن خلدون کے فارسی ترجمے کی فکر میں تھے، ایک دن سفیر صاحب نے مجھ سے کہا، حکیم صاحب! آپ کے ہندوستان میں ایک آدمی ایسا نہیں ملتا جو ابن خلدون کی تاریخ کا ترجمہ کر دے۔ مجھے تین سال جستجو کرتے ہو گئے۔ مجھے یہ سن کر بڑی شرم آئی، سوچتا رہا، مولوی عمادی صاحب نے بڑے بھائی صاحب سے "قانون" پڑھا تھا، میں جانتا تھا کہ وہ عربی فارسی میں بڑی دستگاہ رکھتے ہیں، خط لکھ کے ان کو بلایا اور انہوں نے یہ کام انجام دے دیا۔ قابلِ تعریف بات یہ ہے کہ بہترین ترجمہ کیا اور دو سال میں پوری کتاب کا ترجمہ کر دیا۔"

یہ قسمت کی نیرنگی تھی کہ عمادی صاحب جس شعبے کے رکن تھے اسی شعبے سے ایک وہ بھی منسلک ہوا جو ان کی پائنتی میں بیٹھنے کے قابل تھا۔

لیکن اس گہرے تاثر کے باوجود میرے دل میں شوقِ ملاقات نہ تھا۔ خیال تھا کہ جب وہ ایسے ہی فضیلت پناہ ہیں تو اپنے متحدہ ہم کاروں کی طرح اپنا سارا علم اپنی تھوتھنی پر لادے رہتے ہوں گے، آنکھوں میں نخوت تھرکتی ہوگی، زمین پر اس طرح چلتے ہوں گے گویا لوگوں کے سروں پر چل رہے ہیں، اور باتیں آنکھیں بند کر کے اس طرح کرتے ہوں گے جیسے بہت دور، کسی سیارے میں بیٹھے اپنے بندے پر وحی نازل فرما رہے ہیں۔

——— مگر جب ان کو دیکھا، تو پہلی نظر میں ذہن پر ان کی شخصیت کا پہلا عکس یہ پڑا کہ یہ شخص اپنے تئیں کوئی غیر معمولی ودیعتِ الٰہی نہیں سمجھتا: محض انسان، لاکھوں کروڑوں انسانوں کی طرح کا ایک انسان! اور اس سے زیادہ کچھ ہونے یا منوانے کی کوشش بھی نہیں کرے گا۔ اور میں بھول گیا کہ وہ کوئی بڑے جناور فضیلت پناہ ہیں؟ اور میں سطوتِ دریا سے دہلا سہما ساحل سے بہت دور کھڑا ایک نادان لڑکا ہوں۔ چہرے پر شرافت کی ملاحت، خدوخال میں علم کا رچاؤ، آنکھوں میں گہرے پانی کا وقار۔

---

[1] وکیل بک ڈپو سے عمادی صاحب کی مستقل تصانیف و مقالات میں "محکمات"، "علم الحدیث"، "فلسفۃ القرآن"، "فلسفۂ ابن عربی"، "صناعتہ العرب"، "تاریخ عرب قدیم" اور تراجم میں مفتی محمد عبدہ کی مشہور کتاب "الاسلام والنصرانیہ" (جو "رینان" کے جواب میں لکھی)، شیخ عبدالعزیز شاویش کی "الاسلام دین الفطرۃ" اور امام راغب کی "تفصیل النشاتین و تحصیل السعادتین" شائع ہوئیں۔

[2] "البیان" تین حصوں پر مشتمل تھا۔ ایک حصے میں عرب ممالک کے لئے ہندوستان کی تاریخ و رجال اور حالاتِ حاضرہ پر عربی میں مضامین ہوتے تھے۔ دوسرے حصے میں عرب اہلِ قلم کے مضامین با ترجمہ درج کئے جاتے تھے اور تیسرے حصے میں بلادِ اسلام کے حالات اور خبریں اردو میں ہوتی تھیں۔ ہندوستان سے زیادہ مصر و شام و بیروت اور شمالی افریقہ (تونس و الجزائر و مراکش) میں اس رسالے کی مانگ ہوئی۔

اسلاف عالی گوہر تھے۔ علم صدیوں سے متوارث تھا، جاہ و منصب بھی رہا بسا۔ نیک نہاد اولاد نے جوہر دار بزرگوں کی حقیقی میراث اپنے سینوں سے محفوظ رکھی اور ایک نسل نے دوسری نسل کو پہنچا دی۔ نسباً یہ لوگ صدیقی تھے، صدیقیت ان کے علمی شرف کے ساتھ ان کے اوضاع و اطوار میں نمایاں رہی۔

شیخ عماد نام ایک صاحب فضل و کمال اس خاندان کے مورث تھے وہ آٹھویں صدی کے آخری برسوں میں ہندوستان آئے۔ اس زمانے میں علم کے قافلوں کی آخری منزل پورب دیس تھا۔ شیخ عماد بھی یہیں پہنچے اور جون پور میں خورد ہ اور ان کے گھرانے کے لوگ افادۂ علوم میں مشغول ہو گئے۔ ابراہیم شرقی کے زمانے میں اس گھرانے کے درس علوم کا شہرہ زبان زد عام تھا۔ اس نے بارہ گاؤں میر حاصل جاگیر دیئے، ان لوگوں نے انہی دیہات کو اپنی درس گاہ بنالیا۔

مسلمان بادشاہوں کی یہ جاگیر بخشیاں ایک مستقل فکر کی حامل تھیں۔ جاگیروں کا مدعا تہذیبی اداروں کے لئے آزاد و با اختیار سرمایہ مہیا کرنا تھا۔ ہر درس گاہ قرب و جوار کے طلبہ کی اقامتی درس گاہ ہوتی تھی۔ اکثر و بیشتر طلبہ تن کے کپڑوں سے گھر سے چلتے اور جس درسگاہ میں پہنچتے، فراغت حاصل کرنے تک ان کے تمام مصارف کی وہی درس گاہ کفیل ہوتی۔ یہ دیہاتی درس گاہیں صحت مند تعلیم و تربیت کے علاوہ تبلیغ کا بالواسطہ وسیلہ تھیں۔

عمادی خاندان نے پورب کی بستیوں میں تقریباً ساڑھے چار سو برس تعلیم و تلقین کی شمعیں روشن رکھیں۔ آخر زمانے میں سوگھر پیدا میں شیخ عبد القادر عمادی کی درسگاہ مرجع عام تھی، جس میں بیک وقت دو دو سو طلبہ مقیم رہتے تھے۔ بادشاہی وقتوں کی جاگیر اودھ کی نوابی کے ابتدائی دور میں ضبط ہو چکی تھی، لیکن چشمۂ نور جاگیریں نہ تھیں خود ان کی ذات تھی۔ بزرگوں کا زر خرید ’امرتور‘ ایک گاؤں تھا، اس کی آمدنی سے طلبہ کی مدارات کرتے اور دونوں وقت کا کھانا ان کے ساتھ ایک دستر خوان پر کھاتے۔ یہ عمادی صاحب کے پردادا تھے۔

اس تعلیمی اور تہذیبی خدمت گزاری میں عورتیں بھی اپنے دائرہ عمل میں مردوں کے ساتھ شریک تھیں، اور یہ ہمارے معاشروں کا سیکڑوں برس پرانا دستور تھا، اسی سے خاندانی اوصاف چلا پاتے تھے، تہذیب و شائستگی برومند ہوتی تھی اور معاشرے کا شیرازہ بندھا رہتا تھا۔

عمادی صاحب نے علمی شیفتگی کے اس ماحول میں آنکھ کھولی۔ خاندان میں اب تک بول چال کی زبان عربی تھی، صرف و نحو دادی سے پڑھی۔ اور گیارہ برس کی عمر میں اتنی استعداد حاصل کر لی کہ خود ’’الف لیلہ‘‘ پڑھ لیتے اور اس کے مشکل مقامات لغت کی مدد سے حل کر لیتے۔ اسی کتاب نے عربی انشاء کا شوق پیدا کیا۔ علوم و آداب اپنے والد اور ماما سے پڑھے، دونوں بزرگ صاحب فضل تھے۔ ادب کی ڈھیروں اُلٹم غلّم کتابیں چھوڑ کے قرآن اور حدیث کے درس میں بہترین ادب عالیہ بھی پڑھا دیا۔ اس طریق تعلیم سے طالب علم میں یہ استعداد پیدا ہو گئی کہ جاحظ و ابن قتیبہ کی ادبی صناعتوں اور کلام عرب کے مجموعوں سے خود استفادہ کرلے۔ یہ زندگی سے ہنستے بولتے، کھرے اور سادہ، لطیف اور منطقی کانٹے کی تول تلے ادب کی تعلیم تھی۔ متنبی اور حریری اس کے آگے پانی تھے۔ نقلی اور عقلی علوم میں ملا نظام الدین کے اصول پر ہر فن کی ایک ایک دو دو جامع و مستند کتابیں پڑھائیں، فقہ میں عام نصاب کے خلاف امام محمد شیبانی کی جامع صغیر و جامع کبیر پر اکتفا کی، اور آخر میں امام رازی کی شرح اشارات پڑھائی۔ یہ درس نظامی پر اضافہ تھا۔ اس کے بعد خیر آبادی دریات سے فکر و نظر کی وسعتیں حاصل کرنے کے لئے مولوی ہدایت اللہ خان[1] رام پوری کے درس میں داخل کر دیا۔

---

[1] مولوی ہدایت اللہ خان رام پوری، مولوی فضل حق خیر آبادی کے یگانۂ روزگار شاگردوں میں تھے۔ چند سال رام پور میں درس دیا پھر ۱۳۱۲ھ میں جون پور آگئے اور مدرسۂ امام بخش کو رونق بخشی۔ مولوی حبیب الرحمان خان شروانی ان کی کریم النفسی کا ایک واقعہ بڑے مزے لے لے کر بیان فرمایا کرتے تھے کہتے تھے کہ ایک مرتبہ استاذ العلماء مولانا لطف اللہ مدرسہ عالیہ کے امتحان کے سلسلے میں رام پور تشریف لے گئے سخت گرمی کا موسم تھا امتحان سے فراغت پائی تو زیادہ تھکے ہوئے تھے [illegible] (بقیہ)

ہزاروں رحمتیں ہوں ان بزرگوں پر جنہوں نے فقہ میں سلامت روی کا قانون ذہن نشین کیا، اور بنیادی تعلیم میں آزاد تفکر کا سبق پڑھایا۔ اگر خدا نخواستہ عمادی صاحب قدوری شریف اور مولانا کنز الدقائق کی آل اولاد کے چکر میں پڑ جاتے، تو اور جو کچھ بھی ہوتے لیکن بلند نگاہ اور وسیع القلب عمادی صاحب نہ ہوتے، چھوٹی چھوٹی باتوں میں الجھتے، "صورت سنی" اور "سنی صورت" کے کانٹوں میں اُلجھتے، دوسروں کے لئے بھی مصیبت بنے رہتے اور خود اپنے لئے بھی۔ ترشے کی اصطلاح میں سنی مشائی، ڈاڑھی کو ایک مشت و دو انگشت بنانا پڑتا۔ ٹخنے ڈھکا پاجامہ نہ پہن سکتے، اور نہیں تنی گہری ترشواتے کہ مونچھوں کے وجود کا اطلاق ہی نہ ہو سکتا۔ شرح اشارات رازی کا سبق حقیقت میں آزاد تفکر کا سبق تھا۔ امام رازی بڑے بت شکن تھے انہوں نے شہ نشینی کے طاقچوں سے بڑے بڑے بتوں کو گرایا ہے اور بڑے مزے سے ان کا مُثلہ کیا ہے۔ اور اس بت شکنی کے بعد بہت بڑا احسان یہ فرمایا کہ خود اپنا بت کسی طاقچے میں نہیں بٹھایا۔

درسیات سے فراغت کے بعد حکیم عبدالمجید خاں صاحب سے "دلی" والے طب کی مشہور کتاب "القانون" پڑھی۔ پھر "رام پور" میں عرب محمد طیب[1] سے فنونِ ادب کا فیض حاصل کیا، اور طیب صاحب نے مکتب سے مکتب نوازی کی مسند پر بٹھا دیا۔

اس زمانے کی مکتبی دنیا میں مولوی عبدالعلی آسی ایک مشہور و مقبول شخصیت تھے۔ وہ مولوی عبدالحیٔ فرنگی محلی کے ممتاز شاگردوں میں تھے۔ اور "رام پور" کے مدرسہ عالیہ میں مدرس رہ چکے تھے۔ مدرسی چھوڑ کر "لکھنؤ" میں "اصح المطابع" کے نام سے مطبع قائم کیا، جس میں حدیث و فقہ، خصوصاً عربی کی درسی کتابیں تصحیح و تہذیب کے ساتھ چھاپتے تھے۔ آسی صاحب کو اپنے اس کام کے لئے ایسے لوگوں کی جستجو رہتی تھی جو ادب اور مختلف علوم میں دست گاہ رکھتے ہوں اور غلط نسخوں کی تصحیح میں ان کی مدد کریں۔ وہ اپنے کسی کام سے "رام پور" آئے، طبیب صاحب نے ان کے مطلب کے موزوں ترین آدمی سے ان کو متعارف کیا، اور عمادی صاحب مکتب سے مطبع کی زینت بن گئے۔ یہاں قلمی اور مطبوعہ نسخے تھے اور عمادی صاحب، اوّل سے آخر تک لفظ بلفظ ایک ایک کتاب پڑھتے اور نقل و کتابت کی غلطیاں درست کرتے۔ آسی صاحب کو کاپیاں اور پروف دیکھنے میں بڑی مہارت تھی۔ جیسے بچوں کو نجوں کے ساتھ قرآن پڑھایا جاتا ہے۔ اسی طرح وہ کاپیاں اور پروف پڑھتے تھے۔ یہ کام انہوں نے اپنے ذمے رکھا۔ کام کا دائرہ وسیع کر لیا اور حدیث و فقہ کے علاوہ معقولات کی بہت سی کتابیں اور درسیات کی تقریباً تمام کتابیں شائع

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۔۔۔) استاذ العلماء کی عادت تھی کہ دوپہر کے وقت باہر نکلتے تو سر پر چادر ڈال لیتے' چادر ڈال کے مدرسہ سے پیادہ پا استاذ العلماء مولوی ہدایت اللہ خاں رام پوری کے مکان پہنچے، مولوی صاحب قیلولہ کرنے زنان خانے میں جا چکے تھے، اطلاع پاتے ہی باہر تشریف لائے اور اس شان سے مہمان عزیز کی پذیرائی کی جو انہی بزرگوں کا حصہ تھا۔ اپنے بھتیجے کو بھیج کر کنویں سے تازہ پانی منگوایا اور خود اپنے ہاتھوں سے اپنے مہمان کے پاؤں دھوئے۔ سپاس گزاری یہ تھی کہ "مولوی لطف اللہ صاحب نے دھوپ میں کرم فرمایا"۔ اپنے ہم مرتبہ لوگوں کے ساتھ ان بزرگوں کے یہ آداب تھے۔

[1] عرب محمد طیب نوادرِ عالم سے ایک نادرہ تھے، علوم کا بہتا دریا، وطن مکہ تھا، نہ جانے ہندوستان کس طرح آ نکلے، مولوی فضل حق خیر آبادی (متوفی سنہ ۱۲۷۸ھ) سے معقولات میں کمال حاصل کیا، نقلی علوم میں صاحب دست گاہ تھے، کتاب سے بے نیاز، ان کا علم ان کے سینے میں تھا۔ ادب میں اپنا جواب نہ رکھتے تھے، کلام جاہلیت پر اس قدر عبور تھا کہ گھنٹوں قصیدے پر قصیدے مسلسل سنے جایئے، پڑھنے کے انداز سے شعری تصویروں کی عکاسی کر دیتے اور لہجے سے شعر کی روح نمایاں کر دیتے، نکات سخن بیان کرتے اور داد سخن دیتے۔ ماثل یا متماثل شعر سنانے کی لہر آ جائے تو گھنٹوں ہر رنگ و ہم معنی شعر سنے جایئے۔ جس مجلس میں بیٹھ جاتے، کسی کا چراغ نہ جلنے دیتے۔ نواب کلب علی خاں کی مجلس کے بلبل ہزار داستان تھے، جہد و ہزل میں طاق، نواب ان کی ناز برداریاں کرتے۔ مذہب میں پانی تھے، جس رنگ کے گلاس میں چاہو ڈال دو، مگر رہتے تھے اسلام کے دائرے کے اندر۔ مدتوں مدرسہ عالیہ کے صدر و مہتمم رہے اور طلبہ کے وظیفے بڑی فراخ حوصلگی سے ہضم کئے۔ خدا کی رحمتیں ہوں اس مرد آزاد و بے باک پر۔

کیونکہ "اتبع المطابع" کا نام درسی حلقوں میں صحتِ طباعت کی ضمانت سمجھا جاتا تھا۔ عمادی صاحب کہتے تھے کہ اس کام سے مجھے بڑا فائدہ پہنچا۔ غلطیوں کی تصحیح نے تحقیق اور پرکھ کی استعداد پیدا کردی، اور بعض پڑھنے کی وجہ سے مباحث ذہن نشین ہو گئے، اور پوری کتابیں پڑھنے سے تفصیلاً اس کے مباحث سامنے آگئے۔

تصحیح کا بار جب ہلکا ہوا تو آسی صاحب نے پہلے "الریاض" نام ایک عربی ماہنامہ جاری کیا۔ پھر عبدالوالی صاحب کے اہتمام سے "البیان" جاری ہوا۔ یہ دونوں رسالے عمادی صاحب کی ادارت میں نکلے تھے۔ جب ناخن نرم تھے اس وقت سے عربی انشاء کا شوق پرورش پا رہا تھا۔ تصحیح کے کام سے جب فرصت پاتے عربی جرائد کو مضامین بھیجتے رہتے تھے۔ آسی صاحب نے مناسب سمجھا کہ یہ ابرِ کرم جو باہر برستا ہے گھر ہی میں کیوں نہ برسے۔

عمادی صاحب کے فضل و کمال سے سب سے آخر میں دارالترجمے اور حیدرآباد کے دوسرے علمی اداروں کو استفادے کا شرف حاصل ہوا۔ اعلیٰ حضرت حضور نظام نے (خدا ان کو اپنی حفظ و امان میں رکھے) اس قدر شناسی کے ساتھ تقرر فرمایا تھا کہ ایسے علم و فضل والے علماء خال خال نظر آتے ہیں ... ... مشرقی شعبے میں اس پایہ کے فاضل شخص کا موجود ہونا مشرقی شعبے کا بڑا شرف ہوگا۔ دارالترجمے کو یہ "بڑا شرف" تقریباً بائیس سال حاصل رہا۔ اس مدت میں وہ سبھی کچھ رہے: مترجم[1]، ناظرِ مذہبی، علمی مبصر، واضعِ اصطلاحات۔ عمادی صاحب کو عربی فارسی کی قدیم و جدید لغات و مصطلحات پر بڑا عبور تھا۔ اس لئے وہ ہر شعبے کی مجلس مصطلحات کے مستقل رکن تھے، اور ان کو ارکان مجلس میں بڑا امتیاز و احترام حاصل تھا۔ با ایں ہمہ علمی رہنمائی سے ایک قدم آگے نہیں بڑھتے تھے۔ اصطلاح وضع کرنے میں مدد دیتے اور اس بات سے غرض نہ رکھتے کہ ان کی مدد اور رہنمائی قبول کی گئی ہے یا نہیں۔ وہ اپنی شخصیت کا بوجھ لادنے کی کوشش نہیں کرتے تھے۔

دائرۃ المعارف اور کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد کے دو عظیم ترین بین الاقوامی شہرت کے ادارے ہیں۔ عمادی صاحب ان دونوں کے رکن رکین تھے۔ دائرۃ المعارف نے تاریخ اور فلسفے کے علاوہ ہیئت و ہندسہ وغیرہ علوم کی متعدد کتابیں یورپی شرق شناسوں کے اشتراک سے ایڈٹ کی ہیں۔ اس قسم کی تمام کتابوں کی تصحیح و تہذیب کے نگرانِ اعلیٰ عمادی صاحب مقرر کئے جاتے تھے[2]۔ کتب خانہ آصفیہ کی مجلس مخطوطات میں وہ تلمی

---

[1] مترجم کی حیثیت سے عمادی صاحب کے قلم سے حسب ذیل کتابیں نکلیں:۔
(۱) مورخ مسعودی کی "تنبیہ و اشراف" اور "مروج الذہب" (۲) مؤرخ طبری کی تاریخ الرسل والملوک کی آخری دو جلدیں۔
(۳) طبقات ابن سعد کی بارہ جلدیں۔ (۴) ابن حزم کی الملل والنحل ——— یہ آخرالذکر کتاب تفسیر و حدیث علم کلام و فلسفہ اور مذاہب کی معلومات کا ایک عجیب مجموعہ ہے۔

[2] پانچویں صدی ہجری کے مشہور فلسفی طبیعی و ریاضیاتی مصنف ابن الہیثم کے حسب ذیل رسائل:۔
(۱) رسالۃ الضوء (۲) رسالۃ المرایا المحرقۃ بالقطوع
(۳) رسالۃ المرایا المحرقۃ بالدائرۃ (۴) رسالۃ المکان
(۵) رسالۃ شکل بنی موسیٰ
(۶) رسالۃ المساحت
(۷) رسالۃ ضوء القمر۔
محدث ابن جوزی کی مشہور تاریخی اور سیرتی خاکوں کا نوشتہ المنتظم فی التاریخ وغیرہ۔

نسخوں کے مستند مبصر تھے۔ کتاب کسی موضوع و مضمون کی ہو، اس کی علمی قدر جانچنے میں ان کی نگاہ بہت تیز تھی۔ لیکن مادی قیمت کیا ہو؟ اس میں وہ کورے تھے اور اس سے سروکار ہی نہ رکھتے۔ جس طرح زندگی بھر بازار جاکے کوئی چیز خریدی ہی نہ ہو، وہ قیمت جانچنے میں تیر تکے ہی لگاتا۔ یک در گیری اور محکم گیری ان کی شخصیت کی ایک بنیادی اینٹ تھی۔

حیدرآباد سے عمادی صاحب کے تعارف کا ذریعہ ظفر علی خاں صاحب[1] تھے —— یہاں حیدرآباد سے میری مراد حیدرآباد کی روح ہے یا روح کا مظہر، جس سے حیدرآباد، حیدرآباد تھا —— اور اپنے رفیق دیرینہ کی کچھ اس شان سے تقریب کی کہ پیش گاہ سے تار کے ذریعے طلبی ہوئی، دورباری لباس برطرف کر دیا، پہنچتے ہی باریاب کیا اور مشرقی شعبے کو ان کی رکنیت کا شرف بخشا۔ پہلی ملاقات میں جوہر ذات کا نقش اتنا گہرا پڑا کہ عمادی صاحب خاص امتیازوں کے مورد بن گئے، ایسے امتیاز جن میں وہ یکسر منفرد تھے۔ بارگاہ میں جو نادر قلمی کتابیں صلہ و انعام کی غرض سے پیش کی جاتیں، اور بڑے بڑے مصنف اپنی جو کتابیں نوازش و سرپرستی کی غرض سے پیش کرتے ان کی قدر و قیمت جانچنے کے لئے ایک ہی معتمد جوہری تھا، عمادی صاحب! یہ نجی معاملت تھی، براہ راست "ہمارے قاموس" اور "ہمارے جاحظ" مخاطب کئے جاتے۔ اپنے خاندانی کتاب خانے اور آصف جاہی ریکارڈ آفس کے دروازے ان پر کھول دیئے اور اس نادر تاریخی مواد سے (جسے دیکھنے کا اتفاق عمادی صاحب کے سوا کسی کو نہیں ہوا) خود اپنے لئے ہند و دکن کی سیاسی تاریخ لکھوائی، اور سب سے زیادہ یہ کہ اپنے اطمینان اور اپنی تلاوت میں استفادے کے لئے قرآن کے نامی گرامی ترجموں کی نسبت توثیق چاہی کہ دیکھ کر بتائیں ان میں کونسا ترجمہ مستند ہے اور اگر اس میں غلطیاں ہوں تو حاشیے پر اصلاح کر دو۔ کس قدر جوہر شناس بتانے والا تھا انسانیت کو یہ امتیاز اور منفرد امتیاز! لیکن عمادی صاحب کا جوہر ذات اس قدر اعلیٰ اور گراں مایہ تھا کہ یہ سارے امتیازات سیپ میں بارش کی ایک بوند تھے!

عمادی صاحب نے بطور "تحدیث نعمت" بھی ان باتوں کے ذکر سے اپنی زبان کبھی آلودہ نہیں کی۔ وہ جو اُردو کی ایک کہاوت ہے: نیکی کر کنویں میں ڈال، بالکل اسی طرح انھوں نے یہ سارے کام کئے اور ان کے ذکر اذکار خاموشی کے کنوئیں میں ڈال دیئے۔ اس سے زیادہ ندرہ کاری اور کیا ہوگی۔ کہ وہ بھی ان کاموں سے بے خبر ہے جو اُن سے قریب تر تھے۔

یہ اُن کے گہرے علم کا گمبیر انا تھا۔ انا احساس ذات ہے، یہ احساس جس قدر واضح اور مستقیم اور علم و نظر سے متوازن ہوتا ہے اسی قدر گمبیر ہوتا ہے، اور جس قدر گمبیر ہوتا ہے اسی قدر ہوش مند شخصیت تشکیل پاتی ہے —— لیکن ایگو جس نفسی کیفیت کا اظہار ہے، وہ مستقیم اور متوازن احساس ذات نہیں، انا کی بدمستی ہے —— عمادی صاحب کو احساس تھا کہ وہ علم و نظر سے بہرہ مند ہیں، ان میں ایک خاص کمال اور

---

[1] ظفر علی صاحب کو اعلیٰ حضرت آصف سابع اپنے زمانۂ شہزادگی سے جانتے تھے اور اسی جاننے کی وجہ سے ملک بدر کئے گئے تھے۔ بات یہ تھی کہ اعلیٰ حضرت آصف سادس (میر محبوب علی خاں) کے حکم سے تمام سیکرٹری شہزادہ ولی عہد کو مملکت کا کام سکھانے جاتے تھے، ظفر علی خاں صاحب اس زمانے میں ہوم سیکرٹری عزیز مرزا صاحب کے اسسٹنٹ اور پیش کار تھے، کاغذات پیش کرنے ہمیشہ یہی ان کے ساتھ جاتے۔ عزیز مرزا صاحب تمام سیکرٹریوں میں سب سے زیادہ لائق فائق، اسبابی اور کام میں دھرو برق تھے، ولی عہد کی نگاہ میں بہت عزیز ہو گئے۔ دوسرے سیکرٹریوں کو ان کی فوقیت گراں گذری، ان لوگوں نے یہ سازش گھڑی کہ عزیز مرزا ولی عہد کو برسر اقتدار لانے کی سازشیں کر رہے ہیں۔ اس پاداش میں عزیز مرزا صاحب اور ان کے ردیف ظفر علی خاں صاحب ملک بدر کر دیئے گئے۔ اعلیٰ حضرت آصف سابع نے یہ بات یاد رکھی، اور جب ظفر علی خاں صاحب کرم آباد کی قید محض سے نکلے اور اسی کے لگ بھگ زمانے میں عثمانیہ یونیورسٹی کی نصابی کتابوں کے لئے سررشتۂ تالیف و ترجمہ قائم ہوا، تو ظفر علی خاں صاحب کو حیدرآباد بلایا اور اپنے خاص دفتر سے مغربی شعبے کا رکن مقرر فرما دیا۔

خاص بصیرت ہے اس احساس اور قلندرانہ مشرب[٥] بزرگوں کے فیض تربیت نے ان کی پرکشش منفرد اور جمیل شخصیت کو جنم دیا۔

ان کی شخصیت میں اس قدر اعلیٰ انسانی خوبیاں تھیں جو آج ڈھونڈے سے بھی کہیں نظر نہیں آسکتیں، نہ خانقاہوں میں نہ مدرسوں اور مکتبوں میں، نہ مسجدوں میں، نہ کسی بڑے سے بڑے روحانی مرکز میں۔ اشلیٔے کا تو ذکر ہی کیا، نخوت اور تحقیر کی پرچھائیں بھی ان میں نہ تھی۔ اپنے سے ہیٹے والے کی بیحد بزرگ داشت کرتے، اپنے چھوٹوں کے ساتھ اس طرح پیش آتے گویا وہ خود ہر حیثیت میں ان سے چھوٹے ہیں۔ اپنی کسی بات اور کسی طریقے سے ایک عام ہم نشین کو اس بات کا خفیف سا بھی احساس نہ ہونے دیتے کہ وہ اپنے آپ کو کچھ سمجھتے ہیں۔ نیکی اور دست گیری کا جو سلسلہ ایک دفعہ شروع کر دیا مرتے دم تک قائم رکھا۔ ان کی تنخواہ میں دست گیری کی ایک مستقل مد تھی۔ معمولی نہیں، چھ سو میں سوا سو روپے کی مستقل مد! خود ان کا اپنا حصہ کھانے کپڑے اور اوپری مصارف سمیت پانچ فی صد تھا اور دست گیری کا بیس فی صد! دست گیری اس شان سے کرتے کہ اونچا ہاتھ نیچا رہتا اور نیچا ہاتھ اونچا۔ جیسے مرید بااخلاص اپنے پیر و مرشد کو اور سعادت مند شاگرد اپنے استاد کو نذر پیش کرتا ہے۔ عیدین کے موقع پر دفتر کے چپراسیوں کا گروہ عید کے سلام کو آتا، تو اگرچہ وہاں کا عام دستور یہ تھا کہ چپراسیوں کا سلام دیکھ لیا اور انعام دلوا دیا۔ لیکن عمادی صاحب ان سب سے معانقہ کرتے، بزرگ داشت سے ان کو بٹھاتے، خود ہر ایک کو عطریان پیش کرتے اور عید کا انعام ٹھیک اسی طرح پیش کرتے جس طرح وہاں اعلیٰ حضرت کو نذر پیش کی جاتی تھی۔ عید اور عید گردی میرے لغت و رسم سے خارج رہی ہے، لیکن عمادی صاحب کی خدمت میں حاضر ہونا مقدم تھا۔ ان کی بلندیاں دیکھ کر میری پستیاں پانی پانی ہو جاتی تھیں۔ اور سچ پوچھئے تو اپنی پستی کا یہ احساس انہی کی بلند انسانیت کا ادنیٰ فیض تھا۔ شروع میں ایک دفعہ میں نے اس طریقے پر حیرت سے کچھ کہا، فرمانے لگے: جب عمادی اعلیٰ حضرت کی جناب میں اس طرح عید کی نذر پیش کرتا ہے، تو یہ لوگ بدرجۂ اولیٰ اس کے سزاوار ہیں۔ عمادی کی نگاہ میں سب اس سے اعلیٰ اور اس کے مخدوم ہیں اور وہ سب کا ادنیٰ ترین خادم ہے۔ ان کے لہجے میں بھرپور انسانیت کا خلوص اور گداز تھا۔ اس وقت بھی جب میں یہ لکھ رہا ہوں، وہ دھیمی اور گہری آواز میرے دل میں پیوست ہوئی جا رہی ہے۔

نوکروں کے ساتھ برادرانہ برتاؤ تھا۔ نوکر صرف دو تھے، لیکن ان کا سارا گھرانہ ان کے دسترخوان میں برابر کا حصہ دار تھا، بلکہ ان کے مہمان بھی۔ جو خود کھاتے وہی ان کو کھلاتے۔ لذت کام و دہن سے زیادہ ان کو دسترخوان کی وسعت محبوب تھی۔ نوکر بیماری میں ان کی دیکھ بھال علاج معالجہ کرتے اور ان کے بچوں کو اپنے بچوں کی طرح سمجھتے۔

عزیزوں کے ساتھ بہت اُلفت تھی۔ وطن جب جاتے عزیزوں دوستوں کے لئے سوغاتیں لے جاتے، بچوں کو نقدی دیتے۔ خاندان کے متعدد بچوں کو ان کے رجحان کے مطابق پڑھوایا۔ ایک بھتیجے کو ادب کا اور ان کے صاحبزادے کو سائنس کا شوق تھا، دونوں کو بلا امتیاز ایک ساتھ علی گڑھ میں پڑھوایا۔

حیدرآباد کی جاہ نما معاشرت کا ان پر اتنا بھی اثر نہ تھا جتنی کانٹے پر اوس ہوتی ہے۔ ٹونک کی طالب علمانہ سادگی، جو ہمیشہ سے ان کا شعار تھی، حالات کے تغیر سے اس میں سرمو فرق نہ آیا۔ ان کے ایک بہت پرانے ہم وطن دوست کہتے تھے کہ میں نے وطن میں زندگی کی جو روش دیکھی تھی

---

٥ قلندری طریق کا تحفہ ساتویں صدی ہجری کے اوائل میں شیخ خضر رومی ہندوستان لائے، پورینہ سال تھے، صاحب فضل اور اپنے کام میں صاحب کمال تھے، "پرکشش بیک نگاہ ہے"۔ ان کا طریق کار تھا، خواجہ قطب الدین بختیار کاکی سے ملے، متمتع کیا اور متمتع ہوئے۔ وہ خود تو دیہات کی اس تازہ نظر سے ان علاقوں کو بہرہ مند کرنے واپس چلے گئے جہاں سے آئے تھے لیکن یہاں بھی ان سے ایک مستقل طریق قلندری شائع ہوا۔ قطب صاحب اور ان کے سر حلقہ تھے اور طریقۂ چشتیہ میں بھی اس طرز فکر کا پیوند لگا۔ چیز پیرکار تھی تمام اصحاب طریق متمتع ہوئے۔ عمادی صاحب کے بزرگ شیخ قطب بینادل کے حلقے سے متعلق تھے۔ مشرب قلندری کا خلاصہ دو لفظوں میں طہارت نفس ہے، بلطف نظر کی پاکی وجہ باکی، خوش دلی و خوش خلقی۔ شیخ محدث نے اخبار الاخیار میں خضر رومی کا مختصر ترجمہ لکھا ہے۔

وہی آج اس مرکز جاہ وقائق میں دیکھ رہا ہوں، شمرات میں کوئی فرق ہے، نہ لباس اور بود و باش میں ——— اور اسی سلسلے میں عمادی صاحب کی تحصیل علم کے واقعات سنائے۔

انفرادیت کہئے یا وضع داری، جو کچھ بھی تھی ان کی ٹوپی میں تھی، پہننے سے آزاد اونچی باڑ کی نرم ترکی ٹوپی۔ ڈھیلی ڈھالی گھٹنوں سے بالشت بھر سے کچھ زیادہ نیچی شیروانی۔ ڈیڑھ فٹے پائنچے، ٹخنوں سے اونچے نہیں، اتنے نیچے کہ ایڑیوں سے ملے رہتے۔ یہ چیز خاص الخاص قسم کے لوگوں کو بہت گراں گزرتی تھی۔ حیا اور حلمے سے کبھی گراں جسم نہ ہوئے۔ جو لباس معمولاً پہنتے تھے۔ کوئی مجلس ہو، اسی لباس میں جاتے۔ جلوہ فرمائی کا جدا لباس کیش و آئین نہ تھا۔

لباس کی طرح تعلقات میں بھی بڑے وضع دار تھے۔ جس سے جو تعلق تھا حاضر و غائب یکساں تھا، جو وضع پڑ گئی زندگی بھر کا دستور بن گئی۔ توہین چاہے کسی کی ہو کسی قسم کی ہو، اس سے انہیں سخت اذیت ہوتی تھی۔ بدگوئی، دل آزاری، طنز و استہزا، اپنی ذات کے متعلق ذکر اذکار ان کے مذہب میں گناہ تھے۔ آپ بیتی گفتگو میں اسی حد تک آتی جتنی کہ مفید اور سبق آموز ہوتی۔ حوصلہ افزائی ان کی خصوصیت تھی۔ جس میں ذرا بھی کوئی استعداد پاتے، اس کے لئے سراپا شفقت بن جاتے۔ کم استعدادوں کے کام کو اپنے مقام سے نہیں، ان کے مقام سے دیکھتے اور حوصلہ بڑھاتے۔ رد و کد، بحث و تکرار سے پرہیز کرتے تھے۔ لیکن بطور تفنن کوئی از کمی علمی بات چھیڑ کے ذہنی ورزش کا لطف لیتے اور لطف اندوز کرتے۔ شواذ اور نوادر مسائل، اور لطائف و ظرائف، ان کے کشکول میں بہت تھے۔ انسان خواہ کسی درجے کا ہو، ان کی باتوں سے محظوظ ہوتا تھا۔ جس مسئلے پر گفتگو کرتے کمال خوبیاں نظر آتیں۔ عربی فارسی اردو تینوں زبانوں کے ہزاروں شعر: جِد و ہزل ہر قسم کے ان کے خزانۂ دماغ میں محفوظ تھے، سناتے اور نکتہ سنجی کرتے۔ مطالعے کے تنوع نے ان کی طبیعت کو لالہ زار بنا دیا تھا۔ ادبی تاریخی اور فقہی لطیفوں کی پھُل جھڑیاں چھوڑتے، خوش وقت کرتے اور خوش وقت ہوتے۔ منہ بند کر کے اس طرح ہنستے کہ سارا جسم ہل جاتا۔ شاید مقامی محاوروں کی طرح ہنسنے کا محاورہ بھی مقامی چیز ہے۔ ہنسنے کی بالکل یہی وضع مرحوم مولوی ابوبکر شیث کی بھی تھی، دونوں "جون پوری" تھے۔ ممکن ہے ہنسنے کا یہ سانچا جون پور کی قدیم شائستگی نے ڈھالا ہو۔

تردید کے انداز میں تردید کرنا اور غلطی کی "اصلاح" غلط ہے "کہہ کے نہ کرنا ان کی مستقل عادت تھی۔ اور یہ بھی مستقل عادت تھی کہ جو لوگ بننے کے شوقین ہوتے بڑی نکتہ آفرینی سے ان کی تسکین خاطر کرتے۔ ایک صاحب کو علامہ بننے کا سودا ہوا، خوب مدارات کی، وہ حضرت العلامہ بن گئے اور اس سند پر کہ عمادی صاحب نے علامہ لکھ دیا ہے، علامہ پن کو اپنا قانونی حق سمجھ لیا اور عمادی صاحب نے ظرح داری سے لکھ دیا کہ جامع العلوم کتاب کو متعلمہ کہتے ہیں اور جامع العلوم شخص کو علامہ، میرے دوست بلا شبہ علامہ ہیں اور ایسے علامہ کم ہوتے ہیں۔ تعریض کے پردے میں لطیف مزدوری ہے اور یہ لطیف لطیف کا کرشمہ تھا۔ تمرّد نے عالم لوگ بنتائے، عمادی صاحب نے کہا: میرا یا آپ کا اس میں ہرج کیا ہوا، وہ غریب علامہ بننے کی کوشش میں کچھ بن ہی جائے گا، بگڑے گا تو نہیں۔ میرا تو یہ مسلک ہے ۔

ہمیں تو شیخ و برہمن سبھی کی سُن لینی   یہ کہیں، وکرا کس منہ تو ہیں پکارنے والے

کسی بات کو وہ غلط جانتے ہوں، مگر اس کی مدارات میں بھی دریغ نہ تھا۔ کیا خوب اس طرح کہتے کہ یہ اپنی جگہ مطمئن وہ اپنی جگہ خوش۔

اور یہی عادات تھی تا تاثران کے مترجم مسعود علی صاحب محوی نے عربی ادب پڑھنے کی خواہش کی اور استاد صاحب شاگرد کو اس کے گھر میں جا کے پڑھانے لگے۔ محوی صاحب علیگڑھ کے پڑھے فارغ التحصیل اور علامہ شبلی کے شاگرد تھے، عربی میں نمایاں استعداد کا علامہ شبلی سے اعتراف کروا چکے تھے، جوش صاحب نے خیال کیا کہ شاید وہ سابقہ سرشتی بچ کے غرے کی وجہ سے خود پڑھنے نہیں آتے، اور عمادی صاحب کو بھیجنے پڑے۔ خوب بیسے، خوب برسے، بکتے ہو بسے اتنے ہی وہ نہال ہوئے، جھڑی تھمی تو بڑے ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولے۔ ان کے آنے سے مجھ کو تنگ جیسی لگ جائے گا۔ یہ بات قابل قدر ہے کہ انہیں اس عمر میں بھی پڑھنے کا شوق ہے آپ پڑھنے عمادی آپ کی جناب

پرانے وقف ناموں کا بڑا ذخیرہ جمع کیا تھا۔ امتحانات اور دوسری علمی سرکاری مدوں سے ڈھائی ہزار سالانہ کی جو آمدنی ہوتی وہ قلمی کتابوں اور ایسے ہی ذخیروں کے لئے وقف کر دی تھی۔

یہ نام دراصل سعدان کو بہت پسند تھا۔ کہتے تھے کہ وہ بہت بڑا مصنف ہے۔ اس نے تاریخ اور افسانے کو ملا کر ایک نیا اسلوب پیدا کیا تھا۔ اس کے فن سے معاشرے کی اکثریت ہر زمانے میں بڑے ذوق شوق سے مستفید ہوئی۔ وہ مورخ کی بجائے ایک بامقصد نقاش ہے اور اس کی نقاشی اس ماحول کا دلآویز رنگ مہیا کرتی ہے۔ یہ ان کے تاریخی مطالعے کا انداز نظر ہے۔

ابن خلدون کے دو نظریوں؛ عربوں کی بدویت کے نظریے اور علوم و آداب میں عربوں کی تہی دستی کے نظریے سے سخت اختلاف تھا۔ کہتے تھے کہ مستشرقین نے زیادہ تر ان دو نظریوں کی وجہ سے ابن خلدون کی ستائش کی ہے۔ ان کی محققانہ رائے یہ ہے کہ ابن خلدون کے یہ دونوں نظریے بے اصل ہیں۔ "تاریخ عرب قدیم" اور "صناعۃ العرب" ابن خلدون کے نظریۂ بدویت کی تردیدی تحریریں ہیں لیکن ان کو اپنی مشاہدہ وش کے مطابق تردید کے عنوان سے پیش نہیں کیا۔

مقالہ ہو یا ترجمہ، برداشتہ قلم لکھتے اور کسی پیراگراف یا صفحے میں شاذ و نادر کوئی لفظ قلم زد ہوتا۔ مدت سے خود لکھنا چھوڑ دیا تھا۔ ترجمہ لکھواتے تھے۔ ترجمہ لکھوانے کا ڈھنگ اکثر و بیشتر یہ ہوتا: ٹہلتے رہتے، کتاب ایک نظر دیکھتے اور فقرے روانی سے بول دیتے۔ خوبی یہ ہوتی کہ ترجمہ لفظی ہوتا۔ مسجع عبارتوں کے لفظی ترجمے کی یہ شان تھی:

والقمر الباھر والکواکب الزاھر والغمام الماطر وما یلحق من طائر وما اھتدی بعلم مسافر من منجد وغائر لقد سبق ھاشم امیۃ الی المآثر اول منہ وآخر ابو ھمہمۃ بذلک خابر نقضی لھاشم بغلبۃ۔

قسم ہے ماہ تاباں کی، نجم درخشاں کی، ابر باراں کی، مرغانِ فضائے آسمان کی۔ قسم ہے اس پہاڑی ٹیلے کی جس سے رہرو کو راہ ملے فراز پسند ہوں یا نشیب گیر سب کو پناہ ملے کہ خوبیوں میں ہاشم اُمیّہ سے بڑھ کے ہے آگے پیچھے ہر حال میں بڑھ چڑھ کے ہے ابو ہمہمہ اس کا خبررساں ہے اور یہی اس کا بیان ہے۔ اس بیان کے ساتھ ہاشم کے غالب آنے کا فیصلہ کیا۔

لوگوں کی خدمت طرح طرح سے کرتے، ایک صاحب کے پاس قدیم قلمی کتابوں کا بڑا ذخیرہ تھا۔ چاہتے تھے کہ آصفیہ کتب خانے میں اچھے داموں نکل جائے۔ ان سے کہا: فہرست بنائیے ہر کتاب پر مختصر سا تعارف لکھئے کہ اس کی قدر و قیمت کا اندازہ ہو۔ تعارف لکھنے کا کام ان کے بس کا نہ تھا، یہ کام اپنے ذمے لے لیا، اور بار احسان سے یہ کہہ کے ان کو سبکدوش کر دیا کہ "مجھے پڑھنے کو اچھی کتابیں مل جائیں گی"۔ وہ ہر ہفتے دس پانچ کتابیں لاتے اور تعارفی نوشتوں کے ساتھ اپنی کتابیں لے جاتے۔ مہینوں یہ سلسلہ جاری رہا۔ اتنی کھکیڑ کون کسی کے لئے اٹھاتا ہے۔ چند نمونوں سے تعارف کی ان خصوصیتوں کا اور ادبی شان کا اندازہ ہوگا:

کیمیائے اسلام: اللہ تعالیٰ نے کائنات کی تکوین کیوں کی، نبات و معدن و جماد میں تنوع مشترک کیا ہے، نقصِ خلقت کی کتنی گنجائش ہے۔ سالمات کتنے ہیں اور ناقصات کس قدر ہیں، جوہر و عرض کی کیا نسبت ہے، جن اجسام کو بظاہر منقسمت اور بحواس محسوس کیا جاتا ہے کیا حقیقت میں ان کے اندر تماثل نہیں ہے کہ اعمال تصعید و تنزیل و تحلیل و ترکیب سے وہی جنس سافل مرتبۂ عالی میں پہنچ سکے اور صنعت گری کے طفیل سب کو لے کر ہیرے میں تبدیل کر لیا جائے؟

کیمیائے اسلام کا یہی موضوع ہے جو تمام تر حقائق اشیاء کے علم حق اور حل صدق پر مبنی ہے۔

اسلام سے پیشتر کلدانی و مصری و یونانی قومیں جو ہوس میں مبتلا تھیں، مسلمان بھی ابتداءً اسی طمع میں گرفتار رہے، خلافت سے محرومی کے بعد خالد بن یزید اس کے رشتہ کار تھا، جابر بن حیان اپنی تحریروں میں پیش پیش ہے جو علم الٰہی کی تحقیق میں فن سے تعلق نہیں رکھتے۔ ایک شخص زیبق کی تصعید

میں سرگرم ہے ، تکوین میں انہماک رکھتا ہے ' باایں ہمہ کوشش بے نتیجہ رہتی ہے ' اس لئے کہ نباتات و معادن و جمادات کے حقیقی علم سے مطلقاً آشنا نہیں۔

مسلمانوں نے یہ کمزوری محسوس کی ، مہوسی کے زینے پہ چڑھ کے کیمیا کے بام حکمت پر چڑھ گئے۔

یہ کتاب انہی حقائق پر حاوی ہے۔

'طغرائی نے اپنے تمام پیش روؤں سے الگ ہو کے ابوبکر رازی کو اپنا مدار علیہ مانا ہے کہ اس علمی خلافت کے ——— فی زمنہ ——— وہی بانی با فضل تھے"۔

رسالہ حق : فلاسفۂ اسلام کے سب سے بڑے پیشوا الشیخ بو علی سینا کی یہ کتاب عربی زبان میں تھی جس کا یہ فارسی ترجمہ عہد سلاجقہ کی یادگار ہے۔ اسی عہد کی زبان ہے اور وہی انداز بیان ہے ' کائنات کس طرح وجود میں آئی ، نیستی سے ہستی کیسے ہوئی ، معدوم سے موجود کی کیا سبیل نکلی کوئی شے اسی وقت وجود میں آسکتی ہے جب اس کے لئے کوئی علت و سبب موجود ہو یہ علت اس شے پر مقدم ہوتی ہے ، وجود عدم سے نکلا تو کیوں کر نکلا ، علت وجود کو وجود سے پہلے موجود ہونا چاہئے حال آں کہ وجود سے پہلے آپ عدم کے قائل ہیں۔ یہ مباحث نمونۂ کتاب ہیں۔ ان میں غور کرنے والے پر طبیعیین و دہریین کے مذہب کا فساد خود بخود واضح ہو جائے گا۔ اور ماننا پڑے گا کہ عدم اور وجود سے پہلے ایک واجب الوجود بھی ہے ، تعالیٰ شانہٗ کہ وہی اس کائنات کا سبب بھی ہے اور مسبب بھی"۔

رسالۂ طیر : یہ بھی شیخ کی عربی تالیف کا فارسی ترجمہ ہے جو سلجوقیوں کے عہد میں ہوا تھا۔ اس میں انسان کی تخلیق سے بحث کی ہے کہ ایک نوع کے ہوتے ہوئے ان میں گوناگوں اختلاف کیوں ہے ؟ اختلاف کی نہایت نازک علمی تحلیل کر کے دکھایا ہے کہ ہر انسان میں ترقی کی استعداد موجود ہے ' یہ استعداد بالقوہ ہے ' ممارست سے اگر اس کو فعل میں لایا جائے تو کون سے مدارج ارتقا ہیں جن پر انسان فائز نہیں ہو سکتا"۔

تحفۃ الحبیب : اصفہان کے خوش بیان سخنور و سخن سنج میرزا فخری کی یہ کتاب زبان آوری کی دنیا میں پرواز خیال کا ایک عجیب مرقع ہے مثلاً 'سعدی' نے ، کہ ملاحت کلام میں شور انگیزی پہلے پہل ان کے حصے میں آئی ، ایک غزل لکھی 'خسرو' بھی اسی زمین کو شاداب کرتے ہیں اور مصالح بندی میں جیسے ان دنوں دستور گوئی کہتے تھے ، ایک نئی شان دکھاتے ہیں 'حسن' اس کو روانی و سلاست کے قالب میں ڈھالتے ہیں 'سلمان ساوجی' خواجو کرمانی ' عماد فقیہ کی شکر خائی اور حلاوت انگیز طبع آزمائی سے یہی زمین سخن شکرستان بن جاتی ہے۔ پھر حافظ آتے ہیں اور خداداد تبدل خاطر سے اسی زمین کو آسمان کے ہمدوش بنا دیتے ہیں۔ پھر وحشی اہلی و کاتبی و نزاری و جامی اپنے اپنے طرز میں داد سخن دیتے ہیں۔

ایک ایک زمین میں مشاہیر شعرا کی طبع آزمائی کا یہ حیرت خیز نگارخانۂ معنی اہل نظر کے ذہنی شگفتگی کا انبار در انبار سامان رکھتا ہے۔ جس سے ادب فارسی میں عہد بعہد حسن تخیل و لطف ذوق و عروج فکر کی ایک ایسی تاریخ مرتب ہو سکتی ہے کہ فارسی کی حد تک ایران و ہندوستان آج تک اس سے ناآشنا ہے"۔

اسی سلسلے میں دو مضمونوں کے اقتباس ادب میں تاریخ اور تاریخ میں ادب کی شان دکھاتے ہیں۔

(۱) ساتویں صدی ہجری کے آخری ایام ہیں ' 'بغداد' کا تمدن سیلاب تاتار کی نذر ہو چکا ہے ' 'ہولاکو' کا جانشین 'اباقا' سریر آرائے سلطنت ہے۔ 'تبریز' جو 'زبیدہ خاتون' کی یادگار تھا ' آج اس میں تاتاری لشکر کی چھاؤنی ہے ' روم و عراق و ایران و توران و ماوراءالنہر جتنے اسلامی ممالک تھے سب کے سب کفر کے نرغے میں آ چکے ہیں۔ مصر و شام کی ایک بچی بچائی اسلامی سلطنت رہ گئی ہے جہاں جا کر خلافت نے پناہ لی ہے اگر اب اس پر بھی چڑھائی کے سامان ہو رہے ہیں ' اسی ضرورت سے خود 'اباقا' 'تبریز' میں لشکر زن ہے اور صاحب دیوان وزیر اعظم خواجہ شمس الدین محمد پر تاکید ہو رہی ہے کہ 'مغولستان' سے لے کر ایران تک کی تمام فوجیں یک جا کر لی جائیں پوری قوت کے ساتھ حملہ

"قسطاط کے مناروں پر جھلملا رہے ہیں"۔

(۲) ہجرتِ نبوی کا چھیاسٹھواں سال ہے۔ سیدنا حسین بن علی علیہما السّلام دشتِ کربلا میں شہید ہو چکے ہیں۔ جوشِ انتقام نے عراق کو ایک شعلۂ جوالہ بنا رکھا ہے۔ بنیہ و آل یزید پر عام بیزاری مزید ہے، تو آئین کا تو خاتمہ ہو چکا ہے مگر تو بہ تلا اب بھی برپا ہے۔ اسی حالت میں قبیلۂ ثقیف کا ایک جواں مرد اُٹھتا ہے اور سب کو مٹا دیتا ہے۔ اس کی کنیت ابو اسحاق ہے۔ پہلے خارجی رہ چکا ہے۔ اس میں کامیابی موہوم نظر آئی تو اب زمرۂ طرف داران اہل بیت میں اپنے تئیں منسلک کرنا چاہتا ہے۔ بایں ہمہ شیعہ اس سے کھٹکتے رہتے ہیں کہ سیدنا حسن مجتبیٰ کے عہد میں اس کی کاٹ پھانس دیکھ چکے ہیں۔ اب نہ جانے یہ کانٹا کیا گل کھلائے، یہ فتنہ کیا قیامت ڈھائے"۔

اُردو میں شعر کم کہتے تھے، عہدِ شباب کی ایک غزل ہے :

چشمِ پُرفن کا ہے گردش میں نظام اے ساقی گردشِ ساغر و مینا کو سلام اے ساقی
سطوتِ جام کی جاتی رہی عالم گیری اب کہاں دولتِ شربِ مدام اے ساقی
شیشہ ہے منتظرِ جلوۂ خورشیدِ ازل مجھ کو درکار نہیں ماہ تمام اے ساقی
کعبۂ دل میں بتوں کو ہے خدائی کا غرور لب تک آتا ہے پھر اللہ کا نام اے ساقی
پرتوِ صبحِ بنا گوش سے ہو گی کافور گیسوِ ہندِ جگر خوار کی شام اے ساقی
تیغِ ابرو سے مے آشام کہیں ڈرتے ہیں دمِ شمشیر ہے رندوں کا مقام اے ساقی

مے گل رنگ شہادت کا چلے بزم میں دَور
آ چلی ساعتِ افطارِ صیام اے ساقی

فارسی میں یوں دادِ سخن دیتے ہیں :

جبین زاہد ز افتادگی نشد روشن ہزار سجدہ کند نور بر جبیں نرسد

حریفِ تو ز ہمت کوتاہ بینِ تست ہرگز در کریم بکافر نہ بستہ اند

اہلِ بینش ہمہ از آتشِ دوزخ براں ہر کہ در خلد در آید نہ برندش بجحیم

عجب آں نیست کہ اعجازِ مسیحا داری عجب این ست کہ بیمارِ تو بیمار ترست

فریبِ رنگ و نمودے گہر شناس مخند حباب دار نمودار گہر بخشند
عجب مدار اگر مرغِ خانہ پرور ما نداده ہمتِ پرواز بال و پر بخشند
جہاں گشت کہ جہانے دگر پدید آید گلیم فقر بیا بند و تاجِ زر بخشند

عالم اور علامہ ہونا کوئی بڑی بات نہیں، بڑی بات انسان ہونا ہے۔ عمادی صاحب جتنے بڑے عالم اور علامہ تھے اس سے زیادہ اعلیٰ قسم کے انسان تھے۔ بلند نگاہ اور کریم النفس، قلندر صفت اور قلندر سیرت۔ ان کی زندگی شرافتِ علم اور شرافتِ نفس کے امتزاج کی نمود تھی۔

اقبال کے نغمے ایک جہانِ تازہ کی تخلیق کر رہے تھے لیکن وہ گلستان جس میں چکبست کی حب الوطنی نے زبان کھولی ابھی تک تہ مرش تھا اور چکبست نے خالص ہندوستانی قومیت کے ترجمان کی حیثیت سے تاریخ ادب میں اپنے لئے جو جگہ بنائی وہ ابھی تک کسی اردو شاعر کے نصیب میں نہ آئی تھی۔ نواب جعفر علی خان اثر کا دعویٰ غلط نہیں کہ:

"صرف چکبست ہی وہ قومی شاعر ہے جس نے کل ہندوستان کے جذبات و ضروریات کی بلا امتیاز تفریق مذہب ترجمانی کی ہے"

چکبست کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ اردو اور فارسی کے علاوہ انہوں نے انگریزی ادب اور فلسفہ کا بھی بہت گہرا مطالعہ کیا تھا۔ مل، مارلے اور برک ان کے پسندیدہ فلسفی اور انشا پرداز تھے۔ راناڈے، گوکھلے اور تلک نے بھی ان کے خیالات اور جذبات پر بڑا گہرا اثر ڈالا تھا۔ وہ بڑے زبردست قوم پرست تھے لیکن ان کی قوم پرستی کا دائرہ تنگ نہیں تھا۔ وہ ہندوستانی تہذیب کے قدردان تھے لیکن تمدن کے بڑھتے ہوئے دھارے کو روکنا نہیں چاہتے تھے بلکہ تہذیب کی قدیم اور جدید قدروں کے امتزاج سے ایک ترقی پسند سماج کا سنگِ بنیاد رکھنا چاہتے تھے۔ بقول پنڈت کشن پرشاد کول مرحوم، چکبست کا عقیدہ تھا کہ:

"پرانی تہذیب سے جو کچھ مل سکتا ہے پوری طرح سمیٹ لینا چاہئے لیکن نئی روشنی اور نئے تمدن کے سامنے بھی آنکھیں بند نہیں کرنا چاہئیں۔ ہماری زندگی مشرق اور مغرب دونوں کی روشنی کا عکس ہونا چاہئے۔"

یہ صرف ان کا عقیدہ ہی نہیں تھا۔ انہوں نے زندگی بھر اس مقصد کے لئے جدوجہد بھی کی۔ انہوں نے اپنے تھا اور ملکۂ سخن سے بھی کام لیا اور تعلیمی اداروں میں شامل ہو کر بھی ابھرتی ہوئی نسل کو سنبھالنے اور صراطِ مستقیم پر لے چلنے کی کوشش کی۔ طلبہ سے ان کو بڑی امیدیں تھیں۔ وہ کیننگ کالج (جس نے اب لکھنؤ یونیورسٹی کی شکل اختیار کر لی ہے) کے قدیم طالب علم تھے۔ اس لئے وہاں کے حالات کا ان کے اوپر بہت اثر پڑتا تھا۔ وہ طلبہ کے سچے رہنما اور مربی تھے۔ جب موقع پاتے، کالج جاتے، طلبہ سے ملتے، باتیں کرتے، ان کا نقطۂ نظر سمجھتے اور اپنا سمجھاتے۔

ملکی اور قومی معاملات میں ان کی تمنائیں خالص ہندوستانی تھیں۔ وہ مذہباً ہندو تھے لیکن ان کا کردار خالص ہندوستانی تھا۔ مذہب کی صداقت پر پوری طرح ایمان رکھنے کے باوجود وہ انسان تھے۔ ہر ہندوستانی ان کی آنکھ کا تارا تھا۔ ہندو، مسلمان، چھوٹے بڑے، امیر غریب وہ سب ہی کے خیر خواہ تھے اور سب کے دکھ درد میں ایک سچے دردمند انسان کی طرح شریک ہوتے تھے۔ ان کا یہ شعر صرف شاعرانہ الاپ نہیں ہے بلکہ ان کے مردانہ کردار کا سچا ریز ہے جو خدمت کے میدان میں اترتے وقت ان کی زبان پر آیا تھا ؎

درد دل، پاسِ وفا، جذبۂ ایماں ہونا
آدمیت ہے یہی اور یہی انساں ہونا (چکبست)

ان کے سیاسی خیالات انتہا پسندانہ نہیں تھے۔ ہم ان کو اعتدال پسند کہہ سکتے ہیں۔ وہ ہندوستانیوں کی عظمت و برتری کا خواب دیکھتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ ؎

یہ آرزو ہے کہ مہر و وفا سے کام رہے
وطن کے باغ میں اپنا ہی انتظام رہے (چکبست)

لیکن حکومتِ وقت کے خلاف بغاوت کا جذبہ نہ تھا۔ انہوں نے پہلی جنگِ عظیم (۱۹۱۴ء) میں انگریزی حکومت سے پوری طرح تعاون کیا۔ ان کی انتہائی تمنا یہی تھی کہ:

"ہم چھوٹ گئے، عیش ہوگا اور ہوم رول ہوگا"

وہ ہوم رول کے مطالبے سے کبھی آگے نہیں بڑھے۔ زمانے کے حالات نے آگے بڑھ کر جو بیڑے اٹھائے اگر وہ زندہ رہتے تو ضرور ان سے متاثر ہوتے لیکن موت نے انہیں اتنا وقت نہ دیا کہ ان کا خلوص ان کی سنجیدگی سے مل کر کسی واضح بغاوت کی شکل اختیار کر سکتا۔ لیکن پھر بھی ان کی تحریروں نے قومی جذبات کے ابھارنے میں جو حصہ لیا وہ بہت کم ادیبوں کے حصے میں آیا۔

چکبست بڑے خوش وضع، ملنسار اور وفادار دوست تھے۔ ان کا شباب آریائی وجاہت کی تصویر تھا۔ لکھنؤ کی تراش خراش اور نوک پلک نے ان کی جامہ زیبی میں اور بھی چار چاند لگا رکھے تھے۔ بہت سنجیدہ اور چپ چاپ آدمی تھے۔ باتیں کم کرتے تھے لیکن خشک مزاج نہیں رکھتے تھے۔ طبیعت میں ظرافت بہت تھی۔ کھلکھلا کر بہت کم ہنستے لیکن خندۂ زیرلب سے کبھی ان کا چہرہ عاری نہیں ہوا۔ دوستوں اور بے تکلفوں کی صحبت میں ان کی سنجیدگی کبھی بار نہیں ہوئی بلکہ ان کی بذلہ سنجیوں نے روتوں کو ہنسایا اور مردہ دلوں کو زندگی کی آس بندھائی۔ پرانے زمانے کی تہذیب اور شائستگی سے ان کے فطری حسن اخلاق نے جلا پائی تھی۔ ان سب پر مستزاد ان کا دل تھا جس کا گوشہ گوشہ انسانیت سے معمور تھا۔ وہ سراپا اخلاق تھے۔ لکھنوی تہذیب اور معاشرت کے آب و رنگ نے اس میں اور بھی دل آویزی پیدا کر دی تھی۔ وہ اس وقت کے معاشرے کے تکلفات سے خالی نہ تھے لیکن ان تکلفات میں نقالی اور ذہنی غلامی کا شائبہ نہ تھا بلکہ ان کے جمالیاتی ذوق نے صرف دل و نگاہ کی تسکین کے لئے یہ رنگین نقاب ڈال رکھا تھا۔ وہ قدیم شرافت کا پتلا تھے اور زمانے کے غموں نے ان کے دل میں جو گداختگی پیدا کر دی تھی وہ اس روحانی شرافت میں روح بن کر ان کو سراپا انسان بنائے ہوئے تھی۔

چکبست ترقی پسند ادیب اور ریفارمر تھے لیکن بے راہ روی سے کوسوں دور تھے۔ انہوں نے ترقی اور اصلاح کے میدان میں بھی میانہ روی کو اپنا اصول بنایا۔ وہ تعلیم نسواں کے زبردست حامی تھے لیکن ان کی حمایت غیر مشروط نہ تھی۔ وہ زندگی کے ہر عمل کو اخلاق کی کسوٹی پر کستے تھے۔ تعلیم نسواں بھی ان کے نزدیک ہندوستانی اخلاق کی روایات سے آزاد نہیں ہو سکتی تھی۔ ہندوستانی خاتون کا جذبۂ وفا، شرم، غیرت اور خاندان پروری وہ نگینے ہیں جن کو وہ زیور نسوانیت کے لئے ضروری جانتے تھے۔ وہ عورت کو صرف "چراغ خانہ" بنا کر نہیں رکھنا چاہتے تھے لیکن وہ اس کے "شمع انجمن" بننے کے بھی حامی نہ تھے۔ ان کے نزدیک "امومت" اور اس کے فرائض کی بجا آوری عورت کا بڑا انسانی اور قومی فریضہ ہے جو تعلیم نسواں کو عہد حاضر کی خاتون کو سکھانا تھا۔ اپنی اولاد کی طرف سے مردوں کی بے اعتنائی دیکھ کر انہوں نے دختران ہند کو متوجہ کیا تھا کہ؎

اپنے بچوں کی خبر قوم کے مردوں کو نہیں
یہ ہیں معصوم انہیں بھول نہ جانا ہرگز

مرحوم اودھ پنچ کا حلقہ چکبست کا خاص حلقہ تھا اور وہ تمام ادیب جو اس حلقے میں شامل تھے ان کے خاص دوست تھے لیکن اودھ پنچ کے لہجے میں جو چٹ پٹا پن تھا اسے چکبست نے اپنی تحریروں میں اختیار نہیں کیا۔ ان کی فطرت جارحانہ نہیں تھی اس لئے وہ شدید اختلاف کے باوجود کسی کا دل ہنسی مذاق میں بھی دکھا نہیں سکتے تھے۔

چکبست نے گلزار نسیم کو ایڈٹ کر کے ایک دیباچہ لکھا۔ عبدالحلیم شرر نے اس دیباچہ پر بڑی چوٹیں کیں۔ چکبست نے اس کا جواب لکھا اور جواب الجواب بھی لیکن تندیٔ استدلال کے باوجود کہیں تلخی نہیں آنے دی۔ ان کے اوپر بعض حلقوں سے کچھ غیر اصولی اور نامناسب حملے ہوئے لیکن انہوں نے صبر اور ضبط کا دامن ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ ان کی تحریروں میں شروع سے آخر تک سچا تنقیدی وقار قائم رہا۔ جب گرما گرمی بہت بڑھی تو انہوں نے بڑی شرافت سے لکھا:

"جناب شرر اطمینان رکھیں کہ جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے میرے قلم سے ایک فقرہ بھی ایسا نہ نکلے گا جس سے کسی بندۂ خدا کی توہین مقصود ہو۔"

یہ "بندۂ خدا" چکبست کا محبوب تھا۔ وہ اس کی خدمت کو خدا کی پرستش کا ایک ذریعہ سمجھتے تھے۔ وہ ہندو تھے لیکن اس سے پہلے انسان تھے۔

اس لئے وہ سب کے لئے یا کسی کے لئے غیر نہ تھے۔ کوئی ایسی بات جو کسی کی دل آزاری کا موجب ہو ان کے نزدیک روا نہ تھی۔ وہ مذہب کو بھی انسانیت اور انسان نوازی کی کسوٹی پر پرکھتے تھے۔ انھوں نے اپنے مذہبی تصور اور رجحان کو کس مزے میں سمجھایا ہے ؎

ہمارے اور زاہدوں کے مذہب میں فرق اگر ہے تو اس قدر ہے
کہیں گے ہم جس کو پاسِ انساں وہ اس کو خوفِ خدا کہیں گے (چکبست)

چکبست نے بہت کمایا لیکن کبھی ایک پیسہ جمع نہیں کیا۔ وہ اپنے بڑے بھائی پنڈت مہاراج نرائن چکبست کے ساتھ رہتے تھے۔ ان کے صرف ایک لڑکی تھی۔ پنڈت مہاراج نرائن کے کئی لڑکے تھے۔ یہ سب چچیرے بھائی بہن ساتھ ساتھ رہتے اور سگے بھائیوں اور بہنوں کی طرح پرورش پاتے تھے۔ چکبست کو اپنے بڑے بھائی پنڈت مہاراج نرائن سے بڑی محبت تھی۔ اچھی خاصی آمدنی رکھنے کے باوجود کبھی ان کے دل میں خیال بھی نہ آیا کہ اپنی بیوی اور تنہا بچی کو لے کر الگ رہیں اور عیش سے زندگی بسر کریں۔ ایسے وفادار، محبت پرست اور کنبہ پرور بھائی کی موت پنڈت مہاراج نرائن کے لئے بڑا حادثہ تھی۔ چکبست کے انتقال کے وقت ان کی بچی چھوٹی تھی۔ اس کی شادی کے فرائض پنڈت مہاراج نرائن نے انجام دیئے۔ چکبست کا غم ابھی تک ان کے خاندان میں تازہ ہے۔ ان کے بھتیجے ابھی تک اپنے مرحوم چچا کو ویسے ہی یاد کرتے ہیں جیسے اپنے باپ پنڈت مہاراج نرائن کو یاد کرتے ہوں گے۔ ان دونوں بھائیوں نے برادر نوازی اور کنبہ پروری کی جو مثال قائم کی اس نے اس خاندان کو بڑھنے، پھلنے، پھولنے اور ترقی کرنے کا ہنر سکھا دیا۔ آج چکبست برادران موجود نہیں ہیں لیکن ان کا فیضان ان کے خاندان میں جاری ہے اور کشمیری برہمنوں کی اس شاخ کی ترقی کا ضامن ہے۔

چکبست نے وکالت بھی کی اور روپیہ بھی خوب پیدا کیا۔ لیکن اس پیشے میں جتنے گہرے ہوتے گئے ان کی شعر و ادب کی تشنگی اور بڑھتی گئی۔ اتنے بڑے خاندان کی پرورش اور اتنے بچوں کی تعلیم و تربیت کے لئے روپے کی ضرورت تھی اس لئے ترکِ دنیا میں کوئی مصلحت نہ تھی۔ لیکن دنیا اپنی تمام رعنائیوں کے باوجود ان کی آخری منزل نہ بن سکی۔ ان کو پیشے کی مصروفیت میں برابر اس کا خیال رہا کہ وہ اپنی اصل منزل سے دور ہوتے جاتے ہیں۔ انھوں نے اپنے انتقال سے ایک یا دو روز پہلے بارہ بنکی کی عدالت ججی میں شیخ ممتاز حسین جونپوری سے جو اس وقت بارہ بنکی کی عدالت ججی میں ایک معزز عہدے پر فائز تھے کہا تھا کہ آپ مجھے غالب کا ایک فارسی شعر لکھ دیجئے تاکہ میں ہر وقت اسے اپنی میز پر رکھوں اور پیشے کی مصروفیت کو اپنے ذوقِ علم و ادب پر غالب نہ آنے دوں۔ چکبست نے غالب کے اصل شعر میں تھوڑی سی ترمیم کر کے شیخ صاحب کے حوالے کیا۔ انھوں نے یہ شعر اس طرح لکھا تھا ؎

دل از بابِ سخن گم کردہ پابندِ غمِ ناں شد[1]
زراعت گاہِ دہقاں می شود چوں باغ ویراں شد

شیخ ممتاز حسین جونپوری اعلیٰ درجے کے خوشنویس ہیں۔ وہ اپنے عزیز دوست کی یہ فرمائش پوری نہ کر پائے تھے کہ چکبست کے انتقال کی خبر آئی۔ انھوں نے چکبست کے لکھے ہوئے شعر کو یادگارِ حبیب کے طور پر محفوظ رکھا تھا لیکن وہ کہیں تلف ہو گیا۔ اگر ہوتا تو ادبِ اردو کے طالب علم کے لئے تبرک کے طور پر کام آتا۔

عدالت کی قانونی مصروفیت میں بھی چکبست کا ذوقِ سخن دلچسپی کی کوئی نہ کوئی راہ نکال لیتا تھا۔ وہ جب کام کرتے کرتے تھک جاتے تو بعض سخن فہم اور سخن سنج اہلکاروں کے پاس جا بیٹھتے۔ مصرعے پر مصرعے دیے جاتے۔ گرہیں لگائی جاتیں۔ کچھ کام کی باتیں ہوتیں۔ کچھ لطیفے ہوتے اور فضا میں ان کی بدولت ایک ہلکی سی شعریت پیدا ہو جاتی۔ اس زمانے میں عدالت خفیہ میں ایک منصرم تھے۔ ان کا نام پیارے لال تھا۔ وہ چکبست کے شاعرانہ کمال کے قائل نہ تھے البتہ انھوں نے

---

[1] غالب کا اصل شعر غالباً یوں ہے ؎
دل از بابِ طرب گم کردہ پابندِ غمِ ناں شد   زراعت گاہِ دہقاں می شود چوں باغ ویراں شد

چکبست کو ایک مصرعہ دیا اور فرمائش کی کہ اس پر گرہ لگائیں۔ مصرعہ یہ تھا ؎

"رنگ گل سے بلبل کے پر باندھتے ہیں"

چکبست نے مسکرا کر گرہ کا مصرعہ لگا کر شعر لکھ دیا ؎

نفیسفر عدت میں اکثر کے پیچھے
رنگ گل سے بلبل کے پر باندھتے ہیں

پیارے لال عزیب پر جو کچھ بھی اثر ہوا ہو لیکن پورا دفتر اس برجستہ گرہ سے بہت محظوظ ہوا۔ ان کی یہی خوش مزاجی تھی جس نے ان کو عدالتوں کی بدمگی پھیکی فضا میں بھی ہر دلعزیز بنا دیا تھا اور جب ان کی ناگہانی وفات کی خبر آئی تو وہ بھی رو دیے جن کی آنکھیں برسوں سے مسلیں دیکھنے کے سوا رونا اور ہنسنا سب کچھ بھول چکی تھیں۔

شعر و ادب کا قافلہ اب بہت آگے بڑھ چکا ہے لیکن راہ میں اس نے جو مزار دیکھے ہیں وہ اسے ہمیشہ یاد آئیں گے۔ آگے کی راہ کتنی ہی پرخطر اور ویران کیوں نہ ہو کھوئی ہوئی محبتوں کی یہ غیر فانی یادگاریں ہماری رہنمائی کریں گی۔ آج چکبست ہم میں نہیں ہیں لیکن جو تصنیفات انہوں نے آنے والی نسلوں کے لئے چھوڑے ہیں وہ ہماری ادبی اور قومی زندگی کا بڑا قیمتی سرمایہ ہیں۔

مولانا احسن مارہروی مرحوم

جمیل زبیری

شہروں کی ہماہمی سے دور یوپی کے ایک چھوٹے سے ضلع ایٹہ میں ایک چھوٹا سا قصبہ مارہرہ ہے جسے بہت سے لوگ مارہرہ شریف کے نام سے بھی یاد کرتے ہیں۔ عجیب مردم خیز علاقہ ہے۔ مولانا احسن مرحوم جن کا اصل نام سید شاہ علی احسن تھا اسی چھوٹے سے قصبہ کے رہنے والے تھے۔ میں نے انھیں پہلی بار اس وقت دیکھا جب میری عمر مشکل سے آٹھ یا دس سال ہوگی۔ مجھے خوب یاد ہے رمضان کا مہینہ تھا۔ میں اپنے نانا (صدیق حسن صدیقی جو خود بھی شاعر ہیں اور مولانا احسن کے شاگرد ہیں) کے ہمراہ مولانا کے گھر پہونچا۔ پرانی وضع کے ایک بڑے پھاٹک سے ہم لوگ مولانا کی بیرونی حویلی میں داخل ہوئے ہمارے سیدھے ہاتھ پر ایک دالان تھا جس میں چند کرسیاں پڑی تھیں۔ سامنے ایک چبوترہ تھا جس پر ایک لمبی نیچی سی چوکی بچھی تھی جس پر نہایت صاف دھلی ہوئی ایک چادر پڑی تھی۔ چوکی کے اطراف چھوٹے مونڈھے اور کرسیاں رکھی تھیں جن پر چند اشخاص [illegible] بیٹھے تھے چوکی کے سرے پر بڑے پھاٹک کی طرف پیٹھ کئے ایک نہایت وجیہ انسان ایک مونڈھے پر بیٹھا تھا۔ میرے نانا نے داخل ہوتے ہی مجھے بتا دیا تھا کہ یہی مولانا احسن ہیں۔ میں نے قریب پہونچ کر انھیں سلام کیا اور دیر تک ان کی طرف دیکھتا رہا۔ میں ان کی شخصیت سے کچھ ایسا مرعوب اور اس وقت کے ماحول سے کچھ ایسا متاثر ہوا کہ گو اس واقعہ کو آج تقریباً ۱۶ یا ۱۷ سال گذر چکے ہیں مگر ان کے جسم کا وہ نفیس کرتہ، وہ ہلکے سبز رنگ کا تہبند اور ان کے سیدھے ہاتھ پر سلگتا ہوا حقہ اور مولانا کا ہکلا ہکلا کر جلدی جلدی بولنا مجھے اس طرح یاد ہے جیسے آج کی بات ہے۔ ہمیں دیکھ کر مسکرائے۔ نانا کو قریب ہی بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ مجھے قریب بلا کر پیٹھ ٹھونکی اور علیم اللہ (مولانا کا دیرینہ ملازم تھا) کو آواز دی "علیم اللہ علیم اللہ ہمارے بیٹے کے لئے ایک مونڈھا ہمارے قریب رکھ دو" اور مجھے بالکل اپنے پاس بٹھا لیا۔ اسی اثناء میں کچھ اور لوگ بھی آگئے۔ معلوم ہوتا تھا کوئی بڑی پر تکلف دعوت ہے۔ افطار کا وقت قریب تھا۔ چوکی پر طرح طرح کی چیزیں تھیں جن میں پکوان، مٹھائیاں، پھل، کھجوریں اور دہی بڑے غرض کہ ہر ایک چیز شامل تھی موجود تھیں اور لوگ مؤذن کی صدا کے منتظر تھے۔ ہر آنے والے کو خوش آمدید کہتے اور مزاج پرسی کرنے کے بعد بیٹھنے کا اشارہ کرتے۔ میں خاموش بیٹھا کبھی ان کی طرف کبھی دہی بڑوں کی طرف اور کبھی دیگر افراد کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ایک دفعہ میری طرف دیکھ کر مسکرائے اور ذرا سا جھک کر پوچھا "کیوں بیٹے تمہارا روزہ ہے؟" میں خاموش رہا۔ گو موجودہ اشخاص میں سے کسی کی طرح میں بھی گھر سے منہ بالکل صاف کر کے اور چہرہ پر روزے کے آثار پیدا کر کے چلا تھا۔ مگر میری کم عمری [illegible] نہ چھپا سکی۔ وہ خود ہی ہنس کر کہنے لگے "ایک آدھ روزہ کا ہوگا" پھر اور لوگوں سے محو گفتگو ہو گئے۔ روزہ کشائی کے بعد جماعت

کھڑی ہوئی۔ نماز خود انھوں نے ہی پڑھائی۔ نماز سے فارغ ہو کر امام کرسی پر دراز ہو گئے۔ علیم اللہ نے کٹا ہوا پان لایا۔ وہ کھا کر حقہ قریب
کر لیا اور پھر گفتگو شروع ہو گئی مجھے ان کی گفتگو سے کوئی دلچسپی پیدا نہیں ہوئی کیونکہ اول تو وہ بہت جلدی جلدی بولتے تھے دوسرے ان کی گفتگو میری
چھوٹی سی سمجھ سے بالاتر تھی۔ میں حیران و پریشان ادھر ادھر دیکھتا رہا اور جب نانا نے میری آنکھوں میں نیند کے آثار دیکھے تو مولانا سے رخصت
لے کر چلے آئے۔ چلتے وقت مرحوم نے فرمایا۔ "صدیق کل ضرور آنا۔"

اور یہ سلسلہ پورے مہینے جاری رہا۔ میں نانا کے ہمراہ دو تین مرتبہ اور گیا اور اس محفل کو ہمیشہ اسی طرح پایا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب مولانا مرحوم
علی گڑھ یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں لکچرر کی حیثیت سے کام کرتے تھے اور تقریباً ہر سال پورے ماہِ رمضان کی چھٹی لیکر مارہرہ آجاتے تھے۔ جہاں ان کی تفریح
طبع اور عبادت کا بہت کچھ سامان موجود تھا۔ گھر کے نزدیک ہی ایک بڑی مسجد تھی جس میں وہ تراویح پڑھتے تھے اور چونکہ خود بھی حافظ تھے اس لئے کبھی کبھی خود بھی
کلام مجید سناتے تھے ستائیسویں روزے کو بڑی دھوم سے شبینہ کرتے تھے جس میں جلیبیاں بانٹی جاتی تھیں۔ شبینے کے سلسلے میں مجھے ایک اور واقعہ یاد
آگیا جسے میں نے اپنے والد کی زبانی سنا تھا۔ جس محلے میں ہمارا مکان تھا اس کی مسجد کے ایک امام تھے جنکا نام حافظ عبدالحمید تھا مگر لوگ انھیں گلاؤٹھی
والے حافظ جی کہا کرتے تھے۔ وہ بڑے پُر مذاق اور زندہ دل انسان تھے۔ ایک رات اپنی مسجد میں تراویح ختم کر کے میرے والد سے کہا "چلو، لبستی
(بستی اس محلے کا نام ہے جہاں مولانا رہتے تھے) میں شبینہ ہے وہاں چلتے ہیں۔" لبستی کی مسجد میں مولانا احسن جنھیں مارہرہ کے لوگ 'شاہ میاں' کے نام سے
یاد کرتے تھے تراویح میں موجود تھے اور اگلی صف میں سرے پر کھڑے تھے۔ حافظ جی جماعت کے دوران میں ہی ان کے قریب پہونچے اور کان سے
بھابر منہ لیجا کر کہنے لگے۔ " اس کے بعد میں سناؤنگا "۔ مولانا کو نماز میں غصہ آگیا اور نیت توڑ کر کہنے لگے " لاحول ولا قوۃ، لاحول ولا قوۃ۔ نماز خراب کر دی"
اور پھر نیت باندھ لی۔ حافظ جی سر پر پاؤں رکھکر بھاگے اور اپنے گھر پہنچ کر دم لیا۔ مگر تھوڑی دیر بعد معلوم ہوا کہ احسن صاحب کا آدمی حافظ جی کو بلانے آیا ہے۔
انھوں نے کہلوایا تھا "آپ کا انتظار ہو رہا ہے۔ آکر قرآن ختم کرا دیجئے" اور حافظ صاحب کو جانا پڑا۔ یہ انکا اخلاق تھا جو مرحوم کی زندگی کی سب سے نمایاں
خصوصیت تھی یہ چیز انھیں اپنے آباواجداد سے ورثے میں ملی تھی۔ مولانا مرحوم کا خاندانی تعلق سادات بلگرام سے تھا سید شاہ برکت اللہ جو مولانا کے
جدامجد تھے۔ سترھویں صدی کے آخیر یا اٹھارہویں صدی کے شروع میں بلگرام سے مارہرہ تشریف لائے تھے۔ بلگرام خود وہ جگہ ہے جہاں کا ہر فرد بقول غالب
جوہر قابل کہے جانے کا مستحق ہے۔ مولانا کے بزرگوں میں حضرت صاحب عالم اور حضرت شاہ عالم بڑے عالم بزرگ گذرے ہیں۔ مارہرہ کی مشہور درگاہیں
ہیں جن کی وجہ سے 'مارہرہ' مارہرہ شریف کہلاتا ہے۔ انہی تمام بزرگوں کے مزار ہیں۔

مولانا مرحوم سادات مارہرہ میں سے وہ پہلے شخص تھے جنھوں نے انگریزی تعلیم کی ضرورت کو محسوس کیا اور جدید خیالات سے فائدہ اٹھانے کی
کوشش کی گو وہ خود انگریزی تعلیم حاصل نہ کر سکے مگر قدیم و جدید کی کشمکش میں انھوں نے ایک توازن قائم رکھنے کی کوشش کی اور ذاتی صلاحیت اور ذوق کی
بدولت دونوں کے درمیان ایک معتدل راہ تلاش کرنے میں کسی حد تک کامیاب بھی ہوئے۔ ان کے لئے یہ خاصہ دشوار کام تھا کیونکہ بچپن سے ان کی تعلیم بالکل
پرانی وضع پر ہوئی تھی۔ مولانا نے خود اپنی ایک نظم میں اپنے بچپن کا ایک واقعہ لکھا ہے جس سے اس زمانے کے علمی رواج کا اندازہ ہوتا ہے۔

علی گڑھ کالج قائم ہونے کے بعد جگہ جگہ انگریزی اسکول کھلنا شروع ہوئے اور اسی کے زیر اثر مارہرہ میں بھی مولانا کے گھر کے نزدیک ہی ایک اسکول کھلا۔
حصولِ علم کا شوق تو تھا ہی۔ اس اسکول میں بیٹھنا شروع کر دیا۔ ایک ترکی ٹوپی اور ایک انگریزی پہاڑہ بھی خرید لی۔ شدہ شدہ جب ان کے والد بزرگوار کو اطلاع
پہونچی کہ صاحب زادے نے انگریزی اسکول میں جانا شروع کر دیا ہے تو بہت ناراض ہوئے۔ اور نہ صرف انھیں مارا پیٹا ہی بلکہ کتاب اور ٹوپی بھی چھین لی اور
ہدایت کی کہ آئندہ ایسی جرأت نہ ہو۔ اس واقعہ کے چالیس سال بعد ۱۹۲۹ء میں مولانا نے اس واقعہ کو اس طرح نظم کیا۔

"سرسید کا فیض جاری"

سن نواسی عیسوی گذرے ہتے چالیسؔ سال ❖ ❖ ❖ اس زمانے کے رواج علم کا کہتا ہوں حال

میرا مسکن تھا جو پسٹنے دو صدی سے خانقاہ — زیب سجادہ تھے اس میں عارفانِ دیں پناہ
اس احاطے ہی میں اک اسکول انگریزی کھلا — درس لینے کے لئے جس کی طرف عالم ڈھلا
میں کہ جس کی نوجوانی کا ہوا تھا عنفوان — اس نئی تعلیم کی خواہش میں دوڑا بے تکان
تھا نہ کوئی جسد مائل آمد و رشد کے لئے — بیٹھ جاتا تھا کتابیں لے کے رشد بد کے لئے
آتے جاتے دیکھنے والوں کی پڑتی تھی نظر — رفتہ رفتہ والدِ ماجد کو بھی پہنچی خبر
میرے اس شوقِ تعلم پر بہت برہم ہوئے — اور بالتصریح ارشادات یہ پیہم ہوئے
"تجھکو انگریزی نہ پڑھنے دیںگے ہم او روسیاہ — مار ڈالیں گے جواب اٹھی ادھر تیری نگاہ
ہے غضب جس گھر میں وردِ منقی[1] و شمسیہ رہے — اس میں انگریزی کی یہ گٹ پٹ رہے ہم چپ رہے
سیکھتا ہے ان کا فن جو بولتے ہیں ڈیم[2] فول — تجھکو نامعقول پڑھنا چاہئے قال اقول"

مجھکو ان احکام کی تعمیل کرتے ہی بنی
زندہ رہ کر عالمِ فانی میں مرتے ہی بنی

اسی نظم کے آخری مصرع سے ظاہر ہوتا ہے کہ انھیں انگریزی تعلیم حاصل نہ کر سکنے کا برابر احساس رہا اور نئے اور پرانے رجحانات کے درمیان ایک میانہ راہ قائم کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ وہ اس کوشش میں کہاں تک کامیاب ہوئے اس کا اندازہ ان کے اس قسم کے اشعار سے کیا جا سکتا ہے ؎

یہ شوق اضطراب تماشا دیکھنا — اُنسے جواب خط کا منگایا ہے تار پر

اس میانہ روی کا ذکر انھوں نے ایک مرتبہ اپنے رسالے "فصیح الملک" میں اس طرح کیا ہے۔

"اس میں شک نہیں کہ ہر معاملے میں افراط و تفریط بری ہوتی ہے۔ آجکل اکثر نئی و پرانی دونوں شاعریاں[3] اس طرح کی جاتی ہیں جن میں کوئی خاص اور تازہ لطف نہیں پایا جاتا۔ الا ماشاء اللہ ہم نئی شاعری کے مخالف نہیں ہیں .... فصیح الملک میں یہ کوشش کی جائے گی کہ ایشیائی پرانی طرز کے سوا نئے خیالوں کی ایسی نظمیں شائع ہوں جو پرانے اور نئے دونوں اہل مذاق کی دلچسپی کے لئے موزوں ہو سکیں اور اس کے واسطے یہ معیار ہے کہ خیال نیا اور نیچرل ہو مگر طرز بیان، ترکیبیں اور قیود وہی ہوں جن کی ایشیائی طبیعتیں عادی ہیں"

ادب میں میانہ روی قائم رکھنے کی برابر کوشش کی۔ انھیں اپنے خاندانی وقار اور پرانی روایات کا بڑا احساس تھا اور اس کے رکھ رکھاؤ میں کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھتے تھے۔ ہر ملنے والے سے بڑی محبت اور تواضع سے ملتے تھے اور بہت جلد ہی بے تکلف ہو جاتے تھے۔ مگر کسی قسم کی بیہودگی یا بدمذاقی روا نہیں رکھتے تھے۔ پرانے اخلاق کا مکمل نمونہ تھے۔ اگر کوئی دوسرا ان کے معیار سے گری ہوئی بات کر بیٹھتا تو ان کے چہرے سے ناگواری کا احساس ہونے لگتا تھا اور بسا اوقات صاف دلی سے اس کا اظہار کر دیتے تھے۔

---

[1] ورد و تلاوت منطق کے قسم کی دوا مثالیں ہیں۔
[2] مولانا کو اس نظم میں انگریزی کا یہ لفظ نہیں استعمال کرنا چاہئے تھا۔
[3] مولانا کے قلم سے اس لفظ کا نکل جانا سخت حیرت کی بات ہے۔

رشید احمد صدیقی صاحب نے اپنے ایک مضمون میں مولانا کا ایک واقعہ اس طرح لکھا ہے۔
"مسوری جانے والوں کو معلوم ہے کہ وہاں "موسم گرما" میں کس کس قسم کے وحوش وطیور کہاں کہاں سے کھچ کر آتے ہیں اور صید و صیاد، دانہ و دام، تمنا و تماشا کی کیسی کیسی نیرنگیوں سے سابقہ ہوتا ہے۔ یہاں ایک سالانہ مشاعرہ بھی ہوتا ہے۔ ایک مشاعرہ میں مولانا بھی شریک تھے۔ سامنے کی صف اول میں وہ سب کچھ تھا جس کی ترجمانی ایک شعر میں ہوتی ہے جو میرے بچپن میں بزرگوں میں بہت مقبول تھا۔ اس کا ایک مصرعہ مجھے اب تک یاد ہے۔

ع کہاں لیجاؤں دل دونوں جہاں میں سخت مشکل ہے

مولانا کی باری آئی۔ بھلے مانسوں کی طرح سیدھے سادے لب ولہجہ میں یہ رباعی پڑھی ؎

سازندوں کے انداز کہاں سے لاؤں
بجتی ہوئی آواز کہاں سے لاؤں
فرمائیں معاف نوجوانانِ سخن!
بوڑھا ہوں نیا ساز کہاں سے لاؤں[1]

سننے والے اچھل پڑے اور مجمع میں ایک ہمہمہ سا پیدا ہو گیا اس کے بعد طرح میں غزل پڑھنی شروع کی جس کے ایک شعر پر جو صف اول کو مدنظر رکھ کر پڑھا گیا مجمع سے وہ نعرۂ تحسین و تہنیت بلند ہوا کہ دیر تک کان پڑی آواز نہیں سنائی دی ؎

ملتی ہے امیروں میں ترے حسن کی دولت
یہ مصرفِ خیرات سمجھ میں نہیں آتا"

مولانا کی کلاس میں اکثر طلباء شوخیاں کر بیٹھتے تھے اور مولانا برہم ہو جاتے تھے اور کلاس سے چلے جاتے تھے۔ ایک دفعہ رشید صاحب صدیقی سے جو شعبۂ اردو کے صدر تھے کہنے لگے[2] "رشید صاحب۔ طلباء پڑھنے نہیں آتے۔ وقت گذاری اور تفنن طبع کے لئے آتے ہیں۔ یہ دنیا میں جو چاہے کریں علم تو ان کو آنے کا نہیں" مولانا کے پڑھانے کا طریقہ پرانا تھا وہ بالکل معلم بن کر پڑھاتے تھے اور طالب علموں سے اس قسم کے آداب کی توقع رکھتے تھے جو خود مرحوم نے استادوں کے ساتھ اپنی طالب علمی کے زمانے میں رکھے تھے۔

مولانا احسن مرحوم جس طرح خوش پوشاک تھے اسی طرح خوش خوراک بھی تھے اور اچھے کھانوں کا بہت شوق تھا۔ اسی طرح انہیں چائے سے بھی عشق تھا۔ لوگوں کا خیال ہے کہ یہ صرف شکر کھانے کا بہانا تھا اور اسی شوق نے انھیں ذیابیطس کے مرض میں مبتلا کر رکھا تھا۔ آموں سے بھی اسی طرح رغبت تھی۔ گو آم کھانے سے ان کے سارے جسم پر پھنسیاں نکل آتی تھیں مگر فصل بھر دونوں وقت کھانے کے بعد آموں کا ہونا لازمی تھا۔

ایک مرتبہ میں پوری میں مشاعرہ تھا۔ مارہرہ سے پوری ایک لاری بھر کر لوگ مشاعرے کی شرکت کے لئے روانہ ہوئے۔ مولانا بھی ہم سفر تھے راستے میں شکار پور پر لاری ٹھہری۔ کھانے کا وقت ہو چکا تھا مولانا نے کسی سے کہا "جاؤ کھانا لے آؤ" جو شخص کھانا لینے گیا وہ صرف اپنے اور مولانا کے واسطے کھانا لیکر واپس آ گیا۔ مولانا نے پھر دوسرے آدمی کو بھیجا۔ وہ صرف اپنے واسطے کھانا لے کر واپس آ گیا۔ مولانا کو غصہ آ گیا۔ گھبرا کر لاحول پڑھی اور کہنے لگے "شکار پور

---

[1] اس مشاعرے میں ساز نقاؔ بھی موجود تھے۔
[2] یہ واقعہ بھی رشید احمد صدیقی صاحب نے اپنے اسی مضمون میں لکھا ہے جس کا اوپر تذکرہ آ چکا ہے۔

آکر سب شکار یوں ہی چھوڑ گئے "میں خود جاتا ہوں" اور روانہ ہو گئے تھوڑی دیر میں پورے اشخاص آدمیوں کے لئے کھانا لادا کے رکھ دئیے اور یہ بھول گئے کہ تین شخص کا کھانا پہلے بھی آ چکا ہے۔ سب دل ہی دل میں مسکرا کر چپ ہو گئے مگر کسی کی ہمت نہ پڑی جو مولانا کا جلا خود انہی پر دہرا سکتا۔

مولانا کو شاعری کا شوق بچپن ہی سے تھا۔ ۱۸ سال کی عمر میں داغ کے شاگرد ہو گئے اور اپنی غزلیں بغرض اصلاح انھیں بھیجتے رہے ۱۸۹۶ء میں اپنی غزلیات کا پہلا مجموعہ "ریاض سخن" کے نام سے شائع کیا اور اس کو نواب صاحب ٹونک کی خدمت میں پیش کرکے داد تحسین حاصل کی۔ نواب صاحب نے بعد میں اس کا نام بدل کر "ریاض سخن" کی بجائے "ریاض خلیل" رکھ دیا۔

اس بات کو دہرایا جاتی ہے کہ احسن مرحوم نے جو وقت اپنے استاد کے ساتھ حیدرآباد دکن میں گذارا وہ ان کی زندگی کا کس قدر اہم دور ہے۔

ان کی شاعری پر داغ کا کس قدر اثر ہے اس کا اندازہ حسب ذیل اشعار سے لگایا جا سکتا ہے ؎

کسی کو بھیج کر خط ہائے کیسا یہ عتاب آیا
کہ ہر اک پوچھتا ہے "نامہ بر آیا" جواب آیا

تجھکو اے پیماں شکن پاس وفا کچھ بھی نہیں
بارہا تو نے کہا سب کچھ، کیا کچھ بھی نہیں

کوئی دیکھے یہ تماشائے تکلف کب تک
ہو چکا پردہ بس اب آؤ ادھر دیکھ لیا

لائے ہو جنازہ تو مجھے دفن بھی کر دو
اٹھے ہیں جہاں چار قدم ایک قدم اور

ڈوبی ہوئی نبضیں ہیں تو اکھڑی ہوئی سانسیں
کر پہنچے بیمار سے باتیں کوئی دم اور!!

اس اثر کو مولانا نے خود ہی ایک شعر میں باندھا ہے ؎

طرز چھپتی ہی نہیں داغ کے شاگردوں کی
احسن اوروں سے الگ ان کی زباں ہوتی ہے

داغ کا اثر نہ صرف ان کے شاگردوں تک محدود رہا بلکہ مولانا احسن کے شاگردوں تک نظر آتا ہے۔ اپنے استاد کی طرح مولانا کے بھی شاگردوں کا حلقہ کافی وسیع تھا اور سب میں تقریباً وہی رنگ پایا جاتا ہے۔

؎ گھر گھر مرا چرچا ہے دور دور مری رسوائی	کہتا ہے کوئی وحشی کوئی مجھے سودائی	(صدیق)
؎ آتا نہیں یقین کہ جا ہو گئے تم ایں	اچھا ذرا دکھاؤ تو جا ہیت بنا کے	(اختر)
؎ سوچ کیا ہے قتل میں تھوڑی تو شمشیر بھی	تم اگر بھولے ہو مجھ سے پوچھ تو تقصیر بھی	(منتظر)
؎ اکتا دو مجھ سے ہجر میں الزام زندگی	اچھا ہی ہوا کہ میں اچھا نہ ہو سکا!	(ابر)

احسن کو داغ کی صحبت میں برسوں رہنے کا اتفاق ہوا تھا۔ داغ کے انتقال کے بعد ان کی سوانح حیات کو ترتیب دینے کا کام انھوں نے اپنے ذمہ لیا اور اپنی زندگی کا ایک بڑا حصہ استاد کے نام اور کلام کو چمکانے میں صرف کر دیا۔ داغ کی شاعری سے جس طرح وہ واقف تھے کسی اور شخص کا ہونا ناممکن ہے۔ داغ پر گو شاعر تھے۔ ان کا پورا کلام چار ضخیم دیوانوں میں مرتب ہو چکا ہے۔ اس بات کی ضرورت تھی کہ اس کلام سے ایک اچھا انتخاب کیا جائے اور یہ کام بھی مولانا

احسن نے ہی کیا۔ داغ کی زندگی میں احسن ہر چیز میں ان کا ہاتھ بٹاتے تھے اکثر زیادہ تر اصلاحات حضرت احسن کے ہی ہاتھ کی لکھی ہوئی ہیں۔ اکثر خطوط کا جواب بھی آپ ہی دیا کرتے تھے۔ داغ کو خود بھی اس چیز کا اعتراف تھا اور انھوں نے احسن مرحوم کو اپنے ایک شعر میں اس طرح یاد کیا ہے

سید احسن جو میرے دوست بھی شاگرد بھی ہیں
جنکو اللہ نے دی فکر رسا، طبع رسا

مولانا زود گو شاعر تھے اور شاعری سے انھیں فطری لگاؤ تھا۔ لیکن ان کی طبیعت میں آمد کم اور آورد زیادہ تھی اور شاید یہی وجہ ہے کہ وہ ہر وقت اور ہر عالم میں شعر کہہ سکتے تھے یہ وہ فکر کرتے تھے مگر ان کی فکر پریشان حال شاعروں کی طرح نہ تھی۔ وہ اپنے فرائض کی ادائیگی میں مصروف رہتے، علمی و ادبی مسائل پر گفتگو کرتے رہتے مگر فکر شعر سے کبھی خالی نہیں رہتے تھے۔ جس زمانے میں وہ "شاہکار عثمانی"[1] مثنوی تیار کر رہے تھے ان کا یہ عالم تھا کہ یونیورسٹی کی شعبۂ اردو میں بیٹھے ہوئے ہیں ہر طرح کے طلباء اور دوستوں سے گفتگو بھی جاری ہے۔ علمی بحثوں میں بھی حصہ لے رہے ہیں۔ اور مثنوی بھی لکھی جا رہی ہے۔ اس مثنوی کے لکھنے میں مشکل سے تین یا چار دن صرف ہوئے ہونگے۔

وہ اپنے اوقات کے بہت پابند تھے۔ دراصل اس پابندیٔ اوقات میں ان کے پالے ملازم علیم اللہ کا بڑا ہاتھ تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ علیم اللہ خود گھڑی کی سوئی ہے۔ علیم اللہ سے مولانا کو بڑا لگاؤ تھا۔ اور آخیر میں انھوں نے اس کی بہن سے نکاح بھی کر لیا تھا جس سے ان کے ایک صاحبزادے[2] بھی تولد ہوئے جو حیات ہیں مگر چونکہ انھوں نے اپنے خاندانی وقار کو قائم نہیں رکھا اس لئے احسن مرحوم ان سے ہمیشہ ناراض رہتے تھے۔

۱۹۳۲ء میں رسالہ "ریاست" نے مختلف مشہور شاعروں سے درخواست کی تھی کہ وہ اپنے روزآنہ مشاغل کے بارے میں کچھ تحریر کریں۔ اس درخواست پر بہت سے شاعروں نے اپنے مشاغل کو نظم کرکے بھیجدیا تھا۔ مولانا احسن نے بھی اسی درخواست پر حسب ذیل غزل لکھی تھی

کیوں پوچھ رہا ہے کوئی احسن کے مشاغل — کیا حسن عمل دفتر عصیاں میں ملے گا
اوقات ہیں بے ضابطہ حالات ہیں بے ربط — ہر وقت وہ فکر و غم دوراں میں ملے گا
اس پر بھی ہے اصرار کسی کو تو وہ سن لے — آوارہ دورنگی کے بیاباں میں ملے گا
یا صبح کو ہوگا وہ مصلے پہ نمایاں — یا خفتہ کسی گوشۂ پنہاں میں ملے گا
جب تک نہ ڈھلے دو پہر اس وقت تک اسکو — ڈھونڈو گے تو وہ اطفال دبستاں میں ملے گا
دیکھو گے اگر دو بجے سے چار بجے تک — سوتا ہوا، بیٹھا ہوا، ایواں میں ملے گا
پھر چار بجے شام سے چھ سات بجے تک — مشغول ملاقات عزیزاں میں ملے گا
ہوگی پس مغرب جو تلاش اس کی تو اکثر — پڑھتا ہوا کچھ بزم شبستاں میں ملے گا

۱؎ دکن کے ایک اخبار میں چند مضامین شائع ہوئے تھے جو نواب حیدر آباد دکن کے چھوٹے بیٹے کی غیر متوقع وفات پر جوشش بگھاری نے لکھے تھے اور جن میں کچھ فرمودات نواب حیدرآباد کے بھی شامل تھے۔ مولانا نے انہی مضامین کو مثنوی کے پیرائے میں قلمبند کیا ہے۔

۲؎ ان کا نام رفیق ہے۔

ہوگا انھیں اوقات میں جو وقت میسّر — سرگرم عمل شعر کے میداں میں ملے گا
جب تا بہ کمر زلف شب آئیگی تو اس کو — پہلوئے سکوں، خواب پریشاں میں ملے گا

القصہ جو ہے آج یہاں محوِ تکلّم !
لب بستہ وہ کل شہر خموشاں میں ملے گا

ناظرین کو یاد ہوگا کہ اسی ردیف قافیئے میں حضرت جوشؔ ملیح آبادی نے بھی غزل کہی تھی جو مقبول عام ہے۔

مولانا کو مشاعروں کا بڑا شوق تھا۔ بڑے تکلف سے ان کا اہتمام کرتے تھے اور شعراء مہمانوں کی خاطر مدارات اس طرح کرتے تھے جیسے خود مولانا ہی کے ہاں کوئی تقریب ہو رہی ہے۔ مشاعروں میں اپنی غزلیں نہایت وضاحت سے زور دے دے کر پڑھتے تھے۔ ایک دفعہ مارہرہ کے چھوٹے سے اسکول[1] میں محفل مشاعرہ منعقد ہوئی۔ مولانا مرحوم اس کی صدارت فرما رہے تھے۔ حاضرین میں زیادہ مجمع اسکول کے طلباء کا تھا۔ میں بھی اسی اسکول میں پڑھتا تھا اور مشاعرے میں موجود تھا۔ شاعر کی حیثیت سے شریک ہونے کے شوق میں میں نے بھی اپنے نانا سے غزل کہوا کر پڑھی تھی۔ جب لوگ اپنی اپنی غزلیں پڑھ چکے تو حضرت احسنؔ نے اپنی غزل سنائی جو بالکل اسکول کے لڑکوں کے لئے لکھی گئی تھی۔ لڑکے چیخ چیخ کر انھیں داد دے رہے تھے۔ مولانا جوش میں آکر مسند سے آدھے کھڑے ہو ہو جاتے تھے۔ اس غزل کا ایک شعر مجھے اب بھی یاد ہے ؎

حکام بلائیں تو اندھیرے ہی سے اٹھ جائیں
اللہ بلائے تو سویرا نہیں ہوتا !

لڑکوں کی شوخی بہت بڑھ گئی اور وہ ناراض ہو کر مسند سے کھڑے ہو گئے اور مشاعرہ درہم برہم ہو گیا۔ وہ کہا کرتے تھے " اس طرح کے مشاعروں میں شرکت کرنے کے بعد میں عہد کر لیتا ہوں کہ اب آئندہ کبھی مشاعرے میں شرکت نہیں کرونگا مگر میرا یہ عہد بالکل اس حاملہ عورت کا سا ہوتا ہے جو دردِ زہ کی تکلیف میں مبتلا ہو کر ہمیشہ عہد کرتی ہے کہ آئندہ پھر بچہ نہیں جنے گی مگر تکلیف رفع ہونے کے بعد اپنے عہد کو بالکل بھول جاتی ہے"۔

احسنؔ مرحوم کا ادبی مذاق ستھرا تھا اور وہ فن شعر گوئی سے گہری واقفیت رکھتے تھے۔ جس پر کثرت مطالعہ سے برابر جلا ہوتی رہتی تھی۔ کتابوں سے انھیں عشق تھا اور اسی وجہ سے وہ اپنی کتابیں دوسروں کو عاریتاً دینے میں بھی تکلف کرتے تھے۔ کتابیں جمع کرنے اور مطالعہ کرنے میں انھیں روحانی لذت حاصل ہوتی تھی۔ قدیم اور جدید مصنفین اور مولفین کی بیشتر تصانیف مولانا کے ذاتی کتب خانے میں موجود تھیں۔ مولانا کو اگر پتہ چلتا کہ شعر و ادب اور تاریخ زبان پر کہیں کوئی کتاب نئی لکھی گئی ہے تو انھیں اس وقت تک چین نہیں آتا تھا جب تک اس کا مطالعہ نہ کر لیں! ان کی وفات کے بعد انکے صاحبزادگان نے وصیت کے مطابق ان کی تمام کتابیں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے کتب خانے کو دے دیں۔

مولانا نہ صرف شاعر ہی تھے بلکہ نثر میں بھی انکی خدمات کسی طرح نظر انداز نہیں کی جا سکتیں۔ اسکول اور کالج کے بیسیوں انتخاب مولانا کے قلم کے ہی رہین منت ہیں نثر میں انکا سب سے بڑا کارنامہ کلیات ولی کا دیباچہ (جس کی ضخامت ۱۰۴ صفحات ہے) تاریخ نثر اردو موسوم بہ منثورات اور "منتخب داغ" کا مقدمہ ہے۔

جناب مبشر علی صاحب صدیقی نے اپنے ایک مضمون میں کلیات کے بارے میں لکھا ہے کہ "تحقیق کا راستہ اتنا دشوار گذار ہے کہ یہاں چالاک سے چالاک رہبر ٹھوکر کھا جاتا ہے اور مولانا سے بھی کلیات مرتب کرنے میں کئی جگہ لغزشیں سرزد ہوئیں مگر انکے کارنامے پر اس سے کوئی اثر نہیں پڑتا"۔

---

[1] اس اسکول کا نام وکٹوریہ اسلامیہ اسکول تھا۔

علاوہ ازیں احسن مرحوم نے ایک اور دلچسپ سلسلہ "دماغ داحسن" کے نام سے شروع کیا تھا مگر اس کام کی ابتدا بہت دیر سے ہوئی اور اس کی
وجہ سے یہ کام مکمل نہ ہو سکا۔ اسی طرح مولانا نے ایک لغت کی ترتیب بھی شروع کی تھی جس کا نام "تصحیح اللغات" رکھا تھا افسوس کہ وہ بھی نامکمل رہ گئی۔ خطوط
کے اپنے مذہبی خیالات کو پہلی دفعہ کتابی صورت میں اپنی وفات سے تقریباً دو سال قبل شائع کیا تھا۔ اس کا نام "نگارنامہ عمر" ہے اور اس سے
امداد بھی تخریج ہوتے ہیں۔ مولانا نے تھوڑے عرصے لاہور میں لارنس ایم اے کے ساتھ مضامین جاوید کے ادارے میں بھی کام کیا اور مضامین جاوید کی پہلی
جلد کی ترتیب و تدوین میں بھی شامل تھے۔

احسن مرحوم صاحب طرز تھے مگر ان کی تحریر سلجھی ہوئی، رواں اور شگفتہ ہوتی تھی وہ عربی و فارسی کے دقیق الفاظ استعمال کرکے پڑھنے والوں پر
خواہ مخواہ اپنی قابلیت کا رعب ڈالنا نہ چاہتے تھے۔ ملاحظہ ہو:

"نیچرل شاعری کے حامی جو ہماری پرانی شاعری کی آنکھوں پر پٹی باندھ کر کند چھری سے ذبح کر رہے ہیں ان کو چند
داؤں بہت رسا ہیں۔ اور جہاں کہیں اس قسم کی بحث چھڑتی ہے تو وہ یا تو گل و بلبل کی داستان پارینہ کے بار بار
دہرانے کے شاکی ہوتے ہیں یا کمر و دہن کی فرضی تشبیہوں پر منہ آتے ہیں۔"

"مولانا عبدالحق کی طرح احسن مرحوم نے بھی اپنی نگارشات میں ہندی کے میٹھے میٹھے الفاظ بڑی خوبی سے استعمال کئے ہیں۔" ان کی خوبیوں میں ان کا
املا بھی شامل ہے جس پر انھوں نے ہمیشہ خاص توجہ دی۔

مرحوم کی مالی حالت کچھ بہت زیادہ اچھی نہیں تھی اور بسا اوقات انھیں مجبوراً اپنی تصانیف کو فروخت کرنا پڑا۔
جولائی سنہ ۱۹۳۰ء میں کل ہند اردو کانفرنس میں بریلی تشریف لے گئے۔ وہاں سے واپسی پر ان کی پیٹھ پر پھنسیاں نمودار ہوئیں یہی پھنسیاں آگے چل کر کاربنکل کی صورت
اختیار کر گئیں۔ یہ وہ زمانہ تھا جب وہ علی گڑھ سے مارہرہ منتقل ہو چکے تھے۔ بغرض علاج اپنے بیٹے کے پاس علی گڑھ گئے۔ جب وہاں کچھ افاقہ نہ ہوا تو اپنے
دوسرے بیٹے کے پاس جو پٹنہ میں ڈاکٹر تھے بغرض علاج پہنچے مگر ان کی ساری پیٹھ مجسم ایک پھوڑا بن چکی تھی جس کا اچھا ہونا ناممکن تھا۔ وفات سے ایک
ہفتہ قبل سے بے ہوشی کا عالم طاری ہو گیا تھا۔ آخر میں گردوں نے اپنا عمل بند کر دیا تھا۔ مرنے سے ذرا دیر پہلے آنکھیں کھولیں اور اسی بیٹے سے پوچھا
"کس پر مضمون لکھا جا رہا ہے؟" اور جواب کا انتظار کئے بغیر ہمیشہ کے لئے آنکھیں بند کر لیں۔ ان کی نعش مارہرہ لائی گئی اور انھیں ان کے بزرگوں کی جائے خاندانی
"درگاہ" میں سلا دیا گیا۔

کر دیا خاموش لیکن آج اس کو موت نے
آہ جو احسن جہاں میں یادگار داغ تھا

دیا نرائن نگم

ثاقب کان پوری

جس طرح مسلمانوں کی تعلیم کا سرسید کے بغیر اور اُردو کے تحفظ کا کوئی تصور عبدالحق کو علٰحدہ کرکے نہیں کیا جا سکتا، اسی طرح اُردو کی ادبی صحافت کا تصور منشی دیا نرائن کے بغیر ممکن ہی نہیں۔ عہد حاضر میں حسرت موہانی مرحوم اور منشی دیا نرائن نگم نے کان پور کی تجارتی فضا کو بہت کچھ ادبی رنگ میں رنگ دیا تھا۔ دیا نرائن نگم کی شخصیت تو کتنے ہی ادیبوں کے لئے کعبۂ مقصود تھی وہ یہاں طواف کرنے آئے یا پھر یہیں کے ہو کر رہ گئے، درگا سہائے سرورؔ، پیارے لال شاکرؔ، منشی پریم چند، نوبت رائے نظرؔ، احسن سنبھلی، ان سب سے کان پور کو دیا نرائن نگم کی وجہ سے قربت رہی۔

منشی دیا نرائن نگم سے میری پہلی ملاقات غالباً ۱۹۲۲ء میں ہوئی، یہ وہ زمانہ تھا جب میرے عزیز و محترم دوست جگر مرادآبادی کی شاعری اور خوش نوائی کا ادبی حلقوں میں نیا نیا چرچا ہوا تھا، ان کی رندی و سرمستی نے ادبی حلقوں کو تو چھوڑیئے، خانقاہوں، مدرسوں، ندوۃ العلماء اور سید سلیمان ندوی کے دل و دماغ میں بھی اپنا گھر بنا لیا تھا۔ جگر صاحب منشی دیا نرائن نگم کے یہاں ٹھہرے ہوتے تھے انہوں نے جناب کرشن سہائے صاحب وحشی کان پوری، استاذی مولانا احسن سنبھلی مرحوم، مولانا محمد حسین محوی اور ان کے وسیلے سے مجھے بھی بلایا کہ اگر اس نئے شاعر سے ملنا ہو، جگر صاحب سے بھی ملنے کا مجھے اشتیاق تھا اور منشی صاحب کو بھی دیکھنے کی تمنا تھی اکیونکہ وہ زمانہ میری ادبی زندگی کا ابتدائی زمانہ تھا، یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ نیا ادیب بڑے، ممتاز اور مشہور ادیبوں سے تعلق پیدا کرنے کے لئے کتنا بیتاب رہتا ہے، میں وحشی صاحب کے گھر پہنچا، بڑی خندہ پیشانی سے ملے، جگر صاحب سے تعارف ہوا اور پھر جگر صاحب نے ایک غزل پڑھنی شروع کی، "دل میرا" اور "حاصل میرا" ایک تو ان کے کلام کی گرمی اور دوسرے ان کے پڑھنے کا انداز، وحشی صاحب کرسی سے اتر کر فرش پر لوٹنے لگے، یہ بڑے صاحب دل بزرگ ہیں اور محفل شعر کو بس ایک لمحے میں بزم قوالی میں بدل دیتے ہیں، پھر یہ سب کچھ بڑی بے ساختگی سے ہوتا ہے، وہ مردانِ خوش فکر، کشتگانِ عشق اور تعبیدِ نظیری میں سے ایک ہیں، جگر صاحب غزل پڑھ رہے ہیں، وحشی صاحب آنکھیں بند کئے ہوئے فرش پر لوٹ رہے ہیں اور نعرے بلند کر رہے ہیں، عجیب منظر تھا وہ بھی، منشی صاحب پریشان ہو گئے، میری طرف دیکھا، میں نے کہا ـ "آپ پریشان نہ ہوں وہ حال میں ہیں اور یہ کوئی مرض نہیں ہے"

کی غزل ختم ہوئی تو وحشی صاحب پھر اسی دنیا میں لوٹ آئے اور کرسی پر بیٹھ گئے

وہ یوں مسکرائے جیسے مطمئن ہو گئے ہوں کہ جب جگر صاحب

گویا کچھ ہوا ہی نہیں۔

جگر صاحب کا قال اور وحشی

دیا نرائن نگم سے میری پہلی ملاقات ہوئی، لیکن اس ملاقات میں اُن سے زیادہ بات چیت نہ ہو سکی۔

صاحب کا حال ہمارے درمیان حائل ہو گیا لیکن میں نے اُن کے متعلق رائے ضرور قائم کی اور مجھے زندگی بھر اس رائے پر نظر ثانی کرنے کی ضرورت محسوس نہ ہوئی۔ اُردو زبان تو برصغیر کی بہترین روایات کا سنگم ہے ہی لیکن کچھ افراد بھی ایسے ملتے ہیں جو ہماری مشترکہ روایات کے امین ہوتے ہیں دیا نرائن نگم بھی اُن میں سے ایک تھے، وہ قیامت کے وضع دار تھے۔ جب پہلی بار میں نے انہیں دیکھا تو وہ کرتا اور چوڑی دار پائجامہ پہنے ہوئے تھے اور پھر میں نے ہمیشہ انہیں اسی لباس میں دیکھا، لباس کی یہ وضع داری ممکن ہے کہ بہت سے حضرات کے نزدیک کوئی اہمیت نہ رکھتی ہو لیکن میرے خیال میں تو یہ کردار کی پختگی کی علامت ہے، داخلی شخصیت کا ایک اہم خارجی عکس چشمے کے پیچھے دیا نرائن نگم کی آنکھیں ہمیشہ مسکراتی رہتی تھیں۔ یہ مسکراہٹ اور ہونٹوں کا تبسم ہی اُن کی گفتگو تھا۔ پہلی ملاقات میں انہوں نے اپنے ہاتھ سے ڈبے سے پان نکال کر مجھے دیا اور جب میں جب بھی ہم ملے اس رسم میں کبھی فرق نہ آیا بے تکلفی میں یہ تکلف ان کی وضع تھی۔

ہاں تو میں پہلی ملاقات کا ذکر کر رہا تھا۔ اس ملاقات کے بعد میں کئی بار اُن سے ملنے گیا ۱۹۳۴ء میں میرے استاد حضرت احسن سنبھلی "زمانہ" میں ملازم ہو گئے اور پھر تو تقریباً ہر دن زمانہ کے دفتر میں میرا آنا جانا ہو گیا۔ نگم آنجہانی سے بھی روزانہ کی ملاقاتیں ہونے لگیں۔ زمانے کا معیار وہ ہمیشہ بلند تر کرنے کی کوشش کرتے رہتے، انہیں اپنے بارے میں زیادہ خوش فہمی نہ تھی۔ یہ بھی اُن کی سچائی کی دلیل ہے اسی لئے وہ اُردو کے کسی ممتاز صاحب قلم کو ہمیشہ ادارہ زمانہ سے متعلق رکھتے۔ کم لوگوں کو شاید یہ بات معلوم ہو کہ درگا سہائے سرور، پیارے لال شاکر اور نوبت رائے نظر وغیرہ زمانہ کی ترتیب میں نگم آنجہانی کے معاون تھے۔ ان کے بعد احسن سنبھلی اور یعقوب کلام بی اے زمانہ کو ان کے ساتھ ترتیب دیتے رہے۔

زمانہ کا دفتر نگم آنجہانی کے مکان واقع نیا چوک ہی میں تھا، وہ اپنے رسالہ کا کام بڑی پابندی سے کرتے تھے اور اس زمانے میں بھی وہ میز کرسی پر بیٹھ کر دفتری انداز میں کام کیا کرتے تھے، احسن مرحوم مضامین وغیرہ دیکھتے تھے، اور نگم صاحب ادیبوں کو خود ہی خط لکھتے اور خطوط کے جواب دیتے، مضمون لکھنے سے وہ کانی ہچکچاتے تھے، لیکن خط بہت اچھے لکھتے تھے، اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کا خلوص کسی اور ادبی صنف کے پیکر میں ڈھل ہی نہ سکتا تھا۔ اُن کی شخصیت خطوط کے آئینے ہی میں نقش گری کر سکتی تھی۔ اُن کے خطوط میں اُن کی ساری ادائیں نظر آتی ہیں۔ اسی لئے اُردو کے تمام ادیبوں سے اُن کے بہترین تعلقات تھے، ان کے خط پڑھ کر وہ یہی سمجھتے جیسے نگم صاحب یہ سب باتیں آمنے سامنے بیٹھ کر کر رہے ہیں۔ زمانہ کے لکھنے والے ان سے بڑی محبت کرتے تھے اور محفل زمانہ سے زیادہ عرصے تک غیر حاضر رہنے کے متعلق سوچ بھی نہ سکتے تھے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب ایک بار میرے یہاں آئے اُن سے ملانے کے لئے چند دوستوں اور بزرگوں کو میں نے بلایا۔ نگم صاحب کو نہ بلا سکا۔ انہیں معلوم ہوا تو انہوں نے مجھے خط لکھا۔

عزیزی ثاقب صاحب

آپ سید زادے ہیں اور میں آپ کا حلقہ بگوش۔ آپ کا نہیں آپ کے بزرگوں کا۔ کاشی کے ساتھ کعبہ بھی میرا ہے۔ ہاں اب لکھوں تو کیا لکھوں، ڈاکٹر ذاکر حسین آئے اور آپ نے مجھے ہی نہ بلایا۔ اچھا شکایت پھر کروں گا۔ پہلے آپ کو نظیری کا ایک شعر سنا دوں۔

دیدہ ام دفتر بیاں سفا حرف بحرف
نام خوباں ہمہ ثبت است ہمیں نام تو نیست

کہئے اب بھی شکایت کی کوئی ضرورت ہے۔

آپ خانقاہ میں رہتے ہیں اور خانقاہوں کے "دروازے کبھی فقیروں پر بند نہیں ہوتے۔ شاید اب رسم و رہ خانقاہی بدل گئی ہو۔ اگر ایسا ہے تو مجھے اطلاع دیجئے۔ ممنون ہوں گا۔

دعاگو

دیا نرائن

ان چند سطروں میں تعلقات، خلوص، طنز اور شکایت کی ایک دنیا آباد ہے، یہ بات عجیب ہے کہ نگم صاحب خطوں میں اُردو اور فارسی کے اشعار تو برجستہ لکھتے تھے اور بڑے مناسب موقعوں پر مگر عام طور پر شعر ناموزوں پڑھتے تھے، تلفظ کا بھی کچھ ایسا ہی حساب تھا وہ کئی الفاظ بہت غلط بولتے تھے جیسے بشاش بَشاش کو ہَشاش بُشاش کہتے تھے۔ اسی طرح ایک مرتبہ کرشن سہائے وحشی کے مکان پر پریم چند آنجہانی، اصغر گونڈوی مرحوم ماسٹر عبدالصمد بزمی اور احسن مرحوم وغیرہ سب موجود تھے، نگم صاحب درگا سہائے سرور کا ذکر کرنے لگے، دوران شعر خوانی میں انہوں نے حبذا حبذا کو جنذا جنذا (ح کو ج سے اور ذ کو ن سے بدل دیا) کہا، سب ہی مسکرانے لگے۔ لیکن نگم صاحب سے کون کہتا۔

دیا نرائن نگم کو زمانہ سے بڑا گہرا لگاؤ تھا، یہ رسالہ اُن کی زندگی کا مقصد بھی تھا اور حاصل بھی ——— رسالے کا اپنا پریس تھا، عام طور پر انہیں زمانہ کا بانی سمجھا جاتا ہے، مگر یہ صحیح نہیں، گورنمنٹ ہائی اسکول کے ایک ہیڈ ماسٹر صاحب نے پنشن کے بعد غالباً سنہ ۱۹۰۳ء میں زمانہ کا اجرا کیا تھا جب وہ کانپور سے کلکتے جانے لگے تو یہ رسالہ نگم صاحب کے حوالے کر گئے اور انہوں نے زمانہ کو زمانہ بنا دیا۔ دیا نرائن نگم آنجہانی کے والد کچہری میں پیشکار تھے، وہ اپنے بیٹے کو وکیل بنانا چاہتے تھے لیکن نگم صاحب نے کبھی وکالت کے پیشے کو اچھا نہ سمجھا اور ادبی دنیا کے ہو کر رہ گئے۔

زمانہ کے علاوہ انہوں نے ہفت روزہ آزاد بھی نکالا، جو تقسیم ہند کے بعد تک جاری رہا، آزاد سنہ ۱۹۱۳ء میں جاری ہوا، اس کے اجرا کی تحریک مسجد مچھلی بازار کی شہادت سے ہوئی، دیا نرائن مسلمانوں کو اُن کا حق دلانا چاہتے تھے، انہوں نے بڑی بے باکی سے برطانوی شہنشاہیت کی سنگینوں تلے اپنی رائے کا اظہار کیا، وہ سچے نیشنلسٹ تھے۔ گاندھی جی کے بڑے معتقد، کانگرس کی ہر تحریک کے حامی۔ اسی لئے زمانہ میں نیشنلزم، ہندوستانی زبان، سوراج، مہاتما گاندھی اور ہندوستانی تمدن وغیرہ وغیرہ مسائل پر اکثر مضامین شائع ہوا کرتے تھے۔ سنہ ۱۹۲۵ء کی بات ہے میں نگم صاحب سے ملنے اُن کے دفتر گیا، احسن صاحب اس زمانے میں زمانہ کو مرتب کر رہے تھے۔ جس وقت میں پہنچا اس وقت احسن صاحب اور نگم صاحب میں بحث ہو رہی تھی، نگم صاحب زمانہ کا قومی نمبر نکالنا چاہتے تھے اور احسن صاحب اس تجویز کے خلاف تھے، اُن کی یہ رائے تھی کہ زمانہ کو خالص ادبی پرچہ رہنا چاہئے۔ نگم صاحب کہنے لگے "مولانا زمانہ کے انداز کو سمجھئے حالی، چکبست اور اقبال کی شاعری کو آپ کیا کہیں گے، اِن کے یہاں کیا نہیں ہے، نیشنلزم، مذہبی مسائل، مسلمانوں کا اتحاد، ہندوستان کی آزادی ——— ادب زندگی سے الگ کس طرح ہو سکتا ہے، پریم چند کے افسانے تو آپ برابر پڑھتے ہیں، انہیں ادب کہیں گے یا نہیں، پھر زمانہ میں سیاست، آرٹ، موسیقی، رقص، مذہب، تاریخ اور سب ہی موضوعات پر مضمون چھاپنا چاہتا ہوں، آپ دیکھ لیجئے گا کہ آئندہ ادبی پرچے ایسے ہی ہوں گے اور پھر لوگ کہیں گے۔ اس رنگ کی ابتدا زمانہ سے ہوئی تھی، قومی نمبر ضرور نکلے گا، چلئے ہم فیصلہ ثاقب صاحب پر چھوڑ دیں، نگم صاحب تو یہ کہہ کر الگ ہو گئے اور مزا یہ کہ فیصلہ خود ہی کر دیا کہ "قومی نمبر ضرور نکلے گا" اور فیصلہ ثاقب صاحب کریں گے میرے لئے یہ بڑا دشوار مرحلہ تھا، نگم صاحب کے فیصلے پر میری بات کا کیا اثر ہوگا ——— اور احسن صاحب میرے استاد ہیں ——— کچھ دیر میں چپ رہا پھر میں نے کہا کہ احسن صاحب نے آپ کی مخالفت کب کی، اُن کا مقصد یہ تھا کہ آپ آزاد بھی نکالتے ہیں اور زمانہ بھی سیاست کے لئے آزاد کے صفحات موزوں ہیں اور اگر زمانہ قومی نمبر نکالے تو ادبی شان کا، سیاسی مسائل پر علمی انداز کے مضامین لکھوائے

جائیں، قومی تمدن اور زبان کے مسائل پر غور کیا جائے، وطنی نظمیں شامل ہوں —— آپ نے احسن صاحب کی پوری بات تو سنی ہوتی، وہ یہی کہنے جا رہے تھے، میں اُن کا شاگرد ہوں اس لئے بہت کچھ تمہید سے سمجھ جاتا ہوں۔ یوں میری جان چھوٹی، احسن صاحب خوش ہو گئے، کہنے لگے، جی ہاں یہی میرا مطلب تھا، ورنہ زندگی سے تو بہرہ بیں کو بھی نجات نہیں ملتی، مگر جان کہاں چھوٹی وہ تو محض میرا گمان تھا، نگم صاحب بولے "ٹھیک ہے ٹھیک ہے تو چلئے ابھی کام شروع کر دیں، میں ہندوستانی زبان پر مضمون لکھنا شروع کرتا ہوں اور آپ دونوں نظمیں لکھیں، ابھی اسی وقت" دوسرے لمحے ہم دونوں سادے کاغذ لئے بیٹھے تھے، نگم صاحب بیچ بیچ میں بول اُٹھتے "بھئی آپ دونوں مولوی ہیں ذرا مذہبیت نہ بر قومیت کا ہیئت سے کوئی تعلق نہیں، سمجھے احسن صاحب"۔ احسن صاحب کہاں چپ رہنے والے تھے وہ یہی کہتے "واہ صاحب تعلق کیسے نہیں، مسلمان جغرافیائی حدود کا قائل نہیں ہوتا"۔ آخر جب نگم صاحب مولانا احسن کو قائل نہ کر سکے تو کہنے لگے "یار میرے دوستوں کی پاس داری بھی کوئی چیز ہے، میری ہی خاطر کچھ اشعار لکھ دو"۔ پھر نگم صاحب میری طرف متوجہ ہوئے، "دیکھئے آپ اپنی نظم میں حالیہ سیاسی بیداری کا ذکر ضرور کیجئے گا اور ہاں مرکزی خیال کیا ہوگا آپ کی نظم کا"۔ میں نے ذرا تیز لہجے میں کہا کہ نگم صاحب مجھے آپ یوں کوئی ہدایات نہ دیجئے، مجھے وطنی نظم لکھنی ہے سو لکھ دوں گا۔ میں نے کاغذ پر یوں ہی لکیریں کھینچنی شروع کر دیں، نگم صاحب خاموش ہو گئے اور میں نے بھی دیر تک اُن کی طرف نہ دیکھا، کچھ دیر کے بعد میں نے اپنے کاندھے پر دباؤ سا محسوس کیا، نظر اُٹھائی تو دیکھا کہ نگم صاحب کھڑے مسکرا رہے ہیں اور پان اُن کے ہاتھ میں ہے ——

لو پان کھاؤ —— میں شرمندہ ہوں، یہ بھی تو بھول گیا تھا کہ تم صرف میرے دوست اور عزیز ہی نہیں شاعر بھی ہو، شاعر بڑا حساس ہوتا ہے، ایک رسالے کے ایڈیٹر کو تو یہ بات ہمیشہ یاد رکھنی چاہیئے"۔

کتنی نرمی کے ساتھ وہ کیا کچھ کہہ گئے، مجھے یوں محسوس ہوا کہ میں جیتی ہوئی بازی ہار گیا، دوست، شاعر، ایڈیٹر، حساس یہ سب باتیں مجھ پر ہنسنے لگیں، وہ مسکرا رہے تھے اور میں اُنہیں بس دیکھ رہا تھا اور چپ تھا۔

پان کیوں نہیں کھاتے —— ارے پان نہ کھاؤ مسکرا ہی دو —— اور میں مسکرانے کی جگہ ہنس پڑا۔

"تم نے کتنے شعر کہے"؟

میں نے پوری نظم لکھ لی ہے۔

سچ۔

"سچ" "اور آپ کا مضمون ہو گیا"؟

—— ہاں سُرخی لکھ لی ہے —— "اپنی نظم سناؤ"

"اس میں حالیہ سیاسی بیداری"؟

"پھر وہی باتیں"

میں کہہ رہا تھا کہ اس میں حالیہ سیاسی بیداری کا بھی ذکر ہے —— یہ دیکھئے

محو کر دے اپنی پیشانی سے داغِ عبدیت ——— پھر دکھا دے اہلِ دُنیا کو طریقِ حریت

پھر بلندی پر ہو تیرا پرچمِ حسنِ عمل ——— تیری آوازِ صداقت پھر ہو آوازۂ [illegible]

"بہت اچھے" بہت اچھے — چلو تم نے نظم لکھ دی —— اگر اب بھی ناراض ہو تو کوئی پروا نہیں۔

"آپ ادھر بھی حساب کتاب اور مول تول کرتے ہیں" —— اور ہم دونوں ہنس پڑے۔

میں نے یہ واقعہ خاصی تفصیل سے لکھا ہے اور اس کے لئے میں اپنے پڑھنے والوں سے شرمندہ نہیں ہوں ——— کیونکہ اس واقعے سے نگم صاحب کی شخصیت کے کئی پہلو سامنے آجاتے ہیں ——— پہلی بات یہ کہ وہ اپنے زمانے کس قدر آگے سوچا کرتے تھے، یا اتنا تو آپ کم سے کم مانیں ہی گے کہ ادب اور زندگی کے تعلق کا انہیں کتنا واضح احساس تھا، اور یہ واقعہ ترقی پسند تحریک کی ابتداء سے بہت پہلے کا ہے ——— دوسری بات یہ کہ اُن کا نظریۂ صحافت کس قدر صحت مند اور انقلاب آفریں تھا، تیسری بات یہ کہ وہ اپنے ارادوں کو عملی جامہ پہنانے کے سلسلے میں کس قدر فعال اور سرگرم تھے، ذرا سی تاخیر کے روادار نہ ہوتے تھے۔ اور ان سب باتوں سے بڑی بات ان کی دوست داری و دوست نوازی ——— دوستوں کی کوئی بات انہیں بُری لگتی ہی نہ تھی، مگر دوستوں پر انہیں ناز اور اعتماد اتنا تھا کہ وہ جو چاہتے کرا لیتے ——— اور ان کے اعتماد کے قابل بننا ہی ایک ایسا افتخار تھا ——— ہم سب کے لئے کہ کسی بات سے انکار ہی نہ پڑتا تھا ——— یہ بات بھی نظرانداز نہیں کی جاسکتی کہ نگم صاحب کا طنز کتنا شیریں، گر چوٹیلا ہوتا تھا ——— نرم الفاظ کو وہ تلوار کی کاٹ بخش دیتے تھے۔ یہ خوبی اُن کی گفتگو اور خطوں ہی میں ملتی ہے، مضامین میں وہ رنگ اس کا پتہ نہیں۔

اس واقعہ کے تین چار دن کے بعد جب میں گیا تو کہنے لگے کہ دیکھئے قومی نمبر کے لئے میں نے ایک چھوڑ دو مضمون لکھ لئے ہیں، ایک دیہاتوں کے متعلق اور دوسرے قومی زبان کے بارے میں۔ میں نے کہا کہ دیہاتوں سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں قومی زبان سے ہے "دیہاتوں والا مضمون نہ سنائیے گا" بولے دیہاتوں سے کیوں دلچسپی نہیں، ہندوستان کی نوّے فی صدی آبادی تو دیہاتوں ہی میں رہتی ہے"۔ میں نے جواب دیا کہ مجھے اعداد و شمار سے بھی دلچسپی نہیں اور دیہاتوں سے اس لئے نفرت ہے کہ وہاں سانپ رہتے ہیں" نگم صاحب مسکرائے، "آپ کیسے شاعر ہیں، محبوب کی زلفوں کو سانپ سے تشبیہہ دیتے ہیں اور سانپ کے روادار نہیں، رات بھر اختر شماری کرتے ہیں اور اعداد و شمار سے نفرت ہے"۔ میں نے کہا کہ "محبوب کی زلفوں کو سانپ سے تشبیہہ دینے کا دور گزر گیا اور رہی اختر شماری تو برائے شعر گفتن خوب است، ویسے تو میں زخم شماری کرنے والوں میں ہوں"۔ وہ بہت ہی محظوظ ہوئے اور پھر انہوں نے ہندوستانی زبان کے مسئلے پر اپنا مضمون سُنایا، وہ مضمون زمانہ کے قومی نمبر ۱۹۲۵ء میں شائع ہوا ہے، اس میں اس مسئلے پر جس انداز سے غور کیا گیا ہے اس کی بناء پر آج بھی یہ مضمون ہمارے فکر و عمل کا مستحق ہے۔ یوں رسم الخط، اصطلاحات، سلیس اسلوب، نظامِ تعلیم میں قومی زبان کی اہمیت ان سب پہلوؤں پر انہوں نے بڑے اچھے مشورے دیئے ہیں۔ لیکن مجھے ان سے بنیادی اختلافات تھے۔ انہوں نے اُردو کی جگہ ہندوستانی لکھا اور اُردو و ہندی کو ایک ہی زبان قرار دیا، ہندی رسم الخط کی برتری کا دعویٰ کیا اور اُردو رسم الخط کو غیر ملکی قرار دیا، ہمارے درمیان ذرا تیز قسم کی گفتگو ہوگئی میں نے یہاں تک کہہ دیا کہ پھر آپ کا رسالہ نکالنا اور اُردو ادب کی خدمت کا دعویٰ کرنا بالکل ڈھونگ ہے۔ آپ اُردو رسم الخط کو غیر ملکی قرار دیتے ہیں تو گویا اُردو زبان اور ہندوستانی مسلمانوں کو بھی غیر ملکی سمجھتے ہیں اور پھر زبان و رسم الخط کا تعلق، لباس و جسم کا نہیں بلکہ جسم و روح جیسا ہے۔ اسی بدمزگی کے عالم میں میں اُٹھ کر چلا آیا، دو ہفتے بیت گئے اور میں اُن کے یہاں نہ گیا، پھر ایک دن وہ خود چلے آئے اور ہم دونوں یوں باتیں کرنے لگے گویا کوئی بات ہی نہ ہوئی تھی، آج جب میں اُن کے بارے میں اپنے تاثرات لکھنے بیٹھا ہوں تو دل کو یہ سکون ضرور ہے کہ ہمارا اختلاف اُصولی تھا ذاتی نہیں، اور میں آج بھی اپنے کو صحیح سمجھتا ہوں۔

نگم صاحب ایک مرتبہ اور مجھ سے ناراض ہو گئے تھے، سوداؔ کے متعلق برادرِ محترم اثرؔ لکھنوی کا ایک طویل مضمون کئی قسطوں میں زمانہ میں شائع ہوا تھا، جب میں نے جامعہ ملیہ کے لئے سوداؔ کا انتخاب کیا تو غالباً اثرؔ صاحب کی اجازت سے اس مضمون کے بعض حصوں کو زمانہ کے حوالے کے بغیر دیباچے کے طور پر شامل کر لیا تھا، انہیں یہ گراں گزرا کہ زمانہ کا حوالہ کیوں نہ دیا، اور انہوں نے اس کا اظہار اپنے تبصرے میں بھی کر دیا۔ اُن کی یہ شکایت کچھ ایسی بیجا بھی نہ تھی، جب کہ زمانہ سے انہیں اتنی محبت اور اتنا لگاؤ تھا لیکن ایسی باتوں نے ہمارے تعلقات

کو کبھی متاثر نہ کیا۔

یہ ہمیشہ سے میری عادت رہی ہے کہ میں دوستوں سے ان کی گھریلو زندگی کے بارے میں کچھ نہیں پوچھتا، وہ خود بتا دیں تو یہ الگ بات ہے ——— منشی صاحب آنجہانی سے بھی اس قسم کی گفتگو بہت کم ہوئی، اس لئے میں آپ کو یہ نہیں بتا سکتا کہ وہ شوہر کی حیثیت سے کیسے تھے؟ لیکن یہ یقین ہے کہ ان کی ازدواجی زندگی بہت ہی خوش گوار ہوگی۔ وہ وسیع القلب تھے اور انسانوں سے بے پایاں محبت کرتے تھے ان کے پانچ بیٹے ہیں ——— بڑے بیٹے مسٹر نرائن نگم وکیل ہیں اور والد کے انتقال کے بعد غالباً ۱۹۵۰ء تک زمانہ نکالتے رہے، نگم صاحب آنجہانی کو اپنے بیٹوں سے بڑا پیار تھا اور وہ اس باب میں خوش نصیب بھی تھے، آج ان کے سب بیٹے اچھے عہدوں پر فائز ہیں۔ ایک بیٹا آئی سی ایس ہے دوسرا بیٹا پی سی ایس اور تیسرا انڈین پولیس سروس میں۔ یہ چند بکھری ہوئی یادیں ہیں ——— ان میں کوئی منطقی ربط نہیں، اور پھر محبت منطق کی زد سے آزاد ہے۔ آخر میں یقیناً آپ مجھے اس قسم کی رسمی باتیں لکھنے پر مجبور نہ کریں گے کہ منشی دیا نرائن نگم بڑے آدمی تھے اور ادب کی تاریخ میں ہمیشہ زندہ رہیں گے، نگم صاحب کے متعلق یہ سب کہنا مجھے بے معنی معلوم ہوتا ہے۔

سائل دہلوی

مالک رام

نواب سراج الدین احمد خاں سائل ۱۵ ستمبر ۱۹۴۵ء کو شنبہ کے دن اللہ کو پیارے ہوئے تھے۔ چونکہ سال ولادت ۱۸۶۴ء تھا، اس طرح عمر عزیز ۸۱ برس ہوئی۔ اللہ کریم انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے اور اعلیٰ علیین میں جگہ دے۔ مرحوم مجھ پر بہت مہربانی فرماتے تھے۔ بہت دن سے یہ خیال کر رہا تھا کہ اپنے تاثرات قلم بند کر دوں، لیکن [illegible] سے

ہم کو بھی ہم دکھائیں کہ مجنوں نے کیا کیا — فرصت کشاکش غم پنہاں سے گر ملے

میں تعلیم ختم کرنے کے بعد دو تین برس تک روزگار کے لئے ادھر ادھر ہاتھ پاؤں مارتا رہا لیکن اسے میری نالائقی سمجھئے یا بدقسمتی کہ کہیں جگہ قدم نہ جم سکے۔ ان ایام میں یہاں دہلی میں میرے ایک مہربان تھے، جنہیں اس بات کی بہت فکر تھی کہ کہیں نہ کہیں میرے لئے مستقل ٹھکانا ہو جائے۔ انہوں نے ۱۹۳۸ء کی گرمیوں میں مجھے لکھا کہ اگر تم یہاں آ جاؤ تو شاید ریڈیو کے محکمے میں تمہارا انتظام ہو جائے۔ چنانچہ اس بلاوے پر میں یہاں آ گیا۔ یہ دلی میں میری پہلی آمد تھی۔ میں اس سے پہلے یہاں کبھی نہیں آیا تھا۔ اپنے رجحانات کے باعث، مجھے اس عروس البلاد سے جو دلچسپی ہو سکتی تھی اس سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ یہاں پہنچ کے مجھے کتنی خوشی ہوئی ہوگی۔

ان زمانے میں یہاں میرے ایک ہم وطن عزیز دوست جگت سنگھ رہتے تھے۔ ساتھ کے کھیلے ہوئے، ساتھ کے پڑھے ہوئے، یوں سمجھئے، دانت کاٹی روٹی والا معاملہ تھا۔ وہ آج کی طرح جب بھی ایک اسکول میں مدرس تھے۔ میں انہی کے ہاں اترا۔ دو تین دن کے بعد وہ ایک صبح مجھ سے کہنے لگے۔ تمہیں ادب سے لکھنے پڑھنے کا شوق ہے، کبھی دن فرصت ملے تو لال کنویں پر ایک بڈھے نواب صاحب رہتے ہیں، سراج الدین خاں نام ہے۔ ان سے جا کر ضرور ملو۔ میں نے پوچھا، کون نواب سراج الدین احمد خاں، وہی تو نہیں جو سائل تخلص کرتے ہیں۔ کہا، ہاں وہی۔ دیوانہ را ہوئے بس است۔ اگلے دن اتوار تھا، میں نے ناشتہ کے بعد لال کنویں کی راہ لی۔

بوقتِ صبح چو مردم بکار و بار روند — بلاکشانِ محبت بکوئے یار روند

جگت سنگھ صاحب کو سائل صاحب کے مکان کا ٹھیک ٹھیک علم نہیں تھا۔ وہ بس اتنا ہی جانتے تھے کہ کہیں لال کنویں کے محلے میں رہتے ہیں۔ البتہ مجھے معلوم تھا کہ ان کا لوہارو خاندان سے تعلق ہے۔ اس لئے میرے دل میں اطمینان تھا کہ ایسی معروف ہستی کا مکان تلاش کرنے میں

کوئی دقت پیش نہیں آسکتی۔ چنانچہ میں پوچھتا پوچھتا گلی قاسم جان میں جا پہنچا جہاں اس خاندان کے مکانات ہیں۔ یہاں میں نے ایک آدمی سے پوچھا کہ میں نواب سراج الدین احمد خاں کے ہاں جانا چاہتا ہوں۔ یہ اس وقت نواب ضمیر الدین احمد خاں عرف ضمیر مرزا خلف نواب علاؤ الدین احمد خاں علائی کے مکان کے سامنے تھا۔ اس شخص نے جواب دیا کہ یہاں سے دریافت فرمائیے۔ میں نے مڑ کر دیکھا، تو میرے سامنے جناب ضمیر مرزا کا ملازم کھڑا تھا۔ میں نے اپنا سوال اس سے دہرایا۔ اس نے کہا، جناب وہ اس گلی میں نہیں رہتے۔ ان کا مکان لال دروازے میں ہے۔ مجھے شبہ ہوا کہ شاید اسے نام سننے میں کچھ غلطی ہوئی ہے۔ اس لئے میں نے دوبارہ تاکید سے کہا کہ میں نواب سراج الدین احمد خاں صاحب کے ہاں جانا چاہتا ہوں۔ "جی ہاں، میں سمجھ گیا۔ وہی جو شاعر ہیں اور جن کے گھر میں باہر کی بیگم ہیں۔ وہ لال دروازے میں رہتے ہیں۔ آئیے میں آپ کو پہنچائے آتا ہوں۔" چنانچہ ہم دونوں گلی قاسم جان سے نکل کے لال کنوئیں میں آگئے۔ لال دروازہ کچھ دور تو تھا نہیں۔ یہی چند قدم کا فاصلہ ہے۔ اس کے اندر تھوڑی دور چل کے وہ سیدھے ہاتھ پہ ایک اونچی کرسی کے مکان کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ "یہئے حضور، یہ ہے نواب صاحب کا مکان۔" اس کے بعد اس نے ملازم کو آواز دی اور میری طرف اشارہ کرتے ہوئے اس سے کہا۔ "آپ نواب صاحب سے ملنا چاہتے ہیں" اور مجھے اس کے سپرد کر کے خود واپس چلا گیا۔

میں ملازم کے پیچھے سیڑھیاں چڑھ کے ڈیوڑھی میں آیا۔ یہاں اندر گھستے ہی بائیں طرف ایک چھوٹی سی کوٹھڑی یقیناً ملازم کے لئے تھی۔ اسی طرف کے کوتے میں اوپر جانے کا زینہ تھا۔ سامنے کے رخ پہ ایک دروازہ تھا جس پہ پردہ پڑا تھا۔ یہ گھر کے صحن میں کھلتا تھا۔ پیش طاق پہ ایک تختی لگی تھی، جس پہ لکھا تھا "مکان لاڈلی بیگم" اسے دیکھ کر مجھے معاً "حویلی علی نقی خاں بہادر کی" والا لطیفہ یاد آگیا۔

سیدھے ہاتھ کی بغل میں بیٹھنے کا کمرہ تھا، جس میں داخل ہونے کے لئے دو سیڑھیاں چڑھنی پڑتی تھیں۔ ملازم نے کمرے کا دروازہ کھولا اور مجھے یہاں بٹھا کے خود نواب صاحب کی خدمت میں اطلاع دینے چلا گیا۔

میں نے اپنے ارد گرد نگاہ دوڑائی، تو دیکھا کہ یہاں اچھا خاصا مشرقی اور مغربی تمدن کا امتزاج ہو رہا ہے۔ یعنی کمرے میں دری کا فرش تھا۔ اس کے اوپر نصف کمرے کے لگ بھگ سپید براق چاندنی بچھی تھی۔ صدر میں ایک چھوٹا سا قالین ایرانی اور دو بڑے بڑے گاؤ تکئے لگے رکھے تھے۔ نشست کے قریب چاندی کا پاندان، پیچوان اور لگن، دو تین اگالدان اور سگرٹ کی راکھ جھاڑنے کی پیالیاں دھری تھیں ..... اور جہاں چاندنی نہیں تھی، وہاں چند کرسیاں اور ایک چھوٹی سی تپائی رکھی تھی۔ میں بھی ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔

زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ ایک نورانی صورت بزرگ کمرے میں داخل ہوئے۔

تقریباً ستر برس کا سن، کوئی چھ فٹ کا قد، کمر میں خفیف سا خم، میدہ و شہاب کی ملی جلی رنگت، المبوترا کتابی چہرہ، کشادہ پیشانی، اونچی کاٹھی کی لمبی عقابی قسم کی نوک دار ناک، کلّے کی ہڈیاں نمایاں طور پہ ابھری ہوئی ... ستواں جسم، سنہری جھلک مارتی ہوئی سپید داڑھی، جو یک مشت تو یقیناً تھی دو انگشت کی خدا جانے۔ شرعی لبیں، آنکھیں نسبتاً چھوٹی، لمبے لمبے بازو اور ہاتھ پاؤں، سر پہ ہلکی سی پلّے کی ٹوپی، جس کے نیچے سے لمبے لمبے کھچڑی بال نکلے پڑتے تھے۔ گلے میں کاج بٹی گریبان اور کھلی آستینوں کا ململ کا کرتہ، کندھے پہ رومال، نیچے ٹخنے کا آڑا پاجامہ، پاؤں میں خوردنوک کا جوتا، داہنے ہاتھ میں لکڑی اور بائیں میں سگرٹ کا بکس اور دیا سلائی کی ڈبیا۔

یہ تھے، نواب سراج الدین احمد خاں سائل دہلوی بن نواب شہاب الدین احمد خاں ثاقب بن نواب ضیاء الدین احمد خاں بہادر نیّر درخشاں بن فخر الدولہ نواب احمد بخش خاں بہادر رستم جنگ والیٔ فیروز پور جھرکہ و لوہارو، جن مرزا عارف جان عارف کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ایک جگہ کہا ہے

سائل کو نم شہ چشم حقارت سے دیکھنا نواب پانچ پشت سے اس کا خطاب ہے

میں اٹھ کے آداب بجا لایا۔ بہت لطف سے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ پہلے مجھے بٹھایا، پھر خود دوسری کرسی پہ تشریف فرما ہوئے۔ نام پوچھا، مقام پوچھا، تعلیم اور روزگار کا حال پوچھا۔ چونکہ خود شاعر تھے، خیال کیا ہوگا کہ یہ جو ملنے کے لئے آیا ہے، تو ضرور شعر بھی کہتا ہوگا۔ پوچھنے پر میں نے عرض کی

کر عمر بھر شعر کہنے کا اتفاق نہیں ہوا۔ تو پہلے کچھ تعجب کا اظہار کیا۔ پھر فرمایا۔ لیکن اس میں بھی شبہ نہیں کہ یہ ہے بیکاری کا مشغلہ۔

ہم جس کمرے میں بیٹھے تھے ایک گلی کے رُخ پر تھا اور یہاں کی تینوں کھڑکیاں کھلی تھیں۔ نیچے گلی میں ایک ٹھٹھیرا برتنوں کی مرمت کر رہا تھا۔ قدرتاً شور ہوا ہی چاہتے۔ اس متواتر بے ہنگم آواز سے میں بہت پریشان تھا، یہاں تک کہ بعض اوقات ہمیں ایک دوسرے کی بات سننے میں بھی تکلف ہوتا تھا۔ لیکن کچھ کہہ بھی نہیں سکتا تھا۔ سائل صاحب بھی اس کھٹ کھٹ سے بہت منغض ہوئے۔ ملازم کو آواز دی۔ ارے کوئی ہے۔ دروازے پر سے ملازم نے جواب دیا، حضور حاضر ہوں۔ میاں جاؤ، اس ٹھٹھیرے سے کہو کہ یہ شور بند کرے اور اگر وہ اس کے بغیر نہیں رہ سکتا، تو اس سے کہہ دو کہ یہ محلہ چھوڑ کے کہیں اور چلا جائے۔ یہ کیا مصیبت نازل ہو گئی ہے۔ ملازم نے جا کے سمجھا دیا ہوگا۔ بہرحال آواز آنی بند ہو گئی اس کے بعد ہم اطمینان سے بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ تھوڑی دیر بعد میں نے اجازت چاہی۔ فرمایا۔ جب طبیعت چاہے چلے آؤ۔ بارہ دوپہر تک بالعموم مکان ہی پر رہتا ہوں۔ سہ پہر شام کبھی کبھی گھومنے نکلتا ہوں۔

یہ تھی جناب سائل صاحب سے میری پہلی ملاقات۔

اتفاق سے میری ریڈیو میں بھی نہ نبھ سکی۔ اس زمانے میں جو حضرات اس محکمے کے کرتا دھرتا تھے، میں انہیں خوش نہ کر سکا۔ چنانچہ مہینہ بھر یہاں رہ کے واپس لاہور چلا گیا۔

اگلے برس مجھے پھر انہی مہربان کے ذریعے ایک اور دفتر میں جگہ مل گئی۔ میں شملے گیا اور عارضی طور پر ملازم ہو گیا۔ مشاہرہ قلیل تھا، لیکن کام بھی کچھ ایسا مشکل نہیں تھا۔ حکومت کے دفاتر کے ساتھ یہ لوگ بھی گرمیوں میں شملے اور سردیوں میں دلی جاتے آتے رہتے تھے۔ چنانچہ جب ستمبر میں دفتر دلی آئے تو میں بھی یہاں پہنچ گیا۔ یہاں آنے کے بعد میں پہلی فرصت میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا اور ۱۹۳۶ء اور ۱۹۳۷ء کے دونوں جاڑوں میں متواتر ان کے ہاں آتا جاتا رہا۔ دراصل یہی وہ زمانہ ہے جب مجھے انہیں بہت قریب سے دیکھنے کا اتفاق ہوا۔

اب تفصیل میں کیا جاؤں کہ کیسے کیسے ہمارے تعلقات میں گہرائی پیدا ہوتی گئی۔ بہرحال نتیجہ یہ نکلا کہ ہم بہت جلد ایک دوسرے سے بے تکلف ہو گئے۔ حکم ہوا، کہ جب تک دلی میں رہو، یوں جب جی چاہے یا ضرورت ہو آ سکتے ہو، لیکن اتوار کے دن کہ تمہیں دفتر سے چھٹی ہوتی ہے از صبح تا شام میرے ساتھ رہا کرو۔ میں نے اقرار کر لیا۔ جو لوگ دلی کی سردیوں کو جانتے ہیں، انہیں خوب معلوم ہے کہ مجھے اس وعدے کے نبھانے میں کیا کیا مشکل پیش آئی ہو گی۔ لیکن مجھے خوشی ہے کہ آندھی ہو یا طوفان، بارش ہو کہ کڑکڑاتی سردی، میں تعمیل حکم میں ان دنوں جاڑوں میں بلا ناغہ ہر اتوار کو حاضر ہوتا رہا اور اس دن عام طور پر دوپہر تک ان کے ساتھ رہتا۔

کھانے پینے میں مزاج بہت نفاست پسند تھا۔ حتی الوسع اس بات کی کوشش کرتے، کہ سالن روٹی کا دی ہاتھ سے نہ کھائیں۔ وہ یہ برداشت نہیں کر سکتے تھے کہ چکناہٹ یا سالن کی زردی انگلیوں پر رہ جائے۔ اس لئے بے دریغ چمچے اور کانٹے کا استعمال کرتے تھے۔ انہیں دہی کا پنیر بہت پسند تھا، یعنی دہی پہلے ململ کے ٹکڑے میں ڈال کے لٹکا دیا جاتا تھا۔ جب تمام پانی رس کے ٹپک جاتا تو بقیہ پنیر دو پھریروں یا کسی اور بھاری اور سخت چیز کے درمیان رکھ کے ہموار کر لیتے۔ پھر جیسے چاہتے اس کے ٹکڑے مربع، لمبوترے یا چوکور ٹکڑے کاٹ لیتے۔ ناشتے میں یہ پنیر بالعموم ہوتا تھا اور وہ اسے ہمیشہ کانٹے سے کھاتے تھے۔

کھانے میں مچھلی بہت پسند تھی، لیکن کانٹے سے ڈرتے تھے۔ آخری عمر میں بینائی میں بھی فرق آ گیا تھا۔ چھوٹا کانٹا دکھائی نہیں دیتا تھا۔ اس لئے عام طور پر بیگم صاحبان کے لئے علیحدہ پہلے سے کانٹا نکال کے دسترخوان پر رکھ دیا کرتیں تھیں۔ خطرناک بہت کم تھی۔

ایک دن ناشتے پر فرمایا، خوب پیٹ بھر کر کھاؤ، ممکن ہے کہ دوپہر کا کھانا نہ ملے۔ آج ہمیں سیر کے لئے باہر جانا ہے۔ اب میرا یہ معمول ہو گیا تھا کہ جب وہ مجھ سے کچھ کرنے کو کہتے، تو میں کوئی حیل حجت نہیں کرتا تھا۔ وہ میری عادتوں سے خوب واقف تھے اور انہیں معلوم تھا کہ کونسی

معاملہ یہیں تک رہتا تو کوئی بات نہیں تھی۔ غلطی کس سے نہیں ہو جاتی۔ پھر تحقیق و تصنیف کا میدان تو بہت وسیع ہے خصوصاً جہاں تعلق استنباط اور استنتاج سے ہو وہاں تو اختلاف کا بہت زیادہ امکان ہے۔ اگر ہمارے ممدوح معاملے کو اسی نظر سے دیکھتے تو کوئی قباحت نہیں تھی لیکن خدا معلوم انہیں کیسے شبہ ہوا کہ اس رسالے کی تصنیف میں ان کے ایک مخالف عالم دین کا ہاتھ ہے جو یہیں دہلی میں رہتے تھے۔ بقول امام شمس الدین ذہبی، دو صاحب علم شخصیتوں کے لئے ہم عصری بہت بڑا ابتلا ہے۔ وہ نہ صرف ایک دوسرے کی صحیح قدر و قیمت شناخت نہیں کر سکتے بلکہ بسا اوقات رشک و حسد کے باعث ان میں چشمک بھی ہو جاتی ہے اور وہ ایک دوسرے کے مخالف بن جاتے ہیں۔ یہاں بھی کچھ اسی طرح کا معاملہ پیش آیا۔ یہ دونوں صاحب ہمارے چوٹی کے عالموں اور مصنفوں میں سے تھے لیکن نقطۂ نظر کے اختلاف کی وجہ سے ایک دوسرے کے اشد مخالف۔ چنانچہ جب یہ رسالہ موصوف کے پاس تبصرے کی غرض سے پہنچا تو انہوں نے اپنے مجلّے میں اس پر رائے ظاہر کرتے ہوئے لکھ دیا کہ ہم خوب جانتے ہیں کہ اس پردۂ زنگاری میں کون معشوق ہے اور کس نے یہ کتاب لکھی ہے اور کیوں چھپوائی ہے۔ یہ بھی تشریح ہوتا تھا کہ رسالے کے مصنف کا نام جعلی ہے۔

جونہی یہ پرچہ دلّی میں پہنچا جس میں یہ تنقید چھپی تھی اس نوجوان مصنف نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، عدالت میں ہتک عزت اور ازالۂ حیثیت عرفی کا مقدمہ دائر کر دیا کہ فلاں مجلّے کے ایڈیٹر نے میری تصنیفی قابلیت پر حملہ کر کے میری توہین کی ہے۔ نیز یہ شبہ کر کے کہ میں نے یہ کتاب کسی اور سے لکھوا کے اپنے نام سے چھاپ دی ہے میری شہرت اور عزت پر حملہ کیا ہے۔ ٹھیک طور پر یاد نہیں رہا۔ ہرجانہ غالباً دس ہزار روپیہ طلب کیا گیا تھا۔

جو حضرات قانون سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں معاملہ کس قدر سنگین تھا۔ قرائن ایسے تھے کہ جرم ثابت ہو جائے گا اور موصوف کو سزا ہو جائے گی اور ہرجانہ ادا کرنا پڑے گا اس لئے قدرتی طور پر سب لوگ تشویش کا اظہار کر رہے تھے۔ اگلے دن اسی مقدمے کی پیشی تھی اور وہ اسی سلسلے میں یہاں آئے تھے۔

اتفاق کی بات کہ میں اس نوجوان مصنف سے چند دن پہلے نواب سائل صاحب کے مکان پر مل چکا تھا اور ان کا یہ رسالہ بھی دیکھ چکا تھا۔ نواب صاحب نے میرا تعارف کراتے ہوئے ان کی تعریف کی اور ان کے والد مرحوم سے اپنے قدیم دوستانہ تعلقات کا ذکر کیا تھا۔ یہ نوجوان بھی ان سے اسی طرح مؤدبانہ ملے تھے جیسے ایک خورد اپنے بزرگ سے ملتا ہے۔ میں نے جب اس مقدمے کی روداد سنی تو معاً میرے ذہن میں یہ خیال گزرا کہ اگر نواب صاحب کوشش کریں تو شاید ان کی وساطت سے کچھ سمجھوتہ ہو جائے۔ چونکہ مقدمے کی پیشی اگلے دن تھی اور وقت تنگ تھا اس لئے میں نے فیصلہ کیا کہ ابھی جا کے ان سے ملنا چاہئے تاکہ اگلی صبح عدالت کے وقت سے پہلے اس نوجوان سے بات چیت کی جا سکے۔ میں نے جب اپنے اس خیال کا اظہار وہاں دو ایک دوستوں سے کیا تو انہوں نے بھی میری اس تجویز پر صاد کیا اور زور دیا کہ اگر تم کچھ کر سکتے ہو تو اس سے دریغ نہیں کرنا چاہئے۔ غرض کہ میں باہر نکلا اور بائیسکل پر سوار ہو کر شہر کی طرف روانہ ہو گیا۔ میں جب سائل صاحب کے ہاں پہنچا ہوں تو ساڑھے دس سے زیادہ ہو چکے تھے۔ اس کے باوجود جونہی انہیں میرے آنے کی اطلاع ہوئی فوراً نیچے اتر آئے اور چھوٹتے ہی پوچھا، کیوں خیر تو ہے؟ میں نے کہا، نہیں تو۔ کوئی ایسی بات نہیں۔ کہنے لگے۔ اب میں یہ تو ماننے سے رہا۔ اس ہڑبڑی کے وقت اتنی رات گئے قرول باغ سے تمہارا آنا بے سبب تو ہو نہیں سکتا۔ القصہ میں نے بے آرامی کی معافی چاہتے ہوئے سارا قصہ بیان کیا تو انہوں نے جو کچھ جواب میں کہا وہ آب زر سے لکھ رکھنے کے قابل ہے۔ فرمایا۔ بیٹا! تم بہت بھولے ہو۔ تم ان مولویوں کو نہیں جانتے۔ انہیں اپنے علم کا غرور ہے، انہیں اپنی نمازوں کا غرور ہے، اپنے روزوں کا غرور ہے اور وہ چاہتے ہیں کہ ان کے علم اور عبادت کی وجہ سے لوگ ان کے آگے سجدے کریں اور ان کے ہاتھ چومیں۔ ان کی ہر بات پر آمنّا و صدقنا کہیں۔ اب زمانہ بدل گیا ہے۔ اب تو لڑکا اپنے سگے باپ کی انتہا درجہ بات ماننے کو تیار نہیں اور کہہ دیتا ہے، ابّا جان! یہ بات تو کچھ سمجھ میں نہیں آئی۔ بھلا یہ قل اعوذئیے ملّا کیسے توقع رکھتے ہیں کہ دنیا ان کی ہر بات بے چون و چرا تسلیم کرے گی۔ تم اس نوجوان سے مل چکے ہو۔ وہ گھر کا اچھا کھاتا پیتا ہے۔ اس کے باوا میرے اچھے دوست تھے۔ یہ ان کا اکلوتا لڑکا ہے اور وہ اس کے لئے اچھی خاصی پونجی چھوڑ مرے ہیں۔ اس کی عربی اور مذہبی علوم کی باقاعدہ تعلیم ہوئی ہے اور وہ تو دانا نہیں۔ مجھے اس مقدمے کا علم نہیں تھا لیکن اگر انہوں نے اس کے خلاف کچھ لکھا ہے، تو اسے بجا طور پر رنج ہونا ہی چاہئے اور اگر انہوں نے اس دوسرے عالم کی مخالفت کے جوش میں کوئی ایسی بات لکھ دی ہے جس پر قانونی گرفت ہو سکتی ہے تو انہیں اس کا خمیازہ بھگتنا ہی چاہئے۔

جو آگ لگائے گا، انگارے بنے گا، اگر کوئی اور مجھے اس معاملے میں دخل دینے کو کہتا، تو میں کبھی نہیں مانتا۔ لیکن تمہاری خاطر سے میں اپنی سی کوشش کروں گا۔ آگے جو خدا چاہے۔ کل علی الصباح دفتر جانے سے پہلے آ جانا، میں تمہارے ساتھ خود اس کے پاس چلوں گا۔

میں نے یہ لمبی داستان صرف اس لئے بیان کی ہے کہ اس سے سائل صاحب کے علاوہ دین سے متعلق خیالات پر روشنی پڑتی ہے۔ وہ خود کوئی بہت بڑے عالم نہیں تھے۔ اپنے جد بزرگوار کے بعد انہوں نے شمس العلماء ڈپٹی نذیر احمد مرحوم سے کچھ عربی پڑھی تھی۔ حدیث کی چند کتابیں مشہور عالم مولوی سید نذیر حسین محدث دہلوی سے پڑھیں لیکن اس کے باوجود ہم کسی طرح یہ نہیں کہہ سکتے کہ انہیں عربی علوم یا مذہب سے کچھ ایسی بڑی وابستگی تھی کہ انہیں ان مولویوں کا مد مقابل خیال کیا جائے۔ بلکہ اپنی خاندانی روایات کے مطابق وہ بہت خوش عقیدہ تھے اور سب علماء اور اصحاب فضل کا نام احترام سے لیتے تھے لیکن اس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ جہاں وہ حقیقی بزرگی اور علم کے قدر شناس اور پرستار تھے، وہیں بناوٹ اور ملمع کے سخت دشمن بھی تھے۔ کسی بڑے سے بڑے نام کی شوکت اور شہرت انہیں مرعوب نہیں کر سکتی تھی اور وہ اپنے خیالات کے اظہار میں کوئی لگی لپٹی نہیں رکھتے تھے۔

دیکھئے، بات کہاں سے کہاں جا پہنچی۔ میں ذکر کر رہا تھا کہ ہم حضرت محبوب الٰہی رحمتہ اللہ علیہ کے مزار مقدس کی زیارت سے مشرف ہو کر باہر نکلے اور پھرتے پھراتے جناب خواجہ حسن نظامی مرحوم کے دولت کدے پر پہنچ گئے۔ سائل صاحب اور خواجہ صاحب میں پرانی ملت تھی۔ مجھے ٹھیک سا یاد نہیں لیکن غالباً یہ بھی فرمایا تھا کہ میری کیفیت الی المطلع جناب خواجہ صاحب کی رکھی ہوئی ہے۔ خواجہ صاحب مرحوم مکان پر تشریف نہیں رکھتے تھے۔ ان کے بڑے صاحبزادے حسین نظامی صاحب سے ملاقات ہوئی۔ یہاں تھوڑی دیر ان سے بات چیت ہوتی رہی اور چائے پانی سے کچھ تواضع بھی ہوئی۔ اس زمانے میں خواجہ صاحب موصوف کافورس کے تیل اور سوریابین کا بہت اشتہار دے رہے تھے جانے کیسے ان چیزوں کا ذکر چل پڑا۔ حسین نظامی صاحب نے اپنی دونوں چیزوں کا ایک ایک نمونہ ہمیں پیش کیا اور ہم ان کا شکریہ ادا کرتے ہوئے ان سے رخصت ہوئے۔

باہر نکلے تو میں نے کہا کہ اب آئے ہیں تو چلئے، آپ کے دادا جان کے مزار پر بھی فاتحہ پڑھ لیں۔ چنانچہ ہم گھومتے گھامتے چونسٹھ کھمبا کے پاس اس احاطہ میں پہنچ گئے، جہاں غالب ابدی نیند سو رہے ہیں۔ یہاں فاتحہ کے بعد مختلف قبروں کی نشان دہی کرتے رہے۔ چنانچہ بتایا تھا کہ غالب کے پاس والی قبر معروف کی ہے۔ اس کے بعد معروف کی بیوی ہیں۔ ان کے بعد ان کے صاحبزادے علی بخش خاں کی قبر ہے۔ معروف کی پائنتی ان کے ایک مرید محمد حیات خاں ولد احمد یار خاں (رام پوری) ہیں اور ان کے برابر میں ان ہی کے صاحبزادے خان بہادر محمد نظام الدین خاں ہیں۔

دلی کی ایک ایک اینٹ کے نیچے ایک داستان اور ایک تاریخ دفن ہے۔ ہم یہ اینٹیں الٹتے پلٹتے، باتیں کرتے اور مختلف بزرگوں اور بادشاہوں کی آرام گاہوں سے درس عبرت لیتے ہوئے وہاں پہنچے، جہاں گاڑی ہمارا انتظار کر رہی تھی۔ اب جو چلے، تو ڈیڑھ ایک بجے کے لگ بھگ قطب میں بھول بھلیاں پر جا کے دم لیا۔ یہاں کے انتظام دیکھ کر میں کچھ متعجب سا ہوا۔ شمالی برآمدے میں دریاں بچھی ہوئی تھیں۔ ایک طرف چولھا گرم ہو رہا تھا۔ ایک ملازم چائے کا سامان ایک چھوٹے سے تخت پر قرینے سے لگا رہا تھا۔ جب ہم داخل ہوئے، تو نواب صاحب نے ملازم سے پوچھا، کہو میاں بھائی کے آنے میں کتنی دیر ہے۔ حضور وہ اب آتے ہی والے ہیں۔ آپ تشریف رکھئے۔ حکم ہو تو چائے تیار کر دوں۔ نہیں میاں، ہم بھائی کے آنے سے پہلے کیسے پی لیں، یہ تو ٹھیک نہیں۔ حضرت، اتنے تکلف کی کیا ضرورت ہے۔ وہ آئیں گے تو دوسرا دور ہو جائے گا۔ بس چٹکی میں تیار کئے دیتا ہوں۔ پانی تو ابل پر رکھا ہی تھا، اس نے ایک جھپکے میں چائے کی دو پیالیاں بنا کے ہمارے سامنے رکھ دیں۔ نواب صاحب کا حال تو مجھے معلوم نہیں، لیکن میں اس تین گھنٹے کی کھنڈر گردی سے خاصی بھوک سی محسوس کرنے لگا تھا۔ ہم ابھی چائے ختم بھی نہیں کر پائے تھے، کہ نیچے زمین پر ایک گاڑی آ کے رکی اور اس میں سے ایک بزرگ برآمد ہوئے۔ ۶۵-۷۰ برس کا سن، سانولا رنگ، لانبا قد، اکہرا جسم، کھچڑی ڈاڑھی، تھوڑی پیشانی، گول چہرہ، بدن پر بند گلے کا شیروانی نما انگرکھا، نیچے گرم پاجامہ، سر پر بادامی رنگ کی ٹوپی۔ وہ آئے اور آداب عرض کر کے نواب صاحب کے پہلو میں بیٹھ گئے۔ جب ایک دوسرے کا حال چال پوچھ چکے، تو نواب صاحب نے کہا، بھائی، میں تم سے اس عزیز کا تعارف کرانا چاہتا ہوں۔ پھر میرے متعلق چند کلمے کہہ کے مجھ سے فرمایا، آپ خاں صاحب

حکیم امجد علی خاں صاحب ہیں، میرے بچپن کے لنگوٹیے، بھائی نہیں مگر بھائی سے عزیز تر۔

جن اصحاب نے ذوق کا تذکرہ پڑھا ہے ممکن نہیں کہ وہ حافظ غلام رسول ویراںؔ کا نام نہ جانتے ہوں۔ ویراںؔ ذوق کے شاگرد تھے۔ شاگرد ہی نہیں عاشق تھے کیا مجال جو ان کی موجودگی میں کوئی استاد کے خلاف کچھ کہہ جائے۔ زبان ہی تک نہیں لاٹھی سے بھی اس کی خبر لینے سے نہیں چوکتے تھے۔ قدرت بڑی منصف مزاج ہے۔ اگر کہیں ایک طرف کمی رہ جاتی ہے تو اس کی کسر کہیں اور سے پوری کر دیتی ہے۔ یہاں بھی یہی ہوا۔ ویراںؔ نابینا تھے مگر بلا کے ذہین اور حافظے کا کیا کہنا قرآن حفظ تھا، ہزاروں شعر نوکِ زبان تھے۔ کسی نے کوئی اعتراض کیا اور انہوں نے تڑ سے سند میں کسی استاد کا شعر پڑھا جیسے اعتراض کے انتظار ہی میں تو بیٹھے تھے۔

ذوق ۱۸۵۴ء میں فوت ہوئے۔ وفات سے پہلے وہ اپنا دیوان جمع نہیں کر سکے تھے۔ ان کی وفات کے بعد ان کے اکلوتے صاحبزادے خلیفہ محمد اسمٰعیل اور مولانا محمد حسین آزاد نے یہ کام ہاتھ میں لیا تھا کہ ۱۸۵۷ء کا مشہور ہنگامہ برپا ہو گیا۔ خلیفہ محمد اسمٰعیل بھی جنت سدھارے۔ بھرے گھر میں جھاڑو پھر گئی اور اس کے ساتھ ہی ذوق کا کلام بھی ضائع ہو گیا۔ جو بچا کھچا تھا اسے مولانا آزاد لے کر نکل بھاگے۔ ذوق کے شاگردوں کو فطرتی طور پر فکر ہوئی کہ اگر کلام جلد شائع نہ ہوا تو کل کو کوئی استاد کا نام لینے والا بھی نہیں ملے گا۔ ظہیرؔ اور انورؔ دونوں بھائیوں نے باہم مشورہ کیا اور حافظ ویراںؔ کے پاس پہنچے کہ یہ استاد کے سب سے زیادہ حاضر باش شاگرد تھے اور ان کا کلام بھی سب سے زیادہ ان ہی کو یاد تھا۔ چنانچہ یہ بولتے گئے اور ظہیرؔ اور انورؔ لکھتے گئے اور اس طرح ان تینوں صاحبوں کی کوشش سے ۱۸۶۰ء میں دیوانِ ذوق کا پہلا ایڈیشن شائع ہوا۔ اس کے ایک مدت بعد مولانا آزاد نے بہت کچھ کتر بیونت کر کے، بلکہ اپنی طرف سے اضافے کر کے ایک اور دیوان شائع کیا جو اب متداول ہے۔

حافظ ویراںؔ استاد کی زندگی بھر قلعۂ معلّیٰ ہی میں رہے۔ ان کی وفات کے بعد محلہ کشن گنج (دہلی) میں رہنے لگے۔ ۱۳۰۵ھ میں فوت ہوئے "خاک بستۂ خواجہ" تاریخِ وفات ہے جو انہوں نے خود ہی اپنی وفات سے دو برس پہلے نکالی تھی۔ حضرت خواجہ باقی باللہؒ کی درگاہ میں دفن ہوئے۔ بیرونی احاطے کے صدر دروازے سے ملی ہوئی ان کی قبر ہے۔ لوحِ مزار پر یہ شعر کندہ ہے ؎

فاتحہ مرقدِ ویراںؔ پہ بھی پڑھتے چلنا ان سے کہہ دو جو ہیں اس رہ سے گزرنے والے

اولاد میں صرف ایک صاحبزادی چھوڑی۔ یہ حکیم امجد علی خاں صاحب اسی صاحبزادی کی یادگار رہتے۔ مجھے جب معلوم ہوا کہ حکیم صاحب موصوف ویراںؔ کے نواسے ہیں، تو مجھے ایک پرانا مسئلہ یاد آ گیا۔

میرے دلّی آنے سے کچھ دن پہلے لاہور کے ایک نوجوان ادیب نے "خاقانیٔ ہند" کے نام سے ذوق کی سوانح عمری لکھی تھی۔ اس میں انہوں نے اور اگلم بگلم باتوں کے علاوہ یہ بھی لکھ دیا کہ ذوق مذہباً شیعہ تھے۔ میرے نزدیک یہ بات درست نہیں تھی۔ اس پر میں نے اس کی تغلیط میں ایک مختصر تحریر نگار میں شائع کی تھی۔ میں نے استدلال خود ذوق کے کلام سے کیا تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ کچھ ایسا قابلِ اطمینان ذریعۂ تحقیق نہیں۔ اب یہ سُن کر کہ حکیم صاحب ایک ایسے شخص کے عزیز ہیں جو ذوق کا دن رات کا مصاحب تھا، میں نے ان سے پوچھا کہ کیا آپ سے کبھی اپنے نانا جان سے ذوق کے معتقدات سے متعلق بھی کوئی بات چیت ہوئی تھی۔ فرمایا پہلے تو میں ان کی وفات کے وقت بہت چھوٹا تھا، اس لئے مجھے ایسی باتوں سے کچھ دلچسپی نہیں ہو سکتی تھی لیکن اگر ہوتی تو بھی میرا سر پھرا تھا کہ میں ان سے کوئی بحث ذوق سے متعلق کرتا۔ اگر انہیں کہیں ہلکا سا شبہ بھی ہو جاتا کہ میرے سوال سے استاد کی تنقیص یا اعتراض کا پہلو نکلتا ہے تو وہ میری کھوپڑی نہ ادھیڑ ڈالتے۔ لیکن اس کا میں آپ کو اطمینان دلاتا ہوں کہ ذوق شیعہ نہیں تھے، بلکہ اہلِ سنت والجماعت میں سے تھے۔

معلوم ہوا کہ حکیم صاحب کا معمول ہے کہ اکتوبر سے لے کر مارچ تک جاڑوں کے چھ مہینے، ہر اتوار دوپہر کو یہاں بھول بھلیوں پر آ جاتے ہیں۔ بارش ہو، پانی برسے، آندھی ہو یا طوفان آئے، ان کے اس معمول میں فرق نہیں آ سکتا۔ اگر آپ کسی اتوار کو حکیم صاحب کو یہاں موجود نہ پائیں تو سمجھ لیجئے کہ یا تو وہ دلّی میں نہیں رہا اتنے بیمار ہیں کہ بستر پر سے ہلنے کی تاب نہیں۔ دلّی میں ہوتے ہوئے اور صحت کی حالت میں ناممکن ہے کہ وہ یہاں نہ آئیں۔

کوئی گھنٹے بھر میں دوست احباب جمع ہونا شروع ہو گئے۔ بیشتر شاعر حضرات تھے۔ ان میں دو نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ایک تو حضرت میرزا مرحوم تھے، دوسرے

حکیم صاحب موصوف نے ۲۳ ستمبر ۱۹۳۸ء کو نواسیر کے مرض سے وفات پائی اور اپنے نانا ویران مرحوم کی طرح درگاہ خواجہ باقی باللہؒ میں دفن ہوئے
سائل صاحب نے اپنے ایک دیرینہ دوست کی تاریخ وفات لکھی جو لوح قبر پر کندہ ہے:

زبدۂ مرداں ز نسلِ افغاں چارہ سازِ بیکساں ۔۔۔ حاجیِ بیت الحرام و زائرِ دار البقا
کرد رحلت از جہان و داد رنجِ بیکراں ۔۔۔ از فراقِ جاودانی و ز وداعِ دائمی
سالِ تاریخِ وفاتش سائلِ دہلی نوشت
"فردِ عالم خان صاحب حاجی امجد علی"
۱۳۵۷ھ

ان کے بعد وہ قطب صاحب کے ہفتہ واری اجتماع بھی ختم ہو گئے۔

وہ جلسے ہو چکے خلد آشیاں تک

سچ ہے، ہمیشہ رہے نام اللہ کا۔

سائل صاحب کی پہلی بیوی نواب ممتاز حسین خان والیٔ پٹودی کی ہمشیرہ تھیں لیکن میاں بیوی میں نبھ نہ سکی اور علیحدگی ہو گئی۔ اس بیوی سے ان کے ایک بیٹا ہوا تھا جو صغر سنی میں فوت ہو گیا۔ اس کا نام معظم مرزا تھا یہی لڑکا ان کی کنیت ابو المعظم کا باعث ہوا۔ اس کے بعد ان کا دوسرا نکاح استاد داغ کی منہ بولی بیٹی لاڈلی بیگم سے ہوا جو ان کے چھوٹے بھائی میرزا ممتاز الدین احمد خان کی بیوہ تھیں۔ داغ کی اپنی صلبی اولاد صرف ایک بیٹا احمد تھا جو انہیں کم عمری میں داغ دے گیا۔ انہوں نے ایک شعر میں بھی اس کی طرف اشارہ کیا ہے ؎

احمد کے غم میں دیدۂ دل کیوں نہ ہوں تباہ ۔۔۔ آنکھوں کا نور تھا مرے دل کا سرور تھا

اس کے بعد داغ نے لاڈلی بیگم کو گود لے لیا جو ان کی سالی ادیبا بیگم کی نواسی تھیں۔ اس سے آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ کیوں ضمیر مرزا مرحوم کے ملازم نے مجھ سے کہا تھا کہ وہی نواب سراج الدین احمد خان جن کے گھر میں باہر کی بیگم ہیں۔ نیز میں نے جو شروع میں ذکر کیا ہے کہ ڈیوڑھی کے اندر صدر دالان کے دروازے کے اوپر ایک تختی پر لکھا تھا "مکان لاڈلی بیگم" تو اس کا کیا مطلب تھا۔

جناب بیگم صاحبہ عمر میں سائل صاحب سے کوئی بیس برس چھوٹی تھیں یعنی جب سائل صاحب سے ان کا نکاح ہوا ہے تو یہ کوئی ۱۸، ۱۹ برس کی تھیں اور وہ ۳۸، ۳۹ برس کے۔ ایک تو اس وجہ سے اور دوسرے یہ کہ وہ استاد زادی تھیں، نواب صاحب بہت حد تک ان سے دبتے تھے اور پیار سے نہ کہ ہر بات کہہ لیتی تھیں۔ ۱۹۴۳ء کے جاڑوں میں سائل صاحب حیدر آباد گئے، وہاں انہیں ایک افسوسناک حادثہ پیش آیا جس سے ان کے کولہے کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ اس کے بعد وہ بہت معذور ہو گئے اور بیساکھیوں کے بغیر چلنے پھرنے کے قابل نہیں رہے تھے۔ بیشک اس عمر میں ایسی سخت چوٹ مشکل ہی سے بالکل ٹھیک ہو سکتی ہے لیکن اگر مناسب علاج ہوتا اور نواب صاحب احتیاط کرتے تو ممکن تھا کہ وہ تھوڑا بہت چلنے پھرنے کے قابل ہو جاتے لیکن ان کے مزاج میں شروع سے چھیلا پن اور سہل انگاری تھی۔ انہوں نے نہ صرف خود اس طرف مناسب توجہ نہ کی بلکہ اس معاملے میں وہ کسی اور کی بھی نہیں سنتے تھے۔ مجھے خوب یاد ہے کہ بعض اوقات بیگم صاحبہ بہت خفا ہوتیں ـــــ اور رنج ہو کے کہا کرتی تھیں یہ تو مرض کو پال رہے ہیں۔ بھلا جب تک اس کا مناسب علاج نہیں ہو گا یہ کیسے تندرست ہو جائیں گے۔

سائل صاحب اپنے استاد کا بہت ادب کرتے تھے۔ دن میں کسی نہ کسی سلسلے میں دسیوں مرتبہ ان کا ذکر آ جاتا۔ داغ صاحب کی یہ بات اور داغ صاحب کی وہ بات۔ اپنے استاد بھائیوں کے ساتھ بھی ان کے تعلقات بہت خوشگوار تھے۔ جناب احسن مارہروی مرحوم، جناب نوح ناروی، جناب بیخود دہلوی ان حضرات سے میں سائل صاحب ہی کے ہاں ملا ہوں۔

استاد داغ کے خاندان کی کتنی باتیں مجھے سائل صاحب سے معلوم ہوئی تھیں جن میں سے بعض گفتنی ہیں بعض ناگفتنی۔
ایک دن ان سے متعلق گفتگو ہو رہی تھی، میں نے کہا۔ آپ کے خاندان نے انہیں نواب شمس الدین احمد خان کا بیٹا تسلیم نہیں کیا ـــ آپ کی

دعوت دی جاتی تھی۔ سائل صاحب بھی ان مشاعروں میں آتے تھے۔ ۱۹۳۷ء کے مشاعرے کے بعد جب وہ ہال سے نکل رہے تھے، تو کسی نومشق نے پوچھا کہ دہلی میں آپ کا پتا کیا ہے، جس پر آپ کی خدمت میں خط لکھا جا سکے۔ یک دم کھڑے ہو گئے اور ہاتھ کی لکڑی کو زمین پہ مار کر تنے ہوئے لہجے میں بولے میاں صاحبزادے! خط پہ صرف "سائل دہلی" لکھ دینا، مجھے مل جائے گا۔ اسی طرح کا جواب ایک موقع پہ غالب نے نواب علاؤالدین احمد خان کو دیا تھا کہ بے شک صرف "میرا نام اور دہلی" لکھ دیا کرو، خط مجھ تک پہنچ جائے گا۔

لیکن اس کے باوجود طبیعت میں حد درجہ انکسار اور مروّت کا مادہ تھا۔ کوئی ان کے پاس چلا جائے، انہیں ملنے اور اس کی فرمائش پورا کرنے سے انکار نہیں ہوتا تھا۔ کوئی صاحب تشریف لے آتے اور کلام سنانے کی فرمائش کر دیتے۔ وہ اندر سے بیاض منگواتے، اور شعر سنانے لگتے۔ اب جب تک وہ شخص خود یہ نہ کہہ دے شکریہ، بس کیجیے یا کوئی اور ذکر نہ چھڑ جائے، سائل صاحب بیاض ہاتھ سے نہ رکھتے۔ اگر کوئی صاحب ذوق آدمی ہوتا، تو خیر ایک بات بھی تھی، لیکن بعض اوقات ایسے ایسے گاؤدیوں سے واسطہ پڑ جاتا، جو نظم اور نثر کا فرق تک نہیں جانتے تھے۔ اب جائیے ماشاء اللہ فرمائیے یا فقرے، لیکن نواب صاحب بڑے اطمینان سے اسی طرح ان سے بھی پیش آتے۔ ہمیں بہت تعجب ہوتا۔ ایک آدھ مرتبہ ہم نے شکایت بھی کی کہ آخر آپ کیوں ایسے کودنوں کو ٹال نہیں دیتے۔ ہمیشہ یہی جواب ملا۔ بیٹا! انکار کرنے کی ہمت نہیں پڑتی کہ اس سے اس کی دل شکنی ہوگی۔ تم نے سنا نہیں۔ دل بدست آور کہ حج اکبر است۔

ان کی زبان کی تعریف کرنا تحصیل حاصل ہے کہ ان کے خاندان کی زبان ہمیشہ مستند اور ٹکسالی سمجھی گئی ہے۔ اگر اردو کے معلّٰی کا لطف لینا ہو تو سائل کا کلام دیکھیے۔ باوجود داغ کا شاگرد ہونے کے انہوں نے استاد کی سیدھا سادی شاعری کا تتبع نہیں کیا۔ یہ چیز داغ سے مخصوص تھی اور انہی پہ ختم ہو گئی۔ امیر مینائی نے اس میدان میں مقابلے کے لیے کیا کچھ کوشش نہیں کی، لیکن نتیجہ سب کے سامنے ہے۔ امیر کے شاگردوں میں سے ریاض خیر آبادی۔ حفیظ جونپوری اور جلیل مانکپوری نے اس رنگ کو نباہنے کی کوشش کی اور بہ فرق مراتب اس میں کامیاب بھی ہوئے مگر وہ بات کہاں مولوی مدن کی سی۔ خود داغ کے شاگردوں میں بعض بہت کامیاب ہوئے۔ احسن مارہروی۔ نوح ناروی۔ بیخود دہلوی اس کے شاہد ہیں۔ مضطر خیر آبادی کی غزل میں استاد کا رنگ پوچھا ہے لیکن سچی بات یہ ہے کہ داغ اپنے رنگ کا واحد مالک ہے۔ سائل نے شروع سے جان لیا تھا کہ اس کوشش میں وقت ضائع کرنا بیکار ہے۔ انہوں نے اپنے لیے نئی راہ نکالی۔ زبان تو وہی ہونا ہی چاہیے تھی۔ انہوں نے اس میں خالص عاشقانہ خیالات اور معاملہ اور محاکات کے علاوہ مضمون آفرینی کی طرف توجہ کی اور بہت حد تک اس میں کامیاب بھی ہوتے۔ انہوں نے بعض اوقات بہت مشکل زمینوں میں طبع آزمائی کی ہے اور ان میں ایسے ایسے شگفتہ اور پرلطف شعر نکالے ہیں کہ کچھ انہی سے ممکن تھا۔

ان کی شاعری کی عمر ساٹھ برس کے قریب تھی اور بلا مبالغہ ایک لاکھ شعر سے کم ان کا سرمایہ نہیں ہوگا۔ لیکن ان کا بہت بڑا کارنامہ ان کی مثنوی نور محل نور ہے جس میں بنیادی طور پر اگرچہ نورالدین جہانگیر بادشاہ اور ملکہ نور جہاں بیگم کی حیات معاشقہ کا بیان ہے، لیکن اس میں اور بھی بیسیوں مسائل آ گئے ہیں۔ افسوس کہ یہ نامکمل رہ گئی، ورنہ خاصے کی چیز ہوتی۔ اب بھی اس میں سات آٹھ ہزار شعر سے کم نہیں ہوگا۔
زمانے کا مذاق بدل گیا۔ ان کے سارے دیوان تو کون چھپائے گا اور کون پڑھے گا۔ لیکن اگر کوئی اللہ کا بندہ چار پانچ ہزار شعر کا انتخاب ایک جلد میں شائع کر دے، تو یہ زبان کی واقعی خدمت ہوگی۔ اور مثنوی تو ضرور ہی چھپ جانا چاہیے، اگرچہ وہ نامکمل ہی ہے۔ بقول نظیری نیشاپوری:

هزار نقش دریں کارگاہ کار است
نگین خوردہ نظیری، همه نگو بستند

چودھری افضل حق (مرحوم)

شورش کاشمیری

ہم جن لوگوں کو بہت جلد بھول گئے ہیں، ان میں مرحوم افضل حق بھی ہیں۔ فی زمانہ نا یاران قلم کی جتھہ بندی نے بہت سی قابلِ قدر شخصیتوں کو طاقِ نسیاں کا گلدستہ بنا دیا ہے اور بہت سی مٹیوں کو شہرت کی صف میں لا کھڑا کیا ہے۔

پنجاب مرحوم کی قومی زندگی میں پہلی جنگِ عظیم سے لے کر دوسری جنگِ عظیم تک جن لوگوں نے عزت کا مقام پیدا کیا ان میں بعض شخصیتیں ادب و سیاست کے امتزاج کی مظہر تھیں، چودھری صاحب بھی انہی میں سے ایک تھے لیکن سیاسیات کے اختلافی گرد و غبار نے انہیں اوجھل کر دیا اور آج وہ محض اس لئے ایک فراموش شدہ عظمت ہیں کہ ان کے گرد و پیش اعترافِ محاسن کا کوئی حلقہ نہیں، وہ زندگی میں بھی مفلس کا چراغ تھے اور زندگی کے بعد بھی گمنام قبر ہیں جس پر کوئی کتبہ آویزاں نہیں ہے۔

ـــــ چودھری صاحب کی زندگی ہمیشہ مختلف دھاروں کا سنگم رہی ہے۔ وہ اپنے گرد و پیش کے خلاف بہت بڑا احتجاج تھے، انہوں نے اپنی زندگی کا آغاز پولیس کے سب انسپکٹر کی حیثیت سے کیا تھا۔ جس زمانہ میں وہ پولیس کے سب انسپکٹر بھرتی ہوئے تب ہندوستانیوں میں سے بہت کم لوگ سب انسپکٹر ہوتے تھے، اس "اعزاز" کے مستحق چیدہ چیدہ خاندانوں کے چیدہ چیدہ لوگ ہی سمجھے جاتے تھے۔ مرحوم چودھری صاحب ہوشیار پور کے ممتاز راجپوتوں میں سے تھے، ان کے بڑے بھائی بھی پولیس میں تھے اور سپرنٹنڈنٹ پولیس کے عہدے سے ریٹائر ہوئے۔ چودھری صاحب پولیس میں رہتے تو عجب نہ تھا کہ اپنی ذہانت و فراست کے بل پر پولیس کا بڑے سے بڑا عہدہ حاصل کرتے اور عین ممکن تھا کہ پنجاب میں جن ہندوستانی پولیس افسروں کی آج تک دھوم ہے ان میں سے ایک ہوتے لیکن تحریکِ لاتعاون کے آغاز میں مستعفی ہو گئے ـــــ سید عطاء اللہ شاہ بخاری فرماتے ہیں کہ وہ ہوشیار پور کے ایک جلسۂ عام کو خطاب کر رہے تھے اور چودھری صاحب مرحوم اس جلسہ میں ان کی تقریر کے نوٹ لے رہے تھے، میں نے ان کی طرف نظر اٹھا کر دیکھا تو مجھے ایک قبول صورت نوجوان کے چھریرے بدن پر تھانیدار کی وردی نے بہت متاثر کیا۔ میں نے اثنائے تقریر میں کنایۃً کہا:-

"اے کاش مجھے اس طرح کے نوجوان مل جائیں تو میں چند دنوں میں ہندوستان کی کایا پلٹ دوں لیکن

کیا کسی دن میرے نوجوان تو فرنگی بابا کی صف میں وردی پہنے کھڑے ہیں ؟"
کچھ دنوں بعد لاہور میں مولانا ابوالکلام آزاد کی صدارت میں جمعیتہ العلماء کا اجلاس منعقد ہوا تو چودھری صاحب نے اس اجلاس میں مستعفی ہونے کا اعلان کر
دیا ــــــ انگریزوں کے لئے یہی تھا کہ بیدار کا مستعفی ہونا انتظامی نقطۂ نگاہ سے انتہائی خطرناک تھا۔ مسٹر ہری کشن کول اس زمانے میں جالندھر ڈویژن کے
کمشنر تھے، انہوں نے چودھری صاحب کو ڈرانے دھمکانے پھر منانے سمجھانے کی سرتوڑ کوشش کی، مگر چودھری صاحب قدم اٹھا چکے تھے اور پیچھے مڑنے
کو مطلقاً تیار نہ تھے ــــــ انگریزوں نے دو سال کے لئے قید کر دیا، بیداری کا زمانہ تھا، چودھری صاحب کوئی بڑے لیڈر یا معروف کارکن نہ تھے
اعزہ و اقربا سرکار پرست تھے، جیلر نے حکام بالا کے ایماء پر سختیاں شروع رکھیں، قید تنہائی میں ڈالا، بیڑیاں لگائیں، چکی پسوائی، کھڑی ہتھکڑی لگوائی،
ٹاٹ کے کپڑے پہنوائے، غرض گوناگوں اذیتیں دینے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی، مگر چودھری صاحب نے ہر مصیبت کا خندہ پیشانی سے مقابلہ کیا ــــــ
پنڈت بنکی رام شرما قید خانے میں آپ کے ساتھی تھے وہ رہا ہو کر آئے تو انہوں نے روزنامہ "بندے ماترم" میں ان مظالم کے خلاف احتجاج کیا،
جس سے لوگوں کو پہلی دفعہ ان کی شخصیت اور ہمت کا علم ہوا۔
ــــــ "دنیا میں دوزخ" "قید خانے کے کوائف" ان کی پہلی تصنیف ہے جو آپ نے رہائی کے بعد قلمبند کی۔ ڈسٹرکٹ کانگرس کمیٹی ہوشیار پور
نے اس کو شائع کیا اور رہائی کے بعد آپ کو ڈسٹرکٹ کانگرس کمیٹی کا صدر منتخب کر لیا گیا۔
تحریک خلافت ختم ہو چکی تو مختلف رہنماؤں کی صلاحیتوں کا بھرم کھلنے لگا مگر چودھری صاحب رفتہ رفتہ ابھرتے ہی گئے حتیٰ کہ دو چار برس ہی میں
صوبہ کے مسلمان لیڈروں کی صف اول میں شمار ہونے لگے، چنانچہ ہندوستان میں اندرخانہ جتنی اتحاد کانفرنسیں منعقد کی گئیں ان میں پنجاب کے مسلمانوں
کی طرف سے آپ کو بھی مدعو کیا جاتا رہا اور ہمیشہ آپ کے مشوروں کی قدر کی گئی ــــــ اس رفتار نے انہیں کہیں سے کہیں پہنچا دیا، چنانچہ پہلی بار
جب پنجاب کونسل کے انتخابات ہوئے تو ہوشیار پور کے مسلم حلقے سے لیجسلیٹو کونسل کے ممبر منتخب ہو گئے ــــــ پنجاب کونسل میں آپ کی قابلیت
کے نقش اور سامنے ہوئے، خود انگریز ممبروں نے ان کی جرأت و قابلیت کا اعتراف کیا اور اس کی شہادت کونسل کے اجلاسوں کی مطبوعہ کارروائیوں سے
حاصل کی جا سکتی ہے۔
میاں فضل حسین مرحوم آپ کے بے حد گرویدہ تھے ہمیشہ آپ کی اختلافی تقریر کو توجہ سے سنتے ــــــ وہ تمام زندگی کوشاں
رہے کہ چودھری صاحب اپنی موجودہ راہ سے ہٹ کر ان کے ہم قدم چلیں اور حکومت میں شریک ہوں لیکن چودھری صاحب ہمیشہ ان کے اس خیال
کی مزاحمت کرتے اور اپنے طرز عمل کی سچائی پر اصرار کرتے تھے۔
چودھری صاحب مرحوم انتہائی عاجز طبیعت کے بزرگ تھے۔ ہمیشہ لیڈروں کی سی خو بو سے پرہیز کیا، انکسار ان کی طبیعت میں کوٹ کوٹ کر
بھرا تھا۔ کبھی یہ ظاہر نہیں ہونے دیتے تھے کہ وہ کیا ہیں، بس جو کچھ تھے انتہائی عاجزی کے ساتھ تھے ــــــ صرف ایک دفعہ انہوں نے
جیلخانوں میں اصلاحات کے مسئلہ پر بعض باتوں کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا کہ جیلخانوں کے سدھارنے میں میں نے جو کوششیں کی ہیں مجھے
ان پر جائز فخر ہے۔
جن دنوں بھگت سنگھ اور ان کے ساتھی جیلخانے میں اصلاحات کا مطالبہ کر رہے اور پے بہ پے ہڑتال پر تھے چودھری صاحب غیر سرکاری وزیٹر
ہونے کے علاوہ اصلاحاتی کمیٹی کے ممبر تھے آپ نے اس معرکہ میں جس مستعدی کا ثبوت بہم پہنچایا اس سے اپنے پرائے سب عش عش کر اٹھے
گو آپ کو اس کمیٹی کی رکنیت سے محروم ہونا پڑا، لیکن آپ نے "دنیا میں دوزخ" کے شعلوں کو ہلکا کرنے میں ایک قابل ستائش کارنامہ سرانجام
دیا۔ واقفان حال کو معلوم ہے کہ اصلاحات کی مسیدے پہلی قسط کے مجوز آپ ہی تھے۔
ــــــ ۱۹۳۰ء میں کانگرس نے ڈانڈی مارچ کیا تو گاندھی جی کے بعد جو مجلس عاملہ کے ارکان میں سے ایک آپ بھی تھے ــــــ سردار

وٹھل بھائی پٹیل صدر تھے اور مالویہ ایسے رہنما کسی دہلی میں مجلس عاملہ کو گرفتار کر لیا گیا۔ آپ کو گجرات جیل میں رکھا گیا جہاں آپ نے اپنی مایۂ ناز تصنیف "زندگی" سپردِ قلم کی۔ ـــــ اس کتاب کے شائع ہوتے ہی آپ کے قلم کی دھاک بیٹھ گئی۔ چراغ حسن حسرت نے اس کے دیباچہ میں لکھا ہے کہ جو باتیں علامہ اقبال نے بیسیوں اداؤں کے ساتھ کہی ہیں وہ چودھری صاحب نے سیدھے سادے الفاظ میں لکھ دی ہیں۔ مولانا ظفر علی خاں نے "زندگی" کی تعریف میں نظم لکھی۔ تمام ملک کے جرائد و رسائل نے خراج ادا کیا۔ پنجاب یونیورسٹی نے پہلا انعام پانچ سو روپے دیا۔ سالہا سال یہ کتاب ادیب عالم کے نصاب میں رہی اور غالباً اب بھی شریکِ نصاب ہے۔

ـــــ ۱۹۳۱ء کے بعد آپ نے پنجابی رفقاء کے ساتھ مل کر اپنی الگ راہ قائم کی چنانچہ ۱۹۲۹ء میں جس مجلسِ احرار کی بنا ڈالی گئی تھی اس کو مسلمانوں کی ایک علیحدہ تنظیم کے طور پر زندہ کیا گیا، تحریک کشمیر کی ہمہ گیری نے انہیں دماغِ احرار کا درجہ دیا۔ سید عطاء اللہ شاہ بخاری انہیں پیار سے احرار کے "مہاتما جی" کہتے تھے۔ تحریکِ کشمیر سے لے کر دوسری جنگِ عظیم کے مختلف ملی ہنگاموں میں ان کی شخصیت کے دونوں پہلو ابھرتے گئے ـــــ

ادبی زندگی میں انہوں نے بہت سی کتابیں تصنیف کیں۔ میرا افسانہ' ۲ جلد (خود نوشت سوانح)' جواہرات (افسانے)' شعور (ڈرامہ)' محبوبِ خدا (حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سوانح)' دینِ خدا (اسلامیات)' خطوطِ افضل حق (بیٹی کے نام خط)' تاریخ احرار (انگریزی میں)' پاکستان اور چھوت چھات ـــ ـــ

افسوس ہے کہ ہمارے تنقید نگاروں نے ان کی ادبی زندگی سے انصاف نہیں کیا، حالانکہ وہ اسلوب سے لے کر مقصدیت تک صاحبِ طرز تھے۔ ہمارے ہاں بعض افسانہ نگاروں نے صرف ایک مجموعہ یا ایک افسانہ کی بنا پر ادبِ اردو میں جگہ حاصل کی ہے اور اس کی وجہ محض ادب میں دھڑے بندی ہے ورنہ ادب کی کوئی ترازو ایسی نہیں جس میں چودھری صاحب کے رشحاتِ قلم تل نہ سکتے ہوں اور ان کا پلڑا مقابلتاً جھکا ہوا ہو ـــــ اگر ادب کا مقصد تفسیرِ حیات، تنقیدِ حیات اور تعمیرِ حیات ہے تو "زندگی" اس معیار پر پوری اترتی ہے، جتنا اثر نوجوانوں پر "زندگی" نے ڈالا ہے اتنا شاید اس دور میں نثر کی کسی ایک کتاب نے نہیں ڈالا۔ لیکن کج روی کی حد ہے کہ ادب کے سیاسی ناقدوں کی نگاہیں اس طرف اٹھتی ہی نہیں اور اٹھتی ہیں تو پیچھے کو لوٹ جاتی ہیں۔

ـــــ سیاسی زندگی میں چودھری صاحب "مسلمان سوشلسٹ" تھے۔ ایک زمانہ میں انہوں نے "اسلام میں امراء کا وجود نہیں" لکھ کر علماء کی صفوں میں ہیجان پیدا کر دیا تھا، حتیٰ کہ ان کے کئی احرار ساتھی بھی ان کے خلاف ہو گئے تھے۔ حالانکہ جو بات وہ کہنا چاہتے تھے اس کے مبادی کا شعور بھی ان حضرات کو نہ تھا۔

"تاریخ احرار" بظاہر احرار کی تاریخ ہے لیکن حقیقتاً مسلمانوں میں طبقاتی احساس کے نشوونما کی تاریخ ہے۔ مرحوم نے اس کتاب میں احرار کے جھگڑے کے سپنا ذہن بکمال و تمام پیش کیا ہے۔ اس کے مطالعہ سے ان کے غصے اور احتجاج کا اندازہ ہوتا ہے جو ان کے دل میں امراء کے طبقہ کی بدولت کھولتے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ قرآن مجید میں سرمایہ داری کے خلاف جو احکامات ہیں ان کو یکجا کریں اور پھر ان تفسیروں، تعبیروں اور تاویلوں کے بخیئے ادھیڑیں جنہیں مختلف اوقات میں حکمرانوں کی منشا کے مطابق ڈھالا گیا لیکن اس کی راہ میں کئی دیواریں حائل تھیں مثلاً:

۱ ـ وہ اس مضمون کی صدیوں پرانی وسعتوں کو سمیٹنے کی ہمت نہ رکھتے تھے۔
اولاً وسیع المطالعہ نہ تھے ثانیاً انہیں عربی کا بنیادی علم نہ تھا، ثالثاً عصری تحریکوں کے علمی رجحانات سے کاملاً آگاہ نہ تھے، رابعاً ان کا تجربہ صرف عملی سیاسیات کے بارے میں تھا۔

۲ ـ جس وقت انہوں نے اس انداز میں سوچنا شروع کیا وہ نظر و بحث کی اس تکرار کے لئے موزوں وقت نہ تھا۔

۳ - جس ماحول میں وہ خوردہ رہے تھے وہاں "دانشور" تھوڑے اور "مجذوب" زیادہ تھے۔

——— تمام زندگی فقر و فاقہ میں بسر کی، لیکن وضعداری پر ایک ثانیہ کے لئے بھی آنچ نہ آنے دی ——— جو کمایا جماعت کی نذر کیا ان کے اخلاص و دیانت کی مثالیں اس دور کی پوری تاریخ میں نایاب ہیں ——— ہندوستان میں ایثار پیشہ لیڈروں کی کمی نہیں اگر مسلمانوں میں اس کا قحط ہی تھا، لیکن چودھری صاحب محدود ہونے کے باوجود بے پایاں تھے، انتہائی سیر چشم، اچھے گھرانے میں پرورش پا کر فقیری کی زندگی اختیار کی، وقتِ احرار کی بالائی منزل میں قدم رکھا تو پھر اترے نہیں اور اترے تو دوش پر ——— آخری سفر کے لئے ——— دنوں فاقے کئے لیکن دن بھر کے ساتھ بیٹھنے والوں کو خبر نہ ہونے دی۔ مسکراتا چہرہ، متحرک آنکھیں، نرم گفتار، کہیں سے پیسے مل گئے، بعض کتابوں کی رائلٹی مل گئی یا پنجاب کونسل میں حاضری کا چیک آگیا تو اکثر و بیشتر احباب میں تقسیم ہو گیا۔

شاہ جی کو ضرورت ہے، مولانا حبیب الرحمٰن سوالی ہیں، ماسٹر جی کے پاس کرایہ نہیں، مجاہد نیاز مانگتا ہے، سردار شفیع کو بل جوتنے کے کچھ رقم درکار ہے، فلاں رضاکار کی شادی ہے، فلاں کارکن بیمار ہے اس کے پاس دوا کے لئے پیسے نہیں ——— اور چودھری صاحب ہیں کہ اپنے آپ کو بیچ کر سب کے مطالبات کو پورا کر رہے ہیں۔

شہر میں عید ہے، گھر میں فاقہ، کوئی ساتھی سویاں لے کر آگیا تو عید ہو گئی ورنہ سب اچھا!

دو دفعہ کونسل کے ممبر منتخب ہوئے، ایک دفعہ لیکن ستیہ گرہ کی تحریک کے آغاز میں استعفیٰ دے دیا، تیسری دفعہ پنجاب لیجسلیٹو اسمبلی کے انتخاب میں حصہ لیا لیکن رہ گئے ——— اور رہ اس طرح گئے کہ صوبجاتی خود مختاری کے تحت پہلا انتخاب تھا، اب کے وزارتیں قائم ہو رہی تھیں، سردار سکندر حیات ہر قیمت پر شکست دلوانا چاہتے تھے، لاہور کے بہت سے لوٹے، لچے اور بدمعاش کٹے ہوئے یار یونینسٹ کے حلقۂ انتخاب میں درآمد کئے گئے جنہوں نے بازو پھیلا پھیلا کر اعلان کیا کہ شہید گنج میں ان پر جو کچھ بیتی اس کا ذمہ دار چودھری ہے، مسلمان جذباتی قوم، ہوا کا رخ پلٹا، چودھری صاحب ہار گئے۔ پھر اس کے بعد کبھی منتخب نہ ہو سکے، جب کھڑے ہوتے یونینسٹ پارٹی پوری طاقت سے مقابلہ کرتی، نتیجہ یہ نکلتا کہ شکست کھا جاتے۔ ایک دفعہ راقم نے عرض کیا:

"چودھری صاحب! الیکشن لڑنے سے فائدہ؟ ہمیشہ تو زک اٹھانی پڑتی ہے۔"

ہنسنے لگے "شورش! میں اس لئے الیکشن نہیں لڑتا کہ مجھے جیتنا ہی ہے، میں اس لئے بھی الیکشن لڑتا ہوں کہ مسلمان امراء کو یہ احساس ہو کہ غریب ان کا مقابلہ کر سکتا ہے اور غرباء میں یہ ذہن پیدا ہو کہ امراء کا مقابلہ کرنے سے عزتِ نفس بڑھتی ہے۔"

——— چودھری صاحب کی مجموعی قید کوئی آٹھ یا نو برس ہے۔ جن سپرنٹنڈنٹوں اور جیلروں کے پاس انہیں مختلف جیلوں میں رہنے کا اتفاق ہوا وہ ان کی سیرت کے شاہد تھے تقریباً سب متفق الرائے تھے کہ وہ سیاسی قیدیوں میں غیرت مندی، خودداری اور بہادری کے اعتبار سے گوہرِ یکدانہ تھے، ہر سانحہ کو انہوں نے لبیک کہا، جو مصیبت آئی خندہ پیشانی سے جھیلی، کبھی کسی آفت پر اُف نہ کی ——— دمہ کا مرض جیل ہی میں لگا، آواز صاف تھی اس میں نام کو بھی خرخراپن نہ تھا لیکن جیل خانے میں ہمیشہ کے لئے گلا رندھ گیا۔ آخری بار ستمبر ۱۹۳۹ء میں قید ہوئے، ڈسٹرکٹ جیل راولپنڈی میں دمہ اٹھا، حکومت نے حالات کو جان لیوا دیکھا تو رہا کر دیا۔ بہتیرا علاج کیا لیکن ؎

مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی

آخر افقِ حریت کا یہ ستارہ ۲ جنوری ۱۹۴۲ء کو ہمیشہ کے لئے غروب ہو گیا۔

——— انسانی سیرت کی بنیادی خوبی یہ ہے کہ جو لوگ اس میں رچ بچ گئے ہوں وہ بھی اس کے کردار کی گواہی دیں۔ چودھری صاحب کا سب سے بڑا کمال یہ تھا کہ انہوں نے زندگی کے ہر مرحلہ میں ساتھیوں سے خراج وصول کیا۔ ان کے سب سے بڑے دشمن کا نام حقہ تھا وہ تمباکو نوشی

سے سخت خلاف تھے۔ انھوں نے اپنی کتابوں میں بھی اس کے خلاف جہاد کیا اور مسلمانوں کی سیاسی تحریکوں کی ناکامی کے اسباب میں اس کو سرِ فہرست رکھا ہے۔ اس کا تلخ تجربہ انھیں تحریکِ کشمیر میں ہوا جبکہ احرار کے فراہم شدہ زرِ اعانہ میں سے نصف روپیہ قیدی رضاکاروں کو سگرٹ مہیا کرنے میں اڑ گیا، کیونکہ بصورتِ دیگر ان کے معافی مانگ کر نکل آنے کا اندیشہ تھا اور اس صورت میں تحریک کی عزت بھی ختم ہو جاتی۔ اس کے علاوہ وہ حقہ نوشی کو کاہل سمجھتے، اور تمباکو کی مضرتوں کو ام الامراض سے تعبیر کرتے تھے۔

ان کے سامنے کوئی ساتھی حقہ نہیں پی سکتا تھا۔ عام رضاکاروں کو ہمیشہ اجتناب کی تلقین کرتے بلکہ ان سے عہد لیتے، لطف کی بات یہ ہے کہ احرار کے ممتاز راہنماؤں میں ایک آدھ راہنما کے سوا چوٹی کے سبھی لیڈر حقہ نوشی کے خلاف تھے ———

افراد و جماعت کے بارے میں ان کا نقطۂ نگاہ اتنا صاف تھا کہ بسا اوقات پڑھ کر حیرت ہوتی، بعض سیاسی تحریکوں کے متعلق انھوں نے عجیب و غریب تجزیے کیے ہیں۔ علامہ اقبال کو وہ اپنی صف میں سے سمجھتے تھے، مولانا ابوالکلام آزاد کو علم کا شہنشاہ جن کے ماتھے پہ غدار الفاظ سے شکن آجاتی ہے۔ جواہر لال نہرو کو سیاست کا لاڈلا بچہ جو چاندی کا چمچہ لے کر پیدا ہوا ہے۔ گاندھی جی کو شاطر سیاستدان جو مہاتما اور مدبر کا ایک دلآویز آمیزہ تھے۔ کانگرس کو وہ ہندو سرمایہ داری کا قلعہ اور مسلم لیگ کو ظالم امراء کی آخری جائے پناہ سمجھتے تھے۔ غرض خلاصۂ کلام یہ تھا کہ:

> "امراء کبھی اس غریب کو سامنے لے کر نہیں چلتے جو ان کی بات پر سوچتا ہو،
> ان سے اختلاف کرے، ان کے مقابلہ میں ذہین ہو اور ان سے علیحدہ بھی
> اپنی شخصیت کو ابھار سکے۔"

چودھری صاحب میں یہ چاروں خصوصیتیں بدرجۂ آخر تھیں نتیجہ معلوم کہ وہ بساطِ سیاست پر ایک پٹے ہوئے مہرے کی طرح ختم ہو گئے، حتیٰ کہ زمانے کے ساتھ انھیں دوست بھی بھول گئے۔

سیماب اکبرآبادی

نثار اٹاوی ایم۔ اے

۱۹۳۴ء کی بات ہے۔ میں بذریعہ مراسلت علامہ سیماب اکبرآبادی مرحوم کے حلقۂ تلامذہ میں داخل ہو چکا تھا مگر ہنوز اشتیاقِ دید باقی تھا۔ ایک دن اس جذبۂ شوق کی شدت سے مجبور ہو کر آگرہ پہنچا، غالباً مئی یا جون کا مہینہ تھا، میری تربیت کچھ ایسے ماحول میں ہوئی تھی جہاں استاد کا احترام فرضِ عین سمجھا جاتا ہے، استاد کی خدمت میں نذر پیش کرنا اور خصوصاً اس وقت جب استاد سے پہلی مرتبہ شرفِ نیاز حاصل ہو رہا ہو ضروری تھا۔ مگر اس زمانہ میں میری مالی حالت نہایت سقیم تھی، ایک مقامی اسکول میں معلمی کے عوض مجھے آٹھ روپیہ ماہانہ ملتے تھے، مجھے یاد نہیں پڑتا کہ میں نے اس سفر کے لئے کہاں سے مصارف کا انتظام کیا، استاد کی نذر کے علاوہ مٹھائی لے جانا بھی ضروری معلوم ہوتا تھا چنانچہ شہر سے ایک ٹوکری خرید کر دو روپیہ کی مٹھائی خریدی مگر وہ تو ٹوکری کی تلی ہی میں سما گئی۔ بڑے شش و پنج میں تھا کہ اتنی بڑی ٹوکری میں یہ ذرا سی مٹھائی لے کر کیا جاؤں، آخر کار ایک تدبیر سمجھ میں آئی، ایک روپیہ کے پھل خرید لئے چند سنگترے، چند کیلے اور غالباً ایک یا دو چکوترے۔ ان نے ٹوکری کو پُر کر دیا۔ تانگہ میں ٹوکری رکھ کر قصر الادب کی طرف روانہ ہو گیا۔ قصر الادب عمارت کی بالائی منزل پر تھا۔ میں ٹوکری لے کر اوپر پہنچا، صحن کے بعد ایک کمرہ تھا۔ اس سے ملحق ایک کوٹھری تھی جس پر پھولدار رنگین پردہ لٹک رہا تھا۔ بیرونی کمرہ میں ایک صاحب لکھنے پڑھنے میں مصروف تھے، میں ان سے ناواقف تھا۔ میں نے دریافت کیا مولانا کہاں ہیں؟ انہوں نے کوٹھری کی جانب اشارہ کر دیا، میں نے پردہ اٹھایا، دیکھا فرش پر سفید چادر اور قالین بچھا ہے، قالین پر حضرت علامہ گاؤ تکیہ کے سہارے دراز کش ہیں۔ پیروں کی جانب ایک اور صاحب تشریف فرما ہیں (بعد کو معلوم ہوا کہ وہ جناب محمد صادق صاحب ضیاؔ چنیوٹی تھے)، میں نے سلام کیا اور اپنا تعارف کرایا، علامہ مرحوم کھڑے ہو گئے اور معانقہ کیا۔ ضیاؔ صاحب سے بھی ہاتھ ملایا۔ مولانا فرمانے لگے، نثار صاحب! آپ تو میرے تصور میں کوئی مسن شخص تھے۔ میں نے عرض کیا۔ جیسا ہوں حاضر ہوں، مولانا نے میرے قیام کے متعلق دریافت فرمایا، میں نے عرض کیا صرف آپ کے دیدار سے مشرف ہونے آیا ہوں، آپ سے نیاز حاصل کرنے کے بعد پہلی ٹرین سے واپس ہو جاؤں گا۔ مولانا نے بہت اصرار کیا کہ دو ایک روز قصر الادب میں مہمان رہوں مگر یہ مجھے اس لئے گوارا نہ ہوا کہ جب مجھ میں اتنی استطاعت

نہیں ہے کہ استاد کو کچھ نذر بھی پیش کر سکوں تو یہ کیسے مناسب ہو سکتا ہے کہ اپنی مہمان داری کا بار ان کے سر ڈالوں، چنانچہ میں نے بادلِ ناخواستہ معذرت چاہی اور واپسی کی اجازت طلب کی۔ انہی دنوں علامہ کا پہلا مجموعۂ نظم "کارِ امروز" شائع ہوا تھا چنانچہ اس کے مطالعہ کا شوق بھی بے چین کئے ہوئے تھا۔ "کارِ امروز" کی قیمت اس وقت ساڑھے تین یا چار روپیہ تھی۔ میرے پاس کرایہ کے علاوہ اب صرف پانچ روپے باقی تھے میں نے مولانا سے کارِ امروز کا ایک نسخہ عطا کرنے کی گزارش کی۔ مولانا نے بلند آواز سے کہا۔ اعجاز میاں! نثار صاحب کو ایک نسخہ کارِ امروز کا دے دیجئے۔ وہی صاحب جو کمرہ میں بیٹھے تھے کتاب لے کر اندر آئے اور معلوم ہوا کہ وہ علامہ مرحوم کے صاحبزادے حضرت اعجاز صدیقی ایڈیٹر شاعر ہیں میں نے شیرینی کی تواری میں حصہ کا نوٹ رکھ کر مولانا کے سامنے پیش کیا اور گزارش کی کہ "کارِ امروز" میرے لئے بیش بہا شے ہے میں اس کی کوئی قیمت نہیں چکا سکتا۔ آپ خواہ اسے نذر سمجھئے یا کتاب کی قیمت۔ مولانا خاموش ہو گئے۔ میں نے اجازت طلب کی اور اٹاوہ واپس آیا۔

یہ تھی میری علامہ مرحوم سے پہلی ملاقات ———

مولانا اس وقت باوجود عمر کی پچپن منزلیں طے کر چکنے کے کافی تندرست تھے۔ قد چھوٹا تھا مگر ان کی ترکی ٹوپی اسے درازی عطا کر دیتی تھی سر کے بال سفید ہو چلے تھے اور انگریزی وضع پر ترشے رہتے تھے، مولانا کا چہرہ گول، آنکھیں بڑی اور چمکدار تھیں، ان کی آواز کافی رعب دار تھی۔ مونچھوں کے بال بہت ہلکے رکھتے تھے، داڑھی صفاچٹ رہتی تھی، آخر عمر میں کمر میں تھوڑا خم آ گیا تھا، مگر چھڑی کے سہارے نہایت تیز رفتاری کے ساتھ چل سکتے تھے۔ میں نے انہیں کبھی پُرتکلف لباس میں نہیں دیکھا، "کلیمِ عجم" میں ایامِ شباب کی تصویر دیکھ کر یہ ضرور معلوم ہوا کہ وہ کسی زمانے میں سوٹ بھی پہنتے ہوں گے مگر شاید جوانی کے ساتھ یہ شوق بھی رخصت ہو گیا۔ میں نے انہیں ہمیشہ شیروانی اور چوڑے پائنچے کے پائجامے ہی میں ملبوس دیکھا۔ گھر پر قمیص اور تہ بند یا پاجامہ کے عادی تھے اگر گرمی کی شدت ہوتی تھی تو صرف بنیائن اور تہ بند پر ہی اکتفا کرتے تھے مگر بغیر شیروانی اور ٹوپی کے مکان یا دفتر سے باہر جانا معیوب سمجھتے تھے، انہیں ترکی ٹوپی بہت عزیز تھی۔ کبھی کبھی جاڑے میں سمور کی ٹوپی بھی استعمال کرتے تھے ایسی ہی کے کانٹوں جیسی کھڑے، بھورے بالوں والی ٹوپی ان کے پُررعب چہرہ کو اور بھی باوقار بنا دیتی تھی۔

اس ملاقات کے بعد مولانا سے میرے تعلقات روز بروز بڑھتے گئے، مولانا متعدد مرتبہ اٹاوہ تشریف لائے۔ میں بارہا آگرہ گیا اور ہفتہ دو ہفتہ مولانا کے یہاں قیام پذیر رہا۔ متعدد مقامی اور بیرونی مشاعروں میں ان کا ساتھ رہا۔ غرضیکہ ان کی ہجرتِ پاکستان کے وقت تک مجھے اس کے بے شمار مواقع ملے کہ میں ان کے نظریات، عادات و اطوار اور کردار کے ہر پہلو کا بہ نظرِ غائر مطالعہ کر سکوں۔

علامہ سیماب مرحوم صبح تڑکے بیدار ہونے کے عادی تھے، انہیں اکثر مشاعروں کی شرکت کے باعث رات کے پچھلے پہر تک جاگنا پڑتا تھا مگر یہ جگار صبح خیزی کی راہ میں کبھی حائل نہ ہوتی تھی۔ وہ بہت جلد نمازِ فجر سے فراغت حاصل کر کے سحر گشت کے لئے نکل جاتے تھے، طلوعِ آفتاب سے پہلے کا سہانا وقت اُن کی شگفتگیِ طبع کے لئے بہت موزوں ہوتا تھا۔ وہ خود فرماتے تھے کہ "کارِ امروز" کی بیشتر نظمیں میں نے سحر گشت کے دوران میں کہی ہیں۔ واپسی پر مکان تشریف لاتے، غسل فرماتے، ناشتہ کرتے، اخبارات کا مطالعہ فرماتے اور ٹھیک دس بجے قصر الادب تشریف لاتے دوپہر تک ڈاک دیکھتے، ضروری خطوط پڑھتے ان کے جوابات لکھتے پھر دوپہر کے کھانے سے فراغت پا کر اپنے بیرونی شاگردوں کے کلام پر اصلاح فرماتے اسی دوران میں اگر موقع مل جاتا تو خود بھی شعر کہہ لیتے، شام کو مکان واپس آتے، مغرب کی نماز سے فارغ ہو کر کبھی مکان پر اور کبھی دفتر میں آرام فرماتے اور فکرِ سخن میں مصروف ہو جاتے۔ اگر کسی مشاعرہ کی شرکت ضروری نہ ہوتی تو وہ رات کو جلد سو جانے کے عادی تھے۔

مولانا بڑے ہی صاحبِ علم و فضل بزرگ تھے، ان کی انگریزی تعلیم معمولی ہی تھی مگر ان کی انگریزی تحریر دیکھ کر کوئی یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ صرف ایف۔ اے (سالِ اوّل) تک ہی پڑھے ہیں۔ عربی اور فارسی انہوں نے خوب پڑھی تھی۔ یہ تعلیم انہیں کچھ تو اپنے قابلِ قدر اساتذہ کے ذریعہ اور کچھ فطری ذوقِ مطالعہ سے حاصل ہوئی تھی۔ حضرت مولانا جمال الدین سرحدی مرحوم، مولانا سید احمد گنگوہی اور مولانا قمر الدین وغیرہ فاضل

بزرگوں سے انہوں نے عربی ادب، اصول اور منطق کی تکمیل کی تھی۔ ان کا فارسی کا مطالعہ بھی کافی وسیع تھا جس کا ثبوت ان کی وہ غزلیں ہیں جو انہوں نے فارسی میں کہی ہیں۔ یہ غزلیں اپنی شستگی، صفائی اور سادگی کے اعتبار سے قابلِ قدر ہیں۔

اگرچہ علامہ کی تعلیم و تربیت قدامت پسند ماحول میں ہوئی مگر وہ بڑے روشن خیال اور دوراندیش انسان تھے۔ وہ زمانے کے تیور خوب پہچانتے تھے، اور اس کے ساتھ قدم بقدم چلنے کی کوشش کرتے تھے، ان کی وقت شناس نگاہیں ہمیشہ مستقبل پر رہتی ہیں۔ ادب کے معاملہ میں بھی ان کا یہی وطیرہ تھا۔ جب ان کے معاصرین کی اکثریت روایتی غزل کی پُرپیچ وادیوں میں بھٹک رہی تھی انہوں نے اپنے تصورات اور جذبات کو نئی قدروں کے سانچے میں ڈھالا اور جدید اُردو شاعری کی راہیں متعین کیں "کلیم عجم" کے دیباچہ میں انہوں نے خود اپنی سرگزشت لکھی ہے اور اپنے نظریات شعری کی وضاحت فرمائی ہے۔ لکھتے ہیں:۔

"اوائل مشق سخن تک مجھے قدیم تغزل سے دلچسپی تھی۔ لیکن وقت اور زمانے کے ساتھ علم و معلومات کا دائرہ جس قدر وسیع ہوتا گیا رنگ قدیم سے لگاؤ کم ہوتا گیا۔ حالانکہ میرے رنگ قدیم میں بھی سوقیانہ، غیر متین اور بازاری عنصر کبھی نہ تھا۔ ۱۹۱۸ء سے میرا رنگ تغزل بدل گیا۔ میں اب شاعری میں بلند انسانی جذبات کی ترجمانی کا حامی ہوں میں شاعری میں فلسفہ، حقائق اور معارف کے نکات پسند کرتا ہوں۔ میں اس شاعری کا منکر ہوں جس کا موضوع صرف عورت یا اس کے متعلقات ہوں یا جو امرد پرستی کی نفسیات پر مشتمل ہو۔ میری شاعری کا موضوع حسن محض اور عشق محض ہے اور تمام ضمائر کا مرجع وہ ذات ہے جو حامل حسن اور مرکزِ محبت ہو۔ جس طرح علم، شاعری کے لئے ضروری اور لازمی ہے اسی طرح محبت اور شاعری کو بھی لازم و ملزوم سمجھتا ہوں اور حقیقی واردات قلب کی ترجمانی میرا مسلک ہے۔ گو مجھے تمام اصنافِ سخن پر فطرت نے قدرت دی ہے مگر میں نظم، غزل اور رباعی کو اظہار خیال کا بہترین ذریعہ سمجھتا ہوں۔ شعر کی الہامی حیثیت پر میرا ایمان ہے میں شعر میں بلند خیال کے ساتھ بلند الفاظ کا مؤید ہوں۔ ایسے الفاظ جن میں غرابت نہ ہو اور جنہیں تعلیم یافتہ اصحاب بہ آسانی سمجھ سکیں۔

میں نظم کو غزل پر ترجیح دیتا ہوں اور چاہتا ہوں کہ شعراء غزل سے زیادہ نظم گوئی کی طرف متوجہ ہوں۔ اس لئے کہ غزل جس چیز کا نام ہے وہ اپنی قدامت و کہنگی کی وجہ سے اب زیادہ کارآمد نہیں رہی۔ شعرائے متغزلین اس صنف کو بہ تمام و کمال پامال اور ختم کر چکے ہیں۔ منتہی شعراء کے لئے بھی غزل میں اجتہاد و ایجاد کی گنجائش بہت کم باقی ہے۔ مگر نظم کا میدان ہنوز وسیع ہے اور یہ صنفِ سخن اُردو شاعری کو کارآمد اور مفید بنا سکتی ہے۔ اس لئے زیادہ تر توجہ اسی کی طرف ہونا چاہیئے۔

شعر و شاعری کے متعلق میرا ذاتی نظریہ یہ ہے کہ "زندگی شعر ہے اور شعر زندگی ہے" کائنات بغیر شاعر کے ایک ساز بے نغمہ ہے۔ شاعر دنیا کا ایک ایسا جزوِ ضروری ہے جس کے بغیر دنیا کا قیام ناممکن ہے۔ الہام و القا کا وہ سلسلہ جو انبیاء و اولیاء کی ذاتِ مقدس تک مخصوص ہے۔ شاعر کے دماغ اور سروش کے ساتھ بھی باقی ہے اور ہمیشہ باقی رہے گا۔"

[کلیم عجم]

علامہ مرحوم کے نزدیک شاعر کا مرتبہ بہت بلند تھا انہیں بڑا دکھ ہوتا تھا جب وہ اکثر شعراء کو مشاعروں اور ادبی مجلسوں میں انسانیت سوز حرکات کا مرتکب ہوتے دیکھتے تھے، وہ شاعر کا وقار بہت بلند دیکھنے کے متمنی تھے۔ چنانچہ انہوں نے خود اپنی زندگی کو اسی رنگ میں ڈھال لیا تھا۔ وہ ایسے شعراء سے ملنا جلنا بلکہ بات کرنا تک پسند نہ کرتے تھے جو اخلاقی مراتب سے گرے ہوئے ہوں، اور یہی وجہ تھی کہ بعض لوگ انہیں غلطی سے متکبر اور خود پسند سمجھتے تھے، مولانا فطرتاً نہایت منکسر المزاج تھے۔ میں نے انہیں خود اپنی آنکھوں سے اپنے سے جونیئر اور کمتر درجہ کے شعراء کی بہ صد تواضع کرتے دیکھا ہے شکیل بدایونی جب کبھی تشریف لاتے مولانا نہایت محبت سے بٹھاتے، گھنٹوں باتیں کرتے، ان کا کلام سنتے، اپنا سناتے، چائے پلاتے اور بہ اصرار تمام میزبانی کے فرائض انجام دیتے۔

علامہ بڑے ہی خوددار انسان تھے، ان کی خودداری ان کے پُروقار چہرے سے ٹپکتی تھی۔ جب کبھی ان کے شاعرانہ وقار کو ٹھیس لگ جاتی تھی تو ان کا پیمانۂ صبر چھلک اٹھتا تھا اور وہ بپھر جاتے تھے، ممکن ہے کہ بعض لوگوں کو ان کی یہ ادا پسند نہ ہو۔ خودداری اور غرور کے درمیان بڑا ہی نازک فرق ہے اور ان دونوں کی حدود متعین کرنا ہر شخص کے بس کا کام نہیں ہے۔ ایک مرتبہ مولانا حیدر آباد کے ایک مشاعرہ میں تشریف لے گئے۔ وہاں ان کی بڑی قدر ہوئی۔ وطن واپس آنے پر چند حیدر آبادی احباب کے توسّل سے تحریک ہوئی کہ مولانا مستقلاً حیدر آباد چلے آئیں۔ ولیعہد بہادر ان سے اصلاحِ کلام کے طالب ہیں غالباً تنخواہ کے متعلق بھی معاملہ طے پا گیا مگر جب مولانا کو یہ معلوم ہوا کہ انہیں حیدر آباد کے رسوم کے مطابق دربار میں پگڑی اور پٹکا باندھ کر حاضر ہونا پڑے گا تو ان کی خوددار طبیعت نے بغاوت کر دی اور انہوں نے اس اعزاز کو قبول کرنے سے صاف انکار کر دیا۔

اسی طرح ایک مرتبہ شکوہ آباد میں اسلامیہ اسکول کے قیام کے سلسلہ میں ایک جلسہ تھا پروگرام میں مشاعرہ بھی شامل تھا اسکول کا افتتاح کرنے کے لئے ڈاکٹر سر ضیاء الدین احمد وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کو مدعو کیا گیا تھا اور مشاعرہ کی صدارت علامہ سیماب کے ذمہ تھی۔ اتفاقاً دونوں صدر ایک ہی ٹرین سے شام کے وقت تشریف لائے۔ منتظمین جلسہ میں چونکہ خاصی تعداد علیگڑھ کے تعلیم یافتہ طبقہ کی تھی لہٰذا وہ ڈاکٹر صاحب موصوف کو بڑے احترام سے کار پر بٹھا کر شہر لائے۔ مولانا کے لئے تانگہ کا انتظام کیا گیا۔ مولانا نے اسے اپنی توہین سمجھا اور اسٹیشن سے اس وقت تک قدم باہر نہ نکالا جب تک دوسری کار نہ منگوائی۔ بادی النظر میں یہ بات نہایت معمولی ہو سکتی ہے۔ کچھ لوگ اسے تنگ نظری اور عصبیت بھی کہہ سکتے ہیں۔ لیکن اگر غور کیا جائے تو یہ معاملہ صرف سیماب کی ذات تک ہی نہ تھا بلکہ دیگر اکابرینِ شعروادب کے لئے بھی تامّل کا مقام تھا۔ ہماری سوسائٹی میں ہمارے بزرگانِ ادب کا مرتبہ سیاسی لیڈروں سے بھی کمتر سمجھا جاتا ہے (خواہ اس کے وجوہات کچھ بھی ہوں) اور وہ ان کی اہمیت کو محسوس نہیں کرتے اس لئے ہمارے ادیبوں اور شاعروں کا فرض ہو جاتا ہے کہ وہ عوام کو اپنی اہمیت کا احساس دلائیں اور ان کو اپنا ادب اور احترام کرنا سکھائیں۔

مولانا سیماب کو اپنی خودداری کی بڑی بڑی قیمتیں ادا کرنی پڑیں، تاریخ ادب میں شاید ہی کوئی ایسا شاعر یا ادیب ہوگا۔ جس کے خلاف اس کی زندگی میں اس قدر کثرت سے لکھا گیا ہو جب مولانا سیماب پر پے در پے چاروں طرف سے حملے ہوتے تھے ان کے مخالفین اور معترضین ادبی تنازعات میں ذاتیات اور کردار تک اتر آتے تھے مگر وہ جواں ہمت قصرالادب کی چہار دیواری میں بیٹھا کبھی ہنستا تھا کبھی جز بز ہوتا تھا اور کبھی زمانے کی ناقدر شناسی کا شکوہ کرکے تاسّف کرتا تھا، انہوں نے شاید کبھی خود اپنی قلم سے ان حضرات کا جواب لکھنا مناسب نہ سمجھا، میں نے ایسے عزم اور ہمت کے انسان بہت کم دیکھے ہیں جو بیک وقت سینکڑوں طوفانوں سے ٹکر لیتے رہے ہوں اور ان سے صحیح و سلامت نکل کر ملک میں اس قدر مقبولیت اور شہرت حاصل کر سکے ہوں۔

ایک دن میں نے عرض کیا مولانا! ادبی دنیا میں آپ کے اس قدر مخالف موجود ہیں آپ زمانہ سازی سے کام کیوں نہیں لیتے، شعرا اور نقاد آپ کو متکبر سمجھتے ہیں اور آپ کی خوددارانہ اسپرٹ کا غلط مطلب نکالتے ہیں آپ بھی دوسروں کی طرح ان کو فریب دیجئے۔ رفتہ رفتہ سب رام ہو جائیں گے۔ مولانا میرے اس سوال پر غور و فکر میں پڑ گئے۔ ان کے چہرہ سے کچھ بیکسی کے آثار جھلکنے لگے بولے۔ نظر صاحب! زمانہ سازی تو میرے بس کی بات نہیں، بچپن سے صاف گوئی کی عادت رہی ہے وہ کیسے بدل جائے، لیکن میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میں متکبر نہیں ہوں۔ مجھے اپنے وقار کے تحفظ کا ضرور خیال رہتا ہے اور میں چاہتا ہوں کہ آپ اور ملک کے دوسرے شعرا بھی اس پر عمل کریں۔ جو کچھ جس کے جی میں آئے لکھے میں کسی کو دھوکہ نہیں دے سکتا۔ لیکن یاد رکھئے کہ جب یہ دور گزر جائے گا۔ میں مر جاؤں گا۔ یہ نسل مر جائے گی تو سیماب کے کارناموں کی قدر ہوگی۔ میں نے اتنا کام کر لیا ہے کہ دنیا مجھے فراموش بھی کرنا چاہے تو نہیں کر سکتی میں نے اپنے ہاتھوں سے حیاتِ ابدی کا محل تعمیر کیا ہے اس عمارت کو میری مخالفت کے وقتی طوفان ڈھا نہیں سکتے ؎

شہرتِ شعرم بہ گیتی بعدِ من خواہد شدن

اس فریب اور ریاکاری کے ضمن کے علاوہ اگر آپ کے ذہن میں کوئی تدبیر ہو تو بتائیے میں اس پر عمل کرنے کو تیار ہوں۔ میں نے عرض کیا۔ مولانا آپ مشاعروں میں دوسرے شعراء سے الگ تھلگ رہتے ہیں وہ لوگ اس کا مطلب اگر یہ سمجھتے ہیں تو کیا بیجا ہے کہ آپ شاید انہیں اپنا ہم مرتبہ نہیں سمجھتے۔ مولانا فرمانے لگے۔ آپ کا خیال صحیح ہے مجھے بھی اس کا احساس ہے کہ دوسرے شعراء میرے متعلق اسی طرح سوچتے ہوں گے بعض وقت میں نے اشارتاً ان کو اس کا شاکی بھی پایا ہے مگر وہ میرا دکھ کیا جانیں۔ میں مدتوں سے ذیابیطس کا مریض ہوں یہ مرض اب ناسور کی شکل میں تبدیل ہو چکا ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ زخموں کے باعث اکثر لیٹا رہتا ہوں۔ بیٹھتا بھی ہوں تو تکیہ کا سہارا ضروری ہوتا ہے۔ روزانہ سجاد حسین (مولانا کے صاحبزادے) میرے زخم صاف کرتے ہیں ان سے مواد اور خون رِستا ہے۔ میں اگر دوسرے شعراء کے ساتھ مشاعروں میں قیام کروں تو میری وجہ سے انہیں کس قدر تکلیف پہنچے گی، جہاں عام شعراء قیام کرتے ہیں لوگوں کی آمد و رفت بکثرت رہتی ہے جو بربنائے تکلف مجھے بار بار اُٹھنا بیٹھنا پڑے گا، یہ میرے بس سے باہر ہے۔ میرے زخموں کی صفائی وہاں ناممکن ہے میں نہیں چاہتا کہ صاف ستھری فضا میری ذات سے گندی ہو۔ اور لوگ مجھ سے اس بنا پر تنفر کا اظہار کریں۔ میں چاہتا ہوں کہ اپنے دیگر معاصرین کے ساتھ زیادہ سے زیادہ وقت گذاروں مگر یہ ناممکن ہے۔ یہ باتیں بھی میں صرف آپ سے کہہ سکتا ہوں ہر ایک سے کہنے کی نہیں۔ اب آپ ہی بتائیے اس میں میری کیا خطا ہے۔ مجھ پر جس قدر اعتراضات ہوتے ہیں اور میری جس قدر مخالفتیں کی جاتی ہیں وہ بربنائے حسد ہیں۔ وہ لوگ میری مقبولیت اور شہرت نہیں دیکھ سکتے۔ میں حاسدوں سے نہیں ڈرتا وہ ایک دن خود اپنی آگ میں جل کر خاک ہو جائیں گے۔

مجھے خدا نے حسد سے بچا لیا سیمابؔ　　　ہزار شکر کہ محسودِ روزگار ہوں میں

علامہ مرحوم کی قادر الکلامی اور مشاقی کے سب ہی معترف تھے۔ شعر کہنا ان کے لئے بچوں کا کھیل تھا۔ کیسا ہی موضوع ہو ان کو اشعار موزوں کرنے میں دیر نہ لگتی تھی۔ وہ شعر کہنے کی مشین تھے۔ میں نے انہیں اکثر فکر سخن کرتے دیکھا ہے۔ کبھی کبھی تو ایسا ہوتا تھا کہ مشاعرہ کا وقت ہو گیا ہے شاگرد جمع ہیں مولانا شاگردوں کی غزلوں پر اصلاح کرتے جاتے ہیں۔ ان سے باتیں ہو رہی ہیں اور اپنی غزل بھی کہہ رہے ہیں اگر تنہا ہوتے تو بوقت فکر وہ عام طور پر پلنگ پر کروٹ سے لیٹ جاتے تھے قلم اور کاغذ قریب رکھ لیتے تھے اور بے تکلف لکھتے چلے جاتے تھے۔ میں نے اکثر شعراء کو دیکھا ہے کہ وہ شعر کہتے وقت گنگناتے ہیں، ہاتھ پیر چلاتے ہیں، منہ بناتے ہیں، سگرٹ پر سگرٹ پیتے ہیں اور تب کہیں جا کر سات یا نو شعر کی غزل کہہ پاتے ہیں۔ مولانا کے لئے یہ تمام لوازمات غیر ضروری تھے۔ ہاں کبھی کبھی لیٹے لیٹے داہنے پیر کے پنجے کو ہلاتے جاتے تھے، اور جس قدر اشعار چاہتے تھے، موزوں کر لیتے تھے۔ مشاعروں میں کلام پڑھتے وقت بھی وہ جملہ روایتی تکلفات سے اجتناب فرماتے تھے۔ عام شعراء کی طرح میں نے انہیں ہر شعر پر جھک جھک کے سلام کرتے، اور اظہار کسرِ نفسی کرتے کبھی نہیں دیکھا۔ ان کی آواز بڑی پاٹ دار تھی۔ شعر عجب انداز سے ادا کرتے تھے۔ ان کے پڑھنے کے طریقہ کو نہ تحت اللفظ کہا جا سکتا ہے اور نہ مترنم۔ وہ ان دونوں کے درمیان کی کوئی چیز تھی ان کے پڑھتے وقت شعر اور شاعر دونوں کے وقار کا احساس ہوتا تھا۔ عوام کو تو ان کے اشعار پر داد دینے کی ہمت ہی نہ ہوتی تھی۔ خواص کی داد پر وہ کبھی کبھی مسکرا دیتے تھے۔ جب ان کو کسی اچھے شعر پر مشاعرہ میں داد ملتی تھی تو ان کے چہرہ پر ایک خاص قسم کی بشاشت کی روشنی دوڑ جاتی تھی۔

ان کی قادر الکلامی کے بارے میں ابھی میں عرض کر چکا ہوں۔ اپنے بیرونی اور مقامی پچاسوں شاگردوں کی غزلوں اور نظموں پر اصلاح دینا ان کا روزانہ کا معمول تھا۔ چند گھنٹے دن کے اس کام کے لئے وقف تھے۔ اگر کسی دن ڈاک کم ہوتی تھی تو فاضل وقت میں اپنے لئے کوئی غزل یا نظم کہہ لیا کرتے تھے۔ ان کے شاگردوں میں ہر مذہب و ملت کے لوگ شریک تھے ان کے ادبی اور سیاسی رجحانات بھی جدا جدا ہوتے تھے۔ مولانا کو بعض کے نظریات سے اختلاف ہونا فطری تھا مگر اصلاحِ کلام کے وقت وہ اپنے نظریات کو بالائے طاق رکھ کر شاگرد کے مسلک کے مطابق اصلاح دیتے تھے اور کسی کو اپنا نظریۂ حیات بدلنے پر مجبور نہ کرتے تھے۔ چنانچہ اسی کا نتیجہ ہے کہ آج ان کے ہزاروں شاگرد ملک کی مختلف تحریکات سے وابستہ ہیں۔ بعض روایتی غزل گو ہیں بعض ترقی پسند گروپ سے منسلک ہیں۔ کوئی کانگریسی ہے تو کوئی مسلم لیگ کا ہمنوا ہے اور کچھ لوگ کمیونسٹ

اور مخلتف جماعتوں سے تعلق رکھتے ہیں۔

ان کی قادر الکلامی سے متعلق ایک لطیفہ سنئے۔ حضرت علامہ ایک مرتبہ ٹونک تشریف لے گئے۔ ٹونک کے شعراء کی ایک انجمن نے مشورہ کیا کہ مولانا کا امتحان لیا جائے چنانچہ انہوں نے صبح حاضر ہوکر مولانا سے عرض کیا کہ آج شب کو آپ کو ایک مشاعرہ کی صدارت فرمانا ہے جس کا مصرع یہ ہے۔

"کہ مجھے تاب [illegible] انتظار نہیں ہے" اور یہ کہ آپ کو اپنے اسکول کے دستور کے مطابق خطبۂ صدارت بھی پڑھنا ہوگا۔

اس زمین میں غالب کی ایک مختصر غزل ہے جس کی بحر نہ صرف اُردو میں غیر مروجہ بلکہ نہایت مشکل ہے۔ مولانا کو بھی کسی نے آگاہ کر دیا کہ آپ کا امتحان مقصود ہے۔ علامہ مرحوم نے بخوشی یہ دعوتِ امتحان قبول کر لی اور رات کو مشاعرہ میں نہ صرف طویل طرحی غزل پڑھی بلکہ اسی زمین اور اسی ردیف قافیہ میں ساٹھ ستر اشعار کا خطبۂ صدارت بھی خلافِ معمول نثر کے بجائے نظم میں پیش کیا۔ مولانا کی اس قادر الکلامی پر بڑے بڑے اساتذہ دنگ رہ گئے۔ اور دوسرے دن کئی حضرات نے ان کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا۔

مولانا جس زمانے میں "وحیِ منظوم" کی تکمیل فرما رہے تھے مجھے آگرہ میں ان کے ہمراہ چند دن قیام کا اتفاق ہوا۔ قرآن پاک کا ترجمہ کوئی آسان کام نہ تھا۔ مولانا صبح غسل فرماتے اور نماز سے فارغ ہوکر کمرہ میں آ بیٹھتے تھے۔ لبان اور اگربتیاں جلائی جاتی تھیں۔ کلام پاک کے متعدد نسخے میزوں پر اردگرد کھول کر رکھ دیئے جاتے تھے اس کے بعد وہ ترجمہ شروع فرماتے تھے۔ ایک ایک آیت کی تلاوت کرتے تھے پھر مختلف تراجم کا مطالعہ کرکے اُس آیت کا ترجمہ نظم کرتے تھے دوپہر کو تھوڑی دیر آرام فرمانے کے بعد سہ پہر سے پھر وہی شغل شروع ہو جاتا تھا۔ برسوں کا کام تھا مگر مولانا کو چونکہ زبان اور بیان پر بے انتہا قدرت حاصل تھی لہٰذا انہوں نے صرف ساڑھے پانچ ماہ میں یہ عظیم الشان کام سرانجام دے لیا۔ وہ اپنے اس کارنامہ پر بے انتہا مسرور تھے اور فرماتے تھے کہ میری یہ خدمت نہ صرف میری نجات کا باعث ہوگی بلکہ میرے نام کو دنیا میں زندہ رکھنے کی ضامن ہوگی۔ افسوس کہ سرمایہ کی کمی کے باعث یہ ترجمہ ابھی تک شائع نہیں ہو سکا ہے۔ ان کے بڑے صاحبزادے منظر صدیقی نے کراچی سے صرف نمونتاً "پارۂ عم" کا ترجمہ چھپوا دیا ہے۔ حکومت پاکستان کو اس جانب توجہ کرنی چاہیئے ایسا نہ ہو کہ دست بردِ زمانہ کے ہاتھوں یہ نایاب گوہر ضائع ہو جائے۔

مولانا مرحوم بڑے پکے مسلمان تھے۔ عقیدتاً وہ حنفی تھے، تصوف سے بھی انہیں گہری دلچسپی تھی۔ حاجی وارث علی شاہ صاحب سے انہیں بیعت حاصل تھی وہ اپنے پیر سے بے انتہا عقیدت اور محبت رکھتے تھے۔ حاجی صاحب قبلہ کی ایک تصویر ان کے سرہانے آویزاں رہتی تھی۔ اور اس پر پھولوں کا ہار (کبھی کبھی ایک پردہ لٹکا رہتا تھا۔ وہ نمازیں بھی پڑھتے تھے اور روزے بھی رکھتے تھے اگرچہ اس ضمن میں زیادہ محتاط نہ تھے۔ بزرگانِ دین اور پیشوایانِ اسلام سے انہیں گہری محبت تھی۔ محرم کے ایام میں غزلیں کہنا ترک کر دیتے تھے اور اس مہینے میں صرف سلام یا شہدائے کربلا سے متعلق نظمیں یا مرثیے نظم کرتے تھے۔ ان کے سلاموں اور اس قسم کی نظموں کے دو مجموعے "سرودِ غم" اور "نفیرِ غم" شائع ہوکر مقبول ہو چکے ہیں۔ اس مذہبی شغف کے باوجود وہ دوسرے مذاہب کا بیحد احترام کرتے تھے۔ دوسرے مذاہب کے بزرگوں سے بھی ان کو دلی لگاؤ تھا۔ تعصب تو انہیں چھو تک نہ گیا تھا ان کے مجموعوں میں جہاں پیغمبرِ اسلام اور دیگر رہنمایانِ اسلام پر نظمیں ہیں وہیں ان کے دوش بدوش سری کرشن، گوتم بدھ وغیرہ کو بھی خراجِ عقیدت پیش کیا گیا ہے۔ سری کرشن جی سے تو انہیں خصوصی دلچسپی تھی۔ انہوں نے ہندو مذہب کے اس پیغمبرِ محبت کے متعلق بہت سی نظمیں مختلف عنوانات سے کہی ہیں جو کرشن گیتا کے نام سے شائع ہو چکی ہیں کرشن جی کو وہ کس نظر سے دیکھتے تھے اس کا اظہار انہی کی زبان سے سنئے۔ "کرشن گیتا" کے دیباچہ میں ایک جگہ تحریر فرمایا ہے۔

"مجھے ہندو مذہب کے قدیم اوتاروں میں صرف سری کرشن سے بڑی عقیدت و محبت ہے اس کا ایک سبب تو میرا شاعرانہ ذوق ہے کہ مجھے سری کرشن کی زندگی یکسر رومان اور مطلق محبت نظر آتی ہے۔ ہندوستان میں پریم اور پریت یعنی عشق و محبت

کے جتنے نغمے پھیلے ہوئے ہیں ان کا سرچشمہ میں سری کرشن کی مشہور تاریخی بانسری ہی کو سمجھتا ہوں۔ اس میں شک نہیں کہ برج کے حدود میں سری کرشن کی بانسری نے جو گیت گائے ہیں ان کا اثر بندرابن اور جابن کی رنگین فضاؤں میں آج تک محسوس ہوتا ہے۔ میں جب کبھی دہلی جاتے ہوئے برج کی سرزمین سے ریل میں گزرتا ہوں تو مجھے خاموش صحرا کے ٹیلوں پر اور چرنے والے مویشیوں کے جھنڈ میں اب تک سری کرشن بانسری بجاتے ہوئے نظر آتے ہیں۔"

مولانا کو قدرت کے مناظر سے بھی بڑی دلچسپی تھی انہوں نے مختلف منظریاتی نظمیں لکھی ہیں۔ گلشن، پہاڑ، شفق، ابر، صبح، شام، چاندنی یہ تمام ناظر اُن کے لئے دلکشی کا سامان فراہم کرتے تھے اور دعوت کیف و نظر دیتے تھے مگر انہیں بوجوہ دریا اور ساحل دریا سے نفرت تھی۔ ایک مرتبہ جب میں نے اس کا سبب دریافت کیا تو فرمایا کہ مناظر دریا سے نفرت کا سبب ایک complex ہے۔ وہ ایک مشاعرہ کے سلسلہ میں وسط ہند گئے ہوئے تھے۔ وہاں انہیں ایک ندی کشتی کے ذریعہ پار کرنی پڑی، دریا میں سیلاب آیا ہوا تھا۔ جب کشتی درمیان میں پہنچی تو اُلٹ گئی مگر خدا کے فضل سے تمام مسافر بچا لئے گئے۔ مولانا مرحوم کو اسی دن سے دریا اور اس کی جملہ رعنائیوں سے نفرت ہو گئی۔ پہاڑ پر جانے کے لئے اکثر ان کا جی چاہتا تھا۔ وحیؔ منظوم کے ترجمہ کے زمانہ میں میں نے ان سے گزارش کی کہ آپ آگرہ کی اس روح فرسا گرمی میں اس قدر محنت کر رہے ہیں اگر منصوری یا نینی تال تشریف لے جائیں تو بہتر ہو۔ فرمانے لگے جی تو میرا بھی یہی چاہتا ہے مگر کیا کروں۔ پہاڑوں پر مکان بہ آسانی نہیں ملتے میں تنہا جانا نہیں چاہتا اگر بچوں کو یہاں چھوڑ تا ہوں تو دل ان ہی میں لگا رہے گا اور میں یکسوئی سے کام نہ کر سکوں گا۔ اتنے بڑے خاندان کو لے کر کیسے جاؤں۔ میری طبیعت یہ گوارا نہیں کرتی۔

انہیں اپنے اہل و عیال کا بڑا خیال تھا۔ خاندان میں پچیس تیس افراد تھے۔ مولانا سب کی فکر رکھتے تھے۔ چھوٹے بچوں سے تو انہیں خصوصی محبت تھی۔ اپنے تین یا چار سال کے پوتے افتخار سے اکثر کھیلا کرتے تھے اور اس کی پیاری پیاری باتیں سنکر بیحد خوش ہوتے تھے۔ انہیں اپنی قیمت کا احساس اس لئے بھی تھا کہ وہ اس عظیم خاندان کے کفیل تھے وہ فسادات سے بہت ڈرتے تھے۔ ایک مرتبہ جب میں آگرہ میں مولانا کے یہاں مقیم تھا شہر میں ہندو مسلم فساد ہو گیا۔ میں نے دیکھا کہ مولانا بہت پریشان اور سراسیمہ ہیں۔ ہر دس منٹ بعد تازہ حالات معلوم کرنے کی فکر ہے گھبرائے ہوئے کمرے میں ٹہل رہے ہیں میں نے جرأت کر کے عرض کیا۔ مولانا مسلمان کے لئے موت برحق ہے آپ موت سے اتنا کیوں ڈرتے ہیں۔ کہنے لگے مجھے اپنی جان کی اتنی فکر نہیں۔ بلکہ تمہاری اور بچوں کی فکر ہے۔

مولانا کو اپنے وطن آگرہ سے بے پناہ محبت تھی وہ اسے تمام دنیا میں سربلند و معزز دیکھنا چاہتے تھے ان کو اس کی ادبی منزلت کا بھی بخوبی احساس تھا۔ ارض تاج کے عنوان سے انہوں نے جو نظمیں کہی ہیں وہ ان کی وطن دوستی کی شاہد ہیں ان نظموں میں آگرہ کی ایک ایک عمارت کا تذکرہ اس خوبی اور صداقت سے کیا گیا ہے کہ جواب نہیں، تاج کا حسن تو ان کی شاعری میں جذب ہی ہو چکا تھا۔ انہوں نے بھی تاج پر مختلف انداز سے اتنی خوبصورت اور کیف آفریں نظمیں کہی ہیں جو شاید تاج کے فنا ہو جانے کے بعد بھی اس کا نام باقی رکھنے کے لئے باقی رہیں گی۔ وہ پاکستان میں تھے، مگر ان کی روح آگرہ کی گلیوں میں بھٹکی پھرتی تھی اس جدائی سے انہیں کتنی روحانی تکلیف تھی اس کا احساس صرف وہی کر سکتا ہے جو اُن کی طرح وطن دوست دل رکھتا ہو۔

علامہ مرحوم کی ذات مجسّم عمل تھی میں نے انہیں کبھی بیکار نہیں دیکھا۔ احباب اور شاگردوں میں بیٹھ کر غپ شپ ملانا اُن کا شیوہ نہ تھا۔ وہ زندگی بھر علم و ادب کی خدمت کرتے رہے تقریباً ۳۰۰ کتابیں تصنیف کیں۔ اقتصادی حالات سے مجبور ہو کر اکثر کتابوں کا حق اشاعت دوسروں کے نام فروخت کر دیا۔ آخر میں چند کتابیں اپنے ادارہ قصر الادب کی جانب سے شائع کرائیں۔ ضعیفی میں بھی وہ رات دن کام کرتے تھے۔ پاکستان منتقل ہو جانے کے بعد بھی تصنیف و تالیف کا یہ سلسلہ بدستور جاری رہا۔ پاکستان میں جب ان پر فالج کا حملہ ہوا تو تھوڑا سا افاقہ ہوتے ہی پھر اپنے کام میں مصروف ہو گئے، فالج کے اثر سے جب خود لکھنے کے قابل نہ رہے تو اپنے چھوٹے صاحبزادے مظہر صدیقی سے ضروری خطوط کے جوابات اور غزلیں وغیرہ لکھواتے رہے۔ وہ دوسروں کو بیکار بیٹھے دیکھ کر تعجب کرتے تھے اور سوچتے تھے کہ لوگ بیکار رہ کر وقت کس طرح گزار لیتے ہیں۔ ایسے صاحب فکر و عمل شخص دنیا میں شاذ و نادر ہی پیدا ہوتے ہیں۔ افسوس کہ علم و عمل کا یہ چراغ دنیا کو پچاس سال تک روشنی دیکر ۳ جنوری ۱۹۵۱ء کو کراچی میں گل ہو گیا۔

مرزا یگانہ چنگیزی

سید اعظم حسین اعظم

آج سے چند دنوں قبل مرزا یگانہ چنگیزی کے ذاتی حالات سے میں کچھ زیادہ واقف نہیں تھا کیونکہ مجھے ان کو قریب سے دیکھنے اور ان سے ملنے جلنے کا بہت کم موقع ملا تھا۔ میں نے سب سے پہلے شاید ۱۹۲۷ء میں مرزا یگانہ کے چند اچھے شعر انہی کے لہجے میں پروفیسر سید مسعود حسن صاحب رضوی سے سنے تھے۔ پروفیسر صاحب موصوف نے اس طرح مجھ پر واضح فرمایا تھا کہ مرزا یگانہ نہ صرف اچھے شعر کہتے ہیں بلکہ پڑھتے بھی خوب ہیں۔ پروفیسر صاحب موصوف نے اس وقت مرزا یگانہ کے جو اشعار سنائے تھے ان میں سے دو ایک مجھے یاد ہیں اور دل سے پسند ہیں۔ وہ شعر یہ ہیں ؎

آبلہ پا نکل گئے کانٹوں کو روندتے ہوئے
شوق جانا کچھ پھر آنکھ سے ملیں یار دیکھ کر

وصول صاحب نظر آیا سواد منزل کا
نگاہ شوق سے آگے تھا کارواں دل کا

اس کے بعد گاہ گاہ مرزا صاحب کا کلام ادبی رسالوں میں نظر سے گزرا —————— کئی سال بعد حکیم سید محمد قاسم صاحب کے مدرسہ الادبیہ میں مرزا صاحب سے ملاقات ہوئی۔ حیدر آباد دکن میں سب رجسٹرار تھے۔ وہاں سے چھٹی پر آئے ہوئے تھے۔ میں نے روزنامہ سرفراز کے ایڈیٹر کی حیثیت اس کے موسم بہار کے لئے کلام کی فرمائش کی اور انہوں نے کچھ شعر مجھے عنایت کئے۔

یہ مرزا یگانہ سے میری پہلی ملاقات تھی۔ سیاہ رنگ، داڑھی مونچھیں صاف، کم رو، سن رسیدہ آدمی نظر آئے۔ شخصیت کا کوئی خاص اثر نہیں ہوا مگر ان کی شہرت سن چکا تھا اور دیکھا نہیں تھا۔ اس لئے ان سے مل کر ذوق تجسس کو یہ تسکین ہوئی کہ یہی مرزا یگانہ ہیں۔

اس کے بعد طویل مدت تک مرزا یگانہ سے ملنے کی نوبت نہیں آئی۔ رسائل میں یا خود ان کے مجموعۂ رباعیات میں مرزا غالب دہلوی کے متعلق ان کے معاندانہ اشعار پڑھ پڑھ کر ان سے ایک طرح کی بیزاری دل میں پرورش پاتی رہی۔ ان اشعار میں صرف اپنی لن ترانی اور غالب کی ہجو ہوتی تھی کوئی ایسی قابل لحاظ تنقید نہیں ہوتی تھی جس سے ان کے سنجیدہ غور و فکر کا ثبوت ملتا۔

مرزا یگانہ حیدر آباد کی ملازمت سے ریٹائر ہو کر لکھنؤ آئے تو کبھی کبھار انہیں دیکھنے سننے کا اتفاق ہوا، پھر بھی کوئی سیر حاصل ملاقات اور مبادلۂ خیالات کا موقع نہیں ملا۔ تقریباً دو سال ہوئے کہ ان کے خلاف مسلمان پبلک میں ایک ہیجان عظیم ہوا اور ایک دن ان کی مجمع گشت بنائی گئی۔ جو تحریریں ان سے

منسوب کی گئی تھیں وہ ضرور قابلِ اعتراض تھیں لیکن مجھے مولوی عبدالماجد صاحب دریا بادی کا یہ رویہ بھی اچھا نہیں معلوم ہوا کہ انہوں نے ایک پرائیویٹ خط کو اپنے اخبار میں شائع کر کے اس طرح اچھال دیا کہ بات قابو سے باہر ہو گئی۔ چنانچہ میں نے اخبار "روشنی" میں جو کہ اس وقت میری ادارت میں نکل رہا تھا" اس مسئلے کو زیادہ اہمیت نہیں دی کیونکہ اس اشتعال انگیزی میں حصہ لینے والے اخبارات میرے نزدیک مولوی عبدالماجد صاحب دریا بادی کے آلۂ کار بن رہے تھے۔

اس دوران میں مجھے مرزا یگانہ کے حالات ان کے بعض اعزائے خاص سے معلوم ہوتے رہے۔ میں نے سُنا کہ مسلم ہجوم کی تشدد دانہ یورش کا اثر مرزا یگانہ کے دل و دماغ پر بہت زیادہ ہوا۔ جس مکان میں رہتے تھے اسے انہوں نے یک لخت چھوڑ دیا اور پھر تشہیر کے بعد سے پھر پلٹ کر اسے نہیں دیکھا۔ ان کا کہنا ہے کہ اس میں ان کی نادر کتابیں اور مسودات سبھی کچھ تلف ہو گئے۔ پولیس نے عوام کے ہاتھوں سے جب انہیں رہائی دلائی تو وہ ایک دوسرے مکان میں اپنے کسی عزیز کے ہاں جا کر پناہ گیر ہو گئے اور ایک عرصہ تک وہاں رہے۔ مگر انہیں اپنے گرد و پیش پر اعتماد نہیں رہ گیا تھا لہٰذا وہ اس محلے سے منتقل ہو کر ایک اور محلہ میں کرایہ کے مکان میں رہنے لگے۔ اس مکان میں یکہ و تنہا رہتے تھے کوئی اور ساتھ نہیں تھا۔ تنہائی کی بڑی تکلیف تھی کہ جاڑے آتے ہی بہت سخت بیمار پڑ گئے۔ حالت نازک ہو گئی، ایک رشتہ دار کو خبر ہوئی تو وہ اپنے مکان واقع محلہ شاہ گنج میں انہیں اٹھا لائے۔

میں اسی ہفتے محلہ شاہ گنج میں مرزا یگانہ سے پروفیسر مسعود حسن صاحب رضوی کے ساتھ ملا۔ ایک پختہ مکان کے صاف ستھرے کمرے میں ایک طرف ان کا پلنگ بچھا ہوا ہے۔ اس کی پٹی کے پاس ایک بڑے ظرف میں بہت سی راکھ رکھی ہے جس میں یہ بوڑھا لحیف و نحیف شاعر بار بار کھانس کر تھوکتا رہتا ہے پلنگ کے سامنے ایک میز ہے جس پر کچھ کتابیں اور کاغذات اور کچھ چائے کے ظروف وغیرہ رکھے ہیں۔ وہیں زمین پر مٹی کے تیل کا چولھا، اسٹوو اور چند پتیلیاں وغیرہ ہیں۔ ایک معمولی سی کرسی رکھی ہے۔ کمرے کے بیچ میں کسی اور شخص کا بستر زمین پر بچھا ہوا ہے جس کے بعد کمرے کے دوسرے کنارے ایک اور پلنگ لگا ہوا ہے مگر مرزا صاحب اس وقت کمرے میں بالکل تنہا تھے۔ کمرے کا دروازہ بند رہا کرتا ہے جسے کسی کی آمد کی اطلاع ہونے پر مرزا صاحب خود اٹھ کر کھول لیتے ہیں اور پھر فوراً بند کر لیا جاتا ہے۔

مرزا صاحب بہت بیمار ہیں اور اپنی زندگی سے تقریباً مایوس ہیں۔ اس عالم میں انہیں اپنی تنہائی کا بہت زیادہ احساس ہے کیونکہ ان کی اولادیں پاکستان میں ہیں اور ان کی شریکِ زندگی بھی اس وقت ان کے پاس نہیں ہیں۔ وہ اپنے حال اور خاص کر مستقبل کے متعلق پروفیسر مسعود حسن صاحب رضوی سے بعض ضروری باتیں کرتے رہے۔ پھر "نقوش" کے لئے مضمون اور تصویر بھیجنے کا تذکرہ ہوا۔ کافی دیر گفتگو کے بعد ہم واپس ہوئے۔ تیسرے دن میں تنہا یگانہ صاحب کے یہاں دوپہر کو جا کر ان سے ملا۔ گھنٹوں نشست رہی اور موصوف نے میری فرمائش پر اپنے حالاتِ زندگی بیان کئے۔ کبھی لیٹ جاتے تھے اور کبھی کھانسی اور ضیقِ نفس کی تکلیف سے بیٹھ جاتے تھے۔ تھوڑا سکون ہونے پر پھر لیٹ جاتے تھے اور سگریٹ جلا کر پینے لگتے تھے۔ کمرے میں سوا ہم دو کے کوئی اور نہیں تھا میں نے کافی غور سے ان کی باتیں سنیں اور ان سے بعض دور رس سوالات کئے جن کے جوابات پا کر میں اس فن کار کی بعض خوبیوں اور بعض کمزوریوں سے براہِ راست مطلع ہوا۔

مرزا یگانہ کا پورا نام مرزا واجد حسین ہے۔ ان کے والد مرزا پیارے صاحب تھے۔ یہ سنہ ۱۸۸۴ء میں شہر عظیم آباد کے محلہ مغلپورہ میں پیدا ہوئے تھے۔ تاریخ ولادت غالباً ۲۰ ذی الحجہ سنہ ۱۳۰۱ھ تھی۔ ابتدائی تعلیم مولانا محمد سعید صاحب حسرت عظیم آبادی کے مدرسے میں ہوئی۔ پھر محمد جان اینگلو عربک اسکول پٹنہ میں داخل ہوئے۔ سنہ ۱۹۰۳ء میں کلکتہ یونیورسٹی سے انٹرنس پاس کیا۔ شعر و ادب میں مذاقِ سخن کی اصلاح سب سے پہلے مولوی سید علی خان بیتاب عظیم آبادی نے اور ان کے بعد شاد عظیم آبادی نے کی۔ سنہ ۱۹۰۵ء میں علاج کے سلسلے سے لکھنؤ آئے، پھر یہیں ایک معزز گھرانے میں شادی ہو گئی۔ ۱۹۱۳ء سے لکھنؤ ہی کو اپنا وطن بنا لیا۔

اُردو زبان پر بڑی قدرت رکھتے ہیں اور زبان دانی، محاورہ بندی، جدتِ بیان اور جوشِ ادا کے لئے خاص طور پر ممتاز ہیں۔ وہ دنیائے ادب میں تقریباً پچاس سال تک بہ خیال خود اپنے ادبی فرائض انجام دینے کے باعث بدنام رہے۔ عام طور پر یہی آوازیں آتی رہیں کہ لڑنے جھگڑنے میں گذاری بمصداق

یہ نام گانہیں سکتے نہ کبھی نام رہ گیا مگر مرزا صاحب کے نزدیک ان کی یہ زندگی مجاہدانہ زندگی تھی جسے لڑنے جھگڑنے سے موسوم کرنا حق کی طرف سے آنکھیں پھیرنا ہے۔ ابتداء میں انہوں نے معاصرین لکھنؤ کے خلاف اس لئے آواز بلند کی کہ ان کے نزدیک ان معاصرین کی روش صحیح نہ تھی اور وہ غالب کی غلط تقلید کر رہے تھے۔ مرزا یگانہ نے اس سلسلے میں شعرائے لکھنؤ پر پرجوش تنقیدیں کیں جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تمام لکھنؤ اور سارا اودھ ایک طرف ہو گیا اور مرزا یگانہ ایک طرف۔ اچھا خاصا محاذ قائم ہو گیا جس کا زور وشور تقریباً بیس سال تک رہا۔ لکھنؤ کے شعراء نے مرزا یگانہ کا اس حد تک بائیکاٹ کیا کہ جس مشاعرے میں وہ جاتے تھے اس میں تمام دوسرے شعراء شرکت نہیں کرتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ لوگ مرزا یگانہ کو مشاعروں میں مدعو کرنے سے احتراز کرنے لگے۔

مرزا یگانہ نے تقریباً ۱۹۱۵ء سے مرزا غالب کے کلام کی تنقید یا تنقیص کرنا شروع کی۔ اس سے ان کا مقصد "غالب پسندوں" کی روش کی اصلاح تھی مگر نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ سارے ہندوستان کے شاعر و ادیب بلکہ یوں کہئے کہ کل اہلِ ذوق مرزا یگانہ سے بیزار ہو گئے۔ مرزا یگانہ کی "غالب دشمنی" بھی بڑھتی ہی گئی تا آنکہ انہوں نے بالآخر ۱۹۳۵ء میں "غالب شکن" کے نام سے ایک رسالہ شائع کیا۔

"غالب شکن" کی شانِ نزول یہ ہے کہ ایک بار کانپور میں آل انڈیا شاعر کانفرنس زیر صدارت سر راس مسعود مرحوم ہوئی جس میں مختلف ادیبوں نے مقالے پڑھے۔ ایک مقالہ نگار نے اس وقت کے شعراء پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے مرزا یگانہ کے مجموعہ رباعیات "ترانہ" کا حوالہ دیا جس میں مرزا یگانہ نے غالب کی ہجو میں سخت الفاظ استعمال کئے تھے۔ مقالہ نگار نے ترانہ کا حوالہ دیتے ہوئے تعجب کا اظہار کیا کہ ایک ایسا بلند خیال شاعر ایسی پستی تک اتر سکتا ہے۔ پروفیسر مسعود حسن صاحب رضوی بھی اس کانفرنس میں شریک تھے۔ آپ نے کانفرنس سے واپس آ کر لکھنؤ سے مرزا یگانہ کو حیدرآباد خط لکھا، جس میں کانفرنس کے مقالہ نگار کے قول کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا کہ "آپ کے کمال کے قدردان آپ کی شاعری کے بارے میں اس سے بہتر رائے سننے کے خواہشمند ہیں۔"

پروفیسر مسعود حسین صاحب رضوی کے اس مختصر خط کے جواب میں مرزا یگانہ نے ایک نہایت ہی طویل مکتوب انہیں روانہ کیا جس میں اپنے رویہ کو حق بجانب ٹھہراتے ہوئے غالب پر بڑی طرح سے دے کی تھی۔ اپنے اس مکتوب کو مرزا یگانہ نے بعد میں کتابی شکل میں "غالب شکن" کے نام سے شائع کیا۔ "غالب شکن" کے پہلے ایڈیشن میں جو رباعیاں درج ہیں ان میں محض غالب کی ہجو کی گئی ہے، کوئی تنقید نہیں ہے مگر جب "غالب شکن" کا دوسرا ایڈیشن "غالب شکن دو آتشہ" کے نام سے شائع کیا تو اس میں بعض ایسی رباعیاں بھی اضافہ کیں جن میں غالب کے کردار کی بعض مبینہ کمزوریاں ایک حد تک دکھائی گئی ہیں۔

غالب پر مرزا یگانہ کے پے در پے حملوں سے ایک عرصے تک ہندوستان کے ادبی حلقوں میں مختلف بحثیں چھڑی رہیں آخر کو فضا میں سکون ہو گیا اور خود بقول ان کے رفتہ رفتہ یہ مسئلہ بھی داخلِ دفتر ہو گیا۔ میرزا یگانہ کا عقیدہ ہے کہ یہ ایک فرض تھا جو فطرت کی طرف سے ان پر عائد کیا گیا تھا اور جسے انہوں نے بڑی کامیابی سے انجام دیا۔ مرزا یگانہ جس وقت اپنی اگلی معرکہ آرائیاں بیان کرنے لگتے ہیں تو اس پیرانہ سالی اور بیماری کے عالم میں بھی ان کے چہرے پر ایک تازگی و شگفتگی سی آ جاتی ہے، ان کی آواز بلند ہو جاتی ہے، ان میں جوش و خروش پیدا ہو جاتا ہے اور وہ عجیب فاتحانہ شان سے مسکراتے ہیں۔ اس مسکراہٹ میں یہ اعتماد ہوتا ہے کہ وہ تو ضرور ہی فاتح رہے، اب یہ احمق دنیا اس کا اعتراف کرے یا نہ کرے۔

اس میں تو بہرحال شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ مرزا یگانہ اپنی دھن کے پکے ہیں۔ وہ ملک کے مذاقِ حاضرہ یا ملک کی موجودہ ادبی جماعتوں کا مطالبہ پورا کرنا کیسا ان کو قابلِ اعتنا بھی نہیں سمجھتے۔ وہ ملک کو وہی چیز دے سکتے ہیں جو وہ خود دینا چاہتے ہیں۔ ساری زندگی ان کا یہی مسلک رہا، جس سے ان کی رفتار تیز ہوتی گئی۔ صلح و آشتی کی توقع ایسے اکھڑ اور اپنے اوپر بہت زیادہ بھروسا رکھنے والے شخص سے بالکل بے محل تھی۔

مرزا یگانہ کی یہ خودداری و خود اعتمادی جو اکثر حضرات کے نزدیک خود بینی و خود پرستی کی حدود تک پہنچی ہوئی ہے صرف شعر و ادب کی دنیا تک محدود نہیں ہے بلکہ دیگر معاشرتی معاملات میں حتیٰ کہ اپنے نجی امور میں بھی کارفرما رہی ہے جس سے انہوں نے نقصانات بھی اٹھائے ہیں۔ چنانچہ حیدرآباد دکن کی سی وسیع و زرخیز ریاست میں بھی رہ کر جہاں بڑے بڑے مراتبِ ترقی کے تھے اور ان کے لئے تو راستے بھی نکل سکتے تھے انہوں نے کوئی ترقی نہیں کی۔

اور رفتہ رفتہ اسسٹنٹ رجسٹراری کے چھوٹے سے عہدہ پر رہ گئے۔ بجائے ترقی کے وہ اپنے حکام بالا سے متصادم ہوتے رہے کیونکہ ان کے نزدیک ان حکام کی روش ان کے بارے میں معاندانہ و غیر منصفانہ تھی۔ وہ کسی بڑے سے بڑے افسر کی انتقامی کارروائیوں سے نہیں دبے بلکہ ترکی بہ ترکی جواب دیا اور ہمیشہ اپنے ضمیر کا جھنڈا اونچا رکھا۔

اواخر ۱۹۴۱ء میں جبکہ مرزا یگانہ کی ملازمت ۵۵ سال کی بنا پر ختم ہونے والی تھی پرنس معظم جاہ بہادر نے مرزا صاحب سے خود فرمایا کہ آپ وظیفے سے پہلے چھ مہینے کی باتنخواہ رخصت لے کر میرے پاس کیوں نہیں آ جاتے۔ پرنس کی یہ تجویز سن کر مرزا صاحب دل میں بہت گھبرائے کہ یہ تو وہی بات کہہ رہے ہیں جو مجھ جیسے شخص سے کبھی ممکن نہیں یعنی دربارداری۔ مرزا صاحب نے پرنس کی تجویز کا کوئی جواب نہیں دیا اور خاموش رہے۔ ادھر ان کا انسپکٹر جنرل رجسٹریشن بھی اس امر کا خواہاں ہوا کہ مرزا صاحب وظیفے سے پہلے چھ مہینے کی رخصت لے کر جگہ خالی کر دیں تو وہ اپنا مہرہ اس جگہ بٹھا سکے۔ مرزا صاحب نے رخصت نہیں لی مگر انسپکٹر جنرل نے مرزا صاحب کا تبادلہ تعلقہ یادگیر سے ایسی جگہ کیا جہاں مرزا صاحب جانا پسند نہیں کرتے تھے۔ آخر وہ نہیں گئے اور رخصت لے کر ملازمت سے سبکدوش ہو گئے۔ انہوں نے پرنس کی دربارداری بھی قبول نہیں کی حالانکہ کم سے کم دو سو روپے ماہانہ ضرور ہی ملتے۔

مرزا یگانہ جو کچھ جانتے اور سمجھتے ہیں وہی زبان سے کہتے ہیں، جھوٹ نہیں بولتے، ریا سے کام نہیں لیتے۔ وہ مصلحت بین و مصلحت کوش بھی نہیں ہیں۔ وہ تہذیب سے گفتگو کو نفاق و ضمیر کشی سمجھتے ہیں۔ عمر بھر لڑتے رہے جس سے دنیا ان سے بیزار و نالاں ہو گئی مگر وہ اپنی اس جنگجویانہ روش پر نادم و پشیمان نہیں ہیں بلکہ آج بھی اس کو صحیح سمجھتے ہیں اور اس پر فخر کرتے ہیں۔

مرزا یگانہ نہ صرف اردو کے عظیم المرتبت شاعر غالب دہلوی کو اپنے سے کمتر سمجھتے ہیں بلکہ فارسی کے بے نظیر غزل گو نظیری نیشاپوری سے بھی اپنے کو بہتر و افضل تصور کرتے ہیں۔ آپ علامہ اقبال کو بھی خاطر میں نہیں لاتے اور ان کے خلاف بھی مضامین لکھے ہیں۔

مرزا یگانہ کی تصانیف حسب ذیل ہیں:

(۱) "شہرت کاذبہ المعروف بہ خرافات عزیز" یہ رسالہ اسی نام سے چھپا۔ اس میں اردو کے نامور شاعر عزیز لکھنوی پر شدید حملے اور ان کے کلام پر اعتراضات ہیں۔

(۲) "آندھی نگری" ایک مضمون ہے جس میں ہم عصر شعرا پر لے دے کی گئی ہے۔

(۳) "چراغ سخن" یہ عروض پر رسالہ ہے جس میں معاصر شعراء کی عروض دانی پر اعتراضات کی بارش کی گئی ہے۔

(۴) "ترانہ" مجموعہ رباعیات۔

(۵) "غالب شکن" جس کا تذکرہ اوپر کیا جا چکا ہے۔

(۶) "ادبی پلیٹ" یہ ایک مضمون ہے جو "ادب لطیف" کے جواب میں لکھا گیا ہے اس میں اردو کے ان مضامین کی جو رسائل و جرائد میں "ادب لطیف" کے نام سے لکھے جاتے تھے پرزور مذمت کی گئی ہے۔

(۷) "آیات وجدانی" مرزا یگانہ کی غزلیات کا مجموعہ ہے اور شعری حیثیت سے یہی ان کا سب سے اہم ترکہ کہا جا سکتا ہے۔

اس میں کلام نہیں کہ مرزا یگانہ کی غزل میں بہت اچھے اچھے شعر ملتے ہیں۔ غالب کی غزلوں پر بھی انہوں نے غزلیں کہی ہیں اور ان میں بعض بعض شعر بہت اچھے ہیں۔ مثلاً غالب کی زمین میں یگانہ کی غزل کا ایک شعر سنئے

پیدا نہ ہو زمیں سے نیا آسماں کوئی
دل کانپتا ہے آپ کی رفتار دیکھ کر

یگانہ کی بعض رباعیاں بھی بہت عمدہ ہیں۔ ایک رباعی سنئے ــ

کعبہ کی طرف دور سے سجدہ کرلوں　　یا دیر کا آخری نظارہ کرلوں
کچھ دیر کی مہمان ہے جاتی دنیا　　اک اور گناہ کرلوں کہ توبہ کرلوں

اہلِ مذہب کی نظروں میں یگانہ ملعون و مغضوب ہیں مگر خود یگانہ اپنے کو مسلمان سمجھتے اور مسلمان کہتے ہیں۔ البتہ وہ ایک آزاد خیال مسلمان ہیں اور بعض مذہبی نظریات کے متعلق کچھ اپنے مخصوص خیالات رکھتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ وہ انتہائی غور و خوض اور تحقیق و تدقیق کے بعد انہی نتیجوں تک پہنچے ہیں۔ ان میں کوئی تصنع و ریاکاری نہیں ہے۔ ممکن ہے کہ وہ غلط نتیجے تک پہنچے ہوں مگر ان کا دماغ یہیں تک انہیں لے گیا ہے لہٰذا وہ اس کے لئے مجبور ہیں۔ خیر اس نازک و ناخوشگوار بحث کو چھوڑیئے اور مرزا یگانہ کی ایک رباعی سنئے جس میں ان کی مذہبیت اور غالب دوستی دونوں ہی ایک ساتھ ظاہر ہوتی ہیں جو کہ بہت سے لوگوں کے لئے اچنبھے کی بات ہے اور خود مجھے بھی مرزا یگانہ کی زبان سے یہ رباعی سن کر خوشگوار حیرت ہوئی۔ کہتے ہیں ــ

دونوں دیوانے ہیں علیؑ کے طالب　　جان ایک ہے گو جدا جدا ہیں قالب
مذہب ہی شاعری ہی، تو بیت میں　　غالب مرزا یگانہ اور یگانہ غالب

یہ رباعی سن کر میں نے مرزا یگانہ سے کہا کہ اس میں تو آپ غالب کے قدردان نظر آتے ہیں۔ میرے جواب میں وہ بولے "مجھ سے بڑھ کر اور کون غالب کو سمجھ سکتا ہے؟"

یہ ہیں مرزا واجد حسین یاسؔ عظیم آبادی ثم یگانہ چنگیزی لکھنوی ثم غالب شکن ثم "امام الغزل" ثم "غالب کے چچا"۔ اب آپ انہیں جو کچھ سمجھئے۔ یہ آپ کے فیصلہ پر چھوڑا جاتا ہے۔ البتہ اتنی استدعا ضرور ہے کہ کسی رائے کے قائم کرتے وقت یگانہ پر کوئی اتہام نہ عائد کیجئے گا۔ ان کی اصلی تصویر پیش نظر رکھئے گا کہ یہی خود ان کی خواہش ہے اور ایک ستر سال کے بوڑھے خادم شعر و ادب کی آخری خواہش کا احترام بہرحال ضروری ہے۔

رضا علی وحشت

اظہر قادری

میں نے جب سے ہوش سنبھالا ہے اپنے گھر میں مولانا رضا علی وحشت کا ذکر سنتا اور ان کا کلام رسالوں میں پڑھتا آیا ہوں۔ غالباً ۱۹۳۷ء کا زمانہ تھا کہ مجھے پہلی بار مولانا وحشت کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ اس زمانے میں میں اسکول کا طالب علم تھا۔ مولانا وحشت کے انداز گفتگو اور زبان کی شیرینی اور ملائمت سے میں بے حد متاثر ہوا۔ جہاں انکو دیکھ کر میرے اندر ایک روحانی مسرت پیدا ہوئی وہاں ان کے وقار اور شخصیت کا رعب بھی مجھ پر طاری ہو گیا اور میں نے ایسا محسوس کیا کہ میں واقعی ایک بہت بڑی شخصیت کے سامنے کھڑا ہوں۔ انھوں نے مجھ سے دو چار سوال بھی فرمائے لیکن میں بُت بنا کھڑا رہا اور مجھ سے انکے کسی سوال کا جواب بن نہ پڑا۔ وہ مسکرا دیئے۔ انکی مسکراہٹ میں تلخی یا تمسخر نہیں تھا بلکہ محبت اور بزرگانہ شفقت تھی۔ اس کے بعد سے مجھے مولانا وحشت کی خدمت میں برابر حاضری دینے اور ان کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کا مطالعہ کرنے کا موقع ملا ہے۔

ہمیں مولانا وحشت کی شخصیت کے تین جیتے جاگتے پہلو ملتے ہیں۔ پروفیسر، انسان اور شاعر۔ پروفیسروں میں عام طور پر ایک علمی رکھ رکھاؤ، ضرورت سے زیادہ متانت، عالمانہ شان اور اپنے کو ہر وقت سئے دیئے رہنے کا انداز پایا جاتا ہے۔ مولانا وحشت میں ایسی کوئی بات نہیں۔ مولانا وحشت علم کا ایک بحر ذخار ہیں۔ بڑے سے بڑا عالم بھی انکے سامنے اپنے کو طفل مکتب محسوس کرتا ہے۔ باوجود اس کے وہ زندگی بھر اپنے کو طالب علم سمجھتے رہے اور ہمہ دانی کی شان کبھی بھی اپنے اندر پیدا نہیں ہونے دی۔ وہ لوگ جنہیں وحشت کو قریب سے دیکھنے کا موقع نہیں ملا ہے وحشت کو صرف اردو فارسی کا عالم سمجھتے ہیں یہ سچ ہے کہ وحشت نے اردو فارسی زبان و ادب کا بڑا گہرا اور بالاستیعاب مطالعہ کیا ہے لیکن یہ بات کم لوگوں کو معلوم ہے کہ ان دو زبانوں کے علاوہ وحشت نے انگریزی زبان و ادب کا بھی مطالعہ کیا ہے اور اس سلسلے میں ان کی نظر بڑی گہری اور وسیع ہے۔ سلان کی انگریزی تحریروں سے ان کی زباندانی کا کافی ثبوت ملتا ہے۔ ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ جس زمانے میں مولانا وحشت اسلامیہ کالج کلکتہ میں اردو فارسی کے پروفیسر تھے حیدرآباد دکن سے یار جنگ بہادر تشریف لائے تھے۔ ان کو انگریزی میں ایک سپاسنامہ پیش کرنا تھا۔ انگریزی ادب کے ایک پروفیسر طاہر جمیل مرحوم کے ذمہ یہ کام سپرد کیا گیا۔ طاہر جمیل مرحوم ایک انگریز پروفیسر مرحوم کے پاس گئے اور ان سے سپاسنامہ لکھنے کی درخواست کی۔ پروفیسر مرحوم (Holme) نے اپنی مجبوری ظاہر کی اور انہیں مشورہ دیا کہ یہ سپاسنامہ مولانا وحشت سے لکھوایا جائے تو بہتر ہے۔ طاہر جمیل مرحوم کو پہلے تو یقین نہیں آیا اور سوچا کہ مولانا وحشت کو انگریزی سے کیا واسطہ لیکن بالآخر جب مولانا وحشت نے سپاسنامہ انگریزی زبان میں لکھ کر طاہر جمیل مرحوم کے سپرد کیا تو جمیل مرحوم کو سخت تعجب ہوا

انہوں نے دستِ بستہ کہا کہ "آج مجھ پر یہ راز کھلا کہ آپ اردو فارسی کے علاوہ انگریزی میں بھی حضور کو دخل ہی نہیں بلکہ پوری طرح حاصل ہے۔ میری نظر تک حضور کی قدر اور زیادہ ہو گئی ہے" اخیر عمر میں مولانا ہندی زبان سیکھنے کی طرف مائل ہوئے اور دو ہفتوں میں اتنی مشق بہم پہنچائی کہ ہندی لکھنا پڑھنا آ گیا۔ یہ انکی ذہانت کی دلیل ہے۔ مولانا وحشت کی ان ہی فضیلتوں اور صلاحیت کی بنا پر انکے ایک عزیز شاگرد کیپٹن قمر صدیقی مرحوم کہا کرتے تھے کہ "وحشت گدڑی میں لعل ہیں"

انسان کی حیثیت سے مولانا وحشت کا جواب اس زمانے میں مشکل ہی سے مل سکتا ہے۔ یہ کہنا ہرگز مبالغہ نہیں کہ اس باب میں وہ آپ اپنا جواب ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شرافت اور عجز و انکسار سے ان کا خمیر اٹھا ہے۔ یہ انکی شرافت کی دلیل ہے کہ آج تک کسی کو ان سے شکایت کا موقع نہیں ملا۔ شکایت تو درکنار میں نے جس کو ان سے ایک مرتبہ ملنے کا اتفاق ہوا وہ ان کے خلوص اور حسنِ سلوک سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ میں نے آج تک انہیں کبھی کو تم کہہ کر خطاب کرتے نہیں دیکھا۔ معمولی سے معمولی انسان کو بھی وہ لفظ آپ سے مخاطب کرتے ہیں۔ کسی کی شکایت کرنا کسی کو برا بھلا کہنا ان کی طبیعت کے خلاف ہے ہمارے یہاں کوئی دور ایسا نہیں بیتا جسے ہم شعراء کی معاصرانہ چشمک سے خالی کہہ سکیں۔ باوجود اس قدر نمایاں ترقی کے دورِ جدید بھی معاصرانہ چشمک سے خالی نہیں۔ ایک ادیب یا شاعر دوسرے ادیب و شاعر کو اپنے سے کمتر سمجھنا ایک لازمی بات ہے۔ لیکن اس بارے میں وحشت کا کردار سب سے الگ اور منفرد ہے۔ ان کے اندر ہم ذرہ برابر بھی احساس برتری نہیں پاتے۔ وہ ہر کسی کو اپنے سے بلند و برتر سمجھتے ہیں۔ اور اپنے معاصرین کا ذکر نہایت احترام و عزت سے کرتے ہیں۔ ایک مرتبہ ایک صاحب وحشت صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان سے اپنے کلام پر اصلاح لینے کی خواہش ظاہر کی۔ مولانا نے اپنی مجبوری کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا کہ "میں نہایت عدیم الفرصت انسان ہوں۔ میرے پاس رہ کر آپ کچھ نہ سیکھ سکیں گے۔ اور اسی لئے اب میں نے شاگرد بنانا ایک طرح سے ترک کر دیا ہے۔" ان صاحب نے فوراً پوچھا کہ سیماب صاحب (اس وقت سیماب صاحب حیات تھے) کے متعلق آپکا کیا خیال ہے۔ مولانا نے کہا کہ "سیماب صاحب کے متعلق میں صرف اتنا عرض کرنا چاہتا ہوں کہ وہ مجھ سے بہت بہتر ہیں۔" مشاعروں میں ہر شاعر یہاں تک کہ مبتدیوں کا کلام بھی نہایت غور سے سنتے ہیں اور تعریف کرتے ہیں۔ شعر میں جو فنی اور معنوی محاسن ہوتے ہیں ان کی طرف ہلکے ہلکے اشارے بھی کرتے جاتے ہیں اور اس طرح پڑھنے والوں کی ہر طرح حوصلہ افزائی فرماتے رہتے ہیں۔

مہمان نوازی مولانا وحشت کی طبیعت ثانیہ بن گئی ہے۔ جو لوگ ان کے یہاں جاتے ہیں وہ ان کی خاطر مدارات کئے بغیر انہیں آنے نہیں دیتے خود ایک چھوٹی سی کرسی پر بیٹھ جاتے ہیں اور اپنے مہمان کو صوفے پر بٹھاتے ہیں۔ عمر کی وجہ سے اب مولانا وحشت بہت نحیف و نزار ہو گئے ہیں۔ کمزوری کی بنا پر اٹھنے بیٹھنے میں انہیں بڑی تکلیف ہوتی ہے۔ لیکن اگر کوئی ان کے یہاں چلا جاتا ہے تو فوراً مردانے میں آتے ہیں اور نہایت تپاک سے ملتے ہیں۔ اور جب تک وہ بیٹھا رہتا ہے خود بھی بیٹھے رہتے ہیں۔ ہرچند کہ ایسا کرنے میں انہیں سخت جسمانی کوفت محسوس ہوتی ہے لیکن اپنے ملنے والے کے اندر اپنی تکلیف اور اکتاہٹ کا ذرا بھی احساس پیدا نہیں ہونے دیتے۔ یہاں میں نے اکثر لوگوں کو یہ کہتے ہوئے سُنا ہے کہ مولانا وحشت کی خدمت میں ہر روز حاضری دینے کو جی چاہتا ہے لیکن یہ سوچ کر کہ مردانے تک آنے میں انہیں بڑی دقت ہوتی ہے ان کے یہاں جانے کی ہمت نہیں پڑتی۔

وضع داری مولانا وحشت کے کردار کی ایک بڑی اہم خصوصیت ہے۔ اس زمانے میں انہوں نے جس طرح اپنی وضع داری نباہی ہے اور نباہ رہے ہیں یہ انہی کے دل گردے کا کام ہے۔ جب سے میں نے پہلی بار انہیں دیکھا اس زمانے سے لے کر آج تک ان کے لباس اور وضع قطع میں کوئی فرق نہیں پایا۔ لمبی شیروانی، چوڑے پائنچہ کا پاجامہ، سر پر ٹوپی، عمدہ قسم کا موزہ اور جوتا۔ یہ ہے مولانا کا لباس۔ شیروانی کی جیب میں ایک گھڑی رہتی ہے جس کی نقرئی زنجیر شیروانی کے بٹن میں لگی ہوتی ہے۔ یہ گھڑی مولانا کی جیب میں ہمیشہ رہتی ہے۔ اس لئے کہ انہیں وقت کی پابندی بہت زیادہ عزیز ہے۔ ان کی زندگی میں جس ایک مثال بھی ایسی نہیں ملتی کہ وہ کہیں وقت مقررہ پر نہ پہنچ سکے ہوں۔ مشاعروں میں عام طور پر لوگ دیر سے

پہنچتے ہیں اور اب تو یہ چیز ہمارے یہاں روایت کی شکل اختیار کر چکی ہے۔ لیکن مولانا وحشت ہمیشہ مشاعروں میں وقت مقررہ سے قبل یا ٹھیک وقت پر پہنچ جاتے ہیں۔ اس سلسلے میں مجھے ایک واقعہ یاد آ گیا جس کا یہاں بیان کر دینا لطف سے خالی نہ ہوگا۔ ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ محسن کالج میں ایک مشاعرہ وحشت صاحب ہی کی صدارت میں ہو رہا تھا۔ محسن کالج کلکتہ سے کسی قدر دور ہے جہاں لوگ عام طور پر ٹرین سے جاتے ہیں۔ ٹرین شام کے سات بجے چھوٹنے والی تھی۔ جانے والے تمام شعرا اسٹیشن پہنچ چکے تھے۔ اور مولانا وحشت کا انتظار کر رہے تھے۔ سات بجنے والے تھے اور مولانا وحشت اس وقت تک اسٹیشن نہیں پہنچے تھے۔ لوگوں کے دلوں میں مختلف قسم کے شبہات پیدا ہو رہے تھے اور ان پر ایک بے چینی سی طاری تھی۔ سبھی کہہ رہے تھے کہ ضرور کوئی ایسی ویسی بات ہو گئی ہے ورنہ وقت کی پابندی کا خیال مولانا سے زیادہ کس کو ہو سکتا ہے۔ سات بجنے میں ایک منٹ باقی تھا۔ تمام لوگ مایوس ہو چکے تھے کہ اتنے میں دور سے مولانا وحشت ٹرین کی طرف تیزی سے آتے ہوئے دکھائی دیئے۔ جب وہ قریب پہنچے تو تمام لوگ ان کو لے کر ایک ڈبے میں داخل ہو گئے اور پھر فوراً ٹرین چل پڑی۔ کچھ دیر کے بعد ایک صاحب نے مولانا وحشت سے کہا کہ "حضور آج خلاف معمول ٹرین ایک دو منٹ دیر سے روانہ ہوئی۔ یہ اچھا ہوا ورنہ شاید ہم لوگ اس سے نہ جا سکتے"۔ مولانا وحشت نے مسکراتے ہوئے فرمایا کہ "میں نے ہمیشہ وقت کا خیال کیا ہے۔ کیا آج وقت میرا خیال نہ کرتا"۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ وحشت صاحب نے وقت کا ہمیشہ خیال رکھا ہے۔

مشاعروں میں وحشت صاحب شروع سے اخیر تک ایک ہی انداز میں بیٹھے رہتے ہیں۔ چاہے مشاعرہ دو گھنٹے کا ہو یا رات بھر کا۔ پہلو بدلنا یا بیچ میں اٹھنا مولانا کی وضع داری کے خلاف ہے۔ لوگوں کو حیرت ہوتی ہے کہ کوئی شخص رات بھر مسلسل ایک ہی پہلو کیسے بیٹھ سکتا ہے۔ رات بھر مشاعرے میں ایک ہی انداز میں بغیر پہلو بدلے بیٹھا رہنا مولانا وحشت کے لئے جس قدر تکلیف دہ ثابت ہوتا ہوگا اس کا احساس مشکل نہیں۔ لیکن اس کو کیا کیا جائے کہ یہ بات ان کی وضع داری کے تحت آتی ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ آداب مجلس کا انہیں کتنا پاس ہے۔ کم لوگ ہیں جن کی نظر مولانا کی اس وضعداری اور خصوصیت پر پڑتی ہے۔ یہاں مجھے وحشت صاحب کا ایک شعر یاد آ گیا جو خود انہی پر صادق آتا ہے:-

خیال تک نہ کیا اہل انجمن نے کبھی

تمام رات جلی شمع انجمن کے لئے

خطوط کا جواب لکھنا اور فوراً لکھنا مولانا کے لئے ایک فرض سے کسی طرح کم نہیں۔ آج بھی جبکہ کمزوری اور لاغری کی بنا پر ہاتھوں میں رعشہ پڑ گیا ہے لکھتے وقت انگلیاں کانپتی ہیں اور بینائی بھی کسی قدر کم ہو گئی ہے اگر کوئی انہیں خط لکھتا ہے تو وہ اس کا جواب فوراً لکھتے ہیں اس لئے کہ یہ بات انکی وضع داری کے خلاف ہے کہ ان کی ذات سے کسی کی دل شکنی ہو یا کسی کو تکلیف پہنچے۔ وہ خود نقصان اٹھا کر دوسروں کو فائدہ پہنچانا چاہتے ہیں۔

میں نے اپنے ایک بزرگ سے سنا ہے کہ وحشت صاحب کے ایک ہم جماعت تھے جو زیادہ تعلیم حاصل نہ کر سکے اور تعلیم ترک کر کے ایک چھوٹا سا ہوٹل کھول لیا تھا۔ وہ ہوٹل ہرگز ایسا نہیں تھا جہاں کوئی شریف اور معقول قسم کا آدمی جا کر بیٹھتا۔ لیکن کہتے ہیں کہ وحشت صاحب جب کبھی اس راہ سے گزرتے تو بلا ضرورت بھی اس ہوٹل میں جا کر چائے ضرور پی لیتے۔ اور اس کی وجہ صرف یہ بتائی جاتی ہے کہ کہیں مولانا کے اس ہم جماعت کے دل میں یہ گمان نہ گزرے کہ وحشت صاحب بڑے اور مشہور آدمی ہو گئے ہیں اس لئے مجھ سے ملنے میں انھیں ہچکچاہٹ ہوتی ہے اور اسے کسر شان سمجھتے ہیں۔ مولانا جب کلکتہ میں تھے تو ان کے پاس ہمیشہ ٹرام کا پاس ہوتا تھا اور ٹرام والے پاس صرف فرسٹ کلاس کا دیتے ہیں۔ لیکن اکثر ایسا ہوتا کہ مولانا پاس جیب میں رکھے سیکنڈ کلاس میں بیٹھ جاتے۔ ان باتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ وحشت صاحب کے اندر جھوٹی شان و شوکت کی نمائش ذرہ برابر بھی نہیں ہے۔

وحشت صاحب کے شاگردوں کی تعداد بھی خاصی ہے۔ برصغیر ہند و پاک کا شاید ہی کوئی گوشہ ایسا ہو جہاں ان کے دو چار شاگرد موجود نہ ہوں۔ ہند و پاکستان سے باہر مثلاً رنگون وغیرہ میں بھی ان کے کچھ شاگرد ہیں۔ مولانا کے شاگردوں کی صحیح تعداد معلوم کرنا اور ان کے تفصیلی حالات جاننا

بہت دشوار ہے اس لئے کہ مولانا دیگر شعراء کے برخلاف اپنے شاگردوں سے متعلق بہت کم باتیں بتاتے ہیں۔ سر اکبر حیدری مرحوم (سابق گورنر آسام) بھی مولانا کے شاگرد تھے اور ایک زمانے سے مولانا سے اصلاح لیتے تھے۔ لیکن مولانا نے اس کو اس طرح چھپا کے رکھا جیسے یہ کوئی انکا ہی راز تھا لیکن اپنے معتقدوں سے وہ زیادہ دنوں تک اس "راز" کو چھپا نہ سکے۔

مولانا اپنے شاگردوں کو اپنی اولاد کی طرح عزیز رکھتے ہیں۔ ان کے دکھ درد میں کام آنا اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ اپنے شاگردوں سے کچھ قبول کرنا وہ معیوب سمجھتے ہیں۔ بلکہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ وہ خود اپنے شاگردوں کی امداد کرتے ہیں۔ اور کسی کو کانوں کان اس کی خبر نہیں ہونے دیتے لیکن جن شاگردوں کی وہ مدد کرتے ہیں وہ خود اس کو ظاہر کر دیتے ہیں۔ اگر کبھی کسی شاگرد کی ملازمت جاتی رہی اور وہ مالی مشکلات میں مبتلا ہو گیا تو مولانا نے مسلسل ہر مہینے اسکو مالی مدد پہنچائی اور اسے جیب خرچ دیتے رہے۔ ان باتوں سے صاف ظاہر ہے کہ مولانا وحشت اپنے شاگردوں کو شاگرد نہیں بلکہ اپنی اولاد سمجھتے ہیں اور ان کے ساتھ اولاد کا سا سلوک کرتے ہیں۔ ظاہر ہے ایسی حالت میں اگر مولانا کے شاگرد انکے پاؤں دھو دھو کر پیتے انکو خدا کی طرح پوجتے اور ان کے لئے ہمہ وقت اپنی جان تک قربان کر دینے کے لئے تیار رہتے ہیں تو یہ کوئی تعجب کی بات نہیں۔

مولانا وحشت کو روپیہ پیسہ کا کبھی کوئی لالچ نہیں ہوا۔ روپیہ کو انہوں نے ہمیشہ ضروریات زندگی کو پورا کرنے کا ایک ذریعہ سمجھا اور بس۔ انہوں نے آج تک اپنے کسی شاگرد سے کوئی فرمائش نہیں کی۔ ایک مرتبہ محمد عبدالعلی شوق سندیلوی کو ایک نئی بات سوجھی اور انہوں نے غزلیں کہیں اور ہر غزل پر مختلف شعراء سے اصلاح لی۔ اور ہر ایک کو اس غلط فہمی میں رکھا کہ وہ اسی کے شاگرد ہیں۔ پھر ۱۹۲۶ء میں ان تمام شعراء کی اصلاحوں کو ترتیب دیکر کتابی شکل میں شائع کر دیا۔ اور اس کا نام "اصلاح سخن" رکھا۔ اصلاح لینے کے زمانے میں مختلف شعراء سے ان کی خط و کتابت ہوتی تھی۔ اصلاح سخن کے اخیر میں ان تمام خطوط کو بھی "ضمیمہ اصلاح سخن" کے نام سے شائع کر دیا۔ یہ خطوط بڑے پرلطف ہیں اور اس وقت کے اساتذہ کی افتاد طبع کی بڑی سچی ترجمانی کرتے ہیں۔ کسی صاحب نے ان سے مٹھائیاں طلب کیں کسی نے سندیلہ کے لڈو کی فرمائش کی کسی نے اپنی کتابیں خریدنے اور فنڈ میں روپیہ جمع کرنے کو کہا۔ ایک صاحب فرماتے ہیں "میرا یہ بھی معمول ہے کہ جو صاحب مجھ سے اصلاح لیتے ہیں ان سے بغرض فاتحہ بزرگان و اساتذہ سلف ان کی توفیق اور ہمت کے مطابق کچھ نقد منگا کر مٹھائی تقسیم کر دی جاتی ہے۔ لہذا حسب توفیق بھیجئے۔ باقی رہی استاد کی خدمت یہ آپ جانیں اور آپ کی ہمت۔" دوسرے صاحب لکھتے ہیں "ہمیشہ اصلاح کے لئے باضابطہ شاگردی لازمی ہے۔ شاگردی کی مٹھائی عنایت فرمائیے۔" ایک صاحب لکھتے ہیں "آپ نے ..... بک فنڈ میں اعانت کا وعدہ فرمایا ہے۔ اس وقت دو کتابیں پریس جا چکی ہیں ..... ایک سو روپیہ کا خرچ ان دونوں کتابوں میں ہے۔ مجھے پچاس روپیہ بہت جلد بھیجنا چاہئے۔ اگر آپ اعانت فرما سکتے ہوں تو جلد توجہ کیجئے ..... امید ہے کہ آپ فراہمت کر کے جہاں تک جلد ہو سکے اور جو کچھ مناسب رقم ہو سکے عنایت فرما کر شکریہ کا موقع دیجئے۔" ایک صاحب ٹکٹ کے دام تک وصول کرنا چاہتے ہیں اور فرماتے ہیں "جتنی غزلیں ایک دم آئیں اتنے ہی ٹکٹ بھی آنا چاہئیں۔" ایک صاحب لڈو کی فرمائش یوں کرتے ہیں (حسن طلب کی داد دیئے بغیر نہیں رہا جاتا) "اب آپ سے ہم وطنی کی بنا پر ایک شکایت ہے۔ آپ نے جوابی لفافہ کیوں بھیجا کیا سندیلہ میں اب لڈو نہیں بنتے جو یہ ٹکٹ آیا ہے۔ شکایت سن کر کہیں پارسل نہ بھیج دیجئے گا۔ اس کو بصیغۂ امانت رکھئے میں تعطیل گرما میں آکر خود لے لوں گا۔" ایک قبلہ نے تو اس معاملہ میں انتہا ہی کر دی۔ انکے خطوط بڑے دلچسپ ہیں اور پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ میں یہاں انکے مختلف خطوط سے صرف چند سطریں نقل کرنے پر اکتفا کرتا ہوں۔ فرماتے ہیں "میرے دیوان ..... کی اشاعت کے متعلق میرے شاگردوں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ ہم اپنے مصارف سے چھپائیں گے۔ چنانچہ لوگوں نے ایک فنڈ کھولا ہے آپ بھی چندہ بھیجیں ..... یہ پہلا بار ہے جو ڈالا جاتا ہے ..... اب تک تمہارے چندہ کا انتظار ہے ..... کی اشاعت میں تم بھی کچھ مدد دو۔" آگے تاکید کرتے ہوئے فرماتے ہیں "تمہاری امداد کا انتظار ہے" اپنے آخری خط میں یہ جزبز کسی قدر خفگی کا اظہار کرتے ہوئے فرماتے ہیں "مجھے سخت حیرت ہے کہ اب تک آپ نے ..... کی اشاعت میں کسی قسم کی امداد نہ دی۔ محض معذرت تم کافی نہیں تو کچھ

چاہئے: ان تمام لوگوں کی فرمائش اور سعید پیرے کے تقاضے کے پیش نظر مولانا وحشت کا ایک خط بنام شوق سندیلوی پڑھئے۔ وحشت صاحب تحریر فرماتے ہیں:-

"عزیز محترم۔ السلام علیکم۔ گرامی نامہ مع غزلوں کے موصول ہوا۔ نہایت شرمندہ ہوں کہ اس سے قبل رسید نہیں لکھ سکا۔ عدیم الفرصت رہتا ہوں۔ خدا خدا کر کے آج کچھ وقت ملا ہے اکثر احباب کے خطوط عرصہ سے آکر پڑے تھے اس وقت جواب لکھ رہا ہوں۔ آپ کا کلام ماشاءاللہ بہت خوب اور پُر اثر ہے۔ مجھ جیسے کم سواد کی اصلاح کا محتاج نہیں۔ لیکن از راہ امتثال امر میں نے کہیں کہیں ترمیم کر دی ہے۔ خطوں کو رجسٹری کر کے بھیجنے کی مطلق ضرورت نہیں۔ ڈاک کا انتظام یہاں پوری طرح قابل اطمینان ہے۔ ٹکٹ ملفوف نہ بھیجیں۔ چونکہ میں اس کا روادار نہیں ہوں لہذا جو ٹکٹ آیا تھا اسے واپس کرتا ہوں۔ امید کہ آپ برا نہ مانیں گے۔ خیر اندیش۔ وحشت۔"

آج ہمارے شعراء حضرات کے لئے مشاعروں میں جانا اور اس کے لئے معاوضہ قبول کرنا کوئی بڑی بات نہیں۔ اس سے میرا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ میں اس کو معیوب سمجھتا ہوں اور میری دانست میں ایسا نہیں ہونا چاہئے۔ لیکن اسکو کیا کیا جائے کہ مولانا وحشت کو ہرگز یہ گوارا نہیں کہ وہ باہر کسی مشاعرے میں شرکت کریں اور اس کے لئے انہیں معاوضہ دیا جائے۔ انہوں نے اس طرح کے کتنے ہی مشاعروں میں شرکت کی لیکن معاوضہ کی شکل میں ایک پیسہ بھی قبول نہیں کیا۔ وہ تو اس پر بھی مشکل سے تیار ہوتے ہیں کہ آنے جانے کا خرچ مشاعرے کے منتظمین کے ذمہ ہو۔ مولانا وحشت کی یہی وہ شرافت، وضع داری اور روپیہ پیسہ کی طرف سے بے نیازی ہے جس نے لوگوں کو انکا گرویدہ بنا رکھا ہے۔ یہ انکی وہ خصوصیات ہیں جن میں آج کم لوگ انکے شریک و حریف ہیں۔ مولانا کی سادگی اور شرافت نفسی کو دیکھ کر بےساختہ مولانا حالی مرحوم یاد آجاتے ہیں۔ لہذا مجھے یہ کہنے میں ذرا بھی باک نہیں کہ اس معاملے میں مولانا وحشت دورِ جدید کے حالی ہیں۔

مولانا وحشت کے بارے میں یہ بات بلاخوف تردید کہی جاسکتی ہے کہ وہ صحیح معنوں میں زندگی کے نشیب و فراز سے گزرے ہیں۔ انہوں نے زندگی کو بہت قریب سے دیکھا ہے اور اس کو اس کے ہر رنگ میں دیکھا ہے۔ جہاں انہوں نے زندگی کے بڑے خوشگوار دن گذارے ہیں وہاں انکو حالات نے بڑے کٹھن دور سے گذرنے پر بھی مجبور کیا ہے۔ لیکن آفرین ہے انکی ہمت اور مستقل مزاجی پر کہ دل پر ہزاروں قسم کے غم کھاتے رہے لیکن جبیں پر شکن نہ آنے دی۔ احباب میں جب بیٹھے تو چہرے پر ہمیشہ مسکراہٹ کھیلتی رہی اور ان کے دل کی صحیح حالت سے کوئی بھی واقف نہ ہو سکا۔ البتہ اس کے لئے انہوں نے شاعری کا سہارا لیا اور شعر کے پردے میں سب کچھ کہہ گئے اور اس طرح کم سے کم دل کی بھڑاس تو نکال لی۔ ہر شخص جس نے وحشت صاحب کو قریب سے دیکھا ہے انکے حسب ذیل اشعار سے ان کی زندگی کے ایک پہلو کے متعلق بہت کچھ معلوم کر سکتا ہے:

طور دیکھے ہیں زمانے کے ہمارے دل نے	اب کہاں اس میں تمنا کا گذر ہوتا ہے
طور دیکھے ہیں زمانے کے مجھے کیا غم اگر	مٹ گیا دل سے مرے نام و نشانِ آرزو
شکل کچھ ایسی بدل دی یاس نے امید کی	آرزو پہ بھی نہیں ہوتا گمانِ آرزو
کوئی کس طرح مصیبت سے بچے دنیا میں	مجھ سے اور بھی ہیں عشق کا سودا نہ سہی
جہاں میں چھوڑ جاتا میں المناک ایک افسانہ	اگر مجھ سے مری رودادِ غم تحریر ہو جاتی
مجھے فرصت ہے اپنی فلاح سے نہیں فائدہ طلبی کا	ہے ضرر ہی سے مجھے واسطہ گر نفع جیسے ضرر آئے

یہ اور اس قسم کے اشعار وحشت صاحب کے ہاں بھرے پڑے ہیں جن کو ترتیب دے کر ہم اگر چاہیں تو انکی زندگی کا خاکہ تیار کر سکتے ہیں۔ لیکن اس کے لئے ان کی نجی زندگی سے واقفیت کی ضرورت ہے۔ جیسا کہ اوپر میں لکھ چکا ہوں عمر کی وجہ سے مولانا اب نہایت نحیف و کمزور ہو گئے

ہیں۔ باہر آنا جانا ان کے لئے ایک امر دشوار ہے۔ باوجود اس کے جب لوگ بہت مصر ہوتے ہیں تو کسی خاص صحبت میں وہ ضرور شریک ہو جاتے ہیں۔

غزل اپنی مجھے پڑھتے ہی بنے گی وحشتؔ
پاس احباب سہی، دل کا تقاضا نہ سہی

اب وحشت صاحب شعر و سخن سے ایک طرح سے دست بردار ہو چکے ہیں۔

نہ دو وحشتؔ کو بزم شعر میں تکلیف شرکت کی
کبھی کچھ کہہ لیا کرتا تھا اب اس میں رہا کیا ہے

جیسا کہ اوپر اشارہ کیا جا چکا ہے کسی سے اپنا حال کہنا یا اپنی تکلیف مصیبت بیان کرنا وحشتؔ کی خود دار طبیعت کے خلاف ہے۔ وہ ہزاروں غم سہہ لیں گے لیکن برابر والے کو اس کی خبر تک نہیں ہونے دیں گے۔

کیوں سکوت اپنا بتائے سبب خامشی
کیوں نطق حال کہے دل کی پریشانی کا

ان دنوں وحشت صاحب بہت رنجیدہ رہتے ہیں۔ اس کا ایک سبب تو ترک وطن ہے۔ وطن کا جب ذکر آجاتا ہے تو ان کی آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑتے ہیں۔ یہ غم ان کو اندر ہی اندر کھا رہا ہے۔

باعث اندوہ دل غربت کا ہر منظر مجھے
کاہش جاں کا سبب یاد وطن میرے لئے

وطن کے چھوٹنے کے علاوہ اس وقت جو غم کھا رہا ہے وہ پچھلے زمانہ کی یاد ہے۔ پچھلے واقعات جب انہیں یاد آتے ہیں تو باوجود ضبط بھی انکی آنکھوں سے آنسو نکل پڑتے ہیں۔ پچھلے ساتھیوں کو یاد کر کے وہ کڑھتے رہتے ہیں۔ اس وقت ان کے دل کی جو حالت ہوتی ہوگی وہ اہل نظر اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں۔ اور شاید یہی وجہ ہے کہ اس وقت کا کلام صحیح معنوں میں ان کی زندگی کا آئینہ دار ہے۔ پوری پوری غزل ایک ہی رنگ میں ہوتی ہے وہ رنگ جس میں ان کی زندگی کا رنگ جھلکتا ہے۔

جو زندگی میں نہیں کچھ امید ہی نہ رہی — تو زندگی ہی ہماری رہی رہی نہ رہی
دل فسردہ نے یوں مجھ کو بے نیاز کیا — کہ دہر میں کوئی شئے وجہ دلکشی نہ رہی
مقام شکر ہے کہ اک وقت ایسا آپہنچا — کہ دل کے حال سے خود دل کو آگہی نہ رہی
غلط ہے ڈھونڈوں جو گلستان دہر کو الزام — جب اپنے غنچۂ خاطر میں تازگی نہ رہی

اور آخری شعر تو بالکل انکے حسب حال ہے:۔

یہ کیسا ضرور ہے رووں میں عیش رفتہ کو
برا ہی کیسا ہے جو لب پہ مرے ہنسی نہ رہے

وحشت صاحب شاعری میں صداقت کے قائل ہیں۔ ایسے خیالات جن میں صداقت کا فقدان ہوتا ہے ان کے نزدیک وقعت نہیں رکھتے وہ خود اپنے شعروں میں بھی اس کا بہت خیال رکھتے ہیں اور اپنے شاگردوں کو بھی ہدایت کرتے ہیں کہ صداقت کا دامن کسی حال میں ہاتھ سے نہ جانے پائے وہ حد سے زیادہ مبالغہ کو پسند نہیں کرتے۔ انکا کہنا ہے کہ مبالغہ جب اپنی حد سے تجاوز کر جاتا ہے تو پھر شعر شعر نہیں رہتا بلکہ معما بن جاتا ہے شعر میں صداقت اور بلند خیالی کے علاوہ وہ لطف زبان کا بھی بڑا خیال رکھتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ نہ صرف موضوع کوئی چیز ہے اور نہ صرف زبان

بلکہ موضوع اور زبان دونوں مل کر اپنا ایک مجموعی اثر پڑھنے والے پر چھوڑ جاتے ہیں۔

پسند آ نہیں سکتا ہے طبع وحشت کو
وہ شعر جن میں کہ پوشیدہ کچھ نکات نہیں

وحشت صاحب نے شعر کہنے کے علاوہ کچھ تنقیدی مقالے بھی لکھے ہیں جو آج سے بہت پہلے مختلف جرائد میں شائع ہو چکے ہیں۔ سنہ ۱۹۰۴ء میں وحشت صاحب نے مولانا حالی مرحوم کی غزل گوئی پر ایک وقیع مقالہ سپرد قلم کیا تھا۔ جب یہ مقالہ حالی مرحوم کی نظر سے گزرا تو انہوں نے مولانا وحشت کو لکھا "مولانا! آپ پہلے شخص ہیں جنہوں نے میری غزل گوئی کی طرف توجہ دی ہے۔ ورنہ اب تک لوگ مجھے قوم کا مرثیہ گو ہی سمجھتے رہے ہیں۔" ان باتوں سے وحشت صاحب کی نظر کی گہرائی و گیرائی اور شعور کی پختگی کا کافی ثبوت ملتا ہے۔

سُلطان حیدر جوشؔ

وحید احمد

پیدائش بجنور۔ مرحوم سلطان حیدر صاحب باپ کی طرف سے شیخو پورہ (بدایوں) کے فریدی خاندان سے تھے اور ماں کی جانب سے ان کا سلسلہ حکیم احسن اللہ خاں صاحب دہلوی سے ملتا تھا۔ معلوم نہیں حضرت بابا فرید الدین گنج شکرؒ شیخ فاروقی تھے یا سیّد تھے مگر سیادت فریدی کو تسلیم کرنے والے سلطان حیدر کے نام سے پہلے سیّد لکھ دیا کرتے تھے۔ ان کے والد نے پہلے میش میں پھر راہ خدا میں اپنی کثیر جائداد لٹا دی تھی۔ سخاوت میں وہ مشہور تھے۔ چہرہ پر نور برستا تھا اور بڑھاپے میں بچوں کی سی باتیں، پُر وقار ظرافت سے کیا کرتے تھے۔ سلطان حیدر کا بچپن اپنی والدہ صاحبہ کے زیر سایہ دہلی میں گزرا اور وہیں تعلیم و تربیت پائی۔ اینگلو عربک اسکول دہلی سے انٹرنس پاس کرنے کے بعد ۱۹۰۵ء میں مدرسۃ العلوم علی گڑھ پہنچے۔ لیکن ۱۹۰۶ء میں بعہد نواب محسن الملک جب کالج میں اسٹرائک ہوا تو انہیں علی گڑھ کو خیرباد کہنا پڑا اور سلسلہ تعلیم ختم ہو گیا۔ اس کے بعد کچھ وقت بیکاری میں گزرا اور کچھ سعیِ ملازمت میں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۲؁ء میں ملازمت تحصیلداری سے شروع کی اور نیک نامی کے ساتھ ۴۶؁ء میں ڈپٹی کلکٹری سے پنشن پائی۔ علی گڑھ میں سکونت اختیار کی اور وہیں ۱۱ مئی ۵۳؁ء کو ہمیشہ کے لئے آرام کی نیند سو رہے۔

دہلی میں فٹ بال ٹیم کے اچھے کھلاڑیوں میں تھے۔ میچوں کے سلسلہ میں قلعہ کے انگریزی فوجیوں سے مراسم ہو گئے تھے۔ انگریزی تہذیب کے رسیا تھے علی گڑھ کالج کی فٹ بال ٹیم نے انہیں ہاتھوں ہاتھ لیا۔ صاحبیت کے منازل طے کرنے کا یہاں خوب موقع ملا۔ اور "جان بل" کے خطاب سے نوازے گئے۔ لباس عمدہ اور دیدہ زیب پہنتے تھے۔ مجال نہ تھی کہ سوٹ میں کوئی سلوٹ دراندازی کر سکے۔ جسمانی ورزش کا پر زندگی میں شوق رہا۔ ورزش اور ملازمت نے پابند اوقات بنا دیا تھا۔ اسی واسطے عادات اور اصولوں میں استقلال تھا۔ کم آمیز تھے لیکن جس سے ملتے خلوص سے ملتے۔ تصنع اور ظاہرداری کا ان کے یہاں گزر نہ تھا۔ ماشاء اللہ جسیم و وجیہہ ہونے کے ساتھ زندہ دل تھے۔ ظرافت اُن کی رگ و پے میں سرایت کئے ہوئے تھی۔ شرارت و شوخی فطرت میں داخل تھی۔ ان کی صحبت میں وقت کا اندازہ مشکل سے ہوتا تھا۔ آخر میں ثقل سماعت نے سقم پیدا کر دیا تھا مگر اپنی ظرافت سے اُسے نباہ لے جاتے تھے۔

تام یاد نہیں، مگر ایک مسلمان عالم و فاضل مذہب عیسوی قبول کر کے پادری کے عہدہ تک پہنچ گئے تھے اور دہلی میں مناظرِ عام پر مناظرے کیا کرتے تھے۔ سلطان حیدر کو مناظرے سننے کا شوق تھا لہٰذا منطق سے ان کی دلچسپی بڑھی اور پھر منطق کی تحصیل بھی کی۔ اسی زمانہ میں ناولوں کا بھی چرچا شروع ہوا تھا لہٰذا طالب علمی ہی کے زمانہ میں ایک معمولی سا ناول شائع کر کے مصنف بن گئے تھے۔ "آفندو دانی" کے عہد میں شاید شاعری سے شوق رہا ہو لیکن ان کی شاعری کا کوئی نمونہ دیکھنے میں نہیں آیا۔ بجز اس کے کہ جوشؔ تخلص رکھتے تھے۔ بہرحال ان کا قلمی شوق دراصل رسالہ مخزن سے شروع ہوتا ہے۔ ابتدائی دو تین مضمون اگر قابلِ اعتنا نہ ہوں تو نہ سہی لیکن پھر ان کے مضامین میں اہمیت و خصوصیت جھلک مارنے لگی تھی۔ انگریزی رسالوں۔ مس کوریلی کے ناولوں۔ آسکر وائلڈ اور برنارڈ شا کے ڈراموں اور دیگر یوروپین تصانیف کے پڑھنے کے بعد انہیں فسانہ نگاری کا شوق پیدا ہوا اور وہ اپنے مقبول و دلچسپ طرز کے مالک بن گئے۔ رسالۂ تمدن میں ان کے جملہ مضامین و افسانے ان کی پختگی کے مظہر ہیں۔ تمدن میں پروفیسر مشتاق زاہدی صاحب سے پردہ کے متعلق بحث چھڑ گئی تھی۔ اس قلمی نبرد آزمائی نے رسالۂ تمدن کی ہر دلعزیزی اور اشاعت میں معتدبہ اضافہ ہوا۔ مجھے یاد ہے کہ سلطان حیدر اور پردہ کی موافقت میں میں نے بھی مضمون لکھا تھا اور غالباً یہ میرا پہلا تیر تھا۔

جب مولانا شوکت علی صاحب نے علی گڑھ سے رسالہ "اولڈ بوائے" جاری کیا تو جوشؔ صاحب اپنے مضامین کے ذریعہ اس رسالہ کی روح و رواں تھے۔ پھر مولانا محمد علی صاحب نے دہلی سے کامریڈ کے ساتھ روزانہ ہمدرد بھی نکالا تو اس کے اسٹاف میں سیّد محفوظ علی صاحب، محمد فاروق صاحب اور قاضی عبدالغفار صاحب جیسے گراں قدر اہلِ قلم شامل تھے۔ ہمدرد میں اودھ پنچ کے مرحوم حاجی بغلول صاحب نے سیاسی آن بان کے ساتھ از سرِ نو جنم لیا تھا۔ اس موقع پر سلطان حیدر بھی کسی سے پیچھے نہیں رہے۔ انہوں نے سنجیدہ و مزاحیہ مضامین سے ہمدرد میں چار چاند لگا دیئے اور خوب خوب داد حاصل کی۔

کہنہ مشقی نے اب انہیں مستقل تصانیف کے لئے مجبور کیا۔ چنانچہ یکے بعد دیگرے دو کتابیں لکھیں۔ ابنِ مسلم ایک ناول ہے جو اپنی خصوصیات کی وجہ سے آج بھی جدید کا نمونہ ہے۔ اس میں کردار نگاری کے وصف کو انتہا تک پہنچا دیا ہے۔ اس کا پہلا ایڈیشن ۱۹۱۹ء میں نظامی پریس بدایوں سے شائع ہوا تھا دوسرا ایڈیشن میں نے اپنے نقیب پریس بدایوں سے ۱۹۲۰ء میں شائع کیا اور اب تیسرا ایڈیشن لاہور سے چھپا ہے۔ اس کی اشاعت ۱۹۵۳ء میں سلطان حیدر کے انتقال سے چند ماہ پیشتر ہوئی تھی۔ ان کی دوسری کتاب بانیٔ شیخوپورہ محتشم خان نواب فریدہ کی سوانح عمری ہے جو عہدِ جہانگیری۔ شاہجہانی اور عالمگیری سے تعلق رکھتی ہے اور اس میں تاریخ کی خشکی کو ادب کی رنگینی کا ہم پایہ بنا دیا ہے۔ ان تصانیف کے بعد ان کی تحقیق اور ان کے مطالعہ میں معتدبہ اضافہ ہوا۔ ریفئیل۔ آنجلو اور دیگر ماسٹرز کی تصاویر اور آرٹ کی گہرائیوں میں رسائی حاصل کی اور اس مطالعہ کے نتائج الناظر لکھنؤ۔ کہکشاں لاہور۔ نقیب بدایوں۔ اور سرگزشت علی گڑھ وغیرہ میں نہایت آب و تاب سے جلوہ گر ہوتے۔ ان کے مختصر افسانے مثلاً "ہوائی" اور "نقشِ نقاش" ان کی بے مثال اور بیش بہا یادگار ہیں۔ رسالۂ الناظر لکھنؤ میں ان کی کسی ظریفانہ بات پر حضرت مولانا عبدالماجد صاحب دریا آبادی نے قرآنی لغت میں "سلام" پیش کرکے اعتراض کیا تھا اور ان سے نوک جھونک شروع کی تھی جو ان کے جواب کے بعد ہی ختم ہو گئی۔ دورانِ ملازمت میں پہلی جنگ عظیم کے موقع پر ریکروٹنگ آفیسر بنا دیئے گئے تھے۔ اسی زمانہ میں انہوں نے فوجی زندگی اور جنگ کے اصولوں کے متعلق کافی واقفیت و معلومات حاصل کی تھی۔ چنانچہ ان کی تصانیف میں اکثر میدانِ جنگ کے نقشوں کی بھی تفصیل مل جاتی ہے۔ سلطان حیدر صاحب مشک آنست کہ خود ببوید نہ کہ عطار بگوید کے اصول کے قائل تھے۔ اپنی تصانیف کو زیورِ طبع سے آراستہ کرنے کا شوق تھا۔ لیکن اشاعت کے متعلق بے نیاز سے اور تجارتی پہلو پر کبھی غور نہیں کیا۔ ابنِ مسلم کے تیسرے ایڈیشن کی اشاعت اور افسانوں کی طباعت کی اجازت وہ اپنے چند احباب کو بلا معاوضہ عطا کر گئے ہیں۔

ولایت سے میری واپسی ۱۹۱۹ء میں ہوئی تھی۔ یہ حضرت اس وقت ہردوئی میں تحصیلدار تھے۔ اتفاق سے وہاں پر بہترین صحبت و

سوسائٹی میں جان پڑگئی تھی۔ سید حامد علی صاحب۔ سید مسعود الحسن صاحب رضوی اور مولوی بدرالحسن صاحب الٰہ آبادی وہاں ڈپٹی کلکٹری پر فائز تھے سب کے سب زندہ دل اور باذوق تھے۔ ان سب کی روح رواں بدرالحسن صاحب تھے اور سلطان حیدر اس سوسائٹی کے پریزیڈنٹ اعلیٰ تھے۔ بدرالحسن صاحب قبلہ کی تعریف محض اس قدر کافی ہے کہ متقی مسلمان ہیں اور علی گڑھ کالج کی ابتدائی سوسائٹی کے جناب تھے۔ ہردوئی کے دیگر مذاق سلیم رکھنے والے احباب کے علاوہ سلطان احمد صاحب بیرسٹر اور جان ظرافت چودھری محمد علی صاحب قبلہ اس سوسائٹی کے ممبر تھے اور چودھری صاحب کا شوق اُن کو کشاں کشاں رودولی سے یہاں لے آیا کرتا تھا۔ سوسائٹی کے صدر صاحب نے فرمان جاری کیا کہ ممبران آپس میں اپنے انداز و طرز میں گفتگو کیا کریں۔ اگر روزمرہ کی عادت کے طور پر گفتگو کسی نے کی تو ایسا مجرم ممبری سے خارج کردیا جائے گا۔ شاعر ممبران کو حکم تھا کہ شاعری بھی عامیانہ روش کو ترک کرکے سوسائٹی کے رنگ میں کی جایا کرے اور اعلان عام ہوا کہ شاعر ممبران میں سے کوئی ایک صاف ستھری غزل لکھے پھر اس غزل کو بہ یک وقت تمام اُستادان فن کے پاس اصلاح کی غرض سے بھیج دے۔ اس سوسائٹی کی میٹنگ کے وقت اگر کوئی غیر ممبر آ پھنستا تو باوجود اپنی قابلیت و ہمہ دانی کے ہکا بکا ہو کر رہ جاتا اور اس کے پلے کوئی بات نہ پڑتی۔ امیر حسن مرحوم انسپکٹر زراعت نے شاعری کے اس خاص طرز میں کمال حاصل کیا۔ شوکت الفاظ سے مشاعروں میں داد حاصل کرتے اور داد دینے والا جب مفہوم شعر سمجھنا چاہتا تو سر کھجا کے رہ جاتا۔ ان کی "ٹکڑے کردیئے" والی مرصع غزل کا ایک شعر مجھے یاد ہے۔ اس شعر کا ایکٹنگ اور تصور کس قدر دل خوش کن نظارہ پیش کرتا ہے۔ ملاحظہ ہو۔

اُس نے پہلے مِس کہا۔ پھر تق کہا پھر بِل کہا
اِس طرح ظالم نے مستقبل کے ٹکڑے کردیئے

نشتر سندیلوی کو جب جملہ شاعران باکمال کی اصلاحیں موصول ہوگئیں تو صنفِ شاعری و ادب میں اضافہ کرنے کی غرض سے کتابی صورت میں شائع کی گئیں۔ اور بڑے بڑے ماہران فن کی شخصیتوں کو چمکا کر دکھا دیا گیا۔ غرض ہردوئی کی اس سوسائٹی میں سلطان حیدر کو پروان چڑھنے کا بہترین موقع ملا۔ رسالۂ نقیب بدایوں کے اجراء کا تصور اسی سوسائٹی نے پیدا کیا تھا۔ بدایوں پہنچ کر جب سید محفوظ علی صاحبؒ سے میں نے مشورہ کیا تو وہ دل و جان سے سرپرستی پر آمادہ ہوگئے۔ نقیب نے ادب و ظرافت میں کس قدر اضافہ کیا مجھے نہیں معلوم لیکن یہ واقعہ ہے کہ سید محفوظ علی صاحب کو ایک مرتبہ محمد علی صاحب نے گوشہ سے نکال کر دنیائے ادب کو ممنون کیا تھا اور دوسری مرتبہ محمد علی صاحب کی تقلید کا فخر مجھے حاصل ہوا۔

سلطان حیدر صاحب کے معمولات میں تھا کہ وہ ہر صبح کو ورزش و نماز سے فارغ ہو کر اور ناشتہ سے پہلے اپنے ملازمین سے ظرافت فرمایا کرتے تھے۔ اور اس طرح بلاناغہ طبع رسا کے سمند کو دن بھر کی اصلی رفتار پر چلانے کی مشق کیا کرتے تھے۔ یہ ایک مستقل ڈرامہ تھا جو مستقل طور پر صبح کے وقت کھیلا جاتا تھا یعنی جا و بیجا وجہ تراش کر ملازم یا چھوکرے پر گالیوں کی بوچھار کی جاتی تھی کہ کرسی صاف نہیں کی۔ میز ٹیڑھی رکھ دی۔ چلم سے چنگاری کیوں اُڑتی ہے۔ ملازمین اس انعام کو دعائیں سمجھتے تھے اور پھر مساوات ہو جانے پر جان جان کر اس قسم کی حرکتیں کیا کرتے تھے کہ پارہ تیز ہو اور ہر اعتراض کا جواب ترکی بہ ترکی دیا کرتے تھے۔ حتیٰ کہ ناشتہ کا وقت آجاتا۔ ناشتہ کھاتے وقت گھر والوں اور ساتھیوں کو سنا سنا کر اپنے آپ کو حق بجانب اور ملازم کو ملزم قرار دیا کرتے تھے اس کے بعد دن بھر ہنستے کھیلتے گزرتا تھا۔ یہ واقعہ ہے کہ وہ دوستوں کو ہنسا دیا کرتے تھے ہر مصیبت زدہ کو اس کی بہتری کیلئے صلاح مشورہ دیا کرتے تھے اور پوری ہمدردی کرنے میں انہیں باک نہ تھا لیکن بربنائے وہم جب ذاتی پریشانی ہوتی تو اپنے انداز کو قائم رکھتے ہوئے زمین و آسمان کو زیر و زبر کردینا بھی ان کی عادت میں داخل تھا اور بڑی مشکل سے ان کو تسکین حاصل ہوتی تھی۔ ایک مرتبہ اپنی موجودہ زندگی پر نظر ڈالتے ہوئے مجھ سے کہا کہ تمدن میں پردہ کے متعلق ہم نے غلط بحث کی تھی۔ پردہ تو جہالت کی بات ہے۔ میں نے کہا۔ کہ آپ اپنی جہالت کا پردہ فاش کر رہے ہیں۔ میں تو پردہ ہی ذرا نامناسب سمجھتا ہوں۔ مجھے یاد نہیں رہا تھا ۱۹۲۹ء میں جب ان میں پکرا اپنے کرو[illegible]

ڈاکٹر محمود اللہ جنگ کی معیت میں مجھے مولوی عبدالسلام صاحب (جن کو چند ہ حسن آزاد بھی کہتے ہیں) کی خدمت میں جانے کا اتفاق ہوا۔ کالی چوڑی کی مسجد کے سامنے مختصر سے بالاخانہ پر ان کا قیام تھا۔ فقہ و حدیث میں کامل ہونے کے ساتھ بڑے پایہ کے ولی بھی ہیں۔ اپنی کیفیت میں سرشار رہتے ہیں۔ علم کلام میں ان کو ید طولیٰ حاصل ہے۔ خوب تقریر فرماتے ہیں۔ برابر بولتے رہتے ہیں۔ اور نئی تراشی خراش کی علمی گالیاں ایجاد کرنے میں ان کی مثال نہیں۔ مجھ سے پوچھا کہ میں شیخوپور کا رہنے والا ہوں برجستہ سلطان حیدر کے متعلق استفسار کیا اور فرمایا بڑے کٹر قسم کا دہریہ تھا۔ وجود مطلق سے انکار کرتا تھا۔ بڑی مشکل سے مثنوی کا ایک دفتر پڑھا کر میں نے اسے راہ پر لگایا تھا۔ جب میں نے بعد میں سلطان حیدر سے اس کا تذکرہ کیا تو اقبال کیا اور مولانا کی صفت و ثنا کرنے لگے۔

پنشن کے بعد مستقل قیام علی گڑھ میں تھا مگر شیخوپور بھی آ کر رہا کرتے تھے۔ بدایوں کے اسلامیہ انٹر کالج کے انتظامات میں خرابی واقع ہوئی اور اس کے متعلق اس کے صدر صاحب کلکٹر سے استدعا کر رہے تھے کہ انتظامیہ کمیٹی میں بہ حیثیت وزیٹر کے تشریف لا کر ٹرسٹیوں میں میجری کے متعلق تصفیہ کر دیں تو اس وقت میں اور سلطان حیدر صاحب صاحب ضلع سے ملنے اتفاقیہ پہنچے۔ کلکٹر صاحب نے سلطان حیدر سے کہا آپ ٹرسٹی بھی ہیں پنشن بھی حاصل کر چکے ہیں لہٰذا میری رائے ہے کہ آپ کالج کے سیکرٹری بن جائیں تاکہ یہ بدنظمی دور ہو جائے۔ یہاں کی صورتِ حال پر غور کئے بغیر یہ حضرت راضی ہو گئے۔ صاحب نے صدر صاحب سے کہا اب میرے آنے کی ضرورت نہیں۔ صدر صاحب سیکرٹری شپ کے نزاع کو انہیں منتخب کر کے ہمیشہ کے لئے دفن کر دیں۔ صدر صاحب نے بڑے تپاک سے وعدہ کیا۔ معاملہ طے ہو گیا اور سلطان حیدر صاحب انتظامات کے منصوبے گانٹھتے ہوئے گھر پہنچے۔ دوسرے دن صدر صاحب نے میٹنگ میں یہ کہہ کر کہ سلطان حیدر صاحب کی استدعا پر کلکٹر صاحب نے یہ حکم دیا ہے لہٰذا آپ غور کر لیں اور سلطان حیدر صاحب کو سیکرٹری بنا لیں۔ پروپیگنڈا پہلے ہی ہو چکا تھا۔ ٹرسٹیوں نے ان میں دو ہزار عیب نکالے اور ان کو سیکرٹری منتخب نہیں کیا۔ جب واپس آئے تو روئداد مجھے سنائی۔ افسوس کی انتہا تھی۔ اس لئے نہیں کہ منتخب نہیں کئے گئے بلکہ اس لئے کہ بیچا نکتہ چینی کے بعد مضحکہ اڑایا گیا۔

اب اس عرصہ میں اُن کے کچھ احباب عالم بالا کو منتقل ہو گئے اور کچھ احباب پاکستان چلے گئے۔ ان بیرونی و خانگی انقلابات نے ان کی جان پہ بنا دی اور ان کی ظرافت شوخی نے بھی نیا وطیرہ اختیار کر لیا۔ بھائی عظمت اللہ خان کی وفات پر انہیں سخت صدمہ تھا۔ اس لئے کہ ان کے ذوق کی اصلاح کرنے میں ان کو بہت دخل تھا۔ ایک روز مجھ سے فرمایا کہ بس ہندوستان میں ایک تم ہو اور لاہور پاکستان میں عطاء اللہ بیرسٹر ہیں جن سے میری ڈھارس بندھی رہتی ہے۔ عطاء اللہ صاحب ان کے خالہ زاد بھائی اور بچپن کے ساتھی تھے۔ اس کے بعد جب بہ حیثیت پارلیمنٹری سیکرٹری کے مجھے علی گڑھ کے دورے پر جانا پڑا تو ان کو لکھ دیا تھا کہ میری مصروفیات مجھے ڈاک بنگلہ میں رہنے کے لئے مجبور کرتی ہیں البتہ فارغ ہو کر میرا وقت آپ کے یہاں گزرا کرے گا۔ دوسرے دن صبح کو جب اُن سے ملنے گیا تو میری صورت دیکھتے ہی برس پڑے میرے عہدہ کو سینکڑوں صلواتیں سنا دیں۔ اور میرا اسباب ڈاک بنگلہ سے اپنے یہاں منگوا لیا پھر وہ تمام مصیبتیں اور اذیتیں برداشت کیں جن سے میں ان کو بچانا چاہتا تھا۔ دوران گفتگو میں مجھے یہ بتا دیا تھا کہ میرا آ جانا عطاء اللہ کو میں نے لکھ دیا۔ کہ فکر نہ کرو اس لئے کہ اقلیت ہر جگہ اور ہمیشہ مظلوم ہی ہوتی ہے۔ میں نے اس نکتہ کی تائید کی۔ جب میں حاکم ضلع سے ملنے گیا تو انہوں نے مجھ سے جائے قیام کی تبدیلی کی وجہ دریافت کی۔ میں نے انہیں بتا دیا کہ سلطان حیدر میرے چچا زاد بھائی ہیں لہٰذا ان کے حکم کی مجھے تعمیل کرنا تھی۔ بڑی حیرت کے ساتھ صیغۂ راز میں کلکٹر صاحب نے بتایا کہ یہ تو پاکستانی جاسوس ہیں۔ میں نے ان کے خط پکڑے ہیں اور عنقریب اُن پر مقدمہ چلانے والا ہوں۔ میں نے تعجب سے دریافت کیا کہ کس کو لکھے ہیں اور کیا لکھے ہیں۔ جواب ملا کہ عطاء اللہ کو لکھے ہیں اور یہ لکھا ہے کہ اقلیت مظلوم ہوتی ہے۔ میں ہنس پڑا۔ میں نے اصل واقعہ سمجھا کر انہیں یقین دلا دیا کہ سلطان حیدر کو سیاست سے کچھ واسطہ نہیں رہا۔ اور اب تو اپنے بعض مضامین میں کانگرس کو انہوں نے سراہا ہے

آپ کو مقدمہ کا الزام ہو گا۔ تو تسلیم کرنے کے بعد اس شکایت کو باقی رکھا کہ باوجود پنشن یافتہ ہونے کے مجھ سے ملنے کیوں نہیں آتے ہیں۔ ان کی اس
کوتاہی کی توجیہہ کر کے وعدہ کر لیا کہ اب مجھ سے ملنے آئیں گے۔ مگر جا کر پورا لطیفہ سنا دیا اور عرض کیا کہ ٹال آئیے۔ اب تو ایسے بکھرے کہ آتے ہیں تو مجھ سے یہ
کہنے لگے میں کبھی ملنے نہیں جاؤں گا۔ اب وہ مجھ پر مقدمہ چلائیں۔ میں اور بھائی صاحب ہنسنے لگے۔ مگر صاحبزادے اور صاحبزادی صاحبہ نے ان کی
بے طرح خبر لی کہ نہ دوست کو سمجھیں نہ دشمن کو سمجھیں برآمدہ میں بیٹھ کر ہر کس و ناکس سے بیچ بیچ کر اخباری مضامین پر بحث کرتے ہیں۔ اب اگر کوئی
C.I.D. یا دشمن رپورٹ کر دے تو موجودہ فضا میں کوئی سننے والا نہیں اور برا دن دیکھنا پڑے گا۔ ٹھنڈے ہو کر قائل ہو گئے اور دوسرے
دن کلکٹر صاحب کے یہاں جانے پر راضی ہو گئے اب یہ نہیں معلوم کہ کلکٹر صاحب کو انہوں نے رام کیا یا خود رام ہو گئے مگر بہ خیر گزشت۔
اس سلسلہ میں یہ بھی عرض کر دوں کہ سلطان حیدر بہ حیثیت انسان کے مرنجان مرنج تھے۔ بہ حیثیت ادیب اور ظرافت نگار کے بلند پایہ رکھتے تھے
لیکن بہ حیثیت ڈپٹی کلکٹر ان کی شوخی اور زندہ دلی نئے قسم کی تھی۔ جس کو عام مذاق کے لوگ نہیں سمجھ سکتے اور کیا عجب ہے کہ بیشتر ڈپٹی کلکٹر صاحبان
کا یہی مذاق ہو۔ اس کو ایک مثال دے کر سمجھاؤں گا کیونکہ ان خواص کو سمجھنے کی قابلیت اپنے آپ میں نہیں پاتا۔ کانگرس گورنمنٹ نے نیا نیا چارج
لیا تھا۔ میں محض کونسل کا ممبر تھا اور سلطان حیدر کی لمبی چوڑی چھٹی ختم ہونے والی تھی۔ میرے ساتھ لکھنؤ اس لئے گئے کہ چھٹی کے بعد ان کی
تعیناتی علی گڑھ ہو جائے۔ میں نے قدوائی صاحب سے اس قسم کا وعدہ کرا کے انہیں بتا دیا مگر یقین نہیں آیا تو انہیں ساتھ لے جا کر ان کے سامنے
چیف سیکرٹری موڈی صاحب کو نوٹ لکھوا دیا۔ شام کو جب کونسل کے اجلاس سے کمرے پر پہنچا تو فرمایا مجھے متحقق ہوا کہ قدوائی صاحب
کی موڈی صاحب نہیں مانیں گے۔ اس لئے پنتھ جی سے کہلوا دو۔ دوسرے دن میں نے پنتھ جی صاحب سے عرض کیا اور انہوں نے بھی وعدہ کر
لیا۔ اور میں سمجھا کہ اب ان کو اطمینان ہو جائے گا۔ مگر بولے تو یہ بولے کہ چیف سیکرٹری بھلا ان منسٹروں کی کب ماننے والا ہے۔ گھبرا کر میں نے
عرض کیا تو اب آپ موڈی صاحب سے خود مل لیجئے۔ اس پر انہوں نے سپر ڈال دی اور موڈی صاحب سے ملنے کو گئے۔ موڈی کے سامنے
قدوائی صاحب کا نوٹ موجود تھا اس نے ڈپٹی صاحب سے کہا کہ آپ علی گڑھ چاہتے ہیں؟ جواب دیا کہ "علی گڑھ ہو یا کوئی سا بدایوں کے قریب
کا ضلع ہو"۔ اور پھر خود ہی ایٹہ کا نام بھی تجویز کر دیا۔ اس لئے پھر دریافت کیا کہ ترجیح کس کو دینا چاہتے ہیں۔ فرمایا ایٹہ کو۔ ملاقات ختم ہو گئی۔
واپسی میں کونسل کے اجلاس سے مجھے باہر بلا کر ملاقات کا حال مصنفات و مرحوذات میں سنا دیا۔ لیکن مجھے اپنی غلطی کا اعتراف ہے کہ جلدی میں
اصل حقیقت کو میں نہیں سمجھ پایا۔ وقت رخصت مجھے تاکید کی کہ علی گڑھ کی تعیناتی کا خیال رکھنا۔ کچھ دن بعد خط آیا کہ ایٹہ کو بھیجا گیا ہوں۔ مجھے
حیرت ہوئی اور قدوائی صاحب سے شکایت کرنے پہنچ گیا۔ دیکھتے ہی فرمایا کہ کیوں حضرت یہ کیا بات ہے۔ مجھ سے علی گڑھ کے متعلق کہا اور چیف
سیکرٹری سے ایٹہ کے متعلق طے کیا۔ عرض کیا یک نہ شد دو شد۔ آپ نے تو اُلٹا میرا منہ بند کر دیا۔ میں تو خود اسی کی شکایت کرنے آیا تھا۔ فرمایا
کہ دفتر سے تحقیق کر لو۔ نتیجہ تحقیق وہی نکلا جو قدوائی صاحب نے بتایا تھا۔ اب میں نے ان حضرت کو لکھا کہ ایں ہمہ آوردۂ تست۔ شکایت کس
بات کی ہے۔ جواب ملا کہ یہ حرکت میں نے مصلحتاً کی تھی کہ چیف سیکرٹری یہ نہ سمجھے کہ میں منسٹروں سے اس پر اثر ڈلواتا ہوں مگر تمہاری کوشش
پر مجھے اعتماد تھا جس ہی مجھے مایوسی ہوئی۔ تمہاری کوتاہی کی شکایت ہے اور کچھ نہیں۔ یہ توجیہہ سن کر مجھے اپنی غلطی تسلیم کر لینے کے علاوہ
دوسری صورت ہی کیا تھی۔ اب آخر میں بیوی کے انتقال کے بعد ان کی ظرافت نے اپنے اوپر خود مسکرانا شروع کر دیا تھا۔ لیکن پھر بھی وہ ظرافت سے باز نہیں آتے تھے۔

خدا جانے کیا قصہ ہے۔ میرا اپنا تجربہ یہی ہے کہ جب میرا کوئی عزیز و قریب اس جہان سے رخصت ہونے کو ہوتا ہے تو میرے اور اس کے درمیان میں پردہ ڈال دیا جاتا ہے شاید اس کی
وجہ یہ ہو کہ غم کھانے میں بڑا دل ناکام ہوتا ہے۔ قصہ مختصر ان کے ایک حکم کی تعمیل میں ان کے منشی نے ایک مغالطہ پیدا کر دیا تھا۔ ہر چند میں نے معذرت کرتے ہوئے منشی کی غلط بیانی کا یقین دلایا۔
لیکن انہوں نے میری نہیں مانی تو میں نے عمر بھر میں پہلی مرتبہ ایک سخت خط ان کو لکھ دیا جواب آیا کہ [illegible] کے واسطے عنایۃً معاف کر دو میں ختم کر چکا ہوں [illegible] معاف کر دیا لیکن ایک [illegible] خط و کتابت
بند ہو گئی۔ اس عرصہ میں عطاء اللہ صاحب کا لاہور میں انتقال ہو چکا تھا۔ مجھے خبر نہیں کہ اس سانحہ پر ان کے اوپر کیا گزری۔ کچھ عرصہ کے بعد [illegible]

اختر شیرانی

نیر واسطی

(ادب کے سلسلے میں میری زندگی کا دلچسپ مشغلہ شعر، تنقید اور تاریخ ہے۔ لیکن میری عادت کے خلاف طفیل صاحب نے مجھ سے فرمائش کی ہے کہ میں اختر کی شخصیت کے موضوع پر لکھوں۔ لہٰذا ان کے ارشاد کی تعمیل میں کوشش کرتا ہوں کہ اس فرض سے عہدہ برآ ہو سکوں۔ ن۔ وا)

سنہ ۱۹۲۴ء سے اختر کا نام میرے کانوں میں گونج رہا تھا۔ میں ان دنوں چوک چونا منڈی لاہور میں مطب کرتا تھا۔ حافظ محمد عالم مدیر عالمگیر جو مجھ سے اپنے رسالے کے لئے نظمیں لکھوا کر لے جاتے آتے اور اکثر اختر کے حالات بیان کیا کرتے تھے پھر اسی ضمن میں انتخاب اور بہارستان نے جنہیں اختر نے ۱۹۲۵ء سنہ و سنہ ۱۹۲۶ء میں جاری کیا مجھے ان سے اور زیادہ آشنا کر دیا۔ لیکن اس کے بعد عاشق بٹالوی نے شاعری اور شعر میں ان کی محویت، بیخودی وارفتگی اور والہانہ زندگی کے حالات کچھ ایسے لطیف اور پُرکیف انداز میں بیان کئے کہ میں اختر کا نادیدہ عاشق ہو چکا تھا۔

مارچ سنہ ۱۹۲۷ء کا ذکر ہے کہ ایک دن شام کو مغرب کے بعد ایک حسین اور تنومند نوجوان ننگے سر ہاتھ میں قراقلی ٹوپی لئے کالی اچکن پہنے مطب میں آیا اور کہنے لگا کہ میر نور احمد صاحب ٹمن ایک مریض کو دیکھنے کے لئے چلئے۔ میں نے اس کا نام پوچھا۔ فرمایا اختر شیرانی ——— سنتے ہی لپٹ گیا اور ایسا محسوس ہوا کہ برسوں کے بچھڑے ہوئے کسی دوست کو پا لیا ہے۔ اختر سے میری یہ پہلی ملاقات تھی ——— اس کے بعد تمام عمر جب تک وہ زندہ رہے یہ رشتہ محبت روز بروز مستحکم سے مستحکم تر ہوتا چلا گیا۔

میں نے اختر کو زندگی کے ہر دور اور ہر حال میں دیکھا حتیٰ کہ روز ملاقات سے یوم وفات تک جس کو ان کی شاعری کی عمر کا پورا دور سمجھنا چاہئے ان کی زندگی بلکہ بالخصوص روحانی زندگی کے تمام مراحل میری آنکھوں کے سامنے گزرے ہیں۔ میں نے ان کو خلوت میں دیکھا، جلوت میں دیکھا، دوستوں میں دیکھا، دشمنوں میں دیکھا۔ امیروں میں دیکھا۔ فقیروں میں دیکھا اور فلیمنگ روڈ کے تنگ و تاریک گوشے کے علاوہ گجرات کی رات کی جلوہ باریوں میں، ایبٹ آباد کی شام رودبار کی نالہ سامانیوں، مری کی مستورستانی فضا کی بہار فروشیوں اور خصوصاً باغ لارنس کی دلکش چاندنی راتوں میں دیکھا۔ اختر ہر جگہ اور ہر حال میں ایک عجیب و غریب انسان نظر آیا۔

میانہ قد۔ سڈول جسم۔ نشیلی آنکھیں۔ کتابی چہرہ۔ ستواں ناک۔ کبھی کبھی اچکن ورنہ کھلے گلے کی قمیص اور سندھی طرز کا پاجامہ۔ چال میں لغزش اور نگاہ میں مستی ——— بکھرا بکھرا سا ایک جہان عشرت ——— یہ تھے اختر شیرانی جو ابتدا میں آگ تھے اور انتہا میں خاک ———

اختر ۴ مئی ۱۹۰۵ء کو اپنے وطنِ مالوف ٹونک میں پیدا ہوئے۔ پیدائش کے وقت آپ کے والدِ محترم حافظ محمود شیرانی نے آپ کا نام داؤد خاں رکھا۔ لیکن بعد میں انہوں نے اپنا تخلص اختر اختیار کر لیا۔ اور شیرانی الاصل ہونے کی وجہ سے شیرانی کہلائے۔

ان کے والدِ محترم حافظ محمود شیرانی فارسی علم ادب، تنقید اور تاریخ کے جید عالم تھے اور علمِ عروض میں تمام ہندوستان میں منفرد تھے۔ حافظ صاحب مرحوم جب ۱۹۱۳ء میں ولایت سے تعلیم سے فارغ ہو کر ٹونک تشریف لائے تو انہوں نے ٹونک میں اختر کی ابتدائی فارسی تعلیم کے لئے مولوی ساجد علی صاحب شاکر کو مقرر کیا۔ جنہوں نے پہلے پہل اختر میں شعر کے ذوق کو بیدار کیا۔ ایک پہلوان قیوم خاں ملازم رکھا گیا جو اختر کو ورزش کراتا اور کشتی کا فن سکھلاتا تھا۔ اور ایک خوشنویس متعین کیا گیا جو اختر کو خوشنویسی کی مشق کراتا تھا۔ اختر کی حسین خطاطی اور جسمانی خوبصورتی و تنومندی درحقیقت اسی دور کی یادگار تھی۔

حافظ محمود شیرانی ۱۹۲۰ء میں جب ٹونک سے جلاوطنی کے سلسلے میں اہلِ وعیال کو ساتھ لے کر لاہور آئے اور یہاں آ کر اورینٹل کالج میں پروفیسر مقرر ہوئے تو اختر بھی ان کے ساتھ تھے۔ حافظ صاحب مرحوم نے اختر کو اورینٹل کالج میں داخل کرایا۔ اور غالباً ۱۹۲۲ء میں جبکہ اختر کی عمر ۱۶ سال کی تھی انہوں نے منشی فاضل کا امتحان پاس کر لیا۔

اس کے بعد خیال تھا کہ اسی باقاعدہ تعلیم کے سلسلے کو اور آگے بڑھایا جائے کہ اختر شعر و سخن کی دلچسپیوں کی جانب زیادہ متوجہ ہو گئے۔ اختر نے انگریزی باقاعدہ نہیں پڑھی تھی لیکن مطالعہ کی بدولت خاصی استعداد بہم پہنچائی تھی اور کچھ عربی سے بھی واقفیت حاصل کر لی تھی۔ اختر نے بہت کمسنی ہی میں شعر کہنا شروع کر دیا تھا لیکن ۱۹۲۴ء سے ان کی نظمیں باقاعدہ رسالوں میں شائع ہونے لگیں۔ پہلی نظم جو کہ تھی جس نے علمی اور ادبی حلقوں کو متوجہ کیا۔ اور پھر اس کے بعد سرزمینِ گجرات۔ انجامِ ہستی۔ تیتری۔ "ایک بار دیکھا اور دوبارہ دیکھنے کی ہوس ہے" اور اسی نوع کی بیشمار نظموں کا سلسلہ شروع ہو گیا جنہوں نے دنیائے شعر و ادب میں ہنگامہ برپا کر دیا۔

ابتدائی دنوں میں فلیمنگ روڈ پر آپ کے والد کے مکان میں زینے کے پاس ایک چھوٹا سا کمرہ اختر کے لئے مخصوص تھا۔ جس میں چند کرسیاں اور ایک چارپائی دیکھی جاتی تھی۔ دریچہ کی جانب ایک میز تھی جس پر چند کتابیں رکھی رہتی تھیں اور کبھی کبھی بوہیمین کی مناسبت روس کی تصویر نظر آتی تھی۔

درحقیقت یہ تھا اختر کا وہ مدرسۂ شعر و مکتبِ فکر جہاں ادب اردو کے ایک نئے دور کی تخلیق ہوئی اور شعر و ادب کے نئے اسالیب و اقدار وضع ہوئے۔

اختر کے دوستوں، شاگردوں اور ملاقاتیوں کا ہجوم اسی کمرے میں رہتا تھا اور اختر نے جو ادبی رسائل و مجلات جاری کئے ان کا دفتر بھی درحقیقت یہی کمرہ تھا۔ یہاں اختر ہمہ تن اپنے دوستوں کی خاطر و تواضع میں مصروف رہتے اور ان کا ملازم فضل بار بار بالاخانے کے زینے سے نیچے کی منزل میں جہاں یہ کمرہ تھا آتا اور آنے والوں کی خدمت میں سگریٹ۔ پان۔ شربت اور لیمونیڈ وغیرہ پیش کرتا۔

۱۹۲۵ء سے لے کر ۱۹۳۲ء تک اختر کی شاعری کے شباب کا دور تھا۔ اس دور کے ابتدائی ایام میں ان کی شاعری نے سب سے زیادہ جن لوگوں کو متاثر کیا وہ کالجوں کے طلباء، طالبات اور اس دور کے ہونہار نوجوان ادیب تھے۔ لاہور کے تقریباً ہر کالج کا ہر نوجوان جسے ادب سے ذرا بھی وابستگی تھی ان کے پاس پہنچتا تھا۔ اسی زمانے میں ن۔ م۔ راشد نے گورنمنٹ کالج لاہور کی مجلس اردو میں اختر کی شاعری پر ایک شاندار مقالہ پیش کیا۔ جو اب ان کی کتاب اخترستان میں شامل ہے اور اس کے بعد سید اختر احمد اختر اورینوی نے گورنمنٹ کالج پٹنہ میں ان کی شاعری پر ایک اور سیر حاصل مقالہ پڑھا۔

اس دور میں اختر کے گرد اس دور کے خوش ذوق نوجوان ادیبوں کا ایک شاندار حلقہ جمع ہو گیا تھا۔ ن۔ م۔ راشد۔ پیرزادہ احمد ندیم قاسمی

میرزا ادیب - دلبر حسین مسعود - عمر فاروق - علی رضا - خضر تمیمی - مصطفٰے حسین - سلیم رضا - عاشق بٹالوی - سردار کریم نواز - سید محمد جعفری - عظیم قریشی اور دیگر بیشمار نوجوان ادیب اختر کے پاس چاند کے گرد تاروں کی طرح جمع ہو گئے تھے - چراغ حسن حسرت بھی جنہیں اختر چراغ حسن کہا کرتے تھے کبھی کبھی شام کو اس محفل کو جگمگاتے تھے - جگر و جوش جب لاہور آتے اس کلبۂ اختر کی زینت بنتے -

پھر اختر کے ادبی رسالوں نے رومانی ادیبوں کے اس حلقے کو اور وسیع بنا دیا تھا - مولانا حسرت موہانی مولانا تاجور نجیب آبادی - بابائے اردو مولانا عبدالحق - آغا حشر کاشمیری - چودھری خوشی محمد ناظر - عبدالرحمٰن چغتائی - چودھری فضل حق سب جج - شیخ عالم علی - ڈاکٹر تصدق حسین خالد - ڈاکٹر سید صدیق حسین عجمی - سید شبیر حسین بخاری - مولانا مرتضیٰ احمد خاں میکش - میر منظور محمود دلی - شیخ عبداللطیف تپش - سید ولایت حسین [illegible] - ساحل ٹونکی - اسرار الحق مجاز اور ان کے علاوہ اس دور کے تقریباً تمام مشاہیر علم و ادب اس حلقے میں شامل تھے

اختر کی اس محفل ادب میں ملک کی ممتاز اہل قلم خواتین بھی شریک تھیں - ان میں محترمہ کنیز فاطمہ حیا کا نام سرفہرست ہے - ان کے علاوہ محترمہ ادا بدایونی - محترمہ عائشہ بیگم شمیم - محترمہ نسرین خانم - محترمہ آمنہ تسیم - محترمہ رضیہ خاتون رضا - محترمہ شکیلہ اختر - آنسہ زہرہ بیگم اور دیگر بیشمار ادیب خواتین اختر کے رسائل میں مضامین نظم و نثر لکھتی تھیں -

اختر کی دوستی کے لئے علم و فضل کی کوئی قید نہ تھی - ایک پنواڑی سے لے کر لاہور میں بڑے سے بڑا ادیب اور صحافی ان کا دوست تھا - میں نے یہاں اختر کے دوستوں کی جو فہرست پیش کی ہے وہ بہت محدود ہے صرف پنجاب اور بالخصوص لاہور میں اختر کے ادیب دوستوں کی تعداد بلاشبہ اس سے ہزار گنا زیادہ تھی - درحقیقت کشمیر سے لے کر راس کماری تک ملک کا کوئی ادبی گوشہ اور کوئی ادیب - شاعر اور صحافی ایسا نہ تھا جو اختر سے واقف اور اس کا قدردان نہ ہو - دوستوں کے خطوط کا ایک انبار تھا جو روزانہ اختر کے پاس جمع ہو جاتا تھا -

رومان میں اختر کے مخصوص طرز نگارش کے حاملین کا جو حلقہ بن گیا تھا - اختر اسے دائرہ رومان کے نام سے یاد کرتے تھے - رومان میں ان کے خطوط پر تبصرے ہوا کرتے تھے - رومان کے سرنامہ پر تحریر تھا " اردو کے نوجوان اہل قلم کا ماہنامہ " -

انہیں مصوری سے گہرا لگاؤ تھا - موسیقی سے دلی وابستگی تھی - مشہور موسیقار مرحوم غلام حیدر ان کے خاص دوست تھے - اکثر موسیقی کی محافل میں شامل ہوتے - "[illegible]" کے نغمے ان کو بہت پسند تھے جس کا ذکر انہوں نے اپنے ایک سانیٹ میں بھی کیا ہے -

خطاطی اور فن خطابت سے اختر کو بڑی دلچسپی تھی - وہ خود بڑے اچھے خطاط تھے - حروف کے دائرے بڑے حسین بناتے تھے لیکن سطریں اکثر سیدھی نہیں رہتی تھیں - ہمیشہ ان کی یہ خواہش رہتی تھی کہ ان کا رسالہ بڑے اچھے خط میں چھپے اور اس مقصد کے لئے وہ بالعموم لاہور کے مشہور کاتب کلیمی کو پسند کرتے تھے -

کلاسیکی ادب میں اختر کی نظر بے حد وسیع تھی فارسی کے شعراء میں طالب آملی سے لے کر آج تک کے جدید ایرانی شعراء کے کلام پر انہیں عبور حاصل تھا - شاعری میں حافظ کے پرستار تھے - اور اس کے دیوان کو شاعری کا قرآن کہا کرتے تھے - اردو شعراء میں میر اور غالب کے معتقد تھے - ذوق کا نام جب آتا تو انہیں محمد رمضان کے صاحبزادے کہہ کر عجیب انداز میں یاد کرتے -

وہ مشاعروں کے شاعر نہ تھے لیکن متحدہ ہند کے ہر مشاعرے میں طلب فرمائے جاتے تھے - جہاں جگر و جوش موجود ہوتے ، اختر ضرور ہوتے - مشاعروں میں وہ اپنا کلام بغیر ترنم کے پڑھتے - سامعین چونکہ اختر اور اس کے کلام کے عاشق ہوتے اس لئے آپ کے کلام سے مشاعرہ گونج اٹھا کرتا تھا - اکثر ایسا بھی دیکھا گیا کہ عالم مستی میں بھی پڑھ دیتے - ان مشاعروں سے جو رقم وصول ہوتی وہ بالعموم بوتلوں کے [illegible] میں بہا دی جاتی تھی -

شعر کہتے وقت میں نے اختر کو کبھی گنگناتے نہیں دیکھا لیکن شعر پھولوں کی طرح بے ساختہ ان کے منہ سے جھڑتے تھے عالم مستی میں انہوں نے

بہت کم شعر کہے ہیں وہ کہتے تھے کہ میں شراب کی کیفیت کو شعر کی مصروفیت میں ضائع کرنا نہیں چاہتا۔ وہ بالعموم خمار کی حالت کے بعد شعر کہتے تھے۔
پرائیویٹ صحبتوں میں اپنا کلام خود سنانے میں تامل کیا کرتے تھے اکثر دوستوں کو ارشاد فرماتے کہ وہ ان کا کلام پڑھیں۔ بعض دوست ترنم سے پڑھتے اور وہ اس کو سن کر جھومنے لگتے تھے۔ اختر کا ہر شعر کسی نہ کسی داستان سے وابستہ ہے۔ آخری عمر میں اکثر ایسا دیکھا گیا کہ جب ان کے کسی دوست نے ان کا کوئی خاص شعر خوش الحانی سے پڑھا تو وہ بے چین ہو گئے ایک مرتبہ اصغر نے ان کی ایک مشہور غزل کا یہ شعر ترنم سے پڑھا کہ

> کس کی آنکھوں کا لئے دل پہ اثر جاتے ہیں میکدے ہاتھ بڑھاتے ہیں جدھر جاتے ہیں

تو انہیں کلکتہ کا سفر اور اس کا ایک حسین منظر یاد آگیا اور دیر تک زار و قطار روتے رہے۔
اختر اس عہد کے اہل قلم میں ابوالکلام اور آغا حشر سے متاثر تھے۔ اور آغا حشر بھی اختر سے اس قدر متاثر تھے کہ ایک مرتبہ انہوں نے کہا کہ ۔۔

> کیوں ادا سے کیوں ہے استعد فردوس پرافشاں ہزار دل جنتیں آباد ہیں تخئیل اختر میں

مولانا ابوالکلام نے ۱۹۲۶ء میں جب دوبارہ الہلال جاری کیا تو اس میں اختر کی نظمیں شائع ہوئیں۔ انگریزی ادب میں اختر پر آسکر وائلڈ کا اثر تھا اور گہرا اثر تھا۔ بعض دوستوں کا خیال ہے کہ ان کی زندگی بعد میں اُسی کے روپے میں ڈھلتی گئی۔
رسائل و مجلات کی ادارت میں بھی ان کا خاص مقام تھا۔ ابتدا میں ہمایوں میں انہوں نے ادارت کے فرائض انجام دئے۔ مدتوں تک ماہنامہ سہیلی کی ادارت فرمائی اور آخر میں مولانا تاجور نے جب 'شاہکار' نکالا تو اُس کے ادارتی فرائض میں بھی آپ شریک تھے۔ اور مولانا چراغ حسن حسرت کے 'شیرازہ' کی ترتیب و تزئین میں بھی اُن کا حصہ تھا۔
اختر نے سب سے پہلے ۱۹۲۵ء میں انتخاب کے نام سے ایک رسالہ جاری کیا جس کا نام و معیار کچھ مدت کے بعد بدل کر بہارستان کر دیا۔ بہارستان جب بند ہوا تو ۱۹۲۸ء میں خیالستان جاری کیا لیکن خیالستان بھی زیادہ دیر تک جاری نہ رہ سکا ——— اور اب کاروباری زندگی سے بے تعلقی کی وجہ سے وہ ارادہ کر چکے تھے کہ آئندہ کوئی رسالہ جاری نہیں کریں گے لیکن احباب کا اصرار غالب آیا اور انہوں نے غالباً ۱۹۳۱ء میں رومان کے نام سے رسالہ جاری کر دیا۔ اس موقع پر کہا تھا کہ

> میں کہاں اخذِ متاعِ عالم فانی کہاں طائرِ سدرہ نہیں تنکے اٹھانے کے لئے
> لیکن اہلِ دل کی بزم آرائیوں کو کیا کروں چاہئے ہنگامہ جی کا دل لبھانے کے لئے

جیسا کہ اختر خود کہا کرتے تھے۔ یہ روایت قائم ہو گئی تھی کہ اختر کا کوئی رسالہ زیادہ دیر تک نہیں چل سکتا۔ لیکن اس کے باوجود شوق مشتاقانِ اختر کا یہ عالم تھا کہ جب بھی وہ کوئی نیا رسالہ جاری کرتے فوراً خریداروں کا حلقہ مہیا ہو جاتا تھا۔
اختر کے ان رسالوں سے ایک بڑا فائدہ یہ ہوا کہ ان کے ذریعہ بعد میں اختر کے مجموعہ ہائے کلام صبح بہار۔ اختر ستان۔ لالۂ طور آوارہ۔ شہناز اور شہرود کے لئے ان کی نظموں اور غزلوں کا بہت سا سرمایہ مل گیا۔ ان مجموعوں کے علاوہ نظم میں اختر کی دو کتابیں اور شائع ہوئیں ایک نغمۂ حرم دوسری پھولوں کے گیت۔ نثر میں دھڑکتے دل کے عنوان سے آپ کے مضامین نثر کا ایک مجموعہ چھپا۔ اور اس سے قبل ضحاک اور آئینہ خانے میں نثر کی دو مختصر کتابیں شائع ہوئیں۔ ان چھوٹے رسالوں کے علاوہ آپ نے مجمع البحرین۔ مطلع السعدین اور جامع اللغات کی ترتیب و تدوین میں بھی حصہ لیا اور عوفی کی جوامع الحکایات کا دو جلدوں میں ترجمہ اور خلاصہ لکھا۔
اختر کے ذاتی عادات و خصائل بڑے عجیب و غریب تھے۔ نہ ان کی رات آن کی رات تھی نہ ان کا دن اُن کا دن تھا۔ تمام لیل و نہار مستی۔ بیخودی۔ سرشاری اور پرستش حسن کے لئے وقف تھے۔ ہر چھوٹا بڑا ان کا دوست تھا۔ ہر ایک سے بے تکلفی سے ملتے اور بعض دوستوں

کے نئے نئے پیار کے نام تجویز کرتے اور انہیں ان سے مخاطب کرتے۔ ان کی دوستی کے لئے اخلاص تک ضروری نہ تھا۔ ہر دشمن دوست ان کا دوست
تھا۔ مولینا کے لفظ سے ان کے یہاں اصطلاحاً حسین صورت مراد لی جایا کرتی تھی۔

ابتدائی دور میں نشے کی حالت میں بہت زیادہ بولتے تھے۔ اور اس عالم میں اکثر پتے کی باتیں کہہ جاتے تھے۔ لیکن گاہے بے ربط بولتے تھے۔ سلسلۂ
کلام جلد جلد ایک موضوع سے دوسرے موضوع کی جانب منتقل ہوتا رہتا تھا۔ اور اس سے وہ دل و دماغ میں شگفتگی محسوس کرتے تھے۔ کھاتے بہت کم تھے لیکن
پیتے بہت زیادہ تھے۔ گوشت اور بھنا ہوا گوشت اکثر پسند کرتے تھے لیکن بالعموم صورت یہ ہوتی کہ چند لقمے لے کر چھوڑ دیتے اور اس کے بعد خواہش
یہ ہوتی کہ کچھ دیر تک دسترخوان سامنے کھلا رکھا رہے اور وہ اُسے دیکھتے رہیں۔

میں نے انہیں بہت کم پڑھتے دیکھا ہے لیکن حیرت ہے کہ جب وہ کسی موضوع پر گفتگو کرتے تو محسوس ہوتا تھا کہ ایک بڑا پڑھا لکھا اور بہت
مطالعہ کرنے والا انسان مصروفِ کلام ہے۔ فلیمنگ روڈ کے مشہور درمیانی منزل والے کمرے میں اُن کی محفل ہوا کرتی تھی اس کے بعد عرب ہوٹل کا درجہ
تھا جہاں وہ دوستوں میں بیٹھے محفل کو باغ و بہار بنائے رکھتے تھے۔

انہوں نے گھر اور گھر کے حالات سے کبھی تعلق نہیں رکھا۔ والد صاحب ناراض تھے اور اس لئے والد کے ڈر سے والدہ ان سے چھپ
کر ملتیں اور سمجھاتیں لیکن معاملہ سمجھانے بجھانے سے حل نہیں ہوتا تھا۔ انہوں نے خود بیوی کی ضروریاتِ معیشت کی جانب کبھی توجہ نہیں کی۔ حافظ صاحب
مرحوم ان کا اپنی بیٹی کی طرح خیال رکھتے تھے۔ اور اختر کے بچوں خورشید اور بہبود کو بچوں سے زیادہ عزیز رکھتے تھے۔ لیکن آخر میں اختر مرنے سے
پہلے حبیب لاہور میں میرے یہاں مقیم تھے اکثر بیوی بچوں کو یاد کرتے اور کبھی کبھی یاد کرتے کرتے رو پڑتے۔ ایک دن بیوی کی وفا اور اپنی بے وفائیوں
کو اس قدر یاد کیا کہ روتے روتے ہچکی بندھ گئی۔ مرنے سے پہلے اپنی بیگم کے متعلق ایک سانیٹ لکھا جس کا عنوان پیمانِ وفا تھا۔ اس میں ایک
جگہ لکھا کہ ؎

ہر ایک ذرّہ میں ڈھونڈے گی یہ جبیں تجھ کو ‌ ‌ ‌ بُتِ کعبہ نہ پائے گی جب کہیں تجھ کو

عام لوگوں کے ساتھ ان کا سلوک نہایت مشفقانہ بلکہ عزیزانہ ہوتا تھا۔ نائی۔ پنواڑی اور تانگہ والے اکثر ان کے یار بنے رہتے تھے بعض دفعہ
ایک تانگہ چار چار دن تک ان کی اردلی میں رہتا تھا۔ اور چار دن کے بعد کوچوان کو اکٹھے پیسے دئے جاتے تھے۔ ایک دن دہلی کے ریڈیو سٹیشن
پر صبح کے وقت ایک دوست کو ملنے گئے۔ شام تک تانگہ باہر کھڑا رہا۔ شام کو رخصت کرتے وقت دوست نے پوچھا کہ بھلا یہ دن بھر تانگے
کو کیوں کھڑا رکھا۔ فرمانے لگے کوچوان غریب اور شریف آدمی ہے میں نے سوچا اس کا بھلا ہو جائے۔

محلہ کا پنواڑی ان کا دوست تھا جس کا بل مہینے مہینے بھر کے بعد ادا ہوا کرتا تھا۔ پان بے حد کھاتے تھے خصوصاً ان دنوں میں جبکہ کچھ
وقت کے لئے شراب ترک کردی جاتی تھی۔ پان کے ساتھ چونہ علیحدہ سے منگوایا جایا کرتا تھا۔ سگرٹ کا دَور بھی بڑے زور سے جاری رہتا تھا۔
خصوصاً ان دنوں میں جبکہ شراب چھوڑ دی جاتی تھی۔ عموماً سگرٹ سے سگرٹ سلگاتے تھے اور اکثر اوقات دوست سگرٹ سلگا کر دیتے تھے کثرت
سیگار نوشی کی وجہ سے اُن کی وہ انگلیاں زرد پڑ گئی تھیں جن سے سیگار اور سگرٹ پکڑتے تھے۔ ایک دن سگرٹ کی تعریف میں ایک جدید ایرانی
شاعر کا یہ شعر سنایا۔ ؎

سیگار بے تقلب و ناز پری وشاں ‌ ‌ ‌ ایں ہر دو دلکشا کشش و دوراں کشیدنیست

دو تین مرتبہ ایسا اتفاق ہوا کہ سیگرٹ ہاتھوں ہی میں لئے سو گئے یا نشہ میں غافل ہو گئے۔ فلیمنگ روڈ والے کمرے کے بستر سے دھواں
اُٹھنے لگا۔ فضل ملازم چلایا۔ والدہ محترمہ آئیں اور انہوں نے اختر کو بستر سے جدا کیا۔ ابتدائی دور میں اکثر عبداللہ پسند کرتے تھے۔
میں نے ان کو پان سگرٹ اور شراب کے سوائے کوئی چیز بازار سے خریدتے نہیں دیکھا۔ لباس اور سامان کی ضرورت کی تمام چیزیں ان

کے لئے ان کی والدہ محترمہ خرید کر منگواتی تھیں۔

آخر عمر میں سر کے آگے کے بال کچھ سفید ہو گئے تھے۔ کوشش کرتے تھے کہ اس سفیدی کو چھپائیں اور اس مقصد کے لئے عموماً ہائیڈروجن پیراکسائڈ منگوا کر لگایا کرتے تھے۔

وہ بے حد ملنسار اور خلیق تھے لیکن کبھی کبھی ذرا خشک نظر آتے تھے مگر جب کھلتے اور خصوصاً بوقت مے پرستی کھلتے تو طبیعت بے حد شگفتہ بن جاتی تھی۔ عالم کیف میں سب کچھ ہوتا تھا لیکن ہوش کی حالت میں میں نے انہیں بے حد متین دیکھا۔ چہرہ عموماً متبسم رہتا تھا اور ہوش کے عالم میں کبھی قہقہہ نہیں لگاتے تھے۔ جن لوگوں سے ملنا پسند نہ تھا ان سے ملاقات کے وقت بالعموم خاموش سے بیٹھے رہتے تھے۔

سینما سے انہیں کوئی خاص لگاؤ نہ تھا۔ پہلے پہل جب متکلم فلمیں لاہور میں آئیں تو میں تین چار بار انہیں لے گیا لیکن میں نے دیکھا کہ وہ تصویروں کی جگہ حسین صورتوں کی جانب زیادہ متوجہ رہے جو سینما ہال میں ادھر ادھر رونق افروز تھیں۔ البتہ ہندوستان کے مشہور رقاص شنکر کی فلم انہیں پسند آئی اور خصوصاً وہ منظر انہیں زیادہ پسند آیا جس میں پجارنیں مندر کے باہر دروازہ پر شمعیں ہاتھ میں لئے کمال عقیدت سے رقاصانہ وارفتگی کا مظاہرہ کر رہی تھیں —— باایں ہمہ لطف یہ ہے کہ فلموں والے آتے اور ان سے اپنی فلموں کے لئے منظوم و منثور مکالمے لکھوا کر لے جاتے تھے۔ شہر دو میں ان کا لیلیٰ و مجنوں والا مکالمہ اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔

اختر بہت کم بیمار ہوتے تھے اور ان کی بیماری بالعموم شراب کے بعد کی خماری کیفیت کا نتیجہ ہوتی تھی۔ جس نے آخر میں ان کے جگر اور عصبی نظام کو درہم برہم کر دیا تھا —— دو تین مرتبہ انہوں نے مجھے اپنے والد مرحوم کے علاج کے سلسلے میں یاد فرمایا جنہیں گاہے گاہے ضیق النفس کی شکایت رہتی تھی۔

ایک مرتبہ اختر نے ایک پردہ نشین ضعیفہ مہمان کے علاج کے لئے مجھے گھر بلوایا۔ گرمی کا موسم تھا۔ تنگ کمرہ اور مریضہ صاحب فراش لحاف اوڑھے پسینے میں شرابور پڑی تھیں ان کا یہ حال دیکھ کر میرے لئے مشکل ہو رہا تھا کہ مریضہ کو حال بیان کرنے کی زحمت دوں۔ معلوم ہوا کہ عجلت میں اختر نے انہیں پردے کے لئے معمولی چادر کی جگہ لحاف دے دیا تھا۔

اختر مال و زر کے معاملے میں قطعاً بے نیاز انسان تھے ان کے نزدیک سونے چاندی کی ٹکلیوں اور خزف ریزوں کے درمیان کوئی امتیاز نہ تھا۔

وہ طبعاً نہایت بلند سیرت اور نیک طینت شخص تھے۔ اور بادہ کشی کی عادت سے قطع نظر اگر دیکھا جائے تو وہ اتنے بلند مرتبہ انسان تھے کہ انسانی محاسن و اخلاق کی تمام خوبیاں ان میں جمع ہو گئی تھیں وہ نہایت کریم النفس۔ نیک محضر، خلیق اور دوست نواز دوست تھے —— عطا پاش اور خطا پوش —— اور اس قدر غیور کہ انہوں نے اپنی زندگی میں حسن کی سرکار کے سوا کبھی کسی امیر و وزیر کی قصیدہ خوانی نہیں کی۔ وہ کہتے ہیں کہ

ے کسی مغرور کے آگے ہمارا سر نہیں جھکتا — فقیری میں بھی اختر غیرتِ شاہانہ رکھتے ہیں

یہ سچ ہے کہ بسا اوقات شراب کے لئے وہ عالم بیخودی میں ضرور مجبور ہو جاتے تھے۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ ہوش کے عالم میں تو انہوں نے خدا کے سوا کبھی کسی سے کچھ طلب نہیں کیا۔

وہ ایک مرد قلندر اور فقیر خاک نشین تھے اور ان کے دل میں مہربانی کے سوا کسی کے لئے کینہ و حسد کی جگہ ہی نہ تھی۔ پھر سیر چشمی و مال و منال دنیا سے بے نیازی کا یہ عالم تھا کہ ایک مرتبہ کسی پبلشر نے لاہور سے ٹرنک ان کی خدمت میں سات سو روپے بھیجے۔ وہ جب ان کو ڈاک خانہ سے لے کر گھر چلے تو راستے میں ضرورت مندوں اور دوستوں کو بانٹتے آئے تا آنکہ جب وہ گھر پہنچے تو صرف

پانچ روپے کا ایک نوٹ ان کے ہاتھ میں تھا۔

اسی ضمن میں ایک لطیفہ یہ بھی سنیئے کہ ایک مرتبہ اختر ایک سرکاری ادارے سے اپنے ڈیڑھ سو روپے لینے تشریف لے گئے لیکن وہاں دقت یہ پیش آئی کہ ان کو کئی جگہ کلرکوں کے پاس جا کر کئی رجسٹروں میں دستخط کرنے پڑے۔ اب انہوں نے دو جگہ تو یہ تکلیف گوارا کر لی۔ لیکن جب یہ اُن کو تیسری جگہ ایک کلرک کے پاس جا کر دستخط کرانے کے لئے کہا گیا تو یہ کہہ کر خالی ہاتھ گھر واپس آ گئے کہ بھائی ہم سے یہ بار بار دستخط نہیں ہوتے۔

اختر بے حد ہمدردِ بنی نوع انسان تھے اور جہاں کسی کو تکلیف میں دیکھا تلملا اٹھتے اور اکثر رو پڑتے تھے۔ اور عورت ذات کی مصیبت تو وہ کبھی دیکھ ہی نہ سکتے تھے۔ ایک مرتبہ وہ انارکلی میں تانگے میں سوار تھے کہ ایک عورت بھیک مانگنے آ کھڑی ہوئی۔ مجھ سے فرمانے لگے کہ جو کچھ ہے اسے فوراً دے دو۔ میں عورت کی توہین برداشت نہیں کر سکتا۔"

شرم و حیا کا یہ عالم تھا کہ چند ہم پیالہ و ہم نوالہ لوگوں کے سوائے جب کسی کو آتے دیکھتے شراب کی بوتل کو ادھر ادھر چھپانے کی کوشش کرتے اور رقیق القلب اس قدر تھے کہ ایک مرتبہ راستے میں سڑک پر چند مرجھائی ہوئی کلیاں پڑی نظر آئیں وہیں بیٹھ کر دیر تک انہیں دیکھتے اور کہتے رہے کہ ع

مجھے تو کچھ انہی بیمار کلیوں سے محبت ہے

پس حقیقت یہ ہے کہ اختر اپنے ادب اور آرٹ کی طرح اخلاق۔ انسانیت اور ذاتی و نسبی شرافت کے اعتبار سے بھی بہت بڑے انسان تھے —— ایک اتنے بڑے انسان جو کہیں صدیوں کے بعد اس خرابہ زار میں آتے ہیں۔ ع

گردوں نیا ورد چو تو اختر بصد قراں

اختر نے اپنے مخالف معاصرین میں سے کبھی کسی سے انتقام لینے کی کوشش نہیں کی۔ جس نے آزار دیا اُسے صبر سے سہہ لیا۔ میں نے انہیں دنیاوی امور میں کبھی کسی سے اُلجھتے نہیں دیکھا۔ وہ بہت کم ناراض ہوتے اور اگر کسی سے ناراض ہوتے تو صرف سلام و کلام ترک کر دیتے اور بس —— دشمنوں کے معاملے میں ان کا رویہ یہ تھا کہ ایک مرتبہ ایک شخص نے ایک رسالے کے سلسلے میں انہیں شدید نقصان پہنچایا۔ خیال تھا کہ وہ اب اس سے کبھی نہیں ملیں گے۔ لیکن ایک دن جب وہ ان کے سامنے سے گزرا تو اُسے لپٹ گئے اور اُلٹی اپنی طرف سے معافی مانگنے لگے۔

اختر اپنے دوستوں کے معاملے میں بے حد فیاض، سخی اور سیر چشم واقع ہوئے تھے ایک مرتبہ جس سے تعلق ہو گیا اُسے ساری عمر نبھایا۔ دوستوں کے ساتھ تمام عمر وہ بھائیوں کی طرح گھل مل کر رہے مثال کے طور پر اس ضمن میں میرے ساتھ ان کا سلوک یہ تھا کہ اختر مجھے اپنا بڑا بھائی سمجھتے تھے اور اختر صاحب کہنے پر ناراض ہو جاتے تھے۔ کہتے تھے مجھے اختر کہا کیجئے ساتھ ہی انہیں اس قدر پاس خاطر تھا کہ جب وہ شغل خاص میں مصروف ہوتے اور میری آمد کی آہٹ سن لیتے تو بوتل کو جسے وہ دختر گردن دراز کہا کرتے تھے ادھر اُدھر چھپانے کی کوشش فرماتے تھے —— باایں ہمہ لطف یہ تھا کہ مجھ سے بلا تکلف اپنا ہر دکھ درد بیان ہوتا تھا اور مجھے اپنے عشق و عاشقی کے دلچسپ فسانے سُنائے جاتے تھے۔

۱۹۳۴ء تک میں چوک چونہ منڈی میں تھا اس کے بعد میں اپنا مطب مستی دروازہ کے باہر اپنے مکان نیر منزل میں لے آیا۔ یہاں بھی اختر حسبِ معمول باقاعدہ تشریف لاتے اور بالعموم شام کو روز پیچھے تشریف لاتے۔ ابتدائی ایام میں ان کا معمول یہ تھا کہ شام کو تانگے میں ساتھ لیا اور لارنس یا منٹو پارک کی طرف چل دیئے۔ یہاں آدھی رات تک بیٹھے باتیں کرتے رہتے تھے۔ باتوں کے لئے کوئی موضوع مخصوص نہ تھا۔ بالعموم شعر و ادب موضوعِ گفتگو ہوتا۔ بسا اوقات دوسرے احباب کو بھی ساتھ لے لیا جاتا تھا۔

جیسا کہ میں نے ابھی ذکر کیا اختر کا معمول یہ تھا کہ بالعموم شام کو تشریف لاتے اور کوشش کرتے کہ آدھی رات گھر تشریف لے جائیں لیکن جب گھر سے ناراض ہوتے تو بالعموم یہاں ان کا مستقل قیام رہتا تھا۔ اور اس امر کا خیال رکھا جاتا تھا کہ بلا اطلاع کہیں شب گزاری نہ ہو۔ ایک دن مجھے اطلاع دیئے بغیر یات کو سلیم کے یہاں موڈل ٹاؤن چلے گئے اور اس خیال سے کہ مجھے زحمت انتظار نہ ہو یہ منظوم خط لکھ کر مجھے ایک دوست کے

لکھ کر ارسال فرمایا:۔

برادرِ معظم و محترم دامت معالیکم

سلیم نے مجھے گھیر لیا ہے آج کی رات
کسی بہانے سے بہلا لیا ہے آج کی رات

بہانہ جو بھی ہے بے حد حسین ہے لیکن
نہ جانئے مجھے بہکا لیا ہے آج کی رات

ہے واقعہ فقط اتنا کہ اتفاقاً آج
نگاہِ حسن نے اپنا لیا ہے آج کی رات

کسی حسینہ کا ہے انتظار دونوں کو
کسی حسینہ نے بہکا لیا ہے آج کی رات

معاف کیجیے مری غیر حاضری پھر آج
کہ ایک حور نے پھسلا لیا ہے آج کی رات

کچھ ابھی دل کی لگی ہم نے اُٹھا رکھی ہے —————— اختر

ایک دن رات کو ایک بجے کے قریب کہیں سے تانگے میں تشریف لائے اور جب تانگے سے اُترے تو کوچوان سے عالمِ مستی میں کچھ سخت کلامی ہو گئی۔ صبح خواب سے اُٹھے تو مجھ سے پوچھنے لگے کہ رات میں نے ایک تانگے والے کو کچھ سب و شتم کیا تھا میری آواز بھابی تک تو نہیں پہنچ گئی تھی۔ یہ تھا اُن کی شرم مروت اور لحاظ کا عالم جو اُن کی ذاتی و نسبی شرافت کا نتیجہ تھا۔

دوستوں کی تقریبات مسرت میں وہ جس انداز میں شرکت فرماتے تھے اس سلسلے میں یہ مثال کافی ہے کہ میرے گھر کے بچوں کے ساتھ اُنہیں گہرا لگاؤ تھا۔ اکثر جب گھر آتے تو بچوں کے ساتھ بچوں کی طرح کھیلتے تھے۔ اور ان کی تقریبات میں گھر کے ممبروں کی طرح شریک ہوتے تھے۔ میرے بیٹے سکندر صولت کی سالگرہ ہوئی تو جھومتے ہوئے آئے اور یہ نظم لکھ کر سب کو سنائی۔

سنا رہی ہے نوید بہار سالگرہ
مسرتوں کی ہے پروردگار سالگرہ

زبسکہ سالگرہ ہے میاں سکندر کی
بجا ہے کہئے سکندر وقار سالگرہ

سما رہی ہے نگاہوں میں بن کے عالم کیف
بسا رہی دلوں میں بہار سالگرہ

دیارِ قدس سے آئی ہے حور کی صورت
مسرتیں لئے بہر نثار سالگرہ

خوشی کے پھول برسنے لگے فضاؤں سے
لٹا رہی ہے بہشت و بہار سالگرہ

خوشی سے پھولے سماتے نہیں ہیں غنچہ و گل
بڑھا رہی ہے مبارک لبوں پہ سالگرہ

اسی فروغ سے تا حشر بار بار آئے
دعائیں کرتی ہے یہ بار بار سالگرہ

دعا ہے عمر سکندر کا رشتہ محکم
اسی بہار سے دیکھے ہزار سالگرہ

خوشی سے رقص کریں مل کے ساقی و اختر
بلا رہی ہے مئے خوشگوار سالگرہ

ایک مرتبہ میری اہلیہ گھر سے ناراض ہو کر کچھ مدت کے لئے بھوپال چلی گئیں۔ اختر ہمارے گھر کی ناراضگی کی اطلاعات سے بہت مغموم رہتے تھے ——— لیکن کچھ دنوں کے بعد جب میں اپنی بچی رخسانہ اور اس کی والدہ کو بھوپال جا کر گھر واپس لے آیا تو بہت خوش ہوئے اور اس وقت انہوں نے یہ اشعار کہے۔

دل کا سکون لئے ہوئے رخسانہ آ گئی
نیّر کدہ میں رونق کاشانہ آ گئی

بھوپال کی خبر ہے کہ بھاوج بھی آ گئیں
بھائی کے گھر میں عشرتِ جانانہ آ گئی

اپنے پرائے آج محبت سے خوش ہوئے — ہر ایک کو گماں ہے کہ سلطانہ آگئی
بھائی گئے تھے لینے فقیرانہ جس کو وہ — لاہور میں بہ شوکت شاہانہ آگئی
آنے کا اُن کے سب کو ہوا اس لیے خیال — وہ جانِ کعبہ رونقِ صنم خانہ آگئی
نیر کے دل کو آج نہ ہو کس طرح خوشی — وہ رشکِ صد پری و پریخانہ آگئی
مانا خلوص میں ہوئی جو کچھ ہوئی کمی — بزمِ خلوص کی وہی پروانہ آگئی

ہر چند تھی خفا مگر اظہارِ شوق پر
بھاوج ہماری اختر دیوانہ آگئی

ان مثالوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ اختر کا اپنے دوستوں اور اُن کے گھروں کی غم و شادی کے ساتھ کس طرح کا اور کس قدر رابطہ رہا کرتا تھا۔

اُن کے والد حافظ محمود شیرانی مرحوم اختر کو ہمیشہ اختر کی جگہ ' داؤد ' کے نام سے پکارا کرتے تھے۔ اختر ان کے اکلوتے فرزند تھے اور ایسی صورت میں قدرتی طور پر حافظ صاحب مرحوم کو اختر کے ساتھ جو محبت ہو سکتی تھی ظاہر ہے۔ وہ اوّل اوّل اختر سے بہت محبت کرتے تھے۔ ان کی علمی۔ ادبی اور شعری صلاحیتوں کو دیکھتے اور خوش ہوتے۔ وہ اختر کے ادبی رسائل میں اپنے مضامین اشاعت کے لئے دیتے۔ لغت اور شعر کے بارے میں ان کو اختر کی صلاحیتوں کا اعتراف تھا۔ چنانچہ ان دنوں میں بھی جبکہ اختر سے ناراضگی تھی میں نے دیکھا کہ فضل ملازم بالاخانے سے کوئی چٹ لاتا جس میں کسی لغت یا تاریخی مسئلے میں اختر کی رائے معلوم کی جاتی تھی۔

اِدھر اختر کی حالت یہ تھی کہ ان کے بال بچّوں کے کفیل صرف حافظ صاحب مرحوم تھے اور اختر دنیا و مافیہا سے بے نیاز لا اُبالی کی زندگی بسر کرتے تھے۔ اختر سماج کے باغی تھے اور اُنہوں نے کبھی اپنی زندگی اور ماحول سے سمجھوتہ کرنے کی کوشش نہیں کی۔ وہ صرف شعر و نغمہ کی صدا تھے۔ انہوں نے کبھی کوئی کاروبار نہیں کھولا۔ کبھی کوئی مکتبہ قائم نہیں کیا۔ اُنہوں نے کئی ادبی ماہنامے جاری کئے لیکن وہ کبھی زیادہ دیر تک نہیں چل سکے۔ کیونکہ آمد و خرچ پر کبھی کنٹرول نہیں ہوا۔ ایک مرتبہ " پھولوں کے گیت " مجموعۂ نظم سے جو آپ نے بچّوں کے لئے لکھا تھا غالباً دو سو روپے ملے۔ یہ روپے لے کر وہ لکھنؤ جا رہے تھے کہ راستے میں امرتسر کے کچھ نوجوانوں کو پتہ چلا کہ اختر کے پاس روپے ہیں۔ انہوں نے ان کو سٹیشن پر گاڑی سے اُتار لیا اُنہوں نے یہ روپے قرض لئے اور دو چار دن میں عیش و عشرت میں اڑا دیئے۔ لیکن اب اختر کی سادگی ملاحظہ فرمایئے کہ وہ بیٹھے شیراز ہوٹل میں روپے کی واپسی کا انتظار کرتے رہے۔ مختصر یہ کہ روپے کی صورت میں کوئی چیز بھی ان کے پاس نہیں رہ سکتی تھی۔ آخر میں ان کے آخری مجموعہ ہائے کلام سے جو کچھ روپے وصول ہوئے بمشکل تمام ان کا عشرِ عشیر حصّہ ان کے بچّوں تک پہنچایا جا سکا۔ دستار اُن کے پاس نہ تھی ایک کوٹ کبھی کبھی رہن رکھا دیکھا جاتا تھا۔

ابتداء میں حافظ محمود شیرانی مرحوم نے کئی بار کوشش کی کہ اختر کو کسی کام میں لگائیں لیکن اختر ہمیشہ اس راہ سے دامن بچاتے رہے۔ حافظ صاحب مرحوم جب اسلامیہ کالج لاہور کی پروفیسری چھوڑ کر اورینٹل کالج میں تشریف لے گئے تو اختر سے کہا گیا کہ اسلامیہ کالج میں اپنے والد کی جگہ قبول کر لیں لیکن آپ نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ لڑکوں کا پڑھانا میرے بس کا روگ نہیں۔ پھر ۱۹۳۵ء میں اختر کو دارالترجمہ حیدر آباد (دکن) میں ایک عہدہ پیش کیا گیا لیکن آپ نے وہاں جانے سے بھی انکار کر دیا۔ درحقیقت وہ کسی قسم کی پابندی اپنے ذمہ نہیں لینا چاہتے تھے۔

رفتہ رفتہ اختر کی دن رات کی خلوت گزینی یا کوچہ گردی۔ گھر اور گھر کی زندگی سے بیزاری۔ دنیا اور دنیا کی ہر قسم کی زندگی کی حدود و قیود سے بے نیازی۔ ہر وقت کی شعر نوازی اور بے وقت عیش کوشی۔ رندی و مستی۔ اقارب اور اعزہ سے لاتعلقی۔ ایک خاص قسم کے آوارہ

دیجھنان اور سوامر بازاروں کی طرح کی زندگی اور ایک خاص طرز کے دوستوں سے سروکار ——— یہ سب چیزیں کچھ ایسی تھیں جنہوں نے اختر کے والد محترم کے دل میں اُن کے خلاف سخت غم و غصہ اور رنج و غیرت کے احساسات پیدا کر دئیے تھے۔

ساتھ ہی بعض مخصوص قسم کے احباب گاہے گاہے حافظ صاحب مرحوم کو مخصوص انداز میں ان حالات سے آگاہ فرماتے رہتے تھے۔

جیسا کہ میں نے ذکر کیا اختر اپنے یگانۂ روزگار باپ پروفیسر محمود شیرانی مرحوم کے اکلوتے فرزند تھے اور قدرتی طور پر اُن کے والد محترم کی یہ دلی خواہش تھی کہ ان کا فرزند بھی سوسائٹی اور ملک میں عزت اور علم و ادب میں امتیازی شہرت حاصل کرے ——— لیکن اختر کی اس زندگی کی وجہ سے جو انہوں نے اختیار کر رکھی تھی اختر اور ان کے والد محترم کے درمیان رفتہ رفتہ افتراق و شقاق کی ایک بڑی خلیج حائل ہو گئی تھی اور اس لئے اختر کی گھر کی زندگی بے حد تلخ ہو گئی تھی۔ اور صورت یہ ہو گئی تھی کہ گھر ان سے تنگ تھا اور وہ گھر سے بیزار ——— بارہا ایسا ہوا کہ وہ گھر بار چھوڑ کر دوستوں کے یہاں اقامت گزیں ہو گئے اور اس مقصد کے لئے اکثر میرے غربت کدہ کو شرفِ انتخاب بخشا۔ ——— لیکن پھر کسی نے گھر والوں سے صلح کرا دی اور وہ گھر واپس چلے گئے۔

اکثر ان کا معمول یہ تھا کہ رات گئے گھر لوٹتے تھے اور اس اثنا میں بارہا ایسا ہوا کہ ان کے والد محترم نے غصہ میں آ کر مکان کے اندر زینے کے دروازے کو قفل لگا دیا اختر آتے اور اس دروازے کے باہر سیڑھیوں پر بیٹھے رہتے۔ ماں کی ممتا کے زیر اثر ان کی والدۂ محترمہ جب یہ منظر دیکھتیں تو کمرے کے اندر کواڑ کے پاس اپنے اکلوتے بیٹے کے قریب آ کر بیٹھ جاتیں۔ دونوں رات بھر بیٹھے باتیں کرتے رہتے اور اس طرح اکثر سردیوں کی ساری رات آنکھوں میں گزر جاتی تا آنکہ صبح ہوتی اور دروازہ کھلتا

اس سلسلے میں ایک قابل ذکر لطیفہ یہ ہے کہ وہ اپنے گھر پر رہتے یا کہیں اور ——— ان کی یہ عادت تھی کہ جہاں بھی رہتے خواہ دن بھر کہیں ہوں رات کو کسی نہ کسی وقت اپنے ٹھکانے پر ضرور پہنچتے تھے۔ یعنی مست و لایعقل رہنے کے باوجود اس قدر باخبر اور محتاط ضرور تھے کہ رات کو اپنا ٹھکانا نہیں بھولتے تھے۔ چنانچہ بارہا ایسا ہوا کہ وہ میرے مکان پر قیام کے زمانے میں دن بھر غائب رہتے اور رات کو دو بجے تشریف لاتے تھے۔

ان تمام امور کے باوجود اختر اپنے والد محترم کا بے حد احترام کرتے تھے۔ وہ تمام تعزیرات سہتے اور کبھی حرف شکایت زبان پر نہ لاتے۔ میں نے دیکھا کہ جب بھی وہ اپنے والد محترم کا نام لیتے بڑے احترام سے لیتے اور اکثر ان کی خوبیوں اور خصوصیتوں کو ذکر کرتے۔ عام لوگوں کو اس سلسلے میں اختر کی محبت کا اندازہ اُس وقت ہوا جب ٹونک میں اُن کا انتقال ہوا اور لوگ جنازہ لے کر چلنے لگے تو اس رند خرابات نے راستے میں جنازہ کو روک کر پٹی پکڑ کر کچھ اس انداز میں صدائے نالہ و شیون بلند کی کہ شہر کا ہر چھوٹا بڑا اس منظر کو دیکھ کر زار و قطار رو رہا تھا۔

اختر کے ساتھ شراب کا تصور لازم و ملزوم کی صورت میں سامنے آتا ہے میں نے ذکر کیا ہے کہ اختر سے میری ملاقات ۱۹۲۶ء میں ہوئی ہے اس وقت اختر شراب کے خوگر ہو چکے تھے اُن کی زبانی معلوم ہوا کہ لاہور پہنچنے کے بعد اُنہیں ان کے مخصوص قسم کے دوستوں نے شراب کے ذائقہ سے آشنا کرایا بعد میں جب علامہ تاجور مرحوم نے لاہور میں مرکز اُردو حلقۂ ارباب علم و ادب کے نام سے قائم کیا اور یہاں ہند کے دیگر مشاہیر شعر و ادب کے ساتھ ساتھ حضرت جگر مراد آبادی بھی کچھ مدت کے لئے قیام پذیر ہوئے تو حضرت اختر نے اس سلسلے میں اس پیرِ مغاں کی بیعت کی۔ اختر کا بیان ہے کہ وہ شعر میں علامہ تاجور کا شاگرد تھا اور شراب میں حضرت جگر کا ابتدائی زمانہ میں انہوں نے اپنا کلام علامہ تاجور کو دکھلایا۔ اور اس کے بعد وہ اپنے مخصوص رنگ میں ڈھل گئے۔

شراب میں یہ جگر کی تقلید کا مسئلہ اس حد تک خیر متواتر کی صورت اختیار کر چکا تھا کہ ایک مرتبہ جب اختر طبی مشورہ کے لئے حکیم نیر محمد

چشتی مرحوم کے پاس گئے تو انہوں نے نبض دیکھ کر برجستہ نقش فرمایا کہ "جگر کے کباب کھاؤ"۔
رفتہ رفتہ اختر اس حد تک شراب میں بہہ گئے تھے کہ ان کے جسم میں پانی کی جگہ شراب رہنے لگی۔ شراب ہر وقت اور ہر لحظہ شراب
——— آخر میں شراب کی بدولت ان کا گوشت ہڈیوں سے جدا ہو گیا۔ جگر جل کے کباب ہو گیا اور شراب نے ان کی زندگی کے بخیے ادھیڑ دیئے۔
اختر کی بادہ کشی عام شرابیوں کی طرح کی نہ تھی ان کی عادت یہ تھی کہ جب وہ آغاز کرتے تو بے تحاشا پیتے۔ اکثر سودیشی پیتے اور آخر میں صورت یہ تھی کہ پانی ملانا شرک سمجھتے تھے۔ جب دور شروع ہوتا تو عموماً دو دو ہفتے جاری رہتا اور لطف یہ تھا کہ اس مدت میں غذا قطعاً ترک کر دی جاتی تھی۔ اس کے بعد خمار اور اس کے ساتھ قے اور ابکائیوں اور بے چینی اور گھبراہٹ کا زمانہ آتا۔ اب دو چار دن کے لئے ناغہ کرتے اور پھر دور لازم آ جاتا۔

جہاں تک پند و نصیحت کا تعلق ہے بہت سے دوستوں نے جو خود تو منکر تھے لیکن ان کے ساتھ "ہم رنگ مستان زلیقی" کے عادی تھے انہیں شراب سے باز رکھنے کی کوشش کی لیکن بیکار ——— بارہا مجھ سے نہ پینے کا وعدہ کر کے جاتے لیکن اس کے باوجود میں دیکھتا کہ پئے ہوتے اور جھومتے ہوئے تشریف لا رہے ہیں۔ پوچھتا کہ "حضرت یہ کیا ہوا" فرماتے کہ "اس دفعہ آخری بار حماقت ہو گئی" کئی بار سخت کوشش کی کہ انہیں مجبور کر کے شراب سے باز رکھا جائے لیکن جب کبھی دو چار دن کا ناغہ ہوا اس اثناء میں کہیں نہ کہیں سے کوئی ہم مشرب ٹپک پڑا۔ جو ان کی توبہ کے ٹکڑوں کو چند روز بھی سلامت نہیں رہنے دیتا تھا۔

شراب کے بارے میں وہ اپنے خاص دوستوں کی جیبوں کو اپنی جیب سمجھتے تھے اور حسن طلب کچھ ایسا لطیف اور شاعرانہ ہوتا تھا کہ بغیر فرمائش پورا کئے رہا نہیں رہا جاتا تھا۔ ایک مرتبہ سرما کا مہینہ تھا اور میں باہر دھوپ میں بیٹھا مطب کر رہا تھا۔ وہ مشہور بلانوش شاعر دوستوں کو ہمراہ لے کر آ گئے۔

ایک صاحب نے فرمایا ع " دھوپ میں اپنے مریضوں کو دوا دیتے ہیں"۔
دوسرے صاحب بولے ع " اور شاعر کوئی آئے تو پلا دیتے ہیں"۔
اور آپ نے فرمایا ع " اہلِ دل ایسے مسیحا کو دعا دیتے ہیں"

اس کے بعد ان شاعروں کے سامنے فرمائش شروع کی اور بوتل کے پیسے لے کر چلتے ہوئے۔ شراب کے لئے رقم طلب کر کے اکثر یہ فرمایا جاتا تھا کہ بس آخری موقع ہے اس کے بعد اس کو منہ نہیں لگاؤں گا۔ لیکن یہ کافر ہمیشہ منہ سے لگی رہی۔

شراب پی کر شرابی دوستوں کو ساتھ تانگہ میں لے کر عموماً باہر نکلتے اور دوستوں کے یہاں پہنچتے۔ ملک میں سودیشی کا چرچا تھا۔ ٹھرا پینے کی عادت کی جانب اشارہ کر کے فرماتے کہ میں سودیشی کی تحریک کا زبردست حامی ہوں۔ شرابیوں اور شرابخانہ کے کاروبار سے جو آپ کو لگاؤ تھا اس سلسلے میں ایک لطیفہ یہ ہے کہ انارکلی کے چوک کے دائیں طرف باہر ٹھیکے کی دکان پر ایک مسلمان بادہ فروش ترکی ٹوپی اوڑھے شراب بیچ رہا تھا۔ جب اس کا سر ہلتا اور ٹوپی کا پھندنا جھولتا آپ قہقہے لگاتے اور جھومتے۔

ارباب غرض مختلف کاموں کے سلسلے میں اختر کے پاس آتے تھے۔ کئی لوگ سفارشی خطوط لکھواتے۔ کئی انہیں اپنے کاموں میں سفارش کے لئے ساتھ لے جاتے۔ کئی ان سے اپنے اخبارات و رسائل کے لئے نظمیں لینے کے لئے آتے۔ اور کئی دوست ان کے پاس آ کر اپنی فلموں کے لئے ان سے مکالمات لکھواتے۔ اختر اس طرح کے اکثر کام بخندہ پیشانی مفت انجام دیتے تھے ——— اور لگتا ہے ان کاموں کی قیمت دیسی شراب کی صرف ایک بوتل ہوا کرتی تھی۔ جو اس زمانے میں ساڑھے ساٹھ روپے میں آ تی تھی۔

اختر کی شاعری بڑی حد تک سلمیٰ کے تصور کے گرد گھومتی ہے۔ بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ اختر کی شاعری سلمیٰ کے عشق کی رنگین داستان ہے

اس لئے ضروری ہوا کہ چند کلمات یہاں سلمیٰ کے متعلق بھی عرض کئے جائیں۔

جہاں تک لفظِ سلمیٰ کا تعلق ہے یہ لفظ فارسی اور عربی ادب میں محبوبہ کے لئے استعمال ہوا ہے۔ حافظ کہتا ہے۔

ؔ قاصدِ حضرتِ سلمیٰ کہ سلامت بادا ۔۔۔ چہ شود گر بسلامے دلِ ما شاد کند

ؔ منزلِ سلمیٰ کہ بادش ہر دم از ما صد سلام ۔۔۔ بر صدائے ساربان بینی و آہنگ جرس

ؔ ما بسلمیٰ و من بذی سلم ۔۔۔ این جیراننا وکیف الحال

ؔ امن انکرتنی عن حبِ سلمیٰ ۔۔۔ غریق العشق فی بحر الودادی

اور جامی کہتا ہے کہ

ؔ امن شوقا الی حیار لقیت فیہا جمال سلمیٰ ۔۔۔ کہ مے رساند ازاں نواحی نوید لطفے بجانب ما

لیکن اختر کی شاعری میں سلمیٰ سے مراد ایک معین شخصیت تھی۔

سلمیٰ کا حقیقی وجود لوگوں کی نگاہوں سے اس لئے بھی مخفی رہا کہ اختر اس راز سے پردہ اُٹھانا نہیں چاہتے تھے اور جو لوگ واقف تھے ان کو اس کی اجازت نہیں دی گئی۔ وہ آخر عمر تک اس راز کو چھپاتے رہے اور جو لوگ پوچھتے انہیں بہ لطائف الحیل ٹال دیتے۔ اور جہاں تک میں سمجھتا ہوں ان کا یہ طریق کار صحیح بھی تھا۔ آخر ایک شریف خاتون کو رسوا کرنے کا فائدہ۔

قدرتاً سلمیٰ کی بھی یہ خواہش تھی کہ کسی طرح ان کا نام منظرِ عام پر نہ آئے اور جب انہیں ایک دو مرتبہ یہ محسوس ہوا کہ شاعر بہک کر کچھ خاص قسم کے اشارات کرنے لگا ہے تو انہیں ایک خط میں اختر کو خاص طور سے تنبیہہ کرنی پڑی جس کے جواب میں اختر نے ایک غزل میں کہا کہ

ؔ شعر میں ذکر کسی کا دل ناکام نہ کر ۔۔۔ اُس نے لکھا ہے کہ تو یوں ہمیں بدنام نہ کر
غیرتِ حسن کو منظور نہیں رسوائی ۔۔۔ ضبط اے عشق اِس افسانے کو یوں عام نہ کر

اور اس کے بعد اس حد تک اخفا کی کوشش کی گئی کہ اختر نے اپنے اور سلمیٰ کے خطوط کا اس وقت جو مجموعہ مرتب کیا اس میں اپنے لئے بھی اختر کی جگہ "کوکب" کا لفظ اختیار فرمایا۔

یہ مجموعۂ مکاتیب ان دنوں بہت سے دوستوں کے یہاں چکر لگاتا رہا چند روز میرے پاس بھی رہا لیکن اُس وقت مجھے اس کو نقل کرنے کا خیال نہ آیا۔ آہ اُس وقت کسے خبر تھی کہ

ؔ ہے آج جو سرگزشت اپنی ۔۔۔ کل اُس کی کہانیاں بنیں گی

مجھے معلوم ہوا ہے کہ اس کی ایک ایک نقل آغا خادم حسین تباوی اور سلیم کے پاس موجود ہے۔

بہرکیف احباب کی اطلاع کے لئے اس قدر عرض کر دینا کافی ہے کہ سلمیٰ جن کا اصل نام اور ہے ایک معین شخصیت کا نام ہے اور وہ آج بھی بقیدِ حیات ہیں۔

سلمیٰ سے اختر کے معاشقہ کی ابتداء ۱۹۲۶ء میں ہوئی جبکہ پہلے پہل سلمیٰ کا ایک مکتوب ان کے نام پہنچا اور اُسے پڑھ کر انہوں نے وہ مشہور غزل کہی جس کا مطلع یہ ہے کہ

ؔ اے آئے انقلابِ سپہرِ بریں کہاں ۔۔۔ اللہ یں کہاں وہ ثریا جبیں کہاں

اس کے بعد جب دیدِ جاناں پہ طلبی ہوئی تو اختر یوں نغمہ سنج ہوا کہ

ؔ کتنی شاداب ہے دنیا کی فضا آج کی رات ۔۔۔ کتنی سرشار ہے گلشن کی ہوا آج کی رات

کتنی فیاض ہے رحمت کی گھٹا آج کی رات — کس قدر خوش ہے خدائی سے خدا آج کی رات
کر نظر آسکے گی وہ ماہ لقا آج کی رات

آج کیا بات ہے دنیا کے نظارے خوش ہیں — باغ میں پھول سرِ چرخ ستارے خوش ہیں
ایک بے نام سی سرمستی کے مارے خوش ہیں — ایک میں خوش نہیں جتنے بھی ہیں سارے خوش ہیں
ہے خوشی چار طرف نغمہ سرا آج کی رات

آج کی رات کے عنوان سے یہ تمام نظم اسی نوع کے جذبات و احساسات سے معمور ہے۔ یہ نظم یوم ملاقات سے پہلے کی ہے لیکن اس کے بعد جب ملاقات ہو چکی تو اختر بہ سبیل تقاضائے بازدید یوں نزانہ طراز ہوا کہ

ــہ تمہیں ستاروں نے بھی باربار دیکھا ہے — شریر چاند نے بے اختیار دیکھا ہے
کبھی چمن میں گئی ہو تو مست پھولوں نے — نگاہِ شوق سے آئینہ وار دیکھا ہے
سنہری دھوپ کی کرنوں نے بام پر تم کو — بکھیرے گیسوئے مشکیں بہار دیکھا ہے
قریب شام تمہیں طائرانِ گلشن نے — ہزار بار سرِ لالہ زار دیکھا ہے
نسیم باغ نے زیب النساء سمجھ کے کبھی — تمہیں بہ گلکدۂ شالامار دیکھا ہے
غرض مظاہرِ فطرت نے ہر طرح تم کو — ہزار بار نہیں لاکھ بار دیکھا ہے
مگر مری نگہِ شوق کو شکایت ہے — کہ اس نے تم کو فقط ایکبار دیکھا ہے
دکھا دو ایک جھلک اور بس نگاہوں کو
دوبارہ دیکھنے کی ہے ہوس نگاہوں کو

اور پھر اس کے بعد کی ایک ملاقات کا نقشہ ملاحظہ کیجئے ۔

ــہ کون آیا مرے پہلو میں یہ خواب آلودہ — زلف برہم زدہ و چشم حجاب آلودہ
کس نے پہلو میں بٹھایا یہ مجھے شرما کر — کس کے ہاتھوں میں ہے لرزش سی حجاب آلودہ
کس کے ملبوس سے آتی ہے حنا کی خوشبو — کس کے ہر سانس کی جنبش ہے گلاب آلودہ
کس کو شکوہ ہے مرے عشق سے رسوائی کا — کس کا لہجہ ہے بایں لطف عتاب آلودہ
حسرتِ بوسہ پہ اختر یہ خیال آتا ہے
میرے ہونٹوں سے ہوں کیوں برگِ گلاب آلودہ

اختر سلمیٰ کی نسبت سے دیارِ سلمیٰ کا بھی جودت سے آذکہ نیاز مندان شوق رہا ہے عاشق تھا اور اس سلسلے میں اس نے بربطِ عشق پر بڑے دلگداز نغمے چھیڑے ہیں۔ ایک نظم کے چند بند ملاحظہ ہوں۔

ــہ اے سرزمینِ گجرات اے خلد زارِ اُلفت
پھولوں میں تیرے رقصاں روحِ بہارِ الفت
تیرا ہر ایک ذرہ ہے رازدارِ الفت ـــــ اور یادگارِ اُلفت ـــــ اے سرزمین گجرات
عریاں ہے حسن تیرے سرسبز گلشنوں میں

آوارہ عشق تیرے شاداب دامنوں میں
فطرت برہنہ تیرے پُر نور سینوں میں ——— رنگین مسکنوں میں ——— اے سرزمین گجرات
پھر آرزو کو رسوا کرنے کی آرزو ہے
رونے کی اور آہیں بھرنے کی آرزو ہے
سلمیٰ کے پاؤں پہ سر دھرنے کی آرزو ہے ——— مرنے کی آرزو ہے ——— اے سرزمین گجرات

ایک مرتبہ سلمیٰ جب بیمار ہوئیں تو اختر نے انہیں ایک منظوم خط میں لکھا کہ

ؔ
تندرستی کا گلہ کیا ہے شکایت کیا ہے میری بیمار بتا تو تری حالت کیا ہے
عشق بیماری ہے اور کتنی حسین بیماری کیا خبر بے خبروں کو یہ لذت کیا ہے
ساری دنیا کے مریضوں کو شفا دے یارب! آج احساس ہوا ہے کہ علالت کیا ہے
رو دیے جب بھی سنی درد بھری کوئی خبر درد ہی درد ہے یارب کہ طبیعت کیا ہے
ان کی صحت کی خبر آئے گی جلد آئے گی دلِ ناداں تجھے آخر کو یہ وحشت کیا ہے
سامنے ہوں تو فدا کر دیں دل و جاں اُن پر
ہم نہیں جانتے اختر کہ عیادت کیا ہے

تقریباً پانچ چھ سال تک یہ سلسلۂ معاشقہ جاری رہا لیکن آپ کو اس ضمن میں یہ سُن کر حیرت ہوگی کہ یہ تمام دورِ جنسی آلودگی سے قطعاً مبرا رہا۔ مجھے اختر نے ذاتی طور پر ان حالات سے خود آگاہ کیا اور خود اختر کی تحریروں سے بھی یہ چیز واضح ہے۔ اختر اپنے اس مجموعۂ مکاتیب میں جو آج بھی دوستوں کے پاس ہے ایک مکتوب میں سلمیٰ کو اپنی ملاقات کا وقت یاد دلاتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "کیا آپ میری محبت کی معصومیت اور ملکوتی اور مقدس حیثیت کی داد نہ دیں گی"۔ اور اس کے جواب میں سلمیٰ لکھتی ہیں کہ "آپ انسان نہیں دیوتا ہیں اور آپ کی اسی شان نے مجھے خرید لیا ہے" (یہ مکتوب روزنامہ آفاق لاہور کی اشاعت مورخہ ۲۲ ستمبر ۱۹۵۲ء میں شائع ہو چکا ہے)

اختر اپنی ایک نظم میں بھی اس جانب اس طرح اشارہ کرتے ہیں۔

ؔ
قسم اُس پاکبازی کی جو تھی باہم خیالوں میں قسم اُس بے نیازی کی جو تھی باہم سوالوں میں
قسم اُس چاک دامانی کی جو مجبورِ وحشت تھی قسم اُس پاک دامانی کی جو معذورِ عفت تھی
محبت کی انہی معصوم راتوں کی قسم تم کو حقیقت کی انہی موہوم راتوں کی قسم تم کو
فقط اتنا بتا دو کیا وہ راتیں پھر نہ آئیں گی
وہ راتیں آہ وہ راتیں وہ راتیں پھر نہ آئیں گی

اختر و سلمیٰ کے مجموعۂ مکاتیب سے معلوم ہوتا ہے کہ اس دوران میں ایسے لمحات بھی آئے کہ اگر سنجیدگی سے کوشش کی جاتی تو ان کو رشتۂ ازدواج میں منسلک کیا جا سکتا تھا۔ لیکن بعض وجوہ سے ایسا نہیں کیا گیا ——— بالآخر غالباً ۱۹۳۲ء میں سلمیٰ ایک جگہ رشتۂ تزویج میں باندھ دی گئیں اور یہ سلسلۂ نامہ و پیام ہمیشہ کے لئے وعدۂ حشر پر ختم ہو گیا ——— اختر نے اس موقع پر اپنی محبوبہ کو مطلع کر دیا کہ

ؔ
دل و دماغ کو رو دوں گا آہ کر لوں گا تمہارے عشق میں سب کچھ تباہ کر لوں گا
تمہاری یاد میں میں کاٹ دوں گا شب سے دن تمہارے ہجر میں راتیں سیاہ کر لوں گا

اگر مجھے نہ ملیں تم تمہارے سر کی قسم   میں اپنی ساری جوانی تباہ کر لوں گا
جو تم سے کر دیا محروم آسماں نے مجھے
میں اپنی زندگی صرفِ گناہ کر لوں گا

اور سچ یہ ہے کہ اس کے بعد واقعی اختر نے اپنی جوانی تباہ کر لی۔

ہم نے ذکر کیا ہے کہ اختر جب آسمانِ شعر و ادب پر چمکے اور سلمیٰ کی یاد میں اُن کے نغموں سے فضائے ارض میں گونجی تو اس سے سب سے زیادہ کالجوں کا ماحول متاثر ہوا جن میں طلبا کی طرح طالبات کا عنصر بھی شامل تھا۔ ان کے علاوہ ملک کی اُن ادب نواز خواتین نے اختر کے کلام کو خوش آمدید کہا۔ جن میں سے اکثر بڑے ممتاز اور اعلیٰ گھرانوں کی چشم و چراغ تھیں۔

بعض خواتین اختر کو یوں ہی شوقیہ خطوط لکھتی تھیں۔ بعض اپنے کلام میں اصلاح کے لئے خطوط لکھتیں۔ اور ممکن ہے ان میں سے بعض کو اختر سے کچھ دلی لگاؤ بھی رہا ہو لیکن اکثر کی حالت یہ تھی کہ اختر کی نظموں میں حسن اور نسائیت کے لئے اس کے احساسات اور بے پناہ طوفانی جذبات کو دیکھ کر اس کی قدرداں اور اس کے ہنر کی دلدادہ تھیں۔ بعض کا معمول یہ تھا کہ اس کی نظموں میں سلمیٰ کی کہانیاں پڑھ پڑھ کر اُس کو خطوط لکھتیں اور تعریفًا چھیڑتی تھیں۔ جو خواتین اس سے اپنے کلام میں اصلاح لیتیں اکثر اس کے کمالِ فن کی ستائش کر دیتیں۔ اور یہ اختر کی سادگی تھی کہ وہ ان سب چیزوں کو عشق و محبت کی کارفرمائیوں کا نتیجہ سمجھتے تھے۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ سلمیٰ کے بعد ان پرستارانِ اختر میں سے تقریبًا سب کا تعلق اختر سے زیادہ اختر کے آرٹ سے رہا ہے۔

وہ خواتین جن سے اختر کی مراسلت رہی ہے زہرہ۔ پروین۔ ثریا۔ نسرین۔ ناہید۔ لالہ رخ۔ شمسہ اور لیلیٰ تھیں۔ لیکن اس ضمن میں لاہور کی عذرا۔ سندھ کی زلیخائے جواں۔ امرت سر کی نوبہار نازو اور لکھنؤ کی ممتاز ادیبہ سے بہت زیادہ سلسلۂ نامہ و پیام قائم رہا ہے۔ عذرا سے متعلق اختر نے کئی نظمیں لکھیں جن میں سے۔

؎ کوئی مہ جبیں جلوہ دکھلا گئی   مرے گھر پہ شام بہار آگئی

شاہکار کی حیثیت رکھتی ہے۔

سندھ کی زلیخائے جواں اکثر دہلی سے سندھ یا سندھ سے دہلی جاتے ہوئے لاہور سے گزرتیں ان کے خیر مقدم کے سلسلے میں جو نظمیں لکھی گئیں وہ ادب اُردو کا بیش قیمت سرمایہ ہیں۔

؎ راہ دہلی سے صبا عطر فشاں آتی ہے   خبر آئی ہے کہ وہ جانِ جہاں آتی ہے

اور پھر ؎ سامانِ رشکِ انجم و مہتاب کر کے جا   لاہور کی فضاؤں کو شاداب کر کے جا
مانا کنارِ سندھ ہے مضطر ترے لئے   کچھ تو علاجِ پہلوئے پنجاب کر کے جا

جیسی نظمیں اسی عہد کی یادگار ہیں۔
ماہ لقا لکھنؤ کی شان میں لکھا۔

؎ کب تک رونقِ شامِ اودھ اے ماہ جمال   شامِ لاہور کو بھی صبح بنا دے آکر

اور امرت سر کی نوبہار ناز کی شان میں تحریر فرمایا۔

؎ ہر ذرہ اس کے حسن سے گلشن ہے آج کل   امرت سر ایک وادیٔ ایمن ہے آج کل

عمر کے آخری حصے میں اختر کو شیریں سے کچھ رابطہ رہا ہے اور اس کا علم مجھے اس طرح ہوا کہ ایک دن مرنے سے کچھ مدت پہلے میرے

مکان کے سامنے سڑک پر ٹہل رہے تھے۔ میں نے پوچھا کیا ماجرا ہے؟ — فرمانے لگے آج شیریں کی موٹر ادھر سے گزرے گی۔ شیریں کے متعلق آپ نے جو اشعار کہے وہ شہناز میں خاصی تعداد میں موجود ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

مری سودائے شیریں مری جانِ شیریں ۔۔۔ تمنائے ندیں وارمانِ شیریں
ترا رخ ہے برقِ سحاب بہاریں ۔۔۔ ترے لعلِ لب ہیں گلستانِ شیریں

دیکھ لے دل نظر آیا وہ دیارِ شیریں ۔۔۔ ذرہ ذرہ سے مچلتی ہے بہارِ شیریں
خاکِ لاہور ہے گہوارۂ شان و عظمت ۔۔۔ اختر اس خاک میں روشن ہے وقارِ شیریں

یہاں میں ضمناً یہ عرض کردوں کہ اختر عورت ذات کے بارے میں سخت ذکی الحس واقع ہوئے تھے اور سلمیٰ کی مہجوری کے بعد وہ خاص طور سے بہت زیادہ جذباتی ہوگئے تھے جب بھی کوئی حسین صورت دیکھتے خود سراپا تصویر بن جاتے۔ کسی حسین صورت کا سامنا ہو جانا ان کے لئے مصیبت تھا۔ جس کا اظہار ان کے چہرے سے ہونے لگتا تھا۔ ایک دن میں مزنگ میں ان سے ملنے گیا۔ پتہ چلا کہ ایک حسنِ رہگزر کی جستجو میں سڑکوں پر ادھر ادھر پھر رہے ہیں۔ میں نے ان کا پیچھا کیا اور جب مل گئے تو پوچھا کہ آخر اس آوارہ گردی سے مقصد؟ — فرمانے لگے زندگی کا اس سے بہتر مقصد اور کیا ہو سکتا ہے۔ اکثر ایسا ہوتا کہ یوں ہی کوئی صورت دیکھ کر اپنا ٹانگہ کسی ٹانگہ کے پیچھے دوڑانا شروع کر دیتے تھے۔ ایک بار لاہور سے گزرتے ہوئے سندھ کی شوخ کمسن نے گنڈیریاں کھا کے جب چھلکے پلیٹ فارم پر پھینکے تو وہ چھلکے سیٹ کے سٹیشن سے گھر رومال میں باندھ لائے۔

خطوں کے معاملے میں یہ عالم تھا کہ جب بھی کوئی حسین خط آتا بار بار پڑھتے جھومتے اور کئی کئی دن تک خاص خاص دوستوں کو دکھلاتے اور سناتے تھے۔ مرنے سے کچھ دن پہلے ان مہکتے ہوئے خطوط کی نسبت ارشاد فرمایا۔

مٹ چلے میری امیدوں کی طرح حرف مگر ۔۔۔ آج تک تیرے خطوں سے تری خوشبو نہ گئی

اختر کی زندگی کے تین دور ہیں پہلا دور سلمیٰ سے معاشقہ سے پہلے کا ہے اس زمانے میں اختر نے جوگن۔ بیتری اور نغمۂ سحر وغیرہ عنوانوں سے دلکش نظمیں لکھیں۔ دوسرا دور سلمیٰ سے معاشقہ کے زمانے کا ہے۔ اس دور کا تقریباً تمامتر سرمایۂ شعر و ادب سلمیٰ کے عشق کی حکایت لذیذ و دراز پر مشتمل ہے۔ اختر کی مشہور نظمیں آج کی رات۔ گجرات کی رات۔ اے سرزمینِ گجرات۔ اے عشق کہیں لے چل۔ انگوٹھی۔ آہ وہ راتیں۔ اعترافِ محبت بستی کی لڑکیوں میں۔ بعض رومانی لمحات کی یاد۔ ایک تصویر دیکھ کر سلمیٰ نور جہاں کے مزار پر۔ اور "مری سلمیٰ مجھے لے چل تو ان رنگیں بہاروں میں" اسی دورِ بہار سے متعلق ہیں۔

تیسرا دور سلمیٰ سے مہجوری کا زمانہ ہے۔ اس میں اختر نے ابتداً دنیا سے تنگ آکر ہر مہکتے دروازے پر دستک دی ہے اور ہر لپکتے آنچل کو چھیڑا ہے۔ عذرا۔ ناہید۔ سندھ کی شوخ کمسن شیریں اور دوسرے حسین عنوان اسی دور سے متعلق ہیں اور اختر کی نظم "میری داستانِ حیات" جو لالۂ طور میں مندرج ہے اس دور کی زندہ تصویر ہے۔ اس دور کا آخری حصہ تمامتر نالۂ و شیون اور آہ و بکا پر مشتمل ہے جس میں اختر نے "بہار بیتنے والی ہے آ بھی جا سلمیٰ" اور "رخصتِ دائمی" جیسی المیہ شاعری یادگار چھوڑی۔

اختر کا ہر شعر کسی نہ کسی سانحہ سے وابستہ ہے اور ان کی زندگی جن حالات و سوانح سے گزرتی گئی ان ہی کے سانچے میں ان کی شاعری بھی ڈھلتی گئی آخری دور ارمانوں کی پامالی پر مشتمل ہے۔ اس عہد کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

شاداب ہو سکا نہ گلستانِ آرزو ۔۔۔ کتنے ہی ابر باغ پہ چھا کر چلے گئے

بہت تڑپائے گی دل کو ہماری داستاں برسوں ۔۔۔ کرے گا یاد رو رو کر ہمیں سارا جہاں برسوں

ہ پلا دے عشق جا ہے ابھی جہاں میں کوئی دن تک — جرس کا شور گو بجا کارواں قیام ہے ساقی

ہ قرار چھین لیا بے قرار چھوڑ گئے — بہار لے گئے یادِ بہار چھوڑ گئے

ہماری چشمِ حزیں کا خیال کچھ نہ کیا — وہ عمر بھر کے لئے اشکبار چھوڑ گئے

نگاہِ وعدہ کی عرضِ حزیں قبول نہ کی — ہمیں وہ غمزدہ و دلفگار چھوڑ گئے

اُمید و شوق سے آباد تھا ہمارا دل — اُمید و شوق کہاں اک مزار چھوڑ گئے

اختر کو اپنی زندگی میں پانچ عظیم حوادث سے سابقہ پڑا۔ سلمٰی کی جدائی۔ اپنے چھوٹے بچے کی موت۔ ریشیون کی خودکشی۔ والد کی وفات۔ اور سب سے آخر میں ان کے عزیز داماد نظیرالدین کی ٹونک میں ندی بناس میں غرقابی جس پر انہوں نے حسب ذیل قطعہ کہا۔

ہ ہے غرقِ ظلمتِ یاس آسمان آج — مہِ بدکشن ہے نظروں سے نہاں آج

خدائی بحرِ غم میں کیوں نہ ڈوبے — اجل ڈوبا نظیرالدین جواں آج

۱۳۴۴

ان تمام حوادث پر گھر والوں کا عتاب۔ دوستوں کی سرد مہری اور لاہور کی جدائی مستزاد تھی۔ یہ تھے اختر کے مصائب اور ان سب کا علاج آپ نے شراب تجویز کر رکھا تھا۔

تقسیم سے کچھ مدت پہلے اختر کے والد محترم حافظ محمود شیرانی اپنی مدت ملازمت ختم کر کے اہل و عیال کو ہمراہ لے کر ٹونک روانہ ہوئے تو اختر بھی ان کے ساتھ تھے۔ لیکن وہاں پہنچ کر وہ لاہور کی یاد میں ہمیشہ بیقرار رہے۔ ہر خط جو ٹونک سے آتا اس میں لاہور کی جدائی کا مرثیہ ہوتا۔ وہ لاہور آنے کے لئے بے چین رہتے تھے اور اس اثناء میں جو خطوط انہوں نے دوستوں کو لکھے ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ لاہور ہی کی خاک میں دفن ہونا چاہتے تھے۔ لاہور آنے سے پہلے کئی بار ان کے مرنے کی خبر مشہور ہوئی۔ اس زمانے میں انہوں نے نگار کے غزل گو شعرا نمبر میں لکھا کہ

"ریاست ٹونک میں پیدا ہوا۔ لاہور میں ہوش سنبھالا اور شاید یہیں کے اخبارات کو سب سے پہلے میرے انتقال کی خبر شائع کرنے کا موقع ملے گا۔"

مرنے سے چھ ماہ پیشتر ایک دن اچانک لاہور آگئے اور فرمانے لگے کہ بس اب میں لاہور ہی میں رہوں گا۔ میں نے نیر منزل کے پیچھے کا کمرہ ان کے لئے کھلوا دیا۔ اور اس کے بعد وہ اس میں باقاعدہ مقیم ہو گئے۔

اس بار بھی ان کے بسر اوقات کا عالم وہی تھا یعنی رات دن پینا۔ دن کو بالعموم غائب رہنا آدھی رات کو آنا۔ خود جاگنا اور دوسروں کو جگانا کہ ع خاقانی ز دیگر شب آمد۔

اس اثناء میں گاہے ایسا بھی ہوا کہ عالم نشہ و کیف میں باہر نکلتے اور سلمٰی کے محلہ کی گلیوں کی خاک چھان کر واپس آجاتے۔ اس مرتبہ اختر مصائبِ حیات سے کچھ بہت زیادہ تھکے ہوئے معلوم ہوتے تھے اور اس قدر رقیق القلب ہو چکے تھے کہ اکثر بات بات پر رو دیتے۔ اور جیسا کہ پہلے ذکر کیا گیا اکثر بیوی بچوں کو یاد کرنے اور اپنی بے اعتنائیوں کا گلہ کرتے۔

پھر اسی اثناء میں ایک خاص بات یہ دیکھنے میں آئی کہ اپنی تصویریں بہت زیادہ کھنچواتے اور سب میں تقسیم کرتے تھے۔ ایک دن کہنے لگے معلوم نہیں کیا ہونے والا ہے میں اس بار اپنی تصویریں بہت کھنچوا رہا ہوں۔

ان چیزوں کے علاوہ اس دور میں ایک خاص چیز یہ دیکھی گئی کہ آپ پر عشقِ رسول کا غلبہ معلوم ہوتا تھا چنانچہ اس زمانے میں آپ نے بہت سی نعتیں لکھیں جو آپ کے آخری مجموعۂ کلام شہرود میں مندرج ہیں۔

لیل و نہار اسی طرح گزر رہے تھے کہ ایک دن آپ پر ردِ عمل کی کیفیت زیادہ طاری ہو گئی جس کے نتیجہ میں تشنج و تہوع کی حالت بڑھ گئی۔ قبض شدید ہو گیا۔ جگر نے جواب دے دیا اور آنکھوں پر زردی چھا گئی۔ مجبوراً میں نے انہیں میو ہسپتال میں داخل کرایا۔ وہاں پہلے تو چند روز ٹھیک رہے۔ لیکن اچانک ایک دن طبیعت زیادہ بگڑ گئی ——— اور بالآخر ۴۳ سال کی عمر ہی میں ۹ ستمبر ۱۹۴۸ء کی دوپہر کو آپ نے وقت سے پہلے زندگی کی دشوار گزار راہوں کا سفر ختم کر دیا ——— آہ

؎ میں میکدے کی راہ سے ہو کر گزر گیا ورنہ سفر حیات کا بے حد طویل تھا

مرنے سے پہلے اختر کے ہونٹوں پر یہ مصرع تھا۔ ؏ ہو گئی بزمِ میکدہ خاموش۔ شاعر نے یہ کہا اور بزمِ میکدہ سونی ہو گئی ۱۰ ستمبر کی صبح کو آپ کا تابوت ہسپتال سے نیر منزل لایا گیا اور یہاں سے وہ تدفین کے لئے گورستان لے جایا جا رہا تھا کہ اختر کی بھولنے والی کو اختر یاد آیا۔ راستہ میں ایک برقع پوش خاتون نے تابوت رکوا کر اس کا آخری دیدار کیا ——— اور اس کے بعد شہرستان علم و ادب کی یہ عظیم دولت گورستان میانی میں ہمیشہ کے لئے سپرد خاک کر دی گئی۔

ابوسعید بزمی

ادیبہ بزمی

طفیل صاحب آپ نے مجھ سے بزمی کی شخصیت کے متعلق لکھنے کی فرمائش کی ہے۔ بزمی کا نام ہی میری زندگی کا سب سے اہم باب ہے لیکن حالات کی ستم ظریفی نے اس کتاب کو ہی بند کر دینے پر مجبور کر دیا ہے۔ اس لئے میں نے بھی پچھلی زندگی کے متعلق سب کچھ بھول جانے کی کوشش کی ہے۔ آج پانچ سال گزر جانے کے بعد ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بہت سی باتیں تو مجھے بھول ہی چکی ہیں۔ پھر بھی سوچتی ہوں کہ بہت سی باتیں ایسی ضرور ہیں جن کی یاد ابھی تازہ ہے اور اگر اپنے جذبات سے قطع نظر ان ہیں کہہ دوں تو شاید مفید بھی ہوں۔ اس سلسلہ میں میری کوشش یہی ہے کہ بزمی کو بحیثیت انسان کے آپ کے سامنے پیش کر دوں لیکن میرے ذہن میں ان کی گھریلو زندگی کا کوئی پہلو اس طرح سے نہیں آتا کہ گھر سے باہر کی زندگی یا اس خاص قسم کی "ذہنی دنیا" سے اُن کو الگ کر دوں جو ان کے لئے سب کچھ تھی اور جس کے لئے انہوں نے اپنے آپ کو بڑی ریاضت اور کوشش سے تیار کیا تھا۔

ان کی موت پر مجھے عربی کی یہ ضرب المثل یاد آتی ہے "ایک شخص تمام رات دعا مانگتا رہا کہ خدایا صبح کر دے اور جب صبح ہوئی تو اس کی بینائی زائل ہو گئی۔"

جب ارادے تکمیل کو نہ پہنچیں تو خواب پریشان بن کر رہ جاتے ہیں۔ بزمی کے بے شمار پریشان خوابوں کے دھندلے نقوش میرے ذہن میں باقی ہیں جنہیں اندھیروں سے کھینچ کر لانے کی کوشش کی ہے۔ مگر ان کی ترتیب سمجھ میں نہیں آتی اس لئے میں نے ان کی چند تصویروں کا سہارا لیا ہے کہ شاید یہ ذہن کی رہنمائی کر سکیں۔

لیجئے یہ تصویر بزمی کی وہ واحد تصویر ہے جو نہ جانے کس اتفاق سے میرے پاس موجود ہے۔ بندۂ خدا نے اس مختصر سی زندگی پر ایک ستم یہ بھی کیا کہ کبھی تصویر ہی نہ اتروائی۔ ایک دن ان کی میز کے کاغذوں کے انبار میں سے پاسپورٹ سائز کی تصویر کے یہ دو پرنٹ برآمد ہوئے۔ میں بہت حیران ہوئی۔ مگر وہ بولے "دیکھئے کتنا پریشان کن ٹالا تھا تصویروں کے لئے اب کبھی مت کہئے گا کہ تصویر

نہیں کھنچوا سکے۔"

اور میں مزید حیران ہو کر رہ گئی کہ کس قدر بے تکلفی سے بھوپالی دوستوں کی زبردستی کا احسان مجھ پر رکھ رہے ہیں۔ کیونکہ یہ تصویر تو بھوپال اسٹیٹ پیپلز کانفرنس Bhopal State Peoples Conference کے ممبروں کے اصرار کا نتیجہ تھی ان لوگوں کی خواہش تھی کہ اس کانفرنس کے بانی اور وہاں کے عوام کے منظور نظر رہنما کی کم از کم تصویر ہی دفتر میں آویزاں ہو جائے۔ اور مزے کی بات یہ کہ برسوں تک یہ اعتراض رہا کہ اب کون تصویریں اتروانا پھرے۔

پھر آخری سفر پر روانہ ہونے سے پیشتر کہنے لگے۔ جی چاہتا ہے کہ آپ کے ساتھ ایک تصویر کھنچواؤں کہ خدا جانے کیا ہو۔ . . . .

مجھے عجیب سا وہم ہوا اور وہ تصویریں نہیں اتریں۔ اب جب میرا وہم حقیقت بن کر سامنے آ گیا تو میرے ہاتھ میں صرف یہی تصویر رہ گئی۔ اس میں بڑی کی گہری آنکھیں اور دونوں ابروؤں کے درمیان دو چھوٹی چھوٹی لکیریں جو سوچتے وقت اور نمایاں ہو جایا کرتی تھیں دکھائی دے رہی ہیں۔ جبڑے کی ساخت اور دہانے سے قوت ارادی کی مضبوطی ظاہر ہے۔ چوڑی پیشانی اور چہرے پر وہی شگفتگی ہے جو مزے دار لطیفے بیان کرتے اور زندگی سے بھرپور قہقہے لگاتے وقت پیدا ہو جایا کرتی تھی اور یہ لیجئے حسب دستور داڑھی بڑھی ہوئی ہے۔

——— شیو بنانے اور بال کٹوانے کا کام ان کے لئے بے حد مشکل تھا۔ ہمیشہ دفتر سے اٹھتے ہوئے دس بجے رات کو اگر کسی بد قسمت کی دوکان اس وقت بھی کھلی رہ جاتی تو اس میں داخل ہو جاتے تھے اور وہ بھی دوستوں کی سرزنش سے تنگ آ کر۔ سنا ہے کہ اسی خصوصیت کی وجہ سے مولانا عبدالمجید سالک انہیں سردار جی کہہ کر پکارا کرتے تھے۔

نائی کی دوکان سے چھٹکارا پا کر وہ یوں گھر آتے جیسے ساری دنیا کے جھگڑے چکا کر آئے ہوں ایک دن بہت زوردار قہقہوں کے درمیان مجھے بتایا کہ "کل جو میں بال بنوانے گیا تو شخص مذکور کہنے لگا کہ بال پرانے فیشن کے بنا دوں یا اس فیشن کے رہنے دوں"۔ یاد رہے کہ بڑے بال رکھنے کا فیشن ان دنوں نیا نیا شروع ہوا تھا جو نو عمر لڑکوں میں بہت مقبول تھا۔

شیو کی مصیبت سے نجات حاصل کرنے کا ایک نسخہ انہوں نے ڈاڑھی نکلتے ہی معلوم کر لیا تھا وہ کہ شروع سے ہی ڈاڑھی چھوڑ دی جائے۔ مگر دوستوں کی دستبرد سے وہ بیچاری نہ بچ سکی۔ اس وقت سے مجبوراً شیو کرنے کی روایت شروع ہوئی۔

یہی حال لباس کے معاملے میں بھی تھا۔ عجیب بے نیازی کا عالم تا عمر چھایا رہا۔ ان کی کھدر پوشی میں کھدر کی سرپرستی کے ساتھ، لباس کے مسئلہ کو بھی ایک ہی بار حل کر دیا تھا۔ ایک دم کئی تھان کھدر کے اٹھا لائے اور کرتے، پاجامے، شروانیاں اور ٹوپی سب تیار ہو گئی۔ بعد میں درزی کو ہی اختیار مل گیا کہ بھئی تو اپنی مرضی سے کپڑے بنا دیا کر۔ وہ ظالم ان کی ڈھیل سے دن بدن لا پروا ہوتا گیا اور سینے پرونے کے فن کے تمام تجربات کی وہ وہ جولانیاں دکھائیں کہ کیا کہئے۔ ایک دن جو گھٹنوں تک لمبی قمیص سی کر لایا تو میرے ضبط کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ اور میں نے کھدر کے وہ سب کپڑے اٹھا کر پھینک دئے۔

"بس آج سے کھدر وَدر سب بند۔ آئندہ سے انسانوں کے لئے کپڑے بنیں گے"۔

"ارے بھئی جیسا اسے آتا ہے اس بیچارے نے سی دیئے ہیں۔ آپ کا جی چاہے تو آپ ٹھیک کر دیجئے"۔ لیجئے یہ چاہنے کا سوال آ گیا تو گویا جی نہ چاہے تو مت ٹھیک کر دیہاں ایسا ہی پہننے میں کیسے انکار ہے۔

پھر میں نے بڑے شوق سے عام رواج کے کپڑے تیار کروائے تو انہیں بھی انہوں نے اسی بے نیازی سے پہن لیا جیسے پچھلے درزی کے سلے ہوئے لمبے کرتوں کو۔ البتہ جدید وضع کے لباس میں اتنی ترمیم کر دی کہ کوٹ کے بدلے شروانیاں سلوائیں۔

گنگا جمنا کے دوآبہ میں شروانی وضع داری اور شرافت کی علامت سمجھی جاتی ہے اور جو لوگ یوپی کے قدیم خاندانوں کی خصوصیات

سے واقف ہیں وہ شاید اس بات کی تائید کریں کہ ان لوگوں کے لباس ہی میں نہیں بلکہ چال ڈھال، اُٹھنے بیٹھنے، روزمرہ کی زندگی کے طور طریقوں میں ایک رکھ رکھاؤ، ایک دھیماپن، ایک صبر و سکون کی کیفیت موجود ہوتی ہے۔ یہ صبر و سکون جسے اکثر بڑے ریاض سے حاصل کیا جاتا ہے۔ کچھ عرصہ پہلے تک ان لوگوں کی خصوصیات تھیں جو قومی زندگی میں اہم خدمات انجام دیئے گئے اور بعد میں مولوی کے لقب سے یاد کیے گئے۔ بزمی کا خاندان بھی ایسے ہی مولویوں کا خاندان ہے جن کے ہاں اونچی آواز سے بولنا بُرا ہے، ریشمی کپڑے پہننا بُرا ہے۔ زمین پر زور سے قدم رکھنا بُرا ہے۔ غرض یوں جینا کہ ؎

لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام آفاق کی اس کارگہِ شیشہ گری کا

بزمی کو اپنے اس ماحول سے بہت سی باتیں ورثہ میں ملیں اور کچھ انہوں نے اپنا لیں، ان کی طبیعت میں ایک دلآویز قسم کی یکسانیت تھی ایک ٹھہراؤ تھا۔ سُنا ہے کہ اس ٹھہراؤ اور پختگی میں کو بھوپال کے حکمراں کی چیرہ دستیاں اور ریاستی جیل کی ہولناک کوٹھڑی بھی متزلزل نہ کر سکی۔

شدید سے شدید جذباتی موقع پر بھی وہ ایسے ہی پُرسکون رہتے اور انتہائی غصّہ میں بھی آہستہ سے ایک آدھ جملہ سنائی دیتا۔ چہرہ کے آثار چڑھاؤ یا آنکھوں کی چمک کے سوا اور کسی طرح یہ پتہ چلانا مشکل ہوتا کہ یہ شستہ اور مہذب جملے کس جذبے کے تحت کہے گئے ہیں بیشتر ان کے غصّے کی حالت کچھ یوں ہوتی :۔

"کیا گڑبڑ ہے یہ ؟۔ کیوں اتنا شور مچا رکھا ہے ؟" —— وہ بغیر کاغذ پر سے نظریں اُٹھائے لکھتے لکھتے بولتے جاتے کیونکہ گھر میں بہر حال کسی نہ کسی وقت تو کوئی ہنگامہ ہوتا ہی ہے۔ اور مجھے اکثر کسی وجہ سے ان کے لکھنے میں مخل ہونا پڑتا۔

ان کا اعتراض سُن کر میں بھی جھلّا جاتی۔ "جی ہاں ٹھیک ہے بے خبری میں ہر بات ہی ہنگامہ معلوم ہوتی ہے۔"

اس کا جواب عموماً یہ ہوتا کہ اپنا کاغذوں کا پُشتارہ اُٹھایا اور کسی دوسرے کمرے میں گُھس کے کھٹ سے دروازہ بند ——

ابھی ان کی بے نیازی پر میری طبیعت کا تکدّر باقی ہوتا کہ وہ بچّوں کی سی معصومیت کے ساتھ اپنا تازہ شاہکار سُنانے آموجود ہوتے۔ ایک مضمون نگار اپنے مضمون کی تکمیل پر جس طرح خوشی کا مجسمہ بن جاتا ہے اور مسرّت کی روشنی اس میں نظر آتی ہے اس کا ساتھ نہ دینا بہت مشکل ہوتا ہے۔ اس لئے مجھے اپنی ناراضگی جلدی ختم کر دینی پڑتی۔

تاہم ایسی لڑائی کے موقع بھی ہمارے اس سات سالہ زندگی میں بہت کم آئے کیونکہ بزمی کو ان باتوں سے کوئی دلچسپی ہی نہ تھی جن پر عام طور سے گھروں میں فساد برپا ہوتا ہے۔ گھر میں کیا ہوتا ہے ؟ کھانا کیا پکتا ہے ؟ خرچ کس طرح ہوتا ہے ؟ کون نیا ملازم رکھا جاتا ہے ؟ انہیں کچھ غرض نہ تھی۔

انہیں تو یہ مسرّت ہی کافی تھی کہ گھر کی بدولت انہیں زندگی کا سکون و اطمینان تو میسّر ہے —— کیا یہ خوشی ان کے لئے کافی نہیں تھی کہ وہ جس وقت چاہیں کتابیں پڑھ سکتے ہیں۔ اور انہیں مطالعہ کے لئے بھوپال کے قدیم کھنڈرات اور ویران سڑکوں پر تو پناہ نہیں لینی پڑتی کہ وہ والد کی سخت گیری کی زد میں نہ آسکیں۔ ان کو اپنے بچپن کے بے شمار دکھ یاد تھے اس وقت کے جب زبان کو اظہار پر قدرت نہ تھی مگر دل دکھی احساسات کا خزانہ بن گیا تھا۔ بچپن میں انہیں پرندوں سے بہت محبت تھی مگر وہاں گھر میں پرندے کہاں جہاں سوتیلی ماں کے نخروں کا راج ہو۔

ایک کتاب کہیں سے ہاتھ لگ گئی تھی جس میں پرندوں کی تصویریں تھیں تو ڈرے اور سہمے ہوئے ابوسعید نے جو اس وقت بزمی نہ بنا تھا گھر کے کونوں کھدروں میں الماریوں کے پیچھے اور جہازی پلنگ کے نیچے اندھیروں میں چھپ چھپ کر ویسے ہی تصویریں بنانے کی مشق شروع کر دی اور ایک ایک تصویر نقل کر کے چھوڑ دی۔ لیکن پھر والد صاحب کو پتہ چل گیا چونکہ گھر میں شرع کی رو سے کوئی تصویر رکھنا جرم تھا

اس لئے اصل اور اس کی نقل دونوں کو نذرِ آتش کر دیا گیا۔ بزمی کو یہ سانحہ بڑی جزوی تفصیلوں کے ساتھ یاد تھا۔ اس لئے یہ ان کے لئے بہت بڑا سکون کا باعث تھا کہ ان کے اپنے بنائے ہوئے گھر میں بچے اپنی مرضی سے کتابیں پڑھ سکیں گے۔ کھیل کھیل سکیں گے، آزادی سے ہنس سکیں گے اور یوں وہ اپنے سارے تشنہ ارمان پورے کر سکیں گے۔

اپنی عدیم الفرصت زندگی میں بھی وہ جب اپنے چار پانچ سالہ بیٹے کو سلیٹ پر کیل کانٹے بناتے دیکھتے تو اسے پاس بلا لیتے۔ "آؤ منّے چڑیا بنائیں! کیا بنائیں؟ کبوتر بنائیں! کبوتر!"

پھر بڑے انہماک سے کبوتر بنایا جاتا اور دونوں باپ بیٹے بے انتہا خوش ہوتے۔ شاید اپنی کامیاب تصویر سے زیادہ اپنے بچپن کی تمنا کو پورا کرنے پر خوشی ہوتی تھی۔

پھر یہیں تک بس نہ تھا۔ ایک دن دس پندرہ شیرازی کبوتر اُٹھائے چلے آ رہے ہیں۔

"ارے یہ کیا تماشہ ہے؟"

"ہوں تماشہ کہہ دیا بڑی مشکل سے خرید کر لایا ہوں۔"

"بلی جو کھا جائے گی؟"

"نہیں کھائے گی ہم خود دانہ پانی ڈالا کریں گے۔ ہم تو بچوں کے لئے لائے ہیں۔"

آخر بڑے اہتمام سے کونڈی منگوائی گئی اور چنوں کا دانہ بچے سارا دن دانہ بکھیرتے رہتے اور کبوتروں میں گھسے رہتے اور صحن میں سے گزرتے ہوئے وہ اس خوبصورت منظر کو ایسی محبت سے دیکھتے جیسے کبوتروں کے سڈول اور پاکیزہ وجود میں ان کے آئیڈیل کا کوئی اہم راز چھپا ہوا ہو۔

بزمی کو مطالعہ کا بچپن سے شوق تھا۔ پانچ سال کی عمر میں والدہ کے انتقال کے بعد سے چودہ پندرہ سال تک کا عرصہ جو انہوں نے اپنے نانا کی حویلی میں گزارا تھا۔ مطالعہ کے یادگار دن تھے۔ ان کے نانا مولوی سراج الحق صاحب بھوپال میں قاضی القضاۃ کے عہدے پر فائز تھے اور ایک وسیع کتب خانہ کے مالک تھے۔ انہوں نے بڑے شوق سے بزمی کو فارسی اور عربی پڑھائی کیونکہ ان کے کھینچے ہوئے زائچہ کے مطابق یہ لڑکا بڑی علمی صلاحیتوں کا مالک بننے والا تھا۔ اس پُر اسرار قدیم حویلی کے حجروں میں جہاں زندگی بہت احتیاط اور سنجیدگی کے ساتھ چلتی تھی دونوں نانا، نواسے ان خزانوں کو کُریدا کرتے جن کے جواہر دن بدن مٹی کے مول ہو رہے تھے۔

پھر جب نانا کے انتقال کے بعد اس حویلی کا سکون بھی منتشر ہو گیا اور اس کی بنیادیں نون لگ لگ کر بھرنے لگیں تو بزمی نے غلام گردش کی ایک تنگ و تاریک کوٹھری کو اپنا لیا کیونکہ نانا کے وارثوں کے لئے ان علمی خزانوں اور تاریک حجروں سے زیادہ اہم چیزیں تھیں۔ انہوں نے ایک بار مجھے بتایا "میں حجرے کے دروازے میں لیٹ کر کتابیں پڑھا کرتا تھا کیونکہ اس کے آگے ایک [illegible] اور حجرہ تھا اور اس میں سے ہو کر ذرا سی روشنی میرے حجرے کے دروازے تک آیا کرتی تھی۔"

آخر وہ حویلی ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی اور وہ کتابیں بِک گئیں تو بھوپال کے کھنڈرات نے اپنی آغوش کھول دی جن سے رفاقت کی مدت غالباً دس سال رہی۔ یہیں سے بزمی نے بھوپال کے مقامی اخبارات کے لئے مضمون لکھنے شروع کئے جن کی اشاعت والد کی سخت ناراضی کا باعث بنی اور یہیں سے منشی فاضل کے امتحان کی تیاری ہوئی جس کے لئے اس بنا پر جھڑکیاں دی گئیں کہ اتنی چھوٹی عمر میں چلا ہے امتحان دینے۔

بے چارے والد چند ہی سال بعد اس لڑکے کو جسے وہ منشی فاضل کے امتحان کے ناقابل سمجھتے تھے۔ وہ بھائیوں اور ایک ماں کا سہارا

بنا کر چھوڑ گئے۔ سولہ برس کی عمر تھی کہ ملازمت کا چکر شروع ہوگیا۔ میٹرک کی سند سے لے کر پنجاب یونیورسٹی سے ایم اے (گولڈ میڈلسٹ) تک کے سب مرحلے اسی طرح طے ہوئے۔

اخبار مدینہ سے تعلق کے دوران، چوبیس سال کی عمر سے تیس سال کی عمر تک، جب میرا ان کا ساتھ ہوا وہ اگرچہ معاشی لحاظ سے آسودہ تھے مگر بنک بیلنس کچھ نہ تھا۔ کیونکہ آمدنی سے یا تو موٹی موٹی کتابیں خریدی گئیں یا اسٹیٹ ہیلپز کانفرنس کے چندے دئے گئے تھے۔ ان کے بنائے ہوئے گھر میں ہر طرف کتابیں ہی کتابیں نظر آتی تھیں۔ غالب و اقبال کے کلام سے لے کر فسانۂ آزاد کی ضخیم جلدوں تک، انگریزی کے منتخب افسانوں سے لے کر معاشیات کی ٹھوس کتابوں تک، قرآن و بائیبل کے مقدس نسخوں سے لے کر کارل مارکس کی کیپٹل Capital تک کے مجموعے ان کے پاس موجود تھے۔

انہی کتابوں میں وہ آکسفورڈ ڈکشنری بھی تھی جسے وہ اپنی اوائل عمری کی نوکری میں دفتر میں اپنے ساتھ رکھتے تھے۔ تاکہ خالی اوقات میں پرانی پرانی فائلیں پڑھنے میں مدد دے سکے۔ اور یہ مدد میرے خیال میں بڑی مہنگی تھی۔ کیونکہ اس وقت ہر لفظ ان کے لئے ڈکشنری طلب ہوا کرتا تھا۔ اور ان کے انتقال کے بعد جب امریکہ سے ان کا سامان آیا تو دوسری اشیاء تو ہمیشہ کی طرح سے غائب ہو چکی تھیں۔ البتہ ان کی پسندیدہ کتابیں ضرور مل گئیں جن میں نہ تصویر بتاں تھیں اور نہ حسینوں کے خطوط تھے اسی لئے محفوظ رہ گئیں تھیں شاید!

ان کا کتابیں رکھنے کا طریقہ بھی کچھ نیا ہی تھا۔ کچھ کھلی، کچھ ادھ کھلی، کچھ کے بیچ میں کاغذ ٹھنسے ہوئے اور بعض ایک دوسرے سے دست و گریباں ہوتی ہوئی۔ ایک میدانِ حشر تھا جس کے لئے عام سائز کی میز کو مختصر سمجھ کر ایک بہت بڑی میز لی گئی تھی اس طرح سے انہیں سب سے بڑا فائدہ یہ نظر آتا تھا کہ ہر چیز ہاتھ ڈالتے ہی مل جاتی تھی۔ اور ڈھونڈنے میں وقت ضائع نہیں ہوتا تھا۔ ان کا قول تھا: "جو لوگ کتابیں سجا سجا کر رکھتے ہیں وہ انہیں پڑھتے نہیں"۔ بعد میں جب تمام کتابیں الماریوں میں چُن دی گئیں تو انہیں شکوہ پیدا ہوگیا کہ ان کی تمام چیزیں میں نے کھو دی ہیں۔ اس لئے ان کی ضرورت کی کتابیں مجھے ہی ہمیشہ ڈھونڈ کر نکالنی پڑتی تھیں۔

لیکن اخبار کے سلسلے میں معاملہ برعکس تھا۔ اگر کوئی ان سے پہلے اخبار دیکھ کر اس کے صفحات آگے پیچھے کر دیتا تو بڑی کا یہ جملہ اکثر سنائی دیتا: "تمام اخبار باسی کر دیا ہے کے، سارا تو خراب ہوگئی"۔ پتہ چلتا کہ اس بات پر بہت ناراض ہیں۔

خوشبودار لطیف قسم کی چائے پی کر دھیمے دھیمے انداز میں باتیں کرنا ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ اس وقت سیاست سے لے کر اپنی زندگی کے آئندہ پروگراموں پر غور ہوتا۔ ابوالکلام کی شخصیت ان کو بہت محبوب تھی اس لئے وہ اکثر کے بارے میں گفتگو کرتے رہتے۔ اس کے علاوہ غدر کے دور میں انگریزی استبداد سے ٹکر لینے والے مجاہدوں کی داستانیں اور ان تمام بہادروں کے کارنامے جو غدر کے بعد سے آزادی کے دور تک انگریز کے مظالم سے ٹکرا کر اپنی جان پر کھیل گئے تھے ایسے اور بہت سے محب وطن لوگوں کی داستانیں انہیں ازبر تھیں۔

انہیں غدر کی سو سالہ برسی منانے کی بڑی تمنا تھی۔

مجھے ۱۹۵۷ء کا بڑا انتظار ہے" ——— وہ بڑی دلسوزی سے کہتے۔

"ہم غدر کی سو سالہ برسی بڑے دھوم سے منائیں گے"۔

اب جیسے جیسے ۱۹۵۷ء قریب آتا جاتا ہے مجھے ان کے جملے بار بار یاد آتے ہیں۔

کیونکہ انیس سو ستاون میں تو خود ان کی چپ چاپ گذرنے والی برسیوں کو کچھ سال بیت چکے ہوں گے۔

"وہ کوئی انسان تھا، بلیّات، تھا پورا بلیّات"۔

"بلیّات" کا لفظ ان کی لغت میں بہت وسیع مفہوم رکھتا تھا۔ غصہ ہو تو "بلیّات"۔ پسندیدگی ہو تو "بلیّات" کوئی زیب

دے جائے تو "بلیّات"۔ اگر احترام و عقیدت منظور ہو تو گویا بہت ہی "بلیّات"۔ اِن بہت ہی "بلیّات" قسم کے لوگوں نے ان کے ذہن کا بہت بڑا حصہ گھیر رکھا تھا۔ جو لوگ کچھ بھی نہ ہوتے ان میں بھی عظمت کے پہلو ڈھونڈھ لیتے۔ اور گھر آ کر اطلاع دیتے کہ میں تو اسے یونہی سا آدمی سمجھتا تھا مگر وہ تو "بلیّات" نکلا پورا۔

ایک دن ایک لالہ جی کا قصہ سنا رہے تھے جو کہیں اتفاق سے کانگریس کی سیاسی تحریک کے سلسلے میں دس پندرہ دن جیل میں کاٹ آئے تھے اور اسے اپنی زندگی کا سب سے بڑا کارنامہ سمجھتے تھے۔ کہ میں نے اُن کا کر بات کا رُخ بدل دیا۔

مجھے معلوم تھا کہ بھوپال جیل کی جن کوٹھڑیوں میں بزمی نے ڈھائی سال رہ کر اپنی صحت برباد کی وہ کلکتہ کے بلیک ہول سے بدتر تھیں وہاں سانپ، بچھو اور حشرات الارض قیدیوں کی ہم نشینی کے فرائض انجام دیتے تھے۔ ریاستی جیلوں میں کسی درجہ کا تو سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ وہی عام قیدیوں کی بارکیں جہاں نہ روشنی تھی نہ کھلی ہوا اور گرمیوں کی رات کو جب تپتی ہوئی پتھر کی کوٹھڑیوں میں اِن قیدیوں کو بند کر دیا جاتا تھا۔ یہ وہی لوگ تھے جو عوام کے لئے روٹی، کپڑا، اسکول اور اسپتال مانگتے تھے۔

میں نے کہا بزمی، "یہ ٹھیک ہے کہ دنیا میں بہت سے عظیم انسان ہیں، بہت سے جی نیس ہیں مگر آپ بھی ...."

"ہم نے کیا ہی کیا ہے؟" بزمی نے تاسف کے انداز میں جواب دیا۔

رشید جہاں

صدیقہ بیگم سیوہاروی

رشید آپا!

یہ بات ہوگی اب سے کوئی تیرہ سال پہلے کی۔ میں علی گڑھ میں امیر نشاں میں رہتی تھی اور ابھی مجھے علی گڑھ آئے ہوئے مشکل سے پندرہ دن ہوئے ہوں گے کہ دیکھتی کیا ہوں کہ بوٹے سے قد کی ایک خاتون چلی آرہی ہیں۔ جان نہ پہچان بڑی خالہ سلام —— مردوں کی یہ بات مجھے پسند ہے کہ گھر میں مردانے میں بھی داخل ہوں گے تو دستک ضرور دیں گے۔ لیکن یہ خاتون چلی آئیں بس یونہی —— برسات کی سڑی گرمی پڑ رہی تھی۔ میں دوپٹہ کھسکے اطمینان سے پھر رہی تھی۔ میں کیا جانتی تھی کہ اس بھری دوپہر میں کوئی آجائے گا اور پھر آنے والا بھی ایسا کہ قمیص کے اندر گلے میں سے ہاتھ ڈال کر کھجائے جارہا ہو۔ کھجر کھجر —— مجھے اپنے بدن میں کھجلی سی محسوس ہونے لگی۔ آگئی بیگما کہیں سے، یہاں کھجانے کے لئے۔ میں ویسے ہی جھلسی ہوئی تھی، یہ رنگ ڈھنگ دیکھ، آئے حواس جاتے رہے۔ کہتی تو کیا کہتی اور بیگما ہیں کہ میرے سلام کا جواب دیئے بغیر کمرے میں گھسی چلی آرہی ہیں۔ میں میزبان اپنے گھر میں مہمان بنی جارہی تھی۔ جی میں سوچتی رہی کہ یہ اللہ ماری کون آگئی۔ اس وقت اس کی اچھی بھلی صورت بھی تو مجھے زہر لگ رہی تھی۔ بھلا گرمی میں بھی کوئی چیز اچھی لگتی ہے اور پھر ایسے چپچپاتے موسم میں۔

لیکن چند سیکنڈ کے اندر جیسے زمین میرے پاؤں کے نیچے سے کھسک گئی۔ مجھے اپنے تن بدن کا ہوش نہ رہا۔

"تم صدیقہ ہو؟ مجھے رشید جہاں کہتے ہیں۔"

"ڈاکٹر رشید جہاں!!!" میرے منہ سے بنا سوچے سمجھے نکل گیا۔

"کیوں کیا رشید جہاں کافی نہیں؟" —— انہوں نے بڑے پیار سے کہا جیسے کسی بچے کے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہہ رہی ہوں۔ پھر میرے کندھے پر ہاتھ رکھا تو مجھے اپنے دوپٹے کا خیال آیا۔ نفسیات کی ماہر بھی تو تھیں سمجھ گئیں۔ "اوہ! اپنے گھر میں سب ایسے ہی رہتے ہیں۔" لیکن مجھے اطمینان نہیں ہو رہا تھا۔ میں تڑپ کر اٹھی اور دوپٹہ ڈال کر آگئی۔ اب کہیں میرے ہوش و حواس ٹھکانے لگے۔

ذرا سی دیر میں بے تکلفی سے باتیں شروع ہوگئیں۔ ساری دنیا جہان کی باتیں۔ وہ سچ مچ کامیاب ڈاکٹر تھیں۔ کیسا ہی مریض ہو اُن کے سامنے آ کر ساری باتیں اُگل دے۔

اس روز دو تین گھنٹے میں مجھے محسوس ہوا جیسے میں انہیں بچپن سے جانتی ہوں اور سچ پوچھئے تو اس ملاقات کے بعد کوئی اور ملاقات نہ بھی ہوتی تو یہ دو تین گھنٹے ان کو اچھی طرح سمجھنے کے لئے کافی تھے۔

ہمارا ملازم باہر گیا ہوا تھا اور وہ چائے بنانے کے لئے مجھے اُٹھنے نہیں دے رہی تھیں آخر معاملہ اس پر طے ہوا کہ میں کمرے میں سماوار سے آؤں اور وہیں چائے بنے اور وہ چائے بنانے میں میرا ہاتھ بٹائیں۔ مگر چائے کے برتن، ہائے اللہ وہ بھی تو دُھلے ہوئے نہ تھے بس اور اُلجھ گئی۔ آگئیں چائے بنانے میں نے بھی سوچا جہاں من بھر وہاں سوا من۔ اس لئے وہ ماننے والی کہاں تھیں، ضدی جو ٹھہریں۔ جس بات پر اڑ جاتیں، بس اڑیل ٹٹو کی طرح اڑی ہی تو رہتیں (کم از کم میرا تجربہ تو یہی ہے۔ جب بھی ملی ہوں۔ میں نے انہیں کسی کے سامنے قائل ہوتے نہیں دیکھا)۔

اب اسی ملاقات میں لیجئے۔ ایک ناول نگار خاتون ہیں۔ بھلا سا نام ہے اُن کا۔ ہاں اے' آر' خاتون۔ اے۔ آر' خاتون کے ناول "شمع" کا علی گڑھ میں بڑا زور تھا۔ لڑکیاں برقعوں میں پیٹے پھرتی تھیں۔ جسے دیکھئے اسی پر ریجھا جا رہا ہے۔ اس سے پہلے، سُنا ہے کہ فیاض علی کے ناول "انور" اور "شمیم" بھی اسی طرح مقبول تھے اور پھر علی گڑھ کی لڑکیاں ——— وہ بھلا کہیں ایک دو بار کسی چیز کو پڑھ کر اپنی تسلی کرتی ہیں۔ وہ تو بس پڑھتے ہی چلی جاتی ہیں۔ گویا حفظ کرنے کا ارادہ ہو۔ ہاں تو علی گڑھ میں ان دنوں "شمع" کا زور تھا اور میرے تو اس پندرہ بیس روز کے اندر ہی اندر سنتے سنتے کان پک گئے تھے، کیونکہ میں نے بھی اسے پڑھا تھا اور مجھے تو بڑی ناامیدی ہوئی تھی۔ جیسے کھود کے پہاڑ اور اس میں سے نکلے "مری ہوئی چوہیا" اور اس روز کے بعد سے مجھے علی گڑھ کی لڑکیوں کے ناول پڑھنے کے ذوق اور ان کی پسند پر سے اعتماد اُٹھ گیا۔

ہاں تو مجھے یہ ناول ذرا بھی پسند نہ آیا۔ لیکن دنیا میں کیا نہیں ہوتا۔ اب کیا سنتی ہوں کہ ڈاکٹر رشید جہاں جو ترقی پسند تحریک کی بانیوں میں سے ہیں، اس ناول کی شان میں "قصیدیاں" پڑھ رہی ہیں۔ میرا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا اور آج تک میری سمجھ میں یہ بات نہیں آئی کہ وہ رشید جہاں جنہوں نے نہ جانے انگریزی، فرانسیسی اور روسی اور دوسری زبانوں کے کتنے اچھے اچھے ناول پڑھے تھے وہ اس ناول سے اتنا متاثر کیوں تھیں۔ میں تو بس انتقل تھے اُنگل داب سے رہ گئی پہلے تو میں نے بحث کرنی چاہی مگر اللہ کا نام لو۔" وہ بھلا کس کی بات مانتے ہیں"۔ اس لئے کہ وہ تو شاید دلی جا کر مصنفہ کو اس عظیم کارنامے پر مبارک باد بھی دے آئی تھیں۔ اب انہوں نے اس عظیم ناول کی عظمت پر لکچر دینا شروع کر دیا اور یہ ڈاکٹر رشید جہاں کی شخصیت کا اعجاز تھا کہ میں نے اس ناول کو دوبارہ پڑھا۔ مگر پھر بھی مجھے اس میں اچھے ناول کی کوئی بات نظر نہ آئی۔ لیکن وہ جب بھی ملیں نہ ان کی محبت اور خلوص میں کوئی فرق آیا اور نہ اے آر خاتون کے ناول کی قصیدہ خوانی میں۔

میں ابھی تک ان کا پورا نام لے رہی ہوں۔ یہ نام پڑھنے والوں کو نامانوس سا لگے گا۔ اس لئے کہ وہ تو جگ کی "رشید آپا" تھیں۔ لیکن ابھی تک میری سمجھ میں نہ آیا تھا کہ انہیں کیا کہوں۔ شوکت تھانوی کی "شیش محل" اس وقت تک نہیں آئی تھی اور اگر چھپ گئی تھی تو میں نے نہیں پڑھی تھی ورنہ یہ مسئلہ آپ ہی آپ حل ہو جاتا۔ کیونکہ بقول شوکت انہیں سب ہی رشید آپا کہتے تھے سوائے ان کے جو کسی مجبوری کی بنا پر نہ کہہ سکتے ہوں لیکن رشید آپا سے دوستی کے بعد مجھے یقین ہو گیا تھا کہ جی تو ان کا بھی چاہتا ہوگا۔ اتنے پیارے انسان کا نام لیکر کون پکارے گا۔ اگر صاحبزادہ محمود الظفر مل جاتے تو میں ضرور پوچھ لیتی۔

ہاں تو دو ایک روز بعد میں رشید آپا کی کوٹھی پر گئی۔ رشید آپا باہر ٹہل رہی تھیں مردانہ وار۔ (میں اس زمانے میں پردہ کرتی تھی) مجھے دیکھ کر خوش ہو گئیں جیسے میرا انتظار ہی تو کر رہی تھیں۔

"اچھا تو تم آگئیں"۔
میں نے کہا "آپ سے بدلہ جو لینا تھا"۔
رشید آپا مسکرادیں۔ "اچھا تو آج جی بھر کر بدلہ لو۔ میں بھی تیار بیٹھی ہوں"۔ اور پھر رشید آپا نے اپنی باتیں شروع کر دیں۔ اس دوران میں مجھے جو بات کھٹکتی رہی وہ یہی کہ انہیں کیا کہوں یہ میری کمزوری ہے کہ شادی شدہ عورتوں کو بھابی ہی کہتی ہوں چاہے میں نے اُن کے "اُن" کی شکل بھی نہ دیکھی ہو لیکن شیخ عبداللہ کی کوٹھی کا ہر آنے والا انہیں رشید آپا کہہ رہا تھا۔ بس مرتی نہ تو کیا کرتی۔ میں نے بھی ہتھیار ڈال دیئے۔ حالانکہ میں اگر انہیں 'بھابی' کہتی تو شاید پہلی اور آخری 'بھابی' کہنے والی ہوتی۔
ہاں تو اس روز پھر حسب دستور رشید آپا نے لمبی چوڑی باتیں شروع کر دیں۔ عجیب بات یہ ہے کہ میں نے ذراسی دیر کے لئے بھی یہ نہ سمجھا کہ رشید آپا اتنی پڑھی لکھی ہیں۔ علی گڑھ کے گرلز کالج کے بانی کی لڑکی ہیں اور نوابزادہ حمید الظفر کی بہو ہیں۔ بس مجھے تو وہ اپنی جیسی نظر آئیں۔
رشید آپا ابھی نہ جانے کتنی دیر باتیں کرتیں وہ تو پہلے سے کسی نے دستک دے دی۔ رشید آپا نے انہیں اندر بلایا۔ میں ٹھٹھک گئی۔ کہنے لگیں کہ "ارے یہ طالب علم نہیں ہے۔ اس سے پردہ کرنے کی کیا ضرورت ہے۔
میں بھی تن کر بیٹھ گئی۔ جیسے واقعی طالب علم ہی سے پردہ کرنے کی ضرورت ہو (میں آج بھی جب اس واقعے کو یاد کرتی ہوں تو مجھے اپنے اوپر ہنسی آتی ہے) لیکن بات سنجیدہ تھی۔ کوئی کامریڈ بیمار تھا اور رشید آپا کو اسے دیکھنے کے لئے جانا تھا۔ رشید آپا نے مجھ سے کہا "چلو پاس ہی ہے چلے چلیں تمہیں سیر کرا لاتے ہیں۔ ابھی بات کی بات میں آئے جاتے ہیں"۔ میں اللہ ماری ساتھ ہو پڑی۔
ہم لوگ چلتے چلے جا رہے تھے اور راستہ تھا کہ کھینچتا چلا جا رہا تھا —— عجیب و غریب آڑے ترچھے راستے اور گلی کوچے۔ میں نے اس سے پہلے ایسی گلیاں کاہے کو دیکھی تھیں اور رشید آپا جیسے ان راستوں پر سدا سے چلتی آئی ہیں۔ رشید آپا کو شاید میری تھکن کا احساس ہو گیا۔ اس لئے کہ انہوں نے باتیں شروع کر دیں۔ میں سمجھ گئی کہ مجھے کھلونے دے کر بہلا رہی ہیں۔ میں بھی اڑ گئی تھی کہ نہ بہلوں گی۔ پھر انہوں نے جاگیردارانہ نظام پر باتیں شروع کر دیں مگر میں پھر بھی ٹس سے مس نہ ہوئی۔ وہ بھانپ گئیں اکدم سے موضوع بدل کر بولیں "تمہارا رسالہ کیسا چل رہا ہے۔ (اس زمانے میں، میں ایک زنانہ رسالہ نیا راگ کی ادارت کر رہی تھی۔)
میں نے کہا "بس یونہی"۔
اس وقت اگر میں چاہتی تو بڑے مزے میں رشید آپا سے ایک کہانی کا وعدہ لے لیتی لیکن میں جل رہی تھی۔
رشید آپا بولیں "لیجئے ہم آگئے"۔ اب ہم ایک تنگ و تاریک راستے سے گزر رہے تھے۔ بڑے گندے گندے مکان نظر آ رہے تھے پھر رشید آپا نے اطمینان سے کہا "بس ان ہی میں سے کوئی مکان ہوگا۔ بھلا یہاں کوئی تندرست رہ سکتا ہے یہاں تو بیماریوں کے جراثیم پلتے ہیں اور ہم ان بیماریوں کا علاج کرتے ہیں۔ کیوں صدیقہ غلامی لعنت ہے یا نہیں"۔
اور میں اس وقت ان کے تیور دیکھ کر بے حد سنجیدہ ہو گئی تھی۔ میں نے ڈرتے ڈرتے کہا "جی ہاں" اور یہ کہنے کو تو کہا لیکن پھر مڑ کر دیکھا کہ کہیں کسی کامریڈ نے تو نہیں سُنا اور پھر اطمینان کا سانس لیا۔ سچ ہے اگر کوئی اس وقت سُن لیتا تو ہنس پڑتا لیکن میں کہتی ہوں کہ اگر اس وقت فراق گورکھپوری یا مجاز مرحوم بھی ہوتے تو ان کی زبان سے بھی یہی نکلتا کہ "جی ہاں" ——
رشید آپا بڑبڑاتی چلی جا رہی تھیں۔ اب ہم مکان در مکان گھستے چلے گئے آخر ایک اندھیری سی کوٹھری میں پہنچے جہاں ایک بیمار کے کراہنے کی آواز آ رہی تھی۔ رشید آپا نے سرہانے جا کر اس کا تھرمامیٹر لیا۔ اوہ ۱۰۳ ڈگری بخار ہے۔ کیوں جی اس کو کب سے بخار آ رہا ہے؟
"ابھی کئی روز سے"۔ اس کامریڈ نے کپکپاہٹ سے جواب دیا۔

"اور تم کو آج فکر ہوئی۔ وہ چار روز اور ٹھہر جاتے۔ کس کا انتظار کر رہے تھے۔"

رشید آپا کو غصہ آ رہا تھا اور وہ خاموش تھا۔ پھر انہوں نے مریض کا باقاعدہ معائنہ کیا اور معائنہ کا یہ سلسلہ پندرہ منٹ جاری رہا۔ پھر رشید آپا نے ایک نسخہ لکھ کر اس کے حوالے کیا اور بولیں۔

"دیکھو! دودھ کے سوا اور کچھ مت دینا اور ہاں سنگترے کا عرق ضرور پلاؤ۔"

کامریڈ نے نسخہ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور پھر رشید آپا کو ذرا ایک طرف لے جا کر ڈرتے ڈرتے بولا: "آپ نے نسخہ تو لکھ دیا مگر دوا کہاں سے آئے گی، یہاں تو پھوٹی کوڑی پاس نہیں۔ پیسے ہوتے تو کسی ڈاکٹر کو ——— "وہ کہتے کہتے رُک گیا۔

میں سہم گئی۔ رشید آپا کے تیور پہلے ہی سے کیا کم بگڑے ہوئے تھے اور رشید آپا کیا کوئی اور ڈاکٹر بھی ہوتا تو یہ سن کر اس کے غصّے کا پارا نہ جانے کتنا اور چڑھ جاتا ——— لیکن رشید آپا ——— جیسے کسی نے آگ پر پانی چھڑک دیا ہو اور ان کے چہرہ سے جیسے کسی نے سارا غصہ سوت لیا ہو۔ اُنہوں نے آہستہ سے کہا۔ "اچھا میرے ساتھ چلو ——— اب ہم تینوں چل پڑے۔ بہت دُور تک خاموش چلتی رہیں پھر میری طرف متوجہ ہوئیں۔ "کیوں صدیقہ! یہ حالات اپنے آپ بدل جائیں گے یا ان کو بدلنا پڑے گا۔"

آپ بتائیے اس کا کیا جواب ہوگا۔ اور میں جانتی ہوں کہ راجہ صاحب محمود آباد بھی ہوتے تو وہ بھی وہی جواب دیتے۔ جو رشید آپا کے دل میں تھا اور میری زبان پر۔"

ترقی پسندی کا یہ پہلا سبق تھا جو رشید آپا نے مجھے پڑھایا۔ میرس روڈ کی سڑک پر چلتے ہوئے۔

"موت اور اس مریض میں زیادہ فاصلہ نہیں ہے۔ شاید اتنا بھی نہیں جتنا کہ مجھ میں اور تم میں ہے"۔ رشید آپا نہ جانے کیا کیا کچھ کہتی رہیں اور میں یہی سوچتی رہی کہ واقعی ان حالات کو بدلنا ہوگا یہ اپنے آپ نہیں بدلیں گے۔

میں ابھی وہیں تھی اور رشید آپا آگے بڑھ گئی تھیں۔ "بیچارہ اندھیرے میں پڑا کراہ رہا ہے۔ اندھیرے ہی ہے لیکن اس اندھیرے کو اندھیرا کہنا بھی تو جرم ہے۔"

میں اُن کی باتیں سنتی رہی۔ پھر اُن کی کوٹھی آگئی۔ رشید آپا اندر جا کر دس روپے کا ایک نوٹ لائیں اور اس آدمی کو دے کر بولیں "لو! فوراً دوا لا کر پلاؤ۔ سنگترے بھی لیتے آنا۔ کل مجھے حال بتانا یا میں خود آ کر دیکھ لوں گی تمہارے آنے کی ضرورت نہیں ہے۔"

اب رشید آپا سے میری خوب دوستی ہو گئی لیکن اگر دوستی نہ بھی ہوتی تو اس میں فرق ہی کیا پڑتا اس لئے کہ پہلے ہی روز وہ مجھ سے اس طرح ملیں کہ غیریت کے سارے پردے اُٹھ گئے تھے میں اپنے آپ پر کئی روز ناز کرتی رہی۔ رشید آپا مجھ سے بے تکلفی سے باتیں کرتی ہیں مجھے اپنی بہن کی طرح سمجھتی ہیں۔ مجھے کتنی اچھی اچھی باتیں بتاتی ہیں ——— لیکن یہ ایک فریب تھا جو بہت دن نہ چل سکا۔ اور میں اس خود فریبی میں زیادہ مبتلا نہ رہ سکی۔ اس لئے کہ وہ تو ہر ایک سے اسی بے تکلفی سے ملتی تھیں۔ میرے ساتھ کوئی خصوصیت تھوڑا ہی تھی۔ وہ ہر ایک سے ہی تو اسی محبت اور خلوص سے ملتی تھیں۔

"واہ جی تم ابھی تک بی اے میں ہو۔ میں تو جب تم سے بھی چھوٹی تھی یہی اب سے کوئی پندرہ سولہ سال پہلے تب کیننگ کالج لکھنؤ میں پڑھتی تھی ——— تم ابھی تک بی اے میں ہو۔"

اور لڑکی نے تپاخ سے جواب دیا "جی ابھی تک کیوں اسی سال تو آئی ہوں بی اے میں۔"

اور رشید آپا ہنس پڑیں۔ "بڑی ذہین ہو میں اتنی ذہین نہ تھی"۔ وہ لڑکی خوش ہو گئی اور پھر رشید آپا نے اسے پاس بلا کر بٹھایا اور

جاتے پاتی۔

لیکن رشید آپا کی شخصیت کے کئی پہلو تھے۔ وہ یوں تو اللہ میاں کو مانتی نہ تھیں لیکن دعائیں اور کوسنے بڑے مزے میں دیتی تھیں۔ بالکل بڑے بوڑھوں کے سے۔ یہ اور بات ہے کہ ان کے کوسنے میں ماستا کی تڑپ بھی شامل ہوتی۔ منہ پہ آکر بات پرائی ہو جاتی ہے۔ اس لئے زبان سے لوٹالیتی ہوں ورنہ ان کے ایک آدھ کوسنے کا ذکر نوک قلم تک آ ہی گیا تھا۔ نہ جانے لوگ اس کی کیا کیا تاویلیں کریں —— بس یوں سمجھئے کہ وہ چڑھ کر کٹر کٹر کوسنے سے بھی نہ چوکتی تھیں مگر وہ جل بھنی کب تھیں۔

میری اور رشید آپا کی ملاقات کا سلسلہ کافی دنوں تک رہا۔ پھر وہ لکھنؤ چلی گئیں اپنے سسرال۔ اور میں چند مہینوں کے بعد سی۔ پی چلی گئی۔ —— اس زمانے میں کبھی کبھی خط و کتابت کا سلسلہ بھی رہا، لیکن اکھڑا اکھڑا سا۔

اگر کہیں نثر میں استاد اور شاگرد کا سلسلہ چلتا ہوتا تو میں ڈنکے کی چوٹ پہ کہتی ہوں کہ میں اپنی تمام ترقی پسندی کے باوجود نذر چڑھاوے چڑھا، حق فرض ادا کر اُن کی باقاعدہ شاگرد ہو چکی ہوتی لیکن شاگرد تو اس کے باوجود بھی تھی —— رسم رسوم ادا نہ کرنے سے کیا ہوتا ہے۔ انہوں نے مجھے جو کچھ بھی سکھایا وہ آج بھی میرے لئے مشعل راہ ہے۔

ستمبر ۴۷ء میں شادی کے بعد میں الہ آباد چلی آئی لیکن نہ جانے کیوں مجھے رشید آپا سے شرم آتی تھی کہ میں انہیں اپنی شادی کی اطلاع دیتی۔ دعوت تو خیر کیا دے سکتی کیونکہ شادی ہی ایسی کون سی شاندار ہوئی تھی بس دو بول پڑھے گئے تھے نہ ڈھول تاشے بجے نہ شہنائی۔ لیکن رشید آپا ڈھ لگائے تھیں، جیسے بس موقع کی تاک میں ہوں۔

عوامی تھیٹر کی کانفرنس الٰہ آباد میں تھی۔ اس میں جہاں ہندوستان کے کونے کونے سے لوگ آئے رشید آپا بھی لکھنؤ سے شرکت کے لئے چلی آئیں۔ رات کو ایک ڈراما "جادو کی کرسی" تھا۔ میں اسے دیکھنے کے لئے گئی۔ اچانک رشید آپا سے ملاقات ہو گئی۔ مسلسل بیماری کی وجہ سے ان کی تندرستی خراب ہو گئی تھی۔ چہرے پر بس گھنگھریالے بال نظر آتے تھے —— زرد زرد، ہو رہی تھیں، جیسے کسی نے خون چوس لیا ہو۔ لیکن آنکھوں میں وہی چمک، وہی ذہانت اور وہی تیزی تھی۔ اور آنکھوں کا کیا، زبان کا حال بھی وہی تھا بیشتر اس کے کہ میں کچھ کہوں وہ تو بس مجھ پہ چپٹ پڑیں۔ "شادی کر کے بیٹھ گئیں اور مجھے پوچھا تک نہیں کہاں ہے تیرا دولہا۔" انہوں نے سب کے سامنے کچھ اس طرح کہا کہ میں دولہنوں کی طرح شرما گئی۔ "چل ابھی دکھا —— ہمیں پوچھا نہیں اور دولہا لیکر بیٹھ گئیں"۔ رشید آپا کھلی پڑتی تھیں اور میں سمٹی جاتی تھی۔ مجھے اندر لے گئیں ڈراما شروع ہونے میں دیر تھی وہاں کچھ اور خواتین بھی آگئیں۔

اردو کے مشہور شاعر مسعود اختر جمال صاحب کے گھر کی کچھ خواتین۔ رشید آپا نے پھر وہی گفتگو شروع کر دی۔ اسی انداز میں جیسے اب سے چند سال پہلے علی گڑھ میں کیا کرتی تھیں، جیسے وہ اتنے گزرے ہوئے ماہ و سال کا مذاق اُڑا رہی ہوں۔ اُن کی طبیعت میں رتی بھر جو تبدیلی آئی ہو۔ میرا جی چاہ رہا تھا کہ کسی طرح ڈراما شروع نہ ہو اور وہ یوں ہی باتیں کرتی رہیں۔ لیکن ڈراما شروع ہو گیا۔ یہ ایک طنزیہ سیاسی ڈراما تھا۔ جس میں طباخ سائیں اور حبیب تنویر وغیرہ کام کر رہے تھے۔ دلچسپ اتنا کہ سارے دیکھنے والے محو۔ میں نے ایک مرتبہ جو مڑ کر دیکھا تو رشید آپا غائب۔ معلوم ہوا کہ پیچھے مزدوروں کے جھنڈ میں بیٹھی ہوئی دیکھ رہی ہیں۔ پھر ذرا سی دیر بعد جب ایک اسٹیج پر روشنی پڑی تو دیکھتی کیا ہوں کہ رشید آپا بالکل آگے والی نشست میں بیٹھی ہیں۔ رشید آپا اب وہ جھوٹی تھیں۔ لیکن یہ محض اتفاق نہ تھا۔ مجھے اس روز معلوم ہوا کہ عام لوگوں کی طرح رشید آپا کسی ایک طبقے کی فرد نہیں۔ اگر آپ نے انہیں دیکھا ہے تو جانتے ہوں گے کہ نچلے طبقے میں وہ مزدور تھیں اور اونچی طبقے کے آداب سے بخوبی واقف تھیں کیونکہ انہوں نے

ایسے ماحول میں پرورش ہی پائی تھی - اور درمیانی طبقہ اُن کے لئے اجنبی نہ تھا - وہ ڈاکٹر تھیں اور ان گھروں میں ان کا روز کا آنا جانا تھا اور ہم جیسوں سے انہیں اللہ واسطے کی محبت تھی -

غرض ہر جگہ وہ ایک جیسی تھیں - کسی محفل میں اجنبی نہ تھیں - جہاں پہنچ جاتیں ایسا معلوم ہوتا کہ گویا بس اسی ماحول میں پلی بڑھی ہیں - بس وہ تو اس میں گھل مل جاتیں - کون ہے مائی کا لال جو دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ الگ کر دے ——— ہاں تو بات چلی تھی اس ڈرامے کے بارے میں یہ ڈراما بہت پسند کیا گیا اور الٰہ آباد جیسے شہر میں بار بار اسٹیج ہوا - ہر ایک واہ واہ کر رہا تھا - یہاں تک کہ مخالفین بھی عش عش کر کے اُٹھتے تھے - لیکن رشید آپا نے منہ پھلائے کہہ دیا "قطعی بکواس "۔

میں چونک پڑی "رشید آپا! کیا کہہ رہی ہیں آپ - اس ڈرامے کے بارے میں تو دو رائے ہو ہی نہیں سکتیں "- میں نے اپنی بات پر زور دیتے ہوئے کہا - (دراصل بحث کرنے میں میں یوں بھی کمزور ہوں)

"ابی دو رائے کی کچھ مت کہو - دو رائے تو اشتراکیت پر بھی ہیں - انسانی مساوات اور برابری پر، سرمایہ داری کے خاتمے پر، مزدوروں کی بحالی پر ——— " رشید آپا نے تڑسے جواب دیا اور مجھے ایسا لگا کہ جیسے میرا منہ دبرا ہو گیا ہو - اور پھر رشید آپا نے نہ جانے کیا کیا کہہ ڈالا - میں نے تو کچھ سُنا نہیں - رشید آپا اپنی بات پر اڑی رہیں - یہ ڈراما عام طور پر پسند کیا گیا - پھر مجھے رشید آپا کی رائے کا پس منظر معلوم ہوا۔

ڈرامے کے مکالموں کے طنز مزدوروں کے سمجھ میں نہیں آئے تھے، جو پیچھے بیٹھے ہوئے تھے - اتفاق سے ڈرامے کا موضوع ہی طنز پر مبنی تھا - نتیجہ یہ ہوا کہ وہ ڈراما ہی سمجھنے سے قاصر رہے اور رشید آپا مزدوروں کے خیالات کی ترجمانی کر رہی تھیں - اور یہی نہیں بلکہ میں نے سُنا کہ بعد میں ان سے اور برلاج ساہنی سے اس پر خوب بحث بھی ہوئی - انہوں نے عوامی تھیٹر کے تمام ساتھیوں سے شدت سے اختلاف کیا - کچھ لوگوں کو اُن کی تنقید بُری بھی لگی لیکن رشید آپا بلاوجہ کبھی کسی کو خوش نہ کرتی تھیں۔

اگلے دن میری بچّی کی طبیعت خراب تھی - لیکن شام کو میں رشید آپا سے ملنے چلی آئی اور جب رشید آپا کو معلوم ہوا تو مجھ پر برس پڑیں - ہم نے اپنی ماں اور ساس کی بھی اتنی باتیں کاہے کو سُنی تھیں - سچ سچ رشید آپا مردانہ وار زندگی گزارنے کے باوجود عورتوں کا سا مزاج رکھتی تھیں - وہ عورتوں کی طرح بگڑ رہی تھیں ——— "تم بیمار بچّی کو چھوڑ کر نکل پڑیں" واہ لڑکی واہ ——— ننھی سی جان کا اتنا بھی خیال نہیں، بھلی ہو گئی میری محبت ——— " اور مجھے اُلٹے پاؤں لوٹنا پڑا، مرتی نہ کیا کرتی - ذرا سی دیر بعد دیکھتی کیا ہوں کہ رشید آپا میرے گھر پر موجود ——— اس وقت وہ اپنا آلہ لئے ہوئے تھیں اور خوب سنجیدہ تھیں - معمولی ڈاکٹر ———

بچّی ایسی کوئی خاص بیمار بھی نہ تھی کہ جس کا علاج کرنا اتنا ضروری ہو - یونہی بس نزلے زکام کی شدت سے بخار ہو گیا تھا لیکن رشید آپا نے علاج شروع کر دیا اور جب تک بچّی اچھی نہ ہو گئی وہ برابر اسے خود آ کر دیکھتی رہیں اور انہوں نے میرا تو گھر سے نکلنا تقریباً ناممکن کر دیا۔

رشید آپا پر مجھے غصّہ بھی بہت آیا ہے - وہ سامنے ہوتیں تو ایسی جلی کٹی سناتی کہ چھٹی کا دودھ یاد آتا۔

یہ بھی اسی زمانے کی بات ہے جب الٰہ آباد میں تھی - اس زمانے میں یوں تو پردہ چھوٹ چکی تھی - لیکن گھر والوں کے سامنے بس یونہی سا کرتی تھی محض دکھاوے کا - حالانکہ انہیں بھی اس کا علم تھا لیکن محض بڑے بوڑھوں کے جذبات کا پاس جو رکھنا تھا - اب میں کسی اور سے کیا کہتی - اسی زمانے کی بات ہے - مہینے میں چار پانچ آدمی ایسے ملنے چلے آتے تھے جنہیں رشید آپا نے میرے پاس بھیجا ہوتا - ان لوگوں کو محض افسانہ نگار خواتین سے ملنے کا شوق ہوتا - اس کا اندازہ تو کچھ وہی لڑکیاں کر سکتی ہیں جنہیں ایسے "انوکھی آفت" کا مقابلہ کرنا پڑا ہے یہ بات لکھنے کی نہیں۔

بات یہ تھی جو لوگ رشید آپا سے بحیثیت افسانہ نگار ملنے جاتے انہیں وہ میرے پاس "ریفر" کر دیتیں - اب میں نمٹوں ان سے - اور

گھر میں چہ می گوئیاں ہ اسے لو، بیگما اخباروں میں تو لکھتی ہی تھیں اب مردوئے بھی ملنے آنے لگے" لیکن رشید آپا سے کیا کہوں۔ کبھی کبھی جی میں آتا کہ ایک غصہ سے بھرا ہوا خط لکھ دوں۔ لیکن پھر رہ جاتی ——— البتہ اس کا فائدہ یہ ضرور ہوا کہ میں نے بہت جلد اس دورخی کو چھوڑ دیا۔ غالباً رشید آپا نے سوچ سمجھ کر یہ کیا ہو۔ کیونکہ اب کوئی نہیں آتا۔ لیکن رشید آپا بھی تو زندہ نہیں ہیں۔"

رشید آپا کا گھرانہ بڑا عجیب و غریب ہے، ایک بہن گرلز کالج کی پرنسپل تھیں تو ایک بہن فلم ایکٹرس بھائی بھا دوج بھی فلم لائن میں تھے۔ اور رشید آپا ——— انہیں کون نہیں جانتا۔ رشید آپا اپنے گھر میں سب سے الگ تھیں۔ وہ چاہتیں تو عیش کی زندگی گزار سکتیں تھیں۔ لیکن انہوں نے ہر قسم کے عیش و آرام کو ٹھکرا کر ایک عام انسان کی زندگی کو ترجیح دی۔

اسی کوٹھی میں، مَیں نے اُن کی ایک بہن کو دیکھا جو اپنی جوتی کی ایڑی کے بل پر چل رہی تھیں۔ پاس پڑوس کی فضا سے بے نیاز ——— ہم چار پانچ لڑکیاں رشید آپا کے پاس بیٹھی تھیں کہ اُن کی بہن آئیں اور ہمارے سلام کا جواب دیئے بغیر گزر گئیں ——— رشید آپا شرمندہ تھیں گویا یہ بد اخلاقی اُن سے ہی ہوئی تھی۔ دوسروں کی کمزوری کو اس طرح اپنانا بھی تو بڑی بات ہے۔

میں نے شاید یہ کہیں نہیں لکھا کہ رشید آپا کمیونسٹ تھیں۔ اس کی ضرورت بھی نہیں اس لئے کہ ایسے لوگ اگر کمیونسٹ نہ بھی ہوں تو اُن کی بڑائی میں کوئی خاص فرق نہیں پڑتا۔

آج رشید آپا ہمارے درمیان نہیں۔ وہ یہاں سے ہزاروں میل دور روس کی سرزمین میں آرام کر رہی ہیں لیکن میں جانتی ہوں کہ رشید آپا کی روح بے چین ہوگی خاک وطن کے لئے۔ وہ اپنی بیماری کا علاج کرنے گئی تھیں۔ روس کی مٹی نے انہیں اپنی طرف کھینچ لیا۔ آج روس میں اُن کی ایک حسین سی قبر ہے۔ شاید ہم رشید آپا کے لئے اتنی حسین قبر نہ بنوا سکتے۔ اس لئے کہ ہمیں ابھی اُن کی عظمت کا صحیح معنوں میں احساس بھی نہیں۔ لیکن کون جانے ایک وقت ایسا بھی آئے جب ایک قبر ماسکو سے لکھنؤ لائی جائے۔ جس میں روس کی مٹی خاک ہند سے ملے۔ ہماری امانت ہمیں واپس مل جائے۔

رشید آپا ترقی پسند تحریک کی بانیوں میں سے ایک تھیں۔ وہ ایک بڑی افسانہ نگار تھیں۔ کم لکھتی تھیں لیکن بہت اچھا لکھتی تھیں۔ وہ بہت اچھی معالج تھیں ——— وہ کمیونسٹ تھیں اور وقت آنے پر سرگردن سے اتار کر ہتھیلی پر رکھ لیتی تھیں لیکن ان کی بڑائی ان کے افسانوں میں نہیں ——— ان کے علاج معالجے میں نہیں، ان کے کمیونسٹ ہونے میں نہیں ——— ابھی کتنے افسانہ نگار اور پیدا ہوں گے جو شاید اُن سے زیادہ اچھے افسانے لکھیں گے۔ اُن سے اچھے اچھے ڈاکٹر بھی پیدا ہوں گے۔ اُن سے اچھے اچھے کمیونسٹ بھی پیدا ہوں گے جو قوم کے لئے اُن سے بڑی قربانیاں بھی دیں گے ——— لیکن ان میں کوئی رشید آپا نہ ہوگا۔ وہ سراپا خلوص کہاں ملے گا۔ وہ محبت کس میں ملے گی۔

وہ بے باک تھیں اور شاید اسی لئے کہ اُن کے دل و دماغ میں گانٹھیں نہ تھیں۔ وہ کبھی کسی چیز کو فرض کر کے آگے نہ بڑھتی تھیں۔ جو دیکھتی تھیں بس وہی کہتی تھیں۔ ہو سکتا ہے کہ اس میں اُن کے ڈاکٹر ہونے کو دخل ہو، جو مفروضات پر علاج نہیں کرتا۔ ہو سکتا ہے کہ اُن کے حقیقت پسند فنکار ہونے کو دخل ہو۔ لیکن یہ سچ ہے کہ وہ بے باک تھیں اور نڈر تھیں۔

لوگ کہتے ہیں کہ پچھلے دنوں جب انہیں پولیس نے خطرناک سمجھ کر گرفتار کر لیا تھا تو ان کے مریضوں نے انہیں چھڑوایا۔ میں اس واقعہ کی سچائی کے بارے میں تصدیق سے کچھ نہیں کہہ سکتی تاہم یہ بات رشید آپا کے لئے غیر ممکن نہیں۔

مَیں نے رشید آپا کی شخصیت کا یہ ہلکا سا جائزہ لیا ہے ہو سکتا ہے کہ بعض لوگوں کو یہ شکایت ہو کہ میں دودھ کا دودھ پانی کا پانی نہ کر سکی۔ اُن کی شخصیت کی کمزوریاں سامنے نہ لا سکی۔ لیکن میں نے انہیں کیمرے کی آنکھ سے نہیں اپنے دل و دماغ سے دیکھا تھا اس لئے ہو سکتا ہے کہ چہرے کے داغ نظر سے اوجھل ہو گئے ہوں لیکن اگر آپ انہیں جانتے ہیں تو ذرا مجھ سے نظریں ملا کر سچ سچ بتایئے ان میں خامیاں تھیں بھی کب ———

مجاز [1]

ابواللیث صدیقی

۱۹۳۲ء میں علی گڑھ کا انٹرمیڈیٹ ٹوٹا تو اسکول کی جماعتیں اسکول کے ساتھ اور کالج کی جماعتیں یونیورسٹی کے ساتھ ملحق کر دی گئیں چنانچہ میں بھی یونیورسٹی پہنچا۔ ایک تو یونیورسٹی کی شہرت اور فضا کا مجھ پر پہلے ہی سے رعب تھا۔ پھر علی گڑھ میں بعض ایسی روایات تھیں جن سے اکثر نو واردین گھبراتے تھے۔ یہاں سینئر اور جونیر میں کچھ ایسا حفظِ مراتب تھا کہ بیچارے جونیر عرصہ تک اپنے آپ کو محض 'بدھو' اور سینئروں کے رحم و کرم پر سمجھتے تھے۔ اقامتی زندگی میں سینئروں کو خاص مراعات حاصل تھیں۔ ڈائننگ ہال میں 'بالائی' اور مرغ کا 'ڈونگا' اور 'پنجیری'[2] تو خیر ان کا حصہ تھا ہفتہ میں پیر کے دن 'بریانی' اور جمعہ کے دن 'شاہی ٹکڑے' بھی پہلے ان کی خدمت میں پیش ہوتے۔ پھر ان سینئر بیروں کا حصہ ہوتا جو جونیروں کو بتا دیتے کہ میاں یہ "ویرائٹی" صرف سینئر طالبعلموں کے لئے ہوتی ہے۔ پھر یہ سینئر طالب علم واقعی تھے بھی سینئر، مثلاً ان میں سے ایک صاحب ممتاز ہوسٹل کے ایک ہی کمرے میں بارہ سال سے مقیم تھے اور بی۔ اے پاس نہ کر سکے تھے، ہر سال وہ ایک آدھ مضمون میں پاس ہو جاتے اور دو ایک میں فیل، اور حساب لگاتے تو ہر مضمون میں الگ الگ کئی مرتبہ پاس ہو چکے تھے۔ اب یہ 'مضامین' کی ستم ظریفی تھی کہ انہوں نے طے کر رکھا تھا کہ ان کا ملاپ یا سنجوگ کبھی نہ ہو۔ ایسے سینئر طالب علموں سے جونیر تو درکنار بڑے بڑے بھاری بھاری عہدہ دار بھی ڈرتے تھے اور ان کا بڑا احترام کرتے تھے۔

یونیورسٹی پہنچتے ہی مجھے بھی اس 'فضا' کو محسوس کرنا پڑا۔ خیریت یہ تھی کہ اس وقت کے چند نہایت ہی "سینئر" میرے عزیز اور ہم وطن تھے اور ان کے کرم سے میں ان آزمائشوں سے کسی قدر محفوظ رہا جن سے بالعموم جونیر طالب علموں کو گزرنا پڑتا تھا، پھر بھی میں بڑی اجنبیت محسوس کرتا، میری حالت اس وحشی ہرن کی سی تھی جو جال میں نیا نیا پھنسا ہو۔ ایک دقت یہ تھی کہ میں نہ 'جونیر' تھا نہ 'سینئر'۔ جونیر کے سلسلے سے تو میں یوں خارج سمجھا جاتا تھا کہ بعض اساتذہ اور سینئر طالب علم مجھ پر غیر معمولی شفقت فرماتے، اور مجھے ایسی مراعات حاصل تھیں جو جونیروں کو نصیب نہ ہوئیں۔ سینئروں سے میں خود گھبراتا اس لئے میری وحشت کا علاج سمجھ میں نہ آتا تھا۔

---

[1] یہ مضمون مرحوم کی زندگی میں لکھا گیا تھا۔

[2] علی گڑھ کی خاص اصطلاح میں مرغ کا قورمہ اور پلاؤ وغیرہ۔ اصل میں اصطلاح یہ ہے کہ ڈاکٹر کی تجویز پر بیماروں کے لئے ڈائننگ ہال میں خاص کھانا پکوایا جاتا تھا۔ اکثر سینئر طلباء ڈاکٹر سے اپنے مرغ کا شوربہ اور پلاؤ وغیرہ بطور پرہیزی غذا تجویز کرا لیتے تھے۔

اتفاق سے اسی زمانہ میں علی گڑھ کی یونین (SIDDON'S UNION CLUB) کلب میں ایک مباحثہ ہوا۔ یہ مجھے معلوم تھا کہ یونین کے اس پلیٹ فارم سے عبدالرحمان صدیقی، مولانا شوکت علی، مولانا محمد علی، مولانا ظفر علی خان، ڈاکٹر ذاکر حسین اور خواجہ غلام السیدین جیسے مقرر پیدا ہوئے تھے اور یہاں تقریر کرنے کے لئے بڑی جرأت، ہمت اور استقلال کی ضرورت تھی۔ بہرحال میں تقریر کر ڈالی اور خلافِ توقع بڑی داد پائی، تقریر کو کئی دن ہو چکے تھے۔ میں آفتاب ہوسٹل کے کمرہ نمبر ۶۲ میں مقیم تھا، سہ پہر کے وقت ایک تیز طرار، خوش پوش اور خوش رُو طالب علم تشریف لائے، تعارف ہوا، فرمانے لگے "ڈاکٹر[1] صاحب! میرا نام انصار الحق ہاروانی ہے۔ کلاس میں ہم دونوں ساتھ ہیں لیکن اب تک تعارف نہ تھا۔ یونین میں آپ نے بڑی اچھی تقریر کی۔ یہ دیکھئے ہمارے یہاں سے طالب علموں کا ایک ہفتہ وار انگریزی اخبار نکلتا ہے، اس میں آپ کی اس تقریر کی بڑی تعریف ہے۔"

یہ انصار سے میری پہلی ملاقات تھی۔ اس کے بعد انصار کے بڑے بھائی اسرار اور پھر بہن صفیہ سے میری ملاقات ہوئی۔ اسرار اس وقت اسرارالحق تھے، مجاز کی شہرت صرف ایک محدود حلقے میں تھی۔ صفیہ سکول میں پڑھتی تھیں، بعد میں جب انہوں نے اردو میں ایم۔اے کیا تو میری شاگرد بھی رہیں۔ پھر وہ جاں نثار کی رفیقۂ حیات بنیں اور ۱۹۵۳ء میں انتقال کیا۔ مجاز پر ہوش اور دیوانگی کے بہت سے عالم گزر گئے جب تک علی گڑھ میں رہا اکثر ملاقات رہی، پاکستان بنا اور میں ادھر رہ گیا۔ اس کے بعد مجاز سے صرف ایک مرتبہ لاہور میں ملاقات ہوئی۔ بھائی انصار اس وقت بھی قوم پرست تھے اب بڑے سیاسی لیڈر ہیں۔ جب وہ میرے ساتھ تھے اس وقت علی گڑھ میں عبدالرحمان، انور شیخ، احمد عباس اور حافظ عثمان انصاری جیسے آتش بیان مقرر دھوم دھام سے تھے ان کے سامنے انصار نوآموز تھے لیکن ان کے منجھے ہوئے انداز اور شیریں گفتار نے انہیں یونین کے نمایاں مقرروں میں شامل کرا دیا تھا۔ ان کے تیکھے خدوخال، پتلے ہونٹ اور روشن چہرے اور نگاہوں میں ایک جوش اور حرکت اب تک میری آنکھوں میں پھرتی ہے۔ تینوں بہن بھائیوں کی صلاحیتوں، شہرت اور کارناموں پر غور کرتا ہوں تو محسوس ہوتا ہے کہ ذہانت، شرافت اور لیاقت تینوں نے ورثہ میں پائی تھی۔

مجاز کی نشوونما علی گڑھ کے خاص ماحول میں ہوئی۔ یونیورسٹی سے ہٹ کر علی گڑھ بڑی خشک، غیر دلچسپ اور غیر شاعرانہ جگہ تھی۔ شہر میں تالوں کی تجارت ہوتی اور ریلوے اسٹیشن پر علی گڑھ کی مشہور "ساگونی" کی آوازیں سنائی دیتی تھیں۔ ساگونی ہو شکر سے تیار ہوتی لیکن صورت اور مزہ دونوں میں "صابون" سے مشابہ ہوتی۔ لیکن اس غیر شاعرانہ ماحول میں یونیورسٹی کی دنیا الگ تھی۔ اس کے دارالاقامون میں زندگی اپنے پورے جلال و جمال، آب و تاب اور رنگ و بو کے ساتھ جلوہ گر تھی، ان میں کھلنڈرے، شاعر، ادیب، ملّا اور مولوی، رند اور زاہد، پڑھنے والے اور بے فکرے سب ہی جمع تھے۔ کسی کمرے میں طبلے کھنکتے اور ستار کے تار جھنجھناتے سنائی دیتے، کہیں شعر و شاعری کے چرچے ہوتے، کہیں تاش کی محفل جمی ہوتی، کہیں کرکٹ، فٹ بال اور ہاکی کا ذکر ہوتا۔ لیکن دو چیزیں سب میں مشترک تھیں "خوش باشی" اور "خوش مذاقی"۔ تیسرے درجے کے گھٹیا پن کا تو ذکر کیا کوئی "دوسرے درجے کی بات" بھی اس ماحول میں مستحسن خیال نہیں کی جاتی تھی، شاید علی گڑھ کی اقامتی زندگی کی شہرت اور کامیابی کا راز اسی معیار میں مضمر تھا۔ اور اسی وجہ سے جو لوگ علی گڑھ میں رہتے اور بستے تھے وہ بھی اپنے بچوں کو ہوسٹل میں کچھ وقت گزارنے بھیج دیتے، چنانچہ مجاز نے بھی ایک عرصہ اردو سرکل میں گزارا، حالانکہ ان کا خاندان میرس روڈ پر رہتا تھا۔

علی گڑھ کے مجاز کے معاصرین میں حیات اللہ انصاری، سبطِ حسن، اختر حسین رائے پوری، علی سردار جعفری اور بعد میں جاں نثار حسین اختر، جذبی اور اختر الایمان قابلِ ذکر ہیں۔ ان میں اختر الایمان بہت کم عرصہ رہے اور علی گڑھ کی روایات ان میں سرایت نہ کر سکیں۔ باقی سب ایک ہی حلقے اور بزم کے ایک ہی دسترخوان کے [illegible] جب کہ ان سب کے یہاں بہت سی چیزیں مشترک ہیں یعنی سب شاعر، ادیب اور انشا پرداز ہیں۔ اور سب کے سب آتش نوا ہیں۔ اختر حسین رائے پوری کی دوسری

---

[1] [illegible] کہنے سے بہت پہلے کا واقعہ ہے۔ جب انٹرمیڈیٹ میں تھا کہ محمد ولی پروفیسر محمد حبیب نے مجھے ڈاکٹر کہنا شروع کیا اور پھر یار دوست سب کہنے لگا تھا، کبھی طنزاً اسی لقب سے یاد کرنے لگے۔

مصروفیتوں نے ان کی راہ الگ کر دی۔ باقی ابھی تک ایک ہی راہ پر گامزن ہیں۔ سب نے آزادی کے گیت گائے ہیں اور آزادی کی جد و جہد میں حصہ لیا ہے۔ سب کے یہاں حبِ وطن ہے اور وطن کو سربلند کرنے کی آرزو سب کے یہاں موجود ہے، ان سب کی زندگی بے داغ ہے۔ انہوں نے کبھی کسی کی ٹوپی نہیں اچھالی اور نہ خود اپنی پگڑی اُچھلوائی۔ ان میں سے کوئی ابن الوقت نہیں، یہ سب "وفاداری بشرطِ استواری اصل ایماں" کے قائل ہیں۔

علی گڑھ میں مجاز کے خاندان کا قیام میرس روڈ، پر تھا جسے علی گڑھ کی سول لائن سمجھئے لیکن یہاں بھی سرکاری عہدہ داروں کی بجائے یونیورسٹی والوں کا پرچم لہراتا تھا۔ یونیورسٹی کے اساتذہ کی کوٹھیاں، گرلز کالج اور گرلز کالج ہوسٹل، یونیورسٹی کے طلبائے قدیم جو ریٹائر ہو کر علی گڑھ میں مقیم ہونا پسند کرتے تھے ان کے مکانات اور وہ اولڈ بوائز جو سرکاری عہدوں پر فائز ہو کر علی گڑھ تبادلہ کرا لیا کرتے تھے یہاں رہتے تھے۔ اس پہلو سے ہٹ کر میرس روڈ بڑا "رومان پرور" علاقہ تھا، یہاں بہت سے صنم کدے اور ان صنم کدوں کا طواف کرنے والے ملتے تھے۔ سڑک پر دو رویہ درختوں کی قطار، گھنی چھاؤں، نہر، آم کے درخت، اندھیرا ہوتے ہی جگنوؤں کی چمک دمک، پپیہوں اور کوئلوں کی کوک نے اسے واقعی ایک رومانی علاقہ بنا دیا تھا۔ آبادی کے باوجود یہاں موروں کی بھی کثرت تھی اور میرس روڈ سے کوئی دو فرلانگ کے فاصلہ پر یونیورسٹی کا زراعتی فارم تھا جہاں ہم نے اکثر مور اور تیتر کا شکار کیا ہے۔ گرلز کالج کی وجہ سے اس علاقے کی رونق اور بڑھ گئی تھی۔ لیکن "غنڈہ گردی" کا کوئی امکان نہ تھا کہ یہ بات علی گڑھ کی روایات کے منافی تھی، یوں طواف کرنے والے اکثر یہاں گھومتے نظر آتے تھے اور مجاز تو رہتے ہی یہاں تھے۔ 'نذرِ علی گڑھ' والی نظم میں مجاز نے اسی فضا کے لئے لکھا ہے کہ یہاں کلیوں سے حسن ٹپکتا ہے، پھولوں سے جوانی اُبلتی ہے، یہاں برقِ حسن چمکتی ہے اور نور کی بارش ہوتی ہے، یہاں کی ہر شام، شامِ مصر اور ہر شب، شبِ شیراز ہے۔ ان سڑکوں پر اکثر لوگوں نے مجاز کو گھومتے دیکھا ہے لیکن ان کا کوئی رومان بدنام نہ ہوا اور شاید قریب کے جاننے والے بھی مجاز کی محبوبہ کا نام مشکل سے بتا سکتے ہیں۔

میرس روڈ اور ہوسٹل کے علاوہ علی گڑھ کی زندگی میں بعض اور چیزیں طلباء پر اثر انداز ہوتی تھیں، ان میں سے ایک یونین تھی، یونین صرف مقرروں کی تربیت کے لئے ایک پلیٹ فارم ہی نہ تھی بلکہ علی گڑھ کی اجتماعی زندگی کا سب سے بڑا آئینہ تھی۔ یہاں طالب علموں کو ہر قوم سے ملنے اور تبادلۂ خیال کرنے کا موقع ملتا تھا۔ یہاں وہ کھل کر اپنے افکار اور خیالات کا اظہار کر سکتے تھے، سیاسی مسائل پر بے خوف و خطر مباحثے کر سکتے تھے، سیاسی لیڈروں سے صاف صاف باتیں کر سکتے تھے۔ پھر یہاں مشاعرے اور ادبی مجلسیں ہوتی تھیں۔ ایسے مشاعرے جو علی گڑھ کے علاوہ کہیں اور نظر نہیں آتے تھے، ان میں اساتذہ اور نوجوان شاعر اپنا کلام سناتے اور داد پاتے اور جو داد کا نعرہ یہاں سے بلند ہوتا اس کی گونج ملک کے دور دراز گوشوں میں پھیل جاتی۔ اسی علی گڑھ سے حسرت اور فانی اٹھے اور یہیں سے جگر اور اصغر کی شہرت کا آوازہ بلند ہوا۔ چنانچہ اسی یونین کے پلیٹ فارم سے مجاز کی جو نظمیں پہلی مرتبہ سنی گئیں ان میں 'نذرِ خالدہ' 'ادیبہ خانم' 'نذرِ علی گڑھ' 'نمائش' 'نورس نورا' 'رات اور ریل' 'انقلاب' خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ۱۹۳۲ء کے قریب مجاز کی شاعری شروع ہوئی اور تین چار سال میں ان نظموں کی شہرت یونین کی چہار دیواری سے نکل کر سارے ملک میں پھیل گئی۔ اس وقت علی گڑھ کے نوجوان شاعروں میں مجاز سے زیادہ کوئی مقبول نہ تھا۔ مشاعروں میں بار بار ان سے پڑھنے کی فرمائش کی جاتی، اور اس فرمائش میں طلبا سے زیادہ ان طالبات کی آوازیں بلند ہوتیں جو یونین میں اوپر کی گیلری میں الگ بیٹھی یونین کی کارروائی دیکھتی تھیں۔

جنوری کے آخر اور فروری کے آغاز میں علی گڑھ میں نمائش ہوتی۔ یہ نمائش علی گڑھ کی معاشرتی زندگی کا جزو بن گئی تھی۔ سال بھر لوگ اس کا انتظار کرتے، خرید و فروخت کے پروگرام مہینوں پہلے بنائے جاتے، طالب علم مختلف بہانوں سے گھروں سے روپیہ منگا کر جمع کرتے۔ نمائش آتی تو سب سے زیادہ خوشی ہوتی، صبح سے تیسرے پہر تک تو علی گڑھ کے شہر والے اور مضافات کے دیہاتی نمائش دیکھنے آتے۔ نمائش کے دوکاندار کچھ اونگھتے، کچھ جاگتے، کچھ اپنی دوکانیں کھولے، کچھ دوکانوں پر پردے ڈالے جمائیاں لیتے رہتے۔ شام ہوتے سے ذرا پہلے بھیڑ

چھوٹے جاتی اور کالج کے طلبہ اور طالبات، اساتذہ، ان کے اہل و عیال اور شہر والے نمائش کا رخ کرتے۔ اس وقت سے رات گئے نو بجے تک نمائش اپنے شباب پر ہوتی۔ سیر ہوتی، نظارہ بازیاں ہوتیں، خرید و فروخت بہت کم ہوتی چہل پہل زیادہ، مجاز اس نمائش میں جس طرح دلچسپی لیتے اس کی جھلک ان کی نظم "نمائش" میں ملتی ہے۔ غرض یہ تھا مجاز کا رنگا رنگ ماحول جس میں ان کی اور ان کی شاعری کی تربیت ہوئی۔

پڑھنے لکھنے سے مجاز کو کبھی دلچسپی نہ رہی۔ معلوم نہیں بی۔ اے بھی انہوں نے کس مصیبت سے پاس کیا ہو لیکن جب انہوں نے ایم۔ اے میں داخلہ لیا تو ان کی حالت دیکھنے کے قابل تھی۔ وہ اپنے اساتذہ کا بڑا احترام کرتے۔ رشید صاحب اور مولانا احسن کے ساتھ ان کی عقیدت کچھ مریدانہ سی تھی لیکن قدیم ادب، لسانیات اور اس طرح کے موضوعات سے وہ بھاگتے تھے۔ مجھے وہ "ادیب العلما" کہا کرتے تھے۔ ایک دن ان سے اس موضوع پر مکمل گفتگو ہوئی۔ میں نے کہا کہ شاعری میں رس اور رچاؤ پیدا کرنے کے لئے کلاسیکی ادب کے مطالعہ، تجزیہ اور تنقید کی بڑی ضرورت ہے۔ اس ضرورت کو مجاز نے بھی تسلیم کیا۔ کچھ لکھنے پڑھنے کا پروگرام بھی بنا۔ میں نے تو کچھ پڑھ ڈالا، مجاز صرف پان کھانے، شعر کہنے اور شعر سنانے کی نذر ہو گئے۔ شراب انہوں نے شاید اس وقت تک شروع نہیں کی تھی یا کم از کم ہم لوگوں کو اس کا علم نہ تھا لیکن شاعرانہ لاابالی پن ان میں اس وقت بھی پوری طرح پیدا ہو چلا تھا، وہ ہر وقت اپنا یا کسی اور کا کوئی شعر گنگناتے رہتے، پھر پان کھانے لگتے، سگریٹ اور حقّے سے بھی کچھ شوق تھا۔ غرض نتیجہ یہ نکلا کہ مجاز بھاگ نکلے اور ایم۔ اے کی تکمیل نہ کر سکے اور نہ باقاعدہ مطالعے یا محنت کی طرف مائل ہوتے۔ اس لئے ان کی شاعری میں جو رس اور رنگ ہے وہ محض ان کی طباعی اور شاعرانہ فطرت کا مرہونِ منت ہے۔ اکتساب اور ریاض کا ان کے یہاں سوال پیدا نہیں ہوتا۔

علی گڑھ میں اس وقت طالب علموں کی ایک جماعت کانگریس کے خیالات کی ترجمان تھی، ان میں سے بعض کو سوشلسٹ اور کمیونسٹ بھی سمجھا جاتا تھا۔ حیات اللہ انصاری، سبط حسن، اختر حسین رائے پوری، علی سردار جعفری سب اسی حلقہ سے وابستہ تھے۔ مجاز بھی ان کے ساتھ تھے۔ چنانچہ ان کے یہاں کبھی رومانی طبیعت پر کبھی کبھی انقلاب کا سایہ پڑنے لگا۔ "انقلاب" والی نظم اسی دور کی یادگار ہے۔ اس نظم کو مجاز نے جب پہلی مرتبہ یونین میں پڑھا تو آواز میں ایسا جوش اور اتار چڑھاؤ تھا جیسے وہ یونین سے باہر نکلتے ہی جام چھوڑ کر شمشیر اٹھا لیں گے، لیکن یہاں بھی ان کا فطری لاابالی پن سامنے آیا۔ یوں ان کے اشعار میں اس طرح کے خیالات بار بار ملتے ہیں لیکن عملی طور پر وہ اپنی شاعری کی رومانی فضا میں ہی بستے رہے اور آج تک آباد ہیں، انصاری بڑے عملی قسم کے آدمی تھے اس لئے انہوں نے کانگریس کی عملی جدوجہد میں بڑا حصہ لیا اور اب تک وہ ایک سرگرم سیاسی کارکن ہیں۔

علی گڑھ کے مشاعروں میں اس وقت ترنم سے پڑھنے کا رواج عام ہو چلا تھا۔ حالانکہ علی گڑھ کی بزمِ سخن کے صدرِ مجلس مولانا احسن مارہروی مرحوم اس کے سخت مخالف تھے اور انہوں نے ساغر نظامی کے ترنم پر ایک لطیف طنزیہ قطعہ مشاعرہ میں ہی سنا دیا تھا لیکن جگر کے والہانہ انداز نے علی گڑھ میں ترنم کا شوق پیدا کیا، سردار جعفری تو بے شک نثر میں نظم سناتے لیکن مجاز، جذبی اور جاں نثار اختر نے شروع سے ہی ترنم اختیار کیا۔ جاں نثار کی آواز ترنم کے لئے موزوں نہ تھی اس لئے یونین میں کبھی کبھی ان کے ترنم کے ساتھ اس کی نقل بھی شروع ہو جاتی۔ لیکن جذبی اور مجاز دونوں کا ترنم بے حد پسند کیا جاتا تھا۔ جذبی کے یہاں ترنم میں ایک سوز تھا اور مجاز کے یہاں نغمگی۔ جذبی پڑھتے تو مجسم سوز بن جاتے اور مجاز مجسم نغمہ، ان کے پتلے پتلے ہونٹوں پر تبسم کھیلتا رہتا، وہ جھوم جھوم کر اپنا کلام سناتے اور بار بار والہانہ انداز میں اپنے بکھرے بکھرے بالوں کو پیشانی پر آ پڑتے ہاتھوں سے سنوارتے جاتے تھے۔ ان کی آواز باریک تھی لیکن بڑے سے بڑے مجمع میں مائیکروفون کے بغیر وہ بلا تکلف اسے آخری کونے تک پہنچا سکتے تھے۔ ابھی تک ان کے ترنم کے انداز میں فرق نہیں آیا لیکن صحت خراب ہونے کے بعد سے اس میں کچھ اضمحلال کے آثار پیدا ہو گئے ہیں۔

مجاز کی صحت اس وقت بھی بہت اچھی نہ تھی ——— وہ دُبلے پتلے اور نحیف سے آدمی تھے، اکثر بیمار رہتے، لیٹے رہتے اور اسپتالوں کی سیر کرتے لیکن

نرس نورا کی چارہ گری والی نظم شاید کسی اور اسپتال (غالباً لکھنؤ) کی یادگار ہے کیونکہ یونیورسٹی کے اسپتال میں حسین نورا کی بجائے ایک [illegible]
والے مولانا تیمارداری کے فرائض انجام دیتے تھے اور یہاں بھی یونیورسٹی کے ڈاکٹر صرف زمانۂ امن (PEACE TIME DOCTOR) کے معالج کہے
جاتے تھے اور بالعموم پرہیزی کھانے کی سفارش کے لئے ان کی خدمت میں حاضری ہوتی تھی۔ سگریٹ بہت پیتے تھے، شاید اس کا اثر گلے اور صحت
پر پڑنے لگا تھا، بعد میں رندی کا دور آیا۔ اس کا پورا حال مجھے معلوم نہیں لیکن مجھے محسوس ایسا ہوتا ہے کہ جوش کے ساتھ رہ کر مجاز نے مے و مینا
کا شغل اختیار کیا جس نے ان کی صحت کو اور تباہ کر دیا۔ اور لوگ اس تباہی کی ذمہ داری جوش پر عائد کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں ایک لطیفہ بھی
مشہور ہے۔ مجاز ایک مرتبہ جوش کے یہاں پہنچے اور آواز دی۔ جوش صاحب موجود نہ تھے۔ زنان خانے سے پوچھا گیا کہ آپ کون ہیں؟ انہوں
نے کہا "مجاز" ہوں۔ وہاں سے جواب ملا "اچھا آپ ہی مجاز صاحب ہیں جنہوں نے جوش کو خراب کیا ہے؟" یہ کون جانتا ہے کہ کس نے
کس کو خراب کیا، لیکن مجاز کے لاابالی پن میں اس رندی کی شدت سے اور اضافہ ہوا اور یقیناً ان کی شاعری کو اس سے نقصان پہنچا اور اس نے
ایک کام کے آدمی کو واقعی "نکما" کر دیا۔

مجاز کا ہمیشہ ہونٹوں پر ڈھلکا تبسم ان کی شگفتہ مزاجی کا نشان ہے۔ دوستوں کی محفل میں وہ خوب قہقہے لگاتے اور ایسے فقرے چست کرتے
کہ سامعین لوٹ پوٹ جاتے، اس سلسلہ میں سب سے مشہور لطیفہ روش صاحب کے متعلق ہے۔ کسی محفل میں روش صاحب موجود تھے "شاعر اعظم"
کی بات چھڑی۔ مجاز پہلے تو مسکرائے پھر کہنے لگے "حضرت 'شاعر اعظم' تو بعد کی بات ہے پہلے 'قدِ آدم' تو ہو جائیے!" جن لوگوں نے روش صاحب
کو دیکھا ہے وہی اس لطیفے سے پوری طرح لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔ مجاز کی طبیعت کا یہی انداز ان کے کلام کی شگفتگی اور تازگی کی بنیاد ہے۔

مجاز دوستوں کے دوست اور یاروں کے یار ہیں۔ اس معاملہ میں ان کی 'دوست نوازی' میں بھی لاابالی پن ہے۔ ان کے کمرے میں،
ہوسٹل میں ہو یا گھر پر، ہر وقت دوستوں کی محفل جمی رہتی یا پھر وہ خود اس کمرے سے بے نیاز دوستوں کے ساتھ رہتے اور اکثر ایسا ہوتا کہ کئی کئی
دن وہ اس کمرے کا رخ نہ کرتے۔ کمرے میں چیزیں بے ترتیبی سے منتشر پڑی رہتیں، کتابیں البتہ کہیں نظر نہ آتیں اور نہ کلاس میں مجاز کبھی کتابیں
لانے کی زحمت کرتے۔ ان محفلوں میں شعر و شاعری ہوتی۔ تاش کھیلے جاتے، قہقہے لگائے جاتے اور ساری فضا ان سے گونج جاتی۔ شاید ہی کبھی
کسی نے مجاز کو تنہا دیکھا ہو اور کسی مجلس میں شاید ہی کبھی وہ خاموش اور افسردہ نظر آئے ہوں۔ ان کے اس انداز میں جو رندانہ شان پائی جاتی ہے
وہ ان کے اور ساتھیوں میں سے کم کے حصہ میں آئی ہے۔ اسی لئے ان کے یہاں غمِ جاناں اور غمِ دوراں دونوں غرقِ مے ناب ہیں اور جہاں یہ غم
ہے بھی وہاں ان کی مسکراہٹوں نے اس کی تلخی کم کر دی ہے، ایک غنائی شاعر کے لئے یہ بہت بڑی نعمت ہے، خصوصاً جس دور میں مجاز
ہیں اس میں زندگی کی تلخیاں اتنی بڑھی ہوئی ہیں کہ ایک تبسم یا ایک مسکراہٹ بھی کسی کو نصیب ہو سکے تو غنیمت ہے۔

مجاز کی طبیعت کا لاابالی پن ان کی وضع قطع اور لباس سے بھی ظاہر ہوتا تھا۔ وہ ایک خاصے خوش حال گھرانے سے تعلق رکھتے تھے اور
علی گڑھ میں یوں بھی عام طور پر طالب علم بہت خوش پوش رہتے تھے لیکن مجاز اس معاملے میں بھی بے نیاز تھے، ویسے ان کا لباس علی گڑھ کٹ
پاجامہ اور شیروانی تھا لیکن دونوں سے لاابالی پن ظاہر ہوتا تھا۔ ٹوپی اس زمانہ میں سر کی بجائے زیادہ تر ہاتھ میں رہتی تھی۔ ترکی ٹوپی علی گڑھ سے
رخصت ہو چکی تھی۔ انصار کھدر کی شیروانی اور کھدر کی گاندھی ٹوپی پہنتے تھے لیکن مجاز بالعموم سیاہ رنگ کی سمور کی ٹوپی استعمال کرتے تھے [illegible]
انہوں نے کبھی نہ پہنا اور لاابالی پن کے باوجود کبھی بڑھے بالوں یا میلے کچیلے کپڑوں سے "ہپّی" کی صورت بنائی، لباس میں بے اعتنائی کے باوجود
ایک نفاست اور ستھرا پن موجود تھا، اس زمانے میں علی گڑھ میں [illegible] چپل کا رواج بھی عام تھا لیکن مجاز نے کبھی اسے پسند نہ کیا۔
[illegible] نے آج سے بیس بائیس سال پہلے مجاز کو جیسا دیکھا تھا آپ کے سامنے پیش کر دیا۔ باہر والوں نے مجاز کو ان کی شاعری
میں دیکھا ہے اور اسی سے ان کی صورت اور سیرت کا اندازہ لگایا ہے —— [illegible] کے دیباچہ میں مجاز کے مجموعے [illegible]

کے اس پہلے شعر کو نقل کرتے ہوئے ـــ

دیکھ شمشیر ہے یہ، ساز ہے یہ جام ہے یہ
تو جو شمشیر اٹھا لے تو بڑا کام ہے یہ

لکھا ہے کہ مجاز کی شاعری انہی تینوں اجزا سے مرکب ہے لیکن مجاز بنیادی طور پر "غنائی" شاعر ہے اور بیچ کے ایک مختصر سے عرصہ کو چھوڑ کر وہ ہمیشہ گیت گاتا رہا ہے جن میں شمشیر کم اور ساز و جام زیادہ ہے، یہاں میرا مقصد مجاز کی شاعری پر تنقید کرنا نہیں اس لئے صرف اتنا کہنے پر اکتفا کرتا ہوں کہ ان کے اشعار میں بڑی تازگی، بانکپن، غزل کی ادا اور نغمگی ہے، بعض جدید رجحانات اور میلانات نے مجاز کو غزل سے دور لے جانا چاہا چنانچہ انقلاب کا نعرہ مجاز کی شاعری میں ایک طوفان بن کر اُٹھا، لیکن اس طوفان کو انجام تک پہنچانے کے لئے جس عزم و استقلال اور جس ریاض کی ضرورت ہوتی ہے وہ مجاز کے بس کی بات نہ تھی، اس لئے انقلاب والی نظم اس مجموعے میں ایک نمونہ ہے بوجہ ال تکنیک میں نئے تجربات کا ہے، یہاں بھی ان کے یہاں فیض، راشد، سردار جعفری وغیرہ کی سی بات پیدا نہ ہوئی۔ اب مجاز کی شاعری میں اضمحلال پیدا ہو چلا ہے، اس کے اسباب کی طرف میں اشارہ کر چکا ہوں۔ یہ کوئی عیب نہ ہوتا کہ وہ انقلاب کا مطرب بن جاتا اور جوش کی صحبت سے اسے کم سے کم اتنا فیض ضرور پہنچ سکتا تھا، اور ایسی صورت میں اس کے نغموں میں فیض کے بقول برسات کے دن کی سی سکون بخش خنکی اور بہار کی رات کی سی گرم جوشی اور تاثر آفرینی ہوتی، لیکن 'نوجوان خاتون سے خطاب' اس انداز کی آخری نظم ہے جو ۱۹۳۷ء میں لکھی گئی۔

مولوی محمد داؤد عباسی

محمود احمد عباسی

روہیل کھنڈ (یو۔پی) کے مشہور و مردم خیز قصبہ امروہہ[1] کے ایک علمی خاندان میں ۲۰ رمضان ۱۲۸۲ھ مطابق ۲۹ فروری ۱۸۶۲ء کو داؤد مرحوم نے آنکھیں کھولیں۔ اس علمی خاندان کے مورث اعلیٰ مولانا رکن الدین عباسی[2] اوائل عہد مغلیہ کے مشاہیر علماء میں سے تھے۔ ان کے اخلاف میں نسلاً بعد نسل علماء و فضلا ہوتے رہے۔ داؤد مرحوم کے والد مولوی علی محمد عباسی نے علوم دینیہ کی تحصیل و تکمیل کے بعد درس و تدریس کے بجائے وکالت کا امتحان پاس کیا اور اس پیشہ میں کامیاب و نیک نام رہے۔ انہوں نے اپنے سب بیٹوں[3] کو اس زمانہ میں انگریزی پڑھوائی جب انگریزی کا پڑھنا حرام بتایا جاتا تھا چنانچہ ۱۲ ستمبر ۱۸۷۶ء کو داؤد مرحوم ۱۵ سال کی عمر میں مدرسۃ العلوم علی گڑھ میں داخل ہوئے اور ۱۴ ہی سال تک اکتساب علم کرتے رہے ۱۸۸۸ء میں ایف۔ اے، ۱۸۹۰ء میں بی۔ اے کی سند حاصل کی۔ خاص مضامین فلسفہ اور ادبیات فارسی تھے۔ تکمیل تعلیم کے بعد ۱۸ سال تک

---

[1] روہیل کھنڈ کی بہت قدیم بستی ہے۔ ابن بطوطہ دوران سیاحت میں یہاں بھی آیا تھا۔ اپنے سفر نامہ میں امروہہ کے شیخ زادہ اور قاضی شہر سے اپنی ملاقات کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ "یہ ایک چھوٹا سا حسین شہر ہے"۔ اسی حسین شہر کی خاک سے جو ہر چہار طرف آموں کے سرسبز و شاداب باغوں سے گھرا ہوا ہے۔ بڑے بڑے صاحب کمال اور خاص کر ریختہ اور اردو کے نامور شعرا اٹھے مثلاً میر سعادت علی سعادت جن کو میر تقی میر نے بھی اپنا استاد بتایا ہے، استاذ الاساتذہ شیخ غلام علی ہمدانی مصحفی اور دکنی طرز کی قدیم اردو کا قدیم شاعر اسمٰعیل امروہوی۔

[2] یکے از اجلۂ علمائے عہد بابر و ہمایوں و اکبر شہنشاہان ہند و مورث خاندان عباسیہ منوطنہ امروہہ

"سر ہر آمدِ علم و فضل رکن الدین عباسی بہ دنیائے معارف شد زفیض اکبریا" (تذکرۃ الکرام)

[3] یہ سب آٹھ بھائی تھے۔ ان میں سے ایک نے جب اسکول میں داخل ہو کر انگریزی پرائمری میں dog اور cat وغیرہ لفظ پڑھے اس وقت ان کو محسوس ہوئی کہ اگر کہ صاف کہہ دیا کہ میں ایسی کتاب نہیں پڑھوں گا۔ ان کو دینی مدارس میں بھیجا گیا۔ دینیات اور عربی کے مدارس میں تکمیل کر کے عربی فن طب حاصل کیا اور اس فن میں اب وہ یکتا تھے۔ دو لڑکے ... حکیم محمد احمد صاحب عباسی کا نام بطور مثال ظاہر ہے۔

علی گڑھ کالجیٹ اسکول میں مدرس رہے پھر ۱۸۹۳ء سے سرکاری ملازمت میں منسلک ہوگئے۔ ابتداً نائب تحصیلدار رہے، بڑے مردم شناس اور متدین تھے۔ ضلع باندہ میں قحط کے امدادی کاموں کی نگرانی سپرد تھی اور ہزاروں روپیہ فقط تحویل میں رہتا اس کام کو ایسی خوبی اور دیانت سے انجام دیا کہ بہت نیک نام رہے۔ اپنے ایک دوست مولوی سید طفیل احمد دہلیگ مرحوم کو ۳۰ اکتوبر ۱۸۹۷ء کے مرقومہ خط میں لکھتے ہیں:

"محض خدا کے فضل سے، ہرگز اپنی کسی کارگزاری سے نہیں، میں اس قحط کے کام سے بہت نیک نامی کے ساتھ فارغ ہوا۔ یہ کام بڑی ذمہ داری اور جوابدہی کا تھا، ہزاروں روپیہ بلا کسی شرط کے میرے ہاتھ میں دے دیا تھا کہ مناسب طور سے خرچ کرو۔ اس میں لوگوں نے سینکڑوں روپیہ بلکہ ہزاروں غبن کیا اور کسی نے پوچھا بھی نہیں یہ واقعات تفصیل کے ساتھ انشاء اللہ بوقت ملاقات عرض کروں گا۔ ہاں تو خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ میں اس کام میں نیک نام رہا۔"

باندہ کے بعد چند اور اضلاع ایٹہ اور آگرہ وغیرہ میں تعینات رہے۔ طالب علمی کے زمانہ میں ایک مرتبہ نمونیہ کے شدید مرض میں مبتلا ہو گئے تھے تندرست ہونے کے بعد بھی اس کا کچھ نہ کچھ اثر باقی رہا۔ ۱۸۹۹ء میں پھیپھڑے متاثر ہوئے، بیماری کی رخصت بھی نہ لی۔ برابر کارِ منصبی انجام دیتے رہے اپنے انہی دوست کو ۳ اگست ۱۸۹۹ء کے خط میں لکھتے ہیں:

"میں بفضلہٖ اب بالکل تندرست ہوں، ضعف مطلق نہیں، صبح کو انڈا، دودھ، شہد کھانے کے ساتھ کاڈلیور آئل تیسرے پہر کو میاں فرید کی رائے سے شیرۂ بادام، خشخاش، الائچی، کالی مرچیں اور مصری، رات کو کھانے کے ساتھ پھر کاڈلیور آئل۔ اتنی چیزیں استعمال میں ہیں۔ ان مقویات کے سامنے تو پاس بیٹھنے والوں کا بھی ضعف جاتا رہے۔"

مگر مرض برابر بڑھتا رہا، حسنِ کارگزاری میں ترقی بھی ملی تحصیلداری پر تقرر ہوا لیکن اس کے ایک سال کے اندر ہی یعنی ۲ جون سنہ ۱۹۰۰ء میں بعمر تقریباً ۳۹ سال داعیٔ اجل کو لبیک کہا اور فتح آباد ضلع آگرہ کے احاطۂ عیدگاہ میں دفن ہوئے۔

نہایت سلیم الطبع، نیک نہاد، ہردل عزیز شخص تھے۔ متانت و سنجیدگی کے ساتھ طبیعت نہایت شگفتہ تھی۔ سخن سرائی کا ذوق موہبتِ الٰہی تھا نہ کبھی کسی سے تلمذ حاصل تھا اور نہ کبھی مشقِ سخن کی، شعر فی البدیہہ کہتے۔ مولانا ظفر علی خاں صاحب نے جو کالج میں داؤد مرحوم سے کئی سال جونیئر تھے ایک موقع پر لکھا تھا:

"محمد داؤد مرحوم کو جو راقم الحروف کے زمانۂ طالب علمی میں مدرسۃ العلوم علی گڑھ کے ایک تلمیذ رشید تھے مبداء فیاض سے سخن سرائی کا ایک خاص ذوق مرحمت ہوا تھا۔ شعر فی البدیہہ کہتے تھے اور ظرافت تو مرحوم کا خاص حصہ تھی۔ اتفاق ایسا ہوا کہ کاندھلہ سے جتنے لوگ علی گڑھ آئے سب کے سب امام شعرانی کی ضد واقع ہوئے تھے اور قدرت نے ان کے جسم کو تو جمیل لیکن سر کو مزید تکلیف مقراض سے فارغ البال کر رکھا تھا اس پر مرحوم کو زندہ دلی کی ایک بہت اچھی سوجھی جو اسی وقت کالج کے ہر بچہ بکرے کی زبان پر تھی

آتا ہے کاندھلے سے جو لاتا ہے سر پہ گنج
قاروں نے راستے میں لٹایا خزانہ کیا"

---

[1] کاندھلہ ضلع مظفر نگر یو-پی میں ایک قصبہ ہے۔

علی گڑھ کے تلامذہ میں خاص کر دورِ اولین کے طلباء میں داؤد مرحوم ہی کی شخصیت تنہا ایسی تھی کہ طویل زمانہ تک علی گڑھ میں رہے لیکن اپنی وضع قطع میں مطلق کوئی تبدیلی نہ کی۔ مولانا محمد علی جوہر مرحوم نے ان کی تصویر کشی ان الفاظ میں کی ہے :

"۱۸۹۸ء کی گرمیوں میں جبکہ میری عمر ساڑھے گیارہ برس کی تھی میں اپنے بھائی مولانا شوکت علی کے ساتھ ... بریلی کے اسکول سے علی گڑھ کے مدرسۃ العلوم میں پڑھنے کے لئے آیا ...... اس "نیچر گڑھ" میں تقریباً سبھی طلباء کی ایک ہی سی وضع قطع تھی۔ شیروانی، اچکن، ترکی ٹوپی، سیدھا ڈھیلا ڈھالا پاجامہ، قمیص، جراب، انگریزی جوتا، یہی سب کا لباس تھا۔ کوئی شیروانی کی جگہ ترکی کوٹ پہنا کرتا تھا، ترکی ٹوپی کی جگہ کوئی سیاہ ایرانی ٹوپی اوڑھا کرتا تھا، کوئی کبھی کبھی کرتہ بھی پہن لیا کرتا تھا مگر داڑھیاں سوائے ایک آدھ کے سب کی منڈی ہوئی ہوتی تھیں مگر مونچھوں کے بھی صفایا کرانے کا فیشن اس وقت تک رائج نہیں ہوا تھا۔ بال سب کے آگے سے بڑھے ہوئے پیچھے سے بتدریج زیادہ کترے ہوئے ہوتے تھے جو آج سارے ہندوستان میں رائج ہیں اور جنہیں ولایت تک کی عورتوں نے اسی طرح کتروانا قبول کر لیا ہے اور جو "ایٹن کراپ" کے نام سے موسوم ہیں لیکن جس کچی بارک میں ہم تینوں بھائی رہتے تھے اس کی پاس والی کچی بارک میں اور اس بیچ والے کمرے میں جہاں ایک عرصہ سے "ٹول ہاؤس" بن گیا ہے، ایک دراز قامت مگر خاصے دبلے پتلے صاحب رہتے تھے جو خالص ہندوستان کی پرانی وضع کی اچکن پہنا کرتے تھے جن کی ٹوپی ان کے وطن امروہہ کی ساخت کی کشتی نما ہوتی تھی (جس کو اب "گاندھی کیپ"[1] کہا جاتا ہے) جن کا جوتا دہلی کا سلیم شاہی وضع کا مگر سادہ ہوتا تھا اور جن کے بال رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرح لانبے تھے اور اگرچہ "بر دوش" نہ سہی لیکن تابناگوش ضرور آتے تھے تاکہ ان لمبے بالوں کے باعث اچکن پر تیل وغیرہ کا دھبہ نہ پڑ جائے۔ وہ گردن میں ایک سپید خاصے کا رومال اسی طرح ضرور باندھا کرتے تھے جس طرح سر سید رحمۃ اللہ علیہ اپنے گلے کی رسولی چھپانے کے لئے استعمال فرمایا کرتے تھے۔ یہ وضع قطع اس زمانہ کے بزرگوں کی اس وقت تک باقی تھی۔ لیکن علی گڑھ جیسے "نیچر گڑھ" کے کسی طالب علم کا اس وضع قطع کو برقرار رکھنا اس زمانہ میں اس سے بھی زیادہ نمایاں تھا جتنا کسی یورپین لیڈی کا آج بڑے بال رکھنا، نیچا سایہ پہننا اور سینہ اور گردن، بازو اور بانہوں سب کو کپڑے سے ڈھانپنا آج نمایاں ہوگا اس لئے میری نظر بھی آتے ہی ان بزرگ پر پڑی اور اگر انہیں کسی اور طرح کا امتیاز نہ بھی حاصل ہوتا تب بھی میں ضرور اپنے بھائیوں سے پوچھتا کہ یہ اس عجیب و غریب وضع قطع کے بزرگ کون ہیں۔ لیکن محمد داؤد صاحب کو کون نہیں جانتا تھا۔ علی گڑھ کالج میں اس وقت سب سے زیادہ ممتاز اور ہر دلعزیز جو جماعت تھی اور جس میں محمد حبیب اللہ خان صاحب[2]،

---

[1] گاندھی کیپ اور امروہہ ساخت کی ٹوپی میں نمایاں فرق تھا۔ امروہہ ساخت کی ٹوپی ساٹن پر کلابتوں اور ریشم سے کڑھی ہوئی ہوتی تھی اور گاندھی ٹوپی کھدر کی۔

[2] یعنی خان بہادر الحاج مولوی محمد حبیب اللہ خاں صاحب بی۔ اے دھینگ سابق کلکٹر یو۔ پی جنہوں نے اپنے مادر علمی کی بیش بہا خدمات انجام دی ہیں اور اب بھی پیرانہ سالی میں انجام دے رہے ہیں۔

احمد حسین[1] مرحوم، قسیم بیگ چغتائی[2] جیسے طلبا شامل تھے۔ اس کے سرداریہی پرانی وضع کے بزرگ تھے۔ ان کے کمرے پر بیسیوں ممتاز ترین طلبا کا مجمع رہا کرتا تھا۔

داؤد مرحوم کی کالج کے طلبا میں بہر دلعزیزی مجلد اور باتوں کے ان کی شاعری، شگفتہ مزاجی اور پھبتی و فقرے چست کرنے کی وجہ سے تھی۔ وہ لطیفہ تو کہہ جاتے مگر اس سنجیدگی و متانت کے ساتھ کہ کبھی خود قہقہہ مار کر نہ ہنستے مسکراہٹ لبوں پر آجاتی اور سامعین ان کے لطیفہ اور پھبتی سے پھڑک اٹھتے۔ مولانا محمد علی جوہر مرحوم نے کالج کے زمانہ کے دو ایک لطیفے لکھے ہیں۔ مولانا حالی مرحوم کی مشہور غزل ہے ؎

ان کے جاتے ہی یہ کیا ہو گئی گھر کی صورت
نہ وہ دیوار کی صورت ہے نہ در کی صورت

مقطع ہے ؎

ان کو حالی بھی بلاتے ہیں گھر اپنے مہمان
دیکھنا آپ کی اور آپ کے گھر کی صورت

اس مقطع کی جو تضمین داؤد مرحوم نے کی تھی[3] مولانا محمد علی مرحوم اس کے متعلق لکھتے ہیں:۔

"باوجود پوری سنجیدگی کے داؤد مرحوم کی طبیعت نہایت شگفتہ تھی اور مولانا حالی کی مشہور غزل کے مقطع پر جو تضمین انہوں نے لکھی تھی اس نے تو مولانا حالی تک کو یہ کہنے پر مجبور کر دیا تھا کہ داؤد میری ساری غزل لے لیں صرف میرا تخلص مطلع سے نکال ڈالیں تو میں خوش اور میرا خدا خوش، مگر تضمین بھی بلا کی تھی۔ ایک ہی مصرعے نے مولانا مرحوم کے شعر کا ستیاناس کر دیا۔ سنیئے ؎

گر کرے قصد کسی کام کا دل میں انساں	پہلے یہ دیکھے وہ اس کام کے ہے بھی شایاں
سُن کے لوگوں سے کہ وہ آئے تھے آؤ دکے ہاں	ان کو حالی بھی بلاتے ہیں گھر میں مہماں

دیکھنا آپ کی اور آپ کے گھر کی صورت"

اس کے بعد مولانا مرحوم ایک اور لطیفہ ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

"بزرگوں کی شان میں داؤد صاحب نے صرف یہی ایک گستاخی نہیں کی تھی، کالج میں ایک عرصہ تک ہر نسل ہیں

---

[1] احمد حسین بی۔ اے (علیگ) مرحوم ۱۸۸۸ء میں کالج میں داخل ہوئے۔ ۱۸۹۲ء میں بی۔ اے پاس کر کے ریاست رام پور کے اسٹیٹ ہائی اسکول میں ہیڈ ماسٹر رہے۔ ۱۹۰۰ء میں انتقال کر گئے۔

[2] مرزا قسیم بیگ چغتائی بی۔ اے (علیگ)، آگرہ کے رہنے والے ۱۸۸۵ء میں فرسٹ ایر میں کالج میں داخل ہوئے ۱۸۸۹ء میں بی۔ اے پاس کر کے اول علی گڑھ کے ایک کالج کے جس کی آنکھیں خراب تھیں پرسنل اسسٹنٹ ہوئے پھر جج میں مترجم ہو گئے اس کے بعد آگرہ کالج میں وارڈن رہے اور پھر اتفاق سے ڈپٹی کلکٹر ہوئے۔ خان بہادری کے خطاب یافتہ تھے۔ آخر میں جودھ پور میں بھی رہے۔ بڑے لطیفہ گو تھے ان کے کئی بیٹے تھے جن میں مرزا عظیم بیگ چغتائی افسانہ نویسی میں مشہور ہوئے۔

[3] تضمین کے اس واقعہ کو مولانا ابوالکلام آزاد صاحب نے بھی یادگار رہنمائی از صالحہ عابد حسین کے مقدمے میں بیان کیا ہے لیکن تضمین کے مصرعے بھی غلط لکھے ہیں اور داؤد مرحوم کا حال بھی صحیح نہیں لکھا اور بھی متعدد حضرات نے جنہوں نے یہ لطیفہ بیان کیا ہے ایسی ہی غلطیاں کی ہیں۔

ایک طالب علم کو "بوم" کا لقب ملا ہوا تھا لیکن "ان لسل" کے بالعکس کہ مولانا شبلیؒ کی صحبت میں بیٹھنے کا شوق
تھا جب کالج کا گروپ فوٹو کھینچا گیا تو "بوم" صاحب فوراً مولانا شبلیؒ کی کرسی کے پیچھے آ کر کھڑے ہو گئے
جس پر داؤد صاحب نے اسی وقت لکھ دیا ؎

آج کالج میں کچھ بپا ہے ہجوم — طلبا کا ہے ہر طرف سے ہجوم
بول اٹھی روح سعدیٔ مرحوم — "کس نہ آید بزیر سایۂ بوم
الا مولانا شبلی مخدوم"

مولانا شوکت علی مرحوم کو داؤد مرحوم کے بہت سے لطیفے کالج کے زمانہ کے یاد تھے۔ مولانا شبلیؒ نے ایک مسدس اردو میں لکھا تھا جس کا ایک بند یہ تھا ؎

بانیٔ مدرسۃ سیدؒ والا گہر — وہ مینجنگ کمیٹی کے معزز ممبر
شبلیٔ غمزدہ وہ شاعر اعجاز اثر — اور یہ نو بادۂ اقبال کے سب برگ و ثمر
نہ تکلف کے کچھ انداز نہ کچھ جاہ کی شان
بزم میں آئے ہیں اس حال سے اللہ کی شان

اسی طرح جب مولانا موصوف قسطنطنیہ کے سفر سے واپس آئے تو ایک ڈنر کے موقع پر فارسی نظم پڑھی جس کے چند شعر یہ تھے ؎

کالج امروز بہ آں فر و شاں است کہ بود — بزم را گرمیٔ ہنگامہ ہماں است کہ بود
ہر یکے از بک و ماریسن و آرنلڈ و [illegible] — ہم چناں مدرسہ را روح و رواں است کہ بود
واں دگر دیدہ وراں کہ بہ اسکول ہدانند — ہم چناں سعیٔ طلب از تہ جاں است کہ بود
شبلیٔ غمزدہ آں حرف کش طرف بساط
ہم بہ آں طرز نوی زمزمہ خواں است کہ بود

"ہماں است کہ بود" ردیف و قافیہ تھا اور حسب معمول اپنے نام کے ساتھ "غمزدہ" باندھ گئے تھے اس لئے اس زمانہ میں وہ کالج کے طلبا میں

۱؎ مولانا شوکت علی مرحوم نے "علی گڑھ کالج کی ایک عجیب و غریب شخصیت" کے عنوان سے جو مضمون لکھا تھا اس میں بھی "بوم" والا لطیفہ بیان کیا ہے اور لکھا ہے کہ "مولانا شبلیؒ نے جب یہ قطعہ سنا فوراً تاڑ گئے کہ یہ پھبتی داؤد مرحوم کے سوا اور کس کو سوجھ سکتی ہے چنانچہ انہوں نے خود بھی اس کی بہت داد دی"۔ "بوم اول" کے بارے میں کہتے ہیں کہ "بدایوں یا بریلی کے رہنے والے گوری رنگت، بڑے بڑے دانت والے خوش وضع تھے مگر خبطی طبیعت کی ذرا کمی تھی جس کسی ہم جماعت سے رنجش ہو جاتی اپنے کمرے میں پنسل سے دیوار پر اس کی تصویر بناتے اور جوتے سے کمرے کے [illegible] سے تصویر پر نشانہ بازی کرتے۔ ان کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ روزانہ ضروری سے فارغ ہونے کے لئے جب پاخانہ میں بیٹھتے "اوتھو" "اوتھو" کی زحمت سے بچنے کے لئے مولانا حالی کے "شکوۂ ہند" کے اشعار بلند آواز سے پڑھتے۔ مولانا شبلی سے بڑی عقیدت تھی اور بلا کی طرح ان سے چپٹے رہتے تھے"۔

۲؎ مسٹر بک پرنسپل کالج ۳؎ ان سے پہلے پروفیسر تھے مسٹر بک کے بعد پرنسپل ہوئے ۴؎ مسٹر آرنلڈ [illegible] پریچنگ آف اسلام کے مؤلف ۵؎ مسٹر [illegible] اسکول کے ہیڈ ماسٹر تھے۔

"شبلی فخر دہ" سے معروف تھے۔ داؤد مرحوم کو اتنی سوجھ گئی اسی وزن و قافیہ میں انہوں نے بھی چند شعر کہہ دئے۔ مولانا شوکت علی لکھتے ہیں کہ داؤد مرحوم نے "شبلی فخر دہ" کی یہ نظم سنتے ہی کئی شعر کہہ دئے جن کو ہم نے گا دیا جو سب میں مشہور ہو گئے ان کا ایک شعر یہ تھا ؎

شبلی فخر دہ در صورت نقاف کرہشت
رنگ او تیرہ و تاریک چناں است کہ بود

مولانا محمد علی جوہر لکھتے ہیں:

"چودھری خوشی محمد خاں صاحب کالج کے "پوئیٹ لاریٹ" اور اپنے قد کے لحاظ سے "لانگ فیلو" تھے اور آرنلڈ صاحب اور مولانا شبلی خاص طور سے ان کے مداح تھے مگر چودھری صاحب کو زبان پر پوری قدرت نہ تھی اس لئے کبھی نظم میں داؤد صاحب اور کبھی نثر میں عبدالحق صاحب (جو آج کل اورنگ آباد سے اردو کی خدمت کر رہے ہیں اور اس زمانہ میں کالج میں "سینٹ پال" کے عرف سے معروف تھے) چودھری صاحب کا مذاق اڑایا کرتے تھے۔ چودھری صاحب نے ٹامسن کی نظم "سیزنس" (مختلف موسم) پڑھ کر جوان کے کورس میں داخل تھی ایک نظم لکھی تھی جس پر مولانا شبلی کے مشورہ سے آرنلڈ صاحب نے انہیں ایک انعام مرحمت فرمایا تھا اس میں ایک موقعہ پر چودھری صاحب لکھ گئے تھے کہ ع ناظر! اب سیر سبزہ کر ڈالو۔ ناظر آپ کا تخلص تھا اور قد میں ناظر صاحب کے متعلق کہا جا سکتا تھا کہ "انظر الی الابل کیف خلقت" اس لئے ناممکن ہو گیا کہ اس مصرع کی داد نہ دی جائے جو اس پر داؤد صاحب نے لگایا تھا۔

ناظر صاحب فرماتے ہیں ——— ناظر! اب سیر سبزہ کر ڈالو
داؤد صاحب اس پر فرماتے ہیں ——— اپنے آگے کی گھاس چر ڈالو

نواب محسن الملک مرحوم جب حیدر آباد چھوڑ کر علی گڑھ چلے آئے اور وہ طلبہ جو سر سید کے ڈنڈے سے ڈرتے تھے۔ اب نواب صاحب کے پاس جانے لگے اور علی گڑھ کے سدا بہار کھانے کی حسب دستور شکایت کرنے لگے تو نواب صاحب نے بھی "حسب دستور" اصلاح کے بہت سے وعدے کئے، ان وعدوں سے

---

[1] قرۃ العین حیدر صاحبہ نے "بلدرم" کے حالات میں (حاشیہ صفحہ ۱۳۲ شخصیات نمبر — نقوش — طبع ثانی ۱۹۵۶ء) یہ شعر بہ تغیر بعض الفاظ نقل کیا ہے جو انہوں نے مولانا شوکت علی مرحوم کے سامنے کا ہے اور وہ اس شعر کو اسی طرح پڑھا کرتے تھے اس کے علاوہ "فخر سید چوں بہ .... ہنوز خراماشد" کے متعدد شعر بھی سنایا کرتے تھے جو داؤد صاحب مرحوم کے کہے ہوئے تھے۔

[2] یعنی ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب بابائے اردو — مولانا محمد علی مرحوم نے جس زمانہ میں (یعنی ۱۹۲۳ء میں) یہ تحریر لکھی تھی ڈاکٹر صاحب اورنگ آباد میں بسلسلہ ملازمت مقیم تھے اور وہیں انجمن ترقی اردو کا دفتر اور پریس بھی قائم کیا پھر چند سال بعد ملازمت سے ریٹائر ہو کر دہلی آ گئے فسادات دہلی میں کتب خانہ انجمن برباد ہو گیا اس کے بعد کراچی آکر از سر نو انجمن کا کتب خانہ، مطبع وغیرہ قائم کیا اور اردو کالج کی بنیاد ڈالی جو اب اعلیٰ پایہ درس گاہ ہے۔

[3] چودھری خوشی محمد ناظر بی۔ اے نے ۱۸۹۴ء میں فرسٹ ڈویژن میں بی اے کیا۔ انگریزی فارسی میں [illegible] کے ساتھ [illegible] ریاست کشمیر میں اعلیٰ منصب پر فائز رہے۔ قومی نظمیں بہت لکھی ہیں انجمن حمایت اسلام لاہور کے سالانہ جلسوں میں خاص طور سے پڑھی جاتی تھیں۔

خوش ہو کر چودھری صاحب نے فارسی میں ایک نظم لکھی جس کا قافیہ "جان" "اور "تان" تھا اور مولوی شبلی کے شاگرد رشید اور محبوب خاص نے اسے مولانا ہی کے انداز سے یونین میں پڑھا، ان کے بہت سے شاگرد آج بھی نقل اتار سکتے ہوں گے اسی بحر اور قافیہ میں داؤد صاحب نے بھی فوراً ایک شعر لکھ دیا اور اسی انداز سے اپنے خاص حلقہ میں پڑھ کر سنا بھی دیا، وہ یہ تھا ؎

خوب تر صحرا نوردی می کند

اشتر پنجاب در ہندوستان

اب قارئین کرام داؤد صاحب کے لگائے ہوئے مصرعہ کا لطف پوری طرح اٹھائیں گے ؎

ناظرا اب سیر سبزہ کر ڈالو

اپنے آگے کی گھاس چر ڈالو"

حامد علی خاں[1] کے کمرے سے جو کالج میں "منشی ستائیس" کہلاتے تھے ان کی شامت میں گھڑی چوری ہوگئی تھی میز پر گھڑی کا خانہ خالی پڑا تھا داؤد صاحب مرحوم ادھر آ نکلے چوری کا واقعہ سنا اور فی البدیہہ چند مصرعے موزوں کر کے گھڑی کے خانہ میں لکھ دیئے۔ آخری مصرعہ یہ تھا ؎

چور گھڑی لے گیا کیوں نہ ہو خانہ خراب

علی گڑھ میں تعزیہ داری کے جلوس کے سلسلہ میں سخت بلوہ ہندو مسلمانوں میں ہو گیا تھا، اس فساد کی وجہ سے کالج بھی کچھ دن کے لئے بند کیا گیا تھا۔ ہندوؤں کا لیڈر لالہ بدری پرشاد وکیل تھا اور وہ ہی مقدمہ کی پیروی میں پیش پیش تھا۔ مقدمہ کی پیشی کے دن ایک پرجوش مسلمان داؤد خاں نامی نے کچہری کے احاطہ میں لالہ بدری پرشاد کی بانک سے ناک کاٹ لی۔ لالہ بڑے بزدل تھے غش کھا کر گر گئے اور پیشاب پاخانہ خطا ہو گیا۔ داؤد مرحوم نے اس واقعہ پر نظم لکھ ڈالی جس کے دو شعر یہ تھے ؎

واہ رے سامر اؤ خاں قربان تیرے جائیے	ناک کاٹی ہے عدالت میں بڑے بیدرد کی
کیا زبوں حالت تھی لالہ بدری پرشاد کی	منہ سے گریہ کی صدا تھی اور مقعد باد کی

مولانا شوکت علی مرحوم اپنے مضمون میں لکھتے ہیں کہ:

"بہادر علی جن کا بیٹا اختر علی تحریک خلافت کے زمانہ میں میرا اسیکرٹری رہا تھا وہ غریب اسکول میں تعلیم دینے لگے۔ نیک طبیعت شخص تھے، لانبی داڑھی رکھتے تھے جس کی وجہ سے ہر شخص ان کا مذاق اڑاتا تھا۔ انہوں نے بی۔ اے میں ریاضی لی تھی۔ چونکہ عام خیال یہ تھا کہ مسلمان ریاضی میں کمزور رہتا ہے اس لئے ہماری پارٹی کے مسٹر کمال الدین نے جو عبدالرحمٰن صدیقی کے بہنوئی سورت کے رہنے والے اور فٹ بال کے کپتان تھے، ان کا نام "بابو کھوش" بروزن "بابو گھوش" رکھ دیا تھا۔ جب ریاضی کا مضمون انہوں نے چن لیا تو بابو "کھوسکے" بروزن "بابو گھوکھلے" کی پھبتی ہوئی۔ غرضکہ جب بہادر علی اسکول میں درس دینے لگے تو

---

[1] حامد علی خان ساکن فتح گڑھ ۱۸۹۰ء میں فرسٹ ایئر میں داخل ہوئے ۱۸۹۳ء میں بی۔ اے کیا اولاً نائب تحصیلدار پھر تحصیلدار ہوئے امروہہ میں تعینات تھے، شکار کھیلتے میں بندوق کا نشانہ اتفاقاً لگا اور جاں بحق ہوئے کسی مرتبے پر وہ کالج میں ستائیس سے ترقی کر کے بیٹھے تھے کہ یا تو فرق چار کا ہوگا یا ستائیس کا۔

داؤد صاحب مرحوم نے ایک خاص مناسبت کی بنا پر ایک قطعہ تصنیف کر دیا جس کو ہم نے گا دیا اور وہ سب میں مشہور ہو گیا اس کے صرف یہ دو شعر یاد رہ گئے ہیں ؎

کہاں چھوٹی کسوت کہ صرا ستراہے — تمہارا ہی پیشہ کہو کیسا بُرا ہے

بس اب اس و تدریس میں کیا دھرا ہے — بہادر علی یہ زمانہ بُرا ہے"

مولانا محمد علی جوہر مرحوم نے اپنے ذوق شعر کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ:

"شعر نے جس شخص کے لئے اتنی کم عمر میں بقول غالب خود خواہش کی ہو کہ "گر دد فن او" وہ بھلا داؤد صاحب پر کس طرح عاشق نہ ہوتا جبکہ اسے اسی زمانہ میں معلوم ہو گیا ہو کہ داؤد صاحب کا بھی یہی فن تھا۔ میں نے سُنا تھا کہ چودھری ممتاز حسین[1] صاحب کو آج کل کے کلکٹر سید زین الدین[2] صاحب کے ساتھ خاص الفت تھی مگر زین الدین صاحب جس طرح ۱۹۲۱ء میں نان کوآپریٹروں[3] پر ظلم کرنے میں مشہور تھے اسی طرح اس زمانہ میں چودھری صاحب پر یہاں تک ظلم فرمایا کرتے تھے کہ بیچارے چودھری صاحب نے خودکشی کی ٹھان لی تھی۔ اس قصہ کو داؤد صاحب نے ایک مثنوی کی شکل میں منظوم کیا تھا اور ۱۸۹۱ء سے مجھے اس کا ایک شعر یاد تھا جس میں۔ زین الدین صاحب کا اپنی کوٹھی سے یہ سنتے ہی گھبرا کر باہر نکل آنا بیان کیا گیا ؎

نہ ہوا سر دھتی نہ سر پر چھاؤں
اس پہ طرّہ یہ تھا کہ ننگے پاؤں

اس مثنوی کو میں بھلا کر دکھاتا لیکن کسی نہ کسی کی زبانی میں نے یہ شعر سُن لیا تھا اور گو دریا بیلس کے باعث حافظہ اب بالکل برباد ہو گیا ہے لیکن الحمد للہ بچپن کے سنے سنائے شعر اب تک یاد ہیں۔ جب میرے عزیز دوست محمود احمد صاحب عباسی نے یہ ارادہ ظاہر کیا کہ اپنے مرحوم بڑے بھائی کی اس مثنوی کو وہ پھر شائع کرائیں گے اور تقریظ لکھنے کی مجھ سے فرمائش کر کے مجھے وہ مثنوی دکھائی تو میں نے سب سے پہلے اسی شعر کی تلاش کی اور عجیب مسرت ہوئی جب اس کو اسی طرح مثنوی میں اسی موقع پر جس کا میں نے اپنے حافظہ سے اوپر ذکر کیا ہے، پایا۔"

مثنوی کا نام "شکوۂ یار" رکھا، پانچ سو سے زیادہ شعر ہیں ۱۸۹۳ء میں طبع ہوئی۔ دیباچہ میں خود لکھتے ہیں:

---

[1] چودھری ممتاز حسین مرحوم ولد علی بخش ساکن پانی پت۔ ۱۰ جون ۱۸۸۹ء میں علی گڑھ کے مدرسۃ العلوم میں داخل ہوئے اور ۱۸۹۱ء میں انٹرمیڈیٹ پاس کر کے کالج چھوڑ دیا، اولاً نائب تحصیلدار ہوئے پھر تحصیلداری پر ترقی ہوئی کچھ عرصہ ریاست دوجانہ میں منیجر رہے ——— عرصہ ہوا انتقال ہو گیا۔

[2] سید زین الدین مرحوم ایم۔اے سید زین العابدین مرحوم کے فرزند تھے جو سرسیدؒ کے احباب خاص میں سے تھے اور علی گڑھ میں سب جج تھے۔ سید زین الدین مرحوم کا تقرر براہ راست ڈپٹی کلکٹری پر ہوا، پھر کلکٹر ہوئے۔ ابتدا آپ بڑے فیشن ایبل تھے آخر میں مذہب کا رنگ غالب آیا، کچھ عرصہ ریاست رامپور میں ریونیو منسٹر رہے۔ جب کبھی ملنا ہوتا اکثر داؤد مرحوم کا ذکر کرتے تھے اور ان کے لطیفے سنایا کرتے تھے۔ مجھے اجازت دی تھی کہ مثنوی اور ان کے نام کے قطعہ کو بالاظہار نام چھپوا دوں۔

[3] یعنی کانگریس کی تحریک عدم موالات کے عامل "Non - Co operators"

"چونکہ مجھے کسی سے تلمذ کی عزت بھی حاصل نہیں لہٰذا ضرور ہے کہ جا بجا ٹھوکریں کھائی ہوں گی۔ بہر حال یہ ٹوٹی پھوٹی نظم جس پر نظم کا لفظ بھی مشکل سے عائد ہوتا ہے خاص اپنی ادا سے نیز ایک حد تک عدم فرصت کے اشارے سے اپنے سچے ہمدرد اور رفیق محمد فصیح کے نام سے معنون کرتا ہوں۔ پہلے بھی مجھے اکثر دوستوں نے یہ صلاح دی کہ میں اس کو طبع کرا دوں مگر مجھے یقین نہ تھا کہ طبع ہونے کے بعد مطبوع ہوگی لہٰذا جرأت نہ کر سکا اور بجائے چھپوانے کے چھپانے کی کوشش کی لیکن ان کے سخت اصرار اور متواتر تقاضوں نے اب مجھ کو اس بات پر مجبور کیا کہ اس کو طبع کرا کے پبلک کے سامنے اپنی یاوہ گوئی اور ژولیدہ بیانی کے ثبوت دوں۔"

تمہید کے اشعار ملاحظہ ہوں ؎

قلم دو جہاں دکھا جوہر — خامۂ دُر فشاں دکھا جوہر
وقت آیا ہے خوش بیانی کا — امتحاں آج ہے روانی کا
گل مضموں رنگ دکھلائیں — آج کاغذ پہ پھول کھل جائیں
لب پہ تحسین بار بار آئے — گلشن نظم میں بہار آئے
ہر ورق رشک سنبلستاں ہو — مثنوی غیرت گلستاں ہو
بحر مضموں میں ہو تلاطم آج — جوش میں آئے قلزم امواج
کس طرح سے میں سخن کے زمزمہ ساز — کھولتا ہوں در خزینۂ راز
موجۂ نظم گھیرتا ہوں میں — آج موتی بکھیرتا ہوں میں
گوہر و دُر کی کان ہے سینہ — جوہری کی دوکان ہے سینہ
نکتے جو مضمون ازل سے سربستہ — ہیں مرے سامنے کمر بستہ
توسن فکر ہو جو گرم عناں — پردۂ غیب کے ہوں راز عیاں
پھر کے اک پل میں چار سو آئے — جب اڑے آسماں کو چھو آئے

اسی طرز کے چند اور شعر ہیں پھر "کیفیت ابتدائے الفت" کے عنوان سے یوں شروع کیا ہے ؎

اب سنیں صاحبان سوز و گداز — قصۂ درد و غم کا ہے آغاز
اک مرے دوست اور کرم گستر — ذی خرد، ذی شعور، دانشور
نکتہ رس، نکتہ سنج، خوش اطوار — ساری باتوں میں الغرض ہشیار
مگر آگاہ ہے نہ الفت سے — نابلد محض ہے محبت سے
دور دل سے یہ علت تھی سارے — جانتے ہی نہ تھے یہ کیا ہے

۱؎ محمد فصیح گھوسی ضلع اعظم گڑھ کے رہنے والے ہیں۔ ۱۸۹۸ء میں کالج میں داخل ہوئے ۱۹۰۳ء میں بی اے پاس کیا [illegible] سب انسپکٹر ہوئے پھر اکسائز انسپکٹر پھر تحصیلدار۔ [illegible] کے کمرے میں [illegible] کے پاس [illegible] محمد فصیح بڑے منہ پھٹ تھے اور سید زین الدین سے ان کی دوستی تھی۔

ان عزیزوں سے زبان بے بہرہ — ان صداؤں سے کان بے بہرہ
جس کے دل میں نہ یہ حلاوت ہو — اس سے بیزار جو طبیعت ہو
اس کے سودے سے ہو جو سر خالی — اس سے ہو کر کوئی بشر خالی
اس کو کچھ لطفِ زندگی ہی نہیں — بلکہ یوں سمجھئے آدمی ہی نہیں
اس کی تلخی میں بھی حلاوت ہے — اس کی تکلیف میں بھی راحت ہے
اس سے دل میں سرور آتا ہے — اس سے آنکھوں میں نور آتا ہے
اس کی بدنامی نام کا باعث — اس کی ناکامی کام کا باعث
یہ خزاں ہے بہار سے بہتر — بے قراری قرار سے بہتر
رنج ہے باعثِ خوشی اس میں — موت ہے عین زندگی اس میں
اس کے چھینٹوں سے ہوش آتا ہے — خود بخود دل میں جوش آتا ہے
اس کے غم میں بھی اک بحالی ہے — اس کی جو بات ہے نرالی ہے
اس نے پائی ہے کچھ عجب تاثیر — خاک اس کی نظر سے ہو اکسیر
قدر میں پھول سے سوا خس ہو — جس کو یہ مس کرے وہ پارس ہو
جس پہ یہ مہربان ہوتا ہے — وہ عزیزِ جہان ہوتا ہے
شہرۂ عام قیس نے پایا — کس قدر نام قیس نے پایا
تخمِ الفت کا بو گیا فرہاد — سرخرو اس سے ہو گیا فرہاد
اس کے غم سے نہ تھا جو تل خالی — رتبہ عشاق میں ملا عالی
دقتیں ہیں مگر ہزار اس میں — ہر کسی کو نہیں ہے بار اس میں
اس جنوں کے لیے ہے سر درکار — اس تحمل کو ہے جگر درکار
اس میں زور آزمانے مشکل ہیں — اس کے صدمے اٹھانے مشکل ہیں
جو کوئی یہ مصیبتیں جھیلے — پہلے وہ اپنی جان پر کھیلے
جان ہر ایک کھو نہیں سکتا — ایسے ویسوں سے ہو نہیں سکتا
اس میں لازم ہے مستقل رہنا — اس کے در پہ بجان و دل رہنا
چوٹ پر چوٹ کھائے اف نہ کرے — لاکھ صدمے اٹھائے اف نہ کرے

یہ مثنوی جب چھپ گئی اس کی بڑی شہرت ہوئی کالج کے ہر بے فکرے کی زبان پر اس کے اشعار رہتے۔ شدہ شدہ سید زین العابدین مرحوم کے پوتے [illegible] سید زین العابدین صاحب کو خبر ہو گئی وہ ایسے برہم ہوئے کہ سرسید سے شکایت کی، انھوں نے مسٹر بک پرنسپل سے کہا مگر [illegible] صاحب مرحوم طلبا اور اساتذہ دونوں میں یکساں ہر دلعزیز تھے اور مسٹر بیک [illegible] خاص طور سے ان کے مداح تھے۔ سید محمود مرحوم کو بھی ان کے بعض لطیفے [illegible] کے متعلق پسند آئے تھے۔ ان حالات میں کوئی اقدام ان کے خلاف نہیں کیا جا سکتا تھا بالآخر مسٹر بیک نے

ان کی رائے معلوم کر کے سرکاری ملازمت کی سفارش کر دی اور اس طرح وہ سرکاری ملازمت میں منسلک ہو کر علی گڑھ سے باہر چلے گئے۔ زین الدین مرحوم بھی اپنی ملازمت پر چلے گئے تھے ایک خط میں یہ شکوہ بھی کیا تھا کہ دوستوں نے ہمیں بھلا دیا ہے۔ داؤد مرحوم نے جس قطعہ منظوم میں اس کا جواب دیا تھا وہ یہاں درج کرتا ہوں ؎

تم نے لکھا تھا مجھے خط میں بڑی حسرت سے ۔۔۔ اور حقیقت میں وہ تھی بات بھی حسرت والی
یعنی جو روز[1] کی آخر میں ہوئی تھی حالت ۔۔۔ اور جس قسم کی تھی اس کی پریشاں حالی
کم زیادہ وہ ہی حال تمہارا ہے کہ تم ۔۔۔ جس طرف دیکھتے ہو پاتے ہو میدان خالی
لاکھ کوشش کرو اب کوئی نہیں ملنے کا ۔۔۔ محض بے سود، کرو کیسی ہی دیکھا بھالی
چودھری[2] کر گیا سچ ہے، جو کچھ کرنا تھا ۔۔۔ اس کی ہمت تھی قوی، حوصلے اس کے عالی
اب شہ دم ہے کسی میں، نہ ہے وہ جوش و خروش ۔۔۔ اور ادھر تم پہ بھی ہے چھائی ہوئی کنگالی
یعنی خود تم کو ہے افسوس کہ اب تم میں کچھ ۔۔۔ نہ رہی بات وہ لوگوں کو لبھانے والی
اب نہیں وہ کہ جسے چاہا اسے پھونک دیا ۔۔۔ گویا اک آگ سی تھی جس نے ہوا دہکا لی
مل گیا جب کوئی بیچارہ تو دل اینٹھ لیا ۔۔۔ صبر و ہمت کی جو کچھ جمع تھی سب رکھوا لی
ہو گئے ظلم میں جب طاق، ستم میں استاد ۔۔۔ خوب ان باتوں میں جب مشق بہم پہنچا لی
تو یکایک صفِ عشاق سے نکلا آگے ۔۔۔ اک اولوالعزم، جری، پانی پتی، کرنالی
اس نے دو روز ہی میں کر دی قیامت برپا ۔۔۔ ہو گئی دھوم زمانے میں وہ چھل بل ڈالی
اس کے تیور ہی کچھ ایسے تھے کہ دیکھے نہ بنے ۔۔۔ بانکی تھی اس نے طبیعت بھی عجب متوالی
اس کی الفت کے ہوئے لوگوں میں چرچے کیا کیا ۔۔۔ مثنوی بھی کسی استاد[3] نے اک لکھ ڈالی
تم بھی مشہورِ جہاں ہو گئے اس کے باعث ۔۔۔ اور اس نے بھی کما حقہٗ شہرت پا لی
اس زمانہ کے گزر جانے کا اب رنج فضول ۔۔۔ ٹھہر سکتی نہیں جو شے ہے گزرنے والی
اب کوئی اور، اسی قسم کی، سوچو تدبیر ۔۔۔ شغل کچھ چاہیئے، اچھا نہیں رہنا خالی

ہم بتائیں تمہیں اب اس پہ عمل کرنے کو
"قحبہ چوں پیر شود پیشہ کند دلالی"

داؤد مرحوم کے عزیزوں میں علی حسین عباسی ایک معتبر بزرگ، دمہ کے مریض تھے، کھانسی کھنکار، بلغم تھوک سے ہر دم واسطہ، اپنی قبر کے لیے انہوں نے پہلے ہی سے جگہ تجویز کر لی تھی اور خاندانی قبرستان سے ذرا دور ہٹ کر ایک چبوترہ بھی بنوا دیا تھا لیکن جب ۱۸۹۵ء میں مراد آباد وفات پا گئے

---

[1] اس زمانہ میں "روز و فرزی نشہ" شائع ہوا تھا جس کا نام تھا، زین الدین اور داؤد مرحوم انگریزی تحریر کی قابلیت بڑھانے کے لیے انگریزی خطوط لکھا کرتے تھے۔ ایک معتذر کی طرف سے اور دوسرا فرزی کی جانب سے۔

[2] یعنی چودھری ممتاز حسین مرحوم ساکن پانی پت ضلع کرنال۔

[3] اس زمانہ میں داؤد مرحوم کالج بیت الکمال میں ٹھہرے تھے۔

بنی اور اس کی جامع جیل ڈالی گئی تو اس ریلوے لائن میں یہ چبوترہ آ کر مسمار ہو گیا، علی حسین مرحوم کو کچھ ایسا تعلق ہوا کر امروہہ سے اپنے اکلوتے فرزند ابن حسن عباسی کے پاس جو اس زمانہ میں تحصیلدار تھے اور بعد میں ڈپٹی کلکٹر ہوئے، ان کے جائے تعیناتی پر چلے گئے اور چند روز میں دنیا سے بھی رخصت ہو گئے۔ لوگوں نے ان کی وفات کی تاریخیں کہیں۔ داؤد مرحوم نے بھی تاریخ کہی اور اپنے دوست مولانا طفیل احمد علیگ (مرحوم) کو خط مرقومہ ۲ رمضان المبارک میں لکھا کہ جو تاریخیں ہوئی ہیں وہ ان مرحوم کے حسبِ حال نہ تھیں، مجھ کو حسبِ حال لکھنی چاہیئے تھی چنانچہ مادۂ تاریخ ایسا ہی نکالا ہے۔ سنئے ؎

مر گئے ہیں بڑے میاں جب سے — دل میں اٹھتی ہے ان کے غم سے ہوک
تھے بڑے نیک بخت اور دیں دار — کرتے رہتے تھے سب سے نیک سلوک
جنتی ہونے میں نہیں ان کے — دوست دشمن کسی کے دل میں شکوک
سب نے لکھی ہیں ان کی تاریخیں — ہو گئی اک غلط مجھ ہی سے چوک
اس لئے آج میں نے بھی اپنی — شاعری کی گھڑی کر دی ہے کوک
جب سے یہ دھن ہوئی ہے بھول گیا — کس کو کہتے ہیں پیاس کیسی بھوک

بولا ہاتف کہ ہو گئے بے گھر
آج کھانسی، کھکار، بلغم، تھوک
۱۸۹۹ء

داؤد صاحب مرحوم کی بیاضیں، جو راقم الحروف کے پاس اب تک موجود ہے، میر انیس، مرزا دبیر، میر محسن کے متعدد مرثیے خاص کر وہ مرثیے جو حسنِ بیان، صنائع لفظی و بلاغت کے عمدہ نمونے ہیں نقل ہیں، وہ ہر سال بہ زمانہ طالب علمی ان مجالس کی شرکت کے لئے پنڈراول جایا کرتے تھے جہاں راجہ باقر علی خان[1] کے یہاں محرم کی مجلسیں ہوا کرتی تھیں اور لکھنؤ کے نامی نامی مرثیہ گو آتے تھے۔ خان قلات نے اپنے ولی عہد، سردار یوسف خان کو جو ابھی نوعمر تھے انگریز پولٹیکل ایجنٹ کے ایماء سے تعلیم و تربیت کے لئے علی گڑھ بھیج دیا تھا، ابھی چند ہی سال ہوئے تھے کہ اس نوجوان کو مسند نشینی کی تقریب کے لئے وطن واپس جانا پڑا جہاں پہنچنے بھی نہ پایا تھا کہ مخالف پارٹی نے راستہ ہی میں بڑی بے دردی سے قتل کرا دیا۔ مسٹر بیک کے دل پر جو اس نوجوان سردار کی گاڑھین تھیں ایسا اثر پڑا کہ انہوں نے انگریزی میں اس کا مرثیہ لکھا، وہ خود بھی شاعر تھے اور داؤد مرحوم کی خوش طبعی کی قدر دان، انہوں نے فرمائش کی کہ داؤد اردو میں مرثیہ لکھیں، داؤد مرحوم نے فرمائش کی تعمیل میں جو مرثیہ لکھا صاحب خمخانہ جاوید کی رائے ہیں "مرثیہ یوسف خان سے ان کی غیر معمولی لیاقت معاملہ بندی اور مضمون پسند فکر کا رنگ مترشح ہوتا ہے۔ حق یہ ہے کہ یہ مرثیہ اپنے رنگ میں فرد ہے" اب یہ مرثیہ سنئے ؎

خشک اور ویران صحرا میں بلوچستان کے — اک کھلا تھا پھول نازک اور نہایت خوشنما
باغباں وہ بھی نے دیکھا نہ ہوگا کوئی پھول — اس سے بہتر خوشنما اور دلفریب اس کے سوا
گلشنِ عالم میں لاکھوں گل کھلے ہوں گے مگر — کم ہوا ہوگا کوئی اس سے زیادہ دلربا
لیکن اس کے واسطے موزوں نہ تھی وہ سرزمیں — وہ گل تر ایسے ریگستان کے قابل نہ تھا

ملہ بروایت مروزہ اور متعلق

[1] داؤد مرحوم کے رفیق اور ساتھی قطب الدین صاحب رکن، کہ جو بعد میں حیدرآباد کے مشہور افسر مال رہے، والد ماجد راجہ باقر علی خان آف پنڈراول کے مصاحب تھے اس لئے داؤد صاحب مرحوم کو مجالس کی شرکت کے لئے وہاں قیام کی سہولتیں تھیں۔

چھوڑ کر کالج چلا تھا جبکہ تو سوئے وطن ❊ ہے ہمارے سامنے اب تک سماں اس روز کا
وہ دمِ رخصت ترا رو رو کے ملنا یاد ہے ❊ دل سے جانے کا نہیں اس دن کا وہ جانا ترا
کہہ رہی تھیں حسرت آلودہ نگاہیں تیری صاف ❊ ہو رہا ہے تو ہمیشہ کے لئے ہم سے جدا
لینے واپس آنے کا آتا نہ تھا تجھ کو یقیں ❊ سب تجھے سمجھاتے تھے اور تو مایوس تھا
کچھ دلاسوں کا نہ ہوتا تھا ترے دل پر اثر ❊ بند ہوتا تھا نہ ہرگز آنسوؤں کا سلسلا
اب یہ ثابت ہو گیا تیرا ہی کہنا تھا درست ❊ تھا غلط جو کوئی کہتا تھا کہ تو پھر آئے گا
غیر ممکن ہے کہ تجھ کو بھول جائیں جلد ہم ❊ مدتوں ہوتا رہے گا ذکر کالج میں ترا
جس طرح کھیلوں میں تھا حاصل یدِ طولیٰ تجھے ❊ ویسے ہی علمی ترقی کا بھی تجھ کو شوق تھا
سربرآوردہ رہا الکول میں تو جس طرح ❊ کرکٹ و فٹ بال میں ویسے ہی تو ممتاز تھا

اب نہ تو ہے اور نہ کالج میں ترا کوئی نشاں
خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا

داؤد مرحوم کا مجموعۂ کلام زیادہ تر اخلاقی نظموں، مثنوی، قطعات، تضمین اور چند غزلیات پر مشتمل ہے۔ اشعار کی تعداد پونے دو ہزار ہے۔ ان کی ایک نظم "سچی دوستی کا امتحان" کو ان کے رفیق خان بہادر مولوی الحاج محمد حبیب اللہ خان صاحب سابق کلکٹر یو۔پی نے ۱۸۹۴ء میں طبع کرا دیا تھا اور اپنے دیباچہ مرقومہ ۱۴ر فروری ۱۸۹۴ء میں اس بات کا ذکر کرتے ہوئے کہ مولانا حالی مرحوم کی نظموں سے اردو شاعری میں طرزِ جدید کی بنیاد پڑی، وہ تحریر فرماتے ہیں:

"پچھلے پانچ چھ سال سے مدرسۃ العلوم کے طالب علموں نے اس طرزِ جدید میں طبع آزمائی کی اور چند عمدہ نظمیں پبلک کے سامنے پیش ہوئیں لیکن یہ نظم جس کا نام "سچی دوستی کا امتحان" ہے اور جو ابب نذرِ ناظرین کی جاتی ہے ایسے اعلیٰ درجہ کی نفیس اور دلکش نظم ہے کہ مدرسۃ العلوم کے طالب علموں کی نظمیں تو درکنار ان کل نظموں میں جو اس طرزِ جدید میں (مولانا حالی کی نظموں کو مستثنیٰ کر کے) لکھی گئی ہیں بے مثل اور لاثانی ہے۔ اس نظم کے مصنف ہمارے دوست محمد داؤد صاحب بی۔ اے ہیں جنہوں نے عرصہ تک کالج میں تعلیم پائی ہے اور جو علاوہ کامل استعداد فارسی و عربی کے فنِ شاعری میں اعلیٰ دستگاہ رکھتے ہیں۔ ان کی طبیعت کو قدرتی طور سے شعر سے خاص مناسبت اور لگاؤ ہے اور یہ رائے ہمارے مدت دراز کے ذاتی تجربہ اور واقفیت کے بعد قائم ہوئی ہے۔ ہم پبلک پر اس کا فیصلہ چھوڑتے ہیں وہ اس نظم پر اپنی قطعی رائے قائم کرے لیکن ہم اپنی سمجھ کے مطابق اس امر کے کہنے سے باز نہیں رہ سکتے کہ بلحاظ خوبیٔ مضمون، سلاستِ بیان و بے ساختگی، طرزِ ادا اور بندشِ الفاظ وغیرہ کے یہ نظم نہایت اعلیٰ درجہ کی ہے۔ جس قصہ کو ہمارے دوست نے نظم کیا ہے وہ اخلاقی لحاظ سے نہایت پُر اثر ہے اور اس لحاظ سے اور نیز سادگی اور سلاستِ زبان کے لحاظ سے یہ نظم اس قابل ہے کہ سرکاری دیسی مدارس کے کورس میں شامل کی جائے۔ ہمیں امید ہے کہ قوم اس دلکش نظم کی پوری قدر کرے گی اور ہمارے دوست مصنف جو اپنے قدرتی انکسارِ طبیعت کی وجہ سے پبلک اسٹیج پر آنے میں تامل کیا کرتے ہیں وقتاً فوقتاً ایسی عمدہ نظموں سے قوم کو فائدہ پہنچاتے رہیں گے اور اس ذریعہ سے اردو زبان کی روز افزوں ترقی میں مدد دے کر اس کر اپنا ممنونِ احسان کریں گے ــــ ۱۴ر فروری ۱۸۹۴ء"

اس نظم میں سو سے زیادہ شعر ہیں اور ہر شعر بندش الفاظ و بیساختگی اداء میں دوسرے سے بڑھ کر، بخوف طوالت یہاں شروع کے چند ہی شعر نقل کرتا ہوں ؎

کہہ رہا تھا فخر سے اک شخص یوں بیٹھا ہوا
مجھ سا خوش قسمت بھی دنیا میں نہ ہوگا دوسرا

آج جیسے میرے سچے دوست اور ہمدرد ہیں
ویسے ہی احباب صادق ہر کسی کو دے خدا

ان میں ایک اک معتمد ایسا ہے کہ آئے وقت پر
مال تو کیا جان تک کر دے تصدق اور فدا

ایک قطرہ گر پسینہ کا کہیں میرے گرے
سچ سمجھئے اس جگہ دیں گے وہ اپنا خوں بہا

بیوفائی کس کو کہتے ہیں نہیں ان کو خبر
نام سے نا آشنا کے کان ہیں نا آشنا

یار و ہمدرد و جانباز و رفیق و غمگسار
با مروت، بے تکلف، بے ریا و باصفا

ناز ہو ان پر مجھے جتنا زیادہ ہے درست
جس قدر ہو فخر مجھ کو ان کے اوپر ہے بجا

دوستوں کے ہوتے ہیں شاکی الٰہی کون لوگ؟
کیا شکایت ہوتی ہے وہ کیسا ہوتا ہے گلا؟

کہتے ہیں دیتے ہیں دھوکہ دوستی کو دوست بھی
غالباً یہ جھوٹ ہے ایسا تو کیا ہوگا بھلا

دوست، اور آنکھیں چرائے دوست سے ممکن نہیں
یوں ہی اپنے دل سے لوگوں نے ہے شاید گھڑ لیا

جھوٹے اور سچے بنا لیتے ہیں قصے بیٹھ کر
بعض لوگوں کو انہی باتوں میں آتا ہے مزا!

جیسے خود ہیں ویسا ہی اوروں کو کرتے ہیں قیاس
وہ سمجھتے ہیں کہ ہے سارا زمانہ ایک سا

دوستوں کو دیکھ کر مشکل میں چھپ جائیں جو دوست
خلق میں ہو جائے گا اندھیر اب ایسا بھی کیا!

اسی نظم میں ایسے بھی شعر ہیں کہ صنعت ابہام کا لاثانی نمونہ کہے جا سکتے ہیں مثلاً ؎

خود غرض احباب سے رکھتے نہیں ہم خود غرض
جو ہیں اپنے کام کے ان سے ہمارا کام کیا

''تذکرہ خندۂ گل'' کے مؤلف مولوی عبد الباری نے داؤد مرحوم کے تذکرہ میں ان کے کلام کا انتخاب شائع کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ''وہ نہایت قابل، ذکی اور ذہین تھے...... قدیم اور جدید دونوں رنگوں میں شعر کہتے تھے۔ طبیعت میں چونکہ شوخی کا مادہ زیادہ تھا اس لئے کہیں کہیں وہ ایک ہلکی ظرافت کا رنگ اختیار کر لیتے تھے'' (صفحہ ۲ خندۂ گل)۔ اسی طرح لالہ سری رام ایم۔اے صاحب خمخانہ جاوید ان کے بارے میں لکھتے ہیں کہ ''مولانا حالی کے اکثر اشعار کو تضمین کیا ہے، بلا کے ذکی اور ذہین تھے، ان کے کلام سے ان کی شوخی اور طبیعت داری اور ذکاوت ٹپکتی ہے اگر زندگی وفا کرتی تو کیا عجب کہ اس فن میں بھی نام و نمود حاصل کرتے۔'' مولانا محمد علی جوہر مرحوم نے فرمایا ہے کہ ''خمخانہ جاوید میں جو چند غزلیں اور متفرق اشعار اور یوسف خان کا مرثیہ شائع ہوا ہے ان کو پڑھ کر داؤد صاحب مرحوم کی بے تکلف شاعری اور ان کے سہل ممتنع کا لطف اٹھایا۔ ان اشعار میں سے بھی بچپن کے حافظہ نے ایک شعر کا اندوختہ مجھے عطا کیا تھا چنانچہ اس کو بھی اسی مسرت سے پڑھا ؎

یہ جھوٹ اور ہم سے بس اب رہنے دیجئے
ہم بھی تو رات جھانک رہے تھے دراڑ سے

البتہ اب جبکہ میری عمر غالباً داؤد صاحب کی عمر سے بھی زیادہ ہو گئی ہے اس شعر کے ''معاملہ'' پر نظر پڑی تو تعجب ہوا کہ ان جیسا سنجیدہ اور متین بزرگ بھی کم از کم شعر ہی میں دراڑ سے جھانک سکتا تھا! خدا نہ کرے یہ شعر بھی مثنوی کی طرح سو بجات معتقدہ کے نام کر آپ چیزوں پر ایک [illegible]

کی شان میں کہا گیا ہو۔ اب اس غزل کے جس کا ایک شعر مولانا نے اوپر نقل کیا ہے چند اور شعر سن لیجئے ؎

اس عشق کے طفیل لڑائی رہی سدا — تقدیر سے رقیب سے ناصح سے یار سے
انصاف کی ہے بات میں پھر کیا گلہ کروں — جب ٹال دے وہ ہاتھ گلے میں پیار سے
رہزن ادھر لگا ہے اُدھر زلف پُر شکن — یارب بچائیو مجھے اس لوٹ مار سے
قربان عشق کے کہ ہم آزاد ہوگئے — قید حیا سے شرم سے ذلت سے عار سے
میری طرف سے آپ کے دل میں ہے کیوں غبار — تقصیر ایسی کیا ہوئی اس خاکسار سے
سن کر پیا بھرے مرا نام یوں کہا — وہ ہی نا دُبلے پتلے ضعیف و نزار سے
معلوم ہے مجھے بڑے استاد ہیں جناب — یوں دیکھنے میں سیدھے سے پرہیزگار سے
خود مجھ کو تجربہ ہے بس اب کیا بیاں کروں — خالق بچائے ایسے شریروں کے وار سے

اب دو ایک تضمینیں بھی ملاحظہ ہوں۔ مولانا حالیؔ کا شعر ہے ؎

آؤ لیں جا کر ہمیں اس کو منا — اس کی بے پروائیوں پر جائیں کیا

داؤد مرحوم نے اس کو یوں تضمین کیا ؎

اس سے ہم ہیں اور وہ ہم سے خفا — گو حقیقت میں اسی کی ہے خطا
خیر اب جانے بھی دیں کیا فائدہ — آؤ لیں جا کر ہمیں اس کو منا
اس کی بے پروائیوں پر جائیں کیا

شعر حالیؔ ؎

آرہی ہے چاہِ یوسف سے صدا — دوست یاں تھوڑے ہیں پر بھائی بہت

تضمین داؤدؔ ؎

ہو رہا ہے رنگ عالم کا نیا — دکھ پہنچتا ہے عزیزوں سے سوا
کاروانِ دہر میں یوں برملا — آرہی ہے چاہِ یوسف سے صدا
دوست یاں تھوڑے ہیں پر بھائی بہت

شعر حالیؔ ؎

ہم خوش کبھی ہوئے ہوں تو غم ناگوار ہو — ملتا نہیں محل گلۂ روزگار کا

تضمین داؤدؔ ؎

کیوں نشترِ ملال سے سینہ فگار ہو — کیوں رنج کے خیال سے چشم اشکبار ہو
صدمہ یہ کچھ نیا ہو تو دل بے قرار ہو — ہم خوش کبھی ہوئے ہوں تو غم ناگوار ہو
ملتا نہیں محل گلۂ روزگار کا

شعر حالیؔ ؎

اک خو سی ہو گئی ہے تحمل کی ورنہ اب — وہ حوصلہ رہا نہیں صبر و قرار کا

تضمین داؤد سے

طاقت تو ریخ الشانی کی ہم میں ہی ہے کب　　　تاب ضبط ان عرضداشت کے دل کے ساتھ سب
ز جھیلنے کا آپ ہی کچھ پڑ گیا ہے عجب　　　اک خوشی ہو گئی ہے تحمل کی ورنہ اب
وہ حوصلہ رہا نہیں صبر و قرار کا

اردو کے علاوہ فارسی میں بھی اسی بے تکلفی اور سلاست بیانی سے طویل نظمیں لکھ دیتے۔ فتح نواز جنگ کا ریاست حیدرآباد دکن میں آخری عہدہ ہوم سیکرٹری کا تھا۔ انگلستان کے زمانۂ قیام میں انہوں نے گرٹروڈ نام کی ایک انگریز عورت سے شادی کر لی تھی۔ حیدرآباد کے قیام پر اس عورت کی بد چلنی کی شہرت ہوئی، سالار جنگ دوئم سے اس کا ناجائز تعلق بتایا گیا، اخبارات میں مضامین شائع ہوئے۔ فتح نواز جنگ نے سکندرآباد میں ایک اخبار نویس مرزا پر ازالۂ حیثیت عرفی کا مقدمہ دائر کر دیا، یہ مقدمہ بڑا ہنگامہ خیز ہوا۔ اس زمانہ میں داؤد مرحوم کے ایک رفیق اور دوست مولوی مسعود علی بی۔ اے (مسعود علی بیگ) فتح نواز جنگ کے پیش دست تھے۔ ایک پمفلٹ لکھا گیا، داؤد مرحوم نے اس کو فارسی میں نظم کر دیا تھا۔ بڑی طویل نظم تھی ایک دو شعر اس کے لکھتا ہوں سے

محرم راز ایں پمفلٹ بہ نوشت　　　گفت ایں "میم" نیست رنڈی ہست
چوں رسید ایں بہ گوش فتح نواز　　　استغاثہ کناں ز جا برجست

متعدد کتابوں پر منظوم تقریظیں فرمائشاً لکھی ہیں۔ اردو و انگریزی میں بھی مضامین لکھتے۔ اردو مضامین بعض اخبارات میں شائع ہوتے مگر اپنے نام کا کبھی اظہار نہ کرتے۔ پھبتی کہنے میں کبھی نہ چوکتے۔ "نیچری بھانڈ" اور "نیچری سانڈ" کی پھبتی جن پر کسی تھی وہ مدت العمر ان پر چسپاں رہی۔

مجذوب صاحب

محمد رضا انصاری

شخصیت نگاری اور سوانح نگاری کے فرق کی بدولت مجذوب صاحب کے شخصیت نگار پر یہ ذمہ داری عائد نہیں ہوتی کہ وہ ان کا سن پیدائش عمر اور سالِ وفات وغیرہ کی تفصیل بھی بیان کرے، جن میں سے ایک چیز بھی بدقسمتی سے میرے علم میں نہیں ہے، سن پیدائش اور عمر کے معاملے میں تو بعض بڑی بڑی شخصیتیں گمنامی کا شکار پائی جاتی ہیں لیکن کسی نمایاں شخصیت کا سالِ وفات نہ معلوم ہونا یقیناً جہالت ہے، اس جہالت کا مجذوب صاحب کے بارے میں مجھے اعتراف ہے

عجیب اتفاق ہے جولائی ۱۹۴۲ء میں حیدرآباد کی ایک نجی صحبت میں جہاں کل ہند اردو کانگرس کے سلسلے میں حضرت جگر مراد آبادی کے ساتھ گیا ہوا تھا مجذوب صاحب کا ذکر آگیا جن کے بیشتر اشعار مجھے یاد ہیں۔ جگر صاحب نے تفنناً کہا: "آپ کوئی دو شعر ان کے سنائیے، دیکھئے آپ کے ذوق کا بھی امتحان ہے اس میں!"

ذوق کا ذکر جگر صاحب نے محض چھیڑنے کے لئے کیا تھا اس لئے کہ رسالہ نیا ادب (لکھنؤ) سے میری وابستگی اور ماہنامہ منزل (لکھنؤ) کی ادارت نے جگر صاحب کو جو "ترقی پسندوں کے ادبی ذوق" سے بدگمان سے رہتے تھے، میرے ذوق کا امتحان لینے کی دعوت دے دی۔ بہرحال دو شعر جو بروقت یاد آگئے میں نے سنائے ؎

گھٹا اٹھی ہے تو بھی کھول زلفِ عنبریں ساقی
ترے ہوتے فلک سے کیوں ہو شرمندہ زمیں ساقی

یہ مطلع جس غزل کا ہے اس کا مقطع بھی ؎

الٰہی خیر ہو مجذوب مے خانے میں آیا ہے
قدح کش، لاابالی، جام نازک نازنیں ساقی

دیر تک مجذوب صاحب کا ذکر ہوتا رہا۔ دونوں میں سے کسی کو ان کے بارے میں صحیح علم نہ تھا کہ وہ اب کہاں ہیں اور کس حال میں ہیں۔

خود لکھنا مجذوب صاحب نے گویا سیکھا ہی نہیں تھا، حال معلوم ہو تو کیسے؟

واپسی پر کچھ دنوں کے بعد ایک دفعہ ضمناً مجذوب صاحب کا ذکر آیا تو معلوم ہوا کہ ان کا انتقال ہو چکا ہے۔ اپنے وطن اُورئی ضلع جالون میں۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ تاریخ انتقال بھی جولائی ۱۹۴۴ء کی کوئی تاریخ ہے۔ اس وقت ذہن پر زور دے کر حساب لگایا تھا اور غالباً وہی تاریخ یا ایک آدھ دن آگے پیچھے کی تاریخ تھی جب حیدرآباد میں مجذوب صاحب کی یاد ہم لوگوں کو آئی تھی۔ تاریخ انتقال مجھ کو یا دوسرے لوگوں کو نہ معلوم ہونے کی وجہ کھلی ہوئی ہے کہ آخر زمانے میں مجذوب صاحب ایسی جگہ قیام پذیر ہو گئے تھے جو خبروں کی رہ گزر سے دور پڑتی تھی لیکن اس کی وجہ بتانا مشکل ضرور ہے کہ مجذوب صاحب کا ایسا شاعر جو شعرا کی درجہ بندی میں حسرت، جگر اور اصغر وغیرہ کے طبقے کا غزل گو تھا، عام طور پر نقادوں اور تذکرہ نویسوں کی نگاہوں سے کیوں پوشیدہ رہا۔

صفِ شعرا میں جب کبھی مجذوب صاحب کو دیکھا اساتذہ کے پہلو بہ پہلو دیکھا اور جب محفل یکجائی ہوئی، ہم نے انہیں پایا تو آتش بجاں مغنی پایا۔ جب وہ "نالہ کناں" ہوتے تو اچھے سے اچھے شاعر خاموش سامع بن کر رہ جاتے۔ اس فضا میں جو مجذوب صاحب کی ترنم آواز اور بے چین جذبات سے ہمیشہ پیدا ہو جایا کرتی۔ بڑے بڑے سخن شناس وارفتہ ہو جاتے یا گم صم اور سب اس دعوے کے مؤید نظر آتے۔

یہ معانی، یہ حقائق، یہ روانی، یہ اثر
شاعری تیری ہے اے مجذوب یا الہام ہے؟

شاعر سب ہی "پیدائشی" ہوتے ہیں اس لئے میں یہ نہیں کہتا کہ مجذوب صاحب "پیدائشی" شاعر تھے لیکن یہ کہے بغیر چارہ نہیں کہ مجذوب صاحب سراپا شاعر تھے۔

یہ دعویٰ مجذوب صاحب کے بہت سے جاننے والوں کو محض دعویٰ نظر آئے گا جس کا بظاہر واقعیت سے کوئی تعلق نہیں، بیشک مجذوب صاحب ایک زمانے میں ڈپٹی کلکٹر رہے ہیں پھر اس سے منتقل ہو کر محکمۂ تعلیمات (یو۔پی) میں اسسٹنٹ انسپکٹر ہوئے، آخر میں انسپکٹر آف اسکولس کے عہدے پر پہنچ کر سبکدوش ہوئے۔

مجذوب صاحب سخت قسم کے متشرع بھی تھے اور صوفی بھی، صوفی صرف شاعرانہ حد تک نہیں بلکہ واقعتاً اپنے وقت کے ایک بڑے شیخ طریقت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے مرید خاص اور خلیفہ بھی۔ شیخؒ کے انتقال کے بعد خانقاہ امدادیہ اشرفیہ میں متوسلین کے حالات و کوائف کے نگران اور مشیر بھی۔

تو وہ مذہبی بھی تھے صوفی بھی، سرکاری افسر بھی تھے اور سرکاری فہرستوں میں "خان صاحب" اور "خان بہادر" بھی۔ پھر بھی میں انہیں سراپا شاعر کہنے کی جرأت کر رہا ہوں ——— شاعری اگر صرف قافیہ پیمائی کا نام نہیں بلکہ اس کیفیت، اس شعور اور اس احساس کا نام ہے جو ہر شاعر میں کم و بیش پایا جاتا اور اس سے شعر کہلاتا ہے تو مجذوب صاحب پر یہ کیفیت اور یہ جذبہ ہمہ وقت طاری رہتا تھا، اگر ان کے دوسرے فرائض اس کیفیت کے اظہار میں رکاوٹ بنتے تو ایک سخت قسم کی بے چینی ان کے سر تا پیر سے ٹپکتی دکھائی دیتی تھی۔ اس بے چینی کو محسوس کرنے والا پوری طرح جان لیتا تھا کہ اس میں نہ بناوٹ ہے اور نہ دکھاوا۔

ہم دونوں "صاحبزادگان" "فرنگی محل" (یہ بلحاظ عمر نہ بغرض احترام) مجذوب صاحب کی تلاش میں ان کے مکان واقع بنارسی باغ مغرب کے بعد پہنچے۔ ۱۹۴۲ء کے آس پاس کی بات ہوگی، اس وقت مجذوب صاحب انسپکٹر آف اسکولز ہو چکے تھے اور خان صاحب خواجہ عزیز الحسن غوری انسپکٹر آف اسکولز (یو۔پی) کہلاتے تھے، مکان یعنی سرکاری بنگلے میں وہ نہ ملے نہیں معلوم ہوا کہ نماز پڑھنے گئے ہیں، دیر تک ہم نے ٹہل ٹہل کر انتظار کیا آخر اس مسجد تک پہنچ گئے جہاں وہ نماز پڑھنے گئے ہوئے تھے۔ وہ مسجد کے صحن میں دو زانو بیٹھے ایک طرف گردن ڈھلکائے اور داہنے شانے پر جھکائے تسبیح پڑھ رہے تھے۔ تسبیح ان کے ہاتھ میں تھی اور پڑھنے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ بالکل قریب جا کر سنا تو وہ گنگنا رہے تھے ——

پروانہ ہے، بلبل کا سا انداز نہیں ہے
جاں بازیِ مجذوبِ سخن ساز نہیں ہے

کیا سکنت اور کیسی عاجزی تھی ان کی آواز میں! یہی جی چاہتا کہ جس بے نیاز کو وہ اپنی سچائی کا یقین دلا رہے ہیں اس کے سامنے پہنچ کر ہم سب مجذوب صاحب کی صداقت کی فوراً گواہی دیں مگر وہ تو "عالم السر والشہادۃ" سے مصروفِ راز و نیاز تھے جس کے سامنے سوگند اور گواہ کی حاجت ہی نہیں ہوتی۔

عربی زبان میں ایک لفظ "حنین" ہے جس کے معنی کسی کے شوق میں بے قراری کے ہیں۔ مجذوب صاحب ہمہ تن اشتیاق اور سراپا شوق تھے۔ نماز میں ہوں، سرکاری کام میں ہوں، خالی بیٹھے ہوں یا انجمن میں ہوں، لو ایک ہی لگی رہتی تھی۔ مجذوب نہ تھے "استنِ حنانہ" تھے۔ انہوں نے خود کہا تھا ع

غمِ فرقت سے ہوں میں استنِ حنانہ برسوں سے

"استنِ حنانہ" مسجدِ نبوی میں ایک درخت کا تنا تھا جس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم وعظ فرماتے اور خطبہ دیتے وقت سہارا لیا کرتے تھے۔ پھر مسجدِ نبوی میں منبر بن گیا اور آپ، اس پر کھڑے ہو کر خطبہ دینے لگے۔ کہتے ہیں کہ آنحضرتؐ کی جدائی درخت کے اس تنے کو بہت شاق گزری اور لوگوں نے اس لکڑی سے "حنین" (صدائے اشتیاق) سنی، اسی لئے اس کو استنِ حنانہ یا "نالہ کناں ستون" کہا جاتا ہے۔

مجذوب صاحب تھے بھی ستون کی طرح دراز قد، "استنِ حنانہ" کی تشبیہہ ان کے ظاہر و باطن دونوں کے عین مطابق تھی۔

مجذوب صاحب جب اسسٹنٹ انسپکٹر آف اسکولز ہو کر لکھنؤ میں متعین ہوئے تو ان کا قیام وکٹوریہ اسٹریٹ پر ہوا، یعنی ہمارے اور ان کے گھروں کے درمیان صرف ایک سڑک حائل تھی، یہ نہیں معلوم راقم نے معلوم کرنے کی کوشش کی کہ وہ کب سے ہمارے پڑوسی تھے لیکن ۱۹۳۱ء یا ۱۹۳۲ء میں پہلے پہل ان کا ان کی شاعری اور ان کی والہانہ زندگی کا ذکر اپنے ایک بزرگ کی زبانی سنا جو ایک دوسرے عزیز سے کر رہے تھے اور میں اپنے ساتھیوں کی صحبت سے بچ کر یا خصوصاً اکبری کا سبق پڑھنے بیٹھا ہوا تھا۔

انہوں نے کہا "سڑک پر ایک ہجوم دیکھ کر میں اس کی طرف بڑھا تو دیکھتا کیا ہوں کہ مجذوب صاحب کھڑے جھوم جھوم کر اور رقص کر کر کے گا رہے ہیں مجھے دیکھ کر چونکے اور بولے "آیئے آیئے آپ حضرات اہلِ علم ہیں" میں قریب چلا گیا۔ وہ گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ تک کبھی اس غزل کے اور کبھی اس غزل کے اشعار بلا لحاظ ترتیب سناتے رہے۔"

عجیب و غریب "تعارف" تھا یہ! سڑک پر ایک آدمی جھوم کے ناچے! یہاں یہ تربیت دی گئی تھی کہ اکیلے سڑک پر نہ جاؤ، کسی سے سڑک پر بات نہ کرو، شیروانی کے بغیر گھر سے قدم نہ نکالو، سودا خود نہ خریدو وغیرہ وغیرہ۔ بڑا زبردست تضاد تھا ہماری معاشرت اور اس شاعر کے طور طریقوں میں، ایک ولولہ سا اٹھا ایسے آدمی سے ملنے کا! اس کی شاعری کے شوق میں نہیں، ۱۴ برس کی عمر اور تحریر کی استعداد رکھتے کس کو شاعری کی سوجھ بوجھ ہو سکتی ہے؛ اس عجیب و غریب شخصیت کو دیکھنے کی گدگدی ضرور ہوئی۔ جب یہ معلوم ہوا کہ آج رات کو وہ آئیں گے اور مایار نشست ہوگی تو ہم خوش ہو گئے۔ گرمی کا موسم تھا، مجذوب صاحب آٹھ ساڑھے آٹھ بجے رات کو آ گئے، ہم کو سبق یاد کرنے اور مطالعہ دیکھنے کے بعد ہی اجازت ملی تو آٹے بھر کر مجذوب صاحب کو دیکھنے پہنچ گئے۔

دیکھا کیا؛ گورا چٹا، لمبی سفید داڑھی والا آدمی، سر پر نماز جیسی والی چوگوشیہ ٹوپی، پرانے ڈھنگ کا انگرکھا جس میں داہنے سینے سے متصل گھڑی اور قلم وغیرہ رکھنے والی جیب۔ جو لکھنؤ کے خوش پوشاکوں کے ذوق پر ہمیشہ بار رہی، آستینوں اور دامنوں میں سلیٹیں لگی ہوئی، تخت پر بیٹھے دونوں ہاتھ اٹھا کے داہنے بائیں جھوم جھوم کر ایسے انداز میں شعر پڑھ رہا ہے کہ شاعر کے ساتھ سامعین بھی جھوم رہے ہیں یا کبھی کبھی چیخ پڑتے ہیں۔ ہوں گے سب ملا کر ۱۵، ۱۶ سننے والے جن میں زیادہ تعداد علمائے فرنگی محل کی تھی، چھوٹی پور سب سے پیچھے ایک پلنگ پر بیٹھ گئی۔ میں نے پنسل کاغذ لے کر گیا تھا اشعار نوٹ کرنے، یہی سوچا کہ جس شعر کی زیادہ تعریف ہو اس کو لکھ لو۔ ——— مگر ایک شعر بھی ایسا نہیں سنا جس پر اہلِ علم سامعین نے جی کھول کر تعریف

شرکی ہوں کم از کم رسمی تعریف اور واقعی تعریف کا فرق میں اس وقت بھی سمجھ سکتا تھا۔

مجذوب صاحب پڑھ رہے تھے :۔

ہر تمنا دل سے رخصت ہو گئی	اب تو آ جا اب تو خلوت ہو گئی
دل میں داغوں کی یہ کثرت ہو گئی	رونما اک شانِ وحدت ہو گئی
یاس ہی اب دل کی فطرت ہو گئی	آرزو جو تھی وہ حسرت ہو گئی!
سوگ میں یہ کس کی شرکت ہو گئی	بزمِ ماتم ، بزمِ عشرت ہو گئی
پڑ گئی تھی ان پہ بھولے سے نظر	بات اتنی سی ، قیامت ہو گئی
ایسی ضد کا کیا ٹھکانا ہے بھلا	بات جو کہہ دی وہ قسمت ہو گئی
جی رہا ہوں موت کی امید میں	مر ہی جاؤں گا جو صحت ہو گئی
رنج دینے سے وہ باز آئے تو کب	جب کہ غم کھانے کی عادت ہو گئی
خاک میں کس نے ملایا یہ تو دیکھ	شکر کر مٹی سوارت ہو گئی

کر چکے رندی بس اے مجذوب تم
ایک مدت میں یہ حالت ہو گئی

یہ تو ظاہر ہے کہ مذکورہ بالا سب ہی اشعار ایک درجے کے نہیں یا سب بلند پایہ اشعار نہیں کہے جا سکتے لیکن یہ حقیقت ہے کہ جب مجذوب صاحب خود سنا رہے ہوں تو بڑے سے بڑے منکر کے لئے بھی ممکن نہیں کہ وہ اس کیفیت میں جذب ہو کر جو خود مجذوب صاحب پر طاری رہتی تھی، ایک ایک شعر پر سر نہ دھننے لگے۔

ذرا اے ناصحِ فرزانہ اچل کر سُن تو وہ باتیں
نہ ہو گا پھر بھی تو مجذوب کا دیوانہ ؟ دیکھیں گا

مجذوب صاحب کے پڑھنے کا بالکل نرالا انداز تھا، ٹھیک وہی جس کی طرف میر سوز کے تذکرے میں شمس العلما مولانا محمد حسین آزاد نے "آبِ حیات" میں اشارہ کیا ہے، لکھتے ہیں :

"انہوں نے (میر سوز نے) علاوہ شاعری کے شعر خوانی کا ایسا طریقہ ایجاد کیا تھا کہ جس سے کلام کا لطف دوچند ہو جاتا تھا، شعر کو اس طرح ادا کرتے تھے کہ خود مضمون کی صورت بن جاتے تھے اور لوگ بھی نقل اتارتے تھے مگر وہ بات کہاں ؟ آواز درد ناک تھی، شعر نہایت نرمی اور سوز و گداز سے پڑھتے تھے اور اس میں اعضا سے بھی مدد لیتے تھے مثلاً شمع کا مضمون باندھتے تو پڑھتے وقت ایک ہاتھ سے شمع اور دوسرے سے اوٹ وہیں فانوس تیار کر کے بتاتے، بے دماغی یا ناراضی کا مضمون ہوتا تو خود بھی تیوری چڑھا کر وہیں بگڑ جاتے تھے۔"

آگے چل کر میر سوز کے بارے میں آزاد نے جو بات لکھی ہے وہ وہ ہے جو مجذوب صاحب کے بارے میں میرے دل میں تھی مگر مجھے اس مفہوم کے اظہار کے لئے موزوں الفاظ نہیں ملتے تھے، آزاد لکھتے ہیں :

"تم خود خیال کر کے دیکھ لو ان کے اشعار اپنے پڑھنے کے لئے ضرور حرکات و انداز کے طالب ہیں۔"

مجذوب صاحب کے اشعار حرکات و انداز کے کہاں تک طالب ہیں؟ ممکن ہے یہ بحث طلب مسئلہ ہو لیکن ان کے حرکات و انداز سے شعر کا اثر یقیناً دو چند ہو جاتا تھا، یہ تجربے کی بات ہے۔

ایک دفعہ حضرت جگر مراد آبادی نے مجذوب صاحب کے ایک مجموعۂ کلام کے بارے میں بالکل یہی بات مجھ سے کہی۔ انہوں نے مجذوب صاحب کو مولانا مجذوب کہہ کر یاد کیا اور کہا "دیکھئے ان کا یہ مجموعۂ کلام کیسا بے جان نظر آ رہا ہے، اصل بات یہ ہے کہ مولانا کے اشعار میں مولانا کے حرکات اور ان کی بے چینی کو جب تک شامل نہ کیا جائے صحیح معنوں میں ان سے لطف اندوز نہیں ہوا جا سکتا۔"

اشعار سنانے میں مجذوب صاحب کو میں نے بیہوش ہوتے یا غش کھاتے تو نہیں دیکھا جس طرح بقول مولانا آزاد میر سوز نے ایک خاص موقعہ پر عجیب انداز سے حسب ذیل قطعہ پڑھا ؂

گئے گھر سے جو ہم اپنے سویرے	سلام اللہ خاں صاحب کے ڈیرے
وہاں دیکھے کئی طفلِ پری رو	ارے رے رے ارے رے رے رے رے رے

چونکہ مصرعہ پڑھتے پڑھتے وہیں زمین پر گر پڑے گویا پری زادوں کو دیکھتے ہی دل بے قابو ہو گیا ہے اور ایسے نڈھال ہوئے کہ ارے رے رے کہتے کہتے غش کھا کر بیہوش ہو گئے۔

لیکن مجذوب صاحب کے حرکات و سکنات بھی کچھ اسی طرح کے۔ غزل سنا رہے تھے "کہیں ہوتی" "نہیں ہوتی" جب یہ شعر پڑھا ؂

ہٹاتے ہم نشیں ہر چند لیکن چشمِ گریاں پر
کبھی یہ آستیں ہوتی کبھی وہ آستیں ہوتی

تو پہلے داہنی آستین چشم گریاں پر رکھ لی، پھر گویا ہم نشیں نے ہاتھ ہٹا دیا تو بائیں آستین اس کی جگہ رکھ لی۔

ایک دفعہ یہ شعر پڑھا ؂

ہنس بھی دو، ہنس بھی دو، ہاں ہاں چلو بس رو لئے چکے
اب ہنسے، اب ہنسے دیکھو وہ ہنسی آئی ہے

"دیکھو وہ ہنسی آئی ہے" جب بھی کہا اس طرح کہا کہ جس کی طرف انہوں نے اشارہ کیا اس کو ہنسی آ کے رہی۔

انہوں نے جب سنایا ؂

کسی کی یاد میں بیٹھے جو سب سے بے غرض ہو کر
تو اپنا بوریا بھی پھر ہمیں تختِ سلیماں تھا

تو اپنی نشست پر اس طرح اکڑ کر بیٹھ گئے جیسے واقعی تختِ سلیماں پر بیٹھے ہیں۔

یا جب یہ شعر پڑھا ؂

اٹھاؤں گا نہ زانو سے میں ہرگز اپنا سر ہمدم
ارے میں اپنی آنکھوں سے انہیں جاتا نہ دیکھوں گا

تو اس قدر جھک گئے کہ واقعی سر یہ زانو نظر آنے لگے۔

مجذوب صاحب کی یہ پہلی نشست تھی ہمارے یہاں۔ میں سامع سے زیادہ منشی، بن کر اس میں شریک ہوا تھا۔ وہ خود ہر شعر دو تین بار پڑھتے تھے اور بیشتر اشعار ان سے بار بار پڑھوائے جاتے۔ مجھے نقل کرنے میں کوئی زحمت نہیں ہوئی، ۸ بجے رات سے مجذوب صاحب نے سنانا شروع

کیا تھا، نہ وہ سنانے سے تھکتا اور نہ سننے والے سننے سے۔ فجر کی نماز کے وقت بادلِ ناخواستہ محفل برخاست ہوتی اور سننے والے ایک تشنگی لے کر اٹھتے۔

محفل برخاست ہونے کا مطلب پڑھنے والے یہ سمجھے وہ یقیناً صحیح نہیں ہے، مجذوب کی محفل نرالی شان سے برخاست ہوتی تھی مثلاً فجر کی اذان ہوئی سب لوگ اٹھ کھڑے ہوئے کہ نماز کی تیاری کریں، مجذوب صاحب بھی اٹھ کھڑے ہوئے مگر گنگناتے اور شعر سناتے، جوتا پہن رہے ہیں اور شعر سنا رہے ہیں، گھر سے نکل رہے ہیں اور گھوم گھوم کر شعر سنا رہے ہیں، کچھ بڑے اور باقی لڑکے ان کی متابعت کو تھوڑی دور گئے مجذوب صاحب شعر سناتے چلے جا رہے ہیں اور اگر دو دو قدم پر ہیں تو راستے میں کھڑے ہو جائیں گے اور سناتے رہیں گے، متابعت کرنے والوں کو ان کے اشعار کشاں کشاں ان کے گھر تک پہنچا دیں گے، جب تک گھر کا دروازہ کھلے مجذوب صاحب سنائے جائیں گے۔ یہاں تک کہ وہ گھڑی دیکھ کر ایک دفعہ زور سے "استغفراللہ" کہیں گے گویا نماز کا وقت تنگ ہوتا جا رہا ہے اور جلدی جلدی اپنے مکان کے زینے پر چڑھ جائیں گے اس طرح محفل برخاست ہوتی تھی، ایک دو بار کی بات نہیں ہے ہمیشہ۔ یہ بھی ہوا ہے کہ مجذوب صاحب کو سکون نہیں ہوا ہے چینی اور اضطراب کا عالم طاری ہے دیکھا نمازِ فجر کے بعد پھر گنگناتے چلے آ رہے ہیں اور پھر ان کی صدا پر یا اطلاع پر ہر طرف سے لوگ لپک لپک کر آ رہے ہیں۔ بقول مجذوب صاحب کے ؎

آ رہے ہیں ہر طرف سے طالبانِ دردِ دل!
یہ مری آہ و فغاں ہے یا اذانِ دردِ دل؟

یہ تو آٹھ دس گھنٹے کی نشست تھی ایک دفعہ لگاتار ۴۸ گھنٹوں کی نشست ہوئی جس میں نماز اور کھانے چائے کے علاوہ کوئی وقفہ نہیں ہوا۔ اس کے بعد بھی یہی محسوس ہوا کہ نہ سنانے والا تھکا اور نہ داستان مکمل ہوئی۔

۴۸ گھنٹے کی نشست فرنگی محل کے ایک قدیم متوسل قاضی وحید الدین صاحب کے یہاں ستر کھ ضلع بارہ بنکی میں ہوئی تھی اور سب لوگ لکھنؤ سے لد پھند کر وہاں پہنچے تھے۔

قاضی صاحب کے ایک قدیم ملازم نے گھر والوں اور مہمانوں کا یہ حال دیکھا کہ نہ کھانے کا ہوش ہے نہ سونے کی فکر بس ایک بڈھا گا رہا ہے اور سب میاں لوگ جھوم رہے ہیں تو اسے عجیب معلوم ہوا اس نے بڑی حیرت سے کہا "ایک سٹری تو خیر ہے ہی تھا ہی۔ اس کے ساتھ یہ سب میاں لوگ کا ہے (کیوں) سٹری ہو گئے؟"

مجذوب صاحب چاہے ایک گھنٹہ سنائیں یا ۴۸ گھنٹے سب کچھ زبانی سنایا کرتے تھے، ان کو سارا کلام حفظ تھا، نہ بیاض کا جھگڑا نہ نوٹ بک کی قید، یہ بات پہلے پہل میں نے مجذوب صاحب ہی میں دیکھی اس کے بعد جگر صاحب کو دیکھا کہ وہ جو کچھ سناتے ہیں زبانی سناتے ہیں خواہ کتنی پرانی غزل ہو۔

مجذوب صاحب کبھی ایک دفعہ میں کوئی غزل پوری نہ سنا سکے، ایک غزل سناتے سناتے کوئی اور شعر کسی وجہ سے یاد آ گیا وہ سنایا اور اسی غزل پر چل نکلے، بیچ میں یاد آ گیا یا کسی نے یاد دلایا کہ فلاں غزل ہو رہی تھی فوراً چونکے اور سابقہ غزل کی طرف پلٹ گئے۔ یہ سب ان سے اضطراراً ہوتا تھا۔

غزل ہو رہی تھی ؎

یہ نالہ کناں کون؟ با آوارِ حزیں ہے
دیکھو کہیں مجذوب غزل خواں تو نہیں ہے

اس اثناء میں چلتے آ گئی چھوٹے چھوٹے حسین فنجانوں میں، مجذوب صاحب بےقرار ہو گئے، غزل چھوڑ چھاڑ گنگنانے لگے، اب یہ شعر زبان پہ

پڑھا وہ دوسری غزل کا مطلع تھا اور بے پناہ مطلع ؎

آگئیں یاد وہ آنکھیں مجھے پیمانوں سے
غم مرا اور بڑھا عیش کے سامانوں سے

پھر اسی غزل پر چل دیئے ؎

اجنبیت نہیں دل کو ترے بیگانوں سے — کچھ وہ گھل مل گئے ایسے مرے ارمانوں سے
یا تو ہم کو بھی اجازت ہو نہیں پھر کرم — اس تصور کو بھی رکھ آیئے دربانوں سے
شوق سے مٹھیاں بھر بھر کے مجھے مٹی دی — آج تو لاد دیا آپ نے احسانوں سے

کس قدر ہوش ربا ہوتا ہے پُر درد کلام
پوچھئے گفتۂ مجذوب کے دیوانوں سے

ابھی گفتۂ مجذوب کے دیوانے ہوش ربائی کی کارفرمائیوں سے لطف اندوز ہو رہے تھے کہ مجذوب صاحب پہلی غزل کی طرف لوٹ گئے اور ایک نیا مطلع سنایا ؎

اک عمر سے انجمن میں مری جانِ حزیں ہے
یہ بھی ہے کوئی بات کہ "ہاں" ہے نہ "نہیں" ہے

اسی غزل میں انہوں نے کہا تھا ؎

اف جلکس کشِ حسن ہیں کیسی مری آنکھیں
کھب جاتا ہے نظروں میں ذرا بھی جو حسیں ہے

درحقیقت مجذوب صاحب حسن کے دیوانے تھے، انسانوں سے لے کر فن جانوں تک جہاں بھی انہیں حسن کا جلوہ نظر آتا وہ آپے سے باہر ہو جاتے۔

ایسی ہی ایک محفل میں مجذوب صاحب کی سحری کے لئے آم لائے گئے عشاء کے بعد سے تین بجے رات تک وہ مولانا قطب میاں صاحب (مرحوم) کے یہاں سناتے رہے تھے دوسرے دن مجذوب صاحب کو روزہ رکھنا تھا گھر جاکر سحری کرتے ا قطب میاں صاحب مرحوم نے اپنے یہاں انتظام کیا کہ تھوڑی دیر اور مجذوب صاحب کا سنانا جاری رہے بمشکل سادی جاتے پر مجذوب صاحب رضا مند ہوئے تھوڑے سے آم بھی تھے، تر و تازہ، خوش رنگ اور سڈول، بس مجذوب صاحب بے چین ہو گئے اور جب آم پر چاقو چلا تو انہوں نے منہ پھیر لیا۔

اسی وقت انہوں نے برملا حسن پرستی کے "جرم" کا اقرار کیا۔ کہنے لگے "میری چار پانچ مہینے کی ایک پوتی ہے گوری گوری خوبصورت نرم نرم ہاتھ پاؤں، اس کو گود میں لے کر ایک دفعہ عجیب خواہش ہوئی یعنی اس کے پلپلے بدن کو منہ میں لے کر دانتوں سے خوب چباؤں۔"

انسانی بدن کو دانتوں سے چبانے کا تصور بے بہت کریہہ، لیکن جاننے والے جانتے ہیں کہ وفورِ رغبت کے اظہار میں "لب و دنداں" کی سرگرمیوں کا کتنا دخل ہوا کرتا ہے۔

مجذوب صاحب نے تو نفسیات، جنسیات، اشارات کنایات کسی کا بھی سہارا لئے بغیر جو بات محسوس کی کہہ دی مگر اس طرح انہوں نے اپنی پوری شخصیت کو بے نقاب کر دیا۔ ایسی شخصیت کے لئے ایک ہی جامع لفظ ہے یعنی "حسن پرست" وہ بلا کے حسن پرست تھے مگر غضب کے محتاط کہتے ہیں ؎

حسن پسند پاک ہوں فاسق بیحیا نہیں — دید جمال کے سوا کچھ مرا مدعا نہیں

عشق والوں سے وہ دور رہنے کی پوری کوشش کرتے تھے مگر حسن کی بے محابیاں انھیں عاشقی کی پریشانیاں رکھتی تھیں۔ نہ معلوم کتنی بار انھوں نے اس کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی ہے ؎

بُرے پھنسے ہیں یہ غارت گرِ دنیا و دیں مجھ کو
نہ رکھیں گے نہ رکھیں گے کہیں کا یہ حسیں مجھ کو

جہاں گردن اٹھی آیا نظر کوئی حسیں مجھ کو
بس اب ہر دم نگہ رکھنا ہے پیوندِ زمیں مجھ کو

یہ بُت کسے کو ہیں اب اے خدا! مر دو دیں مجھ کو
اٹھا لے آسماں مجھ کو، نگل جا اے زمیں مجھ کو

یا ؎

پڑے اُف نہ کم سِن حسینوں سے پالا
وہ معصوم نظریں وہ منہ بھولا بھالا

دہائی ہے دردِ محبت! دہائی!
ارے مار ڈالا! ارے مار ڈالا

ایک دوسری غزل میں کہتے ہیں ؎

آتا ہے نظر حسن ہی جاتے ہیں جدھر ہم
کیا پھوڑ لیں اب آنکھیں ہی اے حسنِ نظر ہم

اف پڑ ہی گئی اک بتِ کافر پہ نگہ آج
رکھتے تھے اسی ڈر سے تو نیچی ہی نظر ہم

ایک صاحب نے پوچھ لیا "یہ کون بتِ کافر" ہے۔ فوراً ہی مجذوب صاحب نے دوسرا شعر پڑھا ؎

اتنی تو خبر ہے کہ کوئی ہوش رُبا تھا
رکھتے نہیں کچھ اس کے سوا اور خبر ہم

اسی غزل میں ایک شعر ہے ؎

در پردہ کوئی پردہ نشیں دیکھ لیا ہے
اب حور بھی آجائے تو ڈالیں نہ نظر ہم

محترم مولانا عبدالماجد دریابادی تشریف فرما تھے، ۳۲ء یا ۳۳ء کی بات ہے۔ مولانا کی غیرتِ دینی معمولی بھول چوک پر بھی گرفت کے بغیر نہیں رہ پاتی تھی۔ وہ جن مرحلوں سے گزر کر آئے تھے غالباً اس کا فطری نتیجہ تھا کہ سخت قسم کا تقشف ان کا نگہبان بن جائے، ہم فرنگی محلیوں کا مسلک یہ کہ سماع، عرس اور زیارتِ قبور کے لیے شدِ رحال وغیرہ بھی ممنوع نہیں، غرض مولانا عنایت اللہ صاحب (فرنگی محلی) اور مولانا دریابادی میں کچھ شعر و شاعری کے مضرات پر نوک جھونک ہو رہی تھی۔ مجذوب صاحب نے برجستہ کہا: "اب حور بھی آجائے تو ڈالیں نہ نظر ہم" مولانا عنایت اللہ صاحب نے تعریف کرتے ہوئے مولانا دریابادی سے کچھ کہا، مولانا عبدالماجد صاحب نے جواب میں فرمایا "بے شک اس میں اللہ کی ایک بڑی نعمت کا استخفاف تو پایا ہی جاتا ہے۔" استخفاف کے لفظ نے جو میرے کانوں کے لیے نیا نیا تھا مولانا کا پورا جملہ ذہن نشین کر دیا۔

مجذوب صاحب خود راوی تھے کہ وہ ایک موٹر پر جا رہے تھے حسبِ عادت متوسط رفتار سے خود ہی ڈرائیو کرتے ہوئے، پیچھے سے زور زور سے "پوں پوں" ہوا اور ایک موٹر تیز رفتاری کے ساتھ ان کے داہنے سے نکل گئی، تیز رفتار موٹر کی چلانے والی ایک فیشن ایبل خاتون تھیں اور شاید انھوں نے قیافی صورت والے مجذوب کو ڈرائیور سمجھ کر، دیر میں سائڈ دینے پر چلتے چلتے آنکھیں بھی نکالیں، بس مجذوب صاحب اس ادا میں گم ہو گئے اور فرمایا ؎

اس ناز سے اس شان سے اس تیز روی سے
گزر گئے تو دنیا ہی سے جائیں گے گزر ہم

وکٹوریہ اسٹریٹ جس پر مجذوب صاحب کا ۳۳ء میں قیام تھا وہی سڑک ہے جو مزار حضرت مخدوم شاہ میناؒ کو علاقہ چوک سے ملتی ہے، مزار شریف پر ہر مہینے دھوم دھام کی نوچندی اس وقت بھی ہوتی تھی اور آج بھی ہوتی ہے، نوچندی کی ایک خصوصیت یہ رہی ہے کہ اس میں چوک

اور مڑک کی سر بالانشینان کافی تعداد میں شریک ہوا کرتی ہیں۔ ہر جمعرات کو عام طور پر اور نوچندی جمعرات کو خاص کر سر شام ہی یہ شاہم اور دعا کی فریاد آب و تاب اور تمام حمام کے ساتھ اس مڑک سے مزار شریف کی سمت جاتی نظر آجاتی ہے، مجذوب صاحب نے اسی غزل میں ایک شعر ایسے ہی ایک موقع کے لئے کہا تھا ؎

ہم بھی ہیں سر راہ کھڑے آج حسینو!
بن ٹھن کے نہ نکلو کر لگا دیں نہ گے نظر ہم

ایسے شوخ اشعار مجذوب صاحب کی چلبلی طبیعت نے بہت سے کہے ہیں اسی غزل کا ایک مطلع ہے ؎

جانے تو تمہیں دیں گے نہ اب تا بہ سحر ہم — شب ہائے جدائی کی نکالیں گے کسر ہم
پیری میں حسینوں سے اٹھائیں تو نظر کیا؟ — دزدیدہ مگر ڈال ہی لیتے ہیں نظر ہم

بذلہ سنجی ان کی رگ رگ میں رچی ہوئی تھی جس کی لگام مجذوب صاحب خود بھی کسے رہتے تھے اور جب منہ زوری زیادہ کرنے لگتی تھی تو خود اپنے مرشد (مولانا تھانوی ؒ) کو اس کیفیت کی اطلاع کرتے تھے وہاں سے مناسب ہدایتیں آجاتی تھیں جن پر مجذوب صاحب عمل پیرا ہو جاتے تھے، وہ زمانہ ان کے لئے سخت مصیبت اور کشاکشی کا ہوتا تھا۔ مرشد کی ایک ہدایت، کا علم نزد مسرور کو بھی ہو جاتا تھا، یعنی ان کو "شعر خوانی" کی ممانعت کر دی جاتی تھی۔ دوسروں کے لئے بھی یہ ممانعت مصیبت سے کم نہ ہوتی، لوگ طرح طرح سے اصرار کرتے تھے اور مجذوب صاحب خاموش رہتے۔ لیکن یہ کہتے جاتے تھے کہ "آپ لوگوں کو کیا علم، یہاں دل پر چھریاں سی چل رہی ہیں۔"

ایک دفعہ یہی "توبہ" کا زمانہ چل رہا تھا، سب لوگ سنانے کا تقاضا کر رہے تھے کہ ایک صاحب نے جلیل کا شعر پڑھ دیا ؎

بات ساقی کی نہ ٹالی جائے گی
کر کے توبہ توڑ ڈالی جائے گی

مجذوب صاحب بے قابو ہو گئے۔ توبہ ٹوٹنے لگی مگر انہوں نے ضبط کیا اور اٹھ کر چل دیے۔ یہ صبح کی بات تھی شام کو جو آئے تو جھومتے اور رقص کرتے نئی غزل کے ساتھ ؎

زاہدوں پر مئے اچھالی جائے گی — جان ان مردوں میں ڈالی جائے گی
شیخ پینے کا ارادہ تو کرے — حوضِ کوثر سے منگا لی جائے گی
اور تو نکلیں ہی گے خرقے سے کام — اس میں بوتل بھی چھپا لی جائے گی

۴۰، ۵۰ اشعار اس غزل کے شام تک ہو گئے تھے اور اس انداز سے انہوں نے سنائے جیسے کہیں سے رسی تڑا کر بھاگے ہوں۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مجذوب صاحب عام شاعروں کی طرح شعر گوئی میں "ریاض" کرنے کی زحمت میں کبھی نہیں پھنسے، ایک ابال کی طرح ان کے جذبات ابلتے اور موزوں قالب اختیار کرتے چلے جاتے تھے، کبھی کبھی جذبات کا دھارا اتنا تیز ہوتا کہ ایک زمین میں ڈیڑھ سو دو سو شعر تک کہہ ڈالتے تھے اور بلا انتخاب سناتے چلے جاتے تھے۔ کم از کم تین غزلیں تو مجھے یاد ہیں جو ڈیڑھ سو دو سو اشعار کی ہیں، ایک میں ۲۳ مطلع، بقیہ دو غزلوں میں بھی بیس سے اوپر مطلعے کہے ہیں۔

۲۳ مطلعوں والی غزل کا پہلا مطلع ؎

اب بھی مجذوب بہ محرومیٔ پذیرائی ہے
کیا جنوں میں ابھی آمیزشِ دانائی ہے؟

آتا سکتے والا اور اس قدر بد مستی کے ساتھ سنانے والا مجذوب عام محفلوں سے اور خصوصاً ان تقریبوں سے جو اس کے اعزاز میں کی جائیں دور بھاگا کرتا تھا، اپنا اعزاز وہ کسی طرح پسند نہیں کرتے تھے کہتے تھے ؎

ہم خاک نشینوں کو نہ مسند پہ بٹھاؤ
یہ عشق کی توہین ہے اعزاز نہیں ہے

سرکاری اعزاز کا جو "خان صاحب" کے خطاب کی شکل میں ملا تھا خود انہوں نے مذاق اڑایا ؎

ہوئے خواجہ صاحب سے ہم خان صاحب　　بڑھی نہ کچھ عزت گھٹی شان صاحب

ایک خان بہادر دوست کو خطاب ملنے پر لکھ بھیجا ؎

کیا شان دکھلاتے ہو تم اے خان بہادر　　تم خان بہادر ہو ہم ایمان بہادر
شاباش ہے شاباش ہے اے خان بہادر　　دنیا پہ کیا دین کو قربان بہادر

محفلوں سے گریز کی ایک وجہ تو ان کی بے قید و بند طبیعت تھی دوسری وجہ ایک واقعہ کے بعد ظاہر ہوئی۔ یعنی دوسروں کے ہاں کا کھانا کھانا وہ اس احتیاط کے پیش نظر جو اکل حلال کے پابندوں کے لئے ضروری ہو سکتی ہے مجذوب صاحب پسند نہیں کرتے تھے۔ ایک دفعہ مجذوب صاحب اودھ کے ایک مسلمان تعلقدار کے یہاں زبردستی پہنچا دئے گئے جہاں انہوں نے مجبوراً کھانا بھی کھایا، رات بھر کی شعر خوانی کے بعد جب وہ واپس ہوئے تو ایک صاحب سے انہوں نے پوچھ لیا کہ تعلقدار صاحب کی آمدنی میں کوئی ناجائز ذریعہ تو شامل نہیں ہے، اطمینان دلا دیا گیا کہ وہ سود وغیرہ نہیں لیتے ہیں، جزئیات تک مجذوب صاحب نے پوچھ ڈالے اور جب یہ معلوم ہوا کہ لگان وغیرہ کی وصولی میں ان تعلقدار صاحب کے یہاں بھی عام زمینداروں اور تعلقداروں کی طرح کاشتکاروں پر ظلم کیا جاتا ہے تو مجذوب صاحب نے سب کی نظروں سے بچ کر گرم پانی کرا کے غسل خانے میں استفراغ کیا اور جب اطمینان ہو گیا کہ رات کی غذا کا کوئی ذرہ معدے میں باقی نہیں رہا ہے تو بلکان ہو کر بستر پر پڑ گئے۔ اس نکان کا علم دوسروں کو بھی ہوا اور بڑی دیر میں نکان کا راز کھل پایا۔

یہ تو مجذوب صاحب [illegible] کے [illegible] دوسرا واقعہ تھا، کمال تو یہ کیا انہوں نے کہ بی۔ اے پاس کرنے کے بعد [illegible] ملی ان کو ڈپٹی کلکٹری کی۔ کچھ دنوں اس عہدے کو جو آج سے پچاس سال قبل بادشاہی [illegible] تھا انہوں نے گوارا کیا اس کے بعد استعفیٰ داخل کر دیا، کیوں؟ اس لئے کہ اس ملازمت میں قانون شریعت کے خلاف [illegible] انہیں فیصلے کرنا پڑتے تھے۔

ان کی خدمات حکومت یو۔پی۔ نے محکمہ تعلیمات کو منتقل کر دیں جہاں ان کے ابتدائی عہدے کی تنخواہ ڈپٹی کلکٹری کی تنخواہ سے آدھی تھی مگر وہ راضی اور مطمئن تھے۔

آخر میں [illegible] وہ ایک ریجن کے انسپکٹر آف اسکول ہو گئے اور ایک ہزار کے قریب ان کو تنخواہ ملنے لگی تو اکثر سنایا کرتے تھے ؎

عیش سے عزت سے موٹر کار ہے　　اور اس دنیا میں کیا درکار ہے
اس جہاں کی نعمتیں بھی ہوں عطا　　اے خدا تیری بڑی سرکار ہے

(۲)

جادہ چوں نبضِ تپاں در تنِ صحرا بینند

(غالب)

ڈاکٹر رام بابو سکسینہ

اثر لکھنوی

ڈاکٹر رام بابو سکسینہ ایم اے۔ ڈی لٹ۔ ایل ایل بی چشم بد دور بلا کے ذہین ہیں اور یونیورسٹی کے امتحانوں میں ہمیشہ اوّل آیا کئے۔ بڑے بڑے عہدوں پر فائز رہے۔ انہیں اُردو کا مسیحا اور اسی کے ساتھ اُردو کا عاشق شیدا کہنا بے جا نہ ہوگا۔ اُنہوں نے انگریزی میں تاریخ ادب اُردو لکھ کر اُردو کو صرف ہندوستان بھر سے نہیں بلکہ غیر ممالک سے روشناس کرایا۔ اُردو محض بولی ٹھولی سمجھی جاتی تھی اُس کو زبان' بھرپور زبان، انواع و اقسام کے جواہر سے مالا مال زبان تسلیم کرایا۔ مطالعہ کا شوق اس حد پر ہے کہ اُن کے گھر میں ہر طرف اُردو زبان کی کتابوں کے ڈھیر لگے رہتے ہیں حتیٰ کہ غسل خانہ میں بھی کتابوں کی ایک الماری ہوتی ہے شاید یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ اُردو اُن کا اوڑھنا بچھونا ہے۔

شوق کا یہ حال ہے کہ ایک مرتبہ جب ہم دونوں کا تقرر کانپور میں تھا (۱۹۱۸ء یا ۱۹۱۹ء کا ذکر ہے)، مجھے لکھنؤ کے ایک مشاعرے میں شریک ہونا تھا۔ اُنہوں نے بھی چلنے کا وعدہ کیا مگر عین وقت پر کسی ضروری منصبی کام نے روک لیا۔ ایک یا دو بجے رات کو دیکھتا کیا ہوں کہ رام بابو صاحب مسکراتے ہوئے چلے آ رہے ہیں۔ معلوم ہوا کہ مال گاڑی میں سفر کیا۔ جاڑے کا چلّہ تھا، رات بھر کا جاگنا (اُس زمانے کے مشاعرے پو پھٹتے ختم ہوتے تھے اور واپسی کے وقت یہ اندازہ دشوار ہو جاتا تھا کہ ہم چل رہے ہیں یا زمین چل رہی ہے) یہ تمام زحمتیں گوارا کر کے مشاعرے میں بحیثیت سامع شریک ہونا ——— کیا بغیر اُردو سے عشق نہ ہو اتنی زحمت برداشت کرنا گوارا کر سکتا ہے؟

اُن کی اُردو دوستی کا مزید ثبوت وہ پیغام ہے جو انہوں نے حال ہی میں راجستھان اُردو کانفرنس کے انعقاد کے موقع پر بھیجا تھا اُس کا خلاصہ درج ذیل کیا جاتا ہے:-

"اُردو کی راہ میں جو دشواریاں اور خطرے ہیں اُن سے اُردو کے بہی خواہوں کو بددل نہ ہونا چاہئے بلکہ اُن سے مہمیز کا کام لینا چاہئے اور اپنے مساعی میں زیادہ مستعدی و انہماک دکھانا چاہئے۔

اُردو کو ہندی سے دشمنی یا رقابت نہیں ہے۔ یہ مانتے ہوئے کہ ہندی ہندوستان کی زیادہ آبادی کی زبان ہے اگرچہ اسے عالم گیر ہونا ہے

تو یہ صرف اس حالت میں ممکن ہے کہ اردو اُس کی مدد کرے اور شریک کار ہو۔

اردو کو مایوس ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔ یہ محلوں کی پیداوار نہیں بلکہ ہندو مسلم اتحاد کی نشانی ہے۔ عام لوگوں نے اسے پالا پوسا ہے اور قوموں نے مل کر اسے پروان چڑھایا ہے۔ اردو اسی ملک کی پیداوار ہے باہر سے اس کی کھیپ نہیں آئی۔

لیکن بدلتے ہوئے حالات میں اسے اپنی بقا کے لئے نئے نئے خیالات کو اپنے میں جذب کرنا اور اُن کا ساتھ دینا چاہئے۔ خود اپنی بے پناہ طاقت پر بھروسا کرنا چاہئے۔ اس کے پس منظر میں ہندوستانی روایات ہیں۔ اسے عام لوگوں سے علٰحدگی اختیار نہ کرنا چاہئے بلکہ اُن سے قریب تر ہو جانا چاہئے۔ ایسی میٹھی، اثر یلی، لچکیلی اور کس بل رکھنے والی زبان کو متروک یا تہس نہس نہ ہونا چاہئے۔

اردو کا ادب سُر ل ہے جس سے دل کا کنول کھل جاتا ہے۔ اس کا خزانہ بھرا پڑا ہے جس میں موتی، یاقوت، ہیرا، زمرد اور نہ معلوم کتنے رنگوں کے جواہر ہیں۔ ان کو یقیناً تلف ہونے سے بچایا جائے گا۔"

ہندوستان ایک برصغیر ہے اور کافی وسیع ہے جس میں نصف درجن یا اس سے بھی زیادہ زبانوں کے لئے گنجائش ہے۔ ایک زبان کی ترقی کا یہ مقصد نہیں کہ دوسری زبانوں کا گلا گھونٹ دیا جائے۔ میل ملاپ میں رنگا رنگی ہونا چاہئے۔ اسی طرح حسن اور حسن میں چمک پیدا ہوتی ہے۔

اُنھوں نے ایک ضخیم کتاب میں یورپین اور اینگلو انڈین شاعروں کا کلام مع حالات جمع کر دیا ہے جہاں جہاں رہے اعلیٰ پیمانے پر مشاعرے کئے چنانچہ بلند شہر کے ایک مشاعرے میں میں بھی شریک ہوا تھا۔

قدما کے قلمی نسخوں اور تصاویر کا ایک نایاب ذخیرہ جمع کیا ہے۔ وہ ہمیشہ اردو کے متعلق کچھ سوچا یا لکھا کرتے ہیں۔ شعر کے حسن و قبح پر تو اُن کی نظر ایسی پڑتی ہے کہ باید و شاید۔ اردو نہایت صحیح و فصیح بولتے ہیں مگر تحریر میں بجائے اردو کے انگریزی استعمال کرتے ہیں وہ اس لئے کہ افادیت کا دائرہ زیادہ وسیع ہو جائے۔

لگ بھگ پچاس سال سے ہم ایک دوسرے کو جانتے ہیں اور اکثر ملتے رہے ہیں۔ کبھی وہ میرے یہاں آئے کبھی میں اُن کے پاس گیا۔ انسان کی حیثیت سے بھی اُن کا مثل نہیں۔ شرافت کا پتلا، اخلاق مجسم۔ اس قابلیت اور ہر طرح کے دنیوی عروج کے باوصف رام بابو کو غرور چھو بھی نہیں گیا ہر شخص کے ساتھ خلق سے پیش آنا اور ملنے والے کی بھلائی کی فکر میں لگا رہنا۔ میں نے اُنہیں آج تک کسی کی برائی کرتے نہیں سنا اگر کسی نے اُن کے ساتھ برائی بھی کی تو خاموش ہو رہے کبھی انتقام لینے کا خیال بھی نہ گذرا کبھی حرف شکایت زبان پر آیا۔ اُن پر کئی کٹھن وقت پڑے مگر ہمیشہ مردانہ وار مقابلہ کیا اور کیا مجال جو تیور بھی میلے ہوئے ہوں۔ یہ ایک دلچسپ مطالعہ ہو کہ اُن کا کیریکٹر بنانے میں اردو کو کتنا دخل ہے۔

مجھے ناز ہے کہ رام بابو ایسا شخص مجھے دوست نہیں بلکہ اپنا بھائی سمجھتا ہے۔ میں بھی اُن سے اپنے چھوٹے بھائی کی طرح محبت کرتا ہوں۔ ہم دونوں دل ہی دل میں اس محبت کے مزے لوٹا کرتے ہیں اور جب مل جاتے ہیں تو دونوں کی عید ہو جاتی ہے۔

اُن کی کتابیں جو ابھی زیر تصنیف یا پریس میں ہیں اُن کی اشاعت سے اردو کے ذخیرے میں بیش بہا اضافہ ہوگا۔ منتخب فہرست درج ذیل ہے:۔

(ا) اردو ادب جدید (دو جلدیں) (ب) اشارت و روایت (ج) اردو شعرا کا مرقع مع پیش لفظ (د) مثنویات میر و غلط میر (س) اردو اور فارسی کے شاعروں کا کلام بزبان ہندی (ص) اردو ادب پر وہ مضامین جو لکھے گئے ان میں شامل [illegible]

یہ کچھ بھی نہ ہوتا تو اُن کی تاریخ ادب اردو انگریزی جس کا ترجمہ اردو اور دوسری زبانوں میں ہو چکا ہے اُن کو زندگی جاوید بخشنے کیلئے کافی ہے۔

میں بیمار ہوں اور زیادہ محنت نہیں کر سکتا۔ جیسا کچھ اور جتنا کچھ لکھنا چاہتا تھا نہ لکھ سکا جس کا افسوس ہے۔

جگ جگ جیو رام بابو۔ تمہارا بول بالا رہے۔

جوش ملسیانی

پنڈت ہری چند اختر

۱۹۳۲ء کا ذکر ہے۔ کپور تھلے کا سالانہ مشاعرہ تھا۔ لاہور اور دیگر مقامات سے کئی نامور شاعر آئے تھے۔ صدارت کے لئے شیخ سر عبدالقادر مرحوم سے درخواست کی گئی تھی۔ انہوں نے آتے ہی پوچھا "جوش صاحب آگئے؟" مشاعرے کے مہتمم مولوی ظفر حسین صاحب اشک نے بتایا کہ جوش صاحب نے کسی اور مصروفیت کے باعث معذوری کا اظہار کیا ہے۔ شیخ صاحب نے فرمایا "حیرت ہے کہ یہاں جوش ملسیانی کے بغیر بھی کوئی مشاعرہ ہو سکتا ہے۔ اتنا بڑا استاد اس علاقے میں موجود ہے اور آپ اس کو نہیں بلا سکے" اشک ایسا موقع شناس بھلا اس صورت حال سے کیوں نہ فائدہ اٹھاتا۔ فوراً تجویز پیش کر دی کہ اجازت ہو تو آپ کی طرف سے پیغام بھیج دیا جائے۔ چنانچہ ایک خاص ایلچی موٹر کار میں روانہ ہو گیا۔

اس وقت جو حضرات شریک محفل تھے ان میں سے کئی ایک کو اپنے علم و کمال اور مقبولیت و شہرت کی بنا پر استادی کا درجہ حاصل تھا اور دو چار حضرات ایسے بھی تھے جن کی "حفظِ عزت" کی فکر نازک مزاجی کی مناسب حدود سے تجاوز کر چکی تھی لیکن میں نے دیکھا کہ سر عبدالقادر کی طرف سے جوش صاحب کی اتنی "شدید تعریف" اور خلوص بھرے اشتیاق پر کسی ایک پیشانی پر بھی بل نہیں آیا۔ اور پھر جب مشاعرہ کے اختتام کے قریب جناب جوش تشریف لائے تو ان سب کے چہروں سے حقیقی مسرت کا اظہار ہوتا تھا۔

جن لوگوں نے اس سے پہلے جوش کو نہیں دیکھا تھا انہیں کچھ دیر کے لئے مزید حیرت ہوئی ہوگی۔ درمیانے قد کا ایک سیدھا سادہ ادھیڑ آدمی۔ معمولی کپڑے کی پگڑی، قمیض اور دھوتی، دیسی جوتا، لباس کی وضع قطع خالص دیہاتی، شاعرانہ بناؤ نہ استادانہ تمکنت، کوئی نقیب نہ حاشیہ بردار سراپا خلوص و انکسار انداز میں دیہاتیوں کی سی اخلاص بھری سادگی اور بے تکلفی۔ ہونٹوں پر ہلکا سا شانت آمیز تبسم صورت شکل اور لباس کو دیکھو تو زیادہ سے زیادہ ایک سفید پوش عامی کہہ سکیں۔ ہر شخص یوں ملتا ہے جیسے خدا سے بھی اپنے مرتبے کا علم یا احساس نہیں۔ بھلا اس وضع قطع اور انداز میں تاڑ سکتے لوگ کہ اس اشتیاق اور تعریف و توصیف کا جواز کہاں نظر آ سکتا تھا جس کا اظہار سر عبدالقادر

نے فرمایا تھا۔

لیکن انہیں کچھ زیادہ انتظار نہ کرنا پڑا۔ مشاعرہ قریب الاختتام تھا۔ دو چار شاعر باقی رہ گئے تھے وہ پڑھ چکے تو جوش صاحب سے درخواست کی گئی۔ یہ مشاعرہ مسلم الثبوت اساتذہ اور مشہور و مقبول شعرا کی تعداد کے علاوہ کلام کی بلندی اور عمدگی کے اعتبار سے بھی ایک معیاری اجتماع تھا۔ ایک ہی محفل میں اس پایہ کا اتنا کلام آج کل تو کجا ان دنوں بھی بہت کم سننے میں آتا تھا۔ پس اس میں ذرا بھی مبالغہ نہیں کہ جب جوش صاحب شعر پڑھنے کے لئے اٹھے تو یوں معلوم ہوتا تھا کہ سامعین نہ صرف داد و توصیف کے الفاظ کا ذخیرہ ختم کر چکے ہیں بلکہ واہ واہ اور سبحان اللہ کے نعرے لگاتے لگاتے خود بھی شل ہو گئے ہیں۔ اس پر طرّہ یہ کہ آنے والے شاعر کی وضع قطع بھی کچھ ترغیب انگیز نہ تھی لیکن آپ نے ایک رباعی ہی پڑھی تھی کہ سب دوبارہ سنبھل کر بیٹھ گئے اور غزل شروع ہونے تک تو مشاعرے میں گویا ایک نئی روح ایک نیا جوش اور اس کے ساتھ ایک نئی قوت پیدا ہو گئی۔ اب وہ سیدھا سادہ مسکین صورت اور منکسر المزاج شاعر مملکتِ سخن کا پُرجلال و صاحب سطوت بادشاہ نظر آ رہا تھا۔ دیہاتی سادگی کا مغنی سا مجسمہ نیستانِ شعر میں بپھرے ہوئے شیر کی طرح گونج رہا تھا۔ ایک قصباتی اسکول کا مدرس پروازِ تخیل اور کمالِ فن کے وہ کرشمے دکھا رہا تھا کہ بڑے بڑے استاد بے خودی کے عالم میں جھوم رہے تھے۔ پنجاب کا ایک دیہاتی کوثر میں دھلی ہوئی ٹکسالی زبان میں فصاحت و بلاغت کے دریا بہا رہا تھا۔ جس پر دہلی اور لکھنؤ والے بھی رشک کریں۔

جن لوگوں کو پہلے حیرت ہوئی تھی وہ اور بھی زیادہ حیرت زدہ تھے۔ فرق یہ تھا کہ پہلے ان کی حیرت شک و شبہ پر مبنی تھی اور اب اس سے مرعوبیت اور احترام کا اظہار ہو رہا تھا لیکن خود شاعر اس صورتِ حال سے قطعاً متاثر معلوم نہ ہوتا تھا۔ اس کے لئے یہ کوئی نئی بات نہ تھی۔ عام سامعین کے علاوہ باکمال شاعروں اور عالی مرتبت استادوں نے بھی بڑی فراخ دلی سے خراجِ تحسین ادا کیا تھا۔ صاحبِ فن اہلِ نظر کی تعریف و توصیف سے فن کار کو قدرتی طور پر خوشی ہوتی ہے۔ چنانچہ جوش صاحب بھی مسرور و مطمئن تھے۔ لیکن اس سے زیادہ یہ کچھ نہیں۔ کسی حرکت کسی انداز میں کامیابی کے نشے فتح مندی کے غرور یا مقابلے کی خواہش کا شائبہ تک نہیں۔ تحسین و آفرین کے غلغلوں میں غزل ختم کر کے پہلے کی طرح مسکراتے ہوئے اپنی جگہ پر آ بیٹھے۔ جیسے ایک فرض تھا وہ ادا ہو گیا اور بس۔ اقلیمِ سخن کا جلالت مآب پھر وہی مسکین صورت سادہ مزاج دہاتی تھا گو بظاہر والا شیر پُر غرور وانکسار کا مجسمہ نظر آ رہا تھا۔ فصاحت و بلاغت کے دریا بہانے والا قادر الکلام پھر ایک عامی کی طرح سیدھے سادے چھوٹے چھوٹے بے تکلف جملوں میں باتیں کر رہا تھا۔

یہ مغالطہ اور تعجب تو خیر ناواقف ظاہر بینوں تک محدود تھا۔ لیکن حق بات یہ ہے کہ جس ماحول میں جوش صاحب کی تربیت و پرورش ہوئی اور جن حالات میں ان کی زندگی گزری ان کا پورا علم ہونے پر جوش صاحب کے شاعرانہ کمالات ان لوگوں کو بھی ایک معجزہ معلوم ہوں گے جو انہیں ایک مدت سے جانتے اور ان کے کلام اور مرتبے کو پہچانتے ہیں۔

پنڈت لبھو رام صاحب جوش یکم فروری ۱۸۸۳ء کو ضلع جالندھر (پنجاب) کے قصبہ ملسیان میں پیدا ہوئے۔ ۱۴ سال کی عمر میں والد ماجد کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ انہوں نے بیٹے کی تعلیم اور کنبے کی گزر اوقات کے لئے کوئی اثاثہ نہ چھوڑا تھا۔ اس لئے نہایت غریبی اور تنگدستی سے بسر ہونے لگی۔ ۱۴ برس کے بے یار و مددگار یتیم کے کمزور کندھوں پر جن مختلف اور کثیر التعداد ذمہ داریوں کا بوجھ آ پڑا تھا ان کے تصور ہی سے جی چھوٹنے لگتا ہے۔

اس بے کسی اور اقتصادی مشکلات و مصائب کے علاوہ جوش صاحب کو ماحول بھی سخت غیر شاعرانہ نصیب ہوا۔ تیس سال عمر تک ملسیان میں رہے۔ جسے صرف پنڈت جی کے لحاظ سے قصبہ کہہ دیا گیا ہے۔ پھر ۱۹۱۲ء سے نکودر میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ یہ ملسیان سے ۸ میل کے فاصلے پر تحصیل کا صدر مقام ہے۔ نکودر کو اگرچہ بعد میں ہائی اسکول نصیب ہو گیا۔ جس میں پنڈت جی فارسی کے اوّل مدرس تھے لیکن جوش صاحب

کے زمانۂ طالب علمی میں آپ کے وطن اور آس پاس کے مقامات میں نہ تو تعلیم و تعلم کا کچھ قابلِ ذکر چرچا تھا نہ کسی فرد واحد کو علم و فن میں کوئی امتیازی شان حاصل تھی۔ اور نہ ان کے ہم صحبت اور ہم جماعت طلبہ میں کسی کو شعر و سخن کا ذوق تھا۔ یہ علاقہ کافی زرخیز سمجھا جاتا ہے۔ اور مردم خیز بھی۔ لیکن علم و ادب اور شعر و شاعری کے ساتھ جوشؔ صاحب سے پہلے اسے کوئی مناسبت نہیں رہی۔ زرعی پیداوار کی صورت میں یہاں کی زمین سونا اور لعل اُگلتی رہی ہوگی۔ زندگی کے شعبوں میں اس خاک سے بڑے بڑے آدمی اُٹھے پھلے پھولے لیکن اس کے کسی کھنڈر کسی خرابہ سے کبھی کسی شاعر یا ادیب کی ٹھیکری تک برآمد نہیں ہوئی۔ جن لوگوں سے جوشؔ صاحب کو سابقہ پڑتا تھا۔ جن کی صحبت میں ان کا وقت گزرتا تھا جن کی بات چیت اور دلچسپیوں میں انہیں شامل ہونا پڑتا تھا ان کی سرگرمیوں میں شاعری اور زبان دانی اور ادب و انشاء کو ذرا بھی دخل نہ تھا۔ اسی طرح کسبِ علم و فن اور وسعتِ مطالعہ کے اسباب اور سہولتیں بھی مفقود تھیں۔ پس ایسے حوصلہ کش حالات ادب کش ماحول اور ادیب کش ذمہ داریوں کے باوجود ایک بے سہارا پریشان حال یتیم اگر ایک لائق فائق معلم ایک ممتاز و مستند ادیب اور ایک باکمال صاحبِ فن شاعر بن جائے تو اسے معجزہ کے سوا کیا کہا جائے گا۔

اب جوشؔ صاحب کی شاعری کی جگہ ان کی ذات زیرِ بحث آگئی ہے تو چند اور باتیں بھی بیان کر دوں۔ ان کا طالب علمی کا زمانہ مالی اعتبار سے جتنا مصیبت ناک تھا تعلیمی ترقی کے لحاظ سے اتنا ہی خوش گوار رہا۔ حافظے کی قوت بچپن ہی سے زبردست تھی اور قدرت نے ذہن ایسا عطا کیا تھا کہ درسی کتابوں سے پہلوانی کی ضرورت پیش نہ آتی تھی۔ مشکل سے مشکل سبق دو چار بار نظر ڈالنے سے ازبر ہو جاتا تھا۔ چناں چہ آپ محنت شاقہ سے کام نہ لیتے تھے اور اس طرح دوسری ذمہ داریوں پر توجہ کے لئے وقت نکل آتا تھا۔ مگر اس کے باوجود جماعت میں اوّل نمبر پر رہتے تھے۔ ایک بار کا ذکر ہے امتحان کے دن تھے۔ شام کو کھانا کھانے کے بعد سائیکالوجی کے چالیس صفحے دیکھے اور دس بجتے بجتے سو گئے۔ صبح اُٹھ کر ایک ہم سبق سے کہا کہ ذرا فلاں حصّہ کتاب سے میرا امتحان لو۔ وہ سوال پوچھتا گیا اور یہ انہیں الفاظ میں درست اور معقول جواب دیتے گئے جو کتاب میں درج تھے۔ اس طرح آپ ادیب فاضل اور منشی فاضل بن گئے۔ اگرچہ اب ان جماعتوں کے پڑھانے والے جوشؔ صاحب سے برسوں استفادہ کر سکتے ہیں۔ لیکن اس وقت روز افزوں ذمہ داریوں میں گھرے ہوئے پریشان حال نوجوان کے لئے یہ بہت بڑی بات تھی۔ بالخصوص اس وجہ سے کہ اس سے آپ کے "روزگار" کی سبیل بن گئی اور آپ اُردو فارسی کے معلم اور پھر اوّل مدرس ہو گئے۔

مزاج کی سادگی اور بے تکلفی کی طرف پہلے بھی اشارہ کر چکا ہوں۔ یہ سادگی زندگی کے کسی ایک پہلو تک محدود نہیں بلکہ ساری زندگی پر چھائی ہوئی ہے۔ لباس کی یہ حالت ہے کہ معمولی کپڑے کی سفید پگڑی سفید دھوتی اور سفید قمیض کو کافی سمجھتے ہیں اور عام طور پر اس سے آگے نہیں بڑھتے۔ سردیوں میں البتہ کمبل اوڑھ لیتے ہیں۔ گلوبند کالر نکٹائی اور پتلون کا تو ذکر ہی کیا کوٹ پاجامہ کو بھی دفتر کی وردی کہا کرتے ہیں لیکن کبھی کبھار موسم کے اعزاز میں معمولی سیدھا سادہ کوٹ پاجامہ بھی پہن لیتے ہیں۔ جرابوں کے زیادہ سے زیادہ دو جوڑے جاڑے کے لئے کافی ہیں۔ وہ بھی سفر میں استعمال ہوتے ہیں۔ بوٹ آج تک نہیں پہنا۔ سر عبدالقادر نے ایک مرتبہ فرمایا تھا کہ "اتنی سادگی اس رنگینیٔ کلام سے کچھ بھی مطابقت نہیں رکھتی"۔ لیکن جوشؔ صاحب کی رائے یہ ہے کہ۔

کیف آور تو ہے شراب فقط ساغرِ زرنگار کیا معنی

کھانے پینے میں بھی تکلف کو قطعاً دخل نہیں۔ جو کچھ ملا خدا کا شکر کر کے کھا پی لیا۔ بعض لوگوں کو یہ سن کر تعجب ہوگا کہ شعر و سخن کی محفلوں میں کیف و مستی سے بھری ہوئی شراب کے خم کے خم لنڈھانے والے جوشؔ نے عمر بھر کبھی شراب نہیں پی بلکہ گوشت سے بھی ہمیشہ پرہیز کیا۔ اس کے باوجود احباب کی محفلوں میں نہایت بے تکلفی سے شامل ہوتے اور بلبل کی طرح چہکتے ہیں۔ خود فرماتے ہیں ؎

آتا ہے جذبِ دل کو وہ انداز مے کشی رندوں میں رند بھی رہیں دامن بھی تر نہ ہو

لیکن اس انداز سے کشی کو ہر شخص کے لئے ضروری نہیں سمجھتے۔ حالات و طبائع کے مطابق نسخے میں تغیر و تبدل بھی ہو سکتا ہے۔ مثلاً جناب شیخ کی جوانی

حالت اور منزلِ مقصود کے پیشِ نظر مشورہ دیتے ہیں کہ ؎

پی لوگے تو اے شیخ ذرا گرم رہو گے　　　ٹھنڈا ہی نہ کر دیں کہیں جنت کی ہوائیں

لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ جوشؔ صاحب کسی خانقاہ کے درویش یا مندر کے مہنت بن کے رہ گئے ہیں۔ اس پریشانیوں اور کلفتوں کی دنیا میں ہر شخص کو کسی نہ کسی وقت "پر غورِ بامداد فرزندم" کے جھگڑے سے فرار اور کسی ذہنی پناہ گاہ کی تلاش ہوتی ہے۔ چنانچہ جوشؔ صاحب نے بھی ایسی مصروفیتوں کے علاوہ ایک شغل بے شغلی منتخب کر رکھا ہے۔ شطرنج کھیلنے کا شوق خدا جانے انہیں کب اور کن حالات میں ہوا لیکن رفتہ رفتہ فن کارانہ انہماک کی صورت اختیار کر کے علاج کی جگہ خود ایک مرض بن گیا۔ بارہا یہ دیکھا گیا کہ ایک صبح سے دوسری صبح تک کھیلتے رہے اور تھکے بھی تو صرف اس مجبوری سے کہ دنیا اس انہماک کو دیکھ کر کیا کہے گی۔ آپ کا شمار پنجاب کے مشہور و معروف شاطروں میں ہوتا ہے۔ شطرنج کے متعلق ایک بیاض بھی مرتب کی ہے۔ جس میں بہت سے مشکل نقشے حل کئے ہیں۔ شاعری پر بھی اس شوق کا اثر ہونا لازم تھا۔ اکثر اشعار میں شطرنج کی اصطلاحیں اور تشبیہات بڑی خوبی سے استعمال ہوئی ہیں۔ مثلاً

سمجھتے خوب تھے ہم شاطرِ دوراں کی چالوں کو　　　مگر نقشہ پڑا ایسا کہ بازی ہار بیٹھے ہیں

شکستِ انجامِ قیس و کوہ کن ہی کو نہیں دیکھا　　　بساطِ عشق و الفت پر تو ہر شاطر کو ماتیں ہیں

ایک جگہ آنسو کی زبان سے فرماتے ہیں۔

مجھ سے جاں باز کو غربت ہے بساطِ شطرنج　　　جو نہ پلٹے کبھی واپس وہ پیادہ میں ہوں

شطرنج کا پیادہ آگے ہی بڑھتا ہے۔ اور مہروں کی طرح پیچھے نہیں ہٹتا۔ پہلے مصرع کے متعلق کچھ عرض کرنے کی ضرورت ہی نہیں۔ جاں باز، غربت اور بساطِ شطرنج خود ہی مذاقِ سلیم سے داد و تحسین کا خراج حاصل کریں گے۔

عادات و خصائل کے اعتبار سے جوشؔ صاحب قدیم وضع کے دیہاتی بزرگ ہیں۔ مزاج میں تکلف نام کو نہیں خود بے حد مخلص اور اخلاص نواز ہیں۔ اور ایسے اشخاص سے مل کر خوش ہوتے ہیں۔ ظاہر داری اور ریاکاری کی مزدوری اور کارآمد صفات سے قطعاً محروم ہیں۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ بے حد فراخ دل اور مرنجان مرنج ہونے کے باوجود ان صفات کے لوگوں کو سخت ناپسند فرماتے ہیں اور ان کے متعلق اپنے خیالات و جذبات کو چھپانے کی کوشش بھی نہیں کرتے۔ طبیعت میں بغض و شر کے فقدان کے باعث دوستی کا نباہ تو عمر بھر کر سکتے ہیں لیکن دشمنی کی راہ پر تھوڑی دور بھی نہیں چل سکتے۔ کسی میں کوئی خوبی ہو تو اس کی تعریف دل کھول کر کریں گے مگر فضول خوشامد اور لابہ گری سے سخت نفرت ہے۔ میں نے اصول پرستی اور خودداری کے بڑے بڑے دعویداروں کو ذرا ذرا سی بات کے لئے ذلت کی انتہائی گہرائیوں میں گرتے اور اپنی خودداری بلکہ انسانیت کا خون کرتے دیکھا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ جتنے زور و شور سے اصول پرستی اور آزادیٔ ضمیر کے دعوے کئے جاتے ہیں۔ اتنی ہی ڈھٹائی اور بے حیائی سے ان دکھاوے کے اصولوں کی مٹی پلید کی جاتی ہے۔ مگر پنڈت جی کے متعلق پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ انہوں نے کسی حالت میں بھی یہ ذلت گوارا نہیں کی۔ اس سے بچنے کے لئے انہوں نے اپنی ضروریات میں انتہائی تخفیف کر لی اور قناعت کو اپنا مذہب بنا لیا۔ اس لئے فرماتے ہیں ؎

وہ گدا ہوں تاجِ شاہی کی ہوس تو درکنار　　　سر چھپانے کو جگہ ڈھونڈوں ہما کو دیکھ کر

حقہ آپ کا محبوب ساتھی ہے۔ سگرٹ سے نفرت ہے۔ بالعموم سفر میں بھی ایک سفری حقہ ساتھ رہتا ہے۔ مجلسِ مشاعرہ یا اس قسم کی دوسری تقریبوں کے موقعے پر جبراً قہراً سگرٹ پیتے ہیں۔ اور وہ بھی "ریڈ لیمپ"۔ اچھے اور قیمتی سگرٹ اس لئے پسند نہیں کہ ان میں حقے کا جزوی لطف بھی نہیں۔ نکودر کی تحصیل میں تقسیمِ ملک سے پہلے تمباکو کی بہت کاشت ہوتی تھی اور یہاں کا تمباکو دور دور تک مشہور تھا۔ آپ کا معمول تھا کہ فصل کے موقعے پر بیسیوں نمونے تمباکو کے لاتے اور جو سب سے اچھا نکلتا اس کا اسٹاک سال بھر کے لئے خرید لیتے۔

سادہ زندگی میں کفایت ایک عادت سی بن جاتی ہے۔ آپ نہ خود بے جا خرچ کرتے ہیں نہ گھر میں کسی کو بے جا خرچ کرتے ہوئے برداشت کر سکتے ہیں۔ سادہ کپڑے، ماکولات و مشروبات میں انتہا درجے کی سادگی۔ تھرڈ کلاس سے اونچے درجے کا سفر میں نام نہ لینا اور چھوٹی چھوٹی باتوں میں صرف بے جا سے بچنا یہ آپ کی منفرد خصوصیات ہیں۔ نکودر سے ملسیان آٹھ میل کا فاصلہ ہے۔ ریل اور موٹر کے ہوتے ہوئے بھی بالعموم پیدل آتے جاتے رہے ہیں۔ اسٹیشن سے گھر تک ایک میل کا فاصلہ ہوگا۔ لیکن سامان نہ ہو تو کبھی تانگے میں نہیں گئے۔

ہم نشینوں میں صاحب علم کوئی نہیں۔ یہ اور بات ہے کہ آپ کی صحبت کے فیضان سے ہم نشینوں میں قدرے سخن فہمی پیدا ہو گئی ہے۔
آپ کے بہت پرانے ہم نشینوں میں سے آپ ہی کے ہم نام ایک حکیم صاحب ہیں جو نابینا ہیں۔ نکودر آپ گھر پر نہ ہوں تو عام طور پر ان کے پاس ملیں گے۔ طبی علمی اور دینوی ہر قسم کی گفتگو حقّے کے دور کے ساتھ وہاں ہوتی ہے۔

انگریزی نہیں جانتے۔ جوانی کے زمانے میں انگریزی پڑھنے کی کوشش کئی بار کی مگر ہر بار ایک آدھ کتاب پڑھ کر چھوڑ دی۔ پہلی دفعہ تو جج (JUDGE) اور سولجر (SOLDIER) کے ہجوں سے ہی بیزار ہو گیا۔ جج میں ڈی اور سولجر میں ڈی خدا جانے کس مصلحت سے ہے۔ دوسری مرتبہ پھر شوق ہوا مگر نائٹ (NIGHT) اور ہاف (HALF) اور نو (KNOW) وغیرہ وغیرہ کے تلفظ اور بے ربط ہجوں سے پریشان ہو کر رہ گئے۔ پھر تیسری بار احباب کی ترغیب و تحریص سے ایک ابتدائی کتاب شروع کی تو نکودر میں جہاں آپ کا مستقل قیام ہے طاعون پھیل گیا۔ چوتھی دفعہ کوشش کی تو شہر میں انفلوئنزے نے حشر ڈھا دیا۔ یہ منحوس نتائج دیکھ کر کتاب پھینک دی اور پھر اس وہم میں مبتلا رہے کہ اگر پڑھنا شروع کیا تو خدا جانے کیا قیامت نازل ہو۔

فصیح الملک مرزا داغ کے شاگرد ہیں۔ ان کے شاگردوں کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ جوش صاحب سے فیض اصلاح پانے والوں کی تعداد بھی بہت ہے۔ حالانکہ آپ اکثر مبتدیوں کو یہ کہہ کر ٹال دیتے ہیں کہ "شاعری کا طوق آپ کے گلے میں تنگ ہے"۔ پنجاب اور یوپی کے بڑے بڑے کہنہ مشق آپ سے مشورہ سخن کرتے رہے ہیں اور کرتے ہیں۔ آپ متروکات زبان کے پابند مگر حسن بیان کے دلدادہ ہیں۔ بیخود، سائل، احسن مارہروی، نوح، یگانہ، حسرت موہانی، جگر، جوش، حفیظ سب سے آپ کے اچھے مراسم رہے ہیں۔ عمر کا ایک طویل حصہ آپ نے گوشہ نشینی میں اس طرح گزارا کہ ایک مشاعرے میں اکابر آپ کا کلام سن کر انگشت بدنداں رہ گئے تھے اور جب آپ نے انشاء کی مشہور زمین میں یہ شعر پڑھا

جناب شیخ کی میراث اس میں چل نہیں سکتی
ابھی تو گلشن جنت کے ہم حقدار بیٹھے ہیں

تو آغا شاعر قزلباش اسٹیج پر آ کر آپ سے بغل گیر ہو گئے۔

یہ بات کہ بے شمار شاگردوں کو فیض پہنچانے کے باوجود آپ نے اپنے قابل فخر صاحبزادے حضرت عرش ملسیانی کو اصلاح کے فیض سے فیض یاب نہیں کیا۔ تعجب خیز ضرور ہے لیکن جوش صاحب کی وضع داری اور مزاج کی نفاست کو دیکھتے ہوئے یہ بات عین قابل قبول ہے۔ آپ جوش صاحب کی شخصیت میں ایک شفیق باپ، ایک باوقار استاد، ایک معزز شہری، ایک نہایت شریف انسان اور شہرت و ناموری کو تلاش نہ کرنے والا شاعر پائیں گے۔ انہیں شاعر کی عظمت کا احساس ہے۔ اس کے ساتھ خود اپنی عظمت کا احساس بھی ضرور ہے۔

انکار کیجیے نہ کمالات جوش سے
کم گو سہی مگر وہ سخن ور ضرور تھا

تلوک چند محروم

جگن ناتھ آزاد

مسلسل پینتیس برس تک سرکاری اور غیر سرکاری ملازمت کرنے کے بعد والد جب کنٹونمنٹ بورڈ اسکول راولپنڈی کی ملازمت سے ریٹائر ہوئے تو انہوں نے اپنے اس عرصۂ ملازمت کا جائزہ ان اشعار میں لیا ـــ

سی و پنج سال عمرم بہ ملازمت بسر شد — سحر شباب خود را ہمہ تیرہ شام کردم
شرفم بہ عہدِ پیری چہ بود کہ در جوانی — بہ سگاں ادب نمودم بہ خراں سلام کردم

یہ ہیں ایک شاعر کی مسلسل پینتیس برس کی ملازمت کے تاثرات۔

پینتیس برس ـــ زندگی کا ایک حصہ ـــ بہ سگاں ادب نمودم بہ خراں سلام کردم ـــ اور اس کے باوجود مسلسل تخلیقِ فن کا سلسلہ جو آج تک جاری ہے۔ پینتیس برس کی اس مسلسل گھٹن کا اندازہ ان تنقیدی یا تعریفی مقالات سے نہیں ہو سکتا جو مختلف رسائل اور کتابوں میں والد اور ان کی شاعری کے بارے میں لکھے گئے۔ والد کی زندگی کے وہ گوشے جو ان کے تخلص کے ساتھ گہرا معنوی ربط رکھتے ہیں اور اس سلسلے میں خوابیدہ ہیں ابھی تک منظرِ عام پر نہیں آئے۔ میں اس مقالے میں بعض ایسے ہی گوشوں کو بے نقاب کرنے کی کوشش کروں گا۔

والد سے جب میں نے ذکر کیا کہ طفیل صاحب کا خط آیا ہے اور انہوں نے مجھ سے آپ کے بارے میں مقالہ لکھنے کے لئے کہا ہے کچھ مشورہ دیجئے کیا لکھوں تو کہنے لگے کہ میری زندگی میں ایسے واقعات پیدا ہی نہیں ہوئے جنہیں رسالے کے لئے لکھا جائے اور جو واقعات ہیں وہ مل جل کر ہمارے سماج کی کوئی عمدہ تصویر پیش نہیں کرتے۔ پنجاب کی تنگیوں اور تعصبات کا زمانہ۔ اسے دہرانا کوئی مستحسن بات نہیں ہے۔ میانوالی اور راولپنڈی کے واقعات تو تمہیں یاد ہی ہوں گے۔ اگر مفتی احمد سعید اور بیرسٹر محمد جان میری امداد نہ کرتے تو متعصب لوگ میری زندگی ہی دشوار بنا دیتے۔ اب بھی انہوں نے کچھ کم پریشان نہیں کیا اس سے پہلے بھی جب تم بہت چھوٹے تھے مجھے مخالفوں نے مسلسل کئی برس تک پریشان کیا۔ یہ باتیں لکھنے کی تھوڑا ہی ہیں۔

انہوں نے مقالہ نہ لکھنے کی جو وجہ بیان کی وہی میرے لئے یہ چند سطور لکھنے کی وجہ جواز بن گئی۔ پریشان کرنے والے لوگ یعنی بعض مسلمان

یہ بہانے تعصب پریشان کیا اور اعادہ کس نے کی؟ مسلمانوں ہی نے۔ اب ایک غیر مسلم شاعر کی زندگی کا یہ گوشہ پڑھنے والوں کے سامنے کیوں نہ آئے اس سے بڑی وجہ ایک شاعر کی داستانِ حیات لکھنے کی اور کیا ہو سکتی ہے؟ اور پھر جتنی قدر دانی ہوئی وہ کن لوگوں نے کی؟ کیا ان میں سے بیشتر مسلمان نہیں تھے؟ تو گویا یہ تو تاریخِ ادب کا ایک ایسا باب ہے جو آج سے بہت پہلے معرضِ تحریر میں آجانا چاہیے تھا۔

۱۸۸۷ء والد کا سنِ پیدائش ہے۔ دریائے سندھ کے کنارے عیسیٰ خیل کی تحصیل میں کاجراں والا نام کا ایک گاؤں تھا جو ان کی جنم بھومی ہے یہ گاؤں اسی زمانے میں دریا برد ہو گیا تھا۔ ہمارا خاندان اپنی تھوڑی بہت کاشتکاری اور معمولی دکانداری کو چھوڑ کر عیسیٰ خیل آگیا اور وہیں آباد ہو گیا۔ والد کی عمر اس وقت پانچ سات برس کی تھی۔ وہ خود بیان کرتے ہیں کہ میرا بچپن دیہاتی مسلمان بچوں کے ساتھ کھیل کود میں گزرا۔ دریائے سندھ کی ایک شاخ گاؤں کے پاس سے گزرتی تھی۔ موسمِ گرما میں عموماً سارا سارا دن اس دریا میں نہانے اور تیرنے میں گزر جاتا تھا۔ ساون بھادوں میں جب سارا گاؤں زیرِ آب ہو جاتا تھا تمام مکان کچے کوٹھے اور چھپر گر جاتے تھے۔ اہلِ دیہہ کے لئے یہ بڑا حادثہ ہوتا تھا لیکن چونکہ اس کے عادی ہو چکے تھے کسی نہ کسی طرح گزارا کر ہی لیتے تھے۔ ہم بچوں کے لئے تو پانی کا اس طرح موجیں مارتے ہوئے گھروں میں پہنچ جانا باعثِ مسرت ہوتا تھا۔ گرے ہوئے ملبے سے کواڑوں کے تختے لے کر ان کی کشتیاں بنا لینا اور ادھر ادھر کھیتے رہنا ان ایام میں ہمارا بہترین مشغلہ ہوتا تھا۔ اب جو غالب کا یہ شعر پڑھتا ہوں تو وہ سماں آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے ؎

مقدمِ سیلاب سے دل کیا نشاط آہنگ ہے — خانۂ عاشق مگر سازِ صدائے آب تھا

والد کا دریائے سندھ سے دلی ربط جو آج بھی ان کی گفتار اور اشعار میں موجود ہے، اسی زمانے کی یادگار ہے۔ ایک تازہ ترین نظم میں کہتے ہیں ؎

بھولا نہیں عالم تری امواجِ رواں کا — وہ عالمِ رقصاں مری عمرِ گزراں کا
تو راز تلاطم وہ مرے ذوقِ نہاں کا — افسوس کہاں میں ہوں، یہ قصہ ہے کہاں کا

گزشتہ کناروں سے ترے توڑ کے آیا
طفلی بھی جوانی بھی وہیں چھوڑ کے آیا

تقدیس میں تجھ سے مجھے انکار نہیں ہے — گو پاک نہیں اس سے سروکار نہیں ہے
کیا کیجیے وہ آر نہیں پار نہیں ہے — آسودہ کسی طور دلِ زار نہیں ہے

وہ لہر وہ جوش و خروش اس میں کہاں ہے
افسردہ سی بے جان سی اک نہر رواں ہے

گو تجھ سے وفا کی مجھے عادت بھی رہی ہے — فطرت تری کچھ مائلِ وحشت بھی رہی ہے
مضمر ترے طوفاں میں آفت بھی رہی ہے — ساتھ اس کے نمایاں یہ حقیقت بھی رہی ہے

دیہات اجاڑے تو بسائے بھی ہیں تو نے
نقشے جو مٹائے تو بنائے بھی ہیں تو نے

ہاں میرے تصور میں ہے آباد جو قریہ — آتا ہے ابھی مجھ کو بہت یاد جو قریہ
تھا جلوہ گہِ حسنِ خداداد جو قریہ — ہر قیدِ تکلف سے تھا آزاد جو قریہ

بستا ہے کنارے پہ ترے اب بھی کہیں اور
مضمون تو ہو گا وہی، ہو گرچہ زمیں اور

کوئی چھ سات برس کی عمر میں انہیں ورنیکلر نا ٹیل مڈل سکول میلے نیل میں باقاعدہ داخل کرا دیا گیا۔ پرائمری سے ہائی اسکول تک ہر جماعت میں اول رہے۔ پانچویں اور آٹھویں جماعت کے امتحان میں وظیفہ حاصل کیا۔ اس زمانے میں ضلع بھر میں کوئی ہائی سکول نہ تھا اس لئے گھر سے ساٹھ ستر میل کے فاصلے پر بنوں جاکر وکٹوریہ ڈائمنڈ جوبلی ہائی سکول میں داخل ہوئے۔ سنہ ۱۹۰۸ء میں میٹرکولیشن کا امتحان درجۂ اول میں پاس کیا۔ ایف۔ اے اور بی۔ اے کے امتحان بعد میں بہ دورانِ ملازمت پاس کئے۔

میٹرکولیشن کے بعد سنٹرل ٹریننگ کالج لاہور میں داخل ہونے کے لئے بنوں سے لاہور آئے۔ رستے میں پہلی بار ملکۂ نورجہاں کا مقبرہ دیکھا۔ ان کی مشہور نظم "نورجہاں کا مزار" اسی زمانے کی یادگار ہے۔ والد بتلاتے ہیں کہ اب تو مقبرے کے چاروں طرف بیلیں چڑھی ہوئی ہیں اور ویرانی کا عالم نہیں ہے لیکن اس زمانے میں جب میں نے اسے پہلے پہل دیکھا تھا۔ اس مقبرے کی کیفیت واقعی یہی تھی کہ ؎

چوپائے جو گھبراتے ہیں گرمی سے تو اکثر — آرام کیا کرتے ہیں اس روضے میں آکر
اور شام کو بالائی سیہ خانوں میں شپّر — اڑ اڑ کے لگاتے ہیں در و بام پہ چکر
معمور ہے یوں گورِ غریبانہ کسی کی
آباد رہے محفلِ جانانہ کسی کی

اسی سال میرے دادا کا انتقال ہوا۔ وہ ایک فقیر طبع انسان تھے۔ آتے جاتے مسافر کی خدمت خوشی سے کرتے اور جب کوئی سادھو مل جاتا اس کے ساتھ ہو لیتے اور کئی کئی دن تک گھر سے غائب رہتے تھے۔ چھوٹے دادا اردو اور فارسی سے اچھی طرح واقفیت رکھتے تھے اوائل عمر میں انہوں نے شعر کہنے کی بھی کوشش کی لیکن اسے جاری نہ رکھ سکے۔

والد کی پہلی شادی سنہ ۱۹۱۰ء میں ہوئی۔ پانچ برس بعد بیوی کا انتقال ہو گیا۔ ایک سال کی بچی رہ گئی — ودیا — میری بہن جس کی خودکشی نے والد کی زندگی سے ہمیشہ کے لئے مسرت چھین لی۔

اگلے برس دوسری شادی ہوئی۔ یہ میں اپنی والدہ کا ذکر کر رہا ہوں۔ دو برس بعد سنہ ۱۹۱۸ء میں میں پیدا ہوا۔ تین چار برس کی عمر کے واقعات میری یادوں کے دھندلکے میں ابھی تک موجود ہیں گویا آئندہ سطور صرف شنیدہ ہی کی نہیں بلکہ شنیدہ اور دیدہ دونوں پہلوؤں کی حامل ہوں گی۔

آج سے چونتیس برس پہلے کا زمانہ میری نظر کے سامنے ہے۔ میلے نیل میں ایک چھوٹا سا مکان ہے، والد، والدہ، ودیا اور میں ہم چار افراد اس میں رہتے ہیں، سردیوں کے دن ہیں، والد کوٹھے کی چھت پر دھوپ میں ایک چارپائی پر لیٹے ہیں۔ کوئی کتاب ان کے سامنے ہے گنگنا رہے ہیں، والدہ مجھے اور ودیا کو اوپر بھیجتی ہیں کہ جاکر کہو بازار سے ترکاری لے آئیں۔ ہم دونوں اوپر جاتے ہیں۔ دو ایک بار انہیں پکارتے ہیں لیکن وہ ہماری طرف متوجہ نہیں ہوتے۔ ہم اس خوف سے کہ کہیں جھڑک ہی نہ دیں فوراً واپس آجاتے ہیں۔ اخبار یا کتاب کی جانب ان کی محویت کا آج بھی یہی عالم ہے۔ وہ محوِ مطالعہ ہوں تو انہیں اپنی جانب متوجہ کرنے کے لئے دو چار بار پکارنا بالکل بے کار ثابت ہوتا ہے۔ ان کی محویت سے قطع نظر ان کا خوف اسی تصویر کا ایک اور پہلو ہے جو ایک زمانے تک قائم رہا اور جس کے کچھ کچھ نقوش آج بھی باقی ہیں۔

میرے اور ودیا کے دل میں ایک مدت تک والد کی محبت کے مقابلے میں شاید ان کا خوف زیادہ غالب رہا۔ یہ ان کے کردار کا ایک نمایاں پہلو ہے۔ آج بھی وہ اپنی رائے کے خلاف دنیا بھر کی رائے سن سکتے ہیں لیکن میری رائے ان کی رائے کے خلاف ہو یہ انہیں گوارا نہیں اور میں نے بھی حتی الامکان محتاط رہنے کی کوشش کی ہے۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ ان کی یہ افتادِ مزاج شفقتِ پدری کے رستے میں حائل رہی بلکہ جہاں تک میرا اور ودیا کا تعلق ہے ہمیں اس شفقت کا حصہ وافر ملا ہے۔ ہاں میری چھوٹی بہنیں ساوتری اور کرشنا اس محبت سے پوری طرح شاد کام نہیں ہو سکیں کیونکہ انہوں نے اس وقت ہوش سنبھالا جب ودیا کی خودکشی کے باعث والد کا دل بجھ چکا تھا۔ ودیا نے جو بائیس برس کی عمر میں تین بچوں کی ماں بن چکی تھی سسرال میں

ایک جھگڑے کی بنا پر اپنے کپڑوں پہ تیل چھڑک کر اپنے آپ کو آگ لگا دی تھی۔ وہ دن اور آج کا دن والد کے چہرے پر میں نے وہ مسرت نہیں دیکھی جو اس حادثے سے قبل نظر آیا کرتی تھی۔ والد کی زندگی کا یہ حادثہ کئی انداز سے شعر میں ڈھل کر آیا لیکن انہوں نے اپنے اس ذاتی غم میں کسی اور کو شریک نہیں کیا اس لئے یہ اشعار آج تک کہیں منظرِ عام پر نہیں آسکے ؎

شمشان کا نظارہ دکھاتی ہے یہ دنیا — افسوس اسی شمشان میں کھائیں گے پسیں گے
تو مرنے پہ مجبور ہوئی مر گئی جل کر — ہم جینے پہ مجبور رہیں جل جل کے جئیں گے

بجھ نہیں سکتی جو دل میں آگ ہے بھڑکی ہوئی — عالمِ فانی میں اب راحت کہاں میرے لئے
سچ تو یہ ہے تیرے جل مرنے سے اے لختِ جگر — ہو گئے دوزخ زمین و آسماں میرے لئے

پہلے ہی عزا خانہ تھی وہ میری نظر میں — افسوس کہ اب اور بھی برہم ہوئی دنیا
اے لختِ جگر! آہ کہ جل مرنے سے تیرے — میرے لئے آتش کدۂ غم ہوئی دنیا

تاب اک لمحے کی لا سکتی نہیں جانِ بشر — ایک چنگاری سے ہو جاتا ہے انساں بیقرار
ہائے کن مجبوریوں میں تو نے اے لختِ جگر — کر لیا ملبوسِ تن کو اپنے تن پر شعلہ زار

دلِ بیتاب جلتا ہی رہے گا اس کی حدت سے — زوالِ عمر میں جو داغِ پنہاں دے گئی وہ دنیا
جگر پھنکتا ہے میرا آگ لگتی ہے کلیجے میں — تصور میں نظر آتی ہے جب جلتی ہوئی دنیا

کین فلک اے وائے کہ داغِ جگرم داد — فریاد برآوردم و داغِ دگرم داد
ایں داغِ جگر پارۂ خونِ جگرم سوخت — دیں داغِ دگر آہ کہ سر تا بسرم سوخت

"آں داغِ جگر" اشارہ ہے میری چھوٹی بہن کی موت کی جانب۔ یہ بچی دو برس کی عمر میں دس بارہ دن بیمار رہ کر ہم سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو گئی تھی۔ اس بچی کو موت کے بعد ہندوؤں کے طریقے کے مطابق جلایا نہیں گیا تھا بلکہ دفنایا گیا تھا۔ والد اور میں مسلسل تین روز اس کی قبر پر جاتے رہے۔ وہاں سے واپسی پر والد ہر روز ایک نظم کہتے تھے۔ تین دن کے بعد یہ سلسلہ بند کر دیا۔ یہ نظمیں بھی جہاں تک میرا خیال ہے کہیں شائع نہیں ہوئیں۔ چند اشعار مجھے زبانی یاد ہیں، یہاں درج کر رہا ہوں ؎

پہلی صبح

کیوں ہم سے روٹھ کر نکل آئی ہے تو یہاں — اٹھ میرے ساتھ چل مری پیاری شکنتلا
وحشت فزا مقام ہے جنگل ہے ہولناک — یاں رات تو نے کیسے گزاری شکنتلا
خوابِ گراں میں تو ہے ابھی زیرِ خاکِ سرد — بیدار کائنات ہے ساری شکنتلا

خوش ہو کے پھول پھول کہ گلشن میں ساتھ ہے   آنکھوں سے اس کی اشک ہیں جاری شکنتلا
آنکھوں میں آ گیا دل صد چاک کا لہو   پتھر ہے تجھ پہ دیکھ کے بھاری شکنتلا
ویرانہ ہو گیا ہے بھرا گھر ترے بغیر   کہتے ہیں سب کہاں ہے ہماری شکنتلا

دوسری صبح

مایوس ہو کے کل گئے پھر آج آ گئے   اے کاش زیر خاک سے ہو آشکار تو
ہم دودھ لے کے آئے تھے گھر سے ترے لئے   دو دن کی بھوکی پیاسی ہے اے شیرخوار تو
گھر میں تو رات کاٹی تھی تو نے تڑپ تڑپ   آسودہ ہو گئی تہ خاک مزار تو
افسوس عمر بھر ہمیں تڑپائے گی وہ رات   جب ہو رہی تھی بہر سفر بے قرار تو
روتا ہے پھوٹ پھوٹ کے بالیں پہ تیری آج   وہ بھائی جس سے کرتی تھی ہنس ہنس کے پیار تو
بھولا غم جہاں تجھے جب گود میں لیا   آئی تھی بن کے راحت جان نزار تو
جتنی مسرتیں ترے دم سے ہوئیں نصیب   اتنا ہی کر گئی ہے ہمیں دل فگار تو

تیرے لئے دعا ہے دل غم نصیب کی
ہو بہرہ یاب رحمت پروردگار تو

تیسری صبح

ملتا نہیں ہے کچھ مری فریاد کا جواب   کس نے شکنتلا تجھے یوں کر دیا خموش
مطلب یہ تھا کہ تو مرے نالوں سے جاگ اٹھے   فطرت میں ورنہ ہے مری درد آشنا خموش
مجھ بدنصیب کے لئے تیری خموشیاں   ایسا نہ خامشی میں تو ہو جاؤں گا خموش
طاری ہے آہ شہر خموشاں پہ کیا سکوت   خاموش سرزمیں کی ہے ساری فضا خموش
سر منزل دیار عدم ہے یہی مقام   ڈیرے لگے ہوئے ہیں مگر بے صدا خموش
وادی یہ وہ ہے جس میں مسافر اترتے ہیں   سینے میں سانس رک کے ہیں جوں نقش پا خموش
دم مارنے کی تاب کسی کو یہاں نہیں   پیر و جواں خموش ہیں شاہ و گدا خموش
نغمے خوشی کے ہیں نہ کہیں نالہ ہائے غم   یکسر ہیں ساکنان دیار فنا خموش

صدمہ نہ تا کہ ہو تری معصوم روح کو
ہوتا ہے سانس اب مری فریاد کا خموش

شکنتلا کے ذکر سے پہلے میں ودیا کی خودکشی کا ذکر کر رہا تھا۔ یہ ۱۹۳۹ء کی بات ہے جب ہم راولپنڈی میں تھے جس روز دوپہر کو اس حادثے کی اطلاع تار کے ذریعے سے ملی اسی روز جب صبح کو ـــــ حادثے کی اطلاع سے پانچ سات گھنٹے قبل ـــــ والد بیدار ہوئے تو میں نے انہیں خلاف معمول بہت افسردہ پایا۔ میں نے ان سے دو ایک بار پوچھا کہ طبیعت تو آپ کی اچھی ہے؟ رات کو نیند تو ٹھیک سے آئی؟ انہوں نے کہا۔

ہاں بالکل اچھا ہوں کوئی خاص بات نہیں ہے۔ یونہی طبیعت پریشان سی ہے۔ حسبِ معمول سیر کو چلے گئے ایک ڈیڑھ گھنٹے کے بعد واپس آ گئے۔ افسوگی کا عالم بدستور طاری تھا۔ میں نے اس خیال سے کہ اسکول یا کنٹونمنٹ بورڈ کا کوئی معاملہ پریشان کر رہا ہوگا دوبارہ پوچھنا مناسب نہ سمجھا کنٹونمنٹ اسکول کی ہیڈ ماسٹری ان کے لئے دردِ سر تھا۔ میرا گمان یہی رہا کہ کوئی نیا مسئلہ پیدا ہو گیا ہے۔ اس دن اسکول جانے تک والد خلافِ معمول خاموش ہی رہے اپنی پریشانی کو چھپانا ان کے بس میں تھا نہ ہے۔ دوپہر کو تار ملا جس میں یہ الفاظ درج تھے ——— (VIDYADIED THE MORNING) وہی صبح کا وقت جب والد افسردہ خاطری کے عالم میں بیدار ہوئے میں ودیا اپنے آپ کو آگ کے سپرد کر رہی تھی۔ مہر بہری کو اس حادثے کی اطلاع کسی نہ کسی طرح پہنچ ہی رہی تھی۔

یہ میری بہنوں کی زندگی اور موت کا ذکر تھا جو بلا ارادہ نوکِ قلم پہ آگیا ورنہ میں کہہ تو یہ رہا تھا کہ آج سے چونتیس برس پہلے ہم لوگ کیسے رہتے سہتے تھے عیسیٰ خیل (مغربی) پنجاب میں ایک چھوٹا سا شہر ہے۔ ہمارا وطن ہے اس لئے محبوب ہے ورنہ زندگی کی آسانیاں اور سہولتیں اس شہر میں قطعاً مفقود ہیں زندگی کی اوّلین ضرورت پانی یہاں کمیاب بلکہ نایاب ہے۔ اب نہ جانے کیا کیفیت ہے۔ میں اپنے وقت کی بات بتا رہا ہوں۔ شہر سے دور ایک چھوٹا سا تالاب تھا شہر کی عورتیں ہر صبح و شام اپنے سر پر دو دو گھڑے رکھ کر پانی بھرنے جایا کرتی تھیں اور گھر کی ضروریات کے مطابق دن میں کئی کئی بار جاتی تھیں۔ اس کے علاوہ عورت گھر میں مقید تھی۔ پانی لانے کے سوا باہر کا سارا کام مردوں کے سپرد تھا اور گھر کے اندر کا سارا کام عورتوں کے سپرد۔ یہ پانی اس قابل نہیں ہوتا تھا کہ پیا جائے لیکن سارا شہر یہی پانی پیتا تھا۔ والد پندرہ برس کی عمر میں اس شہر سے نکلے اور بنوں، لاہور اور ڈیرہ اسمٰعیل خان میں تعلیم اور ملازمت کے سلسلے میں چودہ برس گزارنے کے بعد جب دوبارہ عیسیٰ خیل میں آئے تو شہر کے پانی سے بیزار ہو گئے انہیں ہر وقت یہ اندیشہ رہتا تھا کہ یہ پانی ہم لوگوں کو بیمار کر دے گا۔ چنانچہ وہ اکثر پانی کے گھڑوں اور صراحیوں میں پھٹکڑی کی ڈلی پھیرا کرتے تھے اور ہم لوگوں کو یہ خاص ہدایت تھی کہ پانی گلاس میں اس طرح سے انڈیلیں کہ تہ کے قریب کے پانی میں حرکت پیدا نہ ہو۔ اس تمام احتیاط کے باوجود پانی نے اپنا اثر دکھایا اور والد بیمار پڑ گئے۔ پانی کی مٹی نے جمع ہو ہو کر گردے میں پتھری کی صورت اختیار کر لی تھی۔ شدتِ درد کے ناقابلِ بیان عالم میں انہیں چارپائی پر لٹا کر پھر اسی شہر بنوں میں لے جایا گیا جہاں وہ ایک مدت تک زیرِ علاج رہے۔ ڈاکٹر پنیل ایک مشہور انگریز ڈاکٹر تھے۔ انہوں نے اپریشن کر کے پتھری خارج کی اور والد انتہائی نقاہت کے عالم میں واپس گھر آ گئے۔

اب ہر لمحہ عیسیٰ خیل کو چھوڑنے کی تجویزیں پیشِ نظر تھیں لیکن اس کی کیا صورت کی جائے۔

مفتی احمد سعید میانوالی میں ڈسٹرکٹ انسپکٹر آف سکولز تھے، گجرات ان کا وطن تھا۔ نیک خصلت اور تعصب سے بالا انسان تھے۔ ذوقِ سخن رکھتے تھے، والد کے مدّاح تھے اور قدردان۔ ان سے والد نے اپنی مشکل بیان کی کہ اس شہر سے مجھے نکالئے ورنہ پھر بیمار پڑ جانے کا اندیشہ ہے۔ انہوں نے ان کا تبادلہ کلورکوٹ کے مڈل سکول میں ہیڈ ماسٹر کی حیثیت سے کر دیا۔

کلورکوٹ دریائے سندھ کے کنارے ایک چھوٹا سا گاؤں ہے۔ گاؤں کے اردگرد میلوں تک ریگستان پھیلا ہوا ہے۔ آندھیاں یہاں بکثرت آتی ہیں۔ بارش کی صورت کو لوگ ترستے رہ جاتے ہیں۔ بادل اٹھتے ہیں اور ایک جھلک دکھا کر غائب ہو جاتے ہیں لیکن اس کے باوجود وہ نعمتِ غیر مترقبہ ——— صاف ستھرا پانی ——— جس کی تلاش میں والد نے اپنا شہر چھوڑا تھا یہاں بافراط موجود تھا۔ اب والد کو یقین ہو گیا کہ یہاں پانی کی خرابی کی بنا پر بیمار پڑنے کا اندیشہ نہیں۔

لیکن اس اسکول کی ہیڈ ماسٹری کانٹوں کا بستر نکلی۔ ٹیچروں میں شاید دس جماعتوں سے زیادہ پڑھا لکھا کوئی نہ تھا۔ ان کی ذہنیت وہی تھی جو اکثر دیہاتی مدرسوں کی ہوتی ہے۔ ایک ٹیچر صاحب نے ایک دن اپنے طلبہ سے کہا کہ کل سب لڑکے اپنے اپنے گھر سے ایک ایک اکنی لے کر آئیں۔ مجموعی رقم سے کلاس روم کے لئے [illegible] خریدا جائے گا۔ والد کو یہ بات معلوم ہوئی تو انہیں ضابطے اور اخلاق کے پیشِ نظر یہ بہت ناگوار گزری۔ انہوں نے اس ٹیچر کو بلایا اور اس سے کہا کہ یہ حرکت تمہارے لئے اور ہمارے اسکول کے لئے بدنامی کا باعث ہے۔ جب سرکاری طور پر کلاس روم کے لئے [illegible] کے مطابق [illegible]

تو معلوم نہ تھا کہ وہ طلباء سے بیسے جمع کرنے کے کیا معنی ؟ وہ صاحب اس وقت تو کچھ نہ بولے لیکن انہوں نے دوسرے ٹیچروں میں یہ کہنا شروع کر دیا کہ ہیڈ ماسٹر متعصب ہے اور مسلمانوں کو تنگ کرتا ہے۔ کلورکوٹ میں آبادی ہندوؤں کی تھی۔ مسلمان شہر سے دور مختلف دیہات میں آباد تھے۔ ان میں رئیس اور جاگیردار قسم کے لوگ بھی تھے، خوشحال اور کھاتے پیتے بھی اور ایسے بھی جنہیں مفلس کہا جاتے۔ ان دیہات میں کوئی اسکول نہیں تھا۔ میرا خیال ہے معمولی پرائمری اسکول بھی کوئی نہ تھا، انگریزی مڈل کا تو کیا سوال ؟ لہٰذا مسلمان طلباء کے لئے کلورکوٹ میں آکر تعلیم حاصل کرنا ایک بڑا مسئلہ تھا۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے جب ہم کلورکوٹ میں آئے تو اسکول میں مسلمان طلبہ کی تعداد دو چار فی صد سے زیادہ نہ تھی۔ والد نے ان دیہاتی طلبہ کی سہولت کے لئے ایک بورڈنگ ہاؤس کا انتظام کر دیا جس میں بے شمار مسلمان طلبہ دیہات سے آکر داخل ہو گئے اور اسکول میں ان کی خاصی تعداد ہو گئی۔ اس بات سے دیہات کے تمام مسلمان خواہ وہ لوگ نمبردار تھے یا ذیلدار، معمولی کاشتکار تھے یا دکاندار بہت خوش ہوئے کیونکہ ان کے بچوں کی مستقل تعلیم کی ایک صورت پیدا ہو گئی تھی لیکن اسکول کے ٹیچروں کی ذہنیت جوں کی توں رہی۔ ایک ٹیچر نے بورڈنگ ہاؤس سے دو چارپائیاں چرا لیں اور جب اس سے جواب طلب کیا گیا تو اس نے والد کو متعصب ہندو کہنا شروع کر دیا۔ بدقسمتی سے یہ ٹیچر ایسے لوگ تھے جو کسی طرح سے معلمی کے مقدس کام کے موزوں نہیں تھے۔ یہ لوگ سرتاپا بے علم تھے اردو کا صحیح فقرہ بولنا ان کے لئے جوئے شیر لانے سے کم نہ ہوتا تھا لیکن یہ لوگ معلمی کے کام پر مامور تھے۔ ان میں سے ایک صاحب ہر روز ایک طلبہ کو اپنے گھر بھیج دیا کرتے تھے اور وہ طلبہ وہاں دن بھر طرح طرح کے ذاتی کاموں میں مصروف رہتے تھے۔ زیادہ تر وہ کام یہ ہوتے تھے۔ گائے بھینس کے لئے کھلی اور چارے کا انتظام، چارپائی وغیرہ کی بُنائی، گھر کی صفائی اور بچوں کو ادھر ادھر لئے پھرنا وغیرہ۔ ایک اور صاحب نے طلبہ کی باریاں مقرر کر رکھی تھیں اور اپنی اپنی باری کے مطابق ہر طالب علم ان کے لئے گھر سے لسی لایا کرتا تھا۔ ٹیچر صاحب لسی میں مکھن کی موجودگی پر بھی اصرار کیا کرتے تھے۔ ایک ٹیچر صاحب جیب میں تاش ڈال کر اسکول آیا کرتے تھے اور جب موقع ملتا وہ تین ساتھیوں کے ساتھ تاش کھیلنے بیٹھ جایا کرتے تھے۔ والد ان بدعنوانیوں کو گوارا نہ کر سکے۔ مشورہ، نصیحت اور ڈانٹ ڈپٹ کے ذریعے سے انہیں روکنا چاہا۔ انہوں نے والد کے خلاف ایک محاذ قائم کیا۔ ڈسٹرکٹ انسپکٹر آف اسکولز اور ڈپٹی کمشنر کو گمنام خطوط لکھے۔ ڈسٹرکٹ انسپکٹر آف اسکولز مفتی احمد سعید ایک شریف اور غیر متعصب مسلمان تھے۔ ان پر ان شکایات کا مطلقاً کوئی اثر نہ ہوا اور سازشیوں کو ہر بار منہ کی کھانا پڑی لیکن ان کا تبادلہ ہوتے ہی صورتِ حال بدل گئی۔ نئے ڈسٹرکٹ انسپکٹر مختلف مزاج کے افسر تھے۔ انہوں نے ان شکایات کا اثر لیا اور والد کے خلاف انکوائری قائم کی گئی۔ یہ ایک عجیب صورتِ حال تھی۔ مسلمان بچوں کی تعلیم کے لئے والد نے اتنا کچھ کیا اور انکوائری اس الزام کی تحقیق کے لئے ہو رہی تھی کہ یہ متعصب ہیں اور مسلمان طلباء اور ٹیچروں کو پریشان کرتے ہیں ؎

به جرم عشق توام می کشند و غوغا ایست
تو نیز بر سر بام آکہ خوش تماشا ایست

انہوں نے مفتی احمد سعید کو ایک خط لکھا ؎

"فرما دوے کا تعزیہ یک بار مٹ گیا
کل تم گئے کہ ہم پہ قیامت گزر گئی"

لیکن وہ اب دوسرے ضلع میں افسر تھے اور یہاں کے معاملات میں بے بس تھے۔

ڈسٹرکٹ انسپکٹر خود انکوائری کے لئے تشریف لائے۔ ڈاک بنگلے میں "عدالت" قائم ہوئی۔ شہر کے ہندوؤں کو تو گواہی کے لئے بلایا گیا تھا دیہات کے مسلمان اور اسکول کے ٹیچر اور طلبہ موجود تھے۔ ہر شخص کی عزت و آبرو خدا کے ہاتھ میں ہے۔ ٹیچروں نے دو چار معصوم طالب علم ورغلا لئے لیکن دیہات سے آئے ہوئے تمام مسلمانوں اور ہزاروں مسلمان طلبہ نے سازشی ٹیچروں کے خلاف گواہی دی اور ڈسٹرکٹ انسپکٹر آف اسکولز کو اس بات پر مجبور کیا کہ موجودہ ہیڈ ماسٹر کا کلورکوٹ سے بالکل تبادلہ نہ کیا جائے کیونکہ اندیشہ ہے کہ ان کے جانے کے بعد مسلمان بچوں کی تعلیم کا یہ انتظام شاید جاری

سزد ہو سکے۔ والد کے لئے یہ ایک عظیم فتح تھی لیکن اس کے باوجود وہ اس ماحول سے دل برداشتہ ہو گئے۔

یہ وہ زمانہ تھا جب کانگرس کی تحریک آزادی زوروں پر تھی۔ والد نے قومی اور ملکی موضوعات پر بے شمار نظمیں کہیں اور یہ تمام نظمیں بغیر نام کے مختلف اخبارات میں چھپیں۔ اگر نام سے چھپتیں تو نوکری محفوظ نہیں تھی۔ وہ نظم کے ساتھ ایک خط ایڈیٹر کو لکھ دیا کرتے تھے کہ یہ نظم بغیر نام کے یا کسی فرضی نام سے چھاپ دی جائے۔ نہ جانے یہ بات کیوں ان کے ذہن میں نہ آئی کہ اخبارات کی ڈاک سنسر بھی ہو سکتی ہے اور امر واقعہ یہ ہے کہ ڈاک ہر روز سنسر ہو رہی تھی۔ والد کے خطوط کی نقل میانوالی کی خفیہ پولیس کو بھیج دی جایا کرتی تھی اور ان کے بارے میں میانوالی پولیس ایک فائل تیار کر رہی تھی لالہ لاجپت رائے کے انتقال پر انہوں نے ایک طویل نظم کہی یہ نظم لاہور کے ایک پبلشر نے کتابچے کی صورت میں شائع کی تھی۔ والد کا نام اس نظم پر موجود تھا۔ اس نظم نے پولیس کی فائل کو "مکمل" کر دیا اور یہ فائل ایک اور انکوائری کی صورت میں نمودار ہوئی۔ اب کے معاملہ ڈپٹی کمشنر کے ہاتھ میں تھا۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے ان کا نام رادھا کرشن تھا۔ حکومت کی جانب سے رائے بہادر کا خطاب بھی انہیں ملا ہوا تھا۔ اس انکوائری میں والد کے خلاف کسی قسم کے ثبوت کی ضرورت نہ تھی۔ ان کے اپنے خطوط کی نقول اور بعض حالات میں اصل خطوط اور اپنے ہاتھ کی لکھی ہوئی نظمیں موجود تھیں حکومت وقت کے خلاف بغاوت کا جرم ثابت تھا۔ اس کی کم از کم سزا ملازمت سے برطرفی تھی۔ حکومت چاہتی تو گرفتاری کا حکم بھی دے سکتی تھی۔ رادھا کرشن ضلع کے دورے پر کلور کوٹ آئے۔ والد کو انہوں نے اسی ڈاک بنگلے میں طلب کیا اور انہیں صورت حال سے آگاہ کیا۔ والد اپنے خلاف اتنا سنگین معاملہ دیکھ کر ہکا بکا رہ گئے۔ ان کے اپنے ہاتھ کی تحریریں موجود تھیں۔ رادھا کرشن نے صاف الفاظ میں کہا کہ اگر میری جگہ کوئی مسلمان یا انگریز ڈپٹی کمشنر ہوتا تو آپ اس وقت جیل میں ہوتے۔ میں نے محض مذہبی تعلق سے سخت رویہ اختیار نہیں کیا۔ اب آپ ایک طرف ہو جائیے یا تو کانگرس کی تحریک میں شامل ہو جائیے یا سرکاری نوکری میں رہئے۔ وہ تو یہ حکم دے کر چلے گئے۔ والد کے خلاف کوئی کارروائی بھی نہ ہوئی لیکن اس سارے واقعے سے انہوں نے کوئی اچھا اثر نہیں لیا۔ رادھا کرشن نے اگرچہ ان پر احسان کیا تھا لیکن انہوں نے اس واقعہ کا جب بھی ذکر کیا بڑے افسوس کے ساتھ کہ وہ بھی کیا نیکی جو تعصب کی بنا پر کی جائے۔ شاعر ہونے کی حیثیت سے قدردانی کرتے تو کوئی بات بھی تھی۔ تعصب کی بنا پر قدردانی کی تو کس کام کی۔ اب بھی جب آپ کبھی اس زمانے کا ذکر کرتے ہیں تو اس واقعے کا ذکر افسوس اور اندوہ سے کرتے ہیں۔ عیسیٰ خیل کے مرحوم نواب سیف اللہ خان کا تذکرہ اس موقع پر وہ ضرور کرتے ہیں۔ سیف اللہ خان مرحوم ان کی بڑی قدر کیا کرتے تھے۔ جب کبھی ملاقات ہوتی تھی تو بغلگیر ہو کر ملتے تھے اور بڑی عزت سے پیش آتے تھے۔ لاہور میں کسی ملاقات کے دوران میں نواب سیف اللہ خان سے نواب احمد یار خان دولتانہ نے یہ کہہ دیا تھا کہ عیسیٰ خیل وہی شہر ہے نا جہاں محروم صاحب رہتے ہیں؟ انہوں نے والد سے اس واقعہ کا ذکر کیا اور کہا کہ آپ تو ہمارے لئے واجب الاحترام ہیں۔ یہاں ضلع بھر میں زمینوں اور جائدادوں کے مالک ہم ہیں۔ آپ کی حیثیت ایک ہیڈ ماسٹر سے زیادہ نہیں لیکن ہمارے شہر کا نام آپ کی وجہ سے مشہور ہے۔ آپ کی ذات ہمارے لئے فخر کا باعث ہے۔

کلور کوٹ سے اب دانہ انہیں راولپنڈی لے آیا۔ بات یہ تھی کہ میں نے میٹرک کا امتحان پاس کر کے راولپنڈی کالج میں داخلہ لے لیا تھا۔ والد کلور کوٹ کے ماحول سے بیزار تو تھے ہی، کوشش کر کے انہوں نے اپنا تبادلہ راولپنڈی کرا لیا۔ یہاں وہ کنٹونمنٹ بورڈ ہائی اسکول کے ہیڈ ماسٹر مقرر ہو گئے۔ راولپنڈی میں ادبی سرگرمیاں زوروں پر تھیں۔ عبدالحمید عدم کا قیام ان دنوں یہیں راولپنڈی میں تھا۔ عطاء اللہ کلیم، عبدالعزیز فطرت، ضیاء جالندھری، احمد مرتضیٰ یہ سب حضرات یہیں تھے۔ والد راولپنڈی آئے تو شہر کے ادبی حلقوں کی طرف سے ان کا خیر مقدم ایک پرتکلف دعوت کی صورت میں کیا گیا۔ ان کے آنے سے راولپنڈی کی ادبی سرگرمیوں میں نئی جان آ گئی۔ ان کی اپنی ادبی زندگی بھی زیادہ خوشگوار بن گئی لیکن اسکول کے حالات یہاں بھی ویسے ہی ہو گئے جو کلور کوٹ میں تھے۔ ایک افسر تھا ڈسٹرکٹ انسپکٹر آف اسکولز۔ یہاں کنٹونمنٹ بورڈ کا ہر ممبر افسر تھا۔ ایک ممبر محمد رفیع کو تو ان سے پہلے دن ہی سے عناد پیدا ہو گیا۔ اس نے انہیں اسکول سے نکلوانے کی ہر ممکن کوشش کی لیکن ایک اور ممبر محمد جان بیرسٹر ایٹ لا (حال جج مغربی پاکستان

ہائی کورٹ) نے اس کی ایک نہ چلنے دی اور اس کی ہر کوشش کو ناکام بنا دیا۔ یہاں وہ ایک مجسٹریٹ محمد رفیع سے مل گئے جس سے والد کی پریشانیوں میں معتدبہ اضافہ ہو گیا۔ اسکول کے اوقات کے بعد ان کا سارا وقت اپنی صفائی میں لمبے لمبے بیانات لکھنے میں ضائع ہو جاتا تھا۔ چند برس بعد محمد رفیع کا انتقال ہو گیا اور صورت حال سکون پذیر ہو گئی۔ یہاں سے آپ ۱۹۴۲ء میں ریٹائر ہوئے اور آپ نے "سی و پنج سالِ عمرم ......" کہہ کر اطمینان کا سانس لیا۔

فوراً بعد آپ گارڈن کالج راولپنڈی میں اردو فارسی کے لکچرار مقرر ہوئے۔ مولانا تاجور کو اس تقرر کا علم ہوا تو انہوں نے مجھ سے کہا کہ تمہارے والد کو جہاں شروع میں پہنچنا چاہیے تھا وہاں وہ آخر میں پہنچے ہیں۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ اسکولوں میں ان کا وقت قریباً ضائع ہی ہوا ہے۔ انہیں شروع ہی میں کالج میں اردو فارسی کا لکچرار مقرر ہونا چاہیے تھا۔

یہ تین برس بڑے اطمینان اور سکون میں بسر ہوئے۔ ۱۹۴۷ء میں ملک تقسیم ہو گیا اور ہنگامۂ کشت و خون میں کپتان عبدالحمید (اللہ انہیں ہمیشہ اور ہر جگہ آبرو سے رکھے!) نامی ایک فرشتہ خصلت انسان کی امداد سے بخیر و عافیت لاہور پہنچے۔ لاہور سے بہ ہزار دقت امرتسر اور پھر جالندھر گئے میں ان دنوں دہلی میں تھا۔ انہوں نے مجھے خط لکھا کہ "جالندھر تک تو آ گیا ہوں۔ دہلی پہنچنے کی کوئی صورت نظر نہیں آ رہی ہے۔ ہر طرف ایک افراتفری اور کس مپرسی کا عالم ہے۔ یہاں بھی کسی مسلمان ہی سے کام نکلے گا۔" لیکن کون مسلمان اس وقت جالندھر میں اس قابل تھا کہ ان کی خدمت کر سکتا۔ بڑی مشکلوں سے دہلی پہنچے۔ یہاں لالہ درش بند سوگنیا آنجہانی نے "تیج" اخبار میں ان کی ملازمت کا انتظام پہلے ہی سے کر دیا تھا۔ کچھ مدت وہاں کام کیا۔ پھر پنجاب یونیورسٹی کیمپ کالج نئی دہلی میں لکچرار مقرر ہوئے اور ابھی تک وہیں کام کر رہے ہیں۔

میں نے ابھی تک اس مقالے میں والد کی شاعری کے بارے میں کچھ نہیں لکھا۔ اصل میں اس موضوع کو چھیڑنے کی ضرورت بھی نہیں لیکن اتنا لکھنا مضمون کے احاطے سے باہر بھی نہیں ہو گا کہ والد ابھی اسکول کے تیسرے درجے ہی میں تھے کہ ایک منظوم کتاب مجموعۂ قصص ان کے ہاتھ لگ گئی۔ اس میں چند قصے آسان نظم میں تھے۔ انہیں پڑھ کر خود بخود اسی بحر میں مصرعے موزوں ہونے لگے۔ بعد میں درسی کتابوں کی نظمیں پڑھ کر واقفیت بڑھنے لگی اور آٹھویں درجے تک پہنچتے پہنچتے ایسی نظمیں کہنے لگے جو ہم درس طلباء اور ماسٹر صاحبان کے لئے دلچسپی اور حیرت کا باعث ہوتی تھیں۔ ۱۹۰۱ء (ساتویں جماعت) میں آنجہانی ملکہ وکٹوریہ کا نوحہ لکھا جس میں ایک شعر یہ بھی تھا:

فرطِ غم سے غنچے چپ ہیں گل گریباں چاک ہیں
نوجوانانِ چمن بھی سر پہ ڈالے خاک ہیں

اس شعر پر ڈویژنل انسپکٹر آف اسکولز نے جو ایک دہلوی بزرگ تھے بہت داد دی۔ اس سے پہلے ایک مثنوی بارش پر کہی تھی جس کا ایک شعر میرے علم میں ہے:

الٰہی اتنی باراں بانی ہوئی کہ ساری زمیں پانی پانی ہوئی

اگرچہ اس دور کی شاعری کچی تھی اور اردو مادری زبان نہ ہونے کے باعث زبان کے نقائص سے خالی نہ تھی لیکن وزن کی صحت ہر نظم میں برابر قائم رہتی تھی۔

ہائی اسکول میں پہنچ کر شعر گوئی میں زیادہ انہماک ہو گیا اور دسویں جماعت تک پہنچتے پہنچتے ایسی نظمیں بھی کہہ گئیں جو "زمانہ" کانپور اور "مخزن" لاہور ایسے رسالوں میں شائع ہونے لگیں۔ چنانچہ "بڑھاپا کی زاری" اور "سندھ کو پیغام" "معبودہ" "مخزن" اسی زمانے کی یادگار ہیں۔ منشی دیا نرائن نگم ایڈیٹر "زمانہ" کانپور سے اسی زمانے میں خط و کتابت شروع ہو گئی تھی اور انہوں نے تعریفی جملوں سے ہر نظم پر ان کا دل بڑھایا۔ شاعری میں آپ نے کسی سے اصلاح نہیں لی اور نہ ہی عروض کا باقاعدہ مطالعہ کیا ہے۔ فنِ عروض کے متعلق شروع ہی سے آپ کے دل میں یہ خیال بیٹھ گیا کہ جب تک کوئی قابل استاد نہ ملے

حاصل کرنا مشکل ہے۔ لہٰذا یہ کہہ کر اس سے ہمیشہ کے لئے دامن چھڑا لیا ؎

محرومؔ! ہم کو عشق نے شاعر بنا دیا — بے ساختہ زباں سے نکلتی ہے دل کی بات
کرتے رہیں گے مولوی صاحب تمام عمر — مفعول فاعلات، مفاعیل فاعلات

اس قطعے کے بارے میں اب ان کی رائے یہ ہے کہ یہ میری پہلی انکاری تھی ورنہ عروض سے واقفیت کی اہمیت سے کسے انکار ہے۔
عروض کے بارے میں ان کی ایک بار علامہ اقبالؔ سے بھی گفتگو ہوئی تھی۔ اس سلسلے میں علامہ کی رائے کا انہوں نے مجھ سے اکثر ذکر کیا ہے۔ علامہ اقبالؔ نے ان سے کہا تھا کہ میں نے تو عروض سبقاً سبقاً پڑھا ہے، ویسے شاعری کے لئے عروض جاننے کی ضرورت نہیں ہاں استادی شاگردی کے سلسلے کے لئے عروض کا جاننا ضروری ہے۔

والد استادی شاگردی کے سلسلے سے بالکل بے نیاز رہے ہیں۔ شعر میں ان کا کوئی استاد ہے نہ انہوں نے کسی کو اپنا شاگرد بنایا ہے کبھی کسی نے مشورہ مانگا تو مخلصانہ مشورہ دے دیا۔ انہیں ہندوستان و پاکستان کے گوشے گوشے سے اس مضمون کے خطوط اکثر ملتے رہتے ہیں کہ میں آپ کا شاگرد بننا چاہتا ہوں۔ آپ جواب میں یہی لکھتے ہیں کہ مطالعہ اور مشق جاری رکھئے، جوہر ہوگا تو چمک اٹھے گا۔ اصلاح لینے سے کچھ نہ ہوگا۔ اس قسم کے خطوط لکھنے والوں کو بعض کتابوں کے نام مطالعہ کے لئے تجویز کرتے رہتے ہیں جن میں "بانگِ درا"، "جامِ سرور"، "کلیاتِ داغ" اور "کلیاتِ امیر مینائی" کے نام ضرور شامل ہوتے ہیں۔ ان کی رائے ہے کہ اوّل الذکر دو کتابیں خیالات میں تنوع اور بلندی پیدا کرنے کے لئے اور آخر الذکر صفائی زبان کے لئے بہت مفید ہیں۔ اپنی شاعری کے بارے میں اکثر انہوں نے مجھ سے یہ کہا ہے کہ میں نے شاعری کو نہ تو بطور فن حاصل کیا اور نہ اس پر فنی نظر سے توجہ کی۔ ایک رباعی میں کہتے ہیں ؎

شاعر ہوں شاعری میں استاد نہیں — گو نقدِ سخن ہے پاس نقاد نہیں
ہے شعر و سخن کا کب سے سودا مجھ کو — مدت اتنی ہوئی کہ کچھ یاد نہیں

میں نے والد کو شعر کہتے اکثر دیکھا ہے۔ جب طبیعت مجبور کرتی ہے یا کوئی تاریخی تحریک رونما ہوتی ہے تو آپ کاغذ پنسل لے کر بیٹھ جاتے ہیں۔ ایک بار آپ جو کچھ لکھ لیتے ہیں وہ اس کی قطعی صورت ہوتی ہے۔ میں نے انہیں کلام پر نظرِ ثانی کرتے نہیں دیکھا۔ گھر میں بچوں کا شور ہو یا غل غپاڑہ ہو آپ کی شعر گوئی کے راستے میں کبھی حائل نہیں ہوا۔ ہاں کوئی فرمائشی نظم کہنا ہو تو اس کے لئے کچھ نہ کچھ "اہتمام" ضروری ہو جاتا ہے۔ اکثر آپ کاغذ پنسل لے کر گھر سے دور شہر کے باہر چلے جاتے ہیں اور وہیں سے فرمائشی نظم ختم کر کے لاتے ہیں۔ اب تو فرمائشی نظمیں کہنے کی انہیں ضرورت نہیں رہی لیکن جب کلورکوٹ اور راولپنڈی میں ہیڈ ماسٹر تھے تو ڈسٹرکٹ انسپکٹروں اور ڈپٹی کمشنروں کی فرمائشوں پر اکثر اس قسم کی نظمیں کہنا پڑتی تھیں۔ بعض دفعہ تو آپ اس قسم کی نظمیں قلم برداشتہ "لکھ" دیتے تھے۔ اس کی نقل افسر موصوف کو بھیجی اور اصل کہیں پھینک دی۔ میں ان نظموں کی نقلیں کبھی کبھار محفوظ کر لیا کرتا تھا اس وقت ان نظموں کی جانب رجوع کرنا مناسب نہیں کیونکہ یہ مقالہ یادداشت کے سہارے لکھا جا رہا ہے اور کتابوں، بیاضوں یا کاغذات سے اشعار نقل کرنے سے اس کی نوعیت بدل جائے گی۔ کلورکوٹ ہی کے زمانے کی بات ہے۔ ایک دفعہ دریائے سندھ کے سیلاب نے ضلع میانوالی کے کچا و ملاحی (دریا کے دیہات) کو برباد کر دیا۔ ملک نواب مہدی خان ضلع کے ڈپٹی کمشنر تھے۔ ایس۔ ڈی۔ او کوئی رستم کیانی صاحب تھے۔ طوفان زدہ لوگوں کی امداد کا کام ان افسروں کے ہاتھ میں تھا۔ ملک فیروز خان نون وزیرِ تعلیم تھے۔ وہ امداد کے انتظام کا معائنہ کرنے اور تباہ شدہ لوگوں کی ڈھارس بندھانے آئے تھے۔ ڈسٹرکٹ انسپکٹر آف سکولز نے والد کو نظم کہنے کی "فرمائش" کی۔ آپ نے فی البدیہہ نظم کہی چند اشعار سنئے ؎

خستہ جاناں را اماں آید ہمی — مرہمِ زخمِ نہاں آید ہمی
مژدہ بادا اے دل! کہ در دہانِ جہاد — بعد ایامِ خزاں آید ہمی

در بہارش چوں گلستاں گشتیم باز یادِ عہدِ آشیاں آید ہمی
از سرِ ما شورشِ طوفاں گزشت مژدۂ سکوں در دیرِ زماں آید ہمی
ساحلِ امیدِ ما نزدیک شد در نظر از وے نشاں آید ہمی
از پئے امدادِ طوفانِ دیدگاں کشتیٔ امن و اماں آید ہمی
کارِ عیسٰی چوں زماں مہدی کند از حوادث کے زیاں آید ہمی
ما تہی از نسیم اندر دشتِ بلا رستم ما از کیاں آید ہمی

از ستمہائے فلک مارا چہ غم
چوں ملک فیروز خاں آید ہمی

ملک فیروز خان نون کے نام کا ایک سجع بھی لکھا تھا ؎

مئے فیروزیش در جام کردند
ازاں فیروز خانش نام کردند

شاعرانہ صلاحیتوں کا یہ امر مجبوری کتنا افسوسناک استعمال ہوتا رہا۔

فی البدیہہ شاعری کا ذکر آ گیا ہے تو دو ایک واقعات اور بھی سن لیجئے۔ اس فن میں آپ کو واقعی ایک کمال حاصل ہے۔ ابو الاثر حفیظ جالندھری سے آپ کے دوستانہ مراسم ایک زمانے سے ہیں۔ آپ جب کبھی لاہور آتے حفیظ صاحب سے ضرور ملتے تھے۔ حفیظ صاحب بھی جب کبھی راولپنڈی گئے اپنی مشاعرانہ مصروفیات کے باوجود والد سے ملنے ہمارے گھر ضرور آئے۔ ایک دفعہ والد لاہور آئے تو انہیں معلوم ہوا کہ حفیظ صاحب نے انارکلی میں بالائی منزل پہ دفتر لے لیا ہے۔ آپ وہاں پہنچے تو حفیظ صاحب دفتر میں موجود نہیں تھے۔ آپ نے ایک کاغذ کے پرزے پر یہ شعر لکھے اور وہ پرزہ ان کی میز پر چھوڑ کر آ گئے ؎

دفتر جو بالاخانے پہ دیکھا حفیظ کا محروم ہائے تو یہ ہے کہ دل شاد ہو گیا
رونق ہوئی انارکلی کی چار چند بازار سوز و ساز سے آباد ہو گیا
جن منزلوں پہ حسن کبھی جلوہ ریز تھا اب عشق ان میں مائلِ فریاد ہو گیا

۱۹۳۵ء کا ذکر ہے۔ راولپنڈی میں انجمن اسلامیہ کا سالانہ اجلاس ہو رہا تھا۔ والد بھی شریکِ بزم تھے۔ حفیظ اپنی نظم پڑھ چکے تو والد نے کہا

حفیظِ خوش نوا! بزمِ سخن میں قیامت تک رہے گی یاد تیری
نشاط انگیز تیرے نغمات رنگیں غم افزا ہے بیانِ فریاد تیری
کیا پابند نے نالے کو تو نے
یہ طرزِ خاص ہے ایجاد تیری

اسی جلسے میں حفیظ صاحب نے منتظمین کی فرمائش پر چندے کی اپیل کی اور اپنی نظم "مسدسِ حال" پڑھی جس کے اس وقت کہیں کہیں سے مصرعے مجھے یاد ہیں ؎

مرے شیخ ہیں شیخ سر عبدالقادر ہما ان کی جانب سے فرماں بہ صادر
نہیں چاہتے ہم سخن کے نوادر ۰ ۰ ۰ ۰ ۰ ۰ ۰ ۰ ۰ ۰ ۰ ۰ ۰ ۰ ۰ ۰

ہے مطلوب ہم کو نہ گریہ نہ خندہ
سنا نظم ایسی ملے جس سے چندہ

مسدس بہت طویل تھا اور پھر بزبانِ حفیظ۔ حاضرین پر بہت اثر ہوا۔ چندہ بھی خاصا جمع ہوا اور وعدے تو ہزاروں تک پہنچ گئے جب چندہ بازی کی افراتفری ختم ہوئی تو والد نے صدرِ بزم قبلہ شیخ سر عبدالقادر سے جو ان کے قریب تشریف فرما تھے مخاطب ہو کر کہا ؎

حفیظ کہتے تھے احباب جس کو بندہ نواز
بنا ہے گردشِ دوراں سے اب وہ چندہ نواز

شیخ صاحب بہت محظوظ ہوئے اور یہ شعر حفیظ صاحب کو سنایا۔ حفیظ اپنے مخصوص انداز سے مسکرائے اور قبلہ شیخ صاحب نے اسی چندے کے موضوع پر اکبر الٰہ آبادی کے متعدد اشعار سنا دیئے۔

اجلاس تھوڑی دیر کے لئے برخاست ہوا۔ غالباً نماز کے لئے۔ حفیظ صاحب نے اعلان کر دیا کہ حضرات! جناب محروم دوسری نشست میں بھی اپنا کلام سنائیں گے۔ والد کے پاس دوسری نشست کے لئے کوئی نظم نہ تھی۔ وقت بھی بہت کم تھا لیکن چونکہ اعلان ہو چکا تھا انہوں نے کاغذ پنسل لے کر نظم کہنا شروع کر دی اور جب چند لمحوں کے بعد ان سے کلام سنانے کے لئے کہا گیا تو یہ اشعار ان کی زبان پر تھے ؎

اے ملتِ اسلام! ترے ذوقِ سخن سے — فردوسِ نظر عالمِ معنی کا ہے گلزار
ہر سرو یہاں مصرعۂ برجستہ ہے گویا — اشجار سے پیدا ہے ترے عالمِ اشعار
مستانہ کسی کنج میں عاشق ہیں نوا سنج — عارف ہیں کہیں نغمہ سرا بادلِ ہشیار
ہیں تلہ عی اک سمت خراماں ذہنوں کو — دامانِ ترنم میں لئے گوہرِ افکار
جھلکی نظر آتی ہے یہاں حسنِ ازل کی — کتنا متجلّا ہوا آئینۂ گفتار
اعجاز سے کچھ کم نہیں یہ نطق کا جادو — بے پردہ ہوئے جاتے ہیں ہر موج کے اسرار
تبریزی و رومی کی نواؤں سے ہے پیہم — وہ حسن کی بارش کہ ہے جاں مطلعِ انوار
ہے روحِ بشر اس کے تجسس میں ازل سے — جس حسن کے ہیں پردہ کشا جامی و عطار

نغموں سے ہے لبریز ہوا تیرے چمن کی
کتنی ہے دل آویز فضا تیرے چمن کی

علامہ اقبال کا مرثیہ بھی انہوں نے اقبال کی موت کی خبر سنتے ہی فی البدیہہ کہا تھا۔ علامہ کے انتقال کی خبر ریڈیو پر آئی تھا انہوں نے اسی وقت مرحوم کے اعزاز میں اسکول بند کر دیا اور سیدھے گھر آ گئے۔ مجھے بتایا کہ اقبال اس دنیا میں نہیں ہیں۔ پھر کہنے لگے ایک دو شعر میں لکھواتا ہوں تم نوٹ کر لو۔ میں نے کاغذ پنسل ہاتھ میں لی۔ آپ حقے کے ہر کش پر ایک شعر لکھوا دیتے تھے۔ نوحے کا پہلا شعر یہ ہے ؎

ظاہر کی آنکھ سے جو نہاں ہو گیا تو کیا
احساس میں سما گیا دل میں اتر گیا

جب آپ یہ اشعار لکھوا چکے ؎

کچھ مرا نہیں تو جہاں کو چھوڑ کر — قدسی نژاد اوج سماوات پر گیا
کاشانۂ بقا میں مسافر پہنچ گیا — دیوانۂ فنا سے سلامت گزر گیا!

باغِ جہاں میں صورتِ گل خندہ زن رہا | باغِ جناں میں مثلِ نسیمِ سحر گیا
خاکِ چمن میں گوہرِ شبنم نہاں نہیں | خورشیدِ جلوہ بار سے پوچھو کدھر گیا
"ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق" | روشن تر اس حقیقتِ روشن کو کر گیا

تو میں نے کہا کہ اس نظم میں آپ "مر گیا" کا قافیہ تو استعمال نہیں کریں گے؟ کہنے لگے کیوں؟ میں خاموش ہو گیا۔ میرا خیال تھا کہ "مر گیا" کا قافیہ شعر کو بے جان کر دے گا۔ انھوں نے آخری شعر لکھوایا اور وہ شعر یہ ہے ؎

محروم! کیوں نہ ہو دلِ حرماں نصیب کو
یہ وہم ہو گیا ہے کہ اقبال مر گیا

مجھے فوراً احساس ہوا کہ میں نے رائے دینے میں کس قدر غلطی کی تھی۔

دوسرے دن اقبال کے انتقال پر ماتمی جلسے کا پروگرام طے ہوا۔ گارڈن کالج کے ہال میں جلسہ کرنے کا فیصلہ ہوا لیکن عین وقت پر کالج کو کوئی ایسی ضرورت پیش آگئی کہ وہ ہال ہم لوگوں کو نہ مل سکا۔ سارا انتظام مکمل تھا اسے ملتوی کرنا اب ہمارے بس میں نہ تھا چنانچہ طے پایا کہ کالج کے قریب میونسپل باغ میں جلسہ منعقد کیا جائے۔ تمام مدعوئین کالج ہال سے ہو کر باغ میں پہنچ رہے تھے۔ والد بھی کالج سے ہو کر باغ میں آئے اور اپنی نظم سے پہلے مقامِ جلسہ کی تبدیلی پر یہ شعر پڑھا ؎

بلبلِ گلزارِ معنی بود آں رنگیں سخن
ماتمِ اقبال باید کرد در صحنِ چمن

وقار انبالوی کے ساتھ بھی ان کے مراسم بے تکلفی کی حد تک دوستانہ ہیں۔ وقار صاحب پہلے روزنامہ "پرتاب" میں کام کرتے تھے، وہاں سے "احسان" میں آگئے۔ والد کی ان سے لاہور میں ملاقات ہوئی تو کہنے لگے ؎

جس دن سے اُدھر سے تو اِدھر آیا ہے | چشمِ بینا کو کم نظر آیا ہے
"احسان" پہ بھی احسان تھا منظور لیکن | "پرتاب" کو بے وقار کر آیا ہے

یہ دوسری جنگِ عظیم کا زمانہ تھا۔ وقار صاحب نے یونہی باتوں میں ان سے کہا اس جنگ کا انجام کیا نظر آ رہا ہے۔ والد ایک آدھ منٹ تک خاموش رہے پھر بولے ؎

ہو لاکھ مئے خودی سے ہٹلر سرمست | ہو جائیں گے اس کے حوصلے آخر پست
جب گھر میں خوراک ختم ہو جائے گی | کیا کھائے گا وہ اگر نہ کھائے گا شکست

ایک اخبار کا ایڈیٹر اور پھر شاعر ایڈیٹر ایسی چیزیں کہاں چھوڑتا ہے۔ وقار نے فوراً یہ رباعی لکھ لی اور اگلے دن اپنے ایک تمہیدی نوٹ کے ساتھ اخبار میں شائع کر دی۔

اسی سفرِ لاہور کا ذکر ہے۔ وقار اور والد اکٹھے جا رہے تھے۔ دیواروں پر جا بجا سینما کے پوسٹر نظر آئے۔ ان پر وہی عام تصویریں تھیں، نیم عریاں۔ وقار نے تصویروں کی جانب اشارہ کیا اور کہا ملاحظہ فرمایا آپ نے؟ والد نے جواب میں کہا ؎

لبِ عشرت پہ تبسم نظر آتا ہے مگر | آنکھ اخلاق کی روتی ہے بڑے شہروں میں
خلوتِ خاص میں جس بات سے آتی ہے حیا | منظرِ عام پہ ہوتی ہے بڑے شہروں میں

سینما دیکھنے سے آپ نے ہمیشہ احتراز کیا ہے۔ میرا خیال ہے زندگی بھر میں آپ نے دو چار تصویریں ہی دیکھی ہوں گی۔ اس کے علاوہ بھی

جہاں تک اخلاقیات کے عام اصولوں کا تعلق ہے آپ صرف اسکول کے ہیڈ ماسٹر ہی نہیں رہے ہیں بلکہ بقول مولانا عبدالمجید سالک "ہندوؤں اور مسلمانوں کی ایک پوری نسل کے معلم اخلاق رہے ہیں۔" ان کی روزمرہ کی زندگی میں بھی مجھے ایک باقاعدگی اور ضابطہ نظر آیا ہے۔ میں نے جب سے ہوش سنبھالا ہے انہیں صبح کے ناشتے میں دودھ کے ایک گلاس کے سوا کچھ کھاتے پیتے نہیں دیکھا۔ ان کا یہ طریقہ آج تک جاری ہے۔ گھر پر تو اس معمول میں تبدیلی پیدا ہونے کا سوال ہی نہیں، سفر میں ہم لوگ بھی کوشش یہی رہتی ہے کہ اس میں بے قاعدگی نہ ہو۔ چائے یا لسی سے انہیں کوئی رغبت نہیں۔ لسی کو تو جو ہم اہلِ پنجاب کی "قومی" غذا ہے بالکل استعمال نہیں کرتے۔ چائے کے لئے روز ایک کا ہونا شرط ہے۔ دودھ کے بعد پھلوں کا نمبر آتا ہے اور پھل کے بارے میں اس قدر "احتیاط" سے کام لیتے ہیں کہ پھل بالکل بے ذائقہ ہو کر رہ جاتا ہے۔ ان کے نزدیک پھلوں کا چھلکا بہت مضر چیز ہے۔ اس سے پرہیز لازمی ہے چنانچہ اس اصول کے تحت وہ انگور تک کا چھلکا اتار لیتے ہیں گھر کے باقی لوگوں کا انگور کھانے کا یہ طریقہ بالکل پسند نہیں۔ اکثر اس امر کی کوشش بھی کی گئی کہ جہاں تک انگور کا تعلق ہے اسے چھیلنا ترک کر دیں لیکن وہ اپنی وضع پر قائم ہیں۔

صحت کے پیشِ نظر وہ ٹماٹر بھی اکثر استعمال کرتے ہیں اور اس کا بھی چھلکا اتار دیتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ چھلکا اتار لینے کے بعد ٹماٹر میں کیا باقی رہ جاتا ہوگا۔ شاید انہی باقاعدگیوں کا اثر ہے کہ صحت ان کی اس وقت تک اچھی ہے لیکن بعض عارضے ایک زمانے سے ان کے ساتھ ہیں۔ لڑکپن میں جب تیراکی کا شوق تھا تو دریائے سندھ میں ایک بار گہری چھلانگ لگائی۔ شوق تو پورا ہو گیا لیکن "ہرنیا" مستقل طور پر زندگی کا رفیق بن گیا۔ یہ اور اس کے ساتھ عرق النساء دونوں کبھی کبھی بڑی تکلیف اور پریشانی کا باعث بن جاتے ہیں۔ غالباً یہی سبب ہے کہ دوائیں آپ کی ہر لحظہ کی ساتھی ہیں۔ باہر کہیں سفر پر جاتے ہیں تو دس بارہ دوائیں اپنے ساتھ لے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ نمک، مرچ اور چینی وغیرہ شیشیوں میں بند کر کے الگ ساتھ رکھتے ہیں مشاعرے میں کہیں جاتے ہیں تو تمام شعراء کے لئے ان کی دواؤں کی یہ پیٹی حیرت کا باعث ہوتی ہے۔ دوائیں ساتھ لے کر ان کی سفر کی عادت شعراء میں بہت شہرت پا چکی ہے۔ ایک دفعہ لائل پور میں مشاعرہ تھا۔ قتیل شفائی والد سے ملنے آئے۔ جہاں شعراء کا قیام تھا وہاں دو چار کمروں میں وہ گئے۔ والد موجود نہیں تھے ایک کمرے میں میز پر مختلف دواؤں کی دس پندرہ شیشیاں رکھی تھیں۔ وہ ان کے انتظار میں وہیں بیٹھ گئے۔ ان کا اندازہ صحیح نکلا۔ وہی کمرہ والد کا تھا۔

اتفاق کی بات ہے اسی مشاعرے میں ایک شاعر صاحب سامعین کا ہجوم دیکھ کر بیہوش ہو گئے۔ رات کے ڈیڑھ بجے کا وقت تھا ہم لوگ ان کو بڑی مشکل سے قیام گاہ تک لے آئے۔ والد کے پاس "امرت دھارا" موجود تھی۔ اس وقت وہ کام آئی اور شاعر صاحب اگلی صبح اچھے بھلے ہو کر رات کے مشاعرے پر تبصرہ فرما رہے تھے۔

چونکہ والد نے بہت کم عمر میں شعر کہنا شروع کر دیا تھا اور ایک نسل ان کا کلام پڑھتی چلی آ رہی ہے اس لئے ان کی عمر کے بارے میں اکثر غلط اندازے ہوتے ہیں۔ ایک بار جوش ملیح آبادی لاہور تشریف لائے۔ والد ان سے ملنے گئے، انہوں نے والد کو دیکھ کر بڑی حیرت کا اظہار کیا اور کہنے لگے کہ میں بچپن سے آپ کا کلام پڑھ رہا ہوں اور میرا خیال تھا کہ اب آپ بمشکل لاٹھی کے سہارے سے چلتے ہوں گے۔ آپ کی عمر کے بارے میں میرا اندازہ حیرت انگیز طور پر غلط تھا۔ اس واقعہ کو اٹھارہ برس ہو چکے ہیں اور آج بھی جب کہ ان کی عمر تقریباً ستر برس کی ہے آپ عصائے پیری کا سہارا لئے بغیر باقاعدہ کالج جاتے ہیں اور اب اس چھڑی کی ضرورت بھی محسوس نہیں کرتے جو چند برس پہلے ان کے ہاتھ میں موجود رہتی تھی۔

عبدالرزاق ملیح آبادی

شاہد خان

خاندان، پٹھان ۔ وطن، ملیح آباد ۔ تاریخ پیدائش معلوم نہیں ۔ خود کو مولانا آزاد سے زیادہ پرانا کہتے ہیں! عمر کبھی چھیاسی برس کی کبھی ننانوے برس کی بتاتے ہیں ۔ لیکن یہ بات یقینی ہے کہ جوش ملیح آبادی سے، جو ان کی والدہ کے سگے چچیرے بھائی ہیں، کہیں چھوٹے ہیں ۔

قد، چھوٹا ہے ۔ بدن گٹھا ہوا ہے ۔ کینڈا کچھ اس وضع کا ہے کہ بونا کوئی نہیں کہہ سکتا ۔ رنگ صاف ہے ۔ سر بڑا ہے ۔ کلا بھی چوڑا چکلا ہے ۔ لوگ بدصورت نہیں کہتے ۔

مزاج کس قسم کا ہے؟ خدا کے سوا کوئی نہیں جانتا ۔ کچھ معمہ سا ہے ۔ شاید چوں چوں کا مربہ ہے ۔ بالکل ٹھنڈے، جیسے برف کی سل بالکل گرم، جیسے آتش فشاں کی چٹان ۔ بہت ہی ہنس مکھ، بہت ہی خشک ۔ ہنسنے پائیں، تو خود بھی کھلکھلائیں اور روتوں کو بھی ہنسا دیں ۔ منہ بنالیں، تو خود بھی تیوریاں چڑھالیں اور ہنستوں کو بھی روانسا بنا دیں ۔

لیکن اکھڑ ضرور ہیں ۔ ۲۹ء کا واقعہ ہے کہ چوہے مارنے کے لئے سنکھیا لائے تھے اور وہ میز پر سامنے رکھی تھی ۔ دوستوں سے بحث چل پڑی کہ قوتِ ارادی مضبوط ہو تو آدمی سب کچھ کر سکتا ہے ۔ ایک دوست نے کہا "یہ لغو بات ہے، کوئی صاحب فرمائیں کہ میری قوتِ ارادی بڑی ہے اور سنکھیا کا یہ ڈلا کھالیں، تو نتیجہ کیا ہوگا؟ اینٹھ کر رہ جائیں گے اور قوتِ ارادہ کھڑی فاتحہ پڑھتی ہوگی!" اس پر انہوں نے وہ پورا ڈلا چبا کر اوپر سے پانی پی لیا ۔ اور کہنے لگے "ابھی ثبوت ملا جاتا ہے ۔ مجھے کچھ بھی نہ ہوگا!" یقیناً یہ پٹھانی جہالت تھی ۔ مرنے میں کسر ہی کیا رہ گئی تھی؟ مگر ایسے اجڈ لوگوں کا ساتھ شاید سخی قدرت بھی دے دیا کرتی ہے ۔ حضرت کا سر تو چند دن گھوما، مگر پہلے سے کہیں زیادہ تندرست ہو گئے ۔ سر کے بال کھچڑی تھے اور چہرے کا رنگ پیلا ۔ سنکھیا کے طفیل بال کالے بھونرا ہو گئے اور رنگ گہرا سرخ! خود کہا کرتے ہیں سنکھیا کھانے کے بعد ایسی توانائی پائی ہے کہ پہلے تصور بھی نہیں ہو سکتا تھا ۔ بس جی چاہتا ہے اڑتے پھرو!

اکھڑ پن کے سلسلے میں یہ واقعہ بھی لکھ دینا مناسب ہے کہ یا تو بیمار ہی نہیں ہوتے، اور ہوتے ہیں تو جان لیوا بیماری میں مبتلا ہوتے ہیں ۔

مصر میں ٹائیفائڈ کا شکار ہوئے۔ اور مصر میں ٹائیفائڈ ہندوستان میں پلیگ کی طرح ان کے زمانے میں مہلک ہوا کرتا تھا۔

مصر سے واپسی پر بیٹھے کے ایک مریض کی تیمارداری کر رہے تھے کہ اس نے قے کی اور ان کے منہ میں چلی گئی۔ اسی وقت خود بھی مبتلا ہو گئے پھر جب کلکتہ میں مولانا آزاد کے ساتھ تھے، تو دوبارہ ٹائیفائڈ میں مبتلا ہوئے اور جب اچھے ہوئے، تو خود اپنے ہاتھوں کالا آزار کے چنگل میں گرفتار ہو گئے، اور آٹھ مہینے بیماری سے کشتم کشتا کرتے رہے۔ ابھی ابھی ہماری آنکھوں کے سامنے کینسر کے رگڑے میں آ گئے۔ خوشی خوشی بمبئی علاج کرانے گئے، اور ہنستے کھیلتے لوٹ آئے!

ایسی ایسی مہلک بیماریوں میں پھنسے، مگر کبھی پرہیز کیا نہ ڈاکٹر کی کسی ہدایت پر عمل۔ کبھی کبھی کہا کرتے ہیں "اپنی فکر کرنا حماقت ہے، خدا کو غرض ہو گی، تو ہمیں دنیا میں رکھے گا، نہ غرض ہو گی تو اٹھا لے گا۔ ہم کب اپنی مرضی سے یہاں آئے تھے کہ زمین کو دانتوں سے دابے بیٹھے رہیں! پھر ہنس کر کہتے ہیں اللہ میاں اس کو جلدی مارتے ہیں جو موت سے ڈرتا ہے۔ موت سے نہ ڈرو گے، تو ملک الموت تم سے ڈرنے لگے گا!

ہمیشہ دیکھا گیا ہے کہ موٹا پہنتے ہیں۔ موٹا ہی کھانا چاہتے ہیں، اگرچہ کھا نہیں پاتے۔ بھدی چیزیں ہی استعمال کرنا پسند کرتے ہیں، مگر ساتھیوں کے لئے بھدی چیزیں گوارا نہیں کرتے۔ نفیس سے نفیس، نازک سے نازک چیزیں ان کے استعمال میں دیکھنا چاہتے ہیں۔

نہایت چست، چاق چوبند ہیں۔ چلتے ہیں تو بہت تیز چلتے ہیں، لیکن بڑے ہی سست بھی ہیں۔ بیٹھے ہیں تو ہفتوں بیٹھے ہیں۔ بیٹھ گئے، تو اٹھنے کا نام ہی نہیں۔

صناع ہونے کا بھی چشم بد دور دعویٰ ہے۔ بھوپال سے مولانا آزاد کی بہن، سانبھر کا چمڑا لائیں، تو حضرت نے بغیر فرمے کے ایک جوڑا جوتا بنانا شروع کر دیا۔ مولانا دیکھتے اور ہنستے۔ فرماتے "مولوی صاحب آپ بھی وقت کو قتل کرنا خوب جانتے ہیں۔" اور یہ حضرت مسکرا کر جواب دیتے "بن جائے گا، تو آپ ہی داد دیں گے۔" اور جوتا بن جانے کے بعد واقعی مولانا نے داد دی بھی۔

خیاطی کا بھی دعویٰ ہے۔ ایک دفعہ اپنی دو شیروانیاں خود ہی کاٹیں اور خود ہی سیں۔ اتفاق سے ایسی فٹ ہوئیں کہ ملیح آباد کا ہیڈ درزی جو تعلقہ داروں کی شیروانیاں سیا کرتا تھا، دیکھ کر کہنے لگا، ہم سے ایسی شیروانی نہیں سلے گی۔ یہ تو حیدرآباد کی سلی ہوئی ہے، اور جب اسے سلائی دکھائی گئی تو حیرت زدہ ہو کر کہنے لگا۔ "واقعی شیروانی تو آپ ہی نے سی ہے، کیونکہ ہاتھ کی یہ سلائی درزیانہ نہیں ہے!"

بال کاٹنے میں بھی خود کو استاد سمجھتے ہیں۔ مردوں ہی کے نہیں، لیڈیوں کے بھی۔ مردوں، عورتوں کے بال تراشنے کے سبھی فیشنوں پر نگاہ رہتی ہے۔ جیل میں مولانا آزاد صاحب کو قیدی نائی کے سامنے بیٹھنا گوارا نہ تھا۔ یہ صاحب بول اٹھے "میں آپ کی حجامت بنا دوں گا۔" پہلے تو مولانا حجامت کے محاورے پر ہنسے، پھر فرمایا "مولوی صاحب! آپ مجھے کہیں بھیڑ بنانا چاہتے ہیں؟ ـــــ کیا آپ نائی ہیں؟"

ـــــ بڑی منتوں، خوشامدوں کے بعد مولانا کی حجامت بنا دی گئی اور مولانا حیرت میں پڑ گئے!

کہا کرتے ہیں "بچپن میں، بڑا تیز اور ذہین تھا، لیکن لوگوں میں کا ہوا تو اوّل درجے کا گھامڑ سمجھا جانے لگا۔ حالانکہ ایسا تھا نہیں لوگوں کو بیوقوف بنانے کے لئے خود بیوقوف بن گیا تھا!"

سنہ ۱۹۱۳ء میں مصر کا سفر اختیار کیا۔ خاندان میں اب تک پہلے آدمی ہیں، جس نے حج کے علاوہ ہندوستان سے باہر سفر کیا۔ سفر مصر کے وقت انگریزی سامراج کے کٹر دشمن بن چکے تھے، اور اسی لئے سفر کیا تھا کہ لوٹ آئیں تو ملک میں انقلاب برپا کریں گے۔

مصر میں چار سال رہے۔ عربی پڑھی۔ مصر کیوں گئے؟ عربی کیوں پڑھی؟ خود بتایا کرتے ہیں، مسلمانوں کے اٹھنے سے پہلے ہندوستان میں انقلاب ممکن نہیں ہو سکتا تھا۔ اور مسلمانوں کو وہی اٹھا سکتا تھا، جو اسلام سے کما حقہٗ واقف ہو، اور دنیادار ملاؤں کی، جو مسلمانوں سے جونکوں کی طرح چمٹے ہوئے ہیں، پوری طرح قلعی کھول سکے۔

مصر کی زندگی ہوشناکیوں سے لبریز رہی ۔ اُسی زمانے میں قسطنطنیہ بھی گئے ۔ ترکی حکومت "جہانِ اسلام" کے نام سے تین زبانوں میں ایک اخبار نکالا کرتی تھی ۔ ترکی ، عربی ، اُردو ۔ یہ حضرت پہنچتے ہی اُردو حصّے کے ایڈیٹر بن گئے ۔ انور پاشا سے اور دوسرے مدبروں سے ملاقاتیں رہیں۔ قسطنطنیہ ہی میں تھے کہ پہلی جنگ عظیم شروع ہوگئی ۔ انہوں نے انور پاشا سے فوجی خدمتیں پیش کیں ، مگر موصوف نے ترکی فوج میں حصّہ لینا منظور نہ کیا۔ فرمانے لگے " کہ ہندو مسلم تنظیم حاصل کرو ۔ حکومت تمہارے مصارف کی ذمہ دار رہے گی ۔ پھر یہ مشکل بھی ہے کہ بین الاقوامی قوانین کی رُو سے ہم کسی غیر ملکی کو اپنی فوج میں نہیں لے سکتے ۔ جنگ کی حالت میں یہ پابندی باقی نہیں رہتی ۔ لیکن ابھی تک ہم جنگ میں شریک نہیں ہوئے ۔"

اِدھر سے مایوس ہو کر مصر واپس آئے اور پہنچتے ہی انگریزی مارشل لا کے چنگل میں پھنس گئے ۔ لمبی داستان ہے اور اس داستان کا یہ موقع نہیں ۔ قسطنطنیہ میں امیر شکیب ارسلان ، عبدالعزیز شاویش ، عبدالحمید زہراوی ، سیّد صالح تونسی ، ابو سعید الہندی ، العربی ، مرزا عبدالقیوم دہلوی ، عبدالجبار خیری اور عبدالستار خیری ، لالہ ہردیال جیسے انقلابیوں سے ملاقاتیں رہیں ۔

پہلی عالمگیر جنگ شباب پر تھی ۔ عرب صاحب اپنی کارروائیوں میں مصروف تھے ۔ ترکوں سے لڑانے والی ہندوستانی فوجوں کو انگریز پہلے مصر میں اُتارتے تھے ۔ قاہرہ کے مضافات میں ایک مقام "زیتون" ہے ۔ یہیں چھاؤنی ہوتی تھی ، اور یہ حضرت بھیس بدل بدل کے فوجوں میں پہنچ جاتے اور انقلابی پروپیگنڈا پھیلاتے ۔ اتفاق سے ایک روز ایسا ہوا کہ ایک فوج میں بیٹھے اپنا " انقلاب " چھانٹ رہے تھے کہ دفعتاً دوسری ہی فوج کی بھیڑ چیر کر نکل پڑے اور گلے مل کر زار زار رونے لگے ۔ اب جو یہ حضرت دیکھتے ہیں ، تو دونوں ملیح آباد کے ، اور اپنے خاندان کے ۔ ہاتھوں کے توتے (طوطے) اُڑ گئے ۔ مگر اب کرتے تو کیا کرتے !

اس خلافِ انقلابی مہم کا نتیجہ یہ نکلا کہ تین ہزار ہندوستانی فوجی ، جن میں مسلمان ، ہندو ، سکھ سبھی تھے " باغی " ہو گئے اور مصر میں فوجی ہنگامہ برپا کرنے کی اسکیم بھی اُنہوں نے پیش کر دی ، مگر اس مہم کے لئے بڑے بڑے ساز و سامان کی ضرورت تھی اور ساز و سامان یہاں مفقود تھا ۔ کچھ نہ ہو سکا ، لیکن یہ سچے انقلابی مجاہد ، اپنی قسم کے دُھنی نکلے ۔ انگریز انہیں ترکوں کے مقابلے پر نہر سویز لے گئے اور انہوں نے لڑنے سے انکار کر دیا ۔ انگریزوں نے سب کو مشین گنوں سے اُڑا دیا ۔ ملیح آبادی صاحب کہتے ہیں کہ آج تک اس حادثے پر خون کے آنسو رو رہا ہوں ۔ یہ بیش بہا خون میری گردن پر ہے !

متضاد طبیعت تو ہے ہی ۔ ندوۃ العلماء لکھنؤ میں عربی پڑھنے ہی کے لئے داخل ہوئے تھے ۔ مگر وہاں فٹ بال کھیلنے کے سوا کچھ نہ کیا ۔ یہاں تک کہ دن رات بھر اکیلے فٹ بال کھیلا کرتے ، زبردستی امتحان پاس کرتے چلے گئے ۔ لیکن درجۂ چہارم میں سب کتابیں صرف عربی میں تھیں ۔ اور یہ حضرت عربی کی پہلی گرامر کے بھی حافظ نہ تھے ۔ مجبوراً مصر بھاگے ، اور وہاں ذہن ایسا کھلا کہ ۹ مہینے کے اندر ہی درسگاہ میں سب سے بازی لے گئے ۔ اِن کے دو ہم سبق بہت مشہور ہوئے ، مفتی امین الحسینی (فلسطین) اور شیخ یوسف یاسین ، جو اِس وقت سعودی حکومت کے ایک بڑے رُکن ہیں ۔

یا تو چار برس ایک عربی لفظ نہ پڑھا تھا اور یا پھر نو مہینے میں عربی کے ، عالم ، ادیب ، انشاء پرداز اور مقرّر بن گئے ۔ علامہ رشید رضا مرحوم نے جو استاد تھے ، اپنے اِس شاگرد سے ایسا رشتہ جوڑا جو باپ بیٹے کے رشتے سے بھی سوا تھا ۔ اُستاد کا آخری خط شاگرد کو استاد کی وفات کے دسویں دن ملا ۔

مصر میں چار سال پڑھنے اور ہنگامہ آرائی کرنے کے بعد حجاز گئے ۔ شریف مکہ حسین بن علی نے ترکوں سے بغاوت کی تھی ، اور مصر کے حاجی اب مکے جا سکتے تھے ۔ یہ حضرت بھی حج کے لئے تیار ہو گئے ۔ سفر کی اصل غرض یہ تھی کہ شریف حسین کی بغاوت کے راز معلوم کریں اور حجاز سے چپکے سے ہندوستان بھاگ آئیں ، مگر جدہ میں شریف کی پولیس نے گرفتار کر لیا ۔ لمبی کہانی ہے ، بڑی مشکل سے جان بچی اور ہندوستان

واپس آ گئے۔

سب حالات کیسے لکھے جائیں؛ مختصر یہ کہ بچپن سے انگریزی سامراج کو برباد کرنے کی قسم کھائے بیٹھے تھے اور پوری زندگی اسی خبط میں گزار دی۔ پہلے لکھنؤ میں مولانا عبدالباری مرحوم فرنگی محل کے ساتھ ایک خفیہ انجمن بنائی اور ہتھیار جمع کرنا شروع کر دیئے، مولانا حسرت موہانی مرحوم بھی اِس انجمن کے ایک ممبر تھے، اور پڑھنے والے یہ سن کر حیرت زدہ رہ جائیں گے کہ مولوی منظہر الدین شیرکوٹی ایڈیٹر (الامان) دہلی بھی شروع شروع اس انجمن کے سرگرم رکن تھے۔ بعد میں انگریزوں سے مل گئے، مگر خدا مرحوم کو جزائے خیر دے کہ آخری وقت تک انجمن کا راز فاش نہیں کیا، ورنہ بہت سی لاشیں پھانسی کے تختوں پر لٹکتی نظر آتیں۔

پھر مولانا ابوالکلام صاحب آزاد کے ساتھ ہو گئے اور جم کر دس سال اُن کے پاس رہے۔ اِن کے اخباروں، پیغام، پیام، الجامعہ (عربی) اور الہلال کو ایڈٹ کرتے رہے۔ کلکتہ ہی میں دو سال جیل کو بھی آباد کیا۔ "اصحاب سجن" میں مولانا آزاد کے علاوہ یہی آرداس اور سبھاش چندر بوس بھی تھے۔

مولانا آزاد نے پچاس روپیہ ماہوار جیب خرچ دینا تجویز کیا تھا، مگر بیچ میں تین سال ایسے بھی گزرے کہ خود مولانا کا ہاتھ بالکل خالی تھا۔ اس دوران میں شیخ الاسلام ابنِ تیمیہ اور اُن کے شاگرد رشید، ابنِ قیم کی کئی کتابیں ترجمہ کر ڈالیں جو (الہلال بک ایجنسی (لاہور) کے ہاتھ بیچ کر بال بچوں کا پیٹ پالتے رہے۔

جب مولانا کے ہاں کام نہ رہا تو اُن کی اجازت سے الگ ہو گئے، مگر کلکتہ ہی میں رہے۔ اب ایک پیسہ کا بھی کہیں سے سہارا نہ تھا۔ دفعتاً طے کر لیا کہ مصری اخباروں کی نامہ نگاری کریں گے۔ اور مصر کے سب سے بڑے تین اخباروں: المقطم، الاہرام، اور السیاسۃ کے نامہ نگار بن گئے۔ اتوار کے دن آٹھ بجے سے گیارہ بجے تک کام کرتے، تینوں اخباروں کے مضمون تیار ہو جاتے، جس سے کئی سو روپیہ ماہانہ کی آمدنی ہونے لگی۔

پھر خود اپنا اخبار ڈبل کراؤن کے آٹھ صفحوں پر کلکتہ ہی سے نکالا۔ ہند نام رکھا۔ اُس وقت کلکتہ میں دو روزانہ نکلتے تھے: عصرِ جدید اور جمہور۔ جمہور میں چراغ حسن حسرت مرحوم کام کرتے تھے۔ یہ دونوں اخبار شام کو نکلا کرتے جو ایک ورق کے ہوتے، خبریں انگریزی اخباروں سے ترجمہ کر لی جاتیں۔ ہند بالکل اَپ ٹو ڈیٹ نکلا۔ کمپنی سے خریدی ہوئی تازہ ترین خبریں، ایڈیٹوریل، اور وہ سب کچھ جو کسی مہذب اخبار میں ہونا چاہیے۔ مگر لطف یہ کہ بغیر کسی سرمایہ کے نکالا۔ خوش قسمتی سے کاتب بھی وطن پر دل گئے، اور پریس والا بنگالی بابو بھی نہ جانے کیوں معتقد تھا۔ کسی کارکن کی کوئی تنخواہ نہیں تھی۔ رات کو چنے بھگو دیئے جاتے اور دن بھر اخبار کا پورا عملہ، اپنے نشان پر کھڑا یہی دانہ کھایا کرتا۔ اور خود "سپہ سالاری" فرماتے تھے۔ مزے لے لے کر چنے چباتے ․․ ․․ ․․ اور چنے کے فضائل و محاسن پر آسمان زمین کے قلابے ملایا کرتے!

غرضیکہ اخبار چلا، خوب چلا۔ کاتب تک اپنے کچے گھروں کو پکا کر کے مطمئن ہو گئے۔ اُن کی اور اُن کے بھائیوں کی شادیاں بھی اخبار ہی کی آمدنی سے ہو گئیں۔ مگر خود جیسے بے سروسامان تھے۔ ویسے ہی رہے اور اب خود ہی بتایا کہ "جو کچا جھونپڑا سر چھپانے کو تھا، وہ بھی پچھلے سال کی برسات میں سر بسجود ہو گیا! اور اِس پر بہت خوش ہیں کہ اب ساری دنیا ہمارا گھر بن چکی ہے!

خیر سے "دوستوں" کے رسیا بھی ہیں۔ ایک دوست مل گئے بیس۲۰ بائیس۲۲ برس دوستی کے حقوق ادا فرماتے رہے۔ حضرت کو سولہ آنہ بھروسہ ہو گیا۔ اخبار کو کمپنی بنا چکے تھے اور "دوست" کو کمپنی کا ڈائرکٹر۔ پھر لندن تشریف لے گئے، اور "دوست" کی عنایت سے اخبار ہی سے بے دخل ہو گئے!

اب پھر وہی ڈھاک کے تین پات ہاتھ میں تھے، لیکن شکست ماننے والے بھی نہ تھے، فوراً "ہفتہ وار" اجالا" جاری کر دیا، اور پہلے ہی نمبر سے اشاعت چار ہزار کے اوپر تھی۔ کسی نہ کسی طرح پریس بھی قائم کر لیا، اور "آزاد ہند" کے نام سے روزانہ بھی جاری کر دیا۔ یہ دونوں اخبار بڑی کامیابی سے چل رہے ہیں، اور ان کے ہونہار لڑکے، مسٹر احمد سعید انہیں سنبھالے ہوئے ہیں۔

پھر ۱۹۴۹ء کے اواخر میں مولانا ابو الکلام صاحب آزاد کے ایما پر دہلی چلے آئے۔ اب ہندوستان کی ثقافتی کونسل کے سہ ماہی علمی رسالے "ثقافت الہند" کو بھی ایڈٹ کر رہے ہیں اور آل انڈیا ریڈیو کے عربی شعبہ کے سپروائزر بھی ہیں۔

علمی مشاغل پر میں نے کچھ نہیں لکھا۔ ملک بھر ان مشاغل سے واقف ہے۔ بہت سی تالیفیں اور ترجمے نکل چکے ہیں۔ بہت سے مسودے طباعت کا انتظار کر رہے ہیں۔ قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ مولانا آزاد کے ساتھ اتنا لمبا علمی ادبی ساتھ رہا، مگر مولانا کا اسلوبِ نگارش قبول نہ کیا۔ خود کہا کرتے ہیں: "مولانا کا اسلوب، مولانا ہی کے ساتھ خاص ہے۔ اس کی نقل اتارنا، اپنی فضیحت کرنا ہے۔"

خود اپنا ایک اسلوب پیدا کر لیا ہے۔ یہ اسلوب عجیب دلفریب ہے۔ نہایت آسان، عام فہم، اور دل نشین ہونے کے ساتھ ساتھ ادبی محاسن سے بھرا پڑا ہے۔ مضمون تو مضمون ان کی کتابیں کی کتابیں پڑھ جائیے، نہ اُلجھے ہوئے جملے ملیں گے، نہ بوجھل عربی فارسی لفظ۔ سیدھی سادھی ہموار تحریر ملے گی۔ کہیں آپ کو رکنا نہ پڑے گا۔ مطالب بے تکلف ذہن میں بیٹھتے چلے جائیں گے۔ خود کہا کرتے ہیں "میری اخبار نویسی کے کامیاب رہنے کا سب سے بڑا سبب یہی ہے کہ اتنا آسان لکھتا ہوں کہ عورتیں اور بچے تک سمجھ جاتے ہیں۔" تحریر میں ہلکی سی ظرافت اور چھپی ہوئی چٹکیاں ہوتی ہیں۔ یہی سبب ہے کہ پڑھنے والا اکتاتا نہیں بلکہ چٹخارے لیتا ہوا پڑھتا چلا جاتا ہے۔

ڈاکٹر سیّد عابد حسین

ضیاء الحسن فاروقی

حکایت از قدِ آں یارِ دلنواز کنیم   بہ ایں فسانہ مگر عمرِ خود دراز کنیم

سنہ ۱۹۴۴ء میں جب میٹرک کے امتحان کی تیاری کر رہا تھا تو میرے زیرِ مطالعہ ایک کتاب تھی 'پردۂ غفلت' بیداریٔ شعور کی اس منزل میں مجھے کتاب کے مصنف سے کوئی سروکار نہ تھا۔ بس 'پردۂ غفلت' کے پلاٹ اور کرداروں سے اُلجھا ہوا تھا۔ مصنف کو میری جماعت کا کوئی طالب علم نہیں جانتا تھا اور شاید جو استاد ہم لوگوں کو اُردو پڑھاتے تھے انہیں بھی اس کے بارے میں اس سے زیادہ اور کچھ نہیں معلوم تھا کہ وہ ایک بڑا ادیب اور انشا پرداز ہے۔

میٹرک کے بعد جب میں علی گڑھ پہنچا تو وہاں ایک دلچسپ بات یہ معلوم ہوئی کہ انجمن ترقی اُردو کی طرف سے شائع کی ہوئی اسٹینڈرڈ انگلش ۔ اُردو ڈکشنری کی تالیف و ترتیب میں مولوی عبدالحق کے علاوہ جس شخص کی ذہنی و علمی کاوشوں کی آمیزش ہے اس کا نام ڈاکٹر سید عابد حسین ہے اور وہ جامعہ ملیہ۔ دہلی میں پروفیسر ہے۔ اس کے بعد مجھے اس پروفیسر کے بارے میں اور جاننے کا اشتیاق ہوا۔ ملنے کا موقع تو بہت بعد تک نہیں ملا البتہ علی گڑھ کے قیام کے زمانے میں میں نے عابد صاحب کے وہ ترجمے پڑھے جن کا اس وقت وہاں چرچا تھا۔ خاص طور سے میرے ایک دوست جو سائیکالوجی کے طالب علم تھے۔ نفسیات عنفوانِ شباب کا اکثر ذکر کیا کرتے تھے۔ یہ ترجمہ ہے جرمنی کے مشہور عالم ایڈورڈ اشپرانگر کی کتاب سائیکالوجی آف یوتھ (Psychology of youth) کا۔ ترجمے کے شروع میں جو دیباچہ ہے اس سے مترجم کی عالمانہ ژرف بینی کا کسی قدر اندازہ ہوا اور یہ بھی معلوم ہوا کہ مترجم پروفیسر اشپرانگر کا شاگرد ہے اور برلن یونیورسٹی کا پی۔ ایچ۔ ڈی ——— جھلکیاں جو پنڈت نہرو کی مشہور عالم Glimpses into World History کا ترجمہ ہے اور ترکی میں مغرب و مشرق کی کشمکش جو خالدہ ادیب خانم کی تقریروں کے مجموعے Struggle between the East and the West in Turkey ——— کا ترجمہ ہے ——— یہ دونوں ترجمے بھی میں نے علی گڑھ ہی میں پڑھے۔ یہ دونوں کتابیں میں نے مولانا ضیا احمد بدایونی

(رئیس شعبۂ فارسی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ) کے کہنے پر انگریزی میں بھی پڑھیں (مولانا یوں تو مجھے فارسی پڑھاتے تھے لیکن اُردو کے متعلق میرا ذوق شوق دیکھ کر بڑے مفید مشورے دیتے تھے) اس وقت تو میں نہ سمجھ سکا کہ مولانا نے اُردو یا فارسی کی کسی کتاب کے بجائے انگریزی کی کتابوں کے مطالعہ کا مشورہ کیوں دیا لیکن دو تین ہفتے کے بعد جب میں نے انہیں بتایا کہ یہ دونوں کتابیں میں نے پڑھ لی ہیں تو فرمایا کہ "آپ نے مجھ سے کسی موقع پر جگ بیتی اور ترکی میں مغرب و مشرق کی کشمکش کا ذکر کیا تھا۔ اب آپ یہ بتائیے کہ ڈاکٹر عابد حسین کے بارے میں بحیثیت مترجم کے آپ کی کیا رائے ہے؟" میں نے عرض کیا کہ "میں اس نقطۂ نظر سے تو ان کتابوں کا مطالعہ کیا نہیں اور پھر ایسے مسائل کے بارے میں ابھی میری رائے ہی کیا۔ البتہ مجموعی طور پر میرا تاثر یہ ہے کہ باوجود یہ جاننے کے کہ جگ بیتی ترجمہ ہے دوران مطالعہ میں کسی موقع پر یہ نہیں محسوس ہوا کہ یہ ترجمہ ہے۔" کہنے لگے "یہی مترجم کا کمال ہے۔ ایک زبان سے دوسری زبان میں کسی مضمون یا کتاب کا منتقل کرنا آسان کام نہیں ہے۔ ترجمہ کرنے والے کو دونوں زبانوں پر عبور ہونا چاہئے اور پھر سب سے اہم کام الفاظ کے صحیح انتخاب کا ہے، اس پر اسے پوری قدرت ہونی چاہئے ——— ڈاکٹر عابد حسین میں یہ دونوں کمال بدرجہ اتم موجود ہیں۔"

۱۹۴۸ء میں میں نے علی گڑھ سے بی۔ اے کیا اور ایم۔ اے کرنے کے لئے میں نے الٰہ آباد یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا۔ وہاں مجھے عابد صاحب کی ادارت میں نکلنے والے ہفت روزہ اخبار "نئی روشنی" کی خبر ملی۔ عابد صاحب سے جو ذہنی تعلق قائم ہوگیا تھا اس نے ایک دن "نئی روشنی" کو ڈھونڈ ہی لیا۔ پھر جب تک "نئی روشنی" نکلتا رہا اس کی آمد کا برابر مجھے انتظار رہتا۔ اس میں میں نے چھوٹے چھوٹے مضامین لکھنے شروع کئے اور اس طرح ایک طرح کا قلمی تعلق بھی قائم ہوگیا۔ ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کے بعد جو واقعات رونما ہوئے اور ملک کو، خاص طور سے مسلمانوں کو، آگ اور خون کے جس سمندر سے گزرنا پڑا اس سے ایک طرح کی انفعالی کیفیت سبھی پر طاری تھی۔ چاروں طرف اندھیاری تھی، راہ اور نشانِ منزل سب گم ہوتا نظر آرہا تھا۔ مسلمانوں پر افسردگی اور شکست خوردگی کی ایک ایسی کیفیت طاری تھی جو صحیح طور پر سوچنے، حالات اور ان کے تقاضوں کو سمجھنے اور اپنے لئے کوئی لائحہ عمل متعین کرنے کی ساری صلاحیتیں مفلوج کئے دے رہی تھی۔ حالات کی ان تاریکیوں میں نئی روشنی نے بہت پریشان ذہنوں کو سیدھی راہ کا پتہ دیا اور جمود و تعطّل کے سیاہ بادل میں اُمید کی کرن بن کر منزل کی نشان دہی کی۔ میرا خیال ہی نہیں بلکہ یقین ہے کہ عابد صاحب کا یہی ایک کام بہت بڑا ہے۔ اس کی اہمیت کا اندازہ وہی لوگ کر سکتے ہیں جن کے دماغوں میں وسعت اور دلوں میں گرمی ہے اور جو ملک و ملّت کا درد رکھتے ہیں۔ "نئی روشنی" میں "بزم بے تکلّف" کے نام سے ایک کالم ہوتا تھا۔ اس کالم کے ذریعے عابد صاحب نے طنز و مزاح کے پردہ میں بڑے بڑے سیاسی، سماجی اور اخلاقی مسائل چھیڑے اور ان کی طرف لطیف اشارے کرکے ذہنوں میں ایک بے چینی پیدا کی۔ ایسی بے چینی کہ اگر صحت مند بنیادوں پر اس کی پرورش کی جائے اور اُسے زندہ رکھا جائے تو وہ کسی قوم کا بھی سرمایہ بن سکتی ہے۔ موجوں کا اضطراب دریا میں زندگی کی علامت ہے۔

۱۹۵۰ء میں ایم۔ اے کرنے کے بعد مدینہ (بجنور) کے ایڈیٹوریل بورڈ میں شامل ہوگیا۔ غالباً ۱۹۵۰ء کے آخر یا ۱۹۵۱ء کے شروع میں مجھے جامعہ آنے کا اتفاق ہوا اور جامعہ پہنچ کر سب سے پہلا کام جو میں نے کیا وہ یہ کہ عابد صاحب کے دروازہ پر صدا لگائی۔ عابد صاحب اتفاق سے تشریف رکھتے تھے۔ فوراً شرف باریابی حاصل ہوا۔ بڑی شفقت سے بٹھایا، پہلے میرے بارے میں پوچھا پھر مدینہ اور نئی روشنی کے بارے میں گفتگو ہوئی، پھر عام مسائل چھڑ گئے۔ ایک ایسے شخص سے جو عمر میں بہت چھوٹا ہو، علم میں بالکل تہی مایہ ہو، عابد صاحب نے دو ڈھائی گھنٹے گفتگو کی، بڑے اطمینان، سکون اور تفصیل کے ساتھ۔ جب میں رخصت ہوا تو آپ یقین مانئے میری آنکھیں نم تھیں، معلوم نہیں کیوں؟ شاید فرطِ مسرت میں کہ اتنے بڑے آدمی سے ملاقات ہوئی! شاید اس لئے کہ اپنی ہیچمدانی کے باوجود پہلی بار اپنی شخصیت کا احساس ہوا تھا اس لئے کہ میں اتنی طویل اور مفصل ملاقات کی توقع لے کر نہیں آیا تھا، ایسی محبت اور شفقت کی امید نہ تھی۔ مجھے

بزرگوں سے سُنا ہے کہ بڑا آدمی وہ ہے جو چھوٹوں کو یہ محسوس نہ ہونے دے کہ وہ چھوٹے ہیں۔

اس ملاقات کے بعد عابد صاحب کو میں کبھی کبھی خط لکھتا تھا۔ عابد صاحب فوراً جواب دیتے اور اگر کوئی بات مشورہ طلب ہوتی تو ضرور مشورہ دیتے اور مجھے اطمینان ہو جاتا۔ ۱۹۵۳ء میں جب میں جامعہ آیا تو عابد صاحب جرمنی میں تھے۔ ۱۹۵۴ء میں جب وہ جرمنی سے واپس تشریف لائے تو مجھ سے بڑی محبت سے معانقہ فرمایا اور کہا کہ جامعہ میں تو آپ کا دل لگ گیا ہوگا! اُس دن سے لے کر آج تک کوئی سال ہو گئے۔ میں نے انہیں بہت قریب سے دیکھا ہے۔ شام کو ٹہلتے ہوئے۔ مقالے پڑھتے ہوئے۔ ادبی و علمی جلسوں کی صدارت کرتے ہوئے۔ علمی مباحث پر گفتگو کرتے ہوئے۔ چائے پیتے ہوئے، کھانا کھاتے ہوئے۔ کبھی کبھی حقے کے کش لگاتے ہوئے اور سگار پیتے ہوئے (ڈاکٹر صاحب نے تمباکو نوشی ترک کر دی ہے۔ لیکن جب مجیب صاحب سگار پیش کرتے تو پی لیتے ہیں) اور میں کہہ سکتا ہوں کہ عابد صاحب کی شخصیت میں بڑی جاذبیت اور انوکھا پن، بڑی سادگی اور اچھوتا پن ہے۔ ذہن صاف اور دل بڑا ہے۔

عابد صاحب ۱۴ صفر ۱۳۱۴ھ (جولائی ۱۸۹۶ء) کو بھوپال میں پیدا ہوئے جہاں ان کے والد مرحوم سید حامد حسین صاحب ملازم تھے۔ انہیں اردو، فارسی اور عربی اچھی آتی تھی، شاعر تھے اور تاریخ گوئی میں بڑی دستگاہ رکھتے تھے۔ خاندان کی روایت کے مطابق عابد صاحب کی تعلیم بھی پہلے گھر پر شروع ہوئی۔ قرآن پڑھا اور پھر عربی اور فارسی کا سلسلہ شروع ہوا۔ خاندان کے بعض بزرگ انہیں عربی تعلیم دلوانا چاہتے تھے۔ پروگرام یہ تھا کہ ابتدائی کتابیں ختم کر لینے کے بعد انہیں لکھنؤ بھیجا جائے۔ اور وہاں سے وہ مجتہد بن کر آئیں اور اس کشمکش میں تیرہ چودہ سال گزر گئے۔ آخر کار 'قدیم' پر 'جدید' غالب آیا اور عابد صاحب ۱۹۱۰ء میں بھوپال کے جہانگیریہ ہائی سکول میں پانچویں جماعت میں داخل ہو گئے۔ اس عرصہ میں انہوں نے تھوڑی سی انگریزی اور خاصی اردو سیکھ لی تھی۔ ۱۹۱۶ء میں انہوں نے اوّل درجہ میں میٹرک پاس کیا اور اسکالرشپ ملا۔ اس کے بعد اعلیٰ تعلیم کے لئے وہ میور سنٹرل کالج، الٰہ آباد میں داخل ہوئے۔ انٹرمیڈیٹ میں انہوں نے ریاضی اور سائنس لی مگر ان مضامین سے کوئی طبعی مناسبت نہ تھی اس لئے ایف۔ اے میں سیکنڈ کلاس ملی۔ بی۔ اے میں جب آئے تو ریاضی اور سائنس کی دردسری کو چھوڑ کر فلسفے کی موشگافیوں میں اُلجھے۔ فلسفے کی خشکی کے ساتھ فارسی اور انگریزی ادبیات کی رنگینی سے ایک خوشگوار امتزاج قائم کیا اور بی۔ اے میں فرسٹ کلاس لی۔ الٰہ آباد میں وہ مسلم بورڈنگ ہاؤس میں جو ایم۔ بی۔ ہاؤس کے نام سے مشہور ہے رہتے تھے۔ ڈھائی سال تک وہ یہاں مسلم ہوسٹل میگزین کے ایڈیٹر رہے اسی زمانہ میں اُن کی ملاقات اکبر الٰہ آبادی مرحوم سے ہوئی تھی۔ بی۔ اے کرنے کے بعد وہ علی گڑھ چلے آئے اور محمڈن اینگلو اورینٹل کالج میں ایم۔ اے (انگریزی) میں داخلہ لیا۔ علی گڑھ میں اس وقت ایک بے چینی تھی، ایک کشمکش تھی۔ عدم تعاون کی تحریک نے طلبہ اور اساتذہ کو ایک ہیجان میں مبتلا کر رکھا تھا۔ عابد صاحب اگرچہ اس تحریک سے الگ تھلگ رہے لیکن نتیجہ یہ ہوا کہ تعلیمی لحاظ سے یہ سال اُن کا بیکار گیا۔ ۱۹۲۱ء میں باہر جانے کے لئے انہیں ریاست بھوپال سے وظیفہ ملا، تھوڑی بہت امداد ان کے چچا نے بھی کی اور وہ انگلستان چلے گئے۔ جہاں انہوں نے آکسفورڈ یونیورسٹی میں بی اے (آنرز) کے لئے فرسٹ پارٹ کا امتحان بھی پاس کر لیا تھا۔ لیکن چونکہ وظیفہ کی رقم اتنی نہیں تھی کہ آکسفورڈ میں رہ کر وہ یکسوئی سے تعلیم حاصل کر سکتے اس لئے وہ مدد ۱۹۲۲ء میں وہیں سے جرمنی چلے گئے۔ جرمنی میں انہوں نے پی۔ ایچ۔ ڈی میں داخلہ لیا۔ فلسفہ خصوصاً فلسفۂ تعلیم خاص مضمون تھا اور اس کے ساتھ عربی اور تاریخ یورپ دوسرے مضامین تھے۔ نومبر ۱۹۲۵ء میں انہیں پی ایچ ڈی کی ڈگری ملی۔ جرمنی میں پروفیسر ایڈورڈ اشپرانگر کی رہنمائی میں علمی سرگرمیاں ہی ان کی توجہ کا مرکز رہیں۔ اس وقت اتفاق سے ڈاکٹر ذاکر حسین، پروفیسر محمد مجیب، خواجہ عبدالحمید اور ڈاکٹر سلیم الزماں وہیں موجود تھے۔ ہندوستان ایسوسی ایشن ان سب کا علمی و تہذیبی پلیٹ فارم تھا۔ ذاکر صاحب سے وہیں ملاقات ہوئی تھی۔ ذاکر صاحب کی کوششوں سے برلن کے کاویانی پریس نے دیوان غالب شائع کیا تھا اس

کی تصحیح میں عابد صاحب کا بھی ہاتھ تھا۔ عابد صاحب نے ایک مرتبہ مزاحاً مجھ سے فرمایا کہ دیوانِ غالب کا یہ نسخہ تصحیح نہیں بلکہ تغلیط کے لحاظ سے بڑی دلچسپی رکھتا ہے۔

جرمنی ہی کے دورانِ قیام میں یورپ کے ایک مشہور شہر میں ان ہندوستانی نوجوانوں کی ملاقات حکیم اجمل خاں مرحوم سے ہوئی تھی۔ مضامینِ عابد میں ایک مضمون ہے جس کا عنوان ہے "سچا افسانہ"۔ اس مضمون میں اس ملاقات کی طرف اشارہ ہے۔ ان نوجوانوں کے بڑھتے ہوئے ارادے اور بلند خیالات کا تصادم ہوتا ہے ایک پیرِ فرزانہ کی معتدل اور سبک رو انتادِ طبع سے۔ اس کا ایک پیراگراف ملاحظہ ہو کتنی حرارت ہے اس میں! کتنی پُرسوز حقیقت ہے یہ اپنے دامن میں لئے ہوئے!

"یہ ہمتیں اور یہ ارادے ہیں ان نوجوانوں کے، مگر دنیا میں بڑے کام کرنے والے کے لئے محض ہمت اور ارادہ کافی نہیں، جب تک تجربہ اور معلومات، دانائی اور تدبیر، احتیاط اور استقلال شریکِ کار نہ ہوں۔ ظاہر ہے کہ یہ صفات نوجوانوں کو نصیب نہیں۔ یہ اس پیرِ دانش کے حصے میں آتی ہیں جس کی رگوں میں خون کی گردش معتدل ہو چکی ہو اور جس کی سیرت میں وہی قوتیں امتزاج پا چکی ہوں۔ ان نوجوان سپاہیوں کو تلاش ہے ایک پیرِ مرد کی جو ان کا سالار بنے۔ یہ ایسا سالار چاہتے ہیں جس نے مشرق و مغرب کے درمیان کی دشوار گزار گھاٹیوں کو طے کیا ہے اور دونوں میدانوں میں دادِ شجاعت دی ہے جس نے رن دیکھے ہیں اور معرکے جیتے ہیں۔ جس نے سختیاں جھیلی ہیں اور مشکلوں پر فتح پائی ہے۔ یہ لوگ چشمِ تصور سے ہندوستان کے تمام سربرآوردہ مسلمانوں کو دیکھتے ہیں۔ مگر کوئی ان کے کام کا نظر نہیں آتا۔"

جرمنی میں ڈاکٹر عابد حسین صاحب نے اپنا اصلاحی ڈرامہ پردۂ غفلت لکھا اور ڈچ مصنف ڈی بویر (De Boer) کی کتاب ہسٹری آف فلاسفی اِن اسلام کو جرمن زبان سے اردو میں منتقل کیا۔ یہ کتاب اسلامی فلسفے پر نہیں ہے جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہوتا ہے۔ بلکہ حقیقت میں یہ کتاب مسلمان فلسفیوں کے بارے میں ہے اور جامع ہے۔

فروری ۱۹۲۶ء میں ڈاکٹر ذاکر حسین، ڈاکٹر عابد حسین اور پروفیسر محمد مجیب ——— جامعہ کی تین اہم شخصیتیں ——— جرمنی سے ہندوستان واپس آئے اور تینوں نے جامعہ کو اپنی خدمات پیش کر دیں۔ اس لحاظ سے بجا طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ سال جامعہ کی تاریخ کا بڑا اہم سال ہے۔ تین شخصیتیں جو ایک دوسرے کے قلب کی حرارت، اور نگاہوں کی بلندی کو اچھی طرح سمجھتی تھیں، ایک ٹیم کی حیثیت سے اس قومی ادارے کے لئے اپنی جان کھپانے کو تیار ہو جاتی ہیں جو شدائد و مشکلات کی سخت ترین منزلوں سے گزر رہا تھا۔ جس کا نہ تو کوئی شاندار ماضی تھا اور نہ حال امید افزا اور نہ مستقبل کا پتہ ——— اپنے مستقبل کو کسی ایسے ادارے سے وابستہ کر دینا بڑے دل و جگر کا کام ہے۔ لیکن بڑی شخصیتیں اسی طرح "نقد" کو نظر انداز کر کے "ادھار" سے معاملہ کرتی ہیں۔

ایک مرتبہ میں نے عابد صاحب سے پوچھا کہ کیا وہ طالبِ علمی ہی کے زمانے سے نیشنلسٹ تھے۔ فرمایا کہ پہلی جنگِ عظیم کے زمانے میں میں انگریزوں کا طرفدار تھا، پائنیر پڑھتا تھا اور میرے سیاسی خیالات وہی تھے جن کی تبلیغ پائنیر کرتا تھا۔ لیکن جب جلیانوالہ باغ کا حادثہ فاجعہ پیش آیا تو میرے دل و دماغ کی دنیا ہل گئی۔ جلیانوالہ باغ کا مجھ پر بہت اثر تھا۔ اسی زمانے میں مجھ پر گاندھی جی کی ایک تقریر کا جو معاشیات سے متعلق تھی اور جس میں پیداوار اور تقسیمِ پیداوار سے بحث کی گئی تھی، بہت اثر ہوا۔ سامراجی نظام کی پیچیدگیاں مجھ پر واضح ہونے لگیں۔ جب میں آکسفورڈ گیا تو وہاں میرے خیالات بلکہ میرا طرزِ خیال ہی بدل گیا۔ نومبر ۱۹۲۱ء کا ذکر ہے ، آکسفورڈ میں پہلا

کچھ ہفتے پہلے میں یونیورسٹی میں داخل ہوا تھا، ایک دوست کے یہاں اکتوبر کے ماڈرن ریویو میں ٹیگور کا مضمون "حق کی ندا" (The call of truth) نظر سے گذرا جس میں عدم تعاون کی تحریک پر سختی سے تنقید کی گئی تھی۔ اسی کے ساتھ ۱۳ اکتوبر کے ینگ انڈیا میں گاندھی جی کا جواب "The great sentinel" کے عنوان سے پڑھا۔ ٹیگور اور گاندھی کی یہ بحث مشہور ہے۔ اپنے مضمون میں ٹیگور نے گاندھی جی کی تحریک پر جو اعتراضات کئے تھے ان میں بڑی جان تھی لیکن گاندھی جی نے جو جواب دیا تھا اس میں بڑی حقیقت پسندی تھی، آزادی اور عزت نفس کی تعلیم تھی۔ "شاعر" اور "مصلح" کی اس بحث میں "مصلح" غالب رہا اور میں گاندھی کو ٹیگور کو، اپنے آپ کو اور زندگی کو اور ہی نظروں سے دیکھنے لگا ——— غالباً خیالات کی یہی تبدیلی عابد صاحب کو جامعہ لے آئی۔ اب جامعہ میں انہیں پورے تیس سال ہو چکے ہیں۔ اس تیس سال کے عرصہ میں جامعہ نے نہ معلوم کتنے نشیب و فراز دیکھے ——— اس پر جانکنی کا عالم طاری ہوا، پھر زندگی کے آثار ظاہر ہوئے ——— ڈاکٹر صاحب بھی اس نشیب و فراز سے گذرے ان کی شخصیت کی تعمیر میں جہاں بچپن اور جوانی کے بہت سے خانگی آلام و مصائب کا حصہ ہے وہاں عہد بلوغت کے اس نشیب و فراز کو بھی بہت دخل ہے۔

۷ ———

بہت کم لوگوں کو شاید یہ معلوم ہو کہ عابد صاحب نے شاعری بھی کی ہے اور ان کے اشعار اکبر الٰہ آبادی مرحوم سے خراج تحسین وصول کر چکے ہیں۔ الٰہ آباد میں اکبر مرحوم سے ان کی ملاقات بحیثیت شاعر ہی کے ہوئی تھی۔ پھر جب وہ علی گڑھ آئے تو انہوں نے علی گڑھ میگزین میں اکبر الٰہ آبادی پر ایک مضمون لکھا اور غالباً اسی اشاعت میں ان کی ایک نظم "شرح درد اشتیاق" کے عنوان سے شائع ہوئی۔ اکبر مرحوم نے یہ مضمون اور نظم دیکھی تو رشید صاحب کو لکھا کہ یہ ڈاکٹر سید عابد حسین کون ہیں (الٰہ آباد کی ملاقات کی یاد شاید ان کے ذہن سے نکل چکی تھی) نظم کا آخری بند یہ تھا ؎

. . . .

باعث تسکیں مگر ہے یہ خیال — عارضی ہے زیست کا رنج و ملال
اتحاد نور و ظلمت تا بکے! — چند لحظہ، چند ساعت، چند سال
پھر وہی آہنگ سیر لامکاں — پھر وہی سودائے حسن لازوال
قید صورت سے ملے گی پھر نجات — شاہد معنیٰ سے پھر ہوگا وصال

"مرغ جاں را آشیانے دیگر است
ایں مکاں را ہم مکانے دیگر است"

اکبر مرحوم نے عابد صاحب کو بھی لکھا "آپ کی نظم میں نے پڑھی۔ خوب ہے۔ خصوصاً آخر کا بند اسے پڑھ کر میری زبان پر بے اختیار یہ شعر آگیا ؎

آپ کی ہستی تو ذوق راہ عرفاں میں کٹی — کاش چھوڑے آپ کے دامن کو یونیورسٹی

عابد صاحب کی نثر بڑی جچی تلی اور رچی بسی ہوئی ہوتی ہے۔ عبارت کا ہر لفظ اپنی جگہ پر "قطب" ہوتا ہے مجھے یقین ہے کہ جن لوگوں نے "مضامین عابد" کا مطالعہ کیا ہے وہ ضرور مجھ سے متفق ہوں گے یا پھر جن طلبہ نے جامعہ کالج میں ان سے اردو پڑھی ہے ان سے ذرا عابد صاحب کا حال بحیثیت استاد اردو کے پوچھئے۔ آج جبکہ وہ درس و تدریس کے کام سے الگ ہو کر تصنیف و تالیف کا کام کر رہے ہیں، طلبہ انہیں یاد کرتے ہیں اور ہم سب ان کی کمی بُری طرح محسوس کرتے ہیں۔ طلبہ کے ساتھ ان کا تعلق پدرانہ ہوتا ہے۔ مستطیع اور غیر مستطیع ہر قسم کے طلبہ کو مختلف طریقوں سے ان سے فیض پہنچتا رہتا ہے۔ حاجتمند طلبہ کی وہ ہر طرح سے دامے، درمے، قدمے، سخنے مدد کرتے ہیں۔ عابد صاحب جب جامعہ میں رہتے ہیں تو کالج کے طالب علموں کو بڑا اطمینان رہتا ہے۔

مضامین عابد میں ایک مضمون "حدیثِ دیگراں" کے عنوان سے ہے۔ یہ مضمون ایک طرح سے تبصرہ ہے مولوی عبدالحق صاحب کے مجموعۂ مضامین "چند ہمعصر" اور خود مولانائے موصوف کی منفرد شخصیت پر۔ اس میں ایک جگہ عابد صاحب نے لکھا ہے "ایک مصنف خواہ وہ خود پوشی میں کتنا ہی اہتمام کرتا ہو، یوں تو اپنی ہر تحریر کے اسلوب اور مضمون میں اپنی شخصیت کی ایک جھلک دکھانے پر مجبور ہے لیکن خاص کر اس وقت جب وہ دوسروں کی سیرت پر قلم اٹھاتا ہے اس کے خلوت کدۂ ذات کا حجاب اٹھ جاتا ہے، اوروں کے جوہر پرکھنے میں خود اس کے جوہر کھل جاتے ہیں" ——— کیا میں اس موقع پر یہ کہنے کی جرأت کر سکتا ہوں کہ یہاں صیاد خود اپنے دام میں آگیا ہے۔ اس مضمون میں کتنے ہی ایسے فقرے اور جملے ہیں جہاں عابد صاحب خود اپنے آپ سے نہیں بچ سکے ہیں۔ مرزا حیرت کے سلسلہ میں انہوں نے لکھا ہے کہ "سچ پوچھئے تو مسندِ علم کی وہ منزلت ہے کہ جاہ و دولت کی طمع میں اس سے اوپر جانا حقیقت میں نیچے اترنے کے برابر ہے۔" ایک مرتبہ مجھے یاد ہے کہ انہوں نے بڑے تیز رو، الفاظ میں "ملّائے مکتب" کے بلند مدارج کا مجھ سے ذکر کیا اور کہا کہ بوریائے علم کے سامنے مسندِ جم کوئی حقیقت نہیں رکھتی۔

عابد صاحب کے یہاں کنبے کا تصور بہت وسیع ہے۔ خاندان اور خانوادہ کا ہر فرد ان کا عزیز ہے، دل سے انہیں عزیز ہے اور جب کبھی کوئی موقع آتا ہے تو عابد صاحب کی موجودگی ان کے دل کو تقویت دیتی ہے۔ جب وہ طالب علم تھے اور وظیفہ پاتے تھے تو وظیفے کی رقم بڑی کے علاج معالجہ میں صرف کرتے تھے اور انہیں یہ محسوس نہیں ہونے دیتے تھے کہ ان کی خبر گیری کرنے والا کوئی نہیں۔ صالحہ باجی (بیگم عابد حسین) کا کہنا ہے کہ عابد صاحب کی شرافتِ نفس کا اندازہ گھر میں ہوتا ہے۔ ملازموں سے انہیں بڑی محبت ہے اور جب کبھی میں کسی بات پر ملازموں سے باز پرس کرتی ہوں اور عابد صاحب کو اس کی اطلاع ہو جاتی ہے تو وہ ہمیشہ ملازموں کی طرفداری کرتے ہیں۔ عابد صاحب کے دوست بہت کم ہیں لیکن جو ہیں ان پر وہ جان چھڑکتے ہیں، ذکی الحس اور متمدن اتنے ہیں کہ دوستوں سے وہ دوسرے درجہ کی بات سن نہیں سکتے۔ دوستوں کو بھی عابد صاحب کی رائے پر بہت بھروسہ ہوتا ہے۔ جب کوئی مشکل مسئلہ پیش آتا ہے تو وہ ہی اسے حل کرتے ہیں اور سب مطمئن ہو جاتے ہیں۔

عابد صاحب کے مزاج میں بڑی سادگی ہے۔ لباس بہت سادہ اور کھانا بہت کم بمشکل دو چپاتی کھاتے ہیں۔ میٹھا ان کی کمزوری ہے طبیعت میں بھی بہت سادگی ہے۔ یہ ضرور ہے کہ وہ اس سادگی میں اپنی بذلہ سنجی کے ذریعہ بڑی چاشنی پیدا کر دیتے ہیں۔ مزاح ان کی طبیعت کا ایک جزوِ لاینفک ہے۔

صبح و شام ایک دو میل تک ٹہلنا عابد صاحب کے معمولات میں سے ہے۔ رروسو نے ایک جگہ اپنے بارے میں لکھا ہے کہ "میں بیٹھ کر سوچ ہی نہیں سکتا، میرے پاؤں کی 'حرکت' میرے دماغ کی 'حرکت' کا سبب بنتی ہے۔" میرا خیال ہے کہ عابد صاحب کے ساتھ بھی کم و بیش یہی معاملہ ہے۔ شام کے وقت کبھی کبھی میں ان کے ساتھ ہو جاتا ہوں، مختلف موضوعات پر گفتگو ہوتی ہے، میں کوئی بات چھیڑ دیتا ہوں، پھر "گل افشانیٔ گفتار" کا تماشہ دیکھتا ہوں۔ غالب کو اس کام کے لئے "پیمانۂ صہبا" کی ضرورت پڑی تھی، عابد صاحب کو کھلی ہوئی فضا چاہئے۔ عابد صاحب کی حاضر جوابی مسلّم ہے۔ سنا ہے کہ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب بھی اُن سے گھبراتے ہیں۔ بے شمار لطیفے ایسے ہیں جو جامعہ والوں کی زبان پر ہیں۔ کچھ فطری طور پر وہ حاضر جواب ہیں، علم و شعور، مطالعہ اور مشاہدہ کی ترقی کے ساتھ ساتھ اس میں بھی ترقی ہوتی گئی۔ بچپن کا ایک واقعہ ہے۔ ان کے والد مرحوم کے ایک دوست تھے جو اکثر انہیں چھیڑا کرتے تھے۔ ایک دن وہ آئے اور اُن کی طرف اشارہ کر کے اُن کے والد سے کہا۔ آپ نے عابد حسین کو کیا مُعطّلین میں ڈال لیا تھا۔ ابھی وہ کوئی جواب بھی نہیں دے پائے تھے کہ عابد صاحب نے کہا "جی ہاں، انسانوں کا قحط تھا۔" اس وقت اُن کی عمر دس سال کی تھی۔

صالحہ باجی چوروں سے بہت ڈرتی ہیں، اُن کے یہاں کئی چوریاں ہو چکی ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ اُن پر چوروں کی طرف سے دہشت ہونی چاہئے، عابد صاحب اس معاملہ میں بہت بے نیاز ہیں، اُن کا کہنا ہے کہ چور گھر کی چیزیں ہی تو لے جائیں گے، لے جانے دو۔ ایک مرتبہ عابد صاحب ہفتہ عشرہ سے

کے لئے کہیں باہر جا رہے تھے۔ صالحہ باجی کا اصرار تھا کہ ڈاکٹر صاحب ذرا جلدی آجائیے گا، عابد صاحب کہہ رہے تھے، ایسی کیا جلدی ہے، صالحہ باجی کی طرف سے جو دلیل دی جا رہی تھی اس میں چوروں کا خاص ذکر تھا۔ اُن کا کہنا یہ تھا کہ اگر کوئی چور آئے اور میرا گلا دبا دے تو میں کیا کروں گی، شور بھی نہیں مچا سکتی۔ عابد صاحب نے برجستہ کہا "اور اگر میں ہوا اور دو چور آئے، ایک نے آپ کا گلا دبایا اور دوسرے نے میرا تو نتیجہ تو وہی رہا۔"

پونا میں ایک تعلیمی کانفرنس تھی۔ جامعہ کی طرف سے ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب۔ پروفیسر محمد مجیب اور عابد صاحب اس میں شرکت کے لئے گئے تھے۔ مجیب صاحب اور عابد صاحب کا قیام ایک ہی کمرہ میں تھا۔ رات کو جب یہ لوگ لیٹے تو مجیب صاحب کچھ بے چین ہوتے۔ بار بار اٹھ کر بیٹھ جاتے تھے۔ عابد صاحب نے کہا "مجیب صاحب! کیا بات ہے" مجیب صاحب نے بڑے تکلف سے کہا "معلوم ہوتا ہے کہ چارپائی میں کھٹمل ہیں" عابد صاحب نے بے ساختہ فرمایا "تو پھر مدح صحابہ پڑھئے" (مجیب صاحب شیعہ ہیں) عابد صاحب شیعہ تو ہیں لیکن عید بقرعید کی نماز جامعہ میں ہمیشہ سنیوں کے ساتھ پڑھتے ہیں اور "وارکعوا مع الراکعین" کی زندہ مثال ہیں۔

عابد صاحب دُھن کے آدمی ہیں، کوئی کام اُن کے ہاتھ میں ہو جب تک وہ پورا نہیں کر لیں گے دوسرا کام نہیں شروع کریں گے۔ اسی لئے وہ ہمیشہ ایڈمنسٹریشن کی ذمہ داریوں سے بچتے رہے۔ اُن کا کہنا ہے کہ ان کی طبیعت کی افتاد ہی کچھ ایسی ہے۔ وہ سست سوچتے ہیں، فرماتے ہیں کہ زبان کی طرح دماغ میں بھی لکنت ہے۔ لیکن اس سے ایک فائدہ یہ ہے کہ جو کچھ سوچتے ہیں تہ تک سوچتے ہیں، ہر پہلو کی تفصیل پر نظر رکھتے ہیں اس لئے ان کا ہر فیصلہ دو اور دو چار کی طرح واضح، صاف اور مطمئن کرنے والا ہوتا ہے۔

صالحہ باجی کہتی ہیں کہ گھر میں لوگ چھوٹے موٹے مرض کی اطلاع بھی عابد صاحب کو نہیں ہونے دیتے اس لئے کہ اگر انہیں خبر ہو جائے تو لکھنے پڑھنے کا سارا کام ترک کر کے اس طرف متوجہ ہو جائیں گے۔ بڑے سے بڑے ڈاکٹر سے رجوع کریں گے یہاں تک کہ بے چارہ مریض پچھتانے لگا کہ ناحق انہیں اس کی اطلاع ہو گئی۔

عابد صاحب کی شخصیت کی سب سے بڑی خوبی ان کی انسان دوستی ہے، ان کی چال پُرسکون اور سخن دلنواز ہے۔ فرد کی ان کے نزدیک بڑی اہمیت ہے اور فرد کی صلاحیتوں کو اُجاگر کرنے میں ان سے جو کچھ ہو سکتا ہے وہ سب کرتے ہیں۔ اس لحاظ سے اب وہ ملک کی ان چند شخصیتوں میں سے ہیں جن پر بجا طور پر ناز کیا جا سکتا ہے۔

عرشی رامپوری

عشرت رحمانی

یاد بخیر۔ ریاست رام پور (یو۔پی) میں "بزم ادب" کے نام سے ایک ممتاز علمی ادبی جماعت قائم تھی۔ اس کے روح رواں مولانا عزیز اللہ خاں مرحوم مدیر رسالہ نیرنگ و مالک مطبع سعیدی تھے۔ عزیز مرحوم نہایت اعلیٰ خوبیوں کے انسان تھے۔ "نیرنگ" اپنے زمانہ کا ایک ممتاز علمی ادبی ماہنامہ شمار کیا جاتا۔ اور عزیز مرحوم نے اپنی زندگی علم و ادب کی خدمت کے لئے وقف کر دی تھی۔ اور اپنے کسب کمال سے عزیز جہاں بنے ہوئے اپنے گرد شیدائیانِ ادب کا ہجوم لئے خاموشی اور تندہی سے مصروف کار تھے۔ اس بزم کا مرکز نیرنگ کا دفتر عزیز مرحوم کا مکان واقع گھیر ملکیاں تھا۔ جو دفتر کم اور یارانِ سکیدہ کا تکیہ زیادہ تھا۔

بزم ادب کے زیر اہتمام یوں تو کبھی کبھار مختصر شاعرانہ محفلیں منعقد ہوتی رہتیں۔ اور سال میں ایک دو عالیشان قسم کے مشاعرے ہو جاتے۔ لیکن اس کی خاص سرگرمیوں میں روزانہ کی وہ محفل تھی جو چند مخصوص اہل علم و ادب پر مشتمل دوستوں کی نشست کہی جاتی۔ مگر اس میں علم و فن کا کوئی موضوع ایسا نہ تھا جو آئے دن زیر بحث نہ آتا ہو۔ اس بزم کے اراکین میں رام پور کے معدودے چند حضرات شریک تھے۔ جن میں بزرگ بھی تھے اور جواں سال بھی۔ عزیز مرحوم کے خلوص نے ان سب کو اپنی بزم ادب کی شمع کا ہم ذوق پروانہ بنا لیا تھا۔ ۱۹۳۴ء کا زمانہ تھا میں اپنی ابتدائی تعلیم سے فراغت حاصل کر کے کلکتہ اور لاہور کے قیام کے بعد رام پور آیا تھا اور اپنے ذوق ادب کی تسکین کی خاطر بلکہ زانوئے ادب تہ کرنے اس بزم میں شریک ہو گیا۔ میری حیثیت ان چند بڑوں میں سب سے چھوٹے کی تھی۔ لیکن یہ یارانِ نکتہ داں کی محفل تھی جہاں چھوٹے بڑے کی کوئی تخصیص نہ تھی۔ یہاں تو "زندگی برائے ادب" کا نعرہ سب کی زبان پر تھا اور ہر شام کے چند گھنٹے نہایت خلوص و یگانگت کے ساتھ ادبی گتھم گتھا میں گزارے جاتے۔ علم و ادب کی گتھیاں سلجھانے کے لئے آپس میں بعید دلچسپ و پُرکیف بحث مباحثے برپا ہوتے۔ اور ان [illegible] مباحثوں اور مذاکروں کے نتیجہ میں بہت سا علمی مواد مجلّہ نیرنگ کے صفحات کی زینت بن جاتا۔ ان مجالس میں شعر و نظم کی کوئی قید نہ تھی۔ کبھی نشست میں ایک مصرع پڑھا جاتا اور تمام احباب فی البدیہہ فکر سخن میں مصروف ہو جاتے۔ اور تھوڑی دیر میں سب حضرات اپنی اپنی تازہ غزلیں سنا کر بزم

مشاعرہ منعقد کرتا تھے۔ ان احباب میں بھائی امتیاز علی خاں عرشی کی شخصیت ہمہ صفت ممتاز نظر آتی تھی۔ عمر کے لحاظ سے تو کئی اور بزرگ ان سے بڑے تھے مگر علمی فضیلت اور ادبی ذوق میں ان کا پایہ جواں سال حضرات میں خاصہ بڑا تھا۔ اور ادبی مباحث میں ان کی اصابت رائے امتیازی حیثیت رکھتی تھی۔ شرکاء بزم میں چند بزرگ ایسے بھی تھے جو اپنی عمر اور علمیت سے حاضرین کو مرعوب کرنے کی کوشش کرتے کسی موضوع کی باریکیاں سمجھاتے ہوئے آواز کو بلند کرنے پر اتر آتے۔ اور جب اپنی برتری تسلیم ہوتے نہ دیکھتے۔ یا بالفاظ دیگر مرعوب نہ کر پاتے تو نوبت جھگڑے تک پہنچ جاتی۔ مگر ان بزرگوں کے درمیان ایک جوان رعنا نہایت شگفتہ مزاجی وخندہ پیشانی سے مسئلہ کو سلجھاتا اور جھگڑے کو نپٹاتا نظر آتا۔ یہ تھے بھائی عرشی (جنہیں اس وقت یعنی آج سے تقریباً تیس سال پہلے بھی مولانا عرشی سے خطاب کیا جاتا) جن کے لبوں پر پُرکیف تبسم کھیلتا۔ اور وہ ہر رکن کو 'بھائی' اور 'مولانا' سے مخاطب کرکے اپنی دھیمی اور شیریں آواز سے ان کے غیظ آلود تیوروں میں سلاست گفتار کی نرمی پیدا کر دیتے۔ اور ذرا دیر میں مشکل سے مشکل مسئلہ کو آسانی سے سلجھانے میں کامیاب ہو جاتے۔ پھر مولانا عزیز کی مرنجاں مرنج طبیعت گفتگو کے اس پُر لطف انجام پر بشاش ہو جاتی۔ اور اُن کی لطیف آواز گونجتی سنائی دیتی کہ "چلئے بات ختم ہوئی"۔ پھر وہ کسی ملازم کو چائے لانے کے لئے پکارنے لگتے اور تمام احباب قہقہوں کی گونج میں گفتگو کی تلخیوں کو چائے کی چسکیوں پر اڑا دیتے۔

یہ وہ زمانہ تھا جبکہ عرشی صاحب کئی سال قبل علوم مشرقی کی تحصیل سے فراغت کرکے علوم مغربی کی تعلیم میں مصروف تھے۔ اور ان کے شب و روز علمی مشاغل میں گزرتے۔ کئی اداروں سے ان کو ملازمت کی پیش کش ہو چکی تھی مگر وہ اپنی علمی ادبی سرگرمیوں پر کوئی پابندی عائد کرنا پسند کرتے نہ ان کی عزلت گزینی شہرت کو گوارا کرتی۔ ان کے اکثر احباب جو پنجاب اور یوپی سے علمی ادبی رسائل شائع کرتے تھے ان سے مضامین کی پُر زور فرمائش کرتے لیکن وہ ان کو کسی نہ کسی طرح بہ لطائف الحیل ٹال دیتے۔ البتہ مولانا عزیز مرحوم کا خلوص ان پر غالب آتا اور نیرنگ کی کوئی اشاعت ان کے علمی یا ادبی مقالہ یا غزل سے خالی نہ ہوتی۔ کیونکہ عرشی صاحب خوش فکر شاعر ہونے کے باوجود عام طور پر حجاب میں رہتے تھے۔ اور ان کا کلام کسی مجلۂ ادب کی زینت نہیں بننے پاتا۔ نہ کسی عام مشاعرہ کی محفل میں ان کا نام پکارا گیا۔

بزم ادب کی شاعرانہ مجالس میں وہ کارکن و مہتمم کی حیثیت سے پیش پیش نظر آتے۔ مگر مشاعرہ کے وقت وہ ایک خوش فعل سامع کی حیثیت اختیار کر لیتے۔ اور پیشتر ہی تمام احباب سے یہ وعدہ لے لیتے کہ ان کے سامنے شمع نہیں لائی جائے گی۔ نہ اصرار و تقاضہ سے ان کو مجبور کیا جائے گا۔ بہت کم ایسا ہوتا کہ مخصوص شاعرانہ صحبت میں ہم لوگ ان کو مجبور کر دیتے اور وہ عجیب شان تکلف سے شعر خوانی پر آمادہ ہو جاتے۔ بزم ادب کی شبانہ مجلسوں میں ایسے مواقع اکثر پیش آتے۔ دراصل عرشی صاحب کی طبع رسا میں شاعری کا قدرتی مادہ ودیعت ہوتے ہوئے وہ کئی وجوہ کی بناء پر اپنی شاعرانہ حیثیت کو منظر عام پر لانے سے محترز رہے۔ ایک تو ان کی گہری ناقدانہ نظر ان پر کڑی پابندی لگائے رہی۔ پھر سب سے زیادہ یہ کہ علمی ادبی تحقیق و تدقیق کو دوسرے تمام مشاغل پر ترجیح دیتے اور انہی کو اوّلیت حاصل تھی اور آخرکار ان کے تخلص نے ان کے نام اور علمی مقام کی حیثیت اختیار کر لی۔ حالانکہ افغانی النسل ہونے کے باوجود ان کا پیشۂ آباء سپہ گری نہیں تھا مگر ان کے لئے شاعری ذریعہ عزت نہیں۔

عرشی صاحب کا خاندان افغانستان کے یوسف زئی سلسلہ میں اکوزئی شاخ حاجی خیل سے تعلق رکھتا ہے۔ اس خاندان کے مورث اعلیٰ کو ہندوستان آئے سوا سو سال ہوئے اور اسی عہد سے ان کے آباؤ اجداد رامپور کے محلہ پیلوار میں سکونت پذیر ہوئے۔ اور اسی آبائی مکان میں وہ آج تک رہتے۔ ان کے دادا صاحب مرحوم مولوی اکبر علی خاں صاحب اپنے عہد کے جید عالم اور مشہور محدث تھے۔ لیکن عرشی صاحب کے والد محمد ممتاز علی خاں صاحب کو ورثہ میں ان علوم کا کوئی حصہ نہ ملا۔

بجز علوم مذہبی سے ذوق ضرور تھا مگر فضیلت کے درجہ تک نہیں پہنچے اور وہ رامپور کے مویشی خانہ سرکاری کے ہسپتال کے افسر اعلیٰ

تھے۔ مگر انہوں نے ہونہار فرزند کی تعلیم میں اپنے حق کی تلافی کی سعی فرمائی اور بھائی عرشی نے "آنچہ پدر نتواں کرد پسر تمام کند" کے مصداق دادا صاحب کے نقش قدم پر چل کر مدارج فضیلت حاصل کئے۔ انہوں نے رام پور کی مشہور زمانہ درس گاہوں مدرسۂ مطلع العلوم و مدرسۂ عالیہ میں عربی و فارسی کے مروجہ درسیات کی تکمیل کی۔ اور پنجاب یونیورسٹی سے منشی فاضل کی سند حاصل کی۔ بعد ازاں انگریزی ادب کے مطالعہ سے معقول استفادہ کیا۔ اس طرح اپنے ذوق اور ضرورتِ وقت کے لحاظ سے علومِ جدید میں وافر استعداد بہم پہنچائی۔

جیسا کہ ابتدا میں بیان کیا جا چکا ہے بھائی عرشی نے تحصیلِ علم کو اپنا سب کچھ سمجھ کر عرصہ دراز تک اعلیٰ سے اعلیٰ ملازمت سے اپنا دامن بچائے رکھا۔ اور اپنی ضروریات کو محدود کر کے دولت کی آستاں بوسی گوارا نہ کی۔ موروثی جائداد اور والد صاحب کی ذاتی آمدنی خاندان اور اُن کی ضروریاتِ حیات کے لئے کافی تھیں۔ ڈاکٹر ممتاز علی خانصاحب بھی اپنے سعادت مند اور فاضل فرزند کے مشاغل علمی سے مسرور و مطمئن تھے انہوں نے کبھی کسی حالت میں عرشی صاحب کا وطن سے باہر نکل کر کسی اعلیٰ ملازمت سے وابستہ ہونا گوارا نہ کیا۔

ابتدا سے عرشی صاحب کا زیادہ وقت مشرقی علوم کے مطالعہ اور چھان بین میں صرف ہوتا۔ ان کا حلقۂ احباب محدود و مخصوص تھا۔ ان کے خاص علمی احباب میں ابتدا سے مولوی عزیز اللہ خاں عزیز مرحوم ـــ مرزا ہادی علی بیگ واثق شادانی (حال استاد السنۂ شرقیہ گورنمنٹ سنٹرل ماڈل ہائی اسکول لاہور) اور ڈاکٹر وجاہت حسین عندلیب شادانی (صدر السنۂ شرقیہ ڈھاکہ یونیورسٹی) شامل ہیں۔ باقی رام پور کے اکثر علماء و فضلاء اور اہل ادب حضرات سے رشتۂ یگانگت قائم تھا اور ہے۔ عرشی صاحب نیک سیرت، نیک نفس اور سادہ مزاج انسان ہیں ان کا رہن سہن، لباس تمام تر خالص مشرقی ہے۔ ہر موسم ہر موقعہ پر ان کا لباس کرتہ پاجامہ اور اچکن اور رامپوری ساخت کی مخملی ٹوپی رہا۔ اور آج تک وہی وضع قائم ہے۔ وہ اکہرے جسم کے خوش وضع خوش شکل خوش پیکر مردانہ حسن کا مجسمہ ہیں اس لئے ان کو اپنی طرز کا لباس زیب دیتا ہے۔ انہوں نے ابتدا سے خاندانی وضع کے مطابق داڑھی رکھی۔ جو ان کے حسین چہرے پر نہایت خوش نما معلوم ہوتی ہے۔ پابندئ مذہب نے ان کی طبع سلیم میں خاص صلاحیت پیدا کی۔ اوائل عمر سے پابند صوم و صلوٰۃ ہیں۔ لیکن کٹر ملائیت کے سخت مخالف۔ انہوں نے مذہبی علوم کو برتا ہے۔ احکام قرآنی کو سمجھا اور ان کی روشنی میں شرعِ دین کی تعلیم کو عملی جامہ پہنا کر اپنے عقائد و اعمال میں حقیقی اسلامی صلاحیتیں پیدا کی ہیں اور اور دوسروں کو اس سے متمتع کیا ہے۔ دوستوں، عزیزوں اور بیگانوں سے تعلقات میں "تلطف و مدارا" کے امتیاز اور حفظِ مراتب کو برقرار رکھتے ہوئے تعلقات و مراسم کو نباہنے میں ان کی طبع سلیم و وضع حلیم میں خاص ملکہ ہے۔

عرشی مجھ سے عمر میں چند سال بڑے ہیں۔ میرے ان کے تعلقاتِ یگانگت کی ابتدا تقریباً ۲۳ء سے ہوئی۔ اور بزم ادب رامپور کے وجود میں اس قربت میں اضافہ ہوتا رہا۔ اور علمی فضیلت میں تو وہ مجھ سے بزرگ تر ہیں۔ مگر ابتدا سے آج تک حاضر و غائب ہمیشہ سے میرے ان کے درمیان پُر خلوص مساوی تعلقات برادرانہ قائم ہیں۔ میرے اور عرشی کے درمیان تو برادرانہ و مخلصانہ مراسم استوار ہیں لیکن میں نے اکثر ان کو دوسرے اصحاب سے بحث و تمحیص کے دوران میں بھی کبھی ایسی حالت میں نہ دیکھا کہ جس سے یہ گمان ہو سکے کہ وہ خواہ مخواہ کسی پر اپنی فوقیت جتائیں یا فردِ مخالف سے اپنی اصابتِ رائے منوانے کے لئے ملائیت کی درشتی اختیار کر کے کج بحثی پر آمادہ ہوئے ہوں عرشی کی مرنجاں مرنج طبیعت کسی دشمن کے خلاف بھی قدمے سخنے قلمے کسی حیثیت سے آمادۂ انتقام نہیں ہوتی۔ اور یہ کہنا بیجا نہ ہو گا کہ شاید عرشی وہ فرشتہ خصلت انسان ہے جس کا کوئی دشمن نہیں اور اگر کوئی بلا وجہ دشمنی پر آمادہ بھی ہو تو عرشی میں بذاتِ خود دشمن آزاری کا مادہ نہیں۔ وہ دشمن کو اپنی حلیم الطبعی سے دوست تو بنا سکتے ہیں مگر اس کی تلخ کلامی یا ترش روئی کے جواب میں اپنے تیور اور زبان کو نہیں بگاڑ سکتے۔ اور یہ وہ خوبیاں ہیں جو اس دور کے بہت کم لوگوں میں پائی جاتی ہیں۔ بالفاظ دیگر وہ ان معدودے چند انسانوں میں سے ایک منفرد انسان ہیں جن کی نسبت کہا گیا ہے کہ ؎

سخت دشوار ہے انسان کا انساں ہونا

عرشی کا ظاہر و باطن یکساں ہے جو جیسے ملتے ہیں کھل کر ملتے ہیں۔ ہر کسی کو "بھائی" نہیں کہتے مگر جس کو اس رشتہ سے مخاطب کرتے ہیں اس کو صدق دل سے سمجھتے بھی ہیں۔ وہ عقائد کے لحاظ سے اہل سنت والجماعت ہیں۔ اور علمی و مذہبی مسائل و معتقدات میں حضرت امام ابو حنیفہؒ کے پیرو اسی لحاظ سے ان کے نام کے ساتھ "نعمانی" کی نسبت پائی جاتی ہے۔

عرشی کی پیدائش ۸ دسمبر ۱۹۰۴ء مطابق ۲۹ رمضان المبارک ۱۳۲۲ھ یوم پنجشنبہ کو اپنے آبائی مکان محلہ پھلواڑ (رام پور) میں ہوئی اور شاید اس ماہِ مبارک کی تمام برکات و فیوض ان کے حمیدہ عادات و خصائل میں بدرجۂ اتم ودیعت ہوئیں لیکن اپنی تمام علمی و مذہبی صلاحیتوں کے ساتھ وہ ایک عملی انسان اور روشن خیال شارحِ حیات ہیں۔ ان کی پیدائش کے ماہ و یوم نے انہیں "رمضانی یا جمعراتی" نہیں بنایا۔ وہ اس نوع کی کثر ملائیت سے متنفر اور اس قدر منکسر المزاج بزرگ ہیں کہ صحیح معنوں میں مولانا ہوتے ہوئے اس لقب سے شرماتے اور دوسروں پر اپنی فضیلت جتانے گھبراتے ہیں۔ حتیٰ کہ ان کی خاموش طبیعت نے شہرتِ عام سے ہمیشہ نفرت کی۔ اور کتاب خانہ کے گوشہ میں مقید ہو کر علم کے دریا بہانے کے باوجود اپنی ذات و صفات کو منظرِ عام پر لانا گوارا نہیں کیا۔ حالانکہ عرشی کی علمی، عملی زندگی تمام تر مشعلِ ہدایت ہے۔ مگر وہ کبھی سربراہے نظر نہیں آتے ـــــــ ان کے علمی، ادبی کارناموں کے دفاتر ہیں تحقیق و تنقید کے ذخائر ہیں لیکن ان میں سے بہت کم اشاعت پذیر ہوئے ہیں۔ اس کا بڑا سبب ان کا فطری حجاب اور قناعت اور پھر مقامی حالات کی وہ تنگ حدود جو انہوں نے اس محدود دائرہ میں اپنے اوپر عائد کر لیں

عرشی کی شخصیت کا قلمی پیکر جو ہمارے سامنے آتا ہے اس سے ان کے ظاہر و باطن دونوں کا پورا پورا اندازہ اس طرح ہوتا ہے:

تخلص کے عرشی۔ مزاج میں فرشی۔ فرشتہ صفت، مجسمہ خصلت، نسلی افغان، اصلی انسان۔ طبیعت میں وہ لوچ اور نرمی کہ افغانی گرمی کا شائبہ تک نہیں، سادگی کا مجسمہ۔ اخلاص و مروت کا پیکر، مخلص و متواضع، خوش خلق، خوش اطوار۔ یاروں کے یار۔ دشمن کے لئے بیکار۔ علم و فضل میں واقعی مولانا۔ مگر شگفتہ مزاجی و زندہ دلی میں جوانِ رعنا! کشادہ پیشانی، وسیع القلب نیک مشرب، نیک دل۔ تہذیب و علوم مشرقی کے دلدادہ، زمانہ کے انداز پر ہر معقول جدت قبول کرنے پر آمادہ۔ صورت و سیرت میں حسین، ظاہر و باطن سنجیدہ و متین۔ کم سخن مگر خوش گفتار، کم آمیز، نرم و بے ستیز مگر علم و عمل میں تیز! اس ممتاز شخصیت کو اسم با مسمّٰی کا لقب زیب دیتا ہے۔ جس کی ذات میں وہ امتیازی جواہرِ علم و فن پوشیدہ ہیں جو ہر کسی بحرِ علوم میں نہیں پائے جاتے۔ مگر وہ ایک ذخار سمندر کی طرح خاموش ہے جس میں جتنا ظرف ہے اتنا ہی وہ خاموش ہے ـــ کے مصداق اپنے علمی فضائل و ادبی کمالات سے موج در موج تشنگانِ علم و ادب کو متبحرانہ سکوت کے ساتھ فیضیاب کئے جا رہا ہے۔"

پیشتر کہا جا چکا ہے کہ عرشی صاحب نے ابتدا سے اپنے آبائی وطن رام پور کو اپنا ملجا و مسکن بنانے پر قناعت کر کے اس کو اپنی تمام و کمال سرگرمیوں کا مرکز قرار دیا۔

شروع میں چند دیگر علمی مصروفیتوں کے علاوہ کتاب خانۂ عالیہ رام پور (جو اب رضا لائبریری کے نام سے موسوم ہے) کے نایاب و نادر کتب ہائے گرانمایہ سے استفادہ کر کے کئی سال تک خلیفۂ دوئم حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے خطبات و خطوط اور حکیمانہ اقوال کی تحقیقات کی اور ان کو مرتب کیا۔ اسی زمانہ میں مسٹر چیمپین (Mr. Champan) کتاب خانہ سرکاری کے ناظم اعلیٰ تھے۔ انہوں نے عرشی صاحب کے ذوقِ علمی اور تجسس و تدقیق کی صلاحیتوں کا اندازہ لگا کر بڑے اصرار سے ان کو اپنی نیابت کے لئے رضامند کر لیا۔ عرشی نے اس عہدہ کو محض اس خیال سے قبول کیا کہ ان کا زیادہ وقت اس کتاب خانہ میں صرف ہوتا ہے۔ اگر وہ باضابطہ اس سے منسلک ہو جائیں تو ان کے مطالعہ میں

وہ نادر مخطوطات بھی آ سکیں گے جن تک ان کی رسائی ابھی ایک عام شہری کی حیثیت سے نہ ہو سکی تھی۔ چنانچہ اس مردم شناس انگریز کے ساتھ کام کرنے کے بعد ان کی صلاحیتوں کا حال اس کی زبانی نواب صاحب کو بھی بخوبی ہو گیا۔ یہ دیدہ ور فاضل انگریز مسٹر چیمپئن تو عرشی کے تبحر علمی تحقیقی لیاقت کا قائل و مداح تھا لیکن رفتہ رفتہ نواب صاحب بھی ان کے فضل و کمال اور اہلیت سے کما حقہٗ واقف ہو گئے۔ عرشی نے چیمپئن کی رہنمائی میں اس کو اپنا مونس و شفیق استاد تصور کر کے بڑی تندہی اور دل سوزی سے کام کیا۔ پھر ان کے ذوقِ علمی و فطری صلاحیتوں نے ان کے کام کی اہمیت کو اور بھی واضح کر دیا۔ یہ کتاب خانہ دنیا بھر کے ان چند گنے چنے عالیشان کتاب خانوں میں ممتاز حیثیت رکھتا ہے جن کے گرانمایہ نوادر کی زیارت کے لئے شیدایانِ علم و ادب دور دراز کے سفر اختیار کر کے وہاں آتے اور اپنی تشنگیٔ ذوق کی تسکین کی خاطر منت و محنت گوارا کرتے ہیں۔

ریاست رام پور روہیل کھنڈ (یو۔پی) کے علاقہ میں اپنے علم و کمال کے لحاظ سے ایک خطۂ مردم خیز تسلیم کیا جاتا ہے، جو سالہا سال سے فضل و کمال کا منبع رہا ہے۔ یہاں اسلامی تعلیمات اور علوم شرقیہ کی درسیات کے لئے مدرسۂ عالیہ۔ مدرسۂ قادریہ اور مطلع العلوم وہ ادارے ہیں جو عرصۂ دراز سے مرجعِ خلائق بنے ہوئے ہیں۔ اور جہاں دور دراز مقامات حتیٰ کہ بیرونی اسلامی ممالک سے طالبانِ علم آ کر دینی و دنیوی علوم کی تحصیل کرتے ہیں۔ اس سرزمین نے متعدد اکابرینِ دین و ملت اور کاملینِ علم و فن کو جنم دیا اور ملک کے اکثر علماء و فضلاء اور مشاہیر ادباء و شعراء کا مدت مدید تک مرکز بنی۔ ہندوستان کے بیشتر شعرائے متقدمین و متاخرین ہر دور میں دربارِ رام پور کی زینت بنے ہوئے تھے۔ اسی لئے سرکاری کتاب خانہ میں مطبوعہ و غیر مطبوعہ نادر کتب اور گرانمایہ نسخہ جات قدیم تصاویر اور خطاطی کے بے بہا نقوش محفوظ ہیں جن میں سے بیشتر کمیاب و نایاب نوادر کا درجہ رکھتے ہیں۔

جب عرشی صاحب نے مسٹر چیمپئن کی نیابت میں اس کتاب خانہ کا جائزہ لیا اور اس کے ترتیب و نظام کا بہ غائر مطالعہ کیا تو ان کو اندازہ لگا کہ ان نادرات کے ذخائر بے ترتیب بد حالی میں پڑے سڑ رہے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے کئی سال کی شبانہ روز جانفشانی کے بعد ان کو درست و منظم کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ناظمِ اعلیٰ مسٹر چیمپئن اپنے عہدہ سے سبکدوش ہو کر انگلستان روانہ ہوئے تو کتاب خانہ کی نظامت عرشی صاحب کے سپرد ہوئی۔ اور نواب صاحب کا کلی اعتماد ہونے کے بعد انہوں نے کتاب خانہ کی مکمل و مفصل فہرست مرتب کی۔ اور اس کی ایسی اصلاح و تنظیم کی کہ ملک کے اکثر مشاہیر علم و ادب نے اس کو ہندوستان کا بے نظیر ادارہ تسلیم کیا اور عرشی صاحب کی گرامی خدمات و اعلیٰ لیاقت کی قرار واقعی داد دی۔ اس مخزنِ علم و فن کی محافظت عرشی صاحب کا ایک ایسا عظیم کارنامہ ہے جس پر ہمیشہ فخر کیا جا سکتا ہے۔

اس تنظیم نے کتاب خانہ کے نادر جواہرات کو محفوظ کر دیا اور اس سلسلہ میں انہوں جو کاوش و محنت کی اور متعدد علمی ادبی کتابوں کا مسلسل مطالعہ کیا اس سے ان کے ذوق کی بالیدگی ہوئی۔ اس دوران میں ملک کے بیشتر شیدایانِ علم و ادب اور مشاہیر اس ادارہ سے استفادہ کرنے وہاں آئے عرشی صاحب کو ان سے ملنے، علمی مباحث میں حصہ لینے اور ان کے ساتھ ان کے ریسرچ کے کاموں میں شرکت و نگرانی کا بھی موقعہ ملا۔

بھائی عرشی کو خاص طور پر مذہب۔ تاریخ و تنقید ادب سے دلچسپی ہے۔ اس سلسلہ میں انہوں نے اپنی دقتِ نظر اور تحقیق و تفحص سے جو تخلیقات پیش کی ہیں ان کا مرتبہ دنیائے ادب میں نہایت بلند ہے۔ مولانا عرشی کا تبحرِ علمی، معروضی تنقید اور نکتہ رسی مشرف نگاہی مسلم ہے وہ ایک جید عالم اور اردو فارسی اور عربی کے بلند پایہ نقاد ہیں۔ اور ان کی یہ مسلم الثبوت حیثیت کسی تبصرہ کی محتاج نہیں۔ ان کی زندگی کا ایک ایک لمحہ علم و ادب کے لئے وقف، اور کسی نہ کسی شعبہ کی تحقیق و جستجو میں گزرتا ہے۔

عرشی صاحب ذہنی اور جسمانی طور پر نہایت صحت مند اور اعلیٰ انسان ہیں۔ وہ اپنے فرائض و معاملات میں نہایت مستعد و

ہیں ۔ اعزاء و احباب کے ساتھ برتاؤ میں بھی وہ اپنے اس اصول کا پورا پورا لحاظ رکھتے ہیں ۔ ہر معاملہ اور تعلق میں کامل خلوص و دیانت برتتے ہیں ۔ اور اپنے علمی و ادبی مشاغل کی انجام دہی میں بھی پوری طرح اپنے مقررہ اصول پر سختی سے کاربند رہتے ہیں ۔ اسی لئے پابندیٔ وقت ان کی فطرتِ ثانیہ ہے ۔ کوئی ترغیب یا کوئی قوت ان کے عزائم و اصولوں میں تغیر یا اضمحلال نہیں پیدا کر سکتی ۔

عرشی صاحب کی تحریر اور تقریر کا انداز تقریباً یکساں ہے ، ان کا طرزِ ادا نہایت شستہ ، سلیس اور نکتہ رسی کا مظہر ہے ، زبان و بیان میں بلا کی سلاست اور قدرت ہے ۔ اور ایسی شگفتگی کہ سنجیدہ سے سنجیدہ موضوع بہارستان نظر آتا ہے ۔

وہ ایک خوش بیان مقرر بھی ہیں ۔ اور طرزِ بدیع کے مالک بلند پایہ انشا پرداز اور خوش فکر شاعر بھی ۔ مگر دقیقہ سنجی و نکتہ دانی تمام صفات میں نمایاں ہیں ۔ پھر گفتار و کردار کی یکسانیت نے ان کو ایک ایسی امتیازی شان کا مالک بنا دیا ہے کہ عرشی سے ہم کلام ہو کر ہر شخص ان کی لطیف و جمیل شخصیت کے تمام اوصاف سے بآسانی روشناس ہو جاتا ہے ۔ اور ان کے دلکش کلام کی لطافتوں سے بہرہ اندوز ہو کر طبیعت میں فرحت و انبساط محسوس کرنے لگتا ہے ۔ اگر گفتگو علمی موضوع پر ہو تو معلوم ہوتا ہے کہ بحرِ علم سے سیراب ہو رہا ہے ۔ موضوع شعر و ادب ہو تو باغ و بہار کا احساس لے کر اُٹھے ۔ اور پھر اس ہمہ صفت موصوف انسان میں ان تمام کمالات کے باوجود علمیت و فضیلت کا غرور نام کو بھی نہیں ۔

ان کے حسین و متین چہرہ پر ہر وقت بشاشت نظر آتی ہے ۔ اور ان کو رنج و فکر میں بھی مسکراتے ہی دیکھا گیا ہے ۔ علماء و فضلاء کی محفل میں عرشی ایک فاضل اجل ہوتے ہیں ۔ سیاسی مذاکرات میں ایک باخبر مدبر اور بزمِ احباب میں ان کی شگفتہ مزاجی و بذلہ سنجی کچھ اور ہی بہار دکھاتی ہے بخصوصاً بے تکلف دوستوں میں وہ گلزار بن جاتے ہیں ۔ ان کی متانت و سنجیدگی میں بھی ایک کیف ہے ۔ زاہدانہ خشکی کا شائبہ تک نہیں ۔ ان کی خشک رندی پر ہزار پارسائی قربان ہیں ۔ مزاج میں متین شوخی اور سنجیدہ مزاح کی چاشنی ہے ۔ بعض اوقات وہ مطایبات کے ایسے لطیف پہلو نکالتے ہیں کہ اعلیٰ سے اعلیٰ ظرافت منہ تکتی رہ جاتی ہے ۔ برجستگی و بے ساختگی کا یہ عالم ہے کہ تحریر و تقریر میں کہیں بھی تکلف و تصنع یا آورد کا نام تک نہیں ہوتا ۔ احباب کے رنج و خوشی میں اس طرح شریک نظر آتے ہیں جیسے اپنے گھر میں ۔ قدیم دوستوں سے کہیں کسی حالت میں بھی ملاقات ہو بغلگیر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے ۔ اور موقعہ پر خوش طبعی سے نہیں چوکتے ۔

ایک بار ۱۹۵۴ء میں عرشی صاحب میرے قیام لکھنؤ کے دوران میں وہاں علمی مصروفیت کے سلسلہ میں تشریف لائے ہوئے تھے اور میرے پاس قیام پذیر تھے ۔ اسی عرصہ میں میرے ایک عزیز جنہوں نے پنجاب میں شادی کی تھی اور اپنی نئی دولہن کے ساتھ آئے تھے وہ بھی غریب خانہ پر مقیم تھے ۔ میرے یہ عزیز عرشی صاحب کے بے تکلف دوست تھے ۔ لیکن کسی وجہ سے عرشی صاحب کو ان کی شادی کی قبل سے اطلاع نہ تھی ۔ جب عرشی صاحب کی ان سے ملاقات ہوئی اور شادی کا حال معلوم ہوا ۔ تو انہوں نے کہا " ہم رسمی مبارکباد کے قائل نہیں ۔ اور شادی کی اس افواہ کو ماننے کے لئے نہیں تیار ۔ یہ شادی پھر ہوگی اور یہیں ہوگی ۔ بھاوج کو سلام ضرور کہہ دو ۔ مزاج تو ظاہر ہے ۔ آپ سے شادی کرنے کے بعد اس کا کیا پوچھنا ! "

آخر ایک پُر تکلف دعوت کے ذریعہ میں نے شادی منانے کا انتظام کیا اور شادی پھر منائی گئی ۔ اور اس واقعہ سے پانچ سال قبل جبکہ میں دہلی میں مقیم تھا ۔ میری شادی کے موقعہ پر دوسرے مخصوص اعزاء و احباب کو جو عرقی رقعے روانہ ہوئے ان میں جب عرشی صاحب کو یہ رقعہ پہنچا تو انہوں نے مجھ کو لکھا :

" بھائی ! آپ کی شادی کی اطلاع ملی ۔ آپ کی معقولیت کا خیال کرتا ہوں تو یقین نہیں آتا ۔ لیکن جب میں ' اپنے ابوالآباء (آدم) کی سنت ' کو پیش کرتا ہوں تو آپ کو انسانیت کا جامہ اختیار کرنا ہی ہوگا ۔ بہرحال سرگشتۂ خمار رسوم و قیود ہونا مبارک ' ! سوچتا ہوں آپ

جیسا سنجیدہ انسان جب شادی کرے تو احباب کیا کریں گے "

شادیوں کے اِس پُر لطف سلسلہ میں بھائی عرشی کی اپنی شادی بھی یاد آگئی - میری شادی سے کچھ عرصہ کے بعد اُن کی شادی ہوئی - میں دہلی میں ہی تھا - میرے نام رسمی دعوتی رقعہ کی بجائے ان کے قلم کی ایک تحریر موصول ہوئی - لکھا تھا ؎

مبارک باد مرگِ تو بہ عرشی

بھائی —— یہ سوگ منانے آیئے - بھاوج کو بیگم عرشی کا سلام کہہ کر منہ دلایئے - آخر ایک دن وہ آئیں گی اور یہ رسم آمنے سامنے ادا ہوگی - پھر میں یہ فریضہ پیشگی کیوں نہ ادا کردوں - ہمیں بھی مرزا نوشہ کے " خار رسوم و قیود " نے مار ڈالا. اور تیشہ بغیر نہ رہ سکے "

عرشی کے ادبی لطائف اور علمی مطائبات بے شمار ہیں - لیکن اس مضمون میں ان کی ذات و صفات کا تذکرہ ہے - فضل و کمال پر تفصیلی تبصرہ نہیں - اس لئے میں دانستہ چند ذاتی لطائف کے ذکر پر اکتفا کروں گا - بزمِ احباب کے لطیفوں کا بھی اگر تفصیلی بیان کرنے لگوں تو اس مختصر مضمون میں گنجائش نہیں ، ۱۹۴۳ء میں عرشی صاحب لاہور آئے ہوئے تھے - ان کے مخصوص احباب میں مولوی غلام ناصر خاں نگار مرحوم سابق ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ سنٹرل ماڈل ہائی اسکول کے یہاں لڑکی پیدا ہوئی - حسنِ اتفاق سے ولادت کے وقت عرشی صاحب غلام ناصر خاں صاحب کے مکان پر موجود تھے - لڑکی کی ولادت کی خبر سنتے ہی عرشی صاحب نے ان کو مبارک باد دی - اور فرمایا -

" مٹھائی منگوایئے "

اسی دوران میں کسی عزیز نے کہا کہ ' کسی مولوی کو بُلایا جائے لڑکی کے کان میں اذان دی جائے گی "

عرشی نے مسکرا کر کہا " بھئی - ہم سے بڑا مولوی کون ہوگا ' ہم خود اذان دیں گے " اور بڑے اصرار سے ہنستے ہوئے زنانہ میں پہنچے - اذان دی - اور باہر آکر مٹھائی کی مکرر فرمائش کی - اور بولے -

" اب تو میرے دو حصے ہوگئے - ایک بہ حیثیت مولوی اور ایک بچی کے چچا ہونے کا !

پھر لڑکی کا نام رکھنے کے ذکر پر فرمانے لگے -

" اس کی فیس علحدہ لوں گا - آخر داڑھی کی لاج بھی تو رکھنا ہے "

عرشی صاحب کے عزیز ترین احباب میں مرزا ہادی علی بیگ وامق (جن کا نام پہلے آچکا ہے) کا نام خاص ہے - مولانا وامق شادانی عرشی صاحب سے عمر میں بڑے ہیں - اور فضل و کمال میں خاص درجہ رکھتے ہیں - شادانی برادری میں ہم سب احباب اُن کو " ہادی بھائی " کہتے اور ان کا بہت احترام کرتے ہیں - اور یہ محترم بھائی ہم میں سے ہر ایک کو کبھی " میاں " کبھی " بھیا " کہہ کر بڑی شفقت سے مخاطب کرتے ہیں -

' ہادی بھائی ' بڑے پختہ عقائد کے شیر دل عالم فاضل بزرگ ہیں - کسی موضوع پر بحث ہو ان کے سامنے کسی کی مشکل ہی سے پیش چلتی ہے - اُردو زباندانی میں ان کو زندہ لغات کا درجہ حاصل ہے - عربی فارسی کے مستند فاضل ہیں - ساری عمر تحقیق علمی میں بسر کی - اور عروسِ علم کو گلے لگا کر تجرد کی زندگی گزار رہے ہیں - دوستوں کے جاں نثار ، ہمدرد اور دشمنوں کے جانی دشمن ان کے پُر خلوص کردار کی خاصیت ہے ، عرشی صاحب مولانا کا بیحد احترام کرتے ہیں اور دونوں میں انتہائی خلوص و مروت کے تعلقات ہیں - وہ عرشی صاحب کو " عرشی " " میاں " اور کبھی امتیاز علی خاں کہہ کر مخاطب کرتے ہیں - ان دونوں احباب کے درمیان جب کسی موضوع پر گفتگو چھڑ جائے تو کئی کئی گھنٹے

مسلسل جاری رہ سکتی ہے اور یہ موقع بیحد دلچسپ اور قابلِ دید و شنید ہوتا ہے۔
ہادی بھائی کا بلند بانگ طرزِ خطابت اور عرشی صاحب کی دھیمی اور سہل شگفتہ بیانی۔ بحث میں کئی ایسے موڑ آتے ہیں جہاں
ہادی بھائی عرشی صاحب سے روٹھنے اور بگڑنے لگتے ہیں۔ اور عرشی صاحب کو اصل موضوع کی اہمیت برقرار رکھتے ہوئے ان کو منانا
بھی پڑتا ہے۔ لیکن ہار شکست پر دونوں میں سے کوئی بھی آمادہ نہیں ہوتا۔ عرشی صاحب کے لئے محترم بھائی کے بگڑنے کا موقعہ ذرا
نازک بھی ہوتا ہے۔ لیکن اکثر خلوص پر انجام بخیر ہوا کرتا ہے۔ کبھی ہادی بھائی عرشی صاحب کی نکتہ سنجی اور علمی نکات سے متاثر ہو کر ان کو
بے اختیار گلے لگا لیتے ہیں۔ اس وقت ہادی بھائی اپنے "شکستِ پندار" پر ہٹ دھرمی سے کام نہیں لیتے بلکہ عرشی صاحب کے تبحرِ علمی کو
تسلیم کر کے عالمِ سرخوشی میں جھومنے لگتے ہیں۔ عالمانہ فتح و شکست اور مخلصانہ مجادلہ کا یہ نظارہ نہایت پُرکیف اور دیدنی ہوتا ہے۔

غرضیکہ عرشی صاحب کا مخلص ترین دوست اور شدید ترین مخالف۔ بڑے سے بڑا عالم اور بلند پایہ ادیب ان کی علمی فضیلت اور
دقیق و عمیق فکر کا قائل نظر آتا ہے۔ دوستوں کو ان کی ذات و صفات پر ناز ہے اور مخالف ان کا لوہا ماننے پر مجبور ہیں اور حقیقت یہ ہے
کہ یہ بےلوث، بے غرض ایثار و خلوص کا مجسمہ احباب کا مونس و غمخوار اور دل آزاروں کے حق میں بے آزار ہستی کا حکم رکھتا ہے۔

ایک محترم عزیز دوست کی حیثیت سے مجھے ان کے اخلاص و مودت پر فخر و مسرت ہے اور یہ امر میرے لئے باعثِ ناز ہے کہ
میں نے جب کبھی ان سے اپنے رسالہ نیرنگستان (دہلی) اور بعض احباب کے لئے مضمون کی فرمائش کی تو انہوں نے محروم نہ رکھا۔ اور
ان کا ارشاد ہے کہ "تمہارا اصرار میری کوتاہ قلمی پر سدا غالب آتا ہے۔"

لیکن جس زمانہ میں (۱۹۳۹ء سے ۱۹۴۷ء تک) میں آل انڈیا ریڈیو میں پروگرام ڈائرکٹر تھا اور لکھنؤ اسٹیشن پر تعینات رہا۔ عرشی
صاحب سے بارہا تقاضہ و اصرار کرتا رہا کہ ریڈیو اسٹیشن سے کسی علمی ادبی موضوع پر تقریر نشر کریں مگر انہوں نے ہمیشہ کتاب خانہ کی مصروفیت
کا عذر پیش کر کے مجھے خاموش رہنے پر مجبور کر دیا۔ آخر میرا اصرار حد سے متجاوز دیکھ کر انہوں نے دورانِ ملاقات میں مجھے اس ٹال مٹول
کی وجہ صاف طور پر بتا دی۔ انہوں نے فرمایا۔

"بھائی۔ بات یہ ہے کہ آپ اس محکمہ کے با اختیار رکن ہیں۔ اور میرے عزیز دوست۔ اس کا علم اکثر اصحاب کو ہوگا۔
میں آپ کے اصرار سے مجبور ہو کر چند بار تقریر نشر کروں گا۔ لوگوں میں یہ چرچا ہونے لگے گا کہ میں آپ کی دوستی سے
فائدہ اٹھا کر ریڈیو کو اپنی شہرت کا آلۂ کار بنا رہا ہوں، میرے انکار اور آپ کے اصرار سے کون خبردار ہے۔ آپ پر
خواہ مخواہ دوست نوازی کا الزام آئے گا اور میرا ضمیر مطمئن نہ ہوگا۔"

اس سے عرشی صاحب کے عقائد کی پختگی اور قناعت پر بخوبی روشنی پڑتی ہے۔ اس سلسلہ میں جب میری کوئی بحث و تکرار کارگر نہ
ہو سکی مجھے بیحد مایوسی ہوئی۔ اکثر اربابِ ذوق جو عرشی صاحب کے مداحوں و معتقدوں میں سے تھے ان کے سامنے بھی مجھ کو ندامت
محسوس ہوتی۔ وہ طعنے دے دے کر مجھ کو زچ کر دیتے کہ مولانا عرشی سے آپ کے ایسے یگانگت کے مراسم ہیں اور آپ کا ریڈیو اسٹیشن ان کی
تقریروں سے محروم ہے۔

مجھے اپنی ناکامی کے احساس نے ستانا شروع کیا۔ آخر میں نے ان کی بلا اطلاع "یومِ غالب" پر ان کی تقریر پروگرام میں شامل کر
دی۔ اور مقررہ تاریخ سے چند روز قبل خود رامپور گیا۔ اور محض تقریر کی خاطر ان سے لکھنؤ اپنے ساتھ چلنے کے لئے اصرار کیا۔ وہ میری
اس فرمائش کو نہ ٹال سکے اور لکھنؤ پہنچ کر میں نے مطبوعہ پروگرام ان کے سامنے پیش کر کے کنٹریکٹ پر دستخط کرنے اور تقریر لکھنے کی
عرضداشت پیش کر دی۔

عرشی صاحب حیران تھے اور جب میں نے ان سے کہا کہ اگر اب آپ میری اس درخواست پر انکار کریں گے تو میری عزت اور ریڈیو اسٹیشن کی پابندئی نظام (جو میرے سپرد ہے) معرضِ خطر میں ہوگی۔ آخر عرشی صاحب نے مسکرا کر قلم اٹھایا۔ کنٹریکٹ فارم پر دستخط کئے اور تقریر لکھنے کی فکر کرنے لگے۔ چنانچہ انہوں نے مختصر مدت میں معرکہ آرا تقریر لکھی اور نشر کی۔ جو بیحد مقبول ہوئی اور ہمیں بے شمار تعریفی خطوط موصول ہوئے۔ میں نے اس کامیابی پر بعد شکریہ ان کی خدمت میں عرض کیا ؎

لائے عرشی کو الحیا کرکے کفر توڑا خدا خدا کرکے

ہنس کر فرمایا "خدا خدا کرو بھائی۔ میں اس لائق کہاں!"۔ اس کے بعد چند بار اور بھی انہوں نے میرے تقاضوں پر مجبور ہو کر ریڈیو اسٹیشن پر لطف فرمایا۔ اور میں ہمیشہ ان کو اس حیلے سے منا لایا کہ "بر سبیلِ تقریب چند روز کے لئے آپ لکھنؤ تشریف لے آتے ہیں اور ملاقات کا لطف نصیب ہو جاتا ہے"۔

جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے عرشی صاحب خاموش طبع قانع اور کم آمیز بزرگ ہیں۔ لیکن اربابِ علم و ادب سے ان کے مراسم بڑی حد تک قربت و یگانگت کے ہیں۔ اور گو وہ طبعاً شہرت پرستی سے محترز رہتے ہیں لیکن ہندوستان و پاکستان کے علاوہ تقریباً تمام بیرونی اسلامی ممالک میں ان کی علمی و ادبی تخلیقات اور مستند فاضل شخصیت کو بڑے احترام و وقعت کی نظروں سے دیکھا جاتا ہے۔

آخر میں میں یہ عرض کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ مولانا عرشی کی ہمہ گیر شخصیت پر سیر حاصل مقالہ لکھنا میرے بس کی بات نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ عرشی کی شخصیت میں ایسا تنوع اور خلوص و صداقت ہے کہ ان کے علمی ادبی کارناموں کے مطالعہ ہی سے اربابِ علم و ادب ان کی شخصیت سے غائبانہ طور پر روشناس ہو جاتے ہیں۔ اور اس پیارے انسان کی پیاری علمیت و شخصیت سے والہانہ پیار کرنے لگتے ہیں۔ یہ مختصر مقالہ بھائی عرشی کے عالمانہ خلوص و محبت کی نذر کرکے میں وہی مسرت محسوس کر رہا ہوں جو ان سے گلے مل کر ہوتی ہے۔

سیّد امتیاز علی تاج

شوکت تھانوی

"چچا چھکن نے تصویر ٹانگی" یہ تھا وہ مضمون جسے پڑھ کر سید امتیاز علی تاج ذہن میں کچھ اس طرح اُبھرے جیسے جوانی میں کسی کو اپنا کوئی وہ کھلونا یاد آ جائے جس سے وہ بچپن میں کھیلا کرتا تھا۔ اور کچھ ایسا محسوس ہوا کہ گویا بچپن کا کوئی بچھڑا ہوا ساتھی یکایک مل گیا ہو۔ حالانکہ میں کبھی سید امتیاز علی تاج سے نہ ملا تھا مگر ان کے اخبار پھول ہی سے دراصل میں نے اُردو سیکھی تھی۔ یہی پہلا اخبار تھا جو باقاعدہ میرے نام آتا تھا اور یہی اخبار تھا جس میں میرے بڑے بھائی ارشد تھانوی صاحب میرے نام سے کہانیاں لکھ لکھ کر چھپوایا کرتے تھے حالانکہ میں اس وقت شوکت تھانوی نہیں صرف محمد عمر سلمۂ تھا۔

چچا چھکن کے سلسلۂ مضامین کو بڑی یگانگت کے ساتھ پڑھتا رہا۔ پھر سید امتیاز علی تاج کا زندۂ جاوید کارنامہ انارکلی کی صورت میں نظر سے گذرا۔ اور دل میں ایک بے ساختہ ارمان پیدا کر گیا کہ کاش میں ان سے کبھی مل سکتا۔

۱۹۲۸ء میں پہلی مرتبہ لاہور آنا ہوا۔ لاہور میں میرے لئے جو کشش تھی وہ علامہ اقبال۔ سر عبدالقادر اور امتیاز علی تاج کی تھی یعنی جہانگیر کے مقبرے اور شالامار باغ سے بھی زیادہ کشش جس کا ثبوت یہ ہے کہ میں سفر میں نہ جہانگیر کا مقبرہ دیکھنے گیا نہ شالامار کی سیر کی البتہ علامہ اقبال۔ سر عبدالقادر اور امتیاز علی تاج سے نہایت بے تابی کے ساتھ ملنے کے لئے پہنچ گیا۔

ریلوے روڈ پر دارالاشاعت ہی میں سید امتیاز علی تاج کو بڑے بانکے سجیلے جوان رعنا کی صورت میں مَیں نے دیکھا۔ خوبصورت پنڈلیوں میں چُھبا ہوا چوڑی دار پاجامہ اپیرین سلیم شاہی جوتا کتاؤ کے کام کا کرتا پہنے۔ سنہری کمانی کی عینک لگائے آپ اپنے ڈرائینگ روم میں مجھ سے ملے۔ مولانا چراغ حسن حسرت مرحوم بھی اس وقت آپ کے پاس ہی موجود تھے۔ یہ ملاقات اس قدر رسمی اور واجبی سی ثابت ہوئی کہ آج تک اپنی اس بیچدانی پر شرم آتی ہے کہ ان سے مل تو لئے مگر اپنا تعارف ان سے نہ کرا سکے اور تعارف کراتے بھی کیا۔ تھے ہی کس کھیت کی مولی۔

تفصیلی ملاقات پھر ۱۹۳۷ء میں ہوئی جب سیٹھ دلسکھ پنچولی کے بلاوے پر لاہور آنا پڑا۔ تاج صاحب اُس زمانے میں بہاولپور روڈ پر رہتے تھے۔ کوٹھی کے برآمدے میں پہنچتے ہی ایک نہایت اشرف المخلوقات قسم کے طوطے کا عظیم الشان پنجرہ نظر آیا اور دیکھتے ہی دیکھتے انواع و اقسام

کی بلیاں اسی برآمدے میں کلیلیں کرتی ہوئی نظر آئیں مگر اس سے قبل کہ اس کوٹھی کو زو سمجھ کر میں لوٹتا خود تاج صاحب برآمد ہوئے اور اپنے اُس ڈرائینگ روم میں لے گئے جس میں جہانگیری کی دانی کا قلعہ منقل جیبی کے طور پر استعمال ہوتا تھا اور پیتل کے بگلوں اور مارسوں کی وہ کثرت تھی کہ گویا اگر ایک سے بچے تو دوسرا سر پر ٹھونگ ضرور مارے گا۔ نارنجی رنگ کا یہ ڈرائینگ روم جس کی ہر چیز نارنجی تھی کچھ عجیب رومانی فضا پیش کر رہا تھا۔ لاہور میں میرے لئے یہ پہلا گھر تھا جس میں مجھ کو صحیح قسم کے پان کھانے کو ملے اور یہ دیکھ کر دل باغ باغ ہو گیا کہ خود تاج صاحب بڑے سلیقے سے پان کھاتے ہیں۔ بڑی تفصیلی باتیں ہوئیں۔ ملاقاتوں کا بھی ایک سلسلہ قائم ہو گیا کبھی پنچولی کے اسٹوڈیو میں ملاقات ہوتی تو کبھی ریڈیو اسٹیشن پر مگر ابھی تک ایک خاص فاصلہ درمیان تھا اور ۱۹۴۷ء تک یہ فاصلہ اسی طرح قائم رہا۔

قیام پاکستان کے بعد تاج صاحب کی تجویز پر ریڈیو پاکستان نے ایک تعمیری پروگرام "پاکستان ہمارا ہے" کے نام سے شروع کیا۔ میں تو ریڈیو میں تھا ہی اب تاج صاحب بھی آ گئے اور شروع کر دیا یہ پروگرام۔ یوں تو خیر اُس وقت جوش عمل کا ہر شعبہ اور ہر گوشے سے حیرت انگیز مظاہرہ ہو رہا تھا مگر ہم لوگوں نے تو واقعی یہ سمجھ رکھا تھا کہ پاکستان گویا ہم ہی دونوں کو بنانا ہے صبح سے شام تک وہ جنون انگیز مصروفیت کہ نہ کھانے کا ہوش نہ پینے کا بس عالم یہ تھا کہ ؎

نہر پہ چل رہی ہے پن چکی　　　دھن کی پوری ہے کام کی پکی

نہر کی ایک طرف میں ہوں دوسری طرف تاج صاحب وہ بھی لکھ رہے ہیں اور میں بھی پروگرام ایک ہی ہے مگر دونوں مل کر اس طرح لکھ رہے ہیں کہ نہ وہ تھکتے ہیں نہ میں تھکتا ہوں کہ یکایک تاج صاحب نے لکھتے لکھتے کہا "یار علامہ اب یہاں ہونا چاہئے ایک نظم لحافوں کے متعلق"

جی ہاں اسی قرب نے اب یہ تعلقات پیدا کر دیئے تھے کہ تاج صاحب نے مجھ کو علامہ کہنا شروع کر دیا تھا۔ خیر علامہ تک بھی غنیمت تھا مگر خدا اس "یار علامہ" کی ترکیب ملاحظہ فرمایئے ——— ہاں تو کہنے لگے "یار علامہ اب یہاں ہونا چاہئے ایک نظم لحافوں کے متعلق"

اب بتایئے لحاف کے متعلق نظم کہاں سے لائی جائے۔ نہ اقبال نے لحاف کو کبھی موضوع سخن بنایا نہ مولانا ظفر علی خاں نے مگر تاج صاحب ہیں کہ لحاف پر نظم ضرور چاہتے ہیں۔ آخر عاجز آ کر عرض کیا۔

"تاج صاحب لحاف پر تو مشکل ہی سے اساتذہ میں سے کسی نے نظم کہی ہو گی"

بڑے اطمینان سے بولے "تو کہہ ڈالو نا علامہ آٹھ دس شعر لحاف نہ سہی کمبل سہی"

پھر مصیبت یہ کہ نظم بھی وہ ایسی نہ چاہتے تھے کہ ؎

رب کا شکر ادا کر صاف　　　جس نے بنایا تیرا لحاف

بلکہ مقصد یہ تھا کہ سردی میں اکڑنے والے مہاجرین کا وہ دلدوز مرقع اس نظم میں پیش کیا جائے کہ سننے والوں کے بستر میں کانٹے بچھ جائیں اور وہ اپنے گدے گدے بستر چھوڑ کر کھلے آسمان کے نیچے سرد راتیں گزارنے والے مہاجرین کے لئے اوڑھنا بچھونا لے کر دوڑ پڑیں۔ چنانچہ شروع کی یہ نظم کچھ اس طرح کہ ؎

کانپتے تارے لرزتی چاندنی سکڑی فضا　　　برف کی پیغامبر تھی رات ہر موج ہوا
آتش جو الہ کو تھا بے کسی کا اعتراف　　　آگ خود بھی سو رہی تھی راکھ کا اوڑھے لحاف

اور ختم یہ نظم اس طرح ہوئی کہ جب میں کمبل تقسیم کرنے ایک مہاجر خاتون کے پاس پہنچا ہوں جو گود میں بچہ لئے بُت بنی بیٹھی تھی تو اس کا عالم یہ تھا ؎

گود میں بچہ تھا اس کے پھر بھی وہ بے آس تھی　　　اس کو تو معذور ہونا تھا کہ دولت پاس تھی
لیکن اس کو دیکھ کر کمبل جو کھینچی آہ سرد　　　اس میں مایوسی تھی اس میں بیکسی تھی اس میں درد

دفعتاً بجلی گرائی اُس نے جب مجھ سے کہا — آپ اب لائے ہیں کمبل جب یہ بچہ سو گیا
جائیے لیجائیے کمبل تو اب بیکار ہے — مجھ کو کمبل کی جگہ اس کا کفن درکار ہے

اور اب جورات کو آٹھ بجے یہ پروگرام پیش ہوا ہے تو پروگرام ختم کرنے کے بعد ابھی ہم لوگ ریڈیو اسٹیشن سے روانہ بھی نہ ہوئے تھے کہ لحافوں اور کمبلوں سے بھرا ہوا ایک ٹرک ریڈیو اسٹیشن پہنچ گیا۔ جس کو ہم لوگوں نے کیمپ کی طرف روانہ کیا۔ معلوم نہیں یہ حالات کا تاثر تھا یا جوشِ عمل کا خلوص کہ اسی پروگرام کے متعلق مہاتما گاندھی تک نے اپنی پرارتھنا سبھا میں کئی مرتبہ تاج صاحب کا اور میرا نام لے لے کر کہا کہ یہ دونوں پاکستان سے جو تعمیری پروگرام پیش کر رہے ہیں وہ صرف پاکستان کی خدمت نہیں کر رہا ہے بلکہ عام انسانیت کی خدمت انجام دے رہا ہے۔

اس ذکر کو تفصیل میں لے جانے کی ضرورت یوں پیش آئی کہ تاج صاحب کی اس سخت کوشی کے بعد اب ذرا اس کا وہ عالم بھی ملاحظہ فرمایئے جس کو پطرس بخاری "پینک" کہا کرتے ہیں۔ تاج صاحب کو ایک فیچر لکھنا ہے اور اُن سے فیچر لکھوانا ذمہ داری میری ہے چنانچہ مقررہ تاریخ سے ایک ہفتہ قبل ہی سے میں روزانہ ان کو ٹیلیفون کر دیا کرتا ہوں اور جواب میں یہ سن لیتا ہوں " لاحول ولاقوۃ میں سمجھا تھا کسی ضروری کام سے فون کیا ہوگا " یہاں تک کہ اب گویا کل وہ فیچر ہونے والا ہے اور مسودہ آج بھی ندارد۔ مجبور ہو کر دوڑا ان کی کوٹھی کی طرف اور وہ ادھم مچایا کہ آخر تاج صاحب کو بھی نیند بھرا معمول خواب چھوڑ کر اٹھنا پڑا۔ جمائیاں اور انگڑائیاں لیتے آفس روم میں آگئے۔ بجائے اس کے کہ میں اس تکلیف دہی کی معافی چاہتا میں نے براہِ راست فیچر کا مطالبہ پٹھانوں کے قرض والے تقاضے کی طرح شروع کر دیا کہ " تاج صاحب کب اس کی کاپیاں بنیں گی۔ کب ریہرسل ہوگا کب وہ پیش ہوگا۔

میرا یہ اضطراب دیکھئے اور آپ کا یہ اطمینان کہ عینک آنکھوں سے اٹھا کر ماتھے پر لگا لی آنکھوں کو ملا اور پھر نہایت سنجیدگی سے فرمایا۔ " یار علامہ میں نے کئی مرتبہ لکھنے کا ارادہ کیا۔ کچھ نوٹس بھی تیار کئے۔ مگر کچھ موڈ پیدا نہ ہو سکا۔ کوئی ڈھب پیدا نہ ہوا۔ اوپر ہی اوپر خیالات آئے اور اوپر ہی اوپر غائب ہو گئے۔ یار چھوڑ بھی اس ذکر کو۔ پان کھاؤ۔ "

اور جب انہوں نے دیکھا کہ یہاں پان کے بجائے زہر کھانے کا ارادہ ہو رہا ہے اور آنند کی اس حد کو پہنچ چکی ہے کہ رو دینے کو جی چاہ رہا ہے تو ایک دم یہ جمائیاں بھی ختم اور انگڑائیاں بھی غائب اور ایک دم کمر باندھ کر تیار بھی ہو گئے۔

" تو یار علامہ مرا کیوں جاتا ہے لکھے دیتے ہیں نا۔ چار بجے مسودہ منگا لینا "

اور پھر تین بجے ٹیلیفون آ گیا کہ مسودہ منگا لو۔

تاج صاحب کی یہ کیفیت اور کیفیات کا یہ تضاد ان کی زندگی کا ایک عام خاصہ ہے کہنے لگے " یار علامہ یہ علمی مشاغل واہیات اس تضیع اوقات کے بجائے اگر اپنا ہی کام دیکھیں تو بیڑہ پار ہو جائے۔ میں نے طے کر لیا ہے کہ بس یہ دھندا ختم۔ "

میں یہ سن کر آ گیا اور اتنی ہی دیر میں نہ جانے کس کس سے کہہ بھی دیا کہ تاج صاحب علمی مشاغل سے کنارہ کش ہو گئے ہیں کہ اتنی ہی دیر میں ٹیلیفون چلا آ رہا ہے " یار علامہ یہ کیا واہیات ہے کہ ہر وقت دفتر میں بیٹھے رہتے ہو۔ خدا کہیں جاتے۔ "

پوچھا " خیریت "

معلوم ہوا کہ کسی پروڈیوسر نے کچھ ایسے اخلاقی دباؤ ڈالے کہ پھر کہانی دینے کو تیار ہو گئے اور یہ بھی نہیں معاوضے کی معقولیت نے ارادہ بدلنے پر مجبور کیا ہو۔ جی نہیں صرف چند جذباتی باتیں کچھ ملکی اور قومی قسم کی اپیل کہ پاکستان کی فلم انڈسٹری منجدھار میں ہے اور اس فلم سے یہ ڈوبتی ناؤ پار ہو جائے گی وغیرہ وغیرہ بس تاج صاحب پھر پگھل گئے۔ حالانکہ اگر یہی بات اُن سے کہہ دی جائے تو صاف مکر جائیں گے کہ " یار علامہ عجیب فضول ہے تو بھی میں اب ایسا بھی موم کی ناک نہیں ہوں " حالانکہ موم کی ناک ہی کیا سر تا بقدم موم کے ہیں۔

میں نے اپریل ۱۹۴۳ء میں اپنی کتاب شیش محل میں تاج صاحب کے متعلق کس قدر غلط بات لکھی ہے کہ " خالص تجارتی آدمی ہیں مگر صورت

سے بالکل ساہوکار نظر نہیں آتے " تاج صاحب پر اس سے بڑا اتہام اور کوئی نہیں ہو سکتا کہ ان کو تجارتی آدمی کہا جائے ۔ پہلے میں نے یہی بات لکھی تھی اور اب خود تاج صاحب اسی بات کا مجھ کو یقین دلانا چاہتے ہیں مگر میں یہ ماننے کو تیار نہیں ہوں کہ وہ تجارتی آدمی کسی صورت سے ہو بھی سکتے ہیں ۔ روپے پیسے کے معاملے کی بات میں ان کی طرح شرمانے والا کیونکر تجارتی آدمی ہو سکتا ہے ۔ یہ معاملات ان کی طرف سے اکثر مجھ کو طے کرنا پڑے لہٰذا ان سے زیادہ تجارتی آدمی تو میں ہوا ۔

تاج صاحب میں ممکن ہے کچھ خامیاں بھی ہوں مگر ان کی ایک خوبی نے کم سے کم میری نظر سے ان کی ہر خامی کو چھپا دیا ہے کہ وہ آج بھی طالب علم ہیں ۔ ڈراما اُن کا فن ہے ۔ مکالمہ نویسی میں ان کی عظمت کا اعتراف نہ کرنا دھاندلی ہے مگر آج بھی وہ کسی مبتدی سے کسی آئے گئے سے مطلب یہ کہ کسی سے بھی اپنے اسی فن کے سلسلے میں کوئی مشورہ لیتے کبھی نہیں ہچکچاتے اور اگر کسی نے ایسا مشورہ دے دیا جس کو ان کے دل نے قبول کر لیا تو داد دینے میں بھی دیر نہیں کرتے " ہاں اب بات بن گئی یار آدمی ہو زر خیز "

اسی کے ساتھ وہ خطرناک حد تک اُس شخص کے لئے مُنہ پھٹ بھی بن جاتے ہیں جو غیر ضروری طور پر اُن کے سامنے بننے کی کوشش کرے ۔ بڑے بڑے بُت وہ گرا چکے ہیں اور چھبتے ہوئے ایک آدھ فقرے سے بر خود غلط قسم کے لوگوں کی ایسی قلعی کھولی ہے کہ وہ ان کی چشمِ مروت ڈھونڈتے ہی رہ گئے ۔

گھر میں اُن کی حیثیت ایک دوست باپ ۔ ایک مہذب شوہر اور ایک فراخ دل آقا کی ہونے کے علاوہ ایک معصوم بچے کی بھی ہے جو آنکھ بچا کر بد پرہیزی بھی کر سکتا ہے ۔ اور پھر نہایت بھولپن سے اُس کا اعتراف بھی کر لیتا ہے ۔ مثلاً پھوٹ گئی نکسیر اور ڈاکٹر نے طے کر دیا کہ یہ بلڈ پریشر کا شاخسانہ ہے چنانچہ تمباکو قطعاً بند نہ پان میں کھا سکتے ہیں نہ سگریٹ کے طور پر استعمال کر سکتے ہیں اور کمال کیا تاج صاحب نے کہ واقعی وہ پان بھی چھوڑ دیا جو ان کی زندگی کی واحد عیاشی تھا ۔ میں اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر صرف یہ کہہ سکتا ہوں کہ نکسیر لاکھ پھوٹے مگر پان کے سلسلے میں تقدیر پھوٹ جائے یہ میں برداشت نہیں کر سکتا ۔ خیر میں تو یوں بھی بد پرہیز ہوں اور بڑی گھٹیا قسم کی بد پرہیزیاں کر گزرتا ہوں مثلاً گلے میں درد تھا ڈاکٹر نے بولنے کی قطعی ممانعت کر دی ۔ اور کاغذ پنسل سرہانے رکھ دیا کہ لکھ کر بات کیا کرو ۔ چنانچہ میں باتیں تو لکھ لکھ کر کرتا رہا مگر جب تنہائی ملتی تھی تو تھوڑا بہت گا لیا کرتا تھا ۔

تاج صاحب نے شروع شروع میں تو بڑی پابندی سے پرہیز کیا پان واقعی نہیں کھایا مگر جب ان کو حقہ پینے کی اجازت مل گئی تو چوری چھپے سگریٹ بھی پینے لگے اور بیگم حجاب امتیاز نے مورد الزام اِن کو نہیں بلکہ اُن کو قرار دیا جو اُن کو سگریٹ پلا دیتے ہیں ۔ میں نے اب تک سنجیدگی سے پان یا پان کے خشک مسالے کی دعوت نہیں دی ہے ورنہ شاید میں ان کو اپنے اعتماد میں لے کر اور رازداری کا وعدہ کر کے تمباکو بھی کھلا دیتا اور وہ میری دوستی کے بے انتہا قائل بھی ہو جاتے ۔

تاج صاحب مدت سے لکھ رہے ہیں اور یہ سلسلہ جاری ہے اُن کا قلم ابھی بوڑھا نہیں ہوا ہے مگر فلمی سرگرمیوں نے انار کلی کے خالق سے کوئی ایسی ہی تخلیق اب تک ممکن نہ ہونے دی ۔ وہ کہتے ہیں کہ " یار علامہ یہ فلمی مشاغل واہیات " مگر مصیبت یہ ہے کہ اب یہ کمبل نہیں چھوڑتا ۔

حال ہی میں آپ ایک نئے عزم کے ساتھ اپنے دار الاشاعت کی طرف متوجہ ہوئے ہیں اور اس توجہ کے کئی شاندار ثبوت بھی پیش کر چکے ہیں ۔ سلیقہ ۔ محنت اور انہماک کی اب بھی کمی نہیں مگر خدا کرے کوئی فلم پروڈیوسر پھر نہ آ جائے ۔

صوفی غلام مصطفیٰ تبسم

محمود نظامی

تبسم پروفیسر صوفی غلام مصطفیٰ کا نام اور تخلص ہی نہیں حلیہ بھی ہے فطرت بھی ہے اور عادت بھی۔ لیکن اگر پروفیسر تبسم صوفی بھی کہلاتے ہیں تو یہ تصرف پر ایک ذی روح طنز ہے کیونکہ جو لوگ صوفی غلام مصطفیٰ تبسم کو پوری طرح نہیں جانتے انہیں اس پوشیدہ دلی پر بعض اوقات کھٹے کافر کا بھی گمان ہو سکتا ہے۔

میرے اُن شفیق اُستادوں میں، جنہوں نے پچھلے تیس برس کے عرصے میں مجھے سکھانے پڑھانے کی ایک مسلسل کوشش کو جاری رکھا ہے صوفی غلام مصطفیٰ تبسم ایک ایسے بزرگ ہیں جن کی شخصیت کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ جو کچھ نظر آ رہے ہیں وہ دراصل ہیں یا نہیں اور وہ جو کچھ دراصل ہیں وہ نظر بھی آتے ہیں یا نہیں، میں نے جب انہیں پہلے پہل دیکھا تھا تو میں خود کئی قسم کے اوہام میں گرفتار ہو گیا تھا، یہ انیس سو اٹھائیس کی بات ہے میں اسلامیہ کالج لاہور میں فرسٹ ائیر میں پڑھتا تھا۔ ایک شام میں اور میرے چند ہم جماعت اپنے اُستاد ڈاکٹر تاثیر کے ہاں بارود خانہ سعد والی حویلی میں بیٹھے کسی درسی مسئلے پر ان کے خیالات سن رہے تھے کہ اچانک ایک چھوٹے قد کے دبلے پتلے بزرگوار جو اپنے حلیے کے اعتبار سے لاہور کے مولویوں کے نمائندے معلوم ہوتے تھے کمرے میں وارد ہوئے اُن کے آتے ہی تاثیر کا چہرہ یوں کھل گیا گویا انہیں کوئی نعمت ہاتھ آ گئی ہے۔ اور وہ "آ بھئی صوفی" کا فقرہ ادا کرتے ہی درس و تدریس کے مسئلے کو بھول کر [illegible] پر اپنی فقرہ بازیوں، پھبتیوں اور طرح طرح کے مزاحیہ کلمات کے ساتھ پل پڑے۔ ان میں سے اکثر فقروں میں بڑے خوفناک قسم کے ذم کا پہلو نکلتا تھا، جس سے صوفی صاحب کی ذات کے بارے میں کوئی شریفانہ یا معقول رائے قائم کرنا قدرے مشکل تھا۔ لیکن مجھے یاد ہے صوفی صاحب نہایت متانت اور سکونِ قلب سے تاثیر کے ان فقروں کا چپ چاپ لطف لیتے رہے۔ کبھی کبھی وہ کنکھیوں سے تاثیر کے شاگردوں کو ایک نظر دیکھ لیتے غالباً اس خیال سے کہ ان برخورداروں کی موجودگی میں اب کوئی جواب دینا مناسب نہیں لیکن جب تاثیر کی خوش کلامی بہت ہی طوالت اختیار کر گئی تو صوفی صاحب نے میز پر رکھی ہوئی پلیٹ میں سے پان اٹھایا اور اسے چباتے ہوئے ایک بھرپور تیور سے تاثیر پر ایک فقرہ چست کیا۔ تو طلبہ کی ساری مجلس اپنے اُستاد کے ادب کے باوجود ہنستے ہنستے بے حال ہو گئی۔

اسی مجلس میں مجھ پر پہلی مرتبہ تبسم کی طبیعت کے کئی ایسے جوہر کھلے جو آج بھی ان کی شخصیت اور کردار کی نمایاں ترجمانی کرتے ہیں اُن کی طبیعت کا سکون اور ٹھہراؤ۔ ان کی بذلہ سنجی، ان کا خلوص اور اُن کی شفقت، بزرگوں کا ادب، معاصروں کا لحاظ، ہم عصروں کا احترام یہ سب باتیں جو میں نے ان میں روزِ اوّل دیکھی تھیں آج تیس برس گزر جانے پر بھی میں انہیں جوں کا توں دیکھتا ہوں۔ اس پہلی ملاقات میں جس خاص بات نے مجھے حد درجہ متاثر کیا وہ یہ تھی کہ اپنی تمام قابلیت کے باوجود تبسم نے کسی پر اپنے تبحرِ علمی کا رعب ڈالنے کی کوشش نہیں کی۔ آج بھی ان کی یہی حالت ہے۔ کو برسوں کی معلمی کے بعد جب بھی مجھ ایسے کسی نااہل شاگرد سے ملتے ہیں تو ان کی سعی یہ ہوتی ہے کہ نہ صرف اسے اس کی ذاتی نااہلیت کا احساس نہ ہونے دیا جائے بلکہ اس پر اپنی قابلیت اور علم کا رعب بھی کسی طور پر نہ گانٹھا جائے

لیکن اس پہلی ملاقات میں مجھے صوفی صاحب کی ادبی شخصیت کا کوئی زیادہ علم نہ ہو سکا تھا، کیونکہ یہ مجلس زیادہ تر پُرمذاق فقروں اور پھبتیوں تک ہی محدود رہی البتہ اتنا ضرور پتہ چلا کہ صوفی صاحب ٹریننگ کالج سے تبادلے پر گورنمنٹ کالج میں گئے ہیں، اور پھر آہستہ آہستہ صوفی صاحب کی ادبی عظمت کا حال ہم معتقدین پر کھلنے لگا۔ چند ہفتے بعد ایک دن تاثیر نے کہا آج صوفی کے ہاں ہڑبونگ کا دن ہے۔ شب دیگ اور مچھلی کی ضیافت ہے۔ کون کون آئے گا میرے ساتھ۔ صلائے عام دیکھ کر ہم میں سے کئی لوگ ہتھے مارنے کے لئے آمادہ ہو گئے۔ اور فوراً ایک مختصر سا قافلہ باردو خانہ روڈ سے تانگوں میں سوار ہو کر حضرت داتا گنج بخش کے عقب میں ذیلدار روڈ کی ایک گلی کے دہانے پر جا پہنچا۔

کھانے کے بعد نمکین چائے کا دور چل رہا تھا کہ حضرت ابوالاثر حفیظ جالندھری اپنی ایک غزل کا ایک مصرع گنگنانے لگے اور پھر احباب کی فرمائش یا اصرار کا انتظار کئے بغیر اُنہوں نے از خود غزل سُنانا شروع کر دی۔ جملہ حاضرین ہمہ تن گوش ہو گئے۔ اور اُن کے کلام کا لطف لینے کے لئے آگے کو ان کی طرف سرک گئے لیکن اس دوران میں یہ بات ہم طلبہ کے لئے اچنبھے کا موجب بنی رہی کہ اپنا کلام سُنانے کے دوران میں حفیظ کا سلسلۂ سخن بیشتر صوفی تبسم ہی کی طرف رہا اور وہ ۔۔۔ کو مخاطب کرکے شعر پڑھتے رہے اور پھر خود تبسم کی باری آ گئی۔ اُنہوں نے اپنا کلام سُنایا جس پر تاثیر اور حفیظ نے خوب دل کھول کر داد دی۔ لیکن انہوں نے جو کچھ بھی سُنایا وہ صرف فارسی میں تھا اور پھر عرصے تک ہم نے صوفی صاحب کا جو بھی کلام سُنا یا پڑھا فارسی ہی میں تھا۔ یہ بات کئی برس بعد معلوم ہوئی کہ صوفی صاحب کی طبیعت فارسی سے اُکتا کر اب اِدھر اُدھر ہر طرف میدان مار رہی ہے۔

چنانچہ اگر آج آپ صوفی صاحب کے بارے میں یہ بات وثوق سے کہہ دیں کہ وہ ایک ہمہ گیر شاعر ہیں تو وہ صاف مُکر جائیں گے کہ میں ہمہ گیر تو منفرد ہوں مگر اسپورٹسمین۔ آپ بحیثیت ایک پنجابی شاعر کے ان کے فن کو سراہنا شروع کریں تو وہ اپنا فارسی کلام سُنا کر آپ کو سوالیہ نشان بنا دیں گے۔ آپ اب اُن کی فارسی شاعری پر روشنی ڈالنے لگیں گے تو وہ اُردو کی غزل سُنا کر آپ کو ایک مرتبہ پھر چکرا دیں گے آپ گھبرا کر جب یہ فیصلہ کر لیں کہ وہ اُردو پنجابی اور فارسی تینوں زبانوں کے نہایت بالغ نظر شاعر ہیں تو وہ اپنے کلام کا خورد سا مجموعہ کر اپنا تخلص اپنے چہرے پر برساتے نظر آئیں گے اور بڑی معصومیت سے آپ کو سُنانا شروع کر دیں گے کہ

"ایک تھا لڑکا ٹوٹ بٹوٹ"

نتیجہ یہ کہ خود آپ کو اپنے اوپر ٹوٹ بٹوٹ ہونے کا شبہ ہونے لگے گا اور آپ اب مجبور ہو جائیں گے کہ تبسم کی شخصیت نگاری میں وہی طریقہ اختیار کریں۔ جو شعرائے کرام غزل کہتے ہوئے اختیار کرتے ہیں کہ پہلے دوسرا مصرعہ کہا جاتے۔ یعنی بجائے یہ لکھنے کے کہ تبسم کیا ہیں آسانی اس میں رہے گی کہ یہ لکھا جائے کہ وہ کیا نہیں ہیں تاکہ اس کے بعد آسانی سے یہ بات طے ہو جائے کہ وہ جو کچھ نہیں ہیں اس کے علاوہ جو کچھ ہیں وہ ہیں۔

مگر تجربے کے بعد یہ اندازہ بھی فوراً غلط ہو جائے گا کہ یہ صورت بھی اتنی ہی مشکل ہے جتنی آسان نظر آتی ہے اس لئے کہ تحقیقات کرنے کے

بہرحال پہلے گا کہ در اصل صوفی صاحب وہ ہیں جو نہیں ہیں لہٰذا اس ہونے نہ ہونے کا جھگڑا ختم کر کے اس ہمہ گیر شخصیت کے متعلق صرف یہ کہہ دینا کافی ہو گا کہ صوفی غلام مصطفےٰ تبسم نے کسی صوفیانہ خانوادے کے ہاتھ پر کبھی کسی سے بیعت نہیں کی لیکن ان کی مختصر سی ذات میں شخصیت اور قابلیت کے کئی انمول جوہر یوں یکجا ہو گئے ہیں کہ ان کے جاننے والے ان سے وہی والہانہ عقیدت رکھنے پر مجبور ہیں جو صوفیائے کرام سے ان کے معتقدین اور حلقہ بگوشوں کو ہوتی ہے۔

تبسم زندگی بھر جاہل کو عرفان بنانے کی کاریگری فرماتے رہے ہیں لڑکوں کو پڑھانا وہ فن ہے جس کا ہمیشہ یہ حشر ہوتا ہے کہ پیر تو درماندہ ہی رہتے ہیں مرید شفاعت کا کام شروع کر دیتے ہیں تبسم نے بھی خدا جانے کتنے شاگردوں کو دستارِ فضیلت سے نوازا ہے۔ اس مجلس میں ایسے بہت کم لوگ ہوں گے جنہوں نے کسی نہ کسی موقع پر ان سے کچھ نہ کچھ سیکھا نہ ہو۔ مگر طالب علموں کو یہ سکھانے پڑھانے والا طالب علموں سے خود کچھ حاصل نہ کر سکا۔ نئی روشنی کے اس دور میں بھی یہ وضعدار انسان وہی چراغِ مروت جلائے بیٹھا ہے جسے اس دور کے عجائب خانوں میں ہونا چاہئے تھا ہزاروں طالب علموں کا یہ استاد اپنے شاگردوں کے سامنے زانوئے تلمذ کرتا تو اس کو معلوم ہوتا کہ وہ زمانے سے کس قدر پیچھے ہے تبسم آج بھی دوستوں سے دوستی کا دم بھرتے ہیں حالانکہ جانتے ہیں کہ شہر کوراں میں اس آئینہ فروشی پر دنیا ہنستی ہے۔ یہ آج بھی دوستوں کے لئے وقف ہیں۔ ان کو آج بھی دوستی پر دشمنی کا شبہ نہیں ہوتا۔ یہ آج بھی دوستوں کو گھیر گھیر کر لاتے ہیں۔ دیدہ و دل فرشِ راہ کرتے ہیں اور ان کی مدارات میں خود اپنے کو بیچ ڈالنا چاہتے ہیں۔ ان کے پاس دوستوں سے جو کچھ بچ رہا ہے وہ آج بھی دوستوں ہی کے لئے ہے۔ ان کے گھر کا سامان، ان کے جسم کے کپڑے حد یہ ہے اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز وہ کتابیں جن کو الماری میں بند کر کے کنجیاں دانستہ کسی کنوئیں میں پھینک دی ہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ کوئی شخص اپنی ذاتی شرافت کی وجہ سے ان سے کچھ طلب نہ کرے مگر یہ واقعہ ہے کہ اگر کوئی کچھ مانگ بیٹھے تو تبسم میں انکار کرنے کی تاب نہیں۔ البتہ مانگنے والا ذرا سلیقے کا آدمی ہو۔ سوال کرنے کا ڈھب جانتا ہو۔ موقعہ اور محل کا اس کو احساس ہو جس وقت صوفی صاحب انگلیوں میں سگریٹ اور لبوں میں حقّے کی نے دبائے۔ اپنا بنایا ہوا قوام چاٹ رہے ہوں۔ اگر کوئی شخص ان کے قوام کی مہک کی داد دے دے اور ذرا سا قوام التزاماً چاٹ کر اس کی تعریف کر دے تو صوفی صاحب کی آنکھوں میں ایک خاص چمک پیدا ہو جائے گی۔ ان کی ناک کچھ اور سرخ ہو کر خطرناک بن جائے گی یہ وقت ہوتا ہے کہ جس کا جو جی چاہے مانگ لے۔ ویسے بھی ان کے گھر میں دوست نام کے ہر شخص کے لئے روٹی بھی ہر وقت موجود رہتی ہے۔ اور کپڑے بھی ہمیشہ موجود رہتے ہیں۔ پیسہ درکار ہو تو تاش کی گڈیاں حاضر ہیں۔ کھیلئے چند بازیاں اور لے جائیے اپنی قسمت کا پیسہ۔ وہ جو کچھ کھا چکے ہیں اس میں دوستوں کا حصہ ان کے ساتھ دیانت برت کر اور اہل و عیال کے ساتھ بددیانتی کر کے ہمیشہ نکالتے رہے ہیں جو کچھ کھانا چاہتے ہیں اس میں بھی دوستوں کی پتی ہے۔ ورنہ خود ان کی ذات کے لئے سب ہی کچھ موجود ہے خود ان کے پاس نہ سہی ان کے ان قدردانوں کے پاس جو صوفی کو سر آنکھوں پر جگہ دینا چاہتے ہیں مگر ہمت اس لئے نہیں کرتے کہ صوفی اپنے ہتوں کی وجہ سے بھاری ہے۔

صوفی غلام مصطفےٰ تبسم کی ساری زندگی کا ایک محبوب مشغلہ دوست بنانا تو رہا ہی ہے مگر باقی تمام دنیا کی دوستیوں کو اپنی کوششوں سے قائم رکھنا بھی ان کا ایک بے ساختہ شغل ہے اگر ان کو معلوم ہو گیا ہے کہ دو دوستوں میں کھٹ پٹ ہو گئی ہے تو وہ دونوں کے علیحدہ علیحدہ دوست بھی نہیں رہ سکتے۔ دونوں میں سے کسی ایک کے دوست اور دوسرے کے حریف بھی نہیں بن سکتے۔ اور نہ دونوں پہ فاتحہ پڑھ کر خود الگ تھلگ رہ سکتے ہیں۔ اس اختلاف کی خبر سننے کے بعد ان کا ہر سرور بے کیف ہو جائے گا۔ اور پریشان ہوں گے۔ وہ بیقرار سے نظر آنے لگیں گے اور ان کی تمام کوششیں سمٹ کر اسی ایک مرکز پر آ جائیں گی کہ یہ بچھڑے ہوئے دوست کسی طرح آپس میں مل جائیں۔ اکثر ان کی حیثیت اس اختلاف میں اس دیوار کی سی ہو جاتی ہے جو دو پاٹوں کے درمیان آ جائے مگر ان کی یہ مقدس کوشش جاری رہتی ہے۔ اور انجیل مقدس کی یہ آیت اپنی تفسیروں کی صورت پیش کرتی ہے کہ ا۔

"مبارک ہیں وہ جو صلح کراتے ہیں کیونکہ وہ خدا کو دیکھیں گے۔"

خدا کو وہ بے شک دیکھیں مگر قدر تو یہی ہے کہ خدا نے اگر ان کو دیکھ لیا تو کیا ہوگا۔ خدا کی طرف سے ان کو دیکھتے ہی ایک سوال یہ مزود ہونا چاہئے کہ ہستہ بندے ہم نے تجھ کو دنیا میں جس عظیم مقصد کی تکمیل کے لئے بھیجا تھا۔ اُس سے تو کس حد تک عہدہ برآ ہُوا۔ ظاہر ہے کہ مقصد صرف یہ نہیں ہو سکتا کہ دوستیاں کیں اور نباہ کی حد تک کیں اور نہ صوفی صاحب بارگاہِ خداوندی میں یہ کہہ سکیں گے کہ ربّ العزت میں نے تیرے بیشمار بندوں کو شب دیگ کھلائی ہے میرے دستر خوان پر تیرے خدا جانے کتنے بندے سیراب ہوتے رہے ہیں۔ اور یہ سمجھتے رہے ہیں کہ روزی اپنی کما رہے ہیں صرف خوان میرا ہے۔ نہ صوفی صاحب یہ کہہ کر چھٹکارا حاصل کر سکیں گے کہ میں نے جو علم حاصل کیا تھا وہ بے شمار طالب علموں پر تقسیم کیا۔ سوال کی اصل نوعیت تو یہ ہوگی کہ اپنے بعد اپنی کیا یادگار چھوڑی۔ سرسید کو اگر یہ اطمینان تھا کہ اگر خدا نے مجھ سے پوچھا کہ تو کیا لایا ہے تو میں کہوں گا کہ حالی سے مسدس لکھوا کر لایا ہوں، ظاہر ہے کہ اسی قسم کے سوال پر خود حالی نے یہ کہا ہوگا کہ میں مسدس پہلے ہی سرسید کے ہاتھوں بھجوا چکا ہوں۔ مگر تبسم جن صلاحیتوں کے مالک ہیں اور دُنیائے شعر و ادب کو ان سے جو توقعات ہیں اُس معیار کی یہ کیا چیز پیش کریں گے۔ اپنے علم و فضل اور اپنی اہلیت و صلاحیت کو بروئے کار نہ لانے کا شکوہ ڈاکٹر تاثیر اور چراغ حسن حسرت کی طرح ان کی جان سے دور، ان سے بھی ہے۔ تاثیر اور حسرت سے جو شکایت ہے وہ بعد از وقت ہے مگر تبسم سے یہ شکایت برمحل ہے۔ تاثیر اور حسرت نے اپنے ساتھ خود انصاف نہیں کیا۔ تو شعر و ادب کے مؤرخ ان کے ساتھ کب تک انصاف کریں گے۔ کام نہ ہو تو نام کب تک زندہ رہ سکتا ہے صوفی غلام مصطفٰے تبسم خدا ان کو ہزاری عمر عطا کرے اگر اب ان کے پاس وقت ہے کہ اپنے شایانِ شان کوئی بلند پایہ تخلیقی کام ایسا کر جائیں جو رہتی دنیا تک ان کو زندہ رکھے۔ اور وہ صلاحیتیں جن کے یہ امین ہیں ان میں خیانت کا الزام ان پر نہ لگے۔

اول درجے میں ایم اے امتیاز کے ساتھ پاس کیا کہ یونیورسٹی نے طلائی تمغہ عطا کیا۔ ۱۹۲۳ء میں آرہ ڈگری کالج کی نئی جگہ نکلی اور اس جگہ پر میرا تقرر ہو گیا۔ تین سال بعد فارسی کے ریڈر شعبۂ فارسی و اردو کے صدر کی جگہ خالی ہوئی ۱۹۳۰ء میں اس جگہ پر میرا تقرر عمل میں آیا۔ ۱۹۳۷ء میں سیاحت ایران کے لئے روانہ ہوا۔ اور عراق عرب کے مشہور شہروں اور ایران کی عتبات عالیات کی زیارت کرکے بحری راستے سے ہندوستان واپس آ گیا۔ اب تک جن کتابوں کی تصنیف و تالیف ترتیب ترجمہ یا تحشیہ میرے ہاتھوں انجام پا چکا ہے ان کے نام یہ ہیں: ۔ امتحان وفا۔ فرہنگ امثال۔ ہماری شاعری۔ فیض میر۔ مجالس رنگین۔ [illegible] اردو۔ روح انیس۔ نظام اردو۔ جواہر سخن جلد دوم، شاہکار انیس۔ دیوان فائز۔ متفرقات غالب۔ اردو زبان اور اس کا رسم خط۔ آب حیات کا تنقیدی مطالعہ ـــ ان کتابوں کے علاوہ بہت سے تحقیقی اور تنقیدی مضامین مختلف رسالوں میں شائع ہو چکے ہیں اور نامکمل کاموں کا اچھا خاصا ذخیرہ موجود ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ شعر کا ذوق میری فطرت میں مضمر ہے مگر اس کا اظہار شعر گوئی سے زیادہ شعر فہمی کی صورت میں ہوا۔ تاہم کبھی کبھی دل کے جذبات قلم کی زبان سے موزوں اور مترنم شکل میں بے ساختہ ادا ہو گئے۔ ان مختصر ٹکڑوں کا ایک چھوٹا سا گلدستہ بن گیا ہے ـــــ (ہماری شاعری۔ پانچواں ایڈیشن)

ان سوانح میں اتنے اضافے کی اجازت دیجئے کہ مسعود صاحب اپنے حسن خدمات کے صلے میں ۱۹۵۳ء میں ریڈر کی جگہ شعبہ اردو و فارسی کے پروفیسر مقرر کئے گئے اور جون ۱۹۵۴ء میں اسی عہدہ جلیلہ سے وہ ریٹائر ہوئے۔

حلیہ اور خصوصیات

(۱) متوسط قد، بلند پیشانی، گیہواں رنگ جو کبھی کھلتا ہوا ہوگا۔ چہرے پر خود اعتمادی کی جھلک۔ خوش وضع، شریف طبیعت، خوش مزاج، متین اور سنجیدہ۔ باتیں سنئے تو ایسی مزے دار اور پر از معلومات کہ اگر آپ کو فرصت ہو تو گھنٹوں سنا کیجئے اور آپ کا دل نہ بھرے۔ زبان ایسی صاف شستہ اور دھلی ہوئی گویا منہ سے پھول جھڑتے ہیں۔ ان کے منہ سے ہر لفظ نپا تلا نکلتا ہے۔ باوجودیکہ خالص لکھنوی نہیں ہیں لیکن لکھنؤ میں رہتے رہتے زبان اتنی منج گئی ہے کہ خود لکھنؤ والے غلطی کر جائیں تو کر جائیں لیکن ان کے منہ سے کوئی لفظ غلط یا محاورہ ٹکسال سے باہر نہ آپ سنیں گے۔ تقریر نہایت مدلل، منظم اور مفصل کرتے ہیں، ایسی کہ بحث طلب مسئلے کا کوئی گوشہ حتی الوسع تشنہ نہیں رہتا۔ یہ تقریریں اردو میں ہوں یا انگریزی میں، ہندی میں ہوں یا فارسی میں، نہایت روانی فصاحت اور شستہ زبان میں گل افشانیاں ہوتی ہیں۔ لکھنے کا انداز آپ نے آپ کی مشہور کتاب "ہماری شاعری" میں دیکھا ہوگا، جو بحث اٹھائی ہے ہر ممکن دلیل اور شواہد سے واضح بلکہ واضح تر بن کر دی ہے۔ (فروغ اردو۔ جون ۱۹۵۴ء۔ ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی)

(۲) سید مسعود حسن صاحب رضوی ادیب ایم۔ اے کا وطن نیوتنی (ضلع اناؤ) ہے ـــــ موصوف کو فنا فی الاردو کہنا بجا ہے۔ سید مسعود حسن صاحب صرف لکھنے ہی میں ادیب نہیں بلکہ ان کی بات چیت اور انداز گفتگو میں بھی ایک خاص ادبیت پائی جاتی ہے۔ اور جب تقریر کرتے ہیں تو وہ بھی ادبیت کے رنگ میں ڈھلی ہوتی ہے ـــــ اپنے علمی و ادبی شوق کے سلسلے میں سید مسعود حسن صاحب نے اردو اور فارسی کی کمیاب قلمی اور مطبوعہ کتابیں جن کی تعداد کئی ہزار ہے بہت کچھ صرف کر کے جمع کی ہیں جن میں بہت سے ادبی نوادر شامل ہیں ـــــ موصوف اردو زبان کے فاضل اور بہترین ادیب ہونے کے ساتھ ہی اردو کے عاشق بھی ہیں جس کی بقا و ترقی کے لئے انہوں نے اپنی زندگی وقف کر دی ہے ـــــ مسعود الحسن صاحب طبیعتاً بے حد سنجیدہ، بہت نیک اور خوش اخلاق انسان ہیں۔ آپ مذہبی آدمی نہیں ہیں مگر آپ کا شمار تعلیم یافتہ شخصوں کے اس گروہ میں کیا جاتا ہے جو آج کل کی اصطلاح میں "ترقی پسند" کہا جا سکتا ہے۔ ایک علمی و ادبی شخص میں سنجیدگی تو بہرحال ہونا ہی چاہئے مگر مسعود صاحب کی گفتگو میں خشکی نہیں ہوتی بلکہ ان باتوں میں ایک خاص ادبی لطافت اور شگفتگی ہوتی ہے ـــ (حقیقت مئی ۱۹۵۳ء۔ الباقیات الصالحات۔ انیس احمد عباسی)

(۳) مرکزی اور مخصوص باتوں پر ایسے بے لاگ اور مطمئن انداز میں گفتگو کرتے ہیں کہ ان کے نقطۂ نظر سے مخالفت کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ آپ چاہیں تو ان کے خیال میں اضافہ کر سکتے ہیں لیکن ان کے طرز استدلال سے اثر نہ لینا آسان نہیں (مختصر تاریخ اردو۔ ۱۹۴۶ء ڈاکٹر اعجاز حسین)

(۴) آپ تمدن کے عناصر ثلثہ یعنی خوراک، پوشاک اور مکان کے بہترین برتنے والے ہیں۔ کھانا بہت اچھا کھاتے ہیں۔ کپڑا بھی سب سے اچھا اور نہایت صاف ستھرا پہنتے ہیں ـــــ رہا مکان آپ کا دین دیال روڈ پر عرش سے فرش تک یعنی چھت سے زمین تک آپ کی جودت طبع اور خوش مذاقی کا بہترین ثبوت ہے اپنے تخلص

ادبیت کے لحاظ سے آپ نے ادب کے دونوں پہلو یعنی (۱) لٹریچر اور (۲) تہذیب و اخلاق اچھی طرح اختیار کئے ہیں۔ مزاج میں نفاست۔ سلامت روی، حسن سلوک اور استقامت و یکرنگی ہر ہر بات سے نمایاں ہے ——— داڑھی منڈاتے ہیں، سر کے بال بوضع اہل ایران پیچھے سے آتے اور بل کھائے ہوئے (کن کیستم ۱۹۲۲ء۔ مرزا محمد عسکری)

میں مسعود صاحب کو ان سب سے پہلے سے جانتا ہوں۔ ۱۹۱۵ء میں جب میں ایف۔ اے کی تعلیم کے لئے لکھنؤ آیا تو وہ بی۔ اے کے پہلے سال میں تھے اور ہم دونوں شیعہ بورڈنگ ہاؤس میں مقیم ہو گئے۔ اس زمانے کا حلیہ مرزا عسکری و ڈاکٹر ہاشمی کے بیان کردہ حلیہ سے قدرے مختلف تھا۔ رنگ نسبتہً زیادہ صاف تھا میری ہی طرح دبلے پتلے تھے اور خشخشی فرنچ کٹ ڈاڑھی رکھتے تھے۔ مگر ان کی بلند اور روشن پیشانی ان کے درخشاں مستقبل کی طرف اس وقت بھی اشارہ کرتی تھی۔

بالائے سرش ز ہوش مندی می تافت ستارۂ بلندی!

ان کی آواز بڑی شیریں تھی۔ خود بھی شعر بڑے لحن سے پڑھتے تھے اور اس زمانے کے تمام خوش الحان شعراء کا کلام انہی کے انداز، لب و لہجہ میں سنانے پہ پوری قدرت رکھتے تھے۔ عام طور سے متین تھے، مگر مخصوص احباب کی بزم میں جنس بذلہ سنج بھی، بذلہ سنج بھی اور نقال بھی۔

بورڈنگ ہاؤس دو منزلہ تھا۔ زیریں حصے کے سینیئر تھے سید غلام حسین نقوی (جو اب حاجی ہو کر ہر طرح محترم بن گئے ہیں) اور بالائی حصے کے مکرم تھے مسعود صاحب میں اور مرزا حامد حسین ایف۔ اے کے طلباء ہونے کی وجہ سے ان سے جونیئر تھے۔ جس طرح مسعود صاحب متانتوں کے سرچشمہ تھے اسی طرح مرزا بھی شرارتوں کے منبع تھے، میرا معاملہ بین بین کا تھا۔ مرزا نے تحریک پیش کی۔ چونکہ قہقہہ انسانی زندگی کو بڑھاتی ہے اس کے حفظان صحت کے اصول کے ماتحت ایک قہقہہ کلب قائم کیا جائے جس کا مخصوص کام یہ ہوگا کہ ہم بالائی حصے کے طلباء ہر روز صبح کو ایک جگہ جمع ہو کر ہنسنے اور قہقہہ لگانے کی ورزش کریں گے۔ مسعود صاحب کی ظاہری متانت نے وہ ایک دن پس و پیش کرنے پہ مجبور کیا مگر فطری ظرافت غالب آئی اور وہ بھی اس انجمن قہقہہ بازاں کے رکن رکین بن گئے۔ طلباء کی انجمنوں کا جیسا دستور ہے بغیر کچھ کھائے پیئے ان میں زور اور گرمی نہیں آتی اس لئے یہاں بھی قہقہہ سے پہلے کچھ شغل ناؤ نوش ہوتا۔ یعنی کبھی بسکٹ کباب کھائے جاتے، کبھی آلو یا امرود کے کچالو، کبھی دہی بڑے اور پیاس بجھتی کبھی فالسے کے شربت سے، کبھی لیموں کے شربت سے، کبھی صرف ٹھنڈے پانی سے! اب اس ناشتہ کے لئے چندہ بھی ضروری تھا اور اس چندہ کے لئے خزانچی بھی۔ یہ معزز عہدہ مسعود صاحب کو تفویض کیا گیا۔ اس لئے کہ ان کے بارے میں اس زمانے میں بھی یہ یقین تھا کہ یہ کبھی ایک پیسہ بھی خورد برد نہ کریں گے۔ اور ابراہیم لنکن کی طرح وہ فاقے کر سکتے ہیں، بھوکے ننگے رہ سکتے ہیں مگر امانت کی رقم نہیں چھو سکتے۔

بی۔ اے پاس کرنے کے بعد جب میں اور مرزا ٹریننگ کالج الہ آباد میں داخل ہوئے تو مسعود صاحب اس شہر میں پہلے سے موجود تھے۔ وہ اس وقت محکمہ تعلیم کے کیٹلاگ ڈیپارٹمنٹ میں ملازم تھے اور رانی منڈی میں رہتے تھے۔ میں اور مرزا ہر اتوار اور چھٹی کے دن صبح سویرے مسعود صاحب کے ہاں پہنچ جاتے دن بھر اپنے ہاتھ سے طرح طرح کے کھانے پکائے جاتے اور مختلف ادبی موضوعات پہ بحث ہوتی رہتی۔ ہم سب غالب دانیں پرست تھے لیکن ایک دوسرے کو جلانے اور تپانے کے لئے کبھی کبھی ان اصنام ادب و سخن پر بھی خشت باری کر دیتے۔ اس ضمن میں ایک دن مرزا نے کہا بعض حیثیتوں سے ذوق غالب سے بڑے شاعر تھے میں نے کہا وہ سرے سے شاعر ہی نہ تھے۔ موزوں کر لینا اور چیز ہے اور شعر کہنا اور شئے۔ بڑی گرما گرم بحث رہی۔ بالآخر حکم مسعود صاحب بنائے گئے انہوں نے کہا کلام پہ سند قبول خود نہیں۔ مرزا صاحب دو دو حق ذوق کے دیوان سے اشعار چن کر پیش کریں تو جیتی سیر بھر برفی کھلائیں ورنہ مرزا جی۔ حامد نے پورا دن دیوان ذوق پہ صرف کیا۔ تین بجے انہوں نے صرف ساڑھے نو شعر منتخب کئے۔ دن بھر بحث ہوتی اور بالآخر ساڑھے تین شعر ایسے مانے گئے کہ ان میں سے ہر ایک پورے پورے دیوانوں پہ بھاری تھا میں نے مان لیا کہ خاقانی ہند یقینی شاعر تھے اور سیر بھر برفی تینوں نے مل کر سلامت کی۔

اس طرح کی صحبتوں میں بھی مسعود صاحب کی شخصیت کی انفرادیت نہ جاتی تھی۔ وہ کبھی اتنے زور سے نہ ہنستے کہ ہماری طرح پیٹ پکڑ کر لوٹنے لگیں نہ کبھی خفا ہوتے، نہ جھنجھلاتے، جو بزرگی و شفقت کا خیال ان کے ذہن سے محو ہوتا۔ بورڈنگ کے رہنے والے اکثر بے تکلفی یا جوش اخلاص میں ایک دوسرے سے الجھ پڑتے تو گالیاں بھی کر لیتے، یہاں تک کہ مذاق کا سلسلہ بعض احباب کے درمیان فحش اور گالی گلوچ تک بھی پہنچ جاتا مگر مسعود صاحب کا نام کبھی کی

زبان پر بھی صاحب کی ذم کے نہ آتا اور نہ کوئی انہیں آپ کی بجائے تم کہہ کر مخاطب کرنے کی جرأت کرتا۔

یہی احترام و رکھ رکھاؤ کی کیفیت ان کی عمر بھر رہی۔ انہوں نے بچپن ہی سے اپنے کو لئے دئے رکھا۔ وہ فطرتاً شرمیلے بلکہ جھینپو تھے۔ مجھ سے خود بیان کرتے تھے کہ اسکول میں تعلیم حاصل کرنے جب لکھنؤ آئے تو برسوں برس یہ حالت رہی کہ جہاں دو چار لڑکوں کو ایک جگہ کھڑا دیکھتے تھے رستہ کترا کر نکل جاتے تھے۔ کہا جاتا ہے سچا بہادر وہ ہے جو ڈر نے کے باوجود ہمت و جرأت کا کام کرے۔ اس نظریہ کے ماتحت مسعود صاحب یقینی جری ہیں خاص طور سے کہ انہوں نے لکھنؤ کے سب سے بڑے تعلیمی ادارے میں تعلیم کی تکمیل کی، شیعہ بورڈنگ ہاؤس میں قیام کیا جہاں کے گیارہ طلبا ءقواعد و ضوابط کے خلاف بغاوت کرنے پر پہلے ہی سال نکال دئے گئے (ان میں سے ایک میں بھی تھا) معلم ہونے کی حیثیت سے ہمیشہ بڑے بڑے درجوں کو قابو میں رکھنے میں کامیاب ہوتے اور بڑے بڑے مجمعوں میں عالمانہ ادیبانہ اور مدلل تقریریں بھی کیں۔

دل میں چھپے ہوئے ڈر نے انہیں ہر طرح کے احتساب کا اور اپنے جذبات کو چھپانے کا عادی بنا دیا۔ اور اسی نے خوددارانہ احساس کو ضرورت سے زیادہ بڑھا بھی دیا۔ ان کے رہن سہن سے کبھی یہ ظاہر نہ ہوا کہ انہیں کوئی مالی دشواری بھی پیش آ سکتی ہے۔ طالب علمی میں بھی سوائے وظیفوں کے کوئی سہارا نہ تھا ان کا لباس صاف ستھرا رہتا تھا۔ اور ان کے چہرے مہرے سے کبھی یہ ظاہر نہ ہوا کہ بعض وقت ان کے پاس فیس کے روپے بھی نہیں ہوتے۔

ایف۔ اے کا امتحان سر پر تھا۔ امتحان اور کالج کی فیس ملا کر پچاس روپے دینے تھے۔ تین مہینہ سے وظیفہ نہ ملا تھا۔ سخت پریشانی تھی کہ کیا کریں۔ ایک عزیز سے جو صاحب ثروت بھی تھے اور ان کے والد مرحوم کے مرہون منت بھی رہ چکے تھے۔ روپے قرض مانگے۔ انہوں نے سوچا میری طرح صاحب ہندوستان دردِ دل یہ بھی نہ کریں اس لئے حیلہ شرعی کر کے ٹال دیا۔ مسعود صاحب کو ناگوار ضرور ہوا مگر خاموش ہو رہے۔ اتفاق یہ کہ احسان فراموش کے ایک بزرگ کو اس واقعہ کی خبر لگ گئی۔ انہوں نے پچھلا زمانہ یاد دلایا، غیرت بھی دلائی اور خود ضمانت بھی کر لی۔ ان حضرت نے مجبور ہو کر ایک عزیز کے ذریعے اب روپے بھیجے مسعود صاحب نے کہا امتحان دے سکوں یا نہ دے سکوں اب آپ کے روپے نہ لوں گا۔ انہوں نے مجھے بے اعتبار سمجھا، دوسرے کی ضمانت ضروری سمجھی۔ بڑی ردوکد ہوئی، بڑا اصرار کیا گیا مگر مجروح خودداری بات پر اڑا رہا۔ شاید یہی انداز استغنا خدا کو پسند آگیا کہ بغیر کوشش و فکر کے دوسری جگہ قرض حسنہ مل گیا۔ امتحان میں بھی شریک ہوئے اور ممتاز حیثیت سے اسے پاس بھی کیا۔

اسی خودداری نے انہیں شادی کے بازار میں بکنے سے بار بار روک لیا۔ میٹرک پاس کرتے ہی ایک نواب صاحب کی طرف سے فرزندی میں لینے کی خواہش کی گئی۔ مکان و اثاثہ، گاڑی گھوڑا سب ہی کچھ مل رہا تھا۔ مگر انہوں نے کہا "الفقر فخری"۔ اسسٹنٹ ماسٹری کے زمانے میں ایک مشہور و مقتدر تعلقہ دار کے ہاں سے اسی طرح کی خواہش کی گئی اور بہت سے سبز باغ دکھائے گئے مگر انہوں نے کہا "شادی کے معاملے میں میں اس کا قائل ہوں کہ لوگ یہ کہیں کہ فلاں صاحب مسعود صاحب کے سسرے ہیں نہ یہ کہ مسعود صاحب فلاں صاحب کے داماد ہیں۔ یعنی دامادی ذریعہ عزت و ترقی و امتیاز نہ بنے بلکہ اپنی ذاتی صلاحیت و قابلیت!

مسعود صاحب کا حافظہ بلا کا ہے۔ جس چیز کو دھیان دے کر دو تین بار پڑھ لیتے ہیں وہ حرف بحرف یاد ہو جاتی ہے۔ شعراء تو بہت سے ایسے دکھائی دئے جنہیں اپنے کلام کے سینکڑوں شعر زبانی سنانے میں کوئی تامل نہیں ہوتا مگر سوائے مسعود صاحب کے کوئی صاحب طرز نثر نگار میری نظر سے نہیں گزرا جو اپنے مضامین کے صفحے کے صفحے زبانی سناتا چلا جائے۔ مسعود صاحب کے اس حافظے نے جہاں ان کو اپنا علم تازہ رکھنے کا اچھا موقع دیا اور انہیں ایک فاضل اور ایک ادیب بے بدل کی خود اعتمادی بخشی وہیں انہیں مشاعروں کی شرکت سے معذور بنا دیا۔ جہاں کسی شعر کی زیادہ تعریفیں ہوئیں اور انہیں اساتذہ قدیم میں سے کسی کا اس سے بہتر شعر یاد آگیا ہے اب اگر صاحب شعر کی تعریف کرتے ہیں تو سرقہ کو سراہتے ہیں اور اگر خاموش رہتے ہیں تو سکوت سخن شناس کا الزام لگایا جاتا ہے۔ اس لئے کنارہ کشی ہی میں سلامتی دکھائی دی۔

عمر بھر سرکاری و غیر سرکاری علمی و ادبی انجمنوں کے ممبر رہے۔ مگر سوائے مسلم اکاڈمی اور انجمن اردو لکھنؤ کے کبھی کسی ادارے میں کوئی عہدہ قبول نہ کیا۔ ان دونوں جماعتوں کی عہدہ داری سے انہیں تجربہ ہو گیا کہ خاموش ادبی کام کرنے والوں کے لئے انجمن بازی تضیع اوقات ہے۔ چنانچہ انجمن ترقی اردو لکھنؤ اور مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی ایگزیکٹو کی ممبری اب بھی ان کے لئے پریشان کن ہے۔

مسعود صاحب نے اپنے اور دوسروں کے لئے مختلف حدیں کھینچ رکھی ہیں۔ بے تکلفی کی حد، دوستی کی حد، عزیز داری کی حد اس لئے کہ ہر چیز میں انضباط ضروری ہے۔ وہ کبھی بے آپے نہیں ہوتے۔ نہ اپنی طالب علمی و عسرت کے زمانے میں کبھی سے مدد کے طالب ہوئے اور نہ وہ اب اپنی فراغت و اطمینان کے زمانے میں خود بخود کسی کی مدد کے لئے جلدی سے تیار ہوتے ہیں۔ حق یہ ہے کہ نہ کسی نے قرض لے کر لینے دینے والا اخلاص ان سے برتا، اور نہ ان کے اِن تو من شدی من تو شدم والا جوانی جذبہ پیدا ہوا۔ اس پر بھی دل میں گداز ایسا ہے کہ غیرت و حمیت، شرافت و محبت، وفا و اخلاص کے ذکر پر آبدیدہ ہو جاتے ہیں۔ بس ضبط و تحمل مزاج کا جزو بن گئے ہیں اس لئے چاہتے ہیں کہ آپ خود بھی حدود کے اندر رہیں اور انھیں بھی ان کی رگ احساس کو چھیڑ کر اس احاطے سے باہر نکلنے پر مجبور نہ کریں۔

صنف نازک کا ذکر مجھ جیسے بے تکلف دوستوں سے کبھی نہ کیا۔ بظاہر وہ اس کے قائل ہیں کہ ع عشق عصیاں است اگر مستور نیست۔ لیکن ہماری شاعری میں انھوں نے معاملات عشق کا بیان جس تفصیل سے کیا ہے اور اس سلسلے میں جو چٹپٹی باتیں لکھی ہیں ان سے غالب کا یہ شعر یاد آ جاتا ہے۔

کھلتا کسی پہ کیوں میرے دل کا معاملہ
شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے

وہ ہندی، انگریزی اور فارسی کے فاضل ہیں۔ اردو کے وہ بلند تر ادیبوں ہی میں سے نہیں بلکہ اس کے موجودہ ز مرے کے مؤسسین میں سے ہیں۔ انہیں الفاظ کے استعمال پر بے پناہ قدرت ہے۔ ان کا ہر فقرہ بچا تلا سوچا سمجھا ہوتا ہے۔ ایسے علوم میں بھی جن میں انہیں دستگاہ کامل حاصل نہیں وہ "یک من علم را ده من عقل باید" کے مصداق ہیں۔ علاوہ ان تصنیفات و تالیفات کے جن کی فہرست ان کے سوانح کے ضمن میں دے دی گئی ہے ان کا غیر مطبوعہ کام بہت ہے۔ انہوں نے تاریخ اودھ پر بہت سا بیش بہا مواد جمع کر رکھا ہے۔ اور واجد علی شاہ کی ہمہ تصنیفی، تالیفی، ثقافتی زندگی پر جتنی وسیع ان کی معلومات ہیں اور اس فن کار بادشاہ کی جتنی تصنیفات ان کے پاس موجود ہیں ہندوستان و پاکستان میں کسی کے پاس نہیں۔

مرثیوں کا ذخیرہ جیسا کہ مسعود صاحب نے جمع کیا ہے وہ عالم میں کہیں نہ نکلے گا۔ مرزا عسکری مرحوم لکھتے ہیں "عہد قدیم یعنی دکن کے پرانے مرثیہ گویوں سے لے کر آج تک کے تمام چیدہ مرثیے متعدد الماریوں میں رکھے ہوئے ہیں جن کو دیکھ کر آپ کے تجسس و تلاش، قوت انتخاب اور صرف زر کا اندازہ ہوتا ہے۔ ایک مرتبہ نواب نصیر حسین خیال مرحوم نے میرے ساتھ آپ کے مرثیہ خانے کی زیارت کی تھی اور مراثی کی کثرت و تنوع دیکھ کر مبہوت رہ گئے تھے۔ یہی حال راجہ امیر احمد خاں صاحب والی محمود آباد کا ہوا تھا جو مراثی کے جمع کرنے کے خاص طور پر شائق تھے۔ ہندوستان کا شاید ہی کوئی مرثیہ گو ایسا ہوگا جس کا مرثیہ مسعود صاحب کے پاس نہ ہو۔ یہی حال فارسی اور دوسری زبانوں کے مرثیوں کا ہے۔ ان کی تعداد ہزاروں میں ہے اور مسعود صاحب نے ہر ایک کو بغور پڑھ کر ہر ایک کی خصوصیات موضوع وزن و بیان لکھ رکھی ہیں۔

باریک بینی، نفاست پسندی اور سلیقہ مندی ان کی فطرت و طبیعت ہے۔ لباس ہو یا غذا، مکان ہو یا تصنیفات کی کتابت و طباعت ہر ایک میں جزئیات پر نظر رہتی ہے۔ جب تک ایک ایک بات ٹھیک سے درست نہ ہو گی منظر عام پر نہیں آ سکتی۔ تحقیق کے معاملے میں یہی باریک بینی اکثر دیر کا باعث ہوتی ہے۔ ہر کام پر محقق کی خورد بین ساتھ رہتی ہے۔ ذرا ذرا سی باتیں جو عام طور سے نظر انداز کر دی جاتی ہیں ان کے لئے کلکتہ، پٹنہ، حیدر آباد، دہلی تک کے سفر کا بہانہ بن جاتی ہیں۔ جب تک وہ مکمل تحقیق کر کے اپنے کو مطمئن نہ کر لیں گے مضمون نامکمل رہے گا۔ سیکڑوں مکمل تحقیقی کام اب تک محض اس لئے زیور طبع سے آراستہ نہ ہو سکے کہ ان میں کوئی نہ کوئی تشنگی سی ہے۔ میں نے بارہا عرض کیا کہ آپ نے جو کچھ لکھا ہے۔ اسے شائع کر دیجئے۔ مزید تحقیق آئندہ نسلوں کے لئے چھوڑ دیجئے۔ مگر محقق کا ضمیر ایسے تجاہل پر کہاں آتا ہے۔ خدا کرے وہ اپنے ارادوں میں کامیاب ہوں!

ابھی تک جتنا کام مسعود صاحب انجام دے چکے ہیں وہ اردو ادب میں زندہ رہنے کے لئے کافی ہے اگر وہ چیزیں بھی طبع ہو گئیں جو اب تک مسودے کی حد میں پڑی ہیں تو پھر کسی طرح آپ کو یہ ماننا پڑے گا کہ مسعود صاحب ان لوگوں میں ہیں جن کو "ادبی دیو" کہا جاتا ہے!

علی عباس حسینی

کشور ضیا زیدی

اگر پہلا سا طریقہ ہوتا تو میں بڑے ڈرامائی انداز میں کہتی

یادگارِ زمانہ ہیں یہ لوگ!
یاد رکھنا فسانہ ہیں یہ لوگ!

لیکن وہ دور گزر چکا۔ اب مضمون شروع کرنے کے لئے افتتاحیہ الفاظ سوچنے پڑتے ہیں۔ بہرحال نقوش میں شخصیات نمبر کی پیش کش دیکھ کر میرے دل نے کہا کہ علی عباس حسینی کی شخصیت سے مجھ سے زیادہ کون واقف ہوگا گو میرے الفاظ ان کو اچھی طرح روشن اور واضح نہ کر سکیں ہلکا سا خاکہ تو بن ہی جائیگا تکلف و تمہید برطرف۔ ایک شفیق باپ۔ ذرا حق نے شرارت پر ڈانٹا اور پیچھے فریادی۔ آنسو پونچھے گئے، تھوڑی سی نصیحت بھی ہوئی۔ ساتھ ہی والدہ بھی لپیٹ میں آگئیں...... آپ ہی نے بگاڑ رکھا ہے بچوں کو...... وہ بگڑ رہے ہیں...... وہ پھر مسکرائے وہی شفیق پیاری مسکراہٹ جو انسان کے چہرے کو فرشتوں سے ملتا در بہتر بنا دیتی ہے۔ کبھی کو پیسے ملے کبھی کو گڑیا لانے کا وعدہ ہوا۔ اور کوئی گیند کی خوشی میں اچھلنے لگا ———

اپنے ہی بچے نہیں اوروں کی فریاد بھی اسی دلسوزی سے سنتے ہیں۔ کسی کی فیس نہیں داخل ہوئی کسی کے پاس کتابیں نہیں ہیں کسی کے پاس گرم کوٹ نہیں ہے کسی کے بری کے جوڑوں میں کمی پڑ رہی ہے...... غرضیکہ دنیا کے ہر مرض کا واحد علاج "امرت دھارا" یعنی حسینی صاحب...... گو کہ ایسی چھوٹی چھوٹی باتوں کا اظہار کرنا چھچھورا پن اور کم ظرفی ہے۔ لیکن مجھے تو غصہ صرف اس بات پر آتا ہے کہ جو لوگ ہمیشہ ساتھ رہے۔ پڑھایا لکھایا سرپرستی کی۔ وہی آج کہتے ہیں کہ حسینی صاحب نے بیوقوفی کی فضول خرچی کی ہمدردی یا ممنونِ احسان ہونا تو دور کی بات ہے۔ میرے خیال میں حسینی صاحب کو خود ان ہی لوگوں کا ممنونِ کرم ہونا چاہئے۔

ہزاروں روپے کماتے لیکن وہی ڈھاک کے تین پات۔ گو کہ کمائی خالص حلال کی تھی لیکن روپے ایسے اڑ کر ہوا ہو جاتے کہ بس آدمی دیکھتا رہے۔ اس لئے کہ اگر کوئی شناسا شہر میں آیا ہے تو جائے قیام سوائے حسینی صاحب کے اور کہاں؟ اگر کسی کو تعلیم حاصل کرنی ہے تو بہترین معلم کا گھر موجود ہے۔ اگر مہینے میں کم از کم آٹھ دس شاندار دعوتیں نہ ہوں تو پھر جینے کا لطف ہی کیا.........

والد کے ساتھ بیسیوں اپنی عمارتیں بنوالیں، لاکھوں کا کیش بینک میں جمع کر لیا لیکن یہ پیسے کے پیسے رہے، خدا نے صبر اور مستقل مزاجی کی سادگی

حد یہ ان پر ختم کر دی ہیں۔ سادات ہونے کے لحاظ سے اور کیا چاہئے؟ کھانے کو مل جائے تن ڈھکنے جائے، اور اگر اس کے علاوہ کسی کو کھلایا اور پہنایا جا سکے تو ایک سو ایک فی صدی جنت ——— گھر کا ہر فرد بیمار ہے دواؤں اور ڈاکٹروں کا سیلاب ہے کہ اُمڈا آتا ہے روپیہ ختم ہو چکے ہیں پھر بھی اگر کوئی دوست آگیا تو ایک دعوت اور ایک پکچر ...... چلئے پریشانی کا علاج ہو گیا پکچر دکھا کے خوش خوش گھر چلے' باری باری سے سب کے ہاتھوں پر ہاتھ رکھا اگر صحت آگئی تو دوا بھی پلا دی اور چلے گئے اُوپر، بس کتابیں ہیں اور وہ ہیں.... رات کے ایک دو بجے تک مطالعہ میں مشغول رہے۔ صبح سویرے اُٹھتے ہی اخبار مانگا۔ اخبار ختم ہوا اور پھر کتاب ہاتھوں میں آگئی۔ صبح سے شام ہو گئی نہ کہیں باہر گھومنے پھرنے جائیں گے نہ کسی دوست کے گھر ملنے جلانے ان کی ساری دنیا تو انہی کتابوں میں سمٹ آئی ہے جن میں اپنی ساری فکریں، پریشانیاں اور غم سب کچھ غرق کر دیتے ہیں۔ غصہ بہت کم آتا تھا (کیونکہ اب کافی آنے لگا ہے) اس لئے سب ان کے غصہ سے بہت ڈرتے ہیں... غصہ صرف کھانے پر آتا ہے یا کسی دعوت کے سلسلے میں........ کیا بھئی اس قورمے میں گھی کی کفایت کیوں برتی گئی۔ ؟ اور صبح ناشتے میں صرف کباب ہی کیوں ہیں ——؟ انڈا کہاں غائب ہے۔ ؟ اگر انڈا فوراً آگیا تو خیر۔ ورنہ دو چار لقمے جلدی جلدی کھائے اور پھر کتاب ایسے جلدی سے اٹھائی گویا معذرت کر رہے ہوں.... معاف کرنا عزیزم میں تجھ سے اتنی دیر جدا رہا ——!

کہیں سے افسانے کا تقاضہ آیا ہے مگر یہاں خاموشی، آخر ہم لوگ تنبیہ کرتے ہیں۔ ابا دیکھئے فلاں کا آج بھی خط آیا ہے —— اگر موڈ میں ہوئے تو حکم ہوا پنسل کاغذ لاؤ میں بولتا جاؤں تم لکھتے جاؤ... حکم حاکم۔ کیونکہ ہمیں افسانہ پڑھنے میں ضرور لطف آتا ہے۔ ٹائپ رائٹر کی طرح لکھنے میں نہیں.... اور بات جہاں ذرا رومینٹک ہوئی تو اپنا تو دم ہی نکل جاتا لیکن آہستہ آہستہ سمجھ میں آنے لگا کہ فنکار کی حیثیت سے رشتوں کا موازنہ کرنا حماقت ہے۔ یوں بھی وہ جو کہانی لکھتے ہیں ہمیں ضرور سناتے ہیں تاکہ ہمارے اندر سمجھنے کا شعور پیدا ہو۔ وہ بھی اب جبکہ ہم خود سن شعور کو پہنچ گئے.... شروع شروع میں جب میں نے کہانیاں لکھیں تو والد کو دکھاتے بڑی شرم آئی۔ چنانچہ کہانیاں شائع ہو گئیں تو انہوں نے پڑھیں۔ بجائے شاباش دی، کچھ تصحیح کر کے دکھایا... مگر ہم تو بھی مرتے رہے کہ والد نے وہ رومینٹک ٹکڑا پڑھ کر اپنے دل میں کیا سوچا ہو گا۔ ؟ خیر اب ہم ایسے احمق نہیں رہے...... ! آموں اور پان کے بیحد شوقین ہیں اس بارے میں بھی کبھی کبھی غصہ آجاتا ہے لیکن شوکت تھانوی کی طرح پاندان سے عشق نہیں۔ پانوں کی ڈبیا رکھتے ہیں پاندان ان کے خیال میں صرف مستورات ہی کا حق ہے +

ہر مہینے جتنی نئی کتابیں خرید سکتے ہیں خرید لیتے ہیں گو کہ یاران شاطر کچھ باقی نہیں چھوڑتے پھر بھی سینکڑوں کتابیں گھر میں موجود ہیں۔ کتابیں خرید کر پڑھیں، پھر ان سے بے نیاز ہو گئے خواہ وہ ردی میں جائیں یا کسی صاحب ذوق کی الماری میں محفوظ ہو جائیں انہیں کوئی خبر نہیں ——— اگر کبھی ضرورت پڑ گئی کسی کتاب کی تو گدھے کے سر کے سینگ تو شاید مل جائیں مگر کتاب نہیں مل سکتی۔ اس لئے کہ صرف والد ہی کے دوست نہیں۔ ہمارے دوستوں میں سے بھی

ع - جو بڑھ کے خود اُٹھا لے ہاتھ میں مینا اسی کا ہے

حد یہ ہے کہ خود اپنی تصنیفات میں سے بھی ایک کی کوئی جگہ گھر میں نہیں ہے۔ والد کی خاص ذاتی کاپی بھی لوگ مانگ لے گئے اور واقعی بیچاری کو جو کاپی نذر ہوئی تھی وہ بھی کسی کی بھینٹ چڑھ گئی +

یوں تو آپ انہیں کافی آزاد خیال سمجھیں گے لیکن حقیقتاً والد کافی قدامت پرست ہیں۔ نسل۔ ذات پات کے قائل۔ اور اپنے سید ہونے پر فخر..... لڑکیوں کو ڈاکٹری پڑھانے کے قائل نہیں۔ نہایت ہی بے شرمی کی پڑھائی ہوتی ہے اور جانے کیا کیا۔ لڑکیاں پڑھ لیں لیکن اگر نوکری نہ کریں تو بہتر ہے +

کھانے پر بیٹھیں گے تو گھر کا ہر فرد ساتھ ہو خواہ جگہ کتنی ہی کم ہو ہر ایک سمٹ سمٹا کر اسی میں بیٹھ جائے۔ اکیلے کھانا نہیں کھا سکتے، اکیلے کوئی تفریح نہیں کر سکتے اکیلے ہیں وہ ایک ہی کام کرتے ہیں —— مطالعہ ——!

لباس کے معاملے میں حد سے زیادہ بے فکر، بس صاف اور اُجلا ہونا چاہئے قمیص کا کالر اگر ترچھا ہے تو کیا ہوا —— ! شیروانی زیادہ چوڑی ہی سے ہے تو کیا خرابی —— ؟ چنانچہ پچھلے چالیس سال سے والدہ ہی کی قمیصوں کو تختۂ مشق بنایا اور وہ بہت خوش ہو ہو کر میرے بنائے ہوئے جھبولوں کو پہنتے رہے

لیکن اس لاپروائی کے باوجود آپ ان کے پاجامے کی مہری کو "موک پاپوش" سے چاک گریباں نہیں پائیں گے اور نہ کبھی سڑک کی گندگی سے کف اور دامنِ قمیص کے گریباں میں اگر بچاؤ ممکن نہ ہو تو مضائقہ نہیں لیکن کالر ضرور بند رہے گا۔ گھر میں صرف تہمد اور بنیان پہ قناعت کرتے ہیں اگر میں میں لیکن آپ انہیں اس لباس میں کبھی نہیں دیکھ سکتے۔ کیونکہ بغیر کرتے پاجامے کے وہ ڈرائینگ روم میں نہیں جاتے اور بغیر شیروانی، ٹوپی اور چھڑی کے قدم گھر سے باہر نہیں نکلتا۔
اپنی صحت کے معاملہ میں بھی مستعد ہیں، کھانا بہت کم چھوڑتے ہیں۔ ہلکی سی حرارت یا پیٹ کی گرانی کسی وقت کے کھانے ناشتے میں مانع نہیں ہوتی۔ آج اسکا نتیجہ ہے کہ ماشاء اللہ اب بھی اپنے لڑکوں سے زیادہ قوی ہیں۔ . . . کسی کام سے عار نہیں ہے۔ بہ ضرورت شوق آپ انہیں کیاب کی سیخیں بھی سینکتے دیکھ سکتے ہیں اور لڑکی کے پھوڑے پر پلٹس لگانے کے لئے آدھی رات کو نیم کی پتیاں بھی گھوٹتے ———— شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ وہ خالص دیہاتی ماحول کو پسند کرتے ہیں۔ زمیندار کے بیٹے لیکن تعلیم حاصل کرتے روز شہر سات میل پیدل آتے اور جاتے تھے۔ یہ بات دوسری ہے کہ آج ان کے بیٹے چند قدم پیدل یونیورسٹی نہیں جا سکتے۔

لکھتے پڑھتے ایک عمر آئی لیکن نہ تو اب تک کوئی خاص لکھنے کا کمرہ ہے نہ میز نہ کرسی۔ حتیٰ کہ کسی وقت کاغذ کی بھی کمی پڑ جاتی ہے۔ بان کے پلنگ یا زیادہ سے زیادہ بستر پر گاؤ سے ٹیک لگائے تہمد بنیان میں ملبوس، ایک پنسل اور چند کاغذات اپنے سامنے بکھیرے آپ اپنے اس فنکار کو کسی تخلیق میں مشغول دیکھ سکتے ہیں۔ اسی دوران میں بچے آ آ کر اپنی شکایتیں اور فرمائشیں بھی صادر کر دیتے ہیں۔ کبھی ذرا مسکرا کر تسلی دیتے ہیں کبھی ہلکی سی ڈانٹ۔ اور زیادہ تنگ آئے تو کاغذ سمیٹے اور ساول اپنے گھر کی — یعنی اوپر چلے گئے۔

ادھر انہوں نے ایک ناول پندرہ دن کے اندر لکھ کر ختم کیا ہے۔ جس کے ہیرو کے کردار کے متعلق ان کا دعویٰ ہے کہ وہ ہمیشہ زندہ رہے گا۔ انہوں نے یہ ناول مسلسل سترہ اٹھارہ گھنٹے تک یک لخت بیٹھ کر لکھا ہے اور ساتھ ہی اپنے چہیتے نواسے عسکری میاں کی ساری فریادیں بھی سنتے رہے اور ان کو تسلی بھی دیتے رہے ان کی چوٹوں کی مرہم پٹی بھی کرتے رہے . . . . جب سے وہ ریٹائر ہوئے ہیں میں نے یہ محسوس کیا ہے کہ جیسے وہ اب اپنے آپ کو آزاد محسوس کرتے ہیں اور زیادہ جوش اور لگن کے ساتھ لکھنے پڑھنے میں معروف رہتے ہیں۔ خداوند عالم ان کو ہمیشہ ہمارے سروں پہ قائم رکھے اور وہ ہمیشہ اسی طرح اردو ادب کو زندہ جاوید کرنے والے ادب پارے پیش کرتے رہیں . . . . !

حامد علی خاں

محمد عبداللہ قریشی

حامد علی خاں منشی سراج الدین احمد خاں بانئے اخبار زمیندار لاہور کے فرزند ہیں۔ جو ۴ / جنوری ۱۹۰۹ء کو کرم آباد (ضلع گوجرانوالہ) میں پیدا ہوئے
تعلیم کی روشنی اور شعر و ادب کے چرچوں کی وجہ سے یہ سارا گھر آفتاب بنا ہوا تھا۔ منشی سراج الدین احمد خاں خود بڑے اچھے انشا پرداز اور شاعر
تھے۔ ان کے فرزند اکبر مولانا ظفر علی خاں کا تو اس باب میں کوئی حریف ہی نہیں۔ غلام حیدر خاں صاحب جو مولانا ظفر علی خاں سے صرف تین سال چھوٹے
ہیں۔ دنیائے صحافت میں کافی شہرت اور نام پیدا کر چکے ہیں۔ ان کے ایک بھائی محمد اکبر خاں جو علی گڑھ کالج کے ایک قابل گریجوایٹ تھے اور اخبار زمیندار
میں مضامین اور نظمیں لکھا کرتے تھے۔ وہ بھی اگر زندہ رہتے تو اپنے عہد کے نامور شاعروں اور ادیبوں میں شمار ہوتے۔ ایک بھائی پروفیسر محمد احمد خاں جو
کئی سال تک عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد دکن میں پروفیسر کیمسٹری (کیمیا) اور اس کے بعد رجسٹرار رہ چکے ہیں ہمیشہ یونیورسٹی کی مجلس اصطلاحات علمی کے رکن
رکین رہے۔ اب مجلس زبان دفتری حکومت پنجاب کے میر شعبۂ ترجمہ ہیں۔ جن کی نگرانی میں اصطلاحات کا ترجمہ ہو رہا ہے۔ حامد علی خاں نے ایسی شخصیتوں
اور ان گہواروں میں پرورش پائی۔ پروفیسر حمید احمد خاں (اسلامیہ کالج لاہور) بھی انہی کے چھوٹے بھائی ہیں۔ جو انگریزی اور اردو دونوں زبانوں کے نہایت
بلند پایہ ادیب اور نقاد ہیں۔ انہوں نے غالب کے متعلق بہت محققانہ کام کیا ہے۔

حامد علی خاں نے ابتدائی مدرسی تعلیم اسلامیہ ہائی سکول لاہور اور چرچ آف سکاٹ لینڈ مشن ہائی سکول وزیرآباد میں حاصل کی۔ اسکاچ مشن
کالج کے پرنسپل ڈاکٹر ٹامس گراہم بیلی اس زمانے میں ان کے انگریزی کے معلم تھے ——— وہ بعد میں لندن یونیورسٹی میں اردو ادبیات کے شعبہ
کے صدر ہو گئے تھے۔ ڈاکٹر بیلی یورپین ہونے کے باوجود اردو اور پنجابی ایسی بے تکلفی سے بولتے تھے کہ سن کر حیرت ہوتی تھی۔ پنجابی میں بالخصوص ان
کا لہجہ ایسا تھا کہ کوئی شخص ان کے ٹھیٹھ پنجابی ہونے میں شبہ نہ کر سکتا تھا۔ ان کے ذہن میں پنجابی اتنی رچی ہوئی تھی کہ وہ خاص خاص اشیاء کے نام بھی
جان گئے تھے۔ وہ اپنے شاگرد حامد علی خاں کو ایسے کھاتے پیتے امیر گھرانے کا بچہ سمجھتے تھے جس کا طرز ماندو بود انگریزی ہو۔ ایک دفعہ پنجابی میں کہنے لگے "تسی
تاں ڈبل روٹی کھاندے ہووگے۔ ایہہ پنڈاں دے لوک گھیو نال اک طراں دی روٹی پکاندے نے جنہوں پرونٹھا آکھدے نے۔ اوہ بڑا ثقیل ہندا
اے۔" یعنی تم تو ڈبل روٹی کھاتے ہو گے۔ یہ دیہاتی لوگ گھی چپڑ کر ایک قسم کی روٹی پکاتے ہیں جسے پراٹھا کہتے ہیں۔ وہ بڑا ثقیل ہوتا ہے۔
ڈاکٹر بیلی اپنے شاگردوں کو بے تکلفی سے خاص پنجابی لہجہ میں بلایا کرتے تھے۔ کسی کا نام شاہ محمد ہوتا تو اسے جھٹ کہہ دیا "او شاہ جتیا محمد دینیا"

"منا" اور عبدالحمید کو "حمیدا"۔ اسی طرح ایک دفعہ انھوں نے حامد علی خاں کو سبق شروع کرنے کے لئے یوں مخاطب کیا "چل بھئی حامدا" حامد علی خاں کی عزت نفس نے یہ گوارا نہ کیا۔ چنانچہ ایک دوست کو ساتھ ملا کر پلاٹ تیار کیا۔ کہ وہ انھیں ڈاکٹر بیلی کے سامنے انھی کی طرح حامدا کہہ کر پکارے۔ تاکہ یہ اس پر جھگڑ کر ڈاکٹر بیلی کو "حامدا" کہنے سے روک سکیں۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ یہ تیر نشانے پر بیٹھا۔ ڈاکٹر بیلی نے دونوں کو جھگڑتے دیکھ کر اپنے پاس بلایا اور حامد علی خاں سے کہا "کیوں صاحب! "حامدا" کہنے میں کیا برائی ہے۔ مجھے تو اس میں کوئی خرابی نظر نہیں آتی۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ یہ دوستی اور بے تکلفی کی نشانی ہے۔ میں نے کونسل میں ممبروں کو دیکھا ہے کہ وہ میاں محمد شفیع کو "شفیع شفیع" کہتے ہیں اور وہ برا نہیں مانتے"۔ مگر جب ڈاکٹر بیلی کو شفیع کے صحیح ہونے اور "شفیا" میں خرابی واقع ہونے کا فرق معلوم ہو گیا۔ تو انھوں نے حامد علی خاں کو پورا نام لے کر پکارنا شروع کر دیا۔ جب موج میں آتے یا کبھی مذاق کی سوجھتی تو کہہ دیتے "ہن لچھیتاں دی واری لسے"۔

تحریک عدم تعاون کے زمانے میں حامد علی خاں نے نیشنل یونیورسٹی لاہور سے فرسٹ ڈویژن میں بی۔ اے پاس کیا اور اپنے مضامین اقتصادیات تاریخ، سیاست، اردو وغیرہ میں یونیورسٹی میں اول آئے۔ اس یونیورسٹی کا نظام تعلیم امریکن یونیورسٹیوں کی طرز کا تھا۔ گاندھی جی نے حامد علی خاں اور دوسرے کامیاب طلبہ کو اپنے ہاتھ سے سند عطا کی اور جلسہ تقسیم اسناد کے بعد الگ لے جا کر باتیں بھی کیں۔

۱۹۲۲ء میں حامد علی خاں اسی یونیورسٹی میں اکنامکس (اقتصادیات) اور اردو کے پروفیسر مقرر ہو گئے۔ یہ یونیورسٹی بریڈلا ہال لاہور کے متصل واقع تھی۔ اور بریڈلا ہال کالج ہال تھا۔ جو اس وقت کانگریسیوں کا بہت بڑا مرکز تھا۔ ملک کے تمام بڑے بڑے قومی راہنما وقتاً فوقتاً یہاں آتے تھے اور حامد علی خاں کو ان کے خیالات سننے کا اکثر موقع ملتا رہتا تھا۔ طبیعت میں انگریز دشمنی اور آزادی کی تڑپ شروع ہی سے موجود تھی۔ گویا ابتدائے عشق ہی میں آگ سے تھے۔ مسٹر گاندھی۔ سی آر داس۔ لالہ لاجپت رائے۔ مولانا ابوالکلام آزاد۔ پنڈت مدن موہن مالویہ۔ مسز سروجنی نیڈو اور دیگر محب وطن اور آزادی پسند زعماء کی تقریروں نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ اور آپ شعلہ جوالہ بلکہ آتش کا پرکالہ بن گئے۔ اگرچہ آپ عام شوریدہ سر نوجوانوں کی طرح اپنے جوش و خروش کا اندھا دھند اظہار نہ کرتے تھے۔ بلکہ اسے پوری قوت سے اپنے سینے میں چھپائے اور دبائے رکھتے تھے۔ پھر بھی کبھی کبھی یہ لاوا پھوٹ بہتا اور طوفان برپا کر دیتا تھا۔ چنانچہ دو تین موقعوں پر ضبط کی کوئی کوشش بھی کامیاب نہ ہو سکی۔

طالب علمی کے زمانہ کا ایک واقعہ ہے۔ کہ مولانا ظفر علی خاں کسی سفر سے واپس کرم آباد پہنچے۔ "ستارۂ صبح" ان دنوں کرم آباد سے شائع ہوتا تھا۔ اور علامہ عبداللہ عمادی اس کی ادارت کے فرائض انجام دینے کے لئے وہیں رہتے تھے۔ مولانا نے علامہ عمادی سے اپنے سفر کے حالات بیان کرتے ہوئے کہا۔ کہ "بعض انگریز بڑے مہذب اور شریف النفس ہوتے ہیں۔ ان کا برتاؤ دیسی شرفا کے ساتھ ایسا اچھا ہوتا ہے کہ خواہ مخواہ اس کی تعریف کرنے کو جی چاہتا ہے"۔ بات یہ تھی کہ ریل گاڑی میں مولانا کے ہم سفر انگریز ڈپٹی کمشنر سیالکوٹ تھے۔ رات کے وقت گاڑی وزیر آباد اسٹیشن پہ پہنچی۔ دونوں نے کچھ دیر آرام کرنے کے لئے ویٹنگ روم کا رخ کیا۔ دروازہ کھولا تو دیکھا کہ وہاں صرف ایک ہی کوچ ہے۔ اس پر اس انگریز نے مولانا سے نہایت نرم لہجے میں کہا "افسوس یہاں صرف ایک ہی آدمی کی گنجائش ہے۔ کیا ہی اچھا ہوتا اگر یہاں دوسرا کوچ بھی ہوتا"۔

مولانا کو اس کا یہ انداز جو حقیقت میں نہایت مہذب اخراج تھا۔ اتنا پسند آیا کہ آپ نے اس کا ذکر اپنے اخبار "ستارۂ صبح" میں کرنا چاہا۔ حامد علی خاں اس وقت وہاں موجود تھے۔ ان سے رہا نہ گیا۔ فوراً بول اٹھے کہ یہ معمولی بات ہے۔ ہم کیوں اپنے وطن کے دشمنوں کی قصیدہ خوانی کریں۔ مولانا ظفر علی خاں مسکرائے اور کہنے لگے "یہ حامد صاحب تو بڑے انتہا پسند ہیں"۔ اس کے بعد انھوں نے اخبار میں اس واقعہ کا ذکر نہ کیا۔

نیشنل کالج میں حامد علی خاں نے اردو انجمن قائم کی اور وقتاً فوقتاً اس کے اہتمام میں مشاعرے بھی کرائے۔ چند نوجوانوں میں شعر کا شوق پیدا کرنے کے لئے کئی دفعہ ان کو خود غزلیں لکھ کر دیں اور پھر مشاعروں میں ان کی زبانی پڑھوا کر ان کی حوصلہ افزائی کی۔ ایک مشاعرے کے صدر مولانا

عبدالمجید خاں سالک تھے۔ انہوں نے ہندو نوجوانوں کی غزلوں میں حامد علی خاں کا رنگ پہچان کر اور حامد علی خاں کو دادمیں شریک دیکھ کر مشاعرے کے اختتام پر کہہ ہی دیا کہ "حامد صاحب! آج تو آپ نے اپنے کلام پر خوب داد دی"۔

یاس قسم کی ہومسلا افزائی کا نتیجہ تھا کہ نیشنل کالج کے پچانوے فی صدی طلبا اردو پڑھتے اور باقی پانچ فی صدی ہندی اور سنسکرت کی تعلیم حاصل کرتے تھے۔ یہ تحریک خلافت کے عروج کا زمانہ تھا۔ حامد علی خاں بڑے جذبہ کے ساتھ نیشنل کالج میں گئے تھے۔ مگر وہ ہندو نوجوانوں میں اپنے آپ کو بالکل اجنبی پاتے تھے۔ پھر بھی ان کا دل وطن کی آزادی کے جوش میں یہ اجنبیت گوارا کر لینے کو تیار تھا۔ مگر ادھر ترکی میں مصطفےٰ کمال پاشا کو کامیابی حاصل ہوئی ادھر ہندو نوجوانوں کی آنکھیں بدلیں اور انہوں نے خفیہ خفیہ سازشیں شروع کیں۔ ورزشی اکھاڑے قائم کئے اور اردو چھوڑ ہندی پڑھنی شروع کر دی۔

حامد علی خاں اپنے ہندو دوستوں کو باہم سرگوشیاں کرتے دیکھتے اور جب ان کے قریب جاتے تو وہ چپ سادھ لیتے ان کی سمجھ میں یہ بات نہ آتی کہ آخر یہ بے رُخی کیوں ہے۔ کرشن گوپال دت ان کے نہایت مخلص دوست تھے۔ انہوں نے ایک دن ان سے اس کی وجہ پوچھی۔ انہوں نے پہلے تو بتانے سے انکار کیا۔ پھر کہا ان لوگوں کا خیال ہے کہ "ہندوستان ہندوؤں کا ملک ہے۔ مسلمانوں کو یہاں رہنا ہے۔ تو ہندو ہو کر رہیں۔ ورنہ افغانستان چلے جائیں"۔ اس واقعہ نے حامد علی خاں کی آنکھیں کھول دیں۔ یہ دراصل سنگھٹن کی ابتدا تھی۔ ہندوؤں کی اسی تنگ نظری اور تعصب نے آہستہ آہستہ مسلمانوں کو دو قوموں کا نظریہ اور پاکستان کا مطالبہ پیش کرنے پر مجبور کیا۔

رسالہ ہمایوں سے مولانا تاجور نجیب آبادی کے علیحدہ ہو جانے کے بعد دسمبر ۱۹۲۱ء میں حامد علی خاں اس کے جائنٹ ایڈیٹر مقرر ہوئے اور وہ ایک چھوٹے چھوٹے وقفوں کے سوا کم و بیش دس بارہ سال اس سے وابستہ رہے۔ آپ نے مضامین کے انتخاب اور زبان کی درستی میں اتنی کاوش اور محنت کی کہ ہمایوں جلد ہی ہندوستان کے دو چار بہترین پرچوں میں شمار ہونے لگا اور واقعہ یہ ہے کہ ہمایوں آپ کی توجہ اور محنت سے جس بلندی تک پہنچا۔ ہمایوں کا کوئی دوسرا مدیر اسے وہاں تک نہ لے جا سکا۔

ہمایوں کی ادارت کا طویل زمانہ آپ نے نہایت محنت و تندہی اور امانت و دیانت سے گزارا۔ جو کتب وغیرہ تبصرہ کے لئے آتیں یا جو اخبار اور رسالے آپ اس دوران میں انتخابات و اقتباسات کی خاطرات کو دفتر سے اپنے گھر لے جاتے۔ آج کل کی روش کے خلاف مطالعہ کے بعد ان کو نہایت احتیاط سے واپس لے جا کر دفتر میں رکھ دیتے۔ اخبار و رسائل کے اس ڈھیر میں سے آپ نے کبھی کاغذ کا ایک پرزہ بھی اپنے پاس نہیں رکھا۔

حامد علی خاں نے اپنے زمانۂ ادارت میں نہایت سختی اور استقلال کے ساتھ اس امر کا لحاظ رکھا کہ ہمایوں ہر ماہ کی مقررہ تاریخ پر لازماً شائع ہو جایا کرے۔ یہ پابندی رسالہ کا ایک امتیازی وصف بن گئی اور اس کا اظہار بھی بار ہا ہوتا رہا۔ مگر آپ کے بعد آنے والوں نے ہمایوں کا یہ امتیاز خاک میں ملا دیا۔

بیچ میں ہمایوں کی ادارت چھوڑ کر حامد علی خاں نے پنجاب یونیورسٹی سے ۱۹۲۲ء میں دوبارہ بی۔اے کی سند لی۔ اور پھر ۱۹۲۳ء میں لاء کالج لاہور میں داخلہ لے کر قانون کی تیاری شروع کی۔ مگر وہ درمیان ہی میں چھوڑ دی۔

لاء کالج کی طالب علمی کے دنوں میں بھگت سنگھ اور دت جیسے پرجوش نوجوانوں کو پھانسی کے تختے پر لٹکایا گیا اور ان کی لاشیں جلا کر دریا کے کنارے کے قریب ستلج میں بہا دی گئیں۔ لاہور میں ان کے ماتمی جلوس نکلے۔ جب ایک ایسا ہی جلوس لاء کالج کے سامنے سے گزرا۔ تو آپ نے دیکھا کہ نوجوانوں کی آنکھیں پرنم ہیں۔ وہ بے حال اور حزن و غم کی مجسم تصویر بنے۔ سر جھکائے ایک ماتمی جلوس کی صورت میں جا رہے ہیں۔ اور چاروں طرف ایک سکوت طاری ہے۔ بھگت سنگھ نیشنل کالج میں ان کا شاگرد رہ چکا تھا۔ بس پھر کیا تھا۔ دبی ہوئی بارود کو آگ لگ گئی۔ ایک شعلہ دل میں بھڑکا اور آپ نے ... بھگت سنگھ زندہ باد کے پرجوش نعرے لگائے۔ جن سے جلوس میں جوش اور حرارت کی لہر دوڑ گئی۔ چنانچہ جلوس ... آپ ... تو پیچھے دوسرے طلبا اور اساتذہ کے ساتھ لاء کالج کے

پرنسپل مسٹر سی ایل آنند کو شروع سے آپ کی اس حرکت پر شکوک رہے تھے۔

۱۹۳۳ء میں حامد علی خاں نے مولانا تاجور نجیب آبادی کی خواہش اور مشورے کے مطابق لاہور میں اردو سبھا کی بنیاد ڈالی جس کے مستقل صدر پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی دہلوی اور نائب صدر ڈاکٹر شانتی سروپ بھٹناگر۔ پروفیسر بخاری۔ ڈاکٹر موہن سنگھ دیوانہ اور خواجہ دل محمد تھے۔ اس سبھا کے جلسے ڈاکٹر بھٹناگر کے زیر اہتمام پنجاب یونیورسٹی کی کیمیکل لیبارٹری میں ہوا کرتے تھے۔ وہ اردو کے دلدادہ و شیدا تھے۔ اس لئے سبھا کی کارروائیوں میں بہت دلچسپی لیتے تھے۔ علامہ کیفی نے اس سبھا میں بہت سے دلچسپ اور مفید مقالے پڑھے۔ جن میں سے "نئی شاعری کا پہلا مشاعرہ"، "تذکیر و تانیث" اور "اردو کی موجودہ عروضیات" وغیرہ بعد میں رسالہ اردو اور ہمایوں میں بھی چھپے اور کیفی صاحب کی کتاب منشورات کی زینت بھی بنے۔ شاید دو سال بعد اردو سبھا میاں بشیر احمد کی "انجمن اردو" میں مدغم کر دی گئی۔

کچھ مدت بعد حامد علی خاں ایم۔ اے عربی کی تحصیل کے لئے اورینٹل کالج لاہور میں داخل ہو گئے۔ مگر دوسرے سال کے آخر میں آپ کے دوست ن۔ م راشد نے آپ کو بطور مشیر ادبی آل انڈیا ریڈیو دہلی میں کام کرنے کی دعوت دی۔ اور آپ قیام دہلی کے شوق میں کالج چھوڑ کر دہلی چلے گئے۔

جن دنوں آپ اورینٹل کالج لاہور کے دارالاقامہ میں مقیم تھے تو انڈین نیشنل کانگرس کی طرف سے یوم آزادی منایا جانے لگا۔ ہندو طالب علموں نے اس موقع پر کانگرس کا جھنڈا لہرانے کی تیاری کی۔ انہوں نے حامد علی خاں کو اس تقریب میں شریک ہونے کی دعوت دی۔ مگر آپ نے کہا کہ چونکہ کانگرس مسلمانوں کی قومی حیثیت کو تسلیم نہیں کرتی اس لئے میں اس میں شریک نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ ادھر ہندو نوجوانوں نے کانگرس کا جھنڈا نصب کیا۔ ادھر مسلمان طلبہ نے مسلم لیگ کا جھنڈا گاڑ دیا۔ چونکہ کانگرس اور مسلم لیگ دونوں جماعتیں حکومت کے خلاف تھیں۔ اس لئے کالج کے ارباب حل و عقد ڈرے اور انہوں نے اپنی عافیت اس میں دیکھی کہ یونین جیک بھی کھڑا کر دیا جائے۔ یونین جیک دیکھ کر ہندو طلبہ سخت ناراض ہوئے اور انہوں نے آپس میں مشورہ کیا کہ اسے کسی طرح اتروا دیا جائے۔ حامد علی خاں کو جب انگریزی جھنڈا نصب کئے جانے کا حال معلوم ہوا۔ تو ان کی قومی غیرت ایک دم جوش میں آ گئی۔ اور آپ نے کانگرس پارٹی کے نوجوانوں سے کہا کہ اب میں آپ کے ساتھ ہوں۔ اس کے بعد آپ نے ان کی قیادت ہاتھ میں لے کر بورڈنگ ہاؤس کے سپرنٹنڈنٹ کے سامنے نہایت نپے تلے الفاظ میں اپنے جذبات کا اظہار کیا اور نوجوانوں کی ترجمانی کرتے ہوئے کہا۔ کہ بورڈنگ میں ہندو طالب علم رہتے ہیں۔ اس لئے کانگرس کا جھنڈا لہرانا سمجھ میں آ سکتا ہے، یہاں مسلمان طالب علم بھی مقیم ہیں۔ اس لئے مسلم لیگ کا جھنڈا بھی لہرایا جائے تو مقام تعجب نہیں۔ میرا سوال یہ ہے کہ اس بورڈنگ ہاؤس میں انگریز کون ہے جس کی نمائندگی یونین جیک کر رہا ہے؟ اس احتجاج کے کچھ دیر بعد بورڈنگ ہاؤس اور کالج کے منتظمین کو یونین جیک اتارنا پڑا۔

اسی روز پچھلے پہر میاں بشیر احمد مدیر ہمایوں نے بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق کے اعزاز میں دعوت چائے دی جس میں اورینٹل کالج کے پرنسپل مولوی محمد شفیع اور حامد علی خاں دونوں شریک تھے۔ مولوی عبدالحق نے ازراہ تفنن پرنسپل محمد شفیع سے پوچھا۔ آپ کے کالج میں تو قومی جھنڈا لہرانے پر کوئی گڑبڑ نہیں ہوئی؟ آپ کو چاہئے تھا کہ آپ بڑے پیر کا جھنڈا کھڑا کر دیتے۔ حامد علی خاں فوراً بول اٹھے کہ جی ہاں بڑے پیر کا جھنڈا کھڑا کر دیا گیا تھا۔ مولوی صاحب نے پوچھا وہ کیا؟ کہا۔ یونین جیک۔ اس پر بہت قہقہہ پڑا۔

جب حامد علی خاں آل انڈیا ریڈیو دہلی میں تھے۔ تو ان سے وہاں کے افسروں نے ریڈیو پر نشر کرنے کے لئے اردو کے قدیم و جدید ممتاز شعراء کے کلام کا انتخاب کرایا۔ اور تمام دواوین اور یہ منتخب قیمتی سرمایہ جو بڑی کاوش سے جمع کیا گیا تھا۔ ایک الماری میں بند کر کے ان کی تحویل میں دے دیا۔ حامد علی خاں نے منتخب کلام کی دو نقلیں کرائیں۔ ایک نقل دفتر میں ان کے پاس محفوظ رہی۔ اور دوسری بوقت ضرورت استعمال ہوتی رہی۔

جب برعظیم پاکستان و ہند میں ۱۹۴۷ء کی قیامت برپا ہوئی اور دہلی میں بھی فتنہ و فساد اور قتل و خونریزی کی آندھی تیزی سے چلنے لگی تو حامد علی خاں نے فیصلہ کیا کہ جس طرح بھی ہو سکے اس دہکتی ہوئی بھٹی سے نکل کر لاہور پہنچنا چاہئے۔ مگر شہر میں قتل و غارت کا بازار گرم تھا [illegible]

کیسی جا رہی تھی۔ کسی مسلمان کی مجال نہ تھی کہ ایسے خطرناک موقع پر گھر سے نکلتا اور اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالتا۔ ہر شخص اپنی جان بچانے اور سر چھپانے کی فکر میں تھا۔ ایسی پُرآشوب ساعت میں آپ تن تنہا جان ہتھیلی پر رکھ کر ترکمان دروازہ سے نکلے اور ریڈیو اسٹیشن نئی دہلی پہنچ گئے۔ تاکہ دفتر کی امانتیں ذمہ دار افسر کے سپرد کر کے سرخروئی حاصل کریں۔ آپ نے تمام کتابوں کی فہرست تیار کرائی اور کتابیں لائبریرین کے حوالہ کر کے رسید لی۔ پھر منتخب الاشعار کا مجموعہ ڈائرکٹر کے سامنے پیش کر کے کہا کہ چونکہ اب میرا دہلی میں رہنا ناممکن ہو گیا ہے۔ اس لئے یہ امانت آپ کے سپرد کرتا ہوں۔

ڈائرکٹر نے ایک نظر مجموعۂ اشعار پر ڈالی۔ پھر ان کی طرف دیکھا اور کہا "حامد علی خان! یہ تم نے اچھا نہیں کیا۔ تمہاری جان اس امانت سے زیادہ قیمتی ہے۔ میں حیران ہوں کہ تم یہاں کیسے پہنچے اور اب کس طرح گھر واپس جاؤ گے جب کہ بسوں کی آمد و رفت بند ہو چکی ہے۔ کوئی دوسری سواری بھی نہیں ملتی اور اکیلے سڑک پر پیدل چلنا خطرے سے خالی نہیں۔"

حامد علی خان ریڈیو اسٹیشن سے نکلے تو واقعی پریشان تھے۔ کہ اب کس طرح گھر پہنچیں گے۔ نہ کوئی تانگہ نظر آتا تھا۔ نہ بس۔ تھوڑی دور آگے بڑھے تو ایک ہندو ملا جو شکل صورت سے خطرناک معلوم ہوتا تھا۔ آپ کے دل میں بجلی کی تیزی کے ساتھ ایک خیال آیا اور آپ جھٹ اس کے قریب جا کر کھڑے ہو گئے۔ اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو آپ نے مسکرانا شروع کر دیا۔ حامد علی خان کے نہ ڈاڑھی تھی نہ شرعی پاجامہ۔ کوٹ اور ہیٹ میں ملبوس انسان کو کون مسلمان سمجھتا۔ اس ہندو نے جب ان کو بلا جھجک اپنے قریب آ کر مسکراتے دیکھا تو فطری طور پر ہندو اور اپنا ہم خیال ہی سمجھا اور کہا "سب کام تو خوب بن گیا تھا مگر اس بڈھے (گاندھی) نے خراب کر دیا" حامد علی خاں نے اس کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے کہا "یہ بڈھا ہر جگہ ہمارا کام خراب ہی کرتا ہے" اس پر اس ہندو نے دانت پیستے ہوئے کہا "یہ اپنے جناح سے نہیں کہتا۔ ہم سے کہتا ہے کہ ہاتھ روکو"۔

اس قسم کی باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ ایک تانگہ آ نکلا جس میں تین چار ہندو پہلے سے سوار تھے۔ یہ بھی اس میں لد گئے اور بچتے بچاتے کسی طرح گھر آ گئے اور ۲۹ ستمبر ۱۹۴۷ء کی صبح کو بذریعہ ہوائی جہاز ماڈل ٹاؤن (لاہور) میں پہنچ گئے۔

دہلی سے لاہور آنے کے بعد ۱۹۴۸ء میں نو دس ماہ روزنامہ امروز لاہور کے عملۂ ادارت میں کام کیا۔ مگر فضا راس نہ آئی۔ سارا عرصہ لڑائی جھگڑے میں گزرا۔ البتہ جماعتی سیاست کا خوب تجربہ حاصل ہوا۔

اس کے بعد رسالہ مخزن کی ادارت سنبھالی۔ جس کی طباعت و اشاعت کا انتظام ادارۂ نوائے وقت کے ذمہ تھا۔ اس کے بند ہو جانے کے بعد سے اب تک اپنا ذاتی ماہنامہ الحمرا نکالتے ہیں جو سنجیدہ۔ متین۔ مہذب اور شائستہ لٹریچر کا بہترین نمونہ ہے۔

حامد علی خاں ایک نرم کار۔ نرم گفتار اور نرم دل انسان ہیں۔ فخر اور غرور ان میں نام کو بھی نہیں۔ بہت متواضع۔ ملنسار اور خوش اخلاق ہیں۔ عزلت پسند اور گوشہ گیر ہیں۔ خلوت ہی کو انجمن سمجھتے ہیں۔ بالکل الگ تھلگ زندگی گزارنے کے عادی ہیں۔ تنہا نشینی میں خاص لذت محسوس کرتے ہیں۔ ادبی مجالس میں بھی شاذ و نادر ہی شریک ہوتے ہیں۔ صوبائی تعصب سے بالا ہیں۔ ذات پات کی تمیز کو اچھا خیال نہیں کرتے۔ ٹھیٹھ پنجابی ہونے کے باوجود پنجابی کہلانے کی بجائے پاکستانی کہلانا چاہتے ہیں۔ مولانا، مولوی اور اس قسم کے شخصی امتیازات اور خطابات سے سخت نفرت ہے۔ نام و نمود بھی پسند نہیں کرتے۔ اپنے آپ کو نمایاں کرنے کی انہوں نے کبھی کوشش نہیں کی۔ یہاں تک کہ دیباچہ نگاری کو بھی جھوٹی شہرت کا ایک ذریعہ سمجھ کر اس سے کتراتے ہیں۔ مگر ایک دفعہ ڈاکٹر محمد باقر نے ان کا یہ غرور خاک میں ملا دیا۔

بات یہ ہوئی کہ ڈاکٹر باقر اپنی ایک کتاب کا دیباچہ ان سے لکھوانا چاہتے تھے۔ مگر آپ کسی طرح راضی نہ ہوتے تھے۔ یہ ان کے اصول کے خلاف تھا۔ کتاب کا نام "[illegible] کا دامن اور دوسرے افسانے" تھا۔ باقر صاحب اس وقت تو کتاب کا مسودہ زبردستی چھوڑ کر چلے گئے کہ پھر کسی وقت آ کر ان کو رام کر لیں گے مگر اس کے کچھ عرصہ بعد پی ایچ ڈی کرنے کے لئے ولایت روانہ ہو گئے۔ اور حامد علی خاں نے اطمینان کا سانس لیا کہ مقدمہ لکھنے کی بلا ٹل گئی۔

بات آئی گئی ہو گئی لیکن اس کے کچھ عرصہ بعد آپ کو کسی سفری ایجنٹ کے پاس کتاب "[illegible] کا دامن اور دوسرے افسانے" دیکھ کر حیرت ہوئی

کہ اس کے شروع میں حامد علی خاں کے نام سے مقدمہ موجود تھا جس کی زبان بھی ناقص تھی اور اغلاط بھی زیادہ تھیں۔ حامد علی خاں اس وقت تو اس ستم ظریفی پر دل ہی دل میں پیچ و تاب کھا کر خاموش رہے۔ اس خیال سے کہ ؎

نالہ کرتا ہوں تو اندیشۂ رسوائی ہے

لیکن جب ڈاکٹر باقر صاحب ولایت سے واپس آ کر ملے۔ تو ان سے شکایت کی۔ انہوں نے کہا کہ میں نے تاج کمپنی سے اس کے متعلق دریافت کیا تھا۔ ان کا بیان ہے کہ ہم نے دو تین مرتبہ اپنا آدمی حامد صاحب کے پاس مقدمہ لکھوانے کے لئے بھیجا۔ مگر وہ نہ ملے۔ اس پر ہم نے دیباچہ کہیں اور سے لکھوا کر ان کے نام سے شائع کر دیا ہے۔ اس جواب سے جو عذر گناہ بدتر از گناہ تھا۔ آپ کو تسلی تو نہ ہوئی۔ مگر آپ مروّت کی وجہ سے خاموش ہی رہ گئے۔

آپ خودداری سے بھی زیادہ ایمانداری کے قائل ہیں۔ صداقت۔ راست بازی اور جرأت کا یہ عالم ہے کہ بات منہ پر کہہ دینے سے کبھی نہیں جھجکتے اور اس کی مطلق پروا نہیں کرتے کہ اس سے کوئی خوش ہوتا ہے یا ناراض۔ امروز کی ادارت کے زمانے میں سعادت حسن منٹو کا ایک افسانہ اشاعت کے لئے آیا۔ آپ نے دیکھ کر واپس کر دیا کہ یہ شائع نہیں کیا جا سکتا۔ اس لئے کہ یہ مملکت پاکستان کے خلاف ہے۔ اس سے پاکستان کی توہین کا پہلو نکلتا ہے کیونکہ اس مضمون کے مختلف حصوں میں مختلف بیہودگیوں کی طرف اشارہ کر کے بار بار پاکستان زندہ باد کا نعرہ لگایا گیا ہے۔ منٹو کی درخواست پر مولانا چراغ حسن حسرت کی رائے پر فیصلہ ٹھہرا۔ انہوں نے فرمایا کہ مضمون تو اچھا ہے۔ مگر فی الحال اسے شائع نہ کیا جائے۔

اس کے چند روز بعد جب حسرت۔ منٹو اور پطرس بخاری کسی مجلس میں جمع ہوئے تو حسرت نے منٹو کی دلدہی کے لئے رونی صورت بنا کر کہا کہ آپ کا افسانہ تو بہت اچھا تھا۔ مگر حامد علی خاں نے اسے شائع نہیں ہونے دیا۔ بخاری نے کہا۔ یہ عجیب بات ہے کہ چیف ایڈیٹر آپ ہوں۔ آپ کوئی مضمون شائع کرنا چاہیں اور وہ شائع نہ ہو سکے۔ حسرت نے کہا ہاں صاحب! مگر وہ بھی تو آخر ذمہ دار آدمی ہیں۔ انہوں نے میرے ہاتھ باندھ رکھے ہیں۔ منٹو نے خود یہ واقعہ حامد علی خاں کو سنایا۔ حامد علی خاں نے حقیقت حال بیان کرنا چاہی تو منٹو نے کہا کہ آپ جو کچھ کہتے ہیں وہی درست ہے۔ حسرت صاحب کی بات درست نہیں۔ البتہ ان کے حق میں ایک بات جاتی ہے اور وہ یہ ہے کہ اس وقت وہ نشے میں تھے۔

اس کے بعد ایک وقت ایسا بھی آیا جب حامد علی خاں نے الحمرا نکالا کر خود منٹو سے مضمون مانگا۔ اس نے مضمون لکھنے سے تو انکار نہ کیا۔ مگر کہا "حامد صاحب! آپ متانت پسند ہیں میرا مضمون برداشت نہیں کر سکیں گے"۔ اس واقعہ سے حامد علی خاں کی سیرت کے کئی پہلو روشنی میں آتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ جو کام آپ کے سپرد کیا جاتا ہے۔ اسے پوری ذمہ داری۔ فرض شناسی اور محنت سے نباہتے ہیں۔ دوسرے پاکستان کی نوزائیدہ مملکت کے خلاف کوئی ایسی بات سننا گوارا نہیں کرتے جس سے اس کا مذاق اڑانا مقصود ہو یا جس سے اس کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو۔ آپ کی سلامت روی اور اصابت رائے کا دوست دشمن سب کو اعتراف ہے۔

آپ اس قدر ترقی پسند بھی ہیں کہ روس۔ جرمن۔ اٹلی۔ چین۔ امریکہ۔ فرانس اور دوسرے ملکوں کے بڑے بڑے آدمیوں اور تحریکوں کا ذکر اپنے پرچوں میں ہمیشہ چھیڑتے رہتے ہیں۔ تاکہ معلومات عامہ ترقی کرے اور لوگوں کو اچھی باتیں اختیار کرنے کا موقع ملے۔ مگر اس خیال سے انہیں سخت وحشت ہوتی ہے کہ غلامانہ ذہنیت کے ساتھ اندھا دھند دوسرے ملکوں کے اصول اور نظریئے اپنے ملک پر مسلط کر لئے جائیں۔

حامد علی خاں نثر بھی خوب لکھتے ہیں اور نظم بھی۔ غزل بھی نہایت عمدہ کہتے ہیں۔ اور نظم بھی۔ ان کا کلام پاکیزہ خیالات۔ دلکشی و بلند تخئیل اور حلاوتِ انداز بیان کا حامل ہوتا ہے۔ دل میں سوز و گداز کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ آپ نے جب سے ہوش سنبھالا ہے اردو کی بے لوث خدمت اور ادب و شعر کی تبلیغ کر رہے ہیں۔ طبع اور دماغ ان ہی کاموں کے لئے وقف ہیں۔ اپنی حالت پر قانع اور مطمئن ہیں۔ سازش۔ جوڑ توڑ۔ دھڑے بندی۔ ہنگامہ آرائی اور پارٹی بازی کی لعنت میں کبھی گرفتار نہیں ہوئے۔ فرقہ وارانہ تعصب سے بھی ان کا دامن پاک ہے۔ مختلف فرقوں کے آپس کے جھگڑوں میں دخل دیتے ہیں نہ کسی کے متعلق برے الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ محبت یا نفرت کرنا نہیں جانتے۔ وہ محبت کا جواب محبت سے دیتے

اور نفرت کرتے والوں سے نفرت بھی کرتے ہیں۔ مگر اس میں نفاق، خود غرضی یا مصلحت کو دخل نہیں ہوتا۔

حامد علی خاں کی کوئی مستقل اور پائیدار تصنیف ابھی تک شائع نہیں ہوئی۔ مگر انصاف کی بات یہ ہے کہ رسالہ ہمایوں، مخزن اور الحمرا کی جلدیں کسی اچھی تصنیف یا تالیف سے کم قیمتی نہیں۔ عرصہ ہوا منصور احمد مرحوم مدیر ادبی دنیا لاہور نے آپ کے سو شعروں کا ایک چھوٹا سا مجموعہ مرتب کیا تھا۔ جس کے شروع میں آپ کی شاعری پر بھی مختصر سا تبصرہ کیا گیا ہے۔

افسانہائے عشق آپ کی دوسری تالیف ہے۔ اس میں بے مثال محبت کے سات نہایت دل کش اور پاکیزہ رومانی افسانوں کے تراجم جمع کئے گئے ہیں۔ ان کی زبان اتنی صاف اور شستہ ہے کہ بالکل طبع زاد معلوم ہوتے ہیں۔ الفاظ میں اتنا سوچ اور ترنم ہے کہ بقول مدیر ساقی دہلی "جا بجا انگریزی بھی اردو کا منہ تکتی رہ جاتی ہے۔ اس کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے مولانا چراغ حسن حسرت نے زمیندار میں لکھا تھا کہ "بعض مقامات پر ترجمہ بے اختیار اہتزاز کرنے لگتی ہے۔"

غزل کے مندرجہ ذیل چند شعروں میں ان کی رومانی شاعری کی ایک جھلک ملاحظہ فرمائیے ؎

مرا دل زیست اک ایجاد ہے تیری محبت کی۔ کہ خود بنیاد جاں بنیاد ہے تیری محبت کی
یہ درد و سوز یہ کرب و الم یہ حسرت و ماتم۔ مری یہ زندگی فریاد ہے تیری محبت کی
ہوئی مدت جہنم بن گئی دنیا مرے دل کی۔ مگر جنت ابھی آباد ہے تیری محبت کی
کھڑی ہے یونہی تیز و تند طوفانوں کی زد میں بھی۔ وہ سنگین آہنی بنیاد ہے تیری محبت کی
وہی غم ہے وہی دل ہے وہی دیوانگی دل کی۔ وہی قید ابد میعاد ہے تیری محبت کی

پھر یہ شعر دیکھئے ؎

عمر دو روزہ حسرت و حرماں میں کٹ گئی۔ مجھ سے تری جفا کا گلہ بھی نہ ہو سکا
بیگانہ دو جہاں سے ہوا ہوں ترے لئے۔ وہ دل ہزار حیف ترا بھی نہ ہو سکا

بقول منصور احمد "حامد کی شاعری کی ایک دل کش خصوصیت وہ ایمائی الفاظ ہیں۔ جن کے استعمال سے وہ شعر میں پوری کہانی کہہ جاتا ہے۔ جب وہ کوئی تصویر کھینچتا ہے تو اپنے قلم کے ایک مختصر سے مس سے اس کے لئے ایک ایسا دھندلا دھندلا سا پس منظر تخلیق کرتا ہے کہ ہماری چشم تصور اصل تصویر سے گزر کر اس میں کھو جاتی ہے۔ اور دیر تک اس نامعلوم اور حسین سرزمین کی سیر کرتی رہتی ہے۔ مثال کے طور پر یہ شعر دیکھئے ؎

گلزار کے سایوں میں وہی حشر بپا ہے
پھولوں سے ابھی تک تری خوشبو نہیں جاتی

"وہی" اور "ابھی تک" وہ لفظ ہیں جو اس شعر میں کوئی افسانہ کہہ رہے ہیں۔ وہ کیا حشر تھا جو گلزار کے سایوں میں بپا ہوا۔ اور کیوں پھولوں سے ابھی تک اس کی خوشبو نہیں جاتی؟ صرف وجدان ہی ان سوالات کی پہنائی کو پا سکتا ہے۔"

ایک اور شعر دیکھئے ؎

آنکھیں تری آنکھوں سے ملائی نہیں جاتیں
سر اب ترے قدموں سے اٹھایا نہیں جاتا

"اب" نے ایک پورا افسانہ پیدا کر دیا ہے۔ کیوں اب آنکھوں سے آنکھیں نہیں ملائی جاتیں۔ کیوں اب سر قدموں سے نہیں اٹھتا۔ اسے سمجھنے کے لئے تصورات کی ایک دنیا بس جاتی ہے۔

الفاظ کی سحر کاری کے ساتھ ساتھ بعض جگہ الفاظ کی موسیقی بھی ایسی ہے کہ شعر پڑھتے ہی وہ سماں زندہ ہو جاتا ہے اور انسان تصور کی آنکھوں اور کانوں سے وہ سب کچھ دیکھ اور سن لیتا ہے جو شاعر نے دیکھا اور سنا۔ ذیل کے مصرعوں میں خزاں کی رخصت کا سماں اور باد خزاں سے پتوں کے گرنے کی آواز کس خوبی سے پیدا کی ہے ؎

خزاں رخصت ہوئی دبتی سمٹتی کانپتی ڈرتی
چمن سر پر اٹھاتی ناچتی گاتی ہوا آئی
لڑھکتی لڑکھڑاتی کھڑکھڑاتی پتیاں بھاگیں
سپاہ گل قطار اندر قطار اندر قطار آئی

اور پھر ؎

اب جوئبار زندگی چپ چاپ سی ہے ہاں کبھی
اٹھی صدائے مد و جزر کوئی کنارہ گر گیا

پہلے مصرعے میں ساحل دریا کی خاموشی کو تکمیل تک پہنچا دیا ہے اور پھر دوسرے مصرعے میں اس عظیم الشان سکوت کو ایک نہایت ہی مختصر لفظ گرنے سے توڑ کر اس تقابل کو ظاہر کیا ہے۔ جس کا اندازہ کبھی دریا ہی کے کنارے پہ کھڑے ہو کر ہی ہو سکتا ہے۔

رئیس احمد جعفری

ارشد تھانوی

مولانا حالی عین عنفوانِ شباب میں اپنی نئی نویلی دلہن کو اس کے خوشحال میکہ میں پہنچا کر پانی پت سے دلّی بھاگ آئے تھے تاکہ اپنی تعلیمی کمی کو مکمل کر لیں اور میں ایک ایسے ۹ سالہ طالب علم کو جانتا ہوں، جو اتنی سی عمر میں اسی علمی تشنگی کے تقاضے سے گھر چھوڑ کر چل دیا۔

یوپی، کے ضلع سیتاپور میں ایک مردم خیز قصبہ خیر آباد ہے، وہاں کے مکتب میں ایک یتیم سید زادہ پڑھا کرتا تھا۔ معمولی نوشت و خواند اور ابتدائی کتابیں پڑھنے کے بعد اس نے محسوس کیا کہ اس قصباتی مدرسہ میں بقدرِ ذوق اس کی تعلیم نہیں ہو سکتی۔ کسی بڑی درسگاہ کا طالب علم بننا چاہیے۔ ماں اور بڑے بھائی اس کمسنی ہی اپنے سے علحدہ کرنا اور کہیں دور بھیجنا نہ چاہتے تھے۔ لڑکے ہی خواہش فرار پیدا ہوئی۔ ایک روز ماں نے کسی بات پر ڈانٹا بیٹا تو خفا ہونے کا بہانہ ہی ڈھونڈتا تھا۔ موقع پاکر گھر سے نکلا، اور لکھنؤ پہنچ کر دم لیا۔ یہ بات راز ہے کہ زادِ سفر جائز طریقہ پر مہیا کیا تھا۔ یا ماں کی صندوقچی پر ہاتھ مارا تھا، اگر آخری حل کیا تو بھی یہ گناہ کسی طرح ثواب سے کم نہیں۔ بہرحال لکھنؤ پہنچ کر اپنی ذاتی کوشش سے دارالعلوم ندوہ میں داخلہ لیا۔ اور پڑھنے کا جو حق ہوتا ہے، وہ پورا پورا ادا کیا۔ جتنی جتنی علمی مدارج میں ترقی کی، اتنی ہی فکر و تدبر میں بھی صلاحیت پیدا کی مگر درجہ تکمیل تک پہنچتے پہنچتے کارکنانِ ندوہ کے خلاف سرکشی کی، انجمن اصلاح کے نام سے طالب علموں کی ایک انجمن بنالی تھی۔ اس کے سکریٹری کی حیثیت سے ہڑتال کرادی اور جب معاملات رو براہ ہو گئے تب بھی بغاوت کا جوش ٹھنڈا نہ پڑا۔ اور اس دارالعلوم میں رہنا گوارا نہ کیا۔ معتمد ندوہ اس زمانہ میں سید سلیمان تھے۔ وہ اس ہونہار طالب علم پر بہت شفقت کرتے تھے اور نہیں چاہتے تھے کہ بقیہ تعلیم نامکمل رہے اپنے خط کے ساتھ ڈاکٹر ذاکر حسین کے پاس دہلی بھیج دیا۔ بقیہ علمی مراحل جامعہ ملیہ میں طے ہو گئے۔ اس کے بعد ندوہ میں پہنچ کر بھی سند فضیلت حاصل کرلی۔ دینی و دنیوی تعلیم کا یہ پیکر اب مولوی رئیس احمد جعفری تھا۔ میری ان کی پہلی ملاقات ۱۹۳۳ء میں ہوئی جب یہ روزنامہ خلافت بمبئی کے چیف اڈیٹر تھے۔ اور خلافت ویکلی کے نام سے ایک علمی و ادبی ایڈیشن بھی ہفتہ وار شائع کرتے تھے۔ ایک روز میں علمائے اسلام کا کوئی تذکرہ دیکھ رہا تھا۔ متعدد بندگانِ کرام کی نسبت معلوم ہوا کہ وہ صرف پڑھنا جانتے تھے، لکھنا انہیں نہ آتا تھا۔ ان کی تصانیف دوسروں کے قلم کی رہین منت ہیں۔ جو حضرات

کے شاگرد ہوتے تھے۔ اسی وقت ڈاک آئی۔ ایک لفافہ جو کھولا تو شاذ ایسا پڑھنا نصیب ہوتا۔ خلوص مرقوم تھا۔ الفاظ بہت خوب، عبارت بہت اچھی، مگر حروف بڑے اینڈے بینڈے۔ میں عرصہ دراز تک کورٹ انسپکٹر رہا ہوں سیکڑوں نہیں ہزاروں بدخط لکھی ہوئی رپورٹیں اور بیان پڑھ چکا تھا۔ ندوی جعفری صاحب کا خط بلا تکلف پڑھ لیا اور سوچنے لگا کہ حضرت علوم مشرقی کے مستند عالم ہیں، بقدر ضرورت مغربی تعلیم بھی پائی ہے۔ ورنہ شاید بالکل لکھنا نہ سیکھتے۔ اور قدیم علماء کی طرح علم کے ساتھ فن پر توجہ کرنا غیر ضروری سمجھتے۔ یہ اب سے ۲۰ برس پہلے کا ذکر ہے۔ اب تو یہ انداز نگارش اور بھی پختہ ہو گیا ہوگا۔ معلوم نہیں ان کی تصانیف کی کتابت کیونکر ہوتی ہے۔ کاتب لوگ ان کی لکھی پر لکھی بھی تو نہیں مار سکتے پھر بھی اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ خط منشیانہ ہے۔ اور اگلے وقتوں کے انداز تحریر کا دلکش نمونہ دور حاضر کے ادیب و انشا پرداز اور صحافی اتنے بڑے بڑے دائرے نہیں کھینچتے۔

میں بالالتزام خلافت ویکلی کے لئے نظم و نثر لکھا کرتا تھا۔ اس لئے فیما بین غائبانہ ربط قائم ہو گیا۔ کچھ دنوں بعد بھوپال کے ایک صاحب جامعہ ازہر میں اپنی تعلیم کی تکمیل کر کے واپس آئے وہ جعفری صاحب کے دوست تھے، انہیں بھی اپنے ساتھ گھسیٹ لائے۔ میں انہیں پہلی دفعہ دیکھ کر کچھ بھونچکا سا ہو گیا۔ دبیز جسم کے، داڑھی لگائے نوجوان مولانا۔ اس پر طرّہ یہ کہ بہت کم سخن اور سنجیدہ بیان۔ خلافت ویکلی میں ایک بہت ہی دلچسپ افسانہ قسط وار ان کا شائع ہوا کرتا تھا جس میں موجودہ معاشرت کے بعض نازک پہلو بڑی خوبی سے اجاگر کئے جاتے تھے میں سوچنے لگا کہ یہ ٹھوس نہیں ٹھس قسم کا آدمی ایسی باریک بینی اور نکتہ سنجی کا اہل کیسے ہو سکتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ خود نہیں لکھتا کسی سے لکھوا کر اپنے نام سے شائع کر دیتا ہے۔ لیکن مجھے یہ معلوم ہو چکا تھا کہ بہ دوران طالب علمی جبکہ ۱۵ سال کی عمر تھی، یہ ماہنامہ اعجاز کی ادارت کر چکے تھے، جو ان کے بڑے بھائی مولوی عقیل احمد نے بارہ بنکی سے نکالا تھا۔ اور جب جامعہ ملیہ میں تھے تو مولانا محمد علی جوہر کی سوانح عمری لکھی تھی جو مکتبۂ جامعہ نے چھاپی اور شائع کی۔ ان کے نانا مولوی سید نیاز احمد ڈی، پی پولیس سے پنشن لے کر بھوپال میں سپرنٹنڈنٹ پولیس ہو گئے تھے۔ میں ان کی ماتحتی میں بھی رہ چکا تھا۔ اور چونکہ وہ میرے والد اور چچا کے دیرینہ دوست تھے۔ ان کا مستحق شفقت بھتیجا بھی رہا تھا۔ اس لئے بغیر دیکھے ان کے اس عزیز ترین نواسے کے حالات سن چکا تھا۔ پس دل کو یہ کہہ کر مطمئن کر لیا کہ ؎

ہیں کواکب کچھ، نظر آتے ہیں کچھ

اس لئے دیئے پن کی رسمی و اخلاقی ملاقات کے کئی سال بعد،

عادل نے بلایا مجھے، میں بمبئی پہنچا

اپنی روانگی کی اطلاع جعفری صاحب کو بھی رسمی طور پر دے دی تھی۔ خیال تھا کہ جب ملیں گے تو اپنے بڑے نانا حضرت ریاض کے مصرعہ کی ہو بہو تصویر ہوں گے۔ ؎

اک عبا پہنے عصا تھامے عمامہ باندھے

مگر ؎ ہر دم بہ لباس دگر آں یار برآمد۔ ایک نوجوان ملنے آیا۔ دبلا پتلا۔ اکہرے جسم کا، کلین شیو، میں نے پہچانا نہیں۔ بڑے خلوص سے علیک سلیک کی۔ بمشکل پتہ چلا، تو یقین کرنا مشکل ہو گیا کہ یہ وہی جعفری ہیں، جو ایک بھاری بھرکم مولانا کے پیکر میں بھوپال تشریف لے گئے تھے، گفتگو کی، تو منہ سے پھول جھڑنے لگے۔ خوب کھل کے باتیں ہوئیں۔ معلوم ہوا کہ اپنا ذاتی پریس قائم کر لیا ہے، اور ایک روزنامہ بھی کامیابی سے نکال رہے ہیں۔ تصنیف و تالیف کا سلسلہ بھی جاری ہے۔ قائد اعظم کی سوانح عمری لکھ رہے تھے یا لکھ چکے تھے، میں ان دنوں کٹر کانگرسی اور بھوپال اسٹیٹ پیپلز کانفرنس کی مجلس عاملہ کا سرگرم ممبر تھا۔ اس لئے سیاسی موضوع پر بحث چھڑ گئی۔ یہ حقیقت ہے کہ اس سے پہلے متعدد کوشش کے باوجود میں کانگریس سے بدظن نہ ہوا تھا۔ لیکن جعفری صاحب سے ایک گھنٹہ بحث کرنے کے بعد میں نے دل سے مسلم لیگ کا [illegible]

کچھ عرصے کے بعد جب نواب بہادر یار جنگ صدر اسٹیٹس مسلم لیگ بھوپال آئے تو میں نہ صرف اسٹیٹ پیپلز کانفرنس سے مستعفی ہو چکا تھا۔ بلکہ اسٹیٹ مسلم لیگ کی مجلس عاملہ کا رکن بنا دیا گیا تھا۔ میری وہ انقلابی نظمیں جو کانگرسی اخبارات چھاپا کرتے تھے ردی ہو چکی تھیں۔ اور نئی نظمیں کچھ اس قسم کی ہونے لگی تھیں ؎

ہندوانہ ذہنیت نے ودیا اسکیم کی　　ساکھ کھودی کانگرس کے شعبۂ تعلیم کی

مدرسوں کو ودیا مندر کہا جانے لگا　　محض ضد میں پیروانِ دینِ ابراہیم کی

وقت گزرتا رہا۔ لیگ طاقتور ہوتی گئی۔ ہندوستان کا بٹوارہ ہو کر رہا۔ مسلمانوں کی آزاد مملکت قائم ہو گئی۔ ۱۹۵۰ء کے آخر میں بھوپال کو میں نے بھی خیرباد کہا۔ لاہور آ کر کچھ دنوں بعد کراچی پہنچ گیا۔ مولانا رئیس احمد صاحب جعفری ندوی پہلے ہی پاکستان آ چکے تھے کسی نہ کسی روزنامہ کی ادارت کر رہے تھے۔ مختلف موضوعات پر کتابیں لکھ رہے تھے۔ علمی، ادبی، تاریخی، سیاسی، نفسیاتی، افسانوی، دینی موضوعات میں کوئی ایسا موضوع نہ تھا جس پر انہوں نے تصنیف و تالیف، ترجمہ، تلخیص کا حق ادا نہ کیا ہو۔ کراچی کی بے پایاں آبادی میں بھی انہیں ڈھونڈنے کی ضرورت نہ پڑی، ایک دن ارادہ کیا اور بہت آسانی سے انہیں پا لیا۔ اسی خلوص، اسی محبت، اسی شگفتگی سے ملے۔ اور ملتے رہتے ہیں۔ میں بھی گیا۔ وہ بھی آئے۔ اس آمد و رفت میں عجیب بات میں نے پائی۔ میرے ہاں وہ ناشتہ چھوڑ دیں گے۔ چائے پی لیں گے۔ اور اپنے یہاں ناشتہ ضرور کرائیں گے، چائے چاہے ہو یا نہ ہو۔ ہو سکتا ہے کہ یہ اتفاقی بات ہو۔ لیکن میرا متعدد بار کا تجربہ ہے۔ اور اس بات پر میری بیوی ان سے کچھ خفا بھی ہیں۔ بقول ان کے بھوپال آئے تو سب کچھ کھایا اب ذرا ذرا سی چیز سے پرہیز ہے۔ ایک مزے کی بات اور ہے میں مدت سے ناول یا مختصر افسانے بالکل نہیں پڑھتا ؎

ہوئی ریحاں جوانی کی بہار آہ حیف　　طبع رنگیں تھی مئے عشق کی جب متوالی

جعفری صاحب از راہِ محبت مجھے اپنی وہ کتاب تحفتاً دیتے ہیں جو میرے ذوق کی ہوتی ہے۔ لیکن ایک ناول بھی عطا کر دیا۔ جو تازہ شاہکار نہیں بلکہ ۱۹۴۹ء کا چھپا ہوا تھا۔ میں نے دل میں سوچا۔

ہرچہ از دوست میرسد نیکوست

میں نہ پڑھوں گا تو گھر میں اور بہت پڑھنے والے ہیں۔ لا کر میز پر رکھ دیا۔ اگلے روز ریڈیو کے لئے اک اسکرپٹ لکھنے بیٹھا۔ موڈ نہ تھا۔ ناول سامنے تو تھا ہی غیر ارادی طور پر اسے اٹھا کر ورق گردانی کرنے لگا۔ زائد ورق ہٹا کر ٹائیٹل دیکھا۔ موٹے حروف میں نام لکھا تھا — چاندنی — نیچے عبارت تھی — جنت۔ جہنم، اور قیامت کی داستان — دونوں عبارتوں کے درمیان 'فلمی دنیا' بھی لکھ دیا تھا۔ شبہ ہوا کہ شاید دوزخ، بہشت اور حشر نشر کو فلمایا گیا ہے، اور یورپین فلم کمپنیاں جس طرح اپنی مذہبی روایات کو پردۂ سیمیں پر پیش کیا کرتی ہیں، ایسی ہی کوئی جسارت کہیں جعفری صاحب تو نہیں کر بیٹھے۔ مگر اس مردِ مسلمان سے ایسی توقع نہیں۔ ورق الٹا۔ جعفری صاحب نے تحریر فرمایا تھا۔

کاروبار پروڈکشن سے وابستہ رہ کر ڈیڑھ برس تک میں نے فلمی دنیا کا کلوز اپ دیکھا۔ جنت کا لطف، جہنم کا عذاب، قیامت کی نفسا نفسی سب کچھ اس جہانِ خراب آباد میں ہے۔ یہ ناول اسی دنیا کی ایک جھلک ہے۔

جی چاہا کہ اس نئی دنیا کی میں بھی سیر کر لوں، اور یہ بھی اندازہ کر لوں کہ دینی عالم جعفری نے اس دنیوی منظر کو کتنی گہری نظر سے دیکھا ہے۔ چنانچہ پڑھا اور خوب پڑھا سارا۔ اس نتیجہ پر پہنچا کہ انجان تخلص کے جس مفروضہ اسٹوری رائٹر کی زبانی یہ فسانہ دہرایا گیا ہے۔ یقیناً وہ خود جعفری صاحب کے ہیں۔ بڑی حیرت ہوئی۔ ع

مارا ازیں گیاہِ ضعیف ایں گماں نبود

ناممکن ہے کہ کسی سوسائٹی کو پورے طور پر اپنائے بغیر اس کی اس قدر صحیح عکاسی کی جا سکے کہ کوئی باریک سے باریک پردہ حائل نہ ہو۔ اور اس بحر بے پایاں میں گہرا غوطہ لگائے بغیر تہ کے موتی اور خزف ریزے نکالے جا سکیں۔ انجان صاحب ڈوب کر اچھلے بغیر اس قدر جانکار کیونکر ہو گئے یقیناً

ستناور بحرِ الفت میں کہیں ڈوبے کہیں نکلے

جعفری صاحب کا اس گندگی سے دامن بچا کر نکل آنا معجزہ ہی ہو سکتا ہے۔ مگر یہ معجزوں کا زمانہ نہیں۔ اچھا ہوا کہ جعفری صاحب کراچی سے لاہور چلے گئے۔ ورنہ ممکن تھا کہیں پرستائش مند ورمنہ کر بیٹھتا، اور وہ اس داد ایثار کو اپنی ذات پر ایک بیہودہ الزام سمجھ کر مجھ سے بظاہر نہیں تو دل میں آزردہ ہو جاتے۔ میں اس کو واقعی معنوں میں داد ایثار کہتا ہوں۔ انہوں نے اپنے کردار کی ایسی ہی اونچی قربانی دی ہے جیسی بعض مغربی ڈاکٹر بعض خطرناک امراض کی تحقیق و علاج کے لئے اپنے جسم اور بعض اوقات جان کی دیا کرتے ہیں۔ اور شدائد مرض کی اذیت کا اندازہ لگانے کو اس مرض کے جراثیم اپنے خون میں داخل کر لیتے ہیں۔ اور ذاتی تجربہ کے بعد اس کی مدافعت کر کے مخلوق خدا کی تکالیف دور کرنے پر قادر ہو جاتے ہیں۔ جعفری صاحب نے بھی ایک شدید ترین معاشرتی مرض کا تجربہ کر کے چاندنی کے نام سے نسخہ شفا پیش کیا ہے۔ اور خود بھی اس مرض سے پاک صاف ہو کر ادبی و صحافتی فضا میں آ گئے ہیں۔ جعفری صاحب میں ایک بڑی اچھی بات یہ ہے کہ وہ کبھی کسی سے خفا نہیں ہوتے اور دوستوں کو دشمن بنانا انہیں بالکل نہیں آتا۔ حالانکہ یہ بہت آسان بات ہے۔ اور عیب یہ ہے کہ حاسدوں کو جو دشمنوں ہی کی ایک بدترین قسم ہے دوست بنانے کی ناکام سعی سے باز نہیں آتے۔ اور "با دشمناں مدارا" کے اصول پر نقصان مایہ میں اکثر مبتلا ہو جاتے ہیں۔

شبلی بی کام

قمر تسکین

میکسم گورکی نے اپنے "روزنامچے کے پریشان اوراق" میں ذکر کیا ہے کہ ایک روز وہ کسی پارک کے قریب سے گزر رہا تھا کہ اچانک اس کی نگاہیں ادھیڑ عمر کے ایک شخص پر پڑیں جو ایک بنچ پر بیٹھا کبھی ہیٹ اوڑھ لیتا اور کبھی اسے اتار کر سورج کے سامنے کر دیتا تھا۔ گورکی نے قریب پہنچ کر دیکھا تو وہ چیخوف تھا۔ گورکی نے سوال کیا۔

"کیوں میاں چیخوف، یہاں بیٹھے کیا کر رہے ہو؟"

چیخوف نے منہ اٹھا کر بڑی سنجیدگی سے جواب دیا۔

"یار یہ دھوپ قابو میں نہیں آتی۔ میں ہیٹ میں شعاعیں جمع کرکے جلدی سے اوڑھنے کی کوشش کرتا ہوں۔ لیکن وہ نکل بھاگتی ہیں۔"

چیخوف کو سمجھانا بے سود تھا۔ گورکی اسے اپنے حال پر چھوڑ کر اپنی راہ لگ گیا۔

شبلی بی کام دھوپ پکڑنے کی کوشش تو نہیں کر رہا۔ لیکن میں اسے ۱۹۴۲ء سے جانتا ہوں اور اگر میں اپنے علم میں ان لوگوں کی معلومات بھی شامل کروں جو اسے مجھ سے بھی پہلے سے جانتے ہیں تو وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ وہ گزشتہ بیس برس سے طوفان میں مچھلیاں پکڑنے کی کوشش ضرور کر رہا ہے۔

مجھے ایک قریبی دوست ہونے کی حیثیت سے اس کی زندگی کا گہرا مطالعہ کرنے کا موقع ملا ہے۔ جن دنوں وہ "عالمگیر" اور "خیام" کا ایڈیٹر تھا۔ اندرون شہر کے ایک تنگ و تاریک بازار میں رہتا تھا۔ وہ اس وقت مجرد تھا اور اس وقت بھی مجرد ہے۔ اس نے سات روپے ماہوار پر ایک چھوٹا سا چوبارہ کرایہ پر لے رکھا تھا جو صرف ایک کمرہ پر مشتمل تھا۔ اس کی سامنے کی دیوار لکڑی کی بنی ہوئی تھی۔ جس میں تین دریچے تھے جو بازار کی جانب کھلتے تھے۔ روشندانوں میں اور بازار سے گزرنے والی بجلی کے تاروں پر جنگلی کبوتروں کی ایک ڈار غٹرغوں غٹرغوں کرتی رہتی [illegible] کمرے کے [illegible] الماریاں تھیں۔ ایک میں آئینہ کنگھی، کریم اور سنگھار کا دوسرا سامان پڑا رہتا تھا۔ دوسری میں کتابیں اور رسالے بری طرح اٹے رہتے

تھے۔ تیسری میں مٹی کی تہیں جمی رہتی تھیں۔ جن میں چوہوں نے بل بنا رکھے تھے۔ اسی تیسری الماری کے اوپر ایک طاقچہ تھا جس میں بے شمار خطوط کا ڈھیر
اوپر نیچے بے ترتیبی سے پڑے رہتے تھے۔ یہ خطوط راس کماری سے ہمالیہ تک کے ادیبوں، شاعروں، نقادوں اور ایڈیٹروں کے لکھے ہوتے تھے۔ ان
میں ناآموزوں کے خطوط بھی ہوتے اور کہنہ مشق شخصیتوں کے بھی۔ بعض خطوط کے ہمراہ جواب کے لئے ٹکٹ بھی ہوتے اور جوابی لفافے بھی ——— لیکن
شبلی بی کام کے لئے کسی خط کا جواب دینا ایسا ہی ہے جیسے بقول منٹو مرحوم کے ماں بہن کی گالی دے دینا۔ وہ اپنے نام آئے ہوئے تمام خطوط پڑھتا، ایک
آدھ خط کا اپنے دوستوں سے بھی تذکرہ کرتے ہوئے اس مصمم ارادے کا اظہار کرتا کہ وہ اس خط کا جواب ضرور لکھے گا۔ اس نے اکثر ضروری خطوط "اپنے کوٹ
اور پتلون کی جیبوں میں اڑسے ہوتے جب جیبیں جواب دے جاتیں تو وہ ان کو نکال کر مٹی سے اٹی ہوئی الماری کے نچلے خانے میں ڈال دیتا۔ جب وہاں
بھی انبار لگ جاتا اور چوہے ان خطوط کو اپنا تختۂ مشق بنا چکتے تو وہ ان سب کو اٹھا کر اوپر طاقچہ میں ڈال دیتا۔ میں تقسیم سے قبل چھ برس تک خطوط کے
اس ڈھیر کو وہیں رفتہ رفتہ بڑھتے دیکھتا رہا لیکن اسے ان کے جواب دینے کی فرصت نہ مل سکی۔ اسے جواب دینے کی فرصت ہی کہاں ہوتی ہے؟

وہ دن چڑھے چارپائی سے اٹھتا اور وہ بھی اس لئے کہ مہتر اور بہشتی کو آنا ہوتا۔ وہ ہمیشہ اس کا شاکی رہتا کہ سالے سونے نہیں دیتے۔ پھر یہ
عذاب ناگزیر تھا کیونکہ اگر وہ اٹھ کر کواڑ نہ کھولتا تو پانی کہاں سے آتا؟ صفائی کون کرتا؟

وہ بیدار ہو کر سب سے پہلے لوٹا ہاتھ میں پکڑ کر چھت پر چڑھ جاتا۔ شاید دن بھر یہی ایک موقع ایسا ہوتا جب وہ ارد گرد کی منڈیروں اور
چھتوں پر جھانک سکتا۔ لیکن اس کے شرمیلے پن کا یہ عالم تھا کہ اکثر لوگ مالک مکان سے یہ کمرہ کرایہ پر مانگنے چلے آتے۔ کیونکہ ان کے خیال میں یہاں
کوئی بھی نہ رہتا تھا۔ پھر وہ شیو بناتا، غسل کرتا اور کپڑے پہن کر سیڑھیوں سے اتر کر ساتھ کے پان فروش سے سگریٹ کی ایک ڈبیا اور ایک پان خریدتا اور
ہیرا منڈی کے ایک ہوٹل "بسم اللہ" کا رخ کرتا۔ رستے میں اس کے ایک ہندو پروفیسر کے بھائی کی دوکان تھی۔ وہ اس ہندو حلوائی سے اکنی کا بند اور پانچ
پیسے کی مکھن کی ٹکیہ خریدتا اور بسم اللہ ہوٹل میں پہنچ کر ایک سپیشل چائے کا آرڈر دیتا۔ یہ چائے دودھ، چائے کے رس اور چینی کو ملا کر ایک ہی ساتھ بنائی
گئی ہوتی۔

لاکھ آندھی آئی، موسلا دھار بارش ہوئی، لام لگ گئی، خاکساروں پر گولی چلی، فسادات ہوئے۔ لیکن شبلی بی کام کے اس معمول میں کبھی فرق نہ
آیا۔ وہ اپنے اس روزمرہ پر ۱۹۳۸ء سے ۱۹۴۷ء تک عمل پیرا رہا۔

"بسم اللہ ہوٹل" سے نکل کر وہ تحصیل بازار کی راہ لیتا۔ یہاں "عالمگیر" اور "خیام" کا دفتر تھا۔ بشرطیکہ اسے دفتر کہا جا سکے کیونکہ میرے خیال میں
اسے دفتر کی بجائے کباڑ خانہ کہنا زیادہ موزوں تھا۔ جگہ انتہائی تنگ اور بے ڈھب سے اور سب سے زیادہ مصیبت عالمگیر پریس کی گڑگڑاہٹ۔
"سید مٹھا بازار" سے "تحصیل بازار" کی طرف چلیں تو اس بازار کے بائیں ہاتھ ایک چھوٹی سی مسجد ہے۔ اسی مسجد کے ساتھ ایک بڑا سا پھاٹک ہے اس
پھاٹک سے داخل ہوں تو دو بڑی سی مشینیں نظر آتی تھیں۔ یہ مشینیں پہلی جنگ عظیم کا ماڈل تھیں۔ اس لئے پوری قوت سے چیختی چلاتی رہتی تھیں ان
کے پہلو میں ایک چھوٹا سا کمرہ تھا۔ جہاں حافظ محمد عالم مرحوم ایک لمبے بازوؤں والی گہری آرام کرسی پر بیٹھے رہتے تھے۔ ایک میز کرسی شبلی بی کام کے
لئے مخصوص تھی۔ دوسری میز ایجنسی کلرک کے سپرد تھی۔ تیسری میز اشتہارات کے زیر استعمال تھی۔ چوتھی میز پر ایک کلرک بیٹھتا تھا اور پانچویں میز ایک
ٹائپسٹ کو دے دی گئی تھی۔ میں آج بھی اس چھوٹے سے کمرے کا تصور کرتا ہوں تو بلیک ہول کے واقعہ پر یقین کر لینے کو جی چاہتا ہے۔ حیرت
ہے کہ اس قدر تنگ و تاریک کمرے میں اتنے لوگ، اتنی میزیں اور اتنی کرسیاں کس طرح سما جاتی تھیں۔ پھر ملاقاتی بھی آتے رہتے تھے اور حافظ صاحب
سے کاروبار کرنے والے لوگ اس پر مستزاد!

اس کمرے کی ایک چھوٹی سی واحد کھڑکی سڑک کی جانب کھلتی تھی۔ جہاں پانچ سات منٹ کے بعد ایک آواز [illegible] لگا کر گزرتا
تھا۔ مال مربے ——— کھیوں گجک ——— نان کباب ——— آلو چھولے ——— کتابیں رسالے کی ردی ——— [illegible] والا۔

—— بزرگوں کی آنکھیں سُننے میں آتیں —— پریس کی کرب آلود پکار —— حافظ مرحوم کے وقتاً فوقتاً بلند ہوتے نعرے —— "رحمدار کہاں ہو؟ —— بھئی ادھر آؤ —— چار سیر آم لاؤ۔ نہایت اعلیٰ، نہایت نفیس، نہایت میٹھے، نہایت عمدہ، نہایت اچھے ہوں۔" لیکن ان سب باتوں کا شاید شبلی بی کام پر کوئی اثر نہ ہوتا۔ وہ صبح سے شام تک اسی پریس میں کام کرتا۔ اسی شور و غل کے مچھلی بازار میں مسلسل دس برس تک شبلی بی کام نے تحقیقی کام کیے اور کسی ایک بار بھی اس کے قلم نے تھکنے کا نام نہ لیا۔ ایک دفعہ اس نے "شاعر آگرہ" "میں" "میں ایڈیٹر ہوں" کے عنوان سے لکھا تھا کہ جب تک مشینوں کے پہیے گڑگڑاتے ہیں، گراریاں گھومتی ہیں، سلنڈر پھرتے ہیں اور پٹہ چلتا ہے۔ اس کا قلم بھی کاغذ کی سطح پر جولانیاں دکھاتا ہے۔ لیکن جونہی مشینیں ٹھہر جاتی ہیں اس کا قلم بھی تھم جاتا ہے اور یوں محسوس ہوتا ہے جیسے زمین نے اپنے محور کے گرد گھومنا چھوڑ دیا ہے، جیسے گنبدِ افلاک کی گردش رُک گئی ہے جیسے اس کے ذہن پر تاریکی سی چھا گئی ہے اور اب وہ اپنے ذہن سے کام نہیں لے سکتا، اپنے خیالات کی دُنیا نہیں سنوار سکتا۔

شبلی بی کام مسلسل دس برس تک ہنگاموں کی اسی دُنیا اور گڑگڑاہٹ کے اسی عالم میں بیٹھ کر ہفت روزہ "خیام" اور ماہنامہ "عالمگیر" کو ایڈٹ کرتا رہا۔ ان دونوں جریدوں کا شمار اُس وقت کے معیاری اور کثیرالاشاعت جرائد میں ہوتا تھا۔ اور ان کا ہر دوسرے تیسرے مہینے کوئی نہ کوئی ضخیم خاص نمبر شائع ہوتا رہتا تھا۔ وہ ان پرچوں کا تن تنہا چیف ایڈیٹر، مینجنگ ایڈیٹر اور سب ایڈیٹر تھا۔ وہ کام کی نا روانی کے باوجود اپنے فرائض کو جس خوش اسلوبی سے نبھاتا وہ دنیائے ادب و صحافت میں ضرب المثل بن چکی ہے۔ لوگ اُسے "ادبی اور صحافتی جن" کہا کرتے تھے۔ غالباً اسی تن دہی سے متاثر ہو کر نیاز فتحپوری نے ایک دفعہ اُسے لکھا تھا۔

"اگر تمہاری طرح کا محنتی آدمی مجھے مل جائے تو میں نگار اُس کے سپرد کر کے خود گوشہ نشین ہو جاؤں۔" اسی زمانہ میں جوش ملیح آبادی نے اُس کے کسی مقالہ کا حوالہ دیتے ہوئے کلیم میں یہ رائے ظاہر کی کہ

"محنت و جانفشانی اور عرق ریزی اس کا نام ہے۔"

اسی دور میں اُس نے عالمگیر کے صفحات پر بیس بائیس صفحات کا ایک مقالہ "لاشعور اور اُس کی زندگی اور ادب پر اثر" لکھا تو ڈاکٹر مولوی عبدالحق نے لکھا۔

"آپ کا مطالعہ بہت وسیع ہے۔ میں نے اتنی کتابیں نہیں پڑھیں۔"

اس مقالہ پر مولانا عبدالماجد دریا آبادی۔ مولانا عبدالستار صدیقی، عندلیب شادانی، برجموہن دتاتریہ کیفی، محی الدین زور قادری اور بے شمار دوسرے علماء و فضلا نے جو خراجِ تحسین ادا کیا وہ خطوط میں نے بھی دیکھے ہیں اور "عالمگیر" میں بھی شائع ہو چکے ہیں۔

وہ اسی پریس میں بیٹھ کر "حرف و حکایت" کے عنوان سے جواہر ریزے بکھیرتا تھا۔ حتیٰ کہ اُس کے کئی کئی سو صفحات کے ناول بھی اسی پریس کی کربناک اور مضمحل فضاؤں میں بیٹھ کر لکھے گئے ہیں۔

سہ پہر ڈھلے شبلی پریس سے نکلتا اور اخبار و رسائل کا پلندہ بغل میں داب کر سیدھا لوہاری دروازے کی طرف ہو لیتا۔ وہاں اُردو اکیڈیمی میں بیٹھ جاتا۔ سامنے کے ہوٹل سے چائے کا آف سیٹ آتا اور وہ چائے کی پہلی پیالی کے ساتھ ہی تازہ دم ہو جاتا۔ اُس کے دوست احباب بھی یہیں آجاتے اور یا تو رات گئے تک یہیں گپ شپ گرم رہتی یا وہ دو تین دوستوں کے ہمراہ انارکلی سے مال روڈ کا چکر کاٹتا اور بھاٹی دروازے کے رستے واپس عالمگیر پریس میں پہنچ جاتا۔

اسی زمانے میں [illegible] نے اُس کی سیرت کا حال لکھا تھا کہ سنا ہے آپ پہلے کے [illegible] یاد سے انارکلی بازار میں نکلتے ہو [illegible] عالمگیر پریس میں ہیں "کا [illegible] تھا۔ ایک کاتب کھانا تیار کر دیتا اور وہ پریس کی چھت پر بیٹھ کر کھانا کھاتا۔ چائے پیتا۔ کھڑی چارپائی پر لیٹ [illegible] اور چھت کے نیچے اسی [illegible] میں آجاتا۔ سیڑھیوں میں داخل ہوتا تو سب سے پہلے سیڑھیوں کا دروازہ بند

پھر اندر سے چٹخنی لگا کر کمرے کے تمام کواڑوں کو چٹخنی لگا دیتا۔ دراصل یہ وقت اُس کے مطالعہ کا ہوتا۔ اس وقت کسی کو آنے کی اجازت نہ ہوتی۔ نو بجے رات کے بعد اُس کے کسی عزیز ترین دوست کو بھی اُس کی ضرورت محسوس ہوا اور وہ اُس کے کمرے پہ جا کر لاکھ آوازیں دے اُسے پکارے دروازہ کھٹکھٹائے لیکن وہ سب کے جواب میں چپ سادھے رہتا۔ حتیٰ کہ اُس کا دوست مایوس ہو کر لوٹ جاتا۔ اس وقت وہ "حرف و حکایت" "فکر و نظر" اور "ذکر و فکر" کا مواد تیار کرتا یا بیرونی رسائل کے لئے مضمون لکھتا۔ اُس نے ناول اور افسانوں کی بیشتر کتابیں بھی اسی وقت میں لکھی ہیں۔

میرے علاوہ احسان بی اے اور میرزا ادیب کا بھی اُس کے ہاں آنا جانا تھا۔ اس لئے انہیں ایسے وقت میں بھی اُس سے ملنے کا اتفاق ہوا ہے۔ میرزا ادیب نے اپنے ایک افسانے "عبدالرحمٰن" کا مواد شبلی کے اس کمرے سے لیا تھا اور عبدالرحمٰن دراصل عبدالرحیم شبلی کا نفسیاتی تجزیہ ہے اس افسانے کے آخری حصہ میں میرزا ادیب ٹھوکر کھا گئے ہیں۔ لیکن ماحول نگاری میں ان کا یہ افسانہ بڑا کامیاب ہے۔ میرزا صاحب نے لکھا ہے۔

"گرمیوں کے دنوں میں مچھروں کے حملے سے بچنے کے لئے وہ پاؤں کو کسی چادر میں چھپا لیتا اور اگر موسم سرما ہوتا تو اوور کوٹ میں لپٹا لپٹایا دیوار سے سہارا لگائے کسی کتاب کا مطالعہ کرتا، لکھتا اور ساتھ ہی ساتھ سگریٹ کے کش بھی لگاتا رہتا۔"

اس وقت دیوار سے سہارا لگا کر سوان ایک چارپائی پہ رکھی رہتی سیاہی کی بوتل اکثر چارپائی پہ اُلٹ جاتی۔ چادر سیاہی سے تربتر ہو جاتی لیکن وہ افسوس نہ کرتا بلکہ ہنس پڑتا کیونکہ اس کے بجٹ میں ہر ماہ ایسی آٹھ دواتوں کی رقم مخصوص رکھی جاتی تھی۔

ایک بجے رات تک وہ فکر و مطالعہ میں کھویا رہتا۔ پورے ایک بجے جب بازار میں ہنگامہ ختم ہو جاتا۔ پان فروش پیتل سے منڈھا ہوا تختہ مانجھنے لگ جاتا۔ دودھ دہی والا کونڈے صاف کر کے ایک طرف رکھ دیتا اور کڑاہی رگڑ رگڑ کر صاف کرتا اور بازار کے تمام ریڈیو اپنی ریکارڈنگ ختم کر دیتے تو شبلی بی کام چپ چاپ نیند کے آغوش میں جا سوتا۔

برابر دس برس تک اُس کا یہی پروگرام رہا۔ اُسے دُنیا کا کوئی ہوش نہ تھا۔ اس کی مجردانہ زندگی اسی ڈگر پر بسر ہوتی رہی۔ اُس کے بیوی بچے تھے ہی نہیں کہ گھریلو اُلجھنوں کے حل کی فکر ہوتی۔ شادی کے متعلق اُس کے خیالات عجیب ہیں میرزا ادیب نے لکھا ہے کہ

"اس کی ذہنی تخلیقات ملک کے گوشے گوشے میں پھیل چکے تھے۔ وہ اسے بہت بڑا آدمی سمجھتے تھے۔ مگر جو دو تین دوست اس کے بہت قریب تھے اور اس کے معمولاتِ حیات سے پوری طرح واقف تھے۔ وہ اکثر حیران ہو کر یہ سوچنے لگتے تھے کہ اپنی بے پناہ قابلیت کے باوجود یہ شخص اپنی زندگی کے معیار کو بلند کیوں نہیں کرتا۔ حقیقت یہ تھی کہ اس کی نگاہوں میں دولت کی کوئی وقعت نہیں تھی اور عورت کے تصور نے اس کی زندگی کی سرد فضا کو ابھی چھُوا تک بھی نہیں تھا۔ شادی کے بارے میں اس کا نظریہ عجیب و غریب تھا۔ جب کبھی گفتگو میں شادی کا ذکر چھڑ جاتا تو وہ مُسکرا کر کہتا۔ "میں شادی صرف اس لئے کروں گا کہ میرے گھر میں ایک عورت ہر صبح میرے لئے چائے کی گرم گرم پیالیاں بنا دیا کرے اور جب میں کام سے فارغ ہو کر گھر آؤں تو میرے لئے کھانا بالکل تیار موجود ہو۔"

اس کے موڈ کی ایک بات یاد آ گئی۔ قیام پاکستان سے قبل میں لاہور سے ایک رسالہ شائع کرنا چاہتا تھا شبلی سے ذکر ہوا تو اُس نے ایک ریستوران میں جو خاکہ بنا کر مجھے دیا تھا۔ وہ یہ تھا۔

ماہنامہ ندیم لاہور —— ایڈیٹر قمر تسکین

ایڈیٹوریل —— پڑھنے والے بھائیو! میں نہ تو ادیب ہوں نہ شاعر، ایک معمولی ایڈیٹر ہوں جس کا کام نو آموز لڑکوں سے تحریریں چھینا اور اُن کو ٹھیک ٹھاک کر کے شائع کر دینا ہے۔

ماہنامہ ندیم کا پہلا شمارہ ایک حقیر ہدیہ کے طور پیش کرتا ہوں۔ اگر آپ اس کی سرپرستی قبول فرمائیں تو آپ پڑھے لکھے آدمی ثابت ہوں گے

اور میری روزی پانی کا بندوبست ہو جائے گا ——— آداب عرض ۔ قمر تسکین

پہلا افسانہ	ڈراما	نظم
وہ ایک لڑکی پر عاشق ہوا ۔ لیکن لڑکی کسی اور کے ساتھ بھاگ گئی ۔	" تم " "ہاں میں !" معاف کیجئے ۔ میری نظر کو دھوکہ ہوا	یہ صبح کا وقت اور یہ راوی کا کنارا اب کیا ہے نہانے کے سوا اور کا چارا

مزاحی گیت	نفسیات	ریویو
مدرسے ڈھٹیا ہیں چھ سپہے ناچنت ہے	ادیب اس لئے لکھتا ہے کہ اس کی ماں نے اُس کا دودھ چھڑا کر اسے ذہنی صدمہ پہنچایا ۔	" وحشیانت " اس دور کی مایۂ ناز تصنیف ہے ۔ یہ الگ بات ہے کہ اس میں مغز نام کو بھی نہیں ۔ بس چھلکا ہی چھلکا ہے ۔

جب وہ موڈ میں ہو تو سینکڑوں لطیفوں چٹکلوں اور حکایتوں سے پوری محفل کو کشتِ زعفران بنا کر رکھ دیتا ہے ۔ خوب ہنسا اور خوب ہنساتا ہے ۔ اس کے احباب اس کے قریب بیٹھ کر اپنی ہر پریشانی کو بھول جاتے ہیں ——— لیکن اگر وہ کام میں مصروف ہو تو اُس سے بڑھ کر خشک مزاج انسان کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا ۔ ۱۹۴۳ء کا ذکر ہے ۔ پروفیسر اختر اورینوی پٹنہ سے آئے تو لاہور میں ایک آدھ دن کے لئے ٹھہر گئے میں اور میرزا ادیب انہیں شبلی بی کام سے ملانے عالمگیر پریس لے گئے ۔ شبلی دیوار کی طرف منہ کئے کاغذوں پر جھکا "خاص نمبر عالمگیر" کے کام میں مصروف تھا ۔ ہم تینوں اُس کے عقب میں جا کھڑے ہوگئے اور میں نے شبلی کو متوجہ کرتے ہوئے تعارف کرایا ——— "آپ ہیں اختر اورینوی صاحب" ——— شبلی نے منہ پھیرے بغیر اپنا ہاتھ عقب کی طرف بڑھایا ۔ اختر اورینوی اور اس کا ہاتھ مل گئے ۔ ایک منٹ ، دو ، تین اور چار منٹ گزر گئے ۔ شبلی پروف پڑھنے میں مصروف رہا اور منہ پھیر کر بھی نہ دیکھا ۔ چنانچہ ہم تینوں "السلام علیکم" کہہ کر پریس کی گڑگڑاہٹ سے نجات پا آئے ۔ تمام راہ میں اور میرزا ادیب انتہائی شرمندگی کے عالم میں قدم اُٹھاتے رہے ۔ بچارے اختر اورینوی خاموش رہے اور اپنی منزل پر ہم سے جدا ہو گئے ۔ واپسی پر ہمارے مابین شبلی کے بارے میں کوئی گفتگو نہ ہوئی ۔

شبلی بی کام کی زندگی کے اس عجیب و غریب اسلوب نے اُسے ایک افسانوی کردار بنا کر رکھ دیا ہے ۔ چنانچہ اختر اورینوی نے پٹنہ پہنچ کر "انارکلی اور بھول بھلیاں" کے عنوان سے ایک افسانہ لکھا ۔ یہ افسانہ شبلی کے گرد گھومتا ہے ۔ اس افسانے کی اُٹھان بہترین ہے لیکن کلائمکس خلافِ واقعہ ہے ۔ میرزا ادیب نے بھی اپنے افسانے "عبدالرحمٰن" میں کھوج لگانے کی کوشش کی کہ شبلی بی کام کی تفریح کا انحصار کس چیز پر ہے ؟ اختر اورینوی کا خیال ہے کہ شام کے وقت اُس نے انارکلی سے کھلونا خریدا اور اسی میں لذت محسوس کر کے مطمئن ہو گیا ——— میرزا ادیب اپنے افسانے میں اچانک ایک روز اُس کے کمرے میں تبدیلی دیکھتا ہے ۔ نیلے پردے ، کرسی ، میز وغیرہ دیکھ کر کچھ اندازے لگاتا ہے ۔

لیکن میری رائے میں یہ دونوں حضرات تہ تک نہیں پہنچ سکے ۔ شبلی کی تفریح کے اسرار کی گتھی ان سے نہیں کھل سکی اور سچی بات تو یہ ہے کہ میں بھی اس معمّا کو نہیں سمجھ سکا ۔ اس زمانہ میں شبلی کے گھر پر کس مپرسی کا عالم تھا ۔ اس لئے وہ کسی کو اپنے گھر کا پتہ نہ بتاتا تھا ۔ اس کے کمرے کا نقشہ میرزا ادیب نے ان الفاظ میں کھینچا ہے ۔

"کمرے کا ہر چیز مُردہ ، بے جان اور بے روح تھی ۔ یوں محسوس ہوتا تھا گویا زندگی کی حرارت نے اس تنگ و تاریک اور محدود دنیا میں کبھی سانس لیا ہی نہیں ہے ۔ جس وقت وہ کمرے میں موجود ہوتا تو کبھی کبھی پُرسکوت فضا میں چلنے پھرنے یا برتن اُٹھانے اور رکھنے سے ایک لرزش سی پیدا ہو جاتی ۔ مگر چند لمحوں کے بعد ہی یہ لرزش اس طرح غائب ہو جاتی جیسے کسی جھیل کی کائی جمی سطح پر پتھر گرنے سے اضطراب کے ہلکے

آثار پیدا ہو کر آتا تا تا ایک ابھرتے ہوئے دائرے میں ڈوب جائیں ۔ اس کی زندگی کے ہزاروں دن اور ہزاروں راتیں اس درمیان کمرے میں گزر چکی تھیں ۔ مگر اس کی حالت آج بھی وہی تھی جو آج سے سات برس پیشتر تھی ۔ سات سال کی لمبی مدت اس نے اس کمرے میں اس طرح گزار دی تھی جیسے وقتی طور پہ ایک مسافر سرائے میں قیام کر رہا ہو ۔ چائے پینے کام کرنے اور سونے کے علاوہ اسے دنیا کی کسی چیز سے دلچسپی نہیں تھی۔

تقسیم سے کچھ عرصہ قبل حافظ محمد عالم کی بیماری کے دوران میں شبلی میں کچھ بیزاری سی پیدا ہو گئی ۔ شاید وہ مسلسل دس سال تک ایک ہی جگہ کام کرتا کرتا تھک گیا تھا ۔ اس نے کینچلی بدلی اور ہفتہ وار، ماہوار رسالوں کو چھوڑ کر روزناموں کی دنیا میں چلا گیا۔

قیام پاکستان کے بعد بھی شبلی بی کام کے معمول میں کوئی فرق نہیں آیا۔ سید مٹھا بازار والا چوبارہ تو فسادات کی نذر ہو گیا اور تقسیم کے بعد وہ مہاجر بن کر اپنے عزیز و اقارب کے ساتھ آیا تھا ۔ اس نے نئی انارکلی میں دو تین کمرے الاٹ کرا لئے ہیں لیکن یہاں بھی اس کے حصہ میں صرف ایک ہی کمرہ آ سکا ہے ۔ اس کے گھر میں اگرچہ اب بھی بیوی نہیں ہے تاہم ماں باپ موجود ہیں ۔ اس کے باوجود وہ صبح سویرے اٹھتا ہے، شیو بناتا، نہاتا دھوتا اور ناشتہ سے فارغ ہو کر تانگہ کر کے سیدھا دفتر پہنچتا ہے ۔ پہلے وہ اپنے دفتر کا کام ختم کر کے دو بجے کے بعد رسالہ "فلم لائٹ" کے دفتر میں محفل احباب جماتا تھا اب رسالہ ڈائرکٹر کے دفتر میں بیٹھتا ہے ۔ اُسے فلموں سے دلچسپی نہیں ہے ۔ کیونکہ وہ ایک فیصد بھی "فلمی آدمی" نہیں۔ اُسے تو محض ان فلمی دفتروں کے اُن گدوں سے دلچسپی ہے جو اس کے تھکے ہارے جسم کو چند گھنٹوں کے لئے آسودگی دیتے ہیں ۔ فلم لائٹ کے دفتر کا صوفہ اس کی بے پروائی کے باعث جل گیا تو وہ رسالہ ڈائرکٹر کے دفتر میں آ ٹھہرا ۔ یہاں سے اکتائے گا تو کسی اور ایسی جگہ جہاں اس کے بقول پیشاب کرنے کی جگہ ہو، پنکھا ہو، ایک صوفہ سیٹ ہو اور چائے منگوائی جا سکے، چلا جائے گا اور اسی دفتر میں بیٹھ کر اپنی جیب سے دس کا ایک نوٹ نکال کر چائے منگوائے گا ۔ آس پاس بیٹھے ہوئے سب لوگوں، سب ملاقاتیوں اور سب دوستوں کو چائے پلائے گا ۔ کوئی کھانا کھانا چاہے تو اسے کھانا کھلانے سے بھی دریغ نہ کرے گا۔

وہ کہا کرتا ہے ۔ "میں چاہتا ہوں کہ نیوزی لینڈ چلا جاؤں ، سمندر کے کنارے کسی سرسبز و شاداب تختہ پر لیٹ رہوں ۔ لیٹا رہوں ۔ حتٰی کہ کئی صبحیں طلوع ہوں اور شامیں غروب ہو جائیں" —— دراصل اس کا جسم تھک چکا ہے لیکن تعجب ہے کہ اس کا ذہن ابھی تک نہیں تھکا ۔ اس میں ایک لاوا سا سلگ رہا ہے ۔ جس کی چنگاریاں اس کی تحریروں میں اڑتی رہتی ہیں ۔ تقسیم کے بعد سے وہ روزانہ اخباروں میں چیف ایڈیٹری کے فرائض سرانجام دے رہا ہے ۔ وہ اداریئے لکھتا ہے، کئی ملک گیر تحریکیں چلا چکا ہے ۔ کئی وزارتوں کو الٹ چکا ہے ۔ عوام کے ان گنت مسائل کو حل کرنے کی جدوجہد میں کئی فرعونوں کے بخیئے ادھیڑ چکا ہے ۔ لیکن وہ ایک عجیب کردار ہے ۔ جسے سچی بات ہے میں اب تک نہیں سمجھ سکا۔

اس کی بہترین تعریف ہوٹل میں ایک آدھ گھنٹہ بیٹھنا ہے ۔ جہاں اسے اک ذرا چھیڑ دیا جائے تو پھر دیکھئے کیا ہوتا ہے ۔ اس کا تجربہ اور مطالعہ بہت وسیع ہے ۔ وہ گزشتہ پچیس برس سے بے شمار سیاسی، ادبی اور مذہبی تحریکوں کا عروج و زوال دیکھ چکا ہے اس لئے معاشرے کا ایک مزاج بن کر رہ گیا ہے ۔ اسے ادب اور صحافت سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔

وہ باتیں بڑے پتے کی کہتا ہے اور اس حد تک بے باک ہے کہ کسی کی پروا نہیں کرتا ۔ وہ ناشروں کے بھی خلاف ہے اور مصنفوں کے بھی، سیاستدانوں کے بھی اور —— سب کے ۔ بلکہ کبھی کبھی تو خدا اور انبیاء اولیاء بھی اس کی زد میں آئے بغیر نہیں رہتے ۔ بایں ہمہ اس کی گفتگو بے معنی اور بے ہنگم نہیں ہوتی ۔ انداز خواہ کچھ ہو ۔ اس میں علمیت کا رنگ موجود ہوتا ہے ۔ مثلاً وہ حسرتؔ، سالکؔ اور سلیمان ندوی کو کوسنے بیٹھے گا تو ساتھ ہی یہ بھی کہہ دے گا کہ حسرتؔ صاحب نے فلاں تاریخ کا مادہ غلط نکالا ہے اور فلاں کتاب کا نام غلط لیا ہے ۔ سالکؔ صاحب نے قصہ چہار درویش [illegible] کے سر منڈھ دیا ہے ۔ سلیمان ندوی نے مستشرقین کی کتابیں ترجمہ کرا کے اپنے نام سے چھاپ لی ہیں ۔ لیکن وہ عمر خیام کی تاریخ پیدائش متعین نہیں کر سکے ۔ حالانکہ گوسوامی نے نجوم کی مدد سے منٹ اور سیکنڈ بھی بتا دیئے ہیں ۔ اس کا مطالعہ وسیع ہوتا ہے اور وہ پتے کی باتیں کہتا ہے ۔ اب [illegible]

کیسے جینا ہے نے بھی تو بتایا کس طرح ہے؟

وہ idealist (آئیڈیالسٹ) ہے اور اپنے آئیڈیل کی تلاش میں ہے۔ شاید اسی لئے صبح سے رات کے دس بجے تک اخباروں اور رسالوں کے دفتروں میں ہنگامہ خیز زندگی بسر کر رہا ہے۔ لیکن درحقیقت وہ سکون مانگ رہا ہے۔ کیا وہ اپنے آئیڈیل کو پا سکے گا؟ کیا اسے سکون میسر آسکے گا؟

میرا تو اب بھی یہی خیال ہے کہ وہ طوفان میں مچھلیاں پکڑنے کی کوشش کر رہا ہے۔

وہ آرٹ کی بلندیوں پر پرواز کرتا ہے۔ لیکن زندگی کے آرٹ سے آگاہ نہیں۔ وہ ایک "حقیقت پسند" دنیا میں "عینیت" کی تلاش میں سرگرداں ہے —— اس کی حالت قابلِ رحم ہے —— !

اس کے والد اور والدہ دونوں نثر نگار تھے۔ اس لئے جب شبلی نے اس دنیا میں آنکھ کھولی تو اس کے اردگرد اخباروں اور کتابوں کے انبار کے سوا کچھ نہ تھا۔ اس کا سب سے پہلا مضمون دس برس کی عمر میں بچوں کے اخبار "پھول" میں شائع ہوا۔ اس زمانہ میں وہ پانچویں جماعت کا طالب علم تھا۔ نویں جماعت سے شبلی بی کام نے انگریزی میں مضمون نگاری کا سلسلہ شروع کیا۔ اس کا سب سے پہلا مضمون پندرہ روزہ "سن رائز" میں شائع ہوا۔ سکول کے زمانہ میں اس نے زیادہ تر وہی کچھ لکھا جو پڑھنے یا سننے میں آیا تھا۔ لیکن عبدالرحیم میں جو شبلی چھپا بیٹھا تھا وہ سب سے پہلے ٹیکسلا کے کھنڈروں میں گھومتے وقت بیدار ہوا۔ اسے ویرانے خاص طور پر پسند ہیں۔ ویرانوں میں وہ صرف اجڑے ہوئے دیار شامل نہیں کرتا بلکہ سنسان پہاڑ بھی شامل کرتا ہے۔ اسے آبادیوں میں رہنے سے اتنی مسرت نہیں ہوتی جتنی دور دور تک پھیلے ہوئے پہاڑ کے دامنوں میں گنگناتی ہوئی ندیوں اور آبشاروں کی خاموش موسیقیوں میں بیٹھ کر ہوتی ہے۔ اس کے احساسات اس وقت بیدار ہوئے جب وہ ڈلہوزی کی پانچ پلی ندی کے کنارے بیٹھ کر قدرت کے پُرکیف نظاروں کی اتھاہ میں کھو گیا۔

بی کام اس کے نام کا جزو بن چکا ہے۔ جسے کوشش کے باوجود آج تک علیحدہ نہیں کر سکا۔ حتیٰ کہ اب تعارف کے وقت بھی لوگ پوچھتے ہیں۔ کون سے شبلی؟ شبلی بی کام! —— تو مجبوراً اسے اثبات میں سر ہلانا پڑتا ہے۔ اس نے کئی دفعہ اپنے مضامین پر شبلی بی کام کے بجائے عبدالرحیم شبلی لکھ دیا ہے اور یہ مضامین جب اس کے دوستوں کی نظر سے گزرے تو انہوں نے پڑھ کر کہا —— "اچھا تو آپ تھے۔ ہم نے سمجھا۔ وہ کوئی اور شبلی ہو گا۔" اس نے اپنے نام کے ساتھ بی کام لکھنا کبھی گوارا نہیں کیا۔ لیکن بدقسمتی سے بعض ایڈیٹروں نے اس کے پتہ میں سے یہ الفاظ نکال کر نام کے ساتھ نتھی کر دیئے۔ شروع شروع میں ایڈیٹروں نے غالباً مولانا شبلی مرحوم سے عبدالرحیم شبلی کو علیحدہ شخصیت ظاہر کرنے کے لئے ڈگری کو نام سے نتھی کیا تھا اور بعد میں یہ ایک ایسا جزو بن گیا جسے علیحدہ نہیں کیا جا سکتا۔

اس کے خاندان میں یہ رواج ہے کہ ہر شخص کا ایک تخلص رکھ دیا جاتا ہے۔ عام اس کے کہ وہ شاعر ہو یا نہ ہو اس کا تخلص بھی اس کی والدہ محترمہ نے اس کے پیدا ہوتے ہی تجویز کیا تھا۔ غالباً اس وقت مولانا شبلی نعمانی نئے نئے فوت ہوئے تھے اور ان کے ادبیانہ کارناموں کی گونج ابھی تک فضا میں باقی تھی۔ اس لئے ممکن ہے اس کی والدہ نے یہ خیال کیا ہو کہ شاید یہ لڑکا بھی اپنے باپ کے نقشِ قدم پر چلے اور عجب نہیں کہ ان کی طرح شاعر ہی نکلے۔ اس لئے یہ تخلص (شبلی) اس پر ٹھونس دیا گیا۔ تاہم اس میں شعر و شاعری کا فطری ذوق موجود ہے جو کبھی کبھی معاشیات کی شورش تعلیم کے باوجود ابھرتا رہتا ہے اور ایک زمانہ ایسا بھی آیا ہے جب یہ کلام موزوں کی صورت میں ڈھل گیا تاہم اس کے نام سے جتنی بھی غزلیں یا نظمیں شائع ہوئی ہیں۔ وہ ان کو اپنے ادب میں شامل کرنے کو تیار نہیں ہے۔

سانولی رنگت، اٹھے بال، ستواں ناک اور موٹی موٹی آنکھوں والا انتالیس[39] سالہ سید عبدالرحیم ہاشمی (شبلی بی کام) دوستوں کی محفل میں بے باکی کے ساتھ قہقہے لگاتا، ہنستا اور سگریٹ پہ سگریٹ پیتا ہے جب معلمانہ انداز اختیار کر لیتا ہے تو بڑا عجیب سا معلوم ہوتا ہے۔ اس کا یہ معلمانہ انداز چھوٹے بڑے تمام ادیبوں کے ساتھ ہے۔ وہ اپنے کسی دوست اور کسی ملاقاتی کو نہیں چھوڑتا۔ کسی کو معاف نہیں کرتا۔ وہ ادیبوں کے دکھ درد سے

بخوبی واقف ہے۔ وہ جانتا ہے کہ اس کا مستقبل بھی ان ہی سے وابستہ ہے۔ صرف اسی کا نہیں بلکہ اُردو جیسی عظیم زبان کے تمام ادیبوں کا ساتھی اس لئے وہ ایک ادیب کی تکلیفوں اور مصیبتوں کا احساس کرتا ہے۔ اس کے دل میں خلوص ہے اور جب وہ انتہائی خلوص سے کسی ادیب کو چھوٹے اور معمولی مسائل سے لے کر بڑے اور دقیق مسائل کے بارے میں سمجھا رہا ہو تو اس کا یہ انداز بالکل معقولانہ معلوم ہوتا ہے۔

یہی سبب ہے کہ میں نے اپنے اس مضمون میں شبلی بی کام کی کمزوریاں نہیں گنوائیں۔ اس لئے کہ میں اس کا دیرینہ دوست ہوں اور مجھے اس میں خوبیاں ہی نظر آتی ہیں۔ اس کی شخصیت بڑی پیاری، بڑی حسین اور بڑی عجیب و غریب ہے۔ میرا خیال ہے کہ "عجیب و غریب" کا لفظ قدرے وضاحت طلب ہے ــــــ!

شبلی بی کام جب بولنے پر آتا ہے تو اپنے مخصوص انداز میں اپنی عینک کے دائروں سے اپنی شعلہ بار آنکھیں نچا نچا کر بولے چلا جاتا ہے اس وقت اُسے آپ کسی ناراضی، ندامت، آزردگی، مصروفیت غرضیکہ کسی شے کی پروا نہ ہوگی اور اس کے دلائل کا سلسلہ اس وقت رکے گا جب آپ اپنی مکمل شکست کا اعلان کر دیں گے۔

آپ اپنے کسی ذاتی مسئلہ پر اس سے انتہائی ضروری مشورہ کر رہے ہوں گے تو وہ اچانک اپنے دائیں ہاتھ کی انگلیوں سے فضا میں کچھ لکھنے لگے گا اور آپ کے مسئلہ پر قطعی توجہ نہ دے گا۔ اس وقت بھی اُسے آپ کسی ناراضی، آپ کے جذبات و احساسات غرضیکہ آپ کا بالکل خیال نہ ہوگا!

اگر وہ موڈ میں ہوگا تو آپ کو ہلکے سے اشارے پر دو چار سو روپے تک ادھار دینے سے دریغ نہ کرے گا اور اس کے ذہن میں ان روپوں کو واپس لینے کا خیال تک نہ ہوگا۔ لیکن اگر آپ کی جان پر بن آئے اور آپ اس کے سامنے ایک آدھ روپے کے لئے دست سوال دراز کریں۔ وہ موڈ میں نہ ہو تو آپ کی کسی بات سے متاثر نہ ہوگا اور ایک پھوٹی کوڑی بھی جیب سے نہ نکالے گا۔

وہ مال، لارنس، میکلوڈ اور انارکلی میں اس قلندرانہ شان سے چلتا پھرتا نظر آتا ہے کہ کسی روزانہ اخبار کے چیف ایڈیٹر کے بجائے کسی دفتر کا معمولی سا کلرک نظر آتا ہے۔

آج کی مادی دنیا میں ہر بڑے آدمی، ہر ظالم، ہر وزیر، امیر سے نفرت کرتا ہے حتیٰ کہ ان کے سلام کا جواب دینا بھی پسند نہیں کرتا۔ لیکن ہر بے حیثیت آدمی، ہر مظلوم، ہر نتھو خیرے اور ہر غریب کے گلے میں باہیں ڈال کر گھومتا پھرتا دکھائی دیتا ہے۔

جس کام میں مالی فائدہ ہو۔ اُسے ٹالتا رہتا ہے حتیٰ کہ یہ موقعہ ہاتھ سے نکل جاتا ہے۔ دوسروں کے ان گنت کام بھی کرتا ہے اور اس سلسلہ میں اپنی جیب سے دشمنی کرنے سے بھی نہیں چوکتا۔

ہر روز ایک نئی اسکیم بناتا ہے۔ اس کے ذہن میں ہزاروں، لاکھوں اسکیمیں تہ در تہ جمی ہوئی ہیں۔ لیکن وہ آج تک کسی اسکیم کو بھی پایۂ تکمیل تک نہیں پہنچا سکا۔ وہ خود ہی کہا کرتا تھا کہ علم النجوم کی رو سے میں "کیکڑا" ہوں جو آگے بڑھتا بڑھتا عین منزل کے قریب پہنچ کر پھر اس طرح پلٹ کر غائب ہو جاتا ہے کہ اس کے ساتھی منہ دیکھتے رہ جاتے ہیں۔

یہ ہے شبلی بی کام، وہ عجیب و غریب کردار۔ جسے میں اب تک نہیں سمجھ سکا اور جو میرے خیال میں آج بھی طوفان میں مچھلیاں پکڑنے کی کوشش کر رہا ہے۔

بدر الاسلام فضلی

شیخ محمد اسماعیل پانی پتی میرے بہت پرانے دوست ہیں۔ ان سے میری پہلی ملاقات آج سے تینتیس ۳۳ سال پیشتر حالی مسلم ہائی اسکول پانی پت کے کتب خانے میں ہوئی تھی۔ میں نے دیکھا کہ کتب خانے کی بڑی میز کے پاس ایک نہایت سنجیدہ جوان گہرے مطالعہ میں مصروف ہے۔ اور بار بار ایک کاغذ پر کچھ یادداشت لے رہا ہے۔ چھریرا جسم، ستا ہوا چہرہ، سیاہ داڑھی، سر کے بال باریک کٹے ہوئے۔ بدن پر ایک صاف مگر سادہ کرتا اور شرعی پاجامہ۔ یہ تھے شیخ محمد اسماعیل۔ ان کی شخصیت میں جو چیز میرے نزدیک سب سے زیادہ جاذب توجہ تھی وہ ان کا خلوص تھا، ان کی حق گوئی، راست بازی اور نیک نیتی تھی۔

شیخ صاحب کی شخصیت کی سب سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ اس میں تنوع اور رنگا رنگی نہیں ہے۔ ان کو نہ تو انواع و اقسام کے لذیذ کھانوں کا شوق ہے نہ ان کو بہت عمدہ قسم کے لباس سے شغف ہے۔ اور نہ کھیل تماشوں، میلوں اور دوسری تفریحات کی طرف میلان۔ انہوں نے غالباً عمر بھر سینما نہیں دیکھا۔ اور کسی قسم کا کھیل بھی نہیں کھیلا۔ عملی سیاست سے بھی وہ ہمیشہ علیحدہ رہے۔ ان سب چیزوں کو چھوڑ کر ان کو ایک اور صرف ایک چیز سے عشق ہے۔ وہ ہے کتاب، مطالعہ، علمی تحقیق اور تصنیف و تالیف۔ ہم نے مطالعہ کے شوقین بہت دیکھے ہیں مگر اس لحاظ سے شیخ صاحب کی دنیا نرالی ہے۔ اپنے لڑکپن کا ذکر شیخ صاحب نے بارہا کیا ہے۔ خود ان کے قول کے مطابق وہ اس زمانے میں رات کو دو ڈھائی بجے تک کتاب پڑھتے رہتے تھے۔ والدین کی تاکید تھی کہ رات کو جلد سو جائیں ان کے لحاظ سے منہ لحاف میں ڈھک لیتے اور لحاف کے اندر سرسوں کے تیل کا چراغ جلا کر [illegible] شیخ صاحب کتاب پڑھتے رہتے۔ گھر والے سمجھتے کہ سو رہے ہیں۔

شیخ صاحب نے ہمیشہ اپنی آمدنی کا بیشتر حصہ کتابیں خریدنے پر صرف کیا اور ہمیشہ اچھی کتاب کی تلاش میں رہتے تھے۔ اس طرح انہوں نے ایک بے نظیر ذاتی کتب خانہ جمع کر لیا تھا۔ جو بیش بہا قلمی نسخوں اور نایاب مطبوعہ کتابوں پر مشتمل تھا۔ جس خوش اسلوبی سے شیخ صاحب اس کو استعمال کرتے تھے بہت کم لوگ ذاتی کتب خانوں سے ایسا استفادہ کر سکتے ہیں۔ اکثر شائقین علم اس کتب خانے کو دیکھنے کے لئے دور دور سے آتے تھے۔ یہ

کتب خانہ شیخ صاحب کی زندگی بھر کا عزیز ترین اور نہایت قیمتی سرمایہ تھا۔ افسوس ہے کہ یہ ۱۹۴۷ء کے انقلابات کی نذر ہوگیا۔ شیخ صاحب کی صحت پر اس کے ضائع ہو جانے کا بہت بُرا اثر پڑا ہے۔

بالعموم دیکھا گیا ہے کہ ذاتی کتب خانوں کے مالک اپنی کتابوں کی ہوا بھی کسی کو نہیں لگنے دیتے۔ مگر شیخ صاحب اس معاملہ میں بہت فیاض رہے ہیں۔ اُن کے کتب خانے سے ہر شخص فائدہ اُٹھا سکتا تھا۔

شیخ صاحب کی یادداشت نہایت عمدہ ہے۔ بعض اوقات اُن کی اس خوبی سے عجیب لطیفے رونما ہوئے ہیں۔ ۱۹۳۲ء میں سید محی الدین صاحب پرنسپل عثمانیہ انٹرمیڈیٹ کالج اورنگ آباد نے اپنے کالج میں حالی سینٹنری (صد سالہ جشن ولادت) شان سے منائی تھی۔ شیخ صاحب اور میں حالی مسلم ہائی اسکول پانی پت کے نمائندوں کی حیثیت سے وہاں مدعو تھے۔ مسٹر اکبر حیدری وزیر اعظم جلسہ کی صدارت کر رہے تھے۔ بابائے اُردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب مولانا حالی پر تقریر کر رہے تھے۔ تقریر کے دوران میں دفعتہً مولوی صاحب نے شیخ صاحب سے سوال کیا کہ مجالس النساء مولانا حالی نے کس سنہ میں لکھی تھی۔ شیخ صاحب اُس وقت کچھ لکھ رہے تھے۔ مگر بلا تامل انہوں نے سوال کا جواب دیا۔ اور پھر اپنے کام میں مصروف ہو گئے۔ تمام حاضرین جلسہ کی نظریں شیخ صاحب پر پڑیں اور لوگ حیرت زدہ ہو کر ایک دوسرے سے پوچھنے لگے کہ یہ کون بزرگ ہیں جو حالی کے متعلق ایسا یقینی علم رکھتے ہیں کہ مولوی عبدالحق صاحب بھی استفسار فرماتے ہیں۔ اور بھروسہ کرتے ہیں اور جن کو حالی کی لائف کے جزئیات گویا ازبر ہیں۔

حقیقت بھی یہی ہے کہ حالی کی تحقیق پر شیخ صاحب نے ساری عمر جس قدر کاوش و کوشش کی ہے کسی دوسرے کو میسر نہیں۔ انہوں نے اس قدر مواد اس موضوع پر جمع کیا ہے کہ اگر وہ لکھیں تو بہت آسانی سے ہزار صفحہ کی سوانح عمری لکھی جا سکتی ہے۔ لائف لکھنے کی آرزو تو اب تک پوری نہ ہو سکی مگر شیخ صاحب نے مولانا حالی کے غیر مطبوعہ کلام اور کلیات کئی مجموعے مرتب اور شائع کئے ہیں۔ اُن کے علاوہ دو جلدیں مقالات حالی مرتب کئے۔ جن کو انجمن ترقی اُردو نے شائع کیا تھا۔ ایک مختصر سوانح حیات تذکرہ حالی کے نام سے لکھی۔ اور بکثرت مضامین مختلف رسائل کے لئے لکھے۔

شیخ صاحب نے ملک کے موقر رسائل و جرائد میں مضامین لکھنے کا سلسلہ پندرہ سال کی عمر سے شروع کیا اور اب تک جاری ہے۔ ان کے تعداد بتانا مشکل ہے۔ لیکن بعض تحقیقی مقالے واقعی قابل صد تحسین و آفرین ہیں۔ اس لحاظ سے شیخ صاحب کی ایک قابل ذکر خوبی یہ بھی ہے کہ ان مضامین پر تحقیق کا کام آپ نے دس پندرہ سال تک کیا۔ یہ استقلال حیرت انگیز ہے۔ ایسا ہی ایک مقالہ "سنسکرت کے عربی و فارسی تراجم ہے" جس کو شیخ صاحب نے سالہا سال کی محنت شاقہ کے بعد مرتب کیا۔ مولانا وحید الدین سلیم پروفیسر عثمانیہ یونیورسٹی فرمایا کرتے تھے کہ اس مضمون کو دیکھ کر میں فخر کرتا ہوں کہ میرے اہل وطن میں ایک ایسا فاضل محقق موجود ہے۔ میں نے بھی اس مقالے کا اُس وقت انگریزی میں ترجمہ کیا تھا۔

شیخ صاحب کو میں نے کبھی کسی بڑی سے بڑی شخصیت سے مرعوب ہوتے نہیں دیکھا۔ ذاتی تمتع کے خاطر وہ کبھی کسی کی خوشامد نہیں کرتے۔ جن بڑے لوگوں سے اُن کا ملنا رہا وہ برابر کے درجے میں رہا۔ اپنی رائے کے اظہار میں اُن کو ہمیشہ بے باک پایا۔ مگر اس کے ساتھ وہ دوسروں کی رائے کی قدر کرنا بھی جانتے ہیں۔ وہ بے حد خلیق متواضع اور ملنسار انسان ہیں۔ شیخی۔ ریاکاری۔ تصنع سے اُن کو دور کا واسطہ نہیں۔ دوستوں کے مخلص اور ہمدرد دوست ہیں۔ اعزہ و احباب کے ساتھ اُن کا سلوک ایسا ہے کہ ان کی شکایت کسی سے سننے میں نہیں آئی یہ بڑی بات ہے۔

اُن کی صحبت کا رنگ خالص علمی ہوتا ہے۔ اس کے باوجود اُن کی گفتگو بہت دلچسپ ہوتی ہے مجھے پانی پت میں سالہا سال تک اُن کی گفتگو سے لطف اندوز ہونے کا موقع ملا۔ ایک عرصے تک یہ معمول رہا کہ ہم دونوں علی الصباح سیر کے لئے جاتے اور دو گھنٹے تک علمی باتوں پر گفتگو کرتے رہتے یہ لطف میں عمر بھر نہیں بھول سکتا اور اب بھی یہ تمنا دل میں موجود ہے کہ کاش وہ زمانہ پھر لوٹ آسکے۔

شیخ صاحب غالباً ۱۸۹۳ء میں دہلی کے قریب ایک گاؤں بولا میں پیدا ہوئے تھے۔ زندگی کا بیشتر حصہ اپنے اسی آبائی مکان میں بسر کیا جو محلہ انصار میں اُس مکان کی پشت پر تھا۔ جس میں مولانا حالی پیدا ہوئے تھے۔ نیچے کے مکان میں وہ اپنے اہل و عیال کے ساتھ رہتے تھے۔ اوپر کی منزل

شیخ صاحب کا کتب خانہ تھا۔ دن بھر اسی جگہ بیٹھے تصنیف و تالیف و تحقیق کے دل پسند مشغلہ میں محو رہتے تھے

بچپن دہلی میں گزرا جہاں ان کے والد بسلسلہ کاروبار رہا کرتے تھے۔ عنفوان شباب میں پانی پت لوٹ آئے۔ کچھ عرصہ تک حالی مسلم
ہائی اسکول کے کتب خانہ میں لائبریرین رہے۔ اسی زمانے میں یہ بھوپال اور پھر حیدر آباد پہنچے۔ ...... ۱۹۳۲ء میں ان کا انتخاب ہفت روزہ
"عروج" کے ایڈیٹر کی حیثیت سے ہوا۔ جو ضلع جھنگ کا سرکاری اخبار تھا۔ مگر وطن کی محبت نے کچھ ایسا مجبور کیا کہ ڈھائی سال بعد ہی استعفےٰ
دے کر پانی پت واپس آ گئے۔ دو سال تک "پیغام حیات" کے نام سے ہفت روزہ اخبار نکالتے رہتے لیکن بعض وجوہ سے اس کو بھی
بند کرنا پڑا۔ ۱۹۴۷ء سے وہ مسلسل لاہور میں مقیم ہیں۔ اور اُن کا محبوب مشغلہ تالیف و تصنیف برابر جاری ہے۔ اُن کی تصانیف کی
تعداد اس قدر ہے کہ اُن سب کا ذکر طوالت سے خالی نہیں۔

شیخ صاحب اگرچہ بہت سنجیدہ آدمی ہیں۔ لیکن اُن کی طبیعت میں برجستہ مزاح کی بھی بہت عمدہ صلاحیت ہے۔
ایک بار اُن کے ایک بے تکلّف دوست اپنے جوان بیٹے کی شکایت کرنے لگے۔ اُن کے دوست کا نام محمد نوح تھا۔ شیخ صاحب
نے ہمدردی کرتے ہوئے فرمایا۔ "کیا کیا جائے آخر پسرِ نوح ہے"

بعض لوگوں کو عادت ہوتی ہے کہ کسی دوسرے سے ملنے جاتے ہیں تو میز کے قریب بیٹھ کر میز کی چیزوں مثلاً پن کشن، پیپر ویٹ وغیرہ
سے کھیلتے رہتے ہیں یا میز پر رکھے ہوئے خطوط ہی پڑھنے لگتے ہیں جو ایک قسم کی بدتہذیبی ہے۔ ایک دفعہ شیخ صاحب بھی ایک ایسے
ہی شخص کے ہاتھوں تنگ آ گئے۔ اخلاق مانع تھا کہ اُن کو سختی سے روک دیں۔ اس موقعہ پر شیخ صاحب نے جو طریقہ اختیار کیا وہ بہت
خوب تھا۔ وہ حضرت حسب عادت پھر آئے اور اپنا کام شروع ہی کیا تھا کہ شیخ صاحب نے میز کی دراز میں سے ایک خوبصورت گڑیا نکال
کر اُن کے آگے رکھ دی۔ "لیجئے اس سے شوق فرمائیے"۔ دوسرے لوگ بے حد محظوظ ہوئے اور وہ خود ایسے بھاگے کہ پھر نہ لوٹے۔

میں نے شروع میں لکھا ہے کہ شیخ صاحب کی طبیعت میں رنگا رنگی نہیں ہے اس کے باوجود وہ اچھے افسانے لکھنے میں کامیاب ہیں
اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ اُن کے افسانوں کے کردار بالعموم تاریخی ہوتے ہیں۔

ڈاکٹر غلام جیلانی برق

محمد عثمان

انسان فرشتہ ہے نہ شیطان۔ اس قول کی تصدیق کسی اور بزرگ سے ہوتی ہو یا نہ ہوتی ہو ڈاکٹر غلام جیلانی برق کی شخصیت سے بخوبی ہوسکتی ہے اور اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ ڈاکٹر برق اگرچہ کم و بیش بیس برس سے دینیات پر لکھ رہے ہیں اور "دو قرآن" "دو اسلام" اور "ایک اسلام" جیسی مذہبی کتابوں کے مشہور مصنف ہیں۔ مگر ایک اعتبار سے دیکھا جائے تو انہوں نے اس شہرت اور اس تصنیف و تالیف کا اثر نہ اپنے ظاہر پر چھنے دیا ہے اور نہ باطن پر۔ ظاہر پر اس طرح نہیں کہ رہن سہن، میل جول اور وضع قطع کی جو سادگی، بے تکلفی اور رایاب، گو نہ ناخوش مذاق نارمل اسکول کے گمنام ٹیچر میں تھی کالج کے نامور پروفیسر میں بھی بجنسہ قائم ہے اور باطن پر یوں نہیں کہ ایک عام انسان میں اخلاق و کردار کی جو کمزوریاں پائی جاتی ہیں ڈاکٹر برق میں اپنی ڈاکٹری، پروفیسری اور مصنفی کے باوصف ان کا ایک معقول حصہ بہ تمام و کمال موجود ہے۔

ڈاکٹر برق کی ابتدائی زندگی اور تعلیم دونوں بے قاعدہ اور ناہموار تھیں، ابھی تیسری جماعت میں تھے کہ والد کے پیر و مرشد نے سرکاری اسکول کی بجائے مسجد میں بھیجنے کا حکم سنایا۔ اس کے بعد متعلم جیلانی برسوں ایک مسجد سے دوسری مسجد اور ایک ملا سے دوسرے ملا تک پڑھنے اور سیکھنے کی غرض سے جاتا رہا اور ساتھ ساتھ اس کا قیام و طعام بھی بدلتا رہا۔ آج والد کے پاس ہے تو کل بھائی کے پاس اور پرسوں ان دونوں سے تنگ آکر یا دونوں کو تنگ کرکے کسی دور دراز ویران مسجد کو جا بسایا ہے اور قریب کے گاؤں سے دونوں وقت کی روٹیاں مانگ کھانے پہ مطمئن ہے۔ اس کشمکش میں نہ جانے زندگی کی اور کتنی راتیں گزر جاتیں مگر مسجد نیلا گنبد لاہور میں ایک شام ایک خیال نے اس کو ایک نئی راہ پر ڈال دیا۔" عربی اور فارسی کی بہت سی کتابیں پڑھ ڈالی ہیں" نماز مغرب کی اذان پر اپنے حجرے سے نکلتے اور وضو کے لئے آستینیں چڑھاتے ہوئے جیلانی نے دل میں سوچا" اب کوئی باقاعدہ امتحان کیوں پاس نہ کیا جائے" وضو کرتے اور نماز پڑھتے اس کا ذہن زندگی میں پہلی مرتبہ ایک "باقاعدہ" کام کر گزرنے کا منصوبہ بناتا رہا۔ امام نے قرأت شروع کی تو جیلانی امتحان کے کمرے میں بیٹھا منشی فاضل کا کوئی پرچہ تیزی سے حل کر رہا تھا۔ جب امام سجدے میں جھکا تو دوسرے مقتدیوں کے ساتھ اس نے بھی اپنا سر زمینِ مسجد پر رکھا تھا مگر وہ ابھی تک پرچے کے جوابات لکھ رہا تھا۔ امام رکوع و سجود کی منزلیں طے کرتا گیا اور جیلانی منشی فاضل کے مختلف پرچے، پہلا، دوسرا، تیسرا، چوتھا۔۔۔۔ لیکن ابھی تک اسے اس پرچے کا خیال نہ آیا تھا جو پہلے پرچے سے بھی پہلے ہوتا ہے

اور اب معاً اس کے ذہن میں منصوبے کا سب سے کٹھا سوال پیدا ہوا "مگر داخلے کی فیس کہاں سے لاؤں گا؟" اور جب امام نے سلام پھیرا تو جیلانی کے منصوبے کا فقط "اقتصادی پہلو" طے ہونا باقی تھا۔

اس رات اس نئے خیال اور شوق نے جیلانی کو پوری نیند نہ سونے دیا۔ وہ داخلے کے لئے روپے کی فراہمی پر غور کرتا رہا۔ سب سے پہلے اسے والد کا خیال آیا۔ اس نے سوچا والد پٹواری ہیں۔ ضلع کیمبل پور کے مشہور گاؤں بسال کے پٹواری، مانا کہ دوسرے پٹواریوں کی طرح وہ رشوت نہیں لیتے اور تھوڑ گزاری میں آپ اپنی مثال ہیں۔ مگر چودہ روپے ماہوار تنخواہ کے باوجود اپنی طبعی کفایت شعاری کی بدولت ان کے پاس تھوڑی بہت رقم ضرور جمع ہے اور اگر وہ انہیں لکھ دے تو .... اس کے دل میں مسرت کی ایک لہر دوڑ گئی۔ اسے یوں معلوم ہوا کہ جیسے اس کا مسئلہ حل ہو گیا۔ اس کی گتھی سلجھ گئی۔ حتیٰ کہ اسے اپنی بلاوجہ فکر مندی پر تعجب سا ہونے لگا لیکن دوسرے ہی لمحے اطمینان اور تعجب کی یہ کیفیت پھر پریشانی میں بدل گئی۔ اس نے سوچا نہ جانے داخلے کی فیس کیا ہو اور والد دو چار روپے سے زیادہ کی رقم بھیجنے کے عادی نہیں۔ اور پھر اس کا ذہن گذشتہ سات سالہ زندگی کی راہوں پر بھٹک گیا۔ غربت و تنگدستی کے بیتے ہوئے واقعات آنکھوں کے سامنے آنے لگے اور پھر نہ جانے کیونکر اس نے والد کی دی ہوئی یا بچی ہوئی مختلف رقموں کا میزان لگانا شروع کر دیا جو اس سے پہلے وہ بارہا لگا چکا تھا اور جو ہمہ وقت اس کے حافظے میں محفوظ تھا۔ وہ چاہتا تو فقط میزان کو ذہن میں تازہ کر لیتا مگر آج وہ پھر اس کی تفصیلات میں جانا چاہتا تھا۔ اس نے ایک ایک موقع کو یاد کیا اور آخر میں جب سب رقموں کو جمع کیا تو پہلے کی طرح ٹوٹل پھر پچیس نکلا۔ اس نے سوچا سات برس کے طویل عرصے میں پچیس روپے اور اس کی طبیعت پر افسردگی چھا گئی۔ پھر اسے اپنے لباس کا خیال آنے لگا۔ اس کے پاس کھدر کے دو جوڑے تھے جسے وہ باری باری ہر جمعہ کو مدرسے کی طرف ملنے والے صابن سے دھو لیتا تھا۔ ایک جمعہ کو اس کے بعض ہم جماعتوں نے جن کے پاس دو سے زیادہ جوڑے تھے، انتہائی بے فکری کا ثبوت دیتے ہوئے راوی کی سیر کا پروگرام بنا ڈالا اور اسے ساتھ چلنے کو کہا۔ وہ اس دعوت کو رد نہ کر سکا مگر جب وہ دوپہر کے وقت لوٹ کر آئے تو نماز جمعہ سے پہلے کپڑے دھونے کا وقت باقی نہ رہا تھا۔ اس روز اسے اس بات کا شدید احساس ہوا تھا کہ اس کے پاس کم از کم تین جوڑے کپڑوں کے ضرور ہونے چاہئیں۔ اس روز بھی اسے والد کا خیال آیا تھا اور طبیعت پر تھوڑی دیر کے لئے افسردگی چھا گئی تھی اور بالآخر اس نے فیصلہ کیا کہ وہ فیس کے لئے والد کو تکلیف نہ دے گا اور اگلے روز جب اس نے اپنی مشکل اپنے ایک مہربان استاد مولانا غلام مرشد[1] سے بیان کی تو انہوں نے انارکلی بازار کے ایک مخیر اور نیک دل مسلمان خان بہادر محمد تقی سے ضرورت کے بارہ روپوں کا انتظام کر دیا۔

اس کے چند سال بعد جیلانی نے ایک اور منصوبہ تیار کیا۔ یہ منصوبہ پہلے منصوبے سے جس قدر مختلف تھا اس قدر وہ حالات بھی مختلف تھے جن میں یہ منصوبہ تیار ہو رہا تھا۔ مسجد نیلا گنبد کے مدرسۂ حمیدیہ کا متعلم جیلانی اب ماسٹر غلام جیلانی برق، منشی فاضل، مولوی فاضل، ادیب فاضل تھا اور چکوال ہائی اسکول میں پچاس روپے ماہوار پر فارسی کی تدریس پر مامور تھا۔ وہ حجرۂ مسجد کی بجائے دو روپے ماہوار کرایہ کے ایک کچے مکان میں رہتا تھا جس کے تین کمرے اور ایک کھلا سا صحن تھا۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے ماسٹر جی نے اپنے گھر کے لئے فرنیچر کے طور پر ڈیڑھ روپے میں کپڑے کی ایک آرام کرسی اور چار آنے میں ایک پرانا سا اسٹول خریدا تھا اور جب وہ مکان کے سب سے صاف کمرے میں اپنی چارپائی کے پاس آرام کرسی بچھا کر اور سامنے تازہ خریدا ہوا اسٹول رکھ کر کرسی پر دراز ہوا تو اس نے دل میں اطمینان اور خوشی کی ایک عجیب کیفیت محسوس کی ایک ایسی کیفیت جس سے وہ پہلے کبھی آشنا نہ ہوا تھا اور پھر اس کے ذہن میں ایک نیا پلاؤ پکنے لگا۔ اس نے سوچا عربی، فارسی اور اردو کے کئی مرحلے طے ہو چکے ہیں۔ اب انگریزی کی طرف توجہ کرنی چاہئے۔ وہ اس سے پہلے اسلامیہ ہائی اسکول نوشہرہ اور دو ایک اور مقامات پر ہی تدریس

---

[1] شاہی مسجد لاہور کے موجودہ خطیب

کا کام کوئی اڑھائی تین سال کے قریب کر چکا تھا اور یونیورسٹی کے متذکرہ بالا امتحانات پاس کرنے سے اس کا حوصلہ زیادہ، اس کا عزم پختہ اور علم میں آگے بڑھنے کا شوق تیز تر ہو چکا تھا۔ کئی سال پہلے جب وہ مدرسہ حمیدیہ لاہور میں زیر تعلیم تھا اس نے علامہ اقبال مرحوم کو انجمن حمایت اسلام کے جلسوں میں اپنی نظموں سے سامعین پر جادو کا سا اثر کرتے دیکھا تھا۔ پھر وہ نظمیں اسی زمانے میں بعض اخبارات اور رسائل میں شائع ہوئیں اور شاعر کے نام کے ساتھ اس نے پی۔ ایچ۔ ڈی، لکھا پایا تو ان لفظوں کی حقیقت اس کی سمجھ میں نہ آئی۔ دریافت کرنے پر جب معلوم ہوا کہ ایم اے کے بعد گویا علمی دنیا کا یہ سب سے بڑا اعزاز ہے تو متعلم جیلانی نے جس کو یہ تک خبر نہ تھی کہ منشی فاضل یا کسی دوسرے امتحان میں شریک ہونے کے لئے یونیورسٹی کو کچھ فیس بھی دینی پڑتی ہے، دل میں ٹھان لی کہ وہ بھی اس علمی مرتبے کو پانے کی کوشش کرے گا۔ چنانچہ اب حالات کو سازگار پاکر اس نے ایک جامع منصوبہ مرتب کیا جس کی تکمیل کا تعلق پی۔ ایچ۔ ڈی سے اور آغاز کا اسی سال میٹرک کے امتحان میں شریک ہونے سے تھا۔

۱۹۲۹ء میں ۲۷ برس کی عمر میں ماسٹر غلام جیلانی برق نے جب بی۔ اے پاس کیا تو وہ فکر و خیال کی کئی وادیوں میں گھوم چکا تھا۔ ۱۹۲۴ء کے قریب اسے محمود دھرمپال کی ضخیم کتاب 'تہذیب اسلام' پڑھنے کا اتفاق ہوا۔ اس میں اسلامی طرز حیات اور انداز نظر کی برائی کی گئی تھی اور کچھ ایسے 'وزنی' دلائل دیئے گئے تھے جن کا جواب اوسط درجے کے پڑھے لکھے مسلمان کی قابلیت اور قدرت سے باہر تھا۔ کچھ دنوں بعد سوامی دیانند کی 'ستیارتھ پرکاش' ہاتھ لگ گئی۔ اس کے بعد پنڈت لیکھ رام اور مخالف اسلام مشنری مصنفین کی باری آئی اور ماسٹر جی 'بھٹک' گئے۔ پہلے تلاوت قرآن موقوف ہوئی۔ پھر نماز 'چھٹی' پھر روزے ترک ہوئے اور آخر میں ہستی باری تعالے سے انکار کا مرحلہ آیا۔ یہ دور کوئی پانچ سال چلا اور اس میں سوائے چہرے پر ایک داڑھی کے جو نہ جانے اس کی برق نگاہی سے کیسے بچ رہی، ظاہر و باطن سے مسلمانی کا ہر نشان رخصت ہو گیا اور آہ! وہ تنہا و اُداس داڑھی جو اپنی بزم ایمان کے اجڑ جانے پر درحقیقت مرزا غالب کی شمع خاموش تھی ؎

داغ فراق صحبت شب کی جلی ہوئی
اک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خموش ہے

۱۹۳۳ء میں ایم۔ اے کرنے کے تھوڑے عرصہ بعد ماسٹر برق پروفیسر برق بن کر گورنمنٹ کالج ہوشیار پور میں تعینات ہوئے تو ان کی زندگی میں نئی دلچسپیوں نے قدم رکھا۔ تاش اور شطرنج مدتوں سے ان کے مرغوب کھیل تھے مگر اب تک وہ محض ترب کا عامیانہ کھیل کھیلتے تھے اور پتوں کے ساتھ پیسوں کے 'خرام ناز' کی دلفریبیوں سے ناواقف تھے۔ یہاں آ کر جو برج سیکھی تو دو ہی چار دن میں طبیعت راہ دینے لگی اور حوصلہ اتنا بڑھا اور شوق اتنا چلا کہ سروسز کلب کے علاوہ پلیڈرز کلب کے بھی رکن بن گئے تاکہ کھیل کا تار گھنٹوں ٹوٹنے نہ پائے۔ ٹینس بھی انہوں نے اسی زمانے میں سیکھا۔ انگریزی لباس تو وہ مدت سے پہن رہے تھے مگر اس کی نازک مزاجیوں سے آگاہ نہ تھے۔ یہاں پہنچ کر پتہ چلا کہ داڑھی کی موجودگی اس کے حق میں مضر ہے۔ چنانچہ شیو بنانے کے آداب سے آراستہ ہوئے اور یہیں آ کر ان کا یہ گمان یقین میں بدلا کہ ان کی پہلی بیوی ان کی رفاقت کا حق ادا کرنے کی بالکل اہل نہیں۔

مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ وہ اپنے منصوبے کی طرف سے غافل ہو کر بس انہی دلچسپیوں میں کھو گئے تھے۔ ہوشیار پور کے زمانۂ قیام میں ان کے وقت کا خاصا حصہ ڈاکٹریٹ کے مقالے کی تیاری میں صرف ہوا۔ وہ دس بجے کے قریب کلب سے اٹھ کر گھر جاتے اور کھانا کھانے کے بعد مطالعہ و تحقیق میں لگ جاتے۔ یہ مشغلہ کھیل سے کچھ کم دلچسپ نہ تھا۔ اس لئے رات گئے تک، اکثر دو بجے تک، جاری رہتا۔ چارپائی اور اس کے سامنے پڑی ہوئی میز کے اوپر نیچے، دائیں بائیں، انگریزی، عربی اور فارسی کی کتابیں اور رسالے بکھرے پڑے ہوتے۔ پروفیسر برق بڑی دماغ سوزی اور عرق ریزی کے ساتھ ان سے ضرورت کا مواد اور معلومات اخذ کرتے، تنقیح و تہذیب کے بعد ان کو ایک خاص انداز سے مرتب کرتے اور ان سے اپنی کتاب کے لئے مستند نتائج نکالتے تھے۔ یہ علمی مشقت کوئی چھ سال تک جاری رہی۔

۱۹۴۰ء میں پروفیسر برق، مدرسہ حمیدیہ کا وہ متعلم جیلانی جس کو سترہ برس کی عمر تک یہ خبر نہ تھی کہ امتحان کے لئے کچھ فیس بھی دینی پڑتی ہے، پنجاب یونیورسٹی کو دو صد روپیہ فیس ادا کر کے اور امام ابن تیمیہ کی زندگی اور کارنامے پر اپنی تحقیق کا لوہا منوا کر ڈاکٹر برق بن گئے۔ لیکن اس منصوبے کی تکمیل سے کچھ عرصہ پہلے ان کا دماغ ایک نیا منصوبہ سوچ چکا تھا اور اب انہیں اپنے تیسرے منصوبے کی دھن سمائی تھی۔ آپ پوچھیں گے تیسرا منصوبہ کیا تھا؟

۱۹۳۰ء کے قریب، علامہ مشرقی کی تصنیف 'تذکرہ' سے دیانند اور لیکھرام کے جنگل سے نکلے تو دل میں اسلام کی حقانیت اور قرآن کی عظمت کا یقین پہلے سے ہزار گنا بڑھ چکا تھا۔ آٹھ دس سال کے مزید مطالعہ، تحقیق اور غور و فکر سے وہ جس نتیجے پر پہنچے اس کے تین پہلو تھے:۔

۱۔ اسلام کی روح سائنسی حقائق سے متخالف نہیں۔ قرآن حکیم نہ صرف مطالعۂ فطرت اور تسخیر کائنات کی طرف بار بار توجہ دلاتا ہے بلکہ اس کی سینکڑوں آیات اور سائنس کے جدید انکشافات اور نظریات میں حیرت انگیز مطابقت اور آہنگ پایا جاتا ہے جو دینِ اسلام کی حقانیت اور قرآن کے من جانب خدا ہونے کا زبردست ثبوت ہے۔

۲۔ اسلام وہ نہیں جو اکثر علماء کی زبان و قلم سے پیش کیا جاتا ہے بلکہ وہ ہے جس کی تعلیم و تصدیق قرآن اور فقط قرآن سے ہوتی ہے اور ان دونوں 'اسلاموں' میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ 'ملا' کا پیش کردہ اسلام مذہبی تعصب، کج بینی اور فکر و عمل کی مسکینی کا نام ہے مگر حقیقی اسلام علم و اخلاق کی بلندی، نظر کی وسعت اور قلب کی فراخی ہے۔

۳۔ مذاہبِ عالم کی اصل ایک ہے اور ان کا باہمی تضاد اور موجودہ منافرت کم نظر اور حقیقت نا آشنا پادریوں، پروہتوں اور ملاؤں کی پیدا کردہ ہے۔

جب مذکورہ بالا خیالات ڈاکٹر برق کے دل و دماغ میں راسخ ہو گئے اور طبیعت ان کے اظہار کے لئے بے چین ہونے لگی تو انہوں نے ان کو سلسلہ وار شائع کرنے کا منصوبہ تیار کیا۔ یہی ان کا تیسرا منصوبہ تھا جو 'دو قرآن' (۱۹۴۴ء)، 'دو اسلام' (۱۹۵۰ء) اور 'ایک اسلام' (۱۹۵۱ء) کی صورت میں پایۂ تکمیل کو پہنچا۔

ان حالات کا بیان اور ان 'منصوبوں' کا ذکر اس لئے ضروری تھا کہ ان کے بغیر ڈاکٹر برق کی شخصیت کا وہ پس منظر اجاگر نہ ہو سکتا جس میں اس نے اپنی تعمیر کی اور ان واقعات کا اندازہ نہ ہو پاتا جن سے وہ دوچار ہوئے، جن سے انہوں نے اثر لیا اور جن کی مدد سے ان کی شخصیت کو اپنا مخصوص آب و رنگ حاصل ہوا۔ پیش منظر کو سمجھنے کے لئے پس منظر کا دیکھنا بہر حال ایک ناگزیر سی چیز ہے۔

جو لوگ اپنی محنت اور قابلیت سے ابھرتے ہیں بعض اوقات ان میں خود رائی اور اپنی ذات کا ضرورت سے بڑھا ہوا احساس بھی ابھر آتا ہے، ڈاکٹر برق کو یہ جذبہ چھو تک نہیں گیا۔ نخوت و پندار سے بڑھ کر کوئی چیز ان کی ذات سے دور نہیں۔ آپ ان سے ملئے، ان سے الجھئے اگر جی چاہے تو ان کے منہ پر ہی ان کے سارے کارنامے کی نفی کر ڈالئے، وہ اس کے جواب میں کوئی ایسا کلمہ منہ سے نہ نکالیں گے، اٹھنے بیٹھنے پہلو بدلنے یا مخاطب کرنے کا کوئی ایسا انداز اختیار نہ کریں گے جس سے یہ پایا جائے کہ وہ اپنے کو آپ کی ذات یا بات سے بالاتر سمجھتے ہیں۔ اس لحاظ سے نہ صرف ان کو اپنے علم اور مصنفانہ صلاحیت پر کوئی ناز نہیں بلکہ ان میں ایک نوع کی 'نفی ذات' بھی بڑی نمایاں ہے۔ یہ 'نفی ذات' نہ تو صوفیانہ عجز و انکسار سے کوئی تعلق رکھتی ہے اور نہ 'اخلاقِ جلالی' کے تحمل و بردباری سے۔ ایسا نہیں کہ وہ بھڑک نہیں اٹھتے یا برہم نہیں ہوتے۔ کبھی کبھار یہ بھی ہوتا ہے اور ہو سکتا ہے لیکن معمول کی زندگی میں، گھر میں ہوتے ہوئے، کالج کے اوقات میں، احباب کی صحبتوں میں، کلب میں، سینما میں، سیر و شکار کے موقعوں پر غرض ہر جگہ جہاں وہ قلم و کتاب کے بغیر چلتے پھرتے اور ملتے ملاتے موجود ہوتے ہیں ان کو اپنی مصنفانہ شہرت یا عالمانہ حیثیت بالکل اور قطعاً یاد نہیں ہوتی اور کوئی اجنبی ان کی گفتگو، غیر علمی مشاغل میں ان کے انہماک اور

دوستوں سے ان کی بے تکلفی کی نوعیت سے ہرگز نہیں پا سکتا کہ یہ "دو قرآن" یا "ایک اسلام" والے ڈاکٹر برق ہیں۔

خوش دلی ڈاکٹر صاحب کی طبیعت کا جوہر ہے۔ ان کی عمر اس وقت باون ترپن برس کی ہے اور واقعہ دی شعور کے اس عہد میں وہ لو بچوں کے باپ اور جہاں تک ان لفظ کا تعلق ہے ایک سے زیادہ بیویوں کے شوہر ہیں، اس کے باوجود ہنسنے ہنسانے میں وہ اپنا حریف نہیں رکھتے وہ تبسم زیرِ لب کے نہیں بلکہ شگاف قہقہوں کے قائل ہیں۔ یہ قہقہے ان کے دیوان خانہ میں، کلب میں، کھانے اور چائے کی میز پر اور کالج شاف کے بھی غیر رسمی اجتماعوں میں بھی بلند ہوتے اور رہ سکتے ہیں مگر ان کی بہار دیکھنی ہو تو کوئی اس وقت دیکھے جب کالج کے اوقات ختم ہونے پر وہ بے تکلف ساتھیوں کی محفل میں باغ و بہار بنے بیٹھے ہوتے ہیں۔ عالمانہ اور شاعرانہ نکات کے علاوہ ان کے حافظہ میں سعدی و رومی کی حکایات، بلند سے لے کر سکھوں، مراثیوں، جولاہوں اور ملاؤں کے سچے اور جھوٹے، گفتنی اور ناگفتنی لطائف کا اتنا بڑا خزینہ محفوظ ہے اور ان کا طرزِ بیان اس قدر دلکش، نظر افروز اور ترقی پسندانہ ہے کہ محفل ایک بار جم جائے تو گھنٹوں کوئی اٹھنے کا نام نہ لے گا۔ آغازِ مجلس عام طور پر علمی قسم کا ہوتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب یا کوئی اور رفیق کسی مضمون یا کتاب کی تیاری میں مصروف ہیں اور انہوں نے اپنے "زیرِ تدوین" نظریہ کا انکشاف کر دیا ہے یا خصوصیت سے کوئی مسئلہ درپیش ہے (مسائل کا دائرہ حدیث کی حجیت سے لے کر فرائڈ اور اوڈی پس الجھاؤ تک وسیع ہے) تو دو چار احباب کے درمیان ہی سے بحث چھڑ جائے گی۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ ڈاکٹر صاحب خواہ اس وقت سٹاف روم میں موجود ہیں یا نہیں آج "اجلاس" ضرور ہوگا۔ چنانچہ رفقا، جوں جوں جماعتوں سے فارغ ہوتے آئیں گے "اراکین" کی تعداد بڑھتی جائے گی حتیٰ کہ ڈاکٹر صاحب اور حزبِ اختلاف کے لیڈر یا ڈپٹی لیڈر تشریف لے آتے ہیں۔ اب باقاعدہ کارروائی شروع ہوتی ہے۔ آیاتِ قرآنی پڑھی جا رہی ہیں (اتفاق سے دو رفقاء حافظِ قرآن ہیں) احادیث بیان ہو رہی ہیں۔ توریت اور انجیل سے حوالے سنائے جا رہے ہیں، تفسیر کے نکتے حل ہو رہے ہیں، منطق و استدلال کے دہرے بلند رہے ہیں اور وہ سب کچھ ہو رہا ہے جو نظریات کے "منظور" کرانے میں علمی "ایوانوں" کے ماہر عموماً کیا کرتے ہیں مگر اب بحث نے طول کھینچا ہے اور طبیعتوں میں کچھ تیزی آنے لگی ہے۔ اس موقع پر "سرکاری" یا "مخالف" بنچوں میں سے کسی بامذاق نے منہ کا مزا یا محفل کا رنگ بدلنے کے لیے اپنے کسی فاضل دوست پر کوئی فقرہ چست کر دیا ہے یا پھبتی کہہ دی ہے تو سمجھ لیجئے کہ اب محفل کا پہلا دور ختم ہوا اور کارروائی جب دوسرے دور میں داخل ہوتی ہے تو فضا قہقہوں سے گونج رہی ہوتی ہے۔ وہ چہرے جو تھوڑی دیر پہلے ذرا خشمگیں اور علم کی سنجیدگی سے بوجھل بوجھل نظر آتے تھے اب پھول کی طرح شگفتہ ہیں اور بقولِ پطرس کھلی ہوئی باچھیں پھر گھنٹوں تک اپنی اصلی جگہ پر واپس نہیں آتیں۔ ڈاکٹر صاحب پہلے بھی صدر نشین تھے، اب بھی میرِ مجلس ہیں۔ لطائف و ظرائف کا دفتر کھل گیا ہے مگر اصل کشش ان کی قدرتِ بیان میں ہے۔ سید عطاء اللہ شاہ بخاری کے بعد یہ کمال میں نے ڈاکٹر برق میں دیکھا ہے کہ عربی، فارسی، اردو، پنجابی، ملتانی، سندھی، پشتو، کشمیری اور ڈاکٹر صاحب کی حد تک انگریزی بھی اس فہرست میں شامل ہے۔ غرض لطیفہ جس زبان اور طبقے کا ہوگا اس کو اسی زبان اور اسی طبقے کے لب و لہجہ میں ادا کر سکیں گے۔ ڈاکٹر صاحب جب "صاحب لوگوں" کے واقعات جن کا ذاتی تجربہ بھی ان کو کچھ کم نہیں، کا ذکر کرتے ہیں اور ان کے مخصوص تلفظ سے کام لیتے ہیں تو سماں بندھ جاتا ہے۔ اسی طرح جب وہ ان بے شمار ہیڈ ماسٹروں، اسکول انسپکٹروں، پرنسپلوں اور ڈائرکٹروں کا ذکرِ خیر کرتے ہیں جن سے انہوں نے نفع یا نقصان اٹھایا تو ایک ایک کی انفرادیت اس کی مخصوص آواز، طرزِ گفتگو اور اندازِ کار کے ساتھ آنکھوں کے سامنے آ جاتی ہے اور حاضرین کو بے حد محظوظ کرتی ہے۔ لیکن اس تمام لطیفہ گوئی اور واقعہ نگاری پر غالب اور سب سے بڑھ کر دلچسپ ان کی "آپ بیتی" ہے جسے موقع و محل کی رعایت سے وہ انتہائی بے باکی اور صدق گوئی کے ساتھ "منظرِ عام" پر لاتے ہیں۔ ماضی میں ان سے جو کچھ سرزد ہوا "اندھیرے اجالے انہوں نے جو کچھ کیا" بیانِ واقعہ سے خواہ ان کی اہانت و سبکی کا پہلو نکلتا ہو خواہ ان کی کسی نفسی یا اخلاقی کمزوری کا پتہ چلتا ہو وہ لگی لپٹی رکھے بغیر اس کا ذکر کریں گے۔ مرزا غالب نے اپنے کسی خط میں لکھا ہے کہ "آپ اپنا تماشائی بن گیا ہوں" ڈاکٹر صاحب کا سلوک بھی اپنی ذات کے ساتھ

حد درجہ بے باکانہ اور غیر جانبدارانہ ہے۔

لیکن ڈاکٹر صاحب کی مجلس آرائی کی تصویر اس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتی جب تک ایک اور بات کا ذکر یہاں نہ آ جائے۔ ان کے اس درجن دو درجن کے قریب الفاظ و محاورات ایسے بھی ہیں جو بقول شخصے کسی اسکول یا مدرسے میں پڑھائے نہیں جاتے اور نہ شریف گھرانوں میں بولے سمجھے جاتے ہیں۔ یہ الفاظ و محاورات انہوں نے اس وقت سیکھے تھے جب ابھی وہ اسکول نہیں جاتے تھے یا اسکول سے بھاگ جاتے تھے مگر ان کے بے تکلف اور بے ساختہ استعمال میں دستگاہ انہوں نے برسوں کی ریاضت اور مشق و مہارت سے بہم پہنچائی ہے اور اس میں بڑی بڑی جدتیں اور نزاکتیں پیدا کی ہیں اور اب یہ الفاظ مع حواشی اور جدید فرہنگ کے ان کی شخصیت اور بزم آرائی کا جزو لاینفک ہیں۔

ڈاکٹر صاحب اگرچہ پنجاب یونیورسٹی کے سند یافتہ محقق ہیں مگر تحقیق کئے بغیر نتیجے پر پہنچنا یا فیصلہ کرنے کے بعد تحقیق کی کوشش کرنا ان کی شخصیت کا ایک طرفہ پہلو ہے۔ اس میں بری نیت کو کچھ دخل نہیں۔ ان کا ارادہ ہمیشہ معصوم ہوتا ہے مگر ان کی طبیعت میں جلدی سے نتیجہ نکالنے اور رایوں نکلے یا نکالے ہوئے نتیجے پر اعتماد کرنے کی صلاحیت بڑی غیر معمولی ہے۔ اس سے بارہا دوسروں کے جذبات اور خود ڈاکٹر صاحب کی شہرت کو صدمہ پہنچا ہے اور اگرچہ احساس دلانے یا حقیقت واضح ہونے پر وہ تلافیٔ مافات کی کوشش کرتے ہیں مگر بعض اوقات ان کی یہ زود پشیمانی، غالب کے روایاتی محبوب سے کم بعد از وقت نہیں ہوتی۔ چند سال اُدھر کی بات ہے۔ کالج میں طالبات کو ایک خاص نظم اور ضابطے کے ساتھ تعلیم پاتے ابھی دو تین برس ہی ہوئے تھے اور اس دوران میں ایک آدھ معمولی درجے کا ناخوشگوار واقعہ پیش آ چکا تھا کہ ایک سلجھی ہوئی طبیعت کے نوجوان نئے نئے لیکچرار مقرر ہو کر یہاں آئے۔ ان کے آنے کے دو اڑھائی ہفتے بعد اساب کالج کو کسی کاپی میں پڑا ہوا ایک محبت آمیز خط ملا جس کے آخر پر ان کا نام درج تھا۔ ان دنوں کوئی مستقل پرنسپل نہ ہونے کے باعث اگرچہ براۓ نام انچارج ایک اور صاحب تھے مگر عملاً ڈاکٹر صاحب ہی کرتا دھرتا تھے انہوں نے خط دیکھتے ہی سارے معاملے کو بھانپ لیا اور نوجوان لیکچرار کو بلا کر صاف صاف اور خاصے ناملائم لفظوں میں گفتگو کر ڈالی۔ خود دار اور بے یار و مددگار اجنبی پر تو قیامت ہی گذر گئی۔ وہ تو خدا بھلا کرے اس طالب علم کا جس کے کان تک جب یہ بات پہنچی تو بھاگا بھاگا آیا اور اصل ماہنامے کو بھی اٹھا لایا جس سے وہ مکتوب نگار کے نام کے اس نے محض پسندیدہ اسلوب کی بنا پر وہ خط نقل کیا تھا اور کہیں رکھ کر بھول گیا تھا۔ ورنہ بے خطا لیکچرار اپنی صفائی میں ناکام اور اپنی نیک نامی سے مایوس ہو ہی چکے تھے۔

میں نے یہ واقعہ بہت سوچ بچار کے بعد یہاں درج کیا ہے اور محض اس لئے درج کیا ہے کہ اس کے بغیر ڈاکٹر صاحب کی طبیعت کا یہ سنگین رُخ تشنۂ اظہار رہ جاتا۔ فیصلے میں یہی جلدی اور طبیعت کی یہی تیزی ان دو خطوط کا باعث ہوئی جو انہوں نے 'درِ قرآن' کے ایک تبصرہ پر مولانا عبدالماجد دریا بادی کو چار سال یا دو سال پہلے لکھے تھے۔ علاوہ اور باتوں کے اس میں ڈاکٹر صاحب کا مولانا کو یہ مشفقانہ مشورہ بھی شامل تھا "قبلہ! آپ علمی و اسلامی مسائل پر لکھنا چھوڑ دیں، اس لئے کہ یہ کام آپ کے ڈھب کا نہیں...." اپنے اسی خط میں ایک جگہ مولانا کو یقین دلاتے ہیں "آپ کی اسلام سوز جہالتوں پر ایک ضخیم کتاب تیار ہو سکتی ہے لیکن کوئی صاحبِ فکر و نظر آپ جیسی متعفن لاش پر وقت کیوں ضائع کرے۔"

مجھے ذاتی طور پر علم ہے کہ ڈاکٹر صاحب کو متذکرہ بالا دونوں واقعات کا بعد میں بے حد افسوس ہوا۔ انہوں نے اپنے رفیق سے بھی معذرت چاہی اور مولانا کے لئے بھی ان کے دل میں معذرت خواہی کے سینکڑوں ارمان پوشیدہ ہیں مگر مجھے یہ بھی یقین ہے کہ جب تک دم میں دم ہے ہر ایسی صورت پیدا ہونے پر وہ فیصلے پر تحقیق سے پہلے ہی پہنچیں گے۔

ان کی طبیعت کا یہ رُخ لطیف پہلو بھی رکھتا ہے اور کثرت الوقوع کے اعتبار سے لطیف پہلو سنگین پہلو پر بلاشبہ غالب ہے۔ اب ذرا تغیر

جلدی جاگ اُٹھتے ہیں۔ چند سال پہلے تک وہ گرمی ہو یا سردی کلب سے آدھی رات کو لوٹتے تھے اور ظاہر ہے کہ تاروں کی چھاؤں میں اٹھ کر یا جاگتے رہ کر دروازہ کھولنے کا فرض اور ایثار صرف اہلیہ ہی کا حصّہ ہو سکتا تھا۔ چنانچہ ڈاکٹر صاحب جب دروازہ کھٹکھٹاتے تو اہلیہ احتیاطاً اور چھیڑ خانی کے طور پر پوچھتیں: "کون ہے؟" ڈاکٹر صاحب شاید دیر سے آنے کے احساس کو دور کرنے یا بیگم کے اس ایثار کی نقد داد دینے کی خاطر ان کے مستقل "کون ہے" کے جواب میں اکثر کوئی نہ کوئی خوش دلی کا جملہ کہتے۔ کبھی کہتے "آپ کا سرتاج!" کبھی بولتے "آپ کا فرمانبردار شوہر!" کبھی کہتے "تمہارے درجن بھر بچوں کا باپ" وغیرہ وغیرہ۔ ایک دفعہ گھر میں ساس آئی ہوئی تھیں۔ اہلیہ نے ماں کی شفقت اور مامتا سے فائدہ اٹھایا اور دروازہ کھولنے کا کام ان کے سپرد کر کے خود سو رہیں (بقول ڈاکٹر صاحب کے ماں بیٹی کی آواز میں مماثلت بہت ہے) حسبِ معمول بارہ بجے کے قریب جب ڈاکٹر صاحب نے دروازہ کھٹکھٹایا تو تھوڑی دیر کے بعد ایک نسوانی آواز نے پوچھا "کون ہے؟" ڈاکٹر صاحب نے کھٹ سے نہایت ادا کے ساتھ پنجابی میں خاوند کا ایک بھرپور مترادف لڑھکا دیا...... اور پھر کئی روز تک وہ جس احساس سے مغلوب رہے اس کی تفصیل نہ پوچھئے۔

کلب کا ذکر آ گیا ہے تو اس کو بھی نمٹاتے چلیں۔ ہوشیارپور سے ڈاکٹر صاحب کو زندگی کے دو نہایت مخلص اور وفادار ساتھی میسّر آئے۔ دوسری بیگم اور برج۔ گرمی ہو یا سردی، بادل برس رہا ہو یا آندھی اٹھ رہی ہو، لکھنے پڑھنے کا کوئی ضروری کام ہو یا طبیعت ناساز ہو، ہر حال میں عین اس وقت جب مؤذن نمازِ مغرب کے لئے پکار رہا ہوتا ہے ڈاکٹر صاحب اپنی سائیکل پر کلب پہنچتے ہیں اور پھر تین ساڑھے تین گھنٹے تک برج میں لگے رہتے ہیں۔ اتوار کے روز البتہ خاص کھیل بھی ہوتا ہے اور دوپہر کے کھانے کے بعد سے نو بجے رات تک مسلسل اور لگاتار جاری رہتا ہے۔ اس طرح آج کل اوسط کوئی چار ساڑھے چار گھنٹے یومیہ سے زیادہ کی نہیں مگر ایک زمانے میں وہ چھ چھ سات سات گھنٹے یہ کھیل کھیلتے تھے اور برسوں ان کے 'سگریٹ پان' کا خرچ اس سے پورا ہوتا رہا۔ 'سگریٹ پان' تو میں نے یونہی (محاورۃً) کہہ دیا ورنہ جنگ سے پہلے کے سالانہ ستر روپے ماہوار بڑی چیز ہوتے تھے اور کیا عجب علامہ طنطاوی مصری کی تفسیر (جس سے متاثر ہو کر انہوں نے "دو قرآن" لکھی) اور علامہ یوسف علی کا انگریزی ترجمۂ قرآن جس کے وہ بے حد معترف ہیں، اسی مد سے خریدے گئے ہوں۔ ڈاکٹر صاحب کہتے ہیں کہ وہ اس کھیل میں ہارے بہت کم ہیں۔ ان کی جیت کا ریکارڈ ڈیڑھ سو روپیہ ماہوار کا ہے مگر ہار اٹھارہ روپے سے آگے نہ بڑھی اور یہ ہار بھی انہیں کسی معمولی آدمی کے ہاتھوں نہیں ہوئی۔ غالباً ۴۸ء کے شروع کا ذکر ہے، راجہ غضنفر علی خان مرکز میں وزیر تھے اور ان دنوں پنجاب کے دورے پر تھے کہ ایک روز کیمبل پور آ نکلے۔ دن بھر تو آس پاس کے مہاجر کیمپوں میں کمبل اور لحاف بانٹتے رہے اور رات کے ابتدائی حصے میں مقامی کلب کے مقامی اور مہاجر کھلاڑیوں سے پیسے بٹورے۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنے حصے کے طور پر مبلغ اٹھارہ 'چہرہ شاہی' نذر کئے۔

برج کے علاوہ ڈاکٹر صاحب کو شطرنج، شکار اور شمع معمے سے بھی شغف رہا ہے۔ شطرنج پر اب بھی توجہ فرماتے ہیں۔ سال میں دو تین بار شکار پر بھی نکلتے ہیں البتہ 'شمع' والوں کی بے اصولی سے تنگ آ کر انہوں نے معمے حل کرنے ترک کر دئیے ہیں۔ بیچ میں کچھ دنوں 'بیسویں صدی' اور 'آستانہ' سے بھی شغل فرمایا مگر وہ بھی بالآخر 'بے اصول' ثابت ہوئے۔

انگریزی میں یہ خیال ضرب المثل کی حیثیت رکھتا ہے کہ ماتحت اپنے افسر کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔ وہ اس کو پسند کرے گا یا ناپسند، اس سے محبت کرے گا یا نفرت، ڈاکٹر صاحب اس خیال کی زندہ اور نہایت زوردار تائید ہیں۔ وہ پرنسپل کی شخصیت کو بالکل اور ہرگز نظر انداز نہیں کر سکتے۔ اگر پرنسپل ان کے ڈھب کا ہے یا اس سے ان کے مخلصانہ تعلقات استوار ہو چکے ہیں تو وہ ہر جگہ اور ہر موقع پر اس کی نیک دلی اور انسان دوستی کی تعریف کریں گے۔ اگر ایسا نہیں تو ان کی قوتِ بیان کا ایک خاص حصہ اس کی مردم آزاری کی تشہیر کے لئے وقف رہے گا۔ البتہ اس میں وہ ایک خاص وضع کے پابند ہیں۔ 'مردم آزار' پرنسپل جب تک کیمبل پور میں ہے ڈاکٹر صاحب اس کی تصریح میں محتاط رہیں گے۔

صرف ایسی محفل اور موقع پر 'حقیقت' کا 'انکشاف' کریں گے جس میں ان کے اندازے کے مطابق 'سرکاری' آدمی کوئی نہ ہو۔ ورنہ 'مخلوط' قسم کی محفلوں میں وہ بڑی حد تک 'غیر جانبدار' ہو جاتے ہیں۔ اس میں اخلاقی جرأت کی کمی کو اتنا دخل نہیں جتنا ان کی 'امن پسندی' اور کالج کی فضا کو مکدر ہونے سے محفوظ رکھنے کے جذبے کو ہے۔ وہ طبعاً صلح کل اور تعاون پسند ہیں اس لئے اپنی طرف سے کبھی پہل نہیں کرتے لیکن اگر دوسری طرف سے پہل ہو جائے (جو بدقسمتی سے خارج از امکان نہیں) تو وہ برہم ہونے کے علاوہ پریشان بھی ہو جاتے ہیں۔ برہم اس لئے کہ پرنسپل نے ان کے جذبۂ تعاون کی قدر نہ کی اور پریشان اس لئے کہ وہ کسی قیمت پر بھی کیمبل پور چھوڑنا پسند نہیں کرتے (اور پرنسپل سے اَن بَن کی صورت میں ماتحت کا تبادلہ ہو جانا محکمے کی دیرینہ روایت ہے) کیمبل پور ان کا وطن ہی نہیں، اور بھی بہت کچھ ہے۔ دو سال پیشتر وہ سیر کی غرض سے کراچی گئے تو ڈیڑھ دو ہفتے میں 'بے لطف' لوٹ آئے۔ کسی ذاتی یا سرکاری کام سے لاہور جائیں تو جلدی سے جلدی واپس آنے کی فکر کرتے ہیں۔ تقسیم ملک کے بعد سے ان کے پاس یہاں ایک فراخ اور عمدہ مکان ہے جس کی دوسری منزل کے بعض حصے مغلیہ فن تعمیر کی یاد دلاتے ہیں اور اپنے 'تارکِ وطن' مالک کی خوش مذاقی پر دلیل ہیں۔ اس کے علاوہ یہاں کے کلب اور یہاں کی دوستیاں اور تعلقات۔ یہ سب عناصر ان کی 'امن پسندی' کے اجزائے ترکیبی ہیں۔

ڈاکٹر صاحب لاپروا مگر مخلص خاوند اور حد درجہ شفیق اور مہربان باپ ہیں۔ ان کے ماشاء اللہ نو بچے بچیاں ہیں (بچیوں کی تعداد بچوں سے دوگنی ہے) ایک جو سب سے بڑا ہے پہلی بیگم سے ہے جو گزشتہ اٹھارہ بیس برس سے ڈاکٹر صاحب کے گھر کی بجائے گاؤں میں اپنے والد اور ڈاکٹر صاحب کے حقیقی ماموں کے گھر میں رہتی ہیں اور اس دوران میں فقط دو چار مرتبہ اپنے بچے کی علالت کے موقعوں پر یہاں آئی ہیں) باقی آٹھ بچے دوسری بیگم سے ہیں۔ سب سے بڑا لڑکا پشاور یونیورسٹی میں ایم۔ ایس۔ سی کر رہا ہے اور سب سے چھوٹی بچی نے ابھی پار سال اسکول جانا شروع کیا ہے۔ باقی سات درجہ بدرجہ کالج اور اسکول کے مختلف درجوں میں ہیں۔ ان سب کے ساتھ ڈاکٹر صاحب کا سلوک نہایت محبت آمیز اور بے تکلفانہ ہے۔ میں نے تاثیر مرحوم کو اپنے بچوں کا دوست، ہمجولی اور شریک ساتھی پایا تھا۔ ڈاکٹر صاحب بھی اپنے رنگ میں بچوں کے ساتھ خاصے خوش دل اور منشرح واقع ہوئے ہیں۔ میں نے ابھی انہیں لاپروا اور مخلص خاوند کہا ہے۔ مخلص اس لئے کہ میاں بیوی کے درمیان خلوص اور اخلاص کا جو تصور عام اور بجا طور پر پایا جاتا ہے ڈاکٹر صاحب (میرا مطلب دوسری بیگم کی نسبت سے ہے) اس پر پورا اترتے ہیں اور لاپروا اس بنا پر کہ ...... ذرا ٹھہریئے میں اس کی وضاحت ایک مثال سے کرتا ہوں۔ چند سال اُدھر کا واقعہ ہے ایک دوست نے جو کلب میں دیر تک بیٹھنے کے عادی تھے شادی کی لیکن اس کے باوجود کلب سے اپنے 'تعلقِ خاطر' کو کم نہ کیا۔ بیگم صاحبہ ذرا جدید وضع کی واقع ہوئی تھیں، ہفتہ عشرہ تو صبر کر گئیں پھر ایک روز بولیں "میرا خیال ہے آپ کی شادی مجھ سے ہوئی ہے کلب سے نہیں" اِدھر میاں بھی عورتوں کی 'مساوات' کے جدید تقاضوں سے ناواقف نہ تھے۔ جذبات کی نزاکت کو فوراً سمجھ گئے۔ لیکن میرا اندازہ ہے ڈاکٹر صاحب کے لئے 'جذبات کی نزاکت' سمجھنے کا کبھی سوال ہی پیدا نہیں ہوا اور یوں بھی وہ 'نزاکتوں' کے قائل نہیں اور جو شخص زندگی اور جذبات کی نزاکتوں سے چنداں سروکار نہ رکھتا ہو اور یوں معقول آدمی ہو میرا یقین ہے وہ بطور خاوند کے ضرور لاپروا ہو گا۔

البتہ ایک لحاظ سے وہ بڑے 'بیوی پرست' واقع ہوئے ہیں۔ انہیں عورتوں کے سیاسی، معاشرتی یا معاشی حقوق سے تو چنداں دلچسپی نہیں اور نہ وہ تحریکِ نسواں کے مساواتی نظریہ سے کوئی ہمدردی رکھتے ہیں مگر وہ 'بیوی' کو 'ماں' کے یا زیادہ واضح لفظوں میں 'بہو' کو اس کی 'ساس' کے 'جارحانہ عزائم' سے محفوظ رکھنے کے بہت بڑے حامی اور موئید ہیں۔ رفقاء میں سے کوئی شادی کرے تو مبارکباد کہنے کے بعد اکثر پہلا سوال یہی کرتے ہیں "والدہ ماجدہ زندہ ہیں؟" اگر جواب نفی میں ہو اور مخاطب سے بے تکلفی بھی ہو تو اس کو ایک بار اور مبارکباد کہنے میں کچھ مضائقہ نہ سمجھیں گے اور شادی کی کامیابی کی فی البدیہہ پیشگوئی کر دیں گے اور جواب مثبت میں ہو تو ذرا سوچ میں پڑ جائیں گے اور بڑے موثر لہجے میں مشورہ دیں گے کہ جہاں تک ممکن ہو بیگم صاحبہ کو والدۂ ماجدہ کے سایۂ عاطفت سے

دور ہی رکھے گا۔ یوں شادی کی کامیابی کا یہی گُر ہے۔" اور اگر موڈ میں ہوں تو پھر اس بات کا قدرے تفصیل سے ذکر کریں گے کہ ان کی اپنی والدۂ محترمہ اپنی تین عدد پیاری بہوؤں کی طلاق کا سامان کر چکی ہیں۔ بہ حیثیت مجموعی ڈاکٹر صاحب عورت کے متعلق کوئی اونچی رائے نہیں رکھتے۔ اب یہ فیصلہ کرنا آپ کا کام ہے کہ اس سے خود ڈاکٹر صاحب کے بارے میں اونچی رائے قائم کرنے میں کتنی مدد مل سکتی ہے۔

طوالت کے خوف سے ڈاکٹر صاحب کی شخصیت کے بعض اور پہلوؤں پر مختصر طور سے لکھتا ہوں۔ اگرچہ میرا ارادہ ان پر قدرے تفصیل سے لکھنے کا تھا۔ وہ شعر و سخن کا بہت عمدہ اور پاکیزہ ذوق رکھتے ہیں، بڑے زوردار قسم کے عوامی مقرر ہیں۔ سپاس نامہ لکھنے میں وہ ید طولیٰ حاصل ہے کہ چاہیں تو ملا شور بازار جیسے افغان کی چیخیں نکل جائیں[1]۔ پرنسپل کے پاس جب کوئی ایسی تجویز یا سفارش لائیں جس کی منظوری خود ان کی نظر میں مشتبہ ہو تو 'جناب' کا لفظ معمول سے زیادہ فراخ دلی کے ساتھ استعمال کرتے ہیں۔ ضرورت پڑنے پر ایسے طریق کار کو بھی آزما دیکھتے ہیں جس کو اخلاق پر مضمون لکھتے یا تقریر کرتے وقت وہ جائز نہیں ٹھہراتے۔ بڑے متواضع، مرنجاں مرنج، غریب پرور اور دوست نواز ہیں مگر کبھی کبھی اس وصف سے 'دھڑا بندی' اور 'ناحق' سے بھی جا ملتے ہیں۔ ایک زمانے میں پڑھنے اور لکھنے دونوں میں محنت اور شوق کی کارفرمائی تھی۔ اب بہ کفایت پڑھتے اور بہ عجلت لکھتے ہیں۔ دیر سے سونے اور دیر سے اٹھنے کے عادی ہیں۔ برسوں سے انہوں نے سورج طلوع ہوتے نہیں دیکھا، سوائے ایسے موقعوں کے جب وہ دوستوں کے اصرار یا اپنے شوق سے سیر و شکار کی کسی مہم میں شریک ہوں اور اس کے لئے صبح سویرے کی کسی گاڑی، بس یا موٹر سے روانہ ہونا ہو۔ دیر سے اٹھ کر پہلے اخبار دیکھتے اور پھر شیو بناتے ہیں۔ اس کے بعد وضو کر کے دو رکعت نماز فجر خاصی پابندی کے ساتھ ادا کرتے ہیں۔ سردیوں میں بس یہی 'دو رکعت' ان کا 'پنجگانہ' ہے۔ البتہ گرمیوں میں رات کو جب کلب سے لوٹتے ہیں تو کھانا کھانے سے پہلے اور غسل کرنے کے بعد اکثر دو رکعت بطور نماز عشا کے اور ادا کرتے ہیں۔ نماز جمعہ کے وہ قطعی 'تارک' ہیں۔ گذشتہ چودہ برس سے انہوں نے مسجد میں قدم نہیں رکھا۔ روزے کی بجائے وہ ایک روپیہ یومیہ 'فدیہ' ادا کرتے ہیں۔

آخر میں میرا جی چاہتا تھا کہ ڈاکٹر صاحب کے مذہبی افکار و خیالات پر بھی کچھ کہوں مگر اس مضمون کے اصولی اور تکنیکی تقاضے اس امر کے مانع ہیں۔ البتہ یہاں اتنا کہہ دینا کافی ہوگا کہ میرے نزدیک وہ بعض سچے دعووں کے قدرے کمزور وکیل ہیں۔ اس کی دو وجوہ ہیں۔ اوّل یہ کہ دعوےٰ یا خیال جس قدر اونچا اور بلند ہوگا اسی قدر اپنے حق میں اونچے اور بے داغ استدلال کا تقاضا کرے گا۔ ڈاکٹر صاحب بڑے سے بڑے اور اونچے سے اونچے خیال کی حمایت میں ایک آدھ محکم دلیل دینے کے بعد 'تھک' سے جاتے ہیں اور پھر اس شاعر کی طرح جو غزل میں دو ایک اچھے شعر کہہ چکنے کے بعد بھرتی کے اشعار پر اتر آتا ہے، وہ ایسے دلائل دینے لگتے ہیں جو اپنے اندر کچھ زیادہ وزن اور واقعیت نہیں رکھتے۔ غور سے دیکھا جائے تو غزل اور سنجیدہ مضمون نگاری میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ غزل میں ایک آدھ کام کا شعر بھی نکل آئے تو بقول مولانا حالی ساری غزل چمک اٹھتی ہے اور بالفرض وہ نہ بھی چمک اٹھے تو بھی اس کے بُرے شعروں کا اس کے اچھے شعروں پر چنداں بُرا اثر نہیں پڑتا۔ لیکن سنجیدہ مضمون میں خواہ اس کا تعلق مذہب و فلسفہ سے ہو یا کسی اور علم سے صرف ایک بودی دلیل کے ہونے سے سارے مضمون کے وقار اور قدر و قیمت کو دھکا لگتا ہے۔ دوسرے اگرچہ ڈاکٹر صاحب کا اندازِ بیان اپنے اندر ایک خاص نوع کی شگفتگی اور ادبیت رکھتا ہے مگر بہ حیثیت مجموعی اس میں گرج گرج زیادہ ہے اور نرمی اور دل سوزی کم ہے۔ گونج گرج بھی زندگی اور ادب میں ایک مقام رکھتی ہے مگر اس کے علاوہ بھی

---

[1] چند سال پہلے اپنے دورۂ پاکستان کے وقت جب ملا صاحب یہاں تشریف لائے تو حکامِ ضلع کی سفارش و درخواست پر ڈاکٹر صاحب نے ان کی خدمت میں بزبانِ فارسی ایک سپاس نامہ پیش کیا۔ اس میں مشرقی پنجاب کے مظالم کا ذکر کچھ اس انداز سے تھا کہ ملا صاحب پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔

بہت سے مقامات ہیں اور ایک مبلغ کا، ایک ایسے شخص کا جو دلوں کی کھیتیاں سیراب کرنے اور عقائد و اخلاق میں تبدیلی پیدا کرنے کا خواہاں ہو ان مقامات سے بطور خاص آگاہ ہونا ضروری ہے۔ قرآنِ حکیم نے دین کی نشر و اشاعت کو حکمت اور محبت دونوں کا پابند بنایا ہے اور اس کا معیار یہ قرار دیا ہے کہ "دشمن تمہارا جگری دوست بن جائے"، علامہ اقبال مرحوم نے کہا ہے ؎

گذر جا بن کے سیلِ تند رو کوہ و بیاباں سے
گلستاں راہ میں آئے تو جوئے نغمہ خواں ہو جا

ڈاکٹر صاحب 'کوہ و بیاباں' میں تو 'سیلِ تند رو' بنے بناتے ہیں مگر راہ میں 'گلستاں' آجائے تو 'جوئے نغمہ خواں' نہیں ہو پاتے ——— اس کے باوجود مذہبی تعصب اور تنگ نظری کے خلاف انہوں نے اپنے رنگ میں جو جہاد کیا ہے اور انسان دوستی کے جس جذبے کے وہ علمبردار ہیں اس کی جس قدر بھی تعریف کی جائے کم ہے۔

———

اے آر خاتون

زبیدہ خاتون

ایک بیٹی کا اپنی ماں کے صحیح نقش و نگار اور جیتی جاگتی تصویر کو لفظوں میں پیش کرنا، ان کی خوبیوں اور کمزوریوں کو ظاہر کرنا کچھ عجیب سی بات ہے بلکہ ذرا ٹیڑھی کھیر ہے۔ اور پھر اے آر خاتون کی شخصیت تو بالکل بحر اوقیانوس کی طرح گہری ہے، بلکہ ایک معمہ ہے۔ یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ ان کی کن کن عادات کو خوبیوں کے دفتر میں داخل کیا جائے اور کس بات کو کمزوری سمجھا جائے۔ یہ دونوں آپس میں اس قدر گتھی ہوئی ہوتی ہیں کہ ان کو سلجھا کر الگ الگ کرنا ذرا دقت اور دیر طلب کام ہے، کیوں کہ کوئی بھی انسان خوبیوں اور برائیوں سے پاک نہیں ہوتا۔ بہرحال یہ فیصلہ تو پڑھنے والے ہی خوب کر سکیں گے۔ مگر سچی سچی بات کہہ دینے میں کوئی ہرج بھی نہیں ہے۔

اس سلسلہ میں سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ وہ ایک باعمل انسان ہیں اور انہیں ہر وقت کچھ نہ کچھ کرتے رہنے کا ایک مرض سا ہے۔ وہ ہر ایک سے یہی کہتی ہیں کہ "کوئی نہ کوئی کام کرتے رہو اور کچھ نہ ملے تو کھیل ہی کھیلو" اگر سننے والے کوئی توجہ نہیں دیتے تو وہ خود کوئی کتاب یا کھیل شروع کر دیتی ہیں، کوئی اُن کا ساتھ نہ دے۔ تو بچوں کو اپنے ساتھ شامل کر لیتی ہیں، بچے تو اس کے منتظر ہی رہتے ہیں کہ گھر کا کوئی خاص فرد اُن کے کھیل میں دلچسپی لے۔

وہ چپکے ہی چپکے اپنے کام میں ایسے مصروف رہتی ہیں کہ کسی کو پتہ بھی نہیں ہوتا۔ اور دیکھنے والوں کو ان کا کیا ہوا کام ایسا لگتا ہے جیسے کوئی جن آ کر کر گیا ہو۔ بعض وقت تو اُن کے مسلسل کام ہی کام سے دیکھنے والوں کی طبیعت اُکتا جاتی ہے، مگر ان کی کوشش اور مستقل مزاجی میں ذرہ برابر فرق نہیں آنے پاتا۔ چاہے کتنا بھی کوئی انہیں اس کام سے بیزار کرانے کی کوشش کرے طرح طرح سے اُس کام کے عیوب اُن کے سامنے ظاہر کرے، مگر توبہ کیجئے وہ بغیر کسی کی بات کا جواب دیئے اپنے کام میں مصروف رہتی ہیں اور اس کو مکمل کر کے ہی چھوڑتی ہیں۔

مشغول و مصروف رہنا ان کی عادت ہے ان کا کہنا ہے کہ بیکاری سے انہیں اُلجھن ہوتی ہے صحت پر خراب اثر پڑتا ہے اپنی پریشانیاں

اور اُلجھنوں سے بچنے کے لئے انہوں نے کچھ نہ کچھ کرتے رہنے کی عادت ڈال لی ہے۔

انہوں نے ہمیشہ زندگی کو خوشگوار اور آسان بنانے کی سعی کی ہے اور اب تک اسی جدوجہد میں کوشاں رہتی ہیں اس راہ میں انہیں بڑی بڑی رکاوٹیں بھی پیش آتی ہیں، مگر وہ بڑے صبر و استقلال سے اپنی دھن میں لگی رہتی ہیں نہ جانے اُن میں چیونٹی کی سی ہمت کہاں سے آگئی ہے۔

وہ بہت جلد آنکھوں ہی آنکھوں میں مشکل سے مشکل کام سیکھ لیتی ہیں اگر کسی کو بڑے جدید اور نرالی قسم کا سِلا ہوا کپڑا پہنے دیکھیں گی اور وہ انہیں پسند آجائے گا' (کیونکہ یہ ضروری نہیں ہے کہ ہر جدید طرز کا فیشن انہیں پسند آجائے) تو یقین مانیئے کہ بالکل ویسا ہی بلکہ اُس سے بہتر جب تک وہ اپنے ہاتھ سے تیار نہیں کرلیں گی انہیں چین نہیں آئے گا۔ ان میں سیکھنے کا شوق اور تجسس کا مادہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے ہر کسی کی وہ بات یا کام جو انہیں پسند آجائے 'مزید سیکھ کر دم لیں گی' "جستجو" بھی اُن کی ایک فطرت ہے۔ وہ دُنیا کی ہر قسم کی معلومات و حالات اپنے میں جذب کرلیتی ہیں خبروں یا کسی میچ کی کمنٹری کے وقت اگر انہیں تلاش کیا جائے تو وہ ریڈیو کے پاس بیٹھی ہوئی بڑی دلچسپی سے خبریں یا کمنٹری سنتی ہوئی ملیں گی۔

گھر کے دوسرے لوگوں کی زیادہ تر یہی خواہش ہوتی ہے کہ گھر میں رسالے یا کتابیں کم آیا کریں کیونکہ وہ 'کتاب کا کیڑا' بھی ہیں کوئی کتاب ہاتھ لگ جانی شرط ہے۔ وہ اس کو ختم کئے بغیر نہیں رہ سکتیں۔ اگر کبھی کوئی بے حد موٹی تازی کتاب مِل جائے گی (چاہے وہ مخزن ہی پر پھینک ہی کیوں نہ ہو) ایسا معلوم ہوگا جیسے امّی گھر میں موجود نہیں ہیں۔ کبھی کبھی کوئی کہہ اُٹھتا ہے" ارے یہ موٹی موٹی کتابیں کہاں سے آجاتی ہیں۔ خدا کے لئے انہیں نہ لایا کرو"۔ مگر امّی تو چشمہ لگائے کتاب میں اس قدر غرق ہوتی ہیں کہ انہیں معلوم بھی نہیں ہوتا کہ کوئی کیا کہہ رہا ہے یا ان کے اِرد گرد کیا ہو رہا ہے۔ کتاب ختم ہونے کے بعد وہ اِن کے ذہن میں اس قدر سما جاتی ہے کہ اکثر کئی کئی دن وہ اسی کا ذکر کرتی رہتی ہیں۔ کتابوں کی وجہ سے وہ اپنا آرام تک بھول جاتی ہیں (جس کی انہیں اشد ضرورت ہے) انہیں یہ تک خبر نہیں ہوتی کہ وہ کہاں ہیں، کیا کرنا ہے' ضروری سے ضروری کام کتاب ہاتھ میں آکر کچھ دیر کے لئے اُن کے ذہن سے نکل جاتا ہے وہ اپنا اچھا خاصا وقت باورچی خانہ میں بھی صَرف کرتی ہیں اور ساتھ ہی ساتھ دوسرے کاموں میں بھی گِھری رہتی ہیں جیسے لکھنا پڑھنا' خطوط کے جواب دینا' یا کسی آئے گئے سے بات چیت کرنا' اور کوئی نہ کوئی کھانا بھی پکتا رہتا ہے یا کسی کھانے میں جدّت ہوتی رہتی ہے ورنہ کسی غیر ضروری اور بچے ہوئے کھانے کی شکل اور ذائقہ تبدیل کرتی رہتی ہیں۔ شاذ و نادر کا بچا ہوا قورمہ صبح کے کھانے پر بہترین پلاؤ کی صورت میں ملے گا۔ یا دن کی بچی ہوئی دال رات کو کریلوں میں تبدیل ہو جائے گی۔ سالن کے بچے ہوئے آلو یا اَروی شام کی چائے پر کچالوؤں اور چاٹ کا کام دیں گے۔ اور بوٹیاں کبابوں کی شکل اختیار کرلیں گی' صبح کے دودھ پر سے اُتری ہوئی بالائی اگر کسی نے نہیں کھائی ہے تو دوپہر کے کھانے پر پراٹھوں میں نظر آجائے گی' کوئی کسی قدر بھی کوشش کرے مگر ان کھانوں کی اصلیت ہرگز نہیں پہچان سکے گا۔ ان کے یہ سب کام ایک ہی وقت میں چلتے رہتے ہیں۔

ایک مرتبہ محرّم کے مہینہ میں شاید دس تاریخ کو دوپہر کے کھانے سے گھنٹہ دو گھنٹہ قبل نیاز کے سلسلہ میں کہیں سے کوئی چیز آئی اُس کو دیکھ کر ہم میں سے کسی کی زبان سے نکلا" کاش یہ کھچڑا ہو" اور اس کو صرف کھیر پا کر ہم لوگ اچھے خاصے مایوس ہو گئے۔ مگر جس وقت سب کھانا کھانے بیٹھے تو دیکھا کہ دو ڈونگے بھرے بہترین قسم کے خوشبودار کھچڑے کے میز پر موجود ہیں۔ ہم سب نے حیرت سے امّی کی طرف دیکھا' انہوں نے مسکرا کر صرف اس قدر کہا" تم سب کا کھچڑا کھانے کو جی چاہ رہا تھا' مجھ سے جس طرح بھی ہو سکا کھچڑا تمہارے واسطے تیار کردیا۔ کیونکہ میں جانتی ہوں تم لوگوں سے خود کوئی کام نہیں ہو سکتا بس زبانی جی چاہ کر رہ جاتا ہے"۔

چنانچہ خوب جی بھر کر وہ مزیدار کھچڑا کھایا گیا اور ایک حضرت کے تو پیٹ میں درد تک کی نوبت آگئی مگر انہوں نے کھچڑے سے ہاتھ نہیں روکا مگر ہم میں سے کسی کو آج تک یہ پتہ نہیں چلا کہ اس دن والا لذیذ کھچڑا جس کے تیار ہونے میں سُنا ہے ایک مدت درکار ہوتی ہے کون سے

بچے ہوتے اور بے مصرف کھلانے کی رُوح تھا۔

ان سب کاموں اور باتوں کے باوجود ان کا دماغ کسی اور ہی فکر میں رہتا ہے اس کی کسی کو خبر نہیں ہوتی ممکن ہے کسی ناول یا افسانے کا پلاٹ اس میں گھومتا ہو، یہ وہ کسی کو نہیں بتاتیں۔ اُن میں قوتِ برداشت کافی سے زیادہ ہے وہ اکثر لوگوں کی کڑوی کسیلی بات بھی سُن کر خاموش ہو جاتی ہیں، بلکہ شربت کے گھونٹ کی طرح پی جاتی ہیں۔ ان کا مقولہ ہے کہ زندگی میں کسی سے مخالفت اور دشمنی نہیں پیدا کرنی چاہئے بلکہ ایسی بات ہی نہیں کرنی چاہیئے جس سے شر و فساد کی بُو آئے اور اگر اس کوشش کے باوجود مجبوراً کسی سے بدمزگی ہو جائے تو تمام عمر کے لئے اس سے تعلقات ختم کر لینے چاہئیں۔ اُن کی اِس بات سے ایک قسم کی غیرت و خودداری پائی جاتی ہے، اگرچہ وہ خود اس کو اپنی ایک بڑی کمزوری مانتی ہیں۔

غالباً یہی وجہ ہے کہ خاندان کے تمام افراد اُن کا بے حد احترام کرتے ہیں کبھی کسی کے منہ سے اُن کے بارے میں شکایت کے الفاظ نہیں سُنے گئے بلکہ اکثر لوگ ان کی حد سے بڑھی ہوئی تعریف کرنا اپنا ایمان سمجھتے ہیں۔ عام طور سے وہ خاصی کم گو ہیں وہ کبھی کسی سے ملنے یا بات کرنے میں پہل نہیں کرتیں۔ کسی محفل یا جلسہ وغیرہ میں انجان لوگوں کے سامنے وہ گھنٹوں خاموش بیٹھی رہتی ہیں۔

بعض وقت ان کی خاموشی کچھ ناجائز سی معلوم ہوتی ہے بلکہ وہ کچھ اُلجھی ہوئی اور بیزار سی نظر آتی ہیں جس کو سب ہی محسوس کرتے ہیں اور وہ اپنی اِس عادت سے کبھی کبھی اچھا خاصا نقصان اُٹھا لیتی ہیں کیونکہ وہ ضرورتاً بھی نہیں بولتیں مگر وہ مجبور ہیں اپنی فطرت کو کس طرح بدل سکتی ہیں۔ انہیں خود اس بات کا احساس ہے اس کو بھی اپنی بڑی کمزوری سمجھتی ہیں۔

دیکھنے والے پہلی نظر میں انہیں کچھ مغرور اور متکبّر ضرور سمجھتے ہوں گے مگر جتنا زیادہ وقت وہ اُن کے ساتھ گزارتے ہوں گے ان کی رائے یقینی طور پر بدل جاتی ہو گی کیونکہ طبعیتاً وہ منکسر المزاج ہیں۔

اکثر لوگ ان سے ملنے یا آٹوگراف وغیرہ کی قسم کی چیزوں کے لئے ان کے پاس آتے رہتے ہیں جس میں زیادہ تر کالج کے لڑکے لڑکیوں کا حصّہ ہوتا ہے، ایسے موقعوں پر گھر والوں کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ کچھ تکلّف کر کے آنے والوں سے ملیں مگر ان کا جواب ہوتا ہے "نہیں میں جس حالت میں ہوں اُسی طرح سب سے ملوں گی میرا یہی دستور ہے میں لوگوں پر بناوٹی رعب جمانا نہیں چاہتی۔" اور وہ اسی حالت میں سب سے ملتی ہیں چاہے اس وقت وہ باورچی خانہ میں بیٹھی پسینہ میں شرابور ہی کیوں نہ ہو رہی ہوں یا ہاتھ میں کھُرپی لئے کسی کیاری وغیرہ میں پانی لگا رہی ہوں، گھر والے ان کی اِس عادت سے جزبز ہو کر رہ جاتے ہیں مگر ان کو ایسی باتوں کی قطعی پروا نہیں ہوتی، وہ اپنے لئے کسی قسم کا اہتمام نہیں کرتیں بہت ہی سادہ قسم کا لباس پہنتی ہیں مگر دوسروں کے لئے بناؤ سنگار اور تکلفات کو ایک قسم کا ہُنر اور سلیقہ خیال کرتی ہیں۔

وہ وقت اور موقعہ پر ہر قسم کی عادت ڈال لیتی ہیں اور زمانہ کے مطابق اپنے آپ کو ڈھالنے کی کوشش کرتی ہیں مگر حد سے تجاوز نہیں کرتیں۔ بلکہ وقت کی بہتر اور آسان روش اختیار کرتی ہیں اسی وجہ سے انہوں نے اپنے کوئی سخت اُصول نہیں بنائے جو بدلے نہ جا سکتے ہوں وہ کہتی ہیں کہ بعض سخت اصول بعض وقت انسان کو بڑی ذہنی اُلجھن میں مبتلا کر دیتے ہیں۔

اُن کے پاس آنے والے لڑکے لڑکیاں اُنہیں جدید قسم کی الٹرا ماڈرن سمجھ کر خاصی تیاری کر کے ملنے آتے ہیں اور اُن کی سادگی اور گھریلو پن دیکھ کر حیرت میں رہ جاتے ہیں، مگر جیسے جیسے وہ اُن سے بات کرتے ہیں، اُن کی شخصیت سب پر چھانے لگتی ہے اور اُن سے مِل کر کوئی مایوس نہیں ہوتا بلکہ لوگ گرویدہ ہو جاتے ہیں، وہ عمر اور شخصیت کو ملحوظ رکھ کر سب سے بات کرتی ہیں لڑکے لڑکیاں اُن کی صحبت میں اپنائیت پاتے ہیں اور بڑی عمر والے انہیں خود سے زیادہ تجربہ کار اور ہوش مند سمجھتے ہیں۔ اُن کی گفتگو سطح سے اُبھری ہوئی، کھُلی اور صاف ہوتی ہے۔

وہ اپنے آپ کو کسی سے بے حد بے تکلّف نہیں ہونے دیتیں، ان کا خیال ہے کہ حد سے بڑھی ہوئی بے تکلّفی اکثر بدمزگی کا پیش خیمہ ہوتی ہے وہ کسی کی بات میں قطعی مداخلت نہیں کرتیں اگر اُن کے سامنے دو شخص آپس میں لڑتے ہوں تو انہیں بالکل اعتراض نہیں ہو گا۔ ان کا

مشاہدہ بے حد وسیع ہے وہ چہرہ دیکھ کر بڑی آسانی سے انسان کے عادات و اطوار کا پتہ لگا لیتی ہیں بقول شخصے وہ اڑتی چڑیا کو پہچان لیتی ہیں۔ ان کی نگاہوں سے بچ کر اور چھپ کر کوئی کام کرنا بڑا مشکل ہے، وہ ایک ہی نظر میں سب کچھ تاڑ جاتی ہیں۔ اور حافظہ تو ایسا پایا ہے کہ رشک ہوتا ہے معلوم نہیں کس کس زمانہ کی لوگوں کی سُنی سُنائی باتیں تک انہیں ازبر رہتی ہیں اور واقعات تو انہیں ایسے یاد رہتے ہیں جیسے وہ ابھی ہو چکے ہوں۔

صحت خراب ہو جانے کی وجہ سے وہ اب بعض وقت زیادہ پریشان ہو جاتی ہیں اور اسی وجہ سے وہ مجمع عام میں جانے سے پرہیز کرتی رہتی ہیں اور اچھی اچھی ادبی محفلوں سے گریز کر جاتی ہیں۔ بارہا ریڈیو کے پروگرام جو انہیں اکثر پیش ہوتے رہتے ہیں مسترد کر دیتی ہیں۔ اُن میں قوتِ تقریر بہت کم ہے وہ اپنے آپ کو برسرِ عام پیش نہیں کر سکتیں۔ وہ بحالتِ مجبوری کسی بڑے جلسہ یا پارٹی وغیرہ میں شرکت کرتی ہیں۔ ان کی طبیعت میں روک ٹوک اور جھجک کافی سے زیادہ ہے وہ کبھی بے دھڑک اور آزادی سے کوئی کام یا بات چیت نہیں کر سکتیں۔ وہ سوچ بچار کی عادی ہیں۔

یہ تو ہیں اُن کی عادتیں اور خصلتیں مگر اب آخر میں اُن کے مختصراً خاندانی حالات بھی لکھنے ضروری ہیں تاکہ اِس تاریکی میں بھی روشنی پڑ جائے ان کا نام امت الرحمٰن ہے وہ سنہ ۱۹۱۹ء میں دہلی کے محلہ کوچہ چیلان میں خواجہ میر درد کی بارہ دری کے قریب اپنے دادا صاحب کے مکان میں پیدا ہوئیں۔ ان کے دادا مولوی محمد یوسف صاحب، شاہ عبدالعزیز صاحب محدّث دہلوی کے نواسے شاہ اسحاق صاحب کی اولاد میں سے تھے۔ اور ان کی دادی صاحبہ خواجہ میر درد صاحب کی اولاد میں تھیں۔ امّی صاحبہ کی عمر مشکل سے سات سال کی ہو گی کہ اُن کے والد مولوی محمد سلیمان صاحب کا انتقال ہو گیا اور جب وہ چودہ سال کی ہوئیں تو والدہ کی شفقت سے بھی محروم ہو گئیں۔ ان کی شروع کی تعلیم اور پرورش ریاست بھوپال میں ہوئی کیونکہ اُن کے دادا صاحب بھوپال میں مجلس علماء کے رکن اور جاگیردار تھے۔ پندرہ سال کی عمر میں وہ اپنی دادی صاحبہ کے ساتھ مکہ معظمہ چلی گئیں اور تین سال تک وہاں رہیں۔

اُنیس کی عمر میں اُن کی شادی اپنے ماموں خان بہادر ڈپٹی سید بہاء الدین کے لڑکے سیّد ظہیر الدین سے ہو گئی۔

یہ ہیں اُن کے مختصر سے خاندانی حالات، شادی کے بعد ہماری امّی زیادہ تر دہلی سے باہر رہیں۔ کیونکہ ہمارے پاپا یوپی میں ڈپٹی کلکٹر تھے۔ امّی کو بچپن ہی سے تعلیم حاصل کرنے کا بے حد شوق تھا۔ مگر خاندانی روایت کے مطابق اس زمانہ میں لڑکیوں کو اسکولوں کی تعلیم دلانا معیوب سمجھا جاتا تھا۔ اِس لئے اُنہوں نے جس قدر بھی سیکھا اور لکھا پڑھا، سب اپنے شوق اور جستجو کا نتیجہ ہے۔ ان کے مضامین وقتاً فوقتاً رسالہ عصمت میں شائع ہوتے رہے۔ جن میں "بیچ کا چرچہ" اور "شین کی شورش" خاص طور پر مقبول ہوئے۔ ان کا پہلا ناول "شمع" سنہ ۱۹۳۹ء ہی میں مکمل ہو گیا تھا مگر دوسری جنگ عظیم کا آغاز تھا اور اسی جنگ کے ساتھ ساتھ اُن کی زندگی میں بھی کشمکش اور انقلاب پیدا ہونے لگا۔ سنہ ۱۹۴۱ء میں ہمارے پاپا جو آرمی میں کیپٹن بھی تھے لڑائی کے سلسلے میں ملایا بھیج دیئے گئے۔ امّی اور ہم پانچوں بھائی بہن دہلی میں اپنے دادا خان بہادر سید بہاء الدین صاحب کے پاس رہے اور ایک سال تک کوئی خاص واقعہ نہیں ہوا اور پھر امّی نے اپنے بچوں کی تعلیم کے لئے علی گڑھ میں کوٹھی بنا کر وہاں کی سکونت اختیار کر لی۔ سنہ ۱۹۴۲ء میں سنگاپور انگریزوں کے قبضہ سے نکل کر جاپانیوں کے ہاتھ میں چلا گیا یعنی انگریزی فوجوں نے شکست کھائی۔ تقریباً تین سال تک ہم لوگ اپنے پاپا کی طرف سے ایک امید و بیم کی حالت میں مدت گزارتے رہے۔ اِس عرصہ میں "شمع" اور اس کے بعد "تصویر" شائع ہو چکی تھیں۔ تین سال بعد انگریز حکومت نے پاپا کے لڑائی میں کام آجانے کا اعلان کر دیا۔ اور اُمید کی ٹمٹماتی ہوئی آخری کرن بھی ہمیشہ کے لئے ڈوب گئی۔

اب امّی کی زندگی میں ہر طرف انقلاب اور مشکلات کا طوفان تھا۔ جو ہندوستان کے تمام مسلمانوں کے لئے بھی ایک انقلاب کا پیش خیمہ بن گیا یعنی اسی زمانہ میں پاکستان وجود میں آگیا۔ وہ بھی اپنے دوسرے مسلمان بھائی بہنوں کی طرح وطن چھوڑنے پر مجبور ہو گئیں اور لاہور میں

سکونت اختیار کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ یہاں آکر انہیں جن جن مشکلات اور پریشانیوں اور جدوجہد کا سامنا کرنا پڑا ہے وہ مشکل ہی سے کسی خاتون کو کرنا پڑا ہوگا اور انہیں اب تک کسی قسم کا ذہنی سکون میسر نہیں ہوا ہے انہی مشکلات اور اُلجھنوں کی وجہ سے اب اُن کی صحت بالکل خراب ہو گئی ہے اُن کے اعصاب پر بہت خراب اثر پڑا ہے اگر وہ اپنی تکالیف کو ٹالنے کی بہت کوشش کرتی ہیں۔ اور اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ باوجود ہر قسم کے تفکرات اور پریشانیوں کے جو انہیں گھیرے رہتی ہیں، انہوں نے کبھی اس کا عکس دوسروں پر نہیں پڑنے دیا۔ بلکہ اپنی اولاد تک کو اس کے اثر سے محفوظ رکھنے کی کوشش کرتی ہیں، وہ خود ہر مشکل ہنس ہنس کھیل کر جھیل لیتی ہیں۔ اور حقیقت تو یہ ہے کہ اُن جیسی بلند حوصلہ باہمت اور وسیع النظر خاتون مشکل سے ملے گی۔

اس چھوٹے سے خاکے میں اگرچہ ابھی بہت کچھ تشنگی باقی ہے پھر بھی اے۔ آر۔ خاتون کی دھندلی سی جھلک ضرور ملے گی۔ مگر اس کو پڑھ کر یہ نہ سمجھ لینا چاہئے کہ "گھٹنے پیٹ کی طرف جھکے ہیں۔"

---

(۳)

زشرر ستارہ جویم، زستارہ آفتابے

اقبال
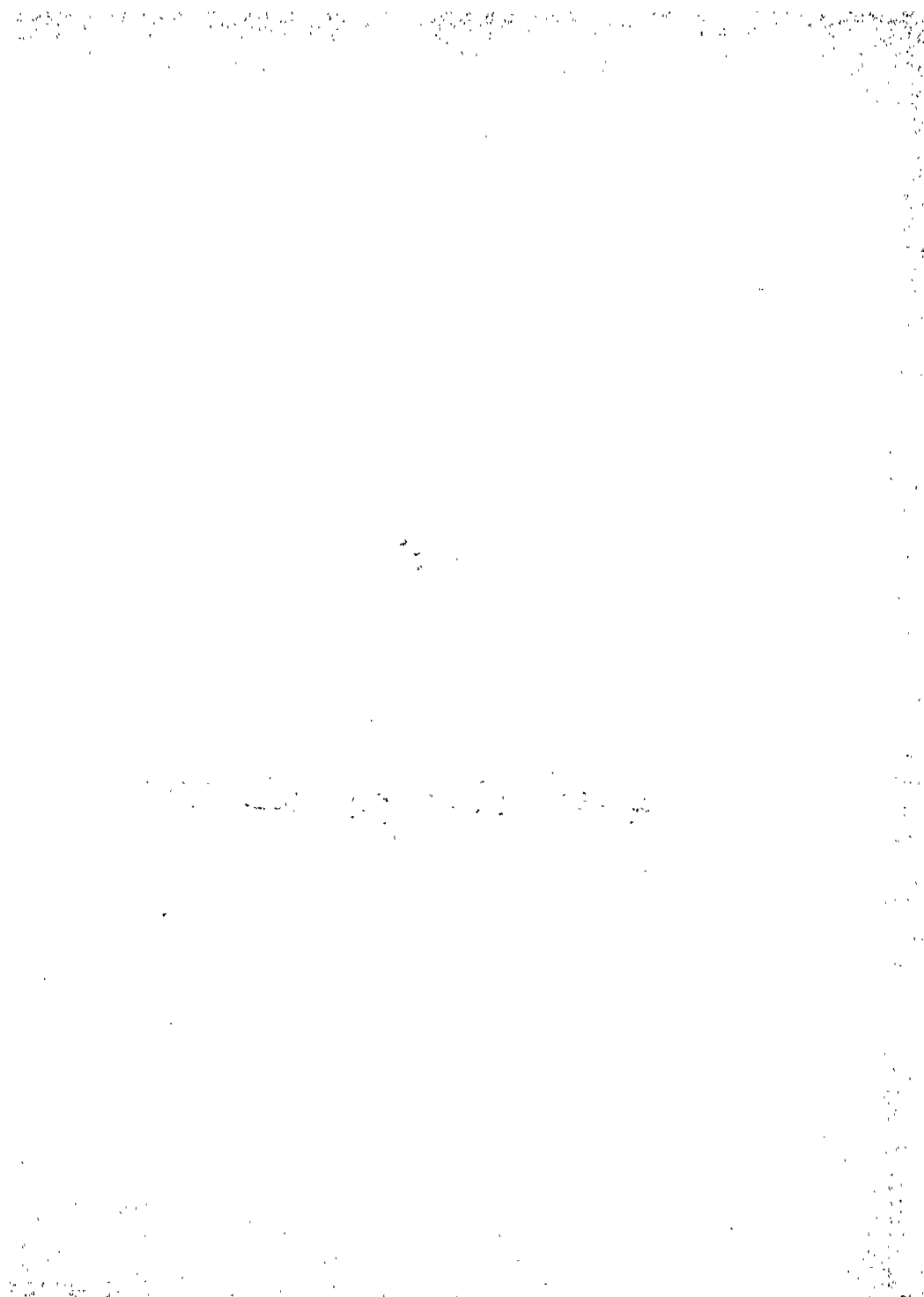
ڈاکٹر سیّد اعجاز حسینؒ

(سید احتشام حسین)

اکبر کو اپنے عہد کے الٰہ آباد میں اپنے اور امرودوں کے سوا بہبود کے دوسرے سامان بالکل نظر نہ آئے۔ مجھے معلوم نہیں اکبر سے پہلے الٰہ آباد میں کسے ایسی شہرت اور اہمیت حاصل تھی جیسے وہاں کے امرودوں کے ساتھ یاد کیا جاتا رہا ہو اور یہ بات بھی تحقیق طلب ہے کہ الٰہ آباد کے امرودوں کو کسی زمانے میں وہ انفرادیت نصیب ہوئی جب اُن کا ذکر دوسری جگہ کے امرودوں سے الگ کیا جانے لگا لیکن اپنے عہد کے الٰہ آباد کے متعلق یہ کہہ سکتا ہوں کہ وہاں کے جن لوگوں کو جانے بغیر الٰہ آباد کی معرفت ادھوری رہ جائے گی ان میں ایک ذات پروفیسر ڈاکٹر سید اعجاز حسین ایم اے ڈی لٹ، صدر شعبہ اُردو الٰہ آباد یونیورسٹی کی بھی ہے۔ امرود اب بھی اپنی جگہ پر ہیں لیکن انسان ایک دوسرے کے لئے جگہ خالی کرتے رہتے ہیں۔ اعجاز صاحب (اس سارے مضمون میں انہیں اسی نام سے یاد کیا جائے گا) شدومد کے ساتھ اپنی اہمیت کے قائل نہ ہوں لیکن وہاں کے امرودوں کی بُرائی نہیں سُن سکتے۔ مجھے یاد آتا ہے کہ پہلے اکبر کی بُرائی سُن لیتے تھے، اب الٰہ آبادیت کے غلبہ کی وجہ سے یہ بھی گوارا نہیں خیر، تو ذکر ہے اعجاز صاحب کا، اور اُن کی انفرادیت کے پیشِ نظر میں انہیں اکبر یا امرود کے ساتھ گڈمڈ نہیں کرنا چاہتا اگرچہ ان کا تعلق دونوں سے ہے (مثلاً اکبر پر انہوں نے ہندی میں ایک کتاب لکھی ہے اور امرودوں کی تعریف میں رطب اللسان رہتے ہیں)، اکبر کو پڑھتے اور پڑھاتے ہیں، امرود کھاتے اور کھلاتے ہیں۔

اعجاز صاحب کو میں نے پہلی مرتبہ ۱۹۳۲ء میں دیکھا اور پہلی ہی ملاقات میں مجھے ان کی ان خصوصیات کا اندازہ ہو گیا جنہیں میں اب بھی اُن کی ذات اور شخصیت کا جزو سمجھتا ہوں، یہ خصوصیات شعر و ادب سے متعلق نہیں، انسان کی روزمرہ کی اخلاقی، سماجی اور عملی زندگی سے وابستہ ہیں یہاں اپنے متعلق کچھ کہنا ناگزیر ہو گا اور اس کے لئے میں معذرت خواہ ہوں۔

اعظم گڑھ سے ۱۹۳۰ء میں ہائی اسکول کرنے کے بعد میں نے مزید تعلیم کے لئے الٰہ آباد کا رُخ کیا۔ وہاں کچھ آسانیاں تھیں اور میری تدریسی زندگی کے لئے اس اہم علمی اور سیاسی مرکز میں ایک کشش، چنانچہ وہاں دو برس گورنمنٹ انٹر کالج میں پڑھتا رہا۔ اس دو سال میں اعجاز صاحب کا نام تو میں نے کبھی کبھی سُنا لیکن ملنے کا اتفاق نہیں ہوا۔ چوک میں کتابوں کی ایک چھوٹی سی دوکان تھی۔ آتے جاتے میں اس پر بھی ٹھہر جاتا تھا، کتابیں خریدنا تو مشکل سے سکتا تھا لیکن نگاہوں کی دعوت ہو جاتی تھی۔ ایک دن ایک نئی کتاب نے اپنی طرف متوجہ کیا۔ دیکھا تو ایک تازہ تصنیف

تھی "آئینۂ معرفت" مصنف کا نام سید اعجاز حسین۔ دکان پر جو بزرگ میاں بیٹھے تھے انہوں نے مجھے بہت زیادہ پُر شوق دیکھ کر چند جملے کتاب کی تعریف میں کہے اور مصنف کے بارے میں اپنی معلومات کا اظہار کیا۔ میں نے اُن کی آنکھیں بچا کر اپنی جیب ٹٹولی اور کتاب کے دام بھی نہ تھے، چلا آیا اور اس کتاب کے پڑھنے کے لئے بہتر وقت کا انتظار کرنے لگا۔

انٹرمیڈیٹ کا امتحان پاس کرنے کے بعد یونیورسٹی میں داخلہ کا سوال تھا۔ وہ سہارا ختم ہو چکا تھا جس کے بھروسہ پر الٰہ آباد میں تھا۔ کوئی نوکری تلاش کروں یا پڑھوں۔ اسی کشمکش میں تھا کہ میرے دو بھائی اور دوست سید محمد شفیع مرحوم اور سبط حسن آ گئے اور انہوں نے اصرار کیا کہ بی اے میں نام لکھا لو، کوئی نہ کوئی صورت نکل آئے گی۔ یہ وہی سبط حسن ہیں جو پاکستان کی جیلوں میں کئی سال کی قید و بند جھیل کے اب لاہور میں ایک صحافی کی زندگی گذار رہے ہیں۔ شفیع بھائی مرحوم نے اسی سال بی اے پاس کیا تھا، سبط حسن بی اے میں پڑھ رہے تھے۔ جب یہ لوگ الٰہ آباد جانے لگے میں بھی ساتھ ہو لیا۔ یونیورسٹی پہونچ کر نام لکھا لیا۔ بورڈنگ ہاؤس کے اخراجات میرے امکان میں نہ تھے۔ چاہتا تھا کہ دوسرے طلباء کے ساتھ کہیں قیام کروں اور تعلیم کا سلسلہ جاری رکھوں۔ شام کے وقت شفیع بھائی مرحوم مجھے ساتھ لے کر نکلے اور اپنے بعض جاننے والوں سے ملے کہ میرے قیام کی کوئی صورت نکل سکے۔ جب کئی دوستوں سے مل ملا کر واپس آنے لگے تو شفیع بھائی مرحوم نے کہا چلو تمہیں اعجاز صاحب سے بھی ملا دیں، بہت اچھے آدمی ہیں۔ اعجاز صاحب اُن دنوں محلہ راجہ پور میں گنگا کے کنارے اپنے ننہالی مکان میں رہتے تھے۔ اندر مکان بہت بڑا تھا لیکن باہر ایک کمرہ تھا جس میں کچھ زیادہ سامان نہ تھا، ایک میز اور چند کرسیاں بے ترتیبی سے پڑی ہوئی تھیں، لکھنے پڑھنے کا سامان تھا نہ کتابیں، سامنے صحن تھا جہاں سے دریائے گنگا اور اس کے گرد و پیش کا برساتی منظر دکھائی دے جاتا تھا۔ اطلاع کراتے ہی اعجاز صاحب باہر تشریف لائے، اخلاق اور گرمجوشی سے ملے، ایسا اخلاق جو تصنع سے سراسر مبرا ہوتا ہے، صاف شفاف شیشے کی طرح، جس کے پار دیکھا جا سکتا ہے۔ کمرے کے بجائے ہم لوگ صحن میں بیٹھے۔ مجھے اچھی طرح یاد نہیں کہ اس دن کیا کیا باتیں ہوئیں لیکن یہ یاد ہے کہ جب میرے قیام کے لئے کسی جگہ کی تلاش کا سوال آیا تو کہا کہ جب تک کہیں انتظام نہیں ہو جاتا یہیں رہیں، یہ کمرہ خالی ہی تو رہتا ہے۔ کچھ تکلفات اور عذر و معذرت کے بعد یہی بات طے ہو گئی، اعجاز صاحب کا اصرار دوسرے خیالات اور تاملات پر غالب آیا۔ میں چند دنوں میں وہیں اُٹھ آیا اور چند دن قیام کرنے کا ارادہ کم و بیش چھ سال کے قیام میں تبدیل ہو گیا۔

انہی دنوں ایک اور لطیفہ پیش آیا۔ گرمیوں کی تعطیل کے زمانے میں جب وطن میں قیام تھا اور بھی عزیز اور دوست اکٹھا تھے کسی سلسلہ میں یہ طے پا گیا کہ چند مہینے تک بال نہ ترشوائے جائیں۔ بالوں پر تقریباً دو مہینے گذر چکے تھے جب میں اعجاز صاحب کے یہاں آیا۔ یہ کوئی ایسی بات نہ تھی جو چھپی رہتی۔ چند دن تو اعجاز صاحب نے میرے بالوں کی بے ترتیب باڑھ کو غور سے دیکھا اور سوچا کہ شاید کوئی زبردست انقلابی اور آشفتہ سر اشتراکی ہے لیکن جب ان باتوں کی کوئی خاص علامت مجھ میں نظر نہ آئی تو انہوں نے بڑی نرمی اور آہستگی سے کہا، احتشام صاحب! آپ بال کیوں نہیں کٹواتے؟ میں جانتا تھا کہ کسی نہ کسی دن یہ سوال ضرور اُٹھے گا، میں نے کہا فرصت نہیں ملی، اگلے اتوار تک بنوا لوں گا، اور اگلا اتوار بھی گذر گیا۔ اب کچھ ایسا تھا کہ اعجاز صاحب سے دیر دیر تک باتیں ہوتی تھیں، گھر، خاندان، تعلیم، ادبی دلچسپی اور تفریحی مشاغل کا ذکر آتا تھا۔ تو انہوں نے ایک دن کسی قدر سختی سے کہا، آخر بات کیا ہے کہ آپ بال نہیں ترشواتے، کیا پیسے نہیں ہیں؟ میں نے سوچا اب اتنی دور بیٹھ کر کسی شرط کی پابندی اس طرح کرنا کہ دیکھنے والوں کو ناگوار گذرے، حماقت ہے، میں نے کہا، کل ضرور بنوا لوں گا۔ اتفاقاً دوسرے دن دوستوں کے دستخط سے خط آ گیا کہ بال کٹوا ڈالو کیونکہ ایک صاحب کو ٹائیفائڈ ہو گیا اور ڈاکٹر نے رسم "مُونڈ تراشی" ادا کرا دی، اب کسی کی پابندی کا سوال نہیں۔ میں نے اعجاز صاحب کو وہ خط دکھایا اور بال ترشوانے چلا گیا۔ انہوں نے اس عجیب و غریب عہد و پیمان سے جو لطف لیا وہ مجھے اب تک یاد ہے۔

یہ لطیفہ یوں لکھتا چلوں کہ چند ہی دنوں میں مجھے اعجاز صاحب کے مزاج، انداز رہائش اور انداز گفتگو کا اچھا خاصا اندازہ ہو گیا۔ وہ نہ تو کسی کے ذاتی معاملات میں ضرورت سے زیادہ اُس کے پیچھے پڑتے ہیں، نہ اِس طرح اپنی بات کہتے ہیں کہ ناگوار ہو یا نہ یہ ظاہر ہونے دیتے ہیں کہ پہلو بچی مجھ سے کیا مطلب۔ مزاج کی یہی وہ خصوصیت ہے جو ان کے دوستوں اور شاگردوں کو اُن کا گرویدہ بناتی ہے۔ اعجاز صاحب اپنی محبت، شفقت اور ذاتی توجہ سے ہر شخص کی نجی زندگی میں داخل ہو جاتے ہیں اور بہت جلد تکلف، تصنع اور دوری کی وہ صدیں ٹوٹ جاتی ہیں جو ابتدائی ملاقات میں دیوار بن کر کھڑی ہو جاتی ہیں۔ اُن کے تمام دوستوں اور شاگردوں نے اس سحر کاری کا تماشا دیکھا ہے۔

بی اے میں میں نے جو مضامین لیے اُن میں اُردو ادب بھی تھا۔ مجھے اُردو سے دلچسپی تھی، کچھ اُلٹا سیدھا لکھتا بھی تھا، شعر بھی کہہ لیتا تھا، جو کتاب ہاتھ لگتی پڑھ بھی لیتا تھا۔ لیکن مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ میری زندگی میں اُردو کی کیا جگہ ہے لیکن یونیورسٹی کے باہر میں نے اعجاز صاحب کو اُردو زبان و ادب ہی کے عشق میں سرشار پایا اور مجھے یہ محسوس ہونے لگا کہ اُردو کو ایک مضمون کی حیثیت سے پڑھنا اور بات ہے اور اس کے عشق میں مبتلا ہو جانا اور بات ہے۔ اعجاز صاحب نے کبھی واضح الفاظ میں مجھے اس کی تلقین نہیں کی، مجھے خاص طور سے اُردو لکھنے پڑھنے کی طرف متوجہ نہیں کیا لیکن وہ جس طرح اپنی زبان سے دلچسپی لیتے تھے، اُٹھتے بیٹھتے اُس کا ذکر کرتے تھے، شعر سے لذت لیتے تھے، اُن میں ایک چھوت کی سی کیفیت تھی، ان سے ہو کر اُردو دوستی کی برقی لہریں دوسروں تک پہنچتی تھیں اور اُسے اپنے رنگ میں رنگ لیتی تھیں چنانچہ مجھے زبان و ادب کے متعلق کچھ نئے تجربے ہونے لگے۔

ان دنوں اعجاز صاحب مختصر تاریخ ادب اُردو لکھ رہے تھے۔ یہ کتاب اس طرح لکھی جا رہی تھی کہ چند صفحے لکھ کر کاتب کو دیئے جاتے تھے، کتابت کی تصحیح ہو کر کاپیاں پریس کو بھیج دی جاتی تھیں۔ پروف پڑھے جاتے تھے اور کتاب چھپتی جاتی تھی۔ میں اکثر دیکھتا تھا کہ اعجاز صاحب کے بعض ایم اے کے طلبا اُن کے پاس آ جاتے ہیں، کتاب کے بعض مباحث پر بحث ہوتی ہے، کچھ حصے پڑھے جاتے ہیں، قلمزد ہوتے ہیں، ہنسی مذاق کی باتیں ہوتی ہیں لیکن کام نہیں رُکتا۔ ان شاگردوں میں ڈاکٹر حامد حسن بلگرامی، رفار عظیم، طالب الہ آبادی، جلیل قدوائی ہوتے اور میں دخل در معقولات کا مرتکب ہوئے بغیر ان دلچسپیوں میں شریک ہوتا۔ دو چار ہفتے بھی نہ گزرے ہوں گے کہ کاپیاں اور پروف میرے دستے ہو گئے، چھوٹے موٹے مشوروں میں بھی شریک کیا جانے لگا اور کبھی کبھی لائبریری سے بعض کتابوں کے حوالے تلاش کرنے کا کام بھی میرے سپرد کر دیا گیا۔ مجھ سے کم تر ادبی ذوق رکھنے والا اور مطالعہ کرنے والا بھی ہوتا تو ان باتوں سے فائدہ اُٹھاتا۔ میں نے جو کچھ بن پڑا سیکھا۔ اعجاز صاحب کا یہ عمل آج تک جاری ہے۔ وہ کتاب چھپا کر نہیں لکھتے، اس کا ڈھنڈورا بھی نہیں پیٹتے، بہت زیادہ اہتمام نہیں کرتے، خاکہ بنانے سے لے کر آخر منزل تک دوستوں اور شاگردوں سے اس کا ذکر کرتے رہتے ہیں، مشورہ سے گریز نہیں کرتے، آسانی سے اپنی رائے نہیں بدلتے، لیکن اپنی بات پر اَڑتے بھی نہیں۔ جب وہ مشورہ کرتے ہیں تو ایسا نہیں معلوم ہوتا کہ واقعی وہ کوئی کتاب یا مضمون لکھنے والے ہیں بلکہ یہی خیال ہوتا ہے کہ شاید کوئی خیال آ گیا ہے اور اس پر گفتگو کر رہے ہیں لیکن سارا مواد اُن کے ذہن میں یکجا ہوتا رہتا ہے۔ اب کتابیں اور مضمون لکھنے کا ذکر آ گیا تو اس بات کو مکمل ہی کر دوں۔

اعجاز صاحب جو کچھ لکھتے ہیں اس کا خاکہ زیادہ تر صبح کی سیر میں مرتب ہوتا ہے اور کئی دن تک ذہن ہی میں اس کی ترتیب ہوتی رہتی ہے۔ اس کا زیادہ حصہ سورج نکلنے سے پہلے ہی لکھا بھی جاتا ہے۔ دن کی شورش میں وہ عموماً سنجیدہ اور غور و فکر سے لکھے جانے والے مضامین کی طرف متوجہ نہیں ہوتے، رات کے وقت بھی شاذ و نادر ہی لکھنے کا کام کرتے ہیں۔ چونکہ اپنے موضوع کے متعلق برابر سوچتے رہتے ہیں اس لیے جب لکھنے بیٹھتے ہیں تو تیز لکھتے ہیں اور عام طور سے زیادہ کاٹ چھانٹ نہیں کرتے، مضامین کو دُہراتے بھی کم ہیں اور میرا خیال ہے کہ اس کی وجہ سے انھیں نقصان بھی پہنچتا ہے۔ اس بات کا تعلق کسی حد تک اعجاز صاحب کے مزاج سے بھی ہے جس میں ایک

نظری شستہ بندی کے ساتھ ساتھ کلام کو خاتمہ تک پہونچانے کی دُھن کا امتزاج ایک خاص انداز سے ہوا ہے۔ اس کا اثر اُن کی گفتگو، تحریر و تقریر اور زندگی کے دوسرے پہلوؤں پر بھی دیکھا جا سکتا ہے۔

جہاں تک تصانیف کا تعلق ہے اعجاز صاحب نے اس خاموشی سے اس کام کو انجام دیا ہے کہ شاید اُن کے بہت سے شاگردوں کو بھی خبر نہ ہوگی کہ اس وقت تک ان کی ہندی اُردو ملا کر آٹھ کتابیں شائع ہو چکی ہیں اور دو ایک کتابیں زیرِ تصنیف ہیں جن میں سے ایک تو جلد ہی طباعت کی منزلوں سے گزرنے والی ہے۔ "آئینۂ معرفت" "مختصر تاریخ ادب اُردو" جس کے پانچ ایڈیشن نکل چکے ہیں اور ہر ایڈیشن میں کافی ترمیم ہوتی رہی ہے) "نئے ادبی رجحانات" (نئی ایڈیشن) "مذہب اور شاعری" "ملک ادب کے شہزادے" "انتخابِ آتش" "مہاکوی میر (ہندی)" "اکبر الہ آبادی (ہندی)"۔ یہ کتابیں تو گہرے تنقیدی مطالعہ کی دعوت دیتی ہیں لیکن مضمون کی نوعیت ان کے سرسری جائزے اور تعارف سے بھی روکتی ہے تاہم اتنا کہنا ضروری ہے کہ اُردو ادب کے طالب علموں کو اعجاز صاحب سے اس سے زیادہ واقف ہونا چاہیئے جتنا وہ اس وقت واقف ہیں۔ یہ تو تھا تصنیف کا ذکر جن میں ادبی مضامین شامل نہیں ہیں، جن کی تعداد کافی ہے لیکن یہ بات تو بہت ہی تھوڑے سے لوگ جانتے ہیں کہ اعجاز صاحب ایک مدت سے شاعری کی دیوی کے قدموں میں بھی اپنے قیمتی افکار چڑھاتے رہتے ہیں۔ یہ کام بھی علی الصباح تاروں کی چھاؤں میں ٹہلتے ٹہلتے ہوتا ہے۔ کشمیر، نینی تال اور مسوری کی فضا بھی شعر کہنے پر اکساتی ہے اور کئی نظمیں اس فضا کی یادگار ہیں۔ زیادہ تر غزلیں لکھتے ہیں لیکن انہیں چھپا کر رکھتے ہیں، بس تھوڑے سے لوگ ہیں جنہیں اُن کے اشعار سننے کی سعادت حاصل ہوتی ہے۔ ایک آدھ بار ایسا بھی ہوا ہے کہ کسی خاص مشاعرے کے لئے کسی دوست یا بزرگ کے اصرار پر کوئی غزل لکھی ہے ورنہ زیادہ تر شوق بے پناہ کے تقاضے کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ اعجاز صاحب کو شاعری کا یہ ذوق اپنے نانا سید حسین صاحب فوق مرحوم سے ملا جن کا سلسلۂ تلمذ آتش سے ملتا تھا۔ اپنی شاعری کے متعلق ایک دفعہ اعجاز صاحب نے میرے ایک استفسار کے جواب میں مجھے لکھا کہ "آٹھویں درجے سے شعر کہنا شروع کر دیا تھا لیکن نانا مرحوم کلام پر اصلاح دینے کے لئے راضی نہیں ہوتے تھے، کہتے تھے کہ ابھی کہنے دو۔ ایف اے تک یہی حال رہا۔ جب بی اے میں پہنچا تو میری ماں کی بڑی بہن یعنی میری خالہ کے اصرار پر کبھی کبھی میری غزلیں دیکھ لیتے تھے۔ اس زمانے میں سید مہدی حسن ناصری مرحوم کی شاگردی کا شرف حاصل ہوا۔ کالج کے علاوہ وہاں سے گھر پر بھی ملتا تھا۔ اُن کی صحبت ایک درس گاہ تھی۔ تفریحی گفتگو میں علمی مسائل، ادبی واقعات، بزرگانِ ادب کے تذکرے برابر آتے رہتے۔ میں کلاس میں اُن سے عربی پڑھتا تھا، گھر پر اُردو کی باتیں ہوتیں۔ نانا کی آنکھیں جاتی رہیں تو انہوں نے میرے کلام کی اصلاح کا کام بھی باقاعدہ ناصری صاحب کے سپرد کر دیا چنانچہ میں نے دو سال تک اصلاحِ سخن میں بھی ناصری مرحوم ہی سے فیض اُٹھایا۔"

یہ تو اعجاز صاحب کا بیان ہے میں نے خود انہیں ہمیشہ اپنے نانا مرحوم اور ناصری صاحب مرحوم کا ذکر بڑے ادب اور جذبے کے ساتھ کرتے ہوئے سنا ہے۔ ناصری صاحب کے انتقال پر انہوں نے ایک پُر درد مرثیہ حالی کے مرثیۂ غالب کے تتبع میں لکھا تھا۔ یہ سب کچھ ہے لیکن شاعری سے اعجاز صاحب کی دلچسپی عملاً بہت گہری نہیں ہے۔ بہت کم اس کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ جو کچھ کہا ہے اس کا بہت تھوڑا سا حصّہ اُن کے پاس محفوظ ہے۔

اعجاز صاحب کی شخصیت اور کردار کا مطالعہ کئی پہلوؤں سے کیا جا سکتا ہے۔ اور اُن کی تصویر کئی آئینوں میں دکھائی جا سکتی ہے لیکن ادب اور زبان کی خدمت اور ایک معلّم کی زندگی کے مختلف پہلو ہی وہ کسوٹیاں ہیں جن پر انہیں پرکھا جا سکتا ہے۔ جو شخص انہیں ایک انسان کی حیثیت سے نظر انداز کرے گا۔ اُن کے طرزِ زندگی اور ارتقائے ذہن کا نفسیاتی مطالعہ نہیں کرے گا وہ انہیں سمجھ نہیں سکے گا۔ اس کے لئے مختصراً اُن کے حالاتِ زندگی سے واقفیت بھی ضروری ہے۔

اعجاز صاحب اگست [illegible] میں پیدا ہوئے۔ ننہال محلہ چوک شہر الہ آباد میں تھا اسی کو اپنا گھر جانا۔ والد بزرگوار لائے مؤرب کہ چکے

لکھے آدمی تھے اس لئے ناناہی نے پرورش اور تعلیم و تربیت کی طرف توجہ کی۔ ابتدائی زندگی ناز و نعم میں بسر ہوئی لیکن جیسے جیسے ان کی عمر بڑھتی گئی گھر کی حالت خراب ہوتی گئی۔ چار پانچ سال کے اندر والدہ اور اُن کی تین بہنوں کا انتقال ہوگیا اور نہ جانے کس طرح خاندان کی مالی حالت بھی سقیم ہوگئی۔ ابتدا میں فارسی عربی پڑھی، پھر انگریزی اسکول میں نام لکھایا۔ ریاضی جان لیوا ثابت ہوئی اور انٹرنس میں دو سال کی ناکامیابی کے بعد کلکتہ جا کر وہاں سے انٹرنس کا امتحان پاس کیا۔ کلکتہ میں زندگی تکلیف سے بسر ہوتی تھی، کبھی کبھی فاقے کی نوبت بھی آتی تھی لیکن یونیورسٹی کی تعلیم حاصل کرنے کے شوق نے ساری مشکلیں آسان کر دیں۔ ابھی بی اے میں داخلہ لیا ہی تھا کہ شادی ہوگئی۔ بہت زیادہ تو نہیں لیکن شادی میں کسی حد تک اعجاز صاحب کی پسندیدگی کو بھی دخل تھا، اس لئے مالی دشواریوں کے باوجود یہ ذمہ داری خوشگوار تھی۔ لوگوں کے مشورے اور ضرورت اس بات پر مجبور کرتی تھی کہ نوکری کر لی جائے لیکن جب ۱۹۲۶ء میں بی اے سے فراغت حاصل ہوگئی تو آگے پڑھنے کی دُھن سوار ہوئی۔ اسی زمانے میں الہ آباد یونیورسٹی میں اُردو ایم اے کی ابتداء ہوئی۔ اس نے شوق کو ایسا مہمیز کیا کہ تمام دشواریوں کو نظر انداز کر کے نام لکھا لیا اور ۱۹۲۸ء میں کامیابی حاصل کی۔ یونیورسٹی نے اُردو ہی میں ریسرچ اسکالر بنا دیا اور سال بھر بعد لکچرر کی حیثیت سے تقرر ہوگیا۔ مالی حالت کچھ بہتر ہوئی اور خیال ہُوا کہ اب ضعیف العمر نانا کی خدمت کی جائے لیکن اسی سال اُن کا انتقال ہوگیا۔ نانا نے معمولی سی زمینداری اور کچھ مکانات چھوڑے تھے جن کے تنہا وارث اعجاز صاحب تھے۔ وہ جس مکان میں رہتے تھے وہ اچھا خاصا بڑا مگر قدیم وضع کا تھا۔ شروع میں ہم نے گنگا کے کنارے، کھیتوں سے کچھ ہٹ کر جس مکان کا ذکر کیا ہے وہ اسی کا ایک حصہ تھا۔ یونیورسٹی کی ملازمت کے بعد یہ پُرانا مکان کچھ نامناسب معلوم ہُوا، کرایہ کے مکان میں رہنے سے اُلجھن تھی۔ اس لئے ایک مکان بنوانے کا خیال ہوا۔ اپنے پُرانے مکان سے کوئی ڈھائی تین سو گز کے فاصلہ پر سڑک کے اُس پار ایک زمین لے لی اور ۱۹۳۲ء میں مکان کی بنیاد پڑ گئی۔ یہ بس میرے وہاں پہونچنے کے فوراً بعد کی بات ہے۔ چنانچہ مکان بننے لگا اور ۱۹۳۳ء میں "نشیمن" کی صورت میں پایۂ تکمیل کو پہونچا۔

اس مکان کا ذکر کئی حیثیتوں سے اعجاز صاحب کی زندگی اور کردار کے سمجھنے میں اہمیت رکھتا ہے۔ اُن کے مزاج کی یہ بہت بڑی خصوصیت ہے کہ وہ نا اُمیدی میں اُمید اور بے سروسامانی میں ساز و برگ دیکھتے ہیں۔ یہ خیال کہ کل کیا ہوگا انہیں کسی کام سے نہیں روکتا، وہ ہر کام اس پختہ یقین کے ساتھ شروع کرتے ہیں کہ اس کا ہونا قطعی ہے۔ میں نے یہ کبھی نہیں دیکھا کہ وہ بہت سی کتابیں، کاغذ، قلم دوات اکٹھا کرتے ہوں اور پھر کسی کتاب کے لکھنے کا سلسلہ شروع کرتے ہوں۔ کتاب شروع ہو جاتی ہے اور سامان اکٹھا ہوتا رہتا ہے۔ یہی "نشیمن" کے بننے میں بھی ہُوا۔ تین سال کی ملازمت اور تقریباً دو سو روپیہ ماہانہ تنخواہ میں روپیہ بچنے کا کوئی سوال نہ تھا۔ دوسرے ذرائع بھی محدود تھے، مکان بنوانے کا کوئی خاص تجربہ نہ تھا۔ لیکن ایک اچھے بڑے بنگلہ کی بنیاد پڑ گئی اور تھوڑے دنوں میں ایک خوبصورت عمارت کھڑی ہوگئی۔ اگرچہ وہ بہت سی اُلجھنیں اپنے ساتھ لائی۔ میرا اندازہ یہ ہے کہ اعجاز صاحب کے مزاج میں جو اُمید پرستی ہے وہ کبھی کبھی اُن عناصر کی طرف متوجہ بھی نہیں ہونے دیتی جو پیچیدگی پیدا کر سکتے ہیں۔ اگر کوئی انہیں ان باتوں کی طرف متوجہ کرے تو وہ ان کی تاویل اور توجیہ ایسی خوبصورتی سے کریں گے کہ آپ اُن کے خیالات کو ٹھیس لگانے کے بجائے اُن کے ہم خیال بن جائیں گے۔ چھ سال کے ساتھ میں مجھے ایسی دشواریاں برابر پیش آئیں، اُس وقت تو بزرگی خوردی، اُستادی شاگردی اور بعض اور وجوہ سے کچھ زیادہ کہنا سُننا آسان بھی نہ تھا لیکن اس مشکل کا اندازہ اب بھی ہوتا ہے۔ کوٹھی کو تیار ہوئے ابھی کچھ زیادہ دن نہیں گزرے تھے کہ اعجاز صاحب کے ایک بہت ہی عزیز دوست سید حامد علی صاحب وکیل ایک دن بڑے سویرے آ گئے اور اعجاز صاحب کو اپنے ساتھ موٹر میں بٹھا کر لے گئے۔ انہوں نے تقریباً چالیس ہزار روپے قرض لئے تھے، انہیں کو ضامن کی ضرورت تھی، کوٹھی نے اعجاز صاحب کی قیمت بڑھا دی تھی، اعجاز صاحب گئے اور ضمانت کے کاغذ پر دستخط کر کے چلے آئے۔ بعد میں لوگوں نے ہمدردانہ کہا کہ یہ بڑی غلطی ہے لیکن اعجاز صاحب اس طرح سوچنے کے عادی نہیں ہیں اور نہ انہیں کبھی اس کا خیال آیا کہ ایسا نہیں کرنا چاہیئے تھا۔ ۱۹۳۶ء میں اچانک سید حامد علی صاحب مرحوم کا انتقال ہوگیا اور اعجاز

صاحب ایک بہت بڑی مصیبت کا شکار ہو گئے۔ مجھے وہ دن اچھی طرح یاد ہیں جب اعجاز صاحب نے بغیر شکوہ و شکایت کے ہر طرح کی تکلیفیں اٹھا کر، اپنا پسندیدہ مکان گروی رکھ کر برسوں میں اس قرض کا ایک بڑا حصہ ادا کیا۔ ساری جسمانی، ذہنی اور مالی کوفت انہوں نے بڑی خاموشی سے جھیل لی۔ اپنی گھریلو ذمہ داریوں اور ضرورتوں کی وجہ سے بوجھ جتنا ہلکا ہوتا تھا اتنا ہی بڑھتا جاتا تھا، ان باتوں نے ان کی صحت اور کام کرنے کی صلاحیت پر بہت اثر ڈالا جسے وہ اب تک بھگت رہے ہیں لیکن وہ نہ زمانے کے شاکی ہیں اور نہ ماضی کے مرثیہ خواں، نہ لوگوں کی ضرورت سے زیادہ ہمدردی سے خوش ہوتے ہیں نہ قسمت کے گلہ مند۔ انہیں مستقبل پر بھروسہ ہے۔ اور ہمیشہ آگے کی طرف دیکھتے رہتے ہیں۔

یہی مستقبل پرستی ان کے سیاسی تصورات میں بھی جھلکتی ہے۔ وہ عملاً اور عقیدتاً اشتراکی نظام کے حامی ہیں۔ سیاسی کاموں میں حصہ نہیں لیتے لیکن ذہنی اور اخلاقی اعتبار سے ہر اس سیاسی اقدام کو قبول کرتے اور لبیک کہتے ہیں جو ترقی پسندانہ ہو اگرچہ اس میں جذباتیت کا بھی اچھا خاصا دخل ہوتا ہے۔

اعجاز صاحب کی زندگی بہت سے قانون اور قاعدوں کی پابندی برداشت نہیں کر سکتی، سرکاری اور غیر سرکاری ہر کام ایک غیر رسمی شکل اختیار کر لیتا ہے یعنی وہ جس کام کو بھی ہاتھ میں لیتے ہیں یا ان کے ہاتھ میں پہونچ جاتا ہے اسے اس کے سارے غیر ضروری لوازم کے ساتھ انجام دینے کے بجائے اپنے ڈھنگ سے پورا کر دیتے ہیں اور اسی بات کی توقع دوسروں سے بھی رکھتے ہیں۔ ان کے شاگرد بڑی خوشی سے ان کے ہر کام کے لئے تیار رہتے ہیں کیونکہ وہ بھی انہیں حتی الوسع مایوس نہیں کرتے۔ یونیورسٹی میں طلبا کی دشواریاں کیا ہیں؟ داخلہ کے شرائط میں کوئی نقص، فیس کی معافی، وظیفہ کے لئے سفارش، حاضری کی کمی اور امتحان میں شرکت کی اجازت، سعی سفارش، نوکری کی تلاش میں مشورہ اور کوشش وغیرہ اعجاز صاحب ان میں سے ہر کام کے لئے ہمہ وقت تیار رہتے ہیں، ان کی طبیعت خراب ہو، کسی اور کام کا وقت ہو، لو دھوپ اور گرمی ہو، شدید بارش ہو رہی ہو، کڑکڑاتے جاڑے ہوں وہ دوسروں کے کام کے لئے نکل کھڑے ہوں گے، اپنی سی کوشش ضرور کریں گے، چاہے سو فیصدی کامیابی نہ ہو۔ اپنے کام کے لئے وہ یہی امید دوسروں سے رکھتے ہیں۔ حالانکہ اس کا مقصد اپنی محنت کا معاوضہ نہیں ہوتا۔

ان تمام خصوصیات میں جس خصوصیت کی سب سے زیادہ جلوہ گری ہوتی ہے وہ ان کے مزاج کی سادگی ہے، اس کی جھلک ان کی رفتار گفتار میں، طرز تحریر میں، لوگوں سے ملنے جلنے میں، طرز معاشرت میں ہر جگہ اپنی جھلک دکھاتی ہے۔ یہ سادگی ہر ایک پر یکساں اپنا پرتو ڈالتی ہے۔ میں نے انہیں "بڑے لوگوں" شاگردوں اور ادیبوں سے بھی ملتے دیکھا ہے۔ اور راجہ پور کے ناخواندہ یا معمولی لوگوں سے بھی۔ ان کا بنیادی انداز شکل ہی سے بدلتا ہے۔ بڑے بڑے لوگوں سے خود ان کی ضرورتیں وابستہ ہوں یا انہیں کوئی کام اعجاز صاحب سے ہو، چھوٹے چھوٹے لوگ اپنی ضرورت سے ان کا گھریلو نام یا محلہ کا رشتہ ظاہر کر کے ان کے پاس آئیں، وہ یکساں انہماک سے گفتگو کرتے ہوئے ملیں گے، اعجاز صاحب کی گفتگو کا انداز بھی مخصوص ہے۔ وہ ٹھہر ٹھہر کر آہستہ آہستہ گفتگو کرتے ہیں اور نکتہ سنجی، خوش طبعی اور بے تکلفی کا انداز پیدا کر لیتے ہیں۔ یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ طبیعت پر مزاح غالب ہے لیکن اگر بات چیت کو خوشگوار اور غیر سنجیدہ بنانے کی ضرورت پیش آ جائے تو وہ اس کام کو بڑی خوبی سے نباہ سکتے ہیں۔ موقع نہیں ہے کہ ایسے لطیفے اور چٹکلے پیش کئے جائیں لیکن ایک واقعہ بے اختیار یاد آ گیا۔ الٰہ آباد یونیورسٹی کے شعبہ ہندی میں ایک استاد ہیں۔ ڈاکٹر رام کمار ورما، ہندی کے بڑے اچھے ادیب، شاعر اور ڈرامہ نگار۔ اعجاز صاحب کے خاص دوستوں میں سے ہیں، دونوں ایک دوسرے کے مداح ہیں۔ میں اس کا عادی تو نہیں لیکن کبھی کبھی ان کی صحبتوں میں بیٹھنے کا موقع ملتا تھا۔ ایک دن میں اعجاز صاحب کے ساتھ تھا، راستے میں ڈاکٹر رام کمار ورما کی کوٹھی پڑتی تھی، ان کے یہاں پہونچ گئے۔ ایک صاحب پہلے سے بیٹھے ہوئے تھے۔ کوئی سرکاری افسر یا رئیس معلوم ہوتے تھے۔ ورما صاحب نے بے تکلف انداز میں اعجاز صاحب کا خیر مقدم کیا اور کہا کئی دن سے ملاقات نہیں ہوئی کیا کرتے رہتے ہو، اعجاز صاحب نے بڑی سنجیدگی سے کہا، اب تمہیں کیا بتاؤں، وہ جو تمہارے گرو صاحب بہادر ہیں [illegible]

کے وہ گفتگو کرنا اور پھر کوئی معاملہ شمار ہی نہیں ہوتا تو کوئی بات نہ تھی، کہنے لگا چھوڑو وائس چانسلر یونیورسٹی میں تمہیں براہ راست کلکٹر بنوائے دیتا ہوں، بڑی مشکل میں جان ہے، کیا کروں، اس کی دوستی تو وبال جان بن گئی ہے صاحب دیکھو دروازے پر کھڑا ہوا ہے۔ ڈاکٹر صاحب تو اعجاز صاحب کی باتوں کے انداز سے واقف ہی تھے، انہوں نے بھی کہا، مار دو کری لکڑی پر، کہاں جاؤ گے ہم لوگوں کو چھوڑ کر، بات اسی انداز میں ہو رہی تھی اور وہ صاحب بیٹھے تھے، وہ حیران کہ آخر یہ کون شخص ہے اور کیا کہہ رہا ہے۔ اُن کو حیرت ہی میں چھوڑ کر ہم لوگ چلے آئے۔ دوسرے دن وہ صاحب اعجاز صاحب کے یہاں آ موجود ہوئے اور پیچھے پڑ گئے کہ راستے بہادری کے لیے میری سفارش گورنر صاحب سے کر دیجئے۔ انہیں لاکھ یقین دلایا گیا کہ یہ محض مذاق تھا، مگر وہ کسی طرح نہ مانے، آخر اعجاز صاحب نے اُن سے جھوٹا وعدہ کر لیا، پھر مجھے یاد نہیں کیا گزری ——— ایسے دلچسپ قصے برابر پیش آتے رہتے ہیں اور وہ کبھی کسی بزم کو بے کیف اور خشک نہیں بننے دیتے۔ اُن کا مزاج مرنجاں مرنج ہے اور جان بوجھ کر کسی کو تکلیف پہونچانا اُن کی فطرت کے خلاف ہے۔ انہوں نے ایک زمانہ میں تصوف کا مطالعہ کیا، مذاہب کے ظاہری لوازم سے گزر کر اُن کی بنیادی یک رنگی پر غور کیا اس سے اُن کے مزاج میں ایک خاص قسم کی فراخ دلی پائی جاتی ہے۔ مذہب، رنگ و روپ، دولت اور افلاس کی بنیاد پر وہ انسانوں میں تفریق نہیں کرتے، بلکہ ان کی اخلاقی زندگی اور انسانی صلاحیتوں پر نگاہ رکھتے ہیں۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ صبح خوشگوار ہوا اور ٹہل کر واپس آ جانے کے بعد بھی سورج نہ نکلے، مناظر فطرت کی دلفریبی دل نشین ہو تو وہ صبح کی نماز پڑھ لیتے ہیں۔ تصوف نے اُن کے کردار اور خیالات پر گہرا اثر چھوڑا ہے جس کے اچھے اخلاقی پہلو ان کی زندگی میں نمایاں ہوتے رہتے ہیں۔

جیسا کہ کہا گیا اعجاز صاحب بہت سی پابندیوں سے گھبراتے ہیں اور مہدی افادی کی زبان میں "محامد رسمیہ" کے قائل نہیں ہیں اسی وجہ سے بڑی بڑی کانفرنسوں میں، شادی بیاہ میں، مجالس و محافل میں، جہاں دیر تک بے قابو ہو کر بیٹھنا پڑے اور دوسروں کے ہاتھ میں وقت کی لگام ہو، شرکت سے گھبراتے ہیں، اگر شریک ہونا ہی پڑے تو کسی وقت چپکے سے نکل کھڑے ہوتے ہیں اور وقت کی لگام خود اپنے ہاتھ میں لے لیتے ہیں۔ صحت کی خرابی کی وجہ سے مسلسل کسی کام میں لگے رہنا اُن کے لئے بہت مشکل ہوتا ہے اس وجہ سے ناواقف یہ سمجھتے ہیں کہ انہیں ان باتوں سے دلچسپی نہیں ہے، مگر جنہیں اُن سے ملتے رہنے کا اتفاق ہوا ہے وہ ان کی اکتاہٹ کا سبب آسانی سے معلوم کر لیتے ہیں۔

اعجاز صاحب ایک اُستاد کی حیثیت سے غیر معمولی جذب و کشش کے مالک ہیں، انہیں اپنے شاگردوں پر بھروسہ رہتا ہے اور شاگردوں کو اُن پر۔ اُن کا بے تکلف، بے ریا اور تصنع سے خالی انداز اُن کے طالب علموں کو اُن کے قریب لاتا ہے اور یہ قرب محض رسمی ملاقات سے گذر کر عزیزدارانہ شکل اختیار کر لیتا ہے۔ اُن کے شاگردوں کے ذہن میں اُن کی ادبی اور انسانی حیثیت اس طرح گڈمڈ ہو جاتی ہے کہ وہ انہیں جدا نہیں کر سکتا۔ ان کی ایک کمزوری کا تکملہ دوسری خوبی سے ہوتا ہے اور نتیجہ میں اُن کی شفیق اور ہمدرد شخصیت ذہن پر چھا جاتی ہے۔ انسانی ہمدردی کا ایک بڑا حصہ ان کو ودیعت ہوا ہے، وہی غلطیوں کا ارتکاب بھی کراتا ہے، کمزوریوں کے روپ میں بھی ظاہر ہوتا ہے لیکن اُن سے قریب رہنے والوں کو معلوم ہے کہ اس کے پیچھے کوئی اخلاقی نقص نہیں ہے۔ میں پھر عرض کروں گا کہ کوئی شخص الٰہ آباد جائے اور اعجاز صاحب سے نہ ملے تو اس کی بدذوقی اور لاعلمی پر مجھے افسوس ہوگا۔

احتشام صاحب

ڈاکٹر محمد حسن

کہا جاتا ہے حسن کی رُوح پتھر میں مجسّمے کی شکل اختیار کرلینے سے پہلے بھی بیقرار ہوتی ہے۔ وہ جہاں ایک طرف سنگتراش کے سینے میں دھوم مچاتی ہے اور تصور کی دنیا آباد کرسکتی ہے وہاں جمادات کے خاموش وجود میں بھی کسی محبوب کی طرح ناز سے انگڑائیاں لیتی ہے۔ یہ بکھری ہوئی انگڑائیاں نہ جانے حسن کے کتنے ان گنت روپ رنگ کی شکل میں بکھرتی رہتی ہیں۔ یہ رودن کا مجسمہ "بوسہ" ہے، یہ حسن کار کا تصور "تاج محل" ہے، یہ میکائیل انجلو کی "مریم" ہے اور یہ غالب کی غزل کا شعر ہے جس کی لذت کسی سرمدی نغمے کی طرح پاکیزہ اور مدہوش کن ہے۔ احتشام صاحب کی شخصیت بھی شاید اسی قسم کے حسین مجسمہ کا نقاب ہے۔

احتشام صاحب کی شخصیت کے بارے میں کوئی کیا کہے ـــــ اس شخصیت کے نہ جانے کتنے پرت اور پہلو ہیں۔ اگر سطحی ملاقات کو اہمیت دیجیے تو ان کے ہاں ایک ٹھہری ہوئی متانت ہے، ایک متانت اور آہنگ ہے جسے کوئی چاہے تو ان کی "برقی طور سے مماثلت رکھتی ہوئی" مسکراہٹ میں دیکھے چاہے تو ان کی باتوں کی شیرینی اور شخصیت میں رچے ہوئے خلوص سے پہچان لے لیکن پچھلے بارہ سال کے عرصے میں جب سے میں ان سے واقف ہوں، مجھے بارہا ان کی صحبت میں اس بات کا احساس ہوا کہ افلاطونی حقیقت کی طرح احتشام صاحب کی شخصیت دراصل کسی حقیقی شخصیت کا محض ایک روپ ہے وہ الفاظ، جو میرے کانوں میں آرہے ہیں وہ متوازن طرزِ عمل، وہ محتاط اور باقاعدہ زندگی ـــــ دراصل کسی عظیم تر حقیقت کا عکس ہی ہے۔

وہ عظیم تر حقیقت، وہ اصلی احتشام حسین کہاں ہے؟ میں جانتا ہوں کہ ان معنوں میں شاید اس حقیقت کا وجود ہی نہیں جن معنوں میں احتشام صاحب کا وجود ہے وہ تو ہر لمحہ بدلتا رہتا ہے، ہر لمحہ اس آویزش کی نشاندہی کرتا رہتا ہے جو مختلف شخصیتوں کے درمیان ایک وسیع القلب انسان کے سینے میں جاری ہے۔ کبھی ایک لہر نغمے کی کسی لَے کی طرح اٹھتی ہے اور ساحل تک سارا کو رنگین کرتی چلی جاتی ہے کبھی دوسرا تصور اٹھتا ہے اور اس لہر کو کسی ضابطہ میں جکڑتا ہوا گذر جاتا ہے پھر کوئی اور احتشام حسین آتا ہے جو راہ گذر سے بکھرے ہوئے خزانوں کی باقیات چنتا ہے اور نئے رنگ محلوں کی تعمیر کے خواب دیکھتا ہے۔

شاید احتشام صاحب کا یہ بڑا ہی مابعد الطبیعاتی تصور ہوا لیکن اصل یہ ہے کہ جس نے احتشام صاحب کی شخصیت میں چھپے ہوئے اس فنکار کا کرب اور تخلیقی اضطراب نہیں دیکھا وہ انہیں صحیح طور پر نہیں جانتا۔ وہ انسان جس کے بارے میں یہ معروف ہے اس کی شخصیت میں ہر مسئلے کا حل ملتا ہے دراصل

"وہ دو داغ جستجو و آرزو کا انسان ہے۔ نہ جانے احساس کے کتنے گدازوں اور پگھلا دینے والے تجربات سے اس شخصیت کا خمیر بنا ہے۔"
آپ نے یہ چند شعر سنے ہیں:

کل تو نیراں کی یاد آئی تھی — آج کیوں ہے فضا اُداس اُداس

جب حریمِ دل میں روشن ہی نہ تھے غم کے چراغ
چاندنی راتیں تھیں ایسی چاند کی راتیں نہ تھیں

بھول جانے کی آرزو کیوں ہے — کیا محبت بھی ہے زمانہ شناس

یہ اس فن کار کی یادگاریں ہیں جو احساس کی مٹھی مٹھی گداز سے اپنا جام لبریز رکھتا ہے جو "بہانے" کے افسانوں میں دل کے درد کا جوہری بنتا ہے۔ حادثات ہی سے نہیں چھوٹی چھوٹی آرزوؤں کی شکست سے بھی جس کی آنکھیں نم ناک ہو جاتی ہیں اور پھر بھی جس کی شخصیت اپنا آہنگ، توازن اور احتیاط نہیں کھوتی۔

بارہ سال پہلے کی بات ہے جب میں نے لکھنؤ یونیورسٹی میں داخلہ لیا تھا۔ اردو میرا مضمون تھا، پروفیسر مسعود حسن رضوی صدر شعبہ تھے۔ آزاد نظم کی بحث اپنے شباب پر تھی۔ راشد اور میراجی رسالوں میں مقبول تھے۔ ہوسٹل کے اندر اور کلاس کے باہر "دریچے کے قریب" اور "فیض کی نظمیں" بات بات میں پڑھی جاتی تھیں۔ احتشام صاحب کے مضامین میں اپنے وطن مرادآباد ہی میں "نگار" کے پرانے پرچوں میں پڑھ چکا تھا۔ یہ مضامین زیادہ تر مذہبی تھے۔ ان میں وہ مضامین بھی تھے جو ابوسعید بزمی سے "امامت اور خلافت" کی بحث کے سلسلے میں لکھے تھے یا پھر افسانے تھے جن میں نیاز کا رنگ جھلکتا تھا یا پھر پریم چند، علی عباس حسینی اور اعظم کریوی کا طرز صاف اُبھرتا نظر آتا تھا۔

بہرحال کلاس میں احتشام صاحب کو دور سے دیکھا۔ ترکی ٹوپی، سیدھی سادی شیروانی پہنے ایک متوسط قد اور اوسط درجے کا جسم نظر آیا البتہ انہیں دیکھ کر پہلا احساس ان کے شائستہ اور کافی خوش رو ہونے کا ہوا تھا۔ پڑھنے پڑھانے کا سلسلہ شروع ہوا تو یکایک ایسا محسوس ہونے لگا کہ ہم سب اس محفل میں سامعین کی حیثیت نہیں رکھتے بلکہ احتشام صاحب ہم میں سے ہر ایک سے فرداً فرداً باتیں کر رہے ہیں۔ ان کے پڑھانے کے انداز میں بڑی گرم جوشی تھی جیسے ادب کی تعلیم اس شخص کے لئے صرف روزی کمانے کا ذریعہ نہ ہو بلکہ زندگی اور موت کا مسئلہ ہو۔

ان کے پڑھانے کی تعریف کرنا دشوار ہے۔ ان کے کلاس کی منظر کشی کرنا ناممکن ہے۔ البتہ ان کے لکچروں ہی میں نہیں ٹیکسٹ بک پڑھانے میں بھی بار بار اس کا احساس ہوتا تھا کہ طلباء اور استاد دراصل ایک طویل سفر پر ایک ساتھ روانہ ہوئے ہیں کوئی ایک قدم آگے ہے کوئی کچھ پیچھے اور احتشام صاحب ایک ایسے گائیڈ کی طرح جو خود بھی ہم سفروں کی ٹولی میں گھل مل گیا ہے اور اپنے بیان سے خود بھی لذت لے رہا ہے راہ کی ہر روش کیاری اور جلوہ بار گلستانوں کو متعارف کرتے ہوئے چلے جا رہے ہیں۔

ان کا پڑھایا ہوا شعر ایک جمالیاتی تجربہ ہوتا ہے صرف مشکل الفاظ کی تشریح نہیں بیچ بیچ میں نازک جذباتی مسائل آ جاتے تھے۔ مجھے آج تک یاد ہے کہ ایک بار پورا گھنٹہ اس مباحثے کی نذر ہو گیا تھا کہ پہلی نظر میں محبت ہو سکتی ہے یا نہیں؟ اگر ہو سکتی ہے تو اس کے نفسیاتی، حیاتیاتی یا جمالیاتی اسباب کیا ہیں پھر غالب کے اس شعر کے ساتھ سے

بہت دنوں میں تغافل نے تیرے پیدا کی — وہ اک نگہ جو بظاہر نگاہ سے کم ہے

حسرت کے اس شعر کا تعارف ہوا سے

ایک ہی بار ہوئیں وجہ گرفتاریٔ دل — التفات ان کی نگاہوں نے دوبارہ نہ کیا

پھر فانی چلے آئے ـــ

بجلیاں ٹوٹ پڑیں جب وہ مقابل سے اٹھا   مل کے پلٹی تھیں نگاہیں کہ دھواں دل سے اٹھا

آہستہ آہستہ ہم لوگوں کو غالب کے کلام کے زندہ اور تابناک ہونے کا احساس ہونے لگا۔ جو ذرا پڑھنے لکھنے کا شوق رکھتے تھے ان کے کانوں میں لوٹس کی "A NOTE ON LITIRARY CRITICISM" فیرن کی "CONVENTION & REVOLT IN POETRY." اور ٹرنل کی "LOVE IN THE MACHINE AGE" کے نام پڑنے لگے اور یہیں سے ہی ہم لوگ کم از کم نفسیات، جنسیات اور مارکسیت کے خاکے سے روشناس ہونے لگے۔

پھر ان کی ذاتی واقفیت کا یہ حال تھا کہ سال میں چار چھ مرتبہ ضرورتاً صرف یادداشت سے حاضری لے لیا کرتے تھے قبل تقسیم کے لکھنؤ میں بی اے میں اردو طلباء کی تعداد کافی ہوتی تھی لیکن ہر طالب علم کے بارے میں احتشام صاحب کو نہ صرف پوری معلومات ہوتی تھیں بلکہ ہم میں سے زیادہ تر ان کو ذاتی طور پر جانتے بھی تھے۔

"نیا زمانہ" میں میرا ایک چھوٹا سا افسانہ چھپا تھا۔ احتشام صاحب پہلے شخص تھے جنہوں نے وہ افسانہ پڑھا اور کلاس میں مجھ سے اس کے بارے میں پوچھا۔ احتشام صاحب ان دنوں ہمارے شعبے میں لکھنے آزاد نظم کے حامیوں میں تھے اور جب مسعود صاحب یا مولانا محمد حسین مرحوم سے ان کے مباحثے ہوتے تھے تو ہم لوگوں میں بھی مختلف پارٹیاں بنتیں اور گرما گرم بحثیں ہوتی تھیں۔

انہی دنوں میں نے "حلقۂ احباب" کے نام سے ایک چھوٹی سی انجمن کی بنیاد ڈالی تھی۔ چند ہم جماعت طلباء جمع ہوتے تھے، اُلٹے سیدھے افسانے پڑھا کرتے تھے اور ان پر بحثیں ہوتی تھیں۔ جوش کا یہ عالم کہ چھوٹے سے حلقے ہی میں چندہ جمع کر کے "مضراب" کے نام سے رسالہ نکالا جو چند شماروں کے بعد بند ہو گیا۔ ان دنوں ہمارے حلقے کا سب سے کامیاب افسانہ نگار احمد حسن تھا اور مجھے آج بھی اس بات کا یقین ہے کہ وہ افسانے لکھتا رہتا اور "ڈان" "پاکستان اسٹینڈرڈ" کی سب ایڈیٹری میں اسیر نہ ہوتا تو یقیناً آج صفِ اول کے افسانہ نگاروں میں ہوتا۔

اس بے بضاعت حلقے کی صدارت کے لئے ہم لوگوں نے بہت ہی ڈرتے ڈرتے احتشام صاحب سے درخواست کی اور اس کے بعد سے چار چھ سال تک برابر احتشام صاحب ان جلسوں کی صدارت کرتے رہے۔

"حلقۂ احباب" کی سیکرٹری شپ نے مجھے احتشام صاحب سے بہت قریب کر دیا۔ گو کل چند سٹوڈنٹس، احتشام صاحب اور میں نے مل کر حلقۂ احباب کا جو سہ سالہ پروگرام تیار کیا تھا اس میں نہ صرف اردو ادب کی تمام تر اصناف کا جائزہ لینے کا ارادہ تھا بلکہ مختلف علوم و فنون کے ماہرین سے عام فہم انداز میں مقالات لکھوانا بھی شامل تھا مختلف ہندوستانی زبانوں کے ادب کا اجمالی خاکہ پیش کرنا اور فنونِ لطیفہ کی اصناف میں سے ہر ایک کا تفصیلی جائزہ بھی ہماری فہرستِ مقالات میں شامل تھا۔ اس سہ سالہ پروگرام کا افتتاح کرنا ڈاکٹر عبدالحق صاحب نے منظور کر لیا تھا۔

اب یہاں احتشام صاحب کی شخصیت کا ایک اور پہلو سامنے آتا ہے۔ نہ جانے کتنی بار مجھے احساس ہوا ہے کہ احتشام صاحب جس حوصلہ کو اپنے ہم نشینوں اور ملنے والوں کے دل میں جگا دیتے ہیں اس کا عشرِ عشیر بھی خود ان میں بہت کم جاگتا ہے۔ خود اپنی بات کہتا ہوں اپنے رفیقوں کے دل میں عمل کا ذوق بیدار کرنا اور جوش پیدا کرنا بہت آسان کام تھا یہی نہیں اکثر مولوی عبدالحق اور خواجہ غلام السیدین جیسے بزرگوں کو دہلی اور بمبئی سے کھینچ بلانا اور "حلقہ" کے لئے جوشش پیدا کر دینا بھی دشوار نہ تھا لیکن خود احتشام صاحب کو اس کے لئے آمادہ کرنا جوئے شیر لانا تھا۔

ہم سب لوگ دن رات پروگرام بناتے، مقالے لکھتے، جلسوں کی نوعیت کے بارے میں سوچتے لیکن جب ہم یہ ساری تجاویز اور منصوبے شہر خواب سے لے کر احتشام صاحب کے پاس پہنچتے تو وہ اس کے راستے کی کچھ ایسی ایسی مشکلات گنا دیتے کہ ہمارے سارے منصوبے ہوا ہو جاتا۔

ایک دفعہ کا قصہ ہے سنہ ۱۹۴۷ء کی ایشیائی کانفرنس میں آئے ہوئے ایرانی مندوبین کو ہم نے لکھنؤ آنے کی دعوت دے دی خیال یہ تھا کہ یہ لوگ

وقت کی کمی کی وجہ سے دعوت تو کیا قبول کریں گے البتہ ایک شکریے کا خط لکھیں گے اور ہمارا فرض پورا ہو جائے گا۔ "حلقۂ احباب" کے پاس کوئی سرمایہ سرے سے موجود ہی نہ تھا، وقت آنے پر البتہ سو پچاس روپیہ چندہ کر لیا جاتا تھا۔

ایسی حالت میں ہماری حیرت کا اندازہ لگائیے جب ایرانی وفد کا تار آیا کہ وہ لکھنؤ آ رہے ہیں اور انہوں نے ہماری دعوت قبول کر لی ہے۔ گھبرائے ہوئے احتشام صاحب کے پاس پہنچے۔ احتشام صاحب بہت برہم ہوئے، بولے "بڑی غیر ذمہ دارانہ حرکت ہے۔ آپ لوگ بیٹھے بٹھائے شوشے چھوڑا کرتے ہیں۔ آپ کو علم ہے کہ تین چار ہزار روپیہ سے کم خرچ نہ آئے گا۔ اب یہ رقم کہاں سے لائیے گا؟"

غرض ہم لوگ سراسیمگی کے عالم میں ادھر ادھر دوڑتے رہے۔ یوپی گورنمنٹ کے وزراء سے ملے، وائس چانسلر سے ملے اور آخرکار رفیع احمد قدوائی مرحوم کی مدد سے ان کے قیام، طعام، سیر و تفریح وغیرہ سب کا انتظام ہو گیا۔ "حلقۂ احباب" کی طرف سے ایک عصرانہ دینے کا پروگرام طے گیا اور یونیورسٹی میں ایک جلسہ کرنے کا اہتمام کر لیا۔

ہم سب لوگ بے حد مطمئن تھے کہ دیکھیں اب احتشام صاحب کیا دشواری بتلاتے ہیں؟ احتشام صاحب کے ہاں پہنچے، ساری روداد ایک ہی سانس میں سُنا ڈالی۔ جلسے کے بارے میں پروگرام بتایا ۹ر اپریل کے لئے جلسہ طے کیا تھا۔ احتشام صاحب نے مخصوص انداز میں اپنے سر پر ہاتھ پھیرا اور بڑے متوازن لہجے میں کہا:

"یہ تو سب ٹھیک ہے مگر جلسے کے لئے حاضرین کہاں سے آئیں گے؟"

بات غلط نہ تھی کیونکہ طلباء کے امتحانات ہو رہے تھے لیکن ہندو بین دہلی سے یہاں تک آ جائیں، یوپی گورنمنٹ کو ہم اس ہفت خواں طے کرنے کے بعد آمادہ کر لائیں اور اس کے بعد ایرانی وفد کے استقبال کے لئے حاضرین کی کمی پڑے ـــــ یہ صرف احتشام صاحب کی افسردگی پرست طبیعت سوچ سکتی تھی۔

افسردگی پرست کی بجائے جی چاہتا ہے یاس پرست لکھوں لیکن یاس ایک مستقل اور اثباتی کیفیت ہے۔ پھر مجھے یہ بھی احساس ہے کہ یہ الفاظ میں ایک ایسے نقاد کے بارے میں لکھ رہا ہوں جس نے ہماری تنقید میں عمرانی اور مارکسی اندازِ نظر کو رواج دیا ہے اور نئے افق بخشے ہیں۔ عمرانی اور مارکسی نقطۂ نظر زندگی کے رجائی پہلو کے نمائندہ ہیں۔ اگر میں نے احتشام صاحب کی تحریریات نہ پڑھی ہوتیں تو ان کی ذات کو یا تو تیر کے دوبارہ جنم لینے سے تعبیر کرتا یا پھر انہیں صوفی، وجودیاتی، یا قنوطی تسلیم کر لیتا۔

غالب کا شعر ہے ؎

بے دلی ہائے تماشا کہ نہ عبرت ہے نہ ذوق
بے کسی ہائے تمنا کہ نہ دنیا ہے نہ دیں

بے دلی کا اتنا دبا ہوا احساس میں نے کم لوگوں میں دیکھا ہے، جی چاہے اسے کاہلی کہئے، مجھے تو بار بار ایسا لگا ہے کہ احتشام صاحب کے اندر ایک بہت ہی اچھا آدمی چھپا ہوا ہے، جو وضعدار ہے، جس نے قصبہ ماہل کے ایک قدیم گھرانے میں پرورش پائی ہے اور اس کی قدیمی روایات کو اپنے میں جذب کیا ہے۔ یہ وضعدار اور بہت ہی اچھا آدمی اتنا طاقتور ہے کہ وہ باغی نوجوان جوان کی دوسری شخصیت کا جزو ہے ہر بار اچھے آدمی سے شکست کھا جاتا ہے۔ اس نوجوان باغی کو وہ کھونے دے کر بھی نہیں بہلاتے۔ اس کی دبی ہوئی کچلی ہوئی شخصیت ایک افسردگی کی شکل میں پھیل گئی ہے۔ یہ وہ مالک ہے جس کا ذکر کرشن چندر کے ناول شکست کے آخری صفحات میں ملتا ہے۔

اب ذرا اس بات پر اچھے آدمی کی چند پرچھائیاں دیکھئے:

جب سے میں نے احتشام کو ان کے گھر میں بیٹھے ہوئے دیکھا ہے تب سے انہیں شدید اختلاف ہے اور جن سے وہ شاید بہ ظاہر رہ چکے کے

اور کوئی مفاد حاصل نہیں کر سکتے۔ گھنٹوں گزر گئے اگر وہ دونوں تک بھی اسی طرح بیٹھے باتیں کرتے رہیں گے تو احتشام صاحب کھانے کے لئے اندر جانا تو دور، آنے والے سامنے تقاضوں کو ٹال دیں گے۔ اگر اس وقت ان کی ریڈیو ٹاک کا وقت ہوگا تو اسے نکل جانے دیں گے لیکن اس بار خاطر مہمان سے یہ نہ کہیں گے کہ آپ کسی اور وقت تشریف لائیے گا۔ یہی نہیں ان کی باتوں میں اکتاہٹ کا ایک ہلکا سا پرتو بھی نہیں آنے پائے گا۔

ان سے ملنے آنے والوں کی عجیب عجیب قسمیں ہیں۔ ان میں شاید سب سے زیادہ تعداد ان لوگوں کی ہے جو اپنی کتابوں پر دیباچہ لکھانے آتے ہیں۔ میں نے خود ایک سے زیادہ مرتبہ ان سے اس "مقدمہ بازی" کی شکایت کی ہے۔ انہوں نے ایسے ادیبوں کے مجموعوں پر بھی دیباچے لکھے ہیں جو اس کے مستحق نہیں تھے۔ کسی نے دہلی میں مجھ سے کہا کہ انجینئرنگ کی ایک ابتدائی کتاب پر احتشام صاحب نے دیباچہ لکھا۔ میں نے آ کر ان سے فریاد کی۔ کہنے لگے بڑ لوگ یہ تو پڑھ لیتے ہیں کہ احتشام نے دیباچہ لکھا ہے لیکن یہ کوئی نہیں دیکھتا کہ احتشام نے کیا لکھا ہے۔ لوگ آتے ہیں بار بار تقاضے کرتے ہیں، سفارشیں کراتے ہیں تو تمھی کہو ان کو کیا کہا جائے جو کچھ ان کتاب کے بارے میں سمجھ میں آتا ہے لکھ دیتا ہوں۔"

اور اس کی گواہی خود میں دے سکتا ہوں کہ میں نے ایک ایسی ہی گھٹیا کتاب کے دیباچہ کے لئے بیک وقت جوش ملیح آبادی سے لے کر ان کے ایک عزیز تک کے خط موصول ہوتے دیکھے ہیں۔

امریکہ جانے سے پہلے ہر شام وہ امین آباد میں اردو کتابوں کی دوکان "دانش محل" میں آ بیٹھتے۔ یہاں ان کے دوست اور ہم نشین طرح طرح کے آدمی ہوتے ہیں اور موضوعات کے دائرے میں کتابوں سے لے کر کرکٹ میچ کے نتائج تک سب کچھ شامل ہے۔ وہ گھنٹوں مقامی سیاست اور الیکشن کے نتائج پر بحث کرتے ہیں۔ یہ بزم بزم بے تکلف تو نہیں کہی جا سکتی کیونکہ احتشام صاحب کی شخصیت کھل کھیلنے کی عادی نہیں۔ ہاں یہ وہ جگہ ضرور ہے جہاں روزگاری کے لئے دو چار خوشگوار لمحے گزر جاتے ہیں۔ اور آپ یقین کیجئے کہ وہاں بیٹھنے والوں کے گروہ میں سے ہر ایک کے لئے احتشام صاحب کے دل میں گرمجوشی اور خلوص کے وہی سوتے ہیں جو شاید کسی پسندیدہ ادیب کے لئے ہوں گے۔

ایک اور رُخ دیکھئے۔ لکھنؤ یونیورسٹی میں ریڈرشپ کا مسئلہ درپیش تھا امیدواروں میں یوں تو بہت تھے لیکن خاص مقابلہ احتشام صاحب اور آل احمد سرور صاحب کے درمیان تھا۔ سرور صاحب کا تقرر ہوگیا اور اس لمحے سے آج تک اگر لکھنؤ یونیورسٹی میں سرور صاحب کسی کو اپنا بہترین دوست کہہ سکتے ہیں تو وہ احتشام صاحب ہیں۔ یہ میں اپنی طرف سے نہیں کہہ رہا ہوں۔ نہ جانے کتنی بار میں نے سرور صاحب کی زبان سے یہ الفاظ سنے ہیں اور اس خلوص کا اندازہ کیا ہے جو احتشام صاحب کی رگ رگ میں پیوست ہے۔

یوں تو یہ معمولی سی بات ہے لیکن ایسے موقعوں پر جب انسان خود اپنی حسرتوں کی شکست کا منظر دیکھتا ہے اور اس کے سامنے اپنے مستقبل پر چھاتے محسوس کرتا ہے، تو اچھے اچھے تصور پرستوں کے قدم ڈگمگا جاتے ہیں۔ حالی اور شبلی کی چشمک ہمارے ادب میں ہنوز ماند نہیں پڑی ہے لیکن اس وسعت قلب کی مثالیں کم ہی ملیں گی جب چند لمحوں کے حریف زندگی بھر کے رفیق ہو گئے ہوں۔

یہ چشم مروت احتشام صاحب کے کردار کی خوبی بھی ہے اور خامی بھی۔ وہ شاعر کا شعر بھی بڑے استقلال سے سن لیتے ہیں اور تنقید نگاروں کی صف اوّل میں ہونے کے باوجود ان کا قلم دلوں کو ٹھیس پہنچانے اور ہنگامی شہرتوں کے بلبلے توڑنے میں مزا نہیں لیتا۔ ایسا بھی نہیں ہے کہ ان کی پسندیدگی اور ناپسندیدگی کے دائرے غیر واضح اور مبہم ہوں۔ وہ نقش کے ساتھ پکاسو کے آرٹ پر ناپسندیدگی کا اظہار کرتے ہیں لیکن اگر خدانخواستہ پکاسو ان کا محلے دار ہوتا تب وہ کھلے بندوں اس کی کوئی نکتہ چینی کر پاتے — یہ البتہ بحث طلب ہے۔

چاہے ان کے قلم کے نشاط و شگاف نہ ہونے پر نکتہ چینی کر لیجئے لیکن ان کے ہمدرد ناسے یہ کوئی شبہ نہیں کر سکتا۔ مروت میں وہ کبھی کبھی اس طرح بہہ جاتے ہیں کہ شاید بہت سے لوگ اسے ہضم نہ کر پائیں۔ اسی لئے انہوں نے ہر [illegible] کا کام اردو کی تنقید کو ایک نظریاتی بنیاد بخشنا تھا اور ہر چند کہ جو کچھ انہوں نے اب تک کیا ہے وہ اس کا [illegible] اور رقابا صرف [illegible]

پھر بھی ادبی تنقید کا یہ موڑ طا تاریخی موڑ ہے۔

شخصیت سے ہٹ کر بات تنقیدی فکر کی طرف جا پہنچی۔ دراصل احتشام صاحب کی ادبی خدمات سے ان کی سماجی خدمت کا مرتبہ کچھ کم نہیں ہے۔ ان کا کارنامہ صرف وہ مضامین نہیں ہیں جو رسالوں میں چھپتے ہیں، بلکہ یہ ہے کہ احتشام صاحب خود اپنی ذات سے ایک انجمن ہیں۔ ان کے طالب علم، یونیورسٹی کا ہر وہ لڑکا جو انہیں جانتا ہے، ہر ادب سے دلچسپی رکھنے والا نوجوان جو انہیں جانتا ہے، احتشام صاحب کو اپنی شخصیت کا ایک جزو سمجھنے لگتا ہے وہ گھنٹوں اس کی بپتا سنیں گے، اس کی جذباتی الجھنوں میں غم خواری کریں گے، اس کو مشورے دیں گے، اس کے لئے ممکن ذرائع فراہم کریں گے اور چاہے وہ اس نئی نسل کے دکھوں کا مداوا نہ کر سکیں مگر ان کی آواز، ان کی شیریں گفتگو بے قرار دلوں کے زخموں پر مرہم ضرور رکھ دیتی ہے۔ امید کا نہیں غم خواری کا مرہم ـــــ!

اس طرح وہ ایک نسل کا مرکز بن گئے ہیں جہاں لوگ مداوا پانے نہیں جاتے شاید غم بانٹنے اور نئے حوصلے لینے جاتے ہیں یہ غم وہ بانٹتے ہیں یہ بات البتہ یقینی ہے یہ نہیں ہو سکتا کہ کوئی کام کی بات نکلے اور وہ آپ کا ذکر نہ کریں۔ اعلیٰ سے اعلیٰ صحبتوں میں وہ ادنیٰ سے ادنیٰ شناسا کو پہچان لیں گے اس سے بات کریں گے اور اپنے سارے مسائل بھول کر اس صحبت میں اس ادنیٰ سے شناسا کا ذکر شروع کر دیں گے۔

گھریلو زندگی میں بھی احتشام صاحب بڑے خاموش، سنجیدہ اور جھگڑوں سے بچنے والے انسان ہیں۔ خریداری کے لئے وہ کبھی بازار نہیں جاتے ہمیشہ ان کے چھوٹے بھائی اقتدار ان کی شیروانی کا کپڑا، ان کے قلم کی روشنائی اور جوتے خریدتے دیکھے جاتے ہیں۔ یونیورسٹی اور شام کو "دانش محل" کے علاوہ بہت کم باہر نکلتے ہیں۔ جلسے جب تک ان کے لئے ناگزیر حادثے نہ بن جائیں اس وقت تک وہ ان سے دامن کش ہی رہیں گے البتہ ہر اتوار کو ترقی پسند مصنفین کے جلسے میں جو سرور صاحب کے ہاں ہوتا ہے تقریباً پابندی سے آتے ہیں۔ وہاں نوجوان ادیبوں سے ان کی گفتگو ہدردانہ نہیں برادرانہ ہوتی ہے۔

احتشام صاحب یوں بہت گھریلو آدمی ہیں ان کا کمرہ بچوں سے آباد رہتا ہے۔ کوئی ان کا قلم جیب سے نکالے لئے جا رہا ہے، کوئی ان کی گود میں بیٹھنے کے لئے تنگ و دو کر رہا ہے، کوئی کتاب چھینے لئے جاتا ہے اور اس کی تصویریں دیکھ رہا ہے اور احتشام صاحب نہایت جمعیت خاطر سے کبھی بچے کو چمکار رہے ہیں اور کبھی آپ سے کروچے کے فلسفۂ جمالیات پر بحث کر رہے ہیں۔ اگر ان کی بچی ثریا کی طبیعت ذرا نڈھال ہے تو ان کے سارے پروگرام منسوخ ہو جائیں گے۔ حالانکہ خود اپنی بیماری کو ہمیشہ ٹالتے ہی رہتے ہیں۔

یہ بیماری جسمانی ہے یا صرف بقول رشید احمد صاحب صدیقی "اسٹائل" ہے یہ کہنا مشکل ہے البتہ دونوں ہی باتیں تھوڑی بہت صحیح ہیں ڈسنٹری پرانی چیز ہے ان کا مرض ہے لیکن اس کے علاوہ طبیعت کی گرانی، الجھن اور پریشانی کچھ کو کچھ بنا دیتی ہیں ایک شام معلوم ہوا کہ احتشام صاحب آج دہلی جانے والے ہیں وہاں جامعہ کی طرف سے "یوم نظیر" منایا جا رہا ہے۔ حضرت گنج میں مجھے اطلاع ملی۔ ساڑھے ۸ بج چکے تھے اور گاڑی غالباً ۲۰-۹ پر جاتی تھی، مجھے ان سے ضروری کام تھا۔ بھاگم بھاگ بارود خانہ پہنچا۔

گھر کے سامنے رکشہ کھڑی تھی۔ تھوڑی دیر میں اقتدار میاں بستر لے آئے، رکشا میں رکھ دیا گیا۔ مجھے یقین ہو گیا کہ ٹھیک سے ملاقات بھی نہ ہو پائے گی۔ بہر حال اطلاع کرائی تو قمیص اور پاجامے ہی میں ملبوس باہر چلے آئے۔ میں نے حیرانی سے پوچھا:

"آپ ابھی تک تیار نہیں ہوئے؟"

بولے "طبیعت میں عجب طرح کا خلجان سا ہے۔ کچھ گرانی محسوس ہو رہی ہے۔ سوچ رہا ہوں کہ جاؤں یا نہ جاؤں!"

اتنے میں اقتدار میاں اور رکشا والے دونوں نے جلدی مچانا شروع کی، کہنے لگے:

"میاں اقتدار کیا ۲۰-۹ کے بعد کوئی اور گاڑی نہیں جاتی؟"

اقتدار میاں نے کہا "جاتی ہے ۱۲ بجے جاتی ہے"۔ پھر کچھ کمرے ۱۵، ۲۰ منٹ معاملہ اسی طرح رکھا رہا۔ فیصلہ ہوا کہ اس گاڑی سے جانا ملتوی کر دیا جائے

یہاں ساحل ہی ساحل ہیں سمندر اور اس کے طوفان نہیں کیونکہ ان طوفانوں پر احتشام صاحب نے اس سختی سے بند باندھے ہیں کہ انہیں یارائے اظہار نہیں۔
احتشام صاحب ہمارے ان تنقید نگاروں کے میر کارواں ہیں جنہوں نے نقطۂ نظر پر اصرار کیا جن کے نزدیک تنقید نہ محض تشریح تھی نہ محض جمالیاتی موشگافی
بلکہ اس کا عمرانی عمل بھی ہے اور اسی بناء پر نقاد کا زاویۂ نظر ہونا بھی ضروری ٹھہرا اور ادب کا حکیمانہ مطالعہ بھی۔ شاید اسی لئے حکیمانہ مطالعہ کی یہ اُمنگ خود انہیں
اپنے تجزیے کی طرف لے گئی۔ "ساحل اور سمندر" ان سطور کے ساتھ ختم ہوتی ہے:

"خیر اس موج اور تنہا سفر میں میں نے اگر کچھ اور نہیں سیکھا تو اتنا ہی سہی کہ میں نے احتشام حسین کو سمجھنے کی کوشش کی.....
عجیب انسان ہے، متضاد کیفیتوں کا حامل، حقیقتوں سے جدوجہد کرنے کا شائق اور خوابوں کے پیچھے مارا مارا پھرنے والا،
اسے سمندر سے بھی محبت ہے، ساحل بھی عزیز ہے۔ وہ طوفانوں کی خواہش بھی کرتا ہے اور سکون کا متمنی بھی ہے ایسا محسوس
ہوتا ہے کہ اس نے زندگی کے ساتھ بے وفائی برتی۔ اس کی وسعتوں میں سے صرف مطالعہ کو چن لیا۔ مطالعہ کتنا ہی وسیع ہو
مشاہدے اور زندگی کی جدوجہد میں شریک ہو کر تجربے حاصل کرنے کا بدل نہیں ہو سکتا۔ سماجی جانور بننے کے لئے کبھی کبھی حمق،
جنون یا محض بچہ بننے کی ضرورت پڑتی ہے اس نے اس راز کو نہیں سمجھا وہ ڈرتا رہا کہ کوئی ہنس نہ پڑے، کوئی کچھ کہہ نہ دے
یہ ایک سہمی سہمی ہوئی محدود شخصیت کی نشانی ہے نعرہ بحروں اور لذت کوشیوں کے بہت سے در کھلے ہوئے دیکھ کر اس نے
کچھ کہا بھی تو اس طرح جیسے اپنے گرد و پیش سے خوفزدہ ہو جائیں۔ جب لوگ دلچسپیوں میں مصروف ہوتے اور وہ
پڑھتا، سمندر کی موجیں گنتا رہتا تو میرا جی چاہتا کہ میں کتاب اس کے ہاتھ سے چھین لوں اور کہوں کہ یہ کھیل کود، یہ شراب نوشی
یہ رقص کے ہنگامے، یہ قماربازی، یہ محض ہنسی کے لئے ہنسی، یہ بے بات کی بات، محض حماقت تو نہیں، کچھ نہ کچھ
لذت تو حاصل ہوتی ہی ہوگی ورنہ لوگ کوشش کیوں کرتے۔ میں نے اس سے کہا بھی کہ یہ سنجیدگی بے محل ہے۔ اس طرح اپنے
خول کے اندر رہنا بے معنی ہے۔ رقص، کھیل کود، بات چیت کے بہانے دل ملتے ہیں، جسم ملتے ہیں، تجربہ حاصل ہوتا ہے
یہی باتیں سنا سنا کر اسے کبھی کبھی منا بھی لایا لیکن اس کی اداسی، اس کے فلسفیانہ غم اور اس کے احساس تنہائی کو دور نہ کر سکا
میں سمجھ ہی نہ سکا کہ وہ چاہتا کیا ہے۔ غالباً اسے خود بھی اس کا علم نہیں ہے۔ شاید اس میں اتنی گہرائی اور پیچیدگی ہے جس کو
وہ بتا نہیں سکتا۔ ایک دن جب میں نے اسے بہت مجبور کیا تو اس نے مسکراتے ہوئے شیکسپیئر کے ڈرامے
"ایز یو لائک اٹ (As you like it)" کا چوتھا ایکٹ میرے سامنے کر دیا۔"

"ساحل اور سمندر" صفحہ ۳۶۶

آپ اسی کے بارے میں جیکس اور روزالنڈ کا یہ مکالمہ پڑھئے۔ مجھے احتشام صاحب کے بارے میں دو چار باتیں کرنے کی اور اجازت دیجئے۔
یہ آخری بات ان کی سیاست کے بارے میں ہے۔ یہ میں مانتا ہوں کہ احتشام صاحب ذہن کے دریچے بند کر کے نہ کبھی کانگریسی ہوئے ہیں نہ کمیونسٹ،
ایسے موقع پر بھی جب کمیونسٹ پارٹی غلط قسم کی پالیسی پر کاربند تھی احتشام صاحب نے اپنے توازن اور اعتدال کو نہیں چھوڑا۔ شاید اس لئے کہ وہ ان کی
فطرت کا دوسرا نام ہے۔ اس غلط پالیسی کے زمانے میں وہ "علم و دانش" کے ادارے میں رہے۔ مارکسی مصنفین کی کانفرنس میں شرکت کرتے رہے لیکن
ایمان کی بات یہ ہے کہ مجھے ان کی سیاست سے الجھن ہوتی ہے۔ ادب بھی ایک محبوبہ ہے جو سوکن کو برداشت نہیں کر سکتی۔ میرا بے اختیار جی چاہتا ہے
کہ احتشام صاحب کی شخصیت جو سیاست اور امریکہ اور روس کے مناقشوں، انڈر ڈیولپمنٹ اور اس کے دھندلکوں میں گم ہو جاتی ہے اپنے جمالیاتی شعور کے
ساتھ نکھر کر سامنے آ سکے۔ اب "ساحل اور سمندر" کو لیجئے۔ یہاں بھی یہ سفر ایک حسن پرست ادیب سے زیادہ واضح اشتراکی رجحان رکھنے والے سیاست داں کا
سفر معلوم ہوتا ہے کہ Goods that failed جیسی غیر ادبی کتاب کا ترجمہ کرنے کی فکر میں ہے۔ کبھی ایسا لگتا ہے جیسے وہ ادیب کے

سارے عشق کو بھول کر انسانیت کے عظیم ورثے کو خانوں میں تقسیم کر رہے ہیں۔

اگر میں احتشام صاحب سے اتنا قریب نہ رہا ہوتا تو شاید ان کی ادبی شخصیت پر شک کرنے لگتا یا ان کے ادبی شعور پر حرف لاتا لیکن میں جانتا ہوں کہ ان کا مذاق شعر جمالیاتی حس اور "کون و مکاں سے پار ہو جانے والی نظر" اپنی نظیر آپ ہے۔ انھوں نے اپنے مضامین میں تازہ تر خوبصورت زرشے ہوئے اور تڑپا دینے والے شعروں ہی کو پیش کیا ہے۔ ہاں ان کی تنقید جمالیات کے دائرے ہی سے آگے نہیں بڑھتی بلکہ ادبیات کے حلقے سے بھی آگے قدم رکھ کر عمرانیات اور سیاسیات کو سمو لیتی ہے۔

احتشام صاحب ان دنوں خاموش ہیں۔ میں جانتا ہوں ان کے پاس کہنے کے لئے بہت سی باتیں ہیں لیکن شاید اس بین الاقوامی سفر نے انھیں فکر و ادراک کے نئے افق دئے ہیں۔ اب ان کا ادبی مذاق صرف چند مضامین سے تسکین نہیں پاتا۔ ان کی فکر اب کائنات کی سیاح ہے اور اس منزل تک پہنچنے کے لئے صرف شوق کی بلندی کافی نہیں۔ ہمتوں کی بلندی بھی ضروری ہے۔

مگر کیا ان سب باتوں کے بعد بھی کوئی یہ کہہ سکتا ہے کہ وہ احتشام صاحب کو جانتا ہے؟ ان احتشام صاحب کو جنہوں نے کبھی اپنی اصلی شخصیت کو خود اپنے سامنے بھی بے نقاب نہیں کیا جو کبھی اپنی الجھنوں کا ذکر بلند آواز میں نہیں کرتے، جن کے سینے میں "اسرار حرم سرا کی حسیناؤں" کی طرح قید ہیں۔ ان کا شعری مذاق تیکھا ہے لیکن ان میں جو بھلا مانس مختسب انسان ہے وہ کسی بُرے شعر پر برہم ہونے یا کسی گھٹیا شاعر سے سختی سے پیش آنے کا بھی روادار نہیں ہوتا۔ ان کی شخصیت میں بڑی تابناکی، بڑی سرمستی، بڑی رنگینی ہے لیکن اس شخصیت پر سنجیدگی، متانت اور توازن کے وہ پہرے ہیں کہ وہ اپنے ضمیر سے سرگوشی میں بھی اپنے دل کے ارمان دہرا نہیں سکتے۔

کب یہ پہرے اٹھیں گے، کب اس اصلی شخصیت کا طلوع ہوگا ——— کون کہہ سکتا ہے؟!

اختر حسین رائے پوری

دیوندر ستیارتھی

"حسن و عشق کے گیت تو بہت ہوئے۔ بغاوت کے گیت ہوں تو نکالئے اپنے جھولے سے!"

"تو آپ نے مجھے کوئی مداری سمجھ لیا کہ جب چاہوں اپنے جھولے سے بے موسم کا پھل نکال کر پیش کر دوں۔"

"بہت خوب۔ لیکن بغاوت کے گیتوں سے میرا کیا مفہوم ہے۔ یہ شاید آپ نہیں سمجھے۔"

"ارشاد"

"میرا اشارہ کسانوں کے ان گیتوں کی طرف ہے جن میں انہوں نے قسمت کا رونا رونے کی بجائے اپنے قدموں پر کھڑا ہونے کا ارادہ ظاہر کیا ہو، جن میں ہمیں ان کے وہ تیور نظر آ سکیں جو اپنے اقتصادی حالات پر غور کرنے والے کسی شخص کے چہرے پر اکثر دیکھے گئے ہیں۔"

"لوک گیتوں میں ایسے گیتوں کی بھی کمی نہیں۔"

"تو ذرا ایسے گیتوں کو منظرِ عام پر لائیے۔ اُن کی ہمیں زیادہ ضرورت ہے۔ خالص شاعری کے زاویے سے تو دوسرے گیتوں کی اہمیت بھی کچھ کم نہیں۔ لیکن جہاں تک ادب کی افادیت کا تعلق ہے، ہمیں کسانوں کے ایسے گیتوں کو ترجیح دینا ہوگی جن میں وہ اپنے کھیتوں کے بارے میں کچھ کہتے ہیں، اپنے قرض چکانے کی بات سوچتے ہیں، زمیندار کی غلامی سے آزاد ہونے کے لئے آواز بلند کرتے ہیں۔"

گفتگو کے یہ نقوش آج تک دھندلے نہیں ہوئے۔ اگرچہ یہ گفتگو بیس برس پیشتر ہوئی۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب اختر حسین رائے پوری کلکتے کے ہندی ماہنامہ "وشو متر" کے مدیرِ اعلیٰ تھے اور میں اس خیال سے دفتر وشو متر پہنچا تھا کہ کسی طرح ایک مضمون کی پیشگی [illegible] جائے اور اس سے دارجلنگ تک کا نہیں تو ریل راستے تک کا ٹکٹ لیا جا سکے۔

میری زندگی میں یہ پہلا موقع تھا کہ کسی ادیب نے مجھے ادب کے اقتصادی پہلو سے اتنی شدت سے روشناس کرایا۔ اختر حسین نے وعدہ کیا کہ وہ وشو متر کے مالک مول چند سے کہہ کر میرے لئے دارجلنگ کے کرائے کا انتظام کر دیں گے۔ میرا مضمون انہوں نے وشو متر میں چھاپا منظور کر لیا۔ لیکن بڑے رکھ رکھاؤ کے ساتھ انہوں نے اس بات پر زور دیا کہ لوک گیتوں کے پس منظر کو سمجھنے کے لئے ادب کے گہرے مطالعے کی ضرورت ہے اور اس کے لئے مجھے گورکی کے افسانوں کا پوری طرح جائزہ لینا چاہئے۔

"آپ پہلے پہل کلکتے میں کب تشریف لائے تھے؟" میں نے پوچھا۔ "ظاہر ہے کہ آپ رائے پور میں پیدا ہوئے ورنہ اپنے نام کے ساتھ رائے پوری کیوں لکھتے۔"

"۱۹۱۲ء میں رائے پور میں میری پیدائش ہوئی جہاں میرے والد صاحب ملازم تھے۔" اختر حسین نے مسکرا کر کہا۔ "ویسے ہمارا خاندان بہار سے تعلق رکھتا ہے۔ خیر چھوڑیئے۔ یہ پرانی باتیں ہیں۔"

"یہ تو آپ نے بتایا ہی نہیں کہ کلکتے میں کب آئے۔"

"۱۹۲۸ء میں مجھے کلکتے آنے کا موقع ملا۔ کلکتے کی مجھ پر گہری چھاپ ہے۔ ماہنامہ وشومتر شروع ہوئے تو خیر بہت دن نہیں ہوئے۔ روزنامہ وشومتر کلکتے کا پرانا ہندی اخبار ہے۔ روزانہ وشومتر میں ترقی ہوتے دیر نہ لگی۔ بہت بار سوچا ہے کہ کیا کبھی کلکتے کو چھوڑ بھی سکوں گا یا نہیں۔"

دارجلنگ سے لوٹ کر میں اختر حسین رائے پوری سے ملنے گیا تو انہوں نے تفصیل سے کلکتے میں اپنی زندگی کے حالات سُنائے۔ پچاس پچپن روپے ماہوار سے اُن کی زندگی شروع ہوئی۔ جن میں سے ستر و روپے ماہوار تو مکان کے کرائے میں ہی نکل جاتے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ اکثر انہیں رات کی ڈیوٹی کرنی پڑتی تھی۔ کلکتے میں انہیں چار بار مکان بدلنا پڑا تھا۔ پہلے مکان کے صحن میں کسی رنگریز کی بھٹی چڑھتی تھی اور پتھر کے کوئلے کے دھوئیں کے مارے ان کا ناک میں دم آجاتا تھا۔ اُس کشمیری رنگریز کے تپے ہوئے جسم اور درد بھرے چہرے کو میرے روبرو منقش کرتے ہوئے اختر حسین نے مسکرا کر کہا: "آپ ٹھہرے گیتوں کے رسیا۔ تو لیجئے آپ کو اُس کشمیری گیت کی یاد دلا دوں جو اس کشمیری رنگریز کے ساتھی گایا کرتے تھے۔ اصل گیت کے بول تو یاد نہیں پہلے بول کا مفہوم یوں تھا ——— اے شال، اُبلتے ہوئے پانی سے اب تو نکلے گی۔ پھر کہیں اس قابل ہو گی کہ محبوبہ کی سہیلی بن سکے!" پھر اپنے دُوسرے مکان کا ذکر کرتے ہوئے انہوں نے بتایا کہ اس کا راستہ ایک ایسی سڑک سے ہو کر گزرتا تھا جس کے دونوں طرف چمڑے کے گودام تھے راہگیروں کو کچے چمڑے کے ڈھیروں میں سے ہو کر جانا پڑتا تھا۔ نہ جانے کتنی بیماریوں کے جراثیم اُس گلی میں کلبلایا کرتے تھے۔ انہوں نے مسکرا کر کہا آج بھی معلوم ہوتا ہے کہ کلکتے کی اُس گلی کی بدبو میری ناک میں بسی ہوئی ہے۔ بھینس کے چمڑے کی بو کسی قدر پھرائی ہوئی ہوتی تھی۔ گوہ کے چمڑے سے ایسی بو آتی تھی۔ جیسے سڑے ہوئے کٹھل سے آتی ہے۔"

"لگے ہاتھ تیسرے اور چوتھے مکان کا حال بھی بتا دیجئے۔"

"تیسرے مکان کے بہت بڑے صحن میں دو سرا ہی منظر دیکھنے کو نصیب ہوتا تھا۔ مالک مکان نے یہ قاعدہ بنا رکھا تھا کہ وہ جمعرات کی صبح کو اپنے ہاں آئے ہوئے بھکاریوں کو ایک ایک ادھیلا دے گا۔ میں اپنے برآمدے میں کھڑا ہو کر کوڑھی، لنگڑے لولے اور اندھے بھکاریوں کے جمگھٹے کا جائزہ لیا کرتا تھا۔ سچ پوچھو تو یہ منظر دیکھنے کے بعد کئی کئی روز تک میری طبیعت پریشان رہتی تھی۔ مجھے ان سرمایہ داروں سے نفرت ہوتی گئی۔ سوداں دینے بلکہ ڈھنڈورا پیٹنے کا ڈھنگ رچانے میں بھی اپنا جواب نہ رکھتے تھے۔ اب سنئے چوتھے مکان کا حال۔ اس کے سامنے ایک پنجابی ہوٹل تھا جہاں صبح سے لیکر آدھی رات تک تندور پر روٹیاں پکا کرتی تھیں۔ ہوٹل کا مالک تندور کے سامنے آلتی پالتی مارے بیٹھا اپنے ہاتھوں سے تندور میں روٹیاں لگایا کرتا تھا۔ اُس کا اپنا حساب تھا۔ کٹھوتی سے گندھے ہوئے آٹے کی ایک خاص مقدار نوچ کر پٹڑے پر رکھتا اور بیلن کی مدد سے گول شکل دیتے ہوئے اسے اٹھا لیتا اور دونوں ہاتھوں میں لے کر چو تالہ سے تال کا سماں باندھنے کے بعد تیزی سے تندور کے اندر تھاپ دیتا۔ دھماکے کے ساتھ تندور میں روٹی تھاپنے کے بعد ہر بار وہ اپنے ماتھے کا پسینہ پونچھتا اور پاس رکھی گڑگڑی اٹھا کر ایک کش لگا لیتا۔ اس پنجابی تندور والے کی ڈفلی دن بھر بجتی ہی رہتی تھی۔ بیچ کے وقفوں میں گڑگڑی کی گڑگڑ۔ یہاں میرا یہ حال ہے کہ اس کی ہر تھاپ کے ساتھ گویا میرے دماغ پہ چوٹ پڑتی ہے۔ اُس کے آٹے کے گولے کی تھاپ میرے سر کے اندر طبلے کے چو تالے کی مانند گونج جاتی ہے۔ ہنسیئے گا نہیں میری بات سن کر۔ ابھی میں یہی کہنے کو جی چاہتا ہے کہ روٹی پہ ٹکوں کی کام از اسی طرح گونج اٹھتی ہے جیسے کلاس ہٹلر کی خیبری دماغ کے شہرتے

آسمان میں کڑکتی رہتی ہے :

اس پر واقعی ندیر کا قہقہہ پڑا اور اختر حسین نے بات کا رخ کسی قدر بدل کر میرے اُس مضمون کی تعریف شروع کر دی جو میں نے اُنکی حسب ہدایت "دشومتر" کیلئے جلد کر دیا تھا۔ وہ دیر تک مجھے سمجھاتے رہے کہ لوک گیتوں کے آئینے میں ہمیں بھی کلاس سٹرگل کے فلسفے کو دیکھنا چاہئے اور اپنے عوامی ادب میں عوام کی وہ آواز سننی چاہئے جو اُن کی اقتصادی کشمکش کی یاد دلاتی ہے۔ میرے مضمون کا وہ گیت انہیں خاص طور پر پسند تھا جس میں بنگال کا کسان اپنے اللہ سے شکایت کرتا ہے کہ ندی میں سیلاب آگیا اور بند ٹوٹ جانے سے اُس کی فصل کا اناج بہہ گیا اور اب وہ اپنی بیٹی کیلئے زیور بنوا کر دینے کا وعدہ پورا نہ کر سکے گا۔ اگرچہ اختر حسین ایک ہی سانس میں کہہ گئے تھے کہ محض اللہ سے شکایت کرنا تو کافی نہیں ہے کسان کو چاہئے کہ اپنے ہاتھوں اپنی قسمت بنانے کا پورا طرح تہیہ کر لے ۔

باتوں باتوں میں اختر حسین نے اُس واقعہ کا ذکر کیا جب وہ ایک بار اپنی پتلون کی کریز بچاتے ہوئے اپنے گھر کے سامنے والے ہوٹل میں داخل ہو رہے تھے کہ اتنے میں ایک بھکاری نے ان کا بازو پکڑ لیا۔

"یقین کیجئے میری پٹی بورژوا ذہنیت فوراً بیدار ہو گئی تھی۔" انھوں نے کسی قدر سنجیدہ ہو کر کہنا شروع کیا۔ "میں اُسے فوراً دھکا دے کر پرے کر دینا چاہتا تھا کہ ہاتھ دبے کے دبے رہ گئے۔ اُس کے ہاتھوں کو لقوہ مار گیا تھا۔ اور وہ گھاس کی طرح تھر تھرا رہے تھے۔ اُس کے بازو میں روٹی کے ٹکڑے دبے ہوئے تھے۔ اُس میں اتنی بھی طاقت نہ تھی کہ خود روٹی کھا سکے۔ میں سمجھ گیا کہ وہ صرف یہی چاہتا ہے کہ میں اُس کی روٹی اُسے کھلا دوں۔ کلکتہ جیسے شہر میں جہاں بھکاریوں کی کوئی کمی نہ تھی، میرے لئے یہ پہلا موقع تھا کہ میں اپنے ہاتھ سے اسی بھکاری کو اُسی کی روٹی کھلا سکوں۔ میں اُس کے منہ میں لقمہ دیتا جا رہا تھا اور وہ بھکاری اسے بنا چبائے نگل رہا تھا۔ اُس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ میرے لئے واقعی یہ ایک نیا تجربہ تھا۔ اور ظاہر ہے کہ اس واقعہ کا مجھ پر گہرا اثر ہوا اور میں جی جان سے اس نظام سے نفرت کرنے لگا جس کی بدولت سینکڑوں ہزاروں لوگ بھکاری بننے پر مجبور تھے۔"

اُس روز مجھے اختر حسین کا ایک مضمون پڑھنے کا موقعہ ملا جو کچھ دن پہلے "دشومتر" میں شائع ہوا تھا۔ اس ڈائری نما مضمون میں ایک جگہ انھوں نے لکھا تھا۔

"چار اگست۔ پھر ریل کا سفر۔ میری زندگی ڈرائنگ ماسٹر کی پرکار یا پٹواری کی جریب کی مانند ہو گئی ہے۔ میں سچ مچ سندباد جہازی ہو گیا ہوں۔ لیکن نہ کہیں سونے چاندی کی بارش ہوتی ہے اور میں ان کی تلاش میں اپنی بُری حالت کو بد سے بدتر بناتا جاتا ہوں۔"

اس مضمون میں آگے چل کر اختر حسین نے مُلک کی سماجی حالت کا جائزہ لیتے ہوئے لکھا تھا۔

"میرا جسم ہی بیمار نہیں، میری روح بھی بیمار ہے۔ یہ جگہ گوبر کا ڈھیر ہے جس میں تعلیم کی روشنی سے کیڑوں کی طرح لاتعداد انسان کلبلا رہے ہیں۔ ان کے بیچ میں میری روح جگنو کی طرح کبھی جلتی ہے کبھی بجھ جاتی ہے۔ میں یہاں سے بھاگ جانا چاہتا ہوں۔ لیکن دنیا میرے لئے یا تو بہت تنگ ہے یا اتنی بڑی کہ اُس کی کشمکش میں گھن کی طرح میں پسا جا رہا ہوں۔ کچھ دنوں سے پھر دل کی دھڑکن شروع ہو گئی ہے۔ کل پڑھتے پڑھتے یک دم میرے ہاتھ تھرانے لگے، دل پنکھے کی طرح گھومنے لگا۔ کان بھائیں بھائیں کرنے لگے، چہرہ خون کے دباؤ کی تیزی سے سُرخ ہو گیا۔ میں نے سانس روک لیا کہ کہیں اس دھڑکن میں رک ہی نہ جائے۔ ایسا دورہ کبھی نہ پڑا تھا۔ پھر ردعمل سے ہاتھ پاؤں نڈھال ہو گئے۔ اندھیرا اور سناٹا۔"

اختر حسین ایک ضروری کام سے باہر چلے گئے تھے۔ میرے ہاتھ میں اُن کا مضمون تھا۔ انھوں نے لکھا تھا۔

"کیا انسان روٹی کمانے اور کھانے والے حیوان کے سوا کچھ نہیں؟ کیا یہی زندگی کا مفہوم اور مقصد ہے؟ کیا جو ان لفظوں کا معنی مفہوم ہے؟ اگر کام کرنے اور جینے میں کوئی فرق نہیں تو میں ہرگز کام نہ کروں گا۔ کیوں نہ پرندوں کے پیچھے [illegible]

پکارہ ہوں اور اسی طرح مر جاؤں۔ دنیا کو میری زندگی کی ضرورت نہیں تو مجھے بھی اس دنیا کی ایسی کیا ضرورت ہے"۔

میں سمجھ گیا کہ اختر حسین کے یہ جذبات ان کی دل کی ہمدردی کی ہی پیداوار ہیں۔ ان کا مضمون پڑھتے پڑھتے ایک جگہ میری نظر جم گئی:

"کون سی وہ تین چیزیں ہیں جو مجھے خدا کے اچھے ٹیسٹ کا قائل بنانے لگی ہیں: .... سمندر، عورت اور تماشہ! ایک وسیع ہے۔ دوسری الجھی پہیلی، تیسرے میں پنجابی خوانچے والے کے بارہ ذائقوں کا مزہ ہے..... روپے پر حکمرانوں کی مہر کیوں دی جاتی ہے؟ کیوں نہیں ہوبہو پروردگار کی تصویر اس پر نقش کر دی جاتی! ...... چھتیسوں راگ راگنیوں کی شیرینی روپے کی جھنکار میں سمٹ آئی ہے۔"

اختر حسین لوٹ کر آئے تو میں نے کہا: "لیجئے یہاں بیٹھے بیٹھے آپ کا یہ مضمون تو میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک پڑھ گیا۔ کہیں کہیں آپ نے خوب چوٹ کی ہے"۔

ایک زور کا قہقہہ پڑا۔ ذرا سنبھل کر اختر حسین بولے: "اب ذرا چائے ولئے کا انتظام کیا جائے"۔

چائے آئی تو ہماری گیان گوشٹھی پوری طرح جم گئی۔ انہی دنوں وشال بھارت کے ایڈیٹر پنڈت بنارسی داس چترویدی نے "[illegible]" کے عنوان سے ایک مضمون شائع کرایا تھا جس میں ادب سے متعلق کچھ بنیادی مسائل اٹھائے گئے تھے۔ اختر صاحب نے اس مضمون کا اپنے مضمون "ادب اور انقلاب" سے موازنہ کرتے ہوئے بتایا کہ جہاں پنڈت جی نے اپنے مضمون میں محض حقیقت پسندی کے حق میں آواز اٹھائی ہے وہاں "ادب اور انقلاب" میں انقلابی حقیقت پسندی پر زور دیا گیا ہے۔

"ٹراٹسکی نے کہا ہے کہ آرٹ محض آئینہ ہی نہیں بلکہ وہ ایک ہتھوڑا بھی ہے!" اختر حسین نے یوں اپنا نظریہ پیش کیا۔ "محض کسان کا دکھڑا رونے اور زمیندار کے ظلم و ستم پر دیدے نکالنے سے کچھ حاصل نہ ہوگا۔ مجھ سے کوئی پوچھے کہ مستقبل کس کا ہے تو میں تو ڈنکے کی چوٹ سے یہی کہوں گا کہ مستقبل کسانوں اور مزدوروں کا ہے۔ مستقبل ان ادیبوں کا ہے جو کسانوں اور مزدوروں کو جگانے کے لئے قدم بڑھاتے ہیں۔ اب ادب کو محض فوٹوگرافی سمجھنے کی غلطی نہیں کی جا سکتی۔ یہ بھی ایک ہتھیار ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ دبے پسے لٹے پٹے لوگوں کو بتایا جائے کہ لوٹ کھسوٹ کیوں ہوتی ہے اور اسے کس طرح ختم کیا جا سکتا ہے۔ یہ کہنا کافی نہیں ہے کہ لوٹ کھسوٹ کیسے ہوتی ہے۔ حالانکہ ضرورت اس کی بھی ہے"۔

میں نے کہا: "آپ کا مطلب یہ ہے کہ جب ہم کسانوں اور مزدوروں کے لئے لکھنا چاہتے ہیں تو انہی سے ان کی دکھ بھری کہانی کہنا کتنا بے معنی ہے"۔

"آپ نے میرا نکتہ پا لیا۔ کسانوں اور مزدوروں کو تو ہمیں یہ بتلانا ہے کہ یہ کانٹا کس طرح نکالا جا سکتا ہے"۔

اس کے بعد بات کا رخ بدل کر اختر حسین نے بتانا شروع کیا کہ کلکتے میں رہتے رہتے اُن کا من بالکل اوب گیا ہے اور وہ اپنی زندگی کسی نئے ڈھب پر چلانا چاہتے ہیں۔ میں نے ہنس کر کہا: "کچھ مجھے بھی بتائیے نا!"

"آپ ٹھیک کام کر رہے ہیں"۔ انہوں نے ہنس کر کہا۔ "آپ کو میں بھلا کیا راستہ دکھاؤں گا۔ ہاں ایک بار پھر یہ ضرور عرض کروں گا کہ لوک گیتوں میں حسن و عشق کی آواز سننے تک ہی اپنی پوری طاقت نہ لگا دیجئے۔ میرا مطلب ہے کہ کلاس سٹرگل والی بات قدم قدم پہ یاد رکھئے۔ اور میرا تو خیال ہے کہ آپ کا کام اسی صورت میں مفید ثابت ہو سکتا ہے"۔

"کہیں آپ یہ تو نہیں سمجھتے کہ میں خواہ مخواہ مارا مارا پھرتا ہوں ان گیتوں کی تلاش میں"۔

"لوک گیتوں کے لئے تو میرا سر جھک جاتا ہے۔ اور جو شخص مختلف زبانوں کے لوک گیتوں کو ایک ساتھ ہمارے سامنے لاتا ہے اور ہمیں ایشیا کے گیتوں کی رنگا رنگی کے باوجود ان گیتوں کی ہم آہنگی سے روشناس کراتا ہے اس کا ہمیں ممنون ہونا ہوگا"۔

[illegible] کے ہاں سے شکریہ ادا کر کے میں چلا آیا۔

اس کے بعد کلکتے میں اختر حسین سے ملاقات نہ ہو سکی۔ مجھے یہ پتہ چلتے دیر نہ لگی کہ اختر صاحب تو وشوامتر کی نوکری چھوڑی اور اعلیٰ تعلیم کے سلسلے میں علی گڑھ یونیورسٹی میں چلے گئے۔

میں بھی کلکتے سے کشمیر جا پہنچا۔ اور کشمیر میں تین مہینے گزارنے کے بعد میں نے پشتو لوک گیتوں کے سلسلے میں پشاور جا کر دم لیا۔ اس بیچ میں اختر حسین کی کوئی خبر نہ ملی۔ جب بھی کبھی کوئی "کلاس سٹرگل" کے موضوع والا گیت ملتا، اختر صاحب کی یاد ہو آتی۔ آخر میں نے "وشال بھارت" کے اسسٹنٹ ایڈیٹر برج موہن ورما کو لکھا کہ اختر صاحب کے بارے میں پوچھ تاچھ کی تو ورما جی نے مجھے اس خط کی کچھ سطریں لکھ بھیجیں جو اختر صاحب نے ان کے نام ۱۵ فروری ۱۹۳۵ء کو لکھا تھا: "پچھلے چار مہینے کیسے بیتے، اس کا حال سنئے۔ اکتوبر میں علی گڑھ یونیورسٹی کے پرووائس چانسلر نے کہا کہ آپ خوشی سے بوریا بستر اٹھا لیجیے گا۔ تو نکالے جائیے گا! اچھا یہی سمجھا گیا کہ ابھی اخباروں کی جیب پبلسٹی سے بچا جائے۔ کانگریس کا میلہ لگنے والا تھا۔ ہم بھی خود اپنے گشتی نامہ نگار بنے وہاں جا پہنچے۔ اگر حضرت دل .... ہائے ورما جی، اس دل نے کہیں کا نہ رکھا! کمبخت کسی پہ آتا نہیں، یوں ہی دھڑکا کرتا ہے! بس صاحب ہم وہاں قریب قریب لیٹے ہو چکے تھے کہ ڈاکٹر انصاری تک پہنچ ہوئی۔ نسخہ ملا مگر اس تیر کا کیا تھا کہ دو مہینے چپ چاپ پڑے رہے۔ نومبر میں ایکس رے ہوا، انجکشن دئیے گئے۔ اس روگ سے شاید بہت دنوں کے لئے چھٹی ملی۔"

ورما جی کے خط سے مجھے یہ بھی پتہ چل گیا کہ علی گڑھ یونیورسٹی سے نکالے جانے کے بعد اختر حسین کو کچھ دن دلّی میں فاقہ مستی میں گزارنے پڑے اور پھر اسی پریشانی میں وہ لاہور جا پہنچے۔ لاہور سے انہوں نے ورما جی کو خط لکھا:

پیارے ورما جی!

آپ کو یاد ہوگا کہ ہندی سنسار میں اختر نامی ایک آوارہ [مدتوں] کبھی رہتا تھا۔ اب وہ پٹواری کی جریب کی مانند زمین ناپتا لاہور چلا آیا ہے۔ علی گڑھ، بمبئی، دلّی .... کہیں بھی اسے آرام نہ ملا۔ اس بیچ میں برابر بیمار اور بیکار رہا۔ تنگ آکر ہندی سے ناطہ توڑ رہا ہے۔ ان دنوں "اردو" اور انگا باد کا کچھ کام کرنے لگا ہے۔ شاید روٹیوں کا کچھ سامان ہو جائے۔ کہیں مول چند جی ملیں یا بنارسی داس جی پوچھیں تو میری بندگی کہہ کر یہ شعر سنا دیجئے حالانکہ دونوں مہانوبھاووں کو حسن یا عشق سے کوئی واسطہ نہیں۔

کیا حسن نے سمجھا ہے کیا عشق نے جانا ہے
ہم خاک نشینوں کی ٹھوکر میں زمانہ ہے

اگر آپ اب بھی میرا مول اتنا سمجھتے ہیں کہ وشال بھارت مفت بھیج دیا کریں تو امیر منزل علی گڑھ کا پتہ بدل کر لاہور کا پتہ کر دیجئے۔ بہت دنوں تک یہیں رہنے کا ارادہ ہے۔

امید ہے آپ سب لوگ خیریت سے ہوں گے۔ جو یاد کرتے ہوں انکو دھنیہ باد، جو بھول گئے ہوں انکا بھی شکریہ۔

آپ کا

اختر حسین رائے پوری

اس کے بعد ایک عرصے تک کسی دوست کے خط سے بھی اختر حسین کے بارے میں کچھ معلوم نہ ہو سکا۔ بعد ازاں معلوم ہوا کہ وہ مستقل طور سے انجمن ترقی اردو کے بلاوے پر حیدرآباد چلے گئے ہیں۔ ادھر میری لمبی مسافرت قائم رہی۔ مئی ۱۹۳۶ء میں جب میں کلکتے میں تھا اور جنوبی ہندوستان کو جاتا میرے پیش نظر تھی۔ میں چاہتا تھا کہ حیدرآباد جا کر اختر حسین سے بھی ملاقات کروں گا۔ لیکن جب مجھے پتہ چلا کہ اختر حسین تو نظام سرکار کا وظیفہ لے کر پیرس چلے گئے ہیں۔ اور اب وہاں سے ڈی لٹ لیکر ہی واپس آئیں گے تو جہاں مجھے یک گونہ خوشی ہوئی، وہاں یہ سوچ کر افسوس بھی ہوا کہ اب نہ جانے کب اپنے اس دوست سے ملاقات ہوگی جس نے مجھے واقعی پہلی بار "کلاس سٹرگل" کے نظریئے سے لوک گیتوں کے پس منظر کو سمجھنے

ستین کی تھی اور یوں مجھے عوامی ادب کے ترقی پسند عناصر کا ٹھیک ٹھیک اتہ پتہ چلانے کی طرف راغب کیا تھا۔

۱۹۴۰ء کے آخری دنوں میں، جب میں لنکا سے لوٹ کر لاہور پہنچا تو مجھے ایک دن ایک دوکان میں ایک کتاب دیکھنے کا موقع ملا ...... گورکی
آپ بیتی حصہ اول، میرا بچپن، مترجمہ ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری ڈی لٹ (پیرس)۔ مجھے یہ جان کر بیحد خوشی ہوئی کہ میرا ایک دوست ترقی کرتے کرتے
ی لٹ ہوگیا اور اب مجھے بھی اسے ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کے نام سے یاد کرنا ہوگا۔

کسی نے یہ بھی بتایا کہ اختر حسین کے افسانوں کا مجموعہ "محبت و نفرت" دلی سے شائع ہو چکا ہے۔ لیکن یہ کتاب مجھے کہیں نظر نہ آئی۔

جنوری ۱۹۴۱ء میں مجھے لاہور سے دلی جانے کا اتفاق ہوا تو اختر حسین سے ملاقات ہوگئی۔ پیرس سے لوٹ کر وہ آل انڈیا ریڈیو میں ملازم ہوگئے تھے۔
وہ بہت خوش نظر آتے تھے۔ اگرچہ کلکتے کی ملاقاتوں کا ذکر کرتے ہوئے وہ اب بھی اپنے چہرے پر ایک خاص طرح کی کیفیت طاری کر لیتے تھے جو اُن کی موجودہ
آسودگی سے بہت کم میل کھاتی تھی۔

اُنہوں نے مجھے کھانے پر بلایا، اپنی بیوی سے میرا تعارف کرایا۔ یہ پتہ چلنے پر کہ بیگم اختر حسین ایک بہت بڑے پولیس افسر کی "دختر بلند اختر" ہیں، میں
زیرِ لب مسکرایا۔ لیکن خود اختر حسین صرف مسکرانے پر اکتفا نہ کر سکے۔ انہوں نے بہت بڑا قہقہہ لگایا اور کہا: "وہ مضمون تو آپ نے بھی پڑھا ہوگا جو پنڈت
بنارسی داس چترویدی نے بندہ کے بارے میں لکھ کر وشال بھارت میں شائع کرایا ہے۔"

اتفاق سے وہ مضمون میری نظر سے نہیں گزرا تھا۔ وہ اندر سے اس مضمون کا کٹنگ نکال لائے اور لال پنسل کے نشان والی کچھ سطروں کی طرف اشارہ
کرتے ہوئے بولے: "پہلے یہاں سے پڑھنا شروع کیجیے۔"

میں نے بلند آواز سے پڑھنا شروع کیا۔

"ہمارے پاٹھکوں نے کالپی کا نام سنا ہوگا۔ اُس کالپی کا جو تین مہاپرشوں کی جنم بھومی ہونے کے کارن پرسدھ ہے۔ ایک سورگیہ پنڈت ہمبرن مدرما
دوسرے امیر علی ٹھگ، اور تیسرے لالہ مول چند جی اگروال (دشومتر والے) ہاں تو اُسی کالپی کے ایک پولیس سپرنٹنڈنٹ کے ہاں ڈاکہ پڑا۔ کیسی ساتھ
سیدی کو اس کی خبر بھی نہیں دی گئی۔ کوئی برات میں جا بھی کیسے سکتا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کتنے ہی ساتھی سنگیوں نے یہ خبر پھیلا دی — ہم تو پہلے ہی سے کہتے
تھے کہ اختر سی۔ آئی۔ ڈی کا آدمی ہے، نہیں تو پولیس افسر کے ہاں کیوں اُس کی شادی ہوتی!"

خیر دوپہر کی دعوت کا خوب مزا رہا۔ ہم لوگ دیر تک قہقہے لگاتے رہے۔ کلکتے کی ملاقاتوں کا ذکر میں بار بار چھیڑ دیتا۔ بار بار اختر صاحب سے "کلاس سٹرگل" کی
تھیوری پر مزید روشنی ڈالنے کی درخواست کرتا۔ بیگم اختر حسین تو حیران تھیں کہ "ہم لوگ کیسی بہکی بہکی سی باتیں کرنے لگتے ہیں۔" ویسے تھیں تو ننھے کو کھلانے سے
ہی فرصت نہ تھی۔ ایک آسودہ حال گھر کے ڈرائنگ روم میں بیٹھا ہوا ایک بالوں والا ایک ڈھیل مہمان اپنے میزبان سے اتنی بے تکلفی برتتے، یہ بات
شاید بیگم اختر حسین کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ اختر صاحب نے بیگم اختر کو مرعوب کرنے کیلئے بتایا کہ جو شخص آج ان کے ہاں مہمان کے طور پر موجود ہے، اُس نے
اپنے پیروں سے ہندوستان کی دھرتی ناپ رکھی ہے اور بھی بہت سے تعریفی جملے وہ ایک سانس میں کہہ گئے۔ سچ پوچھیے تو یہ اپنی تعریف سُن کر مجھے ذرا خوشی
نہ ہوئی۔ اگرچہ میں بہت پھٹے حال تو نہ تھا۔ لیکن اپنے آسودہ حال دوست کے سجے سنورے ڈرائنگ روم میں مجھے اپنا لباس واقعی بہت بدزیب اور
میلا نظر آنے لگا۔ کبھی میں اپنے دوست کی طرف دیکھتا اور کبھی اپنی طرف۔ کلاس سٹرگل کی تھیوری اپنی تمام تر شدت سے میرے سامنے اجاگر ہوگئی
تھی۔ بار بار میرے ذہن میں یہ سوال اٹھ رہا تھا کہ کیا اختر صاحب اور میں ایک ہی کلاس سے تعلق رکھتے ہیں۔ اپنے دوست سے یہ سوال پوچھنے کی نوبت
نہ ہوئی کیونکہ وہ تو بہت دیر سے گورکی کی "آپ بیتی" کی تعریف کئے جا رہا تھا جس کا ترجمہ اس نے بڑی خوبی سے اردو ادب کی نذر کیا تھا۔ میرے
دوست کی بات میں ایک طرح کا رئیسانہ تپاک موجود تھا۔ لیکن جب بھی میری نظر اپنے لباس کی طرف جاتی، جب بھی مجھے اپنی بے آسودگی کا خیال آتا، مجھے
یہ محسوس ہونے لگتا کہ اختر صاحب تو وضعداری میں آج بہت کمال کر رہے ہیں۔ اس وضعداری میں اگر کسی چیز کی کھٹک رہی تھی تو وہ تھی اپنائیت کی

کے حصے پر کام کرتے ہیں۔ ان کی رہائش پاک ریڈیو وغیرہ ماڈل باغ میں تھی۔ میں اس مکان میں پہلی بار ان سے ملنے گیا تو دیکھا کہ ان کا ڈرائنگ روم پہلے سے بھی زیادہ سجا ہوا ہے۔

میں نے ان سے شکایت کی کہ ادھر انہوں نے لکھنا کیوں کم کر دیا ہے۔ وہ دیر تک سرکاری فائلوں سے ہی فرصت نہ ملنے کا بکھان کرتے رہے۔ میں نے بات کا رخ بدل کر کہا گورکی کی آپ بیتی کے تینوں حصے میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک پڑھ گیا۔ آپ نے ترجمہ میں اصل کا حق ادا کیا ہے۔ قدم قدم پر قاری یہ کہنے پر مجبور ہوتا ہے۔ یہی نہیں کہ زبان آسان رکھی گئی ہے۔ اس کی سب سے بڑی خوبی ہے بول چال کی زبان کا انداز۔ کاش آپ نے اپنے طبع زاد افسانوں میں بھی اسی زبان کو اپنایا ہوتا:

اس پر اختر حسین نے ہنس کر کہا: "اچھا تو آج آپ نے میری ٹانگ کھینچنے کی یہ ترکیب نکالی ہے!"

لیکن جب بیگم اختر حسین نے مجھ سے اتفاق رائے کا اظہار کیا تو میں نے سنبھل کر کہا: "اب فرمائیے اختر صاحب! خیر آپ لکھئے سہی، چاہے کٹھن زبان میں ہی کیوں نہ لکھیں۔ حالانکہ آپ کی زبان کا بھی ایک خاص رکھ رکھاؤ ہے۔ اس میں ایک خاص ٹھہراؤ بھی ہے۔"

"آپ تو نقاد بنتے جا رہے ہیں!"

پھر بات کا رخ اس ٹی سیٹ کی خوبصورتی کی طرف گھوم گیا۔ اختر حسین دیر تک اس ٹی سیٹ کی تعریف کرتے رہے۔ لیکن بہت جلد اختر حسین نے گورکی کا ذکر کرتے ہوئے کہا: "گورکی کی آپ بیتی حصہ اول کے مقدمے میں میں نے یہ بات زور دے کر لکھی ہے کہ گورکی کے ادبی شاہکاروں کا بیشتر حصہ دیس سے باہر لکھا گیا۔ جب میں یورپ میں تھا تو مجھے اٹلی کے جنت نظیر جزیرہ کاپری میں جانے کا فخر حاصل ہوا تھا۔ نیپلس کی بندرگاہ سے اسٹیمر پر سوار ہو کر میں گھنٹے بھر میں نیلے سمندر کے بیچوں بیچ پہاڑیوں کے دامن میں آباد ہرے بھرے اس ٹاپو میں جا پہنچا تھا۔ میں نے اپنی آنکھوں سے وہ مکان دیکھا جہاں بیٹھ کر گورکی نے اپنی امر کہانی لکھی تھی۔ سچ تو یہ ہے کہ روس سے دور بیٹھ کر گورکی کہیں زیادہ توازن سے کام لے سکا، کہیں زیادہ وسیع النظری سے اپنے خیالات اور مشاہدات کو سمیٹ سکا:

"ایسی ہی کوئی چیز آپ بھی تو لکھیں:"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ دفتر کی فائلوں سے کون چھٹکارا دلائے گا؟ یہی کیا کم غنیمت ہے کہ کبھی کبھار جب کسی میگزین کے ایڈیٹر کا تقاضا حد سے بڑھ جاتا ہے تو طبیعت پر زور ڈال کر کچھ نہ کچھ قلمبند کرنا پڑتا ہے۔ ویسے میں جو کچھ لکھتا ہوں اس میں اپنے طور پر کلاسیکل قسم کی چیز پیش کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔"

"موضوع کی نوعیت اور مصنف کی شخصیت دو الگ الگ چیزیں تو شاید آپ بھی نہیں مانتے۔"

"یہی تو رونا ہے صاحب! اب آپ میری بات سمجھے۔ آپ بھی تو آخر نوکری کے چکر میں آ پھنسے۔ اگرچہ آپ کی نوکری قدرے آسان ہے۔ آپ کی میز پر شاید اتنی فائلوں کا ڈھیر نہیں لگتا ہوگا۔ اب آپ ہی بتائیے کہ جب مصنف کی شخصیت دفتر کی فائلوں کے ڈھیر کے نیچے دبی پڑی ہو تو شاید اپنے موضوع کے ساتھ کیسے انصاف کر سکتا ہے۔"

جس دفتر میں مجھے ان دنوں ملازمت کرنی پڑی وہ ایک طرح کا نیم سرکاری دفتر تھا اور میرے لکھنے پر کسی طرح کی پابندی نہ تھی۔ پھر بھی میں نے یہ طے کر لیا تھا کہ جس روز میرے لکھنے میں یہ نوکری حائل ہوگی اسی روز میں اس سے استعفیٰ دے دوں گا۔ یہ بات اختر صاحب سے بھی پوشیدہ نہ تھی کہ زندگی کی کشمکش کا مقابلہ کرنے کے لئے ہی میں نے مجبور و لاچار ہو کر اس دفتر میں نوکری کی ہے۔

جب ملک کی تقسیم کا معاملہ سامنے آیا تو میرا خیال تھا کہ اختر حسین تو ہر صورت میں ہندوستان میں رہنے کو ترجیح دیں گے۔ لیکن میری حیرت کی کوئی حد نہ رہی جب مجھے معلوم ہوا کہ انہوں نے پاکستان میں جا کر رہنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ خیر اس میں ہم بھلا کیا کر سکتے تھے۔ یہ ان کا اپنا انتخاب تھا، ان کا اپنا فیصلہ تھا۔

ملک کی تقسیم عمل میں آئی اور اختر حسین مجھ سے ملے بغیر پاکستان چلے گئے۔ میں نے سمجھ لیا کہ اب شاید اس زندگی میں کبھی ان کا دیدار حاصل نہیں ہوگا۔ اختر حسین کے پاکستان چلے جانے پر مجھے حیرت نہ ہوئی البتہ وہ ان جا کر لکھنے کی رفتار تیز کر سکتے۔ لیکن اس کا نتیجہ تو در اصل اس توقع کے برعکس نکلا۔ پاکستان میں شائع ہونے والے رسائل میں اختر حسین کا چہرہ کہیں نظر آ سکے۔ اس کے لئے میں بری طرح ترس گیا۔ بار بار نقوش کے بھاری بھرکم شماروں میں اپنے دوست کا چہرہ اور اس کی تازہ ترین تحریر کا کوئی نمونہ ڈھونڈنے کا جتن کیا۔ لیکن جب کہیں اختر حسین کا ذکر تک نہ ملا دشوار ہو گیا تو میں سمجھ گیا کہ اب اختر حسین نے لکھنے کی طرف سے یکدم سنیاس لے لیا ہے اور اب یہ سوچنا بیکار ہے کہ وہ پھر سے قلم اٹھا کر لکھنے لگیں گے کئی بار دل میں یہ سوال پیدا ہوا کہ انہوں نے لکھنا کیوں چھوڑ دیا۔ لیکن لاکھ سوچنے پر بھی اس کا جواب نہ مل سکا۔

کئی سال کا عرصہ بیت گیا۔ اتنا ضرور پتہ چلتا رہا کہ اختر صاحب پاکستان کی ایجوکیشن منسٹری میں کام کر رہے ہیں لیکن نہ کبھی میں انہیں خط لکھ سکا۔ نہ کبھی ان کا خط آیا۔ میں انہیں یہ بھی تو نہ لکھ سکا کہ میں بھی ادھر کئی برسوں سے ہندسرکار کی پبلیکیشنز ڈویژن میں ہندی آج کل کی ادارت کے فرائض سرانجام دے رہا ہوں اور میں تو بدستور قلم سے کام لئے جا رہا ہوں۔

۲۳ ستمبر ۱۹۵۲ء کی بات ہے۔ میں اپنے دفتر کے کمرے میں بیٹھا کام کر رہا تھا۔ اچانک میری نگاہ اوپر اٹھی تو دیکھا کہ زینے سے ایک شخص میرے کمرے میں داخل ہوا۔ وہ شخص میری طرف بڑھا آ رہا تھا۔ جانی پہچانی صورت۔ میں کرسی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس شخص کی طرف بڑھا۔ ہم بغلگیر ہو کر ملے۔ یہ اختر حسین ہی تو تھے۔

"کب تشریف لائے اختر صاحب!" میں نے جھٹ پوچھ لیا۔

"دیکھو بھئی میں اب زیادہ دیر نہیں رُک سکتا۔ شام کو انڈیا کافی ہاؤس میں آئیے گا۔"

"ایسی بھی کیا جلدی ہے!" میں نے کہا۔

"بس ذرا اشفاق صاحب سے ملنے آیا تھا۔" انہوں نے کھڑے کھڑے جواب دیا۔ "سوچا آپ کو اپنے آنے کی اطلاع کرتا جاؤں۔ شام کو کافی ہاؤس میں نرولا بھی آئے گا۔ آپ بھی آئیے گا۔"

وہ جس طرح آئے تھے اُسی طرح جلدی جلدی چلے گئے۔ مجھے اب تک یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہی اختر حسین تھے۔

شام کو نئی دہلی کے انڈیا کافی ہاؤس کی بالکونی میں پہنچا تو اختر حسین اور شمشیر سنگھ نرولا پہلے سے میرا انتظار کر رہے تھے۔ نئی پرانی بہت سی باتیں ہوئیں اختر صاحب کے چہرے پر بار بار وہی رنگ جھلک اٹھتا تھا جو ہم ان کے چہرے پر آج سے برسوں پہلے دیکھا کرتے تھے۔ معلوم ہوتا تھا کہ انہوں نے اپنے اندر شباب کا رنگ ابھی تک بچا رکھا ہے۔ آواز میں وہی ٹنکار۔ آنکھوں میں وہی تبسم، چہرے پر وہی دلہن کی سی لاج کا احساس۔ لیکن ان کی باتوں میں بڑی گہرائی آ گئی تھی۔

اتفاق سے بالکونی کے ایک کونے میں مجھے اپنا ایک دوست نظر آ گیا۔ میں نے اُسے پاس بلا کر اختر صاحب سے اس کا تعارف کراتے ہوئے کہا۔ "یہ بھی آپ کے مداحوں میں سے ہیں۔"

"بہت خوب!" اختر صاحب نے قہقہہ لگایا۔

"میرے دوست نے اپنی بغل سے ایک کتاب نکال کر اختر صاحب کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "اس پر اپنا آٹوگراف ہی دے دیجئے۔"

یہ "پیام شباب" کی جلد تھی جسے اتفاق سے میرا دوست اُسی روز بازار سے خرید کر لایا تھا۔ اختر حسین نے پیام شباب پر چند الفاظ لکھ دیئے۔ کافی آئی تو اختر صاحب دیر تک گرم کافی کی تعریف کرتے رہے۔ جیسے ان میں بھی تا حتی نذر الاسلام کی کسی ہنگامی نظم کا ذائقہ گھلا ہوا ہو۔ "پیام شباب میں نذر الاسلام کی شاعری آپ کو کیسی لگی؟" انہوں نے میرے دوست سے جھٹ پوچھ لیا۔ اس کے جواب میں میرا دوست صرف مسکرا کر رہ گیا۔

کافی ہاؤس سے نکل کر میں اور شہزادلا اختر صاحب کو کنسٹی ٹیوشن کلب تک چھوڑنے گئے۔ راستے بھر مجھے بار بار اختر حسین سے یہ پوچھنے کا خیال آتا رہا کہ انہوں نے لکھنا کیوں چھوڑ رکھا ہے۔ لیکن یہ سوچ کر اختر حسین یہاں ہمارے بیچ ایک مہمان کی حیثیت رکھتے ہیں اور کہیں ان کے دل پر ٹھیس نہ لگے میں خاموش رہا۔

آخر مجھ سے نہ رہا گیا میں کہہ اٹھا: "آپ کا یہ پانڈو ؤں کا سا بن باس کا زمانہ کب ختم ہو گا؟"

"بہت خوب!" اختر حسین نے اندھیرے میں قہقہہ لگایا۔ "یہ تشبیہ بھی خوب رہی۔ لیکن صاحب آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟"

شہزادلا نے بھی قہقہہ لگایا اور پھر ذرا سنبھل کر کہا "ستیارتھی تو یونہی کچھ نہ کچھ بول اٹھتا ہے۔"

"یوں وضعداری کو ہاتھ سے نہ جانے دو شہزادلا!" اختر صاحب نے شہزادلا کو آڑے ہاتھوں لیا۔ "ستیارتھی ہم دونوں سے سینئر ہے۔"

لیکن شہزادلا کب چپ رہنے والا تھا۔ بولا "بندگی بے عمل است نہ بسال!"

اندھیرے میں اختر صاحب کا چہرہ نظر نہ آ سکتا تھا۔ وہ کچھ نہ بولے۔ لیکن مجھے محسوس ہوتے دیر نہ لگی کہ ایک ادیب کو دوسرے ادیب پر یوں چھینٹے دیکھ کر انہیں ذرا بھی خوشی نہ ہوئی۔ جب میں نے ان سے وداع لی تو دبے الفاظ میں اتنا ضرور کہا "دیکھئے اختر صاحب کتب پبلشرز کے لئے میں نئے ادب کے نئے معیار کے سلسلہ میں آپ پر کچھ لکھنا چاہتا تھا۔ لیکن اتنے میں وہ سلسلہ ہی بند کر دیا گیا۔"

"تم جیسی بھی پبلشر کی طرف دیکھو گے ستیارتھی اُسے تو اپنی دوکان بڑھانی ہی پڑے گی۔" شہزادلا نے فقرہ کسا۔ اور پھر یہ پہلی مرتبہ تو نہیں ہوا۔

اختر صاحب واپس چلے گئے۔ بہت دن تک پھر ان کی کوئی خبر نہ ملی کہیں کسی میگزین میں بھی ان کے بارے میں یا ان کے قلم کا کوئی شاہکار بھی دیکھنے کو نہ ملا۔

اچانک ایک روز نقوش کا افسانہ نمبر (جنوری ۱۹۵۶) موصول ہوا تو میں نے بڑے اشتیاق سے اس میں اختر حسین رائے پوری کا کوئی تازہ افسانہ ڈھونڈنے کا جتن کیا۔ ان کا افسانہ اس افسانہ نمبر میں کہیں نظر نہ آیا۔ ہاں اس افسانہ نمبر کے آخر میں ایک بحث چھپی ہوئی دیکھی ——— "اردو افسانے میں روایت اور تجربے" جس میں سید وقار عظیم، ڈاکٹر عبادت بریلوی، سعادت حسن منٹو، احمد ندیم قاسمی، ہاجرہ مسرور، انتظار حسین، ممتاز شیریں اور شوکت تھانوی نے حصہ لیا تھا۔ اس ادبی بحث کو میں بڑے غور سے پڑھنے لگا۔ میں چاہتا تھا کہ دیکھوں تو سہی کہ اختر حسین رائے پوری کے بارے میں ان نئے ادیبوں کی کیا رائے ہے۔ ایک جگہ میری نظر جم گئی:

ممتاز شیریں: اختر حسین رائے پوری کس دور میں آتے ہیں؟

وقار عظیم: وہ عبوری دور سے تعلق رکھتے ہیں۔

عبادت بریلوی: افسانہ نگاری کی حیثیت سے ان کا کوئی بڑا مرتبہ نہیں۔ ان کے بیشتر افسانے یا تو ترجمے ہیں یا مغربی افسانوں سے ماخوذ ہیں ——— زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ انہوں نے اپنے افسانوں میں ایک رومانی سی فضا پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن یہ کوئی نئی بات نہیں۔ اس سے قبل بھی ایسا ہوتا رہا ہے۔ انہوں نے اس میں کوئی جدت نہیں کی۔

پچھلے دنوں سہیل عظیم آبادی سے ملاقات ہوئی تو پتہ چلا کہ اختر حسین رائے پوری دلی آئے ہوئے ہیں۔ یہ خبر صحیح تھی۔ اختر صاحب دلی تشریف لائے لیکن وہ مجھ سے ملے بغیر ہی پاکستان واپس چلے گئے۔ حالانکہ وہ دوسرے کئی دوستوں سے ملتے گئے۔ میں نے بہت کوشش کی کہ ان سے ملوں لیکن ان کے پاس وقت کم تھا۔ اور انہیں ڈھونڈنا ناممکن تھا۔

اگر ان سے ملاقات ہو جاتی تو میں ان سے یہی عرض کرتا کہ اختر بھائی نقوش میں آپ کے بارے میں جو کچھ لکھا گیا ہے۔ اس سے میں سو آنے متفق تو ہرگز نہیں ہوں۔ میں ان سے کہتا کہ آپ نے ہمارے ادب کی بہت خدمت کی ہے لیکن پھر سے اپنا قلم نکالئے۔ کے گے اگر پھر سے کچھ لکھئے۔ اپنے ماضی کو اپنے ساتھ لے کر چلئے [illegible] کیجئے اپنے جوہر قابل کو عوامی ادب کی تعمیر میں لگائیے۔ میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اگر کہیں مجھے مل گیا تو اختر بھائی سے یہی بات کہوں گا [illegible] افسانہ نگاری [illegible] صاف صاف [illegible] ادیب کب تک یوں [illegible] سکتا ہے۔ اختر صاحب! [illegible] ضروری ہے۔

دبی دبی سی رہتی تھیں۔ ان کا سارا بچپن تو بیماریوں ہی میں کٹا ہے پرہیز کرتے کرتے تھک کر بچا سے خود بسکٹ چرا کر کھانے لگے۔ میں نے ایک دن اماں کو یہ بات بتا دی۔ بس پھر تو میری شامت ہی آگئی۔ خود تو ان میں سکت تھی نہیں، چھوٹی بہن رقیہ کو ہاکر اسی دن شام کو جتنی بھی میری گڑیا الماری کے اوپر رکھی تھیں سب کو اتروا کے ایک ایک کی ٹانگ توڑ توڑ کر باہر پھینک دی۔ اور سنو اٹھریاٹ آستین اور کھلے گلے کا بلاؤز بے حد ناپسند ہے۔ وہ اونچی آواز میں بولنے بھی نہیں دیتے اور بھئی حد تو یہ ہے کہ تصویر کھنچوانے تک کی اجازت نہیں ملتی ہے۔ تم سے پوچھا جائیگا سمجھیں؟ مگر ان کو کبھی بھی پسند نہ کر لینا۔"

ان باتوں کو سن کر مجھ کو ہنسی آگئی تھی، وہ جو خاندان بھر کی آنکھوں کا تارا تھا جس کے قہقہے اس گھر کی زندگی تھے جس کی آنکھوں کی گہرائیوں میں ساری دنیا سمٹ کر آگئی تھی، جو وقت سے بہت پہلے بیدار ہو چکا تھا اور جس کے لئے خاندان کی ہر لڑکی آنکھیں بچھائے رہنے کے باوجود اس کی طرف نظر اٹھا کر دیکھنے کی بھی جرأت نہ کرتی تھی اور جس سے خاموشی کے ساتھ محبت کرنے کے لطیف احساس کے سوا زبان پہ نام لانے تک کی کسی میں ہمت نہ تھی۔ اسی کے لئے کھلے طور پر آپا کہہ رہی تھیں کہ "مزاج پرسی کیا کرو" اور اسی وقت پھر مجھ کو اپنی ایک حماقت بھی یاد آگئی، جب بھی اماں ان کو کوئی خط لکھتیں۔ میں بھی اس کے کونے پر بڑی سعادت مندی سے کچھ نہ کچھ لکھ دیا کرتی تھی، ایک دن اماں کے نام کا ایک لفافہ جو آیا تو اس میں میرے نام کا بھی ایک پرزہ تھا مگر وہ پرزہ ایسا ہی تھا جو ایک بم کی طرح مجھ پر آ کر لگا لکھا تھا "تم جو یہ لکھتی ہو کہ میں یہ نہ لکھوں کہ تمہارا خط ملا، تو اچھا بھئی تمہارا خط نہیں ملا" گھر کے بچے بچے کی زبان پہ یہی جملہ تھا اور میرے لئے ڈوب مرنے کی کوئی جگہ بھی نہ ملتی تھی۔ ڈیرہ دون جانے والی صبح سچ مچ میں بڑی غمناک تھی میں پورب کی طرف کھلتے ہوئے چھت پہ خاموش بیٹھی تھی اور وہ پچھم کی طرف والی چھت پہ سارے لوگوں کے ساتھ غمگین بیٹھے باتیں کر رہے تھے، اور اچانک میرے دل میں ایک تڑپتی ہوئی تمنا پیدا ہوئی کہ کاش دو چھتوں کے بیچ میں آنگن کا یہ خلا نہ ہوتا اور میں گھوم کر جانے کی بجائے سامنے دوڑتی ہوئی وہاں پہ پہنچ جاتی ـــــ مگر اس جگہ پہنچ کر میں کیا کرتی؟ کیا مزاج پرسی کرنے کی مجھ میں ہمت ہو سکتی تھی؟ اور آج پورے دو سال کے بعد وہ اپنے ہاتھ میں خوبصورت سینری لئے میرے پاس کھڑے تھے ان کی کھلی ہوئی سفید رنگ کی پیشانی پہ بیگ برش کئے ہوئے گھنے اور سیاہ بال چمک رہے تھے اور موٹے موٹے شیشوں کے پیچھے سے شریر آنکھیں میری بے بسی پر مسکرا رہی تھیں۔ اسی رات کو جب سارے لوگ بڑے کمرے کے فرش پر اکٹھے بیٹھے تھے اور مزے مزے کی باتیں ہو رہی تھیں میں اسی شام والے انداز میں سمٹی ہوئی ایک طرف بڑی نیک بنی چپ چاپ بیٹھی ہوئی تھی، یہ پہلا موقع تھا جب میں ان کو اتنے قریب سے دیکھ رہی تھی اور ان کے قہقہوں کی گونج میں ان کی دلچسپ باتیں سن سن کر یہ سوچ رہی تھی کہ ممانی جان نے اختر ماموں کے خلاف آخر کیوں اتنا ڈرا دیا تھا؟ ـــ مگر پھر آرہ میں وہ ڈھول والی ڈانٹ؟ اور میں کوئی فیصلہ نہ کر سکی۔

ان دنوں میری عمر صرف ۱۴ سال کی تھی لیکن اپنے گھر کی سب سے بڑی لڑکی ہونے کی [illegible] ہر کسی کی نگاہوں میں میرے بڑے پن کا احساس چھا کر رہ گیا تھا اور اسی احساس بڑائی نے آخر مجھ کو ۱۴ سال ہی کی عمر میں جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر وقت سے بہت پہلے ہی جگا کر رکھ دیا تھا۔ کمرے کے اندر سے جیسے ہی اماں اٹھ کر دوسری طرف گئیں ان کی شوخ نگاہیں اچانک میری طرف اٹھیں "اچھا ذرا نزدیک آجا بیٹھ، میں ابھی آپ لوگوں کا امتحان لوں گا۔" شکیل بھیا نے (جو میرے چچا اور خالہ زاد بھائی ہیں اور اب گیا کالج میں اردو کے لکچرر ہیں) بڑے خلوص سے ان کی طرف دیکھا اختر ماموں کی شاعری اور نیرنگ خیال میں ان کے چھپے ہوئے انشائیہ کے تذکرے خاندان میں ہونے لگے تھے اور ہمیشہ سے معصوم صورت والی میری منجھلی بہن رضیہ بڑے بھولے پن سے ان کی طرف حیرت سے تکتی ہوئی رہ گئی۔ میز پہ جلتے ہوئے لیمپ کی روشنی سیدھی ان کے چہرے پہ پڑ رہی تھی اور عینک سے ڈھکی ہوئی ان کی بڑی بڑی ذہین آنکھوں میں شرارت ناچ رہی تھی۔ "اچھا دیکھو میں اپنا ایک شعر سناتا ہوں تم سب مل کر مجھ کو اس کے معنی بتاؤ۔ دائیں طرف کو ذرا سے جھکے ہوئے ان کے گداز لبوں پہ ایک تھرتھراہٹ سی آئی۔

"شیشۂ دل کے لئے ہے یہی معراج کمال
تیری غیبت میں بھی ہوا تجھے دیکھا کرنا"

[illegible] حقیقت [illegible] میرے دل و دماغ پہ لہرائی اور اچانک میری نگاہیں آپ ہی آپ جھک گئیں۔ شکیل بھیا دنیا بھر کی تشریح کرتے رہے [illegible] مگر میں سوچتی رہ گئی کہ میری تین سال کی خاموش نگاہوں سے اتنی تاثیر کہاں سے بھر گئی تھی۔ پھر مجھے معلوم ہوا کہ ڈیرہ دون میں ان کی

طبیعت نہیں لگ سکی تھی اور مسوری کی بلندیوں پر ٹھنڈک لگنے کی وجہ سے وہ جلد ہی پٹنہ واپس آ گئے تھے۔ میڈیکل کالج میں ان کا تیسرا سال شروع ہو چکا تھا اور اچھا "اسٹوڈنٹ" کی حیثیت سے وہ ڈاکٹری کی تعلیم کو کسی طرح سے بھی مکمل کر لینا چاہ رہے تھے، مگر اس طرف اچانک پھر ان کے منہ سے تھوڑا سا خون آ گیا تھا۔ ہسپتال کے سب سے بڑے پروفیسر اور ڈاکٹر ٹی۔ این۔ نہرو جی نے مکمل طور پر آرام کرنے کے لئے اکوسرن کے کنارے رہنے کی تاکید کر دی تھی۔ ابھی تک وہ اب وہ ایک بیمار کی حیثیت سے تبدیلیِ آب و ہوا کی خاطر جا رہے تھے، یہاں دریائے سون کے کنارے کچھ مہینے گزارنے کو آ گئے تھے۔ ان کے برتن علیحدہ طور پر رکھے گئے تھے، پانی پینے کا گلاس تک الگ تھا اور ان کے گھر والوں نے بڑی تاکید سے اس بات پر زور دیا تھا کہ ان کو آؤٹ ہاؤس کے ایک کمرے میں الگ تھلگ رکھا جائے اور ان کے کھانے پینے کی چیزیں دوسروں سے بالکل علیحدہ رکھی جائیں۔ ٹی۔ بی کا کیڑا ابھی تک نکلا تو نہیں تھا مگر پھر بھی احتیاط رکھنا ضروری ہے۔ اماں خود بڑھ کر رونے لگیں، اُن کے اپنے بچوں کا اتنا عزیز لڑکا جو مدتوں کے انتظار پر اتنے لاڈ پیار پر دنیا میں آیا تھا اور آج جو ان کی خوش قسمتی سے ان کے گھر کا مہمان ہوا تھا تو وہ "پام ولا" کی اتنی بڑی شاندار کوٹھی کو چھوڑ کر ان کو آؤٹ ہاؤس میں جگہ دیں گی؟ ابا جان کا چہرہ بھی بڑا افسردہ تھا انہوں نے بچپن میں کتنے پیار سے ان کو اپنی گود میں کھلایا تھا، اور آج جب موت کا سایہ ان کے سر پر منڈلاتا ہوا محسوس ہو رہا تھا تو وہ کس طرح سے ان بچارے کا دل توڑنا چاہتے تھے "نہیں بھئی یہ تو نہیں ہوگا۔ اب جو بھی ہو ہم تو ایک ہی ساتھ رہ کر گزاریں گے" اور اماں ابا جان کے اس فیصلے پر بے حد خوش تھیں۔ یہ ۳۱ء کی شروع جنوری کی بات تھی آموں کے باغ، شیشم، نیم اور تاڑوں کے جھنڈ اپنی ٹھنڈی ٹھنڈی ہواؤں میں ان کے لئے زندگی کا پیغام لاتے رہے۔ سرکنڈے کے ریشمی پھولوں سے ڈھکے ہوئے ریتوں کے اونچے اونچے سنہرے ٹیلوں میں اب ان کے نغموں کی گنگناہٹ کانپنے لگی تھی اور سون کے ساحل پر گھنٹوں اکیلے بیٹھے ہوئے یا تو اپنی تصویروں میں رنگ بھرتے رہتے یا بڑی اچھی اچھی نظمیں لکھتے رہا کرتے تھے، اور چاندنی راتوں میں "پام ولا" کے سامنے نہر کے کنارے چپ چاپ سے بیٹھے ہوئے وہ شیشم کے پتوں میں سے چھن چھن کر جھلکتی ہوئی بے قرار چاندنی کو دیکھتے ہوئے اپنی تازہ کہی ہوئی نظموں کو گنگنایا کرتے تھے انہی دنوں کی لکھی ہوئی نظم کا ایک ٹکڑا یہ بھی تھا۔

دل کی کلی کھلی بھی جو باد خزاں نے آ لیا

نغمے نکل رہے تھے کہ ساز مرا بگڑ گیا

خندہ ابھی تھا زیرِ لب آنسو کا ابر چھا گیا

اپنی خوشی کا آفتاب وقتِ سحر غروب تھا

ارول کی شاداب فضائیں، ہرے بھرے باغوں اور لہلہاتے ہوئے دھان کے کھیتوں میں جہاں وہ حیات نو پا رہے تھے، تو اسی جگہ میں دو ایک بڑے ادیب شاعر اور نقاد بھی بن رہے تھے، ان دنوں نیاز فتحپوری کا بڑا گہرا اثر ان پر چھایا ہوا تھا، بڑے بڑے الفاظ اور رنگین استعاروں کے ساتھ انہوں نے پہلی بار ارول ہی میں افسانے لکھنے شروع کر دئیے تھے۔ جن میں سے کچھ تو بہارستان پٹنہ میں چھپتے رہے تھے، اور انہی دنوں ان کا ایک افسانہ "نیا شوالہ" نگار میں پہلی بار چھپ کر بہت مقبول بھی ہوا تھا۔ ان دنوں ان کی عمر بیس سال کی تھی، وہ ارول آ کر اپنی بیماری کو اس حد تک بھول چکے تھے کہ گھنٹوں نہروں میں تیرتے رہتے اونچے اونچے ریت کے ٹیلوں پر لمبے لمبے قدموں کے ساتھ گھومتے رہتے اور نہر میں دیر دیر تک کشتی رانی کرتے رہتے تھے، اور جب اتنے کاموں کے بعد بھی وقت بچ جاتا تو "پام ولا" کے ہرے ہرے لان پر اوندھے منہ لیٹ کر وہ فطری مناظر کی تصویریں بناتے رہتے اور اس کے بعد پھر مجھ کو ہاکی بھی پڑھایا کرتے تھے۔ صحیح معنوں میں انکو اتنا بڑا ادیب اور شاعر ارول ہی نے بنایا ہے، وہ اپنے دل و دماغ میں ادب کا بیج لے کر تو ضرور آئے تھے مگر سون کے ساحل پر ہی ان بیجوں میں سے کونپلیں پھوٹیں تھیں اور ہرے بھرے پتے نکلنے لگے تھے۔ چھ فٹ کا اونچا قد، دوہرا جسم، لمبی گردن اور سیاہ بیک برش کئے ہوئے سیدھے سیدھے بال، وہ سارے لوگوں میں نمایاں طور پر نظر آ جاتے اور لمبے لمبے قدموں والی چال سے وہ دور ہی سے پہچان لئے جاتے تھے، نوجوانی کی چمک، روشنی اور زندہ دلی کے بعد بھی جب تک ان کے چہرے پر مسکراہٹ ہوتی دل کھول کر باتیں کرنے کو جی چاہتا اور جہاں

سنجیدگی چھائی رہتی پھر تو "جی" اور "جی ہاں" سے زیادہ بولتے ہوئے بھی ڈر لگتا تھا۔ میں نے ہمیشہ سے ان کے اندر دو شخصیتوں کو پایا تھا۔ ایک تو لطیف خیالات و جذبات کا، بے پایاں محبت کرنے والا، زندہ دل، محبوب شاعر و ادیب، اور دوسرا خاندان کا لاڈلا، گردائی بیماری سے ضدی، چڑچڑا، زود رنج، کٹر مذہبی اور بڑے پرانے خیالات کا انسان۔ اور زندگی کے دونوں پہلو اپنے اپنے وقت پر اونچے اور نیچے ہوتے رہتے تھے، لیکن سون کے ساحل پر چلتی ہوئی بڑی لطیف اور صحت بخش ہواؤں نے زیادہ تر ادب اور شاعری والا محبوب پہلو ہی جھکا ہوا رکھا تھا ——— دوسرے سال میرے نانا جان کا انتقال ہو گیا تھا اور ہم سارے لوگ ایک ہی ساتھ ادری آ گئے تھے وہی گھر میرا ننہال تھا اور وہی اختر صاحب کا آبائی گھر بھی۔ اختر صاحب کے والد اور میرے نانا جان کی جتنی بھی زمینداری اور کاشتکاری تھی سب کی سب ایک ساتھ تھی اور نانا جان کی موت سے سارا انتظام درہم برہم ہو رہا تھا۔ انہی دنوں اختر صاحب مکمل طور پر ایک زمیندار اور کاشتکار بن کر رہ گئے تھے۔ ان کا کھانا بھی کھیت ہی پر جایا کرتا تھا اور پانچ سو بیگھے والے کھلیان میں غلوں کے ہزاروں ہزار من اونچے اونچے ڈھیر پر وہ سارا سارا دن اتنے آرام سے بیٹھے ہوئے ہل، بیل، لگت اور کھلیان کے کاموں میں جتتے ہوئے گزار دیتے کہ ذرا بھی اس کا پتہ نہیں چلتا تھا کہ کھیتی کے سوا کبھی انہوں نے دوسرا کام بھی کیا تھا اور جاڑے کی شام میں جب سارے کارندے اپنے کاندھوں پر ہل لئے اپنے اپنے گھروں کو جانے لگتے اور پتھریلی گلیوں میں گزرتے ہوئے بیلوں کی گھنٹیاں بجنے لگتیں تب ٹھیک اسی وقت بڑے بھاری بھاری جوتوں کی ٹاپ برآمدے کے پختہ فرش پر بھی گونج اٹھتیں اور گوبر سے تھڑے ہوئے جوتوں کے تلے میں سے دھان کی سنہری کھلیں نکل نکل کر ادھر ادھر بکھرتی جاتیں، اور میں حیران نگاہوں سے دیکھتی ہوئی سوچتی رہ جاتی کہ وہ چاندنی راتوں میں شعر و ادب کی تفسیر بیان کرنے والا انسان کہاں چلا گیا؟۔

اب ان کی صحت ہر طرح سے اطمینان بخش تھی۔ چند مہینوں کی کاشتکاری کے بعد جولائی سے کالج کھلنے والا تھا۔ میڈیکل کا کورس پورا کرنے کے لئے انہوں نے بڑی کوشش کی مگر ڈی۔ ایس۔ بنرجی صاحب نے بڑی سختی سے روک دیا اور مشکلوں کے بعد انہوں نے صرف آرٹ کالج میں داخلہ لینے کی اجازت دے دی تھی۔ اختر صاحب پٹنہ جا چکے تھے مگر جیسے ہی چھٹیاں آتیں سیدھے بھاگ کر ادری چلے آتے اور سون کے ساحل پر پھر ایک زندگی سی آ جاتی تھی۔ اتنے ہی دنوں میں انہوں نے میڈیکل کالج کی تیزاور تیکھی دواؤں کی بو کو بھلا کر آرٹ اور ادب کو گویا اپنی زندگی کا مقصد بنا لیا تھا۔ کبھی کبھی وہ بڑی حسرت سے کہا کرتے کہ میں نے صرف غریبوں کی خدمت کے لئے ڈاکٹری پڑھنا چاہا تھا۔ مگر اب مجھے یہ محسوس ہوتا ہے کہ میں ادب اور آرٹ ہی کے لئے پیدا کیا گیا تھا۔ گھنٹوں وہ شیلی، کیٹس، بائرن اور ورڈز ورتھ کی نظمیں مجھے سمجھاتے رہتے کبھی دیر دیر تک غالب، میر اور اقبال سے ان کا موازنہ کرتے ہوئے مجھ کو ان کی خصوصیات بتلاتے اس وقت ان کے الفاظ اور خیالات کی روانی کو دیکھتے ہوئے مجھے ہمیشہ ہی محسوس ہوتا کہ علم کا یہ سمندر کبھی بہت بڑے ساحل سے ٹکرانے کو بیتاب ہے۔ اور میں! ——— ؟ میں تو اس سمندر کے کنارے خواہ مخواہ کی اگی ہوئی ایک ایسی گھاس تھی جس کے کمزور جڑوں میں بھی کبھی سمندر کی جھاگیں ایک دائرہ سا بنا کر تھوڑی دیر کے لئے اس میں ایک حسن پیدا کر دیتی ہیں۔ ان کو سچ مچ میں کیٹس سے محبت تھی، اس کی شاعری میں انکو اپنے درد اور غم کی جھلک نظر آتی تھی اور اختر صاحب کو اس بات کا پورا یقین تھا کہ کیٹس ہی کی طرح ٹھیک ۲۸ سال کی عمر میں وہ بھی اس دنیا سے چلے جائیں گے۔ کیٹس کا نام اور اس کی درد میں ڈوبی ہوئی شاعری ہی ان کے دل میں اپنے مرض کا غم بھر دیا کرتی تھی، ویسے اپنی بیماری کا احساس ان کو کبھی بھول کر نہ ہوا کرتا تھا۔ اتنے دنوں میں میں نے بھی اپنے بچپن سے لکھنے لکھانے کے شوق کو پورا کرنے کی کوشش شروع کر دی تھی اور اختر صاحب جس تیزی سے ادب میں صحت یاب ہو رہے تھے اسی رفتار سے میں بھی چھوٹے چھوٹے انشائیہ لکھنے کی مشق کر رہی تھی۔ گھر کی پہلے سے ادب نواز فضا اور اس پر سے ایک ادیب مقرر پھر نہ کچھ روشنی تو کونوں کھدروں میں پڑ ہی جاتی ہے۔ میری اماں اور ابا جان کو اختر صاحب سے بے حد محبت تھی گھر کے اندر چھوٹے چھوٹے بچے بھرے پڑے تھے مگر ایک دن بھی اس گھر میں یہ محسوس نہیں کیا گیا تھا کہ کوئی چھوت کا مریض یہاں آیا ہے۔ ڈاکٹروں کا بھی خیال بہت کچھ بدل گیا تھا اسی لئے ۱۹۳۲ء میں ۲۳ مئی کی لکھتی ہوئی تاریخ کو وہ میری زندگی میں آ گئے تھے۔ پٹنہ کالج گرمی کی چھٹیوں میں بند تھا اور تیروں کے اونچے اونچے ٹیلوں کی وجہ سے "پام ولا" کی وہ پیغمبری عمارت ایک لمکتا ہوا تنور بن کر رہ گئی تھی، سارا دن گرمی سے تڑپتے ہوئے گزرتا مگر سون کے کنارے

رات کا کھانا بھی ٹھنڈا ٹھار ہوگیا اور بے مکدر ہوتا تھا۔

اختر صاحب نے انگلش میں آنرز لیا تھا مگر ان کے پڑھنے کی شان بڑی نرالی تھی انھوں نے جب بھی کتابیں دیکھیں بس ایسے ہی جیسے افسانے پڑھے جاتے ہیں آدھا گھنٹہ بھی ہم کبھی نہ پڑھتے تھے۔ ان کو اپنے کالج میں انگلش کا انگریز پروفیسر بہت پسند تھا۔ اکثر وہ اس کے لیکچرز کا نوٹ مجھ کو سنایا کرتے اس کی قابلیت اور سادگی کے وہ بے حد مداح تھے۔

اکتوبر کی چھٹیوں سے پہلے ہی میرے منجھلے چچا کا سارا خاندان "پام ولا" میں آگیا تھا۔ منجھلے ابا ریٹائر ہوکر "پام ولا" کے قریب ہی اپنی کوٹھی بنوانے آگئے تھے اچانک طور پر آجانے والے دن بے حد حسین، بڑے رنگین اور بہت ہی دلچسپ تھے ایک تو ہم بہنوں کی بھی خاصی تعداد تھی اس پر سے ایک ہی ساتھ منجھلے ابا کی پانچ لڑکیاں آگئی تھیں۔ وہ مجھ سے بڑی تھیں ایک ہماری عمر کی اور وہ میری بہن رضیہ کی ہم عمر اور اس سے کچھ چھوٹی بس پھر تو "پام ولا" میں جیسے پر نکل آئے تھے۔ چمن چمن کے شرارتیں کی جاتیں اور اختر صاحب کی کہی ہوئی نظموں میں اور ان کی جن جن شاداب مناظر اور حسن کو سراہا گیا تھا ان کے ہر پہلو پر عقیدت کے پھول چڑھائے جاتے تھے اور کرشن جی کی بنسی پر جھوم اٹھنے والی گوپیوں کی طرح ہم اختر صاحب کے ان مصرعوں پر لہک لہک اٹھتے تھے۔

سبزۂ شاداب پر شبنم کے جھالوں کا ہجوم — سون کی وادی میں رقصاں ہے غزالوں کا ہجوم

شاعر سرشار کے رنگین خیالوں کا ہجوم

اور اختر صاحب اکتوبر کی چھٹیوں میں اور دل جوئی آئے تو یک دم سے وہ راجہ اندر بن کر رہ گئے۔ وہ دن بڑے یادگار طور پر گزرے۔ پیار ہم سب کی سب اختر صاحب کے گرد ایک گھیرا لگائے بیٹھی رہتیں۔ کسی کے ہاتھ میں بانگ درا ہوتا اور کسی کے ہاتھ میں دیوان غالب، ہر طرف بس دیوان ہی دیوان نظر آتے تھے۔ مومن کی شاعری چھڑتی، غالب کا انداز بیان سمجھایا جاتا اور اقبال کے ترانوں میں ماضی پر تبصرے ہوتے رہتے۔ اختر صاحب نے ایک خاص شاعرانہ ماحول پیدا کرکے ہمارے دلوں کو امنگوں سے بھر دیا تھا، شاعری اور احساس شعریت سے ہم اتنے ہم آہنگ ہوگئے تھے کہ اچانک طور پر ہم ساری بہنوں نے ایک ہی ساتھ شعر کہنا شروع کر دیا۔ اختر صاحب حیران رہ گئے۔ یہ سون کے میٹھے پانی ہی کے کرامات تھے جو ایک ساتھ ایسی لڑکیاں جذباتی شعر کہنے لگ گئیں جو تعلیمی لحاظ سے بے حد کمزور تھیں۔ "پام ولا" پورے طور پر شعر و ادب کا گہوارہ بن کر رہ گیا تھا۔ آدھی آدھی رات تک بیت بازی ہوتی رہتی، مصرع طرح دیا جاتا شعر لکھے جاتے اور پھر مجلس مشاعرہ منعقد ہوتی۔ صدارت کی کرسی اختر صاحب کے لئے مخصوص تھی اور باری باری عائشہ شمیم، شکیلہ اختر، عزیزہ نگار، رضیہ حنا، نصیرہ ماذاد، نسیمہ سوز اپنا اپنا کلام سنا کر داد تحسین حاصل کرتیں۔ اندر سبھا کی مجلس جمی رہتی اور راجہ اندر اپنی جگہ پر استعجاب بنے رہتے۔ مگر ان ساری رنگینیوں کے ساتھ ہی ساتھ نمازوں کی پابندی بھی تھی، اسلامی خصوصیات پر وہ بڑے ہی عالمانہ رنگ میں روشنی ڈالا کرتے اور جمعہ کی نماز پڑھاتے ہوئے بہت ہی شاندار خطبے دیا کرتے تھے۔ اسکول سے لیکر میڈیکل کالج تک میں، ان کی پڑھائی کا ایک اعلیٰ ریکارڈ تھا اور کوئی نہ کوئی وظیفہ ان کو ملتا ہی رہا تھا۔ میڈیکل کالج میں اسکالرشپ کے ملنے بھی روپے ملتے، وہ تبلیغی سلسلے میں چندہ دے دیا کرتے تھے۔ پٹنہ یونیورسٹی میں میڈیکل کالج بڑے ہی ٹھسے اور فیشن کا کالج سمجھا جاتا رہا ہے مگر اسی کالج کے ہوسٹل میں اختر صاحب کے بستر پر مہینوں اس لئے چادر نہ بچھ سکی تھی کہ انھوں نے اپنے ناشتے کے پیسوں کے ساتھ چادر کی قیمت بھی غریب لڑکوں کی فیس میں دے ڈالی تھی اور ان کی غیرت نے صبح کے ناشتے میں چنا چبا چبا کر کھانا زیادہ پسند کیا تھا مگر گھر والوں کو اس کی خبر تک نہ پہنچنے دی تھی۔ اسی طرح سے جب وہ اور ول پہنچے تھے تو ہم لوگ ان کے بستر میں کبھی تکیے کا توشک دیکھ کر حیران رہ گئے تھے بعد میں معلوم ہوا کہ گھر میں ایک بزرگ ضعیفہ کے پاس توشک نہیں تھا اختر صاحب نے خود قینچی لے کر اپنے توشک کے دو ٹکڑے کر دئے اور وہ توشک اب ایسی صورت اختیار کر چکا تھا۔ ایک دن "پام ولا" میں سارا دن اپنے کوٹ کا گلا بند کئے ہوئے چھپے رہے۔ بعد میں پتہ چلا کہ باہر ایک جولاہے کے پاس کرتا نہیں تھا اختر صاحب نے اپنی قمیص اتار کر اسے دے دی ہے اور اب اپنا کوٹ اس لئے پہنے پھر رہے ہیں کہ اس وقت کوئی دھلی ہوئی قمیص ان کے پاس نہیں تھی۔

اپنی طبیعت، مزاج اور آرٹ کے لحاظ سے وہ بڑے عجیب و غریب انسان تھے۔ ساری دنیا کا غم سمیٹ لینے کی تڑپ نے ان کو اچھا خاصا

ایک افسانہ "مگر بیٹیاں" بنا دیا ہے۔ وہ جب بی۔ اے کرنے کے لئے پٹنہ کالج کے مسلم ہوسٹل میں رہنے لگے تو سارے لڑکوں کی سرداری انہی کو بخش دی گئی تھی۔ مذاق سے بچانا ہی اچھا۔ اس زندہ دل گروپ اکٹھا ہو گیا تھا۔ شیطانی کی ساری اسکیمیں انہی کے کمرے میں سوچی جاتیں۔ ہوسٹل کے سپرنٹنڈنٹ کی بے جا مداخلت ان سسیموں کو بہت ہی کھلتی تھی اسی لئے اسٹڈی پیریڈ کی گھڑیوں میں کورس کے بجٹ میں سالا گروپ مزے میں کالج کے پہلو میں بہتے ہوئے گنگا کی سیر کرتا رہتا اور جو اچانک سپرنٹنڈنٹ کی یاد آ جاتی تو پھر گنگا کے دوسرے کنارے پر سے ٹوٹی پھوٹی کالی ہانڈی میں چھٹے پالنے جو تنے بڑے حفاظت کے ساتھ ہوسٹل میں لائے جاتے اور پھر ان کے نام پر فاتحہ پڑھ کے ان کے کوارٹر کی طرف بڑے زور کے دھماکوں سے ہانڈی چھوڑ دی جاتی تھی۔ ۱۱-۱۱ بجے رات کو ہوسٹل کے بند پھاٹک پر سے وہ بڑے اطمینان سے کود جاتے تھے جیسے ان کو کبھی احتیاط کی تاکید ہی نہ کی گئی تھی۔ ۱۵ جنوری ۱۹۳۴ء میں بہار کا ہیبت ناک زلزلہ آیا تھا اور اسی کی تباہ کاریوں کی وجہ سے یونیورسٹی کا امتحان بجائے مارچ کے مئی میں ہو رہا تھا۔ اختر صاحب کے سارے پرچے بڑے اچھے جا رہے تھے آنرز کا صرف ایک پرچہ باقی رہ گیا تھا کہ اچانک ان کے منہ سے خون آنا شروع ہو گیا۔ وہی خون جس نے ان کا محبوب میڈیکل کالج ان سے چھڑا دیا تھا اور اب وہ آنرز کا پورا امتحان بھی ختم نہ کر سکے تھے۔ ہوسٹل کے دریچے سے باہر خون تھوکتے ہوئے ان کا چہرہ فق تھا اور ہوش اڑا ہوا۔ اگر خون آنے کی بات ذرا سی بھی پھیلتی تو پھر امتحان دینا تو درکنار، ہوسٹل کو بھی چھوڑ دینا پڑتا، مگر جیسے ڈوبتا ہوا انسان ایک تنکے کا سہارا لے، انہوں نے شکیل بھیا کو ساتھ لے کر جو اسی ہوسٹل میں تھے اپنا ہرا بھرا سکون سے ٹہلتے ہوئے ڈاکٹر عبدالحئی صاحب کے یہاں چلے گئے اور مسلم ہوسٹل سے اٹھ کر میڈیکل کالج کے اسی پرانے غم گسار ہوسٹل میں چلے آئے جو پہلے بھی ان کے دکھوں کا شریک رہ چکا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے ان کی ہمت افزائی کی، کلشیم کا کوئی انجکشن بنایا اور خاموشی کے ساتھ امتحان دینے کی تاکید کر دی۔ دوسرے روز اتوار تھا اختر صاحب نے کئی انجکشن لئے کلشیم کی گولیاں کھاتے رہے مگر ریسٹ کرتے رہنے کے باوجود بھی خون کے نمکین تھکے منہ سے آتے ہی رہے، دوسرے روز اسی حالت میں وہ امتحان دینے چلے گئے ان کے مرجھاتے ہوئے زرد چہرے پر مسکراہٹ اب بھی موجود تھی، اکزامینیشن روم میں اپنی سیٹ پر بیٹھے ہوئے وہ امتحان کا پیپر لکھتے رہے نمکین خون کا ابال آتا رہا اور وہ بڑی خاموشی کے ساتھ ان کو اپنے رومالوں میں جذب کر کے اپنی جیب میں ڈالتے چلے گئے، ہال سے باہر برآمدے میں شکیل بھیا برف اور نارنگی لئے بیٹھے تھے اور ہر تھوڑی دیر کے بعد برف کے ٹکڑے اور چھلی ہوئی نارنگی اختر صاحب تک پہنچ جاتی تھی۔ خدا کا شکر ہے کہ امتحان کے کمرے میں رومالوں کی بڑھتی ہوئی سرخی کسی نے نہیں دیکھی تھی اور جیسے تیسے آنرز کا یہ آخری پیپر ختم ہی ہو گیا۔ خون آنے کا وحشت ناک اثر ان پر امتحان کے بعد ایسا چھایا کہ وہ اسی حالت میں ۲۲ میل لاری پر چل کر اردل پہنچ گئے۔ اور "پام ولا" پر جیسے ایک سکتہ لگ گیا۔ گھر اور باہر کے سارے لوگوں کی ہمدرد نگاہیں ان سے زیادہ مجھ پر تھیں۔ اردل کے سارے علاقے بھر میں ایک افسردگی سی چھا کر رہ گئی تھی اور اظہار عیادت اور ہمدردی کے الفاظ میرے لئے سوہان روح بن کر رہ گئے تھے۔ مکمل ریسٹ کی صورتوں میں بھی جب کسی طرح سے خون آنا بند نہ ہوا تو پھر نہر کے راستے اسٹیمر سے ان کو پٹنہ واپس لایا گیا، میں بھی ساتھ تھی، پٹنہ کے ڈاکٹروں نے ڈھیروں ڈھیر دواؤں کی فہرست لکھی افسردہ چہروں کے ساتھ تسکین دیتے رہے، مگر اختر صاحب پر ایک وحشت سوار تھی وہ پٹنہ سے گھبرا کر پھر آرہ پہنچ گئے تھے، اب تک شکیل بھیا نے بڑی رفاقت کی تھی یہ گھر ان کے والدین کا تھا اور یہاں ایک ڈاکٹر کے مکان کی وجہ سے علاج کی سہولت نظر آتی تھی۔ سارا دن انجکشن دیتے ہی گزرا۔ مگر دوائیں جیسے بے اثر ہو چکی تھیں۔ اختر صاحب کو بات تک کرنے کی سخت ممانعت تھی چت لیٹے ہوئے وہ بڑی حسرت سے صرف مجھی کو تکتے رہتے تھے میرا دل ڈوبتا جا رہا تھا لیکن کسی طرح سے ان کو بہلاتی اور تسکین دینے کی کوشش کرتی، اور گزری ہوئی باتوں کو چھیڑ چھیڑ کر کسی طرح سے وقت کاٹنا چاہتی تھی، میری شادی کو پورا ایک سال ہو رہا تھا اور اپنی ناتجربہ کاری کے ساتھ میں نہیں جانتی تھی کہ اب میں کیا کروں! میرے جہیز کا بستر بچھا ہوا تھا اور ان کے مرجھاتے ہوئے زرد اور نحیف چہرے کے نیچے میرا پھول بنا ہوا وہ تکیہ کا غلاف لہک رہا تھا جس کو میں نے بڑے چاؤ سے بنایا تھا۔ کبھی کبھی ان کا دبلا کمزور ہاتھ آہستہ سے اٹھتا اور وہ میرے شانے کو بڑے پیار سے تھپتھپانے لگتے۔ وہ کیا کہنا چاہتے تھے میں نہیں جانتی لیکن خاموش زبان کا اتنا پیارا اشارہ مجھ میں نشتر سا لگاتا آنکھیں ایسے کرب سے بے اختیار ہو جاتیں لیکن میں بڑی مشکلوں سے ان امڈتے ہوئے آنسوؤں کو پی جاتی اور کسی پاگل کی طرح ان کو آئندہ کے خواب سنانے لگتی، جانا ہے ایک اچھا سا گھر بسے گا۔ جہاں ہم پھول کھلائیں گے۔ جانا، گھر کیسا اچھا سجا ہوا رہے گا اور ہماری میزوں پر اصلی

اور تھوکوں کا ایک ڈھیر لگا رہے گا؟ میری ان باتوں کو سن کر ان کے لبوں پر ایک تھرتھراہٹ سی آ جاتی اور ڈبڈبائی آنکھوں سے آنسوؤں کے چند قطرے بے کسی طور پر ڈھلک پڑتے اور میں ایک بے بسی کے عالم میں حیران رہ جاتی کہ آخر میں کیسے حیران کو بہلاؤں؟ ۔ خالہ اماں بے حد پریشان تھیں اور خالو ابا جو میرے اپنے تایا بھی تھے ایک ڈاکٹر کی حیثیت سے زیادہ بے چین تھے انہوں نے میرے سر پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا "تم مت گھبراؤ۔ بس ابھی خون رک جائے گا۔ ابھی سب سے آخری انجکشن کوبرا سانپ کے زہر کا دیا گیا ہے۔"

مگر جب رات کے گیارہ بجے اور موسلا دھار بارش ہونے لگی تو میں اور شکیل بھیا قریب ہی کرسی پہ بیٹھے ہوئے یہ دیکھ کر گھبرا اٹھے کہ ان کے منہ اور ناک سے خون کی قے ہو رہی تھی۔ اگالدان اور سیلفچی خون سے بھر گئی تھی پھول بنے ہوئے غلاف، قمیض اور سارا بستر خون سے تر بتر ہو رہا تھا اور اس پر سے بھی خون تھا کہ چلا ہی آ رہا تھا۔ خالو ابا اختر صاحب کی نبض پکڑ کر بیٹھ رہے ہیں حیران نگاہوں سے نبض تکتے ہیں اور اختر صاحب ایک پتھر کے بت بنے خاموش سامنے کی دیوار کو دیکھے رہے ہیں۔ ہو کیا تھا اور کیا ہو جائے گا؟ ہم سب کو اس کا شدید طور پر احساس تھا۔ ایک دو انجکشن اور دیئے گئے دعاؤں کو الٹ پھیر کر پڑھایا جا رہا تھا اور برف کے ٹکڑے منہ میں ڈالے جاتے رہے۔ اس وقت انہوں نے اپنے کمزور ہاتھوں سے مگر بڑی مضبوطی کے ساتھ میرا ہاتھ تھام رکھا تھا۔ جیسے موت کے منجدھار میں ڈوبتے ہوئے کو بھی ایک بے بس ہاتھ کے سہارے شاید اپنی زندگی کے ساحل کو پا لیں گے۔ میری زبان پر سکتہ تھا لیکن میری روح خدائے تعالیٰ کے آگے ایک عزیز تر ہستی کی بھیک مانگ رہی تھی۔ دعاؤں کے لئے بار بار امام جماعت احمدیہ حضرت مرزا بشیر الدین محمود احمد ایدہ اللہ کی خدمت میں قادیان تار پہ تار دیئے جا رہے تھے اور یہ دعاؤں کی قبولیت کا معجزہ اور خدائے تعالیٰ کا خاص فضل ہی تھا کہ وہ اندھیری رات سچ مچ میں آخر کٹ ہی گئی۔ اور ان کو کسی طرح سے پٹنہ لا کر پے انگ وارڈ میں داخل کیا گیا۔ اختر صاحب کو بخار اور کھانسی کبھی تھی ہی نہیں مگر کمزوری بے حد بڑھ چکی تھی۔ اٹھنے بیٹھنے چلنے اور بات تک کرنے سے معذور۔ کیسا دور آ گیا تھا جن ڈاکٹروں نے میڈیکل کالج میں ان کو ایک اچھے اسٹوڈنٹ کی حیثیت سے کافی توجہ دے کر پڑھایا تھا وہ سب کے سب بڑی محبت سے دیکھنے اور علاج کے لئے مفت آتے رہے۔ میڈیکل کالج ہوسٹل کے ایک ہر دلعزیز ڈاکٹر گھوشال نے ان کے بیگ برش کئے ہوئے بالوں کو اپنے سامنے حجام سے کافی چھوٹا کرا دیا۔ ان کی شیو کرائی اور کپڑے تبدیل کرا کے واپس جاتے جاتے مڑ کے پھر پلٹے اور قریب آ کر ہنستے ہوئے بولے "بالوں کی زیادہ خدمت کرو گے یہ پھر بڑھ آئیں گے۔ بس جلدی سے اچھے ہو جاؤ پھر ہم تم کو پروفیسر بنا دیں گے۔" ایک مردہ سی ہنسی ان کے لبوں پہ آئی جیسے ان کا دل کہہ رہا تھا "پروفیسر! پروفیسر کون بن سکے گا؟" پٹنہ کے سارے بڑے ڈاکٹروں کی یہی کوشش تھی کہ جہاں تک جلد ہو سکے رانچی کے پاس اٹکی سینی ٹوریم میں ان کو داخل کر دیا جائے۔ مگر وہاں سے ہر تار کا جواب یہی آ رہا تھا کہ کوئی سیٹ خالی نہیں ہے۔ ادھر زیادہ خون آ جانے کی وجہ سے اختر صاحب کمزور بھی بہت ہو گئے تھے وہاں تک جانا ذرا مشکل ہی نظر آ رہا تھا ایک مہینے کے بعد آخر اس صورت میں اٹکی آ جانے کی اجازت مل سکی تھی کہ اپنا ایک بڈ اور مریض کے استعمال کی ساری چیزیں خرید کر بھیجو۔ اور اتنی ساری چیزیں خرید کر بھیجنے پر بھی برآمدے میں صرف لوہے کی ایک پلنگ بچھنے کی جگہ مل سکی تھی۔ میں یہاں بھی ساتھ ہی آئی تھی۔ میرے ہی سامنے ایمبولنس پر سے جب ان کو اسٹریچر پہ اتار کر وارڈ میں لایا جا رہا تھا تو سینی ٹوریم کے مدراسی سپرنٹنڈنٹ نے اتنے کمزور مریض کو لینے سے صاف انکار کر دیا تھا۔ ان کے پہلے سے پچکے ہوئے گالوں والے چہرے پہ غصے کی ایک لہر دوڑ گئی "بڈ ہمارا اپنا ہے اور آپ یہاں رہنے کی ہمیں اجازت دے چکے ہیں" ہڈیوں کے ڈھانچے سے اب بھی ویسی ہی گونجتی ہوئی بلند آواز نکل سکتی تھی۔ چھوٹا ناگپور گھومنے کا ان کے لئے یہ پہلا موقع تھا۔ یہاں آتے ہی ان کے چہرے سے پژمردگی دور ہو گئی تھی۔ اس دنیا کے سارے ہی لوگ ایک دوسرے کے ہمدرد و غم گسار تھے پٹنہ ہی میں ان کا بلغم پازیٹو ہو چکا تھا اور یہی خبر ان کے لئے بڑی اذیت رساں تھی۔ اب تک وہ یہی سمجھتے رہے تھے کہ کسی رگ کے پھٹ جانے سے خون آ جاتا ہے۔ اٹکی آ کر ایک ہی ہفتہ میں زندگی اور زندہ دلی کے آثار نظر آنے لگے تھے۔ نحیف آنکھوں سے خوف و ہراس مٹتے جا رہے تھے اور اب وارڈ کے اندر مریضوں اور نرسوں سے چھیڑ چھاڑ میں دبے دبے طور پر وہ بھی دلچسپیاں لینے لگے تھے۔ ایک دن جب میں سو میل دور رانچی سے کھڑکھڑاتی ہوئی ریل پہ چل کر اٹکی اتنی دور اسٹیشن سے پیدل چلتی ہوئی ان کے پاس پہنچی تو شاید وہ پہلے سے کسی بات پہ ہنس رہے تھے اور اسی طرح سے ہنستے ہوئے انہوں نے ایک ساتھ تین نرسوں کو پکڑے ہوئے مجھ سے ملایا "دیکھو بھئی یہ اینتھری ہے یہ ننھی سی پھدکتی ہوئی ڈولی ادھر جلدی

کمشنر یا انہیں۔ اور بہن بڑے خلوص کے ساتھ ان سب کو کلیشیم گولڈ اور طاقت کا انجکشن سمجھ کر ان سے مل مل کر خوش ہوتی رہتی۔ ایک ہی مہینہ کے بعد انکی ہوا کر
ان کا بلغم نیگیٹیو ہو گیا تھا۔ صحت کے ساتھ ان کی فن کارانہ صلاحیت بھی ابھرتی جا رہی تھی، جب بھی سینی ٹوریم میں کوئی فنکشن ہوتا سب سے آگے ہی رہتے۔
ملاسی سپرنٹنڈنٹ منظور صاحب کچھ اس طرح سے متاثر ہو چکے تھے کہ ہر بات ان کے مشورے سے ہوتی۔ ڈرامہ کے لئے اسٹیج بنانے سے لیکر ڈرامہ لکھنے اور
اس کے ایک ایک کردار سے کامیاب طور پر ایکٹنگ تک کی کوشش انہی کی رہین منت ہوتی۔ سینی ٹوریم کے انتظامی اُمور میں بھی وہ کافی حصہ لینے لگے تھے جہاں
تک تعاون کا سوال ہوتا ٹھیک تھا مگر جہاں مریضوں کی عام سہولت کے سلسلہ میں ان کے بنائے ہوئے نقشے میں گڑبڑ ہوتی پھر وہ ساری باتیں تفصیل کے
ساتھ رانچی سے نکلنے والے ایک انگریزی اخبار "سنڈے" میں گمنام طور پر چھپ کر مشتہر ہو جاتیں۔ چھوٹا ناگپور میں اس اخبار کی بڑی اہمیت سمجھی جاتی تھی جہاں بھی
اس قسم کی باتیں چھپیں منظور صاحب کی بدحواسیوں کا عجیب عالم ہوتا، وہ اخبار لئے سیدھے ان کے پاس چلے آتے، صاف طور پر جانتے تھے کہ یہ گمنام شخصیت
کس کی ہے مگر جس انسان کے رعب سے سارا سینی ٹوریم کانپتا تھا، اختر صاحب کے وقار کے آگے اس کی بولنے کی ہمت نہ پڑتی تھی، بار بار ان کے
شانے پر ہاتھ رکھ کر وہ یہی کہتے جاتے "تم پتہ چلاؤ گے کہ ہماری یہ اندر گھری باتوں کو باہر پھیلا کون رہا ہے"! اختر صاحب کے چہرے کی سرخی یکدم سے بڑھ
جاتی اور پھر اخبار میں ایک دو مراسلات کے بعد اُن کے سارے مطالبات پورے ہو جاتے۔ اختر صاحب جس وارڈ میں تھے ان دنوں اس وارڈ کو "فورتھ بی"
کہا جاتا تھا اس میں ۲۴ مریضوں کے بیڈ تھے۔ ٹی۔ بی کے مریض بخار اور کھانسی میں بے دم پڑے رہتے تھے، زندگی جن کے سامنے سسک رہی تھی اور موت
کے پنجے جن کی طرف تیزی سے بڑھے چلے آ رہے تھے اور جو حریصانہ طور پر ایک ایک ڈش کچے ٹماٹروں کا بڑی تیزی سے نگل جاتے تھے تاکہ جلد سے جلد ان کے
جسم میں سارا وٹامن پہنچ کر سرایت کرتی ہوئی موت کا مقابلہ کر سکے۔ اسی وارڈ میں اب قہقہے گونجنے لگے تھے اور موت کی تاریک راتیں ان کی ہنسی کی پھلجھڑیوں
سے چراغاں بھی ہونے لگی تھیں۔ چند ہی مہینوں کے بعد اختر صاحب کے بی۔ اے کا نتیجہ نکل گیا تھا۔ وہ اپنے کالج سے انگلش آنرس میں فسٹ آئے تھے اور یونیورسٹی
میں ان کا نمبر تیسرا تھا۔ کوالیفیکیشن ہوا مگر اختر صاحب بڑی خاموشی سے سینی ٹوریم کے بیڈ پر اپنے ریسٹ کا پیریڈ گزار رہے تھے۔ یونیورسٹی کی طرف سے ان کو سونے
کا میڈل اور ڈھائی سو کی انگلش کتابیں انعام میں ملی تھیں، مگر اب وہ ساری کیفیت سے بے نیاز ہو کر سینی ٹوریم پر اسی طرح سے چھا گئے تھے جیسے کاشتکاری
کرتے ہوئے وہ محلے کے پورچ پر جم کر رہ گئے تھے۔ انہوں نے یہاں بھی کئی افسانے لکھے "سینا ٹوریم کا فقیر" اسی جگہ کا لکھا ہوا بہت پسند کیا گیا تھا۔ پورے طور
پر چند ہی مہینوں میں وہ صحت یاب ہو گئے تھے بائیں پھیپھڑے میں اے۔ پی پڑ رہا تھا اور چہرے کے سفید جلد کے اندر سے خون کی سُرخی جھلکنے لگی تھی، وہ ایک
میل سے زیادہ ٹہلنے لگے تھے۔ آگرا اور، محنڈا اور جنگلوں کی ٹولی میں بیٹھے ہوئے وہ گھنٹوں اسلام کی خوبیوں کو بڑے پیار سے سمجھاتے رہتے۔ میں ان سے
دو میل دور الگ مکان میں رہتی تھی وہاں سے پیدل چل کر ان سے ملنے کو آتی تو کبھی وہ کسی کی مزاج پرسی میں گئے ہوتے یا نرسز کوارٹر کی کسی تقریب کی
تیاریوں میں لگے رہتے۔ آنند بھیا ان کو یہاں بھی مل گیا تھا اور راجہ تو ہر جگہ راجہ ہی رہتا ہے۔ انکی سینی ٹوریم میں جب وہ پہلے پہنچے تھے اور منظور صاحب نے
گرمی گزار کر ان کو واپس جانے کو کہہ دیا تھا اس وقت اچانک ان کے منہ سے پھر خون آ گیا تھا —— تار پاتے ہی میں اردلی سے سیدھی ان کے پاس پہنچی اب
زر ویٹیشن روم میں وہ اکیلے پلنگ پر خاموش پڑے تھے دونوں بانہوں پر سختی سے داب کر پٹیاں باندھ دی گئی تھیں۔ ان کی نظر جیسے ہی مجھ پر پڑی دل کا سارا
غم آنسوؤں میں بہہ نکلا اسی پرانے طریقے پر پھر انہوں نے میرا ہاتھ تھام لیا تھا۔ ان کے چہرے پر بے حد گھبراہٹ تھی، اردلی خاص طور پر ان کی نگرانی اپنے دل سے
کر رہی تھی، اس کی آنکھوں میں بھی آنسو ڈبڈبائے ہوئے تھے وہ مجھ سے بڑے پیار سے بولی۔ اب تو بھیا اچھا ہے بھابھی۔ سچ پوچھ اس نے تو مجھے ڈرا ہی
دیا تھا۔ ہائے بھابھی انتشری تو تیرے لئے پھوٹ پھوٹ کر رو دی تھی۔ مگر وہ جو منتی ہے نا۔ گھبرا وہ ذرا جھانکنے تک نہ آئی یہاں —— بڑا چھوڑ دیتے چلی
تھی بھیا کو —— ہم نہ رہا تو گیسے کے بھیا اکیلا کہیں کی —— اختر صاحب نے اس سے پہلے جس ہمت سے اپنی بیماریوں کا مقابلہ کیا تھا اب ان کی طرف دیکھتے
ہوتے ہی لگتا تھا جیسے وہ اپنی ارمان کھو چکے ہیں۔ سرہانے خاموش رہنے کا بورڈ لگا تھا اور وہ بے حس و حرکت ایک طرح سے لیٹے ہوئے سامنے سینی ٹوریم کے اس
آفس کو دیکھتے رہتے جہاں اپنی تندرستی کے زمانے میں وہ کئی تقریریں کر چکے تھے جہاں دھرے ہوئے فائلوں میں ان کے کئی اصلاحی نقشے موجود تھے اور جس جگہ پر منظور صاحب

جیسے سخت گیر ڈاکٹر کے چھینٹے بن کر بھی انتظامی امور میں جھگڑا کر کے وہ اپنی بات منواتے رہے تھے۔ ایک دن ان کے منہ سے کچھ زیادہ خون آگیا تھا ایک وہ اپنی ترشی ہوتی جست ہی نازک اور خوبصورت انگلیوں کو دیکھتے دیکھتے بے تابانہ طور پر انھیں چومنے لگے۔ وہ آہستہ آہستہ سسک رہے تھے اور ایک مصور، ایک شاعر اور ایک ادیب کی وہ فن کارانہ انگلیاں ان کے خشک اور کانپتے ہوئے لبوں پر دھری تھیں۔ ان کے مردانہ ہاتھوں میں آتی حسین انگلیوں کو دیکھ کر ہمیشہ سے ہی محسوس ہوتا تھا کہ وہ غلطی سے اس ہاتھ پر لگ گئی ہیں اور اب وہی شمع کی کانپتی ہوئی لو شاید بجھنے لگی تھی۔ ڈولی بڑے خلوص سے ان کی خدمت کر رہی تھی جب یہ کچھ اچھے ہونے لگے تب وہ ایک دن مجھ کو سمجھاتی ہوئی کہنے لگی "بھابی بھیا کو سمجھا دے کہ وہ اتنے زور زور سے گرج گرج کر کسی کو ڈانٹا نہ کرے۔ سچ کہتی ہوں بھابی! میں نے اپنی زندگی میں اتنی گرجتی ہوئی ڈانٹ کبھی بڑے صاحب کی بھی نہ سنی تھی — ہاں بھابی! بس چلانے سے منع کرتی رہنا۔" اختر صاحب جب اچھے ہو گئے تب یہ راز کھلا کہ ڈولی نے کسی وارڈ سرونٹ کو کچھ زیادتی سے ڈانٹ دیا تھا جس سے اختر صاحب کو غصہ آگیا اور وہ انسانیت کی اس تضحیک کو برداشت نہ کر سکے۔ پہلے تو انھوں نے ڈولی کو سمجھایا کہ وہ اس نوکر سے معافی مانگ لے مگر ڈولی نے صاف طور پر کہہ دیا تھا کہ "ایسے ایسے نوکر اس کی جوتی کی نوک پر دھرے رہتے ہیں۔" اتنی بات سن کر اختر صاحب اپنی بلند آواز میں ڈھول پر جو گرجنے لگے تو پھر سارا وارڈ اکٹھا ہو کر رہ گیا۔ اور اسی رات کو سوتے سوتے میں ان کے منہ سے خون آنا شروع ہو گیا تھا — ڈولی اپنے کوارٹر جا کر خوب روتی رہی تھی مگر جیسے ہی اس کو ان کی بیماری کی خبر ملی تو رات ہی کو ننگے پیر دوڑتی ہوئی بدحواس چلی آئی۔

سوا سال اگلی میں رہ کر اختر صاحب واپس چلے آئے تھے ڈاکٹر صاحب نے ایک بڑی اچھی سرٹیفکیٹ دے کر ان کو خاندان اور سوسائٹی کے لئے بے ضرر کہہ دیا تھا۔ ان کا وزن کافی بڑھ گیا تھا اور صحت بہتر۔ بہترین کھانے اور آرام کرنے کی سخت تاکید کر دی گئی تھی۔ وہ اور دل ہی چلے آئے تھے، زندہ دلی اور خوش مزاجی کے ساتھ شرارتوں میں کوئی کمی نہ آئی تھی اور ان کو دیکھ کر بھولے سے بھی یہ خیال نہ ہوتا تھا کہ کبھی ان کو دکھوں سے بھی واسطہ پڑا تھا۔ ان کی نگاہوں میں وہی محبت خلوص اور رچاؤ سا پایا سب ہی کچھ تھا مگر اس کے ساتھ ہی ایک چڑچڑاہٹ اور بیزاری کی جھلک بھی صاف نظر آنے لگی تھی۔ معمولی معمولی باتوں میں وہ ضدی اور باغی بن جاتے اور ایسا لگتا جیسے اپنے راستے میں ایک چھوٹی سی کنکری کو بھی روک دیکھنا ان کو گوارا نہ تھا۔ اتنی لمبی بیماری نے بھی اک داغ ان پر چھوڑ دیا تھا — دوسرے ہی سال اختر صاحب نے پرائیویٹ طور پر اردو میں ایم۔ اے کا امتحان دے دیا اور پھر فرسٹ کلاس فرسٹ آکر ایک اور سونے کا میڈل اور دوسری اردو کتابوں کا انعام پا لیا تھا۔ اب تک وہ صرف اپنی زندگی کو قائم رکھنے کی جدوجہد کرتے رہے تھے مگر اب ان کو زندگی گزارنے کا راستہ تلاش کرنا تھا ان کی نگاہوں میں زندگی گزارنے کا معیار بڑا ہی سیدھا سادا تھا ان کو انسانیت سے بے حد محبت تھی اور انھوں نے لکھنے اور بانٹنے کے فرق کو کبھی بھی محسوس نہ کیا تھا۔ خود بیمار رہتے رہتے ان کے دل میں انسانی زندگی کی قیمت بہت بڑھ گئی تھی۔ اور اختر صاحب شروع ہی سے برعکس طور پر دوسروں کی مدد کو اپنا ایمان سمجھتے تھے۔ شادی کے فوراً ہی بعد میں نے اپنا ایک جوڑہ کپڑا ان کو پٹنہ جاتے وقت دے دیا تھا کہ میری بھاوج کو دے دیجئے گا وہ اس کو بدل کر اچھے ڈیزائن کا خرید دیں گی۔" جب یہ واپس پہنچے تو میں نے بڑے اشتیاق سے ان کی اٹیچی کھولی، کپڑے کے بیسیوں نمونے نگاہوں میں پھر رہے تھے مگر جب اٹیچی کھلی تو اس میں کپڑے کا نام و نشان تک نہ تھا۔ وہ یہ تماشہ دیکھتے ہوئے بڑے سکون سے بولے "تمہارے کپڑے؟ وہ تو بڑے قیمتی کپڑے تھے۔ جنرل ہوسٹل میں بارہ بجے رات کو ایک لڑکی زبیدہ مر گئی تھی اس کا بھائی روتا ہوا ہوسٹل میں میرے پاس آیا اسپتال والے مردے کو آنکس روم میں بھجوانا چاہ رہے تھے مگر وہ بے چارہ شریف لڑکا اس خیال سے کانپ رہا تھا کہ جوان لڑکی غربت میں عزت اور حیا کے ساتھ مر گئی تھی اس کے بے جان جسم کو اب مردہ خانہ تک لے جانے کے لئے ڈوموں کے ہاتھ لگیں گے۔ ان لوگوں کے پاس ایک پیسہ تک نہ تھا۔ میں نے ڈاکٹروں سے کہہ کر لاش کو صبح تک اسپتال میں رکھوا لیا اور صبح ہی تمہارے کپڑے بیچ کر اس بیچاری کو سپرد خاک کر دیا۔"

اختر صاحب ایم۔ اے کے بعد تلاش روزگار میں پریشان ہی تھے کہ ان پر رہیومیٹزم کا بڑا ہی سخت حملہ ہو گیا، جوڑ جوڑ میں ورم کے ساتھ سارا جسم سوج کر کپا بن گیا تھا اور درد کے ٹیس کے ساتھ تیز بخار نے ان کو توڑ کر رکھ دیا۔ کسی طرح سے پھر وہ پٹنہ ہوسٹل کے وارڈ میں داخل کئے گئے۔ ہارٹ صاحب نے دیکھا دل پر حملے کا اثر ہو چکا تھا، چھ مہینے تک ایک طرح سے بغیر ہلے جلے ہوئے چت لیٹے رہنے کی سخت تاکید کر دی گئی تھی۔ اس وقت جب ہم ان سے

ملنے کے لئے جاتے تھے تو ان کی آنکھوں میں نفرت اور غصہ بھرا رہتا تھا اور کئی کئی دنوں تک وہ ہم لوگوں میں سے کسی سے بھی بات نہیں کیا کرتے تھے۔ مگر ایسا دورہ بھی چند ہی دنوں تک رہتا تھا، دراصل ان کو اسلام سے بے حد محبت تھی اور خدا سے ناتا کر لینے کے بعد وہ اس کو چھوڑ نہیں سکتے تھے۔ بیٹھے ہی لیٹے اشاروں میں بھی وہ ہمیشہ نماز پڑھتے رہتے تھے۔ مگر ان دنوں وہ اپنے متعلق کوئی فیصلہ نہ کر سکتے تھے کہ ان کا حشر کیا ہوگا اور ان کا مستقبل آخر کیسا بن کر رہے گا! یہ ایک ایسا دھندلکا تھا جس کے پار ان کی نگاہیں پہنچ ہی نہ سکتی تھیں۔ ڈاکٹر محمد شال نے اسپرین کی گولیاں کھلا کھلا کر ان کے درد کو دور کر دیا تھا اور اس وقت بھی جب کہ ان کے سارے جسم کے جوڑوں پر [illegible] کی تیزی کے ساتھ سفید پٹیاں بندھی تھیں ڈاکٹر محمد شال بڑے پیار بھرے خلوص میں کہتے "اختر تم جلدی سے اچھے ہو جاؤ ہم تم کو پروفیسر بنا ہوا دیکھنا چاہتے ہیں" اور ڈاکٹر محمد شال کی باتیں خدائے تعالےٰ نے آخر پوری ہی کر دیں۔ ۳۸ء کے دسمبر میں بڑے ڈرامائی انداز میں اختر صاحب کو پٹنہ کالج میں اردو کی لکچراری مل گئی تھی۔ پبلک سروس کمیشن نے ان کا نام دوسرے نمبر پر بھیجا تھا ان کے دوستوں کی ساری کمپنی یہ دیکھ کر بے چین ہو گئی کہ پہلے سے ایک کالج میں کام کرتے ہوئے لکچرار کو کمیشن نے یونیورسٹی کے چند ہی اونچے نمبروں کے معیار سے سیدھے سادے طور پر فرسٹ کر دیا تھا اور ذہنی بلندی، اعلےٰ صلاحیت، پرستائی اور بے روزگاری پر اس کی نگاہیں نہیں گئی تھیں۔ تعلیم کے منسٹر ان دنوں ڈاکٹر سید محمود صاحب تھے اختر صاحب کے دوست علی اطہر صاحب کی پہنچ وہاں تک بھی تھی اور آخر ڈاکٹر سید محمود صاحب کو انہوں نے اس بات پر راضی کر لیا تھا کہ پٹنہ کالج میں کھلے طور پر اردو کے کلاس میں تینوں فرسٹ سکنڈ تھرڈ آئے ہوئے امیدواروں سے لکچر دلایا جائے اور تب وزیر تعلیم خود سے یہ فیصلہ کریں کہ اس جگہ کا اصل حق دار کون ہو سکتا ہے! یونیورسٹی اور کالج میں یہ اک نیا تماشہ تھا، وزیر تعلیم کے ساتھ دو پارلیمنٹری سکریٹری، پرنسپل اور بہت سے پروفیسر بھی سیکڑوں لڑکوں کے ساتھ اردو کے کلاس میں پہنچ چکے تھے۔ اختر صاحب کے ہم چشموں نے یہ خبر مشہور کر رکھی تھی کہ پروفیسر نجم الدین صاحب نے اختر کو پہلے سے سوالات بتا دئے ہیں اور پروفیسر صاحب وہی مضمون ڈاکٹر صاحب کو اختر سے پوچھنے کو کہیں گے۔ یہاں تک کہ ان کے مقابلہ کے دو امیدواروں نے عین مقابلہ کے کمرہ میں ڈاکٹر صاحب سے جا کر یہ شکایت کر دی، ڈاکٹر صاحب کو بات بہت بری لگی اور انہوں نے صاف طور پر کہہ دیا کہ امتحان لینے میں آیا ہوں وہ کہ پروفیسر نجم الدین صاحب۔ اس کے بعد وزیر تعلیم نے پہلے امیدوار کے سامنے اسی وقت ایک مضمون پیش کیا اور اس پر کلاس کے سامنے تقریر کرنے کو کہا، جب وہ تقریر کر چکے تو ڈاکٹر صاحب نے بال جبریل سے چند اشعار دئے کہ اس کی تشریح کریں، جب وہ تشریح بھی کر چکے تو ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ اب آپ بال جبریل میں سے جو اشعار چاہیں اختر صاحب کو تشریح کے لئے دے دیں پہلے صاحب نے کتاب لے کر بڑے غور سے ورق گردانی شروع کر دی کہ کوئی سا شعر ایسا منتخب کریں جو اختر صاحب کے بس کا نہ ہو، جب کئی منٹ صرف ہو گئے تو یہ چیز ڈاکٹر صاحب کو بری لگی اور انہوں نے جلدی کرنے کی تاکید کی آخر انہوں نے اشعار منتخب کر کے دئے۔ اب اختر صاحب کی باری تھی اختر صاحب نے ان شعروں کی تشریح کر دی، پھر ڈاکٹر صاحب نے غالب اور فلسفے کے متعلق خود ہی اختر صاحب سے سوالات کئے اور اسی موضوع پر انکو لکچر دینے کو بھی کہا، جب وہ لکچر دے چکے تو انھی سے تیسرے صاحب کے لئے بال جبریل سے اشعار منتخب کرائے اتفاق سے وہ اشعار مسجد قرطبہ کے تھے جس کو تیسرے صاحب غلط طور پر پڑھ رہے تھے۔ کلاس کے لڑکوں نے اب ہوٹنگ کرنا شروع کر دیا تھا، اور ہمارے طفیل احمد خان سلطانپوری اور مظفر نقوی نے چن چن کر سوالات کرنے بھی شروع کر دئے تھے۔

تینوں امیدواروں کی تقریریں اپنے اپنے نمبر حاصل کر چکی تھیں وہ کانگریس کی پہلی منسٹری کا دور تھا اختر صاحب کے سوا دونوں امیدوار کانگریسی تھے محمود صاحب ابھی پٹنہ کالج کے احاطہ ہی میں تھے کہ کالج کے لڑکوں نے اپنی کامیابی میں ایک بڑا ہی پرجوش نعرہ لگایا اور مسلم لیگ زندہ باد کی گونج سن کر محمود صاحب نے متحیر ہو کر پوچھا یہ نعرہ کیسا تھا؟ علی اطہر صاحب نے ڈاکٹر صاحب کو بتایا کہ وہ لڑکے اختر زندہ باد کے نعرے لگا رہے ہیں اور یہ کہتے ہوئے انہوں نے ڈاکٹر محمود کو مبارکباد دینے کا اشارہ کر دیا۔ اختر صاحب کے دوستوں میں علی اطہر صاحب، شرف الدین احمد شرف عظیم آبادی، تمنائی، یحییٰ نقوی اور رضا نقوی نے اختر صاحب کو ایک دولہا کی طرح سجا کر پہلے پہل لکچرار کی صورت میں پٹنہ کالج بھیجنا چاہا، بکس کو کھولا گیا اس کے اندر کوئی سوٹ یا شیروانی نہیں تھی بس [illegible] امریکن شارک سکن تھا جس کو جھاڑ پونچھ کر دوستوں نے ایک ساتھ مل کر پہنایا۔ اب جوتے کا سوال رہ گیا تھا مگر جوتے ایسے تھے کہ مرمت کئے

کی طرح (نیچے نظر آ رہے تھے ہمارے مجرم صاحب وہی کٹ کا دو اور کوٹ تو خیر کسی طرح سے لٹکتے اونچے قد پر خاصا مہذب دار دکھائی دے رہا تھا مگر پاؤں میں صاف طور پر
نظر آ رہے تھے جو گھٹے ہوئے اور سستے سے جوتوں کا کیا تھا۔ ؟ سب نے اپنے اپنے پیروں پر نظر ڈالی، مگر توبہ کیجئے وہاں تو ایک کو بھی جوتوں کی ضرورت تھی۔ جیسے تیسے انہی جوتوں
پر پالش رگڑا گیا اور چمکتے ساٹن جیل قدر سے ایک فٹ ٹم پر بیٹھ کر ساری برات کالج کے نئے دولہا کے ساتھ کالج پہنچ گئی۔ وہ دن اختر صاحب کی کالج کی زندگی کا
پہلا دن تھا۔ پٹنہ کالج کے اسی احاطے میں میڈیکل کالج کے میدان کو پار، مل تھی اسی جگہ مسلم ہوسٹل کی اونچی کھڑکیوں سے سپرنٹنڈنٹ اور بعض پروفیسروں کے نام فاتحہ کی
مانگریاں پھوڑی جاتی رہی تھیں۔ انہی سترہ سالوں پر سے سیدھے قدموں سے چل کر انہوں نے اپنی وحشتناک بیماری کی حالت میں بی۔ اے کا امتحان دیا تھا۔ ان کو
اس احاطے کے کونے کونے سے بے پناہ محبت تھی۔ اختر صاحب کے دوستوں کی مختلف پارٹیاں ہیں جو بھی ان سے ذرا خلوص سے ملا وہ ان کی زندگی سے کبھی قدم نہ
ہٹ سکا۔ کالج کا اسٹاف اگر ان کے دوستوں میں شریک ہے تو کالج کے لڑکے ان کے اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز! اور اختر صاحب کو اس بات کی بے حد خوشی ہے کہ آج
وہ سترہ سالوں سے صرف اپنے کلاس ہی کے نہیں بلکہ اکثر دوسرے کالجوں کے لڑکوں کے لئے بھی تابندہ مستقبل کی تعمیر کی جدوجہد کرتے رہے ہیں۔ ان کا تعلق اپنے
شاگردوں سے جہاں اپنے عزیزوں کی طرح ہے وہاں ایک باوقار اور پرخلوص دوست کی طرح بھی۔ بہار کے پرانے شاعر اور ادیبوں کے لئے اختر صاحب کی
نگاہوں میں بڑی عزت بڑا احترام ہے۔ اس کے ساتھ ہی وہ نئی پود میں ادب اور شاعری کی ذرا سی بھی صلاحیت دیکھ کر اپنی خوشیوں کا اظہار کرتے ہوئے اس کو آگے
بڑھانے میں کوشاں رہیں گے۔ مگر اتنے وسیع اخلاق کے باوجود بھی اختر صاحب کے مخصوص دوستوں کا ایک بے تکلف گروپ بھی تھا جو اب پاکستان چلے جانے
سے ٹوٹ کر رہ گیا ہے۔ دوستوں نے ان کے ساتھ جہاں محبت اور وفاداری کا بہت ثبوت دیا ہے وہاں اختر صاحب کو بھی اپنے دوستوں سے بے حد محبت
رہی ہے۔ انہوں نے اپنے دوستوں کی ضرورت کو ہمیشہ اپنی ضرورت سے زیادہ اہمیت دی ہے۔ ان کے ایک دوست کو اپنے والد کے لئے مقدمے کی فیس جمع
کرنے کو روپے کی ضرورت تھی اختر صاحب نے جب اپنی جیب خالی دیکھی تو پھر انہوں نے بڑے اطمینان سے اپنے بی۔ اے اور ایم۔ اے کے امتحانوں میں ملی ہوئی
سونے کی میڈلوں کے ساتھ اپنے اور بھی جیتے ہوئے سونے اور چاندی کے میڈلوں اور کپوں کو اونے پونے بیچ کر روپے اپنے دوست کے حوالے کر دئے اور
جب اس فرض کو ادا کر کے وہ مجھ کو خوشخبری سنانے آئے تو میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ یادگار چیزیں گھر میں رہنے کی بجائے دوکانوں پر بک چکی تھیں۔ اور اسی
ڈر سے میں نے انگریزی اور اردو کی ان ساری کتابوں کو جو انہیں انعام میں ملی تھیں ارتھل میں اپنے کمرے کی الماری میں بند کر کے مضبوط تالا لگا دیا تھا۔

ایک تو منتوں کے بعد پیدا ہونے والی اولاد عموماً للا بابو ہو کر رہ جاتی ہے اس پر سے بچپن میں ٹائیفائڈ اور کالا آزار جیسی لمبی بیماریوں نے ان کی طبیعت میں
لاڈ، ضد اور حکومت پیدا کر کے شاہی آرام طلب بنا دیا تھا، وہ تو کچھ خاندانی ذہانت ہی تھی جو ہمیشہ کام آتی رہی۔ ان کا سارا بچپن بیماریوں میں کٹ گیا تھا اور دعائیں
کرتی رہنے والی شفیق ماں کے اُٹھتے ہوئے ہاتھ اختر صاحب کے میٹرک پاس ہونے سے کچھ دنوں پہلے ہی خاموشی کے ساتھ قبر میں چھپ گئے تھے۔ نوجوانی
کے عالم میں تمناؤں کی رنگینیوں سے بھی پہلے منہ سے خون کے تھکے آنے لگے تھے اور جب سینی ٹوریم سے اچھے ہو کر واپس آئے تو ریومیٹزم کے سخت حملے کے ساتھ
دل پر بھی ہلکا سا اثر پڑ گیا تھا۔ بڑا پھونک پھونک کر قدم ڈالتے ہوئے وہ اپنی ملازمت کو نبھاتے آ رہے ہیں عمدہ غذا، ہوادار مکان اور آرام، ان کی زندگی کا
ایک ضروری جز بن کر رہ گئے ہیں۔ کالج کے فرائض کے ساتھ دنیا بھر کے کاموں کا ایک جھنجھٹ ان کے ساتھ لگا رہتا ہے اور اس کے ساتھ ہی ساتھ جلسوں
میں گھنٹوں تقریریں کرتے رہنے کا تو اب جیسے پیشہ ہی بن کر رہ گیا ہے۔ اور اختر صاحب کے ساتھ سارے لوگ یہ جانتے ہیں کہ حضرت امام جماعت احمدیہ مرزا
بشیر الدین محمود احمد ایدہ اللہ کی مخلصانہ دعاؤں کی قبولیت سے اللہ تعالیٰ نے معجزانہ طور پر ان کو باعزت طرح پر زندہ رکھ کر انسانیت اور قوم کی خدمت کا موقعہ
عطا کیا ہے۔ سنہ ۴۲ء کے ہنگاموں سے لیکر جنگ اور فتنہ و فساد تک کی ہولناکیوں میں روزانہ کی زندگی کتنی دشوار گذار بن کر رہ گئی تھی اختر صاحب آج تک ان
سے لاعلم رہے ہیں۔ آنے والے مہمانوں اور عزیزوں کی کثرت سے مجبور ہو کر میں کسی وقت ان سے بہتر گوشت یا چینی کی پرمٹ کے لئے درخواست لکھانے جاتی
تو وہ صاف طور پر میٹھی چیزوں اور پکے ہوئے کھانا کھانے سے ہی انکار کرتے ہوئے اعلانیہ طور پر کہہ دیتے کہ وہ ایک ساتھ دو کام نہیں کر سکتے ہیں۔ یا تو وہ کوئلہ
گلابی اور چینی کی فکر کریں گے یا پھر پڑھیں گے۔ اور میں قلم اور سادہ کاغذ لئے جھنجھلائی ہوئی ان کے کمرے سے نکل آتی۔ اختر صاحب کا گھریلو زندگی کا شروع سے

کے ساتھ ہی کبھی خالی نہ رہا تھا۔ ان کے اور میرے بھائیوں سے ہمیشہ ان کے مکان میں ایک رونق رہی تھی مگر وہ سب کے سب لڑکے اپنے اپنے ایسے کمرے چن بیٹھے تھے جو اختر صاحب سے دور دور ہیں۔ جب غصے کی حالت میں قلم اور سادہ کاغذ لئے میں ان لڑکوں کے پاس پہنچتی تو وہ بھی بڑے ٹھسّے اور شان سے کہہ دیا کرتے کہ ہم بھی ایک ساتھ دو کام نہیں کر سکتے ہیں یا تو یہ مسٹ ہی لکھتے رہیں گے یا پھر کورس کی پڑھائی ہوگی"۔ اور آخر جیسے تیسے لکھ لکھا کر میں ہی اپنا کام آخر سنبھالتی اور نوکروں کو ساتھ لئے کوئلے اور چینی کے ساتھ ضرورت کی اور بھی بہت سی چیزیں حاصل کرنے کو نکل جاتی۔ خدا کا شکر ہے کہ اختر صاحب کے گھر سے ان سترہ برسوں میں کئی عزیز پروفیسر، ڈاکٹر، انجینئر اور سپرنٹنڈنٹ پولیس ہو کر نکلے ہیں۔ اپنوں کے ساتھ کئی غیروں نے بھی میٹرک۔ بی۔ ایس۔ سی اور ایم۔ اے اس گھر سے پاس کیا ہے۔ زمانے میں کیا کچھ نہ ہوتا رہا۔ اختر صاحب ابھی تک بے خبر ہیں کہ کون سی چیز نایاب ہوگئی تھی اور اب کن چیزوں کی فراوانی ہے نہ مارکٹنگ، شور اور ہنگاموں سے وہ بچہ کی طرح گھبراتے ہیں۔ اچھی اور بری چیزوں کی پہچان وہ خریداری میں دام کے لحاظ سے کرتے ہیں جو چیز سستی مل گئی بس زندگی گزارنے کے لئے وہی بہتر ہے۔ ایک دفعہ اگلی سے واپس آکر اپنی ڈگری کے سلسلے میں علی گڑھ سے واپس آتے آرہ میں ٹھہرے اور وہاں میرے لئے خاص طور پر انھوں نے تحفہ خریدا۔ ان دنوں میں اور ین بیل تھی۔ آتے ہی بڑی محبت سے کہا میں تمہارے لئے دو تحفے خرید کر لایا ہوں"۔ اور جب ان تحفوں پر میری نظر پڑی تو جی جل کر بس خاک ہی تو ہوگئی۔ موٹی ٹاٹ کا کالا سا سکڑا ہوا بہت ہی بدشکل ۶ روپے جوڑہ والا چپل تھا اور کھدر کی بدصورت سی ایک ساڑی تھی، تب سے میں نے کہہ دیا کہ "بھئی بس تو باز رہی آپ کے تحفے سے" مگر وہ پورے آٹھ دن بڑے معرکے کا جھگڑا کرتے رہے تھے۔ اختر صاحب بہت بڑے ادیب، تنقید نگار اردو کے محسن، یونیورسٹی میں اردو کے چیئرمین اور ہر طرح سے آئیڈیل انسان ہوں تو ہوں ـــــ مگر وہ اپنی زندگی گزارنے سے ہمیشہ کوسوں دور رہے ہیں!

گھر کے اندر جہاں میرے ساتھ ان کو بھی صفائی کا خبط ہے وہاں وہ مجھ سے دیر دیر تک اس بات پر جھگڑتے رہیں گے کہ پلنگ کی چادر، تکیہ کا غلاف، میز پوش اور دروازے کے پردے فضول اور بیکار چیزیں ہیں اور یہی کپڑے غریبوں کے جسم پر ہونا چاہئے۔ لیکن جب میں اپنے روپیہ سے چادر وغیرہ منگا لوں گی تب بڑے اطمینان سے فرمائیں گے کہ تمہاری چادر کا ڈیزائن بڑا اچھا ہے اور اس کمرے کے فرش پر تھوڑا سا لگا ہوا دھبہ برا معلوم ہو رہا ہے۔ ان کے ملنے جلنے کا حلقہ بڑا عجیب ہے وہ بڑے سے بڑے منسٹروں اور راج بھون کے مشاعروں کے انتظام کار بنتے ہوئے بھی اپنے آپ پر ان کا احسان لینا پسند نہیں کرتے اگر دعوتیں کرتے رہنے کا بے حد شوق ہے۔ جب کبھی ان کو کسی کتاب یا امتحان کے پیپر دیکھنے کا پیسہ ملے گا وہ میرے پاس آئیں گے: "مجھے اتنے لوگوں کی دعوت کرنی ہے، چیزیں سب گھر کی پکی اور عمدہ ہوں جوڑ کر بتاؤ کتنا خرچ آئے گا؟" اور جب میں مہمانوں کی تعداد اور کھانے کی فہرست بنا کر کہتی کہ تیس یا چالیس روپے لگیں گے" تب وہ اکھڑ جاتے ہیں اور پچیس مہمانوں کو عمدہ قسم کا کھانا وہ صرف پندرہ روپے میں کھلانے کی کوشش کریں گے۔ اس سے زیادہ مجھ کو غصہ آجاتا ہے جہاں پانچ روپے سیر گھی ہو اور ایک ایک مرغیاں دو دو روپے میں آئیں وہاں بیسیوں قسم کی عمدہ چیزیں پندرہ بیس روپے میں آپ کسی اور سے بنوا لیجئے۔ اور اکثر یہ بلا میرے سر سے ٹل جاتی ہے۔ اور کبھی ان کو بھی اپنے حساب سے فاضل خرچ کرنا پڑتا ہے۔ ایک دفعہ چیف منسٹر کو کھانے پر بلانے کا سوچ رہے تھے۔ کھانے کی فہرست تیار کرلی گئی کھلانے کے لئے کمرے تک کا انتخاب ہو چکا تھا کہ اچانک مجھ کو برتنوں کی یاد آئی وہ بڑے اطمینان سے بولے گھر میں جو بھی برتن ہیں اسی سے کام چلایا جائے گا۔ میں نے صاف طور پر بے جوڑ برتنوں میں کھانا کھلانے سے انکار کر دیا۔ لاکھ انھوں نے اس بات پر ضد کیا کہ وہ بچارے لوگ تو پتوں پر بھی کھانا کھایا کرتے ہیں۔ لیکن میں نہ مانی اور وہ بہت دیر تک پیچ و تاب کھاتے رہے ان کو رہ رہ کر اسی کا غم تھا کہ "اپنے گھر میں وہ اپنی خوشی سے کچھ کر بھی نہیں سکتے ہیں" اور اسی "اپنے" کے لفظ پر میری ان سے کافی لڑائی ہوتی رہی ہے۔ اور ایسے ہی بے سر پیر کی لڑائیاں ہم اکثر لڑتے رہتے ہیں۔ اختر صاحب میں جو سب سے بڑا عیب ہے وہ یہی کہ معمولی سی معمولی بات کر بھی غصے میں اتنے زور سے بولا کریں گے کہ دور سے دیکھنے والا یہی سمجھے گا کہ بڑی بھاری جنگ ہو رہی ہے اور وہ جہاں زور سے بولے بس میرے دماغ کا پارہ اپنی انتہا کو پہنچ جاتا ہے۔ تو یہ بھی کوئی بات ہوئی کہ آہستہ سے بول ہی نہیں سکتے۔ پھر وہ جیسے خود انتہائی سادگی سے رہتے ہیں اسی طرح سے اپنے معزز مہمانوں کو بھی رکھنا چاہتے ہیں۔ مہمانوں کی یہی چیز مجھے کھلا دیتی ہے شام کی جاتے ختم ہوتے ہی وہ میرے پاس آئے "مجاز کے لڑکے مرثیے کو آگئے ہیں میں اسٹیشن پر جگر مرادآبادی کو لینے جا رہا ہوں، لوگوں نے کوشش کی تھی

کہ ان کو کیسا اچھے ہوٹل میں ٹھہرایش گے لیکن اتفاق سے یہ صحیح نہیں ہو سکا ہے اب میں جب بیگم صاحب کو اپنے ہی پاس رکھوں گا" یہ سنتے ہی بیسے ہوش اڑ گئے۔ چپسٹے تیار بیٹھے گھر کی صفائی ہو جاتی، آ خر دیکھا کہیں گے کہ کیسے بدتمیز لوگ ہیں یہاں کے" اور وہ چڑھ کر بولتے "بڑے لوگوں کی نگاہ میں اتنی چھوٹی چھوٹی باتوں پہ نہیں جاتیں گی کہیں گے کیا میں کوئی نواب کا ناتی عقرڈا ہی ہوں جو اپنی شان جتاتا پھروں بس ہم جیسے ہیں ویسے ہی رہیں گے" اور جب اختر صاحب کے مختلف گھروں میں مجاز، ساحر، حفیظ، سلام، عبادت بریلوی، سرور، احتشام، فراق، اپندر ناتھ اشک، عرش ملسیانی، عبدالقادر سروری، جعفر علی خان اثر اور جگر مراد آبادی جیسے معزز مہمان آتے رہے تو اگر ان دنوں میں پٹنہ میں رہتی تو بس یہی جی چاہتا ہے کہ مہمانوں کے رہنے تک میں اس گھر سے کہیں دور چلی جاتی تاکہ اختر صاحب کے پھوہڑپن کا الزام مجھ پر عائد نہ ہو۔ بڑے سے بڑے محترم مہمانوں کو وہ بڑی فراخ دلی سے اپنے گھر میں ٹھہرا کر خوشی محسوس کرتے رہتے ہیں اور میں اتنے عرصے تک ان کی شایان شان خدمت نہ کر سکنے کے احساس اور غم سے تڑپتی رہتی ہوں۔ مہمان مجھ کو بے حد عزیز ہیں اور اندل کی جہان نوازی بہار بھر میں مشہور ہے مگر اختر صاحب کا اصول نرالا ہے کہ وہ زمین پر چٹائی بچھا کر مٹی کے برتنوں میں بھی اپنے مہمانوں کو کھلا کر خوشی محسوس کریں گے اور میں تو اپنے مہمانوں کو سر آنکھوں پہ بٹھانے کی قائل ہوں۔

گھر کے اندر جب ہم دو ادیبوں کی حیثیت سے گفتگو کرنے لگتے ہیں تو گھر میں آئے ہوئے عزیزوں کو ہمارا یہ کھیل بڑا اچھا لگتا ہے، ادب شاعری اور فلسفہ پہ باتیں کرتے کرتے ہم مذہب اور قرآن شریف کی تفسیر کبیر تک پہنچ جاتے ہیں، جب تک ہم دونوں ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ تب تک تو گفتگو میں اپنایت قائم رہتی ہے مگر ایسا کچھ ہی دیر رہتا ہے پھر ہم الگ راستوں پہ مڑ کر بحثیں شروع کر دیتے ہیں اور اس کا نتیجہ کبھی یہ بھی نکلتا ہے کہ ہم آٹھ آٹھ دنوں تک ایک دوسرے سے بول چال بند کر دیتے ہیں۔ اختر صاحب کا گھر کبھی مہمانوں سے خالی نہ رہا ان کے رشتہ داروں سے زیادہ میرے عزیزوں کو پٹنہ کی ضرورت رہتی ہے لیکن میرے عزیز بھی تو انہی کی چچا زاد بہن کے بچے ہیں۔ جب کبھی ان کو کہیں سے روپیہ ملتا ہے وہ تاش کے پتوں کی طرح پھینٹتے ہوئے روپے کو بانٹ دیتے ہیں اور روپے دینے کی عجیب عجیب صورتیں ہوا کرتی ہیں: عذرا اگر دن بھر ہنستی رہیں گی تو ان کو دس روپیہ ملے گا، شمیم نے اگر آج ایک شعر کا بھی معنی بتا دیا تو وہ پندرہ روپے جیت لیں گی۔ اور شہلا کی دعا سے اگر ایک ہفتہ کے اندر پبلشر آگیا اور اس نے بقایا روپیہ دے دیا تو پچاس روپے شہلا کے ہوں گے۔ کبھی کو افسانے کا فن سمجھنے پر انعام دیا جا رہا ہے تو کسی کو زیادہ شعر یاد رکھنے پر۔ لیکن ابھی تک مجھ کو یاد ہے کہ شادی سے پہلے پانچ روپے کا لالچ دے کر انہوں نے مجھ سے پورا شکوہ یاد کرا لیا تھا اور آج تک میرے وہ پانچ روپے باقی ہی رہ گئے ہیں۔ اختر صاحب سمجھ میں آنے والی چیز نہیں ہیں۔ جوتے نہیں ہیں قمیضوں کی سخت ضرورت ہے کوٹ میں سے پیوند نکل آئے ہیں کبھی کبھی کالج جاتے وقت کپڑوں کی تنگی کا رونا رویا جا رہا ہے مگر پیسے جب بھی آئے فاضل ہی سمجھے گئے۔ اختر صاحب کے گھر میں ان کا اپنا کوئی بچہ نہیں ہے مگر جو ایک نسل پہلے پڑھ کر نکل چکی ہے اب ان کی نسل پڑھنے آگئی ہے اور اس طرح سے خدا نے ایک ہی ساتھ چھپر پھاڑ کر آٹھ آٹھ بچے دے دیئے ہیں۔ ممی اور مجی اختر صاحب کے بھائی فضل احمد آئی۔ پی۔ ایس اور میری اپنی تیسری بہن صوفیہ شہناز کے بچے ہیں اور جو چار سالوں کی عمر سے میرے پاس رہ کر کونونٹ میں تعلیم پا رہے ہیں۔ میری منجھلی بہن رضیہ رعنا کا بچہ ممی سینٹ زیویر میں ہے چوتھی بہن عذرا کی بچی سیمیں اور میرے بھائی لیکچرر عزیز احمد کی بچی نسرین کونونٹ کے بچہ کلاس میں ہیں۔ اور نقو ممی کی بہن شیریں اور میری سب سے چھوٹی بہن ندو می ہائی اسکول میں۔ اور اختر صاحب کے چچا زاد بھائی کا بچہ تاج مسلم اسکول میں، گھر۔ اب گھر نہیں ہے وہ ایک بورڈنگ ہاؤس بن کر رہ گیا ہے جہاں قدم قدم پہ ماسٹر جگہ جگہ پر پنسل، سلیٹ اور اسکولوں کی کتابیں بکھری پڑی رہتی ہیں۔ صبح کو آٹھ بجے جب سارے بچے کونونٹ اور اسکول چلے جاتے ہیں تو دماغ ہلکا ہلکا سا لگتا ہے اور جب چار بجے رکشا موٹریں اور گاڑیاں ان سب کو لا لا کر پہنچانے لگتی ہیں تو پھر گھر سے کہیں بھاگ جانے کو جی چاہتا رہتا ہے۔ اور آئے ہوئے مہمان بچوں کی اس فوج سے بُری طرح گھبرا گھبرا کر بھی آنے سے باز نہیں رہتے۔ اختر صاحب کا دستر خوان ہمیشہ سے بڑا لمبا چوڑا بچھتا رہا ہے گھر کے سارے لوگ ایک ہی ساتھ کھانا کھایا کرتے ہیں اور کھانے کے درمیان ایسی ایسی مزیدار باتوں کا سلسلہ چلتا ہے کہ گیارہ ، بارہ بجے رات تک پاجامے محفل جمی رہتی ہے جو بچے ہاتھ منہ دھو کر بھر جاتے ہیں پھر بھی کسی کا جی پلنگ پہ جانے کو نہیں چاہتا۔

اختر صاحب کی بعض خصلتیں عجیب ہیں۔ وہ اپنی چابی کسی کو نہیں دیں گے بکس میں اگرچہ کوئی خاص چیز نہیں ہے پھر بھی کسی کو چھونے نہیں دیا جائیگا سارا
گھر چھوڑ کر بس وہ اپنے لئے ایک کمرہ مخصوص کر لیتے ہیں اسی ایک کمرے میں ان کی ساری چیزیں اپنی اپنی مقررہ جگہوں پر دھری رہیں گی کسی نے ان کے کمرے کی
کسی ایک چیز کو بھی چھیڑ دیا بس تو پھر بھڑ کے چھتے کو ہاتھ لگ گیا۔ ان کے لکھنے کی میز پر ٹنوں گرد ہو تو ہو مگر اس کو کوئی چھوئے نہیں۔ میں جب جا جا کر
مرتے مارتے پر تل جاتی ہوں تب غریب میز کی قسمت چمکتی ہے۔ اختر صاحب کے افسانے لکھنے کی بھی عجیب شان ہے کمرہ صاف ہو میز پر ساری چیزیں ان کے
خیال سے اپنی اپنی جگہ پہ ہوں موسم ان کی پسند کا ہو کالج میں ان دنوں زیادہ کام نہ رہیں اور گھر کے اندر مہمانوں کا بڑھتا ہوا سیلاب نہ ہو۔ تب وہ افسانہ
یا کوئی مضمون لکھنا شروع کریں گے پتلی پتلی سفید اور گلابی رنگ کی انگلیاں دو تین ہی صفحوں تک چلتے چلتے تھک جائیں گی باہر دروازے پر کبھی ہلکے اور کبھی زور
سے دستک ہونے لگے گی کبھی ملاقاتی کارڈ آنے لگیں گے اور اختر صاحب سے روزانہ ملنے والوں کا پھر اک تانتا بندھ جائے گا۔ صبح سے دوپہر دوپہر سے
شام اور شام سے رات، رات تک نہ جانے کتنے قسم کے لوگ آتے رہیں گے اور اختر صاحب قلم سے زبان سے اور پھر اپنی تفصیلی باتوں سے ان سب کی
خدمت کا پورا حق ادا کر کے تھکے ہوئے سے اپنی مسہری پر لیٹ کر آرام کرنا شروع کر دیں گے اور اس طرح سے کبھی کبھی تو پندرہ دن تک بھی ان کا افسانہ ختم ہونے
کا نام ہی نہیں لیتا ہے گھر کے اندر میری پانچویں بہن شہلا تیز آواز میں ریڈیو بجاتی رہتی ہے بچے آنکھ مچولی کھیلنا شروع کر دیتے ہیں اور ہماری بہنیں پٹنہ مارکٹ
سے تازہ تازہ خریدی ہوئی چیزوں پر تفصیلی گفتگو کرنے لگتی ہیں اور جب عین اسی وقت میں گھر کے نوکروں یا باورچی پر مجھے غصہ آ جاتا ہے تب تو گورنمنٹ کالج
کوارٹر ایک چڑیا خانہ ہی نظر آتا ہے اس وقت اختر صاحب بیچارے اپنی چندیا پر مشکلوں سے بچائے ہوئے کچھ غنیمت سے بال پر آملہ کا تیل سکھاتے ہوئے
باہر اپنے احاطے میں ٹہلنے کو نکل جاتے ہیں۔

اختر صاحب کی ایک خاص چیز ان کا بجٹ ہے۔ ہر تھوڑے دنوں کے بعد وہ اپنا بجٹ بناتے ہیں، ہر مہینہ ایک خاصی رقم جو ان کی آمدنی پر لگتی ہے
تبلیغ اسلام کے لئے چندہ بھیج دینے کے بعد اپنے روزانہ کا حساب بناتے ہیں بجٹ ہی کے حساب سے بالکل نپے تلے ہوئے سارا مہینہ گزار دیتے ہیں اور
اگر یونیورسٹی یا کسی پبلشر سے فاضل روپے مل گئے تب تو پھر جی چاہا خرچ کرتے رہے۔ ان کو کسی چیز کی عادت نہیں ہے نہ وہ سگریٹ پیتے ہیں نہ پان اور
نہ چائے، بس ایک عادت عمدہ غذا، دوائیں اور آرام کرتے رہنے کی ایسی ہے جو سب عادتوں سے بڑھ چڑھ کر ہے ——!

اختر صاحب کی اب تک دس کتابیں شائع ہو چکی ہیں جن میں افسانے، ڈرامے، ناولٹ اور تنقیدی مضامین سبھی ہیں، انہوں نے ایک ناول "تعمیر"
بھی لکھا ہے جو کئی سالوں سے لکھا ہوا بکس میں دھرا ہے، ہندوستان میں غریب اردو پر کوئی پبلشر اپنا سرمایہ لگاتے ہوئے ڈرتا ہے اور پاکستان ہمارے
لئے دوسرا ہی دیس ٹھہرا۔ ان کے افسانوں کا ایک مجموعہ اور ایک نظموں کا مجموعہ بھی مسودوں کی صورت میں پڑا کسی آنے والے اچھے دن کی راہ تک رہا ہے

اختر صاحب کو بہار کے آم اور چھوٹا ناگپور کے مناظر بہت پسند ہیں۔ جب وہ کالج کا کام کرتے کرتے تھک جاتے ہیں تو سوچتے ہیں کہ اوریتن[1] کی
پہاڑی پر حضرت بدھ کی طرح بیٹھ کر سکون اور نروان حاصل کریں گے۔

اختر صاحب حاجی پور زیدی سیدوں کے گھرانے سے ہیں۔ اوریتن میں ان کے بزرگ سید احمد جان فیروز تغلق کے زمانے میں آکر بسے تھے اور فوجی
کارناموں میں انہوں نے جاگیر پائی تھی۔ میرا خیال ہے کہ اپنی ضد اور چڑچڑاہٹ کے باوجود اپنی پرمذاق طبیعت، سادگی، علمی صلاحیت اور نرمی کے ساتھ وہ
ہنستے ہوئے آئیڈیل آدمی ہوتے اگر چھوٹی چھوٹی باتوں میں مجھ سے وہ الجھتے نہ رہتے۔

---

[1] نوٹ:- اوریتن کی بستی میں ایک پہاڑی ہے جس پر پالی زبان میں کتبے لکھے ہوئے ہیں اور بدھ کی مورتیاں بنی ہوئی ہیں کہا جاتا ہے کہ مہاتما بدھ نے
اس پہاڑی پر آکر دھیان کیا تھا!

حیات اللہ انصاری

مسیح الحسن رضوی

جب کسی شخص کی زندگی ہنگاموں سے خالی ہو، اس میں گھن گرج کی کیفیت نہ ہو، بلکہ اس کے برعکس نرم رو دریا کی سی کیفیت ہو تو اس کے بارے میں کیا اور کیونکر کہا جائے؟ حیات اللہ انصاری افسانہ نگار ہیں، صحافی ہیں اور اب لیڈر بھی بنتے جا رہے ہیں، ان میں سے اگر کسی بھی حیات اللہ کو ہاتھ لگایا جائے گا تو دوسرے حیات اللہ کا ذکر ناگزیر ہو جائے گا۔ اس سے بچنے کا آسان نسخہ یہ ہے کہ آپ کے سامنے اس حیات اللہ کو پیش کیا جائے جو ان تینوں چیزوں کا مرکب ہے —— حیات اللہ جو انسان ہے اور سب کچھ بعد میں۔

اس حیات اللہ نے زمانہ کے بڑے سرد و گرم چکھے ہیں۔ عزیزوں کی خفگی، دوستوں کی بے زاری اور تمسخر۔ عزیزوں کی خفگی کے سبب ایک زمانہ میں فرنگی محل سے "بن باس" ملا اور دوستوں کی بے زاری کے سبب انجمن ترقی پسند مصنفین سے علٰحدگی اختیار کرنا پڑی۔ اب جب کہ حیات اللہ انصاری اپنی راہ الگ میں کامیاب ہو گئے ہیں تو دوست تو دوست عزیز بھی انہیں اپنا رہے ہیں۔ فرنگی محلیوں سے ملئے تو وہ آپ کو بتلائیں گے کہ حیات اللہ کا تعلق فرنگی محل سے ہے۔ دوست کہیں گے کہ انجمن ترقی پسند مصنفین کے بنانے میں حیات اللہ انصاری کا ہم سے کم ہاتھ نہیں ہے۔ بلکہ سہ کانفرنس میں تو ڈاکٹر علیم نے یہاں تک کہہ دیا تھا کہ ایک زمانہ میں حیات اللہ ہم سے زیادہ گرم کمیونسٹ تھے اور ہمیں انہیں لگام دینے کے لئے کہنا پڑتا تھا کہ "ذرا سنبھل کے، آگے خندق ہے"۔ بہرکیف حیات اللہ انصاری خندق میں گرنے سے بچ گئے۔ اس میں ڈاکٹر علیم کا مشورہ شامل تھا یا خود حیات اللہ کی کوششوں اور سمجھ کا ہاتھ، یہ کہنا مشکل ہے۔ لیکن ان کی اس تبدیلی کا ان کے دوستوں پر بڑا ناگوار ردِ عمل ہوا جو بقول ان کے بزرگوں کے حیات اللہ انصاری کی صحبت میں پڑ کر خراب ہو چکے تھے۔ کمیونسٹ حیات اللہ گاندھیائی بن گئے تھے اور ہندستان (ہفتہ وار لکھنؤ) کی اڈیٹری کر کے بڑے زور شور سے گاندھیائی فلسفۂ حیات کی تبلیغ کر رہے تھے۔ دوست ان کی اس تبدیلی کا مذاق اڑاتے پھر رہے تھے۔ اس مذاق اڑانے کا سلسلہ اب تک جاری ہے۔ چنانچہ جب انہوں نے چند سال ادھر اردو کو علاقائی زبان بنانے کے لئے دستخطی مہم چلائی تب بھی ان کا مذاق اڑایا گیا۔ جب انہوں نے صدر جمہوریہ ہند کی خدمت میں بیس لاکھ دستخط پیش کر دیئے تب بھی ان کا مذاق اڑایا

گیا جب انہوں نے کل ہند امن کونسل کے ممتاز رکن اور ہندی کے افسانہ نگار یشپال کی اردو دشمنی کے خلاف اپنے اخبار میں احتجاج کیا اور انہیں کلچر دشمن ٹھہرایا اس وقت بھی ان کا مذاق اڑایا گیا اور ایک بھرے جلسہ میں ملک راج آنند نے حیات اللہ کو اپنے الفاظ واپس لینے کا حکم دیا۔ اور شاید یہ سن کر آپ کو تعجب ہو کہ جب لکھنؤ کے ایک انگریزی روزنامہ میں کسی نیپالی نے پیغمبر اسلام کے نام پر اپنے کتے کا نام رکھ کر اس کی گمشدگی کا اشتہار دیا اور حیات اللہ انصاری نے اپنے اخبار قومی آواز کے ذریعہ اس کے خلاف احتجاج کیا تب بھی بعض حلقوں کی طرف سے ان کا مذاق اڑایا گیا اور ان کو فرقہ پرست اور رجعت پسند کہا گیا۔ جب اردو کی دستخطی مہم کے سلسلہ میں ایک بڑے جلسہ عام ان پر قاتلانہ حملہ ہوا تو ان کی "گاندھیائی ستیہ گرہ" کا مذاق اڑایا گیا۔ تو کہنے کا مطلب یہ ہے کہ حیات اللہ انصاری کی زندگی اس مذاق اڑانے کے شیطانی چکر کے درمیان پروان چڑھی ہے۔ لیکن خود ان کے کردار پر اس کا بڑا خوشگوار رد عمل ہوا ہے۔ وہ اپنے دشمنوں کے بھی دوست ہیں اور دوستوں کے یار غار۔ وہ ہر شخص کی زندگی میں اچھے پہلو ڈھونڈھ نکالتے ہیں۔ پھر ان ہی اچھے پہلوؤں کے سہارے وہ اس شخص سے اپنے تعلقات کی عمارت استوار کرتے ہیں۔ اور ان کی یہ ٹکنک اتنی کامیاب رہی ہے کہ اب ان کے مخالفین بھی ان کا احترام کرنے کے لئے اپنے کو مجبور پاتے ہیں۔

اس مضمون کو آگے بڑھانے سے قبل میں آپ کے سامنے سنہ ۱۹۲۶ء کے حیات اللہ کا کچھ ذکر کروں گا۔

غالباً اس وقت حیات اللہ کی عمر تیرہ چودہ سال کی رہی ہوگی۔ فرنگی محل کے ایک حصہ میں وہ اپنے والد مولانا وحید اللہ مرحوم کے ساتھ رہتے تھے۔ ایک بے چین بچہ جس کا اپنا کمرہ، حیات منزل (ایک کیوریو شاپ و نوادر کی دکان)، تھا جس میں ہر طرح کی چیزیں تھیں۔ کوک سے خود بخود چلنے والا پنکھا، توپ، تھیٹر کے پردے، بائیسکوپ کی مشین، عجیب و غریب میزیں اور کرسیاں، طلسم ہوشربا، فسانۂ آزاد اور نہ جانے کیا الم غلم۔ یہ سب چیزیں خود حیات اللہ کی بنائی ہوئی تھیں۔ ان کے بچپن کے ایک ساتھی کا کہنا ہے کہ اگر حیات کو انجینیری کی تعلیم دی جاتی تو وہ آج ملک کا ایک ماہر انجینیر ہوتا۔ ہندوستان کی تاریخ میں یہ وہ زمانہ تھا جب تحریک خلافت دم توڑ چکی تھی۔ مسلمان اور خصوصاً اس کے علما کا طبقہ میدان میں آنے کے بعد پیچھے ہٹ گیا تھا۔ حیات اللہ کا تعلق چونکہ علما کے خاندان سے تھا ۔ یہ وہ زمانہ تھا جب سیاسی افراتفری اور علما کی باہمی پھوٹ کی وجہ سے فرنگی محل کی قیادت کا آفتاب بھی غروب ہو چکا تھا ان حالات اور ماحول میں حیات اللہ فرنگی محل میں تعلیم و تربیت حاصل کر رہے تھے۔ ان کی جدت پسندی، ذہانت اور روشن خیالی کا احساس اس وقت عام طور پر فرنگی محل میں کیا جانے لگا تھا۔ چنانچہ ان کے ہم عمر ساتھیوں کو ان کی صحبت میں بیٹھنے اور اپنا وقت برباد کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ لیکن فرنگی محل کے بچے اس وقت اپنے بزرگوں کے بچپن کے مقابلہ میں کم سعادت مند واقع ہوئے تھے اس لئے وہ چھپا چوری حیات منزل میں جمع ہوتے اور اس لڑکے کے کارنامے اور سائنس سن کر اپنے جذبۂ تحیر کو تسکین دیتے۔ اس زمانہ کے دو واقعات خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ایک مولانا کو فرنگی محل کے ایک مکان کے کمرہ میں "جلوۂ طور" نظر آنا اور حیات اللہ انصاری کا مسجد آصفی کے عقب میں واقع ایک دوسری چھوٹی مسجد کے مینار سے چھلانگ لگانا۔

پہلا واقعہ اس طرح ہے کہ حیات اللہ کہیں سے ایک تیز روشنی والا دھماکا لے آئے۔ اور جب مولانا تہجد ادا کرنے کے بعد سو گئے تو انہوں نے اس دھماکے کو داغ دیا۔ چاروں طرف روشنی ہو گئی اور مولانا چلائے کہ —— "نور الٰہی انوار الٰہی ——" کہتے ہیں کہ اس واقعہ کے بعد مولانا ہمیشہ کے لئے مجذوب ہو گئے۔

دوسرا واقعہ راوی نے اس طرح بیان کیا ہے کہ ایک دن حیات منزل میں لڑکے جمع تھے۔ حیات اللہ نے ان سب سے اپنے مینار سے چھلانگ لگانے اور بانسوں کے درختوں کے ایک جھنڈ کے بانس کی مدد سے، جو مینار کی اونچائی تک پہنچتا تھا، اپنے نیچے تک بخیر و خوبی پہنچنے کی حیرت انگیز داستان بیان کی۔ لڑکوں کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ اس واقعہ کے بعد حیات اللہ اس ٹولی کے مسلمہ لیڈر بن گئے۔ اب ان کی قیادت میں لڑکوں کی ٹولی گھومتی پھرتی اور شہر کے دوسرے حصوں کو جاتی۔ اگر کسی دن دیر ہو جاتی اور لڑکے اپنے والدین کے ڈر سے گھبراتے تو حیات اللہ ان کا اطمینان کرا

دیتے۔ پھر فرنگی محل کی گلی میں جب یہ ٹولی داخل ہوتی تو حیات اللہ حلوائی کی دوکان سے جلیبیاں لے کر ان میں تقسیم کر دیتے اور کہتے کہ گھر پہنچ کر کہہ دینا کہ میلاد شریف سے آ رہے ہیں۔ میلاد کے لئے جلیبیاں خریدنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ حیات اللہ اپنی کم عمری میں اپنے ماحول اور اپنے بزرگوں کی کمزوری سے اچھی طرح واقف تھے۔ لیکن یہ لڑکا جس کا نام حیات اللہ تھا محض جدت پسند اور شریر ہی نہیں تھا وہ اس کم عمری میں بلا کا حاضر دماغ بھی تھا۔ حیات منزل میں ایک بار اس نے بھاپ سے چلنے والا پہیہ بنایا۔ جس ٹوتیں میں بھاپ بند تھی وہ اتفاقاً پھٹ گیا۔ حیات اللہ کا آدھا منہ بھاپ سے جھلس گیا لیکن انہوں نے اس وقت شور نہیں مچایا۔ منہ پہ پانی بھی نہیں ڈالا۔ وہ خاموشی سے اس جگہ سے ہٹے اور فرسٹ ایڈ بکس سے انہوں نے کوئی چیز منہ پر مل لی۔ یہ فرسٹ ایڈ بکس ان کی عمر عیار کی زنبیل میں دوسری چیزوں کے ساتھ موجود رہتا تھا۔

لوگ کہتے ہیں کہ اگر حیات اللہ اس وقت حاضر دماغی سے کام نہ لیتے تو ان کا منہ ہمیشہ کیلئے آدھا سیاہ اور آدھا سفید ہو گیا ہوتا۔ ان کی یہ زندگی بڑے ڈرامائی انداز میں اس طرح ختم ہو گئی کہ مولانا وحید اللہ کا انتقال ہو گیا۔ ماں پہلے ہی مر چکی تھیں اب ان کے سر پر کوئی وارث نہیں تھا۔ اس عرصہ میں انہوں نے فرنگی محل کے عربی مدرسے سے سند حاصل کر لی تھی لیکن اس تعلیم سے وہ بالکل مطمئن نہیں تھے انہیں کوئی آگے کی راہ سوجھانے والا بھی نہیں تھا۔ ایک محبت کرنے والا ماموں زاد بھائی مزدور تھا۔ لیکن وہ خود طالبعلم تھا جو انہیں محض مفید مشورے دے سکتا تھا۔ ان مشوروں کے طفیل انہوں نے دو تین سال میں انٹرنس پاس کر لیا لیکن ان کے حوصلوں نے یہیں بس نہیں کی وہ کوشش کر کے علی گڈھ پہنچ گئے جہاں وہ اس زمانہ کے سب سے غریب پرور ہوسٹل آفتاب ہال میں رہنے لگے۔ یہاں کے قیام کے دوران میں ان کی زندگی کا اہم واقعہ یہ ہے کہ انہوں نے اردو میں تقریر کرنے کی مہم چلائی اور ساری یونیورسٹی میں ہنگامہ کھڑا کر دیا۔ اس سے قبل وہ لکھنؤ میں کمیونسٹ بن چکے تھے۔ جہاں انہوں نے وجود باری کے مسئلہ پر مولانا عبدالباری مرحوم کی خفگی مول لی تھی۔ یہاں شاید یہ بتلانا دلچسپی سے خالی نہ ہو کہ مولانا عبدالماجد دریابادی کی دہریت سے متعلق تحریروں نے حیات اللہ کی زندگی میں بچپن ہی میں زہر گھول دیا تھا۔ چنانچہ اس زمانہ میں انہوں نے اپنے استاد اور بزرگ مولانا عبدالباری مرحوم سے وجود باری کے مسئلہ پہ تلخ باتیں کیں تو مرحوم نے انہیں اپنی صحبت سے اٹھ جانے کا حکم دیا۔ حیات اللہ خاموشی سے اس صحبت سے، جس میں سید جالب دہلوی مرحوم وغیرہ شریک تھے اٹھ کر چلے آئے۔ لیکن ابھی وہ اپنی "حیات منزل" کے راستہ ہی میں تھے کہ مولانا عبدالباری نے انہیں واپس بلایا۔ شفقت سے اپنے پاس بٹھایا اور ان کو مخاطب کر کے کہا کہ "میں عالمانہ سطح پر عقیدہ کے اس خلوص کا احترام کرتا ہوں"۔ اس واقعہ کے بعد مولانا مرحوم حیات اللہ کا آخر وقت تک احترام کرتے رہے۔ عام مذہبی لوگوں کی کٹر ملائیت کے خلاف مولانا کا یہ رویہ حیات اللہ کے لئے ایک نیا تجربہ تھا۔ نہیں کہا جا سکتا کہ آئندہ زندگی میں انہوں نے اس سے کس طرح فائدہ اٹھایا۔

علی گڈھ سے بی اے کی ڈگری لینے کے بعد اب جو حیات اللہ لکھنؤ واپس آتے ہیں تو کایا ہی پلٹ گئی تھی۔ کمیونسٹ حیات اللہ بقول مولانا محمد علی مرحوم گھوڑ اسکول پر رہنے لگے تھے۔ یہاں سے دوستوں سے چھیڑ چھاڑ اور طعن و تشنیع کا دور شروع ہوا۔

ان کی زندگی کے اس دور (۱۹۲۹ء) میں میں ان سے متعارف ہوا۔ اس وقت ان کے افسانوں کا مجموعہ "انوکھی مصیبت" شائع ہو چکا تھا۔ "آخری کوشش" جیسا غیر فانی شاہکار انہوں نے ابھی تخلیق نہیں کیا تھا۔ کمیونزم کو وہ خیرباد کہہ چکے تھے۔ لیکن گاندھیائی ہوتے ہوئے بھی وہ غیر طبقہ واری سماج کے علمبردار تھے۔ میری طرح ان کی نظریاتی زندگی کا یہ معمہ بہتوں کی سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ آخر گاندھی ازم کو مارکسزم کے غیر طبقہ واری سماج سے کیا نسبت ہے۔ لیکن اب بہت دنوں ساتھ رہنے کے بعد کم از کم میں نے اس معمہ کو حل کر لیا ہے۔ حیات اللہ ناک کو سر کے پیچھے ہاتھ گھما کر پکڑتے ہیں دوسرے اسے سامنے سے پکڑ لیتے ہیں۔ یہ طریق کار کا فرق ہے۔ اس کی وضاحت اس طرح کی جا سکتی ہے کہ حیات اللہ سرمایہ داری کے اس لئے مخالف ہیں کہ اس میں فرد کو معاشی مساوات اور ترقی کے مواقع حاصل نہیں ہیں۔ اس کے ساتھ وہ کمیونزم کے اس لئے مخالف ہیں کہ اس میں ریاست کی جبریت کو بڑا دخل ہے۔ پھر ان کے سامنے سماج کی نا ہمواری کو ختم کرنے کے لئے کون سا فلسفہ حیات ہے؟ یہ فلسفہ حیات

ان کی نظر میں گاندھی ازم کے علاوہ کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا جس کی بنیاد معاشی مساوات کے اصولوں پر ہے اور جہاں سیاست کی جبریت کا کوئی سوال نہیں ہے اور پھر سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ان کے خیال میں گاندھی جی کی تعلیمات میں بھرپور Human touch ہے۔

یہ ایک لمبی بحث ہے جس میں یہاں پڑنے کی گنجائش نہیں۔ تاہم اب نئے حالات کے پیش نظر حیات اللہ کو اپنے طور پر اتنی کامیابی ضرور ہوئی ہے کہ ان کے دوست اور مخالف بھی انہیں رجعت پسند نہیں کہتے ہیں۔ بلکہ ان کی خدمات کا اعتراف کرتے ہیں۔ کسی فرد کی اس سے بڑی کامیابی اور کیا ہو سکتی ہے؟

آج حیات اللہ جس مقام پر کھڑے ہوئے ہیں وہاں تک پہنچنے کے لئے انہوں نے ہر طرح کی مشکلات کا سامنا سرفروشانہ جذبہ کے ساتھ کیا ہے۔ دنیا میں شاید سب سے بڑی ذلت فاقہ کھینچنے کی ہے۔ اس فاقہ کا احترام صرف اس صورت میں کیا جا سکتا ہے جب آدمی اپنے اصولوں اور نظریات کے لئے بھوکوں مرنا گوارا کرے لیکن ناحق کے سامنے سر نہ جھکائے۔ حیات اللہ ان دشوار گزار راہوں سے بھی بڑی خاموشی اور پامردی کے ساتھ گزرے ہیں۔ سنہ ۱۹۴۱ء میں جب سامراجی جنگ ہٹلر کے روس پر حملہ کے بعد قومی جنگ بن گئی تھی اور حیات اللہ کے بیشتر ساتھی ریڈیو، مشاعروں اور پبلسٹی کے دوسرے ذرائع سے روپیہ بٹور رہے تھے تو اس وقت حیات اللہ لکھنؤ کی دسمبر کی سردیوں میں ململ کی شیروانی پہنے اسی شان استغنا سے رہتے تھے اور چنے کے اکوروں سے وٹامن حاصل کرتے تھے۔ دوسرے ادیب عشرت کدوں میں جا کر دھومیں مچاتے تھے اور حیات اللہ اپنے گھر پر سانپ پالتے تھے۔ ان سانپوں کے پالنے کا قصہ یہ ہے کہ پنڈت نہرو کے ایک عزیز مسٹر کول جو مشہور سائنسدان ہیں اس زمانہ میں لکھنؤ یونیورسٹی میں تھے۔ ان کی کسی طرح سے حیات اللہ سے دوستی ہو گئی۔ پھر کیا تھا دونوں نے مل کر سانپ پالنا شروع کئے۔ میں کول صاحب کے بارے میں تو نہیں جانتا ہوں لیکن حیات اللہ کے بارے میں وثوق سے بتا سکتا ہوں کہ انہوں نے اس فن شریف کو سیکھنے میں اپنا کافی وقت برباد کیا۔ اس زمانہ میں سانپوں سے متعلق قصے کہانیاں بھی لکھیں اور مجھے یاد پڑتا ہے کہ اس موضوع پر جب ریڈیو پر ان کی تقریر ہوئی تو ان کے اس اصرار پر ریڈیو کے ذمے داروں میں کافی کھلبلی مچ گئی کہ تقریر سے پہلے مائک پر بین بجائی جائے۔ بہرکیف ان سانپوں کا قصہ یوں ختم ہوا کہ کول صاحب انگلینڈ چلے گئے اور حیات اللہ کی زائد انرجی کے نکاس کے لئے دوسری راہیں نکل آئیں۔ انہوں نے پرانے لکھنؤ میں زور شور کے ساتھ تعلیم بالغان کا کام شروع کر دیا۔ جو ایک عرصہ تک جاری رہا۔ اس کے ٹھیک پندرہ برس بعد انہوں نے بالغوں کی تعلیم کے لئے اور انہیں دس روز میں اردو لکھنا پڑھنا سکھانے کے لئے "حیات اللہ قاعدہ" تیار کیا۔ سنہ ۱۹۴۲ء میں ہندستان (ہفتہ وار لکھنؤ) بند ہو گیا حیات اللہ کی تیس چالیس روپے ماہوار کی نوکری چھوٹ گئی اور وہ اس وسیع دنیا میں جہاں ان سے ہمدردی کرنے والوں کا شدید قحط تھا وہ بالکل تنہا رہ گئے۔ تنہا اس معنی میں کہ حیات اللہ نے ہندستان کے ذریعہ ادب اور صحافت کی بڑی خدمت کی تھی۔ آج کے بہت ممتاز ادیبوں اور شاعروں میں سے کم لوگ ایسے ہوں گے جنہوں نے ان کے اخبار میں نہ لکھا ہو۔ اس وقت اس ہفتہ وار اخبار کو جاننے والوں کی تعداد بہت کم ہوگی (کیونکہ ترقی پسند تحریک کے سلسلہ میں نقادوں نے کہیں بھی اس کا ذکر نہیں کیا ہے) لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ حیات اللہ نے اس پرچہ کے ذریعہ اپنے ان متوازن خیالات کا ریہرسل کیا تھا جن کو بعد میں انہوں نے قومی آواز کے ذریعہ پیش کیا ——

قومی آواز کا ذکر کئے بغیر حیات اللہ کی زندگی بڑی ادھوری رہ جائے گی۔ لیکن ان کی زندگی کے اس پہلو پر لکھنے سے قبل ان کی رضاکارانہ بیکاری کے زمانہ کا ایک قصہ اور تجربہ ان کے کردار پر روشنی ڈالنے کے لئے یہاں لکھنا ضروری ہے۔ جب ہندستان کے تمام ممتاز ادیبوں نے ایک ایک کر کے فلمی لائن کو اختیار کیا تو حیات اللہ نے بھی قسمت آزمائی کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ انہوں نے چیتن آنند کے ہاتھ اپنی ایک فلمی کہانی "نیچا نگر" فروخت کی۔ اس سلسلہ میں وہ کئی ماہ بمبئی رہے۔ جب اس کہانی کا فلم تیار ہوا تو اس نے فرانس میں اکاڈیمی انعام جیتا۔ لیکن اس عرصہ میں بمبئی کی فلمی دنیا نے حیات اللہ کو بدحواس کر دیا۔ چنانچہ وہ اپنی فلمی کہانی کے پیسے جیب میں ڈال کر بمبئی سے بھاگ نکلے اور لکھنؤ آ کر دم

لیا۔ یہاں رفیع احمد قدوائی مرحوم سے انہوں نے ملاقات کی اور انہیں ایک اردو روزنامہ نکالنے کا مشورہ دیا قدوائی صاحب اس وقت یوپی میں
کانگرس کا الیکشن لڑنے کی تیاریاں کر رہے تھے۔ وہ اخبار نکالنے پر فوراً آمادہ ہو گئے۔ حیات اللہ نے کام سنبھال لیا۔ اس وقت حسن عسکری دہلی میں
تھے۔ جب پہلا پرچہ نکلا تو انہوں نے حیات اللہ کو جلبلا کر ایک مختصر کڑوا کسیلا خط لکھا۔ حیات اللہ حسن عسکری کا خط پی گئے۔ پھر اس کے بعد
شاید دونوں میں کبھی خط و کتابت نہیں ہوئی۔ اس سلسلہ میں ان کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے ایک الیکشن کے پرچہ کو اپنی کوششوں سے ایک
باوقار روزنامہ بنا دیا اور آج یہ بات بلا خوف تردید کہی جا سکتی ہے کہ ہندستان کے مسلمانوں کی مذہبی اور ثقافتی خدمت جس صحت مندانہ طریقہ
سے قومی آواز انجام دے رہا ہے۔ اس کی مثال آزاد ہندستان میں مشکل سے ملے گی۔ قومی آواز کی بقا کے لئے انہوں نے اپنے محدود ساتھیوں سے
بھی اس طرح جنگ کی جس طرح وہ باہر اپنے ترقی پسند ساتھیوں اور فرقہ پرست جماعتوں سے کرتے رہے تھے۔ انہوں نے خود پیٹ پر پتھر باندھ
کر اور اپنے ساتھیوں کے پیٹ پر پتھر باندھ کر قومی آواز کو زندہ رکھا ہے۔ اس کی وجہ سے ادارہ کے اراکین میں تلخیاں پیدا ہوئیں، شکوک
پیدا ہوئے، نیت کا سوال درمیان میں لایا گیا۔ دوستی اور تعلقات میں فرق آیا لیکن وہ اپنی بات پر جمے رہے۔ بات پر جمے رہنا حیات اللہ کا
بہت بڑا وصف اور کمزوری ہے۔ وہ جب سوچ سمجھ کر ایک بات کا فیصلہ کر لیتے ہیں تو پھر بڑی مشکل سے اسے بدلنے پر تیار ہوتے ہیں بلکہ بدلتے
ہی نہیں ہیں۔ اس میں بعض اوقات کٹھ حجتی کو دخل ہوتا ہے۔ لیکن ایسا بہت کم ہوا ہے کہ انہوں نے کسی مسئلہ کے بارے میں خلوص نیت سے اپنی
رائے نہ قائم کی ہو۔

لیکن خود ان کی بھی ایک کمزوری ہے۔ یہ کمزوری ان کے تخیل کی اڑان ہے۔ جس کو اگر آپ حیات اللہ کے ساتھ رعایت برتیں تو ان کی امید
پرستی کا نام دے سکتے ہیں۔ وہ کبھی مایوس نہیں ہوتے۔ لیکن ان کے اس مایوس نہ ہونے کا ایک دوسرا پہلو یہ ہے کہ اگر آپ خدانخواستہ ان کی باتوں
میں آ گئے تو یہ عین ممکن ہے کہ آپ امید کا دامن ہمیشہ کے لئے چھوڑ دیں۔ مثلاً مجھے یاد ہے کہ ایک زمانہ میں انہوں نے اپنے ایک کمیونسٹ دوست
گوکل چند رستوگی کے ساتھ مل کر کوہ پیمائی کا بڑا عظیم الشان پروگرام بنایا تھا۔ اس کے لئے لکھنؤ کے نخاس سے سامان جمع کرنے کی ایک طول و طویل
فہرست بھی بنائی گئی تھی۔ دن بھر یہ دونوں دوست کوہ پیمائی کے اصولوں پر دلچسپ گفتگو کیا کرتے۔ غریب رستوگی اس گپ میں اتنا منہمک ہو جاتا کہ اس
کی نوجوان آنکھوں میں ایورسٹ کی برفیلی چوٹیاں چمکنے لگتیں۔ لیکن کچھ دن کے بعد یہ ہوا کہ حیات اللہ کو اپنے تخیل کی اڑان کے لئے دوسرا مشغلہ ہاتھ
آ گیا۔ رستوگی غریب آج کل فارمنگ کے چکر میں پڑ گیا ہے۔ شاید اسے اس بات کا علم نہیں ہے کہ تن سنگھ کے ایورسٹ کے سر کرنے سے قبل حیات اللہ
انصاری اپنے تخیل میں اسے کبھی کا سر کر چکے ہیں۔ تو یہ تخیل پرستی یا امید پرستی حیات اللہ کی فطرت کا خاصہ ہے۔ جس کے سہارے انہوں نے اپنی
زندگی کے کتنے ہی معرکے سر کر ڈالے ہیں۔ لیکن حیات اللہ کے اس اسکیچ کو پڑھنے والوں کو میرا یہ مشورہ ہے کہ وہ رستوگی کی مثال کو سامنے رکھیں۔
اور زیادہ اڑان بھرنے کی کوشش نہ کریں کیونکہ بسا اوقات حیات اللہ کو اس اڑان کا بھگتان بھگتنا پڑا ہے۔ اس کا قصہ یوں ہے کہ ایک بار یو پی
اسمبلی میں کہیں وزیر مالیات حافظ محمد ابراہیم نے اپنی بد قسمتی سے بجٹ تقریر میں اردو کا ذکر خیر فرما دیا۔ دوسرے دن جب یہ تقریر اخبارات میں
چھپی تو حیات اللہ نے اپنی امید پرستی کے ہاتھوں اس کی بڑی مٹی پلید کی ——— اردو کی جیت اور ان کے تخیل نے سینکڑوں ہوائی قلعے بنا ڈالے۔
پھر یہ ہوائی قلعے اڑا اڑا دھم گرے اور بیچارے حیات اللہ دیکھتے کے دیکھتے رہ گئے۔ اب یہ نوبت پہنچ گئی ہے کہ وہ اردو کے مقدمہ سے مایوس
ہوتے جا رہے ہیں۔ لیکن اس پر بھی انہوں نے صبر اور تخیل کے دامن کو ہاتھ سے نہیں چھوڑا ہے اور اب وہ "سرد جنگ" کی تیاری کر رہے ہیں۔ وہ
جمہوریت کی فتح پر بھرپور اعتماد رکھتے ہیں۔

ان کے تخیل کی اڑان کی ایک دوسری مثال بھی سنتے چلئے۔

۱۹۴۷ء میں غیر منقسم ہندستان کی جو سیاسی صورت حال تھی اس سے کم و بیش سب ہی واقف ہیں۔ یہاں ان اشتعال انگیز واقعات کا اعادہ

کرنے کی ضرورت نہیں۔ لیکن ان حالات میں بھی حیات اللہ مایوس نہیں تھے۔ ان کے تخیل کی اڑان کا وہی حال تھا۔ چنانچہ ۱۸ جولائی ۱۹۴۳ء کو مجھے ایک خط میں لکھتے ہیں۔

"...... جو تحریک چلنے والی ہے اس پر مجھے پورا عقیدہ ہے۔ اب ہندوستان کو آزاد اور لڑائی کو ختم سمجھئے آٹھ دس مہینوں کی اور بات ہے۔ یہاں قربانیوں کی ضرورت ہے"

مجھے اس کا اقرار ہے کہ رستوگی کی طرح اس بار میں بھی ان کے ساتھ ایورسٹ کی چوٹی پر جا پہنچا۔ لیکن بعد کو جو واقعات پیش آئے اس نے مجھے سخت مایوس کیا۔ اگر میں رستوگی ہوتا تو شاید میں بھی فارمنگ کے چکر میں پڑ گیا ہوتا۔ لیکن یہ نہ سمجھئے گا کہ حیات اللہ انصاری کی اس تخیل پرستی میں حقائق سے بالکل ناطہ توڑ لیا جاتا ہے۔ میں نے اڑان کے لئے انہیں پر تولتے وقت، زمین پر مضبوطی سے قدم جمائے دیکھا ہے۔ اب اسی معاملہ میں یہ ہوا کہ وہ مجھے یہ خط تھا کہ اپنے دوست اور انگریزی ناول "کنتھا پورا" کے مصنف راجا راؤ کے ہمراہ اس کوشش میں نکل کھڑے ہوئے کہ برطانی سامراج کے مظالم کی داستان کو غیر ملکی اخباروں میں شائع کرایا جائے۔ یہ راجا راؤ بھی عجیب خوابی انسان تھے۔ اپنے تخیل کی اڑان میں حیات اللہ سے ہزاروں ہزار ہاتھ آگے۔ حیات اللہ وکٹوریہ اسٹریٹ کے ایک کمرہ میں بیٹھ کر ایورسٹ کو سر کرنے کی ہمت رکھتے تھے۔ پھر راجا راؤ تو ہوائی جہاز پر سفر کرتے تھے۔ اس لئے یہ نہ پوچھئے ان کے تخیل کی اڑان۔ اس سونے پر سہاگہ احمد علی (ہماری گلی والے) کی ذات تھی جو اپنی ٹھیٹ حقیقت پسندی سے دونوں کو بریک دیتے تھے۔

اس وقت (۱۹۵۶ء) حیات اللہ انصاری قومی آواز، دستخطی مہم اور فرقہ پرستوں کے خلاف جہاد کرنے کا دوسرا نام ہے۔ دستخطی مہم کے سلسلہ میں اوپر کہیں ذکر آچکا ہے۔ جب انہوں نے اس مہم کو شروع کیا تھا تو بہت کم لوگوں کو اس بات کا یقین تھا کہ وہ بیس لاکھ دستخط جمع کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ اس زمانہ میں ہندوستان کا جو سیاسی مزاج تھا اس پر یہ بات ناممکن بھی نظر آتی تھی۔ لیکن انہوں نے دیکھتے ہی دیکھتے ایک عظیم الشان تنظیم کھڑی کر دی۔ جس نے پوری لگن کے ساتھ بیس لاکھ دستخط جمع کرکے صدر جمہوریہ ہند کی خدمت میں پیش کر دیئے۔ آج اگر حیات اللہ کی کوششیں بارآور نہیں ہو رہی ہیں تو اس میں ان کا قصور نہیں ہے۔ ہندوستان کے جمہوری مزاج کا قصور ہے اور جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے حیات اللہ کو ہندوستان کی جمہوریت پر اٹل بھروسہ ہے۔ اس لئے وہ اس سلسلہ میں اپنے بس بھر کام کئے جا رہے ہیں۔ اس مہم کے سلسلہ میں حیات اللہ نے ان دیکھے میدانوں کو سر کیا۔ بڑوں بڑوں سے ٹکر لی۔ یہاں تک کہ انجمن ترقی اردو کے معتمد قاضی عبدالغفار مرحوم تک کی مخالفت مول لی۔ اس سلسلہ میں انسانی فطرت کی کمزوری کے پیش نظر یہ ممکن ہے کہ دونوں میں قیادت کے لئے بھی رسہ کشی ہوئی ہو۔ لیکن قاضی عبدالغفار کے انتقال کے بعد انہوں نے قومی آواز میں جو اداریہ لکھا اس میں اردو کی جدوجہد کا سہرا قاضی صاحب مرحوم کے سر باندھ دیا۔ جو لوگ حیات اللہ کے مزاج سے ناواقف تھے انہوں نے منہ میں انگلیاں دے لیں۔ جب حیات اللہ کو اس حیرت کا علم ہوا تو انہوں نے اپنی مخصوص دلکش مسکراہٹ پر اکتفا کی۔

اسی طرح کا ایک ہنگامہ مجاز مرحوم کے انتقال کے موقع پر اس وقت پیش آیا جب انہوں نے "مجاز رخصت ہو گیا" کے عنوان سے ایک اداریہ سپرد قلم کیا۔ اس اداریہ میں حیات اللہ نے دل کھول کر مجاز کے فن کی تعریف کی۔ صحیح معنوں میں اس اداریہ میں انہوں نے خون کے آنسو بہائے تھے۔ لیکن اس کے ساتھ انہوں نے اپنی عادت کے مطابق کمیونسٹ پارٹی کی بھی خبر لے ڈالی اور اس بات پر اظہار افسوس کیا کہ "مجاز اس لئے چاند ہی کر نہ چمک سکے کہ وہ ایک ایسی جماعت سے وابستہ تھے جو ادب کو اپنے زمانہ کے مسائل اور ایک خاص سیاسی نظریے سے متعلق رکھنا چاہتی ہے......"

علی سردار جعفری جو ان دنوں ایک مشاعرہ کے سلسلہ میں لکھنؤ آئے ہوئے تھے انہوں نے اداریہ کو پڑھا۔ اپنے مخصوص انداز میں با مول

کو دونوں ہاتھوں سے سر کے پیچھے پھینکا اور کہا کہ "حیات نے سب ٹھیک لکھا ہے مگر یہ .... " پھر انہوں نے کمیونسٹ پارٹی والے پیراگراف کو قومی آواز کے ہر رکن کو دکھایا "یہ غلط ہے اس موقع پر یہ نہ ہونا چاہئے تھا"۔

واقعی اگر حیات اللہ اس موقع پر اپنے مضمون کو نہ دیتے تو اچھا تھا۔ یہ ان کا بنفس معاویہ سہی لیکن دیکھنے کی بات یہ ہے کہ ایسی ہمت کتنے لوگوں میں ہے جو بھیڑ بھاڑ سے متاثر ہوئے بغیر بے باکی سے اپنے خیالات کو ڈنکے کی چوٹ پر کہہ سکیں۔ اس کے دوسرے دن مجاز کے سوگ میں ایک جلسہ ہوا۔ سب نے اپنے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ اس جلسہ میں حیات اللہ بھی بولے۔ لیکن انہوں نے یہاں بھی اپنی راہ دوسروں سے الگ نکالی اور مجاز کی شرابی پر ایک نئے انداز سے روشنی ڈالی۔

حیات اللہ بڑے پیارے دوست ہیں۔ ان کی سنجیدگی کے پیچھے ایک بڑی زندہ دل، ہنسوڑ اور چٹکلے باز شخصیت چھپی ہوئی ہے۔ وہ اپنے دوستوں کی کمزوریوں کا مذاق اڑاتے ہیں۔ انہیں تنگ کرتے ہیں۔ خود دہی اور لسی پر زندہ رہنے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن انہیں عمدہ پراٹھے، قورمہ، کباب اور پلاؤ کھلاتے ہیں۔ دوستوں کی بیویوں کو شوہروں کے خلاف بغاوت کرنے پر اکساتے ہیں۔ چنانچہ جذبی کے ساتھ علی گڈھ میں ایک دلچسپ لطیفہ پیش آچکا ہے۔ حیات اللہ کسی کام سے علی گڈھ گئے ہوئے تھے۔ جذبی ان کے پرانے رفیق اور دوست ہیں۔ ان کی بیوی نے بتلایا کہ جذبی میرے ساتھ باہر نکلتے ہوئے گھبراتے ہیں۔ حد یہ ہے کہ کبھی سنیما تک ساتھ نہیں جاتے۔ حیات اللہ نے انہیں تسلی دی اور یقین دلایا کہ اس مرتبہ ایسا انتظام کر کے جاؤں گا کہ جذبی ہمیشہ آپ کے ساتھ سنیما جائے گا۔ وہ ٹھہرا بڑا شاعر اور یونیورسٹی کا لیکچرار، شاید اسے ڈر لگتا ہوگا کہ اس کے طالب علموں کو یہ معلوم ہو جائے گا کہ جذبی بیوی کے ساتھ نکلتا ہے۔ جب اس دن جذبی گھر واپس آئے تو حیات اللہ نے انہیں دوسرے شو میں بیوی کے ساتھ سنیما جانے کا الٹی میٹم دے دیا۔ جذبی گھبرا گئے۔ مگر مجبور تھے وہ خود اتنے شریف واقع ہوئے ہیں کہ اس شرارت کی مدافعت کرنا ان کے بس سے باہر ہے۔ اس واقعہ کے بعد حیات اللہ لکھنؤ واپس آگئے۔ معلوم نہیں جذبی کے طالب علموں کو اس بات کا علم ہوا یا نہیں کہ جذبی اپنی بیوی کے ساتھ سنیما دیکھتے ہیں۔ طالب علموں کو چاہے معلوم ہو یا نہ ہو لیکن ہماری دعا ہے کہ اس کی خبر مولانا عبدالماجد دریابادی کو نہ ہونا چاہئے کہ حیات اللہ دوسروں کی عورتوں کو سنیما دکھاتا پھرتا ہے۔ کیونکہ اگر انہیں اس بات کا علم ہو گیا تو حیات اللہ کی خیریت نہیں ہے۔ اس سلسلہ میں یاد آیا کہ قومی آواز جب شروع شروع میں نکلا ہے تو حیات اللہ نے مولانا عبدالماجد دریابادی سے بھی معرکے لئے تھے۔ لیکن حیات اللہ ٹھہرے ٹھنڈے مزاج کے انسان انہوں نے بلونت سنگھ کے بقول اس بھاری پتھر کو چوم کر چھوڑ دیا۔ خیر یہ تو جملہ معترضہ تھا۔ ذکر حیات اللہ کے اچھے اور دلچسپ دوست ہونے کا تھا۔ ہر شخص کی طرح حیات اللہ کا بھی ایک مخصوص حلقہ احباب ہے۔ ان کی روح کی گہرائیوں میں جھانکنے کے لئے اس حلقہ احباب میں شامل ہونا ضروری ہے۔ یہاں حیات اللہ ایک بالکل مختلف انسان ہیں۔ جو آپ کو سستے پھلوں کے خریدنے کے گُر سے لے کر بجاجی اور نخاس کے سستے مال کے ذریعہ گھر کو سجانے کی ترکیبیں بتلاتے نظر آئیں گے۔ حیات اللہ بچپن سے پیٹ کے مریض ہیں۔ شاید بچپن میں ماں کے قبل از وقت انتقال کی وجہ سے باپ نے بہت زیادہ دلار کیا ہوگا جس کی وجہ سے ان کا معدہ کمزور ہو گیا۔ بہرکیف وجہ کچھ بھی رہی ہو اس پیٹ کی بیماری کا سلسلہ آج تک قائم ہے۔ اور اب وہ اس کا علاج غذاؤں اور دواؤں کے ذریعہ خود کر لیتے ہیں۔ یہاں تک تو ٹھیک ہے لیکن آگے چل کر یہ معاملہ نازک صورت اختیار کر لیتا ہے۔ یہ صورت اس وقت پیش آتی ہے جب ان کا کوئی دوست درد سر، پیٹ کی خرابی، یا اسی قسم کی کسی دوسری شکایت کا ذکر کرتا ہے۔ حیات اللہ فوراً سنبھل کر بیٹھ جاتے ہیں۔ "اچھا تو آپ کو یہ شکایت ہے؟" پھر اس شکایت کا شجرہ پیچش سے ملا کر کہیں گے "سب پیٹ کی خرابی ہے۔ کبھی آپ کو پیچش تو نہیں ہوئی؟" اب وہ بچارہ دوست ذہن کو کھنگال کر کہتا ہے کہ "جی نہیں پیچش کبھی نہیں ہوئی۔ مجھے کیا میری سات پشتوں کو یہ موذی مرض کبھی نہیں ہوا۔" لیکن حیات اللہ اس کی بات کا اعتبار نہیں کریں گے۔ فوراً کھانے اور نہ کھانے کی ایک لمبی چوڑی فہرست گنا

دیں گے اور آخر میں مشورہ دیں گے کہ آج رات کو فاقہ کرنا اور سوتے وقت اینا لے ڈالنا۔ دوسرے دن جب یہ دوست ملے گا تو اس سے مزاج پوچھیں گے۔ پھر دریافت ہوگا اینا لیا تھا؟ دوست کسی ناگہانی آفت کا بہانہ کرکے بتلائے گا کہ اینا لینے کی نوبت نہیں آئی۔ چنانچہ تاکید کی جائے گی کہ آج سہی، دیکھو پھر ندامت۔ آخر روز روز کے سوال جواب سے تنگ آ کر دوست ایک دن حیات اللہ کو مژدہ سنائے گا کہ آپ کے اینا نے معجزہ کر دکھایا۔ درد سر، بے خوابی، اعصابی تشنج سب غائب اور یہ سن کر حیات اللہ کا چہرہ فرط مسرت سے سرخ ہو جائے گا۔

اسی سلسلہ میں مجھے یاد پڑتا ہے کہ ۱۹۴۳ء میں انہیں اپنے قومی آواز کے اسٹاف کی صحت کی طرف سے سخت تشویش پیدا ہو گئی۔ پہلے تو انہوں نے فرداً فرداً سب کو ان کی صحت کی اصلاح کی طرف متوجہ کیا۔ لیکن جب کسی نے نہیں سنا اور بدستور ان کو سب کی صحت چوپٹ نظر آئی تو انہوں نے وٹامن والے سستے کھانوں کی ایک فہرست دفتر میں لگوا دی اور اس کے ساتھ اپنا ایک طول طویل نوٹ بھی لگا دیا جس میں انہوں نے سب کو یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ سستی غذا کے ذریعہ بھی وٹامن حاصل کئے جا سکتے ہیں۔ اس سلسلہ میں انہوں نے اپنی غربت کے زمانہ کے تجربات کو بھی گنوایا۔ ان کا یہ مشورہ اس سلسلہ میں واقعی نوٹ کرنے کے قابل ہے کہ فصلی پھل، آم خربوزہ وغیرہ اس وقت کھانا چاہیئے جب بڑے لوگوں کا ان کے استعمال سے پیٹ خراب ہو جائے اور وہ بازار میں سستے داموں فروخت ہونے لگیں۔ ساتھ ہی یہ نکتہ ہے کہ فصلی پھل مزے ہی کیلئے نہیں وٹامن حاصل کرنے کے لئے کھانا چاہئیں۔

پھر اسی صحبت میں حیات اللہ، خدا، حسن، سچائی اور آئن اسٹائن کے نظریہ اضافت پر چٹخارے دار باتیں کرتے نظر آئیں گے۔ جیسا کہ ذکر آ چکا ہے ایک زمانہ میں حیات اللہ خدا کے قائل نہیں تھے۔ لیکن اب ان کی منطق نے خدا کو پا لیا ہے۔ وہ اسے حسن اور سچائی کے روپ میں جلوہ کر دیکھتے ہیں اور ایک صوفی کی طرح پتہ پتہ پر اس کے نقش کو کندہ دیکھتے ہیں۔ ایک ایسی ہی صحبت میں قرآن کے بارے میں ان سے پوچھا گیا کہ آپ اسے الہامی کتاب مانتے ہیں یا نہیں ــــــ؟ حیات اللہ ایک ذرا مراقبہ میں چلے گئے۔ پھر سر اٹھایا۔ ان کی آنکھوں میں مسرت کی چمک تھی بولے مانتا ہوں۔ کس طرح؟ کچھ دیر وہ پھر خاموش رہے اور پھر بولے "بھئی اصطلاح میں یا بالفاظ دیگر دل کی زبان میں اس مسئلہ پر بات ہو سکتی ہے" بتلائیے نا؟ ان سے اصرار کیا گیا۔ کہنے لگے میں ایک چھوٹا موٹا ادیب ہوں مجھ سے میری انا اور وجدان لکھاتا ہے۔ فرض کیجئے کہ یہ انا کسی شخص میں ہو اسے یا یوں کہئے کہ کسی کی خودی مٹ جائے پھر وہ جو لکھے گا یا کہے گا وہ محض اس کی انا کی گونج نہیں ہو گی۔ ایک آفاقی پکار ہو گی۔ اب آپ اسے جو کچھ نام دے لیجئے۔"

ان کے اس استدلال کو ہم جیسے انسان تخیل کی اڑان کا نام دیں گے۔ لیکن دل کی زبان کو سمجھنے والوں کے لئے اس میں ہزاروں نکات پوشیدہ ہیں۔ حیات اللہ کا بچپن اور زندگی کا بیشتر حصہ لکھنؤ میں گزرا ہے۔ ان کا لکھنؤ کے علماء کے فرنگی محل کے قدیم خاندان سے تعلق ہے۔ خدا تک رسائی حاصل کرنے میں ان کی خاندانی روایات کا ہاتھ ہے یا ان کے گاندھیائی ہونے کا اس بارے میں کچھ کہنا مشکل ہے۔ لیکن اگر اس سوال کا جواب دینے کے لئے حیات اللہ سے کہا جائے تو یقین ہے کہ وہ گاندھی جی کی تعلیمات کو اپنے خدا تک پہنچنے کا وسیلہ قرار دیں گے۔

نفاست کے اعتبار سے حیات اللہ پورے لکھنوی ہیں۔ وہی لب و لہجہ (لیکن تصنع سے پاک) وہی لباس کا اہتمام اور وہی تہذیب کا رکھ رکھاؤ۔ لکھنؤ میں ان کا قیام شہر کی نئی آبادی والے حصہ میں ہے۔ عید بقرعید کے موقع پر وہ صرف اپنے بزرگوں سے ملنے فرنگی محل جاتے ہیں اور اس بات پر شدت سے اصرار کرتے ہیں کہ ان کے چھوٹے ان سے ملنے کے لئے نئے نگر بارغ آئیں۔ چنانچہ فرنگی محل جانے کا انہوں نے کچھ ایسا طریقہ اختیار کیا ہے کہ لامحالہ ان کے چھوٹوں کو ان سے عید ملنے کے لئے ان کے گھر جانا پڑتا ہے۔

لکھنؤ میں جہاں بہت سی خوبیاں ہیں وہاں ایک تہذیبی برائی یہ بھی ہے کہ مسلمانوں کے دو فرقے شیعہ اور سنی اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بنائے بیٹھے ہیں۔ لیکن حیات اللہ نے بہت شعوری طور پر اس خلا کو پُر کرنے کی کوشش کی ہے۔ وہ شیعہ سنی علماء اور عمائدین شہر کا یکساں احترام کرتے ہیں وہ دونوں فرقوں میں یکساں مقبول ہیں۔ شیعہ علماء اور شرفاء کے گھرانے کی کوئی ایسی تقریب نہیں ہوتی ہے جس میں حیات اللہ کو مدعو

نہ کیا جاتا ہو۔ حد یہ ہے کہ جب لکھنؤ میں مدح صحابہ اور تبرّہ کے سلسلہ میں باہمی تعلقات بہت خراب ہوگئے تھے تو ان ہی دنوں میں حیات اللہ نے شیعوں کی مشہور درس گاہ سلطان المدارس کے طلباء کے حقوق کے لئے ایک تحریک کی رہنمائی کی تھی۔ جس میں طلباء نے ایک لمبی ہڑتال بھی کی تھی لیکن کسی موقع پر بھی حیات اللہ کو اس لئے موردِ الزام نہیں ٹھہرایا گیا۔ کہ وہ شیعوں کی درس گاہ کی تخریب کر رہے ہیں۔ وہ لکھنؤ اسکول کی شاعری کے کچھ ایسے معتقد نہیں ہیں لیکن انیس کا لوہا مانتے ہیں۔

اس مضمون کے شروع میں آنحضرت کی ذات کے متعلق ایک دل آزار اشتہار کا ذکر آ چکا ہے۔ اس سلسلہ میں حیات اللہ نے شہر میں جو مجلس عمل بنائی تھی اس میں دونوں فرقوں کے نمائندوں کو شریک کیا تھا۔ پھر جب مجلس عمل کے ایک عالم نے جو ان کے عزیز ہوتے ہیں مجلس عمل کے فیصلوں سے انحراف کیا تو حیات اللہ نے بغیر کسی قسم کی رو رعایت کے اخبار کے ذریعہ ان کا پول کھولا۔ اس واقعہ کے سلسلہ میں ان کی وہ غیر فرقہ پرست شخصیت بھی کافی مجروح ہوئی۔ لیکن اس کی انہوں نے فدا پروا نہیں کی۔ جب ان سے کہا گیا کہ آپ اس تحریک کے ساتھ بہت دور تک چلے گئے ہیں تو انہوں نے نہایت ٹھنڈے لہجہ میں جواب دیا کہ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ حیات اللہ اگر اپنے اخبار میں اس تحریک کے خلاف کچھ لکھ دیں گے تو معاملہ ختم ہو جائے گا وہ معاملہ کی نزاکت اور مسلمانوں کے جذبات سے واقف ہی نہیں ہیں۔ لوگوں کے پاس اس کا کوئی جواب نہیں تھا۔ لیکن اس دھن کے پکے شخص نے اس معاملہ سے نپٹنے کے بعد دوسرا مورچہ سنبھالا اور بالآخر مخالفین کو یہ سمجھانے میں بڑی حد تک کامیابی حاصل کر لی کہ انہوں نے اِس معاملہ میں جو رویہ اختیار کیا تھا وہ بالکل صحیح تھا۔

حالات نے اس وقت حیات اللہ کو سیاست میں حصہ لینے پر مجبور کر دیا ہے جس کے لئے وہ بالکل نادم اور شرمندہ نہیں ہیں۔ لیکن یہ ایک بہت افسوسناک بات ہے۔ دراصل وہ بنیادی طور پر ایک فن کار اور مفکر ہیں اور یہیں ان کی جگہ ہے۔ چند سال ادھر وہ ایک صحافتی وفد کے ساتھ مصر گئے تھے۔ وہاں سے واپسی پر وہ اپنے ساتھ فراعنہ مصر کی داستانیں، بادشاہوں اور شہزادیوں کے مجسمے اور وادیٔ نیل کے رومان کی کہانیاں لے کر آئے۔ مصر کی سماجی زندگی کے اور بہت سے پہلوؤں کا بھی جمالیاتی نقطۂ نظر سے مطالعہ کر کے لوٹے۔ لیکن انہیں وہاں شاہ فاروق کے خلاف ہونے والی سازش اور اس انقلاب کی کوئی بو باس نہیں ملی جہاں کی واپسی کے چند ماہ یا شاید چند ہفتوں کے بعد رونما ہوا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مخصوص حالات کی وجہ سے وہ ایک سیاسی آدمی بن گئے ہیں ورنہ اس سے انہیں فطری لگاؤ نہیں ہے۔

بعض لوگوں کا اب سے چند سال قبل یہ خیال تھا کہ کانگرسی حیات اللہ بس چند دنوں کی بات ہے کہ وزیر نہیں تو نائب وزیر اور وہ بھی نہیں تو پارلیمنٹری سکرٹری ضرور ہو جائیں گے۔ لیکن حیات اللہ کی ذات سے ایسا کوئی خطرہ نہیں ہے۔ انہوں نے اُردو کی تحریک اور اقلیت کے حقوق کے لئے جس جان جوکھم کی منزل میں قدم رکھا ہے وہاں سے سرکاری کرسیاں بہت دور ہیں۔ واضح رہے کہ بعض دوسرے لوگوں کی طرح حیات اللہ منزل سے پلٹ پڑنے کے لئے کوئی چور دروازہ کھلا ہوا نہیں رکھتے ہیں۔ جب وہ اپنی منزل پر روانہ ہونے لگتے ہیں تو چور دروازہ تو چور دروازہ وہ معمولی روشندانوں اور جھروکوں کو بھی بند کر دیتے ہیں۔ آج اپنی اس سچائی اور خلوص کی وجہ سے وہ پہچانے جاتے ہیں۔ اگر ہندستان میں اقلیت کی تاریخ ختم نہیں ہو گئی ہے تو آگے چل کر حیات اللہ کا نام یقینی ان چند گنے چنے لوگوں میں ہوگا۔ جنہوں نے ہندستان کے جمہوری نظام میں اسے معزز جگہ دلوانے کے لئے کام کیا اور دوسروں کو ان کا کھویا ہوا اعتماد واپس دلوایا۔

حیات اللہ کو کسی نے غصہ آتے نہیں دیکھا۔ یہ ایک ایسی بات ہے۔ جو ان کے سب جاننے والوں کو معلوم ہے لیکن ان سے انکے بارے میں استفسار کیا گیا تو وہ مسکرائے "سلطانہ نے یہ غصہ دیکھا ہے"۔۔۔ اس بلا کی سچائی نے استفسار کرنے والے کو غرقِ حیرت کر دیا۔ بعد کو تحقیقات سے معلوم ہوا کہ حیات اللہ کو بھی غصہ آتا ہے وہ چارپائیں چھوڑ دیتے ہیں۔ روٹھ بھی جاتے ہیں اور وہ سب کچھ کرتے ہیں جو ایک عام شوہر کرتا ہے۔ لیکن اس داستان کی تفصیل بیان کرنے کا یہ موقع نہیں۔ بہرحال کچھ باتیں سلطانہ حیات کو بھی تو کہنا چاہئیں جو حیات اللہ کے ساتھ دس بارہ برس سے بڑی خوشگوار زندگی گزار رہی ہیں۔

اوپندر ناتھ اشک

کوشلیا اشک

اشک جی نے اپنی ایک ہندی نظم میں لکھا ہے :

اور میں دریا
چِر کا چلا
تھکا اور ہارا
لشٹر گتی سے میدانوں میں بہنے والا
مون اور گمبھیر، شانت اور شرانت
یوون کی سب یاد بھلا کر
ٹوٹ، کُھل کر
بہتا ہوں اویرانت[1]

---

[1] اور میں دریا
بہت دیر کا چلا ہوا
تھکا اور ہارا
آہستہ آہستہ میدانوں میں بہنے والا
خاموش، گمبھیر، شانت
جوانی کی سب یاد بھلا کر
ٹوٹ اور مٹا کر
بہتا ہوں ہمیشہ ہمیشہ

لیکن رکاوٹوں کو پار کر کے بیابانوں کے ساتھ آہستہ آہستہ چپ چاپ کھسکتے کھسکتے بہتا دریا کی رفتار کا محض ایک پہلو بھی ہے اور محض انتہا بھی۔ موسم سرما کا سوکھا سمٹا، نحیف و نزار، بے جان اور بے حس سا بہنے والا دریا برسات کے موسم میں کناروں کو توڑتا، پھنکارتا ہوا دیوانہ وار بہنے لگتا ہے۔ اسے دیکھ کر کون سوچ سکتا ہے کہ یہ کبھی قریب المرگ زخمی سانپ سا آہستہ آہستہ بھی سرکتا ہوگا۔

دریا کی روانی کی یہی دو حدود اشک جی کے مزاج کی حدود ہیں۔ ان کے مزاج کی ایک انتہا کو دیکھ کر اس کے بارے میں کسی طرح کا یقین اپنے دل میں پکا کرنے والا شخص جب اس کی دوسری انتہا کو دیکھے گا تو نہ صرف اسے حیرت ہوگی بلکہ اس کے اس یقین کو بھی صدمہ پہنچے گا۔

اشک جی سے اپنے تعارف اور اپنی شادی کے اولین دنوں میں میری حالت اسی شخص کی سی تھی جس نے دریا کی روانی کا محض سرمائی روپ ہی دیکھا ہو ——— چھوٹی عمر ہی میں اشک جی کی شادی ہو گئی تھی، ایک بھولی بھالی ناخواندہ دیہاتی لڑکی کے ساتھ۔ وہ کسی قابل ہوئی تو دق نے طویل اذیت کے بعد اسے موت کی گود میں سلا دیا۔ اس کی وفات سے اشک جی کو بڑا صدمہ پہنچا۔ ان کے ہاں پہلی بیوی کے مرتے ہی رشتے آنے لگتے ہیں۔ اشک جی کو پہلی بیوی پسند تو نہ تھی لیکن چار برس کی رفاقت کے بعد اسے چاہنے لگے تھے۔ انہوں نے جلدی دوسری شادی نہ کی۔ سب جج بننے کے لئے قانون پاس کیا تھا لیکن مقابلے کے امتحان سے محض دو مہینے پہلے بیوی کے رحلت کر جانے کی وجہ سے افسردہ دل ہو کر انہوں نے سب جج بننے کا خیال چھوڑ دیا اور اپنے فطری رجحان کے مطابق ادب کی خدمت میں محو ہو گئے۔

لاہور کی زندگی ان دنوں کافی دلچسپ لیکن رسوا تھی۔ کوئی نہ کوئی سکینڈل آئے دن پھیلا کرتا۔ وہاں سے سکون کی تلاش میں نکلے تو وسط پنجاب کے ایک گاؤں پریت نگر میں جا پہنچے۔ وہاں بھی رسوائی نے پیچھا نہ چھوڑا۔ ایک لڑکی کے سلسلے میں خاصہ سکینڈل پھیل گیا۔ اشک جی اتنے تنگ آ گئے کہ انہوں نے اپنے بھائی کو لکھ دیا ——— "میری شادی کہیں طے کر دو۔" بھائی صاحب نے دیکھے بھالے بغیر ایک جگہ منگنی پکی کر دی۔ کچھ دن گزرے اور کچھ سکون ہوا تو محسوس کیا کہ خاصی جلدبازی ہو گئی ہے۔ پہلے بھی شادی کچھ ایسے ہی ہوئی تھی، تجربات کافی تلخ تھے۔ انہوں نے بھائی صاحب سے کہا ——— "منگنی چھوڑ دیجئے۔" بھائی صاحب نے کہیں دور کے رشتے ہی میں منگنی طے کر دی تھی، وہ نہیں مانے۔ تذبذب اور کشمکش و پیچ کی ایسی ہی حالت میں تھکے ہارے اداس اور برگشتہ خاطر تھے، جب ان سے میرا تعارف ہوا اور میں نے ان کے مزاج کا وہی روپ دیکھا جس کا ذکر انہوں نے اپنی مندرجہ بالا نظم میں کیا ہے۔

میں ریناله ضلع منٹگمری میں ہیڈ مسٹریس تھی۔ لاہور آتی تو بیڈن روڈ پر اپنے ماما جی کے ہاں ٹھہرتی۔ اشک جی وہیں مجھ سے ملنے آیا کرتے۔ آتے تو ڈرائنگ روم میں ایسے چپ چاپ بیٹھ جاتے گویا منہ میں زبان ہی نہ ہو۔ کوئی بات پوچھتی تو اتنی دھیمی آواز میں جواب دیتے کہ قریب بیٹھا شخص بھی نہ سن سکے۔ ان دنوں میں سوچا کرتی تھی کہ ان کی اس مغموم اداس زندگی کو مسکرانا سکھاؤں گی ——— آپ میری حیرت کا اندازہ کر سکتے ہیں جب اپنی شادی کے ایک ماہ بعد ہی میں نے انہیں فلک شگاف قہقہے لگاتے دیکھا اور مجھے سننا پڑا کہ میں بے حد سنجیدہ مزاج ہوں اور غالباً ان جیسے ہنس مکھ کھلکھلے مزاج آدمی کے ساتھ نہ چل سکوں۔

کبھی اس حد پر اور کبھی اس کے عین برعکس دوسری حد پر چلنے والے اشک جی کے مزاج کا محض ایک پہلو دیکھنے والا جب اچانک اس کا دوسرا پہلو دیکھتا ہے تو وہ کچھ لمحے کے لئے حیران و مبہوت رہ جاتا ہے ——— اپنی ازدواجی زندگی کے گزشتہ سات برسوں میں ہماری شادی کو صرف سات برس گزرے ہیں، حیرت کے ساتھ دھچکا سا لگانے والے ایسے لمحے کم نہیں آئے۔

شادی کے اولین دنوں کا ذکر ہے۔ ایک بار ہم نے کچھ احباب کو مدعو کیا۔ ان دوستوں میں کچھ اشک جی کے حسب ذیل کے تھے میرے خیال

بچھا کر سبزی ترکاری اور سالن مسالہ کے ڈونگے وغیرہ رکھ کر میں نے سب سے دسترخوان پر بیٹھنے کے لیے کہا۔ جب سب لوگ اپنی اپنی جگہ پر بیٹھ گئے تو میں نے اپنے دائیں طرف کونے پر بیٹھے ہوئے مہمان سے کہا کہ شروع کیجئے! انہوں نے کچھ اخلاق اور تکلف اور کچھ عقیدت کے سبب اپنے سامنے بیٹھے ہوئے اشک جی سے کہا: "جی آپ ہی شروع کیجئے" اور مجھ سے ڈونگا لے کر ان کی طرف بڑھا دیا۔

اشک جی اپنی عادت کے مطابق لگاتار باتیں کر رہے تھے۔ انہوں نے ڈونگا بڑھایا تو کسی طرح کے تامل یا جھجک کے بغیر ان سے ڈونگا لے کر اشک جی نے اپنی پلیٹ میں سالن ڈالا اور اسے آگے بڑھانے کی بجائے وہیں رکھ دیا اور دوسرے ڈونگے کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ ڈونگے پر ڈونگا اٹھا کر یہ سالن مسالہ وغیرہ اپنی پلیٹ میں ڈالتے گئے اور اپنے سامنے ڈونگے اکٹھے کرتے گئے اور پھر یہ دیکھے بغیر کہ کسی دوسرے نے بھی کچھ لیا ہے یا نہیں آپ نے کھانا شروع کر دیا۔

میں نے دبی زبان سے کہا: "آپ نے کھانا شروع کر دیا، ڈونگے آگے بڑھا دیجئے؟"

اشک جی نے توڑا ہوا لقمہ منہ میں ڈالتے ہوئے کہا: "ارے بھائی لیجئے نا، تکلف نہ کیجئے اور لیتے جائیے۔"

اور بدستور کھاتے رہے۔

تب کچھ شرمسار سی ہو کر میں نے ڈونگے آگے بڑھائے۔

اسی طرح ایک بار کا ذکر ہے۔ خلاف امید دو تین مہمان زیادہ آ گئے۔ میں نے انہیں بیٹھک سے بلایا اور کہا: "باقی تو سب ٹھیک ہے لیکن بینگن کا بھرتہ شاید کچھ کم پڑے۔ ڈرتی ہوں کوئی رہ نہ جائے۔ بازار تو بہا ہی ہے۔ آپ کہیں تو جلدی سے دو بینگن منگا کر بھون لوں ورنہ کم لگے گی۔"

بولے: "تم فکر نہ کرو جی، سب ٹھیک ہے اور کچھ پکانے کی ہرگز کوئی ضرورت نہیں، میں سب سنبھال لوں گا۔"

میں نے کہا: "تھوڑا تھوڑا خود ہی سب کی پلیٹوں میں ڈال دیجئے گا۔"

بولے: "تم ذرا بھی فکر نہ کرو، میں سب دیکھ لوں گا۔"

اور باہر جا کر اپنے دوستوں سے باتوں میں محو ہو گئے۔ میں بھی نچنت ہو گئی۔

جب وقت پر سب کھانے کے لیے بیٹھے تو میں نے بھرتے کی پلیٹ کی طرف اشارہ کیا۔ انہوں نے بھرتہ اٹھایا اور کافی مقدار میں اپنی پلیٹ میں ڈال کر بولے: "دیکھو بھئی یہ ترکاری بس اتنی ہی ہے لیتے وقت ذرا دوسروں کا خیال رکھئے گا۔"

شرم کے مارے میرا منہ لال ہو گیا۔ میں نے کہا: "آپ تو دوسروں کا خیال رکھئے۔"

"ارے یار......" کہتے ہوئے انہوں نے زور کا قہقہہ لگایا: "اب تو جوٹھا ہو گیا نہیں واپس ڈال دیتا" اور پھر مجھ سے معافی مانگتے ہوئے بولے "غصے کیوں ہوتی ہو، یہ سب اپنے آدمی ہیں۔ یہاں کھانا کھانے تھوڑی آتے ہیں۔ اس بہانے کچھ دلچسپ گھڑیاں بیت جاتی ہیں۔" اور دوستوں سے بولے "لو یار تھوڑا تھوڑا۔ یہ تو اور پکانے لگی تھیں میں نے روک دیا کہ تم سب اپنے آدمی ہو، تکلف کی کیا ضرورت ہے۔"

اشک جی کے لیے سبھی اپنے آدمی ہیں۔ جامعہ ملیہ دہلی کے پروفیسر سرور نے ان کے بارے میں ایک جگہ لکھا ہے:

"اشک کی طبیعت میں اجنبی پن نام کو نہیں۔ پہلی ہی ملاقات میں آپ سے سب کہہ دیں گے
آپ سے بے تکلف اور سب کے دوست۔"

اور مجھے ان کے ساتھ اپنی پہلی ملاقات کی یاد آ جاتی ہے۔

مجھے بٹالہ سے لاہور پہنچنے میں دیر ہو گئی تھی لیکن یہ مجھ سے پہلے پریت نگر سے لاہور پہنچ گئے تھے۔ میں ابھی غسل وغیرہ سے بھی فارغ نہ ہوئی تھی کہ آپ کا چھوٹا بھائی پہنچا۔ معلوم ہوا کہ اشک جی کو آئے چار پانچ گھنٹے ہو چکے ہیں۔ ان کی طبیعت خراب ہے، ہلکی سی حرارت ہے، ہاکی کھیلتے ہوئے ٹانگ پر گہری چوٹ آ گئی ہے اور اگر مجھے خاص تکلیف نہ ہو تو میں ہی ادھر چلی چلوں۔

اشک جی کے بڑے بھائی لاہور میں دانتوں کے ڈاکٹر تھے۔ بائیبل سوسائٹی کے سامنے ان کی سرجری تھی۔ ان کے بھائی نے مجھے وہاں کا پتہ بتایا ہم نے کہا، "آپ ان سے کہیے کہ میں آدھ گھنٹے میں خود ہی وہاں پہنچ جاؤں گی۔"

میں نے اشک جی کو پہلے بھی دو ایک بار دیکھا تھا۔ سلک کا بنگالی کرتا اور باریک کنارے کی دھوتی پہنے۔ ہندی سماج لاہور کے جلسوں میں ان کی نظمیں بھی سنی تھیں لیکن یہ مجھ سے واقف نہ تھے۔ چند خطوں ہی کا تعارف تھا۔ دوکان کی چق اٹھا کر میں اندر داخل ہوئی تو میں نے دیکھا کہ ہاف پینٹ اور کھلے گلے کی قمیص پہنے بیٹھے ہیں۔ ایک آنکھ پر پٹی بندھی ہے جو نصف سر کو اپنی لپیٹ میں لیے ہوئے ہے۔ قمیص کے کف میں تین تین اسٹڈ ہیں اور ہاف پینٹ کی بیلٹ میں تین تین بکلس۔ اپنی حیرت کو چھپا کر میں نے نمسکار کیا۔ میرے نمسکار کا جواب دیے بغیر بولے "آؤ!" میں بیٹھنے ہی والی تھی کہ اچانک اٹھ کھڑے ہوئے۔ بولے "یہاں مریضوں کی بھیڑ لگی رہتی ہے، گھر میں پتا جی آئے ہوئے ہیں اور بیٹھے ہوئے ہیں۔ چلو بیدی کے ہاں چل کر بیٹھتے ہیں۔"

اس سے پہلے کہ میں کچھ جواب دیتی آپ نے باہر نکل کر تانگے والے کو آواز دی اور اگلی سیٹ پر جا بیٹھے۔

بیدی کا نام سن کر نہ جانے کیوں میں نے سمجھا کہ ہم کسی ڈاکٹر کے یہاں جا رہے ہیں ——— ڈاکٹر بیدی ——— اور میرے تخیل میں جدید طرز پر سجا ہوا ایک ڈرائنگ روم گھوم گیا لیکن جب گھوڑا ہسپتال کے برابر سے ہو کر رشی نگر کے باہر کی سڑک پر چلتے ہوئے تانگہ ایک کیچڑ بھری گلی کے سامنے جا کر رکا اور مکانوں کے آگے بہتے ہوئے کیچڑ کی عفونت کے مارے دماغ پھٹا گیا (اس وقت تک رشی نگر میں نالیاں نہ بنی تھیں اور مکانوں کا گندا پانی ان کے آگے بہتے ہوئے کیچڑ میں اکٹھا ہو جاتا تھا) تو میرا ماتھا ٹھنکا لیکن تانگے سے اتر کر میں چپ چاپ ان کے پیچھے پیچھے چلنے لگی۔

جس کمرے میں ہم داخل ہوئے وہ نہ جدید تھا، نہ میرے تصور کے مطابق سجا ہوا تھا اور نہ بیدی ہی ڈاکٹر تھے۔ کمرہ چھوٹا سا تھا اس میں ایک پلنگ بھی بچھا تھا، ایک میز اور دو تین کرسیاں بھی تھیں اور "کہو بھئی بیدی" کہہ کر اشک جی نے جس شخص سے ہاتھ ملایا وہ منجھلے قد کا ایک سیدھا سادا سکھ نوجوان تھا۔ ننگے سر اور کچھا پہنے ہوئے۔

کمرے میں ایک نفیس سوٹ میں ملبوس ایک دوسرا سکھ نوجوان بھی بیٹھا تھا۔ اشک جی اسے جانتے تھے یا نہیں، یہ تو میں نہیں کہہ سکتی لیکن اس پر ایک اڑتی سی نگاہ ڈال کر یہ اپنے دوست کو دھکیلتے ہوئے ساتھ صحن میں لے گئے اور اس سے بولے "یہ بھائی اپنے اس دوست کو جلدی چلتا کرو خواہ تمہیں کتنا بھی عزیز نہ ہو۔" میری طرف اشارہ کرتے ہوئے بولے "ان کو ذرا لے جا کر بٹھاؤ اور مجھے کوئی پاجامہ آجامہ دو، نکر کی قید سے نجات حاصل کروں۔" اور اپنے دوست کو جواب دینے کا موقع دیے بغیر رسی پر دھو کر سوکھنے کی غرض سے ڈالا ہوا اور سوکھا ہوا ایک پاجامہ لے کر جملہ "میں ابھی آتا ہوں" کہہ کر اندر کمرے میں چلے گئے۔

میں حیرت زدہ سی بیدی صاحب کے ساتھ (کیونکہ یہ بیدی اردو کے مشہور افسانہ نگار راجندر سنگھ بیدی کے علاوہ کوئی دوسرے نہ تھے) پھر اپنے اندر سامنے کمرے میں گئی اور جس کرسی کی طرف انہوں نے اشارہ کیا اس پر چپ چاپ بیٹھ گئی۔

کچھ عقیدت کے مارے اور کچھ اس لیے کہ میں اتنی دور سے اشک جی سے ملاقات کرنے آئی تھی میں ان سب باتوں کے باوجود جو میرے نزدیک نہایت غیر مہذبانہ تھیں، چپ چاپ بیٹھی رہی۔ یہ جان کر کہ الفاظ سے کھیلنے والے یہ کوئی صاحب طرز ہیں، میں نے اس وقت تک اشک جی کی کہانیاں ہی پڑھی تھیں، ان کے افسانوں سے میں روشناس نہ تھی، ہاں بھی اس انہماک سے کھیل سکتے ہیں کہ آنکھیں نظر جائیں، مجھے حیرت ہو گئی تھی اور اگرچہ ان کی اس قریب قریب المریچر مہذب سے بے تکلفی کو دیکھ کر میں حیرت زدہ رہ گئی تھی لیکن اس عجیب پاگل پن کے باعث انہیں کچھ اور جاننے کا تجسس بھی

میرے دل میں پیدا ہو گیا تھا۔

مجھے بیدی صاحب کی وہ بے بسی کبھی نہ بھولے گی۔ میں نے بعد میں انہیں نہایت نفیس سوٹ میں ملبوس بھی دیکھا ہے اور جدید ڈھنگ سے سجے ہوئے ماڈل ٹاؤن کے بنگلے میں بھی، لیکن اپنے ملنے والوں کے معاملے میں میں نے انہیں اتنا ہی مہذب اور با اخلاق پایا ہے۔ اشک جی کبھی کبھی بہت روکھے ہو جاتے ہیں لیکن بیدی صاحب کو میں نے کبھی خواندہ یا ناخواندہ مہمان سے روکھا سلوک کرتے نہیں دیکھا۔

مجھے بٹھا کر بیدی صاحب (اپنے ملاقاتی کو چلتا کرنے کی بجائے) مٹھائی کی طشتری اور سوڈے کا گلاس اندر سے لے آئے اور اسے ان مہمان صاحب کے سامنے رکھتے ہوئے بولے "لیجئے ڈاکٹر صاحب! اتنی دیر سے آپ بیٹھے ہیں، کچھ کھائیے نا؟"

ڈاکٹر صاحب (جو بعد میں معلوم ہوا کہ کسی ڈاکٹر بنانے والی کمپنی سے ہومیوپیتھی کی ڈگری لئے ہوئے تھے) غالباً اپنے رومانی کارنامے سنا رہے تھے۔ اگرچہ بیدی صاحب نے "اتنی دیر" کہتے ہوئے ان الفاظ پر زور دیا تھا لیکن اس لطیف اشارے کو وہ کیا سمجھتے۔ انہوں نے بڑے اطمینان سے تپائی کو اپنی طرف کھینچ کر اس کے نیچے گھٹنے ٹکا دئے اور اپنی بات جاری رکھتے ہوئے مٹھائی کا ایک ایک ٹکڑا اٹھا کر منہ میں ڈالنے لگے۔

بیدی صاحب کے چہرے پر ایک رنگ آنے اور ایک جانے لگا۔ اپنی کرسی پر بیٹھے وہ پہلو بدلنے لگے۔ مجھے پورا یقین ہے کہ وہ اپنے دوست کو کبھی نہ ٹال سکتے لیکن اشک جی نے کپڑے بدل کر آنگن ہی سے کہا "اب اپنی کانفرنس ختم کر دیا، کچھ وقت ہمارے لئے بھی رہنے دو۔"

کوئی احمق ہی ہوگا جو اتنا سیدھا اشارہ نہ سمجھے۔ اس لئے ڈاکٹر صاحب اچانک ہڑبڑا کر اٹھے اور بیدی صاحب سے معافی مانگ کر پھر آنے کا وعدہ کر کے چلے گئے۔ اشک جی نے آکر مختصراً بیدی صاحب سے میرا تعارف کرایا۔ بیدی صاحب پھر نئی مٹھائی اور سوڈے کی بوتلیں لانے کو بھاگے اور اشک جی جا کر پلنگ پر تکیے ہوئے سے لیٹ گئے۔

وہیں لیٹے لیٹے انہوں نے آنکھ کی چوٹ سے جو بات شروع کی تو اپنی چوٹ اور حرارت کے باوجود اپنی زندگی کی سبھی کہی اور ان کہی باتیں کہہ گئے۔

لیکن سب سے بے تکلف اور سب کے دوست؎ کی دوسری انتہا بھی ہے۔ یوں تو اشک جی دوستوں ہی سے نہیں، بارہا پہلی بار ملنے والوں سے بھی اپنی سبھی کہی ان کہی باتیں کہہ دیتے ہیں لیکن جنہیں وہ اپنا دشمن سمجھ لیں (کوئی ان کی توہین کر دے یا انہیں دھوکہ دے دے) تو اس سے روزانہ ملنے پر بھی کبھی اس پر اپنا عندیہ ظاہر نہیں ہونے دیتے اور دس برس بعد بھی اپنی ہتک کا بدلہ لینے سے نہیں چوکتے۔ یہ بات نہیں کہ یہ اپنے کردار کی اس خامی سے بے بہرہ ہیں۔ بات چل پڑے تو اشک جی اس کا اعتراف کر لیتے ہیں۔ اسے زمانۂ جہالت کا نشان بتاتے ہیں اور ہمیشہ اپنی اس عادت سے نجات پانے کی کوشش کرتے ہیں لیکن انہوں نے ایسے خاندان میں جنم لیا ہے جہاں دادا کی توہین کا بدلہ پوتے چکاتے رہے ہیں اور جب بھی کبھی بیہودہ دانستہ کوئی ان کی ہتک کر دیتا ہے تو یہ پیدائشی جذبے سے مجبور ہو کر دیا دھرم کا سارا فلسفہ بالائے طاق رکھ کر اپنی اس توہین کا انتقام لینے کے لئے تل جاتے ہیں۔ نہ اس توہین کو بھولتے ہیں اور نہ اس وقت تک سکون پاتے ہیں جب تک اس کا بدلہ نہ لے لیں یا دوسرا معافی نہ مانگ لے۔

ان کی معافی کا قصہ بھی دلچسپ ہے۔ کئی بار ایسا ہوتا ہے کہ کسی سے دھوکہ کھانے یا ہتک کی وجہ سے ناراض ہوتے پر دل ہی دل میں کڑھنے اور دھیان گیا ہے اپنے اس ہتک کا بدلہ لینے کی سکیمیں سوچتے رہتے ہیں کہ وہ اپنی اس حرکت پر اظہار افسوس کر دیتا ہے۔ بس یہ سب کچھ بھول کر اس کے گن گانے لگتے ہیں۔

ابھی تین چار برس پہلے ان کے ایک دوست نے دھوکے کے ساتھ ہم سے نہ صرف دلی والا مکان (جہاں اشک جی کے بمبئی آنے پر میرا بھائی رہتا تھا) اسے کرکسی کو دے دیا بلکہ وہاں میرے بھائی کا جو سامان تھا وہ بھی ٹھکانے لگا دیا۔ اشک جی نے سارے تو بڑے تلملائے لیکن جس کو اس نے

مکان چھا جو بھی ادیب اور دوست تھے انہوں نے مکمل بات جانتے ہی کہہ کر افسوس ظاہر کیا۔ تب نہ صرف اشک جی نے مکان واپس لینے کی کوشش نہیں کی بلکہ مالک مکان کو لکھ کر حتی الامکان انہیں وہاں جانے کی سعی کی۔ لیکن جس دوست نے دھوکہ دیا تھا اس سے انتقام لینے کا عہد کئے رہے۔ پچھلے دنوں جب ڈاکٹروں سے صلاح مشورہ کرنے بمبئی گئے تو کہیں وہ بھی بمبئی ہی میں تھا۔ اسے ان کے وہاں ہونے کا پتہ چلا تو ملنے چلا آیا۔ نہ جانے کیا کیا باتیں ہوئیں لیکن وہ معافی مانگ گیا۔ واپس آئے تو بولے "شاید ..... پنچ گنی آئے!"

میں حیرت زدہ سی ان کا منہ تکنے لگی۔

تب بتانے لگے کہ کیسے وہ ملا۔ کیسے مسز بیدی کے ساتھ ملاقات سے ملنے آیا، کیسے بحث ہوئی اور کیسے انہوں نے اسے لاجواب کر دیا۔ کیسے پاکستان میں اس کا بڑا نقصان ہوا ہے اور کیسے اس نے اپنے کردار پر افسوس کا اظہار کیا ہے۔

جب اس صفائی پر بھی میرے چہرے سے حیرت اور غصے کے آثار نہ مٹے تو بولے "جب اس نے معافی مانگ لی تو کیا میں اسے پھانسی پر لٹکا دیتا۔ بمبئی میں گرمی ہے، حال اس کا آج کل پتلا ہے۔ لاکھ بُرا سہی مگر آدمی دلچسپ ہے۔ میں نے اسے پنچ گنی آنے کے لئے کہہ دیا۔ اب ہٹاؤ اس قصے کو۔"

اور یہ کہہ کر بے پروائی سے سر کو جھٹکا دے کر اپنے کام میں محو ہو گئے۔

اشک جی اپنے کپڑوں کے سلسلے میں بڑے بے پروا ہیں۔ لوگوں نے انہیں ہر طرح کا لباس پہنے دیکھا ہوگا لیکن سوٹ بوٹ، اچکن ٹوپی قمیص شلوار، دھوتی کرتا وغیرہ ہر فیشن کے کپڑے پہننے کے باوجود انہیں تہ بند پہنے ننگے بدن رہنا بڑا پسند ہے۔ پہلے پہل یہ سوٹ وغیرہ بھی پہنتے تھے جب انہیں سرکاری دفتر میں کسی سے ملنے جانا ہوتا ورنہ سارا دن گھر میں ننگے بدن، تہ بند اور کبھی کبھی محض کچھا پہنے بیٹھے رہتے (قمیص یا کرتا قریب ہی رکھتے، کوئی آتا تو جھٹ پہن لیتے) پھر جب خود سرکاری دفتر میں نوکر ہوئے تو اگرچہ ہمیشہ پینٹ وغیرہ کسے رہنا پڑا لیکن تہ بند سے ان کا موہ نہیں گیا۔ جب بھی گھر میں ہوتے تہ بند پہنتے۔

دلی میں ہم آل انڈیا ریڈیو میں نئے نئے ملازم ہوئے تھے، گرمی کا موسم تھا لیکن شامیں نسبتاً ٹھنڈی ہو گئی تھیں۔ ایک شام کھانا کھانے کے بعد بولے "چلو ذرا سیر کی جائے۔"

اپنی عادت کے مطابق صرف تہ بند پہنے ہوئے تھے۔ مجھے تو بڑی بدتمیزی معلوم ہوتی تھی۔ لیکن نئی نئی آئی تھی زیادہ زور نہ دیتی تھی۔ آہستہ سے میں نے کہا "کپڑے تو بدل لیجئے!"

کہنے لگے "پھر سیر کا مزا کیا خاک آئے گا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا میں ننگے بدن گھومنے کا جو لطف ہے وہ کپڑے ٹھونس کر جانے میں کہاں؟"

"میں تو نہیں جا سکتی۔"

بولے "اس وقت سڑک پر کون ہوگا!"

"تو بھی" میں نے کہا "میں تو نہ جاؤں گی۔"

"تو میں ہو آتا ہوں، مہندر کو لے لوں گا۔"

مہندر، اردو کے مشہور افسانہ نگار کرشن چندر کے چھوٹے بھائی ہیں اور خود بھی خوب لکھتے ہیں۔ ہمارے ان کے گھر ساتھ ساتھ تھے۔ مہندر بھائی کو ساتھ لے کر یہ ننگے بدن صرف تہ بند پہنے، اس کی دائیں کور کو ہاتھ سے خاص انداز میں اٹھائے چلے جا رہے تھے کہ [illegible] صاحب جو آل انڈیا ریڈیو میں شعبہ موسیقی کے انچارج تھے اور خود بھی بہت اچھے موسیقار تھے، آتے دکھائی دئے۔ ڈبل روڈ تھا، بجلی کی روشنی تو تھی ہی،

دونوں طرف نیم کے گھنے پیڑوں کے باعث وہاں اندھیرا سا رہتا ہے۔ سرِ شام وہاں سناٹا چھا جاتا ہے۔ اس وقت تو نو ساڑھے نو کا وقت تھا سڑک سونی تھی اور نظامی صاحب آسمان کی طرف منہ کئے کوئی دھن بناتے اور گنگناتے چلے آ رہے تھے۔

بڑھ کر اشک جی نے ان کے کندھے پر ہاتھ مارا "کیوں بھئی کدھر؟"

نظامی صاحب کا خیال اپنی دھن میں تھا۔ سڑک پر خاصی تاریکی تھی۔ چند دن پہلے اس مقام کے نزدیک ہی ایک ریڈیو انجینئر پر قاتلانہ حملہ ہو چکا تھا۔ اشک جی کو اس عالم میں دیکھ کر وہ فوراً پہچان نہ سکے۔ ان کا رنگ فق ہو گیا اور لحظہ بھر کے لئے وہ ان کو ٹکر ٹکر تکتے رہے۔ پھر جب اشک جی نے اپنا فلک شگاف قہقہہ لگایا اور کہنہ ربھائی نے بڑھ کر انہیں "آداب عرض" کیا تو ان کی جان میں جان آئی۔ حیرت سے انہوں نے پوچھا "کیا بات ہے ایسے کیوں گھوم رہے ہو؟"

اشک جی کو اس میں حیرت کی کوئی بات نہ دکھائی دیتی تھی۔ جو شخص بی۔ اے تک لنگوٹ لگائے جسم پر تیل کی مالش کئے جالندھر کے بھرے بازار میں بھاگتا پھرتا رہا ہو، جسے کسی نے ٹوکا نہ ہو، اور جو اس بات کا ذکر بڑے فخریہ انداز میں کرتا ہو، اسے دلی کی نسبتاً سونی سڑک پر لنگوٹ نہیں، تہ بند لگائے گھومنے میں کیا برائی نظر آ سکتی۔ "تم بھی نرے گھونچو آرٹسٹ ہو" کہتے ہوئے اشک جی نے ان سے ہاتھ ملایا اور آگے بڑھ گئے۔

ادھر کچھ برسوں سے اشک جی نے تہ بند نہیں پہنا اور متواتر نوکری کرنے کی وجہ سے اپنے قول کے مطابق زیادہ وقت کپڑوں کے قید خانے میں بند رہے ہیں لیکن نہ ابھی تہ بند کا موہ چھوٹا ہے نہ ننگے بدن بیٹھنے کا۔ بمبئی میں جب جب گھر پر کام کرتے رہے ہیں، اپنی پرانی عادت کے مطابق ہمیشہ دھوتی یا ہمیشہ انڈرویئر (under wear) میں کام کرتے رہے ہیں۔ یوں بھی کپڑوں کے معاملہ میں کچھ عجیب طرح کی بے نیازی ان کے مزاج میں ہے۔ اکیلے تھے تو جو بھی کپڑا باہر ہوا یا ٹرنک کے اوپر ہوا وہی پہن لیتے تھے۔ میں آئی تو جو بھی میں نکال دیتی وہی پہن لیتے۔ لیکن اس کے باوجود جب کبھی جی سے پہنتے ہیں تو تب نفاست پسندی کی حد کر دیتے ہیں۔ پہلے پہل مجھے یہ بے نیازی اور نیاز بڑا عجیب سا لگتا تھا لیکن اب میں ان کے مزاج کی اس انتہا پسندی کی عادی ہو گئی ہوں۔

دلّی ہی کی بات ہے۔ یہ دیکھ کر کہ پاس میں پیسے ہوتے ہوئے بھی یہ بڑے بھدے کپڑے پہنتے ہیں (سبب کچھ بھی ہو) جب میں آئی تو آل انڈیا ریڈیو کی نوکری کے باوجود گرمیوں کے لئے ان کے پاس صرف تین پتلون اور تین قمیص تھیں —— نوکر دھو کر پھا کرا لاتا اور یہ بدل کر چلے جاتے تھے اور سردیوں کے لئے محض ایک ذلیل سا سوٹ تھا) میں نے آتے ہی ان کے نہ، نہ کرنے پر بھی دو بڑھیا گرم سوٹ سلوائے۔ ایک دن جب میں نے نیا سوٹ پہننے کو نکالا تو ٹائی حسبِ پسند نہ ہونے کے باعث چھوڑ دیا۔ میں اسی شام کچھ بہت اچھی ٹائیاں لے آئی۔ کسرت کرتے، حجامت بناتے اور غسل لیتے ہوئے انہیں کچھ دیر ہو گئی تو جھلانے لگے۔ جلدی میں کبھی یہ قمیص پہنتے کبھی وہ۔ آخر جب سوٹ پر سجتی ہوئی قمیص پہنی تو ٹائی پر کافی دیر اٹکے۔ بوٹ پر پالش کیا گیا۔ آخر جب پوری طرح اطمینان ہو گیا تو ناشتے کا وقت نہ رہا۔ کسی نہ کسی طرح زور دینے پر ناشتہ کر کے بھاگے۔ ان کے جانے پر میں حیرت زدہ سی کھڑی سوچنے لگی کہ کہاں تو اتنی بے پروائی کہ کیا پہنتے ہیں کیا نہیں پہنتے، اس کا ہوش نہیں اور کہاں اتنی نفاست پسندی کہ کالج کے چھوکرے بھی مات کھا جائیں۔ کام کرتے ہوئے میں متواتر یہی سوچتی رہی۔

ان کو گئے پانچ چھ منٹ گزر گئے تھے اور میں منا رہی تھی کہ میٹنگ کے وقت پر پہنچ جائیں تاکہ اس دیر کا غصہ مجھ پر نہ اترے کہ جبھی برآمدے میں پھر ان کے جوتوں کی آواز سنائی دی۔ میں باہر کی طرف بھاگی کہ کوئی فائل رہ گئی ہو تو دیکھ کر جلدی سے دے دوں۔ دوسرے لحظہ آپ داخل ہوئے اور سیدھے اندر کے کمرے میں چلے گئے۔ میں نے پوچھا "کیا ہوا؟ کیا رہ گیا؟"

"بنیان ہے، کچھ نہیں۔"

جاکر دیکھتی ہوں تو آئینے کے سامنے کھڑے وینشنگ کریم مل رہے ہیں۔
ان کی ماتا جی سے ایک بار بات چلی تو کہنے لگیں: "دلکھیں ہی سے اس کی ایسی عادت ہے، نہیں پہنتا تو نہیں پہنتا، پہنتا ہے تو وانیا دن
کو مات کرتا ہے۔ ایک بار سربندر (بڑے بھائی) کی شادی پر بڑھیا سلک کا ایک کوٹ سلوایا۔ درزی نے اوپر کی جیب کہیں زیادہ ٹیڑھی کر دی
مجھے تو اس میں کوئی نقص نہ لگتا تھا مگر اس نے وہ ایک بار پہن کر دیکھا اور پھر نہیں پہنا۔"
ان دنوں اشک جی آٹھویں یا نویں جماعت میں پڑھتے تھے۔

ان کے اس دورخی مزاج کا ایک اور ثبوت مجھے انہی دنوں پھر ملا۔ دلی ہی کی بات ہے۔ میں نے اندرپرستھ گرلز ہائی سکول میں نوکری کرلی تھی
لڑکیوں کے امتحان ہو چکے تھے اور پیپروں کا ڈھیر کا ڈھیر آیا پڑا تھا۔ انہی دنوں نوکر بھاگ گیا۔ کسی طرح رات کا کھانا پکا کر، برتن اور کپڑے وغیرہ اسی طرح
چھوڑ کر میں پیپر دیکھنے لگی اور رات کے دو بجے تک دیکھتی رہی۔ یوں بھی میں صبح دیر سے اٹھنے کی عادی ہوں۔ اس دن کچھ اور دیر ہو گئی۔ اٹھتے ہی پہلی نظر
جس چیز پر پڑی وہ رسی پر سوکھنے کے لیے ڈالے ہوئے دھلے دھلائے کپڑے تھے۔ حیرت ہوئی کہ یہ کس نے دھوئے۔ سوچا شاید علی الصبح کوئی نوکر
مل گیا ہے۔ خوشی خوشی سے بھاگی اندر گئی تو دیکھا باورچی خانے میں باپ بیٹا (اشک جی کی پہلی بیوی سے ایک لڑکا ہے) بیٹھے برتن مل رہے ہیں اور
اشک جی اپنے لڑکے کو برتن ملنے کے فن میں مشاق بنا رہے ہیں۔
میں بھونچکی سی چوکھٹ میں کھڑی رہ گئی۔ پھر بڑھ کر میں نے کہا: "ہٹئے یہ کیا کر رہے ہیں، کیا میں مر گئی ہوں جو برتن ملنے آ بیٹھے ہیں؟"
کہنے لگے "مرنے کا نام نہ لو۔ پڑھی لکھی بیوی اب مجھے کہاں سے ملے گی؟"
میں نے کہا: "ہٹا یئے، یہ مذاق مجھے پسند نہیں۔"
لیکن انہوں نے مجھے برتنوں کو ہاتھ نہیں لگانے دیا۔ کہنے لگے: "میرے ہاتھ تو گھسے ہوئے ہیں، تم کیوں فضول ہی انہیں خراب کرتی ہو۔
تم سے بڑے نہیں ملوں گا، اس بات کا یقین رکھو۔ سکول کے دنوں میں برسوں برتن ملے ہیں۔ جاؤ جلد تیار ہو جاؤ، سکول پہنچنے میں تمہیں دیر ہو جائے گی۔"
مجبور ہو کر مجھے ہٹنا پڑا۔ خوش قسمتی سے اسی دن نوکر مل گیا، نہیں تو جانے یہ کتنی دیر تک گھاٹ بنے رہتے۔
لیکن اس واقعہ کے چند دن بعد کا ذکر ہے، اتوار تھا۔ میں باہر صحن میں بیٹھی پیپر دیکھنے میں محو تھی اور اشک جی اندر کچھ لکھ رہے تھے کہ مجھے آواز
پڑی۔ مجھے اٹھنے میں کچھ دیر ہوئی کہ پھر آواز پڑی۔ پیپر چھوڑ کر میں بھاگی۔ بولے "ذرا وہ ڈکشنری دینا۔"
ڈکشنری دو قدم کے فاصلے پر ریک میں پڑی تھی۔ میرے سامنے دو دن پہلے کپڑے دھونے اور برتن ملنے کا واقعہ گھوم گیا۔ ڈکشنری دیتے ہوئے سوچنے
لگی کہ جو آدمی ایسی شاہانہ آرام طلبی کا مالک ہو سکتا ہے کہ دو قدم اٹھ کر چیز اٹھانے کی بجائے دوسرے کو بلائے، وہ کپڑے دھونے اور برتن ملنے جیسا
مشکل کام کیسے کر سکتا ہے۔

لیکن یہی اتار چڑھاؤ اور انتہا پسندی اشک جی کے مزاج کا اہم جزو ہے۔ ان کا سبھاؤ ایسے سکون پسند آدمی کا سا نہیں جو پہاڑ کی چوٹی پر پہنچ کر
وہیں ڈیرا ڈال دے، بلکہ ایسا چنچل راہی ہے جس کو کبھی پہاڑوں کی چوٹیاں پسند ہیں کبھی گہری گھاٹیاں، جو کبھی گنجان شہروں کو پسند کرتا ہے کبھی سنسان
ویرانوں کو، جسے کبھی یہ انتہا مرغوب ہے کبھی وہ۔ کوئی ایک سیدھا میانہ روی اسے پسند نہیں۔ بچپن ہی سے اشک جی کی زندگی حوادث سے پُر رہی ہے
انھوں نے نہایت کڑوے جام بھی پیئے ہیں اور بے حد میٹھے بھی، فراوانی بھی دیکھی ہے اور نقصان بھی۔ بے انتہا محبت بھی پائی ہے اور بے پناہ نفرت
بھی اور نہ جانے کن پیدائشی سنسکاروں، ماں باپ کی کن خوبیوں اور خامیوں اور کن دوسری جسمانی، دماغی، معاشرتی اور اقتصادی پیچیدگیوں کے باعث ان کا سبھاؤ

ایک دوسری کے برعکس حدوں میں گھڑی کے پنڈولم کی طرح گھومتا رہتا ہے۔ قہقہے مارتے ہیں تو چھت پھٹتی ہوئی دکھائی دیتی ہے اور کبھی بے سبب کسی چیز کی طرف سے ٹھیس پہنچنے پر رو پڑتے ہیں تو سمجھ میں نہیں آتا کیونکر انہیں تسکین دی جائے۔ ایک لمحہ میں اتنے کمزور کہ بے ساختہ رحم آ جائے۔ دوسرے لمحے اتنے مضبوط کہ پہاڑ سے بھی ٹکر لینے کو تیار ہو جائیں۔ کپڑا ایسے کہ کیا پہنتے ہیں اس کا دھیان نہیں، کیا لکھتے ہیں اس کی پروا نہیں۔ لیکن دوسرے موقع پر اتنے نفاست پسند کہ لباس کی چھوٹی سے چھوٹی تفصیل کا خیال رکھنے والے اور اتنے مہذب کہ منہ سے ہر لفظ جانچ تول کر نکالنے والے، کبھی اتنے فراخ دل کہ بڑی سے بڑی بات کو خاطر میں نہ لائیں اور کبھی اتنے تنگدل کہ چھوٹی سی بات پر راتوں کی نیند حرام کر لیں اور جب تک اس کا انتقام نہ لے لیں چین نہ پائیں۔ کبھی ایسے کنجوس کہ تکلیف سہہ کر پیسہ پیسہ جوڑیں اور کبھی ایسے فضول خرچ کہ اتنی مصیبت سے جمع کی ہوئی رقم لحظہ بھر میں خرچ کر دیں کبھی ذہنی لایقینی کے ایسے شکار کہ اپنی اور دوسروں کی زندگی تباہ کر دیں اور کبھی ارادے کے ایسے پکے کہ دو ٹوک فیصلہ کر کے اس سے انچ بھر بھی نہ ہٹیں کبھی بے حد سنگدل کبھی موم کی طرح پگھل جانے والے، کبھی اتنے شاطر کہ بڑے سے بڑے چالاک سے دھوکہ نہ کھائیں اور کبھی ایسے سادہ لوح کہ عام آدمی بھی ٹھگ کر چلا جائے۔ انہی انتہاؤں کو لے کر اشک جی کے اس تفاوت بھرے مزاج کے سلسلے میں ایسے دلچسپ واقعات ہیں کہ چھوٹے سے مضمون میں ان پر پوری روشنی نہیں ڈالی جا سکتی۔

لیکن جس طرح کوئی عام اصول استثنیٰ سے خالی نہیں ہوتا اسی طرح اشک جی کا یہ مختلف انتہاؤں پہ چلنے والا اسبھاؤ بھی مستثنیات سے خالی نہیں میں نے پچھلے چھ برس میں ان کی طبیعت کے ایسے پہلو بھی دیکھے ہیں جن کی محض ایک ہی انتہا ہے۔ اس سے مختلف دوسری حد نہیں۔

ان کے لکھنے ہی کو لیجئے، لکھنے کی ان کو سنک سی ہے اور یہ سنک انتہا ہی کا دوسرا نام ہے۔ بارہا ادیبوں کے اپنے زرخیز اور بنجر اوقات ہوتے ہیں کبھی ایسا وقت آتا ہے جب ان کی تخئیل باڑھ پر آئی ہوئی ندی کی طرح ایک سے بڑھ کر ایک شاہکار کاغذ پر اتارتی جاتی ہے۔ پھر ایسا وقت بھی آتا ہے جب تخئیل کی باڑھ اتر جاتی ہے اور ان کا دماغ اترے ہوئے سمندر کے پھیکے، بے کیف، سنسان ساحل سا ہو جاتا ہے۔ وہ ہفتوں، مہینوں اور بارہا برسوں کچھ نہیں لکھ پاتے۔ اشک جی کو میں نے دیکھا ہے کہ وہ ہمیشہ لکھتے ہیں۔ سردی گرمی، برسات یا سوکھے میں متواتر بہنے والی دوامی ندی کی طرح ان کی تخئیل ہمیشہ ہری رہتی ہے۔ یہ دکھی ہوں یا سکھی، نوکر ہوں یا بے کار، اکیلے ہوں یا دکیلے ہمیشہ لکھنے کے لئے وقت نکال لیتے ہیں۔ ان کے دوست ان کی اس عادت کو سنک کا نام دیتے ہیں۔ ہے بھی سنک ہی، لیکن ان کی یہ سنک ایک ہی انتہا پر قائم رہتی ہے۔ اس کی دوسری انتہا یعنی سستی یا بے حسی میں نے ان کے ہاں کبھی نہیں دیکھی۔ لکھے بغیر یہ رہ ہی نہیں پاتے۔ ابھی ایک برس پہلے، جب ڈاکٹروں نے دق کا فتویٰ دیتے ہوئے ہدایت کی کہ انہیں پورا آرام لینا چاہئے تو میں سمجھتی تھی کہ اب یہ کچھ دن چین لیں گے۔ میں نے انہیں الگ کمرے میں لٹا دیا اور دروازہ لگا دیا کہ نہ کوئی ہوگا نہ بات کریں گے۔ انہوں نے نہ لکھا نہ پڑھا نہ باتیں کیں لیکن لیٹے لیٹے یادداشت کے بل پر "دیپ جلے گا" کے نام سے ایک طویل نظم لکھ ڈالی۔ ایک مہینے بعد میں انہیں پنچ گنی لے آئی اور چار مہینے تک انہیں کام کرنے کی اجازت نہ ملی۔ ان دنوں یہ لیٹے لیٹے ایک دوسری طویل نظم لکھتے رہے۔

عام طور پر اشک جی اپنے ناطے رشتے داروں سے اسی حد تک محبت کرتے ہیں جس حد تک یہ ان سے پاتے ہیں۔ لیکن بڑے بھائی، ماں اور سب سے چھوٹا بھائی اس سے مستثنیٰ ہیں۔ ماں اور بڑے بھائی خواہ ان سے کیسا بھی روکھا سلوک کیوں نہ کریں، خواہ کتنی بھی ٹھیس کیوں نہ پہنچا دیں یہ ان کی رکھائی اور بے اعتنائی کا جواب ہمیشہ ادب اور محبت میں دیتے ہیں۔ ان کے برے سلوک سے رنجیدہ خاطر نہ ہوتے ہوں یہ بات نہیں کبھی کبھی کوئی چھوٹا سا واقعہ ان کی راتوں کی نیند حرام کر دیتا ہے یہ ان کی بدسلوکی پر جلتے بھنتے رہتے ہیں، لیکن جب ان سے ملتے ہیں تو سب کچھ بھول جاتے ہیں اور ان کے دکھ سے دکھی اور ان کے تفکرات سے فکرمند ہو جاتے ہیں۔

اسی طرح دوستوں کے سلسلے میں بھی ان کی محبت ایک ہی انتہا پر رہتی ہے۔ اشک جی کا قول ہے کہ جسے ہم پسند کرتے ہیں پیار کرتے ہیں،

جس کی دوستی کے خواہشمند ہیں اس کی خامیوں کو دیکھنا بے معنی ہے۔ اس کی دوستی میں جو مسرت ہمیں حاصل ہوتی ہے اسی پر ہماری نظر رہنی چاہیے دوستی کھری سی چیز ہے۔ جسے ہم چاہتے ہیں اسے دوست بنائے رکھنے کے لئے اس کی چھوٹی موٹی باتوں پر توجہ نہ دے کر ہمیشہ محبت دیتے رہنا چاہیے انتقام کی تو بات ہی وہاں نہیں اٹھتی اور میں نے دیکھا ہے کہ اپنے عزیز ترین دوستوں کے سلسلے میں (اگرچہ ان کی تعداد بہت کم ہے) اشک جی ہمیشہ اپنے اس قول پر عمل کرتے ہیں۔

اشک جی کی ایک اور سنک تھی جس کی دوسری مثال آج تک مجھے نظر نہیں آئی۔ وہ تھی باقاعدہ صبح اٹھ کر ورزش کرنا۔ شادی کے بعد جب میں نئی نئی دلی آئی تو میں نے دیکھا کہ صبح اٹھ کر لنگوٹ لگائے تیل کی مالش کر کے ڈنٹر بیٹھک نکالتے اور فری ہینڈ کسرت کرتے۔ بیدی صاحبان دونوں دلی آئے ہوئے تھے۔ انہوں نے کبھی اشک جی کو فری ہینڈ کسرت کرتے نہ دیکھا تھا۔ اس اچھل کود کو دیکھ کر انہوں نے اشک جی کو "ہنومان" کے خطاب سے سرفراز کر دیا اور جتنے دن وہ رہے صبح صبح اشک جی کی کسرت ایک فلک شگاف قہقہے سے شروع ہوتی رہی۔ لیکن دھن کے یہ ایسے پکے ہیں کہ کسی مذاق یا پھبتی کو سن کر اپنی دھن نہیں چھوڑتے۔ اس لئے "ہنومان" کہلائے جانے کے باوجود بلاناغہ ورزش کرتے رہے۔ مجھے پیچش کی پرانی شکایت ہے۔ دورہ پڑتا ہے تو نڈھال ہو جاتی ہوں۔ ایک دن مجھ سے کہنے لگے۔ "تم ورزش نہیں کرتیں اسی لئے تمہاری آنتیں کمزور ہو گئی ہیں۔ پرانے خیالات کی ہندوستانی عورتیں گھر کے کام کاج کی صورت میں اور مغربی عورتیں ناچ گانے کی صورت میں کافی کسرت کرتی ہیں اور تندرست رہتی ہیں۔" ان سب کا ذکر کرتے ہوئے انہوں نے ورزش کی اہمیت پر چھوٹی موٹی تقریر کر ڈالی۔ سانس روک کر، سینہ پھلا کر مجھے بتانے لگے ——— کس طرح کسرت کرنے سے کمر پتلی ہو جاتی ہے، سینہ چوڑا ہو جاتا ہے اور جسم کی ایک الٹی تکون سی بن جاتی ہے۔ مجھے انہوں نے صلاح دی کہ اگر میں فری ہینڈ ورزش نہیں کر سکتی تو کم سے کم سانس روک کر سینہ پھلا کر رسی ہی پھاندا کروں۔

ورزش کی اہمیت پر انہوں نے مجھے اتنے لکچر دئے اور بیدی صاحب کے قول کے مطابق ہنومان کی طرح کود پھاند کر اتنی طرح کی ورزشیں بتائیں کہ میں بھی ورزش کے ذریعے اپنی بیماری دور کرنے اور کمر پتلی بنانے کی کوشش کر دیکھنے کو تیار ہو گئی (یہاں میں یہ بتا دوں کہ نہ اشک جی موٹے ہیں اور نہ میں، لیکن ان کی کمر تو سانس روکنے اور سینہ پھلانے پر الٹی تکون کے پچھلے زاویے کی سی بن جاتی تھی اور میری غالباً نہ بنتی تھی) کچھ دنوں تک میں نے بھی کود پھاند کی لیکن ایک تو مجھے صبح جلدی اٹھنے کی عادت نہیں اور پھر کسرت کرنا مجھے نہایت خشک اور اکتا دینے والا کام معلوم ہوتا ہے۔ پھر میری آنتوں کو بھی کوئی فائدہ نہ پہنچا۔ کچھ ہی دن بعد میں نے ہتھیار ڈال دئے اور نہایت عاجزی سے کہا کہ کمر کی تکون آپ ہی کو مبارک ہو۔ مجھے کسی خوبصورتی کے مقابلہ میں تو بیٹھنا نہیں۔ مجھے تو آپ معاف ہی رکھیں۔

اشک جی نے پھر مجھے مجبور نہیں کیا۔ لیکن خود متواتر اچھل کود کرتے رہے۔ وقت ہوتا تو مالش بھی کرتے ورنہ ڈنٹر بیٹھکیں خواہ چھوڑ دیں — فری ہینڈ کسرت ضرور کر لیتے۔ کئی بار میں ناشتہ رکھ دیتی۔ یہ قریب قریب ناشتے پر بیٹھ جاتے لیکن پھر کسرت کرنے کا خیال آ جاتا اور "بس چند منٹ کے لئے معاف کرو" کہہ کر بھاگ جاتے اور پیٹ دبا، سینہ پھلا، جسم کی تکون بنا کر اچھل کود کرنے لگتے۔ اگر اپنے ضبط اور باقاعدگی کی داد چاہتے کبھی کبھی آئینہ دیکھتے تو افسوس ہوتا کہ اتنی باقاعدگی سے ورزش کرنے کے باوجود گال پچکے جا رہے ہیں۔ تب بازو کو موڑ کر ابھرے ہوئے پٹھے کی مچھلی دیکھ کر مطمئن ہو جاتے کہ چربی خواہ نہیں چڑھی لیکن ورزش کرنے سے پٹھوں میں لوہے کی سی مضبوطی آ گئی ہے۔

جب سے آئی ہوں میں نے انہیں باقاعدگی سے بلاناغہ ورزش کرتے دیکھا ہے لیکن اتنی ورزش کے باوجود انہیں آنتوں میں تکلیف [illegible] ورزش کی مقدار [illegible] شروع کر دی [illegible] سال سے [illegible] صبح [illegible] اٹھ کر [illegible] سانس روک کر [illegible] بنایا کرتے تھے اس وقت [illegible]

اس بات کی تھی کہ بستر پر کچھ دیر اور لیٹ کر آرام کرتے اور اپنی ہری ترکاریوں کی بجائے طاقت ور غذا کھاتے۔ یہ سب معلوم ہونے پر شک ہی اس بات کی تھی کہ بستر پر کچھ دیر اور لیٹ کر آرام کرتے اور اپنی ہری ترکاریوں کی بجائے طاقت ور غذا کھاتے ۔ یہ سب معلوم ہونے پر شک ہی ایک فلک شگاف قہقہہ لگانا چاہتے ہیں لیکن اب اس کی بھی اجازت نہیں کیونکہ اس سے پھیپھڑے کو نقصان پہنچتا ہے۔
مجھے پورا یقین ہے کہ اگر یہ بیمار نہ پڑتے تو ان کی یہ سنک ہمیشہ رہتی۔ اس کی دوسری مخالف انتہا پر چلنا — یعنی مکمل آرام لینا ان کے لئے کبھی ممکن نہ ہوتا۔

آپ دق سے بیمار ہو کر ڈیڑھ برس پنج گنی کے سینی ٹوریم میں گذار کر الہ آباد آگئے ہیں۔ دل و دماغ آلٹوں پر مصروف رہتے ہیں لیکن جسم سے آرام لینے کو مجبور ہیں۔ دق کی اس مجبوری نے انہیں تھوڑا بہت فلسفی بنا دیا ہے اور ان کی طبیعت اپنی انتہا پسندی چھوڑ کر میانہ روی سیکھ رہی ہے لیکن وہ میانہ روی سیکھ پائے گی اور مکمل طور پر صحت مند ہونے پر وہ سیکھ قائم رہے گی۔ اس میں کم سے کم مجھے شک ہے۔

حفیظ ہوشیارپوری

ناصر کاظمی

۱۹۴۲ء کی بات ہے۔ خاصی سردیاں تھیں۔ رات کا وقت تھا۔ اسلامیہ کالج لاہور میں ایک انٹرکالجیئیٹ مشاعرہ تھا۔ رنگ رنگ کے طالب علم وہاں موجود تھے بعض جانے پہچانے مقامی و غیر مقامی شاعر بھی تھے۔ سامعین اور ارباب ذوق سے ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ تاجور نجیب آبادی حسب معمول کرسیٔ صدارت پہ بیٹھے تھے۔ اُن کے ساتھ ہی سٹیج پہ یوں تو دو تین اور بھی اصحاب تھے لیکن ایک بہت دلچسپ اور عجیب سی چیز بھی تھی۔ گہرا سانولا رنگ، پچکے ہوئے گال، خشک ہونٹ، سرمئی برف سے بال، اکہرا جسم، چھدری چھوٹی مونچھیں، آنکھیں گرمی سے اُچکتی ہوئی ہڈیوں کی ایک مالا۔ شاعر مسند پہ آکر اپنا کلام سُناتا۔ صاحب صدر دل بڑھاتے اور داد دیتے لیکن یہ صاحب اپنی حرکتوں سے مگن تھے۔ خود ہنستے اور دوسروں کو بھی ہنساتے۔ شاعر ان کی طرف دیکھتا تو ایک دم سنجیدہ ہو جاتے اور سر کو نفی میں ہلا کر داد دینے لگتے مشاعرہ ختم ہوا۔ شاعروں کو داد ملی۔ طلبا کو انعام ملے۔ پہلا انعام جسے ملا اُس کا نام نہیں بتاؤں گا۔ دوسرا انعام اعجاز بٹالوی کو ملا۔ میں عبدالمجید بھٹی کے ساتھ عرب ہوٹل میں آکے بیٹھ گیا۔ پھر وہاں کچھ اور لوگ جمع ہو گئے۔ ڈاکٹر تاثیر مرحوم نے حفیظ ہوشیارپوری سے تعارف کرایا۔ میں دنگ رہ گیا۔ تغیر یوں بھی ہوتا ہے زمانے میں۔

حفیظ نے کوئی ڈیڑھ درجن غزلیں سنائی ہوں گی۔ تاثیر صاحب نے آدھا دیوان غالب سنا دیا۔ ہاں یاد آیا اُن میں کچھ اُن کے اپنے شعر بھی تھے۔ ایک غزل داغ کے رنگ میں تھی باقی رنگ غالب۔ حفیظ نے میری طرف دیکھا اور پھر دیکھا۔ میں نے بھی انہیں معنی خیز نظروں سے دیکھا اور ڈرتے ڈرتے دو ایک غزلیں سنائیں۔

اگلے دن میں سگریٹ لے کر کالج ہوسٹل کی طرف جا رہا تھا کہ وہی عجیب سی چیز ایک میلا خورا گرم سا سوٹ پہنے ٹائی میں ٹھنی سی گرہ، دونوں ہاتھ پتلون کی جیب میں، ڈھیلے دکانوں کے بورڈوں کی طرف دیکھتے ہوئے اردگرد کی چیزوں سے یکسر بے خبر کسی کو ڈھونڈتی ہوئی نہ جانے کدھر سے کدھر کو جلدی جلدی چلتی دکھائی دی۔ جیسے کہہ رہی ہو:

ہم سے دیوانے رہیں شہر میں سبحان اللہ
دشت میں قیس رہے کوہ میں فرہاد رہے

سنا ہے حفیظ خاصا پڑھا لکھا شاعر ہے۔ ہوگا! میں نے تو اُس کے ہاتھ میں آج تک کبھی کوئی کتاب نہ دیکھی اور نہ ہی اُسے کسی کتب خانے کی طرف جاتے دیکھا۔ جب اُس نے ایک دن مجھے یہ بتایا کہ اُس نے گورنمنٹ کالج لاہور سے نفسیات کا ایم۔ اے کر رکھا ہے تو میں ششدر سا ہو گیا۔ کم از کم اس وضع قطع کا طالب علم میں نے اس کالج میں تو نہیں دیکھا۔ اور یہ نفسیات نہ جانے اُسے کیسے ہضم ہو گئی۔ اُس سے مل کر ذرا بھی تو احساس نہیں ہوتا کہ وہ ایک فرض شناس خاوند، ایک شفیق باپ اور ریڈیو میں ایک ذمہ دار افسر بھی ہے۔ جب وہ پہلی بار اسٹیشن ڈائریکٹر ہو کر لاہور آیا تو میں دو تین دن تک دانستہ طور پر اُسے ملنے نہیں گیا۔ ایک تو اُس کی نئی مصروفیات کا خیال، دوسرے میں بھی اُن دنوں پریشان سا تھا۔ ماں باپ کا سایہ سر سے اٹھ چکا تھا اور میں پراگندہ روزی پراگندہ دل لاہور کی گلیوں کی خاک چھانتا پھرتا تھا۔ سوچا اس بُرے حال میں حفیظ کو کیا ملوں! اُس حفیظ کو جس نے مجھے کبھی بڑے آسودہ حال میں دیکھا تھا۔ اُسے آئے ابھی دو دن ہی گزرے تھے۔ رات کے کوئی ۱۱ بجے ہوں گے۔ میں اپنے تاریک کمرے میں موم کی شمع جلائے کلیاتِ میر پڑھ رہا تھا کہ ایک نحیف سی آواز آئی "ناصر" میں نے اُٹھ کر دروازہ کھولا۔ حفیظ کھڑا تھا اُس نے پھر کہا "ناصر!" میں نے کہا "جی!" اور حفیظ بولا "میں اپنا درد کہاں تک چھپاؤں گا" یہ میرا ہی ایک مصرعہ تھا

؎ ناصر میں اپنا درد کہاں تک چھپاؤں گا

حفیظ میرے ساتھ اٹھتے بیٹھتے چلتے پھرتے میرے مصرعے پڑھنے کا کوئی نہ کوئی موقع ڈھونڈ لیتا ہے۔ پہلے میں اسے دل لگی سمجھتا تھا لیکن اب مجھے معلوم ہوا کہ وہ واقعی ایک دردمند انسان ہے۔ وہ ہر آدمی سے اظہار دردمندی نہیں کرتا اور نہ ہی اُس کے اس انداز کو کوئی سمجھتا ہے۔ جب میں صاحب حیثیت تھا تو وہ خوش ہوتا تھا جب غریب الوطن ہو کر یہاں آیا تو اُس نے مجھ سے لفظی ہمدردی بھی نہیں کی اور نہ ہی کبھی کوئی امداد کی حالانکہ وہ کر سکتا تھا۔ اب سوچتا ہوں کہ اُس نے میری غربت کا کتنا احترام کیا! بھلا یہ ہو سکتا ہے کہ کوئی دوست ہو کر بھی کام نہ آسکے یہ بات نہیں۔ حفیظ اوّل تو کسی کو دوست نہیں بناتا اگر بناتا ہے تو اُسے برابر کا درجہ دیتا ہے۔ وہ ذرا اذیت پسند ہے۔ دوستوں کو مصیبت میں دیکھتا ہے تو وہ بظاہر ہنستا رہتا ہے مگر اُس کا دل روتا ہے۔ دراصل وہ اپنے ساتھ بھی یہی کرتا ہے۔ مجھے اُس نے کبھی رسماً سہارا تو نہیں دیا لیکن گرنے بھی نہیں دیا۔ اور ایک بار ایسی مدد بھی کی کہ میں آج تک اُس کی بدولت چین سے دن گزار رہا ہوں۔

تقسیم ملک سے پہلے جب میں اسلامیہ کالج میں بی اے میں پڑھ رہا تھا تو اُن دنوں میں اپنی ہوسٹل کے کمرہ نمبر ۴ میں رہتا تھا۔ میرا کمرہ دلہن کی طرح سجا ہوا تھا۔ ماں باپ زندہ تھے۔ خاندانی جائداد قائم تھی۔ خوشی برداشت کرنے کی بڑی ہمت تھی اور ہر وقت نئے نئے غموں کی جستجو رہتی۔ اُن دنوں میں اکیلا رہتا تھا۔ ویسے میں تھا بھی اکیلا ادیب اور شاعر لوگ تو کیا ہم جماعتوں سے بھی بالکل الگ۔ ویسے سب مجھے جانتے تھے یہ مجھے اب معلوم ہوا۔ میں کمرے میں بیٹھا شاید کسی شخص کا انتظار کر رہا تھا۔ ان دنوں ایک ہی شخص کا انتظار تھا۔ وہی غالب والا "شخص" ———— اتنے میں دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے کئی بار کہا کون؟ لیکن کوئی جواب نہ ملا۔ میں پھر اپنے دھیان میں لگ گیا۔ دستک پھر ہوئی۔ اٹھ کر دروازہ کھولا۔ وہی چیز میرے سامنے کھڑی تھی۔ مجھے کچھ ہنسی سی آگئی لیکن میں ضبط کر گیا۔ اُن کے ساتھ پروفیسر عبدالمجید بھی تھے جن کے ذکر کے بغیر میرے احباب کا حلقہ مکمل نہیں ہو سکتا۔

"معاف کیجئے۔ آپ کو زحمت ہوئی" حفیظ نے بڑے پیار سے کہا۔ میری آنکھیں بھر سی آئیں۔ خوشی بھی ہوئی کہ ایک معروف سا آدمی میرے پاس خود چل کر آیا اور پریشانی بھی کہ انتظار کسی اور کا تھا۔ حفیظ نے حسب معمول وقت کم ہونے کی معذرت کی اور فوراً جیب سے ریڈیو کا کنٹرکٹ نکال مجھے دستخط کرنے کو کہا۔ . . . . میری عمر اُس وقت سولہ برس ہوگی اور میرے پاس صرف چار پانچ غزلیں ہی اس قابل تھیں کہ کسی ادبی مجلس میں سنائی جا سکیں۔ میں کچھ چپ سا ہو گیا۔ پھر خیال آیا کہ حفیظ سے میری کوئی دوستی بھی نہیں کوئی تعلق نہیں اور نہ ہی دنیائے ادب میں مجھے کوئی جانتا ہے۔ یہی سوچ کر میں نے دعوت منظور کر لی۔ وہ دن اور آج کا دن ایسی سینکڑوں ہی دعوتیں مل چکی ہیں بلکہ بعض دفعہ تو ایسی دعوتوں کا انتظار سا بھی رہتا ہے۔ کیونکہ رقم کا سوال ہوتا ہو کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ وہ کتنی بڑی گھڑی تھی جب میں ریڈیو کے مشاعرے میں شریک ہوا۔ نہ میں غزل پڑھتا نہ لوگ مجھے جانتے اور نہ ہی میری زندگی عروسِ سخن کیلئے وقف ہوتی۔ پھر یہ خیال کرتا ہوں کہ اور بھی تو کچھ لوگ تھے جنہیں یہ دعوت نامہ ملا تھا۔ لیکن اب اُن کا نام و نشان بھی نظر نہیں آتا۔ کوئی کلرک بن گیا کوئی

افسر ہو گیا کوئی پاگل ہو گیا وغیرہ وغیرہ۔

آل انڈیا ریڈیو میں حفیظ جب محض پروگرام اسسٹنٹ تھا تو بھی وہ سیدھی سادی زندگی بسر کرتا تھا۔ اُس کے افسر خود چل کر اُس کے کمرے میں آتے تھے۔ اب ڈائرکٹر ہے۔ اب بھی وہی حال ہے۔ میں اُس کے دفتر گیا۔ چپراسی کو چِٹ دی وہ اٹھ کر ملا۔ سگرٹ پیش کی اور پھر اپنے کام میں لگ گیا۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی مجھے یوں لگا کہ شاید ڈائرکٹر صاحب کے کوئی دیہاتی رشتہ دار انہیں ملنے آئے ہیں پھر یکدم خیال آیا کہ یہ تو وہی حفیظ ہے۔ اتنا سیدھا سادا انسان میں نے آج تک اُس سے دفتر کے متعلق کبھی کوئی بات نہیں سنی۔ نہ کسی افسر کی تعریف اور نہ ہی بدگوئی۔ وہ لوگوں کے متعلق بہت ہی کم باتیں کرتا ہے۔ بلا کا محنتی ہے۔ صبح نو بجے سے چراغ جلے تک کام کرنا تو خیر اس کا معمول ہے۔ دیانتداری اور محنت سے کام کرنا یوں تو اس کی فطرت میں شامل ہے لیکن اس میں میاں بشیر احمد صاحب کا بھی ہاتھ ہے۔ وہ میاں صاحب کے ساتھ ۱۹۳۷ء میں انجمن اردو پنجاب میں بہ حیثیت اسسٹنٹ سیکرٹری کام کرتا رہا۔ اور میاں صاحب اُن گنے چنے لوگوں میں سے ہیں جنہیں وہ اپنا دوست سمجھنے کے علاوہ ایک نیک سیرت انسان بھی کہتا ہے۔

حفیظ کو پرانی اور نایاب کتابیں جمع کرنے کا بہت شوق ہے۔ یہ شوق اسے اپنے بڑے بھائی راحل مرحوم سے ورثہ میں ملا۔ اُس کی کتابیں دیکھ کر میں تو حیران رہ گیا کہ یہ ننھی سی جان اتنی کتابیں کس وقت پڑھتی ہو گی! اس کے پاس فارسی، اردو کے تذکرے، پرانے شعراء کے دیوان کچھ قلمی نسخے جن میں بعض واقعی کمیاب ہیں۔ موسیقی، تصوف، صرف نحو اور لسانیات اور بعض تاریخی کتابوں سے اس کی الماریاں اٹی پڑی ہیں۔ وہ اپنی کتابیں کسی کو نہیں دیتا۔ بالکل اسی طرح جس طرح وہ کسی کو قرض نہیں دیتا۔ مجھے اُس کی یہ بات بڑی بُری لگتی ہے۔ یہ ایک اچھا اصول سہی۔ لیکن اس میں بزدلی کا ایک پہلو بھی نکلتا ہے۔ کتابوں کا اُسے بُری طرح خبط ہے۔ میرے خیال میں وہ ان کی صرف ورق گردانی ہی کرتا ہے۔ چھٹی کے دن جب بھی اُسے پوچھا کہ بھائی کہاں چلے ہو تو اکثر یہی جواب ملا کہ بیوی کو کچھ رشتہ داروں سے ملانے گیا تھا اب کشمیری بازار چلا ہوں۔ شاید کوئی کتاب ہاتھ لگے۔ ایک دفعہ میں اُس کے یہاں بیٹھا تھا کہ راحل مرحوم نے اُدھر سے جرأت کا دیوان بھیجا۔ یہ بڑا کمیاب اور پرانا نسخہ تھا۔ اُس کی بڑی بیٹی صبیحہ نے بجلی کا پنکھا بند کر دیا۔ کہنے لگی "اس کتاب کے اوراق بہت بوسیدہ ہیں آپ پڑھ لیں پھر پنکھا چلا دوں گی" میں نے حفیظ کی طرف دیکھا اور مسکرا دیا۔ صبیحہ بلا کی ذہین ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ اُس کے بغیر حفیظ کی شخصیت ادھوری سی رہ جاتی ہے۔ وہ اور اس کے دوسرے بہن بھائی حفیظ کو فنی ہوشیار پوری کہتے تھے۔ ماں باپ نے تو نام عبدالحفیظ رکھا تھا۔ عبدل حفیظ نے خود اڑا دیا۔ ح اور ظ بچوں نے اڑا دی۔ میں نے صبیحہ سے پوچھا کہ فنی کے کیا معنی ہیں وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی کہنے لگی "ایک" میں نے کہا "ایک چیز" وہ شرما کر بھاگ گئی۔ صبیحہ کی فارسی دانی کا ایک لطیفہ یاد آ گیا۔ ایک دفعہ حفیظ نے مجھے، نور عالم، اشتیاق حسین اور شیخ صلاح الدین کو چائے پر بلایا۔ حفیظ نور عالم کو نور قطب عالم کہتا ہے۔ صبیحہ فوراً بول اٹھی "یہ عالَم ہیں یا عالِم! اور یہ قطب ہے یا کُتب" ہم سب حیران رہ گئے۔ حفیظ بھی لفظوں کا رسیا ہے لیکن یوں لگتا ہے کہ اس سلسلے میں وہ اپنی بیٹی کا شاگرد ہے۔

حفیظ بڑی رُوکھی پھیکی سی بے کیف اور بعض اوقات بے معنی باتیں بھی کر لیتا ہے۔ اس کے لطیفے اتنے خشک ہوتے ہیں کہ اُس کے بڑے سے بڑے عقیدت مند تنگ آ کر اِدھر اُدھر جھانکنے لگتے ہیں۔ بعض تو روٹھ بھی جاتے ہیں۔ لیکن مجھے اکثر یہی شک گزرا ہے کہ یہ شخص بہروپیا ہے۔ اس کا ظاہر کچھ اور باطن کچھ۔ لیکن یہ تو منافق کی تعریف ہے۔ وہ منافق نہیں۔

جلتے ہیں مگر دیکھ کے دلسوزیٔ احباب

یعنی سرِ بزم فروزاں نہ ہوئے ہم

اُسے تاریخ گوئی پر بڑا عبور حاصل ہے۔ اور یہ فن بھی اُس نے راحل مرحوم سے سیکھا۔ چلتے چلتے اشتہاروں کو دیکھ کر تاریخ نکال دیگا۔ آپ کی باتوں میں سے تاریخی فقرے نکال دیگا۔ میں تو ایک دفعہ اُس کی تاریخ گوئی سے اتنا متاثر ہوا کہ میں نے شادی کر لی۔ اُس نے فوراً چند ایک تاریخیں کہیں۔

شاعرِ شہرِ طرب شاداں شدہ

ہر قید سے آزاد تھا ہر چند ناصر کاظمی
شادی ہوئی تاریخ ہے پابند ناصر کاظمی

ناصر کاظمی بانو
۱۹۵۲

صبیحہ کو جب معلوم ہوا تو اُس نے فوراً کہا۔

کبھی کبھی تو یوں لگتا ہے کہ یہ سارا خاندان ہی تاریخ گو ہے۔ ابا حفیظ اردو کے علاوہ فارسی میں بھی شعر کہہ لیتا ہے۔

حفیظ میں بہت سی انسانی کمزوریاں ہیں لیکن گراوٹ کوئی نہیں۔ وہ فن کی عزت کرنا جانتا ہے۔ اچھی سے اچھی غزل سنا ڈالیے جائے گا۔ ایک شعر پہ شاعر مان لیگا

ہاں ایسے علم کا قائل ہے جو اظہر من الشمس ہو۔ صرف و نحو۔ عروض اور زبان پر اُسے پورا عبور حاصل ہے۔ لفظوں کا بے محل و بد محل استعمال اس طرح کرے گا کہ شاعری

کا گمان گزرنے لگتا ہے۔ اس کی بے کیفی اور بے رونق کے باوجود وہ بڑا ہی گہرا انسان بھی ہے۔ وہ دوستی ترک کر سکتا ہے لیکن دشمنی نہیں کر سکتا۔ اُس نے اپنی خشک

باتوں سے لوگوں کو خاصا مایوس کر رکھا ہے۔ شاعری کا رسیا ہے۔ جب بھی فرصت ملے فکر سخن کرتا ہے لیکن داد دستہ سے بالکل بے نیاز ہے۔ اہم باتیں سرسری

طور پہ کرے گا اور معمولی باتوں کو بڑی اہمیت دے گا۔ ہر طرح سے ملنے والوں کا امتحان لیگا اور جو رائے قائم کرے گا اُسے دل میں رکھے گا۔ وہ تیرکی سال

بہن کہ بچوں کو ڈرانے کے بہت خلاف ہے۔ اسی لئے اُس کی شخصیت بڑی نرم و نازک اور دھیمی سی ہے کبھی نچلا نہیں بیٹھتا۔ جوان ہو بوڑھا ہو یا بچہ ہو

اُسے کسی نہ کسی طرح چھیڑے گا۔ ہنسے گا ہنسائے گا۔ جسے ملے گا اسے احساس ہوگا کہ وہ اسی کا ہے لیکن وہ بڑا ہرجائی ہے بیٹھے گا۔ بھائی صاحب جواب تھیں۔ آپ حیران ہو گئے،

کس چیز کا جواب نہیں دیواروں کا جواب نہیں بہیرا کا جواب نہیں رہا پ کا جواب نہیں۔ پھر آپ کو پتہ چلے گا کہ وہ کسی بوڑھے آدمی کی ٹوپی سے متاثر ہوا ہے۔ ایک بات کو

ہر روز بے محل و بر محل اسقدر دہرائے گا کہ آپ بیٹھے کی اہمیت کے قائل ہو جائیں گے۔ ہر مجلس آپ کو کبھی نہ کبھی بات پہ ہنسا دے گا اور خود سنجیدہ ہو

جائیگا۔ ویسے میں نے اُسے روتے بھی دیکھا ہے۔ یونہی چھوٹی چھوٹی باتوں پر۔ اُسے کار چلاتے دیکھو تو ہنس ہنس کے مر جاؤ گے۔ تنہا دیکھو تو رو پڑو گے۔

حفیظ کی غزل روایت سے آشنا ہے لیکن اُس کا قالب نیا ہوتا ہے۔ دراصل وہ اپنے آپ کو روایت سے کسی طرح بھی الگ نہیں کرنا چاہتا۔ وہ

بہترین اُستاد ہے۔ غالب کو جب لوگوں نے بے اُستادا کہا تو اُس نے ایک فرضی اُستاد ایجاد کیا۔ مجھے قسمت سے اصلی اُستاد مل گیا۔ اُس جیسے فی البدیہہ

شعر کہنے والے کم ہی دیکھے ہیں۔ انگریزی تو اُس نے بھی پڑھی ہے مگر وہ خواہ مخواہ ہیئت کے تجربے کرنے کا قائل نہیں۔ بیدل اور غالب کا قائل ہے۔ ویسے

میر کا نام اُس نے اپنے ایک مقطع میں استعمال بھی کیا ہے۔

نقش ہے قولِ میر دل پہ حفیظ

"کیا عمارت غموں نے ڈھائی ہے"

مگر شیخ صلاح الدین نے اُسے قائل کر لیا کہ اُس پہ میر کا بھی اثر ہے۔ شیخ صلاح الدین کا ذکر میں نے یہاں اس لئے کیا کہ یہ ایک ایسا شخص ہے جس کی

بات حفیظ کبھی نہیں موڑتا خواہ وہ سچی ہو یا اُس میں کوئی گھپلا ہو۔

جس زمانے میں حفیظ سے اپنی دوستی ہوئی وہ زمانہ غزل گو شعراء کیلئے بہت بھاری زمانہ تھا۔ بیسیوں میں دو چار کا کہیں کچھ بناؤ تھا۔ لیکن حفیظ اپنی روش

پہ ڈٹا رہا۔ وہ نگینہ کی طرح گھر میں گڑ کر بیٹھا رہا۔ اور اُس نے اُسی کنج تنہائی میں رہ کر بڑے حوصلے سے دیوانگی کی۔ شاعران حال سے میں اُس کا مقابلہ نہیں کرونگا

غزل کے فن میں لوئی بے تہہ اس کا معارض نہیں ہو سکتا۔ یہ ٹھیک ہے کہ دور خامی نے اُسے عام قبولیت کے طغرے سے ذرا محروم سا رکھا ہے لیکن

اس سے اس کے مقام میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اُس نے سینکڑوں ہی غزلیں کہی ہیں۔ لیکن یہ اُسی کا حوصلہ ہے کہ اُس نے ابھی تک صاحب دیوان بننا نہیں

چاہا۔ میں کہہ یہ رہا تھا کہ ان دنوں ادیبوں پہ روایت سے بغاوت کرنے کا بھوت سوار تھا۔ وہ اُلٹی سیدھی باتیں لکھ کر صرف طاقت حاصل کرنا چاہتے تھے۔

پرانی نسل کا کندر تو گزر گیا لیکن ابھی ان کے نام لیوا باقی ہیں۔ بعض لوگ تو اساتذہ کی تقلید ہی کو شاعری سمجھتے ہیں بعضوں کا یہ حال ہے کہ سب سر پیر کے مصرعے

موزوں کر کے ہی قانع ہیں۔ اس پورے دور کے جواب میں حفیظ کا یہ شعر کافی ہے۔

اگرچہ میں نے محبت کے گیت بھی گائے
بہت بلند ہے اس سے میرا مقامِ غزل

مجھے تو یوں لگتا ہے کہ حفیظ اپنے بچپن کا کوئی ساتھی ہے۔ جو بچوں کی طرح ہنستا ہے روتا ہے اور ضد کرتا ہے جب بھی اُس نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا۔ مجھے یوں لگا جیسے

ابھی مونگ پھلیاں نکال رہا ہو۔

ن ۔ م ۔ راشد

عطاء اللہ سجاد

راشد اور میں زندگی میں ایک دوسرے کے اس قدر قریب رہے ہیں اور ہماری رفاقت اس قدر طویل رہی ہے کہ میرے لئے ایک خارجی مبصر کی حیثیت سے اُس کی ذات اور شخصیت کا تجزیہ کرنا بے حد مشکل ہے۔

راشد سے میری ملاقات آج سے قریباً ستائیس سال قبل دسمبر ۱۹۲۹ء کی ایک شام کو ہوئی تھی۔ غالباً وہ شام بھی دسمبر کی عام شاموں کی طرح بے حد خنک اور ٹھٹھرا دینے والی ہوگی لیکن میرے لئے اُس کے تصور میں آسودگی اور راحت کے احساس کے سوا اور کچھ بھی نہیں۔

ضلع گوجرانوالہ کے ایک معمولی سے قصبہ سیکھیکی منڈی میں ہمارے مرحوم دوست اشرف کا مکان! اشرف نے ہمارا تعارف کرایا۔ عطاء اللہ۔ نذر محمد۔ میں نے دیکھا نذر محمد گندمی رنگ کا ایک خوب رو نوجوان ہے جس کی لمبی پلکیں اُس کے عینک کے شیشوں میں سے بھی نمایاں تھیں۔ جن لوگوں نے گزشتہ پندرہ سال میں راشد سے ملاقات کی ہے وہ شاید میرے اس بیان کو میری دوستانہ نظر کی خود فریبی پر محمول کریں کیونکہ راشد کے چہرے پہ آج کل جوانی کی اُس ملاحت اور دلکشی کی بجائے ایک درشتی جھلکتی ہے جسے اُس کی ٹانٹ نے اور بھی گہرا کر دیا ہے۔

اصل میں راشد نے بے حد حساس طبیعت پائی ہے۔ اپنی ملازمت کے دوران میں وہ کئی بار استعفیٰ دے چکا ہے۔ لیکن وہ کوئی چڑچڑا آدمی نہیں وہ اندر ہی اندر سوچتا اور کڑھتا ہے اور قدرتی طور پر اُس کا چہرہ اُس کے اندرونی خلفشار سے متاثر ہوتا رہا ہے۔ اس کے اپنے قول کے مطابق پروفیسر بخاری نے ایک بار اُس کے متعلق (BORN UN HAPPY) یعنی پیدائشی افسردہ دل کی پھبتی کہی تھی۔ ظاہر ہے کہ اس طبیعت کا آدمی محفل آرائی کے لئے موزوں نہیں اُس کی کم آمیزی اور کم گوئی بعض لوگوں کے دل میں اس کی طرف سے بے طور پر تعلّی اور خشکی کا ایک احساس پیدا کر دیتی ہے۔ اس کے باوجود جب وہ اپنے مخصوص حلقۂ احباب میں موجود ہوتا ہے تو کم آمیزی کی دھند چھٹ جاتی ہے اور مودت و اخلاص کی روشنی اپنی پوری تابانیوں کے ساتھ جلوہ گر ہوتی ہے۔

جن دنوں ہماری ملاقات ہوئی وہ اپنے نام کے ساتھ راشد وحیدی لکھتا تھا۔ جب میرا اُس سے تعارف ہوا تو مجھے معلوم نہیں تھا کہ یہی نذر محمد راشد وحیدی ہے چنانچہ میں نے شعر و ادب میں محبت کے تجربات کا ذکر کرتے ہوئے جب اُس سے راشد وحیدی کی ایک نظم "اے محبت...." کا ذکر کیا جو اُس مہینے کے رسالے میں شائع ہوئی تھی۔ تو اُس نے مجھے مسکرا کر انداز میں کہا کہ وہ نظم میری ہے۔ میں یہ سن کر اچھل پڑا اور اُس سے معانقہ

ہاتھ ملا کر کہا کہ مجھے آپ سے مل کر واقعی بے حد خوشی ہوئی۔ راشد نے مسکرا کر اشرف سے کہا لو بھئی انہیں یہ معلوم کر کے کہ میں راشد وحیدی ہوں واقعی بے حد خوشی ہوتی ہے۔ شاید اس فقرے میں یہ طنز پوشیدہ تھی کہ مجھ سے پہلے مل کر اس شخص نے جس خوشی کا اظہار کیا تھا وہ محض رسمی تھا۔ راشد اپنے نام کے ساتھ وحیدی اپنے ایک خالو وحید گیلانی سے اظہار عقیدت کے طور پر لکھتا تھا۔ وحید گیلانی مرحوم بھاٹی گیٹ اسلامیہ ہائی سکول میں سیکنڈ ماسٹر تھے لیکن انہوں نے ۱۹۲۶ء سے لے کر ۱۹۳۱ء تک "قوس قزح" کے نام سے ایک ایسا ادبی مجلہ شائع کیا جس کی مثال آج بھی کہیں نہیں ملتی۔ "قوس قزح" اردو صحافت میں ایک سے زیادہ جدتوں کا علمبردار اور شعر و ادب کے ایک نئے دور کا نقیب تھا۔ اور یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ اس وقت کی نوجوان پود اس مجلہ کے ادبی کارناموں سے بے حد متاثر ہوئی

سکھیکی میں راشد اور میں نے جو آٹھ دس دن مل کر کاٹے وہ ایک پائدار اور دوامی دوستی کی بنیاد بن گئے۔ ہر دوپہر ہم اشرف مرحوم کے مکان کے سامنے نہر کے کنارے کرسیاں بچھا کر بیٹھ جاتے اور پھر گھنٹوں شعر و ادب کا چرچا رہتا، لطیفہ گوئی ہوتی اور اپنا اپنا کلام سنایا جاتا۔ ہمارے پاس سے کپڑے یا برتن دھونے والی عورتوں کی ٹولیاں ہنسی مذاق کرتی اور ہمیں کنکھیوں سے دیکھتی گزر جاتیں۔ اور ہم تینوں میں سے اشرف مرحوم حسن رہگذار کی اس فراوانی سے خوب متمتع ہوتا۔ ان دنوں کی یاد میں راشد نے لاہور پہنچ کر ایک نظم بھی لکھی جس کے چند مصرعے مجھے اب تک یاد ہیں۔

آہ وہ سکھیکی منڈی وہ پری زادوں کے ڈھیر

- - - - - - - - - - - - - -

ہر سحر وہ میلے کپڑے لے کے آنا نہر پر
اور تعفن چھوڑ جانا نہر کی ہر لہر پر
وہ کوشلیا کی بہن، وہ جس کا نام آتا نہیں
جس کے غمزے بیہدہ جس کی ادائیں بے قرین

راشد کی پیدائش ۱۹۱۰ء میں اس کے آبائی وطن اکال گڑھ ضلع گوجرانوالہ میں ہوئی۔ اکال گڑھ کنارِ چناب پر ضلع گوجرانوالہ کا ایک تاریخی شہر ہے۔ لیکن تعجب ہے کہ چناب کا عشق انگیز اثر راشد کو شاعر تو بنا سکا ہے لیکن اُسے رانجھا یا مہینوال نہیں بنا سکا ہے۔ اس کی زندگی میں کوئی ہیر یا سوہنی داخل نہیں ہوئی۔ اگرچہ اس نے اردو ادب کو چند لاجواب عشقیہ نظمیں بخشی ہیں لیکن اس کی کتاب حیات میں معاشقہ کا کوئی باب نہیں۔ البتہ اس نے متوسط گھرانے کے ایک شریف مسلمان نوجوان کی طرح اپنی عم زاد کے لئے جو اس کی منگیتر تھی اور اب اس کی رفیقۂ حیات ہے ضرور ایک نظم لکھی تھی۔ ایک بند مجھے یاد رہ گیا ہے۔

حریم عفت و عصمت میں ہے قیام اُس کا
طوافِ خانۂ حرمت میں ہے خرام اُس کا
نجوم و ماہ سے بڑھ کر ہے احتشام اُس کا
اُسی سے پیار مجھے ہے اُسی سے پیار مجھے

راشد افلاطونی عشق کا قائل نہیں۔ اختر شیرانی سے کسب فیض کرنے کے باوجود وہ اُس کے اس نظریہ سے کبھی متفق نہیں ہوا کہ سدا وصلی میں جدائی کر گزرا دیا تھا اُس کی نظم "حزن انسان" افلاطونی نظریۂ عشق پر ایک طنز ہے۔ اُس کے نزدیک جسم اور روح دونوں کے آہنگ کا نام محبت ہے۔ غالباً دورِ حاضر کا وہ پہلا شاعر ہے جس نے اس جسارت کے ساتھ محبت میں جسموں کے آہنگ پر زور دیا ہے اور محبت کے افلاطونی نظریہ کی تضحیک کی ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ راشد کی زندگی کسی "ایپکیورین" کی زندگی رہی ہے بلکہ اس کے برخلاف وہ ان تمام "نفیوں" (NEGATIVES) پر عمل پیرا رہا ہے جس کی تعلیم اس جیسے لوگوں کو اپنے گھروں میں ملتی رہی ہے۔ البتہ اس نے زندگی میں جنس کی اہم حیثیت پر ہمیشہ زور دیا ہے اور جنس کے متعلق اُس کا یہ نظریہ ہمارے درمیان کئی مفید علمی و ادبی بحثوں کا موضوع بنا رہا ہے۔ جن دنوں ہم قلعہ گوجر سنگھ میں مقیم تھے راشد نے اپنی مشہور نظم "اظہار" لکھی جس میں ایک مصرع تھا

میرے ہونٹوں نے تجھے پیدا کیا

میں نے کہا اس کی بجائے

میرے خوابوں نے تجھے پیدا کیا

ہونا چاہئے۔ راشد نے کہا اگر میں ہونٹوں کی بجائے خوابوں لکھ دوں تو میرا مقصد ہی فوت ہو جاتا ہے۔

لاہور میں ہم قریباً تین سال قلعہ گوجر سنگھ میں مقیم رہے۔ میں اور چودھری (اب مسٹر جسٹس) محمد یعقوب علی خاں لا کالج میں پڑھتے تھے اور راشد ایم۔ اے پاس کرنے کے بعد مولانا تاجور کے نئے رسالہ شاہکار کی ادارت کرتا تھا۔ وہ زمانہ ہمارے لئے تنگدستی اور عسرت کا زمانہ تھا، ان سیکڑوں بے مایہ نوجوانوں کی طرح جو لاہور جیسے غدار شہر میں حصول تعلیم کے لئے وارد ہوتے ہیں ہم لوگ بھی اپنے لئے راستہ بنا رہے تھے اور ساتھ ہی ساتھ زندہ رہنے کے لئے تگ و دو کر رہے تھے۔ لیکن ان دنوں کی بے فکری۔ خود اعتمادی، صلاحیت کا ادراک اور دلجمعی کو تلاش کرتا ہوں تو کہیں نظر نہیں آتی۔ ہم نے اپنے مکان کا نام لانشیمن یعنی آشیانہ رکھا ہوا تھا۔ میں لا کالج میں پڑھنے کے علاوہ احسان کے عملہ ادارت میں بھی منسلک تھا اور شام کو جب میں دس بارہ گھنٹے کی مسلسل محنت کے بعد لانشیمن میں واپس آتا تو دو فاقہ مستوں کی پھبتیاں میرا استقبال کرتیں، تین قہقہے بلند ہوتے اور اس کے بعد زندگی کی ہر چیز مسکراتی ہوئی نظر آتی۔

لانشیمن میں ہمارے نقل مکان کرنے کا پہلا دن تھا کہ شام کے وقت پروفیسر احمد شاہ بخاری تشریف لائے۔ ہماری کتابیں ابھی چارپائیوں پر پڑی تھیں اور بخاری صاحب کو بٹھانے کے لئے اس وقت ہمارے پاس کوئی کرسی نہیں تھی۔ بخاری صاحب نے کتابوں کو چارپائی پر دیکھا تو

چارپائے بروکتابے چند

کی پھبتی کہی۔ راشد نے کرسی نہ ہونے پر معذرت کی اور چارپائی خالی کر دی۔ اب بخاری صاحب جو بیٹھے ہیں تو علم و ادب کے دفتر کھل گئے، اتفاقات کے ایک ایک مصرعہ پر داد دی، راشد کی تشبیہات کے سلسلہ میں میتھو آرنلڈ کی تشبیہات کا ذکر آیا۔ اس وقت کی انگریزی شاعری کے رجحانات پر سیر حاصل تبصرہ ہوا۔ راشد نے امریکہ کا ایک رسالہ دکھایا جس میں "اتفاقات" کا انگریزی ترجمہ چھپا تھا۔ انگریزی میں فرمایا "راشد تم سے انصاف نہیں ہوا"

غالباً یہ علمی صحبت دو ڈھائی گھنٹے جاری رہی۔ اور اس کے بعد صرف ایک بار پھر بخاری صاحب کی زیارت "لانشیمن" میں ہوئی۔

"لانشیمن" میں اختر شیرانی مرحوم، مولانا تاجور، راجہ مہدی علی خاں اور راشد کے ہم جماعت آغا عبدالحمید اور عمر فاروق بھی آیا کرتے تھے کبھی کبھی مولانا چراغ حسن حسرت بھی تشریف لاتے کیونکہ وہ "احسان" میں میرے رفیق کار تھے اور میں انہیں کھینچ لایا کرتا تھا۔ مولانا تاجور کا ہر معاملے کے متعلق بات کرنے کا اپنا ڈھنگ تھا اور ان دنوں "جوانی چنانکہ افتد دانی" کے مصداق ان کی باتیں ہمارے لئے کئی ایک ایکٹ کے ڈراموں کا موضوع بن جاتیں۔

راشد کو مولانا ان دنوں غالباً پینتیس روپے ماہوار تنخواہ دیا کرتے تھے۔ مولانا کا تمام کاروبار ان کے برادر نسبتی سلیمان خاں صاحب کے ہاتھ میں تھا۔ اور مولانا ایک مشکل صورت حال سے بچنے کے لئے ہمیشہ سلیمان خاں صاحب کو سپر کے طور پر استعمال کرتے۔ مثلاً اگر وہ راشد کے کسی اداریہ یا نظم کی تعریف کرتے تو میں کہتا کہ مولانا بیچارے راشد کی تنخواہ میں بھی اضافہ فرمائیے تو کہتے "بھئی یہ تم نے بڑی مشکل بات کہی۔ اگر راشد کو ترقی دوں تو پھر سلیمان خاں بھی مانگے گا۔ اب تم ہی بتاؤ میں اسے کیسے انکار کر سکوں گا۔ وہ میری بیوی کا بھائی ہے۔ نہ بھئی ترقی کی بات اس وقت نہ چھیڑو میں چپکے سے راشد کی تنخواہ بڑھا دوں گا"

اگر کسی اخبار یا رسالہ میں مولانا یا شاہکار کے متعلق کوئی تنقید شائع ہوتی اور ہم لوگ مولانا سے اس کا تذکرہ کرتے تو مولانا بڑے سنجیدگی سے فرماتے "بھئی یہ تو غنڈوں کی ایک پارٹی ہے پارٹی۔ انہوں نے تو مجھے ختم کرنے کے لئے ہزاروں روپے چندہ جمع کر رکھا ہے"

قلعہ گوجر سنگھ کے قیام کا زمانہ راشد کی شاعری کا بہترین زمانہ تھا۔ اس زمانہ میں اس نے "آنکھوں کے جال"، "زوال" اور "اظہار" ایسی نظمیں لکھیں کبھی کبھی اس کی کسی نظم پر بحث کے دوران میں میں اس کی نظم کی پیروڈی شروع کر دیتا۔ یہ اس کی دکھتی رگ تھی اور ایک دن تو اس نے بڑی سی

سنجیدگی کے ساتھ مجھ سے سوال کیا کہ کیا میری نظمیں واقعی اس قدر قابلِ تضحیک ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ سوال میرے طرزِ عمل پر ناراضی کا ہلکا سا اظہار تھا ورنہ خود اُسے بھی اور اس کے لاتعداد مداحوں کو اس وقت بھی یقین تھا کہ راشد نے اردو ادب پر شعر و سخن کی کئی نادیدہ اور شاداب دنیاؤں کے دروازے کھول دئیے ہیں۔

راشد ایک بے حد شاداب تخیل کا مالک ہے۔ اس تخیل، اپنی مخصوص DICTION اور اچھوتی تشبیہات کے زور سے وہ ایک معمولی تجربہ کو ایک عظیم نظم کی صورت میں پیش کر دیتا ہے۔ عرب ہوٹل کے ایک نیم روشن اور تنگ کمرے میں ایک شام کھانا کھاتے اُس نے دیکھا کہ اُس کے گلاس کا عکس سفید پتھر کی میز کی سطح پر پڑ رہا تھا۔ چند دن کے بعد اس نے اپنی نظم "آنکھوں کے جال" مکمل کر لی جس میں اب یہ مصرعے پڑھتا ہوں تو عرب ہوٹل کی وہ شام یاد آ جاتی ہے۔

آہ! تیری مدبھری آنکھوں کے جال
میز کی سطح درخشندہ کو دیکھ
کیسے پیمانوں کا عکس سیمگوں
اس کی بے اندازہ گہرائی میں ہے ڈوبا ہوا

"زوال" کا پس منظر ہمارے مکان لانشیے کا صحن ہے جس میں گوندنی کے ایک درخت کے پیچھے سے راشد نے چاند کو ابھرتے دیکھا اور ہمیں ایک ایسی نظم بخشی جو اپنے تاثر میں لازوال ہے۔

لاہور میں ادب کو ذریعۂ معاش بنانے کی سعیٔ لاحاصل کے بعد راشد نے کمشنر ملتان کے دفتر میں کلرکی پر قناعت کر لی۔ یہ اُس کی زندگی کا غالباً تلخ ترین زمانہ تھا۔ تنگدستی، قلیل تنخواہ، متاہل زندگی کی ذمہ داریاں، نااہل اور نیم خواندہ افسروں کی دھونس اور ملازمت کے لئے اُس کی طبیعت کی نامناسبت ان سب چیزوں نے مل کر اُس کی حساس طبیعت پر بے حد اثر کیا۔ اُس کی اُس زمانے کی نظموں سے بھی وہی تلخی نمایاں ہے۔ "شاعرِ درماندہ" اسی دور کی یادگار ہے اور "رقص" بلاشبہ غالباً یہ پہلی عشقیہ نظم ہے جو سیاسی پس منظر کے ساتھ لکھی گئی ہے۔

اس زمانے میں راشد خاکسار تحریک میں شامل ہو گیا۔ اور سی۔ آئی۔ ڈی نے کمشنر کو اس کے خلاف رپورٹیں بھیجنی شروع کیں۔ دفتر کا سپرنٹنڈنٹ پہلے ہی اس سے مخالف تھا کہ راشد اس کے سامنے ٹوپی پہن کر نہیں آتا تھا۔ اس نے بھی رنگ آرائی کی لیکن خوش قسمتی سے کمشنر مشہور عالم دوست مسٹر کنگ تھے انہوں نے الٹا سی۔ آئی۔ ڈی والوں کو ڈانٹ پلا دی اور راشد سے ان کا رویہ ہمدردانہ ہو گیا۔ اس کے بعد راشد کو ریڈیو میں ملازمت مل گئی۔ ان دنوں آل انڈیا ریڈیو کے ڈائریکٹر جنرل مسٹر فیلڈن تھے۔ راشد نے جاتے ہی ان سے کہا

"جناب میں خاکسار تحریک میں شامل ہوں، کیا اس بات کا میری ملازمت پر کوئی اثر پڑے گا"

فیلڈن صاحب نے مسکرا کر کہا "تمہارا ارادہ ہمارے کسی سٹوڈیو پر بم پھینکنے کا ہے"؟

راشد نے جواب دیا "نہیں"

"تو پھر جاؤ اپنا کام کرو"

دہلی کے دورانِ قیام میں بھی راشد کے رئیے اس کا عہدہ سے بڑھا ہوا احساسِ عزتِ نفس اور ذکاوت حس باعثِ زحمت بنتے رہے۔ اور سٹیشن ڈائریکٹر مسٹر ایڈوانی سے مسلسل حاشا کلکل رہی۔ ایک دفعہ ریڈیو کے اعلیٰ افسران نے حکم دیا کہ پروگرام اسسٹنٹ پروگراموں کے نشر کے دوران میں کھانا نہ کھایا کریں۔ راشد نے یہ حکم سنا تو کہنے لگا کہ ہم کوئی رجمنٹ ہیں کہ ہم پر ایسے حکم نافذ کئے جاتے ہیں۔ ایڈوانی صاحب کہنے لگے کہ میں تمہاری یہ بات افسرانِ متعلقہ تک پہنچا دوں گا چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا اور راشد کچھ عرصہ کے لئے اس وجہ سے افسروں کے زیرِ عتاب

رہا۔ اسی طرح ایک دفعہ ریڈیو کے انگریز چیف انجینیر سے لڑائی ہوگئی۔ راشد اتفاق سے کمرے میں ایک کرسی پر ٹانگیں پھیلائے بیٹھا تھا کہ چیف انجینیر صاحب وارد ہوئے اور انہوں نے حکم دیا کہ وہ ٹانگیں پھیلا کر نہ بیٹھے۔ راشد نے اُن کی طرف دیکھ کر کہا "آپ تشریف لے جائیے اور اپنا کام کیجئے۔ آپ کو اس بات سے کوئی تعلق نہیں کہ میں کس طرح بیٹھتا ہوں۔ چیف انجینیر صاحب نے رپورٹ کر دی اور معاملہ افسرانِ بالا تک گیا لیکن راشد اپنی پوزیشن پر اڑا رہا۔

دہلی کے دوران قیام میں راشد نے اپنی نظم "دریچے کے قریب" لکھی جس میں سیاسی تلخی کا اظہار زیادہ شدت کے ساتھ کیا گیا ہے۔ راشد کی یہ پہلی نظم ہے جو اُس نے براڈ کاسٹ کی۔

جنگ عظیم کے دوران میں راشد فوج کے محکمۂ نشرواشاعت میں کپتان بھرتی ہو کر چلا گیا اور اس عرصۂ ملازمت میں وہ قاہرہ، تہران اور لنکا میں تعینات رہا۔ تہران کے دوران قیام میں اُس نے وہ نظمیں لکھیں جو اب "ایران میں اجنبی" کے نام سے اُس کے دوسرے مجموعۂ کلام میں چھپ رہی ہیں۔

فوج کی ملازمت بھی راشد کو راس نہ آئی اور وہاں بھی اس نے افسروں کے جبر و تعدی کے خلاف احتجاج کے طور پر استعفےٰ دے دیا اور ریڈیو کے محکمہ میں واپس آگیا۔ آج کل وہ نیویارک میں یونائیٹڈ (U N O) کے ریڈیو یونٹ میں ڈپٹی ڈائریکٹر کے عہدہ پر تعینات ہے۔ یہ کام اسے بے حد پسند ہے اور وہ اپنی موجودہ ملازمت پر خوش معلوم ہوتا ہے۔

راشد ایک صاف گو انسان اور بے حد مخلص دوست ہے۔ اسے اپنی نفرت یا ناپسندیدگی چھپانے کے لئے ملائم الفاظ کا انتخاب کرنا نہیں آتا۔ وہ دوستوں کے وار بڑی خندہ پیشانی سے سینے پر سہہ لیتا ہے لیکن اگر اسے یہ شبہ ہو کہ فلاں گوشہ سے فلاں بات اسے ذلیل کرنے کے لئے اور محض معاندانہ تعصّب کی وجہ سے کی گئی ہے تو پھر وہ اینٹ کا جواب پتھر سے دینا جانتا ہے۔ دلی میں جب ہمارے ایک مرحوم و مغفور دوست سے (جن کے لئے میرے دل میں ہمیشہ بے حد محبت اور عزت رہی ہے) راشد کے تعلقات خراب ہو گئے اور جانبین نے ایک دوسرے کی طرف توپوں کے منہ پھیر دیئے تو راشد نے اپنی معرکہ آرا ہجو "اشتراکی سنترے" لکھی۔ یہ نظم ایک ہجو کی حیثیت سے اتنی کامیاب تھی کہ اس نے اپنے ہدف سے بھی داد وصول کی۔ کچھ عرصہ کے بعد دونوں دوستوں میں مصالحت ہوگئی اور محبت کے شفاف پانی نے تمام گرد و غبار دھو دیئے۔ مرحوم کی وفات سے کچھ عرصہ پہلے راشد رخصت پر لاہور آیا ہوا تھا اور مرحوم نے کئی بار مجھ سے ذکر کیا کہ راشد اور بیگم راشد ان کی تیمارداری کے لئے ایک سے زیادہ بار آتے تھے۔

راشد ایک مخلص دوست، ایک شائستہ لیکن فاش گو انسان ہے۔ وہ اپنی رائے کے اظہار کے لئے مبہم اور نرم الفاظ تلاش نہیں کرتا بلکہ جس انداز میں وہ کوئی بات محسوس کرتا ہے اسی انداز میں کہہ دیتا ہے۔ شاید یہ اُس کے کردار کی خامی ہو کیونکہ آج کل زندگی کی قدر بدل گئی ہے اور لوگ سانپ کے زہر کی بجائے اس کے حسن پر نقد دینے لگے ہیں۔

احمد علی

سید علی اکبر قاصد

میرے مضمون کا عنوان "احمد علی" بہت ادھورا اور نامکمل سا ہے ــــ کبھی ہیرکٹنگ سیلون والے آپ کے سر کے بال زیادہ تراش دیں تو آپ کا چہرہ دو چار دن عجیب اجنبی اجنبی سا لگے گا۔ اسی طرح احمد علی کا نام پروفیسر کے دُم چھلّے کے بغیر عجیب عجیب سا لگتا ہے ــــ ہاں یہ ذکر خیر ہے پروفیسر احمد علی کا ــــ "انگارے" والے احمد علی ــــ "ٹوائی لائٹ آف ڈلہی" والے احمد علی ــــ لکھنؤ یونیورسٹی والے احمد علی اور حکومت پاکستان کے محکمۂ امور خارجہ والے احمد علی۔

آج سے کوئی پندرہ سال پہلے میرے استاد پروفیسر کلیم الدین احمد نے ایک بھری محفل میں کہا تھا کہ "احمد علی کے افسانوں میں زندگی کا سراغ ملتا ہے اور احمد علی نے تھوڑا ہی لکھ کر ادب میں اپنا ایک انفرادی مقام حاصل کر لیا ہے" ــــ اس وقت میرے دل میں احمد علی سے ملاقات کی تمنا ابھری تھی ــــ اور طالب علمی و کم عمری کا وہ جذبہ بھی دل میں پیدا ہوا تھا کہ کاش میں بھی احمد علی کی طرح لکھ سکتا! ــــ میں "احمد علی کی طرح" لکھ تو نہ سکا مگر آج اس کی بجائے "احمد علی پر" لکھ رہا ہوں۔

پانچ برس بیتے ــــ میرے دوست سلیم اللہ فہمی ایک شام مجھے احمد علی کے مکان پر لے گئے۔ وہاں پروفیسر احمد علی اور چراغ حسن حسرت مرحوم سے پہلی بار میری ملاقات ہوئی ــــ یہ ملاقات میرے لئے ایک ڈرامائی تاثر رکھتی تھی ــــ ایک عام پڑھنے والے کی حیثیت سے میرے ذہن نے بھی ان دونوں کی خیالی تصویریں بنا رکھی تھیں ــــ چراغ حسن حسرت، دُبلے پتلے سے نستعلیق آدمی ہوں گے۔ دھیمے دھیمے باتیں کرتے ہوں گے ــــ باتوں کا لہجہ اُن کے اشعار کا سا ہوگا ؎

آؤ حُسنِ یار کی باتیں کریں
زلف کی رخسار کی باتیں

اور احمد علی پروفیسروں کی طرح ہوں گے ــــ خاصے بھاری بھر کم ــــ چندیا پہ بال کم، چہرے پر فارغ البالی کے اثرات ــــ مگر یہ پہلی ملاقات ان ذہنی تصویروں کو [illegible] سے مجھے تھوڑی سی تکلیف ضرور ہوئی لیکن تھوڑی دیر بعد ذہن نے حقیقت سے مطابقت حاصل

کرلی۔ شام کے سائے گہرے ہوتے گئے۔ اور احمد علی کی شخصیت کے نقوش اُبھرتے گئے۔

احمد علی کو پہلی بار دیکھتے ہی سے پتہ چلتا ہے کہ یہ شخص انسانوں کے ہجوم میں شامل بھی ہے اور اُن سے الگ بھی ہے ——— احمد علی اُن معنوں میں خوبصورت نہیں جن میں گریگری پک اور دلیپ کمار خوبصورت کہے جاتے ہیں لیکن اُن کے چہرے کے گرد ایک انفرادی فضا موجود ہے، نقشہ تیکھا ہے اور آنکھوں کی چمک ان کی شخصیت کا بنیادی عنصر، مگر یہ چمک ویسی نہیں جیسی کسی ماہر مسمریزم کی آنکھوں میں ہوتی ہے بلکہ اس میں کچھ اُداسی اور خاکستری کیفیت بھی ملتی ہے ——— شعلے پر راکھ کا غلاف ——— احمد علی کی مخروطی لمبی انگلیاں بھی فوراً مرکزِ توجہ بن جاتی ہیں ——— زندگی کے اس سفر میں کتنے ہی لوگوں سے ملا ہوں اور

قامت و چہرہ، وہ وہ دیکھا، کبھی نہ بھولے، یاد رہے

لیکن کسی کی انگلیاں احمد علی کی انگلیوں کی طرح مرکزِ توجہ نہ بن سکیں ——— ابھی پہلی ملاقات کی شام کی بات کر رہا ہوں ——— جب چائے آئی اور سب پینے لگے تو احمد علی بڑی نفاست سے پیالی اُٹھاتے، اپنے ہونٹوں تک لے جاتے اور پھر طشتری میں رکھ دیتے ——— ان کے اس عمل میں کچھ ایسی کیفیت تھی کہ مجھے محسوس ہوا جیسے احمد علی پیدائشی بلکہ صدری طور پر بت تراش ہیں ——— احمد علی کے سر کے بال بڑے بڑے تھے اور بے ترتیبی میں بھی ایک ترتیب تھی جیسے غزل کے اشعار میں یا ستاروں میں ہوتی ہے ——— اُردو میں باتیں کرتے کرتے انگریزی بولنے لگتے اور لہجہ کا خیال رکھتے ——— پہلی ملاقات نے احمد علی کی شخصیت کے یہ تاثرات پیدا کئے اور یہ آج بھی قائم ہیں۔ ان میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ ہاں قریب سے دیکھنے کے بعد اضافے مزید ہوئے ہیں۔

لباس کے معاملے میں احمد علی ان لوگوں سے بہت الگ ہیں جو "انٹلکچوئل" کہلاتے ہیں، اگر کسی شام کسی ایسے آدمی سے آپ کی ملاقات کرائی جائے جو گہری ہری قمیص کے ساتھ ساتھ گہری سُرخ ٹائی لگائے ہوئے (BRUTE AMERICAN CONTRAST) اور کہا جائے کہ "ان سے ملئے، یہ ہیں پروفیسر احمد علی" تو یہ کسی پریشانی کی بات نہیں، اور اسی لئے یہ بات میں نے آپ سے احتیاطاً عرض کر دی ہے ——— اس ذوقِ لباس کی نفسیاتی وجہ میرے نزدیک یہ ہے کہ احمد علی کراچی کی بے رنگ زندگی سے انتقام لے رہے ہیں۔ بھلا یہ بھی کوئی زندگی ہے کہ نہ تو موسیقی کی محفلیں جمتی ہیں۔ نہ رقص کی لہریں اُٹھتی ہیں، نہ ہم مشرب کہیں دو چار بیٹھے ہیں ——— اس کی ایک اور نفسیاتی وجہ میری سمجھ میں یہ آتی ہے کہ غالباً احمد علی غیر شعوری طور پر اپنے آپ کو جوان رکھنے اور جوان پیش کرنے کے لئے یہ اہتمام کرتے ہیں ——— اُن کی عمر اب یہی کوئی چوالیس پینتالیس سال ہے، پہلی نظر میں یہ عمر چھپتی بھی نہیں لیکن جب ملنے والا اُن سے قریب ہوتا جاتا ہے تو وہ کم عمر معلوم ہونے لگتے ہیں، شوخ کپڑے باتوں میں شوخی، حرکات و سکنات اور جنبشوں میں جوانوں بلکہ نوجوانوں کی سی بے چینی اور قوت کا اظہار، کچھ وارفتگی اور والہانہ پن، اور اسی ضمن میں گفتگو کرتے ہوئے چابیوں کے گچھے سے کھیلتے رہنا ——— یوں گردشِ ایام پیچھے کی طرف لوٹ جاتی ہے۔

احمد علی دیکھنے میں خاصے لمبے آدمی ہیں مگر اس لمبائی سے بہت زیادہ ان کے اندر گہرائی ہے، علم کی اور مطالعے کی ——— بلاشبہ وہ ایک بڑے فنکار ہیں، متوازن نقاد اور شگفتہ ادیب، ادب اور زندگی پر غائر نظر رکھنے والے ——— خوشگوار اور دلکش مسکراہٹوں والے احمد علی ہمارے ادب اور کلچر کی تاریخ میں زندہ رہیں گے ———

احمد علی گفتگو کے فن کے بڑے ماہر ہیں ——— جس طرح اچھے بندوقچی کا RANGE بہت وسیع ہوتا ہے اُسی طرح احمد علی کی باتوں کا دائرہ بھی بہت وسیع ہے ——— جولیس سیزر اپنے بارے میں کہتا تھا کہ ——— "میں آیا ——— میں نے دیکھا ——— اور میں نے فتح کر لیا" ——— احمد علی بھی بڑے فخر کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ "میں آیا ——— میں نے باتیں کیں ——— اور میں نے فتح کر لیا"

ایک بڑی بین الاقوامی قسم کی محفل میں، میں بھی شریک تھا اور احمد علی بھی ——— احمد علی کے سامنے پیمانہ و مینا تو نہیں تھے مگر چاروں طرف

خواتین مزدور بھیں جو پھر دیکھئے اندازِ گل افشانیٔ گفتار۔ احمد علی بیک وقت ایک معمر انڈونیشی خاتون، ایک ادھیڑ جاپانی خاتون، ایک نوجوان چینی خاتون اور ایک مسکراتی ہوئی ہسپانوی خاتون سے باتیں کر رہے تھے اور کیسی باتیں؟ —— انڈونیشیا میں شاعری کے نئے رجحانات، جاپان میں اٹھارھویں صدی عیسوی کے معاشی حالات، چین کا مستقبل —— پھر احمد علی کو ہسپانوی خاتون کی ابروؤں میں اسپینی فن تعمیر کی جھلک نظر آ گئی۔ محراب، اور وہ آدھے گھنٹے تک اسپینی فن تعمیر پر گفتگو کرتے رہے —— کبھی کبھی احمد علی کی گفتگو عجیب انداز کی ہوتی ہے —— بظاہر اُن کے عام تصورات و عقائد سے مختلف، ایسے موقعوں پر قدامت کا وہ اظہار کریں گے کہ حیرت ہو جائے گی —— کوئی عورت سُنے تو بےساختہ کہے۔ اللہ! یہ انگارے کا مصنف بول رہا ہے؟" —— میں سوچتا ہوں کہ اصل احمد علی کون ہے؟ —— یہ جملے کہنے والا، یا انگارے کا افسانہ نگار! بھائی جان (حسن مثنیٰ ندوی) اور ابوالخیر کشفی نے ستم یہ کیا کہ مہرِ نیمروز کے پہلے شمارے میں کسی کا یہ جملہ چھاپ دیا کہ —— "بندے کو خدا پر یہ فوقیت ہے کہ خدا لذتِ مرگ سے آشنا نہیں!" —— میں نے چھپنے کے بعد پڑھا، مجھے فوقیت کے لفظ پر شدید اعتراض تھا۔ بھائی جان اور کشفی کہتے کہ ہمیں کب اتفاق ہے؟ یہ تو کسی کا قول ہے، ہم نے چھاپ دیا، آپ جواب دیجئے" —— ایک دن شام کو احمد علی آ گئے اور کشفی اور بھائی جان سے اُلجھ پڑے —— "صاحب! آپ نے یہ کیا چھاپ دیا؟ اس قول کے لکھنے والے نے خدائے بلند و برتر کے بارے میں ایک منٹ بھی نہیں سوچا —— خدا تو علیم و بصیر ہے۔ ماناتے رموزِ کُل ہے۔ سب سے بڑا فنکار ہے وغیرہ وغیرہ" —— کشفی بڑی معصومیت سے بولے کہ —— "یہ احمد علی صاحب بول رہے ہیں یا مفتی شفیع" —— احمد علی ہنس پڑے اور بحث ختم ہو گئی … لیکن وہ لمحہ بہت قیمتی تھا، خدا اور مذہب کے بارے میں احمد علی کے صحیح جذبات سامنے آ گئے۔ احمد علی نے دہلی کی روایات کی آغوش میں پرورش پائی ہے —— وہ روایت شکن ضرور ہیں لیکن اُن کی زندگی اور ان کی تحریروں میں یہ روایات بغیر کچھ کہے سُنے در آتی ہیں —— اسی لئے وہ دلّی والوں کی طرح کبوتر بھی اُڑاتے ہیں۔

احمد علی صرف کبوتر ہی نہیں اڑاتے بلکہ انہیں کئی اور جانوروں سے بھی دلچسپی ہے جمشید روڈ پر ایک مکان میں رہتے ہیں لیکن یہ مکان بھی اُن کے مذاق کا کسی حد تک آئینہ دار ہے —— چھوٹا سا باغیچہ —— چھوٹے چھوٹے پتھروں سے نمونے کی پہاڑیاں سی بنی ہوئی —— چھوٹا سا گڑھا گڑھے میں پانی —— پانی میں رنگین مچھلیاں —— جالیاں لگی ہوئی —— جالیوں میں لال —— رنگ برنگی چڑیاں، گھاس پر خرگوش اور ایک عدد بلی —— دروازے پر دو عدد کتے —— سوداؔ کے ممدوح کی طرح احمد علی شیر اور بکری کو ایک گھاٹ پر پانی تو نہ پلا سکے، لیکن یہ صلاحیت ان میں ضرور ہے، بلی اور کتے کو رشتۂ رفاقت میں منسلک کر رکھا ہے، ایک زمانے میں تو وہ بڑی سنجیدگی کے ساتھ یہ سوچ رہے تھے کہ بلی اور کتے کو زنجیرِ مناکحت میں باندھا جا سکتا ہے یا نہیں؟ —— اس سلسلے میں اُن سے اگر کوئی شکایت ہے تو بس اتنی کہ ہمیشہ کاٹ کھانے والا کتا رکھتے ہیں۔

عجائبات سے احمد علی کو بہت شغف ہے، اُن کا ملاقاتی کمرہ —— کمرہ کاہے کو ہے ایک بڑا ہال ہے اور داخلے کا دروازہ بغدادی ہے آپ ملاقاتی کمرے میں پہنچیں گے تو قالین، مجسموں، تصویروں، ایک بہت بڑے چوبی صندوق اور ایسے ہی الم غلم سامان کو دیکھ کر تھوڑی دیر کے لئے احمد علی کو بھول جائیں گے —— جب آپ اپنے عالم میں آئیں گے تو احمد علی کی آنکھوں کو مسکراتا پائیں گے —— "یہ صندوق دورِ شون شانگ کا ہے"۔ "یہ منقش جگ عہدِ چیں چیاں چانگ سے تعلق رکھتا ہے"۔ وغیرہ وغیرہ —— احمد علی نے یہ سب سامان اپنے قیامِ چین کے زمانے میں جمع کیا تھا۔ جب وہ پاکستان کے سفارتی نمائندے کی حیثیت سے چین گئے تھے —— ایسے وہ پہلے بھی انگریزی کے پروفیسر کی حیثیت سے قیامِ پاکستان سے پہلے بھی چین ہو آئے ہیں —— اور وہ یہ سب سامان اُسی بڑے چوبی صندوق میں بھر کر لائے تھے۔ جو اب ان کے کمرے میں رکھا ہوا ہے، بھابی بلقیس (بیگم احمد علی) کا کہنا ہے کہ جب گھر میں زیادہ مہمان آ جاتے ہیں، تو احمد علی اسی صندوق پر سوتے ہیں مگر اس احترام و عقیدت سے کہ رات بھر سو نہیں پاتے —— یہ کمرہ عجائب خانہ بھی ہے اور نگار خانۂ چین بھی، اسی لئے یہاں ٹھہرنا مومن کے

ایمان کے لئے باعث ضرر ہے کیونکہ طبیعت جلدی کی طرف ہر وقت مائل رہتی ہے۔

آج کل احمد علی کو ایک ہی دُھن ہے اور وہ ہے مکان بنوانے کی —— یہ دُھن اُن کی تخلیقی قوت سے جونک کی طرح چمٹ گئی ہے۔ —— اُنہوں نے ہاؤسنگ یونین ایریا میں ایک پلاٹ لیا ہے۔ بدقسمتی یا خوش قسمتی سے میرا تعلق یونین سے ہے اور احمد علی کا دوست بھی ہوں اس کے علاوہ مجھے وہ ماہر تعمیرات بھی سمجھتے ہیں، چنانچہ اب جب بھی ملتے ہیں اور اکثر ملتے ہیں تو مکان کا ذکر چھیڑ دیتے ہیں، کتابیں پڑھنے کی جگہ وہ جرمنی، انگلستان، فرانس اور سوئٹزرلینڈ کے مکانوں کے نقشوں کا مطالعہ کرتے رہتے ہیں —— کسی مکان کی چھت پسند آتی ہے تو کسی کا برآمدہ —— بال کی کھال نکالنے میں احمد علی اپنا جواب آپ ہیں، اُن کا تذکرۂ مکان اب تو دفتر طلسم ہوشربا بن گیا ہے، اور میں لیڈ ہونے کے باوجود احمد علی سے کہہ نہیں پاتا۔ بگڑتے ہوئے آئیں گے —— "بھئی اکبر! —— آخر یہ کیا ہے؟ تم میرے مکان کی طرف بالکل توجہ نہیں دیتے، کل کوئی پتھر اُٹھا لے گیا۔ اور آج مٹی لے گیا۔ یہ سب کیا ہے؟" ——

آج کل بلقیس بھابی اور احمد علی کے درمیان بچوں کے علاوہ اگر کوئی موضوع گفتگو ہے، تو یہی مکان کا سلسلہ —— فرصت کے اوقات میں دونوں میاں بیوی مکان کا نقشہ بناتے رہتے ہیں یا بیٹھتے رہتے ہیں —— "باتھ روم یہاں ٹھیک رہے گا" —— "بھئی میں اپنی اسٹڈی بائیں باغ کے مشرقی گوشے میں بنواؤں گا" —— "سامنے کی جالیاں ویسی ہی ہوں گی جیسی ......" یا پھر یہ ہوتا ہے کہ میاں بیوی کسی مکان کا نقشہ لئے بیٹھے ہیں۔ چھت احمد علی کو پسند نہیں آئی اور دروازے بلقیس بھابی کو ناپسند ہیں —— یہ سلسلہ اب معمولات کا حصہ ہو گیا ہے۔

احمد علی کی ازدواجی اور گھریلو زندگی بہت خوشگوار ہے، بھابی بلقیس اُن کے رکیلے پن کی تلافی اور تکمیل ہیں، احمد علی کی طرح وہ بھی گفتگو کے فن کی ماہر ہیں۔ اس تسلسل سے بولتی ہیں جیسے کتاب پڑھ رہی ہوں —— شادی شدہ خواتین احمد علی اور بیگم احمد علی سے مل کر اپنے شوہروں سے اور شاکی ہو جاتی ہیں "میاں ہو تو ایسا —— بیوی کا کتنا خیال رکھتا ہے، ہر بات مان لیتا ہے، ایک تم ہو کہ میری سنتے ہی نہیں" —— اور بیچارے شوہر جل کر کہہ اُٹھتے ہیں —— "بیوی میاں پر حاوی ہے" —— حالانکہ ایسا کہنا حقیقت سے خاصہ دور ہے —— احمد علی کے دونوں بچے مروج اور ارم بہت پیارے اور ذہین ہیں —— ان ناموں میں بھی احمد علی کی دو معصوم تمنائیں چھپی ہوئی ہیں —— ایک بات اور —— احمد علی کو جب بلقیس بھابی کے سامنے گھر سے باہر رہنے کا بہانہ تراشنا ہوتا ہے تو بہترین ذہانت کا ثبوت دیتے ہیں۔

زمانے کی طرح کراچی کا موسم بھی بدل گیا ہے اور اب کراچی میں آسمان پر بادل چھائے رہتے ہیں اور بارش ہوتی ہے تو ہوتی ہی چلی جاتی ہے، فضا کے ابر آلود ہوتے ہی لوگ سیر و تفریح اور پکنک کے لئے گھروں سے نکل پڑتے ہیں لیکن ایسے میں احمد علی کی مصروفیت دلچسپ اور مکمل طرح پر انفرادیت لئے ہوئے ہوتی ہے، اپنی خاکستری "اوپل" میں اپنے دونوں بچوں کو بٹھا کر —— بغیر نعرہ لگائے —— ویرانے کی طرف نکل پڑتے ہیں، وہاں ان کے بچے مینڈکیاں پکڑتے ہیں اور احمد علی فورس اِن ریزرو (FORCE IN RESERVE) بن کر اپنے بچوں کو مینڈکیوں کی گرفتاری میں کمک پہنچاتے ہیں۔ جب اندھیرا چھا جاتا ہے تو واپسی ہوتی ہے اور ان کے فتراک میں شام کا ماحصل یعنی قسم قسم کی چھوٹی بڑی مینڈکیاں، بڑی احتیاط سے رومال میں لپٹی لپٹائی ان کے گھر آ جاتی ہیں، مینڈکیاں پکڑتے وقت ان کی لمبی مخروطی انگلیوں میں نفاست کے ساتھ نشانہ بھی ہوتا ہے اور پوری پلاننگ بھی —— احمد علی پلاننگ کے بھی بڑے ماہر ہیں۔ اس دلچسپ فنکارانہ کام میں بھابی بلقیس ان کی مدد تو نہیں کرتیں مگر اظہار ناپسندیدگی بھی نہیں کرتیں —— وجہ ظاہر ہے، ایسے سہانے موسم میں انہیں احمد علی کی دوسری مصروفیتیں پسند نہیں۔

عرصہ سے احمد علی نے کوئی تخلیقی چیز نہیں لکھی —— اُن کی زندگی اور مزاج کو سامنے رکھتے ہوئے جب میں اس بارے میں سوچتا ہوں تو کئی باتیں سمجھ میں آتی ہیں —— ایک تو یہ کہ احمد علی اپنی گزشتہ تخلیقات سے مطمئن ہیں، دوسری بات یہ کہ انہیں کچھ یہ احساس بھی ہے

کہ نقادوں نے ان کے صحیح ادبی مرتبہ کا تعین نہیں کیا۔ اور اس احساس میں وہ حق بجانب ہیں ـــــ تیسری بات یہ کہ وہ موجودہ ادبی ماحول سے مطمئن نہیں، جس میں آدمی دو چار کہانیاں لکھ کر مشہور ہو جاتا ہے اور نقاد اس کا ڈھنڈورا پیٹتے رہتے ہیں ـــــ ویسے ابھی احمد علی کو بہت کچھ کہنا ہے، ان کے دامنِ خیال میں ابھی بہت کچھ ہے ـــــ کتنے ہی افسانے نامکمل پڑے ہیں ـــــ دوست انہیں لکھنے پر اُکساتے رہتے ہیں۔ اور جب وہ سنجیدگی سے لکھنے کی طرف مائل ہوتے ہیں تو وہی دوست یا معتقد میدان سے بھاگ کھڑے ہوتے ہیں ـــــ حسن مثنیٰ صاحب اور کشفی صاحب نے ان سے وعدہ کیا تھا کہ MERMAIDS IN LUCKNOW (ناول) کا اُردو میں ترجمہ کیا جائیگا۔ اور "انگارے"، "شعلے"، "ہماری گلی" اور "قید خانہ" کے افسانوں کا انتخاب ایک جلد میں شائع کیا جائے گا۔ ہر شام دو گھنٹے کام کیا جائیگا۔ کشفی تو یہ وعدہ کرکے ہندوستان چلے گئے اور بھائی جان دو مہینے گھر سے ہی نہ نکلے۔ اب اس کا کیا علاج؟ ـــــ ایک ہی علاج ہے، وہ یہ کہ احمد علی خود ہی دن کے دو چار گھنٹے ادب کے لئے وقف کر دیں۔

احمد علی بہت اچھے، مخلص، اور سچے دوست ہیں کیونکہ وہ اچھے آدمی ہیں، دوستوں کے لئے وہ بڑی سے بڑی قربانی کر سکتے ہیں ـــــ قرض سے کر بحث و تمحیص تک ـــــ بحث و تمحیص قربانی یوں ہے کہ اس کے لئے وقت کو قربان کرنا پڑتا ہے۔

یہ ایک ادھوری جھلک ہے، اس احمد علی کی، جو باغی ہونے کے ساتھ ساتھ روایت پرست ہے، ـــــ جسے پُرانی شاعری بہت پسند ہے ـــــ اور کبیر کے ایک دوہے یا میر کے ایک شعر کے سہارے زندگی کے کتنے ہی لمحے کاٹ سکتا ہے ـــــ جو ادبی طور پر خاموش ہے، لیکن مجھے یقین ہے کہ یہ خاموشی ایک بڑے ادبی طوفان کا پیش خیمہ ہے۔

اختر انصاری

عزیز عرفی

اختر صاحب کی کیفیت ایک جھیل کی سی ہے۔ خاموش اور پرسکون۔ جس کی سطح پر ہلکی ہلکی لہریں ہوں جو حلقے بناتی ہوئی حلقوں ہی میں مدغم ہو جائیں۔ ساحل پر کھڑا ہوا کوئی شخص پتھر پھینک دے تو تمام سکون درہم برہم ہو جائے۔ ساری جھیل میں لہریں ہی لہریں رقص کرنے لگیں۔ ہر گوشہ متحرک ہو جائے ــــ اور پھر اس کے بعد ساکن سطح پر مسکراتا ہوا سکوت۔ وہاں ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر معدوم ہے جو اپنی قوی ہیکل دھاڑتی ہوئی موجوں سے ساحل پر کھڑے ہونے والے خندہ زن تماشائیوں کو دور تک دھکیل دیتا ہے۔ وہاں اس ندی کا جوش، ولولہ اور عزم بھی نہیں جو سنگلاخ چٹانوں کو کاٹتی، گنگناتی اور اٹھلاتی اپنی منزل کی طرف دوڑتی رہتی ہے ــــ وہ تو محض ایک جھیل ہے، پُرسکون اور ساکت جس کی سطح کے نیچے ننھی ننھی سرخ و سبز سنہری ــــ مچھلیاں تیرتی رہتی ہیں ــــ حسرتوں کی طرح پلتی رہتی ہیں ــــ اور پھر ایک زمانہ آتا ہے کہ وہ مچھلیاں مر جاتی ہیں۔ جھیل کی سطح مرتعش ہو جاتی ہے۔ لہریں ساحل سے ٹکرانے لگتی ہیں۔ جیسے وہ ساحل کو توڑ کر واقعی نکل جائیں گی۔ اور ایک پہاڑی ندی کی طرح سنگلاخ چٹانوں کا سینہ چیرتی ہوئی اپنی منزل کو پالیں گی ــــ برسوں پرانی حسرتیں دم توڑتے توڑتے بھی بڑھیں گی ــــ لیکن پھر جھیل کی سطح اسی طرح ساکت ہو جاتی ہے۔ اور جھیل کا پانی دھیمے دھیمے سرگوشیاں کرنے لگتا ہے۔ کون اس برسوں پرانے سکون کو چھوڑ کر پتھروں سے سر ٹکرائے ــــ"

اس طرح یہ کہنا قطعاً وقت طلب نہیں کہ اختر صاحب میں دنیا سے اٹھنے اور جھگڑنے کی ہمت نہیں۔ انہوں نے زندگی بھر حسرتوں اور امیدوں کے آنسو بہائے ہیں۔ مرحوم آرزوؤں کا ماتم کیا ہے۔ لیکن دیوانہ وار نہ گریبان کو چاک کیا اور نہ دامن کو تار تار ــــ بلکہ ناکامی، مایوسی اور محرومی پر مسکرانے کے لئے ایک ــــ چھوٹی سی خوبصورت کمروں کی جنت تعمیر کی۔ جہاں اب وہ چاروں طرف سے دروازے بند کئے اپنے کوچ پر لیٹے آہستہ آہستہ پائپ پیتے رہتے ہیں۔ آتش دان پر شیلف میں رکھی ہوئی اپنی تصانیف کو، سجتے ہوئے فرنیچر کو، دیوار پر آویزاں شاہکار تصویروں کو، اپنے گرد پھیلی ہوئی قیمتی اشیاء کو دیکھتے رہتے ہیں اور مسکراتے رہتے ہیں۔ انہوں نے دروازہ کے شیشوں پر بھی رنگ کے غلاف چڑھا دیئے ہیں کہ مبادا ان کی ناکام حسرتیں جھانک کر رنگ میں بھنگ ملا دیں ــــ لیکن یہ سب باتیں تعبیر طلب ہیں۔

اختر صاحب نے اپنی زندگی کا ابتدائی حصہ جامع مسجد دہلی کے اطراف کی گلیوں میں گزارا۔ ان کے والد دہلی کے سول سرجن تھے۔ ایک شفیق باپ کی حیثیت سے ان کی خواہش تھی کہ اختر صاحب سول سروس میں جائیں۔ دوسرے نوجوانوں کی طرح اختر صاحب کی آرزوؤں کے بار آور ہونے کا وقت آیا ــــ ان کے والد دنیا سے رخصت ہو گئے۔ اختر صاحب کا مستقبل رہ گیا۔ تصورات پر جھلملاتا ہوا قصر ڈگمگانے لگا۔ لیکن اختر صاحب نے حالات کے سامنے سپر نہ ڈالی اور اپنے اس قصرِ پایشان کے حصول کے لئے لندن گئے۔ مگر قسمت کے دربان نے محل کے دروازے ہی سے ناکام

نامراد لوٹا دیا ـــــ اور جب وہ لندن سے واپس ہوئے تو ان کی دنیا میں تاریکی چھائی ہوئی تھی ـــــ اور اس تاریکی میں ان کی سوتیلی ماں، بہن، بھائی، بیوی بچے ان کی طرف ٹکٹکی باندھے دیکھ رہے تھے ـــــ اختر صاحب کے والد سخت مذہبی قسم کے آدمی تھے۔ وہ دہلی کے سول سرجن تھے۔ لیکن انہوں نے "دنیا کمانے" کی طرف کبھی توجہ نہیں کی۔ لہٰذا ورثا کو ان کی قبل از وقت موت کے بعد کچھ جائداد اور ایک مختصر رقم کے علاوہ کچھ نہ ملا۔ روپیہ جو تھا وہ اختر صاحب کے لندن آنے جانے میں اور دوستوں کو قرض دینے میں ختم ہو گیا ـــــ یہ واقعہ ہے کہ اختر صاحب نے پانچ چھ ہزار روپیہ سال دو سال ہی میں اپنے چند دوستوں کو دے ڈالا۔ خود اس زمانہ میں نہ سگریٹ پیتے تھے نہ چائے سے کوئی خاص دلچسپی رکھتے تھے ـــــ دوسرے تعیشات کا تو ذکر ہی کیا ہے ـــــ وہ روپیہ خرچ کرنے میں بقول خود نہایت پھوہڑ واقع ہوئے ہیں، اکثر کہا کرتے ہیں۔

"میں اپنی اس کمزوری سے ہزار کوشش کے باوجود آج تک چھٹکارا نہیں پا سکا ہوں، جذبات کی رَو میں بہ کر روپیہ خرچ کر ڈالتا ہوں اور پھر کڑھتا رہتا ہوں اور کڑھتے رہنے کے ساتھ ساتھ دل ہی دل میں عزم کرتا ہوں کہ آئندہ ایسی حماقت نہیں کروں گا۔ لیکن وقت آنے پر بالکل وہی حماقت دوبارہ مجھ سے سرزد ہوتی ہے۔ اس کے بعد پھر کڑھنے کا سلسلہ جاری ہو جاتا ہے تا آنکہ از سر نو روپیہ ہاتھ میں آئے اور ایک دفعہ پھر وہی حماقت سرزد ہو۔ زندگی بھر یہ چکر قائم رہا ہے ـــــ" اس سلسلے میں اختر صاحب ایک مزے کی بات یہ بھی کہتے ہیں کہ محض سکونِ قلب کی خاطر یہ ضروری ہے کہ میری جیبیں خالی ہوں کیونکہ جب تک میرے پاس پیسہ رہتا ہے میں خرچ کرنے کی تدبیروں پر غور کرنے کے سوا کچھ اور نہیں کر سکتا۔ ان کا یہ انگریزی کا جملہ مجھے اکثر یاد آتا ہے ـــــ

"FOR SHEER PEACE OF MIND I MUST - BE PENNILESS."

چنانچہ یہ حقیقت ہے کہ ایک بھرے پُرے خاندان کا بار اٹھانے کے باوجود اختر صاحب نے آج تک، بقول خود پانچ روپے بھی پس انداز نہیں کیے۔ اس سلسلے میں بھی وہ مذکورہ بالا قسم کی بات کہا کرتے ہیں ـــــ "میں اکثر یہ سوچتا ہوں اور یہ سوچ کر اپنے آپ کو عبرت دلاتا ہوں کہ چھوٹے چھوٹے بچوں کا ساتھ ہوتے ہوئے مہینے کے تیس دنوں میں انتیس دن برابر خالی ہاتھ رہنا اور جیب میں ایک پھوٹی کوڑی کا بھی نہ ہونا کس قدر خطرناک بات ہے۔ چنانچہ اکثر دل ہی دل میں عہد کرتا ہوں کہ آئندہ ضرور پس انداز کروں گا اور وقت بے وقت کے لئے ضرور کچھ روپیہ محفوظ رکھوں گا۔ لیکن یہ عہد آج تک تو شرمندۂ تکمیل ہوا نہیں ہے ـــــ"

خیر یہ سب باتیں تو ضمنی طور پر کہی گئیں۔ قصہ تو اصل میں اختر صاحب کی ابتدائی زندگی کا تھا۔ لندن سے واپسی پر اختر صاحب نے ملازمت کے لئے ہاتھ پیر مارے۔ لیکن خاطر خواہ کامیابی نہ ہوئی۔ لہٰذا علی گڑھ جا کر بی۔ ٹی میں داخلہ لیا ـــــ اور جب وہ بی۔ ٹی (T۔B) کر کے نکلے تو انہیں ایک اچھی خاصی رقم ادا کرنا تھی۔ (جس کی قسطیں ۱۹۵۰ء تک تو وہ یقینی ادا کرتے رہے) ایک اچھے خاصے فیملی (FAMILY) کو پالنا تھا۔ لہٰذا انہوں نے مسلم یونیورسٹی کے سٹی اسکول میں کام شروع کر دیا۔ اس وقت تک ان کے عزائم جوان تھے اور ان کا یہ یقین محکم تھا کہ وہ اسکول سے جلد ہی نجات پا کر اپنی آرزوؤں کی تکمیل کر سکیں گے۔ بد ماحول کی ناسازگی کی بنا پر نہ پنپ سکیں۔ لیکن وہ تیرہ ۱۳ سال تک اسکول سے نہ نکل سکے۔

ماحول اور واقعات کو اپنی خواہش کے مطابق ڈھالنا کچھ آسان بات نہیں۔ اختر صاحب کی آمدنی قلیل تھی اور اخراجات زیادہ ـــــ بہن بھائیوں کی تعلیم اور پرورش ایک طرف ـــــ اپنی آرزوؤں کی تکمیل دوسری طرف ـــــ دونوں باتیں اس قلیل آمدنی میں ناممکن تھیں ـــــ انہوں نے اپنی آرزوؤں اور حسرتوں کا خون کیا۔ لیکن بہن بھائیوں کی تعلیم اور پرورش سے ہاتھ نہ اٹھایا ـــــ اختر صاحب کو اسکول سے نکلنے کے مواقع بھی ملے۔ لیکن ان میں RISK لینے کی ہمت نہ تھی ـــــ کیونکہ اختر صاحب کو ابتدا ہی میں ناکامیوں اور محرومیوں نے جکڑ لیا تھا۔ دوسرے ایک بڑی فیملی (FAMILY) کی پرورش ان کا فرض بن چکی تھی۔ لہٰذا وہ ہمیشہ مزید مصائب کا مقابلہ کرنے سے کتراتے رہے اور انہوں نے اپنی موجودہ حالت کو اپنا نصیب سمجھ لیا ـــــ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود اختر صاحب نے اپنی زندگی کے لئے جو معیار متعین کیا تھا کہ صرف وہ اس پر قائم

ہے کہ اسے ذہنیت بلند بنانے کیلئے کوشاں بھی رہے ۔۔۔ یہ چیز اختر صاحب کی ذہنی بالیدگی سے قطع نظر ان کی داخلی اور خارجی زندگی میں نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔

اختر صاحب کو پہلی بار میں نے اس وقت دیکھا جب میں سٹی اسکول کی پانچویں جماعت میں داخل ہوا ۔۔۔ نویں دسویں جماعتوں کو انگریزی پڑھانا ، خالی گھنٹہ میں اسٹور کے لان پر پائپ منہ میں دبائے ٹہلتے رہنا ۔ یہاں کا روز کا معمول تھا ۔ ان کے مراسم بھی چند پرانے اور بااثر قسم کے اساتذہ سے ہی تھے ۔

طلبا کا ایک خاص مشغلہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے اساتذہ کے متعلق مختلف اوقات میں مختلف زاویوں سے تبصرے کیا کرتے ہیں اور زیادہ تر ان اساتذہ کا ذکر خیر ہوتا ہے جن سے براہ راست تعلق ہوتا ہے ۔۔۔ لہذا آٹھویں جماعت تک کے تمام طلبا ان کے متعلق بہت کم جانتے تھے لیکن اس کے برعکس ان جماعتوں کے طلبا میں اختر صاحب کو قریب سے دیکھنے کا شوق ہمیشہ رہا ۔ اور وہ ہر جماعت میں عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھے گئے ۔

میں پانچویں یا چھٹی جماعت میں تھا کہ ایک دن کسی ہم جماعت نے پوری کلاس کو اطلاع دی ۔۔۔ " اختر صاحب بہت بڑے شاعر ہیں . . . " یقین جانئے ہم ہی تھے کہ اختر صاحب انگریزی میں شاعری کرتے ہیں اور عرصہ تک ہم ایک دوسرے سے کہتے رہے ۔۔۔ " اختر صاحب انگریزی میں شاعری کرتے ہیں اور ان کی نظمیں لندن کے رسالوں میں چھپتی ہیں ۔ "

اس کی دو وجوہ تھیں ۔ پہلی تو یہ کہ اختر صاحب ہمیشہ " سوٹڈ بوٹڈ " رہتے تھے ۔ جوتے کی چمکتی پالش سے لے کر فرانسیسی طرز کے تراشیدہ بالوں تک سر سے پیر تک سک سے درست ! کیا مجال کہ جوتے پر گرد جم جائے یا بالوں کی ایک آدھ لٹ پریشان ہو جائے ۔۔۔ اور یہ عام طور پر مشہور تھا کہ اختر صاحب روزانہ سوٹ تبدیل کر کے آتے ہیں ۔ اگر پورا سوٹ نہیں تو کوٹ پتلون میں سے ایک چیز تو ضرور ۔ اور اگر اتفاق سے دونوں میں سے کوئی چیز بھی تبدیل نہ کی گئی تو ٹائی تو یقینی طور پر وہ نہیں ہوتی جو وہ کل باندھ کر سکول آئے تھے ۔۔۔ پھر لباس کی مناسبت سے سگریٹ کی بجائے پائپ منہ میں دبائے رہتے ۔۔۔ پھر ہم لوگ یہ بھی جانتے تھے کہ اختر صاحب ولایت ہو آئے ہیں ۔۔۔ ان وجوہ کی بنا پر ہم لوگ اختر صاحب کو مکمل " انگریز " تصور کرتے تھے ۔۔۔ (یہ دوسری بات ہے کہ اختر صاحب کو رنگ کی مناسبت سے انگریزوں سے دور کا بھی واسطہ نہیں) اور ہم لوگوں کا مکمل یقین تھا کہ اختر صاحب گھر کے اندر بیٹھتے کھاتے پیتے ۔ حتیٰ کہ لیٹتے اور سوتے بھی مغربی انداز میں ہوں گے ۔۔۔ بلکہ بیوی اور بچوں سے بھی انگریزوں کی طرح ملتے ہوں گے ۔ انہی باتوں کے پیش نظر اختر صاحب کے چھوٹے بھائی ارشد سے جب میری اور دوسرے ساتھیوں کی ملاقات آٹھویں جماعت میں ہوئی تو ہم لوگ اس سے اکثر اختر صاحب کی گھریلو زندگی کے متعلق معلومات حاصل کرنے کی کوشش کرتے ۔۔۔ اور وہ اکثر چڑ کر کہتا ۔

" آخر تم لوگ اختر صاحب کو سمجھتے کیا ہو ۔۔۔ ؟ "

جب میں نویں جماعت میں پہنچا تو اختر صاحب کو قدرے قریب سے دیکھنے کا موقعہ ملا ۔ جب کہ اختر صاحب انگریزی کے استاد کی حیثیت سے کلاس میں تشریف لائے ۔

اختر صاحب کا معمول تھا کہ وہ ایک دھیمی سی مسکراہٹ لئے کلاس میں داخل ہوتے ۔۔۔ ایک ایسی مسکراہٹ جس میں سنجیدگی کا عنصر کچھ زیادہ ہی ہوتا ۔ ہم لوگ تعظیماً کھڑے ہو جاتے ۔۔۔ اختر صاحب گردن کے ایک موہوم سے جھٹکے کے ساتھ بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کرسی پر بیٹھ جاتے ۔۔۔ اختر صاحب کوٹ کی اوپر کی جیب سے رومال نکالتے ۔۔۔ چشمہ اتار کر چہرے کو اچھی طرح صاف کرتے اور پھر چشمہ کو صاف کر کے لگا لیتے ۔۔۔ رومال کی خوشنما تہ کر کے اسے پھر کوٹ کے اوپر کی جیب میں لگا لیتے ۔۔۔ کبھی کبھی ٹائی کی ناٹ بھی

ڈھیلی کرنے کی ضرورت پڑ جاتی ـــــ اس کے بعد کتاب لے کر کھڑے ہو جاتے اور پڑھانا شروع کر دیتے۔

اختر صاحب پائپ بہت پیتے ہیں۔ اگر آپ ان کے کمرے میں جائیں تو اور چیزوں کے علاوہ ایک چھوٹی سی میز پر پائپوں کا ایک اچھا خاصہ انبار نظر آئے گا ـــــ اور پھر پائپ سے متعلق دیگر اشیاء بھی۔ ممکن ہے یہ چیز آپ کو کسی غلط فہمی میں مبتلا کر دے ـــــ لیکن یہ حقیقت ہے کہ اختر صاحب کو پائپ ریپئیر (REPAIR) کرنے اور اس کا تمباکو بنانے میں مہارت حاصل ہے ـــــ پائپ اختر صاحب کی زندگی کا ایک لازمی جُز ہی نہیں بلکہ "شریکِ زندگی" ہے ـــــ وہ گھنٹوں تنہا بیٹھے رہتے ہیں اور پائپ پیتے رہتے ہیں۔ جہاں اور جب بھی آپ اختر صاحب کو دیکھیں گے وہ پائپ ضرور پی رہے ہوں گے ـــــ لیکن کلاس کے اندر اختر صاحب نے پائپ کبھی نہیں پیا۔ جب پڑھانا ختم کر دیتے یا ترجمہ کرنے کے لئے دیتے تو کمرے سے باہر برآمدے میں جا کر ٹہلتے رہتے اور پائپ پیتے رہتے ـــــ ایک مرتبہ عجیب واقعہ پیش آیا۔ سردیوں کے دن تھے۔ اختر صاحب کو بہت شدید قسم کی کھانسی ہو گئی تھی ـــــ پائپ ہی کی زیادتی کی وجہ سے ـــــ اور کلاس میں پڑھاتے پڑھاتے اس قدر سخت قسم کا دورہ پڑتا کہ کتاب میز پر رکھ کے برآمدے میں چلے جاتے اور کافی دیر تک کھانستے رہتے ـــــ اتفاق کی بات انہی دنوں اسکول کا معائنہ ہوا ـــــ اور جب اختر صاحب ہماری کلاس میں پڑھا رہے تھے تو انسپکٹر صاحبان گھومتے ہوئے آ گئے ـــــ اور اختر صاحب کو پڑھاتے ہوئے دیکھنے لگے۔ اختر صاحب اطمینان سے پڑھاتے رہے ـــــ لیکن چند ہی منٹ بعد ان کا چہرہ سُرخ سے سرخ تر ہونے لگا اور انہوں نے اپنی پوری قوت کے ساتھ پڑھانا شروع کر دیا ـــــ ہم لوگ متحیر کہ یہ ماجرا کیا ہے اور اختر صاحب ہیں کہ انتہائی بلند آواز میں پڑھائے جا رہے ہیں اور اسی تیزی سے چہرہ سرخ ہوتا جا رہا ہے ـــــ تھوڑی دیر بعد جب انسپکٹر صاحبان چلے گئے ـــــ تو اختر صاحب کتاب میز پر پھینک بُری طرح کھانستے ہوئے برآمدے میں گئے اور کافی دیر تک کھانستے رہے ـــــ جب کھانسی تھمی تو بڑے زور سے ہنستے ہوئے کلاس میں داخل ہوئے۔ سب نے خیریت دریافت کی تو کہنے لگے ـــــ "جس چیز سے ڈرتا ہوں وہی سامنے آ جاتی ہے ـــــ میں سوچ رہا کہ ان لوگوں کے سامنے کھانسی پریشان نہ کرے ـــــ اور ان لوگوں نے جوں ہی اندر قدم رکھا مجھے کھانسی آنے لگی ـــــ اب میرے سامنے ایک یہی راستہ تھا کہ میں سانس روک کے زور زور سے پڑھاتا رہوں"

اسکول نے اختر صاحب کی زندگی پر کافی گہرے نقوش چھوڑے ہیں ـــــ اس کے دو پہلو ہیں۔ اول تو یہ کہ اسکول میں رہتے ہوئے اختر صاحب کو "فاضل وقت" کافی ملا ـــــ چونکہ ایک اسکول ٹیچر کی مصروفیات بہ نسبت دوسرے شعبہ جات کے ملازمین کے کم ہوتی ہیں۔ سال میں چھٹیاں بھی کافی ملتی ہیں اور روزانہ کے اوقات میں بھی کافی فرق ہوتا ہے ـــــ دوئم یہ کہ ہمارے معاشرے میں اسکول ٹیچر کی جو وقعت ہوتی ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں ـــ دراصل یہ سارا نظامِ تعلیم نہ اساتذہ کو اچھی تنخواہیں دیتا ہے اور نہ ہماری سوسائٹی ایک اسکول ٹیچر کو اس کی جائز عزت دیتی ہے۔ مگر ان حالات میں اول تو اس شعبہ کو اچھے دماغ ملتے نہیں ـــــ اور جو مجبوراً یہاں آ جاتے ہیں مگر ان کی ساری صلاحیتیں کچل کر رہ جاتی ہیں ـــــ لہٰذا اختر صاحب کی حساس طبیعت پر ایک اسکول ماسٹر کی کم حیثیتی کا شدید احساس ہوا۔ ایک مرتبہ اختر صاحب اپنے کسی عزیز کے یہاں بریلی گئے۔ ایک شام ان کے مہربان نے کسی کلب میں وہاں کے معزز شہریوں سے تعارف کرایا۔ ان لوگوں نے اختر صاحب کا بہ حیثیت شاعر اور ادیب بڑے تپاک سے خیر مقدم کیا لیکن جوں ہی ان لوگوں کو یہ معلوم ہوا کہ یہ ایک اسکول ماسٹر ہیں تو ان کے سارے اشتیاق پر جیسے اوس پڑ گئی ـــــ

ایک خط میں اسکول کی زندگی کے متعلق لکھتے ہیں :ـــ

"یہ ۱۸ سال علیگڑھ میں جس ذلت، مصیبت اور پستی کی حالت میں گزارے ہیں ان کی یاد عمر بھر دل میں ناسور بنی رہے گی ـــ"

اس قسم کی باتوں سے اختر صاحب گوشہ نشین ہو گئے۔ اسکول ماسٹری سے وہ کبھی مطمئن نہ ہوئے۔ لیکن اس دنیا سے نکلنے کے لئے انہوں نے کبھی جدوجہد بھی نہ کی۔ حالانکہ اسکول چھوڑنے کی خواہش ہمیشہ رہی ـــ

اس بنیادی وجہ کے علاوہ اختر صاحب کے گوشہ نشین ہونے میں چند چیزیں اور بھی کارفرما ہیں۔ پہلی چیز تو یہ کہ اختر صاحب ادبی ذوق رکھتے تھے۔ لہٰذا جب انہیں اسکول میں ملازمت مل گئی تو اس سے قطع نظر کہ وہ اس سے مطمئن تھے یا نہیں ——— انہیں اپنے اس ذوق کی پرورش کرنا تھی — لہٰذا انہوں نے مطالعہ اور تصنیف کے لئے اسکول کے "فاضل وقت" سے جی بھر کے فائدہ اٹھایا — ان کی تقریباً تمام ہی تصنیفات اسی دور کی ہیں۔ — اختر صاحب کی زندگی میں ناکامی سے بھی ادب کو فائدہ پہنچا — اگر بالفرض اختر صاحب سول سروس میں کامیاب ہو جاتے تو یقینی بات ہے کہ اختر صاحب کی حیثیت جو اس وقت اردو ادب میں ہے وہ نہ ہوتی — یا جو کچھ انہوں نے اردو ادب کو دیا ہے وہ نہ دے سکتے۔

دوسری بات یہ کہ اختر صاحب کی مالی حالت اس قدر اچھی نہ تھی کہ وہ دنیا کے ہنگاموں پر خرچ کر سکتے لہٰذا انہوں نے اپنی قلیل آمدنی کو اپنی گھریلو زندگی پر ہی خرچ کرنا بہتر سمجھا ——— چونکہ اختر صاحب نے اپنی زندگی کے لئے جو خاکہ مرتب کیا تھا۔ اس کے حصول میں انہیں خارجی طور پر ناکامی ہوئی تھی لہٰذا اس کی تکمیل اپنی خانگی زندگی میں کرنا تھی ——— اور انہوں نے رفتہ رفتہ اپنی ادبی تخلیقات کے ساتھ ساتھ ایک اعلیٰ معیار ذہن میں رکھ کر اپنے کمروں کو (FURNISH) کیا۔ ایک خط میں اپنے کمروں کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں :-

"اصل میں میری شاعری اور دوسرے ادبی کام کو مشہور ہونا چاہئے تھا۔ لیکن شہرت نصیب ہو رہی ہے میرے کمروں کو۔ یہ شہرت دور دراز کے مشہور شہروں تک پہنچ گئی ہے۔ ماشاء اللہ!"

ادبی تخلیقات کے علاوہ یہی کمرے اختر صاحب کی زندگی کا ماحصل ہیں۔ ان کی تعمیر کردہ اپنی جنت ہیں اور وہ اپنی اس "جنت" کے حقیقی خالق کی حیثیت سے ان کمروں میں پڑے رہتے ہیں اور پائپ پیتے رہتے ہیں۔

اختر صاحب کی گوشہ نشینی سے جہاں انہیں ادبی کام کرنے کے لئے اور اپنی حسرتوں اور آرزوؤں کی داخلی طور پر تکمیل کے لئے مواقع ملے وہاں ایک سب سے بڑا یہ بھی نقصان ہوا کہ وہ اس گوشہ نشینی سے مکمل طور پر آرام طلب اور سست ہو گئے — ان کی تخلیقی صلاحیتیں گہری نیند سو گئیں — اختر صاحب کے لئے یہ کہنا کہ وہ فطری طور پر شروع ہی سے آرام طلب اور سست تھے میرے خیال میں غلط ہے — جو شخص اپنی تعلیم کے زمانے میں ہمیشہ نمایاں طالب علم رہا ہو ——— باپ کی موت کے بعد ناموافق ماحول کی پروا کئے بغیر اپنے مقصد کے حصول کے لئے لندن کا سفر کرے اسے بنیادی طور پر آرام طلب اور سست نہیں کہا جا سکتا۔ بلکہ یہ وہ بعد کے واقعات اور حالات تھے جن کی وجہ سے اختر صاحب گوشہ نشین ہوئے۔ اور گوشہ نشینی نے انہیں آرام طلب اور سست بنا دیا۔ ان کی جدوجہد کرنے کی قوت کو زنگ چاٹ گئی۔ ان کی حساس طبیعت مسلسل ناکامیوں اور محرومیوں کی وجہ سے سہم گئی اور مزید مصائب کا مقابلہ کرنے سے ہمیشہ کتراتی رہی ——— ان ہی وجوہ کی بنا پر وہ اپنی زندگی میں کوئی انقلاب برپا نہ کر سکے لیکن انقلاب کے ہمیشہ منتظر رہے —

اختر صاحب جب تک اسکول میں رہے انہیں تعلیم کے علاوہ علمی دنیا اور آل انڈیا ریڈیو میں جانے کے مواقع بھی ملے۔ لیکن وہ اسکول نہ چھوڑ سکے ——— ایک مرتبہ شاید ۱۹۴۳ء میں آل انڈیا ریڈیو سے کچھ جگہیں مشتہر ہوئیں۔ اختر صاحب نے بھی سوچنا شروع کیا — احباب سے مشورہ کرتے رہے اور سوچتے رہے ——— حتیٰ کہ آخری تاریخ آ گئی — لہٰذا رات کو فیصلہ کیا گیا کہ دہلی جا کر ہی درخواست دی جائے — چونکہ ڈاک سے درخواست کا پہنچنا ناممکن تھا۔ لہٰذا دوسرے دن علی الصبح پہلی گاڑی سے روانہ ہو گئے ——— اردو بازار میں چند احباب سے پھر مشورہ کیا — ان لوگوں نے کہا ——— "اماں کس مصیبت میں پڑ رہے ہو ——— یہ نوکری تمہارے بس کی نہیں ..." کچھ ریڈیو کی ملازمت کے واقعات بھی سنائے ——— اور اختر صاحب شام کو درخواست دیئے بغیر مطمئن ہو کر واپس آ گئے۔

اسکول میں رہتے ہوئے وہ کم از کم ایم۔ اے تو کر سکتے تھے۔ لیکن ایم۔ اے بھی ان کے لئے پرابلم بنا رہا ——— شاید پانچ یا چھ بار انہوں نے ایم۔ اے کرنے کا ارادہ کیا — ایک دو بار شاید فارم اور فیس [illegible] کے علاوہ ایک دو پرچے بھی دے آئے — لیکن ایم۔ اے [illegible]

معاملہ کیے حبیب الرحمٰن ... پرنسپل ٹریننگ کالج کا کہ۔ ایک دن اختر صاحب کو پکڑ کر ہیڈ ماسٹر صاحب کے پاس لے گئے اور انہیں دو ماہ کی چھٹی منظور کرا دی اور کہا کہ ایم۔ اے کے لئے تقاضہ کرتے رہے — ایک خط میں خود اس کا تذکرہ کیا ہے —

"۱۹۴۰ء میں، میں نے ایم کیا — آپ کو معلوم ہے کہ یہ بھی صرف حبیب صاحب کے اخلاقی دباؤ کا نتیجہ تھا۔ ورنہ میں تو تیرہ سال سے ارادہ ہی کر رہا تھا اور اسکول میں پڑا سڑ رہا تھا —" (خط بنام اطہر جبین صاحب)

ایم۔ اے پریویس تو کر لیا۔ مگر جب فائنل کا وقت آیا تو بیوی بیمار ہو گئی — اور وہ ہمت چھوڑ بیٹھے۔ احباب نے ہمت افزائی کی۔ روزانہ ان کو یقین دلایا گیا کہ بھئی آپ کو تو امتحان کی تیاری کی ضرورت ہی نہیں آپ یونہی نمایاں طور پہ کامیاب ہو جائیں گے — ہر شام اختر صاحب احباب سے وعدہ کر لیتے لیکن ہر رات "غور" کرتے اور ارادہ چھوڑ دیتے — لیکن کچھ احباب بھی پنجے جھاڑ کر پیچھے پڑ گئے تھے۔ انہوں نے اختر صاحب کو امتحان ہال میں پہنچا ہی دیا — اور وہ کامیاب ہو گئے اور نمایاں طور پہ کامیاب ہوئے۔ اس کے بعد یونیورسٹی کے شعبۂ اردو نے ان کو لے لیا۔

جب اختر صاحب اسکول چھوڑ کر یونیورسٹی پہنچے تو معلوم ہوتا تھا کہ ان کے خفتہ عزائم اور حوصلے پھر سے بیدار ہو گئے ہیں — انہوں نے اپنے لئے ایک پروگرام مرتب کیا اور پی۔ ایچ ڈی میں داخلہ لینے کا عزم صمیم — ایک سال تک وہ پی۔ ایچ ڈی کرنے کے لئے سوچتے رہے — دوسرے سال داخلے کے لئے فارم منگائے گئے۔ لیکن وہ فارم کبھی پُر نہ ہو سکے اور پی۔ ایچ ڈی کا خمار آہستہ آہستہ اتر گیا —

اب وہ شعبۂ اردو سے ٹریننگ کالج چلے گئے ہیں —

شعبۂ اردو سے ٹریننگ کالج تک داستان بھی بڑی عجیب قسم کی ہے — اختر صاحب جب شعبۂ اردو میں پہنچے تو انہیں قدرے اطمینانی ہوا کہ چلو جنگ کی ملازمت مل گئی۔ لیکن بقول ان کے بد قسمتی ان کی تاک میں رہتی ہے۔ لہٰذا انہیں وہاں بھی چین نصیب نہ ہوا جس اسامی پر ان کا تقرر ہوا تھا وہ تقسیم ہند کے بعد اردو کو دیس نکالا ملنے کی وجہ سے تخفیف میں آ گئی۔ لہٰذا اختر صاحب کو حکم ملا کہ اسکول واپس جاؤ — اور اختر صاحب تلملا گئے —

"میرے معاملے میں ابھی تک کچھ نہیں ہوا — جو صورت حال تمہارے سامنے تھی وہی اب تک ہے۔ یونیورسٹی کھلنے پر شاید کچھ ہو۔ بہرحال یہ طے کر چکا ہوں کہ اسکول واپس نہیں جاؤں گا — اگر شعبۂ اردو میں مستقل تقرر نہ ہوا تو یہاں بھی نہ رہوں گا — اپنے آپ کو کافی تباہ کر چکا اب اس سے زیادہ کا حوصلہ نہیں۔ سترہ سال سے علی گڑھ میں پڑا گھس گھس کر رہا ہوں اور آج تک ۱۲۰ روپیہ کا لیکچرر نہ ہو سکا —"

اس خط میں جو علی گڑھ سے فرار کا ثبوت ملتا ہے — وہ ڈاکٹر عندلیب شادانی کی ڈھاکہ یونیورسٹی کے لئے دعوت ہے — جس کے متعلق وہ اکثر سوچتے رہتے اور ٹالتے رہے لیکن جب انہیں علی گڑھ سے قطعی مایوسی ہوئی تو انہوں نے خود ڈاکٹر شادانی کی طرف رخ کیا ان واقعات کی تفصیل بھی ان کی زبانی سنئے :—

"گرمیوں کی تعطیل میں میں نے ارادہ کر لیا کہ ڈھاکہ چلا جاؤں گا اور شادانی صاحب سے خط و کتابت بھی کی۔ لیکن ایک ماہ سے زیادہ اس ارادہ پر قائم نہ رہ سکا۔ میرے دماغ پہ اس کا بہت بڑا اثر ہوا۔ دن کی نیند اڑ گئی اور طبیعت ہر وقت بے انتہا پریشان اور وحشت زدہ رہنے لگی — اتفاق سے شادانی صاحب رام پور آئے۔ میں نے سوچا کہ جب ڈھاکہ جا رہا ہوں تو ان سے ملنا اخلاقی فرض ہے — چنانچہ رام پور گیا — ان سے گفتگو کر کے میں نے محسوس کیا کہ میرا وہاں جانا حماقت ہوگی — تفصیل ممکن نہیں صرف اتنا کہہ سکتا ہوں کہ جب مجھے ان سے پتہ چلا کہ وہاں زندگی نہایت مہنگی ہے اور مکان نایاب ہیں — مجھے بڑی کوشش کے بعد وہ ایک کمرے والا فلیٹ دلا سکیں گے۔ تو میں نے دل میں کہا کہ کیا میرے دماغ میں کیڑا کلبلا رہا ہے کہ میں دہلی کی جائداد چھوڑ دوں۔ علی گڑھ کا آٹھ دس ہزار کا سامان خاک میں ملا دوں — بھی جائی زندگی پہ لات ماروں اور وہاں جا کر دو کمروں میں رہنا شروع کر دوں۔ اس وقت میں نے طے کر لیا کہ ہر حال میں یہیں رہوں گا — چاہے اسکول ہی جانا پڑے — چنانچہ دہ پڑھا تی

جو مہینہ ڈیڑھ مہینہ سے طبیعت پر طاری تھی دور ہو گئی اور میں نہایت خوش و خرم علی گڑھ واپس آیا۔ یہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ پرنسپل ٹریننگ کالج حبیب صاحب میرے معاملے میں دلچسپی لے رہے ہیں اور مجھے اپنے یہاں لے جانا چاہتے ہیں لیکن میں نے اس بات کو زیادہ اہمیت نہ دی کیونکہ خورشید الاسلام کراچی گئے ہوئے تھے تو خیال تھا کہ وہیں رہ جائیں گے اور شعبہ اردو میں ایک جگہ خالی ہوگی پھر کب تک میرا تقرر ملتوی کیا جاتا رہے گا۔ گذشتہ تین سالوں میں بار بار ایسا ہوا کہ شعبہ اردو میں جگہ خالی ہوئی اور تخفیف میں لے آئی گئی ...... چونکہ خورشید صاحب کے نہ آنے میں میرا فائدہ تھا اس لئے وہ واپس آگئے —— جب وہ واپس آگئے تو میں دیوانہ وار حبیب صاحب کی طرف بھاگا ...... بہرحال یکم نومبر ۵۰ء سے میرا تقرر مستقل لیکچرار کی حیثیت سے بغیر PROBATION کے کیا گیا —— اور علی گڑھ میں ۱۶ سال پاپڑ بیلنے کے بعد میں نے پہلی دفعہ محسوس کیا کہ میں بھی ملازم ہو گیا —— چنانچہ اب ٹریننگ کالج ہی میں جگہ ہے ملا ہوا کالج ہے بہت آرام کی زندگی ہے — — — میں نے ام ایڈ میں داخلہ لے لیا ہے۔ چند ماہ میں مقالہ لکھ کر دے دوں گا۔ اس کے بعد پی۔ ایچ ڈی میں داخلہ لے لوں گا۔ اور اب اردو کے بجائے ایجوکیشن میں پی ایچ ڈی کروں گا ....

(خط بنام اظہر حسین صاحب)

لیکن شاید آج تک نہ وہ ام ایڈ کر پائے ہیں اور نہ پی۔ ایچ۔ ڈی ——

اختر صاحب کا روزانہ کا معمول ہے کہ وہ کالج سے آتے ہی غسل خانہ میں گھس جاتے ہیں —— اس سے پیشتر کہ پسینہ خشک ہو وہ اپنے جسم پر پانی ڈالنا شروع کر دیتے ہیں —— غسل کرنے کے بعد کھانا کھاتے ہیں اور پھر اپنے کمرے میں کمرہ بند کر چادر تان کر سو جاتے ہیں —— دن کی نیند اختر صاحب کو رات کی نیند سے زیادہ عزیز ہے۔ رات کو دو ڈھائی بجے سونا تو معمول کی بات ہے اگر اختر صاحب کو رات بھر جاگنا پڑے تو وہ خوشی خوشی رات گزار دیں گے۔ لیکن دن کی نیند ختم کرنے کے لئے دوپہر کا کھانا تو لازمی طور پر ختم کرنا ہوتا ہے —— سردیوں میں جب اسکول کا وقت صبح دس بجے سے شام چار بجے تک ہو جاتا تھا اختر صاحب شام چار بجے اسکول سے واپس آکر سوتے —— دوپہر کو دو تین گھنٹے ضرور سوتے ہیں۔ سونے کے بعد کمرہ کی صفائی —— ہر چیز کو صاف کرنے کے بعد اس کی مخصوص جگہ پر رکھنا روزانہ کا فریضہ ہے —— کمروں کی صفائی اور چیزوں کی ترتیب کے معاملے میں اختر صاحب کو نہ ملازم پر بھروسہ ہے اور نہ بیوی پر —— لہٰذا اس کام کو وہ بڑے انہماک، جوش اور شوق کے ساتھ خود کرتے ہیں۔ صفائی سے فارغ ہونے کے بعد پھر غسل کرتے ہیں اور بالوں وغیرہ کو سنوارنے کے بعد اپنے کمرے میں پہنچ کر پائپ سے شغل شروع ہو جاتا ہے —— اسی دوران میں چائے آجاتی ہے اور پھر اس کے بعد ملاقاتیوں کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔

اختر صاحب سے ملاقات کرنے کا یہ مخصوص وقت ہے۔ لہٰذا ہر شخص چراغ جلے ملنے آتا ہے اگر کوئی شخص پیشتر آجائے تو اس سے اختر صاحب کو بھی تکلیف ہوتی ہے اور اس شخص کو بھی —— چونکہ ان کے معمول میں خلل پڑ جاتا ہے وہ کسی سے ملنے کے لئے تیار نہیں ہوتے اور ملنا پڑتا ہے —— ملاقاتی کو یا تو یہ سن کر نا امید ہی ہوتی ہے کہ اختر صاحب سو رہے ہیں یا پھر برآمدے میں بیٹھ کر کافی سے زیادہ دیر تک انتظار کرنا ہوتا ہے۔

احباب سے ملاقات کا سلسلہ رات کے دس گیارہ بجے تک رہتا ہے —— اس دوران میں ادبی محفلیں بھی ہوتی ہیں، مشاعرے بھی ہوتے ہیں، خوش گپیاں بھی ہوتی ہیں، اختر صاحب اپنی مرحوم حسرتوں اور شکستہ امیدوں کا ماتم بھی کرتے ہیں۔ قسمت کو گالیاں بھی دے لیتے ہیں اور کمرے کی چمکتی ہوئی چیزوں کو دیکھ کر ایک فاتح کی طرح مسکراتے بھی ہیں۔

اختر صاحب کے ملاقاتیوں میں اسکول کے طالب علم بھی ہوتے ہیں بی۔ اے اور ایم۔ اے کے بھی —— یونیورسٹی کے نوعمر لیکچرار بھی ہوتے ہیں اور پیرانہ سال بھی —— شاعر اور ادیب بھی ہوتے ہیں اور غفور صاحب (لیکچرار ٹریننگ کالج)، جیسے فلسفی بھی جو اکثر بیٹھے بیٹھے فلسفے کی گتھیاں سلجھانے میں محو ہو جاتے ہیں اور اختر صاحب منہ میں پائپ دبائے دوسری سمت سوچتے رہتے ہیں یا دیگر احباب سے باتیں کرتے ہیں۔

اختر صاحب اپنے احباب کے حلقے میں بہت زیادہ مقبول ہیں۔ وہ شروع کی چند ملاقاتوں میں بہت کم کھلتے ہیں اور ملنے والے کو قدرے کرخت

ا بھی ہونے لگتا ہے — لیکن جب بے تکلف ہوتے ہیں تو اس کے سامنے اپنی محرومیوں کا اس بے تکلفی سے ماتم کرتے ہیں کہ ان پر احساس ہونے لگتا ہے کہ اختر صاحب
سے اس کے مراسم بہت گہرے ہو گئے ہیں۔ لہٰذا ان سے اختر صاحب کے ساتھ ہمدردی کے علاوہ عقیدت بھی ہو جاتی ہے۔ رات کو جب متعدد احباب
اختر صاحب کے یہاں جمع ہو جاتے ہیں تو ہر شخص اس انتظار میں رہتا ہے کہ کب دوسرے حضرات تشریف لے جائیں تو میں اختر صاحب سے باتیں کروں
چنانچہ یہ سلسلہ کافی طویل ہو جاتا ہے۔

لوگوں کے رخصت ہونے کے بعد اختر صاحب کھانا کھاتے ہیں۔ کچھ دیر برآمدے میں چہل قدمی کرنے کے بعد اپنے کوچ پر آ کر لیٹ جاتے ہیں۔
انہ رسائل پڑھتے ہیں، پائپ پیتے ہیں، اپنی سسکتی ہوئی حسرتوں کو پچکارتے ہیں اور ان کے حصول کے لئے راہیں سوچتے ہیں —— یہی وقت مطالعہ اور
تصنیف کا ہوتا ہے۔ لیکن لکھنا تو انہوں نے ۱۹۴۴ء سے مستقل طور پر چھوڑ رکھا ہے —— ہاں مطالعہ روزانہ کرتے ہیں اور پھر رات ایک دو بجے اندر
مکان میں جا کر سو جاتے ہیں۔

اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ دوست احباب نہیں آتے یا جلدی رخصت ہو جاتے ہیں تو اختر صاحب ریڈیو سنتے رہتے ہیں پائپ پیتے رہتے ہیں۔ ریڈیو
وہ اس قدر دھیمی آواز میں سنتے ہیں کہ کمرے میں بیٹھا ہوا دوسرا شخص مشکل سے ہی سن پاتا ہے —— لیکن وہ اپنے کوچ پر لیٹے رہتے ہیں، ریڈیو ان کے سرہانے
دھیمی آواز میں بجتا رہتا ہے، پائپ پیتے رہتے ہیں اور سنتے رہتے ہیں —— ایک شب ریڈیو سن رہے تھے۔ شاید کوئی ڈرامہ ہو رہا تھا کسی کردار نے ایک
شعر پڑھا۔ سن کر پھڑک گئے۔ اور بڑی دیر تک اس شعر کو پڑھتے رہے اور سر دھنتے رہے — دفعتاً خیال آیا کہ یہ تو خود ان کا ہی شعر ہے — لہٰذا فوراً
اپنا مجموعہ کلام نکال کر تصدیق کی۔

اختر صاحب فطرتاً بہت زیادہ نفاست پسند ہیں۔ ان کی خارجی زندگی میں یہ نفاست پسندی دوسرے لوگوں کو تصنع کی حد تک معلوم ہوتی ہے۔
اختر صاحب کالج سے آنے کے بعد گھر سے بہت کم نکلتے ہیں — اس کی وجہ آرام پسندی اور گوشہ نشینی کے علاوہ ایک یہ بھی ہے کہ زیادہ تر احباب خود ان کے
گھر ہی آ جاتے ہیں۔ لہٰذا انہیں دوسروں کے گھر جانے کا بہت کم موقع ملتا ہے۔ لیکن جب کسی دوست سے ملے ہوئے بہت دن گزر جاتے ہیں تو بے چین ہو کر خود
اس کی تلاش میں نکلتے ہیں — بازار وغیرہ بھی ماہ دو ماہ میں ایک دو بار ہی جاتے ہیں —— لیکن جب اختر صاحب گھر سے نکلتے ہیں خواہ کالج جانے کے
لئے، کسی تقریب میں شرکت کے لئے یا کسی دوست سے ملنے کے لئے —— نکلتے ہیں ہمیشہ کیل کانٹے سے لیس ہو کر ہی —— منزل پر پہنچ
کر رومال سے چہرے اور چشمے کے شیشوں کو صاف کرنا ان کا سب سے پہلا کام ہوتا ہے —— اس کے بعد کنگھا نکال کر بالوں میں پھیرتے ہیں خواہ بال بکھرے
ہوئے ہوں یا نہیں۔ جوتے کو خوب رگڑ کر چمکاتے ہیں۔ چہرہ اور جوتے کو صاف کرنا ان کے لئے لازم و ملزوم ہیں۔ وہ کہا کرتے ہیں کہ اگر جوتے پر گرد
پڑی ہوئی ہو تو اس گرد کا عکس ساری شخصیت پر پڑتا ہوا معلوم ہوتا ہے —— اگر جیب میں دو رومال نہیں ہیں تو وہ ایک ہی رومال سے دونوں
کا کام کر لیتے ہیں — ان چیزوں سے فارغ ہونے کے بعد پائپ میں تمباکو ڈالتے ہیں۔ تب کہیں جا کر بات چیت کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔

مٹی اور دھول سے اختر صاحب بُری طرح بھاگتے ہیں — اگر سڑک پر گزرتے ہوئے یا بیٹھے ہوئے خاک دھول اڑ کر ان کے اوپر آ جائے تو اختر صاحب
اپنا چہرہ پیٹ لیتے ہیں۔ اپنے شانے اور کوٹ کو اس طرح جھاڑنا شروع کر دیتے ہیں جیسے ماتم کر رہے ہوں —— وہ علی گڑھ میں مٹی اور دھول کی لو کے
دن میں کمرے کو چاروں طرف سے بند کئے پسینہ میں شرابور پڑے رہتے ہیں۔ ایک ایک روزن کو اچھی طرح بند کر دیتے ہیں۔ مبادا ان میں سے دھول
کے ذرے آ جائیں۔

اختر صاحب کی زندگی میں دو چیزیں نہایت واضح ہیں —— مایوسی اور خود رحمی —— مایوسی کی ابتدا ان کی عملی زندگی کے ساتھ ہوئی۔ میرے
خیال میں ان کی زندگی میں کوئی ایسے غیر معمولی قسم کے واقعات تو ہوئے نہیں جن کا مداوا ہی نہ تھا —— البتہ اختر صاحب کی ناز و نعم میں پلی ہوئی تخیل پرست
حساس طبیعت نے چھوٹے سے چھوٹے واقعہ کو بھی ایک پہاڑ سمجھا اور ان میں اتنی جرأت نہ ہوئی کہ اس چوٹی کو سر کر سکتے۔ کوشش کرنا تو درکنار انھوں

نہ رہا تو کوہ پہاڑ سمجھ کر اپنا سر پیٹ لیا قسمت کو گالیاں دیں اور دنیا سے مایوس ہو کر گوشہ نشین ہو گئے۔ انہیں یہ بھی گلہ رہا کہ وہ ایک قابل انسان ہیں، لیکن لوگ ان کی طرف توجہ نہیں دیتے ——— لیکن انہیں یہ احساس کبھی نہیں ہوا کہ ہماری سوسائٹی اس شخص کو منہ ہی نہیں لگاتی جو مکھن لگانے، دو چار ڈوبے جیبوں میں ڈالے ناخداؤں کے درباروں کا طواف نہ کرے، خواہ وہ کتنا ہی قابل، عالم فاضل کیوں نہ ہو ——— یہی حال ادبی دنیا کا ہے ——— انہیں شکایت ہے کہ ادب والوں نے انہیں وہ جگہ نہیں دی جس کے وہ مستحق تھے اور انہیں اکثر بیشتر نظر انداز کر دیا گیا۔ تو یہاں بھی وہی چیز کارفرما ہے ——— اختر صاحب ہنگاموں سے بھاگتے رہے —— وہ شاعر ہیں لیکن مشاعروں میں کبھی نہیں جاتے خواہ مشاعرہ ان کے گھر کے قریب ہی ہوتا ہے وہ گروہ بندی کے بھی قائل نہیں۔ اگر وہ بھی ایک گروہ یا حلقہ بنا لیتے تو آج انہیں قطعاً یہ شکایت نہ ہوتی۔

اختر صاحب کی زندگی میں مایوسی اس قدر سرایت کر گئی ہے کہ اب وہ ہر کام کی ابتدا ہی سے مایوس ہو کر کہنے لگتے ہیں: "چونکہ یہ کام میں کر رہا ہوں اس لئے یہ کبھی نہیں ہو سکتا"۔ مایوسی اور قسمت سے گلہ اختر صاحب کی زندگی میں قدم قدم پہ ملتا ہے

"دوسرے روز صبح ہی سے لو بڑی شدت کے ساتھ چلنے لگی اور ہونا بھی ایسا ہی چاہیے تھا میں نے جو گھر سے نکلنے کا ارادہ کیا تھا ——"

(خط بنام اظہر حسین صاحب قادری)

اسی خط میں آگے چل کر لکھتے ہیں ——

"...... غالب نے اپنے خطوط میں کہیں اپنی اس خصوصیت کا ذکر کیا ہے کہ میں نے جس سے عشق کیا، اس کو مار رکھا اور جس فرمانروا کی شان میں قصیدہ لکھا اس کی سلطنت کا بیڑا غرق ہوا۔ تو بھئی غالب کی کوئی اچھی خصوصیت تو مجھ میں پیدا کاہے کو ہوتی۔ مگر یہ ایک بد وصف جو ان میں تھا میرے اندر بدرجۂ اتم پایا جاتا ہے ——— مختصر یہ کہ اول درجہ کا منحوس ہوں —— جہاں جاتا ہوں اس نحوست کا اثر ساتھ لے جاتا ہوں ——— آپ کو یاد ہوگا کہ آج سے سترہ سال پہلے ۱۹۳۴ء میں جب میں ایک اسکول میں ٹیچر ہو کر آیا تھا تو یہ اسکول کیا چلتا ہوا ادارہ تھا۔ روپے کی وہ فراوانی تھی کہ جب کسی طرح خرچ نہیں ہوتا تھا تو استادوں کو سال میں دو دو INCREMENT دے دیئے جاتے تھے۔ میرے آتے ہی اس کی مالی حالت خراب ہو گئی اور بے چارے استادوں کی سالانہ ترقیاں بند ہو گئیں۔ اور اس کے بعد جب تک میں رہا وہ اسکول پنپ نہیں سکا اور اس کی مالی حالت گرتی ہی چلی گئی۔ پھر جب میں نے خدا خدا کر کے ایم اے کیا اور شعبہ اردو میں لیکچرار ہو گیا تو میرے تقرر کے بعد جو ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو عمل میں آیا، چوبیس گھنٹے کے اندر اندر ہندوستان تقسیم ہو گیا، اردو کو اس ملک نے دیس نکالا مل گیا۔ اور شعبہ اردو دم توڑنے لگا ——— گویا نہ میں اردو میں ایم اے کرتا نہ ہندوستان میں اردو کا ستارہ گہناتا۔ اور صاحب! تکلف برطرف میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ دوسری بڑی لڑائی بھی صرف اس لئے لڑی گئی کہ ۱۹۳۹ء تک میری تنخواہ کسی قدر معقول ہو گئی تھی اور سخت ضرورت اس بات کی تھی کہ مہنگائی زیادہ سے زیادہ ہو جائے تاکہ میں بدستور بھوکا کنگال بنا رہوں ——— پھر شاید آپ یہ بھی جانتے ہیں کہ مجھے خاک دھول سے کس قدر وحشت ہوتی ہے ——— آسمان پر آندھی کا پہلا غبار نظر آتا ہے تو میرا چہرہ پیلا پڑ جاتا ہے اور غالباً آپ کو یہ بھی معلوم ہوگا کہ علی گڑھ تیزی کے ساتھ صحرا بنتا جا رہا ہے ——— آپ کے سر کی قسم اگر میں پہاڑ کی چوٹی پہ سکونت اختیار کر لوں تو وہاں بھی خاک اڑنے لگے ——— "

اس سلسلے میں اختر صاحب نے مجھے اس طرح لکھا تھا۔

. . . . . میں جب سے یونیورسٹی میں آیا تھا۔ بہت خوش تھا اور بہت مطمئن تھا اور "ڈرتا ہوں آسمان سے بجلی نہ گر پڑے" کے مصداق یہ سوچ سوچ کر لرز رہا تھا کہ دیکھئے کیا مصیبت نازل ہونے والی ہے ـــــ خوف بھری نظروں سے باری باری اپنے سب بچوں کو دیکھتا تھا اور سوچتا تھا کہ خدا جانے ان میں سے کون اللہ کو پیارا ہونے والا ہے ـــــ بارے اس معبود حقیقی نے میرے بچوں کی جان بخشی کی اور صرف میری ملازمت کی جان پہ بنی۔

اس مسلسل مایوسی نے اختر صاحب کو زندگی میں محرومی کا شدید احساس پیدا کر دیا ہے۔ لہٰذا وہ اس مایوسی سے قطع نظر اپنی آرزوؤں اور مسرتوں کے حصول کے لئے سوچتے رہتے ہیں اور اگر اتفاق سے ان کے حصول کا موقعہ مل جاتا ہے تو ایک حقیقی فاتح کی طرح قہقہے لگاتے ہیں ـــــ

اسکول سے جب اختر صاحب شعبہ اردو میں آئے تو ان کی مالی حالت پہلے کی نسبت کافی بہتر ہو گئی۔ اول تو یہ کہ آمدنی میں اضافہ ہوا دوسرے یہ کہ چھوٹے بھائیوں کے ملازم ہونے سے ان کے شانوں سے بار بھی کم ہو گیا۔ لہٰذا اختر صاحب کے پاس گھر کے اخراجات نکالنے کے بعد ایک اچھی خاصی رقم بچنے لگی جو بچا کر رکھنا ان کے بس کی بات نہیں۔ لہٰذا انہوں نے بے تحاشا قیمتی چیزیں خریدنی شروع کیں۔

اختر صاحب کے پاس پائپ ہمیشہ ضرورت سے زائد رہے لیکن کوئی اس قدر قیمتی پائپ نہ تھا جو ان کے شوق کی صحیح طور پر تکمیل کرتا لہٰذا ۰۷ روپیہ کا DUNHILL خریدا۔ اس طرح ۵۰ روپیہ کا RONSON لائیٹر خریدا گیا۔ اختر صاحب سگریٹ نہیں پیتے ایک مرتبہ دہلی گئے۔ پندرہ روپیہ کا سگریٹ کیس پسند آ گیا خرید لائے۔ دریافت کیا "بھئی یہ کس لئے؟" جواب ملا "بس یونہی"! ایک مرتبہ دہلی سے بڑی بہن بھائی کے بعد پینتالیس روپے کا جوتا اور ایک فیلٹ ہیٹ خرید کر لائے ہر دوست سے فخریہ کہا۔ "کم از کم دہلی میں اس سے اچھا جوتا نہیں تھا ـــ پورے دو دن بھاگ دوڑ کرنے کے بعد دستیاب ہوا ـــ" لیکن فیلٹ ہیٹ چند دن بعد ہی طبیعت سے اتر گیا اور آخر کار ایک دوست کو عنایت فرما دیا۔

انہی دنوں اختر صاحب گرلز کالج میں بھی PART TIME LECTURE ہو گئے۔ آمدنی کے ساتھ ساتھ مصروفیت بھی بڑھ گئی۔ لہٰذا سائیکل کی ضرورت ہوئی۔ ایک پرانی سائیکل گھر میں پڑی تھی۔ اس کا بناؤ سنگار کرایا گیا لیکن بڈھی گھوڑی پہ لال لگام نہ جچی۔ اسے فروخت کر کے تین سو روپے کی ریلے سائیکل خرید ڈالی ـــ حالانکہ سائیکل چلانے سے اچھی طرح واقف بھی نہ تھے اور ایک دن ایسی ٹکر ہوئی کہ ہفتہ بھر تک پٹیاں باندھے رہے۔

ایک مرتبہ علیگڑھ میں راے صاحب امراؤ سنگھ کی دوکان پر کھڑے تھے۔ شوکیس میں رکھا پلاسٹک کا بنا ہوا گھڑی کا اسٹینڈ پسند آ گیا ـــ اختر صاحب نے قیمت دریافت کی۔ جواب ملا ـــ "صاحب یہ تو ہم دوکان کی شو کے لئے لائے ہیں فروخت کرنے کے لئے نہیں ـــ آج تک کسی نے ہم سے طلب نہیں کیا ـــ" لیکن اختر صاحب بضد اور ہر قیمت پہ خریدنے کے لئے تیار ـــ لہٰذا خرید لیا ـــ اسی طرح اختر صاحب نے اپنے کمروں کی آرائش میں اضافے کئے ہیں ـــ

اختر صاحب جب بھی کوئی چیز خریدتے ہیں تو سب سے اعلیٰ کوالٹی کی پسند کرتے ہیں۔ عمدہ اور حسین چیز خریدنا ایک طرح سے ان کی HOBBY ہے۔ ان کے سامنے ایک ہی قسم کی الگ دو چیزیں رکھ دی جائیں اور ایک کی قیمت کم اور ایک کی قیمت زیادہ بتائی جائے تو زیادہ قیمت کی چیز لینا پسند کریں گے ـــ وہ جب کبھی کسی دوکان پر جاتے ہیں تو خاموشی کے ساتھ دوکان کی اشیاء کا جائزہ لیتے رہتے ہیں۔ وہ عام طور پر دوکان دار سے چیزیں کم طلب کرتے ہیں بلکہ مطلوبہ اشیاء کی طرف اشارہ کرتے جاتے ہیں اور دوکان دار پیک کرتا جاتا ہے ـــ قیمت ٹھہرانا ان کے بس کی بات نہیں ـــ

اختر صاحب تنگ دست رہتے ہیں لیکن دل ہمیشہ غنی رکھتے ہیں۔ قرض مانگنے والوں کو وہ شاذ و نادر ہی مایوس کرتے ہیں۔ پھر اس قرض کی

واپسی کا انتظار بھی کرتے رہتے ہیں —— ایک مرتبہ سکول کا چپراسی ایک خط بلکہ عتاب نامہ لے کر آیا کہ آپ یا تو اسکول واپس آ جائیے یا اپنی جگہ سے مستعفی ہو جائیے — ان دنوں اختر صاحب شعبہ اردو میں آ چکے تھے اور اسلامیہ ہائی اسکول کی نوکری کا دل تمام مہینہ کی آخری تاریخیں تھیں جیب میں شاید دو ہی روپے تھے وہ چپراسی کو دے دیئے —— کیونکہ انہیں یہ گوارا نہ تھا کہ چپراسی ایک عرصہ کے بعد گھر پر آئے اور خالی ہاتھ واپس چلا جائے۔

اختر صاحب اشتراکیت کے حامی ہیں — انہیں دعویٰ ہے کہ انہوں نے اشتراکیت کو پڑھا ہے، سمجھا ہے اور اسے اپنی نفسیات میں پیش کیا ہے لیکن اختر صاحب کی اشتراکیت ان کی ذات تک ہی محدود ہے وہ نہ کبھی کمیونسٹ پارٹی کے ممبر بنے اور نہ ان کے کسی جلسے میں شریک ہوئے ۱۹۴۹ء میں کمیونسٹوں کی گرفتاریاں ہوئیں یونیورسٹی سے بھی چند طلباء اور اساتذہ گرفتار ہوئے۔ اختر صاحب کو پریشانی لاحق ہو گئی۔ چونکہ صرف کمیونسٹ ہی نہیں بلکہ وہ ادیب اور شاعر بھی گرفتار کئے جا رہے تھے جنہیں اشتراکیت سے ہمدردی تھی۔ ایک دن باتوں ہی باتوں میں کہنے لگے — "یوں تو نظر بندی سے کوئی ڈر نہیں۔ لیکن بیٹھے بٹھائے سارا سکون درہم برہم ہو جائے گا —"

مذہب سے اختر صاحب کو کسی قسم کی دلچسپی نہیں۔ وہ عید اور بقر عید کی نماز بھی نہیں پڑھتے۔ لیکن قربانی ضرور کرتے ہیں —— خواہ وہ بچوں کی خاطر کرتے ہوں یا احباب کے لئے لیکن مذہبی نقطۂ نگاہ سے نہیں —— وہ دہلی کے سٹیشن پہ NON VEGETRIAN ہوٹل میں جا کر کھانا بھی کھا لیتے ہیں ——

گاندھی جی کے مرنے کی خبر سن کر انہیں ایک دھچکا سا لگا۔ کمرہ صاف کرتے کرتے افسردہ ہو کر کرسی پہ بیٹھ گئے —— لیکن اس لئے نہیں کہ گاندھی جی ہندوستان کے بڑے لیڈر تھے یا ہندو مسلم اتحاد کے حامی تھے بلکہ اس لئے کہ وہ ایک "عظیم انسان" تھے۔

ایک مرتبہ اظہر حسین صاحب قادری نے دعوت افطار کی —— اختر صاحب کو بھی بلایا — اختر صاحب افطار کا وقت ختم ہونے کے بعد پہنچے سب نے دریافت کیا "بھئی دیر کیوں ہو گئی —" جواب دیا — "یہ اچھا نہیں معلوم ہوتا کہ میں بے روزہ دار ہو کر آپ لوگوں کے ساتھ شرکت کروں — لہٰذا اب آپ لوگ افطار کر چکے ہیں۔ باقی کے پروگرام میں آپ کا شریک ہوں —"

آپ اختر صاحب سے گھنٹوں بیٹھے باتیں کرتے رہیئے۔ ان کے چہرے پہ مسکراہٹ آئے گی لیکن دبی دبی سی۔ یا طنز میں ڈوبی ہوئی — وہ خود کسی محفل میں، کسی نشست میں ایسا واقعہ بیان نہیں کر سکتے جس سے سامعین کے پیٹوں میں بل پڑ جائیں — لیکن برخلاف اس کے ان کے سامنے اگر کوئی پُرمزاح واقعہ یا لطیفہ بیان کیا جائے تو وہ انتہائی لطف لیتے ہیں۔ خوب ہنستے ہیں، بار بار بیان کراتے ہیں اور لطف اندوز ہوتے ہیں —

ایک مرتبہ اختر صاحب "ریڈیو ٹاک" کے سلسلے میں دہلی گئے — میں بھی ہمراہ گیا۔ غازی آباد سے عطا محمد (مشہور فنکار جو کہ اب تحصیلداری کے فائلوں میں دب کر رہ گئے ہیں) بھی ہم رکاب ہو گئے — اس دن اختر صاحب بہت خوش تھے — واپسی پر جامع مسجد سے ریلوے اسٹیشن تک متعدد لطیفے بھی سنا ڈالے۔ جب ہم لوگ اسٹیشن پہ پہنچے تو ریل پلیٹ فارم پہ آ چکی تھی حالانکہ روانہ ہونے میں تقریباً دو گھنٹے باقی تھے —— عطا محمد تو قمیض اور پینٹ کا تکیہ بنا کر اوور کوٹ پہنے برتھ پہ دراز ہو گئے —— اختر صاحب نے اسٹیشن کے باہر شرنارتھیوں کی دوکانوں پر چاٹ کھانے کا ارادہ ظاہر کیا — میں نے کہا "اس وقت رات کے گیارہ بجے ہیں اور سنا ہے کہ یہاں رات میں مسلمانوں کے لئے نکلنا ٹھیک نہیں — بہتر یہی ہے کہ اسٹیشن پہ رہیئے —" (یہ ۱۹۴۸ء کا واقعہ ہے جب کہ فسادات کو زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا) لیکن اختر صاحب نہیں مانے کہنے لگے — "ہم لوگ سوٹ پہنے ہوئے ہیں — انگریزی میں بات کریں گے۔ کوئی نہیں پہچانے گا —" بہرحال ہم لوگ اسٹیشن کے باہر پہنچ گئے — اختر صاحب نے خوب مزے لے لے کر چاٹ کھائی۔ ہم لوگوں نے اس دوران میں بہت کم بات کی لیکن جو بات کی وہ انگریزی میں کی۔ مجھے تو کسی حد تک ڈر بھی محسوس ہو رہا تھا لیکن اختر صاحب بالکل بے فکر اطمینان سے چاٹ کھاتے رہے —— اختر صاحب نے جب دوکاندار کو پیسے دیئے تو وہ کہنے لگا۔

"بابو جی آپ لوگوں نے بڑی ہمت کی —— ویسے تو کوئی بات نہیں۔ لیکن سالے بدمعاشوں کا کون روکتا ہے —— آپ لوگ اب

شاد عارفی

طاہرہ اختر

لڈن ماموں ——— اگر آپ اچنبھے میں نہ پڑیں تو عرض کروں کہ یہ نام انہی "پُراسرار شاعر" (بقول ماہنامہ ادبِ لطیف) کا گھریلو نام ہے جنہیں ادبی حلقے احمد علی خاں شاد عارفی کے نام سے پہچانتے ہیں۔ اور یہ سوچ بھی نہیں سکتے کہ ان دو ناموں کے علاوہ موصوف کے دو نام اور بھی ہیں۔ ایک لطف علی خاں اور دوسرے پاپا۔ پہلا نام حامدیہ اسکول کے درجہ الف کے ماسٹر کی غلطی کا ممنون ہے جو اسکول کی ساتویں جماعت تک چلتا رہا اور پھر درخواست دے کر حقیقی نام احمد علی خاں میں تبدیل کرا دیا گیا۔ مگر اس زمانے کے ساتھی انہیں آج بھی اسی نام سے جانتے ہیں۔ دوسرا نام "پاپا" لڈن ماموں کے بھتیجوں سے ممنون ہے جو محلہ بھر میں "قبولِ عام" کی سند حاصل کر چکا ہے۔

وہ جو کہا گیا ہے کہ ہر اسم اپنے مسمّی پر اثر پذیر ہوتا ہے اس لئے بالکل ٹھیک ہے کہ محلہ بھر کے بچوں اور جوانوں میں لڈن ماموں پاپا کا کردار اس خوبصورتی سے ادا کرتے ہیں جیسے علی گڑھ کے ابا حلیم طلبا میں گھرے بیٹھے ہوں اور بچے یا جوان یہ محسوس نہ کر رہے ہوں کہ ان کے درمیان کوئی ان سے بڑی عمر کا آدمی بیٹھا ہے۔ نصیحت کرنے کا انداز بھی ان کا اپنا انداز ہے جس میں طنز اس طرح شامل ہوتا ہے کہ صاف نظر آتا ہے اور غیر محسوس بھی ——— مثلاً کوئی لڑکا بستہ بغل میں دبائے ہوئے پتنگ بازی دیکھنے لگے تو یہ اس سے ہنس کر کہیں گے کہ لاؤ بستہ مجھے دو اور یہ پتنگ اڑاؤ۔ لڑکا جب اس پر کچھ پشیمان ہونے لگے تو یہ کہیں گے ——— پھینکو بھی ان کتابوں کو ان میں کیا تفریح ہو سکتی ہے۔ اس کے علاوہ پڑھنے لکھنے والوں نے ہمیشہ تیل بیچا ہے۔ جب لڑکا شرمندگی کی حد پر آ جاتا ہے تو یہ اپنا آخری حربہ استعمال کرتے ہیں ——— کھیلیے کودیے ہوگے نواب ——— اور وہ لڑکا اب اسی میں عافیت سمجھتا ہے کہ سیدھا سیدھا مدرسہ پہنچ جائے۔ ہم نے تو لڈن ماموں کو تلخ سے تلخ حالات میں بھی مغموم اور اداس نہیں دیکھا گیا۔ ہنسی ہر وقت ان کے ہونٹوں پر کھیلتی رہتی ہے۔ سنہ ۳۱ء کی ایک طرحی غزل کے مقطع میں انہوں نے اس طرف بہت واضح اشارہ کیا ہے اور یہی ان کا مزاج بھی ہے۔ فرماتے ہیں ؎

تلخیٔ وقت و گردشِ دوراں پہ قہقہہ
کچھ شاد سے ہی رنج و محن کا دیا جواب

یہی نہیں بلکہ رنج و محن کا جواب دینا انہوں نے اپنے عقیدے میں شامل کر لیا ہے۔ چنانچہ جب ان کی جیب میں تھوڑے پیسے رہ جاتے ہیں تو وہ انہیں کسی فقیر کو دے کر اپنی جیب خالی کر دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ان تھوڑے سے پیسوں کی وجہ سے اللہ میاں کو میری فکر نہیں تھی۔ اب جبکہ گرہ میں مال نہیں رہا ہے ظاہر ہے کہ وہ مسبب الاسباب ہو کر خود کوئی سبب پیدا کرے گا۔ چنانچہ وہ بھی کوئی نہ کوئی سبب پیدا کرتا رہتا ہے اور ان کا کوئی کام اٹکا نہیں رہتا۔ کوئی غلط بات یا توہین برداشت کرنے کی لڈن ماموں میں قطعاً تاب نہیں۔ چھ سات ملازمتیں ذرا ذرا سی زیادتیوں کی وجہ سے چھوڑ دیں۔ اگر کوئی پوچھے کہ آپ یہ کیا کرتے ہیں تو مسکرا کر جواب دیں گے کہ اللہ میاں مجھے پریشان کرنے اور اپنے اطمینان کے لئے مجھے ایک آدھ گھٹیا ملازمت دے کر جب بے فکر ہو جاتے ہیں تو میں استعفےٰ دے کر انہیں پریشان کرنے لگتا ہوں کہ لاؤ رازقِ مطلق ہو تو میرا انتظام کرو' اور جیسا کہ میرا عقیدہ ہے وہ اپنے رازقِ مطلق ہونے کا ثبوت دیتا رہتا ہے۔

تو میں یہ کہہ رہی تھی کہ لڈن ماموں ضبطِ غم میں اپنا جواب نہیں رکھتے اور بڑے بڑے صدمے ہنسی میں اڑا جاتے ہیں۔ اسی روشنی میں موصوف کا ایک شعر اور یاد آ رہا ہے جس میں انہوں نے زندگی کی دشواریوں کو جھیلنے کی تلقین کی ہے ؎

زرد چہرے نے تبسم کو کیا ہے بدنام
ورنہ ظاہر بھی نہ ہوتا کہ پریشاں ہے کوئی

یہاں میں لڈن ماموں کا اسی زمین میں ایک بہت عمدہ شعر سنانا چاہتی ہوں مگر معلوم نہیں آپ اچھے شعروں میں دلچسپی لیتے ہیں یا نہیں فرماتے ہیں ؎

جاپ سن کر جو ہٹا دی تھی اٹھا لا ساقی
شیخ صاحب ہیں میں سمجھا تھا مسلماں ہے کوئی

یہ شیخ صاحب کے مسلمان ہونے یا نہ ہونے کی بحث تو خواہ مخواہ بیچ میں آ گئی ورنہ میں یہ کہہ رہی تھی کہ "کچھ شادی نے رنج و محن کا دیا جواب" اور واقعی طور پر لڈن ماموں نے گردشِ دوراں کا مقابلہ ڈٹ کر کیا اور بقول حضرت حالی ان کے لئے یہی فتح و ظفر کی صورت بھی رہ گئی تھی جبھی تو لڈن ماموں نے اپنے اوپر وہ حملے کئے ہیں کہ باید و شاید۔ ان حملوں کی تفصیل طولانی ہے اس لئے میں مختصر نویسی سے کام لے کر یہ بتانا چاہتی ہوں کہ ابھی آپ انٹرنس کا ششماہی امتحان ہی دینے پائے تھے کہ ان کے والد خان عارف اللہ خاں کا انتقال ہو گیا۔ گھر کی تمام ذمہ داریاں ان پر آن پڑیں جنہیں موصوف نے خندہ پیشانی سے برداشت کیا۔ بھتیجا بھتیجی کے پڑھانے لکھانے' شادی کرنے اور والدہ کی خدمت کو اپنا فرض تسلیم کرتے ہوئے شادی کا خیال ترک کر دیا۔ مگر ۵۹ برس کی عمر میں ان کی والدہ کی آنکھیں جاتی رہیں۔ بھتیجی کی شادی کر دی۔ بھتیجے کو بی۔ اے بی ٹی کرا کے اس کی شادی کر دی اور وہ سسرال میں رہنے لگا۔ والدہ کی خدمت کے سلسلہ میں مجبوراً شادی نہ کرنے کا عہد توڑنا پڑا اور چالیس سال کی عمر میں شادی کر لی۔ ان کی نظم "نصف بہتر" اسی طرف اشارہ کرتی ہے۔ لڈن ماموں کی زندگی کا سب سے بڑا المیہ یہ رہا ہے کہ ان کی اطاعت شعار بیوی ڈیڑھ سال زندہ رہ کر داغِ مفارقت دے گئی۔

اگر یہ درست ہے کہ شخصیت کے سلسلے میں کسی شاعر کی جائے پیدائش اور خاندانی حالات معہ اپنے تمام حدود اربعہ کے درج کئے جائیں تو مجھے یہ لازم آ جاتا ہے کہ اس بارے میں اختصار سے کام لے کر یہ بتاتی چلوں کہ لڈن ماموں کی وہ حار یا غستان سے ہے اور آپ ڈوڑال اور رزڑ قبائل سے تعلق رکھتے ہیں۔ ننھار رام پور میں ہے۔ ان کی نانی رام پور میں پیدا ہوئی تھیں مگر نانی کے والد اور والدہ خالص افغانی تھے اور نسلاً رزڑ۔ لڈن ماموں کے نانا مولوی سید ولی حق کا ذکر "تذکرۂ کاملانِ رام پور" میں موجود ہے' نواب علاؤالدین خان والیٔ لوہارو کی خواہش پر ضیاءالدین و لی عہد لوہارو کے عربی معلم بن کر لوہارو چلے گئے جن کے ساتھ ان کے داماد مولوی محمد عارف اللہ خان یعنی لڈن ماموں کے والد بھی

لوہارو آگئے اور یہاں تھانیداری کے عہدے پر فائز ہوئے۔ لڈن ماموں سنہ ۱۹۱۲ء میں وہیں لوہارو میں پیدا ہوئے۔ ابھی یہ ڈیڑھ سال کے تھے کہ ان کے نانا اور والد کو ریاست سے پنشنیں مل گئیں اور یہ اپنے وطن رام پور آگئے۔ چنانچہ لڈن ماموں بھی رام پور آگئے۔ عربی فارسی کی تعلیم اپنے نانا اور والد سے گھر پر حاصل کی، اُردو حکیم عتیق میاں سے پڑھی۔ علم حاصل کرنے کی لگن سے تنگ آکر خاندانی روایت سے بغاوت کرتے ہوئے اپنے ماموں کرامت علی خان کے ذریعہ جو اس وقت رام پور میں تھانیدار تھے! ۱۲ برس کی عمر میں اسکول میں داخلہ لے لیا جس پر لڈن ماموں کے والد عرصہ تک ناراض رہے اور کہتے رہے کہ کرامت علی خان نے میرے لڑکے کو کرسٹان بننے میں مدد دی ہے جسے میں کسی طرح معاف نہیں کر سکتا۔ مگر ایک دن ہوا یہ کہ دہلی سے لڈن ماموں کے بڑے ماموں کا تار آگیا اور یہ دیکھ کر کہ لڈن ماموں نے وہ تار حرف بحرف پڑھ کر سنایا بہت خوش ہوئے اور اپنی ناراضگی کے ردِ عمل میں بڑے پیار سے سر پر ہاتھ پھیرا اور کہا میں غلطی پر تھا۔ زمانہ کا تقاضا یہی تھا جو تم نے کیا۔ اب تم شوق سے انگریزی پڑھ سکتے ہو مگر اچھے بُرے کا امتیاز ہاتھ سے نہ جانے پائے۔ "مجھ پر بھروسہ کیجئے" لڈن ماموں نے جواب دیا اور اس بھروسہ کو آخر تک نباہا۔ چونکہ قدرت نے انہیں علم حاصل کرنے کی ترغیب دی تھی اس لئے ان کے مطالعہ کا یہ عالم رہا کہ رات کے دو دو بجے تک کتاب ہے اور لڈن ماموں ہیں اور آپ تعجب کریں گے کہ یہ شوقِ مطالعہ آج بھی کم نہیں۔ خصوصاً شعر و ادب کی دلچسپی جنون کی حد تک پہنچ گئی تھی۔ سبعہ معلقہ کا ایک ایک شعر معہ اپنی تمام خوبیوں کے ان کا موضوعِ سخن تھا یعنی یہ مطالعہ ورق گردانی کے طور پر نہ تھا بلکہ ہمیشہ مفہوم و معانی میں ڈوب کر استفادہ مدِ نظر رہا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ آج بھی سبعہ معلقہ کے شاعروں میں صرف لبید کو ترجیح دیتے ہیں اور کہتے ہیں اس میں شاعرانہ خودداری اپنی تمام سنجیدگیوں کے ساتھ موجود ہے۔ یہ لڈن ماموں کے صحیح ذوقِ مطالعہ کا نتیجہ ہی تو ہے کہ انہوں نے بڑے بڑے دیوانوں کا انتخاب ایک ایک شعر میں مرتب کیا ہے۔ مگر یہ وہ شاعر ہیں جو انہیں پسند نہیں پھر بھی ان کا گہرا مطالعہ کر کے یہ انتخاب تیار کیا ہے۔ حضرت میر کا یہ شعر جس کا مصرعہ ہے" یہ سن کر کلی نے تبسم کیا" خاقانیِ ہند ذوق کے دیوان کا خلاصہ ملاحظہ کیجئے ؎

منعمِ موذی کے گھر کو اہلِ حاجت لوٹ لیں
مانگتا ہے کب کوئی حبا کہ عسل زنبور سے

ناسخ اور اس قسم کے دوسرے خشک شعرا کے متعلق کہا کرتے ہیں کہ ان حضرات نے اپنی عمر ضائع کی اور کاغذ بھی ——— زیادہ سے زیادہ ان لوگوں کے کلام سے رسالہ تذکیر و تانیث تیار کیا جا سکتا ہے یا وہ اردو لغت جس میں اشعار کے ذریعہ مثالیں پیش کی گئی ہوں۔ حضرت آتش کا یہ مطلع "سن تو سہی جہاں میں ہے تیرا فسانہ کیا" الخ ——— رند کا یہ شعر جس کا آخری مصرعہ ہے "وگرنہ دام کہاں میں کہاں کہاں صیاد" ——— حد یہ ہے کہ اپنے استادِ فصاحت جنگ حضرت جلیل کو اس ایک مطلع کا شاعر کہتے ہیں ؎

نگاہ برق نہیں چہرہ آفتاب نہیں
وہ آدمی ہے مگر دیکھنے کی تاب نہیں

اگر آپ حضرت غالب کے دیوان کا خلاصہ چاہیں گے تو صاف صاف کہہ دیں گے کہ وہ تو خود انتخاب ہے، انتخاب کا انتخاب حماقت ہے ہاں اگر آپ یہ پوچھیں گے کہ ان کے نزدیک غالب کا سب سے اچھا شعر کونسا ہے تو کہیں گے ؎

پرتوِ خور سے ہے شبنم کو فنا کی تعلیم
ہم بھی ہیں ایک عنایت کی نظر ہونے تک

دو چار دن کے بعد آپ اگر پھر یہی سوال کریں گے تو جواب ملے گا ؎

کتنے شیریں ہیں تیرے لب کہ رقیب
گالیاں کھا کے بے مزا نہ ہوا

اگر آپ معنوی بحث چھیڑ دیں گے تو ارشاد ہوگا۔ اس شعر میں غالب کی خودی اپنے انتہائی عروج پر ہے۔ محبوب سے کہتے ہیں ہم تو گالیاں برداشت ہی نہیں کر سکتے وہ تمہاری ہوں یا کسی اور کی۔ مگر رقیب کے گالیاں سہہ جانے سے ہم اندازہ کرتے ہیں کہ تیرے لبوں کی شیرینی اپنی کوئی حد ہی نہیں رکھتی ——— اس کے بعد اگر آپ یاد دلائیں گے کہ چار دن پہلے تو آپ نے غالب کا وہ شعر پسند کیا تھا اور آج اس شعر کو سب سے اچھا شعر بتا رہے ہیں تو فوراً مسکرا دیں گے جس کے معنی یہ ہوں گے کہ وہ ظالم تو سب ہی اچھے شعر کہہ گیا ہے۔ حضرت حالیؔ کا یہ مقطع بہت پسند ہے ؎

بڑا جی خوش ہوا حالیؔ سے مل کر　　ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں

ایک دن کہنے لگے جوشؔ کو میں بہت اچھا شاعر سمجھتا تھا مگر اس کا یہ مقطع دیکھ کر "ابھی اگلی شرافت کے نشاں کچھ پائے جاتے ہیں" جوشؔ سے میرا دل برا ہو گیا۔ حضرت حالیؔ کے اس مقطع کا ایسا مذاق اڑایا ہے جس کا جواب نہیں۔ غرضیکہ لڈن ماموں نے اردو کے تمام شعراء کے کلام پر ناقدانہ نظر ڈالی ہے کچھ دن ہوتے ہیں لڈن ماموں سے امیرؔ مینائی کے ایک شعر کا مطلب پوچھ رہی تھی مطلب بتاتے بتاتے کہنے لگے کہ یہ شعر امیرؔ مینائی کا نہیں بلکہ نظامؔ رامپوری کا ہے اور اس سلسلے میں انہوں نے ایسی دلیلیں پیش کیں جن سے ان کی بات کو تقویت پہنچتی تھی ایک دن کہنے لگے نظامؔ کے کلام کا سرقہ ہوا ہے میں پرانے لوگوں سے پوچھ تاچھ کر رہا ہوں پھر ثابت کروں گا کہ نظامؔ کا بہت سا کلام امیرؔ مینائی کے کلام میں شامل ہو گیا ہے۔

بہر حال لڈن ماموں کی شاعری اپنی جگہ ٹھوس اور پختہ ہے اور ان کے فطری شاعر ہونے میں کسی کلام کی گنجائش نہیں۔

شاعر کو الہام ہوتا ہے اس بات کی جانچ میں نے لڈن ماموں کی شاعری سے کی ہے۔ جس گھر میں لڈن ماموں رہتے تھے (اب وہ اپنے بھتیجے ماسٹر فدا احمد خاں صاحب کے پاس رہتے ہیں اور اپنا ذاتی مکان فروخت کر دیا ہے) اس کا نقشہ کھینچنا بہت مشکل ہے سوداؔ کے شہر آشوب سے بڑھ کر ہے۔ کچی کھپریل سے ڈھکی ہوئی کوٹھڑی جس میں نہ گرمی کا آرام نہ سردی کا نہ بارش سے حفاظت ہو سکتی ہے بغیر پلاسٹر کی ٹوٹی لگی ہوئی دیواریں۔ ایک چھوٹا سا پلنگ، ایک لوٹا، دو تین مٹی کے گھڑے، دروازہ بغیر زنجیر کا جس کو جب جاتے تار لگا کر بند کر جاتے۔ یہ تھا اُردو کے شاعر شادؔ عارفی کا مکان جس میں وہ شعر کہتا تھا۔

لڈن ماموں روز غزلیں لکھا کرتے تھے نظموں کے روپ میں سماج اور سماج کے زخموں پر نمک چھڑکا کرتے تھے اور اب بھی یہی مشغلہ جاری ہے جیسا میں نے پہلے لکھا لڈن ماموں انتہائی خوددار ناک چڑھے اور ٹھپی قسم کے آدمی ہیں "جو کی روٹی کھا مگر آزاد رہ" ان کی زندگی کا اصول ہے خوشامد کرنا نہیں جانتے۔ صاف دل اور صاف گو ہیں لگی لپٹی کے قائل نہیں۔ خدا اور رسول پر پکا ایمان رکھتے ہیں۔ اس لئے وہ لوگ جو ان کو دور سے دیکھتے ہیں ان کے متعلق مختلف رائیں رکھتے ہیں۔ کوئی کہتا ہے وہ کمیونسٹ ہیں کسی کی رائے ہے دہریہ ہیں۔ مگر میری رائے میں وہ ایک پکے مسلمان ہیں اور شاعر کے علاوہ کچھ نہیں۔ کسی کا احسان لینا گوارا نہیں کرتے۔ رام پور کے اکثر رئیسوں نے ان کی امداد کرنا چاہی مگر لڈن ماموں نے انکار کر دیا۔ وہ کہتے ہیں اگر رئیسوں سے روپیہ لوں گا تو ان کے خلاف پھر نظمیں کیسے لکھوں گا۔ میری شاعری کا مقصد فوت ہو جائے گا۔

لڈن ماموں کی باتوں میں بلا کی کشش ہوتی ہے مختلف موضوعات پر بات چیت کرتے جائیں گے مگر درمیان میں لطیفے اور قصے بھی جاری رکھیں گے۔ لڈن ماموں کبھی اکیلے نہیں رہتے یار دوستوں اور شاگردوں کا مجمع لگا رہتا ہے۔ اگر شعر و شاعری سے فرصت ہے تو شطرنج، چوپسی جاری ہے۔ اس کام سے فرصت ملی تو پتنگ بازی اور کبوتر بازی۔ ان کے پرانے گھر میں بہت سے کبوتر پلے ہوئے تھے۔ کبوتروں، مرغیوں اور کتوں کے بارے میں بہت کافی معلومات رکھتے ہیں۔ ایک دن میں نے پوچھا لڈن ماموں آپ نے اس قدر کبوتر کیوں پال رکھے ہیں کہنے لگے ان کے

دم سے گھر کی تنہائی محسوس نہیں ہوتی ——— زندگی چلتی پھرتی محسوس ہوتی ہے۔

لڈن ماموں زندگی کی معمولی سی معمولی بات اور ہنگامہ میں دلچسپی لیتے ہیں اور اسی سے اپنی شاعری کا مواد تیار کرتے ہیں۔ فرد اور سماج دونوں کو وہ دست کسی کو شاعر کی حیثیت سے نہیں بخشتے۔ جس میں کوئی چار سو بیس قسم کی بات دیکھتے ہیں اس کی شان میں قصیدہ لکھ مارتے ہیں اور بہت تیز کہہ جاتے ہیں۔ دسہرہ، گنگا اشنان، مہترانی، نمائش وغیرہ نظمیں اسی سلسلے کی کڑیاں ہیں۔

لڈن ماموں نے کچھ دن ہوئے ایک غزل لکھی تھی جس کا مطلع تھا ؎

ہیں تو چٹنی سے کھا رہا ہوں شاد

دال ملتی ہے جیل خانہ میں

یہ شعر ان کی زندگی کی ترجمانی کرتا ہے مگر خدا کو رازق ماننے کی وجہ سے دونوں وقت مزے سے کھاتے ہیں۔ کون دیتا ہے کہاں سے آتا ہے؟ وہ جانے جو دونوں جہاں کا رازق ہے اور پتھر کے کیڑے کو بھی رزق پہنچاتا ہے۔

سیّد عبدالحمید عدم

شاد امرتسری

۱۹۴۵ء کی سردیوں کی ایک شام کا ذکر ہے میں نلینگ روڈ پر ایک چھوٹے سے ٹی سٹال میں چائے پی رہا تھا کہ چائے خانہ میں مراتب علی تائب داخل ہوئے کہ ان سے ہر شام وہاں ملاقات ہوتی تھی۔ ان کے ساتھ ایک موٹا تازہ شخص سگرٹ کو انگوٹھے اور دو انگلیوں میں تھامے جھومتا جھامتا اندر گھس آیا۔ گندمی رنگ، کشادہ پیشانی، چوڑا چکلا جسم، توند کچھ بڑھی ہوئی، ڈھیلے ڈھالے کپڑے جیسے از خود اس کے جسم پر لٹک گئے ہوں۔ بوسیدہ کوٹ کے بٹن غائب، پاجامہ نما پتلون ڈھلکی ہوئی جس کو وہ بار بار ہاتھ سے پکڑ کر اونچا کرتا تھا۔ گردن پر جمی ہوئی میل کی تہہ سے معلوم ہوتا تھا کہ یہ شخص کئی دن سے نہیں نہایا۔ چہرہ مسکراتا ہوا اور آنکھوں میں ایک معصومانہ چمک۔ پیشتر اس کے کہ میں کچھ سوچتا کہ آج تائب صاحب اپنے ساتھ کیا شے لے آئے ہیں انہوں نے مجھ سے کہا۔ شاد صاحب! آپ ہیں عدم صاحب یعنی سیّد عبدالحمید عدم، اُردو کے مشہور شاعر۔ میں یہ سن کر بھونچکا سا رہ گیا کہ اس ڈیل ڈول کا شعر سے کیا تعلق ہو سکتا ہے مگر اتنے میں عدم صاحب نے مسکراتے ہوئے ہاتھ بڑھایا "حضور آپ سے مل کر واقعی خوشی ہوئی۔" اتنا کہا اور بیٹھ کر سگرٹ پینے لگے۔ میں نے چائے منگانا چاہی مگر عدم صاحب نے پھر مسکراتے ہوئے کہا "حضور یہ چائے کا وقت نہیں اب تو شام ہو رہی ہے۔" یہ کہا اور پھر نہایت بے تکلفی سے داد طلب انداز میں میری جانب دیکھا۔ تائب صاحب بھی مسکرا رہے تھے۔ کچھ ادھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ چائے ختم ہوئی تو ہم تینوں ٹی سٹال سے نکلے۔ باتیں کرتے کرتے اور چلتے چلتے میکلوڈ روڈ تک پہنچے تو عدم صاحب جھٹ قلعہ گوجر سنگھ کے باہر والی دیسی شراب کی دکان کی طرف لپکے۔ میں اور تائب صاحب بھی ہچکچاتے ہوئے دکان کے اندر داخل ہوئے۔ عدم صاحب بوتل کو ہاتھوں میں تھامے کھڑے تھے اور ان کے چہرے سے کچھ اس قسم کی معصومانہ مسرت ٹپک رہی تھی جو ایک بچے کو اس کی پسند کا کھلونا مل جانے پر ہوتی ہے۔ بوتل کو کاغذ میں لپیٹ بغل میں دبا عدم صاحب بولے۔ "حضور یہیں بیٹھ جائیں؟" میں ان دنوں دیال سنگھ کالج کا طالب علم تھا اور بعض وجوہ کی بنا پر [illegible] ہوسٹل چھوڑ کر [illegible] ایک دوست کے ساتھ رہتا تھا۔ میرے دوست مسٹر حسن کسی دفتر میں ملازم تھے۔ افسر کے بیٹے اور میرے عزیز دوست۔ میں نے دیسی شراب خانے میں بیٹھنا مناسب نہ سمجھا اور کہا "عدم صاحب گھر چلتے ہیں۔" عدم صاحب کو جیسے کسی نے بہشت کی خوشخبری دے دی،

سبحان اللہ کہا اور ہم گھر کی جانب چل پڑے۔

بوتل کھولی گئی۔ اس سے پہلے میں نے دیسی شراب کبھی نہیں پی تھی مگر عدمؔ صاحب نے اس خلوص اور بے تکلفی سے دعوت دی کہ مجھے یوں محسوس ہوا کہ یہ ٹھرا نہیں۔ چند ہی منٹ کے بعد شراب کا اثر ہوا اور عدمؔ صاحب نے از خود اپنا کلام سُنانا شروع کر دیا۔ ایک، دو، تین، چار اور معلوم نہیں کتنی غزلیں سُنا ڈالیں۔ دور چلتا رہا اور شعر ہوتے رہے۔ یہ محفل کافی دیر تک رہی اور آخر عدمؔ صاحب کی یہ حالت ہو گئی کہ مجھے اور ثاقب صاحب کو انہیں پکڑ کر تانگے میں لادنا پڑا۔

عدمؔ صاحب سے بظاہر یہ میری پہلی ملاقات تھی مگر مجھے کچھ یوں محسوس ہوا کہ وہ میرے بہت دیرینہ دوست ہیں اور عرصے بعد ملے ہیں۔

دوسرے روز شام کے قریب میں گھر پہنچا تو عدمؔ صاحب کو موجود پایا۔ میری غیر حاضری میں وہ میرے دوست اور میرے کمرے کے ساتھی مسٹر حسن سے نہ صرف اپنا تعارف کرا چکے تھے بلکہ نہایت بے تکلفی سے محوِ گفتگو تھے اور انہیں اپنی کئی غزلیں بھی سُنا چکے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی عدمؔ صاحب نے اس طرح اٹھ کر میرا استقبال کیا جیسے وہ صاحب خانہ ہوں اور میں ایک مہمان کی حیثیت سے ان کے گھر آیا ہوں ——

ٹھرے کی ایک بوتل میز پر کھلی پڑی تھی اور اس کی بُو سے سارا کمرہ مہک رہا تھا۔ میرے دوست مسٹر حسن (جو اب بھی میرے ہمسایے ہیں) شراب بالکل نہیں پیتے مگر پینے والوں کو نہ صرف برداشت کرتے ہیں بلکہ ان کے لئے ساز و سامان فراہم کرنا سعادت تصور کرتے ہیں۔ چنانچہ ایک پلیٹ میں کچھ کباب بھی پڑے ہوئے تھے۔ ان دنوں ہمارے اس کمرے میں جس کا نام ہم نے پاکستان لاج رکھا ہوا تھا، شام کو روزانہ محفل آراستہ ہوتی تھی۔ مختلف قسم کے احباب جمع ہو جاتے تھے۔ ظہیر کاشمیری، سیف الدین سیف، ثاقب علی ثاقب، لطیف انور اور ہمارے ایک کرم فرما مسٹر خلیل شام ہوتے ہی چلے آتے۔ خوش گپیاں ہوتیں۔ خلیل صاحب لطیفہ بازی اور بذلہ سنجی سے ہمیں نوازتے۔ سیف صاحب کلام سناتے، ان سے بحثیں ہوتیں۔ ظہیر کاشمیری سے کمیونزم پر گرما گرم گفتگو ہوتی۔ علم و ادب کی باتیں ہوتیں اور گاہے گاہے شراب کا دور بھی چلتا۔ میرے دوست مسٹر حسن تاش کے بہت شوقین ہیں۔ ان کے بھی کچھ دوست احباب آجاتے۔ وہ الگ تاش میں مصروف رہتے اور ہم اپنے کام میں مگن گویا یہ کمرہ صحیح معنوں میں سعدیؔ کے اس شعر کی تفسیر تھا ؎

بہشت آں جا کہ آزارے نباشد
کسے را با کسے کارے نباشد

عدمؔ صاحب کے آنے سے اس روز کی محفل میں ایک نمایاں فرق یہ پڑا کہ شراب روز آنے لگی اور اکثر اوقات عدمؔ صاحب اپنے ساتھ ہی بوتل لے آتے۔ وہ باقاعدہ شام ہوتے ہی دفتر سے سیدھے میرے ہاں چلے آتے۔ دوسرے احباب بھی جمع ہو جاتے۔ عدمؔ صاحب شراب کے ساتھ ساتھ بیسیوں غزلیں بھی سناتے جاتے۔ ہمیں غزلوں سے اور خود کو شراب سے بے ہوش کرتے۔ عدمؔ صاحب کا حافظہ بہت تیز ہے اور انہیں اپنی سینکڑوں غزلیں یاد رہتی ہیں اور خاص طور پر شراب پینے کے بعد تو انہیں تمام بھولے ہوئے شعر بھی یاد آجاتے ہیں۔

عدمؔ صاحب کے سلسلے میں یہ کہنا بالکل بے جا نہ ہوگا کہ شراب کے بغیر ان کی شخصیت بالکل بے معنی ہے۔ اس کے بغیر وہ مجسّم اور بت بر رو دکھائی دیتے ہیں۔ ان کی گفتگو بے جان، بے معنی اور عامیانہ ہوتی ہے یہاں تک کہ وہ کسی بھی حسین شے سے ایسی حالت میں متاثر نہیں ہوتے۔ ان کا ایک شعر اس سلسلے میں سُنیے ؎

شراب پی کے مجھے آنکھ کھول لینے دے
ابھی چھلکتے ہوئے رُخ کو بے نقاب نہ کر

یوں بھی عدمؔ صاحب کا علم و ادب کا مطالعہ بہت محدود ہے۔ وہ کسی ادبی یا فنی نظریے یا کسی مکتبِ خیال کے اصولوں سے پوری طرح

بہت سا نہیں ہیں اور یہ اس لئے نہیں کہ انہوں نے کسی نظریے یا کسی مکتبِ فکر کے اصولوں کے مطالعہ نہیں کیا اور نہ اس لئے کہ وہ خود کو بہت عالم سمجھتے ہیں بلکہ اس لئے کہ ان کا مزاج ہی کچھ اس قسم کا لا اُبالی واقع ہوا ہے کہ وہ کسی سنجیدہ قسم کے ادب یا نظریے کا مطالعہ کر ہی نہیں سکتے۔ اس کی ایک وجہ غالباً یہ بھی ہے کہ شروع سے ہی انہوں نے سائنس کی تعلیم پائی۔ حساب کے مضمون سے بہت دلچسپی رہی۔ بی۔ اے کے بعد ملٹری اکاؤنٹس میں کلرک ہو گئے اور ایس۔ اے۔ ایس کے امتحان میں (سبارڈی نیٹ اکاؤنٹس سروس جو بک کیپنگ اور اکاؤنٹنسی کا امتحان ہوتا ہے) دو بار فیل ہونے کے بعد تیسری بار پاس ہوئے اور پھر اس طرح سے دفتری کام میں محو ہوئے کہ انہیں ادبیات کا مطالعہ کرنے کا موقع ہی نہیں ملا۔

عدمؔ صاحب کی شخصیت کا سب سے نمایاں پہلو ان کی سادگی اور معصومیت ہے۔ معصومیت کا لفظ میں روایتی طور پر استعمال نہیں کر رہا بلکہ اگر اجازت ہو تو میں یہ کہوں گا کہ عدمؔ صاحب کی شخصیت میں محض معصومیت کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ زندگی کا ہر پہلو چاہے وہ نجی ہو دفتری ہو یا ان کے فن سے متعلق ہو ان کی شخصیت کی اس خصوصیت سے بہرحال اثر پذیر ہوتا ہے۔ ان کی طبعی سادگی اس حد تک ان کی زندگی میں رچ گئی ہے کہ بعض اوقات یہی معصومیت اور سادگی ان کے دوستوں کے لئے تکلیف دہ ثابت ہوتی ہے۔ بظاہر یہ بات بہت عجیب معلوم ہوتی ہے مگر میں چاہتا ہوں کہ اس کی وضاحت کر دوں تاکہ ان کی سادگی اور معصومیت کا تکلیف دہ ہونا آپ پر بھی ثابت ہو سکے۔

۱۹۴۷ء کے شروع میں جب لاہور میں فسادات شروع ہو چکے تھے لاہور میں روزانہ شام کے وقت کرفیو نافذ ہو جایا کرتا تھا۔ ان دنوں ہماری شام کی محفلوں میں احباب کی کمی کا شدید احساس ہوتا تھا مگر عدمؔ صاحب قریب قریب بلاناغہ آتے تھے اور چونکہ کرفیو آٹھ ساڑھے آٹھ بجے نافذ ہو جاتا تھا اس لئے بعض اوقات گھر واپس جانے کی بجائے میرے گھر ہی سو جایا کرتے تھے۔ انہی دنوں عدمؔ صاحب دو تین روز کیلئے اچانک غائب ہو گئے۔ مجھے تشویش ہوئی۔ آخر چوتھے روز آئے اور کہنے لگے: "حضور، ایک چھوٹا سا مقدمہ بن گیا ہے۔" میں حیران ہوا کہ معاملہ کیا ہے۔ کہنے لگے "میں اسی لئے تین چار دنوں سے نہیں آیا۔ حضور بات یہ ہے کہ میرے پاس اس دن ایک بوتل رم کی اور چھ بوتلیں بیئر کی تھیں۔ میانمیر سے کوئی تانگے والا لاہور آنے کے لئے تیار ہی نہ ہوتا تھا۔ سب کہتے تھے کہ کرفیو کا وقت ہونے والا ہے۔ آخر ایک تانگے والے کو میں نے آمادہ کر ہی لیا۔ رم کی بوتل اور بیئر ساتھ تھی۔ راستے ہی میں کرفیو کا وقت ہو گیا۔ پولیس نے تانگے والے کا چالان کر دیا۔ بوتلوں پر قبضہ کر لیا اور مجھے کوتوالی میں لے گئے۔ سپرنٹنڈنٹ پولیس کے استفسار پر میں نے بتایا کہ یہ شراب میں اپنے اور اپنے ایک دوست شادؔ امرتسری کے لئے لے جا رہا تھا۔ حضور آج تاریخ ہے اور آج آپ کو میرے ساتھ کوتوالی جانا پڑے گا تاکہ معاملہ ختم ہو اور شراب واپس مل جائے ورنہ حضور شراب مفت میں حرام ہو جائے گی۔" چنانچہ میں کئی دن ان کے ساتھ اس مصیبت میں مبتلا رہا اور خدا خدا کر کے قصہ پاک ہوا۔

اسی قسم کے بیسیوں واقعات ہوں گے جہاں ان کی سادگی اور معصومیت نے کسی نہ کسی مصیبت سے دوچار کیا۔

عدمؔ صاحب کا مزاج بالکل بچوں کا سا ہے۔ وہ بچوں کی طرح ضد بھی کرتے ہیں مگر جھٹ مان بھی جاتے ہیں۔ انہیں جھوٹ بولنا آتا ہی نہیں۔ یہ میں بالکل مبالغہ نہیں کر رہا۔ وہ اگر کبھی کبھار جھوٹ بولنے کی کوشش بھی کریں تو ان کے چہرے سے اس طرح عیاں ہو جاتا ہے جس طرح ایک ڈرپوک بچے کا جھوٹ بولتے وقت چہرے کے بدلتے ہوئے رنگ پر قابو نہیں رہتا۔ میں اکثر سوچتا ہوں کہ شاید انہی فطری اخلاقی خوبیوں کی وجہ سے ان کے شعروں میں صداقتِ احساس اور خلوصِ اظہار ہوتا ہے ورنہ ان کی زندگی کا تجرباتی میدان بہت محدود ہے۔ وہ زندگی میں فقط تین کام کرتے ہیں۔ دفتر جاتے ہیں، شعر کہتے ہیں اور شراب پیتے ہیں۔ یہی ان کی زندگی اور کل کائنات ہے۔ زندگی کے بے شمار متنوع پہلوؤں کا مطالعہ کرنا ان کے بس کا روگ نہیں۔ وہ ریاکاری، سیاست بازی اور گروہ بندی سے اس طرح ناآشنا ہیں جس طرح آج کا کوئی انسان نہیں ہوتا۔ وہ غریب کہا کرتے ہیں "ہم سے نہیں سکتے"۔ یہی وجہ ہے کہ وہ کسی خاص مکتبِ خیال کے مقلد نہیں۔ ان کی آزادیٔ طبع اور آزادیٔ فکر کسی ضابطے کی متحمل نہیں اور شاید کبھی ہو بھی نہیں سکتی۔ اس آزادی بلکہ آزادہ روی کی وجہ ان کا طبعی لا اُبالی پن ہے۔ میں نے اکثر غور کرنے کی

کوشش کی کہ انہوں نے شراب نوشی کو اس طرح اپنے آپ پر سوار کیوں کر رکھا ہے مگر کوئی خاص وجہ سمجھ میں نہیں آئی۔ سوائے اس کے کہ یہ بھی زندگی کے ساتھ ان کے غیر سنجیدہ سلوک کی آئینہ دار ہے۔ وہ کسی مسئلے پر بھی سنجیدگی سے غور نہیں کرتے۔ ایک عجیب قسم کی بے راہ روی اور لاابالی پن ہر وقت ان کو اپنے دام میں پھنسائے رکھتا ہے۔ یہ بے راہ روی اور لاابالی پن اس طرح مستقل صورت اختیار کر چکا ہے کہ عدم صاحب اس کے اثر سے محفوظ ہی نہیں رہ سکتے۔ مجھے کئی بار خیال آیا کہ عدم صاحب نے کہیں یہ ایک مصنوعی لبادہ تو نہیں اوڑھ رکھا یعنی کیا یہ بے راہ روی ان کی زندگی اور ان کے فن کا نمائشی پہلو تو نہیں مگر ہر بار مجھ پر یہ عیاں ہوا کہ ایسی بات نہیں۔ یہ لاابالی پن اور ایک فنکارانہ وارفتگی ان کی شخصیت کا ایک فطری جزو ہے۔ یہ محض سونا ہے اس پر سہاگہ نہیں۔ یہ کوئی ملمع نہیں بلکہ اصل ہے۔ مجھ پر یہ حقیقت کچھ اور بھی واضح ہوئی جب میں نے ان کے تصورِ عشق پر غور کیا۔ غور کرنے پر مجھے حیرت ہوئی کہ انہوں نے زندگی میں کبھی عشق نہیں کیا۔ عشق سے میری مراد بالکل وہی مجنوں اور فرہاد کا عشق نہیں بلکہ زندگی کا وہ ایک اور فقط ایک یادگار جذباتی واقعہ ہے جو اکثر اوقات فن اور جذبات و احساسات میں ایک دائمی گداز پیدا کرتا ہے۔ کسی سے شدید قسم کا عشق نہ کرنے کا سبب ان کی وہی فطری بے راہ روی اور طبعی لاابالی پن ہے۔ عدم صاحب نے کسی سے بھی عشق نہیں کیا مگر پھر بھی وہ ہر حسین چیز کے عاشق ضرور ہیں اور یہ احساس اکثر اوقات ہنگامی ہوتا ہے۔ یہ حسن پرستی اگرچہ ایک معمولی قسم کے حساس انسان کی حسن پرستی نہیں تاہم اس حسن پرستی میں وہ تڑپ اور وہ دائمی گداز بھی نہیں جو زندگی میں صحیح عشق کرنے سے پیدا ہوتا ہے اور جس سے ایک گہرا غم، ایک دردمندی اور ایک ابدی دل سوزی پیدا ہوتی ہے جس کی دھیمی دھیمی آنچ میں گوہرِ مراد آبدار ہوتا ہے۔ مگر اس دردمندی اور کیفیتِ غم کی غیر موجودگی نے عدم صاحب کو زیادہ نقصان نہیں پہنچایا۔ انہوں نے اپنے آپ کو آتشِ سیال کی بھٹی میں ڈال کر کندن بنانے کی کوشش کی ہے جس میں وہ بڑی حد تک کامیاب ہوئے ہیں۔

عدم صاحب کی وارفتگی بھی منفرد نوعیت کی حامل ہے۔ منفرد میں نے اس لئے کہا ہے کہ بعض اوقات ان کی وارفتگی نے عجیب عجیب گل کھلائے ہیں۔ ۱۹۴۷ء ہی کا ذکر ہے۔ ان دنوں لاہور میں فسادات بہت ہی خطرناک صورت اختیار کر چکے تھے۔ ایک رات ظہیر کاشمیری اور عدم صاحب میرے گھر ہی سو رہے۔ قریب قریب صبح ہونے والی ہوگی کہ کمرے میں شور ہوا۔ میں ہڑبڑا کر اٹھا تو کمرے میں بتی جل رہی تھی اور کمرہ دھوئیں سے بھرا ہوا تھا۔ ظہیر کاشمیری مجھے چیخ چیخ کر پکار رہا تھا۔ معلوم ہوا کہ عدم صاحب کا تکیہ بالکل جل چکا ہے۔ بستر کی چادر جل رہی ہے، یہاں تک کہ عدم صاحب کے سر کے بال بھی جل رہے ہیں مگر انہیں قطعاً ہوش نہیں۔ آخر بصد مشکل میں نے اور ظہیر کاشمیری نے عدم صاحب کو جگایا۔ تکیے کو صحن کے دستی پمپ کے پانی سے بجھایا۔ عدم صاحب کو یہ معلوم کر کے بہت زیادہ حیرت نہ ہوئی کہ ان کی گردن جل رہی تھی۔ کہنے لگے "حضور ایسا تو کئی بار ہوا ہے۔" یہ کہا اور ایک سگرٹ جلا لیا۔ خیر کچھ دیر بعد سب کے سب پھر سو گئے۔ ابھی بمشکل آدھ گھنٹہ بھی نہ ہوا ہوگا کہ ظہیر کاشمیری کی آواز پھر گونجی۔ پھر اٹھے تو دیکھا کہ عدم صاحب کی قمیض جل رہی ہے مگر وہ بالکل بے سدھ پڑے ہیں۔ پانی کا گلاس ان کی قمیض پر ڈالا گیا مگر انہیں ہوش نہ آیا۔ صبح ہو چکی تھی۔ ظہیر کاشمیری نے کہا کہ اگر میں رات کو نہ جاگتا تو صبح اخبار میں خبر چھپ جاتی کہ سکھوں نے تین شاعروں کو جلا ڈالا۔ اسی قسم کا ایک اور واقعہ ہے۔ انہی دنوں کا ذکر ہے۔ ایک شام عدم صاحب تشریف لائے۔ ان کے ساتھ الطاف مشہدی بھی تھے۔ دور چلا۔ شراب ختم ہوئی تو الطاف مشہدی کے کہنے پر عدم صاحب ان کے ساتھ تلاشِ شراب میں نکل کھڑے ہوئے۔ ان کے جانے کے بعد کچھ دیر تک تو میں نے انتظار کیا پھر میں سو رہا۔ صبح سویرے اٹھا تو کیا دیکھتا ہوں کہ عدم صاحب نشے میں دھت چلے آرہے ہیں۔ منہ سوجا ہوا، گالوں پر نیلے نیلے داغ، پتلون پھٹی ہوئی۔ میں نے پوچھا حضرت کیا معاملہ ہے؟ الطاف کہاں چلا گیا؟ لیکن چونکہ نشہ بہت تھا کوئی معقول جواب نہ دیا اور لیٹ گئے۔ میں نے ان دنوں سیکرٹریٹ میں عارضی طور پر ملازمت کر لی تھی۔ میں دفتر جانے کی تیاری کر چکا تو تابش صاحب آ گئے۔ اتنے میں عدم صاحب جاگے اور زور زور سے رونا شروع کر دیا "حضور میں مر گیا۔ حضور میں وفات پا جاؤں گا۔" تابش صاحب اور میں نے دیکھا تو معلوم ہوا کہ حضرت کو بہت سی چوٹیں آئی ہیں۔ خیر بڑی مشکل سے گھر پہنچایا گیا۔ چند دن بستر پر رہے۔ کوئی دوا وغیرہ استعمال کرنے کی بجائے پانچ روز مسلسل صبح و شام ٹھرا پیا اور ٹھیک ہونے پر بتایا کہ حضور اس رات الطاف مشہدی کے ساتھ انار کلی میں ایک سکھ کے ہوٹل میں

شراب کی جستجو میں جا پہنچے۔ تھوڑی سی مل گئی۔ سکھوں سے کسی بات پر تو تو میں میں ہو گئی تو میں نے ہوٹل کی بالکنی سے جان بچانے کی غرض سے چھلانگ لگا دی۔ پتہ ہی نہیں چلا کہ میں نے کیوں اور کب چھلانگ لگائی۔

وارفتگی کے سلسلے میں یاد آیا کہ عدم صاحب اکثر بچوں کی طرح پیسے گم کر دیتے ہیں۔ کئی بار ایسا ہوا کہ کچھ خریدنے کے لئے جیب میں سے روپے نکالے اور کہیں نوٹ گر گیا ہے۔ اسی وارفتگی کے سبب وہ کئی کئی روز تک نہیں نہاتے اور پھر لطف یہ کہ انہیں اس کا احساس بھی نہیں ہوتا۔ سردیوں میں خاص طور پر وہ ایک ایک قمیص کئی کئی دن پہنے رکھتے ہیں۔ ان کے کوٹ اور پتلون کی تہہ اکثر خراب ہوتی ہے۔ کپڑے اکثر ان کے جسم پر لٹکے ہوئے معلوم ہوتے ہیں بعض اوقات وہ کئی کئی دن تک منہ بھی نہیں دھوتے۔ صبح اٹھے، کلی کی اور دفتر چلے گئے۔ جب تک جیب میں پیسے ہوں گھر کا رخ نہیں کرتے۔ کئی بار ایسا ہوا کہ ہفتہ ہفتہ بھر باہر پڑے رہے۔ بڑا لڑکا خالد بار بار آیا اور ہر بار انہوں نے کہا بیٹا میں آج ضرور آؤں گا۔ ایک دفعہ انہوں نے خود ایک واقعہ سنایا۔ مہینے کی پہلی تاریخ تھی۔ کوئی پانچ سو روپیہ تنخواہ لے کر شام کو اختر شیرانی سے ملے اور ایک ہی شام میں پانچ سو روپے شراب اور عورت کی نذر ہو گئے۔ صبح گھر گئے تو بیوی نے تنخواہ مانگی۔ کہنے لگے کہ کسی جیب کترے نے کمال صفائی سے جیب کاٹ لی ہے۔ ایک پیسہ بھی نہیں چھوڑا۔ بیوی جان گئی کہ جھوٹ ہے۔ لڑائی ہوئی اور بصد مشکل اسے منایا۔ اسی طرح ان کی بے راہ روی اور وارفتگی کے سینکڑوں واقعات ہیں۔ اسی وارفتگی نے ان کے کردار میں کئی خوبیاں بھی پیدا کی ہیں۔ اسی مستی اور رندی نے ان کو معصوم بنایا ہے۔ شراب کی ایک بری عادت میں ذاتی طور پر تو اسے برا بھی نہیں سمجھتا اس نے ان کی تمام انسانی برائیوں کو ختم کر دیا ہے اور انہیں خلوص کا پیکر بنا دیا ہے۔ وہ دوستوں سے خلوص سے ملتے ہیں۔ دوستوں کی خاطر جو کچھ بھی کر سکتے ہیں کرتے ہیں۔ دل آزاری کا ڈھنگ ہی انہیں نہیں آتا۔ کسی کو دکھ دینا ان کی سرشت ہی میں نہیں۔ وہ صحیح معنوں میں صاف گو اور صاف دل ہیں۔ ان کا ظاہر باطن ایک ہے۔ کسی سے کوئی بغض یا عناد رکھنا ان کی فطرت میں داخل ہی نہیں، ہر بات منہ پر کہتے ہیں اور خلوص سے کہتے ہیں۔ دل میں کبھی میل نہیں رکھتے اور دل میں میل رکھنے والوں سے ملتے بھی نہیں۔ شراب نے ان کو واقعی انسان بنا دیا ہے۔ ان کے کردار کی انہی خوبیوں نے ان کے فن میں بھی خلوص، صداقت اور سچائی کے عناصر پیدا کئے ہیں۔ ان کا مشاہدہ اور تجربہ خواہ وہ زندگی کے کسی بھی شعبے سے متعلق ہو نہایت سادہ، صحت مند اور صحیح ہوتا ہے۔ تجربے اور مشاہدے کی یہ سادگی اور صحت شعور و لاشعور کے مختلف مرحلوں سے گزرنے کے بعد بھی برقرار رہتی ہے اور جب وہ ان تجربات و مشاہدات کو شعری صورت دیتے ہیں تو وہ تمام سادگی، صحت اور خلوص شعر کے لازمی جزو بن جاتے ہیں اور اس طرح شعر کو صداقت پر مبنی اور ہمہ گیر بنا دیتے ہیں۔ ان کا فن نکھرا نکھرا ہے۔ ہلکے پھلکے مضامین ہیں جن میں کوئی الجھن نہیں جو ہلکے ہلکے اشارے اور کنایے مفہوم کو لطیف بناتے ہیں۔ ان کی شاعری کا حسن کاریگری اور شعوری کاوش کی بجائے سادگی بیان، بے تکلفی اور بے ساختگی کے باعث ہے۔ کسی خاص نظریاتی فکر کا فقدان ان کے ذہن کو محدود دائروں میں گھومنے سے باز رکھتا ہے۔ وہ زندگی کو جیسے دیکھتے ہیں اسی طرح اس کا اظہار کرتے ہیں۔ ان کے اشعار ہلکے پھلکے تصنع اور بناوٹ سے پاک ہوتے ہیں۔ رندی اس کے اثرات اور اس کے ردعمل کے متعلق انہوں نے متنوع قسم کے شعر کہے ہیں جن میں روایتی رنگ کی بجائے ایک انفرادی رنگ کی جھلک موجود ہے۔

رندی کے متعلق چند شعر سنئے ؎

پیتا ہوں حادثات کے عرفان کے لئے ——— مے ایک تجزیہ ہے غم روزگار کا

زمانے کی رفتار سے تنگ آ کر ——— عدم کر لیا مے کدے میں بسیرا

مے سی حسین چیز ہو اور واقعی حرام ——— میں کثرت شکوک سے گھبرا کے پی گیا

سو بار لغزشوں کی قسم کھا کے چھوڑ دی ——— سو بار چھوڑنے کی قسم کھا کے پی گیا

بادہ کشی حرام ہے یا زندگی حرام ——— تصدیق کر رہا ہوں غم روزگار سے

عدم کی شاعری شراب، حسن اور عشق کی شاعری ہے۔ اس میں اگرچہ کوئی سنجیدہ اور واضح فلسفہ یا انداز فکر نہیں مگر اس کے باوجود ان کی تمام شاعری میں

ایک نیم فلسفیانہ ہلکی پھلکی لہر رواں دواں ہے جس میں کبھی کبھار موجیں بھی اٹھتی ہیں۔ ان کے ہاں تصوف کی ہلکی سی چاشنی بھی ملتی ہے۔ تصوف کا باقاعدہ بیان تو نہیں مگر ہلکے ہلکے اشارے موجود ہیں۔ چند شعر سنئے ؎

چھپے ہو حجابات دیر و حرم میں   مگر بے تکلف نظر آ رہے ہو
بہار و خزاں کم نگاہوں کے وہم   بُرے یا بھلے سب زمانے تِرے
ضمیرِ صدف میں کِرن کا مقام   انوکھے انوکھے ٹھکانے ترے
جب بھی ہوتے ہیں ہم عدم تنہا   یار سے ہم کنار ہوتے ہیں
خبر نہیں یہ روایت ہے یا حقیقت ہے   سنا تو ہے وہ رگِ جاں کے پاس رہتے ہیں
ایک ہی بار تری شکل کا عرفان تھا محال   دوسری بار کوئی آئینہ حیراں نہ ہوا

آج کے شاعروں نے جہاں کئی شعری لوازم کو نظر انداز کر دیا ہے وہاں نغمگی کو بھی کہ شعر کی بنیادی خصوصیت ہے قابلِ توجہ نہیں سمجھا۔ عدم کے ہاں نغمگی اور روانی مستقل طور پر موجود ہے۔ ان کی شاعری میں ایک مترنم فضا رچی ہوئی ہے۔ حسین گاتے ہوئے الفاظ اور دلکش ترکیبیں ہی ان کی شاعری کا تار و پود ہیں۔ اشعار میں کہیں کہیں شوخی اور شرارت کے عناصر بھی ملتے ہیں مثلاً ؎

بے خودی میں مرا آغوش ہے مجھ سے آگے   شرم مت کیجئے میں شاملِ آغوش نہیں
تخلیقِ کائنات کے دلچسپ جرم پر   ہنستا تو ہوگا حضرتِ یزداں کبھی کبھی

عدم صاحب میں ایک بہت بڑی خامی یہ ہے کہ وہ شعر بہت کثرت سے کہتے ہیں اور انہیں اس بات کا دھیان نہیں رہتا کہ کون سا شعر اس قابل ہے کہ رکھا جائے اور کون سا تلف کر دیا جائے۔ یوں تو ہر شاعر کو اپنا ہر شعر عزیز ہوتا ہے مگر اس کے باوجود شعراء میں اکثر اس قدر تنقیدی شعور ضرور ہوتا ہے کہ وہ کون سے اشعار کو رکھیں اور کن کو تلف کر دیں۔ اُردو کے سب سے بڑے شاعر غالب کے اسی تنقیدی شعور نے غالب کو عظیم اور لافانی بنایا ہے۔

عدم صاحب شعر بہت کثرت سے کہتے ہیں اور بعض اوقات رطب و یابس کو بھی چھپانے سے گریز نہیں کرتے۔ عدم صاحب کی زود گوئی اور کثرت گوئی سے مجھے ایک واقعہ یاد آگیا۔ ۱۹۴۲ء ہی کی بات ہے۔ ایک رات وہ زیادہ نشے میں تھے اس لئے میرے گھر ہی سو رہے۔ قریب قریب آدھی رات کا وقت ہوگا کہ دیکھتی میری آنکھ کھلی دیکھا کہ بتی جل رہی ہے۔ عدم صاحب چارپائی پر بیٹھے ہیں۔ ایک ہاتھ میں سگرٹ دوسرے میں پنسل لئے کچھ سوچ رہے ہیں۔ نوٹ بک سامنے تکیے پر پڑی ہے۔ میں بے خبر سو گیا۔ صبح میں نے پوچھا مولانا رات کیا بات تھی۔ کہنے لگے حضور یونہی نیند کھل گئی خیال آیا کہ کچھ شعر ہی کہہ ڈالوں مگر فقط سات غزلیں کہہ کر ہی نیند آگئی۔ اب جو شاعر گھنٹے دو گھنٹے میں سات غزلیں کہہ ڈالے اندازہ کیجئے کہ وہ کس کثرت سے شعر کہتا ہوگا۔ کثرت سے شعر کہنا بُرا نہیں مگر ان سب اشعار کو من و عن رکھ لینا یقیناً بُرا ہے۔ وہ جو کچھ کہہ دیں اس میں کانٹ چھانٹ کی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔ شعر اچھا ہوا بُرا ہوا بس ہو گیا۔ اب اس میں مزید غور و فکر کرنا ان کا اصول ہی نہیں۔ اسی وجہ سے بعض اوقات غزلوں میں بہت ہلکے شعر بھی ملتے ہیں جنہیں پڑھ کر افسوس ہوتا ہے کہ کاش یہ شعر غزل میں نہ ہوتے۔ مجھے یاد ہے میں نے کئی بار کہا کہ فلاں غزل میں سے فلاں فلاں شعر نکال دیجئے۔ انہوں نے وعدہ کیا کہ ہاں ضرور حذف کر دوں گا۔ مگر جب غزل چھپی تو وہ اشعار موجود تھے۔ اصل بات یہ ہے کہ انہوں نے آج تک جتنے شعر کہے ہیں وہ انہیں قریب قریب سب کے سب زبانی یاد ہیں۔ میں نے پہلے بھی کہا تھا کہ حافظہ ان کا بلا کا ہے۔ اشعار کہنے کے بعد ان کو یاد ہو جاتے ہیں اس لئے بعد میں اگر وہ چاہیں بھی تو ان اشعار کو حذف نہیں کر سکتے۔ حافظے سے متعلق ایک واقعہ یاد آیا۔ اتوار کا دن تھا، مجھے دفتر سے چھٹی تھی۔ عدم صاحب صبح ہی تشریف لے آئے۔ تھوڑی دیر بعد سبط صاحب بھی آگئے۔ عدم صاحب کہنے لگے: حضور آج پیسوں کی کمی

بندوبست ہوتا نظر نہیں آتا۔ میرا خیال ہے آج ایک مجموعہ ترتیب دے ڈالوں اور چوہدری نذیر کو دے کر پیسے حاصل کروں۔" میں نے کہا وہ کیسے؟ کہنے لگے: "حضور مجھے اپنے کوئی دو سو قطعات یاد ہیں ان کو نقل کرنے کی ضرورت ہے۔" چنانچہ کاغذ قلم لے کر بیٹھ گئے اور دوپہر کے کھانے کے دو گھنٹے بعد تک پورے دو سو قطعات حافظے سے نکال کر کاغذوں پر بکھیرے۔ مجموعے کا نام "ہوائے برشگال" رکھا۔ شام ہوئی تو کہنے لگے "چلیے حضور چوہدری نذیر کے پاس چلتے ہیں تاکہ آج کی شام کا بندوبست ہو۔"

آخر میں میں یہ عرض کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ عدم صاحب میرے دوست ہیں۔ میں نے ان کی شخصیت اور ان کے فن کو پرکھنے کی مخلصانہ کوشش کی ہے۔ روایتی انداز اختیار نہیں کیا۔ ہو سکتا ہے پیشہ ور نقاد حضرات کو میری کئی باتوں سے اختلاف ہو۔ میں سمجھتا ہوں انہیں مجھ سے اختلاف کرنے کا حق حاصل ہے۔ میں نے عدم کو جس طرح دیکھا ہے، جس طرح ان کی زندگی اور ان کی شاعری کا مطالعہ کیا ہے اس کی ایک سیدھی سادی تصویر آپ کے سامنے رکھ دی ہے۔ اگر اس تصویر میں عدم صاحب کے کچھ خد و خال آپ کو نظر آئیں تو میں سمجھوں گا کہ میں نے یہ چند سطریں بے مصرف نہیں لکھیں۔

جذبی

انور عظیم

"کیا جھک مار رہے ہو؟"

"جذبی کے متعلق اپنے تاثرات قلم بند کر رہا ہوں۔"

"اف! جذبی کے متعلق! اتنے UNINSPIRING آدمی کے متعلق؟ حد ہوگئی!"

واقعی حد ہوگئی۔ ذرا اس شاعر پر ایک نظر ڈالئے۔ اس کی شخصیت میں کوئی ایسی بات نہیں جو اپنی پہلی جھلک میں لوگوں پر اپنا جادو چلانے میں کامیاب ہو جائے۔ اس کی شکل و صورت، اس کا قد، اس کی آنکھیں، اس کی باتوں کا انداز کہیں کوئی چہک دار کوئی خیرہ کن جلوہ نظر نہیں آتا۔ اگر اس کی پوری شخصیت میں کوئی چیز چمک دار یا جولاں نظر آتی ہے تو وہ اس کا سر کا صفا چٹ میدان ہے۔ اس چٹیل چمکدار سر کے کنارے دونوں طرف ہلکے ہلکے بال اُگے ہوئے ہیں جو وسط میدان میں دونوں طرف سے آکر مل گئے ہیں۔ اور انہوں نے اس چمکدار سطح مرتفع کا احاطہ سا کر لیا ہے۔ یہ سر جتنا بڑا، جتنا چمکدار ہے، آنکھیں اتنی ہی چھوٹی، گہری اور چمک سے محروم ہیں۔ جذبی کو پہلی نظر میں دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ ایک ایسے آدمی کے سامنے کھڑے ہیں جس میں مسکرانے اور ہنسنے کی صلاحیت بالکل مفقود ہے۔ گھنی بھوؤں نے اس شاعر کی شخصیت میں ایک تکلیف دہ پیچیدگی سی پیدا کر دی ہے۔ لیکن تھوڑی دیر آپ ان سے باتیں کریں، گھل مل جائیں۔ پھر دیکھئے اس کے چہرے کی گھٹن اور افسردگی سے مسکراہٹ کا ایک کوندا کس طرح لپکتا ہے اور سب کچھ جھلملا کر رکھ دیتا ہے۔ لیکن وہاں بھی مایوسی ہوگی۔ اتنے بڑے بڑے اور شفاف دانت مسکراہٹ کی معصومیت اور جذبات کی بالیدگی پر بڑا بار گزرتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ جذبی کبھی بھی چیچک کا شکار نہیں ہوئے۔ لیکن ان سے پہلی بار ملنے یا ان کو پہلی بار دیکھنے کے بعد مجھے اس شخص پر بڑا رحم آیا تھا۔ میں نے ہمدردی کے جذبات کے ساتھ سوچا تھا بے چارا اس حملے سے کس طرح بچا ہوگا۔ اگر میرا یہ خیال غلط ہے تو پھر میرا یہ قیاس صحیح ہوگا کہ بچپن میں جذبی کسی اناڑی اور ظالم جرّاح کا تختۂ مشق بن گئے ہوں گے۔ اور جرّاح نے اپنا سارا حوصلہ اسی ایک تختۂ مشق پر نکال لیا ہوگا۔

واقعی جذبی میں اتنی گھٹن، اتنی تلخی، اتنی کلبیت (جو ان کے فن پر پورے طور پر محیط ہونے میں ناکام رہی ہے) کیوں ہے۔ کیا ایک انسان جبلّی طور پر ایسا ہوتا ہے، یا سماجی حالات اور زندگی کے تجربے اس کے مزاج اور اس کی مجموعی شخصیت کی تربیت اور ترتیب کرتے ہیں، کیا جذبی محض گھٹا ہوا تلخیوں کے زہر سے بھرا ہوا، کلبیت کے اندھیرے میں بھٹکتا ہوا، ایک افسردہ دل اور انجمن کو افسردہ کرنے والا انسان ہے؟ کیا اس خاکستر کے ڈھیر کے اندر چنگاریاں دبی ہوئی نہیں ہیں؟ کیا اس کی شخصیت میں اس کی داخلی دنیا کی جذبات کی، اس کے شعور اور تجربے کی آئینہ دار، اس کی شاعری میں ان چنگاریوں کے تجسّس

اُبھرتے ہوئے نظر نہیں آتے، اس کی شاعری کو اس کی شخصیت سے الگ کر کے کیوں دیکھا جاتا ہے۔ اس کی شاعری کی پوری ترتیب و تحلیل میں اس کی اپنی شخصیت کا کتنا درد، کتنی اداسی، کتنی حوصلہ پروری، مایوسیوں کی کتنی پکار اور ان مایوسیوں پر یلغار ہونے والی کتنی نت نئی تمنائیں اسیر ہیں۔ شاید بہت کم لوگ جانتے ہیں (یا جاننا چاہتے ہیں)۔

شاعر کی زندگی شعر سے نہیں شروع ہوتی۔ شاعر کی زندگی کے تلخ و تند، لطیف و خوشگوار تجربوں کا جذباتی رچاؤ جب فنی آہنگ میں ڈھلتا ہے۔ اور الفاظ کی موسیقی میں تجسیم پاتا ہے تو اس میں شاعر کی انفرادی زندگی کے ساتھ ساتھ دور کے اجتماعی تجربوں کی بنیادی سچائیاں بھی شامل ہوتی ہیں۔ ان سچائیوں کے گُل بوٹے ہماری آنکھوں کے سامنے ہیں لیکن ان کی جڑیں ماضی کے دل میں پیوست ہیں۔ جہاں یہ بات پورے انسانی سماج کے لئے صحیح ہے، وہاں اس کو ایک فرد کی زندگی اور اس کے فنی مظاہر کو جانچتے ہوئے بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

جذبی آج ہمارے سامنے جیسے ہیں ویسے ہیں۔ لیکن آئیے ذرا ہم پیچھے ہٹ کر دیکھیں۔ آج سے بہت پہلے جب جذبی جی ہے عدم میں تھے۔ اور صرف معین احسن اس دنیا میں موجود تھا۔ میں نے شروع میں کہا تھا کہ جذبی کسی اناڑی جرّاح کا تختۂ مشق بن گئے ہوں گے۔ اگر آپ حالات کی سختیوں اور نا انصافیوں کو ایک انسان کی زندگی میں ایک ظالم جرّاح کا درجہ دینے پر راضی ہو جائیں تو میرا قیاس حقیقت میں بدل جائے گا۔

جذبی کا خاندان جو بہت پہلے میرٹھ سے دانا پور (بہار) منتقل ہو گیا تھا، پھر دوبارہ لکھنؤ واپس آ گیا۔ ان کے دادا ڈاکٹر عبدالغفور مطیع کی بدولت خاندان کے پس منظر میں ادبی فضا پیدا ہو چکی تھی۔ جذبی کے بچپن ہی میں ادبی ماحول نے اثر ڈالنا شروع کر دیا تھا۔ خود ان کے دادا ایک لغت مرتب کر رہے تھے۔ جن کا چودہ سال کا کام دھرا رہ گیا۔ پھر ان کی پھوپھی خاتون اکرم رحمٰن کی شادی راز ق الخیری سے ہوئی، کی ادبی دلچسپیوں اور مصروفیتوں نے بھی گھر کے ماحول میں کافی ادبی رنگ پیدا کر دیا تھا۔ ابھی میاں معین احسن کی عمر ۸ یا ۹ سال کی تھی کہ ان پر شاعری کا حق ادا کرنا واجب ہو گیا تھا۔ ان کو روزانہ غزلیں یاد کرنے کے لئے کہا جاتا۔ میاں معین احسن جن کے حلیے کا اندازہ اگر آج کے حلیے سے لگایا جائے تو وہ دیکھنے میں ایک بے حد مسکین خاموش اور سست لڑکا دکھائی دیں گے۔ یہی لڑکا پرانی تہذیب کا بار سر پر اٹھائے، سر پر ٹوپی چپکائے، آنکھیں نیچی کئے، نہایت ادب سے غالب، اسمٰعیل میرٹھی، حالی اور اقبال کی چیزیں زبانی یاد کرتا اور روز اپنے بزرگوں کو سنایا کرتا۔ انیس کے اسی وقت کے یاد کئے ہوئے اشعار ابھی تک یاد ہیں۔ ذرا غور کیجئے وہ معصوم سالا کا انیس کے یہ اشعار سنا رہا ہے ؎

وہ جست و خیز و سرعت و چالاکی سمند

سانچے میں تھے ڈھلے ہوئے سب جوڑ بند

سم قرص ماہتاب سے روشن ہزار چند

نازک مزاج، شوخ، سیہ چشم، سربلند

دادا اور پھوپھی وغیرہ کی ادبی دلچسپیوں اور غزلیں اور نظمیں یاد کرنے کا اس خاموش لڑکے کے ذہن پر یہ اثر ہوا کہ ۹ سال کی عمر میں ہی جناب نے تک بندی شروع کر دی۔ ان دنوں جھانسی میں قیام تھا، اور ساتویں آٹھویں جماعت کی طالب علمی کا دور تھا۔ صادق دہلوی کا شمار ان دنوں استادوں میں ہوتا تھا۔ ان کے شاگرد تھے حامد شاہجہانپوری۔ وہ معین احسن کے گھر والوں کے پڑوسی تھے۔ ان کے یہاں اس ننھے شاعر کا آنا جانا تھا۔ ان سے تعلقات کا اثر پڑا۔ عقیدت اتنی بڑھی کہ معین احسن نے ان کی پوری بیاض حفظ کر لی۔ ان ہی دنوں باضابطہ شاعری کا آغاز ہوا۔ معین احسن نے اپنی ایک غزل دوسرے کے نام سے ان کو دکھائی۔ انہوں نے ایک آدھ شعر پسند کیا۔ اس طرح معین احسن نے، جو اس وقت نویں جماعت میں پڑھتا تھا، اور جس کی عمر اس وقت پندرہ سال تھی اپنا تخلص ملال رکھا۔ اور اپنی شاعرانہ زندگی کی پہلی منزل میں بے دھڑک داخل ہو گیا۔ ان دنوں دنیائے شاعری میں جگر اور فانی کے نام روشن تھے۔ ان کی غزلوں کا بڑا شہرہ تھا۔ ان دنوں نظموں کا رواج نہیں تھا۔ ایک ایسے زمانے میں ایک ہونہار شاعر نے اپنی فنی زندگی کے ابتدائی دور میں باضابطہ اصلاح حاصل کرنے کا بیڑا اٹھایا۔ غزلوں کا دور تھا۔ اور معین احسن ملال کے سامنے اپنی طبع آزمائی کے لئے وہی میدان تھا۔ حامد شاہجہانپوری نے ملال کی طبع رسا کا اندازہ لگایا اور انہیں اپنے استاد

عارف دہلوی سے رجوع کرنے کے لئے بھیج دیا۔ وہ ہر شعر پر بحث کیا کرتے تھے۔ ایک ایک لفظ کے الٹ پھیر سے اگر شعر ہو جاتا تو ٹھیک ورنہ وہ پورا شعر کاٹ دیا کرتے تھے۔ وہ بندش، چستی، ابہام وغیرہ پر بات چیت کرتے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شاعر کو اپنے ابتدائی دور میں ہی کافی محنت کرنی پڑی۔ استاد پوچھا کرتے "بتاؤ تجربے کا شاعری سے کیا تعلق ہے؟" اور اس کے بعد زندگی کے واقعات کی تشریح کیا کرتے تھے۔ ۱۹۲۹ء سے ۱۹۳۲ء تک یہی سلسلہ چلتا رہا۔ اس کے بعد ملال کے استاد نے کہا "تمہاری غزلیں دوسرے درجے کے استادوں سے اچھی ہوتی ہیں۔ اگر دماغ خراب نہ ہو تو —"

آگرے میں تعلیم کا سلسلہ شروع ہوا تو وہاں اردو کے ایک اور مشہور سے ملاقات ہوئی۔ وہ شاعر تھا مجاز۔ مجاز ان کے ہم جماعت تھے۔ وہ دونوں سائنس کے طالب علم تھے۔ ان دنوں آگرے میں میکش اکبرآبادی وغیرہ کا دور تھا۔ کالج کا پہلا سال تھا۔ شاعری کی کونپلیں ایک تناور درخت بننے کے لئے بیتاب رہی تھیں۔ ان ہی دنوں ملال کو فانی سے ملنے کا موقع ملا۔

ایک دن حضرت ہمت کر کے فانی کے یہاں پہنچے تو وہ آرام کرسی پر بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک طرف پختہ کار شاعر تھے، ان کا رعب اور شہرت تھی اور دوسری طرف ایک نو مشق نوجوان۔ کالج کا طالب علم شاعر جس کی ابھی مسیں بھی نہیں بھیگی تھیں۔ لیکن جیسے شاعری کا جنون اس دور کے ایک عظیم المرتبت شاعر کے یہاں کھینچ لایا تھا۔ وہ بڑی محبت اور تپاک سے پیش آئے۔

"کہئے کیا شغل ہے؟" فانی نے پوچھا۔

"سائنس پڑھتا ہوں" یہ وہ الفاظ تھے جو جلدی سے تھرتھراتی ہوئی آواز کے ساتھ معین احسن ملال کی زبان سے ادا ہوئے۔

"شعر و شاعری کا شوق بھی ہے؟"

"صاحب بس یوں ہی بک جھک لیتا ہوں" سراپا انکسار آواز مشکل سے نکلی۔

"کچھ سنائیے"

ملال نے اپنی آنکھیں اٹھائیں۔ ان کے سامنے بڑی متانت کے ساتھ ایک کشیدہ قامت بزرگ اچھے لباس میں بیٹھے تھے۔ ان کے کھچڑی بالوں نے ان کے اندر اور بھی مربیانہ شان پیدا کر دی تھی۔

ملال نے اپنی غزل کا پہلا شعر پڑھا

دل کو ہونا تھا جستجو میں خراب — پاس تھی یوں تو منزل مقصود

فانی نے شعر دہراتے ہوئے دوسرا مصرعہ یوں پڑھا

پاس تھی ورنہ منزل مقصود

نوجوان شاعر نے خاموشی سے اصلاح قبول کر لی اور نہایت سعادت مندی کے ساتھ دوبارہ اصلاح شدہ شعر پڑھا ("فروزاں" میں یہ غزل اصلاح شدہ شعر کے ساتھ شائع ہوئی ہے)۔

پھر جذبی نے فانی کو ایک اور غزل سنائی — "فروزاں" کی پہلی غزل جس کا مقطع ہے

ضبط غم بے سبب نہیں جذبی

جو اس وقت تھا —

ضبط غم بے سبب نہیں ہے ملال — خلش دل بڑھا رہا ہوں میں

فانی ایک دم سے اٹھ کر بیٹھ گئے۔ بہت داد دی۔ کہنے لگے

"بہت سے طالب علم قسم کے شاعر آئے۔ آپ سے استدعا کروں گا — اس خلش کو زندہ و تابندہ رکھئے۔"

اس حادثے نے کیا گل کھلائے اور کیسے دردمند شاعر کو پروان چڑھایا، لوگوں کو معلوم ہے۔

ذاتی حیدرآباد چلے گئے۔ لیکن ملالؔ سے تعلقات کا سلسلہ رہا۔ اس کے بعد بھی ان سے چار پانچ بار ملنے کا موقع ملا۔ یہی وہ دور تھا جب شاعری کا جنون پورے شباب پر پہنچ گیا۔ اس زمانے میں شاعروں کی بیٹھک بیگمؔ کے ہاں ہوا کرتی تھی۔ نتیجہ ظاہر تھا۔ ملالؔ (جذبیؔ) اور شہیدؔ (مجازؔ) دونوں یار غار تھے اور دونوں ایک دوسرے کی لاج رکھتے ہوئے ایک ساتھ بڑی آن بان سے سائنس کے امتحان میں فیل ہوئے۔ شہیدؔ بھی شاعر تھے، اور دونوں میں دوستانہ چشمک بھی ہوتی تھی۔ جذبیؔ نے اپنے دوست کے تخلص کا فائدہ اٹھا کر ایک پیروڈی لکھ ڈالی تھی ؎

آہ شہیدا واہ شہیدا — دیکھ ادھر للہ شہیدا

ان دنوں شاعری کی موجیں زندگی کے ساحل کی بندشوں کو توڑ کر ہر طرف دوڑ جاتی تھیں۔

ان دنوں کا ایک دلچسپ واقعہ ہے۔ ہوسٹل میں ایک صاحب موتی تھے۔ ذرا ناٹ کھٹ اور تنک چڑھے تھے۔ یاروں کی ان سے بنتی نہ تھی۔ ملالؔ اور شہیدؔ کے ایک دوست عابد تھے۔ عابد سے موتی کی ہمیشہ جوتم پیزار ہوا کرتی تھی۔ موتی کے نام کا فائدہ اٹھا کر ملالؔ نے ایک قطعہ تیار کر دیا ؎

عابد نے یہ کہا کہ بڑا بدصفات ہے	کیوں بھونکتا ہے رات کو کیا ایسی بات ہے
جب جانتے ہیں آپ کہ کتنے کی ذات ہے	میں نے کہا کہ آپ بُرا مانتے ہیں کیوں

انہیں دنوں آل احمد سرورؔ بھی اسی کالج میں تھرڈ ایئر میں پڑھتے اور ان دونوں شاعروں (کھلنڈرے لڑکوں) کے مقابلے میں ایک ممتاز طالب علم کی حیثیت رکھتے تھے اور وہ بزم ادب کے سیکرٹری تھے۔

اس زمانہ میں جذبیؔ اور مجازؔ کی دوستی بہت بڑھ گئی۔ بلکہ بقول جذبیؔ "دوستی ان دنوں صرف مجازؔ سے تھی۔ لڑکے کہا کرتے "بھئی دونوں نکاح کر لو۔" خود ان کے وارڈن ان کے "جڑواں پن" کے کچھ اتنے قائل ہو گئے تھے کہ جذبیؔ ان سے سینما جانے کی چھٹی لیتے آتے تو وہ فرماتے YES ASRARULHAQ CAN ALSO GO."

فیل ہونے کے بعد دونوں کو جدا جدا ہونا پڑا۔ جذبیؔ لکھنؤ چلے گئے اور مجازؔ علیگڑھ سدھارے۔ اسی زمانے میں خبط ہوا کہ تخلص بدلنا چاہئے۔ اور ۱۹۲۳ء میں یہ نیک کام بھی ہو گیا۔ ملالؔ جذبیؔ میں منتقل ہو گیا۔

یہاں بھی شاعری کا سلسلہ اسی مجنونانہ بدحواسی کے ساتھ جاری رہا۔ کتابیں خوب پڑھی جاتیں۔ لیکن نصاب کی کتابوں کا خیال آتے ہی طبیعت الجھنے لگتی۔ "اف یہ کورس کی غیر شاعرانہ فضول کتابیں کون پڑھے۔" نتیجہ ظاہر تھا۔ یہاں بھی لڑھک گئے۔

جذبیؔ پر اس کے بعد بڑا کڑا وقت آیا۔ موصوف کے اباجان کو دھچکا لگا۔ اور وہ اپنے صاحب زادے کے تعلیمی مستقبل کو رو بیٹھے۔ کہنے لگے

"میاں، شعر و شاعری میں تمہاری ناؤ ڈوب گئی۔ اب چھوڑو۔ چپ چاپ پوسٹ آفس وغیرہ میں کام کر لو۔"

جذبیؔ جب ساڑھے تین سال کے تھے ان کی والدہ فوت ہو چکی تھیں۔ سوتیلی ماں کی سخت کوشیاں سانپ کی طرح ان کے نوجوان دل کو ڈستی رہی تھیں۔ ابا بھی ان کے مشورے سے متاثر تھے۔ اپنے فیل ہونے نے معاملہ اور بگاڑ دیا تھا۔ جھانسی اور لکھنؤ میں غم عشق کے کچو کے بھی لگنا شروع ہو گئے تھے۔ جذبیؔ کا کہنا ہے "غم عشق کیا اسے دونوں طرف سے ایک معصوم اور مبہم خلش کہہ لو" مختلف قسم کی جذباتی خلش جو زہر کی طرح پک رہی تھی ۱۹۲۴ء میں زخم بن کر پھٹ پڑا۔

"ایک شام جب اباکی نظروں سے پھر جانے کا غم سینے پر ایک بوجھ بنا ہوا تھا۔ آسمان پر ہلکے ہلکے بادل تیر رہے تھے —— اگست یا ستمبر کا مہینہ تھا۔ انتہائی ذہنی کوفت کے عالم میں ایک مصرعہ ہو گیا

مرنے کی دعائیں کیوں مانگوں جینے کی تمنا کون کرے

چندرہ منٹ میں غزل ہوگئی"

اسی غزل نے بعد میں جذبی کو مشہور کیا اور اس کو ایک قبولیت پسند شاعر کا خطاب دلوایا۔ حالانکہ بقول جذبی "یہ غزل اس خاص لمحے کے موڈ کی بے ساختہ ترجمانی کرتی ہے۔"

(اس غزل کی اگرچہ میں کوئی خاص داد نہیں ملی۔ دو سال تک پڑی رہی۔ ۱۹۳۵ء میں "ہمایوں" کو بھیجی گئی۔ مجنوں نے وہی غزل "ایوان" میں شائع کی)۔

اس غزل کا موڈ شاعر پر گہرا ہو کر چھا گیا۔ یہاں تک کہ ایک دن سوتیلی ماں سے سخت جھگڑا ہوا۔ اس جھگڑے نے اس غزل کے دل شکستہ شاعر کو گھر چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔ اپنے ایک دوست کے بھائی کے ساتھ احمد آباد کی سیر کو چلے گئے۔ ٹرین میں ایک صاحب سے ملاقات ہوگئی۔ وہ فوٹوگرافر تھے ان سے معلوم ہوا کہ ایک نئی فلم کمپنی کھلی ہے — "دن فلم کمپنی"! یہ خبر اس زمانے میں حوصلہ افزا معلوم ہوئی کہ اس میں زیادہ حصہ مسلمانوں کا ہے۔ جذبی نے ان سے ایک خط لیا اور اس فلم کمپنی میں آ دھمکے۔ وہاں مہینہ بھر خاک چھانتے رہے۔ شوٹنگ وو ٹنگ ادھوری رہ گئی۔ منیجنگ ڈائرکٹر آدمی باذوق تھے۔ جتنے جو کچھ تھے کھا پی گئے۔ کمپنی ٹھپ ہوگئی۔ اسی زمانے میں جذبی کے پرائیویٹ امتحان کا نتیجہ نکل چکا تھا اور اتفاق سے "شکستہ کشتی" کا شناور ساحل کنار ہو گیا تھا۔

ساحل کی تمنا اور بڑھی اور جذبی نے اپنے والد کو ایک خط لکھا کہ "اگر آپ میری مدد کریں تو میں علی گڑھ یا اجمیر جا کر اپنی تعلیم کا سلسلہ جاری رکھوں۔" پھر انتہائی مصیبت کا دور شروع ہوا۔ تعلیم دہلی میں شروع ہوئی۔ حالات ناقابل برداشت تھے۔ ماموں وغیرہ جو ان دنوں بھوپال میں تھے کچھ مدد کر رہے تھے۔ اس دوران میں زبردست علالت کا حملہ ہوا۔ اور اس زمانے میں جذبی کو زندگی سے انتہائی نفرت اور اکتاہٹ ہونے لگی۔ "فلسفے میں شاعر بچارا پھر اٹک گیا۔ جناب کا خیال تھا "جینئس فیل نہیں ہوتا۔ یا تو ممتحن کو فلسفہ نہیں آتا تھا یا میں واقعی فلسفے میں فیل تھا"۔

پھر وہی مسئلہ، پرانا روگ! لیکن ۱۹۳۶ء میں آخر کامیابی نصیب ہوئی۔ اور آ گے سلسلہ ہوگئی۔ علی گڑھ میں انگریزی میں داخلہ لے لیا۔ لیکن ابا نے سخت مخالفت کی اور پھر وہ دہلی واپس آ گئے۔ وہاں خالہ تھیں اور مجاز ریڈیو میں ملازم تھے — "آواز" کے نائب مدیر! ان کے ساتھ جذبی کا قیام رہا۔ ایک مصیبت وہاں بھی منتظر تھی۔ مجاز برطرف کر دیے گئے۔ دونوں کا قیام اسی طرح دہلی میں رہا۔ اس زمانے میں جوش بھی دہلی آ گئے تھے۔ وہ قرول باغ میں مقیم تھے اور "کلیم" نکال رہے تھے۔ اس زمانے میں شعر و شاعری کے جنون کے ساتھ سب سے بڑا کام دفتروں میں درخواستیں بھیجنا اور ٹیوشنوں کی تلاش کرنا تھا۔ اور اس سے جو وقت بچتا وہ جوش کی صحبتوں میں گزرتا۔

ان ہی دنوں رات کے اندھیرے میں قسمت کا ستارہ چمکا۔ بمبئی میں ایک جگہ مترجم کی نکل آئی۔ یہ جگہ سیکرٹریٹ میں تھی۔ تین چار مہینے وہاں کام کیا۔ پھر وہاں سے بھی پتہ کٹا اور افتاں و خیزاں بھوپال پہنچے۔ ۱۹۳۸ء میں سکول میں جگہ ملی۔ اس اسکول کا نام ماڈل ہائی سکول تھا۔ جذبی نے ڈٹ کر یہاں دس مہینے تک کام کیا لیکن تنخواہ کا مسئلہ طے نہ ہو سکا۔ یعنی یہی طے نہ ہو سکا کہ تنخواہ ملے گی یا نہیں۔

آخر جی چھوٹ گیا اور یہ شاعر آوارہ لکھنؤ پہنچ گیا۔ وہاں سردار جعفری، سبط حسن وغیرہ "نیا ادب" نکال رہے تھے۔ اس حمام میں سب ہی ننگے تھے۔ سب کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ سردار اور سبط حسن ساتھ رہتے تھے۔ ۱۹۳۹ء تک جذبی بھی وہیں براجمان رہے۔ افلاس اور تنگ دستی کا آفتاب سوا نیزے پر آ گیا تھا۔ یکایک اسکول میں دس مہینے بھاڑ جھونکنے کا صلہ مل گیا۔ دس مہینے کی تنخواہ شاعر کی مٹھی میں تھی — چھ سو روپے! شاعر کو اتنی خوشی ہوئی کہ بیمار پڑ گیا۔ دو سو تو کھڑے گھاٹ ڈاکٹروں کی نذر ہوگئے۔ باقی چار سو روپے لے کر موصوف علی گڑھ وارد ہوئے۔ اس وقت ایم اے کرنے کی دھن سوار ہوگئی۔ اس زمانے میں ترقی پسندی کی تحریک ابھر رہی تھی۔ اور جذبی کو بھی اس تحریک کا ایک مبہم تصور تھا۔ ترقی پسندی کا معیار جب جوش کی نظمیں تھیں" اور اس وقت تک ترقی پسندی کی بنیاد ڈالنے والوں نے وضاحت بھی نہیں کی تھی:

جذبی نے بھوپال کے دوران قیام میں "فطرت ایک مفلس کی نظر میں" لکھی تھی۔ اس کے بعد ۳۸، ۱۹۳۹ء میں ایک اور نظم "اے کاش" لکھی۔

...مجموعے میں مکمل ہوئی۔

علی گڑھ آنے کے بعد جذبی کی صحت بالکل ہی خراب ہو چکی تھی۔ اونٹ کسی کل بیٹھنے کو تیار نہ تھا۔ وہاں ایک ایسا حلقہ ملا جو سیاست اور ادب ...پر رکھتا تھا۔ اور جو کچھ کرنے کے لئے بے تاب تھا۔ اس زمانے کی راتیں باتوں میں بیت جاتی تھیں۔ سورج ڈوبتا تھا اور پھر جلوہ گر ہو جاتا تھا لیکن بحثیں ختم ہونے کو نہ آتی تھیں۔ ادب پہ بات ہوتی، سیاست پر بات ہوتی۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پہ بات ہوتی۔ دل کی تشنگی پھر بھی نہ بجھتی۔ اس حلقے میں ...حسن، انور انصاری وغیرہ تھے۔ اس زمانے میں ادبی مسائل کے صحیح خدوخال اُبھر کر سامنے آنے لگے تھے۔ اور ان کو سمجھنے کی بصیرت پیدا ہونے لگی تھی۔ ...پے در پے دھچکوں، ذاتی شکستوں، ماحول کی سرد مہریوں نے خود شاعر کی تخلیقی قوت پر اوس ڈال دی تھی۔ امنگوں کا دم نکل رہا تھا۔ اور پائے ثبات ڈگمگا رہے تھے۔ اس زمانے میں ایک خیال کا بھوت بہت ستایا کرتا۔ ایک صلاحیت تھی وہ بھی ساتھ چھوڑ گئی۔ ایک بار جبر کر کے کوشش کی۔ تین چار چھپے ...شعر ہوئے۔ ہمت جواب دینے لگی۔ پھر کوشش کی —— یونہی بے خیالی میں مصرعے آتے گئے ——

اپنی سوئی ہوئی دنیا کو جگا لوں تو چلوں

معلوم ہوا ایک بند ہو گیا جو ایک ہی خیال کی ترجمانی کرتا ہے۔ امتحان کو چند دن تھے۔ ہیجان بے حد شدید تھا۔ پڑھا لکھا سب غائب ہونے لگا۔ ان ...ان ہی دنوں ایک طرف تو ہیبتناکی امتحان کا بھوت سوار ہو رہا تھا۔ دوسری طرف روحانی تجربات نے دل کو تہ و بالا کر دیا تھا۔ جذبات کی دنیا میں ایسی آگ لگی کہ سراپا زندگی دھوئیں کا ناچتا ہوا مینار بن گئی۔ دل کے تار بڑے جھنکار سے ٹوٹے اور دماغ کی کڑیاں مل گئیں۔ یہ ۱۹۴۱ء کا زمانہ تھا۔ اسی جذباتی ہیجان اور فشار کے دور میں جذبی نے سب سے زیادہ شاعری کی۔ کئی نظمیں خون جگر کا اعجاز بن کر باہر چھلک پڑیں —— کون جانے یہ اشعار تھے یا شاعر کی آنکھوں سے ٹپکے ہوئے شعلہ فشاں خون دل کے قطرے —— اتنا تو سب کو معلوم ہے کہ وہی لہو کے قطرے آج تک جدید شاعری کی رگوں میں آگ کی طرح دوڑ رہے ہیں۔

"بیزار نگاہوں" کی داستان پُرخوں شدہ دل کی داستان ہے جس میں محبت کی مقدس خودی کا پورا جمال موجزن ہے۔ یہ نظم اسی دور کی نظم ہے اور شاعر کے جذباتی تجربے کی خوبصورت یادگار ہے۔ اس تجربے کا ہیجان انسان کے معصوم جذبے کو پاکیزگی بخشنے والا ہیجان ہے۔

علی گڑھ سے طبیعت اچاٹ ہو چکی تھی۔ "آج کل" کی ملازمت مل گئی اور جذبی دلی آ گئے —— وہاں جذبی کو زیادہ تر بیمار رہنا پڑا۔ دوسری عالمگیر جنگ پورے شباب پر تھی۔ یہ وہ دور تھا جب دلی ادیبوں کے لئے ایک مقناطیسی نقطہ بن گئی۔ فیض، تاثیر، راشد، کرشن چندر، منٹو، اپندر ناتھ اشک ...، اختر رائے پوری —— یہ پورا قافلہ یہیں جما ہوا تھا۔ ان سب ادیبوں سے جذبی کا ملنا جلنا کافی تھا۔ ان ملاقاتوں میں ادبی زندگی کی چاشنی تھی اور بعض لمحات دلچسپ گزرے۔

لیکن اس نئی ملازمت کے کولہو میں جُتنے کے بعد جلد ہی جذبی کو محسوس ہوا کہ گاڑی چلے گی نہیں۔ چلے گی تو اٹک اٹک کر چلے گی۔ "آج کل" کا ایڈیٹر (جوش ملیح آبادی نہیں) ایک ایرانی النسل محمد یعقوب دواشی تھا۔ حکومت کا خالص پٹھو۔ وہ انگریز حکام سے زیادہ انگریزی حکومت کا وفادار تھا۔ جب اس کو جذبی کے رجحانات اور میلانات کا احساس ہوا تو قدم قدم پہ روڑے اٹکانے لگا۔ ایک بار "آج کل" کے ٹائیٹل کا رنگ سرخ چھپا۔ وہ ہندوستانی انگریز کہنے لگا "جناب یہ تو سوویت رنگ ہے"۔

ایک انگریز پروڈکشن کا انچارج تھا۔ اس نے بھی یہی بات کہی۔ جذبی کے دل میں آگ سلگنے لگی۔ اس کے بعد ایک دلچسپ واقعہ ہو گیا۔ ایک مضمون ترجمے کو ملا جس میں کہا گیا تھا کہ مہاتما گاندھی آغا خاں کے محل میں آرام کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ جذبی نے اس کے ترجمے سے انکار کر دیا۔ کرنل دہلی سے جھڑپ ہوئی۔ معاملہ پکتا گیا۔ جذبی نے آخر تنگ آ کر اور اکتا کر تین مہینے کی چھٹی لے لی اور بمبئی چل دیئے۔ وہاں سبط حسن اور جعفری کے ساتھ رہے۔ جذبی کو یہ خیال تھا کہ وہاں فلم کمپنی وغیرہ میں دھنس رہیں گے۔ بھائی سبنے، کیفی وغیرہ نے بڑی ہمت بندھائی۔ منٹو نے کہا فلمستان میں

نوکری دلا دیں گے۔ چلو امید کی ایک اور کرن پھوٹی۔

"ڈاکٹر لیٹر کم جی سے انٹرویو ہوا۔ انہوں نے پوچھا "کہئے آپ نباہ کر سکیں گے یا نہیں؟"

"جناب کیوں نہیں کر سکیں گے؟" جواب حاضر تھا۔

"جی، پریم چند بھی آئے یہاں لیکن نہیں چل سکے۔"

اس کے بعد جذبی کو وحشت سی رہنے لگی "سمجھوتے کی ایک حد ہوتی ہے۔" جذبی کو بمبئی کا سا ہنگامی شور و غوغا الگ کھائے جا رہا تھا۔ وہاں تنہائی میسر نہیں آتی تھی۔ اسی وحشت کے زمانے میں سر بیڈ وے سے ملاقات ہوگئی۔ ان سے جذبی نے ریسرچ کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ انہوں نے وظیفہ دلا دیا۔ وہاں سے جذبی سیدھے دہلی آئے۔ استعفا دیا اور علی گڑھ میں کام کرنے لگے۔ اتفاق سے موقع نکل آیا۔ اور یونیورسٹی میں ملازمت مل گئی۔ اس وقت سے آج تک جذبی اسی علی گڑھ میں زندگی گزار رہے ہیں جس کے بارے میں ایک بار انہوں نے مجھ سے کہا تھا

"یہ ایک کنواں ہے جہاں ہم مینڈکوں کی طرح ایک محدود دائرے میں چکر لگاتے رہتے ہیں۔ جب کوئی مینڈک باہر سے آکر اس میں ٹپک جاتا ہے تو دل پہ ان میں کافی چہل پہل ہو جاتی ہے۔"

یہ بات انہوں نے میرے اچانک ٹپک پڑنے پر خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہی تھی۔

زندگی کا پیچ سلسلہ جذبی کو یہاں تک لے آیا ہے۔ جذبی اور ان کو جاننے والے یہ جانتے ہیں کہ ایک شاعر کی زندگی کا سلسلہ یہاں ختم نہیں ہو جاتا۔ یہ صحیح ہے کہ آج وہ مسلم یونیورسٹی میں ایک لیکچرار کی حیثیت سے ایک خاموش زندگی گزار رہے ہیں۔ ان کا اپنا ایک چھوٹا سا کوارٹر ہے ننگی اینٹوں سے بنا ہوا ایک سفری کوارٹر۔ وہ اپنی بیوی اور بچوں کے ساتھ ایک اچھے اور ذمہ دار شوہر اور شفیق باپ کی زندگی خاموشی سے گزار رہے ہیں۔

صبح آٹھ بجے سے یونیورسٹی کی پڑھائی شروع ہوتی ہے۔ اور اس وقت سے ان کے فرائض کا چکر شروع ہوتا ہے۔ یونیورسٹی سے واپس آکر پھر وہی بیوی وہی بچے، وہی گھر اور وہی گھریلو تقاضے۔ اس چھوٹے سے کوارٹر میں ایک چھوٹا سا صحن باہر ہے۔ یہی اس شاعر کا گھر نما ہے۔ یہاں چق اٹھا کر آپ جب اندر پہنچیں گے تو ایک ترتیب وار بے ترتیبی سی نظر آئے گی۔ ایک میز، اس کے آگے ایک کرسی، ایک آرام کرسی، اس کے آگے ایک چھوٹی سی میز۔ اور اس چھوٹی سی میز پر کبھی کتابیں، کبھی چائے کا طشت اور کبھی سگار کا بکس نظر آئے گا۔

میں جب کبھی اچانک جذبی کے یہاں مہمان بے تکلف نازل ہوا ہوں تو میں نے اکثر ان کو تنہا پایا ہے۔ دو میزوں اور کرسیوں سے پرے ایک گوشے میں پڑی ہوئی چارپائی پر دو زانو بیٹھے ہوئے۔ لیکن ایسا کبھی نہیں ہوا کہ میں کمرے میں گھس پڑا ہوں اور اس کے بعد شاعر کو میرے آدھمکنے کا علم ہوا ہے۔ جی نہیں ایسا کبھی نہیں ہوا۔ ابھی میں باہر ہی ہوں اور ابھی اس کا یقین بھی نہیں ہوا ہے کہ حضرت گھر پہ موجود ہیں یا تیر کمان سے نکل چکا ہے کہ تحسین و آفرین کی لے میں چق کے پیچھے سے خیر مقدم کے نعرے گونجنے لگے۔

میری عمر اور جذبی کی عمر میں ایک پوری ادبی نسل کا فرق ہے۔ لیکن جذبی نے ایک لمحے کے لئے بھی اپنی عمر کی برتری کا سہارا نہیں لیا۔ اور بعض مباحث ایسے بھی آئے جب میں نے تلخ باتیں کہیں اور سختی سے کہیں۔ لیکن جذبی کے انداز گفتگو اور دوستانہ لب و لہجے اور برتاؤ میں فرق پیدا نہیں ہوا۔ میں جانتا ہوں اور جذبی بھی جانتے ہیں کہ ان کے بعض کٹر تضادات کو میں ان کے محدود حد داخلی رد عمل کا نتیجہ سمجھتا ہوں۔

جذبی میں بڑی زندگی ہے۔ مجھے ان سے مل کر کبھی تھکن، اکتاہٹ اور بوریت کا احساس نہیں ہوا۔ میں جب بھی ان سے ملا ہوں، مجھے محسوس ہوا کہ میں ایک مخلص اور ہمدرد دوست سے بات کر رہا ہوں۔ جب اختلاف کی بات ہوتی ہے اصولی ہوتی ہے۔ اور ہم دونوں نے کبھی بھی ایک دوسرے کو ملحد یا گمراہ یا رجعت پسند کہنے والی ہٹ دھرمی سے کام نہیں لیا ہے۔ میں نے ان میں وہ لچک بھی محسوس کی ہے جو ایک سنجیدہ اور منطقی گفتگو کو کسی نتیجے تک پہنچانے کے لئے ضروری ہے۔

جذبی کے متعلق یونیورسٹی میں، یونیورسٹی سے باہر علی گڑھ میں اور علی گڑھ سے باہر آپ کو مختلف رائیں مختلف حلقوں میں ملیں گی۔

پڑتی ہے۔ جس کا نشہ فیضان ان کی اپنی زندگی کا ذاتی تجربہ ہے۔ یہ کہنا غلط نہیں ہوگا کہ یہ تجربہ کبھی کبھی جذبی کی شاعری اور زندگی دونوں پر حاوی ہوگیا ہے۔ یہیں سے ان کے یہاں قنوطیت اور کلبیت کے سوتے پھوٹتے ہیں۔ لیکن یہ اداسی، یہ کلبیت، یہ شکست خوردگی ان کی پوری شاعری اور ان کی پوری زندگی پر محیط نہیں ہے۔

جذبی کو اپنی موجودہ زندگی میں، موجودہ سماجی نظام کی لعنتوں میں سے ہر لعنت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ یونیورسٹی میں تعصب پرستیوں، خوشامدوں، ایک دوسرے کی ٹانگیں کھینچنے اور دنیا پرستی سے بچنے کی اس فضا میں وہ اکیلے ایک تماشائی کی طرح کنارے پر کھڑے ہیں لیکن بالکل بے نیاز بھی نہیں۔ جب اس فضا میں زہر بہت بھر جاتا ہے تو وہ چیخ اٹھتے ہیں: "یار، اب انقلاب آ ہی جائے تو اچھا ہے۔ اپنی زندگی بہت ہو چکی ہے۔۔۔۔ انتظار کب تک؟"

جذبی سردار جعفری کی شاعری سے شاکی ہیں۔ وہ کہتے ہیں "وہ شاعر محنت اور مشق سے بنا ہے۔ میں اسے بہت اچھا شاعر مانتا ہوں لیکن وہ اپنی ذاتی زندگی میں بھی بلند کردار ہے اور شاعر بھی ہیں۔ اور اگر وہ بلند نہ ہو تو پھر وہ سردار جعفری نہیں۔"

لیکن ساتھ ہی جب دوستوں کا ذکر کریں گے تو اسی شدت اور یقین کے ساتھ کہیں گے۔۔۔ "ادب کے میدان میں میرے اور سردار کے اختلافات جتنے بھی ہوں لیکن میرا دوست سردار جعفری ہی ہے۔ سردار کی خوبیوں اور انسانیت پر مجھے جتنا بھروسہ ہے اور کسی پر نہیں۔ جانتا ہوں اگر آج ضرورت پڑے تو میرے لئے وہی سب سے زیادہ تڑپے گا۔"

جب کبھی غم روزگار، محبت، دوستی، انسانیت، فرض، عمل اور مستقبل کا ذکر آیا ہے جذبی نے مجاز اور سردار کے لئے اپنی انتہائی دوستی کا اعلان کیا ہے اور ماضی کے لمحات یاد کرکے ان کی آنکھوں میں آنسو بھر آتے ہیں۔

جذبی کے بارے میں ایک پھبتی یہ بھی کسی جاتی ہے کہ وہ ایک بے عمل آدمی ہیں۔ لیکن ابھی پچھلے سال کا ذکر ہے جب انجمن ترقی پسند مصنفین کی کل ہند کانفرنس کے سلسلے میں علیگڑھ کام سے گیا تھا تین دن تک مستقل جذبی میرے ساتھ چکر لگاتے رہے۔ دوستوں اور دشمنوں کے تضحیک آمیز جملے برداشت کرتے رہے۔ لیکن انجمن کے لئے چندہ جمع کرنے کی مہم میں پیچھے نہ ہٹے۔ اور انہوں نے علیگڑھ کے باعمل دوستوں کے مقابلے میں زیادہ کام کیا اور کانفرنس کے لئے وہ سب کچھ کیا جو وہ کر سکتے تھے۔

کبھی کبھی جذبی پر ایک غیر منطقی بے نیازی کا دورہ پڑتا ہے اور وہ "سنیاس" کا رویہ اختیار کر لیتے ہیں لیکن یہ محض لمحاتی اور جذباتی کیفیت ہوتی ہے۔

ہاں جذبی کو رات کے وقت جاگ کر دیر تک گپیں لڑانے میں بھی کافی مزا آتا ہے۔ لیکن گپیں اکثر ادبی مسائل کے متعلق ہوتی ہیں یا زندگی کی جدوجہد یا دوسرے تجربوں کے متعلق۔

ایک رات۔۔۔ گیارہ بجے جذبی پر نمائش میں جانے کا دورہ پڑ گیا۔ میں ان کا مہمان تھا اس لئے بقدر ہمت ساتھ دینا ضروری تھا۔ ہم جگر مرادآبادی کے ساتھ نمائش میں گئے۔ علی گڑھ کی نمائش وہاں کی زندگی میں بڑا اہم حصہ ادا کرتی ہے۔ رات کافی بھیگ چکی تھی لیکن وہاں کافی چہل پہل تھی۔ ہم بس ہوٹل میں بیٹھے۔ وہاں لاؤڈ سپیکر پر جگر مرادآبادی اور جذبی کے نام پر لوگوں کو اپنی طرف کھینچا جانے لگا۔۔۔ "یہی وہ شاندار ہوٹل جہاں اس وقت ملک کے دو مشہور شاعر جگر مرادآبادی اور جذبی موجود ہیں۔" یہ گمراہ کن اعلان محض کاروبار کے لئے ہو رہا تھا۔ ہم کافی لطف اٹھاتے رہے اور نمائش سے ایک بجے لوٹے۔

گھر پہنچ کر بھی دو گھنٹے تک گپ ہوتی رہی۔ موصوف اس پر بہت خوش تھے کہ وہ کانفرنس کے لئے جگر مرادآبادی سے بھی چندہ لینے میں کامیاب ہو گئے تھے۔

جذبی پر ایسے لمحات کم ہی آتے ہیں ورنہ وہ ایک خاموش انسان کی طرح اپنے روزانہ کے معمول کے مطابق فرائض ادا کرتے ہیں۔ بیوی سے وہ مان لڑاتے ہیں، بچوں کو پیار کرتے ہیں، ان کو گود میں لے کر کھلاتے ہیں، میز پر بیٹھ کر کبھی علمی کتابیں پڑھتے ہیں اور کبھی اپنا تحقیقی مقالہ لکھتے ہیں۔۔۔ اور یہ سب کچھ نہ ہو تو خاموش چارپائی پر بیٹھ جاتے ہیں، سگار پیتے ہیں، سگار سے گھبرا اٹھیں تو سگریٹ پیتے ہیں اور سگریٹ سے اکتاتے ہیں تو حقہ گڑگڑاتے ہیں۔۔۔ کمرے کو دھوئیں سے بھر دیتے ہیں۔۔۔ اس دھوئیں میں شاعر کے دل کا خاموش اضطراب بھی ہوتا ہے اور تشنگی بھی۔۔۔ یہ تشنگی خود اپنی زندگی کی ہوتی ہے۔ اور وسیع تر زندگی کی بھی جس کی پشت ماضی کی طرف ہے اور نظر مستقبل کی طرف۔

ابھی سموم نے مانی کہاں نسیم سے ہار — ابھی تو معرکہ ہائے چمن کچھ اور بھی ہیں

جذبی کو راکھ کا ڈھیر سمجھنے والوں سے صرف اتنا عرض کروں گا کہ راکھ کے ڈھیر کو نظر انداز کرکے آگے بڑھ جانے سے پہلے ایک ذرا رک جائیے اور اس ڈھیر کو کرید کر دیکھئے۔۔۔ کون جانے اس کے اندر چنگاریاں دبی ہوں جن کو اگر ہوا مل جائے تو جنگل کی آگ بن جائیں۔

شکیلہ اختر

صوفیہ فضل

بے حد گھنگھریالے سیاہ بال اور سنہرے رنگوں والی آپا کو ہم نے ہوش سنبھالتے ہی دیکھا۔ جب بھی ان کی طرف نظر اٹھی تو بس ڈرتے ہی ڈرتے۔ سنا ہے کہ آپا کے آنے سے پہلے دو بھائی چھوٹے ہی چھوٹے اس دنیا سے جا چکے تھے، اب آپا جو آئیں تو ایک تو لاڈلی اس پر سے بیمار — اسی لئے ہاتھوں ہاتھ رہتے رہتے آپا بس آپا ہی بن بیٹھیں۔

پائیں باغ میں کچے کچے آم اور امرود کھاتے کھاتے بیمار پڑ کر جب میں اچھی ہوئی تو آپا نے مجھ کو سزا دینے کے لئے یسرنا القرآن پڑھانا شروع کیا۔ جہاں تک نقطوں کی بات تھی ایک دو تین تک کی گنتی میں سنا دیا کرتی مگر کمر ٹیڑھے، پڑے اور بیٹھے ہوئے الفاظ کسی طرح بھی میرے پلے نہ پڑتے تھے اور آپا کو ساتھ ہی ساتھ یہ دھن بھی لگی رہتی تھی کہ ایک ہی دفعہ ساری کی ساری کتاب وہ مجھے ختم ہی کرا دیں۔ جانے یسرنا القرآن کو بھی مجھ سے کیسی اللہ واسطے کی بیر تھی جو اس کا کوئی اور اور چھور میری سمجھ ہی میں نہ آتا تھا۔ ابھی ابھی دل و دماغ کو سنبھال کر عربی پڑھ رہی ہوں کہ پیچھے صاحب دوسری سطر اڑ کی موجود ہے، جیسے تیسے اس بلا سے ابھی نجات ملی ہی تھی کہ ایک اور نئی زبان "کتاب شد" کی سر پر سوار — ابھی عربی، اردو اور فارسی کی جھنجھٹ میں دماغ خراب ہی ہو رہا تھا کہ ادھر سر اور پیٹھ پر آپا کے دھموکے پڑنے شروع ہو گئے۔ ہاتھ سے مارتے مارتے جب ان کا دل نہ بھرا تو ایک دن پنچی سے مارتے مارتے آپا نے اونچی کرسی والے برآمدے سے مجھے نیچے دھکا دے دیا —— پھر تو بس اسی دن سے ہمارے نصیبے بھی کھل گئے۔ اماں جان نے صاف طور پر کہہ دیا کہ ایسی پڑھائی سے باز رہو جس سے میری بچی کی جان ہی چلی جائے" —— شام تک جب آپا کا غصہ اتر گیا تب انہوں نے بھی یہ مان لیا کہ یہ کتاب ہے ہی فضول۔ آخر آپا نے کھیلتے ہی کھیلتے نو سال کی عمر میں اپنی ساری پڑھائی کیسے ختم کر دی تھی؟ پھر اس دن سے کبھی آپا نے کسی کو پڑھانے کی ہمت نہیں کی۔ اب بھی کسی کسی بچے کی پڑھائی پر بس ہلکی سی نظر ڈال لیتی ہیں۔

شاید آپا کے مزاج میں سب سے پہلی چڑچڑاہٹ ان کے گھنگھریالے بالوں نے ہی پیدا کی ہوگی جو ان کو بے حد ناپسند ہیں اور اس کے بعد دائمی انیمیا کی بیماری نے رہی سہی کسر بھی پوری کر دی۔ ہم سارے بھائی بہنوں میں آپا سب سے زیادہ خلیق و ملنسار، ہنس مکھ اور ٹوٹ کر محبت کرنے والی ہیں مگر کبھی اچانک ایسے ہی ہنستے ہنستے آپا کو طوفانی غصہ آ جاتا ہے جیسے پہاڑی علاقوں میں یک بیک بدلیاں اٹھتیں اور بجلیاں چمکتی ہیں اور پھر

تیز رو کی بارش ہو کر دھلا دھلا ہوا آسمان صاف نکھرا ہوتا ہے بالکل اسی طرح سے ابھی ابھی غصہ، چڑچڑا ہٹ اور بیزاری کے بعد آپا کا چہرہ پیارا پیارا مسکراہٹ سے چھلکنے لگتا ہے اور ہم حیران نگاہوں سے تکتے رہ جاتے ہیں کہ آپا کا غصہ نقلی تھا یا ان کی یہ مسکراہٹ نقلی ہے۔ کبھی بھی وہ لاکھ تھکی اور افسردہ ہوں اور آنکھیں آنسوؤں سے ڈبڈبائی ہوئی ہوں لیکن اسی وقت اگر کوئی ان سے ملنے کے لئے آ جائے تو پھر ان کی بھیگی ہوئی آنکھوں میں ہمیشہ کی طرح وہی خلوص بھری مسکراہٹ تیرتی نظر آئے گی اور ان کی آواز میں دکھ درد اور غم کا ایک سایہ تک نظر نہ آئے گا۔ وہ ایک ہی وقت میں جی بھر کے رو بھی لیتی ہیں اور دل کھول کر ہنستی بھی۔

خاندان، گھر یا باہر جیسی بھی مجلس ہوگی آپا اس پر چھا کر رہ جائیں گی۔ ٹھیٹ سے ٹھیٹ دیہاتی ماحول سے لے کر شہر کی اعلیٰ ترین سوسائٹی تک میں آپا کی قدر، محبت اور عزت یکساں طور پر ہوتی ہے۔ ابھی ابھی آپا اگر ایک دیہاتی گنوار جھونپڑے میں بڑے خلوص کے ساتھ دلچسپ باتوں میں منہمک ہیں تو شام کو بہترین ڈرائنگ روم میں نفیس صوفے پر اسی دلچسپی کے ساتھ مزے دار باتوں میں لگی نظر آئیں گی۔ ان کا دائرہ اتنا وسیع ہے کہ بعض دفعہ گھر میں تماشے نظر آتے ہیں۔ گیٹ پر موٹر کی قطار لگی ہے اور ڈرائنگ روم میں سے بڑی ہی بے تکلف اور چہکتی ہوئی آوازیں آ رہی ہیں، پھر اچانک دوسرے کمرے میں سے آپا کی آواز آنے لگتی ہے۔ فرق بس اتنا ہی ہوتا ہے کہ آواز کی رفتار اور لہجے میں وہ پہلی سی روانی نہیں رہتی، دوسرے کمرے میں کئی مہمان خواتین چوکی کے فرش پر ریزرو طریقے سے بیٹھی ہوئی ہیں، چہرے پر سنجیدگی چھائی ہے، لبوں پر پان کے لاکھے جمے ہیں اور خاص عظیم آبادی لہجے میں سنبھل سنبھل کر باتیں کر رہی ہیں۔ ٹھیک اسی وقت کچھ لوگ دروازے پر آپا سے تھوڑی سی باتیں کرنے کو ٹھہر جاتے ہیں اور پردے کے پیچھے سے آپا کی اخلاق میں ڈوبی دبی دبی سی آواز ان کی ہر طرح کی امداد کا یقین دلاتی ہے۔ ڈرائنگ روم اور دوسرے کمرے کی مہمان دوستوں کی تنہائی کا خیال کر کے جب آپا دروازے سے پلٹتی ہیں تو برآمدے کے پاٹے سے لگی ہوئی چند ضرورت مند عورتیں انہیں اپنی دکھیا کہانی سنانے لگتی ہیں اور آپا کبھی ہسپتال اور کبھی کسی کے نام کا خط لکھ کر ان کو چلتا کرتی ہیں اور پھر رکشے کے کرایے کے ساتھ گھر میں پائی موجود رشتہ داروں سے چندہ اکٹھا کر کے دو چار روپے سے فوری طور پر مدد دینے لگتی ہیں اور اس درمیان میں اگر وقت ہوا تو ڈرائنگ روم کی مہمان بیچاریاں بیٹھے بیٹھے کڑھ کر آپا کا دل بہلانے لگتی ہیں اور دوسرے کمرے کے اندر ریشمی ساری کا سیدھا آنچل اوڑھے سونے کے زیوروں میں ریزرو قسم کی مستورات حیران نگاہوں سے آپا کو ڈھونڈھ رہی ہوتی ہیں۔

آپا کی مقبولیت کی کوئی انتہا نہیں۔ ان کو گھر صاف رکھنے کا جنون ہے اور اپنے مہمانوں کے ساتھ اخلاق برتنے کے ساتھ ان کو قسم قسم کی چیزیں کھلانے کی ان پر دھن سوار رہتی ہے۔ اکثر آپا کا گھر مہمانوں کی کثرت سے ایک چڑیا خانہ نظر آتا ہے۔ نئے نئے کھانے کھلائے جاتے ہیں اور سب سے بڑھ کر اس بات پر حیرت ہوتی ہے کہ آپا اپنے گھر کو ربڑ کی طرح کھینچ کر نہ جانے کیسے بڑا کر لیتی ہیں اور سارے مہمان جن کی تعداد کبھی کبھی ۵۰ سے بھی اوپر ہو جاتی ہیں رات کو اپنے اپنے بستروں پر سوتے نظر آتے ہیں۔ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ آئے گئے لوگوں سے ان کا گھر خالی رہا ہو۔ اس گھر کی حالت بالکل ویٹنگ روم جیسی ہے۔ ایک بستر ابھی بندھ رہا ہے کہ گیٹ پر موٹر یا ٹمٹم لگی اور کئی بستر اور بکس اندر آ گئے۔ پٹنہ بہار کا مرکز ہے سبھی کو یہاں کی ضرورت لگی رہتی ہے۔ پھر بھی کچھ لوگ ایسے ہیں جو بڑے اطمینان سے کہہ دیتے ہیں کہ "ان کا خرچ ہی کیا ہے؟ نہ بال نہ بچے، دو میاں بیوی اور دو چار نوکر ہوں گے۔" بھئی صاحب مستقل طور پر ان کے ساتھ رہ کر پڑھنے والے بچوں ہی کی تعداد آٹھ ہے۔ اس پر سے آرہ، اور پھر گیا، مظفرپور اور چھپرہ کے رشتہ داروں کا گھڑی گھڑی آنا۔ پھر بھی گھر اکیلا کا اکیلا ہی ہے اسی مہمان داری کے ہاتھوں آپا بیچاری نے بھرے گھر میں بیراگ لے رکھا ہے اور ان کا بکس ایک غریب کی کٹیا کی طرح ہمیشہ سے خالی کا خالی ہی رہا یہاں تک کہ چپل، جوتے، کپڑے اور صابن تک کے پیسے اسی چکر میں چلے جاتے ہیں۔ آپا کو ریڈیو کے مضمون اور درسی کتابوں اور افسانوں کے جتنے بھی روپے ملتے ہیں وہ سب کے سب بڑے اطمینان سے ہنستے ہنستے اسی انگلش چولھے کی بھینٹ چڑھ جاتے ہیں اور اس پر بھی آپا ۲۰ تاریخ کے بعد گھبرائی گھبرائی سی رہتی ہیں۔

تیمارداری آپا کی فطرت کا ایک حصہ بن کر رہ گئی ہے۔ جو بھی بیمار رہا آپا بھرا اچھا نرسنگ کے اس کی خدمت کے لئے وقف ہو جائیں گی۔ ہفتوں وہ

ہسپتال میں وہ کرسیوں کو پکڑ پکڑ کر سوتی رہتی ہیں۔ میلوں پیدل چلتے ہوئے ہسپتال کا کونا کونا ان کا جانا پہچانا ہوا ہے۔ ہسپتال کا سارا اسٹاف ان کو دور ہی سے آتا دیکھ کر سلام کرتا ہے اور اس سلام کے بوجھ تلے ان بیچاری کا پرس ہلکا ہوتا جاتا ہے۔

آپا کے دل میں بغیر کسی تعصب کے ساری انسانیت کے لئے بڑی گہری محبت اجاگر رہتی ہے وہ ان کے دکھوں پر تلملا جاتی ہیں۔ اسی لئے اپنی شادی کے چند مہینوں کے بعد آپا نے اپنے ہزاروں روپے کے زیور اور شادی کے قیمتی کپڑے تک بیچ کر خیرات کر دئے۔ غریبوں کے ہنگام میں آپا بلا خلوص مصروف رہتی ہیں۔ انہی کی تحریک اور کوشش سے اردو کا ایک مدرسہ کھولا گیا ہے جہاں غریبوں کے چالیس بچے پڑھ رہے ہیں۔ صحیح معنوں میں آپا انسانیت کی خدمت کے لئے ایک ایمبولنس کار ہیں۔ کوئی دکھی ہوا، کوئی تڑپا، کسی کو تکلیف ہوئی اور ایمبولنس کار کی محبت بھری گود کھلی ہے۔ مگر آپا ایک ایسی ایمبولنس کار ہیں جس کی چھت خود ہی ٹپک رہی ہے، جس کے کمزور پہیوں میں پنکچر کی بیسیوں چیپیاں لگی ہیں، جس کا پرزہ پرزہ ڈھیلا ہو گیا ہے اور وہ گاڑی ابھی تک صرف اپنی ہمت اور اپنی غیر معمولی محبت اور رانی جی پر ہی چل رہی ہے اور اس وقت تک چلتی رہے گی جب تک کہ ختم ہوتے پٹرول کی ایک ایک بوند سوکھ نہ جائے گی ہم لوگوں میں سے کوئی کتنا ہی بیمار ہو آپا کی بے پایاں محبت بھری خدمت ہمارے دلوں میں سکون بھر دیتی ہے اور ہسپتال کا ماحول پھر ہمارے لئے غیریت بھرا نہیں رہتا۔ جہاں وہ دوسروں کی تسکین کی موجب ہیں وہاں دو سال ہوئے جب آپا کے پیٹ کا بہت ہی بڑا اپریشن ہوا تھا تو چند ہی دنوں کے بعد اسی کوریڈ کے دوسرے کمرے میں دمے کا اچھا خاصا ایک مریض اپنے سارے خاندان کے ساتھ آیا اور دس بجے رات کو اس کی سانس اکھڑ گئی اور وہ موت کے ڈر میں ڈھارس دینے والی آپا پیٹ میں بندھی پٹی کمزوری جھکی جھکی دیوار کا سہارا لئے چلتی ہوئی رونے کی آواز سن کر اپنے کمرے سے بھاگ گئیں اور ساری رات انہوں نے نرس کی ڈیوٹی روم میں جاگ کر گزار دی۔

آپا کی طبیعت میں بے حد سادگی ہے بڑی سی بڑی مجلس میں جہاں عظیم آبادی بیٹھتے اور اونچے طبقے کی شوقینی اور فیشن عروج پر ہوتا ہے وہ اپنے صاف دھلے ہوئے کپڑوں میں شریک ہوتی ہیں۔ کسی کی امارت کبھی بھی انہیں مرعوب نہیں کر سکتی ہے اور انسانیت کی اعلیٰ قدروں کے سوا وہ کسی چیز کو بہت کم اہمیت دیتی ہیں۔

جس طرح انجمن ترقی اردو کی میٹنگوں میں ان کی شرکت ضروری سمجھی جاتی ہے ویسے ہی مارکیٹنگ میں بھی۔ جہاں وہ شعبۂ نسواں کی ایک بہت ہی مخلص ممبر ہیں، چندہ جمع کرنا اور ریلیف کے مختلف کاموں کی ذمہ داری انہی پر ہوتی ہے وہاں خاندان کے لئے رشتے کی تلاش اور شادی کا انتظام بھی ان کے بغیر نہیں ہو سکتا ہے۔ آپا کے ہاتھوں کے پکے ہوئے باقرخانی اور مرغ مسلم سے لے کر چٹنی، اچار اور مربّے تک بہترین سمجھے جاتے ہیں۔ اسی طرح سے ہزار سلائیاں گھر میں ہوں کٹنگ ماسٹر ابھی تک صرف آپا ہی ہیں۔ سوئٹر کے نمونے اور دوسری چیزوں کے ڈیزائن انہی کے ذریعے ہم لوگوں تک پہنچتے ہیں۔ اب جن کاموں میں ہم تھک سے جاتے ہیں آپا بڑے سکون سے ان کاموں میں لگی رہتی ہیں یہاں تک کہ بچوں کے جمگھٹ میں بیٹھی کبھی گھر وندے کبھی خرگوش کتے، ہاتھی اور گڑیا بنا بنا کر انہیں دیتی رہتی ہیں۔

آپا کے دل میں محبت اور خدمت کا ایک اتھاہ سمندر چھپا ہوا ہے۔ مگر ان کی طبیعت میں بلا کی عجلت، چڑچڑاہٹ اور ضد کے ساتھ تنک مزاجی بھی۔ خاندان بھر میں ان کی جیسی بے لوث محبت اور اخلاص برتنے والی شخصیت نہیں ہے۔ لیکن وہ بے حد جذباتی ہیں اور بات بات پر ان کے آنسو ٹپک پڑتے ہیں۔ ساری مجلسوں میں جہاں لوگ ان کو جوہی سمجھتے ہیں اور ان کی ہنسنے ہنسانے والی پُرلطف اور خلوص بھری باتوں میں ان کی طرف کھنچتے چلے آتے ہیں وہیں قہقہے پر قہقہے لگانے والی آپا گھر کے اندر پل بھر میں غصے سے بھرا بھی اٹھتی ہیں۔ گھر کے سارے ملازمین اور بچوں کے لئے بس آنا ہی کہہ دینا کافی ہوتا ہے کہ "آپا آ رہی ہیں" مگر اتنے رعب اور ادب کے بعد بھی سارے لوگ ان پر جان دیتے ہیں۔

ادب اور شاعری سے آپا کو بہت ہی بچپنے سے لگاؤ رہا ہے۔ اماں جان اور ابا جان دونوں کو ادب سے گہری دلچسپی رہی تھی اسی لئے آپا نے ہوش سنبھالتے ہی زندگی، تہذیب، ویشیا، پیام، بھاگیہ، عصمت اور تہذیب ہی کو دیکھا جب وہ صرف دس سال کی تھیں تو اسی وقت انہوں نے پہلی بار شعر

لکھا تھا۔ بچپن ہی سے آپا کی نگاہ بہت بڑی گہرائی تھی، وہ چھوٹی سے چھوٹی بات کو بہت زیادہ محسوس کیا کرتی تھیں۔ آپا کی تعلیم تو بہت ہی معمولی طور پر ہوئی تھی لیکن انہوں نے اپنے شوق اور کوشش سے اپنے مطالعہ کو بہت وسیع کر لیا ہے اور اب وہ دنیا کے بہت سے موضوعات کو اپنا چکی ہیں۔ ویسے تو وقت بے وقت وہ دنیا بھر کی تواریخ اور جغرافیہ اور ایسے ہی بے کار و باکار کتابیں پڑھتی ہی رہتی ہیں لیکن ان کو اسلامی ہسٹری پڑھتے رہنے کا ایک مینیا سا ہے اور جب پڑھتے پڑھتے ان کو کوئی اچھی میٹریل جاتی ہے تو پھر وہ سیدھی ہم لوگوں کے پاس چلی آتی ہیں اور پھر گھنٹوں انہی باتوں پر تبصرے ہوتے رہتے ہیں۔ آپا کو پڑھنے کی لت اس حد تک لگی ہوئی ہے کہ ناشتہ کھانے کے وقت بھی کوئی نہ کوئی کتاب ضرور ان کے ہاتھ میں رہے گی۔

آپا کا سب سے پہلا افسانہ "رحمت" ۱۹۳۶ء کے ادب لطیف میں چھپا تھا اور اس کو بہت پسند کیا گیا تھا۔ اسی کے بعد سے آپا نے اپنی شاعری ختم کر کے افسانہ نگاری شروع کر دی تھی۔

اب تک ان کے جتنے بھی افسانے چھپتے رہے ہیں وہ سارے کردار ان کی آنکھوں کے سامنے سے گزر چکے ہیں۔ ایک آدھ افسانہ جو انہوں نے پلاٹ سوچ کر لکھا بھی ہے تو اس طرح کہ نہ تو قلم ہی چلتا ہے اور نہ کہانی ختم ہی ہوتی ہے۔ "درپن" "آنکھ مچولی" اور "ڈائن" ان کے تین مجموعے اب تک نکل چکے ہیں اور ان افسانوں کے کیریکٹر سبھی جیتے جاگتے اور چلتے پھرتے انسان ہیں۔ آپا کے دو افسانے "مظلوم" اور "موسیٰ" میں اتنی زندہ تصویر کھینچی گئی ہے کہ ان افسانوں کے چھپنے کے بعد "مظلوم" والی بڑھیا بٹھنڈے کے جن جن نئے گھروں میں جاتی گئی لوگ دور ہی سے اس کو دیکھ کر پہچان گئے کہ یہی "مظلوم" والی بڑھیا ہے اور اسی طرح سے ہسپتال میں کیمپ کی جمعدارن (موسیٰ) کا ایک ایک نشان افسانے میں اس قدر نمایاں ہے کہ اس کو پڑھنے والے بے اختیار موسیٰ کو یاد کرنے لگے اور آج مرنے کے بعد بھی موسیٰ ہمیں زندہ نظر آتی ہے۔

آپا کی افسانہ نگاری کی عجیب عجیب خصوصیتیں ہیں۔ ٹھیک بہن عصمت چغتائی کی طرح کبھی مسہری یا پلنگ پر پیٹ کے بل لیٹی ہوئی وہ تکیہ کے سہارے سے افسانہ لکھتی چلی جاتی ہیں۔ ایک افسانہ ختم ہوا دوسرا شروع ہوا تیسرے کی باری آئی۔ شور ہو رہا ہے، شادی کے ہنگامے ہیں، نوکرانیاں جھگڑ رہی ہیں — بچے دھما چوکڑی مچا رہے ہیں، بلا کی گرمی پڑ رہی ہے، پسینے کے قطرے ٹپک رہے ہیں مگر آپا ہر چیز سے بے خبر اسی انداز میں جھکی ہوئی لکھتی چلی جا رہی ہیں۔ گھر سونا سونا لگ رہا ہے، ہم لوگوں کی سلائی ادھوری پڑی ہوئی ہے۔ ایک ہفتہ دس دن اس جنونی کیفیت میں جب گزر جاتے ہیں تب پتہ چلتا ہے کہ آپا نے ایک ساتھ چار افسانے لکھ دئے ہیں اور جیسے ہی انہوں نے اپنا قلم رکھا ہمارا یہ کام شروع ہو جاتا ہے کہ ان کے لکھے ہوئے افسانے سنتے چلے جائیں۔ افسانوں کو سنا کر اور ان کی پسندیدگی کے بعد آپا اطمینان کی ایک گہری سانس لے کر ان افسانوں کو اپنے فائل میں بند کر دیتی ہیں اور پھر مہینوں وہ یہ بھول جاتی ہیں کہ انہوں نے کبھی افسانہ بھی لکھا تھا — جب مہمان داری، شادی، مارکیٹنگ، خدمت خلق اور شعبۂ نسواں سے فرصت ملتی ہے تو کبھی کبھار ایک آدھ افسانہ صاف کر کے کہیں بھیج دیا۔ آپا نے ایک بہت ہی یادگار چیز لکھنی شروع کی تھی "موج اور ساحل" ان کی یہ ناول بہار پر بیتی ہوئی ۱۹۴۶ء کی کہانی تھی۔ بہت سے حصے لکھے جا چکے ہیں۔ اس کا ایک حصہ نیا دور کے فسادات نمبر میں "ایک دن" کے نام سے نکل بھی چکا ہے۔ مگر افسوس کہ وہ یادگار چیزیں اب کہیں شائع نہیں ہو سکتی ہیں۔ ان دنوں وہ ایک ناولٹ لکھ رہی ہیں جس کے دو حصے ماہ نو میں چھپ چکے ہیں۔ پہلا حصہ "بجھتے ہوئے چراغ" اور آخری حصہ "آگ اور پتھر" کے نام سے۔

آپا کو فطرت نے بڑا ہی نرم دل اور دوررس نگاہیں بخشی ہیں۔ جس موڑ پر سے ہم لوگ آسانی سے گزر جاتے ہیں آپا ٹھٹھک کر رہ جاتی ہیں اور ان کی نگاہ ہر اس پہلو پر وہ سب کچھ آ جاتا ہے جس کو ہم نہیں دیکھ سکتے۔ اگر روزمرہ کے اتنے سارے فضول کام آپا کے سپرد نہ ہوتے تو آج وہ افسانوی دنیا میں چھا کر رہ گئی ہوتیں۔

"آنکھ مچولی" اور "گھر یا ویرانہ" آپا کے اپنے افسانے ہیں اور "ڈائن" میں انہوں نے ہم سب بہنوں پر کہانی لکھی ہے۔ آپا عرصے سے انیمیا کی مریض ہیں، مگر اب خون کی کمی نے خطرناک صورت اختیار کر لی ہے۔ ڈاکٹروں نے ان کو مکمل طور پر ریسٹ کرنے کی تاکید کی ہے مگر باغ کی دیکھ بھال، ترکاریوں کے لان اور ان کی کیاریوں اور پھولوں کی دیکھ ریکھ کون کرے گا؟ اسی لئے آپا ڈاکٹروں کی ساری باتوں کو سنی ان سنی کر کے اپنی اسی پرانی ڈگر پر چلتی چلی جا رہی ہیں۔

(۴)

نواہا زندہ شد در شاخساراں
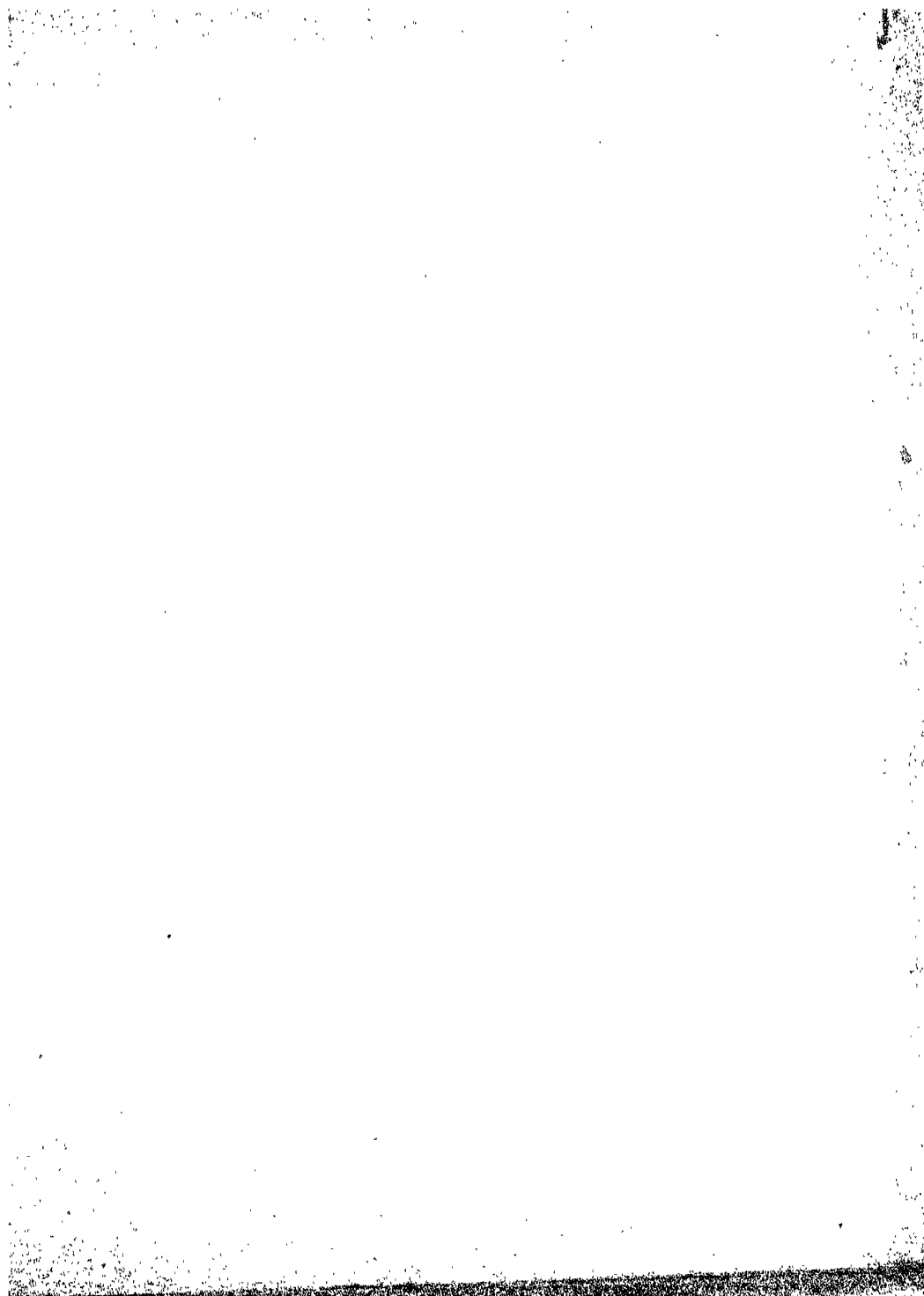
مولانا محمد علی

ضیاء الدین احمد برنی

محمد علی دو سال کے تھے کہ ان کے والد کا انتقال ہو گیا۔ اس کے بعد سے ان کی تعلیم و تربیت کا بار ماں کے ضعیف کندھوں پر آن پڑا۔ انہی کی تربیت کا اثر تھا کہ علی برادران ان عادات سے متصف ہوئے جن کی وجہ سے وہ سارے فضائے ہند پر چھا گئے۔ محمد علی نے نہ صرف بین الاسلامی بلکہ بین الاقوامی شہرت حاصل کی۔

محمد علی پہلے بریلی کے اسکول میں بھیجے گئے۔ اس کے بعد علی گڑھ میں تعلیم پاتے رہے۔ وہاں سے انگلستان گئے اور آکسفورڈ سے بی۔ اے کی ڈگری حاصل کی۔ آئی سی۔ ایس کے امتحان میں وہ گھوڑے کی سواری میں فیل ہو گئے اور ملک و ملت کے لئے یہ اچھا ہی ہوا ورنہ وہ زیادہ سے زیادہ کلکٹر بنتے اور کمشنر ہو کر ہزاروں کلکٹروں کی طرح گمنامی کی حالت میں مر جاتے۔

ولایت سے آنے کے بعد وہ کچھ دن تک رام پور کے محکمۂ تعلیم میں ملازم رہے۔ وہاں سے بڑودہ پہنچ گئے اور پھر نوساری میں کمشنر مقرر ہو گئے۔ بڑودہ میں تقریباً چھ سات سال تک ملازمت کی۔ مضامین نگاری کا شوق پہلے سے تھا۔ "ٹائمز آف انڈیا" (بمبئی) کے ایڈیٹر مسٹر لووٹ فریزر ان کے دوست تھے۔ ان کی درخواست پر انہوں نے ملک کی سیاسی حالت پر چند مضامین لکھے جو بعد کو کتابی صورت میں بھی شائع ہو گئے۔

بعض باتوں کی وجہ سے وہ بڑودہ کی ملازمت سے دل برداشتہ ہو گئے تھے اور اس لئے انہوں نے دو سال کی چھٹی لے لی اور کلکتہ چلے گئے۔ پنجاب کے لفٹیننٹ گورنر سر مائیکل اوڈوائر ان کے دوست تھے جب انہیں معلوم ہوا کہ محمد علی خالی ہیں تو انہوں نے بادرہ کی وزارت تعلیمی پیش کی۔ اسی طرح ایک دو اور ریاستوں نے بھی انہیں اپنانے کی کوشش کی مگر محمد علی نے ان پیشکشوں کو ٹھکرا دیا اور کلکتہ سے ہفتہ وار اخبار "کامریڈ" نکالنے کے انتظامات میں لگ گئے۔ کامریڈ کا پہلا پرچہ ۱۴ جنوری ۱۹۱۱ء کو نکلا۔ محمد علی کی پبلک لائف صحیح معنوں میں اسی تاریخ سے شروع ہوتی ہے ۲۰ سال تک ان کی ہنگامہ پرور شخصیت دنیا کے سامنے رہی اور بالآخر ۴ جنوری ۱۹۳۱ء کو لندن میں جہاں وہ برطانیہ کے سامنے ہندوستان کا مطالبۂ آزادی پیش کرنے کے لئے گئے تھے، انتقال کر گئے۔ ان کی تمنا تھی کہ وہ غلام ملک میں نہ مریں۔ سو یہ دعا قبول ہوئی اور انہوں نے ایک آزاد ملک میں اپنی جان جان آفریں کے سپرد کی۔

محمد علی طالب علمی کے زمانہ ہی سے اپنی غیر معمولی ذہانت کے لیے مشہور رہے۔ بریلی میں بھی، علی گڑھ میں بھی اور آکسفورڈ میں بھی۔ ان کے حافظہ کا
یہ کیفیت تھی کہ وہ متعدد شعراء کی غزلیں کی غزلیں زبانی سنا دیتے تھے۔ شیکسپیئر کے ڈراموں کے بیسیوں حصے انہیں ازبر تھے۔ کبھی کبھار ایسا بھی ہوتا
تھا کہ یار لوگ بیٹھ جاتے تھے اور ان سے مختلف شعراء کا کلام سنتے تھے۔ "فسانۂ آزاد" کی بیسیوں طویل طویل عبارتیں بھی انہیں یاد تھیں۔
ابتدا ہی سے وہ بہت محنتی تھے۔ حالانکہ ذہین طلبا بالعموم محنت سے جی چرایا کرتے ہیں۔ یہی حالت آخر وقت تک رہی۔ میرے خیال میں انہوں
نے کم و بیش کئی ہزار کتابیں پڑھی ہوں گی۔ وہ سیکرٹریٹ اور کانگرس کی شائع کردہ رپورٹوں کا بھی گھنٹوں بیٹھ کر مطالعہ کیا کرتے تھے۔ راتوں کو دیر تک جاگنے
کے عادی تھے۔ ۱۹۱۴ء میں انہوں نے لندن ٹائمز کے اشتعال انگیز مضمون "ترکوں کی پسند" کا جو دندان شکن جواب دیا تھا وہ ایک ہی نشست میں جو ۴۶
گھنٹوں پر مشتمل تھی، لکھا گیا تھا۔ اس اثنا میں انہوں نے اپنے اوپر خواب و خور حرام کر لیا تھا۔ صرف چائے، بسکٹ اور کافی پی پی کر وقت گذاری
کرتے رہے۔ مجھے وہ سماں اب بھی اچھی طرح سے یاد ہے۔ وہ بستر پر بیٹھے بیٹھے لکھ رہے ہیں، بیسیوں کتابیں ادھر ادھر بکھری پڑی ہیں، کبھی اس سے
اقتباس لیتے ہیں اور کبھی اس سے۔ یہ مضمون نہ صرف انشا پردازی کا بہترین نمونہ ہے بلکہ معلومات اور دلائل کے اعتبار سے بھی وہ اس قدر پُرزور
ہے کہ خواہ مخواہ داد دینے کو جی چاہتا ہے۔ لندن کی گول میز کانفرنس کے دوران میں باوجود علالت کے وہ مطالعہ کرتے رہے۔ بیمار ہیں مگر ملک و
ملت کے مسائل پر غور کر رہے ہیں، اسکیمیں تیار کر رہے ہیں، انٹرویو دے رہے ہیں، تقریریں کر رہے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ اگر ان کا حافظہ اس قدر
قوی نہ ہوتا تو یقیناً ان کی تقریریں اور مضمون اتنے جامع نہ ہوتے۔ یہ سب ذہانت اور محنت کے کرشمے ہیں۔

علی برادران کی باہمی محبت :

محمد علی کو اپنے بڑے بھائی (شوکت علی) سے غیر معمولی محبت تھی۔ آج کل کے لوگ اس کا اندازہ نہیں کر سکتے۔ شوکت علی ان سے بہت
کام لیا کرتے تھے۔ محمد علی جز بز ہوتے تھے مگر انہیں احساس تھا کہ وہ چھوٹے بھائی ہیں اور اس لئے انہیں بڑے بھائی کا کہنا (بلا چون و چرا) مان
لینا چاہیئے۔ ایک مرتبہ انہیں "سگ باش برادر خورد مباش"۔ "خر باش برادر بزرگ مباش" کی مثل بتائی گئی تو اس کے جواب میں انہوں نے کہا
"میں سگ بننا پسند کروں گا، لیکن یہ کبھی پسند نہ کروں گا کہ میرے بھائی خر کہلائیں"۔ علی گڑھ میں دونوں بھائیوں کے برادرانہ تعلقات کے
چرچے رہا کرتے تھے۔ شوکت علی انہیں چھیڑنے یا غصہ دلانے کی غرض سے یا کبھی کبھار دوسروں کے سامنے اپنی شانِ کی دھونس جمانے کے لئے
ان سے سب کے روبرو جھڑک جھڑک کر کام لیا کرتے تھے، مگر وہ اطاعت اور فرمانبرداری کے جذبے کے ساتھ ان کے ہر حکم کی تعمیل کرتے تھے۔
۲۳-۱۹۲۲ء میں جب دونوں بھائی بیجاپور جیل میں محبوس تھے، اس زمانہ کا ذکر ہے کہ شوکت علی کی بعض "حرکتوں" کی وجہ سے حکومت
نے ان سے یہ رعایت چھین لی تھی کہ وہ بی اماں سے مل سکیں۔ اس وقت محمد علی نے نہایت ایثار سے کام لے کر اپنے ایک خط میں (جو جیل سے
لکھا گیا تھا اور میرے پاس سنسر شپ کے لئے آیا تھا) بی اماں کو یوں لکھا :

"۔۔۔۔۔۔ میری جنت یا تلواروں کی چھاؤں میں ہے یا آپ کے قدموں کے نیچے ہے۔ تاہم مجھے یہ قبول ہے
کہ آپ کو دیکھے بغیر آپ سے ہمیشہ کے لئے اس دنیا سے رخصت ہو جاؤں۔ مگر یہ ہرگز قبول نہیں کہ میں تو
آپ کے دیدار سے سعادت اندوز ہوا کروں اور شوکت کی آنکھیں اس نظارہ کو ترسا کریں۔ وہ ہر حالت
میں مجھ سے کہیں زیادہ آپ کی محبت اور اس انعام کے مستحق ہیں۔"

مذکورہ بالا عبارت دنیا کے ہر ادب کے لئے باعثِ فخر ہو سکتی ہے اس لئے کہ اس میں نہ صرف ماں کے احترام کو نہایت خوبی
سے دکھایا گیا ہے بلکہ بڑے بھائی کی عزت کو بھی جس خوبصورتی سے نبھایا گیا ہے وہ آپ اپنی نظیر ہے۔

انگریزوں سے دشمنی : — اسے آکسفورڈ کا اثر سمجھئے یا کسی اور سبب پر محمول کیجئے مگر یہ حقیقت ہے کہ محمد علی شروع شروع میں یعنی "کامریڈ"

کی ابتدائی زندگی میں انگریزوں کے بالکل مخالف نہ تھے۔ ان کے بہت سے دوست جو آکسفورڈ میں ان کے ساتھ پڑھتے تھے، ہندوستان میں بڑے بڑے عہدوں پر فائز تھے۔ ان سب سے ان کے تعلقات دوستانہ اور مصالحانہ رہے مگر نظربندی کے زمانہ میں ان کی طبیعت نے پلٹا کھایا اور انہیں انگریزوں سے ہمیشہ کے لئے نفرت ہو گئی اور انہوں نے طے کر لیا کہ اب انگریزوں کو نکال کر ہی دم لیں گے۔ گول میز کانفرنس کی تقریر میں بھی یہی جذبہ کارفرما تھا۔ میرے خیال میں وہ سب سے پہلے لیڈر ہیں جنہوں نے کانفرنس میں بیٹھ کر انگریزوں سے للکار کر کہا کہ یہ مقصد ہو چکا ہے کہ ہندوستان پر برطانوی تسلط نابود ہو کر رہے۔ ساتھ ہی انہوں نے انگریزوں کی طرف دوستی کا ہاتھ بھی بڑھایا مگر یہ پیشکش اس سے مختلف تھی جو "کامریڈ" کے اجرا کے وقت کی گئی تھی۔

انگریز اس لئے مخالف ہو گئے تھے کہ انہوں نے ملکی و ملی جنگیں لڑنا شروع کر دی تھیں۔ سر جیمز میسٹن جو یو۔پی کے لفٹیننٹ گورنر تھے، محمد علی کے خصوصی دوستوں میں تھے مگر جب انہوں نے دیکھا کہ ان کے مشورہ کے برخلاف وہ کانپور کی مسجد کے قضیہ میں سرگرمی سے حصہ لے رہے ہیں تو وہ ان کے خلاف ہو گئے۔ یہ مخالفت اور زیادہ زوروں پر ہو گئی جب محمد علی نے ریمزے میکڈانلڈ اور دوسرے انگریز دوستوں کی امداد سے لارڈ ہارڈنگ پر زور ڈلوا کر کانپور کی مسجد کا فیصلہ بڑی حد تک مسلمانوں کے حق میں کرا لیا۔ محمد علی کی نظربندی (۱۹۱۵ء سے ۱۹۱۹ء تک) ایک بڑی حد تک میسٹن کی مخالفت کی رہین منت ہے۔

مقدمہ کراچی میں وہ عدالت میں انگریز جج بی۔سی کینیڈی کی آمد پر کھڑے تک نہیں ہوتے تھے۔ سرکاری وکیل راس آلسٹن نے جن سے محمد علی کی پرانی شناسائی تھی، آخر ایک دن پوچھ ہی لیا کہ "مسٹر محمد علی! میں دیکھتا ہوں کہ آپ جج کی آمد پر کھڑے بھی نہیں ہوتے، حالانکہ آپ دیکھتے ہیں کہ میں خود بخود کھڑا ہو جاتا ہوں۔" محمد علی نے جواب دیا کہ "آپ کو تو اسی بات کی فیس ملتی ہے۔"

اس معاملہ میں شوکت علی بھی محمد علی کے ہم نوا تھے۔ بمبئی کے محلہ مدن پورہ میں ایک مرتبہ تقریر کرتے ہوئے انہوں نے فرمایا: "گلیڈ اسٹون ترکوں کو یورپ سے بوریا بستر سمیت نکال دینے کا حامی تھا لیکن ہم انہیں نکالتے وقت بوریا بستر بھی رکھوا لیں گے۔ یہ مال ہمارا ہے۔" ایک اور موقع پر انہوں نے انگریزوں کے خلاف تشدد برتنے کا ذکر کرتے ہوئے کہا: "میں جب کبھی انہیں قتل کرنے کا خیال کرتا ہوں تو بیک آرنلڈ اور تھیوڈور مارسین کی نیلی نیلی آنکھیں راہ میں حائل ہو جاتی ہیں اور میری تلوار کند ہو جاتی ہے۔" (یہ صرف مفہوم ہے، اصل الفاظ اس وقت میرے سامنے نہیں ہیں)

گول میز کانفرنس:

انگریز دشمنی کے باوجود محمد علی گول میز کانفرنس میں شریک ہوئے۔ ان کی شرکت ان کی حب الوطنی کا سب سے بڑا مظاہرہ تھا۔ وہ اس وقت سخت بیمار تھے اور جہاز میں اسٹریچر پر لٹا کر لیجائے گئے تھے۔ روانگی سے پیشتر جب ان سے پوچھا گیا کہ آپ لندن کیوں جا رہے ہیں تو ان کی زبان سے بے ساختہ نکلا کہ مرنے کے لئے جا رہا ہوں۔ لیکن ایک بیان میں انہوں نے فرمایا تھا کہ حکومت نے صلح و آشتی کا جو دروازہ کھولا ہے میں اسے بند کرنا نہیں چاہتا۔ اس موقع پر کئی ایک اخبارات نے لکھا تھا کہ جب اس کانفرنس میں کانگرس شرکت نہیں کر رہی ہے تو محمد علی کو بھی شریک نہیں ہونا چاہئے۔ اردو اخبارات میں مخالفت میں نظمیں بھی لکھی گئی تھیں، سنجیدہ اور غیر سنجیدہ دونوں۔ غلام احمد خاں آرزو (مدیر ہندوستان، بمبئی) نے بھی ایک "سنجیدہ" نظم لکھی تھی جس کے چند اشعار درج ذیل کئے جاتے ہیں:

اللہ کا سپاہی اور گول میز پنچایت

تیرا تھا قول فیصل "آزادیٔ مکمل" — ہندوستان بھر میں جس سے مچی تھی ہلچل
گمراہ ہو گیا خود ہم کو دکھا کے مشعل — وہ ولولہ وہ جذبہ سب ہو گیا معطل

اب دستِ طمع اس کی جانب بڑھا ہوا ہے　　جو واللہ مسلموں کے خوں میں رنگا ہوا ہے
اغیار کی عدو پہ کیسا تلا ہوا ہے　　لیکن نہ جانے تیری غیرت کو کیا ہوا ہے

آزادیٔ وطن کیا لیں بے خطر ملے گی؟　　قربانیاں دیئے بن فتح و ظفر ملے گی؟
لندن کے ہوٹلوں میں کھا کر ڈنر ملے گی؟　　جیلوں ہی میں ملے گی وہ چیز اگر ملے گی

محل، بندرگاہ، پر اور تقریباً سارے راستہ کالی جھنڈیاں لہرائی گئی تھیں۔ محمد علی اسٹریچر سے یہ تماشا دیکھ رہے تھے اور گول میز والی تقریر میں انہوں نے اس واقعہ کی طرف اشارہ بھی کیا ہے۔

مگر محمد علی ان چیزوں سے مطلق متاثر نہیں ہوئے۔ وہ جس چیز کا ارادہ کر چکے تھے وہ اٹل تھی

جب محمد علی کانگرس سے علیحدہ ہوئے اس وقت وہ سارے ہندو پریس کے غصہ کا نشانہ بن گئے تھے۔ لیکن مرنے سے چند ہفتے قبل بینٹ جیمز پیلس میں جب انہوں نے معرکۃ الآرا تقریر کی تو اس مخالفت کے سارے تار و پود بکھر گئے۔ بمبئی کے سب سے ممتاز قوم پرست اخبار "بمبئی کرانیکل" نے ان کی وفات پر جو خراجِ تحسین پیش کیا اس کا آخری حصہ ملاحظہ کیجئے:

"مولانا محمد علی کی آخری تقریر سے اس توانائی بخش قومیت کی اسپرٹ کا اظہار ہوتا ہے جو زندگی بھر ان کا نمایاں جوہر رہا۔۔۔۔۔۔ اگرچہ وہ کانگرس سے الگ ہو گئے تھے لیکن انہوں نے گول میز کانفرنس میں اپنے گرجدار آواز میں کہا: "ہندوستان اب برطانوی تسلط کو برداشت نہیں کرے گا"۔۔۔ اس جملہ سے کسی ایماندار کانگرسی کو اختلاف نہیں ہو سکتا۔ ان کی وفات سے دنیا ایک دلچسپ اور ہنگامہ پرور شخصیت سے محروم ہو گئی ہے"

محمد علی کی بے باکی:۔

محمد علی ہمیشہ سے بے باک تھے۔ انہوں نے کبھی نتائج و عواقب کی پروا نہیں کی۔ وہ جو کچھ کہنا چاہتے تھے برملا کہتے تھے۔ گول میز کانفرنس میں انہوں نے جو کھری کھری باتیں کہیں وہ ہندوستان کے کسی اور لیڈر نے نہیں کہیں۔ اسی طرح پہلی اسلامی موتمر میں جو حجاز میں منعقد ہوئی تھی انہوں نے اپنی گرجدار آواز میں سلطان ابن سعود (مرحوم) کو مخاطب کر کے صاف صاف کہہ دیا تھا:

"تو اپنے آپ کو اس مقدس سرزمین کا بادشاہ (ملک الحجاز) کہتا ہے اور کہلواتا ہے جہاں رسول مقبولؐ نے اپنی زندگی بسر کی تھی حالانکہ تیرے پیشرو ترکوں نے ہمیشہ اپنے آپ کو خادم الحرمین کہا اور کہلوایا۔ تو بھی ان کی تقلید میں اپنے آپ کو خادم الحرمین کہہ اور ملوکیت پر جو حضرت معاویہؓ کی سنت ہے ہرگز ہرگز نہ چل"

یہ باتیں ایک سر پھرا ہی کہہ سکتا ہے اور محمد علی اپنے زمانے کا سب سے بڑا سر پھرا تھا۔ اعلائے کلمۃ الحق کی اس سے بہتر مثال اور کیا ہو گی؟

شانِ مذہبیت:۔

محمد علی کی مذہبیت جنون کی حد تک پہنچی ہوئی تھی۔ بالفاظِ دیگر ان کا ہر کام (دشمنی و دوستی) اللہ کے لئے تھا۔ نظربندی کے زمانہ میں جب سپرنٹنڈنٹ پولیس عبدالمجید سی۔ آئی۔ ڈی کے افسر اعلیٰ سر چارلس کلیولینڈ کے ایماء پر چھندواڑہ پہنچے تاکہ رہا کرنے سے پیشتر علی برادران سے ایک عہد نامہ پر دستخط کرائیں جس میں یہ وعدہ درج ہو کہ وہ غیر آئینی طریقوں اور تشدد سے ہمیشہ محترز رہیں گے تو محمد علی نے اس عبارت میں یہ اضافہ کیا کہ سب سے پہلے مجھ پر اللہ کی اطاعت فرض ہے اور بادشاہِ وقت سے میری وفاداری اس شرط سے مشروط ہے کہ اگر دنیاوی قوانین خدائی احکام سے ٹکرائیں گے تو اس صورت میں میں صرف اللہ کے احکام کی اطاعت کروں گا۔" حکومتِ وقت نے اسے قبول نہیں کیا اور اس لئے دونوں بھائیوں کو مزید دو سال تک قید رہنا پڑا۔

مقدمہ کراچی میں بھی جو طویل بیان انہوں نے دیا تھا اس کے دوران میں راڈویل کا ترجمہ قرآن ہاتھ میں لے کر فرمایا تھا :

"قرآن مجید کے اس ترجمہ کی طرف دیکھئے اس میں بہت سی باتوں کی بار بار تکرار موجود ہے لیکن اس کے باوجود یہ ایک چھوٹی سی کتاب ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ہمارے مذہب کے تمام احکام اور جملہ قوانین کا واحد، اہم اور جاں بخش منبع یہی کتاب ہے ۔ ۔ ۔ ۔ آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ میرے مذہب کا حقیقی سرچشمہ کہاں واقع ہے۔ ہمارے مذہب کا ایک اور منبع بھی ہے جسے احادیث کہتے ہیں لیکن حقیقی اور اصل سرچشمہ یہی کتاب ہے اور کوئی مسلمان ایسا نہیں جسے کسی آیت کے بارے میں کوئی اختلاف ہو۔ میرے مذہب کی یہی سب سے یقینی اور سب سے محفوظ بنیاد ہے اور اس کے بارے میں دو رائیں ہونے کا کوئی امکان نہیں۔"

اس کے بعد انہوں نے فرمایا کہ جہاں کہیں اور جب کبھی دنیوی اور مذہبی احکام کا ٹکراؤ ہوگا۔ میں ہمیشہ مذہبی احکام کو مانوں گا اور دنیوی احکام کو مذہبی احکام کے تابع سمجھوں گا۔

محمد علی کے لطیفے :-

ان باتوں کے باوجود ان میں خشکی نام کو نہ تھی۔ ان کی بے شمار خوش گپیاں اور بذلہ سنجیاں ثبوت ہیں اس بات کا کہ وہ قدرت کی طرف سے کیسا دل لائے تھے۔ وہ درحقیقت اپنے دور کے دوسرے غالب تھے۔ چند لطیفے ملاحظہ ہوں:

ایک مرتبہ حکیم محمد اجمل خاں کے مکان پر محمد علی کسی مشاورتی جلسہ میں شریک تھے۔ حکیم صاحب کسی ضرورت سے زنان خانہ میں گئے ہوئے تھے کہ اتنے میں ایک شخص آموں کی سینی لایا جس میں ایک خط بھی رکھا ہوا تھا۔ بعض لوگوں نے رائے دی کہ خط کو تو پڑھ دیا جائے۔ محمد علی نے کہا کہ پڑھنے کی ضرورت نہیں یہ پرچہ ترکیبِ استعمال ہے۔ حکیم صاحب کا مکان اور پرچہ ترکیبِ استعمال کس قدر برمحل ہے۔

ظفر الملک (ایڈیٹر 'الناظر' مرحوم) ایک مرتبہ سدری کا سبز لبادہ پہنے ہوئے مسلم لیگ کے جلسہ میں شریک ہوئے۔ ان کا کنٹوپ بھی اسی رنگ کا تھا محمد علی نے دیکھتے ہی یہ پھبتی کسی "یہ ہریل کہاں سے آگیا؟" اس پر زور کا قہقہہ پڑا۔

حکومت ہند میں ایک زمانہ میں مسٹر ڈینس برے ہوم ممبر تھے۔ اپنے اخبار 'کامریڈ' میں محمد علی نے لکھا :
"کون کہتا ہے کہ اسمبلی میں گدھے نہیں ہوتے۔ وہاں بھی ایک گدھا ہے۔ کیا تم نے اسے (BRAY) یعنی رینگتے ہوئے نہیں سنا؟" یہ مذاق 'لندن ٹائمز' میں بھی نقل ہوا تھا۔

جن دنوں اینگلو انڈین اخبارات دربار دہلی میں مہاراجہ بڑودہ کے طرزِ عمل پر نکتہ چینی کر رہے تھے اس زمانہ میں بڑودہ کا ریذیڈنٹ ایک آئی سی ایس تھا جس کا نام کوب تھا۔ اس نے مہاراجہ کے خلاف زہر چکانی میں نمایاں حصہ لیا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ مہاراجہ کو بادشاہ کی شان میں بے ادبی کرنے کی سخت سے سخت سزا ملے۔ اینگلو انڈین اخبارات اور ریذیڈنٹ کی مہم کے جواب میں محمد علی نے اپنے سابق آقا کی حمایت میں 'کامریڈ' میں COB AND HIS COBWEBS کے عنوان سے کئی ایک مضامین لکھے جن میں کاب کی سازشوں کی دھجیاں بکھیر کر رکھ دی تھیں۔ COBWEB مکڑی کے جالے (تارِ عنکبوت) کو کہتے ہیں۔ اس میں یہ رعایت رکھی گئی ہے کہ کوب کے دلائل تارِ عنکبوت سے زیادہ وقعت نہیں رکھتے۔ محمد علی ابھی چھٹی پر ہی تھے لیکن سلسلۂ مضامین شروع کرنے سے پیشتر انہوں نے استعفیٰ دے دیا تھا تاکہ یہ نہ کہا جائے کہ وہ مہاراجہ کے ملازم ہیں۔

محمد علی سیاسیات میں "نو چینجر" تھے یعنی وہ نہیں چاہتے تھے کہ ہندوستانی نمائندے اسمبلیوں میں جائیں اور تضیعِ اوقات کریں۔ برخلاف اس کے ایک طبقہ ایسا تھا جو اسمبلیوں میں رہ کر تخریبی مہم جاری رکھنا چاہتا تھا۔ انہی دنوں کا قصہ ہے کہ محمد علی اسمبلی کا تماشا دیکھنے کے لئے پریس گیلری میں جا کر بیٹھ گئے۔ پنڈت شام لال نہرو نے انہیں دیکھتے ہی کہا: "مسٹر محمد علی! جب آپ یہاں تک تشریف لے آئے ہیں تو پھر نیچے آ جائیے۔" محمد علی نے

جس پر جواب دیا "میں یہاں اس بلندی سے آپ کی پستی دیکھنے کے لئے آیا ہوں" ممبران اسمبلی کھسیانے ہو کر رہ گئے۔ محمد علی کے اصل الفاظ تھے:

I HAVE COME HERE TO LOOK DOWN

"ہمدرد" کے آخری دور میں محمد علی کو ایک آرٹسٹ کی ضرورت تھی۔ چنانچہ عبدالسمیع خان جو بوشنگ آباد کے رہنے والے ہیں اور آج کل کراچی میں قیام پذیر ہیں، اس سلسلہ میں ان سے ملنے کے لئے گئے۔ محمد علی نے پوچھا کہ کہاں کے رہنے والے ہو؟ سمیع صاحب نے کہا کہ سی۔ پی (ہوشنگ آباد) کا رہنے والا ہوں۔ محمد علی نے حیرت سے پوچھا کہ کیا سی۔ پی میں بھی آرٹسٹ ہوتے ہیں؟ سمیع صاحب نے برجستہ کہا "آرٹسٹوں کو تو پیچھے چھوڑئیے، سی۔ پی میں تو قیمتی موتی پیدا ہوتے ہیں"۔ محمد علی چونک گئے اور اس قدر خوش ہوئے کہ انہیں فوراً رکھ لیا۔ محمد علی عمر بھر اس لطیفہ کو نہیں بھولے۔ وہ جب کبھی کسی سے ان کا تعارف کراتے تو کہتے کہ یہ سی۔ پی کے موتی ہیں۔

محمد علی اسمبلی جاتے وقت کبھی کبھی سمیع صاحب کو بھی ساتھ لے جاتے تھے تاکہ وہ مختلف ممبروں کی نشست و برخاست کے انداز کو دیکھ کر اسکیچ بنائیں۔ یہ اسکیچ اخبار میں چھپتے تھے۔ ان اسکیچوں کی سرخیاں محمد علی اپنے ہاتھ سے لکھتے تھے جو بہت برمحل اور معنی خیز ہوا کرتی تھیں۔ کبیرالدین احمد ان دنوں بنگالی مسلمانوں کے نمائندہ تھے۔ ان کے اسکیچ کے نیچے محمد علی نے لکھا "THE WIT AND WISDOM OF BENGAL" یعنی بنگال کی نکتہ سنجی اور دانشمندی۔ ان صاحب کی تقریریں بہت دلچسپ ہوتی تھیں اور دوران تقریر میں وہ اپنے مزاح سے ممبروں کو ہنسایا کرتے تھے۔ —— سر فریڈرک وائٹ کے اسکیچ کے نیچے انہوں نے نام کی رعایت سے لکھا "WHITE MEN'S BURDEN." اس لئے کہ انگریز یعنی جملہ سابق حکمران کہا کرتے تھے کہ خدا نے برنصیب ہندوستان کی حکومت کا بار ہمارے کندھوں پر رکھا ہے اور وہ موقع بے موقع اس دلیل کو اپنی حکومت کے قیام کے جواز میں پیش کرتے تھے۔ انگریز (WHITEMEN) اس حکومت کو خدائی امانت سے بھی تعبیر کرنے کے عادی تھے۔ محمد علی جناح کے اسکیچ کے نیچے انہوں نے لکھا "THE BOMBAY DUCK RESTING." اس میں جناح کے لباس کی طرف اشارہ ہے جو جناح اس بارے میں غیر معمولی طور پر محتاط رہا کرتے تھے۔ ڈک ہنس کو کہتے ہیں جو سفید براق پروں کا پرندہ ہے۔ جناح کے صاف ستھرے لباس پر شکن اور چرس تک نہ ہوتی تھی۔ اس ریمارک کی موزونیت کس قدر برمحل ہے۔

محمد علی کی مخالفتیں :۔

دارالسلطنت کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ محمد علی بھی کلکتہ سے دہلی آ گئے۔ کلکتہ سے "کامریڈ" کا آخری پرچہ ۴ ستمبر ۱۹۱۲ء کو نکلا تھا اور دہلی سے اسی اخبار کا پہلا پرچہ تقریباً ایک مہینے کے بعد ۱۲ اکتوبر ۱۹۱۲ء کو شائع ہوا۔ محمد علی کے آتے ہی دہلی کے کرسی نشین لیڈروں نے محسوس کر لیا کہ ایک بڑے حجم والا تارہ افقِ دہلی پر طلوع ہوا ہے اور یہ کہ اب ان سب کی لیڈری ماند پڑ جائے گی۔ ان کی آمد سے پہلے خان بہادروں اور رائے بہادروں نے لیڈری پر قبضہ کر رکھا تھا مگر ان کے آتے ہی یہ بت گر گر کر پاش پاش ہو گئے۔ انہوں نے چیف کمشنر اور ڈپٹی کمشنر کے خوب ہی کان بھرے کہ اس رام پوریے کو یہاں سے خارج البلد کر دینا چاہیئے مگر ان کی کوششیں ناکام رہیں۔ محمد علی نے آتے ہی دو معرکے سر کئے۔ ایک تو انہوں نے قصابوں کی زبردست ہڑتال کو حسن خوبی سے نمٹایا، دوسرے انہوں نے جامع مسجد والوں سے ٹکر لی اور زبردست اور مسلسل جہاد کر کے انہیں مجبور کر دیا کہ وہ نمازیوں کی آسائش کی خاطر مسجد میں دریاں اور شامیانے لگائیں۔ محمد علی کا مطالبہ عوام کا مطالبہ تھا اور اس لئے جامع مسجد کمیٹی کے ممبروں کا دل پسیجا اور انہوں نے مطالبہ کے سامنے ہزیمت خوردگی کے جذبہ کے ساتھ سر تسلیم خم کر دیا۔ محمد علی نے ایک جدت یہ کی کہ آتے ہی جامع مسجد کو اپنی تقریروں کا پلیٹ فارم بنا لیا۔ ان کی آمد سے پہلے یہاں صرف مذہبی تقریریں کی جاتی تھیں۔ غدر میں مسجد کی واگذاری کے وقت منجملہ دیگر شرائط کے یہ شرط عائد کر دی گئی تھی کہ اس میں سیاسی تقریریں ہرگز نہ کی جائیں گی مگر محمد علی نے اس شرط کی مطلق پرواہ نہ کی اور برابر تقریریں کرتے رہے۔ اس کی وجہ سے ان کے مخالفین کو ایک اور موقع مل گیا کہ وہ حکام کو آمادہ کریں کہ وہ محمد علی کو جامع مسجد میں سیاسی مجمع کرنے سے روکیں۔ مگر اس دفعہ بھی حکام کچھ نہ کر سکے۔ محمد علی کی دہلی میں

مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ جس دن وہ جمعہ کی نماز کے بعد نظر بندی کے حکم کے ماتحت دہلی سے مہرولی چلے ہیں، لاکھوں آدمیوں کا جم غفیر جامع مسجد اور اس کے باہر انہیں الوداع کہنے کے لئے جمع ہوگیا تھا اور دونوں بھائی لوگوں سے مصافحہ کرتے ہوئے سیڑھیوں سے نیچے اتر رہے تھے سب کی آنکھیں اشکبار اور دل ان کی رہائی کی دعائیں مانگ رہے تھے۔ یہ منظر آج بھی میری آنکھوں کے سامنے ہے۔

بعد کو بہت سے ایسے مسائل آئے جن کی وجہ سے ہندوستان کے لیڈر گروہوں میں بٹ گئے، مثلاً جنگ طرابلس، جنگ بلقان، ہندو مسلم منافقات، مسئلہ خلافت، نہرو رپورٹ، مسئلہ قتل مرتد، سائمن کمیشن، شدھی، گول میز کانفرنس وغیرہ۔ نہرو رپورٹ کے معاملہ میں پنجاب کے لیڈروں نے محمد علی کا ساتھ نہیں دیا اور اپنی ٹولی علیحدہ بنالی۔ اسی سلسلہ میں محمد علی پر نثر و نظم میں سب و شتم کا جو سلسلہ شروع ہوا وہ تقریباً ان کی وفات تک جاری رہا۔ مگر ان کی آخری تقریر پڑھنے کے بعد ان کے بہت سے مخالف ان کے گرویدہ ہوگئے اور کانگریسی اخبارات کی مخالفت بھی ایک گونہ جاتی رہی۔ مرنے کے بعد تو وہ تقریباً سب فرقوں کے ہیرو بن گئے تھے۔

محمد علی کا ایک معرکہ خواجہ حسن نظامی سے ہوا۔ چونکہ اس مبحث پر علیحدہ مضمون میں تفصیلی بحث کی جا رہی ہے اس لئے یہاں میں صرف اشارۃً اس کا ذکر کروں گا۔ اس جنگ میں مختلف اخبارات میں محمد علی پر اس قدر گندگی اچھالی گئی کہ پناہ بخدا۔ مگر محمد علی نے مقابلۃً اپنے مضامین میں متانت اور سنجیدگی کو ملحوظ رکھا اور یہ اردو صحافت کا درخشاں پہلو ہے۔ دوسرا معرکہ ظفر علی خان سے ہوا جو محمد علی کے خلاف نظم و نثر دونوں میں اپنی جولانی طبع کے جوہر دکھایا کرتے تھے۔ مخالفت اس حد تک بڑھ گئی تھی کہ اگر محمد علی "ہمدرد" میں قتل مرتد کے خلاف مضامین لکھتے تھے تو "زمیندار" میں قتل مرتد کی تائید میں مضامین نکلنے شروع ہو جاتے تھے وقس علیٰ ہذا۔ محمد علی کی انصاف پسندی دیکھئے کہ دوران مخالفت میں بھی انہوں نے مجھ سے دو ایک بار کہا کہ ظفر علی نظم و نثر دونوں پر یکساں قدرت رکھتے ہیں۔ بمبئی میں حافظ علی بہادر خان ایڈیٹر "الہلال" نے بھی کچھ عرصہ تک علی برادران کے خلاف محاذ قائم کیا تھا۔

مضامین محمد علی میں ڈاکٹر اقبال کے خلاف چند مضامین ملتے ہیں۔ یہ اس لئے لکھے گئے تھے کہ ڈاکٹر اقبال نے اپنے صوبہ کی کونسل میں دوران تقریر میں کہیں یہ کہہ دیا تھا کہ انہیں ہندوستانیوں پر اعتماد نہیں ہے اور اس لئے پنجاب میں انگریز افسروں کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں مقرر کیا جائے۔ محمد علی بگڑ گئے اور انہوں نے ان کی نظموں کے طویل اقتباسات پیش کر کے پوچھا کہ اقبال! تمہارے علم و عمل میں یہ تفاوت کیوں ہے؟ محمد علی کا انداز تحریر نہایت شستہ ہے اور پڑھتے وقت یہ معلوم ہوتا ہے کہ مخالفت کے باوجود وہ ڈاکٹر اقبال کے احترام کو بھی ہاتھ سے جانے دینا نہیں چاہتے۔ اقبال بھی محمد علی کا غیر معمولی احترام کرتے تھے۔ "اسیری" اور "وفات" پر اقبال نے جو لافانی نظمیں لکھی ہیں وہ ہمیں بتاتی ہیں کہ اقبال کو محمد علی کا کس قدر احترام منظور تھا۔

سرسید کے بعد غالباً محمد علی ایسے لیڈر تھے جنہیں سب سے زیادہ گالیاں دی گئیں مگر وہ ؏

گالیاں کھا کے بے مزا نہ ہوئے

پُر آشوب دور:-

حقیقت ہے کہ محمد علی نے بڑا پُر آشوب دور پایا تھا۔ جنگ طرابلس، جنگ بلقان اور پہلی جنگ عظیم ان کے زمانہ میں ہوئیں۔ اس سے قبل روسیوں اور انگریزوں کے ہاتھوں ایران کا گلا گھونٹنے کی کوششیں کی جا رہی تھیں۔ مصر انگریزوں کی غلامی میں تھا۔ طرابلس پر دول عظمیٰ نے اٹلی کا غاصبانہ قبضہ تسلیم کر لیا تھا۔ افریقہ کی دیگر شمالی ریاستیں فرانس کے پنجۂ استبداد میں تھیں۔ الغرض ساری دنیائے اسلام ایسی ہیجانی کیفیت میں تھی کہ اس کی مثال تاریخ عالم میں نہیں ملتی۔ تقریباً سب بلقانی ریاستیں ترکوں پر بے پناہ مظالم ڈھا رہی تھیں۔ محمد علی کو ایک ایک کا فکر تھا اور انہوں نے چندہ کر کے طبی مشن روانہ کئے، ترکوں کی حمایت میں وفد خلافت بھیج کر عالم اسلام کے مصائب کو ہلکا کرنے کی امکانی کوشش کی۔ ہندوستان کی

آزادی کی جدوجہد اس پر مستزاد تھی۔ ایک جان تھی جو دنیائے اسلام کے غم میں اپنے آپ کو ہلکان کئے ہوئے تھی۔ اگر یہ ساری چیزیں نہ ہوتیں تو قدرت نہ جانے محمد علی سے کیا کیا کام لیتی۔

ذاتی خصوصیات :-

پہلی جنگِ بلقان میں جو دولِ عظمیٰ کی سازش کا نتیجہ تھی، ترکوں کی پے درپے ہزیمتوں نے محمد علی کے دل پر بہت چرکے لگائے تھے ـــ دوسری جنگِ بلقان میں جو لوٹ مار کی تقسیم پر بلقانی اتحادیوں میں برپا ہوئی تھی جب غازی انور پاشا نے دولِ عظمیٰ کے احتجاج کے باوجود ایڈریانوپل پر بے مثال یلغار کرکے قبضہ کر لیا تو جتنی خوشی محمد علی کو ہوئی اتنی کسی اور کو نہ ہوئی ہوگی۔ ایڈریانوپل کے قبضہ کا تار رات کو آیا تھا اور وہ سارے مسلمانوں کو اس مسرت میں شریک کرنے کے لئے سیدھے جامع مسجد پہنچے اور دھواں دھار تقریر کی جس میں ترکوں کو اس کامیابی پر مبارکباد دی گئی تھی اور دولِ عظمیٰ کی سازشوں کو بے نقاب کیا گیا تھا۔ یہ خبر دوسرے دن اخباروں میں نکلنی تھی لیکن محمد علی نے انتظار نہیں کیا اور راتوں رات سارے شہر دہلی میں یہ دل خوش کن خبر پہنچا دی۔ وہ رات بھی کیا ہیجانی رات تھی۔

جب مجاہد نقشبندی پر گولی چلی ہے اتفاقاً ان کے خسر اس میں شہید ہوگئے تو پولیس نے تحقیقات میں بہت کچھ لیت و لعل سے کام لیا۔ بھیا احسان الحق جو محمد علی اور خواجہ حسن نظامی دونوں کے دوست ہیں، سیدھے محمد علی کے پاس پہنچے اور انہیں صورتِ حالات سے واقف کیا۔ یہ وہ زمانہ ہے جبکہ خواجہ صاحب اور محمد علی میں قلمی جنگ ہو رہی تھی۔ لیکن ذاتی تعصبات کو بالائے طاق رکھ کر انہوں نے دہلی کے ڈپٹی کمشنر بیڈن سے ٹیلیفون پر ایک گھنٹہ تک گفتگو کی اور انہیں معاملے کے نشیب و فراز سے آگاہ کیا اور زور دیا کہ اس قتل کی پوری پوری تحقیقات کی جائے اور مجرموں کو قرار واقعی سزا دی جائے۔ محمد علی کے کیرکٹر کی اس بلندی کا ذکر آج بھی بھیا احسان بڑے فخر سے کیا کرتے ہیں۔

محمد علی ذیابیطس کے مرض میں مبتلا رہتے تھے۔ مرض کا کما حقہٗ علاج اس لئے نہیں ہو سکا کہ وہ پرلے درجہ کے بدپرہیز واقع ہوئے تھے۔ وہ آموں کے عاشق تھے لیکن کسی نوع آموں کو چھوڑنے پر رضامند نہ تھے۔ ایک دن خود بھی آم کھا رہے تھے اور دوسروں کو بھی کھلا رہے تھے کہ دورانِ گفتگو میں میرے ایک سوال کے جواب میں فرمایا "خواہ جان چلی جائے مگر میں آم کسی حالت میں نہیں چھوڑوں گا"۔ بعد کو ڈاکٹروں کے زور دینے سے انہوں نے ایک آم یومیہ پر قناعت کر لی تھی لیکن وہ ایک آم سائز میں کئی آموں کے برابر ہوا کرتا تھا۔

لباس کے معاملے میں (کم سے کم ابتدائی دور میں) وہ دوسرے محمد علی جناح تھے۔ آخر میں جب انہوں نے اپنی وضع قطع بدل لی اور ڈھیلا ڈھالا جبہ پہننا شروع کر دیا اس وقت بھی وہ اچھی قسم کا کھدر استعمال کرتے تھے۔ مدت تک محمد علی کوٹ پتلون میں ملبوس رہے۔ ان کے ابتدائی فوٹو آپ کو اسی سوٹ بوٹ میں ملیں گے۔ وہ انگرکھا اور چوڑی دار پاجامہ بھی زیب تن کرتے تھے۔ ٹوپی سفید رنگ کی بالوں والی استعمال کرتے تھے۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ان کی ٹوپی میلی ہو گئی۔ جبل پور کے ایک خلافتی کارکن تھے جن کا نام اس وقت میرے ذہن سے اتر گیا ہے۔ وہ اس وقت لمبے بالوں کی نئی نئی ٹوپی پہنے پاس ہی بیٹھے تھے۔ محمد علی نے اپنی ٹوپی اتار کر ان کے سر پر رکھ دی اور ان کی ٹوپی خود پہن لی۔ خلافتی کارکن اس عزت افزائی پر بے حد خوش تھے مگر ارد گرد کے لوگ ہنس دیئے اور بات آئی گئی ہو گئی۔ یہ حقیقت ہے کہ جو لباس بھی وہ زیب تن کرتے تھے وہ ان پر خوب سجتا تھا۔ ترکی مشن میں وہ فوجی لباس میں نظر آتے ہیں۔ اپنے ڈیل ڈول سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کہیں کے کرنل انچیف ہیں۔ یہ فوجی لباس بھی انہیں خوب زیب دیتا تھا۔

غالباً ۱۹۱۳ء یا ۱۹۱۴ء کا واقعہ ہے کہ تار کا ہرکارہ ایک ضروری تار بہت تاخیر سے لایا اور جب اس سے پوچھا گیا تو خاطر خواہ جواب دینے کی بجائے اس نے اکڑنا شروع کر دیا۔ اس پر محمد علی نے آؤ دیکھا نہ تاؤ اسے خوب پیٹا اور پھر خود ہی تار گھر والوں کو ٹیلیفون پر اطلاع بھی کر دی۔ سپرنٹنڈنٹ نے کہا کہ تار بہت دیر پہلے بھیجا گیا تھا، اس نے بالضرور راستہ میں وقت ضائع کیا ہوگا۔ پھر اس نے تار کے دیر سے پہنچنے کی معذرت چاہی اور کہا کہ آپ نے اچھا کیا کہ اسے سزا دے دی۔

ایک دن محمد علی میرے سامنے "روزنامہ خلافت" کے ایڈیٹر حافظ علی بہادر کو ڈانٹ رہے تھے کہ انہوں نے سوقیانہ اشتہار اپنے یہاں کیوں چھاپا۔ وہ آمدنی کی کمی کا عذر کرنے لگے۔ اس وقت انہوں نے فرمایا: "میں فاقے کرنا بہتر سمجھتا ہوں لیکن سوقیانہ اشتہاروں کو کبھی قبول نہ کروں گا۔" اس دن کے بعد سے کبھی کوئی مخرب اخلاق اشتہار "روزنامہ خلافت" کی زینت نہ بن سکا۔ "مراد آباد میں مردہ زندہ ہوگیا" یا "اس کے پڑھنے سے بہتوں کا بھلا ہوگا" جیسے اشتہارات بھی محمد علی کی نظروں میں شجر ممنوعہ کی حیثیت رکھتے تھے۔

اپنی زندگی میں انہوں نے بہت سوں کو مختلف ریاستوں میں اچھے اچھے عہدوں پر ملازم کروا دیا۔ وہ بہت دوست نواز تھے۔ کئی رئیسوں سے ان کے تعلقات گہرے اور دوستانہ تھے۔

جب کبھی انہیں روپے کی ضرورت پڑتی تو وہ اپنے دوستوں ہی کو تکلیف دیتے۔ اس سلسلہ میں مہاراجہ محمود آباد سے بھی انہوں نے بہت سی رقمیں لیں۔ نواب حمید اللہ خاں بھی ان کی مدد کرتے رہتے تھے۔ ایک مرتبہ ریاست بھوپال نے شبلی کی سیرۃ نبوی کے ترجمے کے سلسلہ میں انہیں پانچ ہزار روپے دیے۔ ترجمہ کا کام ابتدائی منزل سے کبھی آگے نہیں بڑھا۔ اگر وہ مکمل ہو جاتا تو ایک اور عظیم الشان خدمت ان سے بن پڑ جاتی۔

"محمد علی ہر اعتبار سے دیو پیکر تھے۔ ان کے رفقاء اور ان کے معاصر ان کے سامنے پودنے تھے۔" یہ سچ ہے کہ وہ بے حد جذباتی آدمی تھے اور بعض اوقات انہیں اپنے اوپر قابو نہ رہتا تھا۔ جب وہ دہلی سے لینسڈاؤن بیجاتے جا رہے تھے تو شاید الہ آباد کے اسٹیشن پر انہیں چند انگریز نظر آگئے۔ انہوں نے چلا کر کہا: "یہ نکال دو ان حرامزادوں کو۔"

وہ دوستوں کے جاں نثار دوست تھے اور یہ حقیقت ہے کہ انہیں جتنے مخلص دوست اور کارکن ملے وہ مشکل سے کسی اور کو ملے ہوں گے۔ میر محفوظ علی، حکیم اجمل خاں، عبدالماجد دریابادی، چودھری خلیق الزماں، پروفیسر نواب علی، ڈاکٹر انصاری، مولانا سلیمان ندوی، سید حسین، راجہ غلام حسین، ولایت علی بمبوق، عبدالرحمٰن صدیقی، شعیب قریشی وغیرہ ان میں سے ہیں جو محمد علی کے ہمیشہ فدائی رہے۔ ہندوؤں میں مسز نائیڈو ان کی عاشق زار تھیں، اور نہرو اور پکتھال پر ان کی قابلیت نے جو سکہ جما دیا تھا وہ آخر وقت تک قائم رہا۔ جو دوست ان سے الگ ہوئے وہ سیاسیات کی بنا پر علیحدہ ہوئے نہ کسی اور بنا پر۔ سید عبداللہ بریلوی ایڈیٹر "بمبئی کرانیکل" بھی اختلافات کے باوجود ان کے زبردست دوست اور مداح رہے۔

محمد علی کے ایک دوست نے جب ان سے غداری کی اور گول میز کانفرنس میں انہوں نے "پڑوسی جاسوس" کی طرف اشارہ بھی کیا ہے، تو دوستوں کے بیچ میں پڑ جانے سے محمد علی نے ان کا قصور دریا دلی سے معاف کر دیا مگر وہ اسے کبھی بھولے نہیں۔ کہا کرتے تھے کہ میں معاف کر سکتا ہوں مگر بھول نہیں سکتا۔ یہ عین بشریت ہے۔

ایک دفعہ محمد علی نے مولانا شبلی کی دعوت کی۔ تقسیمِ کا نپور ابھی ابھی ختم ہوا تھا۔ اس دعوت میں راقم الحروف کے علاوہ اور بہت سے دوست شریک تھے جن میں پشاور کالج کے پروفیسر محمد شفیع بھی تھے۔ دعوت کے اختتام پر مولانا شبلی نے واقعہ کانپور پر اپنی رباعیات اور نظمیں سنائیں اور پھر ایک تقریر میں محمد علی کی خدمات کو سراہا اور انہیں خراج تحسین ادا کیا۔ اس کے بعد انہوں نے فرمایا کہ آپ جس کسی شخص کے نام میں محمد اور علی کا اجتماع دیکھیں تو سمجھ جائیے کہ وہ لازمی طور پر زمانہ کا بہت بڑا آدمی ہے، اور اس سلسلہ میں تاریخ اسلام سے اپنے دعوے کے ثبوت میں بہت سے نام پیش کیے۔ محمد علی سر جھکائے اپنی تعریف سنا کیے اور پھر یکایک بولے: "سوائے عالم محمد علی والیِ ایران کا بھی تو ذکر کیجیے۔" مولانا شبلی نے معاً فرمایا کہ "یہ کلیہ کی استثنا ہے۔" اس پر زور کا قہقہہ پڑا۔

بہرحال محمد علی کی شخصیت "عجیب و غریب" تھی۔ وہ بیک وقت لیڈر، افسانہ نگار، شاعر، صحافی، مقرر، مؤرخ اور زبردست انشاپرداز تھے

لہ چند ہمعصر از مولوی عبدالحق (بہ تغیرِ الفاظ)۔

مسکرا رہا ہے کے نقل موجود ہیں۔ انہیں پڑھتے اور ان کی تحریرات پر سر دھنتے۔ انگریزی انشا پردازی کے میدان میں انہوں نے انگریزوں تک کو شکست دے دی ہے۔ ان کے اردو کے مضامین بھی تیرے روح پرور ہوتے تھے۔

بیچارے ریٹائر کے بعد محمد علی کی جو کتابیں میرے پاس آخری بار منتقل ہونے کے لئے آئیں ان میں دیوان غالب کا ایک نسخہ بھی تھا۔ محمد علی کی عادت تھی کہ وہ پڑھتے وقت اچھے اچھے شعروں پر ایک ' دو یا تین نشانات (سر) لگا دیا کرتے تھے۔ جو نسخہ ذیل میں ان کے زیر مطالعہ رہا وہ نظامی پریس کا مطبوعہ تھا۔ بعض بعض جگہ وہ ریمارک بھی لکھ دیتے تھے جو بہت پر لطف اور دلچسپ ہوا کرتے تھے۔ ایک دو مثالیں درج ذیل کی جاتی ہیں۔

غالب کا ذیل کا قطعہ ملاحظہ ہو:

نہ پوچھ اس کی حقیقت حضورِ والا نے
مجھے جو بھیجی ہے بیسن کی روغنی روٹی
نہ کھاتے گیہوں نکلتے نہ خلد سے باہر
جو کھاتے حضرت آدم یہ بیسنی روٹی

نظامی پریس والے ایڈیشن میں اس قطعہ پر جو شرح درج ہے اس پر محمد علی نے ذیل کے دلچسپ انداز میں نکتہ چینی کی تھی۔ فرماتے ہیں:

"اس لطیفہ کے آخری حصہ کا ستیاناس کر دیا۔ حکم ہوا کہ اے چنے اتیری خیر اسی میں ہے کہ ہمارے سامنے سے دور ہو جا ورنہ کچا چبا جائیں گے سب سے زیادہ پر لطف نہ دلا ہوا ہوتا ہے نہ پسا ہوا، نہ بھنا ہوا، نہ پکا ہوا بلکہ کچا بوٹ"

اسی طرح غالب کے اس غیر مطبوعہ شعر پر جو نظامی والے ایڈیشن میں درج ہے سد

چند تصویر بتاں چند حسینوں کے خطوط
بعد مرنے کے مرے گھر سے یہ ساماں نکلا

محمد علی نے ذیل کی عبارت تحریر فرمائی تھی:

"نیور تو کچھ اور ہی کہہ رہے ہیں۔ مرزا ایسے ہرجائی نہ تھے کہ چند بتوں اور حسینوں کی یادگاریں ان کا ترکہ ہوتیں۔ مگر ممکن ہے کہ شعر مرزا ہی کا ہے۔ بہرحال کچھ اچھا شعر نہیں ہے۔"

افسوس ہے کہ غالب کا یہ ایڈیشن جامعہ ملیہ لائبریری میں محفوظ نہیں رہا۔

بہرحال امید نہیں کہ آئندہ محمد علی جیسا کوئی اور سر پھرا لیڈر ہندو پاکستان کی سرزمین سے اٹھے۔ خدا ان کی تربت پر اپنے انوار کی بارش نازل کرے۔

———

مولانا سید حسین احمد مدنی

رشید الوحیدی

مولانا حسین احمد مدنی ۱۲۹۶ھ ہجری میں یو پی کے ایک چھوٹے سے قصبے بانگرمئو ضلع اناؤ میں پیدا ہوئے جہاں اُن کے والد مرحوم مولانا حبیب اللہ صاحب ایک اسکول میں مدرس تھے ابھی مولانا کی عمر بہت کم تھی کہ ان کے والد بزرگوار اپنے آبائی وطن ٹانڈہ ضلع فیض آباد واپس آگئے مولانا مدنی نے چشم ہوش اسی قصبے میں کھولی یہاں ان کے والد بزرگوار مڈل اسکول میں ہیڈ ماسٹر تھے اس طرح آپ کی تعلیم کا آغاز یہیں سے ہوتا ہے۔ ابتدائی تعلیم حسب دستور گھر ہی پر شروع ہوئی اس سلسلے میں کسی چھان بین کی ضرورت نہیں مولانا خود اپنی سوانح عمری "نقش حیات" میں تحریر فرماتے ہیں۔ "میرے والد مرحوم کو بچوں کی تعلیم و تربیت کا بہت خیال تھا ہر بچے کو چار برس کی عمر میں پڑھنے بٹھا دیتے تھے اور ذرا سی کوتاہی پر بلا لحاظ عمر کافی مرمت کر دیتے تھے۔" اس طرح مولانا کو آزادی کے ساتھ کھیلنے کا صرف ۴ برس بچپن کا حصہ نصیب ہوا آگے تحریر فرماتے ہیں۔ جب میں ۴ برس کا ہوا تو گھر میں والدہ مرحومہ کے پاس قاعدہ بغدادی اور سیپارہ پڑھنا شروع کر دیا۔ صبح ساڑھے ۹ بجے تک تو گھر میں پڑھتا رہتا اس کے بعد کھانا کھا کر والد مرحوم کے ساتھ اسکول چلا جاتا۔ آپ کے والد مرحوم بچوں کی تربیت کے خیال سے بچوں کو زیادہ تر باہر کے لڑکوں کے ساتھ کھیلنے کو منع کرتے تھے۔ چنانچہ مولانا اگر کبھی موقع مل جاتا تو اپنے ایک ماموں نادر بھائی کے یہاں جو ان کے گھر کے قریب رہتے تھے چلے جاتے اور گھر میں چھپ کر گولی کھیلتے۔ اگر کہیں شامت اعمال سے اس کی اطلاع والدہ کو ہو جاتی تو خاصی مرمت ہو جاتی۔ اس طرح ماں باپ کے زیر تربیت اور سایۂ عاطفت میں آٹھ برس کی عمر تک وطن ہی میں قرآن شریف (ناظرہ) اور فارسی کی چند کتابیں مثلاً آمدنامہ۔ دستور الصبیان۔ گلستاں وغیرہ پڑھیں اور اسکول میں ساتویں درجے تک پڑھ لیا تھا اس زمانے کی تعلیم کا معیار نیز فنون کی کثرت کی وجہ سے اسی درجے میں اکثر اقسام ریاضی حساب اقلیدس تاریخ عمومی تاریخ خصوصی مساحت عملی تحریر۔ املا۔ خط شکستہ اردو کورس وغیرہ شامل تھے۔ نیز ان تمام فنون میں مولانا نے اپنی ذہین طبیعت اور والدہ مرحوم کی تربیت سے بہت اچھی مہارت حاصل کر لی تھی۔ مولانا ابھی تیرہ سال کے ہوئے تھے کہ ان کے (.......... والد مرحوم) جو کہ مذہبی اور دیندار آدمی تھے، مذہبی تعلیم کے لئے انہیں دارالعلوم دیوبند بھیج دیا جہاں انہوں نے رات دن کی محنت شاقہ سے اساتذہ

کی توجہ اور شفقت کا رُخ اپنی طرف پھیر لیا۔ دیوبند میں عسرت اور تنگی مالی کی سخت گرانی سے ہمیشہ پریشان رہتے تاہم اس کو ایک رحمت
خداوندی سمجھا حسبِ قاعدہ دیوبند کے اہلِ شہر طلباء دارالعلوم کی امداد کے خیال سے اپنے گھروں سے کھانا کھلایا کرتے تھے۔ حضرت شیخ الہند
مولانا محمود الحسن صاحب نے جو کہ مردم شناسی کا جوہر رکھتے تھے۔ انہیں اپنے دامن میں پناہ دی اور ان کا کھانا اپنے گھر سے کر دیا تھا۔ مد
سے صبح و شام مولانا کھانا لینے شہر تشریف لے جاتے اس بے نیاز اور سچے طالب علم کی ضروریات بہت محدود تھیں صرف چند کتابیں دو،
جوڑے کپڑے اور مٹی کا پیالہ جس میں مولانا اپنا اور اپنے بڑے بھائی کا کھانا لاتے تھے ان کا سارا سامان تھا۔ ایک مرتبہ کسی طرح آپ کا پیا
کھانا لاتے وقت ٹوٹ گیا آپ وہیں کھڑے ہو کر رونے لگے۔ حضرت شیخ الہندؒ کے والد محترم ادھر سے گزرے رونے کا سبب دریافت
تو آپ نے کہا کہ ایک ہی پیالہ تھا وہ ٹوٹ گیا اب کھانا کس چیز میں لاؤں اور اگر مدرسے واپس جاتا ہوں تو بھائی ماریں گے۔ انہوں نے تسلی د
اور دوسرا پیالہ خرید کر دیا تو یہ نازک مرحلہ طے پایا آپ کی محنت کا یہ عالم تھا کہ ہفتے میں ۶ دن شب و روز کتابوں میں کھوئے رہتے اور ساتو
دن پورا دن رات سو کر گزارتے حتیٰ کہ کھانے تک کا ہوش نہ رہتا صرف پانچوں وقت نماز پڑھنے کے لئے التزام اٹھا دیتا تھا کھانا بہت کم ہو
تھا زیادہ تر نیند سے بچنے کے لئے نمکین ستو یا دال استعمال فرماتے تھے آپ کے نزدیک کتاب۔ درس گاہ۔ استاد کا ادب و احترام اور ان کی خ
سچے علم کے حصول کے لئے ضروری تھی۔ اس سلسلے میں ایک واقعہ عبرت اور دلچسپی سے خالی نہ ہوگا ایک مرتبہ شہر میں بھنگیوں نے ہڑتال کر دی اہل
شہر کی پریشانی کا عالم قابلِ دید تھا سخت گرمی کا زمانہ اس پر پاخانے کی سڑاند اور بدبو کسی سزا سے کم نہ تھی۔ شیخ الہندؒ نے مولانا سے فرمایا جاؤ بھنگی
بلا لاؤ کئی دن سے صفائی نہیں ہوئی ہے۔ ابھی شاید ان کو بھنگیوں کی اس تحریک کا علم نہ تھا۔ مولانا صورتِ حال سے واقف تھے مگر تعمیلِ حکم ضروری تھ
گئے اور مایوس واپس آئے گھر آ کر چپکے چپکے تمام گندگی صاف کر ڈالی حتیٰ کہ بالٹی بھر بھر کر نالی تک بالکل صاف کر دی۔ بہت دنوں تک شیخ الہندؒ کو
اس واقعے کی اطلاع نہ ہو سکی ۱۳۱۶ھ میں مولانا کے والد محترم ہجرت کر کے مدینے تشریف لے گئے وہاں پہنچ کر . . . جن مصائب کا سامن
کرنا پڑا وہ مولانا کی کتاب نقشِ حیات میں بالتفصیل درج ہے بہرحال ذرائع آمدنی کا نقصان اور خرچ کی ضرورت سے مجبور ہو کر معمولی سی پرچون کی
دوکان کھولی مگر اس کی آمدنی زیادہ تر مکان اور دوکان کے کرائے پر صرف ہوتی۔ آخر مجبور ہو کر اُجرت پر کتابت شروع کر دی ادھر استاد کے حکم
کے مطابق درس و تدریس کا سلسلہ جاری رکھنا بھی از حد ضروری تھا۔ چنانچہ حرم نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں درسِ حدیث کا سلسلہ شروع کر دیا رات کو
گھر کی ضرورت کے لئے مشک بھر کر پانی لاتے۔ دن بھر دوسری جگہ مصروفیات کے علاوہ درس دیتے تھے بعض وقت عسرت کا یہ عالم رہا ہے کہ آدھ
پاؤ مونگ کی دال ایک ہانڈی بھر کر پانی میں نمک ڈال کر اُبال لیا اور تھوڑا تھوڑا سب نے مل کر پی لیا اللہ کا شکر ادا کر کے اپنے اپنے کاموں میں مصروف
ہو گئے۔ کبھی تربوز کے چھلکے گلا کر نمک ملا کر کھائے اور کبھی سبزی منڈی سے گری پڑی سبزی کو دھو کر اُبال کر اس سے تارِ نفس کے قیام کا
سہارا ڈھونڈا۔ ایسا بھی ہوا ہے کہ پیٹ پر پتھر باندھ کر حرم شریف میں درس دینے کے لئے تشریف لے گئے اس طرح مولانا گوناگوں تنگیوں اور
صعوبتوں سے گزرے اور امتحان میں پورے اُترے۔ آخر جب اہلِ مدینہ سے متجاوز ہو کر حلقہ درس ترک و بخارا سمرقند قازان قزق ترکستان
مصر اور کابل کے طلبہ تک پہنچا تو مولانا نے خدا کے بھروسے پر کسبِ معاش کے دھندوں کو ترک فرما دیا اور یک سو ہو کر درسِ حدیث میں ہمہ تن
مصروف ہو گئے۔ پھر سنہ ۱۹ میں حضرت شیخ الہندؒ کے ساتھ گرفتار . . ہوئے اور مالٹا بھیج دیئے گئے۔ شیخ الہندؒ کی تحریکِ آزادی
جو عام طور سے "ریشمی خطوط کی تحریک" سے مشہور ہے۔ ہماری قومی زندگی کی تاریخ کا ایک اہم باب ہے شیخ الہندؒ کا کیا منصوبہ تھا اور ہندوستان
کو انگریزوں کے چنگل سے چھڑانے کے لئے انہوں نے کیا اسکیم بنائی تھی، برطانوی سامراج کے C.I.D سے دامن بچا کر وہ کس طرح
حجاز پہنچے تھے اور وہاں شریفِ مکہ کی غداریوں کا کس طرح شکار بنے تھے۔ یہ بڑی حیرت انگیز مجاہدانہ داستان ہے اور تاریخ کے صفحات
میں محفوظ ہو گئی ہے۔ حجاز میں مولانا مدنی کو جب اپنے استاد محترم کے منصوبے کا علم ہوا تو وہ دل سے ان کے ساتھ ہو گئے۔ یہاں سے

مولانا کی جدوجہد آزادی کا آغاز ہوتا ہے، شیخ الہندؒ کے بعد مولانا نے ان کے نصب العین کو پوری طرح اپنایا اور آزادی کی راہ میں بڑی بڑی
صعوبتیں اٹھائیں۔ چنانچہ مالٹا میں حضرت شیخ الہندؒ کے رفیق کار رہے اور وہاں اپنے میر کارواں کی جی بھر کر خدمت کی وہاں انگریز حکام کی سختیوں
کی وجہ سے شیخ الہندؒ کو گرم پانی نہ ملتا تھا اور گٹھیا کا مرض تھا جس کی وجہ سے سردی میں بہت دقت ہوتی تھی مولانا کو استاد کی اس تکلیف کا
احساس ہوا آپ ایک لوٹا پانی لے کر پیٹ سے لگا لیتے اور تمام رات لحاف اوڑھ کر بیٹھ جاتے صبح سویرے بدن کی حرارت سے نیم گرم
پانی پیش کر دیتے بہت دنوں تک یہ انتظام رہا مگر استاد کو اس کی کوئی خبر نہ ہوئی۔

شیخ الہندؒ کا دور جس قدر پر آشوب اور انگریزوں کی ساحرانہ مکاریوں کا دور تھا . . . . . اس میں شیخ الہند ایک عزلت نشین
صوفی یا خانقاہی پیر کی حیثیت سے کبھی مسلمانوں کی موجودہ پریشانیوں کا علاج نہ کر سکتے تھے چنانچہ وقت اور حالات کی نبض کو پہچان کر مولانا
میدانِ سیاست میں اترے اور ثابت کر دیا کہ وہ میدان سیاست میں ایک بہترین کمانڈر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہی بنیاد بعد میں علماء کی سیاسی
جنگ کا پیش خیمہ ثابت ہوئی جس کے اہم ہیرو مولانا مدنی۔ عبید اللہ سندھی۔ مفتی کفایت اللہ اور انور شاہ رحمہم اللہ وغیرہم قرار پائے۔
مولانا مدنی کے عہد میں بھی بہرحال وہی بدیسی حکومت کے مظالم اور وہی انگریزوں کی فتنہ پردازیاں قائم تھیں جن کے انسداد کے لئے ہر لمحہ
خانقاہوں سے نکل کر عوام کے دوش بدوش اس تحریک کو زندہ رکھنے کی ضرورت تھی جو آپ سے پہلے اس مہلک ناسور کو مندمل کرنے کے لئے
اسلافِ کرام نے شروع کی تھی۔ چنانچہ مولانا نے شیخ الہند کے بعد جس ذمہ داری سے اس کو زندہ رکھا اس کے خوشگوار نتائج انگریزوں کے
ہندوستان چھوڑنے کی صورت میں ظاہر ہوئے اس کے بعد مولانا نے سیاست کو جس قدر سمجھا اور اس کو اپنی جماعت میں ترقی دی اس کے
ضمن میں مولانا کی ہندوستان میں قربانیاں روز روشن کی طرح ظاہر ہیں۔ اگر مولانا کی پروردہ گلیم طبیعت اور قانع و شاکر فطرت نے اس آزادی
کے صلے میں کسی اونچی پوزیشن کو قبول نہ کیا اور دنیا کے سامنے وہ منسٹر اور وزیر اعظم کی صورت میں نہ ظاہر ہوئے تو اس سے ان کی للہیت اور
خلوص پر پردہ پوشی ناممکن ہے۔ بشرطیکہ مؤرخ کا قلم انصاف اور دیانت کا ساتھ نہ چھوڑے اور خدانخواستہ یہ قربانیاں کسی تعصب کی نذر نہ ہو جائیں۔

مولانا کی زندگی میں تقریباً ہر گوشہ جہاد سے تعبیر ہے آپ کا روزمرہ کا معمول اسلامی طرز زندگی میں ڈھل چکا ہے۔ شب بیداری کا یہ
عالم ہے کہ رات کو ۱۲ بجے تک دارالعلوم میں طلبہ کو حدیث شریف کا درس دیتے ہیں اس کے بعد ڈیڑھ بجے تک تصنیف و تالیف کے
سلسلے میں کچھ کام کرتے ہیں۔ پھر ۴ بجے سے اٹھ جاتے ہیں اس کے علاوہ آپ کے یہاں روزانہ تقریباً ۳۰ — ۴۰ مہمانوں کا ہجوم رہتا ہے جن
کو بذات خود مولانا وقت دیتے ہیں اور ان کے طعام و قیام کا پورا انتظام مولانا اپنے ذمے رکھتے ہیں۔ جس کے لئے وقت کی کوئی قید نہیں۔
ایک ایک ماہ بھی لوگ قیام کرتے ہیں جس میں پاکستان ہندوستان کے علاوہ مدراس کلکتہ بمبئی افریقہ سورت سبھی جگہ کے لوگ شامل ہوتے ہیں۔
مولانا کی محفل میں زاہد عابد شاعر ادیب لیڈر عوام شہری دیہاتی امیر غریب سبھی طرح کے لوگ شامل ہیں اور مولانا کی ذات میں اپنے جذبات و
افکار کی تسکین حاصل کرتے ہیں۔ کوئی مشکلات کا ذکر کرتا ہے جس میں مالی ذہنی حکام کی بدعنوانیاں خانگی مسائل غرض ہر طرح کی مشکلیں شامل ہیں اور
مولانا ہر لمحہ نئے مسائل کے لئے اپنے آپ کو تیار رکھتے ہیں کہیں میر و غالب کی شاعری زیر بحث ہے تو مولانا ایک ایک شعر پر پوری طرح تبصرہ
فرمائیں گے کسی وقت ڈاکٹر اقبال مرحوم کا ذکر آ گیا تو ان کے جذبۂ دینی اور خودی کے مسئلے پر سیر حاصل تشریح فرمائیں گے کہیں ابوالکلام کی نثر
موضوع سخن ہے کسی وقت قسطنطنیہ، تیونس، مراکش کی موجودہ کشمکش اور تاریخ عہد و ارلعہ الگ استکامی امور الگ عنوان بحث بن گئے ہیں دوسرے
وقت آپ کسی دیہاتی سے مصروف تکلم پائیں گے تو ربیع و خریف کی ہونے والی تمام فصلوں میں ہر قسم کے غلے اور اناج پر مفصل اظہار خیال فرمائیں
گے اور اس قدر معلوماتی تبصرہ کریں گے کہ بڑے سے بڑا کسان اور زمیندار بھی زانوئے ادب تہ کر کے کھیتی باڑی کا درس حاصل کرے۔ موسمی پھلوں
میں بالخصوص آم اور خربوزہ پسند فرماتے ہیں لیکن ان کے انتخاب میں کسی کے محتاج نہیں عمدہ اور غیر عمدہ قسموں پر بخوبی تشریح فرمائیں گے چھلکے اور

مذاق کے سلسلے میں اول تو آپ کو محفل میں بہ دقت ایک آدھ ہی ایسا ظریف الطبع ایسا مل جائے گا جو مولانا کی طبیعت کا ایسا رنگ پاکر اپنے رنگ میں آجائے اور پھر مولانا کو ایک اچھوتے رنگ میں دیکھ لیجئے کسی کو گلاب جامن سے کسی کو برفی سے کد ہے تو اس کو اسی عنوان سے چھیڑیں گے اور وہ زبانی ہی نہیں بازار سے منگوا کر اسے کھلائیں گے اگر کسی نے سلوک اور تصوف کے مسائل چھیڑ دیئے ہیں تو اس ترد روحانی کیفیت پیدا ہو جاتی کہ شاید بزم ملکوتی میں بھی ایک مرتبہ اپنی عبادت اور اطاعت پر شک ہونے لگے اور راہ طریقت کے الجھے سے الجھے مسائل کچھ نگاہوں سے کچھ زبان سے اس طرح حل ہوتے چلے جائیں گے کہ طالب راہ تصوف اطمینان قلب کے ساتھ وہاں سے اٹھے گا۔ غرض کہ ہر قسم کے انسان کو اپنی ذہنی طبعی روحانی غذا مولانا کی اس محفل میں حاصل ہو جاتی ہے۔ مہمانوں کے مطلبیے بعض اوقات انتہائی تکلیف دہ صورت اختیار کر لیتے ہیں کوئی اصرار کر رہا ہے کہ میرے بچے کی بسم اللہ ہے تشریف لے چلیں کہیں عقیقہ کہیں شادی وغیرہ یہ رسوم مولانا کے زحمت سفر کا اکثر باعث بنتے رہتے ہیں مولانا کچھ دیر تو سختی سے پھر سمجھاتے ہوئے پھر خوشامدانہ انکار فرماتے ہیں آخر ان کے اخلاق کریمانہ کی تاب انکار نہیں رہتی اور ڈائری میں تاریخ لکھ لی جاتی ہے ایک مرتبہ ایک صاحب تشریف لائے اور آتے ہی پوچھا کہ حضرت موسیٰ کے والد کا کیا نام تھا مولانا نے اس کی طرز سوال کو بھانپ لیا فرمایا مجھے نہیں معلوم بس پھر کیا تھا صاحب اور ہی ہر صاحب کا بیان جس قدر آسکے یاد تھیں سنا ڈالیں مگر کھانے کے وقت مولانا کے ساتھ دسترخوان پر کھانا کھایا اور کچھ دیر وہیں آرام کیا ایسے بھی مہمان آتے ہیں جو بقول مولانا میرے اصلاح نفس کے لئے آتے ہیں۔ مولانا کو ایک باپ کی حیثیت سے جہاں تک دیکھا گیا ہے شاید کوئی شفیق سے شفیق باپ باوجود کمال محبت و قدرت کے وہ درجہ حاصل نہ کر سکے۔

ابھی ابھی مدراس بمبئی کے طویل سفر سے واپس آئے ہیں اگر درس کا وقت ہے تو فوراً مدرسے تشریف لے جائیں گے۔ وہاں سے آکر اطمینان سے بیٹھے بھی نہ تھے کہ چاروں طرف سے ابا جی ابا جی کا شور بلند ہوا دوسرے لمحے کوئی بچہ پیروں سے چمٹا جا رہا ہے کوئی کمر سے لپٹا جا رہا ہے کوئی پشت پر چڑھا ہوا گلے میں جھول رہا ہے مولانا غایت شفقت و محبت سے فرماتے ہیں ذرا ہٹ تو جا دیکھ تیرے لئے کیا لایا ہوں چھوڑ تو مگر سختی یا جھڑکی کا شائبہ تک نہیں حیرت ہے اس برداشت پر اور تعجب ہے اندرون دنیا اس طبیعت پر اور اخلاق مصطفوی پر۔ بچوں کو پھل کھلونوں سے بہلا رہے ہیں مگر بچوں کو تو مدت سے بچھڑے ہوئے ابا جی کی ضرورت ہے اور والد محترم مشغول و دیدار۔ قوم وقت سے بھر پور قلب سے تھوڑا سا حصہ بچوں کی دلجوئی کے لئے نکالتے ہیں۔ چھوٹے صاحبزادے نے کوئی جلسہ منعقد کیا تو اس کی صدارت بھی ابا جی سے کرانا چاہتے ہیں۔ ابا جی پریشان ہو رہے ہیں میرے پاس کہاں وقت ہے مگر اس وقت ایک شفیق باپ اور چھوٹے لخت جگر کا معاملہ ہے جہاں عذر اور ہٹ تمام مطالبات منوا لیتی ہے وقت کا نہ ہونا یا فرصت کم ہونا تو شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی کا عذر ہو سکتا ہے!۔

مولانا کے مکان پر مہمانوں کا ہجوم تو رہتا ہے اس کے علاوہ دارالعلوم میں طلبہ کی امداد کے سلسلے میں مولانا کی طرف سے کھانا جاری ہوتا ہے یہی نہیں کنبہ پروری آپ کا ایک اہم ترین فریضہ ہے اور پھر کنبے میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جو والد مرحوم کے زمانے کی بیوائیں ہیں والد کے ساتھ رہنے والوں میں جس قدر حاجتمند تھے سبھی مولانا کی امداد کے حقدار ہیں اور ان کا خرچ مولانا کے ذمے ہے۔ عید الفطر عید الاضحیٰ کے مبارک موقع پر آج بھی مولانا اپنے محلے کے ہر گھر میں تشریف لے جاتے ہیں اور بڑوں سے بچوں تک کو حسب مراتب عیدی تقسیم فرماتے ہیں۔ ۔ ۔ حضرت شیخ الہندؒ کے انتقال کو تقریباً ۲۹ سال کا عرصہ گزرا مگر ان کی صاحبزادیوں کے ساتھ وہ معاملہ ہے جو شاید ایک باپ اپنی بیٹی کے ساتھ نہ کر سکے عید کے مبارک موقع پر اس گھر میں کافی رقم خرچ فرماتے ہیں اور خود بنفس نفیس تشریف لے جاتے ہیں تمام احوال دریافت فرماتے ہیں صاحبزادیوں کے سامنے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے اپنے کسی بہت بڑے سرپرست یا باپ کے سامنے ہیں گفتگو میں تابعداری انکساری کا طرز نمایاں رہتا ہے۔

مولانا کو پھولوں کے علاوہ درخت اور پرندوں سے بھی بہت انس ہے دارالعلوم جیسے عظیم الشان ادارے میں کافی خوبصورت وسیع و عریض باغ دراصل مولانا کے شوق اور طلب کا نتیجہ ہے جس میں بہت سے درخت بنگال، آسام، بمبئی، سورت، لکھنؤ سے مولانا کے اپنے جیب خاص سے

لگا کر لگائے جاتے ہیں اور اس کی نگہبانی و باغبانی ملازم سے زیادہ خود مولانا فرماتے ہیں۔ چمن کے سلسلے میں معمولی سے نقصان پر طلبہ سے سخت بازپرس فرماتے ہیں لیکن قصداً اگر کسی نے صدمہ پہنچایا ہے اس وقت تو آپ سے برداشت نہ ہوگا اور اگر کسی ضرورت سے یا اتفاقاً کسی سے کوئی نقصان ہوگیا تو کچھ خیال نہیں فرماتے ایک بار آسام سے قیمتی پودوں کے گملے آئے مولانا انہیں شوق سے ملاحظہ فرما رہے تھے اتفاق سے سب سے چھوٹی بچی بھاگ کر آئی اور کسی جھٹکے سے گملے پر گر پڑی ننھے پودے ذرا سی دیر میں ختم ہوگئے۔ برداشت اور درگزر کی جو کیفیت اس وقت دیکھنے میں آئی وہ حیرت انگیز تھی۔ اطمینان سے بچی کو اٹھا لیا اور مسکراتے ہوئے کمرے میں تشریف لے گئے اور پھر اس کے بعد کبھی اس پر اظہارِ خیال نہ فرمایا۔
مجموعی طور پر مولانا کی زندگی بہت حسین، منظم اور مہذب زندگی ہے جس میں تماشا گاہِ عالم کی سیر کا سامان بھی ہے۔

سیّد ابوالاعلیٰ مودودی

نعیم صدیقی

کہتے ہیں کہ پاکستان میں خوراک کی کمی ہے، تعلیم کی کمی ہے، اسلحہ کی کمی ہے ——— اور دوسری طرف آدمیوں کی بہتات ہے۔ لیکن سچ یہ ہے کہ یہاں سب سے خوفناک توڑا آدمیوں ہی کا توڑا ہے۔ کوئی قوم اگر آدمیوں کے قحط سے دوچار نہ ہو تو اور ہر چیز کی کمی وہ پوری کر لے جاتی ہے۔ بلاشبہ مرد و زن ایک بے پناہ ہجوم یا ایک ٹھاٹھیں مارتا سمندر ہے جو پاک زمین کے حصے میں آیا ہے ——— آٹھ کروڑ نفوس! ——— ان میں وزیر بھی ہیں، لیڈر بھی، ایم ایل اے بھی ہیں، صحافی بھی ہیں، ادیب اور اہل فن بھی ہیں، تاجر اور صنّاع بھی ہیں، سپاہی اور سپہ گر بھی ہیں، لیکن انسان بہت ہی کم ہیں تو جو سے آدمی "ہماری قسمت میں بہت لکھے گئے ہیں، لیکن آدمی ہمارے پاس نہیں ہیں! آج بھی ہمارے شہر زندگی کے گرد پیر رومی کا شیخ چراغ ہاتھ میں لئے سرگرداں ہے الاپ رہا ہے کہ "انسانم آرزو ست"! ہو سکتا ہے کہ ہمارے ہاں روائتی مردم شماری کا ریکارڈ کئی اونٹوں کا بوجھ ہو، لیکن اگر ہم اپنے ان کے نزدیک "معاشی حیوان" کو محض بطور مروّت انسان کہنا چھوڑ دیں تو پھر شاید مردم شماری کا سارا اندراج چاول کے ایک دانے پر ہو سکے گا! ——— یہ آپ نے سنا ہی ہو گا کہ ماہر فن خطاط چاول کے ایک دانے پر پورا سورہ یٰسین لکھ دکھاتے ہیں! ہمیں آدمی بننے کیلئے ابھی ارتقا کی بڑی لمبی اور کٹھن راہ طے کرنی ہے

"آدمی گوشت اور ہڈی کے اس بولتے اور چلتے پھرتے ڈھانچے کو نہیں کہتے جس پر چند اندرونی خواہشات سواری کرتی ہیں۔ آدمی نام ہے شعور اور احساس کا، آدمی نام ہے اصول اور ایمان کا، آدمی نام ہے سیرت اور اخلاق کا۔ اور یہ مخلوق ہمارے ہاں ایک ناقابل ذکر اقلیت کا مقام رکھتی ہے۔

ابوالاعلیٰ مودودی اسی اقلیت کا ایک فرد ہے ——— "ایک آدمی"!

وہ اگرچہ ایک انقلابی مفکر بھی ہے، ایک سحر طراز ادیب اور خطیب بھی، لیکن اس کی بڑائی کا اصل راز یہ ہے کہ وہ ایک آدمی ہے ایک ایسا آدمی جو پاکستان بھر میں نمایاں ہے۔ اگر ہم ہمالہ کی کسی چوٹی پر کھڑے ہو کر ارض پاک کے آدمیوں پر نگاہ ڈالیں تو شاید پہلی نگاہ اسی شخصیت کے حصے میں آئے گی۔ آخر کیوں؟ ——— اس لئے کہ یہ ایک ایسی شخصیت ہے کہ جس کی اہمیت کسی آبائی جاگیر، کسی سرکاری عہدے، کسی خاندانی منصب اور کسی مصنوعی شہرت اور نمائشی پروپیگنڈے کے سبب نہیں، بلکہ محض ایک نظریہ و مقصد، ایک سیرت و کردار اور ایک سرگرم عمل کے بل پر ہے۔ وہ بڑا آدمی ہے تو فقط اس بنیاد پر کہ وہ ایک آدمی ہے، وہ ایک انسان ہے!

ہاں مگر ــــ اب مودودی ایک فرد کا نام نہیں رہا۔ اب اس لفظ کو بولتے ہی زندگی کا ایک مکمل فلسفہ، ایک اجتماعی کیریکٹر، ایک سیاسی تصور، ایک منظم تحریک اور ایک نصب العین نگاہوں کے سامنے آجاتے ہیں۔ مودودی کا نام لیتے ہی اسلامی دستور کے مسائل ذہن میں اُبھرنے لگتے ہیں اور اسلامی نظام کا ہیولیٰ آنکھوں میں پھر جاتا ہے۔ اس معیار کی شخصیتوں کو ہمیشہ دیکھا اور دکھایا جاتا رہا ہے۔ دیکھنا اور دکھانا ایک تو "اکابر پرستی" کے گھٹیا جذبے سے ہوتا ہے۔ لیکن اس دیکھنے اور دکھانے کا ایک اعلیٰ محرک بھی ہے، اور وہ یہ کہ اُن اوصاف اور عادات کو معلوم کیا جائے جنہوں نے ہم جیسے کسی پیکرِ آب و گِل کو اپنا کے ذریعے بہت بڑے پیمانے پر خیر و برکت کا سرچشمہ بنا دیا ہوتا ہے۔ اس تحریر کا منشا بندگانِ خدا کیلئے ایک نیا ذہنی دیوتا گھڑ کے پیش کرنا نہیں ہے بلکہ ہم یہ جاننا چاہتے ہیں کہ یہ شخص جس کے نام سے پاکستان کا ایک ان پڑھ دیہاتی تک واقف ہے اور جس کا حلقۂ تعارف عراق اور شام اور حجاز تک پھیلا ہوا ہے، آخر اس کا اصل جوہرِ شخصیت کیا ہے۔

جو لوگ بڑے آدمی کہلاتے ہیں ان کی سب سے بڑی چھوٹائی یہ ہوتی ہے کہ ان کا بڑاپن بالعموم ان کی شخصیت پر باہر سے ایک خول کی طرح چڑھا ہوتا ہے۔ اس چمکتے دمکتے خول کو دور ہی دور سے دیکھتے رہیئے تو بڑی مرعوبیت طاری رہتی ہے، اس کے اندر کے آدمی سے اگر مڈبھیڑ ہو جائے تو ناظر کے تصورات کے محل چکنا چور ہو جاتے ہیں۔ لیکن مودودی کی شخصیت اپنے بیرونی مظاہر سے لے کر اپنے باطنی جوہر تک بالکل یکساں اور یک آہنگ ہے، بلکہ یہ کہنا بے جا نہ ہو گا کہ مودودی کی سوانح عمری اس کی پیشانی اور چہرے پر لکھی ہوئی ہے۔ مولینا عبید اللہ سندھی مرحوم جلا وطنی کا دور ختم کر کے وطن تشریف لانے تو کسی موقع پر ریل میں سفر کرتے ہوئے لاہور سے گزرے۔ مولینا مودودی ان سے ملاقات کرنے پلیٹ فارم پر پہنچے مگر کچھ معلوم نہ تھا کہ مولینا سندھی کس ڈبے میں ہیں، تلاش میں تھے۔ مولینا سندھی مرحوم نے دیکھتے ہی خاص طور پر متوجہ کر کے (غالباً کھڑکی سے) مصافحہ کیا اور پہلے سے ملاقات نہ ہونے کے باوجود بڑے جزم و یقین کے ساتھ استفہامیہ انداز میں فرمایا: "آپ مولینا مودودی ہیں نا؟" پہلی بار ایک چہرے کو اور وہ بھی ایک نظر دیکھ کر غائبانہ تعارف کے بل پر ایک شخصیت کو پہچان لینے کی جو حیرت انگیز نظیر سندھی صاحب نے قائم کی وہ خود شاہد ہے کہ مودودی کا ظاہر اس کے باطن کا کتنا مکمل آئینہ دار ہے۔ ظاہر و باطن کے درمیان خود پیدا کردہ فاصلے نہیں ہیں۔ تصنع اور تکلف کے پردے نہیں ہیں۔ تضاد اور تناقض نہیں ہے۔ دور سے جو کچھ دکھائی دیتا ہے، قریب آنے پر وہی اور زیادہ نکھر کر نگاہوں میں آ جاتا ہے۔

آج سے سترہ اٹھارہ برس پہلے کی بات ہے ــــ اور اگر میں ان برسوں کو گنتی کر کے گن نہ لیتا تو میرا گمان یہی ہوتا کہ گویا کل کا واقعہ ہے میں ابھی اپنے گاؤں ہی میں مقیم تھا اور آئندہ زندگی کے متعلق بنتے بگڑتے نقشوں میں گم سم، کچھ لکھنے، کچھ سوچنے اور زیادہ تر پڑھنے اور سمجھنے میں مصروف! اُس چھوٹی سی دور افتادہ دیہی آبادی کے برانچ پوسٹ آفس میں ہر روز ڈاک کا میلا سا جو تھیلا آیا کرتا تھا اس میں میرے نام کا کوئی نہ کوئی اخبار یا رسالہ ضرور ہوتا۔ ایک رسالے میں مولینا کے نام سے جب پہلا مضمون میری نظر سے گزرا تو مضمون نگار کا نام ابوالاعلیٰ مودودی بڑا ہی عجیب لگا۔ یہ مضمون بھی کسی زورِ بیان کا متحمل نہیں تھا۔ کیوں کہ اس میں محض ایک اسلامی نو آبادی ــــ دارالاسلام ــــ کے عملی قیام کی دعوت دی گئی تھی[1]۔ اس تحریر میں سادگیٔ بیان کا حسن تو تھا ہی، مگر اس کا خاص تاثر (جو اب تک میری کتابِ ذہن کے اوراق پر ثبت ہے) یہ تھا کہ لکھنے والا ان تمام لکھنے والوں سے مختلف چیز ہے جنہیں میں جانتا تھا اور اس کے اندر بڑا غیر معمولی پن ہے۔ ہمارے ہاں کی روایت کا تقاضا یہ تھا کہ اس ترغیبی مضمون میں ایک تو جوش انگیزی، جذبہ دہی اور دوسرے رومانی پہلو پیش کئے جاتے۔ لیکن نہیں، جذباتیت کے بجائے اس کا مزاج فکری تھا اور اس میں روشن پہلوؤں کے ساتھ مشکلات و موانع کو بھی قاری کے سامنے رکھ دیا گیا تھا۔ اس کے باوجود بغیر صحافیانہ اور خطیبانہ تعاقل سے مدد لئے، لکھنے والے نے اس

---

[1] اسی نو آبادیوں کے ایک تخیلی کا نقش میرے ذہن نے علامہ اقبال کے ایک مطبوعہ خطبے سے اخذ کیا تھا۔ اسی پس منظر کے ساتھ میں نے اس مضمون کو پڑھا۔ واقعہ میں عملی دارالاسلام کو دیکھنے میں اقبال کا ذہنی کام کر رہا تھا۔

سیّد ابوالاعلیٰ مودودی

نعیم صدیقی

کہتے ہیں کہ پاکستان میں خوراک کی کمی ہے، تعلیم کی کمی ہے، اسلحہ کی کمی ہے ـــــ اور دوسری طرف آدمیوں کی بہتات ہے۔ لیکن سچ یہ ہے کہ یہاں سب سے خوفناک قحط آدمیوں ہی کا نزول ہے۔ کوئی قوم اگر آدمیوں کے قحط سے دوچار نہ ہو تو اور ہر چیز کی کمی وہ پوری کر لے جاتی ہے۔ بلاشبہ مردوزن کا ایک "بے پناہ ہجوم" یا ایک ٹھاٹھیں مارتا "سمندر" ہے جو پاک زمین کے حصے میں آیا ہے ـــــ آٹھ کروڑ نفوس! ـــــ ان میں وزیر بھی ہیں، لیڈر بھی ہیں، ایم اے، ایل ایل بی بھی ہیں، صحافی بھی ہیں، ادیب اور اہل فن بھی ہیں، تاجر اور صناع بھی ہیں، سپاہی اور سپہ گر بھی ہیں، لیکن انسان بہت ہی کم ہیں۔ "بڑے آدمی" ہماری قسمت میں بہت لکھے گئے ہیں، لیکن "آدمی" ہمارے پاس نہیں ہیں! آج بھی ہمارے شہر زندگی کے گرد پیر رومی کا "شیخ" چراغ ہاتھ میں لئے سرگرداں ہے اور الاپ رہا ہے کہ "انسانم آرزوست"! ہو سکتا ہے کہ ہمارے ہاں روایتی مردم شماری کا ریکارڈ کئی دفتروں کا بوجھ ہو، لیکن اگر ہم اپنے ہاں کے ہر ذی عقل معاشی حیوان کو محض بطورِ مروت انسان کہنا چھوڑ دیں تو پھر شاید مردم شماری کا سارا اندراج چاول کے ایک دانے پر ہو سکے گا! ـــــ یہ آپ نے سنا ہی ہو گا کہ ماہرِ فن خطاط چاول کے ایک دانے پر پورا سورہ یٰسین لکھ دکھاتے ہیں! ہمیں آدمی بننے کیلئے ابھی ارتقا کی بڑی لمبی اور کٹھن راہ طے کرنی ہے۔

آدمی گوشت اور ہڈی کے اس پُتلے اور چلتے پھرتے ڈھانچے کو نہیں کہتے جس پر چند اندرونی خواہشات سواری کرتی ہیں۔ آدمی نام ہے شعور اور احساس کا، آدمی نام ہے اصول اور ایمان کا، آدمی نام ہے سیرت اور اخلاق کا۔ اور یہ مخلوق ہمارے ہاں ایک ناقابلِ ذکر اقلیت کا مقام رکھتی ہے۔

ابوالاعلیٰ مودودی اسی اقلیت کا ایک فرد ہے ـــــ "ایک آدمی"!

وہ اگرچہ ایک انقلابی مفکر بھی ہے، ایک سحر طراز ادیب اور خطیب بھی، لیکن اس کی بڑائی کا اصل راز یہ ہے کہ وہ ایک آدمی ہے۔ ایک ایسا آدمی جو پاکستان بھر میں نمایاں ہے۔ اگر ہم ہمالہ کی کسی چوٹی پر کھڑے ہو کر ارضِ پاک کے آدمیوں پر نگاہ ڈالیں تو شاید پہلی نگاہ اسی شخصیت کے حصے میں آئے گی۔ آخر کیوں؟ ـــــ اس لئے کہ یہ ایک ایسی شخصیت ہے کہ جس کی اہمیت کسی آبائی جاگیر، کسی سرکاری عہدے، کسی خاندانی منصب اور کسی مصنوعی شہرت اور نمائشی پروپیگنڈے کے سبب نہیں، بلکہ محض ایک نظریہ و مقصد، ایک سیرت و کردار اور ایک سرگرمی عمل کے بل پر ہے۔ وہ بڑا آدمی ہے تو فقط اس بنیاد پر کہ وہ "ایک آدمی ہے"، وہ ایک انسان ہے!

ہاں مگر ـــــ اب مودودی ایک فرد کا نام نہیں رہا ۔ اب اس لفظ کو بولتے ہی زندگی کا ایک مکمل فلسفہ، ایک اجتماعی کیریکٹر، ایک سیاسی نقطۂ نظر، ایک منظم تحریک اور ایک نصب العین نگاہوں کے سامنے آجاتے ہیں ۔ مودودی کا نام لیتے ہی اسلامی دستور کے مسائل ذہن میں اُبھرنے لگتے ہیں اور اسلامی نظام کا ہیولیٰ آنکھوں میں پھر جاتا ہے ۔ اس معیار کی شخصیتوں کو ہمیشہ دیکھا اور دکھایا جاتا رہا ہے ۔ دیکھنا اور دکھانا ایک تو "اکابر پرستی" کے گھٹیا جذبے سے ہوتا ہے ۔ لیکن اس دیکھنے اور دکھانے کا ایک اعلیٰ محرک بھی ہے، اور وہ یہ کہ اُن اوصاف اور عادات کو معلوم کیا جائے جنہوں نے ہم جیسے کسی پیکرِ آب و گِل کو ابنائے نوع کیلئے بہت بڑے پیمانے پر خیر و برکت کا سرچشمہ بنا دیا ہوتا ہے ۔ اس تحریر کا منشاء بندگانِ خدا کیلئے ایک نیا ذہنی دیوتا گھڑ کے پیش کرنا نہیں ہے، بلکہ ہم یہ جاننا چاہتے ہیں کہ یہ شخص جس کے نام سے پاکستان کا ایک ان پڑھ دیہاتی تک واقف ہے اور جس کا حلقۂ تعارف عراق اور شام اور حجاز تک پھیلا ہوا ہے، آخر اس کا اصل جوہرِ شخصیت کیا ہے ۔

جو لوگ بڑے آدمی کہلاتے ہیں ان کی سب سے بڑی چھوٹائی یہ ہوتی ہے کہ ان کا بڑا پن بالعموم ان کی شخصیت پر باہر سے ایک خول کی طرح چڑھا ہوتا ہے ۔ اس چمکتے دمکتے خول کو دور ہی دور سے دیکھتے رہیئے تو بڑی مرعوبیت طاری رہتی ہے ۔ اس کے اندر کے آدمی سے اگر مڈبھیڑ ہو جائے تو ناظر کے تصورات کے محل چکنا چور ہو جاتے ہیں ۔ لیکن مودودی کی شخصیت اپنے بیرونی مظاہر سے لے کر اپنے باطنی جوہر تک بالکل یکساں اور یک آہنگ ہے، بلکہ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ مودودی کی سوانح عمری اس کی پیشانی اور چہرے پر لکھی ہوئی ہے ۔ مولانا عبید اللہ سندھی مرحوم جلا وطنی کا دور ختم کر کے وطن تشریف لائے تو کسی موقع پر ریل میں سفر کرتے ہوئے لاہور سے گزرے ۔ مولانا مودودی ان سے ملاقات کرنے پلیٹ فارم پر پہنچے مگر کچھ معلوم نہ تھا کہ مولانا سندھی کس درجے میں ہیں، تلاش ہی میں تھے ۔ مولانا سندھی مرحوم نے دیکھتے ہی خاص طور پر متوجہ کر کے (غالباً کھڑکی سے) مصافحہ کیا اور پہلے سے ملاقات نہ ہونے کے باوجود بڑے جزم و یقین کے ساتھ استفہامیہ انداز میں فرمایا: "آپ مولانا مودودی ہیں نا؟" پہلی بار ایک چہرے کو اور وہ بھی ایک نظر دیکھ کر غائبانہ تعارف کے بل پر ایک "شخصیت" کو پہچان لینے کی جو حیرت انگیز نظیر سندھی صاحب نے قائم کی وہ خود شاہد ہے کہ مودودی کا ظاہر اس کے باطن کا کتنا مکمل آئینہ دار ہے ۔ ظاہر و باطن کے درمیان خود پیدا کردہ فاصلے نہیں ہیں، تصنع اور تکلف کے پردے نہیں ہیں، تضاد اور تناقض نہیں ہے ۔ دور سے جو کچھ دکھائی دیتا ہے، قریب آنے پر وہی اور زیادہ نکھر کر نگاہوں میں آجاتا ہے ۔

آج سے سترہ اٹھارہ برس پہلے کی بات ہے ـــــ اور اگر میں ان برسوں کو گنتی کر کے گن نہ لیتا تو میرا گمان یہی ہوتا کہ گویا کل کا واقعہ ہے ـــــ میں ابھی اپنے گاؤں ہی میں مقیم تھا اور آئندہ زندگی کے متعلق بنتے بگڑتے نقشوں میں گم سم، کچھ لکھنے، کچھ سوچنے اور زیادہ تر پڑھنے اور سمجھنے میں مصروف! اُس تھوڑی سی دورافتادہ دیہی آبادی کے برانچ پوسٹ آفس میں ہر روز ڈاک کا میلا سا جو تھیلا آیا کرتا تھا اس میں میرے نام کا کوئی نہ کوئی اخبار یا رسالہ ضرور ہوتا ۔ ایک رسالے میں مولانا کے نام سے جب پہلا مضمون میری نظر سے گزرا تو مضمون نگار کا نام ابوالاعلیٰ مودودی بڑا ہی عجیب لگا ۔ یہ مضمون بھی کسی زورِ بیان کا متحمل نہیں تھا ۔ کیوں کہ اس میں محض ایک اسلامی نوآبادی ـــــ دارالاسلام ـــــ کے عملی قیام کی دعوت دی گئی تھی[1] ۔ اس تحریر میں سادگیٔ بیان کا حسن تو تھا ہی، مگر اس کا خاص تاثر (جو اب تک میری کتابِ ذہن کے اوراق پر ثبت ہے) یہ تھا کہ لکھنے والا ان تمام لکھنے والوں سے مختلف چیز ہے جنہیں میں جانتا تھا اور اس کے اندر بڑا غیر معمولی پن ہے ۔ ہمارے ہاں کی روایت کا تقاضا یہ تھا کہ اس ترغیبی مضمون میں ایک تو جوش انگیزی موجود ہوتی اور دوسرے روشن ہی روشن پہلو پیش کئے جاتے ۔ لیکن نہیں، جذباتیت کے بجائے اس کا مزاج فکری تھا اور اس میں روشن پہلوؤں کے ساتھ مشکلات و موانع کو بھی قاری کے سامنے رکھ دیا گیا تھا ۔ اس کے باوجود بغیر صحافیانہ اور خطیبانہ لفاظی سے مدد لئے، لکھنے والے نے اس

---

[1] یہ ـــــ مولانا کے ذہن کے ایک تخیل کا نقش ہے جسے علامہ اقبال کے ایک معلوم خط سے اخذ کیا تھا، اسی سلسلہ میں مولانا کے ساتھ میں نے جس مضمون کو پڑھا، حقیقت میں بھی وہ دارالاسلام کا [illegible] کام کیا جا رہا تھا ۔

میں پوری پوری ترغیبی روح پیدا کر دی تھی۔ اس مضمون کے بین السطور کے دھندلکے میں ایک نئی قسم کی شخصیت میرے سامنے تھی جسے پہچاننے سے تو میں قاصر تھا، لیکن جس کی جاذبیت نے مجھے اسی لمحہ ناآشنائی میں اپنی جگہ سے ہلا دیا۔ یہ کون آدمی ہے؟ یہ انوکھا سا نام کس کا ہے؟ یہ کیا اسکیم ہے؟ بس یہ سوالات سامنے تھے اور مضمون کو بار بار پڑھا جا رہا تھا۔ والد مرحوم سے ذکر کیا۔ ان کو پڑھ کر سنایا۔ اس رسالے کے مدیر نے اپنے نوٹ میں خود بھی مجوزہ سکیم سے دلچسپی کا اظہار کیا تھا، لہٰذا ان کو خط لکھا اور خط کے جواب میں سرسری سی ابتدائی معلومات مزید حاصل ہوئیں مگر ان معلومات نے مزید تشنگی پیدا کر دی۔ میرے دل میں اس سے قبل صرف ایک ہی ملی شخصیت سے غیر معمولی دلچسپی کار فرما تھی —— میرا اشارہ اقبالؒ کی طرف ہے —— لیکن اب ایک اور منفرد قسم کی شخصیت سے میری دلچسپی کا آغاز ہو چکا تھا —— بعد میں غائبانہ تعارف کا سلسلہ دراز ہوتا چلا گیا۔

۱۹۳۸ء کے بالکل آغاز میں ہفتہ بھر کا پروگرام بنا کر لاہور آیا اور مدعا اس سفر یہی تھا کہ اقبالؒ اور مودودی دونوں سے ملاقات کروں گا بلکہ اپنے اس دور کے ذہن کے مطابق کہنا چاہیئے "زیارت"! لیکن زیارت صرف علامہ اقبالؒ ہی کی حاصل ہو سکی جو بیک وقت پہلی بھی ثابت ہوئی اور آخری بھی! چند ہفتے بعد اقبال اپنا نغمہ حیات اورنہ پورا کر کے ازلی و ابدی فضاؤں کی طرف پرواز کر گیا۔ ۱۹۳۹ء ہی کے وسطی حصے میں مولانا مودودی کو قریب سے دیکھنے کا اشتیاق لئے ہوئے پٹھانکوٹ کا عزم باندھ کر دوسرا سفر کیا۔ غائبانہ تعارف تو اب کافی آگے تک جا چکا تھا، کیونکہ ماہنامہ ترجمان القرآن کے متعدد شمارے نگاہ سے گزر چکے تھے۔ غالباً "سیاسی کشمکش حصہ اول" کے فکر انگیز مباحث دل و دماغ میں اپنی جگہ پیدا کر چکے تھے اور مولانا کے ساتھ کام کرنے والے ایک کرم فرما سے خط و کتابت کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ یہاں اس امر کا ضمناً تذکرہ کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ میں اگرچہ ایک غیر سیاسی علاقے کا دیہاتی نوجوان تھا اور عملاً پارٹی پالیٹکس سے ابعد تھا، لیکن ملک میں مسلمانوں کو انگریزی استبداد اور متعصب ہندو اکثریت کی دو بلاؤں سے جو ہمت آزما کشمکش درپیش تھی اس سے فطری حد تک گہرا ربط رکھتا تھا۔ اپنی پوری قوم کی طرح میں بھی اندھیرے میں تھا: کہ اب کیا ہونا چاہیئے اور راہ نجات کیا ہے؟ مولانا مودودی کی تحریریں دیکھ کر امید کی ایک کرن ہاتھ آئی کہ شاید یہ شخص صحیح طرز پر سوچ رہا ہے اور ممکن ہے کہ اس کے ذریعے الجھنوں کے اس جنگل سے باہر نکلنے کا راستہ مل سکے جو واقعاتی تاریخ کی صورت میں دور دور تک پھیلا ہوا تھا۔ میری ابتدائی دلچسپی مذہبی سے زیادہ سیاسی تھی۔ لیکن خود اس سیاست کے اندر "مسلم قومیت" کی روح تہ نشین تھی۔ ہاں تو میں گھر سے چلا اور کچھ وقت دارالاسلام کی اسی نو آبادی میں رہ کر مولانا مودودی اور ان کے خیالات اور ان کی عملی سکیم کو سمجھنے کا ارادہ لے کر چلا۔ بس والوں نے اپر باری دوآب کی نہر کے کنارے اتارا۔ کچھ دیر کھڑا ادھر دیکھتا رہا کہ کوئی دیہاتی آئے اور مزدوری لے کر سامان پہنچا دے۔ آخر اس بستی کا خاکروب "فقیریا" ادھر سے گزرا اور جب اس کو معلوم ہوا کہ مجھے دارالاسلام جانا ہے تو اس نے سوٹ کیس اور بستر سر پر رکھ لیا اور ہم چلے۔ میرا یہ راہنما مجھے بسوں کی سڑک کے بجائے ریل کے پل کے رستے لے گیا جو نیچے سے بند نہیں تھا۔ اور ایک ایک قدم اس کے (غالباً ستر) سلیپروں پر رکھ کر اسے پار کرنا پڑتا تھا۔ پہلے تو اتنے لمبے پل اور اس کے نیچے شور کرتے اور بپھرے ہوئے رواں دواں پانی کو دیکھ کر دل دہل گیا۔ ارادہ کیا کہ واپس ہو کر جرنیلی سڑک کے راستے نہر کو پار کر لوں، لیکن پھر خیال آیا کہ ایک خاکروب کے سامنے مجھے ایسی کمزوری نہیں دکھانی چاہیئے۔ چلا مگر دس پندرہ سلیپروں پر لمبے لمبے ڈگ بھرنے کے بعد سر چکرایا، بیٹھ گیا۔ لیکن ایک بار پھر اسی ہمت افزا خیال نے سہارا دیا اور پھر فقیریا کے نقوش قدم پر آگے بڑھنے لگا جو بغیر پیچھے مڑ کر دیکھے بے ساختگی سے چلا جا رہا تھا۔ پل پار کرنے کے بعد جھاڑیوں اور درختوں اور سبز گھاس کے بنے ہوئے ماحول میں چند کوارٹر دکھائی دینے لگے اور ان کوارٹروں کے درمیان مسجد اپنے میناروں کی دونوں باہیں اوپر کو پھیلائے کھڑی تھی۔ پہلے سے اطلاع تھی اور ایک دوست منتظر تھے۔

نہایا دھویا اور پھر ملاقات کا بے چینی سے منتظر رہا۔ غالباً مغرب کی نماز کا وقت قریب ہوا تو بستی کی مختصری آبادی —— تین چار افراد —— مسجد کی طرف کھنچنے لگے۔ اذان ہوئی اور اس کی آواز پر قریب کے ایک بڑے کوارٹر سے ایک شخص برآمد ہوا۔ ململ کا کرتہ، ٹخنے کا غرارہ نما پاجامہ، سر پر

والی ہی کی ایک ٹوپی (جو نماز کیلئے گویا خاص تھی)، پاؤں میں غالباً باٹا کے سیاہ رنگ کے سلیپر —— پورا لباس نہایت اجلا جو سبز پس منظر میں عجیب شان سے نمایاں تھا —— اس سادہ لباس کے ساتھ ایک روشن چہرہ (جلد کی سپیدی کے ساتھ جو سرسیرت کی مخفی سی تمک لئے ہوئے) جس پر سکہ بند مذہبی معیار سے چھوٹی شرع سیاہ رنگ ڈاڑھی !! —— کسی تعارف کے بغیر میں پہچان گیا کہ یہ وہی شخص ہے جس کے خیالات سے میں نے تھوڑا سا استفادہ کیا ہے۔ آنے والے نے مسجد میں داخل ہوتے ہی ایک ایسے انداز سے "السلام علیکم" کہی جو آج تک میں نے کسی اور میں نہیں پایا۔ مؤدبانہ جھجک کے ساتھ مصافحہ کیا، کھڑے کھڑے دوستوں نے مختصر تعارف کرایا اور پھر نماز کھڑی ہوگئی۔ نماز کا امام بھی وہی شخص تھا دلچسپ یہ کہ نماز اور قرأت کا اسلوب بھی بے حد ندرت لئے ہوئے تھا اور اس میں بھی اس شخص کی سیرت کی جھلک موجود تھی۔

اپنے پروگرام کے مطابق دو مہینے کا عرصہ میں نے جنگل کے دامن میں آباد شدہ اسی ننھی سی بستی میں گزارا۔ مولانا مودودی کا بیشتر وقت ترجمان القرآن کی ادارتی ذمہ داریوں، تصنیفی کاموں اور خط و کتابت میں صرف ہوتا۔ مولینا سے ملاقات یا تو نمازوں کے اوقات پر مسجد کے کشادہ صحن میں ہوتی اور کبھی نماز سے قبل اور کبھی نماز کے بعد بات چیت رہتی، یا عصر کے بعد مولانا جب سیر کو نکلتے تو ترجمان القرآن کے منیجر اور کاتب، مولینا صدر الدین اصلاحی اور میں —— اور کوئی مہمان آجاتا تو وہ بھی —— سب ساتھ جاتے۔ دین و سیاست کے اہم مسائل پر بحثیں بھی ہوتیں، لطائف بھی ہوتے، بستی اور اس کی مقصدی سکیم سے متعلق معاملات بھی چھڑتے، ترجمان القرآن اور اس کے مکتبہ کے امور کا تذکرہ بھی ہوتا اور اہم اور دلچسپ خطوط اور باہر سے آئے ہوئے سوالات اور اعتراضات پر بھی بات چیت ہو جاتی۔ اس "بزم متحرک" کی دلچسپیاں اور ان کی یادیں تو اب دل و دماغ کا مستقل سرمایہ بن گئی ہیں۔ کبھی مغرب کے بعد کا کھانا یکجائی ہو جاتا اور سلسلہ گفتگو عشا تک جاری رہتا۔ اس "بزم متحرک" کا نشہ دو ہی چار دن میں اتنا تیز ہو گیا تھا کہ صبح ہی سے عصر کا انتظار رہتا اور اشتیاق کہتا کہ "سورج خدا کے واسطے ہو جا تلے تلے"!

ابتدائی رابطے کے اس دور کی واقعاتی تفصیلات اب کچھ زیادہ محفوظ نہیں ہیں اور نہ گفتگوؤں ہی کا پورا مواد سامنے رہ گیا ہے۔ البتہ وہ تاثرات میں بیان کر سکتا ہوں جن کو اپنے ساتھ لئے میں بعد کی اسلامی تحریک کے اس چھپتے سے کیمپ سے رخصت ہوا۔

خیالات ہی کے مطالعے سے میں نے اندازہ کر لیا تھا کہ یہ شخص مولوی نہیں ہے (یہ بات مولویت کے بارے میں ہر طرح کے تحقیر آمیز تاثر سے الگ ہو کر محض حقیقت پسندانہ نقطۂ نظر سے کہہ رہا ہوں)۔ پہلی بار چہرہ سامنے آنے پر میری نگاہ نے میرے اندازے کی تصدیق کر دی۔ بعد کی ملاقاتوں اور گفتگوؤں نے اس ہیولے کو قطعی بنا دیا۔ مگر حیرت مجھے اس بات پر تھی کہ یہ شخص "مسٹر" بھی نہیں تھا۔ وہ مومن اور مسلم اور دین کا رمز شناس ضرور تھا، مگر اس کے گرد روایتی تقویٰ کی پر تکلف اور بوجھل فضا نام کو بھی موجود نہ تھی۔ وہ آزاد خیال اور وسیع النظر تھا، مگر اس میں وہ لاابالیانہ پن بالکل نہیں تھا جو اسلام تک کی حدود کو پامال کرتا کہیں کا کہیں جا پہنچتا ہے۔ اس سلسلے میں ایک گفتگو مجھے نہیں بھولتی جب کہ ہماری "بزم متحرک" میں ڈاڑھی کی بات چھڑی۔ مولانا مودودی کہہ رہے تھے کہ (الفاظ یاد نہیں صرف مفہوم ذہن میں ہے) ڈاڑھی کو آج جو غیر معمولی اہمیت دے دی گئی ہے اصولاً وہ نظام دین میں نہیں تھی۔ مجھ ایسا روزانہ بدست خود شیو بنانے والا اور ڈاڑھی کے "متروک" یا "گراں" سے ڈرنے والا نوجوان یہ الفاظ سن کر مطمئن بھی ہوا اور حیرت زدہ بھی! اسی حیرت زدگی میں بے اختیار میں نے سوال کیا کہ کیا ڈاڑھی نہیں رکھنی چاہیئے؟ جواب ملا کہ میرا مطلب یہ نہیں، رکھنی تو چاہیئے لیکن اس کو دینی حلقوں نے جو حد سے بڑھی ہوئی اہمیت دے دی ہے وہ خود دین میں نہیں پائی جاتی —— آج تو ایک مسلمان سے مذہبی حضرات کے ہاں جو اہم ترین اولین مطالبات کئے جاتے ہیں ان میں ڈاڑھی سب سے پیش پیش ہے[1]۔ اس گفتگو سے مجھے یہ بھی اندازہ ہوا کہ یہ شخص متوازن مزاج اور انصاف پسند ہے۔ انصاف پسندی اور توازن کی

[1] اس سلسلے میں یہ بیان کر دینا مناسب ہوگا کہ لباس (یعنی ٹوپی) سے اور زندگی کے دوسرے پہلوؤں سے متعلقہ مسائل میں مروجہ جامد اور انتہا پسندانہ مذہبی تعصبات اور ان کے خلاف ٹھوڑا پسندانہ [illegible] فقہ نظر کے درمیان مجھے اس کو اعتدال کی [illegible] کا موقع ملا جو مقتل سے لکھ چکا تھا۔ ایسی گفتگوؤں کے زیر اثر غیر شعوری طور پر میرا نقطۂ نظر بدل گیا۔ اگرچہ مجھے اس وقت اس تبدیلی کا پورا شعور نہ تھا۔

ایک اور اہم شہادت جو میرے سامنے آئی اس نے بھی مجھ پر گہرا اثر ڈالا۔ ان دنوں میرے دل میں مسلم لیگ کے لئے ویسی ہی ہمدردی موجود تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ چند دوستوں کی ملتفتانہ بحثوں نے خاکسار تحریک کے بارے میں کچھ جاننے اور سمجھنے کی تحریک پیدا کر دی تھی۔ مودودی صاحب سے کسی موقع پر میں نے مشرقی صاحب کے نظریے اور ان کی برپا کردہ تنظیم کے متعلق رائے دریافت کی۔ اس پر ایک لمبا سلسلۂ گفتگو جاری بزم متحرک میں چھڑ گیا۔ مولانا نے نظریۂ ارتقاء کی توضیح کر کے بتایا کہ درحقیقت علامہ صاحب نے اپنی فکر اور تحریک کی اساس اسی نظریے پر رکھی ہے اور اوپر سے اسے اسلامی اصطلاحات کا جامہ پہنا دیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی مولانا نے مشورہ دیا کہ سنی سنائی باتوں کی بجائے مجھے علامہ صاحب کے اصل لٹریچر کو خود دیکھنا چاہئے اور ٹھوس طریق سے کوئی رائے قائم کرنی چاہئے۔ کتابیں مولانا کے پاس موجود تھیں جن میں سے "تذکرہ" اور "اشارات" کو میں نے پڑھا۔ دونوں کتابوں پر مولانا مودودی کے حواشی موجود تھے اور ان کو میں ساتھ ساتھ دلچسپی اور ذوقِ تجسس سے پڑھتا گیا۔ ان حواشی میں کہیں تو کلمہ ہائے اعتراف اور کلمہ ہائے تحسین موجود تھے، کہیں بیزاری اور اختلاف کا اظہار، اور کہیں کہیں فکری لغزشوں پر سخت درجے کی گرفت پائی جاتی تھی۔ ان حواشی کو پڑھنے سے مجھے خاکسار تحریک کی ماہیت سمجھنے کے ساتھ ساتھ مودودی صاحب کی سیرت کے ایک اہم گوشے کو بھی زیادہ اچھی طرح جاننے کا موقع ملا۔ میرے سامنے اب تک زیادہ تر ایسے ہی لوگ تھے جو نظریاتی اور سیاسی میدان میں اگر کسی کے مخالف ہوں تو اندھے مخالف ہوتے ہیں اور حامی ہوں تو غالی حامی! لیکن اس میدان میں مجھے پہلی بار ایک نئے کردار سے تعارف حاصل ہوا۔

یہ بات بھی میں نے سمجھ لی کہ یہ شخص "بازمانہ ساز" قسم کا آدمی نہیں ہے۔ نہ جامد اور منفی اور منفعل قسم کی فطرت پر اس کی شخصیت مبنی ہے، بلکہ یہ ایک اصول و مقصد رکھنے والے نایاب مردانِ کار کی طرح "با زمانہ ستیز" کے حوصلے رکھتا ہے۔ تھوڑی سی معلومات کی روشنی میں یہ بھی معلوم ہو چکا تھا کہ اس نے اب تک سفرِ مقصد قربانیاں دیتے ہوئے کاٹا ہے اور آئندہ اس کے سامنے معاشی نقصانات اور سیاسی مخالفتوں کے سنگین تر مراحل ہیں لیکن یہ اپنی منزل سے منہ موڑنے والا نہیں ہے۔

مجھے یہ بھی اندازہ ہو گیا کہ اس کے سامنے جو کچھ سکیم ہے (اور واقعہ یہ ہے کہ اس کی عملی صورت میرے ذہن میں متشخص نہیں ہو سکی تھی) وہ ایک لمبا پروگرام اور ٹھنڈا طریقِ کار اور کسان کا سا صبر چاہتی ہے۔ یہ ہتھیلی پر سرسوں جما کر کام کے نتائج کی فصل جلد از جلد کاٹ لینے والوں میں سے نہیں ہے اور نہ جوشیلے پن کا مریض ہے جو ہماری قوم کا موروثی روگ بن چکا ہے۔

یہ رائے بھی میرے ذہن میں قائم ہو گئی کہ یہ جو کچھ بھی کرنا چاہتا ہے، اپنے ارادوں میں مخلص ہے اور اس کی متاعِ فکر و عمل منڈی کا مال نہیں ہے

سب سے زیادہ مجھے جس چیز نے متاثر کیا وہ میرے جیسے ایک دیہاتی نوجوان کو جس کا علمی یا عملی، دینی یا سیاسی، کسی بھی لحاظ سے کوئی مقام نہ تھا، مولانا مودودی کی نگاہوں میں ایک اہمیت حاصل تھی۔ میں نے کسی لمحے یہ محسوس نہ کیا کہ ایک بڑا آدمی کسی اونچے مقام سے مجھے دیکھ رہا ہے اور "بڑے آدمیوں" کے بارے میں میرا جو کچھ تصور چلا آ رہا تھا وہ مودودی صاحب کے حق میں قطعی طور پر بدل گیا۔ وہاں بُعدِ مراتب کے بجائے میں نے قربِ اخوت محسوس کیا۔ یوں یہ حقیقت بھی مجھ پر واضح ہوئی کہ مولینا "پیرانِ کہن" سے نومید ہیں۔ اور "بہ جوانان سہل کن حرفِ مرا" کی دعا کے ساتھ قوم کی نئی نسل کی طرف روئے سخن رکھتے ہیں۔

الغرض میرے لئے یہ ایک نیا کردار تھا جس کا عنوان تجویز کرنا مشکل تھا۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا تھا کہ یہ ہمارے مستقبل کا کردار ہے۔ "اگلے وقتوں" کے لوگوں کے بالمقابل یہ "آنے والے وقتوں" کا کردار تھا۔ یہ کردار مرعوب کن نہیں بلکہ جاذبیت دار تھا۔ اس سے ڈر نہیں آتا تھا بلکہ اس کے لئے محبت و احترام کے جذبات پیدا ہو گئے تھے! ان سارے تاثرات کے ساتھ مودودی کی ذات اور اس کی فکر سے ایک گہرا رابطہ استوار کئے ہوئے میں نے "دارالاسلام" کو الوداع کہی۔

یہی ہے وہ ایک آدمی جس کی شخصیت کا مطالعہ کرنا پیشِ نظر ہے۔ مطالعۂ شخصیت کا اصل مقصود اس جوہرِ سیرت کا سراغ لگانا ہے جس کا پرتو آدمی کی زندگی کے بعید ترین گوشوں تک جا پڑتا ہے اور جس کے سرچشمے سے زندگی کی کیاری کا ایک ایک ذرۂ خاک سیراب ہوتا ہے۔ کسی کے جوہرِ سیرت تک پہنچنے کیلئے جب ہم ذہنی سفر کرتے ہیں تو سب سے پہلے سابقہ "مظاہرِ شخصیت" سے پیش آتا ہے، اور آگے بڑھیں تو اخلاق اطوار سے دوچار ہوتے ہیں۔ اور سب سے آخر میں جا کر نظریات و افکار اور اصول و مقاصد دیکھے جاتے ہیں۔ مولینا مودودی کی شخصیت کے فکری پہلو کو تو میں نے ایک الگ مضمون[1] میں پیش کر دیا ہے۔ اخلاق و اطوار پر یہاں براہِ راست بحث کرنے کا ارادہ نہیں، یہاں صرف مظاہرِ شخصیت کو پیش کرنا مطلوب ہے۔ "مظاہرِ شخصیت" سے میری مراد آدمی کے وہ خصوصی

---

[1] ملاحظہ ہو "مولانا مودودی ——— اپنی اور دوسروں کی نظر میں"

اسالیبِ اظہار میں بول چال، تحریر، تقریر، کھان پان، نشست و برخواست اور "ذوقیات"[1] کے اندر پائے جاتے ہیں اور جن کے ذریعے اس کے ذہن اور اس کی سیرت کی کتاب کو پڑھا جا سکتا ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ آدمی گھر کے جس ماحول میں رہتا ہے، جس بیٹھک میں بیٹھتا اور جس دفتر میں وہ قلم چلاتا ہے جس لباس کو پہنتا اور جن اشیاء کو اپنے استعمال میں رکھتا ہے، ان سب پر اس کی شخصیت کی چھاپ پڑی ہوتی ہے۔ کوئی شخص فرنیچر اور دوسرے سامان کو جو ترتیب دیتا ہے، جس ڈھنگ سے وہ خطوط لکھتا ہے، جس طرز پر وہ دستخط ثبت کرتا ہے، اس کے اندر اس کی شخصیت کی روح شامل ہوتی ہے۔ یہ سب مظاہرِ شخصیت[2] ہیں اور ان کا مطالعہ کر کے کسی شخص کے اصل جوہرِ سیرت کی قدر و قیمت مشخص کی جا سکتی ہے اور اس کا اخلاقی مقام متعین کیا جا سکتا ہے، چاہے اس سے ملاقات تک کا موقع نہ ملا ہو۔ آدمی کی داستان عمر بھر اس کے ماحول اور اس کے املاک اور اس کے مستعملات پر کسی پر اسرار قلم سے مرقوم ہوتی رہتی ہے۔ مظاہرِ شخصیت کے مطالعہ کے معنی خفیہ رسم الخط میں لکھی ہوئی اسی داستان کو پڑھنے کے ہیں ورنہ بجائے خود یہ معلومات کہ فلاں کیا پہنتا اور کیا کھاتا ہے اور کیسے بیٹھتا ہے اور کیونکر بولتا اور لکھتا ہے، کوئی قدر و قیمت نہیں رکھتیں اور ان کے حاصل کرنے اور قلم بند کرنے اور دوسروں تک منتقل کرنے میں وقت اور قوت صرف کرنا کسی معقول آدمی کا مشغلہ نہیں ہو سکتا۔

آدمی کا سراپا اس کی شخصیت کا نشیمن ہوتا ہے اور سراپا کو ایک نظر دیکھتے ہی افسانی کرداروں کا ایک رازداں اس کے اندر رہنے بسنے والی شخصیت کا مسودہ ادا لیہ پا لیتا ہے۔ مولانا مودودی کا سراپا، بلکہ وجاہت دار چہرہ کسی بھی ماحول میں ہو ——— گھر میں، مجلس میں، دفتر میں، ریلوے اسٹیشن پر، کار کے کسی ڈبے یا جلسہ گاہ میں ——— بالکل ممتاز اور نمایاں رہتا ہے اور بتاتا ہے کہ وہ جس شخصیت کا آئینہ دار ہے اس کے نمونے تقدیر نے بہت زیادہ تعداد میں نہیں بنائے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس مضمون کے آغاز میں مولانا مودودی کی ایک قلمی تصویر پیش کر دی جائے۔ یہ تصویر میں اپنے قلم سے کھینچنا چاہتا تھا، مگر اس میں وقت زیادہ درکار ہے۔ وقت بچانے کیلئے میں اپنے صحافی دوست ملک سفیان آفاقی کی مرتبہ تصویر مستعار لئے لیتا ہوں :-

"چھوٹے بالوں کے پٹے جن میں درمیان سے مانگ نکلی ہوئی، کھلتا ہوا گندمی رنگ، چوڑا ماتھا، آنکھوں پر ہلکے سے نیلے رنگ کے شیشوں کی عینک (نہیں ——— مولانا سفید شیشے استعمال کرتے ہیں۔ ن۔ص) دوہرا جسم اور مسکراتی ہوئی آنکھیں، چہرہ ہنس مکھ، اور سفید سی داڑھی پر جہاں تہاں سیاہی متر شح !" ("ابوالاعلیٰ مودودی")

مولانا مودودی ان بہ قیمت بہتر لوگوں میں سے ہیں جن کے قامت پر توجہ نہیں جاتی۔ یوں قد بہت چھوٹا نہیں ہے، دوہرے بدن کی وجہ سے نظر کو مغالطہ ہوتا ہے لیکن موزونیت اس درجہ کی ہے کہ مودودی صاحب کے سراپا میں کوئی بات کھٹکتی نہیں۔ دوہرے بدن کے باوجود مولانا کی چال ڈھیلی ڈھالی اور مریل قسم کی نہیں ہوتی بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی شخص کسی خاص مشن پر جا رہا ہے۔ "چال" کے بارے میں ابھی دن تفہیم القرآن کے حاشیے میں خود مودودی صاحب نے بڑے کام کی بات لکھی ہے، ملاحظہ ہو :-

"مگر غور طلب پہلو یہ ہے کہ آدمی کی چال میں آخر وہ کیا اہمیت ہے جس کی وجہ سے اللہ کے نیک بندوں کی خصوصیات گناتے ہوئے سب سے پہلے اس کا ذکر کیا گیا ؟ اس سوال کو ذرا تامل کی نگاہ سے دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ آدمی کی چال محض اس کے انداز رفتار ہی کا نام نہیں ہے بلکہ وہ درحقیقت وہ اس کے ذہن اور اس کی سیرت و کردار کی اولین ترجمان بھی ہوتی ہے۔ ایک عیار آدمی کی چال، ایک غنڈے بدمعاش کی چال، ایک

---

[1] کچھ لوگ پیشہ ایسے پائے گئے ہیں جو شبہ آدمیوں کے مظاہرِ شخصیت کا چربہ اتارتے ہیں۔ حالانکہ اصل نتیجہ خیز چیز اپنے اندر کسی اچھا جوہرِ سیرت کا پیدا کرنا ہے اور اس کے نتیجے میں ہر آدمی کے اپنے مظاہرِ شخصیت ایک امتیازی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ کسی کی شخصیت کا لباس پہن کر ہم اپنا قد و قامت اس کے مطابق نہیں بنا سکتے۔ بلکہ ہمیں اپنے ہی قد و قامت کے مطابق لباس سلا سکتا ہے۔

[2] آفاقی صاحب نے مودودی کو نہیں دیکھا جب داڑھی بالکل سیاہ تھی اور خوب گھنی تھی۔ اس کے حلقے میں کشادہ پیشانی والا روشن چہرہ عجیب منظر سامنے لاتا تھا۔ عجیب بات ہے کہ مولانا مودودی کی داڑھی کے بال غیر معمولی تیز رفتاری سے سفید ہوئے ہیں۔ اور اب تو کوئی اکا دکا بال ہی سیاہ رہ گیا ہوگا۔

ظالم جابر کی چال، ایک خود پسند متکبر کی چال، ایک باوقار مہذب کی چال، ایک غریب مسکین کی چال، اور اسی طرح مختلف اقسام کے دوسرے آدمیوں کی چالیں ایک دوسرے سے کس قدر مختلف ہوتی ہیں کہ ہر ایک کو دیکھ کر بآسانی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ کس چال کے پیچھے کس طرح کی شخصیت جلوہ گر ہے۔ پس آیت کا مدعا یہ ہے کہ رحمان کے بندوں کو تم عام آدمیوں کے درمیان چلتے پھرتے دیکھ کر ہی بغیر کسی سابقہ تعارف کے الگ پہچان لو گے کہ یہ کس طرز کے لوگ ہیں۔ اس بندگی نے ان کی ذہنیت اور ان کی سیرت کو جیسا کچھ بنا دیا ہے، اس کا اثر ان کی چال تک میں نمایاں ہے۔ ایک آدمی انہیں دیکھ کر پہلی نظر میں جان سکتا ہے کہ یہ شریف اور حلیم اور ہمدرد لوگ ہیں، ان سے کسی شر کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ (ترجمان القرآن ۔ ج ۴۲ ۔ عدد ۵)

میرا ذاتی تاثر یہ ہے کہ مولانا مودودی کی چال یہ ظاہر کرتی ہے کہ یہ شخص احساسِ ذمہ داری کے عالم میں کوئی فرض ادا کرنے جا رہا ہے، مگر گھبراہٹ کے انداز سے نہیں، پر وقار طریق سے۔ ممکن ہے دوسروں کا تاثر کچھ اور ہو، لیکن اتنا بہر حال ہر کوئی محسوس کریگا کہ "یَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا" کے معیار پر یہ چال پوری اترتی ہے۔

مودودی صاحب کے سراپا کا ایک جزو لباس بھی ہے اور میں پہلے ذکر کر چکا ہوں کہ وہ گھر اور دفتر میں رہتے ہوئے کیسا لباس پہنتے ہیں۔ سردیوں میں کھلے پاجامے کیساتھ دھاری دار قمیض اور اونی سویٹر استعمال کرتے ہیں۔ سر پہ گرم اونی ٹوپی پہن لیتے ہیں۔ پاؤں میں جرابوں کے علاوہ چمڑے کے موزے بھی ہوتے ہیں اور باٹا کا کینوس کا نیو کٹ جوتا۔ لگتا ہے کہ سخت سردی ہو جانے پر سفید رنگ کی اونی قبا بھی اوڑھ لیتے ہیں جسے زیارت سے آتے ہوئے ساتھ لائے تھے۔ باہر جانا ہو تو تنگ موری کا چوڑی دار پاجامہ، موسم کے مطابق گرم یا سرد شیروانی اور قراقلی کی بنی ہوئی اونچی باڑھ کی سیاہ رنگ ٹوپی استعمال کرتے ہیں۔ گرمیوں میں باہر جانے کا لباس کبھی کبھی شیروانی سمیت بالکل سفید ہوتا ہے اور غالباً اس لباس میں مودودی صاحب کی شخصیت پوری طرح نمایاں ہو جاتی ہے۔ وضو کیلئے لکڑی کی کھڑاواں موجود رہتی ہیں۔ لباس کے تنوع کا دائرہ بے حد محدود، لیکن شخصیت کی ترجمانی اور زیبائش کیلئے ہمیشہ موزوں رہتا ہے۔ مودودی کے لباس کے اصل اجزا ہیں ——— صفائی، سادگی اور حسنِ ذوق!!

آدمی حیوانِ ناطق ٹھہرا۔ نطق سے بڑھ کر اس کا کوئی ترجمان اور غماز نہیں ہو سکتا۔ نطق شخصیت کے بہاؤ کی گزرگاہ ہے۔ آدمی نے بات کہی اور اس کی حقیقت کھلی۔ ناطقہ کی تانت باجی تو زمانے بھر نے راگ پالیا۔ "تا مرد سخن نگفتہ" والی بات پرانی نہیں ہوئی۔ موضوعات کی پسندیدگی، زبان کا معیار، الفاظ کا انتخاب، لہجہ کا اتار چڑھاؤ، بولنے کی رفتار، آواز کی پستی و بلندی، بات چیت میں جذبات کی آمیزش اور اس کا تناسب، وہ چیزیں ہیں جو پانچ منٹ میں ایک آدمی کی ساری مخفی حقیقتوں کا خود اسی کی زبان کے لاؤڈ سپیکر سے اعلانِ عام کر دیتی ہیں۔ کسی کا ذہنی و علمی معیار کیا ہے، کسی کا ظرف کتنا ہے، کسی کا ذوق کس نوعیت کا ہے، کسی میں سنجیدگی کس درجہ پائی جاتی ہے، کوئی کہاں تک بااصول ہے، یہ اور اسی طرح کے دوسرے بہت سے سوالات ہیں جن کا جواب ایک شخص دو چار فقرے بول کر دے چکتا ہے۔ مگر بسا اوقات خود نہیں جانتا کہ اس نے اپنی کن کن حقیقتوں کو دوسروں کے سامنے رکھ دیا ہے۔

مولانا مودودی کی گفتگوؤں سے میں گزشتہ چودہ پندرہ برس کے زمانے سے بہرہ اندوز ہوتا رہا ہوں۔ مولانا کے اندازِ گفتگو پر چند باتیں جو مستقل تاثرات کی حیثیت میں میرے ذہن میں موجود ہیں، اس موقع پر بیان کرتا ہوں۔

عام طور پر دیکھنے میں آتا ہے کہ تحریر یا تقریر کے آدمی کو ہم جتنا بلند پاتے ہیں، وہی آدمی مجلسی زندگی میں گفتگو کرتے ہوئے انتہائی پست ہو جاتا ہے۔ مثلاً اس کی تحریر و تقریر میں بااصول پسندی اور مقصدیت ہوتی ہے، لیکن اپنی گفتگوؤں میں اس کا بے اصولا پن اور اس کی لامقصدیت صاف صاف نمایاں ہوتی ہے۔ اسی طرح تحریر و تقریر میں جو سنجیدگی اور معقولیت کسی کی شخصیت میں محسوس ہو رہی تھی بے تکلفانہ گفتگو کے ماحول میں ملمع کی وہ ساری چمک دمک غائب ہو کر رہ گئی۔ تحریر و تقریر میں علمیت و تفکر کے کچھ آثار جھلملا رہے تھے لیکن گفتگو کے دائرے میں سامنا ہوتے ہی پتہ نکل جاتا ہے کہ وہ سب کچھ تصنع کی کرشمہ سازیاں تھیں۔ اسی طرح تحریر و تقریر میں زبان کے ٹھاٹھ موجود تھے لیکن بات چیت میں سب غائب! الغرض تحریر و تقریر کا آدمی ہمارے ہاں بالعموم اس آدمی سے بالکل الگ ہوتا ہے، جس سے ہم مصافحہ کرتے ہیں، جس کے ساتھ بیٹھتے اور جس سے بات چیت کرتے ہیں۔ لیکن مولانا مودودی اس معاملے میں اپنی مثال آپ ہیں کہ وہ نہ صرف تحریر و تقریر کے دو الگ میدانوں میں ایک ہی سی حالت پر رہتے ہیں بلکہ وہ اظہار کے ان وسیع میدانوں سے ہٹ کر جب کبھی عام بات چیت کے نسبتاً محدود دائروں کی طرف چلتے ہیں تو بھی اپنی یکسانی کو برقرار

دکھتے ہیں۔ وہی بلندیٔ فکر، وہی سنجیدگی و وقار، وہی حسنِ گفتار، وہی غیر جذباتی لب و لہجہ، الفاظ کا وہی حسنِ انتخاب، ظرف کی وہی وسعت، معلومات کی وہی سلیقہ کرانی، مقصدیت، اصولیت کا وہی زور، اور کلام کا وہی مزاج آپ کو عصرانہ نشست کی ہلکی پھلکی بات چیت میں بھی ملے گا جو مودودی صاحب کی تحریر و تقریر میں پایا جاتا ہے۔

بڑے لوگوں کی ایک خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ ان کے اندر دوسروں کے لئے بڑی زور دار جاذبیت پائی جاتی ہے اور جاذبیت کا یہ اثر ان کی گفتار میں پوری طرح نمایاں ہوتا ہے۔ جاذبیت کیلئے بہت ساری چیزیں تباہ کن ثابت ہو سکتی ہیں مگر ان میں سے ایک سب سے زیادہ خطرناک ہے۔ وہ ہے آدمی کی خودی کا متورّم ہو جانا۔ خودی جب متورم ہو جاتی ہے تو اس کی زندگی کے تمام پہلوؤں کے ساتھ ساتھ اس کی زبان اور اس کی گفتگو اس کے زہر سے متاثر ہوتی ہے۔ اس عالم میں آدمی کی "میں" کا بوجھ بہت زیادہ بڑھ جاتا ہے اور وہ ہر موقع پر اپنے آپ کو نمایاں کرتا ہے۔ اپنے آپ کو پیش کرتا ہے۔ اپنے آپ کو دوسروں پر ٹھونستا ہے۔ اپنے آپ کو اہمیت دیتا ہے۔ اپنے آپ کو کچھ تسلیم کرانا چاہتا ہے۔ لیکن متورم خودی کے بوجھ کو اٹھانے پر کوئی دوسرا تیار نہیں ہوتا۔ لوگوں کو ایسے شخص کی گفتگو سے انقباض ہوتا ہے اور وہ اس کے ارد گرد سے چھٹ چھٹا جاتے ہیں۔ مولانا مودودی کو اللہ تعالیٰ نے صحت مند خودی دی ہے۔ اس شخص نے اپنے آپ کو دوسروں پر ٹھونسنے اور اپنے آپ کو کچھ منوانے کی کوشش کبھی نہیں کی۔ میں نے بارہ پندرہ برس میں سینکڑوں مجالس میں مولانا مودودی کی گفتگوؤں کو سنا ہے مگر کبھی کسی گفتگو کے دوران میں ایسا نہیں ہوا کہ میرے یا دوسرے ساتھیوں کے ذہن نے مولانا کے انا کا بارگراں اپنے اوپر پڑتا محسوس کیا ہو۔ ایک رخ یہ، اور دوسرا رخ یہ کہ مودودی کی زبان پر کبھی کوئی غریب کارانہ کلمۂ انکسار بھی نہیں آیا۔ یہ بھی انسانی خودی کا ایک دوسرا رنگ ہے، اور شاید پہلے سے کچھ زیادہ ہی خطرناک! مودودی صاحب سے ملنے والوں کو کبھی یہ ابتلا پیش نہیں آتا کہ انہیں ایک شخص کی مسلسل سنی پڑے اور خود ان کو مافی الضمیر کے کہنے کا موقع نہ ملے۔ یہاں ہر شخص کو بات کرنے کا کھلا موقع ملتا ہے۔ جس میں نہ مودودی صاحب کی شخصیت رکاوٹ بنتی ہے۔ نہ جدید یا قدیم قسم کے مراسم و آداب!

ہمارے معاشرے کی ایک عام روایت بن چکی ہے کہ لوگ اختلافی گفتگوؤں میں ضرور ہی لڑنے جھگڑنے پر اُتر آتے ہیں۔ ہماری یہ قومی صفت صرف معمولی درجے کے لوگوں میں نہیں، اونچے درجے کے مصنفین، لیڈروں، وزیروں، حکام، اخبار نویسوں اور مذہبی رہنماؤں سبھی میں پائی جاتی ہے اور جو جتنا بڑا ہے اس میں یہ خوبی اتنی ہی وافر پائی جاتی ہے۔ ہمارے ہاں گفتگو کا بنیادی فارمولا یہ ہے کہ اپنی بات دوسرے سے منوا کے چھوڑنا ہے اس کے لئے دو بڑے ہتھکنڈے اختیار کئے جاتے ہیں۔ ایک جو ذرا کم کم استعمال میں آتا ہے وہ لجاجت کا ہتھکنڈہ ہے۔ یعنی ہونٹ لٹکا لٹکا کے، خوشامد کر کر کے، اور اپنے جذبات کے حق میں رحم کی اپیلیں کر کر کے مخاطب سے کوئی بات منوانا! دوسرا ہتھکنڈہ جو بھٹیار خانوں اور قہوہ خانوں سے لیکر پارلیمانی ایوانوں تک کثیر الاستعمال ہے۔ قوتِ غضبیہ کو کام میں لانے کا ہتھکنڈہ ہے۔ یعنی آپ نے بات کہی، نہیں مانی گئی تو پھر ذرا زور دے کر اسے دُہرایا، پھر نہیں مانی گئی تو آواز اونچی ہو گئی۔ پھر نتھنے پھولنے لگے۔ ہونٹوں پر جھاگ آنا شروع ہوا۔ گردن کی رگوں کا ابھار بڑھ گیا ——— آخری حد نہ جانے کیا ہو!

مولانا مودودی اختلافی امور پر گفتگو کرتے ہوئے ان دونوں طریقوں سے دُور ہٹ کر ایک تیسرا راستہ اختیار کرتے ہیں۔ ان کا ہتھکنڈہ افہام و تفہیم کا ہتھکنڈہ ہے۔ یعنی مقصدِ کلام دوسرے کی بات کو سمجھ لینا اور اپنی بات سمجھا دینا ہوتا ہے! بارہا ایسا ہوا کہ مخاطب مولانا کا سارا استدلال سن کر اپنے موقف سے نہیں ٹلا۔ اسی پر قائم رہا۔ یا مولانا کے مقابلے میں کسی دوسرے عالم یا لیڈر کی رائے کو ترجیح دیتا رہا تو ایسے موقعوں پر مودودی صاحب ہمیشہ ٹھنڈے انداز سے یہ کہا کرتے ہیں کہ "آپ چاہیں تو وہ رائے رکھ سکتے ہیں!" ——— اس فقرے نے بارہا مناظرہ پسند لوگوں کی اسکیموں کو درہم برہم کر دیا ہے۔ مولینا مودودی کو مناظرانہ انداز کی گفتگو سے شدید درجے کی نفرت ہے۔ وہ ایسی گفتگو کو اوّل تو اپنے خاص حکیمانہ اسلوب سے افہام و تفہیم کے ہتھکنڈہ پر لانے کی کوشش کرتے ہیں اور اکثر کامیاب رہتے ہیں۔ لیکن اگر کسی طرح کامیابی نہ ہو تو پھر "قَالُوْا سَلٰمًا" کی قرآنی ہدایت کے مطابق "حسنِ فرار" کا مظاہرہ کرتے ہیں۔

معقول استدلال کو جب کوئی شخص محض حمق اور نا معقولیت یا عدم ضد کی وجہ سے رد کر رہا ہو، اور اندازہ ہو جائے کہ بار بار ایک ہی دلائل دُہرانے سے کوئی فائدہ نہیں ہو سکتا تو ایسی صورت میں مودودی صاحب بالعموم صاف صاف اعترافِ شکست کرتے ہوئے کہا کرتے ہیں کہ "میرے پاس جو دلائل تھے وہ میں نے بیان کر دیئے۔ اگر آپ ان سے مطمئن نہیں تو اپنی رائے پر قائم رہیئے۔ اور کوئی دلیل میرے پاس نہیں ہے" ——— کم لوگ اس طرح اعترافِ شکست کر

سکتے ہیں۔

ہر لیڈر اور عالم اور بڑے آدمی کو خبطیوں سے سابقہ پیش آتا ہے۔ خبطیوں سے مراد وہ لوگ ہیں جن کے خیالات اور جذبات میں توازن نہیں ہوتا اور جن کو اپنے ذہن سے خود آگاہی نہیں ہوتی۔ نہ ان کو اپنے عالم افکار پر کوئی قابو حاصل ہوتا ہے۔

اس طرح کے غیر منظم ذہن کے لوگ طرح طرح کے مسائل، قسم قسم کی کہانیاں، رنگ رنگ کی بھارتیں لے کے مولانا مودودی کو بھی شرفِ ملاقات سے سرفراز فرماتے رہتے ہیں۔ نوعِ انسانی کی اس صنف سے اگر آپ بحث کرنے لگیں یا ان کے خیالات کو منظم کرنے کی کوشش کے درپے ہو جائیں یا ان کو آپ ان کے عدمِ توازن سے آگاہ کرنے کی کاوش میں لگ جائیں تو پھر ان کی جبع اور زیادہ رواں ہوتی ہے۔ پھر ان سے گھنٹوں اور ہفتوں گفتگو کرتے رہیئے، بلکہ برسوں دماغ لڑاتے رہیئے، یہ اسی حالت پر رہیں گے جس پر تھے۔ مودودی صاحب ایسے آدمی کو دو چار باتوں میں پہچان جاتے ہیں اور بڑے ہمارے اشارے سے کام لیتے ہیں۔ یعنی اُسے کھلا موقع دیتے ہیں کہ وہ بولتا چلا جائے اور خود چپ چاپ بیٹھے سنتے رہتے ہیں۔ کوئی اختلاف نہیں کرتے، کسی چیز کی تردید نہیں کرتے، کسی بات پر نقد نہیں دیتے۔ بلکہ سراسر "تختۂ مشق" بن کر رہ جاتے ہیں۔ بیچارا خبطی کتنا بڑا خبطی کیوں نہ ہو، مقابل سے کسی ردِ عمل کے بغیر گھنٹہ دو گھنٹہ مسلسل بولنے کے بعد آخر ہمت ہار دیتا ہے۔ چنانچہ ان تجربات سے مولانا مودودی کو ہم نے تو گزرتے دیکھا ہے اور ہمیں یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ جو شخص اس شہادت گاہ سے یوں گزر سکتا ہے اسے کبھی اور چھانسی لغزش نہیں دلا سکتے۔

ہم ذاتی تجربے سے مولانا مودودی کے ساتھ میں دو باتوں کی شہادت ہم بڑے وثوق سے دے سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ مودودی صاحب کو ہم نے ایک لمحے کے لئے بھی مغلوب الغضب نہیں دیکھا اور نہ آپ کو کبھی غضب آمیز الفاظ میں بات کرتے سنا ہے۔ حدیہ کہ جن گوناگوں مخالفتوں اور الزامات اور گالیوں اور دوسری زیادتیوں کا مولانا کو لمحہ لمحہ سامنا کرنا پڑا ہے ان کے ردِ عمل کے طور پر بھی کبھی ایسا نہیں ہوا کہ مولانا کی زبان کا معیارِ پاکیزگی و سنجیدگی اپنی مقررہ حد سے نیچے گرا ہو۔ بے شمار گھٹیا الفاظ ہیں جن کو ادیب اور صحافی گفتگو ہی میں نہیں، اخباری کالموں میں ہر روز استعمال کرتے ہیں۔ لیکن مولانا مودودی کے چمنستانِ تکلم میں ان کا نمو کی کوئی جگہ نہ ہوئی۔ ان گنت اسالیب ہیں جو ادنیٰ قسم کی جذباتیت نے اپنے اظہار کیلئے وضع کر لئے ہیں اور جاہلے معززین اور شرفاء دن رات ان کو استعمال میں لاتے ہیں لیکن مولانا مودودی کے جہانِ ذوق میں ان کی سمائی قطعاً نہیں! مولانا کے حسنِ ذوق کا شعور رکھنے والے کسی آدمی کے سامنے آپ کوئی لفظ بول کے دریافت کریں تو وہ آپ کو بتا سکے گا کہ مولانا یہ لفظ بول سکتے ہیں یا نہیں!

ایک شخص جس کی مادری زبان دلی کے شریف گھرانوں کی خاص بولی ہو اور پھر اس بولی کو جیدر آباد کی علمی فضا نے سیراب کیا ہو اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اسے اسلام کے آدابِ اخلاق نے ایک خاص مزاج دیا ہو، اس سے آپ کو کس انداز گفتگو کی توقع کرنی چاہیئے؟ ——— حلقۂ یاراں ہو یا مجلسِ بیگانگاں، جوشِ زندگی کے کیسے تند و تیز لمحے ہوں، یا گھر کی چار دیواری کے اندر کا حلقہ، بیوی بچوں سے رابطہ ہو یا نوکروں اور ملازموں سے، مولانا مودودی کی گفتگو نفاست، سنجیدگی اور پاکیزگی کے معین معیار سے کبھی بھولے سے بھی نیچے نہیں گرتی!

مولانا کے اندازِ گفتگو کے بارے میں ایک خاص بات یہ ہے کہ بڑے جماؤ کے ساتھ ایک ایک لفظ ٹھہر ٹھہر کر بولتے ہیں۔ بقول ملک غلام علی صاحب (مولانا کے خاص معاون کار) اگر کوئی شخص چاہے تو پوری گفتگو معمولی رسم الخط میں قلمبند کر سکتا ہے۔ یہ اندازِ گفتگو وہی شخص لے کے چل سکتا ہے جو غصے، تندی، جلد بازی اور ذہنی اضطرابات سے مغلوب نہ ہو۔ مولانا مودودی جیسی شخصیت کا ایک مستقل ابتلاء یہ ہوتا ہے کہ طرح طرح کے لوگ آ آ کر ذریعۂ امتحان بنتے ہیں۔ خبطی، ذہنی الجھنوں کے مریض، خود پسند، تیز زبان، مناظرہ باز، بحثیئے، متعدد غرضیکہ قسم قسم کی مخلوق ایسے لوگوں کو تختۂ مشق بناتی ہے۔ ایسے لوگ بات کر کے مخاطب کا ذہنی سکون بہم برہم کر دیتے ہیں اور ان کے مقابلے میں انضباط کو قائم رکھنا معمولی آدمیوں کے بس کا نہیں ہوتا۔ لیکن مولانا مودودی ایسے لوگوں کی گفتگوؤں کے ریلوں کے درمیان سنجیدگی و وقار کی چٹان بنے اپنے مزاج کو قائم رکھتے ہیں۔ غالباً اس سلسلے کے چند عجیب کرشمے "امتحانات" میں سے ایک وہ تھا جب ایک قادیانی پارٹی مولانا پر تبلیغ کرنے دارالاسلام پہنچی تھی۔ اس "امتحان صبر و وقار" کے موقع پر میں بھی شریکِ مجلس تھا۔ مگر چونکہ یہ روداد پہلے سے ملک غلام علی صاحب بیان کر چکے ہیں اس لئے انہی سے الفاظ مستعار لیتا ہوں۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

ٹ۔ ملاحظہ ہو: مولانا مودودی ——— اپنی اور دوسروں کی نظر میں

"ایک مجلس میں مولانا اور ہمارے سامنے ان لوگوں نے اپنے فنِ مناظرہ اور علمِ کلام کے خوب خوب کرتب دکھائے۔ کئی گھنٹے تک اُلٹے سیدھے سوالات و جوابات کا سلسلہ جاری رکھا۔ ہمیں کوفت بھی ہوتی تھی اور غصہ بھی آتا تھا۔ کبھی ہمارا جی یہ چاہتا تھا کہ ان سے رخصت اور معافی طلب کی جائے اور کبھی ہم اس پر آمادہ ہوتے تھے کہ انہیں ترکی بہ ترکی جواب دیئے جائیں۔ مگر مولانا تحمل سے ان کی باتیں سنتے رہے، نرمی سے جواب بھی دیتے رہے اور حق کو ان پر واضح کرنے کی کوشش بھی کرتے رہے۔ آخر کار جب مولانا نے دیکھا کہ ہمارا صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا ہے تو قادیانی حضرات سے دھیمے لہجے میں کہنے لگے کہ "میں نے اپنے ساتھیوں کو بڑی محنت سے کافی مدت تک ضبط اور برداشت کی مشق کرائی ہے خطرہ ہے کہ آپ لوگ میرے سارے کئے کرائے پر پانی پھیر کر نہ جائیں۔" اللہ بہتر جانتا ہے کہ یہ بات کام کر گئی یا "مبلغین" اتمام حجت کرتے کرتے تھک گئے، بہر حال اس کے بعد وہ تشریف لے گئے۔" ("مودودی — اپنی اور دوسروں کی نظر میں")

جو لوگ مولانا کو دور ہی سے دیکھتے ہیں اور بے تکلفی کے دروازے کے باہر ہی باہر سے جھانکتے ہیں، ان کو ایک کمی محسوس ہوتی ہے۔ وہ یہ کہ مولانا گفتگو اور ملاقات میں "بے پناہ قسم کی گرمجوشی نہیں دکھاتے۔ کوئی نیا آدمی ملنے آئیگا تو وہ خوبصورتی سے سلام کا جواب دیں گے۔ ہاتھ کی تھوڑی سی مہذبانہ جنبش اور بالائی حصۂ جسم کے بالکل خفیف سے جھکاؤ کے ساتھ ہلکا سا مصافحہ کریں گے، نووارد عام مجلس میں آکر بیٹھے تو تھوڑی دیر کیلئے سکوت اختیار کر لیں گے تاکہ اگر وہ کوئی بات کرنا چاہتا ہو تو اُسے موقع ملے۔ ورنہ جو سلسلہ چل رہا تھا وہی از سرِ نو شروع ہو جائیگا۔ ملاقاتی علیحدگی میں خاص طور پر ملے تو دریافتِ مدعا کیلئے سادہ انداز میں کہیں گے: "فرمائیے!" یا پھر یہ سوال کریں گے کہ "آپ کہاں سے تشریف لائے ہیں؟" مولانا نے بطورِ خود کبھی معانقہ نہیں کیا، البتہ ہمارے پٹھان رفقا اس معاملے میں کبھی کبھی پیش دستی کر لیتے ہیں۔ ہاں، یاد آیا —— جیل کے زمانے میں تنہائی اور رفقاء سے علیحدگی کے ردِ عمل کی وجہ سے مولانا معانقے کرنے لگے تھے۔ بعض لوگ مولانا کے طرزِ عمل کے اس ظاہری پہلو کو سرد مہری سمجھتے ہیں اور مایوس ہوتے ہیں۔ خصوصیت سے پاکستان کے اندر پٹھان اور پاکستان کے باہر اہلِ عرب اس کو شدت سے محسوس کرتے ہیں۔ لیکن درحقیقت یہ مولانا کے مزاج کا ایک مجبورانہ جھکاؤ ہے جو علمی کاموں میں انہماک کی وجہ سے پیدا ہوا ہے۔ اس مزاج کی سطح کے نیچے ایک حد درجہ ملنسار آدمی پایا جاتا ہے۔ چنانچہ دارالاسلام سے لیکر اب تک مولانا کا یہ حال ہے کہ وہ رفقا اور ملاقاتیوں سے ملے بغیر اور عصرانہ مجلس میں کچھ وقت بیٹھے بغیر رہ ہی نہیں سکتے —— چاہے کیسے ہی سخت ضروری کام اور اہم معاملات درپیش ہوں۔ وہ "آدم گریز" اور "خانہ نشین" اور اپنے آپ سے کام رکھنے والے آدمی ہرگز نہیں ہیں۔ ملنے والوں سے وہ ملتے ہیں اور بات کرنے والوں سے وہ خوب باتیں کرتے ہیں، مگر خواہ مخواہ کی زبان چلانے اور گپ لڑانے کی صلاحیت ان میں نہیں ہے۔ پروفیسر ترمہ آفاقی کے فلسفے کی رُو سے ایسا آدمی "عوامی" نہیں ہو سکتا ——

طبائع اپنے جوہرِ سیرت کے لحاظ سے اپنا ایک مستقل رنگ رکھتی ہیں، کسی میں حزن و یاس، کسی میں اضطراب، کسی میں غضب و تنفر، کسی میں شوخی و شرارت اور کسی میں مسخرہ پن کا بنیادی رنگ ہم نمایاں دیکھتے ہیں۔ مولانا مودودی کا رنگِ طبیعت وقار کیساتھ شگفتگی کے امتزاج سے بنا ہے۔ سنجیدہ شخصیتیں جو علمی تحقیق اور فکری کاوشوں میں منہمک رہتی ہیں، بالعموم شگفتگی کا جوہر کھو بیٹھتی ہیں اور نری سنجیدگی آخر کار خشونت بن کر رہ جاتی ہے۔ دوسری طرف شگفتگی کا جوہر جن اشخاص میں اپنی حدود پھاند جاتا ہے وہ وقار کا رنگ کھو بیٹھتی ہیں۔ مودودی کی شخصیت دونوں جوہر صحیح تناسب کے ساتھ اپنے اندر لئے ہوئے ہے۔ اس سے حُسنِ اعتدال ضائع نہیں ہوتا۔

مولانا مودودی پر مختلف ادوار گزرے اور گوناگوں احوال سے سابقہ پڑتا رہا، لیکن تفریح اور بے تکلفی کے خاص الخاص لمحات میں بھی دامنِ وقار ہاتھ سے نہیں چھوٹا۔ اسی طرح جب میں پچھلی تاریخ کو دیکھتا ہوں تو بے شمار واقعات ایسے سامنے آتے ہیں جو ایک پیکرِ خاکی کے لئے پوری طرح غارت کر سکون ہمسے چاہئیں تھے اور ان کا اثر لازماً مودودی کے دل و دماغ پر رہا ہوگا —— بلکہ کبھی کبھی تو ہم قریبی ساتھیوں کو ان پر رحم بھی آتا —— لیکن نمازوں میں، دفتر میں، اجتماعی کھانوں میں، مجالسِ گفتگو میں اور سیر کے اوقات میں جب بھی سامنا ہوا تو ہمیشہ ایک ایسا چہرہ سامنے آیا جس پر گویا ایک غیر مرئی تبسم کی افشاں چھڑکی ہوئی ہے۔ مضمون نگارانہ اور مصنفانہ کاوش کے لمحات ہوں، جماعتی و تحریکی مسائل کی پیچیدگیوں کا دور ہو، مخالفین کی شرارتوں اور اپنوں کی نادانیوں سے

سابقہ ہو، کسی بھی حال میں اس چہرے کی شگفتگی کا رنگ نہیں پھیکا پڑا۔ یہ شگفتگی گفتگو میں ہلکے ہلکے مزاح کا رنگ پیدا کر دیتی ہے۔ بے جا نہ ہوگا اگر اس موقع پر چند مثالیں بیان کروں۔ جن سے مولانا کے مخصوص اسلوبِ مزاح کا اندازہ ہو سکے گا۔

ایک مذہبی طرز کے بزرگ اپنے اخبار میں کئی برس سے مولانا مودودی پر خدا واسطے کی عنایات فرماتے رہتے ہیں۔ ایک صاحب نے کسی مجلس میں مودودی صاحب سے کہا کہ ایک مرتبہ آپ ان کے بارے میں بھی کچھ لکھتے تو مناسب ہوتا۔ "میں ان سے بالکل مایوس ہوں" مودودی صاحب دھیمے انداز میں کہنے لگے "میں نے ان کی شخصیت کا خوب اچھی طرح مطالعہ کیا ہے۔ اس میں جزم کہیں نہیں ہے، بس زیر و زبر ہی زیر و زبر ہے"۔

مرکز کی گاڑی کی چھت پر سامان رکھنے کیلئے ایک مربع شکل کا جنگلہ لگوایا گیا ہے۔ یاد نہیں کب کی بات ہے، ہم مولانا کے ساتھ گاڑی کے انتظار میں لاہور کی کسی سڑک پر کھڑے تھے، دور سے اسی رنگ اور ماڈل کی کوئی گاڑی آتی دکھائی دی۔ کسی نے کہا کہ لیجئے گاڑی آگئی۔ مولانا نے ایک نگاہ ڈالی اور کہا نہیں ——— اس کے سر پر وہ ملکہ وکٹوریہ کا سا تاج نہیں ہے۔

قیوم خانی دور میں پشاور جانے کے لئے مولانا مودودی گاڑی کے انتظار میں ہم کو ساتھ لئے پلیٹ فارم پر ٹہل رہے تھے۔ اور جماعتی اور سیاسی امور پر بڑی اہم گفتگو ہو رہی تھی۔ ایک صاحب میری توجہ کی زد میں آگئے جو ہمارے پیچھے پیچھے چلتے اور پھر جب ہم ایک سرے پر پہنچ کر مڑتے تو وہ پھر پیچھے ہو لیتے۔ گفتگو میں احتیاط کی ضرورت واضح تھی، مگر مولانا ساتھ لگے ہوئے سائے سے بے خبر تھے۔ میں نے توجہ دلانے کی مختلف تدبیریں سوچیں، مگر بالآخر "ٹاک ٹ میتھڈ" ہی اختیار کرنا پڑا۔ انگریزی میں کہا: "There is a fifth person behind us" (واضح رہے کہ ہمارا گروپ چار افراد پر مشتمل تھا۔) مولانا نے برجستہ کہا: "نہیں۔ کہنا چاہیئے۔ a fifth-Columnist"

ماہر القادری صاحب نے اپنے ایک مضمون میں ایسا ہی ایک مزاح آمیز نکتۂ لطیف درج کیا ہے جس زمانے میں علماء کرام دستوری رپورٹ پر مشورت کر رہے تھے، ایک صاحب نے پوچھا: "مولانا علماء کی مجلسِ مشاورت کا کیا رنگ ہے؟" فرمایا: "صبغۃ اللہ[1]!"

(ماخوذ از "مودودی ——— اپنی اور دوسروں کی نظر میں")

۱۹۴۸ء میں پہلی گرفتاری سے کچھ ہی قبل مولانا نے لائل پور اور جھنگ کا سفر کیا تھا۔ بہت سے لوگ ساتھ تھے۔ میں بھی تھا۔ ایک مقام پر کار کسی ضرورت سے روک دی گئی۔ چودھری محمد اکبر صاحب فطرت کے بلاوے پر لبیک کہہ کر لوٹے تو مولانا نے پوچھا: "کیا پانی کہیں سے مل گیا ہے؟" چودھری صاحب نے کہا: "نہیں دوسری طرح کام چلانا پڑا۔" مولانا نے فوراً کہا: "اچھا تو یوں کہیئے کہ ڈرائی کلیننگ کی ہے"۔

(ماخوذ از "مودودی ——— اپنی اور دوسروں کی نظر میں")

مرکز کی گلی فیروز پور روڈ سے جہاں ملتی ہے، پہلے وہاں نشیب تھا۔ بعد میں مٹی ڈلوا کر راستہ اونچا کیا گیا جس کی چوڑائی بہت کم تھی۔ ایک دفعہ کہیں سے گاڑی پر آ رہے تھے تو ڈرائیور نے جب گاڑی کو گھمایا، مولانا نے کہا: "دیکھنا بھئی! احتیاط سے! کہیں فَاُمُّهٗ هَاوِيَة ہی نہ ہو جائے[2]۔"

(حوالہ: ایضاً)

ایک لطیفہ ——— جو ہے تو پرائیویٹ قسم کا، لیکن شاہکار درجے کا ہے۔ اسے راز نہیں رکھا جا سکتا۔ ایک موقعہ پر مولانا کی طرف سے چائے دی گئی بسکٹ اور پیسٹری ساتھ تھی۔ مولانا نے باقر خاں کی طرف مخاطب ہو کر فرمایا: "افسوس ہے کہ ہم باقر خانی کا انتظام نہ کر سکے"! ——— خوب قہقہہ ہوا۔

(حوالہ ایضاً)۔ بعد میں معلوم ہوا کہ اس لطیفہ کی موجد اول بیگم ملک نصر اللہ مرحومہ تھیں۔ ایک بار انہوں نے باقر خاں صاحب سے پوچھا تھا کہ "آپ کی باقر خانی کا کیا حال ہے؟"

زمانۂ جیل کے لطائف میں سے ایک اور شاہکار عرض ہے جو حسنِ تمثیل و تشبیہ کا بھی ایک نادر نمونہ ہے۔ مولانا اختر علی خاں اپنی رہائی کے لئے پرلچو

---

[1] ۔ مسلم سوسائٹی کے مزاج کے بارے میں آیتِ قرآنی ہے: صِبْغَةَ اللّٰهِ ۚ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً ۔ (ترجمہ: "یہ اللہ کا رنگ ہے! ——— اور اللہ کے رنگ سے اور کس کا رنگ بہتر ہو سکتا ہے؟")

[2] آیت ہے: وَاَمَّا مَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُمُّهٗ هَاوِيَة ۔

بے چینی سے منتظر تھے اور کبھی کبھی مولانا سے ملتے تو اپنا درد دل بیان کرتے اور ان کی گفتگو سے کچھ سرمایۂ تسکین حاصل کرتے۔ صورت واقعہ یہ تھی کہ اب مولینا مودودی کی اسارت کا تسلسل مولانا اختر علی خاں اور بعض دوسرے اصحاب کی رہائی میں رکاوٹ بنا ہوا تھا۔ اسی حقیقت کو مودودی صاحب نے ایک لطیفہ میں سمو کر کہا: "بات یہ ہے کہ گلی میں ایک ٹرک پھنس گیا ہے اور اس کے پیچھے کاریں، بیل گاڑیاں، تانگے سبھی رکتے جا رہے ہیں اور پورا ٹریفک جام ہو گیا ہے۔ ٹرک نکلے تو ٹریفک رواں ہو"

لطائف تمثیل و تشبیہ کے سلسلے میں دو تین چیزیں اور قابلِ ذکر ہیں

اضطرابات پنجاب ۱۹۵۳ء کی تحقیقاتی عدالت میں ایک تحریری بیان میں مولینا نے اپنی پوزیشن کو حکومت کی زیادتی کے بالمقابل واضح کرنے کیلئے امر واقعہ کو یوں بیان کیا کہ "اسکی مثال بالکل ایسی ہے کہ جیسے ایک شخص سڑک سے ہٹ کر کھیتوں میں جا کھڑا ہو اور دوسرا شخص وہاں موٹر لے جا کر اس کو ٹکر دے"۔ ایک فقرے میں پوری تصویر آ جاتی ہے۔

مولانا کو پتھری کی تکلیف ہے۔ کسی نے آپریشن کرانے کا مشورہ دیا تو کہنے لگے "ایک بار آپریشن کرا چکا ہوں مگر کیا کروں کہ میرے جسم میں پتھر بنانے کی مستقل فیکٹری کام کر رہی ہے۔"

اضطرابات پنجاب ہی کے سلسلے میں مولانا نے ۱۶ مارچ کو جو اخباری بیان دیا تھا اسمیں ایک جملہ تھا کہ "کیا اس حکومت میں اب ایک آدمی بھی ایسا نہیں رہا جو ایک تھانیدار کی سطح سے بلند سطح پر سوچ سکے"۔ ـــــ چار لفظوں میں شہری حقوق کی پامالی، جمہوری اصولوں سے بے نیازی، دھونس اور قوت کے بیجا استعمال اور سیاسی سوجھ بوجھ اور حاکمانہ صبر و تحمل سے بالاتر ہو کر اندھا دھند اقدامات کرتے چلے جانے کی پوری تاریخ بیان ہو گئی جو پاکستان بننے کے بعد سے نشوونما پا رہی تھی۔ ایک لفظ تھانیدار کے لطیف تمثیلی استعمال کو دیکھئے!

"جماعت کی تاریخ اور لائحہ عمل" میں ایک مقام پر یہ واضح کرتے ہوئے کہ ہماری اصل کشمکش اشتراکیت، مغربی الحاد اور فسق و اباحیت کے خلاف ہے، جماعت کے خلاف مہم چلانے والے مولوی حضرات کے بارے میں لکھا ہے کہ "علمائے کرام خواہ مخواہ بیچ میں آ کھڑے ہوتے ہیں یا گڑیا بنا کر لا کھڑے کئے گئے ہیں۔"

ایک خاص عرصے کے اندر مولانا مودودی دستوری مہم کے سلسلے میں کام کرنے کا نقشہ مجلس شوریٰ کے مشورے سے تیار کر رہے تھے۔ رفقا نے خطرناک پہلوؤں کی طرف اشارہ کیا۔ مسکرا کر فرمایا "سانپوں سے کھیلنے جا رہا ہوں! ـــــ ہاتھ ٹھیک پڑ گیا تو کامیابی! نہ پڑا تو ڈسے جانے کا خطرہ واضح ہے۔"

ماہر القادری صاحب کا بیان کردہ ایک لطیفہ اور ہے۔ جی چاہتا ہے کہ اسے بھی لے لیا جائے: "مولانا نے اپنے صاحبزادے (غالباً فاروق نام ہے)[1] کو کراچی میں تعلیم حاصل کرنے کیلئے چھوڑ دیا تھا۔ ایک دن ہم تینوں موٹر میں جا رہے تھے۔ مولانا کے صاحبزادے ان سے مشینوں اور کل پرزوں کا بار بار ذکر نکالتے تھے۔ میں نے کہا کہ ان کو اس فن سے بہت دلچسپی ہے۔ مسکرا کر بولے "باپ مولوی، بیٹا لوہار!" ("مودودی ـــــ اپنی اور دوسروں کی نظر میں")

سود حصہ دوم میں اشتراکیت پر ناقدانہ بحث کرتے ہوئے اس کی آہنی ڈکٹیٹرشپ کے بارے میں دو تین صفحے کا ایک نوٹ لکھا ہے۔ اس نوٹ میں مذکور ہے کہ "جب کوئی کارکن اپنے گھر نہیں پہنچتا تو اس کی بیوی خود ہی سمجھ جاتی ہے کہ پکڑا گیا .... ایک روز یکایک ایسا ہوتا ہے کہ اس کا بھیجا ہوا پارسل واپس آ جاتا ہے۔ بس یہی اس امر کی اطلاع ہے کہ اس کا خاوند لینن کو پیارا ہوا ...... اس کا فرض ہے کہ اچھی کامریڈنی کی طرح اس معاملہ کی بھاپ تک منہ سے نہ نکالے۔" (صفحہ ۲۶)[2] ـــــ "لینن کو پیارا ہوا" اور "کامریڈنی" کی لطافت اس موقع پر ہر صاحبِ ذوق کو محسوس ہوگی۔

ہاں یہ بھی تو ایک دلچسپ چیز تھی۔ "دارالاسلام" کے دور میں ایک مرتبہ ترجمان القرآن کا فرنیچر لاہور سے بذریعہ ریل گیا تھا۔ سرنا اسٹیشن سے اسے دو فرلانگ دور لے جانا تھا۔ بالمعاوضہ حمالی کا کوئی قابلِ حصول انتظام تھا نہیں، اس لئے ہم سب مدیر ترجمان القرآن سمیت اس مہم کو نکلے۔ کرسیاں، میزیں

---

[1] مولانا کے صاحبزادوں کے ناموں میں "فاروق" تو بطور ردیف آتا ہے، یعنی احمد فاروق، عمر فاروق، خالد فاروق وغیرہ۔

[2] پہلے یہ باتیں سرمایہ داروں کا مخالفانہ پروپیگنڈہ قرار دے کر مسترد کر دی جاتی تھیں۔ لیکن اب خود خروشچیف اور بلگانن کے بیانات نے ان کی صداقت ثابت کر دی ہے۔

اور دوسری چیزیں تو ایک ایک دو دو آدمیوں کے ذریعے جا سکتی تھیں، البتہ ایک بڑی الماری کا بوجھ "اجتماعی ہتھ" چاہتا تھا۔ سامنے کئی آدمی باری باری کندھا دیتے
چھوٹے لے چلے جن میں خود مولانا مودودی بھی شامل تھے۔ وہ کبھی ادھر سے سنبھالتے، کبھی ادھر سے سہارا دیتے۔ اس موقع پر خوب کہا کہ "عاشق کا جنازہ ہے ذرا
دھوم سے نکلے۔"

بے شمار یاد رہ جانے والے اور بھول جانے والے لطائف و نکات میں سے یہ چند چیزیں ہیں جو اس وقت عرض کی جا سکیں۔ ان سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ
مودودی کی شخصیت کے عناصرِ ترکیبی میں شگفتگی کا کیا مقام ہے۔ اور اس کی اصل تصویر ان ڈراؤنی تصویروں کے مقابلے میں کیسی ہے جن کو دور ہی دور بیٹھ کر بعض
مصوروں نے مرتب کیا ہے۔ ان ڈراؤنی تصویروں کے ذریعے جن لوگوں نے مودودی کو دیکھا ہے ان کی نظر میں ایک ایسا کٹھ ملا اور ایک ایسا مجسمۂ خشونت
بسا ہوا ہے کہ بسا اوقات وہ اس کی وجہ سے ڈرپوک بچوں کی طرح راتوں کو چونک چونک اٹھتے ہیں۔

ایک صاحبِ دعوت کی، کم سے کم اس دور میں، یہ بہت بڑی کمزوری ہوگی کہ وہ قلم سے جہاد نہ کر سکتا ہو اور کاغذ کے میدان میں تگ و تاز نہ دکھا سکے۔ وہ لیڈری
جو محض زبان کے چٹخارے پر چل جاتی تھی، اس کا دور کبھی کا گزر چکا۔ ایسے بہت سے اہلِ زبان آج داستانوں میں زبان دابے دور دراز گوشوں میں پڑے ہیں۔ یہ لوگ کاغذ کے
میدان میں ہار گئے۔ کیونکہ ہمارا قلم جس طرح فکر کی غذا کا بہتر کتابیں رکھ سکتا تھا وہ فراہم نہ تھی۔ تقریر کی لیڈری آسان ہے، تحریر کی لیڈری مشکل ہے۔ مولانا مودودی
جس دعوت کو لے کے اٹھے ہیں وہ زبان و قلم دونوں کو استعمال کئے بغیر اپنا راستہ نہیں نکال سکتی۔ خدا کی عطا ہے کہ مودودی کو اس نے قلم کی طاقت سے بہرہ مند فرمایا۔
قلم سے آدمی جو کچھ لکھتا ہے، اس کے معانی و مطالب سے قطعِ نظر، محض لکھنے کا ظاہری اسٹائل اور اس کا رسم الخط بول کر کہہ دیتا ہے کہ لکھنے والا کیا
ہے کیا نہیں ہے۔ آدمی کی ہر تحریر میں خواہ وہ ایک سطر بھر کی کیوں نہ ہو اس کا اپنا ہاتھ اور اس کا اپنا قلم اس کی شخصیت کے احوالِ پنہاں کاغذ پر نقش کرتا چلا
جاتا ہے۔ ہماری تحریریں گویا ہماری خود نوشت سوانح عمریاں ہیں —— معنویت کے اعتبار سے بھی اور ظاہری انداز کے اعتبار سے بھی۔ چنانچہ
نفسیاتی مطالعۂ تجزیہ کا فن اب یہاں تک ترقی کر چکا ہے کہ ماہرین ایک آدمی کے اپنے لکھے ہوئے نام پتے یا دو چار سطروں کے مشاہدے سے اس کے احوال و اطوار
کے تمام ضروری پہلو سامنے لا سکتے ہیں اور ان کے اندازے بالعموم اسی پچاسی فیصد صحیح نکلتے ہیں۔
اسی نقطۂ نظر سے مولانا مودودی کی تحریر کا ایک ہلکا سا جائزہ لینا مدِنظر ہے۔ یعنی ہم ان کی تحریر کی ادبیت اور اس کی فصاحت و بلاغت پر نہیں، بلکہ اس
کے ظواہر پر ایک نظر ڈالنا چاہتے ہیں۔

مولانا مودودی کے لکھنے کا ہمیشہ ایک خاص ماحول ہوتا ہے۔ ان کا لکھنے کا کمرہ —— جو دفتر بھی کہلاتا ہے —— دوہری دیواروں پر مشتمل ہوتا ہے
اینٹ گارے کی دیواروں کی اندرونی جانب ایک چار دیواری الماریوں کی ہوتی ہے جن میں دینی اور مغربی علوم کی کتابیں مولانا مودودی کی جائے نشست کے
چاروں طرف صف بستہ حاضر رہتی ہیں۔ ایک طرف اگر مسند کی جلدوں کی قطار ہے تو دوسری انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا کی جمعیت کھڑی ہے۔ اس ہاتھ بخاری
اور اس کی شروح ہیں تو اس ہاتھ دستوریات اور عالمیات پر اچھی اچھی انگریزی کتابیں ہیں۔ ادھر اگر اسلامی تاریخ پر بیش بہا قدیم عربی لٹریچر ہے تو ادھر یورپ کی سیاسی
مذہبی اور فکری تاریخ سے متعلق انگریزی زبان میں جدید لٹریچر آراستہ ہے۔ اس الماری میں قرآن کی بھاری بھرکم تفاسیر ہیں تو اس الماری میں بائبل سے متعلق بیش قیمت
فنی مجلدات موجود ہیں۔ کہیں فقہ اسلامی کی مستند کتابیں سجی ہیں تو کسی دوسری جگہ انگریزی دور کے قوانین لاء پر چیدہ چیدہ تصانیف موجود ہیں —— وہاں
ابن خلدون جلوہ فرما ہیں تو یہاں افلاطون۔ وہ ابن تیمیہ ہیں تو یہ کارل مارکس۔
لکڑی کے فریم میں مرتب کی ہوئی کتابوں کی اینٹوں سے جو چار دیواری بنتی ہے اس کے درمیان ایک جہازی میز پھیلی ہوئی ہے۔ اس جہازی میز کے
بائیں جانب کاغذات رکھنے کا چھوٹا سا خانہ دار ریک پڑا ہے۔ ریک کے ساتھ چند کتابیں قطار میں کھڑی ہیں۔ دائیں جانب نئی آئی ہوئی کتابیں، مسودے، پمفلٹ اور
خطوط وغیرہ رکھے ہیں۔ سامنے ایک لمبا چوڑا گتہ پھیلا ہے اور اس پر لکڑی کا زیرِ مشق نشست کے بالکل سامنے وسط میں رکھا ہے۔ اس تختۂ زیرِ مشق کے

ساتھ لگے ہوئے کلپ نے کاغذ کے تہ بتختے اپنے بھینچے ہوئے ہونٹوں میں پکڑ رکھے ہیں۔ اس سے آگے نکل پالش کیا ہوا قلمدان، دو پیپر ویٹ، ایک کاغذ جاذب
لگانے کا پیڈ، ایک پن گیر، ایک خاکستر دان، ایک گھنٹی ——— مکمل سیٹ ——— ترتیب سے رکھا ہوا ہے۔ دو تین شیشے کے پیپر ویٹ بھی
کاغذات پر رکھے ہیں۔ ان چیزوں کو آپ ہمیشہ ترتیب میں رکھا پائیں گے اور ان میں سے ہر چیز کی ایک جگہ ہمیشہ متعین رہے گی۔ ملاقاتی اور رفقاء اگر اس ترتیب
کو بدل دیتے ہیں تو ان کے جانے کے بعد مولانا کا ہاتھ سب سے پہلے ان کو ان کی اپنی صحیح جگہ پر پہنچا دیتا ہے۔ کسی چیز کا بے ڈھنگے پن سے رکھا ہونا مولانا مودودی
کے ذہن پر فوری اثر ڈالتا ہے۔ کمرے یا برآمدے میں کوئی کرسی ٹیڑھی رکھی ہو، نماز کیلئے بچھنے والی چٹائیاں غیر متوازی ہوں، میز پر کے کاغذات ترچھے رکھے
ہوں، وہ نگاہ پڑتے ہی اپنے ہاتھ سے پہلے اسے ٹھیک کر لیں گے۔ دو ایک موقعوں پر کرسیوں یا چٹائیوں کے ترچھے ہونے پر مزاحاً فرمایا: "اس سے بچھانے
والے کے ذہن کا ٹیڑھا ہونا واضح ہوتا ہے"۔

میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ اگر مطالعۂ شخصیت کی صلاحیت رکھنے والا کوئی شخص مودودی صاحب کی عدم موجودگی میں ان کے کمرے میں داخل ہو اور
اُسے کمرے کا ماحول صرف پانچ منٹ دیکھنے کا موقع ملے تو وہ مودودی صاحب کی آدھی سیرت تو ضرور صحیح صحیح لکھ دیگا۔ اس پرسکون مگر خیال انگیز ماحول میں
مودودی صاحب سوچتے اور لکھتے ہیں۔ وہ صبح ناشتے کے بعد اپنے وقت مقررہ پر آ کر کرسی پر بیٹھ جائیں گے۔ پان کی ڈبیہ اور بٹوا ساتھ ہوگا۔ پان کھائیں
گے اور دماغ میں فکر و کاوش کا پورا کارخانہ متحرک ہو جائے گا۔ بالعموم ان کا چہرہ بتا دیتا ہے کہ اس وقت وہ کسی مضمون یا کسی مسئلے پر کاوش میں ہیں۔ جب
پورا نقشہ ذہن میں مرتب ہو چکے گا تو وہ قلم اٹھائیں گے، ورنہ یونہی علی الشپ انہوں نے کبھی کچھ نہیں لکھا ——— بلکہ پہلے سے سوچے بغیر کوئی بھی کام
وہ نہیں کرتے۔ کیا عجب کہ وہ سونے اور کھانے کیلئے بھی پہلے سے سوچتے ہوں۔ پورا مواد اکٹھا کر لینے، حوالے جمع کر لینے اور سلسلۂ بحث کی کڑیاں دل ہی
دل میں جوڑ لینے کے بعد وہ قلم کو حرکت میں لاتے ہیں۔ یوں سمجھئے خط ہو یا مضمون یا کچھ اور ——— پہلے وہ اسے اپنے دماغ کے اوراق پر لکھتے ہیں اور پھر ان
اوراق کو دیکھ دیکھ کر کاغذ پر منتقل کرتے جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے لکھنے میں بڑی روانی رہتی ہے اور زیادہ قطع و برید نہیں ہوتی۔

مولانا کا قلم بڑا کاغذ خور واقع ہوا ہے۔ ذوقِ نفاست کی وجہ سے وہ ہمیشہ اچھے چکنے اور دبیز کاغذ کو پسند کرتے رہے ہیں اور کئی کئی رِم بیک وقت خرید لیتے
رہے ہیں۔ مگر اب کاغذ کی ——— اور خصوصاً اچھے کاغذ کی ——— نایابی کے سبب وہ بات نہیں رہی۔ تاہم اب بھی عمدہ سے عمدہ کاغذ موجود رہتا ہے۔ وہ
فل سکیپ سائز کے پورے تختے پر لکھنے کے عادی ہیں۔ کاغذ کی پٹیوں اور چٹوں پر کبھی نہیں لکھتے۔
لکھنے سے پہلے وہ شکن ڈال کر داہنی طرف کھلا حاشیہ چھوڑتے ہیں۔ میرے سامنے اس وقت مولانا کے دو قلمی مسودے ہیں۔ ایک ۱۹۴۵ء کا (تقریر
اجتماع شمالی ہند منعقدہ "دارالاسلام")، دوسرا ماضی قریب کا (ترجمان القرآن کی ایک سابق اشاعت کے "اشارات")۔ دونوں مسودوں کا حاشیہ ڈھائی انچ
چھوڑا ہے۔ ہمیشہ تقریباً اتنا ہی دیکھنے میں آتا ہے۔ عجیب بات ہے کہ ۱۹۴۵ء والے مسودے کے ہر صفحے پر پوری انتالیس انتالیس سطریں ہیں، اور بعد کے مسودے
میں سینتالیس سینتالیس ——— یہ منتظم سطر بندی سفید کاغذ پر بغیر زیر مسطر کے، ذہن کی اقلیدسی مہارت اور اعصاب پر اس کے انضباط کی دلیل ہے۔
دونوں میں سے کسی مسودے کے اوراق کو ذرا فاصلے پر پھیلا دیا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ ایک ہی تحریر کی مشینی نقلیں ہیں۔ قطع و برید بہت ہی کم ہے اور جو
کچھ ہے بھی اس کا زائد از نصف حصہ ایسا ہے جو نظر ثانی کرتے ہوئے ضروری محسوس ہوا۔ پورے اوراق میں تمام کی تمام سطریں بالکل سیدھی ہیں۔ زیادہ سے
زیادہ یہ ہے کہ بائیں جانب سے عبارت صفحے کے آخر تک جا کر انچ کے دسویں حصے کی حد تک نیچے کو جھکاؤ رکھتی ہے۔ ہر پیراگراف واضح طور پر الگ سے شروع
ہوتا ہے۔ حروف کی اشکال بالکل یکساں ہیں۔ نقطے، شوشے، علامات، اوقاف اور واوین اپنی اپنی جگہ پر لازماً موجود ہیں۔ بلکہ الفاظ ضروری حرکات بھی اپنے
ساتھ لئے ہوئے ہیں۔ حلقہ دار حروف (مثلاً ص، ق، ظ وغیرہ) کے حلقے اندر سے لازماً خالی ہیں جیسے کہ ہونے چاہئیں۔ جہاں کسی لفظ کو کاٹا گیا ہے یا کوئی جزو
بعد میں بڑھایا گیا ہے وہاں ضروری علامت اضافہ (/) دی گئی ہے۔ گھنی سطروں کے باوجود بین السطور نمایاں ہیں۔
اس طرز تحریر کو دیکھتے ہی جو رائے قائم ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ لکھنے والا بہت ہی متوازن مزاج آدمی ہے اور پورا پورا احساس ذمہ داری رکھنے والا ہے

وہ دوسروں کے حقوق اور آرام کا لحاظ کرتا ہے۔ اس کی زندگی میں ضبط و نظم اور باقاعدگی ہے۔ وہ جذباتی آدمی نہیں ہے بلکہ مزاج میں مفکرانہ ٹھہراؤ رکھتا ہے۔ وہ مستقل مزاج، صاحبِ عزیمت اور تلون سے خالی ہے۔ یہ اور ایسے ہی دوسرے اہم نتائج انسانی شخصیت و کردار کا ہر رازداں برآمد کر سکتا ہے۔ یہاں اس کا موقع نہیں کہ ان نتائج کے حق میں پورا پورا استدلال کیا جا سکے۔ پیشِ نظر شخصیت خود ان پر گواہ ہے۔ مجھے صحافت کے دائرے میں کام کرنے کی وجہ سے قسم قسم کے رسم الخط دیکھنے کا موقع ملتا ہے اور نئے لوگوں کی طرف سے جو خطوط اور نگارشات موصول ہوتی ہیں ان کے پس پردہ کام کرنے والی شخصیت کا اندازہ کرنا پڑتا ہے اور بسا اوقات لفافے پر لکھا ہوا پتہ دیکھ کر ہی ابتدائی تاثر قائم ہو جاتا ہے۔ اونچی اور صاف ستھری شخصیتوں کے رسم الخط کے چند اہم نمونے میری نگاہ میں ہیں میری شہادت یہ ہے کہ مودودی صاحب کے طرزِ تحریر کے ہم پایہ کوئی دوسرا نمونہ میرے تجربے میں نہیں آیا۔

تحریری سلسلے میں آدمی کے خطوط کا طرزِ انشاء بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ مودودی صاحب کے لکھے ہوئے خطوط دیکھنے کا خاص موقع مجھے حاصل رہا ہے۔ ایک زمانے میں ترجمان القرآن اور مرکزِ جماعت کی ڈاک کا کام مولانا کی نگرانی میں میرے ذمے رہا ہے۔ اُن کی مستقل عادت یہ ہے کہ وہ ڈاک خود دیکھتے ہیں اور پوری توجہ سے دیکھتے ہیں اور مختلف شعبوں کے ناظمین کی رہنمائی کیلئے نشانات لگا کر مختصراً ہدایات لکھ دیتے ہیں۔ جن خطوط میں خود ان کو مخاطب کیا گیا ہو یا اسلام یا جماعت کے متعلق اصولی مسائل دریافت کئے گئے ہوں ان کے جواب وہ اپنے قلم سے لکھتے ہیں یا املا کراتے ہیں۔ ورنہ کم سے کم جوابی مضمون کا خلاصہ اور اس کی ترتیب زبانی بتا دیتے ہیں۔

اپنے قلم سے لکھے ہوئے خطوط میں مولانا مودودی کی چند مستقل روایات نمایاں طور پر محسوس ہوتی ہیں۔ وہی حاشیہ چھوڑنے اور پیرے بنانے اور علامات لگانے کی باقاعدگی اور سطروں کی سیدھائی اور تحریر کی صفائی خطوط میں اور بھی زیادہ اچھا معیار پیش کرتی ہے۔ ہر خط کی پیشانی پر تاریخ ضرور درج ہوتی ہے۔ بلا استثنا تمام خطوط کا سرنامہ "محترمی و مکرمی! (خواتین کے لئے محترمہ و مکرمہ) السلام علیکم ورحمۃ اللہ" کے الفاظ پر مشتمل ہوتا ہے۔ اس کے بعد تقریباً ہر جوابی خط کا آغاز "عنایت نامہ ملا" سے ہوتا ہے۔ خاتمہ ہمیشہ "خاکسار ابوالاعلیٰ" کے لفظوں پر ہوتا ہے جو خط کے نیچے بائیں کونے میں اوپر تلے لکھے ہوتے ہیں۔ خط کا پتہ ہمیشہ "بخدمت شریف جناب" کے مقررہ الفاظ سے شروع ہوتا ہے اور زیادہ تر تین سطروں میں مکمل ہوتا ہے۔ شہر یا مقام زیر خط کشیدہ ہوتا ہے۔ خط کے اس نقشے میں شاید برسوں سے کبھی کوئی تغیر نہیں آیا۔ بے شمار خطوط کے سابق مطالعہ کے بل پر میں یہ کہتا ہوں کہ کسی خط میں مصنوعی ادبیت اور غیر ضروری طور پر مزاح کا استعمال نہیں ہوتا اور نہ ضروری نفسِ مضمون پر غیر ضروری فقروں کا اضافہ کہیں محسوس ہوتا ہے۔ خطوط میں مضمون نگاری کے بجائے زیادہ تر گفتگو کا رنگ پایا جاتا ہے۔ عامیانہ گفتگو کا نہیں، عالمانہ گفتگو کا!

وہ لمبا عرصہ جس میں ڈاک میرے سپرد تھی، بالعموم بعدِ ظہر میں مولانا کے ہاں جاتا اور کبھی کبھی دفتر میں اور کبھی باہر آم کے بڑے پیڑ کے نیچے نشست رہتی۔ اہم علمی خطوط کے جوابات مولانا خود املا کراتے ——— کبھی آرام کرسی پر بیٹھے اور کبھی ٹہلتے ہوئے۔ کبھی کبھی تو مودودی صاحب مجھ سے خطوط پڑھوا کر پہلے سنتے بھی، لیکن اکثر محض یادداشت کی بنا پر بالکل اسی ترتیب سے جوابات لکھوا دیتے جس ترتیب سے خطوں میں سوالات درج ہوتے تھے ——— اور کمال یہ کہ سوالات آیات اور احادیث اور فقہ کے مباحث سے بھی متعلق ہوتے۔ پھر وہ املا ایسی روانی سے کراتے کہ کسی موقع پر جملے کا تسلسل اور بحث کا ربط نہ ٹوٹتا۔ بیچ میں اگر اٹھ کر جانا پڑتا یا کوئی صاحب آ جاتے تو بعد میں اتنا پوچھتے کہ آخری فقرہ کہاں تک پہنچا۔ بعض اوقات کچھ خطوط میں اپنی میز پر ہی چھوڑ آتا، لیکن مولانا اچانک کسی خاص خط کے بارے میں دریافت کرتے اور مجھے اٹھ کر وہ لانا پڑتا۔ ہفتہ دو ہفتہ کی آئی ہوئی ڈاک کے ایک ایک خط کا ان کو متعین طور پر خیال رہتا اور اس کا نفسِ مضمون مستحضر رہتا۔ لیکن سارے خطوط املا ہی نہیں کرائے جاتے بلکہ بعض کے متعلق مولانا صرف اشارات دے دیتے اور ان کو لکھنے کی ذمہ داری مجھ پر ڈال دیتے۔ اس احساسِ ذمہ داری کی وجہ سے میں بھی پوری کاوش اور محنت کرتا۔ یہ مولانا کا ایک مستقل طریقِ تربیت تھا۔

اکثر لوگ شرعی مسائل میں استفتاء بھیجا کرتے۔ ایسے ہر استفتاء کے جواب میں تمہیداً یا خاتمہ پر یہ ضرور لکھواتے کہ میں مفتی نہیں ہوں۔ فتویٰ نہیں دیا کرتا، صرف اپنی معلومات کے مطابق رائے عرض کرتا ہوں۔ فتویٰ مطلوب ہو تو کسی دارالافتاء کی طرف رجوع کیجئے۔ اور رائے مسئلے کی ٹیکنیکل صورت بتانے

کے بجائے اس کی اسپرٹ اور مقصدیت کو نمایاں کرتی۔ خاص بات یہ ہے کہ میں نے یہ نوٹ کی کہ مولانا مودودی نے کبھی کسی سوال، اعتراض یا اختلاف کرنے والے کو نفرت اور تحقیر اور غیظ و غضب سے مخاطب نہیں کیا، بلکہ ایسی چیزوں کے آنے کو ہمیشہ کام کے حق میں مفید سمجھتے تھے، چاہے ان کے الفاظ اور انداز سخت بھی کیوں نہ ہوں۔ البتہ مناظرانہ اور شر پسندانہ ذہن کا انہوں نے کبھی خیر مقدم نہیں کیا۔ ایسے لوگوں کو ہمیشہ نصیحت کرتے کہ مناظرہ بازیاں اور ٹیڑھے سوالات تلاشِ حق میں کبھی مدد نہیں دے سکتے۔ اختلافی معاملات میں بالعموم یہ لکھواتے کہ میرا مطالعہ یہ ہے، آپ کو یہ قرینِ حق معلوم ہو تو قبول کیجئے ورنہ جس کی رائے آپ کو صحیح معلوم ہو اسی کو اختیار کیجئے۔ فرقہ وارانہ جھگڑوں کے متعلق خطوط کو بھی وہ خوش آمدید نہیں کہتے تھے۔ اور معلمانہ انداز سے لکھواتے کہ ان جھگڑوں کے بجائے دین کی اصل حقیقت کو اپنانے کی ضرورت ہے۔ فقہی اور فروعی اختلافات کے لئے باہم دگر توسع کے ساتھ معاملہ کرنا چاہئے۔ مجھے ایک موقع بھی ایسا یاد نہیں کہ پوری خط و کتابت میں مولانا نے کسی کی تکفیر کی ہو یا تفسیق ! ———— بلکہ زجر و توبیخ کا موربانہ انداز بھی کبھی اختیار نہیں کیا۔

چنانچہ مجھے ایک طرف اس خطوط نویسی کے زمانے میں مولانا کی سیرت کا دوسروں کے مقابلے میں زیادہ گہرا مطالعہ کرنے کا موقع "مفت" میں ملا۔ ساتھ ساتھ میری فکری تربیت ہوتی گئی اور نظامِ اسلامی سے متعلق علمی کاوش کے دروازے مجھ پر کھلتے گئے۔ شائد میرے اسلوبِ نگارش پر بھی اس دور کا اثر بہت زیادہ پڑا ہے۔ ہاں ! ———— ہر بڑے آدمی کی طرح مولانا مودودی کو خطوط میں تعریف و قصیدہ سے بھی موصول ہوتے اور کبھی کبھار زہریلی گالیاں بھی لکھی ہوئی آتیں مگر نہ کوئی قصیدہ مودودی صاحب کے مزاج پر اثر انداز ہو سکا اور نہ گالیوں کا ردِ عمل بجز ایک بے نیازانہ تبسم کے کچھ اور میرے سامنے آیا۔ اس ڈاک کے سوا جو علمی مسائل یا جماعتی معاملات سے متعلق ہوتی، بقیہ خطوط کو محفوظ رکھنے کا اہتمام مودودی صاحب نے کبھی نہیں کیا ورنہ انبار جمع ہو جاتے۔ اہم محفوظ شدہ خط و کتابت اب "رسائل و مسائل" نامی مجموعے کی صورت میں مطبوعہ ہے۔

ان اشارات سے میں خود نتائج اخذ کرنے کے بجائے یہ کام اس مقالے کے قارئین پر ہی چھوڑتا ہوں۔

ہر صاحبِ دعوت کو زبان کی طاقت کی ضرورت ہے۔ محض قلم کے بل پر علمی کام کئے جا سکتے ہیں مگر عوام کے قریب ہو کر ان کو سمیٹنے اور منظم کرنے اور کسی تحریک کو آگے لے چلنے کیلئے وہ آدمی موزوں نہیں ہو سکتا جو اسٹیج پر آ کر گنگ ہو جائے۔ مولانا مودودی گنگ نہیں ہیں، خطیب ہیں۔

میں نے اُن کا اولین خطاب دارالاسلام کی مسجد میں جمعہ کے موقع پر سنا۔ ان پڑھ دیہاتیوں کی کثیر تعداد کے اندر تھوڑے سے تعلیم یافتہ لوگ پٹھانکوٹ اور سجان پور کے قصبوں اور قلعہ جمال پور کی مختصری آبادی سے آکر شامل تھے۔ مولانا نے ان دنوں اُردو زبان میں خطباتِ جمعہ کا ایک سلسلہ شروع کر رکھا تھا۔ (اور اب وہ کتابی شکل میں شائع ہو چکا ہے)۔ اذانِ ثانیہ پر وقار سے اُٹھے، منبر کے (غالباً) پہلے زینے پر کھڑے ہوئے، آہستگی اور سادگی سے خطاب شروع کیا۔ ———— ایسے جیسے لوگوں سے باتیں کر رہے ہوں۔ یہ مستقبل کا ایک بڑا مقرر تھا۔ سیدھے سادے کلمات کا اثر اس خاموش فضا میں پوری طرح نمایاں تھا۔ بعد میں مودودی صاحب نے متعدد مواقع پر کالجوں اور یونیورسٹیوں میں اعلیٰ درجہ کے علمی خطبے دیئے۔ ارکانِ جماعت کے مختصر اجتماعات میں بارہا تقاریر کیں، سوالات کے جوابات دیئے اور ہدایات دیں۔ آہستہ آہستہ ان کی خطابت آگے بڑھتی جا رہی تھی۔ پاکستان بننے کے بعد انہوں نے بہت سے بڑے بڑے جلسوں میں تقریریں کی ہیں۔ اور آئے دن یہ سلسلہ جاری رہتا ہے۔ اب وہ اپنی نوعیت کے بہت ممتاز مقرر ہیں۔

انہوں نے اپنی دعوت کی نوعیت کے لحاظ سے خطابت کے ایک نئے طرز کی بنیاد ڈالی ہے اور پرانے خلافتی مکتبِ خطابت سے الگ ہو کر ایک نیا مکتبِ خطابت استوار کیا ہے۔ مولانا خطابت کو ایک اہم ذمہ داری سمجھتے ہیں اور ضروری قرار دیتے ہیں کہ ایک ایک لفظ پہلے سے غور کرنے کے بعد زبان سے نکالا جائے۔ کیونکہ ہزاروں بندگانِ خدا پر اس کا اچھا یا برا اثر پڑتا ہے۔ اور اس سلسلے میں آدمی کو آخرت کی عدالت میں جواب دہی کرنی ہے۔ بے تسلسل اور بے ربط اور موضوع سے آزاد ہو کر پہاڑی نالوں کی طرح جھاگ اُٹھا اُٹھا کر بہنے والی تقریر کو وہ تعلیم و تربیتِ عوام کے لحاظ سے مضر سمجھتے ہیں۔ ان کا سوچا سمجھا نظریہ یہ ہے کہ ہماری قوم میں سطحی جوشیلے پن کا مرض بڑھ گیا ہے۔ اور اس کی سنجیدہ اور تعمیری دعوت کو جذب کرنے کی صلاحیت کم ہو گئی ہے نیز

خطابتی سامعوں نے اس کا مذاق صدرجہ بگاڑ دیا ہے۔ لہٰذا اب اسے جوشیلی اور بے ربط تقریروں کی مزید غذا دینے سے پرہیز کرنا چاہیئے۔ مودودی کے مکتب خطابت میں ایسی تقریر کی کھپت نہیں ہے جس میں چٹکلے، لطیفے، کہانیاں، قوالی، مسخرہ پن، شورش انگیزی، شوریدہ سری، دریدہ دہنی اور فکری آوارہ گردی کے عناصر پائے جائیں۔ اس مکتب خطابت کی تقاریر سادہ، رواں، سنجیدہ، مدلل اور ٹھنڈی نوعیت کی ہوتی ہیں۔ ان کی روح معلمانہ ہوتی ہے۔ مودودی صاحب نے عمر میں کبھی کوئی ایسی بے سروپا تقریر نہیں کی جو ایک محدود اور معینہ وقت کی حد سے آگے بڑھی ہو اور ساری ساری رات ہوائیں طوفانی لہریں اٹھاتے صبح کر دی ہو پھر نہ نعروں کی بہار، نہ واہ واہ اور سبحان اللہ کا ہنگامہ، نہ زندہ باد ——— مردہ باد کا شور۔ کہنے کی بات کہی اور اسٹیج سے رخصت ہو گئے۔

تقریر کے اس مخصوص اسلوب کے تقاضے سے مودودی صاحب پہلے سے کئی کئی گھنٹے صرف کر کے تیاری کرتے ہیں۔ سوچتے رہتے ہیں، مواد اکٹھا کرتے ہیں، پھر سلپ لے کر ان پر تقریر کے مطالب کی کڑیاں مختصر اشارات کی شکل میں درج کر لیتے ہیں۔ جب یہ ہو چکتا ہے تو تقریر کے پورے "موڈ" میں آ جاتے ہیں۔ تقریر کرنے سے پہلے کے تھوڑے سے وقفے میں ان کے چہرے پر ایک خاص رنگ پایا جاتا ہے جس کو قریب سے جاننے والے ساتھی ہی پہچان سکتے ہیں۔ اپنے انہی اشارات کے ذریعے وہ اپنی پوری تقریر بعد میں کسی کو بٹھا کر لفظ لفظ کی ترتیب سے املا کرا دیتے ہیں۔ کئی بار ایسا ہوا ہے کہ ایک ہی تقریر مختلف مقامات پر کرنی پڑی تو بالعموم ہر جگہ لفظ بلفظ دہرائی گئی اور اس کی ترتیب میں سرِمو فرق نہیں آیا۔

اسٹیج پر تقریر کرتے ہوئے ان کا جو کچھ مخصوص انداز ہوتا ہے اس کے امتیازی خدوخال کو میں نے ایک خاص موقع پر تعین سے سمجھا۔ ہمارے ایک دوست کرداروں کا ڈرامائی پیرایہ اڑانے میں ماہر ہیں۔ خصوصیت سے مقررین کا تو وہ زندہ ریکارڈ بن کر حیرت میں ڈال دیتے ہیں۔ انہوں نے ہمارے مجبور کن اصرار پر ایک مرتبہ بڑی جھجک کے ساتھ مودودی صاحب کی تقریر کا ریکارڈ سنایا۔ اس ریکارڈ کو سننے کے بعد اب میں بآسانی بتا سکتا ہوں کہ مودودی صاحب کے امتیازات کیا ہیں۔ وہ اسٹیج پر زیادہ تر ڈائس کے سہارے کھڑے ہوتے ہیں اور کاغذات سامنے رکھ لیتے ہیں۔ سینے تک کا بالائی حصہ کسی قدر آگے کی طرف جھکاؤ لیے ہوئے ہوتا ہے، ایک ہاتھ ——— غالباً بایاں ——— کمر کے پیچھے رہتا ہے۔ دوسرے ہاتھ سے وہ شیروانی کے تیسرے یا چوتھے بٹن کو ذرا ذرا چھیڑتے رہتے ہیں۔ یہی ہاتھ کبھی کبھی بڑی آہستگی سے مختصر سی اشاراتی حرکت کرتا رہتا ہے۔ لہجے کے اتار چڑھاؤ کے ساتھ یہ حرکت تیز یا سست ہوتی ہے۔ تقریر کی ابتدا دھیمی آواز اور انتہائی ٹھہراؤ سے ہوتی ہے اور الفاظ میں شخصیت کا وزن محسوس ہو رہا ہوتا ہے۔ آہستہ آہستہ آواز اور لہجہ چڑھاؤ کی طرف جاتے ہیں، مگر بس ایک متعین حد تک۔ اس حد سے آگے کوئی ایسا جملہ ہی جا سکتا ہے جس کے پیچھے شدتِ جذبات کام کر رہی ہو۔ ایسا بہت کم ہوتا ہے اور بہت کم وقفے کیلئے یہ رنگ آتا ہے۔ تقریر پھر اپنی مقررہ مقدارِ اعتدال پر آ جاتی ہے۔ موضوع کے راستے پر مودودی صاحب گویا بلحاظِ مستقیم چلتے ہیں اور ادھر ادھر کی آوارہ گردی نہیں کرتے۔ تقریر میں درد مندی کی روح ہمیشہ موجود رہتی ہے۔ انہوں نے دستور اور جمہوریت اور انتخابات اور دوسرے اہم اور پیچیدہ مسائل پر جب کبھی خطاب کیا ہے، اپنی بات کو عام فہم بنا کے پیش کیا ہے اور ہر پیچیدگی کا حسن و خوبی سے تجزیہ کر کے غیر تعلیم یافتہ سامعین تک کو متاثر کیا ہے۔ ان کا اندازِ تفہیم اپنی مثال آپ ہے۔

اس طرح کی "غیر رنگین" اور "بے تفریح" تقریر جس میں مجمع کو اس کی دل پسند ذہنی کوکین نہ کھلائی جاتی ہو، دو دو گھنٹے عوام کو بٹھا کر سنانا آسان نہیں۔ اس کے لئے مودودی صاحب نے جلسوں اور اجتماعات کی ایک نئی فضا برسوں کی محنت سے پیدا کی ہے۔ پہلے اپنے رفقا کو اور پھر ان کے ذریعے عوام الناس کو ضبط و نظم اور سنجیدگی اور خاموشی کی تربیت دی ہے۔ "کھیل تماشے" کا عنصر اجتماعات سے بالکل خارج کر دیا ہے۔ خصوصاً پابندیٔ وقت کے معاملے میں ایک نئی روایت قائم کی ہے۔ اس سلسلے میں ایک لطیفہ قابلِ ذکر ہے۔ گزشتہ کل پاکستان اجتماع کے موقع پر جلسۂ عام بھی رکھا گیا تھا۔ لوگ آٹھ بجے سے جہانگیر پارک میں جمع ہو چکے تھے اور کچھ ابھی آ رہے تھے۔ ساڑھے آٹھ بجے مودودی صاحب کی تقریر ہونی تھی۔ اگلی صفوں میں بیٹھے ہوئے ایک صاحب نے قریب کے دوسرے ساتھی سے پوچھا "وقت کیا ہوا ہے؟" انہوں نے جواب دیا "ابھی آٹھ بج کر سولہ منٹ نہیں ہوئے ورنہ مودودی صاحب کی تقریر شروع ہو چکی ہوتی۔"

بارہا ایسا ہوا ہے کہ کسی مخالف طاقت نے شرپسند عنصر کو تیار کر کے مودودی صاحب کی تقریر میں شرارت کرنے اور جلسہ خراب کرنے بھیجا، لیکن

جماعتِ اسلامی کے جلسوں کی سنجیدہ و منضبط فضا اور مودودی صاحب کی شخصیت اور ان کے اندازِ تقریر نے ہمیشہ ایسی فضول کوششوں کو ناکام بنا دیا۔ اس سلسلے میں یہ بھی قابلِ ذکر بات ہے کہ مولانا مودودی (بلکہ ان کے دوسرے رفقا بھی) اس طرح کے حالات میں کبھی بھی گھبراتے نہیں۔ بلکہ جرأت مندی اور اعتماد کے ساتھ ہر قسم کے حوادث کا سامنا کرنے کے لئے تیار ہو کر جاتے ہیں اور خدا کے فضل سے عملاً بھی کامیابی دیتا ہے۔

جلسوں میں جا کر وہ سوالات کو ہمیشہ خوش آمدید کہتے ہیں۔ چنانچہ چٹوں پر چٹیں آتی ہیں اور ڈھیر کا ڈھیر جمع ہو جاتا ہے۔ بڑی حوصلہ مندی سے مولانا مودودی ان چٹوں کو ایک ایک کر کے پڑھتے ہیں۔ اور ایک فقرے میں حاضر دماغی سے ان کے ایسے پھڑکتے ہوئے جواب دیتے چلے جاتے ہیں کہ سامعین اثر لیتے ہیں۔ شالامار باغ کی تقریر (سنہ) میں ایک صاحب نے سوال کیا کہ "جب دوسری پارٹیوں نے مل کر ایک متحدہ صورت اختیار کر لی ہے تو آپ نے اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ کیوں بنا ئی ہے؟" مولانا نے فوراً جواب دیا کہ "افسوس ہے کہ مجھے ڈیڑھ ہی اینٹ مل سکی، ورنہ میں اس سے بڑی مسجد بناتا"۔

تقریر کے دوران میں (گردے کی تکلیف کی وجہ سے) وہ دو تین بار پانی پیتے ہیں۔ نعرے لگائے جانے کو دل سے پسند نہیں کرتے، بس گوارا کرتے ہیں۔ تقریر کرنے کے بعد چند لمحے سستانے کیلئے کرسی پر بیٹھتے ہیں، پھر جلد روانہ ہو جانا چاہتے ہیں۔ لیکن لوگ آ آ کر مصافحے کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ رفقا راستہ بناتے ہیں اور ان کو جلد از جلد بھیڑ سے نکال لے جانے کی کوشش کرتے ہیں۔

میں نے مولانا کی ریڈیائی تقریریں بھی سنی ہیں (جو اب مطبوعہ صورت میں ملتی ہیں) عام رائے یہ ہے کہ مولانا مودودی کی آواز ریڈیو کی ضروریات کے مطابق بہت ہی موزون ہے۔ آواز بہت صاف سنائی دیتی ہے، اچھی طرح پہچانی جاتی ہے اور تلفظ کی پوری صراحت محسوس ہوتی ہے۔ ریڈیائی تقریروں میں بولنے کی رفتار اکثر اوقات تیز رہی ہے کیونکہ ۱۰ یا ۱۵ منٹ میں وہ موضوع سے متعلق اپنی پوری بات کہنے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن اب تو مولانا مودودی پر ریڈیو کے دروازے بند ہیں، کیونکہ سیاسی آدمی ہونے کا قصور پاکستان میں ایسا قصور ہے جس کے بعد آدمی سے خالص علمی اور فکری اور دینی استفادہ کرنا بھی حلال نہیں رہتا۔

سالانہ اجتماع کی تقریر کا بنیادی نقشہ مطالب مجلسِ شوریٰ کے مشورے سے بنتا ہے اور امیرِ جماعت ——— خواہ وہ کوئی ہو ——— اسی نقشے کی پابندی کرتا ہے۔ مولانا مودودی اتنی اونچی شخصیت رکھنے کے باوجود اس پابندی سے کوئی استثنیٰ نہیں رکھتے۔ یوں بھی کسی مہم کے سلسلے میں دورے اور خطابات ہوں۔ تو ان کے لئے بھی مجلسِ شوریٰ ہی کے اندر باقاعدہ منصوبہ بنتا ہے اور تقریر کے اساسی خطوط معین ہو جاتے ہیں۔ البتہ فوری اور ہنگامی اور متفرق مواقع پر، جبکہ جماعت کی پہلے سے بنی ہوئی پالیسی کے اندر کام کرنا ہوتا ہے۔ مولانا مودودی (اور جو کوئی بھی امیر ہو) تازہ مشورہ کئے بغیر خطاب کرتے ہیں۔ جماعت کا مؤسس اور داعیِ اوّل بھی، اپنی امتیازی شخصیت کے باوجود جماعت کے نظم کی پابندی سے بالاتر نہیں ہے۔

نماز کے بھی گوناگوں اسٹائل ہیں اور ہر اسٹائل شخصیت کا ترجمان ہوتا ہے۔ ریاکار آدمی کی نماز اور خدا ترس کی نماز، بے سمجھے بوجھے کی نماز اور شعوری نماز، زندگی سے ہم آہنگی رکھنے والی نماز اور اس سے تضاد رکھنے والی نماز، جذباتی آدمی کی نماز اور مستقل مزاج شخص کی نماز، عادت کی نماز اور ارادے کی نماز، عامیانہ شخصیت کی نماز اور کسی ممتاز شخصیت کی نماز ایک دوسرے سے بالکل الگ الگ پہچانی جاتی ہیں۔

مودودی صاحب ہمیشہ پابندی سے مسجد میں نماز باجماعت ادا کرتے رہے ہیں، لیکن اب جب سے پتھری کی تکلیف اور نزلہ کے پے در پے حملوں نے عمر کے تیسرے مرحلے میں ان کے اعصاب کو حد درجہ کمزور کر دیا ہے، وہ بیشتر نمازیں مرکز کے لان میں رفقائے مرکز اور ملاقاتیوں سے مل کر ادا کر لیتے ہیں۔ پھر بھی جمعہ کو ضرور محلے کی مسجد (مسجد رسول پورہ) میں جاتے ہیں۔ ہر قسم کے خطیبوں کے خطبے سنتے ہیں اور ہر سطح کے اماموں کی اقتدا کرتے ہیں۔ اس شخص کو جس کے دوستوں دشمنوں کے حلقوں میں چرچے ہیں اور جس کے ساتھ حامیانہ اور مخالفانہ دلچسپیاں رکھنے والے ہزارہا انسان بیرونِ پاکستان کے مختلف ممالک تک میں پھیلے ہوئے ہیں اگر آپ مسجد رسول پورہ کے کسی کونے میں ایک درویش بے نیاز کے انداز سے بیٹھا پائیں گے۔ اس کا سر جھکا ہوگا اور وہ خطبہ تفکر کے

ساتھ سن رہا ہوگا۔ فرض نماز کے بعد دعا ہوتے ہی وہ اٹھے گا اور ایک موجِ نسیم کی طرح غیر محسوس طور پر چلا جائیگا۔

دارالاسلام کی مسجد کی امامت بالعموم مودودی صاحب کرتے تھے اور اب بھی مرکز میں با جماعت کے اجتماعات کے موقعوں پر وہی مصلے پر کھڑے ہوتے ہیں۔ وضو ہمیشہ گھر سے کر کے چلتے ہیں۔ سنتیں کبھی گھر سے پڑھ کر آتے ہیں اور کبھی مسجد میں پڑھ لیتے ہیں۔ امامت کیلئے کھڑے ہوں تو سیدھے کھڑے ہوتے ہیں مگر مودبانہ جذبات قیام کے اسلوب میں صاف جھلکتے ہیں۔ نماز کیلئے استقبالِ قبلہ کرتے ہی ان کے اندر ایک خاص طرح کا احساس ذمہ داری پیدا ہو جاتا ہے۔ ان کی نماز ہمیشہ معتدل ہوتی ہے —— نہ غیر معمولی طور پر طویل، نہ جلد بازانہ —— سکون اور وقار ان کے ارکان میں شروع سے آخر تک جھلکتا ہے۔ قرأت کا انداز بالکل ہی خاص قسم کا ہے۔ ایک ایک آیت الگ الگ کر کے اور اس کے اجزائے مطالب کو واضح کرتے ہوئے قرآن پڑھتے ہیں۔ لہجے میں ٹھیک معانی مطالب کے مطابق اُتار چڑھاؤ ہوتا ہے۔ نہ تو مصنوعی طریق سے سُر بناتے ہیں اور نہ بے لوچ طریق سے عبارت کی طرح آیات پڑھتے ہیں۔ کیفیت بالکل ایسی ہوتی ہے اور وہ ساتھ نماز پڑھنے والوں پر اثر انداز ہوتی ہے کہ جیسے کائنات کے فرماں روا کی خدمت میں کھڑے ہیں اور اپنے جذبات پیش کر رہے ہیں اور اُدھر سے لطف و عنایت طلب کر رہے ہیں۔ مودودی کی نماز میں وہی تحریکی روح پائی جاتی ہے جو اُن کے عمل کام میں ہے۔ اس میں دلوں کو بجھا دینے والا وہ جمود نہیں ہوتا جو ہماری نمازوں پر دورِ زوال سے پرتو افگن ہے اور جس کی وجہ سے اول تو نماز کی طلب ہی ختم ہو گئی ہے، اور اگر اپنے آپ کو گھسیٹ کر لے جائیے بھی تو اکتا اور اُوس پڑ جاتی ہے۔ فرض پڑھنے کے بعد مختصر سی دعا ہوتی ہے اور امامت کا سلسلہ ختم ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد سنتیں پڑھ کر مولانا مودودی بھی جائے نماز سے الگ ہو جائیں گے اور دوسرے لوگ بھی منتشر ہونے لگیں گے۔ مودودی صاحب نوافل مسجد میں نہیں پڑھتے کیونکہ قرآن و حدیث کے مطابق اُن کا نظریہ یہ ہے کہ فرائض اجتماعی طور پر اور نوافل اخفاء کے ساتھ ادا کرنے چاہئیں۔ مودودی صاحب کی نماز اور امامت نہ بے جا طور پر بوجھل ہوتی ہے، نہ بے رُوح اور بے کیف! بلا مبالغہ عرض کرونگا کہ پہلی نماز جو میں نے مودودی صاحب کے ساتھ ادا کی اس کا ذائقہ پہلے کی تمام نمازوں سے مختلف تھا۔ اس امامت میں نئی شخصیت جلوہ گر تھی۔ نماز اور قرأت کا یہ خاص اسلوب میں نے پہلے بھی اور بعد میں بھی کسی دوسرے میں نہیں پایا اگرچہ دوسرے حضرات کی نماز و امامت میں بھی طرح طرح کی خوبیاں اور اثر انگیزیاں محسوس کی ہیں۔ نماز کو اصل میں تصورِ نماز بناتا ہے اور تصورِ نماز تصورِ خدا پر مبنی ہوتا ہے۔ مودودی صاحب کی نماز میں ان کا انقلاب آموز تصورِ خدا طاری و ساری رہتا ہے۔ افسوس ہے کہ یہ چیز صرف نفسیاتی و روحانی تجربہ سے تعلق رکھتی ہے اور مقالاتی بحثیں اس کی متحمل نہیں ہیں۔

دارالاسلام میں میں نے دوسرے رفقاء کے ساتھ مولانا مودودی کے حلقۂ درس میں قرآن اور حدیث کا جو مطالعہ کیا ہے درحقیقت اس نے میرے ذہنی سانچے کو بڑی حد تک توڑ پھوڑ کر موجودہ شکل دی ہے۔ مسلسل پانچ برس یہ حلقہ درس ایک اسٹڈی سرکل کے سے انداز پر ہماری ذہنی و اخلاقی تربیت کا ذریعہ بنا رہا ہے۔ درس بہت جگہ ہوتے ہیں، بہت سے بزرگ درس دیتے ہیں، لیکن مجبوراً پھر وہی کہنا پڑتا ہے کہ مودودی صاحب کے درس کا انداز بھی بالکل مختلف پایا۔

طریقہ یہ تھا کہ نمازِ فجر یا نمازِ عصر کے بعد تمام لوگ حلقہ زن بیٹھ جاتے اور اپنے اپنے مصحف سامنے رکھ لیتے۔ اکثر اوقات ہم لوگ پہلے سے زیر درس آنے والے حصہ کا مطالعہ کر لاتے اور اس کے بارے میں سوالات اور الجھنیں نوٹ کر لاتے۔ مولانا ہلکی آواز سے تعوذ اور تسمیہ کہہ کر آغاز کرتے پھر گزشتہ سلسلہ کلام کا خلاصہ ذہنوں میں مستحضر کر دیتے، پھر اگلی آیات کا معنوی ربط سامنے لاتے۔ اس کے بعد ایک ایک آیت پڑھتے، اُس کا صاف مگر جاندار اور اثر انگیز اور جدید اُردوئے مبین میں ترجمہ کرتے، پھر خاص خاص اصطلاحی کلمات کی وضاحت کرتے، جو مغالطے متعلقہ مضمون کے بارے میں عام طور پر پائے جاتے ہیں ان کو صاف کرتے اور آخر میں احکام اور تقاضے واضح کرتے۔ پھر اگلی آیت اور پھر اس سے آگے —— اور اسی طرح تقریباً ایک رکوع نشست میں ہو جاتا۔ اس درس میں کبھی بھی صرف و نحو اور منطق اور بلاغت کی ٹیکنیکل بحثوں کا پرتو انہوں نے نہ پڑنے دیا۔ ان کا

اسلوب عام آدمی ——— خصوصاً تعلیم یافتہ نوجوان ——— کو سمجھانے کا ہوتا اور اسی کی ذہنی سطح، دلچسپی اور الجھن کو وہ پیشِ نظر رکھتے تھے۔ بحث سے جدید علوم اور جدید مسائل کا کچھ بھی تعلق ہوتا تو ساتھ کے ساتھ ان پر ضرور گفتگو کرتے۔ نیز مختلف فقہی نقطہ ہائے نظر کو متقابلاً سامنے رکھ دیتے۔ صاحبِ درس کے سامنے اصل نصب العین یہ تھا کہ شرکاء اپنے اندر قرآن کا انسانِ مطلوب پیدا کریں اور درسِ حدیث کے ذریعے اس کے تفصیلی خدوخال نمایاں کریں۔

درس کی ایک ایک آیت اور حدیث پر ہر مرحلے میں سوالات کی بوچھاڑ شروع ہوتی۔ سوالات ہر قسم کے ہوتے تھے۔ اونچے علمی قسم کے، سطحی، مذہبی گروہوں کے پیدا کردہ، جدید طبقوں کے اٹھائے ہوئے، ٹھنڈے انداز کے، جذباتی طرز کے ——— اور اکیلا مودودی ان سارے حملوں کو خندہ پیشانی کے ساتھ چار جانب سے سینے پر لیتا۔ حکیمانہ و تفہیمانہ اسلوب سے ہر بات کی وضاحت ہوتی چلی جاتی۔ کسی معرکے کے مسئلے کے چھڑ جانے پر لمبی بحث کا سلسلہ چل نکلتا اور اس کی وجہ سے درس ایک ہی آیت یا حدیث پر رُکا رہتا۔ بحث میں نوعمر سائلین تیزی بھی دکھاتے اور باہر سے آنے والے مہمان بھی طرح طرح سے حصہ لیتے۔ مگر صاحبِ درس ٹھنڈے انداز پر بار بار اصل حقیقت کو نمایاں کرنے کی سعیٔ مسلسل کرتا چلا جاتا اور آخری جیت اسی کی ہوتی۔ خصوصیت سے جہاں کہیں معاشی اور سیاسی بحثیں پیدا ہوتیں وہاں بڑی بڑی گرماگرمی پیدا ہو جاتی۔ کمیونسٹ پروپیگنڈے کے پھیلائے ہوئے تصورِ مساوات کی بنیاد پر تو ہم لوگ خوب خوب اُلجھے بلکہ ندامت کے ساتھ اقرار کرنا پڑتا ہے کہ دو ایک موقعوں پر ہماری طرف سے زیادتی ہی ہوئی۔ مگر وہ مجسمۂ استقلال نہ کبھی گھبرایا، نہ کبھی بگڑا، نہ ہم سے مایوس ہوا۔ کوئی اور ہوتا تو شاید لعنت ملامت پہ اُتر آتا، حلقۂ درس سے نکال باہر کرتا بلکہ سلسلۂ درس ہی کو برطرف کرکے بیٹھ رہتا۔ مگر کیا کرتے کہ پھر وہی مسکراتا چہرہ، وہی ٹھنڈا امزاج اور وہی تفہیمی انداز ہمارے سامنے ہوتا۔ باہر سے مودودی صاحب کے نئے نئے عقیدت مند پیری مریدی کی روایات ذہن میں لئے ہوئے آتے اور ہماری بے تکلفانہ اور آزاد بحثوں کو "غیر شرعی" اور غیر مودبانہ سمجھ کر خفا ہوتے۔ کبھی تو حلقہ درس ہی میں ٹوک دیتے۔ ہم چپ رہتے اور خود مولانا مودودی ہماری مدافعت کرنے اور ہماری آزادی اور ہمارے حقوق کی وکالت کرتے۔ مجھے یاد ہے کہ ایک بحث "فلسفۂ ارتقاء" کے سلسلے میں بہت طول پکڑ گئی تھی۔ اسی طرح ایک مرتبہ اَلسُّلْطَانُ ظِلُّ اللّٰہ (حدیث) پر خوب خوب دماغ سوزی ہوئی۔ غالباً ایک یحییٰ صاحب تھے اور دو سرا میں عقابین کو کسی علمی بنیاد کے بغیر اصرار تھا کہ یہ حدیث موضوع ہے اور قابلِ استرداد۔ مولانا مودودی نے بخلاف اس کے اس کا ایک ایسا مفہوم ہمارے سامنے رکھا جس پر کسی پہلو سے اعتراض وارد نہیں ہوتا تھا۔ ان کا مطالعہ یہ تھا کہ اَلسُّلْطَان کے معنی یہاں بادشاہ نہیں بلکہ حکومت و سلطنت بلکہ "حاکمیت" ہیں اور حدیث کا منشا، انہوں نے یہ واضح کیا کہ بادشاہت یا حاکمیت یا اقتدار اللہ تعالیٰ ہی کے اقتدار کا ایک پرتو ہے اور جو شخص اس خدائی امانت و عطیہ کو پاکر اس کی اہانت کرتا ہے خدا بھی اُسے ذلیل کرتا ہے۔ یہ بالکل ایسے ہی ہے جیسے علم خدا کا ایک عطیہ ہے اور جو عالم علم کو نفسانیت کیلئے استعمال کرے وہ مجرم ہے۔ اس مفہوم نے نئے دروازے کھول دیئے۔ مگر حدیث کا جو استعمال ہماری تاریخ میں ہو چکا تھا اور اس کی وجہ سے جو اضطراب عام طور پر نوجوانوں میں پھیلا ہوا تھا اس کی وجہ سے ہم اصرار کرتے تھے کہ ایسی حدیث کو آخر بنائے استدلال بنانا ہی کیا ضرور ہے۔ یحییٰ صاحب تو بڑی صفائی سے یہ کہتے تھے کہ مولانا! جب معلوم ہے کہ ہمارے بادشاہوں کے حفظِ اقتدار کیلئے دنیا پرست عالموں نے حدیثیں گھڑی اور استعمال کی ہیں تو یہ جانتے ہوئے ایسی حدیثوں کو کیوں لیا جائے۔ صاحبِ درس نے بڑی مغزماریوں کے بعد یہ اصول ہمارے ذہن نشین کرایا کہ اگر کوئی حدیث روایت و سند کی صحت رکھتے ہوئے کوئی ایسی تاویل و تشریح قبول کرتی ہو جو دین کے اصولوں اور اس کے مجموعی تاثرات کے مطابق بیٹھ سکے تو پھر بلاوجہ اُسے رد کرنے کا کسی کو حق نہیں ہو سکتا ———

بہرحال اس آزادانہ فضا میں ہم نے دین کو کسی قدر تفصیل کے ساتھ سمجھا۔

درس ختم ہوتا تو ہم سب اپنے اپنے مصحف لے منتشر ہو جاتے۔ کسی دن جاتے ہوئے اپنی کسی فکری غلطی اور کسی عملی کوتاہی کا شعور و احساس لے کے جاتے اور اس کی اصلاح کا جذبہ موجزن محسوس ہوتا۔ کسی دن دین کی کوئی نئی حقیقت دلوں کے دامن میں لئے ایک عجیب سی مسرت کے ساتھ ——— جسے مسرتِ علم کہنا چاہیئے ——— مسجد سے نکلتے۔ کسی دن ذہن کی کوئی الجھن اور زیادہ پیچیدہ ہو جاتی اور وہ اگلے روز سابق درس کے بارے میں از سرِ نو بحث چھیڑنے کا محرک بنتی۔ کسی دن مختلف الخیال رفقاء آپس میں بحث کرتے ہوئے نکلتے اور چوبیس گھنٹے میں فرصت کے

مواقع پر دینی بحث بار بار جاری رہتی یہاں تک کہ اگلے دن کا درس سامنے آجاتا۔ ایسا بھی ہوتا کہ درس کے بعد ہم لوگ مودودی صاحب کو ان کے دفتر میں جب گھیرتے اور دماغ کی رہی سہی بھڑاس نکالتے۔ یہ سب کچھ ہوتا مگر بدتمیزی کے رنگ سے خدا نے فضا کو پاک رکھا۔ کیونکہ بنیادی کلمہ اور مرکزی نظریہ سب کو انضباط میں لئے ہوئے تھا اور سب طالب علم تھے نہ کہ مناظرہ باز۔ نظریات ٹوٹتے اور بنتے، جامد خیالات پگھلتے اور نئی شکل اختیار کرتے۔ شخصیت مکرر دلوں میں ایک زلزلہ سا آتا رہتا۔ ذہنوں میں ہر روز نئے آثار چڑھاؤ رہتے۔ اور ہم محسوس کرتے کہ ہمارے اندر تخریب و تعمیر کا متوازی عمل جاری ہے۔ ہمارے اندر کا پرانا انسان دم توڑ رہا ہے اور ایک نیا انسان ابھر رہا ہے۔ مذہب کے نام آلود موروثی تصورات اکھڑ رہے ہیں اور تحریک اسلامی کا نیا تصور دل و دماغ کے مطلع پر جگمگا رہا ہے۔ الغرض ہم نے مودودی صاحب سے جو چیز بھی قبول کی ہے اپنی آزادی رائے کو برقرار رکھتے ہوئے اور دلیل و عقلیت کی بانڈیاں لڑ کر قبول کی ہے۔ عقیدت مندی کے ساتھ آمنا و صدقنا شاید کسی ایک امر میں بھی نہیں کہا۔ مودودی صاحب نے بھی اس طریق تعلیم و دعوت کو سوچ سمجھ کر اپنایا تھا۔ وہ دراصل اندھے مُرید (followers) نہیں چاہتے تھے کہ جن کا گلہ بنا کر وہ اپنی عقیدت کے باڑے میں رکھیں اور اس کو اپنی کرامات کی چراگاہ میں چرا کر اس کے گوشت اور دودھ اور اُون سے فائدہ اٹھائیں اور پھر دنیا سے رخصت ہوتے ہوتے یہ گلہ اپنی اولاد کیلئے بطور ترکہ اور جائداد کے چھوڑ جائیں ——— وہ ایک سوچنے سمجھنے اور اپنے اندرونی جذبے سے حرکت کرنے والی طاقت پیدا کرنے کے اہتمام میں تھے جو اسلامی اصولوں پر ایک نئی دنیا بنانے کا پارٹ ادا کر سکے۔ ہمیں کبھی مغالطہ نہیں ہوا کہ ہم فی الواقع اس گراں بہا کام کے پوری طرح اہل بن گئے ہیں۔ احساس صرف یہ ہے کہ دارالاسلام کی تربیت نے ہمیں ایسے سوچنے سمجھنے والے پیروانِ اسلام میں بدل دیا ہے جن کا سرچشمۂ فکر قرآن و حدیث ہے۔ اور جو اعتماد کے ساتھ مخالفانہ حالات کے مقابلے میں کھڑے ہو کر وہ بعد میں آگے بڑھنے کا راستہ خود بنا سکتے ہیں۔

اس درس کا سلسلہ کبھی کبھی مرکز میں اب بھی جاری رہتا ہے اور اب بھی سوالات اور بحثیں چھڑتی ہیں۔ مگر سچ یہ ہے کہ ہم دارالاسلام کے دور کے درس کو ترس گئے ہیں۔ کتنا اچھا تھا ہمارا وہ زمانۂ ناآشنائی! کتنے ناقابل فراموش ہیں وہ اجنبیت کے مزے"!

اب اُس صاحبِ درس کی شخصیت کا نقشہ آپ خود اپنے ذہن میں کھینچ سکتے ہیں۔

لیجئے اب ذوقیات کے دائرہ کی طرف!

مولانا مودودی کے ذوقیات کا شجرۂ طیبہ چائے اور پان سے سیراب ہوتا ہے۔ اور اس کی ٹہنیاں پان کے پتوں سے آراستہ ہیں۔ پان مولانا کے اس مسرت و تفریح کا ترجمان ہے اور یہی نازک سا برگِ سبز پریشانیوں کے بار ہائے گراں اپنے کفِ سبز پر سہارتا ہے۔ لیکن سب سے بڑھ کر یہ کاوش و تفکر کی گھڑیوں کا رفیق ہے۔ دماغ میں جونہی سوچنے کی تحریک ہوتی ہے معاً مولانا مودودی کا ہاتھ ڈبیہ بٹوے کی طرف بڑھتا ہے۔ ادھر زردہ چھالیہ ڈالا جاتا ہوتا ہے اور ادھر خیالات ترتیب پانے لگتے ہیں۔ پان چبانے کے لئے جبڑوں کی ہلکی ہلکی جنبش تلازم افکار کی نرم خیز لہروں سے بالکل ہم آہنگ ہو جاتی ہے۔ مودودی کی تحریروں میں کوئی شک نہیں کہ پان کے پتے کی سبزی، اس کے کرارے پن، چھالیے اور چونے کی تیزی اور زردے کی حرارت انگیز اور تحریک زا لطیف تلخی کے سارے پہلو شریک رہتے ہیں۔

کل ہی مولانا مودودی سے احباب کی مجلس میں (جو سفر حج سے واپسی پر فوراً ہی مرکزی دفتر میں منعقد ہوئی) دریافت کیا گیا کہ کیا پان اس لمبے سفر میں ملتا رہا۔ فرمانے لگے کہ اللہ تعالیٰ نے خاص انتظام یہ کیا کہ مفتی محمد شفیع صاحب کو ہم سفر بنایا۔ ان کے ساتھ پان کا ذخیرہ تھا اور وہ اسے دیر تک محفوظ رکھنے کا کوئی خاص طریقہ جانتے تھے۔ چنانچہ پان ملتا رہا۔ کوئی چار دن کا فاقہ کیا ہوگا کہ مکہ پہنچ گئے اور مکہ کے بارے میں تو اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی ضمانت ہے ہی کہ یہاں رزق ضرور ملے گا۔ ایک صاحب نے پوچھا: "کیا مولانا! پان بھی رزق کی تعریف میں آتا ہے؟" ——— "اجی واہ۔ تو کیا روٹی اور سالن ہی کا نام رزق ہے"؟ ——— مودودی صاحب خندہ آمیز انداز سے فرمانے لگے: "اصل رزق تو پان ہے"۔

ایک گفتگو ماہر القادری صاحب نے یوں روایت کی ہے:

"ایک بار پان کا ذکر چل نکلا۔ میں نے مولانا سے کہا کہ آپ تو بڑے شوق سے مزہ لے لے کر تمباکو کھاتے ہیں۔ مگر میرا یہ عالم ہے کہ چھالیہ میں تمباکو چھو بھی جائے تو اس چھالیہ کو نہیں کھا سکتا۔ اس کے جواب میں مولانا نے فرمایا کہ میں بھی پہلے تمباکو نہیں کھاتا تھا۔ ایک بار کسی صاحب نے تمباکو کا پان کھلا دیا (میرا خیال یہ ہے کہ پنواڑی نے غلطی سے تمباکو ڈال دیا تھا۔ ن۔ص) اور اس پان کو کھا کر مجھے گھماتی آئی۔ بس اس گھماتی کے بعد مجھے تمباکو کھانے کی عادت پڑ گئی ———— مگر اس عادت پر اتنا قابو بھی ہے کہ جیل میں جاتا ہوں تو وہاں پان کی یاد نہیں آتی۔"

("مولانا مودودی ———— اپنی اور دوسروں کی نظر میں")

جیل جانے کا واقعہ بھی سن لیجئے جسے میں پہلے لکھ بھی چکا ہوں۔ پہلی مرتبہ کی گرفتاری (۴ اکتوبر ۱۹۴۸ء) کے موقع پر ضروری کارروائی اور تیاری ہو چکنے پر مولانا روانگی کیلئے نکلے۔ برآمدے میں رفقا سے ملے، سیڑھیوں کے کنارے کھڑے ہوئے اور بہ طرزِ معمول پان طلب کیا۔ "ڈبیہ بٹوا کہاں ہے؟ آخری پان کھا لیا جائے۔" پوچھا گیا کہ آخری کیوں؟ ہنستے ہوئے فرمانے لگے: "بس اب طلاق دے رہا ہوں۔" پان جیسے رفیق کے بارے میں یہ فیصلہ سن کر کسی نے پوچھا کہ کیا جیل کے بعد بھی یہ طلاق جاری رہے گی؟ تو فرمایا: "نہیں یہ طلاق رجعی ہے، مغلظ نہیں"۔ اس پر سید نقی علی صاحب اور دوسرے لوگ قہقہہ لگا کر ہنسے۔ یوں یہ شخص ہنستے ہنساتے مصافحہ کرکے نامعلوم مدت کی قید کیلئے مسلح پہرے میں جیپ گاڑی کے اندر بیٹھ کر روانہ ہو گیا۔

("مولانا مودودی ———— اپنی اور دوسروں کی نظر میں")

مولانا کی رائے میں پان کی ترکیب و ترتیب الہامی ہے۔ فرماتے ہیں کہ ذرا اس کے اجزا کے تنوع اور ان کی باہمی مغائرت کو دیکھئے۔ کہاں کہاں سے یہ اجزا لا کر جوڑ ملائے جاتے ہیں۔ انسانی ذائقہ محض عقل کی رہنمائی سے کہاں یہ ترکیب پیدا کر سکتا ہے۔

ایک بار (جب کہ انگریزی دورِ حکومت تھا) کہنے لگے کہ ان انگریزوں نے اپنی عادتِ بد کا تو اتنا اہتمام کیا ہے کہ گاڑی کے اونچے درجے کے ڈبوں میں شراب کے پیگ رکھنے کے اسٹینڈ لگا کر رکھے ہیں تاکہ راستے میں بھی ———— ضرورت ہو تو لیٹے لیٹے ———— شراب کی چسکیاں لی جاتی رہیں۔ لیکن ان کمبختوں کو ہمارے پان کا لحاظ نہیں کہ اگالدان لگوا دیئے ہوتے۔ اسلامی نظام حکومت کبھی آیا تو گاڑیوں کے ڈبوں میں اگالدان ضرور لگیں گے۔

دارالاسلام کے دور میں مولانا مودودی کے پاس ایک بڑا سا پاندان تھا جس پر نکل پالش کیا ہوا تھا۔ یہ بالعموم دفتر کی میز پر دکھائی دیتا اور جب مولانا مجالسِ شبانہ میں آ بیٹھتے تو پاندان بھی ساتھ آتا۔ حسنِ ذوق کا یہ نمونہ تاریخی حیثیت اختیار کر گیا، کیونکہ مولوی منش لوگ باہر سے آتے تو ———— سامنے تو نہیں ———— ادھر ادھر دبی زبان سے کہتے کہ یہ پاندان خلافِ شریعت ہے۔ ہم لوگ مسکرا کر سن لیتے۔ بعض میں یہ راز کھلا کہ ایسے حضرات اسے چاندی کا پاندان سمجھتے رہے تھے اور سونے چاندی کے برتنوں کو محسنِ انسانیت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کیلئے حرام ٹھہرایا ہے۔ خود پان بھی بعض لوگوں کے فتووں کا ہدف بنے بغیر نہ رہتا۔ کچھ لوگ اسے ناجائز نہیں کہتے تھے مگر بڑی لجاجت سے مولانا سے درخواست کر دیتے تھے کہ عام تصورات کا لحاظ کرتے ہوئے آپ اسے ترک کر دیں۔ مگر مولانا مودودی دوسروں کو دکھانے اور دوسروں کو خوش کرنے کیلئے نہ کوئی چیز اختیار کرتے ہیں، نہ کچھ ترک کرتے ہیں۔ ایک پان ہی پر کیا موقوف، کوئی اگر میز کرسی کی نشست پر اعتراض کرتا، کوئی سفید اجلے لباس پر ہی اپنے انوکھے نظریات کے دھبے ڈال دیتا، بلکہ ایک مرتبہ تو ایک مہذب قسم کے مہمان نے دورانِ گفتگو میں دیواروں کی سفیدی کو بھی خلافِ اسلام قرار دیا۔ مودودی صاحب ان امور میں بحث کرنے سے بچ جاتے ———— خوبصورتی سے طرح دے جاتے۔

ضمناً ایک ضروری بات یاد آئی۔ مولانا مودودی ذوقیات کے معاملے میں گھٹے ہوئے مذہبی ذہنوں کے برعکس بڑے فراخ دل اور عالی ظرف واقع ہوئے ہیں۔ ہمارا تصورِ مذہب ہر چیز پر اعتراض کی انگلی رکھتا ہے خصوصیت سے پان اور چائے اور سگریٹ تو بہت ہی بڑے مظلوم ہیں۔ جماعت میں آنے والوں میں جو لوگ حقہ اور سگریٹ کے عادی تھے ان کی اکثر شامت آتی رہی ہے۔ خصوصاً مرکز میں چائے پینے والوں کو تو کسی نہ کسی نووارد کی

خشونت سے نت سابقہ رہتا ۔ میں خود اس تلخ تجربے سے گزرتا رہا ۔ مگر میری اور اس طرح کے دوسرے رفقا کی محفوظ پناہ گاہ مولانا مودودی ہوتے ۔ وہ رسمی مسئلوں کو شریعت کا جزو نہیں مانتے اور نہ ممنوعات کے دائرے کو خواہ مخواہ وسیع کرتے چلے جانے کے قائل ہیں ۔ بلکہ ان کا مسلک یہ ہے کہ اباحت اور رخصت سے فائدہ اٹھانے کا حق کوئی کسی سے سلب نہیں کر سکتا ۔ ابتدا میں احتراماً میں مولانا مودودی کے ساتھ بیٹھ کر سگریٹ نہیں پیتا تھا اور خطوط نویسی کے دوران جب مولانا کے دفتر میں زیادہ دیر بیٹھنے سے اعصاب میں ہلچل ہونے لگتی تو چپکے سے ان کے پاندان سے زردہ کے چند ریزے لے کر منہ میں رکھ لیتا ۔ مولانا میری کمزوری سے جب آگاہ ہو گئے تو کسی مجلس میں بر سلسلۂ "حدیث دیگراں" اشارۃً واضح کیا کہ سگریٹ جسے پینا ہو وہ پیئے ، اس میں کیا حرج ہے ۔ جب سے اب تک مولانا ہمارے سامنے پان کھاتے ہیں اور ہم ان کے سامنے سگریٹ پیتے ہیں ۔ کسی طرف سے حملہ ہوتا ہے تو ہم اس پناہ گاہ میں سمٹ جاتے ہیں ۔ لیکن اب کئی سال کی تربیت سے اس قسم کے جملہ معاملات میں جماعت کی مجموعی فضا انتہائی فراخدلانہ قسم کی ہو گئی ہے اور کوئی بھی اب خردہ گیریاں نہیں کرتا ۔

میں نے جیل کی ڈائری میں (جس کے چند ہی اوراق شائع ہوئے ہیں) لکھا ہے کہ اپنی دو روزہ رہائی کے دوران میں مولینا کے خلاف مقدمے کی کارروائی سننے ہم فوجی عدالت میں گئے ۔ کارروائی ختم ہونے پر ملاقات ہوئی ۔ برسبیل تذکرہ میں نے بیان کیا کہ سگریٹ چھوڑ دیا ہے ۔ مولانا ہنس کر فرمانے لگے : "ایسے نہیں ، جیل میں آئیے تو چھوڑ دیجئے ، باہر جائیے تو پھر پیجئے ، پھر جیل آئیے تو پھر چھوڑ دیجئے ۔"

مولانا مودودی چائے سے بھی خاص رغبت رکھتے ہیں ۔ لیکن مولانا آزاد کے ذوق سے آپ کا ذوق بالکل برعکس ہے ۔ مودودی صاحب اس معاملے میں پنجابی نسخے کے قائل ہیں ، یعنی چائے کی پتی بھی بہت ہو ، دودھ بھی بہت ہو ، شکر بھی بہت ہو ۔ چنانچہ شکر کے تین چمچے آپ کے لئے پیالے کو میٹھا کرتے ہیں ۔ چائے کی گرمی کے ساتھ آپ کو برفاب کی ٹھنڈک سے بھی گہری دلچسپی ہے ۔ "ٹھنڈا پانی" مولانا مودودی کے ادنیٰ مرغوبات میں سے ایک ہے ۔ مگر ٹھنڈے پانی کا مفہوم ان کے ہاں یہ ہے کہ آدھی برف ہو اور آدھا پانی ۔ حتیٰ کہ جاڑے میں بھی وہ ٹھنڈے پانی کا مطالبہ کرتے ہیں ۔ یاد ہے کہ جب دارالاسلام کے زمانۂ خطر میں راتوں کو پہرے کا انتظام ہوتا تھا اور ڈیوٹی دینے والے گروپوں میں مولانا مودودی کی باری بھی جس رات آتی تھی تو آپ برف کا خاص انتظام کر لیتے تھے ۔ گھنٹے گھنٹے بعد برف کی سل کو ہتھوڑے سے توڑا جاتا اور مولانا خود بھی برفاب پیتے اور دوسرے ساتھی بھی !

کھانوں میں مولانا مودودی کے گھر کا ایک خاص مرغوب کھانا "شب دیگ" ہے ۔ یہ شب دیگ مولانا کی والدہ مکرمہ کی ہدایت و نگرانی میں (بالعموم عیدالاضحیٰ کے موقعوں پر) پکتی ہے اور سارے رفقا مولانا کے ساتھ مل کر کھاتے ہیں ۔ واقعی یہ چیز خوب رہتی ۔ تقسیم کے بعد شاید ایک بار اس قصۂ ماضی کی یاد تازہ کی جا سکی ہے ۔

مودودی صاحب کے ذوقیات کے سلسلے میں کھانے کا ایک دلچسپ فلسفہ سنئے ۔ ابھی گزشتہ رمضان میں ہمارے ایک پروفیسر دوست نے سمن آباد میں مودودی صاحب کو دعوتِ افطار دی ۔ یہ دعوتِ افطار مکمل کھانے سے کسی قدر زیادہ ثقیل تھی ۔ دسترخوان فرش پر بچھا ، لیکن چھری کانٹا موجود ! دو چار دوستوں نے چھری کانٹا اٹھایا ، مگر مولانا مودودی نے مشرقی وضع نہ چھوڑی ۔ میزبان نے پلاؤ کے قریب چمچہ رکھ کر اپنا مشورہ پیش کیا ۔ ساتھ ہی کسی صاحب نے پوچھا "چھری کانٹے سے کھانا اسلامی نقطۂ نظر سے جائز ہے یا نہیں ؟" فرمایا "جائز کیوں نہیں ، مگر دست و دہن کے درمیان اگر کوئی تیسری چیز حائل ہو جائے تو کھانے کا مزہ غارت ہو جاتا ہے ۔" اب ایک لطیف سلسلۂ گفتگو پھڑکتے جملوں اور ہلکی مسکراہٹوں کے ساتھ چل نکلا ۔ مودودی صاحب نے باتوں باتوں میں کھانے سے متعلق ایک مکمل فلسفہ پیش کر دیا ۔ خلاصہ یہ تھا کہ کھانے کا مزہ محض اُتنے تاثر کا نام نہیں جو ذائقہ کے ذریعے حاصل ہوتا ہے بلکہ اس میں مختلف حسیات حصہ لیتے ہیں ۔ کھانے کا ایک رنگ اور اس کی ایک شکل ہوتی ہے جس سے آنکھیں بہرہ اندوز ہوتی ہیں ۔ ایک خوشبو ہوتی ہے جس سے مشام متاثر ہوتا ہے ۔ ان کے ساتھ مل کر ذائقہ کی حس لطف اندوز ہوتی ہے ۔ کھانے میں لمس کا بھی ایک حصہ ہے اور وہ ملتا جبھی ہے کہ انگلیاں براہ راست مس کریں ۔ چھری کانٹے اور چمچے سے کھائیے تو لمس کا یہ حصہ غارت ہو جاتا ہے ۔

ذوقیات کے دائرے میں اور بہت سی چیزیں قابل ذکر ہیں لیکن اس مضمون کیلئے اتنا ہی حصہ کافی ہے ۔

کہتے ہیں اور ٹھیک کہتے ہیں کہ آدمی کے ساتھ بس کر ہی اسے جانچا پرکھا جاسکتا ہے۔ خصوصیت سے لیڈروں، وزیروں، علماء، مصنفوں اور صحافیوں کو دُور سے کبھی جانا ہی نہیں جاسکتا ہے۔ کتابوں اور مقالوں، تقریروں اور بیانوں میں بالکل دوسرا آدمی جلوہ گر ہوتا ہے جو تمام محاسن و کمالات کا جامع معلوم ہوتا ہے۔ اصل آدمی ستر پردوں کے پیچھے بہت دُور تاریکی میں چھپا دیکھ رہا ہوتا ہے کہ دنیا کس طرح بیوقوف بن رہی ہے۔ شہرتِ شخصیت کا حجابِ اکبر ہے۔ مولانا مودودی کے ساتھ ہم نے رہ بس کر دیکھا ہے۔ ان سطور میں یہی دکھانا مطلوب ہے کہ وہ رفقا کے درمیان کس طرح رہتا سہتا اور گھلتا ملتا ہے۔ مطالعۂ شخصیت کا یہی بہترین طریقہ ہے۔

اوّلین بات یہ ہے کہ مولانا مودودی اپنے ملنے والوں اور کسی طرح کا تعلق رکھنے والوں میں سے ایک ایک فرد کو پوری اہمیت دیتے ہیں خصوصیت سے ساتھ کام کرنے والے رفقا، چاہے وہ عمر، علم، منصب، کارکردگی اور دوسرے اوصاف کے لحاظ سے کسی بھی درجے کے ہوں، سب کے سب اُن کی نگاہ میں ایک ہی طرح کی دوستانہ اہمیت رکھتے ہیں اور ایک ہی طرح توجہ حاصل کرتے ہیں۔ اپنے ہر ملاقاتی اور اجتماعات میں شریک ہونے والے تمام کارکنانِ جماعت پر وہ فرداً فرداً توجہ صرف کرتے رہے ہیں (اب چونکہ تعداد زیادہ ہو چکی ہے اور شرکائے اجتماع بہت زیادہ ہوتے ہیں اس لئے وہ دورِ اوّل والی بات تو نہیں رہی، پھر بھی ہر ایک سے انفرادی رابطہ رکھنے کی کوشش مولانا ضرور کرتے ہیں)۔ وہ تقریباً تمام ارکانِ جماعت کو فرداً فرداً نام اور شکل سے جانتے ہیں بیشتر صورتوں میں ان کے ذہنی ارتقاء کے مراحل اور ان کے جماعتی احوال کو سمجھتے ہیں، خوبیوں اور کمزوریوں سے باخبر رہتے ہیں، مقامی جماعتوں کے حالات کی یاد تازہ رکھتے ہیں۔ کئی کئی سال پہلے جن لوگوں کو کبھی ایک بار دیکھا تھا ان کو دیکھتے ہی پہچان لیتے ہیں اور اسی طرح گزشتہ سلسلۂ واقعات کو مستحضر کر لیتے ہیں۔ گردہ کے آپریشن کے بعد ان کا حافظہ اگرچہ متاثر ہوا ہے اور اب کسی کسی موقع پر وہ کوئی چیز یاد لانے کے لئے ان کو ذرا سی کاوش کرنی پڑتی ہے، لیکن متعلقہ افراد کو اہمیت اور توجہ دینے کی خوبی جوں کی توں قائم ہے۔ ہر ایک کو اہمیت اور توجہ دینا خود پسندی، علیحدگی پسندی اور اپنی ذات میں سمٹے رہنے کی عادت کے بالکل نقیض ہے اور مولانا مودودی کی شخصیت کی مستقل جاذبیت کا ایک سبب یہی ہے۔

اسی کے ساتھ ساتھ وہ ہر ایک کو اعتماد میں لیتے ہیں، شریکِ مشورت کرتے ہیں اور ذمہ داریاں سونپتے ہیں۔ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ انہوں نے ساتھیوں سے بات چھپانے کی کوشش کی ہو یا ان کے خلاف بے اعتمادی کا اظہار کیا ہو۔ ہماری ہزار کوتاہیوں کے باوجود مودودی صاحب کی اس افتادِ مزاج میں کبھی کوئی تغیر واقع نہیں ہوا۔ انہوں نے رفقا کے درمیان کبھی اقرب اور ابعد کا امتیاز نہیں کیا۔ ایک کے خلاف دوسرے کے سامنے کسی طرح کا اظہارِ تکدر اور اظہارِ نفرت نہیں کیا۔ دارالاسلام کے دور سے لیکر اب تک ایسا ہوتا رہا ہے کہ جب کبھی کسی سفر سے آمد ہوئی، کسی ملاقات اور گفتگو اور مشاورت سے فراغت ہوئی، کوئی اجلاسِ شوریٰ ختم ہوا تو مولانا مودودی کے گرد رفقا جمع ہو جاتے ہیں اور بے تکلفی سے باتیں پوچھتے ہیں اور باتیں سنتے ہیں۔

مولانا مودودی بہ حیثیت امیر اگرچہ کارکنانِ مرکز اور باہر کے ماتحت اُمرا کیلئے، نیز خاص طور پر دفتر ترجمان القرآن کے کارکنوں کیلئے "افسر" کی حیثیت رکھتے ہیں، لیکن برسوں کا تجربہ گواہ ہے کہ انہوں نے کبھی بھی افسرانہ اور حکمانہ انداز سے نہ کوئی کام کسی کو سونپا ہے، نہ باز پرس کی ہے اور نہ بالادستی کے اظہار کے لئے اُس طرز سے نگرانی کی ہے۔ سارا معاملہ دوستانہ انداز سے چلتا ہے۔ اسی دوستانہ انداز کی بات ہے کہ مولانا کے ساتھ رہ کر کام کرنے کا ہر کسی کو شوق رہتا ہے اور کوئی ان کا ساتھ چھوڑ کر جانے پر اس وقت تک آمادہ نہیں ہوتا جب تک جماعتی مصالح کا شدید تقاضا نہ ہو۔

سب سے بڑی بات یہ ہے کہ مولانا مودودی کے ہاں ہر شخص کو خصوصیت سے رفقا کو اختلاف اور تنقید کا پورا پورا حق حاصل رہتا ہے عام اصطلاح کے لحاظ سے چھوٹے سے چھوٹا آدمی اُٹھے گا اور علیحدگی میں مولانا سے ملے گا اور رُو در رُو ہر بات کہہ دے گا جو اس کے ضمیر کی آواز ہو۔ تنہائی تک ہی محدود نہیں عام مجالس گفتگو میں کوئی رفیق کسی بات پر کہہ دے گا کہ مجھے اس سے اختلاف ہے یا آپ کا یہ نقطۂ نظر فلاں جماعتی اصول سے یا آپ ہی کے فلاں قول سے ٹکراتا ہے۔ اور پھر اجتماع میں ——— رفقا اُٹھ کر بے دھڑک سوالات کریں گے۔ اعتراضات سامنے لائیں گے اور اپنے اختلافات بیان کر دیں گے۔ جماعتی فیصلے تو نظری اختلاف کے باوجود ہر رکن عملاً قبول کرتا ہے، لیکن مولانا کے علمی نظریات اور ذاتی تصورات سے اختلافات کیے جاتے اور مسلسل برقرار رہتے

ہیں۔ ہمارے جماعتی نظم میں اسلامی جمہوریت کا یہ پہلو بڑی ہی اہمیت رکھتا ہے اور اس کی وجہ سے کسی بھی منصب پہ آنے والا شخص ایک کڑے امتحان سے گزرتا ہے۔ چونکہ سب سے بڑا منصب مرکزی امارت کا ہے۔ لہٰذا مرکزی امیر پر معاملات و مسائل اور نزاعات کے بھاری بوجھ کے ساتھ تنقید کی اتنی بوچھاڑ رہتی ہے کہ پہاڑ کا سا عزم درکار ہے۔ تنقید کے حق کو اسلامی تقاضوں کے مطابق استعمال کرنے کی تربیت پاتے رہنے کے باوجود جماعت میں ہمیشہ ایسے نئے لوگ موجود رہتے ہیں (اور بعض دیرینہ ساتھی بھی اپنے مزاج کی وجہ سے اس معاملہ میں ہمیشہ نئے رہتے ہیں) جو بے ڈھنگے پن سے تنقید کرتے ہیں مگر مولانا مودودی اس بوچھاڑ کا مقابلہ تحمل اور شگفتگی کے ساتھ کرتے ہیں۔ اور ڈانٹ ڈپٹ یا ترش روئی کا کبھی مظاہرہ نہیں کرتے۔ انہوں نے اسلامی اصول کے مطابق اپنی پوری زندگی کو ایک کھلی کتاب کی طرح جماعت کے سامنے رکھ دیا ہے۔ اس کے کسی بھی نسخے کی کسی بھی عبارت پر ہر رفیق کو اظہارِ رائے اور تنقید' بلکہ کہنا چاہیئے کہ باز پرس کا حق حاصل ہے۔ چنانچہ جماعتی اُمور سے آگے نکل کر مولانا کے گھر اور ان کے بچوں کی تعلیم و تربیت اور دوسرے شخصی معاملات تک پر متعدد بار لوگوں نے کھل کر گفتگوئیں کی ہیں۔ زندگی کو اس طرح سب کے سامنے رکھ دینا اور تنقید و اعتراض کا عام حق دے دینا کوئی آسان کام نہیں۔ جسے آسان معلوم ہو وہ اسے ذرا کرکے دیکھے۔ اس مقام تک شائد کوئی لیڈر اور عالم دین مشکل ہی سے رسائی رکھتا ہوگا۔ اور رفقا نے جس شخص کو بار بار اعتراضات کی چھلنیوں چھان کر، اور تنقید کے چھاجوں پھٹک کر دیکھا ہے وہی اس کی صحیح قدر پہچانتے ہیں۔ مولانا مودودی کو مصنوعی زندگی سے سخت گریز ہے۔ لباس' وضع قطع' اور دوسرے پہلوؤں میں مختلف لوگوں نے ان ان کو طرح طرح کے مشورے دیئے ہیں، لجاجت سے اصرار کیا ہے، لیکن مولانا نے کسی کو خوش کرنے کے لئے کبھی کوئی ایسی تبدیلی اپنے اندر نہیں کی جس کے لئے دین خود تقاضا نہ کرے اور ضمیر کے اندر جس کیلئے تحریک نہ ہو۔ بعض لوگ چاہتے تھے کہ آپ نوافل پڑھا کریں' بعض کو اصرار تھا کہ ڈاڑھی زیادہ لمبی رکھیں، بعض کا مشورہ تھا کہ سر کے بالوں کی ہیئت بدل دیں' بعض کا تقاضا رہا کہ اسلوبِ نگارش اور طرزِ گفتگو میں تبدیلیاں کریں' اور کچھ یہ چاہتے کہ لباس میں پیوند لگایا کریں۔ لیکن مولانا مودودی دوسروں پر اثر انداز ہونے کے لئے کسی ادنیٰ سی ترمیم پر بھی کبھی راضی نہیں ہوئے۔ ساتھ ہی انہوں نے اپنی کسی عادت اور اپنے کسی معمول کو کبھی کسی سے اخفاء میں رکھنے کی کوشش نہیں کی۔ وہ ڈرامائی کردار بننے پر کبھی ایک لمحہ بھی تیار نہیں ہوئے۔

رفقا کی عزتِ نفس کا مولانا کو ہمیشہ خاص خیال رہتا ہے۔ وہ ان کا پورا پورا احترام کرتے ہیں اور اسلامی آداب کے ساتھ ان سے مساویانہ معاملہ کرتے ہیں۔ انہوں نے کبھی کسی رفیق کو ملامت نہیں کی' برا بھلا نہیں کہا' غضبناک ہو کر سخت گیرانہ معاملہ نہیں کیا۔

اس کے معنی یہ نہیں کہ ان کی تربیت سے تغافل برتا ہے۔ تربیت ہمیشہ مدنظر رہی۔ بس اس کا منصوبہ جداگانہ نوعیت کا تھا۔ مولانا مودودی کے طریقِ تربیت کا ایک جزو تو یہی اعتماد میں لینا' احترام ملحوظ رکھنا' ذمہ داریاں سونپنا اور دوستانہ سطح پر معاملہ کرنا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ کریم النفسی کا مظاہرہ کرتے ہوئے چھوٹی چھوٹی چیزوں پر گرفت نہیں کرتے اور اہم ترکوتاہیوں پر وہ ایک خفیف سے اشارے یا بالواسطہ طرز کے ایک جملے کے ذریعے ہنستے مسکراتے احساس دلا دیتے ہیں۔ اس سے آگے کا معاملہ ہو تو بغیر کسی گرماگرمی کے پاس بٹھا کر تفصیل سے بات سمجھا دیتے ہیں۔ اظہارِ ندامت پر فراخدلی سے معاف کرتے رہتے ہیں۔ اگر کسی رفیق یا ملازم کی اصلاح سے لمبے تجربے کے بعد وہ بالکل مایوس ہو جائیں ——— اور ایسی صورتیں پورے گزشتہ دور میں شاید دو ہی چار پیش آئی ہیں ——— تو خوبصورتی سے معاملہ ختم کر دیتے ہیں۔ مولانا مودودی کا یہ طویل المیعاد طرزِ تربیت نتائج کے لحاظ سے بہت ہی کامیاب رہا ہے۔ خصوصاً انہوں نے اپنی بیگم صاحبہ کی زندگی میں جو انقلاب پیدا کیا ہے وہ حیرت ناک ہے۔ ہماری یہ بہن ایک ایسے خاندان سے آئیں جس میں مغربیت تیزی سے چھا رہی تھی۔ مولانا مودودی کی والدہ مکرمہ کے اصرار سے یہ رابطہ قائم ہوا۔ شادی کے بعد جب مولانا مودودی کے نظریات و عزائم زیادہ اچھی طرح واضح ہونے لگے اور پھر جب وہ ایک ایسے راستے کی طرف مڑ گئے جو دنیوی کامرانیوں کے باغ و بہار سے نہیں، بلکہ فقر و فاقہ کے خارزار سے ہو کر گزرتا تھا اور وہ خارزار علاً دارالاسلام کی بے رونق اور سادہ دیہاتی زندگی کی صورت میں بالکل سامنے آگیا تو ہماری ان محترم بہن کے سارے خواب درہم برہم ہونے لگے۔ وہ گویا عیش مسرت کی ایک دنیا سے ایثار و امتحان کی بالکل ایک دوسری دنیا میں منتقل ہو گئیں۔ دل و دماغ میں جو ہلچل ایسے انقلاب سے ہونی چاہیئے تھی وہ ہوئی۔ لیکن مولانا مودودی ٹھنڈے دل سے ایک ٹھنڈی اسکیم کے تحت ان کی دلجوئی کرتے ہوئے آگے بڑھتے رہے۔ وہ کچھ دن سنتے سنتے' کچھ لٹریچر پڑھتے پڑھتے' اور ایک خاص ماحول میں رہتے سہتے آخر کار اپنی جگہ سے ہل

گئیں۔ پھر جو وہ ایک بار آگے بڑھیں تو ایسی جگہ آ پہنچیں کہ جہاں ان کے اندر ایک نئی شخصیت پیدا ہو گئی۔ بالکل اسی طرح مولانا مودودی اپنے بچوں کو مارے اور برا بھلا کہے اور بات بات پر ٹوکے بغیر مشفقانہ انداز میں تربیت دینا پسند کرتے ہیں۔ کبھی اچانک کوئی غلط حرکت کریں تو ایک آواز آئیگی "ہاں" —— ہائیں —— یا اونہہ ہونہہ"! —— بس یہی مولینا مودودی کا عصائے تربیت ہے جسے وہ بچوں پر استعمال کرتے ہیں۔

رفقاء نے ہمیشہ مولانا مودودی کی شخصیت سے درسِ عزیمت و استقلال لیا ہے۔ موقع بہ موقع مولانا ہی کی ذات نے ان کی ہمت بندھائی ہے۔ ڈرپوک اور کمزور شخصیتیں اپنی کمزوری اپنے ساتھیوں میں بھی منتقل کر دیتی ہیں۔ اور اسی طرح عزیمت و استقلال کے پیکر قریبی لوگوں پر بھی اپنے اس جوہر کا پرتو ڈال دیتے ہیں۔ دارالاسلام کے دورِ خطر میں مولانا مودودی آس پاس کی بستیوں کی فضا کو درست رکھنے کے لئے ہمارے گروپ مرتب کر کے بھجواتے تھے اور تاکید کرتے تھے کہ کوئی شخص ایک چھڑی اور ایک چاقو تک ساتھ لے کے نہ جائے، کیونکہ مسلح ہو کر امن و سلامتی کی دعوت دینا بے معنی ہے۔ اور ہم بے دھڑک علاقے بھر میں گھوم آتے، حالانکہ ہمیں معلوم تھا کہ نفرت و کدورت اور فتنہ و فساد کی بارود ہر آبادی کے نیچے بچھ رہی ہے۔ جب دورِ فساد شروع ہو گیا تو اس عالم میں مولانا مودودی نے بنفسِ نفیس بستی کی حفاظت کے لئے فوجی نظام تجویز کیا اور بہترین منصوبہ بنایا۔ خود وہ اس نظام کے کمانڈر تھے اور تمام انتظامات میں حصہ دار رہے۔

جن دنوں کشمیر کے نام پر ہمارے خلاف "جہادِ اکبر" لڑا جا رہا تھا لاہور کے ایک روزنامے نے (جسے جماعتِ اسلامی سے خدا واسطے کا بیر رہا ہے) ایک زہر ملا نوٹ لکھا اور جھوٹ کی کڑیاں ملا ملا کر فتویٰ دیا کہ یہ لوگ غدار ہیں۔ میں تسنیم کے ادارے میں شریک تھا۔ مولانا سے مشورہ لینے گیا کہ اس پر تردیدی نوٹ لکھنا چاہیئے۔ مولانا مودودی مزاحاً کہنے لگے تردید کیوں —— صاف صاف کہیئے کہ ہم اقراری مجرم ہیں —— بس اتنے سے فقرے نے مجھے اور دوسرے شرکائے مجلس کو متاعِ عزم و ہمت سے مالا مال کر دیا اور اس وقت میرے ذہن میں ایک مصرع نمودار ہوا —— "ہم لوگ اقراری مجرم ہیں!" —— اگلی صبح تک نظم مکمل ہو گئی۔ پھر جب یہ ہنگامہ اور بڑھا اور جوابی کام کرنے کیلئے اخبارات کی طاقت بھی ہم سے چھین لی گئی تو طے پایا کہ شہر کے ہر حلقے میں جلسے کر کے اپنی بات واضح کی جائے۔ سوال یہ تھا کہ ابتدا کس حلقے سے کی جائے۔ مودودی صاحب کہنے لگے کہ سب سے پہلے "خطرناک ترین" موقع کو لیجئے، اور وہ موچی دروازہ تھا۔ ان کے اس مشورے نے جو خاص روح کارکنوں کے اندر پھونک دی، اس کا آج تک ہمیں اندازہ ہے۔

اور پھانسی کی کوٹھڑی میں! —— اعزہ و رفقاء ملنے جاتے ہیں اور پوچھتے ہیں کہ "آپ کو کسی چیز کی ضرورت ہے؟" "جی ہاں! عینک کے خانے اور خلال کے چند تنکوں کی"۔ یہ تھا اس شخص کا جواب جس کے لئے پھانسی کا پھندا تیار ہو رہا تھا۔ مولینا مودودی نے رحم کی اپیل کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ اس سلسلے میں دریافت کرنے پر جو تین وجوہ آپ نے بیان فرمائے ان میں سے ایک یہ تھا کہ اگر میرے جیسے آدمی نے بھی جان بچانے کے لئے رحم کی اپیلیں کرنا پسند کر لیا تو پھر اس ملک میں غیرت و حمیت کا بالکل خاتمہ ہو جائیگا۔

اور جب فوجی عدالت میں مقدمہ چل رہا تھا —— مولانا کے وکیل نے ایک راہ یہ سجھائی کہ آپ "تسنیم" کے شائع کردہ بیان کو اپنانے سے انکار کر دیں۔ لیکن مولانا مودودی کی سیرت نے اس مشورہ کو مسترد کر دیا اور جب عدالت میں پوچھا گیا تو آپ نے کسی قدر زور دے کر کہا کہ "ہاں! یہ پورا بیان میرا ہے"!

مولانا اپنے رفقاء کے درمیان اس سادہ زندگی کی وجہ سے بھی محبوب ہیں جو ان کا تعلق دوسروں سے مساویانہ اخوت کی بنیادوں پر جوڑتی ہے۔ ان کا لباس ہمیشہ سادہ رہا اور بسا اوقات تو ان کے کرتے اور پاجامے پر خوبصورتی اور مہارت سے لگے ہوئے باریک پیوند بھی ہم نے دیکھے ہیں۔ لیکن یہ نمائش فقر سے ہمیشہ خالی پائے گئے۔ ان کے ہاں کئے کھانے بارہا کھانے کا موقع ملا اور دعوتوں میں شرکت کی لیکن کھانا ہمیشہ سادہ پایا۔ دفتر میں میز کرسی ہمیشہ رہے لیکن صوفوں اور قالینوں کو کبھی بار نہ مل سکا۔ کبھی کوئی ماما یا کوئی بچہ گھر میں ملازم رہتا ہے۔ لیکن تمام کاموں کے لئے نوکروں کا بیڑہ کبھی بھرتی نہیں ہوا۔ اس سبب سے مولینا مودودی کو دن میں کئی کئی بار خود ہی اٹھ کر گھر جانا پڑتا ہے اور نیچے دروازے پر دستک دے کر بلاوا دیتے رہتے ہیں۔ مولانا مودودی اپنے ہاتھ سے بہت سارے کام کر لیتے ہیں اور ایسے کاموں کی فہرست بہت دلچسپ ہے مگر تفصیل کا موقع نہیں۔ یہ سادہ زندگی ان کے لئے رفقاء سے مساویانہ رابطہ رکھنے کو آسان بناتی ہے ——

دارالاسلام میں ہر روز شام کو کبھی کرسیوں پر، کبھی چٹائیوں پر اور کبھی کنارِ جو پتھروں اور گھاس پر تکلف برطرف کر کے برادرانہ محفل جمتی اور مولانا مودودی کی

میں نیکے الرمنا" بن کر بیٹھتے ۔ رات کو اجتماعی کھانا ہوتا اور گنا گوں کھانے یکجا ہو جاتے اور باہم دگر دست درازیاں ہوتیں ۔ اجتماعی کھانے کی روح رواں ہمیشہ مودودی صاحب ہوتے ۔ وہ نہ ہوتے تو کھانا پھیکا ہو جاتا ۔ اب لاہور میں صرف عید کے موقع پر اس اجتماعی کھانے کی یاد تازہ کی جاتی ہے ۔

اجتماعات کی صورت میں کئی برس تک مولانا ایک عام رکن کی طرح قیام و طعام کے عام انتظام میں حصہ دار ہوتے ۔ فرش پر سوتے اور سب کے ساتھ مل کر رہتے ۔ اب ان کی صحت کی کمزوری کا لحاظ کر کے ان کے رفقا نے پرہیزی کھانے کا انتظام شروع کیا ہے اور ان کو اجتماع گاہ میں قیام گاہ کا ایک گوشہ الگ کر کے دے دیا جاتا ہے تاکہ وہاں وہ ضروری امور کیلئے سوچ سکیں، تقریر کی تیاری کر سکیں اور آرام سے سکیں ۔ مگر آرام کہاں ! اسی طرح وہ سفر میں جب بھی رفقا کے ساتھ جاتے ہیں تو اسی درجے میں سفر کرتے ہیں جس میں سب کے لئے سفر کرنا ممکن ہو ——— اور یہ تیسرا درجہ ہی ہو سکتا ہے ۔ دونوں کل پاکستان اجتماعات (۱۹۵۱ء، ۱۹۵۲ء) میں کراچی تشریف لے گئے تو اسی آخری درجے میں سفر کیا ۔ کسی ایک موقع پر کہیں ان سے کسی ملاقاتی کی جانب سے سوال کیا گیا کہ "میں ! آپ اور تھرڈ کلاس میں ؟" ۔ فرمایا " اگر کوئی چوتھا درجہ ہوتا تو اسی میں سفر کرتا "

اندازہ کر لیجئے کہ یہ کیسی شخصیت ہے اور اس کے ساتھ اس کے رفقا کی وابستگی کس نوعیت کی ہو گی ۔

ہاں ——— اس سادہ زندگی کے پس منظر میں وہ ایثار کام کر رہا ہے جو اس زمانے میں اپنی مثال آپ ہے ۔ جب اپنا نصب العین معین کر کے آپ عزم کے راستے پر چل پڑے تو بار بار ایسے مواقع آئے کہ ترجمان القرآن سے کبھی ایک حلقے کے خریدار ٹوٹ جاتے، کبھی دوسرے حلقے کے، لیکن مودودی کے ایمان نے اس ٹوٹ پھوٹ کی کبھی پروا نہیں کی ۔ آخر میں مسلم لیگی حلقوں کے ناراض ہونے کا تو رسالہ کی خریداری پر نمایاں اثر پڑا ۔ مگر حق کا دیہ سپاہی اپنے موقف سے نہیں سرکا ۔ حالات کی اس گردش میں بار بار مولانا مودودی فقر و فاقہ کی بالکل سرحد پر جا پہنچتے رہے ہیں ۔ اور دوسری طرف تن تنہا بہت ساری ذمہ داریاں اٹھانے کی وجہ سے رات کو دو دو بجے تک بیٹھ کر کام کرنے کے عادی رہے ہیں ۔ ترجمان کے مقالات کے مجموعے کتابی شکل میں آئے اور دوسری کتابیں شائع ہوئیں تو یہ لٹریچر حد درجہ مقبول ہوا اور کئی کئی ایڈیشن اب تک نکلے ہیں ۔ آمدنی کا یہ ایک جائز اور وسیع ذریعہ تھا اور اس سے مولانا مودودی اپنے مالی حالات کو ہمیشہ کیلئے مضبوط بنا سکتے تھے ۔ لیکن انہوں نے یہ کتابیں تحریک کیلئے وقف کر دیں ۔ اس وقت دو چار کتابوں کے علاوہ باقی کتابیں جن کی تعداد پچاس ساٹھ کے قریب ہو گی، سب جماعت اسلامی کی ملک ہیں ۔ اس ایثار کے ساتھ دوسرا ایثار یہ تھا کہ جماعت اور تحریک کے عائد کردہ مختلف فرائض کا بار شروع سے بلا معاوضہ اٹھایا ——— حالانکہ یہ شرعاً اور اخلاقاً ناجائز نہیں تھا کہ مولانا اپنا پورا وقت دیتے ہوئے بقدر کفالت جماعت سے معاوضہ یا کم سے کم وظیفہ لیتے ۔ اس کے لئے اصرار بھی کیا گیا ۔ لیکن وہ قرض اٹھا اٹھا کر تو کام چلاتے رہے، یہ صورت بالکل قبول نہیں کی ۔

سوچئے کہ ہمارے پاس کتنی ایک مثالیں ایسی موجود ہیں !

اس موضوع کے سلسلے میں ضروری ہے کہ مولانا مودودی کا پارٹ مجلس شوریٰ میں دکھایا جائے جو بیرونی دنیا کی نگاہوں سے بالکل اوجھل ہے ۔

مودودی صاحب ہمیشہ مقررہ وقت پر پہلے سے "ایوان" (جو بیشتر ان کا دفتری ہوتا ہے) میں موجود ہوتے ہیں ۔ لوگ آتے اور بیٹھتے جاتے ہیں ۔ ماحول بڑا سنجیدہ ہو جاتا ہے ۔ سابق کارروائی پڑھی جاتی ہے، ایجنڈا پڑھا جاتا ہے، اور اکثر اوقات تمام ارکان شوریٰ باری باری اپنے اپنے علاقوں کے تحریکی حالات کے بارے میں معلومات پیش کرتے ہیں ۔ پھر مسائل پر بحث شروع ہوتی ہے ۔ مولانا مودودی بحث کے دوران میں نقطہ ہائے نظر کو سمجھنے کے موڈ میں پرسکون طریق سے بیٹھے رہتے ہیں ۔ ابتدائی عام بحث کے بعد آہستہ آہستہ دو یا زیادہ اختلافی آرا متعین شکل میں سامنے آجاتی ہیں اور ضرورت ہو تو ان کو مولانا مودودی بصیرت مندانہ تجزیہ کے ساتھ بیان کر دیتے ہیں ۔ اب ان آرا کے حق میں مختلف افراد (جو کبھی مستقل گروہ بندیوں کی شکل اختیار نہیں کرتے) انفرادی طور پر استدلال کرتے ہیں بحث اگر انضباط سے ذرا ادھر اُدھر ہو تو مولانا خندہ سے انداز سے از سر نو تجزیہ کر کے اسے پھر راہ راست پر ڈال دیتے ہیں ۔ اگر لوگ زیادہ بولنے لگیں تو کسی کسی موقع پر یکایک مولانا ہنسیں گے اور مسکرا کر کہیں گے " اچھا حضرات ! آپ بحث جاری رکھئے، میں ذرا ڈیوٹی بڑھائے آؤں " ۔ اس پر اکثر چہرے مسکرا اٹھتے ہیں اور لطیف تنبیہانہ انداز کی اس تنبیہ کو سمجھ کر بحث لیے پن کا از خود سدباب کر لیتے ہیں ۔ مولانا مودودی نہ تو اس دوران میں اپنی رائے کو سامنے لاتے ہیں اور نہ کبھی یہ محسوس ہوتا ہے کہ پہلے

سے وہ کوئی چیز طے کئے بیٹھے ہیں جسے منوانا چاہتے ہیں۔ واقعی صورت ہوتی بھی یہی ہے کہ وہ دوسروں کی بحث سے بہت کچھ اخذ کر کے ذہن کے اندر اپنی رائے کو آخری شکل دیتے ہیں۔ اپنے منصب کے زور سے انہوں نے کبھی کسی بات کو نہ پیش کیا ہے، نہ منوایا ہے۔ وہ اگر کوئی نقطۂ نظر رکھتے ہوں تو وہ بحث کے بعد کسی موقع پہ دلنشین انداز میں دلائل و وجوہ کے ساتھ اسے پیش کر دیتے ہیں۔ پھر کچھ وہ اپنے رفقائے شوریٰ سے اخذ کرتے ہیں اور کچھ ان کا نقطۂ نظر قبول کیا جاتا ہے۔ اس طرح لین دین سے متفقہ فیصلے طے پاتے ہیں۔ دو یا تین اختلافی رجحانات کے درمیان جب بحث بہت طول کھینچ جاتی ہے تو مولانا مودودی ان کے مابین نقطۂ اعتدال پیدا کر کے اس خوش اسلوبی سے پیش کرتے ہیں کہ بحث کا طوفان چھٹ چھٹا جاتا ہے۔ شوریٰ کی تاریخ میں گنتی کے مواقع ایسے آئے ہیں جن پر رائے شماری سے فیصلہ ہوا ہو، ورنہ عمومی معمول بلکہ روایت یہ ہے کہ باہمی افہام و تفہیم کے بعد اتفاق رائے اور اطمینانِ قلب و ذہن کے ساتھ ہی معاملات طے پاتے ہیں۔ مجلس شوریٰ میں مولانا مودودی کا ایک اہم پارٹ یہ رہتا ہے کہ جب بھی بحث کی فضا بوجھل ہونے لگتی ہے تو وہ ایک تبسم انگیز فقرے سے اس کو ہلکا پھلکا بنا دیتے ہیں۔ حقیقت باہر کے لوگوں کو معلوم نہیں ہوگی کہ ہمارے ہاں اگرچہ تمام مسائل پر ارکانِ شوریٰ باہم بھی اور امیر جماعت سے بھی گفتگوئیں کرتے رہتے ہیں، لیکن "ایوان" سے باہر امیر کی طرف سے یہ کوشش کی جاتی ہے کہ وہ پہلے سے اپنے ہم خیال تیار کر کے لائے اور نہ ارکانِ شوریٰ علیحدگی میں امیر کو متاثر کرنے کی کوشش کرتے ہیں بلکہ یہ سارا کام "ایوان" کے اندر ہی اندر ہوتا ہے۔ اس سبب سے نہ گروہ بندی پیدا ہوتی ہے، نہ سازشیں! ——— اور ہر فرد یہ محسوس کرتا ہے کہ وہ تمام کارروائی میں برابر کا حصہ دار ہے اور اس کی رائے ویسی ہی قیمتی اور اس کا استدلال ویسا ہی اہم ہے جیسے کسی اور کا اور خود امیر کا!

ہو سکتا ہے کہ کوئی شخص میرے اس مطالعۂ شخصیت میں اچھے ہی اچھے پہلو دیکھ کر مجھ پر قصیدہ گوئی کا الزام رکھے۔ میں کسی کو روک نہیں سکتا، مگر اتنا حسنِ ظن اپنے آپ سے ضرور رکھتا ہوں کہ قصیدہ گوئی کے لئے میرا مزاج بنایا ہی نہیں گیا۔ مگر دوسری طرف میرا مزاج یہ بھی نہیں ہے کہ خواہ مخواہ کا تکلف کر کے کچھ خرابیاں کسی کے اندر نکالوں۔ مودودی صاحب کی شخصیت کا مجموعی ڈھانچہ بہت ہی صاف ستھرا اور نفیس ہے اور اس میں کوئی بنیادی اور اہم قسم کی کوتاہی یا فساد موجود نہیں ہے۔ یوں وہ انسان ہیں، رائے قائم کرنے، فیصلے دینے، معاملات کو سمجھنے اور تدابیر اختیار کرنے میں غلطیاں کرتے ہیں، ہم سب ایسی غلطیوں پر ان سے بحث بھی کرتے ہیں اور اگر ہمارے دلائل مضبوط ہوں تو مولانا مودودی قائل ہو کر تبدیلی بھی قبول کرتے ہیں۔ لیکن جہاں تک ان کے اخلاق اور کردار کی ساخت کا تعلق ہے اس میں کوئی رخنہ تلاش کرنے میں ناکامی ہوتی ہے۔ کمزوریاں ان میں ہوں گی مگر آخر تحریک کی بھٹی میں پڑ کر اپنے رفقا کے ساتھ ساتھ خود مودودی صاحب بھی تو بنے ہیں۔ اور وہ تو ہم سب سے پہلے (۱۹۴۱ء میں) اپنی اس سلگائی ہوئی بھٹی میں از خود پڑے تھے اور اس میں تپتے ہوئے ان کو آج ۲۵، ۲۶ سال ہو چکے ہیں ——— میں اپنے ضمیر کے سامنے بہرحال مطمئن ہوں کہ میں نے عقیدت مندی کے رنگ سے نہیں بلکہ یہ تصویر واقعیت اور حقیقت کے رنگ سے مرتب کی ہے ——— اور اتنی اچھی تصویر سامنے ہونے کے باوجود میں کہتا ہوں کہ مودودی ہرگز کوئی فرشتہ نہیں، وہ معصوم نہیں، وہ انسان ہے اور غلطیاں اور کوتاہیاں اور کمزوریاں رکھنے والا انسان۔

مودودی کی شخصیت کا یہ مطالعہ و تجزیہ ختم کرتے ہوئے میں علی سفیان آفاقی کے چار لفظوں کو دہراتا ہوں کہ "مولانا مودودی کی زندگی اس اعتبار سے دلچسپ ہے کہ وہ ایک انسان کی زندگی ہے۔" (ابوالاعلیٰ مودودی) اور ان الفاظ ہی کی روشنی میں تعصب کی ان دیواروں پر ماتم کرنا چاہتا ہوں جن کو لوگوں نے خود اپنے اور مودودی کے درمیان کھڑا کر رکھا ہے اور مخالفانہ پروپیگنڈہ کرنے والوں کو اذن دے رکھا ہے کہ ان دیواروں پر نت نیا پلستر لیپتے رہیں۔ مودودی صاحب سے جسے اختلاف ہو وہ اختلاف کرے، جو ان کے مذہبی تصور کو غلط سمجھتا ہو وہ اپنا کلامی اور فقہی نقطۂ نظر پورے زور سے سامنے لائے اور جسے ان کے سیاسی پروگرام سے بُعد ہو وہ سیاسی محاذ پر ان کا پورا پورا مقابلہ کرے ——— مگر وہ اپنی نوعیت کے "انسان" اور ایک تاریخی شخصیت ہونے کے لحاظ سے ساری ملت کی ایک قیمتی متاع ہیں بلکہ انسانی دنیا کے بنیادی سرمایۂ شخصیت و کردار کا ایک جزء!

——— اور ان کی ذات میں علم اور عمل کے کچھ نہ کچھ ایسے پہلو موجود ہیں جن میں سے ہر ایک کی ہمیں ضرورت ہے۔ انہی پہلوؤں تک رسائی حاصل کرنے کا راستہ نکالنے کیلئے ان کا مطالعۂ شخصیت مفید ہے، ورنہ محض ایک شخص جس کا نام ابوالاعلیٰ مودودی ہے کسی دوسرے سے قابلِ ترجیح نہیں ہے۔

علّامہ مشرقی

غلام جیلانی برق

یہ ۱۹۰۸ء کی بات ہے۔

کہ میرے گاؤں (بسال ضلع اٹک) میں میرے والد صاحب کے مرشد فروکش ہوئے۔ حضرت والد بادائے عقیدت کے لئے ان کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ میں اور میرے ایک بھائی غلام ربانی عزیز بھی ہمراہ تھے۔ ہم نے بھی نذرانہ پیش کیا۔ مرشد نے پوچھا۔ کہ یہ بچے کیا کرتے ہیں۔ حضرت والد نے بتایا کہ سرکاری سکولوں میں پڑھتے ہیں۔ بڑا چھٹی میں اور چھوٹا دوسری تیسری میں۔ یہ سنتے ہی مرشد کے تیور بدل گئے۔ جلال میں فرمایا "ان کو آج ہی سکولوں سے اٹھا لو۔ ملکی تعلیم بے دینی ہے۔" اور ہم دونوں بھائی مسجد میں بھیج دئے گئے۔ جہاں ہم نے پہلے تدریسی کا نصاب ختم کیا۔ پھر دس برس عربی نحو۔ فقہ۔ منطق فلسفہ۔ حدیث۔ تفسیر اور تاریخ پر صرف کئے۔

مسجد کے یہ تیرہ برس میری زندگی میں بہت اہم تھے۔ اول اس لئے کہ یہاں مجھے عربی زبان پر قدرت حاصل کرنے کے مواقع میسر آئے۔ اور دوم اس لئے کہ مجھے ملا و پیر کی اندرونی زندگی دیکھنے کا موقعہ ملا۔ چونکہ یونانی فلسفہ پڑھنے کے بعد تعقل کی گرفت ڈھیلی پڑ چکی تھی۔ اور فکر آزاد ہو گئی تھی اس لئے میں نے اس مذہب کے ہر پہلو پر غور کرنا شروع کر دیا جو ملا پیش کر رہا تھا۔ بے شمار شبہات پیدا ہوئے۔ جن کا جواب ملا کے پاس موجود نہ تھا۔ رفتہ رفتہ یہ شبہات بے چینی میں بدل گئے۔ اور بے چینی نے بغاوت و الحاد کی صورت اختیار کر لی۔ ۱۹۲۲ء سے ۱۹۲۸ء تک میں خدا و رسول اور امام و قرآن سے باغی رہا۔ میرا کام رسولِ خدا کی تضحیک اور کتاب اللہ کا مذاق اڑانا تھا۔ اور مذاق بھی ایسا۔ کہ بڑے بڑے زندیق میرے سامنے کان پکڑتے تھے۔ اور ابلیس مجھ سے پناہ مانگتا تھا۔

میرا الحاد عین شباب پر تھا۔ کہ ایک دن (۱۹۲۸ء) ایک دوست علامہ مشرقی کی مشہور کتاب تذکرہ میرے پاس لائے۔ اور کہا۔ کہ اسے پڑھو۔ شاید تمہارے بعض شبہات کا حل اس میں موجود ہو۔ میں نے نفرت و حقارت سے کتاب کو اٹھایا لیکن چند ابتدائی جملوں ہی نے میری دنیائے دل میں ایک زلزلہ سا پیدا کر دیا۔

" دنیا کی سب مسلّم اور مروج اشیاء میں سب سے پیارا مذہب ہے۔ یہ پوجا کیوں ہے۔ یہ جھگڑا کیا ہے۔ یہ رسمی عقائد۔ یہ شرعی مراسم۔ یہ برہمن کے قشقے۔ یہ بت پرست کی مورتیاں۔ یہ مشرک کی قربانیاں اور ہندو کے

چڑھاوے کیوں ہیں۔ یہ گبر کی شعلہ نوازی اور عیسائی کا ابن خدا کیا ہے۔ اور یہ تسبیح اور سجدہ کے بار۔ حج کے مناسک۔ جانور کے
نماز۔ تپسیا۔ پن۔ دان۔ خیرات۔ صدقات۔ نذر۔ نیاز۔ لمبی ڈاڑھیاں۔ متشرع چہرے۔ تعویذ۔ اصطباغ۔ ہون۔ اشنان
وغیرہ۔۔۔۔۔۔ وہ اسرار جاریہ ہیں۔۔۔۔۔۔ جن کو ہر شخص نہایت عقیدت والتزام سے کرتا ہے۔ ان کے سچ یا جھوٹ
ہونے کے متعلق ایک حرف زبان پر نہیں لاتا۔ جاہل اور عالم۔ کم فہم اور عاقل سب اس مشق نامعلوم میں جکڑے رہے ہیں اور
ان کو نیا ہتے۔ ہماری زندگی کا منتہائے واہم سمجھتے ہیں۔۔۔۔۔۔۔۔۔

تعجب ہے کہ مذہب کی طرف اس تمام میلان کے باوجود ابتدائے آفرینش سے آج تک یہ فیصلہ نہ ہو سکا کہ کون سا مذہب
سچا ہے۔ کون سا شارع کائنات کی منشا کے مطابق ہے اور مذہب کی سچائی کا معیار کیا ہے؟۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ آج
علم الطبیعیات کے حقائق پر سارا جہان متحد ہے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ زمین کی محوری حرکت یا سورج کے اضافی سکون پر
ساری دنیا متفق ہو چکی ہے۔۔۔۔۔۔۔ لیکن ہندو اور بدھ۔ گبر و برہمن۔ عیسائی اور مسلمان کے درمیان اختلاف بدستور
قائم ہے (اور رہے گا)۔ صداقت کی جامع الناس کیفیت کیوں ان سب کو کسی مشترک حقیقت پر جمع نہیں کرتی؟۔۔۔۔۔۔
میرا یقین ہے کہ دنیا کے مختلف پیغمبر جہاں سے آئے تھے ایک ہی پیغام لائے تھے۔ انہوں نے اس کو رضائے خداوند کو ایک
ہی چشم تحیر سے دیکھا تھا۔ وہ انسان کو ایک ہی مقام بلند سے دیکھ کر تڑپ اٹھے تھے۔ حیرت کی بجلیاں اور علم و خبر کی سنسنیاں
اُن کے بدنوں میں ایک ہی راہ سے داخل ہوتی تھیں۔۔۔۔۔۔۔ جو کہا وہ سب ایک تھا۔ فدائے ساز ایک تھی
چشمک ناز ایک تھی۔ کلمۂ راز ایک تھا۔ بوسہ یہ پیغام ایک تھا۔ جب تک یہ محرم اسرار لوگ اس دنیا میں رہے راز
راز کو برملا کہتے رہے۔ سولی پر چڑھ چڑھ کر اور رسوا ہو ہو کر خلق خدا کو آمادۂ عمل کرتے رہے۔ سب کو ایک نصب
العین اور ایک قانون پر متحد کرتے رہے۔ لیکن ان کے بعد جب ناحقیقت شناس لوگوں نے اس کام کو سنبھالا
تو لوگوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ پیغام خدا غلط سنا کر اپنے پیچھے صفیں کھڑی کر لیں۔ آج سطح زمین پر خدا کے ظاہر کا منتقدانہ
عذاب بالکل ایسی ضد اور بغاوت سے ہے۔۔۔۔۔۔۔ یہ مذہب کی ضد فی الحقیقت جہالت اور ناشناسی کی ضد ہے
۔۔۔۔۔۔ علم اور نبوت کی ضد قطعاً نہیں۔ علم جہاں ہوتا ہے اتحاد و اشتراک پیدا کرتا ہے۔ امن و سلام اور سعی و
عمل پیدا کرتا ہے۔۔۔۔۔۔۔ اس کے ہوتے ہوئے جدال ناممکن ہے۔۔۔۔۔۔ دو مخالف فریق آج تک اس
بات پر نہیں لڑے کہ پانی سیال نہیں۔ آگ ٹھنڈی ہے۔ یا بوجھل چیز آسمان کی طرف جاتی ہے۔۔۔۔۔۔۔ اسی طرح اگر روئے
زمین کے تمام مذاہب علم کی کسوٹی پر پرکھے جائیں۔۔۔۔۔۔۔ تو آج ہی نسل انسانی متحد۔۔۔۔۔ ہو سکتی ہے۔

(تذکرۂ علامہ مشرقی۔ آغاز)

میں اس کتاب کو پڑھتا گیا۔ ان الفاظ کی تشریحات کے متعلق میری دلچسپی بڑھتی گئی۔ یہ بات میرے کانوں میں پہلی مرتبہ پڑی۔

"دنیا کے مختلف پیغمبر جہاں سے آئے تھے ایک ہی پیغام لائے تھے"

مجھے تو ملاؤں نے یہ سمجھایا تھا کہ پہلے انبیا کے پیغام نامکمل و ناقص تھے اور ان میں زبردست تضاد و تباین تھا۔ میں حیران تھا کہ ایک خدا
نے ایک نسل انسانی کی طرف سینکڑوں متضاد مذاہب کیوں بھیجے تھے۔ اور اقوام و ملل کو باہم الجھا کر سطح زمین پر فتنہ و فساد کی آگ کیوں بھڑکائی تھی
علامہ مشرقی نے مجھے پہلی مرتبہ بتایا کہ

"انبیاء نے انسان کو اس زمین پر رہنے کا ڈھنگ سکھایا۔۔۔۔۔۔ اجتماعی بقا کی راہ دکھائی۔ اقوام کے عروج کے اصول

بیان کئے۔ حکومتِ خدا کو تائمر سے قطعاً بری ثابت کر کے دنیاوی سزا کی تعیین کی۔ اُخروی سزو جزا کی تعیین کی۔ اُمتوں کو راہِ راست پہ چلا کر صدیوں تک دوام و تمکن دے گئے۔ نافرمانوں کو ان آنکھوں سے سزا ملتی دکھا گئے۔ یہی ان کا لایا ہوا دین تھا۔۔۔۔۔
انبیا کو اس معرفت کے محکم تر بنانے کا علم اُن کی بے مثال بصیرت کے باعث ملا۔۔۔۔۔ کمال غور و انہماک سے ملا۔ وسیع نظری و بلند بینی سے ملا۔ تعقّل کے بام بلند اور تدبّر کے اُفق اعلیٰ پر چڑھ کر ملا۔ زمین سے کئی منزلیں بلند ہو کر بلکہ ستاروں کی رصدگاہوں پہ پہنچ کر ملا۔ نہیں نہیں۔ آسمان سے اور آسمان پہ بسنے والے خدا سے ملا۔ وحی اور نبوت سے۔ عجز اور عشق سے۔ تذلل اور تکلم سے ملا۔۔۔۔۔۔۔ ہر زمانے میں ان انبیا کی بدولت اصل دین کی تجدید و تکمیل ہوتی رہی۔ کوئی مخالف راہِ عمل کوئی نیا دین یا جدا مذہب دنیا کے کسی نبی نے ختماً قائم نہیں کیا" (تذکرہ صفحہ ۔۔۔)
زورِ بیان کے علاوہ بات کہنے کا طریقہ اس قدر دلنشیں، مرتب اور مدلل تھا۔ کہ بات دل میں اُترتی گئی۔ دورِ الحاد میں انبیا کے متعلق میری یہ رائے تھی کہ یہ سب لیڈری کے جذبے کے اور دنیوی وجاہت کے شوقین تھے۔ یہ اپنے جلوس نکلوا کر نعرے لگوانا اور پیری مریدی کی دکان چمکا کر دنیا کو لوٹنا چاہتے تھے۔ علامہ نے میرے ان وساوس پہ یوں آگ برسائی۔

" یہ سوال کہ کیا سب رہنمایانِ خلق اور احبّائے الناس جو اپنی مدت العمر سعی و عمل کے بعد خلق خدا کو ایک راہ پہ لگا گئے تھے جو اپنی دُھن کے اس قدر پکے تھے کہ گردنیں کٹوا گئے۔ مگر اپنی بات کو نہ چھوڑا۔ کیا یہ سب معاذاللہ جھوٹے اور دغاباز تھے۔ کیا اُن کا تانا بانا سب مکر و فریب کا جال تھا۔۔۔۔۔۔ کیا ان سب کو نفس نے اس قدر دھوکہ دے رکھا تھا۔ کہ دھوکے میں جیتے رہے۔ دھوکے میں کٹتے رہے۔ دھوکے میں قوموں کو امن و امان کے فلک الافلاک تک پہنچا گئے۔ اور دھوکے میں مر گئے۔۔۔۔۔۔۔۔۔ کیا موسیٰ فی الحقیقت ایک بے علم، بدحواس، وحشی اور مختل الحواس مجنون تھا جو فرعون کی طاغوتی طاقت کے خلاف برسوں علانیہ برسرِپیکار رہا۔ جو اپنی بے سروسامانی کے باوجود اُس کو علی الاعلان ہلاکت کا اٹل پیغام سناتا رہا۔ جس نے ڈنکے کی چوٹ اُسکو اور اس کی قوم کو عذاب کی دھمکیاں دیں۔۔۔۔۔ کیا عیسیٰ علیہ السلام محض ایک مرنجاں مرنج۔ سادہ لوح۔ خالی الذہن۔ دنیا و مافیہا سے نابلد اور بھیڑوں کو چراتے مالا گڈریا تھا۔ جس پہ قیصر روم نے افترا باندھ کر اُسے واجب القتل قرار دیا تھا۔۔۔۔۔۔ جس کی سنجیدہ آنکھوں میں اُسے ہیبت و نخوت نظر آتا تھا۔۔۔۔۔۔۔ کیا بدھ علیہ الرحمۃ والسلام جیسا باکمال شخص جس کے پیروؤں کی تعداد آج دنیا کے سب نئے اور پرانے مذاہب کے ماننے والوں سے بڑھ کر ہے۔۔۔۔۔ فی الحقیقت ایک چلہ کش اور نفس کش۔ ایک خشک مغز اور بیرست آگیں زاہد ہی تھا جس نے تختِ سلطنت کو لات مار دی۔ اور باشندگانِ زمین کو راہِ راست پہ لانے کیلئے وہ اندوہناک مشقتیں جھیلیں کہ سطحِ زمین یکسر کپکپا اُٹھی اور قرنوں تک اس لرزش کا اثر چار دانگِ عالم میں باقی رہا۔۔۔۔۔
۔۔۔۔۔۔۔۔۔ کیا وہ سالار انبیا اور ختم المرسل محمد علیہ السلام والصلوٰۃ جس کے آسمان شگافِ علم و عمل کو دیکھ کر رحمتِ ایزدی کا موسلادھار مینہ روئے زمین پہ ابدالآباد تک برستا رہے گا۔ جس کے قانونِ بقا و فنا کی جبین پہ چکر و بر اور شمس و قمر سلام بھیجتے رہیں گے۔ جس کی قوتِ تغیر و انقلاب کا اندازہ کر کے ہر نظام کو کندن بننے کی دائمی آرزو رہے گی کیا وہ سرورِ عالم فی الحقیقت ایک کنج نشیں۔ کملی پوش۔ بے علم آمی۔ ناما ندداں زاہد۔ ایک نماز گزار متوکل اور فاقہ کش متقی ہی تھا۔ جس نے اقل قلیل مدت میں عرب کی بے نام اور مجود زدہ قوم سے علم و عمل کے وہ آتشیں فوارے اکنافِ عالم میں رواں کئے۔ کہ ۔۔۔ب ہمیشہ اُن کے کارناموں کو سن کر سر دُھنا کرے گی۔ کیا یہ سب کے لئے خلق اور

گیا تھا۔ تو آج نصاریٰ۔ ہنود اور پیروانِ بدھ دنیا کے بیشتر حصے پر کیوں حکمران ہیں۔ "تذکرہ" کا اصل موضوع یہی مسئلہ ہے۔ اور سارا تفاصیل علامہ اس سلسلے میں فرماتے ہیں۔ کہ الہامی صحائف کو زبانی زبانی ماننا اور عملاً کچھ نہ کرنا یا کچھ اور کرنا منافقت کی انتہا ہے۔ یہ دنیا دارالعمل ہے۔ یہاں عمل سے بیڑے پار ہوتے ہیں۔ اللہ کے خزانۂ عامرہ سے وہی اقوام انعام پا رہی ہیں۔ جو کام کر رہی ہیں یعنی تنظیم، محنت، جذبۂ سرفروشی، اتحاد و ضبط نفس کا ثمرات اور نکات پر سارا عالم گواہی دے رہا ہے۔

"جس اُمت میں وہی قرآن اوّل کا اسلام عملاً و معناً موجود ہوگا۔ جو قوم اُس قانونِ خدا کا اتباع اپنے تن بدن کو دُکھ میں ڈال کر کرے گی ...... وہی اُمم حقیقتاً طلب اور صبر آزما خدا سے کچھ لے کر رہے گی۔ وہی اُس کی صحیح معنوں میں محبوب و منظورِ نظر اُمم کی مستحق اور سایہ کو بلا سکے گی .... اگر خلیفۂ خدا اور مالک زمین بننا یعنی اسلام اور تمام قرآن ہے۔ تو یہ سب کچھ عمل اور صرف عمل سے ہو سکتا ہے۔ پیہم اور شب و روز کی تکلیف سے ہو سکتا ہے۔ آرام طلبی کے نئے ڈھنگ نکال کر اور قانونِ خدا میں آسانیاں وضع کر کے اس مقامِ جلیل کے برقرار رہنے کی اُمید رکھنا ہوشمند قوم کا کام نہیں۔ لفظ لا اور عقیدہ کلمہ اور قوموں پر اکتفا کر کے شرعی پاجامے اور باعزت پگڑیاں پہن لینا اور اس طرح اپنے آپ کو مسلمان بنائے رکھنا کاہل اور نابکار اُمت کا شیوہ ہے۔ اُس دانائے نے ان حاشکاروں کو دھوکا دینا ہے۔ خیر الماکرین کے ساتھ مکر کرنا ہے۔ ایک چھوٹے سے چھوٹا آدمی بھی اس زبانی جمع خرچ اور لفظی عبادت کی کچھ پروا نہیں کرتا۔ بلکہ کاہل نوکر کی زبانی آؤ بھگت کو دیکھ کر اُسے ملازمت سے برطرف کر دیتا ہے۔ پھر آفتاب شمس و قمر سے اس کام پر اُجرت یا نعمت کی اُمید رکھنا پوری جہالت ہے ...... پس میری دانست میں اگر ایک شخص اپنے لفظی اور زبانی عقیدے پر عامل نہیں۔ تو اُس کا عقیدہ خدا کی نظروں میں کوئی حقیقت نہیں رکھتا .... کہنا اور کچھ کرنا منافقت ہے۔ اصلی بدمعاشی اور ایمان کی ضد ہے ... قرآن کا گناہِ کبیرہ ہے ..... حقیقت کا منہ چڑانا ہے ...... برخلاف اس کے جو شخص عمل کر رہا ہے .... وہی اس کے حاکم اعلیٰ ہونے پر سچا ایمان رکھتا ہے۔ وہی اُس کو صحیح معنوں میں مان رہا ہے۔ وہی اس کو دل سے آقا تسلیم کرتا ہے وہی مسلم اور مومن ہے .... مسلمانوں کی کاہلی اور کم ہمتی۔ قوم نے آج عمل کی تکلیف دہ صورت کو خیرباد کہہ کر عقائد کی آرام دہ مکاری پر تکیہ کر لیا ہے۔ اور اس مکر کے اندر ایک نیا مکر یہ پیدا کر لیا ہے۔ کہ نہایت عقیدتمندی سے اس بات کے درپے رہتے ہیں کہ خدا کو خوش کرنے کے لئے عقائد کو درست کیا جائے۔ اعمال کے درست ہونے پر بحث قطعاً بند ہو چکی ہے۔ گویا ہم سے ملک اس لئے چھینے جا رہے ہیں کہ حاکم زمین و آسمان کو اس لاڈلی اُمت کے ملفوظات پسند نہیں ہیں ...... اسلام عمل اور صرف عمل ہے۔ جو عامل ہے۔ اُس کا عقیدہ بھی درست ہے۔ نہیں بلکہ اُسے زبانی عقیدے کی ضرورت ہی نہیں خالی قول و عقیدہ بہر نوع کچھ نہیں۔ آج کچھ نہیں، کل کچھ نہیں اور ابدالآباد تک کچھ نہیں"

(تذکرہ ص ۸۳-۸۶)

۵۲۷ صفحات (بڑی تقطیع)، پہلی سطر سے یہ کتاب از اول تا آخر اسی طوفانی انداز کے ساتھ چلتی ہے۔ قدم قدم پر حدیثیں۔ ترجمہ و تشریح کی ندرتیں، رسوم مناسک کی تنومند تفاصیل اور ضابطۂ عروج و زوال کی ایمان افروز تفاسیر۔ کتاب کو پڑھ کر

ع۔ غل پڑا دنیا میں اک کافر مسلماں ہو گیا

اس زمانے میں، میں اور میرے بڑے بھائی غلام ربانی عزیز (آج کل پروفیسر گورنمنٹ کالج ملتان) گورنمنٹ ہائی سکول کبیروالہ میں مدرس تھے۔ وہ بھی "تذکرہ" پڑھنے سے پہلے ملحد سے تھے۔ وہ بھی میری طرح اس کتاب سے متاثر ہوئے۔

اور علامہ مشرقی کو جو اُس وقت گورنمنٹ ہائی سکول پشاور میں پرنسپل تھے۔ خط لکھا کہ میں اور میرے بہت سے احباب آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ اگر ہم ڈیڑھ سو آدمی آپ کے ہاں آئے۔ تو آپ کو بڑی تکلیف ہوگی۔ اس لئے آپ ہی یہاں آنے کی تکلیف گوارا فرمائیں۔ علامہ نے جواب میں سخت قسم کا انکار کیا۔ لیکن ہم مسلسل لکھتے رہے۔ اور مختلف ترغیبات سے کام لیتے رہے۔ آخر علامہ نے سپر ڈال دی۔ اور ہمیں اطلاع دی۔ کہ میں ۱۵ رمضان المبارک (غالباً ستمبر ۱۹۲۹ء) کو آپ کے ہاں بچوں سمیت مردان آرہا ہوں۔ دو تین گھنٹے ٹھہروں گا۔ ہم نے اُن کی بیگم صاحبہ کو ایک ایڈووکیٹ قاضی محمد شفیع مرحوم کے ہاں ٹھہرانے کا بندوبست کیا۔ سڑک پر تین میل تک سکاؤٹ کھڑے کر دئے تھے۔ اُن کے پاس بگل تھے۔ مقصد یہ کہ جب انکی کار نمودار ہو۔ تو بگل بجائیں۔ تاکہ ہمیں اطلاع ہو جائے۔ ساڑھے گیارہ بجے کے قریب اُن کی کار قاضی صاحب کے مکان کے سامنے رکی۔ اندر سے ایک طویل قامت۔ خوش پوش۔ گندمی رنگ۔ ڈاڑھی صاف اور گھنی مونچھوں والا انسان نمودار ہوا۔ سفید ریشمی پتلون۔ اوپر سفید ریشمی اچکن۔ سر پہ ترکی ٹوپی۔ "مجھے مشرقی کہتے ہیں۔ اور یہ ہے اکرام ابن المشرقی" اکرام کی عمر مشکل آٹھ نو برس کی ہوگی۔ علامہ صاحب بیٹھک میں تشریف فرما ہوئے۔ خیر و عافیت۔۔۔ کی رسمی گفتگو کے بعد علمی مسائل زیر بحث آگئے۔ آپ نے جنت و دوزخ پہ بھی روشنی ڈالی۔ اور فرمایا۔ کہ جنت و جہنم دنیا میں بھی موجود ہیں سکون قلب ایک جنت ہے جو صرف قرآنی کردار سے حاصل ہو سکتا ہے۔ سلطنت بھی جنت ہے۔ علم بھی جنت ہے۔ قابل اور سعادتمند اولاد بھی جنت ہے حسین اور شریف رفیقۂ حیات بھی جنت ہے۔ اسی طرح تکالیف۔ امراض۔ پریشانیاں۔ افلاس جہالت۔ غلاظت۔ بدکرداری سب جہنم ہیں۔ انسانی جنتوں اور جہنموں میں محصور ہے۔ قرآن ایک ایسی زندگی کی تعلیم دیتا ہے۔ جس سے آپ کی زندگی میں بے شمار جنتیں جمع ہو جائیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے جہاں دنیوی آسائشوں کا ذکر کیا ہے۔ وہاں جنّات (جنت کی جمع) کا لفظ استعمال کیا ہے۔ اور چونکہ اُخروی جنت صرف ایک ہے۔ اس لئے اُسے ہر جگہ "جنّت" کہا (جنّات نہیں کہا)۔ آپ نے اُخروی جنت کے متعلق فرمایا۔ کہ وہاں داخل ہو کر ہر جنتی کو ایک نہ بردست مسرت حاصل ہوگی اللہ تعالےٰ اس مسرت کو رنگ دوام عطا کر دیں گے۔ دنیا کی تمام مسرتیں عارضی ہیں۔ ایک شخص کو ڈربی کا ایک لاکھ روپیہ انعام ملتا ہے۔ اُسکی مُسرّت چار پانچ دن کے بعد مدھم پڑ جاتی ہے۔ لیکن جنّت کی خوشیاں اور مستیاں لازوال ہوں گی۔ اگر دنیا میں جنسی لذت کے بعض لمحات کو لازوال کر دیا جائے تو وہیں جنت بن سکتی ہے۔

گفتگو جاری[1] تھی۔ کہ ظہر کی اذان ہو گئی۔ بیٹھک ہی میں صفیں آراستہ ہو گئیں۔ ہم سب مسرور تھے۔ کہ آج ایک عظیم مفکر و مفسّر کی قیادت میں نماز ادا کریں گے۔ لیکن علامہ نے یہاں بھی جدّت کو نہ چھوڑا۔ اور اپنے نابالغ بچے اکرام کو فرائض امامت سرانجام دینے کے لئے آگے کر دیا۔ بچے کی خود اعتمادی دیکھئے۔ کہ بے دھڑک آگے بڑھا۔ اور پوری صحت سے نماز پڑھائی۔ بعد نماز علامہ مشرقی نے اجازت چاہی اور واپس چلے گئے۔

۱۹۳۰ء میں اسلامیہ کالج لاہور میں مجھے عربی ایم۔ اے کے لئے جانا پڑا۔ اس سال دسمبر کے آخری ہفتے میں مجھے علامہ مشرقی کا ایک خط پشاور سے ملا۔ کہ میں مذاہب کی عالمی کانفرنس میں شامل ہونے کے لئے ہالینڈ جا رہا ہوں۔ فلاں تاریخ (غالباً ۳۱، دسمبر ۱۹۳۰ء) کو شام کے چار بجے مجھے میکلوڈ روڈ پر خواجہ فیروزالدین بار ایٹ لا کے مکان پر ملو۔ میں چند ہم جماعتوں کے ساتھ وہاں گیا۔ یہ صحبت رات کے ۱۰ بجے تک جاری رہی۔ ہم نے کھانا بھی وہیں کھایا[2] اس دوران میں مختلف مسائل زیر بحث آئے۔ میرے حافظے میں صرف چار محفوظ ہیں۔

(۱) اس مرتبہ علامہ نے ڈاڑھی بڑھا رکھی تھی۔ میں نے اس "مُلّا پن" کی وجہ پوچھی۔ تو کہنے لگے۔ اس کی وجہ ایک فوری جذبہ ہوا ہے۔ بات یوں ہوئی کہ جسٹس سر سلیمان مجھے ملنے کے لئے آئے۔ تو آتے ہی بہ رنگ معذرت کہنے لگے۔۔

---

[1] درمیان میں کھانے کا کوئی وقفہ نہ تھا۔ اس لئے کہ سب مہمان (اکرام بھی) روزہ دار تھے۔ (برق)

[2] یہ سطر لکھ رہا تھا کہ کسی نے "زمیندار" میرے ہاتھ میں تھما دیا جس میں خواجہ صاحب کی وفات حسرت آیات کی خبر درج تھی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون (برق)

"معاف فرمائیے گا۔ میں آج شیو (SHAVE) نہیں بنا سکا:"
میرے منہ سے بے ساختہ نکلا "کیا ڈاڑھی اتنی بُری چیز ہے۔ کہ ایک دن بھی منہ پر رہ جائے۔ تو دوسروں سے معافی مانگنا پڑتی ہے! اگر گاندھی بکنگھم پیلس میں ننگے پیروں اور ننگے جسم کے ساتھ جا سکتا ہے۔ تو ایک مسلمان یقیناً ڈاڑھی کے ساتھ دوسروں سے مل سکتا ہے۔ میں اب سے ڈاڑھی رکھوں گا"

بات سن کر لطف ہی آگیا۔

۲۔ فرمایا:۔
"اس سال جب گرمیوں میں حسبِ معمول حکومت پنجاب و ہند کے دفاتر شملے میں منتقل ہوئے۔ تو صوبائی و مرکزی دفاتر کے مسلمان آئی سی۔ ایس افسروں نے ایک ادبی جماعت بنائی۔ اور مجھ سے التماس کی، کہ آپ "تذکرہ" کی باقی نو جلدیں جلد از جلد شائع فرمائیں۔ اور ساتھ ہی پانچ ہزار جلدیں خریدنے کا نہ صرف وعدہ کیا۔ بلکہ بیس ہزار روپے پیشگی ادا کرنے کی پیش کش بھی کی"

"تو پھر آپ نے کیا جواب دیا" میں نے پوچھا

فرمایا "میں نے انہیں لکھا ہے۔ کہ کیا آپ لوگ "تذکرہ" کی پہلی جلد پر عمل کر چکے ہیں"

علامہ کے اس ٹیڑھے جواب پر غصہ بھی آیا۔ اور مایوسی بھی ہوئی کہ اگر علامہ صاحب قوم کے عمل کا انتظار کرتے رہے۔ تو پھر ان کا وہ دعا جو "تذکرہ" کے صفحۂ عنوان پر بایں الفاظ درج ہے۔

"قرآن حکیم کے صحیح مقاصد اور اس کے منجانب اللہ ہونے پر دس جلدوں میں ایک مکمل اور مبسوط علمی تبصرہ"

کبھی شرمندۂ وفا نہیں ہوگا۔ تذکرہ کی پہلی جلد ۱۹۲۲ء میں نکلی تھی۔ آج پورے تیس برس گزر چکے ہیں۔ علامہ نے چھ جلدوں کے مسودے تیار بھی کئے۔ ان میں سے جلد دوم کا ایک مضمون "گاندھی اور چرخہ" (غالباً یہی عنوان تھا) میں نے بھی پڑھا۔ لیکن کوئی جلد قوم کے مشتاق ہاتھوں تک تا ہنوز نہیں پہنچ سکی۔

۳۔ فرمانے لگے

"ابوالکلام آزاد کی تفسیر جلد میدان میں آرہی ہے۔ سنا ہے کہ آزاد نے نظریۂ عمل "تذکرہ" سے چرالیا ہے۔ اور علمی بد دیانتی کی حد یہ کہ اعتراف تک نہیں کیا:"

جب چند روز بعد تفسیر آزاد کی پہلی جلد مجھے ملی۔ اور "مالک یوم الدین" کے تحت علامہ کے مشہور نظریۂ عمل کی تفاصیل پڑھیں۔ تو مسرت بھی ہوئی۔ کہ امام الہند مُلّا کے اسلام سے نِچ نکلے ہیں۔ اور افسوس بھی۔ کہ "تذکرہ" کا احسان مان لیتے تو ان کا کیا بگڑ جاتا۔ بہرحال میری مسرت بہت زیادہ تھی اور افسوس محض رسمی سا۔

۴۔ اللہ کے قول (الہامی صحائف) و عمل (کائنات) کا ذکر چل پڑا۔ تو ایک دلچسپ کہانی سنائی۔ جس کا تعلق انگلستان سے تھا۔
"سنہ ۱۹۴۱ء کا ذکر ہے۔ کہ اتوار کا دن تھا۔ اور زور کی بارش ہو رہی تھی۔ میں کسی کام کے لئے باہر نکلا۔ تو جامعۂ کیمبرج کے مشہور ماہرِ فلکیات سر جیمز جینس (SIR JAMES JEANS) پر نظر پڑی۔ جو بغل میں انجیل دبائے چرچ کی طرف جا رہے تھے۔ میں نے قریب ہو کر سلام کیا۔ انہوں نے کوئی جواب نہ دیا۔ دوبارہ سلام کیا۔ تو وہ متوجہ ہوئے۔ اور کہنے لگے "تم کیا چاہتے ہو" میں نے کہا۔ دو باتیں۔ اوّل یہ کہ زور سے بارش ہو رہی ہے۔ اور آپ نے چھاتا بغل میں داب رکھا ہے۔ اگر کوئی مصلحت مانع نہ ہو۔ تو چھاتا ان لیجئے۔ سر جیمز اپنی بد حواسی پر مسکرائے اور چھاتا تان لیا۔

دوم یہ کہ آپ جیسا شہرۂ آفاق نماز پڑھنے جا رہا ہے۔ یہ کیا؟ بات یہ ہے کہ اُس زمانے میں سائنس کے انکشافات اور نو بنو حقائق نے مذہب کو تعلیمی حلقوں سے باہر نکال دیا تھا اور تعلیم یافتہ طبقہ مذہب کے نام تک سے بیزار ہو چکا تھا۔ میرے اس سوال پر پروفیسر جیمز لمحہ بھر کے لئے رک گئے۔ اور میری طرف متوجہ ہوکر فرمانے لگے "آج شام کو چائے میرے ساتھ پیئو" میں شام کے وقت ان کی رہائش گاہ پہنچا ٹھیک چار بجے لیڈی جیمز باہر آکر کہنے لگیں "سر جیمز تمہارے منتظر ہیں" اندر گیا۔ تو ایک چھوٹی سی میز پر چائے لگی ہوئی تھی۔ لیڈی جیمز نے چائے بنا کر ایک پیالی مجھے اور ایک پروفیسر صاحب کو دی۔ پروفیسر صاحب تصورات میں کھوئے ہوئے تھے۔ کہنے لگے "تمہارا سوال کیا تھا؟" اور میرے جواب کا انتظار کئے بغیر اجرام آسمانی کی تخلیق۔ اُن کے حیرت انگیز نظام۔ لرزہ فگن پنہائیوں اور فاصلوں۔ انکی پیچیدہ راہوں اور مداروں نیز باہمی کشش اور طوفانہائے نور پر وہ ایمان افروز تفاصیل پیش کیں کہ میرا دل اللہ کی اس داستان کبریا و جبروت سے دہلنے لگا۔ اور ان کی اپنی کیفیت تھی۔ کہ سر کے بال سیدھے اٹھے ہوئے تھے۔ آنکھوں سے حیرت و خشیہ کی دوگونہ کیفیتیں عیاں تھیں۔ اللہ کی حکمت و دانش کی ہیبت سے اُن کے ہاتھ قدرے کانپ رہے تھے اور آواز لرز رہی تھی۔ فرمانے لگے "عنایت اللہ خان! جب میں اللہ کے تخلیقی کارناموں پر ایک جھلتی سی نظر ڈالتا ہوں۔ تو میری تمام ہستی اللہ کے تصور و جلال سے لرزنے لگتی ہے۔ اور جب کلیسا میں اللہ کے سامنے سرنگوں ہو کر کہتا ہوں۔

"تو بہت عظیم ہے" "تو بہت بڑا ہے"

تو میری ہستی کا ہر ہر ذرہ میرا ہم نوا بن جاتا ہے۔ مجھے بے حد سکون و سرور نصیب ہوتا ہے اور ان سجدوں کے بعد میں کچھ ہلکا سا محسوس کرنے لگتا ہوں۔ عام لوگوں کی صرف زبان نماز پڑھتی ہے۔ اور میری ہستی کا ہر ہر ذرہ محوِ تسبیح و تحمید ہو جاتا ہے۔ مجھے دوسروں کی نسبت ہزار گنا زیادہ کیف نماز میں ملتا ہے۔ کہو! عنایت اللہ خان! تمہاری سمجھ میں آیا۔ کہ میں گرجے میں کیوں جاتا ہوں؟

پروفیسر جیمز کی ان تفصیلات نے عجیب کہرام سا میرے دماغ میں پیدا کر دیا۔ میری نگاہِ تصور قرآن کریم کے طول و عرض کا جائزہ لینے لگی اور ایک دلچسپ آیت سامنے آگئی۔ میں نے کہا

"جناب والا! میں آپ کی رُوح افروز تفاصیل سے بے حد متاثر ہوا ہوں۔ اس سلسلے میں قرآن کی ایک آیت یاد آگئی ہے۔ اگر اجازت ہو تو پیش کروں" فرمایا "ضرور پیش کرو"۔ وُہ آیت یہ تھی۔ "ومن الجبال جدد بیض وحمر مختلف الوانها وغرابیب سود ومن الناس والدواب والانعام مختلف الوانه كذلك انما يخشى الله من عباده العلماء۔

(قرآن)

(وہ دیکھو پہاڑوں میں سفید، سُرخ اور سیاہ رنگ کی تہیں موجود ہیں۔ اسی طرح انسانوں۔ حیوانوں اور دیگر جانداروں کے مختلف رنگ ہماری حکمت کا تقاضا ہیں۔ اور مت بھولو کہ اللہ سے صرف اہل علم ہی ڈرتے ہیں)

"کیا کہا۔ اللہ سے صرف اہل علم ہی ڈرتے ہیں۔ حیرت انگیز۔ بہت عجیب۔ یہ بات جو مجھے پچاس برس کے مسلسل مطالعہ و مشاہدہ کے بعد معلوم ہوئی۔ محمدؐ کو کس نے بتائی تھی؟ کیا قرآن میں واقعی یہ آیت موجود ہے؟ اگر ہے۔ تو میری شہادت لکھ لو کہ قرآن ایک الہامی کتاب ہے۔ محمدؐ ان پڑھ تھا۔ اُسے یہ عظیم حقیقت خود بخود کبھی معلوم نہیں ہو سکتی تھی۔ اُسے یقیناً اللہ نے بتائی تھی۔ بہت خوب۔ بہت عجیب...." اور سر جیمز کئی منٹ تک اس آیت پر سر دھنتے رہے۔ اور محمد عربی علیہ السلام کی خدمت اقدس میں خراج عقیدت پیش کرتے رہے۔ اسی صحبت میں مجھے یہ خیال پیدا ہوا۔ کہ آج قرآن کو سائنس کی نگاہ سے دیکھنے کی ضرورت ہے۔ اور اسی خیال نے مجھ سے "تذکرہ" لکھوایا:

ذرا سلسلۂ اسباب پر غور فرمائیے۔ مشرقی کا لندن میں جانا۔ سر جیمز سے اتفاقاً ملاقات۔ وہ شام کی چائے۔ وہاں وہ معجزات تخلیق و تکوین پر حیرت انگیز بحث۔ وہ مشرقی کے قلب و دماغ کا تلاطم۔ اور وہ "تذکرہ" کا تخیل۔ یہاں شاید یہ ذکر کر دینا بے جا نہ ہوگا کہ میں نے "ایک اسلام" "تذکرہ"

سکے نزدیک اشاعت بھی ہے۔ اور "دو قرآن" کا تخیل بھی اسی کتاب کی بعض تفاصیل سے لیا تھا۔

اسی صحبت میں علامہ نے ملازمت ترک کرنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ میں نے وجہ پوچھی۔ تو کہا۔ "والدۂ اکرام بار بار طعنے دیتی ہے۔ کہ "تذکرہ" کا مصنف اور انگریز کی دہری غلامی کا طوق گلے میں! یہ بات کچھ سمجھ نہیں۔ چنانچہ آپ نے کچھ عرصہ بعد ملازمت ترک کر دی۔ اور جس کی ترغیب پہ ملازمت چھوڑی تھی۔ وہ علامہ صاحب کو چھوڑ گئیں۔

تیسری ملاقات

۱۹۳۲ء میں خاکسار تحریک پورے جوبن پہ تھی۔ ہندوستان کے طول و عرض میں اندازاً چار لاکھ مسلح رضاکار ہر طرف "چپ راست" کرتے نظر آتے تھے۔ میں ان دنوں گورنمنٹ کالج ہوشیار پور میں معلم تھا۔ کسی کام کو لاہور آیا۔ تو علامہ سے ملنے کی اُمنگ اُٹھی۔ تانگے پہ بیٹھ کر "اچھرہ" جا پہنچا۔ مجھے ایک خاکسار دفتر کی بالائی منزل میں لے گیا۔ یہ تھا علامہ کا خاص کمرہ۔ جس میں نہ کوئی کرسی تھی نہ میز۔ نہ قلم نہ کاغذ۔ فرش پہ ایک پھٹی پرانی چٹائی بچھی ہوئی تھی۔ ایک مقام پہ دو مربع فٹ میں چٹائی اڑی ہوئی تھی۔ اور فرش میں یوں گڑھا پڑ گیا تھا۔ جیسے پانی کا گھڑا برسوں ایک ہی جگہ پڑا رہے۔ اور اس کے نیچے گڑھا بن جائے۔ دس بارہ منٹ کے انتظار کے بعد زینے پر سے قدموں کی چاپ سنائی دینے لگی۔ اور چند لمحات کے بعد علامہ مشرقی بایں ہیئت نمودار ہوئے۔ کہ سر کے بال بے طرح بکھرے ہوئے اور گریبان کے بٹن کھلے تھے۔ نسواری کھدر کا کرتہ بدن پہ۔ اور ویسا ہی ڈھیلا سا پاجامہ کمر میں۔ پاؤں میں ٹوٹی ہوئی چپل۔ میں تعظیماً اُٹھا۔ آپ نے خشونت سے لبریز نگاہ میرے قیمتی سوٹ۔ ہیٹ اور رنگین ٹائی پہ ڈالی۔ بے دلی سے ایک ہاتھ آگے بڑھایا۔ مصافحہ کے بعد اس گڑھے والے مقام پہ جا بیٹھے۔ اور ڈاک پڑھنے لگے۔ کافی دیر کے بعد میری طرف متوجہ ہوئے اور پوچھنے لگے۔ "آپ کون ہیں اور کہاں سے آئے ہیں"؟ میں نے دیرینہ تعلقات جتلاتے ہوئے کیمبلپور میں آپ کی آمد کا ذکر کیا۔ تو جھٹ کہنے لگے۔ "وہ ریشمی سوٹ پہن کر بیس ہزار کی موٹر میں مزے اُڑانے والا مشرقی فوت ہو چکا ہے۔ آپ کے تعلقات اسی مشرقی سے ہوں گے۔ یہ مشرقی آپ کو بالکل نہیں پہچانتا۔" اور پھر ڈاک پڑھنے میں کھو گئے۔ علامہ کی یہ طنز میرے لئے ایک الٹی میٹم تھی کہ یا تو ملازمت چھوڑ کر خاکسار تحریک میں شامل ہو جاؤ۔ اور یا مجھ سے تعلقات منقطع کر لو۔ لیکن میں اتنی بڑی قربانی کے لئے تیار نہ تھا۔ چند لمحات کے بعد میں نے اجازت طلب کی۔ اور یہ تھی علامہ سے میری آخری ملاقات۔ اس کے بعد نہ ملاقات کا موقعہ ملا اور نہ سلسلۂ مکاتبت جاری رہ سکا۔

حالاتِ زندگی

عنایت اللہ خان ۲۵ اگست ۱۸۸۸ء کو امرتسر میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد عطا محمد خان ایک با اثر رئیس اور صاحبِ علم بزرگ تھے۔ ایف۔ اے تک امرتسر میں تعلیم حاصل کی۔ اور پھر فارمن کرسچین کالج لاہور سے ۱۹۰۶ء میں بی۔ اے (حساب) کی ڈگری لی۔ ۱۹۰۷ء میں ایم۔ اے (ریاضی) درجۂ اوّل میں پاس کیا۔ اور یونیورسٹی کا پچھلا ریکارڈ توڑ دیا۔ پھر کیمبرج یونیورسٹی کے کرائسٹ کالج میں چلے گئے۔ جہاں ۱۹۰۹ء میں آپ ریاضی کے امتحان میں اوّل رہے اور فاؤنڈیشن سکالر کا خطاب حاصل کیا۔ ۱۹۱۰ء میں ریاضی کا ٹرائی پوس اس امتیاز سے پاس کیا کہ "سینئر رینگلر" کا خطاب پایا۔ ۱۹۱۱ء میں "ٹرائی پوس" کے دو اور امتحانات (عربی و فارسی) میں شامل ہو کر درجۂ اوّل حاصل کیا۔ ہر ٹرائی پوس" کی میعاد تین برس ہوتی ہے۔ لیکن آپ نے صرف چار برس میں تین "ٹرائی پوس" میں امتیازی کامیابی حاصل کی جس پر لنڈن کے اخبارات نے آپ کو خراجِ تحسین پیش کیا۔ ۱۹۱۲ء میں آپ انجینئرنگ کے سب سے بڑے امتحان یعنی مکینیکل سائنس ٹرائی پوس میں شامل ہو گئے۔ اور نہایت شان سے کامیاب ہوئے۔ اس پر آپ کو دنیا کے مختلف حصوں سے پیغاماتِ تہنیت موصول ہوئے۔ اور اخبارات نے جلی سرخیوں سے آپ پر شذرات لکھے۔

انگلستان سے واپس آئے۔ تو مندرجہ ذیل اسامیوں پر فائز رہے۔

۱۹۱۳ سے ۱۹۱۶ تک اسلامیہ کالج پشاور کے وائس پرنسپل

۱۹۱۶ء سے ۱۹۱۷ تک " " " پرنسپل

۱۹۱۰ سے ۱۹۱۹ تک انڈر سیکریٹری تعلیمات حکومت ہند۔
۱۹۲۰ " ۱۹۳۱ " سرحد میں پرنسپل ٹریننگ کالج۔ انسپکٹر مدارس۔ رجسٹرار اور پرنسپل گورنمنٹ ہائی سکول پشاور
آپ کو ۱۹۲۰ء میں آئی ای ایس بنا دیا گیا تھا۔ جب آپ ۱۹۳۱ء میں مستعفی ہوئے تو اس وقت آپ کی تنخواہ دو ہزار کے قریب تھی۔
۱۹۳۱ء میں آپ نے خاکسار تحریک کا آغاز کیا۔ جسے ۱۹۴۰ء میں حکومت برطانیہ نے کچل دیا۔ گو یہ تحریک ۱۹۴۰ء کے بعد بھی زندہ رہی
لیکن موت مسلسل اس کے تعاقب میں رہی۔ یہاں تک کہ ختم ہو گئی۔

تصانیف

علامہ کی تصانیف یہ ہیں :۔

۱۔ تذکرہ۔ جس کے متعلق ایک پروفیسر نے علامہ کو لکھا تھا۔

"سماوی کتابوں میں سب سے بڑی کتاب قرآن ہے اور ارضی کتابوں میں "تذکرہ"۔

جہاں تک اقوام کے فلسفۂ عروج و زوال کا تعلق ہے حقیقتاً تذکرہ زمین کی سب سے بڑی کتاب ہے۔ تعمیر اقوام پر آج تک دو ہی اہم کتابیں تصنیف ہوئی ہیں۔ تذکرہ۔ اور سطلر کی مائن کیمف۔ مرخرالذکر۔ تذکرہ کے بعد دوسرے درجے پہ آتی ہے۔

۲۔ خریطہ۔ جس کا موضوع یہ ہے۔ کہ شاعر دور زوال کی پیداوار ہے۔ جب کوئی قوم ترقی کے انتہائی نقاط پہ پہنچ جاتی ہے تو شاعر مفقود ہو جاتا ہے۔ اور جب زوال شروع ہوتا ہے۔ تو شاعر آ جاتا ہے۔ اس نظریہ پہ ہر قوم کی تاریخ سے یقین انگیز شہادت پیش کی ہے۔ کتاب بہت دلچسپ اور فکر انگیز ہے۔

۳۔ اشارات :۔ جس میں خاکسار تحریک کا پروگرام اور کچھ ہدایات درج ہیں۔

۴۔ قول فیصل۔ "تذکرہ کے رنگ میں لکھی ہوئی ایک ہیجان کتاب۔ جس کا موضوع "حرکت و عمل" ہے اور اقتباس ملاحظہ ہوں۔

"ہمارا مذہب۔ ہمارا دین۔ ہمارا اسلام۔ ہمارا ایمان سپاہی بننا ہے۔ دنیا کو زیر نگیں کرنا ہے۔ بنیان مرصوص کی طرح مضبوط رہنا ہے۔ خالدؓ۔ طارقؒ۔ عمرؓ۔ مسلمؒ۔ نہیں۔ نہیں بلکہ سرور کائنات اور ختم رسل کے عمل کی پیروی کرنا ہے۔ اگر یہ نہ کریں۔ تو ہم مسلمان نہیں رہ سکتے ...... تم انگریز ابھی کل بادشاہ بنے ہو۔ اور ہم ماں کے پیٹ سے بادشاہ بن کر نکلے تھے۔ بادشاہت ہمارا مذہب ہے۔ اور تم نے مذہب میں مداخلت نہ کرنے کا عہد کیا ہوا ہے۔ اس لئے ہم اپنے مذہب پہ چل رہے ہیں ...... تم اگر اس مذہب کو پسند نہیں کرتے۔ تو پہلے قرآن۔ حدیث اور مسلمانوں کی تیرہ سو سالہ تاریخ کو دنیا سے مٹا دو۔ ہم خود بخود اپنا مذہب چھوڑ دیں گے۔ مسجد کے ملاؤں۔ قل اعوذیوں۔ مکار پیشواؤں اور خود غرض رہنماؤں کا پیش کیا ہوا اسلام ہم نہیں مانتے ...... کہ یہ مصلحت بینی اور بزدلی کا اسلام ہے۔ فریب و مکر کا اسلام ہے۔ ہمارا مذہب وہ ہے جو ایک ایک دن میں نو نو شہر فتح کیا کرتا تھا۔ جس پہ خدا کا آخری رسول تئیس برس تک خود چل کر دکھا گیا .... ہاں وہ مذہب ہے۔ جس کے ایک چھوٹے سے حصے پہ چل کر تم انگریز دنیا کے بادشاہ بنے بیٹھے ہو۔ مسجد میں بیٹھے ہوئے غریب مولوی اور باسی ٹکڑے کھانے والے بیچارے "ملا کو کیا خبر کہ اسلام کیا ہے"۔

ــــــــــــــــــــــــــــــ

لے پوشیدہ ہیں بیچارے ممولوں کی نظر سے
شہباز فلک سیر کے احوال و مقامات (اقبالؒ)

"یہ عجیب منافقت ہے۔ کہ تم کہتے ہو۔ رسول خدا صلعم نے مسواک کی۔ اس لئے اے مسلمانو! مسواک کیا کرو۔ سرور کائنات تہمد پہنا کرتے تھے۔ اس لئے تہمد پہنو۔ ختم رسول ڈھیلے سے استنجا کیا کرتے تھے۔ اس لئے پانی ہوتے ہوئے بھی ڈھیلے سے استنجا کرو ...... یہ عجیب منافقت ہے کہ تم رسول خدا کے ہر چھوٹے سے چھوٹے عمل کو دین و ایمان کا جزو سمجھتے ہو۔ لیکن ...... ان کی چوبیس گھنٹے کی سپاہیانہ زندگی۔ ان کے ہر وقت تلوار اور تیر و کمان سے مسلح رہنے ...... ان کے پے در پے غزوات اُن کے خندقیں کھودنے ...... اور ہر وقت کے عمل اور مستعدی کو شیر مادر کی طرح بے ڈکار ہضم کر جاتے ہو ... اور تمہاری شیطانی لغات میں رسول کے ان اعمال کا نشان تک موجود نہیں ...... رسول خدا سے تمہاری جھوٹی محبت کا ثبوت اس سے بڑھ کر کیا ہو سکتا ہے۔ کہ جب کوئی شخص تمہیں پھر اُسی سپاہیانہ زندگی۔ اُسی محبت و مواخات۔ اُسی حرکت و عمل اور اُسی فاتحانہ اور غالبانہ انداز زندگی کی طرف بلاتا ہے .... تو تمہارے آرام پرست جسم اور غفلت زدہ نفس پکار اُٹھتے ہیں۔ کہ ایلو! یہ شخص نبی بننا چاہتا ہے۔ تمہارے ارادے صاف ہیں کہ تم عمل سے بھاگنا چاہتے ہو۔ اس غریب کو بدنام کر کے اپنا امام مانتے ہو۔ اپنی چند روزہ کی دکان کی حفاظت چاہتے ہو۔ اور رسول خدا کے مشکل کاموں سے منہ موڑتے ہو ..... کیا مُلّا سے تمہاری صلح صرف اس لئے نہیں۔ کہ وہ بیچارا تمہارے گھر کا نمک کھا کر ..... ایک مسواک۔ ایک تہمد۔ ایک ڈھیلے اور داڑھی کے بدلے تم کو جنت کا اقرار نامہ دیتا ہے۔ تم سے ڈر کر قرآن کی آیات چھپاتا ہے ..... تمہاری روٹیاں کھا کر نوکروں اور غلاموں کی طرح تمہارے حکم کا بندہ بنا ہوا ہے۔ وقت بے وقت جیسی نماز چاہو پڑھا دیتا ہے۔ مالک مسجد کو کام پڑ جائے تو ظہر کو عصر کر دیتا ہے۔ طلاق چاہو تو طلاق کا فتویٰ لے دیتا ہے۔ رجوع چاہو۔ تو رجوع کرا دیتا ہے۔ نکاح پہ نکاح چاہو۔ تو باندھ دیتا ہے۔ اور جہاد و قتال کو ممنوع قرار دیتا ہے ... وہ تمہارے مطلب کا آدمی ہے۔ تمہیں اسلام کا کوئی تکلیف دہ حکم نہیں سناتا۔ تمہاری غفلتوں کی تاویلیں کرتا اور گناہوں کے حیلے ڈھونڈتا ہے ...... یہ ہے تمہارا مولانا۔ مولوی۔ لیڈر۔ مرشد۔ دین کا عالم اور سند لیکن جو شخص سرور کائنات کے چوبیس گھنٹے کے عمل کی طرف تمہیں بلائے .... وہ دجال۔ کافر اور مدعی نبوت۔"

یا المعجب

(ص۔۔)

۵۔ مولوی کا غلط مذہب۔ غالباً سولہ رسائل پر مشتمل ہے۔ اس میں مولوی کے آسمان اسلام پر بُری طرح آتشباری کی ہے۔

لغزشیں

میرے مضمون کا تعلق علامہ کی ادبی و ثقافتی زندگی سے ہے۔ سیاسی زندگی سے نہیں۔ لیکن یہ مقالہ ان کی سیاسی زندگی کو چھیڑے بغیر نامکمل رہتا۔ اس لئے اس پہلو پر بھی کچھ کہنا پڑا۔

عام دستور یہی ہے۔ کہ جب کوئی مہم کامیاب ہو جائے۔ تو صاحب مہم کو بہادر۔ با تدبیر اور ہوشمند ہیرو کہا جاتا ہے۔ اور ناکام ہو جائے تو مورخ اسباب ناکامی پر بحث کرنے بیٹھ جاتا ہے۔ کمال اتاترک کامیاب ہو گیا۔ تو مشرق و مغرب کے مورخین نے اس کی جرات۔ شجاعت۔ تدبر اور جانبازی پر طویل مقالے لکھے۔ دوسری طرف نپولین کو واٹرلو میں شکست ہوئی تو اُس کی لغزشوں پر بیسیوں کتابیں نکل آئیں۔ یہی حال علامہ مشرقی کا ہے کہ آپ نے عین اُس وقت جب خاکسار تحریک کی ہیبت سے برطانیہ کا ایوانِ تدبر کانپ رہا تھا! دو خطرناک قدم اٹھائے۔ پہلا ۱۹۳۹ء میں۔ جب علامہ شیعہ و سنی کے تصادم کو روکنے کے لئے کئی ہزار خاکساروں کے ہمراہ یوپی میں داخل ہو گئے۔ اور وہاں مسلح پولیس سے مقابلہ شروع کر دیا۔ اس تصادم میں درجنوں خاکسار مجروح و شہید ہوئے۔ اور مشین گنوں نے خاکساروں کی ہمت و استقلال پر کاری ضرب لگائی۔ دوسرا تصادم حکومت پنجاب سے ۱۹۴۰ء میں ہوا۔ اُس زمانے میں دوسری جنگ عالمگیر چھڑی ہوئی تھی۔ اور حکومت برطانیہ چار لاکھ خاکساروں کی فوج کو اپنے لئے ایک خطرہ سمجھتی تھی۔ جنگ میں بعض اوقات حکومتوں کے خزانے خالی ہو جاتے ہیں۔ اور ہر سپاہی محاذ پہ جا پہنچتا ہے صنعت و

بے چارگی کے ان لمحات میں اگر کوئی شخص ہمت کرے۔ تو حکومت کا تختہ اُلٹ سکتا ہے۔ کچھ ایسے ہی خطرات کی بنا پر حکومت نے خاکساروں پر پابندیاں لگا دیں کہ وہ پنجاب کے چار شہروں یعنی جالندھر، امرتسر، لاہور اور شاید راولپنڈی میں مارچ نہ کیا کریں۔ تدبر کا تقاضا یہ تھا کہ علامہ مشرقی اس عارضی پابندی کو برداشت کر لیتے۔ لیکن وہ قانون شکنی پہ ڈٹ گئے۔ چنانچہ مارچ ۱۹۴۰ء کے شدید تصادم میں خاکساروں کا بڑا جانی نقصان ہوا۔ علامہ گرفتار ہو گئے۔ اور خاکساروں کے گروہ لاہور کی مختلف مساجد میں جا گھسے۔ جہاں سے تیس چالیس یوم تک مقابلہ جاری رکھا۔ آخر تابکے۔ حکومت نے سب کو گرفتار کر لیا۔ تحریک کو خلاف قانون قرار دے دیا۔ ملک میں وسیع پیمانے پر خاکساروں کی گرفتاریاں ہوئیں۔ اور اس طرح دس برس کی تعمیری کوششیں چشم زدن میں برباد ہو گئیں۔ اور ہماری اُمیدوں کا سربفلک محل دھڑام سے زمین پہ آ رہا۔

ان تمام حادثات میں مسلمانانِ ہند کی ہمدردیاں علامہ کے ساتھ تھیں۔ لیکن جب تحریک پاکستان نے قائد اعظم رحمتہ اللہ علیہ کی عظیم قیادت میں زور پکڑا۔ تو علامہ مشرقی نے پریس اور پلیٹ فارم سے حضرت قائد اعظم پہ شدید بمباری شروع کر دی۔ ابتدا سے علامہ کا نصب العین آزادی اور اسلامی سلطنت کا قیام تھا۔ سمجھ میں نہ آیا۔ کہ جو مجاہد (قائد اعظم) اس جہاد میں دس کروڑ مسلمانانِ ہند کی کمان کر رہا ہے۔ علامہ صاحب اُس ہستی پہ کیوں برس رہے ہیں؟ علامہ کی یہ وہ خطرناک لغزش[1] تھی۔ جس نے انہیں مسلمانانِ ہند کی ہمدردی و محبت سے یکسر محروم کر دیا۔ اور وہ منزلِ سیاست میں یوسفِ بے کارواں بن کر رہ گئے۔ اس وقت (۱۹۵۲ء) وہ پاکستان میں ایک بے حرکت سی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ نہ لکھتے ہیں نہ بولتے ہیں، حالانکہ قدرت نے انہیں ایک شاداب دماغ۔ تنومند فکر۔ طوفانی قلم۔ فلک سیر تخیل اور ایک تند و تیز جذبۂ ایمان عطا کیا ہے۔ وہ تعمیرِ ملت میں ایک اہم رول ادا کر سکتے ہیں۔ اس وقت ہمارا ملی و انفرادی اخلاق رُو بہ زوال ہے، ہمارے گراں فروش تاجروں نے عوام کا دم ناک میں کر رکھا ہے۔ ہمارے کارخانہ دار ہمارا خون چوس رہے ہیں۔ ہمارے راشی اہلکار ہماری بنیادوں میں پانی دے رہے ہیں۔ اخبارات سے معلوم ہوتا ہے کہ جرائم بڑھ رہے ہیں۔ صداقت و دیانت کا جنازہ اُٹھ رہا ہے۔ رُوح کی نگری اُجڑ رہی ہے۔ اور ابلیس کی دنیا بس رہی ہے۔ کیا ان نازک اوقات میں قوم کے اخلاق کو سدھارنے کی ضرورت نہیں؟ کیا بدکار اقوام کی سلطنت کبھی باقی رہی ہے؟ اگر نہیں رہی۔ اور ہماری بدکاریاں پاکستان کے لئے ایک مستقل خطرہ بن چکی ہیں۔ تو پھر علامہ صاحب خاموش کیوں ہیں۔ آج خاکسار تحریک کی پھر ضرورت ہے۔ کس لئے؟ بازاروں سے گراں فروشی۔ چور بازاری۔ جھوٹ اور کھوٹ کی لعنت کو مٹانے کے لئے۔ ہر گھر اور ہر دفتر تک یہ آواز پہنچانے کیلئے۔ کہ وہ اہلکار جو حرام کھا رہے ہیں۔ وہ افسر جو راشی، کنبہ پرور، استحقاق کش اور انصاف فروش ہیں۔ وہ عوام جو جھوٹ بول رہے ہیں۔ جو اتحاد و تنظیم کی قوت سے محروم ہیں اور جن کی دنیائے دل برباد ہو چکی ہے۔ وہ سب اپنی آزادی کے دشمن اور دولتِ خداداد پاکستان کے بدخواہ ہیں۔ اگر یہ لوگ باز نہ آئے۔ تو دیر و زود اُن سے دولتِ آزادی چھین لی جائے گی۔

فرض کی آواز

میری یہ محکم رائے ہے کہ علامہ مشرقی میں اصلاح و تعمیر کی بے پناہ طاقت موجود ہے۔ ان کا گلبار قلم لاکھوں دلوں میں زلزلے پیدا کر سکتا ہے۔ اُن کی مہیب آواز کروڑوں غفلت زدہ نفوس کو خوابِ غفلت سے جگا سکتی ہے۔ اور اُن کی آتشیں تقریریں برباد و ویران دلوں میں ایمان و یقین کی دہکتی ہوئی چنگاریاں بھر سکتی ہیں۔

کیا علامہ صاحب اپنے فرض کو پہچانیں گے؟

نشانِ راہ دکھاتے تھے جو ستاروں کو
ترس گئے ہیں کسی مردِ راہ داں کے لئے (اقبال)

---

[1] میں نے اس تحریک سے پوری ذہنی وابستگی رکھتے ہوئے، پورے خلوص کے ساتھ اپنی رائے کا اظہار کیا ہے۔ اس کے باوجود یہ باتیں ناگوارِ خاطر ہوں تو معذرت خواہ بھی ہوں۔

سیّد عطاء اللہ شاہ بخاری

شورش کاشمیری

مولانا ابوالکلام آزاد کے پیرایۂ بیان کو ملحوظ رکھیں تو سید عطاء اللہ شاہ بخاری ۱۸۹۱ء مطابق ربیع الاول ۱۳۱۰ھ میں ہستی عدم سے اس عدم ہستی نما میں وارد ہوئے اور "نہمت حیات" سے متہم۔ ددھیال کی طرف سے عطاء اللہ اور ننھیال کی جانب سے شرف الدین احمد نام رکھا گیا۔ عوام نے "زندہ دلی" پیر کہنا شروع کیا، عقیدت مند صرف شاہ جی کہتے ہیں۔ حضرت علامہ انور شاہ نوراللہ مرقدہٗ نے انجمن خدام الدین لاہور کے سالانہ اجلاس میں "امیر شریعت" کا لقب تجویز کیا، خود بیعت فرمائی۔ ان کے علاوہ پانچ سو علماء نے بھی بیعت کی جن میں مولانا ظفر علی خان مدیر زمیندار بھی شامل تھے۔

اسلاف خاندان بخارا سے سری نگر وارد ہوئے۔ سلطان زین العابدین والی کشمیر کے زمانہ میں انہیں بڑا رسوخ حاصل تھا۔ ان کی رحلت پر خاندان کی شاخیں ہندوستان کے دوسرے مقامات میں بس گئیں۔ ایک شاخ نے گجرات میں اور دوسری نے پٹنہ میں قیام کیا —— آپ کے والد بزرگوار کی شادی اسی شاخ کے ایک بزرگ حکیم سید احمد شاہ اندرابی کی دختر فرخندہ اختر سیدہ فاطمہ اندرابی سے ہوئی۔ آپ ابھی بچے ہی تھے کہ ان کا انتقال ہو گیا۔ ان کی رحلت پر والد پٹنہ سے گجرات چلے گئے اور دوسری شادی کر لی۔ شاہ جی ننھیال ہی میں رہے جہاں نانی مرحومہ نے بیٹی کی نشانی سمجھ کر بڑی شفقت سے پالا۔ آپ کے نانا ابا کا مکان شعر و ادب کی محفلوں کا مرکز تھا۔ شاد عظیم آبادی آپ کی نانی صاحبہ سے محاورہ اور روزمرہ کی صحت کے لئے تشریف لاتے تھے۔ ان کی صحبتوں سے آپ نے بھی استفادہ کیا۔ رفتہ رفتہ شعر و شاعری اور زبان و کلام کا ذوق نکھر گیا ——

غالباً نانی صاحبہ کی وفات پر آپ نے پٹنہ سے گجرات کا قصد کیا۔ اثنائے سفر میں موانعات پیش آتے رہے۔ ایک آدھ جگہ ملازمت بھی کی۔ کچھ دن بنارس میں چاندی کے ورق کوٹتے رہے حتیٰ کہ امرتسر پہنچ گئے وہاں مختلف اساتذہ سے قرآن، حدیث اور فقہ پڑھی، لحنِ خوش الحان اور حسن الحانی کا یہ جوہر آپ کو نانا مرحوم سے ورثہ میں ملا تھا، وعظ شروع کیا تو سارا امرتسر گرویدہ ہو گیا۔ پہلی جنگ عظیم کے خاتمہ پر جلیانوالہ باغ امرتسر کو گولیوں کا تحفہ ملا تو ملک میں ایک طوفان کھڑا ہو گیا، مولانا داؤد غزنوی کی تحریک پر آپ نے تحریک خلافت میں شمولیت اختیار کی —— دیکھتے ہی دیکھتے تمام ملک میں آپ کی خطابت کا شہرہ ہو گیا۔ حتیٰ کہ ہندوستان میں یہ بات متفق علیہ ہو گئی کہ اردو زبان میں آپ سے بڑا کوئی عوامی خطیب نہیں۔

شاہ جی اور خطابت ہم نشین ہیں۔ آپ نے تقریباً تیس یا پینتیس برس رفیقہ کا زمانہ سمجھ کر اس دشت کی سیاحی میں بسر کیے ہیں ...

آپ کے لولیسے لالہ سمیٹ چکی ہیں۔ لاکھوں آدمیوں کو آپ کی سیاست سے اختلاف رہا۔ اب بھی اختلاف کرنے والوں کی کمی نہیں لیکن کوئی سا شخص بھی اس سے اختلاف نہیں کرے گا کہ خطابت ان کی لونڈی ہے۔ وہ بولتے نہیں موتی رولتے ہیں ——— ان کی برجستہ گوئی، ان کی حاضر جوابی، ان کی بذلہ سنجی، ان کی نکتہ آفرینی، ان کی زبان دانی، ان کی شعر و سخن سے دلچسپی، غرض ——— ع

ہزاروں خوبیاں ایسی کہ ہر خوبی پہ دم نکلے

درحقیقت وہ ایک چلتا پھرتا شعری انسائیکلوپیڈیا ہیں۔ اردو، فارسی، پنجابی کسی زبان میں بھی ان کی طبیعت بند نہیں۔ وہ ایک بحر مواج ہیں، ان کا کوئی صدف موتی سے خالی نہیں ——— بلاشبہ ان کا نام دنیا کے سٹیفنز سسرو اینڈ مڈبرک صہبان ابن عزال اور سعد زاغلول کے ساتھ لیا جا سکتا ہے۔ انہوں نے خطابت اختیار نہیں کی بلکہ خطابت نے انہیں اختیار کیا ہے، برِ صغیر کی بہت سی تحریکیں انہوں نے جگمگائی ہیں۔ وہ زبان و بیان کا ایک ایسا مرقع ہیں جس میں رنگا رنگ تصویریں ہیں، ان کی خطابت کو نگارخانے سے تشبیہہ دی جا سکتی ہے ——— ع

ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است

ایک خوبصورت وجود میں عنفوانِ شباب کی جو رعنائیاں ہوتی ہیں وہ تمام تر ان کی خطابت میں ہیں۔ انہوں نے اپنے خیالات کی سزا بھی بھگتی ہے۔ انگریزوں سے بھی اور مسلمانوں سے بھی لیکن انگریزوں کی سزائیں ان کی متاع عزیز ہیں، مسلمانوں سے انہیں کوئی گلہ نہیں، وہ اس کے ڈانڈے تیرہ سو برس کی تاریخ کے مختلف حلقوں سے ملاتے ہیں ——— اس وقت ان کی عمر پینسٹھ برس کے لگ بھگ ہے۔ اس حساب سے انہوں نے ہفتہ میں سے ڈیڑھ دن قید و بند میں بسر کیا ہے ——— ع

خوردا افسوس زمانے کہ گرفتار نہ بود

——— ان کی نجی محفلیں باغ و بہار ہوتی ہیں ——— ع

اک ذرا چھیڑیئے پھر دیکھئے کیا ہوتا ہے

تمام رات بیت جائے گی لیکن وہ بولنے سے نہیں تھکتے اور آپ سننے سے نہیں تھکیں گے۔ جب آتش جوان تھا وہ شروع رات سے پو پھٹنے تک تقریر کرتے اور لوگ تھے کہ نقش کالحجر ہو کر بیٹھے رہتے۔ ان کا مضمون، زلفِ یار کی طرح پیچ و خم کھاتا ہوا کہیں ختم نہیں ہوتا۔

تنہائی سے انہیں سخت نفرت ہے۔ غالباً اس کا تصور بھی ان کے ہاں نہیں، وہ زندگی کو بازار سمجھتے اور بازار ہی پر مرتے ہیں لیکن سب سے بڑا عوامی خطیب ہونے کے باوجود عوام کو کالانعام سمجھتے ہیں، غالباً ان کا خیال ہے کہ رائے عامہ ہوا کی موج یا بادل کا ٹکڑا ہے۔ ان کے نزدیک راشد، تعلیم معری، بیکا راگ، برطانوی سیاست اور غلام احمد کی نبوت عجیب و غریب پہیلیاں ہیں۔

دوستوں پر غایت درجہ اعتماد کرتے ہیں۔ دشمنوں کو درخورِ اعتنا ہی نہیں سمجھتے ——— سیاسیات میں حصہ لینے کے بعد اب سیاسیات سے سخت متنفر ہیں، انہیں انتخاب کے نام سے چڑ ہے، غیبت کرتے نہ سنتے ہیں، دل کی دوستی کو دماغ کی دوستی پر ترجیح دیتے ہیں۔ چنانچہ اختلافِ فکر و عمل کے علی الرغم مولانا عبدالمجید سالک، ڈاکٹر محمد دین تاثیر، سید احمد شاہ بخاری اور صوفی غلام مصطفیٰ تبسم کی یاری کا دم بھرتے تھے مگر جس زمانہ میں مولانا ظفر علی خان، ڈاکٹر شیخ محمد عالم، ڈاکٹر سیف الدین کچلو وغیرہ سے اتحادِ فکر و عمل تھا ان سے دل کی رسم و راہ کا کوئی معاملہ نہ تھا۔

جماعت احرار، سیاسیات میں ان کی "مساعیِ شکست انجام" کا ثمرہ ہے۔ اب تو خیر حکومت ہی نے اسے خلافِ قانون قرار دے رکھا ہے لیکن ایک زمانہ میں احرار کا طوطی بولتا تھا۔ چودھری افضل حق مرحوم، مولانا مظہر علی اظہر، مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی ایسے لوگ آپ کے دست و بازو تھے۔ اب وہ سبو ٹوٹ چکا، صہبا چھلک گئی، میکدہ اجڑ گیا، آبخورے کے ریزوں میں تلچھٹ باقی ہے اور بقول اقبال ؎

بیا یک لحظہ با عاماں درآمیز — کہ خاصاں بادہ ہا خوردند و رفتند

حسن جہاں کہیں ہو ان کی کمزوری ہے، بلبلوں کی سانولوں سے لے کر پھر یروں کی اڑانوں تک میں وہ حسن تلاش کرتے اور اس پر مرتے ہیں۔ وہ جذبات کے قتلے چھیتے اور جذبات پر مرتے ہیں۔ انہیں عامیانہ حسن سے قطعاً لگاؤ نہیں۔ تاج محل کو گاندھی جی کے الفاظ میں مزدوروں کے بیگار کی یادگار سمجھتے ہیں۔ تمام زندگی سیر و سیاحت میں گزار دی لیکن سیر و سیاحت کے عادی نہیں۔ موٹا جھوٹا پہنتے سادہ غذا کھاتے اور ہنسی خوشی جیتے ہیں۔ اب کچھ دنوں سے طبیعت بیمار ہے، دوستوں کے بچھڑنے اور بچھڑنے کا سخت رنج ہے، فرماتے ہیں:

"میاں اب تو دشمن بھی شریف نہیں رہا، شریف دشمن سے لڑنے میں تو لطف آتا تھا۔"

چھرہ خوش اور آواز خوش ان کی طبعی خوراک ہیں، گو صوفی منش ہیں لیکن مزامیر کے قائل نہیں، صرف گلے کے رس سے لطف اٹھاتے ہیں۔ شعر و شاعری سے انہیں ایک گونہ دلبستگی ہے، تمام اساتذہ کے چیدہ چیدہ شعر ازبر ہیں، ان کے برمحل استعمال میں جو خصوصیت انہیں حاصل ہے، وہ کسی اور کو نہیں، مولانا آزاد کی طرح ان کے حافظہ کی گرہیں بھی، طبیعت شگفتہ ہو تو کھلتی اور بکھرتی چلی جاتی ہیں، بہ قول شاعر ع

وہ اپنی ذات میں اک انجمن ہیں

کبھی سرو قامت تھے، اب ان کا قد بھی ان کے دل کی طرح اللہ کے حضور میں جھک گیا ہے۔ چہرہ پر جھریوں کی مسجع عبارتیں، ماتھا کشادہ لیکن تفکر کی کائنات پیمائیوں سے مجروح، آنکھیں —— ایک زمانہ میں ساری مستی شراب کی سی تھی —— اب چپ چاپ اگر یا کچھ سوچ رہی ہیں۔ لہجہ میں عرب شہسواروں کا بانکپن، قرآن پڑھیں تو قرن اوّل کا مبتدا لکنی یاد آجاتا ہے۔ شعر سنائیں تو عجمی دربار وں کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد کے الفاظ میں:

"دنیا کسی کے لئے کبھی نہیں بدل سکتی۔ تمام زندگی نصف افسانۂ امید اور نصف ماتم یاس ہے"

اور اب اس مرحلہ میں ——

مختصر حالِ چشم و دل یہ ہے
اس کو آرام اس کو خواب نہیں

——————

رحمان

آثر صہبائی

مغربی پاکستان ہائی کورٹ کا یہ چیف جسٹس اور پاکستان کا مایۂ ناز فرزند وزیر آباد کے ایک متوسط طبقے کے گھرانے میں ۲۴ر جون ۱۹۰۳ء کو عالمِ وجود میں آیا۔ ابھی زندگی کی صرف تین بہاریں گزری تھیں کہ قدرت نے ایک نہایت ہی کڑا امتحان لیا یعنی ۱۹۰۶ء میں آپ کے والد ماجد جناب شیخ غلام علی صاحب کا سایۂ شفقت سر سے اٹھ گیا۔ اب صرف آپ کی والدہ ماجدہ تھیں اور آپ کا توام بھائی رحیم۔ زندگی کے آغاز ہی میں مصیبت کا یہ عظیم پہاڑ اس مختصر سے کنبے کے سر پر ٹوٹ پڑا۔ دونوں بھائیوں کی کفالت اور تعلیم و تربیت کا بار آپ کی والدہ کے بھائیوں نے اٹھایا۔ اس گوہر آبدار کی تربیت ان خوش نصیب انسانوں کی قسمت میں لکھی تھی۔ ان میں سے شیخ مولا بخش صاحب تو اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں لیکن شیخ عنایت اللہ اور شیخ رحمت اللہ صاحب اپنی محنت اور ہمت کا پھل دیکھنے کے لئے زندہ ہیں۔ رحمان صاحب کے دل میں ان دونوں بزرگوں کے لئے بے پناہ احترام ہے۔ ان کے احسانات کا آپ کو بڑا احساس ہے۔ آپ کی والدہ ماجدہ بھی اپنے لختِ جگر اور نورِ نظر کی شاندار کامیابیاں دیکھنے کے لئے ۱۹۴۲ء تک زندہ رہیں۔

آپ کی تعلیم وزیر آباد کے ایک مشن اسکول میں ہوئی۔ بچپن سے نہایت ذہین و فطین مگر خاموش طبع تھے۔ غالباً والد کے سانحۂ ارتحال نے آپ کو بہت قبل از وقت سنجیدہ بنا دیا تھا۔ رحمان صاحب نے سنہ ۱۹۱۹ء میں میٹرک کا امتحان پاس کیا اور صوبہ بھر میں دوئم رہے۔ یہ بہت بڑا امتیاز تھا۔ اسلامیہ کالج لاہور میں داخل ہو گئے۔ آپ کے توام بھائی رحیم (آج کل چیئرمین امپروومنٹ ٹرسٹ لاہور) بھی آپ کے ساتھ تھے۔ دونوں بھائی نہایت بھولے بھالے انتہا متین اور سنجیدہ تھے۔ دونوں ذہین اور محنتی تھے۔ بڑے شرمیلے اور معصوم سے تھے۔ لیکن دونوں کے لبوں پر ایک لطیف سا تبسم ہر وقت کھیلتا رہتا تھا۔ دونوں میں بڑی دلکشی اور جاذبیت تھی۔ رحمان صاحب البتہ اپنی ذہانت اور قابلیت کے باعث بہت ممتاز تھے۔ میں بھی ان ایام میں اسی کالج میں سیکنڈ ایئر کا طالب علم تھا۔ اگرچہ ہم ایک دوسرے سے کچھ زیادہ متعارف نہ تھے تاہم میرے دل پر رحمان صاحب کی قابلیت، ذہانت، سنجیدگی اور کردار کی معصومیت کا نہایت گہرا نقش تھا۔

ایف۔ اے کا امتحان پاس کرنے کے بعد آپ گورنمنٹ کالج لاہور میں داخل ہو گئے اور ابتدا ہی سے HONRS SCHOOL OF MATHEMATIC میں

سے دیا اور صوبہ بھر میں اول آئے۔ دو سال کے بعد ریاضی میں ایم۔ اے بھی کیا۔

گورنمنٹ کالج میں ہی آپ نے انگریزی میں انشا پردازی شروع کی۔ آپ کے انگریزی مضامین کالج کے میگزین "راوی" میں شائع ہوتے تھے۔ انگریزی کے مشہور پروفیسر مسٹر [illegible] رحمان صاحب کی انشا پردازی سے بہت متاثر ہوئے اور آپ کی حوصلہ افزائی فرماتے رہے۔ عجیب اتفاق ہے کہ رحمان صاحب کی توجہ اردو ادب کی طرف مبذول کرانے میں بھی پروفیسر صاحب پیش پیش تھے۔ چنانچہ ۱۹۲۴ء کے لگ بھگ جبکہ آپ ایم۔ اے میں تھے آپ نے اپنی سب سے پہلی نظم "بانگِ جرس" لکھی۔ ظاہر ہے کہ اس نظم کی ادبی حیثیت کیا ہو سکتی ہے لیکن یہ اپنی تاریخی اہمیت کے اعتبار سے زندہ رہے گی۔

افسوس کہ ہمارے ملک کے بہترین دل و دماغ حکومت کی مشین کے کل پرزے بننے پر مجبور ہیں۔ تعلیمی اداروں میں اتنی دلکشی نہیں، علم و ادب کی قدر پرکاہ کے برابر بھی نہیں۔ کوئی ادیب آزادانہ طور پر محض اپنے ادب کے بل بوتے پر عزت کی زندگی بسر نہیں کر سکتا۔ ان حالات میں ہر ذہین فطین شخص اضطراری طور پر مقابلے کے امتحانات کی طرف لپکتا ہے۔ چنانچہ رحمان صاحب بھی آئی۔ سی۔ ایس کے امتحانِ مقابلہ میں شریک ہوئے اور ۱۹۲۶ء میں بڑے امتیاز کے ساتھ کامیاب ہوئے۔ مسلمانوں میں اول اور ہندوستان بھر میں تیسرے نمبر پر رہے۔ مزید تربیت کے لئے انگلستان چلے گئے۔ وہاں عربی اور فارسی بھی ان کے مضامین تھے۔ ۱۹۲۸ء میں اپنے جملہ اعزازات کے ساتھ اپنے وطنِ عزیز میں واپس تشریف لائے اور مختلف مراحل طے کرتے ہوئے ۱۹۵۴ء میں لاہور ہائی کورٹ کے اور اکتوبر ۱۹۵۵ء میں مغربی پاکستان ہائی کورٹ کے چیف جسٹس مقرر ہوئے

کچھ ہمتِ مرداں ہوتی ہے کچھ رحمتِ یزداں ہوتی ہے
قطرے ہی سمندر بنتے ہیں، ذرّے ہی بیاباں ہوتے ہیں

ایف۔ اے کے بعد رحمان صاحب سے پھر ایک مدت تک ملاقات نہ ہو سکی۔ کئی سال بعد غالباً ۱۹۴۰ء میں کشمیر میں ان سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ میں ان دنوں وہاں وکالت کیا کرتا تھا۔ ایک دعوت میں ہم دونوں اکٹھے تھے۔ سرسری سی ملاقات رہی۔ اس وقت تک بھی مجھے رحمان صاحب کی شعر گوئی کے متعلق کوئی علم نہ تھا۔

۱۹۴۷ء میں قیامِ پاکستان پر مجھے بھی کشمیر سے ہجرت کرنا پڑی۔ اس دورِ پُرآشوب کا تذکرہ اب لاحاصل ہے۔ میں بھی انتہائی پریشانی کے عالم میں سیالکوٹ پہنچا۔ ناداری اور بیکاری زوروں پر تھی۔ آمدنی کی کوئی صورت نہ تھی، تمام کاروبار بند پڑے تھے اور اخراجات پہلے کی نسبت زیادہ تھے۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ میں اپنے آبائی شہر میں بھی ایک اجنبی تھا۔ وکالت کا کام غالباً نومبر ۱۹۴۷ء میں شروع کیا۔ طبیعت بیمار سی کیفیت تھی۔ آزردگی اور شکستہ دلی کے باعث کام کاج میں جی نہ لگتا تھا۔ انہی ایام میں رحمان صاحب کی ایک نظم "تا سحورِ ازل" ہمایوں میں دیکھی۔ یہ نظم بہت پسند آئی۔ حیرت بھی کہ اتنی پختہ اور دل آویز نظم رحمان صاحب نے کیونکر لکھ لی۔ بعد میں معلوم ہوا کہ آپ برسوں سے مشقِ سخن فرما رہے ہیں۔ ان دنوں رحمان صاحب ہائی کورٹ کی ججی کے علاوہ کسٹوڈین کا کام بھی کیا کرتے تھے۔ میں نے ایک مختصر سا خط لکھا جس میں ضمناً اس وقت کی ذاتی پریشانی کا بھی کچھ تذکرہ تھا۔ چند دنوں کے بعد آپ نے مجھے سیالکوٹ میں ہی اسسٹنٹ کسٹوڈین مقرر فرما دیا۔ رحمان صاحب کی اس عملی ہمدردی کا مجھ پر نہایت گہرا اثر ہوا۔ چنانچہ شکریہ ادا کرنے کے لئے میں لاہور پہنچا۔ آپ نہایت تپاک اور محبت سے ملے اور دیر تک گفتگو فرماتے رہے۔ آپ نے اپنی افسریت کا مجھے مطلقاً احساس نہ ہونے دیا۔ شعر و ادب، سیاست اور زندگی کے دوسرے مسائل پر ایک مشفق اور غمگسار دوست کی طرح باتیں کرتے رہے۔ آپ کی ہمدردی اور انسان دوستی کا میرا یہ پہلا تجربہ تھا۔

دل بدست آور کہ حجِ اکبر است از ہزاراں کعبہ یک دل بہتر است

اس کے چند ماہ بعد مجھے سیالکوٹ کا پبلک پراسیکیوٹر مقرر کیا گیا۔ اس تقرر کے سلسلے میں مجھے آنریبل مسٹر جسٹس ایم۔ آر کیانی سے ملنے کا اتفاق

شکریہ ادا کرنا ہے جو ان دنوں حکومت پنجاب کے مشیر قانونی تھے۔ آپ کی بے لوث محبت، فراخدلی اور ادب پروری کا میرے دل پر گہرا نقش ہے میں طبیعت کے اس علم شکر اللہ مجھے کبھی کبھی لاہور آنا پڑتا تھا اور لاہور آنے کی سب سے بڑی کشش رحمان صاحب کی ذات گرامی تھی۔ ان کی ملاقات کے تصور سے جی خوش ہوتا تھا۔ ان سے مل کر عجیب ذہنی اور روحانی لذت محسوس ہوتی تھی اور جب میں ان سے رخصت ہوتا تو اس محبوب شخصیت کی ملاقات کئی دن تک میرے لئے باعث فرحت و انبساط رہتی۔ یہ ملاقاتیں ابھی نا سی طویل ہوا کرتی تھیں اس سے مجھے رحمان صاحب کو ذرا زیادہ قریب سے دیکھنے کے موقعے ملتے رہتے تھے۔

آپ بڑی دلکش اور محبوب شخصیت کے مالک ہیں۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ آپ افسرانہ تحکم اور طمطراق کو عدالت ہی میں چھوڑ آتے ہیں اور ملنے والوں سے اتنی گرمجوشی، بے تکلفی اور خلوص و محبت سے ملتے ہیں کہ ہر ملنے والا یہ احساس لے کر اٹھتا ہے کہ رحمان صاحب اسی کے بہترین دوست ہیں۔ جس کا جی چاہے ملاقات کے لئے آئے۔ جب تک جی چاہے باتیں کرے اور جب جی چاہے اٹھ کر چلا جائے۔ میں نے آج تک رحمان صاحب کو کبھی اس قسم کا اشارہ تک بھی کرتے نہیں دیکھا کہ ملاقاتی ان کے لئے بار خاطر بن رہا ہے۔ حالانکہ بعض ملاقاتی ضرورت سے بہت زیادہ طویل اور بیکار گفتگو بھی کرتے ہیں ؎

ہر کہ خواہد گو بیا و ہر کہ خواہد گو برو
دار و گیر و حاجب و درباں دریں درگاہ نیست

رحمان صاحب ہر شخص کی بات نہایت غور اور ہمدردی سے سنتے ہیں اور جہاں تک بس چلے اس کی پوری پوری مدد کرتے ہیں ؎

ہوا ممکن تو یاری کی نہیں تو اشکباری کی

میں سیالکوٹ سے آتا تو علمی اور ادبی موضوعات پر بڑی دلچسپ گفتگو رہتی۔ میری خواہش تھی کہ میں لاہور چلا آؤں۔ چنانچہ محض ضمنی طور پر میں نے اپنی اس دبی دبی خواہش کا اظہار کیا تو آپ نے نہایت گرمجوشی سے اس کی تائید فرمائی اور محض لفظی تائید پر اکتفا نہ کیا بلکہ عملی طور پر اس معاملے میں پوری پوری دلچسپی بھی لی چنانچہ آپ کی اس توجہ خاص کے باعث میرا تبادلہ لاہور میں ہو گیا۔

دوسروں کے ساتھ نیکی اور احسان کرتے ہوئے رحمان صاحب کی انتہائی کوشش ہوتی ہے کہ دوسرا شخص ان کے احسان کے بوجھ کو محسوس نہ کرے۔ اس قسم کی لطیف خواہش بہت تھوڑے لوگوں میں پائی جاتی ہے۔

لاہور آنے کے بعد مجھے رحمان صاحب کو اور زیادہ قریب سے دیکھنے کے موقعے ملتے رہے۔ رحمان صاحب کی سب سے نمایاں خصوصیت توازن یا اعتدال ہے۔ ان کے دماغ میں ٹھنڈک کے ساتھ ساتھ تیزی اور ان کے دل میں حرارت کے ساتھ ساتھ سلامتی طبع کا نہایت عمدہ رچاؤ ہے۔ میں نے آج تک آپ کو خفگی یا برہمی کی حالت میں نہیں دیکھا۔ ان کی محبت اور گرمجوشی میں بھی رکھ رکھاؤ اور توازن پایا جاتا ہے۔ ان کے یہاں نہ خودی کا نشہ ہے نہ بے خودی کی لغزش۔ علم و حکمت ہے مگر پندار نہیں، خلوص و محبت ہے لیکن حدود شکن وارفتگی نہیں، محنت و مشقت ہے لیکن یبوست اور تلخی نہیں، ہمدردی اور دستگیری ہے لیکن نمود و نمائش نہیں، دینداری اور مذہبیت ہے لیکن تعصب اور تنگ نظری سے کوسوں دور۔

یہ عجیب اتفاق تھا کہ میں جب بھی رحمان صاحب کے پاس جاتا عام طور پر ایک معمر اور مفلوک الحال شخص وہاں ضرور آ جاتا اور اپنے آلام و مصائب کی داستان دہراتا رہتا۔ اکثر اوقات وہ باتیں کرتے کرتے رونا بھی شروع کر دیتا۔ بے چارے کو کچھ ثقل سماعت کی بھی تکلیف تھی اس لئے خود بھی چیخ چیخ کر باتیں کرتا اور رحمان صاحب کو بھی اپنی طبیعت کے خلاف کچھ اونچی آواز میں جواب دینا پڑتا۔ میں خود بھی اس کی حالت دیکھ کر متاثر ہوتا لیکن اس کی طویل طولانی ایک ہی بات کا بار بار دہرانا اور روتا چلا جانا مجھ پر کچھ گراں سا گزرتا تھا۔ البتہ رحمان صاحب اس کی رام کہانی بڑے صبر و سکون، تحمل اور

"بزمِ اقبال" کی طرف سے ایک بلند پایہ سہ ماہی رسالہ "اقبال" انگریزی اور اردو میں باالتزام شائع ہو رہا ہے۔ علامہ مرحوم کے متعلق ایک مبسوط اور مستند کتاب زیرِ تصنیف ہے۔ یہ کتاب دو حصوں میں ہوگی (یہ کتاب اب شائع ہو چکی ہے) "ذکرِ اقبال" اور "فکرِ اقبال"۔ پہلا حصہ مولانا عبدالمجید سالک اور دوسرا حصہ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم صاحب کے سپرد کیا گیا ہے۔ "ادارۂ ترقی ادب" کی طرف سے بھی غیر ملکی زبانوں کی چند بلند پایہ علمی کتابوں کے ترجمے شائع کئے جا چکے ہیں۔

ان تمام اداروں کی روح و رواں رحمان صاحب کی شخصیت ہے۔ اکثر بڑے لوگ خط کا جواب دینا گوارا نہیں فرماتے اور اس میں اپنی بڑائی محسوس کرتے ہیں لیکن رحمان صاحب اپنی تمام عظمتوں اور مصروفیتوں کے باوجود اپنے احباب کے خطوط کا جواب دینے میں بڑے مستعد ہیں۔ ہر خط کا جواب مناسب وقت پر مل جاتا ہے۔ خط اپنے ہاتھ سے لکھتے ہیں اور عام طور پر اردو میں بڑے خوشخط ہیں۔

اگرچہ ہر مسلمان جج کے لئے ضروری ہے کہ وہ اسلامی فقہ سے براہِ راست متعارف ہو لیکن یہ ایک افسوس ناک حقیقت ہے کہ اکثر جج اور وکلا صاحبان اسلامی قانون کا مطالعہ بھی انگریزی زبان میں ہی کرتے ہیں۔ بہت کم جج اور وکیل ایسے ہیں جن کو عربی زبان پر اتنا عبور ہو کہ وہ اسلامی فقہ کے اصل ماخذ تک رسائی حاصل کر سکیں۔ رحمان صاحب عربی اور فارسی دونوں زبانوں سے اچھی طرح واقف ہیں لیکن آپ نے یہیں تک بس نہیں کی۔ آپ نے باقاعدہ طور پر ایک پروفیسر رکھا ہوا ہے جس سے ہفتے میں دو مرتبہ صبح کے وقت عربی کتابیں سبقاً سبقاً پڑھتے ہیں۔ میں نے دریافت کیا کہ اس عمر میں باقاعدہ طور پر عربی پڑھنے کا کیا مقصد ہے؟ کیا آپ اسلامی قانون پر کوئی کتاب لکھنا چاہتے ہیں؟ فرمانے لگے "اسلامی قانون پر ایک مستند کتاب لکھنے کو جی تو چاہتا ہے اور وقت کی یہ نہایت اہم ضرورت بھی ہے لیکن افسوس کہ میرے پاس تحقیق و جستجو کے لئے اتنا وقت نہیں بہرحال میری اتنی خواہش ضرور ہے کہ میں فقہ کی کتابوں کو انگریزی کی جگہ عربی میں پڑھ سکوں"۔

آپ بڑے باہمت انسان ہیں اور آپ کا مطالعہ بہت وسیع ہے۔ "قانون" انگریزی ادب و "فلسفہ" اور اردو ادب کی پرانی اور نئی کتابیں آپ کے زیرِ مطالعہ رہتی ہیں۔ میں نے اردو کی بہت سی نئی کتابیں سب سے پہلے آپ کی میز پر دیکھیں۔ پھر وہ کتابیں محض الماریوں اور میز کی آرائش کے لئے نہیں ہیں بلکہ آپ ہر کتاب کو بڑے غور سے دیکھتے ہیں اور ایک بے لاگ رائے قائم کرتے ہیں۔ بڑے بڑے لوگوں کی بات تو خیر جانے دیجئے، بعض بڑے بڑے ادیب بھی پوری کتاب پڑھنے کے بغیر ہی اپنا گراں قدر تبصرہ سپردِ قلم فرما دیتے ہیں اور اس "حرکت" پر فخر بھی کرتے ہیں۔ رحمان صاحب اس گروہ سے الگ ہیں۔ آپ رائے دینے سے قبل پوری کتاب کو ناقدانہ نظر سے دیکھتے ہیں اور ایک منصف مزاج جج کی طرح بے لوث فیصلہ دیتے ہیں۔ آپ کی تنقید بے لاگ ہونے کے باوجود ہمدردانہ اور فیاضانہ ہوتی ہے۔

میں نے اپنی کتاب "بامِ رفعت" کا ایک نسخہ پیش کیا اور تبصرے کی خواہش کی۔ ایک دو ماہ بعد آپ سے ملاقات ہوئی تو خود ہی فرمانے لگے "ابھی میں نے "بامِ رفعت" ایک مرتبہ تو پڑھ لی ہے لیکن تبصرہ لکھنے سے پیشتر میں اس کو دوبارہ پڑھنا چاہتا ہوں"۔ چنانچہ اس سے تقریباً ایک مہینہ بعد رحمان صاحب نے ایک سیر حاصل تبصرہ رقم فرمایا۔

در گرم روی سایہ و سرچشمہ نجوئیم بامامخن از طوبیٰ و کوثر نتواں گفت

آپ کو صرف اپنے کام سے کام ہے۔ آپ کی زندگی ایک پُر وقار، خاموش اور تیز دریا کی طرح ہے۔ نہایت خاموشی اور پوری دیانت داری سے اپنے فرائض ادا کرنے میں منہمک رہتے ہیں۔ میں نے آج تک آپ کی زبان سے کسی کی تنقیص یا مذمت نہیں سنی۔ رحمان صاحب کو عیب جوئی کی نسبت عیب پوشی بہت زیادہ پسند ہے اور پھر آپ ہر شخص میں کوئی نہ کوئی خوبی کا پہلو ڈھونڈ نکالتے ہیں۔ نمود و نمائش، لاف و گزاف، خود ستائی، خود نمائی اور غیبت کے دھبوں سے آپ کی تصویرِ حیات یکسر پاک ہے۔

۱۹۲۳ء میں شعر گوئی کا آغاز ہوا۔ آپ کی سب سے پہلی غزل ۱۹۲۵ء میں رسالہ "نیرنگِ خیال" لاہور میں شائع ہوئی۔ اس کے بعد کسی نے اداریہ تو کوئی چیز اشاعت کے لیے بھیج دی ورنہ از خود کہیں نہ بھیجی۔ پھر ایک مدت تک آپ کا کلام "زروان" کے فرضی نام سے "نوائے وقت" (ان ایام میں یہ ہفتہ وار اخبار تھا) میں شائع ہوتا رہا اور اس کا علم آپ کے بہت تھوڑے احباب کو تھا۔ علامہ اقبالؒ کی فارسی مثنوی "اسرارِ خودی" کا منظوم ترجمہ آپ نے ۱۹۴۲ء کے لگ بھگ شروع کیا اور نہایت مستعدی اور خاموشی کے ساتھ اس کو پانچ چھ سال میں ختم کیا۔ یہ ترجمہ بجائے خود ایک تاریخی کارنامہ ہے۔ علامہ مرحوم کے کلام کے ترجموں کا جب بھی تذکرہ لکھا جائے گا "ترجمانِ اسرار" کا ذکر ناگزیر ہوگا لیکن آپ نے اس عظیم کام کو جس وقار اور متانت کے ساتھ انجام دیا۔ تصنع، فخر و غرور، تفاخر و تبختر اور خود اشتہاری آپ کے خمیر میں نہیں ہے۔

آپ ۱۹۵۰ء میں پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر مقرر ہوئے، تاآنکہ ۱۹۵۱ء میں مستشرقین کی بین الاقوامی مجلس INTERNATIONAL CONGRESS OF THE ORIENTALISTS کے اجلاس میں شرکت کے لیے قاہرہ مدعو کیے گئے۔ فواد الاول یونیورسٹی مصر نے ایل ایل ڈی کی اعزازی ڈگری آپ کی خدمت میں پیش کی۔ یہ ایک بہت بڑا اعزاز تھا لیکن مجھے اس کا علم صرف اس وقت ہوا جب اس مضمون کے سلسلہ میں میں نے آپ سے تفصیلی ملاقات کی۔ میرا خیال ہے کہ اکثر احباب کو اس کا علم ان سطور کے ذریعے ہوا ہوگا۔ آج تک آپ نے اپنے نام کے ساتھ "ڈاکٹر" نہ لکھا نہ لکھوایا۔ البتہ پنجاب یونیورسٹی والے لکھ دیتے ہیں تو آپ نے کبھی اعتراض نہیں کیا۔ انکسار اور بے نیازی کی مثال اس سے بڑھ کر اور کیا ہوگی!

آں مسلماناں کہ میری کردہ اند
در شہنشاہی فقیری کردہ اند

رحمان صاحب کی روزمرہ زندگی میں مشرقیت اور مغربیت کا نہایت خوشگوار امتزاج ہے۔ عام طور پر مغربی لباس پہنتے ہیں لیکن گرمیوں میں گھر پر ململ کا کرتہ اور لٹھے کی شلوار استعمال کرتے ہیں۔ "بڑے لوگوں" کی طرح خواہ مخواہ انگریزی میں گفتگو نہیں کرتے بلکہ عام طور پر نہایت شستہ اردو میں باتیں کرتے ہیں کبھی کبھی پنجابی میں بھی گفتگو ہوتی ہے۔ کھانا بالکل سادہ اور دیسی ہوتا ہے۔ اکل و شرب میں شریعت کی عائد کردہ حدود کا پورا پورا احترام کرتے ہیں۔ صوم و صلوٰۃ کے پابند ہیں۔ تلاوتِ قرآن روزانہ تو نہیں البتہ کبھی کبھی ضرور ہوتی ہے اور ماہِ رمضان میں ایک مرتبہ قرآن کریم ضرور ختم کرتے ہیں۔ ٹینس کا شوق ہے اور بڑے التزام سے کھیلتے ہیں۔ اگر ٹینس نہ کھیل سکیں تو سیر کر لیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کی صحت ماشاء اللہ بہت اچھی ہے۔ جسم مضبوط اور موزوں ہے۔ زندگی میں بڑا توازن اور باقاعدگی ہے امیری ہے لیکن امیرانہ ٹھاٹھ یا نخوت نہیں، ثروت و اقتدار ہے لیکن بدمزاجی اور رعونت نہیں حقیقت میں رحمان ایک درویش صفت مسلمان ہے۔

ما قصۂ سکندر و دارا نخواندہ ایم
از ما بجز حکایتِ مہر و وفا مپرس

شرافتِ نفس اور خلوص و وفا آپ کے کردار کی نہایت ہی تابناک خصوصیت ہے۔ ۱۹۲۵ء میں آپ کی شادی آپ کے ماموں جناب شیخ مولا بخش صاحب کی لڑکی سے ہوئی۔ افسوس کہ یہ سہانا خواب نہایت ہی مختصر ثابت ہوا۔ ۱۹۳۱ء میں آپ کی رفیقۂ حیات ہمیشہ کے لیے آپ سے جدا ہو گئیں۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ اس وقت آپ صرف اٹھائیس برس کے لگ بھگ تھے۔ جوانی کا عالم تھا، ولایت کی تعلیم و تربیت تھی اور ایک اعلیٰ عہدے پر فائز تھے لیکن اس جوانِ صالح نے اس آتشیں دور کو بڑے صبر اور حوصلے سے گزارا۔

اس دور میں آپ نے صرف دو نظمیں لکھیں: "ایک شام" اور "شبِ دیجور"۔ یہ نظمیں اگرچہ اتنی پختہ اور معیاری نہیں تاہم آپ کی روح کی تڑپ ان میں سنائی دیتی ہے۔ صرف ایک شعر اور وہ بھی فارسی کا سن لیجیے کتنا بے ساختہ اور لطیف شعر ہے:

اے تو زیبندۂ زندگی و ہستم بریدہ
از ما مپرس کہ بکجا رسیدہ

پہلی شادی سے آپ کے کوئی اولاد نہ تھی۔ آخر ۱۹۳۴ء میں دوسری شادی کی۔ خدا کی قدرت اس بیوی سے بھی پورے نو برس تک کوئی اولاد نہ ہوئی۔ کچھ مخلص احباب واقربا ایک اور شادی کرنے کی ترغیب دیتے رہے۔ اگر آپ اولاد کی خاطر تیسری شادی کر بھی لیتے تو اس میں اخلاقاً یا شرعاً کوئی قباحت نہ تھی۔ لیکن آپ ان تمام ترغیبوں اور تحریکوں کو ٹالتے رہے اگر کسی نے بہت زیادہ اصرار کیا تو بس اتنا ہی کہہ کر خاموش ہو گئے "بھئی اگر خدا نے مجھے اولاد دینی ہے تو اس بیوی سے بھی دے سکتا ہے۔" خدا پرستی اور وفا پرستی کی کتنی روشن مثال ہے! آخر پورے نو برس کے بعد اللہ تعالیٰ نے آپ کو اسی بیوی سے فرزند عطا فرمایا اور اب بفضلہٖ آپ کے تین فرزند اور ایک دختر ہے۔

دورِ حاضر میں ایسے وفا پرست شوہر کی مثال کم ہی ملے گی

رحمان صاحب کی شرافت، انسان دوستی، رحمدلی اور نرم مزاجی کو ان کی کمزوری پر محمول کرنا شدید غلطی ہوگی۔ جہاں کسی اہم اصول کا تعلق ہو وہاں آپ کے کردار کی پختگی کا پوری شدت کے ساتھ اظہار ہوتا ہے۔ یہی فرشتہ سیرت رحمان ایک مردِ آہنی کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔

جب آپ وائس چانسلر تھے تو کالجوں کے طلباء نے ایک منظم اور مضبوط تحریک شروع کی کہ ان کے امتحانات ملتوی کر دیئے جائیں۔ اخبارات میں مضامین نکلے، جلسوں میں تقریریں کی گئیں، جلوس نکالے گئے اور بڑے بڑے زوردار نعرے لگائے گئے، وفد پر وفد پہنچا یہاں تک کہ رحمان صاحب کی کوٹھی کے سامنے شدید قسم کے مظاہرے بھی کئے گئے لیکن یہ مردِ خدا ایک چٹان کی طرح اس طوفانِ بدتمیزی کا مقابلہ کرتا رہا۔ یہ نہیں کہ طلباء کے ساتھ آپ کو کوئی ہمدردی نہ تھی وہ تو ہمدردی کا ایک پیکر ہے۔ سوال صرف بنیادی اصول کا تھا۔ امتحانات کے التواء کا یہ مطلب تھا کہ آئے دن طلباء کے جائز ناجائز مطالبات کے سامنے گھٹنے ٹیک دیئے جائیں۔ ظاہر ہے کہ اس طرح یونیورسٹی کا وقار خاک میں مل جاتا اور اس کا تمام نظم و نسق تباہ و برباد ہو جاتا۔ پھر اس میں یونیورسٹی کو بہت سا مالی نقصان بھی برداشت کرنا پڑتا تھا۔ اگر رحمان صاحب اس وقت ذرا سی بھی کمزوری دکھاتے اور ان مظاہروں کے سامنے جھک جاتے تو یونیورسٹی کے امتحانات حقیقی معنوں میں بازیچۂ اطفال بن کر رہ جاتے۔ اگرچہ ممکن تھا کہ وقتی طور پر آپ سستی شہرت اور مقبولیت حاصل کر لیتے اور "رحمان زندہ باد" کے بھی چند نعرے بلند ہو جاتے۔

دیانت داری اور فرض شناسی رحمان صاحب کو اپنے والد مرحوم سے وراثت میں ملی ہے۔ آپ کے والد محکمہ ریل میں ملازم تھے۔ تنخواہ کچھ زیادہ نہ تھی، اور کوئی ذریعۂ آمدنی نہ تھا۔ بالائی آمدنی سے پرہیز کرتے تھے۔ ظاہر ہے کہ ان محدود وسائل سے بیوی بچوں کے لئے آسائش کے سامان مہیا نہ کئے جا سکتے تھے۔ آپ کی بیوی کبھی تنگدستی کا گلہ کرتیں تو آپ فرمایا کرتے "کیا میں ان بچوں کے لئے حرام کا لقمہ مہیا کروں؟"

رحمان صاحب نے فرمایا "ہماری والدہ ماجدہ ہمیں اکثر والد مرحوم کی اس قسم کی باتیں سنایا کرتی تھیں اور میں ان باتوں سے بچپن میں ہی بہت متاثر ہوا کرتا تھا۔ ایک شریف، ایمان دار اور غریب باپ حقیقت میں رحمتِ الٰہی ہے! انسانی سیرت اور کردار کی تشکیل و تکمیل کچھ ایسے ہی ماحول میں ہوتی ہے۔"

یہ فقرے رحمان صاحب نے بڑے رقت انگیز لہجے میں ادا فرمائے۔

میں نے پوچھا "آپ کا محبوب شاعر کون ہے؟" فرمایا "میرا محبوب ترین شاعر اقبالؒ ہے۔" علامہ مرحوم سے آپ کو بے پناہ عقیدت اور محبت ہے۔ مرحوم کے کلام پر آپ کی بڑی گہری نظر ہے۔ بچپن سے پڑھ رہے ہیں۔ خدا معلوم ایک ایک شعر کتنی کتنی مرتبہ پڑھ چکے ہیں۔ آپ کی اس والہانہ عقیدت کا ایک تازہ ثبوت "ریحانِ اسرار" (اسرارِ خودی کا منظوم ترجمہ) ہے جو کئی برس کی محنت کا نتیجہ ہے۔ اقبالؒ کے بعض شارحین بھی "اسرار" کے مرحوم کے مطالب کی وضاحت ہی ثابت ہوئے لیکن رحمان کی زندگی میں اقبالؒ کی تعلیم متشکل نظر آتی ہے۔ رحمان کے کردار کی تعمیر میں اقبال کے افکار کا بہت دخل ہے۔

"شاعری کے متعلق آپ کا کیا نظریہ ہے؟" میں نے مزید سوال کیا۔

فرمایا: "شاعری کے متعلق میرا نظریہ وہی ہے جو علامہ مرحوم نے پیش کیا ہے۔ ادب میں اگر اخلاقی اور روحانی افادیت نہیں تو وہ محض ذہنی تعیش ہے۔ میں اپنا نظریہ "ماہِ رفعت" کے تبصرے میں وضاحت کے ساتھ بیان کر چکا ہوں۔"

"ماہِ رفعت" کے تبصرے میں آپ یوں رقمطراز ہیں: "روایتی شاعری جدید قسم کی بھی ہو سکتی ہے اور قدیم نوع کی بھی۔ پرانی روایتی شاعری معروف ہے لیکن نئی روایتی شاعری کی حدیں کسی قدر ترقی پسندی کے غبار نے دھندلی کر دی ہیں۔ میرے نزدیک ہر وہ شاعرانہ تصنیف جو خلوص اور احساس مبنی نہ ہو بلکہ محض ایک مقبول طرز کی پیروی میں رونما ہو روایتی ہے، خواہ اسے گل و بلبل کے افسانے کی شکل دی گئی ہو اور خواہ "مزدور" یا "دیہاتی لڑ کے عنوان سے جدید رومانوی انداز میں اسے پیش کیا گیا ہو۔ ایسی شاعری درحقیقت شاعری نہیں ہوتی بلکہ قدما کی اصطلاح میں محض "قافیہ پیمائی" اور طرز کی نظر کے پیشِ نظر "آہنگ آرائی" کہلا سکتی ہے۔ حقیقی شاعری وجود میں نہیں آتی جب تک کہ خارجی واردات جذبات کی بھٹی میں سلگ سلگ قلبی کیفیات میں تبدیل نہ ہو جائیں۔ دوسرے لفظوں میں اس قسم کی شاعری میں ذاتی تجربہ کا ضمناً یا براہِ راست انعکاس ہونا چاہیئے۔"

حال ہی میں "حلقۂ اربابِ ذوق" کے سالانہ جلسے کے موقع پر رحمان صاحب نے ایک نہایت ہی مختصر عالمانہ، پُرمعنی اور بصیرت افروز خطبۂ صدارت ارشاد فرمایا ہے۔ چند اقتباسات بلا تبصرہ پیش کرتا ہوں:

"ادب برائے ادب کا فرسودہ نظریہ اس حقیقت کی روشنی میں صریحاً باطل ٹھہر سکتا ہے۔"

"میری نظر میں تقلیدی اور بے روح ادب جسے مصنف کے ایقان و اخلاص نے جلا نہیں دی محض روایتی ہے، خواہ روایت پرانی ہو یا نئی۔"

"اس طبقے کے ادیبوں کا ایک گروہ تحت الشعور اور لاشعور کے گڑے مُردے اکھاڑنے کو ہی ادبی خدمت سمجھتا ہے۔ اسی ذریعے سے عریانی، فحاشی، جنسی کج روی اور سوقیانہ زبان نے جدید ادب میں راہ پائی ہے۔ افراط و تفریط نے نوبت یہاں تک پہنچائی کہ بعض منچلوں نے بغاوتِ محض کو اپنا شعار بنا لیا۔ سماج سے بغاوت، قانون سے بغاوت، مذہب و اخلاق سے بغاوت، خدا سے بغاوت، ہر بلند آدرش سے بغاوت۔"

"عظیم ادب وہی ہے جس کے پس منظر میں ایک صحت مند نظریۂ حیات، ایک جیتا جاگتا نصب العین کارفرما ہوتا ہے۔"

روایتی ادب کے علمبرداروں کے متعلق فرماتے ہیں:

"یہ لوگ محض دیرینہ یا جدید روایت کی لکیر پیٹ رہے ہیں۔ ان کے پاس کوئی ذاتی سرمایۂ خیال نہیں۔ ان کا تصورِ ادب سراسر میکانکی ہے، ان کی جدت یا ندرت محض الفاظ کے الٹ پھیر کا نام ہے۔ ان کے یہاں صورت ہے معنی نہیں، جسم ہے جان نہیں، انہیں ایک طرح سے کاروانِ حیات کا پسماندہ غبار سمجھئے۔"

میں نے پوچھا: "آپ کے نزدیک زندگی کا بہترین نصب العین کیا ہے؟"

فرمانے لگے: "انسان کے لئے بہترین نصب العین وہی ہے جو اسلام نے پیش کیا ہے۔ اقبالؒ نے اسلام کی نہایت دلکش مگر حقیقی تصویر پیش کی ہے۔ اسلام کی موجودگی میں ہمیں کسی دوسرے نظامِ حیات کی حاجت نہیں۔ اگر ہم لوگ تخلقوا باخلاق اللہ کو پیشِ نظر رکھیں اور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے اسوۂ حسنہ کو اپنے لئے مشعلِ راہ بنائیں تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم میں پھر صدیقؓ و عمرؓ اور عثمانؓ و علیؓ پیدا نہ ہوں۔ خود اعتمادی اور خدا اعتمادی ہی سے نجات

بہترین فلسفہ ہے "کام، کام" اور "کام" ہی انسان کا فرض ہے نتیجہ صرف اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔ یہی اسلام کی روح ہے۔ "السّعی منّی والاتمام من اللہ"

رحمان صاحب کے ان الفاظ سے میں بے حد متاثر ہوا۔ یہ محض رنگین بیانی یا وعظ گوئی نہ تھی بلکہ ایک صاحبِ عمل کی روح کی گہرائیوں میں سے اٹھی ہوئی آواز تھی۔ رحمان کی زندگی خود اعتمادی اور خدا اعتمادی کا ایک سبق آموز اور ولولہ انگیز مجموعہ ہے۔

"کون سی کتاب نے آپ کو سب سے زیادہ متاثر کیا؟" میں نے مزید دریافت کیا۔

فرمایا "قرآن پاک نے۔ میں نے اس مقدس صحیفے کو بار بار پڑھا ہے اور اب بھی اکثر پڑھتا ہوں اور انشاء اللہ عمر بھر پڑھتا رہوں گا کلام ربانی سے بہتر اور کون سا کلام ہو سکتا ہے۔ زندگی کے سفر میں یہ ایک شفیق رہنما اور بہترین رفیق ہے۔"

اس مغرب زدگی، الحاد و زندقہ، اخلاقی انتشار اور روحانی انحطاط کے تاریک و یاس انگیز دور میں رحمان کا وجود حبِ اسلام، حبِ پاکستان اور محبتِ خیر و حق کی ایک روشن شمع ہے۔ خدا اس شمع کو دیر تک روشن رکھے اور اس کی روشنی کو تیز سے تیز تر کرے۔ آمین!

اسی ہائی کورٹ میں پہلے بھی دو ادیب اور ادیب پرور جج ہو گزرے ہیں۔ جسٹس ہمایوں مرحوم اور جسٹس سر شیخ عبدالقادر مرحوم۔ ایک شاعر تھے اور دوسرے شاعر گر اور نثر نگار۔ ہمایوں مرحوم کا عہد تو میں نے نہیں دیکھا لیکن سر عبدالقادر مرحوم سے میری کچھ شناسائی بھی تھی اور جن ایام میں میں لاہور میں زیرِ تعلیم تھا مرحوم اکثر مشاعروں کی صدارت فرمایا کرتے تھے۔ بڑے خوش وضع، خوش پوش، خوش خلق اور خوش ذوق بزرگ تھے۔ تحریر و تقریر میں بڑی شگفتگی اور سلاست تھی۔ بڑے ادب دوست اور ادیب پرور تھے۔ آج جب میں رحمان صاحب کی تصویر کشی میں مصروف ہوں تو بار بار بے اختیار سر عبدالقادر مرحوم کی تصویر کے مختلف پہلو میری نظروں کے سامنے پھر رہے ہیں۔ معمولی اختلافات سے قطع نظر رحمان صاحب مجموعی طور پر حقیقی معنوں میں شیخ مرحوم کے جانشین ہیں۔

رحمان صاحب ایک اچھے ادیب، بہت اچھے جج اور نہایت ہی اچھے انسان ہیں۔ جب کبھی رحمان صاحب کے جاننے والوں میں ان کا ذکرِ جمیل چھڑ جاتا ہے تو میں اکثر احباب کو ان کی تعریف میں رطب اللسان پاتا ہوں۔ ہر شخص کوئی نہ کوئی ایسا ذاتی واقعہ سناتا ہے جس سے میرے تاثرات کی تائید ہوتی ہے اور میں اپنے حسنِ انتخاب پر خوش ہو کر زیرِ لب یہ شعر گنگناتا ہوں ؎

ہر کس کہ دید روئے تو بوسید چشمِ من
کارے کہ کرد دیدۂ من بے نظر نہ کرد

———

میں تو "قوتِ زِ سند" کا کام دیتی رہی لیکن انقلاب کے بعد بعض لوگ نشۂ اقتدار سے بہک گئے۔ بعض نے ساتھ چلنا چاہا لیکن دشواریٔ منزل کے احساس سے پنڈ چھوڑ دیا اور بعض تماشائی ہونے کی خواہش میں خود تماشا ہو گئے۔

اس دور میں مرحوم لیاقت علی، خواجہ شہاب الدین اور میاں ممتاز دولتانہ —— یہ تین حضرات تھے جن سے ان کی لڑائی کا آغاز ہو گیا۔ اسباب کیا تھے؟ یہ ایک اختلافی مضمون ہے لیکن عدم کے الفاظ میں ––

چھوٹی چھوٹی رنجشیں اک حادثہ سا بن گئیں!
چھوٹی چھوٹی رنجشوں سے دوستی جاتی رہی

مصرعہ طرح کہاں سے آیا؟ اس سے قطع نظر یہ لڑائی یک غزلہ دو غزلہ سہ غزلہ ہو گئی۔ نظامی نے چومکھی لڑی، بانکے پیکیٹ کی طرح اس کے وار تیز ہوتے گئے۔ کئی جھڑپوں میں وہ خوم چورنگ ہو گیا لیکن "نوائے وقت" دب کر ابھرتا ہی رہا۔ خان لیاقت علی خان اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں اور اب انہیں بیچ میں لانا مناسب نہیں لیکن خواجہ شہاب الدین کو اس حقیقت کے اقرار میں بخل نہیں ہو گا کہ وزیر و مدیر دونوں میں کس کا قلم طاقتور رہا ——

خواجہ صاحب کا ایک خط حمید نظامی کے نام حال ہی میں جدہ سے آیا تھا جس میں خواجہ صاحب فرماتے ہیں:

"جہاں میں آج بیٹھا ہوں وہاں دل و دماغ دنیوی علائق سے عموماً بیگانہ رہتے ہیں۔ کسی "معذرت" کے لئے نہیں، واقعہ کے طور پر عرض کر رہا ہوں کہ نوائے وقت ہی اردو صحائف میں پڑھنے کی چیز ہے"

میاں ممتاز دولتانہ سے لگاتار "بد عدہ" رہا۔ انہوں نے "بدلہ" لینے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی اور معاملہ اس سے مختلف نہ تھا کہ ––

سانس دیکھی تنِ بسمل میں جو آتے جاتے
اور چرکا دیا جلاد نے جاتے جاتے

لیکن یہاں بھی حمید نظامی ہی سرخرو نکلے۔ گو دولتانہ کا دورِ وزارت ان کے لئے سخت ابتلا کا عہد تھا۔ ایک اخبار بند، دوسرا بند، تیسرا بند، ڈیکلریشن منسوخ، پریس چھاپنے سے انکاری، عملہ غائب، احباب غائب، رجعت پسند حملہ آور، ترقی پسند تماشائی لیکن حمید نظامی کے معمولات میں کوئی فرق نہ آیا۔ وقت پر اٹھنا، وقت پر لکھنا، وقت پر کھانا، وقت پر چلنا، وقت پر سونا —— ہفتہ میں دو بار سنیما دیکھنا، دن ڈھلے بیڈروپول پہنچ جانا، ساتھیوں میں گپ لڑانا، ہنسنا کھیلنا اور گھر چلے جانا —— دوستوں سے صرف دوستی کی بات کرنا، اور بس — اس سارے سفرِ صعوبت میں انہوں نے کبھی دوستوں کو اپنی افتادِ صبح و شام سے آگاہ نہیں کیا۔ ہرچہ بادا باد، دوسرے قارئین کے ساتھ ان کے خاص احباب کو بھی اخبار ہی سے معلوم ہوتا تھا کہ گزشتہ روز نوائے وقت پر کیا گزری؟ "جہاد" کیوں بند ہوا؟ اور "نوائے پاکستان" کیسے از مطبوعات نوائے وقت ہے۔

پھر ان کا یہ "رویہ" اپنے احباب ہی سے نہیں بلکہ اپنے گھر والوں سے بھی ہے۔ گورنر موڈی کے زمانے میں ان پر مقدمہ داغ دیا گیا کہ بغیر لائسنس کے پستول رکھا ہے، وارنٹ نکلے، گرفتاری ہوئی، ضمانت لی گئی —— اگلے دن اخبار میں چھپا تو اہلیہ نے حیرت سے استفسار کیا۔ انہوں نے جواب دیا ملاحظہ ہو:

"ان کا گھریلو معاملات سے کوئی تعلق نہ تھا اور اب آپ نے اخبار میں پڑھ ہی لیا ہے۔"

ان کا کہنا ہے کہ وہ اپنے مصائب میں جب اپنی بیوی کو بھی حصہ دار نہیں بناتے جو حقیقتاً ان کی شریکِ حیات ہے تو پھر بھلا وہ ان لوگوں کو اپنے مصائب کا کوئی بوجھ کیونکر اٹھا سکتے ہیں جو محض ان کے شریکِ سخن ہیں —— وہ انتہائی گہرے ہیں۔ ان کے ہونٹوں سے کسی راز کا کریدنا

انتہائی مشکل ہے۔ ان کی آنکھوں پر دن کو مٹیالے چشمے کے سیاہ خول چڑھے رہتے ہیں جن سے کوئی بات بھی نہیں ابھرتی ہے ——— چہرہ ان کا گوشت
کی تہوں سے اس قدر بھرا ہے کہ ورق الٹے بغیر کچھ پتہ نہیں چلتا کہ کتاب میں کیا ہے۔ انہیں غصہ ضرور آتا ہے لیکن روزانہ نہیں، کبھی کبھار، افراد
پر بھی اور خیالات پر بھی۔ اس وقت وہ لفظ لفظ کا تھپڑ لگتے ہیں۔" ان کے صاف ستھرے ماتھے پر سلوٹیں جم جاتی ہیں۔ آخر کار قصہ اس پر ختم ہوتا ہے کہ وہ

یا اپنا گریباں چاک یا دامنِ یزداں چاک

اور بڑھا "سوغیروں" ہی کے گریبان ان کے ہاتھوں چاک ہوئے ہیں ——— آج جس گروہ کے ہاتھ میں ملکی سیاست کی باگ ڈور ہے اس کا خمیر
رجعت کی خاک میں گندھا ہے۔ ان لوگوں نے انگریزی عہدِ حکومت میں نہ صرف اپنے ہی خاندانوں کو پروان چڑھایا بلکہ اپنے آپ کو تلطف کا مافوق البشر
سمجھا۔ ان کی سابق تاریخ، جمہور المسلمین پر عرّ آسنے کی تاریخ ہے۔ بالخصوص مرحوم پنجاب کے شعوب و قبائل انگریزوں کے خود کاشتہ پودے ہیں ———
حمید نظامی ان کے رخسار پر ایک زبردست چپت ہے۔ اس نے زندگی کی مراعات ورثہ میں حاصل نہیں کیں بلکہ جوڑ بٹور کر بنائی ہیں، اس نے
معاشرہ کے خلاف جدوجہد کر کے اپنی راہ پیدا کی اور موجودہ مقام حاصل کیا ہے۔
سلطان عبدالحمید نے عزلِ خلافت کے فوراً بعد ایک بیان میں کہا تھا "اگر خلافت کا تخت مجھے دوبارہ مل جائے تو میں سب سے پہلے ترکی
کے اخبار نویسوں کو دار پر لٹکا دوں" ——— یہاں جن خاندانوں کے ہاتھ میں عنانِ اختیار ہے ان میں سے کچھ افراد کی ایک جمعیت، اس کی دوست
بھی ہے اور وہ ہر عوامی آنچ سے بے پروا ہو کر دوستانہ روابط نبھا رہا ہے لیکن ان کے اندرونی خیالات میں (الا ماشاءاللہ) طبقاتی مزاحمت رہی ہے۔
جہاں تک اس کے سیاسی خیالات کا تعلق ہے ظاہر ہے کہ وہ تحریکِ پاکستان کے افق ہی سے طلوع ہوا ہے۔ اس میں اور اس سے تعلق
امراء میں خیالات کا کوئی بنیادی ٹکراؤ نہیں، جو ٹکراؤ ہے وہ طبائع اور طبقات میں ہے اسی لئے اربابِ اختیار کی انا اس سے مدبحث، اور وہ جی ہی میں
کڑھتے ہیں لیکن نظامی ان کی طبقاتی فتح مندیوں کے خلاف ایک تنقیدی قہقہہ ہے۔ وہ غرباء کے بچوں کا انتقام ہے، جو بڑی مدت کے بعد پنجاب کے
بااقتدار خاندانوں سے بہ جبر لیا گیا ہے ـــ

حفیظ اہلِ زباں کب مانتے تھے
بڑے زوروں سے منوایا گیا ہوں

اس نے اپنے فکر و نظر کو ایک خاص سانچے میں ڈھال لیا ہے اس کی بعض کاوشوں میں اونچے طبقے کے عادات کی ملاوٹ ہے۔ اس کی خصوصیت یہ
ہے اس کے "گرد و پیش" بعض ایسے عناصر پیدا کر دیئے ہیں جو محض تنورِ شکم کی خاطر اس پر گالیوں کا جھاڑ باندھتے ہیں۔ اس وقت اس کی عمر
۳۹ اور ۴۰ سال کے درمیان ہے۔ اس نے زندگی کی عمارت اٹھانے میں ایک ایک اینٹ خود چنی ہے، وہ ان لوگوں میں سے نہیں جو اپنے
خاندانوں کی وجہ سے پہچانے جاتے ہیں بلکہ اس کا شمار ان لوگوں میں ہوتا ہے جن کی وجہ سے ان کا خاندان پہچانا جاتا ہے۔
اس نے اپنے بل پر تعلیم حاصل کی، اسلامیہ کالج لاہور سے بی۔ اے اور ایف سی کالج لاہور سے ایم۔ اے (انگریزی) کیا۔ پڑھاتا رہا،
کماتا رہا اور پڑھتا رہا ———

اس کو بڑا بننے کا شوق شروع سے تھا، اس کی طبیعت کے دروازے ادب و سیاست دونوں کے لئے کھلے تھے، ابتداً جرائد و رسائل
میں لکھتا رہا۔ "شیرازہ" "ہمایوں" اور "ادبی دنیا" میں طنز و افسانے، ہلکے پھلکے مضامین اور خاکے لکھے۔ کئی تراجم بھی چھپے آخر کار اس کی طبیعت
کا ایک رخ بن گیا، ادھر سیاسیات کا ایسا چسکا پڑا کہ عہدِ طالب علمی ۱۹۳۷ء میں مسلمان طلبہ کی سٹوڈنٹس فیڈریشن کا سنگِ بنیاد رکھا اور صدر منتخب
ہو گیا۔ ۱۹۳۹ء میں صحافت سے وابستگی اختیار کی، پھر ۱۹۴۰ء میں قائداعظم کے ایماء اور دوستوں کے اصرار پر صدر بن گیا۔ اسی اثناء میں کالجوں کے
مباحثوں میں حصہ لینا شروع کر دیا۔ زبان پر قابو تھا، خیالات تقریباً منجھ چکے تھے، بیسیوں مباحثوں میں شرکت کی اور کوئی پچیس کے قریب انعامات لئے تھے۔

حاصل کئے۔ لاہور سے علی گڑھ تک مارکی، جہاں گئے کامیاب لوٹے، سنہ ۱۹۴۲ء میں ایم۔ اے کیا تو معیشت کا سوال سامنے تھا۔ کئی راہیں کھلی تھیں، لیکن طبیعت کا میلان صحافت کی طرف تھا۔ انہی دنوں اپنے ایک دوست کے لئے جو آئی۔ سی۔ ایس کا امتحان دے رہے تھے، ادبیات اردو کا چار سو صفحات کا ایک خلاصہ تیار کیا جو ایک معروف پبلشر کو پسند آ گیا اس نے قیمتاً خرید لیا۔ اپنے نام سے چھاپا چنانچہ اب تک اس کے کئی اڈیشن فروخت ہو چکے ہیں۔

۲۳ مارچ سنہ ۱۹۴۰ء کو ہفتہ وار "نوائے وقت" نکالا جو پہلے ایک فکری ہفت روزہ تھا۔ ۲۲ جولائی سنہ ۱۹۴۴ء کو قائداعظم کی تحریک "اور "آشیر باد" سے روزنامہ ہو گیا۔ پاکستان کے لئے نوائے وقت نے جو کچھ کیا مخفی نہیں۔ ہر کہ و مہ کو معلوم ہے، تین چار برس ہی میں ان کی شہرت کا مطلع روشن ہو گیا ——— اس سے پہلے صحافت کا مزاج زیادہ تر ادبی تھا مسلمانوں میں صحافی شاذ اور انشاپرداز عام تھے۔ ایک ایڈیٹر کے لئے شاعر و ادیب ہونا شرط ہوتا تھا، نوائے وقت نے اس سنت سے اعراض کیا ——— جو لوگ اردو اخبار نویسی کو شعر و انشا کی چیز سمجھتے تھے یا جنہیں انگریزی میں دستگاہ کے باعث اردو اخبار نویسی کا وجود ہی اضافی نظر آتا تھا، نوائے وقت نے ان کے خیالات کی نفی کی اور اخبار کو صرف اخبار کی حیثیت سے پیش کیا۔

انگریزی کی برتری نے انگریزی خوانوں کو اردو اخبارات سے بے تعلق کر رکھا تھا اور مشرقی مزاج کے معدودے چند انگریزی خواں بھی اردو اخبار محض اداریوں کی خاطر پڑھتے تھے، نوائے وقت نے اس ذہنیت کو یکسر بدل ڈالا اور اب غالباً نوائے وقت پہلا روزنامہ ہے جو پاکستانی انگریزوں میں بھی خوف یا شوق سے پڑھا جاتا ہے ——— ہمارے ملک کی سیاست میں اس کا وجود ناگزیر ہو گیا ہے، اس کے حامی و مخالف گالی دینے یا تعریف کرنے کے لئے اس کو ضرور پڑھتے ہیں ——— اس کی بنیادی خوبی یہ ہے کہ وہ ملکی سیاسیات میں مسائل تخلیق کر سکتا اور بسا اوقات ایسے موضوع پیدا کر لیتا ہے جن پر نقد و نظر اور تنقید و تنقیص کی ایک عام بحث شروع ہو جاتی ہے ——— جس سے ایک خاص ذہن ترشح ہوتا ہے اور مرحوم پنجاب کے اضلاع میں اس ذہن کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔

"نوائے وقت" یا حمید نظامی لازم و ملزوم ہیں، دونوں کی شخصیت ایک دوسرے میں پیوست ہے، ایک کی نفی سے دوسرا ابھر نہیں سکتا۔ اس کی اپنی پسند و ناپسند بھی شدید ہے بلکہ سنگین، اسی طرح اس کے مخالف و موافق بھی، افراط و تفریط پر ہیں ——— اس کے مخالفوں کی سب سے بڑی تعداد اسی کے طبقے میں ہے۔ اس کا واحد جرم یہ ہے کہ وہ ان کے طبقے کا ہو کر ان سے آگے نکل گیا ہے ——— اس کے اداریوں میں طوالت نام کو نہیں ہوتی۔ چھوٹے چھوٹے فقرے اور تلی بندھی بات، "سر راہے" (ذکاہی کالم) کی ادبی حیثیت محل نظر ہو سکتی ہے لیکن اس میں ایک ہلکی سی چوٹ ضرور ہوتی ہے جس سے ضارب و مضروب دونوں لطف لیتے ہیں۔

اکثر لوگوں میں اس کے متعلق یہ خیال عام ہے کہ وہ مغرور ہے لیکن وہ مغرور نہیں، صرف رکھ رکھاؤ کا عادی ہے، عام لوگوں میں خلط ملط نہیں ہوتا۔ اس کا خیال ہے کہ ہر انسان اس قابل نہیں ہوتا کہ اس سے "رسم و راہ" پیدا ہو ——— جو لوگ کسی نہ کسی وجہ سے عام ہو جاتے ہیں وہ تبرک کی طرح تقسیم ہو کر اپنی عزت کھو بیٹھتے ہیں۔

وہ ان لقمہ لوں میں بیٹھنے کے بجائے ان کی گالی کھانے میں عزت کو زیادہ محفوظ سمجھتا ہے۔

اور حمید نظامی کی ساری تصویر الفاظ کے انہی نسخ یا نستعلیق جوڑوں میں ہے۔

———

آغا شورش کاشمیری

(محمد وارث کامل بی اے)

لاہور کی وہ تفریحی رہگذر جو اپنے اردگرد حاشیے بناتی ہوئی کہیں ناک کی سیدھ اور کہیں بل کھاتی ہوئی چلی جاتی ہے آج سے پچیس سال پہلے کسی جوانِ رعنا کے خرامِ ناز کا تختۂ مشق بنی ہوئی تھی۔ اس نوجوان سے میری آنکھیں نہ صرف ایک دو بار بلکہ بار بار چار ہوئیں لیکن کچھ تو اپنی کم آمیزی کے باعث اور کچھ اس وجہ سے کہ اس جوانِ رعنا کی عقابی نگاہیں اذنِ خطاب تو درکنار کسی راہرو کو رسمی علیک سلیک کی اجازت بھی نہیں دیتی تھیں، میرے اور اس جوانِ رعنا کے درمیان اجنبیت کی دیواریں حائل رہیں۔ یہ عقدہ بھی نہ کھل سکا کہ آخر یہ نوجوان ہے کون؟ نظر کے آئینے پر اس نوجوان کے چہرے بشرے کے جو نقش ابھر آئے تھے میں تصور میں کبھی کبھی انہی سے ہم کلام رہا اور اس ہم کلامی کو بزعمِ خود تعارف سے تعبیر کرتا رہا حالانکہ اس ہم کلامی اور اس تعارف کی حیثیت ایک طلسمِ خیال کی سی تھی۔ اس نوجوان کی ہیئت کذائی جن خصوصیات کا حسین آمیزہ تھی قلم کی زبان آج بھی ان کا مرقع کھینچ سکتی ہے۔ کتابی چہرہ، عقابی آنکھیں، ستواں ناک، ڈھلکے ہوئے رخسارے، شاداب ہونٹ، نپے تلے کان، کھلی پیشانی، گتھے ہوئے دانت، گھمبیر سر، دائیں بائیں خم کھاتی ہوئی گردن [illegible] بلکہ مادہ، سانولا رنگ، کھچا ہوا قد، زبان خاموش لیکن نگاہیں ہر لحظہ گردش میں، چہرے پر متانت ظرافت سے آنکھ مچولی کھیلتی ہوئی۔ رفتار ایسی کہ ہر قدم پہ سوتے فتنے جگا دے اور گفتار ایسی (اس کا اندازہ بعد میں ہوا) کہ پری شیشے میں اتر آئے عزم و حوصلہ کی یہ شان (چہرہ کی تراش خراش سے یہ چیز ٹپکتی تھی) کہ بسان شعر کا مفہوم سمجھ لیجئے ؎

ہر چند کوہ سے بھی گراں تر ہے بارِ عشق
ہمت یہ کہہ رہی ہے کہ تنہا اٹھائیے

شاہی مسجد میں ایک جلسہ کا پروگرام تھا۔ لوگ شہر کے اطراف و اکناف سے اس کثیر تعداد میں جمع ہوئے تھے کہ مسجد کا صحن عرفات کا منظر پیش کر رہا تھا۔ اس اجتماع میں میں بھی شریک تھا لیکن میری حیثیت ایک ایسے تماشائی کی سی تھی جس کی بیدلی نہ اسے درسِ عبرت دیتی ہے نہ اس کے لئے تسکینِ ذوق کا سامان فراہم کرتی ہے۔ غالب نے کسی ایسے ہی تماشائی کی ذہنیت کا اس شعر میں ماتم کیا ہے ؎

بیدلی ہائے تماشا کہ نہ عبرت ہے نہ ذوق
بیکسی ہائے تمنا کہ نہ دنیا ہے نہ دیں

خوش قسمتی سے میں سٹیج کے قریب ہی بیٹھا تھا اور یہ میں ہی جانتا ہوں کہ اس قرب کی خاطر میں نے اپنے وقت کا کتنا قیمتی سرمایہ صرف کیا تھا۔ مجمع جمے ہوئے کچھ زیادہ دیر نہیں ہو پائی تھی کہ میں نے سٹیج پر بچھی ہوئی ایک کرسی پر اس شیر بیشۂ سیاست کو متمکن دیکھا جسے ان ایام میں "زندہ دلانِ پنجاب" دینی کشتی کا ناخدا سمجھتے تھے یعنی ظفر الملت والدین مولانا ظفر علی خاں (جو آجکل کس مپرسی کے عالم میں بستر علالت پر اپنی بچی کچی زندگی کے دن بسر کر رہے ہیں) شاہی مسجد کے بام و در اللہ اکبر اور مولانا ظفر علی خاں زندہ باد کے نعرہ ہائے زلزلہ انداز سے گونج اٹھے مولانا نے اپنے مخصوص انداز میں تقریر کی۔ تقریر کیا تھی شعر و ادب کے سانچے میں ڈھلا ہوا ایک بصیرت افروز مقالہ تھا یا کسی کوہ آتش فشاں کا شعلۂ جوالہ سامعین "صم، بکم، عمی فہم لا یرجعون" کی تصویر بنے بیٹھے تھے اور اگر اس پورے مجمع میں کسی کو مولانا کے خیالات سے اختلاف بھی تھا تو اس پر یہ کیفیت گزر رہی تھی ؎

دل میں گھُٹ گھُٹ کے رہ گئی حسرت

لب پہ آ آ کے رہ گیا مطلب

دیکھتا کیا ہوں کہ وہی چھریرے بدن کا کشیدہ قامت نوجوان سٹیج پر نمودار ہوتا ہے اور کسی رسمی تمہید کے بغیر تقریر شروع کر دیتا ہے۔ میں نے ابتدا ہی میں سمجھ لیا تھا کہ مولانا ایسے بلیغ البیان اور فصیح اللسان مقرر کے بعد اس طوطی کی صدا نقار خانے میں کون سنے گا لیکن اس نوجوان نے اس ٹھسے اور اس ٹھاٹھ سے تقریر کی کہ مجمع اس کی تقریر کے اختتام تک جما رہا بلکہ کچھ نعروں سے بڑی دلچسپی کا ثبوت بھی دیا مجھے یاد ہے کہ اس نوجوان نے مولانا کی بارگاہ فضل و کمال میں خراج عقیدت پیش کرنے کے بعد یہ بھی کہا تھا۔

"مولانا آپ کی شخصیت واجب الاحترام ہے۔ میں آپ کے فضل و کمال کا اعتراف
کئے بغیر بھی نہیں رہ سکتا لیکن یہ کبھی نہیں ہو سکتا کہ آپ کی ہر بات تسلیم کر لی جائے آپ نے
جو روش اختیار کی ہے میرے خیال میں اس سے قوم کو نقصان تو پہنچ سکتا ہے کسی فائدہ
کی توقع نہیں کی جا سکتی"

میں اس نوجوان کی تقریر کے دوران کچھ ایسا کھو سا گیا تھا کہ قوتِ تمیز بھی جواب دے گئی جانی پہچانی اور دیکھی بھالی شکل کی شناخت بھی نہ کر سکا۔ جب اس نوجوان کی تقریر کے خاتمہ پر لوگوں میں کھسر پھسر ہوئی تو میں نے بھی کان اٹھائے۔ کوئی صاحب اپنے ساتھی سے کہہ رہے تھے کہ یار! یہ شورش ہمارے سامنے کا لونڈا ہے کل تک اسے بستہ بغل میں دبائے سکول جاتے دیکھتے تھے اور آج یہ اتنے بڑے مقرر کے کان کتر رہا ہے۔ جس کی دھاک دور دور بیٹھی ہوئی ہے۔ یہ لونڈا تو آفت کا پرکالہ نکلا یہ بات چیت ابھی ختم ہوئی تھی کہ پیچھے سے ایک صاحب نے میرا شانہ ہلایا۔ میں نے مڑ کر دیکھا تو میرے خالہ زاد بھائی تھے۔ (یہ صاحب کیپٹن شفیق احمد خان ایم اے پی سی ایس ہیں جو آجکل جھنگ میں مجسٹریٹ درجہ اول لگے ہیں) کیوں وارث صاحب اسی شورش کی تقریر! یہ ہے قابلیت۔ ایک مدت سے ہم دونوں کتابوں کے ورق چاٹ رہے ہیں لیکن پھر بھی ہمارے اندر یہ اہلیت پیدا نہیں ہوئی کہ ہم اس دھڑلے سے تقریر کر سکیں۔ وارث صاحب! در اصل تقریر ہی ایک ایسا فن ہے جس سے کسی کی شخصیت بلند ہو سکتی ہے۔ ہمارا یہ کہنا کہ ہم نے اتنے امتحان پاس کئے ہیں اور ہمارے پاس اتنی سندیں ہیں جو دنیا کی نظر میں ہمارا وقار اونچا نہیں کر سکتیں میں نے کہا بھائی صاحب اس نوجوان شورش کو میں اچھی طرح جانتا ہوں کئی ماہ برابر میری اور اس نوجوان شورش کی گذرگاہ ایک ہی رہی ہے۔ اندازہ تو مجھے پہلے بھی تھا کہ یہ نوجوان چھپا رستم ہے اور چونکہ بعد ضرب اس کی گدڑی میں لال چھپے ہوئے ہیں لیکن یہ میرا کہنا کہ میں نے اس سے کچھ اور زیادہ قریب ہونے کی کوشش نہیں کی۔

یہ نوجوان شورش یہ جوان رعنا شورش جس کی کتاب زندگی کا ایک ورق میں نے اوپر کی سطور میں پیش کیا ہے آج صرف شورش نہیں بلکہ آغا شورش کاشمیری ہے۔ آغا شورش کاشمیری ابھی پچاس برس کو نہیں پہنچے ایک سال کے بعد غالباً انھیں عزت، وجاہت اور شہرت کی وہ معراج نصیب ہوگی جس پر ان کے اقران و امثال رشک کریں گے یہ کوئی منجمانہ پیش بینی نہیں بلکہ ایک پیش قیاسی ہے جو میں نے ان کی عمر کی مناسبت سے کی ہے۔ آغا شورش کاشمیری

سنہ ۱۴ اگست ۱۹۱۷ء کو اس رنگ و بو کی دنیا میں آنکھیں کھولیں اس حساب سے وہ اس گلستان آب و گل کی ۴۳ بہاریں دیکھ چکے ہیں۔ کسے خبر تھی کہ آغا شورش کی تاریخ ولادت ۳۰ سال بعد ایک نوزائیدہ اسلامی مملکت 'پاکستان' کی تاریخ ولادت ثابت ہوگی۔ یہ تاریخی مناسبت بھی قدرت کا ایک عجیب کرشمہ ہے یا اسے ان خدمات کا صلہ کہنا چاہیے جو اس نوجوان سیاسی کی زندگی کا اوڑھنا بچھونا رہی ہیں۔

آغا شورش کاشمیری نے عملی سیاست کے میدان میں بال بھارت سبھا کے سیکرٹری کی حیثیت سے قدم رکھا یہ ۱۹۳۵ء کی بات ہے۔ اس وقت ان کی عمر ۱۵ سال کے لگ بھگ تھی۔ شروع ہی میں زمیندار کا مطالعہ بڑی باقاعدگی سے کرتے تھے۔ اور وہ ادبی شہ پارے جو مولانا ظفر علی خاں کے قلم جواہر رقم سے نکلتے تھے آغا شورش بڑے شغف اور بڑے انہماک سے ان کے معانی و مطالب پر غور کرتے اور ان کے محاسن پر سر دھنتے تھے شعر گوئی اور نثر نگاری کی صلاحیتیں بھی اسی دور میں بیدار ہوئیں الہلال و البلاغ کے مطالعہ نے ان کے آئینہ طبع پر کچھ اور صیقل کر دیا۔ پھر کیا تھا۔ ایک طرف مولانا ظفر علی خاں کی جذباتیت اور دوسری طرف مولانا آزاد کی ابوالکلامیت دونوں نے سونے پر سہاگے کا کام کیا اور آغا شورش کی شخصیت پر ادب و انشا، شعر و سخن، تقریر و خطابت اور فکر و نظر کے ایسے رنگین غلاف چڑھائے کہ برصغیر کے طول و عرض میں ان کی دھوم مچ گئی۔ برطانوی دور میں جب تحریک آزادی کی مہم زوروں پر تھی تو اس نوجوان خطیب نے ملک کے گوشے گوشے میں اپنی شعلہ مقالی اور آتش بیانی کے جھنڈے گاڑ دیئے اس حقیقت سے آج آغا شورش کاشمیری کے بدخواہ بھی انکار نہیں کر سکتے کہ جہاں تک فن خطابت کا تعلق ہے آغا کا کوئی سہیم و عدیل نہیں ہے۔ اسی سال جب یوم اقبال کی تقریب ہوئی آغا نے تقریر کی تو پورے ہال کی روح کھنچ کر آغا کی انگلیوں میں آگئی تھی۔ آغا کی تقریر کا راز جس چیز میں مضمر ہے وہ یہ ہے کہ آغا اپنے خیالات کا اظہار زبان سے نہیں بلکہ زبان دل سے کرتے ہیں۔ زبان و دل کی کامل آہنگی کے ساتھ اپنی آواز کی پوری گونج اور کڑک سے جب آغا شورش کاشمیری تقریر کرتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کے ذہن پر معانی و مطالب کی بارش ہو رہی ہے ان کے مطالب الفاظ کے تابع نہیں ہوتے بلکہ الفاظ کو یہ ضرورت پیش آتی ہے کہ مطالب کے آگے سر تسلیم خم کریں۔ آغا شورش ایسی زبان لکھتے اور ایسی زبان بولتے ہیں جو عوام کے دل و دماغ کی گہرائیوں میں گھر کر جاتی ہے۔

آغا شورش کاشمیری کو تحریک آزادی میں شرکت کی یہ سزا ملی کہ برطانوی استعمار نے انہیں دس سال ۹ ماہ کی طویل مدت تک قید رکھا آغا نے ایک سال دو ماہ قید تنہائی کی سختیاں سہیں۔ دو ماہ دو دن بھوک ہڑتال کی۔ یہ قید ۱۲۴ الف اور ڈیفنس آف انڈیا ایکٹ کے ماتحت عمل میں آئی تھی۔ اسی طویل المیعاد اسیری کے عالم میں آغا شورش کو غالباً اپنی زندگی میں پہلی بار یہ تجربہ ہوا کہ انسانیت کا معیار کتنا گر چکا ہے؟ انسان اپنے ہی جیسے دوسرے انسانوں کے ساتھ کتنا بہیمانہ برتاؤ کرتا ہے۔ انعام عہدہ اور منصب کی ہوس میں لوگوں کا خون کتنا سفید ہو گیا ہے کہ وہ یہ سوچنے کی بھی زحمت گوارا نہیں کرتے کہ جس شخص کے ساتھ ہم وحشت و درندگی کا سلوک کر رہے ہیں وہ خود انہی کی قوم کا ایک فرد ہے؟ بیڑی، ڈنڈا بیڑی، ہتکڑی، توبڑے اور سنٹرل جیل کے صحن میں تپتے ہوئے گندے کیڑے یہ ہیں وہ تعزیری ہتھکنڈے جو کسی کے اشارے پر جیل کے حکام نے آغا کے خلاف بڑی بے رحمی کے ساتھ استعمال کئے ۱۹۳۵ء سے ۱۹۴۵ء تک آغا کی زندگی کے دس سال قومی سرگرمیوں سے الگ تھلگ رہ کر بسر ہوئے لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ آغا کی سیرت کی تعمیر اسی دس سالہ مدت کا حاصل ہے۔ اگر آغا کی زندگی کے دامن پر قید و بند کی صعوبتوں کے داغ نہ ہوتے تو غالب قیاس یہ ہے کہ ان کی شخصیت کا نقش کبھی نہ ابھر سکتا اور وہ مدت العمر کس مپرسی کی زندگی بسر کرتے۔

آغا شورش کاشمیری کوئی ۹ سال سے ہفت روزہ چٹان لاہور کے مالک و مدیر ہیں ۱۹۴۹ء میں مجلس احرار نے جب روزنامہ "آزاد" نکالا تھا تو کچھ عرصہ کے لئے اس کی ادارت کے فرائض بھی آغا نے سرانجام دیئے تھے اس وقت تک آپ کے قلم سے جو تصانیف نکل چکی ہیں ان کی فہرست یہ ہے۔

(۱) قیدی کا روزنامچہ (جسے جیل کے حکام نے پنجاب سی آئی ڈی کے مشورہ سے ضبط کر لیا تھا)

(۲) آزاد ہند کے زوجی عناصر (۳) اُس بازار میں (۴) گفتنی و ناگفتنی (مجموعہ کلام) (۵) پس دیوار زنداں (زیر طبع) (۶) مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری (زیر ترتیب)

آغا شورش کاشمیری ایک خاص طرز نگارش کے مالک ہیں "چٹان" کے قارئین جو قریب قریب پاکستان اور بھارت کے گوشے گوشے میں پھیلے ہوئے ہیں ان کو

نظم کا ہو یا ماسنتے ہیں اس ہیرو نظر بوی اور اس قبول عام کا راز شاید اس حقیقت میں مضمر ہے کہ آغا گفتار کا غازی بھی رہا ہے اور اس کے ساتھ ہی کردار کا غازی بھی، تقریر ہو یا تحریر، نظم ہو یا نثر ان کی تہہ میں جو ہر عمل کار فرما نظر آتا ہے گفتنی و ناگفتنی کے دیباچہ میں آغا نے لکھا ہے کہ

"میں نے جو کچھ کہا اس پر عمل بھی کیا - ان سیاسی شعروں میں میرے کردار کی پوری پوری جھلک موجود ہے - میری خامیاں بھی ہیں اور خوبیاں بھی - یہاں مجھ میں قدرے انا جاگ اٹھتی ہے جو شاعر مستعار انقلابی نعروں سے ہیرو بنتے ہیں مجھے نہ صرف ان سے ہمدردی پیدا ہوتی بلکہ ان کے شیوہ ستائش باہمی پر رحم آتا ہے ان کا سارا گھمنڈ خود فریبی کے کھوکھلے دعووں پر ہے جن لوگوں کو اپنے ملک کی سیاسی جدوجہد کے ابجد سے واقف نہیں اور جن عوام کا وہ نام لیتے ہیں کبھی ان کے لئے کانٹے کی چبھن محسوس نہیں کی وہ انہیں تلوار کے زخم کھانے پر کیوں کر آمادہ کر سکتے ہیں مجھے فخر ہے کہ میں نے عوام کو قریب سے پکارا اور انھوں نے قریب سے سنا ہے میرے ہر شعر کی بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ میں انہی کے لہجے میں بولتا اور انہی کے ذہن کی بات کہتا ہوں - مجھے اس مقصد کے لئے اپنے ماحول سے باہر کسی مزدور کا گلنار چہرہ دیکھنے کی ضرورت نہیں اور نہ پرائے دیس سے محرکات شعر ڈھونڈنے کی احتیاج ہے میرا ملک اور میری قوم ایک نظم مسلسل ہیں میں انہی میں سے موضوع، مضمون اور عنوان ڈھونڈتا ہوں میرے گرد و پیش اتنا مواد پڑا ہے کہ اس کے سامنے شاعر و ادیب ایک طرف رہے - آفتاب و ماہتاب بھی دامن پھیلا سکتے ہیں ؎

دامان باغباں سے کف گل فروش تک
بکھرے پڑے ہیں سینکڑوں عنوان مرے لئے "

آغا شورش کاشمیری کو واقعی یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ یہ کہیں ؎

بہت قریب سے دیکھا ہے رہنماؤں کو	بہت قریب سے کچھ راز پائے ہیں میں نے
کہوں تو گردشِ لیل و نہار رک جائے	وہ راز جن سے بہت زخم کھائے ہیں میں نے

آغا شورش کاشمیری کی سیاسی اور ادبی زندگی کے چند پہلوؤں پر تو میں نے اپنی بساط کے مطابق سطور بالا میں روشنی ڈال دی ہے لیکن ابھی میں نے انکی عادات اطوار کے بارے میں کچھ نہیں لکھا اس کی وجہ یہ ہے کہ میں اس موضوع کو حرف آخر کی حیثیت دینا چاہتا تھا - اور اس لئے کہ کسی مضمون کی آخری سطریں ذہن پر کچھ انمٹ نقش چھوڑ جاتی ہیں دوسرے ایک وجہ اور بھی ہے اور وہ یہ کہ میں اپنے قارئین پر یہ حقیقت واضح کر دینی چاہتا ہوں کہ یہ نوجوان جس کی زندگی انقلابات کے ہولناک ماحول میں بسر ہوئی ہے اور جس کے قلم کی جولانیوں نے اچھے اچھے ادیبوں، خطیبوں، شاعروں، صحافیوں اور سیاسی رہنماؤں کو ناک چنے چبوا دیئے ہیں انوکھے کردار اور نرالے اطوار کا مالک ہے - طبیعت میں بلا کا جوش مزاج میں غضب کی خشونت، تنی ہوئی بھنویں ایسی جیسے کھچی ہوئی کمانیں اٹھی ہوئی، نگاہیں ایسی جیسے کسی بلندی پہ ڈالی ہوئی کمندیں چہرہ کی تراش خراش میں غیظ و غضب کے جذبات گھلے ملے، کھچا ہوا قد فتنہ خیزیوں کی آماجگاہ۔ اگر میں یہ کہوں تو کچھ مبالغہ نہ ہوگا ؎

تیور بدل گئے تو زمیں کا سینہ پھٹ گیا
ابرو کے اک اشارہ سے محشر بپا ہوا

اگر یہ عیب ہیں تو آغا شورش کاشمیری کا دامن ان سے ضرور داغدار ہے - آغا کی افتاد طبع ہی کچھ ایسی ہے کہ ان سے ان کے بہت سے ہمعصر [illegible]

کرگھسٹے کبھی تو آغا بڑے تپاک سے ملتے ہیں اور کبھی ان بلا کی سرد مہری کا ثبوت دیتے ہیں کہ ملاقاتی اپنا سا منہ لے کر رہ جاتے ہیں۔ مجھے ان کے قریبی دوستوں سے معلوم ہوا ہے کہ آغا شورش کاشمیری نے کبھی کسی کو نقصان پہنچانے کی کوشش نہیں کی۔ آغا ٹھیٹھ پنجابی زبان میں گفتگو کرتے ہیں۔ لیکن تقریر و تحریر میں ان کی زبان ابوالکلامیت کے سانچے میں ڈھلی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ کبھی کبھی ان کے ہوش پر جوش غالب آجاتا ہے لیکن یہ غلبہ صرف چند لمحات کے لئے ہوتا ہے پھر فوراً اپنے جذبات پر قابو پا لیتے ہیں۔ آغا صاحب جب ٹیلیفون پر کسی سے گفتگو کرتے ہیں تو طنز و ظرافت کا ایک دفتر کھل جاتا ہے۔ چٹان کے مالک و مدیر کی حیثیت سے ان کا کردار بہت بلند ہے۔ کاتب، ادارۂ تحریر، منیجر اور چپراسی سبھی ان سے خوش اور مطمئن ہیں۔ ان کا برتاؤ ان سب سے برادرانہ ہے، حاکمانہ نہیں اور اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ آغا نے زمانے کے نشیب و فراز دیکھے ہیں اور ہر رنگ کی زندگی بسر کی ہے۔

---

(۴)

چمن کا جلوہ باعث ہے مری رنگیں نوائی کا

(غالب)
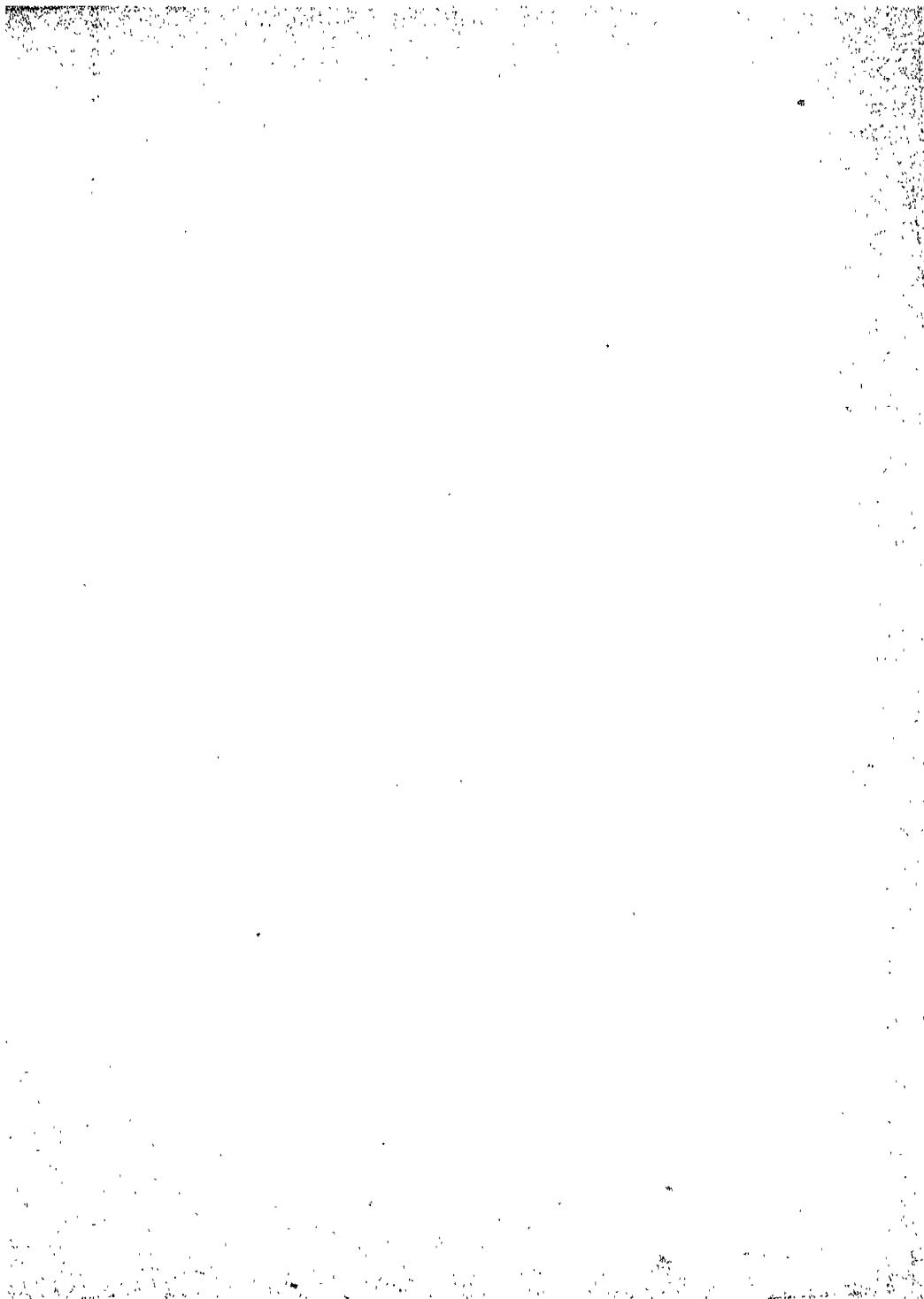
حیدر آباد کی چند شخصیتیں

تمکین کاظمی

بیس بائیس سال پہلے میں نے چند "شخصی خاکے" لکھے تھے جسے اہلِ علم نے بہت پسند کیا اور بعض لوگ برابر تقاضا کرتے رہے کہ اس سلسلہ کو جاری رکھو مگر میں اس طرف توجہ نہ کر سکا۔ البتہ پیوستہ سال مجھے خیال ہوا کہ ان سب بزرگوں، دوستوں، عزیزوں کے شخصی خاکے لکھ ڈالوں جن سے میں ذاتی طور پر واقف ہوں، چنانچہ بعضوں کے متعلق الگ الگ میں نے لکھنا شروع کیا۔ ابھی میں خاکہ نویسی میں مصروف ہی تھا کہ "نقوش" کا "شخصیات نمبر" طبع ہوا اور مجھے اس کے مطالعہ کی فکر ہوئی۔ تقسیم کے بعد سے پاکستانی مطبوعات کا حصول مشکل ہو گیا ہے۔ وی پی کا طریقہ نہیں، یہاں کے اداروں سے بھی بڑی مشکل سے منگوا سکتے ہیں، بالآخر عزیزم سعادت نظیر نے بمبئی سے مانگ کر شخصیات نمبر لا دیا اور میں نے اس ضخیم نمبر کی ورق گردانی رات بھر میں کر لی اور ایک طویل خط طفیل صاحب کو لکھا مگر میرا یہ خط یا تو انہیں ملا نہیں یا وہ انجان ہو گئے۔

گزشتہ مہینے میں محبی نصیر الدین ہاشمی نے مجھ سے خواہش کی کہ شخصیات نمبر کے ضمیمہ کے لئے "کیفی حیدر آبادی" پر کچھ لکھ دوں، چنانچہ میں نے ان کی فرمائش کی تعمیل کر دی اور انہوں نے "کیفی کا شخصی خاکہ" طفیل صاحب کو بھجوا دیا اور پھر طفیل صاحب نے فرمائش کی کہ حیدر آباد والوں کے خاکے لکھ دوں۔

میری ولادت سنہ ۱۹۰۲ء کی ہے اور میرا گھرانا علمی ادبی رہا ہے جس کی وجہ سے بچپن ہی سے مجھے علماء، فضلاء اور شعراء سے واقفیت رہی ہے اور بیشتر مشاہیر سے میں بچپن ہی سے مانوس تھا، اس طرح میں سیکڑوں بزرگوں پر لکھ سکتا ہوں مگر میں نے چند بزرگوں کی ایک فہرست بنالی ہے اور انہی کے خاکے پیش کر رہا ہوں۔

شخصیات نمبر میں بعض لوگ مثلاً امجد، فرحت اللہ بیگ، وجد وغیرہ پیش کئے گئے ہیں اس لئے انہیں میں نے چھوڑ دیا ہے اور بعض مضامین علیحدہ مستقل طور پر میں نے لکھے ہیں اور وہ علیحدہ شائع ہو رہے ہیں اس لئے اس مضمون میں انہیں بھی نہیں لیا گیا ہے۔

"علم و ادب" میں فرقہ واریت مجھے پسند نہیں۔ اس لئے میں نے دونوں طبقے پیش کئے ہیں۔ اسی کے ساتھ ہی ساتھ ملکی، غیر ملکی اور حیدر آبادی، غیر حیدر آبادی کا بھی میں قائل نہیں ہوں۔ جو لوگ حیدر آباد آ کر بس گئے وہ ملکی ہی ہیں چاہے دو سو سال سے ہوں یا دو سال سے میں انہیں حیدر آبادی ہی

شمار کرتا ہوں۔

مشکل یہ ہے کہ لوگ شخصی خاکے کے ساتھ مستقل تنقید اور نظم و نثر کے اقتباس بھی چاہتے ہیں اور ان تینوں کی سمائی ایک جگہ نہیں ہو سکتی، خاکہ بالکل مستقل چیز ہے اس میں تنقید، تبصرہ اور اقتباس کی گنجائش نہیں۔ اس سے زیادہ خطرناک بات یہ ہے کہ لوگ کسی کے متعلق کوئی ایسی بات سننے کے لئے قطعاً تیار نہیں جو اخلاقی یا مذہبی لحاظ سے ناگفتہ بہ ہو، خواہ وہ امر واقعہ ہو، چنانچہ حال ہی میں صفی اورنگ آبادی پر میں نے ایک مضمون لکھا اور اس میں صفی کی "آتشبازی" پر بھی روشنی ڈالی تو میرے بزرگوں نے خوب لے دے کی۔ حیران ہوں کہ کیا کروں بقول ترقی حیدرآبادی —

حیراں ہوں یا الٰہی! توڑوں تو کس کو توڑوں

پیمانہ ہاتھ میں ہے پیماں سامنے ہے!

بہر حال میں یہ کوشش کروں گا کہ جو بھی لکھوں صحیح لکھوں اور لگی لپٹی نہ رکھوں، واقعات ایمانداری اور دیانت کے ساتھ پیش کر دوں۔
آپ اس حصے میں ایسے بزرگوں کے خاکے ملاحظہ فرمائیں گے جو اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں اور ایسے لوگوں کے خاکے بھی دیکھیں گے جو اللہ کے فضل سے اب بھی موجود ہیں۔ میں نے جو معیار قائم کیا ہے اسی پر سب کو جانچتا جانا چاہتا ہوں چاہے وہ مرحوم ہوں یا موجود۔ فقط

علامہ عبداللہ یوسف علی

سنہ ۱۹۲۰ء میں جب میں گلبرگہ میں تھا مجھے ڈسٹرکٹ میونسپلٹی کے سپروائزر کی حیثیت سے بھی کام کرنا پڑا ہے، میرے تفویض شہر گلبرگہ کی ڈسٹرکٹ کی نگہداشت تھی مگر معزز مہمانوں کا استقبال اور ان کا انتظام بھی بعض موقع پر میرے تفویض رہا ہے۔ چنانچہ اسی سلسلہ میں بعض مشاہیر سے بھی مجھے نیاز حاصل ہو گیا، جن میں عبداللہ یوسف علی بھی تھے۔

عبداللہ یوسف علی صدر المہام (وزیر) مال، صنعت و حرفت و تجارت کی حیثیت سے دورہ پر آنے والے تھے اور میں گورنمنٹ ہاؤس پہ ان کا انتظار کر رہا تھا کہ دو تین موٹریں سرخ مٹی سے بھری ہوئی گیٹ میں داخل ہوئیں یہ موٹریں بیدر سے آ رہی تھیں اور بیدر کی لال مٹی سے لالم لال تھیں۔ پہلی موٹر سے ایک کم رو، معمولی قد و قامت کا شخص چیک کا سوٹ پہنے ہوئے اترا اور اپنے سوٹ کی گرد جھاڑتا ہوا ادھر ادھر دیکھ کر مجھ سے کچھ پوچھنا ہی چاہتا تھا کہ میں نے خود اس سے سوال کیا "صدر المہام صاحب کہاں ہیں؟" اس نے مسکراتے ہوئے میری طرف دیکھا اور پیچھے کی موٹر کی طرف اشارہ کیا۔ میں نے دوسری موٹر کی طرف رخ کیا تو اس میں باسط جنگ (عبدالباسط خان) نظر آئے۔ علیک سلیک کے بعد میں نے ان سے بھی یہی سوال کیا تو انہوں نے سامنے کی موٹر کی طرف اشارہ کر دیا۔ میں نے ان سے کہا اس موٹر میں صدر المہام تو نہیں ہیں ان کا شوفر ہے تو وہ ہنسنے لگے اور موٹر سے اتر کر مجھے ساتھ لے کر پہلی موٹر کی طرف بڑھے اور اس صدر المہام سے جسے میں شوفر سمجھ رہا تھا، میرا تعارف کرایا۔ اس طرح مجھے علامہ عبداللہ یوسف علی سے نیاز حاصل ہوا۔

عبداللہ یوسف علی بیدر سے موٹر پر آئے تھے راستہ بھی ناہموار تھا اس لئے تکان کا اثر چہرے پر تھا، میں نے گورنمنٹ ہاؤس دکھایا۔ اتنی دیر میں ان کے ملازمین بھی آ گئے اور وہ غسل خانہ میں چلے گئے۔ غسل سے فارغ ہو کر لباس تبدیل کر کے چائے پینے کے لئے آ بیٹھے تو مجھے بلا لیا اور دیر تک باتیں کرتے رہے، باسط جنگ بہادر ان کے ساتھ بہ حیثیت ناظم انجمن امداد باہمی (رجسٹرار کوآپریٹو سوسائٹیز) تھے۔ باسط جنگ سے میرے خاندانی مراسم تھے اور والد مرحوم سے انہیں بڑی محبت تھی۔ اس لئے وہ جب بھی گلبرگہ آتے تو ہمارے ہی مہمان ہوتے یا گورنمنٹ ہاؤس میں بھی ٹھہرتے تو ایک دو دن ہمارے گھر پر ضرور رہتے تھے۔

پہلی ملاقات میں علامہ نے ادھر ادھر کی باتیں کیں مگر دوسری تیسری ملاقات سے وہ کھل گئے اور بڑی دلچسپ باتیں کرنے لگے

کے آثارِ قدیمہ اور دفاتر، محبس، تالاب وغیرہ کا معائنہ میرے ساتھ کیا اور جہاں جاتے مجھے ساتھ لے جاتے تھے۔ باسط جنگ بہادر بڑے خشک دفتری آدمی تھے۔ وہ علامہ کی اس روش پر حیران تھے، ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ علامہ باوجود اتنے قابل، ایسے مشہور اور بڑے عہدہ دار ہونے کے ایک نوجوان کے ساتھ قہقہے لگانے اور بات بات پر ہنسنے پر کیسے مائل ہو گئے۔

باسط جنگ بہادر جب بھی گلبرگہ آتے والد مرحوم ان کی دعوت کیا کرتے تھے اس لئے اب بھی ان کی دعوت کی اور ان سے کہا کہ اپنے ساتھ صدر المہام صاحب کو بھی لائیں تو انہوں نے صاف انکار کر دیا۔ کہنے لگے میں صدر المہام کو اپنی طرف سے آپ کے پاس چلنے کو نہیں کہہ سکتا۔ آپ عابد سے کہلوا دیجئے۔ والد نے مجھ سے فرمایا کہ کل رات کا کھانا باسط میاں ہمارے پاس کھائیں گے، اگر تم بلا سکو تو عبداللہ صاحب کو بھی بلا لو۔ میں نے علامہ سے عرض کیا کہ کل رات غریب خانہ پر ماحضر تناول فرمائیے، تو انہوں نے بڑی خوشی سے دعوت قبول کر لی اور فرمایا صبح دکنی پکوان ہوں تو بہتر ہے۔ چنانچہ اس دعوت میں دکنی پکوان ہی تھے جنہیں علامہ نے بہت پسند کیا۔

گلبرگہ میں پانی بھورسنگہ کے تالاب سے آتا تھا اور یہ تالاب بہت ہی مختصر تھا۔ میں نے اس کو وسیع کرنے کی تحریک کی تو علامہ نے تالاب کو ملاحظہ فرمایا اور اپنے نوٹس میں اس کو بھی شریک کر لیا۔ بھورسنگہ کا تالاب دیکھ کر واپس ہوتے ہوئے حضرت رکن الدین تولاؒ کے مزار پر پہنچے تو میں نے حضرت موصوف کی سوانح سنائی کہ یہ مجذوب تھے۔ حضرت خواجہ بندہ نوازؒ جس وقت یہاں آئے ہیں اسی جگہ بیٹھے ہوئے تھے۔ بندہ نوازؒ نے یہاں پہنچ کر دو جیتل (سکۂ رائج الوقت) بطور نذر پیش کئے تو آپ نے اٹھ کر یہ نذر قبول کی۔ چونکہ مدت سے چار زانو بیٹھے ہوئے تھے اس لئے جب اٹھ کر کھڑے ہوئے تو تکلیف ہوئی اور آپ نے فرمایا "تولا" چونکہ یہی ایک لفظ ان کی زبان سے لوگوں نے سنا تھا اس لئے ان کو تولا کہنے لگے جو رفتہ رفتہ "تولہ" ہو گیا۔ حضرت کے پاس ہی آپ کے ایک معتقد عبداللہ کا مزار ہے جو ابتداً برہمن تھے اور آپ کے معتقد تھے آپ ہی کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا اور یہیں رہنے لگے، لوگ زیارت کے لئے آتے اور گائے کا گوشت ساتھ لا کر کھایا کرتے تھے جو انہیں ناگوار گزرتا۔ انہوں نے شکایت کی تو حضرت تولاؒ نے اس کی ممانعت کر دی چنانچہ اب تک یہ دستور ہے کہ جو بھی حضرت کی زیارت کے لئے جاتا ہے ایک روز پہلے سے گوشت کھانا چھوڑ دیتا اور نہا دھو کر جاتا اور اپنے ساتھ گوشت نہیں لے جاتا ہے۔ میں نے یہ قصہ سنایا تو علامہ بہت متاثر ہوتے فرمانے لگے "تم نے دیکھا ہمارے بزرگوں نے تالیفِ قلوب کی کتنی باتیں کیں اور اپنے اخلاق اور کردار سے کس قدر اثر قائم کیا اور کس عمدگی سے تبلیغ کی۔" پھر فرمانے لگے "تم بتا سکتے ہو کہ یہ باتیں انہی لوگوں پر کیوں ختم ہو گئیں اب کیوں باقی نہیں ہیں؟" میں نے عرض کی ان بزرگوں میں خلوص تھا محبت تھی۔ ہر کام یکسوئی سے کرتے تھے اس لئے اثر بھی ہوتا تھا۔ اب خلوص کا فقدان ہے، محبت نہیں رہی۔ نمود و نمائش رہ گئی ہے اور پھر کبر و غرور آ گیا ہے، اس لئے کوئی اثر نہیں رہا۔ کردار تو ان کے جیسے کچھ ہو گئے ہیں آپ واقف ہیں، فرمانے لگے سچ کہتے ہو پھر دیر تک صوفیائے کرام کا ذکر فرماتے رہے اور ان کے طریقۂ تبلیغ کی وضاحت فرمائی۔

سنٹرل جیل کا معائنہ کیا تو کارخانہ جات قالین، شطرنجیاں، نواڑ، دریاں بُنے جاتے تھے بڑی تفصیل سے ملاحظہ کیا اور بہت پسند فرمایا اور دورانِ معائنہ جرائم اور ان کے ارتکاب، سزا اور اس کے اثرات پر ایسی جامع تقریر فرمائی کہ میں کر جی خوش ہو گیا۔ ایک دریا تھا جو ہر جگہ بہتے اور ہر مقام کو سیراب کرتے تھے۔

درگاہ حضرت خواجہ بندہ نوازؒ کا ملاحظہ کیا تو پوچھا۔ تم بتا سکتے ہو کہ کئی سو سال سے یہ قبریں کیوں زیارت گاہ خاص و عام ہیں؟ میں نے کوئی معمولی وجہ بتائی تو روحانیات پر ایک افضل تقریر فرمائی اور ثابت کیا کہ روحانی اثر مٹ نہیں سکتا اور تا قیامت ان کی یہی کیفیت رہے گی۔

گلبرگہ لنگا یتوں کا بھی پوترا استھان ہے۔ کیونکہ یہاں شمن بس اپا مہاراج کا دیول ہے جس کی جاترا بڑی دھوم سے ہوتی ہے۔ علامہ نے دیول کا معائنہ بھی کیا اور دیول کے کلس اور دستکاری کے متعلق ہندو مسلم جھگڑے کا حال سنا تو فرمانے لگے "بھائی! یہ برائے نام مسلمانوں کی حکومت ہے اقتدار اعلیٰ انگریزوں ہی کا ہے سو یہاں یہ حال ہے کہ مسلمان ہندو دیول پر کلس چڑھانے نہیں دیتے جب کبھی ہندوستان آزاد ہو جائے گا اور ہماری اپنی حکومت ہوگی تو پھر مندروں کی خیر ہے نہ مسجدوں کی یہ دونوں فرقے ایک دوسرے کے معابد کو ڈھا کر رہیں گے۔"

علامہ کا یہ خیال حرف بہ حرف پورا ہوا۔ شاید اسی کو وہ دیکھ نہ سکے اور ترک وطن کر کے لندن جا رہے۔

میرے بعض دوستوں (اکبر عالم، ایم اے۔ ایل ایل بی جو ان دنوں علیگڑھ سے ایل ایل بی کر رہے تھے، اور عبدالمنعم سعیدی بی اے (علیگ) جو عثمانیہ سے ایل ایل بی کر رہے تھے) نے خواہش کی کہ علامہ سے انہیں ملاؤں۔ اس لئے میں نے علامہ سے استدعا کی کہ میرے پاس چائے پر تشریف لائیں اور ان لوگوں سے ملیں تو بڑی خوشی سے آمادہ ہو گئے اور شام کی چائے پر میرے احباب سے ملاقات کی۔ اکبر عالم سے سیاسیات پر اور منعم سعیدی سے مذہب پر دیر تک گفتگو فرماتے رہے۔ بعض اور طالب علم بھی تھے ان سے بھی دیر تک باتیں کیں۔ ایک طالب علم جو تعلقہ کوڑنگل کے ایک غریب خاندان سے تھے میرے پاس رہتے تھے، ان سے خصوصیت کے ساتھ بات چیت کی اور دوسرے روز انہیں ملنے کے لئے کہا اور سب لوگوں کے سامنے اپنی طالب علمی کے حالات سنائے کہ کس طرح انہوں نے افلاس اور تنگ دستی میں طالب علمی کی اور کس طرح ایک مخیر شخص نے ان کی مدد کی، اپنے حالات بڑی بے تکلفی سے سنائے اور اپنی فلاکت اور تنگ دستی کے اظہار میں کوئی پس و پیش نہیں کیا۔ ماشاء اللہ کیا لوگ تھے۔ کتنے حقیقت پسند اور کیسے سچے اور حق گو! میں نے کسی بڑے آدمی کو اتنی صفائی سے اپنی سابقہ زندگی اور مفلسی کا ذکر کرتے نہیں سنا جن لوگوں پر یہ زمانہ گزر چکا ہے وہ بھی ہمیشہ اس کے بیان سے گریز کرتے رہے مگر علامہ نے فخر کے ساتھ سب کچھ سنا دیا۔ ان کی مفلسی اور ابتدائی زندگی کے حالات سننے کے بعد ہم لوگوں کے دلوں میں ان کی عظمت اور زیادہ ہو گئی اور ہم انہیں ایک نمونہ سمجھنے لگے۔

یوں تو علامہ کے مضامین اور کتابیں میری نظر سے گزر چکی تھیں مگر جب وہ حیدرآباد آئے تو میں انہیں ایک دفتری عہدہ دار ہی سمجھتا تھا، اس ملاقات میں معلوم ہوا کہ وہ بڑی معلومات کے بزرگ ہیں تاریخ پر ان کی بڑی اچھی نظر تھی۔ شاہان بہمنیہ کی گنبدیں دیکھیں تو بڑے مزے سے تاریخ بیان کرنے لگے چونکہ ان دنوں میں نے گلبرگہ کی ایک مختصر تاریخ اور حضرت خواجہ بندہ نوازؒ کی سوانح عمری مرتب کی تھی اس لئے میری معلومات تازہ تھیں۔ مجھ سے اس خصوص میں علامہ نے گفتگو فرمائی تو بہت خوش ہوئے اور میری معلومات کی بڑی داد دی اور بڑے اچھے مشوروں سے سرفراز فرمائے۔ اسی طرح مذہب پر بھی بڑی خاص نظر تھی اور تصوف سے متعلق بڑی خاص معلومات تھیں اور ایک خصوصیت یہ تھی کہ عربی، فارسی، انگریزی، مرہٹی، گجراتی کے علاوہ کنڑی بھی اچھی طرح جانتے اور عمدگی سے بولتے تھے۔ عربی، لاطینی اور سنسکرت کے قائل تھے کہ یہ تینوں ام الالسنہ ہیں بقیہ زبانوں کو اتنی اہمیت نہ دیتے تھے، اردو بڑی صاف اور شستہ بولتے اور اردو کا صحیح ذوق رکھتے تھے۔

عبدالمنعم سعیدی اور میں ان دنوں اسکر وائلڈ کے ایک ڈرامے کا ترجمہ کر رہے تھے، میں نے ذکر کیا تو فرمایا۔ یہ ڈراما جس کا ترجمہ تم کر رہے ہو کوئی خاص چیز نہیں ہے وائلڈ کا ترجمہ کرنا ہو تو اس کے "پکچر آف ڈورین گرے" کا ترجمہ کرو مگر اس سے تم ابھی عہدہ برآ نہ ہو سکو گے اگر تم لوگوں کی مشق جاری رہے تو دس سال کے بعد اس ڈرامے کا ترجمہ کر سکتے ہو۔

علامہ نرے علمی آدمی نہ تھے ادب پر بھی خاصا عبور رکھتے تھے۔ البتہ شاعری سے زیادہ دلچسپی نہ تھی مگر اس سے بے بہرہ بھی نہ تھے۔ اساتذہ اردو کے کلام سے واقف تھے۔ غالب اور اقبال کے اکثر شعر بھی یاد تھے اور میر کے شعر بھی سنایا کرتے تھے۔

بہر حال گلبرگہ میں ایک ہفتہ علامہ کا قیام رہا اور ان دنوں میں صبح سے شام تک میں ساتھ ہی ساتھ رہا۔ بعض موضوعات [illegible] تک بیٹھے باتیں کیا کرتے تھے۔ میرے حال پر بہت [illegible]

آنا ضرور علامہ سے ملتا، ایک روز اسی طرح ملنے کے لئے گیا تو ایک قدیم ایرانی تصویر مجھے دی کہ اس کی فوٹو کاپی کرا دو۔ میں نے وہ تصویر لے لی اور ایک فوٹوگرافر سے اس کی کاپی کرالی اور یہی تصویر ایک نقاش کو جو پرانی تصویروں کی نقلیں کرنے میں بڑا ماہر تھا دے کر اس کی ایک نقل بھی کرائی۔ دو تین روز کے بعد میں نے نقاش کی بنائی ہوئی نقل اور فوٹو کی فوٹو کاپی لیجا کر پیش کی۔ آپ نے دیکھ کر رکھ لیا۔ پھر میں نے وہی اصل تصویر جو علامہ نے دی تھی پیش کی تو بہت پریشان ہوئے دونوں کو ملا کر دیر تک دیکھتے رہے اور پھر اصل اور نقل کو الگ الگ رکھ کر بڑی تعریف کی کہ بڑا اچھا مصور ہے اور خوب نقل کی ہے۔ پھر فرمایا کہ میں چند تصویریں بمبئی سے منگوا دوں گا اسی طرح ان کی نقل بھی کرا دو، مگر بدنصیبی سے اس کے چند ہی روز بعد وہ حیدر آباد سے تشریف لے گئے۔

گلبرگہ میں اسٹیشن کی "پلیٹ فارم پیمائی" میرا محبوب مشغلہ تھا اکثر اسٹیشن جانا اور پلیٹ فارم ناپا پھرتا تھا اس سلسلہ میں اکثر آتے جاتے ہوئے دوستوں سے ملاقات ہو جاتی تھی اسی طرح ایک روز پلیٹ فارم پر کھڑا ہوا میل ٹرین کا نظارہ کر رہا تھا کہ علامہ نظر آئے۔ لپک کر ٹرین میں سوار ہو گیا اور ملاقات کی تو فرمایا میں حیدر آباد سے واپس جا رہا ہوں، پھر ان تمام اختلافات کا ذکر فرمایا جو حیدر آباد میں ہوئے اور دیر تک حیدر آباد کے متعلق گفتگو فرماتے رہے۔ شولاپور تک میں نے ساتھ دیا اور وہاں اتر پڑا، اتفاق سے قیام گلبرگہ کے زمانے میں مجھے بمبئی جانے کا اتفاق بھی اکثر ہوتا رہا سنہ ۱۹۳ء میں آخری ملاقات علامہ سے بمبئی ہی میں ہوئی اس کے بعد سے نہ تو میں بمبئی جا سکا اور نہ کسی دوسری جگہ علامہ سے نیاز حاصل ہو سکا۔

میرے نگاہی مضامین کا مجموعہ "غنچۂ تبسم" شائع ہوا تو میں نے بھجوایا جسے علامہ نے بہت پسند فرمایا، خصوصاً دو ایک مضامین بہت پسند کئے اور مجھے لکھا کہ فرصت ہوئی تو میں "فنشی" اور "گھر داماد" دونوں مضامین کا ترجمہ انگریزی میں کروں گا، میں نے ریختی گو شعراء کا تذکرہ بھی بھجوایا تھا اسے دیکھ کر تحریر فرمایا "کتاب مجھے پسند نہیں آئی ممکن ہے اس خاص شاعری کے پسند کرنے والوں کے لئے کار آمد ہو مگر ایسے کام کرنا وقت ضائع کرنا ہے" عجیب اتفاق ہے کہ نواب فخر یار جنگ بہادر معتمد فینانس نے بھی میرے تذکرۂ ریختی کو ملاحظہ فرما کر مجھے تحریر فرمایا تھا، "خدا آپ کے ادبی اور اخلاقی نقاطِ نظر میں انطباق بخشے۔"

علامہ کی سب سے زیادہ جو بات مجھے پسند تھی وہ ان کی علمی رواداری اور وسعتِ قلبی تھی بڑی سیر چشمی سے تشنگانِ علم کو سیراب کرتے۔ خصوصاً نو آموزوں کی دل افزائی فرماتے اور ہمت بندھاتے تھے، جن دنوں علامہ سے مجھے نیاز حاصل ہوا ہے میری مضمون نگاری کی ابتدا تھی اور چار چھ مضمون میرے چھپ چکے تھے جنہیں دیکھ کر علامہ نے میری بڑی ہمت افزائی کی تھی اور بہت سے مفید اور کار آمد مشورے دئے تھے جو میرے لئے مشعلِ راہ ثابت ہوئے اور انہی کو پیشِ نظر رکھ کر میں نے مضمون نگاری کی۔

مطالعہ کا طریقہ اور اپنے مفید مطلب مضامین کے نوٹس لینے کے متعلق علامہ نے بڑی عمدہ ہدایات دی تھیں۔ علامہ نے بڑی تفصیل سے مجھے سمجھایا تھا کہ انشا پرداز بننا ہو تو مطالعہ نہ چھوڑو ہر ایک کتاب پڑھو، اسے سمجھو اور اس کے مضامین اپنے دماغ میں محفوظ رکھا کرو۔ ایک ہی موضوع پر مختلف مصنفین کی کتابیں یکے بعد دیگرے غور سے پڑھا کرو اور ایک دوسرے میں کیا فرق ہے غور کیا کرو۔ کسی موضوع کو حقیر اور پامال نہ سمجھو، ہر موضوع کا مطالعہ کرو، اس طرح اور بھی بہت سی باتیں علامہ نے بتائی تھیں۔

حقیقت یہ ہے کہ میرے ابتدائی مضامین جو ایک اٹھارہ سالہ نوجوان کی نومشقی کا نتیجہ تھے دیکھ کر اگر علامہ اظہارِ پسندیدگی نہ فرماتے اور میری خود بیانی اور کج زبانی دیکھ کر خاموش ہو جاتے تو میں اس قصے ہی کو ختم کر دیتا مگر علامہ نے میری بڑی ہمت افزائی کی اور مجھ میں خاصی تشویق اور ہمت پیدا کی جس کا نتیجہ نکلا کہ میں نثر ہی کو اپنا کر لکھتا رہا اور آج تک لکھ رہا ہوں، معلوم نہیں میری طرح علامہ نے اور کتنوں کو انشا پرداز بنا دیا، خداوند عالم علامہ کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔ آمین!

عبداللہ العمادی

ہوش سنبھالنے کے بعد سے علامہ عبداللہ العمادی کی تصانیف اور مضامین میرے مطالعہ میں رہتے مگر کبھی ان سے مجھے نیاز حاصل نہیں ہوا تھا۔ دارالترجمہ کے قیام کے بعد جب عمادی حیدرآباد آئے تو مجھے یہ سعادت نصیب ہوئی اور پہلی ہی ملاقات میں انہوں نے مجھے ایسا گرویدہ کر لیا کہ میں ان کا حلقہ بگوش ہو کر رہ گیا۔ معلوم نہیں کس نے میرا تعارف کرایا تھا یا کسی اور نے بہرحال میرا نام سنتے ہی بے انتہا مسرور ہو گئے، میرے بعض مضامین کا حوالہ دیا اور فرمایا کہ میں تمہارے مضامین پڑھ کر خوش ہوتا اور تمہارے لئے دعا کیا کرتا تھا۔ تم میرے لئے اجنبی نہیں ہو، میں مدت سے تم سے مانوس ہوں۔ ان کی اس شفقت و عنایت کا مجھ پر اتنا گہرا اثر ہوا کہ میں نے بھی انہیں اپنا شفیق بزرگ اور مداح سمجھ لیا اور یہ شفقتیں و عنایتیں آخر وقت تک میرے حال پر مبذول رہیں۔

عمادی کم رو، کم گو، گم سم قسم کے بزرگ تھے۔ نیا شخص ان سے مل کر نہ تو انہیں عالم سمجھ سکتا اور نہ ہی معقول آدمی بلکہ اجنبی اگر ان کے اسم گرامی اور علمی کارناموں سے واقف نہ ہوتا تو انہیں خاطر ہی میں نہ لاتا۔ بظاہر کم گو تھے مگر مسائل علمیہ کے وقت ان کی زبان آوری قابل دید ہوتی۔ جب کھل جاتے تو ان کی طلاقت لسانی ظاہر ہونے لگتی اور ایسے جواہر بکھیرتے کہ سننے والا مالا مال ہو جاتا۔ سوا مطالعہ کے کسی بات کا شوق ہی نہ تھا۔ کپڑا بالکل معمولی پہن لیتے، کھانا بھی اسی طرح ہوتا، سر پر البتہ رکھی ہوتی تھی کیونکہ دودھ جانا پڑتا تھا۔ طبیعت میں اس قدر غربت اور انکسار تھا کہ میں نے اس قسم کے کسی بزرگ میں نہیں دیکھا، کوئی اپنی کتاب لا کر ضد کرتا کہ مولانا تقریظ لکھ دیجئے، کتاب الٹ پلٹ کر دیکھی، سرسری طور پر پڑھ لیا اور برداشتہ قلم تقریظ لکھ دی۔ لطف یہ کہ صاحب تصنیف کی تعریف اتنی کر دہ پھولوں نہ سماتا اور آخر میں ایک آدھ فقرہ ایسا لکھ دیتے کہ جاننے والے جان جاتے کہ یہ سب ایک مبتدی کی دل افزائی کے لئے لکھا ہے۔ معلومات کا یہ حال تھا کہ کسی موضوع پر گفتگو کیجئے یہ معلوم ہوتا کہ وہ اس فن کے ماہر ہی ہیں۔ میں انہیں صرف عالم سمجھتا تھا فن تاریخ میں ان کی قابلیت مجھے معلوم ہی نہ تھی ایک دفعہ پوچھا کیا کر رہے ہو، تو میں نے عرض کیا "ارسطو جاہ" پر کام کر رہا ہوں۔ آپ نے ارسطو جاہ کا نام اور پورے خطابات بیان کر کے پوچھا۔ وہی ارسطو جاہ؟ میں نے عرض کیا جی ہاں وہی! بس ارسطو جاہ کی کارگزاریاں جو گنانے لگے تو معلوم یہ ہو رہا تھا کہ میں نے آٹھ دس سال کی محنت میں جو چیزیں جمع کیں وہ عمادی کی زبان کی نوک پر ہیں۔ میں نے حیرت ظاہر کی تو فرمایا چونکہ تم تحقیق کر رہے ہو اور مسلسل اس موضوع پر کام کر رہے ہو اس لئے تمہیں حیرت ہو رہی ہے تاریخ کے پورے مقامات میری نظر میں ہیں چنانچہ میں نے اپنی یہ کتاب پیش کی تو ملاحظہ فرما کر بڑی داد دی اور جہاں جہاں میں نے تحقیق کی تھی اور جو باتیں میں نے گھر یلو مواد اور خانگی اسناد کی بنا پر لکھی تھیں ان کی داد دی کہ یہ کام تم نے بڑا اچھا کیا ہے یہ مواد دوسرا شخص فراہم نہ کر سکتا تھا۔

طبیعت میں استغنا اور درگذر کا مادہ بہت تھا، ہمیشہ اپنی حالت پر قانع رہے اور بڑے سے بڑے مخالف کو بھی کبھی مخالف نہیں سمجھا ہر ایک کو دوست ہی سمجھتے تھے، اسی وجہ سے ان کے مخالفین بھی بہت ہی کم تھے اور جو تھے بھی تو مخالفت کرتے ہوئے شرماتے تھے یہ ان کے کردار تھے جن کی وجہ سے دشمن بھی ان کو دوستی پر مجبور رہتے۔

ارسطو جاہ پر کام کر کے میں نے نواب یوسف علی خان (سالار جنگ) کو دشمن بنا لیا تھا چونکہ ارسطو جاہ میر عالم کے آقا اور میر عالم کی زندگی بنانے والے تھے اس لئے ان کی سوانح حیات میں میر عالم کا چہرہ بے نقاب ہو رہا تھا۔ نواب صاحب نے ابتداً یہ چاہا کہ میر عالم کے خلاف جتنی باتیں ہیں انہیں قلم زد کر کے شائع کروں مگر میں اس کے لئے آمادہ نہ ہوا تو انہوں نے کوشش کی کہ یہ کتاب چھپنے نہ پائے چنانچہ اپنے اثر سے کام لے کر حکومت سے جو امداد اس کتاب کی اشاعت کے لئے مل رہی تھی اسے رکوا دیا۔ اس پر مجبور ہو کر میں نے [illegible]

طور پر لکھا جس میں خیر النساء کا تعلق میر عالم کے خاندان سے ثابت کر کے میں نے اپنے دل کا غبار نکال لیا تھا، میں نے اس کا ذکر کیا تو عمادی نے بڑا اشتیاق ظاہر کیا کہ مجھے دکھاؤ۔ میں نے مسودہ پیش کیا تو یہ کہہ کر رکھ لیا کہ دیکھ کر واپس کروں گا۔ دو تین روز کے بعد جب میں نے مسودہ مانگا تو ادھر ادھر کی باتوں کے بعد فرمایا اگر تم سے میں کوئی خواہش کروں تو پوری کرو گے؟ میں نے عرض کیا ضرور! تو فرمایا اس مسودے کو ضائع کر دو ایسی کتاب ہرگز شائع نہ کرنا۔ میں نے بحث شروع کی تو فرمایا تم نے وعدہ کیا ہے میری خاطر یہ کام کر دو۔ چنانچہ میں نے ان سے مسودہ لے کر وہیں چاک کر دیا اور پرزے انھی کی میز کے نیچے رکھی ہوئی ردی کی ٹوکری میں ڈال دیے، میرے اس طرز عمل سے خوش ہو کر بہت دعائیں دیں اور فرمایا میاں! ایک بڑے گھرانے کی عورت کا ناجائز تعلق ریذیڈنٹ ہی سے سہی مگر شرمناک بات ہے۔ تم فقط عاقل الدولہ کے خاندان کو ذلیل کرنا چاہتے تھے جس میں میر عالم ضمنی طور پر آجاتے ہیں مگر یہ تو پورے دکن بلکہ سارے ہندوستان کے لئے ذلت کی بات ہے، اپنے ہاتھوں اپنے آپ کو ذلیل کر لینا کیا بات! اچھا ہوا جو تم نے مسودہ چاک کر دیا۔ خدا تمہیں اس کی جزائے خیر دے گا۔ بعد میں جب میں نے غور کیا تو معلوم ہوا کہ عمادی نے یہ مسودہ چاک کروا کر مجھ پر بڑا احسان کیا۔ اگر یہ طبع ہو جاتا تو بڑی بری بات تھی۔ اس طرح وہ اپنے چھوٹوں کی زندگی بنایا کرتے تھے۔

مومن خاں مومن دہلوی پر میں نے کام شروع کیا تو مجھے بہت سا مواد نوٹ کرا دیا اور بڑی دلسوزی سے مشورے دیتے رہے، علی گڑھ سے مومن کے فارسی کلیات کی نقل میں نے منگوائی تو بہت خوش ہوئے اور کتاب آتے ہی لے کر خود ملاحظہ کیا اور پنسل سے بیشتر اشعار پر نشانات بھی بنا دیے، باوجود لکھنؤ اسکول کے مقلد ہونے کے مومن کے معترف اور مداح تھے اور مومن کے قصے بڑی دلچسپی سے سناتے تھے۔

علمیت کا یہ عالم تھا کہ دریا تھے تمام شعبہ ہائے علوم پر حاوی تھے اور ہر شعبہ پر عمیق نظر تھی، عام طور پر پرانے علماء یک فنے ہوتے تھے۔ حدیث پر عبور ہو تو صرف و نحو میں نیاز مند، صرف و نحو پر عبور ہو تو حدیث و فقہ میں کورے، مگر عمادی کی نظر سب پر یکساں تھی۔ ادب الجاہلیہ، ادب اسلامیہ، قرآن، حدیث، فقہ سے لے کر تاریخ، جغرافیہ، طب اور علوم جدیدہ پر تک حاوی تھے اور جس فن پر بھی گفتگو کرتے معلوم ہوتا تھا کہ اس فن کے ماہر خصوصی ہیں اور عمر اسی فن میں گزاری ہے۔ ایسے ہمہ گیر عالم کم از کم میری نظر سے ایک دو ہی گزرے ہیں ورنہ میں نے بیشتر علماء کو ایک آدھ فن ہی پر حاوی پایا ہے۔

حیدر آباد میں ایک بزرگ حکیم ابراہیم جامعہ طبیہ کے پروفیسر تھے جو بڑے دماغ دار اور ذہین تھے۔ ہزاروں شعر نوک زبان تھے، شعراء جاہلیہ، شعراء اسلام، شعراء ایران اور شعراء ہند کے ہم معنی شعر ہزاروں یاد تھے جنھیں وہ گھنٹوں سنایا کرتے تھے مگر ان میں صرف حافظہ کا کمال تھا علمیت نہ تھی۔ برخلاف ان کے علامہ عمادی باوجود علمیت کے ان سے اچھے حافظے کے مالک تھے، قاضی تلمذ حسین نے ریاض خیر آبادی کی خمریات کا ابو نواس سے مقابلہ شروع کیا تھا، ایک روز معلوم نہیں قاضی صاحب نے عمادی کو بلوایا تھا یا وہ خود پہنچ گئے تھے کہ خمریات کا دور ہو رہا تھا۔ خوش نصیبی سے میں بھی پہنچ گیا تو عمادی نے کاغذ قلم میرے آگے کھسکا دیا۔ اب یہ ہونے لگا کہ قاضی صاحب ریاض کا شعر پڑھتے جسے سنتے ہی عمادی ابو نواس کا شعر اسی مضمون کا سناتے اور پھر عرب کے دوسرے شعراء کے شعر یکے بعد دیگرے سنا کر اساتذۂ عجم کے شعر بھی سناتے، جنھیں میں لکھ لکھ کر قاضی صاحب کو دیتا جاتا کیونکہ قاضی صاحب کا بہرہ پن اتنا بڑھ گیا تھا کہ چیخنے پر بھی سنائی نہ دیتا تھا، ابو نواس کے شعر قاضی صاحب کو بھی یاد تھے مگر دوسرے شعراء عرب اور ایران کے شعر سن کر یا پڑھ کر قاضی صاحب پھڑک پھڑک جاتے تھے۔

صرف شعر ہی عمادی کو یاد نہ تھے بلکہ وہ عروض پر بھی حاوی تھے اور عروض کی غلطیاں بیشتر اساتذہ کے اشعار سے نکالتے رہتے۔ قاضی تلمذ حسین نے ریاض کا کلیات چھپوانا شروع کیا تو سب سے پہلے عمادی نے اس کی مخالفت کی کہ اتنا رطب و یابس چھپا کر روپیہ برباد کرنے کی بجائے ریاض کے کلام کا انتخاب شائع کر دو مگر قاضی صاحب بھی ضدی تھے اور انھیں کچھ ایسی عقیدت یا محبت ریاض سے تھی کہ انھوں نے اتنا ضخیم کلیات

ترکی نور محلی

غلام احمد ترک علی شاہ قلندر ترکی نور محلی پانی پتی، عجیب و غریب بزرگ تھے ابتداً غلامی تخلص کرتے تھے پھر غوث علی شاہ قلندر پانی پتی کے
سلسلہ میں قلندر ہو گئے اور ترک علی شاہ نام رکھ کر ترکی تخلص کرنے لگے۔ فردوسی کی باقیات الصالحات سے تھے۔ ناطق مکرانی، واثق ہراتی، امام بخش
صہبائی کی شاگردی کا فخر تھا۔ ان بزرگوں سے فارسی پڑھی تھی مگر اردو میں بھی ترک تازی کی تھی اور ریختہ میں میر علی اوسط رشک سے تلمذ تھا۔
ترکی خود تو کچھ نہ تھے مگر شاعر گر ضرور تھے۔ ہزاروں کو شاعر بنا دیا تھا۔ چنانچہ شیخ غلام قادر گرامی جالندھری کو ترکی ہی نے شاعر بنایا۔ گرامی ان
کے سالے تھے اس لئے ترکی نے گرامی کی پرورش پرداخت کی، لکھایا پڑھایا اور شاعر بنا کر چھوڑا، چونکہ ترکی نہایت کمزور طبیعت کے آدمی تھے
اور حد درجہ زود رنج اس لئے گرامی نے تنگ آکر ان کا ساتھ چھوڑ دیا تھا اور ترکی کو مانگھٹ میں چھوڑ کر دکن آ گئے تھے مگر ترکی نے دکن میں بھی ان کا
پیچھا نہیں چھوڑا اور خود حیدرآباد پہنچ گئے اور یہاں بھی گرامی کو تنگ کرتے رہے۔
خوش نصیبی سے والد مرحوم (تجلی) اپنا فارسی کلام ترکی ہی کو دکھایا کرتے تھے اور ترکی سے بڑے پُرخلوص مراسم تھے اس لئے میں نے ترکی کی
گود میں کھیل کود کر ہوش سنبھالا ہے اور بعض عادتیں ترکی کی پائی ہیں چنانچہ اعتراض کرنا ترکی ہی نے مجھے سکھایا تھا اور میرے نام سے اعتراض لکھ کے
مجھے پڑھایا کرتے تھے، والد مرحوم داغ کے انتقال کے بعد سے پہلے اپنی اردو غزل حافظ مرزا منیر الدین ضیا گورگانی خلف مرزا رحیم الدین حیا کو دکھایا
کرتے تھے اس لئے ضیا کا احترام بہت کرتے تھے اور ضیا اکثر غریب خانہ پر آیا کرتے تھے ایک روز دیوان خانہ میں بڑا مجمع تھا۔ ترکی، ضیا،
کیفی وغیرہ بیسیوں شعراء موجود تھے کہ مرزا ضیا نے غزل سنائی جس میں ایک شعر تھا ؎

اے مقدر غیر کو وہ اس طرح ساغر پلائیں
جام ہو تھالی کے اوپر جام پہ سرپوش ہو

ترکی نے شعر سن کر اِدھر اُدھر دیکھا میں ان کے پیچھے بیٹھا ہوا تھا۔ مجھ سے مخاطب ہو کر کہا خود کیوں نہیں کہتے بڑھ کر کہو، یہ سن کر سب ترکی
کی طرف متوجہ ہو گئے۔ ضیا نے پوچھا کیا ہے تو ترکی نے اطمینان سے کہا یہ تجلی زادہ کہہ رہا ہے کہ آپ نے اس فارسی کے شعر سے مضمون لیا ہے"

بعد تمیز بہ اغیار مے دہد ساقی
یکف حنا شدہ جام و بجام سرپوش است

یہ سننا تھا کہ مرزا ضیا کے غصے کا پارہ چڑھ گیا اور انہوں نے تیوری چڑھا کر بیاض جیب میں رکھ لی اور جھٹ سے اٹھ کر دیوان خانہ سے
چلے گئے۔ یہ قصہ اتنا جلد ہوا کہ والد مرحوم مرزا ضیا کو روک بھی نہ سکے البتہ یہ غصہ انہوں نے مجھ پر اتارا اور دو تھپڑ رسید کر دیے۔ جب میں
پٹ چکا تو کیفی صاحب نے بگڑ کر کہا۔ خواہ مخواہ غریب پٹ گیا۔ استاد! آپ کو کچھ کہنا ہی تھا تو اپنی طرف سے کہتے بچے کی طرف سے
اس قسم کی باتیں کر کے اسے پٹوا دینا کیا بات ہے؟ جب کیفی نے اطمینان دلایا کہ میں نے کچھ نہیں کہا یہ استاد کی کرامت تھی تو والد کا غصہ
کم ہوا۔

یہ عادت استاد ترکی کی عمر بھر رہی۔ مشاعرے میں بھی کسی نہ کسی کے نام سے اعتراض کر دیتے اور ہنگامہ مچایا کرتے تھے۔ انتہا یہ کہ ایک
کتاب ترکی نے لکھی ہے "گلبانگ ترکی" اس میں صرف اعتراض ہی اعتراض ہیں۔ طریقہ یہ اختیار کیا ہے کہ شعر اور ان پر سید لکھ کر کسی نہ کسی کے
کلام پر اعتراض کیا ہے بعض اعتراضوں کا جواب بھی خود ہی دیا ہے اور بعضوں کی توثیق کی ہے۔
جس سے خوش ہوتے ان کی داد دیتے اور جس سے خفا ہوتے اس پر کچھ نہ کچھ اعتراض جڑ دیتے تھے چنانچہ داغ کے حیدرآباد آنے کے بعد

ظہیر دہلوی بھی آ گئے اور انہیں داغ نے مہاراجہ کشن پرشاد بہادر کے پاس رکھوا دیا تو اختر مینائی (خلف امیر مینائی) اور جلیل (فصاحت جنگ)
جو پہلے سے مہاراجہ کے پاس تھے ظہیر کی مخالفت کرنے لگے اور ان دونوں نے ترکی کو ہموار کر کے آگے کر دیا چنانچہ ہر مشاعرہ میں ترکی نے
ظہیر پر فقرے کسے اور داغ پر پھبتیاں اڑائیں۔ داغ چونکہ اس مشاعرے میں شریک نہ تھے اور ظہیر نے غزل پھاڑ کر مشاعرے سے نکل کر
داغ کو سارا قصہ سنا دیا تھا اس لئے داغ نے مہاراجہ بہادر کو لکھا اور مہاراجہ نے ترکی کی خوب خبر لی اس طرح ترکی کی ترکی تمام ہو گئی
اور انہوں نے جلیل اور اختر کو چھوڑ کر ظہیر سے دوستی کر لی اور پھر ایسے دوست بن گئے کہ ظہیر کے مرنے تک رفاقت کی بلکہ ظہیر کے دفن
کے وقت رو رو کر بدحال ہو گئے، اس طرح ترکی کی دشمنی وقتی ہوتی تھی مگر دوستی کے معنی ترکی کے پاس اعتراض نہ کرنے کے نہ تھے وہ ہر ایک
پر اعتراض کرتے اور ہر ایک کی ہنسی اڑاتے تھے۔

مہاراجہ کشن پرشاد ان کے مربی تھے سو روپیہ ماہوار دیا کرتے اور عید بقرعید، دیوالی دسہرے پر الگ سلوک کرتے پھر بیچ میں ترکی
اپنی ضرورت کا اظہار کر کے الگ لے لیا کرتے تھے مگر باوجود اس کے موقع پر نہ چوکتے بلکہ مہاراجہ کی ہنسی بھی اڑاتے تھے مہاراجہ بہادر
تو مستقل مربی تھے مگر طوبیٰ شوستری، صف شکن جنگ (نواب نادر بن) ضیا یار جنگ طلسمی وکیل، وزیر الدولہ، عبدالجبار خان آصفی،
تجلی، محمد علی خان ناظم، صولت جنگ عابد وغیرہ ہمیشہ ترکی کی مالی امداد کرتے تھے مگر یہ ان لوگوں کو بھی نہ بخشتے بلکہ موقع پر ڈنک مار ہی
دیتے تھے۔

عبدالجبار خان آصفی بڑے اچھے شاعر اور بڑے عالم تھے ترکی پر بہت مہربان رہتے تھے اور ڈرتے بھی تھے۔ چنانچہ آصفی اکثر کہا کرتے تھے
کہ برعکس نہند نام زنگی کافور کے مصداق "کاٹیا واری" کا نام ترکی رکھا گیا ہے، چونکہ کاٹیا واری گھوڑا بدفطرت اور منہ زور ہوتا ہے اس لئے آصفی
ترکی کو انہی صفات سے متصف پاتے تھے۔

منادالملک طوبیٰ شوستری بڑے عالم تھے۔ ایرانی نژاد تھے مگر عربی زبان پر بڑا عبور تھا اور باوجود عجمی ہونے کے عربی پر اتنی قدرت تھی کہ عربی ان
کی مادری زبان معلوم ہوتی تھی۔ یہ بھی ترکی کے مربی اور محسن تھے مگر ترکی انہیں خاطر ہی میں نہ لاتے تھے اور ہمیشہ ان پر اعتراض کیا کرتے تھے ایک
روز آغا شوستری بیٹھے ہوئے ایرانیوں کی تعریف اور اہل ایران کی فضیلت بیان کر رہے تھے اور ڈینگ مار رہے تھے کہ ایرانی نہایت ہی فہیم ہوتے ہیں
اور ذکی ہوتے ہیں، ان کا دماغ نہایت رسا ہوتا ہے، ہر چیز بڑی آسانی سے سیکھ جاتے ہیں چنانچہ ؎

عقل و دانش ہمہ با مردم ایران دادند

بالکل صحیح کہا گیا ہے، یہ گفتگو ہو ہی رہی تھی کہ حضور نظام (مرحوم) کا چوبدار آیا اور کہنے لگا کہ حضور نے یاد فرمایا ہے۔ آغا شوستری نے کہا "تم چلو،
ہم آتا ہے۔" بس یہ جملہ منہ سے نکلا ہی تھا کہ ترکی جھاڑ کا کانٹا بن کر لپٹ گئے۔ کہنے لگے "استاد! آپ پندرہ بیس سال سے ہندوستان میں ہیں، دن بھر
اردو بولتے اور سنتے رہتے ہیں اب تک آپ کو اردو نہ آئی۔ ابھی آپ نے فرمایا "تم چلو، ہم آتا ہے" بخلاف آپ کے ہم ہندوستانیوں نے ایران
کی صورت تک نہیں دیکھی نہ ایرانیوں سے صحبت رہتی ہے اور نہ ہمارا روزمرہ فارسی ہے۔ پھر بھی ہم صحیح فارسی بولتے، لکھتے، پڑھتے ہیں اور شعر بھی ایسے
کہتے ہیں جنہیں سن کر آپ بھی رشک کرتے ہیں، ایسی شتر گربہ زبان تو ہم نہیں کہتے جیسی ابھی آپ نے کہی۔ اب فرمائیے ایرانی افضل ہیں یا ہندوستانی؟"
اس طرح ترکی کسی کو نہ بخشتے تھے۔

امجد حیدرآبادی جو حیدرآباد کے مشہور اور ہندوستان کے واحد رباعی گو شاعر ہیں ترکی کے شاگرد تھے۔ شاید انہیں اپنی قابلیت کا زعم ہو مگر
ترکی اسے برداشت نہ کر سکے بلکہ اپنی شاگردی سے نکال دیا اور اتنے خفا ہوئے کہ اپنے تذکرہ "سخنوران چشم دیدہ" میں لکھ مارا:

"امجد تخلص، احمد حسین نام، حیدرآبادی، سن سال عمر سے بارہ [illegible]"

بہرہ یافتہ بتلامذۂ فقیر منسلک شدہ بہ شعر خود در چند روز نا زیبان و با ہر کسے ہجویات

آغاز کرد، لہٰذا او را از آمدن منع کردم"

غور فرمائیے آنجہانی جیسا فاضل "قدرے از عربی و فارسی بہرہ یافتہ" کا مستحق ٹھہرے تو دوسرے کس شمار و قطار میں! تسکین کا حال تو یہ تھا کہ اساتذۂ عجم بھی در خور اعتنا نہ تھے۔ ایک... مشاعرے میں اردو قطعہ پڑھا جس کے چند شعر مجھے یاد رہ گئے ہیں ؎

میری نظر میں ذرہ سے کم ہے کلام مہر　　شاہد مرے سخن کا ہے خورشید خاوری
اچھا ہوا کہ پہلے ہی مجھ سے گزر گئے　　سعدی و انوری و دقیقی و رودکی
ورنہ دکھاتے رنگ طراز سخن انہیں　　کچھ ٹوٹی پھوٹی ان کی بھی سن لیتا پارسی

ظاہر ہے کہ جو تسکین سعدی، انوری، دقیقی اور رودکی کی ٹوٹی پھوٹی فارسی سننے کا احسان کر سکتا ہے وہ بھلا معاصرین اور شاگردوں کی کیا دل افزائی کرتا ہوگا؟ تسکین فقط انہی لوگوں کی بڑھی سی تعریف کیا کرتے تھے جو ان کے مداح، معتقد، مربی یا محسن تھے ورنہ دوسروں پر زبان تعریض کھلی رہتی۔ مگر اپنے بھی رتبہ سمجھتے بلکہ ان پر بھی منہ مارتے تھے، غرض استاد تسکین اپنے تخلص کے اعتبار سے اپنے آپ کو آٹھوں گانٹھ کمیت سمجھتے تھے مگر بقول اصغر ان میں خاص اکا ٹھیاواڑ پن موجود تھا اور ہیچ عیب شرعی سے منفعت تھے۔

مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ نہایت نیک دل اور رقیق القلب تھے۔ استاد ظہیر دہلوی سے جب ان کی دوستی ہوگئی اور ان کی حالت سے واقف ہو گئے تو ان کی بڑی امداد و اعانت کرتے رہے ہیں ذاتی طور پر واقف ہوں کہ لوگوں سے کہہ کہہ کر ظہیر کی رقمی امداد کرائی اور خود بھی دامے درمے قدمے سخنے کام آتے رہے، بیشتر حاجتمندوں کو مہاراجہ کے پاس پیش کر کے امداد دلواتے۔ نواب صاحب ٹانڈہ سے رقم دلواتے اور جہاں تک ہو سکتا سعی و سفارش میں دریغ نہ کرتے تھے، اعتراض تو وہ اپنے بڑوں پر بھی کرتے تھے اس سے ان کی دانست میں دل آزاری یا کسی کی خفت ہونے کی کوئی وجہ نہ تھی اپنی قابلیت اور ذہانت کے اظہار اور تفریح سے غرض تھی اس لئے وہ اس کو اہمیت ہی نہ دیتے تھے، مشاعرے میں بے دردی سے اعتراض کر کے ناک میں دم کر دیتے اور دوسرے روز اسی شخص کے گھر جا کر جس پر اعتراض ہوتے تھے مل لیتے۔ ان کی موجودگی میں کوئی دوسرا کسی پر اعتراض کرتا تو خود آستین چڑھا کر معترض کے اعتراضوں کا ایسا دندان شکن جواب دیتے کہ وہ اپنا سا منہ لے کر رہ جاتا۔ ہزاروں شعر یاد تھے اور عروض پر پورا عبور تھا۔ سند میں شعر پیش کرنے میں تو کمال تھا۔ پے در پے سیکڑوں شعر سند کے سناتے اسی لئے ہر شخص ان سے ڈرتا تھا اس اعتراض میں لطف یہ ہوتا تھا کہ آپ نے کسی پر اعتراض کیا اور اپنی تائید میں دس پندرہ شعر سنا دیئے اور کسی نے یہ اعتراض سن کر ایسے ہی موقع پر یہی اعتراض جڑ دیا اور یہ موجود رہے تو فوراً معترض سے لپٹ پڑتے اور اس کے خلاف بحث کرنے لگتے اور اپنی تائید میں اساتذہ کے شعر بھی سناتے جاتے۔ اس طرح سبقت بھی ان کی رہتی اور پٹ بھی ان کی، غرض صرف یہ ہوتی کہ میری دھاک بندھی رہے اور میں سب پر چھایا ہوا رہوں۔ والد مرحوم ان کی اس حرکت پر ہمیشہ ٹوکا کرتے مگر وہ ایک نہ سنتے تھے۔

دوسرا ان پر اعتراض کرتا تو بھی خفا نہ ہوتے بلکہ خوش ہو کر بحث کرتے اور معترض کو قائل کر کے دم لیتے تھے، ایک روز ہمارے دیوان خانے میں بیٹھے ہوئے تازہ غزل سنا رہے تھے۔ مطلع کا دوسرا مصرعہ تھا ع

رگ لیلیٰ زند آں جا زمجنوں خوں چکید ایں جا

مجھے چونکہ خیال ہوا اعتراض کر کے تسکین نے چھوڑ دیا تھا اس لئے میں مقطع کا طالب ہی تھا یہ مصرع سنتے ہی میں نے کہا استاد نظام الدین کے مشہور مصرع

کھلا جو فصد لیلیٰ نے تو رگ مجنوں کے خون نکلا

کا ترجمہ ہے، یہ سن کر استاد بہت بگڑے۔ والد مرحوم نے بھی شاباش دی مگر تسکین ذرا دیر کے بعد استاد نے مجھے شاباشی دی کہ برخوردار ایسا ہی خیال

ماشاءاللہ پورے قد کے آدمی تھے، ہڈی چوڑی، ہاتھ مضبوط تھا، غذا بھی خوب تھی، آخر میں ہیر کا شوق فرمانے لگے تھے غالباً افیون بھی کھانے لگے تھے کیونکہ مٹھائی سے بہت رغبت ہو گئی تھی۔

میری والدہ مرحومہ کو ترکی سے بڑا اعتقاد تھا اس کا ایک قصہ والدہ سناتی تھیں کہ میری ولادت سے پہلے ایک لڑکا تولد ہوا، ترکی نے اس کی تاریخ ولادت کہی اور قطعہ اپنے ہاتھ سے لکھ کر والدہ کے پاس بھجوایا چند روز کے بعد والدہ نے والد مرحوم سے کہا کہ اس قطعے کو صاف لکھوا کر فریم کرا دیں چنانچہ والد نے اسے امیر قلم سے لکھوانا چاہا تو ترکی نے کہا "ارے بھائی! جلدی نہ کرو، اس بچے کا قطعہ گھر میں لگانے کی ضرورت نہیں اس کے بعد جو بچہ ہوگا اس کا قطعہ تاریخ ہم خود ہی لکھوا کر آئینہ لگوا کر دیں گے وہ دیوار پر لگانا۔" والد اس کو مجذوب کی بڑ سمجھ کر خاموش ہو گئے مگر والدہ نے کہا چند روز ٹھہر جائیے ترکی صاحب قلندر ہیں، یہ لوگ غیب کی باتیں بتاتے ہیں۔ چنانچہ چند ہی مہینے کے بعد اس لڑکے نے انتقال کیا اور اس کے بعد میری ولادت ہوئی چنانچہ میرا قطعۂ تاریخ ولادت کہہ کر رنگین کاغذ پر خوش خط لکھوا کر اطراف سونے کا کام کرا کر فریم کر کے ترکی نے دیا کہ اسے دیوار پر لگا دو یہ ایسی کرامت تھی کہ والدہ مرحومہ ترکی کی معترف ہو گئی تھیں اور نانی اماں تو بس ترکی کو زندہ ولی سمجھتی تھیں جب کبھی فاتحہ، نذر و نیاز ہوتی سب سے پہلے ترکی کے گھر حصہ جاتا اور ترکی جب گھر آتے تو ڈیوڑھی کے صدا لگاتے "دودھ ملیدہ اللہ ہی دے گا" اور والدہ ان کے لئے کچھ نہ کچھ میٹھا بھجواتیں۔ اگر میٹھا تیار نہ ہو تو بالائی اور چائے ضرور مل جاتی اور استاد پاؤ پیالی چائے میں دودھ ملائی اور آدھی پیالی شکر ڈال کر ایک لب بند لب ریز پیالی بنا لیتے اور مزے مزے لے کر پیتے تھے جس کا نام انہوں نے لب دبڑ رکھا تھا۔

ترکی کو اپنے قلندر پن پر ناز تھا اور واقعی وہ تھے بھی قلندر، سب کے دوست اور سب پر مہربان سب کو ایک ہی لکڑی سے ہانکتے تھے۔ کسی کی بد رعایت نہ کرتے اور ذرا بھی لگی لپٹی نہ رکھتے تھے۔ البتہ داد دینے میں بخیل اور اعتراض کرنے میں سخی تھے، وضع داری مطلق نہ تھی، قلندرانہ اکھڑ پن بہت تھا۔ طبیعت میں صلاحیت، بردباری اور متانت مطلق نہ تھی۔

مشاعرے میں پڑھنے کا انداز خاص تھا، ہمیشہ شاگردوں کا ایک ہجوم غفیر ساتھ لاتے اگر ساتھ زیادہ لوگ نہ ہوں تو مشاعرے میں بیٹھنے کے بعد حلقے والوں، شاگردوں اور جان پہچان کے لوگوں کو قریب بلا کر بٹھا لیتے، داد دیتے ہوئے صف سے آگے نکل جاتے، پڑھنے کا انداز بھی نہایت اچھا تھا، آواز گرجدار تھی، لہجہ نہایت مردانہ اور بڑے زور سے پڑھتے تھے۔ فارسی غزل سنانے لگتے تو معلوم ہوتا کہ ابھی ابھی ایران سے آئے ہیں وہ دھوم دھام سے غزل پڑھتے کہ محفل چونک اٹھتی، کبھی دوہرے ہو جاتے کبھی صف سے آگے بڑھ جاتے کبھی تا بزانو اٹھتے اور کبھی کھڑے ہو جاتے، ایک مشاعرے میں رباعی پڑھی ؎

دیکھیں برتر کو جو غالب کو نہیں دیکھا ہے
ذوق کی گر ہے تمنا تو رسا کو دیکھو

نادر علی برتر کی طرف اشارہ کیا پھر مرزا غلام مصطفیٰ رسا کی طرف بتایا۔

اور ناسخ کی جو صورت کی ہے خواہش دل میں
ترکی مست کے انداز و ادا کو دیکھو

تیسرا مصرع تو صاف سیدھے طریقے سے سنا، اگرچہ چوتھے مصرع پر ترکی مست کہہ کر جھومتے ہوئے اٹھے اور بائیں پاؤں کے انگوٹھے کے بل کھڑے ہو کر سیدھا پاؤں اٹھا کر ایک چکر لگایا جس کی وجہ سے لبادہ کہ تہ پشواز کی طرح پھیل گیا اور مجلس مشاعرہ دنگ ہو گئی۔ یہ

ترکی مست کے انداز و ادا

تھے۔ عموماً ایسی حرکتیں مشاعرے میں کرتے کہ لوگ حیران ہو جاتے تفضل نامی ایک صاحب ان کے مرید با اخلاص تو نہیں البتہ مصاحب خاص

اسے چلانا شروع کیا، اس کا سلسلہ ابتدا ہی تھی کہ ایک روز میرے قدیم اور محترم مشفق حضرت سید شاہ عبدالقادر صاحب اپنی ڈاک کار پر جو تیزی سے تشریف لائے اور مجھے اپنے ساتھ اسی گاڑی میں بٹھا کر لے چلے اور نام پلی کے آرائش بلدہ کے بنوائے ہوئے مکانات پر پہنچ کر گاڑی روکی۔ ایک اسے کلاس کے مکان پر پہنچے تو دیوان خانہ میں ایک ریش دراز، قیم شحیم، سرخ و سپید خوش مزاج مرد مقدس نظر آئے شاہ صاحب نے بڑی ہی عقیدت سے دست بوسی کی اور میرا تعارف کرایا کہ یہ میرا دوست اور علوم مشرقیہ کا طالب علم اور ادب و انشاء کا رسیا ہے۔ پیر و مرشد نے بڑی خندہ پیشانی سے ملاقات فرمائی، تعلیم کے متعلق سوالات فرمائے، بعض عرب مصنفین کے متعلق گفتگو کی پھر فارسی شعراء کا تذکرہ کیا اور اردو شاعری پر دیر تک گفتگو اور بحث فرماتے رہے، شاہ صاحب نے شاید پہلے ہی سے میری شکایت کر رکھی تھی اس لئے پیر و مرشد نے تھوڑے تھوڑے وقفے سے میرا امتحان لینا شروع کیا اور جن جن چیزوں پر خود حضرت کے معلومات تھے ان کے متعلق بڑی تفصیل سے بات چیت کی گویا مجھ کو خوب ٹٹول رہے تھے کہ کتنے پانی میں ہے، دو تین گھنٹے تک گفتگو فرمانے کے بعد جب حضرت قبلہ نے اپنے اس نئے خادم کو کہیں بند نہ پایا تو "ابن وحشیہ" پر گفتگو فرمانے لگے، بدنصیبی سے ابن وحشیہ سے میں بالکل ہی ناواقف تھا اس نام کے ایک مصنف کے دو مختصر رسالے فن نیرنجات میں کتب خانہ آصفیہ کی فہرست میں ضرور نظر آئے تھے مگر چونکہ مجھے اس فن سے دلچسپی نہ تھی اس لئے میں نے ان کا مطالعہ نہیں کیا تھا۔

حضرت نے جب مجھے ابن وحشیہ سے ناواقف پایا تو اس کے فضائل و مناقب گنانا شروع کیا اور بڑی تعریف و توصیف فرمائی، بہرحال اس صحبت میں پیر و مرشد نے مجھے خوب پرکھ لیا اور دوسرے روز ملنے کا وعدہ لے کر رخصت کیا ساتھ ہی ساتھ میری کتابیں بھی دیکھنے کی خواہش کی۔ دوسرے روز صبح صبح شاہ صاحب نے پھر گرفتار کر لیا اور میں اپنی کتاب "غنچۂ تبسم" بغل میں داب کر شاہ صاحب کی ڈاک کار میں سوار ہو گیا۔ حضرت قبلہ میرے منتظر ہی تھے، گرما گرم میٹھا کھلایا اور بڑی نفیس چائے پلائی۔ میں نے اپنی کتاب پیش کی تو الٹ پلٹ کر دیکھا اور میرے والد مرحوم کی تصویر دیکھ کر چیخ اٹھے "ایں، پاشا بھائی؟ یہ تمہارے کون تھے؟" (میرے والد کا عرف پاشا میاں تھا اور ان کے بے تکلف قدیم دوست اور ساتھی پاشا بھائی پکارا کرتے تھے اس لئے میں بھی حیران ہو گیا کہ یہ حضرت میرے والد کو پاشا بھائی کیسے کہہ رہے ہیں) میں نے جب بتایا کہ میں انہی پاشا میاں کا بیٹا ہوں تو حضرت نے کھڑے ہو کر مجھے گلے سے چمٹا لیا اور آب دیدہ ہو گئے۔ دیر تک پرانے تذکرے کرتے رہے جب ذرا ان کی رقت کم ہوئی تو میں نے پوچھا آپ کب آیا کرتے تھے؟ فرمانے لگے تجھے خواجہ میاں یاد ہیں؟ میں نے عرض کیا جی کئی خواجہ میاں تھے، دو چار تو مغلپورہ ہی میں تھے۔ البتہ ایک پولیس میں انسپکٹر تھے۔ کہنے لگے ہاں ان کا کوئی بھائی بھی تھا؟ میں نے عرض کیا ہاں ایک ان کے چھوٹے بھائی پاشا محی الدین تھے جو فوٹوگرافی کا شوق فرماتے تھے۔ کہنے لگے میں وہی پاشا محی الدین ہوں۔ پھر میرا بچپن کا حلیہ اور میرے خاندان کے افراد کا پتہ نام بنام بتایا اور فرمانے لگے تجھ سے پہلی ملاقات ہی میں مجھے انس پیدا ہو گیا تھا اور مجھے یقین تھا کہ تو میرا عزیز ہے۔ اب مجھے چچا پکارنا۔ پھر کیا تھا میں چچا پکارنے لگا، یہ تھے میرے شفیق بزرگ سید شاہ محی الدین پاشا قادری وجودی شمسی۔

وجودی تخلص فرماتے تھے اور چونکہ حضرت شمس الدین اورنگ آبادی کے مرید اور خلیفہ تھے اس لئے اپنے آپ کو شمسی فرمایا کرتے تھے ۱۹۱۵ء تک بھی یہ حضرت ہمارے پاس آتے جاتے تھے اس کے بعد سے یہ نظر ہی نہیں آئے۔ ان دنوں جب یہ غریب خانہ پر تشریف لایا کرتے تھے جوان تھے، چہرے پر خشخشی سی داڑھی اور سر پر انگریزی تراش کے بال تھے، دوہرا پاجامہ، پاؤں میں فل بوٹ یا پمپ شو ہوتا تھا سر پر ترکی ٹوپی اور نئی تراش کی رنگین شیروانی پہنا کرتے تھے۔ گویا اس زمانے کے فیشن ایبل لوگوں میں شمار ہوتا تھا۔ بیشتر فارسی لٹریری اور قدیم علمی کے ساتھ مشاعروں میں شریک ہوا کرتے تھے۔

اب چند سال کے بعد نظر آئے تو اس شان سے کہ سر پر لمبے لمبے بال شانوں پر گرتے ہوئے، منہ پر لمبی داڑھی یک مشت و دو انگشت، جسم خاصا بھاری بھرکم اور چہرہ و صورت زمانے سے بچھڑا ہوا، سر آمادہ اور بات کرنے کے طریقے کے اور کوئی بات سابقہ نہ تھی۔ بہرحال

ان بزرگ نے مجھے بھتیجا بنا لیا اور ایسا بنایا کہ بس میری حاضری روزانہ ہونے لگی۔ بعض لوگوں نے مجھے مرید سمجھا بعضوں نے نوکر سمجھا اور بعضوں نے کیمیا کا خواہش مند اور کسی نے نقد دینا، کیونکہ حضرت کے پاس اسی قبیل کے لوگ زیادہ آیا کرتے تھے۔

صبح ہی سے بھی شام تک مریدین، معتقدین اور ضرورت مندوں کی آمد کا سلسلہ شروع ہو جاتا۔ مرید تو خیر اپنی سعادت مندی سے اپنی عادت رکھتے، معتقدین خاص ضرورت کے تحت آتے۔ مگر ایک جماعت ہوس پیشہ کیمیا گروں کی بھی تھی جو طرح طرح کا ڈھونگ رچا کر آتی اور نسخۂ کیمیا چاہتی۔ بعض لوگ عمل عملیات تعویذ گنڈوں کے لئے بھی آ جاتے اور بعض محض روحانی برتری کی خاطر قدم بوس ہوتے تھے۔

میں جب بھی پہنچا حضرت سب کو چھوڑ کر میری طرف متوجہ ہو جاتے میرے لئے چائے منگواتے یا باہر سے منگواتے اور شعر و شاعری، لطیفہ گوئی، بذلہ گوئی، فقرہ، پھبتی، ضلع، جگت سے لے کر پھکڑ تک شروع ہو جاتا اور بعض دفعہ تو بے تکلف مغلظات بھی رواں ہو جاتیں۔

مریدین اور معتقدین حیران ہوتے کہ حضرت اس نوجوان سے اتنے مانوس کیوں ہیں مگر وہ فطرتِ انسانی سے ناواقف تھے۔ حضرت بھی آخر انسان تھے دن بھر حدیث، فقہ، مسائل اور وحدت الوجود بیان کرتے کرتے تھک جاتے تھے۔ مریدین اور معتقدین سے دل لگی مذاق تو نہ کر سکتے تھے اور نہ اس طبقہ میں کوئی اس کا اہل ہی تھا اس لئے اس تفریح کے واسطے انہوں نے مجھے منتخب فرمایا تھا۔ چنانچہ میرے پہنچتے ہی ایک ایک کر کے سبھوں کو چلتا کر دیتے۔ بعض بے تکلف جو رہ جاتے وہ بیٹھے رہتے اور پھر سید شاہ وجودی صاحب فقط "وجودی" رہ جاتے اور ایک شاعر کی طرح بے تکلف ہو جاتے۔

حضرت شمس الدین صاحب قبلہ نے حیدرآباد میں بڑی مقبولیت حاصل کی تھی۔ چشتیہ گھرانے کے بزرگ تھے قوالی سننے کھڑے ہو جاتے علاوہ اس کے لوگوں کو جلانے لگتے۔ جس کے جسم پر ہاتھ رکھ دیتے وہ بندۂ بے دام ہو جاتا۔ بیشتر طوائفوں کو تائب کرا کر نکاح کرا دیا چنانچہ ترابِ جان اور بے جان وغیرہ بڑی مشہور رنڈیاں حضرت کے ہاتھ تائب ہوئیں اور لوگوں سے نکاح کر کے گھر بیٹھ رہیں۔ بیشتر ہندو خاندان بھی معتقد تھے چنانچہ شیوا جی اور شاہی پرشاد وغیرہ کا خاندان پورا معتقد تھا۔ جگن ناتھ پرشاد صاحب جو بعد کو جمیل الدین احمد بنے انہی شمس الدین کے دست گرفتہ تھے جنہیں بعد میں مولوی محمد حسین صاحب (ناظم عثمانیہ) نے تیار کیا۔

اپنے پیر کی طرح وجودی شاہ صاحب نے بھی بڑی خدمت کی۔ خود مرید کرنے کے خواہش مند نہ تھے لوگ مرید ہونے آتے تو اپنے پیر بھائی نجے میاں یا اپنے خلیفہ خالد میاں وغیرہ کے پاس بھجا دیتے۔

نہایت ہی نڈر، بڑے بے باک اور فطرتاً باغی تھے۔ حیدری صاحب صدر اعظم حیدرآباد بڑے پیر پرست، فقیر دوست اور بزرگ نواز تھے حیدرآباد کے پیران باصفا حیدری صاحب سے طرح طرح فائدے اٹھاتے تھے۔ میں نے جب یہ دیکھا کہ وجودی صاحب کی کوئی معاش نہیں ہے اور ان کی گزر بسر بڑی تکلیف سے ہوتی ہے تو میں نے کہا حیدری صاحب کو آپ کے پاس پہنچا دیتا ہوں ان سے اپنے لئے تنخواہ کرا لیجئے اور خانقاہ کے لئے کچھ نقد رقم منظور کرا لیجئے۔ یہ سنتے ہی مجھ پر برس پڑے، خوب صلواتیں سنائیں مگر میں نے بھی ان کا ناک میں دم کر دیا۔

مولوی محمد سجاد صاحب ہماری خاندان کے قدیم بزرگ تھے۔ مدرسۂ دارالعلوم میں والد مرحوم اور چچا مولوی سید غلام حسین صاحب مرحوم کے ساتھ پڑھ چکے تھے اور اتفاق سے میرے بھی دفتر کے مددگار رہے۔ یہ حیدری صاحب کے روحانی سیکرٹری تھے کیونکہ جتنے مولوی، مشائخ مجذوب وغیرہ حیدری صاحب سے ملتے وہ انہی کے توسط سے ملتے تھے اور یہ جہاں چاہتے حیدری صاحب کو لے جاتے تھے۔

اس لئے میں نے ایک دفعہ مولوی سجاد صاحب کو ساتھ لے جا کر وجودی شاہ صاحب سے ملایا اور شاہ صاحب نے سجاد صاحب پر وہ رعب گانٹھا کہ سجاد صاحب بھی گرویدہ ہو گئے۔ [illegible]

"پھر کیا ہے کسی روز سر اکبر کو یہاں لائیے مگر شاہ صاحب کو پہلے سے اطلاع نہ دیجئے۔ اچانک لے آئیے۔" چنانچہ سجاد صاحب نے وعدہ کر لیا۔
ایک روز دفتر میں مجھ سے کہنے لگے "اجی مسکین صاحب! کل تعطیل ہے دس بجے آپ بھی شاہ صاحب کے پاس آ جائیے ہم بھی آئیں گے۔" چنانچہ
دوسرے ہی روز دس بجے میں نے شاہ صاحب کے پاس پہنچ کر دس بجنے سے پہلے حاضرین کو چلتا کر دیا اور چائے کا انتظام کرا دیا۔ ٹھیک دس بجے
حیدری صاحب مع سجاد صاحب تشریف لائے۔ میں نے شاہ صاحب سے عرض کیا کہ "حضرت! سر اکبر تشریف لائے ہیں آپ اپنے لئے نہ سہی
میری خاطر انسانیت سے ملاقات فرما لیجئے اور انہیں ناراض نہ کیجئے ورنہ میری نوکری جاتی رہے گی۔" یہ سن کر شاہ صاحب پیچ و تاب کھاتے رہے
اور حیدری صاحب دیوان خانہ میں داخل ہو گئے۔ میں نے تو فرار پر قرار کیا کیونکہ خوف یہ تھا کہ ممکن ہے یہ حضرت کوئی بات بے تکی کہہ دیں مگر خلاف
توقع وجودی شاہ صاحب نے حیدری صاحب سے بڑی عمدگی سے ملاقات کی اور کوئی گھنٹہ بھر تک باتیں کرتے رہے اور خوب رعب گانٹھ لیا
چنانچہ حیدری صاحب نہایت ہی معتقد ہو کر واپس ہوئے۔ حیدری صاحب کے جانے کے بعد میں پہنچا تو وجودی شاہ نے حیدری صاحب
کی بڑی تعریف کی اور تفصیل سے ساری گفتگو سنائی کہ یہ باتیں رہیں وغیرہ۔ مگر اس کے ساتھ ہی صاف کہہ دیا کہ تم نے سازش کر کے حیدری کو بلا لیا تھا اور میں نے
اس خیال سے کوئی بے تکی بات نہیں کی کہ تم پر حرف نہ آئے۔ مگر اب میں صاف صاف کہے دیتا ہوں کہ مجھے نہ تو تنخواہ کی ضرورت ہے
اور نہ خانقاہ کی، نہ ہی حیدری صاحب کے آنے کی۔ میں آزاد منش فقیر ہوں۔ حیدری صاحب آتے رہیں گے تو لوگ مجھے سفارش کرنے کے لئے
مجبور کریں گے اور میں سفارش کرتا رہوں، وہ نہ سنیں گے تو مجھے تکلیف ہو گی برا بھلا کہہ دوں گا۔ اس لئے اب ایسی ترکیب کرو کہ وہ نہ
آنے پائیں۔ چنانچہ میں نے بحث مباحثہ کر کے اس خیال کو بدل دیا اور وہ خاموش ہو رہے۔ اس کے بعد دو تین دفعہ رات کو دس گیارہ بجے
حیدری صاحب تنہا آئے اور وجودی شاہ صاحب سے مل کر گئے مگر معلوم نہیں کیا بات ہوئی کہ تیسری دفعہ آنے کے بعد چوتھی بار انہوں
نے تکلیف نہیں کی۔ اس کا سبب نہ تو وجودی صاحب نے بتایا نہ حیدری صاحب نے سجاد صاحب سے کچھ کہا۔ میں سمجھتا ہوں کہ حضرت
نے کوئی گالی حسب عادت دے دی ہو گی اس لئے حیدری صاحب رک گئے۔

بہر حال وجودی شاہ میں یہ خصوصیت تھی کہ وہ بڑے سے بڑے کو خاطر میں نہ لاتے تھے اور نہ ان میں حرص و طمع تھی اپنی حالت پر قانع اور
شاکر تھے۔ اصل بات یہ تھی کہ انہیں سونا بنانا آتا تھا وقت [illegible] بیس پچیس تولے سونا بنا لیتے اسے فروخت کر لیتے تو چھ ماہ کے لئے
غلہ منگوا لیتے، ملازمین کی تنخواہیں، مکان کا کرایہ ادا کر دیتے، کپڑے بنوا لیتے، دعوتیں کرتے، غریب [illegible] آ جاتے اور پھر سارا روپیہ خرچ کر کے
اطمینان سے بیٹھ جاتے۔ اس کے بعد پھر قرضوں کا سلسلہ شروع ہوتا اور یہ چکر ہمیشہ چلتا رہتا۔ جب قرضے بہت زیادہ ہو جاتے اور مزید قرضہ کہیں
نہ ملتا اور دو وقت کے فاقے ہونے لگتے تو ایک روز کسی سے نہ ملتے۔ دن بھر بیٹھے چپ رہتے، رات کو سونا بنا لیتے اور دوسرے روز
خاص خاص لوگوں کے حوالے کرتے کہ اسے فروخت کر کے رقم لا دو۔ ایک دو مارواڑی ان کے معتقد تھے انہی کے ہاتھ سے سونا
فروخت کراتے۔ ایک وقت شاہ عبدالقادر صاحب کے اور میرے حوالے بھی آٹھ آٹھ تولہ سونا کیا کہ فروخت کر دو۔ یہ سونا متوسط قسم
کا ہوتا تھا جن دنوں یہ سونا ہمارے ہاتھ سے فروخت کرایا گیا ہے ان دنوں اچھا سونا تئیس روپیہ تولہ تھا اور ان کا بنایا ہوا سونا پچیس روپیہ
تولہ فروخت ہوا۔ اس طرح زندگی بھر عمدگی سے گزارتے رہے۔

یہ سونا بنانا انہوں نے کس طرح سیکھا کبھی بھی ظاہر نہیں کیا۔ بیشتر لوگ اسی چکر میں رہتے کہ ان سے کیمیا کا نسخہ معلوم کریں گے مگر انہوں
نے کسی کو بھی نہیں بتایا۔ [illegible] بغداد و عراق میں بھی بہت رہ چکے تھے۔ نہ جانے کس سے سیکھا
تھا۔ [illegible] ایک خاتون سے عقد کیا تھا جو ساتھ رہتی تھیں مگر کوئی اولاد نہ تھی۔ اکثر مریدوں کے بچوں کو اپنے پاس رکھ لیتے تھے۔
[illegible] مریض تھے اور سلسلۃ البول بھی تھا اس لئے کہیں جاتے آتے نہ تھے [illegible]

بیٹھے رہتے۔ بڑے ہی حاضر جواب اور نفسیات داں تھے۔ حیدرآباد میں مشہور ہو گیا تھا کہ ایک لڑکا جو سترہ سال کا تھا لڑکی بن گیا، اور یہ حضرت یوسف شریف کے تصرف سے ہوا، اسی شہرت کے زمانے میں ایک مولوی صاحب جو دارالعلوم کے فارغ التحصیل اور مدرسۂ عالیہ کے مدرس تھے حضرت سے ملنے کے لئے آئے اور یہی ذکر کیا اور کچھ ایسی گفتگو کی کہ شاہ صاحب کو جلال آگیا۔ جھٹ سے آپ نے داڑھی کو آدھی موڑ کر دانتوں تلے دبا لیا اور کہنے لگے۔ ارے مولوی! یہ لوگ تو بڑے بزرگ ہیں میں ایک ادنیٰ غلام ان کا ہوں، دیکھ ابھی تجھے عورت بنا دیتا ہوں۔ یہ کہتے ہوئے جو آنکھیں نکالیں اور چہرہ خوفناک بنایا تو مولوی ساری شیخی بھول گئے اور جوتیاں چھوڑ کر وہاں سے بھاگ گئے۔ مارے ہنسی کے میرا برا حال ہو گیا اور تھوڑی ہی دیر کے بعد حضرت بھی ہنسنے لگے۔ اس طرح بعض حرکتیں بڑی مزے دار کر بیٹھتے تھے۔

نواب اسمٰعیل خاں رہائیگیر دار جہانگیر آباد، نبیرۂ نواب مصطفیٰ خان شیفتہ اکثر حیدرآباد آیا کرتے تھے کیونکہ جسٹس خلیل الزماں سے ان کی قرابت تھی۔ ایک دفعہ وہ ملنے آئے تو میں بھی بیٹھا ہوا تھا ان سے میرا تعارف یہ کہہ کر کرایا کہ میرے بھتیجے ہیں۔ بعد میں کہیں ان سے پھر ملاقات ہوئی تو انھوں نے پوچھا، جناب! آپ کے چچا صاحب کہیں رک گئے ہیں اسی لئے تکمیل نہ کر سکے اور باتیں کرتے تو کہتے بہک جاتے ہیں" میں نے کہا "پہلے ہی کب تھے جو کہیں پہنچ کر رکتے۔" اس پر وہ بات مسرور ہوئے اور دیر تک شاہ صاحب کا ذکر کرتے رہے۔ جب کبھی آتے شاہ صاحب سے ضرور ملتے تھے۔

حضرت امجد سے وجدی شاہ کی بہت دوستی تھی سید ابراہیم ادیب جو عربی کے پروفیسر اور ادب الجاہلیہ کے بڑے جید عالم تھے، بھی ان کے بڑے مخلص دوست تھے، وجدی شاہ کا اور امجد کا غالباً مدرسہ کا ساتھ تھا اس لئے دونوں میں بڑی بے تکلفی تھی ساری دنیا امجد صاحب کو صوفی سمجھتی تھی مگر وجدی شاہ ہمیشہ ان سے یہی کہتے کہ امجد تم تھوڑا سا تصوف پڑھ لو اور وہ ہنس کر خاموش ہو جاتے اور سید ابراہیم صاحب تو وجدی شاہ سے باقاعدہ مسائل تصوف پوچھا اور سمجھا کرتے تھے۔

مریدین کی تعداد خاصی تھی۔ کوئی دو تین سو مرید ہوں گے، چند خلیفہ بھی تھے۔ خان بہادر جان نثار جنگ کو بھی خلافت دی تھی اور خالد میاں ان کے چہیتے خلیفہ تھے۔ اپنا کتب خانہ بھی انہی کو دے دیا تھا اور وصیت کی تھی کہ خالد میاں کے باغ میں دفنایا جائے چنانچہ خالد میاں نے انہیں اپنے باغ ہی میں دفنایا اور مقبرہ بھی بنا دیا اور ہر سال بڑی دھوم سے عرس بھی کرتے ہیں۔

حیدرآباد میں بزرگان دین ہمیشہ آیا کرتے ہیں ایک دفعہ ایک بزرگ عوض علی شاہ تشریف لائے جو شاہ صاحب کے پاس بھی آنے جانے لگے۔ چنانچہ انھوں نے مجھے وہاں اکثر دیکھا اور حضرت سے بے تکلف پایا تو ایک دفعہ میرے سامنے ہی پوچھا کہ یہ کون صاحب ہیں تو کہا: "ایک سلسلہ میں یہ میرے پیر ہیں" انھوں نے پوچھا کون سا سلسلہ تو کہا: "ابلیسیہ" وہ حیران ہوئے کہ ابلیسیہ سلسلہ کیسا تو کہا آپ کو شاید معلوم نہیں کہ معلم الملکوت نے بھی اپنے خلفاء بنائے ہیں چنانچہ یہ انہی کے خلیفہ ہیں اور سلسلۂ ابلیسیہ میں صاحب خرقہ و سجادہ ہیں میں نے اس سلسلہ میں انہی سے بیعت کی ہے۔ عوض علی شاہ یہ سن کر اتنے پریشان ہوئے کہ پھر انھوں نے وہاں آنے کی ہمت نہیں کی۔

اپنے قدیم ملنے والوں اور پرانے دوستوں سے وجدی شاہ کو بڑی ہمدردی تھی چنانچہ ڈاکٹر راحت اللہ خاں کیوریٹر آصفیہ لائبریری کو جو ان کے قدیم ہم محلہ اور دوست کے فرزند تھے بہت چاہتے تھے اسی طرح بعض اپنے قدیم دوستوں سے بڑی وضعداری سے ملتے تھے۔

وجدی شاہ کا خاندان بہت بڑا تھا مدراس، اورنگ آباد اور نیلور میں ان کے قرابت دار بہت تھے حیدرآباد کے مشہور صاحب قادری کے گھرانے سے جو "تاج محی الدین پاشا" کا خاندان کہلاتا تھا قرابت قریبہ تھی، مشہور ہفتہ وار اخبار "مخبر دکن" مدراس کے ایڈیٹر و مالک سید [illegible] تھے۔ اس طرح خاندان بہت بڑا اور پھیلا ہوا تھا مگر وجدی شاہ سب سے وضعداری کا تعلق رکھتے تھے مجھے سمجھانے کی ضرورت [illegible]

[illegible] کے علاوہ [illegible] بہت ہی سنجیدہ اور وضع دار تھے

حتی الامکان کسی کی بُرائی نہ کرتے اور اگر کوئی کسی کی برائی کرتا بھی تو اسے بھی روک دیتے اور ہنس بول کر موضوع بدل دیتے تھے۔

شعر بھی خوب کہتے تھے، دیوان مکمل کر لیا تھا۔ اس میں سے کچھ حصہ ان کے ایک مرید جعفر علی صاحب نے دو سال ہوئے چھپوا بھی دیا ہے مگر کتابت کی غلطیاں بہت زیادہ ہوئی ہیں۔

بہرحال وجدی شاہ صاحب بہت غنیمت بزرگ تھے اور یہی ایک بزرگ ہیں جو پیرانِ طریقت میں سے مجھے پسند آئے ورنہ دوسرے بزرگوں سے نہ تو میں نے زیادہ ملاقات کی اور نہ ہی وہ مجھے متاثر کر سکے۔

مکتبۂ ابراہیمیہ کے مالک عبدالحق بھی وجدی شاہ کے مرید ہو گئے تھے اور خلیفہ بھی، انہوں نے داڑھی پیر سے زیادہ بڑھالی ہے ع

مگر وہ بات کہاں مولوی مدن کی سی!

مولوی سیّد محمد یوسف الدین

بعض لوگ اس نام کو پڑھ کر حیران ہوں گے کہ یوسف الدین صاحب کا شخصی خاکہ میں کس طرح لکھ سکتا ہوں کیونکہ ان کو انتقال کئے ۴۵ سال ہو گئے اور ان کی وفات کے وقت میری عمر ۱۰ سال کی تھی مگر واقعہ یہ ہے کہ مرحوم سے میری واقفیت کی وجہ یہ ہے کہ مولوی صاحب میری والدہ کے حقیقی ماموں تھے، میرے نانا (سید عبدالرحیم صاحب جو حکومت حیدرآباد کے اول تعلقدار (کلکٹر) اور غالب الملک کے اسٹیٹ کے معتمد تھے) نے جس وقت انتقال کیا ہے میری والدہ کمسن تھیں انہیں مولوی صاحب نے اپنے پاس بلا لیا اور اپنی نگرانی میں تعلیم دلاتے رہے، اس طرح شادی ہونے تک والدہ انہی کے پاس رہیں، شادی کے بعد اپنے گھر رہنے لگیں مگر مولوی صاحب اکثر گلبرگہ سے آیا کرتے اور میں دو دو دن تک ان کے ساتھ ہی ساتھ رہتا تھا۔

یوسف الدین صاحب کی ولادت اور تعلیم حیدرآباد میں ہوئی تھی مگر عجیب و غریب دماغ انہوں نے پایا تھا، باوجود صلاحیت اور خاندانی وجاہت کے معمولی ملازمت قبول کر لی اور ترقی کرتے کرتے چند ہی سال میں اول تعلقدار (کلکٹر) ہو گئے۔ حضور غفران مکان میر محبوب علی خان شاہ دکن کو آپ پر پورا پورا اعتماد تھا، چنانچہ صرف خاص (پرائیویٹ اسٹیٹ) کی معتمدی بھی دی تھی مگر آپ نے وہاں کے حالات دیکھ کر کچھ اصلاحیں کرنے اور پہلا میزانیہ (بجٹ) مرتب کرنے کے بعد معذرت کر لی اور پھر تعلقداری پر چلے گئے۔

مولوی صاحب کی ایک بڑی عظیم پارٹی تھی جس کے اراکین ڈاکٹر رگھو ناتھ، نواب عماد جنگ (راول)، نواب رفعت یار جنگ (اول) حاکم الدولہ، کاظم علی صاحب معتمد تعمیرات، محبوب علی صاحب کمشنر کروڑگیری (کسٹم) مولوی مدنی صاحب مولوی عبداللہ صاحب عرف کٹے والے شاہ صاحب، ملا عبدالقیوم وغیرہ تھے۔

حیدرآبادیوں میں یوسف الدین صاحب پہلے بزرگ ہیں جنہوں نے شہر سے دور جنگل میں بیرون کے قریب ٹولی چوکی (قلعہ گولکنڈہ کے راستے میں) ایک اونچی پہاڑی پر بنگلہ بنوایا اس کا نام انہوں نے "جبل السلام" رکھا، یہ پرفضا و منظر کی خوشنما کوٹھی اب تک موجود ہے۔

ابتداً یوسف الدین صاحب نے ایک اینگلو انڈین گھرانے میں جو مسلمان ہو گیا تھا شادی کی ان خاتون سے کئی لڑکے ہوئے مگر زندہ نہ رہے بالآخر ان [illegible] میری نانی اور دوسری بیوی جو ان کے مجبور کرنے سے حیدرآباد کے ایک امیر گھرانے میں شادی کی اور ان خاتون کے بطن سے کئی لڑکیاں [illegible] سے بیشتر اب بھی موجود ہیں چنانچہ بیگم نواب ولی الدولہ (صالح پائیگاہ) مرحوم ہی کی صاحبزادی ہیں اور مولوی نظام الدین صاحب نائب [illegible] گورنمنٹ سنٹرل پریس آپ ہی کے فرزند ہیں۔

دلچسپی رہی لہٰذا خود انہوں نے دو تین قسم کے اردو ٹائپ ایجاد کئے اور نسخ کا مانو ٹائپ بھی بنا لیا جو ہندوستان اور پاکستان میں پہلا اردو کا مانو ٹائپ ہے مگر اس میں بھی ہر جوڑوں کی دردسری اور شکست اور کرسی کی آفت ہے۔

میں بچپن ہی سے خط انتظامی سے مانوس ہوں۔ میرے سامنے اس کی کاسٹنگ ہوئی اور دس بارہ سال کی عمر میں میں نے اس کی کمپوزنگ سیکھی ہے مگر اردو دنیا چونکہ نستعلیق ٹائپ کے چکر میں پھنسی ہوئی تھی اس لئے میں انتظار کر رہا تھا کہ نستعلیق ٹائپ کا دھوکا بے نقاب ہو جائے اور اردو دنیا نستعلیق کی ناکارگی کو اچھی طرح سمجھ لے تو میں اس خط کو پیش کروں، خدا کا شکر ہے کہ اب وقت آگیا ہے، جبکہ اردو زبان کے لئے ایک ایسے ٹائپ کی ضرورت محسوس کی جا رہی ہے جو مفرد حروف رکھتا ہو، خوبصورت ہو، پڑھنے میں آسان ہو، جس کا مانو ٹائپ اور لینو ٹائپ مشین بھی بن سکے اور ٹائپ رائٹر بھی عمدہ بنے۔

ان سب خصوصیات کا حامل "خط انتظامی" ہے، چونکہ یہاں مروج نہیں ہے اس لئے میں اس خط کو پیش نہیں کر سکتا۔ انشاء اللہ نقوش کے کسی آئندہ شمارہ میں خط انتظامی پیش کروں گا۔

معاف فرمائیے اس تفصیل میں زیادہ وقت ضائع ہو رہا ہے اور مولوی یوسف الدین کی شخصیت ابھی پردے ہی میں ہے۔ مولوی صاحب شریف و سپید بزرگ تھے۔ انتقال کے وقت ساٹھ ایک سال کی عمر تھی، پورا قد، بھاری بھرکم جسم، گول چہرہ، بڑا ہی رعب دار، بھرواں داڑھی جسے خضاب لگایا جاتا تھا، سر پر انگریزی وضع کے بال، ہمیشہ سیدھی مانگ نکالا کرتے تھے، سر پر صرف منصب داری پگڑی (دستار) ہوتی، دوسری ٹوپی کبھی کبھار پہنتے تھے، [illegible] سب سے پہلے میں نے انہیں سوٹ پہنتے ہوئے بھی دیکھا ہے مگر ٹائی نہ لگاتے تھے گلوبند لپیٹ لیا کرتے تھے۔ جس کپڑے کی شیروانی ہوتی اسی کپڑے کی پتلون بھی ہوتی تھی۔ صرف نماز کے لئے عیدین یا جمعہ کو مسجد جاتے تو ڈھیلا ڈھالا پاجامہ پہنتے یا گھر پر پاجامہ ہوتا ورنہ ہمیشہ پتلون اور شیروانی پہنا کرتے۔ گھر میں ململ کا کرتا اور پاجامہ پہنتے مگر یہ پہنے ہوئے یا تو اندر اپنے کمرے ہی میں رہتے یا پھر اندرونی حصے ہی میں اس لباس میں نظر آتے۔ مردانہ حصے میں بغیر شیروانی کے نہیں آتے تھے۔ متانت اور سنجیدگی کا یہ حال تھا کہ انہیں کھلکھلا کر ہنستے ہوئے کسی نے بھی نہیں دیکھا البتہ مسکراتے ضرور تھے، گفتگو نہایت مختصر کرتے بلکہ اشاروں سے مطلب ادا کیا کرتے تھے، تحریر اور تقریر دونوں مختصر۔ تقریر تو ان کی کسی نے نہیں سنی کیونکہ دو چار جملوں ہی میں اپنا مطلب ادا کر دیتے تھے۔

میری والدہ کو بہت چاہتے تھے اور وہ ان کی خدمت میں گستاخ بھی بہت تھیں چونکہ باتیں بہت کرتی تھیں اس لئے مولوی صاحب انہیں طوطی پکارا کرتے تھے۔ میری ولادت ہوئی تو مولوی صاحب نے میرا نام رکھا "ابو رضا سید مصباح الدین" یہ تاریخی نام تھا اور سنہ ولادت ۱۳۳۱ھ نکلتے تھے۔ مجھے ابو رضا پکارا کرتے تھے کبھی کبھی موڈ میں ہوتے تو "طوطی" بھی کہتے۔

میری تسمیہ خوانی (بسم اللہ) ہوئی تو مولوی صاحب نے مجھے سوٹ سلوا دیا اور اس کے بعد سے اپنے انتقال تک ہر مہینے مجھے ایک سوٹ سلوا دیا کرتے تھے، اپنے بچوں کے لئے جب کپڑے بنواتے میرے لئے بھی بنوا دیتے اور اپنی لڑکیوں کے لئے جب کپڑے تیار کراتے میری والدہ اور خالہ کے لئے بھی بنواتے تھے۔

میرے نانا سید رحیم الدین صاحب کی جائداد سے جو روپیہ ملا تھا اسے مولوی عبدالباقر خاں وکیل حیدرآباد کے پاس محفوظ کرا دیا تھا۔ جب ضرورت پڑتی میری نانی مجھے بھیج کر وکیل صاحب کے پاس سے روپیہ منگا لیتیں۔ مولوی عبدالباقر خاں سے مولوی صاحب کی بڑی گہری دوستی تھی گھر کا کام بغیر ان کے مشورے کے نہ ہوتا تھا، اسی طرح مولوی عبدالغفور صاحب وکیل سے بھی ان کے خصوصی مراسم تھے انہی مراسم کی وجہ سے مولوی صاحب کی بڑی صاحبزادی مولوی عبدالغفور صاحب کے صاحبزادے سے بیاہی گئیں اور مولوی عبدالباقر خاں صاحب کے فرزند مولوی عبدالباسط خاں [illegible]

مولوی صاحب کی متانت اور سنجیدگی کا یہ حال تھا کہ کسی سے بے تکلف ملتے ہی نہ تھے، صرف کاروباری باتیں ہوا کرتی تھیں۔ بیان کیا جاتا ہے کہ میری ولادت سے ڈیڑھ سال پہلے والدہ کو ایک لڑکا ہوا۔ والدہ مولوی صاحب ہی کے بنگلہ پر تھیں انّا نے شاید ٹولی چوکی تک جا کر سیندھی (تاڑی) کا شوق کیا اور واپس آ کر بچے کو دودھ پلا کر سُلا دیا۔ بچہ ایسا سویا کہ بس سو ہی گیا، صبح جب سب لوگ جاگے تو دیکھتے کیا ہیں کہ لڑکا نیلا پڑ گیا ہے اور زندگی کے کوئی آثار نہیں ہیں اسی روز مولوی صاحب نے خاندان بھر میں اعلان کر دیا کہ آئندہ سے کسی بچہ کے لئے انّا ملازم نہ رکھی جائے۔ اگر ماں کا دودھ کافی نہ ہو سکے تو ڈبے کا دودھ پلایا جائے چنانچہ اس کا اثر یہ ہوا کہ میرے پیدا ہونے کے بعد چونکہ والدہ کو دودھ کم آتا تھا اس لئے چند شیشیوں کے دودھ پر میری پرورش ہوئی۔

ایک دفعہ مولوی صاحب بیدر کے دورہ پر گئے ہوئے تھے واپسی میں گلبرگہ سے کوئی آٹھ دس کوس (بیس میل) اُدھر تانگہ خراب ہو گیا، اور مولوی صاحب تانگے سے اتر کر پیدل چلتے ہوئے گلبرگہ پہنچے، بیس میل پیدل چلنے کا اتفاق انہیں عمر بھر میں پہلی دفعہ ہی ہوا ہوگا۔ شام میں چائے پی کر حسب معمول ٹینس کورٹ پر چہل قدمی بھی نہ کر سکے بلکہ اپنے سونے کے کمرے میں چلے گئے، میں چونکہ زیادہ شریر واقع ہوا تھا اس لئے ان کے سونے کے کمرے میں بھی پہنچ جاتا تھا اور وہ ہوں ہاں کر کے خاموش رہ جایا کرتے تھے۔ شام میں جب میں نے کمرے میں پہنچ کر دیکھا تو مولوی صاحب پلنگ پر بیٹھے اپنے پاؤں آپ دابتے ہوئے نظر آئے۔ اپنے پاؤں آپ دابنا میرے لئے نیا تماشا تھا میں نے لپک کر والدہ کو سنا دیا کہ "ماموں پاشا پلنگ پر بیٹھے اپنے پاؤں آپ داب رہے ہیں"۔ یہ سن کر والدہ نے کہا کہ "تمہارے ماموں پاشا پندرہ بیس میل پیدل چل کر آئے ہیں اس لئے پاؤں دُکھ رہے ہوں گے"۔ دس پندرہ چھوکریاں اور دس بارہ ہی خانگی نوکر تھے مگر انہوں نے کسی سے پاؤں دبوانا پسند نہیں کیا اور اپنے پاؤں آپ دابتے رہے۔

میری نانی جو مولوی صاحب کی چھوٹی بہن اور اپنے بھائی پر نثار ہونے والی تھیں مولوی صاحب کے گھر کا پانی تک نہیں پیتی تھیں جب میں نے یہ دیکھا تو ان سے پوچھا "اماں! آپ ماموں پاشا کے گھر میں کھانا کھاتی ہیں نہ پانی پیتی ہیں یہ کیوں؟" تو کہنے لگیں "بیٹا! پاشا کو دشمنوں نے ورغلا کر مسان بنا لیا ہے اس لئے ان کے گھر کا کھانا پانی میرے لئے حرام ہے۔" مدت تک میں لوگوں سے پوچھتا رہا کہ مسان کیا چیز ہے مگر کسی نے نہیں بتایا ایک روز جبکہ مولوی صاحب مجھے اپنے ساتھ سکندرآباد لئے جا رہے تھے میں نے خود انہی سے مسان کے معنی پوچھے اور وہ خود بھی حیران ہوئے کہ مسان کیا بلا ہے پھر میں نے سارا قصہ سنایا اور بتایا کہ اماں نے ایسا کہا ہے تو مولوی صاحب نے خاصا قہقہہ لگایا اور کہا —— "فری میسن ایک سوسائٹی ہے جسے فری میسن لاج کہتے ہیں یہ ایک اخلاقی سوسائٹی ہے جس کے رکن وہی ہو سکتے ہیں جو کسی مذہب کے پیرو اور خدا کی وحدانیت کے قائل ہوں۔ میں بھی اسی طرح کا ممبر ہوں۔ یہاں کے جُہلا نے اس سوسائٹی کو نہ جانے کیا سمجھا ہے کہ غلط باتیں مشہور کر دیں۔ یہی بات تمہاری نانی نے بھی سُنی ہوگی۔" چنانچہ سکندرآباد سے واپس آ کر مولوی صاحب نے اپنی بہن کو سمجھایا اور وہ اپنے بھائی کے گھر میں کھانے پینے لگیں۔

مولوی صاحب کی وضعداری اور خود اعتمادی حیدرآباد بھر میں مشہور تھی، کسی کو خاطر میں نہ لاتے تھے۔ مسٹر ٹرنپ صدر ناظم اور معتمد مالی تھے اور عملاً وہ ان کے افسر تھے جب کبھی ٹرنپ دورے پر آتے، مولوی صاحب صوبہ داری کی جھنڈی کی گاڑی اسٹیشن بھجوا دیتے اور اس میں اپنے چیف کا استقبال کے لئے جاتے اور اسٹیشن سے ساتھ لاتے مولوی صاحب اپنے ڈرائنگ روم میں آرام کرسی پر بیٹھے رہتے جب ٹرنپ گاڑی سے اتر کر برآمدے میں پہنچ جاتے تو یہ کرسی سے اٹھ کر دروازے تک جا کر ان کا استقبال کرتے اور ہاتھ ملا کر ڈرائنگ روم میں لا کر اپنے برابر آرام کرسی پر بٹھا لیتے اور جب ٹرنپ واپس ہونے لگتے تو بھی انہیں چھوڑنے اسٹیشن نہ جاتے بلکہ گورنمنٹ ہاؤس کے دروازے ہی پر کھڑے کھڑے خدا حافظ کر دیتے تھے۔

یہ حالات سن کر مجھے بڑی تکلیف ہوئی اور میں نے اسے مجبور کر کے اپنے ساتھ لے لیا اور نواب صاحب کے پاس لے جا کر پیش کیا میں نے حالات سنائے تو نواب صاحب بہت متاثر ہوئے پھر مجھ سے فرمایا کہ اس لڑکے کی ماں کی طرف سے ایک درخواست اور دو بہنوں کی طرف سے دو درخواستیں الگ الگ لکھوا لو اور قلم دان منگوا کر ایک چٹھی ناظم تعلیمات کے نام لکھ دی کہ اس لڑکے کے نام وظیفہ یا اسکالرشپ جاری کر دیا جائے اور جب وہ رخصت ہونے لگا تو پچیس روپے نقد سرفراز فرمائے اور تسلی دلاسا دیا اور فرمایا کہ کل سے مدرسہ جایا کرو۔ تمہاری ماں بہنوں کے نام اور تمہارے نام جو وظیفہ ہوگا ان سب کی مجموعی رقم تمہارے والد کی تنخواہ کے برابر ہو جائے گی چنانچہ ایسا ہی ہوا اور اس لڑکے نے اطمینان کے ساتھ منشی فاضل کامیاب کر کے تعلیمات میں ملازمت کر لی اور جلد ہی صدر مدرس (ہیڈ ماسٹر) بھی ہو گیا۔

مولوی عبدالجبار خان آصفی (رام پوری) کے گھر کے سامنے ایک بوڑھا درزی رہتا تھا اس کی بڑھیا درزن آنکھوں سے معذور تھی۔ درزی مر گیا تو مولوی صاحب نے پیسے دلانے ہی نواب صاحب سے عرض کیا نواب صاحب نے درخواست پیش کرنے کے لئے فرمایا دوسرے روز مولوی صاحب نے پیسے والے سے درخواست لکھوائی اور خود اس پر تصدیق کی اور پانچ روپیہ ماہوار تنخواہ کی سفارش بھی لکھی اور مجھی کو دیا کہ پیش کر دو میں نے پیش کیا تو درخواست پڑھ کر نواب صاحب نے دس روپیہ ماہوار کی اجرائی کی تجویز کی اور دوسرے مہینے ہی سے تنخواہ جاری ہو گئی۔

نواب صاحب کے انتقال کے وقت تین صاحبزادے تھے، نواب حبیب اللہ خان جو عالی رفاعی کے نام سے مشہور ہوئے بڑے علم دوست اور ادب نواز اور اچھے شاعر تھے مگر طبیعت میں لاابالی پن تھا سرور نگر میں رہتے تھے ارباب اردو کے نام سے ایک انجمن قائم کی تھی اور اسی انجمن سے ایک ماہنامہ "تحفہ" بھی نکالتے رہے جو ایک آدھ سال سے زیادہ نہ چل سکا۔ آخر میں عالی رفاعی نے ترک لباس کر دیا تھا اور تقریباً گوشہ نشین ہو گئے تھے۔

نواب صاحب کے دو اور صاحبزادے نواب سردار جنگ اور نواب نادر جنگ ان کے انتقال کے وقت کم سن تھے۔ بعد کو تکمیل تعلیم کی غرض سے یورپ گئے اور بیرسٹری کر لی، سردار جنگ بہادر اب مجسٹریٹ ہیں اور نادر جنگ بہادر نے مہتمم کروڑگیری کسٹم سپرنٹنڈنٹ رہ کر وظیفہ (پنشن) لے لیا ہے۔

مرحوم کی کتابیں نہ تو عالی رفاعی نے چھپوائیں اور نہ سردار جنگ اور نادر جنگ نے، معلوم نہیں مسودے باقی بھی ہیں یا تلف ہو گئے۔

حیدرآباد میں محرم میں جو تماشے اور مخرب اخلاق حرکات ہوتی تھیں ان کے سدباب کی طرف سب سے پہلے نواب صاحب ہی نے قدم اٹھایا اور مکہ مسجد میں شبینے کا اہتمام اور خاص خاص ایام میں نمازوں اور وعظوں کا بندوبست بھی شروع کیا، اضلاع میں واعظین مقرر کئے اور حیدرآباد کے مسلمانوں کو حقیقی مسلمان بنانے کی طرف توجہ کی مگر قدرت کو یہ منظور نہ تھا، شرک و بدعت کو بھی عمر دی گئی تھی اس لئے نواب صاحب کی عمر کم ہو گئی اور انھوں نے ایسے وقت انتقال کیا جب کہ حیدرآباد کو ان کی شدید ضرورت تھی۔ اس خاندان کا علم و فضل انہی کے ساتھ ختم ہو گیا۔ سچ ہے کہ

فخر ہوتا ہے گھرانے کا سدا ایک ہی شخص

انوار اللہ خان

مولانا انوار اللہ خان (المخاطب بہ فضیلت جنگ بہادر) مرحوم حیدرآباد کے قدیم علماء میں سے تھے۔ آپ کا خاندان علمی و دینی تھا اور مشہور بزرگ حضرت شاہ رفیع الدین قندھاری قدس سرہٗ سے آپ کے خاندان کا تعلق تھا [illegible]

نہ تھا مگر آپ کو نہ تو اپنی علمیت و فضیلت کے اظہار کا شوق تھا نہ ہی آپ کا انکسار اور عجز اس کی اجازت دیتا تھا۔ آپ کو شاہ دکن کی استادی کا شرف حاصل تھا پھر آپ صدر الصدور اور صدر المہام امور مذہبی بھی ہو گئے تھے مگر عہدہ دارانہ شان اور امارت آپ میں پیدا ہی نہ ہوئی وہی عالمانہ وقار بلکہ طالب علمانہ انکسار آپ میں تھا جو آخر تک رہا۔

آپ کے دو کارنامے بڑے اہم ہیں ایک "مدرسۂ نظامیہ" کا قیام اور دوسرے "مجلس اشاعت العلوم" کی بنیاد۔ آپ نے درس نظامیہ کی ترویج کی خاطر مدرسۂ نظامیہ کی بنیاد ڈالی اور اپنی ساری توانائیاں اس کے لئے صرف کر دیں۔ خود حضور نظام دکن نے بھی اس سے دلچسپی لی اور نظامیہ کا آغاز نہایت عمدگی سے ہوا۔

انوار اللہ خاں عالم تھے نیک دل تھے اور حریص علی الخیر تھے نیک کام میں جلدی کرتے تھے۔ چنانچہ مدرسہ کے قیام میں بھی انہوں نے بڑی جلدی کی چونکہ نرے عالم تھے اس لئے سیاسیات سے قطعاً ناواقف تھے اور ضروریاتِ زمانہ سے بھی بے خبر ہی تھے۔ انہوں نے اپنی نیکدلی سے یہ سوچ رکھا تھا کہ دکن کو دینی تعلیم کی سخت ضرورت ہے اور ملک کی خدمت علماء ہی کر سکتے ہیں مگر یہ غور نہیں کیا کہ صرف دینی تعلیم سے کام نہیں چل سکتا اس کے ساتھ ہی ساتھ روشن خیالی اور دنیوی تعلیم بھی ضروری ہے چنانچہ مدرسۂ نظامیہ بغداد کا درسی نصاب جو سینکڑوں سال پہلے تجویز ہوا تھا اور اب خود بغداد و مصر میں نہ تھا یہاں مقرر ہوا اور ملا سازی یا مولوی گری شروع کی گئی۔ اساتذہ بھی پرانے خیال کے فراہم کئے گئے اور طریقۂ تعلیم و طرزِ رہائش بھی قدیم ہی رکھا گیا۔ مدرسہ چلنے لگا۔ فارغ التحصیل نکلنے لگے مگر نظامیہ نہ تو دار العلوم حیدرآباد بن سکا نہ دار العلوم دیوبند نہ ہی ندوۃ العلماء بنا۔ ندوہ، دیوبند اور دار العلوم سے زیادہ روپیہ نظامیہ پر صرف ہوا مگر نظامیہ کسی ایک فارغ التحصیل کو بھی دنیا کے سامنے فخر سے پیش نہ کر سکا۔ اب بھی نظامیہ چل رہا ہے مگر اس کا عدم و وجود دونوں برابر ہیں۔

دوسرا کارنامہ مولانا کا "مجلس اشاعت العلوم" کا قیام تھا۔ اس مجلس سے زیادہ تر مولانا ہی کی کتابیں شائع ہوئیں اور بیرونی علماء کی کتابوں کی اشاعت بھی عمل میں آئی اور یہ کام نسبتاً نظامیہ کے زیادہ فائدہ مند اور دیرپا رہا۔ مولانا نے بیشتر کتابیں بڑی تفصیل سے تحریر فرمائیں خود مقاصدِ اسلام کا سلسلہ بڑا ہی عمدہ تھا اس کے علاوہ فتنۂ قادیانیت کے خلاف بھی مولانا نے کئی کتابیں لکھیں جو طبع ہو گئی ہیں اور دوسرے علوم و فنون پر بھی خامہ فرسائی فرمائی ہے۔ بہرحال عربی، فارسی، اردو تینوں زبانوں میں بہترین کتابیں اس مجلس نے شائع کیں اور یہ ایک احسانِ عظیم علم و ادب پر مولانا کا رہا۔

ان علمی کاموں کے علاوہ مولانا نے امورِ مذہبی کے دفتر میں "دار الافتاء" بھی قائم کرا دیا تھا اور اہلِ خدماتِ شرعیہ قاضی، خطیب، امام وغیرہ ائمۂ مساجد، موذنین وغیرہ کے لئے نصابِ تعلیم مقرر کر کے امتحان بھی مقرر کرا دیا تھا جس سے امید تھی کہ مذہبی لوگوں کو فائدہ پہنچنا چاہئے تھا مگر بدنصیبی سے نہ پہنچ سکا۔ کیونکہ مولانا کے بعد محکمہ ایسے لوگوں کے ہاتھ میں پھنسا جن کو ان باتوں سے دلچسپی ہی نہ تھی۔

میرے والد مرحوم سے مولانا کے مراسم بڑے قدیم اور پُرخلوص تھے جس کی وجہ سے مجھ پر بھی بڑی شفقت و عنایت فرمایا کرتے تھے اور میں جب بھی حاضرِ خدمت ہوتا مجھ سے بڑی بے تکلفی کے ساتھ مخاطب فرماتے چونکہ میں بچپن ہی سے شعر و سخن کا ذوق رکھتا تھا اور اساتذہ کا کلام مجھے بہت یاد تھا اس لئے مجھ سے فرمائش کر کے شعر سنتے اور اگر موڈ اچھا ہوتا تو اپنے شعر بھی مجھے سناتے۔ میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ عالم شاعر نہیں ہو سکتا، معاف کیجئے میں نے غلط لکھ دیا ہے "عالم شاعر نہیں ہوتا" اگر وہ شعر کہنے لگے تو شاعر ضرور ہو جاتا ہے مگر شاعری کی روح فنا ہو جاتی ہے اور صرف موزونیت باقی رہ جاتی ہے خصوصاً عربی ادب کا ماہر اور عربی شعر کا واقف کوئی ہو اور اردو زبان میں شاعری کرنے لگے تو پھر موزونیت کی بھی خیر نہیں ہوتی موزوں اردو شعر بھی عربی شعر کی بحر پر اس طرح ڈھالتے ہیں کہ ناموزوں معلوم ہونے لگتا ہے۔ چنانچہ یہی کیفیت میں نے مولانا میں محسوس کی۔ مولانا کا پایۂ علم میں بہت اونچا تھا۔ عربی ادب پر بھی خاصا عبور تھا اسی وجہ سے طبیعت میں ایک قسم کی بے ساختگی جو شاعری کے

کے نام سے ستر قلمی کا ترجمہ فرما رہے تھے۔ ڈیڑھ نثر ہی نے چھپی ہے اس کے بعد کچھ ایسا مصروف رہا کہ فرصت نکال ہی نہ سکا۔

بہر حال میں نے وقتِ واحد میں پہلوانی، علم، ادب، شعر، تاریخ اور علوم متفرق کو آصفی میں جمع پایا ہے۔ کوئی پہلوان آجائے تو آپ کشتی لڑنے کے داؤ پیچ، داؤں گھات پر مسلسل تقریر فرمانے لگیں گے۔ کوئی پنجہ کش آجائے تو اس سے پنجہ بھی لڑائیں گے اور پنجہ کشی کی تاریخ اور اس کی اہمیت پر تقریر بھی فرمائیں گے اور اگر بدنصیبی سے کوئی شاعر پھنسے تو پھر اس کی خیر نہیں۔ اپنا فارسی کلام جو سنانا شروع کریں گے تو دم لینے نہ دیں گے۔ اساتذہ کی غزلوں پر غزل کہنے کا بہت شوق تھا۔ پہلے وہ سناتے مثلاً حافظ کی پوری غزل سنا دیتے پھر اپنی غزل سنانے لگتے۔ کمال یہ کہ ہر حافظ کا شعر سنایا جاتا کہ حافظ نے اس قافیہ کو یوں باندھا ہے اور میں نے یوں ادا کیا ہے اس طرح ان کی ایک غزل سننے کے لئے تین گھنٹے لگتے تھے۔ ظاہر ہے کہ جو غزل کسی کی غزل پر کہی گئی ہو اور قافیہ کو خاص طور پر باندھا گیا ہو وہ کتنی مہمل ہوگی۔ یہی حال ان کی غزلوں کا تھا۔ ایک ضخیم کلیات تقریباً ایک ہزار صفحات کا مرتب فرما دیا ہے جو مشاقی اور موزونی طبعی کا اچھا نمونہ ہے مگر اس میں شعریت ہے نہ تغزل۔ فارسی ہی زیادہ کہتے تھے۔ کبھی کبھار اردو بھی کہہ لیا کرتے تھے جو فارسی ہی کی طرح مشاقی کا نمونہ ہوتی تھی۔

دس بارہ بڑی نفیس کتابیں لکھیں، جن میں سے تین چار طبع ہو چکی ہیں۔ کئی صاحبزادیاں اور دو صاحبزادے تھے۔ ایک جوانی ہی میں چل بسے اور دوسرے جو تقریباً میرے ہم عمر ہیں کبوتر اڑاتے رہتے ہیں۔

مولانا شبلی نے تاریخ دکن پر کام کیا تو آصفی سے بھی کام لیا اور سلسلۂ آصفیہ میں جو تاریخ دکن لکھی گئی ہے اس میں بھی آصفی کا بڑا حصہ ہے۔ طبیعت کے سخت اور مزاج کے تیکھے تھے۔ زبان بہت صاف تھی اور گالیاں بھی بے تکلف دے دیا کرتے تھے، مجھ سے ہمیشہ فرماتے "ارے تو سید ہے اس لئے تجھے گالی نہیں دے سکتا، ورنہ جی تو چاہتا ہے کہ خوب گالیاں دوں۔" میں عرض کرتا حضرت! حاضر ہوں مگر اس نکال بیٹھے تو فرماتے بدمعاش! میری عاقبت خراب کرانا چاہتا ہے۔ موڈ میں آتے تو خاصا مذاق کرتے مگر اس میں بھی پہلوانی اور پھکڑ پن ہوتا۔

مہاراجہ کشن پرشاد بہادر بہت چاہتے تھے۔ ایک موقع مہاراجہ نے ایک لطیف مذاق کیا ایک فارسی غزل کہہ کر ترکی کو دکھائی، ترکی کی اصلاح کے بعد طباطبائی (نظم) کو دکھائی اور ان کی اصلاح کے بعد کسی اور کو۔ اس طرح آخر میں یہ غزل آصفی کے پاس بھجوائی۔ آصفی نے وہ اصلاح دیکھ کر غزل کے پرخچے اڑا دیئے۔ جب یہ اصلاح شدہ غزل انہیں واپس ملی تو مہاراجہ نے اپنی ایک تحریر کے ساتھ اپنی پہلی غزل اور سب اصلاحیں آصفی کے پاس بھجوا دیں جسے دیکھ کر آصفی آپے میں نہ رہے۔ اتنے بپھرے کہ ایک لمبا چوڑا خط مہاراجہ کو لکھ بھیجا جس میں ترکی سے لے کر طباطبائی سبھوں کو رگید ڈالا اور مہاراجہ کو بھی جو جی چاہا لکھ دیا۔ مہاراجہ دریا دل تھے سن کر خاموش ہو گئے پھر بلایا مگر آصفی نہ گئے۔ بالآخر مہاراجہ نے معذرت کی اور بڑی مشکل سے انہیں منایا۔

ترکی نے انہیں بہت بگاڑ کیا تھا۔ وہ ان کی کمزوریوں سے واقف تھے ان کی غزل پر غزل کہتے اور مقطع میں ان کی تعریف کر دیتے بس آصفی پھولے نہ سماتے حالانکہ ترکی کی غزل کے سامنے آصفی کی غزل پھیکی پڑ جاتی مگر محسوس نہ کرتے اور خود پڑھ پڑھ کر لوگوں کو سنایا کرتے تھے۔

سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ نہایت صاف دل سیدھے سادے بزرگ تھے کوئی لپٹی نہ رکھتے تھے۔ جب خفا ہوتے تو جو منہ میں آتا کہہ جاتے اور جب غصہ ٹھنڈا ہو جاتا تو صاف بھی ہو جاتے تھے۔ تنگی ترشی کے ساتھ ساتھ فراخ دلی بھی خاصی تھی۔ طلباء کی امداد کرتے، کتابیں دیتے، اہل حاجت کی خدمت کرتے، اہل وطن کی سفارشیں کرتے مگر ساتھ ہی ساتھ دکنیوں کی خدمت بھی کرتے جاتے تھے۔

عبدالجبار خاں صوفی

مولانا عبدالجبار خاں صوفی ملکاپوری بیدری ثم حیدرآبادی مدرسۂ اعزہ کے ہیڈ ماسٹر تھے۔ مدرسۂ اعزہ حیدرآباد کے شرفاء اور امراء

خاندانِ شاہی سے قرابت قریبہ رکھنے والوں کے لئے قائم کیا گیا تھا' چونکہ والد مرحوم نے بھی مدرسہ اعزہ میں تعلیم پائی تھی اور صوفی صاحب کے شاگرد بھی رہ چکے تھے اس لئے جب بھی وہ سلطان پورہ کی طرف جاتے صوفی صاحب سے ضرور ملتے تھے اور ان کے ساتھ میں بھی ملا کرتا تھا۔ چونکہ باپ کے استاد تھے اس لئے مجھے کچھ زیادہ ہی ادب کرنا پڑتا تھا۔ سلطان پورہ میں میرے احباب اکثر رہتے تھے جن کے لئے میں جایا کرتا تھا اور جب بھی مجھے ملاحظہ فرماتے صوفی صاحب پکار لیا کرتے اور گھنٹہ دو گھنٹے اپنی علمی مصروفیات کا حال سناتے تھے۔

تذکرۂ شعرائے دکن دو جلدوں میں، تذکرۂ اولیائے دکن دو جلدوں میں اور تاریخ دکن کئی جلدوں میں مرتب کی تھی۔ تذکرے تو مکمل چھپ گئے مگر تاریخ دکن کی ایک ہی جلد طبع ہو سکی۔ مرحوم کو کام کرنے کا ڈھب آ گیا تھا اور بڑا سستا کام کر کے کرارے دام وصول کرتے تھے سنا اس لئے کہ دو چار تذکروں کو سامنے رکھ کر اور چار چھ آدمیوں کے حالات حاصل کر کے تذکرے مرتب کر دیتے تھے اور انہیں سرکار میں پیش کر کے ہزاروں روپیہ ان کی چھپائی کے لئے بھی حاصل کر لیا تھا اس طرح خوب فائدہ اٹھایا۔

بڑے نفاست پسند اور بر خود غلط قسم کے بزرگ تھے۔ ایک دفعہ فرمانے لگے میاں! تصنیف و تالیف بڑی مشکل چیز ہے۔ خونِ جگر کھانا پڑتا ہے تب کہیں کتاب لکھی جاتی ہے۔ میں نے عرض کیا قبلہ ایسی کتاب جیسی کہ آپ نے شعرائے دکن لکھی ہے حکم ہو تو ایک ہفتے میں مکمل کر دوں۔ یہ سن کر بہت خفا ہوئے۔ میں تو بھاگ کھڑا ہوا مگر آپ نے فوراً مولوی غازی الدین احمد (جو بعد کو غازی یار جنگ ہوئے) سے شکایت کی۔ کیونکہ یہ بزرگ بھی ان کے شاگرد رشید اور والد کے اسکول فیلو تھے انہوں نے میری خوب خبر لی اور مجھے صوفی صاحب کے پاس جا کر باقاعدہ معافی مانگنی پڑی۔

نایاب کتابوں کے متعلق ہمیشہ فرماتے کہ میرے پاس موجود تھیں طغیانی میں تلف ہو گئیں۔ ۱۹۰۸ء میں حیدرآباد کی "موسی ندی" میں ایک زبردست سیلاب آیا تھا جس میں اکثر مکانات برباد ہوئے اور صوفی صاحب کا مکان بھی شاید گر گیا تھا۔

ان کمزوریوں سے قطع نظر آدمی قابل تھے عربی فارسی کے فارغ التحصیل تھے اردو کا مطالعہ بھی اچھا تھا۔ شعر گوئی کا شوق بھی تھا، مطالعہ بھی اچھا تھا۔ معلومات نہایت اچھی تھیں۔ بڑھاپے کے باوجود حافظہ نہایت ہی اچھا تھا اور ہر بات بڑی تفصیل سے سنایا کرتے تھے۔ حیدرآباد کے بڑے بڑے لوگ مثلاً نواب تلاوت جنگ صدر المہام مال، نواب رستم جنگ ناظم کروڑگیری، نواب غازی یار جنگ انسپکٹنگ آفیسر عدالت وغیرہ ان کے شاگرد تھے جن کی شاگردی پر مولوی صاحب ناز فرمایا کرتے تھے۔

مولوی صاحب کا اصل کارنامہ تاریخ دکن ہے' دکن کا تاریخی مواد نہایت مبہم اور منتشر ہے مگر مولوی صاحب نے بڑی محنت سے اسے فراہم کیا اور بڑے ہی سلیقے سے مرتب کیا ہے چونکہ میں بھی تاریخ کا طالب علم ہوں اور تاریخ دکن میرا موضوع ہے اس لئے ان کی محنت کا اندازہ میں نے اچھی طرح کیا ہے۔

مختصر یہ کہ مولوی صاحب بڑی خوبیوں کے بزرگ تھے اور اپنے زمانے کے قابل لوگوں میں سے تھے۔ بیس پچیس کتابوں کے مسودے مولوی صاحب نے چھوڑے ہیں مگر ان کے ورثا نے اس طرف توجہ نہیں کی۔

حکیم وحیدالدین مالیؔ

حیدرآباد سے سینکڑوں صاحبانِ فضل نکلے جن میں سب سے زیادہ قابلِ ذکر حکیم وحیدالدین مالیؔ ہیں۔ اتفاقاً حکیم صاحب [illegible] مرحوم [illegible] ہم درس رہے ہیں اس لئے ہمارے گھرانے سے [illegible]

فاضل بھی حکیم صاحب کے ساتھی تھے اس لئے بھی زیادہ مراسم رہے۔

بظاہر حکیم صاحب نہایت گم گو اور کھوئے ہوئے سے نظر آتے تھے مگر حد درجہ ذہین اور بڑے ہی ذہین تھے۔ یوں امتحان کی حد تک انھوں نے فقط مولوی فاضل کامیاب کیا تھا مگر عربی پر انہیں حاکمانہ عبور اور ماہرانہ قدرت تھی بڑے بڑے علماء ان سے بات کرنے سے جھجکتے تھے ایک دریا تھے جو بہتے رہتے۔ طبیعت کا یہ حال کہ ع

وہیں پانی ہوئی جس شعر کی بہتر زمین نکلی

کبھی سبع معلقہ کا جواب لکھتے تو کبھی متنبی کی چندیاں بکھیرتے۔ کبھی صاحب قصیدۂ بردہ کی خبر لیتے تو کبھی انوری و فیضی کو جھنجھوڑتے۔ غرض بلا کے طباع اور ذہین تھے۔

شمس العلماء طبی شوستری ایک بڑے عالم اور قابل بزرگ تھے۔ عراق اور ایران میں عمر گزاری تھی اور علمائے عالم میں یکتا شمار ہوتے تھے۔ حضور غفران مکان میر محبوب علی خان شاہ دکن کے استاد تھے اور واقعہ یہ ہے کہ عربی و فارسی میں اپنی نظیر آپ تھے مگر وحید الدین عالی کے سامنے ان کا چراغ ہی نہ جلتا تھا، طبی شوستری نے عراق میں عربی کی تکمیل اہلِ زبان اساتذہ سے کی تھی اور ایران میں فارسی کی تکمیل کی تھی اور لطفِ خاص یہ کہ مادری زبان فارسی تھی بخلاف ان کے عالی نے نہ تو اہلِ زبان علمائے عرب سے تحصیل کی تھی اور نہ عراق و عرب کی صورت ہی دیکھی تھی مگر طبعی مناسبت، ذاتی کوشش اور فطری لگاؤ کی وجہ سے عربی ادب اور خصوصاً عربی شعر پر اتنے حاوی تھے کہ طبی شوستری تک ان کے معترف تھے۔

عالی کے فرزند حکیم نظام الدین صاحب نے بعض قصائد اور طبی شوستری کے چند خطوط شائع کئے ہیں۔ کاش عالی کے عربی اور فارسی کلام کی اشاعت ہو جاتی میری ذاتی رائے یہ ہے کہ عالی کے جیسا عربی کا شاعر ہندوستان بھر میں پیدا نہیں ہوا۔ یہ بالکل قدرتی چیز تھی ع

یہ رتبۂ بلند ملا جس کو مل گیا

یہ حال عربی کا تھا۔ فارسی میں بھی خوب شعر کہتے تھے خصوصاً نعت بہت کہی ہے مگر افسوس ہے کہ فارسی کلام بھی شائع نہ ہو سکا۔

طب میں بھی غیر معمولی مہارت تھی، تشخیص بڑی اچھی کرتے تھے اور نسخہ نویسی میں بھی کمال تھا اور بہت سوچ سمجھ کر علاج کرتے تھے طبیب کی حیثیت سے ملازم تھے اور باقاعدہ مطب بھی کرتے تھے۔ عثمانیہ یونیورسٹی قائم ہوئی تو عربی کی پروفیسری کے لئے انتخاب ہوا۔ ابھی جائزہ بھی حاصل نہیں کیا تھا کہ انتقال ہو گیا۔ عمر بمشکل پچاس رہی ہو گی کہ دنیا سے منہ موڑ لیا۔

عجیب و غریب بزرگ تھے۔ فنا فی العلم تھے کھانے پینے اوڑھنے کا شوق مطلق نہ تھا۔ صرف مطالعہ ان کا مشغلہ تھا جو کتاب پڑھتے اس پر نوٹ ضرور کیا کرتے۔ چنانچہ والد کے کتب خانے میں بیشتر کتابیں ایسی تھیں جن پر عالی کے نوٹس تھے۔

ایک دفعہ والد کو درد گردہ ہو گیا اور بڑی تکلیف ہونے لگی حکیم محمود ہمدانی کا علاج ہو رہا تھا، مجھ سے راستے میں ملاقات ہوئی تو میں نے عرض کیا کہ والد عثمان آباد سے بیمار ہو کر آ گئے ہیں۔ درد گردہ ہے اور محمود ہمدانی کا علاج ہے۔ سن کر خاموش ہو گئے دوسرے روز صبح تشریف لائے نسخہ ملاحظہ کیا نبض دیکھی، قارورہ رکھنے کے لئے کہا اور جوشاندہ جو ابلا ہوا رکھا تھا پھینکوا دیا خود گھر جا کر دوا بھجوائی۔ دوسرے ہی روز سے تکلیف کم ہونے لگی اور ایک ہفتے میں صحت ہو گئی۔

مشہور ہے کہ عالی مفت دوا دیتے تھے مگر میں نے ہمیشہ ان سے دوا مفت ہی لی ہے کبھی مجھ سے دوا کی قیمت نہیں مانگی اور نہ حاشیے سے انکار کیا البتہ کتاب انھوں نے مجھے بھی نہ دی کئی دفعہ میں نے بعض کتابیں مانگیں مگر وہ ٹالتے رہے نہ تو صاف انکار کیا اور

والد صاحب کبھی اصلاح سے آتے تو عالی سے ملتے ہوئے جاتے اور کبھی عالی کے پاس گزارتے اس کے دوسرے روز عالی صاحب ہمارے گھر آجاتے اور شام تک یہیں ٹھہرتے۔ والد کو عربی سے شغف تھا اس لئے فارسی شاعری ہی معرض بحث میں آتی اور دونوں ایک دوسرے کو اپنا اپنا فارسی کلام سناتے تھے۔ والد فارسی بھی کہہ لیتے تھے مگر عالی کی شاعری سے ان کی شاعری کو کوئی نسبت نہ تھی۔ ان کا سرمایہ فارسی بیس پچیس غزلوں سے زیادہ نہ تھا اور عالی کا یہ حال تھا کہ ایک ایک نشست میں تیس چالیس غزلیں سنا دیتے تھے مگر تھے دونوں دوست اور ایک دوسرے کے اشعار کی دل کھول کر داد دیتے تھے۔

عالی کے انتقال سے دو ایک مہینے پہلے کا قصہ ہے کہ عالی صبح صبح تشریف لائے اور شام تک غریب خانہ پر ہی ٹھہرے رہے پھر والد سے فرمائش کی، والد نے ایک نئی غزل سنائی۔ اس شعر پر عالی پھڑکتے رہے اور بہت دیر تک داد دیتے رہے ؎

جور و جفائے آسمان غرضۂ قشر دین محمد
وائے بپشت استخوان چرخ چپان زمیں زمین

ہندوستان میں عربی کا ایسا شاعر کوئی پیدا ہوا ہے اور نہ پیدا ہوگا۔ کاش بھائی حکیم نظام الدین اپنے والد کا عربی کلام چھپوادیں اور دنیا کو معلوم ہو جائے کہ ہندوستان نے بھی عربی شاعر پیدا کئے ہیں۔

قطب الدین فاضل

مدرسۂ دارالعلوم حیدرآباد کو صرف دو ہی آدمیوں کو پیش کرنے کا فخر ہے گو اس کی کارگزاری مسلم اور اس کا احسان حیدرآباد پر ہوتا ہے دونوں حکیم حمید الدین فاتی اور حکیم قطب الدین محمود علی فاضل تھے۔

قطب الدین صاحب کا خاندان حیدرآباد کا قدیم خاندان تھا۔ ان کے دادا بھی قطب الدین ہی تھے جو پائگاہ کے خاص لوگوں میں سے تھے اور ان کے والد غیاث الدین بھی بڑے ہی پایہ کے بزرگ تھے جو ہمارے خاندان سے قرابت قریبہ رکھتے تھے۔ غیاث الدین پائگاہ کے تعلقدار (کلکٹر) تھے مگر جب حضرت محمود علی شاہ سے بیعت ہوئے تو تعلقداری سے اپنے بڑے بیٹے قطب الدین کے حق میں دست بردار ہوگئے اور پیری مریدی شروع کردی۔ نواب غیاث الدین خان سے غیاث الدین شاہ بن گئے اور مرتے دم تک ایک ہی وضع پر قائم رہے۔ غیاث الدین شاہ صاحب سے میری پھوپھی بیاہی گئی تھیں اس لئے قطب الدین میرے پھوپھیرے بھائی ہوتے تھے اور میرے والد ان کے ماموں تھے مگر عمر میں بھانجے ماموں سے تین سال بڑی عمر کے تھے اور ہر وقت ہم درس رہے اس لئے قطب الدین میرے والد کو ماموں کہنے کے بجائے حمید پکارتے تھے۔

قطب الدین حیدرآباد ہی میں پیدا ہوئے اور تعلیم و تربیت بھی یہیں ہوئی۔ پنجاب یونیورسٹی سے مولوی فاضل اور منشی فاضل کیا پھر طب اور قانون کے امتحان بھی دئے۔ ان دنوں حیدرآباد میں جتنے بھی امتحان ہوتے تھے سب میں کامیابی حاصل کی۔ پڑھنے کا شوق جنون کی حد تک پہنچ گیا تھا۔ ان دنوں طب عربی اور فارسی زبان میں پڑھائی جاتی تھی۔ طب کا امتحان دیا تو ایک پرچہ ایسا نفیس حل کیا کہ ممتحن نے [illegible] ہوئے اس پر رائے لکھی کہ [illegible] تعلق تھا [illegible] ہے جس کے پرچے [illegible] مگر [illegible] نے حل کیا ہے جو عربی کا فاضل اور [illegible] رکھتا ہے [illegible] ہندوستان [illegible] عربی لکھتے ہوئے نہیں دیکھا۔ یہ پرچہ قطب الدین [illegible] سے اس [illegible] کی وجہ سے [illegible]

نثر ہی میں نہیں بلکہ نظم میں بھی تھا اور عربی فارسی دونوں زبانوں میں دریا بہتے تھے۔

تصنیف و تالیف کا شوق ہوا تو کتابیں لکھنی شروع کیں۔ قانون کی کتابوں کی شرحیں لکھیں، خلاصے لکھے اور پھر مختلف موضوعات پر سینکڑوں کتابیں لکھ ڈالیں۔ ابتداً پائگاہ میں تعلق رہا، ہوتے ہوتے پھر مستعد ہو گئے تھے۔ امیر پائگاہ نواب لطف الدولہ بہادر برادرانہ سلوک فرماتے تھے۔

قصیدۂ لامیہ کی طرح ایک دفعہ جو توجہ کی تو ایک دن میں لگ گئے۔ چار چار سو شعر کے چار چھ قصائد لکھ ڈالے۔ ان کا مقابلہ حیدرآباد میں اگر کسی کا ہو سکتا تھا تو حکیم وسید الدین عالی ہی تھے ان دونوں میں بہت محبت تھی اور ایک دوسرے کو بہت پسند کرتے تھے۔ اعلیٰ حضور غفران مکان میر محبوب علی خان شاہ دکن نے ایک دفعہ سنادالملک آغا شوشتری سے پوچھا کہ آپ حیدرآباد میں کس کو پسند کرتے ہیں تو انہوں نے کہا یوں تو یہاں بہت سے عالم ہیں مگر قطب الدین سب سے تیار اور بڑے ہی ذہین ہیں۔ یہ سُن کر حضور نے یاد فرمایا اور یہ باریاب ہوئے دیر تک گفتگو ہوتی رہی۔ حضور نے فرمایا تھا ... الدین تم کو میں عدالت یا تعلیمات میں مقرر کرنا چاہتا ہوں تو عرض کیا سرکار! چار پشت سے پائگاہ کا نمک خوار ہوں۔ لطف الدین خان اس وقت تک لطف الدولہ نہیں ہوئے تھے ۔ نے پائگاہ کو میرے سپرد کر دیا ہے میں کیسے چھوڑ سکتا ہوں۔ حضور نے فرمایا میں لطف الدین خان سے کہہ دوں گا تو عرض کیا سرکار! وہ حکم کی تعمیل میں خانہ زاد کو اجازت تو دے دیں گے مگر خانہ زاد انہیں کس طرح چھوڑ سکے گا۔ اس جواب سے حضور کچھ متاثر ہوئے مگر پھر مسکرا کر فرمایا اچھا تم پائگاہ ہی میں رہو چنانچہ قطب الدین نے پائگاہ ہی میں عمر گزار دی۔ تقریباً [illegible] سال کی عمر ہوگی کہ انتقال کیا۔

ان کے انتقال کی اطلاع جب ان کے والد بزرگوار کو دی گئی تو انہوں نے نہایت ہی صبر و استقلال سے کیفیت سنی اور جنازہ حافظ ڈنکلی کی مسجد میں لانے کے لیے کہا کیونکہ یہ مغلپورہ میں رہتے تھے اور قطب الدین صاحب نے فتح دروازے کے مکان میں انتقال کیا تھا۔ جب جنازہ حافظ ڈنکہ کی مسجد میں لایا گیا اور غیاث الدین شاہ صاحب کو اطلاع دی گئی تو وہ اٹھ نہ سکے۔ بدنصیبی سے یہ اطلاع میں نے ہی دی تھی مگر جب وہ اٹھ نہ سکے اور میں بھی انہیں سہارا دے کر اٹھا نہ سکا تو ان کے مرید چودھری شہاب الدین اور عبدالکریم کو میں نے بلایا اور تین آدمی مل کر انہیں کھڑا کر سکے۔

بری اطلاع پا کر گر بیٹھ جانا ہم نے سنا ضرور تھا دیکھا نہ تھا مگر عمر میں پہلی اور آخری بار کمر بیٹھتی ہوئی نظر آئی۔ غیاث الدین شاہ صاحب کی واقعی کمر بیٹھ گئی تھی گو مدتوں وہ زندہ رہے مگر چلنے پھرنے کے قابل نہ تھے۔

قطب الدین صاحب مجلسی حیثیت سے زیادہ دلچسپ نہ تھے باتیں اکھڑی اکھڑی کرتے، باتیں کرتے کرتے اپنی دھن میں کھو جاتے۔ وہ جھول جھول کر باتیں کرتے جس طرح کہ پرانے مکتبوں میں لڑکے جھول جھول کر پڑھا کرتے ہیں غالباً یہ جھومنے کی عادت انہیں مکتب ہی سے ہوئی تھی۔

حافظہ غیر معمولی قوی تھا۔ بچپن کی پڑھی ہوئی کتابیں تک ازبر تھیں اور بے تکلف سنایا کرتے تھے۔ ایک دفعہ مجھ سے پوچھا کیا پڑھتے ہو؟ میں نے جواب دیا سکندر نامہ۔ پوچھا بحری یا بری؟ مجھے معلوم نہ تھا کہ دو سکندر نامے بحری اور بری الگ الگ ہیں میں نے کہا وہی جو نظم میں ہے تو کہا میاں! یہ دونوں ہی نظم میں ہیں۔ تم جس سکندر نامہ کو پڑھ رہے ہو اس کا کوئی شعر سناؤ۔ میں نے شعر سنایا ؎

شنیدم ز پیران دیرینہ سنج
کہ زر زر کشد در جہاں گنج گنج!

شعر سُن کر کہا یہ سکندر نامہ بری ہے۔ پھر آپ نے سکندر نامے کے شعر سنانے شروع کیے اور تقریباً ڈھائی تین سو شعر ایک سانس میں سنا دیے۔ چند شعر جو میری سمجھ میں نہیں آ رہے تھے میں نے بتائے تو انہیں سمجھا بھی دیا۔

عربی قصائد، فارسی قصائد اور غزلیات اور اردو کلام کا خاصا ذخیرہ موجود ہے۔ بیشتر قصائد اور نظمیں چھپی ہیں مگر اشاعت محدود ہوئی ہے۔
میرزا قادر علی خان ابوالعلائی، ڈاکٹر سیادت علی خان، ڈاکٹر ولی الدین انہی کے فرزند ہیں۔

قطب الدین صاحب کی کتابوں میں سے شرح شرح محمدی بہت مشہور اور مقبول ہوئی قانونی کتابوں کے علاوہ ان کی دوسری کتابیں طبع نہیں ہوئیں۔ مسودات غالباً قادر علی صاحب کے پاس ہیں جو شاید تلف ہو جائیں گے کیونکہ اب کوئی امید ان کی طباعت اور اشاعت کی نہیں ہے۔

محبّ حسین

مولوی محبّ حسین یو۔پی کے باشندے تھے، ابتداً حیدرآباد آ کر افسر جنگ کے توسط سے فوج کے دفتر میں ملازم ہوئے اور افسر جنگ کی لڑکیوں کو پڑھاتے بھی رہے۔ آدمی معقول، پڑھے لکھے اور وضع دار تھے حیدرآباد میں بہت جلد مقبول ہو گئے۔ پردے کے خلاف تھے اور شدت کے ساتھ پردے کی مخالفت کرتے تھے، چونکہ ان کی دونوں صاحبزادیاں میری والدہ مرحومہ کے ساتھ پڑھتی تھیں اس لئے ہم لوگوں سے خاصے مراسم تھے۔ مہینے میں ایک دو بار یہ لوگ ہمارے گھر آتے اور ہم بھی ان کے گھر جایا کرتے تھے اس آمد و رفت کی وجہ سے میں بھی محبّ حسین صاحب سے مانوس تھا اور ان سے خوب باتیں کیا کرتا تھا۔ والد مرحوم ان کے مخالف تھے کیونکہ وہ انہیں دہریہ، ملحد اور نیچری کہتے تھے مگر انہوں نے مجھے کبھی ان سے ملنے کی ممانعت نہیں کی۔

حیدرآباد کی مشہور خاتون صغرا ہمایوں مرزا کو محبّ حسین نے بہت مشہور کیا۔ اپنے رسالوں "معلم نسواں" اور "شفیق نسواں" میں ان کا خاصا پروپیگنڈا کرتے رہے۔ غالباً محبّ حسین کی بے پردگی کی اسکیم پر کاربند ہونے والی حیدرآباد میں سب سے پہلی خاتون یہی تھیں۔

محبّ حسین مترجم بڑے اچھے تھے۔ رینالڈز (جو غالباً بعد کو سر بھی ہوئے) کی دو بہترین کتابیں "امیر علی ٹھگ" اور "میرا پہلا جرم" اردو میں منتقل کیں۔ خصوصاً امیر علی ٹھگ بڑا نفیس ترجمہ ہے۔ مدتوں تک دو ماہنامے نکالتے رہے اور ان میں اکثر ترجمے شائع کرتے رہے حیدرآباد میں علمی ادبی فضا محبّ حسین ہی نے پیدا کی اور یہاں کے نوجوانوں میں علمی کاموں اور ادبی ہنگاموں کا شوق پیدا کیا چنانچہ حیدرآباد کے شعراء کی ایک بڑی جماعت ان کی وجہ سے علم و ادب کی طرف مائل ہو گئی اور انہوں نے خوب کام کیا۔ نوجوانوں میں مباحثوں اور تقریروں کا شوق بھی محبّ حسین نے پیدا کیا، ان میں سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ بالکل غیر سیاسی آدمی تھے اور ان کی طبیعت سازش کی طرف مائل نہ تھی اس لئے اطمینان کے ساتھ حیدرآباد میں کام کرتے رہے۔

عربی فارسی خاصی جانتے تھے اردو بھی اچھی تھی۔ انگریزی پر اتنا عبور تھا کہ اردو میں ترجمہ بڑی عمدگی سے کر لیتے تھے، باتونی بہت تھے بڑی اچھی باتیں کرتے تھے، عبدالحلیم شرر سے بڑا انس تھا اور دونوں میں خوب بنتی تھی۔

اس زمانے کے فیشن کے مطابق ڈاڑھی ضرور رکھ لی تھی اور مولوی صاحب مشہور تھے مگر بالکل غیر مذہبی آدمی تھے۔ کئی ایک کتابیں چھپوائی تھیں۔ اب تو ان کے نام بھی مجھے یاد نہیں ہیں، آخر میں بصارت سے محروم ہو گئے تھے اور مرتے تک اسی حال میں رہے۔ ۱۹۲۲ء میں جب گلبرگہ آئے تو مجھ سے ملاقات کی اور "رقعات محبّ" کی بہت سی جلدیں فروخت کرانے کے لئے مجھے دیں مگر جب ۲۲ء کے اواخر یا ۲۳ء کے اوائل میں گلبرگہ آئے تو اندھے ہو چکے تھے اور دماغ بھی متاثر ہو گیا تھا۔ گلبرگہ میں ایک وکیل تھے علیم الدین جن سے محبّ حسین کی ایک صاحبزادی بیاہی گئی تھیں۔ علیم الدین کے انتقال کے بعد کچھ جائداد (مکان اور زمینیں وغیرہ) ان کی صاحبزادی کے حصے میں آئی تھی۔

جس کے انتظام کے لئے یہ گلبرگہ آیا کرتے تھے۔ اتفاق سے گلبرگہ کے آخری سفر میں دو تین روز میرے مہمان رہے۔ ان دنوں خدائی کرتے تھے ایک روز فرمانے لگے: ”عابد تم مجھے خدا مانتے ہو یا نہیں؟“ میں نے کہا حضرت! یہاں ناپور میں ایک پیغمبر ہیں جن کا نام ہے عبداللہ اور عبداللہ ناپوری مشہور ہیں۔ چونکہ گلبرگہ انہی پیغمبر کے جورس ڈکشن میں ہے اس لئے اصولاً پہلے آپ کو اپنی خدائی کی توثیق عبداللہ ناپوری سے کرانی چاہیئے تب کہیں ہم گلبرگہ والے آپ کو خدا مانیں گے‘ فرمانے لگے بیٹا! تم مذاق کر رہے ہو‘ میں نے کہا جی میں بالکل واقعہ عرض کر رہا ہوں ان ناپوری پیغمبر کے ایک داماد یہاں وکیل ہیں آپ اجازت دیں تو انہیں یہاں بلا کر اپنی طرف سے شہادت میں پیش کر دوں گا۔ کہنے لگے بے وقوف نہ بنو، کوئی جاہل ہوگا جس نے پیغمبری کا دعویٰ کیا ہے۔ میں نے کہا قبلہ! خدائی اور پیغمبری کا دعویٰ قابل اور فاضل لوگ ہی کرتے ہیں جاہل نہیں کرتے خود آپ بھی تو بڑے قابل ہیں۔ یہ سن کر بگڑنے لگے میں نے بڑی منت سماجت کے بعد منایا ورنہ بستر باندھ کر جانے کے لئے تیار ہو رہے تھے۔

اس طرح دو ایک سال گزار کر محب حسین نے انتقال کیا‘ کئی شادیاں کیں اور ہر ایک بیوی سے اولاد ہوئی اور سب خوش حال ہیں۔ ایک بیٹے جوان ہی مرے ان کا ایک لڑکا یہیں گزیٹڈ پوسٹ پر ہے‘ ڈاکٹر صادق حسین ایک بیٹے ہیں جو صدر اعظم کے دفتر میں منتظم تھے وظیفہ پر سبکدوش ہو گئے ہیں اور تھیاسوفیکل سوسائٹی میں روح پر تقریریں کرتے رہتے ہیں ایک صاحبزادے امتیاز حسین بی اے ایل ایل بی ہیں جو وکالت میں ناکام رہ کر ملازمت اختیار کر چکے ہیں۔ سال چھ مہینے میں یہ بھی وظیفہ پر سبکدوش ہو جائیں گے۔ لڑکیاں بھی خوش حال ہیں۔

محب حسین صاحب کی علمی خدمات بھلائی نہیں جا سکتیں۔ حیدرآباد کی علمی ادبی فضا ان کی شرمندۂ احسان ہے۔

عزیز جنگ ولاؔ

مولوی احمد عبدالعزیز المخاطب بہ عزیز جنگ متخلص بہ ولاؔ بڑے قابل بزرگ تھے۔ مولوی یوسف الدین صاحب سے بڑے اچھے مراسم تھے‘ موصوف کے بڑے فرزند مولوی غازی الدین احمد المخاطب بہ غازی یار جنگ چونکہ والد مرحوم کے ہم مکتب تھے اس لئے بھی ہم لوگوں سے عزیزانہ مراسم ہو گئے تھے۔ ۱۹۲۶ء میں اتفاق سے غازی یار جنگ گلبرگہ پر ایڈیشنل سیشن جج ہو کر آئے اور مولوی علی الدین احمد (دین یار جنگ) ناظم عدالت (مجسٹریٹ) بن کر آئے اور مولوی رکن الدین احمد وہاں پہلے ہی سے مہتمم خزانہ (ٹریژری آفیسر) تھے اس طرح تینوں بھائی ایک جگہ جمع ہو گئے اور ان حضرات کے قیام تک تقریباً روزانہ ملاقاتیں ہوتی رہیں اس لئے بھی میرے مراسم اس خاندان سے زیادہ ہو گئے۔

عزیز جنگ بہادر کی خدمت میں والد کے ساتھ اکثر جانے کا اتفاق ہوتا تھا‘ پھر تنہا بھی جاتا رہا‘ وظیفہ لینے کے بعد ولاؔ نے اپنی زندگی تصنیف و تالیف کے لئے وقف کر دی تھی‘ حقیقت یہ ہے کہ میں نے ایسا منتظم‘ ایسا سلجھا ہوا‘ ایسا دور اندیش‘ ایسا نکتہ رس حیدرآباد بھر میں کسی کو نہیں پایا۔ ولاؔ مدراسی تھے اور مدراس کے شریف ترین گھرانے نائطہ سے تھے‘ یہ خاندان اپنے رہن سہن‘ بود و باش‘ صحت و صفائی‘ اصول اور وضعداری میں اپنی نظیر آپ ہے۔ ولاؔ اس نائطہ گھرانے کے صحیح جانشین اور نمائندے تھے۔ ابتداً چھوٹی سی خدمت پر مامور ہو کر ترقی کرتے کرتے اول تعلقداری (کلکٹری) تک پہنچ کر وظیفہ لیا۔ مختلف محکموں میں مامور رہے اور جس کام کو بھی انجام دیا نہایت دیانت اور خوش سلیقگی سے انجام دیا۔

تعلیم باقاعدہ ہوئی تھی‘ عربی فارسی کی بڑی اچھی استعداد تھی‘ مطالعہ بھی بڑا اچھا تھا جوانی ہی سے تصنیف و تالیف کا ذوق تھا اور ہر فن پر لکھتے تھے چنانچہ کھجور کی کاشت سے لے کر انگور کی کاشت تک ایک ایک کتاب لکھی ہے اور ہر کتاب اپنے موضوع پر مکمل اور مفید ہے‘

"فنِ عمل تاریخ گوئی" پر ایک نفیس کتاب لکھ دی۔ اس کے علاوہ اردو میں تاریخ گوئی سے متعلق کوئی کتاب نہیں ہے۔ یوں تاریخی جملے اور فقرے جمع کر کے "گلبنِ تاریخ"، "آئینۂ تاریخ" وغیرہ ناموں سے لوگوں نے کتابیں شائع کیں مگر فنِ تاریخ گوئی پر اس کی تاریخ پر یہ اولین اور آخری کتاب ہے۔
اسی کے ساتھ ولاؔ نے "قانونِ مال"، "قانونِ عطیات"، "مصطلحاتِ عطیات" وغیرہ پر بیسیوں کتابیں شائع کیں۔ ان کی خوش قسمتی سے حکومت نے کتاب پر صلۂ تصنیف دیا اور سرکاری طور پر جلدیں خریدی جاتی رہیں چنانچہ تصنیف و تالیف سے خاصا رقمی فائدہ انہوں نے اٹھایا۔
"آصف اللغات" کے نام سے ایک لغات کی ترتیب شروع کی اور اس کو ساتھ ہی ساتھ چھپواتے بھی رہے اور غالباً دس بارہ جلدیں چھپا بھی دیں، یہ بڑی اچھی اور خاص لغات تھی جو اب نایاب ہو گئی ہے۔ یہ تمام کتابیں ولاؔ اپنے ذاتی پریس میں چھپوائی تھیں کیونکہ انہوں نے اپنے مکان ہی میں ایک پریس قائم کر لیا تھا۔ کاتب اور سنگ ساز بھی ملازم رکھے تھے اور اپنی ہی نگرانی میں چھپواتے رہتے تھے۔
طبیعت میں انتظامی صلاحیت اور نفاست بہت تھی، سلطان پورہ میں ایک مکان اور باغ بنا لیا تھا۔ مکان نہایت ہی وسیع اور بڑا ہی نفیس بنوایا۔ پھر اپنے لڑکوں کے لئے الگ الگ حصے بھی بنوا دیے تھے چنانچہ چاروں بیٹوں کے لئے چار قطعات الگ الگ تھے اور یہ چاروں ایک ہی جگہ رہتے تھے۔ "عزیز باغ" ایک نمونے کا مکان تھا اس گھر کے کپڑے تک باہر نہ جاتے تھے۔ اندر ہی دھوبی ملازم تھا جو اندر ہی کپڑے دھوتا تھا اور چاروں بھائی ایک ساتھ ہنسی خوشی رہتے تھے۔
ولاؔ بڑے ہی خوش قسمت بزرگ تھے ان کے صاحبزادے سب کے سب قابل اور کارآمد نکلے۔ غازی یار جنگ نے عدالت [illegible] کے انسپکٹنگ آفیسر کی حیثیت سے وظیفہ لیا۔ محی الدین احمد صاحب ناظم کروڑگیری ہوئے۔ دین یار جنگ بہادر صدر ناظم کوتوالی انسپکٹر جنرل پولیس ہوئے اور اب حضور نظام کے پرائیویٹ اسٹیٹ کی کمیٹی کے چیئرمین ہیں۔ رکن الدین احمد صاحب ڈپٹی اکاؤنٹنٹ جنرل کے عہدہ پر سبکدوش ہوئے اور اب بھی حضور نظام کے پرائیویٹ اسٹیٹ میں کارگزار ہیں۔
ولاؔ کو شاعری کا شوق بچپن سے تھا۔ عربی، فارسی، اردو زبان میں خوب شعر کہتے تھے۔ اردو کا ایک ضخیم کلیات اور فارسی کا ایک دیوان شائع [illegible] رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا سراپائے مبارک بڑا نفیس نظم کیا ہے جو طبع ہو چکا ہے۔
ولاؔ نے حیدرآباد کی مطبوعات جمع کر کے رائل ایشیاٹک سوسائٹی آف گریٹ برٹن اینڈ آئرلینڈ واقع لندن کو تحفۃً دیں جنہیں یورپ کے اہلِ علم نے شکریہ کے ساتھ قبول کیا اور برٹش اکیڈیمی سے "شمس العلماء" کا خطاب بھی پایا تھا۔
ولاؔ نہایت ہی وضع دار اور پابند بزرگ تھے اور جن لوگوں سے جس طرح ایک دفعہ مل لیتے اسے آخر تک نباہتے تھے۔ میں جب کبھی جاتا اگر کوئی پھلوں کا موسم ہوتا تو پھل ورنہ مٹھائی ضرور کھلاتے، اپنے باغ کے آم عموماً کھلایا کرتے تھے ورنہ مٹھائی تو ضرور ہی آتی، اور تمام ہر ایک کی خیر و عافیت پوچھتے اور پھر عام گفتگو فرمایا کرتے تھے۔ اپنی تصانیف بھی سرفراز کیا کرتے اور اس کے متعلق گفتگو کی جاتی تو خوش ہوتے تھے۔

ایک زمانہ میں مجھ کو کتب خانۂ آصفیہ جانے کی عادت ہو گئی تھی۔ کوئی خاص کتاب مطالعہ میں نہ ہوتی تو اساتذۂ فارسی کے دواوین کا مطالعہ کرتا اور ایسے شعر جن میں محاورات یا خاص خاص تلمیحات وغیرہ ہوتیں نوٹ کرتا جاتا اور ان کو جمع کر کے جب بھی حاضر ہوتا پیش کر دیتا۔ یہ اس حقیر کوشش سے بہت خوش ہوتے اور مجھے دعائیں دیا کرتے تھے۔ شاید ہی ان میں سے کچھ چیزیں ان کے لئے کارآمد ہوتی ہوں گی مگر چونکہ میں محنت کر کے جمع کرتا اور ان کا خیال رکھ کر بھیجا کرتا تھا اس لئے خوش ہوتے تھے۔
ولاؔ کی اصولی زندگی اور باقاعدگی ضرب المثل تھی اور لوگ اس پر رشک کرتے تھے۔ یہی جھلک ان کے صاحبزادوں میں بھی ہے چنانچہ
[illegible]

کشن پرشاد شاد

ہز ایکسی لنسی سر مہاراجہ یمین السلطنت کشن پرشاد بہادر شاد ان بزرگوں میں سے تھے جو نہ صرف شاعر اور ادیب تھے بلکہ شاعر نواز، شاعر ساز شاعر گر بھی تھے، مہاراجہ بہادر نے وزارت کی گود میں پرورش پائی اور تعلیم و تربیت بھی شاہانہ طریقے پر ہوئی۔ بچپن سے حضور غفران مکان میر محبوب علیخان بہادر شاہِ دکن کی مصاحبت حاصل رہی اور حضور مرحوم کے وصال تک شرفِ خدمت حاصل رہا۔

مہاراجہ کو شاعری اور ادب کا ذوق ورثے میں ملا تھا مہاراجہ چندولال بھی شاعر ادیب اور ادیب پرور تھے چنانچہ ان کی علم پروری اور ادب نوازی نے دکن کو چمن بنا دیا تھا، شاہ نصیر، شیخ حفیظ، غیرہ کو انہوں نے ہی دہلی سے بلوایا تھا اور یہ دونوں ایسے آئے کہ سرزمین دکن ہی میں آسودہ ہو گئے۔

مہاراجہ بہادر نے بھی چندولال کی طرح سینکڑوں کو بلوایا اور ہزاروں کی پرورش کی۔ حیدر آباد کی علمی چہل پہل زیادہ تر انہی کی زیر بارِ منت ہے یوں تو وہ ہر ایک کی پرورش کرتے اور ہر ایک کو نوازتے تھے مگر شعراء اور ادباء کو خصوصاً بہت سرفراز کرتے تھے۔

رتن ناتھ سرشار، سہا مجددی، ثاقب بدایونی، بیخود غازی پوری، ظہیر دہلوی، ترکی پانی پتی، جلیل مانک پوری، رفعت یار جنگ، اختر مینائی، راختر یار جنگ، فانی بدایونی وغیرہ سینکڑوں شعراء کی پرورش مہاراجہ نے کی اور سینکڑوں شعراء اور نثر نگار ہوش بلگرامی، ہوش یار جنگ، جوش ملیح آبادی، تحوی صدیقی وغیرہ کی سرپرستی اور اعانت کرتے رہے حقیقت یہ ہے کہ شاید ہی کوئی بدنصیب ہو گا جسے مہاراجہ سے فیض نہ پہنچا ہو۔

لالہ سری رام دہلوی، مؤلف خمخانہ جاوید، سے لے کر خواجہ حسن نظامی تک ہزاروں مؤلفین اور مصنفین مہاراجہ کے مہمان ہوتے کسی کو خانہ باغ میں ٹھہراتے تو کسی کو کسی ہوٹل میں اور کسی کو اپنے کسی متوسل کے گھر پر اور پھر اس کو اس کی حیثیت سے زیادہ "رخصتانہ" دے کر رخصت فرماتے تھے۔

مہاراجہ کی تعلیم خاصی اچھی ہوئی تھی۔ فارسی اچھی طرح جانتے تھے عربی سے بھی ناآشنا نہ تھے انگریزی سے بھی بقدرِ ضرورت واقف تھے اردو پر خاصا عبور تھا۔ مہاراجہ نے سینکڑوں کتابیں لکھیں اور تقریباً اسی قدر چھپ بھی گئیں۔ کسی موضوع پر بند نہ تھے فوٹوگرافی سے لے کر ناول، افسانہ، ڈرامہ، عروض، سفرنامہ، شعر، ادب سب پر تصنیف فرما دیتے۔ شعر بھی خوب کہتے تھے۔ ابتداً مظفرالدین معلی سے مشورۂ سخن کرتے تھے پھر استاد داغ سے مشورہ کرنے لگے۔ داغ کے بعد جلیل کو مہاراجہ بہادر ہی نے استادِ شاہ بنایا اور خود بھی مشورہ کرنے لگے۔

مہاراجہ بحیثیت انسان بڑے مکمل تھے، کردار نہایت بلند اور شخصیت بڑی ہی مکمل تھی۔ عفو و درگزر کا مادہ شاید ہی کسی میں اتنا ہو جتنا مہاراجہ میں تھا۔ میں نے ہزاروں آدمی دیکھے مگر ایسا وسیع القلب کوئی نظر نہ آیا۔ بڑی سے بڑی خطا بلا معذرت خود بخود معاف کر دیتے تھے۔

میرے گھر کے سامنے میر پاشا رسیف الملک، کی ڈیوڑھی کے افتادہ حصے میں ایک کریم الدین نامی نوجوان رہتے تھے، بہت ہی معمولی حیثیت کے آدمی تھے۔ واجبی واجبی تعلیم یافتہ تھے۔ ترکی کو اپنا اردو کلام بتایا کرتے تھے۔ ایک روز مہاراجہ کے ایک ملازم نے میرے پاس آ کر ان کا پتہ پوچھا میں نے پتہ بتا دیا تو دس پندرہ منٹ کے بعد انہیں ساتھ لیتے ہوئے آیا اور میرے سامنے دو سو روپے انہیں دے کر رسید لکھوائی اور مجھ سے گواہی بھی لکھوائی کہ میرے سامنے یہ رقم کریم الدین کو دی گئی ہے، کریم الدین نے رقم لینے کے بعد کہا کہ انہوں نے چھ سات مہینے پہلے مہاراجہ کی خدمت میں ایک منظوم درخواست بھجوائی تھی کہ میں اجمیر شریف جانا چاہتا ہوں، زادِ راہ سرفراز فرمایا جائے چنانچہ اب مہاراجہ نے سرفرازی فرمائی ہے۔

چونکہ مہاراجہ اس قسم کی داد و دہش کے عادی تھے اس لئے مجھے کوئی حیرت نہیں ہوئی۔ دو چار روز کے بعد میں حاضر ہوا تو مہاراجہ بہادر کو یاد آیا اور انہوں نے پوچھا کریم الدین جو تمہارے گھر کے پاس رہتا ہے کون شخص ہے۔ میں نے اس کے متعلق جو کچھ جانتا تھا عرض کر دیا اور یہ بھی عرض کر دیا کہ استاد ترکی کو اردو غزل بتاتے ہیں۔ یہ سن کر مہاراجہ بہت محظوظ ہوئے فرمانے لگے کیا ترکی صاحب اردو زبان کے بھی استاد ہو گئے؟ میں نے عرض کیا وہ ہر زبان کے استاد ہیں۔ فارسی اور اردو دونوں پر انہیں یکساں عبور ہے اور اب تو مشاعروں میں اردو غزل بھی پڑھنے لگے ہیں۔ اس گفتگو کے بعد مہاراجہ بہادر نے کمرے میں جا کر ایک گول لپیٹا ہوا کاغذ لا کر مجھے عنایت فرمایا کہ اسے دیکھ کر تلف کر دو۔ یہ ایک مڑا کاغذ تھا جو بڑی ساتز کا تھا اور اس پر موٹے قلم سے ایک نہایت بیہودہ شعر مہاراجہ کے متعلق لکھا ہوا تھا جس میں بڑی غلیظ گالی تھی۔ اس شعر کو پڑھ کر میں نے کاغذ کے پرزے کر دیئے اور میرا چہرہ غصے سے متغیر ہو گیا۔ میرا یہ حال دیکھ کر مہاراجہ نے مسکراتے ہوئے فرمایا "پانچ چھ مہینے پہلے اس شخص نے ایک تحریر بھیجی تھی کہ اجمیر شریف جانا چاہتا ہوں آمد و رفت کے لئے اخراجات پانچ سو روپے دیئے جائیں۔ میں نے اس وقت کوئی توجہ نہیں کی، ڈیڑھ دو مہینے کے بعد پھر اس شخص نے ایک تحریر بھجوائی مگر میں نے اس پر بھی کوئی توجہ نہیں کی۔ اب دو تین مہینے کے انتظار کے بعد اس نے اس طریقے سے یاد دہانی کی ہے پہلا مصرع ؏

شاد ہو کر کیوں نہ خاطر شاد کی؟

ہی کافی تھا دوسرے مصرعے میں اس نے گالی دے کر ہجو کی ہے۔ یہ عام طریقہ ہے شعراء پہلے قصیدہ پیش کرتے ہیں، پھر تقاضا کرتے ہیں اور آخر میں ہجو کرتے ہیں، اس غریب نے بھی یہی کیا۔" میں نے عرض کیا بالکل صحیح ارشاد ہوا مگر کسی شاعر نے کسی امیر کی ہجو ایسی نہیں کی ہے۔ انتہا یہ کہ جو ہجو فردوسی سے منسوب کی جاتی ہے وہ بھی ایسی بیہودہ نہیں ہے۔ فرمانے لگے تم سچ کہتے ہو مگر وہ فردوسی تھا اور یہ کریم الدین ہے ؏

فکر ہر کس بقدر ہمت اوست

بعد کو جب میں نے ترکی سے یہ قصہ کہہ دیا تو انہوں نے کریم الدین کو اپنے پاس آنے سے منع کر دیا تھا اور بیشتر شاگردوں کو یہ قصہ ترکی نے سنا بھی دیا تھا۔

غور فرمایئے ایک بدحیثیت نے بیہودہ شخص سے ایسی گالی سن کر دو سو روپے دینا مہاراجہ کے کردار کو کہاں پہنچا دیتا ہے؟

میرے خاندان کے کسی بزرگ کی شاگردی مہاراجہ کے کسی بزرگ نے کی تھی اس کا لحاظ وہ مرنے تک فرماتے رہے اور میں ہمیشہ ان کی خدمت میں حاضر ہوتا رہا۔ وزارت سے علیحدہ ہونے کے بعد مہاراجہ سے جن جن لوگوں نے بے اعتنائیاں کی تھیں اور جو لوگ انہیں سلام کرنے بلکہ ان کا سلام لینے تک کے روادار نہ تھے ان سے جو جو سلوک مہاراجہ نے کئے ہیں میں بخوبی جانتا ہوں، صدر اعظم ہوتے ہی ان سب لوگوں نے یورش کر دی، صدقے اتارے، پھول پہنائے، قصائد، قطعات، تاریخیں پیش کیں اور طرح طرح سے آمد و رفت شروع کر دی اور مہاراجہ اسی طرح ملتے رہے جیسے مدار المہامی کے زمانے میں ملتے تھے، بیچ کے خلاء کو انہوں نے بھلا ہی دیا۔ ایسا وسیع القلب اور درگزر کرنے والا شاید ہی پیدا ہو۔

مہاراجہ میں سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ کبھی کسی کا دل نہ توڑتے اور جو شخص جو بھی خواہش کرتا اس کے تکملہ کا وعدہ کر لیتے اور اپنی حد تک کوشش بھی کرتے تھے، اپنے آپ کو انہوں نے کبھی بھی بڑا آدمی نہیں سمجھا۔ ہمیشہ اپنے تئیں حقیر، فقیر، غریب ہی سمجھتے رہے۔ خود شریف الطبع تھے اس لئے ہر ایک پر اعتماد کرتے تھے۔ ابتداً ان کی پیشی میں مولوی محمد علی (نبیرہ مولوی کرامت علی محدث دہلوی) رہے ان پر اتنا اعتماد کرتے تھے کہ سارا کام انہی پر چھوڑ دیا تھا ان کے دستخط دیکھ کر خود دستخط کر دیا کرتے تھے اور محمد علی کا یہ حال تھا کہ انہوں نے بھی کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا اور ہمہ تن اعتماد بنے رہے۔ اسی وجہ سے لوگ ان کے مخالف ہو گئے چنانچہ لال خاں کوتوال نے نعوذ بالله خط اور جعلی کا مقدمہ بنا کر محمد علی کو شہر بدر کرا دیا اور وہ حیدرآباد سے چلے گئے اور بمبئی میں... جہاں ان کا انتقال ہو گیا [illegible]

مہاراجہ کی صدارتِ عظمیٰ کے زمانے میں مہدی نواز جنگ بہادر ان کے معتمد ہوئے جو نہایت ہی قابلِ اعتماد اور شریف آدمی ہیں۔ مہاراجہ نے ان پر بھی اتنا ہی اعتماد کر لیا جتنا کہ مولوی محمد علی پر کرتے تھے، اسی وجہ سے لوگ ان کے بھی مخالف ہو گئے چنانچہ حیدری صاحب نے سرِ اعظم ہوتے ہی مہدی نواز جنگ کو خاصا پریشان کیا مگر مہدی نواز جنگ بہادر بھی بڑے مردِ میدان نکلے اور بڑی ہی مستعدی اور حاضر دماغی سے مقابلہ کیا اور آخر کامیاب رہے۔

مہاراجہ کے انتقال کے بعد ایک کتاب مہدی نواز جنگ بہادر نے مہاراجہ کے متعلق شائع کرائی ہے جو بہت غنیمت ہے مگر ایک کتاب سے کیا ہو سکتا ہے مہاراجہ کی ایک ایک خصوصیت پر ایک ایک ضخیم کتاب لکھی جا سکتی ہے۔

مہاراجہ نے علم و ادب کی نہ صرف خدمت کی بلکہ اس گلشن کی آبیاری بھی کی اور دامے، درمے، قدمے، سخنے ہر طرح علم و ادب کے لئے وقف رہے۔

مہاراجہ کی داد و دہش ایک مستقل موضوع ہے، ان کے مورثِ اعلیٰ راجہ چندولال بھی بہت دینے والے مشہور تھے مگر ان کی سخاوت پر تبصرہ کرتے ہوئے رائے مکھن لال نے اپنی تاریخ "یادگارِ مکھن لال" میں یہ لکھنے کی جرأت کی ہے کہ "ایک ہاتھ سے رشوت لیتے اور دوسرے ہاتھ سے خیرات کرتے تھے" مگر مہاراجہ کے عہد کا مورخ ایسی جرأت نہیں کر سکتا کیونکہ مہاراجہ نے کبھی بھی رشوت نہیں لی نہ ہی نذرانہ قبول کیا اپنی جاگیر کی آمدنی اور اپنی پیشکاری کی تنخواہ اور اپنی صدارتِ عظمیٰ کی تنخواہ ہی سے داد و دہش کرتے تھے۔ آخر میں جب داد و دہش بڑھ گئی اور آمدنی کم ہو گئی تو قرضہ لیتے رہے مگر ہاتھ نہ رکا۔

مہاراجہ ضرورتاً اور بلا ضرورت دیتے ہی رہتے تھے کوئی مانگے یا نہ مانگے مگر وہ دیتے ضرور تھے اور عجیب و غریب طریقے دینے کے تھے۔ حاضر باشوں کو زیادہ دیا کرتے تھے۔ صبح جب موٹر پر سوار ہو کر نکلتے تو ایک تھیلی میں روپے، اٹھنیاں، چونیاں، دونیاں بھری ہوتیں۔ ڈیوڑھی سے نکلتے ہی مٹھی بھر بھر کر پھینکتے جاتے واپس آنے تک یہ تھیلی ختم ہو جاتی۔ دن میں چار دفعہ بھی نکلتے تو اسی طرح نکلتے اور لپیں ہی مٹھیاں بٹتیں۔ پھر جو حاجت مند اور غرض مند آتے انہیں الگ سرفرازی ہوتی۔ رات کے کھانے پر اکثر حاضر باشوں کو روک لیتے اور جب وہ کھانا کھا کر جانے لگتے تو جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک لفافہ نکالتے اور چپکے سے دے دیتے۔ ایک زمانے میں ہوش بلگرامی اور میں ایک ساتھ جایا کرتے تھے اور عموماً رات کے کھانے پر روک لئے جاتے چنانچہ ایک روز لفافہ ہوش کو ملتا اور ایک روز مجھے، اس لفافے میں کم سے کم پچیس اور زیادہ سے زیادہ پچاس روپے ہوا کرتے تھے۔

۱۹۳۱ء میں مجھے ٹائیفائڈ ہو گیا۔ میری علالت کی اطلاع ملی تو مکان پر تشریف لائے۔ جاتے جاتے سرہانے کے تکیہ کے نیچے نوٹ ایک ایک سو روپے کے رکھ کر تشریف لے گئے اس طرح تین دفعہ تشریف لائے اور تینوں دفعہ ہی تکیہ کے نیچے نوٹ چھوڑ گئے روزانہ آدمی کو بھیجا کر خیریت دریافت کراتے اور پھر حبیب احمد صدیقی (جو اب اے ڈی سی کے مددگار ہیں) کے ہاتھ الگ روپے بھجواتے اور کہلواتے کہ علاج معقول کریں ضرورت ہو تو روپیہ منگوا لیں۔

میں نے ادارۂ علمیہ کے نام سے ایک بک ڈپو قائم کیا تھا جو عابد روڈ پر تھا۔ ہمیشہ آتے جاتے تشریف لاتے اور کتابیں لے جاتے، بل بھجوانے سے پہلے رقم آ جاتی، میرا چھوٹا بھائی رشید اکثر چلا جاتا اور وہ جب بھی جاتا فرماتے "بھئی وہ کتابیں جو آئی تھیں ان کی قیمت لیتے جاؤ۔" چنانچہ ساٹھ ستر روپے اسی وقت دے دیتے۔ اس طرح کتابوں کی قیمت چار چار دفعہ ادا ہوتی۔ یہ دینے کے بہانے تھے۔ عید، بقرعید، ہولی، دیوالی کوئی تقریب ہو سرفرازی لازمی تھی۔ دیتے وقت اس کی حیثیت نہیں دیکھتے جسے دے رہے ہیں بلکہ اپنی حیثیت پیشِ نظر ہوتی۔ سوال کھل کر [illegible] پھر جاتے کہ ہم نے کم دیا ہے۔ یہ بات میں نے مہاراجہ کے علاوہ صرف مولانا خورشید علی ناظم دفتر دیوانی میں پائی ہے اور کوئی تیسرا

اس صفت سے مختلف نظر نہیں آیا۔

مذہب کے معاملہ میں مہاراجہ "گول" تھے۔ صبح الحمد کر پوجا بھی کر لیتے نماز بھی پڑھ لیتے، دھیان گیان بھی کرتے اور ذکر و شغل بھی فرماتے اولیاء کی جاتراؤں بھی دھوم دھام سے کرتے گیارھویں کی نیاز بھی تزک و احتشام سے ہوتی اور محرم بھی بڑی عقیدت سے منایا جاتا مشائخین کے ہاتھ چومتے، گورو بابا کے پاؤں پڑتے دونوں طریقوں پر چلتے رہے۔

ایک مسلمان خاتون سے عقد کیا تھا اور صاحبہ بیبی اپنے آپ کو مسلمان لکھا دیا۔ مرنے وقت وصیت کی کہ ہندو طریقے پر جنازہ اٹھایا جائے کیونکہ انہیں یاد دلایا گیا تھا کہ اگر آپ مرتے وقت کوئی وصیت نہ کریں اور مسلمان طریقے پر دفن ہوں تو آپ کی موروثی پیشکاری آپ کے فرزند خواجہ پرشاد کو نہ ملے گی۔ محض خواجہ پرشاد کی خاطر مہاراجہ نے چتا میں جلنا پسند کیا مگر بدنصیب خواجہ پرشاد کو پیشکاری پھلنا پھولنا نصیب نہ ہوا، بمبئی میں ایک ہوٹل کی بالائی منزل پر سے گر کر بیچارے کی جان گئی۔

جی تو نہیں چاہتا کہ مہاراجہ کا ذکر ختم کروں مگر لکھنا بہت ہے اور وقت کم ہے اس لئے مجبوراً ختم کر رہا ہوں۔

حیدرآباد کے دور اوّل کے بزرگوں میں سے میں نے سات کو انتخاب کیا ہے یہ وہ ہیں جن سے میں ذاتی طور پر واقف رہا ہوں اور جو باتیں میں نے لکھی ہیں اپنی آنکھوں سے دیکھی ہیں اور اپنے محسوسات کو ایمانداری سے پیش کیا ہے۔

لیجئے دوسرے دور کی چند شخصیتوں سے روشناس ہو جائیے، یہ دور بڑا لمبا ہے اس میں سینکڑوں بزرگ آسکتے ہیں مگر میں نے صرف چند کا انتخاب کیا ہے۔

ضیاء یار جنگ

مفتی نور الضیاء الدین المخاطب بہ ضیاء یار جنگ دکن کے قدیم شرفا سے اور حیدرآباد کے عالم فاضل بزرگ تھے۔ اورنگ آباد کے مشائخ گھرانے سے تعلق تھا۔ حیدرآباد ہی میں تعلیم و تربیت ہوئی تھی فارغ التحصیل اور نہایت ذہین بزرگ تھے۔ علم و ادب کے علاوہ قدیم مشاغل پتنگ بازی، شطرنج، شکار، شاعری، پکوان سبھی کا شوق تھا۔ "تاش بینی" میں بھی مشہور تھے۔ مختلف خوبیاں جمع تھیں۔

یہاں بھی میرے لئے وہی مصیبت ہے جس سے ڈر رہا ہوں۔ ضیاء یار جنگ بہادر کی حیثیت حیدرآباد میں وہی تھی جو یوپی میں نواب صاحب جہانگیرآباد یا چودھری محمد علی ردولوی کی تھی۔ اس فن تاش بینی کو انہوں نے فن کی طرح استعمال کیا تھا اور اس میں ماہر کامل تھے مگر تفصیلات نہ تو طفیل صاحب چھاپنا پسند کریں گے اور نہ حیدرآبادی بزرگ پڑھنے کے بعد مجھے زندہ رہنے دیں گے اس لئے ؎

کردم اشارتے و مکرر نمی کنم

شطرنج میں دن بھر کھیلتے، پتنگ مسلسل لڑاتے مہینوں پتنگوں کے پیچے ہوتے تھے [illegible] سے مراتب و برات کا خیال رکھتے تھے۔ یہ شغف مرغوبات علمی حیثیت ایک [illegible] تھے [illegible] علمیہ سے بھرے ہوئے [illegible]

[illegible]

[illegible] اہم [illegible]

کیا اور بہترین اعتماد دیتے رہے۔ اسی وجہ سے [illegible] اہم سے اہم مقدمہ کا حکم گڑگڑانے ہوئے کر دیا اور وہ حیدرآباد سے اپنا چلے گئے اور بعد میں [illegible]

فیصلہ کر دیتے، ہائی کورٹ میں مفتی اور جج کی حیثیت سے بھی کام کیا اور ایسا اچھا کام کیا کہ بڑے بڑے قانون داں لوہا مان گئے۔ اسراف کی وجہ سے لینے دینے کی ضرورت تھی اس لئے تحائف اور نقدی سنا ہے کہ قبول کر لیتے تھے مگر مجھے ذاتی طور پر اس کا علم نہیں ہے

۱۹۱۱ء میں جب حیدرآباد میں پلیگ ہو گیا تو ہم لوگ ٹولی چوکی میں مولوی سید یوسف الدین صاحب کے بنگلہ میں منتقل ہو گئے، ضیاء یار جنگ کا باغ بھی قریب ہی تھا ایک روز صبح ناشتہ کر کے والد ضیاء یار جنگ کے پاس جانے لگے تو میں بھی ساتھ ہو گیا، والد مرحوم کے ہم عمر اور شاید استاد بھائی بھی تھے اس لئے دونوں میں بڑی بے تکلفی تھی۔ والد کو دیکھتے ہی لپٹ گئے، مجھے چھاتی سے لگایا اور بیٹھ کر شاعری شروع کی دوپہر کا کھانا وہیں کھایا، شام میں والد کو "جبل السلام" تک پہنچا گئے۔ یہ میری پہلی ملاقات تھی جو ان سے ہوئی اس کے بعد والد کے ساتھ اور تنہا ان سے ملتا رہا، شمس آباد میں تلنگوں کا جلسہ ہوتا تو مجھے بھی یاد فرماتے، دو دو دن روک رکھتے اور بڑے خلوص سے مہمان داری فرماتے تھے۔

مقرر بڑے اچھے تھے، ایسی اچھی تقریر فرماتے کہ سن کر جی خوش ہو جاتا تھا، کسی موضوع پر تقریر کر رہے ہوں باغ و بہار کا لطف پیدا کر دیتے تھے، مگر ہٹ دھرم اور بر خود غلط نہ تھے۔ معاصرین کا لحاظ کرتے تھے چھوٹوں کی دل افزائی کرتے کسی میں کوئی بات قابل التفات پاتے تو دل کھول کر داد دیتے اور صحیح رہبری کرتے تھے۔

فارسی کے بڑے اچھے شاعر تھے، فارسی غزل بڑی اچھی کہتے تھے، مہاراجہ کشن پرشاد کے مشاعروں میں خصوصیت سے شریک ہوتے اور بڑی سبر حاصل غزلیں پڑھتے تھے۔ شاگردوں کو بنانے اور تیار کرنے کا شوق تھا عبداللہ خاں کامل شاگرد ہوئے تو ان پر بڑی محنت کی نہ صرف انہیں تیار کیا بلکہ "بارگاہ سلطانی" میں بھی پیش کر دیا اور ان کے لئے بڑی جدوجہد کی مگر کامل صاحب میں نقص یہ تھا کہ محسن کش تھے انہوں نے ضیاء یار جنگ ہی کے خلاف ریشہ دوانی شروع کی۔ ضیاء یار جنگ اس میدان کے بھی مرد تھے، ایسا پینترا بدلا کہ کامل ناقص ہو کر رہ گئے، بہرحال کسی جگہ رکتے نہ تھے۔ ہر کام کو تیار ہر بات کے لئے آمادہ تھے

اگر ضیاء یار جنگ میں یہ دوسری باتیں نہ ہوتیں اور وہ صرف علمی ادبی کام میں لگ جاتے تو ملک کو بے انتہا فائدہ پہنچا سکتے تھے۔ یوں بھی انہوں نے ملک کی علمی، ادبی، سیاسی، مذہبی خدمت خاصی کی ہے۔ ایک ضخیم کلیات یادگار چھوڑا ہے جو شاید تلف ہو جائے گا کیونکہ ان کے پس ماندوں کو شعر و ادب سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔

غلام حسین داد

آج سے پچاس سال پہلے ایک بڑی اچھی جماعت نوجوانان دکن کی ابھری جو بہت، کام کرتی رہی۔ ان میں سب سے زیادہ عملی آدمی غلام حسین داد تھے یہ حضرت ملکی اور شریف الخاندان تھے، گھر کے بھی خوش حال تھے، طبیعت میں جدت، اور دل میں قوم کی خدمت کا جذبہ تھا ساتھ ہی ساتھ علمی ادبی جدوجہد بھی کرتے تھے۔

چھوٹی چھوٹی نظمیں بڑی اچھی کہتے تھے، ان دنوں مرہٹواڑی اور سیندھی خوری عام تھی، جس طرح مندروں میں دیوداسیاں ہوتی ہیں اسی طرح [illegible] میں ایک طبقہ مرلیوں کا تھا یہ نیچ ذات کی ہوتی تھیں مگر ہوتی غضب کی تھیں۔ ان میں سے کچھ "گا رڈن" کی حیثیت سے [illegible] چھوٹے کچھ "[illegible]" کی حیثیت سے گھروں میں نوکر رہتیں اور کچھ صرف "پیشہ" کرتی تھیں مگر یہ سب ہوتی تھیں مرلیاں حیدرآباد کا طبقہ ان سے بہت متاثر تھا، بیشتر لوگوں نے ایک ایک مرلی بطور "داشتہ آید بکار" رکھ چھوڑی تھی۔ شرفا اور امرا کم مگر متوسط طبقہ بہت زیادہ اس سے متاثر تھا۔ ان دنوں یہ میرے بھی نہ تھا [illegible]

پھنسنے کے بعد نکلنا مشکل ہوتا تھا۔ اکثر لوگوں نے اپنی بیاہتا بیویوں کو چھوڑ کر مرلیوں کو گھر ڈال لیا تھا اور انہی کے ہو رہے تھے۔ سماج کے اس ناسور کا علاج کسی کی سمجھ میں نہیں آیا۔ سب سے پہلے غلام حسین واؔد نے ایک لمبی نظم کہی اور کراؤن پلپ سائز کے چھ صفحہ رقیہ کی صورت میں ہزاروں کی تعداد میں شائع کی اس کا نام رکھا "مرلی کی بہار" پھر سیندھی خوری پر ایک نظم کہی اور "شربت زندگانی" کے نام سے چھپوائی۔ اس کے بعد "مرلی نامہ" "سیٹھ جی" "لونڈے کی دوستی" وغیرہ قسم کی نظمیں بڑی عمدہ عمدہ کہیں اور شائع کیں۔

یہ نظمیں صرف واؔد ہی کی نہیں ہوتی تھیں۔ واؔد کے علاوہ عبدالحئی بازغ، میرے والد دخلی، کیفی، زخم (ڈاکٹر زور کے والد) بھی شریک ہوتے تھے، کبھی یہ تینوں چاروں مل کر ایک نظم پوری کرتے، کبھی آدھی ایک کہتا اور آدھی دوسرا مگر چھپواتے اسے بغیر نام کے یا فرضی نام سے تھے اور اس کے طابع و ناشر واؔد ہی ہوتے تھے۔ والد کی شادی میں جو مبارکبادیں، سہرے، قطعات وغیرہ کہے گئے تھے، انہیں بھی ایک جگہ کر کے واؔد نے کتابی صورت میں چھپوا دیا تھا اسی طرح کیفی کی شادی پر سہروں کا مجموعہ واؔد نے چھپوایا، اس طرح واؔد نہ صرف دوستوں کی خدمت کرتے بلکہ ملک کی اخلاقی اور سماجی خدمت بھی انجام دیتے تھے، حیدرآباد میں "ہاکرز" ملتے ہی نہیں۔ واؔد نے اپنی چھوٹی چھوٹی کتابوں کی دو دو پیسے قیمت رکھ کر لڑکوں کو دینا شروع کیا اور وہ گھوم پھر کر بیچنے لگے اس طرح واؔد ہی نے حیدرآباد میں ہاکرز پیدا کئے اور پھیری والے کتب فروش بھی انہی کتابوں کی وجہ سے ان کتابوں کے ساتھ لوگوں نے آمدن، بغدادی قاعدہ وغیرہ بھی رکھ کر چلتے پھرتے بیچنا شروع کر دیا۔ واؔد کی نظمیں اتنی مقبول ہوئیں کہ بچے بچے کی زبان پر چڑھ گئیں۔ یہ سلسلہ واؔد اور ان کے ساتھیوں نے سات آٹھ سال تک جاری رکھا۔ میں نے ان تمام کتابوں کو اکٹھا کر کے جلدیں بنالی تھیں مگر میری زندگی "دشت گردی اور صحرا نوردی" میں بسر ہوئی اور پھر تیس سال سے حیدرآباد میں ہوں بھی تو "محلہ نورد" کبھی کوٹلہ میں تو کبھی سلطان پورہ میں، کبھی عثمان پورہ میں تو کبھی سلطان شاہی میں، اس طرح کرایہ کے مکانوں میں رہنے سے میری کتابیں دیمک کی نذر الگ ہوئیں اور ادھر سے اُدھر آنے جانے میں الگ ضائع ہوئیں، اب ان میں سے ایک کتاب بھی میرے پاس نہیں اور حقیقت یہ ہے کہ میں نے انہیں حقیر سمجھ کر ان کی حفاظت بھی نہیں کی، ہائے کتنے کام کی چیزیں میں نے برباد کیں۔

بچپن میں یہ نظمیں جیسے جیسے کہی جاتی تھیں میں یاد کر لیتا تھا کیونکہ ہمارے دیوان خانہ ہی میں یہ کہی جاتی تھیں۔ ایک نظم کے چند شعر یاد آ گئے ہیں سن لیجئے، شانِ نزول یہ ہے کہ ایک صاحب بیوی بچوں، گھر بار کو چھوڑ کر مرلی کے گھر پڑ گئے ہیں اور ان کے بیوی بچے یوں دن گزار رہے ہیں ؎

ماں بے قرار ہے کہ پکانے کو کچھ نہیں ۔۔۔ بچے بلک رہے ہیں کہ کھانے کو کچھ نہیں
بیٹی کے پاس جسم چھپانے کو کچھ نہیں ۔۔۔ گھر کا یہ حال ہے کہ بچھانے کو کچھ نہیں
دے دے لے لے بٹتے بچے کو سودا یہ ہے

. . . .

بہر حال واؔد نے ملک کی بڑی خدمت کی، ایک پریس انہوں نے قائم کر لیا تھا، کتابت کبھی خود کرتے، کبھی کسی سے لکھوا لیتے، نہایت مرنجاں مرنج اور دردمند دل کے مالک تھے، مجھ پر بڑی عنایت فرماتے۔ جب کوئی کتاب چھپواتے سب سے پہلے مجھے عنایت فرماتے تھے رہتے کہاں تھے مجھے معلوم نہیں کیونکہ ہم کبھی ان کے گھر جاتے ہی نہ تھے۔ یہی آتے اور بہت آتے بلکہ دو دو دو دن ہمارے پاس ہی رہتے تھے سعید بن علی مصلی ایک عرب جمعدار والد کے دوست تھے وہ بھی بہت آتے تھے، واؔد سے ان کی بڑی بے تکلفی تھی۔ دونوں جب مل بیٹھتے تو آپس میں خوب چھیڑ چھاڑ ہوتی تھی۔ اب تو بہت کم لوگ واؔد کو جانتے ہیں مگر ان کو حیدرآباد کبھی بھلا نہیں سکتا۔

عزیز یار جنگ

نواب مشرف جنگ کے فرزند تھے، حیدرآباد کے قدیم شرفا کے نمونے، باپ بھی بڑے شاعر اور مشہور شاعر فیض کے شاگرد تھے فیض کا مشاعرہ دیوڑھی میں منعقد کرتے تھے۔ حیدرآباد ہی میں تعلیم و تربیت پائی تھی اول تعلقدار اور ناظم عطیات رہ کر وظیفہ پر سبکدوش ہوئے۔ داغ کے شاگرد تھے اور شعر خوب کہتے تھے۔ دو دیوان ایک واسوخت طبع ہو چکے ہیں۔ والد کے خواجہ تاش ہونے کی وجہ سے مجھ پر بھی مہربان تھے۔

پچیس سال ہوئے کہ حیدرآباد کے ایک ماہنامے نے مجھ سے خواہش کی کہ عزیز یار جنگ کی شاعری پر مضمون لکھوں میں نے اس سلسلے میں ایک خط لکھا تو فوراً جواب دیا۔ اتفاق سے ان کے واسوخت پر میرے ایک ملاقاتی نے مضمون لکھا اور مجھ سے کہا کہ میں اس مضمون میں عزیز یار جنگ بہادر کی تحریر کا نمونہ بھی شائع کرنا چاہتا ہوں۔ آپ وہ خط جو آپ کے نام ہے مجھے دے دیجئے چنانچہ میں نے وہ انہیں دے دیا۔ ان جوان صاحب نے مضمون چھپوایا تو یہ خط اس طرح شائع کیا جس سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ انہی کے نام آیا ہے۔ اتفاق سے یہ مضمون عزیز یار جنگ کی نظر سے گزرا تو بہت خفا ہوئے مجھے یاد فرما کر خفگی کا اظہار فرمایا کہ "تمہارے والد کے تعلقات کی وجہ سے میں نے تمہیں یہ خط لکھا تھا اور بے تکلفانہ مراسلت تھی۔ اس اجنبی شخص کو میں ایسا خط کس طرح لکھ سکتا تھا اس نے اسے شائع کر کے اپنے ہم چشموں میں اپنی عزت تو بڑھا لی مگر لوگ مجھے کیا کہیں گے کہ ایسے معمولی شخص کو اس طرح مخاطب کیا ہے۔ اب تم اعلان کر دو کہ یہ خط میرے نام تھا۔ فلاں شخص نے مجھ سے حاصل کر کے شائع کیا ہے۔"

میں نے ان کی خفگی دور کرنے کی خاطر اعلان کرنے پر فوراً آمادگی ظاہر کر دی مگر ایسا اعلان کرنا اس لئے مناسب نہیں جانا کہ اس طرح دھوکہ دے کر یہ خط اپنی طرف منسوب کرنے والا شخص پست ہو جاتا۔ بہرحال عزیز کا غصہ بڑی مشکل سے کم ہوا۔ یہ ان کی وضعداری اور احتیاط تھی معمولی اور اجنبی لوگوں کے ساتھ مراسلت اور بے تکلفانہ مراسلت تک پسند نہ کرتے تھے، داغ جب ترپ بازار میں آ گئے تو یہ قریب ہو گئے تھے اس لئے داغ کے پاس زیادہ اٹھتے بیٹھتے تھے اور شاگردانِ داغ سے بہت مانوس تھے۔

داغ کے بھتیجے امراؤ مرزا نادان داغ کے بعد بہت پریشان ہو گئے تھے۔ آخر میں عزیز ہی کے گھر پر رہتے تھے اور عزیز ہی ان کے کھانے اور پینے کے ذمہ دار تھے چنانچہ "پینے" کے لئے روزانہ نادان کا روپیہ مقرر کر دیا تھا اور نادان کے مرنے تک ان کی امداد و اعانت کرتے رہے عزیز سے یہ روپیہ وصول کر کے نادان نے ترپ بازار کے نکڑ کے میخانے سے پی اور حالت نشہ میں باہر نکلے ہی تھے کہ ایک تانگے سے ٹکرا گئے گرے اور بری طرح گرے۔ لوگوں نے پہنچ کر اٹھایا تو فی البدیہہ سنایا :-

ضعف سے کوچۂ جاناں میں گرا
میں نے ٹھوکر بھی کہاں کھائی ہے؟

نادان کا کلام پرچوں کی شکل میں تھا اور یہ پرچے ایک تکیے میں بھرے ہوئے تھے جو عزیز یار جنگ کے پاس رہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ عزیز یار جنگ کے دیوان "ارمغانِ عزیز" میں کچھ حصہ نادان کا بھی ہے، اللہ بہتر جانتا ہے کہ حقیقت حال کیا ہے مگر میں سمجھتا ہوں کہ ایسا نہ ہوگا کیونکہ عزیز خود شاعر تھے اور اچھے شاعر تھے۔

گنگ محل کے قریب مس ٹیکاشا کے سامنے گھر بنا لیا تھا اور ڈاکٹر مس ٹیکاشا سے بڑی دوستی تھی جس کی وجہ سے خود بھی بہت باقاعدہ زندگی بسر کرتے تھے آخر میں یورپ کا سفر بھی کیا تھا۔ شعر و سخن کا ذوق بہت تھا دن بھر اسی کا چرچا رہتا تھا۔ مرتے دم تک یہی کیفیت رہی۔ بڑے وضعدار اور شریف آدمی تھے۔

اکبر علی

مولوی اکبر علی مدیر صحیفہ کیفی صاحب نے ابتداً صحیفہ کے نام سے ایک ماہنامہ جاری کیا تھا مگر وہ ایک لاابالی آدمی تھے۔ پابندی سے رسالہ نکالنا ان کے بس کا روگ نہ تھا اس لئے رسالہ جلد ہی بند ہو گیا اور اسے اکبر علی صاحب نے لے لیا' چند پرچے ماہوار نکالے اور پھر ۱۹۱۱ء میں حضور میر عثمان علی خان بہادر کی تخت نشینی کی تقریب میں صحیفہ کو روزنامہ بنا دیا اور اس اخبار کو بڑی عمدگی سے چلاتے رہے' اکبر علی حیدر آباد ہی کے رہنے والے تھے۔ غالباً فوجی گھرانے سے تھے۔ دارالعلوم سے مولوی فاضل کامیاب کر کے صدر محاسبی میں ملازمت کر لی تھی۔ پھر صحیفہ جاری کیا تو نوکری چھوڑ دی اور بڑی محنت سے صحیفہ کو اپنے پاؤں پر کھڑا کیا' بڑے پابند وضع دار' ضدی' ہٹ دھرم تھے جس بات پر اڑ جاتے اڑے ہی رہتے۔ والد کے دوست تھے اس لئے مجھ پر بڑی عنایت فرماتے تھے۔

۱۹۱۶ء میں جبکہ میں والد کے ساتھ عثمان آباد میں تھا' اکبر علی صاحب نے مجھے نامہ نگار بنایا اور اصلاح کی ہفتہ وار خبریں بھیجنے کے لئے کہا چنانچہ میں ۱۹۱۶ء سے ۱۹۲۶ء تک عثمان آباد اور گلبرگہ سے صحیفہ کی نامہ نگاری کرتا رہا۔ ہر دو چار مہینے کے بعد دو چار روپے کے ٹکٹ اور چھپے ہوئے فارم اکبر علی صاحب میرے پاس بھجوا دیا کرتے تھے۔ یہ معاوضہ دیتے تھے وہ نامہ نگاروں کو۔ فارم حالات لکھنے میں کام آتے اور ٹکٹ لفافے پوسٹ کرنے میں لگ جاتے۔

۱۹۲۶ء میں جب میں مستقل طور پر حیدر آباد آ گیا تو مجھ سے ترجمہ کی خواہش بھی کی اور میں نے صحیفہ کے لئے ترجمہ کرنا بھی شروع کیا مگر کبھی اکبر علی صاحب نے اس کا معاوضہ نہیں دیا۔ عبدالرؤف صاحب بی' اے' ایل ایل بی جو بعد میں حیدر آباد میں وزیر بھی ہو گئے تھے' مدتوں روزانہ تین چار کالم لکھ کر مطبع میں بھیجتے اور ترجمہ کرتے رہے مگر مولوی جی نے انہیں بھی سوکھا ہی ٹرخایا اور کوئی معاوضہ نہیں دیا۔ کاتب' پریس مین سبھی تنخواہ کو روتے رہتے تھے۔ مولوی جی کسی کا رونا پیٹنا نہ سنتے۔

صحیفہ ڈائری شائع کر کے خاصا فائدہ اٹھایا پھر دہلی اور کلکتہ کے سفر میں حضور نظام کے ساتھ جا کر سفر شاہانہ کا روزنامچہ مرتب کیا اور اس کی طباعت اور اشاعت کے لئے خاصی رقم لی' اس طرح آمدنی کے ذرائع بہت معقول پیدا کر سکتے تھے مگر نعتیہ مشاعرہ کرتے تو مجبور کر کے "مال خشکا" کھلاتے۔ اس سے زیادہ ہمت نہ کرتے تھے اس طرح بخالت ان کی طبیعت ثانیہ بن گئی تھی۔ اس بخالت کے ہاتھوں ان سے سب تنگ تھے۔

اس سے قطع نظر آدمی بڑے ہی پابند اور دھن کے پکے تھے' جو بات ذہن میں آتی لکھتے اور بے دھڑک لکھتے تھے کسی بڑی سے بڑی ہستی کا خوف بھی نہ تھا۔ البتہ سر اکبر حیدری کو بہت سراہتے تھے۔ ریلوے کے سلسلہ میں سر اکبر کی موافقت کے پوسٹر چھپواتے اور خود اپنے تانگے پر ایک سیڑھی' لئی کی ہانڈی اور پوسٹر رکھ کر رات بھر حیدر آباد میں گھوم کر دیواروں پر اپنے ہاتھ سے پوسٹر لگاتے اور سر حیدری سے روپے بھی پاتے۔

پرانی وضع کے آدمی تھے نئی باتیں نہایت ناپسند تھیں۔ اپنے اخبار میں ایک کالم "نسوانی" کے نام سے رکھا تھا جس میں عورتوں کی بولیاں ٹھولیاں چھپتی تھیں اور بڑے مزے مزے سے عورتوں کی بدکرداریاں چھاپتے تھے۔ آج کل جس طرح صدق جدید لکھنؤ عورتوں کی برائیوں کو مزے لے لے کر لکھتا ہے اسی طرح اکبر علی بھی لکھا کرتے تھے' ایک دفعہ ایک خبر ملی کہ کوئی لڑکی اپنے موٹر ڈرائیور کے ساتھ فرار ہو گئی مولوی جی نے سرخی بنائی "شوفر سے شوہر" اس طرح بڑے مزے کی چیزیں چھاپتے رہتے تھے۔

بعض خرافات پر نیک دل سے خفا ہوتے اور بڑی عمدگی سے اس کے خلاف لکھتے اور یہ قلمی جہاد مسلسل کرتے رہتے تھے غرض حیدر آباد کے قصر صحافت کے ایک ستون تھے۔ تقریباً چالیس سال تک صحیفہ چلاتے رہے اور بڑی عمدگی سے چلایا' ان کے انتقال کے بعد ان کے بیٹے پرچہ نہ چلا سکے۔ پریس اب تک چل رہا ہے جو انہی کی یادگار رہے۔

ادبی ذوق بھی تمام تھا۔ طالب علمی کے زمانے میں ایک عربی ناول "انسان الغاب" کا ترجمہ "جنگلی انسان" کے نام سے کیا تھا جو طبع ہو چکا تھا۔ شعر و سخن کا بھی ذوق تھا۔ آخر عمر میں نعتیہ مشاعرہ ماہوار کرتے تھے اور خود بھی اپنی نعت مشاعرے میں سناتے تھے۔ بہرحال غنیمت آدمی تھے۔

راجیشور راؤ اصغر

حیدرآباد کے مشہور سمستان جٹپول کے والی تھے یوپی میں یہ سمستان ہوتا تو راجہ اصغر رئیس کہلاتا۔ تعلقہ یہاں تھا، راجہ تھے زیادہ وقت حیدرآباد ہی میں گزارتے تھے اور علمی ادبی کاموں میں مصروف رہتے تھے لکھنے پڑھنے کا بہت شوق تھا خصوصاً کتابیں بہت چھپواتے رہتے، شاید ہی کوئی موضوع ہو جس پر راجہ صاحب نے کوئی کتاب نہ چھپوائی ہو، آخر آخر میں بڑا اچھا کام کرنے لگے تھے ایک بڑی ضخیم ہندی لغات چھپوائی تھی جو اب ختم کارآمد ہو گئی۔ ہے ایک انتخاب شعراء کا "نغمۂ عندلیب" کے نام سے چھپوایا تھا جو نہایت ضخیم اور نفیس ہے۔

ابتداً مجھ سے مراسلت رہی پھر میں راجہ صاحب کے پاس آنے جانے لگا، آہستہ آہستہ بے تکلف ہوتے گئے اور آخر میں خاصے بے تکلف ہو گئے تھے، بولتے کم تھے اور اردو صاف نہ تھی مگر لکھتے خوب تھے، مولانا مختار احمد سے مشورہ کرتے تھے اور اپنے مسودات انہی کو دکھاتے اور انہی کی معرفت چھپواتے بھی تھے، پندرہ ایک سال ہوئے کہ سورگباش ہوئے تخمیناً ساٹھ سال کی عمر تھی ایک دفعہ اپنی تصانیف مجھے بتائیں تو میری آنکھیں کھل گئیں، تقریباً سوا سو کتابیں تھیں اور زیادہ تر میری پیدائش سے پہلے کی چھپی ہوئی تھیں۔ عام طور پر لوگ، نہیں بیس پچیس کتابوں کا مالک سمجھتے ہیں مگر یہ سو سے زیادہ کتابوں کے مصنف تھے۔

چونکہ فطرت نقرپہ تھی اور اپنا پروپیگنڈہ کرنا نہ آتا تھا اس لئے زیادہ مشہور نہ ہو سکے، احباب بھی ایسے نہیں تھے جو اچھالتے اس لئے بیچارے تقریباً گمنام رہے۔

مختار احمد

"محافظ اسلامی علامہ مختار احمد" ٹونک کے باشندے تھے مدتوں پہلے حیدرآباد آ گئے اور ایسے آئے کہ یہیں پیوند زمین ہو گئے علمی خدمات کے صلے میں کچھ تنخواہ بھی مقرر تھی اور توشک خانۂ عامرہ سے سال میں دو تین بار خاص رقم الگ مل جاتی تھی جو یا تو کتابیں خریدنے میں صرف ہوتی یا دعوت میں، تنخواہ آتی تو بڑی ہی شاندار دعوت کرتے خود کھاتے دوستوں کو کھلاتے تنخواہ ختم ہو جاتی تو فاقہ کشی کرنے کو بھی تیار ہو جاتے، مگر اپنی فلاکت اور تنگ دستی زبان پر نہ لاتے، مجھ سے دوستی اس طرح ہوئی کہ ایک رسالے میں ان کا مضمون پڑھتے ہوئے میں مکتبۂ ابراہیمیہ میں بیٹھا تھا کہ یہ تشریف لائے، بغیر کسی تعارف کے مجھ سے پوچھا آپ کیا پڑھ رہے ہیں میں نے رسالہ کا نام بتایا تو پوچھا مضمون کس کا ہے میں نے بتایا تو پوچھا آپ جانتے ہیں یہ کون ہے میں نے لاعلمی ظاہر کی تو پوچھا مضمون کیسا ہے، میں نے تعریف کی تو کہا میرا مضمون ہے۔ اس کے بعد گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے تک گپ شپ اڑاتے رہے پھر تو یہ حال ہوا کہ جہاں ملتے روک لیتے۔ لمبی گفتگو ہوتی اور خوب باتیں ہوتیں، جغرافیہ ان کا خاص موضوع تھا۔ اسلامی شہروں کے متعلق بڑی معلومات رکھتے تھے اور اس قسم کے مضامین خوب لکھتے تھے مگر صرف جغرافیہ ہی کی حد تک معلومات محدود نہ تھیں تاریخ اور ادب پر بھی خاصا عبور تھا، عالم و فاضل بزرگ تھے۔

اپنے چھوٹے بھائی مولوی وقار احمد ایم اے، ایل ایل بی مدیر روزنامہ نظام گزٹ کی تعلیم و تربیت انہی کی محنت کا نتیجہ ہے اپنے

ایک بیٹے نثار احمد کو بھی بڑی عمدگی سے تیار کیا تھا مگر عزیب نے داغ مفارقت دیا۔ حکمی جو اب نظام گزٹ میں کام کرتے ہیں انہی کے فرزند ارجمند ہیں۔
مولوی غلام مصطفیٰ ذہین حیدرآبادی سے بڑی دوستی تھی۔ اپنے ایک لڑکے کی شادی ان کی لڑکی سے کی تھی۔
لغات پر بھی مختار احمد صاحب کی نظر بڑی اچھی تھی۔ آخر میں دکنیات کی طرف بھی متوجہ ہو گئے تھے۔ دکنی زبان کی ایک لغات بھی مرتب کر رہے تھے،
اپنے موضوع سے ہٹ کر دوسرے فنون پر کتابیں لکھتے اور فروخت کر دیتے تھے بعض بڑی اچھی کتابیں فروخت کر دیں جو دوسروں کے نام سے چھپیں۔
راجہ راجیشور راؤ اصغر بھی ان سے اچھا سلوک کرتے تھے مگر یہ اتنے شاہ خرچ تھے کہ زندگی تکلیف ہی میں بسر کی۔ آدمی وضعدار اور بڑے مخلص تھے۔
علمی فراخ دلی اور ادبی بلند حوصلگی خاصی تھی، طبیعت میں جبن اور بخالت مطلق نہ تھی۔

مانک راؤ وٹھل راؤ

پائگاہ کے جاگیردار اور وہیں ملازم بھی تھے، پرانی وضع کے عربی فارسی پڑھے ہوئے بزرگ تھے۔ تاریخ کا ذوق فطری تھا تاریخ دکن پر بڑی اچھی نظر تھی۔ بستان آصفیہ کے نام سے ایک سلسلہ شروع کیا تھا جس کی کئی جلدیں چھپا دی تھیں چونکہ جدید طریقۂ تحقیق اور طریقۂ ترتیب سے ناواقف تھے اس لئے اپنی کتابیں پرانے طریقے پر ہی مرتب کیں اور چھپوائیں۔ مگر مواد نہایت ہی عمدہ جمع کیا ہے۔ آنے والی نسلیں اس مواد کو اپنے حسب منشا استعمال کر سکتی ہیں جو بڑا کارآمد ہوگا۔

ان میں خصوصیت یہ تھی کہ نہایت معتدل قسم کے بزرگ تھے تعصب و تنگ نظری مطلق نہ تھی تاریخ کو تاریخ ہی کی طرح مرتب کرتے تھے افسانوی واقعات سے تاریخ مرتب کرنے کے قائل نہ تھے۔ سو سال پہلے ایک مؤرخ مکھن لال گزرے ہیں جو ریذیڈنسی کے میر منشی تھے۔ انہوں نے ایک بڑی نفیس تاریخ "یادگار مکھن لال" مرتب کی تھی اور بڑی ہی دیانتداری سے واقعات مرتب کئے تھے، ان کے بعد مانک راؤ ہی کا نمبر ہے۔
مجھے یاد نہیں ہے کہ میری ملاقات راؤ صاحب سے کب ہوئی مگر ۳۰ سال سے ملاقات تھی میں جب کبھی حسینی علم کی طرف جاتا ان سے ضرور ملتا اور وہ جب کبھی چار مینار کی طرف آتے مجھ سے ضرور ملتے تھے تاریخ کی ترتیب کے سلسلے میں مشورہ کرتے مگر مشورے پر عمل نہ کرتے بلکہ پرانے ڈھب ہی پر ترتیب دیتے تھے۔
کام کرنے کا ڈھنگ بڑا اچھا تھا، اخبارات کے کٹنگ بڑے سلیقے سے جوڑ رکھے تھے اور الگ الگ عنوانات پر الگ الگ کٹنگ جمع کرتے تھے اس طرح انہوں نے تاریخ مسلسل مرتب کی تھی اور بڑی عمدہ چیز محفوظ کر دی تھی، مثلاً حیدرآباد کی طغیانیاں ایک جگہ کر دی تھیں بعض جلدیں مستقل بنا دی تھیں جو بڑی اہم تھیں، گزشتہ تیس چالیس سال میں ایسا اچھا اور کارآمد مواد کسی نے بھی فراہم نہیں کیا۔
ذات کے برہمن تھے اور پابند مذہب بھی تھے۔ کھانے پینے میں احتیاط کرتے تھے مگر علمی رواداری اور مذہبی بے تعصبی خاصی تھی، طبیعت میں انکسار تھا اور بڑی خندہ پیشانی سے ملتے تھے، مرنے سے پہلے ایک جلد تیار کر رکھی تھی اور چھپانے کی فکر ہی میں تھے کہ انتقال ہو گیا، بہرحال پانچ چھ جلدیں جو انہوں نے چھپوا دی ہیں یہی ان کا بڑا کارنامہ ہے۔

سرفراز نواز جنگ

آج سے تیس پینتیس سال پہلے آپ نے انگریزی اخباروں میں "سید سردار علی کی کھلی چٹھی" پڑھی ہو گی۔ یہ کھلی چٹھیاں اس نوجوان سید سردار علی خان

المخاطب بہ سردار نواز جنگ کی ہوتی تھیں۔

یہ حیدرآباد ہی کی پیداوار تھے ان کے والد سردار دلیر الملک بہادر یہاں معتمد وغیرہ رہے اور آخر میں اپنے مقدمے کی وجہ سے بہت مشہور ہو گئے تھے۔ ۱۹۱۱ء میں جبکہ ہم لوگ ضلع رائچور میں تھے سردار صاحب کو میں نے دیکھا جہاں وہ دوم تعلقدار (ڈپٹی کلکٹر) ہو کر آئے تھے، ہمارے مکان کے قریب ہی ان کا رہائشی مکان تھا شام میں اکثر والد انہی کے پاس جا کر بیٹھتے اور رات میں اکثر سردار صاحب ٹہلتے ہوئے ہمارے پاس آجاتے تھے، سردار صاحب مجھ سے بہت مانوس تھے۔ کاغذ، لفافے، پنسل اور رنگین تصویروں کے رسالے مجھے دیا کرتے تھے۔ رائچور سے والد کا تبادلہ عثمان آباد ہو گیا اور پھر سردار صاحب بھی وہاں کے دوم تعلقدار ہو کر آئے اور پھر منصرم اوّل تعلقدار ہو کر مستقر عثمان آباد پہنچے، اس طرح مسلسل ملنے کا اتفاق ہوتا رہا، پھر سردار صاحب رائچور اور اس کے بعد گلبرگہ کے اوّل تعلقدار ہو کر چلے گئے، والد عثمان آباد ہی میں تھے اور میں حیدرآباد میں تھا کہ ۱۹۲۰ء میں سردار صاحب نے والد کا تبادلہ گلبرگہ کر دیا اور مجھے بھی بلا لیا اور مجھ سے اپنے پاس صوبہ داری ہی میں کام لینے لگے اور مسلسل ڈیڑھ دو سال تک میں ان کے پاس کام کرتا رہا، صوبہ داری تخفیف ہو گئی تو میں معلق رہ گیا اور پھر لوکل فنڈ میں چلا گیا اور سردار صاحب ناظم (پوسٹ ماسٹر جنرل) ہو گئے مگر مجھ سے مراسم آخر تک رہے۔

مسئلہ برار پر ایک مستقل کتاب اور کئی والیسراؤں کی سوانح عمریاں سردار صاحب نے لکھی ہیں ایک مختصر سی اردو کتاب برار سے متعلق "خیابان برار" کے نام سے بھی شائع کی ہے، لوگ ان سے انگریزی کے مصنف کی حیثیت سے واقف ہیں مگر کم لوگ یہ جانتے ہیں کہ یہ اردو کے بھی بڑے اچھے ادیب اور شاعر تھے۔ آخر میں شاعری تو چھوڑ دی تھی مگر ادب کا ذوق باقی تھا۔

میں نے سردار صاحب کی طرح کا انسان کہیں نہیں دیکھا، معاف فرمائیے نہایت ہی ایمانداری سے عرض کر رہا ہوں کہ سردار صاحب میں بیک وقت واحد صفات ملکوتی بھی پائے جاتے تھے اور خصوصیات اسفل بھی، گفتگو کرنے لگتے اور تصوف بگھارتے تو معلوم ہوتا کہ بایزید وقت ہیں ان سے بڑا صوفی اور پیر کامل شاید ہی ہو مگر جب گفتگو ختم ہو جاتی اور عمل کا دور آتا تو محسوس ہوتا کہ چنگیز و ہلاکو کی روح ان میں حلول کر گئی ہے۔ ایسی متضاد شخصیت کہیں دیکھنے میں آئی نہ سننے میں۔ میں ان کا ذکر خیر برائیاں گنانے اور بدنام کرنے کے لئے نہیں کر رہا ہوں بلکہ اس لئے کر رہا ہوں کہ طلبائے نفسیات کے لئے ایک مسئلہ پیش کر دوں اور وہ اس پر غور کر سکیں، ایسی مشترکہ شخصیت اور متغیر کردار کا کوئی مقام میں تجویز نہیں کر سکتا۔ آپ ہی ان کے لئے کوئی مقام تجویز کریں تو بہتر ہوگا۔

مجھے ان کے پاس کام کرنے کی سعادت نصیب ہوئی ہے اور چونکہ میں بچپن سے ان کی خدمت میں گستاخ تھا اور وہ مجھ پر بزرگانہ شفقت فرمایا کرتے تھے اس لئے میں ان سے برملا کہہ بھی دیتا تھا کہ آپ کی یہ حرکت منافقت پر محمول کی جا سکتی ہے یا یہ فعل ظالمانہ ہے تو ہنستے اور فرمایا کرتے "میاں! انسان فطرت میں بدی ہے تاوقتیکہ کسی سے مسلسل نیکیوں کا صدور نہ ہو اسے بدی مجھو۔ جب اس کی مسلسل نیکیاں دیکھتے جاؤ تو اس کی نیکی کا گمان کر سکتے ہو یقین پھر بھی نہ کرو۔"

یہ تھا ان کا فلسفہ اور اسی پر وہ عمر بھر کاربند رہے مگر اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ کوئی ان کا دوست نہ بن سکا اور دو چار بدنصیب جو اپنی وضعداری کی وجہ سے دوستی نباہتے رہے وہ بھی دل ہی دل میں ان سے متنفر تھے۔

عربی، فارسی تعلیم بھی اچھی ہوئی تھی انگریزی کے تو خاصے ادیب تھے آکسفورڈ میں انگریزی کی تکمیل کی تھی، اردو پر بھی خاصا عبور تھا، بڑی صاف سلیس اور بامحاورہ اردو بولتے اور لکھتے تھے۔ مطالعہ اتنا اچھا کہ تصوف، فلسفہ، الٰہیات، منطق، سیر، تاریخ، جغرافیہ، سائنس، معقولات، منقولات سب پر یکساں نظر تھی جس موضوع پر گفتگو کرتے یہ معلوم ہوتا کہ خاص انہی کا فن ہے اور اس کے ماہر ہیں۔ عام معلومات کے علاوہ قانونی اور دفتری معلومات کا بھی یہی حال تھا۔ اجمیر شریف سے واپس ہوتے ہوئے پونا میں ایک روز ٹھہر گئے مجھ سے فرمانے لگے یہاں کے کالج اور فرینڈز آف

انڈیا سوسائٹی دیکھنا چاہتا ہوں میں نے جا کر ان لوگوں کو اطلاع دی اور انہوں نے آنے کی اجازت دے دی تو سالار نے کو بھیجا کہ لوگ کے پرفیسر اور سوسائٹی کے ممبروں کو ایسا الجھایا کہ سب ان کا کلمہ پڑھنے لگے۔ بعض تو ایسے گرویدہ ہوئے کو اسٹیشن تک رخصت کرنے کو گئے۔ مجھ سے بعض نے بڑی حیرت سے پوچھا کہ تمہارے حیدر آباد میں ایسے قابل لوگ کس طرح پیدا ہوئے یہ تو بڑی غیر معمولی قابلیت اور بڑے اعلیٰ دماغ کے مالک ہیں۔ میں نے جواب دیا "آپ لوگوں نے فقط ایک پرادنس کمشنر کو دیکھا ہے معتمدین اور صدر المہام لوگ ان سے زیادہ قابل ہیں" یہ تو مصلحتاً کہی مگر حقیقت یہ ہے کہ رہنما والوں کو سردار صاحب نے متحیر کر دیا۔ یہ حال ان کی قابلیت کا تھا۔

انگریزوں کے زمانے میں حیدر آباد کے متعلق بڑی گڑبڑ ہو رہی تھی چونکہ حالات نازک صورت اختیار کر چکے تھے اس لئے حضور نظام کو دہلی بلوایا گیا تھا، سردار نیاز جنگ نے حسن نظامی کو فراہم کر کے دہلی میں حضور نظام کے استقبال کی تیاریاں کرائیں اور اس ٹھاٹھ کا استقبال کرایا کہ انگریز بھی دنگ رہ گئے یہ سارا کھیل سردار صاحب نے حیدر آباد میں بیٹھ کر کھیلا۔ پھر جب حضور دہلی سے واپس ہونے لگے تو حیدر آباد میں جشن اور چراغاں کرنے کی تحریک کی اور سب سے زیادہ خود سردار صاحب نے حصہ لیا، ایسے کھیل وہ بیٹھے بیٹھے کھیل لیتے تھے، اس کا خمیازہ انہیں یہ بھگتنا پڑا کہ انگریز سخت ناراض ہو گئے اور ریذیڈنسی ان کی علیحدگی کا مطالبہ کرتی رہی اور انہیں وظیفہ پر سبکدوش ہونا پڑا۔ بدنصیبی سے میری آمد و رفت اس زمانے میں بھی سردار صاحب کے پاس تھی اور بیشتر مراسلت میرے سامنے ہوتی رہی اور بعض خطوط مجھ سے لکھواتے کیے اس لئے میں اس واقعہ سے واقف ہوں۔

سردار صاحب کو عبد المقتدر صاحب بدایونی سے بیعت تھی اور ان کا بہت احترام کرتے اور باقاعدہ پاؤں پڑتے تھے مگر بعض لوگوں کے متعلق انہوں نے سفارش کی تو وعدہ کر لیا کہ ان کی سفارش نہیں کرنے گے مگر ان کے جاتے ہی ان لوگوں کو ڈانٹ بتائی کہ بھولے بھالے مرشد کو تم نے رو پیٹ کر ہمدرد بنا لیا میں نے ان کے کہنے سے وعدہ تو کر لیا ہے مگر یاد رکھو تمہیں اسی طرح سزا دوں گا۔

بعض لوگوں کو منصرم تحصیلداری دے کر بھجواتے پھر بعض لوگوں سے کہہ کر ان کے خلاف درخواستیں دلواتے اور ان درخواستوں پر کارروائی کر کے انہیں تحصیلداری سے ہٹا دیتے یہ لوگ روتے پیٹتے آتے تو ڈانٹ ڈپٹ کرتے اور نو یہ تلا کر کے پھر کسی تحصیلداری پر بھجواتے اس طرح کے کام بہت کرتے اور اس سے خوش ہوتے تھے۔

فصیح جنگ ان کے بڑے مرشد، مربی اور ہمدرد تھے جنہیں وہ "حضرت محسنی" لکھتے اور کہتے تھے، ایک مرتبہ مشہور ہوا کہ سردار صاحب کو زوال ہو رہا ہے تو فصیح جنگ نے نواب حسین دوست خاں سے میرے سامنے ہی کہا کہ "ارے نواب! سردار صاحب کو زوال ہو رہا ہے میں تو اپنا بستر باندھ رہا ہوں، تم بھی اپنی جاگیر کا رُخ کرو اب حیدر آباد کی خیر نہیں ہے" سردار صاحب بیٹھے ہوئے ہنستے رہے۔ کمال یہ تھا کہ اپنے ماتحتین کو معطل، موقوف، برطرف کر کے یا تبادلہ کر کے سردار صاحب یہ سمجھتے تھے کہ انہوں نے بڑا نیک کام کیا اور خلق اللہ کو اس طرح فائدہ پہنچایا ہے۔

سردار صاحب کی دو خصوصیتوں کا میں قائل ہوں۔ ایک تو یہ کہ شاہ پرست تھے مرتے دم تک شاہ پرست رہے اور دوسری یہ کہ کسی شخص کے کتنے ہی دشمن ہوں وہ مر جاتا تو اس کے بیوی بچوں سے امکانی ہمدردی کرتے۔ بعض لوگوں کو سردار صاحب نے تبادلہ کیا پھر انہیں معطل کیا اور پریشان کرتے رہے اسی پریشانی میں وہ مر گئے تو آپ نے ان کے بچوں کو جیب سے روپے دیئے، بیوی کے وظیفے کی کارروائی ذاتی طور پر سفارش کر کے وظیفہ منظور کرایا، بعضوں کے لڑکوں کے تقررات کرائے مگر زندگی بھر وہ لوگ معتوب رہے۔

شیر دل ایسے تھے کہ کسی سے نہ ڈرتے تھے اور ہر ایک سے لڑنے کے لئے تیار رہتا۔ گو ہمیشہ اپنی طرف سے نرمی سے پیش آتے تھے۔ سمجھ بوجھ سے طریقے سے ہر شخص سے پیش آتے اور وہ خود بھی بے اعتنائی کرتا اور کچھ مقابلہ شروع ہو جاتا تو ایسا کچا کرتے کہ توبہ بھلی۔

گلبرگہ پر پیشیاں تھیں ڈاکٹر عبدالرب جیل سرجن تھے جو سردار صاحب کے بھی معالج تھے " ناظم طبابت نے ان کا تبادلہ لاتور پر کر دیا اور ڈاکٹر صاحب اپنا سامان باندھنے لگے ہیں تو سردار صاحب سے ذکر کیا تو کہا ڈاکٹر صاحب سے کہو کہ تبادلہ نہیں ہوگا سامان نہ باندھیں اور خود سردار صاحب نے ایک نیم سرکاری ناظم طبابت کو لکھی کہ ڈاکٹر عبدالرب بڑے ہی خلیق اور ہمدرد ڈاکٹر ہیں گلبرگہ کے باشندوں اور بعدہ والوں کو ان کی موجودگی سے بہت فائدہ پہنچ رہا ہے اس لئے ان کا تبادلہ منسوخ کر دیا جائے مگر ناظم طبابت بھی ایک ہی کائیاں تھے انہوں نے جواب دیا کہ لاتور پر ایک بیمار اور خلیق ڈاکٹر کی ضرورت ہے وہاں مدت سے کوئی اچھا ڈاکٹر نہیں ہے اس لئے ڈاکٹر عبدالرب کا وہاں بھجوایا جانا لاتور والوں کے لئے ضروری ہے، گلبرگہ ڈاکٹر صاحب سے بہت فائدہ اٹھا چکا اب لاتور والوں کو بھی فائدہ اٹھانے دیجئے۔ یہ جواب بڑا دندان شکن تھا مگر سردار صاحب بھی کانٹے کے آدمی تھے نیم سرکاری وصول ہوتے ہی ایک ٹیلیگرام ناظم طبابت کو کیا کہ ڈاکٹر عبدالرب کے لئے میں بارگاہ خداوندی میں معروضہ پیش کر رہا ہوں براہ کرم فرمان کا انتظار فرمایئے ــــــ یہ ایسی ضرب تھی کہ ناظم طبابت اسے روک نہ سکے۔ ڈاکٹر صاحب کو تار کے ذریعہ اطلاع دی کہ فی الحال تبادلہ ملتوی کیا جاتا ہے، اس طرح ڈاکٹر صاحب کو وہاں سے جانے نہ دیا۔ اب انہوں نے معروضہ پیش کیا یا نہیں اللہ ہی بہتر جانتا ہے مگر ناظم طبابت تو مرعوب اور مجبور ہو گئے۔

بہرحال سردار صاحب کی شخصیت معجونِ مرکب تھی اور عجیب و غریب بزرگ تھے۔

توفیق

دکن میں شاعری کا چرچا مدت سے ہے اور ہزاروں شاعر ہوئے اور ہیں مگر یہاں کی شاعری کچھ فیشن کچھ شوق اور کچھ بیکاری کے تحت رہی، پڑھے لکھے لوگوں نے اپنا تخلص مقرر کر لینا لازمی سمجھ لیا تھا جس طرح علماء خواہ مخواہ اپنی کنیت رکھ لیتے ہیں اسی طرح بیکار اور قوم بھی ایک نہ ایک تخلص رکھ لیا کرتے تھے اور تخلص کی لاج رکھنے کے لئے غزل بھی کہہ لیتے اور اپنا نام خواہ مخواہ پانچویں سواروں میں لکھوا لیتے، ان کے علاوہ بعض بعض ایسے بھی تھے اور ہیں جنہوں نے عمر بھر رو ہی غزلیں کہیں مگر کمال انکسار اپنے آپ کو شاعر سمجھتے رہے اور اب تک سمجھ رہے ہیں۔ اس قبیل کے لوگ نہ صرف دکن میں تھے اور ہیں بلکہ ہندوستان اور پاکستان میں بھی موجود ہیں مگر انہی میں چند ایسے لوگ بھی پیدا ہو گئے جو واقعی شاعر تھے اور جن کا شعراء میں شمار کیا جا سکتا تھا۔ ایسے ہی لوگوں میں سید جلال الدین توفیق بھی تھے یہ بزرگ سید زادے اور سادات مہدویہ سے تھے۔ پرانی وضع کے تعلیم یافتہ اور خاصے پڑھے لکھے تھے ضروریاتِ شعری سے باخبر اور عروض و قافیہ پر اچھی نظر تھی، صدر محاسبی میں ملازمت تھی منتظم رہ کر ریٹائر ہوئے بچپن سے شعر و سخن کا شوق تھا اور بڑی اچھی مشق تھی۔

طبیعت میں سلجھاؤ تھا، سوچ سمجھ کر شعر کہتے اور احتیاط بھی کرتے تھے، ابتداً شعرائے لکھنؤ کی اتباع کی اور آتش و ناسخ کی پیروی کرتے رہے مگر جلد ہی اسے چھوڑ کر غالب و مومن کی طرف متوجہ ہو گئے اور ان دونوں اساتذہ کا مطالعہ اتنا گہرا کیا کہ خود بھی ان دونوں کی صدائے بازگشت بن گئے اس سے یہ فائدہ تو ہوا کہ وہ ان دونوں استادوں کے رنگ میں بے تکلف شعر کہنے لگے مگر نقصان یہ ہوا کہ اپنا کوئی رنگ پیدا نہ ہو سکا۔

توفیق نے زیادہ کوشش مومن کا رنگ اختیار کرنے کی کی ہے اور ایک حد تک کامیابی بھی ہوئی ہے مگر تصوف اور اخلاق کی طرف جو وہ مائل ہوتے گئے تو غالبیت آتی گئی اور زیادہ تر غالب ہی کی پیروی کرتے رہے، توفیق فطرتاً شاعر پیدا ہوئے تھے۔ ان کی طبیعت شاعری کے لئے موزوں بھی تھی مگر مومن کا رنگ ان پر کھلتا نہ تھا اس لئے کہ مومن کے پاس تغزل اور صرف تغزل ہی تھا اور اس کے لئے "رندی" کی ضرورت تھی اور توفیق ایک متقی زاہد مرتاض تھے اس لئے مومن کے رنگ میں جو کچھ کہتے گویا مومن کو اپنے الفاظ میں دہرا دیتے تھے اس لئے

اس میں زیادہ کامیاب نہ ہو سکے تغزل تخیل سے پیدا نہیں ہوتا یہ عمل کا محتاج ہے۔ توفیق اگر ابتدا عاشق مزاج نہ ہوتے اور پاک محبت عاشق کر کے عشق پیدا نہ ہو جاتے تو ان سے بھی تغزل نبھ نہ سکتا جس طرح امیر مینائی نے مفروضات عشق کو سامنے رکھ کر غزل کہی ہے اور داغ کا مقابلہ کرنا چاہا ہے اسی طرح توفیق نے بھی مصلے پر بیٹھ کر مومن کا تغزل نباہنا چاہا ہے۔ یہی وجہ ان کی ناکامی کی ہوئی۔

رہا غالب سو اس کا انداز بیان ہی اور تھا۔ طرز بیدل میں ریختہ کہنا توفیق سے کیا ہو سکتا اس لئے اس رنگ میں بھی وہ مسائل تصوف ہی بیان کر سکے رہ گئے۔ آدمی دماغ دار اور ذہین تھے اگر اپنے دماغ سے مومن و غالب کے تتبع کا خیال دور کر دیتے اور اپنے طور پر فکر شعر کرتے تو یقیناً اچھے شاعر بن جاتے مگر وہ اس طرف غور کر ہی نہ سکے۔

توفیق نے ابتداً مشاعروں میں بھی شرکت کی اور فرمائشی نظمیں، سہرے اور قصائد بھی کہے مگر درمیان میں وہ بہت محتاط ہو گئے تھے جی چاہتا تو غزل کہتے ورنہ نہ کہتے بعض دفعہ تو وہ مہینوں شعر نہ کہتے اور پھر شعر کہنے لگتے تو مسلسل کہتے رہتے۔

والد مرحوم سے توفیق کی دوستی تھی صدر محاسبی میں توفیق کے علاوہ ایک اور شاعر صاحبزادہ حافظ مرزا منیر الدین ضیاء گورگانی دہلوی بھی تھے جو شہزادہ مرزا حیا دہلوی کے فرزند اور داغ کے شاگرد رشید تھے۔ یہ بھی بڑے قابل اور عروض کے ماہر تھے۔ والد مرحوم نے ان سے عروض پڑھی تھی اور داغ کے انتقال کے بعد انہی سے مشورہ کرتے تھے، صدر محاسبی کا دفتر ناف شہر میں سالار جنگ کی ڈیوڑھی میں تھا۔ آتے جاتے میں اکثر صدر محاسبی چلا جاتا اور پہلے ضیاء اور ان کے بعد توفیق سے ضرور ملتا تھا۔ مجھے توفیق سے مل کر خوشی ہوتی تھی کیونکہ نہایت منکسر بہت ہی متواضع اور بڑے ہی مخلص بزرگ تھے۔ ضیاء جتنے بددماغ اور رعونت مآب تھے یہ اتنے ہی نرم خلق اور ملنسار تھے، کبھی ضیاء نے مجھے شعر نہیں سنایا شعر تو بڑی چیز ہے، سیدھے منہ بات کرنے کے بھی روادار نہ ہوتے تھے۔ سلام کا جواب دینا بھی ان کے لئے بار تھا؛ بخلاف ان کے توفیق کا یہ عالم تھا کہ سلام کیجئے تو کرسی سے اٹھ کر کھڑے ہو جاتے بڑی محبت سے جواب دیتے مصافحہ کرتے اور ہمہ تن توجہ ہو جاتے۔ بڑی ہی محبت سے بات چیت کرتے، غزل کی فرمائش کی جائے تو کبھی سنا دیتے کبھی بڑی ہی لجاجت کے ساتھ معافی مانگ لیتے۔

میرے ایک عزیز ہاشم علی مرحوم سے توفیق کے برادرانہ مراسم تھے اور وہ ہاشم علی کے پاس بہت آتے جاتے تھے۔ وہاں گانے بجانے کا چرچا بھی رہتا تھا۔ کبھی کبھار اپنی غزل گا کر بھی سناتے، موسیقی سے بھی انہیں دلچسپی تھی اور واقف بھی تھے۔ اپنی غزلوں کی دھنیں خود ہی بتاتے تھے اور کبھی کبھار ہارمونیم پر گاتے بھی تھے مگر مخصوص صحبت میں زیادہ لوگ ہوتے تو انجان ہو جاتے۔

اسی زمانے میں ایک دو طوائفوں کو بھی اپنا کلام دینا شروع کیا تھا جس کی وجہ سے چند غزلیں خاصی مشہور ہوئیں، رنڈیوں سے پبلسٹی کا کام حیدرآباد میں سب سے پہلے داغ نے لیا۔ پہلے غزل کی پبلسٹی کے دو ہی طریقے تھے مشاعرے یا رنڈیاں، لوگ مشاعرے میں غزل سن کر اکثر شعر یاد کر لیتے جو مشہور ہو جاتے یا پھر رنڈیاں غزلیں گاتیں تو ان سے سن کر عوام بھی گانے لگتے، داغ نے تو ایک دو رنڈیاں ہمیشہ نوکر رکھیں اور ایک قوال نوکر رکھا بھی ہمیشہ نوکر رہا۔ شام میں رنڈیاں آتیں داغ اپنی تازہ غزل دے دیتے وہ یاد کر لیتیں، دھن یا تو خود بتاتے یا وہ خود دھن نکال کر سناتیں تو منظور دیتے۔ اس طرح غزلیں گا کر گنگناتی یہ غزلیں داغ کے پاس سے واپس جاتے ہی رنڈیاں اپنی سہیلیوں کو سناتیں، سکھاتیں اور دوسرے روز وہ گاتیں ان کے چاہنے اور سننے والے ان غزلوں کو گلی گلی پہنچا دیتے اور غزل جس دن کہی جاتی اس کے دوسرے روز شہر بھر میں مشہور ہو جاتی۔ اس طرح داغ کا قوال رحمت اللہ بھی ان کی غزلوں کی پبلسٹی کرتا۔

توفیق کو داغ کا یہ طریقہ معلوم تھا اس لئے انہوں نے بھی ایسی ہی کوشش کی مگر زمانہ بدل چکا تھا۔ داغ نے انیسویں صدی عیسوی میں جیسے پبلسٹی کا کام لیا تھا مگر بیسویں صدی عیسوی میں رنڈیوں کا زور شور ختم ہو چکا تھا۔ رنڈیوں کی جگہ ناٹک نے لے لی تھی۔ اب [illegible] مشہور ہوتی تھیں اسٹیج پر گائی جاتی تھیں۔ علاوہ ازیں دو ایسی رنڈیاں بھی نہ تھیں اختر جان جیسی صاحب ذوق، صاحب جان جیسی [illegible] داغ کی غزلیں [illegible]

اور جو سنے سے چھوٹا دل پکڑ کر بیٹھ جاتا بڑی خصوصیت یہ تھی کہ داغ عوامی شاعر تھے۔ کلام اتنا صاف، بے ساختہ اور ایسی روزمرہ میں ہوتا تھا کہ سن لینا کافی تھا۔ کانوں کے راستے دماغ میں پہنچ کر حافظے میں محفوظ ہو جاتا تھا۔ بخلاف اس کے توفیق مومن کی لکیر پیٹتے اور غالب کا قالب بدلتے رہتے تھے جس سے عوام بالکل نا آشنا تھے۔ پھر بھی ایک نذری کے منہ سے مشہور ہو کر توفیق کی یہ غزل چند سال تک زبان زد عوام رہی ؎

اس نے کہا ہستی تری میں نے کہا جلوہ ترا	اس نے کہا پھر نیستی میں نے کہا پڑ (؟) ترا
اس نے کہا جانا مرا میں نے کہا میری اجل	اس نے کہا پھر زندگی میں نے کہا آنا ترا
اس نے کہا شام بلا میں نے کہا گیسو ترے	اس نے کہا صبح صفا میں نے کہا چہرا ترا
اس نے کہا کیا کام ہے میں نے کہا خدمت تری	اس نے کہا کیا نام ہے میں نے کہا بندا ترا
اس نے کہا دل لے گیا میں نے کہا ہاں لے گیا	اس نے کہا وہ کون تھا میں نے کہا غمزا ترا
اس نے کہا کس سے گلہ میں نے کہا تقدیر سے	اس نے کہا تقدیر کیا میں نے کہا منشا ترا

علامہ اقبالؒ کی یہ غزل مشہور ہوئی ؎

کبھی اے حقیقتِ منتظر نظر آ لباسِ مجاز میں
کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبینِ نیاز میں

تو توفیق نے بھی اسی زمین میں ایک غزل کہی جو حیدر آباد میں خاصی مشہور ہوئی ؎

کبھی پردہ در ہوں میں راز کا کبھی ہوں میں پردۂ راز میں	کہ حقیقت اک مری مشترک ہے حقیقت اور مجاز میں
یہ کہاں کے جلوے سما گئے یہ کہاں کی حیرتیں چھا گئیں	کہ ہزاروں آئینے لگ گئے ہیں نگاہ آئینہ ساز میں
نہ کروں سلام جو کعبہ کو نہ کروں جو سجدہ تو کیا کروں	ہے خیال بت مرے سامنے میں کھڑا ہوا ہوں نماز میں

توفیق چشتی اور پروپیگنڈے کے خواہشمند تو تھے مگر اس کے اصول اور طریقے نہ جانتے تھے اور نہ انہیں اس کی خبر تھی کہ ان کا کلام عام پسند اور عوام کے سمجھنے کے قابل نہیں ہے اسی لئے وہ زیادہ مشہور نہ ہو سکے خصوصاً عوام ان سے ناواقف ہی رہے ؎

شرر آسا تڑپ سوزِ غم میں جل کے حاصل کی
بہ رنگِ دانہ باروت ہستی ہے مرے دل کی

جیسے شعر بھلا عوام کو کیا پسند آتے اس لئے توفیق خاص خاص لوگوں ہی میں مقبول رہے۔

توفیق کے معاصرین میں کیفی اور امجد تھے۔ امجد سے غزل نہیں سنبھلتی تھی اس لئے انہوں نے ابتداً چند نظمیں کہیں اور پھر رباعی پر اتر آئے اور اپنے آپ کو رباعی کے لئے وقف کر دیا یہ اچھا بھی ہوا کیونکہ غزل میں وہ توفیق اور کیفی کا ساتھ نہ دے سکتے تھے۔ کیفی البتہ زمانہ شناس تھے اور وہ عوام کے نزدیک رہنا چاہتے تھے اس لئے انہوں نے عام فہم اور دکنی روزمرہ کے شعر کہنے شروع کئے نتیجہ یہ نکلا کہ توفیق سے زیادہ شہرت کیفی کو حاصل رہی اور اب بھی جس قدر کیفی مقبول ہیں توفیق نہیں ہیں۔

شاگردوں کی کثرت بھی وجہ شہرت ہو سکتی ہے۔ توفیق اس سے بھی اجتناب کرتے تھے ان کے چند ہی شاگرد تھے جو محدود حلقہ احباب رکھتے تھے اس لئے وہ بھی توفیق کو زیادہ اجاگر نہ کر سکے۔

بہرحال توفیق کو جتنا مشہور ہونا چاہیے تھا اتنی شہرت نہ ہو سکی حالانکہ ان کا ایک دیوان بہت پہلے چھپا پھر اس کا دوسرا ایڈیشن اضافے کے ساتھ شائع ہوا مگر پھر بھی کوئی بات پیدا نہ ہو سکی۔ دوسرے دیوان پر جو ۱۹۳۳ء میں طبع ہوا ہے عبدالرزاق راشد نے بڑا اچھا مقدمہ لکھا تھا مگر

توفیق کے لائق فرزند توصیف نے ایک انگریزی پیش لفظ مسٹر دانا ناشب محمد غیاث قس سے بھی لکھوا لیا اور اسے دیوان کے ساتھ چھپا کر خوش ہو گئے کہ ناشب معتمد غیاث قس توفیق کا قدر دان ہے، توصیف صاحب بیچارے بھی صدر محاسبی کے کلرک ہی تھے ان کی دانست میں یہ اعزاز بہت بڑا تھا کہ ناشب معتمد خاص تک رسائی کرے انہیں یہ معلوم نہیں کہ شاعر کا کلام ایسا کرنسی نوٹ ہوتا ہے جس پر عوام کے دستخط ہوتے ہیں غیاث قس کے [illegible] سکے نہیں۔

بہر حال باوجود اپنی کوشش اور اپنے بیٹے کی جدوجہد کے توفیق حیدرآباد میں زیادہ شہرت نہ پا سکے مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ بڑے اچھے شاعر اور بہت خاص شخصیت کے مالک اور بڑے ہی نیک دل بزرگ تھے۔

تجلی

سید منتجب الدین نام تجلی تخلص تھا، سید یار جنگ کے پوتے اور بخت بلند جنگ کے نواسے تھے والد کا نام سید سیادت علی خان تھا جو ناظم دیوانی بلدۂ حیدرآباد تھے، اپنے والد کے انتقال کے تیسرے روز پیدا ہوئے اماں نے منحوس سمجھ کر پہلو سے جدا کر دیا تو خالہ ام الملک بیگم سلطان نواز جنگ ان کو اپنے گھر لے جا کر پرورش کی آہستہ آہستہ ماں کو بیوگی پر صبر آیا تو بیٹے کو اپنے گھر بلا لیا اور بڑے چاؤ چونچلے سے بسم اللہ (تسمیہ خوانی) کی تھی کہ خود اللہ کو پیاری ہو گئیں، بڑی بہن رابعہ بیگم غیاث الدین علی شاہ، اور خالہ نے پال پوس کر پروان چڑھایا، بہنوئی یعنی غیاث الدین علی شاہ نے اپنی نگرانی میں اپنے بیٹے سید قطب الدین محمود علی فاضل کے ساتھ تعلیم و تربیت کی۔

ابتدائی تعلیم مدرسۂ اعزہ میں ہوئی۔ پھر دارالعلوم حیدرآباد میں شریک ہو گئے اور وہیں سے فراغت حاصل کی، طبیعت پر تصوف کا رنگ غالب تھا نوجوانی ہی میں آغا داؤد کے ہاتھ پر بیعت کی اور تصوف ہی کے ہو رہے۔ شعر و سخن کا ذوق بھی تھا اور یہ موروثی ذوق تھا کیونکہ باپ اور دادا دونوں شاعر تھے اس لئے خود بھی شعر کہنے لگے پہلے میکش کو اور پھر داغ حیدرآباد آگئے تو داغ کو کلام دکھانے لگے۔ فارسی اردو دونوں زبانوں میں فکر سخن کرتے تھے فارسی پہلے استاد الملک آغا شوستری کو دکھاتے رہے، ان کے انتقال کے بعد سے ترکی پاشی پی کو دکھانے لگے [illegible] منصب سے سرفراز تھے، سید عبدالرحیم اول تعلقدار کی صاحبزادی سے (جو مولوی سید محمد یوسف الدین صوبہ دار گلبرگہ کی بھانجی تھیں) شادی ہوئی، یوسف الدین صاحب کے کہنے پر نوکری کر لی۔ ابتداً صوبہ داری گلبرگہ میں صیغہ دار ہوئے پھر ضلع رائچور کے خزانہ دار (ٹریژری آفیسر) ہو گئے۔ رائچور سے عثمان آباد تبادلہ ہوا اور وہاں سے گلبرگہ تبادلہ ہوا اور گلبرگہ ہی میں اللہ کو پیارے ہوئے اور خواجہ بندہ نواز کے پائنتی میں آسودہ ہیں۔ یوں تو آٹھ دس لڑکے لڑکیاں ہوئے مگر تین لڑکے باقی رہے ۱۔ راقم الحروف ۲۔ سید رفیع الدین کاظمی ۳۔ سید رشید الدین کاظمی۔ رفیع الدین مجرد ہیں کہ انہوں نے شادی نہیں کی۔ راقم الحروف اور رشید الدین فتنۂ اہل و عیال میں مبتلا ہیں۔

تجلی کی نشوونما حیدرآباد میں ہوئی ۱۹۰۸ء تک وہ حیدرآباد ہی میں رہے اور اس زمانے کی سوسائٹی میں خاصا رسوخ رکھتے تھے، ہنر، داغ، توفیق، کیفی، محفوظ، رسا، ناظم، جلیل، اختر، سہا، ثاقب وغیرہ سے برادرانہ و دوستانہ مراسم تھے، دیوان خانہ ان چند گزوں سے بھرا رہتا تھا رات دن شعر و سخن، نظم و نثر کا چرچا رہتا تھا۔ ۱۹۰۸ء میں گلبرگہ چلے گئے تو بھی طبی تعطیلات میں ورنہ ہر جمعہ کو حیدرآباد آجاتے اور چھٹی گزار کر [illegible] رہتی، ۱۹۱۲ء میں عثمان آباد تبادلہ ہو گیا تو آمد و رفت کم ہو گئی اور دیر دیر سے حیدرآباد آنے لگے اس طرح حیدرآباد کی صحبتیں چھوٹ ہی گئیں۔

اضلاع رائچور، عثمان آباد، گلبرگہ اور ان ضلعوں کے تعلقات میں جہاں جہاں بہ منصب تحصیلدار رہے مشاعرے کرتے رہے اور اپنے ذاتی اثر اور دلچسپی سے لوگوں میں شعر و ادب کا ذوق پیدا کیا۔ مطالعہ کا بڑا شوق تھا اور مرتے دم تک مطالعہ کرتے رہے بڑی محنت سے کتابیں جمع کی تھیں

جو مؤلف ہوئیں حیدرآباد سے جب ہم لوگ باہر گئے تو یہاں کا ذخیرہ تباہ ہوا اور مرحوم کے انتقال کے بعد جب ہم اضلاع کا جمع شدہ ذخیرہ گلبرگہ میں رکھ کر حیدرآباد آ گئے اور یہاں مستقل طور پر انتظام کر کے اس ذخیرے کو منتقل کرنا چاہا تو وہ بھی برباد ہو چکا تھا اس طرح مرحوم کا بہترین ذخیرہ ضائع ہوا۔

نثر نویسی کا شوق نہ تھا، چونکہ حیدرآباد میں فارسی عام تھی اور والد کے بچپن میں فارسی ہی میں مراسلت ہوا کرتی تھی اس لئے فارسی ہی لکھتے تھے میرے بچپن میں وہ رائچور اور عثمان آباد سے جو خطوط مجھے لکھا کرتے وہ فارسی ہی ہوتے تھے اور میں جواب بھی فارسی ہی میں لکھا کرتا تھا۔ جب میں نے اردو نثر لکھنی شروع کی تو انہیں بھی اردو میں خطوط لکھنے لگا اور وہ بھی اردو ہی میں مراسلت کرنے لگے۔ فارسی بولتے بھی بڑی روانی سے تھے مگر لہجہ بالکل ہندوستانی ہوتا تھا ایرانی لہجہ میں یا تو بول نہیں سکتے تھے یا جھینپتے تھے بہرحال اچھی فارسی برے لہجے میں بولنا ان کا معمول تھا۔ یہی حال اردو کا بھی تھا اردو بھی نہ دکنی لہجے میں بولتے اور ہمیشہ دکنی محاورے استعمال کرتے تھے البتہ شعر میں دکنی محاورات کے استعمال سے پرہیز کرتے تھے۔

خطاط بڑے اچھے تھے نواب مظفر الدین خان مشہور خوش نویس کے شاگرد تھے اور قطعات بڑے اچھے لکھتے تھے یوں عام تحریر بھی صاف لکھا کرتے تھے خط شکستہ قطعاً نہ لکھتے تھے اور مجھے بھی شکستہ لکھنے سے منع کرتے تھے، کہتے تھے یہ خطِ شکستہ کا لبسہ منصبداروں کی ایجاد ہے، شریف لوگ ایسا خط نہیں لکھتے

ہمارے خاندان میں سب بزرگ حافظ ہوتے تھے مگر نہ تو کسی کے نام کے ساتھ حافظ لکھا یا کہا جاتا تھا اور نہ ہی کبھی اپنے حفظ کا مظاہرہ کرتے تھے، والد مرحوم نے دس بارہ پارے حفظ کئے تھے اس کے بعد چھوڑ دیا تھا مگر دیکھ کر پڑھنے کے عادی تھے چار چار چھ چھ صفحات کے بعد کہیں ضرورت پڑتی تو دیکھ لیتے ورنہ پڑھتے جاتے تھے۔ انتقال سے ایک سال پہلے انہیں اپنے حافظ نہ ہونے کا احساس پیدا ہو گیا گلبرگہ میں جس مکان میں رہتے تھے اس کے پیچھے ایک مسجد افتادہ حالت میں پڑی ہوئی تھی آپ نے اسے درست کرایا اور خود وہاں نماز پڑھنے لگے۔ مغرب عام طور پر اسی مسجد میں پڑھتے تھے۔ رمضان آیا تو آپ نے اس مسجد میں تراویح کا انتظام کرنا چاہا۔ ایک حافظ جی کو مقرر کیا مگر انہوں نے ایک دن پہلے اطلاع دی کہ میں نے آپ سے اس مسجد میں تراویح پڑھانا طے کیا تھا مگر اب بعض وجوہ سے پڑھا نہیں سکتا آپ کوئی اور انتظام [illegible]۔ اس اطلاع پر بہت برہم ہوئے، دوسرا حافظ ملا نہیں۔ مجھ سے کہا تو میں نے کہا آپ خود پڑھائیے۔ آپ کو تقریباً کلام مجید حفظ ہے روزانہ دوپہر میں احتیاطاً پارہ پڑھ لیجئے اور رات میں پڑھا دیجئے۔ ترکیب سمجھ میں آ گئی۔ مجھے اور میرے ایک دوست کو بھی پابند کر دیا کہ تم دونوں بھی دوپہر ایک پارہ خوب غور سے پڑھ لیا کرو اور مسجد میں جب میں پڑھاؤں تو سنتے جانا غلطی ہو جائے تو لقمہ دینا، اس طرح تراویح پڑھانے لگے اتفاق سے مرحوم ہی کے ایک شاگرد لقمہ دینے کا فرض انجام دینے لگے اور میں بچ گیا مگر مرحوم نے اس طرح تیس دن میں تیس پارے ختم کر دئے اور انہیں اپنے حافظ نہ ہونے کا جو قلق تھا جاتا رہا۔

جوانی میں طب کا امتحان بھی دیا تھا عملی تجربہ قطعاً نہ تھا اور خود دائم المرض تھے جب بھی کوئی حکیم نسخہ لکھتا اس میں کتر بیونت کر کے اور اپنی طبیعت خراب کر لیتے یہ مرض جیسے جیسے عمر بڑھتی گئی بڑھتا ہی گیا۔

تند و ترش، مجموعاً المزاج اور کچے کان کے تھے ہر ایک کی بات کا یقین کر لیتے، فوراً بگڑ جاتے اور جلد ہی من بھی جاتے تھے۔ قلبی کیفیت اچھی تھی تو کم و اشتغال میں منہمک رہتے تھے اور اوراد و وظائف کے پابند تھے، چونکہ مذہبی آدمی تھے اس لئے مجاذیب اور مزارات کے بڑے معتقد تھے جو مجذوب مل جاتا اسے پکڑ کر گھر لاتے، کھلاتے پلاتے، کپڑے بناتے اور نذر دے کر رخصت کرتے تھے، فاتحہ (نذر و نیاز) ہمیشہ ہوتی رہتی تھی [illegible] سب کی فاتحہ بڑے اہتمام سے کرتے تھے، ہم نکہ ان کے اس طریقے کا مخالف تھا اس لئے مجھ پر خفا ہوتے رہتے تھے، بیمار رہتے تھے [illegible] طبیعت بگڑ گئی تو میں نے حیدرآباد لانا چاہا کہنے لگے تم مجھے حیدرآباد لے چلنا چاہتے ہو لے چلو گلبرگہ میں مرنے والا ہوں [illegible]

اس کی تاکید کی کہ بسبب وہاں دفن ہونے کے لئے تیار نہیں ہیں ڈرکیوں لے جاتے ہو۔ چنانچہ دہیں انتقال کیا اور خواجہ صاحب کے پائیں میں آسودہ ہوئے۔
چار دیوان مکمل کئے تھے، ان چاروں کو اکٹھا کر کے ایک دیوان بنایا جو بہت ضخیم ہو گیا اس کی طباعت کے لئے ایک مرتبہ ابو العلائی اسٹیم پریس آگرہ سے معاملہ کیا تو حاجی محمد یحییٰ اور مسودہ بھجوا دیا مگر مطبع ہی برخاست ہو گیا اسی زمانے میں دیوان کی تاریخیں بھی لوگوں سے منگوالی تھیں، "مطلع تجلی" نام رکھا تھا"
اس دیوان کا انتخاب میں نے کیا ہے جس کی طباعت کی فکر کر رہا ہوں۔ انشاء اللہ چھپوالوں گا۔

مرحوم کی شاعری کا یہ حال تھا کہ طبیعت موزوں پائی تھی، مولوی آدمی تھے عشق و عاشقی سے محض نابلد فرضی مضامین ہجر و فراق باندھتے تھے ظاہر ہے کہ کیا بات پیدا ہو سکے گی؟ مشق بھی جاری نہ تھی جی چاہتا تو روزانہ دو دو غزلیں کہہ ڈالتے ورنہ مہینوں نہ کہتے شعر گوئی کا طریقہ وہی قافیہ پیمائی تھا، پہلے قافیے چن لیتے ان کو مصرعوں میں بر دال کرتے پھر ان مصرعوں پر مصرعے بہم پہنچاتے، اس طرح غزل کہی جاتی۔ اس میں آورد ہی آورد ہوتی تھی آمد ندارد، ایک آدھ شعر صاف نکلتا اور بس سارا دیوان ایسا ہی ہے۔

آخر میں نعت بہت کہنے لگے تھے، شروع میں شاید طبیعت زیادہ رواں تھی۔ ابتدائی غزلیں کچھ اچھی ہیں، عموماً اپنے حسب حال شعر کہتے تھے

دشمنوں سے بھی جھک کے ملتا ہوں — یہ تجلی شعار ہے میرا
لگانا آگ دل کو، دفن کر دینا تجلی تم — نہ کرنا دل لگی پیدا کسی نا اہل انساں سے
با مردم اہل تند خوئی مشکل — با مردم بد ذات نکوئی مشکل
با مردم بد مزن کہ حرف معقول — گوئی مشکل و گر نہ گوئی مشکل

اپنی امارت اور خاندانی وجاہت کا بڑا خیال رہتا تھا۔ دوستوں اور عزیزوں سے کبھی کوئی کام نہیں لیا، مرحوم دانخدمت تحصیلدار تھے اور فصیح جنگ کے بے تکلف یار غار مگر کبھی فصیح جنگ سے اپنی مستقل تحصیلداری کے لئے نہیں کہا۔ میں فصیح جنگ کے پاس بہت جایا کرتا تھا مگر مجھے ہمیشہ منع کرتے تھے کہ خبردار میرے لئے یا اپنے لئے فصیح الدین سے کچھ نہ کہنا۔

داغ سے والہانہ محبت تھی جب داغ کا ذکر کرتے آب دیدہ ہو جاتے اور اس احترام سے "استاد داغ" کا نام لیتے جیسے کسی پیر کا نام لے رہے ہوں، اسی طرح مولوی سید یوسف الدین صاحب سے بھی انہیں عقیدت تھی۔

حساب میں بہت کمزور تھے اس لئے تاریخ بھی کہہ نہ سکتے تھے۔ ایک روز بیٹھے ہوئے تاریخ کہہ رہے تھے، میں نے پوچھا کیا ہے تو کہنے لگے جلال لکھنوی کے انتقال کی تاریخ نکال رہا تھا۔ ایک مصرعہ بڑا اچھا نکالا ہے۔ میں نے پوچھا کیا ہے تو کہا "جاں کندنی سید ضامن علی جلال" میں نے کہا یہ تو وفات کی تاریخ نہیں کہنے لگے پھر کیا ہے؟ میں نے کہا یہ نزع کی تاریخ ہے۔ جان کندنی ہی تو ہے وفات یا انتقال ابھی کہاں؟ کہنے لگے ٹھیک تو ہے مجھے خیال نہ رہا۔ ان کے استاد بھائی محمد حسین آلم نے گلبن تاریخ نام سے ایک کتاب شائع کی تھی جس میں تاریخی الفاظ جملے وغیرہ تھے اسی کی مدد سے بڑی محنت مشقت کے بعد تاریخ نکالتے تھے وہ بھی وفات جا کر جان کندنی ہو جاتی تھی۔

میری مضمون نگاری سے بہت متاثر رہتے تھے، لاہور کے بعض رسائل میرے نام کے ساتھ "مولانا" لکھتے تھے کوئی مضمون "مولانا تمکین کاظمی" کے نام سے طبع ہوتا تو دیکھ کر بڑے خفا ہوتے کہتے میاں! تم نے بڑی محنت کی ہے مگر اب بھی لوگ مولوی کہتے ہیں تو شرم آتی ہے کہ ہم اس لقب کے مستحق نہیں ہیں لوگ غلط اندازہ کر رہے ہیں اور تم ہو کہ بائیس سال کی عمر میں مولانا بن گئے وہ لوگ جو تمہیں مولانا لکھتے ہیں صورت دیکھیں تو کیا کہیں گے؟

حضرت [illegible] دہلوی کی شاعری پر میں نے ایک تفصیلی مضمون لکھا تھا جو [illegible] چھپا تھا [illegible]

پڑھا کرو تو شعور پیدا ہوگا۔

مگر باوجود اس قدامت کے بعض باتیں بڑی اچھی تھیں مجھ سے وعدہ لیا تھا کہ ان سے جھوٹ نہ بولوں گا۔ میں نے کبھی کوئی بات مرحوم سے جھوٹ نہیں کہی۔ کوئی بات صحیح نہ کہہ سکتا تو چپ رہ جاتا اور وہ سمجھ جاتے تھے۔ رات گانے کی پارٹی ہوتی اور میں غائب ہو جاتا دوسرے دن بلاتا اور سوجاتا صبح پوچھتے میاں رات کہاں تھے؟ تو میں "جی" کہہ کر خاموش ہو جاتا تھوڑی دیر جواب کا انتظار کرتے پھر کہتے بیٹی کہہ دیا کرو کہ دعوت میں جا رہا ہوں دیر سے آؤں گا مجھے انتظار کی زحمت نہ ہوتی تم کتنے نہیں میں پریشان ہوتا ہوں ابھی تمہیں میری پریشانی کا احساس نہیں ہے جب تم باپ بنو گے تو قدر عافیت معلوم ہوگی ؎ قدر بابا آں زماں دانی کہ خود بابا شوی

مرحوم نے بڑی عمدگی سے میری تربیت کی تھی۔ چلنا پھرنا، اٹھنا بیٹھنا، کھانا پینا، پہننا اوڑھنا ہر بات سمجھایا کرتے خصوصاً علم مجلسی میں تو انہوں نے مجھے مکمل کر دیا تھا، یہ جو ۳۵-۳۶ سال سے لکھ رہا ہوں یہ انہی کی فیضِ تربیت کا نتیجہ ہے۔

عظمت اللہ خاں

عظمت اللہ خاں سے میری پہلی ملاقات اس وقت ہوئی جبکہ وہ کہیں ہیڈ ماسٹر تھے ان کی ایک مختصر کتاب "من چلے" چھپی تھی جسے میں نے تصدق حسین صاحب تاج سے لے کر پڑھا تھا اور انہوں نے ہی مجھے ساتھ لے جا کر عظمت اللہ خاں سے ملایا تھا۔ اس کے بعد سے میں ان سے اکثر ملا کرتا تھا اور بڑی پرلطف صحبت رہتی تھی ان دنوں امجد اور زبین بھی وہاں اکثر آیا کرتے تھے۔

عظمت مرحوم ان دنوں یورپ کے ڈراموں کا ترجمہ کر رہے تھے اکثر مسودہ سنایا کرتے اور پھر مختلف باتیں ہوتیں۔ ایک روز صبح صبح میں پہنچا تو دیکھتا کیا ہوں کہ آٹھ دس شریف آدمی بیٹھے ہوئے ہیں اور گرما گرم بحث ہو رہی ہے میرے پہنچتے ہی عظمت نے پوچھا "تمکین صاحب! آپ حسن میں گورے پن کو بھی شمار کرتے ہیں یا نہیں؟" سوال میری سمجھ میں نہیں آیا میں نے وضاحت چاہی تو ایک اور صاحب نے تفصیل سنائی کہ یہاں بحث یہ ہو رہی ہے کہ حسن کا تعلق رنگ روپ سے ہے یا نہیں؟ میں نے کہا ہے اور ضرور ہے یہ سنتے ہی حاضرین نے نعرہ لگایا اور عظمت خاموش ہو گئے میں نے پھر اپنے جواب کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا اور سب لوگ میرے سر ہو گئے بحث صرف یہ تھی کہ کالا رنگ حسن میں داخل نہیں ہے کالے رنگ کی عورت حسین نہیں کہلا سکتی، عظمت کہتے تھے کہ رنگ چاہے گورا ہو یا کالا حسن اس میں بھی ہوتا ہے، اور میں بھی عظمت کا ہم خیال تھا۔ صرف ہم دو ایک طرف تھے اور ایک بڑا گروہ دوسری طرف تھا۔ بحث بڑی لمبی ہو گئی تھی بالآخر بغیر کسی تصفیہ کے ختم ہو گئی یہ ابتدا تھی عظمت سے بے تکلفی کی، وہ عمر میں مجھ سے خاصے بڑے تھے مگر اس روز جو بے تکلف ہوئے تو اتنے کھل گئے کہ اپنی ساری زندگی کی روداد بلا کم و کاست بیان کر دی اور مجھ سے بھی گناہوں کا اعتراف کرا لیا، اس طرح ہم ایک دوسرے کے بہت قریب ہو گئے تھے۔

عظمت نہایت شریف، باوقار، مخلص اور قابل آدمی تھے، محنتی اور کارگزار بھی بہت تھے کام کرنے سے تھکتے نہ تھے خاکے اور اسکیم بنانے میں تو ان کو کمال تھا، دفتری کام بڑے انہماک سے کرتے تھے، مگر یہ کام کرنے کا وقت انہیں نہ ملتا تھا اس لئے کہ لوگ بہت آ جاتے تھے، میں جب گلبرگہ سے آتا ان سے ضرور ملتا تھا ایک روز میں نے کہا اپنی نظمیں چھپا دیجئے تو کہنے لگے ایک شرط پر چھپاتا ہوں تم جمع کر دو اور ایک مضمون میری نظموں کے متعلق ایمانداری سے لکھ دو ورنہ مجھ سے نہ تو نظمیں جمع کرنا ہو سکے گا اور نہ ان پر کچھ لکھنا۔ بات آئی گئی ہو گئی گلبرگہ واپس ہو کے مجھے خیال ہوا کہ ان کی نظمیں اکٹھی کر دوں چنانچہ میں نے "ایمد" اور "علیگڑھ میگزین" وغیرہ سے نظمیں نقل کر لیں اور ایک مضمون "عظمت اللہ خاں [illegible]" لکھا [illegible] اور [illegible] اس وقت تک عظمت کو عام لوگ "ایمد" پڑھنے والے اور علیگڑھ کے طلباء ہی جانتے تھے۔

ہمایوں میں اس مضمون کے طبع ہوتے ہی یار لوگوں نے میرا پیچھا شروع کیا کہ عظمت اللہ خان کی غیر مطبوعہ نظمیں بھیجو چنانچہ اکثر رسالوں کو میں نے ان کی نظمیں بھجوائیں، میرا مضمون جب عظمت نے پڑھا تو مجھے ایک لمبا چوڑا خط لکھا کہ تم نے واقعی مجھے شاعر ثابت کر دیا ورنہ میں تو اسے شاعری نہیں سمجھتا تھا۔ اب وہ جو نظمیں تم نے جمع کر لی ہیں مجھے بھیج دو میں چھپوا دیتا ہوں۔ اس کے بعد ہی وہ بیمار ہوئے اور مدراس گیا اور ہم چلے گئے۔ میں حیدرآباد آگیا اور وہ بمبئی ٹرنیم میں تھے۔ مجھ سے مراسلت ہونے لگی آخری خط میرے پاس آیا کہ اب ڈاکٹر نے لکھنے پڑھنے کی اجازت دے دی ہے ایک آدھ ہفتے میں واپس بھی ہو جاؤں گا۔ اسی مضمون کا ایک خط عبدالرزاق بسمل کو بھی ملا اور اس کے ساتھ ہی ساتھ انتقال کی اطلاع بھی ملی۔

عظمت کی موت ناوقت ہوئی۔ ملک کو ان کی شدید ضرورت تھی ان کے جیسے معتدل لوگ بہت کم ہوتے کاش وہ اور جیتے اور کام کرتے۔

عظمت کے مضامین اور ان کی نظموں کا مجموعہ دونوں طبع ہو گئے ہیں مگر ان کے ترجمے نہیں چھپ سکے۔ عظمت نے سینکڑوں کو شاعر، مضمون نگار، ایڈیٹر کیا کچھ بنا دیا۔ رفیق بیگ نے عظمت ہی کے مشورے سے ٹائپ کا کام کیا اور "نمائش" جاری کیا۔ فرحت اللہ بیگ اپنے مضامین میں عظمت ہی سے اصلاح لیا کرتے تھے۔ اپنے نا تمام مضامین عظمت نے عصمت اللہ بیگ کو بھی دے دئے تھے۔ امجد صاحب عظمت کو رباعیاں سنانے کے بعد رسالوں کو دیتے یا مجموعے میں چھپواتے۔ اسی طرح ذہین بچوں کے لئے نظمیں لکھ کر عظمت کو دکھا لیا کرتے، "مسعود جنگ" کا نام عظمت ہی کا دیا ہوا تھا۔ غرض عجیب و غریب آدمی تھے عظمت اللہ خان!

بعض ایسے لوگ بھی ان سے لکھوا لیتے جو بظاہر بہت قابل مشہور تھے ؎

نام کیوں لوں کوئی اللہ کے بندے ہوں گے

بہر حال عظمت ایک مشین تھے جو نظم، نثر، انگریزی، اردو سبھی کچھ ڈھالتے رہتے، رہ گیا ان کا حصہ، ان کے حصے میں اور رکھے ہی کیا، دوسروں کے حصے میں آتے۔

نہایت زندہ دل، مرنجان مرنج آدمی تھے، ململ کا کرتا پہنتے کہنیوں تک آستین چڑھائے ہیں کی آرام کرسی پر بیٹھے حقہ یا سگریٹ پیتے جاتے باتیں بھی کرتے شعر بھی کہتے مضمون بھی لکھتے، اصلاح بھی دیتے، مشورے بھی دیتے، سبھی کچھ ہوتا، ہنستے کھیلتے وقت گزار دیتے، خود خوش رہتے اور دوسروں کو خوش کرتے تھے۔

پہلوانی سے لے کر رسم الخط تک، عروض سے لے کر تصوف تک، ڈرامے سے لے کر نمائش ہیئت تک ہر موضوع پر بڑی سیر حاصل گفتگو کرتے اور ہر بات کے تجربے سناتے جاتے تھے، حد درجہ سیدھے، نہایت سچے، بڑے ہی وفادار دوست تھے۔

حکیم شمس اللہ قادری

حیدرآباد کے سب سے پرانے مضمون نگار تھے غالباً حیدرآبادی مضمون نگاروں میں حکیم صاحب پہلے ہیں جو ہندوستان کے اچھے پرچوں میں تحقیقی مضامین لکھتے رہے ورنہ یہاں کے لوگ پہلے تو لکھنے پڑھنے ہی سے ڈرتے تھے اور لکھتے پڑھتے بھی تو حیدرآباد سے باہر کے رسالوں میں چھپوانے سے بھی ڈرتے تھے۔

حکیم صاحب کی تحقیق کے قائل بڑے بڑے لوگ تھے چنانچہ شبلی نعمانی وغیرہ ان کو بہت مانتے تھے حکیم صاحب تھے بھی بڑے ہی محقق اور مؤرخ جانا ہزاروں کتابیں حافظے میں محفوظ تھیں، حیدرآباد میں سوالات کے لگ ... [illegible] ایک ... [illegible] کتب خانہ آصفیہ میں ...

[illegible]

نام بتا دیتے کہ فلاں کتاب کے فلاں صفحہ پر اس کی تفصیل ہے دیکھ لو شبلی، حالی وغیرہ بھی عبداللہ خاں سے پوچھ لیا کرتے تھے "تذکرہ گلشن ہند (مرزا علی لطف) کو کسی کباڑی کی دکان سے نواب محمد یار جنگ نے خریدا تھا جن سے عبداللہ خاں نے لے کر عبدالحق (بابائے اردو) سے مقدمہ لکھوا کر شائع کیا تھا۔ عبداللہ خاں کے بعد حکیم صاحب ہی کا نمبر تھا مگر عبداللہ خاں اُمّی محض تھے اور حکیم صاحب پڑھے لکھے تھے مگر علمیت حافظے سے کم تھی حافظہ غضب کا تھا۔

نوجوان مضمون نگاروں سے بہت خوش ہوتے اور ان کی رہنمائی کرتے تھے چنانچہ حکیم صاحب نے ہمیشہ مجھ پر عنایت کی ہے۔ بیچ میں ایک شخص کی وجہ سے مجھ سے حکیم صاحب سے ناچاقی ہو گئی تھی مگر مولانا سید خورشید علی صاحب نے مصالحت کرا دی اور پھر وہ ویسے ہی مہربان ہیں۔

آثارِ قدیمہ، مسکوکات، مرقعات، کتابیات وغیرہ پر کئی ایک کتابیں چھپوائیں۔ بیشتر تاریخیں ایڈٹ کر کے چھپوائیں، سب سے اہم کتاب "اردوئے قدیم" چھپوائی جو بڑی اہم اور کارآمد ہے، مدتوں رسالہ تاریخ مرتب کرتے رہے، اس طرح ملک کی بڑی خدمت کی۔

عبدالحق (بابائے اردو) حکیم جی کے قدیم دوست تھے آخر آخر میں حکیم صاحب نے عبدالحق کے قدم بقدم چلنا شروع کر دیا اور وہی فوائد حاصل کئے جو عبدالحق نے کئے تھے، بہترین مکان اور موٹر فراہم ہو گئی تھی۔ ایک بہترین کتب خانہ اور جمع پونجی چھوڑ کر انتقال کیا، حکیم صاحب کے تین فرزند ہیں جو دو اخبار نکالتے ہیں اور کاروبار اچھی طرح چلا رہے ہیں۔

حکیم صاحب میں بُرائیاں بھلائیاں دونوں تھیں مگر بُرائیاں ان کی شخصی تھیں جن کا اثر دوسروں پر نہ پڑتا تھا ان کی ذات سے لوگوں کو نقصان کم فائدہ زیادہ پہنچا ہے اور یہی ان کے بقائے دوام کے لئے کافی ہے۔

یہ دوسرا دور تھا جس سے آپ روشناس ہوئے اس دور کے صرف اتنے ہی بزرگ میں نے منتخب کئے ہیں ورنہ بڑی لمبی فہرست ہے۔

اب تیسرے دور کو ملاحظہ فرمائیے، اس دور سے بھی چند شخصیتیں میں نے منتخب کی ہیں۔

نظامت جنگ

حیدرآباد میں ایک خاندان بڑا مشہور، قابل اور دیانتدار گزرا ہے جس کے اراکین حاکم الدولہ، عماد جنگ اول و دوم، رفعت یار جنگ وغیرہ تھے، نواب سر نظامت جنگ بہادر (ایم۔ اے، ایل ایل بی۔ بیرسٹر ایٹ لا) بھی اسی خاندان کے ایک رکن تھے۔ ابتداً سررشتہ عدالت میں مامور ہوئے پھر صدر المہام سیاسیات (پولیٹکل ممبر) ہو گئے تھے۔ دیانت داری کا یہ عالم کہ دفتر کا پانی بھی نہ پیتے تھے۔ احتیاط کا یہ حال کہ عزیز و اقارب تو دور سے معمولی ملاقاتیوں کو بھی کوئی فائدہ نہیں پہنچایا اخیر خواہی کا دم بھرتے رہے۔

شادی نہیں کی تنہا زندگی بسر کی، چند روز مکانات بنانے کا شوق رہا "ہل فورٹ" بنوایا اور پھر اسے فروخت کر دیا اسی طرح کئی مکانات اور باغات بنوائے۔ نہایت ہی خاموش، کم گو، خوش رفتار، منکسر تھے ابتداً دفتری آدمی بنے رہے، انگریزی ادب پر خاصا عبور تھا، نظم و نثر دونوں پر حاوی تھے حضور نظام دکن کی اکثر نظموں کو انگریزی میں منتقل کیا تھا، خود بھی انگریزی میں فکر سخن کرتے تھے۔

حیدرآباد نے جہاں عربی، فارسی اور اردو کے شاعر پیدا کئے وہاں انگریزی کے شاعر بھی پیدا کئے ہیں جن میں پہلا نمبر ہے شریمتی سروجنی نائیڈو کا اور

اور دوسرا سر نظامت جنگ کا، انگریزی کے ادیب تھے اور بڑے بڑے انگریز ان کا لوہا مانتے تھے، مولانا محمد علی کامریڈ کے لئے ان سے مضامین لکھوایا کرتے تھے۔

نواب صاحب کے چھوٹے بھائی مولوی عظیم الدین احمد ابتداً ضلع عثمان آباد پر مددگار تعلقدار ہو کر آئے اتفاق سے ہم لوگ بھی وہیں تھے، اس لئے ہم سے بھی مراسم ہو گئے چونکہ مجھ پر بہت کرم فرماتے تھے اس لئے میں بھی ان سے زیادہ ملتا تھا یہ بھی اپنے بڑے بھائی کی طرح کم گو، کم سم اور بے غرض بزرگ تھے، عثمان آباد سے تبادلہ ہوا تو کروڑگیری (کسٹم) کے مددگار ناظم ہو گئے، ان دنوں نواب صاحب نظامت جنگ کنگ کوٹھی روڈ پر رہتے تھے اور عظیم الدین صاحب بھی ساتھ رہتے تھے۔ میں اکثر صبح کے وقت ان سے ملنے جایا کرتا تھا، ورانڈے کے سامنے چبوترے پر آرام کرسی پر بیٹھے اخبار پڑھتے نظر آتے، سامنے گولی (گوالا) بھینس کا دودھ دوہتا رہتا اور نواب صاحب اس طرح بیٹھتے گویا گوالے کی نگہداشت کر رہے ہیں۔ ایک لطیفہ مشہور ہے کہ گوالا دودھ دوہتا ہوا ایک شلوقی (تھیلی) بھر کر دودھ روزانہ اپنے گھر لے جاتا تھا کسی عزیز نے دیکھ کر یہ چغلی کھائی اور نواب صاحب کے سامنے شلوقی پیش کی کہ اس طرح گوالا روزانہ چوری کرتا ہے، نواب صاحب نے سن کر بڑے غصے سے فرمایا "یہ تو ہم بارہ سال سے دیکھ رہے ہیں تم نے کونسی نئی بات معلوم کی"۔ شلوقی گوالے کو دے دی گئی اور معاملہ حسب دستور رہتا رہا۔

اخبار نظام گزٹ ہفتہ وار جاری ہوا تو میں اس میں "گپ کالم" لکھا کرتا تھا۔ نواب صاحب نے شاید کبھی پڑھ لیا اور یہ کالم پسند آ گیا۔ مسلسل پڑھتے رہے اور پھر مجھے یاد فرمایا۔ میں نے دفتر میں ملاقات کی تو بڑی محبت سے ملاقات فرمائی اور گپ کے سلسلہ پر داد دی اور مجھے فرصت سے ملنے کے لئے فرمایا۔ ایک روز شامت جو آئی تو میں نے بنگلہ پر حاضری دی، صبح کا وقت تھا ورانڈے کے سامنے آرام کرسی پر بیٹھے ہوئے تھے میں نے اطلاع کروائی تو بلا لیا اور اسی طرح بیٹھے بیٹھے گفتگو فرمانے لگے، میں فطرتاً گدائے متکبر ہوں، یہ ادا مجھے پسند نہ آئی، بدنصیبی سے وہاں کرسی ہی نہ تھی ایک اسٹول پر اخبارات رکھے تھے میں نے اخبارات اٹھا کر نیچے ڈال دیئے اور اسٹول پر بیٹھ کر گفتگو شروع کی نواب صاحب کو اس طرح بلا اجازت میرا بیٹھ جانا بڑا ناگوار گزرا باتیں کرتے کرتے خاموش ہو گئے۔ میں نے بھی خاموشی اختیار کی اور دو چار منٹ کے انتظار کے بعد چلا آیا، اس کے بعد مجھے کبھی ان سے ملنے کی ہمت نہیں ہوئی۔

میرے ہم زلف مولوی محمد محسن صاحب منصبدار نواب صاحب کے قریبی عزیز ہیں ان کی لڑکی کی شادی میں اچانک سامنا ہو گیا تو صورت دیکھتے ہی نام لے کر مخاطب کیا دیر تک گفتگو کرتے رہے اور شکایت کی کہ آپ ملتے نہیں میں نے اس دن کا واقعہ دہرایا تو مسکرا کر فرمایا معلوم نہیں کیا بات تھی مجھے یاد نہیں، مگر پھر بھی میں نے ان کے گھر جانے کی ہمت نہیں کی۔

وظیفہ (ریٹیشن) لینے کے بعد بالکل مذہبی آدمی ہو گئے تھے قرآن کی تفسیر بھی لکھ رہے تھے بعض چھوٹی چھوٹی کتابیں بھی لکھی تھیں۔ ایک انجمن "علم و عمل" کے نام سے قائم کی تھی جس کے لئے ایک مکان اور نقد رقم وقف کی ہے۔

مرحوم میں جو صلاحیتیں تھیں وہ ان کی کم گوئی اور بے جا رواداری کی وجہ سے بروئے کار نہ آ سکیں، برسر خدمت رہنے تک مذہبی خدمت نہیں کی بلکہ مذہب سے دور دور ہی رہے، وظیفہ کے بعد جو مذہبی خدمت شروع کی تھی وہ ان کے شایان شان نہ تھی، معمولی صلاحیتوں کے لوگ بھی یہ کام کر سکتے تھے، ان سے جو توقعات تھیں پوری نہ ہو سکیں۔

اپنی حد تک نیک، خیر اور وضعدار آدمی تھے بعض قرابتداروں کی مالی امداد بھی کرتے تھے مگر اپنے خاندان کی خوشحالی اور ترقی کی کبھی کوشش نہیں کی، اتنا بڑا شخص سینکڑوں کو بنا سکتا تھا مگر وہ اپنے خاندان والوں کو بھی نہ بنا سکے اس بخالت کو وہ رواداری سمجھتے تھے، سماجی حیثیت سے میں تو انہیں کوئی اہمیت نہیں دیتا ایک انگریزی شاعر کی حیثیت سے حیدرآباد اس پر فخر کر سکتا ہے۔ انگریزی نظموں کے چار پانچ مجموعے طبع ہو چکے ہیں جو عام طور پر پسند ہیں۔

بہادر یار جنگ

حیدر آباد کے ایک مشہور اہلِ سیف (فوجی) خاندان سے تھے، بڑی غیر معمولی شخصیت تھی، بچپن ہی سے تقریر کا شوق تھا۔ مشہور ہے کہ کم سنی میں اپنے والد کے ساتھ نظام کلب گئے تو والد نے اپنے دوستوں سے کہا کہ بہادر خاں تقریر بھی کرتے ہیں چنانچہ لوگوں نے مجبور کیا کہ تقریر کرو تو تقریر شروع کی اور تمہید اس طرح شروع کی کہ آپ لوگ بزرگ اور قابل ہیں مجھ جیسے کم معلومات کا آپ کے آگے تقریر کرنا بھینس کے آگے بین بجانا ہے، اس پر ہنسی ہوئی تو معلوم ہوا کہ ضرب المثل الٹی استعمال ہو گئی تھی، اس طرح جو کچھ پڑھتے یاد رکھتے اور تقریر میں اس کا استعمال بڑی خوش اسلوبی سے کرتے تھے۔

حیدر آبادی تقریر کے معاملے میں ہمیشہ پیچھے رہے ہیں تقریری مادہ ان میں ہمیشہ کم رہا ہے، غالباً نواب بہادر یار جنگ حیدر آباد میں پہلے شخص ہیں جنہیں قدرت نے طلاقتِ لسانی سے سرفراز کیا تھا، آدمی بھاری بھر کم سرخ و سفید تھے، تقریر کے لئے کھڑے ہو جاتے تو اپنی ظاہری شخصیت ہی سے حاضرین کو مرعوب کر لیتے اور پھر جب اپنی گل افشانیٔ گفتار دکھاتے تو غضب ہی کر دیتے تھے۔

ابتدائی تعلیم کچھ زیادہ نہیں ہوئی تھی مگر بہادر یار جنگ نے بعد میں درسی کتابیں بڑی محنت سے پڑھیں اور خاصی قابلیت بہم پہنچالی تھی، معمولی عربی اور خاصی فارسی پڑھ لی تھی اردو کا مطالعہ بڑا اچھا تھا، مشاہیرِ ہند جو حیدر آباد آتے، ان سے بہت ملتے اور حصولِ معلومات کی کوشش کرتے تھے، سیاسیات سے بڑی دلچسپی تھی، شخصی اعتبار سے غصیلے اور جوشیلے آدمی تھے، جلد بازی بھی طبیعت میں تھی۔ ابتداً عراق اور ایران کا سفر کر کے آئے تو حیدر آباد میں اپنے مشاہدات بصورتِ تقریر بیان کرنا شروع کیا اس طرح ان کی تقریریں شروع ہوئیں۔

محبوب نگر کے چند نوجوانوں نے اتحاد المسلمین کے نام سے ایک انجمن قائم کی تھی جس کے روحِ رواں خواجہ بہاؤ الدین تھے۔ انھوں نے یہ دیکھا کہ بہادر یار جنگ غیر معمولی طور پر ابھر رہے ہیں تو اتحاد المسلمین میں کھینچ لیا اور نواب اس طرح اتحاد المسلمین سے ایسے وابستہ ہوئے کہ انجمن ان میں جذب ہو گئی اور وہ انجمن میں جذب ہو گئے۔

سیاسی حیثیت سے ملک کا مفاد اور وطن کی محبت ان میں تھی، چونکہ ناتجربہ کار اور کم سن تھے اس لئے غرور و خوص کا مادہ کم تھا۔ اگر چند برس اور زندہ رہتے تو غیر معمولی لیڈر ہوتے، تھوڑے عرصے ہی میں نہ صرف حیدر آباد بلکہ ہندوستان بھر میں شہرت حاصل کر لی تھی۔ قائدِ اعظم انہیں بہت پسند کرتے تھے۔

علم و ادب سے بھی شغف تھا۔ ادبی کتابوں اور رسالوں کا مطالعہ بھی کرتے رہتے اور کبھی کبھار شعر بھی کہتے تھے، عین جوانی میں خون کے دباؤ کی وجہ سے اچانک موت واقع ہوئی، حقیقت یہ ہے کہ ناوقت موت ہوئی ؎

این ماتم سخت است کہ گویند جوان مُرد!

احمد محی الدین

حیدر آباد کے قدیم اور شریف خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ مولوی اکبر کے خاندان سے بھی قرابت تھی جن کا بنی خانہ اب تک موجود ہے حیدر آباد میں ملازمت تعلیم و تربیت ہوئی، حیدر آباد سول سروس کے لئے کوشش کی مگر انتخاب نہ ہو سکا۔ بددل ہو کر ملازمت کی کوشش کی [illegible] ان دنوں معین الدین صاحب بی اے [illegible]

یونیورسٹی کالج کی بورڈنگ کے موذب سے جو ان کے انچارج تھے۔ ہر جمعرات کی رات وہاں "یاران غافل" جمع ہوتے، بڑی اچھی صحبت رہتی۔ ذوالفقار علی حقانی بی اے بی ٹی مرحوم، سیف اللہ صدیقی، احمد محی الدین، راقم الحروف وغیرہ جمع ہوتے تھے۔ ان دنوں نواب مسعود جنگ نے حقانی صاحب کو ذرا الجھیڑا تھا اور وہ بہت چراغ پا تھے۔ سیف اللہ اور میں انہیں چھیڑنے کے لئے ہر جمعرات کی رات کو ایک اسکیم بناتے کبھی تعلیمی ہفتہ وار اخبار کی اسکیم مرتب ہوتی "معلم" نام تجویز ہوتا ذیلی عنوانات بنائے جاتے اور ایک مکمل خاکہ ایسا تیار ہوتا گویا کل سے اخبار جاری ہی ہوگا۔ کسی جمعرات کی رات روزنامے کا خاکہ بنتا، نام تجویز ہوتا ٹائمز کے لحاظ سے "الوقت" ذیلی عنوانات تجویز ہوتے تمام کام زبانی انجام پاتا، کبھی بک ڈپو اور پبلشنگ ہاؤس کی تجویز ہوتی اس طرح رات دلچسپی سے گذرتی صبح معین الدین صاحب نہاری کا نفیس ناشتہ کراتے اور سب لوگ واپس ہو جاتے، چند روز بڑی دلچسپی رہی اس کے بعد جب معین الدین صاحب نے بورڈنگ چھوڑ دی تو جمعرات پارٹی بھی ختم ہوگئی میں گلبرگہ چلا گیا اور اسکیمات چونکہ فرضی تھیں اس لئے سب بھول گئے۔ چونکہ مجھے گلبرگہ سے ہر ہفتہ حیدرآباد آنے کی عادت تھی اس لئے ایک دفعہ حیدرآباد آیا تو "خداوند" (عبدالرحمن نے سیف اللہ کا نام رکھا تھا اور ہم لوگ انہیں خداوندی کہتے تھے) نے فرمایا کہ احمد میاں نے اخبار نکالنا طے کر لیا ہے اور "الوقت" کی اجرائی کے انتظامات ہو رہے ہیں مجھ سے ملاقات ہوئی تو احمد میاں نے کہا اخبار نکالنا تو میں طے کر چکا ہوں مگر نام سوچ رہا ہوں، الوقت مجھے پسند نہیں۔ مخبر دکن، مشیر دکن جیسا نام چاہتا ہوں۔ میں ترکیبی نام کا مخالف تھا اسی لئے میں نے اس دکن کے دم چھلے کی مخالفت کی مگر احمد میاں اسی طرف مائل تھے، آٹھ دس روز کے بعد پھر حیدرآباد آیا تو معلوم ہوا کہ "رہبر دکن" نام تجویز ہوا ہے اور درخواست بھی دے دی گئی ہے چنانچہ منظوری ملی اور "رہبر دکن" بڑی آب و تاب سے نکلا۔ احمد میاں نے ایسی نیک نیتی سے اخبار جاری کیا تھا کہ وہ ترقی کرتا ہی رہا اور جنوبی ہند کا سب سے کثیرالاشاعت اخبار ہو گیا۔ دکن ملک کی خدمت کی اور حق یہ ہے کہ حق خدمت ادا کیا۔ حیدرآباد میں اس وقت دو روزنامے اور نکلتے تھے ایک "صحیفہ" دوسرا "مشیر دکن" یہ دونوں ہی اگلے وقتوں کے پرچے تھے۔ ایک کے ایڈیٹر مولوی جی تھے دوسرے کے پنڈت جی۔ صحیفہ ایسا کٹر اخبار تھا کہ اشتہار چھاپنا خلاف شرع سمجھتا تھا، کسی جاندار کی تصویر صحیفہ میں طبع ہو ہی نہ سکتی تھی، مشیر کے پنڈت جی بھی اسی قسم کے کٹر تھے مولوی مجیب احمد تمنائی مشیر کے نگران تھے مگر مضامین کی حد تک ان کا تعلق تھا لکھائی چھپائی سے وہ بے تعلق تھے، ایسے زمانے میں ایک روشن خیال اخبار کی شدید ضرورت تھی، اجرائی کے چند سال بعد ہی سے خاص نمبر یعنی سالگرہ نمبر عید نمبر وغیرہ نکلنے لگے، جو مصور ہوتے تھے۔ شہزادگان والاشان کی تصاویر پہلی بار رہبر دکن ہی میں طبع ہوئیں، غرض جتنی جدت ہو سکتی تھی ہوتی رہی، کارکن بھی بڑے مخلص ملے، احمد میاں کے بھائی یوسف الدین مہتمم تھے، عبداللہ خاں پالیسی کنٹرول کرتے تھے اور زیادہ تر وہی اداریے لکھتے تھے، مترجمین اور دوسرے کارکن بھی بڑے ہی مستعد اور مخلص ملے اور خوب کام ہوتا رہا، کسی شخص اور ادارے نے اپنے محلے کے لئے اتنی سہولتیں مہیا نہیں کی تھیں جتنی احمد میاں نے کیں، اپنے محلے کا کوئی آدمی مر جاتا تو وہ تجہیز و تکفین کے مصارف برداشت کرتے اس کے متعلقین کو ماہوار وظیفہ مقرر کر دیتے تنخواہیں خاصی فراخ دلی سے مقرر کرتے اور وقت پر ادا کرتے، قرضے بھی خاصے دیا کرتے اور دوسری سہولتیں بھی دیتے اس شان کا عملہ پر خاد رہتا تھا۔

رہبر دکن جاری کر کے گلبرگہ آئے نواب اقبال علی خاں مہتمم تعمیرات کے مہمان ہوئے تو میں نے بائیکاٹ کیا اس سے بہت متاثر ہوئے اور میرے پاس منتقل ہو گئے دو دن میرے مہمان اور دو دن اقبال علی خاں کے مہمان رہے، اس طرح دوستوں کا خیال رکھتے تھے، میں نے خریدار فراہم کئے تاکہ عہدہ دار اور محلے والوں کو خریدار بنایا اور اتفاق سے سو خریداروں نے نقد چندہ دے دیا وی پی کی نوبت نہ آئی، اس کامیابی سے اتنے مسرور ہوئے کہ بیشتر اضلاع کا دورہ کیا اور خاصے خریدار ہر ضلع سے فراہم کئے۔

یہ بھی عجیب بات ہے کہ ان کے ایک بیٹے سید یسین ہوئے اور ابتدائی تقرر گزشتہ مدت ہوا اور وہ احمد محی الدین جن کو حیدرآباد میں میں نے صاحب نے گزشتہ مدت نہیں دی تھی اپنا احباب اور ان کو اعلی کوشش گزشتہ [illegible]

خوش قسمتی سے میاں کی ہر بات میں رہی، اولاد اچھی ہوئی، تعلیم و تربیت اچھی دلا سکے، اولاد کو خدمتیں بھی اچھی ملیں، جائداد خاصی چھوڑی جسے ان کی اولاد حفاظت سے رکھ بھی رہی ہے۔ یہ برکت ان کی کنبہ پروری اور نیک دلی کی ہے، اپنے عزیز و اقارب کی انہوں نے کافی مدد کی اپنی آمدنی کا خاصا حصہ ان پر صرف کرتے تھے۔

مدتوں بلدیہ (میونسپل کارپوریشن) کے رکن (ممبر) رہے، شہری خدمت بھی خوب کی بیشتر کمیٹیوں کے رکن رہتے تھے اور اپنی ذاتی رائے بڑے بے لاگ طریقے سے بیان کر دیتے تھے۔

خاص نمبر نکالنے سے پہلے ترتیب اور مضامین کے متعلق مجھ سے اور تصاویر اور اشتہارات کے متعلق عبدالرزاق صاحب بسمل سے مشورہ کر لیتے اور ایک لائحہ عمل بنا کر اس پر سختی سے کاربند ہو جاتے تھے، ان کے انتقال کے بعد بھی ان کے لائق فرزندوں نے بڑی عمدگی سے رہبر دکن جاری رکھا۔ پولیس ایکشن کے بعد جب سب پرچے بند کر دیے گئے تو یہ بھی بند کر دیا گیا۔ انہی کے ایک عزیز نے رہنمائے دکن کے نام سے جاری کر کے دوبارہ پرچہ جاری کر دیا جو اسی طریقے پر چلایا جا رہا ہے مگر ؎

وہ بات کہاں کی گئی گو وہ کن کے ساتھ!

فانی

فانی بدایونی کا کلام مدت سے پڑھ رہا تھا، ان کی تصویریں بھی دیکھی تھیں مگر ان سے ملنے کا اتفاق ہی نہیں ہوا تھا۔ اتفاق سے ایک روز سر مغرب مکتبۂ ابراہیمیہ سے نکل ہی رہا تھا کہ ایک دبلے پتلے، متوسط قد و قامت کے شریف آدمی نے مجھ سے ہوش بلگرامی کے گھر کا پتہ پوچھا۔ اتفاق سے میں ہوش ہی کے پاس جا رہا تھا۔ ہوش ان دنوں حیدرگوڑہ میں تھے، میں نے کہا چلئے میں بتا دیتا ہوں وہ ساتھ ہو گئے۔ مجھے سائیکل لے کر اپنے ساتھ پیدل چلتا ہوا دیکھ کر راستے میں انہوں نے ایک دو معذرتی جملے کہے اور پھر خاموش ہوش کے گھر تک پہنچ گئے۔ ہوش اپنے گھر کے ورانڈے ہی میں بیٹھے ہوئے تھے، ہوش سے ان صاحب کی شاید کبھی ملاقات ہو چکی تھی مگر ہوش نے بھی انہیں پہچانا نہیں بالآخر انہیں اپنا تعارف آپ کرانا پڑا کہ میں فانی بدایونی ہوں۔ اس طرح معلوم ہوا کہ یہ دبلا پتلا کھویا کھویا سا شخص فانی ہے۔ ہوش نے بہت مجبور کیا کہ ان کے مہمان ہو جائیں مگر فانی نے انکار ہی کیا اور نظامیہ ہوٹل کے قیام ہی سے خوش رہے، یہ تھی پہلی ملاقات فانی سے، اس کے بعد مسلسل ملاقاتیں ہوتی رہیں، مہاراجہ بہادر کے پاس، ہوش کے پاس، جوش کے پاس، نظامیہ میں۔ چند روز رہ کر فانی چلے گئے۔ دوبارہ آئے تو نامپلی اسٹیشن کے پاس "صلح سرائے" میں قیام کیا اور پھر چاپل میں اس مکان میں منتقل ہو گئے جو آغا شیں بلدہ کا مکان تھا اور مہاراجہ بہادر نے ان کے لئے محفوظ کرا یا تھا۔ یہ قیام مستقل تھا، پھر تو ملاقاتیں ہوتی ہی رہیں۔

اردو شعراء میں سب سے زیادہ نکما شاعر میر تھا جس نے سوا شاعری کے کچھ نہیں کیا اور اگر شاعری کے علاوہ کچھ کیا تو فاقہ! شاعری اور خصوصاً غزل کی شاعری محتاج ہوتی ہے نفسیات کی اور غیر نفسیات داں شاعر، شاعر نہیں کہلا سکتا۔ میر کے بعد کوئی غیر نفسیات داں شاعر اگر پیدا ہوا تو وہ فانی ہی تھا۔ فانی کو نفسیات سے چڑ تھی، وہ نفسیات کے پیچھے لٹھ لے کر دوڑتے تھے، انہیں دنیا اور دنیوی مخلوق سے کوئی سروکار نہ تھا، وہ قنوطی تھے اور ایسے قنوطی کہ دنیا ان کی نظروں میں تاریک تھی، مجسم محروم، مجسم حزن و ملال، رونا ان کا روزمرہ تھا، صورت بھی سوگ برستی پائی تھی۔

مجھے راشد الخیری سے بھی بغض تھا اس لئے کہ وہ مجسم ہوگی اور رونے پیٹنے کے حامی تھے، فانی سے میری دوستی ہو گئی وہ تھے بھی اس قابل کہ ان سے دوستی کی جائے نہایت شریف بڑے ہی مخلص اور سچے وفادار دوست مگر دوستوں کو بھی بجوت گریہ دیتے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ دنیا ان کے ساتھ روئے، ہے حال ہی میں ریڈیو پر ایک ریکارڈ سنا تھا

محبت میں سارا جہاں رو رہا ہے — زمیں رو رہی آسماں رو رہا ہے

بالکل یہی حال فانی کا تھا۔

میں نے انہیں مجبور کیا کہ وہ وکالت کریں مگر تیار نہ ہوئے، پیڈ ماسٹر بنائے گئے تو یہی کہتے ہی رہے، وہ چاہتے تھے کہ مدرسہ میں بجائے تعلیم کے ماتم ہوتا رہے، لڑکے سینہ کوبی کریں، مدرسین چیخیں لگائیں اور سب مل کر روتے جائیں اور سے

سینہ کوبی سے زمیں ساری ہلا کے اٹھے

کیا علم دھوم سے تیرے شہداء کے اٹھے

کا سماں رہے۔

اور کوئی شخص ہوتا تو دنیا بنا لیتا، حیدر آباد پر چھا جاتا مگر فانی فاقے کرتے رہے، مہاراجہ بہادر سرپرست، معظم جاہ بہادر مربی پورا حیدرآباد مانوس، سارے عہدہ دار ہمدرد، علمی طبقہ سر پر بٹھاتا تھا اور حیدر آباد کے عوام خاصے مانوس ہو گئے تھے۔

داغ حیدر آباد آئے تھے تو ان کو مدار المہام کی سرپرستی نصیب تھی نہ کسی شہزادے کی قربت دو ایک شاہی مصاحبوں سے ملاقات تھی مگر داغ نے ایک ایک کر کے سب کو ہموار کیا، عوام کو مسحور کیا، عہدہ داروں کو مسخر کیا اور "پستی سے فلک نا پہ" پہنچ کر رہے، داغ نہ تو گریجویٹ تھے نہ ال ال بی نہ ہی فانی کی طرح انہیں سہولتیں نصیب تھیں مگر داغ استاذ السلطان بنے اور فانی فنا ہو گئے ۔

فانی دکن میں آکے یہ عقدہ کھلا ہمیں!

ہندوستاں میں رہتے ہیں ہندوستاں سے دور

کہہ کر حیدر آبادیوں کو مخالف بنا لیا، حیدر آباد والے اپنے وطن کو دکن بولتے ہیں اور صرف شمالی ہند کو "ہندوستان" چنانچہ داغ کے زمانے میں بھی ایسا ہی کہتے تھے، داغ نے بھی ایسا ہی کہنا شروع کر دیا تھا، چنانچہ جب وہ اہل وطن کو خط لکھتے تو "ہائے ہندوستان تیرا ارمان" بڑے درد بھرے طریقے سے لکھتے تھے، داغ اس گر سے واقف تھے کہ روم میں رہنا ہو تو روم والوں کی طرح رہو، چنانچہ انہوں نے حیدر آباد میں حیدر آبادیوں کی طرح زندگی گزاری اور اسی لئے کامیاب بھی ہوئے مگر فانی نفسیات سے بے خبر زمانے کے حالات سے ناواقف اور صورت حال کے اندازے سے قاصر تھے، یہ شعر نہ تو ان کی عزت میں اضافہ کر سکا اور نہ حیدر آبادیوں کے حالات بدل سکا، البتہ فانی سے لوگ بد دل ہو گئے اور اسے طنز سمجھ کر حیدر آبادی طبقہ ان سے نفرت کرنے لگا، بہر حال فانی نے بڑی بری زندگی گزاری آخری زمانے میں ان کے حالات بد سے بدتر ہو گئے تھے میرا چھوٹا بھائی رشید کاظمی فانی کے قریب ہی تھا، بیچارہ ان سے بہت ملتا اور ان کی حالت پر روتا تھا مگر ہم لوگ رو کر کیا کر سکتے تھے اور روتے بھی کب تک؟

شام کے مُردے کو کب تک روئیے!

مجھے فانی سے محبت تھی، ان کے لئے اکثر روتا ہوں اور شاید مرتے تک روتا رہوں گا (میں دعا کرتا ہوں کہ خدا کسی کو شاعر نہ بنائے اور اگر بنائے تو غالب و داغ، اکبر و اقبال بنائے، آبرو و فانی نہ بنائے، آمین!)

فصاحت جنگ

حافظ جلیل حسن جلیل مانک پوری المخاطب بہ نواب فصاحت جنگ بہادر جلیل القدر امیر مینائی کے شاگرد تھے۔ امیر رام پور ہی میں تھے کہ جلیل ان کے پاس پہنچ گئے اور امیر اللغات کا کام کرنے لگے، امیر چاہتے تھے کہ ان کی لغات کے لئے حیدر آباد سے کوئی امداد ملے اور وہ لغات شائع کر سکیں، اس کے لئے انہوں نے داغ سے مراسلت کی تھی اور داغ نے حضور نظام سے عرض کر کے بنارس کے مقام پر جبکہ حضور کلکتے سے واپس ہو رہے تھے

لکھنؤ سے تھے امیر کو باریاب کرایا تھا اور حضور نے انہیں حیدرآباد آنے کا حکم دیا تھا۔ اس حکم کی تعمیل اور داغ کے تقاضے پر امیر مع اپنے چند عزیزوں اور شاگردوں کے حیدرآباد آئے مگر ایسے آئے گویا مرنے کے لئے آئے تھے۔ آتے ہی بیمار ہوئے اور اللہ کو پیارے ہو گئے، دوسرے لوگ تو واپس ہو گئے مگر جلیل اور اختر مینائی (اختر یار جنگ، فرزند امیر مینائی) حیدرآباد ہی میں رہ گئے، ابتداً داغ نے ان دونوں کی مدد کی پھر مہاراجہ کشن پرشاد بہادر نے دونوں کو ملازم رکھ لیا۔ داغ کا انتقال ہوا تو مہاراجہ نے جلیل کو پیش کیا اور حضور غفران مکان کی استادی کا شرف حاصل ہوا، حضور غفران مکان کے بعد حضور بندگان عالی نے بھی اپنی استادی سے سرفراز فرمایا اور پانچسو روپیہ ماہوار تنخواہ مقرر ہوئی اور پانچ سو روپیہ سالانہ بھی منظور ہوا، آخر میں حضور نے مکان بھی دلوا دیا تھا جو اب "جلیل منزل" کے نام سے موسوم ہے۔

جلیل صاحب نہایت متقی پرہیزگار، پابند اور نیک دل بزرگ تھے۔ والد مرحوم چونکہ داغ کے شاگرد تھے اور جلیل داغ کے پاس زیادہ آمد و رفت رکھتے تھے اس لئے والد سے بھی مراسم ہو گئے تھے پھر مہاراجہ کی ڈیوڑھی سے متعلق ہوئے تو تنگی کے عالم رہنے لگے اور تنگی والد کے بڑے گہرے دوست اور فارسی کے استاد بھی تھے اس لئے مکان پر بھی آمد و رفت رہتی تھی اور میں بچپن سے جلیل سے واقف تھا حضور نے جلیل القدر لقب سے سرفراز فرمایا تھا جس کی مسرت میں جلیل نے ایک مرصع قصیدہ پیش کیا تھا جس کا ایک شعر تھا ؎

جلیل القدر کو دیکھو جلیل زار کو دیکھو

لقب جو شاہ سے ملتا ہے چرچا ہو ہی جاتا ہے

جب بھی جلیل تشریف لاتے میں یہ شعر گنگنانے لگتا جسے سن کر جلیل خوش ہوتے تھے۔

۱۹۰۸ء میں والد گلبرگہ چلے گئے اور ایسے گئے کہ آخر تک اضلاع ہی میں رہے۔ والدہ مرحومہ کی زندگی تک میں کبھی حیدرآباد اور کبھی گلبرگہ یا رائچور میں رہتا تھا مگر والدہ کے انتقال کے بعد سے میں بھی حیدرآباد میں مسافرانہ آیا کرتا تھا اور "سفر در وطن" کا لطف اٹھاتا تھا ۱۹۲۶ء تک یہی حال رہا۔ اس اثناء میں مجھے جلیل سے ملنے کا اتفاق ہی نہیں ہوا ۱۹۲۶ء میں مستقل طور پر حیدرآباد آ گیا تو یہی سوچتا رہا کہ کسی دن ملوں گا مگر مل نہ سکا، ایک دفعہ میں نے کسی مضمون میں یہ لکھا تھا کہ پوری غزل کسی استاد کی بھی مرصع اور منتخب نہیں ہوتی۔ میر کے اتنے بڑے دیوان میں سے یار لوگوں نے ۷۲ شعر چنے ہیں، آج جلیل استاد ہیں مگر باوجود اس استادی اور کہنہ مشقی کے ان کی غزل میں ایک دو شعر ہی اچھے نکلتے ہیں ورنہ بقیہ شعر یوں ہی ہوتے ہیں۔ جلیل کے ایک شاگرد تھے لطف علی عارف بیچارے واجبی پڑھے لکھے تھے اس مضمون کو پڑھا تو انہیں بے انتہا غصہ آیا کہ استاد جلیل کی یہ توہین و تذلیل کی گئی ہے چنانچہ جلیل کو سنایا کہ یہاں ایک بدلگام ہے جو بڑے بڑے استادوں کے متعلق جو جی چاہتا ہے لکھ دیتا ہے چنانچہ اس نے حضرت کے متعلق یہ لکھا ہے۔ جلیل بڑے ہی سمجھ دار تھے سب سن کر کہا ذرا وہ مضمون تو لا دیجئے میں بھی تو دیکھوں۔ چنانچہ عارف نے پرچہ پیش کیا تو جلیل نے پڑھا اور کہا بیچارے نے بڑی صحیح بات کہی ہے اس نے تو میری استادی کا اعتراف کیا ہے اور یہ بھی لکھا ہے کہ میری غزل میں ایک دو شعر اچھے ہوتے ہیں اور یہ بالکل صحیح تنقید ہے میں تو اس کا ممنون ہوں کہ بیچارے نے اچھا مضمون لکھا ہے۔ پھر میرے متعلق پوچھا کہ کون ہے کہاں کا رہنے والا ہے میرے ایک ملاقاتی نوازش حسین نواز بھی وہاں موجود تھے انہوں نے اپنی معلومات کی حد تک بتایا تو کہا انہیں کسی دن لے آیئے کہنے میں مشتاق ہوں، چنانچہ نواز نے مجھے مجبور کیا اور میں جلیل صاحب کے پاس پہنچا، شام کا وقت تھا میں ملا تو غور سے دیکھنے لگے میں نے عرض کیا آپ نے پہچانا؟ تو فرمایا بھئی چہرہ تو بتا رہا ہے کہ دیکھا ہوا ہے مگر یاد نہیں آ رہا ہے کہ کب اور کہاں دیکھا ہے۔ میں نے عرض کیا آپ کسی تجلی سے واقف ہیں؟ یہ سنتے ہی کھڑے ہو گئے مجھے چھاتی سے لگا لیا اور کہنے لگے میاں اکیس سال کے بعد تم مل رہے ہو مگر تجلی کا غضب آنا کام ہے کہ میں سوچ ہی رہا تھا کہ تم نے نام لے دیا بڑی دیر تک باتیں کرتے رہے اس کے چند ہی سال کے بعد میں اتفاق سے محلے میں جا رہا اور ان کی جلیل منزل کے سامنے ہی رہتا تھا اکثر چلا جاتا، نہ جاتا تو بلا لیتے۔ مدتوں یہ حال رہا۔

بڑے وضع دار اور مخلص بزرگ تھے، اوقات اتنے معمور کہ ولی نظر آتے تھے۔ جاڑا ہو یا گرمی تہجد بھی پڑھتے تہجد کے بعد ذکر و شغل میں مصروف ہو جاتے اور پھر فجر پڑھ کر ذرا لیٹ جاتے۔ نمازیں باجماعت ہوتیں، گھر ہی پر جماعت ہوتی تھی، مہمان نواز تھے، آئے دن دو تین مہمان رہتے تھے، خوش نصیب ایسے کہ بیٹے، نواسے، پوتے، پڑپوتے سبھی تھے اور سب خوشحال تھے اور اب بھی ہیں۔

کسی کی برائی سنتے اور نہ خود برائی کرتے، سپاہی کوئی بھی غزل سناتا تو خوش ہوتے اصلاح چاہتا تو اصلاح دیتے ورنہ داد دیتے امیر مینائی کا بڑا احترام کرتے تھے اور اختر مینائی سے بے انتہا انس تھا ایک لطیفہ سنئے تنخواہ آتی تو تنخواہ کی پوری تھیلی اختر میاں کے پاس بھیج دیتے۔ وہ اس تھیلی کو رکھ لیتے اور پھر مٹھائی منگوا کر تنخواہ کی تھیلی مٹھائی کی چنگیر کے ساتھ واپس بھجواتے تو مٹھائی سب میں تقسیم ہوتی اور تنخواہ کی تھیلی کھولتے آخر تک یہ معمول رہا۔

پوتوں نے ریڈیو خریدا اور گھر میں لگا دیا تو بہت خفا ہوئے حکم ہوا پھینک دو۔ بچوں نے اختر میاں سے کہا، انہوں نے آکر پوچھا حافظ صاحب ریڈیو کہاں ہے ہم بھی سنیں، تو کچھ اظہار ناراضگی کیا مگر اختر میاں نے کہا کیا مضائقہ ہے اچھی چیز ہے تو خاموش ہو رہے اور خبریں سنیں پھر اکثر سن لیتے تھے۔ ایسا خلوص اور اتنی محبت بہت کم دیکھنے میں آئی دونوں (جلیل و اختر) ایک دوسرے کے عاشق تھے، ان بڈھوں کی محبت جوانوں کے لئے سنگ میل تھی۔

حیدرآباد میں ہزاروں شاگرد ہیں اور حیدرآباد سے باہر بھی ہزاروں ہیں، دو تین دیوان اور کئی ایک تصانیف طبع ہو چکی ہیں۔ آخری دیوان "روح سخن" اب تک نہیں چھپا واقعہ یہ ہے کہ یہ دیوان "روح سخن" ہی ہے۔

جلیل کے بیٹوں اور شاگردوں نے ایک بزم جلیل قائم کی ہے مشاعرے کرتے رہتے ہیں۔ کاش مشاعروں پر روپیہ ضائع کرنے کی بجائے دیوان چھپوا دیں۔

واقعہ یہ ہے کہ جلیل بہترین غزل گو تھے، لکھنؤ اسکول میں اتنا اچھا غزل گو کوئی پیدا نہیں ہوا۔

صفی اورنگ آبادی

بہبود علی صفی اورنگ آبادی، اورنگ آباد دکن میں پیدا ہوئے تھے۔ بچپن میں باپ کے ساتھ حیدرآباد آ گئے اور یہیں مدرسہ نظامیہ میں تعلیم پائی۔ باپ طبابت پیشہ تھے صفی خوش نویس تھے۔ باپ کی زندگی تک نوکری نہیں کی پھر مہاراجہ بہادر کے پاس خوش نویسوں میں ملازم ہو گئے۔ مگر جب مہاراجہ کو یہ معلوم ہوا کہ ان کا دیوان صاف کرنے والا خوش نویس بھی شاعر ہے اور صفی تخلص کرتا ہے تو نوکری چھوڑ دی، حیدرآباد کے مشہور امیر نواب معین الدولہ بہادر نے مدتوں اپنی مصاحبت میں رکھا، پھر نواب تراب یار جنگ سعید نے بھی سرپرستی کی، آخر میں خود انہوں نے اپنے شاگردوں سے ماہوار رقم مقرر کرا لی تھی اور اسی پر گزر بسر کرتے تھے۔

ابتداً مولوی ظہور علی کو استاد بنایا پھر ضیاء دہلوی کی شاگردی کی اس کے بعد خود رفیع حیدرآبادی سے مشورہ کرتے رہے۔ آخر میں کئی حیدرآبادی کے شاگرد ہو گئے تھے۔ علمی لیاقت اچھی تھی، عروض اور قافیہ کی تعلیم باضابطہ پائی تھی۔ یوں تو اصناف سخن پر طبع آزمائی کرتے رہے مگر غزل پر زیادہ مائل تھے اور خوب کہتے تھے چھوٹی بحروں میں زیادہ کہتے تھے۔

حیدرآباد میں عوامی شاعر ایک ہی پیدا ہوا وہ صفی تھا۔ ان کی غزل کا یہ حال تھا کہ ادھر غزل ہوئی اور ادھر مشہور ہو گئی۔ پھر بچے بچے سے سن لیجئے۔ چھوٹے چھوٹے بچے گا گا کر گاتے پھرتے ۔۔۔

جب کبھی تیری دید ہوتی ہے — اپنی اس روز عید ہوتی ہے
جھک کے ملنا بڑی کرامت ہے — اس سے دنیا مرید ہوتی ہے
اچھے گُن دیکھ اچھی شکل نہ دیکھ — سنکھیا بھی سفید ہوتی ہے

صفی کی پرورش عوام ہی میں ہوئی تھی اور وہ زیادہ تر عوام ہی سے ربط رکھتے تھے اور انھی کے خیالات کی ترجمانی بھی کرتے رہتے تھے، اسی وجہ سے عوام ان کے کلام سے خوش بھی تھے۔

اپنے استاد کیفی کی طرح مرنجاں مرنج، سیدھے سادے، سادہ دل آدمی تھے۔ چلتے پھرتے، اٹھتے بیٹھتے شعر کہہ لیا کرتے تھے۔ کسی بات کے پابند نہ تھے جو مل گیا پہن لیا، جو مل گیا کھا لیا اسی طرح جو مل جائے "پی" بھی لیتے تھے، ولایتی دیسی کی تخصیص نہ تھی مگر آخر عمر میں تائب ہو گئے تھے۔ مرنے سے پہلے بڑے پابند نمازی ہو گئے تھے۔

فانی کی طرح قطعاً خیر آدمی تھے، ایک ضخیم دیوان موجود ہے مگر شاگردانِ صفی بجائے دیوان چھپانے کے مشاعرے کئے جا رہے ہیں۔

علی منظور

سادات مہدویہ میں سے تھے، نہایت منکسر، بڑے ہی غریب، بہت ہی شریف اور سیدھا انتہا نیک آدمی تھے، ہر ایک سے محبت سے ملتے بڑے ہی خلوص سے بات چیت کرتے، کوئی مخالفت بھی کرتا تو "اللہ تعالیٰ خوش رکھے" کہہ کر خاموش ہو جاتے۔ مجھ سے بیس ایک سال سے مراسم تھے مگر نہ تو وہ میرے گھر آتے نہ میں ان کے گھر جاتا۔ محفل غیر میں اور سر راہ ملاقاتیں ہو جاتیں، جب بھی ملتے بڑی محبت سے ملتے اور بعض ایسے احباب کی خیر و عافیت پوچھتے جن سے میری خط و کتابت رہتی تھی مثلاً حامد علی خاں مدیر الحمرا وغیرہ (ماحول، محلہ، دفتر سب غیر شاعرانہ تھے مگر یہ شاعر تھے اور خوب کہتے تھے۔ نظم، غزل، نعت سبھی کہتے تھے جو بھی کہتے سوچ سمجھ کر کہتے اور کہہ کر غور بھی کر لیتے تھے "کاتا اور لے دوڑی" کا عیب نہ تھا) لوگوں نے مشہور کیا ہے کہ نعت کا ایک مختصر سا دیوان بیچ دیا تھا جسے ان کے ایک ملاقاتی نے اپنی بیوی کے نام سے چھپا لیا، اللہ بہتر جانتا ہے کہ واقعہ کیا ہے۔

دو مجموعے طبع ہو چکے ہیں، حال ہی میں انتقال ہوا۔ مجموعوں کے بعد کا کلام بھی خاصا ہے۔ نہایت قانع اور منکسر المزاج تھے۔ ان کے بیٹے فرزند کلام اکٹھا کر رہے ہیں، کوئی پبلشر ہمت کرے تو ایک ضخیم مجموعہ طبع ہو جائے گا۔

ہوش بلگرامی

کیفی حیدرآبادی کے ایک شاگرد تھے۔ راجہ بھوانی پرشاد جو کہ شہر میں مدرسہ مفید الانام کے بازو "نرنجن منزل" میں رہتے تھے۔ خواجہ تاش ہونے کی وجہ سے بھوانی راجہ سے میری بھی دوستی ہو گئی تھی اور بھوانی راجہ دوست تھے ہوش بلگرامی کے، اس طرح ہوش سے میری دوستی ہوئی۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب ہوش ذرا نو مشق تھے اور چادر گھاٹ کے دروازے کے قریب رہتے تھے۔

سنہ ۱۹۳۱ء میں ہوش شہر بدر ہوئے اور یہ ملاقاتیں بھی ختم ہو گئیں، سنہ ۱۹۴۳ء میں پھر حیدرآباد آ گئے تو ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ اس بارہ سالہ "بن باس" میں ہوش کو ذاتی تفکرات کی تلخیاں اور اپنے تجربے ہوئے۔ کہ واقعی ہوش بن گئے تھے۔ مصاحبت اور درباری میں کامل اور علم مجلسی کے ماہر

ہو گئے تھے۔ علمی خدمت، ادبی تعاون، رسالہ نکالنے کی رسم ختم ہو چکی تھی صرف مصاحبت باقی رہ گئی تھی جو بہت کام آئی۔ یہ دور مہاراجہ کشن پرشاد کی مصاحبت سے شروع ہوا۔ مہاراجہ نے کئی مہینے تک اپنی ذاتی سرپرستی میں رکھا پھر نظامت پوسٹ ماسٹر جنرل آفس میں سیونگ بنک انسپکٹر بنا دیا اور جوش دفتر میں کام کرنے لگے۔

انہی دنوں حضور نظام دہلی تشریف لے گئے واپسی پر حیدرآباد میں بڑا جشن چراغاں ہوا اسی ہنگامے میں جوش بارگاہ سلطانی میں بھی باریاب ہونے لگے اور تقرب روز بروز بڑھتا گیا مہاراجہ بہادر نے معتمدی فوج (ملٹری سیکرٹری) کی مددگاری بھی دلوا دی اور اب جوش مرتبہ نشین اور مصاحبت حضور نظام سے معزز و مفتخر ہو گئے، علمی ادبی مشاغل بھی شروع ہو گئے، امیرانہ ٹھاٹھ پیدا ہو گیا اور دعوتیں بھی شروع ہوئیں، دربار رام پور میں جو زبان چٹخارے کی ہو گئی تھی۔ کھانے کا شوق تھا ہی اسی کو وسیلہ کامیابی بھی بنا لیا اور لوگوں کو کھلانے بھی لگے بڑی پرتکلف دعوتیں ہونے لگیں اس طرح ماحول کو سازگار بنا لیا، سارے عہدہ داروں سے بے تکلف مراسم ہو گئے اور جوش وِن (WIN) جانے لگے۔

مددگاری سے ترقی کر کے نائب معتمد ہو گئے نظم جمعیت (فوج بے قاعدہ) کی تنظیم کی اور اس میں اتنا فائدہ ہوا کہ قرضے ادا ہو گئے اور دعوتیں اور بڑھ گئیں، جوش یار جنگ کے خطاب سے بھی سرفراز ہوا اور نوابی ٹھاٹھ پورا رچ گیا، اب امرائے دکن سے برابری ہونے لگی، مہاراجہ بہادر سے مساویانہ ملاقاتیں ہوتیں۔ دوسرے امراء سے بھی برابری تھی، یہ انتہائی عروج کا زمانہ تھا اور یہی زمانہ احتیاط، سلامت روی اور دور اندیشی کا ہوتا ہے، مگر غفلت کے پردے بھی تو ہر طرف لٹکتے ہیں، جوش بھی زعم امارت میں بے ہوش ہونے لگے، اس پر طرہ یہ کہ سررشتہ تعمیرات کے معتمد (پی ڈبلیو ڈی سیکرٹری) بھی بن گئے۔ بس اب کیا تھا ساون کے اندھے ہو گئے اور ہر چیز ہری نظر آنے لگی، بھوانی پرشاد جیسا دوست کنارہ کش ہو گیا، سید حیثیت جیسے مخلص کو شکایت پیدا ہو گئی حکیم منصور جنگ الگ ہو گئے۔ مہاراجہ بہادر دریا تھے ایسے سینکڑوں تماشے دیکھ چکے تھے ٹک ٹک دیکھتے رہے اور کیا کرتے دم مارنے کی گنجائش نہ تھی، غرض دوست احباب اور مخلص ایک ایک کر کے کنارہ کش ہو گئے، علی اختر مستقل مددگار رہے، احمد شفیع منصب دار اور معتمدی جرسے ہی زور و شور سے شروع ہوئی "سرفراز منزل" بھی ساتھ ہی ساتھ مکمل ہو گئی اور کنگ کوٹھی اور مہاراجہ بہادر کی ڈیوڑھی میں جو ٹھاٹھ تھے وہ یہاں نظر آنے لگے۔ فوارہ بلند ہو چکا تھا سرنگوں ہونا لازمی تھا چنانچہ ہوا اور جوش معتمدی سے ہٹ گئے، حضور نظام نے پھر بھی بندہ نوازی فرمائی کہ پنشن جاری فرما دی۔

اصولاً اب آنکھیں کھلنی چاہیے تھیں مگر نہ کھلیں۔ ترنگی اس نشہ کو نہ اتار سکی۔ پولیس ایکشن ہوتے ہی نئے حکمرانوں کو گھیر لیا۔ خوب دعوتیں دیں اور انہیں خوش کرنے کے لیے ایک کتاب لکھنے لگے جس میں حضور نظام سے لے کر اپنے بیوی بچوں تک کی مخالفت کی۔ دعوت کر کے مسودہ سناتے تو لوگ داد دیتے اور یہ خوش ہوتے مگر سنجیدہ لوگوں نے باوجود حالات بدلنے کے ان کی کتاب کو پسند نہیں کیا، جوش حیدرآباد آئے تو انہیں بھی مسودے کا کچھ حصہ سنایا اور جوش نے بھی منع کیا کہ اس کو نہ چھپوائیے۔ بعض ابواب مجھے بھی سنائے تھے اور میں نے بھی سخت مخالفت کی تھی مگر کسی کی پیش نہ گئی اور جوش نے کتاب چھپوا ڈالی "مشاہدات" نام رکھا پھر چند سنجیدہ لوگوں سے مشورہ کیا تو انہوں نے بھی منع کیا اور بعض قانونی خدشات بھی ظاہر کیے جس کی وجہ سے بعض صفحات نکال دیے گئے، بعض سطریں حذف کی گئیں اور بے ربط کتاب بے ربط تر بن گئی۔

چند ہی نسخے فروخت ہوئے تھے کہ لے دے شروع ہو گئی، تنقیدیں اور خلاف مضامین چھپنے لگے بعض لوگوں نے عدالتی کارروائی کی دھمکی بھی دی، پہلے دو دفعہ دل کے دورے پڑ چکے تھے، اس کشمکش میں پھر اثر ہوا۔

ستمبر ۱۹۵۱ء سے میں خود بیمار تھا اکتوبر میں کچھ یونہی سا افاقہ ہوا مگر اواخر اکتوبر میں صاحب فراش ہو گیا، ابھی میں بیمار ہی تھا کہ جوش کے خلاف مضامین نظر آنے لگے اور میں ان سے ملنے کی فکر ہی میں تھا کہ [illegible] کا خط آیا جس میں انہوں نے لکھا تھا کہ جوش بیمار ہو [illegible] ان کی خیر [illegible] باوجود علالت کے میں نے [illegible] جوش سے ملاقات کی [illegible]

معتمد فوج بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ جوش سے یہ مِل کر کہ انہیں دل کا دورہ پڑا ہے میں نے مشاہدات کے متعلق گفتگو ہی نہیں کی مگر خود انہوں نے ذکر چھیڑ دیا اور میں نے نزاکتِ حال کی وضاحت کی اور صورتِ حال بھی واضح کر دی۔ یہ گفتگو ہو ہی رہی تھی کہ کرنل نذیر الاسلام بھی آ گئے اور انہوں نے بھی شدید مخالفت کتاب کی اشاعت کی کی بڑی رد و کد کے بعد جوش اس بات پر آمادہ ہو گئے کہ بقیہ جلدیں تلف کر دیں چنانچہ نذیر الاسلام کو انہوں نے اجازت دی کہ فریقِ ثانی سے بات چیت کر کے کتاب کی سب جلدیں ان لوگوں کے حوالے کر دیں، اس تصفیہ کے بعد جوش نے بڑی گرمجوشی اور خوشی سے مجھے رخصت کیا اور میں ۱۹ر نومبر کو ملنے کا وعدہ کر کے چلا آیا۔

۱۹ر نومبر ۵۸ء کو صبح صبح ایک جھٹکا لگا اور جوش ہمیشہ کے لئے بیہوش ہو گئے۔

جوش نے ڈاکٹر سید علی بلگرامی کے پاس ہوش سنبھالا تھا، نواب عماد الملک کے پاس رہ چکے تھے، نہایت ذہین، طباع، ذکی اور فہیم تھے، فارسی عربی بقدرِ ضرورت جانتے تھے، مطالعہ نہایت اچھا تھا، صحبت یافتہ تھے، علمِ مجلسی کے ماہر تھے، طبیعت میں اپج تھی، لکھتے خوب تھے، مضامین بہت لکھے تھے، ایک مجموعہ عروسِ ادب کے نام سے طبع ہو چکا تھا بقیہ مضامین چھپوانے کی فکر میں تھے۔ ابتدائی دور میں ایک چھوٹی سی کتاب "بدیہہ گوئی" پر شائع کی تھی، مذہب کے بارے میں اتنے وسیع المشرب تھے کہ لوگ ان سے ناخوش رہتے تھے، جلد بازی فطرت میں تھی، ہر کام میں جلدی کرتے تھے اور خیالات بھی جلد جلد بدلتے رہتے تھے، ایک طویل مثنوی بھی چھپوائی تھی۔

پولیس ایکشن کے بعد ہی حیدرآباد چھوڑنا چاہا مگر چھوڑ نہ سکے، مرنے سے پہلے بھی حیدرآباد چھوڑنے کی فکر میں تھے مگر چھوٹے کس طرح ان کی تربت یہیں تھی اور یہیں کی مٹی قسمت میں تھی۔

جوش کے مخالفین بہت اور موافقین کم تھے جن لوگوں نے انہیں نزدیک سے دیکھا تھا وہ ان کے مداح تھے کیونکہ ان میں برائیوں کے ساتھ ساتھ بھلائیاں بھی خاصی تھیں اور میری دانست میں بھلائیاں برائیوں سے زیادہ ہی تھیں، یہ میرا ذاتی خیال ہے چاہے آپ اسے دوستی پر محمول کریں، حقیقت یہی ممکن ہے کہ ان کی جو باتیں دشمنوں کو برائیاں نظر آتی تھیں وہ دوستی کی وجہ سے مجھے بھلائیاں معلوم ہوتی ہوں۔ بہرحال جوش میرے دوست اور مخلص دوست تھے اور مجھے ان کے مرنے کا بے حد قلق ہے۔

یہ دورِ سوم تھا۔ اس میں سے صرف چند شخصیتیں میں نے انتخاب کی ہیں ورنہ یہ فہرست بڑی طویل تھی۔

لیجئے اب دورِ چہارم کی چند شخصیتوں سے روشناس ہو جائیے اس دور کے حضرات وہ ہیں جو بفضلہ تعالیٰ موجود ہیں اور بیشتر اہم خصوصیات کے مالک ہیں۔ یہ فہرست بڑی طویل ہے، چونکہ مضمون بہت لمبا ہو گیا ہے اس لئے میں نے اس فہرست کو مختصر کر لیا ہے۔

مُردوں پر کچھ لکھ دینا آسان ہے مگر زندوں کے متعلق ایمانداری سے لکھنا بہت مشکل ہے اور پھر ان لوگوں کے متعلق لکھنا جو آئے دن ملتے جلتے رہتے ہوں مشکل ہوتا ہے، میں نے کوشش تو کی ہے کہ اخلاقی جرأت اور ایمانداری سے لکھ سکوں اپنی کوشش میں کس حد تک کامیابی ہوئی ہے اس کا اندازہ آپ ہی کر سکتے ہیں۔

زین یار جنگ

مولوی زین الدین انجینئر المخاطب بہ نواب زین یار جنگ جنہیں حال ہی میں بھارت سرکار نے "پدما بھوشن" کے اعزاز سے نوازا ہے حیدرآباد کے ان بزرگوں میں سے ہیں جو عاقبت بین اور معتدل ہیں، ہر دور میں آپ نے بڑی سلامت روی دکھائی۔ آپ ڈاکٹر سید علی بلگرامی مترجم تمدن عرب و تمدن ہند کے داماد ہیں۔ یورپ سے انجینئرنگ کی ڈگری لی اور حیدرآباد آ کر مختلف خدمات پر فائز رہے۔ شروع سے آپ کا تعلق کنگ کوٹھی سے نہایت ہی قریبی رہا۔ حیدرآباد میں اتحاد المسلمین کے وزارتی دور سے پہلے آپ صدر المہام (وزیر) تعمیرات تھے اس کے بعد جو بحرانی کیفیت رہی تو آپ نے حکومت ہند اور حضور نظام کے درمیان میں رہ کر بڑی کوشش کی کہ حالات سازگار ہو جائیں، پولیس ایکشن کے بعد جدید وزارت بنی تو اس میں بھی آپ کو وزارت پر لیا گیا اور سررشتہ تعمیرات آپ ہی کے ذمہ رہا اور جب تک عام انتخابات ہو کر جدید کابینہ نہ بنی آپ وزارت پر فائز رہے۔ انتخاب میں آپ کے فرزند ارجمند سعادت علی صاحب نے کامیابی حاصل کی اور منتخب ہو کر مدتوں کام کرتے رہے پھر سیکرٹری بنا لئے گئے۔

حضور نظام نے جو ٹرسٹ بنائے ہیں ان میں آپ ٹرسٹی اور چیئرمین کی حیثیت سے شریک ہیں، آپ کی غیر جانبدارانہ پالیسی اور اعتدال پسندی بڑی کامیاب رہی ہے اور اسی وجہ سے آپ ہر وقت ہر طبقے میں مقبول رہے، آپ کی فنی معلومات کا یہ حال ہے کہ دنیا کے بہترین آرکیٹکٹ مانے جاتے ہیں۔ آپ نے دو تین دفعہ دنیا کا دورہ کیا ہے پہلا دورہ عثمانیہ یونیورسٹی کی تعمیر کے سلسلہ میں ہوا دوسرا اس کے بعد اور تیسرا دورہ گزشتہ سال حکومت ہند کی طرف سے قومی تھیٹر کے نقشے کے سلسلے میں ہوا ہے۔ عہد عثمانی کی بہترین عمارتیں عثمانیہ یونیورسٹی، کتب خانہ آصفیہ وغیرہ آپ ہی کے نقشے پر بنے ہیں قائداعظم کے گنبد اور مقبرے کا نقشہ بھی آپ ہی نے بنایا ہے جو بے انتہا نفیس نقشہ ہے۔

بحیثیت انسان آپ بڑے صاحب کردار اور بڑی خاص شخصیت کے مالک ہیں، علم و ادب سے بھی بہت لگاؤ ہے، سماجی کاموں سے بھی بڑی دلچسپی ہے۔ تمام بڑی بڑی کمپنیوں اور تقریباً تمام اداروں کے رکن ہیں۔ مدرسۂ انوار العلوم کو آپ ہی نے کالج بنایا اور اپنی پوری توانائیاں اس پر صرف کیں۔ طلباء نوازی اور ادب پروری کا ذوق آپ کو شروع سے ہے اور ہر قسم کی خدمت کئے جاتے ہیں۔

ستر سال کی عمر میں آپ میں نوجوانوں کی سی پھرتی اور جوانوں کی سی ہمت ہے۔ کام سے تھکتے نہیں دن بھر مصروف رہتے ہیں۔ سرکاری، سماجی، ذاتی کاموں میں صبح سے شام تک مشغول اور مصروف رہتے ہیں۔ عملی زندگی آپ کی قابل رشک ہے۔ بچپن سے میں آپ کی فطرت کا مطالعہ کرتا رہا ہوں ہمیشہ ایک طریقے اور ایک ہی رنگ میں دیکھا ہے، آپ کی جو وضع شروع سے تھی وہی اب تک ہے۔ خلق، ملنساری، ہمدردی، شفقت میں اضافہ ہی ہوتا جاتا ہے۔

سیّد خورشید علی

۱۹۰۸ء میں جب موسیٰ ندی میں طغیانی ہوئی اور سیلاب کم ہوا تو والد مرحوم اپنی ایک بہن کے گھر کا حال دیکھنے کے لئے جانے لگے اور میں بھی ضد کر کے ساتھ ہو گیا۔ جہاں میں نے بہت سی نئی چیزیں دیکھیں جن کے من جملہ مولوی سید خورشید علی صاحب بھی تھے جو کہ خاکی کوٹ سفید پتلون پہنے سرخ ترکی ٹوپی لگائے ہاتھ میں بید کی چھڑی لئے ہوئے والنٹیر بنے پھر رہے تھے والد نے بتایا کہ یہ خورشید علی ہیں اور بڑے پرجوش نوجوان ہیں۔ اس کے بعد میں نے ہر جگہ انہیں دیکھا اور احترام کی نظر سے دیکھا مگر ملاقات کبھی نہ ہوئی تھی۔ ۱۹۲۶ء میں جب میں نے گلبرگہ کو خیرباد کہہ کر حیدرآباد کی سکونت اختیار کی تو ملازمتی حیثیت سے حیدرآباد میں منتقل ہونا ضروری تھا۔ نصراللہ خاں صدر صاحب نے ایک سال چکر میں رکھ کر انکار کر دیا اور پرشاد اور

امداد باہمی رکھا پرشی میں جبکہ سردار نواز جنگ اور باسط جنگ نے مجھے منتقل کرنا چاہا تو بھی میں نے پسند نہیں کیا۔ نصراللہ خاں کی شکایت جب میں نے فخر یار جنگ معتمد فینانس سے کی تو انہوں نے بکمال عنایت ونوازش مجھے ایک تعارفی چٹھی دے کر مولوی سید خورشید علی صاحب کے پاس بھیجا۔ جب میں نے اس چٹھی کے ذریعے ملاقات کی تو موصوف نے بڑی یگانگت اور شفقت سے مجھے اپنے دفتر میں منتقل کرنا قبول فرمالیا مگر مشکل یہ تھی کہ دفتر دیوانی مال وملکی میں جائدادیں راسامیاں، خالی نہ تھیں اور گلبرگہ والے میری مزید رخصت منظور نہیں کر رہے تھے اس لئے میں نے گلبرگہ کی ملازمت سے استعفیٰ دے کر دفتر دیوانی میں کام کرنا شروع کر دیا اور مولوی صاحب نے چند ہی روز کے بعد میرا تقرر کر دیا۔

دفتر دیوانی بالکل اسنادی اور تاریخی دفتر تھا، مولانا نے اسے بڑی عمدگی سے منظم کیا تھا۔ منتخب لوگوں کو جگہ دی تھی اور سب کو بڑی ہی عمدگی سے تیار کیا تھا۔ اس دفتری تنظیم کے علاوہ ایک اخلاقی ترتیب بھی ایسی قائم کی تھی کہ دفتر کے لوگ اس طرح رہتے تھے گویا ایک ہی خاندان کے افراد ہیں۔ معلوم یہ ہوتا تھا کہ دفتر دیوانی میں ایک ہی خاندان ہے جس کے سرپرست مولانا خورشید علی ہیں۔

مولانا کی شخصیت بڑی ارفع و اعلیٰ ہے۔ آپ حیدرآباد کے قدیم اور شریف گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں۔ ابتدائی تعلیم حیدرآباد ہی میں ہوئی پھر نظام کالج میں بھی آپ نے تعلیم پائی اور ترجمانی ہی میں علم وادب، ملک اور سماج کی خدمت میں منہمک ہو گئے۔ ابتداً فینانس میں مترجم کی حیثیت سے مامور ہوئے اور پھر جلد ہی ترقی کر کے مددگار معتمد اور پھر ناظم دفتر دیوانی ومال ہو گئے۔ اتفاقاً آپ کو سرگلانسی اور سراکبر حیدری جیسے عہدہ داروں کے ساتھ کام کرنے کا اتفاق ہوا اور ان عہدہ داروں نے آپ کی حقیقی قدر افزائی کی، ترجمانی ہی سے آپ تحریر وتقریر میں خاصے مشہور ہو گئے تھے۔ ادیب، افادہ، ذخیرہ، خاتون وغیرہ رسائل اور متعدد جرائد میں آپ کے مضامین بہت چھپا کرتے تھے۔ انگریزی سے ترجمہ کرنے میں آپ کو کمال تھا، گوکھلے پر سب سے پہلے اردو میں آپ نے ہی ایک مختصر سی کتاب شائع کی تھی اور اردو داں طبقے کو سروجنی نائڈو کی شاعری سے آپ ہی نے روشناس کیا تھا۔

بیت المعذورین، نظام کلب، والنٹیر کور، حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس کے مدتوں سیکرٹری رہے۔ آپ نے عہد عثمانی کی تعلیمی، علمی ادبی ترقیوں پر ڈاکٹر زور، عبدالقادر سروری، راجے جانکی پرشاد سے مختلف کتابیں لکھوا کر چھپائیں اور ایک شاہ پرست کی طرح ہمیشہ فدائی رہے۔

پندرہ سال سے زیادہ ہوا کہ آپ نے ریٹائر ہو کر اپنی زندگی علم وادب کے لئے وقف کر دی ہے، دکن کی کئی تاریخیں آپ نے ایڈٹ کیں چنانچہ "تاریخ راحت افزا" چھپ بھی رہی ہے اور مآثر نظامی وغیرہ مرتب شدہ رکھی ہیں۔ اب بھی آپ علم وادب کی خدمت میں مصروف ہیں اور کچھ نہ کچھ لکھتے ہی رہتے ہیں۔ تاریخ خصوصاً تاریخ دکن پر آپ کی نظر بڑی وسیع ہے اور ادب پر بھی انشا پردازانہ عبور ہے۔ اردو بڑی لطیف اور پیاری لکھتے ہیں۔

مجھ پر دفتر دیوانی میں جانے کے بعد سے بزرگانہ عنایت وشفقت فرماتے ہیں اور میں اپنے بزرگ کی طرح احترام کرتا ہوں، بدنصیبی سے میرے خاندان میں میرا کوئی بزرگ باقی نہیں رہا ہے مگر مولانا کی ذات کو میں اپنا بزرگ سمجھ کر مطمئن اور مسرور رہتا ہوں شروع سے مجھ پر جو عنایت ونوازش ہے وہ اب تک مسلسل جاری ہے۔ نہ صرف میری خانگی زندگی بلکہ تصنیف وتالیف میں بھی مولانا امداد واعانت فرماتے رہتے ہیں اور اپنے زریں مشوروں سے مجھے نوازتے رہتے ہیں۔

نہایت خاموش کارکن اور مخیر بزرگ ہیں، سینکڑوں زندگیاں آپ نے بنا دیں مگر "گپت خاندان" پر ہمیشہ عامل رہے یعنی جن لوگوں کی مالی امداد کی اس طرح کی کہ دوسروں کو خبر تک نہ ہونے پائی۔ بیشتر ایسی ہستیاں آج نام ونمود حاصل کر چکی ہیں جو مولانا کی امداد پر تعلیم وتربیت پاتی رہیں اور مولانا ہی نے ان کی زندگی سنواری۔ صرف یہی ایک صفت ایسی ہے جو انہیں ممتاز بناتی ہے۔

میں نے اپنی عمر میں دو ایسے سخی دیکھے ہیں جو دے کر شرماتے تھے کہیں سے کم دیا۔ ایک حاجی صاحب بہادر دوسرے مولانا خورشید علی۔ ان دونوں کا یہی طریقہ تھا کہ اپنی حیثیت سے زیادہ دیتے اور پھر شرماتے کہ کم دیا ہے۔

تندمزاجی اور نازک مزاجی اعتدال سے عمدہ طبیعت کے رنگ ہیں۔ غصہ آتا ہے مگر جلد خود ہو جاتا ہے خفا جلد ہوتے اور معاف بھی جلد کر دیتے

اور پھر صاف بھی ہو جاتے ہیں، البتہ کئی باتوں پر اڑ جاتے ہیں ان سے دنیا کی کوئی قوت بھی ہٹا نہیں سکتی۔ وظیفہ لینے کے بعد سے خانہ نشین ہیں پائگاہ صرفِ خاص وغیرہ کہیں بھی دوبارہ ملازمت نہیں کی، بعض جگہ سے پیش کش ہوئی بھی تو ٹھکرا دیا، نہایت قانع، مسرور اور مطمئن بزرگ ہیں اپنے قدیم ملنے والوں سے یگانگت خلوص اور ہمدردی رکھتے ہیں اور بڑی عمدہ زندگی گزار رہے ہیں۔

عبدالرحمٰن خاں

پہلے پروفیسر تھے پھر پرنسپل ہوئے اور پھر "شیخ الجامعہ عثمانیہ" ہوئے۔ بڑے قابل اور خاموش بزرگ ہیں، قدیم ملکی خاندان سے ہیں، لندن سے ڈگری لاکر نظام کالج میں صدر شعبۂ سائنس ہوئے، پھر عثمانیہ یونیورسٹی کے پرنسپل بنے، نواب سعادت جنگ مرحوم صوبہ دار و صدر المہام صرفِ خاص کی صاحبزادی سے شادی کی، خان صاحب کے سسرال سے بڑے قدیم مراسم تھے اور ان کے چھوٹے سالے رشید اللہ خاں سے دوستی تھی اس لئے خان صاحب سے بھی شادی کے بعد سے مراسم ہوگئے، بڑے ہی شریف، نیک اور علمی بزرگ ہیں۔ جامعہ عثمانیہ کے اولین سند یافتہ طلباء کو یورپین اسکالرشپ دلاکر لندن وغیرہ بھجوایا۔ ڈاکٹر نظام الدین، ڈاکٹر سیادت علی خان، ڈاکٹر ولی الدین، ڈاکٹر زور وغیرہ آپ ہی کے زمانے کے فارغ التحصیل آپ ہی کے یورپ بھجوائے ہوئے ہیں سینکڑوں طلباء کی سرپرستی کر کے تعلیم دلائی اور پھر ملازمت بھی دلائی، بیشتر غریب طالب علم آپ کی وجہ سے آج خوش حال، فارغ البال اور مشہور و معروف ہیں۔

فلکیات سے آپ کو ذاتی شغف ہے اور اسی فن پر آپ اب تک کام کئے جا رہے ہیں باوجود وظیفہ لینے کے اب بھی آپ کی نظریں آسمان پر لگی رہتی ہیں اور ستاروں کے پھیر میں پھنسے ہوئے ہیں، نئی نئی دریافتیں کرتے ہیں، مضامین چھپواتے ہیں، لکچر دیتے ہیں، ہندوستان میں آپ واحد ماہر فلکیات ہیں جو اس فن کے کامل سمجھے جاتے ہیں اور ساری دنیا کے فلکی آپ کو مانتے ہیں۔

چونکہ آپ ملازمتی سیاسیات کے ماہر نہ تھے اور نہ "خوشامد پیشہ" واقع ہوئے تھے اس لئے آپ کو قبل از وقت وظیفہ پر سبکدوش کیا گیا مگر آپ نے اس کا کوئی اثر ہی نہ لیا، اپنے کام میں لگے رہے۔ باوجود کبر سنی کے قویٰ نہایت ہی اچھے ہیں اور اب بھی آپ بیگم پیٹھ سے حیدرآباد تک کبھی کبھی سائیکل پر بھی آجاتے ہیں، بہرحال خان صاحب بین الاقوامی شہرت کے مالک اور حیدرآباد کی خاص شخصیت ہیں۔

علی یاور جنگ

آپ ایرانی النسل ہیں آپ کے والد بزرگوار ڈاکٹر نصیر جنگ بہادر تھے اور آپ کی والدہ ماجدہ طیبہ بیگم صاحبہ نواب عماد الملک بہادر مرحوم کی صاحبزادی تھیں، آپ کی والدہ مرحومہ نے حیدرآباد کی نسوانی دنیا میں تعلیم کی روح پھونک دی تھی۔ آج حیدرآباد کی نسوانی ترقی اور تعلیم جو نظر آتی ہے وہ بیگم صاحبہ کی جد و جہد کا نتیجہ ہے، نواب علی یاور جنگ کی ولادت حیدرآباد ہی میں ہوئی ابتدائی تعلیم و تربیت یہیں ہوئی پھر آپ نے آکسفورڈ یونیورسٹی سے سیاسیات میں ڈگری لی اور حیدرآباد آکر کالج میں پروفیسر ہو گئے مگر آپ کو قدرت نے سیاسی گتھیاں سلجھانے کے لئے پیدا کیا تھا اس لئے آپ ناظم اطلاعات (ڈائرکٹر آف انفارمیشن بیورو) بنائے گئے پھر کیبنٹ کے اسسٹنٹ سکریٹری ہوئے اور ہوم سکریٹری ہو کر وزیر تعلیمات ہو گئے۔

حیدرآباد میں اصلاحات کا آغاز آپ ہی کے ہاتھوں ہوا اور حیدرآباد کی شخصیت ہمیشہ سے بھی آپ ہی نے مرتب کیا تھا آپ کی قابلیت

پارٹی نے ہنگامہ مچا دیا جس کی وجہ سے آپ مستعفی ہو کر خانہ نشین ہو گئے، جب پولیس ایکشن ہوا تو لوگوں کی آنکھیں کھلیں اور آپ کی مخالفت کا نتیجہ لوگوں نے آنکھوں سے دیکھ لیا، ملٹری گورنمنٹ کے دور میں آپ عثمانیہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر بنائے گئے اور پھر آپ کی خدمات مرکزی حکومت نے حاصل کر لیں اور آج کل آپ مصر کے سفیر ہند ہیں۔

علم و ادب کا ذوق آپ کو ورثہ کے طور پر ملا ہے، اس پر ذاتی دلچسپی طرّہ ہے، آپ نہایت مستعد بڑے ہی کارگزار اور باریک بین نکتہ رس دماغ کے مالک ہیں، انگریزی ادب پر انشا پردازانہ عبور ہے، تاریخ کا مطالعہ بڑا اچھا ہے خصوصاً پولیٹیکل تاریخ میں آپ استنادی حیثیت رکھتے ہیں۔

میرے نہایت ہی قدیم عنایت فرما اور کرم گستر ہیں، ہمیشہ میری اعانت اور دل افزائی فرماتے رہے اب تک موصوف کی عنایتیں میرے شاملِ حال ہیں، میری دلی تمنا اور دعا ہے کہ یہ تابناک ستارہ افقِ ہند پر تاباں و درخشاں رہے۔

سجاد مرزا

مولوی عزیز مرزا مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے ان لوگوں میں سے تھے جنہوں نے سرسید کے آنکھوں کے سامنے تعلیم پائی اور جنہیں حیدرآباد نے خصوصیت سے بلا کر خدمت دی۔ اگر سازش کا شکار نہ ہوتے تو عزیز مرزا صاحب ہوم سیکرٹری کے بعد شاید وزارت پر بھی ترقی پاتے مگر قسمت نے ساتھ نہیں دیا۔

مولوی عزیز مرزا مرحوم کے صاحبزادے حیدرآباد ہی میں رہے، پہلے پھولے اور اب بھی حیدرآباد ہی میں ہیں، مولوی احمد مرزا انجینئر، مولوی ابو سعید مرزا (سعید جنگ) جج نے بڑی ترقی کی مگر افسوس ہے کہ ان دونوں بزرگوں سے میرے زیادہ مراسم نہ تھے۔ مولوی احمد مرزا صاحب سے نہایت مختصر مراسم رہے مگر مولوی سجاد مرزا صاحب سے میرے مراسم بہت زیادہ رہے۔ موصوف جب صدر مہتمم تعلیمات بن کر گلبرگہ تشریف لائے تو میں گلبرگہ ہی میں تھا اس لئے مدت تک نیاز حاصل رہا، پھر موصوف حیدرآباد آ گئے تو بھی نیاز حاصل ہوتا رہا۔ صدر مہتمم تعلیمات، پرنسپل ٹیچرز ٹریننگ کالج، ناظم تعلیمات اور پھر معتمد تعلیمات (ایجوکیشنل سیکرٹری) رہ کر موصوف نے وظیفہ پر سبکدوشی حاصل کی، چونکہ آپ ماہر تعلیم اور بین الاقوامی شہرت کے مالک تھے اس لئے یونسکو نے آپ کو مشیر تعلیم بنا لیا اور آپ نے بڑی عمدگی سے اس اہم خدمت کو انجام دیا اور اب پھر حیدرآباد واپس ہو گئے ہیں۔

علمی خدمت کا جذبہ آپ میں اتنا ہے کہ حیدرآباد کی انجمن ترقی اردو کے ہال کے لئے آپ نے اپنے گاڑھے پسینے کی کمائی میں سے ایک کثیر رقم عنایت کی اور ہال بنوا دیا۔ مدتوں تک "المعلم" نام سے ایک تعلیمی ماہنامہ نکالتے رہے، آپ کی کھدر پوشی بڑی قدیم ہے۔ شروع میں جب ترکِ موالات کی مہم چلنے لگی تو آپ نے کھدر پوشی شروع کی اور ہمیشہ ہاتھ کا بنا ہوا کپڑا پہنتے رہے، انتہا یہ کہ آپ اپنا رسالہ دیسی ہاتھ کے بنے ہوئے کاغذ پر چھپواتے اور خط لکھنے کے لفافے کاغذ تک دیسی استعمال کرتے تھے۔

بڑی سوجھ بوجھ کے مالک، نہایت ہی دماغ دار اور شگفتہ مزاج، دوست نواز، وضع دار اور حلیم الطبع بزرگ ہیں ملنے جلنے کی بھی ایک خاص وضع برتتے ہیں اور جس سے جیسے مراسم ہوتے ہیں اسی طرح آپ ملاقات بھی رکھتے ہیں۔ لوگوں سے سینکڑوں کتابیں لکھوا دیں مگر آپ نے کوئی کتاب اپنے نام سے نہیں چھپوائی۔ نام و نمود سے قطعاً متفق نہیں ہیں۔

کیقباد جنگ

کیقباد آپ کا نام ہے، منشی آپ کا خاندانی نام ہے، بڑے پرانے گریجویٹ ہیں، حیدرآباد میں پارسی خاندان بڑی مدت سے آباد ہیں اور تجارت و ملازمت بڑی کامیابی سے کر رہے ہیں۔ آپ کا خاندان بھی حیدرآباد کا قدیم خاندان ہے، آپ نے مختلف محکموں میں ملازمت کرنے کے بعد نائب معتمد سیاسیات (پولیٹیکل جوائنٹ سیکرٹری) بن کر وظیفہ حسن خدمت حاصل کیا، بڑے ہی صاحب ذوق اور علم دوست بزرگ ہیں، آپ کا کتب خانہ بے نظیر ہے۔ مطبوعات جدیدہ کا آپ کو شوق نہیں بلکہ عشق ہے ناممکن ہے کہ کوئی نئی کتاب طبع ہو اور آپ نہ منگوائیں۔ حافظہ نہایت قوی اور معلومات بڑے ہی بہتر ہیں۔ فارسی پر آپ کو ماہرانہ عبور ہے قدیم پہلوی سے بھی واقف ہیں اور جدید فارسی کے ماہر ہیں۔

مذاہب عالم کا مطالعہ آپ نے بڑی تحقیقی نظر سے کیا ہے۔ مذہب اسلام سے آپ کو لگاؤ ہے اور بڑا وسیع مطالعہ رہا ہے تقسیم ہند سے پہلے لاہور سے ایک کلام مجید شائع ہوا جسے آپ نے فوراً منگوا لیا اور مطالعہ جو کیا تو اعراب کی بیشتر غلطیاں نظر آئیں چنانچہ آپ نے یہ غلطیاں نوٹ کر کے مجھے دیں اور میں نے ملا کر دیکھا تو واقعی یہ سب غلطیاں اس نسخے میں موجود تھیں لطف یہ ہے کہ یہ غلطیاں آپ نے کسی صحیح اعراب والے نسخے سے مقابلہ کر کے نہیں نکالی تھیں بلکہ سرسری طور پر ناظرے میں نظر آئی تھیں اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ آپ کا قرآنی مطالعہ کتنا گہرا اور مستقل ہے۔

مجھ سے تیس ایک سال سے مراسم ہیں اور آپ کے کتب خانے سے میں فائدہ اٹھاتا رہتا ہوں۔ اپنے نوجوان لڑکے کے ہوائی حادثے میں ہلاک ہونے سے بددل ہو کر کتابیں فراہم کرنا چھوڑ دیا تھا مگر پھر وہی سلسلہ شروع ہو گیا۔ کئی مہینے سے بغرض علاج بنگلور گئے ہوئے ہیں۔ گزشتہ مہینے میں اپریشن بھی ہوا ہے جو سنا ہے کہ کامیاب رہا مگر ابھی مراسلت کرنے کے قابل نہیں ہیں، آپ کے فرزند سے جو ساتھ ہیں خیریت معلوم ہوتی رہتی ہے، خداوند عالم صحیح و سلامت واپس لائے۔

مہدی نواز جنگ

حیدرآباد ہی کے شرفا سے ہیں۔ ابتدائی تعلیم حیدرآباد ہی میں ہوئی اور محکمۂ مال میں ملازم ہو گئے۔ غالباً دوم تعلقدار (ڈپٹی کلکٹر) تھے کہ مہاراجہ بہادر نے صدر اعظم ہوتے ہی آپ کو معتمد باب حکومت (رجسٹرار) بنا لیا اور مہاراجہ کے معتمد علیہ کی حیثیت سے کام کرتے رہے، آپ نے جس دیانت، محنت، سلیقہ اور تجربے سے معتمدی کی ہے۔ سارا ملک واقف ہے، اس اہم خدمت پر رہ کر سبھوں کو خوش رکھنا ناممکن تھا چنانچہ سر اکبر حیدری آپ سے خفا ہو گئے اور جب صدارت عظمیٰ پر فائز ہوئے تو آپ کو بڑی آزمائش میں مبتلا کر دیا مگر مہدی نواز جنگ نے بڑی بہادری سے ان آزمائشوں سے عہدہ برآ ہو کر دکھا دیا کہ وہ بڑے سے بڑے معرکے میں کامیاب ہو سکتے ہیں۔

جب تک ملازمت میں رہے ملک کی خدمت کی پھر وظیفہ حسن خدمت پر سبکدوش ہو کر بھی خدمت کرتے رہے۔ گزشتہ انتخابات میں دوست احباب نے مجبور کیا تو کانگریس کی طرف سے آپ بھی کھڑے ہو گئے اور منتخب ہو کر عوامی وزارت سے سرفراز ہوئے۔

سابقہ دور کے تین ہی بزرگ ایسے ہیں جنہوں نے انقلاب کے باوجود اپنے آپ کو کامیاب و کامران بنا لیا پہلے نواب زین یار جنگ دوسرے نواب علی یاور جنگ تیسرے نواب مہدی نواز جنگ۔ اب وزارت طبابت سے سرفراز اور کارگزار ہیں۔ خدمت ملک بہر حال کئے ہی جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ نواب سالار جنگ بہادر کے اسٹیٹ کی کمیٹی کے صدر نشین بھی آپ ہی اور بڑی عمدگی سے اسٹیٹ اور نمائش کو باقی رکھا ہے۔

بڑی غیر معمولی صلاحیتوں کے مالک اور عجیب و غریب بزرگ ہیں، علم و ادب سے بڑی دلچسپی ہے، مطالعہ نہایت اچھا اور معلومات بڑی ہی نفیس ہیں۔ مہاراجہ بہادر کی ایک مختصر سی لائف بھی آپ ہی نے مرتب کرا کے شائع کی ہے جس میں بڑا ہی اچھا مواد ہے۔
خدا کرے آپ کی کوشش بارآور ہو اور سالار جنگ کا کتب خانہ عوام کے مطالعہ کے لئے کھول دیا جائے اگر ایسا ہو جائے تو ملک کی بڑی خدمت ہو گی اور لوگ علمی ادبی تحقیق بڑی آسانی سے کر سکیں گے۔

ڈاکٹر عبداللطیف

کرنول کے مشائخ گھرانے سے ہیں۔ انگریزی ادب میں لندن سے پی۔ایچ ڈی کیا ہے اور انگریزی کے بڑے اچھے ادیب ہیں جامعہ عثمانیہ میں شعبہ انگریزی کے صدر رہے اور پھر وظیفہ حسن خدمت حاصل کر لیا۔ غالب پر ایک کتاب بھی انگریزی میں لکھی اور پھر اس کا ترجمہ بھی کرا کے چھپوا لیا۔ سیاسیات اور مذہب پر بھی بڑی اچھی نظر ہے، چونکہ انگریزی بڑی اچھی لکھتے ہیں اس لئے قائد اعظم بھی انہیں بہت پسند کرتے تھے اور تقسیم ہند سے پہلے آپ سے کام بھی لیا کرتے تھے۔
اب حیدرآباد ہی میں قیام ہے اور احادیث پر کام کر رہے ہیں۔ بڑے بالغ نظر اور ٹھوس معلومات کے بزرگ ہیں۔ عملی آدمی نہیں ہیں، کتابی اور تحریری آدمی ہیں۔ خود لکھیں خود چھپوائیں یہ ان کے بس کا روگ نہیں ہے۔ کاش کوئی ادارہ اس کام کو اپنے ذمہ لے تاکہ وہ ان سے صرف لکھوا تا جائے، بڑے ہی کار آمد بزرگ ہیں۔

ڈاکٹر سیادت علی خان

آپ مولوی قطب الدین فاضل کے فرزند ہیں۔ حیدرآباد ہی میں تعلیم و تربیت ہوئی۔ مولوی فاضل، ایم اے، ایل ایل بی کرنے کے بعد لندن جا کر آکسفورڈ یونیورسٹی سے بی سی ایل اور ڈی فل اور بار ایٹ لا (لنکنز ان لندن) کیا۔ حیدرآباد آ کر جامعہ عثمانیہ کے قانون کے پروفیسر ہو گئے۔ پھر سر رشتہ عدالت میں منتقل ہوئے اب ہائی کورٹ کے جج ہیں۔
جسٹس ڈاکٹر میر سیادت علی خان ملک کے ان ہونہاروں میں سے ہیں جن پر ملک ناز کر سکتا ہے۔ عربی، فارسی، اردو انگریزی پر یکساں عبور ہے۔ مذہب، ادب اور قانون پر یکساں نظر ہے مگر اپنے مخاطب کو اپنی علمیت سے مرعوب کرنے کے قائل نہیں ہیں۔ مرنجاں و مرنج یار باش، نیک دل اور وضع دار آدمی ہیں، بڑوں کا ادب اور چھوٹوں کا وقار ہمیشہ پیش نظر رہتا ہے۔ ان کے والد میرے والد کے بھانجے تھے مگر عمر میں چند سال بڑے تھے اور یہ میرے بھتیجے ہیں مگر ہم عمر، ہم دونوں میں چند ہی مہینوں کا فرق ہے۔
آج کل قانون ہی کی طرف زیادہ مائل ہیں، شرح قانون شہادت بڑی نفیس لکھی ہے جو بہت مقبول ہے اور بہت سی شرحیں لکھی ہیں مضامین خوب لکھتے ہیں مگر آج کل عدالتی مصروفیات کی وجہ سے کم لکھ رہے ہیں۔

ڈاکٹر ولی الدین

آپ جسٹس ڈاکٹر میر سیادت علی خان کے چھوٹے بھائی ہیں۔ حیدرآباد ہی میں تعلیم و تربیت ہوئی۔ منشی فاضل، ایم۔اے، ایل ایل بی کرتے

کے بعد لندن گئے، آکسفورڈ سے پی ایچ ڈی کیا اور بار ایٹ لا کر کے واپس آ گئے۔ جامعہ عثمانیہ کے صدر شعبۂ فلسفہ ہیں۔

تصوف کا مطالعہ گہرا ہے اور آج کل مذہب اور تصوف پر کام کر رہے ہیں۔ ایک درجن سے زیادہ کتابیں طبع ہو چکی ہیں۔ علامہ اقبال پر بھی ایک بڑی نفیس کتاب لکھی ہے جو بہت مقبول ہوئی۔

خاموش کارکن ہیں، ہنگاموں میں نہیں پھنستے۔ اطمینان سے بیٹھ کر کام کئے جاتے ہیں۔ مشرقی اور مغربی علوم پر حاوی ہیں۔ پڑھانے سے جو وقت بچتا ہے وہ مطالعہ اور تصنیف و تالیف میں صرف کرتے ہیں باوجود فلسفی ہونے کے تحریر میں شگفتگی ہے اور مضامین بڑے اچھے لکھتے ہیں۔

ڈاکٹر نظام الدین

حیدرآباد ہی کے قدیم خاندان کے فرد ہیں۔ مولوی فاضل کامیاب کرنے کے بعد بی۔ اے کرتے کرتے لندن چلے گئے اور عوفی پر تحقیق کر کے فارسی میں پی ایچ ڈی کیا۔ حیدرآباد واپس آ کر جامعۂ عثمانیہ کے فارسی کے پروفیسر ہو گئے۔ حال ہی میں وظیفہ پر سبکدوش ہوئے ہیں۔

عماد الملک، قطب الدین فاضل، محمد یار جنگ نے ایک دار الاشاعت "دائرۃ المعارف" کے نام سے قائم کیا تھا جو پچاس سال سے عربی کی نایاب اور کمیاب کتابیں شائع کر رہا ہے، جب اس کا تعلق جامعہ عثمانیہ سے ہوا تو ابتداً پروفیسر الیاس برنی اس ادارے کے نگراں رہے اور پھر ڈاکٹر نظام الدین کے سپرد ہوا، ڈاکٹر صاحب عربی کے نہ صرف فارغ التحصیل ہیں بلکہ انہیں عربی زبان اور ادب سے بڑی ہی محبت بھی ہے اس لئے انہوں نے بڑی دلچسپی سے دائرۃ المعارف کو چلایا اور اب وظیفہ پر سبکدوش ہونے کے بعد بھی نہایت ہی مستعدی سے چلا رہے ہیں۔

ڈاکٹر نظام الدین بھی نہایت خاموش کام کرنے والے ہیں، ٹھوس اور اہم کاموں میں لگے رہتے ہیں، ایران والوں نے فردوسی کی ہزار سالہ یادگار منائی تو حیدرآباد سے بطور نمائندہ آپ ایران بھجوائے گئے اور "جشن ہزار سالہ فردوسی" میں شرکت کی۔ بہرحال آپ ملک کے مایۂ ناز لوگوں میں شمار ہوتے ہیں۔

مجھ سے پچیس تیس سال سے مراسم ہیں، دوسرے برادران ملک کی طرح آپ بھی اپنا پراپیگنڈہ نہیں کر سکتے اور نہ تعلّی اور خودستائی سے لوگوں کو مرعوب کر سکتے ہیں، خاموشی سے علمی ادبی خدمت کئے جا رہے ہیں مگر چونکہ عربی کی نایاب اور کمیاب کتابیں آپ ایڈٹ کر کے چھپواتے ہیں اس لئے عوام ان خدمات سے ناواقف ہیں۔

ڈاکٹر یوسف حسین خان

مولوی فدا حسین خان وکیل حیدرآباد کے مشہور اور قابل وکلاء میں سے تھے۔ ڈاکٹر یوسف حسین خان انہی فدا حسین خان صاحب کے فرزند ارجمند اور ڈاکٹر ذاکر حسین خان کے بھائی ہیں۔ ولادت اور ابتدائی تعلیم و تربیت حیدرآباد ہی میں ہوئی اور پھر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں شریک ہوئے۔ ترک موالات کے زمانے میں جامعہ ملیہ قائم ہوئی تو آپ ملیہ میں شریک ہو گئے اور وہاں سے لندن جا کر پی ایچ ڈی کیا۔ پھر حیدرآباد آ کر شعبۂ تاریخ کے ریڈر ہو گئے آج کل جامعہ عثمانیہ کے تاریخ کے پروفیسر ہیں۔

نہایت زندہ دل، مرنجاں و مرنج، متواضع اور محنتی شخص ہیں۔ دفتر دیوانی کے کیپر کی حیثیت سے بھی بڑا کام کیا، تاریخ اصلاحات پر بھی کام ہو رہا ہے۔

ایک درجن کے قریب کتابیں چھپ چکی ہیں، سیاسیات، ادب اور تاریخ پر تمام کتابیں ہیں۔ علامہ اقبال پر بھی ایک بڑی عمدہ کتاب لکھی ہے جو بہت پسند کی جاتی رہی۔

میں نے جب مومن خان مومن پر کام کرنا شروع کیا تو مجھے ڈی تاسی کے تذکرے سے مومن کے حالات لینے کی ضرورت پڑی۔ اپنے شفیق اور محترم ڈاکٹر ستار صدیقی سے میں نے خواہش کی تو انہوں نے ڈاکٹر یوسف حسین خان کو لکھا اور یوسف حسین خاں صاحب نے مجھے ڈی تاسی کا ترجمہ کر دیا۔ یہ پہلی ملاقات بیس سال پہلے ہوئی تھی اور آج تک ڈاکٹر صاحب اسی خلوص اور محبت سے ملتے ہیں جس طرح پہلی ملاقات کی تھی بڑے ہی وضع دار واقع ہوئے ہیں۔

اردو زبان سے ڈاکٹر صاحب کو والہانہ محبت ہے اور سارا دم مستقل طور پر کام کیے جاتے ہیں۔ حال ہی میں کسی نے اردو کی بجائے ہندی رسم الخط کو رواج دینے کی تحریک کی تو آپ نے سخت اختلاف کیا اور بڑی عمدگی سے اردو رسم الخط کی حمایت کی۔ بہرحال اُردو کے سچے خدمت گزار ہیں۔

یہ خاکے ہیں حیدرآباد کے چار ادوار کے، میں نے مرحومین کو زیادہ اور موجودین کو کم لیا ہے، کیونکہ موجودین پر پھر بھی لکھا جا سکتا ہے، طوالت کی وجہ سے بیشتر اصحاب کو میں نے چھوڑ دیا ہے۔ انشاء اللہ پھر کسی وقت اس کی تلافی بھی ہو جائے گی ——— فقط

تمکین کاظمی

علی گڑھ کی چند شخصیتیں

خلیل الرحمن اعظمی

شعر و ادب کا مطالعہ کرنے والوں کے لئے الفاظ و حروف کے پردے پر بنے ہوئے غیر فانی نقوش کے ساتھ نقش گروں کی شخصیت سے دلچسپی لینا ایک فطری امر ہے۔ کوئی کتاب، کوئی شعر، کوئی ڈراما، کوئی ناول اور کوئی کہانی جب ہم پر اپنی تخلیق کا جادو جگانے لگتی ہے تو اس کے ساتھ ہی ہمارے ذہن میں اس فن پارے کے خالق کا چہرہ ابھرنے لگتا ہے۔ اچھی کتاب اور اعلیٰ درجے کی ادبی تخلیق اپنے پڑھنے والے کے اندر بھی ایک طرح سے تخلیق کا جذبہ پیدا کردیتی ہے اور وہ اس طرح کہ ہمارا ذہن اس فنکار کی شخصیت اور اس کے خدوخال کی ایک مکمل تصویر بنا لیتا ہے۔ بسا اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ کسی ادبی شاہکار سے متاثر ہونے کے بعد ہم اپنے ذہن میں اس کے خالق کی جو تصویر بناتے ہیں وہ اتنی خوبصورت اور دل آویز ہوتی ہے کہ اس کی اصل تصویر دیکھ کر ہمیں کچھ مایوسی سی ہوتی ہے اور دل کو عجیب دھکا سا لگتا ہے شاید اسی لئے رشید احمد صدیقی نے ایک جگہ لکھا ہے کہ "دنیا کی تمام تصانیف کم و بیش صرف منافقت یا گھاگھیت کا نمونہ ہیں" دوسرے الفاظ میں ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ ان تصانیف میں مصنف نے اپنا اصل چہرہ چھپانے کی کوشش کی ہے۔ اسی لئے جس طرح قدیم زمانے کے پیغمبروں اور صوفیوں، اوتاروں اور رشیوں منیوں کی شخصیت کے گرد انسانی تخیل نے ایک ماورائی اور خوبصورت ہالہ بنا رکھا ہے اور مختلف صدیوں اور مختلف ادوار کے انسانوں نے ان کو اپنے زاویے سے دیکھ کر ان کی تصویریں بنائی ہیں اسی طرح جن شاعروں ادیبوں یا مصنفوں کے ذاتی حالات اور ان کے کردار اور شخصیت کے بارے میں ہماری معلومات کا دائرہ محدود ہے ان کی تصویریں بھی صنم گری کی زد میں آتی ہیں۔ گوتم بدھ، رام چندر، کرشن، مسیح، زرتشت اور دوسرے روحانی پیشواؤں کے مجسمے اور تصویریں ہزاروں اور لاکھوں کی تعداد میں ہیں اور ان سب تصویروں میں اصل شخصیت سے زیادہ روایات اور تصورات اور کسی قوم یا کسی فرد کے اپنے ذہن کی پرواز کا عنصر نمایاں ہے۔ قدیم فلسفیوں اور شاعروں کے بارے میں بھی ہم زیادہ تر اسی صنم گری کے شکار ہیں۔ ہومر، کالیداس، فردوسی، دانتے، اور شیکسپیئر وغیرہ کی تخلیقات پڑھ کر ہمارے ذہن میں ان فنکاروں کے جو خدوخال ابھرتے ہیں وہ اصل سے کہاں تک مطابق ہوں گے یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جو اکثر ذہنوں کو پریشان کرتا رہتا ہے۔ غالباً یہی جذبہ محرک بنا کہ دنیا میں جو لوگ قوم و ملک اور آنے والی نسلوں

کے لئے اپنے کارنامے چھوڑ جائیں ان کی زندگی کے حالات بھی لکھے جائیں، ان کی ذاتی اور نجی شخصیت اور کردار کا ریکارڈ رکھا جائے، ان کے پرائیویٹ خطوط اور دوسرے کاغذات محفوظ کئے جائیں اور کچھ لوگ نکیرین کے مانند اپنے آپ پر یہ فرض عائد کرلیں کہ ان غیر فانی ہستیوں کی غیر فانی زندگی کے ایک ایک لمحے کا حساب رکھیں۔ غالب نے بڑی خوبصورتی سے اس خواہش کا اظہار کیا ہے اور آدمی کی لکھی ہوئی تحریر کو خدا کی طرف سے تعینات کئے ہوئے کاتبوں کے مرتب کردہ اعمال نامے سے زیادہ معتبر و مستند ٹھہرایا ہے ؂

پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق　　　آدمی کوئی ہمارا دمِ تحریر بھی تھا

رشید احمد صدیقی کا ہی ایک قول اور یاد آیا جسے اس موقع پر نقل کردینا نامناسب نہ ہوگا۔ لکھتے ہیں:۔

"داعیٔ اسلام کی جس چیز نے مجھے سب سے زیادہ مرعوب اور متاثر کر رکھا ہے وہ میری ایک کمزوری ہے یعنی میں کبھی اس کی ہمت نہیں کرسکتا کہ میری پرائیویٹ زندگی کی تمام جزئیات منظر عام پر آئیں یا لائی جائیں۔ رسالت مآب کا ضبط و ظرف دیکھئے کہ مقرب ترین اصحاب حتیٰ کہ ازواج مطہرات کو اس امر کی ہدایت تھی کہ روحی فداک کی زندگی کے ہر جزو فعل تک کی خبر دوسروں تک پہنچائیں اور وہ بھی اس لئے کہ وہ اسوۂ حسنہ تھے۔ اس محک آتشیں پر آزمائے جانے کے لئے کون آمادہ ہے؟"

واقعہ یہ ہے کہ اس "محک آتشیں" پر آزمائے جانے کے لئے ایک پیغمبر ہی آمادہ ہوسکتا ہے اس لئے کہ اسے اپنے اوپر یہ اعتماد ہوسکتا ہے کہ اس کے ظاہر و باطن اور قول و عمل میں مکمل مطابقت ہے لیکن فنکار کی شخصیت عموماً پیچیدہ ہوتی ہے، اس کے اندر بہ یک وقت دو شخصیتیں ہوتی ہیں ایک وہ جو باہر سے نظر آتی ہے یہاں وہ ایک آدمی، ایک مرد، ایک عورت، شوہر، بیوی، بیٹا، باپ، بھائی، جوان، بوڑھا، خوبصورت، بدصورت، اندھا، لنگڑا، بہرا، بھینگا، جوشیلا، معتدل، رحمدل، غضبناک، باہمت، بزدل، توانا و مضبوط، کمزور و ناتواں، فاتح و کامراں، شکست خوردہ و آزردہ، چاہنے والا، چاہے جانے والا اور چاہت سے محروم۔ غرض عام آدمیوں کے اندر جو سیکڑوں اور ہزاروں رنگ روپ ہیں کم و بیش ہمارا فنکار بھی انہی کی گرفت میں ہوتا ہے۔ فنکار کی دوسری شخصیت اس کا اندرون ہے جو عام نگاہوں سے اوجھل ہوتا ہے لیکن اس کی تصانیف اسی کا کرشمہ ہوتی ہیں۔ بعض فنکاروں کے یہاں اندر کا یہ انسان ہمہ وقت بیدار رہتا ہے، بعض کے یہاں کبھی کبھی چونک اٹھتا ہے اور کچھ نشانات چھوڑ کر پھر گہری نیند سو جاتا ہے۔ ان دونوں شخصیتوں کا رشتہ ملانے اور ان کو ایک دوسرے سے ربط دے کر ان کا تجزیہ کرنے کا کام ایک ماہر نفسیات ہی کرسکتا ہے لیکن ماہر نفسیات اس جگہ بے بس ہوجاتا ہے جب معمول (Subject) کے بارے میں اس کے پاس خاطر خواہ مواد (Data) نہ ہو۔ باسویل کی طرح کم ہی لوگ ہوں گے جو جانسن کے ساتھ سائے کی طرح لگے رہیں اور اس کا سیاہ و سپید عوام الناس کے حوالے کردیں اور روسو کے مانند کسی میں اتنی اخلاقی جرأت ہے کہ اپنے پیرہن کا ایک ایک تار نوچ کر پھینک دے اور اپنے آپ کو سربازار عریاں کرکے کہے کہ آؤ، اے لوگو اس شخص کا تماشا دیکھو جس نے معاہدۂ عمرانی کی تخلیق کی ہے۔

اردو زبان میں سیرت و سوانح کی تاریخ ابھی سو برس سے بھی زیادہ کی نہیں ہے۔ "آب حیات" پہلی کتاب ہے جس میں محمد حسین آزاد نے اردو کے مشہور شعراء کی تصویریں کچھ اس چابکدستی سے بنائی ہیں کہ ہم انہیں اپنی آنکھوں کے سامنے چلتا پھرتا دیکھ سکتے ہیں لیکن صاحب آب حیات کے پاس ماضی کے شعراء کے بارے میں جو مواد تھا اس کی حیثیت "شنیدہ" کی سی تھی، اس میں آزاد کی طباعی اور ذہانت نے اتنی رنگ آمیزی کی ہے کہ یہ نقوش دل آویز ہونے کے باوجود افسانہ طرازی کے بوجھ تلے دبے ہوئے ہیں۔ غالباً اسی لئے موجودہ دور کے ایک ذہین افسانہ نگار نے ایک بار لکھا تھا کہ اردو کے پہلے افسانہ نگار محمد حسین آزاد ہیں اور افسانہ لکھنے کا ڈھنگ میں نے "آب حیات" سے سیکھا ہے۔ خالص سیرت نگاری میں اولین حیثیت حالی کی ہے لیکن حالی نے "یادگار غالب" اور "حیات جاوید" دونوں کتابیں اس اعتذار کے ساتھ پیش کیں کہ ابھی ہمارے ملک کی اخلاقی حالت اس قابل نہیں ہے کہ بڑے آدمیوں کی تصویر کا ہر رُخ پیش کیا جائے یہی وجہ ہے کہ بعد میں چل کر جب

غالب کے سوانح نگاروں نے ان کی شراب نوشی، قماربازی، ڈومنی سے محبت اور ان کی چھوٹی چھوٹی اخلاقی کمزوریوں کا ریکارڈ مرتب کرنا شروع کیا تو "بادہ خوار" غالب کو صرف "ولی" سمجھنے والا طبقہ چیخ اٹھا۔ شبلی نے حالی کو یہ طعنہ دیا تھا کہ حیاتِ جاوید "کتاب المناقب" اور "مدلّل مداحی" ہے۔ لیکن خود شبلی کے سوانح نگار سید سلیمان نے اپنے ممدوح کو جنید و شبلی، بایزید بسطامی، غزالی اور شاہ ولی اللہ کے پہلو میں بٹھانے کی کوشش کی اور جب دوسرے لوگوں نے عطیہ فیضی کے نام شبلی کے پرائیویٹ خطوط کو مرتب کرکے شائع کر دیا اور ان کی حیاتِ معاشقہ کے لئے نفسیات دانوں کو مواد مل گیا تو پرستارانِ شبلی چیں بر جبیں ہو گئے۔ شیخ عطاء اللہ نے مکاتیبِ اقبال مرتب کئے تو اس کی پہلی جلد کی اشاعت محض اس لئے روک دی گئی کہ اس سے اقبال کے عقیدت مندوں میں ایک کھلبلی سی مچ گئی اور کتاب سے ان صفحات کو خارج کر دیا گیا جن سے اقبال کی شخصیت یا علم پر کوئی دھبہ آ سکتا ہو۔

اب ادھر کچھ دنوں سے ہمارے یہاں اخلاقیات کا یہ تصور تبدیل ہو رہا ہے۔ غالباً سر رضا علی پہلے شخص ہیں جنہوں نے اپنا کچا چٹھا پیش کرنے کی جرأت کی ہے اور اس حیثیت سے "اعمال نامہ" اس صنفِ ادب کا ثمر پیش رس ہے۔ اب نقوش کے ایڈیٹر محمد طفیل نے یہ خطرناک فریضہ اپنے اوپر عائد کیا ہے کہ ہماری زبان کی وہ علمی ادبی شخصیتیں جو ہمارے درمیان موجود ہیں ان کے پیچھے کچھ محتسب لگا دیئے جائیں جو "درونِ خانہ" قسم کے اندراجات مرتب کریں اور وہ حضرات جو ہماری محفلوں سے رخصت ہو چکے ہیں لیکن ان کا کوئی نہ کوئی ہم صحبت اب بھی ان کی یاد اپنے سینے میں دفن کئے ہوئے ہماری بزم میں رونق افروز ہے وہ اس دبے ہوئے خزانے کو باہر نکالے تاکہ وہ متاعِ بے بہا جو دراصل قوم کی ملکیت ہے قوم کے کام آئے۔ یہ کام بڑے جان جوکھوں کا ہے۔ کس میں اتنا بوتا ہے جو اس بال سے باریک راستے پر چل سکے اور قدم لڑکھڑا نہ جائیں۔ مشاہیر کی تاریخ پیدائش، تاریخ وفات اور ان کے کارناموں کا ہی کھاتہ بنانا اپنی ملاقاتوں کا حال مزے لے کر بیان کرنا اور اس طرح چالیس پچاس صفحے سیاہ کر دینا ممکن ہے مضمون نگار کی رسوائی کا سامان فراہم کر دے اور نفسیات دانوں کو خود شخص موجود کے بارے میں رائے قائم کرنے کا موقع دے لیکن اس سے اصل مقصد کہاں تک پورا ہو گا۔ یہ سوچنے کی بات ہے۔ کم از کم مجھے یہ اعتراف کر لینے میں کوئی باک نہیں ہے کہ میں یہ کام ایمانداری سے کرنا چاہوں تو خون تھوک دینا پڑے گا۔ اوّل تو جن لوگوں کے بارے میں تھوڑے بہت نقوش و تاثرات ذہن پر مرتسم ہیں ان کی حیثیت اس تصویر کی سی ہے جو اس کیمرے سے کھینچی گئی ہو جو قریب قریب زاویۂ تصویر سے باہر (Out of focus) ہو۔ دوسرے یہ کہ بعض باتیں ایسی ہیں جنہیں بیان کرنے میں "خوفِ فسادِ خلق" کا اندیشہ ہے۔ میں ایک معمولی دنیادار آدمی ہوں حق کا اظہار کرکے منصور کی طرح دار پر چڑھنے کا مجھ میں حوصلہ نہیں۔

طفیل صاحب کا اصرار ہے کہ میں علی گڑھ والوں پر قلم اٹھاؤں لیکن مجھے بار بار یہ احساس ہوتا ہے کہ علی گڑھ کی علمی ادبی شخصیتوں اور یہاں کے مشاہیر سے میرا واسطہ اس طرح پڑا ہے کہ کسی کو صرف دور سے سڑک پر چلتے پھرتے دیکھا ہے۔ کوئی صاحب زن سے اپنی خوبصورت کار میں میرے پاس سے گزر گئے ہیں، کوئی صاحب اسٹیج پر تقریر کرنے یا تحقیقی و علمی مقالہ پڑھنے آئے ہیں اور علم و ادب کا دریا بہا کر چلے گئے ہیں۔ کسی صاحب کے کلاس میں ایک طالب علم کا بھیس بنا کر کہیں پچھلی صف میں بیٹھا ہوا اونگھتا رہا ہوں۔ کسی کو کسی ڈنر یا ایٹ ہوم میں بیٹھے ہوئے گل افشانیٔ گفتار کرتے اور اپنے احباب میں ہنستے بولتے دیکھ لیا ہے کسی سے بطور عقیدت ملنے گیا ہوں اور اس کے آراستہ ڈرائینگ میں ڈرا سہما بیٹھا رہا ہوں اور ہر وقت یہ اندیشہ لاحق ہو رہا ہے کہ کہیں کسی شیشے کی نازک شے سے نہ ٹکرا جاؤں اور مجھے خفت اٹھانی پڑے۔ کسی کے پاس اپنی نوکری کے لئے سفارش نامہ یا کسی دوسرے بڑے آدمی سے ملنے کے لئے تعارفی خط لکھوانے گیا ہوں اور چند منٹ با ادب با ملاحظہ بیٹھ کر واپس آ گیا ہوں۔ گیارہ سال کی زندگی میں علی گڑھ کے ان صاحبانِ جاہ و جلال کے گھروں کے اندر جھانکنے کا مجھے موقع نہیں ملا اور نہ ہی استری کئے ہوئے صاف ستھرے ملبوس سے ہٹ کر شب خوابی کے لباس یا لنگوٹ باندھ کر ورزش کرتے یا اپنے بیوی

بچوں سے چہل کرتے یا نوکروں کو پیٹتے اور قرضخواہوں سے لڑتے دیکھا ہے۔ اگر بعض لوگوں کو دیکھا بھی ہے تو کبھی کبھی اور ان کو بھی بیان کرنے کی اس لئے جرأت نہیں کہ مجھے ابھی یہاں رہنا ہے۔ ابھی اسی دریا کا پانی پینا ہے کسی مگرمچھ سے بیر کرنا نادانی نہیں تو کیا ہے۔ پڑھنے والوں کا تو ممکن ہے ہر طرح بھلا ہو لیکن لکھنے والے کا تو جینا دوبھر ہو جائے گا۔ اس لئے ناظرین کرام کو پہلے ہی آگاہ کئے دیتا ہوں کہ میری اس تحریر کو ایک اخبار کے نامہ نگار کی سرسری رپورٹ اور ایک ایڈیٹر کی فرمائش کی تعمیل سے زیادہ وقعت نہ دی جائے۔ اگر کوئی بات زبان قلم سے ناموزوں و نامناسب نکل جائے تو اسے محض میرے طرز نگارش کی خامی و ناپختگی پر محمول کیا جائے۔

جہاں تک شہر کا تعلق ہے علی گڑھ ہندوستان کا ایک بہت ہی معمولی اور حقیر فقیر سا شہر ہے بلکہ بعض اعتبار سے اسے شہر بھی کہنا درست نہیں، یہاں نہ تو بادشاہوں کے محلات اور تاریخی آثار ہیں اور نہ ہی کوئی قابل ذکر اور قابل دید مقام۔ ایک پرانا قلعہ ضرور ہے لیکن وہ بھی ایسا قلعہ جو غالباً مرہٹوں نے فوجی سامان رکھنے اور اپنی سپاہ کی محافظت کے لئے بنایا تھا اس لئے وہ دور سے ایک پہاڑی کی شکل میں نظر آتا ہے اور قریب جانے سے ایک بڑے پھاٹک کے اندر کچھ تنگ، تہ خانے اور رسد گاہیں ہیں اور وہ بھی آہستہ آہستہ نیست و نابود ہوتی چلی جا رہی ہیں۔ پہلے یہ ایک قصبہ تھا اور اسے کول کہا کرتے تھے۔ سرسید اور علی گڑھ تحریک سے قبل علم و ادب کے سلسلے میں علی گڑھ سے صرف چند ہی نام وابستہ ہیں۔ غالب کے بعض احباب اور تلامذہ جن میں منشی ہرگوپال تفتہ، منشی نبی بخش حقیر، منشی بالمکند بے صبر اور جواہر لال شعلہ کا نام لیا جاتا ہے، کول ہی میں مقیم تھے۔ اور وہ بھی کچہریوں میں ملازمت کے سلسلے میں۔ البتہ پچھلی صدی میں استاذ العلماء مولوی لطف اللہ صاحب علی گڑھی مرحوم اپنے دور کے زبردست عالم گزرے ہیں۔ جن کا ایک عربی کا مدرسہ تھا اور دور دور سے لوگ تحصیل علم کے لئے آیا کرتے تھے۔ کول کا نام کب سے علی گڑھ پڑا اور یہ علی کون صاحب تھے جن سے نسبت دی گئی اس کے بارے میں یقینی طور پر کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ البتہ سرسید کا تبادلہ جب بنارس سے یہاں ہوا اور انہوں نے سائنٹیفک سوسائٹی کا دفتر یہیں منتقل کر لیا تو اس کا نام علی گڑھ پڑ چکا تھا۔ علی گڑھ کا شہر اسٹیشن کے ایک طرف ہے دوسری طرف وہ بستی ہے جو سرسید کی بسائی ہوئی ہے۔ پہلے یہاں خاک اڑتی تھی۔ اس لق و دق میدان اور اس نیم ریگستانی علاقہ کی چمن بندی اور اسے ایک ایسی علمی بستی کی شکل میں تبدیل کر دینا جو آگے چل کر اسی طرح دنیا کی بڑی درسگاہوں میں شامل ہو گئی۔ جو تحصیل علم کے علاوہ تربیت اور قومی تعمیر و تشکیل کا منبع بھی رہی ہیں بوڑھے سید ہی کا کام تھا۔ اور اب علی گڑھ اس فہرست کا ایک نام ہے جس میں نالندہ، ٹکسلا، جامعہ ازہر، آکسفورڈ، کیمبرج، دیوبند اور شانتی نکیتن وغیرہ شامل ہیں۔ جہاں علم و فضل اور تہذیب کی شمعیں روشن ہوئیں۔ سرسید نے اس خرابے کو کچھ اس طرح آباد کیا کہ لوگ دہلی، لکھنؤ، عظیم آباد، رامپور اور حیدر آباد کے درباروں کا شان و شکوہ بھول گئے اور دور دور سے تشنہ کامان ادب نے کھنچ کھنچ کر اس چشمے سے سیراب ہونے کے لئے اپنے اپنے ڈیرے ڈال دیئے۔ ابھی ایک صدی بھی نہیں گزری ہے جب اس کی نیو پڑی تھی لیکن اس عرصے میں یہاں سے کیا کیا فاتح نہ اٹھے جنہوں نے اردو زبان ادب کا دھارا موڑ دیا اور ہوا کا رُخ اپنے قابو میں کر لیا۔ تہذیب الاخلاق اور انسٹی ٹیوٹ گزٹ کی ترتیب و تدوین سید کے مبارک ہاتھوں یہیں کہیں ہوتی تھی۔ حالی نے مقدمہ شعر و شاعری یہیں کہیں پھوس کے بنگلے میں بیٹھ کر لکھا تھا۔ شبلی نے اسلام کے بکھرے ہوئے شیرازے کو یہیں سرسید کے بنگلے کے قریب ایک چھوٹے سے مکان میں بیٹھ کر مرتب کیا تھا۔ نذیر احمد ذکاء اللہ، محسن الملک، وقار الملک، وحید الدین سلیم اور عنایت اللہ انہی گلی کوچوں اور ویران سڑکوں پر پھر چکے ہیں اور کیا عجب کہ ان راستوں کو ان کے پاؤں کی آہٹ ابھی تک یاد ہو۔ جس کلاس روم میں آج نوخیز اور نو عمر طالب علم سیاہ شیروانیاں پہنے نظر آ رہے ہیں وہیں کہیں عبد الحق، حمید الدین فراہی، محمد علی، شوکت علی، محفوظ علی بدایونی، عبد الرحمٰن بجنوری، حسرت موہانی، فانی بدایونی، عظمت اللہ خاں، ظفر علی خاں، اقبال سہیل، سجاد حیدر اور سجاد انصاری طالب علم بن کر بیٹھ چکے ہیں۔ جن بڑے بڑے کمروں میں آج اساتذہ درس دیتے ہوئے نظر آ رہے ہیں وہیں آرنلڈ، سر والٹر ریلے، کرکی، ٹرٹین، مولانا سلیمان اشرف، مولانا ابوبکر محمد شیث اور مولانا احسن مارہروی بھی کھڑے ہو کر علم و ادب کے موتی رول چکے ہوں گے۔ اسی یونین میں اور انہی نوسٹلوں میں بعید

اردو ادب کے معماروں کی آوازیں گونجتی ہوں گی جب انہیں اس حیثیت سے کوئی نہ پہچانتا ہوگا۔ اختر حسین رائے پوری، سبط حسن، سردار جعفری، عصمت چغتائی، حیات اللہ انصاری، خواجہ احمد عباس، مجاز، جاں نثار اختر، باری، منٹو اور شاہد لطیف کے مانوس چہرے اب بھی اس بستی کو یاد ہیں۔ اب بھی ان کی آوازیں یہاں گونج رہی ہیں۔

اس تحریر کا لکھنے والا آج سے گیارہ سال قبل ۱۹۴۵ء میں ایک کم سواد طالب علم کی حیثیت سے علی گڑھ میں داخل ہوا اور یہاں کی ہوا کچھ اس طرح لگی کہ تعلیم ختم کرنے کے بعد بھی اسی بستی کا ہو رہا۔ اس کی نس نس میں علی گڑھ کی مٹی کچھ اس طرح رچ گئی ہے کہ اب شاید اس کی خاک یہیں ٹھکانے لگے۔ وما توفیقی الا باللہ۔ " خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں "۔ ان کو دیکھنے والے ان کے بارے میں لکھیں گے۔ ناچیز نے جن چہروں کو دور یا نزدیک سے دیکھا ہے ان کے بارے میں مختصراً لکھتا ہے۔

نواب صدر یار جنگ حبیب الرحمٰن خاں شروانی مرحوم

علی گڑھ اسٹیشن سے اترتے ہی سید کی جس بستی کا میں نے ذکر کیا ہے اس طرف دو سڑکیں جاتی ہیں۔ ایک یونیورسٹی روڈ دوسری میرس روڈ۔ اب اس سڑک کا نام تقسیم ہند کے بعد ٹیکارام مندر روڈ ہو گیا ہے لیکن یہ نام صرف بورڈ پر لگا ہوا ہے اسے اب بھی میرس روڈ ہی کہتے ہیں۔ اس سڑک پر چلئے تو ایک فرلانگ آگے جا کر نواب چھتاری کی کوٹھی سے متصل اور نواب دھرم پور کی امریکن کوٹھی کے مقابل ایک شاندار اور خوبصورت عمارت ملے گی جس پر "حبیب منزل" لکھا ہوا ہے۔ یہ نواب صدر یار جنگ کی کوٹھی ہے۔ علی گڑھ میں اتنی وسیع اور پرشکوہ عمارت شاید ہی اور ملے۔ نواب صدر یار جنگ بھیکم پور (ضلع علی گڑھ) کے رہنے والے تھے اور شروانیوں کے مشہور خاندان سے تعلق رکھتے ہیں، وہاں انہوں نے اپنے نام سے بھی ایک بستی بسائی جس کا نام "حبیب گنج" رکھا ان کا کتب خانہ جو ہندوستان کے نادر ترین کتب خانوں میں سے ہے، وہیں ہے علی گڑھ کی اس کوٹھی کی تعمیر سے متعلق یہاں یہ روایت مشہور ہے کہ جس زمانے میں نواب صاحب مرحوم حیدر آباد میں صدر الصدور امور مذہبی کے مشیر اعلیٰ تھے اسی دوران میں ایک بار فرماں روائے دکن کا کسی وجہ سے آپ پر عتاب نازل ہوا، وہاں سے علیحدہ ہو کر "حبیب گنج" چلے آئے اور اپنے علمی مشاغل میں مصروف ہو گئے لیکن نظام دکن کے جی میں نہ جانے کیا آئی کہ انہیں اپنے اس رویئے پر نظرثانی کرنی پڑی اور دس سال کے بعد دوبارہ نواب صدر یار جنگ کو اسی عہدے پر مامور کیا اور اس عرصے کی تنخواہ یکشت عنایت فرمائی۔ اس رقم سے نواب صاحب مرحوم نے "حبیب منزل" تعمیر کرائی اور وہاں سے سبکدوش ہونے کے بعد ان کا مستقل قیام علی گڑھ میں رہنے لگا۔ اب یہ مکان ہندوستان کے تمام مشاہیر علم و ادب کی جولاں گاہ تھا۔ نواب صاحب نہ صرف اس دور کے زبردست عالم اور صاحب تصنیف بزرگ تھے بلکہ ان کی حیثیت ایک ادارہ کی تھی۔ وہ مشرقی تمدن کا آخری اور بے مثال نمونہ اور علم و فضل کا مجسمہ تھے۔ ہندوستان کی کوئی قومی و مذہبی تحریک ایسی نہ تھی جس کے وہ روح رواں نہ رہے ہوں۔ ندوۃ العلماء، ایجوکیشنل کانفرنس اور علی گڑھ یونیورسٹی تینوں آپ کی قیادت سے مشرف ہو چکے ہیں۔ آخر عمر میں مسلم یونیورسٹی کی دینیات کی فیکلٹی کے ڈین بھی تھے۔ حسن اتفاق سے علی گڑھ آتے ہی مجھے مرحوم کی خدمت میں حاضر ہونے کا موقع مل گیا۔ میں بچپن ہی میں نواب صاحب کے علم و فضل اور ان کی عظمت سے واقف ہو چکا تھا۔ میرے والد مولوی محمد شفیع صاحب مرحوم نے علامہ شبلی نعمانی اور مولانا حمید الدین فراہی کے ایماء پر بیسویں صدی کے اوائل میں ایک عربی درسگاہ مدرسۃ الاصلاح کے نام سے سرائے میر (اعظم گڑھ) میں قائم کی تھی اور مسلمانوں کی معاشرتی و تمدنی اصلاح کے لئے ایک انجمن اصلاح المسلمین کی بنیاد بھی رکھی تھی اس درسگاہ سے نواب صاحب مرحوم کو بھی دلچسپی تھی یہی وجہ ہے کہ جب میں اعظم گڑھ سے علی گڑھ کے لئے روانہ ہونے لگا تو مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم نے مجھے نواب صاحب کے نام ایک تعارفی خط دیا اور یہ فرمایا کہ علی گڑھ جا کر سب سے پہلے نواب صاحب کی خدمت میں حاضر ہونا۔ اس زمانے میں نواب صاحب

ایجوکیشنل کانفرنس کے بھی روح رواں تھے اس لئے مجھے کانفرنس سے عربی کے ایک وظیفے کے ملنے کی بھی توقع تھی۔ چنانچہ میں علی گڈھ کے ایک سینئر طالب علم مولوی محمد صابر ندوی اندونیسی کی معیت میں نواب صاحب کے یہاں حاضر ہوا۔ انہیں دیکھ کر مجھ پر تھوڑی دیر کے لئے ایک رعب سا چھا گیا، سرخ و سپید رنگ، لمبا قد، خوش پوش اور خوبصورت آدمی تھے۔ سفید نورانی داڑھی تھی لیکن چہرہ عام علماء جیسا نہیں تھا، شائستگی اور نفاست کا ایک پیکر میرے سامنے تھا، بڑی نرم آواز میں انہوں نے مجھ سے کچھ پوچھا لیکن میں سن نہ سکا۔ کچھ بولا تو کسی نے کہا کہ زور سے بولئے نواب صاحب اونچا سنتے ہیں۔ تھوڑی دیر میں میں اپنے حواس پر قابو پا گیا کیونکہ نواب صاحب کے لب و لہجے میں تمکنت کے بجائے شفقت و مرحمت تھی۔ اس ملاقات کے بعد بھی مجھے اپنے زمانۂ طالب علمی میں نواب صاحب کے یہاں جانے کا موقع ملا لیکن کسی نہ کسی ضرورت سے اس زمانے میں میری علمی استعداد اتنی نہ تھی کہ مرحوم سے کچھ استفادہ کر سکتا۔ کئی امور ایسے تھے جن کے بارے میں کچھ پوچھنا چاہتا تھا لیکن ہمت نہ پڑی۔ نواب صاحب کی شرافت، وضعداری اور رکھ رکھاؤ اور ان کی علم دوستی کے چرچے علیگڈھ میں عام تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ نواب صاحب کے یہاں شام کو دیوان خانے میں نشست ہوتی تھی جس میں علی گڈھ کے اکثر اہل علم حضرات جایا کرتے تھے۔ وہاں کیا کیا علم و ادب کے خزانے لٹتے ہوں گے کاش اس میں میرا بھی حصہ ہوتا۔ نواب صاحب کی بگھی روزانہ شام کو میں دیکھتا تھا جو مفتی عبداللطیف صاحب کے مکان "نور ولا" کے سامنے رکتی تھی اور انہیں لے کر مولوی بدرالدین صاحب علوی (استاد شعبہ عربی) کے یہاں جاتی اور پھر یہ دونوں حضرات، نواب صاحب کے یہاں تشریف لے جاتے۔ نو ساڑھے نو بجے رات میں یہی بگھی ان دونوں بزرگوں کو اپنے مکانوں میں واپس لاتی تھی۔ اس معمول میں کبھی فرق نہیں آیا۔

نواب صاحب کا جب بھی ذکر آتا تو علی گڈھ والے اس بات پر بہت افسوس کرتے کہ ان کے خاندان میں اب اس جگہ کو کوئی سنبھالتا نظر نہیں آتا۔ مرحوم کے بڑے صاحبزادے مجذوب ہو گئے ہیں اور مستقل طور پر کچھوچھہ شریف (فیض آباد) میں مخدوم اشرف جہانگیر کی درگاہ میں رہتے ہیں۔ دوسرے فرزند عبیدالرحمٰن خاں صاحب شروانی آج کل مسلم یونیورسٹی کے ٹریژرار ہیں لیکن ان کے حصے میں باپ کا علم و فضل نہیں آیا۔ عبیدالرحمٰن صاحب کے صاحبزادے یعنی نواب صاحب کے پوتے ریاض الرحمٰن خاں شروانی نے عربی میں ایم، اے کیا ہے اور یونیورسٹی میں عربی کے استاد ہیں۔ ان کو پڑھنے لکھنے سے مزید دلچسپی ہے اور کچھ نہ کچھ کرتے رہتے ہیں۔ خدا کرے نواب صاحب کی روایات کو زندہ رکھنے میں کامیاب ہوں۔

سنہ ۱۹۵۰ء میں علی گڈھ ہی میں نواب صاحب کا انتقال ہو گیا۔ ایسے لوگ صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں۔ ان کے مرنے سے مشرقی علم و فضل اور وضعداری کا آخری چراغ گل ہو گیا۔

مرحوم جہاں مذہبی علوم، تاریخ و فلسفہ اور فقہ اسلامی کے زبردست عالم تھے وہاں شعر و ادب کا اعلیٰ اور ستھرا مذاق رکھتے تھے۔ میر حسن کا تذکرہ اور دیوان خواجہ میر درد کی ترتیب و تدوین اور ان کے مقدمے ان کی یادگار ہیں۔ شاعر بھی تھے اور حسرت تخلص کرتے تھے۔ "کاروانِ حسرت" کے نام سے ان کے کلام کا مجموعہ شائع ہو گیا ہے۔ مرحوم کی خط و کتابت حالی و شبلی سے لے کر پچھلے دور کے تمام مشاہیر ادب اور علماء سے تھی اور ان کے کتب خانے میں یہ نوادر محفوظ ہیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد کی خلوت پسند طبیعت نے اپنے افکار و خیالات کے اظہار کے لئے مولانا شروانی کو اپنا مخاطب بنایا اور احمد نگر کے ایام نظر بندی میں جو خطوط لکھے وہ "غبار خاطر" کے نام سے شائع ہو کر مقبولیت حاصل کر چکے ہیں۔ ان خطوط کی اشاعت نے نواب صدر یار جنگ کی شخصیت کو اور بھی دلکش بنا دیا اور ابوالکلام کا یہ حبیب سارے ملک کا محبوب بن گیا۔ کاش ہندوستان کے اہل علم مولانا شروانی کے نادر کتب خانے سے صحیح طور پر استفادہ کر سکیں کیونکہ اس مرحوم نے جس عرق ریزی سے یہ موتی چن چن کر اکٹھا کئے ہیں ان کی قدر و قیمت کا پہچاننا موجودہ نسل کا سب سے بڑا فریضہ ہے۔

خان بہادر شیخ عبداللہ

میرس روڈ پر "حبیب منزل" سے چند ہی قدموں کے فاصلے پر ایک مکان ہے جس کا نام ہے "عبداللہ لاج" ہے - یہ مکان مسلم گرلس کالج کے احاطے میں ہے اس میں نوّے سال کے ایک بیٹھے ہوئے نورانی صورت کے بزرگ ملیں گے جو باہر نکلیں گے تو ترکی ٹوپی سر پر ہوگی - انہیں علی گڑھ والے "پاپا" کہتے ہیں - یہ شیخ عبداللہ ہیں جو مسلمان قوم میں تعلیم نسواں کے اوّلین معمار ہیں - سرسید نے جب علی گڑھ میں مدرسۃ العلوم قائم کیا اور نئی تعلیم سے اپنی قوم کو بہرہ ور کرنا چاہا تو قدامت پرستوں نے ان کی کتنی مخالفت کی اور انہیں کس کس طرح مطعون کیا وہ دنیا کو معلوم ہے - ظاہر ہے کہ جب نئی تعلیم کو ہمارے ملک میں مردوں کے لئے اس قدر مہلک قرار دیا گیا تو عورتوں کے سلسلے میں اس کا نام لینے کی کسی کو کیا ہمت ہو سکتی تھی - سرسید کے ذہن میں یہ پروگرام بھی تھا لیکن اس وقت قوم کی ڈوبتی ناؤ کو پار لگانے کے لئے صرف مردوں کی تعلیم کے لئے بنیاد ڈالنا ہی ایک کٹھن مرحلہ تھا، بعد میں اس مشن کی تکمیل شیخ عبداللہ کے ہاتھوں ہوئی - شیخ عبداللہ کے بارے میں مشہور ہے کہ یہ ایک کشمیری برہمن تھے اور کمسنی ہی میں مشرف بہ اسلام ہو کر علی گڑھ کی درسگاہ میں داخل ہوئے تھے اور سرسید کے دامن تربیت نے انہیں کچھ اس طرح ڈھال دیا کہ یہیں کے ہو رہے - مسلم گرلس کالج کی بنیاد ڈالی اور تعلیم نسواں کی حمایت میں علی گڑھ سے رسالہ "خاتون" نکالا - ان کے اس کام میں ان کی وفا شعار بیگم اعلیٰ بی نے بڑا ہاتھ بٹایا - سب سے پہلے خود شیخ صاحب نے اپنی لڑکیوں کو تعلیم دلائی اور پردے کی سختیوں کو کم کر کے انہیں قومی اور ملکی کاموں میں مردوں کے دوش بدوش لا کھڑا کیا - ان کی صاحبزادی رشید جہاں نے اردو میں پہلی بار جدید طرز کی افسانہ نگاری شروع کی - خود ان کے شوہر محمود الظفر نے اس طرز میں ان کا ساتھ دیا - "انگارے" جو اردو افسانہ نگاری اور ترقی پسند ادب کی تحریک میں ایک اہم تاریخی حیثیت رکھتی ہے اس میں سجاد ظہیر اور احمد علی کے علاوہ ان دونوں میاں بیوی کی کہانیاں بھی ہیں جو قدامت پرستی کے خلاف بغاوت کا ہمارے ادبی سرمائے میں نشان اولیں ہیں - دوسری صاحبزادی ممتاز جہاں بیگم تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد گرلس کالج کی پرنسپل ہو گئیں - انہیں سارا علی گڑھ ممتاز "آپا" کہتا ہے - خورشید جہاں بھی شیخ صاحب کی لڑکی ہیں جنہوں نے ایک زمانے میں "رینوکا دیوی" کے نام سے فلمی دنیا میں شہرت حاصل کر لی تھی - ان کے صاحبزادے محسن عبداللہ بھی ایک عرصے تک فلم سے وابستہ رہ چکے ہیں - محسن عبداللہ کی بیوی یعنی شیخ صاحب کی بہو شاہدہ خاتون بھی فلمی دنیا میں چلی گئیں اور "نینا" کے نام سے اداکاری کے کمال دکھائے -

مسلم گرلس کالج نے آہستہ آہستہ اپنے قدم جمائے اور ہزارہا مسلم خواتین اس کالج سے تعلیم پا چکی ہیں - عصمت چغتائی بھی اسی کالج کی پروردہ ہیں - ان کے بیشتر افسانے اور ان کا مشہور ناول "ٹیڑھی لکیر" یہیں کے مشاہدات پر مبنی ہے -

شیخ صاحب باوجود پیرانہ سالی کے ایک دلکش شخصیت کے مالک ہیں - ان کے چہرے پر ایک عجیب طرح کی نرمی اور معصومیت ہے - چہرے پر داڑھی نہیں ہے لیکن مونچھیں موجود ہیں - اب جھک کر اور آہستہ آہستہ چلتے ہیں - لوگوں کی باتیں بڑے انہماک سے سنتے ہیں اور ضرورت مندوں کے ساتھ بڑی شفقت سے پیش آتے ہیں - وہ گرلس کالج کی تمام بچیوں سے باپ کا سا برتاؤ رکھتے ہیں اور اپنی بیٹی ممتاز جہاں کے کام میں اب تک ہاتھ بٹاتے ہیں - یونیورسٹی میں ہر سال سرسید کے یوم وفات کے موقع پر ایک جلسہ ہوتا ہے جس میں شیخ صاحب کا شریک ہونا ضروری ہے - اس موقع پر ہر سال وہ ایک تقریر کرتے ہیں اور سرسید کی باتیں کرکے آبدیدہ ہو جاتے ہیں - ابھی حال ہی میں ان کی خدمات کے اعتراف میں ان کی جوبلی منائی گئی - اس سلسلے میں یونیورسٹی کے اسٹریچی ہال میں بھی ایک جلسہ ہوا - شیخ صاحب نے جو تقریر کی اس کا ایک فقرہ بہت ہی دلچسپ تھا - طلباء کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ "جس جگہ آج تم بیٹھے ہوئے ہو انہی کرسیوں پر کبھی میں بھی بیٹھا کرتا تھا اور میری طالب علمی کے زمانے میں جب کوئی بڑا آدمی آتا تھا تو [illegible] کرتا تھا کہ کیا کبھی ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ میں بھی اس کے [illegible]

کر سکوں گا اور لوگ میرے سننے کے لئے بہہ تن گوش ہوں گے ۔ میں اس درسگاہ کا ممنون ہوں کہ اس کی تربیت نے مجھے اس قابل بھی بنایا۔"

خان بہادر حبیب اللہ خاں

علی گڑھ سے باہر کم حضرات ان سے واقف ہوں گے لیکن علی گڑھ میں ان کی حیثیت ایک ادارہ سے کم نہیں ۔ یہ علی گڑھ کی زندہ انسائیکلوپیڈیا ہیں ۔ ان کی عمر بھی پچاسی نوّے سال سے کم نہ ہوگی ۔ یہ سرسید اور علی گڑھ کے عاشقوں میں ہیں ۔ ان کا قول ہے کہ اگر حضرت محمد صلعم آخری نبی نہ ہوتے تو نبوت کا خاتمہ سرسید پر ہوتا ، سرسید پر اعتراض اور نکتہ چینی یا کسی نوع کی تنقید وہ برداشت نہیں کر سکتے ۔ حبیب اللہ خاں اصلاً شاہجہاں پور کے پٹھان ہیں ۔ علی گڑھ میں سرسید کے زمانے میں ہی داخل ہوئے اور یہاں سے فارغ ہو کر ڈپٹی کلکٹری کے عہدے پر فائز ہوئے ملازمت کے دوران میں بھی وہ علی گڑھ کے معاملات میں دلچسپی لیتے رہے اور یہاں کی آئے دن کی سیاست کی باگ ڈور ان کے ہاتھوں میں رہی ۔ صاحبزادہ آفتاب احمد خاں اور ڈاکٹر سر ضیاءالدین کی دو پارٹیاں علی گڑھ میں مشہور تھیں ۔ آپ صاحبزادہ صاحب کے جاں نثار دوستوں میں تھے اور ان کی حمایت میں انہوں نے ڈاکٹر ضیاءالدین کو ناک چنے چبوا دیئے ۔ جب تک ڈاکٹر ضیاءالدین زندہ رہے ان کی زندگی کے ایک ایک لمحے کا احتساب حبیب اللہ صاحب کا محبوب ترین مشغلہ تھا ۔ ان کے مکان میں ایک کمرہ محض ڈاکٹر ضیاءالدین کے خلاف ریکارڈ جمع کرنے کے لئے وقف تھا لیکن جس دن ڈاکٹر صاحب کے انتقال کی خبر آئی سارے کاغذات میں اپنے ہاتھ سے آگ لگا دی اور کہا کہ مرحوم کو خدا معاف کرے ، اب ان کے عیوب کی تشہیر درست نہیں ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد ڈپٹی حبیب اللہ صاحب نے علی گڑھ کو مستقلاً اپنا وطن بنا لیا اور یہیں اپنی شاندار کوٹھی بنوائی جس کا نام اپنے عزیز ترین دوست میر ولایت حسین صاحب کے نام پر "ولایت منزل" رکھا ۔ ڈپٹی صاحب نے شادی تمام عمر نہیں کی ۔ اپنا مکان یونیورسٹی کے نام لکھ دیا ہے ۔

" ولایت منزل" علی گڑھ میں مرجع خلائق ہے ۔ علی گڑھ کے تمام اکابر اور ارباب اقتدار یہاں آکر نذرانۂ ادب تہ کرتے ہیں ۔ مولوی محمد طفیل صاحب منگلوری بھی ڈپٹی صاحب کے عزیز ترین دوست تھے اور انہی کے مشورے سے علی گڑھ میں بیٹھ کر انہوں نے "مسلمانوں کا روشن مستقبل" لکھی ۔ خود ڈپٹی صاحب نے صاحبزادہ آفتاب احمد کی سوانح عمری "حیات آفتاب" کے نام سے شائع کی ہے اور اس میں شک نہیں کہ اس صنف ادب میں یہ ایک وقیع اضافہ ہے ۔ "میرا علی گڑھ" کے نام سے علی گڑھ کی ایک تاریخ لکھ رہے ہیں اور اس میں شبہ نہیں کہ یہ کتاب مکمل ہونے پر علی گڑھ کی سب سے معتبر تاریخ ہوگی کیونکہ علی گڑھ سے متعلق ڈپٹی صاحب کے پاس ہر طرح کا مواد محفوظ ہے ۔ شاید ہی اس تحریک پر اتنا وافر ذخیرہ کسی کی ملکیت ہو ۔

ڈپٹی صاحب اب کافی ضعیف و ناتواں ہو گئے ہیں ۔ ہاتھوں میں رعشہ ہے اور بینائی بھی کمزور ہے ۔ اپنی کتاب اس طرح تصنیف کر رہے ہیں کہ بیٹھے بیٹھے مولوی محمود الحسن صاحب کو بولتے جاتے ہیں ۔ مولوی محمود الحسن صاحب جنہیں لوگ مسکین صاحب بھی کہتے ہیں ۔ یہاں بچوں کے اسکول میں مدرس ہیں اور ڈپٹی صاحب کے پرائیویٹ سیکرٹری بھی ۔ ہر جمعہ کو انہی کے ساتھ تانگے پر بیٹھ کر یونیورسٹی کی جامع مسجد میں جاتے ہیں ، اس وقت شیروانی اور ترکی ٹوپی میں ملبوس ہوتے ہیں ، نماز جمعہ کے بعد سرسید کے مزار پر فاتحہ پڑھتے ہیں اور یہی معمول چلا آرہا ہے ۔ علی گڑھ کی کوئی بات اس وقت تک مستند نہیں سمجھی جاتی جب تک ڈپٹی صاحب اس کی تصدیق نہ کر دیں ۔ یونیورسٹی نے ان کی خدمات کے اعتراف میں انہیں اعزازی ڈاکٹریٹ کی ڈگری بھی دی ہے ۔

مولوی محمد مقتدیٰ خاں شیروانی

یہ جنگ بھی اسی سال کے لگ بھگ ہوں گے ، نورانی داڑھی اور مقدس چہرہ ۔ سر پر چوگوشیہ ٹوپی اور ہاتھوں میں کپڑے کا بنا ہوا ایک تھیلا ۔

تین میں طرح طرح کے کاغذات بھرے ہوئے۔ یہ بجا طور پر علی گڈھ کے "ذل کشودہ" ہیں۔ سرسید نے جب علی گڈھ میں انسٹی ٹیوٹ پریس قائم کیا تو اس کا انتظام و انصرام ان کے سپرد ہوا۔ وحید الدین سلیم کے بعد انسٹی ٹیوٹ گزٹ کی ادارت بھی آپ ہی کے سپرد ہوئی۔ ان کے اہتمام میں نہ جانے اردو کے کتنے بیش بہا جواہر زیور طبع سے آراستہ ہو کر منظر عام پر آئے۔ یونیورسٹی پریس کی کتابیں کتابت و طباعت کے لحاظ سے بہت پہلے اپنا معیار قائم کر چکی تھیں۔ نواب اسحٰق خاں مرحوم نے ایک زمانے میں امیر خسرو کے کلیات، مختلف حصوں میں اس دور کے اعلیٰ ترین محققوں سے مرتب کرا کے آرٹ پیپر پر آپ ہی کے اہتمام میں شائع کرائے تھے اور اس کام کے لئے ایک گراں قدر رقم صرف کی تھی۔ مولوی عبدالحق صاحب رسالہ اُردو اورنگ آباد سے نکالتے تھے تو اس کی طباعت علی گڈھ میں محمد مقتدیٰ خاں شروانی کے اہتمام میں ہوتی تھی۔ رشید احمد صدیقی کا رسالہ سہیل بھی ان کے اہتمام میں آرٹ پیپر پر چھپا کرتا تھا۔

فارسی و اردو کتابوں کی اتنے اعلیٰ پیمانے پر طباعت و اشاعت کے اہتمام کے علاوہ مقتدیٰ صاحب خود بھی زبردست علم و فضل کے مالک ہیں اور متعدد علمی و تاریخی کتابوں کے مصنف ہیں۔ دنیا کے بڑے بڑے کتب خانوں میں جو مخطوطات و نوادر ہیں وہ سب آپ کی نظر میں رہتے ہیں اور اس پیرانہ سالی میں بھی وہ ان کی اشاعت اور ترتیب و تدوین کے متعلق اسکیمیں بناتے رہتے ہیں۔ ۱۹۵۱ء میں جب ایم۔ اے کرنے کے بعد مسلم یونیورسٹی گزٹ کی ادارت کا کام میں نے سنبھالا تو اس کا پہلا پرچہ نکلتے ہی موصوف میرے دفتر میں تشریف لائے اور بڑی مسرّت کا اظہار کیا اور اس کی ترتیب و اشاعت سے متعلق اپنے تجربات مجھے بتاتے رہے۔ اس وقت یہ تعلق ایسا بڑھا جو اب تک قائم ہے۔ اب بھی جب کہیں راستے میں نظر آ جائیں گے تو رک کر گھنٹوں باتیں کریں گے اپنے جھولے سے کچھ کاغذات نکال کر مجھ کو دکھائیں گے اور اپنے اشاعتی پروگرام کی مجھ کو اطلاع دیں گے۔ ان کے اس ذوق شوق اور محنت کو دیکھ کر ہم نوجوانوں کو شرم آتی ہے۔

ایک زمانے میں علی گڈھ میں انجمن اردوئے معلیٰ کے اہتمام میں ایک اُردو کانفرنس ہوئی تھی جس میں خطبہ دیتے ہوئے مولانا سید سلیمان ندوی نے محمد مقتدیٰ خاں شروانی کی خدمات کو بہت سراہا تھا اور کہا تھا کہ یہ شخص واقعی اس قابل ہے کہ اُردو زبان کی ایک اکیڈمی یا ریسرچ انسٹی ٹیوٹ قائم کیا جائے اور اس کی باگ ڈور اس کے سپرد کر دی جائے۔

محمد مقتدیٰ خاں شروانی یہاں کے اخبار "علی گڈھ" اور "جمہور" میں چھوٹے چھوٹے مزاحیہ اور ظریفانہ مضامین بھی لکھتے رہتے ہیں جن میں ان کا اپنا اسلوب نگارش ہے۔ ان مضامین پر "ممنش" لکھا ہوتا تھا۔

وہ جب کسی سے باتیں کرتے ہیں تو ان کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ کہے جائیں اور دوسرا ہمہ تن گوش ہو کر سنتا رہے سننے والا اگر بے صبر ہے اور بیچ میں اپنی کوئی بات چھیڑ دیتا ہے یا انہیں کچھ بتانے لگتا ہے تو وہ فوراً ٹوک کر "معلوم معلوم" کہیں گے اور اگر اس پر بھی وہ بولتا رہے تو معلوم معلوم معلوم معلوم" بہت تیزی سے کہنا شروع کر دیں گے۔ یہاں تک کہ وہ بے چارہ گھبرا کر خاموش ہو جائے گا اور پھر انہی کی سننے لگے گا۔

شروانی خاندان کے شجرہ اور اس کی تاریخ سے بھی آپ کو خاص دلچسپی ہے اور اس سلسلے میں کئی کتابیں لکھ چکے ہیں۔ نواب مزمل اللہ خاں شروانی کی سوانح حیات بھی مرتب کر رہے ہیں اور آج کل جب ملتے ہیں تو سو سو طرح سے اس کا ذکر کرتے ہیں۔

منشی نجم الدین

چھوٹے قد کے ایک خستہ حال معمر بزرگ ہیں جن کی اہمیت سے علی گڈھ کے پرانے لوگ واقف ہیں۔ یہ سرسید کے ملازم تھے۔ ان کی وفا شعاری اور خدمت گذاری کی وجہ سے سرسید انہیں بہت عزیز رکھتے تھے اور پیار سے "میراٹٹو" کہا کرتے تھے۔ چنانچہ یہ نام ایسا چلا کہ اب تک انہیں "سرسید کا ٹٹو" کہا جاتا ہے۔ ان کے پاس سرسید، حالی، شبلی، محسن الملک، ذکاء اللہ، امام صمد وغیرہ کی تصانیف موجود ہیں جو خود

مصنفین نے اپنے دستخط کے ساتھ انہیں تحفے کے طور پر دی تھیں - نیز ان کے نام ان کے بہت سے خطوط اور ان بزرگوں کی دستخطی تصویریں ہیں۔ اس نادر ذخیرے سے مختار الدین احمد آرزو صاحب نے فائدہ اٹھایا ہے اور منشی صاحب سے متعلق ایک مستقل مضمون "نئی تحریریں" (مٹ) میں شائع کرایا ہے جس میں بہت سے خطوط اور ان کے عکس بھی شامل ہیں شبلی کی نوجوانی کی ایک تصویر بھی ان کے پاس محفوظ تھی جو رسالہ آج کل (دہلی) میں شائع ہوئی - اب کافی ضعیف ہو گئے ہیں - ایجوکیشنل کانفرنس کے دفتر سے متعلق ہیں اور کتابوں اور مسودات کی نقل کا کام کر کے گزارہ کرتے ہیں۔ علی گڑھ کے ایک مکان کا جغرافیہ اور وہاں کے رہنے والوں کے متعلق ایک، ایک تفصیل ان کو یاد ہے اور سر سید اور ان کے معاصرین کی ایک زندہ یادگار ہیں۔

مولوی اکرام اللہ خاں ندوی مرحوم

بہت موٹے اور بھدے خدوخال کے ایک پستہ قد اور گول مٹول سے بزرگ تھے شخصیت میں کوئی وجاہت یا جاذبیت نہ تھی خاموش طبع تھے۔ ان کو میں نے اکثر یونیورسٹی مارکیٹ یا انجمن ترقی اردو کے دفتر کے آس پاس اس طرح چلتے ہوئے دیکھا تھا جیسے ٹہلنے رہے ہوں بعد میں معلوم ہوا کہ "وقارِ حیات" کے مصنف مولوی اکرام اللہ خاں ندوی یہی ہیں - مولوی صاحب ندوہ کے لائق فرزند اور شبلی کے عزیز شاگردوں میں تھے شبلی کی زندگی ہی میں الندوہ کی ادارت کی۔ بعد میں نواب صدر یار جنگ ان کو ایجوکیشنل کانفرنس میں لائے اور مستقل طور پر اسی سے وابستہ رہے۔ "کانفرنس گزٹ" کی ادارت اور تصنیف و تالیف کا کام آپ کے سپرد تھا اور نہایت خاموشی سے اپنے تحقیقی و علمی مشاغل میں لگے رہتے تھے۔ وطن شاہجہان پور تھا لیکن علی گڑھ میں بس گئے تھے اور کانفرنس کمپاؤنڈ کے ایک مکان میں بیوی بچوں کے ساتھ رہتے تھے ۱۹۳۱ء میں انتقال ہوا اور یہیں سپرد خاک ہوئے۔

سلطان حیدر جوش

اردو افسانہ نگاری کے دورِ اولین کی باقیات میں سے تھے - علی گڑھ کے گریجویٹ تھے اور عرصہ تک ڈپٹی کلکٹری کے عہدے پر فائز رہے۔ شیخو پور بدایوں وطن تھا لیکن ریٹائر ہونے کے بعد علی گڑھ میں سکونت اختیار کر لی تھی - جس زمانے میں میں نے انہیں دیکھا ہے ان کی عمر کافی ہو چکی تھی لیکن چہرے پر وہی رونق اور فارغ البالی تھی - گورے چٹے تھے اور دیکھنے میں انگریز معلوم ہوتے تھے۔ عام طور پر مکمل سوٹ میں ملبوس رہتے تھے۔ سر کے بال تقریباً غائب ہو چکے تھے اور داڑھی آخر عمر تک مُنڈاتے تھے - سُنا ہے پہلے احاطہ مینڈھو ہاؤس کے قریب کہیں رہتے تھے لیکن آخر عمر میں میرس روڈ کی ایک کوٹھی "حامد منزل" میں فروکش تھے - ایک بار ابوالفضل صدیقی کے ساتھ ان سے ملنے گیا - ملنے کے بعد اندازہ ہوا کہ تقریباً بہرے ہو چکے ہیں - صدیقی صاحب کانوں کے پاس بلا ملا کر ان سے کچھ باتیں کرتے رہے اور میں خاموش بیٹھا رہا - کئی سال ہوئے علی گڑھ ہی میں انتقال ہو گیا - ان کے صاحبزادے احسان حیدر صاحب مسلم یونیورسٹی ہائی اسکول کے ہیڈ ماسٹر تھے، بعد میں انگلستان چلے گئے اور اب سُنا ہے کراچی میں ہیں - جوش صاحب کی صاحبزادی محمودہ اور یہیں گرلس کالج میں لکچرر ہیں۔

ظفر عمر

"نیلی چھتری اور بہرام کی گرفتاری" کے مصنف ظفر عمر علی گڑھ کے پرانے گریجویٹ تھے - وطن بنوٹ ضلع بلند شہر تھا، ان کے نام کے بارے میں ایک روایت یہاں سننے میں آئی کہ اصل نام ظفر علی تھا - ان کے باپ کو کسی شیعہ بزرگ نے طعنہ دیا کہ حضرت آپ سنی ہیں لیکن "علی" کا

چھپا نہیں چھوڑتے ، اس پر ان کے باپ نے "ظفر عمر" نام رکھ دیا۔ علی گڑھ سے فارغ ہونے کے بعد پولیس کے محکمہ میں ملازم ہو گئے اور اس میں کار ہائے نمایاں انجام دیئے۔ ان کے جاسوسی ناول اسی زمانے کے تجربات پر مبنی ہیں۔ ان ناولوں نے اتنی مقبولیت حاصل کی اور ان سے اتنی آمدنی ہوئی کہ کئی ناولوں کے نام پر علیگڑھ میں انہوں نے ایک ایک مکان بنوایا "نیلی چھتری"، "بہروں کا کلب" اور "لال کھٹہ" تینوں کوٹھیاں شمشاد مارکیٹ سے قلعہ کی طرف جانے والی سڑک پر ہیں۔ "نیلی چھتری" میں خود رہتے تھے۔ ایک بار دورے انہیں دیکھنے کا موقع ملا جب وہ ریٹائر ہو کر مستقل طور پر یہیں مقیم تھے۔ وجیہہ آدمی تھے لیکن ایک بار گولی کا نشانہ بنے اور ایک ٹانگ کاٹ دینی پڑی۔ آخر عمر میں اولڈ بوائز ایسوسی ایشن سے بہت دلچسپی لیتے تھے اور اس کے زبردست کارکن تھے۔ ان کی صاحبزادی سے اختر حسین رائے پوری کی علی گڑھ ہی میں شادی ہوئی۔ تقسیم کے بعد پاکستان چلے گئے اور وہیں انتقال ہو گیا۔

پروفیسر عبد العزیز میمن

اس وقت پوری دنیا میں عربی زبان کے مسلم الثبوت ادیب اور محقق ہیں۔ عربی علوم کے سلسلے میں آپ کا نام طٰہٰ حسین اور پروفیسر کرنکو کے ساتھ لیا جاتا ہے، آپ کی بے شمار کتابیں بیروت اور مصر سے اعلیٰ درجے کے ٹائپ میں شائع ہو چکی ہیں اور وہاں کے اہل زبان سے خراج تحسین وصول کر چکی ہیں۔ ہندوستان میں عربی کو اس طرح مادری زبان کے مانند لکھنے اور بولنے والے بہت کم ادیب پیدا ہوئے ہوں گے۔ میمن صاحب راجکوٹ (کاٹھیاواڑ) کے رہنے والے ہیں۔ تعلیم باقاعدہ کسی درسگاہ میں نہیں حاصل کی اور نہ ہی ڈگری کے نام کی کوئی شے ان کے پاس ہے۔ مختلف علماء کی خدمت میں رہ کر علم حاصل کی اور خود ذہانت اور محنت سے استعداد میں اضافہ کیا۔ نذیر احمد کے شاگرد بھی رہ چکے ہیں۔ نذیر احمد کے علم و فضل کے ساتھ ان کی خست اور کنجوسی بھی میمن صاحب کے حصے میں آئی ہے۔ لاکھوں روپے جمع کر رکھے ہیں اور خود اتنے معمولی طور پر رہتے ہیں کہ باہر سے آنے والا شخص پہچان بھی نہیں سکتا کہ یہی علامہ عبد العزیز میمن ہیں۔ شکل و صورت سے تاجر معلوم ہوتے ہیں۔ چوڑا چکلا چہرہ، لمبا قد، بہت چوڑا ماتھا، خشخشی داڑھی اور چوڑی مہری کا پاجامہ۔ سر پر مارواڑیوں کے انداز کی ایک ٹوپی۔ اکثر ایک ٹوٹی پھوٹی سائیکل سے بازار کی طرف جاتے ہوئے نظر آئیں گے۔ سائیکل پر ایک بڑا سا جھولا بھی لٹک رہا ہوگا۔ بازار سے سبزی ترکاری، اناج، مسالے تمام ضروریات کی چیزیں خود خرید کر لائیں گے اور دوکاندار سے ایک ایک پیسے پر گھنٹوں تکرار کریں گے۔ ایک بڑا سا مکان بھی بنوا رکھا ہے۔ اور اس کے مختلف حصے کرائے پر اٹھا رکھے ہیں۔ کرایہ اس سختی سے وصول کرتے ہیں کہ کوئی سود خوار پٹھان اپنا قرض بھی اس طرح نہ وصول کرتا ہوگا۔ نہ صرف روپے پیسے کے معاملے میں بلکہ علم کے معاملے میں بھی ان کا بخل اسی درجے کا ہے۔ ان سے کسی سلسلے میں استفادہ کرنا اور کچھ معلوم کر لینا یا اپنی ریسرچ کے سلسلے میں مدد لینا آسان کام نہیں۔ میرے علم کے مطابق اب تک اس مقصد میں محض ان کے شاگرد مختار الدین احمد صاحب کامیاب ہوئے ہیں۔ مئی جون کی چلچلاتی دوپہر میں میمن صاحب ان کو ریسرچ میں مدد دینے کے لئے بلاتے تھے لیکن آرزو صاحب کو بھی کام کرنے کی وہ دھن تھی کہ دو سال تک بلا ناغہ حاضری دیتے رہے اور کام ختم کر کے چھوڑا۔

میمن صاحب ویسے کافی ظریف اور بذلہ سنج آدمی ہیں اور ادھر ادھر کی باتیں خوب مزے لے لے کر کرتے ہیں جہاں کسی نے بیچ میں کوئی علمی مسئلہ چھیڑ دیا تو فوراً کہیں گے "اجی حضرت آپ کن دھندوں میں پڑ گئے چھوڑیئے اس کو، بتایئے کشمیر کے سلسلے میں پاکستان نے اب کیا بیان دیا ہے"۔ میمن صاحب کے مکان میں نہ تو کوئی آراستہ ڈرائنگ روم ہے۔ اور نہ ہی بیٹھنے کا کوئی کمرہ۔ لکڑی چارپائی پر بیٹھے ہوئے حقہ گڑگڑاتے رہتے ہیں۔ تمباکو بڑا اچھا پیتے ہیں اور طرح طرح کے تمباکوؤں کو ملا کر تجربہ کرتے رہتے ہیں۔ اپنے شاگردوں سے تمباکو اور امین آباد لکھنؤ میں تماکو کے یہاں کی بنی ہوئی خوبصورت چلموں کی فرمائش کرتے ہیں۔ شام کو ان کی نشست اٹھنا بیٹھنا انگل

کے ایک نابینا مدرس کے یہاں رہتی ہے۔ یہ نابینا مدرس خود باغ و بہار آدمی ہیں اور سارے علی گڑھ کی خبروں کی کنجی۔ یمین صاحب روزانہ ان کے پاس سے ہر طرح کی مقامی اطلاعات کا ذخیرہ جمع کر کے اپنے گھر واپس جاتے ہیں۔ گھر پر ایک ریڈیو بھی ہے لیکن گھڑی دیکھ کر ٹھیک اسی وقت ریڈیو کھولتے ہیں جب خبریں آ رہی ہوں۔ کوئی اور پروگرام نہیں سنتے۔

علامہ اقبال کا ذکر بہت کرتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ علی گڑھ میں انہی کے توسط سے مجھے جگہ ملی تھی۔ اقبال کے ذاتی حالات سے متعلق ان کے پاس معلومات کا ایک ذخیرہ ہے۔ مختار الدین آرزو صاحب کے ساتھ مجھے اکثر جانے کا اتفاق ہوا ہے۔ میں خاص طور سے اسی موضوع کو چھیڑ دیتا تھا اور ان کی باتیں سنتا رہتا تھا۔ کبھی کبھی ہنسی مذاق میں عربی کے اشعار پڑھتے ہیں اور ان کا مطلب اردو میں بڑے عمدہ طور پر سمجھاتے ہیں۔

سنہ ۱۹۴۹ء میں شعبہ عربی کی چیئرمین شپ سے سبکدوش ہو چکے تھے لیکن اس کے بعد بھی علی گڑھ ہی میں قیام رہا۔ پچھلے سال انہیں پاکستان میں علوم اسلامی کے تحقیقی ادارہ کا ڈائرکٹر بنا دیا گیا ہے اور سنا ہے وہاں اٹھارہ سو روپے تنخواہ ہے۔ اب بھی چھٹے چھ ماہے آتے رہتے ہیں۔

پنڈت حبیب الرحمٰن شاستری

سنسکرت کے عالم ہیں اور یونیورسٹی میں سنسکرت کے استاد۔ ویدانت اور اسلامی تصوف دونوں پر آپ کا مطالعہ بہت وسیع ہے اور مختلف فلسفوں پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ ایک زمانے میں ان کے مضامین جامعہ اور ہندوستانی وغیرہ میں چھپا کرتے تھے جس میں ان کا مضمون "راس لیلا" خاص طور پر اہم ہے جس میں کرشن کے رقص اور اس کے مختلف پہلوؤں کی رمزیت اور اشاریت کی فلسفیانہ توجیہہ کی ہے۔ اردو میں ایک کتاب "رس یا فلسفۂ نشاط" کے نام سے لکھی تھی جو مسلم یونیورسٹی پریس سے محمد مقتدیٰ خاں شروانی کے اہتمام میں شائع ہوئی تھی۔ یہ کتاب پنڈت جی نے "ترجمان حقیقت ڈاکٹر سر محمد اقبال" کے نام معنون کی تھی۔ سادہ وضع رکھتے ہیں۔ دیکھنے میں عالمانہ وقار کا اندازہ نہیں ہوتا لیکن جب بولتے ہیں تو مجلس پر چھا جاتے ہیں۔ شعبہ فلسفہ و نفسیات کے اہتمام میں اکثر آپ کے توسیعی لکچر ہوئے ہیں جن میں میں بھی شریک رہا ہوں اور اس میں شک نہیں کہ تحقیق کا حق ادا کر دیتے ہیں۔ عملی تصوف سے بھی لگاؤ ہے۔ ڈاکٹر عشرت حسین انور کے یہاں اکثر نشست ہوتی ہے۔ اور تصوف و روحانیت کے موضوع پر گھنٹوں باتیں ہوتی ہیں۔ حقے سے بھی شوق ہے۔ جس زمانے میں میرا قیام ۵۔ حالی روڈ پر تھا تو میں نے انہیں مولوی مشتاق حسین صاحب (اورینٹل اسسٹنٹ لٹن لائبریری) کے پاس خوشبودار تمباکو پیتے اور کڑک کر باتیں کرتے سنا ہے۔ شمشاد بلڈنگ کے ایک معمولی کوارٹر میں رہتے ہیں اور سارا وقت مطالعے میں صرف کرتے ہیں۔ اپنے صاحبزادے کی آوارگی سے بہت نالاں رہتے ہیں

مولانا ضیاء احمد بدایونی

"دیوان مومن" کے شارح و مرتب مولانا ضیاء احمد بدایونی فارسی و عربی کے زبردست عالم و محقق اور اسلامی فقہ و تصوف فلسفہ و منطق اور عروض و بیان کے مسلم الثبوت ماہرین میں سے ہیں۔ آپ کا شمار ہندوستان کے ان چند علماء میں ہوتا ہے جن سے آئے دن ہزارہا محقق و تنقید نگار اور علمی و ادبی کام کرنے والے استفادہ کرتے رہتے ہیں۔ علی گڑھ میں جب کوئی علمی مسئلہ حل نہیں ہوتا تو مولانا کی طرف رجوع کیا جاتا ہے اور وہ اسے باتوں باتوں میں پانی کر دیتے ہیں یہاں کے ایک نوجوان اور ذہین ادیب مولانا کے تبحر علمی کے اس لئے قائل نہیں تھے کہ انہوں نے موٹی موٹی کتابوں کی تصنیف نہیں کی ہے اور نہ ہی پیشہ ور مصنف کی طرح نام کمایا ہے۔ ایک بار یہی حضرت جو غالب پر ریسرچ کر رہے تھے اور فارسی کے

بعض شعراء کے تقابلی مطالعے کے سلسلے میں اپنی ذہانت کے علاوہ ملک کے متعدد مشہور ادیبوں اور نقادوں سے رجوع کر چکے تھے بالآخر جب مولانا کے پاس تشریف لے گئے تو مولانا نے چند منٹوں میں ساری دقتیں حل کر دیں اس کے بعد وہ صاحب اتنے متاثر ہوئے کہ سب سے کہتے تھے "واقعی یہ شخص خلیج فارس کا مگرمچھ ہے"۔ اس تشبیہ میں جہاں ان صاحب کی ذہانت اور مولانا کے تبحر علمی کا پتہ چلتا ہے وہیں ان کے حلیئے اور چال ڈھال کا بھی اندازہ ہو جاتا ہے۔ پچاس سال سے زائد عمر ہو گی، توند نکل آئی ہے۔ متشرع شباہت اور چوڑی مہری کا اونچا پائجامہ ہاتھوں میں چھڑی لے چلتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آہستہ آہستہ رینگ رہے ہیں اور پھنکارتے جا رہے ہیں۔

مولانا بدایوں کے ایک علمی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ شرافت، وضعداری، دردمندی اور حلم و بردباری آپ پر ختم ہے۔ علم کا غرور جو ہمارے بیشتر علماء کا تکیہ سخن ہے مولانا میں کچھ بھی نہیں گیا ہے۔ مولانا شبلی کے طرز کی نعتیہ نظمیں بھی لکھتے ہیں اور پرانے انداز کی غزلیں بھی۔ ان کی نظموں کا مجموعہ "تجلیات" کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ انجمن اردوئے معلیٰ کے جلسوں میں رشید صاحب کے اصرار سے اپنی غزلیں ترنم سے پڑھتے ہیں۔ انہیں جب بھی میں نے معصومیت سے پڑھتے سنا ہے تو بے ساختہ مرحوم حسرت موہانی کی یاد آ جاتی ہے۔

علی گڑھ میں اپنا ذاتی مکان بدر باغ میں "بیت الحبیب" کے نام سے بنوایا ہے۔ شعبہ فارسی میں ریڈر ہیں اور ہمہ وقت مطالعے میں مشغول رہتے ہیں۔ افسوس ہے ان کی اولاد میں بھی کوئی ان کا جانشین نظر نہیں آتا۔

خواجہ منظور حسین

علی گڑھ کے ان چند فرزندوں میں ہیں جن پر علی گڑھ نے ہمیشہ ناز کیا ہے۔ ان کے علمی وقار اور تنقیدی نظر کا نہ صرف ہندوستان کے چوٹی کے ادیب اعتراف کرتے ہیں بلکہ انگلستان اور فرانس وغیرہ میں ان کا قول سند مانا جاتا ہے۔ ٹی ایس ایلیٹ اور ای ایم فارسٹر جیسے مشاہیر آپ کے گہرے دوست ہیں اور انکی اور دوسرے ملکوں کے اول درجہ کے ادیب اپنی تصنیف خواجہ صاحب کو بطور تحفہ بھیجتے ہیں اور انکی اپنی رائے طلب کرتے ہیں پروفیسر احمد علی نے اپنی انگریزی کتاب T.S-Eliot's Prey World of Dream خواجہ صاحب کے نام معنون کی ہے۔ تمنائی نے چین کی بہترین کہانیوں کو پہلی بار اردو میں خواجہ صاحب کے ہی ایماء سے منتقل کیا اور انہی کے نام اپنی کتاب "زندہ چین" کا انتساب کیا۔ آل احمد سرور جیسے فاضل نقاد خواجہ صاحب کے تربیت یافتہ ہیں۔ ان کی کتاب "تنقید کیا ہے" خواجہ صاحب کے نام معنون ہے۔ پروفیسر وقار عظیم نے "نیا افسانہ" کے نام سے جو کتاب لکھی ہے اس میں بہت کچھ خواجہ صاحب کی رہنمائی کو دخل ہے جس کا انہوں نے اپنے دیباچے میں اعتراف کیا ہے۔

علی گڑھ میں خواجہ صاحب شعبۂ انگریزی کے صدر تھے۔ آکسفورڈ سے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے بعد انہوں نے علی گڑھ کو اپنا مستقر بنا لیا تھا اور یہیں اپنا ذاتی مکان بدر باغ میں بنوایا تھا۔ ان کی شادی یہیں کے پروفیسر ایم، ایم شریف (سابق صدر شعبہ فلسفہ) کی صاحبزادی سے ہوئی تھی اور اس طور پر میاں افتخار الدین اور احمد شاہ بخاری پطرس کے ہم زلف ہوتے ہیں۔ دہلی کے شرفاء میں سے ہیں، ان کے اسلاف میں سے ایک باکمال شخص خواجہ صاحب گزرے ہیں جن کا ذکر اشرف صبوحی نے اپنی کتاب "دلی کی چند عجیب ہستیاں" میں کیا ہے۔

خواجہ صاحب خوبصورت آدمی ہیں۔ گورا چٹا رنگ، میانہ قد، کلین شیوڈ، شیروانی اور چوڑی دار پاجامہ عام طور پر پہنتے تھے۔ عام گفتگو میں انگریزی کا ایک لفظ بھی استعمال نہیں کرتے تھے۔ ان کی زبان دہلی کی خالص ٹکسالی زبان ہوتی تھی۔ ان کو میں نے صرف ایک بار انگریزی میں تقریر کرتے ہوئے سنا ہے۔ جب ای ایم فارسٹر علی گڑھ آئے تھے اور یونین ہال میں خواجہ صاحب نے ان کا خیر مقدم کیا تھا۔ شعبۂ انگریزی کی "ریلے لٹریری سوسائٹی" میں خواجہ صاحب ہر سال کسی نہ کسی موضوع پر ایک وقیع مقالہ انگریزی میں پڑھتے تھے۔ اس مقالے کو سننے کے لئے لوگوں کو کتنا اشتیاق ہوتا تھا اور کتنے مشاہیر اس مجلس میں موجود ہوتے تھے اس سے علی گڑھ والے خوب واقف ہیں۔

خواجہ صاحب انتہائی خلیق اور ملنسار ہیں ۔ ایک معمولی طالب علم بھی ان کے یہاں پہنچ جاتا تھا تو گھر سے فوراً نکل آتے اور گھنٹوں اس کے ساتھ اپنے لان میں ٹہل ٹہل کر باتیں کرتے ۔

اپنے دوست تصور حسین زیدی کے ساتھ جو اس زمانے میں انگریزی میں ایم اے کے طالب علم تھے مجھے بارہا ان کے ہاں جانے کا اتفاق ہوا ہے ۔ خواجہ صاحب کا ادبی نقطۂ نظر بہت سلجھا ہوا تھا ، ترقی پسند شعرا میں فیض اور جذبی اور افسانہ نگاروں میں بیدی کے قائل تھے ۔ کرشن چندر اور سردار جعفری کے ادب میں جو صحافتی عنصر ہے اس پر کڑی تنقید ہم لوگوں نے خواجہ صاحب سے اسی زمانے میں بھی سُنی ہے ۔ جب ان کی شہرت و مقبولیت حد درجہ بڑھی ہوئی تھی ۔ جذبی صاحب پر بطور خاص شفقت فرماتے تھے ۔ انہوں نے اپنے مجموعۂ کلام " فروزاں " کی ترتیب و انتخاب میں خواجہ صاحب کو ہی رہنما بنایا ۔

اُردو میں خواجہ صاحب نے کوئی مستقل کتاب شائع نہیں کی لیکن اُردو ادب میں خواجہ صاحب کی خدمات سے اہل نظر واقف ہیں ۔ وہ ان چند ادیبوں میں سے ہیں جنہوں نے سب سے سے پہلے فرانسیسی اور روسی ادب کے شاہکاروں کو اُردو ادب میں منتقل کیا ۔ آج بھی علی گڑھ منتھلی ، جامعہ اور اُردو کے پُرانے فائلوں میں خواجہ صاحب کے ترجمے دیکھے جا سکتے ہیں ۔ ایک طویل مقالہ " ادب اور اخلاق " بھی لکھا تھا جو علیگڈھ کے ایک جلسے میں پڑھا گیا تھا لیکن نہ جانے کیوں کتابی صورت میں شائع نہیں ہوا ۔ دراصل خواجہ صاحب کا علم اور شعور اب اس درجہ تک پہنچ چکا ہے کہ وہ اپنی لکھی ہوئی چیزوں سے مطمئن نہیں ہوتے ۔ کہتے ہیں کہ کوئی تحریر جب تک خود میرے اپنے معیار پر پوری نہ اترے اسے کس طرح اشاعت کے لئے دے دوں ۔ یہی سبب ہے ۔ کہ میر پر ان کی کتاب اب تک ۔ مسودے کی شکل میں ان کے پاس پڑی ہوئی ہے یہ کتاب اگر خواجہ صاحب کسی طرح چھپوانے کے لئے آمادہ ہو جائیں تو میرا خیال ہے اُردو تنقید میں یہ سب سے معیاری اور قیمتی اضافہ ہوگا ۔ خواجہ صاحب کی گپ شپ اور ان کی باتیں سُن کر علی گڈھ کے بہت سے طالب علم اور لکچرر ادیب اور نقاد ہو گئے اور ادبی دُنیا میں شہرت حاصل کر لی ۔ خواجہ صاحب کا ضبط دیکھئے کہ وہ اپنی جگہ سے نہیں ہلتے ۔ شہرت کی خواہش کبھی بھولے سے بھی ان کے دل میں نہیں پیدا ہوتی ۔

اپنی طالب علمی کے زمانے میں خواجہ صاحب " علی گڈھ میگزین " کے ایڈیٹر تھے ۔ اس زمانے کے میگزین دیکھنے کے قابل ہیں ۔ ان میں خواجہ صاحب کے اس دور کے مضامین اب بھی اپنے طرز انشاء اور سوجھ بوجھ کے لحاظ سے خاصے کی چیز ہیں ۔ سجاد انصاری خواجہ صاحب کے عزیز ترین دوست تھے اُردو میں اپنی نوعیت کے اکیلے فلسفیانہ اور فکر انگیز مضامین خواجہ صاحب کی تحریک سے پہلی بار لکھے گئے جسے خواجہ صاحب نے ان کی وفات کے بعد " محشر خیال " کے نام سے مرتب کر کے شائع کیا ۔ سچ تو یہ ہے کہ اگر یہ کتاب اس زمانے میں مرتب ہو کر شائع نہ ہو گئی ہوتی تو آج اس جواں مرگ ادیب کو کوئی نہ جانتا ۔

۱۹۴۸ء میں خواجہ صاحب پاکستان چلے گئے اور آج کل گورنمنٹ کالج لاہور کے پرنسپل ہیں ۔ سُنا ہے اقبال پر ایک کتاب لکھی ہے اور اسے شائع کرنے کا ارادہ بھی رکھتے ہیں ۔ کاش وہاں کے لوگ اس قیمتی متاع کو خواجہ صاحب سے برآمد کرنے میں کامیاب ہو جائیں ۔

قاضی عبدالغفار

" لیلیٰ کے خطوط " کے جواں طراز اور جواں نگار مصنف جب تقسیم ہند کے بعد انجمن ترقی اُردو (ہند) کے سکریٹری ہو کر علی گڈھ تشریف لائے تو اس وقت ان پر خزاں کا عالم تھا ۔ صحت جواب دے چکی تھی اور طبیعت بجھ سی گئی تھی پھر بھی شائستگی و نفاست اور تہذیب و شرافت کا ایک پیکر تھے ۔ ان کو دیکھ کر کسی ایسے ملبوس کا گمان ہوتا تھا جو ابھی ابھی دھل دھلا کر آیا ہو اور گرد یا دھبے کا ہلکا سا نشان بھی نہ ہو ۔ اپنے لباس

اور طرزِ نگارش کے اعتبار سے قاضی صاحب بھی مولانا ابوالکلام آزاد کی طرح ایک ارسٹوکریٹ ادیب تھے لیکن مولانا کے برخلاف قاضی صاحب نہ تو خلوت پسند تھے اور نہ ہی انانیت کے اسیر۔ انتہائی ملنسار، نرم طبیعت، بردبار اور عفو و درگزر سے کام لینے والے آدمی تھے یہی وجہ ہے کہ فریب کھانا اور پھر اس کی تجدید کرنا ان کی شخصیت کا ایک جزوبن چکا تھا۔ ان کی نرمی اور بھلمنساہٹ سے فائدہ اٹھا کر بہت سے نالائق نہ صرف ان کو بلکہ انجمن کو نقصان پہنچاتے اور قاضی صاحب کی افسردگی اور آزردگی میں اضافہ کرتے۔ یہی وجہ ہے کہ سخت علالت کے دوران میں بھی بستر پر بیٹھے بیٹھے انجمن کا کام کیا کرتے اور سارے خطوط کا جواب خود دیتے۔ آخر عمر میں اپنے ساتھ کام کرنے والوں کا اعتبار اٹھ گیا تھا۔ نوجوان ادیبوں کی ہمت افزائی اور ان کے لئے ہر طرح کمربستہ رہنا قاضی صاحب کا ایسا جوہر تھا جو پرانی نسل کے لوگوں میں مجھے کسی اور میں نظر نہیں آیا۔ آج سے کئی سال پہلے "ادب لطیف" میں میرا مضمون "بہادر شاہ ظفر" چھپا تو انہیں بہت پسند آیا۔ رقعہ بھیج کر مجھے بلایا اور بہت ہی تعریف کی اور کہا کہ جس نقطۂ نظر سے تم نے بہادر شاہ ظفر پر تنقید کی ہے وہ بالکل نئی چیز ہے اور بہت ہی قابلِ قدر۔ میری خواہش ہے کہ تم اسی نقطۂ نظر سے ظفر کے کلام کا ایک انتخاب مرتب کر دو۔ میں اسے انجمن سے شائع کروں گا۔ اور اگر انجمن کی لٹریری کمیٹی نے نامنظور کر دیا تو اپنے خرچ سے طبع کراؤں گا۔ میں نے یہ انتخاب مرتب کر کے دیدیا، اتفاق کہ اسی زمانے سے قاضی صاحب پر سخت علالت کا دورہ پڑنے لگا اور ان کا زیادہ وقت حیدر آباد اور بمبئی میں علاج کے سلسلے میں صرف ہونے لگا اور میرا مسودہ انجمن کی فائل میں پڑا رہ گیا اور اب اس کی اشاعت کی نہ جانے کب نوبت آئے۔

علی گڑھ میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی طرف سے کوئی جلسہ ہوتا اور قاضی صاحب کو مدعو کیا جاتا تو اپنی ناتوانی کے باوجود آتے ایک بار کرشن چندر کی آمد کے موقع پر سالانہ جلسہ ہوا تو قاضی صاحب نے صدارت بھی کی اور خطبہ صدارت لکھ کر لائے۔ جس زمانے میں مسلم یونیورسٹی گزٹ کی ادارت کا بار میرے کاندھوں پر تھا میں نے حسرت موہانی کی وفات پر ان سے ایک مضمون گزٹ کے لئے لکھنے کو کہا۔ دوسرے ہی دن قاضی صاحب نے یہ فرمائش پوری کی اور اس کا اصل مسودہ عنایت فرمایا اور کہا کہ یہ اب تمہارے اخبار کے علاوہ کہیں اور نہ بھیجا جائے گا یہاں کے چند اساتذہ نے آج سے دو سال قبل ایک علمی ادبی رسالہ "فکر و نظر" کے نام سے شائع کرنے کی اسکیم بنائی اور اشاعت کے لئے آپس میں چندہ کیا، اس رسالے کے لئے قاضی صاحب نے سب سے پہلے چندہ دیا اور انجمن کی طرف سے "فکر و نظر" کے لئے اشتہار بھی دلوایا۔ اس کی مجلس ادارت کا پہلا مشاورتی جلسہ قاضی صاحب نے خود اپنے یہاں کیا۔ اس موقع پر انہوں نے ایک پُر تکلف دعوت بھی کی۔ میں ان کے قریب ہی بیٹھا ہوا تھا اور جھجک جھجک کر کھا رہا تھا۔ قاضی صاحب نے فوراً بہت سی چیزیں میری طرف بڑھا دیں اور کہنے لگے میں تو اپنی ضعیفی اور علالت کی وجہ سے مرغن غذائیں ہضم نہیں کر سکتا لیکن میں نے آپ نوجوانوں کی دعوت اس لئے کی ہے کہ خود آپ کو کھاتے دیکھ کر مجھے ایک تسکین سی ہوتی ہے۔

علی گڑھ میں ہر سال ایک آل انڈیا مشاعرہ ہوتا ہے۔ جس میں مشاہیر شعراء تشریف لاتے ہیں اس موقع پر قاضی صاحب کے یہاں ایک دعوت اور شعر و شاعری کی نشست ضرور ہوتی تھی۔ اس میں علی گڑھ کے شعراء کو بھی بلاتے۔ اتنی ستھری شعر و سخن کی بزم میں میں نے کہیں اور نہیں دیکھی۔

قاضی صاحب کا وطن مراد آباد میں تھا۔ علی گڑھ کالج کے تعلیم یافتہ تھے اس کے بعد صحافتی دنیا میں داخل ہوئے اور مولانا محمد علی کے ساتھ ہمدرد و کامریڈ میں اور پھر مولانا ابوالکلام آزاد کے ساتھ کلکتہ میں کام کیا۔ خود بھی کئی اعلیٰ درجے کے اخبار نکالے جس میں "جمہور" اور "صباح" کلکتہ سے اور "پیام" حیدر آباد سے نکلا اور صحافت نگاری کی تاریخ میں ایک نمایاں مثال قائم کی۔ قاضی صاحب کے قلم سے ایک سطر بھی ایسی نہ نکلتی تھی جو ایک مخصوص طرزِ نگارش کی حامل نہ ہو۔ اس درجے کے صحافی آئندہ زمانے میں کم نکلے ہیں۔

علی گڑھ میں ان کا قیام صاحبزادہ آفتاب احمد کی کوٹھی "آفتاب منزل" کے ایک حصے میں تھا۔ ان کے ڈرائنگ روم اور خوابگاہ وغیرہ میں جانے کا بارہا اتفاق ہوا۔ وہاں [illegible] علامہ مولانا ابوالکلام آزاد کی جوانی کی تصویر [illegible] جو قاضی صاحب کے [illegible]

ڈاکٹر انصاری، حکیم اجمل خاں اور مولانا محمد علی کی تصویریں بھی اپنی طرف متوجہ کرتی تھیں۔ قاضی صاحب کے داماد چودھری محمد سلطان صاحب مسلم یونیورسٹی میں شعبہ سیاسیات میں ریڈر ہیں اور قاضی صاحب سے چند ہی قدموں کے فاصلے پر نواب ساجد علی صاحب کی کوٹھی میں فروکش ہیں۔ اپنے نواسے طارق سلطان سے بہت پیار کرتے تھے اور اسے بیٹے کی طرح اپنے ہی ساتھ رکھتے تھے۔

۱۷ر جنوری ۱۹۵۶ء کو تین بجے دن میں قاضی صاحب کا علی گڑھ ہی میں انتقال ہوگیا۔ علالت کا سلسلہ عرصے سے چل رہا تھا۔ لیکن یہ اندازہ نہ تھا کہ اس قدر جلد ہم سے رخصت ہو جائیں گے۔ یونیورسٹی کے قبرستان میں سپرد خاک ہوئے۔ دوسرے دن یونیورسٹی یونین میں بھی ایک تعزیتی جلسہ ہوا۔ یہ عجیب بات ہے کہ اس جلسے میں یہاں کے طالب علموں اور استادوں کی تعداد بہت کم تھی۔ ذاکر صاحب نے اس موقع پر تقریر کرتے ہوئے آبدیدہ ہو کر کہا کہ "میں آپ لوگوں کو گواہ بنا کر یہ وصیت کرتا ہوں کہ اگر میں مر جاؤں تو میرے مرنے پر نہ کوئی جلسہ ہو اور نہ یونیورسٹی بند کی جائے۔"

ڈاکٹر ذاکر حسین

ذاکر صاحب سے میری ذاتی واقفیت علی گڑھ سے پہلے کی ہے۔ ۱۹۴۷ء میں انٹرمیڈیٹ کا امتحان پاس کرنے کے بعد میں نے جامعہ ملیہ دہلی میں عارضی طور پر کلرکی کرتی تھی۔ ذاکر صاحب کا قاعدہ ہے کہ وہ جہاں رہیں گے چھوٹے سے چھوٹے آدمی سے بھی ملیں گے، اس سے کرید کرید کر باتیں پوچھیں گے اور طرح طرح سے اس سے تعلقات بڑھائیں گے۔ میں ذاکر صاحب کی شہرت وعظمت اور ان کی تعلیمی خدمات کا پہلے ہی معترف تھا بلکہ جامعہ ملیہ کی پچیس سالہ جوبلی کے موقع پر ۱۹۴۶ء میں اس لئے دہلی گیا تھا کہ ذاکر صاحب کی تقریر سنوں اور واقع یہ ہے کہ یہ پہلی تقریر تھی جسے سن کر میری آنکھیں ڈبڈبا آئی تھیں اور دل پگھل گیا تھا۔ اب جامعہ کی کلرکی کے زمانے میں ذاکر صاحب کی شخصیت نے اور بھی مسحور کر دیا اور پھر تو یہ حال ہوگیا کہ اپنی چھوٹی چھوٹی ضروریات کے لئے جسے احباب کے سامنے کہنے میں بھی جھجک ہوتی۔ میں بلا تکلف ذاکر صاحب سے کہہ دیتا تھا اور وہ اس سلسلے میں کچھ نہ کچھ کرتے یا مجھے اس طرح مطمئن کر دیتے کہ میں سرے سے اس ضرورت ہی کو مہمل سمجھنے لگتا۔ یہ ذاکر صاحب کا خاص آرٹ ہے اور اس جادو سے بچنا کم از کم میرے لئے مشکل ہے۔ میں جب بھی ان کی خدمت میں کسی کام سے حاضر ہوا ہوں تو واپس آکر چاہے مقصد پورا نہ ہوا ہو لیکن گمان یہی ہوتا ہے کہ سو فی صدی کامیابی ہوئی ہے۔ بعض اوقات ذاکر صاحب لطف لینے کے لئے دانستہ بھی غلط باتیں کہتے ہیں اور کچھ اس طور سے کہ آدمی مہر ڈال دیتا ہے۔ پھر مسکراتے ہیں اور بڑے دلآویز طور پر کہتے ہیں بھئی میں غلط کہہ رہا تھا آپ اتنی جلدی قائل کیوں ہو گئے۔ ذاکر صاحب بڑے بڑے خیالات اور اعلیٰ مقاصد کا اظہار کرنے والوں سے بالکل متاثر نہیں ہوتے، ان کا اندازہ ہے کہ ایسے لوگ عموماً زندگی میں ناکام رہتے ہیں کیوں کہ یہ لوگ جذباتی اور تخیل پرست ہوتے ہیں اور عمل کی صلاحیت سے محروم۔ ان کا یہ قول بہت مشہور ہے کہ "کھٹ کھٹ کئے جاؤ کچھ نہ کچھ ہو ہی جائے گا۔" یہی وجہ ہے کہ صبر وشکر کے ساتھ مستقل مزاجی سے اپنے کام میں لگے رہنے والوں کو بہت پسند کرتے ہیں دوسری بات یہ ہے کہ وہ اپنے ملنے والوں سے اس بات پر بہت زور دیتے ہیں کہ زندگی میں جو چھوٹے چھوٹے کام، چھوٹی چھوٹی ذمہ داریاں اور بظاہر معمولی مطالبات ہیں انہیں حقیر سمجھ کر نظر انداز نہ کرنا چاہئے۔ وہ کہتے ہیں جو شخص ان چھوٹے چھوٹے کاموں کے کرنے کا سلیقہ اور ظرف نہیں رکھتا وہ بڑے بڑے کام بھی نہیں کر سکتا اور نہ ہی بڑی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہو سکتا ہے۔

ذاکر صاحب کی ایک اور چیز سے میں بطور خاص متاثر ہوں اور وہ ان کا لکھنے کا طریقہ ہے۔ ذاکر صاحب اگرچہ پیشہ ور ادیب نہیں ہیں۔ ضرور تاً ہی کبھی کبھی مضمون یا خطبہ لکھتے لیکن ان کی ایک ایک سطر میں ان کا طرز نگارش عجیب جادو جگاتا ہے۔ میرا خیال ہے ذاکر صاحب ایک صاحب طرز ادیب ہیں اور ان کی اس خصوصیت کو ہمارے بڑے بڑے پیشہ ور ادیب اور نقاد نہیں پہنچتے جنہوں نے ادب ہی کے لئے عمریں گنوا دی ہیں۔ ان کا لکھنے کا انداز خالص تخلیقی ادب کا سا ہے۔ عموماً اس وقت لکھنے [illegible] سے گزرنے والا ہو لیکن اپنی تحریر میں اپنی

شخصیت کا سارا رچاؤ سمو دیتے ہیں۔ سادہ نثر اتنی دلآویز اور تخلیقی جوہر سے اتنا مالا مال کسی اور ادیب، یا سیاستدان اور ماہر تعلیم کے یہاں مجھے نہیں ملی۔ خط لکھنے کا پیڈ سفید ہوتا ہے۔ اگر اس پر نام چھپا ہوا ہو تو اردو میں چھپا ہوگا۔ عموماً مضامین بھی اپنے پیڈ ہی پر لکھتے ہیں۔ سوادِ خط اس قدر خوبصورت ہے کہ رشک آتا ہے۔ کہیں سے کوئی جملہ یا فقرہ کٹا ہوا نہیں ملے گا۔ پوری تحریر آئینے کی طرح صاف و شفاف ہوتی ہے۔ گورنمنٹ کی ملازمت کے دوران میں کانووکیشن کے موقع پر ان کی افتتاحی تقریر چھاپنے کے لئے مجھے جانا پڑتا تھا اور جب مسودہ میرے ہاتھ میں آتا تھا تو گھنٹوں دیکھا کرتا۔ کئی بار میں نے خود اسی طرح کا ہینڈ رائٹنگ بنانے کی مشق کی لیکن بہت کم کامیابی ہوئی ویسے ان کے دستخط کی نقل میں اچھی خاصی کر لیتا تھا۔

ذاکر صاحب میں ذہانت اور سلیقہ دونوں بلا کا ہے۔ وہ اپنے مخصوص موضوعات تعلیم، معاشیات اور فلسفہ کے علاوہ دنیا بھر کے موضوعات پر اچھی خاصی معلومات رکھتے ہیں۔ جغرافیہ، سائنس، انجینئرنگ، طب اور سرجری، تاریخ، ادب، شعر، تصوف، مذہب، رقص و موسیقی کوئی شعبہ نہیں جس پر ذاکر صاحب کی دسترس نہ ہو۔ اس موضوع پر ان سے اگر کسی تقریب یا جلسے کا افتتاح کرنے کے لئے بھی کہا جائے گا تو ایسی خیال انگیز باتیں کریں گے کہ اس کے بڑے بڑے ماہرین دنگ رہ جائیں گے۔ عموماً اس قسم کی معلومات، وہ ثانوی ذرائع سے حاصل کرتے ہیں یعنی اس موضوع سے متعلق کسی کی باتیں سن کر یا کسی شخص سے کرید کرید کر کچھ پوچھنے کے بعد لیکن وہ اس علم کو اس طرح ہضم کر لیتے ہیں اور اس طرح اپنے ذہن میں رچا بسا لیتے ہیں کہ کسی کو شبہ بھی نہیں ہو سکتا کہ ذاکر صاحب اس کے منتہی نہیں ہیں۔

علی گڈھ کے استادوں سے ان کو عام طور پر یہ شکایت رہتی ہے کہ یہ لوگ اپنے علم سے کام لینا نہیں جانتے۔ ہمارے یہاں پروفیسر محمد حبیب، ڈاکٹر ہادی حسن، ڈاکٹر بابر مرزا جیسے تاریخ داں اور ماہرین سائنس موجود ہیں لیکن دنیا ان کو اس لئے نہیں جانتی کہ ان کی تصانیف نہیں ہیں اور اگر ہیں تو برائے نام۔ ذاکر صاحب نے "یوم سرسید" کے موقع پر ایک بار تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ سرسید کو دیکھئے کہ کام کرنے کی ایسی دھن تھی کہ فن زراعت، ہومیوپیتھک، رسالہ بیدھا اور رسالہ طاعون تک لکھ ڈالا حالانکہ وہ ان فنون کے ماہر نہ تھے۔ لیکن ہمارے یہاں کے استاد ان کے ماہر ہو کر بھی آنے والی نسلوں کے لئے کچھ نہیں چھوڑنا چاہتے۔

رشید احمد صدیقی

رشید صاحب کے مضامین کا جادو تو مجھ پر اسی زمانے میں چل گیا تھا جب میں اعظم گڈھ میں ہائی اسکول کا طالب علم تھا اور سچ تو یہ ہے کہ ان کے مضامین علی گڈھ کے بارے میں پڑھ پڑھ کر میں علی گڈھ کا گرویدہ ہو گیا تھا اور یہی مضامین مجھے یہاں کھینچ کر لائے۔ رشید صاحب کی تصویر "مضامین رشید" میں دیکھ چکا تھا اور ان کی شخصیت کے بارے میں ذہن طرح طرح کے نقوش بناتا رہتا۔ اعظم گڈھ سے چلنے لگا تو شبلی کالج کے پرنسپل بشیر احمد صدیقی صاحب نے جو رشید صاحب کے عزیز اور نسبتی بھائی تھے مجھے تعارفی خط دیا لیکن علی گڈھ میں اس تعارفی خط کا رشید صاحب پر کوئی خاص اثر نہیں ہوا سوائے اس کے کہ انہوں نے کہا کہ میرے پاس ضرور اسی وقت آئیے گا۔ جب آپ کو ڈیوٹی سوسائٹی سے قرض کی ضرورت ہو۔ اس قرض کی مجھے کئی بار ضرورت پڑی اور رشید صاحب کے یہاں جانا پڑا۔ گھر پر بار بار جاتا اور واپس آ جاتا کیونکہ اول تو مکان اس قدر لق و دق ہے کہ دروازے سے گھر کے اندر باوجود چلانے اور دروازہ کھٹکھٹانے کے آواز نہ پہنچتی دوسرے یہ کہ اگر کوئی لڑکی یا مالی برآمد بھی ہوا تو اس نے فوراً جواب دیا کہ "رشید صاحب گھر میں نہیں ہیں"۔ ناچار پھر شعبۂ اردو کا چکر لگاتا اور وہاں بھی موجود نہ ہوتے تو شعبۂ اردو کے چپراسی میاں خاں کی ہدایت کے بموجب بشیر الدین صاحب لائبریرین کے کمرے میں جاتا۔ جتنا اکتا کر حاضر ہوتا تھا رشید صاحب بغیر کہے مقصد سمجھ جاتے اور درخواست پر رقم مطلوبہ کی منظوری لکھ کر کہتے [illegible] خاں صاحب (عبدالسعید خاں آنریری سکریٹری ڈیوٹی سوسائٹی) کے پاس لے جائیے۔ چنانچہ اس کے بعد ڈیوٹی [illegible] کی ادائیگی کا چیک حاصل کرنے میں خاں صاحب کے سو سو ناز اٹھانے پڑتے۔

اگرچہ بعد میں اندازہ ہوا کہ خاں صاحب بڑے باغ و بہار آدمی ہیں اور ان کی باتیں نہ صرف دلچسپ ہوتی ہیں بلکہ ان کے پاس معلومات کا بے اندازہ ذخیرہ اور لطائف و ظرائف کا ایک خزانہ ہے۔ علی گڑھ کے ایک ایک شخص کی ساتوں پشت کی تاریخ کوئی ان سے پوچھ لے۔ ایسے ایسے نکتے کریں گے کہ آدمی دنگ رہ جائے اور سچ تو یہ ہے کہ میں ابتدا ہی میں بہار کے ہر شخص کی اہمیت سے واقف ہو گیا تو اس میں خاں صاحب کی ان ملاقاتوں کا بہت کچھ فیضان ہے۔

رشید صاحب کی شخصیت کا شروع شروع میں مجھ پر کچھ اثر نہیں پڑا۔ شکل و شباہت کے اعتبار سے بھی وہ کچھ یونہی سے ہیں۔ لباس اور چال ڈھال سے کسی طرح نہ پروفیسر معلوم ہوتے ہیں نہ ادیب اور نہ ہی کوئی قابل ذکر شخص۔ جو آدمی ان کو نہ جانتا ہو وہ اندازہ نہیں کر سکتا کہ یہی رشید احمد صدیقی ہیں۔ دور سے دیکھ کر ان کو کوئی مزاح نگار تو سمجھ ہی نہیں سکتا۔ ایک آدھ جلسوں میں انہیں تقریر کرتے سنا تو اندازہ ہوا کہ تقریر سے بچنے کی کوشش کرتے ہیں اور صرف ٹالنے یا معذرت کرنے کے لئے کھڑے ہوتے ہیں۔ ایک آدھ فقرے ضرور مزہ دے جاتے تھے لیکن خود ان فقروں کو ادا کرتے ہوئے رشید صاحب کے چہرے پہ کوئی خاص تاثر نہ ہوتا۔

رشید صاحب سے صحیح معنوں میں ملاقات اس زمانے میں ہوئی جب میں بی اے کا طالب علم تھا اور آتش پر میرے مقالات بالاقساط نگار میں شائع ہو رہے تھے۔ غالباً نیاز صاحب نے ان کو لکھا کہ علی گڑھ کے یہ کون صاحب ہیں جن کے مضامین آتش پر ہیں تو رشید صاحب کو میری جستجو ہوئی اور یہ جان کر انہیں بڑا تعجب ہوا کہ میں وہی شخص ہوں جو ڈیوٹی سوسائٹی سے قرض لینے کے لئے انہیں اکثر گھیرتا ہے۔ پھر تو رشید صاحب بہت زیادہ ہو گئے۔ کہا کہ جب مجھ سے ملنے گھر آیا کرو تو اپنا نام ضرور بتا دیا کرو کیونکہ میں نیکر اور بنیائن پہنے ہوئے اپنے باغیچے میں کام کرتا رہتا ہوں۔ غیر ضروری آدمیوں سے ملنے کے لئے کپڑے بدل کر باہر آنا اور پھر ان کے لئے کرسیاں اور مونڈھے نکلوانے میں زحمت ہوتی ہے اور علی گڑھ ایسی جگہ ہے کہ اگر جھوٹ نہ بولا جائے تو سارا دن اسی کی نذر ہو جائے۔

رشید صاحب سے قریب آنے کے بعد پہلا تاثر زائل ہو گیا اور آہستہ آہستہ ان کی شخصیت میں دلکشی نظر آنے لگی۔ اب ان کی باتیں اور ان کے فقروں میں مزہ آنے لگا۔ اور یہ اندازہ بھی ہوا کہ وہ فطری طور پر ایک مزاح نگار ہی ہیں۔ بی اے تک میرے پاس اردو اختیاری مضمون کی حیثیت سے نہیں تھا۔ میرا ارادہ فلسفہ یا معاشیات میں ایم اے کرنے کا تھا لیکن رشید صاحب کے مشورے سے میں نے اردو میں ایم اے کرنے کا ارادہ کر لیا اور ان کا طالب علم ہو گیا۔ رشید صاحب کلاس میں لکچر نہیں دیتے بلکہ باتیں کرتے ہیں اور بسا اوقات موضوع سے بہک بھی جاتے ہیں لیکن ہم لوگوں کو اندازہ ہوتا کہ وہ انتہائی ذہین اور طباع آدمی ہیں اور ان کا ایک ایک جملہ اپنے اندر علم و ادب کا بیش بہا خزانہ رکھتا ہے۔ یہ معلومات، چاہے امتحان کے لئے کام نہ آتیں لیکن زندگی میں یا ادب و شعر کی پرکھ میں تیر بہدف نسخہ ثابت ہوتیں۔ رشید صاحب ڈیپارٹمنٹ کے اسٹاف روم میں بجائے چیئرمین کی کرسی کے ایک نیچی سی آرام کرسی پر بیٹھتے اور وہیں سے بیٹھے بیٹھے دوسرے اساتذہ سے باتیں کرتے ہم نار میں بیٹھ کر چوری چھپے ہم سب یہ باتیں سنتے اور مزے لیتے۔ انجمن اردوئے معلی کے جلسوں میں بھی رشید صاحب کی گل افشانی گفتار دیکھنے کے قابل ہوتی۔

رشید صاحب کی ایک خصوصیت کا میں نے اندازہ کیا کہ وہ جس کو چاہتے ہیں اس کا ہر طرح ساتھ دیتے ہیں چاہے وہ کتنی ہی غلطیاں کرے اور غیر ذمہ داری کا مرتکب ہو۔ اس زمانے میں ڈیپارٹمنٹ کے چپراسی یار خاں سے کہ معبد خاں صاحب بہت سے اساتذہ اور طالب علم بھی شاکی ہوتے۔ وہ کہتے ہیں کہ میرے دوست کے مقابلے میں اگر حضرت جبریل بھی آسمان سے اتر کر آئیں تو میں دوست ہی کی حمایت کروں گا۔

رشید صاحب صحیح معنوں میں ایک تخلیقی فنکار ہیں۔ کتابوں سے زیادہ ان کی توجہ زندگی کے مشاہدات پر ہوتی ہے۔ کہتے ہیں کتابیں تو اکثر انسانی ذہن کو [illegible] دیتی ہیں اور اس سے سارا رس اور [illegible] ہے کہ وہ ان مصنفوں کے کچھ بہت زیادہ

قائل نہیں جو وقت کے کسی مفات یا مصنف کے سال پیدائش کی تحقیق میں برسوں لگاتے ہیں یا سیکڑوں صفحے سیاہ کرتے ہیں۔ ان کا یہ بھی عقیدہ ہے کہ ہر طرح کی بہت سی معلومات جمع کرنا اور اپنے ذہن کو ایک کباڑ خانہ بنا لینا انسان کی آنچ کو ختم کر دیتا ہے اور اس کو شخصیت کی ذہنی اور انسانی رشتوں کی لذت سے محروم کر دیتا ہے۔ غالباً یہی سبب ہے کہ ان کے گھر میں کوئی کتب خانہ نہیں۔ ان کے پاس آئے دن تحفے میں کتابیں آتی رہتی ہیں لیکن وہ اسے لائبریری میں یا دوستوں کو دے دیتے ہیں۔ رسالے گھر کے بچے پڑھتے ہیں اور پھر بعد میں یونیورسٹی کے میڈیکل آفیسر ڈاکٹر حفیظ الدین صاحب اٹھا لے جاتے ہیں۔

شام کو رشید صاحب بلاناغہ اسٹاف کلب جاتے ہیں اور احباب میں بیٹھ کر برج کھیلتے ہیں۔ کھیل میں وہ ہار جیت کی کچھ ایسی فکر نہیں کرتے کھیل کے آداب اور اسپورٹس مین شپ کا ہر لمحہ لحاظ رکھتے ہیں۔ جوانی میں ٹینس کے بڑے اچھے کھلاڑی تھے لیکن مسلسل صحت کی خرابی نے یہ مشغلہ چھڑا دیا۔

رشید صاحب کی گھریلو زندگی میں بڑی سدفق اور چہل پہل ہے اور وہ پورے طور پر اس کی گرفت میں رہتے ہیں۔ روپیہ جمع کر کے دولتمند بننے یا پوسٹ کی پہنٹ کتابیں لکھ کر تصنیفات کی تعداد میں اضافہ کرنے کی ان کو آج تک فکر نہ ہوئی۔ کہتے ہیں یہ بازاری اور اشتہاری لوگوں کا کام ہے

ڈاکٹر عبد العلیم

ڈاکٹر عبد العلیم کو علی گڑھ کے بعض لوگ "گوتم بدھ" کہتے ہیں اس کی وجہ ان کی باوقار اور بھاری بھر کم شخصیت فلسفیانہ انداز میں کچھ سوچتے رہنا اور عموماً ہر بات کا "ہاں" یا "نہیں" یا کسی مختصر ترین فقرے میں جواب دینا ہے۔ سگار ان کے جسم کا ایک ضروری جزو معلوم ہوتا ہے۔ فرنچ کٹ خوبصورت داڑھی، سرخ و سپید رنگ، سر پر لمبے نام بال۔ عموماً چوڑی مہری کا پاجامہ اور شیروانی پہنتے ہیں۔ یہاں کے جلسوں کی صدارت ان کی قسمت میں لکھ گئی ہے ہر جگہ پکڑے جاتے ہیں اور اس میں شک نہیں کہ یہ فن انہیں خوب آتا ہے ویسے بھی وہ کسی مجلس میں بیٹھے ہوں تو صدر معلوم ہوتے ہیں۔ ان کی زبان دراصل بھری بزم ہی میں کھلتی ہے۔ تنہائی میں ملئے تو دو دو چار قسم کے آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ کبھی آدمی بیٹھے ہوں تو بڑی دلچسپ باتیں کریں گے۔ کسی پر فقرے کسیں گے، کبھی بات میں مزاح کا پہلو نکال دیں گے۔ ڈاکٹر علیم کا اصل جوہر ان کی تقریر میں کھلتا ہے۔ کوئی موضوع ہو، کسی مسئلے پر مباحثہ یا سمپوزیم ہو، کسی مقالے پر تنقید و بحث آرائی ہو رہی ہو وہ اس کے بارے میں ایسی واضح، دوٹوک اور مدلل باتیں کریں گے کہ سارے الجھے ہوئے دھاگے کھل جائیں گے۔

ڈاکٹر علیم یونیورسٹی میں شعبہ عربی کے صدر اور ادارۂ علوم اسلامی کے نگران ہیں لیکن اس سے یہ اندازہ لگانا درست نہیں کہ وہ عربی کے ادیب یا محقق ہیں جس طرح علامہ عبد العزیز میمن وغیرہ۔ علیم صاحب نے جرمنی سے عربی میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری لی لیکن ذاکر صاحب کی طرح دراصل وہ ایک ماہر تعلیم ہیں اور انہوں نے کسی ایک موضوع میں اختصاصی حیثیت حاصل کرنے کے بجائے اپنے علم کا دائرہ وسیع رکھا ہے یہی وجہ ہے کہ انہیں فلسفہ و نفسیات، تاریخ و معاشیات، سیاسیات و علم مدن، شعر و ادب اور لسانیات پر یکساں عبور ہے اور ان میں سے ہر ایک پر بڑی جچی تلی رائے رکھتے ہیں۔ انہوں نے اردو میں بہت کم تنقیدی مضامین لکھے ہیں لیکن یہ مضامین اپنی گہرائی اور جامعیت کے اعتبار سے بڑی بڑی کتابوں پر بھاری ہیں۔ آج اردو کا کوئی ایسا ادیب نہیں جو اتنے کم صفحات لکھنے کے باوجود ادبی دنیا میں اتنی وقعت و احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہو۔

تنظیمی صلاحیت اور کسی ادارے کی نگرانی و رہنمائی کے لئے علیم صاحب بہت موزوں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب سے انہوں نے علی گڑھ میں شعبہ عربی کی باگ ڈور سنبھالی [illegible] اس وقت سارے شعبوں میں یہی شعبہ سب سے زیادہ ترقی کر رہا ہے اور

اپنی وسعت کا دائرہ بڑھاتا جا رہا ہے۔
بحیثیت انسان ڈاکٹر علیم کی شرافت، اور طلباء و اساتذہ سے ان کی ہمدردی علی گڈھ میں ضرب المثل ہے۔ وہ یہاں ایک "مشکل کشا"
کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس مشکل کشائی میں شعر و ادب، اور ریسرچ سے لے کر حصول ملازمت، وظیفہ اور فیس کی معافی سب کچھ شامل ہے۔
یونیورسٹی روڈ پر مکان ۳۱ میں رہتے ہیں۔ یہ پہلے ہیوس کا بہت پرانا شاندار بنگلہ تھا۔ اب اس کی چھت پختہ کر دی گئی ہے۔ علیم
صاحب کی گھریلو زندگی بڑی خوشگوار ہے۔ اور ایک بہت بڑے کنبے کی پرورش کا انتظام بڑی خوبی سے کرتے ہیں۔ بحیثیت شوہر اور باپ
کے بھی ان کی شخصیت بے مثال ہے۔

آل احمد سرور

اب تو خیر سرور صاحب مستقل طور پر علی گڈھ میں آ گئے ہیں لیکن اس بیچ کے عرصے میں جب وہ رامپور یا لکھنؤ میں تھے اس وقت بھی انہیں
علی گڈھ کا ہی سمجھا جاتا رہا ہے۔ ان کی شخصیت پر علی گڈھ کی زبردست چھاپ ہے۔ ان کے ذہن کی تعمیر میں اقبال، رشید احمد صدیقی، ڈاکٹر صاحب
خواجہ غلام السیدین، سر راس مسعود اور خواجہ منظور حسین کا فیضان شامل ہے۔ وہ مشرق و مغرب، اور قدیم و جدید کا ایک خوبصورت امتزاج ہیں
اور یہی وجہ ہے کہ ہر جگہ محبوب و مقبول ہیں، ان کے نقطۂ نظر میں کافی لچک اور لوچ اور ان کے مذاق میں رچاؤ اور نکھار ہے۔ موجودہ تنقید
نگاروں میں سرور ہی صاحب ایسے ادیب ہیں جو ایک مخصوص اسلوب نگارش کے مالک ہیں، یہی انداز ان کی عام گفتگو اور تقریر میں بھی ہوتا ہے
طالب علمی کے زمانے میں بڑے اچھے مقرر رہ چکے ہیں اور یہاں کی یونین کے وائس پریزیڈنٹ بھی۔ سرور صاحب خشک اور خلوت پسند با خالص
اسکالر قسم کے آدمی نہیں، وہ اپنی ذات سے ایک انجمن ہیں، ان کی دلچسپیوں اور تعلقات کا دائرہ بہت وسیع اور رنگا رنگ ہے اور افراد سے
لے کر اسٹیج کے ہنگاموں تک ان کی دسترس اور رسائی ہے اور اس میں شک نہیں کہ جہاں جاتے ہیں فضا پر چھا جاتے ہیں۔
سرور صاحب میں ذہانت اور طباعی کا جوہر قدرت کی طرف سے بہت وافر ملا ہے۔ پامال اور فرسودہ مسائل کو اس طرح اپنی گرفت میں لے
لیتے ہیں کہ بالکل نئی چیز معلوم ہوتے ہیں، ان کے ایک ایک فقرے میں چشمے کی سی روانی اور شیرینی ہوتی ہے۔
شکل و شباہت کے اعتبار سے سرور صاحب خوش اندام لوگوں میں ہیں اور بڑی نفاست سے رہتے ہیں۔ سرخ و سپید رنگ میانہ
قد، کتابی شیو کیا چہرہ، عام طور پر سوٹ پہنتے ہیں ویسے ان کی پرانی علی گڈھ کی تمام قدریں شیروانی میں ملتی ہیں۔ عینک ان کے چہرے پر بڑی
کھبتی ہے، ہونٹوں پر پان کی ہلکی سی سرخی ہوتی ہے اور عام طور پر مسکراہٹ کھیلتی رہتی ہے۔ گھریلو زندگی بہت خوشگوار ہے۔ سید حسین
ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کی پروفیسر شپ کے علاوہ قاضی عبد الغفار مرحوم کے بعد انجمن ترقی اردو کی باگ ڈور بھی آپ ہی کے سپرد کی گئی ہے اور
اس میں شک نہیں کہ جب سے سرور صاحب نے یہ کام اپنے ذمہ لیا ہے انجمن کی رگوں میں نیا خون آ گیا ہے اور اس کا کام دوگنی رفتار
سے ہو رہا ہے۔
علمی و تنقیدی مضامین کے علاوہ ادھر سرور صاحب نے پھر شاعری کی طرف توجہ کی ہے اور پچھلے سال اپنا مجموعۂ کلام "ذوق جنوں"
شائع کر چکے ہیں۔ اب مشاعروں میں بھی شرکت کرنے لگے ہیں اور اپنا کلام تحت اللفظ میں سناتے ہیں۔

معین احسن جذبی

جذبی صاحب ۱۹۴۲ء میں اردو میں ایم اے کرنے کی غرض [illegible] ایم اے کرنے کے بعد کچھ دنوں کے لئے

رسالہ آج کل دہلی میں نائب مدیر کی حیثیت سے کام کرتے تھے لیکن ۱۹۴۴ء میں استعفیٰ دے کر پھر علی گڈھ واپس آگئے اور پی ایچ ڈی میں داخلہ لیا۔ ۱۹۴۵ء میں شعبۂ اُردو میں لکچرر کی حیثیت سے ان کا تقرر ہوگیا۔ میں اسی سال نیا نیا علی گڈھ میں وارد ہوا تھا لیکن جذبی صاحب کی شاعری کا بہت دنوں سے پرستار تھا اور انہیں دیکھنے اور ان سے ملنے کی بڑی آرزو تھی۔ کچھ دنوں تک اس کی کوئی سبیل نہ نکل سکی، کئی مہینے کے بعد سیّد یوسف حسن کے توسط سے میں جذبی صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ جذبی صاحب سے ملنے کے بعد تھوڑی دیر کے لئے میرے ذہن کو کچھ دھچکا سا لگا کیونکہ میں نے ان کی جو خیالی تصویر بنا رکھی تھی وہ اور ہی تھی۔ ان کی شخصیت اور ان کے طرزِ گفتگو نے پہلی بار مجھے کچھ مایوس کیا لیکن دو ہی چار ملاقاتوں میں یہ احساس ہونے لگا کہ جذبی صاحب ایک سیدھے سادے بے تکلف اور ملنسار آدمی ہیں وہ اپنے ملنے والے پر اپنی شاعری یا اپنی قابلیت و ذہانت کا رعب نہیں جماتے اور نہ ہی اس پر اپنی شخصیت کو مسلط کرنا چاہتے ہیں۔ انہیں جو آدمی اچھا اور معقول نظر آتا ہے فوراً اس سے دوستانہ اور برابر کی سطح پر تعلقات پیدا کر لیتے ہیں۔ چاہے وہ طالب علم ہی کیوں نہ ہو اس کے لئے چائے منگاتے ہیں اور سگریٹ پینے پر اصرار کرتے ہیں اور بے دھڑک پوچھ بیٹھتے ہیں "کہئے حضرت کوئی عشق بھی وغیرہ بھی کیا ہے"۔
ان کے اس طرزِ ادا نے بہت جلد علی گڈھ کے نوجوانوں کو جو ادب کی دیوی کے پجاری تھے آہستہ آہستہ ان کے گرد جمع کر دیا۔ اشعر ملیح آبادی مرحوم، قاضی سلیم، اصغر عباس زیدی، سیّد منہاج الدین، فرید بخش قادری، ریاض الدین قیصر، باقر مہدی، تصوّر حسین۔ ہم سب کی ایک ٹولی سی بن گئی اور کچھ دنوں میں جذبی صاحب کے ایما سے اور ان کی رہنمائی میں ہم لوگوں نے یہاں انجمن ترقی پسند مصنفین کی بنیاد ڈالی اور یوسف حسن صاحب اس کے پہلے سیکرٹری منتخب ہوئے۔ وہ زمانہ واقعی عجیب زمانہ تھا نئی نئی کتابوں اور نئے رسالوں کی تلاش رہتی اور جوں ہی جذبی صاحب کی ڈاک میں کوئی چیز آتی ہم سب اسے چاٹ جاتے۔ لکھنے کا جنون تھا اور اناپ شناپ صفحے کے صفحے سیاہ کئے جاتے۔ انجمن کے جلسے الحمرا میں ہوتے جو اس زمانے کا ایک خوبصورت ریستوران تھا، ہر جلسے میں حاضرین کی چائے، برفی اور نمک پاروں سے تواضع کی جاتی۔ جذبی صاحب کی وجہ سے انجمن کے ہر جلسے میں خواجہ منظور حسین صاحب تشریف لاتے، ڈاکٹر ابواللیث صدیقی، ڈاکٹر مسعود حسین اور الٰہد انصاری وغیرہ بھی آنے لگے۔ باہر سے مولوی عبدالحق صاحب، قاضی عبدالغفار، حیات اللہ انصاری، اختر حسین رائے پوری یا کوئی بھی ادیب آجاتا تو جذبی صاحب اسے انجمن کے جلسے میں کھینچ کر لاتے۔ اس موقع پر ہم سب یوسف صاحب کو فوری جلسہ کے لئے آمادہ کرتے اور تمام ممبروں کو اطلاع دینے کے لئے بڑے شوق سے سارا علی گڈھ چھان مارتے۔ اس زمانے میں یہاں کی انجمن ترقی پسند مصنفین ہی سب سے بڑا ادبی مرکز اور شعر و سخن کی نشست بن گئی اس میں جو مضامین پڑھے جاتے، جو تنقیدیں ہوتیں اور جو جو بحثیں آپس میں کی جاتیں ان کا کئی کئی دن تک چرچا رہتا۔

جذبی صاحب ہم لوگوں کے یہاں بعض اوقات ہوسٹل میں پہنچ جاتے اور اس وقت جو بھی مل جاتا سب کو لے کر اسٹاف کلب کے کمرے میں جہاں ان کا قیام تھا آتے اور اپنے نوکر نند علی کو چائے بنانے کے لئے آواز دیتے اور پھر گپ شپ، شعر و شاعری اور شخصیات پر گفتگو چھڑتی۔ جذبی صاحب شعر و ادب سے متعلق اپنے نظریات اور تخلیقی عمل سے متعلق اپنے ذاتی تجربات بیان کیا کرتے اور ہم لوگوں کو اپنی نظم و نثر کو زیادہ سے زیادہ موثر اور خوبصورت بنانے کے لئے مشورہ دیتے۔ ان کی گفتگو میں اکثر خواجہ منظور کے اقوال کا حوالہ ہوتا۔ کبھی کبھی مجاز، سردار جعفری، سبطِ حسن، مخدوم، اختر حسین رائے پوری، فیض، تاثیر، راشد، میراجی وغیرہ کا ذکر چھیڑ دیتے اور پچھلی صحبتوں کا ذکر بڑے لطف سے کرتے۔ ان شاعروں اور ادیبوں کی پرائیویٹ زندگی، ان کی آپس کی چشمکیں، ان کا خلوص و محبت اور ان کے ساتھ گزرے ہوئے لطیفے جذبی صاحب کا خاص موضوع ہوتے۔ اب یہ اندازہ ہوا کہ جذبی صاحب بہت ہی دلچسپ اور باغ و بہار آدمی ہیں، ان کے پاس اتنے تجربات [illegible] زندگی ختم ہونے نہ آئیں۔ ان صحبتوں کے علاوہ سب سے بڑی چیز ہم لوگوں کے

ملتے یہ تھی کہ جذبی صاحب ہر طرح سے ہم لوگوں کو چاہتے۔ وہ صرف ادبی معاملات میں ہی نہیں بلکہ ہر معاملے میں رہبری کرتے، فیس اور مراعات کا مسئلہ، ڈائننگ ہال سے کھانا بند ہو جانے کا مسئلہ، یونیورسٹی کا اکاؤنٹ جمع نہ ہونے اور نام کٹ جانے کی فکر، امتحان آنے پر ہال ٹکٹ حاصل کرنے کا انتظام۔ غرض جذبی صاحب ہمارے ہر دکھ سکھ کے ساتھی ہو گئے۔ میں جب بی اے میں پہنچا تو میری سیاسی سرگرمیوں کی بنا پر مجھے ہوسٹل سے نکال دیا گیا۔ جذبی صاحب فوراً مجھے اپنے گھر لے آئے اور کہا آج سے تم میرے ساتھ رہو گے میں تقریب قریب دو سال تک جذبی صاحب کے ساتھ اس طرح رہا کہ مجھے ایک لمحے کے لئے کبھی یہ محسوس ہوا کہ میں کسی اور کے گھر پر پڑا ہوں اور اس کا ممنونِ احسان ہوں اس گھر میں میں خاندان کے ایک ممبر کی حیثیت سے تھا۔ اسی زمانے میں جذبی صاحب کی بھوپال میں شادی ہوئی۔ ان کی بیوی کے آنے کے بعد بھی جذبی صاحب کے معمولات یا دوست احباب سے تعلقات اور ملاقاتوں میں فرق نہیں آیا۔ اسی طرح محفلیں گرم ہوتیں۔ چائے کا دور چلتا اور ہر طرح کے ادبی پروگرام بنائے جاتے۔

جذبی صاحب کے ساتھ رہ کر مجھے تھوڑا بہت ان کے شعری عمل کو سمجھنے میں بھی آسانی ہوئی۔ اوّل تو وہ کم کہنے کے عادی ہیں آج کے دن کے واقعات پر یا سیاسی پالیسی کے ماتحت نظمیں لکھنے کو وہ شاعری نہیں سمجھتے۔ کہتے ہیں یہ صحافت اور پمفلٹ بازی ہے۔ اسی لئے اس معاملے میں وہ اپنے دوست سردار جعفری سے کبھی متفق نہ ہو سکے۔ جذبی صاحب اپنی نظمیں بڑی محنت سے لکھتے ہیں۔ مہینوں ایک موضوع کو ہضم کرتے اور رچاتے بساتے رہتے ہیں، اس کے لئے فضا تیار کرتے ہیں اور پھر لکھ لینے کے بعد بھی نظم کو فوراً چھپنے کے لئے نہیں بھیجتے۔ اسے کچھ مہینے اور سال سال ڈالے رکھتے ہیں اور اس پر اتنی تراش خراش کرتے ہیں کہ بسا اوقات ایک ایک نظم کے لئے ایک ایک ضخیم مجلد نوٹ بک ختم ہو گئی ہے۔ "میری شاعری اور نقاد" کے عنوان سے ان کی نظم میرے سامنے لکھی گئی اور اس کی تکمیل میں کئی سال لگ گئے۔

اسٹاف کلب (پرانا اسٹاف کلب جہاں آج کل براکرز آفس ہے) چھوڑنے کے بعد جذبی صاحب نے امیر نشان میں مکان کرایہ پر لیا۔ میرا قیام ان کے ساتھ اسی مکان میں تھا جذبی صاحب تقریباً آٹھ سال تک رہے۔ یونیورسٹی کے قریب مکان حاصل کرنے کی ہمیشہ کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہو سکے۔ آخر تنگ آکر ایک ہجو بعنوان "مکان نامہ" لکھ کر ذاکر صاحب کو بھیجی۔ خیر اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اب ذکاء اللہ روڈ پر انہیں ایک اچھا سا مکان مل گیا ہے۔ جذبی صاحب کی خانگی زندگی بڑی خوش گوار ہے اگرچہ ایک بڑے کنبے کی پرورش کا بوجھ ان کے کاندھوں پر ہے۔ ایک لڑکا اور دو لڑکیاں ہو چکی ہیں۔ صاحبزادے سہیل میاں کافی ہونہار اور تیز ہیں۔ جذبی صاحب اپنے بچوں سے بے انتہا پیار کرتے ہیں۔ ادھر کئی سال سے مسلسل وہ اپنے پی، ایچ، ڈی کے تھیسس کے سلسلے میں بےحد مصروف اور فکرمند رہے جس کی وجہ سے شعر کہنے کی رفتار اور بھی کم ہو گئی جس پر ان کے عزیز دوست مجاز مرحوم نے کہا تھا کہ "اب تک صرف دو غم سنتے آئے تھے غم جاناں اور غم دوراں۔ جذبی نے ایک تیسرا غم ایجاد کیا ہے اور وہ ہے "غم تھیسس"۔ شکر ہے کہ اس غم سے اب جذبی صاحب نے نجات حاصل کر لی ہے کیونکہ ان کا تھیسس مکمل ہو گیا ہے۔

اختر انصاری

جن لوگوں نے اختر انصاری کے رومانی قطعات اور "دردِ بھری" "خوناب" کی غزلیں پڑھی ہیں۔ وہ اختر انصاری کو دیکھتے ہیں تو یقین نہیں آتا کہ یہی ہیں۔ بھاری بھر کم آدمی ہیں اور اعلیٰ درجے کا سوٹ پہنتے ہیں اس لئے بادی النظر میں گمان ہوتا ہے کہ کوئی آئی سی ایس قسم کے آدمی ہیں۔ جس زمانے میں پہلی بار ان کے مکان احاطہ میڈیکل ہاؤس میں ان سے ملنے کے لئے سید یوسف حسن کے ہمراہ گیا تو اختر صاحب مسلم یونیورسٹی ہائی اسکول میں ٹیچر تھے لیکن ان کا آراستہ ڈرائنگ [illegible] تھے اور مصوری کے شاہکار، رنگا رنگ شیشے کی خوبصورت چیزیں، مختلف وضع اور فیشن کے فرنیچر۔ ایک قیمتی کتب [illegible] کتابیں اور تمام مشہور رسالوں کے مکمل فائل

دیکھ کر میں دنگ رہ گیا۔ ہماری یونیورسٹی میں کسی بڑے سے بڑے پروفیسر کو بھی میں نے اس ٹھاٹھ سے رہتے نہیں دیکھا تھا۔ اختر صاحب
ایک صوفے پر سلیپنگ گاؤن پہنے ہوئے پائپ پی رہے تھے اور دیکھنے میں انگلستان یا فرانس کے بعض ناول نگاروں سے مشابہ تھے۔
بعد میں اختر صاحب یونیورسٹی میں اردو کے لکچرر ہو گئے اور اتفاق سے ایم اے میں مجھے ان کا طالب علم بننا پڑا۔ اس زمانے میں ان سے قریب
ہونے کا موقع ملا۔ اب یہ اندازہ ہوا کہ بظاہر اس شاندار جسم کے اندر ایک چوٹ کھایا ہوا دل ہے اور اختر صاحب طرح طرح کی نفسیاتی پیچیدگیوں
کا شکار ہیں۔ دوران تعلیم میں وہ واقعی آئی سی ایس ہونے کے خواب دیکھا کرتے تھے اور اسی غرض سے انگلستان گئے بھی تھے لیکن اچانک
والد کے انتقال سے خاندان کا شیرازہ بکھر گیا اور انہیں ناکام واپس آنا پڑا، ایم اے بھی نہیں کیا تھا اس لئے اسکول کی ٹیچری کے علاوہ کوئی
نوکری نہیں مل سکتی تھی۔ والد نے گھر میں فرنیچر اور سامان آرائش کافی چھوڑا تھا، اختر صاحب نے اسے اپنے ڈرائینگ روم میں سجایا اور پھر
اس طرح اس جذبے کی تسکین کے لئے سامان فراہم کرتے رہے۔ اسکول کی محدود زندگی نے آہستہ آہستہ ان کو اپنی گرفت میں لینا شروع کیا اور
ان کی تخلیقی اپج تقریباً ختم ہونی شروع ہو گئی اور اردو کا یہ کامیاب ترین شاعر، افسانہ نگار اور تنقیدی بصیرت کا حامل ادیب و انشا پرداز
ادبی افق سے غائب ہونے لگا۔ اختر صاحب کو اس کا بہت احساس تھا لیکن ان کے مطالعے اور تحصیل علم میں کمی نہیں آئی۔ ایک ادبی
ڈائری ان کے پڑھنے سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ کس طرح ایک اسکول کے گمنام ٹیچر نے دنیا کے علمی و ادبی شاہکاروں کا بالاستیعاب مطالعہ
کیا ہے اور ان کے متعلق ایک جچی تلی رائے رکھتا ہے جو بڑی بڑی یونیورسٹی کے اعلیٰ درجے کے پروفیسروں کے بس کی بات نہیں۔
یونیورسٹی میں آجانے کے بعد اختر صاحب کی زندگی میں یک گونہ تبدیلی ہوئی لیکن ابھی اس نئی عمارت کی پوری بنیاد بھی مکمل نہ ہوئی تھی کہ
اختر صاحب کی شعبہ اردو میں ملازمت ختم ہو گئی، کچھ دنوں وہ بیحد پریشان رہے۔ آخرکار ٹریننگ کالج میں انہیں ایک لکچررشپ مل گئی۔ اس جگہ
پر انہوں نے بڑی تندہی اور جانفشانی سے کام کیا اور کالج میں مقبولیت حاصل کی اور ایک حد تک اس بات کی کوشش بھی کی کہ اپنے حواس کو
مجتمع کرکے اپنی گئی ہوئی ادبی زندگی کو دوبارہ واپس لائیں۔ اس مقصد میں انہیں تھوڑی بہت کامیابی ہوئی ہے اور ادھر کچھ ایسی چیزیں لکھی ہیں جن
میں نئے تیور اور نئی اٹھان ہے۔ "یادوں کے چراغ" کے نام سے اپنی آپ بیتی بھی لکھ رہے ہیں جس کے بعض اجزاء سننے کا مجھے بھی موقع ملا ہے
اس میں شک نہیں کہ مکمل ہونے پر ایک قابل قدر ادبی تحفہ ہوگا۔

ڈاکٹر مسعود حسین خاں

مسعود صاحب ذاکر صاحب کے بھتیجے اور قائم گنج کے پٹھان ہیں لیکن ان کے مزاج میں ایسی نرمی اور ٹھنڈک ہے جو ٹیگور کی شاعری
میں ملتی ہے۔ وہ ہندوستان میں لسانیات کے چند مسلم الثبوت ماہرین میں سے ہیں اور اس موضوع پر پیرس سے ڈی لٹ کرکے آئے
ہیں لیکن ان تمام مرحلوں سے گزرنے کے بعد بھی وہ اس نرمی پر کوئی پردہ نہ ڈال سکے۔ ان کا مزاج خالص ہندوستانی ہے۔ ادھر انہوں
نے اپنی شعری تخلیقات کا مجموعہ "دو نیم" کے نام سے شائع کر دیا ہے اسے پڑھنے کے بعد میرا کچھ ایسا اندازہ ہے کہ ان کے کلام میں گیتوں
کا حصہ سب سے زیادہ جاندار ہے اور "روپ بنگال" ان کی ایک کامیاب تخلیق ہے۔ مسعود صاحب نے ابتدا میں اپنی شاعری میں ہندوستانی
کلچر کے جن عناصر کو سموتا اور ایک رسیلی زبان کا تجربہ شروع کیا تھا اس سے ادھر وہ کچھ ہٹ سے گئے ہیں لیکن اس طرح کو اگر پورے طور پر
پروان چڑھنے کا موقع ملے تو مسعود صاحب کے ہاتھوں اردو شاعری میں زبردست اضافہ ہو سکتا ہے۔ مسعود صاحب نے ہندی اور سنسکرت
ادب کا گہرا مطالعہ کیا ہے اور بنگالی زبان سے بھی واقف ہیں اور یہ سارے اثرات ان کی شخصیت میں رچ گئے ہیں اس لئے اس طرح کی
شاعری کے لئے ان سے زیادہ کوئی [illegible]

مسعود صاحب بحیثیت انسان اپنی مثال آپ ہیں۔ ان جیسا مخلص آدمی مشکل سے ملے گا۔ رشید صاحب اکثر "ملنسا ہٹ" کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ اس لفظ کا استعمال سب سے زیادہ موزوں مسعود صاحب کے سلسلے میں ہو سکتا ہے۔ میں نے ان کو کبھی غصے میں یا غضبناک نہیں دیکھا ہے اور نہ ہی کسی کو سخت اور نا ملائم بات کہتے ہوئے۔ ان کی لغت میں شاید دشمن کا لفظ نہیں ہے۔ بعض لوگ حسد کی بنا پر مسعود صاحب کی شخصیت میں کیڑے نکالتے ہیں لیکن خود مسعود صاحب نے آج تک کسی کی ذاتی کمزوریوں کو اپنا موضوع نہیں بنایا۔

مسعود صاحب خوبصورت اور وجیہہ آدمی ہیں اور قد و قامت اور رنگ روپ پر مزید قائم گنج کی چھاپ ہے۔ بہت سادہ وضع رکھتے ہیں۔ جاڑوں میں ایک کھردرا سا سوٹ اور گرمیوں میں پتلون اور بش شرٹ زیب تن ہوتی ہے۔ گاہے ماہے شروانی بھی پہنتے ہیں۔ دیکھنے میں توانا و تندرست ہیں لیکن معمولی سا سفر بھی انہیں ہفتوں کے لئے صاحب فراش کر دیتا ہے۔ زکام سال بھر پیچھا نہیں چھوڑتا۔ گرمی کے دنوں میں بھی اسٹاف روم کے اندر پنکھے سے دور ہٹ کر بیٹھتے ہیں۔ آج کل اپنا ذاتی مکان تیار کر رہے ہیں اور بقول شخصے "تعمیر پسند" ہو گئے ہیں۔ چائے، سگریٹ، پان کسی سے شوق نہیں۔ وہ مکمل طور پر ترک منشیات کے اصول پر عامل ہیں۔ امتناعِ مسکرات کا قانون ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔

آج کل شعبۂ اردو میں ریڈر ہیں۔

ڈاکٹر مختار الدین احمد آرزو

علی گڑھ میں آرزو صاحب کی شہرت پہلے پہل علی گڑھ میگزین کے "غالب نمبر" کی وجہ سے ہوئی لیکن ان کے تحقیقی مضامین بہت پہلے سے رسالوں میں شائع ہونا شروع ہو گئے تھے۔ "نگار" میں ان کا مضمون "سطحیات سید سلیمان ندوی" ایک ہنگامہ بپا کر چکا تھا اور "ادبی دنیا" میں رام بابو سکسینہ کی "تاریخ ادب اردو" پر انہوں نے ایک ٹھوس مقالہ لکھا تھا۔ تحقیق کا ذوق آرزو صاحب کو قاضی عبدالودود صاحب کی صحبت میں ملا۔ ان کی ادبی زندگی کا آغاز شاعری سے ہوتا ہے جب وہ مدرسہ شمس الہدیٰ پٹنہ کے طالب علم تھے۔ اس زمانے میں آرزو صاحب پٹنہ کے مشاعروں میں ایک ہونہار نوجوان شاعر کی حیثیت سے شریک ہوتے اور اپنی مترنم آواز کی بنا پر خوب داد لیتے۔ غزلوں پر جمیل مظہری اور پرویز شاہدی کا اثر نمایاں تھا۔ لیکن جلد ہی قاضی عبدالودود صاحب سے سابقہ پڑا تو شاعری ترک کر کے تحقیق کی طرف آ گئے۔ قاضی صاحب کا آرزو صاحب پر گہرا اثر ہے۔ علی گڑھ کی تعلیم نے آرزو صاحب کو ڈگری مزید دی لیکن ان کی شخصیت کی مکمل تشکیل علی گڑھ آنے سے قبل ہو چکی تھی یہی وجہ ہے کہ یہاں آنے کے بعد آرزو صاحب کے طرز فکر اور طریق کار میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ البتہ علی گڑھ میں انہیں اپنے کام کے لئے ایک وسیع میدان ملا اور اپنی تحقیق کے نتائج کو مناسب طور پر اشاعت دینے کا موقع ملا۔ ان کا قول ہے کہ ایک جگہ کھودو لیکن گہرا کھودو۔

آرزو صاحب بقول عرش ملسیانی زبردست "گورکن" ہیں۔ پرانی کتابوں اور قلمی نسخوں کی تلاش کا ایسا چسکا ہے جو کہیں بھی ساتھ نہیں چھوڑتا۔ ایک بار اورینٹل کانفرنس لکھنؤ میں مجھے ان کے ساتھ شریک ہونے کا موقع ملا، اس موقع پر مخطوطات و نوادر کی ایک نمائش بھی ہوئی تھی۔ اس وقت ان کا ذوق و شوق اور انہماک دیکھنے کے قابل تھا۔ مسلم یونیورسٹی کی لائبریری کا ایک ایک پرزہ انہوں نے پڑھ ڈالا ہے اور جہاں کہیں کوئی قیمتی خزانہ دبا پڑا ہے۔ ان کی ان کو اطلاع ہے۔ ابھی دو سال قبل راک فیلر فاؤنڈیشن کے اسکالرشپ پر لندن میں ریسرچ کرنے آکسفورڈ یونیورسٹی گئے تو جو مخزن [illegible] کی حد تک سے متعلق سارا مواد چھان مارا اور

آخر کار بہت کچھ ساتھ لے کر آئے ۔ پچھلے دنوں "آج کل" میں راجہ رام موہن رائے کا ایک اُردو خط گارساں دتاسی کے نام شائع کرایا ہے جو انہیں پیرس میں ملا ۔ جدید تحقیق کی رو سے یہ اُردو کا قدیم ترین خط قرار دیا گیا ہے ۔ یہ تو محض ایک دریافت ہے ۔ دیکھئے اپنی جھولی سے ابھی اور کیا کیا نکالتے ہیں ۔

باوجود محقق ہونے کے آرزو صاحب خشک اور کھردرے آدمی نہیں ۔ ان کی شخصیت بڑی رنگا رنگی اور زندگی کے مظاہر سے لطف لینے کی بھرپور صلاحیت ہے ۔ محفلوں اور دعوتوں میں شریک ہونا ، رقص ، مصوری اور موسیقی کا مذاق صحیح رکھنا ، پکنک اور سیاحی ، چاندنی راتوں میں ٹہلنا اور ریستوران میں بیٹھ کر احباب کے ساتھ نفیس چائے اور سگریٹ پینے کا سلیقہ بھی آرزو صاحب کو آتا ہے ۔ آرزو صاحب کے اندر مزاح کی حس بہت بڑھی ہوئی ہے ، وقت پر ان کو فقرے خوب سوجھتے ہیں ۔ ان کی گل افشانیٔ گفتار سے صحیح طور پر چند ہی واقف ہیں ۔ جس زمانے میں مسلم یونیورسٹی گزٹ کا ایڈیٹر تھا اور میرا قیام ۵ ۔ حالی روڈ پر تھا اسی زمانے میں آرزو صاحب سے تعلقات بڑھے اور اتنی قربت ہوئی کہ آرزو صاحب مستقلاً میرے ساتھ قیام پذیر ہو گئے اور دو سال تک اس طرح گذرے ہیں کہ ہم دونوں کا ایک ایک لمحے کا "اعمال نامہ" ایک دوسرے کے سینے میں محفوظ ہے ۔ ۵ ۔ حالی روڈ پر ہم مولوی مشتاق حسین صاحب (اسسٹنٹ لائبریرین ، لٹن لائبریری) کے ساتھ وابستہ ہو گئے تھے اور Paying Guest کی حیثیت سے رہتے تھے ۔ مشتاق صاحب علی گڑھ کی عجیب و غریب ہستیوں میں سے ہیں ، ان کی شخصیت بذات خود علی گڑھ میں ایک ادارہ سے کم نہیں ۔ اگرچہ انہوں نے کوئی علمی و ادبی کام نہیں کیا لیکن ان کے علم ، ان کی ذہانت اور ان کی سوجھ بوجھ کے سب قائل ہیں ۔ لیکن سب سے زیادہ جو چیز لوگوں کو ان کی طرف کھینچتی ہے ۔ وہ ان کا خلوص ، جاں نثاری اور دوست نوازی ہے ۔ ۵ ۔ حالی روڈ پر شام کو محفل جمتی تھی ۔ جس میں مشتاق صاحب صدر بن کر بیٹھتے اور ارد گرد میرے اور آرزو صاحب کے علاوہ قیوم قائد ، حشمت اللہ انصاری ، حنیف خاں ناشاد اور سید رضی الدین ایک گول دائرے میں ہوتے ۔ چائے کا دور چلتا اور دُنیا بھر کے مسائل پر بحث مباحثہ ہوتا ایسے موقعوں پر آرزو صاحب کے لطیفے اور فقرے اور برجستہ مکالمے اس قدر دلکش ہوتے تھے ۔ کہ پہروں اس کا نشہ باقی رہتا ۔

آکسفورڈ سے واپسی پر آرزو صاحب نے ایک علٰحدہ مکان کرائے پر لے لیا ہے اور اب مع اہل و عیال کے مقیم ہیں ۔ ان کے دو بچے طارق اقبال اور خالد اقبال بڑے پیارے ہیں ۔

آرزو صاحب معتدل مزاج کے آدمی ہیں اور زندگی بسر کرنے کا فن انہیں آتا ہے ۔ اپنی صلاحیتوں کا ایک شمہ بھی انہوں نے بیکار نہیں چھوڑا ہے اور ہر طرح سے کامیابیوں کو اسیر کیا ہے ۔

مسعود علی ذوقی

اختر انصاری صاحب کے آئی سی ایس نما شخص ہیں جو ایک زمانے میں اپنی فطرت نگاری اور رومانی نظموں اور گیتوں کے لئے مشہور تھے اور ان کی تخلیقات "ہمایوں" اور "نیرنگِ خیال" میں بڑے اہتمام سے شائع ہوتی تھیں ۔ انہوں نے شاعری کی بساط بہت جلد اُٹھا دی ۔ کوئی مجموعہ مرتب کر کے نہیں چھپوا سکے اس لئے آج ادب کے طالب علم ان کا نام تقریباً بھول چکے ہیں ۔ ذوقی صاحب ایک شاندار اور اسمارٹ آدمی ہیں اور آج کل مسلم یونیورسٹی ہائی اسکول کے ہیڈ ماسٹر ہیں لندن کے ڈائرکشن سے بھی شغف رکھتے ہیں چنانچہ ایک زمانے میں نیاز حیدری کے ساتھ مل کر ایک فلمی کمپنی کھولنے کی اسکیم بنائی تھی جو کامیاب نہ ہو سکی ۔ فلم کے سلسلے میں کئی سال تک بمبئی میں قیام رہ چکا ہے اور متعدد فلموں کے اسسٹنٹ ڈائرکٹر رہ چکے ہیں جن میں محبوب کی فلم آن "خاص طور پر اہم ہے ۔ جاپان اور انگلستان

کے کالجوں میں پرنسپل بھی رہ چکے ہیں۔ میں نے ذوقی صاحب کو پہلی بار ۱۹۳۸ء میں لکھنؤ میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی کانفرنس کے موقع پر دیکھا تھا جب وہ " فانی کی الیہ شاعری " پر مقالہ پڑھنے کے لئے آئے تھے۔

ڈاکٹر محمد عزیز

"تاریخ دولت عثمانیہ" کے مصنف ڈاکٹر محمد عزیز یہاں شعبہ اردو میں استاد ہیں۔ ڈاکٹریٹ کے لئے جو مقالہ لکھا تھا اس کا عنوان ہے۔ " اسلام کے علاوہ مذاہب کی ترویج میں اردو کا حصہ " یہ اب کتابی صورت میں انجمن ترقی اردو سے شائع ہو چکا ہے۔

عزیز صاحب ایک فرشتہ صورت اور فرشتہ سیرت بزرگ ہیں، نرمی، بردباری، تحمل اور انکساری کا مجسمہ ہیں۔ بہت محنتی استاد ہیں اور تلکست پڑھانے میں اپنا جواب نہیں رکھتے۔ عمر پچاس سال کے لگ بھگ ہے لیکن دیکھنے میں تقریباً ساٹھ کے معلوم ہوتے ہیں۔ خرابی صحت نے انہیں وقت سے پہلے بوڑھا کر دیا ہے لیکن ان کے علمی مشاغل اور مطالعہ میں کوئی کمی نہیں آئی۔

سادہ وضع رکھتے ہیں۔ شروانی، پاجامہ اور شروانی ہی کے کپڑے کی بنی ہوئی ٹوپی پہنتے ہیں۔ گردن جھکا کر چلتے ہیں انہیں دیکھ کر اکثر گمان گزرا ہے کہ حالی ایسے ہی رہے ہوں گے۔ وطن ضلع اعظم گڑھ ہے۔ کچھ دن دار المصنفین سے بھی وابستہ رہ چکے ہیں۔

اسلوب احمد انصاری

شعبۂ انگریزی میں استاد ہیں اور خواجہ منظور حسین کے عزیز شاگرد اور تربیت یافتہ۔ خواجہ صاحب ہی کی طرح اسلوب صاحب نے مطالعہ کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنالیا ہے اور اس میں شک نہیں کہ خواجہ صاحب کے بعد اب علی گڑھ میں وسعت معلومات اور ادبی پرکھ کے اعتبار سے اسلوب صاحب ہی ان کی جگہ لیتے نظر آتے ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ اسلوب صاحب نے ابھی اپنی زندگی کو اس طرح کتابوں کے حوالے کر رکھا ہے۔ کہ لوگوں سے تعلقات بڑھانے یا متاثر کرنے کا ڈھب انہیں بالکل نہیں آتا۔ طالب علمی کے زمانے میں ان لڑکوں میں تھے جنہوں نے شروع سے آخر تک ہمیشہ فرسٹ کلاس فرسٹ حاصل کیا اور اس کے لئے اپنی صحت اور اپنی سماجی زندگی کی قربانی دی۔ لکچرر ہونے کے بعد اپنی شخصیت اور زندگی کے بعض نقوش کے تشنۂ تکمیل ہونے کا اسلوب صاحب کو احساس ہونے لگا لیکن یہ ایک۔ دن کا کام نہیں، پھر بھی ادھر چند سالوں میں انہوں نے اپنے آپ کو بہت بدلا ہے۔ کم آمیزی کی عادت کم کی ہے اور اب محفلوں میں بھی نظر آتے ہیں اور احباب اور واقف کاروں کا حلقہ بھی بڑھ گیا ہے۔ کھل کر ہنسنے اور قہقہہ لگانے لگے ہیں، لطائف و ظرائف، پھبتی اور شکوہ شکایت سے بھی تھوڑی بہت دلچسپی لینے لگے ہیں۔ اپنی رائے کو منوانے کے لئے ذرا بلند آہنگی سے بولنا اور اپنی بات پر اڑ جانا بھی سیکھ لیا ہے۔ غرض اسلوب صاحب آہستہ آہستہ کتابوں کے اس بھاری بوجھ کے نیچے سے نکلنے کی کوشش کر رہے ہیں جس نے ان کی قابلیت و لیاقت میں تو بے انتہا اضافہ کر دیا تھا لیکن شخصیت کا سارا رس چوس لیا تھا۔ عنقریب انگریزی ادب کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے آکسفورڈ جا رہے ہیں۔ امید ہے وہاں یہ تراش خراش مکمل ہو جائے گی۔

اسلوب صاحب ادب کے معاملے میں کسی رو رعایت کے قائل نہیں۔ خواجہ منظور کی طرح وہ ہر تخلیق کا معیار اور اس کی سطح دیکھتے ہیں۔ اور اس کے تخلیقی عناصر اور رنگ و آہنگ سے متاثر ہوتے ہیں۔ ان کو خود بھی شہرت کی کوئی خواہش نہیں اور نہ ہی ان لوگوں سے بالکل مرعوب ہوتے ہیں جن کا ادبی دنیا میں ڈنکا بجتا رہتا ہے۔ اسلوب صاحب کے نزدیک ایسے لوگ ادنیٰ درجے کے اشتہار باز ہیں۔ ایک نوجوان ادیب کا ذکر ہو رہا تھا جو بڑی تیزی سے اپنی تصانیف کی تعداد میں اضافہ کر رہے ہیں اور اپنا صلاحیتوں کو کسی ایک مرکز پر متعین کرنے کے

بجائے اپنے ذہن کو بنیوں کی دکان کی طرح ہر طرح کے مال سے بھر رکھا ہے۔ ان کے تنقیدی مضامین اور تبصروں کا ذکر چلا تو اسلوب صاحب نے کہا کہ یہ صاحب ہر اس ادیب یا افسانہ نگار کے مداح ہو جائیں گے جو ریڈیو سے منسلک ہو یا کسی مشہور رسالے کا ایڈیٹر اس کے ہاتھ میں ہو تاکہ اس کے ذریعہ اپنی پبلسٹی کرا سکیں۔ یہ لوگ ادیب یا آرٹسٹ نہیں ادبی کباڑیئے اور دلال ہیں۔ اسلوب صاحب کہنے لگے مجھے اس قسم کی شہرت و مقبولیت یا اس طرح کتابوں کا مصنف بننے کی کبھی ہوس نہیں ہوئی۔ میری خواہش ہے کہ چاہے میں زندگی میں چند ہی مضامین یا ایک ہی کتاب کیوں نہ چھوڑ جاؤں لیکن اپنے ضمیر کا خون نہ کروں۔

اسلوب صاحب نے بلاشبہ اپنے سارے مضامین میں محنت کا حق ادا کیا ہے اور ایمانداری کو کبھی ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ ایک بار کہنے لگے کہ ایک شاعر نے مجھ سے محض اس لئے بہت تعلقات بڑھائے کہ اس پر میں مضمون لکھ دوں اور اپنے مضمون میں انہیں وہی عظمت عطا کر دوں جو خود ان کے اپنے خیال کے مطابق انہیں ملنی چاہئے اس پر میں نے کہا کہ بھئی مجھے اس طرح کا کام کرنا ہوتا تو دنیا میں ایسے ذی رتبہ لوگ پڑے ہوئے ہیں جن کی تعریف اور قصیدہ خوانی کو اپنا شعار بناؤں تو مادی منفعت حاصل کر سکتا ہوں اس وقت میں آپ کا ہی انتخاب کیوں کروں گا۔

اسلوب صاحب ۱۹۴۲ء سے لکھ رہے ہیں۔ ان کا پہلا قابلِ ذکر مضمون رسالہ جامعہ میں "اقبال کا ذہنی ارتقا" کے عنوان سے شائع ہوا تھا۔ اس عرصے میں کوئی اور پیشہ ور یا تجارتی ادیب و اشتہار باز ہوتا تو نہ جانے کتنی کتابیں اس کی بازار میں بکتیں۔ لیکن اسلوب صاحب کا یہ حال ہے کہ برسوں میں کہیں ایک مضمون لکھیں گے اور اسے بھی بہت غور و فکر اور نظرِ ثانی کے بعد چھپنے کے لئے دیں گے یہی وجہ ہے کہ رسالوں میں ایک لمبے وقفے کے بعد ان کا کوئی مضمون شائع ہوتا ہے۔ تو چلتا ہوا نام نہ دیکھ کر عام قاری نظر انداز کر دیتا ہے لیکن اہلِ نظر سے وہ چیز نہیں چھپتی۔ ان کا کوئی مضمون ایسا نہیں جو سرسری یا صحافتی اور بھرتی کا ہو اور اسے اول درجے کے اہلِ علم نے نہ سراہا ہو۔ میرا خیال ہے اسلوب صاحب کی یہ روش انہیں ادب میں دیرپا مرتبہ دلائے گی اور ان کی کتابیں چاندی کی چاندنی نہ ثابت ہوں گی۔

اسلوب صاحب کا وطن سہارنپور ہے اور وہ آزاد انصاری کے خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ ایک خوب صورت اور وفا شعار بیوی کے شوہر اور دو معصوم بچوں کے باپ ہیں۔ گھریلو زندگی پُرسکون ہے۔

منیب الرحمٰن

آٹھ سال انگلستان میں رہنے اور وہاں سے فارسی میں پی، ایچ ڈی کی ڈگری لینے کے بعد دو سال پہلے اپنی پرانی درسگاہ علیگڑھ میں وارد ہوئے جہاں سے انہوں نے فارسی کے علاوہ تاریخ میں بھی ایم اے کیا تھا۔ منیب صاحب جب علی گڑھ سے انگلستان گئے تھے تو اپنی شاعری کی وجہ سے مشہور تھے۔ انہوں نے اردو شاعری میں جدید میلانات اور ہیئت کے نئے تجربوں کو آگے بڑھانے میں بڑا سرگرم حصہ لیا تھا لیکن واپس آئے تو اسکالر بن کر۔ شاعری سے زیادہ ریسرچ پسند ہو گئے اور جب اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ میں ان کا تقرر ہو گیا تو وہ اور بھی آہستہ آہستہ شاعری سے دور ہوتے گئے انہوں نے اپنے کلام کا کوئی مجموعہ مرتب نہیں کیا ہے۔ اپنی پچھلی نظموں کو ناقابلِ اشاعت سمجھتے ہیں اور نئی نظم لکھنے کی انہیں فرصت نہیں۔

منیب صاحب ایک دلکش شخصیت کے مالک ہیں۔ قد، قامت، جسم، رنگ اور چہرے کے نقوش ہر اعتبار سے علی گڑھ کی اصطلاح میں انہیں "سویٹ" کہا جا سکتا ہے۔ اپنے والد اکرام حسین صاحب ریٹائرڈ آئی جی اور اپنے بڑے بھائی حفیظ الرحمٰن صاحب [illegible] کے ساتھ ایک خوب صورت اور شاندار کوٹھی "گل رعنا" میں رہتے ہیں اور اس کا ایک حصہ اپنے مخصوص

کر کے اس کا نام "نوشہ" رکھ دیا ہے۔ ان کی سوتیلی بیوی بڑی وفا شعار اور ہر طرح سے ان کے مزاج کے مطابق ہیں۔ وہ یونیورسٹی میں فرنچ اور جرمن زبان کی لکچرر ہیں جن کے کلاسز عموماً شام کو ہوتے ہیں۔ ان کی عدم موجودگی میں مُنیب صاحب شام کو اپنے ننھے بچے معتق کی نگہداشت کرتے رہتے ہیں۔

ڈاکٹر عشرت حسین انور

فارسی اور فلسفہ میں ایم۔ اے ہیں اور "اقبال کی مابعد الطبیعات" پر تحقیقی مقالہ لکھ کر فلسفے میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری لی چینی فلسفے پر تحقیق کرنے چین گئے تھے جہاں ان کی ایک ٹانگ پر فالج گرا اور لارڈ بائرن ہو گئے۔ ادھر چند سالوں سے سنسکرت سیکھ رہے تھے اور سنا ہے اب اس کا سب سے بڑا امتحان دینے والے ہیں۔ عشرت صاحب کو کام کرنے کی بڑی دھن اور جم کر میز پر بیٹھنے کی عادت ہے۔ ملنے والوں سے بچنے کے لئے اپنے گھر کے باہر تالا لگوا دیتے ہیں اور دن رات اپنی تصانیف کی تکمیل میں مصروف رہتے ہیں۔ اقبال کا تقابلی مطالعہ مشرق و مغرب کے سارے فلسفیوں سے کر ڈالا ہے اور بہت جلد اپنی تحقیق کے نتائج اشاعت کے لئے دینے والے ہیں فارسی میں شاعری کرتے ہیں اور اقبال کی مثنوی اسرار خودی کا جواب "سرود بیخودی" کے نام سے دیا ہے۔

عشرت صاحب ایک صوفی منش بزرگ ہیں شادی تمام عمر نہیں کی، اجمیر کی خانقاہ سے وابستہ ہیں اور وہاں کے عرس میں شریک ہوتے ہیں۔ خود ان کے یہاں علی گڑھ میں برابر قوالی کی محفلیں جمتی ہیں۔ ایک آدھ قوال تو مستقل طور پر ملازم رکھ لیتے ہیں۔ بڑے ہنس مکھ اور زندہ دل آدمی ہیں اور باتیں کرتے ہیں تو چھا جاتے ہیں۔ گورا چٹا رنگ اور تیکھے خدوخال ہیں، عینک اور لباس میں زیادہ تر ڈاکٹر ہادی حسن کا تتبع کرتے ہیں اسی لئے ایک زمانے میں علی گڑھ والے انہیں ہادی حسن کا Miniatuere کہتے تھے۔ حالی روڈ کے بنگلے میں فروکش ہیں۔

ڈاکٹر محمد حسن

علی گڑھ میں نووارد ہیں اور ابھی ان کا حال اس پودے کا سا ہے جو دور دراز کی سرزمین سے اکھیڑ کر نئی جگہ پر لگایا گیا ہو اور پورے طور پر نئی ہوا سے مانوس نہ ہونے کی وجہ سے کمھلایا کمھلایا سا رہتا ہو۔ علیگڈھ شہر اور یونیورسٹی دونوں کے ماحول سے شاکی رہتے ہیں اور یہاں رہ کر ہمہ وقت لکھنؤ کو یاد کرتے رہتے ہیں۔ اصل وطن مراد آباد ہے اور زمینداری خاندان سے تعلق ہے۔ تعلیم لکھنؤ یونیورسٹی میں حاصل کی اور وہیں ادبی تربیت حاصل کی اور اپنے مضامین کے ذریعہ روشناس ہوئے۔ تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد عرصہ تک صحافت کے پیشے میں رہے۔ پانیر میں کام کیا اور بعد میں ایک فلمی رسالہ "فلم میل" کے بھی ایڈیٹر رہے۔ اب مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں استاد ہیں۔

محمد حسن صاحب ایک ذہین و طباع آدمی ہیں اور انگریزی اور اردو دونوں زبانوں کے ادب پر اپ ٹو ڈیٹ معلومات رکھتے ہیں۔ رقص، موسیقی، مصوری اور دوسرے فنون پر بھی مضامین لکھتے رہتے ہیں۔ ریڈیائی ڈرامے اور فیچر، کتابوں پر تبصرے اور مختلف موضوعات پر تقریریں ان کی لکھنؤ اور دوسرے ریڈیو اسٹیشنوں سے اکثر ہوتی رہتی ہیں۔ "ہندی ادب کی تاریخ" بھی لکھی ہے اور "ہندوستانی جمالیات" پر کام کرنے کا ارادہ ہے۔ علی گڑھ میں انہوں نے ایک اردو تھیٹر کی بھی بنیاد ڈالی جس نے پچھلے سال علیگڈھ میں اور یہاں سے باہر حیدرآباد اور نینی تال وغیرہ میں مختلف ڈرامے اسٹیج کئے ڈرامے خود ہی لکھتے ہیں، ڈائرکٹ کرتے ہیں اور اسٹیج پر ایکٹر کی حیثیت سے بھی آتے ہیں ــــ محمد حسن صاحب ایک مرنجان مرنج اور با اخلاق آدمی ہیں لکھنؤ میں ان کی صحبتیں مجاز، نصیر حمید اور شوکت صدیقی وغیرہ کے ساتھ رہتی تھیں اور زمانے کے حالات و ظرائف بڑے مزے سے سناتے ہیں شادی ابھی نہیں کی ہے وہ مدو پور کے علاقے میں ذرہ باغ "نامی کوٹھی میں رہتے ہیں وہ ان کا عارضی مکان ہے ان کے مستقل ... علیگڈھ میں آنے کے بعد اگرچہ وہ شاکی رہتے ہیں لیکن ان کی صحت اب لکھنؤ کی نسبت یہاں زیادہ اچھی ہے۔

بہار کی چند ادبی شخصیتیں

شاہ ولی الرحمٰن کاکوی

ماہنامہ نقوش کے مدیر محترم نے فرمائش کی ہے کہ بہار کے ادیبوں سے متعلق ایک مضمون لکھوں۔ انہوں نے موضوع کی وضاحت نہیں کی کہ شعراء بھی ادیبوں میں شامل ہیں یا نہیں۔ مناسب ہیں نے مشاہیر شعراء کو بھی اس فہرست میں شامل کر لیا ہے کیونکہ ادبیات میں شاعری بھی شامل ہے۔

مخدوم شیخ شرف الدین احمد بہاریؒ

آپ امام تاج فقیہ (مرزبن بیت المقدس اور فاتح منیر) کے پوتے۔ مخدوم شیخ شہاب الدین پیر جگ جوت کے نواسے اور مخدوم یحیٰ منیری کے صاحبزادے تھے۔ شیخ پیر جگ جوت مذکور کاشغر کے حکمران اور شیخ شہاب الدین سہروردی (متوفی ۶۳۲ھ) کے مرید و خلیفہ تھے۔ آپ کا مزار بھی درگاہ جیٹھلی میں گنگا کے کنارے پٹنہ سٹی سے چھ میل پورب موجود ہے۔ مخدوم بہاری ۶۶۱ھ میں پیدا ہوئے اور ۷۸۲ھ میں وفات پائی۔ آپ عرصہ تک بہتیہ (شاہ آباد) اور راجگیر (پٹنہ) کے جنگلوں اور پہاڑوں میں فقر و قناعت کے ساتھ ریاضت و مجاہدہ میں مصروف رہے۔ آپ کی پیدائش منیر میں واقع ہوئی تھی جو پٹنہ سے ۲۰ میل پچھم ایک قصبہ ہے اور بہار شریف میں وفات پائی جہاں آپ کی درگاہ بوسہ گاہ خلائق ہے اور ہر سال عظیم الشان عرس ہوتا ہے۔ آپ سے کچھ اردو اقوال بھی منسوب ہیں، مثلاً دیس بھلا پردیس وغیرہ۔ لیکن آپ کے علم و فضل کا اصلی تماشا گاہ آپ کے فارسی مکتوبات ہیں جن میں اسرارِ تصوف پر مدلل بحثیں ہیں۔ آپ علوم ظاہری و باطنی میں کمال رکھتے تھے۔ آپ کے عم زاد بھائی مخدوم شاہ شعیب (متوفی ۸۲۴ھ) نے مناقب الاصفیاء کے نام سے ایک کتاب فارسی میں لکھی۔ آپ کا مزار شیخ پورہ (ضلع مونگیر) میں ہے۔

قاضی سید عنایت اللہ مونگیری (سال پیدائش ۱۰۵۰ھ) فتاوی عالمگیری کی تدوین میں شریک تھے۔ ملا غلام یحیٰ (متوفی [illegible]) ضلع پٹنہ کے ایک گاؤں میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کی قابلیت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ انہوں نے میر زاہد پر حاشیہ لکھا۔ یہ مرزا مظہر جان جاناں (متوفی ۱۱۹۵ھ) کے مرید تھے۔ اس قبیل کے سیکڑوں علماء و فضلاء بہار میں تھے جن کا ذکر نظر انداز کرتا ہوں۔

مرزا عبدالقادر بیدل عظیم آبادی (۱۰۵۴ھ - ۱۱۳۳ھ)

مرزا بیدل ۱۰۵۴ھ میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کی جائے پیدائش میں اختلاف ہے۔ کوئی بخاری کہتا ہے، کوئی لاہوری، کوئی [illegible]، کوئی اکبرآبادی۔

اور کوئی عظیم آبادی۔ بندرابن خوشگو نے سفینۂ خوشگو میں بیدل کو اکبرآبادی الوطن لکھا ہے۔ اس کا بیان قابلِ استناد معلوم ہوتا ہے کیونکہ اس نے بیدل سے دہلی میں ملاقاتیں کی تھیں۔ لیکن علامہ آزاد بلگرامی (متوفی ۱۲۰۰ھ) نے جو بیدل کی وفات (۱۱۳۳ھ) کے وقت ۱۷ سال کے تھے، ان کو عظیم آبادی لکھا ہے، ایک جگہ نہیں بلکہ اپنے تینوں تذکروں، ید بیضا، خزانۂ عامرہ اور سرو آزاد میں۔ علامہ سلیمان ندوی کا خیال ہے کہ بیدل کا مولد و منشا صوبہ بہار تھا۔ مصحفی نے بھی اپنے تذکرہ "عقد ثریا" میں ان کو عظیم آبادی لکھا ہے۔ بہرحال بیدل کی طفولیت اور آغاز شباب کا زمانہ بہار میں گزرا ہے اس لئے اگر ارباب عظیم آباد انہیں اپنا ہم وطن سمجھیں تو کوئی قباحت نہیں۔ شاہ آباد میں آرہ سے ۲۱ میل پچھم ایک قصبہ ہے جس کا نام رانی ساگر ہے اسی کے قریب کوئی بستی سرائے جارس تھی وہاں ایک بزرگ شاہ کمال قادری رہتے تھے۔ بیدل کے والد اور چچا مرزا قلندر کو انہی سے بیعت تھی۔ بیدل بھی انہی کے دامن فیض سے وابستہ ہوئے۔

بیدل کا پایۂ شاعری اتنا بلند ہے کہ ان کے حریفوں کا طائر خیال بھی وہاں تک پرواز نہیں کر سکتا۔ انہوں نے فلسفۂ تصوف و اخلاق کے ایسے ایسے نکتے شاعرانہ لطافت کے ساتھ اور گوناگوں اسالیب سے بیان کئے ہیں کہ بیدل کے کمالات شاعرانہ پر ایمان لانا پڑتا ہے۔ بیدل نے نثر میں بھی تین کتابیں یادگار چھوڑیں، چہار عنصر، نکات بیدل، رقعات بیدل۔ کلیات بیدل میں ہزاروں غزلیں، متعدد مثنویاں اور سینکڑوں رباعیات ہیں۔ غالب نے بیدل کی پیروی کرنا چاہی لیکن ناکام رہے۔ بیدل کے خیالات نہایت عمیق، رنگین اور دلکش ہیں۔ اس رنگ کا کوئی شاعر ایران میں بھی پیدا نہیں ہوا۔ بیدل کے کلام میں ڈارون کا نظریۂ ارتقا اور اقبال کا "انسان کامل" تک موجود ہے ؎

ہیچ شکلے بے ہیولیٰ قابل صورت نشد — آدمی ہم پیش ازاں کادم شود بوزینہ بود
منزل انسان کامل ہر کجا آید بہ چشم — بے تامل شد یقین حق بود یا خر زدہ است

بیدل حیرت کے بیاباں میں سرگرداں ہے، دیر و حرم کی دیواروں سے سر ٹکراتا ہے، لیکن منزل مقصود نہیں پاتا، کیونکہ کنہ ذات تک انسان کی رسائی نہیں۔ اس فلسفہ کو اس نے بار بار بیان کیا ہے، اور قوت اختراع سے ایسے نئے نئے اسالیب سے کام لیا ہے کہ حیرت ہوتی ہے۔ بیدل کے کچھ اشعار ملاحظہ ہوں ؎

ستم است گر ہوست کشد کہ بہ سیر سرو و سمن درآ — تو ز غنچہ کم نہ دمیدۂ در دل کشا بہ چمن درآ
پئے نافہ ہائے رمیدہ بو مپسند زحمت جستجو — بہ خیال حلقۂ زلف او گرہے خور و بہ ختن درآ
تمام شوقیم لیک غافل کہ دل براہ کہ می خرامد — جگر بہ داغ کہ می نشیند نفس بہ آہ کہ می خرامد
مگر نہ چشمش غلط نگاہے رسد بفریاد حال بیدل — وگرنہ آں برق بے نیازی بہ پیش گیاہ کہ می خرامد
نہ تنہا از قدح مستی داز گل رنگ می جوشد — نوائے محفل قدرت بہ صد آہنگ می جوشد
تجدید ناز آشفتۂ رنگ لباس آمدنیست — بے پردگی دیوانہ طرح نقاب افگندنست
ہر جا برون جوشیدہ خود را بہ خود پوشیدہ — در نور شمع محفل فانوس پیراہنست
گاہے بہ کعبہ می روم وگہ بہ سوئے دیر — دیوانہ ام ز حسرت زخم سنگ می زند
بیدل آں شعلہ کز او بزم چراغاں گرم است — یک حقیقت ز ہزار آئینہ تاباں شدہ است
ہمہ عمر با تو قدح زدیم و نرفت رنج خمار ما — چہ قیامتی کہ نمی رسی ز کنار ما بہ کنار ما

بیدل اردو میں بھی شعر کہتے تھے لیکن صرف دو شعر مشہور ہیں جن کو میر نے نکات الشعرا میں درج کیا ہے ؎

مت پوچھ دل کی باتیں وہ دل کہاں ہے ہم میں — اس تخم بے نشاں کا حاصل کہاں ہے ہم میں

جب بلبل کے آستاں پر جو گزر آن کر پکارا
پوچھے ہے سوار برلا ہے بیدل کہاں ہے کیونکر

ملا محمد محسن تحقیق (متوفی ۱۱۲۲ھ) بیدل کے قریب العہد تھے اور فارسی میں اشعار کہتے تھے۔ میر غلام حسین شورش (متوفی ۱۱۹۵ھ) نے فارسی میں اردو شعراء کا ایک تذکرہ لکھا۔ شاہ کمال علی کمال متوفی ۱۱۵[illegible]ھ دیوان (اصلاح کیا)
کے بہتے والے میر کے ہمعصر تھے، دیوان اردو کے علاوہ فاتح الاشاان کے مکاتیب کا مجموعہ ہے۔ حضرت عشق عظیم آبادی (متوفی ۱۲۰۳ھ)
نے اردو دیوان کے علاوہ تصوف میں چند رسالے بھی تصنیف کئے۔ یہ بزرگ مرزا محمد علی فدوی کے استاد تھے اور فدوی سے راسخ عظیم آبادی نے اصلاح لی تھی۔ نواب علی ابراہیم خاں خلیل عظیم آبادی (متوفی ۱۲۰۸ھ) ایک قابل قدر ادیب و مورخ اور بنارس کے گورنر تھے۔ ان کا تذکرہ گلزار ابراہیم (۱۱۹۸ھ) اردو شعرا کا ایک [illegible] پایہ اور مستند تذکرہ ہے گلشن ہند اسی کا ترجمہ ہے۔ خلاصۃ الکلام اور صحف ابراہیم بھی انہی کی تصانیف ہیں ان کا ایک شعر سن لیجئے۔

مرے دیوانہ پن کو دیکھ کر زنجیر ہنستی ہے
یہاں تدبیر کرتے ہیں وہاں تقدیر ہنستی ہے

سید غلام حسین خاں (۱۱۴۰ھ-۱۲۱۹ھ) بڑے پائے کے مورخ اور ادیب تھے۔ انہوں نے نثر کی کئی کتابیں لکھیں جن میں سیر المتاخرین فارسی زبان میں ہندوستان کی تاریخ تین جلدوں میں ہے اور اس کا ترجمہ انگریزی میں بھی ہو گیا ہے۔ ان کا وطن حسین آباد جہنہ (ضلع پلاموں) تھا۔ یہ شاعر بھی تھے اور شیخ علی حزیں سے اصلاح لیتے تھے۔ خواجہ امین عظیم آبادی بھی اردو و فارسی کے شاعر تھے۔ ان کا انتقال ۱۱۹[illegible]ھ میں ہوا۔ ان کے اشعار ملاحظہ ہوں

نیست غمے زمرگ خویش تلخی غم چشیدہ را
دل بہ سفر قوی بود رنج سفر کشیدہ را

دن کٹا فریادیں اور رات زاری میں کٹی،
عمر کٹنے کو کٹی پر کیا ہی خواری میں کٹی

بلبل کو باندھیے تو رگ گل سے باندھیے
دل باندھیے تو یار کی کاکل سے باندھیے

شیخ وجیہ الدین عشقی عظیم آبادی نے تیرہویں صدی ہجری کی ابتدا میں اردو شعرا کا ایک تذکرہ فارسی میں لکھا۔ انہی کے شاگرد آغا حسین قلی خاں عاشقی عظیم آبادی نے دو جلدوں میں فارسی شعرا کا تذکرہ لکھا جس کا نام نشتر عشق ہے۔

شیخ غلام علی راسخ عظیم آبادی

راسخ اردو زبان کے اچھے غزل گو اور مثنوی نگار تھے، شاد عظیم آبادی نے لکھا ہے کہ راسخ ۱۱۶۳ھ میں پیدا ہوئے لیکن یہ صحیح نہیں ہے۔ قاضی عبدالودود بار ایٹ لا کی تحقیق ہے کہ وہ ۱۱۶۹ھ کے لگ بھگ پیدا ہوئے تھے۔ موصوف راسخ نے فدوی سے اصلاح لی تھی مگر پھر لکھنؤ جا کر میر سے مستفید ہوئے۔ ۱۲۳۸ھ میں وفات پائی۔ راسخ کا دیوان شائع ہوا تھا جو اب نا پید ہے۔ انہوں نے انتقال سے چند سال قبل ایک رسالہ لکھا جس کا نام خلاصۃ العروض ہے۔ یہ رسالہ ہنوز غیر مطبوعہ ہے۔ راسخ کے چند اشعار یہ ہیں

صبح سے ہے بیتابی جی کو آہ نہیں کچھ بھاتا ہے
دیکھئے کیا ہو شام تلک دل آج بہت گھبراتا ہے

عقل والوں کی امانت تو نہ آئی کچھ کام
اب ہمیں شیوا اپنا کریں گے کسی سودائی کا

تا خواب مرگ ذکر رہا ان کا زبان پر
نیند آگئی ہمیں تو اسی داستان پر

نہیں ہوش اوروں پہ کچھ حسد مجھے شک ہے تو اپنا ہی ہے
جنہیں تیرے جلوے کے سامنے مری طرح بے خبری رہی

اشعار مثنوی

کیا کہوں آہ محبت کیا ہے
کیا کہوں اس میں مصیبت کیا ہے

عشق اک لذت روحانی ہے — عشق کیفیت وجدانی ہے
اس کے وارفتوں کو محویت ہے — عشق اک زور ہے کیفیت ہے
ابتدا اس کی ہے گریاں رہنا — انتہا رفتہ و حیراں رہنا
عاشقی شوق سے کچھ مت پوچھو — تشنگی ذوق سے کچھ مت پوچھو
کچھ عجب شعلۂ سرکش ہے یہ — ایک پرکالۂ آتش ہے یہ
ایک جنجال ہے مائل ہونا — دو نگاہوں کا مقابل ہونا!
عشق میں طینت اضداد ہے ایک — رتبۂ خسرو و فرہاد ہے ایک

ناسخ کی غزلوں پر میرؔ کی غزلوں کا پرتو ضرور ہے لیکن تغزل میں میرؔ ارفع و اعلیٰ ہیں اور راسخؔ کا اُن سے کوئی مقابلہ نہیں۔ تاہم راسخؔ نے اپنی مثنویوں میں عشق کی جیسی تعریف کی ہے میرؔ کی مثنویوں میں ایسی دلکش تصویریں نظر نہیں آتیں۔ پھر بھی میرؔ میرؔ ہیں اور راسخؔ راسخؔ۔

جوششؔ عظیم آبادی، رضاؔ عظیم آبادی (متوفی ۱۲۱۶ھ)، دلؔ عظیم آبادی، ہیبت قلی خاں حسرتؔ عظیم آبادی، ثابتؔ عظیم آبادی، نالاںؔ عظیم آبادی، مہاراجہ رام نرائن موزوںؔ بھی اس سلسلے میں قابل ذکر ہیں۔

عظیم آباد میں کچھ ایسی دلکشی تھی کہ دہلی کی تباہی کے بعد وہاں کے کچھ شعرا نے یہاں پناہ لی اور اُن میں سے اکثر یہیں پیوند خاک ہو گئے۔ مثلاً فغاںؔ دہلوی (متوفی ۱۱۸۶ھ)، میر ضیاؔ دہلوی، میر باقر حزیںؔ دہلوی وغیرہ۔

قصبۂ پھلواری شریف جو پٹنہ سے چھ میل پچھم واقع ہے علم و فضل کا مرکز رہا ہے۔ اس قصبہ کے شعرا میں شاہ ابوالحسن فردؔ (۱۱۹۱ھ - ۱۲۶۵ھ) خاص طور پر قابل ذکر ہیں، جن کا نہایت ضخیم فارسی دیوان دو مرتبہ شائع ہو چکا ہے۔ اُن کا ایک فارسی اور ایک اُردو شعر درج کرتا ہوں ؎

کشتۂ ناوک تو می دہد جانے دگر — کن رہا تیرے کہ دارم ذوق پیکانے دگر
میرے جنوں کا شور ہے اب آسماں تلک — رسوائی اپنی پہونچی کہاں سے کہاں تلک

اس سلسلے میں چند اور شعرا بھی قابل ذکر ہیں، مثلاً سید شاہ باقر علی باقرؔ گیاوی (شاگرد غالبؔ)، شاہ فرزند علی صوفیؔ منیری (شاگرد غالبؔ) جن کی کتاب وسیلۂ شرف شائع ہو چکی ہے، شاہ امین احمد شوقؔ بہاری مصنف مثنوی شہد و شیر وغیرہ۔

سید فرزند علی صفیرؔ بلگرامی (۱۲۴۹ھ - ۱۳۰۷ھ)

صفیرؔ کی پیدائش مارہرہ میں ہوئی۔ بچپن میں بلگرام آئے اور کچھ ہی دنوں کے بعد آرہ اپنے والد کے ساتھ پہنچ کر یہیں کے ہو رہے۔ ان کو جگت شاگرد کہنا چاہیے کیونکہ انہوں نے رشکؔ و سحرؔ (تلامذۂ ناسخؔ)، غالبؔ اور مرزا دبیرؔ سے اصلاحیں لیں۔ اُردو کلیات شائع نہ ہو سکا۔ بہت پرگو شاعر تھے اور نثر نگاری میں خاص مذاق رکھتے تھے۔ رشحات صفیر، ترجمۂ بوستانِ خیال، چشمۂ کوثر، تحقیق اللسان، مردم دیدہ، اور جلوۂ خضر (تذکرۂ شعرائے اُردو) خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ کہنہ مشق اُستاد تھے اور شاگرد بنانے کا خاص شوق تھا۔ کلام کا نمونہ یہ ہے ؎

خاک سے میری بگولہ پھر عیاں ہونے کو ہے — یہ غبارِ ناتواں بھی آسماں ہونے کو ہے
بادۂ عشرت ہوشیار بتقاضات جوانی نے جام لیا — بادہ پیمائی ساقی نے کی دوڑ کے مجھکو تھام لیا
کس حالت میں دلِ سے واعظ نہیں نقصان رندوں کا — جو شیشہ ٹوٹ جاتا ہے تو پھر پیمانہ ہوتا ہے

خان بہادر سید ضمیر الدین احمد (۱۸۶۲ء - جنوری ۱۹۲۲ء)

آپ عظیم آباد کے ایک عالی خاندان رئیس اور قابل قدر ادیب تھے۔ [illegible] میں پریسیڈنسی کالج کلکتہ سے فلسفہ، انگریزی اور فارسی میں اعزاز کے ساتھ بی اے پاس کیا۔ آپ نے انگریزی اور اردو میں متعدد کتابیں لکھیں مثلاً شیر شاہ کی لائف (انگریزی)، راسخ کی لائف (انگریزی)، داؤد خاں قریشی کی لائف (انگریزی)، ترجمہ طبقات اکبری (انگریزی)، فلسفۂ تصوف، تذکرۂ ملوکی و مملوکی، سیرۃ الشرف۔ تذکرۂ ملوکی و مملوکی میں ملک قطب الدین ایبک سے لے کر خلجی سلاطین تک کے تاریخی حالات درج کئے گئے ہیں۔ سیرۃ الشرف مخدوم شرف الدین بہاری کی لائف ہے۔ آخر الذکر کتاب بہت قابل قدر اور ادبی نقطۂ نظر سے بھی اہم ہے۔ عرصہ ہوا یہ کتاب چھپی تھی، اب نایاب ہے۔ ضرورت ہے کہ اسے پھر شائع کیا جائے۔ آپ نے پنچ وغیرہ میں متعدد مضامین بھی لکھے تھے۔[1]

علامہ سلیمان ندوی (۱۳۰۲ھ - ۱۳۵۳ھ)

علامہ ندوی کا وطن قصبہ دیسنہ ضلع پٹنہ تھا۔ پھلواری اور دربھنگہ میں کچھ دن تعلیم پانے کے بعد ندوۃ العلماء لکھنؤ کے دار العلوم میں داخل ہوئے اور وہاں سے فارغ التحصیل ہو کر ندوۃ العلماء میں مدرس اور دکن کالج پونہ میں پروفیسر رہے۔ الندوہ کی سب ایڈیٹری کی، پھر الہلال کے حلقۂ ادارت میں شامل ہو گئے۔ علامہ شبلی کے خاص تربیت یافتہ اور جانشین تھے۔ دار المصنفین کا خاکہ شبلی نے تیار کیا تھا لیکن اس کی بنیاد و تعمیر علامہ ندوی کی مساعیٔ جمیلہ سے ہوئی۔ شبلی سیرۃ النبی کی صرف دو جلدیں لکھنے پائے تھے کہ ۱۹۱۴ء میں انتقال ہو گیا۔ انہوں نے انتقال کے وقت سیرۃ النبی کی تکمیل کی خدمت علامہ ندوی کے سپرد کی۔ آپ نے ۱۹۲۰ء میں وفد خلافت کے ساتھ انگلینڈ، ۱۹۲۴ء میں وفد حجاز کے صدر کی حیثیت سے حجاز، اور ۱۹۳۳ء میں علامہ اقبال اور سر راس مسعود کے ساتھ کابل کا سفر کیا۔ غرضکہ علامہ ندوی کی علمی، ادبی، سیاسی، تعلیمی، اور مذہبی خدمات سند ہیں۔ اور ایسی روشن خدمات صوبۂ بہار کیا علمائے ہند میں سے بھی کسی نے نہیں کیں۔ اب ایسا جامع حیثیات عالم و ادیب شاید ہی پیدا ہو۔ آپ کا علمی تبحر آپ کے بے شمار مضامین اور تصانیف سے نمایاں ہے۔ الندوہ، معارف، الہلال اور ملک کے دوسرے اخبارات و جرائد میں آپ کے بے شمار مضامین شائع ہوئے۔ آپ کی تحریروں میں روانی و شگفتگی مابہ الامتیاز چیز تھی۔ شذرات و حزنیات لکھنے میں ید طولیٰ حاصل تھا۔ آپ نے حسب ذیل تصانیف یادگار چھوڑیں۔ سیرۃ النبی (جلد ۳ - ۶) ارض القرآن (۲ جلد) حیات امام مالک، سیرت عائشہ، خیام، حیات شبلی، نقوش سلیمانی، اور متعدد خطبات و تقاریر۔ عربی زبان پر بھی آپ کو قدرت حاصل تھی چنانچہ اس زبان میں بھی آپ برجستہ تقریر کرتے اور مضامین لکھتے تھے۔

علامہ ندوی کے سلسلے میں مولانا سید مناظر احسن گیلانی (متوفی ۵ جون ۱۹۵۶ء) کا ذکر بھی ناگزیر ہے۔ آپ بھی ایک عالم و ادیب تھے۔ گیلانی (ضلع پٹنہ) وطن تھا۔ عرصہ تک جامعہ عثمانیہ حیدرآباد کے شعبۂ دینیات کے صدر رہے۔ آپ نے مذہبی، علمی، ادبی موضوعوں پر ہزاروں صفحات یادگار چھوڑے ہیں۔

مولوی مسعود عالم ندوی (متوفی ۱۹۵۴ء) بھی بہار کے فرزند تھے اور علم و ادب کے خدمت گزار۔ عربی کی استعداد بہت اچھی تھی چنانچہ ندوہ

---

[1] آپ کے صاحبزادے سید حمید الدین احمد صاحب بھی ایک ممتاز شاعر و ادیب ہیں۔ ان کی غزلیں رفعت تخیل اور پاکیزگی ذوق کی حامل ہیں۔ انہوں نے نئے اسلوب کے مرثیے بھی لکھے ہیں جو متداول مرثیوں سے بالکل علیحدہ ہیں۔ یہ مضمون نگاری پر بھی قادر ہیں۔

سید وصی احمد بلگرامی

وصی احمد بلگرامی قصبۂ کراکت (شاہ آباد) کے رہنے والے اور صفیر بلگرامی کے پوتے ہیں۔ تیس سال تک ڈپٹی کلکٹری کی۔ سنہ ۱۹۴۶ء میں پنشن لینے کے بعد ترک وطن کر کے کراچی چلے گئے۔ مضمون نگاری کا شوق ابتدائے شباب سے ہے اور متعدد ادبی مضامین کے مالک ہیں۔ ان کی ادبیت مسلم ہے اور طرز نگارش میں انفرادیت نمایاں ہے۔ اُن کے بعض مشہور و مقبول مضامین یہ ہیں "جلترنگ کے نہیں بیٹھے"، "ش ش ص" (مطبوعہ ندیم) "ملک خطا کے شہزادے" (مطبوعہ نگار)، "زلف و رخ" اور "سپاہی کی بیٹی" (مطبوعہ سہیل گیا)۔ "ش ش ص" سے سلطان عظیم آبادی، شاد عظیم آبادی، اور صفیر بلگرامی مراد ہیں۔ اس مضمون میں انہوں نے صفیر کی اُستادی اور سلطان و شاد کی شاگردی کی داستان بیان کی ہے اور شاد کو صفیر کا شاگرد کرنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور صرف کر دیا ہے۔ "سپاہی کی بیٹی" سے اُردو زبان مراد ہے۔ "ملک خطا کے شہزادے" کتابی شکل میں بھی شائع ہو گیا ہے۔ جناب نیاز فتحپوری ان کے ادبی مضامین کے بڑے مداح ہیں۔

پروفیسر نجیب اشرف ندوی، پروفیسر محفوظ الحق مرحوم، اور عبدالمالک آروی مرحوم بھی اس سلسلہ میں قابل ذکر ہیں۔ پروفیسر نجیب اشرف ندوی علامہ سلیمان ندوی کے ہم وطن اور اُردو کے قابل قدر مضمون نگار ہیں۔ اُن کی "رقعات عالمگیر" شائع ہو چکی ہے جس میں اورنگ زیب کے خطوط و رقعات جمع کئے گئے ہیں۔ یہ آج کل رسالہ "نوائے ادب" بمبئی کے اڈیٹر ہیں، یہ رسالہ علم و ادب کی گراں قدر خدمات کر رہا ہے۔ پروفیسر محفوظ الحق مرحوم پٹنہ کے رہنے والے تھے، آرہ میں شادی ہوئی تھی۔ پریسیڈنسی کالج کلکتہ میں شعبۂ فارسی کے پروفیسر تھے۔ ادبیات فارسی کا مطالعہ بڑا گہرا اور وسیع تھا اس لئے ان کو ہندوستان کے فاضل مستشرقین میں شمار کیا جاتا ہے۔ خیامی ادبیات کے وہ بڑے نقاد و محقق تھے۔ انہوں نے متعدد مورخانہ و محققانہ مضامین لکھے اور ساری عمر ادبی خدمات میں گزار دی۔ عبدالمالک آروی مرحوم عربی، فارسی اور انگریزی سے واقف تھے۔ وہ آرہ کلکٹری کے ایک محض معمولی اور گمنام کلرک تھے لیکن علم و ادب کا بڑا شوق تھا۔ انہوں نے متعدد ادبی مضامین لکھے اور کئی کتابیں تصنیف و تالیف کیں جن میں "اقبال کی شاعری" خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ لیکن ان کی تصنیفات و مضامین میں غیر متعلق اور دور از کار باتیں بہت ہوتی تھیں۔ سید مظفر الدین ندوی صاحب بھی بہار ہی کے فرزند ہیں، چاٹگام میں کسی کالج کے پرنسپل تھے۔ اب پنشن پاتے ہیں۔ انہوں نے ایم۔ اسے گمے کی انگریزی کتاب "نطشے" کا اُردو ترجمہ کیا جس کا ایک اقتباس علامہ سلیمان ندوی کی کتاب سیرۃ النبی جلد ششم میں موجود ہے۔

قاضی عبدالودود بارایٹ لاء عظیم آبادی

قاضی صاحب عظیم آباد کے ایک رئیس خاندان کے چشم و چراغ ہیں۔ ابتدائی تعلیم کے بعد کچھ دن علی گڑھ میں تعلیم پائی۔ پھر بلگرامی ٹیوٹوریل کالج علی گڑھ میں داخلہ لیا۔ اس کالج کے ٹوٹ جانے کے بعد پٹنہ سے میٹرک اور آئی اے اول درجہ میں پاس کیا اور سنہ ۱۹۲۰ء میں امتیاز کے ساتھ بی اے کی ڈگری لی۔ سنہ ۱۹۲۳ء میں انگلینڈ جا کر بی اے کینٹب اور بیرسٹر ہوئے۔ سنہ ۱۹۲۹ء میں ولایت سے واپس آ کر علم و ادب کی خدمت میں مصروف رہے۔ قاضی صاحب کو بچپن ہی سے کتب بینی کا شوق ہے۔ ذہانت اور حافظہ اعلیٰ درجہ کا ہے۔ فارسی و اُردو کا مطالعہ بڑا وسیع ہے، وہ صحیح معنی میں ایک گراں پایہ مستشرق کی حیثیت رکھتے ہیں۔ معلومات کا دائرہ اتنا وسیع ہے کہ انہیں فارسی و اُردو ادبیات کا ایک دبستان اور دائرۃ المعارف کہنا چاہیے۔ انہیں تحقیقات کا ذوق فطرت سے عطا ہوا ہے اور بلاشبہ وہ موجودہ دور کے محقق اعظم ہیں۔ علمی و تحقیقی مضامین کا انہوں نے ایک انبار لگا دیا ہے۔ یہ مضامین ملک کے مختلف رسائل میں شائع ہوئے ہیں۔ اگر تمام مضامین کو کتابی شکل میں شائع کیا جائے تو کئی ضخیم جلدیں تیار ہو جائیں۔ قاضی صاحب کی تحقیقات کے کچھ نمونے درج ذیل ہیں۔ خان آرزو کا سال ولادت مصحفی کے تذکرہ "عقد ثریا" میں

۱۱۰۱ھ درج ہے۔ میں نے قاضی صاحب سے دریافت کیا تو انہوں نے خود مجمع النفائس کا حوالہ دے کر کہا کہ وہ ۱۱۹۰ھ میں پیدا ہوئے تھے اور نزولِ غیب مادۂ تاریخ ہے۔ شاہ مبارک آبرو کا سالِ وفات پردۂ خفا میں تھا، قاضی صاحب نے سفینۂ خوشگو سے صحیح سالِ وفات ۱۱۴۶ھ پتا نکال لیا۔ انشا اور جرأت کی تاریخ وفات ۱۲۳۳ھ اور ۱۲۲۵ھ کہی جاتی تھی لیکن قاضی صاحب کی تحقیق ہے کہ صحیح سالِ وفات ۱۲۳۲ھ اور ۱۲۲۲ھ ہے۔ ارباب ادب کو یقین تھا کہ ملا عبدالصمد واقعی غالب کا استاد تھا۔ قاضی صاحب نے دلائل کے ساتھ ثابت کر دیا ہے کہ وہ خود غالب کا زائیدۂ قلم تھا۔

قاضی صاحب کے ذکر کے سلسلہ میں ڈاکٹر مختار الدین آرزو کا ذکر بھی ناگزیر ہے۔ آرزو صاحب بہار سب ڈویژن کے رہنے والے ہیں۔ اُن کی تحصیلِ علم کی مختصر روداد یہ ہے کہ مدرسۂ شمس الہدیٰ پٹنہ سے دستارِ فضیلت حاصل کرنے کے کچھ عرصہ کے بعد گریجوایٹ ہوئے اور علی گڑھ سے ایم اے اور ڈاکٹریٹ کی ڈگریاں لیں۔ پھر پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کرنے کے لئے وظیفہ پا کر ولایت گئے اور مغرب کے چشمۂ علوم سے سیراب ہو کر حال میں واپس آ گئے ہیں۔ آرزو صاحب کی تحریریں مختلف رسالوں میں شائع ہوتی رہتی ہیں۔ اُن کی تحریر سادہ، رواں اور شستہ ہے، اور بیشتر خیال میں ڈاکٹر عبدالحق کی تحریر سے کچھ مشابہت رکھتی ہے۔ علی گڑھ میگزین (۱۹۴۹ء) کا غالب نمبر انہی کی ادارت میں نکلا تھا اور اب کتابی شکل میں "احوالِ غالب" کے نام سے چھپ گیا ہے۔

کلیم الدین احمد

کلیم الدین احمد صاحب ڈاکٹر عظیم کے نامور فرزند ہیں۔ انگریزی میں بی اے آنرز اور ایم اے کی ڈگریاں حاصل کیں اور دونوں امتحانوں میں اوّل آئے۔ ۱۹۳۰ء میں ولایت گئے اور کیمبرج یونیورسٹی سے ٹرائی پاس کر کے وطن واپس آ گئے اور پٹنہ کالج کے لکچرار ہو گئے۔ آج کل پٹنہ کالج کے پرنسپل ہیں۔ کلیم الدین کے تربیت یافتہ دماغ نے اردو ادب کی قدر و قیمت میں اضافہ کر دیا ہے۔ اُن کے تنقیدی مضامین بڑے پائے کے ہوتے ہیں۔ سب سے پہلے ان کی معرکۃ الآرا کتاب "اردو شاعری پر ایک نظر" منظرِ عام پر آئی، اس کے بعد "اردو تنقید پر ایک نظر" اور "اردو داستان گوئی" یہ سب کتابیں اردو میں ہیں۔ انگریزی میں بھی قدرِ اوّل کی ایک کتاب شائع ہو چکی ہے جس کا نام "سائکو اینلسز اینڈ لٹریری کریٹیسزم" ہے۔ کلیم الدین صاحب اردو شاعری کے مرتبے کو تسلیم نہیں کرتے۔ وہ اردو شاعری کے سرمایہ کو مغربی عینک سے دیکھتے ہیں۔ انتہا یہ ہے کہ وہ غزل گوئی کو "نیم وحشی صنفِ سخن" سمجھتے ہیں۔ غزل گوئی وہ صنف ہے جس نے فارسی میں حافظ اور اردو میں غالب کو بقائے دوام کا خلعت دیا ہے۔ اس لئے کلیم صاحب کا تحکمانہ ارشاد قابلِ سند نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح اردو تنقید کو بھی وہ اقلیدس کا خیالی نقطہ اور معشوق کی موہوم کمر قرار دیتے ہیں، لیکن یہ ارشاد بھی قابلِ تسلیم نہیں۔ کلیم صاحب میں ایک عیب یہ بھی ہے کہ اپنے والد ماجد کے کلام پر تنقید کرنے میں انہوں نے غیر جانبداری سے کام نہیں لیا۔ "اردو شاعری پر ایک نظر" میں اُن کی تیغِ قلم سے تقریباً ہر شاعر کا کلام مجروح ہو گیا لیکن ڈاکٹر عظیم کا کلام اس کی زد سے محفوظ رہا۔ ایسی روش ایک نقاد کے دامنِ کمال کا بدترین داغ ہے۔

پروفیسر جمیل مظہری

جمیل مظہری ضلع سارن (صوبہ بہار) کے باشندے ہیں۔ ۱۹۳۱ء میں ایم اے کرنے کے بعد اُن کی ابتدائی صحافتی زندگی کلکتہ کی فضا

میں سانس لینے لگی۔ حضرت وحشت سے ان کو تلمذ ہے۔ ۱۹۳۷ء میں وہ پٹنہ میں پبلسٹی آفیسر ہوئے، لیکن ۱۹۴۲ء کی تحریک سے متاثر ہو کر استعفیٰ دے دیا اور جیل بھی گئے۔ جیل سے رہائی پا کر حضرت جوش ملیح آبادی کی وساطت سے فلمی دنیا میں داخل ہوئے۔ ۱۹۴۶ء میں محکمۂ نشر و اشاعت کے ڈپٹی ڈائرکٹر ہوئے اور ۱۹۵۰ء سے پٹنہ کالج میں شعبۂ اردو کے پروفیسر ہیں۔

جمیل مظہری نہایت بلند پایہ شاعر ہیں، وہ غزلیں بھی کہتے ہیں اور قصیدے بھی، مرثیے بھی اور رباعیاں بھی، غرض وہ ہر صنف سخن پر یکساں قدرت رکھتے ہیں۔ ان کی ذہنیت فلسفیانہ اور رجحان طبیعت مفکرانہ ہے۔ اُن کے طرز بیان و اسلوب نگارش میں قوت و شوکت ہے، الفاظ میں شیرینی دلآویزی، شادابی، شگفتگی اور حلاوت ہے۔ وہ ایک خوش فکر و خوش گو شاعر ہیں۔ اُن کے خیالات میں پختگی و متانت ہے، جذبات میں صداقت ہے، احساس میں شدت ہے، تجربات میں وسعت و ہمہ گیری ہے اور لب و لہجہ شاعرانہ و عاشقانہ ہے۔ ان کے ہاں داخلیت و خارجیت میں ہم آہنگی، طنزیات میں دلکشی و سنجیدگی، افکار و خیالات میں رنگینی اور گہرائی اور طرز بیان میں ترنم اور موسیقیت پائی جاتی ہے۔ وہ ترقی پسند شاعر ہیں لیکن اُن کی شاعری حدود فن کے دائرے میں سانس لیتی ہے۔ ان کی غزلوں کے دو چار اشعار ملاحظہ ہوں۔

بقدر پیمانۂ تخیل سرور ہر دل میں ہے خودی کا
اگر نہ ہو یہ فریب پیہم تو دم نکل جائے آدمی کا

ہے رہ تاریکیوں میں حیراں بجھا ہوا ہے چراغ منزل
کہیں سر راہ یہ مسافر پٹک نہ دے بوجھ زندگی کا

یہی تو انجام جستجو ہے کہ ٹھوکریں کھا کے بتکدوں کی
جبین رسوا کو رکھ کے اپنی حرم کی چوکھٹ پہ سو گیا ہوں

دیتے ہی کہا تھا ساقی نے اس جام میں ہے تلخی عمل
پر مانگ کے واپس کرنے کا موقع ہی نہ تھا پینا ہی پڑا

جمیل کی نظموں کا مجموعہ "نقش جمیل" منظر عام پر آ کر خراج تحسین وصول کر چکا ہے۔ وہ صرف اعلیٰ درجہ کے شاعر ہی نہیں بلکہ بلند مرتبت ادیب بھی ہیں ان کا افسانہ "فرض کی قربان گاہ پر" جو اب کتابی شکل میں "فتح و شکست" کے نام سے شائع ہو چکا ہے نہایت فنکارانہ اور تدراملی کا افسانہ ہے بقول نیاز فتحپوری ان کے قلم سے درجۂ دوم کی کوئی چیز نہیں نکلتی۔ حکیم مزدک ایرانی کے افکار کو بھی انہوں نے افسانوی رنگ میں پیش کیا ہے اور قوت تخیل سے آب و رنگ بھر کر ایک عجیب دلکش تصویر پیش کی ہے۔ مختصر یہ ہے کہ جمیل کی شاعرانہ و ادیبانہ صلاحیت اس شعر کا مصداق ہے۔ ؎

سوز غم دیدۂ پرنم دل شیدا داری
دیگراں انچہ بدارند تو تنہا داری (ولی)

جمیل کے ساتھ پروفیسر اجتبیٰ حسین رضوی کا ذکر بھی اہم ہے۔ اُن کا مجموعۂ کلام "شعلۂ ندا" کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ رضوی کے خیالات و افکار میں بڑی گہرائی ہے اور طرز بیان فلسفیانہ و شاعرانہ ہے۔ وہ تھیاسوفیکل سوسائٹی کے رکن ہیں اور ان کی طبیعت روحانی اور صوفیانہ خیالات کی طرف مائل ہے جس کے نقوش "شعلۂ ندا" میں نظر آتے ہیں۔ وہ بیدل کی طرح دریائے حیرت میں بھی غرق ہیں، اس کا ثبوت اُن رباعیوں سے ملتا ہے جن کا عنوان "حکمت و حیرت" ہے۔ رضوی کے بھی دو تین اشعار سن لیجئے۔ ؎

اسی انقلاب قدم قدم پہ حیات نو کا مدار ہے
جو ہزار طرح کی گردشیں ہیں تو اک طرح کا قرار ہے

ہے شام بجھا بجھا تم تاروں سے ہے صبح جبیں کا جھاک ..... [illegible]
کس نے بال سنوارے ہیں کیس نے روپ نکھارا ہے

ہم تو آشفتہ سری سے نہ سنورنے پائے
آپ سے کیوں نہ سنوارا گیا گیسوا اپنا

اس سلسلہ میں پرویز شاہدی اور تمنا عظیم آبادی کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ یہ دونوں حضرات خاص عظیم آباد کے باشندے ہیں۔ پرویز شاہدی کا شمار ترقی پسند شعراء میں ہے۔ ان کے افکار میں رعنائی اور فنکاری کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔ ان کی شاعرانہ صلاحیتوں کے متعلق صرف اتنا لکھ دینا کافی ہے کہ جمیل مظہری کی ایک شاعری پیاں کی شاعری کو ترجیح دیتے ہیں۔ اُن کی غزلیں اور نظمیں رسالوں میں شائع ہوتی رہتی ہیں۔ اس وقت میرے سامنے اُن کا کلام موجود نہیں ہے۔ اس لئے نمونہ پیش کرنے سے مجبور ہوں۔

ناز عظیم آبادی حضرت نوح ناروی لکھنوی کی یادگار اور قدیم رنگ کی شاعری میں اس صوبہ میں جواب نہیں رکھتے۔ جو کچھ کہتے ہیں بہت پختہ اور استادانہ کہتے ہیں۔

سہو قلم سے میں نے ابھی تک تمنا عمادی پھلواروی کا ذکر نہیں کیا۔ یہ ایک ذی علم بزرگ ہیں اور ان کی استادی، نکتہ سنجی، اور دقیقہ رسی میں کوئی کلام نہیں۔ وہ نثر نگاری پر بھی قدرت رکھتے ہیں۔ چنانچہ شوق سندیلوی کی مشہور کتاب "اصلاح سخن" کے جواب میں انہوں نے "ایضاح سخن" ایک کتاب لکھی جس پر ڈاکٹر عندلیب شادانی نے "معاصر" میں تبصرہ کیا تھا۔

شوق نیموی کے شاگردوں میں ضیا عظیم آبادی مرحوم بھی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ انہوں نے بڑی اچھی طبیعت پائی تھی اور ان کے کلام میں سوز و گداز بہت ہے کیونکہ ان کا دل چوٹ کھایا ہوا تھا۔ ان کا دیوان عرصہ ہوا شائع ہوا تھا اب ناپید ہے۔ ان کی شاعرانہ صلاحیتوں کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ان کے ایک شعر پر میر کے شعر کا دھوکا ہوتا ہے۔ چنانچہ اثر عظیم آبادی اس شعر کو میر ہی کا سمجھتے تھے۔ ؎

اک بیس جگہ میں اٹھتی ہے اک درد سا دل میں ہوتا ہے ہم راتوں کو اٹھ کر روتے ہیں جب سارا عالم سوتا ہے

صحافتی دنیا میں بھی صوبۂ بہار گمنام نہیں ہے۔ [illegible] میں مظفر پور سے سائنٹفک سوسائٹی بہار کی طرف سے "اخبار الاخیار" نام ایک اخبار جاری ہوا تھا جو مہینہ میں دوبارہ شائع ہوتا تھا۔ اس کے اڈیٹر منشی فرمان علی خاں تھے۔ پٹنہ سے ایک ظریفانہ اخبار نکلا جس کا نام "اپنچ" تھا۔ اس کا طرز تحریر اودھ پنچ لکھنؤ جیسا تھا۔ اس نے سالہا سال تک ظرافت کے پھول کھلائے۔ اس کے اڈیٹر منشی عبدالرحیم تھے۔ نواب سید نصیر حسین خیال کی ادارت میں پٹنہ سے "ادیب" نکلتا تھا جس میں علمی و ادبی مضامین شائع ہوتے تھے۔ چند اور اخبارات و رسائل کے نام یہ ہیں۔ اتحاد، المبشر (زیر ادارت سید منظر علی ندوی مرحوم) حسن و عشق (مونگھیر) بزم سخن اور تاج (گیا)، نوید (زیر ادارت عبدالباری ساقی) تصویر خیال، فطرت (راجگیر) بہارستان و صبح نسیم (پٹنہ)، ندیم، سہیل و اشارہ (گیا) تہذیب (پٹنہ) معیار (پٹنہ) معاصر (پٹنہ) بہار تیج (پٹنہ) وغیرہ۔ ندیم انجم کی ادارت میں جاری ہوا۔ پھر ریاست علی ندوی اور اس کے بعد حسن امام وارثی اور محی الدین ندوی اڈیٹر ہوئے۔ اس جریدہ نے ۱۵ - ۱۶ سال تک اردو کی خدمت کی۔ معیار بڑے پایہ کا رسالہ تھا۔ اس کی زندگی نے وفا نہ کی۔ قاضی عبدالودود صاحب اس کے اڈیٹر تھے۔ ان کا نام ہی اس کے محاسن کا ضامن ہے۔ معاصر اب تک جاری ہے اس میں زیادہ تر قاضی عبدالودود صاحب، کلیم الدین صاحب، اختر اورینوی صاحب اور حسن عسکری صاحب کے مضامین شائع ہوتے ہیں۔ حسن عسکری صاحب پٹنہ کالج میں شعبۂ تاریخ کے پروفیسر ہیں۔ اور قابل قدر مؤرخ۔ ان کا دماغ تاریخی معلومات کا مخزن ہے۔ وہ نہ صرف انگریزی کتابوں کا مطالعہ کرتے ہیں بلکہ فارسی کتابوں کا بھی۔ اخباروں میں آج کل "صدائے عام" (زیر ادارت تنظیم جدید صاحب وکیل) اور ساقی (زیر ادارت غلام سرور جو ایک نوجوان ادیب ہیں) جاری ہے۔

یہ مقالہ کچھ طویل ہو گیا ہے۔ لیکن موضوع ہی اتنا وسیع تھا کہ اس سے زیادہ اختصار بھی ممکن نہ تھا۔

سرگذشت عہد گل را از نظیری می شنو
عندلیب آشفتہ تر می گوید ایں افسانہ را

۱؎ بہار تیج بیتاب عظیم آبادی نے جاری کیا تھا جو ایک خوشگو ترقی پسند شاعر ہیں۔ اس کی ادارت ضیا عظیم آبادی کرتے تھے۔

سرحد کی ادبی شخصیتیں

سید فارغ بخاری

صوبہ سرحد کی ادبی تاریخ پر نظر دوڑائی جائے تو ایسی بے شمار ادبی شخصیتیں نظر آتی ہیں جن کی عظمت مسلم ہے جنہوں نے اپنے اپنے دور میں کارہائے نمایاں انجام دیئے اور اپنے ماحول کی کایا پلٹنے میں اہم پارٹ ادا کیا۔ ان میں بڑی بڑی قد آور شخصیتیں بھی ہیں جو کسی طرح سے بھی چھپائے نہیں چھپتیں۔ انہوں نے ایک دور افتادہ اور پسماندہ ماحول میں رہتے ہوئے بھی اپنے آپ کو اجاگر کرنے کے لئے کوئی نہ کوئی راہ نکال ہی لی۔

عنوان کے اعتبار سے میرا موضوع نہایت وسیع ہے اتنا وسیع کہ اگر نقوش کے شخصیات نمبر کا دوسرا حصہ سارے کا سارا بھی اس کے لئے وقف کر دیا جائے جب بھی شاید اس عنوان کی وسعت کا حق ادا نہ ہو سکے۔ کیونکہ اس طرح موضوع صرف اردو شعراء تک ہی محدود نہیں رہتا بلکہ اس میں پشتو، فارسی اور ہندکو زبان کی ادبی شخصیتوں کا ذکر بھی ناگزیر ہو جاتا ہے۔ دوسری طرف تین چار صدیوں میں پھیلی ہوئی اردو ادب کی بیسیوں شخصیتوں کے تفصیلی جائزے کا بھی یہ مختصر مضمون متحمل نہیں ہو سکتا۔

اس صورت میں میں نے موضوع کو سمیٹنے کی غرض سے اپنے لئے ایک درمیانی راہ ڈھونڈ نکالی ہے وہ یہ کہ ان صفحات کو میں ان حضرات کے ذکر تک محدود رکھوں جن سے میں نہ صرف بالمشافہ مل چکا ہوں بلکہ ان سے نیازمندانہ مراسم کا شرف بھی حاصل رہا اور نہایت قریب سے ان کی شخصیت کے مطالعہ کا موقع بھی ملا

مضمون کو زیادہ جامع اور مکمل طور پر پیش کرنے کی غرض سے میں نے ایک تدبیر یہ سوچی ہے کہ پشتو، فارسی، ہندکو زبانوں اور خود اردو ادب کے قدیم اساتذہ کی اولوالعزم شخصیتوں کا سرسری جائزہ لیتے ہوئے گزر جاؤں اور صرف اردو کے ادیبوں اور شاعروں ہی کا تذکرہ کروں۔

پشتو ادب کی تاریخ تقریباً دو ہزار سال پرانی ہے اس لمبے چوڑے عرصہ میں اس نے ہزاروں شاعر اور ادیب پیدا کئے انہیں نہایت دقت نظر سے دیکھا جائے تو جب بھی سینکڑوں ایسی عظیم ادبی شخصیتیں نظر آتی ہیں جنہیں کسی صورت میں بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

بیرونی دنیا تو صرف خوشحال خان خٹک اور رحمان بابا کے ناموں ہی سے واقف ہے اس میں شک نہیں کہ پشتو ادب کی تاریخ میں ان سرود فنکاروں

کی مثال نہیں ملتی۔ خوشحال خاں خٹک کی شخصیت تو کچھ ایسی گوناگوں خصوصیات کی حامل تھی کہ شاید دوسری قوموں میں اس کا جواب مشکل ہی سے مل سکے گا وہ صرف گفتار ہی کا نہیں کردار کا بھی غازی تھا وہ نہ صرف پشتو زبان کے عظیم شاعر اور ادیب کی حیثیت سے بلکہ ایک بہادر اور اولوالعزم جرنیل کے طور پر بھی پشتون قوم میں ایک مسلمہ شخصیت کا مالک ہے۔ اس نے پشتون قوم کو غیر ملکیوں کی غلامی سے چھڑانے کے لئے اپنی تمام عمر میدان کارزار میں گزار دی اس صاحب سیف و قلم نے ایک طرف تو اپنے عہد کی شہنشاہیت سے ٹکر لی جس کی صاحبقرانی ہر آئے سال کا عالم تک پھیلی ہوئی تھی تو دوسری طرف پشتو ادب کو اپنے گراں بہا نثر و نظم ذخیرے سے مالا مال کر دیا۔

رحمان بابا کا کردار خوشحال خاں سے بالکل مختلف ہے۔ وہ ایک صوفی منش شاعر تھا، اس نے پشتو غزل کے باغ میں وہ گل کھلائے جن کی بہار سدا بہار رہی گلزار سدا مہکتا رہے گا۔ رحمان بابا کو ہم پشتو کا حافظ کہیں تو بے جا نہ ہوگا۔ وہ پختون خواہ کا ہر دلعزیز اور نہایت مقبول عوامی شاعر ہے اس کی شاعری میں عوام کے دکھ درد کی ترجمانی بھی ہے اور وہ جوہر اور کشش اور وہ جادو بھی جس کا اثر جلدی ہوتا ہے اور دیر تک قائم رہتا ہے اس کے کلام میں وہ خوبی ہے جس نے اردو میں میر اور غالب اور فارسی میں سعدی اور حافظ کو ہر عہد میں محبوب بنائے رکھا۔

خوشحال خاں اور رحمان بابا کا درجہ پشتو ادب میں بہت بلند سہی لیکن ان کے علاوہ بھی یہاں کئی ایک قد آور شخصیتیں نظر آتی ہیں۔

پشتو زبان کا پہلا شاعر امیر کروڑ ۱۳۹ھ کی دریافت ہے وہ امیر پولاد کا بیٹا تھا، بڑا بہادر، دلیر اور شجاع انسان تھا ایک وقت میں سو مردان جنگی اسلحہ پوش کا مقابلہ کرتا اس نے اپنے عہد میں غور، بالشتان، خیسار، تمران اور برکوشک کے مشہور فولادی قلعوں کو فتح کیا۔

امیر کروڑ تلوار کے ساتھ ساتھ قلم کا بھی دھنی تھا اگرچہ اس کی صرف ایک ہی رزمیہ نظم دستیاب ہو سکی ہے لیکن اس نظم سے یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں کہ وہ کس قدر زوردار قلم کا مالک تھا اور اس نے اپنی طویل عمر میں کیا کچھ نہیں کہا ہوگا۔

اس کے علاوہ بیٹ نیکہ، اسعد سوری، ملک یار غرشین، شیخ متی کو بھی پشتو ادب کے ستونوں کا درجہ حاصل ہے۔

بابا ہوتک آٹھویں صدی ہجری کا ایک ممتاز حماسی پشتو شاعر ہے یہ ایک خدا رسیدہ بزرگ تھا اپنی قوم کا قائد ہونے کے باعث قلم کے ساتھ ساتھ اسے تلوار بھی سنبھالنا پڑی۔ رزمیہ شاعری میں بابا ہوتک کا مرتبہ بہت بلند ہے۔ ان کی نظمیں اپنے ماحول کی آئینہ دار ہیں اور اپنے عہد کی تاریخ پر بھی روشنی ڈالتی ہیں۔

اکبر زمینداروی نویں صدی میں ہوا ہے پشتو کی اولین مثنوی اکبر سے منسوب ہے جس کی وجہ سے اس کی عظمت بڑھ جاتی ہے اس کے علاوہ نظم اور غزل میں بھی اپنی منفرد خصوصیات نے اکبر کو اپنے معاصرین میں بہت بلند کر دیا ہے۔

مرزا خان انصاری نے گیارھویں صدی کا زمانہ پایا ہے وہ اس اعتبار سے پشتو کا منفرد شاعر ہے کہ اس نے سب سے پہلے پشتو شاعری کو تصوف سے آشنا کیا۔ سب سے پہلے اپنا دیوان بھی اسی نے مرتب کیا اور ایک روایت کے مطابق پشتو نثر نگاری کا بانی مبانی مرزا خان ہی ہے۔

مرزا خان پیر روخان کے سکول کا فرد ہے۔ پیر روخان ایک بہت بڑی انقلابی شخصیت تھی وہ ایک عالم باعمل تھے انہوں نے حکومت وقت کی استبدادیت کے خلاف اس وقت علم جہاد بلند کیا جبکہ ان کے ہمعصر علماء حکومت کے ہاتھوں میں بک کر اس کے اشارہ ابرو پر کھیل رہے تھے انہوں نے پیر صاحب پر طرح طرح کے اتہام تراشے اور صاحب اقتدار لوگوں کے ایماء پر انہیں پیر تاریکی کا نام دیا۔ لیکن پیر صاحب ان تمام باتوں سے بے نیاز ہو کر اپنی دھن میں لگے رہے انہوں نے سارے پختون خواہ میں بیداری کی لہر دوڑا دی اور اپنی سحر بیانی سے قدیم نظریات اور غلامانہ روایات کے تار و پود بکھیر دیئے۔

پیر صاحب بڑی اولوالعزم شخصیت کے مالک تھے انہوں نے علمائے وقت اور حکومت وقت کی منظم مخالفت اور قدم قدم پر بے پناہ مظالم کے باوجود عوام کو اپنا گرویدہ بنایا اور اپنے عقیدتمندوں کا اتنا عظیم اور طاقتور گروہ پیدا کر لیا کہ حکومت کو بھی ان کی بڑھتی ہوئی قوت سے خوف محسوس ہونے لگا۔

پیر صاحب کا ادبی پایہ بھی بہت بلند ہے وہ عربی فارسی پشتو اور ہندی زبانوں کے عالم بے بدل تھے انہوں نے پشتو نثر کو رواج دے کر پشتو ادب پر ناقابل فراموش احسان کیا۔

خوشحال خان اور رحمان بابا نے گیارھویں صدی ہجری میں پشتو ادب کو ایک نئی شاہراہ پر ڈال دیا۔ انہوں نے آتے ہی اپنے اپنے الگ سکول جاری کئے۔ اور ان کے بعد سے لے کر دورِ جدید تک جتنے شعراء بھی گزرے ان میں سے ہر ایک انہی دو سکولوں میں سے کسی نہ کسی سے ضرور وابستہ نظر آتا ہے۔

خوشحال خان کا خاندان بڑا زرخیز ثابت ہوا۔ اس نے ہر دور میں کئی ایک بلند پایہ شاعر پیدا کئے۔ یہاں تک کہ یہ سلسلہ آج تک جاری ہے ان دنوں نواز خٹک اور اجمل خٹک اسی مشہور خاندان کی یادگار ہیں جنہیں پشتو ادب کے دورِ جدید میں نمایاں مقام حاصل ہے۔

خوشحال سکول سے زیادہ رحمان سکول مقبول ہوا حتیٰ کہ خوشحال خان کی اولاد میں سے بھی اکثر شعراء نے رحمان سکول ہی کی پیروی کی۔ اس کی وجہ رحمان بابا کے کلام کی سادگی، سلاست، بے ساختگی تھی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ انہوں نے غزل کے مزاج کو قائم رکھنے کی کوشش کی۔ رحمان بابا کی بے پناہ مقبولیت کے باوجود خوشحال سکول یکسر ختم نہ ہوا بلکہ ہر دور میں اس کے مقلد بھی ملتے رہے اور دورِ جدید میں تو ایک دفعہ پھر یہ سکول اس قدر مقبول ہوا کہ اس وقت تمام کے تمام نوجوان پختون شعراء خوشحال ہی کے رنگ میں رنگے نظر آتے ہیں البتہ اتنا ضرور ہے کہ ان کا یہ انداز محض نظم تک ہی محدود ہے اور جہاں تک غزل کا تعلق ہے وہ اب بھی رحمان بابا کی تقلید سے دامن نہیں چھڑا سکتے۔ آخری دور میں حمزہ خان شنواری، سمندر خان سمندر، محمد اکبر خادم، صنوبر خان مہمند، غلیق، قاضی اثر، خاطر ہلالی، زخمی جگر پشتو ادب کی گرانقدر شخصیتیں ہیں۔

دورِ جدید میں اجمل خٹک، سید رسول رسا، فضل حق شیدا، ولی محمد طوفان، قلندر، راہی، مہدی شاہ، سلیم، دوست محمد کامل، فیض یوسف، مراد شنواری، ایاز، نصراللہ خان نصر، امیر، وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔

فارسی ادب کا سراغ یہاں گیارھویں صدی ہجری سے ملتا ہے۔ معز الدین یہاں کا پہلا دریافت شدہ فارسی شاعر ہے۔ لیکن فارسی کے ساتھ ساتھ پشتو اور اردو میں بھی اس کا درجہ بہت بلند ہے۔

ابتدا ہی سے سرحد کے تقریباً تمام اردو پشتو شاعر فارسی میں بھی طبع آزمائی کرتے رہے ہیں اس لئے ان کا علیحدہ ذکر بے محل معلوم ہوتا ہے۔ البتہ تیسرے دور میں چند ایک خالص فارسی گو شعراء بھی ملتے ہیں جن میں سے استاد زین العابدین عابد، قاضی طلاء محمد طلا، منشی امیر الدین امیر، مولوی علی رضا عندلیب، سردار خان بابا خان زاہد، غلام محمد خٹک، مرزا غلام عباس، منشی غلام جیلانی اور سید جی میاں کے نام قابل ذکر ہیں۔

آخری دور میں ادیب پشاوری، رضا کاظمی اور ملک ناصر خالص فارسی گو شعراء میں نمایاں نظر آتے ہیں اور دورِ جدید میں جب کہ فارسی کا ذوق دم توڑ رہا ہے۔ یسمل بخاری سرحد کا اکلوتا شاعر ہے جس نے محض فارسی ہی کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا رکھا ہے۔

فارسی کی طرح ہندی کے شعراء میں بھی یہ خصوصیت رہی ہے کہ وہ مقامی زبان کے ساتھ ساتھ اردو میں بھی اپنے زورِ قلم کے جوہر دکھاتے رہے ہیں۔

سرحد کے خالص ہندکو شعراء میں بارھویں صدی ہجری کی تنہا یادگار استاد گاموں ہیں ان کے بعد رمضو، جیلانی اور دونی چند، مظفر، بردا، مسکین، عبداللہ، شاد، کریم اور نئے لکھنے والوں میں وحشی، مفلس، جوش، سید یونس، معتبر تاتاری، اثر، پہلوان نمتو، نظر، مجید، شادا اور مفتی ممتاز نظر آتے ہیں۔ ان میں سے جوش اور معتبر نے بڑا نام پیدا کیا۔ پرانی ڈگر چھوڑ کر نئی راہیں تراشیں اور ہندکو شعر کو اردو کے دوش بدوش لا کھڑا کیا۔

اردو ادب کا آغاز سرحد میں چودھویں صدی عیسوی میں ہو چکا تھا۔ لیکن اردو کا اولین مستند صاحب دیوان شاعر قاسم علی خاں آفریدی ہے آفریدی نے پشتو فارسی شعر بھی لکھے ہیں لیکن اردو میں اسے ولی دکنی کا مقام حاصل ہے۔
اس کے بعد میں حیدر پشاوری بھی ایک عظیم شاعر گزرا ہے۔
دوسرے دور میں ریاض سرحدی، مدہوش پشاوری، صبح سالم، مرزا عباس اور تیسرے دور میں مسیحی شاہ خادم، عاصی سرحدی، غلام حسین ملک برق گنجوی، سلطان فرخ وغیرہ قابل قدر ادبی شخصیتیں گزری ہیں۔

شائق سرحدی

خصوصاً شائق سرحدی کو تو ایک انقلابی شاعر اور بلند پایہ نقاد کی حیثیت سے بہت اونچا مقام حاصل ہے۔ حالی کی طرح اس نے سب سے پہلے یہاں پرانی قدروں سے بغاوت کا نہ صرف نعرہ بلند کیا بلکہ خود بھی اس پر عمل کرکے دکھایا۔ انہوں نے غزل کو نیا موڑ دینے کے عملی تجربے کئے اس کی آواز گو اس وقت بالکل اجنبی تھی لیکن یہ پورے معاشرے کی آواز تھی یہ پہلی جنگ عظیم کا زمانہ تھا۔ ۱۸۵۷ء کے غدر کے بعد ہندوستانی عوام کو اس بری طرح کچلا گیا کہ وہ برسوں سر نہ اٹھا سکے۔ یہ اثر بیسویں صدی کے آغاز میں کہیں جاکر زائل ہوا۔ تو لوگوں کو اپنی زبوں حالی اور غلامانہ زندگی کا احساس ہوا ان کے دلوں میں انقلاب انگیز ولولے کروٹیں لینے لگے لیکن اس وقت تک ملک میں کوئی انقلابی تحریک موجود نہ تھی۔ اس لئے دلوں کی امنگیں دلوں ہی میں مچل رہی تھیں۔ شائق نے ان عوامی امنگوں کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا انہوں نے اردو شاعری کی روایتی قدروں سے انحراف کرکے نئے رجحانات کو جنم دیا اور سارے ماحول کی کایا پلٹ کر کے رکھ دی۔
شائق ایک مکتبۂ فکر، ایک تحریک، ایک ادارہ تھا اس نے اس تیرہ و تار ماحول میں ایسی انقلابی مشعل روشن کی جسے رجعتی حلقوں کے طوفان اور مخالفتوں کے جھکڑ بھی نہ بجھا سکے۔

مولانا عبدالرحیم پوپلزئی

مولانا عبدالرحیم پوپلزئی اسی مکتبۂ فکر کا ایک بیباک نمائندہ تھے۔ علم و فضل ترکے میں پایا۔ علماء عصر سے حدیث، فقہ اور تفسیر کی تکمیل کرنے کے بعد دارالعلوم دیوبند میں داخل ہوئے جہاں شیخ الہند علامہ محمود الحسن صاحب سے کسب علم کیا۔ ۱۹۱۲ء میں فارغ التحصیل ہو کر پشاور پہنچے تو اپنے استادِ گرامی کے مشورے سے سیاسیات میں حصہ لینا شروع کیا۔
ان کی شخصیت بڑی دلآویز، بڑی جاذب نظر اور بڑی ہمہ گیر تھی۔ وہ بیک وقت ایک عالم اجل، شعلہ نوا مقرر، نڈر صحافی، بے خوف رہنما، بلند پایہ ادیب اور ایک انقلابی شاعر تھے۔ آپ کی تمام عمر قید و بند میں گزری۔ دوران اسیری ہی میں پلورسی کا عارضہ ہو گیا ۱۹۴۲ء میں رہا ہو کر آئے تو بستر علالت پر ایسے پڑے کہ پھر اٹھ نہ سکے اور آخر ۱۹۴۳ء کو اس دارِ فانی سے رخصت ہوئے۔
آپ سرحدی عوام کے محبوب رہنما تھے۔ اپنی عمر کا غالب حصہ انگریزی سامراج کے خلاف جنگ آزادی میں گزارا۔ سرحد میں نوجوان بھارت سبھا اور کانگرس کے بانی مبانی تھے۔ صوبہ سرحد کا نوجوان طبقہ آپ کے خیالات سے بیحد متاثر تھا۔ میں نے طالب علمی کے زمانے میں انہیں کبھی منبر پہ خطبہ دیتے دیکھا تو کبھی خاکروبوں کے جلوس کی قیادت کرتے پایا اور کبھی کسی عظیم الشان عوامی اجتماع کے سامنے دھواں دھار تقریر کرتے نظر آئے۔
سیاسی الجھنوں اور قید و بند کے مصائب نے آپ کو شعر و سخن کی طرف متوجہ ہونے کا کم موقع دیا تاہم انہوں نے جو کچھ کہا وہ فیض کی طرح

کم ہونے کے باوجود اُردو ادب کا قیمتی سرمایہ ہے خصوصاً جنسیات پر تو انہوں نے جو کچھ لکھا وہ سوائے فیض کے اور کسی کو نصیب نہ ہو سکا۔

سائیں احمد علی

میں غالباً پانچویں جماعت میں پڑھتا تھا۔ ہمارے محلہ میں ارباب درزی کی دوکان پر ایک ضعیف العمر شخص سڑک کے کنارے چارپائی پر پڑا رہتا۔ انہیں میں نے یا تو کھانستا ہوا دیکھا یا آنکھیں بند کئے لیٹا ہوا پایا۔ ہر وقت عقیدتمندوں کا ہجوم گھیرے رہتا۔ میں انہیں کوئی خدا رسیدہ بزرگ سمجھتا رہا۔ ایک دن کسی نے بتایا۔ یہ سائیں ہے ——— ہندکو، اردو اور فارسی کا بہت بڑا شاعر ——— یہ سن کر میں بھونچکا رہ گیا۔ اس وقت تک میرے ذہن میں عبا و قبا والے قصیدہ گو درباری شاعروں کا ہی تصوّر تھا ——— "کیا شاعر ایسے بھی ہوتے ہیں؟" میں نے دل ہی دل میں کہا۔ ——— اور اس دن سے آتے جاتے وہاں کھڑے ہوئے پہروں سائیں مرحوم کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے لگا ——— یہاں تک کہ ایک دن ارباب درزی نے مجھے ٹوک دیا ——— "جاؤ بیٹا۔ اپنا کام کرو۔ یہاں کوئی تماشا تو نہیں ہو رہا ———"

سائیں مرحوم اُمّی شخص تھے لیکن ان کی شخصیت اتنی جامع اور بھرپور تھی کہ بڑے بڑے اہل علم ان کا لوہا مانتے تھے ——— ابتدا میں مقامی زبان ہندکو کو اپنایا اور اسے اتنے عروج تک پہنچایا کہ آپ کو ہندکو کا غالب کہا جاتا ہے۔ رفتہ رفتہ اردو فارسی میں بھی طبع آزمائی کرنے لگے اور دیکھتے ہی دیکھتے ان زبانوں میں بھی اپنے لئے ایک نمایاں مقام حاصل کر لیا۔

سائیں زبان و محاورہ کے بادشاہ تھے ہر وقت اردو میں بات چیت کرتے۔ صحت زبان و تلفظ کے معاملہ میں اتنے محتاط واقع ہوئے تھے کہ ذرا بھی کوئی غلط لفظ استعمال کرتا تو بر سرِ مشاعرہ ٹوک دیتے۔

ادبیات سرحد کا تیسرا دور سرحد میں اُردو کی تبلیغی اور عملی کارکردگیوں کا دور تھا اور ان تجربات کی موجد اور پیش رو سائیں کی واحد شخصیت تھی۔ انہوں نے سب سے پہلے پشاور میں پبلک مشاعروں کا آغاز کیا جو اُردو کی نشر و اشاعت اور ادبی تبلیغ کا ایک نہایت مؤثر ذریعہ تھا۔ انہوں نے یہاں کے اوّلین ادبی ادارے بزم سخن کی بنیاد رکھی جس میں ادیبوں کی تمام منتشر قوتوں کو جمع کر دیا۔ یہ انہی کی کوششوں کا نتیجہ تھا کہ مشاعروں کے انعقاد اور بزم سخن کے قیام سے یہاں ایک ایسی شمع روشن ہوئی کہ سرحد کے گوشے گوشے سے ادبی پروانوں کا ہجوم اس کے گرد جمع ہونے لگا۔

سائیں کے شعور کی پختگی اور ان کی عظمت کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ انہوں نے انفرادی سرگرمیوں کو اجتماعی رنگ میں ڈھال کر زبان و ادب کی بیش بہا خدمات انجام دیں۔ آپ عروض سے بھی واقف تھے اور فن شاعری پر بھی پوری دسترس رکھتے تھے اپنے دور کے تمام بڑے چھوٹے شعراء آپ کی عظمت کے قائل تھے اور ان میں سے اکثر آپ سے مشورۂ سخن بھی لیتے تھے۔

آخر عمر میں طبیعت میں تلخی اور چڑچڑا پن آگیا تھا بہت کم بولتے تھے۔ دُور دُور سے لوگ شوق ملاقات لئے آتے لیکن بسا اوقات بیٹھ بیٹھ کر چلے جاتے کسی کو جرأت نہ ہوتی کہ انہیں بلائے یا سلسلۂ گفتگو چھیڑے ——— کبھی موڈ میں ہوتے اور شعر سنانے لگتے تو بھی کسی کو داد دینے یا کلمہ کہنے کا حوصلہ نہ ہوتا ——— کوئی بھولے سے داد دے بیٹھتا تو فوراً سوال کرتے۔ بتا کیا سمجھا ہے؟ ——— شعر سنانا بند کر دیتے اور اس کی وہ خبر لیتے کہ آئندہ کے لئے بیجا داد دینے سے وہ ہمیشہ کے لئے توبہ کر لیتا۔

انہیں نمود و نمائش سے نفرت تھی وہ ہمیشہ خاموشی سے سنانا اور سننا پسند کرتے ——— خود بھی بہت کم داد دیتے۔ چپ چاپ سر ہلاتے سنتے جاتے ——— کہیں غلطی ہوتی تو سر اُٹھا کر معنی خیز نظروں سے دیکھتے اور فوراً اصلاح کر دیتے ——— کبھی کوئی شعر پسند آتا تو سر دھنتے بس یہی ان کی سب سے بڑی داد تھی۔

سائیں کا درس سخن رات دن جاری رہتا وہ آخر عمر میں بہت پینے لگے تھے عمر کی زیادتی کے باعث قویٰ مضمحل ہو گئے اور عناصر میں اعتدال

رہا۔ محمد کشمیری کے پاس اپنے ایک مخلص دوست ارباب مدنی کی دوکان کے سامنے چارپائی پر پڑے رہتے اور اہل علم حضرات کا ہر وقت جمگھٹا لگا رہتا۔

اُردو میں غالب اور انیس سے اور فارسی میں حافظ اور نظیری سے بہت متاثر تھے۔ اردو فارسی کے بیسیوں اشعار از بر تھے جنہیں روزمرہ گفتگو میں نہایت سلیقے سے پیش کرتے۔ سخن فہمی میں ان کا درجہ بہت بلند تھا۔ بیدل اور نظیری کے وقت طلب اشعار آپ کے پاس لائے جاتے اور آپ سنتے ہی صرف چند اشاروں سے مشکل سے مشکل شعر کو صاف کر دیتے۔

لباس نہایت سادہ پہنتے، ہفتوں کپڑے بدلنے کا ہوش نہ رہتا بالکل مجذوبوں کی طرح پڑے رہتے لیکن ایک دنیا قدردان تھی۔

بظاہر معاش کا کوئی ذریعہ نہ تھا لیکن آخر وقت تک بڑی شان سے وقت گزارتے رہے۔ ۱۴ اپریل ۱۹۳۷ء کو پچانوے برس کی عمر پاکر یہ آفتاب علم غروب ہوا اور شیخ حبیب صاحب کی زیارت کے پاس "لکھے دروازے" کے سامنے سپرد خاک کئے گئے۔

بیدل پشاوری

مرزا دلاور خاں بیدل پشاوری سرحد میں اپنے دور کے اولوالعزم شاعر تھے وہ صوبہ سرحد کے قدیم شعراء میں تنہا خوش نصیب شاعر ہیں جن کا دیوان ان کی زندگی میں مرتب ہو کر شائع ہو گیا اور اس اعتبار سے بھی وہ پہلے سرحدی شاعر ہیں جنہیں ہندوستان کے مشاہیر شعراء حضرت بیخود دہلوی، حضرت فصاحت جنگ جلیل حسن جلیل، حضرت ریاض خیرآبادی اور حضرت نوح ناروی نے ان کے دیوان کی اشاعت پر خراج تحسین پیش کیا۔

اُردو فارسی دونوں زبانوں کے بلند پایہ شاعر تھے فن شاعری میں بھی درک حاصل تھا۔ کلام ہموار ہے ان کی شاعری خالص داخلی شاعری ہے۔ کلام میں تعلّی اور خودستائی نہیں اگرچہ جاننے والے جانتے ہیں کہ یہ چیز ان کی طبیعت میں بدرجۂ اتم پائی جاتی تھی اپنے ہمعصروں کا تو ذکر ہی کیا وہ تو میر، غالب اور اقبال کو خاطر میں نہ لاتے۔ ہر ایک کے سامنے برملا ان پر نکتہ چینی کرتے اور اپنے آپ کو ان سے بہتر اور بلند شاعر ظاہر کرتے ــــ ممکن ہے اقتضائے عمر کے باعث آخر وقت میں یہ بات ان کی طبیعت میں پیدا ہو گئی ہو۔

بیدل نے طویل عمر پائی۔ آخر میں ان کا دماغ تقریباً ماؤف ہو چکا تھا بعض اوقات بڑبڑاتے اور ہذیان گوئی کرتے ہوئے بازاروں میں گھومتے نظر آتے ــــ راستے میں جو بھی ملتا اسے باآواز بلند اپنے اشعار سنانے لگتے۔ ہر شعر پر داد طلب کرتے اور دوسرے شعراء کا مضحکہ اڑاتے۔ آخر یہ چیز اتنی بڑھ گئی کہ دوستوں نے ان سے ملنا جلنا ترک کر دیا۔ عمر بھر کے ملنے والے انہیں دیکھتے تو کترا کر نکل جاتے ــــ مشاعرہ میں کھڑے ہو کر سنانے لگتے تو بس سناتے ہی چلے جاتے، لوگ اکتا جاتے، منتظمین تنگ آجاتے لیکن آپ کو ذرا احساس نہ ہوتا۔ کوئی ٹوک دیتا تو ناراض ہو کر چلے جاتے۔ یہاں تک کہ انہیں مشاعروں میں مدعو کرنے سے گریز کیا جانے لگا۔ سادگی ان کے کلام کی بڑی خوبی اور سطحیت بڑا عیب تھا۔
آپ نے ۱۰ اپریل ۱۹۳۹ء کو پشاور میں انتقال کیا اور وزیر باغ کے قریب دفن ہوئے قاضی فضل ربی نے قطعۂ تاریخ وفات کہا۔

سال رحلت روحِ آشفتہ حال ــــ گفت بیدل شاعر شیریں مقال

۱۳۵۸ھ

رعنا کاظمی

اگر انسانی طبائع میں ذہنی وراثت کو واقعی کوئی دخل حاصل ہے تو مجھے یہ کہنے میں باک نہیں کہ شعر و ادب سے میری طبیعت کا لگاؤ در حقیقت میرے ننھیال کا عطیہ ہے یوں تو ددھیال میں علم و فضل کی کمی نہ تھی لیکن وہاں شعر و سخن کا رسیا کوئی نظر نہیں آیا۔ برخلاف اس کے ننھیال میں جہاں

تک سراغ ملتا ہے۔

اور پھر آگے چلیئے تو دونوں ماموں سکندر شاہ رعنا کاظمی اور لعل شاہ جگر کاظمی نہ صرف شاعر بلکہ علم و فضل میں ایک نمایاں مقام کے مالک ـــــــ

رعنا کاظمی مرحوم فارسی زبان کے بے بدل شاعر تھے یہی ذوق انہیں کشاں کشاں ایران لے گیا جہاں برسوں مقیم رہے اور وہاں کی سب سے بڑی درس گاہ میں معلم کے فرائض انجام دیتے رہے۔ اہل ایران سے اپنے علم و فن کا لوہا منوایا۔ چنانچہ ان دنوں وہاں جو شعراء کا تذکرہ لکھا گیا اس میں ادیب پشاوری اور رعنا کاظمی کے نام سر فہرست نظر آتے ہیں۔

میری طفلی کا زمانہ تھا کہ رعنا مرحوم ایران سے لوٹ کر پشاور پہنچے۔ ان کی شخصیت یوں بھی بڑی بارعب تھی جب یہ پتہ چلا کہ وہ شاعر بھی ہیں تو میں اور زیادہ مرعوب ہوا۔ چار پانچ برس کی عمر ہی کیا ہوتی ہے۔ انہیں پہلی دفعہ دیکھا تو یہی جی چاہا کہ لپٹ جاؤں اور التجا کروں کہ مجھے بھی شاعری سکھا دیجئے لیکن ان کے حضور تو بڑے بڑے لوگوں کا ناطقہ بند ہو جاتا۔ میری بساط ہی کیا تھی جو تاب سخن کی جرأت کرتا۔

رعنا کا علم و فضل میں بھی جواب نہ تھا۔ عربی فارسی کے علامۂ روزگار، فلسفہ منطق اور حکمت میں بے مثال ـــــــ بڑے بڑے لسان ان کے سامنے گنگ نظر آتے ـــــــ فارسی کا لب و لہجہ اتنا شستہ کہ اہل زبان بھی سن کر ششدر رہ جاتے۔ علامہ اقبال مرحوم سے ملنے گئے تو انہیں اس قدر متاثر کیا کہ انہوں نے کہا "میں نے آج تک کسی ہندوستانی کو اس قدر فصیح فارسی بولتے نہیں سنا"

علم و فن کے اسی گھمنڈ نے انہیں بد دماغ بنا دیا تھا کسی سے سیدھے منہ بات تک نہ کرتے۔ ان کی اس بد دماغی سے اپنے بیگانے سبھی شاکی تھے۔ اس ہمہ دانی کے باوجود اسی بد دماغی کے باعث تمام عمر فقر و فاقہ میں کٹی۔ عین جوانی میں ادبی حلقوں کو سوگوار چھوڑ کر وفات پا گئے۔

جگر کاظمی

یہ میرے دوسرے ماموں ہیں جو آج ۷۸ برس کی عمر میں بفضل تعالیٰ بقید حیات ہیں۔ یہاں کے بیشتر مشہور شعراء آپ کے حلقۂ تلامذہ میں رہ چکے ہیں جن میں سے حضرت ضیا جعفری اور رعنا کاظمی کے نام قابل ذکر ہیں۔ خود مجھے ان سے اصلاح لینے کا اتفاق نہیں ہوا لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتا کہ شعر و سخن کی طرف میرا رجحان انہی کی توجہ کا مرہون منت ہے۔ ان کی وجہ سے مجھے گھر میں یہ شاعرانہ ماحول نصیب نہ ہوتا تو شاید شاعری کی بجائے میں نے کوئی اور دھندا اختیار کیا ہوتا۔ پھر میں اُن کی دور بین نظر کا بھی معترف ہوں۔ بچپن ہی میں جب کبھی گھر آتے مجھے دیکھتے ہی فرماتے "یہ منا ضرور شاعر نکلے گا" پھر مجھ سے پوچھتے "کیوں بیٹا شاعر بنو گے" میں تائید میں سر ہلا دیتا اور وہ مارے خوشی کے پھولے نہ سماتے ـــــــ

جگر صاحب یہاں کے اولین ادبی ادارے بزم سخن کے مؤسسین میں سے ہیں اور یہاں کے ادبی ہنگاموں میں ہمیشہ پیش پیش رہے ہیں۔ اردو کے علاوہ فارسی کے بھی بلند پایہ شاعر ہیں خصوصاً اس گئے گذرے زمانے میں بھی قصیدہ کی صنف آپ ہی کے دم قدم سے یہاں زندہ ہے۔

جگر صاحب ایک متوسط گھرانے میں پیدا ہوئے نو برس کی عمر میں والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا ماموں کے ہمراہ کلکتہ چلے گئے جہاں مدرسہ عالیہ میں پانچ سال تک پڑھتے رہے ۱۹۱۲ء میں تعلیم چھوڑ کر وطن مالوف کا رخ کیا ـــــــ زاد راہ نہ ہونے کی وجہ سے سال بھر دہلی میں پڑے رہے۔ پشاور پہنچ کر چند دن قیام کیا اور پھر ایک عزیز کے ہمراہ کشمیر جا پہنچے جہاں فارسی عربی کی تعلیم مکمل کی۔

کلکتہ میں قیام کے دوران میں حضرت شمس کلکتوی سے اصلاح لینے اور مشاعروں میں شامل ہونے لگے ان دنوں وہاں آغا حشر مرحوم کی وجہ سے ادبی ہنگامے زندہ دل پر تھے جگر نے ان صحبتوں سے پورا پورا فائدہ اٹھایا ـــــــ دہلی پہنچے تو ایک دن پھرتے پھراتے ایک مشاعرے میں جا پہنچے یہ مشاعرہ حضرت داغ دہلوی کی صدارت میں ہو رہا تھا آپ نے اجازت لے کر غزل پڑھی ایک شعر پر داغ مرحوم نے چونک کر جگر کو دیکھا اور پوچھا "کہاں کے رہنے والے ہو" آپ نے بتایا "سرحدی ہوں" ـــــــ یہ سن کر انہیں بڑا تعجب ہوا ان کی بڑی تعریف کی اپنے برابر بٹھایا اور فرمایا ـــــــ

"ہم تو سمجھتے تھے سرحد پٹھانوں کا ملک ہے وہاں اُردو کوئی جانتا بھی نہ ہوگا۔ لیکن تمہاری زبان تو دلّی والوں سے زیادہ فصیح معلوم ہوتی ہے"
نظم و نثر بے تکلف لکھتے ہیں اور کھرے کھرے کھات لکھتے ہیں —— باغ و بہار قسم کے آدمی ہیں۔ طبیعت میں اَنا ضرور ہے لیکن تکبّر نہیں ——
ہشتاد سالہ بزرگ ہیں لیکن طبیعت جوان پائی ہے۔ صحت بحال اور قویٰ میں اعتدال ہے —— شاعری سے زیادہ اپنی غیر معمولی صحت پر فخر کرتے ہیں اور اس کے اظہار میں مُکّے سے پتھر توڑنے کا کرشمہ بارہا احباب کو دکھا چکے ہیں۔

جگر صاحب عہدِ رفتہ کی یادگار ہیں آپ کے ہمعصروں میں سے صرف قاضی قضا صاحب حیات ہیں۔ آپ نے سرحد میں اُردو کی ترویج کے سلسلہ میں قابلِ قدر خدمات انجام دی ہیں اور ایسے وقت میں ادب کی شمع روشن کی جب کہ یہاں کا ماحول تیرہ و تار تھا —— آپ نے عظیم الشان مشاعروں اور ادبی ہنگاموں کے ذریعے لوگوں میں ادبی ذوق پیدا کیا اور آج سرحد میں اردو ادب جس بلند مقام پر نظر آتا ہے اس میں آپ کی مساعیٔ جمیلہ کا غالب حصہ ہے۔

قاضی محمد عمر قضا

قاضیوں کے مشہور گھرانے میں جنم لیا علم و فضل ترکہ میں پایا۔ شعر و سخن کا ذوق گھٹی میں پڑا تھا کچھ عرصہ داغ دہلوی سے غائبانہ اصلاح لیتے رہے
تمام عمر شعر کہتے اور حقّہ پیتے گزر گئی۔ والد کی وفات کے بعد ایک معقول جائیداد ترکہ میں پائی۔ ساری عمر کوئی دھندا نہ کیا۔ بیٹھ کر کھاتے رہے اسی مشغلے میں تمام جائیداد پھونک ڈالی حتّٰی کہ رہائشی مکان تک نہ رہا۔ کتابیں جمع کرنے کا شوق جنون کی حد تک رہا —— ان کی لائبریری میں فرانسیسی، انگریزی، عربی، فارسی، گجراتی، پشتو اور اُردو کتب کا ایک نہایت قیمتی ذخیرہ موجود ہے جن میں بڑے بڑے نادر نسخے بھی ملتے ہیں۔
ابتدا میں گھڑ سواری اور شطرنج کا بہت شوق تھا لیکن شاعری کے شوق نے باقی تمام شوق بھلا دیئے۔

قضا عالم فاضل شخص ہیں اور اہلِ علم کی قدر کرتے ہیں لیکن نقادانہ طبیعت سے کوئی شخص بھی محفوظ نہیں رہتا۔ ان کی عمر اس وقت ۷۷ برس ہے۔ سماعت جاتی رہی، بصارت کمزور ہو گئی، اعضا مضمحل ہو گئے لیکن دل و دماغ محفوظ ہیں۔ ہوش و حواس قائم ہیں —— اب بھی باتوں میں وہی سنجیدگی وہی مٹھاس اور وہی لذت —— مادری زبان ہندکو ہے لیکن ہمیشہ اردو بولتے ہیں یہاں تک کہ گھر پر بھی اُردو ہی میں باتیں کرتے ہیں —— صاف اور شستہ اردو —— کوثر میں دھلی ہوئی زبان ——

قضا نہایت محتاط اور ممتاز شاعر ہیں انہیں ادبیاتِ سرحد کی تاریخ میں ایک نمایاں مقام حاصل ہے —— وہ اُردو فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے ہیں۔ اصنافِ سخن میں صرف غزل کو اپنایا اور اسے عروج پر پہنچایا۔

قضا کو ہم سرحد کا غالب کہیں تو بیجا نہ ہوگا۔ غالب کی طرح انہیں اپنے فارسی کلام پر ہمیشہ ناز رہا اور اردو مجموعے کو بے رنگ سمجھتے رہے لیکن اُن کی شہرت و عظمت کا باعث یہی اُردو مجموعہ ثابت ہوا —— غالب کی طرح بیدل اور نظیری سے بے حد متاثر ہیں اس لئے اوائل میں طبیعت نہایت دقت پسند تھی اور طرزِ بیدل میں ریختہ لکھنے کو اپنے ذوقِ سخن کی معراج سمجھتے تھے چنانچہ ابتدائی غزلوں میں اُن کا یہی مرغوب انداز ملتا ہے۔

یک جہاں جلوہ ہوا اضطراب ضبطِ دل
قائم اقرار اے قضا ہر آئینہ سیماب تھا

لیکن رفتہ رفتہ سادہ اور سلیس زبان میں غزل کہنے لگے زبان اور محاورہ پر عبور حاصل تھا یہ اسلوب اتنا مقبول ہوا کہ انہوں نے اپنے لئے منفرد مقام حاصل کر لیا ؎

آؤ نہ ہم بھی بھیس بدل کر ادھر چلیں —— ہے ربط ان کے ناز کو ناآشنا کے ساتھ

آئی سمجھ گھڑی قیامت کی　　زلف سے ناپتے ہیں قد اپنا
لیجئے آپ کو مبارک ہو　　کھا گیا غیر کو حسد اپنا

قضاؔ کو داغؔ سے شرف تلمذ رہا لیکن یہ عجیب بات ہے کہ آپ داغ کے مکتبۂ فکر سے بہت کم متأثر ہوئے بلکہ اس کے برخلاف ان کے کلام میں غالب کے رنگ کی جھلکیاں ملتی ہیں۔

قضا سے پہلے سرحد میں غزل روایتی ڈگر پر چل رہی تھی انہوں نے اسے رفعت، حسن اور تازگی عطا کی، مضمون آفرینی کی بنا ڈالی اور غزل کو زمین سے اٹھا کر آسمان پر پہنچا دیا۔ قضا سے پہلے بلکہ ان کے دور میں بھی یہاں غزل میں کوئی ندرت نہ تھی، وہی گھسے پٹے مضمون باندھے جاتے اور اگلے ہوئے لقمے چبائے جاتے ——— قضا نے آکر ایک ایسے مکتبۂ فکر کی بنیاد ڈالی جس نے یہاں کی اونگھتی ہوئی شاعرانہ فضا کو چونکا دیا ——— قضا کی شاعری اس مسلسل بھیانک تاریکی میں روشنی کا مینار ثابت ہوئی ——— تلاش و جستجو کے دلدادہ اس کی طرف لپکے اور اس سے مستفید ہونے لگے۔

قضا میں انانیت ضرور ہے لیکن ان کے علم و فضل کے پیش نظر یہ انانیت انہیں زیب دیتی ہے ——— تمام عمر لکھتے رہے اور اتنا کچھ لکھا کہ کئی دیوان مرتب ہو سکتے ہیں۔ ان کی آخری آرزو یہی ہے کہ کسی طرح دیوان چھپ جائے اور اس کے لئے وہ سالہا سال سے کوشاں ہیں۔ اس وقت سے جب پریس ان کا اپنا تھا اور دیوان چھاپنے میں کوئی خاص دقت نہ تھی۔ لیکن ان کی حد سے بڑھی ہوئی احتیاط اور بدگمانی نے اس دیرینہ آرزو کو شرمندۂ تکمیل نہ ہونے دیا۔ جرائد کو کلام چھپنے کے لئے اس خدشہ سے نہیں دیتے کہ کوئی چرا نہ لے۔

مشاعروں میں ابتدا ہی سے کم شریک ہوتے ہیں اور اب تو اتنے معذور ہو چکے ہیں کہ مہینوں گھر سے باہر قدم نہیں رکھتے۔ ویسے بھی گھر سے باہر شاذ ہی نکلتے تھے۔ تمام دن بیٹھک میں بیٹھے پڑھ رہے ہیں یا پھر حقہ پی رہے ہیں ——— یہ بھی شاید قضا صاحب کی منفرد خصوصیت ہے کہ وہ سلیٹ پر شعر لکھتے ہیں، اسفنج سے مٹاتے اور صاف کر کے لکھتے رہتے ہیں یہاں تک کہ غزل کی نوک پلک درست ہو جائے تو اسے کاپی پر منتقل کر لیتے ہیں۔

ع　نہ چلی سامنے قضاؔ کے　　غوث کی، قطب کی، ولی کی

غلام محمد غوثی سرحدی

۱۹۴۲ء میں تعلیم ادھوری چھوڑ کر گھر سے نکلا اور تلاش معاش میں دہلی ہوتا ہوا کلکتہ جا پہنچا۔ وہاں پشاور کے جواں سال شاعر اختر آصفی کے ذریعے غلام محمد غوثی سے تعارف ہوا۔ آپ صحافی بھی ہیں شاعر بھی اور عروضی بھی ———

بیس برس کی عمر میں اپنے وطن مالوف پشاور کو چھوڑ کر کاروباری سلسلہ میں کلکتہ جاتا ہوا اور وہیں کے ہو رہے غزل کے شاعر ہیں، غزل قدیم رجحانات کی آئینہ دار ہے۔ آغا حشر مرحوم اور وحشت کلکتوی کے جلیسوں میں سے ہیں نہایت ثقہ قسم کے بزرگ ہیں نیشلسٹ خیالات رکھتے ہیں شروع ہی سے کانگرس کے ساتھ تھے اور آج بھی ان کی وضع داری اور اصول میں کوئی فرق نہیں آیا۔ بارہا قید و بند کی صعوبتیں بھی جھیلیں تمام عمر ہنگامہ بازی میں گزری ——— صوفی منش بھی ہیں اور رند مشرب بھی ——— ان کی زندگی عجیب ہنجار سے گزری۔ کبھی سونے چاندی میں کھیل رہے ہیں تو کبھی فقر و فاقے دوچار ———

خوش پوش اور خوش ذوق انسان ہیں ہر وقت فکر سخن میں کھوئے نظر آتے ہیں۔ میری ذہنی تربیت میں غوثی صاحب کا بڑا حصہ ہے۔ اگرچہ میں نے

صرف چند ابتدائی غزلوں پر ہی ان سے اصلاح لی تاہم میرے ادبی ذوق کو جلا دینے اور سب سے پہلے ادبی حلقوں سے متعارف کرانے کا سہرا انہی کے سر ہے۔

۱۹۳۵ء میں پشاور واپس آیا۔ انہی دنوں مجھے یہاں کی ادبی محفلوں میں شمولیت کا موقع ملا اور میری ادبی زندگی کا آغاز بھی ہوا۔ دائرۂ ادبیہ پشاور سے وابستگی اختیار کی اور مشاعروں میں باقاعدہ حصہ لینے لگا۔

اس وقت یہاں کی قدیم ادبی جماعت بزم سخن آخری سنبھالا لے رہی تھی۔ وہ اپنی چٹختی ہوئی بوڑھی ہڈیوں کے ساتھ جواں سال ادبی ادارے دائرۂ ادبیہ سے ٹکر لینے کے لئے میدان میں کود پڑی تھی۔ اس کے صدر محمد شاہ برق تھے۔

محمد شاہ برق

برق صاحب نہایت پرگو اور حاضر دماغ واقع ہوئے ہیں ہمیشہ مشاعرے سے دو تین گھنٹے پہلے بیٹھ کر پندرہ بیس اشعار کی غزل کہہ لیتے ——— ایک دفعہ دفتر سے دو مہینے کی چھٹی لے کر کراٹ گئے اور واپسی پر ایک سو غزلیں لکھ لائے ——— تمام عمر شعر و سخن کے مشغلے میں گزاری۔ دفتر سے چھٹی ہوتی تو بزم سخن کے بالاخانے یا میر عباس مرحوم کے قہوہ خانے میں جا بیٹھتے جہاں احباب جمع ہونے لگتے ادبی بحثیں ہوتیں۔ اساتذہ کے کلام کی شرح کی جاتی، نوعمر شعراء کے کلام پر اصلاح دی جاتی۔ یہاں تک کہ ایک بجے شب یہ محفل برخاست ہوتی اور آپ گھر کا رخ کرتے۔ یہ سلسلہ کم و بیش پچیس تیس برس تک ایک ہی ہنجار پر قائم رہا۔ اب گوشۂ عزلت اختیار کر لیا ہے اور ادبی دنیا سے بالکل کنارہ کش ہو گئے ہیں۔

ہنس مکھ اور ملنسار ہیں کبھی بے تحاشا چائے پینے اور بے تحاشا شعر کہنے کی وجہ سے بدنام تھے لیکن اب صرف کثرت چائے نوشی کا الزام لے کر جی رہے ہیں۔

خالص مکی

دائرہ ادبیہ میں ایک سفید ریش بزرگ کبھی کبھار تشریف لاتے تھے۔ ضعیف العمر، دائم المریض لیکن زندہ دل، فہمیدہ اور باذوق ——— بعد میں معلوم ہوا وہ یہاں کے مشہور اساتذہ میں سے ہیں اور انہیں خالص مکی کہتے ہیں۔

دماغ زرخیز پایا تھا مشرقی علوم پر عبور حاصل تھا خصوصاً شعر فہمی میں تو اپنی نظیر آپ تھے۔ طبیعت دقت پسند تھی۔ بیدل، نظیری اور غالب سے بے حد متاثر تھے اور انہی کی تقلید میں خود بھی فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں نہایت الجھے ہوئے شعر کہتے تھے لیکن بظاہر مومن کے بڑے مداح تھے یہاں تک کہ اس کی مدح میں غالب کی قدح سے بھی دریغ نہ کرتے۔

خالص کے اصلی حریف ان کے ہمعصر جگر کابلی تھے۔ ابتدا ہی سے ان میں ان بن رہی اور یہ چشمک آخر تک قائم رہی ان کا سب سے بڑا مشغلہ ایک دوسرے کی مخالفت کرنا تھا۔ خالص جہاں بیٹھتے جگر پر کڑی تنقید کرتے اور جگر ہر ملنے والے سے خالص کی شکایت کرتے ——— لیکن خالص فوت ہوئے تو سب سے زیادہ قلق جگر کو ہوا وہ رو رو کر کہتے تھے خالص کے اٹھ جانے سے ہماری شاعری ختم ہو گئی اور یہ حقیقت ہے کہ خالص کی وفات کے بعد جگر بالکل گوشہ نشین ہو کر رہ گئے۔

خالص آزاد مشرب اور وسیع المشرب انسان تھے ان کے والد اہل سنت والجماعت سے تعلق رکھتے تھے۔ ہوش سنبھالا تو اہل حدیث بن گئے شیعی لٹریچر پڑھتے پڑھتے اثنا عشری ہوئے۔ بمبئی میں کہیں سے خواجہ کا لٹریچر ملا اس سے متاثر ہوئے۔ کچھ دن عیسائیت کی طرف رجحان رہا۔ پھر مرزا غلام احمد صاحب کے ہاتھ پر بیعت کر لی اور آخر میں سب بندھن توڑ کر بالکل آزاد ہو گئے۔ نہایت خوش مذاق اور صاف گو واقع ہوئے تھے [illegible]

پہ ایک لطیفہ اکثر سنایا کرتے کہ انکا ایک پٹھان دوست انہیں محرم کے جلوسوں میں دیکھا کرتا تھا۔ پھر اس نے سنا خالص قادیانی ہو گئے، کچھ دنوں بعد ایک گرجے میں پاکر وہ بے حد متعجب ہوا اور بے ساختہ بولا "یہ کمبخت بھی ہر مذہب میں حاضر ہے"۔

خالص نستعلیق قسم کے بزرگ تھے چہرے سے تدبر اور رعب ٹپکتا۔ گفتگو ثقہ اور متین ہوتی۔ علمی باتوں میں بڑی دلچسپی لیتے اور خوب مزے لے کر طنز کے تیر پھینکتے جاتے۔ دوسروں کو زچ کرنے میں انہیں بڑا لطف آتا۔ وہ نہایت روشن خیال اور روشن دماغ انسان تھے کسی بات کا برا نہ مانتے یہاں تک کہ اپنی کمزوریوں کو بھی برملا بیان کرتے لیکن افسوس کہ ان کی تحریروں میں یہ بات پیدا نہ ہو سکی۔

خالص مزدور پیشہ تھے آمد محدود تھی لیکن طبیعت شاہانہ پائی تھی۔ مہینوں فقر و فاقہ گزارنے کے بعد جہاں کہیں کام بنتا اور سو پچاس روپے ہاتھ آتے وہیں دوستوں کو کھلا پلا کر پھر وہی فقر و فاقہ ——— اپنے کام میں بڑے ماہر تھے ٹھیکیداری میں لاکھوں کمائے لیکن کچھ بھی پس انداز نہ کر سکے۔ ہزاروں عالیشان بلڈنگیں بنائیں مگر اپنے لئے ایک جھونپڑا تک نہ بنا سکے۔ ایک ٹوٹے پھوٹے کرائے کے مکان میں رہتے جو ایک دن بارش ہوتی تو مہینہ بھر ٹپکتا ———

آخر عمر میں صحت جواب دے گئی۔ ذیابیطس کے مریض تھے، ہاضمہ بیکار ہو گیا، سماعت جاتی رہی، چلنے پھرنے سے معذور ہو گئے ——— کام کاج کرنے کے قابل نہ رہے۔ احباب نے کوشش کر کے سکول میں معلم کرا دیا۔ لیکن وہاں بھی زیادہ دن نہ گزار سکے مسلسل بیکاری کے باعث تنگدستی ایسی مسلط ہوئی کہ مرتے دم تک چھٹکارا نہ مل سکا۔ خودداری کا یہ عالم کہ کبھی کسی کے سامنے ہاتھ نہ پھیلایا۔ کئی کئی وقت کا فاقہ ہوتا لیکن چہرے پر مسکراہٹ کھیلتی رہتی، ماتھے پر بل تک نہ آتا ——— لیکن اپنی زندگی کے اس المیے کو بھی وہ اپنی شاعری کا موضوع نہ بنا سکے۔

خالص کی شعر فہمی ان کی سب سے بڑی خصوصیت تھی۔ ایک دفعہ یار دوستوں کو مذاق سوجھا سب نے مل کر ایک مہمل غزل لکھی جو محض الفاظ و تراکیب کا گورکھ دھندا تھی غزل انہیں سنائی گئی انہوں نے بڑی تعریف کی لیکن جب راز کھلا تو وہ اڑ گئے کہ اس میں معانی موجود ہیں۔ چنانچہ اب جو انہوں نے اسے معنی پہنانے شروع کئے تو سب حیرت سے ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے وہی مہمل غزل خالص کی سحر بیانی سے اچھی خاصی غزل معلوم ہو رہی تھی۔

فروری ۱۹۶۳ء میں پشاور میں انتقال کیا اور یہیں دفن ہوئے۔

رضا حسین رضا ہمدانی

اسی دوران میں رضا ہمدانی سے میرا تعارف ہوا جس سے آگے چل کر ایسے قلبی تعلقات قائم ہوئے کہ ہماری رفاقت دوستوں کے حلقوں میں ضرب المثل بن گئی اور ہم ایک دوسرے کے نام سے پہچانے جانے لگے۔

رضا ہمدانی سے میری پہلی ملاقات بزم سخن کے ایک مشاعرے میں ہوئی اور پھر جب ملاقاتوں کا سلسلہ بڑھا تو بڑھتا ہی گیا ——— میں نے اس ایرانی الاصل، غزال چشم مغل زادے کو ایرانی اور ترکمانی قالینوں میں رفو کرتے ہوئے بھی شاعری میں مگن پایا اور رنگ برنگے شال دوشالوں میں پیشے ہوئے بھی فکر سخن میں غلطاں دیکھا ——— رضا کی دوکان پر ہر وقت شعراء کا جمگھٹا لگا رہتا اور وہ اپنے شاعرانہ پیشے رفوگری کے تانے بانے میں مصروف۔

رضا بزم سخن کا جنرل سیکرٹری تھا۔ بزم کا حقیقی دفتر رضا کی دوکان ہی تھی معاشی دھندے کے بعد اس کا سارا وقت ادبی خدمت کی نذر ہو جاتا۔

ایک مدت تک رضا کی انگلیاں نوک سوزن سے چھلنی ہوتی رہیں ——— وہ قالینوں اور شال دوشالوں کے سوراخ بند کرتا رہا اور معاشی ناآسودگی اس کے دل میں ناقابل رفو سوراخ بناتی رہی۔ یہاں تک کہ ایک دن وہ رفوگری سے گلو خلاصی کر کے پتیل کے ترازو میں سبز و سیاہ چائے تولتے دیکھا گیا۔ یہاں بھی ہم مشرب احباب کا جمگھٹا رہنے لگا۔ پرائی نوکری میں یہ سلسلہ کب تک چلتا۔ آخر اس نے اس غلامی سے بھی جان چھڑائی اور رہائش گاہ میں ایک چھوٹی سی قبائلی دکان کر لی۔ تھوڑی سی آمد و رفت ——— جس میں شاعری زیادہ ہوتی اور دکانداری کم ———

دائرہ ادبیہ اور بزم سخن کی باہمی چپقلش، شاعرانہ سیاست کے جوڑ توڑ اور تخریبی مگر زندہ دلی سے بھرپور سکیموں کا مرکز یہی دوکان تھی۔ اس گروہ بندی کے باوجود رضا کی امن جو اور صلح کن طبیعت کا یہ عالم تھا کہ حزب مخالف کے اراکین بھی اس کی قدر کرتے —— راقم الحروف دائرہ ادبیہ کے ساتھ وابستہ تھا۔ اور رضا سے بھی قلبی انس تھا —— ہم دونوں بزم و دائرہ کے موضوع پر ہر وقت بحثتے اور اکثر یہ مباحثہ تکرار مجادلے کی سرحدوں کو چھونے لگتا —— اسی قضیئے کو نپٹانے کے لئے ہم نے ایک الگ جماعت بنانے کا فیصلہ کیا اور ۱۹۴۸ء میں ہم نے بزم سخن اور دائرہ ادبیہ سے قطع تعلق کر کے دبستان کا سنگ بنیاد رکھا۔ اب رضا کی ادبی سرگرمیاں مشاعروں کے حدود پھاند کر نشر و اشاعت کا روپ اختیار کر گئیں ماہنامہ ندا اور ہفتہ وار شباب انہی ایام کی یادگار ہیں۔

جب معاشی بحران نقطۂ عروج کو پہنچ گیا تو رضا نے میری معیت میں پشاور سے ہجرت کر کے راولپنڈی کو جا بسایا۔ وہاں بھی ادبی ہنگاموں نے ساتھ نہ چھوڑا پھر لاہور جا کر ہفتہ وار مصور شباب کا اجراء کیا اور جب شباب بند ہو گیا تو کراچی جا کر صحافت کو ذریعہ معاش بنانے کی کوشش کی۔ ادبی لگن وہاں بھی ہمراہ رہی۔ چنانچہ انجمن ترقی اُردو کراچی کی سلور جوبلی منعقدہ ۱۹۵۱ء کے انتظام و انصرام میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور انجمن کی پچیس سالہ ادبی رپورٹ رضا ہی کے تراوشِ قلم کا نتیجہ تھی جو سندھ میں اُردو کی ایک مجمل تاریخ ہے۔

دوسری جنگ عظیم کا ریلا جہاں ملک کے افراد کو ساتِ سمندر پار لے گیا وہاں اس نے ہمیں وطن آنے پر اکسایا اور جب ہم پشاور پہنچے تو پھر وہی معاش کا سوال اپنی بھیانک صورت لئے ہمارے سامنے آکھڑا ہوا۔ اسی زمانہ میں ہم دونوں نے طبی لائن اختیار کی اور کچھ عرصہ بعد —— رفوگر رضا قالینوں کی بجائے جسم انسانی کے زخموں کو رفو کرنے لگا۔

آج غیر شاعر دنیا رضا کو ڈاکٹر کی حیثیت سے جانتی ہے اب وہ ملازمت سے تو بے نیاز ہے لیکن شعر و ادب سے بے نیاز نہیں —— سنگ میل کا جری التوا بھی اس کے تخلیقی جذبے میں سنگ گراں نہ بن سکا۔ چنانچہ اس وقت وہ بے شمار کتابوں کا مصنف ہے۔

رضا کی شاعری میں مقصد بھی ہے اور فن بھی —— دل کی باتیں بھی ہیں اور دماغ کی بھی —— ادب کی چاشنی بھی ہے اور عمل کی حرارت بھی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس میں وہ خلوص ہے جو شعر کو تصنع اور آورد سے پاک اور منزّہ رکھنے میں مدد دیتا ہے۔

رضا ادبیات سرحد کا ایک ناقابل فراموش باب ہے وہ سچا رفیق، مخلص فنکار اور متحرک ادبی کارکن ہے —— وہ سادہ وضع، سادہ دل اور سادہ نظر انسان ہے اس کی ادبی خدمات کا پلڑا بہت بھاری ہے اس نے یہاں دور جدید میں نہایت اہم پارٹ ادا کیا —— وہ سب سے پہلا سرحدی ادیب ہے جس نے پشتو لٹریچر کو اردو دان طبقے سے متعارف کرایا یہی کارنامہ اس کا نام زندہ رکھنے کو کافی ہے لیکن اس کے علاوہ بھی اس نے بہت کام کیا اس کی نظم و نثر تخلیقات بے پایاں ہیں وہ گزشتہ تیس برس سے خدمت ادب میں منہمک ہے وہ گلشن ادب کا ایک سدا بہار پھول ہے ایک مکتبۂ فکر ہے، ایک تحریک ہے ——

جعفر علی جعفری

جعفری کو میں نے دیکھا تو وہ نابینا تھے لیکن کہتے ہیں کچھ عرصہ پہلے ان کی آنکھیں اچھی بھلی تھیں دوکانداری کرتے تھے اور ان کی دوکان پشاور کے شعراء کا سب سے بڑا مرکز تھی۔ بینائی کے ساتھ دوکان بھی جاتی رہی لیکن اس حادثے نے ان کے شعری قویٰ کو مفلوج کرنے کی بجائے اور جلا دی اور وہ پہلے سے کہیں زیادہ بڑھ چڑھ کر شعر و سخن میں دلچسپی لینے لگے۔

جعفری بزم سخن کے فدائی تھے اور اس بزم کی تمام تر سرگرمیاں انہی کی مرہون منت تھیں۔ مشاعروں کے لئے پنڈال سجانا، شعراء کو چٹھیاں اور ٹکٹ تقسیم کرنا —— غرض کہ سب کچھ جعفری ہی کو کرنا پڑتا۔ اس کے علاوہ وہ تمام نو آموز شعراء کے کلام کی اصلاح بھی کرتے اور مشاعروں کو کامیاب بنانے

میں بانٹ دیتے۔ پھر انہیں پڑھنے کی ریہرسل بھی کراتے اور مشاعروں میں خود ہی انہیں داد بھی دیتے —— دن جتے رہتے۔

بہرحال ضیا اور قمر کے ایک دن تھے۔ ہنگامہ آرائی ان کی زندگی تھی اور طنز و مزاح ان کی گھٹی میں پڑے تھے —— ہر مشاعرے کے طرحی مصرع سینچ رہے ہیں۔ یہی اگر ہو گیا شعر ضرور کہتے —— ادھر یہ شعر ان کے منہ سے نکلتے اُدھر زبان زد خاص و عام ہو جاتے اس طرح مشاعرے سے مشاعرے میں پہنچتے ہی ایک ہنگامہ بپا ہو جاتا۔

حسین میر جعفری کا طنز ان کے اقتضائے طبیعت کے باعث تھا اس سے کسی کی دل آزاری مقصود نہ تھی چنانچہ وہ اپنے عزیز دوستوں اور جلیسوں ایک رعایت نہ کرتے بلکہ بعض اوقات تو اپنے آپ کو بھی لپیٹ میں لے آتے۔

ہم کہاں کے مرد میداں تھے مگر اے جعفری
جب کبھی پی لی تو اس کوچے میں پھیرا ہو گیا

ان کے طنزیہ اشعار بے شمار ہیں لیکن ان میں زیادہ تر ثقاہت سے گرے ہوئے اور مبتذل قسم کے ہیں اگرچہ ان میں فنی محاسن موجود ہیں لیکن ابتذال کی وجہ سے احاطۂ تحریر میں نہیں لائے جا سکتے۔

ہزلیات اور ہجو میں جعفری کا کوئی ثانی نہ تھا ان کی شوخ و شنگ طبیعت اس طرف خوب چلتی تھی اس پر امی بھی تھے اس لئے انہیں جرأت سے بڑی مناسبت تھی لیکن ان کے حسرت ناک انجام پر نظر کی جائے تو وہ انشاؔ سے بہت ملتا ہے۔ آخری ایام میں جب راقم الحروف رضا ہمدانی کی معیت میں جعفری کے مکان پر انہیں دیکھنے گیا تو ان کی حالت زار دیکھ کر بے اختیار آنسو نکل آئے —— کمرے کے ایک کونے میں سر گھٹنوں میں دیئے گم سم بیٹھے تھے، بیمار و نزار، جسم میں کپکپاہٹ —— ہماری آواز سن کر سر اٹھایا آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑے بہت دیر تک وفور گریہ سے بات نہ کر سکے آخر بولے "زارغ بھائی مرنے کے انتظار میں گھڑیاں گن رہا ہوں لیکن یہ انتظار کمبخت تو طول شب ہجراں بن گیا ہے تم جانتے ہو میں اندھا ہو کر بھی کسی پر بوجھ بن کر نہیں رہا لیکن اب اتنا معذور ہوں کہ زندہ لاش بن کر رہ گیا ہوں۔ بھائی بھاوج خدمت میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتے لیکن یہ مانگے تانگے کی زندگی مجھے منظور نہیں۔"

اُن کی یہ سقیم حالت دیکھ کر دل بھر آیا۔ یا اللہ کیا یہ وہی جعفری ہیں جن کی باتوں سے پھول جھڑتے تھے جو اپنے لطیفوں سے محفل کو زعفران زار بنا دیتے تھے —— جن کے سامنے بڑے بڑے چرب زبان گنگ ہو کر رہ جاتے۔ انہیں دیکھ کر مجھے آبِ حیات کا وہ واقعہ یاد آگیا جو مولانا آزاد نے انشاؔ کے متعلق لکھا ہے۔

دراصل جعفری کی زندہ دلی کا جنازہ اس دن نکلا جس دن اس کی جواں سال اکلوتی لڑکی اچانک فوت ہو گئی اس زخم نے جعفری کی زندگی کو سلب کر دیا اور ان کا دل یک لخت دنیا اور دنیا کے ہنگاموں سے اچاٹ ہو گیا ادبی محفلوں میں جانا چھوڑ دیا اور گوشہ نشینی اختیار کر لی۔

جعفری نے تقریباً دو برس کی طویل علالت کے بعد جون ۱۹۵۱ء کو وفات پائی۔

ضیا جعفری و عبدالودود قمر

دائرہ ادبیہ میں یوں تو بہت سے نوجوان ادیب موجود تھے لیکن ضیا اور قمر اس ادارے کی روح رواں تھے انہوں نے بزم سخن سے بغاوت کر کے دائرہ کی بنیاد رکھی اور اپنی ان تھک کوششوں سے اسے انتہائی عروج تک پہنچایا۔ میں دائرہ ادبیہ میں آیا تو ضیا اور قمر کا طوطی بول رہا تھا۔ اس وقت مرحوم کے طول و عرض میں نئے اور پرانے اچھے اچھے لکھنے والے موجود تھے لیکن ان دو شخصیتوں کے سامنے سب کے سب گھٹنے اور

سے بھرپور محفلوں کا مرکز یہی دوکان تھی۔ اس گروہ
باشندے معلوم ہوتے تھے ۔

ضیا اور قمر کی رفاقت ادبیات سرحد کا ایک سنہری باب ہے انفرادی طور پر شاید ان کی سرگرمیاں اتنی قدر کرتے ——— راقم الحروف دائرہ ادبیہ نے بے تعطل کام کیا ——— یہی تیم دورِ جدید کی بانی مبانی ہے انہوں نے ماضی کی فرسودہ قدروں سے بغاوت کی تحت بخشتے اور اکثر یہ مباحلۂ افکار جاری رہتے ہموار کی اور نئے لکھنے والوں کی صحت مند تربیت سے ان کے دلوں میں خود اعتمادی اور بلند نگاہی کے جذبے کو جنم دیا ۔ ۱۹۳۴ء میں ہم نے بزم سخن اور

ضیا اور قمر کی ملاقات حادثاتی تھی قمر کی رعنائی جمال کا شہرہ تو تھا ہی لیکن ضیا بھی مہر نیم روز سے کم نہ تھے دونوں ایک دوسرے کے دام اشاعت کا روپ گھائل ہو گئے کہ آج تک ان کے بندھن نہ ٹوٹ سکے ۔ ان کی اٹوٹ رفاقت کی وجہ مزاج کی ہم آہنگی بھی تھی دونوں مذہبی رجحانات کے دونوں "در جوانی توبہ کردن" والے پیغمبرانہ گروہ میں سے تھے دونوں علم و فضل کے شیدائی اور شعر و ادب کے رسیا تھے ضیا نے قمر کو تصوف یوں سے لگا کر رہی سہی کسر بھی پوری کر دی ۔ دونوں نے ایک ہی پیر کامل سے بیعت کی اور ایک دوسرے کے ابدی ساتھی بن گئے ۔ کی۔

ضیا اور قمر کو ایک دوسرے سے علیحدہ کر کے نہیں دیکھا جا سکتا ۔ وہ مثبت و منفی تاروں کی طرح مل کر سرحد کے ادبی ماحول میں روشنی کا مینار ثابت ہوئے ۔ ضیا صرف ادیب اور شاعر ہی ہے لیکن قمر اس کے ساتھ ساتھ ایک اچھا منتظم اور ان تھک ادبی کارکن بھی ہے ۔ نئی پود کی تربیت میں ان دونوں کا بڑا حصہ ہے دائرہ ادبیہ کے زمانے میں راقم الحروف مشورۂ سخن ضیا صاحب سے لیتا تھا لیکن ذہنی تربیت اور لکھنے لکھانے کی ترغیب قمر صاحب ہی نے دلائی ۔

ضیا کو دورِ جدید کے کاروان سالار کی حیثیت حاصل ہے ۔ سرحد میں سب سے پہلے جدید اقدار کو انہوں نے ہی اپنایا ۔ ان کی شاعری کلاسیکیت اور جدت کا ایک خوشگوار سنگم ہے وہ پرانی قدروں کی بنیادوں پر نئی عمارت کھڑی کرنے کے حامی ہیں اسی توازن نے انہیں بھٹکنے سے بچایا اور ہر عہد میں مقبول بنایا ———

ضیا کے کلام کی سب سے بڑی خصوصیت ان کی رجائیت ہے ۔ وہ صوفی منش بھی ہیں اور رند مشرب بھی ——— ان میں فرار بھی ہے اور اقرار بھی ——— ان کے ہاں جنسی میلان بھی ہے اور زندگی کے ٹھوس مسائل بھی ——— وہ فن کے دلدادہ بھی ہیں اور مقصد کے شیدائی بھی ———

ضیا کی زندگی اور فن میں جتنی مطابقت پائی جاتی ہے وہ شاید ہی کسی اور فنکار کو نصیب ہوئی ہو ——— صوفی منش ہونے کے باعث وہ اپنی روزمرہ زندگی میں ایک صلح کل انسان ہیں ——— ہر مذہب، ہر فرقے اور ہر مشرب کے لوگوں سے گھل مل کر رہنا اور اخلاص و محبت سے پیش آنا ان کا خاصہ ہے ——— اسی طرح ادب میں بھی وہ ایک صلح کل شخصیت رکھتے ہیں وہ اپنے آپ کو کسی مخصوص دائرے میں مقید نہیں کرتے ۔ کسی ایک مکتبۂ خیال سے وابستہ نہیں ہوتے، کسی خاص عقیدے کے پرچار پر مقید نہیں رہتے ۔

ضیا کی ایک بڑی صفت ان کی وسیع النظری ہے وہ تنگ نظری اور تعصب سے کوسوں دور ہیں وہ جھوٹی وضع داری کے قائل نہیں اور نہ ضدی ہیں نہ برخود غلط ——— اس چیز نے ان کے فن کو بڑا فائدہ پہنچایا اور انہیں جاوداں بنا دیا ۔ انہوں نے جو کچھ کہا سوچ سمجھ کر کہا ۔ خلوص اور دیانت داری سے کہا ———

ضیا کی رعنائی، زندہ دلی اور بذلہ سنجی ضرب المثل بن چکی ہے وہ زیادہ دیر سنجیدہ نہیں رہ سکتے، یہ ان کی کمزوری بھی ہے اور خوبی بھی ——— وہ علمی گفتگو میں بہت دلچسپی لیتے ہیں، گھنٹوں بولتے ہیں لیکن سنجیدہ سے سنجیدہ بحث کے دوران میں ایک آدھ فقرہ ایسا کہہ جاتے ہیں جس سے بحث کی ساری سنجیدگی درہم برہم ہو کر رہ جاتی ہے ۔ دراصل زیادہ سنجیدہ فضا میں ان کی روح گھٹنے لگتی ہے ان کی طبیعت میں مزاح بہت ہے اور جب انہیں مزاح کا دورہ پڑے یا کوئی چٹپٹا فقرہ ان کے ذہن میں تڑپنے لگے تو اسے روکنا ان کے بس کا روگ نہیں ہوتا ۔

ضیا محفل کی جان، مشاعروں کی رونق اور ادبیات سرحد کے بوستان کا لالۂ احمر ہیں ۔

نذیر مرزا برلاس

برلاس ضیاؔ اور قمرؔ کے ایک اور ساتھی ہیں۔ جو شروع ہی سے ان کے دوش بدوش سرحد میں شعر و ادب کے پودے کو اپنے خون دل سے سینچ رہے ہیں۔ میں اگر یہ کہوں کہ برلاس کی کشش ہی مجھے دائرہ ادبیہ میں کھینچ کر لے گئی تو بے جا نہ ہوگا۔ سب سے پہلے میں نے انہیں دائرہ کے ایک مشاعرے میں سُنا وہ اپنی مشہور نظم رنگین وادی پڑھ رہے تھے مجھے اُن کی آواز بڑی عجیب سی لگی۔ غزل کے ماحول میں ان کی رومان میں ڈوبی ہوئی اس حسین و جمیل نظم نے سارے مجمع کو رنگین خوابوں کی ایک پُراسرار دنیا میں پہنچا دیا۔ اور میں تو ان کی شخصیت سے اتنا مرعوب ہُوا کہ ان کے سامنے مجھے ایک عرصہ تک شعر پڑھنے کی ہمت نہ ہوئی۔

برلاس سرحد میں اردو شاعری کے رومانی دور کا آغاز کرنے والے بھی ہیں اور خاتم بھی ——— برلاس نے ہوش سنبھالا تو پنجاب میں اختر شیرانی کا طوطی بول رہا تھا اختر متحدہ ہندوستان میں مسلمہ طور پر اردو شاعری کے رومانوی دور کے بانی مبانی تھے۔ برلاس ان دنوں اسلامیہ کالج لاہور میں تعلیم پا رہے تھے انہوں نے اختر کو پڑھا، سنا اور نہایت قریب سے دیکھا ——— دوسرے نوجوان شعراء کی طرح برلاس بھی اختر سے بے حد متاثر ہوئے ادھر مغربی شعراء میں سے ورڈز ورتھ، شیلے اور کیٹس کے مطالعے نے بھی انہیں رومانیت کی طرف مائل کیا ادھر ان کی طبیعت بھی ابتدا ہی سے رومان پسند واقع ہوئی تھی ان سب اتفاقات نے مل ملا کر برلاس کو سرحد میں اپنے دور کا سب سے بڑا رومانی شاعر بنا دیا۔

برلاس کی تمام عمر پڑھنے پڑھانے میں گزری۔ انہوں نے ایک معمولی ٹیچر کے طور پر اپنی زندگی شروع کی اور اس وقت اسلامیہ کالج پشاور میں پروفیسر ہیں۔ وہ ان لوگوں میں سے ہیں جو لکھتے کم اور پڑھتے زیادہ ہیں۔ کتاب ان کی بہترین رفیق ہے اور ہر سال کوئی نہ کوئی امتحان دینا ان کی بابی ہو چکی ہے۔ ناساعد حالات کی وجہ سے انہیں تعلیم ادھوری چھوڑ کر ملازمت کو ذریعۂ معاش بنانا پڑا لیکن تحصیل علم کے ذوق نے نچلا نہ بیٹھنے دیا اور انہوں نے منشی فاضل، ادیب فاضل، بی اے، بی ٹی، ایم اے اردو اور ایم اے فارسی کے امتحانات ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے پاس کر لئے۔ ان دنوں طہران میں پی ایچ ڈی کی تیاری میں منہمک ہیں۔

سردار عبدالرب نشتر

نشتر صاحب کو شاعر کے طور پر کم اور سیاسی رہنما کی حیثیت سے زیادہ لوگ جانتے ہیں آپ جسمانی طور پر بھی اور ذہنی اعتبار سے بھی ایک قد آور شخصیت کے مالک ہیں۔ طالب علمی کے زمانے میں بزم سخن سے رابطہ پیدا ہوا اور شعر و سخن میں دلچسپی لینے لگے لیکن علی گڑھ سے واپسی پر سیاسی رجحانات کے غلبے نے انہیں ادب سے چھین لیا۔ پھر بھی جب تک پشاور میں رہے کبھی کبھار شعر بھی کہہ لیتے اور ادبی محفلوں میں بھی شریک ہوتے رہتے۔ ابتدا میں اکبر الٰہ آبادی مرحوم سے بذریعہ خط و کتابت مشورہ سخن لیتے رہے۔

شروع میں نیشنلسٹ خیالات رکھتے تھے اور کانگرس کے سرگرم کارکن تھے۔ بعد میں نظریات میں انقلاب رونما ہوا اور بعض دوسرے نیشنلسٹ مسلمانوں کی طرح کانگرس کو متعصب ہندوؤں کی جماعت سمجھ کر اس سے کنارہ کش ہو گئے اور مسلم لیگ میں شامل ہو کر مسلمانوں کی علٰحدہ ریاست کے قیام کے لئے کوشش کرنے لگے۔

انہوں نے ایک وکیل کے طور پر اپنی زندگی کا آغاز کیا اور ترقی کرتے کرتے حکومت کے اعلیٰ عہدوں کو چھو آئے۔ پاکستان کے چوٹی کے رہنماؤں میں شمار ہوتے ہیں ——— فارسی، انگریزی، اردو اور پشتو کے نہایت اعلیٰ مقرر ہیں۔

[illegible] عمر ہو چلی ہے لیکن بالکل نہیں جاتا۔ آنکھوں کی چمک اور چہرے کی شگفتگی برقرار ہے انہیں دیکھ کر یہ بات بے حقیقت معلوم ہوتی ہے کہ شاعر

کے لئے بامعرفت ہونا ضروری ہے۔

میر ولی اللہ

میر صاحب ضلع ہزارہ کی ممتاز ادبی شخصیت ہیں۔ وہ ذہین، محنتی اور مستعد انسان ہیں انہوں نے تن تنہا یہاں وہ کام کیا جو بڑے بڑے ادارے انجام نہ دے سکے۔ تمام عمر خدمت ادب میں گزری ——— شگفتہ اور رنگین طبیعت رکھتے ہیں یہی وجہ ہے کہ ہر وقت ہشاش بشاش رہتے ہیں اور آج پینسٹھ برس کی عمر میں بھی چہرے پر جوانی برستی ہے۔ قویٰ بحال اور صحت برقرار ہے۔

عالم فاضل انسان ہیں مشرقی زبانوں کے علاوہ انگریزی پر بھی پورا عبور حاصل ہے اور اپنے علم و فضل سے انہوں نے پورا پورا فائدہ بھی اٹھایا ہے۔ آپ انگریزی، فارسی، عربی کا بالاستیعاب مطالعہ کرتے رہے ہیں۔ وہ پہلے سرحدی ادیب ہیں جنہوں نے ادبی حلقوں سے اپنے فن کا لوہا منوایا اور متحدہ ہندوستان کے مشاہیر ادباء کے دوش بدوش ملک کے بلند پایہ ادبی پرچوں میں چھپتے رہے۔

میر صاحب کی شخصیت جامع، ہمہ گیر اور بے مثال ہے آپ بیک وقت نہ صرف ایک نغز گو شاعر، کامیاب مترجم اور بلند پایہ نثار رہیں بلکہ طنز و مزاح میں بھی ید طولیٰ رکھتے ہیں۔

میر صاحب زرخیز دل و دماغ اور غیر معمولی صلاحیتوں کے مالک ہیں۔

میر صاحب کاک ٹیل قسم کے رائٹر ہیں جو تمام اصناف ادب پر حاوی نظر آتے ہیں اور سارے ادبی ماحول پر چھائے ہوئے ہیں۔

آپ ایک عرصہ سے پشاور یونیورسٹی میں لاء کالج کے پرنسپل کے طور پر متعین ہیں ان دنوں بھی فرصت کے اوقات میں تصنیف و تالیف ان کا محبوب مشغلہ ہے۔

وحید المؤرخین حاجی سرحدی

راولپنڈی کے قیام کے دوران میں ایک بزرگ سے ملنے کا اتفاق ہوا جو بڑی نستعلیق قسم کی شخصیت کے مالک تھے ملتے ہی ہماری آمد پر بیساختہ چند تاریخیں ارشاد فرمائیں اور ہمیں بغیر کسی تعارف کے یہ سمجھنے میں ذرا بھی وقت نہ ہوئی کہ آپ ہی وحید المؤرخین حضرت حاجی سرحدی ہیں۔

ابتدا میں گورنمنٹ ہائی سکول پشاور میں معلم رہے پھر بدیشیوں کے اتالیق کے طور پر راولپنڈی جانا ہوا اور اس سرزمین کو ایسا اپنایا کہ آخر وفات بھی وہیں پائی۔

نہایت پرگو واقع ہوئے تھے عمر بھی طویل پائی غزلوں نظموں کا بے پناہ ذخیرہ ترکے میں چھوڑا لیکن بدقسمتی سے کوئی مجموعہ چھپ نہ سکا۔

حاجی سرحدی مرحوم اپنے دور کے ممتاز شاعر تھے لیکن ان کی شہرت ایک تاریخ گو کے طور پر ہوئی تاریخ گوئی میں انہیں مہارت تامہ حاصل تھی یہاں تک پاک و ہند کی مشاہیر شخصیتوں نے انہیں بیسویں صدی کا سب سے بڑا تاریخ گو تسلیم کرتے ہوئے وحید المؤرخین کا خطاب دیا۔

جن حضرات کو حاجی مرحوم سے شرف نیاز حاصل ہوا ہے وہ اس امر کی تائید کریں گے کہ فی البدیہہ تاریخ کہنے میں آپ کس درجہ ماہر واقع ہوئے تھے۔ باتوں باتوں میں یوں بے تکلف تاریخ کہتے جیسے پہلے ہی سے مادے نکال رکھے ہوں جو کوئی ملنے جاتا اس کی آمد پر بیساختہ تین چار تاریخیں کہہ ڈالتے آپ نے دنیا کی مشاہیر شخصیتوں کے متعلق ایسی ہزاروں تاریخیں کہیں جو اردو ادب کے گراں بہا ذخیرے کے طور پر محفوظ رکھنے کے قابل ہیں آپ نے فنی طور پر بھی بے بدل تاریخیں یادگار چھوڑیں آخر عمر میں فن تاریخ گوئی پر ایک بلند پایہ کتاب بھی لکھ رہے تھے جسے مکمل کرنے کی موت نے فرصت نہ دی۔

ذوالفقار بخاری

پشاور میں اسد اللہ شاہ بخاری ایک بڑے ثقہ قسم کے بزرگ ہوتے تھے جو زندگی بھر ادبی جلسوں کی صدارت کرتے رہے کیونکہ ان سے بہتر صدر ملنا محال تھا خود شاعر نہ تھے لیکن صدارت کے لئے ایسے موزوں کہ کسی مشاعرے یا ادبی جلسے میں ان کا صدر ہونا کامیابی کی ضمانت سمجھا جاتا شخصیت اتنی باوقار کہ نہ صرف کرسئ صدارت سج جاتی بلکہ اپنی پچھے دار تقریر اور نہایت دلآویز طریقے سے قدیم اساتذہ کی منتخب نظمیں سنا کر مشاعرے کا رنگ باندھ دیتے اور حاضرین کو ایسا مسحور کر دیتے کہ کیا مجال جو کوئی ہلنے کا نام لے۔

ان شاہ صاحب کے تین فرزند تھے رفعت بخاری، پطرس بخاری اور ذوالفقار بخاری ——— حسن اتفاق دیکھئے کہ یہ تینوں علم وفن میں ایک دوسرے سے بڑھ کر ثابت ہوئے۔

رفعت بڑے بھائی تھے جو اپنے دور کے ذہین اور فطین شاعر گزرے ہیں مجسّم ہنگامہ تھے کبھی ایک سے الجھتے کبھی دوسرے سے ——— کسی کی پگڑی اچھالتے تو کسی کی قبا پر ہاتھ ڈالتے۔ بزم سخن سے بگڑے تو بزم افکار کھڑی کر دی اور ایسے معرکے کے مشاعرے کئے جن کی نظیر نہیں ملتی۔

رفعت بڑی خوبیوں کے مالک تھے لیکن بدقسمتی سے دماغی عارضے میں مبتلا ہو کر لاہور کے مینٹل ہسپتال میں داخل ہوئے اور وہیں انتقال کیا۔
پطرس کو کون نہیں جانتا ان کا ذکر شخصیات نمبر حصہ اوّل میں تفصیل سے آچکا ہے اسلئے مزید کچھ لکھنا تحصیل حاصل ہو گا۔
ذوالفقار بخاری ان دنوں ریڈیو پاکستان کے ڈائرکٹر جنرل ہیں۔ یہ حضرت بھی کئی خصوصیات کے مالک ہیں۔ شاعری سے لے کر گلنے بجانے تک کے فن میں طاق ہیں۔ ان کی شخصیت کے کئی پہلو ہیں اور ہر پہلو ملنے والے کو مبہوت کرنے کے لئے کافی ہے۔
شعر سننے سے زیادہ سنانے کے شوقین ہیں۔ پڑھنے کا انداز دلکش ہے اور داد وصول کرنے کا ڈھنگ بھی خوب آتا ہے ——— لہک لہک کر پڑھتے ہیں اور جھوم جھوم کر داد وصول کرتے ہیں۔
دیکھنے میں ایکٹر معلوم ہوتے ہیں اور بنیادی طور پر بھی یہی کچھ ——— افسرانہ فرائض سے لے کر روزمرہ زندگی کی چھوٹی موٹی سرگرمیوں تک ہر بات میں وہ اداکاری کرتے دکھائی دیتے ہیں۔
پرگو بھی ہیں اور بدیہہ گو بھی ——— ایک ہی نشست میں غزل کہتے ہیں، بے تکلف کہتے ہیں، جب چاہیں کہتے ہیں اور خوب ٹھوک بجا کر کہتے ہیں۔
الفاظ کی موزونیت، بندش اور اسلوب کا خیال رکھتے ہیں۔ اشعار کی چولیں بٹھانے میں انہیں خاص کمال حاصل ہے۔

فہمیدہ اختر

بڑے گھرانے کی چھوٹے قد کی یہ نوجوان خاتون ادبی حیثیت سے بہت اونچی شخصیت رکھتی ہیں۔ طبقۂ نسواں کی بہت بڑی افسانہ نگار ہیں۔ ادبی ذوق گھٹی میں پڑا تھا۔ طالب علمی کے زمانہ ہی سے علم وادب میں دلچسپی لینے لگیں۔ لیڈی گرفتھ گرلز ہائی سکول ہی سب سے پہلی ادبی انجمن بزم ادب کی بنیاد رکھی اور اس کی جنرل سیکرٹری مقرر ہوئیں۔
سرحد میں خواتین مسلم لیگ کی بنیاد پڑی تو ادب کو خیرباد کہہ کر سیاست میں حصہ لینے لگیں اور قیام پاکستان کے سلسلہ میں ان تھک کام کیا۔ شکستہ ادارۂ تعمیر نو میں شامل ہونے سے ادبی جنون پھر تازہ ہوا اور چند ایک اچھے افسانے پیش کرنے کے بعد پھر سیاست کی بھول بھلیاں میں کھو گئیں۔ لیکن ایک عرصہ تک سیاست کے خارزار میں بھٹکنے کے بعد احساس ہوا کہ ان کی قربانیوں کا ثمر ایک خاص طبقے کی اجارہ داری میں منتقل ہو

چکا ہے۔ اور ملک و قوم کی سربلندی کے جو فلک بوس محل انہوں نے تیار کئے تھے وہ مسمار ہو رہے ہیں اس نازک موقع پر مایوس ہونے کے بجائے وہ پھر ادب کی طرف لوٹ آئیں، چنانچہ انہوں نے نہایت محنت اور کاوش سے چند انقلابی کہانیاں لکھیں جو بہت مقبول ہوئیں۔

فہمیدہ نے اصلاحی قسم کے مضامین بھی لکھے ہیں لیکن ان کا اصلی میدان مختصر افسانہ ہے انہوں نے اپنے افسانوں میں قبائلی ماحول اور تہذیب و تمدن کی بھرپور عکاسی کی ہے اور یہی ان کی وہ خصوصیت ہے جس نے انہیں دوسرے ان گنت لکھنے والوں میں ممتاز درجہ دے دیا ہے۔

نثار عزیز

نثار عزیز نے اپنی شخصیت کی تعمیر بڑی محنت سے کی ہے حال ہی میں انہوں نے شادی کر لی ہے اگر شادی کے بندھن حائل نہ ہوئے تو یہ تعمیر فلک بوس ثابت ہوگی۔

نثار عزیز نے افسانے بھی لکھے ہیں اور تنقیدی مضامین بھی ــــ لیکن ان کی شہرت کا باعث ان کا مشہور ناول "نگری نگری پھرا مسافر" ہے جس میں انہوں نے اپنی ہی زندگی کے واقعات کو ناول کا روپ دے دیا ہے۔ اور اس لئے اس میں فن سے زیادہ خلوص ہے۔

نثار عزیز بہت بلند حوصلہ خاتون ہیں وہ تمام عمر قسمت کے خلاف برسر پیکار رہیں۔ میٹرک کرتے ہی ٹی بی کے موذی مرض نے حملہ کر دیا اور انہیں تعلیم ادھوری چھوڑ کر پانچ چھ برس وارڈ سینیٹوریم میں گزارنے پڑے لیکن ہمت نہ ہاری اور ابھی پوری طرح صحت یاب بھی نہ ہو پائی تھیں کہ پھر پورے زور شور سے پڑھنا شروع کر دیا اور آخر ایم اے کر کے ہی دم لیا۔

قتیل شفائی

قتیل کو میں اس وقت سے جانتا ہوں جب اسے اورنگ زیب کے نام سے زیادہ اور قتیل کے نام سے کم ــــ بہت ہی کم لوگ جانتے تھے۔ وہ اس وقت شعر نہیں کہتا تھا لیکن مذاق بلند تھا۔ اساتذہ کی جستہ جستہ غزلیں یاد تھیں جنہیں اپنے مخصوص ترنم سے پڑھ کر محفل کو مسحور کر دیتا۔ یہ ۳۸ء کی بات ہے۔ وہ نوعمر تھا تلاش معاش میں اسے پشاور آنا پڑا لیکن یہاں کامیابی نہ ہوئی اور ہری پور واپس جا کر چونگی کی ملازمت اختیار کر لی۔

تھوڑے عرصہ بعد ہی قتیل کا نام اخبارات اور رسائل میں نظر آنے لگا۔ اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہ چوٹی کے شعراء میں شمار ہونے لگا۔ لیکن وہ اس ابتدائی ملاقات کو نہ بھولا یہی وجہ ہے کہ آج تک ہمارے مخلصانہ تعلقات جوں کے توں قائم ہیں۔

قتیل کی منفرد شخصیت میں اس کی خود اعتمادی کو بڑا دخل ہے۔ وہ بے خود غلط انسان نہیں اپنی کمزوریوں کا بھی اسے احساس ہے لیکن اپنی خوبیاں بھی اس سے ڈھکی چھپی نہیں۔ وہ محنتی ہے، ذہین ہے اور اس کے ساتھ ہی ساتھ حوصلہ مند بھی ہے۔ اسے موجودہ مقام تک پہنچنے میں بڑی جگر کاوی سے کام لینا پڑا۔ قدم قدم ناکامیوں سے سابقہ پڑا لیکن وہ مایوس نہ ہوا اور ایک دفعہ جو قدم آگے بڑھا لیا اسے کسی قیمت پر بھی پیچھے نہ ہٹایا۔

قتیل دوستوں کا دوست اور دشمنوں کا دشمن ہے وہ منافقت نہیں جانتا۔ صاف دلی اور صاف گوئی اس کی وہ خصوصیات ہیں جو بسا اوقات اس کے لئے بڑی نقصان دہ بھی ثابت ہوئیں لیکن مقتضائے طبیعت کے باعث وہ ان چیزوں کو ترک نہ کر سکا۔

قتیل کی شاعری کی ابتدا بھی گیتوں سے ہوئی اور شاید اس کی انتہا بھی گیتوں ہی پر ہو وہ نعت، نظمیں بھی کہتا ہے۔ اور خوب غزلیں بھی ــ اس کا مزاج گیتوں کے لئے بنا ہے وہ حسن اور رومان کا شاعر ہے گیتوں کا شاعر ہے اس کی غزلوں، نظموں میں بھی گیت ہی جھلکتے نظر آتے ہیں۔

قتیل کے گیتوں کی نمایاں خصوصیت ان کی رفعت اور بے ساختگی ہے اس کے گیتوں میں دیہات کے الھڑ اور سادہ باشندوں کے سیدھے سادے خالص جذبات و احساسات کی دھڑکنیں سنائی دیتی ہیں اور ان میں وہ کچھ مزاح بھی ہے جو اردو شاعری کی روح ہے۔ مشاعرے کو شاعری کی تعلیم کا ذریعہ بنانے کے سبب

رہ سکا۔

قتیل نے اپنی مختصر سی شاعرانہ عمر میں بہت کچھ لکھا اس نے مثنویاں لکھیں منظوم ڈرامے لکھے، ریڈیو فیچر لکھے، بے شمار گیت، قطعات، نظمیں، غزلیں لکھیں۔ اس میں لکھنے کی بڑی قوت ہے۔

قتیل پانچ بچوں کا باپ اور پانچ کتابوں کا مصنف ہے۔ دونوں طرف اس کی تخلیقات کا یہ توازن غیر شعوری سہی لیکن اس میں کچھ نہ کچھ ربط ضرور محسوس ہوتا ہے۔

قتیل کی شخصیت پیچیدہ یا پر اسرار نہیں وہ سیدھا سادہ ایک عام انسان ہے لیکن کوئی شخص بھی اس سے ملنے کے بعد متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا یہ جادو نہ اس کی آنکھوں میں ہے نہ باتوں میں نہ چہرے میں ——— پھر یہ جادو اس کی شخصیت میں کہاں سے آیا اور کیسے نکھر آیا یہ سراغ لگانا مشکل ہی نہیں ناممکن ہے کیونکہ اس طلسمی چراغ کو اس نے ایسے تہ خانوں میں چھپا رکھا ہے جہاں آج تک کسی کی رسائی نہیں ہو سکی ——— خود اس کی بھی نہیں ———

اخگر سرحدی اور عزیز اختر وارثی

ان دونوں حضرات نے کوہاٹ میں اردو زبان و ادب کی اشاعت کے سلسلے میں ناقابل فراموش خدمات انجام دیں۔ عزیز اختر کی معیت اخگر کے لئے دست راست کی حیثیت رکھتی تھی ان کا ملاپ بڑا کارآمد ثابت ہوا۔ انہوں نے اس دور افتادہ سرزمین پہ بے نظیر ادبی اجتماعات کئے۔

اخگر بڑی ہردلعزیز شخصیت کے مالک ہیں ان کی سرگرمیاں محض ادب تک محدود نہ تھیں۔ ان میں کام کرنے کی بے پناہ قوت تھی وہ بیک وقت ادبی، سیاسی اور مذہبی محاذوں پر کام کرتے رہے۔ وہ کوہاٹ میں انجمن ترقی اردو کے صدر، کانگرس کمیٹی کے جنرل سکرٹری اور مجلس تعلیم القرآن کے ناظم تھے ہنگامہ آرائی ان کی فطرت بن چکی تھی۔ ایک طرف کانگرس کے جلسے ہو رہے ہیں تو دوسری طرف اردو کانفرنس کا انعقاد عمل میں لایا جا رہا ہے اور ساتھ ہی عید میلاد کا جلوس نکالا جا رہا ہے۔ ان کے اخلاص اور نیک نیتی کے باعث دوست دشمن سب ان سے محبت کرتے، ان کی عزت کرتے اور انہیں احترام کی نظروں سے دیکھتے ہیں۔

عزیز اختر کوہاٹ کے مخلص اور ہردلعزیز ادبی رہنما ہیں۔ ان کا شمار ترقی پسند شعراء میں ہوتا ہے۔ شروع میں حضرت سیماب اکبر آبادی سے اصلاح لیتے رہے بعد میں سیماب سکول سے بہت آگے نکل گئے لیکن جو حنفیت ان سے شروع میں تھی آخر تک اسے نبھاتے رہے۔

اختر سادہ وضع، سادہ دل اور مخلص انسان ہیں ایک اچھے شاعر کے ساتھ ساتھ وہ ایک بے پناہ ادبی کارکن بھی ہیں۔ انہوں نے اپنے دوست اخگر سرحدی کی رفاقت میں صوبہ سرحد کے جنوبی اضلاع میں اردو زبان و ادب کی ترویج و اشاعت کے لئے پورے ادارے کا کام انجام دیا ہے لیکن اب کچھ عرصہ سے خاموش زندگی گزار رہے ہیں۔

موسےٰ خان کلیم

سب سے پہلے [illegible]ء میں ماہنامہ "طور" کے سلسلہ میں ان کا نام سننے میں آیا۔ انہی دنوں نہ صرف ان کا نام سنا بلکہ انہیں دیکھنے کا اتفاق بھی ہوا وہ خود ڈیرہ اسمٰعیل خان سے چل کر قلمی معاونت حاصل کرنے کے لئے پشاور آئے۔ ڈیرہ جیسے دور افتادہ مقام سے ایک بلند پایہ ادبی پرچے کا اجراء کرنا کلیم ہی کا کام تھا اس پرچے کو کامیاب بنانے کے لئے انہوں نے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا لیکن اس ناسازگار ماحول میں وہ پنپ نہ سکا اور وہ بمشکل تمام سال بھر تک زندہ رہ سکا۔

نام موسیٰ خان تھا تخلص کلیم اختیار کیا، پرچہ نکالا تو وہ بھی طور ——— ان تمام واقعات سے ان کے کلاسیکل ذوق کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے۔

اسلامیہ کالج پشاور سے ایم اے کیا اور وہیں پروفیسری کا منصب پایا۔
علم و ادب سے والہانہ عشق ہے، مطالعہ وسیع ہے اور دماغ زرخیز ۔۔۔ اقبال اور غالب سے بہت متاثر ہیں خصوصاً اقبال کے تو فدائیوں میں سے ہیں۔
شاعر کم اور نثار زیادہ ہیں عموماً علمی اور تحقیقی مضامین لکھتے ہیں اور موضوع کا حق ادا کرتے ہیں طلباء میں علمی ادبی ذوق پیدا کرنے میں ان کا بڑا حصہ ہے۔

مضمر تاتاری

پشاور کے جدید شعراء میں سب سے پہلے میرا تعارف مضمرؔ ہی سے تھا لیکن یہ حقیقت مجھے بہت بعد میں معلوم ہوئی کہ وہ بالکل اُمّی شاعر ہے۔ اس انکشاف نے صرف مجھے ہی نہیں بڑے بڑے لوگوں کو چونکا دیا۔ کیونکہ اس کی گفتگو، اس کے کلام اور اس کے مبلغ علم غرض کسی چیز سے بھی یہ بات ظاہر نہیں ہوتی کہ وہ سرے سے پڑھنا لکھنا جانتا ہی نہیں۔ چنانچہ جب ندیم قاسمی صاحب پر یہ راز کھلا تو انہوں نے کہا ۔۔۔ "یہ شخص اگر پڑھا لکھا ہوتا تو بڑے بڑے اونچے فنکاروں کی کرسیاں خالی کرا لیتا۔
مضمر ۔۔۔ سائیں احمد علی مرحوم کا شاگرد بھی ہے اور صحبت یافتہ بھی ۔۔۔ اس کی شاعری کی ابتدا ہندکو حرفیوں سے ہوئی ۔۔۔ انیسؔ، جوشؔ اور اقبالؔ کے سماع نے اُردو شاعری کا ذوق دلایا اور انہی تین شاعروں سے وہ متاثر بھی نظر آتا ہے ۔۔۔ سب سے پہلے مضمر نے اپنی ایک نظم دائرہ ادبیہ کے مشاعرہ میں پڑھی تھی اس نظم کی ایسی دھوم مچی کہ ادبی حلقوں نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔
مضمر نظم کا شاعر ہے یہ کلیہ کہ ہر شاعر کی ابتدا غزل سے ہوتی ہے مضمر کے ہاں آ کر باطل ہو جاتا ہے۔ کیونکہ اس نے تمام عمر غزل نہیں کہی۔
مضمر ایک مخلص دوست اور سچا فنکار ہے اس نے تمام عمر خدمت ادب ہی گزاری وہ ایک خاموش کارکن ہے۔ نام و نمود کی خواہش سے کوسوں دور ۔۔۔ وہ ادبیات سرحد کے بوستان کا خود رو پھول ہے، انمول موتی ہے، لوک گیت ہے۔

فارغ بخاری[۱]

فارغؔ سے میرا بیس بائیس برس کا ساتھ ہے۔ ہم دونوں اخبارات و رسائل میں مل کر کام کرتے رہے، ادبی اداروں میں ایک ساتھ حصہ لیا۔ تصنیف و تالیف میں رفیقِ کار رہے، اور روزمرہ کی زندگی میں اتنا قرب رہا کہ اب تو ایک دوسرے کے بغیر زندگی کا تصور بھی محال نظر آتا ہے۔
اس عرصہ میں جہاں تک میں نے فارغ کا مطالعہ کیا وہ مجھے ایک بہت بڑا "شعبدہ باز" نظر آیا۔ وہ جو کچھ بظاہر دکھائی دیتا ہے، درحقیقت ویسا نہیں، بلکہ ذرا غور سے دیکھئے تو اسے بالکل اس کے برعکس پایئے گا۔ دراصل اسے لوگوں کو دھوکا دینے میں لطف آتا ہے، اسی لئے اس نے اپنی شخصیت کو کتنے ہی مصنوعی خولوں میں چھپا رکھا ہے، مثال کے طور پر اس کا قد جتنا چھوٹا ہے، شخصیت اتنی ہی بڑی ہے۔ وہ جتنا بڑا فنکار ہے اس سے کہیں زیادہ بڑا انسان ہے۔
فارغ، کو پہلی نظر میں دیکھ کر انسان کو خاصی مایوسی ہوتی ہے، ٹھگنا ساقد، بے ڈھنگا سا ناک نقشہ، نہ گفتگو میں کوئی کشش، نہ شکل و صورت میں جاذبیت، نہ میل جول میں رغبت ۔۔۔ کیا یہی وہ فارغ ہے جس کی نظمیں لوگ جھوم جھوم کر پڑھتے ہیں جس کی تحریروں سے حکومت کو بغاوت کی بو آتی ہے، جو پوری ایک درجن کتابوں کا مصنف ہے وہ کتابیں جنہیں پڑھ کر اس کی عظمت کا عظیم و تعظیم مجسمہ ذہن میں

---

[۱] فارغ بخاری پر رضا ہمدانی نے لکھ کر اس سلسلے کو مکمل کر دیا۔ (مرتب)

میں اُبھرنے لگتا ہے ـــــ نام بڑا اور درشن چھوٹے ـــــ بڑا ترقی پسند بنا پھرتا ہے ـــــ ترقی پسند ہم نے بھی دیکھے ہیں ـــــ
بڑھے ہوئے بال ـــــ بے تکا سا لباس ـــــ ماورائی ساحلیہ ـــــ اور اسے دیکھیے ـــــ اچھے بھلے انسانوں کی طرح سوٹ
بوٹ پہنے ٹائی لگائے۔ ہر وقت کام میں یوں جتا ہوا جیسے گوشت پوست کا نہیں لوہے کا بنا ہوا مشینی انسان ہو ـــــ کون کہے گا اسے
ترقی پسند ـــــ جسے نہ کبھی قہوہ خانوں میں گپیں ہانکتے دیکھا نہ ہی بازاروں میں لیکچر کرتے پایا، وہ تو ہر وقت انڈا دینے والی مرغی کی طرح کھونے
کھدروں کی تلاش میں سرگرداں رہتا ہے۔ دنیا اور اس کے ہنگاموں سے دور، جہاں کوئی ہم نفس ہو نہ ہم زبان ـــــ ایسے ہی کسی
گوشۂ عزلت میں اگر کتابوں، فائلوں اور کاغذوں کے انبار میں ڈوبا ہوا کوئی شخص نظر آئے تو اسے بلا جھجک فارغ بخاری کہہ لیجیے۔

فارغ، اس کا تخلص بھی اس کی مصروف زندگی پر ایک بھرپور طنز ہے ـــــ برعکس نہند نام زنگی کافور ـــــ وہ جب سے پیدا ہوا شاید ہی اسے کبھی ستانے کا موقع ملا ہو، اس لمحے کی وہ ہمیشہ آرزو کرتا ہے، لیکن جہاں کہیں یہ لمحہ میسر آئے، کوئی نہ کوئی کام اپنے لئے ڈھونڈ نکالتا ہے، اور کچھ نہ ہو تو اپنے نصف درجن بچوں کو پڑھانے میں ہی وقت ضائع کرنے لگے گا ـــــ دراصل اسی مصروفیت میں اس کی زندگی ہے۔ اور مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ جس دن اس کے کرنے کو کوئی کام نہ رہا اُسی دن اس کی موت واقع ہو جائیگی

صبح اسے اپنے مطب میں دیکھیے تو دوپہر کسی اخبار کے دفتر میں، شام دوستوں کے جھرمٹ میں اور پھر رات گئے تک کسی نظم، مضمون یا کتاب کی تخلیق میں منہمک ـــــ ہر ششماہی پر جب اس کی کوئی نئی کتاب مارکیٹ میں آتی ہے تو احباب حیران و ششدر رہ جاتے ہیں۔ "آخر یہ ظالم اتنی ضخیم کتابیں لکھنا کس وقت ہے"؟ اس انتہائی مصروفیت کے باوجود وہ بڑے بڑے مشاعروں میں بھی شریک ہوتا ہے، ہر سال ناک کا آپریشن بھی کراتا ہے۔ اور وقت نکال کر سیفٹی ایکٹ کے بہانے جیل یاترا بھی کر آتا ہے۔

فارغ، دیکھنے میں بڑا سست اور کاہل الوجود نظر آتا ہے، یہاں بھی دیکھنے والوں کو وہی چکمہ ـــــ وہی شعبدہ بازی حالانکہ اس میں کام کرنے کی اتنی قوت و صلاحیت ہے کہ بہت کم لوگوں میں یہ چیز پائی جاتی ہے۔ جن دنوں 'بزم بازی' کا جنون سوار تھا تو اس نے تن تنہا پشاور میں یکے بعد دیگرے کئی ادارے کھڑے کر دیئے، 'ادبستان' 'انجمن ترقی اردو' 'انجمن ترقی پسند مصنفین' وغیرہ کی داغ بیل ڈالنے والا فارغ اور صرف فارغ ہی تھا ـــــ پھر اخبارات و رسائل کا دورہ شروع ہوا تو 'شباب' 'کیسر کیاری'، 'نغمۂ حیات' 'البلاغ'، 'سنگِ میل' جیسے گرانقدر پرچوں کا اجرا سرحد ایسی سنگلاخ سرزمین سے کیا۔ اور انہیں کامیاب کر کے دکھایا ـــــ اس کے بعد تصنیفات و تالیفات کا خیال ہوا تو نہایت قلیل عرصہ میں متعدد کتابیں لکھ ڈالیں۔

اگر آپ جلد باز واقع نہیں ہوئے، اور پہلے ہی لمحے ہار کر اس کے متعلق کوئی غلط رائے نہیں قائم کر بیٹھے تو دوسرے ہی لمحے اسے بے تکلف پائیے گا، اور پھر لمحہ بہ لمحہ اس مصنوعی سنجیدگی کے چھلکے اترتے جائیں گے اور ان میں سے ایک ایسی بھاری اور دلآویز شخصیت اُبھر آئے گی جسے آپ بھولنا چاہیں بھی تو نہ بھلا سکیں، اس جادو کو توڑنے کے لئے جس اسم اعظم کی ضرورت ہے، آیئے لگے ہاتھوں وہ بھی آپ کو بتا دوں، عام طور پر لوگ اپنی تعریف سے خوش ہوتے ہیں۔ لیکن فارغ پر یہ تجربہ کبھی نہ آزمائیے گا۔ ورنہ اس کا موڈ اور زیادہ بگڑ جائے گا۔ کیونکہ اسے خوشامد سے بے حد چڑ ہے۔ اگر آپ چاہتے ہیں کہ وہ جلد از جلد کھل جائے اور گھل مل کر اصلی فارغ سامنے آ جائے تو چپکے سے کوئی ادبی بحث چھیڑ دیجیئے یا پھر شام کے بعد اسے ملئے۔ کیونکہ سات کے چوبیس گھنٹوں میں یہی ایک ایسا وقت ہے جب وہ اس موڈ میں ہوتا ہے جس کے متعلق غالب نے کہا ہے۔ ؏ پھر دیکھئے انداز گل افشانئ گفتار۔ ایک دفعہ اسے چھیڑ دیجئے اور پھر سنیئے وہ یوں چہکنے لگے گا جیسے محفل میں طلسمی مٹھائی بانٹ رہا ہو۔

فارغ کو اپنی شخصیت بنانے کے لئے بڑے پاپڑ بیلنے پڑے ہیں۔ وہ بچپن ہی سے بڑا احساس واقع ہوا تھا اسی شدت احساس کے

باعث اس نے اپنے والد مرحوم کی وفات کے بعد بھائیوں پہ بوجھ بننا گوارا نہ کیا، اور تعلیم ادھوری چھوڑ کر تلاش معاش میں ایک عرصے تک
دلی، لکھنؤ، کلکتہ اور برما کے ہنگاموں میں کھویا رہا ـــــ اس نے صرف چھ روپے ماہانہ کی ملازمت سے اپنی زندگی کا آغاز کیا ـــــ اور
پھر کبھی کمپاؤنڈری کی تو کبھی بھیک کھاتے ٹھکتا رہا، کبھی معلم بنا تو کبھی کلرک، کبھی فرنیچر کا کاروبار کیا تو کبھی کارخانوں کی منیجری، کبھی کتابوں کا دھندا
چلایا، تو کبھی صحافت کو ذریعہ معاش بنایا لیکن اس کی سیماب صفت طبیعت کو کہیں بھی سکون نہ ملا۔ آخر سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر پھر سے حصول
علم کے لئے جدوجہد شروع کردی اور رات دن کی محنت شاقہ سے اپنی علمی تشنگی کو بجھاتا رہا۔

آج اس کی زندگی بہت حد تک منظم ہو چکی ہے لیکن اب بھی یہ عالم ہے کہ صبح وہ ایک ڈاکٹر کی حیثیت سے اپنی ڈسپنسری میں مریضوں
کی دیکھ بھال کرتا دکھائی دیتا ہے۔ تو دوپہر کو کسی اخبار کے دفتر میں ایک صحافی کے روپ میں نظر آتا ہے۔ اور رات ڈھلتے ہی ایک ادیب
شاعر اور مصنف کے پیکر میں ڈھل جاتا ہے۔

فارغ، زندگی کی بھٹی سے کندن ہو کر نکلا ہے۔ اسے گردش روزگار نے ایسی ایسی تلخیاں دی ہیں کہ اگر اس کی فطری رجائیت
آڑے نہ آتی تو اب تک کبھی کی یا تو خودکشی کر لی ہوتی یا پاگل خانے پہنچ کر دم لیتا ـــــ

یہ اس کی فطری رجائیت ہی کی کارفرمائی تھی کہ جیل کی کال کوٹھڑی میں بھی وہ ایک لمحے کے لئے مغموم نہ ہوا۔ جیل سے اس نے مجھے بیسیوں
خط لکھے، جن میں قید کی صعوبتوں کا کبھی بھول کر بھی ذکر نہ کیا، بلکہ میری تالیف قلب کے لئے یوں کوشاں رہتا جیسے اسیری کے ایام
وہ نہیں، میں گزار رہا ہوں۔

فارغ جیل میں بھی بیکار نہ بیٹھا، اس نے مصوری سیکھی، باترجمہ قرآن کریم پڑھا، مکتوب نگاری کی۔ فلسفے اور نفسیات کا مطالعہ کیا، اور
دو نہایت قیمتی کتابیں لکھیں، "قفس رنگ" جو اس کی نظموں غزلوں کا مجموعہ اور "قید و بند" جس میں جیل کی آپ بیتی ہے۔

فارغ اپنی نظموں میں صبح کے اجالے اور سحر کی روشنی پہ جان چھڑکتا ہے لیکن اس حقیقت سے بہت کم لوگ واقف ہیں کہ دراصل وہ رات
کی تاریکی کا دلدادہ ہے ـــــ دن کو تو وہ اپنی زندگی کا حصہ ہی نہیں سمجھتا، کیونکہ ان اوقات کو اس نے محض نان و نفقہ کے حصول کی غرض
سے محنت و مزدوری کے لئے وقف کر رکھا ہے۔ البتہ رات کو وہ صرف اپنی ملکیت سمجھتا ہے۔ اس میں کسی کی مداخلت بھی برداشت نہیں کرتا۔
رات کو اپنانے کے لئے اس نے بڑے جتن کئے۔ بڑی بڑی منفعت ملازمتوں کو ٹھکرایا، نہایت معقول معاشی وسائل پر لات ماری، اس لئے
کہ وہ اس کی دولت پر ڈاکہ ڈالنا چاہتے تھے۔ رات ہوتے ہی وہ ایک مطلق العنان بادشاہ کی طرح اپنا سکہ چلانا شروع کر دیتا ہے۔ بڑے
اہتمام سے وہ رات کی دیوی کا استقبال کرتا ہے اس کے چرنوں میں عقیدت کے پھول چڑھاتا ہے۔ اور پھر رات کی دیوی کی عبادت
میں مصروف ہوتا ہے تو بسا اوقات صبح کے تڑکے تک یہ ریاضت جاری رہتی ہے۔

فارغ کو دوستوں سے بڑا پیار ہے لیکن تنہائی اسے دوستوں سے بھی زیادہ عزیز ہے۔ اسے سگرٹ، کاغذ، قلم اور کتابیں مہیا کر
دی جائیں تو شاید تمام عمر بھی وہ تنہائی سے نہ اکتائے گا۔

حسن، شراب اور شعر ـــــ فارغ کی تین سب سے بڑی کمزوریاں ہیں۔ اس کی ان کمزوریوں سے بعض سیاسی دوستوں نے بڑے
بڑے فائدے اٹھائے ہیں۔ وہ "بت شکن" کہلاتا ہے، اور واقعی اس نے بڑے بڑے بتوں کو توڑا بھی ہے، سب سے پہلے تو اس نے اپنے
خاندان کے اس روایتی بت کو توڑا کہ مسند پر بیٹھ کر آباء کے نام کی سوداگری کرو اور سادہ لوح مریدوں سے روپیہ بٹور کر عیش کرو لیکن
جہاں محنت کا نام آئے وہاں صاف انکار، اس کا خیال ہے کہ سیدوں نے اپنے آپ کو "برہمن" کی طرح کی کوئی ہستی سمجھ رکھا ہے جو مزدوری
کرنا کسر شان سمجھتے ہیں، فارغ کو چونکہ شروع ہی سے روایتی باتوں سے چڑ تھی اس لئے اس نے محنت مزدوری کو کبھی عیب نہ سمجھا۔

ایک عرصے تک وہ اپنے پندار کے بت پر مسلسل ضربیں لگاتا رہا اور آخر اسے چکنا چور کر کے چھوڑا، خیال کیجئے، جس شخص نے ایسے عقیدت مندانہ ماحول میں آنکھ کھولی ہو جہاں عام لوگ اس کے برابر بیٹھنے کی جرأت نہ کریں، جہاں اس کی دست بوسی اور قدم بوسی کو ارادت مندوں کا گروہ اپنے نصیب کی معراج سمجھے، اور جہاں اس کو پیرزادہ ہونے کی حیثیت سے ماورائی انسان سمجھا جائے، اس کا اس حد تک عجز و انکسار پر اتر آنا کہ بغیر مزدوروں، غریبوں اور مفلوک الحال گروہ کے کسی اور سے سروکار ہی نہ ہو، زندگی کا کتنا بڑا انقلاب ہے، اور اس سے بڑھ کر بت شکنی اور کیا ہو سکتی ہے بقول یگانہ مرحوم کے ع

غلام ہمت آنم کہ خود شکن باشد

لیکن اپنی ان کمزوریوں کے باعث غیر شعوری طور پر اس نے کئی ایک ایسے نئے بت بھی تراش ڈالے جن کی تخلیق پر اب وہ خود بھی پشیمان ہوگا، اپنی اسی افتاد طبیعت کے باعث اس نے اپنے بعض چہیتوں کے جنون شہرت کی تسکین کے لئے ان کی ہر جائز و ناجائز خواہش کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔

فارغ کے مذہبی نظریات بظاہر ملحدانہ قسم کے معلوم ہوتے ہیں، وہ مذہب کے مابعد الطبیعاتی تصور کا قائل نہیں، وہ اس کی جامد حیثیت پر اعتقاد نہیں رکھتا، لیکن اس کے باوصف وہ بزم سماع میں شریک ہوتا ہے، مجلس عزا میں سوگوار نظر آتا ہے۔ مولود شریف میں سر پر ٹوپی جمائے مؤدب بیٹھتا ہے، اپنے بچوں کو منت کے طوق پہنواتا ہے۔ روزے نہ رکھتے ہوئے عید کی تقریب میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتا ہے اور قریب آکر ایک بات کان میں سن لیجئے ——— یہ ملحد کبھی کبھار چھپ چھپا کر نماز بھی پڑھ لیتا ہے۔ اس کی لائبریری میں مختلف مکتب ہائے فکر کے مترجم قرآنوں کے علاوہ گیتا اور انجیل مقدس کے نسخے بھی مل جاتے ہیں۔

اس حقیقت کو کون نہیں جانتا کہ فارغ نے نہ صرف سب سے پہلے پشتو ادب، کلچر اور معاشرت کو بیرونی دنیا سے متعارف کرایا بلکہ اس مہم کو اپنی زندگی کا سب سے بڑا مشن بنا رکھا ہے۔ اور اپنا فن، قلم اور تمام تر تخلیقی قوتیں اس کے لئے وقف کر رکھی ہیں، لیکن میں اگر یہ بات آپ کو بتا دوں کہ وہ پشتو کا ایک فقرہ تک صحیح ادا نہیں کر سکتا تو آپ یقیناً متعجب ہوں گے۔ اور یہی نہیں بلکہ وہ اکثر اپنے پشتون ادیب دوستوں سے 'بور' ہو ہو جاتا ہے۔

فارغ کو اپنی طبیعت کے تلون کا خود بھی اعتراف ہے۔ وہ کبھی کوئی ایک کام بھی زیادہ دنوں تک مستقل مزاجی کے ساتھ نہیں کر سکتا ——— ذریعۂ معاش ہی کو لیجئے، سوائے ڈاکٹری کے اور کسی کام سے بھی وہ زیادہ دیر تک نباہ نہیں کر سکا۔ اور ڈاکٹری کے سلسلے میں بھی آج تک اس کی ڈسپنسری متحرک ڈسپنسری کی طرح مختلف مقامات کا سیر کر چکی ہے ——— اسی طرح ادب میں بھی اس نے ایک صنف پر قناعت نہیں کی، منظومات میں غزل، نظم، رباعی، قطعہ، مرثیہ، سلام، منظوم فیچر، گیت اور نثر میں افسانہ، مضمون، تنقید، ڈرامہ، ناول غرض ہر شعبے پر ہاتھ مارنے کی کوشش کی۔

زندگی کے دوسرے شعبوں میں بھی اس کے تلون کا یہی عالم ہے۔ لیکن جب ہم ادبی نظریات کے متعلق اس کی مستقل مزاجی اور فولادی عزائم کو دیکھتے ہیں تو اس کی شخصیت کے اس واضح تضاد پر سخت حیرت ہوتی ہے۔

دراصل فارغ دوہری شخصیت کا مالک ہے۔ ایک اس کی انفرادی شخصیت ہے دوسری اجتماعی ——— لیکن ان دونوں متضاد شخصیتوں میں اس نے کچھ اس خوبصورتی سے سمجھوتہ کرا رکھا ہے کہ ان کے درمیان کسی قسم کے تصادم کا امکان نہیں رہا۔ اسی طرح جس طرح ان کے نام "سید میر احمد شاہ" اور اس کے تخلص "فارغ بخاری" میں۔ ———

———

باعث اس نے اپنے والد مرحوم کی وفات کے بعد بھائیوں پر بوجھ بننا گوارا نہ کیا، اور تعلیم ادھوری چھوڑ کر تلاش معاش میں ایک عرصے تک دلی، لکھنؤ، کلکتہ اور بمبئی کے ہنگاموں میں کھویا رہا —— اس نے صرف چھ روپے ماہانہ کی ملازمت سے اپنی زندگی کا آغاز کیا —— اور پھر کبھی کمپاؤنڈری کی تو کبھی یونہی کھاتے لکھتا رہا، کبھی مہتمم بنا تو کبھی کلرک، کبھی فروٹ کا کاروبار کیا تو کبھی کارنیوال کی منیجری، کبھی کتابوں کا دھندا چلایا، تو کبھی صحافت کو ذریعہ معاش بنایا، لیکن اس کی سیماب صفت طبیعت کو کہیں بھی سکون نہ ملا۔ آخر سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر پھر سے حصول علم کے لئے جد و جہد شروع کر دی اور رات دن کی محنت شاقہ سے اپنی علمی تشنگی کو بجھاتا رہا۔

آج اس کی زندگی بہت حد تک منظم ہو چکی ہے لیکن اب بھی یہ عالم ہے کہ صبح وہ ایک ڈاکٹر کی حیثیت سے اپنی ڈسپنسری میں مریضوں کی دیکھ بھال کرتا دکھائی دیتا ہے۔ تو دوپہر کو کسی اخبار کے دفتر میں ایک صحافی کے روپ میں نظر آتا ہے۔ اور رات ڈھلتے ہی ایک ادیب شاعر اور مصنف کے پیکر میں ڈھل جاتا ہے۔

فارغ، زندگی کی بھٹی سے کندن ہو کر نکلا ہے۔ اسے گردش روزگار نے ایسی ایسی پٹخنیاں دی ہیں کہ اگر اس کی فطری رجائیت آڑے نہ آتی تو اب تک کبھی کی یا تو خودکشی کر لی ہوتی یا پاگل خانے پہنچ کر دم لیتا ——

یہ اس کی فطری رجائیت ہی کی کارفرمائی تھی کہ جیل کی کال کوٹھڑی میں بھی وہ ایک لمحے کے لئے مغموم نہ ہوا۔ جیل سے اس نے مجھے بیسیوں خط لکھے، جن میں قید کی صعوبتوں کا کبھی بھول کر بھی ذکر نہ کیا، بلکہ میری تالیف قلب کے لئے یوں کوشاں رہتا جیسے اسیری کے ایام وہ نہیں، میں گزار رہا ہوں۔

فارغ جیل میں بھی بیکار نہ بیٹھا، اس نے مصوری سیکھی، با ترجمہ قرآن کریم پڑھا، مکتوب نگاری کی۔ فلسفے اور نفسیات کا مطالعہ کیا، اور دو نہایت قیمتی کتابیں لکھیں، "نقش رنگ" جو اس کی نظموں غزلوں کا مجموعہ اور "قید و بند" جس میں جیل کی آپ بیتی ہے۔

فارغ اپنی نظموں میں صبح کے اُجالے اور سحر کی روشنی پر جان چھڑکتا ہے لیکن اس حقیقت سے بہت کم لوگ واقف ہیں کہ در اصل وہ رات کی تاریکی کا دلدادہ ہے —— دن کو تو وہ اپنی زندگی کا حصہ ہی نہیں سمجھتا، کیونکہ ان اوقات کو اس نے محض نان و نفقہ کے حصول کی غرض سے محنت و مزدوری کے لئے وقف کر رکھا ہے۔ البتہ رات کو وہ صرف اپنی ملکیت سمجھتا ہے۔ اس میں کسی کی مداخلت بھی برداشت نہیں کرتا۔ رات کو اپنانے کے لئے اس نے بڑے جتن کئے۔ بڑی بڑی منفعت ملازمتوں کو ٹھکرایا، نہایت معقول معاشی وسائل پر لات ماری، اس لئے کہ وہ اس کی دولت پر ڈاکہ ڈالنا چاہتے تھے۔ رات ہوتے ہی وہ ایک مطلق العنان بادشاہ کی طرح اپنا سکہ چلانا شروع کر دیتا ہے۔ بڑے اہتمام سے وہ رات کی دیوی کا استقبال کرتا ہے اس کے چرنوں میں عقیدت کے پھول چڑھاتا ہے۔ اور پھر جو رات کی دیوی کی عبادت میں مصروف ہوتا ہے تو بسا اوقات صبح کے تڑکے تک یہ ریاضت جاری رہتی ہے۔

فارغ کو دوستوں سے بڑا پیار ہے۔ لیکن تنہائی اسے دوستوں سے بھی زیادہ عزیز ہے۔ اسے سگرٹ، کاغذ، قلم اور کتابیں مہیا کر دی جائیں تو شاید تمام عمر بھی وہ تنہائی سے نہ اکتائے گا۔

حسن، شراب اور شعر —— فارغ کی تین سب سے بڑی کمزوریاں ہیں۔ اس کی ان کمزوریوں سے بعض نام نہاد دوستوں نے بڑے بڑے فائدے اٹھائے ہیں۔ وہ "بت شکن" کہلاتا ہے، اور واقعی اس نے بڑے بڑے بتوں کو توڑا بھی ہے، سب سے پہلے تو اس نے اپنے خاندان کے اس روایتی بت کو توڑا کہ مسند پر بیٹھ کر آباء کے نام کی سوداگری کرو اور سادہ لوح مریدوں سے روپیہ بٹور کر عیش کرو لیکن جہاں محنت کا نام آئے وہاں صاف انکار۔ اس کا خیال ہے کہ سیدوں نے اپنے آپ کو برہمن کی طرح کی کوئی ہستی سمجھ رکھا ہے جو مزدوری کرنا کسر شان سمجھتے ہیں، فارغ کو چونکہ شروع ہی سے روایتی باتوں سے چڑ تھی اس لئے اس نے محنت مزدوری کو کبھی عیب نہ سمجھا۔

ایک عرصے تک وہ اپنے پندار کے بت پر مسلسل ضربیں لگاتا رہا اور آخر اسے چکنا چور کر کے چھوڑا، خیال کیجئے جس شخص نے ایسے عقیدت مندانہ ماحول میں آنکھ کھولی ہو جہاں عام لوگ اس کے برابر بیٹھنے کی جرأت نہ کریں، جہاں اس کی دست بوسی اور قدم بوسی کو ارادت مندوں کا گروہ اپنے نصیب کی معراج سمجھے، اور جہاں اس کو پیرزادہ ہونے کی حیثیت سے ماورائی انسان سمجھا جائے، اس کا اس حد تک عجز و انکسار پر اُتر آنا کہ بغیر مزدوروں، غریبوں اور مفلوک الحال گروہ کے کسی اور سے سروکار ہی نہ ہو، زندگی کا کتنا بڑا انقلاب ہے، اور اس سے بڑھ کر بت شکنی اور کیا ہو سکتی ہے بقول یگانہ مرحوم؎

غلام ہمت آنم کہ خود شکن باشد

لیکن اپنی ان کمزوریوں کے باعث غیر شعوری طور پر اس نے کئی ایک ایسے نئے بت بھی تراش ڈالے جن کی تخلیق پر اب وہ خود بھی پشیمان ہو گا، اپنی اسی افتادِ طبیعت کے باعث اس نے اپنے بعض چہیتوں کے جنونِ شہرت کی تسکین کے لئے ان کی ہر جائز و ناجائز خواہش کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔

فارغ کے مذہبی نظریات بظاہر "ملحدانہ" قسم کے معلوم ہوتے ہیں، وہ مذہب کے مابعد الطبیعاتی تصور کا قائل نہیں، وہ اس کی جامد حیثیت پر اعتقاد نہیں رکھتا، لیکن اس کے باوصف وہ بزمِ سماع میں شریک ہوتا ہے، مجلسِ عزا میں سوگوار نظر آتا ہے۔ مولود شریف میں سر پر ٹوپی جمائے مؤدب بیٹھتا ہے، اپنے بچوں کو منت کے طوق پہنواتا ہے۔ روزے نہ رکھتے ہوئے عید کی تقریب میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتا ہے اور قدرے قریب آکر ایک بات کان میں سن لیجئے ——— یہ "ملحد" کبھی کبھار چھپ چھپا کر نماز بھی پڑھ لیتا ہے۔ اس کی لائبریری میں مختلف مکتب ہائے فکر کے مترجم قرآنوں کے علاوہ گیتا اور انجیل مقدس کے نسخے بھی مل جاتے ہیں۔

اس حقیقت کو کون نہیں جانتا کہ فارغ نے نہ صرف سب سے پہلے پشتو ادب، کلچر اور معاشرت کو بیرونی دنیا سے متعارف کرایا بلکہ اس مہم کو اپنی زندگی کا سب سے بڑا مشن بنا رکھا ہے۔ اور اپنا فن، قلم اور تمام تر تخلیقی قوتیں اس کے لئے وقف کر رکھی ہیں، لیکن میں اگر یہ بات آپ کو بتا دوں کہ وہ پشتو کا ایک فقرہ تک صحیح ادا نہیں کر سکتا تو آپ یقیناً متعجب ہوں گے۔ اور یہی نہیں بلکہ وہ اکثر اپنے پشتون ادیب دوستوں سے "ہُوں ہاں" ہو جاتا ہے۔

فارغ کو اپنی طبیعت کے تلون کا خود بھی اعتراف ہے۔ وہ کبھی کوئی ایک کام بھی زیادہ دنوں تک مستقل مزاجی کے ساتھ نہیں کر سکتا ——— ذریعۂ معاش ہی کو لیجئے، سوائے ڈاکٹری کے اور کسی کام سے بھی وہ زیادہ دیر تک نباہ نہیں کر سکا۔ اور ڈاکٹری کے سلسلے میں بھی آج تک اس کی ڈسپنسری متحرک ڈسپنسری کی طرح مختلف مقامات کا سیر کر چکی ہے ——— اسی طرح ادب میں بھی اس نے ایک صنف پر قناعت نہیں کی، منظومات میں غزل، نظم، رباعی، قطعہ، مرثیہ، سلام، منظوم فیچر، گیت اور نثر میں افسانہ، مضمون، تنقید، ڈرامہ، ناول غرض ہر شعبے پر ہاتھ مارنے کی کوشش کی۔

زندگی کے دوسرے شعبوں میں بھی اس کے تلون کا یہی عالم ہے۔ لیکن جب ہم ادبی نظریات کے متعلق اس کی مستقل مزاجی اور فولادی عزائم کو دیکھتے ہیں تو اس کی شخصیت کے اس واضح تضاد پر سخت حیرت ہوتی ہے۔

دراصل فارغ دوہری شخصیت کا مالک ہے۔ ایک اس کی انفرادی شخصیت ہے دوسری اجتماعی ——— لیکن ان دونوں متضاد شخصیتوں میں اس نے کچھ اسی خوبصورتی سے سمجھوتہ کرا رکھا ہے کہ ان کے درمیان کسی قسم کے تصادم کا امکان نہیں رہا۔ اسی طرح جس طرح اس کے نام "سید میر احمد شاہ" اور اس کے تخلص "فارغ بخاری" میں۔ ———

انتظاریہ

سر سید احمد خاں

(شیخ محمد اسماعیل پانی پتی)

رنگ سرخ و سفید۔ چہرہ نہایت پُر رعب۔ پیشانی بلند۔ سر بڑا۔ بھویں سیاہ بھرا۔ آنکھیں متناسب اور نہایت روشن۔ ناک اونچی۔ کان لمبے۔ گلے میں بڑی سی رسولی۔ لمبی ڈاڑھی جس میں بالکل چھپی ہوئی۔ جسم فربہ۔ قد لمبا۔ ہڈی چوڑی چکلی۔ ہاتھ پاؤں قوی اور زبردست۔ بدن گٹھیلا اور مضبوط۔ صورت وجیہہ۔ وزن پورا ساڑھے تین من۔ لباس ترکی۔ معاشرت انگریزی۔ یہ تھے جدامجد نواب مسعود جنگ ڈاکٹر سر سید احمد خان مرحوم بانی علی گڑھ کالج۔ مجدد زبان اردو۔ باعث تخلیق مسدس حالی۔

یہ تو ہوا سر سید کا حلیہ۔ آئیے اب آپ کو ان کی گھریلو زندگی کی بھی ایک جھلک دکھاؤں۔ آج سے سولہ برس پہلے ۱۹۲۳ء میں میں نے مولوی عنایت اللہ مرحوم ناظم دارالترجمہ عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد سے درخواست کی کہ اپنی زندگی کے کچھ حالات مجھے لکھ دیں۔ مولوی صاحب مرحوم میری کسی درخواست کو کبھی رد نہیں کرتے تھے۔ اس مرتبہ بھی انہوں نے یہی کیا۔ اور اپنے واقعاتِ حیات لکھ کر مجھے پانی پت بھیج دیے۔ مولوی عنایت اللہ چونکہ سر سید کے مخلص دوست شمس العلماء خان بہادر مولانا ذکاء اللہ پروفیسر میور سنٹرل کالج الہ آباد کے لڑکے تھے اور نہایت لائق، مؤدب اور سعادت مند تھے اس لئے سر سید کو شروع ہی سے نہایت عزیز تھے۔ اور وہ ان سے بے حد محبت کرتے تھے۔

مولوی عنایت اللہ نے اپنے جو حالات مجھے بھیجے اُس میں اُس وقت کی کیفیت بھی لکھی جب انہوں نے پہلے پہل سر سید کو دیکھا۔ اس کی تقریب یہ ہوئی کہ چونکہ دہلی میں مولوی عنایت اللہ کی تعلیم کا خاطر خواہ انتظام نہ تھا لہٰذا بچپن ہی میں مولانا ذکاء اللہ ان کو اپنے ساتھ الہ آباد لے گئے۔ راستے میں اپنے دوست سر سید کے پاس بھی دو دن ٹھہرے۔ اس قیام کا جو نہایت ہی دلچسپ اور پُرلطف حال مجھے مولوی عنایت اللہ نے لکھا آج میں وہ ہدیہ ناظرین کرتا ہوں۔ اس عبارت سے جہاں سر سید کی گھریلو معاشرت اور خانگی زندگی کا حال نہایت عمدگی کے ساتھ معلوم ہوتا ہے وہاں مولوی عنایت اللہ کی نہایت حسین و دلکش طرز تحریر کا بھی ناظرین کرام کو تھوڑا سا اندازہ ہو جائیگا۔

"[illegible] کا زمانہ تھا کہ میرے والد مرحوم مولانا ذکاء اللہ جو اُس وقت میور کالج الہ آباد میں پروفیسر تھے۔ گرمیوں کی تعطیل دہلی میں ختم کرکے الہ آباد واپس جانے لگے۔ اس مرتبہ انہوں نے مجھے اور میرے بڑے بھائی کو جو مجھ سے تین برس بڑے تھے اپنے ہمراہ لے جانا چاہا تاکہ الہ آباد میں ہماری تعلیم کا کوئی بہتر بندوبست کریں۔ راستہ میں سید صاحب (سر سید مرحوم) کے پاس علیگڑھ میں قیام کرنے کا قصد کیا۔ میری عمر

اس وقت آٹھ برس کچھ مہینے کا تھا اور یہ پہلا موقع تھا کہ مجھے اپنی والدہ سے جدا ہونے کا اتفاق ہوا۔ چلنے کا وقت آیا تو انہوں نے ہم دونوں بھائیوں کو گلے سے لگایا۔ پیار کیا اور کوئی دعا پڑھ کر دم کی۔ مجھے بے اختیار رونا آیا مگر ضبط کیا۔

اس سے پہلے میں کبھی ریل پر سوار نہ ہوا تھا۔ سٹیشن پہنچ کر گاڑی میں بیٹھا۔ بیٹھا کیا؟ کبھی دوڑ کر اس کھڑکی سے منہ نکال کر جھانکتا تھا، کبھی اُس کھڑکی سے۔ اور سب سے زیادہ بے قراری اس بات کی تھی کہ دیکھئے ریل کب چلتی ہے؟ اور کیونکر چلتی ہے؟ آخر کار یہ وقت بھی آگیا۔ ریل کھسکی۔ سٹیشن کی عمارتیں، صورتیں، نقشے ایک ایک کر کے پیچھے ہٹتی گئیں۔ ٹرین کبھی سیدھی، کبھی سانپ کی طرح لہراتی جو ہر کا پل آتے ہی فرّاٹے بھرنے لگی۔ پہیوں کی سے دھماکے اور رفتار کی تیزی کے ساتھ ہوا کے جھونکے دل میں ایک امنگ پیدا کرنے لگے۔ اب یہ معلوم ہوا کہ میدان، کھیت، درخت، آدمی، مویشی کوئی ایسا نہ تھا جو الٹی طرف نہ بھاگا جاتا ہو۔ میں اپنے وطن سے نکلا اور یہ میرے وطن کی طرف چلے۔ دور کی چیزیں آہستہ آہستہ اور پاس کی اشیاء بے تحاشا دوڑتی نظر آئیں۔ جدھر دیکھا آسمان کے کنارے زمین سے ملے ہوئے معلوم ہوتے۔ اوپر سورج تھا اور چلتے پھرتے بادل۔ نیچے دھوپ تھی اور چھاؤں کے ٹکڑے کبھی یہاں کبھی وہاں۔ انجن کی طرف کبھی کبھی سیاہ گاڑھا دھواں نظر آتا تھا۔ مگر تھوڑی دیر میں ٹرین دھوپ میں سے نکل کر بادلوں کے سایہ میں آجاتی اور ہر طرف اندھیرا چھا جاتا۔ بادل ایسے گرجتے جیسے گھر میں کوئی ڈھول بجا رہا ہو۔ اب یہاں سنائی بھی دیتی تو بہت ہلکی۔ یہ کیفیت بھی تھوڑی دیر میں بدل جاتی اور ٹرین اندھیرے کو چیر کر روشن مطلع میں آجاتی۔

جب کوئی سٹیشن قریب آنے کو ہوتا تو انجن ٹرین کو پلیٹ فارم پر لانے کے لئے پٹڑی بدلتا اور پھر کون سا ایسا ہوگا جس کا منہ کھڑکی سے باہر ہو اور انجن کو اس حال میں دیکھ کر تالیاں نہ بجانے لگے۔ چھوٹے اسٹیشنوں پر ریل کے ٹھہرتے ہی مسافروں کی بھاگ دوڑ۔ گارڈ کا اپنی گاڑی سے اتر کر انجن تک بخط مستقیم جانا اور پھر ہری جھنڈی دکھا کر ٹرین کو چلتا کرنا۔ اس کے بعد اپنی گاڑی کی طرف آ، چلتی ریل میں دوڑ کر پائدان پر کھڑا ہو جانا۔ بڑے سٹیشنوں کے قریب بہت سے انجنوں کا نظارہ۔ کوئی کھڑا ہے۔ کوئی چل رہا ہے۔ کوئی صاف نظر آ رہا ہے۔ کوئی دھوئیں اور بھاپ میں چھپا ہوا ہے مگر چیختے چلاتے سب ہیں۔ پھر ٹرین کا ہلکی چال سے دفعتاً بڑی گرج اور لرزے سے سٹیشن کی اونچی اور لمبی چھت کے نیچے داخل ہونا۔ پلیٹ فارم پر لوگوں کا ہجوم۔ قلیوں اور مسافروں کا شور۔ سودا بیچنے والوں کی بے تکی بولیاں۔ ہوٹلوں اور چائے خانوں کا چمکتا ہوا سامان۔ اگرچہ یہ سب معمولی چیزیں تھیں مگر میرے لئے تو آج دنیا کے مشاہدوں کا ایک دفتر کھل گیا تھا۔ جو نئی چیز دیکھتا چاہتا کہ والد بھی اسے دیکھیں۔ کئی دفعہ آنکھوں میں کوئلے کی راکھ بھی پڑی مگر جب دیکھنے سے نہ رہا۔ غرض اسی حال میں چند گھنٹوں کے سفر کے بعد علی گڑھ آگیا۔ والد یہاں اترے۔ اتنا یاد ہے کہ کسی نے آکر کہا کہ "سید صاحب نے گاڑی بھیجی ہے۔" سٹیشن سے نکل کر ہم سب اُس گاڑی میں بیٹھے اور تھوڑی دیر کے بعد ایک احاطہ میں جو مجھے باغ معلوم ہوا داخل ہوئے۔ ایک بڑے بنگلے کے سامنے برساتی میں آکر گاڑی ٹھیر گئی۔

میں نے اب تک انگریزی وضع کے مکان دور سے دیکھے تھے۔ کبھی اُن کے اندر نہیں گیا تھا۔ گاڑی سے اتر کر ہم کئی کمروں میں سے گزرتے ہوئے ایک بڑے کمرے میں آئے جو مجھے بہت وسیع معلوم ہوا۔ اس کمرے کے سب سے بڑے دروازے میں خس کی ٹٹی لگی ہوئی تھی اور پنکھا چل رہا تھا، مگر کھینچنے والا نظر نہ آتا تھا۔ کمرے میں بہت سی خوبصورت کرسیاں کئی وضع کی رکھی ہوئی تھیں اور خس کی خوشبو کے ساتھ کوئی اور خوشبو بھی وہاں موجود تھی جو بہت اچھی معلوم ہوتی تھی۔ خس کی ٹٹی کے قریب ایک میز پر جس کی پوشش سبز تھی بہت سے کاغذ اور کتابیں اور کچھ چمکتی ہوئی چیزیں نہایت سلیقے اور خوبصورتی سے رکھی ہوئی تھیں۔ میز کے قریب ہی کرسی پر ایک بھاری بھرکم آدمی۔ سفید ڈاڑھی۔ سفید لباس۔ موٹے موٹے پاؤں اور ان میں سلیپر جو پیچھے ایڑیوں سے کٹے معلوم ہوتے تھے۔ شیر کا سا کلہ [illegible]

لگی ہوئی۔ یہ برہنہ سر بیٹھے تھے۔ یہی سید احمد خاں تھے جنہیں دلی کے بعض لوگ صرف "علی گڑھ والا" کہنا کافی سمجھتے تھے اور وہ ایک خوف اور چیرہ کی چیز سمجھے جاتے تھے۔ سید صاحب والد صاحب کو دیکھ کر السلام علیکم کہتے ہوئے کرسی سے کچھ جھکے جھکے اُٹھے اور یہ کہہ کر کہ "آپ آ گئے" والد صاحب سے مصافحہ کیا۔ اور ہم دونوں بھائیوں کو دیکھ کر کہا "ارے یہ کون ہیں؟" ہم دونوں قریب گئے اور جھک کر آداب کیا۔ سید صاحب نے ہماری صورتیں غور سے دیکھیں۔ پھر خوب ہنسے اور والد سے باتیں کرنے لگے۔ اب میں کبھی سید صاحب کی صورت دیکھتا تھا اور کبھی کمرے کے ساز و سامان کو۔ فرشی پنکھے کی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا۔ ہر طرف صفائی اور سلیقہ۔ نیچے فرش پر زرد حاشیہ دار دری کہ سُرخ اور نیلی دھاریوں کی دری اور سفید براق سی چھت گیری۔ دیواروں پر ہلکا فیروزی رنگ۔ کہیں کہیں سنہری چوکھٹوں میں تصویریں لگی ہوئیں۔ جن میں پہاڑ، سبزہ زار اور چشمے نظر آتے تھے۔ جی چاہتا تھا کہ میں بھی انہی میں کہیں ہوتا۔ آتش دان کا کارنس میرے لئے اس قدر پُرتکلف تھا کہ اب بڑی سے بڑی نمائش گاہ بھی وہ لطف نہیں دے سکتی۔ اس کارنس پر بہت سی خوبصورت رنگ برنگ کی چیزیں رکھی تھیں اور ان سب کے اوپر دیوار میں ایک عجیب صورت کا گھنٹہ لگا ہوا تھا۔ سید صاحب اور میرے والد جب باتیں کرتے کرتے چپ ہو جاتے تھے تو پنکھے کی ہلکی آواز کے ساتھ اس گھنٹے کی کھٹ کھٹ میرے تصور میں اس کمرے کی بزرگی اور متانت کو دوبالا کر دیتی تھی۔ کارنس پر جو چیزیں آراستہ تھیں اُن میں سب سے زیادہ دلکش سنگ مرمر کا ایک چھوٹا سا روضہ تھا جو شیشے کی صندوقچی میں رکھا ہوا تھا۔ یہ مجھے منصور کا مقبرہ معلوم ہوا جسے میں دہلی میں بارہا دیکھ چکا تھا۔ لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ یہ تاج بی بی کا روضہ ہے۔ میں اس کو ایک کھلونا اور اس لڑکے کو جو اس کا مالک ہو قابل رشک سمجھنے لگا۔ مگر یہ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ وہ اتنے اونچے پر کیوں رکھا ہوا ہے کہ کسی لڑکے کا ہاتھ وہاں تک نہیں پہنچ سکتا۔

سید صاحب اس قدر عظیم و جسیم تھے کہ مجھ کو اپنے والد اُن کے سامنے بہت دبلے اور مختصر معلوم ہونے لگے۔ درآں حالیکہ اس سے پہلے میں اُن کے برابر کسی کو بڑا آدمی نہ سمجھتا تھا۔

سید صاحب والد سے بھی باتیں کرتے جاتے تھے اور کبھی کبھی ہم دونوں بھائیوں سے بھی کوئی بات پوچھ لیتے تھے۔ میرے بڑے بھائی تو کرسی پر بیٹھ گئے تھے مگر میں کھڑا رہا۔ کیونکہ سخت عدیم الفرصت تھا۔ میں سید صاحب کے پاس کھڑا ان کے لکھنے کی دوات کو بڑی محویت کے ساتھ دیکھنے میں مصروف تھا۔ اس دوات کا ڈھکنا مجھے بالکل شیر ببر کا سر معلوم ہو رہا تھا۔ بالکل اسی صورت کا جس کی تصویر میری ریڈر میں بنی ہوئی تھی۔ اُس کی آنکھیں لال لال نگینوں کی طرح خوب چمک رہی تھیں۔ میں اس خواب حیرت سے اُس وقت چونکا؛ جب سید صاحب نے مجھ سے پوچھا کہ تم کیا پڑھتے ہو؟ میں نے ایک ہی سانس میں جواب دیا "اردو کی چوتھی ختم کر چکا ہوں۔ فارسی کی دوسری پڑھتا ہوں اور رائل ریڈر شروع کر رکھی ہے۔" اس سیدھے سادے جواب پر سید صاحب اور میرے والد بہت زور سے ہنسے۔ وجہ میری سمجھ میں نہ آئی۔ شاید میرا یہ "علم و فضل" باعث مسرت ہوا ہو۔

یہ دونوں بزرگ باتیں بھی کرتے جاتے تھے اور تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد قہقہے بھی لگاتے تھے۔ سید صاحب نے کچھ کاغذات والد کو دیئے جب وہ اُن کو پڑھنے لگے تو سید صاحب لکھنے میں مصروف ہو گئے۔ تھوڑی دیر بعد سید صاحب نے لکھتے لکھتے قلم ہاتھ سے رکھ دیا اور ایک چھوٹے سے بکس کی طرف ہاتھ بڑھا کر بڑی مہیب آواز میں کہا "پنکھا روکو" جس پر فرشی پنکھا فوراً رُک گیا۔ سید صاحب نے بکس میں سے ایک چروٹ نکال کر دیا سلائی جلائی اور جب دیا سلائی چروٹ کے قریب لائے تو مجھ کو اُن کا چہرہ اور بھی عظیم الشان اور خوفناک معلوم ہونے لگا۔ اب مجھے معلوم ہوا کہ خس کی خوشبو کے علاوہ جو خوشبو کمرے میں پھیلی ہوئی تھی وہ چروٹ کی تھی۔

اس آواز اور چہرے کا نقش دل پر ہوتے ہی میں سید صاحب سے ڈرنے لگا اور یہ اُسی خوف کی ابتدا تھی جو ہمیشہ قائم رہا۔ حاضر و غائب کبھی دل سے نہ گیا۔

گی ہوئی۔ برہنہ سر بیٹھے تھے۔ یہی سید احمد خاں تھے جنہیں دلّی کے بعض لوگ صرف "علی گڑھ والا" کہنا کافی سمجھتے تھے اور وہ ایک خوف اور ہیبت کی چیز سمجھے جاتے تھے۔ سید صاحب والد صاحب کو دیکھ کر السلام علیکم کہتے ہوئے کرسی سے کچھ جھکے جھکے اُٹھے اور یہ کہہ کر کہ "آپ آ گئے" والد سے مصافحہ کیا۔ اور ہم دونوں بھائیوں کو دیکھ کر کہا "ارے یہ کون ہیں؟" ہم دونوں قریب گئے اور جھک کر آداب کیا۔ سید صاحب نے ہماری صورتیں غور سے دیکھیں۔ پھر خوب ہنسے اور والد سے باتیں کرنے لگے۔ اب میں کبھی سید صاحب کی صورت دیکھتا تھا اور کبھی کمرے کے ساز و سامان کو۔ فرشی پنکھے کی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا۔ ہر طرف صفائی اور سلیقہ۔ نیچے فرش پر نمدہ حاشیہ دار کہ سُرخ اور نیلی دھاریوں کی دری اور سفید براق سی چھت گیری۔ دیواروں پر ہلکا فیروزی رنگ۔ کہیں کہیں سنہری چوکھٹوں میں تصویریں لگی ہوئیں۔ جن میں پہاڑ، سبزہ زار اور چشمے نظر آتے تھے۔ جی چاہتا تھا کہ میں بھی انہی میں کہیں ہوتا۔ آتش دان کا کارنس میرے لئے اس قدر پُر تکلف تھا کہ اب بڑی سے بڑی نمائش گاہ بھی وہ لطف نہیں دے سکتی۔ اس کارنس پر بہت سی خوبصورت رنگ برنگ کی چیزیں رکھی ہوئی تھیں اور ان سب کے اوپر دیوار میں ایک عجیب صورت کا گھنٹا لگا ہوا تھا۔ سید صاحب اور میرے والد صاحب باتیں کرتے کرتے چپ ہو جاتے تھے تو پنکھے کی ہلکی آواز کے ساتھ اس گھنٹے کی کھٹ کھٹ میرے تصور میں اس کمرے کی بزرگی اور متانت کو دوبالا کر دیتی تھی۔ کارنس پر جو چیزیں آراستہ تھیں اُن میں سب سے زیادہ دلکش سنگ مرمر کا ایک چھوٹا سا روضہ تھا جو شیشے کی صندوقچی میں رکھا ہوا تھا۔ یہ مجھے تصویر کا مقبرہ معلوم ہوا جسے میں دہلی میں بارہا دیکھ چکا تھا لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ یہ تاج بی بی کا روضہ ہے۔ میں اس کو ایک کھلونا اور اس لڑکے کو جو اس کا مالک ہو قابل رشک سمجھنے لگا۔ مگر یہ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ وہ اتنے اونچے پر کیوں رکھا ہوا ہے کہ کسی لڑکے کا ہاتھ وہاں تک نہیں پہنچ سکتا۔

سید صاحب اس قدر لحیم شحیم تھے کہ مجھ کو اپنے والد اُن کے سامنے بہت دبلے اور مختصر معلوم ہونے لگے۔ درآں حالیکہ اس سے پہلے میں اُن کے برابر کسی کو بڑا آدمی نہ سمجھتا تھا۔

سید صاحب والد سے بھی باتیں کرتے جاتے تھے اور کبھی کبھی ہم دونوں بھائیوں سے بھی کوئی بات پوچھ لیتے تھے۔ میرے بڑے بھائی تو کرسی پر بیٹھ گئے تھے مگر میں کھڑا رہا۔ کیونکہ سخت عدیم الفرصت تھا۔ میں سید صاحب کے پاس کھڑا ان کے لکھنے کی دوات کو بڑی محویت کے ساتھ دیکھنے میں مصروف تھا۔ اس دوات کا ڈھکنا مجھے بالکل شیر ببر کا سر معلوم ہوتا تھا۔ بالکل اسی صورت کا جس کی تصویر میری ریڈر میں بنی ہوئی تھی۔ اُس کی آنکھیں لال لال نگینوں کی طرح خوب چمک رہی تھیں۔ میں اس خواب حیرت سے اُس وقت چونکا؟ جب سید صاحب نے مجھ سے پوچھا کہ تم کیا پڑھتے ہو؟ میں نے ایک ہی سانس میں جواب دیا "اردو کی چوتھی ختم کر چکا ہوں۔ فارسی کی دوسری پڑھتا ہوں اور رائل ریڈر شروع کر رکھی ہے۔" اس سیدھے سادے جواب پر سید صاحب اور میرے والد بہت زور سے ہنسے۔ وجہ میری سمجھ میں نہ آئی۔ شاید میرا یہ "علم و فضل" باعث مسرت ہوا ہو۔

یہ دونوں بزرگ باتیں بھی کرتے جاتے تھے اور تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد قہقہے بھی لگاتے تھے۔ سید صاحب نے کچھ کاغذات والد کو دیئے جب وہ اُن کو پڑھنے لگے تو سید صاحب لکھنے میں مصروف ہو گئے۔ تھوڑی دیر بعد سید صاحب نے لکھتے لکھتے قلم ہاتھ سے رکھ دیا اور ایک چھوٹے سے بکس کی طرف ہاتھ بڑھا کر بڑی مہیب آواز میں کہا "پنکھا روکو" جس پر فرشی پنکھا فوراً رُک گیا۔ سید صاحب نے بکس میں سے ایک چرٹ نکال کر دیا سلائی جلائی اور جب دیا سلائی چرٹ کے قریب لائے تو مجھ کو اُن کا چہرہ اور بھی عظیم الشان اور خوفناک معلوم ہونے لگا۔ اب مجھے معلوم ہوا کہ خس کی خوشبو کے علاوہ جو خوشبو کمرے میں پھیلی ہوئی تھی وہ چرٹ کی تھی۔

اس آواز اور چہرے کا نقش دل پر ہوتے ہی میں سید صاحب سے ڈرنے لگا اور یہ اُسی خوف کی ابتدا تھی جو ہمیشہ قائم رہا۔ حاضر و غائب کبھی دل سے نہ گیا۔

جس کمرے میں سید صاحب کی نشست تھی اُس کے قریب ہی ایک کمرہ والد کے لئے مخصوص کر دیا گیا تھا۔ وہیں ہمارا اسباب رکھا گیا تھا۔ کچھ دیر سید صاحب کے پاس ٹھہر کر جب والد صاحب اس کمرہ میں آئے تو ہم دونوں بھائی بھی اُن کے ساتھ آئے اس کمرے میں غسل خانہ تھا۔ اُس کو دیکھنے کا سامان اتنا صاف ستھرا اور میرے لئے عجیب تھا کہ بغیر اجازت کسی چیز کو چھونے کی ہمت نہ ہوئی۔ کپڑے بدلنے کے کمرہ میں جو آئینہ دار خوبصورت میز رکھی تھی اُس پر کچھ چیزیں شیشے کی بھی رکھی تھیں۔ مگر ان سب کو مجھ سے سخت دشمنی تھی کیونکہ جہاں میں نے خوش ہو کر کسی چیز کو ہاتھ لگایا۔ اور وہ آپ سے آپ ٹوٹ کر گر پڑتی تھی۔

شام ہوئی تو سید صاحب بنگلے سے باہر آئے۔ کوٹھی کے احاطے میں ایک طرف کو باغ تھا۔ اُس کے بیچ پر ایک چبوترہ تھا۔ اُس پر بہت سی کرسیاں رکھی ہوئی تھیں۔ کرسیوں پر بیٹھ کر سید صاحب اور میرے والد پھر باتیں کرنے لگے۔ تھوڑی دیر بعد سید صاحب نے مجھے اپنے قریب بلایا اور میرے دونوں ہاتھ پکڑ کر کہا "منہ کھولو" میں نے منہ کھولا تو کہنے لگے "ہمارے اس لڑکے کے منہ میں سے تو خون نکل رہا ہے توبہ۔ توبہ" میں دلی سے چلا تھا تو پان کھایا تھا۔ اس لئے دانت لال ہو گئے تھے۔ میں نے شرمندہ ہو کر جلدی سے منہ بند کر لیا اور سمجھ لیا کہ پان کھانا بُری بات ہے۔

جب کچھ رات ہو گئی تو آدمی نے آکر کہا "کھانا میز پر ہے" اس پر سب لوگ اُٹھے اور کھانے کے کمرہ میں آئے۔ یہاں پھر میری آنکھوں کے لئے عجیب و غریب منظر تھے۔ میز پر نہایت سفید چادر۔ چینی کے برتن۔ شیشے کے گلاس۔ چاندی کے چمچے، ہاتھی دانت کے دستے کی چھریاں میز پر رکھی تھیں۔ میز پر دو بڑے شاندار لیمپ روشن تھے۔ پنکھا چل رہا تھا۔

اس سامان کو دیکھ کر مجھے اپنے گھر کا دسترخوان۔ برتن اور فتیل سوز یاد آیا۔ میری والدہ دسترخوان ہمیشہ اُجلا بچھوایا کرتی تھیں۔ مگر وہ گاڑھے کا ہوتا تھا۔ اس میز پوش کی صفائی اور چمک سے اُسے کیا نسبت تھی۔ برتن تانبے کے قلعی دار ہوتے تھے۔ چینی کے برتن خاص خاص کھانوں کے لئے یا جب کوئی مہمان آئے تو برتے جاتے۔ شیشے کے گلاس صرف گرمیوں میں یا رمضان شریف میں افطاری کے وقت نکالے جاتے تھے۔ ماما ئیں ان کو ہاتھ لگاتے ہوئے ڈرتی تھیں۔ چھریاں اور کانٹے چاندی کے تو میں نے کبھی خواب میں بھی نہ دیکھے تھے۔ گھر کا فتیل سوز اگرچہ روز مرہ مجھوایا جاتا تھا مگر اُس کی صورت شکل اور ٹمٹماتی مدھم سی روشنی ان لیمپوں کی صاف اور تیز روشنی کے سامنے کیا حقیقت رکھتی تھی۔

باتیں کرتے اور قہقہوں پر قہقہے لگاتے سب لوگ میز کے گرد کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ تین چار سفید پوش ملازم اور ایک بہت بڑی لمبی ڈاڑھی کا دبلا پتلا سوکھا مگر بے حد چست چالاک اور تیز خانساماں طرح طرح کے کھانے سامنے لاتا تھا۔ اور سب لوگ چمچوں سے حسب ضرورت کھانا اپنی رکابی میں نکال کر کھاتے تھے۔ ہم دونوں بھائیوں کی رکابیوں میں ہمارے خانساماں نے خود ہاتھ سے کھانا نکال کر دیا کھانے کے ذائقہ کی نسبت میں نے غور نہ کیا مگر یہ یقینی ہے کہ وہ گھر جیسا نہ تھا۔ اور سچی بات یہ ہے کہ میں نئی نئی چیزوں کے دیکھنے میں ایسا مصروف تھا کہ کچھ سمجھ ہی میں نہ آیا کہ کیا کھا رہا ہوں۔

جب ہم دونوں کھانا کھا چکے۔ تو سید صاحب نے ایک نوکر سے کہا کہ "ان بچوں کو اُن کے پلنگوں پر لے جا کر سلا دو۔"

صبح ہوتے ہی چڑیوں کی آواز پر آنکھ کھلی۔ میں بے انتہا خوش تھا۔ جتنی چیزیں اب تک دیکھی تھیں ان کی نسبت سینکڑوں سوال والد سے کرتا تھا۔ اور بار بار پوچھتا تھا کہ الہ آباد میں یہ سب چیزیں ہوں گی یا نہیں؟ والد کبھی تو جواب دے دیتے تھے۔ کبھی ہنس کر چپ ہو جاتے تھے۔

والد نے علی گڑھ میں دو دن قیام کیا۔ پھر الہ آباد روانہ ہو گئے اور دوسرے دن سورج ابھی نہیں نکلا تھا کہ وہاں پہنچ گئے۔

ساڑھے آٹھ برس کی عمر میں سید صاحب کی طرزِ معاشرت پر میرا چھوٹا سا دماغ غور کرنے کے قابل تو کیا ہوتا۔ مگر ان کے بنگلہ کی بہت سی چیزیں ایسی تھیں کہ جی چاہتا تھا میرے پاس بھی ہوتیں۔ اب یہ شوق پیدا ہوا کہ جہاں بھی رہوں وہاں کی ہوا ایسی ہی اچھی ہو۔ ایسے ہی کھلے میدان ہوں، وباغ ہو۔ باغوں میں پھولوں کے پودے ہوں۔ گرد و پیش کی سب چیزیں صاف ستھری۔ چمکتی ہوئی۔ ہلکے ہلکے رنگوں کی ہوں۔ اور کوئی چیز میلی اور خراب نہ ہو۔ یہ ایسا خیال تھا جس کا بہت کچھ اثر طبیعت پر تمام عمر غالب رہا۔"

یہ ہے سرسید کی طرزِ معاشرت کا وہ دلاویز نقشہ جو مولوی عنایت اللہ کے سحر طراز قلم نے نہایت نہایت خوبی کے ساتھ کھینچا ہے۔ آیئے اب آپ کو اس عظیم الشان انسان کی شخصیت سے متعارف کرائیں۔

انیسویں صدی اس لحاظ سے تاریخ میں نہایت نمایاں رہے گی کہ اس میں ایک دو نہیں بہت سے ایسے نامور مصلح۔ ریفارمر۔ ادیب۔ شاعر مورخ اور انشاء پرداز پیدا ہوئے کہ زمانہ ان کی نظیر شاید پھر کبھی نہ لا سکے۔ دنیا ہزاروں لاکھوں چکر کھاتی ہے جب ایسے باکمال پیدا ہوتے ہیں جیسے قدرت نے اس صدی میں پیدا کئے۔ ان مشاہیر میں سرسید مرحوم اپنی خوبیوں۔ اپنی لیاقتوں اور اپنے مہتم بالشان کارناموں کی بدولت بلاشبہ ایک خاص حیثیت رکھتے ہیں۔ وہ ملک کے خیر خواہ۔ قوم کے ہمدرد اور مسلمانوں کے حقیقی غمخوار تھے۔ اپنی ساری عمر انہوں نے قوم کی بھلائی، ہمدردی اور ترقی کے غم میں گزار دی مگر قوم کی طرف سے ہمیشہ ان کو نیچری۔ مرتد۔ کافر اور بے ایمان کے "معزز خطابات" سے نوازا گیا۔ اور مکہ معظمہ تک سے ان کے لئے کفر کے فتوے بڑی کوشش اور سعی سے حاصل کر کے تمام ملک میں نہایت کثرت کے ساتھ ان کی تشہیر کی گئی۔ قوم کے حقیقی بہی خواہوں کو قوم کی طرف سے ہمیشہ یہی صلہ ملا کرتا ہے۔

جو اوصاف و فضائل و محاسن ایک ریفارمر ایک لیڈر اور ایک مصلح قوم میں ہونے چاہئیں وہ قدرت نے نہایت فیاضی کے ساتھ سرسید کو عطا کئے تھے۔ اولالعزمی و بلند حوصلگی۔ ہمت و جرأت۔ بہادری و شجاعت مستقل مزاجی و خود اعتمادی۔ دلیری و بے خوفی۔ سچائی و راستبازی۔ ہمدردی و محبت۔ غیرت و حمیت۔ عقل و فہم۔ دانائی و دُور اندیشی۔ تدبیر و تدبر۔ انتظام و قابلیت۔ خوش اخلاقی و ملنساری۔ وقار و متانت۔ رعب و داب اثر و رسوخ۔ قدر دانی و حوصلہ افزائی۔ محنت و جفاکشی۔ فراخ حوصلگی و عالی ہمتی۔ رواداری و بے تعصبی وغیرہ اخلاقِ حسنہ جن کا ایک لیڈر میں پایا جانا ضروری ہے۔ وہ سب کے سب سرسید کے وجود میں پورے طور پر پائے جاتے تھے۔ اس لحاظ سے اگر یہ کہا جائے کہ سرسید پیدائشی لیڈر تھے یا خلاقِ مطلق نے ان کو لیڈری ہی کے لئے پیدا کیا تھا تو شاید کچھ بیجا نہ ہوگا۔

قدرت جن نفوس مخصوصہ پر مہربان ہوتی ہے ان کو بڑی کثرت اور بہتات کے ساتھ اپنے انعامات اور عطیات سے نوازتی ہے۔ خوش قسمتی سے سرسید انہی باکمال اشخاص میں سے ایک تھے یعنی ان کی ذات میں بیک وقت بہت سے محاسن اور فضائل جمع ہو گئے تھے۔ وہ جہاں ایک آتش بیان مقرر تھے وہاں ایک بلند پایہ ادیب بھی تھے۔ جہاں انہوں نے مسلمانوں کو تعلیم کی طرف توجہ دلائی وہاں اپنے زمانہ کے اردو ادب کو بھی ایک نئی زندگی بخشی۔ جہاں انہوں نے مدرسۃ العلوم مسلمانان قائم کیا۔ وہاں سائنٹیفک سوسائٹی اور آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کی بھی بنیاد ڈالی۔ ایک طرف انہوں نے مسلمانوں کی تعلیمی رہنمائی کی تو دوسری طرف انڈین کانگریس سے مسلمانوں کو روکا، یہ ایسی رَو تھی کہ مسلمانوں کا بڑا سے بڑا لیڈر بھی اس دلدل سے اپنے دامن کو نہ بچا سکا۔ مگر سرسید کی حقایق نگاہ نے پہلی ہی نظر میں نہایت عاقبت اندیشی سے تاڑ لیا تھا کہ کانگریس کبھی بھی مسلمانوں کی حقیقی ہمدرد نہیں بن سکتی۔ اس لئے سرسید نے مسلمانوں کو اس سے الگ رہنے کی بڑے زور سے تلقین کی۔ یہی حقیقت تھی جو ہمارے مسلم لیڈروں پر بڑے تلخ تجربوں کے بعد آخر میں ظاہر ہوئی اور وہ ایک ایک کر کے کانگریس سے نکل گئے۔ ایسے ہی موقع پر اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ سرسید کتنا بلند نگاہ۔ عاقبت اندیش۔ اور صائب الرائے انسان تھا۔

ہمارے بہت سے سیاسی لیڈر مذہب سے بالکل کورے ہوتے ہیں۔ اور ہمارے بیشتر مذہبی رہنما سیاست میں صفر محض کا درجہ رکھتے ہیں۔

مسلمان اور باغی بالکل ہم معنی لفظ تھے۔ اس وقت مسلمان کے حق میں کوئی کلمہ خیر کہنا گویا انگریز کی آتش غضب کو بھڑکانے کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ اور جس کا انجام پھانسی کا تختہ تھا جس پہ ہزاروں مسلمان بے گناہ اور بے قصور بڑی بے پروائی سے چڑھا دیے گئے۔ ایسے پر آشوب، ایسے ہولناک اور ایسے نفسا نفسی کے زمانہ میں سر سید نے انتہائی دلیری کے ساتھ رسالہ "اسباب بغاوت ہند" لکھا اور اسے چھاپ کر حکام بالا اور لندن پارلیمنٹ کے ممبروں کو بھیج دیا۔ جس میں مسلمانوں کی بے گناہی کو نہایت دلائل کے ساتھ ثابت کیا اور فساد کی تمام تر ذمہ داری ناعاقبت اندیش انگریز حکام پر ڈالی۔ حقیقت یہ ہے کہ سر سید ہی جیسا دلیر انسان ایسے خطرناک وقت میں ایسا ہولناک اقدام کر سکتا تھا۔ ہر شخص کی ہمت نہیں۔

مذہب سے سر سید کو جس قدر محبت تھی اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات ستودہ صفات سے جتنا عشق تھا اور پھر دونوں امور کے لئے ان میں جتنی غیرت اور حمیت تھی اور اس کی نظیر موجودہ لیڈروں اور ادیبوں میں تلاش کرنا ایک فعل عبث ہے۔

مذہب اسلام کے لئے جو غیرت سر سید کے دل میں تھی اس کی مثال میں وہ واقعہ مشہور ہے جب کسی ان کے ایک دوست نے ان کو لکھا کہ میرا انگریز افسر مجھے نماز پڑھنے سے روکتا ہے۔ سخت مشکل میں ہوں کیا کروں۔ اس کے جواب میں سر سید لکھتے ہیں:

"گو میں کسی وقت کی نماز پڑھتا ہوں اور کسی وقت کی نہیں پڑھتا اور وقت بے وقت کا بھی خیال نہیں کرتا۔ دو دو وقت کی بھی ملا کر پڑھ لیتا ہوں۔ ریل میں لمبا سفر ہو تو مجھ سے ادا نہیں ہو سکتی۔ یہ سب باتیں مجھ میں ہیں اور نالائقی اور شامت اعمال سے ایسی سستی نماز میں ہے مگر تم نے اس معاملہ میں جو پیش آیا نہایت برا کیا۔ نماز جو خدا کا فرض ہے اس کو ہم اپنی شامت اعمال سے جس خرابی سے چاہو ادا کریں یا قضا کریں۔ لیکن کوئی شخص اگر یہ کہے کہ تم نماز نہ پڑھو، اس کا صبر ایک لمحہ بھی نہیں ہو سکتا۔ یہ بات سنی بھی نہیں جا سکتی میری سمجھ میں نماز نہ پڑھنا صرف گناہ ہے جس کے بخشے جانے کی توقع ہے۔ ... مگر کسی شخص کے منع کرنے سے نہ پڑھنا یا سستی میں ڈالنا میری سمجھ میں کفر ہے جو کبھی نہ بخشا جائے گا۔ تم کو پہلے ہی اپنی طرف سے ایسا طریقہ اختیار کرنا تھا جو کبھی اس قسم کی بحث نہ آتی۔ اور جب ایسا طریقہ اختیار نہیں کیا تھا تو پھر لجلجانا اور گڑگڑانا اور "حضور رخصت ہی دیں" "تنخواہ کاٹ لیں" کہنا واہیات تھا۔ تڑاق سے استعفےٰ دے دیتا تھا۔ اور صاف کہہ دینا تھا کہ میں اپنے خدائے عظیم الشان قادر مطلق کے حکم کی اطاعت کروں گا نہ کہ آپ کی۔ "کیا ہوتا؟ نوکری میسر نہ ہوتی؟ فاقے مر جاتے؟ نہایت اچھا ہوتا"

والسلام

خاکسار سید احمد از بنارس ۔ ۹ر جنوری [illegible]

سر ولیم میور لیفٹیننٹ گورنر یوپی نے "لائف آف محمد" نامی کتاب لکھی تو اس میں حضور رسول مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نہایت رکیک اعتراضات کیے۔ کتاب شائع ہوئی تو سر سید کا دل ان اعتراضات کو دیکھ کر جل گیا۔ اور فوراً اس کا جواب دینے کا ارادہ کیا۔ لیکن جواب کے لئے جن کتابوں کے مطالعہ کی ضرورت تھی وہ ہندوستان میں ملتی نہیں تھیں۔ انہوں نے اس غرض کے لئے لندن جانے کا قصد کیا مگر روپیہ پاس نہ تھا۔ جانے کہاں سے۔ مگر عشق نبی میں سرشار سید نے اس کی کچھ بھی پروا نہ کی۔ تھوڑے عرصہ پہلے تزک جہانگیری بڑے اہتمام سے چھپائی تھی اور دس روپیہ فی جلد قیمت رکھی تھی۔ وہ سب جلدیں ایک روپیہ فی جلد کے حساب سے بیچ ڈالیں۔ گھر میں جو کچھ اثاثہ تھا وہ بھی فروخت کر دیا اور گھر کو رہن رکھ کر کچھ روپیہ حاصل کیا اور اس طرح لندن روانہ ہو گئے۔ وہاں بیٹھ کر نہایت قابلیت اور خوبی کے ساتھ کتاب کا جواب لکھا مگر اب اس کے چھپوانے کے لئے پیسہ نہ تھا۔ مگر اس عاشق رسول نے ہمت نہ ہاری گھر خط لکھا کہ جو کچھ سامان باقی رہ گیا ہے سب بیچ ڈالو۔ میرا سارا کتب خانہ نیلام کر دو۔ روپیہ بھیجو۔ ایک گھر باقی ہے اس کو بھی رہن رکھ دو اور روپیہ بھیجو۔ پھر اپنے خاص خاص دوستوں کو لکھا کہ جو کچھ بھیج سکتے ہو بھیجو۔ اس سلسلے میں اپنے دوست نواب محسن الملک کو خط لکھا کہ "میں نے مصمم ارادہ کر لیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت میں کتاب لکھی جائے۔ اگر تمام روپیہ خرچ ہو جائے اور میں فقیر بھیک مانگنے کے قابل ہو جاؤں تو بلا سے۔ قیامت میں یہ کہہ کر پکارا جاؤں گا کہ اس فقیر مسکین احمد کو جو اپنے نانا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے نام پر فقیر ہو کر مر گیا۔ حاضر کرو۔ واہ میں فقیر شاہنشاہی

لبس است"

یہی کتاب تھی جو بعد میں "خطبات احمدیہ" کے نام سے انگریزی اور اردو میں شائع ہوئی۔

عام طور سے یہ بات مشہور ہے کہ تین باتوں کا تین امور کے ساتھ اجتماع نہیں ہوتا۔ ایک تو بڑے بڑے اونچے خیالات سوچنے والے اور عظیم الشان ہوائی قلعے تعمیر کرنے والے میدان عمل میں محض صفر ہوتے ہیں۔ دوسرے وہ لوگ جو ذہانت کے پتلے اور نہایت ہوشیار ہوتے ہیں وہ بالعموم اچھے حافظ کے مالک نہیں ہوتے۔ تیسرے جو لوگ اچھا بول سکتے ہیں وہ عام طور پر اچھا لکھ نہیں سکتے۔ لیکن اس نظریہ کو سرسید کے وجود نے باطل کر دیا تھا۔ اُن میں یہ کمال تھا کہ جو اعلیٰ منصوبے وہ سوچتے تھے اُن کو نہایت عزم کے ساتھ عمل کا جامہ بھی پہنانے تھے۔ پھر جیسے وہ ذہین تھے ایسے ہی حافظہ کے زبردست بھی تھے اور سب سے بڑھ کر اُن میں یہ بات تھی کہ جتنی عمدہ اور دلنشین ان کی تقریر ہوتی تھی ایسی ہی نفیس اور شاندار ان کی تحریر ہوتی تھی۔ لکچر دیتے تھے تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ جنگل میں شیر کی آواز گونج رہی ہے۔ مضمون لکھتے تھے تو یہ محسوس ہوتا تھا کہ ایک قادر الکلام ادیب فصاحت کے دریا بہا رہا ہے۔

ایک بڑا کمال سرسید میں یہ تھا کہ وہ صحیح معنوں میں ہر فن مولا تھے۔ جو کام وہ خود اختیار کرتے تھے۔ یا جو کام ان کے سپرد کیا جاتا تھا اُسے ایسے ذوق و شوق، ایسی دلچسپی اور ایسے انہماک کے ساتھ انجام دیتے تھے گویا اس کام سے زیادہ اُنہیں اور کسی کام سے لگاؤ نہیں۔ اور پھر وہ اُس کام کو کرتے بھی اس خوش اسلوبی کے ساتھ تھے جس کی حد نہیں۔ مثلاً تصنیف و تالیف کو لیجئے۔ جب انہوں نے دہلی کے محلات۔ عمارات۔ مقابر اور آثار قدیمہ کی تاریخ لکھنے کا ارادہ کیا تو اس دُھن میں اپنے آرام و راحت کو بالکل تج دیا۔ گرمی کی دوپہر ہو یا سردی کی شام وہ برابر دہلی کے قدیم کھنڈروں میں مارے مارے پھرتے تھے۔ کہیں قدیم مسخ شدہ کتبے کھڑے پڑھ رہے ہیں کہیں عمارات کی تصویریں لے رہے ہیں۔ کہیں کھنڈروں کی تحقیقات کر رہے ہیں کہ یہاں جو محل بنا ہوا تھا وہ کب بنا تھا اور کس نے بنایا تھا۔ کہیں عمارات کے بانیوں کے حالات کتابوں میں ڈھونڈ رہے ہیں۔ فی الحقیقت یہ ایسا کام تھا جو ناز و نعمت میں پلے ہوئے امیر گھرانے کے ۲۹ سالہ نوجوان مجسٹریٹ کے لئے بڑا ہی مشکل اور صبر آزما تھا۔ مگر سرسید نے لگاتار ڈیڑھ برس کی محنت و تلاش میں اسے انجام دے کر کتاب کو "آثار الصنادید" کے نام سے شائع کر دیا۔ خود لکھتے ہیں کہ "قطب صاحب کی لاٹھ کے بعض کتبے جو زیادہ بلند ہونے کے سبب پڑھے نہ جا سکتے تھے۔ اُن کے پڑھنے کے لئے ایک چھینکا دو بلیوں کے درمیان ہر ایک کتبے کے محاذ میں بندھوا لیا جاتا تھا اور میں خود اوپر چڑھ کر اور چھینکے میں بیٹھ کر ہر کتبے کا چربا اُتارتا تھا جس وقت میں چھینکے میں بیٹھتا تھا تو مولانا صہبائی فرط محبت کے سبب بہت گھبراتے تھے اور مارے خوف کے اُن کا رنگ متغیر ہو جاتا تھا۔"

ایسا ہی جب انہوں نے بائبل کی تفسیر لکھنی شروع کی تو اس کام میں اتنی محنت و مشقت برداشت کی جس کی انتہا نہیں۔ کئی کئی رات مسلسل جاگتے اور لکھتے رہتے تھے۔ جب نیند بہت زیادہ ستاتی تو اور وہ پھیلی ہوئی کتابوں پر سر رکھ کر تھوڑی دیر سو رہتے اور پھر اُٹھ کر لکھنے لگتے تھے۔

اکثر مصنفوں کی عادت ہوتی ہے کہ وہ تصنیف و تالیف کے وقت کامل سکون چاہتے ہیں۔ اُس دوران میں اگر چڑیا بھی اُن کے کمرے میں آ جائے تو وہ چیخنے لگتے ہیں کہ "مجھے میرے دوستوں سے بچاؤ۔" خود میری اپنی یہ حالت ہے کہ رات کے پچھلے پہر کے پرسکون لمحات میں جب مضمون لکھنے بیٹھتا ہوں تو گھڑی تک اٹھا کر دوسرے کمرے میں رکھ آتا ہوں تاکہ اس کی ٹک ٹک کمرے کے سکون میں خلل انداز نہ ہو۔ مگر سرسید کے متعلق مولانا حالی لکھتے ہیں کہ "مختلف آدمیوں اور مختلف کاموں کے ہجوم میں ان کے خیالات منتشر نہ ہوتے تھے۔ اُن کے دفتر کا بڑا کمرہ جہاں بیٹھ کر کام کرتے تھے صبح سے شام تک وہاں ہر قسم کے لوگ برابر آتے جاتے رہتے تھے اور ہر وقت دوستوں اور ملاقاتیوں اور ماتحت کام کرنے والوں کا مجمع رہتا تھا۔ اسی مجمع میں جہاں وہ اور سب کام کرتے تھے تصنیف و تالیف کا دشوار گزار مرحلہ بھی وہیں طے کیا جاتا تھا۔ مشکل سے مشکل مضامین جو کہ اکثر جمہور کی رائے اور مذہبی خیالات کے برخلاف ہوتے تھے اور جن میں قدیم علماء اور مصنفین پر نکتہ چینی کرنے کی ضرورت اور غور و خوض کرنے کی سخت حاجت ہوتی تھی اُن کے لئے بھی کبھی نہیں دیکھا کہ وہ خیالات کے مجتمع کرنے کے لئے کسی علیحدہ کمرے میں جا کر بیٹھے ہوں۔ یا اور لوگوں کو اپنے پاس سے اُٹھا

دیا ہو۔ یا اُن کے پاس بیٹھنے سے تنگ دل ہوتے ہوں۔ یا لوگوں کے اٹھ جانے کے انتظار میں مضمون لکھنا ملتوی کر دیا ہو یا حاضرین کے ہجوم کے سبب اُن کے خیالات پراگندہ ہو گئے ہیں۔ ہم نے خود دیکھا ہے کہ احباب جمع ہیں اور آپس میں دلچسپ بحثیں یا ہنسی ہنسی کی باتیں کر رہے ہیں جن سے خواہی نخواہی ایک کامی آدمی کا دھیان بٹ جاتا ہے مگر یہ شخص بدستور اپنے مضمون کی ادھیڑ بن میں مستغرق ہے۔ کبھی لکھتا ہے کبھی سوچتا ہے اور دوستوں کے حرف و حکایت سے مطلق خبر نہیں ہوتا"

حدیث میں آتا ہے کہ خط کا جواب دینا ایسا ہی ضروری ہے جیسا السلام علیکم کا جواب دینا۔ سر سید کا اس حدیث پہ پورا پورا عمل تھا۔ مولانا حالی لکھتے ہیں کہ "میرے خط کا جواب مجھے پانی پت میں ہمیشہ تیسرے دن مل جاتا تھا۔ کبھی یاد نہیں کہ جواب چوتھے دن آیا ہو یا بالکل نہ آیا ہو: ہاں جو گمنام لوگ بیہودہ خطوط ان کے نام آیا کرتے تھے ان کا جواب انہوں نے کبھی نہیں دیا۔ اور ان کا جواب ہو بھی کیا سکتا تھا۔ ان کے خطوط میں جو انہوں نے اپنے دوستوں، عزیزوں اور ملنے والوں کو ہزاروں کی تعداد میں لکھے انتہائی خلوص، سچی دوستی، بے غرض محبت اور نہایت درجہ بے تکلفی کے ایسے عجیب عجیب نمونے نظر آتے ہیں کہ ان پہ ہزار صد فصیح و بلیغ مضامین قربان کئے جا سکتے ہیں۔

جس زمانے میں سر سید ولیم میور کی "لائف آف محمدؐ" کا جواب لکھنے کے لئے لندن گئے تو وہاں سے اپنے دوست نواب محسن الملک مولوی سید مہدی علی کو انہوں نے ایک خط لکھا۔ جو خلوص قلب اور سچی محبت و دوستی کا عجیب مرقع ہے۔ ملاحظہ فرمائیے: ۔

مخدوم و مکرم من

السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ۔ عنایت نامہ پہنچا۔ دل کو باغ باغ کیا۔ جس قدر آپ نے مولوی زین العابدین کی محبت کا میری نسبت ذکر کیا ہے وہ در حقیقت بہت کم ہے۔ اُس کا فرمانا کن الفاظ کر جیسا کہ وہ ہے میں ہی خوب جانتا ہوں۔ اب آپ کو میری طبیعت کا حال بخوبی معلوم ہو گیا ہے میں سچی محبت اور دوستی کے آگے رشتے ناطے کی کچھ بھی پروا نہیں کرتا۔ مولوی سمیع اللہ خاں کو میں اپنے چھوٹے حقیقی بھائی سے کم نہیں سمجھتا تھا اور اب بلحاظ ان کی محنت و تندرستی، خوشی ہمارا امداد دینی و دنیوی عیش کے ایسا ہی کہتا ہوں اور ایسا ہی جانتا ہوں۔ آپ یقین کیجئے کہ جس قدر مجھ کو اپنے بھائی کے مرنے کا رنج ہوا تھا اُسی قدر یا اُس کے قریب مولوی سمیع اللہ خاں کی طرف سے جو میرے دل میں رنج و ملال آیا ہے اُس کا مجھ کو رنج ہوا ہے۔ وہ بچے ہیں انہوں نے دنیا نہیں دیکھی۔ دوستی و محبت کے معاملات دینا و سے محض ناواقف ہیں۔ کسی رنڈی پر وہ عاشق نہیں ہوئے۔ کبھی لونڈے پر وہ عاشق نہیں ہوئے۔ ان کو مزہ محبت اور دوستی کا مطلق معلوم نہیں ہے۔ سچ ہے کہ جس نے ایک گھڑی بھی عشق نہیں کیا۔ نہ وہ خدا کی دوستی کا مزہ جانتا ہے نہ انسان کی اور نہ محبت کے لائق ہے۔ اُن کی ناتجربہ کاری ہے جو وہ یہ سمجھتے ہیں کہ میں کسی کے کہنے سننے سے اُن کی طرف سے رنجیدہ ہوا ہوں۔ میں تو اُس شخص کو کافر بے ایمان سمجھتا ہوں جو دوست کی نسبت یہ خیال کرے کہ اس نے خلاف دوستی و محبت کے کوئی بات کی یا کہی۔ میں تو دوست کی گالی دینے اور برا کہنے کو بھی دوستی پہ محمول کرتا ہوں۔ اور در حقیقت دوستی ہی کے سبب سے وہ بات ہوتی ہے۔ مگر جب کہ حقیقت میں خلاف محبت اور دوستی کے کوئی بات ہو تو پھر شیشہ محبت جو نہایت نازک ہے کسی طرح ثابت نہیں رہ سکتا۔ آپ خیال کیجئے کہ محبت اور دوستی ایسی سخت اور مضبوط چیز ہے کہ کسی طرح نہیں ٹوٹ سکتی اور کوئی اُس کو نہیں توڑ سکتا۔ مگر وہ نازک بھی ایسی ہے کہ باریک سے باریک شیشہ اور حباب کو بھی اُس سے نسبت نہیں ہے۔ وہ ہتھوڑوں اور ہزاروں صدموں سے بھی نہیں ٹوٹتی اور ایک ادنیٰ سی خلاف محبت کے بات کہنے سے ٹوٹ جاتی ہے۔ اور جوں جوں محبت زیادہ بڑھتی ہے اس کی نزاکت زیادہ ہوتی جاتی ہے۔ مولوی سمیع اللہ خاں کو اب بھی میں اپنے بھائی سے کم نہیں سمجھتا مگر جو ملال میرے دل میں ہوا وہ اب تک کم نہیں ہوا۔ پھوٹ جاوے وہ آنکھ جو کسی کو دیکھے اس نگاہ سے جو اس کے دل میں نہیں ہے۔ گل جاوے وہ زبان جو وہ کہے جو اُس کے دل میں نہیں ہے۔ ٹوٹ جاوے وہ ہاتھ جو وہ لکھے جو اُس کے

دل میں نہیں ہے۔ والسلام علیکم و علی لدیکم۔

خاکسار تابعدار شائندہ شما سید احمد از مقام لندن - ۲۶ نومبر ۱۸۶۹ء

اسی سلسلہ میں ایک دوسرا خط ملاحظہ فرمائیں جو انہی مولوی مہدی علی کے نام ہے۔ اور سرسید نے روانگی لندن سے قبل لکھا تھا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سرسید کا اپنے خاص دوستوں سے کیا برتاؤ تھا اور وہ ان کو کس قدر احترام سے یاد کرتے تھے۔

"بخدمت شریف خلیفہ ظاہری و مرشد حقیقی و معنوی مولانا مرشدنا مولوی مہدی علی صاحب

مخدوم و مکرم من سلامت

آپ کا عنایت نامہ مورخہ ۲۶ اپریل مع ہنڈی دو سو روپیہ کے پہنچا اور آپ کا شکر کیا اور دعا کی کہ خدا اس کی جزا دے۔ ان دنوں میں کہ طبیعت ایسی رنجیدہ ہے۔ کتاب (خطبات احمدیہ) کے خرچ کے سرانجام ہونے کا دوسرا رنج ہے۔ مجبوری یہاں روپیہ قرض لینا پڑا۔ چنانچہ تین ہزار روپیہ قرض لینے کی گفتگو ہو رہی ہے۔ خدا راست لائے۔ آپ نے تمام دوستوں نے جس قدر مدد کی وہ نہایت ہی عمدہ اور بہت ہی غنیمت تھی۔ ورنہ زہر کھا کر مر جانے کے سوا اور کوئی چارہ نہ ہوتا۔

ایک اخبار خاص مسلمانوں کے فائدے کے لئے جاری کرنا میں نے تجویز کر لیا ہے۔ اور "تہذیب الاخلاق" اس کا نام فارسی میں اور "محمڈن سوشل ریفارمر" انگریزی میں رکھ لیا ہے۔ اس کا سرنامہ بہت خوبصورت یہاں کھدوا لیا ہے۔ کاغذ بھی ایک برس کے لائق یہاں خرید لیا ہے اور یہ سب چیزیں بذریعہ جہاز بادبانی روانہ کر دیں کہ میرے وہاں پہنچنے تک پہنچ جاویں گی۔ خرچ ماہواری اجرائے اس اخبار کا سو روپیہ ہوگا۔ ہم بیس دوست پانچ پانچ روپیہ مہینہ کر کر دیں گے۔ اور اخبار مفت میں بانٹیں گے اور بقیمت بھی بیچیں گے اس اخبار میں بجز اس کے کہ خاص مسلمانوں کی دینی اور دنیاوی بھلائی کے آرٹیکل ہوں گے اور کچھ نہیں ہونے کا۔

۴ ۲ اگست ۱۸۷۰ء کو انشاء اللہ تعالیٰ میں لندن چھوڑوں گا۔ ایک ہفتہ مصر میں رہوں گا۔ اور انشاء اللہ تعالیٰ مع الخیر ۲ اکتوبر ۱۸۷۰ء کو بمبئی میں پہنچوں گا۔ اور چوتھی یا پانچویں کو انشاء اللہ تعالیٰ الہ آباد میں آپ کے جمال مبارک دیکھوں گا۔ امید ہے کہ تم مجھ کو اگر اپنے پاس نہ بیٹھنے دو گے تو اپنی جوتیوں کے پاس بیٹھنے دو گے۔ اگر اپنے ساتھ بٹھلا کر نہ کھانے دو گے تو کتے کی طرح دوسری رکابی میں آ گے رکھ دو گے۔ ورنہ اور لوگ تو مجھ کو کافر کر روٹی پانی دینا ہی کفر سمجھتے ہوں گے۔ ہزار ہزار شکر ہے کہ میرا خدا ایسا نہ ہوا جس کی سند لاکھوں تقصیر کیا کرتا ہوں اور روٹی دیتا ہے۔ اور کیا عجب ہے بقول شخصیکہ قیامت کو بھی اپنی مہربانی سے اپنے دائیں ہاتھ پاس بٹھلا لے۔ لیکن اگر وہ بھی میرے بھائی بندوں یا میرے ہم مذہب مسلمانوں کا سا ہوتا تو ہم کیا کرتا۔ اس وقت تو مولوی مہدی علی صاحب کا سہارا بھی نہ رہتا۔ واہ واہ کیا میری قسمت ہے۔ میرے خدا نے کیا اچھا خدا مجھ کو دیا ہے۔ الحمد للہ علیٰ ذالک

جس قدر میں تمہارے ہاں کے مولویوں سے ناراض ہوں۔ ایسا کسی سے ناراض نہیں۔ زندہ مولویوں اور بالتخصیص واعظوں کا تو جانی دشمن ہوں اور گذشتہ مولویوں میں سے سوائے چند کے رنجیدہ ہوں۔ کسی کو سوائے چند کے لکھنا اور کتاب تصنیف کرنے اور کسی بات کے تحقیق کرنے کا مطلق سلیقہ نہ تھا۔ صرف جنگل میں بھالی اور بیری۔ سوکھی اور گیلی لکڑیاں چننے والے تھے۔ خدا ان پر رحم کرے۔ اور ان کی تقلید کرنے والے اندھوں کو خدا ہدایت کرے۔ اگرچہ تم خفا ہو گے۔ مگر میں سچ کہتا ہوں کہ جس قدر نقصان اسلام کو تقلید نے پہنچایا ہے۔ اتنا کسی چیز نے نہیں پہنچایا۔ شخص اسلام کے حق میں تقلید سنکھیا سے بھی زیادہ زہر قاتل ہے۔ بلاشبہ ہم نے علماء کو مثل یہود و نصاریٰ کے اتخذوا احبارھم ورھبانھم اربابا من دون اللہ سمجھ لیا ہے۔ خدا اس گناہ سے سب مسلمانوں کو بچا دے۔ آمین۔ اور میرے دوستوں کو اور مولوی مہدی علی میرے پیارے دوست کو سب سے پہلے۔ آمین۔ ثم آمین۔ ثم آمین۔

آپ کا تابعدار غلام سید احمد۔ روز جمعہ تاریخ روانگی خط ۲۰ مئی ۱۸۷۰ء

سرسید اپنے نہایت عزیز دوستوں کو جس بے تکلفی سے خط لکھتے تھے ذیل کا مکتوب اُس کا بہترین نمونہ ہے۔ یہ سرسید نے اپنے بے حد گہرے دوست خلیفہ سید زین العابدین کو لکھا تھا۔

مکرمی زین بھیا

ابھی تمہارا خط پہنچا۔ کچھ شبہ نہیں کہ تم کو مجھ سے جدا ہونے کا ایسا ہی رنج ہے جیسا کہ تم نے لکھا۔ مگر تم تو اس رنج کو کسی قدر لکھ بھی سکے مگر مجھ کو تمہارے چلے جانے سے جو رنج ہے وہ لکھا بھی نہیں جا سکتا۔ زبان کھجلاتی ہے اور کوئی یہاں نہیں ہے کہ اُس کو بُرا کہوں۔ دل میں غصہ آتا ہے اور کوئی یہاں نہیں ہے جس پر غصہ اتاروں۔ ہاتھ کھجلاتے ہیں اور کوئی یہاں نہیں جس کو ماروں۔ مکان سُونا نہیں ہوا بلکہ دل سُونا ہو گیا۔ صبح کو ڈھونڈ کر خدا یاد نہیں آتا مگر تم یاد آتے ہو۔ حاصلِ کلام یہ کہ ہرگز فراموشی نہ کرنا۔ حقیقت میں تمہارے جانے سے قبل روانگی پنجاب میری طبیعت درست نہیں تھی۔ پنجاب میں اور زیادہ مضمحل اور عدم مادہ ہوگئی۔ لاہور میں زیادہ ٹھہر نہ سکا اور اضلاع پنجاب میں جہاں جہاں جانا تھا جا نہیں سکا۔ واپس چلا آیا۔ لاہور اور اضلاع لاہور میں جو چندہ ہوا اس کی تعداد قریباً ۱۲ ہزار روپیہ کے ہے۔ تمہارے گھر کا سب طرح خیریت ہے۔ والسلام

خاکسار سید احمد۔ از علی گڑھ۔ ۲۶ / اپریل ۱۸۹۴ء

سرسید اپنے دوستوں کی ملاقات کے کتنے زیادہ متمنی اور شائق رہتے تھے اس کا اندازہ ذیل کے خط سے کیجئے جو انہوں نے اپنے نہایت عزیز دوست شمس العلماء خان بہادر مولانا ذکاء اللہ کو لکھا تھا۔ یہ اور بہت سے دیگر خطوط سرسید کے اپنے ہاتھ سے لکھے مولوی عنایت اللہ مرحوم نے مجھے مرحمت فرمائے تھے۔ میں یہ خط تبرکاً اُسی طرزِ تحریر میں نقل کرتا ہوں جس طرح سرسید نے لکھا تھا۔ ناظرین الکل سے پڑھیں۔ جہاں حروف پر اصل خط میں نقطے نہیں ہیں میں نے بھی نہیں دیئے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ نقل مطابق اصل ہے۔

جناب والا شمس العلماء خان بہادر

واہ جناب واہ اپنے خواجہ وجیہہ الدین سے فرمایا کہ گیارہ بجے کا وقت جو بجٹ میٹنگ کے لیے مقرر کیا ہے اچھا نہیں ہے اگر ایک بجے کا وقت ہوتا تو اچھا تھا مطلب آپ کا یہ تھا کہ آپ نو بجے دلی سے چلتے اور اجلاس میں شریک ہو کر اوسی دن واپس چلے جاتے یہی آپ کا انصاف ہے۔ آپ سے ملاقات نہیں ہوئی۔ برس میں دو اجلاس ہوتے ہیں جن میں آپ سے ملاقات ہونے کی توقع ہوتی ہے اگر برس میں دو دن بھی آپ ملاقات پسند نہیں کرتے تو مجھکو اپنی بدقسمتی پر افسوس ہے آپ ضرور تاریخ اجلاس سے ایک روز پہلے تشریف لاویں گا دوسرے دن اجلاس میں شریک ہو کر تشریف لے جائیں کا ایک دن قبل اجلاس کے بورڈ آف منجمنٹ کا اجلاس ہوگا اور غالباً سید محمود بھی اوس اجلاس میں اور ٹرسٹیوں کے اجلاس میں شریک ہونگے اون سے بھی ملاقات ہو جاویگی پس آپ ضرور ایک روز قبل اجلاس کے تشریف لاویں۔ معلوم نہیں کہ عزیزی عنایت اللہ مدراسی واپس آئے یا نہیں۔ والسلام

خاکسار

سید احمد علیگڑھ ۵ / جولائی ۱۸۹۶ء

مضمون بہت طویل ہو گیا اور ہم نے ابھی تک سرسید کی شخصیت کے متعلق بہت ہی کم بیان کیا ہے۔ گنجائش ہوتی تو ہم سرسید کی محبت و شفقت، زندہ دلی و خوش طبعی، غیر معمولی ذہانت و طباعی، سچائی و راستبازی، ہمت و استقلال، صاف گوئی و دلیری، عزیزوں کے ساتھ مہربانی، دوستوں کے ساتھ برتاؤ، نوکروں کے ساتھ تعلق، سیر چشمی و فراخ حوصلگی، مستحقین کی امداد و دستگیری، وضع داری و رکھ رکھاؤ، جوانمردی و بہادری، فیاضی و دادو دہش، طلب علم کا ذوق و شوق، انتقام و خصومت سے پرہیز، منشیات اور مسکرات سے اجتناب، عالی ظرفی و عالی حوصلگی، عفو و اغماض کی عادت

دلسوزی، بدکلامی و بدلگامی اور ہزل و فحش گوئی سے بالکل علیحدگی اور بے تعصبی و رواداری وغیرہ فضائل کے متعلق بہت سی باتیں تفصیل کے ساتھ بیان کرتے اور دکھاتے کہ یہ شخص گذشتہ انیسویں صدی میں کیسی عجیب و غریب اور عظیم الشان شخصیت کا مالک تھا۔ اور اس کی لائف ہمیں کن اخلاق حسنہ کے قبول کرنے اور اختیار کرنے کی طرف متوجہ کرتی ہے۔ مگر قلتِ گنجائش کے سبب ہم ان تمام ضروری امور کو چھوڑتے ہیں اور آخر مضمون میں تبرک کے طور پر سرسید کا پورا ایک سو برس پہلے کا ایک خط قارئین کرام کی خدمت میں ہدیۃً پیش کرتے ہیں۔ یہ خط آج تک غیر مطبوعہ تھا اور کبھی کسی رسالے، اخبار یا مجموعہ میں آج سے پہلے شائع نہیں ہوا۔ اس خط کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ فارسی میں ہے۔ سرسید کی اردو تحریریں تو سینکڑوں ہزاروں آپ کی نظر سے گذری ہوں گی مگر مرحوم کی فارسی تحریر آج کل کے شاید کم لوگوں نے دیکھی ہو۔ اس خط کی عبارت سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ سرسید کو جیسا عبور اردو پر تھا ایسی ہی قدرت ان کو فارسی زبان کی تحریر میں حاصل تھی۔ جیسی آج کی اردو تحریر سلیس، عام فہم اور دلچسپ ہوتی تھی، وہی بات ان کی فارسی تحریر میں موجود تھی۔ مولوی سید بندہ علی نام ایک صاحب سرسید کے دوست تھے اور عرصہ تک جونپور، شاہجہان آباد، مظفر نگر وغیرہ مقامات پر منصف اور صدر امین رہے تھے۔ یہ خط ان کے نام سرسید نے فروری ۱۸۵۵ء میں اس وقت لکھا تھا جبکہ وہ بجنور (یو۔پی) میں صدر امین تھے۔ اس تمہید کے بعد اب یہ سو برس پہلے کا تبرک ملاحظہ ہو۔

جناب سیدی مشفقی مکرمی سلامت

بعد سلام مسنون الاسلام و اشتیاق ملاقات بہجت آیات التماس اینکہ قبل ازیں عریضہ نیاز بجواب عنایت نامہ عالی فرستادہ بعلم ملاحظہ رسیدہ باشد از قضا و قدر ربانی و تقدیر ازلی و مشیت ایزدی ترقی بندہ بصدر امینی شدہ و بجنور صدر امین شدم این ہمہ فضل و کرم حق تعالیٰ است ورنہ این نالائق ہیچ کارہ محض است۔ فضل و کرم خدا را ملاحظہ فرمایند کہ چگونہ میکند۔ اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْر۔ اگرچہ مفارقت دہلی و احباب آنجا بسیار ناگوار طبع افتاد مگر تن بقضا دردادم۔ آب و ہوائی اینجا نہایت در نہایت خوب و مرغوب است و بجنور اگرچہ قصبہ خورد است اما بسیار خوش و پر بہار۔ سررشتہ اینجا ہم متعلق بصدر امین و قریب ہفتاد و پنج ہزار روپیہ آمدنی دارد۔ و درینجا سوائے مفارقت احباب دیگر ہمہ وجوہ خوش و خرم ہستم۔ اللہ تعالیٰ انجام ہم بخیر کند آمین یا رب العالمین۔ ہنگام روانگی از صدر الصدور صاحب ہم بالکلیہ صفائی شد آنچہ مقتضائے بزرگان نسبت بحال خوردان است بلا واسطہ احدی خود بہ ایں طریقہ پیش آمدند و این امر ہم باعث بسیار خوشنودی شد۔ امید کہ گاہ گاہ از حال مزاج خود مطلع میفرمودہ باشند۔

خاکسار

سید احمد۔ از بجنور

۱۰ فروری ۱۸۵۵ء۔

خان بہادر مولوی بشیر الدّین

احمد الدین مارہروی

مولوی بشیر الدین کی شخصیت ہر اس شخص کے لئے جو ان سے پہلی مرتبہ ملتا' ایک معمّہ بن جاتی تھی۔ چھریرا جسم' چھوٹا قد' نامزاشیدہ داڑھی کبھی الجھی ہوئی کبھی ہوا میں لہراتی ہوئی' گال پر ایک سیاہ مسّہ' بال کبھی باریک ترشے ہوئے' کبھی بہت لمبے' ہڈیاں مضبوط' رفتار اتنی تیز کہ ساتھ چلنا مشکل ہو جائے' کثیف کھدر کا لباس' کرتے کے سب بٹن کھلے ہوتے یا ٹوٹے ہوئے' ایک ہاتھ میں تسبیح' دوسرے میں دلیسی ٹین کا بنا ہوا آلۂ سماعت۔ ایسے تھے وہ مولوی بشیر الدین جن کی شخصیت' علمیت اور صحافت کی ایک دنیا قائل تھی۔

کلکتہ کے مالک التجار مولوی محمد امین جو خود بھی بہت علم دوست تھے ان سے اپنی پہلی ملاقات کا حال اس طرح سنایا کرتے تھے "گھر میں اطلاع کرنے پر مولوی صاحب اس حلیہ سے نکلے کہ جوتا ٹوٹا ہوا تھا' بال بڑھے ہوئے اور داڑھی کھنکھل تھی' سوسی کا ایک پاجامہ اور کرتہ زیب تن تھا' ہاتھ میں حقہ تھا جس کو انہوں نے لاکر ایک کرسی پر رکھ دیا اور خود پھرتی سے اندر چلے گئے' پھر پانوں کی تھالی لئے ہوئے آئے اور پان میرے ہاتھ میں دے کر نہایت اطمینان سے حقہ گڑگڑانے لگے۔ نہ بات نہ چیت' میں سمجھا کوئی منہ چڑھا نوکر ہے۔ مجھے اس کی بدتمیزی پر بہت غصہ آیا اور جھنجھلا کر کہا جاؤ مولوی صاحب کو بلاؤ۔ اس کے جواب میں انہوں نے بڑی زور سے "ایں" کہا تو میں سمجھا کہ غریب حضرت بہرے بھی ہیں اس لئے کان کے قریب منہ کرکے کہا کہ جاؤ اور مولوی بشیر الدین کو بھیج دو۔ کہنا محمد امین تاجر آئے ہیں۔ یہ سن کر زور کا ایک قہقہہ لگایا' مجھ سے لپٹ گئے' بہت زور سے ہاتھ ملایا اور کہنے لگے محمد بشیر الدین میں ہی ہوں۔ میں نے حیرت سے ان کی طرف دیکھا اور اب بھی شاید یقین نہ آتا اگر وہ نہایت بے تکلفی سے میرے ذاتی معاملات اور دوستوں کے متعلق دریافت نہ کرنے لگتے۔"

ظفر عمر (مصنف نیلی چھتری) اپنا ایک واقعہ سناتے تھے کہ "جب میں بورڈنگ ہاؤس میں داخل ہوا تو چونکہ باہر جانے کی اجازت نہ تھی اس لئے لڑکے بیروں سے چیزیں منگوایا کرتے تھے۔ مولوی صاحب کو دیکھ کر میں نے سمجھا کہ یہ بھی ملازم ہیں اور ان سے سگریٹ لانے کے لئے کہا۔ جب ثقل سماعت کی وجہ سے سن نہ سکے تو میں نے دو پیسے ان کے ہاتھ پر رکھ کر سگریٹ کا اشارہ کیا جس کے جواب میں اس زور کا تھپڑ رسید کیا کہ چودہ طبق روشن ہو گئے' بھونچکا رہ گیا۔ مولوی صاحب نے فوراً سپرنٹنڈنٹ کو بلا کر حکم دیا کہ یہ لڑکا سگریٹ پینے کا عادی ہے اب اسے

ہرگز سگرٹ نہ پینے دینا۔ تب معلوم ہوا کہ یہی وہ مولوی بشیر الدین ہیں جن کی وجہ سے مجھے اسکول میں داخل کیا گیا ہے۔" کہنے لگے " مولوی صاحب کے بظاہر کمزور جسم میں بڑی جان تھی اور وہ طمانچہ مجھے آج تک یاد ہے۔"

مولوی صاحب کے مزاج میں لاپرواہی کا مادّہ بدرجۂ اتم تھا یہی وجہ تھی کہ اکثر ان کی داڑھی الجھی ہوئی اور کپڑے کثیف رہتے تھے۔ ۱۹۰۳ء میں دہلی دربار کے ساتھ محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس بھی تھا۔ سب لوگ نہایت بیش قیمت اور پُرتکلف لباس پہن کر باہر نکلتے لیکن مولوی صاحب حسب عادت اسی ہیئت کذائی سے گھومتے پھرتے تھے۔ جس روز ان کو تقریر کرنی تھی تو چلتے وقت مائی لارڈ نثار حسین نے ان کی داڑھی میں کچھ دھاگے الجھے ہوئے دیکھ کر کہا کہ "بھائی جہاں آپ اور قومی کاموں کے واسطے چندہ کرتے ہیں وہاں مولوی صاحب کی داڑھی کے واسطے ایک کنگھے کا بھی بندوبست کر دیں۔" ہنس کر کہنے لگے "مگر پھر آپ کو ایک ملازم بھی رکھنا پڑے گا، کیونکہ آپ جانتے ہیں کہ مجھے کنگھا کرنے کی فرصت ہی نہیں ملتی۔"

واقعہ بھی یہی ہے کہ وہ ہر وقت کسی نہ کسی مسئلہ میں ایسے الجھے رہتے کہ ان فروعات کی طرف غور کرنے کی مہلت ہی نہ ملتی تھی۔ ایک ہمہ اوہر سو ادا کی مثل ان پر پوری طرح صادق آتی تھی۔ یوں تو ہر وقت ہی ان کے پیشِ نظر بہت سے کام رہتے تھے لیکن جب ذہن ایک طرف مائل ہو جاتا تو اٹھتے بیٹھتے سوتے جاگتے وہی ایک خیال پیشِ نظر رہا کرتا تھا۔

ایک مرتبہ لفظ نیشن (NATION) کے معنوں پر بحث ہو گئی۔ میں نے کہا کہ عربی میں "قوم" کا جو مفہوم ہے وہ نیشن کے لفظ سے ظاہر نہیں ہوتا بلکہ اس کے دوسرے معنی ہوتے ہیں۔ کہنے لگے لائبریری چلو ——— مختلف کتابیں نکلوائیں، تمام ڈکشنریاں دیکھیں، لغات میں قوم کے معنی تلاش کئے۔ غرض سارا دن اسی بحث میں ختم ہو گیا۔ وہ تو اطمینان سے بیٹھے حقہ پیتے رہے اور یہاں اتفنیں قل ہو اللہ پڑھتی رہیں۔ میں اس زمانہ میں بورڈنگ ہاؤس میں رہا کرتا تھا۔ رات کو دو بجے دروازہ کھٹکھٹانے کی آواز آئی دیکھا تو مولوی صاحب کھڑے ہیں۔ آتے ہی کہنے لگے "تمہارے پاس مولوی عبدالحق کی ڈکشنری ہے۔ دیکھو تو نیشن کے معنی انہوں نے کیا لکھے ہیں، اسے تو دیکھنا بھول ہی گئے تھے۔" معنی دیکھے گئے اور پھر جو بحث کا آغاز ہوا تو صبح ہو گئی اور اگلے روز "البشیر" میں قوم اور نیشن کے مفہوم پر ایک ایک نہایت محققانہ مضمون شائع ہو گیا۔

انہماک کی یہ عادت بعض اوقات خود فراموشی کی حد تک پہنچ جاتی تھی۔ ایک مرتبہ علی گڑھ جا رہے تھے راستے میں کسی علم دوست غیر ملکی کا ساتھ ہو گیا، ٹرکی اور افغانستان کے مسائل زیرِ بحث آ گئے۔ انہیں پتہ بھی نہ چلا کہ کب علی گڑھ آیا اور گزر گیا۔ جب گاڑی دہلی پہنچ کر ختم ہو گئی تو معلوم ہوا کہ علی گڑھ تقریباً سو میل پیچھے رہ گیا ہے اور اب دوسری گاڑی سے واپس جانا ہو گا۔

جس زمانہ میں اسکول ہال کی عمارت بن رہی تھی ان کے ہاں مولوی محمد حسین شوق مہمان تھے۔ کھانے کا وقت آیا تو مولوی صاحب ہاتھ دھو کر دسترخوان پر بیٹھے مگر فوراً ہی یہ کہہ کر کہ آپ شروع کیجئے میں ابھی آتا ہوں، کسی طرف چلے گئے۔ دو گھنٹے گزر گئے، کھانا ٹھنڈا ہو گیا، شوق صاحب نے یا دلِ ناخواستہ کچھ کھایا کچھ نہ کھایا، سونے کو لیٹے تو نیند نہ آئی باہر نکل آئے، دیکھا کہ اسکول کی عمارت کے سامنے دھوپ میں ٹہل رہے ہیں۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ دیواروں پر نقوش بنانے کا مسئلہ زیرِ غور ہے اور اپنی دانست میں سمجھ رہے ہیں کہ کھانا کھا کر آئے ہیں۔ چنانچہ اس کے بعد شام تک کھانا نہیں کھایا۔

کھانے کے بارے میں ان کی یہ لاپرواہی آخر تک قائم رہی۔ شاذ و نادر ہی کبھی خود دسترخوان طلب کرتے تھے بلکہ بعض اوقات جب کہا جاتا کہ کھانا تیار ہے تو چونک سے پڑتے تھے۔ اچھا کھانا کھا کر خوش ضرور ہوتے تھے، لیکن دسترخوان پر جو کچھ ہوتا وہ بے چون و چرا کھا لیتے۔ کہتے تھے مجھے جب تک بتایا نہ جائے پتہ ہی نہیں چلتا کہ کیا کھا رہا ہوں۔ مسائل ہی ایسے پیچیدہ سامنے آ جاتے ہیں کہ اس طرف خیال کرنے کا موقع ہی نہیں ملتا لیکن چائے کے معاملہ میں حالت بالکل جداگانہ تھی۔ اس کے لئے نہ کوئی وقت مقرر تھا نہ مقدار۔ جب جی چاہتا پیتے اور جتنی چاہتے پیتے۔ آخر میں بہت کم کر دی تھی مگر پھر بھی کئی پیالیوں کا اوسط ہو جاتا تھا۔

باوجود اس انہماک کے وضعداری کا بہت پاس تھا۔ جب کہیں جاتے تو تمام رشتہ داروں سے ضرور ملتے، ان کی اور سارے خاندان کی خیریت دریافت کرتے۔ اگر کوئی مر جاتا تو اس کی تعزیت کرنا اور بچہ پیدا ہوا ہو تو اسے دیکھ کر پیار کرنا ضروری سمجھتے تھے۔ دید و ادید میں بعض اوقات کئی دن لگ جاتے اور استطاعت سے زیادہ روپیہ صرف ہو جاتا تو حتی الوسع پیدل گھومتے تھے، اس کے بعد دوستوں اور ملاقاتیوں کا نمبر آتا جن کی تعداد کسی زمانہ میں بھی کم نہیں رہی۔ جس مقام پر کوئی عزیز بھی ہوتا اور دوست بھی، تو ٹھہرتے ہمیشہ عزیز کے ہاں اور رہتے دوست کے ساتھ۔ بعض اوقات اس عزیز اور دوست میں باہم رنجش ہوتی اور ایک دوسرے کی مذمت کرتا تو وہ دونوں کو باہم شیر و شکر کرنے کی کوشش کرتے اور اگر اس میں کامیابی نہ ہوتی تو کہتے کہ تمہاری رنجشیں اپنی جگہ پر اور میرے تعلقات اپنی جگہ پر۔

کانگریسی دوستوں کے ساتھ، مسلم لیگ اور سرکار پرست لیڈروں کے ساتھ ان کے تعلقات یکساں خوشگوار اور استوار رہتے۔ اصولی اختلافات کو کبھی ذاتی دوستی میں حارج نہ ہونے دیتے۔ بلکہ جو لوگ اپنے عقائد میں پختہ ہوتے ان کی دل سے عزت کرتے تھے، زمانہ ساز لیڈروں سے البتہ سخت متنفر رہتے اور کہتے تھے کہ "یہ لوگ لیڈر نہیں گیدڑ ہیں، نہ ان میں کیریکٹر ہے نہ قوت کہ حالات کا مقابلہ کریں اور نہ اتنی جرأت ہے کہ شکست کو شکست سمجھ کر تسلیم کریں۔ یہ قوم فروش بھی ہیں اور خود فروش بھی۔"

مولوی صاحب کی خانگی زندگی بھی عجیب مجموعہ اضداد تھی، ان کو اپنے اہل و عیال سے بے انتہا محبت تھی لیکن قومی کاموں کے سامنے اکثر گھر کی ضروریات کو بھول جاتے تھے اور بادی النظر میں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ انہیں بیوی بچوں سے کوئی دلچسپی نہیں لیکن امر واقعہ یہ ہے کہ وہ صرف اپنے بچوں پر ہی نہیں بلکہ اولاد کی اولاد پر بھی پوری نظر رکھتے تھے، نام خود ہی تجویز کرتے، کپڑوں کا انتظام بھی اپنی ہی زیر نگرانی کرتے اور اگر کوئی بچہ بیمار ہو جاتا تو اس کے معالجہ میں پورے انہماک سے کام لیتے تھے۔ مولوی صاحب کے دو لڑکے اور چار لڑکیاں تھیں اور سب کا نام بشیر پر تھا۔ انہوں نے ان سب کو اعلیٰ تعلیم دلائی، لڑکیوں کو امور خانہ داری سکھائے اور لڑکوں کو علی گڑھ کالج بھیجا۔ لیکن جدید فیشن کی ہوا بھی نہ لگنے دی۔ لڑکے علی گڑھ کالج کے مغربی ماحول میں رہتے اور دیسی کپڑے پہنتے تھے جس سے دیکھنے والوں کو حیرت ہوتی تھی، لڑکیوں کو بھی معمولی کپڑے پہناتے اور زیور کے استعمال کی اجازت نہ دیتے تھے، جب ان کی شادی ہوتی تو اس بات کا خاص خیال رکھا کہ جہیز میں کوئی ولائتی چیز یا کپڑا نہ دیا جائے۔

ان کی زندگی کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ ساری اولاد ان کی زندگی ہی میں داغ مفارقت دے گئی اور وہ بھی نیا و مافیہا میں عالم شباب میں، مولوی صاحب ان تمام حادثات کو انتہائی صبر و سکون سے برداشت کرتے رہے۔ آخر میں بڑے صاحبزادے بشیر احمد مرحوم کے انتقال پر جب میں نے تعزیت کی تو کہنے لگے "یہ سب دراصل عمر کے ٹیکس ہیں جو مجھے ادا کرنے پڑ رہے ہیں، لیکن انسان کو اپنی عمر پر بھی تو اختیار نہیں۔"

مولوی صاحب کو اپنی تمام اولاد میں بشیر پاشا سے بہت محبت تھی۔ جب انہوں نے بی۔ اے پاس کر لیا تو ان کو بی۔ ٹی کرا کے اسکول میں سیکنڈ ماسٹر مقرر کر دیا۔ اس سلسلہ میں یہ بتا دینا بھی ضروری ہے کہ مولوی صاحب اقربا پروری یا کنبہ پروری سے بالاتر تھے، اپنے رشتہ داروں کو اسکول اور بورڈنگ ہاؤس میں جگہ تو دیتے مگر ان پر کڑی نگرانی رکھتے اور سب سے زیادہ کام لیتے تھے تاکہ وہ آزمودہ اور پختہ کار ہو کر اعلیٰ مدارج حاصل کر سکیں۔ جس زمانہ میں معاندین نے ان کے خلاف الزام تراشی کی مہم تیز کر رکھی تھی تو سررشتہ تعلیمات سے اس امر کی بھی شکایت کی گئی۔ جواب طلبی ہوئی تو مولوی صاحب نے لکھا کہ "جس تنخواہ پر میرے اعزا کام کر رہے ہیں اگر اس مشاہرہ پر اسی قابلیت کے استاد آپ مجھے دلا سکیں تو میں آج ہی سابقہ خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے آپ کے حکم سے ان کو برخاست کر دوں گا۔ یوں بھی آپ دیکھ سکتے ہیں کہ اسکول میں سب سے زیادہ کارگزار یہی استاد ہیں۔" یہ دندان شکن جواب سن کر محکمہ کو بھی خاموش ہو جانا پڑا اور مخالفین کو بھی سانپ سونگھ گیا۔

مولوی صاحب کا خیال تھا کہ بشیر پاشا کو اپنا جانشین بنائیں اور مرتے وقت البشیر اور اسکول کو ان کے سپرد کر جائیں لیکن افسوس کہ بیٹا زندگی

پوری نہ ہوسکی اور وہ ۱۹۲۳ء میں ایک جانکاہ حادثہ کا شکار ہو کر ہمیشہ کے لیے داغ مفارقت دے گئے۔ کہتے تھے اس واقعہ نے میری کمر ہمت توڑ دی اور اگر میرے سامنے قومی کام نہ ہوتے تو میں اس صدمہ سے ہرگز جانبر نہ ہو سکتا۔ پھر یہ شعر پڑھا کرتے ؎

تاب لاتے ہی بنے گی غالبؔ
واقعہ سخت ہے اور جان عزیز

——— کبھی دوسرے مصرعہ میں یوں ترمیم کر دیتے :۔

واقعہ سخت ہے اور عمر طویل

بہت کم لوگوں کو علم ہے کہ مولوی صاحب کی ایک پارٹی بھی تھی جس کا نام "جہل مرکب" تھا وہ خود اس کے صدر تھے اور ممبران میں صاحبزادہ آفتاب احمد خان (وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ) ڈاکٹر سر ضیاء الدین (وائس چانسلر علی گڑھ) حبیب اللہ خان (بانی آفتاب ہال) محمد حسین شوق، نثار حسین، مولوی طفیل احمد (مصنف "مسلمانوں کا روشن مستقبل")، خان بہادر جعفر حسین، میر ولایت حسین اور نظامی بدایونی (اڈیٹر ذوالقرنین) وغیرہ شامل تھے۔ اٹاوہ کالج کے ہسٹری میوزیم میں ایک تصویر آویزاں ہے جس کے وسط میں مولوی صاحب اپنی مخصوص وضع میں بیٹھے ہیں اور ان کے گرد عمائدین علیگڑھ کا یہ گروپ ہے، کپڑے کی ایک پٹی پر نہایت نستعلیق الفاظ میں جہل مرکب لکھا ہوا ہے جو ہر دیکھنے والے کی حیرت کا باعث ہوتا ہے اور اسے سمجھانا پڑتا ہے کہ یہ دراصل قومی دیوانوں کی ایک جماعت تھی جو اپنی ذات کو فراموش کر چکے تھے اور ہمیشہ قومی مسائل کو حل کرنے کی فکر میں سرگرداں رہتے تھے یہ لوگ ایک دوسرے کو مائی لارڈ کہہ کر مخاطب کرتے تھے اور اکثر ان میں سے دو بھی ایک جگہ مل جاتے تو پھر ان کی گفتگو سننے سے تعلق رکھتی تھی۔ یہ تصویر علی گڑھ یونیورسٹی میں جوبلی کے موقع پر لی گئی تھی اور آج ایک تاریخی حیثیت رکھتی ہے۔ مائی لارڈس کا یہ علم دوست گروپ آج ہم میں موجود نہیں۔ سب ایک ایک کر کے اللہ کو پیارے ہو گئے۔ اس محفل کی آخری شمع مولوی بشیر الدین صاحب کی ذات تھی جو پورے سو برس فروزاں رہنے کے بعد ۱۲ / جون ۱۹۵۶ء کو خاموش ہو گئی۔

———

امیر مینائی

اسمٰعیل احمد مینائی

کہا جاتا ہے کہ زندگی پر نام اور تخلص کا اثر پڑتا ہے مگر امیر مینائی کے یہاں معاملہ بالکل برعکس تھا۔ ماں باپ نے امیر احمد نام رکھا، خود انہوں نے امیر تخلص اختیار کیا۔

نام کا نام تخلص کا تخلص ہے امیر   یہ عجیب حسنِ خداداد مرے نام میں ہے

لیکن عمر بھر فقیری و فقیر منشی میں گزری اور گزاری۔

ابھی نوجوان ہی تھے کہ حضرت میاں امیر شاہؒ سے بیعت کر لی اور ان کی نظر کیمیا اثر کے فیض نے سلوک کو جذب میں تبدیل کر دیا۔ اس بیعت کا واقعہ خاصا دلچسپ ہے، خاندانی تعلق کے باعث امیر مینائیؒ درگاہ حضرت شاہ مینائیؒ میں روز بلکہ دن میں کئی کئی بار حاضری دیا کرتے تھے۔ وہاں متعدد اکابر مشائخینِ وقت سے ملنے جلنے کا موقع ملتا تھا اور امیر مینائیؒ کی سعادت مندی کو دیکھ کر ان میں سے اکثر نے اس کی کوشش کی کہ وہ ان کے حلقہ بگوشوں میں شامل ہو جائیں مگر امیر مینائیؒ کو حضرت مخدوم صاحب کی جانب سے پہلے ہی بشارت دی جا چکی تھی کہ تمہیں اس شکل و صورت اور وضع قطع کے شیخ سے وابستہ ہونا ہے۔ ہر بزرگ میں ان نشانیوں کو تلاش کرتے ان کو ایک مدت ہو گئی، بعض صوفیاء کے حال نے ان کو اپنی جانب کھینچا بھی، مگر مخدوم صاحب کا تصرف باطنی ہر بار آڑے آیا۔ ایک روز مابین عصر و مغرب امیر مینائیؒ حسبِ معمول مزارِ مبارک پر حاضر ہوئے تو دیکھا کہ ایک بزرگ منہ لپیٹے مزارِ مبارک کی جالی سے لگے بیٹھے ہیں ——— ان کو خلوت مطلوب تھی، چندے انتظار کیا کہ یہ فارغ ہو لیں تو خود بیٹھیں، مگر وہ بزرگ نہ آج اٹھتے ہیں نہ کل ——— یہ ادائے نماز کے لئے باہر والی مسجد میں چلے گئے ——— وہاں سے نبٹ کر لوٹے تو دیکھا کہ وہ حضرت بدستور جمے ہوئے ہیں، ان کا معمول تھا کہ مزار مبارک کے داہنی جانب سرہانے سے متصل بیٹھ کر پڑھتے تھے، اُس جگہ پر وہ بزرگ ڈٹے بیٹھے تھے۔ غرض ان کو بڑی الجھن ہوئی، پہلو بدل بدل کے کچھ دیر گزاری بالآخر مغرب کا وقت آگیا تو یہ پھر مسجد چلے گئے، وہاں سے جب فراغت پا کے آئے تو دیکھا کہ وہ صاحب اپنی جگہ سے ہلے تک نہیں ہیں، اب تو ان سے نہ رہا گیا، پاس جا کے کہا کہ حضرت کیا نماز مغرب کے لئے بھی مسجد نہ جایئے گا۔ انہوں نے منہ کھول کر ایک نظر امیر مینائیؒ کو سر سے پاؤں تک بغور دیکھا اور فرمایا "میاں امیر! اب بھی نہیں پہچانا"۔ یہ الفاظ سُن کر ان کا عجب حال ہو گیا۔ اب جو غور کر کے دیکھتے ہیں تو وہی شکل و صورت، وہی حلیہ، جو خواب میں ان کو دکھایا جا چکا تھا ——— بس پھر کیا تھا، بیتاب

رہ بیقرار ہوکے قدموں سے لپٹ گئے۔ انہوں نے اُٹھا کر سینے سے لگا لیا، ہم آغوش ہونا تھا کہ دنیا بدل گئی، تقریباً دو برس اسی استغراق اور جذب کے عالم میں گذرے، کسی شے کی فکر نہ تھی، دن رات حضرت مخدوم صاحب کا آستانہ تھا یا میاں امیر شاہؒ آئے ہوئے ہوں تو اُن کی قیام گاہ، لکھنا پڑھنا، شعر شاعری، مجلس محفل، سب ترک، سب سے بے نیاز، یہ عالم کہ چار چار روز گھر کی صورت نہ دیکھتے تھے۔ والدہ اِن کی اُس وقت حیات تھیں، سب سے چھوٹے اور چہیتے فرزند تھے، ماں نے باپ کے گذرنے کے بعد اِن کی ہوش مندی قابلیت اور شہرت دیکھ کر اِن کی ذات سے بڑی بڑی اُمیدیں وابستہ کر رکھی تھیں، جوانی میں یہ عالم اُن سے نہ دیکھا گیا، پہلے حضرت مخدوم صاحب کی درگاہ پر حاضر ہوکے دعا کی، پھر میاں امیر شاہؒ کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور عرض کی کہ "حضور میرے امیر کو مجھے واپس دیجئے"۔ میاں صاحب متبسم ہوکر خاموش ہو گئے، تھوڑی دیر بعد جب امیر مینائی درگاہ شریف کا چکر لگا کے پہنچے، تو شفقت سے اپنے قریب بلایا اور اپنی ٹوپی جو بوقت بیعت ان کے سر پر رکھ دی تھی وہ بہ سہولت اُتار لی، پھر کیا تھا جیسے کسی دیوانے کو ہوش آگیا ہو یا کسی کی سوتے سے آنکھ کھل گئی ہو، جذب و مستی سب رفو چکر ہوگئے، اور سخت بیقراری کا عالم طاری ہو گیا، اس بیقراری کو دیکھ کر مرشد نے فرمایا "میاں امیر ماں کی دلجوئی کو مرشد کی اطاعت پر ترجیح ہے۔ جس لطف سے تم اِس وقت محروم کر دیئے گئے ہو، انشاء اللہ اخیر عمر میں یہ لطف پھر تم کو نصیب ہوگا —— اور تم دکن میں رہو گے" —— یہ ہزار تڑپے پھڑکے، مگر میاں صاحب نے ایک نہ سنی اور ماں کے پاس جانے کا حکم دے کر خود گھر کی راہ لی ——

ثاقب کانپوری، جامع مکاتیب امیر مینائیؒ نے لکھا ہے کہ حضرت ایک "عالم نور" تھے۔ راقم الحروف نے اُن کو نہیں دیکھا مگر اُن کے فرزندوں اور شاگردوں کے علاوہ اغیار نے بھی یہی بیان کیا ہے کہ امیر مینائیؒ کی ذات بڑی پاکیزہ و دلکش تھی چہرے پر ایک معصومیت ایک محویت کے آثار کا ہلکا سا پردہ پڑا رہتا تھا جو ہر دیکھنے والے اور ملنے والے کو بے اختیار رجھا لیتا تھا۔

سنہ ۱۲۴۴ھ میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے، والد کا نام کرم محمد مینائی تھا۔ مینائی سے مراد حضرت شاہ مینائیؒ کی نسبت ہے۔ جن کی درگاہ لکھنؤ میں آج بھی مرجع خاص و عام ہے۔

ہر کہ خواہد چشم را بینا کند   سُرمۂ خاکِ درِ مینا کند

لکھنؤ ہی میں ہر فن کے اساتذۂ وقت سے علوم کی تعلیم حاصل کی، طب کی تکمیل کی، اور عنفوانِ شباب ہی میں اپنی میانہ روی اپنی لیاقت و سعادت اپنی طباعی و ذکاوت، کے باعث فرنگی محل اور خانوادۂ اجتہاد، ہر دو میں یکساں مقبول و محترم ہوئے، جلد ہی دربار شاہی میں رسائی ہو گئی، پہلے شاہزادہ نادر مرزا کی اتالیقی سپرد ہوئی پھر منصب افتا پر فائز ہوئے واجد علی شاہی مٹی اور غدر ہوا، تو چندے کاکوری میں قیام کیا، جہاں حضرت محسنؒ سے یکجائی ہوئی اور نعت گوئی کا چسکا پڑا جو اخیر عمر تک توشۂ آخرت بنا رہا، پھر لکھیم پور کان پور، بہار، کے چکر لگا کے بالآخر اپنے والد کے شاگرد عزیز، یوسف علی خاں والیٔ ریاست رام پور کے ایما و اصرار پر، اپنے مرشد کے وطن ریاست رام پور میں آکے رہ بسے یہیں وحید الزمان خان شہر کی کلکٹری کی اور وجیہہ الزمان خان سفیر ریاست، کی بھتیجی سے شادی ہوئی اور یہیں پہلے مفتی عدالت و اُستاد شاہ، پھر اُستاد شاہ و مقرب خاص، اور اخیر میں صدر نشین مجلس تدوین امیر اللغات رہے، اور یہیں سے بظاہر امیر اللغات کو پورا کرنے کی لگن کے بہانے موت (۷۲) سال کی ضعیف العمری میں، اِن کو کھینچ کر بماہ اگست سنہ ۱۹۰۰ء حیدرآباد دکن لے گئی اور وہیں سپرد خاک کر دیا، جہاں وہ درگاہ یوسف صاحب شریف صاحبؒ کے احاطے میں قیامت کی نیند سو رہے ہیں، تعویذ پر سامنے انہی کے شاگرد جلیل کا قطعۂ تاریخ مرقوم ہے۔

امیر کشور معنے امیر مینائی   خدا کے عاشق صادق دو نبی کے فقیر
گئے جو خلد بریں کو تو اُن کی تربت پر   لکھا جلیل نے یہ روضۂ جناب امیر

اور پشت پر خود ان کی لاثانی بیت، جلی حروف میں کندہ، دل رکھنے والے زائرین کو بے اختیار کھینچ لیتی ہے۔

اس مزار پہ احباب فاتحہ پڑھ لیں
پھر اس قدر بھی ہمارا نشاں رہے نہ رہے

مولوی شبیر حسن مرحوم نے مجھ سے بیان کیا تھا کہ میں جب حیدر آباد پہلی بار گیا تو داغ و امیر کے مزاروں پر فاتحہ خوانی کی نیت سے درگاہ شریف پہنچا، خاص درگاہ میں جا کے قبروں کی تلاش کی تو داغ کا مزار قبۂ مبارکہ کے سامنے ہی مل گیا، سوچا کہ فاتحہ پڑھ لوں پھر خیال آیا کہ امیر کا مزار بھی کہیں پاس ہی ہوگا، پہلے اس کی تلاش کر لوں پھر فاتحہ پڑھ لوں گا، قریب میں تلاش کرنے پر کہیں امیر کی قبر نہ ملی تو جو بندہ یا بندہ آگے بڑھ گیا، راہ میں ایک آنے والے نے رہبری کی کہ میاں امیر مینائی کی قبر تو درگاہ آنے کے رستے میں ہے واپس جاؤ —— میں واپس ہوا اور شہر خموشاں میں پہنچ کے تلاش شروع کی، جب امیر مینائی کی قبر سامنے آئی تو سب سے پہلے اسی بیت پر نظر پڑی اور میں نے بے اختیار سبحان اللہ کہہ کر فاتحہ پڑھ لی پھر داغ کے مزار پر جا کے فرض سے سبکدوش ہوا۔

فی الحقیقت یہ درویشی، خیر منشی، اور حُبِ رسول کا مسلک، امیر مینائی کے محیطِ وجود کا مرکز تھا جس پہلو کو ان کی شخصیت کے جانچا جائے اس کی تہ میں یہی عناصر کار فرما ملیں گے —— نوجوانی کا حال بسلسلۂ تذکرۂ بیعت آپ سن چکے، نواب کلب علی خاں سے خفا ہو کے جب دو سالی کو لکھنؤ چلے گئے تھے اپنے ایک عزیز کے ایماء پر بسلسلۂ کار براری، ایک بار لفٹنٹ گورنر سے ملنے گئے۔ دفتر گورنری کے احاطے ہی میں عدالت کا دفتر تھا، ان کی پالکی داخل ہو رہی تھی کہ احاطۂ عدالت میں ہرکارے نے آواز لگائی "گیا دین حاضر ہے" —— یہ فوراً واپس ہو گئے، اور ان عزیز نے جب نتیجۂ سعی کے بارے میں دریافت کیا تو کہہ دیا کہ میاں یہ آوازِ سروش غیبی تھی، جس مرحلے میں گیا دین، اس میں میرا کہاں گزر، یہ مشرب و مسلک ان کا کاروبار یا معاش کے معاملات ہی میں نہیں، ہر رنگ میں تھا، ایک بار کسی گلدستہ میں داغ کی غزل شائع ہوئی۔

بتانِ ماہ وش اجڑی ہوئی منزل میں رہتے ہیں
یہ جس کی جان لیتے ہیں اسی کے دل میں رہتے ہیں

بیٹے اور شاگرد سر ہو گئے کہ حضرت اس زمین میں غزل ہونی چاہئے، حضرت تھے کہ برابر ٹالتے رہے جب اصرار حد سے بڑھ گیا تو فرمایا کہ میاں جلیل —— مجھے دنیا داغ کا ہمعصر سمجھتی ہے ان کی غزل پر غزل کہی جائے تو بہتر ہو ورنہ کم از کم اس معیار کی تو ہو، یہاں حالت یہ ہے کہ داغ نے غزل نہیں کہی ہے قلم توڑ دیئے ہیں، غزل تو غزل، ایک شعر کا جواب ہونا مشکل ہے —— میں اس زمین میں شعر کہہ کر داغ کی توہین کرنا نہیں چاہتا —— یہ تو ایک واقعہ تھا جو شاید دو چار حضرات ہی کو معلوم ہوا انہوں نے اس کے بعد کمال فراخ دلی سے یہ مقطع بھی لکھا۔

امیرؔ اچھی غزل ہے داغ کی جس کا یہ مصرع ہے
بھنویں تنتی ہیں، خنجر ہاتھ میں ہے تن کے بیٹھے ہیں

بعض رسائل میں کبھی کبھی ان کے خلاف مضامین شائع ہوتے تھے یا چند حضرات بے جا اعتراضات ان کے کلام پر وارد کرتے تھے، تو عمر اور جوشیلے شاگرد اس پر سخت برہم ہوتے اور جواب لکھنے کی تیاریاں زور شور سے شروع ہوتیں مگر خود ان کو جب اطلاع ہو جاتی، یہ شعر پڑھ کر ہر ایک کو روک دیتے۔

ہر کہ او در راہِ ما خارے نہد از دشمنی
ہر گلے کز باغِ عمرش بشگفد بے خار باد

داغ جب دوسری بار حیدر آباد دکن جانے لگے تو امیر سے ملنے رام پور آئے، جلال کو خبر پہنچی تو وہ بھی لکھنؤ سے آگئے امیر ہی کے یہاں ٹھہرے روانگی سے پہلے شام کو ایک مختصر سی صحبتِ شعر و سخن منعقد ہوئی، جلال کے بعد داغ نے غزل شروع کی۔ رسوائی کا شیدائی کا —— جب یہ مصرعہ پڑھا ؎ ہو گیا پرتوِ رُخ حُسن سے کچھ اور ہی رنگ —— تو جلال نے جھوم کر کہا واہ نواب مرزا خاں واہ کیا مصرعہ کہا ہے ——

؎ ہو گیا پرتوِ رخ حُسن سے کچھ اور ہی رنگ —— پھر ارشاد ہو، واللہ اعجاز ہے اعجاز —— تعریف نہیں ہو سکتی ——

داغ ایک لمحے کے لئے دم بخود ہو گئے ——— جلال نے کبھی اُن کے اچھے سے اچھے شعر کی اتنی تعریف نہیں کی تھی۔ بھلے بلا کے طباع اور ذہین آدمی، پر تو دے حسن کے نقص کو فوراً پا گئے مگر جلدی میں اُس کو دور کرنے کا پہلو نہ سوجھا ——— امیر مینائی نے کسی تامل کے بغیر مصرعہ دہرایا۔

ہو گیا پر تو رخسار سے کچھ اور ہی رنگ

ہاں میاں نواب مرزا ——— پھر تو پڑھنا ——— داغ نے اُن کو متشکر نظروں سے دیکھ کر شعر پڑھ دیا۔

ہو گیا پرتو رخسار سے کچھ اور ہی رنگ
میں نے منہ چوم لیا تیرے تماشائی کا

تو شرافت اور پاکیزہ نفسی کا یہ رنگ اُن کی طبیعت کا سب سے نمایاں پہلو تھا اور یہ تمام تر اُسی فقیر منشی اور حبِ رسول کا فیضان تھا۔

میاں جی، تیس سال سے اُوپر اِن کے خدمت گار خاص رہے، کھانا کھاتے میں چھتری ہلانا، سواری پر ساتھ جانا، وضو کرانا، بیماری آزاری میں پاؤں دبانا چپی کرنا، غرض ہر طرح سے خدمت کی۔

جیسے آقا تھے ویسے ہی نوکر ——— صوم و صلوٰۃ کے پابند، فجر کی نماز کے بعد امیر مینائی رح باہر آتے تو سبقت کرکے میاں جی سے پہلے اُن کو سلام کرتے، میاں جی شرمندہ ہو کے چپ ہو جاتے اور دل میں سوچتے کہ انشاء اللہ کل میں، میاں کو پہلے سلام کروں گا۔ تیس برس اِسی حسرت میں گزر گئے، امیر مینائی دکن جاکے پیوندِ خاک بھی ہو گئے مگر میاں جی کو سلام میں سبقت کرنے کا موقعہ نہ دیا ———

دوپہر کا کھانا بیوی خود کھلاتی تھیں، سامنے بیٹھ کے مکھیاں جھلتی جاتیں، یہ کھانا کھاتے جاتے، ماما گرم گرم پھلکے باورچی خانے سے لاکے دیتی جاتی ——— تین چار پھلکے ——— اِس سے زیادہ اِن کی غذا نہ تھی، ایک روز صرف ایک پھلکا کھاکے اُٹھ گئے ——— بیوی نے پوچھا کیا بات ہے کہا کچھ طبیعت مائل نہیں ہے، سیلابچی آفتابہ، ہمیشہ کی طرح پاس رکھا تھا، یہ اُٹھنے لگے تو ٹھوکر لگی آفتابہ اُلٹ گیا۔ یہ بڑھ کر باورچی خانے کے متصل غسل خانہ تھا اُس میں ہاتھ دھونے چلے گئے، بیوی ماما کو آواز دے کر پانی صاف کرانے لگیں، انہوں نے چپکے سے پکانے والی کو آواز دی، وہ آئی تو کہا ——— کھانے میں نمک زہر ہے زہر، جلدی سے پانی ملا دے، اگر تیری بیوی کو خبر ہو گئی تو تیری اپنی جان ایک کر دیں گی" ———

اُن کی تمام زندگی درویشانہ اور فقیرانہ گزری، اور اِس کا اثر اُن کے پاس رہنے والوں اور بیٹھنے اُٹھنے والوں سب پر کم و بیش پڑا، اُن کے فیض صحبت سے سب سے زیادہ مستفید حضرت جلیل ہوئے اور جن لوگوں نے حضرت جلیل کی ایک جھلک بھی دیکھی تھی وہ قسم کھا سکتے ہیں کہ جلیل ایک فرشتہ صورت و سیرت بزرگ تھے ———

خود نواب کلب علی خان، خلد آشیاں کی ذات پر اُن کی شخصیت کا خاصا اثر پڑا ریاستوں اور رجواڑوں میں والیانِ تخت و تاج، کہاں شرع و آئین کی پابندی کرتے ہیں مگر امیر مینائی رح کے فیض صحبت سے خلد آشیاں کی زندگی میں شرع و آئین کی پابندی کرنے کا میلان واضح طور پر جھلکتا ہے، حرم صرف ایک بیوی پر مشتمل تھا، اُس زمانے کو دیکھتے ہوئے صرف یہی ایک امر خلد آشیاں کی صالحیت و صلاحیت کی مستحکم دلیل ہے اور ایسا صرف دو حضرات کے اثر سے تھا، امیر مینائی رح اور مولانا ارشاد حسین علیہ الرحمتہ، جن سے خلد آشیاں بیعت بھی تھے ——— صوم و صلوٰۃ کے سختی سے پابند تھے، پہلے پہلے تو مسجد میں جاکر با جماعت نماز ادا کرتے تھے پھر محل ہی کے اندر ادا کرنے لگے، اور آخر میں پاؤں کے عارضے کے باعث اکثر پلنگڑی پر بیٹھے بیٹھے پڑھتے تھے۔

چھپا کے حق کلوں سے سلوک کرنا درویش صفت اغنیا کی خاص پہچان ہے، خلد آشیاں کا نامۂ اعمال اِس بارے میں بھی بڑا درخشاں ہے اور یہاں بھی امیر مینائی کے ہاتھ کا عکس صاف جھلکتا ہے، حضرت اُن کے استاد ہی نہیں مشیر و مقرب خاص تھے، اور گو اُن کی افتاد مزاج بالعموم منکسرانہ و مصالحانہ تھی، اور مولانا عبدالحق رح کی طرح شمشیر برہنہ کبھی نہ تھے، تاہم حق گوئی کا محل آجائے تو پھر چوکنے یا طرح دے جانے کی خو اُن کی بھی نہ تھی، خلد آشیاں کے بعد جب عرش آشیاں بھی جلد ہی اللہ کو پیارے ہو گئے۔ اور نواب حامد علی خاں کی کم سنی کے باعث ریجنسی کا دور دورہ ہوا

پھر بھی انگریزیت کا سیلاب بلا سے آیا، تو امیر اللغات پر بھی آفت آئی، اِن کی جلد بافت محض متورّہ گئی۔ اور لیے دفتر اس قدر گھٹا دی گئی کہ مؤلفین
کو معاوضہ دینا تو درکنار، دفتر کے عمّال جیسے خدمتگار، کاتب مصحح وغیرہ کی تنخواہیں تک ادا نہیں ہو سکتی تھیں۔ پہلے انہوں نے جنرل اعظم الدین خاں کو
سمجھانے بجھانے کی کوشش کی، وہ اپنی ذات سے اچھے افسر تھے مگر چونکہ طبیعت پر مغربیت کا بشدت غلبہ تھا اس لئے امیر اللغات کے معاملے
کو کسی طرح دل پر نہ لیا ـــــ انہوں نے مجبور ہو کے باوصف پیرانہ سالی و عوارض، بہار و بنگال کا ایک سفر اختیار کیا۔ پٹنے میں مہدی حسن خاں شاداب
کے پاس ٹھہرے اور انہی کے توسط سے عمائدین بہار تک اپنی آواز پہنچائی مگر نہ وہاں دال گلی، نہ ڈھاکے یا مرشد آباد میں، اور واقعہ بھی یہ ہے
کہ اِن میں سے کسی کی اتنی ہمت اور استطاعت تھی جو اتنے بڑے کام کا مالی بار اٹھاتا ـــــ ناکام ہو کے یہ رام پور لوٹ آئے ـــــ اور
گو اس پیرانہ سالی میں حیدر آباد جانا نہیں چاہتے تھے مگر امیر اللغات کی لگن نے ایسا کرنے پر بھی آمادہ کر دیا۔ اسی اثنا میں جنرل اعظم الدین خاں
مار ڈالے گئے اور نواب حامد علی خاں با اختیار رئیس بن گئے۔ اُن کو کسی طرح سے اس کی خبر مل گئی کہ حضرت حیدر آباد جانے کی تیاری کر رہے ہیں
اور اُن سے اجازت لے کر جانا چاہتے ہیں۔ علم دوستی و معارف پروری کی خفتہ صلاحیتیں اُن میں ہنوز کا حقہٗ بیدار نہیں ہوئی تھیں جو بعد
کو اُن کی حیاتِ رائیگاں کا روشن پہلو بنیں ـــــ کچھ یہ بھی تھا کہ ریاست کی مالی حالت اُس وقت اچھی نہ تھی، غرض نہ دفتر امیر اللغات کی سرپرستی
کرنے پر راضی ہوئے نہ امیر مینائی رح کو جانے کی اجازت دی، امیر مینائی رح چاہتے تھے کہ کسی طرح خود اس موضوع پر ایک بار اُن سے گفتگو کریں
اور وہ ٹالتے تھے ـــــ آخرکار ایک دن انہوں نے پکڑ ہی لیا، انہوں نے صبر و سکون اور شائستگی سے اِن کی گفتگو سنی اور قائل ہو گئے ـــــ مگر
شرط یہ کی کہ "میں ابھی سیاحتِ عالم پر جا رہا ہوں وہاں سے واپس آ جاؤں تو آپ جائیے" ـــــ انہوں نے دریافت کیا کہ "آپ کی عدم موجودگی
میں انتظام کس کے سپرد رہے گا، ریجنسی کونسل کے یا کوئی سربراہ کار ہو گا" ـــــ غرض اِن کی یہ تھی کہ شاید امیر اللغات کے لئے کوئی ہمدرد
پیدا ہو جائے، حامد علی خاں یہ سمجھے کہ یہ انتظام مملکت کے نقطۂ نظر سے دریافت کر رہے ہیں، انہوں نے کہا "حضرت آپ تردد نہ کریں، میں نے
سب انتظام کر دیا ہے، نظم و نسق خوش اسلوبی سے چلے گا ـــــ حضرت نے جواب دیا کہ "نواب صاحب آپ کی موجودگی ہی میں کیا خاک انتظام
تھا جو اب آپ کی غیر موجودگی میں بہتر ہو گا" ـــــ حامد علی خاں اُٹھنے لگے تھے یہ سن کر پھر بیٹھ گئے، اِن کا ہاتھ پکڑ لیا اور کہا "حضرت لگو بچو
کرنے والے اور سرکار کے اقبال سے سب ٹھیک رہے گا" کہنے والے تو ہزاروں ہیں مگر یہ بات کہنے والا آپ کے سوا کوئی نہیں، پہلے ہی میں
اس کا روادار نہ تھا کہ آپ یہاں سے جائیں۔ اب تو کسی طرح آپ کو جانے نہ دوں گا بلکہ میرے واپس آنے پر امیر اللغات کے لئے کوئی مناسب
انتظام یہیں کر دیا جائے گا" ـــــ اس ایک واقعے سے اُن کی صاف گوئی کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے، کتنا نازک وقت تھا، امیر اللغات کی ناؤ
ڈگمگا رہی تھی، والیِ ریاست نہ اِن کی جانب ملتفت تھا نہ اِن کے کام کی جانب، بظاہر مصلحت اندیشی، تملّق کی خواستگار تھی، مگر انہوں نے سچی
بات کہنے میں کوئی تامّل نہیں کیا ـــــ

تعلّی ایک ایسی شاعرانہ کوتاہی ہے جو اُردو فارسی کے کم و بیش ہر شاعر کے کلام میں پائی جاتی ہے، امیر مینائی کے کلام اور اُن کے کیف
حیات میں مگر اس "جمالِ سرگرانی" کے بڑے نادر و دلپذیر نمونے ملتے ہیں، مرزا محمد تقی ہوس لکھنوی کی بیاضِ شاعری کا ایک بڑا مشہور ہے"
جناب امیرؑ کی منقبت میں اِن کا ایک قصیدہ، خلد آشیاں نے اُن سے پاس اور سے سُنا اور بہت پسند کیا اور جو مصرع ہوا اجتماع
ہوتا تھا اس میں بار بار مزے لے لے کر اس کی بندشیں دہرائیں، اور بالآخر یہاں تک کہہ دیا کہ "اب منقبت میں ایسا قصیدہ کہنا" اور اس زمین
میں کسی کے بس کی بات نہیں" امیر مینائی رح کو خدا جانے کس وجہ سے یہ بات بہت شاق گزری اور دوسری شام کو جب سب جمع ہو گئے تو عرض
کیا کہ ایک نیا قصیدہ لکھا ہے پیش کرنا چاہتا ہوں، خلد آشیاں نے پوچھا کہ قصیدے کا موضوع کیا ہے۔ کہا منقبت جناب امیرؑ ـــــ اور
زمین وہی ہے جو مرزا محمد تقی ہوس کے قصیدے کی ہے۔ خلد آشیاں اور سارے حاضرین ہمہ تن گوش ہو کے سنبھل بیٹھے۔ انہوں نے قصیدہ پڑھنا شروع کیا۔

کیونکر نہ کروں ملکِ معانی کو میں تسخیر — خامہ ہے مرا دست ید اللہ کی شمشیر
آئے جو تعلّی پہ مری ہمتِ عالی — دشوار نہیں قلعۂ افلاک کی تسخیر
سرکشش مری نرمی سے کبھی بڑھ نہیں سکتے — لہرآب کی شعلے کے لئے بنتی ہے زنجیر
انصاف کی چھوٹے دم انشا نہ رعایت — پروا نہ کروں میں قلم شمع سے تحریر
دل صاف زباں صاف سخن صاف ہے میرا — موتی کی لڑی ہے کہ مسلسل مری تقریر
طائر اُتر آتے ہیں ٹھہر جاتی ہیں نہریں — جادو صفت ہے وہ مرے سخن میں تاثیر
عکس آئینے میں میرے اشارے سے ہے گویا — لب میرے جو ہلتے ہیں تو بول اٹھتی ہے تصویر
خضر رہ باطن ہے مری فضلت ظاہر — یوسف کی زیارت ہے مرے خواب کی تعبیر
جو بات مرے منہ سے نکل جائے وہی ہو — گویا ہوں زبانِ قلم کاتبِ تقدیر
سُن سُن کے مجھے گرم طبیعت ہوئے شاعر — ذرّوں نے جو پائی ہے تو خورشید سے تنویر
کہتا ہوں وہ سُنتا ہوں جو استادِ ازل سے — ہوں صورتِ طوطی پسِ آئینۂ تقدیر
وہ خسروِ اقلیم سخن ہوں کہ جہاں میں — شہرہ ہے مرا علم کے مانند جہانگیر
تھے قبضۂ خسروِ میں معانی کے جو کشور — سب میں نے کئے تیغ زباں کھینچ کے تسخیر
جب مصحفی و میر بے تہنیت آئے — تھوڑی سی زمیں دی انہیں اس ملک میں جاگیر
بیچارہ ہوس کیا ہے کہے گا جو قصیدہ — ایسے تو بہت ہیں مرے گلشن میں عصافیر
البتہ مقابل ہیں مرے عرفی و فیضی — پر فرق ہے اتنا میں جواں طبع ہوں وہ پیر
لطفِ سخن تازہ کہاں اُن کے سخن میں — کہنہ ہوں دوائیں تو بدل جاتی ہے تاثیر
رو کیں جو خلائق نہ رُکے میری طبیعت — پڑتی ہے بھلا پائے گُہر میں کوئی زنجیر
پیدا جو ہُوا بعد میں سبحان کے تو کیا ہے — تقدیم کی مانع نہیں کچھ لفظ کی تاخیر

اس شعر پر خلد آشیان نے ہاتھ پکڑ لیا اور کہا "حضرت جب میں نے دعویٰ کیا تھا کہ منقبت میں اب ایسا قصیدہ کہنا اور اسی زمین میں، کسی کے بس کی بات نہیں، تو آپ کو مستثنےٰ کر دیا تھا ——— آپ تو سب کچھ کہہ سکتے ہیں"۔———

ایک مرتبہ خلد آشیان نے طرحی مشاعرہ کیا ——— دنیائے حسن و عشق کو رنج و محن ہوا، امیر مینائی نے جو غزل کہی تھی وہ مشاعرے سے پہلے خلد آشیان کے ایما پر ان کو سُنائی، اُن کو پسند نہ آئی تو کہا کہ "حضرت معلوم ہوتا ہے اس غزل کے لکھنے میں آپ کا جی نہیں لگا"——— مشاعرے میں تقریباً مہینہ بھر باقی تھا، حضرت نے روزانہ ایک غزل اسی زمین میں کہہ کر نواب صاحب کو سُنانے کا معمول کر لیا، اکیسویں روز جب یہ مطلع پڑھا۔

جس غنچۂ لب کو چھیڑ دیا خندہ زن ہوا — جس گُل پہ ہم نے رنگ جمایا، چمن ہوا

تو خلد آشیان نے کہا "حضرت ہم غریبوں کے لئے بھی تو کچھ کہنے کو چھوڑ دیجئے" حضرت مسکرائے اور سلسلہ ترک کر دیا، مگر بعد کو ریاض کے استفسار پر کہا کہ ——— "بھئی اگر نواب نہ روک دیتے تو مشاعرے کے روز تک اسی طرح غزلیں کہتا رہتا"۔———

[illegible] جتنا فن کے قدر دان تھے، جو ہر کمال رکھتے تھے جس فن کو لیا پانی کر دیا، اس عہد میں شعر کہنا شرفا کا شعار اور وقار تھا۔

آنہوں نے بھی اِس کو اختیار کیا اور ایمان کی بات یہ ہے کہ اپنے معاصرین میں سے کسی سے دب کے نہ رہے۔ داغ کی شعلہ بیانی مسلّم، جلال کی تحقیق و تلاش سر آنکھوں پر، مگر امیر مینائی رح نہ شعلہ بیانی میں کسی سے کمتر نہ تحقیق و تلاش میں کسی کے دبیل، اور پھر جس صنفِ سخن کو چھوا، اپنے عہد کے اعتبار سے اُسی کو ممتاز و منفرد کر دیا۔ ان کے سے قصائد نہ داغ کے دیوان میں ملتے ہیں نہ جلال کے کلیات میں، اور نعت گوئی کا امتیاز اِس کے ماسوا ——— ہے کوئی ان کا سا کامیاب و مقبول قادر الکلام اُن کے عہد میں ——— جلال و داغ کے لئے صرف اُن کی شاعری اُن کی ناموری کا سرمایہ تھی، امیر مینائی رح سے شاعری کا طرۂ امتیاز چھین لیا جائے تو بھی وہ نامور رہیں گے۔

اُن کے مذاق و استعداد مکتوب نگاری سے اُن کے دو فاضل شاگردوں، ثاقب گوالیاری اور رازا میٹھوی کی سعادت مندانہ ریاضت و محنت کے طفیل، اہلِ ذوق اچھی طرح واقف ہو چکے ہیں۔ مگر یہ کم لوگوں کو معلوم ہے کہ سرزمین لکھنؤ کا یہ نامور سپوت گردونِ تذکرہ نویسی کا بھی ایک تابناک ستارہ ہے، اور جیسے میر تقی میر کا تذکرۂ نکات الشعراء فارسی زبان میں اُردو شعراء کے متعلق پہلی مستند تصنیف ہے امیر مینائی رح کا تذکرۂ انتخاب یادگار غالباً بزبان اُردو، شعراء کا ایسا پہلا تذکرہ ہے جس کو مشاہیر اردو شعراء کے منجملہ ایک فرد فرید نے خود مرتب کیا ہو۔ اس تذکرے کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اِس میں عربی، فارسی، اُردو اور بھاشا، چاروں زبانوں کے سخنوروں کا حال درج ہے

آنہوں نے بماہ اکتوبر ۱۹۰۰ء (۷۳) سال کی عمر میں وفات پائی اس طرح سن کے لحاظ سے وہ عمرِ طبعی کو پہنچ کر مرے، مگر دکن پہنچتے ہی بیمار ہو جانے اور پھر باوجود ہزار علاج ایک مہینے میں وفات پا جانے سے اُن کے انتقال کے بارے میں بہت سے لوگ آج تک خلجان میں مبتلا ہیں۔

یہ خلجان بے جا ہے اور اُن کی موت اُن کی عمر کی طرح بالکل طبعی تھی بایں ہمہ بعض مسائل اور ضرورتوں کے اعتبار سے اُن کی جگہ آج تک خالی ہے، اُردو زبان و ادب کے سدا بہار چمن میں، جہاں لالہ و گل کی رنگینیاں اور طوطیٔ و بلبل کی زمزمہ آفرینیاں دھیمی نہیں پڑتیں، گلچیں و صیاد تو بہت سے آتے جاتے رہے، والا نظر باغبانوں کا مگر ہمیشہ توڑا رہا ہے، چمن سے آسودگیٔ گوش و نظر آسان ہے، لیکن چمن کی آبیاری آسان نہیں، چمن کو سینچنے کے لئے خونِ دل صرف کرنا پڑتا ہے اس لئے جو فکر و شعور، علم و فضل کی کسوٹی پر زرِ کامل عیار نہ نکلیں اُن کی کاوش سے شجرِ اُردو کا پروان چڑھنا معلوم ———

امیر مینائی رح اپنے عہد کے افاضل میں تھے، زبان دانی اُن کی میراث تھی، علم و فضل اُن کا سرمایہ، اور ان دونوں کے امتزاجِ صحیح نے اُن کی پاکیزہ ہستی میں زبانِ اُردو کی لغت تیار کرنے کے لئے سب سے موزوں اور سنجیدہ محقق کو پالیا تھا۔ متقدین کا لفظ میں نے بالقصد استعمال کیا ہے، امیر مینائی رح نے امیر اللغات میں اُردو کے تمام اساتذہ کے کلام سے سند میں شعر دیئے، مگر اپنا ایک شعر بھی پیش نہیں کیا، حضرت اکبر الہٰ آبادی نے اُن سے ایک بار دریافت کیا کہ "منشی صاحب، جب آپ نے داغ و جلال، منیر و تسلیم کے اشعار سے سند لی ہے تو اپنے اشعار سے استناد میں کیا قباحت تھی، اُستادی اور استناد میں تو آپ کا پلہ ان سب پر بھاری ہے، حضرت نے فرمایا کہ "ایسا کرنے میں کبر کا پہلو پیدا ہوتا تھا، اور میری اپنی دانست میں یہ بات تقاضائے دیانت کے بھی خلاف تھی کہ میں خود ہی ایک لفظ کے معنی و محلِ استعمال کی صراحت کروں اور خود اپنے ہی شعر یا مصرعے سے اس کا ثبوت بہم پہنچاؤں" ———

مجھ سا ہیچ مرز ہیچمدان، پھر اُن کی اولاد، قدرتی طور پر مجھ کو یہ بات کہتے ہوئے تامل ہوتا ہے، لیکن دیانت کے ساتھ جو رائے قائم ہو اس کو بیباکی سے بیان نہ کرنا بھی حق گوئی کی توہین ہے، میری دانست میں اُن کے بعد سے اب تک، لغاتِ اُردو کو اُن سے اچھا کیا اُن سا یگانہ مصر بھی، لغت کے کام کے لئے نہیں ملا اور یہی باعث ہے کہ میں اُن کی وفات اُن کے سن، دونوں کو طبعی مانتے ہوئے فطری ہی نہیں اپنے نقطۂ نظر سے بھی، اب تک اُن کا ماتم گسار ہوں، لغت کے شعبے میں اُردو زبان، فرہنگ آصفیہ، نور اللغات، اور انجمن ترقی اُردو کی ڈکشنری کی موجودگی کے باعث تہی دامن نہیں، مگر اُن کی کم مائیگی میں کسی صاحب نظر کو کلام ہو سکتا ہے، اگرچہ جو آدھی صدی میں اُردو زبان و ادب کا دامن مختلف

اور لائق مشاہیر کے گل ہائے وجود سے مالامال رہا ہے، محقق، شاعر، ادیب، سبھی اِس آسمان پر جلوہ گر ہوئے، شبلی، نذیر احمد، نظم طباطبائی جیسے اہلِ علم و تحقیق، حالی، اکبر، اقبال، چکبست، اصغر، فانی، ریاض، جگر، جلیل، سیماب سے خوش بیان شعرا، آزاد، مہدی الافادی، رشید، عبدالماجد، سلیمان ندوی، نیاز فتحپوری، ابوالاعلیٰ مودودی جیسے ادیب، کون سی زبان اور کون سا ادب ہے جو ان پر فخر نہ کرے، اور پھر ان سب کے اوپر ہیں لیکن اُردو کی خدمت کی لگن میں سب سے اوّل بابائے اُردو مولوی عبدالحق انجمن ترقی اُردو —— جن کے بارِ کرم و احسان سے اُردو سر نہیں اُٹھا سکتی —— مگر اِن میں سے کس نے تالیفِ لغت اُردو کے سنگِ گران کو چھونے کی جرأت کی، فی الحقیقت لغت کے کام کو سمیٹنے کے لئے بڑا دل گردہ چاہئے، کوہ وقار عزم و استقلال، بحر آشام جذبۂ تحقیق و تجسس، بے پناہ تبحرِ علمی، بالغ نظر، صائب فکر

یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے لغت داں

امیر مینائی رحمۃ میں یہ خصوصیات بڑی حد تک یکجا تھیں، اُردو، فارسی، عربی، بھاشا، سنسکرت، ان زبانوں کے وہ عالم تھے، نجوم رمل اور جفر —— عروض، موسیقی —— فقہ و قانون کے وہ ماہر تھے، رمز الغیب و رموز غیبیہ اُنہی کی تصانیف ہیں، ست سیئہ بہاری کی شرح کے مصنف وہی ہیں اور واجد علی شاہ کی تصنیف نغمۂ قدسی پر شرح صوت المبارک کے نام سے حواشی اُنہی کے لکھے ہوئے ہیں، فلسفہ، حکمت، طب، اِن علوم کی اُنہوں نے تکمیل کی تھی، تفسیر حدیث اور تصوّف کے بحر ذخار میں اُن کا مقام شناوری مسلم ہے، اُن کے بعد اُن جیسا جامع کمالات مشاہیر اُردو کی صف میں ڈھونڈے نہیں ملتا، اِس لحاظ سے اُردو کے بھی خواہ اُن کی وفات کو بے وقت کہیں تو بے جا نہیں، امیر اللغات کا جس قدر کام انہوں نے پورا کر لیا تھا اُس میں سے صرف ایک جزو دو جلدوں کی شکل میں شائع ہوا ہے مگر ع

قیاس کن زگلستان من بہار مرا

اہلِ نظر اُس سے مؤلف و مصنف کے مرتبہ و مقام کو پہچان سکتے ہیں۔ امیر اللغات کے بعد سے کوئی لغت اُس پیمانے اور اُس معیار کا ابتک تیار نہ ہو سکا، اور سچ پوچھئے تو یہ کام اکیلے شخص کے بس کا ہے بھی نہیں، خود امیر مینائی رح کے زمانے میں باقاعدہ طور پر دفتر امیر اللغات قائم تھا اور ایک ادارے کی صورت میں وہاں کام ہوتا تھا، آہ، راز، جلیل، شوق قدوائی، یہ تو مشہور نام ہیں ان کے سوا بھی ایک خاصہ بڑا عملہ اس ہی کام کرتا تھا۔ پھر بھی نہ کام کی مقدار حسب دلخواہ ہوئی نہ کام کا معیار، بس امیر مینائی رح کی تنہا ذات تھی جس کے تبحرِ علمی اور پاکیزہ نفسی کے بل بوتے پر اور سچی بات یہ ہے کہ ریاست رام کی معارف پروری سے یہ ناؤ اتنی مدت تک چلی، خلد آشیاں کے مرتے ہی ڈگمگانے لگی اور امیر مینائی رح کے پردہ کرتے ہی ڈوب گئی ع

"خوش درخشید و لے شعلۂ مستعجل بود"

میرے سامنے یہی امیر اللغات اُن کا سب سے بڑا کارنامہ ہے، جس کی آب و تاب کو ناتمامی کا داغ اور نصف صدی کی ترقیاں بھی ماند نہیں کر سکیں۔ اِسی سلسلہ میں نے اُس کے بیان کو اُن کے تذکرے میں زیادہ جگہ دی ہے۔

مولانا محمد اسمٰعیل میرٹھی

مولوی محمد اسلم سیفی

مولانا اسمٰعیل میرٹھی کا زمانۂ حیات ۱۲ نومبر ۱۸۴۴ء تا یکم نومبر ۱۹۱۷ء تھا۔ عمر عیسوی حساب سے ۷۳ اور ہجری حساب سے ۷۵ سال ہوئی۔
ان کی پیدائش شہر میرٹھ میں ہوئی جہاں ان کے والد نے جولائی ۱۸۳۶ء میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ یہ محلہ مشائخاں کہلاتا تھا۔ اب اس کا نام اسمٰعیل
نگر ہے۔ یہ نام کی تبدیلی شہری بورڈ کی طرف سے عمل میں آئی ہے۔

جب مولانا کا خاندان قصبہ لاوڑ سے یہاں آکر آباد ہوا تو میرٹھ کی آبادی آج کل کے مقابلہ میں ایک چوتھائی تھی۔ اکثر عزیز اور اقارب اور اہل برادری
اسی محلہ میں سکونت رکھتے تھے۔ ایک اوسط درجہ کا خاندان تھا جس کے پاس کچھ زمینداری بھی تھی۔ اس زمانہ کے لوگ جب کہ انگریزوں کے تسلط کو ۸۷ سال
گزر چکے تھے خاموش زندگی کے عادی تھے۔ پرانے دستور کے مطابق ابتدائی تعلیم مکاتب میں ہوا کرتی تھی۔ اسمٰعیل کے بڑے بھائی تو ایک ریاست کے
منیجر تھے اور منجھلے درس و تدریس کا شغل رکھتے تھے۔ ابتدائی کتابیں ان سے پڑھ کر مرزا رحیم بیگ کے مکتب میں جا داخل ہوئے۔ ان کے والد بہت
خاموش اور کم آمیز بزرگ تھے اور اپنے تئیں شہری ماحول میں اجنبی تصور کرتے تھے —— بچپن کے ماحول کا اور اس وقت کی زندگی کا کچھ
پتہ نہیں لگا۔ عادتاً اسمٰعیل کی یہ مخصوص صفت دیکھنے میں آئی ہے کہ جو کام کرتے تھے اس پر کامل توجہ دیتے تھے۔ چنانچہ فن خطاطی ایک استاد
کامل سے سیکھا اور خود بھی اس میں کمال حاصل کیا۔ مرزا رحیم بیگ فارسی کے مشہور استادوں میں شمار ہوتے تھے۔ مولانا کو بھی فارسی زبان میں دلچسپی
انہی کی صحبت میں حاصل ہوئی۔ ان کے فارسی کلام کی خوبی ان نظموں سے ظاہر ہوتی ہے جو کلیات اسماعیل میں درج ہیں۔ مثلاً مثنوی دو دیدا آخر اور
بہت سی فارسی نظمیں جن میں غزلیں قصائد اور قطعات ہیں۔

۱۰ مئی ۱۸۵۷ء کو ناگہاں غدر کا واقعہ پیش آیا۔ اس کی ابتدا میرٹھ ہی سے ہوئی۔ اس وقت اسماعیل کی عمر ۱۳ سال تھی۔ اس ہنگامہ کی اہمیت کو کچھ
کچھ سمجھ سکتے تھے۔ برسوں اس کے اثرات کا تذکرہ زبان زد خاص و عام رہا۔ اسی زمانہ میں نارمل اسکول میرٹھ میں قائم کیا گیا تھا۔ اس میں پرائیویٹ طالب علم
بن کر ایک سال تعلیم پائی۔ چند شفیق اساتذہ سے مستفید ہوئے۔ خاص کر علم ہندسہ کے استاد سے۔

جو حالت میں نے مشاہدہ کی اس وقت مولانا کی عمر ۴۴ سال کی تھی۔ ایک نہایت متین اور خاموش بزرگ شخص معلوم ہوتے تھے۔ مگر [illegible]
کتنا ہی بچے شور و غل مچائیں، خواہ عزیز یا اقارب مرد اور عورتیں جمع ہو جائیں اور [illegible] بلند آوازی سے بات چیت ہوتی ہو مگر وہ [illegible]

ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر کچھ سوچتے رہتے۔ یہی حال آگرے کے قیام میں ۱۸۸۱ء سے دسمبر ۱۸۹۹ء تک مشاہدہ میں آئی۔ عام طور سے ملاقات کے شائق نہ تھے۔ کسی موقع پر ملاقات ہو جائے تو ہو جائے۔ کبھی مشاعرہ میں شرکت نہیں کرتے تھے۔ اس بارہ سال کے زمانے میں اور اس کے بعد کا زمانہ ۱۰ سال کا زمانہ پنشن کے بعد کا میرٹھ میں گزرا وہ زندگی بھی نہایت خاموش تھی۔ جب لوگ ان کو کسی پبلک میٹنگ کی شرکت کے واسطے دعوت دیتے مثلاً فیض عام اسکول کے واسطے کوشش یا اور طریقے کی شرکت تو وہ شرکت فرما لیتے۔ مگر جو کام کرتے نہایت اخلاص کے ساتھ کرتے۔ شہرت اور ناموری کے پاس نہیں جاتے تھے۔ آثارِ سلف اس قدر بلند پایہ نظم ہے مگر وہ لکھ کر بھی ان کے بستے کی زینت رہی۔ یہ وہی نظم ہے کہ جس کے شائع ہونے پر سینکڑوں خطوط اطرافِ ہند سے ان کے نام آگرے کے قیام میں آئے تھے۔

کچھ رسالے فارسی زبان کے مدارس کے طلبہ کے واسطے لکھے تھے۔ ایک سرکاری اشتہار کی تعمیل میں ایک اخلاقی قصہ طلسم اخلاق کے نام سے لکھ کر پیش کیا۔ اس پر دو سو روپیہ انعام ملا۔ اُن کا ایک خاص طرزِ تحریر ہے کہ مضمون نثر میں کچھ اشعار بھی حسب موقع لکھ دیتے ہیں۔ یہ بات اور تحریروں میں بھی پائی جاتی ہے۔ ذاتی اخلاق ایسا تھا کہ جو ملتا تھا وہ گرویدہ ہو جاتا تھا۔ ملنے والوں کا یہ حال تھا کہ ان سے جاہ و مرتبہ، دولت و ثروت میں کتنے ہی بلند پایہ کیوں نہ ہوں ان کے ساتھ ادب سے پیش آتے تھے۔ ان کے شاگردوں کا حال تو یہ ہوتا تھا کہ پروانوں کی طرح ان کی خدمت پر دوڑتے تھے۔ میں نے ایک بار دیکھا کہ جب وہ ہیڈ ماسٹر صاحب کے کمرے میں داخل ہوئے تو یک بیک ہیڈ ماسٹر صاحب کھڑے ہو گئے اور جب تک مولانا نے بات چیت کی (حالانکہ وہ بہت مختصر تھی) ہیڈ ماسٹر صاحب کھڑے ہی رہے۔ یہ ایک ہیڈ ماسٹر ترقی کر کے انسپکٹر آف اسکولز ہو گئے اور میرٹھ ہی آگئے۔ اکثر ملنے کے واسطے آتے تھے۔ اور اصنافِ نظم پر اُن سے مشورہ لیا کرتے تھے۔

میرے دیکھنے میں کبھی یہ بات نہیں آئی کہ انہوں نے کسی سے جھگڑا اٹھایا ہو۔ ایک بار ان کے آگرے کے ایک ہم عصر پنڈت ہنس دھر کے لڑکے نے ان پر اس بات کا دعویٰ کر دیا کہ ان کی مشہور اردو زبان کی کتابوں کے حق تصنیف میں پنڈت جی بھی شریک تھے اور یہ مقدمہ میرٹھ کی عدالت میں ہوا۔ بالآخر فیصلہ مولانا کے حق میں ہوا۔ اگرچہ وہ بڑے نقاد تھے مگر مضمون نویسی پسند نہیں کرتے تھے کہ جس کی بنا پر بحث کا سلسلہ شروع ہو جائے۔

میں سمجھتا ہوں کہ ان کی زندگی پر سب سے بڑا اثر ان کے پیر و مرشد مولانا غوث علی شاہ قلندر قادری قدس سرہ العزیز کی ذات بابرکات تھی۔ ۱۸۶۷ء یا ۱۸۶۸ء میں وہ ملاقات سے مشرف ہوئے اور دس سال تک مستفید ہوتے رہے۔ شیخ کے اشارہ پر ۴۰ رباعیاں لکھیں۔ شیخ کے وصال پر ترکیب بند اردو میں اور مثنوی دو بیا غز فارسی میں لکھی۔ چند اور فارسی کے قطعے بھی اسی سلسلہ میں لکھے۔ شیخ کے وصال کے بعد جب تذکرۂ غوثیہ کی تدوین کا خیال مولانا شاہ گل حسین رحمتہ اللہ علیہ کو ہوا تو اس کتاب کو جامۂ زبان پہنایا۔ یہ ان کی نثر کا پہلا اور نہایت دل فریب نمونہ ہے۔

غزل گوئی میں پند و حکمت و فلسفہ کے مضامین کو زیادہ پسند کرتے تھے۔ یہی امتیاز ان کی نظموں میں نمایاں ہے۔ وہ قوم کی پست حالت دیکھ کر بہت متاثر تھے۔ اپنی نظموں میں جا بجا یہ مضمون بہت زور شور کے ساتھ لاتے ہیں۔ سرسید کے ہم نوا تھے ایک نظم جس کی سرخی سرسید ہے ۱۸۹۰ء میں لکھی اور دوسری بانگِ درا اور تیسری مسلمان اور انگریزی تعلیم ہے۔ یہ سب نظمیں کلیات میں ہیں۔ مولانا کی زندگی پر تصوف کا رنگ آخر وقت تک غالب رہا۔

کچھ پتہ نہ لگا کہ مرزا اسد اللہ خاں غالب سے تلمذ کس طرح حاصل ہوا۔ مگر خود اس کا نہ صرف اقبال کیا بلکہ استاد کی زمین میں کافی غزلیں لکھیں اور ان کا ذکر بھی کیا کرتے تھے۔

اہل و عیال اور دیرینہ احباب کے ساتھ عمدہ سلوک کرتے تھے اور مالی امداد بھی در پردہ کیا کرتے تھے۔ غصہ کا اظہار یا تیز کلامی کبھی نہیں کرتے تھے۔ اگر بہت ناراض ہوئے تو کلام کرنا ترک کر دیتے تھے۔ بہت سے مسودے ان کے میرے پاس ہیں۔ جن میں ایک میر تقی میر کی کلیات کا انتخاب ہے۔ اور اسی طرح اپنے مشہور استاد کے کلام کا بھی۔

بس ان کے نقوش میں سب سے بڑا نقش یہی تھا کہ وہ ہر وقت کام کرتے رہتے تھے اور کبھی دعویٰ استادی نہیں کیا۔

غزل گو شعرا اگر اصلاح لینے کے واسطے آتے تو انکار کر دیتے۔ ایک واقعہ یاد آگیا۔ مولانا ندرت میرٹھی جو اس زمانہ میں مرتبۂ استادی رکھتے تھے، خاص کر صنف غزل گوئی میں، ایک بار مولانا کی خدمت میں آئے اور فن سخن میں مشورہ چاہا۔ انہوں نے انکار کیا مگر ندرت کے اصرار پر پھر کہا کہ اچھا پہلے جینس کا سراپا لکھ کر لاؤ پھر بتائیں گے۔ یہ قصہ مولانا ندرت نے خود مجھے سنایا۔ نہ سراپا لکھا گیا نہ کبھی مشورۂ سخن ہوا۔ ان کا طرز ان کے قصیدہ حمدیہ عبرت سے خوب ظاہر ہوتا ہے۔ مگر دوسرے اشعار میں بھی نمودار ہے۔ وہ شاعرانہ اپنے ہم عصروں میں بہ لحاظ نفع بھی بہت کامیاب رہے —— یعنی کسی استاد کو اپنے کلام کی اشاعت سے اتنی منفعت حاصل نہیں ہوئی جتنی انہیں۔ مگر جب وہ دولت مند ہو گئے تھے آخر وقت تک کبھی بھی اپنی وضع نہیں بدلی۔

نقاش سے ممکن ہے ؟ کہ ہو نقش نمامت ہیں نقش میں جلوہ گر اسی کے اوصاف
ہر شے میں عیاں ہے اوصاف وحدیت گر وہم دوئی نہ ہو تو ہے مطلع صاف

اس عقیدہ کو بار بار اور طرح طرح سے ظاہر کیا ہے اور عمل کی ترغیب دی ہے۔ خود اس پر کاربند تھے۔

جس درجہ ہو مشکلات کی طغیانی ہو اہل ہمم کو اور بھی آسانی
تیراک اپنا ہنر دکھاتا ہے خوب ہوتا ہے جب اس کے سر سے اونچا پانی

سنہ ۱۹۱۰ء کے شروع میں نواب اسد اللہ خاں رئیس میرٹھ کی کوٹھی پر ایک جلسہ منعقد ہوا۔ سوال یہ تھا کہ زرچندی کے موقع پر نواب وقار الملک کو میرٹھ آنے کی دعوت دی جائے تاکہ مسلم یونیورسٹی کے واسطے اس موقع پر چندہ فراہم ہو سکے۔ ایک بزرگ سادہ ملبوس میں سر پر ترکی ٹوپی، عمر ۶۰ سال قدرے ضعیف معلوم ہوتے تھے ڈرائنگ روم میں داخل ہوئے۔ کل حاضرین تعظیم کے واسطے کھڑے ہو گئے۔ جلسہ میں تجویز پیش ہوئی کہ تمام سربرآوردہ حضرات اس موقعہ پر یونیورسٹی کا وفد بلانا مناسب نہیں خیال کرتے۔ اس پر ان بزرگ نے ذرا تیز لہجہ میں جواب دیا کہ تمام معززین شہر کی خواہش ہے کہ یہی موقع موزوں ہے۔ اس پر سربرآوردہ حضرات خاموش رہ گئے اور یہی رائے پسند خاطر رہی۔ یہ مولانا اسمٰعیل تھے۔

انہوں نے ۴۰ سال کی ریسرچ کے بعد جو نصاب اردو طلبہ کے واسطے مرتب کیا تھا وہ آج تک مقبول خاص و عام ہے۔ اسی لئے ان کا نام اب تک روشن ہے۔ یہ ادبی خدمت ان کی یاد کو تازہ رکھے گی۔

سر تیج بہادر سپرو

ڈاکٹر سید اعجاز حسین

بیسویں صدی کے آغاز میں الہ آباد متحدہ ہندوستان کی زمین پر ایک آسمان بنا ہوا تھا۔ متعدد ممتاز ہستیاں مختلف صلاحیتوں کی وجہ سے درخشندہ ستاروں کی طرح نظر آرہی تھیں۔ پنڈت مدن موہن مالوی، پنڈت موتی لال نہرو، سی۔ وائی چنتامنی، اکبر کی شہرت سے تمام ہندوستان گونج رہا تھا۔ وکالت، سیاست، صحافت، ادب چاروں عناصر یہاں کے عوام و خواص کو اپنا گرویدہ بنائے ہوئے تھے اور یہ متعدد ہستیاں تیزی سے آگے بڑھ رہی تھیں۔ سارا ملک ان کی رہنمائی میں آگے بڑھ رہا تھا۔ پنڈت مدن موہن مالوی تمام تر سیاسی و سماجی ذہنیت کا مرقع سمجھے جاتے تھے، پنڈت موتی لال نہرو اول تو اپنی وکالت کی وجہ سے مشہور ہوئے اور پھر بعد میں سیاسی رہنما بن کر سامنے آئے، سی۔ وائی چنتامنی بحیثیت صحافی کے بے نظیر دل و دماغ کے مالک سمجھے گئے، اکبر اپنی مزاحیہ شاعری کا سہارا لے کر دلوں سے خراج تحسین وصول کرنے لگے۔ تیج بہادر سپرو نے میدانِ سیاست میں کم عدالت میں زیادہ نام پیدا کیا۔ یہاں تک کہ ۱۹۱۹ء میں وہ وائسرائے کے یہاں مشیرِ قانون بنائے گئے اس وقت کے لحاظ سے یہ اقتدار ایک ہندوستانی کے لئے معراج سے کم نہ تھا مگر اس عہدہ پر وہ زیادہ دن تک نہ رہ سکے، مختلف وجوہ سے ڈیڑھ سال کے بعد اسے بھی ترک کر کے پھر الہ آباد ہائیکورٹ میں وکالت شروع کی۔

تیج بہادر سپرو اسی شہر کے باشندے تھے جہاں مولوی نذیر احمد پیدا ہوئے تھے۔ بجنور سے آکر ۱۸۹۵ء میں انہوں نے الہ آباد میں قیام کیا اور یہ سرزمین ایسی پسند آئی کہ مرتے مرتے اس کا چھوڑنا گوارا نہ ہوا یہاں تک ۱۹۴۹ء میں یہیں انتقال ہوا۔

کشمیری یوں بھی ترقی یافتہ تہذیب کے گرویدہ ہوتے ہیں لیکن تیج بہادر سپرو میں اس کا لگاؤ عشق کے درجہ تک تھا۔ وہ مسلمانوں کی طرزِ معاشرت، نشست برخاست، زبان و تاریخ سے بیحد دلچسپی رکھتے تھے۔ کھانا پینا، اٹھنا بیٹھنا سب کچھ اسلامی تہذیب کا مرقع تھا۔ چنانچہ ان کے یہاں ایک باورچی مسلمان ضرور رہتا اور وہ عموماً وہی چیزیں اپنے دسترخوان پر دیکھنا چاہتے تھے جو نوابوں یا مسلمان رؤسا کے یہاں ہوتی تھیں۔ غالباً اسی کا نتیجہ تھا کہ اردو زبان سے بے پایاں محبت کرتے تھے یہ شغف اتنا زیادہ تھا کہ وہ اردو کی کسی برائی کو سننا گوارا نہ کرتے تھے۔ وہ اتنی شستہ اور پاکیزہ اردو بولتے تھے کہ میں نے کم لوگوں کو اس زمانہ میں اتنی اچھی اردو بولتے سنا ہے۔ شام کو روزمرہ ان کے یہاں دربار ہوتا تھا اس میں خاص خاص لوگ شریک ہوتے تھے اس جلسہ میں عموماً اردو الفاظ، محاورات، شعر و شاعری پر گفتگو ہوتی تھی ان کی رائے اور سوجھ بوجھ ہمیشہ قابل احترام ہوتی تھی۔

اردو کے مشہور شعراء جو بھی الٰہ آباد آتے وہ ایک وقت تیج بہادر کے مہمان ضرور ہوتے تھے اور وہ کلام سن کر جو داد دیتے تھے اس سے پتہ چلتا تھا کہ وہ نکات شعری سے کما حقہ واقف ہیں۔ پورے انہماک و لگن سے شاعر و شعر کو سمجھنے کی کوشش کرتے تھے۔ کبھی کسی شاعر پر اعتراض بھی کرتے تو نہایت حسن و خوبی کے ساتھ، چونکہ خود ان کا انداز گفتگو نہایت دلکش تھا اس لئے سخت سے سخت اعتراض بھی لہجہ کے لحاظ سے ناگوار نہ ہوتا۔

اردو سے دلچسپی کا یہ عالم تھا کہ جب مرض الموت میں گرفتار ہوئے تو علاوہ اور اطباء کے ایک وید صاحب بنارس سے علاج کے لئے بلائے گئے معالج نے سخت ہندی میں ان سے گفتگو شروع کی۔ سپرو کو یہ زبان سوہان روح معلوم ہوتی، نہایت بیباکی کے ساتھ کہہ دیا کہ نہ میں آپ کی زبان سمجھتا ہوں نہ آپ میری زبان سمجھ سکیں گے، آپ تشریف لے جائیے چنانچہ وید صاحب کو مجبوراً واپس جانا پڑا۔ ممکن تھا کہ ان کے علاج سے فائدہ ہوتا مگر زبان کی تلخی سے زیادہ ان کو کوئی مرض بھی تکلیف نہیں دے سکتا تھا۔ انھوں نے مرجانا گوارا کیا مگر محض زبان کی اجنبیت نہ گوارا کی۔ انہوں نے اردو سے اپنی محبت کا اظہار ایک انجمن کی صورت میں دنیا کے سامنے پیش کرنا چاہا تھا چنانچہ ایک ادارہ کی بنیاد "انجمن روح ادب" کے نام سے قائم کی، اس کے واسطے روپیہ بھی فراہم کرنا شروع کر دیا تھا۔ تھوڑی مدت میں چالیس پچاس ہزار کی رقم جمع بھی کر لی تھی جو آج تک بنک میں اسی انجمن کے نام سے جمع ہے مگر حالات کچھ ایسے ناسازگار ہوئے کہ یہ انجمن وہ صورت نہ اختیار کر سکی جس کی ان کو تمنا تھی۔

ہندوستان میں کم ہی لوگ ان کی قانونی قابلیت کے ہم پلہ سمجھے جا سکتے ہیں چنانچہ انہوں نے جتنا روپیہ کمایا کم ہی وکلاء نے اتنا کمایا ہوگا مگر ان کا خرچ اتنا شاہانہ تھا کہ مرنے کے بعد کوئی قابل ذکر رقم نہ چھوڑ سکے۔ اس خرچ میں دوسروں سے سلوک کرنے کی بھی مد تھی اور یہ سلوک بغیر کسی مذہب و ملت کے امتیاز کے تھا۔ ہمارے ایک کرم فرما قاضی مسعود حسین صاحب ایڈووکیٹ جو اب بھی الٰہ آباد ہائیکورٹ کی نمایاں شخصیتوں میں ہیں وہ تیج بہادر سپرو کے نہایت خاص لوگوں میں سے ہیں ان کا کہنا ہے کہ مخیر تو اور لوگ بھی دیکھے سنے گئے ہیں مگر تیج بہادر سپرو کی یہ خصوصیت بہت کم لوگوں کو نصیب ہوتی کہ وہ سلوک کر کے اس سے بے حد پریشان رہتے تھے کہ کسی پر یہ راز ظاہر نہ ہو جائے، یہ وہ شریفانہ جذبہ ہے جس کی قدر ہر شریف آدمی کرتا ہے۔

تیج بہادر سپرو کی شہرت قابلیت کے علاوہ دیانت داری کی وجہ سے بھی تھی۔ مثال کے لئے اس وقت کو یاد کرنا پڑتا ہے کہ جب وہ الٰہ آباد میں پہلے پہل وکالت کے لئے آئے تو ان کا کہنا تھا کہ سات سال تک مجھے ہائیکورٹ میں کوئی مقدمہ نہیں ملا اس لئے کہ دلالوں کو میں نے کبھی منہ نہیں لگایا۔ باوجود اس کے کہ میری مالی دشواریاں بڑھتی جاتی تھیں مگر میں نے کبھی ایمانداری اور وکالت کی سطح کو نیچے نہیں ہونے دیا۔ ان کی روزمرہ کی گفتگو اور عملی زندگی بھی ہر شخص کو یہ محسوس کرنے پر مجبور رکھتی تھی کہ وہ نہایت ایماندار اور با اصول آدمی ہیں۔

تیج بہادر سپرو نہایت حساس اور نازک مزاج آدمی تھے۔ عام طور سے مشہور تھا کہ ان کا مزاج شاہانہ ہے وہ ذرا سی بات پر خفا ہو جاتے ہیں تو عمر بھر ناراض رہتے ہیں اور ذرا سی بات پر خوش ہو جاتے تو ہر ممکن کوشش کے لئے ان کو آمادہ سمجھئے۔ باوجود احباب پرستی و وضعداری کے وہ اپنے مطالعہ میں کبھی فرق نہیں آنے دیتے تھے۔ ہمیشہ کوٹھی کے برآمدے میں سوتے تھے، وہیں چار بجے صبح بیڈا اخبار آجاتا تھا اور وہ پڑھنا شروع کر دیتے تھے پھر قانونی کتابوں اور کاغذات کا سلسلہ شروع ہو جاتا تھا۔ یہاں تک کہ ہائیکورٹ کا وقت آجاتا تھا۔ وہاں کی بحث و مباحثہ سے فراغت کے بعد گھر آ کر ناشتہ وغیرہ کر کے ادبی و علمی کتابوں سے دن بھر کی کوفت دور کرنے کی کوشش کرتے۔ لوگ آتے رہتے وہ ملتے رہتے باتیں کرتے رہتے اور موقع ملتا تو پھر کتاب زیر نظر کا مطالعہ شروع ہو جاتا اکثر ایسا ہوتا کہ روزمرہ آنے والوں کو بھی کتابیں اٹھا کر دے دیتے کہ پڑھئے دیکھئے کتنی اچھی کتابیں ہیں۔ اس طرح صحبت کو بغیر بے لطف کئے ہوئے خود بھی مطالعہ کرتے اور بات کرنے والوں کو بھی چپ کرا دیتے۔ جیسے جیسے عمر بڑھتی جاتی تھی صحت خراب ہوتی جاتی تھی مگر باوجود علالت کے بھی مزاج کی شگفتگی کبھی نہ گئی۔ کبھی کبھی دوست احباب ان کو صلاح دیتے کہ حضور آپ کچھ ورزش کیا کیجئے تاکہ صحت قائم رہے تو ہنس کر جواب دیتے کہ "اللہ نے مجھے ہر طرح کی عافیت دی ہے میں اچھا ایک قید ورزش کی کیوں لگا لوں۔ خواہ مخواہ کی یہ زحمت اختیار کروں کون سی عقلمندی ہے۔ رہا صحت قائم رہنے کا سوال سو وہ خود ہی قائم رہے گی، شفا دار ہے خدا خود اس کی

حفاظت کرے گا۔"

جج بہادر سپرو علامہ اقبال کے خاص طور سے معتقد تھے، ان کی شاعری کے بڑے دلدادہ تھے۔ جب کبھی لاہور جاتے تو اقبال سے ضرور ملتے، وہاں سے آ کر ان کی باتیں بڑی دلچسپی لے کر بیان کرتے۔ کہتے تھے کہ سچ پوچھو تو ہم اور اقبال ایک ہی خاندان کے لوگ ہیں۔ وہ اصلاً کشمیری اور میں بھی، اور حسنِ اتفاق سے نسل کے لحاظ سے اقبال بھی سپرو ہیں اس لئے سمجھنا یہ چاہئے کہ ہم اور وہ ایک ہی ہیں، مذہب نے جدا کر دیا ہے مگر میرے نزدیک اس خون کے رشتہ کو کوئی مذہب دور نہیں کر سکتا۔

جج بہادر عرصۂ دراز تک بیمار رہنے کے بعد جنوری ۱۹۴۹ء کو ۷۲ سال کی عمر میں الہ آباد کیا دنیا کو چھوڑ گئے۔ اولاد کے لحاظ سے بھی وہ خوش قسمت رہے۔ دو لڑکیاں اور تین لڑکے ان کی اولاد کی فہرست مکمل کر دیتے ہیں۔ اولاد ذکور بھی قابلِ قدر ہے۔ آپ کے بڑے صاحبزادے پرکاش نرائن صاحب سپرو الہ آباد ہائیکورٹ کے جج تھے، دوسرے لڑکے آنند نرائن صاحب سپرو آئی۔ سی۔ ایس ہیں اور ترجوگی نرائن صاحب سپرو الہ آباد یونیورسٹی میں پروفیسر ہیں لیکن باوجود قابلیت و کامیابی کے جج بہادر سپرو کا کوئی نظیر نہ ہو سکا۔ سچ ہے ؂

کاندریں راہ فلاں ابنِ فلاں چیزے نیست

لالہ سری رام دہلوی

ڈاکٹر رام بابو سکسینہ

لالہ سری رام دہلوی، رائے بہادر مدن گوپال ایم اے بیرسٹرایٹ لا کے فرزند اور رائے بہادر ماسٹر پیارے لال آشوب کے بھتیجے تھے۔ آپ دہلی میں ۴ر دسمبر ۱۸۷۵ء کو پیدا ہوئے۔ تعلیم دہلی اور لاہور دونوں مقامات پر ہوئی۔ ۱۸۹۵ء میں آپ نے ایم اے انگریزی کا امتحان پاس کیا اور جلد ہی ان کا منصف کے عہدہ پر تقرر ہوا۔ ۱۹۰۴ء میں انہوں نے اس ملازمت سے استعفیٰ دے دیا۔ شعر و ادب کا شوق دامنگیر تھا، زمانہ اور مخزن میں ادبی مضامین لکھنے کا سلسلہ شروع ہوا۔ انور کا دیوان زمانہ طالب علمی میں شائع کر چکے تھے۔ داغ دہلوی کے دیوان مہتاب داغ کے حقوق اشاعت بھی حاصل کئے اور داغ کے کئی غیر مرتب اشعار کو یکجا کرکے ضمیمہ یادگار داغ کے نام سے شائع کیا۔ مرزا محمد تقی بیگ مائل اور بہاری لال مشتاق شاگرد غالب کے دواوین کو بھی مرتب کرنے کا ارادہ رکھتے تھے لیکن فرشتۂ اجل نے مہلت نہ دی۔ کتابوں کو جمع کرنے کا بے حد شوق تھا۔ ان کے ذاتی کتب خانہ میں عربی، فارسی، اردو اور ہندی کی ہزارہا نادر اور بیش قیمت کتابیں جمع تھیں۔ ان کے مملوکہ سینکڑوں مخطوطات، پانچ سو تصاویر، اعلیٰ ترین خطاطی کے نمونے اور لاتعداد فرمان و شاہی دستاویزات ان کی وفات کے بعد بنارس ہندو یونیورسٹی کو بطور میراث دے گئے ہیں۔ تعصب یا بغض و عناد کی ہوا انہیں چھو تک نہ گئی تھی۔ نئے شاعروں کی دامے، درمے، سخنے مدد کرنا اپنا فرض جانتے تھے۔ ان کی مایۂ ناز تصنیف خمخانۂ جاوید کی پہلی جلد ۱۹۰۸ء میں شائع ہوئی۔ ۲۵ر مارچ ۱۹۳۰ء کو جب ان کی موت ہوئی، وہ اس کی چار جلدیں شائع کر چکے تھے، پانچویں جلد ملا محمد کیفی نے ان کی وفات کے بعد شائع کی اور کہا جاتا ہے کہ چھٹی جلد ۱۹۴۷ء کے فسادات میں ضائع ہو گئی۔

میرے مراسم لالہ سری رام سے نہایت دیرینہ تھے۔ عرصہ تیس سال تک میں ان کی صحبت سے فیض یاب رہا۔ ۱۹۲۳ء میں بڑودہ کے مہاراجہ ہز ہائنس سیاجی راؤ گائیکواڑ کے ہاں بطور پرائیویٹ سکریٹری کے میری خدمات تفویض تھیں۔ مہاراجہ صاحب بنارس یونیورسٹی کے سابقہ چانسلر تھے۔ جلسۂ تقسیم اسناد کا خطبہ پیش کرنے کے لئے وہ بنارس گئے۔ گٹھیا (Gout) کا عارضہ انہیں پہلے سے تھا، وہاں

اس کا دورہ پڑا۔ حکیم اجمل خاں صاحب دہلی سے بلائے گئے۔ وہ میرے ساتھ ہی ٹھہرے۔ چار دن علاج جاری رہا، لیکن خاص افاقہ نہ ہوا۔ حکیم صاحب کے مشورہ پر مہاراجہ صاحب اُن کے ساتھ دہلی چلے آئے۔ یہاں پُرانی دہلی میں بیکانیر ہاؤس میں مقیم ہوئے۔ یہ جگہ مٹکاف ہاؤس (Metcalf House) کے قریب ہے۔ نزدیک ہی علی پور روڈ ہے۔ جہاں لالہ سری رام کی کوٹھی تھی۔ اس علاقے میں ان کی کئی اور کوٹھیاں بھی تھیں جو کرائے پر اُٹھا کرتی تھیں۔ مہاراجہ صاحب کے ساتھ ان کا اسٹاف بھی آیا تھا۔ ان سب کے ٹھہرانے کے لئے جگہ کا سوال درپیش تھا۔ یہ مشکل لالہ صاحب کی مدد سے حل ہوئی اور اس طرح ان سے میری پہلی ملاقات ہوئی۔ اب تک مجھے یاد ہے کہ لالہ صاحب سے ملتے ہی میں ان کی شخصیت سے گہرے طور پر متاثر ہوا تھا۔ وہ قدیم تہذیب و شرافت کا ایک اعلیٰ نمونہ تھے۔ نہایت صاف و شستہ ٹکسالی اُردو بولتے تھے۔ خوش مذاق اور خوش مزاج تھے۔ باتیں کیا کرتے گویا پھول جھڑتے تھے۔ پہلی ہی ملاقات میں، میں ان کا گرویدہ ہوگیا اور ان کی دعوتوں پر ان کے ہاں آنے جانے لگا۔

لالہ سری رام مہاراجہ سے ملنے کا اشتیاق رکھتے تھے۔ مہاراجہ صاحب اپنے ترقی پسند خیالات کی وجہ سے کافی مقبول تھے۔ ان کی اعلیٰ انتظامی صلاحیت اور اُس آزادی پسندی کا بھی شہرہ تھا جس کا مظاہرہ انہوں نے دہلی دربار ۱۹۱۱ء کے موقعہ پر کیا تھا، اس وجہ سے وہ ریاستوں کے حکمرانوں کے سرگروہ کہے جاتے تھے۔ ملاقات کا وقت میں نے مقرر کرادیا۔ اس ملاقات سے لالہ صاحب بہت خوش ہوئے۔ ان دنوں میرا بیشتر وقت لالہ صاحب کی پُرلطف صحبت میں بسر ہوتا تھا اور میں ان کی خوش مزاجی، ظرافت طبعی اور مہمان نوازی سے پورا پورا بہرہ مند ہوتا رہا۔

لالہ سری رام کی یہ مستقل دعوت تھی کہ جب بھی میں دہلی آؤں، ان کے پاس ٹھہروں۔ چنانچہ اس افتخار کو میں نے کبھی ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ ان کی زباندانی اور خوش بیانی کا نقش میرے دل پر گہرا تھا۔ ان کی باتوں میں گلوں کی خوش بو بھی اور عقل کا نچوڑ ہوتا تھا۔ دیدہ و دل دونوں ان سے شاداب ہوتے تھے۔ بہت کم لوگ میں نے ایسے دیکھے ہیں جن کے کلام و بیان میں ایسا چلتا ہوا جادو ہوتا ہے کہ سننے والا مسحور و محو و مستغرق ہو جائے۔ اس لحاظ سے لالہ سری رام کا نام سرتیج بہادر سپرو، ڈاکٹر سچدا نند سنہا اور سر راس مسعود کے ساتھ لیا جا سکتا ہے۔ یہ لوگ لاجواب خوش تقریر تھے۔ گفتگو کے وقت چھا جاتے تھے اور باتوں باتوں میں ایسے لطیفے اور چٹکلے چھوڑتے تھے کہ بات چیت باغ و بہار ہو جاتی تھی بولنے کا بھی ایک سلیقہ ہوتا ہے۔ ان لوگوں کی جادو بیانی کا ایک راز یہ بھی تھا کہ پُرانے سے پُرانے واقعات اور چٹکلوں کو کچھ ایسے انداز سے پیش کرتے کہ وہ نئے اور پُراثر بن جاتے تھے۔

افسوس ہے کہ دورِ زمانہ کے ساتھ ساتھ یہ روشیں متروک ہوئی جاتی ہیں۔ اب نہ اگلی سی زمینیں ہیں اور نہ وہ صحبتیں گھنٹوں متواتر لالہ صاحب شستہ ٹکسالی اردو میں باتیں کیا کرتے تھے۔ اپنے احباب اور واقعاتِ زندگی کی ایسی مکمل لفظی تصویریں پیش کرتے تھے کہ ان کی قدرتِ زبان پر حیرت ہوتی تھی۔ بات بات میں اُردو کے بر موقعہ اشعار موتیوں کی طرح ٹانکتے چلے جاتے تھے۔ ان کا حافظہ غضب کا تھا۔ اور ہزاروں اشعار ان کی نوکِ زبان پر تھے۔ اس لحاظ سے کسی کا شیوۂ گفتار میں ان سے میدان مارنا آسان کام نہ تھا۔

لالہ صاحب اعلیٰ خاندان سے تھے اور اس پر انہیں بجا طور پر فخر بھی تھا۔ اپنے بزرگوں میں راجہ ٹوڈرمل اور پیارے لال آشوب کا ذکر وہ اکثر بڑے احترام سے کیا کرتے تھے اور وہ خطبہ بھی دکھایا کرتے تھے جو پیارے لال آشوب کو باشندگانِ دہلی نے پیش کیا تھا۔ اس خطبہ میں غالب کی لکھی ہوئی چند سطریں بھی درج ہیں جن میں غالب نے پیارے لال آشوب کی خدمات کو سراہا ہے۔ جہاں ایسا موقعہ ہوتا، لالہ صاحب بڑے جوش و خروش سے اپنے حسب نسب، اپنے خاندان کی شہرت اور موروثی جائداد و املاک کا ذکر کرتے تھے اور اس قسم کے افتخار نے انہیں معمولی اور چھوٹی چیزوں سے بے نیاز کر دیا تھا لیکن اسی نے ان میں احساسِ برتری اور تنگ دلی بھی پیدا کر دی تھی۔ دہلی کی مشہور ہستی حکیم اجمل خاں اور ان کے عزیزوں، خاندان لوہارو اور شہرہ

آفاق انگلو انڈین شاعر اور ناول نگار کپلنگ سے اپنے مراسم اور تعلقات کا ذکر وہ بڑی مسرت سے کیا کرتے تھے۔ کپلنگ نے دلی میں ان ہی کی کوٹھی میں قیام کیا تھا۔ صاحب ذوق مہمانوں کو لالہ صاحب اکثر وہ کمرہ اور اس میں رکھی ہوئی میز دکھلاتے تھے جس پر کپلنگ لکھنے پڑھنے کا کام کیا کرتا تھا۔

لالہ سری رام اردو ادب سے گہری دلچسپی رکھتے تھے۔ اپنی ملازمت تک کو انہوں نے اس پر قربان کر دیا تھا۔ صحت کی خرابی کی وجہ سے وہ منصف کے تھکا دینے والے فرائض انجام دے سکنے سے معذور تھے اور شعر و ادب کے گوشہ میں خانہ نشین ہو گئے۔ مصوری، خطاطی اور قلمی نسخوں کا جمع کرنا ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ جیسا کہ پہلے ذکر آچکا ہے، یہ تمام نوادر اب بنارس ہندو یونیورسٹی کی زینت بنے ہوئے ہیں جہاں لالہ صاحب سے ایک خاص شعبہ منسوب ہے۔

لالہ صاحب اردو زبان و ادب کے عاشقوں میں تھے۔ ان کی تصنیف خم خانہ جاوید ایک یادگار کارنامہ ہے اور اردو ادب میں اس کی حیثیت انسائیکلوپیڈیا کی ہے۔ اس کی تالیف کے سلسلے میں، لالہ صاحب نے کئی ادیبوں اور اہل قلم حضرات کو ملازم رکھا۔ پنڈت کیفی مہینوں ان کے یہاں مہمان رہے۔ اس فیاضی کا انہوں نے پورا پورا فائدہ اٹھایا اور لالہ صاحب کی وفات کے بعد بھی ان ہی کی کوٹھی پر مقیم رہے۔ پنڈت کیفی، لالہ صاحب کے ادبی کاروبار کے عامل تھے۔ خم خانہ جاوید کی تکمیل کے لئے وہ ایک کثیر رقم وقف کر گئے تھے لیکن بدقسمتی سے یہ کام پایۂ تکمیل کو نہ پہنچ سکا۔ ملک اور ادب کے لئے یہ ایک ناقابل بیان نقصان ہے۔ لالہ صاحب کی وفات کے کئی سال بعد پنڈت کیفی نے خم خانہ جاوید کی ایک جلد شائع کی لیکن پہلی جلدوں کے مقابلے میں اس کا رنگ ہلکا ہے۔ نہ وہ اگلا سا معیار ہے نہ ادبی چاشنی۔ خم خانہ جاوید کی باقی جلدیں اب مکمل نہیں ہو سکتیں اور اس طرح لالہ صاحب کا وقف شرمندۂ تکمیل نہیں ہو سکا۔ کیفی صاحب مستقل طور پر لالہ صاحب کے ہاں رہتے تھے اور ان کے مشورہ سے خم خانہ جاوید مرتب کرتے تھے۔ گوپی ناتھ امن کے چچیرے بھائی گوہرن لال ادیب ان کے خاص معاون تھے لیکن افسوس کہ خانگی تنازعوں و کارکنان کی عدم توجہی سے لالہ صاحب کا خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہوا اور ان کے وقف کا صحیح مصرف نہیں کیا گیا۔

لالہ سری رام دریا دل تھے لیکن ان کی سخاوت میں مصلحت کو بڑا دخل تھا۔ جو کچھ وہ دیتے، اس کا بدلہ بھی چاہتے۔ یہی وجہ ہے کہ خرچ کے حساب میں وہ بڑی احتیاط برتتے تھے۔

ان کی عمر کے آخری سال بیماری کے رنج و غم اور درد و عذاب میں بسر ہوئے۔ خانگی تنازعوں نے ان کی خوشیوں کے سوتوں پر خاک ڈال دی تھی۔ اس دوران میں وہ ڈیرہ دون سے مجھے نہایت طویل خط لکھا کرتے۔ یہاں وہ تبدیل آب و ہوا اور علاج معالجہ کے لئے تشریف لے گئے تھے۔

ان کی شخصیت پیچ در پیچ تھی۔ تہذیب، شائستگی اور شرافت کا وہ خلاصہ تھے۔ ایک وضعدار ہندوستانی شریف کی تمام صفات ان میں بدرجۂ اتم موجود تھیں۔ ان کا حلقۂ احباب وسیع تھا۔ بڑی بڑی ہستیوں سے اور ہندوستانی ریاستوں کے راجاؤں سے راہ و رسم پیدا کرنے اور ان سے تعلقات استوار کرنے کا بڑا شوق تھا۔ خوش سلیقہ، خوش اطوار اور خوش گفتار تھے لیکن مزاج نازک و تند و ترش تھا۔ جب غصہ آتا تو طبیعت قابو سے نکل جاتی۔ ضبط، میانہ روی اور اعتدال جو متوازن شخصیت یا [illegible] میں ہوتا ہے ان کے ہاں کم تھا۔ ان کے دوستوں کا دائرہ بھی محدود تھا اور ان کی دنیا میں صرف خواص کا گزر تھا۔

ان کی وفات پر مرزا فرحت اللہ بیگ نے ایک نہایت مؤثر مضمون لکھا تھا۔ پنڈت کیفی نے بھی اپنے ذاتی تجربات کی روشنی میں لالہ صاحب پر مضمون لکھے ہیں جو ان کی شخصیت کا عمدہ مطالعہ پیش کرتے ہیں۔

اپنی تمام خامیوں اور خوبیوں کے باوجود، لالہ سری رام دہلی میں اپنے زمانہ کی نمایاں شخصیت تھے۔ وہ ملک کے بے مثل مربی تھے اور اردو زبان کے احسانات بھلانے کی چیز نہیں۔ ان کی موت دہلی اور اردو کے لئے ناقابل تلافی نقصان ہے۔ آہ! ع: آں قدح بشکست و آں ساقی نماند۔

سید علی بلگرامی

غلام پنجتن

کارلائل نے کہا ہے کہ انگریزی زبان میں سوانح عمریاں تو بہت لکھی گئی ہیں لیکن صحت و تسلسل کے ساتھ لکھی ہوئی کسی کی زندگی کی تاریخ اتنی ہی کمیاب ہے جتنی کہ کسی کی اعلیٰ مقاصد کے حصول میں گزاری ہوئی زندگی۔ ایسے لوگ تو بہت سے گزرے ہیں جن کی سوانح حیات ترتیب دینا چاہیں مگر ان کے متعلق مفید اور سبق آموز مواد فراہم کرنے کی اہلیت رکھنے والے کم ہیں۔ ان بزرگوں کے ساتھ کے اٹھنے بیٹھنے والے ہی معقول اور صحت مند مواد مہیا کر سکتے ہیں۔ مگر روز کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے والوں میں چند ہی ایسے ہوتے ہیں جن کو اس بات کی تمیز ہو کہ زندگی میں کیا چیز کیا اہمیت رکھتی ہے۔ پھر جب انسان گزرے ہوئے زمانے کو یاد کرتا ہے تو فطرتاً خیالات کا سلسلہ اس کے بس میں نہیں رہتا اور یہ بھی ہوتا ہے کبھی معمولی سی بات تو حافظے میں جم کر رہ جاتی ہے لیکن اسی زمانے کا اہم واقعہ محو ہو جاتا ہے۔ کبھی عقیدت کی آنکھ ایک ہی رخ دیکھتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ قوموں تاریخ سے افراد کی سوانح لکھنا مشکل ہے۔ گزرے ہوئے زمانے کی تاریخ لکھنے کے لئے ریکارڈ بھی ہوتا ہے اور یادگاریں بھی۔ لیکن کسی ایک شخص کی سوانح حیات تو وہی لکھ سکتا ہے جو ذاتی علم رکھتا ہو جوں جوں زمانہ گزرتا جاتا ہے ایسے لوگ کم ہوتے جاتے ہیں اور وہ وقت بھی آ جاتا ہے کہ ان میں سے کوئی باقی ہی نہیں رہتا۔ دور گزشتہ کے مشاہیر کے حالات معلوم کرنے کا شوق تو دو چار کو ہوتا ہے مگر ایسے مواقع نہیں تھے کہ وہ یہ شوق پیدا کر سکیں۔ موجودہ دور میں کچھ ایسی ہوا چلی ہے اور ذہنیت کچھ ایسی مفلوج ہوئی ہے کہ پچاس برس پہلے ہم سے جو بزرگ جدا ہو چکے ہیں ان کا تو ذکر ہی کیا۔ مظہر الحق۔ سر علی امام جسٹس شاہ دین۔ سر محمد شفیع۔ مولانا محمد علی۔ حکیم اجمل خاں۔ صاحبزادہ آفتاب احمد خاں کو یاد نہیں کیا جاتا۔ ایسے میں کار پردازانِ نقوش کا پرانے مٹتے ہوئے نقوش کو ابھارنا قابلِ ستائش ہے مگر مجھ ایسے نالائق محض سے کچھ اس سلسلے میں توقع رکھنا محض اس وجہ سے ہو سکتا ہے کہ ؎

اسفل ہی سہی لیکن نسبت تو ہے اعلیٰ سے

سب جانتے ہیں کہ واجد علی شاہ کو مٹیا برج میں لے جانے کے دوسرے سال جب بہادر شاہ ظفر کو رنگون پہنچا دیا گیا تو اودھ میں

شمالی ہندوستان جس کو اب اتر پردیش کہتے ہیں خوب ہی لوٹے گئے۔ وہ بہار بھی اس وسیع علاقے میں ایسے مسلمان گھرانے ہوں گے جن کو ان مصائب کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ ان میں سے ایک سادات بلگرام کا وہ کنبہ بھی تھا جس میں سید علی ۱۸۵۱ء میں پیدا ہو چکے تھے۔ ان کے جد امجد مولوی سید کرامت حسین صاحب کمپنی بہادر کی سرکار کے گورنر جنرل کے دربار میں نواب وزیر آف اودھ کے دربار کے نمائندے تھے۔ کرامت حسین صاحب نے اپنے دونوں بیٹوں اعظم الدین حسن اور زین الدین حسن کو کلکتے کے مدرسہ عالیہ میں جو وارن ہیسٹنگز نے قائم کیا تھا تعلیم دلائی۔ یہ دونوں انگریزی داں ہونے کے علاوہ علوم مشرقیہ کے عالم بھی تھے۔ آگے چل کر ان دونوں کو انگریزی سرکار میں ملازمت بھی ملی۔ اعظم الدین حسن گورنر جنرل کے مشرقی زبانوں کے ترجمان (Oriental Interpreter) کی حیثیت سے اے ڈی سی بنے اور پھر سندھ کے پولٹیکل ایجنٹ ہو گئے۔ صوبہ بہار میں ڈپٹی کلکٹر اور بندوبست کے حاکم رہے اور سی ایس آئی کا خطاب پایا۔ دوسرے بھائی زین الدین حسن صوبہ بہار و بنگال میں ۱۸۷۵ء میں ڈپٹی کلکٹری کے عہدے سے ریٹائر ہو کر بہ اصرار حیدر آباد میں کمشنر انعام بن کر آئے۔ سید علی انہی کے فرزند تھے۔ ان کے بڑے بھائی سید حسین (عماد الملک) نے کلکتہ یونیورسٹی سے ۱۸۶۶ء میں بی اے کا امتحان پاس کر لیا تھا۔ اسی سال سید علی فارسی و عربی کی تعلیم گھر پر ختم کر کے انگریزی مدرسے میں داخل ہوئے۔ دو سال انہوں نے کیننگ کالج لکھنؤ میں بھی تعلیم پائی تھی اس کے بعد ۱۸۶۸ء میں پٹنہ کالج سے شریک ہو کر کلکتہ یونیورسٹی سے بی اے کی ڈگری لی۔ بی اے میں ان کی اختیاری زبان سنسکرت تھی۔ دو سال قانون و ادب کی تحصیل میں گزار کر انہیں ٹامسن اسکالرشپ انجینئرنگ کی تعلیم رڑکی کالج میں حاصل کرنے کے لئے ملا اور یہ وہاں داخل ہو گئے۔ نواب سر سالار جنگ نے ۱۸۷۶ء میں یورپ کا سفر کیا اس سفر میں ان کے بڑے بھائی مولوی سید حسین بلگرامی بھی ہمرکاب تھے۔ اس سفر میں جو کچھ انہوں نے دیکھا اس سے متاثر ہو کر انہوں نے ارادہ کر لیا کہ حیدر آباد سے چند ہونہار نوجوان ہر سال انگلستان تعلیم کے لئے روانہ کئے جائیں جو واپس آکر ریاست کے مختلف عہدوں کو سنبھال سکیں۔ ایک ایرانی نوجوان مرزا مہدی خاں جو اسسٹنٹ انجینئری کے امتحان میں کامیاب ہو چکے تھے ان کے ہمراہ تھے۔ ان کو سر سالار جنگ نے رائل اسکول آف مائنز میں داخل کر دیا اور جب ہندوستان لوٹے سید علی کو رڑکی سے بلوا کر کچھ ماہ اپنے اسٹاف میں رکھا اور پھر تکمیل تعلیم کے لئے انگلستان بھیج دیا جہاں انہوں نے ۱۸۷۹ء میں لندن یونیورسٹی کا امتحان داخلہ اعلیٰ درجے میں پاس کر لیا اس امتحان میں ان کی اختیاری زبان جرمنی اور فرانسیسی تھی۔ انہوں نے کیمسٹری۔ طبیعات۔ معدنیات اور ان کے متعلقہ مضامین کی تعلیم چند سال میں ختم کر لی۔ اپنی ذہانت و قابلیت کے تحسینی صداقت نامے کیسلے۔ جڈ ٹنڈل ایسے باکمال پروفیسروں سے لے کر انگلستان چھوڑا جو منی فرانس اسپین ہوتے ہوئے کچھ ماہ اٹلی میں اطالوی زبان سیکھنے کے لئے قیام کیا۔ سنسکرت اور بنگالی تو پہلے ہی سے جانتے تھے حیدر آباد میں انہوں نے مرہٹی اور تلنگی بھی سیکھ لی۔ ان کا حافظہ بڑا زبردست تھا، جو ایک دفعہ پڑھ لیتے بھولتے نہ تھے۔ فرانسیسی زبان میں بلا تکلف باتیں کرتے تھے۔ اور قلم برداشتہ لکھتے تھے وہ جس زبان کی کتاب پڑھنے بیٹھتے ایک ہی نظر میں معنی و مفہوم سمجھ لیتے تھے۔ چودہ زبانیں ایسے لہجے میں بولتے تھے کہ یہ سب گویا ان کی مادری زبانیں ہیں۔ بنارس کے پنڈتوں کو ان کے سنسکرت کے لہجے میں ہندی شاستری کی جھلک نظر آتی تھی اور ان کے تلفظ پر بیاس جی کا شبہ ہوتا تھا۔ یورپ سے واپسی پر وہ انسپکٹر جنرل معدنیات مقرر کر دیئے گئے۔ انہوں نے اور مرزا مہدی خاں نے جو ان سے ایک دو سال پہلے واپس آ چکے تھے مل کر پاکھال ضلع ورنگل اور رائچور میں معدنی تحقیقات شروع کی۔ جب ان کی رپورٹ پر عمل کا وقت آیا تو وہی ہوا جو ہوتا چلا آ رہا ہے بقول اکبر الہ آبادی؎

کچھ قدر نہیں اس کی پرستش ہی نہیں اس کی ــــ میٹھا کی لیاقت بھی مفلس کی جوانی ہے

سر سالار جنگ نے جو ریاست کی خوش انتظامی اور مالی فلاح کے منصوبے باندھے تھے اس میں رکاوٹیں تو انہی کی زندگی میں پیدا ہو گئی تھیں ان کے بعد یہ کیسے گوارا ہو سکتا تھا کہ سید علی اور مرزا مہدی ایسے کثیر المعلومات نوجوانوں کو سرزمین دکن سے سونا اگلوانے کی اجازت

دی جاتی - رائچور کا سونا ہو یا ورنگل کا کوئلہ ——— ان کی جستجو اور کالے آدمی ——— ایں خیال است و محال است و جنوں ——— دونوں کو معاونیاتی خدمات سے محروم کر دیا گیا - مرزا مہدی علی تو مال - اعداد و شمار - مردم شماری کے محکموں میں طبقات الارض کی صلاحیتوں کو دفن کرنے کے لئے بھیج دیئے گئے اور سید علی بلگرامی ہوم سیکرٹریٹ - تعلیمات اور ریلوے کا چکر کاٹتے رہے - سنہ ۱۹۰۱ء میں یہ چکر ختم ہوا اور سنہ ۱۹۰۲ء میں کیمبرج یونیورسٹی میں مرہٹی کے پروفیسر ہو گئے - کدال تو ان دونوں کے ہاتھ سے حکومت کی پالیسی نے چلنے نہ دی - مگر ان دونوں کے ہاتھوں سے قلم چھین لینے کی قوت کسی میں نہ تھی - ملک کو نہ سہی ملک کی زبان کو یہ دونوں ہستیاں مالامال کر گئیں۔

جس زمانے میں سید علی انگریزی تعلیم حاصل کر رہے تھے اسی زمانے میں سر سید احمد خاں نے ورنیکلر یونیورسٹی کے قیام کی تحریک سرکار انگریزی میں کی تھی جس کا انکاری جواب دیتے ہوئے گورنمنٹ نے ان کو لکھا تھا کہ وہ علوم و فنون کے ہر شعبے میں ہندوستانیوں کو فراخ دلی سے اعلیٰ تعلیم دینا چاہتی ہے جس کے لئے دیسی زبان میں کوئی ذخیرہ موجود نہیں - اس لئے کچھ عرصے تک ہندوستان کے باشندوں کو انگریزی زبان ہی سکھانا ہوگی اور اسی میں اعلیٰ تعلیم دینا پڑے گی - سر سید کو اس طرف توجہ کرنی پڑی - سر سید کی اس آواز پر سب سے پہلے لبیک مولوی ذکاء اللہ مرحوم نے کہا - اور دہلی کے ماسٹر پیارے لال آشوب اور پنڈت دھرم نرائن اس مقصد کی تکمیل کے لئے اٹھے۔ سید علی صاحب کے دل پر یہ بات بچپن ہی سے بیٹھ گئی اور اسی وجہ سے انہوں نے سنسکرت اور پھر فرانسیسی اور جرمنی اپنی اختیاری زبانیں امتحانات کے لئے چنیں اور ان زبانوں کی کتابوں کے ترجمے اردو زبان میں آگے چل کر کئے - یہی وجہ ہے کہ ان کا اوریجنل ورک کم اور تراجم زیادہ ہیں۔

سالار جنگ ثانی اور نواب سر آسمان جاہ کی وزارت میں وہ جن الجھنوں میں پڑ گئے وہ ان کی علمی اور ادبی زندگی میں بھی رخنہ انداز ہوئیں - ان حالات سے بد دل ہو کر انہیں وکالت کا خیال آیا - درسگاہوں سے باہر ہو کر جب انسان دنیا کے جھمیلوں میں پڑ جاتا ہے تو وہ امتحان پاس کرنے کا ڈھنگ بھول جاتا ہے - یہ کلیہ ان کے حق میں غلط ثابت ہوا - کلکتہ یونیورسٹی کے بی ایل کے سنہ ۱۸۹۱ء والے سال کے امتحان میں چار ماہ باقی رہ گئے تھے لیکن انہوں نے فیس داخل کر کے امتحان کی تیاری شروع کر دی حالانکہ وہ سنہ ۱۸۷۵ء یا سنہ ۱۸۷۶ء میں قانون کی تعلیم چھوڑ چکے تھے امتحان میں بیٹھے اور یونیورسٹی بھر میں اوّل آ کر طلائی تمغے اور یونیورسٹی کے اسکالرشپ کے حقدار قرار پائے - اسی زمانے کے لگ بھگ حیدرآباد کے معاملات پر مسٹر مترا نے ایک پمفلٹ شائع کیا تھا - ایک گروہ کا خیال یہ تھا کہ اس پمفلٹ کو محسن الملک کی پارٹی نے جس کے دو مضبوط ستون سید علی بلگرامی اور محمد صدیق انجینئر سمجھے جاتے تھے شائع کرایا ہے - ریذیڈنسی کا گمان یہ تھا کہ فتح نواز جنگ کی میم صاحب کی خانگی زندگی کے متعلق جو واقعات بیان کئے گئے ہیں ان کو اس ریاست میں سوائے عماد الملک اور سرور الملک کے کوئی نہیں جانتا اور چونکہ عماد الملک آسمان جاہ کی وزارت کے حامیوں میں سے ہیں - اس لئے یہ مواد سرور الملک کے اور کسی نے نہیں دیا - اس مقدمے کی پیروی کے لئے مترا کی طرف سے فوجداری کے مشہور بیرسٹر مسٹر ایلڈرلی نارٹن جو اس زمانے میں مدراس میں وکالت کرتے تھے اور بمبئی کے مشہور سالیسٹر ایچ لو بلائے گئے یہ مقدمہ ایک کمیشن کے سامنے سنہ ۱۹۲۲ء میں بڑے زور شور سے چلتا رہا - یہی مقدمہ حقیقت میں فتح نواز جنگ کو حیدرآباد سے نکالے جانے اور سر آسمان جاہ کی وزارت کے ٹوٹنے کا پیش خیمہ ہوا - سنہ ۱۹۱۹ء یا سنہ ۱۹۲۰ء میں جب میں یو پی میں وکالت کرتا تھا ایک مقدمے میں میرا اور مسٹر نارٹن کا اورنگ آباد آنا ہوا - اس مقدمے میں میں مسٹر محمد اعز انصاری بیرسٹر کے (جو بعد کو ہائی کورٹ کے جج ہوئے) جونیئر کے طور پر کام کر رہا تھا - اکثر ہم تینوں کی تفریحی صحبتیں رہتی تھیں - مسٹر نارٹن بڑے بذلہ سنج اور ہنس مکھ تھے - ان میں گورے کالے کی تفریق کا مادہ بہت کم تھا - وہ اکثر ان صحبتوں میں بڑی شخصیتوں کا بلا نسلی تفریق کے مذاق اڑاتے رہتے تھے اس پمفلٹ اور اس زمانے کی "گندی سیاست" کا تذکرہ کرتے ہوئے نارٹن نے کہا کہ اگر سید علی بی ایل کا امتحان دے کر حیدرآباد واپس نہ آتے اور کلکتے ہی میں رہ جاتے تو وہ بہت

جلد کلکتہ بار میں نمایاں مقام حاصل کر لیتے۔ ان کا حافظہ قوی ذہن تیز اور نظر وسیع تھی۔ انہیں ہمدردی بھی تھی اور ایسی طبیعت پائی تھی کہ مقدمہ کے واقعات معلوم کرنے میں مشکل کی پراگندہ خیالی سے ان کا دل اُچاٹ نہ ہوتا اور یہی وہ خوبیاں ہیں جو قانون پیشہ کو "لائم لائٹ" میں لاتی ہیں۔

وہ ریاست میں تو کسی خطاب کے مستحق نہ ٹھیرے مگر گورنمنٹ آف انڈیا نے ان کی علمی خدمات کا اعتراف شمس العلماء کا خطاب سنہ ۱۸۹۳ء میں دے کر کیا۔ اور انگلستانی یونیورسٹی نے ان کو ڈاکٹر اور ڈی لٹ بنا دیا۔ دوران ملازمت میں انہوں نے ایک رسالہ الحقائق نکالا تھا۔ یہ رسالہ عربی زبان میں سہ ماہی تھا اس میں نواب عماد الملک اور علامہ شوستری اور مولوی سید کرامت حسین صاحب کے جو سنہ ۱۹۰۸ء میں الٰہ آباد ہائی کورٹ کے جج مقرر ہوئے مضامین شائع ہوتے تھے۔ یہ رسالہ چل نہ سکا اور جلد بند ہو گیا انہوں نے میڈیکل جورس پروڈنس کا ترجمہ اُردو میں "اصول قانون متعلق بہ طب" کیا۔ اس کاوش اور محنت کا معاوضہ سر آسمان جاہ کی وزارت کے زمانے میں سرکار سے چھ ہزار روپیہ ملا۔

نواب وقار الامراء کے زمانے میں وہ طوفان جو سید علی صاحب کو پریشان کرنے کے لئے اٹھایا جاتا تھا بہت کم ہو گیا اور ان کے علمی کاموں میں وقار الامراء سے مدد بھی ملی۔ انہوں نے اس موقع کو غنیمت جان کر ایک سررشتہ علوم و فنون قائم کرالیا اور اپنی نگرانی میں دکن کی تاریخ اور بہت سی کتابیں تالیف و ترجمہ کرائیں۔ انہوں نے مولانا شبلی کا تقرر بحیثیت ناظم سررشتہ علوم و فنون کرایا۔ یہ سررشتہ ایک عرصے تک قائم رہا۔ مولوی سید احمد صاحب دہلوی مؤلف فرہنگ آصفیہ کو ۵۰ روپیہ ماہوار وظیفہ مقرر کرایا۔ ان کی تالیفات پر انعام دینے کے لئے انہوں نے خود گزارش پیش کی اور سرکار سے ایک گراں قدر رقم منظور کر کے ان کے حوالے کر دی۔

آل انڈیا ایجوکیشنل کانفرنس کا سالانہ جلسہ جو اس زمانے میں علی گڈھ میں ہوا تھا اس میں انہوں نے ایک تحقیقاتی مقالہ "کلیلہ ودمنہ" پر پڑھا انہوں نے بڑی محنت سے یہ پتہ چلایا تھا کہ یہ کتاب اصل میں کہاں سے نکلی کہاں کہاں گھومی کس کس زبان میں اس کا ترجمہ ہوا اور اس میں کیا کیا تبدیلی ہوتی گئی اور اصل سے موجودہ نسخے کتنے مختلف ہو گئے۔ وہ انگلستان میں جب کیمبرج کے پروفیسر ہو کر گئے تو الف لیلے کے متعلق بھی ایسی ہی تحقیقات شروع کی تھی مختلف نسخے اور وہ دوسری کتابیں جس میں الف لیلے کے حوالے یا اقتباسات تھے اور جن زبانوں میں الف لیلے کا ترجمہ ہوا سب اکٹھے کر لئے تھے جن کی تعداد سو سوا سو تھی۔ اس کے کام کو وہاں تو کر نہ سکے۔ ہندوستان آتے ہی جب وہ پردوئی میں مقیم ہو گئے تو ان کی ساری توجہ علی گڈھ کی طرف مبذول ہو گئی اور وہ مسلم یونیورسٹی کا کانسٹی ٹیوشن بنانے میں مشغول ہو گئے اور انہوں نے اس کے مرتب کرنے کے لئے یورپ اور مصر کی یونیورسٹیوں کے طریق کار انتظامی امور اور تعلیمی نصاب کا مطالعہ کیا۔ افسوس ہے کہ وہ زیادہ زندہ نہ رہ سکے۔ بہت ممکن تھا کہ جو کشمکش یونیورسٹی کے متعلق ہوئی اس میں بہت کمی ہو جاتی اور یہ تو مانی ہوئی بات تھی کہ وہی پہلے وائس چانسلر ہوتے۔ علی گڈھ پارٹی کے احرار اور استبدادی دونوں اُن پر بھروسہ کرتے تھے۔

تمدن ہند اور تمدن عرب ان کے دو بڑے شاہکار ہیں جو ان کے نام کو ہمیشہ زندہ رکھیں گے۔ ان دونوں کتابوں کا مصنف موسیو لیبان ہے۔ یورپ میں یہ دونوں کتابیں اس جید عالم و ماہر فن کی دماغ سوزی اور انتھک کاوشوں کی یادگار ہیں اور بڑی مستند ہیں۔ ان کتابوں کا ترجمہ انہوں نے اس طرح سے کیا کہ پہلے پورا پیراگراف پڑھ لیتے تھے پھر قلم اُٹھا کر اپنی زبانِ اُردو میں لکھنا شروع کر دیتے تھے اور پھر مجال نہیں کہ مصنف کا منشا فوت ہو جائے۔ ان ضخیم کتابوں کو پڑھتے وقت یہ محسوس ہی نہیں ہوتا کہ یہ کسی کتاب کا ترجمہ دوسری زبان سے اُردو میں ہے۔ انہیں ہند کے پرانے تمدن سے بڑی دلچسپی تھی۔ الورا کے مشہور غاروں کی جس میں بعض تو اس وقت مٹی میں دبے ہوئے تھے۔ بڑی چھان بین کی اور ان پر گائڈ کے طور پر ایک کتابچہ لکھا جس سے آئندہ چل کر ان لوگوں کو جنہوں نے پرانی یادگاروں کی تحقیق کی بڑی رہنمائی ہوئی۔ انہوں نے فارسی اور سنسکرت کی تعلیمی فوائد کا تقابل کیا اور اس پر ایک پیارا رسالہ لکھا۔ حیدرآباد کی اقتصادی حالت اور یہاں کے

معدنیات پر جو رسالہ انہوں نے لکھا اس کی افادیت ابھی تک قائم ہے کاش ان کے نواسے سعادت علی جو لوک سبھا کے ممبر ہیں اور پرائم منسٹر کے پارلیمنٹری سیکرٹری امور خارجہ ہیں اس رسالے کو اپنی ماں کی کتابوں میں سے ڈھونڈ کر ریسرچ ڈیپارٹمنٹ کے حوالے کردیں۔

مرحوم کو کتابوں کا بیحد شوق تھا۔ ان کی لائبریری ان کے ڈرائینگ روم سے زیادہ شاندار تھی اور بہت با زیب۔ انہیں کسی کتاب کے نکالنے میں دقت نہ ہوتی تھی بعض انگریز کتب فروشوں کو انہوں نے مستقل آرڈر دے رکھا تھا۔ یورپ کی کسی زبان میں اسلام کے مذہب یا تاریخ پر کتاب شائع ہوتے ہی ان کے پاس آ جاتی تھی بعض Periodicals کے وہ مستقل خریدار تھے۔ عام طور پر جن لوگوں کو کتابیں جمع کرنے کا شوق ہے وہ ان کو جان سے زیادہ عزیز رکھتے ہیں اور کسی کو ان کی ہوا بھی نہیں لگنے دیتے انہیں یہ عادت نہ تھی وہ جس کو اپنے سے زیادہ مشتاق دیکھتے اور اس کو قدردان بھی سمجھتے اپنی کتاب نذر کر دیا کرتے تھے چنانچہ مولانا شبلی کو کئی نادر کتابیں انہوں نے حوالے کردیں۔ سرسید جب آخری مرتبہ حیدرآباد آئے تو بشیر باغ میں سرکاری مہمان کی حیثیت سے ٹھہرے۔ سید علی صاحب ان کو اپنا کتب خانہ دکھانے کو لائے۔ سرسید کئی گھنٹوں تک ان کے نایاب ذخیرے کو دیکھتے رہے اور مختلف کتابوں پر گفتگو کرتے رہے ایک کتاب کو جو اسپین کے اسلامی دور کی باتصویر تاریخ تھی بہت تعریف کی اور کہا کہ ایسی کتاب تو ہمارے کالج کی لائبریری میں ہونا چاہئے تھی تاکہ ہمارے نوجوانوں کو ہماری عظمت معلوم ہو اور عبرت بھی ہو انہوں نے وہ کتاب نہایت خندہ پیشانی سے سرسید کے حوالے کر دی اور کہا کہ آپ سچ فرماتے ہیں ایسی نایاب کتاب ہماری قومی لائبریری ہی میں رہنی چاہیئے۔ انہیں جب کبھی موقع ملا انہوں نے نایاب کتاب کو اور نایاب بنانے کے لئے چھپا کر نہیں رکھا بلکہ اس کو شائع کرنے کی فکر کی۔ کہا جاتا تھا کہ تزک بابری کے اصلی ترکی زبان میں صرف دو نسخے تھے ایک روس کی لائبریری میں اور دوسرا فرانس کے کتب خانے میں۔ اس کا ایک نسخہ انہیں نواب سالار جنگ بہادر کے کتب خانے میں بھی نظر پڑا۔ جب وہ سنہ ۱۹۰۱ء میں حیدرآباد کو خیرباد کہہ کر انگلستان روانہ ہوئے تو اس نسخہ کو اپنے ساتھ لیتے گئے۔ نواب یوسف علی خاں سالار جنگ ثالث اس وقت نابالغ تھے اور ان کی ہر شے پر کورٹ آف وارڈس کی نگرانی تھی۔ سید علی صاحب کے مخالفین نے ان کے اس فعل کو بڑی رنگ آمیزی کے ساتھ پیش کر کے سرکار سے یہ حکم لے لیا کہ یا تو سید علی صاحب فوراً اس کتاب کو واپس کریں یا ان کے وظیفہ سے اس کی قیمت محسوب کرنا شروع کر دی جائے۔ جب اس حکم کی ان کو اطلاع ملی اس وقت تک یہ کتاب لندن کے قدیم کتابوں کے پرکھنے والوں کی نظر چڑھ چکی تھی اور گب میموریل فنڈ کے خرچ سے اس کی عکسی کاپیاں ہو چکی تھیں۔ مولوی صاحب نے اصل کتاب معہ ایک کاپی کے فوراً واپس کردی اور جواب میں لکھا کہ میرا مقصد اس کتاب کو ہتیانا نہیں تھا بلکہ سالار جنگ کے کتب خانے کا نام بڑھانا اور اس کتاب کو زندہ کرنا تھا۔ اور اس میں میں کامیاب ہو چکا۔ کیمبرج یونیورسٹی میں ان کی جو عظمت و توقیر تھی اور ان کی پرانے ادب کے ساتھ دلچسپی کی جو شہرت تھی اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ کیمبرج کی لائبریری میں ایک پرانی کتاب "الوصایا" تھی۔ اس قلمی نسخے پر شہاب الدین خفاجی اور امام عبدالقادر کی مہر تھی۔ وہ اس قدر بوسیدہ ہو گئی تھی کہ اس کا فوٹو لینا ضروری ہو گیا۔ اس کے سب فوٹو تقسیم ہو چکے تھے۔ صرف ایک اُن پروفیسر صاحب کے پاس رہ گیا تھا جن کا اس سبجکٹ سے تعلق تھا۔ سید علی صاحب سے جب اس کتاب کا تذکرہ آیا تو انہوں نے یہ کہہ کر کہ آپ اس کے مجھ سے زیادہ مستحق ہیں یہ کاپی ان کے نذر کر دی۔ انہیں مصر کی پرانی تاریخ پر ایک نایاب کتاب ہاتھ آگئی۔ انہوں نے اس کے حصے رائل ایشیاٹک سوسائٹی کے جرنل میں طبع کرانا شروع کر دیئے۔ انہوں نے کلام پاک کا ایک ایسا انڈکس بنوانا چاہا کہ جس کے ذریعہ سے ہر موضوع پر جو آیت جس سورت میں ہو آیت اور سورت کے حوالے سے مل سکے۔ اسی طرح سے انہوں نے عربی مصنفین کا نام وار ایک انڈکس حیدرآباد ہی میں بنوانا شروع کیا تھا۔ جس سے ہر مصنف کی تحقیقات کا پتہ چل سکے۔ ان دونوں کو ان کا ارادہ بیروت میں طبع کرانے کا تھا مگر یہ کام بھی جوں کا توں ہی رہ گیا۔

فطرت کا یہ اٹل عمل ہے کہ بچہ جس ماحول میں پرورش پاتا ہے۔ اس کا اثر غیر شعوری طور پر اس کے عادات و خصائل پر ضرور پڑتا ہے۔ سید علی اپنے وطن بلگرام سے دور ایک بڑے عہدہ دار کے گھر میں پیدا ہوئے تھے۔ ۱۸۵۸ء کی شورش فرو ہو جانے کے بعد جب ان کی عمر چھ سات برس کی تھی یہ دیکھا کہ ان کے چچا کی بڑی آؤ بھگت ہوتی ہے۔ اور ان کو آرہ گیریژن برس کا ہیرو اور بچانے والا کہا جاتا ہے۔ وہ جس اسکول میں پڑھتے اس کے دروازے بعض خوشحال خاندانوں کی اولاد پر کھلے ہوئے تھے۔ ایسے میں انہیں اپنی خاندانی وجاہت کا احساس پیدا ہونا لازمی تھا پھر ان کے اس احساس برتری پر ان کی اسکول کالج اور یونیورسٹی میں نمایاں کامیابیوں نے سونے پر سہاگے کا کام دیا۔ بعض لوگ جو ان کے زمانے میں ان کے گھر کے چکر کاٹتے تھے ان کے جانے کے بعد یہ کہنے لگے کہ "ان پر جب دولت و جاہ غالب تھی" وہ اُن کی فیاضیوں پر بھی یہ کہہ کر پردہ ڈالنا چاہتے ہیں کہ اکثر ان سے وہی متمتع ہوتے جو چلتے پرزے ہوتے یا اُن کی شہرت میں مدد دیتے۔ چونکہ انہیں تنگدستی کا منہ دیکھنا پڑا تھا اور لہو و لعب میں نہیں پڑے تھے اس لئے ان کے پاس اتنا تھا کہ جو ان کو دو چار بار مدد کے لئے گھیرے اس کو کچھ نہ کچھ دے کر ٹال دیں۔ جن اشخاص کی انہوں نے مدد کی اس میں علماء مصنفین اور طلباء تھے۔ ان بلند حوصلہ امداد پر یہ گمان کرنا کہ وہ نقد و کتب علماء کو اس وجہ سے دے دیتے کہ ان کا نام ہو مہمل سی بات ہے۔ اگر انہیں نام و خطاب و شہرت کی خواہش ہوتی تو اپنی خودداری سے ان راستوں کو اپنے اوپر بند نہیں کر لیتے جو خطاب دیتے والوں کے محلوں اور کوٹھیوں کی طرف جاتے ہیں۔ جب وہ اپنی ادبی صحبتوں میں مصروف ہوتے تو ان کے گھر پر بڑے سے بڑا آئے اس نے لئے اس صحبت کو چھوڑ کر ڈرائینگ روم کی طرف کبھی نہیں بڑھے۔ البتہ وہ اچھا کھاتے تھے اچھا پہنتے تھے اچھے مکان میں رہتے تھے۔ ان کا اخلاق وسیع تھا مگر بڑے درباروں میں جبیں سائی ان کو نہ آتی تھی۔ کوئی نہ کوئی مہمان ان کے یہاں آتا ہی رہتا تھا۔ امریکن ہو یا یورپین، ترکی ہو یا مصری ان کے پاس ضرور آتا اور ان سے فرنچ زبان میں گفتگو کا لطف اٹھاتا۔ ان کی بیگم صاحبہ خیر مجسم تھیں۔ تمام عمر شوہر سے ان کی اور انہوں نے شوہر کی رضا جوئی کو مقدم سمجھا۔ اپنے شوہر کے مہمانوں کے لئے عمدہ عمدہ کھانے اپنی نگرانی میں پکواتیں۔ کیمبرج میں بھی ان کے ساتھ گئیں۔ ہندوستانیوں کو جو وہاں آتا ہندوستانی کھانا کھلا دیتیں۔ اس زمانے میں جو طلباء تھے آج تک ان کو محبت و احترام سے یاد کرتے ہیں۔ مگر نہ ہندوستانی لباس چھوڑا نہ خاندانی رسم و رواج ترک کیا جس طرح حقہ یہاں پیتی تھیں وہاں بھی پیا کیں۔ سید علی صاحب جب تک حیدرآباد میں برسر خدمت رہے۔ جہاں اہل غرض نے ان کو گھیرا وہ اس کی مدد کر دیتے تھے اور سفارش کرنے سے دریغ نہ کرتے تھے۔ بعض وقت تو اس بارے میں وہ حد سے زیادہ بڑھ جاتے تھے۔ مولوی خدابخش خاں جن کی پٹنے میں لائبریری مشہور ہے۔ وہاں وکالت کرتے تھے درجہ دوم کی سند تھی۔ حیدرآباد میں ایک مقدمے کے سلسلے میں آئے سید علی صاحب اور ان کے والد دونوں سے ان کی ملاقات تھی اسی وجہ سے وہ مولوی صاحب کے یہاں ٹھہرے ہوئے تھے۔ انہوں نے خواہش کی کہ اگر یہاں ان کو درجہ اول کی سند مل جائے تو اچھا ہے۔ سید علی صاحب نے کہا کہ یہ کیا بڑی بات ہے اور مولوی میر افضل حسین صاحب چیف جسٹس کے پاس گئے اور پرانے تعلقات جو ان کے خاندان کے مولوی خدابخش سے تھے وہ بھی بیان کئے میر صاحب نے ان کو سوکھا جواب دے دیا جب مولوی خدابخش خاں صاحب کو یہ علم ہوا تو ان کو افسوس ہوا اور سید علی صاحب سے معذرت چاہی کہ آپ کو میری وجہ سے ایسا جواب سننا پڑا۔ سید علی صاحب نے کہا کہ نہیں مولوی صاحب میں آپ کو ایک نہ ایک دن یہاں کا میر مجلس کرا کر رہوں گا۔ چنانچہ جب وقار الامراء کا دور شروع ہوا تو مولوی خدابخش میر مجلس ہو کر ہی رہے۔ نواب سر عقیل جنگ بہادر کہتے تھے کہ میں حیدرآباد سے بیزار ہو کر بمبئی جانے والا تھا۔ ملازمت کے وعدے تو بہت سے ہوتے مگر پورا ایک بھی نہیں ایک دن میں اپنے چچا سید علی صاحب سے ملنے گیا اور ان کی دریافت پر کہا کہ کل بمبئی جا رہا ہوں انہوں نے کہا کیوں۔ سید عقیل نے کہا کہ میں بمبئی میں جا کر خود نوکری تلاش کروں گا۔ انہوں نے کہا کہ ایک دن اور ٹھہر جاؤ اگر تم کو ملازمت نہ ملے تو یہاں مل آئے چلے جانا۔ کل صبح بیگم پیٹھ میں مجھے وقار الامراء کی ڈیوڑھی پر ملو۔ چنانچہ صبح میں گیا۔ چچا بھی آ گئے

اور اطلاع کرنے کے لئے اے ڈی سی سے کہا اس نے کہا کہ نواب صاحب آج کسی سے نہیں ملیں گے۔ انہوں نے حکم دیا ہے کہ کسی کی اطلاع مت کرو۔ سید علی صاحب نے کہا کہ آپ میری ذمہ داری پر جا کر اطلاع کیجئے کہ نہایت ہی اہم کام ہے۔ سر وقار الامراء کپڑے پہن کر آفس کے کمرے میں برآمد ہوئے اور سید علی صاحب کو بلوایا۔ آپ گئے اور میرے نوری تقرر کے متعلق ہوم تعلقداری کا ان کو جو درج ملا دیا جائے حکم لکھا دیا۔ سر وقار الامراء نے چچا سے شکوہ کیا کہ آپ نے بلاوجہ مجھے آج تکلیف دی انہوں نے کہا کہ آپ کے لئے تو مزید وزا سی بات ہے لیکن میرے لئے مقبل کا اس طرح چلا جانا تو معمولی بات نہیں۔ ان میں یہ کمزوری ضرور تھی کہ کانوں کے بڑے کچے تھے۔ جدا کسی طرف سے کسی نے کچھ ایسا لگا دیا جس میں ان کی شکی متصور ہو فوراً بگڑ جاتے مگر جب بیچ وادن کی چالاکی کھل جاتی تو صاف بھی ایسے ہو جاتے تھے کہ گویا کبھی دل میں ملال آیا ہی نہ تھا۔

مرزا مہدی خاں کوکب جنہوں نے تمدن یورپ۔ ہندسۂ جدید اور نیچرل فلاسفی ایسی کتابوں کو اُردو کا جامہ پہنایا تھا۔ سید علی مرحوم کے ساتھ انگلستان میں بھی تھے۔ معدنیات کی تحقیقات میں رات دن ساتھ رہنا پڑا۔ پھر دونوں میں قربت اس طرح سے بھی ہو گئی تھی کہ مرزا مہدی خاں کے چھوٹے بھائی ڈاکٹر کریم خاں (نواب خدیو جنگ) کے ساتھ سید علی صاحب کی بھتیجی طیبہ بیگم کی شادی بھی ہوئی تھی۔ مرزا صاحب سید علی مرحوم کا ذکر بڑی حسرت کے ساتھ کیا کرتے تھے ان کی نظر میں مرحوم کی سب میں بڑی خوبی یہ تھی کہ اپنے ہم عصر علمی خدمات کرنے والوں سے نہ رشک کرتے تھے نہ حسد۔ بلکہ ان کا دل بڑھاتے تھے اپنی کتابیں مستعار دے دیتے تھے جن میں سے بعض تو پھر ان تک واپس پہنچی بھی نہ تھیں۔ بعض وقت ان میں آرام طلبی عود کر آتی تھی۔ ایک کام میں لگے لگے یکایک ان کی طبیعت اُچاٹ ہو جاتی تو اسے چھوڑ کر دوسرے کام میں متوجہ ہو جاتے۔ محنتی و جفاکش نہ تھے۔ مذہبی بحث عامیانہ ہو یا عالمانہ پسند نہیں کرتے تھے۔ ایّام عزا کا احترام کرتے تھے۔ اسلام سے واقف اور سچے مسلمان تھے۔ چونکہ انہوں نے تنگ دستی کا منہ نہ دیکھا تھا اس لئے روپیہ کی قدر نہ کرتے تھے۔ امیرانہ زندگی بسر کرتے تھے۔ وہ اپنے بڑے بھائی کی طرح خاموش طبیعت اور خاموش بیٹھنے والے نہ تھے۔

سید علی صاحب مرحوم اپنے آباؤ اجداد کی طرح مذہباً شیعہ تھے۔ ان کی پالیسی مرنجان و مرنج کی تھی۔ علمی گفتگو خواہ مذہبی ہو یا تاریخی انہی سے کرتے تھے جن کو ان کا اہل جانتے تھے مگر مناظروں سے دُور بھاگتے تھے۔ ان کی نظر میں مذہب اخلاق کی ایک ایسی زندہ طاقت تھا جس کا اظہار انسان کے اخلاقی کمال میں متواتر ہوتا رہتا ہے ان کے خیال کے مطابق انسان جو کچھ جانتا ہے اور جو نہیں جان سکا اس کے درمیان جو اعلیٰ ترین اتحاد پایا جاتا ہے اس کے احساس اور علم کا نام مذہب ہے۔ مذہب یہ ہے کہ محدود ارادت کو غیر محدود مشیّت کے تابع کر دیا جائے۔ ان کو یہ دیکھ کر افسوس ہوتا تھا کہ اسلام کی عالمگیر تہذیب مسلمانوں کے ہاتھوں بدنام ہو رہی ہے۔ جب وہ کیمبرج کی پروفیسری سے علٰحدہ ہو کر واپس آئے تو اس کے کچھ دن پہلے ہی نواب وقار الملک اور سر جان ہیوٹ لفٹنٹ گورنر صوبہ آگرہ و اودھ کے درمیان انگلش اسٹاف کے علی گڈھ کالج میں اختیارات و اقتدار کے متعلق سخت جھگڑا چل رہا تھا اور حقیقت میں اسی کے باعث شیعہ کالج بنانے کی تجویز پیدا کرائی گئی تھی۔ جب ان سے یہ تمام اندرونی باتیں بیان کی گئیں تو انہوں نے اس تحریک کو نہایت بدبختیانہ کہا۔ ایک دفعہ مجھ سے فرمانے لگے کہ تمہیں معلوم ہے کہ علی گڈھ کالج میں صرف ایک ہی مسجد کیسے بنی۔ جب سر سید اقامت خانے کالج کلاسوں اور دوسرے ہالوں کا نقشہ تیار کرا رہے تھے تو بورڈنگ کے احاطہ میں دو مسجدیں بنوانا چاہتے تھے میرے بھائی نے اس کی سخت مخالفت کی اور سید صاحب سے کہا اگر آپ ہی شیعہ سنی طلباء سے ایک مسجد میں نماز نہ پڑھوا سکے تو جب یہ یہاں سے تعلیم پاکر نکلیں گے تو آپ کے مشن کا کیا حال ہوگا۔ سر سید نے فوراً ہی دو مسجدوں کا ارادہ ترک کر دیا۔ لکھنؤ کے ایک ان کے بڑے بارسوخ دوست نے انہیں آل انڈیا شیعہ کانفرنس کی صدارت کے لئے لکھا کہ آپ شیعہ ہیں، عالم ہیں، صاحب مال و جاہ ہیں اس

عہدے کو قبول کرکے شیعہ قوم کی رہنمائی کیجئے۔ آپ نے جواب میں لکھا کہ میں شیعہ ضرور ہوں مگر عالم نہیں طالب علم ہوں۔ مالدار نہیں ہوں البتہ ذراعت سے کھا پی لیتا ہوں۔ میں اس قسم کی کانفرنسوں کو پسند نہیں کرتا۔ مسلمانوں کے لئے ایک آل انڈیا ایجوکیشنل کانفرنس موجود ہے
ان کی طبیعت دو کھی پھیکی نہ تھی مزاج میں مزاح بھی تھا۔ اجمیر میں خواجہ صاحب کی درگاہ میں فاتحہ پڑھنے کے لئے وہ جا رہے تھے۔ درگاہ میں داخل ہوتے ہی موٹی آسامی دیکھ کر مجاوروں نے انہیں گھیر لیا انہوں نے کہا مجھے کیوں گھیرتے ہو میں تو وہابی ہوں۔ مولوی عبدالحق صاحب بیان کرتے تھے کہ ایک دفعہ وہ مولانا شبلی۔ ظفر علی خاں (ایڈیٹر زمیندار) وغیرہ ان کے یہاں بیٹھے ہوئے تھے مولانا شبلی نے سید علی صاحب کو مخاطب کرکے کہا کہ عبدالقادر جیلانی نے کوئی کتاب شیعوں کے خلاف نہیں لکھی تو شیعوں کو حضرت کے ساتھ اتنی عداوت کیوں ہے سید صاحب نے جواب دیا کہ کتاب لکھنے نہ لکھنے کا سوال نہیں ہے انہوں نے ہماری آدھی سلطنت چھین لی مولانا نے کہا کہ وہ کیسے انہوں نے جواب دیا کہ اگر وہ نہ ہوتے تو سب ہمارے اماموں ہی کی پرستش کرتے۔ اگر اس طرح آپ کی سلطنت چھن جاتی تو آپ کیا کرتے۔ ایک مولوی صاحب نے آپ سے ایک کمیاب کتاب نقل کرنے کو مانگی مروّت کے مارے انکار تو نہ کیا کتاب نکالی اور یہ کہہ کر دینے لگے کہ کتاب تو نایاب ہے مگر جلد سؤر کے چمڑے کی ہے۔ مولوی صاحب نے لاحول ولا قوۃ کہہ کر ہاتھ کھینچ لیا۔ آپ تمدّن ہند کا ترجمہ کر رہے تھے ایک دن کچھ دوستوں کو ٹرا ریڈین قوم کا حال سنانے لگے ایک صاحب نے کہا کہ کیا یہ قوم باقی ہے۔ اس صحبت میں ایک بدہیئت پختہ رنگ مولوی صاحب بھی اتفاق سے موجود تھے مسکرا کر ان کی طرف اشارہ کر دیا۔

گرمیوں کا زمانہ تھا۔ ۳ مئی ۱۹۱۱ء کی رات میں کھانا کھانے کے بعد وہ اپنے ہردوئی کے مکان میں ٹینس کورٹ پر بیٹھے ہوئے اپنی بہن فاطمہ بیگم ، بیگم صاحبہ اور .. .. اپنی بچی رقیہ بیگم اور اپنی بہن کی لڑکی سے ہنس ہنس کر باتیں کر رہے تھے کہ ہوش بلگرامی کے الفاظ میں :-

"آسمان سے ملک الموت بن کر ایک تارہ ٹوٹا جس کی روشنی سے سب کی
آنکھیں چکا چوند ہو گئیں مگر ان کے پلک جھپکاتے ہی ان کی حرکتِ قلب بند
ہو گئی۔ جو اعزا چند منٹ پہلے اپنے فخرِ خاندان سے ہنس بول رہے تھے
وہ چیخ چیخ کر رونے لگے جو گھر ابھی عشرت کدہ بنا ہوا تھا وہ ماتم کدہ بن گیا۔"

منشی سجّاد حسین

(ایڈیٹر اودھ پنچ)

ممتاز حسین جونپوری

منشی سجاد حسین ۱۸۵۶ء میں پیدا ہوئے، یہ وہی سنہ ہے جس میں اودھ کے ادب نواز اور مظلوم فرماں روا جان عالم واجد علی شاہ کے ساتھ ایک سنجیدہ مذاق کیا گیا اور انگریزوں نے انہیں کسی قصور کے بغیر تاج و تخت سے محروم کرکے مٹیا برج میں قید کردیا۔ ان کے جانے سے لکھنؤ کی بساطِ سخن ہی اُلٹ گئی اور بڑے بڑے ادیبوں اور شاعروں کا شیرازہ بکھر کے رہ گیا۔ جو تھوڑی بہت کسر رہ بھی گئی تھی وہ ایک برس بعد غدر کے ایسے نے پوری کردی۔

یہ تھا وہ سیاسی پس منظر جس میں "اودھ پنچ" کے ہونے والے ایڈیٹر منشی سجاد حسین نے آنکھ کھولی۔ جہاں تک ادبی فضا کا تعلق ہے۔ اس وقت اُردو زبان نئے نئے خیالات کو اپنا چکی تھی اور اس پر انگریزی اثرات نمایاں ہو چکے تھے۔ انگریزی کتابوں اور اخبارات کی اشاعت نے ادبی حلقوں پر فکر و نظر کی راہیں کھول دی تھیں۔ منشی سجاد حسین نے اسی فضا میں پرورش پائی اور بڑے ہوئے ماحول سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔

ان کے مورث اعلیٰ یوں تو بارہ بنکی کے مشہور اور مردم خیز قصبہ دیوہ شریف سے تعلق رکھتے تھے لیکن آب و دانہ کی کشش انہیں کاکوری شریف کھینچ لائی تھی۔ یہ دونوں بہت پرانی اسلامی بستیاں ہیں اور اسلامیان ہند کے لئے یکساں باعث عقیدت و احترام۔ منشی سجاد حسین ایک اونچے اور معزز گھرانے سے تعلق رکھتے تھے، ان کے والد شیخ مقصود علی ڈپٹی کلکٹر اور ماموں نواب فدا حسین لکھنؤ کے بڑے نامی وکیل تھے جو بعد میں ریاست حیدرآباد کی عدالت العالیہ کے چیف جسٹس ہو گئے تھے۔ منشی صاحب نے ابتدائی تعلیم لکھنؤ میں اپنے ماموں کے پاس ہی پائی اور اُردو فارسی پر عبور کے علاوہ عربی میں بھی شدبد حاصل کی۔ اس زمانے میں لکھنؤ ہزار اجڑ چکا تھا لیکن شرفاء کے خاندانوں میں بڑی ٹکسالی زبان بولی جاتی تھی۔ بیگمات کی زبان اور محاورات مستند تھے چنانچہ منشی سجاد حسین کو بچپن ہی سے اچھی زبان سیکھنے اور اچھی اُردو پڑھنے کا موقع ملا اور یہی وجہ تھی کہ وہ جوانی ہی میں زبان کے زبردست محقق تسلیم کئے جانے لگے۔ ان کی طبیعت شروع

ہی سے بڑی چلبلی تھی۔ پرانے زمانے کے مولوی طلبا ان کی شرارت و شوخ طبعی کے سلسلے میں کیا کہتے تھے۔ یہ اکثر اپنے استادوں کو سبق پڑھنے اور یاد کرنے میں جل دے جایا کرتے تھے۔

۱۸۷۳ء میں انٹرنس کا امتحان پاس کر کے اور کالج میں ایف اے تک پڑھ کے بھاگ نکلے اور فیض آباد میں نوجوانوں کو اردو پڑھانے پر مقرر ہو گئے۔ لیکن جلد ہی گورا شاہی انداز اور فوجیوں کی صحبت سے دل اچاٹ ہو گیا اور لکھنؤ کی یاد ستانے لگی۔ آخر کار ایک دن نوکری پر دو حرف بھیج کر گھر چلے آئے۔

مضمون نویسی کا شوق بچپن ہی سے تھا اور بلا کے ذہین اور ہنس مکھ اور بذلہ سنج بھی تھے چنانچہ دوسری نوکری کا خیال ترک کر کے بدایوں کے منشی محفوظ علی (ڈپٹی کلکٹر) جیسے نقاد ادیب کے ڈھارس اور دم و امے دینے پر لندن کے ظرافتی اخبار "پنچ" کی طرز پر ۱۸۷۷ء میں لکھنؤ سے ہفت روزہ "اودھ پنچ" نکالا اور اسے چلانے کے لئے "شام اودھ" کے نام سے ایک چھاپہ خانہ بھی قائم کیا۔ اس زمانہ میں ان کا قیام کچھ عرصہ لکھنؤ کے محلہ بیرونی خندق میں رہا پھر گولہ گنج منتقل ہو گئے۔

یہ وہ دور تھا جب کہ سودا کی بھونڈی ظرافت اور سید انشاء کے چٹکلوں کی جگہ یورپ کا مذاق لکھنؤ کی محفلوں میں بار پا رہا تھا لیکن ابھی پرانا رنگ بالکل مفقود نہیں ہوا تھا۔ اردو محاورات اور ہنسنے ہنسانے والے ادب کا چشمہ لکھنؤ کے چپے چپے سے ابل رہا تھا اور سودا سلف بیچنے والے گلی گلی تشبیہ اور استعارے سناتے پھرتے تھے خریداروں کو پھانسنے کے لئے اب بھی ککڑیوں کو لیلیٰ کی انگلیاں اور مجنوں کی پسلیاں یا گنڈیریوں کو قلاقند اور برفی کی ڈلی کہہ کر لفظوں کی کمند پھینکی جاتی تھی۔ چائے فروش بھی مزاح و ظرافت کی دوکان لگائے سخن سنجوں کی تاک میں بیٹھے رہتے تھے۔

یہ تھا اس زمانے کا لکھنؤ جب منشی سجاد حسین نے ظرافت کا نیا معیار پیش کیا اور ظرافتی ادب میں ایک نئی طرح ڈالی۔ انہوں نے مزاح کے پردے میں زبان اور محاورات کی اصلاح پر سارا زور قلم صرف کر دیا اور اسی کوشش میں اخلاق اور سیاسی مقاصد کو بھی فراموش نہ کیا۔ اس لحاظ سے انہیں ایک ایسے سپاہی سے تشبیہ دی جا سکتی ہے جس نے اپنے قلم سے جہاد کیا اور ملک کی آزادی اور قوم کی فلاح کے لئے مذاق ہی مذاق میں وہ کچھ کر دکھایا جو بڑے بڑے سیاسی لیڈروں سے نہ ہو سکا تھا۔

منشی سجاد حسین کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے ایک ایسی ادبی اقلیم میں ظرافت کا اعلیٰ معیار قائم کیا جہاں جرکین اور جان صاحب کا سکہ رائج تھا۔ منشی سجاد حسین نے مذاق اور ظرافت میں سنجیدگی اور توازن پیدا کیا اور اس سے بھی زیادہ یہ کہ ملک کے گوشے گوشے سے چوٹی کے مزاح نگار شاعروں اور ادیبوں کو ڈھونڈ کر انہیں دنیا سے روشناس کرایا۔

"اودھ پنچ" کے سماجی، سیاسی، اقتصادی، علمی اور ادبی مضامین نے دیکھتے دیکھتے معاشرے میں انقلاب برپا کر دیا اور ملک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک ہلچل سی مچ گئی، یہاں تک کہ اکبر الٰہ آبادی بھی "اودھ پنچ" کے جادو سے محفوظ نہ رہے وہ اس وقت تک قصبۂ کڑا کے مشہور استاد وحید مرحوم سے سنجیدہ غزلوں پر اصلاح لیتے تھے لیکن "اودھ پنچ" ہی کے زیر اثر پرانا خرقہ و جبہ دور پھینک اور دقیانوسی رنگ تغزل چھوڑ کر دریائے ظرافت میں غوطہ زن ہو گئے۔

اکبر مرحوم کا پہلا منظوم خط ۱۸۷۷ء ہی کے اودھ پنچ میں شائع ہوا۔ جس میں انہوں نے بڑے پرجوش طریق پر "اودھ پنچ" کا خیر مقدم کیا تھا۔ اسی کے بعد انہوں نے ظرافت کا چولا پہنا۔ اکبر مرحوم اودھ پنچ کے لئے نثری مضامین بھی لکھتے تھے۔ جو کبھی ان کے اپنے نام سے اور کبھی فرضی ناموں سے شائع ہوتے تھے۔ اودھ پنچ میں شائع ہونے والا اکبر کا منظوم خط بعد میں ان کے دیوان میں بھی شامل کیا گیا اور اسے کسی شک و شبہ کے بغیر اکبر کی ظریفانہ شاعری کا سنگ بنیاد کہا جا سکتا ہے۔

منشی سجاد حسین کے دوستوں اور نامی ظرافت نگاروں میں سے بہتوں کو میں نے بھی دیکھا ہے۔ ان میں خدا بخشے نواب آزاد، مرزا مچھو بیگ ستم ظریف، سید اکبر حسین جج، پنڈت تربھون ناتھ سحر، منشی احمد علی شوق، پنڈت رتن ناتھ سرشار، منشی احمد علی کسمنڈوی۔ اور بابو جوالا پرشاد برق کے علاوہ اودھ پنچ کے بہت اچھے اور پرانے لکھنے والوں میں خان بہادر سید محمد ہادی کلکٹر اور ہمارے استاد بیڈ ماسٹر منشی ہرسرن داس بی اے بھی شامل تھے۔

بہت عرصہ گزرا میرٹھ سے ایک اخبار "طوطئ ہند" نکلتا تھا۔ اس سے اور "اودھ پنچ" سے بڑی نوک جھونک رہتی تھی۔ دونوں اخباروں کی علمی اور ادبی جنگ میں بابو ہرسرن داس نے بھی بڑا حصہ لیا۔

"اودھ پنچ" گو ایک فکاہی رسالہ تھا لیکن ملک کے سیاسی اور سماجی رجحانات اور معرکہ آرائیوں سے بے خبر نہ تھا۔ یو پی میں اس اخبار کو کانگرس کا چراغ تصور کیا جاتا تھا اور صوبے کے جن گوشوں میں کانگریس کا گزر نہ تھا وہاں یہی چراغ لوگوں کی ذہنی راہنمائی کرتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ہمارے عزیز دوست پنڈت برج نارائن چکبست کے علاوہ بڑے بڑے جغادری کانگریسی لیڈر منشی سجاد حسین کے مداحوں، قدردانوں اور قریبی دوستوں میں شامل تھے۔ چکبست نے سچ کہا ہے کہ "اودھ پنچ نے اردو اخبار نویسی کی تاریخ میں اخبار کو محض تجارت کا ذریعہ نہیں سمجھا بلکہ مغربی اصولوں کی بنا پر صحافت کا ایک معیار قائم کیا ہے۔

اودھ پنچ ظرافت کا سرچشمہ تھا اور عام طور پر لوگ منشی سجاد حسین کی تحریر اور لطیفوں سے بڑا لطف اٹھاتے تھے۔ جو پھبتی یا لطیفہ "اودھ پنچ" میں شائع ہو جاتا وہ مہینوں لوگوں کی زبان پر رہتا اور ملک کے ہر گوشے میں پھیل جاتا تھا۔

اکبر الٰہ آبادی اور ظریف لکھنوی انیسویں اور بیسویں صدی کے بہت بڑے اصلاحی شاعر اور ظرافت نگار ہیں۔ ان میں سے ظریف کو ان کے بڑے بھائی صفی لکھنوی کے کہنے پر منشی سجاد حسین ہی نے ظرافت نگاری کے داؤں پیچ بتائے اور اصلاح تخیل و ادب اور سیاست وغیرہ میں جنگ و پیکار کے لئے تیار کیا۔

اردو صحافت میں کارٹونوں کے ذریعے اظہار خیال اور حالاتِ حاضرہ پر روشنی ڈالنے کی بنا بھی منشی سجاد حسین ہی نے ڈالی وہ "لندن پنچ" پڑھتے وقت مصور کو پاس بٹھا لیتے اور اسے "لندن پنچ" کی تصویریں دکھا کر کارٹون کے رمز بتاتے جاتے تھے۔ کبھی لندن پنچ کے خاکوں ہی میں کانٹ چھانٹ کر لیتے اور کبھی نیا خاکہ بنانے کی ہدایت کرتے تھے، اور یہی تعلیم وہ اپنے بعد ہونے والے ایڈیٹر شیخ ممتاز حسین کو بھی دے گئے۔

منشی سجاد حسین کا جسم دوہرا، قد میانہ، رنگ گندمی اور چہرہ گول تھا۔ چہرے پر مونچھیں اور بڑی بڑی داڑھی بھی موجود تھی۔ ان کے یہاں اکثر بے تکلف دوستوں کا جمگھٹا رہتا تھا۔ منشی سجاد حسین کا مزاج حالی کی نثر سے بھی زیادہ سادہ تھا۔ عام طور پر شیروانی اور پرانے زمانے کی فیلٹ پہنتے تھے، پاجامہ کبھی چھوٹے پائنچوں کا ہوتا تھا کبھی بڑے کا۔ چہرے سے شگفتگی برستی تھی۔ لہجے میں نرمی اور مٹھاس تھی۔ بات چیت کے کھرے تھے اور اپنی گوناگوں خوبیوں کے باعث ہر فرقے اور طبقے میں یکساں مقبول تھے۔

ایک بار ایک اخبار کے ایڈیٹر پر مقدمہ چلا۔ یہ صفائی کے گواہ تھے۔ مستغیث کے وکیل نے پوچھا کہ کل کی گواہی کے بعد جب آپ استغاثے کے وکیل سے ملے تو کیا باتیں ہوئیں، انہوں نے کہا جانے دیجئے یہ نہ پوچھئے۔ وکیل صاحب نے جواب دینے پر اصرار کیا تو کہنے لگے "آپ کے متعلق فرماتے تھے کہ ایسا ایسا بیوقوف بنایا ہے کہ بایدوشاید" ساری عدالت ہنس پڑی اور وکیل صاحب شرما کے بیٹھ گئے۔

منشی سجاد حسین بڑے نڈر، مستقل مزاج اور قانع انسان تھے۔ روپے پیسے کی ذرا بھی پروا نہ کرتے تھے۔ جو کچھ لکھتے سچائی اور دلیری سے لکھتے تھے۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ انہوں نے ایک ریاست کی بدنظمی کے متعلق پے در پے مضامین لکھے۔ اس ریاست میں ان کے کچھ عزیز بھی اچھے عہدوں پر فائز تھے۔ چنانچہ انہیں بھی ایک اعلیٰ عہدہ پیش کر دیا گیا لیکن وہ صاف انکار کر گئے اور اپنے مسلک سے ذرا بھی انحراف گوارا نہ کیا۔

منشی سجاد حسین بڑے پکے کانگریسی اور کانگریس کے بڑے جوشیلے رکن تھے۔ ۱۸۸۵ء میں نیشنل کانگریس میں شامل ہوئے تھے اور ۲۲ جنوری ۱۹۱۵ء تک مرتے دم تک اس کے ممبر رہے۔ ان کے کانگریسی دوستوں میں بڑے بڑے ادیب اور اردو کے پرستار شامل تھے جن میں پنڈت بشن نارائن و بابو گنگا پرشاد ورما مالک و مدیر "اخبار" اودھ کے نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ اس کے علاوہ مہاراجہ سر علی محمد خان مرحوم والیٔ ریاست محمود آباد ان کے بڑے مخلص قدردان تھے۔ منشی سجاد حسین اور "اودھ پنچ" نے ایسے نازک وقت میں کانگریس کی مدد کی اور اس کے مقاصد کی نشر و اشاعت میں خم ٹھونک کر حصہ لیا جبکہ انگریز راج اپنی بھرپور جوانی پر تھا۔ اور کوئی آزادی کا خواب بھی دیکھنے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔ چند گنے چنے افراد کے سوا ملک کا ہر شخص غلامی پر قانع اور مطمئن تھا۔ اور لکھنؤ میں تو کانگریس کی مخالفت میں ایک باقاعدہ "انجمن اینٹی کانگریس" کے نام سے کام کر رہی تھی۔ منشی سجاد حسین اور ان کے ساتھیوں نے جم کر مخالف عناصر کا مقابلہ کیا۔

۳۰ دسمبر ۱۸۹۹ء کو لکھنؤ میں کانگریس کا جلسہ ہونے والا تھا۔ اس کے مقابلہ میں اینٹی کانگریس والوں نے بھی ایک جلسے کا اعلان کر دیا اور ایک اشتہار شائع کیا جس میں لوگوں سے شرکت کی اپیل کی گئی تھی۔ اس اشتہار میں کہیں بدقسمتی سے "متعلقین" کا ذکر آ گیا تھا اس پر منشی سجاد حسین نے "اودھ پنچ" میں "اندھے سیچے والی جیل چلپھار" کے عنوان سے ایک ایسا چٹ پٹا مضمون لکھا کہ بچارے مخالفوں کو لینے کے دینے پڑ گئے۔

اینٹی کانگریس والوں نے لکھا تھا "اس جلسے میں گورنمنٹ کے خیرخواہ اپنے اعزا، اقربا، احباب اور متعلقین کے ساتھ شرکت فرمائیں"۔

جواب میں منشی سجاد حسین کے مضمون کی چند سطریں ملاحظہ ہوں ——

"اس نیازمند کو پوچھنا ہے کہ مخالفین کانگریس کے متعلقین کو جو تکلیف دی گئی ہے اس کا انتظام کیا فرمایا گیا ہے کیونکہ اینٹی بھائیوں سے کچھ بعید نہیں کہ کنجڑوں کی طرح معہ متعلقین جلسے میں آ موجود ہوں۔

"مشتہرین جانتے ہوں گے کہ متعلقین بی گھر بسی، لڑکوں کی والدہ، بیگم خانم صاحبہ یعنی جورو جی مینی ندوجہ معظمہ طال اللہ پانچھا و آنچل الدوپٹہا کو کہتے ہیں، جس طرح تھیٹر گھوڑ دوڑ کے جلسوں میں اکثر اتفاق ہوتا ہے یہاں بھی یہ آ دھمکیں گی اور جب سارا گھر شریک ہوگا تو ضرورت کا سامان بھی ہمراہ ہوگا جو یہیں پیش خدمتیں، شیرخوار بچہ (جس کے ابھی ٹیکہ لگا ہوگا) پھر اس کا گہوارہ، پالنا، حسینی "انا"، چھوچھو، بکری کا بچہ۔ چند خرگوش، مینی چوہے، طوطے کا پنجرا (خاص اس مصلحت سے آئے گا کہ بولنے والے کی بولیاں یاد کرے) باورچی خانہ کا دیگ، انا کے صاحبزادے، نطفہ ناتحقیق کا پلا ہوا لینڈی کتے کا پلا۔ چھوٹی صاحبزادی کی گلہری کا بچہ، کبوتروں کی کابک۔ مرغی کا ٹاپہ، بٹیروں کے تھیلے، بیگم صاحبہ کا پاندان۔ طشت، تسلہ، ڈھمک، بھیرے، بچے کے پوتڑے، نہالچے سبھی ہوا چاہئیں۔"

اس مضمون سے نہ صرف منشی سجاد حسین کے زورِ قلم اور زباندانی کا پتہ چلتا ہے بلکہ اس زمانے کے لکھنؤ کی زندگی پر بھی روشنی پڑتی ہے۔

اودھ پنچ میں جب بھی اس طرح کا مضمون شائع ہوا تو ہلڑ ہو گیا۔ منشی سجاد حسین کی اتنی دھاک بندھی تھی کہ ہر شخص ان سے ڈرتا تھا لیکن آخر عمر میں ایسا باغ و بہار آدمی بھی فالج سے لاچار ہو کر سورج مکھی کا پھول بنا۔ مدتوں سسکتا رہا اور بالآخر دنیا سے بیزار ہو کر ایسا گیا کہ پھر لوٹ کر نہ آیا۔

آخری عمر میں انہوں نے کانگریس کے اجلاس کے لئے صدر استقبالیہ کی حیثیت سے ایک خطبہ لکھا جو ان کی بیماری کے سبب چکبست سے پڑھوایا گیا۔ مرنے سے پہلے یہ اعزاز بھی شاید انہیں آخرت کے خوف سے عطا کیا گیا۔ ورنہ زمانے نے ان کی ناقدری ہی کی۔

اگر وہ انگریزوں کی چاپلوسی کرتے تو کم از کم خان بہادری کا روکھا سوکھا خطاب تو لے ہی مرتے۔ مگر ان کے کردار کی عظمت اور قناعت کا یہ عالم تھا کہ تمام عمر انگریز عہدہ اور خطاب دکھاتے رہے لیکن وہ ٹس سے مس نہ ہوئے۔ انہیں قانون کی گرفت سے بچ کر لکھنے کا بھی بڑا سلیقہ تھا یہی وجہ تھی کہ وہ انگریزوں اور حکومت پر بڑی سے بڑی چوٹ کرنے کے باوجود کبھی قانون کی گرفت میں نہ آ سکے۔ البتہ قدرت کے قانون کی گرفت سے وہ نہ بچ سکے اور قضا کا فرشتہ انہیں سب سے بڑی عدالت میں پیش کرنے کے لئے اپنے ساتھ لے جانے میں کامیاب ہو گیا۔

مرزا محمد ہادی عزیز لکھنوی

مانی جائسی

۱۹۰۵ء کی بات ہے کہ میں حسین آباد ہائی سکول لکھنؤ میں دسویں درجے کا متعلم تھا اور شعر بھی کہتا تھا، لیکن شاعری کی حیثیت سے میرا حلقۂ تعارف نہایت محدود تھا، میرے مدرسے کے طلبہ اور مدرسین تک اس حلقے کی وسعت تھی اور بس۔

عزیز صاحب گو سن میں مجھ سے بڑے مگر جوان تھے، شاعری کو عروج ہو چلا تھا اور مجھ تک بھی اُن کے شعر کبھی کبھی پہنچ جاتے تھے۔ یہ سعادت مجھے حکیم سید علی صاحب آشفتہ مرحوم کے ذریعے سے ہوا کرتا تھا جن کا زمانۂ طالب علمی بھی وہی تھا جو میرا، فرق بس اتنا تھا کہ وہ عربی کے طالب علم تھے اور میں انگریزی پڑھتا تھا۔ آشفتہ مرحوم مجھ سے کوئی تین برس چھوٹے تھے مگر شعر کا ذوق انہیں بھی تھا اور خود بھی کہنے کی کوشش کرتے تھے۔ کوئی باقاعدہ اُستاد تو اس وقت اُن کا تھا نہیں، مجھی سے مشورہ کر لیا کرتے تھے، مگر عزیز صاحب سے انہیں خاصی عقیدت تھی۔

میں نے لکھنؤ چھوڑا اور اس کے بعد مجھے معلوم نہیں کب آشفتہ صاحب نے عزیز صاحب کا تلمذ اختیار کیا۔ بہرحال انہوں نے اپنے استاد کے فیوض سے خوب استفادہ کیا حتیٰ کہ بلند پایہ شعراء میں شمار ہونے لگے اور خاصی شہرت حاصل کی۔

بہتیرے شعر عزیز صاحب کے میں نے ان سے سنے اور اس زمانے میں سنے جب عزیز صاحب استاد نہیں بلکہ مبتدی تھے۔ زیادہ تو نہیں ایک قصیدے کے یہ دو مطلع جو آشفتہ مرحوم نے سنائے تھے، اب بھی یاد ہیں:-

(۱) فراقِ یار میں گھٹ کر لبوں پر اب تو جاں آئی — کہاں تک اے دلِ مہجور دعوائے شکیبائی

(۲) میانِ رہ گزر بے دم پڑا ہے تیرا شیدائی — دکھا دے جانے والے آج اعجازِ مسیحائی

یہ تھی میری طالب علمی کے دو سال لکھنؤ میں گزر گئے لیکن میں اور جناب عزیز ایک دوسرے سے روشناس بھی نہ ہو سکے۔ یہ غائبانہ تعارف نومبر ۱۹۲۶ء تک رہا۔ اس عرصے میں میں بھی شاعر کی حیثیت سے جانا جا چکا تھا۔ ان کا تو ایک مجموعہ بھی "گل کدہ" کے نام سے شائع ہو گیا جو انہوں نے ۱۹۱۹ء کے لگ بھگ مجھے بھوپال میں بھیجا۔ میں اس زمانے میں نوکری کے سلسلے سے بھوپال ہی میں مقیم تھا۔

اگر حسنِ اخلاق کے ماثبت کچھ اور نہیں، صرف یہی ایک بات لکھ دی جائے کہ انہوں نے میرے پتے کا پتہ لگانے کی زحمت گوارا کی اور اپنی تصنیف مجھے مرحمت فرمائی، درحالے کہ ذاتی تعارف کیا دید و ادید کی نوبت بھی نہ آئی تھی، تو بھی ان کے دامنِ اخلاق کی وسعت ثابت ہو جاتی ہے ——— ہر چند کہ اس ذیل میں اور بھی بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے۔

افسوس ہے کہ بڑی مدت تک میں ان سے ناآشنا رہا، اس لئے اس زمانے کے حالات اور حالات سے ان کی نجی زندگی اور کردار کے متعلق نتائج کا استنباط کرکے ان کی تفصیل سے قاصر ہوں، اصل میں یہ فرض تو ان کے مخصوص شاگردوں کو ادا کرنا چاہئے تھا جن میں اثرؔ لکھنوی، جوشؔ ملیح آبادی، تسکینؔ سعد وزی، امنؔ لکھنوی اور جگرؔ بریلوی ایسے مشاہیرِ ادب شامل ہیں ——— خیر، میں ہی اس حق سے سبکدوش ہوتا ہوں جس کا زیبا ان کی محبت، حسنِ خلق، انسانیت اور خلوص نے مجھے کر رکھا ہے کہ ان کی بنا پر جو نقوش میرے دل پر ابھرے ہیں وہ کبھی محو نہیں ہو سکتے۔

غرض نومبر ۱۹۲۶ء آیا، جوشؔ ملیح آبادی شاگردِ عزیزؔ، لکھنؤ کے محلہ گولا گنج میں مقیم ہیں جہاں سے امین آباد میونسپل ہائی اسکول قریب ہے۔ اور عزیزؔ صاحب مدرسے کی درمیانی فرصت میں از راہِ شاگرد نوازی جوشؔ کی استدعا پر اکثر وہاں آ جاتے ہیں۔ میں بھی اس زمانے میں آگرے سے لکھنؤ آیا ہوا تھا۔ ایک روز مجھے بھی جوشؔ صاحب اپنے یہاں پکڑ لے گئے۔ ایک بجے دن کے قریب عزیزؔ صاحب تشریف لائے۔ اور جوشؔ صاحب نے میرا تعارف ان سے کرایا۔ یہ پہلا دن ہے کہ مرحوم نے مجھے اور میں نے مرحوم کو دیکھا، بڑے تپاک سے حضرت عزیزؔ ملے اور مجھے بھی دلی مسرت حاصل ہوئی۔ شعراء کے اجتماع کا مصرف لازماً شعر خوانی ہے، سو ہوئی، کچھ میں نے پڑھا کچھ ممدوح مغفور نے ارشاد فرمایا، یہ مختصر سی پُر لطف صحبت برہم ہوئی تو وہ مدرسے واپس تشریف لے گئے اور میں اپنی قیام گاہ پر آیا۔

دوسرے دن کٹرہ ابو تراب خاں میں اپنے مکان پر اثرؔ صاحب نے مجھے اور جوشؔ اور جناب عزیزؔ کو مدعو کیا، وہیں دن کا کھانا ہوا۔ اور دیر تک شعر خوانی ہوتی رہی، بڑے مزے مزے کی باتیں اور بذلہ سنجیاں ہوئیں اور بڑی ہی فرحت بخش محفل رہی۔

میری رخصت ختم ہوئی، تیسرے دن میں آگرے واپس گیا مگر سچ یہ ہے کہ حضرت عزیزؔ سے ملنے کے بعد اب کی بار لکھنؤ کو اس قدر جلد چھوڑنا شاق گزر گیا، بہت شاق۔

اس کے بعد لکھنؤ کے بعض مشاعروں اور کبھی کبھی دوسرے مقامات کے مشاعروں میں ملاقاتیں ہوئیں اور ہمیشہ، ہر دفعہ ان کی خوش کرداری کی عظمت دل میں بڑھتی گئی اور محبت، مروت، محاسنِ اخلاق اور نیک نفسی کا سکہ زیادہ نمایاں ہو کر بیٹھتا گیا۔ تا این کہ ۱۹۳۳ء میں میری طلبی ریاست محمود آباد سے ہوئی اور میں چند روز کے لئے وہاں چلا گیا۔ یہ وہ زمانہ ہے جب جناب عزیزؔ راجہ صاحب محمود آباد کو ادبیات اردو و فارسی کی تعلیم دینے پر مامور[1] ہیں۔ اس طور پر کبھی کبھی مجھے بھی ان سے ملنے کی مسرت حاصل ہوتی رہتی تھی۔

درمیان میں میں پھر آگرے چلا گیا اور ۱۹۳۵ء میں ریاست ٹہرا کی مدار المہامی کے لئے بلایا گیا۔ ٹہرے جانے سے پہلے چند روز محمود آباد میں قیام رہا مگر عزیزؔ صاحب مغفور وہاں سے جا چکے تھے۔ اور اپنے وطن میں علاج کر رہے تھے۔

صاحبِ فراش نہ تھے مگر نقاہت بڑھ گئی تھی، اسی حال میں ایک روز راہ میں ملے اور یہ میری ان کی آخری ملاقات تھی جس کے چند ہفتوں کے بعد ۲۹ جولائی ۱۹۳۵ء کو یہ چراغ جس سے محفلِ شعر و ادب منور تھی ہمیشہ کے لئے گل ہو گیا۔ انا للہ و انا الیہ راجعون ○

مرحوم کے پس ماندگان میں تین لڑکے اور دو لڑکیاں ہیں، لیکن ان میں باپ کا ورثۂ شاعری سب سے چھوٹے فرزند مرزا محمد جعفر حیاتؔ لکھنوی

---

[1] عزیزؔ صاحب مرحوم کو غالباً ۱۹۲۷ء میں مہاراجہ سر محمد علی محمد خاں صاحب بہادر۔ کے۔ سی۔ ایس۔ آئی۔ والیٔ محمود آباد نے اس خدمت کے لئے منتخب فرمایا تھا، اس وقت سے آخر عمر تک یہی شغل رہا۔

ہی کو ملا ہے جو چند سال سے بسلسلۂ ملازمت دہلی میں مقیم ہیں۔ انگریزی اخبار "ہندوستان ٹائمز" سے ان کا تعلق ہے، بہت خوب شعر کہتے ہیں اور بڑے سلیم المذاق ہیں۔ شعر پڑھنے کا انداز بھی بڑا دلکش ہے۔ یہ ایک مبارک اقدام بھی کر رہے ہیں یعنی حضرت عزیزؔ مغفور کا غیر مطبوعہ کلام جو صدہا غزلیات، نظموں اور قطعات رباعیات اور قصائد پر مشتمل ہے، عنقریب شائع کرنے والے ہیں۔

حلیہ عزیزؔ صاحب میانہ قامت، گندم رنگ، قبول صورت آدمی تھے، بھرا ہوا گول چہرہ تھا، چیچک کے دو چار داغ چہرے پر تھے جو بھلے معلوم ہوتے تھے۔ نہ دبلے تھے نہ موٹے، بھرے بھرے شانے، اُبھرا ہوا سینہ، غرض ایک خوش نما سراپا ان کا تھا۔ سر پہ بال گھنے تھے اور بیچ سے مانگ نکالتے تھے۔

لباس نہایت خوش پوشش آدمی تھے اور دوسرے شہروں میں کیا، لکھنؤ میں بھی مشرقی وضع کے ملبوسات کا ذوق، اچھا ذوق رکھنے والا ان سے بہتر شاید ہی کوئی رہا ہو۔ میں نے تو لباس میں وہ نفاست بہت کم دیکھی ہے۔ جو انہیں ملحوظ رہتی تھی۔ ہمیشہ سیاہ ایرانی ٹوپی لگاتے تھے، اور اچکن کبھی حیدرآبادی وضع کی (شیروانی) اور کبھی ایسی کہ جس کی چولی یعنی قریب ناف تک ریشمیں چھوٹی چھوٹی گھنڈیوں اور تکموں کا ایک سلسلہ ہوتا تھا، پہنا کرتے تھے۔ جامہ زیب ایسے تھے کہ ہر لباس ان پر نہایت موزوں اور بھلا معلوم ہوتا تھا۔

عادات و اخلاق بڑے ہی مہذب لیکن شگفتہ مزاج اور بذلہ سنج تھے، ملاقات کے وقت خفیف سا تبسم دل میں گھر کرتا تھا، باتوں کی گل افشانی نگاہوں کی محبت ریزی اور موقع موقع سے بے ساختگی کے ساتھ ظرافت کی چاشنی صحبتوں میں گرمی پیدا کرتی اور دلوں کو نہال کر دیتی تھی۔ اہل و عیال کی طرف حد درجے کا التفات تھا اور ایثار تو گویا ان کا شعار تھا جو اہل و عیال سے تجاوز کر کے احباب بلکہ انسانی برادری کے لئے بھی دریغ نہ کیا جاتا تھا۔

شاگرد اور ان کے ساتھ خصوصی برتاؤ اور شفقت مولانا عزیزؔ کے شاگرد تو صدہا ہیں لیکن جن سے مجھے ملنے کا اتفاق ہوا وہ (۱) محبوبؔ جناب راجہ محمد امیر احمد خاں صاحب بہادر (محمود آباد) (۲) حُبّ جناب مہاراج کمار محمد امیر حیدر خاں صاحب (محمود آباد) (۳) جگت موہن لال صاحب رواںؔ (اناؤ) (۴) نواب میرزا جعفر علی خاں صاحب اثرؔ (لکھنؤ) (۵) شبیر حسن خاں صاحب جوشؔ (ملیح آباد) (۶) گوپی ناتھ صاحب امنؔ (لکھنؤ) (۷) سید علی صاحب آشفتہؔ (لکھنؤ) (۸) ادیبؔ صاحب (لکھنؤ) برادر جناب امنؔ لکھنوی۔ (۹) جگرؔ صاحب (بریلی) اور (۱۰) مرزا تصدق حسین صاحب صدقؔ (جائس ضلع رائے بریلی) ہیں۔ اور میرے نزدیک یہی حضرات حقیقتاً ان کے شاگردوں میں ممتاز ترین درجہ رکھتے ہیں ——— ایک صاحب اور بھی بہ اعتبار شاعری قابلِ ذکر ہیں۔ ان سے میرا تعارف تو کبھی نہیں ہوا لیکن اکثر رسائل میں ان کا کلام دیکھا ہے، وہ بھی عزیزؔ صاحب کے ممتاز شاگردوں کی صف میں آتے ہیں اور اس صف میں بھی امتیاز رکھتے ہیں۔ ان کا کلام مدارس کی بعض نصاب کی کتابوں میں بھی داخل ہے ——— وہ ہیں تسکینؔ سندیلوی۔

جن تلامیذ سے ملاقات ہے ان سے بارہا عزیز صاحب مغفور کا ذکر آیا، سب ان کو ایسی محبت سے یاد کرتے ہیں جیسے کوئی اپنے شفیق باپ یا مربّی کو یاد کرے۔ جوشؔ صاحب قوم کے پٹھان ہیں اور ایسی باتوں میں یوں بھی کوئی مادّی لطف یا منفعت نہیں، اس لئے انہیں تو کبھی رنج و افسوس کے ساتھ استاد کو یاد کرتے نہیں دیکھا، باقی سب کو تو ان کی شفقت اور شاعرانہ کمالات کا ذکر کرتے ہوئے گویا اشک بار دیکھا ہے۔

رواںؔ صاحب کا انتقال حضرت عزیزؔ مرحوم کی حیات ہی میں ہو گیا، لیکن مسلم یونی ورسٹی کے ایک مشاعرے میں ان کو میں نے کمال احترام و عقیدت اور خلوص و محبت سے عزیز صاحب کا ذکر کرتے ہوئے، ان کی استادی پر مباہات کرتے ہوئے اور ان کی اصلاحوں کی مدح سرائی کرتے ہوئے سنا ہے۔ معلوم نہیں عزیزؔ صاحب کا ان کے سامنے انتقال ہوتا تو اس صدمے کو وہ کیونکر برداشت کر سکتے۔

خاندان عزیزؔ صاحب لکھنؤ کے ایک عالی نسب مغل خاندان سے تھے، ان کے والد میرزا محمد علی صاحب کا شمار اس زمانے کے اکابر علماء

میں تھا اور صاحبِ تصانیف تھے، ایک کتاب نجوم السماء تو ان کی بڑی مشہور تصنیف ہے۔ مشاغلِ علمی کو عزیز صاحب کا پیشۂ خاندانی سمجھا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ ان کے (جناب عزیز کے) بڑے بھائی مرزا محمد مہدی، لکھنؤ کے حاذق اور مشہور اطباء میں تھے اور اس فن میں ان کے شاگرد بکثرت تھے۔ میں نے بھی بارہا ان کی زیارت کی ہے، ہمیشہ ان کے گرد طالبانِ علم طب کا مجمع دیکھا اور مطب کو مریضوں سے بھرا ہوا پایا۔

علم و فضل اور شاعری

شاعری کا تو کہنا ہی کیا کہ ان کے اس کمال کو ہندوستان اور پاکستان کے گوشے گوشے میں شہرتِ تام، قبولِ عام اور بقائے دوام کے درجات حاصل ہیں، البتہ علم و فضل کے حدود عموماً معلوم نہ ہوں گے، سو عزیز صاحب فارسی کے مستند عالم اور عربی کے منتہی فاضل تھے، استعدادِ فطری اور ذہانت خداداد تو تھوڑے ہی سے علم کو بہت کچھ کر دکھاتی ہے، اور یہاں تو فضیلتِ علمی کے ساتھ فطری مواہب اور کتب بینی کے انتہائی شوق نے چار چاند لگا کر علماء و فضلاء اور شعراء و ادباء کی صفوں میں ہمیشہ انہیں ممتاز رکھا۔

اس مضمون میں ان کی شاعرانہ خصوصیات کو اُجاگر کرنے کی عبارت "نجی زندگی" اور "ذاتی کردار" سے تجاوز کی مرادف اور موضوع سے خارج ہوگی، اس لئے حضرت مولانا عزیزؔ کا یہ تعارف اپنی کوتاہیوں کے اعتراف کے ساتھ ختم کرتا ہوں، بس اتنا ہی اور کہوں گا کہ جناب مغفور شاعری کے اعتبار سے اتنا ہی بلند پایہ رکھتے تھے جتنے بلند وہ خود، حسن فطرت اور کمال انسانیت کے اعتبار سے تھے ——— اور یہ بھی یہی کہ انسانیت اگر کہیں ناقص ہے تو شاعری بھی اسی نسبت سے ناقص ہوگی، مزدور ہوگی، چاہے کوئی ناظم ظاہر میں لفظوں کا طلسم ہی کیوں نہ باندھے یا ابلہ فریبی کے لئے اِدھر اُدھر سے ذلہ ربائی کر کے اپنے کو شاعر ثابت کرنے کی ان تھک کوشش ہی کیوں نہ کرے ——— صاحب نظر کی بارگاہ سے "اندازِ قد" کو "می شناسم" کا خلعت، بہرحال مل جائے گا۔

خواجہ عبدالرؤف عشرت لکھنوی

خواجہ شمس الدین

واہ رے لکھنؤ تیری سرزمین میں کیسے کیسے باکمال اور زندہ دل لوگ پیدا ہوئے کہ زمانہ ان کا مثل و نظیر اب ڈھونڈے گا اور نہ پائے گا۔ یہاں جو تھا اپنے رنگ میں بے مثال تھا، جس نے جو وضع و قطع اور جو طور طریقہ اختیار کیا مرتے دم تک اس کو نباہ گیا، حسن اخلاق، خوش مزاجی اور وضعداری تو یہاں کے شرفا کی گھٹی میں پڑی تھی، لطف طبع، مروت، رواداری اور سیر چشمی عام تھی، اسی لئے یہاں کا آدمی کہیں بھی جاتا چھپا نہ رہتا اور صاف پہچان لیا جاتا کہ لکھنؤ کا ہے، یہاں کے رگ رگ کو شعر و موسیقی، بدیہہ گوئی اور ظرافت و خوش طبعی سے فطری لگاؤ تھا، زمانہ کے تغیر اور وقت کے انقلاب نے یہاں کے خصوصیات کافی حد تک بدل دیئے ہیں اور کیا عجب ہے کہ تھوڑے دنوں کے بعد لکھنوی اور غیر لکھنوی میں جو امتیاز چلا آتا ہے وہ ختم ہو جائے۔ لکھنوی خصوصیات کے حامل بکثرت یہاں نظر آتے تھے کہ دیکھتے دیکھتے صفحۂ ہستی سے اٹھ گئے اور جو چند باقی ہیں اٹھتے جا رہے ہیں، لیکن کیا یہ بے انصافی نہ ہوگی اگر ہم ان مشاہیر کو دلوں سے بھلا دیں اور ان کا تذکرہ ثبت نہ کریں جن سے لکھنؤ کی زیب و زینت تھی اور جن کی بزرگ ہستیوں پر لکھنؤ بجا طور سے فخر کر سکتا تھا، ایسے ہی حضرات میں ایک نمایاں اور قابل قدر شخصیت مرحوم خواجہ عبدالرؤف صاحب عشرت کی بھی تھی۔ جن کے ادبی خدمات اور علمی و لسانی کمالات پر میں اس وقت روشنی ڈالنا نہیں چاہتا کہ یہ ایک مستقل کام ہے جس کے واسطے کافی وقت اور فرصت درکار ہے بلکہ میں ان کے ذاتی اور شخصی حالات اور ان کے اخلاق و عادات پر مختصراً کچھ لکھنا چاہتا ہوں کہ وہ کیا تھے اور کن صفات کے انسان تھے، اردو لٹریچر کی انہوں نے جو گراں قدر اور عظیم الشان خدمتیں کیں وہ ارباب ادب اور اہل زبان سے پوشیدہ نہیں ہیں، اردو کا وہ کون سا رسالہ یا اخبار تھا جس میں ان کے مضامین کثرت کے ساتھ شائع نہیں ہوئے اس کے علاوہ ان کے تصانیف و تالیفات خود گواہ ہیں کہ مرحوم وہ کام کر گئے جو دوسرے نہ کر سکے، ان کی سیرت کے متعلق مجھے قلم اٹھانے میں دشواری محسوس نہیں ہوتی وہ میرے پھوپا تھے اور میری حقیقی بڑی بہن (اللہ ان کا سایہ عاطفت دیر تک قائم رکھے) ان کو منسوب تھیں، والد مرحوم خواجہ قطب الدین، مالک نامی پریس لکھنؤ کے شاگرد بھی تھے اور ان کو مثل باپ کے سمجھتے تھے، میں نے جب سے آنکھیں کھولیں اور ہوش سنبھالا ان کو دیکھا، دیتے

احاطہ خانساماں میں تھے اور چوک میں والد مرحوم نے اپنے نامی پریس کی مطبوعہ کتابوں کی جو دوکان رکھی تھی اس کے تمام انتظامات، اور کام ان کے اور ان کے منجھلے بھائی خواجہ غلام محمد مرحوم کے زیر نگرانی کر رکھا تھا یہ دوکان جو ٹھیک وسط چوک میں واردوغہ حیدر بخش کی مسجد کے نیچے واقع تھی، بڑے موقع کی دوکان تھی اس زمانے میں لکھنؤ کا چوک سارے شہر کا مرکزی مقام اور گذر گاہ خاص و عام تھا، عہد شاہی سے دستور تھا کہ تمام جلوس اور باراتیں چوک سے نکلتی تھیں۔ تیسرے پہر سے آدھی رات تک، چوک کی گرم بازاری کا وقت تھا، تین بجے سے میونسپلٹی کے بہشتی اکبری دروازہ سے گول دروازہ تک پانی کا چھڑکاؤ کرتے تھے کہ زمین ٹھنڈی رہے اور گرد و غبار بیٹھ جائے۔ پھر سارے شہر کے اشراف و روسا اور لکھنؤ کے زندہ دل نوجوان اور ہر فن کے اہل کمال تفریح، ملاقات احباب یا خریداری کے لئے یہاں آتے تھے، مختلف دوکانیں ان کی نشست گاہیں تھیں، جن میں شہر کے اہل علم و ادب اور چیدہ حضرات کی سب سے بڑی نشست گاہ خواجہ صاحب کی دوکان تھی، دن کو دوکانداری رہتی تھی سر شام سے دوکانداری تو بند ہو جاتی تھی۔ اور اہل سخن کا مجمع لگ جاتا تھا میں بھی اکثر جایا کرتا تھا۔ مولانا شرر، ریاض، تسلیم، آغا حشر کاشمیری، رشید و دولہ صاحب عروج، عارف، حسرت موہانی، وفا، مرزا محمد عسکری، شمشاد، عزیز، محشر، وسیم، اور خدا جانے کتنے اہل سخن اور شعراء آیا کرتے تھے، خواجہ صاحب مرحوم کہتے تھے کہ مولانا محمد حسین آزاد مصنف آبحیات بھی جب لکھنؤ آئے تھے تو کئی بار اُن سے ملنے آئے تھے میں نے نہیں دیکھا مگر وہ پنڈت رتن ناتھ سرشار، مولانا شبلی اور ابوالکلام آزاد کے متعلق بھی کہتے تھے کہ ان کی دوکان ان حضرات کی نشست گاہ رہ چکی ہے یہاں بیٹھ کر شعر و سخن کا چرچا رہتا تھا، الفاظ و محاورات کی تحقیق ہوتی تھی اور زبان کے مشکل مسائل حل ہوتے تھے عموماً یہ مجلس ۹ بجے شب تک رہتی تھی مگر محرم میں جبکہ چوک کی رونق اور چہل پہل امام باڑوں کی روشنی، عزاداری اور تعزیوں کے جلوسوں کے نکلنے سے بہت بڑھ جاتی تھی خواجہ صاحب کو ۱۱ - ۱۲ بجے شب تک، دوکان کھلی رکھنا پڑتی تھی، وہ آنے والوں کی خاطر و مدارات بھی بیحد کرتے تھے بغل میں میاں وزیر پان فروش کی دوکان تھی جن کے ہاتھ کی سفید پانوں کی معطر گلوریاں شہر بھر میں مشہور تھیں وہ خود تو پان بہت ہی کم کھاتے تھے مگر دوسروں کی تواضع وزیر کی گلوریاں مول لے کر بہت کرتے تھے میں ان کا چھوٹا تھا اور وہ میرے بزرگ تھے مگر جب میں ان کی دوکان پر جاتا اسی وقت وزیر سے پان لے کر مجھے دیتے تھے، خواجہ صاحب لاولد تھے اور مجھ کو بہت چاہتے تھے میرا بچپن کا زمانہ تھا اکثر ضد کر بیٹھتا تھا اور جس بات کی ضد کر بیٹھتا تھا اس کو ضرور پورا کرتے تھے، ان کی والدہ مرحومہ جو شاہی زمانہ کی تھیں مجھ سے بیحد محبت کرتی تھیں جمعہ کی چھٹی میں اکثر بہن کے پاس جا کر رہتا تھا تو برابر میری خاطر داری اور ناز برداری میں لگی رہتی تھیں۔ ماتوں کو شاہی دنتوں کے قصے سنایا کرتی تھیں اور میں بہت شوق سے سنا کرتا تھا، میری مرغوب چیزیں خود اپنے ہاتھ سے پکا کر کھلاتی تھیں، خواجہ صاحب اور ان کے بھائی خواجہ غلام محمد اپنی ماں کے بیحد مطیع اور فرماں بردار تھے اور اس وصف میں میں نے آج تک کسی شخص کو ان کے برابر نہیں پایا ہر کام ماں سے پوچھ کر اور ان کے اشارہ پر کرتے تھے ماں کی جدائی کے خیال سے شہر کے باہر کہیں نہیں جاتے تھے، خواجہ صاحب مرحوم کو لکھنؤ سے باہر سفر کرنے کا بہت کم اتفاق ہوا، لکھنؤ کے لوگ یوں بھی سفر کرتے بہت گھبراتے ہیں اور وہ تو پورے لکھنوی اور شرفائے لکھنؤ کے صفات کے زبردست حامل تھے، ایک مرتبہ کسی نے پٹنہ میں اُن پر کوئی جھوٹا دعویٰ کر دیا اور ان کے نام سمن جاری کرا دیا جس کی جوابدہی کے لئے ان کو پٹنہ جانا پڑا، کیا بتاؤں کہ پٹنہ تک جانا ان کو کیسا کھلا ہے اور اس کے لئے کتنے سامان کئے ہیں کہ شاید حج کے سفر کے لئے بھی کوئی اتنے سامان نہ کرتا، وہاں پہنچے تو پٹنہ کے قدرشناس لوگوں نے ان کی حد سے زیادہ آؤ بھگت کی، آنریبل خواجہ محمد نور صاحب نے اپنا مہمان بنایا اور وہاں کے اکابر و امراء نے ان کی بہت عزت اور تکریم کی بڑے بڑے بیرسٹروں اور وکیلوں نے ان کے مقدمہ کی مفت پیروی کی، ان کے اعزاز میں مشاعرے ہوئے اور دعوتیں ہوئیں۔ آخر مقدمہ میں کامیاب ہو کر گھر واپس آئے۔ اہل عظیم آباد کی اس قدردانی اور ہمدردی کو ہمیشہ یاد کیا کرتے تھے، لکھنؤ کے لوگوں کا جذبۂ حب وطن تو واقعی قابل تعریف ہے اور خدا معلوم یہاں کی زمین میں کیسی مقناطیسی کشش ہے کہ یہاں کے قدیم باشندوں کا تو کیا ذکر باہر کے لوگ آ جاتے ہیں تو لکھنؤ سے جانے کو ان کا دل نہیں چاہتا

مگر اس سے لکھنؤ والوں نے نقصان بھی بہت اٹھائے ہیں۔ خواجہ صاحب بات کے بہت پکے اور قول کے بہت سچے تھے۔ کبھی جھوٹ نہیں بولتے تھے اور نہ کسی سے وعدہ خلافی کرتے تھے جو وعدہ کر لیا وہ پتھر کی لکیر ہو گیا، زبردست سے زبردست طاقت بھی ان کو وعدہ خلافی اور عہد شکنی پر مجبور نہ کر سکتی تھی۔ الیکشن کے زمانہ میں اکثر دیکھا کہ کوئی امیدوار پہلے پہل پہنچ گیا اور اس سے ووٹ دینے کا وعدہ کر لیا پھر دوسرے امیدوار کے بیسوں نعدان پر پڑے وہ ٹس سے مس نہ ہوئے اور سب سے کہہ دیا کہ زبان کٹ جائے تو کٹ جائے قول سے پھر نہیں سکتا۔ اسی لئے صاف گوئی کی عادت تھی، مداہنت یا بناوٹ بالکل نہ تھی، اس کے ساتھ مروت دار بھی بے حد تھے جو کام کسی کا اپنے بس کا ہوتا اس سے کبھی انکار نہ کرتے اور جذبۂ ایثار و مروت میں شدید سے شدید نقصان بھی برداشت کر لیتے، وضعداری کی صفت اہل لکھنؤ کا حصہ تھی اور اس میں بھی خواجہ صاحب بہت ممتاز سمجھے جاتے تھے، وضع، قطع، لباس، طور طریقے جو اختیار کر لئے تھے ان میں کبھی تبدیلی نہ کی، دیانت دار ایسے تھے کہ ہر شخص اُن کا اعتبار کرتا تھا، کسی کا ایک پیسہ اپنے ذمہ باقی نہ رہنے دیتے تھے۔ مزاج میں عجلت پسندی تھی، باتیں بہت جلدی جلدی کرتے تھے، چلنے میں نہایت تیز رفتار تھے اور پیدل چلنے سے کبھی تھکتے نہ تھے، میں جب چھوٹا تھا تو محرم کی روشنی دکھانے لے جاتے تھے عشا کے بعد لیکر نکلتے تو صبح تک چلتے اور میں بھی روشنی دیکھنے کے شوق میں چلا کرتا سارے شہر کے امام باڑے دیکھتے اور دکھاتے، اور ہر ایک کے خصوصیات اور تاریخ سمجھاتے، لکھنؤ کا واقف کار ان سے بڑھ کر کوئی نہ تھا اسی لئے لکھنؤ کے تمدن و معاشرت اور مشاہیر کے متعلق انہوں نے بے شمار مضامین لکھ ڈالے، ان کی دوکان پر یہاں کے اگلے اور شاہی زمانہ کے لوگ اکثر آ کر بیٹھا کرتے تھے ان سے ایک ایک بات پوچھتے اور یادداشت کے طور پر لکھ لیتے تھے پھر انہی یادداشتوں سے مضامین مرتب کرتے خود ان کی والدہ شاہی عہد کی تھیں اور اس زمانہ کے اکثر چشم دید حالات بیان کیا کرتی تھیں، خواجہ صاحب کو لکھنؤ سے یہاں کی زبان سے، یہاں کی بول چال سے، یہاں کی وضع قطع سے یہاں کے معاشرت اور تمدن سے اور یہاں کے باشندوں اور یہاں کی عمارتوں سے بے حد عشق تھا اور یہاں کے قدیم حالات جاننے کی ہمیشہ فکر رہتی تھی، افسوس یہ ہے کہ انہوں نے یہاں کے متعلق مختلف عنوانوں پر مضامین تو بے شمار لکھے جو تمام ہندوستان کے اخبارات و رسائل میں برابر شائع ہوئے مگر کوئی مستقل کتاب ترتیب نہ دی، اب ان مضامین کا کہیں پتہ نہیں کتاب ہوتی تو محفوظ رہتی، لوگ ان کے مضامین کے بے حد گرویدہ تھے اور رسائل و اخبارات کے اڈیٹر صاحبان کی ہمیشہ ان سے طلب جاری رہتی جو کبھی ختم نہ ہوتی، ملک بھر کے رسائل و اخبارات ان کے پاس ہمیشہ مفت آیا کرتے جن کے پڑھنے کا بھی ان کو موقع نہ ملتا، اکثر ان میں سے بند کے بند میں اٹھا لاتا تھا اور پڑھا کرتا تھا خواجہ صاحب مرحوم نے یوں تو ہر موضوع پر مضامین لکھے ہیں لیکن اودھ اور لکھنؤ پر انہوں نے جو مضامین تحریر کئے وہ بے حد مقبول ہوئے اور ان کو خود بھی اس موضوع پر زیادہ دلچسپی تھی اور بڑے شوق و ذوق سے اس پر قلم اٹھاتے تھے مجھے یاد ہے کہ جب ان کا ایک مضمون قدسیہ بیگم ملکہ و محبوبۂ نصیر الدین حیدر بادشاہ پر شائع ہوا اور غالباً زمانہ کانپور میں وہ نکلا تھا تو تمام ملک میں اس کی دھوم مچ گئی اور بہت سے اخبارات و رسائل نے اس کو نقل کیا اسی طرح غازی الدین حیدر بادشاہ کے جشن تاج پوشی کا بھی مضمون تھا، ایک مضمون بادشاہ نصیر الدین حیدر پر بھی لکھا تھا جن کے عہد میں لکھنؤ کا پورا شباب تھا۔ ان کی دوکان شہر کے پرانے اور جہاں دیدہ لوگوں کی سب سے بڑی نشست گاہ تھی ان میں ایسے لوگ بھی تھے، جو عہد شاہی کا تماشا تیس تیس چالیس چالیس برس کی عمر تک دیکھے ہوئے تھے خود ان کی والدہ عہد شاہی کی تھیں ان لوگوں سے تمام حالات پوچھ کر قلم بند کرتے جاتے، اسی لئے ان کے معلومات بے حد وسیع تھے اور جب کسی عنوان پر قلم اٹھاتے تو اس کا حق پورا کر دیتے، مولانا شرر مرحوم نے بھی لکھنؤ کے تمدن پر بہت لکھا ہے مگر خواجہ صاحب کے معلومات اور مضامین ان سے بہت زائد تھے شرر مرحوم کو لکھنؤ سے باہر رہنے کا بیشتر اتفاق رہا ہے اور جہاں تک ہمارا خیال ہے وہ مضافات لکھنؤ میں پیدا ہوئے خواجہ صاحب چند روز کے سوا کبھی لکھنؤ سے باہر نہ نکلے اور ان کی ولادت لکھنؤ کے مشہور محلہ احاطہ خانساماں میں ہوئی۔ خانگی تفکرات سے ہمیشہ آزاد رہتے، اولاد کا جھگڑا نہ تھا گھر کا سارا کام والدہ کے ذمہ تھا جو بڑی منتظم اور محنتی تھیں، انگریزی افسروں کو اردو پڑھانے کے چند پنشن جیش قرار تنخواہوں پر جب سے مل گئے تھے۔

ملازمت والد مرحوم کی بھی ترک کر دی تھی، اور چوک میں اپنی ذاتی دوکان کتابوں کی کر لی تھی، جتنا وقت ملتا تھا زبان کی تحقیقات، کتابوں کے مطالعہ اور تصنیف و تالیف و تحریر مضامین میں صرف کرتے تھے، اردو کے متعلق ان کی تصانیف بکثرت تھیں جن کو والد مرحوم کے پریس میں چھپاتے اور فروخت کرتے، مضامین جو رسائل و اخبارات کو بھیجتے اُن کا کبھی کوئی معاوضہ نہ لیتے، شوق تحریر و مطالعہ اتنا تھا کہ آدھی آدھی رات تک جاگا اور لکھا پڑھا کرتے، وہ ایک ایسے متحرک اور شاغل انسان تھے کہ آرام لینا اور خالی رہنا جانتے ہی نہ تھے جب دیکھو کسی نہ کسی کام میں مشغول ہیں انہوں نے اپنی زبان یا قلم سے کبھی کسی کی برائی یا عیب گیری نہیں کی اپنے آپ کو نہ کبھی بڑا سمجھا نہ کسی کے سامنے اپنی بڑائی کی، ہر شخص سے بہت ہی جھک کر ملتے اور انکساری برتتے، بچے تو لکھنؤ کے مگر کھانے پینے کے یا لباس کے ذرا بھی شوقین نہ تھے، تندرستی ۴۰ - ۴۵ برس کی عمر تک تو بہت اچھی رہی بیماری کا نام بھی نہ جانتے تھے مگر اس کے بعد ایک بار درد گردہ اٹھا جو پتھری کے سبب سے تھا اور اس کا سلسلہ کچھ ایسا بڑھا کہ ختم ہی نہ ہوا، درد گردہ کے دورے جو کبھی کبھی پڑتے رہتے تھے ان کی تندرستی بگاڑ چکے باوجود اس کے ہمت ایسی تھی کہ جس طرح کام پہلے کرتے تھے اسی طرح جاری رکھا کسی بات میں فرق نہ آنے دیا، دور دراز مقامات پر انگریزوں کو پڑھانے جانا، دوکان پر بیٹھنا، سیکڑوں خطوں کا جواب لکھنا جو ان کے شاگردوں کے یا بیرونجات کے لوگوں کی زبان یا شاعری کے متعلق استفسار کے آتے تھے، غزلوں پر اصلاح دینا، مضامین اور تالیفات مرتب کرنا، یہ اور ان کے علاوہ بہت سے کام تنہا انجام دیتے رہے، اور بیماری کی تکالیف کی پروا نہ کی، آخر تو ٹے کر دورے پڑتے چلے گئے اور دماغی و اعصابی کمزوری نے پلنگ پر لٹا دیا والدہ کا مدت ہوئی انتقال ہو چکا تھا، بہن کی شادی ہو چکی تھی، ان کے غمگسار اور تیماردار یا تو اُن کی بیوی تھیں جن کی خود تندرستی بہت خراب رہتی تھی اور یا چھوٹے بھائی خواجہ غلام محمد مرحوم تھے جو میونسپلٹی میں ملازم تھے مگر اس میں شک نہیں کہ ہمشیرہ محترمہ نے باوجود اپنی صحت خراب ہونے کے ان کی ایسی خدمت اور رفاقت کی کہ کم کسی بیوی نے اپنے شوہر کی کی ہوگی۔ آخر کار وقت اجل آ پہنچا اور وہ داعی اجل کو لبیک کہہ کر اس عالم فانی سے رخصت ہو گئے، اور لکھنؤ کا یہ نامور فرزند جو اس پر جان و دل سے فدا رہتا تھا اپنے مکان واقع احاطۂ خانساماں سے متصل خاندانی قبرستان کے ایک گوشہ میں پہنچ کر قیامت تک کے لئے محو خواب ہو گیا۔

اے میرے عزیز وطن! تیرے ایسے چاہنے والے اور تمام ملک میں تیری نیک نامی کو اس طرح پھیلانے والے اب کہاں پیدا ہوں گے، کیا لوگ تھے اور کیا صورتیں تھیں کہ دیکھتے دیکھتے غائب ہو گئیں ؎

وہ صورتیں الٰہی کس دیس بستیاں ہیں
اب جن کے دیکھنے کو آنکھیں ترستیاں ہیں

(رحیم)

مولانا صفی لکھنوی

ممتاز حسن جونپوری

مولانا سید علی نقی صفی ۳ جنوری ۱۸۶۲ء کو لکھنؤ کی شعر و ادب نواز سرزمین میں پیدا ہوئے اس وقت وہاں اودھ کو وزراء کے محلوں اور شاہان اودھ کے درباروں میں پرورش پاتے ایک صدی سے زیادہ عرصہ گزر چکا تھا اور وہ سرتاپا پرتکلف رسمی اور رنگین الفاظ کی خلعت میں ملبوس تھی۔

مولانا صفی کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ آپ نے لکھنؤ کی شاعری میں اصلاح اور ادب میں انقلاب پیدا کرنے کا وہ کام اپنے ہاتھوں میں لیا جو دہلی اور پنجاب میں حالی اور آزاد نے انجام دیا۔ وہاں ان حضرات کو جان گلکرسٹ جیسے ادب پرور حکام اور سرکار کی امداد میسر تھی۔ لیکن ان کی کوششوں کا اثر لکھنؤ پر نہیں پڑ سکا تھا۔ اس ضمن میں مولانا صفی نے جو کوششیں کیں ان میں وہ بہت بڑی حد تک کامیاب ہوئے۔ اس کے ثبوت میں ہم بعض دستاویزی شہادتوں کے علاوہ ان چشم دید گواہوں کو پیش کریں گے .. .. جنہوں نے انیسویں صدی عیسوی میں دبستان لکھنؤ کی آخری بہار دیکھی اور جو آج بھی صدی کا تین چوتھائی حصہ طے کر کے ستارۂ سحر کی طرح جھلملا رہے ہیں۔ اس ضمن میں مولانا صفی کے کارناموں سے اردو ادب کی تاریخ خالی ہے اور اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ صفی نے خود اپنے ساتھ دشمنی کی ہے۔

مولانا صفی ایک خاموش اور عافیت پسند شاعر تھے۔ آپ ایک گمنام حاتم کی طرح اردو ادب کو کچھ دے گئے لیکن بہت کم لوگ آپ سے روشناس ہو سکے۔ مختلف اصناف میں آپ نے ایک لاکھ سے کم شعر نہ کہے ہوں گے لیکن آج یہ سب نادروں کے خزانے کی طرح لاپتہ ہیں۔ چھ سال کی جانکاہ محنت کے بعد آپ نے عمر خیام کی بارہ سو رباعیوں کی صحت کر کے ان کا منظوم ترجمہ کیا اور تصویروں کے خاکے بنائے لیکن ایسی مفید اور بیش بہا چیز بھی شرمندۂ طباعت نہ ہو سکی۔ آپ کی زندگی کا بڑا حصہ ایسی تاریک گمنامی میں گذرا کہ مدتوں آپ لکھنؤ کے مشاعرے کے لئے غزل کہتے اور دوسروں کو دے دیتے۔ یہ لوگ مشاعروں میں پہنچ کر یہی غزلیں اپنے نام سے سناتے اور واپس آکر بڑے فخر کے ساتھ صفی سے اس داد و تحسین کا ذکر کرتے جو مشاعرے

میں انہیں ملتی تھی۔

صفی نے ساری عمر کسی کو اپنا استاد نہیں بنایا اور ان کے کلام کا تمام نکھار ان کی اپنی کاوشوں کا نتیجہ ہے۔ آپ کے ایک نامور شاگرد مولانا عزیز مرحوم نے اس کا اعتراف اپنے ایک شعر میں یوں کیا ہے کہ ؏

اس کا شاگرد ہوں جس کا نہیں استاد کوئی

مولانا صفی نے رؤسا و امرا کی مدح کر کے پیٹ نہیں پالا۔ مشرقی اور مغربی علوم سے فراغت حاصل کرنے کے بعد آپ نے ۱۸۸۳ء میں محکمۂ دیوانی کی ملازمت کر لی اور پیشکاری کے عہدہ سے پنشن لے کر علیحدہ ہوئے۔ آپ کا دیوان آپ کی وفات کے بہت دنوں بعد چھپا اور اس وقت کوئی ایسا شخص نہ تھا جو تاریخ اردو ادب کے مؤلفین کے سامنے صفی کی حقیقی شخصیت کو پیش کرتا اور ان کے تاریخی کارناموں پر روشنی ڈالتا۔ یہ بات کتنی ہی افسوسناک کیوں نہ ہو بہرحال اپنی جگہ پر حقیقت ہے۔ تاریخ اردو ادب مرتبہ رام بابو سکسینہ میں بھی اصلاح زبان کے سلسلے میں مولانا صفی کے شاگردوں اور پھر ان شاگردوں کے شاگردوں کا ذکر توضاحت سے موجود ہے لیکن انتہائی عبرت اور حیرت کا مقام ہے کہ اس میں خود صفی کا کہیں ذکر نہیں۔ اس اہم واقعہ کی تائید مولانا حسرت موہانی نے اپنے رسالہ "اردوئے معلےٰ" میں اور مرزا جعفر علی خاں اثرؔ نے اپنی ایک نظم میں بھی کی ہے۔ ان کا تفصیلی ذکر آئندہ آئے گا۔

لکھنؤ کی شاعری اور ادب کے رنگ اور اصلاحات کی داستان بہت طویل ہے۔ مشہور یہ ہے کہ ناسخؔ نے الفاظ کی تراش خراش اور استعمال میں ندرت پیدا کرنے کے سلسلے میں بڑا کام کیا ہے اور ان کے ذی علم تلامذہ نے بھی ترتیب لغات میں قابل قدر خدمات انجام دی ہیں۔ لکھنؤ سکول کے پرانے رنگ کی اصلاح کے لئے مولانا صفی نے بھی ناسخ اور ان کے تلامذہ سے کچھ کم خدمات انجام نہیں دی ہیں۔ ذیل میں ان دونوں "مصلحین" کا شجرہ پیش کیا جاتا ہے۔

ناسخؔ (مصلح اصطلاح و تدوین الفاظ)

- رشک (مولف لغت اردو)
  - جلال لکھنوی (مصنف رسالہ تذکیر و تانیث و رسالہ عروض)
    - آرزو لکھنوی (مصنف نظام اردو)
- مہر
- خواجہ وزیر
- منیر شکوہ آبادی (موجد قیود اعلان نون وغیرہ)
  - شہید جونپوری (محقق)

صفیؔ (مصلح طرز تخیل قدیم)

- مولانا عزیز
  - اثر لکھنوی
  - جوش ملیح آبادی
  - روداں
- ظریف لکھنوی (مبلغ و نشر فن معترضہ نگ)
- صغیر مرحوم (ایڈیٹر علیمجری)
- حامد (بیرسٹر) (آپ انگریزی شاعری میں لامہ فیضی مسن کے شاگرد تھے)
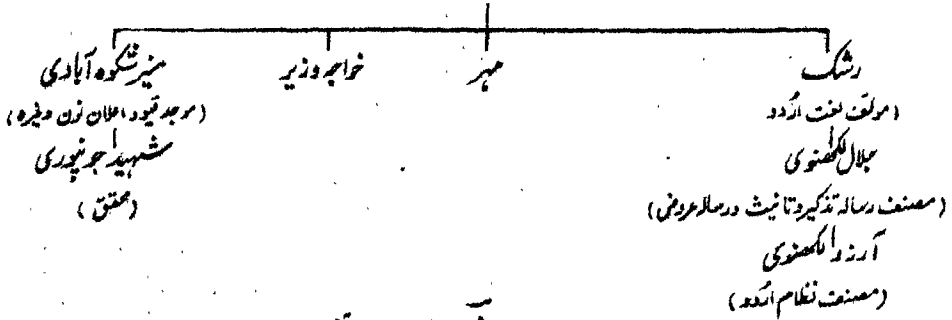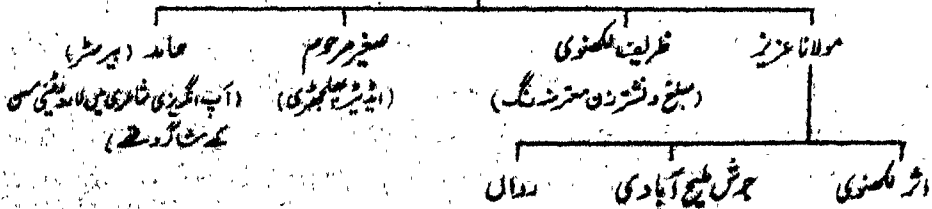
مولانا صفی نے لکھنؤ کے رنگ شاعری اور تخیل کی اصلاح کے لئے طرح طرح سے جہاد کیا۔ غدر کے بعد جہاں بڑے بڑے سیاسی انقلاب رونما ہوئے اُردو زبان میں انگریزی سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہی اور اس میں بھی ایک انقلابی لہر دوڑ گئی منشی سجاد حسین نے ۱۸۷۷ء میں لکھنؤ سے "اودھ پنچ" نکالا۔ اور صفی لکھنوی نے تین چار انگریزی دان ادیبوں کو ڈھونڈ کر ان کے اصلاح تخیل کا تہیہ کیا۔ ان میں ڈاکٹر مرزا محمد ہادی رسوا اور منشی سجاد حسین خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ لکھنؤ کے رنگ قدیم اور تخیل پر ہاتھ ڈالنا آسان کام نہ تھا۔ مدتوں چہ میگوئیاں ہوتی رہیں لیکن صفی نے ہمت نہ ہاری۔ انہوں نے منشی سجاد حسین کی معیت میں اپنے چھوٹے بھائی ظریف کو تیار کیا اور ظرافت اور مزاح کے ذریعے زلف و دہن اور کمر والی لکھنوی شاعری پر حملہ شروع کیا۔ اس کی تفصیل کے لئے دیوان ظریف کا مقدمہ ملاحظہ ہو۔

۱۸۹۵ء میں صفی کے مکان پر "دائرہ ادبیہ" کے نام سے ایک انجمن قائم ہوئی، جس میں نظم کے موضوع دیئے جاتے تھے اور پھر ان پر نظمیں لکھی جاتی تھی۔ اس سے قبل ۱۸۸۰ء میں صفی نے خود ایک معرکہ آرا قومی نظم "نخل فریاد" کے عنوان سے شائع کی تھی۔ اصلاح تخیل کے لئے صفی کے محبوب ترین اور خوش گو شاگرد صغیر مرحوم نے لکھنؤ سے ایک رسالہ پھلجھڑی نکالا۔ یہ سلسلہ برابر جاری رہا۔ یہاں تک کہ صفی اپنے عہد کا رنگ تخیل بدلنے میں کامیاب ہو گئے۔ اس ضمن میں مولانا حسرت موہانی مرحوم نے اپنے رسالہ اردوئے معلی میں لکھا ہے :-

" نصیر الدین حیدر اور غازی الدین حیدر شاہان اودھ کے زمانے میں غزل اودھ کی تخیل کا جو انداز تھا وہ اُردو داہل ادب دقیقہ شناس نظروں کے سامنے ہے۔ اس کی ناسخی دپیروی میں کیا بلحاظ لفظ و بندش اور کیا بلحاظ تخیل جس طرح شعرائے لکھنؤ منہمک تھے اس میں ترمیم و اصلاح کی ہمت کرنا کوئی آسان کام نہ تھا۔ یہ مولانا صفی کی زندگی اور شاعری کا ایک کارنامہ ہے۔"

واقعی مولانا صفی کی شخصیت کا یہ ایک فلک رفعت کارنامہ ہے اور اگر مولانا کی شخصیت میں کوئی اور بات نہ ہوتی تو بھی یہ اصلاح و تصحیح تاریخ ادب میں ان کا نام زندہ اور تابندہ رکھنے کے لئے کافی تھی۔ یقیناً اس سلسلے کی اور کڑیاں بھی ہیں اور مدارج اصلاح و ارتقائی منازل میں اور لوگوں کے نام بھی نمایاں نظر آتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ پہل کا سہرا ہر حال میں مولانا صفی ہی کے سر رہے گا۔ انہیں اس حق سے کسی صورت محروم نہیں کیا جا سکتا۔ مولانا کی خدمات سے انکار کرنا یا ان کا اعتراف نہ کرنا ادبی خیانت ہے۔ خاص کر ایسی حالت میں کہ انہوں نے خود رسالہ معیار اصلاح تخیل کے لئے نکالا اور انجمن معیار قائم کی جس کے دم مرتے دم تک صدر رہے۔ چکبست، علامہ اقبال اور ڈاکٹر مرزا محمد ہادی کے علاوہ ادب کے تمام معیاری اور مستند مصلح مولانا صفی کی عظیم المرتبت شخصیت کے قائل ہیں۔

صفی کی شخصیت میں شاعری کے وسیلے اور ان کی دماغی صلاحیتوں کے لحاظ سے ملک و قوم کی اصلاح و ترقی کے اور بھی گوشے ملتے ہیں آپ نے لوگوں کے ذہنوں میں مدد جزر پیدا کیا۔ اپنی نظموں کے ذریعے کئی رفاہی منصوبوں کی داغ بیل ڈالی۔ کالج اور سکول کھلوائے، یتیم خانہ قائم کرایا اور صنعتی ترقی کے لئے لوگوں کو عملی اقدام کی طرف مائل کیا اور یہ حقیقت ہے کہ آپ نے جو قومی نظمیں لکھی ہیں۔ اُردو زبان کی تمام پابندیوں اور خوبیوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے اور ان کی شعری قدر و قیمت کے پیش نظر ہندوستان کے کسی شاعر نے ان سے بہتر نظمیں نہیں لکھی ہیں۔ آپ کی نظموں کے مجموعے "لخت جگر" اور "صحیفۂ القوم" ہمارے اس دعویٰ کا روشن ثبوت پیش کرتے ہیں۔

مولانا صفی نے ملک کے مختلف فرقوں سے تعلق رکھنے والے بڑے بڑے لیڈروں اور رہنماؤں کی منظوم سوانح عمریاں بھی لکھیں ہیں اور ایک لحاظ سے اردو میں یہ کام سب سے پہلے آپ ہی نے شروع کیا۔ اس کے علاوہ مولانا نے قومی نظموں میں کارآمد تاریخی اور جغرافیائی حالات کا ذکر بھی پیڑی بندی کے عنوان سے شروع کیا۔ جیسا کہ آپ نے خود کہا ہے ؎

نظم میں تاریخی وجغرافیائی پیٹریاں   اس پٹی بندی کا موجد میں ہوں واقف ہے جہاں

مولانا صفی اُردو کی طرح فارسی کے بھی بڑے زبردست ادیب اور شاعر تھے۔ میں نے آپ کے صدہا شاگردوں کو سُنا ہے لیکن آپ

سے پوری طرح باخبر تھے اور کسی بھی موضوع کو شاعرانہ جولانیوں کے ساتھ بیان کرنے پر اس بلا کی قدرت رکھتے تھے کہ جو کچھ کہتے تھے وہ ان کا اپنا حال معلوم ہوتا تھا۔ مثال کے لئے ایک شعر ملاحظہ ہو ؎

کل ہم آئینے میں رُخ کی جھرّیاں دیکھا کئے　　　کاروانِ عمرِ رفتہ کے نشاں دیکھا کئے

اظہارِ خیال پر کمال قدرت کی سب سے بڑی وجہ غالباً مولانا صفی کا مشغلۂ کتب بینی ہی تھی۔ صراح، قاموس اور فارسی کے لغات بہارِ عجم اور غیاث اللغات کے صفحات پر ان کی اتنی تحریری یادداشتیں درج تھیں کہ یہ صفحات اپنی جگہ ایک دوامی مدرسہ یا عراق کے درسِ خارج کی صحبت بن گئے تھے۔

مولانا صفی عام طور پر اپنے گھر کی بیرونی نشست گاہ میں بیٹھا کرتے تھے۔ یہ نشست گاہ کبھی پھوس کی بنگلیا ہوا کرتی تھی۔ اسے آج کے بہت سے نو عمر ادیبوں اور شاعروں نے نہیں دیکھا ہوگا کیوں کہ گزشتہ پچاس سال کے اندر اس میں کئی تبدیلیاں رونما ہو چکی ہیں۔

مولانا کی حیات میں یہ نشست گاہ ہزاروں اہلِ ذوق کا مامن تھی اور میں نے یہاں مولانا شبلی اور حالی جیسے بلند پایہ حضرات کو خود دیکھا ہے۔ لیکن افسوس کہ آج یہی نشست گاہ پناہ گزین پردیسیوں کا آستانہ بن کر رہ گئی ہے۔

مولانا کا گھر مسجد کے دروازے کی طرح ہر آنیوالے کے لئے کھلا رہتا تھا۔ آپ انتہائی سادگی کے ساتھ ہر ایک سے یکساں تواضع اور اخلاق سے پیش آتے تھے اور بڑی سے بڑی فرمائش کی تکمیل کے لئے اس کشادہ دلی سے آمادہ رہتے تھے جیسے اسی کی تنخواہ پاتے ہیں۔ آخر عمر میں آپ فرمایا کرتے تھے کہ اب الفاظ یاد نہیں آتے۔ مفہوم راہ بھولے ہوئے حافظے کے گرد منڈلاتے نظر آتے ہیں اور شعر کہنے میں لطف اور مزے کی بجائے تکلیف ہوتی ہے۔ ایک بار میں نے ایک قومی نظم لکھنے کی فرمائش کی تو مولانا نے معذرت پر معذرت کر کے اپنی مجبوریوں کا اظہار کیا۔ میری نافہمی اور خود غرضی کہ برابر اصرار کرتا رہا لیکن جب وہ کسی طور آمادہ نہ ہوئے تو شکستہ دل ہو کر چلا آیا ——— ابھی واپس آئے۔ زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ مولانا کا فرستادہ نظم لئے ہوئے پہنچ گیا۔ میں نے اپنی طویل عمر میں اس انتہا درجہ کی وضع داری اور خیالِ خاطرِ احباب کی مثال نہ دیکھی ہے اور نہ سنی ہے۔

ایک بار مولانا کی قوتِ ادراک اور احساسات و مطالعہ پر مجھے بڑی حیرت ہوئی، لکھنؤ کے ایک تاجر حکیم صاحب مقوّی ادویہ کے لئے اشتہاری قسم کی ایک نظم کی خواہش لے کر مولانا کے پاس آئے۔ اور کوئی بھلا آدمی ہوتا تو یا تو ہمت ہی نہ کرتا یا چند شعر کہہ کر ٹال دیتا لیکن مولانا نے نظم کہی اور وہ بھی اس درجے کی کہ ناصری مرحوم نے، جو الٰہ آباد یونیورسٹی کے فیلو اور ترتیب نصاب کمیٹی کے رکن تھے، طلبہ کے اخلاق کی اصلاح اور ترکِ عادات کے لئے اس نظم کو نصاب میں داخل کرا دیا۔ اس نظم کا عنوان غالباً "ما الحیات" ہے اور پہلا شعر یہ ہے ؎

ہنستی ہے ساری دنیا رنگت ہے زعفرانی　　　برباد اور دیکھے اُٹھتی ہوئی جوانی

یہاں نظم کی بلاغت اور پردہ ہی پردہ میں اظہارِ خیال پر قدرت کا ذکر کرنا مقصود نہیں بلکہ میں صرف مولانا کے کمالِ اخلاق اور منکسر المزاجی کی طرف اشارہ کرنا چاہتا تھا۔

مولانا صفی نے طب، فلسفہ، اور حکمت، غرض کہ سبھی کچھ پڑھا تھا اور اگر وہ شاعر نہ ہوتے تو کسی اور شعبہ میں اپنی عظمت کا لوہا منوا کر رہتے۔ لیکن یہ بھی ان کے کردار کی عظمت ہی کا ایک پہلو ہے کہ انہوں نے لوگوں کو خاموشی کے ساتھ درس دیا۔ وہ نور کا ایک ایسا سرچشمہ تھے جن سے سینکڑوں آفتاب پھوٹے لیکن خود انہوں نے اپنے آپ کو تاریکی اور گمنامی میں رکھنا پسند کیا۔ مولانا صفی لکھنوی پرانے بزرگوں کے اخلاق اور معدولیت پسند شخصیت کا نمونہ تھے۔ آج کل ریڈیو اسٹیشن جا کر غزل یا نظم پڑھنا معیوب نہیں سمجھا جاتا لیکن مولانا صفی اس میں شاعری جیسے پاکیزہ فن کی اہانت تصور کرتے تھے اور زیادہ روپے کی ترغیب کے باوجود کبھی گھر سے نہ نکلے۔ منتخب اشعار کا معاوضہ دے کر اشاعت کی اجازت حاصل کرنے کی ادنا خواہش ظاہر کی گئی لیکن وہ عزت اور احتیاج کے باوصف ہمیشہ ایک گوشہ نشین فقیر کی طرح ہاتھ سمیٹے بیٹھے رہے اور دستِ سوال دراز نہ کیا۔

سر تیج بہادر سپرو آنجہانی اور رائے بریلی کے تعلقہ دار راجہ مہندر سنگھ آنجہانی نے کئی بار چاہا کہ مولانا صفی اپنا دیوان ان کی مدد سے چھپوا دیں مگر ان کی غیرت نے گوارا نہ کیا اور یہی وجہ تھی کہ ان کی وفات اور ان کے لڑکوں کے مرنے کے بعد مجھے اپنی بند وقف بیچ کر اردو کی لاج کے لئے ان کا دیوان شائع کرنے کا شرف حاصل کرنا پڑا۔

مولانا زندگی بھر اپنے آرام کے لئے دوسروں پر بار ڈالنے سے گریز کرتے رہے۔ ان کی وفات پر جوش ملیح آبادی نے "آج کل" میں مولانا کی غیور طبیعت اور وضع داری کو ان الفاظ میں خراجِ عقیدت پیش کیا ہے کہ :۔

"طویل عمر اور لمبی علالت کو صبر و شکر کے ساتھ کاٹ دینا مولانا کے سوا کسی اور کا کام نہ تھا اور اگر ان کی سوکھی ہڈیوں کو کچھ اور راحت اور سکون میسر آ جاتا تو ابھی شاید کچھ اور جی جاتے اور اگرچہ عمر طبعی کو پہنچ گئے تھے لیکن ۱۵ رجون ۱۹۵۰ء کو یوں نہ مرتے"

جیسا کہ میں نے پہلے کہا ہے مولانا دنیا کی صحبتوں اور ناچ رنگ کے جھمیلوں سے بہت دور تھے مگر ہر رنگ سے باخبر تھے۔ ناچ رنگ لکھنؤ کے پرانے نوابوں اور شرفا کی خاص خاص صحبتوں کا لازمہ بن چکا تھا۔ میرے ایک وضع دار شاہی وثیقہ دار کرم فرما اپنی ایک خاص محفل کا ذکر فرماتے تھے کہ اس میں رقاصہ کے سوا سازندوں میں سے کوئی نہ ہوتا تھا۔ بے تکلف، عالی مرتبت ذمہ دار اور صاحب کردار احباب ہوتے تھے۔ کسی کے سامنے طبلہ ہوتا تھا، کسی کے ہاتھ میں مجیرا، کسی کے زانو پر سارنگی اور کسی کے پہلو میں ستار یا ہارمونیم۔ ادھر رقاصہ نے غزل چھیڑی ادھر ساز بجنے لگے، یہ بھی ہم مذاق شرفا اور پرانے لکھنؤ کی صحبتوں کا ایک نقشہ تھا جواب نظر نہیں آتا۔

صفی یوں تو موسیقی کے رموز سے واقف اور ایسی صحبتوں سے باخبر تھے لیکن انہوں نے تمام عمر کسی ساز کو ہاتھ نہ لگایا۔ اس کے باوجود وہ ایسی صحبتوں کا نقشہ تاریخ کے دامن پر اتارنے کے لئے ایک انتہائی یادگار، جاندار اور زندۂ جاوید شعر چھوڑ گئے ہیں ؎

غزل اس نے چھیڑی مجھے ساز دینا ذرا عمرِ رفتہ کو آواز دینا

اس شعر پر میں نے انہی ضعیف العمر نواب صاحب کو بارہا یادِ شباب میں سر دھنتے اور آنسو بہاتے دیکھا ہے۔

مولانا صفی ہمیشہ شیروانی، اونچی دیوار کی ایرانی ٹوپی، قمیص اور چھوٹی مہری کا پاجامہ اور بوٹ پہنتے تھے۔ پان بہت کم کھاتے تھے البتہ حقہ کے عادی تھے اور کبھی کبھی سگریٹ بھی پی لیتے تھے۔ تمام عمر مسکرات سے دور رہے کبھی کبھی نماز پڑھتے اور دو ایک روزے رکھ لیتے تھے۔ مجالس اور میلاد کی محفلوں میں کم جاتے تھے۔ نہایت غیر متعصب، آزاد طبع اور آزاد خیال تھے۔ مذہب میں ریاکاری کو بہت برا سمجھتے تھے اور نکتہ چینی اور اظہار رائے میں بڑے بے باک تھے۔ بعض شاعروں کی طرح تعلّی، دوسروں کی بدگوئی یا منقبت کبھی ان کا شعار نہ تھا۔ نہایت ہنس مکھ، خلیق، وضع دار اور نرم دل تھے اور سب کے شریکِ درد رہتے تھے۔ مرزا جعفر علی خاں اثر نے آپ کی وفات پر ایک مبسوط نظم صفی کے کردار اور شخصیت کے متعلق کہی تھی جس کے چند شعر یہ ہیں :۔

وضعِ صفی نہ پوچھ اک رندِ پارسا تھا بیگانہ بھی تھا سب سے پھر سب سے آشنا تھا
خلقِ خدا کی خدمت مقصد حیات کا تھا اس کے سوا نہ کوئی مطلب نہ مدعا تھا
بدلہ بدی کا نیکی دشمن کو دوست بنانے والا اس منزلت کا شاعر کیا کوئی دوسرا تھا
خلقِ حسن نے اس کے دل کو فزوں تر سے ہر کہ و مہ کو اپنا گرویدہ کر لیا تھا
صدق و خلوص و ایثار اس کی سرشت میں تھے جو قول یا عمل تھا بے ریب و بے ریا تھا
ظاہر سے بھی زیادہ باطن کی تاب ناکی عارف تھا خود نگر تھا صالح تھا با خدا تھا
غیرت کی پاسداری شیوہ تھا اس جری کا ایمانِ حیا کو سمجھا وہ صاحبِ حیا تھا

نازاں ہیں سب زبان پر تجھ پر زبان تھی نازاں ۔۔۔ رنگِ سخن کچھ ایسا تو نے بدل دیا تھا
وہ تیری بذلہ سنجی وہ تیری خوش نوائی ۔۔۔ پڑھتا تھا تیرا کلمہ پڑھتے جو سن چکا تھا

مولانا صفی کی بذلہ سنج طبیعت اور گرہ لگانے میں مہارت کے سلسلے میں کئی لطیفے مشہور رہے ۔ یہاں ہم صرف ایک واقعہ کا ذکر کریں گے جو مولانا کے ایک نیاز مند قدردان مرزا محمد سجاد تاجر بیان کرتے تھے ۔

ایک مرتبہ یہ صاحب مولانا کے ہم سایہ پرنس ہمایوں جاہ سے ملنے گئے جو ٹیپو سلطان کے خاندان کے ایک مقتدر فرد تھے ۔ ان سے ملاقات کے بعد سجاد صاحب مولانا سے بھی ملنے چلے گئے اور وہاں زبان سے نکل گیا کہ پرنس ہمایوں جاہ سے ملنے آیا تھا ۔ سوچا کہ آپ سے بھی مل لوں ۔ مولانا نے بڑی خاطر تواضع کی اور جب وہ چلنے لگے تو متبسم ہو کر فرمایا کہ کہئے اب پھر پرنس ہمایوں جاہ سے ملنے کب آیئے گا ؟

مولانا صفی کا بے مثل اندازِ شعر خوانی ایسا تھا کہ اس میں ترنم تھا لیکن اسے موسیقی سے دُور کا تعلق نہ تھا ۔ اس ضمن میں نے ایک تفصیلی اور مستقل مضمون بھی لکھا ہے

مختصر لفظوں میں مولانا صفی کی شعر خوانی کو انہی کے اس شعر کی صورت میں بیان کیا جا سکتا ہے ؎

بہ حسنِ صوت گو مرغوب ہے طرزِ غزل خوانی ۔۔۔ نہ لیکن یوں کہ سمجھیں اک مغنّی نکتہ داں مجھ کو

مولانا صفی نے اپنی پُر اثر اور ہمہ گیر شخصیت کے بل بوتے پر اپنے لئے ایک خاص مقام تو ضرور پیدا کر لیا تھا لیکن آپ کو جو شہرت حاصل ہونی چاہئے تھی اور ادب کی تاریخ میں آپ کو جو درجہ ملنا چاہئے تھا وہ نہ مل سکا ، اس کی سب سے بڑی وجہ تو یہ ہے کہ آپ طبعاً خلوت پسند تھے اور نام و نمود سے گریز کرتے تھے ۔ اور دوسری وجہ یہ کہ آپ کے بعض حاسدوں نے لوگوں کے دلوں سے آپ کی حقیقی قدر و منزلت کم کرنے کے لئے بڑی تندہی سے کام کیا اور یہ باور کرا دیا کہ صفی صرف قومی نظمیں اچھی لکھ سکتے ہیں ۔ اس طرح گویا ان کا وہ سارا ریاض اکارت گیا جو انہوں نے غزل کو پروان چڑھانے کے لئے کیا تھا ۔

بہر حال اردو ادب کے لئے یہ بات ایک المیہ سے کم نہیں کہ صفی جیسا بلند پایہ شاعر جس نے پون صدی تک ہر صنفِ شعر میں اپنی طبع رواں کے جوہر دکھائے ، اتنی جلدی فراموش کر دیا گیا ۔ اور اس کی شخصیت اور شاعری یوں برباد ہوگئی کہ صفی قبر کی آغوش سے اپنا یہ شعر سناتے معلوم ہوتے ہیں ؎

یہ صلہ ہے عمر بھر کی محنتِ برباد کا
سننے بیٹھے ہیں وہ افسانہ دلِ ناشاد کا

تاجور نجیب آبادی

محمد وارث کامل

علی سائیں کی مسجد کے عقب میں جہاں اپنے آخری موڑ پر فلیمنگ روڈ دم توڑتی ہوئی نظر آتی ہے کچھ نئی وضع کے مکانات بنے ہوئے ہیں انہی مکانات میں ایک وہ مکان بھی ہے جو ایک مدت تک شمس العلماء علامہ تاجور نجیب آبادی کی قیام گاہ بنا رہا ہے۔ علامہ سے میری پہلی ملاقات اسی مکان کے ایک کھلے برآمدہ میں ہوئی تھی ۱۹۴۲ء کے موسم گرما کا شباب ڈھل چکا تھا لیکن پھر بھی اس یک منزلہ مکان میں دن کو بھی جہاں شب کی سیاہی کا گمان تھا، اس بلا کی گرمی اور اس قیامت کا حبس تھا کہ دم گھٹا جاتا تھا۔ علامہ نے چارپائی پر بیٹھے بیٹھے اپنے بھاری بھرکم جسم کی ایک ارتعاشی حرکت سے میرا خیر مقدم کیا اور کسی تمہید کے بغیر مجھ پر طنز و ظرافت سے ملے جلے الفاظ کے تیروں کی بوچھار کر دی۔

"اچھا تو آپ ہیں میرے ہم وطن مولانا محمد وارث کامل بی۔ اے۔ خوب، ماشاء اللہ آپ تو بڑے نستعلیق دکھائی دیتے ہیں۔ مولانا! آپ کافی عرصہ سے لاہور رہ رہے ہیں کبھی بھولے سے بھی آپ نے ادھر کا رُخ نہیں کیا۔ میرے ڈیل ڈول کا آدمی جو روش کائنات پر بار گراں بنا ہوا ہو کہاں کہاں جائے اور کس کس سے ملے؟ پھر کچھ عمر کے تقاضے بھی تو ہوتے ہیں آپ مجھ سے عمر میں کہیں چھوٹے ہیں آپ کا یہ اخلاقی فرض تھا کہ مجھ سے اولین فرصت میں ملتے۔ تاجور رہا ہی سہی لیکن انکار تو نہیں کہ آپ اس کے پاس بھی نہ پھٹکیں۔ مولانا میں تو آپ ہی کی برادری کا آدمی ہوں سالہا سال پہلے میں نے دارالعلوم دیوبند سے فضیلت کی سند لی ہے۔ میں نے خود ہی بلایا تو آپ تشریف لائے۔ مولانا آپ سے تو یہ بار سے باز رہنے کی ملاقات پھر بھی آپ شکریے کے مستحق ضرور ہیں۔"

میں نے علامہ کی یہ گفتگو خاموشی کے ساتھ سنی اور آخر میں اپنے غلط رویّہ پر معذرت طلب کی۔ علامہ سے میری ملاقات شاہکار کی اشاعت کے سلسلے میں تھی۔ اگر یہ ماہنامہ پہلے کی طرح علامہ کی ملکیت ہوتا اور کسی شیخ الجہود کے ہاتھوں میں اس کی باگ ڈور نہ ہوتی تو میں اس ملاقات

کو اپنے حق میں ایک نعمت غیر مترقبہ سمجھتا ہیں نے علامہ کی یہ پیشکش تو قبول نہیں کی البتہ ان کی یہ بنیادی تجویز مان لی کہ مولانا ! مکتبہ دانش سے وابستہ ہو جائیے۔ غرض علامہ کی ناگواریٔ خاطر کا خطرہ جاتا رہا اور تعلقات کی خوشگواری میں مطلق کوئی فرق نہیں آیا۔ حادثۂ تقسیم تک علامہ سے ملاقات اور رسم کا سلسلہ جاری رہا۔ ۱۹۴۷ء کے انقلابِ عظیم نے میرے اور ان کے درمیان کچھ ایسا خطِ فصل کھینچا کہ مزید ملاقاتیں ہی کے امکانات کچھ کم قوی نہ تھے۔ قیامت تک کے لئے معرضِ التوا میں جا پڑیں۔ پاکستان کی آزادی یا بالفاظِ دیگر نوزائیدہ مملکت پاکستان نے ابھی اپنی زندگی کی تین بہاریں دیکھی تھیں کہ علامہ نے آخرت کی راہ لی۔ میں نے مجبوری میں رہتے ہوئے جہاں میں سات سال مدینہ کی ادارت کے فرائض سر انجام دیتا رہا ہوں، یہ خبرِ وحشت اثر سنی تو ایک تعزیتی جلسہ کا فوری اہتمام کیا اور اس میں علامہ کے حالاتِ زندگی، ان کی علمی و ادبی خدمات اور ان کی شاعری پر روشنی ڈالی۔ اس موقعہ پر میں نے ارتجالاً یہ دو شعر بھی کہے تھے۔

غضب کی رات سے تاروں کی چھٹ گئیں نبضیں
جو کچھ دیئے ہیں کہیں ٹمٹمائے جاتے ہیں
نظر سے دل کی طنابیں جو کھینچ لیتے ہیں
کہیں جہاں میں وہ انسان بھی پائے جاتے ہیں

علامہ تاجور نجیب آبادی کے ساتھ جو علمی و ادبی صحبتیں گرم رہی ہیں ان کی تفصیل میں جانا نہیں چاہتا البتہ ایک صحبت، جس سے علامہ کی نیا مذاقی اور وسیع النظری پر روشنی پڑتی ہے، یہ تقاضا کر رہی ہے کہ میں اس کے نقوش ضرور اجاگر کروں۔ اس صحبت کا شرف مجھے حضرتِ احسان دانش کی پہلی قیام گاہ (کوٹ عبداللہ شاہ مزنگ) پر حاصل ہوا۔ علامہ دعوتِ چائے پر مدعو تھے۔ جس کمرہ میں دعوت کا اہتمام کیا گیا اس میں علامہ کے خیر مقدم کے لئے ایک تو میری خدمات وقف تھیں اور دوسرے ایک مولانا محمد علی سہارنپوری تھے۔ یہ ان خدمات کے سلسلہ میں میرے دست راست بنے ہوئے تھے۔ علامہ تشریف فرما ہوئے تو ہم دونوں نے بصد ادب و احترام ان کا استقبال کیا اور اس مسندِ نشست کی درخواست کی جو خاص ان کے لئے آراستہ کی گئی تھی۔ چند لمحات نہیں گذرے تھے کہ موقر مہمان کے میزبان حضرت احسان وارد ہوئے اور رسمی علیک سلیک کے بعد اپنے بڑے صاحبزادہ کو حکم دیا کہ چائے کی چینک اور پرچیں پیالیاں لے آئے۔ ہر چیز تیار تھی اس لئے آنِ واحد میں حکم کی تعمیل ہو گئی۔ علامہ نے چینک، پرچوں اور پیالیوں پر ایک تجسس آمیز نظر ڈالی اور پھر برق کی سرعت کے ساتھ اس کارگر شیشہ گری کا طلسم پاش پاش کر ڈالا۔ احسان صاحب مہتمم بے خانہ بدوش قلندر ان کی طبیعت پر شکست و ریخت کا یہ جارحانہ عمل گراں نہیں گذرا بلکہ میں نے دیکھا کہ ان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ احسان صاحب کے اس حسنِ تجو نے علامہ کے مزاج کا پارہ کچھ اور تیز کر دیا۔ بولے:۔

تو اب بھی اپنے آپ کو شاعرِ مزدور ہی سمجھتا ہے۔ تجھے اس بات کا مطلق احساس نہیں کہ دنیائے ادب میں تیرا کیا مقام ہے۔ ایسی بھی کیا کور ذوقی کہ روز مرّہ کے استعمال کی چیزیں بھی تیرے گھر میں نہیں یہ پرچیں پیالیاں کیا اس قابل تھیں کہ ان میں کسی مہمان کو چائے پلائی جائے۔ بھونڈی اور بھدی پیالیاں ٹیڑھی ترچھی پرچیں، سیلے ڈول چینک یہ ہے تیرے ذوق کی کائنات، شرم کر۔ میں تجھے اجلے کپڑوں میں دیکھنا چاہتا ہوں اور اس ٹھاٹھ کے ساتھ کہ تیرے گھر میں ہر چیز سلیقے کی اور ہر شے قرینے کی ہو۔ جا ابھی نیا سیٹ لا۔

چائے کے سیٹ کا مسئلہ تو حل ہو گیا اور ہم سب نے چائے پی بھی لی لیکن اس دوران میں جو لطف حدیثِ مائدہ نے دیا، بیان سے باہر ہے۔ علامہ کی زبان سے جو فقرہ بھی نکلتا تھا کبھی طنز و ظرافت کی چاشنی لئے ہوتا اور کبھی قند و نبات کا مزہ دیتا۔ علامہ نے اس دعوتی تقریب میں معاشرتی زندگی کے نشیب و فراز پر اس بالغ نظری کے ساتھ اپنے خیال کا اظہار کیا کہ ہم عش عش کر اٹھے ہم میں سے جب کوئی لب کشائی

کی عبارت کرتا تو علامہ لفظ لفظ پر ٹوکتے کبھی الفاظ کے دروبست پر اور کبھی تراکیب کی تراش خراش پر بڑی بے رحمی کے ساتھ تنقید کرتے مجھے یاد ہے کہ علامہ نے مولانا محمد علی سہارنپوری کے ایک جملہ میں تین غلطیاں نکالیں مولانا کا جملہ یہ تھا :۔

علامہ ... یہ ہماری نا عاقبت اندیشی ہے کہ ہم غریبی کے دن کاٹ رہے ہیں"

علامہ نے ارشاد فرمایا کہ مولانا "نا عاقبت اندیشی" غلط ترکیب ہے۔ نفی عاقبت کی نہیں بلکہ اندیشہ کی ہے اس لئے "نا" کا استعمال "اندیشی" کے ماقبل ہونا چاہیئے۔ "ہم غریبی کے دن کاٹ رہے ہیں" ادبی حیثیت سے یہ جملہ بھی غلط ہے۔ رات کٹتی ہے دن نہیں کٹتا۔ دن بسر ہوتا ہے، گذرتا ہے اور تیر ہوتا ہے "غریبی کے دن" میں یہ سقم ہے کہ مضاف الیہ غریبی بن گیا ہے، حالانکہ نفس عبارت سے کچھ اور ظاہر ہوتا ہے۔ جملہ یوں ہونا چاہیئے تھا "ہم غریبی میں دن تیر کر رہے ہیں"۔

احسان صاحب تو کاندھلہ کی مخصوص بولی بولتے ہیں لہٰذا علامہ کے تنقیدی نشتر ان پر نہیں چل سکے۔ رہا میں، میرا شغل ایک مدت سے خطابت ہے زبان کھلتی ہے تو پھر میرے سامنے وسعتیں ہی وسعتیں ہوتی ہیں۔ جن میں فکر و ارادہ کو کوئی دخل نہیں ہوتا۔ تلفظ الفاظ کی نشست و برخاست اور محاورہ بندی پر میری نظر صرف تحریر ہی میں نہیں بلکہ تقریر میں بھی رہتی ہے۔ علامہ سے میری گفتگو بڑی دیر تک ہوتی رہی اور میں جی ہی جی میں مگن ہو رہا تھا کہ یہ میری خوش قسمتی ہے کہ علامہ ایسا نقاد بھی میرے کسی لفظ اور کسی جملہ پر گرفت نہیں کر سکا۔ شامت اعمال کہ باتوں باتوں میں میری زبان سے یہ جملہ نکل گیا "علامہ! سنبیاں بہت لذیذ ہوتی ہیں" علامہ برس پڑے اور ایسے برسے کہ نغمے بہ نکلے۔ فرمایا :۔

سنبیاں۔ یہ کیا کہا آپ نے۔ یہ کس زبان کا لفظ ہے ہماری نظر سے تو آج تک یہ لفظ نہیں گذرا۔

میں :۔ علامہ عید، بقرعید پر تو آپ نے بھی سنبیاں کھائی ہوں گی۔

علامہ :۔ مولانا، آپ نے تلفظ غلط کیا ہے۔ یہ لفظ "سنبیاں" نہیں بلکہ "سویاں" ہے۔ کچھ سمجھے آپ، اہل زبان ہوتے ہوئے ایسی فاش غلطی، آپ کو تو پنجاب آئے ابھی جمعہ جمعہ آٹھ دن ہوتے ہیں۔ ہمیں دیکھئے کہ ہم نے اپنی زبان کو ہر قسم کی دستبرد سے محفوظ رکھا ہے۔ دوسروں پہ اپنی زبان کے نقش بٹھاتے ہیں کسی کی زبان ہم پر اثر انداز نہیں ہو سکی اردو میر و سودا، مصحفی و انشا، آتش و ناسخ، غالب و ذوق، انیس و دبیر، داغ و امیر، جوش و جگر، سیماب و احسان، اختر و تاجور کی زبان ہے اور پنجابی وارث شاہ اور بلھے شاہ کی زبان۔ ہر زبان کے استاد الگ الگ ہیں۔

اس صحبت کے جو نقوش میں نے اپنے حافظے کی مدد سے زیب قرطاس کئے ہیں ان سے علامہ کی معاشرتی، اخلاقی اور ادبی زندگی کے بہت سے پہلو نمایاں ہو جاتے ہیں۔ تاریخ ادب میں ان کا جو مقام ہے اسے سمجھنے کے لئے ہمیں علامہ کی چند خصوصیات پر نظر ڈالنی ہوگی اور وہ بھی ذیلی سرخیوں کے ساتھ تاکہ بعد میں کسی تذکرہ نویس کو زیادہ کاوش نہ کرنی پڑے۔

علامہ فارسی اور عربی علوم میں اتنی کامل دستگاہ رکھتے تھے۔ کہ ان کے اساتذہ کو بھی ان کے تبحر علمی پر ناز تھا۔ مجلہ دیوبند "القاسم" میں اس نابغہ فاضل دیوبند کے جو مضامین کسی دور میں اشاعت پذیر ہوئے ہیں۔ ان سے اگر کہیں وسعت نظر کا ترشح ہوتا ہے تو کہیں جودت فکر نوازش کرتی ہے۔ علامہ کو قدرے ذہنی سکون میسر آتا تو نہ معلوم وہ اپنے علمی ذوق کی تسکین کا سامان کس طرح بہم پہنچاتے "میری علمی اور ادبی زندگی" کے عنوان سے علامہ نے ۱۹۴۰ء میں جو سلسلۂ مضامین سپرد قلم فرمایا تھا۔ اس میں ایک جگہ یہ الفاظ بھی نظر آتے ہیں

"مدت مدید سے اس فکر میں ہوں کہ قسمت موجودہ افکار لاحاصل سے رہائی بخشے تو "ادب العرب" کے نام سے چند مجلدات میں ادب عربی (نظم و نثر) پر ایک ضخیم تصنیف سرانجام دے کر اسے زندگی کی راہ سپردگی کے لئے منزل راہ زندگی بنا لوں ...... دیوبند میں پہلے دلپسند مضامین شروع

ہی سے عربی ادب اور فلسفہ پڑھتے رہے۔ لاہور آیا تو شمس العلماء مفتی عبداللہ ٹونکی جیسے عربی کے بے مثال ادیب اور بین الاقوامی شہرت کے فلسفی کا فیض مجھے نصیب ہوا۔ اُردو ادب میں میری دلچسپی تفریح کی حد تک رہتی تھی مگر حالات ناسازگار نے اس تفریح کو میری زندگی بنا دیا۔

علامہ کے اندر نثر نگاری کی سب خوبیاں جمع تھیں یعنی طنز و ظرافت، بذلہ سنجی، نغز گفتاری، سحر نگاری، شعلہ بیانی ان کی دلآویز تحریر کی وہ ادائیں ہیں جن پر ان کے معاصرین رشک کرتے تھے۔ ان کی نثر کے دو تین نمونے پیش کرتا ہوں۔ آپ ان سے علامہ کی قلمی بوقلمونی کا اندازہ کر سکتے ہیں:-

"میں زمانہ سے دولت و حشمت کا طلب گار رہا تھا کہ میرے آباو اجداد اپنی نمایندہ پشاور کے حصے کی کچھ دولت و حشمت صرف کر گئے عیش و راحت کا خوگر بھی نہیں کہ گردیشی نے اس حسرت نادیدہ سے روشناس ہی نہیں ہونے دیا۔ ادب شہرت، اس کا آغاز جس قدر مسرور کن نظر آتا تھا اگر اس کے اندوہگیں انجام سے باخبر ہوتا تو شہرت کو اپنے لئے شجر ممنوعہ بنا لیتا۔ اُردو زبان سے متعلق میرا جنون خدمت، ادب نواز و ادب پرست طبقات کی نگاہ استحسان کا مستحق ہو یا نہ ہو لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ رسوائی میرے لئے سوہانِ روح بن گئی ہے۔ اس شخص کی بدنصیبی سے کون انکار کرے گا جس نے زندگی کے پندرہ سال علوم عربیہ کی تحصیل و تکمیل میں اس طرح گذارے ہوں کہ عید بقر عید کے سوا شکم سیر کھانا اور سالم لباس کبھی میسّر نہیں ہوا، جس کی جوانی کے حسین خواب گرسنگی اور برہنہ پائی کے تصورات تک محدود رہے اور جس نے اپنا عہد طالب علمی اُردو سے نفرت اور فارسی سے بیزاری میں اس لئے بسر کیا کہ عربی اور علوم عربیہ کے مقابلہ میں اُردو فارسی ادب بے حقیقت چیز سمجھا کیا یہ وقت کی ستم ظریفی نہیں کہ اس نے نادری کر اس کی زندگی تباہ دیا ہے۔ آہ!

اپنے شاگرد چوہدری لعل کاوش کو ایک خط لکھتے ہیں:-

عزیز گرامی قدر کاوش

ہزاروں دعائیں، لاکھوں سلام! تمہارا خط ایسے وقت ملا کہ میں تم سے مایوس ہو چکا تھا تمہارے لئے میرے دل میں طوفانِ محبت، دماغ میں متعصبانہ خیالات اور زبان پر بے تحاشا گالیاں جاری تھیں، کاوش! تمہارے مستقل طور پر گم ہو جانے سے دل میں ایک خلا سا محسوس کرتا ہوں، ۱۵ لاکھ کی آبادی کا یہ لاہور میرے لئے تو اجاڑ ہو رہا ہے تم یاد آتے ہو تمہاری والدہ یاد آتی ہیں۔ تمہاری دلہن اور تمہارے حسین بچے یاد آتے ہیں۔"

اپنے بعض معاصرین کے بارے میں رقمطراز ہیں:-

علم و ادب کا صحافتی طوفان پانچ سال کے لگ بھگ علم و ادب کی بے کراں وسعتوں میں برپا رہا۔ اکثر معاصرین نے اپنے اپنے ظرف و حوصلہ کے مطابق اس سیلاب کو روکنا چاہا۔ مگر ان کی زمین گیری کیسے یا سخت جانی، انہیں اس طوفان سے بچائے گئی ورنہ پانی تو ان کے سر سے گذر چکا تھا۔ اس دور میں پست فطرت معاصرین کی حاسدانہ مدح خوانی کے ایسے ایسے تو کتنے تماشے دیکھنے میں آئے۔ کہ اکثر نگاہ تماشا حیرت میں ڈوب ڈوب گئی ہماری ادبی و صحافتی لائنوں میں بدنسلی و بے نسلی وبائے عام کی صورت اختیار کئے ہوئے ہے "ادبی دنیا" کے عہد عروج میں مجھے اس وبائے عام کو عریاں صورت میں دیکھنے کا موقع ملا

علامہ نے پنجاب میں اردو شاعری اور انشاپردازی کا کچھ اس شان سے صور پھونکا کہ تعلیم یافتہ نوجوانوں کے خوابیدہ جذبات بیدار ہو گئے۔ لکھنؤ اور دہلی میں ادبا کی تحریر کا جو رنگ تھا اس کے سانچے میں پنجاب کے ادیبوں کی تحریریں بھی ڈھلنے لگیں۔ رسائل و اخبارات کی زبان میں پہلے جو درشت اور کھردرا پن تھا رفتہ رفتہ اس کی جگہ بانکپن نے لے لی۔ تلمیحات اور محاورے کی ٹکسالی زبان کی چھاپ جب پنجاب کی اردو پر پڑی تو زبان کا لطف دوبالا ہو گیا۔ ۱۹۱۵ء میں جب مخزن کی ادارت کی باگ ڈور علامہ تاجور نجیب آبادی نے سنبھالی تو پانچ سال تک آپ نے اس کے فرائض اس خوش اسلوبی کے ساتھ سرانجام دیے کہ ادبی حلقوں میں اس کی مانگ بڑھ گئی۔ علامہ فرماتے ہیں کہ میں نے ایک دنیا پیدا کر لی تھی۔ مخزن بھی میرے ساتھ ساتھ ترقی کرتا رہا۔ میں اس کے بڑھاپے کو جوانی میں تو تبدیل نہ کر سکا لیکن

"جو آ کے نہ جائے وہ بڑھاپا دیکھا"

کے مقولہ کو مخزن کے حق میں، میں نے غلط ثابت کر دیا۔" مخزن کے بعد علامہ تاجور نے ہمایوں کی ادارت سنبھالی پانچ سال اس سے وابستہ رہے۔ اس مختصر سی مدت میں ان کی ادبی شہرت کے آفتاب کی شعاعیں ملک کے گوشے گوشے میں پہنچ چکی تھیں۔ علامہ نے اپنی صحافتی زندگی کے تیسرے دور میں خود اپنے رسالہ کا اجرا کیا۔ یہ رسالہ "ادبی دنیا" ۱۹۳۳ء تک شعر و ادب کا علمبردار رہا۔ ۱۹۳۵ء میں علامہ نے شاہکار کے نام سے ایک اور رسالہ نکالا۔ علامہ نے ہفتہ وار اخبار پریم بھی جاری کیا تھا جس کے ذریعہ آپ ملک کے بچوں بچیوں کے دل میں خدا، مذہب، وطن اور بنی نوع انسان کی محبت اور بلا امتیاز ہر مذہب کے پیشواؤں کی محبت پیدا کرنی چاہتے تھے (لاہور میں آمد سے قبل علامہ رسالہ تاج ہبل، آفتاب اردو (لدھیانہ) اور رسالہ تاج الکلام (نجیب آباد) کے مدیر رہ چکے تھے)

یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ آج پاکستان کے طول و عرض میں جو اردو روزنامے، ہفتہ وار اخبارات اور ماہنامے جاری ہیں ان کے ادبی محاسن کا سہرا علامہ تاجور نجیب آبادی کے سر ہے۔ خیر و شر کے بارے میں اسلام نے جو نظریہ پیش کیا ہے کہ جو شخص بھی خیر یا شر کی رسم ایجاد کرتا ہے اس کے اعمال پر اس کے منفی یا مثبت اثرات کی پرچھائیں ضرور پڑتی ہے اس کی رو سے بلا شائبہ مبالغہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اخبارات و رسائل میں جو اچھوتی تشبیہیں، لطائف و ظرائف، پرشوکت الفاظ، زبان کے محاورے اور ادب و تنقید کے سانچے میں ڈھلے ہوئے اشعار جہاں کہیں بھی دیکھنے میں آتے ہیں، زبان حال سے علامہ کی عظمت کی گواہی دیتے ہیں اور علامہ کی بارگاہ میں یہ خراج عقیدت پیش کرتے ہیں ؎

تیرے نازک لبوں نے سیکھا ہے
ہم نے انداز مسکرانے...... کا

علامہ کی شاعرانہ خصوصیت کو میں نے اس لئے آخر میں جگہ دی ہے تاکہ ان حضرات سے جو میرے مخاطب ہیں یہ حقیقت مخفی نہ رہے کہ علامہ اپنی اس خصوصیت کو کوئی خاص اہمیت نہیں دیتے تھے۔ اور غالباً یہی وجہ ہے کہ وہ مدت العمر میں اپنے کلام کا مختصر سا مجموعہ بھی شائع نہ کر سکے۔ علامہ کا بیشتر غیر مطبوعہ کلام ایسے شعراء کی تحویل میں ہے۔ جو علامہ کے شاگرد ہیں نہ عقیدت کیش۔ خدا کرے کہ ان بدباطن شعرا کی پردہ دری ہو اور علامہ کا یہ غیر مطبوعہ کلام پوری دیانت و امانت کے ساتھ منظر عام پر آ سکے۔ علامہ اتنے خوش اعتقاد واقع نہ ہوتے تو کسی کو بھی دستبرد کی جرأت نہ ہوتی۔ علامہ کا مزاج کچھ اس انداز کا تھا جس کی آئینہ داری اختر کے اس شعر سے ہوتی ہے ؎

سلطنت بیچتے ہیں دُردکشاں خاک کے مول
ہے یہاں سایۂ ہما خس و خاشاک کے مول

علامہ تاجور نجیب آبادی کے نام و نسب کے بارے میں اس دور کے ادبا کو بہت کم معلومات ہیں۔ ہم نشینی [illegible] کی زبانی [illegible]

ارشادات کئے دیتا ہوں :۔

"میرا نام احسان اللہ خاں، ابو المعرفان کنیت، تاجور تخلص، جائے ولادت نینی تال، تاریخ پیدائش غالباً سنہ ۱۸۹۴ء، وطن نجیب آباد ضلع بجنور، قومیت درانی پٹھان، تربیت گاہ دارالعلوم دیوبند، ذریعہ معاش دیال سنگھ کالج کی پروفیسری، وطن اقامت لاہور ہے، گورنمنٹ نے علمی ادبی خدمات کے صلے میں سنہ ۱۹۲۴ء میں شمس العلماء کا خطاب عطا کیا۔ انجمن ارباب علم نے سنہ ۱۹۲۳ء میں بلیغ الملک کا خطاب دیا تھا۔"

علامہ تاجور چند در چند فضائل کے باوصف سیمّا منتقم واقع ہوئے تھے اگر کسی کی طرف سے دل میں گرہ بیٹھ جاتی تو بڑی مشکل سے نکلتی تھی۔ کانوں کے کچے بھی تھے کئی دفعہ ایسا ہوا کہ کسی کے خلاف کسی نے علامہ کے کان بھر دئے اور پھر اس بیچارے کی شامت آ گئی کہ علامہ اس سے برسوں نہیں بولے۔ مزاج نا آشنا ہونے کے باعث علامہ کے اکثر شاگرد ان کی زندگی ہی میں ان سے کٹ گئے۔ علامہ کی اس کمزوری کا اثر ان کی زندگی کے ہر شعبہ پر پڑا ہے شروع شروع میں اس اثر نے خاندانی کشیدگی کی شکل بھی اختیار کی سب سے پہلی بیوی سے علامہ کی ناراضی اور پھر نکاح ثانی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یہ بھی علامہ کی اسی کمزوری کا نتیجہ تھا۔ علامہ مستقل مزاج بھی نہیں تھے عمر بھر انہوں نے کوئی کام پامردی اور مستعدی کے ساتھ نہیں کیا۔ ذہنی انتشار کا ناسور اس بری طرح ان کے دل و دماغ کی گہرائیوں میں رس رہا تھا۔ اور دلجمعی کے ساتھ وہ کسی موضوع پر ایک مختصر سی تصنیف بھی نہیں پیش کر سکے۔ اپنی طالب علمی کے ابتدائی دور میں علامہ نے جو کچھ پڑھا تھا۔ بعد کے مطالعے سے اس میں اضافہ تو کیا ہوتا بلکہ بہت کچھ سہو و نسیان کی نذر ہو گیا تھا۔ صحافتی زندگی کے اس دور میں جب شاہکار کی اوارت ان کے سپرد تھی انہوں نے ایک دفعہ نہایت صفائی کے ساتھ مجھ سے کہا کہ "مولانا اب تو درس نظامی کی ایک بھولی بسری یاد باقی رہ گئی ہے وہ مبلغ علم جس پر مجھے ناز تھا۔ حوادث روزگار کی بھینٹ چڑھ گیا ہے اب تو عالم یہ ہے کہ "المستقیم" کے کسی عربی مضمون کا اردو ترجمہ بھی میرے بس کی بات نہیں"۔

علامہ صرف گفتار کے غازی تھے۔ کردار کا جوہر ان کی زندگی میں نظر نہیں آتا۔ مجھے نہایت افسوس کے ساتھ یہ کہنا پڑتا ہے کہ علامہ نے دین کا پابند دنیا ہ ایک فاضل دیوبند کی حیثیت سے مذہب کو ان کا اوڑھنا بچھونا ہونا چاہئے تھا لیکن حقیقت یہ ہے کہ میری طرح جن لوگوں نے انہیں بہت قریب سے دیکھا ہے وہ جانتے ہیں کہ علامہ اکثر و بیشتر نماز تک بھی نہیں پڑھتے تھے۔ نہ صرف یہ بلکہ انہیں دین سے اتنا بعد ہو گیا تھا کہ وہ علما کو بھی قدر و منزلت کی نگاہوں سے نہیں دیکھتے تھے۔ ایک دفعہ رئیس المفسرین مولانا شبیر احمد عثمانی اور سید العلماء علامہ سید انور شاہ کاشمیری نے علامہ تاجور کی بے عملی پر انہیں سرزنش بھی کی تھی۔ جہاں تک میں نے غور کیا ہے علامہ کی بے عملی زندگی میں زیادہ دخل ان کی اس وابستگی کو تھا جو انھیں اپنے ہندو اور سکھ شاگردوں سے تھی۔ دیال سنگھ کالج کی پروفیسری ان کے حق میں رحمت نہیں بلکہ زحمت ثابت ہوئی ایک تو اس لئے کہ انہوں نے ماحول کا غلط اثر قبول کر لیا دوسرے اس لئے کہ ان کے تعلقات ان مسلمان شاگردوں سے کٹ کے رہ گئے جو اگر چاہتے تو علامہ کو دنیا کے اس اعلےٰ ترین مقام تک پہنچا سکتے تھے جس کی بلندیوں تک رسائی ان کے سان گمان میں بھی نہیں آ سکتی تھی۔

اگر جمالیاتی ذوق کوئی عیب ہے تو پھر مجھے یہ بات کہنے میں بھی مطلق کوئی تامل نہیں کہ اس عیب کا داغ بھی علامہ کے دامن پر تھا علامہ کا یہ ذوق اتنا بلیغ تھا کہ بھونڈے خدوخال انھیں ایک آنکھ نہیں بھاتے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ ایک دفعہ ان کے ایک ہم وطن مولوی صاحب کسی ضرورت سے ان کے پاس آئے تھے بیچارے کریہ المنظر تھے میں نے دیکھا کہ جب تک وہ علامہ کے پاس بیٹھے رہے، علامہ کی تیوری چڑھی رہی ماتھے کے بل گہرے سے گہرے تھے کہ یہاں تو کہاں آ مرا، ترو ڈالے کے لئے تو تماشا اور یہ مخصوص تھا تاجور کا گھر اس قابل کہاں کہ اس پر علامہ تو تیوری بچارے مولوی صاحب پر علامہ کی۔ بے رخی کا نفسیاتی اثر پڑا اور انہوں نے بددل ہو کر رخصت چاہی علامہ نے سر کی ہلکی سی جنبش کے ساتھ انہیں الوداع

[illegible] ... نے کتنا بجھوا دیا ... مولوی قسم اس کی ہے نے مجھے نصیحت سے بہت کیا
بہت دصورتی میرے ذوق نظر پر سخت گراں گزرتی ہے ۔ میں نے زبان سے تو کچھ نہیں کہا ۔ البتہ جی ہی جی میں یہ ضرور سوچا کہ اگلے وقتوں کا ذوق بالا بھی ایسا ہی بالغ ہو بیٹھے
جتنا ہو ۔ کا سبب تو علامہ کے پاس بھی کوئی نہ پھٹکے ۔ علامہ خود بدصورت واقع ہوئے تھے لہٰذا تو کبھی کبھی ان پر علامہ جاحظ کا گمان ہوتا تھا ۔ علامہ جاحظ ہو کہ
آگیا تو گئے ۔ مثلاً ایک لطیفہ بھی سن لیجئے ۔ ایک دفعہ علامہ جاحظ بغداد کی کسی گلی سے گزر رہے تھے کہ پیچھے سے انہیں کسی خاتون نے آواز دی ۔ علامہ جاحظ نے مڑ
کر دیکھا تو اس خاتون نے جو قریب ہی آ گئی تھی بڑی لجاجت سے یہ درخواست کی کہ آپ کو زحمت تو ہو گی ذرا سامنے والی دکان تک میرے ہمراہ چلے چلیں ۔ علامہ جاحظ
اپنے دور کے بڑے فلسفی تھے اور آج تک کبھی انہوں نے کسی کے آگے ہتھیار نہیں ڈالے تھے لیکن اس خاتون کی لجاجت نے ان پر ایسا جادو کر دیا کہ بغیر سوچے سمجھے اس
کے ساتھ ہو لیے ۔ دوکان کے پاس پہنچے تو اس خاتون نے دوکان دار سے کہا کہ یہ صاحب جو میرے ہمراہ ہیں انہیں دیکھ لیجئے ۔ پھر یہ خاتون علامہ جاحظ سے مخاطب
ہوئی ۔ علامہ ! آپ نے میری خاطر بڑی زحمت گوارا کی ۔ آپ کا بہت بہت شکریہ ۔ اب آپ تشریف لے جا سکتے ہیں ۔ علامہ جاحظ کھسیل گئے اور انہیں اپنی
حماقت پر اتنا غصہ آیا کہ دانت پیسنے لگے ۔ خاتون جا چکی تھی ۔ وہ دوکاندار جو دراصل پیشہ ور سنار تھا بولا کیوں صاحب آپ کو کیا فکر دامنگیر ہے ؟ علامہ جاحظ
نے کہا فکر کیا دامن گیر ہوتی اس سوچ میں ہوں کہ یہ خاتون مجھے یہاں کیوں لائی تھی ؟ کیوں اُس نے ... ...
آپ سے کہا کہ انہیں دیکھ لیجئے " اور پھر کیوں میرا شکریہ ادا کیا ؟ ان سوالات کا جواب چاہتا ہوں ۔ سنار علامہ سے واقف تھا ۔ اس نے ادب و احترام کے
ساتھ علامہ کی خدمت میں یہ گزارش کی کہ حضرت ! یہ خاتون اپنی انگوٹھی کے نگینے پر ابلیس کی تصویر کندہ کرانا چاہتی تھی ۔ میں نے اسے مذاق سمجھا اور مزاحاً اس سے
یہ کہہ دیا کہ اگر ابلیس کی تصویر ہی کندہ کرانی ہے تو اسے میرے پاس لے آنا کہ میں اسے ایک نظر دیکھ لوں ۔ آج کئی دن کے بعد یہ خاتون آپ کو ہمراہ لائی اور مجھ
سے کہا کہ انہیں دیکھ لیجئے ۔ مجھے تو بہر حال حکم کی تعمیل کرنی ہے ۔ علامہ جاحظ یہ سن کر چپ رہ گئے اور زندگی میں پہلی بار انہیں اپنی شکست خوردگی کا احساس
ہوا ۔ علامہ جاحظ نے یہ پورا واقعہ خود قلم بند کیا ہے ۔ اس سے جہاں یہ علم ہوتا ہے کہ علامہ جاحظ کتنے کریہہ المنظر تھے وہاں یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ انہیں اپنی
بدصورتی سے مطلق عار نہ تھی ۔ وہ اسے بھی اپنے خالق کی شان خلاقی کا مظہر سمجھتے تھے ۔ بہت ممکن ہے علامہ تاجور کا بھی یہی عندیہ ہو ۔ بہر حال یہ ضرور ہے کہ
علامہ تاجور کو اپنے بارے میں یہ غلط فہمی ضرور تھی کہ وہ اپنے چہرہ کی تراش خراش کے لحاظ سے ایک مرد معقول ہیں ۔ ان کی چمکتی ہوئی آنکھیں ہر شخص سے یہ
مطالبہ کرتی تھیں کہ وہ ان کے مرد ذوق کی داد دے ۔

میں نے اپنے ممدوح کی شخصیت کے یہ تاریک پہلو اس لئے اجاگر کئے ہیں تاکہ لوگوں پر یہ حقیقت واضح ہو کہ کسی صاحب کمال کی زندگی نقائص سے
مبرا نہیں ہوتی ۔ البتہ بعض ثنا پسند اور بعض مند تذکرہ نویس یہ پہلو تشنہ چھوڑ دیتے ہیں ۔ میرے خیال میں یہ بہت بڑی زیادتی ہے ۔ نقائص سے علامہ
کے محاسن پر حرف نہیں آتا بلکہ یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ علامہ بہت کچھ تھے لیکن بتقاضائے بشریت ان سے کچھ غلطیاں بھی سرزد ہوئی ہیں ۔

علامہ تاجور آج ہمارے درمیان نہیں لیکن پھر بھی زبان حال سے ہمیں یہ پیغام دے رہے ہیں ؂

بڑے ہیں ہم مگر ایسے بڑے بھی کم ہوں گے
کبھی زمانے کے اچھے ہمیں کریں گے یاد !

دل شاہجہانپوری

شبنم رومانی
(بی کام)

وہ کون سی خوبی ہے جو دل صاحب میں نہیں ہے۔ وہ بھولے بھالے سے انسان ہیں، دوستوں پر مرمٹنے والے دوست ہیں، گھر پھونک تماشہ دیکھنے والے میزبان ہیں، زمیندار ہیں لیکن کاشتکار انہیں اپنا سائیں اور اسنا لین سمجھتے ہیں، طبیب ہیں لیکن دوائیں مفت بانٹتے ہیں اور کوئی کچھ نذر کرے تو اس طرح روٹھ جاتے ہیں جیسے ان کی توہین ہوگئی ہو، شکاری ہیں لیکن کوئی خوبصورت ہرنی قریب سے گزر جاتی ہے تو، نگلی بندوق کی لبلبی سے پھسل جاتی ہے، شاعر ہیں مگر کبھی دعویٰ نہیں کیا، کوئی تعریف کرتا ہے تو شرما جاتے ہیں، تنقید کرتا ہے تو مسکرا دیتے ہیں، استاد ہیں مگر شاگرد دوں کو شاگرد نہیں کہتے احباب کہتے ہیں اور ہر شاگرد کی اتنی عزت کرتے ہیں کہ بیچارہ خواہ مخواہ انہی کا استاد بننے کا خواب دیکھنے لگے ——— یہی وجہ ہے کہ ملک ان پر اعتبار کرتا ہے اور لوگ انہیں "اعتبار الملک" کہتے ہیں۔

ہاں ایک خوبی ایسی ضرور ہے جو دل صاحب میں نہیں ہے۔ اگر وہ تھوڑے گنگنے مزاج کے انسان بھی ہوتے اور انہیں کبھی کبھار چھوٹا موٹا غصہ بھی آجایا کرتا تو پھر قدرت کو مزید انسان پیدا کرنے کی ضرورت باقی نہ رہتی اور اس کا مشن پورا ہو جاتا ——— حضرت آرزو لکھنوی مرحوم نے ایک محفل میں ٹھیک ہی کہا تھا:

> "دو باتیں میری سمجھ میں اب تک نہیں آئیں ——— جناب بیباک سید النسل ہوکر
> اتنے مغلوب الغضب اور دل صاحب افغان النسل ہوکر اتنے متین و سنجیدہ کیوں ہیں؟"

دل صاحب کی نشوونما ایسے ماحول میں ہوئی جہاں دن رات شکار کے پروگرام بنتے تھے، صوفی حضرات کا مجمع رہتا تھا، محفل سماع گرم رہتی تھی اور قوالوں کو ریاض کرائے جاتے تھے، لہٰذا ان دونوں مشاغل سے آپ کو بھی دلچسپی رہی ہے۔ کافی عمر تک سیر و شکار کا شوق رہا۔ پہروں بندوق کی لبلبی سے انگلی نہیں ہٹتی تھی۔ خورد و نوش کا سامان ساتھ ہی ہوتا تھا۔ ناشتہ دانوں میں طرح طرح کے حلوے ہوتے تھے، صبح کو پوری جماعت جنگل میں منہ لے کے ناشتہ کرتی تھی اور پھر سب لوگ شکار کھیلنے نکل جاتے تھے۔ گاؤں کے لوگ جمع ہو کر جنگل کا "جھاڑا" کرتے تھے۔ جانور نکل نکل کر بھاگتے تھے اور بندوقوں کی گولیاں ملک الموت بن کر ان کے پیچھے دوڑتی تھیں۔ شام کے وقت جو شکار مارا جاتا اس کا گوشت مختلف طریقوں سے پکایا جاتا۔ کوئی باورچی کباب پکاتا،

کوئی گوشت کوئی قورمہ ——— رات میں سب لوگ ایک ساتھ مل بیٹھتے، کھانا کھاتے اور جنگل میں منگل مناتے۔ آپ کا نشانہ بہت صاف تھا۔ ایک مرتبہ آپ نے ایک "چھانک" شکار کیا تھا جس کے سینگ (بغیر کھوپڑی ملائے) چالیس انچ لمبے تھے۔

ایک شکار میں آپ نے ایک بہت بڑا سانبھر گرایا۔ وہ اس قدر بھاری بھرکم تھا کہ اس کا ذبح کرنا مشکل ہو گیا۔ آپ کے ساتھ جلال آباد کے ایک خان صاحب بھی تھے۔ آپ نے ان سے کہا:

"میں اس کا منہ پکڑتا ہوں تم ذبح کرو۔"

جب وہ چھری پھیرنے لگے تو سانبھر نے اس زور سے گردن ہلائی کہ دل صاحب سنبھل نہ سکے اور گر پڑے۔ خانصاحب نے ہنس کر فرمایا "دیکھ لیا شاہجہان پور کے پٹھانوں کا زور"۔ اب خان صاحب کی باری تھی۔ دل صاحب نے کہا "میں چھری پھیرتا ہوں آپ منہ پکڑ لیجئے"۔ خانصاحب نے اپنے جسم کا پورا زور ڈال کر سانبھر کی گردن دبائی مگر دل صاحب نے جیسے ہی چھری پھیری اس نے گردن کو وہ زور کا جھٹکا دیا کہ خان صاحب دور تک لڑھکتے چلے گئے۔

دل صاحب سے ان کے دیہات کے کاشتکار بہت مانوس ہیں اور ان پر جان چھڑکتے ہیں۔ ایک مرتبہ کسی شکاری نے ایک نیل گائے پر فائر کیا تو اس سے اس کی ٹانگ ٹوٹ گئی۔ وہ نیل گائے اتفاق سے آپ کے پاس سے گزری، آپ نے گولی چلا کر اسے گرا لیا۔ پھر کیا تھا شکاری صاحب بہت بگڑے "میرا شکار کیوں مار لیا؟ شاہجہان پور کے شکاری بے ایمان ہوتے ہیں۔" اتنا سننا تھا کہ گاؤں والے دل صاحب کے پاس جمع ہو گئے اور ان سے کہا "آپ ہم کو اجازت دیں تو مہمان شکاری صاحب کو مار کر راتوں رات کسی کنوئیں میں ڈال دیں۔" شکاری صاحب نے یہ سنا تو دل صاحب کے قدموں پر گر گئے ——— آخر دل صاحب کی بڑی سفارشوں پر اُن کی جان چھوٹی۔

ایک مرتبہ شکار کے سلسلہ میں آپ نیپال کی ترائی تشریف لے گئے۔ جاڑوں کا موسم تھا۔ بلا کی سردی پڑ رہی تھی۔ جنگل میں لکڑی کے ایک ٹھیکیدار کا مکان تھا آپ وہیں ٹھہرے تھے۔ انہی کا گاڑی بان صبح صبح آپ کو ریلو پر شکار کے لئے لے جاتا تھا۔ غریب آدمی تھا صبح کو جب آتا تھا تو صرف ایک چادر اس کے جسم پر ہوتی تھی آپ نے اس سے پوچھا ——— "اس سردی میں کیونکر بسر ہوتی ہے؟" اس نے جواب دیا "بڑے بڑے لٹھے رات بھر جلاتا ہوں اور بدن سینکتا ہوں۔" آپ نے گاڑی رکوا دی۔ وہ ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا۔ سمجھا اس سے کوئی غلطی ہو گئی ہے۔ دل صاحب کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اپنی اونی جرسی اور گرم قمیص اتار کر اسے دے دی اور کہا "اسے پہن لو اور گھر واپس چلو تا کہ میں دوسرے کپڑے پہن لوں ———"

میرے ایک خالو ظہیر الدین خان رائے بریلی میں کوتوال تھے اور تقریباً پندرہ سال وہاں رہے۔ جب باہر سے ان کے یہاں مہمان آتے تھے تو تانگہ والوں میں فوجداری ہو جاتی تھی۔ ہر تانگہ والا یہ چاہتا تھا کہ سواری وہ لے جائے۔ قصہ یہ تھا کہ تھے تو وہ کوتوال مگر مزاج پایا تھا شاہانہ ——— کرایہ ٹھہرتا تھا پانچ اور دیتے تھے دس ——— یہی حال کچھ دل صاحب کا ہے۔ وہ سرکاری ٹھیکیدار بھی ہیں اور جب کوئی نیا کام نکلتا ہے تو جو مزدور ان کے پاس کام کرتے ہیں ان میں ہمیشہ جھگڑا ہوتا ہے ——— اور ہر مرتبہ دل صاحب کو جھگڑا چکانے میں بڑی دقت پیش آتی ہے۔

دل صاحب کا کلام سب سے پہلے "پیام یار" میں چھپا تھا۔ یہ پرچہ لکھنؤ سے نکلتا تھا۔ اس میں اکثر امیر و داغ بھی شرکت فرماتے تھے۔ اسی کے مطالعہ سے آپ کو شعر و سخن کا ذوق ہوا۔ رفتہ رفتہ اس ذوق نے یہاں تک زور مارا کہ آپ نے خود شعر کہنا شروع کر دیا۔ ایک بار "پیام یار" میں طرح نکلی "جگر دیکھ لینا" "نظر دیکھ لینا"۔ اس میں آپ نے بھی غزل کہی تھی جس کا ایک شعر اب بھی محفوظ ہے۔ یہ شعر [illegible] کا ہے ؎

چلا ہے ابھی تیر مژگاں کسی کا
ذرا اپنا اپنا جگر دیکھ لینا

دل صاحب کی نومشقی کا زمانہ تھا کہ حکیم سید جعفر حسین صاحب بغرض علاج شاہجہانپور تشریف لائے۔ موصوف صاحب نظر شاعر بھی تھے۔

کا تخلص کرتے تھے وہ حضرت اشک لکھنوی سے تلمذ حاصل تھا۔ دل صاحب سے ملاقات ہوئی۔ دیر تک شعر وسخن کے متعلق گفتگو ہوتی رہی حکیم صاحب نے آپ کے اشعار سن کر یہ مصرع دیا :

ع ہم رکھ کے کہیں بھول گئے طاق میں غنچہ (قافیہ "طاق" وغیرہ ردیف "میں غنچہ")

اور فرمائش کی کہ اس پر غزل کہہ کر مجھے دکھاؤ۔ دل صاحب نے فوراً قلم سنبھال ان کی موجودگی میں سات شعر کہہ کر ان کے حوالے کر دیئے۔ حکیم صاحب نے اشعار دیکھے تو بے ساختہ واہ واہ کر اٹھے، فرمایا :

"میں نے تو کو شاعر مان لیا"

انہی دنوں "پیام یار" میں اس طرح پر طبع آزمائی ہو رہی تھی "یہ چوٹی کس کے پیچھے پڑی ہے" امیر، داغ، جلال، ریاض سبھی نے اس پر فکر فرمائی تھی۔ منشی امیر مینائی کا شعر تھا ؎

پہنچتی ہے یہ گردن تک ہی اس کے
صراحی دخت رز سے کچھ بڑی ہے

حکیم صاحب نے اعتراض کیا کہ صراحی شراب سے بڑی کیسے ہو سکتی ہے؟ اسی وقت محمد علی میاں خیال شاہجہانپوری آگئے خیال صاحب کو عربی فارسی میں کافی دستگاہ تھی۔ شاعری میں انہیں حضرت امیر مینائی سے شرف تلمذ حاصل تھا۔ شعر سوچ سمجھ کر صاف کہتے تھے۔ دل صاحب نے عربی کی ابتدائی تعلیم انہی سے حاصل کی تھی۔ انہوں نے فرمایا "معلوم ہوتا ہے حکیم صاحب کو کبھی اس شغل سے واسطہ نہیں پڑا۔ مجھ سے پوچھئے میں برسوں تک پیتا رہا ہوں۔ مینا میں شراب ہمیشہ کم ہوتی ہے گردن کا کچھ حصہ خالی رہتا ہے۔"

غالباً ۱۸۹۳ء میں شاہجہانپور میں ادبی و تعلیمی کانفرنس ہوئی تھی جس میں سر سید احمد خاں، مسٹر محمود، وقار الملک، مشتاق حسین، مولانا شبلی، مولانا حالی، ڈپٹی نذیر احمد اور نواب محسن الملک وغیرہ تشریف لائے تھے۔ اس کانفرنس کی روح رواں مولوی رفعت علی مرحوم تھے۔ انہی کی کوششوں سے یہ کانفرنس منعقد ہوئی تھی۔ اس کا سلسلہ تین چار روز تک جاری رہا۔ اس کانفرنس میں سر سید اور ان کے رفقاء نے تقاریر کے ذریعہ ترغیب دی کہ ارباب وطن قدامت پرستی کو ترک کر کے دور حاضر کے تہذیب و تمدن کو اختیار کریں۔ ۔ ۔ ۔ دل صاحب بھی اس جلسے میں شریک تھے۔

مدت تک کسی استاد کی اصلاح کے بغیر مشاعروں میں غزل پڑھتے رہے مگر بعد میں ایک استاد کامل کی جستجو ہوئی۔ اس زمانے میں تین استاد مسلم الثبوت تھے۔ امیر مینائی، داغ دہلوی اور جلال لکھنوی۔ حضرت امیر کا پایہ باعتبار علم و فن سب سے بلند تھا اس لئے آپ نے انہی کو استاد منتخب کیا۔ منشی صاحب ان دنوں دربار رام پور سے وابستہ تھے۔ غزلیں ان کے پاس اصلاح کے لئے جاتی تھیں اور وہ ترمیم فرما کر واپس کر دیتے تھے۔ استاد اور شاگرد میں پہلی ملاقات ۱۸۹۸ء میں ہوئی جب دل صاحب اپنے ماموں کے ہمراہ بتقریب عرس بدایوں گئے۔ وہاں سے واپسی پر منشی صاحب کی زیارت کے لئے رام پور روانہ ہوئے۔ چونکہ بغیر اطلاع گئے تھے لہٰذا براہ راست منشی صاحب کی خدمت میں حاضر نہیں ہوئے۔ صبح کو حاضری دی۔ صدر دروازہ کے اندر دو دروازے تھے ایک زنانخانے کا دوسرا نشست گاہ کا۔ نشست گاہ بالائی منزل پر تھی وہاں حضرت جلیل مانکپوری موجود تھے۔ جلیل صاحب نے آپ کی آمد کی اطلاع کر دی، حضرت فوراً تشریف لائے اور بہت محبت سے گلے لگایا۔ فرمایا "یہاں کیوں نہیں قیام کیا؟" مگر دل صاحب کے عذر معقول پر چپ ہو گئے اور پھر شعر و ادب اور علم و فن پر گفتگو شروع ہو گئی۔

دل صاحب وہاں سے جائے قیام پر واپس آئے ہی تھے کہ معلوم ہوا جلیل صاحب تشریف لائے ہیں۔ باہر آ کر دیکھا تو جلیل صاحب تشریف فرما تھے۔ ایک ملازم بھی ساتھ تھا۔ شیرینی کی ایک سینی اس کے سر پر تھی جلیل صاحب نے فرمایا "قبلہ و کعبہ نے یہ شیرینی اور دس روپے مرحمت کر بھیجے ہیں۔"

؎ دل صاحب کا اصلی نام حکیم ضمیر حسن خان ہے۔

دل صاحب نے کہا "یہ تو شاگرد کا فرض تھا کہ استاد کی خدمت میں نذر پیش کرتا نہ کہ استاد نے شاگرد کو شیرینی اور روپے بھیجے ہیں۔"
جلیل صاحب نے کہا "منشی صاحب نے ارشاد کیا ہے کہ میں ضمیر کو مثل مسعود احمد کے اپنا بچہ سمجھتا ہوں۔ بچوں کو شیرینی کھلانا بڑوں کا فرض ہے۔"
آخر بڑی بحث کے بعد دل صاحب نے روپیہ واپس کر دیئے اور شیرینی لے لی دوسرے روز پھر حضرت استاد کی خدمت میں حاضر ہوئے دوران گفتگو استاد نے فرمایا ـــــ "ضمیر! تمہاری شوخیٔ طبع سے ظاہر ہوتا ہے کہ دنیائے شاعری میں تمہارا مستقبل بہت نمایاں ہوگا۔"
اس سلسلہ میں حضرت داغ کا ذکر آ گیا۔ منشی صاحب نے فرمایا "جو لوگ مجھے خوش کرنے کے لئے میرے سامنے داغ کو برا بھلا کہتے ہیں میرا جی چاہتا ہے کہ ان کا منہ نوچ لوں۔ بھلا داغ کی کوئی ہمسری کر سکتا ہے ـــــ ہا! کوئی اس شان کا شعر کہہ کر تو سنائے ؎

غبارِ حسرت بیان سے نکلا
دل کا کانٹا زبان سے نکلا

دل صاحب نے شیکسپیئر کے ایک ڈرامے کا اردو میں ترجمہ بھی کیا تھا جس میں تناسخ کے مسئلہ پر تفصیل سے بحث کی گئی تھی اس کا نام "دل سوز" تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب جارج پنجم شہزادے کے روپ میں ہندوستان تشریف لائے تھے اور ان کا ورود لکھنؤ میں ہوا تھا۔ لوگ جارج کو دیکھنے کے لئے دور دور سے آ کر لکھنؤ میں جمع ہو گئے تھے۔

انہی دنوں دل صاحب نے لکھنؤ پہنچ کر مختلف مطابع سے ناول کی اشاعت کے بارے میں بات چیت شروع کی۔ نظیر آباد میں حافظ عبدالحق نامی ایک صاحب رہتے تھے وہ بھی کسی پریس کے ایجنٹ تھے۔ انہوں نے مطالعہ کے بہانے ایک دن کے لئے کتاب مانگی۔ دل صاحب ایسے مرد سادہ کہ کتاب ان کے حوالے کر دی۔ دوسرے دن واپس لینے پہنچے تو حافظ صاحب غائب، تیسرے دن غائب، چوتھے دن غائب، پانچویں دن غائب ـــــ اب تو دل صاحب کو فکر لاحق ہوئی۔ اپنے ایک دوست رحمٰن حسین خان مرحوم سے ذکر کیا۔ رحمٰن صاحب زندہ دل، منچلے اور نڈر انسان تھے فوراً آپ کے ہمراہ حافظ صاحب کے مکان پر پہنچ گئے اور کہا "آپ خاموش رہیں۔" پھر دروازے پر آواز دی "حافظ صاحب!" مگر جواب ندارد۔ دوسری بار پھر پکارا مگر کوئی نہ بولا تیسری بار دروازہ پر زور سے دستک دی مگر لاحاصل ـــــ آخر تنگ آ کر رحمٰن خان نے حافظ صاحب کو ایک فصیح و بلیغ گالی کے ساتھ خطاب کیا تو اندر سے حافظ صاحب کی آواز آئی "کون بدتہذیب ہے؟" رحمٰن خان نے چیخ کر کہا "ذرا باہر تشریف لائیے ابھی معلوم ہوا جاتا ہے۔" حافظ صاحب غصہ میں بھرے ہوئے باہر نکلے اور پھر جو خان صاحب میں اور ان میں خالص اردوئے معلیٰ شروع ہوئی تو لوگوں نے کانوں پر ہاتھ دھر لئے۔ قریب تھا کہ ہاتھا پائی ہو جائے کہ خان صاحب نے کہا "لا! دل صاحب کی کتاب واپس کر۔"
حافظ صاحب جلے ہوئے تو تھے ہی فوراً مکان میں گئے اور کتاب لا کر پٹک دی "یہ لو اپنی کتاب!"

دل صاحب کو صوفیائے کرام سے گہری عقیدت رہی ہے۔ آپ کے نانا حافظ احمد حسین خان صاحبؒ سلسلۂ قادریہ چشتیہ کے بہت بلند پایہ بزرگ گزرے ہیں۔ ان کی بارگاہ میں اکثر باریابی حاصل رہتی تھی۔ ان کا مخصوص قوال گندھیا جو بعد کو ملک میں بہت مشہور ہوا اس کے ریاض و تربیت میں دل صاحب کا کافی ہاتھ رہا اور اس کو بہت سا کلام کہہ کہہ کر حفظ کرایا۔ ایک مرتبہ اس نے میران پور کٹرہ کے سجادہ نشین کو جبکہ وہ شطرنج کھیل رہے تھے آپ کا یہ مطلع سنایا ؎

رنگ لایا ہے یہ ضبطِ الفتِ گیسوئے دوست
آخر اپنے پیرہن سے پھوٹ نکلی بوئے دوست

تو ان پر اتنا گہرا اثر ہوا کہ شطرنج کی بساط الٹ مار کر الٹ دی اور دیر تک عالمِ رقص و وجد میں رہے۔ جب ذرا ہوش آیا تو کہا "یہ ضمیر مجھے ملے تو پوچھوں گا یہ شعر

اُس نے کس عالم میں کہا تھا"

منشی امیر مینائی کی وفات کے بعد آپ نے کسی سے مشورۂ سخن نہیں کیا اپنی ذاتی قابلیت اور مشقِ سخن پر اعتماد کیا۔ چونکہ جوہر شاعرانہ آپ کو قدرت کی طرف سے ودیعت تھا لہٰذا جو شعر بھی کہتے تھے بلحاظ فن بہت فصیح و بلیغ ہوتا تھا۔ جلد ہی آپ کی شہرت سارے ملک میں بوئے مشک کی طرح پھیل گئی —— یہاں تک کہ جب جلیل مانکپوری جانشینِ امیر ہوئے تو ملک کے بیشتر اساتذہ اور ناقدین کی نظریں دل صاحب کی طرف اٹھی رہ گئیں —— آخر حضرت جلیل کی رحلت کے بعد انہیں تمام ملک نے متفقہ طور پر جانشینِ امیر بنا دیا اور بعض بزرگوں نے تو یہاں تک لکھ دیا کہ "دل صاحب حضرت جلیل کی زندگی میں بھی جانشینِ امیر تھے"

دل صاحب کی شاعرانہ عظمتوں کا چرچا مشاعروں اور ادبی جرائد تک محدود رہا ہے۔ انہوں نے کبھی اپنی شہرت نہیں چاہی اور ہمیشہ خود نمائی سے دور بھاگے۔ یہی وجہ ہے کہ شہرت کے جس زینے پر وہ آج ہیں وہاں انہیں آج سے چالیس سال پہلے ہونا چاہیے تھا۔

سید التفات رسول صاحب تعلقدار (سندیلہ) ہر سال اپنے والد کا عرس کرتے تھے جس میں مشاعرہ بھی ہوتا تھا۔ دل صاحب اکثر ان کے مشاعرہ میں شرکت فرماتے تھے۔ آپ کے ہمراہ جناب بیتاب شاہجہاں پوری بھی ہوتے تھے۔ یہ مشاعرہ اعلیٰ پیمانے پر ہوتا تھا اور تین دن تک جاری رہتا تھا۔ التفات رسول صاحب نے تمام عمر اس مشاعرے کو برقرار رکھا۔

سنہ ۱۹۰۹ء کا ذکر ہے سندیلہ میں محفلِ شعر گرم تھی جس کا ذکر دل صاحب کے پہلے مجموعہ کلام "نغمۂ دل" کے تبصرہ میں جناب نیاز فتحپوری نے بھی کیا ہے۔ دو نشستوں میں دیگر شعراء نے کلام سنایا، تیسری نشست مشاہیر شعراء کے لئے متعین تھی۔ دل صاحب کی غزل جس کا ایک شعر یہ ہے حاصلِ مشاعرہ رہی ؎

نہ وہ آرامِ جاں آیا، نہ موت آئی شب وعدہ!
اسی دھن میں ہم اٹھ اٹھ کر ہزاروں بار بیٹھے ہیں

دل صاحب کے بعد صرف دو حضرات باقی رہ گئے تھے۔ صبح چار بجے کا وقت تھا جب آپ غزل پڑھ چکے تو ان کی باری آئی۔ چونکہ غزل بہت چمکی تھی لہٰذا ان حضرات نے یہ عذر پیش کیا کہ تھوڑی دیر کے لئے محفل برخاست کر دی جائے۔ سید محمد عسکری وسیم خیرآبادی بھی موجود تھے انہوں نے دل صاحب کے کان میں کہا "ان لوگوں کا مقصد یہ ہے کہ کچھ دیر کے وقفہ کے بعد جب پھر مشاعرہ شروع ہوگا تو آپ کی غزل کے اثرات لوگوں کے دلوں سے ہٹ جائیں گے اور ان کی غزلیں کامیاب ہو جائیں گی۔" مگر جب بعد میں مشاعرہ شروع ہوا تو ان لوگوں کی غزلیں کورہی اتر گئیں۔ ان لوگوں نے لکھنؤ جا کر دل صاحب کے خلاف بہت پروپیگنڈہ کیا اور انجمن بہارِ ادب کے مشاعرے میں مدعو کیا تاکہ کسی طرح اپنی ناکامی کا انتقام لکھنؤ میں لے سکیں۔

لکھنؤ میں سوائے دو ایک حضرات کے باقی سب دل صاحب کے دوست تھے۔ مشاعرے سے ایک روز قبل نواب محمد عسکری بلیغ مرحوم نے آپ کی دعوت کی۔ بعد طعام محفلِ شعر منعقد ہوئی۔ تمام حضرات نے ایک ایک غزل پڑھی اور دل صاحب سے بہ اصرار سات غزلیں سنی گئیں۔ بعد ختمِ محفل پروفیسر شاداں مرحوم نے فرمایا "یہ آپ کا امتحان تھا کہ آپ نے صرف ایک غزل اچھی کہہ لی ہے یا آپ واقعی اچھا کہتے ہیں، مگر خدا کے فضل سے آپ اس امتحان میں کامیاب ہوئے اور مخالفین کو شکست نصیب ہوئی۔"

اس کے بعد آپ کو "بہارِ ادب" کا رکن بنا لیا گیا اور ہر سال مشاعرے میں بلائے جانے لگے۔ مشاعرہ وسط سرما میں ہوتا تھا۔ ایک سال مشاعرہ "افضل محل" میں ہو رہا تھا، دل صاحب بھی تشریف فرما تھے، حضرت صفی، عزیز، یگانہ، آرزو وغیرہ کے علاوہ حضرت شہید مچھلی شہری اور سائل دہلوی بھی شریک تھے۔ غضب کی سردی پڑ رہی تھی، مشاعرہ اپنے شباب پر تھا کہ یکایک کسی نے بجلی کی روشنی بند کر دی اور پنکھے کھول دیئے —— دیکھ کے

مہینے میں پنکھوں کی ہوا ——— دل صاحب کے پاس کمبل تھا انہوں نے وہی لپیٹ لیا۔ پاس ہی رفیع احمد خان بیٹھے تھے انہوں نے پکارا "دل صاحب! میرے لئے بھی جگہ ہے؟" آپ نے کہا "کیوں نہیں وہ درہ بیٹے اور لیجیے تشریف" اور ان کو کمبل میں لے لیا۔ تھوڑی دیر بعد روشنی ہو گئی تو پنکھے چلتے رہے غالباً تماشہ دیکھنے کے لئے ——— عجیب منظر تھا۔ کوئی قالین اوڑھے تھا کوئی تھوڑی یا کسی کو نہیں پڑا تھا جگہ جگہ لوگ ایک دوسرے سے بری طرح چپٹے ہوئے تھے۔ . . اس واقعہ کے بعد مشاعرہ موسم برسات کے بجائے موسم گرما میں ہونے لگا۔

قیصر باغ کے ایک مشاعرے میں بھی ایک ایسا ہی واقعہ پیش آیا۔ پنڈت آنند نرائن ملا مہتمم مشاعرہ تھے۔ دل صاحب کے علاوہ تمام مشاہیر شعراء شریک تھے۔ ملا صاحب نے کالج کے طلباء کو کم پاس دیئے تھے اس لئے بہت سے لڑکے جن کو پاس نہیں ملے تھے ان کے مخالف ہو گئے۔ قریب ۱۰ بجے مشاعرہ شروع ہوا۔ بارہ کا عمل تھا۔ حفیظ جالندھری نظم سنا رہے تھے۔ جب انہوں نے پورے جوش میں یہ مصرعہ پڑھا ع

یہ بن، یہ پہاڑ، یہ گھاٹیاں، یہ پیڑ یہ شیروں کی آزادی ہے

تو کالج کے شیروں نے دفعتاً بجلی کا تار کاٹ دیا۔ کچھ دیر تک تو سکتہ کا عالم رہا مگر جب بعد میں لیمپ لائے گئے ہیں تو وہاں وہ دھم مچا ہے کہ ——— !!!

بھا بادر بسا کی پاسا اور سالانہ مشغل کی طرح تھی یہ "منزل تھا" "محفل تھا" کئی ہزار کا مجمع تھا۔ لکھنؤ میں یہ طریقہ رہا ہے کہ پہلے مقامی شعراء (از مبتدی تا منتہی) کلام پڑھتے ہیں۔ اس کے بعد بیرونی شعراء کو دعوت شعر خوانی دی جاتی ہے۔ اس مشاعرہ میں دولہا صاحب نبیرہ حضرت میر انیس مرحوم بھی تشریف فرما تھے۔ نیچی نیچی نظریں جھکائے بیٹھے تھے۔ جب قتیل لکھنوی نے غزل پڑھی تو ایک شعر پر دولہا صاحب نے نظر اٹھا کر قتیل صاحب کو دیکھا۔ جناب عزیز لکھنوی جو دل صاحب کے قریب ہی بیٹھے تھے کہا "دل صاحب پہچانا ——— اعتراض ہو گیا۔" بعد میں دل صاحب نے جب اپنی غزل کا یہ شعر پڑھا ؎

نہ پہنچے تاب کھینچے کیا کیا امید و بیم کے نقشے!
تلاطم میں تھی کشتی سامنے نظروں کے ساحل تھا

تو دولہا صاحب نے نظر اٹھا کر دل صاحب کو دیکھا۔ عزیز صاحب نے فوراً کہا "دل صاحب سمجھے ——— آپکے شعر کی داد دی گئی ہے۔"

حضرت بیباک شاہجہان پوری تلمیذ داغ سے دل صاحب کی گاڑھی چھنتی تھی۔ اکثر مشاعروں میں ساتھ ساتھ جاتے اور ساتھ ہی ساتھ قیام کرتے تھے۔ بیباک صاحب شاعر ہونے کے علاوہ بہترین سخن فہم تھے۔ جس شعر پر داد دے دیتے تھے بلند پایہ سمجھ لیا جاتا تھا مگر صاف گو اور مغلوب الغضب بھی تھے اس لئے لوگ ان سے بہت ڈرتے تھے۔ سندیلہ کے ایک مشاعرہ میں دل و بیباک کے علاوہ سیف شاہجہانپوری بھی شریک تھے۔ سیف صاحب بیباک میاں کے قریبی عزیز ہونے تھے مگر بڑے فتنہ پرداز تھے۔ بعد مشاعرہ دل صاحب، بیباک میاں اور سیف صاحب سے نواب التفات رسول نے فرمایا کہ ڈپٹی کمشنر اور جج ضلع آپ لوگوں کا کلام سننا چاہتے ہیں۔ یہ حضرات انگریز ہیں۔ انہوں نے اردو نظم نہیں سنی لہٰذا آپ شام کو تشریف لاکر اپنا کلام سنائیں۔ جب روانگی کا وقت آیا تو سیف صاحب نے جانے سے انکار کر دیا اور برجستہ کہا "میں وہاں جا کر مسخرہ بننا نہیں چاہتا۔" دل صاحب اس وقت تو خاموش ہو گئے اور بیباک میاں کے ساتھ التفات رسول صاحب کی قیام گاہ پہنچے۔ ڈپٹی کمشنر اور جج ضلع کو اپنا کلام سنایا۔ چونکہ وہ اردو سے ناواقف تھے لہٰذا ایک مترجم نے انگریزی میں اشعار کے معنی ان کو سمجھائے۔

واپس آکر جب دل، بیباک اور سیف اکٹھے ہوئے تو دل صاحب نے چھیڑا ——— "کیوں سیف صاحب! جب آپ ولایت درزی کی دکان پر جا کر اس کو اپنی غزلیں سناتے ہیں جو بالکل جاہل ہے تو آپ کے لئے فخر کی بات ہوتی ہے مگر جب ایک ڈپٹی کمشنر جس کے اجلاس میں آپ دست بستہ کھڑے ہوتے ہیں، آپ کو نہایت احترام سے اشعار سننے کے لئے مدعو کرتا ہے تو آپ انکار کر دیتے ہیں کہ میں مسخرہ بننا نہیں چاہتا؟"
یہ سننا تھا کہ بیباک میاں آگ بگولا ہو گئے۔ "کیوں بے سیف کے بچے! تو نے یہ کیا بھڑک کر کہا کیا ہم مسخرے ہیں؟ اللہ کی قسم اگر [illegible]

میں ہوتا تو میں سینہ پر چڑھ کر تیرے گلے کا خون پی لیتا۔"

مرزا یگانہ اور عزیز لکھنوی مرحوم میں ہمیشہ اختلاف رہا۔ جس مشاعرہ میں دونوں حضرات ہوتے یگانہ صاحب مصر ہوتے کہ میں عزیز کے بعد پڑھوں گا اور مخالف جماعت "معیار ادب" مصر ہوتی کہ عزیز صاحب یگانہ کے بعد پڑھیں یہ کشمکش یہاں تک پہنچتی کہ دونوں بغیر غزل پڑھے اٹھ جاتے اور اہل مشاعرہ سر پیٹتے رہ جاتے۔ ایک بار سیتا پور کے ایک بڑے مشاعرے میں لکھنؤ سے مرزا یگانہ اور ان کی مخالف "معیار ادب" کے اراکین بھی آئے ہوئے تھے۔ تقدیم اور تاخیر کے مسئلے پر دونوں میں اختلاف شروع ہو گیا۔ بانی مشاعرہ نے دل صاحب سے کہا "آپ بیچ میں پڑ کر معاملہ کرا دیجئے ورنہ مشاعرہ خراب ہو جائے گا۔" لکھنؤ کے ایک اچھے شاعر شفیق لکھنوی بھی شریک محفل تھے۔ وہ بالکل غیر جانبدار تھے۔ دل صاحب نے حامی بھر لی۔ پہلے اراکین "معیار ادب" کے پاس گئے۔ ان کو سمجھا بجھا کر اس بات پر راضی کر لیا کہ ان کی جماعت کے سب شعراء پہلے پڑھ لیں۔ ان کے بعد مرزا یگانہ اور پھر شفیق لکھنوی۔ چونکہ شفیق صاحب لکھنؤ کے ہیں اور یگانہ کے بعد پڑھیں گے اس لئے جیت اہل لکھنؤ کی ہوگی۔ پھر آپ یگانہ کے پاس گئے اور ان کو سمجھایا کہ آپ غزل ان لوگوں کے بعد ہی پڑھیں گے مگر آپ کے بعد شفیق لکھنوی کو پڑھوا دیا جائے گا جو ایک اچھے شاعر ہیں۔ ان کے آخر میں پڑھنے سے آپ کی کوئی توہین نہ ہوگی۔ یگانہ نے بھی یہ تجویز مان لی اور مشاعرہ کی کامیابی نے دل صاحب کو دولہا بنا دیا۔

شاہجہان پور کے ایک آل انڈیا مشاعرے میں دل، فرخ اور سیماب پاس ہی بیٹھے تھے۔ مشاعرہ جاری تھا۔ فیاض شاہ آبادی نے یہ مصرعہ پڑھا ع

ان کے دل کی دھڑکنیں سنتے ہیں اپنے دل سے ہم

سیماب صاحب نے اعتراض داغ دیا "دل کی دھڑکنیں سنی بھی جاتی ہیں؟"

دل صاحب نے برجستہ جواب دیا "جی ہاں ——— مگر کانوں سے نہیں دل سے"

جب فیاض صاحب نے مقطع پڑھا ع

فیض اسے فیاض پاتے ہیں جناب دل سے ہم

تو سیماب صاحب بہت شرمندہ ہوئے اور معافی مانگ لی۔

الہ آباد کی کسی تقریب میں دل صاحب شریک تھے۔ نجم الدین جعفری بار ایٹ لا بھی قریب ہی بیٹھے تھے۔ دل صاحب نے جعفری صاحب سے پوچھا "آپ مجھ سے واقف ہیں؟"

جعفری صاحب نے فوراً جواب دیا "کیوں نہیں، آپ تو ہر وقت میرے بائیں پہلو میں دھڑکتے رہتے ہیں۔"

کانپور کے ایک مشاعرے میں جب دل صاحب کا نمبر آیا تو ناظم مشاعرہ نے کہا "آپ حضرت دل ہیں جو عاشق کے پہلو میں رہتے ہیں؟"

دل صاحب نے برجستہ کہا "اب تو معشوقوں کی مٹھی میں رہتا ہوں۔"

مراد آباد کے ایک مشاعرہ میں دل صاحب بھی مع ایک شاگرد کے مدعو تھے۔ آپ کو مشاعرے سے قبل ایک میزبان کی تحویل میں دے دیا گیا۔ صبح سے دوپہر تک ملنے والوں کی آمدورفت جاری رہی۔ دل صاحب چونکہ لمبا سفر طے کر کے آئے تھے اس لئے بھوک نے بہت پریشان کیا۔

لکھا انہوں نے تقاضا خلافِ تہذیب سمجھا۔ جب دو بج گئے تو آپ سے ضبط نہ ہوا۔ اپنے شاگرد کو دو روپے دے کر کہا "ذرا بازار جا کر ایک ڈبی سگرٹ اور ایک بوریا لے آؤ۔"

میزبان صاحب نے سنا تو بہت حیران ہوئے۔ وجہ پوچھی تو دل صاحب نے اپنے شاگرد سے کہا: "ہاں ہاں بوریا لے آؤ میری آنتیں اس پر قل ہو اللہ پڑھیں گی۔"

اس پر میزبان بہت جھینپے اور فوراً دسترخوان بچھا دیا گیا۔

سہارن پور کے ایک مشاعرے میں دل صاحب اور نوح صاحب ساتھ ساتھ شریک ہوئے۔ بعد مشاعرہ طلباء آٹوگراف کیلئے ٹوٹ پڑے۔ چلتے وقت دل صاحب بیاض وہیں بھول گئے۔ قیام گاہ پہنچ کر یاد آیا تو سخت پریشان ہوئے۔ بہت تلاش کی گئی مگر بیاض نہ ملی۔ سید نثار حیدر زیدی اس وقت کلکٹر تھے۔ تمام ضلع میں احکامات بھیج دئے گئے کہ بیاض نہ ملی تو سخت مصیبت نازل ہوگی اور جو یہ بیاض ڈھونڈھ کر دے گا اسے انعام دیا جائے گا۔

دوسرے دن جعفر عباس ایڈوکیٹ کے یہاں مشاعرہ تھا دل صاحب کی باری آئی تو انہوں نے بمشکل چند شعر جو یاد تھے سنائے۔ جب مشاعرہ ختم ہوا تو کسی نے کہا: "آپ کی بیاض مل گئی ہے۔"

دل صاحب خوشی سے اچھل پڑے "کیا واقعی ——— ؟"

جواب ملا ——— "جی ہاں! مگر وہ ایک رقاصہ کے پاس ہے اور اس کی شرط یہ ہے کہ دل صاحب میرے مکان پر تشریف لائیں ناشتہ کریں کلام سنائیں پھر بیاض ان کو پیش کی جائے گی۔" دل صاحب شرط پر غور کرنے لگے، نوح صاحب نے ان کے چٹکی لی تو بولے،

"جب پیر اگذرے خانے میں ہوتا ہے، کعبہ میں بھی رہتا ہوں، دیر میں بھی جاتا ہوں تو ایک رقاصہ کے یہاں جانے سے کیا گریز ———"

وقت مقررہ پر جعفر عباس، نوح صاحب اور دل صاحب وہاں پہنچے بڑے تکلف سے چائے پلائی گئی۔ اپنے ہاتھوں سے بنا کر اس فتنۂ روزگار نے دل صاحب کو چائے پیش کی۔ دل صاحب تھے کہ شرم سے دوہرے ہوئے جا رہے تھے اور نوح صاحب آنکھوں کے کونے دبا دبا کر اس شرارت پر مسکرا رہے تھے۔ چائے کے بعد شعر خوانی ہوئی اور اللہ اللہ کر کے بڑے اعزاز سے بیاض دل صاحب کو پیش کی گئی ——— بیاض کو دیکھ کر ان کی آنکھوں میں بے ساختہ آنسو آ گئے اور بیاض رقاصہ کے ہاتھ سے چھوٹ پڑی۔ بعد میں معلوم ہوا کہ بیاض کسی لڑکے نے مشاعرہ گاہ سے اٹھا لی تھی اور بازار میں اسے بیچنے لے گیا تھا۔ اس کی گمشدگی کی باقاعدہ رپورٹ لکھی جا چکی تھی اور پولیس سرگرم تلاش تھی۔ اتفاق سے رقاصہ کا بھائی ادھر آنکلا اس نے لڑکے سے کہا "میاں صاحبزادے یہ کتاب میرے حوالے کر دو ورنہ گرفتار ہو جاؤ گے۔" لڑکا یہ سنتے ہی بیاض پھینک کے بھاگ کھڑا ہوا۔

دل صاحب انکساری و سادگی کے مجسمہ اور وضع کے اتنے پابند ہیں کہ خواہ کتنا ہی وقت گذر جائے تا ختم مشاعرہ نہیں اٹھتے۔ جب کسی بیرونی مشاعرہ میں شریک ہوتے ہیں تو میزبان پیچھا نہیں چھوڑتے اور بہ اصرار اپنے یہاں ٹھہراتے ہیں۔ الہ آباد کے ایک مشاعرے میں شرکت کے لئے آپ گئے تو پروفیسر ضامن علی کے مہمان ہوئے۔ پروفیسر صاحب کے اصرار پر ایک ہفتہ تک قیام رہا۔ اس دوران میں ایک اور شاعر آکر خان صاحب کے یہاں ٹھہرے۔ دل صاحب اور وہ ایک ہی کمرے میں سوئے۔ نصف شب کے قریب انہوں نے دل صاحب کو جگایا کہ "شمال ہوا مجھے تکلیف دیتی ہے کسی نوکر کو بلا کر میرے پلنگ کا رخ تبدیل کرا دیا جائے۔" لہٰذا ضامن صاحب کو جگایا گیا۔ ملازم کو سوتے سے اٹھایا گیا اور ان کے

پتنگ کا رخ تبدیل کیا گیا۔ دوسرے دن یہ لطیفہ تمام الہ آباد میں مشہور ہو گیا اور ضامن صاحب نے ان کی میزبانی سے کان پکڑ لیے۔

دلؔ صاحب اپنے ہم عصروں میں حضرت بیخودؔ دہلوی کے بعد سب سے معمر ہیں۔ آپ کی عمر اس وقت اسّی سے اوپر ہے۔ ۱۰ اپریل ۱۹۵۵ء کو آل انڈیا ریڈیو دہلی سے ایک باقیات الصالحات کا مشاعرہ نشر ہوا تھا اور حکومت ہند کے محکمہ اطلاعات نے دستاویزی فلم لی تھی۔ اس مشاعرہ میں وہی مشاہیر شعراء مدعو تھے جن کی عمر عزیز ساٹھ سے اوپر تھی۔ دلؔ صاحب بھی شریک تھے۔

گذشتہ سال نواب رامپور نے اپنی سالگرہ کے موقع پر قصر شاہی میں شاندار مشاعرہ کیا تھا۔ دلؔ صاحب بوجہ پیرانہ سالی اب مشاعروں کی شرکت سے گریز کرتے ہیں مگر نواب صاحب کے بھائی وحیدؔ میاں کے پیہم اصرار پر شریک ہونا پڑا۔ اس تقریب میں پہلے نواب صاحب کے اعزاز میں اعلیٰ پیمانے پر ایٹ ہوم دیا گیا اس کے بعد علی ظہیر صاحب وزیر یو۔پی کی صدارت میں مشاعرہ ہوا۔ منتظم مشاعرہ ساغرؔ نظامی تھے۔ جب سب شعراء پڑھ چکے تو ساغرؔ نے کہا: "اب صرف تین بزرگ شعراء باقی رہ گئے ہیں، قبلہ جوشؔ ملسیانی، قبلہ نوحؔ ناروی اور قبلہ دلؔ شاہجہان پوری۔ یہ حضرات ترتیب کے متعلق خود فیصلہ کر لیں میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔" یہ اعلان سنتے ہی جوشؔ صاحب ڈائس پر پہنچ گئے اور غزل شروع کر دی۔ ان کے بعد نوحؔ صاحب لپکے مگر دلؔ صاحب نے گھسیٹ لیا۔ "ٹھہریئے صاحب میری عمر صرف ۷۹ سال ہے۔ آپ حضرت نوحؔ ہیں آپ کی عمر تیرہ سو سال ہے۔ آپ مجھ سے پہلے کیسے پڑھ سکتے ہیں ——؟"

دلؔ صاحب میں اگلے وقتوں کی تمام خوبیاں بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ یوں تو اہلِ شاہجہان پور خاطر تواضع میں حاتم طائی کی نسل سے مشہور ہیں، مگر دلؔ صاحب نے اپنے ہم وطنوں کا ریکارڈ بھی توڑ دیا ہے۔ بقول فضاؔ جالندھری "آپ اتنے مہمان نواز ہیں کہ نووارد مہمان کا جی چاہتا ہے آپ کے دسترخوان کی تمام چیزیں چٹ کر جائے۔" شاہجہانپور میں جب بھی کوئی بڑا مشاعرہ ہوتا ہے اکثر مہمان آپ ہی کے یہاں ٹھہرتے ہیں۔ نواب جعفر علی خاں اثرؔ جب ڈپٹی کمشنر تھے تو سالانہ کمیٹی کے سلسلہ میں شاہجہانپور آتے تھے مگر کبھی کسی افسر کے یہاں نہیں ٹھہرے سیدھے دلؔ صاحب کے یہاں پہنچے اور بستر کھلوا دیا۔ نوحؔ صاحب اکثر آپ کے مہمان رہے۔ جگرؔ صاحب جب بھی شاہجہانپور گئے سب سے پہلے دلؔ صاحب کے یہاں حاضری دی۔ جوشؔ صاحب پچھلے دنوں کراچی آتے ہوئے شاہجہانپور محض اس لئے اترے کہ حضرت عزیزؔ لکھنوی کے دیرینہ دوست اور اردو کے مسلم الثبوت استاد حضرت دلؔ کے شہر سے ان سے ملے بغیر گذرنے کو ان کا جی نہ چاہا۔ سچ پوچھیے تو دلؔ صاحب نے شاہجہانپور کو متعارف کرایا ہے اور شاہجہانپور اسی لئے مشہور ہے کہ وہ دلؔ صاحب کا وطن ہے۔

اوائل ۱۹۳۲ء میں سردار جگت سنگھ اور سید دل محمد فضاؔ جالندھری بسلسلۂ "دل نمبر رسالہ رہنمائے تعلیم" لاہور سے شاہجہانپور تشریف لائے تھے۔ ان دنوں آموں کی فصل تھی۔ دلؔ صاحب نے ہر دو حضرات کو اپنے باغات کے آم کھلائے۔ فضاؔ صاحب کا کہنا ہے کہ "جن آموں کا ذکر جلیلؔ صاحب اور داغؔ صاحب نے اپنے اشعار میں کیا ہے وہ سب حضرت دلؔ کے باغات میں موجود ہیں۔"

دلؔ صاحب آموں کے عاشق صادق ہیں۔ فصل انبہ میں آپ اپنے احباب کو آم خوری کے لئے لے جاتے ہیں، دعوتیں ہوتی ہیں، ڈال اور پال کے آم کھائے جاتے ہیں، شکار کھیلا جاتا ہے اور شعر پڑھے جاتے ہیں۔

آپ کے ایک دوست آم کھانے باغات میں تشریف لے گئے۔ وہ بمبئی آم سے سخت نفرت کرتے تھے کہتے تھے "بمبئی تو ایسا گندا آم ہے کہ اس کو چھیل کر پیشاب کر دینا چاہیئے۔" دلؔ صاحب کے کانوں تک بھی ان کی یہ بات پہنچی آپ نے ایک خوب بڑا بمبئی چھیل کر ان کو دیا۔ انھوں نے مزے لے لے کر کھایا اور بہت تعریف کی۔ نام پوچھا تو دلؔ صاحب نے کہا "قارورہ!" بہت حیران ہوئے تو آپ نے فرمایا "صاحب!

آم کی بیاسی کے لئے بھی سلیقہ چاہیئے مبہج وقت سے پیشتر یا بعد کو کھایا جائے تو یقیناً بدمزہ ہوگا۔"

آپ کا مشغلہ طب صرف رفاہ عام کے لئے ہے۔ خاص خاص مجربات آپ تو تیار کر کے مفت تقسیم کرتے ہیں۔ لوگوں کے مکانوں پر جا کر مریضوں کو دیکھتے ہیں مگر کبھی کسی سے کوئی معاوضہ نہیں لیتے۔ ایک بار ایک انگریز کو جو ہر طرف سے مایوس ہو چکا تھا آپ کے علاج سے صحت ہو گئی اس نے پانچ سو روپے بطور نذر پیش کئے تو آپ نے اسے ایسی نظروں سے دیکھا کہ وہ شرما گیا اور جب تک بیٹھا رہا معافی مانگتا رہا۔

بڑے بڑے رؤسا اور حکام آپ کے یہاں آتے اور آپ کو اپنے یہاں عزت سے بلاتے ہیں ——— مگر آپ سرکاری تقریبات میں بھی اسی شان سے شریک ہوتے ہیں جس شان سے اپنے مزدوروں کے ساتھ ان کے دوپہر کے کھانے میں۔

مشاعروں کے سلسلہ میں شعراء کافی روپیہ پیدا کر لیتے ہیں۔ ایک ایک آنہ کے لئے لڑتے ہیں۔ میں نے مشاہیر شعراء میں اکثر کو "معاوضہ" کے لئے اراکین مشاعرہ سے دست و گریباں دیکھا ہے۔ اکثر صف اول کے شعراء تو مقررہ رقم سے بھی زائد طلب کر بیٹھتے ہیں۔ فرماتے ہیں مشاعرہ کیلئے نئی شیروانی سلوائی دو سو خرچ ہوئے، سوٹ کیس لیا پچاس صرف کئے، سیکنڈ کلاس کے بجائے فرسٹ میں سفر کیا ڈھائی سو لگے، دلوائیے پانچ سو" یہ مرض صرف پیشہ ور شعراء ہی کو لاحق نہیں ہے کھاتے پیتے سفید پوش شعراء بھی اس میں مبتلا ہیں مگر دل صاحب نے تو ادب دوستی کا ریکارڈ ہی توڑ دیا۔ آپ نے اراکین مشاعرہ سے کبھی کچھ طلب نہیں کیا۔ یہاں تک کہ بعض بعض جگہ آپ اپنی جیب سے کرایہ آمد و رفت صرف کر کے تشریف لے گئے۔ نواب التفات رسول صاحب نے ہرچند آپ کو زادِ راہ دینا چاہا مگر آپ نے کبھی قبول نہیں کیا ایک مرتبہ بہت مصر ہوئے تو آپ نے فرمایا ——— "آپ مجبور کرتے ہیں تو لئے لیتا ہوں مگر آئندہ آؤں گا نہیں" ——— یہ سن کر التفات رسول صاحب بہت شرمندہ ہوئے اور الفاظ واپس لے لئے۔

دل صاحب آج بھی شاہجہانپور رہتے ہیں۔ زمینداری اچھی ان کا ذریعہ آمدنی تھی، بحق سرکار ضبط کی جا چکی ہے۔ ٹھیکیداری تقریب قریب ختم ہو گئی ہے صبح کو مطب کے بعد اصلاح و تصحیح کا مشغلہ اور شام کو لوگوں سے ملنا جلنا اب بھی جاری ہے۔ اب بھی شاہجہانپور کی کسی شاہراہ پر ٹہلنے کی چھڑی بازو میں پھنسائے، ہاتھ پشت پر باندھے اور سر جھکائے بے نیازانہ گزرتے ہوئے لوگ انہیں دیکھتے ہیں تو ادب سے ایک طرف ہٹ جاتے ہیں۔ مگر کبھی سلام کا موقعہ نہیں پاتے کتنوں ہی نے مجھ سے کہا "کاش ہم کبھی دل صاحب کو پہلے سلام کر سکتے" دل صاحب خود سلام کرنا زیادہ پسند کرتے ہیں شاید وہ سارا ثواب خود ہی لوٹنا چاہتے ہیں۔

انقلابات زمانہ نے انہیں نیم جان کر دیا ہے مگر وضع کی پیشانی پر شکن نہیں آئی۔ ان کے بڑے صاحبزادے شبیر حسن خان جوش کوئی تیس سال کے قریب سے وکالت کرتے ہیں۔ چھوٹے صاحبزادے شفیق حسن خان جو پچیس کے لگ بھگ ہیں گھر کا کاروبار سنبھالے ہوئے ہیں اور پچھلے چند برسوں سے شعر بھی کہنے لگے ہیں۔ کبھی کبھار ان کی غزلیں نگار اور ہندوستانی ادب میں نظر آ جاتی ہیں۔

چلتے چلتے حق شاگردی بھی ادا کر دوں۔ میں ان سے بہت قریب رہا ہوں اور میرا ایمان ہے کہ وہ مکمل انسان ہیں اور مکمل استاد بھی۔ انہوں نے کبھی مصرعہ کاٹ کر مصرعہ اور شعر کاٹ کر شعر نہیں لکھا۔ ان کی اصلاح شاگرد کی استعداد کے مطابق ہوتی ہے کبھی کسی بلندی کا شعر آسمان پر نہیں پہنچاتے اس کو خود آگے بڑھنے کا سبق دیتے ہیں۔ شعر میں جتنی فنی اور اسلوبی احتیاطیں وہ برتتے ہیں کسی نے نہیں برتیں۔ اپنے تلامذہ کے خیال کی بلندی اور پستی، رنگ کلام اور انداز بیان پر وہ اپنے نظریات کا غلاف کبھی نہیں چڑھاتے، ان کے تلامذہ میں جہاں خالص کلاسیکی شعراء ملتے ہیں وہاں خالص انقلابی، رومانی اور ترقی پسند بھی۔ وہ ہر ایک کو اس کے اپنے انداز فکر کے مطابق راہ دکھاتے ہیں۔ ان کا اصول اصلاح یہ ہے کہ شعر میں فنی خامی یا زبان و بیان کا سقم نہیں رہنا چاہیے۔

ان کی اصلاح اتنی باریک اور اتنی نازک ہوتی ہے کہ دیکھئے اور دیکھتے رہ جائیے بطور مثال ایک شعر پر ان کی اصلاح نقل کرتا ہوں شعر تھا ـــ

جشنِ فطرت مری ہستی پہ ہے نازاں شبنم
گُل نورس مرے اشکوں سے جواں ہوتے ہیں

آپ نے لفظ "جشن" میں جیم اور شین کے نقاط کے گرد گھیرا ڈال کر (حُسن) شعر کو آسمان پر پہنچا دیا۔ اب شعر پڑھیے اور لطف اٹھایئے ؎

حُسنِ فطرت مری ہستی پہ ہے نازاں شبنم
گُل نورس مرے اشکوں سے جواں ہوتے ہیں

دلؔ صاحب کے تلامذہ کی فہرست بہت طویل ہے۔ ہندوپاکستان کے گوشے گوشے میں ان کے عقیدت مند بکھرے ہوئے ہیں مگر فطرتاً بے نیاز ہونے کی وجہ سے وہ اپنے شاگردوں کا ریکارڈ نہیں رکھتے اور اکثر ان کے خطوط، پشت پر جواب لکھ کر واپس کر دیتے ہیں اس طرح ان کا نام و پتہ بھی محفوظ نہیں ہوتا۔ دورِ حاضر کے بیشتر اساتذہ نے ان سے باقاعدہ اصلاح لی ہے مگر دلؔ صاحب کی وضعداری کو کیا کہا جائے انہوں نے اسے ہمیشہ صیغۂ راز میں رکھا اور آج بھی یہ سطور لکھتے وقت ان کی وضع پرستی میرا قلم روکے ہوئے ہے۔ بہرحال یہ چند نام میرے ذہن میں محفوظ رہ گئے ہیں یعنی بدؔ شاہجہان پوری، کسریٰؔ منہاس، عیشؔ فیروزپوری، فضاؔ جالندھری، اصغرؔ شاہجہانپوری، شفاؔ گوالیاری، عبرتؔ صدیقی، اشرفؔ سرحدی، رسؔا بریلوی، خیالؔ شاہ آبادی، ساقیؔ جاوید، شمشیرؔ جھنجھانوی، بسملؔ شاہجہانپوری، شاداںؔ گوالیاری، عاصیؔ ترمذی، نظیرؔ حسین خاں نظیرؔ، دردؔ شاہجہانپوری، جمالؔ میاں جی۔

دلؔ صاحب اب چراغِ سحری ہیں مگر ان کی پیاری شخصیت اور ان کے پاکیزہ افکار انہیں ہمیشہ زندہ رکھیں گے خود بقول ان کے ؎

دلؔ ہوں، مجھی فطرت ہے اسے اہلِ نظر میری
میں سینۂ عالم میں ہر وقت دھڑکتا ہوں

فلک پیما

میاں بشیر احمد

مُدیرِ نقوش نے چند ماہ ہوئے مجھے لکھا کہ میں اپنے عزیز ترین دوست میاں عبدالعزیز فلک پیما مرحوم پر چند خیالات کا اظہار کروں۔ پہلے تو کچھ عرصہ میں اس فرمائش پر گھبرایا۔ میں نے سوچا کہ فلک پیما پر لکھنا بڑا مشکل کام ہے۔ فلک پیما کے خیالات کو سمجھنے کے لئے بڑی فلسفیانہ فہم درکار ہے، اُن کی گوناگوں شخصیت اور اُن کے کردار کا نقشہ کھینچنے کے لئے بڑے تامل اور تدبر اور تفکر کی ضرورت ہے اور مختلف وجوہ سے میں آج کل اس قابل نہیں کہ یہ دشوار کام اپنے ذمے لے سکوں۔ سو میں نے دل میں فیصلہ کیا کہ میں یہ کام نہیں کروں گا۔ میں یہ کام نہیں کر سکتا۔ اتنے بڑے شخص اور اپنے ایسے دوست کی شان کے شایان کچھ لکھ سکوں تو لکھوں اور نہ لکھ سکوں تو محبت و عظمت کے حضور میں گستاخی اور بے ادبی ہوگی کہ لکھنے کا عزم بھی کروں۔ پھر ایک دن یک لخت دل میں ایک بجلی سی دوڑ گئی اور معلوم ہوا کہ فلک پیما پر میں بہت کچھ لکھ سکتا ہوں، کئی صفحے سیاہ کر سکتا ہوں اور جب کر سکتا ہوں تو حیف ہے کہ ایسا نہ کروں: انسانی محبت کا تقاضا ہے اور دوست کی مدح کا اصرار ہے کہ میں ایسا کروں میں نے اپنے آپ سے وعدہ کر لیا کہ وقت نکالوں گا اور اطمینان سے لکھوں گا اور اس لکھنے سے اور اس محنت سے فائدہ بھی اُٹھاؤں گا اور لطف بھی۔ اُن کی کتاب "مضامین فلک پیما" ہے جو اب نایاب ہے اُسے پڑھوں گا سمجھوں گا سر دھنوں گا اور لکھوں گا۔ میری طرف اُن کے سینکڑوں خطوط ہیں بڑے پرائیویٹ اور بے تکلف اور بے تحاشا، ان میں انسانی جذبات کی لہریں ہیں علمیت کے موتی ہیں فلسفے کے ہیرے ہیں۔ اِن کو دیکھوں گا پرکھوں گا اور دوں کو دکھاؤں گا۔ کس قدر شاندار کام ہوگا۔ اور پھر اُن ہزاروں ملاقاتوں پر ایک نگاہ ڈالوں گا جو میری اُن کی ہوئیں اُنہیں یاد کروں گا دل کے کانوں سے سنوں گا اور شکریے کی زبان سے دوستوں اور ہم جنسوں کو سناؤں گا اور مزے لوں گا واہ! کس قدر پُر لطف کام ہوگا!

لیکن صد حیف کہ فرصت نہ ملی پر نہ ملی حالانکہ مجھ سے آدمی کی بات یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ "فرصت ہی نہیں دیتے افکار معیشت کے"۔ پھر کس قدر شرم کی بات ہے کہ میں نے کچھ نہ لکھا، ہزاروں کاموں کے اندر بیسیوں بے سود مصروفیتوں اور بے معنی "مصیبتوں" اور "غموں"

کے اندر ڈوبا رہا یا چھپا رہا۔ یہ نہ کیا کہ ڈوبنا ہی تھا تو ایک دن ایک غوطہ لگا کر فلک پیما کی خوبصورتیوں کے چند انمول موتی سمیٹ کے اُوپر لے آتا اور سورج اور چاند کی روشنی میں اُن کی چمک سے بعض نگاہوں کو خیرہ اور بعض دماغوں کو مدہوش اور دلوں کو زندہ کر دیتا۔ شاید یہ کام مجھ سے نہ ہونا تھا نہ ہو سکتا تھا صرف اِس کی آرزو تھی لیکن حیف کہ وہ بھی اتنی زبردست نہ ہوئی کہ یہ کام مجھ سے ہو جاتا! یوں دن گزرتے گئے، یہاں تک کہ شدت کی گرمی پڑنے لگی اور مجھ نازک مزاج کے پہاڑ پر چلے آنے کے دن قریب آ گئے۔ سوچا کہ اب پہاڑ پر فراغت میں ٹھنڈک میں بے خوابی کی راتوں میں خوب موقع ملے گا کہ فلک پیما کی کتاب کو پڑھوں اور مطلوبہ مضمون کو ٹھہر ٹھہر کر لکھوں اور "نقوش" کے صفحات پر اس نقش کو ثبت کر دوں۔

لیکن وائے قسمت کہ یہ بھی نہ ہونا تھا اور نہ ہوا۔ پہاڑ پر تو آ گیا تو دو چار روز ہوئے کہ ارادہ کرنا پڑا کہ اس دفعہ اور وہ بھی بہت جلد صحت کے لئے سیر و تفریح کی غرض محض گریز کی خاطر یورپ چل دوں۔ اس حال میں تھا کہ آج طفیل صاحب کا عنایت نامہ اور شکایت نامہ آ دھمکا۔ میں نے سوچا کہ خیر اب تو یہ کام ہو ہی نہیں سکتا نہ صرف یہ کہ فلک پیما کی کتاب پاس نہیں ہے نہ اُن کے خطوط ہیں اور نہ دل جمعی بلکہ اب یہاں (مری) جانے میں دو روز رہ گئے ہیں سینکڑوں کام نبٹانے ہیں بیسیوں قسم کی تیاریاں کرنی ہیں ان میں تشویش بھی ہو گی تُعلف بھی آئے گا یہ خیال کر کے کہ خلاف یہ کچھ لکھنا چاہئے اس رنگ میں کیوں بھنگ ڈالوں۔ چھوڑ دوں یہ خیال اور صرف چار سطر کا ایک معذرت نامہ طفیل صاحب کو لکھ دوں کہ قصہ ختم ہو جائے۔

مُدیر نقوش کے نجی اور مطبوعہ خطوط دونوں پر پھر ایک نظر ڈالی۔ لکھا تھا: "میں چاہتا ہوں کہ آپ مجھے فلک پیما پر مضمون لکھ دیں کہ یہ حیثیت انسان کیسے تھے اور ہیں اور ان میں کیا کیا خوبیاں اور کمزوریاں تھیں یا ہیں۔ ادبی کارناموں پر بحث مقصود نہیں ہے۔" یہ پڑھتے ہی دل نے مجبور کیا کہ اُٹھوں اور ابھی میز پر بیٹھ کر کچھ لکھ ڈالوں خواہ وہ چند کلمات یا ایک آدھ صفحہ ہی کیوں نہ ہو "وَهُوَ هٰذَا"۔

مجھے عزیز کس طرح عزیز تھے اور کیوں اس ساری کہانی کو بیان کرنے کی نہ یہ جگہ ہے نہ اِس کی فرصت ہے لیکن عجیب بات یہ تھی کہ وہ میرے عالیہ محترم جسٹس میاں شاہ دین ہمایوں کے "ہم عصر" اور دوست بھی تھے اور میرے بھی، وہ اُن کے "ہم عمر" بھی تھے اور میرے بھی بلکہ وہ تو میری بڑی بیٹی رفعت کے ہم عمر بھی تھے مجھ سے زیادہ۔ وہ بڑوں سے سنجیدہ باتوں میں نوجوانوں سے ہنسی مخول میں اور بچوں سے کھیل کود میں محو ہو سکتے تھے۔ اُن کی شخصیت متنوع اور انوکھی تھی، اپنی بیچ کی اور پچھلی عمر میں وہ صاحب لوگ معلوم ہوتے تھے۔ فیشن ایبل سوٹ بہترین ٹائی ریشمیں رومال جیب سے نکالے بڑے بانکے معلوم ہوتے تھے، ہنسی مذاق ٹھٹھا دل لگی ایک چھوٹے سے حلقے میں یہ سب کچھ لیکن پوری — DECENCY (پاکیزہ مزاجی) کی تصویر تھے۔ بڑے آزاد خیال کافر سے مسلمان اپنے مخصوص دائرے میں بظاہر مُلف انعنوی پر ہمُر لیکن فحش نیم فحش اور ہلکے پن سے کوسوں سینکڑوں کوس دُور۔ وہ ایشیا والوں کی اس کور ذوقی پر نالاں تھے کہ یہ خوشی کو جہاں دیکھتے ہیں مسلتے ہیں، مسلمانوں کی اس کوتاہ اندیشی پر رنجیدہ تھے کہ یہ پرہیزگاری کا جامہ پہن کر اپنے خدا کی وسیع دنیا میں اُس کی قدم قدم پر بکھری ہوئی اور مسکراتی ہوئی مسرتوں اور خوبصورتیوں کا خون کرتے ہیں اور اسے روحانی قربانی کا کریہہ نام دیتے ہیں۔ فلک پیما کا پیغام یہ تھا اور اسی پر اپنی پختہ سالی میں اُن کا عمل تھا کہ زُہد و اتقا سے علیحدہ ہو کر حرص و ہوا سے اور بحث مباحثے سے کنارہ کر کے اپنے چھوٹے چھوٹے معاشرتی حلقوں میں کائنات کی بڑی سے بڑی خوبیوں اور خوشیوں کو ایک دوسرے میں دیکھو اور دکھاؤ۔ زندگی کا ایک ہی پہلو ہے اور وہ پہلو دلکش ہے، ایک تاریک پہلو بھی موجود ہے لیکن وہ موت ہے زندگی نہیں!

ایک دفعہ مجھے اپنے ایک خط میں لکھا کہ "بشیر! مجھے جتنا رنج زیادہ ہوتا ہے اُتنا ہی میں اور زیادہ ہنستا ہوں۔" میں نے اُن کی زندگی کو اس خیال کی تصویر پایا جیتی جاگتی بولتی چالتی تصویر۔ اکثر اپنی غم پسندی میں مجھے اُن کا یہ فقرہ یاد آ گیا اور اس سے نہ صرف میری ڈھارس بندھی بلکہ ہنسی بھی بے اختیار ہنس دیا اور اپنے افکار کو بھول گیا۔

اس سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ فلک پیما ایک عیش پسند اور تنعم پرست آدمی تھے۔ بطور ایک مال کے اعلیٰ ترین افسر کے بطور ایک ترکی اسمبلی کے بطور ایک طالب علم فلسفی کے وہ بیحد مصروف اور محنتی اور جفاکش تھے۔ اپنے بہتر دیں سال میں عمر کے آخری دنوں تک وہ روزانہ آٹھ دس گھنٹے کام کرتے رہے اور کام سے لطف اندوز ہوتے رہے۔ یوں وہ ٹینس کے خاصے کھلاڑی تھے "برج" کے خاصے ماہر تھے، لاہور شہر کے اندر جاکر پوری کچوری اور حلوہ کھانے کھلانے کے مشتاق تھے، وہ ان طرح طرح کی باتوں سے لطف اٹھاتے تھے لیکن دراصل اُن کی عمر سنجیدہ باتوں اور متین کاموں میں گزری۔ مگر ایک بڑی بات یہ تھی کہ اکثر دوسرے بڑے اور مشہور آدمیوں کی طرح جو ایسے کاموں میں مصروف ہوتے ہیں ان کاموں کی سنجیدگی اور متانت نے کبھی اُن کے دل و دماغ پر قبضہ نہیں کیا وہ کبھی سنجیدگی اور متانت اور عقلمندی کے غلام نہ ہوئے بلکہ انہوں نے ان سے بھی زندگی کی خوشی کا کام لیا۔ خوشی جو بیک وقت سادہ اور اعلیٰ پایہ کی تھی!

باغ جناح (لاہور) میں سینکڑوں بار وہ اور میں مل کر گھومے اور اکثر میں نے کائنات اور زندگی کے فلسفے کی گفتگو چھیڑی میں چاہتا تھا کہ مجھ سا فلسفہ ناشناس اُن سے ماہرِ فلسفہ سے کچھ نہ کچھ سیکھتا رہے۔ وہ مجھے اپنی مطالعہ کی ہوئی کتابوں کا خلاصہ بتا کر مجھے اپنے علم سے مالا مال کرتے رہتے۔ بعض دفعہ دیر تک میں سوال جواب کرتا رہتا آخر یک لخت ہنس کر وہ کہہ دیتے کبھی بشیر دیکھو تو یہ پھول کتنا بے نظیر ہے آج کیسی لطیف ہوا چل رہی ہے یا بس چھوڑو بھی اس فلسفے کو!

ہمایوں جاری ہوا تو میں نے اُن سے کہا کہ کچھ لکھیے۔ کہنے لگے دیکھو میری مضمون نویسی کا زمانہ گزر چکا، میں اب بھی خوب لکھ سکتا ہوں اور لکھوں گا لیکن میں مضمون نگار نہیں بننا چاہتا نہ مصنف بننا یا مشہور ہونا چاہتا ہوں، مجھ سے میری آزادی نہ چھینو لیکن محبت سے آزادی سے جو کچھ میں لکھوں گا صرف تمہارے لئے اور ہمایوں کے لئے لکھوں گا اور گمنام رہ کر لکھوں گا۔ میں نے اس شرط کو منظور کر لیا۔ برسوں کے بعد جب یہ پردہ فاش ہوا اور فلک پیما کی نقاب کشائی ہوئی تو اور لوگوں کے تقاضے بھی بڑھے کہ ہمارے لئے بھی کچھ لکھئے تو عموماً انکار کیا یا پھر مجھ سے اجازت طلب کی جیسے میں نے "فلک پیما" کو اپنے لئے Patent (مخصوص) کر رکھا ہو۔ میں حیران ہوتا اور کہتا کہ جیسے آپ کی مرضی۔ وہ کہتے کہ نہیں میں ہمایوں کی محبت کا آزاد غلام ہوں۔ میں محبت کے لئے لکھتا ہوں کیونکہ میں محبت کے لئے جیتا ہوں۔ ہزاروں باتیں اور ہیں لیکن میں کیا کیا لکھوں اور کس طرح لکھوں "فرصت" نہیں دیکھی نہیں۔ غنیمت ہے کہ اتنی دیر ہی فلک پیما سے آزاد خیال اور آزاد عمل دلی دوست کی بابت کچھ لکھ دیا تو اسی سے کئی بندشوں سے آزادی مل گئی اور زندگی کی ذرا سی جھلک دیکھ لی!

؎ اس مضمون میں میں نے فلک پیما کے ادبی کارنامے پر نظر ڈالی۔ لیکن اتنا ضرور کہنا چاہتا ہوں کہ وہ اردو کے ایک نادر انشاء تھے جنہیں اب تک بہت کم لوگوں نے سمجھا ہے، وہ جن کی کما حقہٗ ابھی قدر نہیں ہوئی!

مالک رام

مختار الدین احمد

یہ میرا قاہرہ میں دوسرا دن تھا۔

ہوٹل سے میرے دوست رشاد عبدالمطلب ٹیلیفون ایکسچینج والوں سے بلند آواز میں بحث و مباحثہ میں مصروف تھے اور عامی لہجے میں عربی بول رہے تھے۔ میں مالک رام صاحب سے ٹیلیفون پر بات کرنی چاہتا تھا جو اسکندریہ میں مقیم تھے۔ کئی نمبر غلط نکل چکے تھے، کوئی وہاں اور سیمنٹ کا بیوپاری تھا تو کوئی کھالوں کی تجارت کرتا تھا۔ ایک صاحب محامی (وکیل) نکلے اور بڑے اخلاق اور شفقت سے انہوں نے گفتگو شروع کی لیکن صورت حال معلوم ہوتے ہی انہوں نے نہایت درشتی سے رسیور رکھ دیا۔ اب جو نمبر ملا تھا تو کوئی بولتا ہی نہ تھا۔ آپریٹر کہہ رہا تھا کہ گھنٹی بج رہی ہے لیکن کوئی رسیور ہی نہیں اٹھاتا۔ دفتر بند ہوگا۔ رشاد کہتے تھے: آج دفتر کیسے بند ہوگا، تم نے اب کی بھی نمبر غلط دیا ہے۔ آخر قاہرہ میں ایک صاحب سے رجوع کیا گیا۔ ان سے مالک رام صاحب کے گھر کا نمبر معلوم ہوا۔ دوسرے ہی لمحے ٹیلیفون کے دوسرے سرے پر مالک رام صاحب کھڑے گفتگو کر رہے تھے۔ میں نے پہلی مرتبہ ان کی آواز سنی۔ نرم اور دلکش لہجے میں انہوں نے میری آمد پر اظہار مسرت کیا اور بولے اسکندریہ فوراً پہنچو۔

دوسرے دن میں نے قاہرہ سے اسکندریہ کا ٹکٹ لیا، پلیٹ فارم پر کچھ مصری اخبارات و رسائل لئے اور ایک ڈبے میں بیٹھ گیا۔ انجن چیختا چنگھاڑتا، افریقہ کے ریگستان کا سینہ چاک کرتا لمحہ بہ لمحہ اسکندریہ سے قریب ہوتا جا رہا تھا۔ میں ہم سفروں سے گفتگو کرتا رہا۔ رسالے پڑھتا، کھڑکی سے باہر کے مناظر دیکھتا رہا اور تصور میں مالک رام صاحب کے خصائل و عادات کی بابت سوچتا رہا اور تصویریں بناتا رہا۔

ٹرین اسکندریہ پہنچی تو پلیٹ فارم پر درمیانی قد کے ایک وجیہہ آدمی عینک لگائے کھڑے تھے، یہ مالک رام تھے۔ معانقے مصافحے کے بعد ہم لوگ ان کے فلیٹ کی طرف چلے جو اسٹیشن کے پاس ہی تھا۔ اسی شام اسکندریہ کے وائی۔ ایم۔ سی۔ اے کا ایک جلسہ تھا اور ان کے ایک دوست نے بہت [illegible] [illegible] رکھا تھا۔ مالک رام اپنے نووارد مہمان سمیت وہاں مدعو تھے۔ سامان رکھ کر شہر کی سیر کرتے رہے اور اسکندریہ اور مصر کی عمومی زندگی پر تبصرہ کرتے ہوئے ہم [illegible] وائی ایم سی اے کے دفتر پہنچے۔ مباحثہ وغیرہ میں تو انہوں نے کچھ حصہ نہ لیا بلکہ خاموش تماشائی کی طرح تقریریں سنتے رہے۔ لیکن وہاں تقریروں کے بعد اور چائے [illegible] چونکہ وہ یہاں بہت ہر دلعزیز ہیں اور مصری سوسائٹی میں انہوں نے اچھی خاصی جگہ بنائی ہے۔

[illegible] دعوت میں قبطی اور عیسائی بھی تھے لیکن بیشتر تعداد مسلمانوں کی تھی۔ ماکولات کے ساتھ مشروبات خاص کا سلسلہ بھی

تھا۔ میزبان بڑے اخلاق سے ہر میز پر جا کر مہمانوں کی دیکھ بھال کر رہے تھے۔ وہ جب ہماری میز پر پہنچے تو مالک رام صاحب کی طرف متوجہ ہوتے اور بولے "آپ بھی کچھ پیجئے"۔ انہوں نے کہا "شکریہ! لیکن میں جمعہ کو نہیں پیتا۔"

میں نے دعوت کے بعد ان سے کہا کہ اگر آپ کے میزبانوں کا حافظہ قوی رہا تو آپ کسی نہ کسی دن ضرور پکڑے جائیں گے۔

مصر میں کچھ لوگ دیا سلائی کی ایک تیلی سے تین آدمیوں کی سگریٹ سلگانا شگون بد تصور کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ پھر آئندہ یہ تینوں ایک جگہ جمع نہ ہو سکیں گے۔ میں نے کھانے کے بعد سگریٹ نکالی اور اپنی میز پر کے اصحاب کو پیش کی۔ ان کی تعداد بشمول راوی چار تھی۔ میں نے ان سبھوں کی سگریٹیں سلگانی شروع کیں۔ اب تیسرے صاحب کی باری آئی تھی، مالک رام صاحب اردو میں ہاں ہاں کہتے رہے۔ میں کچھ نہ سمجھا۔ مصری دوستوں نے بھی شاید میری دل شکنی پسند نہ کی، سگریٹ سلگ چکی تھی۔ یورپ پہنچا تو معلوم ہوا یہ بھی گرشتہ شمار رسوم و قیود میں، بلکہ وہم پرستی میں مصریوں سے کچھ بڑھ کر ہی ہیں۔

دعوت کے بعد ہم لوگ گھر پہنچے۔ یہاں پہلے تو چائے سے ملاقات ہوئی۔ یہ لوگ انگریزی تو جانتے ہی ہیں عربی بھی خوب بولتے ہیں۔ پھر مالک رام صاحب کے مطالعہ کے کمرے میں آئے۔ یہ مضامین اور کتابیں ہی نہیں لکھا کرتے بلکہ انہیں لکھنے پڑھنے کے کمرے کو عجائب خانہ بنانے کا بڑا شوق ہے۔ اپنے پسندیدہ موضوعات پر انہوں نے پتا نہیں کہاں کہاں سے کس کس طرح کی کتابیں جمع کر رکھی ہیں۔ اس رات میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ انہوں نے سفر کی حالت میں ہندوستان سے دور رہ کر اردو، فارسی اور عربی کا اچھا خاصا بیش قیمت کتب خانہ جمع کر لیا ہے۔ غالب کے سلسلے کی شاید ہی کوئی تصنیف ہو جو ان کے پاس نہ ہو۔ اردو زبان کے شاعروں کے تذکرے بھی جس قدر ان کے پاس ہیں کسی کے پاس کم دیکھنے میں آئے۔ انہیں دو تین تذکروں کا پتہ چلا جو انگلستان میں تھے، فوراً پچاسوں پونڈ خرچ کر کے ان کے عکس منگا لیئے۔ کتابوں کی خرید اور نقل و حمل میں اچھی خاصی رقم خرچ کرتے رہتے ہیں۔ دوستوں کو آئے دن فرمائشیں کرتے رہتے ہیں کہ یہ کتاب بھیجو، وہ رسالہ تلاش کرو۔ قیمتیں فوراً چکا دیتے ہیں۔ کسی نے اگر ایک آدھ کتاب ویسے ہی نذر کر دی اور قیمت نہ لی تو ناراض ہو جاتے ہیں۔ ایک صاحب سے انہوں نے ایک کتاب ضرور بھیجنے کی فرمائش کی۔ انہوں نے وہ کتاب حاصل کر کے ان کی نذر کر دی۔ انہیں ایک خط میں لکھتے ہیں:

> ہاں، میں آپ کا شکریہ ادا کرنا بھول گیا۔ بیوی نے آپ کا مرسلہ نسخہ "لکھنؤ کا دبستان شاعری" دیا۔ زحمت کے لئے ممنون ہوں، لیکن آپ نے یہ کیا مذاق شروع کر رکھا ہے کہ میں جس کتاب کیلئے آپ کو لکھتا ہوں آپ اسے "اپنے مخدوم اور بزرگ" کا نام لکھ کر ڈاک میں ڈال دیتے ہیں ——— آپ کی یہ روش مجھے آئندہ آپ کو زحمت دینے میں مانع ہوگی۔

وہ اپنے دارالمطالعہ میں بیٹھے کوئی رات کے ایک بجے تک کتابیں دکھاتے رہے اور زمانہ کی باتیں کرتے رہے۔ دوسرے دن صبح کی چائے پی کر ایک دو اصحاب سے ملاقات کرائی۔ دارالمعارف میں ہم لوگ تازہ مطبوعات دیکھتے رہے۔ کتابوں کا ایک پشتارہ ساتھ آیا۔ طے یہ ہوا کہ کتابیں میں اپنے ساتھ لیکر چلا جاؤں، قیمتیں وہ میری طرف سے بعد میں چکاتے رہیں گے۔

مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ وہ دفتری جھمیلوں اور عجیب قسم کی غیر ادبی مصروفیات کے باوجود وہ اتنا وقت ادبی و علمی مضامین لکھنے کے لئے کس طرح نکال لیتے ہیں۔ وہ ذکر غالب پر نظر ثانی و اضافہ کر رہے تھے۔ امام احمد بن حنبل پر ایک مفصل اور جامع کتاب لکھنے کا منصوبہ بنا رہے تھے، بعض مضامین اور کتابوں کے خاکوں کا جال ان کا دماغ بُن رہا تھا۔ پھر بھی جب میں نے غالب کے سلسلے میں اپنے تیسرے مجوزہ مجموعے گنجینۂ غالب کے لئے چند موضوعات کا انتخاب ان کیلئے کیا تو وہ بلا تکلف ان پر مضامین لکھنے کو تیار ہو گئے اور انہوں نے جلد ہی اپنا وعدہ پورا بھی کر دیا۔

پندرہ سولہ گھنٹے ساتھ گزارنے کے بعد جب اُن سے رخصت ہوا تو ایسا محسوس ہوا جیسے ہم لوگ برسوں سے ایک دوسرے سے واقف ہیں۔

مالک رام صاحب سے میری یہ ملاقات جولائی ۱۹۵۳ء کو ہوئی لیکن ان سے میرے تعلقات پہلے سے تھے اور میں ان سے واقف تو بہت عرصے

سے تھا۔ غالباً سب سے پہلی مرتبہ میں نے نیرنگِ خیال کے اقبال نمبر میں ان کی تصویر دیکھی اور ان کا ترجمہ کیا ہوا ایک مضمون دیکھا جو بجنوری مرحوم کا لکھا ہوا تھا۔ مضمون پڑھ کر نہ صرف انکین بجنوری اور مالک رام دونوں کا رعب مجھ پر بیٹھ گیا۔ جوں جوں عمر اور سمجھ بڑھتی گئی بجنوری مرحوم سے عقیدت میں کمی آتی گئی لیکن مالک رام کی تحریروں میں دلچسپی روز بروز بڑھتی ہی گئی۔

ان سے تعلقات کا آغاز ۱۹۴۸ء میں ہوا جب میں علی گڑھ میگزین کے غالب نمبر کی ترتیب میں مصروف تھا۔ میرا ارادہ تھا کہ غالبیات کے جملہ ماہرین کو اس نمبر میں لکھنے کی دعوت دوں۔ مالک رام صاحب کی خدمت میں مجھے نیاز حاصل نہ تھا اور نہ ان کی افتادِ طبیعت کے متعلق کوئی اندازہ تھا۔ خدا بھلا کرے امتیاز علی عرشی صاحب کا، انہوں نے یہ مشکل آسان کر دی۔ میرا اُن سے غائبانہ تعارف کرایا اور مضمون لکھنے کی استدعا کی۔ بعض مضمون نگاروں کی طرح نہ تو انہوں نے عدیم الفرصتی کا گلہ کیا نہ ٹال مٹول کی کوشش کی اور نہ پیشہ ور شاعروں کی طرح صعوبات سفر، نذرانۂ کلام اور دوسرے افکار کا ذکر ضروری سمجھا۔ ان کا فوراً خط آیا کہ میں مضمون ضرور لکھوں گا، اور انہوں نے بہت جلد مضمون بھیج کر اپنا وعدہ پورا کیا۔

وہ کئی زبانیں جانتے ہیں۔ اردو، فارسی، انگریزی اور پنجابی سے تو وہ اچھی طرح واقف ہی ہیں۔ عربی سے ان کی دلچسپی قدیم ہے، پھر اسلامی ممالک میں طویل قیام کے باعث ان کا مطالعہ اور بھی وسیع ہو گیا ہے۔ وہیں انہیں فرانسیسی سیکھنے کا بھی موقع ملا۔ اور تعجب نہیں یورپ کی کسی اور زبان سے بھی واقف ہوں۔

ان کا ذوق ہمہ گیر قسم کا ہے۔ غالباً وہ اسپیشلائزیشن (تخصص) کے کچھ قائل نہیں ——— یوں بھی انہیں صرف ایک پٹڑی پر ہمیشہ چلنا مرغوب نہیں طرح طرح کے موضوعات پر لکھتے رہتے ہیں۔ کبھی فتوح البلدان کا ترجمہ ہو رہا ہے۔ کبھی سلیمان تاجر کا سفرنامۂ ہند و چین اردو میں منتقل کر رہے ہیں۔ کبھی غالب کے ذکر و اذکار کا شغل ہے تو کبھی عورت اور اسلامی تعلیم کے موضوع پر خامہ فرسائی ہو رہی ہے۔ ایک زمانے میں فارسی کے سارے قصیدہ گویوں کا کلام جمع کر رہے تھے۔ پھر خط آیا کہ تلامذۂ غالب کے عنوان سے ایک طویل مضمون لکھ رہے ہیں۔ ایک بار انہوں نے اطلاع دی کہ حمورابی کے متعلق ایک کتاب زیر ترتیب ہے جس میں اس کے آئین و قوانین بھی ترجمہ کر کے شامل کر رہے ہیں۔ پھر مژدہ سنایا کہ افلاطون کی تمام تحریروں کا ترجمہ کر رہے ہیں۔ اب انہوں نے لکھا ہے کہ گارساں دتاسی کی تاریخ ادب ہندی و ہندوستانی کے ضخیم مجلدات کا ترجمہ اردو میں کرنا چاہتے ہیں۔

میں نے انہیں مضمون لکھتے ہوئے نہیں دیکھا لیکن میرا خیال ہے کہ انہیں اپنے افکار دماغ سے کاغذ تک منتقل کرنے میں دیر نہیں لگتی۔ ان کی زبان صاف ستھری، بے عیب اور رواں ہوتی ہے۔ وہ اپنے مضامین میں تمہیدی حصہ رکھتے ہیں اور اسے دلچسپ بھی بناتے ہیں۔ تمہید وہ حسب حال لکھتے ہیں، وہ [illegible] برمحل۔ ان کی ابتدا دلی کے مرثیہ اور سلطنتِ مغلیہ کے جھلملاتے ہوئے چراغ سے نہیں کرتے۔ وہ مضامین جو انہوں نے مختلف شخصیتوں پر لکھے ہیں بہت دلچسپ ہیں اور ان مضامین میں طرزِ تحریر بہت شگفتہ ہے۔ سائل دہلوی اور کیفی پر ان کے مضامین اچھے ہیں لیکن نواب صدر یار جنگ پر جو مضمون انہوں نے لکھا ہے وہ سب سے بہتر ہے۔

آدمی بڑے وضع دار ہیں اور قدیم روایات کے دلدادہ۔ بڑے مروت والے ہیں۔ علمی کام ہوں یا دوسرے، جہاں تک ان سے ممکن ہو سکتا ہے وہ دوسروں کو مدد دینے پر تیار رہتے ہیں۔ جب بھی انہیں کسی کتاب یا کسی مخطوطے کے عکس کے لیے لکھا، ہمہ تن مستعد نظر آئے۔ بعض مرتبہ عکس بھی بھجوائے اور قیمت بھی نہ لی۔ ڈاکٹر عبدالستار صدیقی صاحب کو جوالیقی کی المعرب کی ضرورت تھی۔ یہاں بہت تلاش کی، متعدد اصحاب کو لکھا، کتاب نہ ملی۔ میں نے مالک رام صاحب کو لکھا۔ کتاب چھپ کر فوراً بازار سے ناپید ہو گئی تھی۔ انہوں نے بڑی مشکل سے کہیں سے ڈھونڈ ڈھانڈ کر ایک نسخہ نکالا اور ڈاکٹر صدیقی کی نذر کیا۔ صدیقی صاحب سے ان کے تعلقات کی ابتدا غالباً یہیں سے ہوئی ہے۔ کتابیں تو کتابیں ہیں وہ ضرورت اور اہمیت کا خیال کر کے کبھی کبھی ایک بڑی رقم خرچ کرنے سے بھی گریز نہیں کرتے۔ ایک طالب علم کو کچھ روپوں کی ضرورت پڑی، انہیں اطلاع ملی تو کئی ہزار روپے بھجوا دیئے اور لکھ بھیجا کہ تعلیم کی تکمیل ضروری ہے، واپسی کی فکر نہ کیجئے، جی چاہے واپس کیجئے، جی چاہے نہ کیجئے۔

یہی نرمی اور مروت کہیں کہیں ان کے تحقیقی مضامین میں بھی جھلکتی ہے۔ کبھی کبھی ان کی تحقیق پر ان کی فطری نرمی اور دردمندی غالب آ جاتی ہے۔ یہ

اپنے پسندیدہ مصنفین کو صحیح رنگ اور اصلی خدوخال میں نہیں دیکھتے بلکہ ان کی کمیوں اور کمزوریوں پر بھی پردہ ڈالنا چاہتے ہیں۔ میں نے علی گڑھ میگزین میں غالب سے متعلق ایک مضمون شائع کیا تھا۔ اس کے متعلق ایک خط میں لکھتے ہیں :

"کاش کہ ...... غالب کی بادہ گساری سے متعلق نہ لکھتے۔ آخر انہیں یہ مضمون لکھنے سے کیا مل گیا؟ — میں مطالعۂ بزرگاں کو منتِ خطاست کا قائل نہیں ہوں لیکن گناہِ بے لذت سے فائدہ؟ اگر اس سے ہمارے علم و ادب میں یا معلومات میں کچھ اضافہ ہوتا ہو تو ایک عذر بھی ہے ورنہ پردہ پوشی سے کام لینا خداوند کریم کی صفت ستاری و غفاری کا تقاضا ہے۔"

غالب تو خیر ان کا خاص موضوع ہے ویسے بھی جن موضوعات پر وہ مضامین لکھتے ہیں ان پر ان کی اچھی خاصی گرفت ہوتی ہے اور وہ موضوع کے حدود سے بہت اچھی طرح واقف ہوتے ہیں۔ بایں ہمہ اگر ان سے کسی مسئلہ پر اختلاف کیا گیا تو انہوں نے کبھی برا نہ مانا، توجہ سے سنا اور اگر انہوں نے ضروری سمجھا تو اپنی رائے میں تبدیلی بھی کر دی۔

ذکرِ غالب کے دوسرے ایڈیشن کا ایک نسخہ انہوں نے قاضی عبدالودود صاحب کو بھجوایا اور ان سے خواہش ظاہر کی اس پر بے لاگ تبصرہ لکھیں۔ ایک طویل تبصرہ معاصر میں شائع ہوا۔ تبصرہ اچھا خاصا سخت تھا۔ لیکن اس کے بعد ہی ان دونوں کے تعلقات زیادہ بڑھے۔ اسی طرح غالب نمبر میں جب ان کا مضمون "غالب کے خصائل و عادات" پر شائع ہوا تو قاضی صاحب نے بعض امور سے اختلاف کیا۔ میں نے یہ باتیں انہیں لکھ بھیجیں۔ بعض باتوں پر وہ متفق نہ ہو سکے۔ لیکن بعض غلطیاں انہوں نے فوراً مان لیں اور ان کی تصحیح کر دی۔

زندگی میں نفاست اور سلیقے کے بڑے قائل ہیں۔ یہ صفت ان کی زندگی کے تقریباً سارے پہلوؤں میں کارفرما نظر آئے گی۔ صاف ستھرے کپڑے پہنتے ہیں۔ صاف ستھرے مکان میں رہتے ہیں۔ ان کے ملنے کا کمرہ، مطالعے کا کمرہ، سونے کا کمرہ گرد و غبار سے آپ اٹا ہوا کبھی نہیں پائیں گے۔ بہت اچھے کاغذ پر مضامین اور خطوط لکھتے ہیں۔ قلم، سیاہی ساری چیزیں اچھی ہونی چاہئیں۔ اپنی کتابیں اور مضامین صاف ستھرے طور پر چھپواتے ہیں۔ دوسروں کی مطبوعات بھی اسی طرح صاف ستھری دیکھنی چاہتے ہیں۔ علی گڑھ میگزین غالب نمبر کے مطالعے کے بعد انہوں نے مجھے لکھا :

"غالب نمبر پچھلے ہفتہ موصول ہوا شکریہ لیکن یہ آپ نے کیا کیا؟ ایسا تاریخی نمبر اور ایسا ردی کاغذ، یہ ٹھیک ہے کہ معشوق بہرحال معشوق ہے لیکن اگر اس کا لباس اس کی شان کے مطابق نہ ہو تو بے لطفی ضرور ہو جاتی ہے۔ یہی بات اس نمبر پر صادق آتی ہے۔ اتنی محنت سے مضامین جمع کیے، اتنا خرچ کیا اور ایسا گھٹیا کاغذ۔ سارا مزا کرکرا کر دیا۔ مجھے یقین ہے کہ آپ نے کچھ نسخے نسبتاً اچھے کاغذ پر بھی شائع کیے ہوں گے۔ اگر میرا گمان صحیح ہو تو ایک نسخہ اس کا مرحمت ہو۔"

ایک دوسرے خط میں پھر لکھتے ہیں :

"کتابت کی غلطیاں اتنی ہیں۔ دونوں کمیت اور کیفیت کے لحاظ سے کہ حیرت ہوتی ہے۔ پھر کتابت میں یکسانی بھی نہیں رہ سکی۔ رنگدار بلاک الا ما شاء اللہ سب مغشوش ہو گئے اور انہیں پڑھنا تک محال ہے۔ یہ آپ کو سوجھی کیا! آخر انہیں سرخ رنگ میں چھاپنے سے فائدہ ہی کیا تھا جتنے بلاک کالی روشنائی میں چھپے ہیں بالکل معقول اور روشن ہیں۔ ایسے ہی دوسرے بھی چھاپ دیئے ہوتے۔"

اپنا مضمون "تلامذۂ غالب" رسالہ اردو ادب میں دیکھ کر لکھتے ہیں :

"اردو ادب کے دونوں پرچے اور میرے مضمون کی دوسری قسط کے دس نسخے موصول ہوئے۔ ہائے سرپیٹ لیے

کو جی چاہتا ہے۔ اتنی غلطیاں کتابت کی اور ستم بالائے ستم کہ مصرعوں کے نمبر تک غلط ہیں جس سے مضمون الٹ پلٹ ہو گیا ہے۔"

مضامین کی اشاعت میں صحت کا بڑا اہتمام رکھتے ہیں:

"مجھے اپنے مضمون سے متعلق دو باتیں یاد آگئیں۔ آخری ایام کے سالات میں ایک جگہ میں نے لفظ سائنس کا استعمال کیا ہے۔ مجھے اس کی تذکیر و تانیث میں کچھ شبہ سا ہے ...... اگر میں نے مذکر لکھا ہے تو رہنے دیجئے۔
دوسری، ایک جگہ مرزا کی زبان سے کہا گیا ہے: کوئی ڈھب کا مکان نہیں ملتا تھا۔" یہاں ڈھب کی جگہ ڈھنگ بنا دیا جائے۔ اگر کاپی مطبع میں نہیں گئی ہے تو یہ مشکل نہیں ہوگا۔ اگر جا چکی ہو تو پتھر پر یہ تبدیلی کرا دیں۔ اگرچہ ڈھب بھی غلط نہیں لیکن ڈھنگ زیادہ فصیح ہوگا۔ یہ دونوں باتیں ضرور دیکھ لیں۔"

ایک ہفتہ بھی گزرنے نہ پایا تھا کہ ان کا دوسرا والا نامہ موصول ہوا:

"میں نے اپنے پچھلے خط میں اپنے مضمون سے متعلق دو باتیں لکھی تھیں۔ پہلی یہ کہ سائنس کو مذکر رہنے دیں۔ اب گزارش ہے کہ اسے مؤنث بنا دیں یعنی "سائنس پھیل گئی" بنا دیں۔ میں ان باتوں میں لکھنوی محاورے کو ترجیح دیتا ہوں اور لکھنؤ میں سائنس مؤنث ہی ہے اس لئے اسے مؤنث بنا دیں۔
دوسرے ڈھب کی جگہ ڈھنگ کرایا جائے۔ امید ہے آپ نے یہ کر ہی دیا ہوگا، مہربانی کر کے آپ بھی میری طرح تساہل سے کام نہ لیں گے۔"

جب ان کا مضمون پہنچا تھا تو کچھ ہدایتیں بھی کہ کتابت پر خاص توجہ ہو، غالب کی فارسی غزلوں کو کلیات میں سے دیکھ لیا جائے۔ مضمون کسی طاق عدد سے شروع کیا جائے، جیسے ۹، ۱۱، ۱۳ وغیرہ۔ مقصود یہ کہ اگر ممکن ہو تو مضمون کی ۸، ۱۰ کاپیاں علیحدہ نکلوا لی جائیں۔ کاتب لفظوں کو ملا کے نہ لکھے، جیسے، اسلئے، آجکل، انکو، یہ لفظ الگ الگ لکھے جائیں: اس لئے، آج کل، ان کو وغیرہ۔

خط و کتابت میں باضابطگی پر بہت زور دیتے ہیں۔ جواب میں تاخیر ہوئی تو غضب ہو جاتا ہے:

"ایک درخواست کرتا ہوں کہ خطوں میں زیادہ باقاعدگی کو اپنا شعار بنائیں۔ مجھے اس سے زیادہ کوفت کسی بات سے نہیں ہوتی کہ لوگ خطوں کے جواب نہ دیں۔"

ایک مرتبہ پھر ان کے خط کے جواب میں مجھ سے تاخیر ہوئی۔ انہوں نے فوراً لکھا:

"میں نے اتنے دن آپ کو خط نہیں لکھا اس کی دو وجہیں تھیں: اوّل تو یہ کہ میں اپنے خطوں ... کی رسید کے انتظار میں رہا، دوسرے یہ کہ میں نے خیال کیا کہ میرا خط کہیں بارِ خاطر نہ ہو۔ جب کوئی مجھے خط نہیں لکھتا یا میرے خط کا جواب نہیں دیتا تو غلط یا صحیح مجھے یہ خیال گزرتا ہے کہ میں خواہ مخواہ دخل در معقولات کر رہا ہوں۔"

ایک دوسرے خط میں لکھتے ہیں:

"بھائی آج یہاں عید ہے اس لئے عید مبارک کہتا ہوں۔ آپ کے وہاں تو غالباً کل ہوگی۔ یارِ شاطر ہوں بارِ خاطر نہیں بننا چاہتا۔ آپ نے اتنے دن خط نہیں لکھا، میں نے بھی مخلِ صحبت ہونا پسند نہ کیا۔"

خطوط کثرت سے لکھتے ہیں اور بڑے شگفتہ انداز میں، چند ٹکڑے دیکھئے:

"اب سنیئے لطیفہ۔ آپ نے اپنے آخری خط پر پتہ لکھا۔ عربی میں صندوق البرید اور الاسکندریہ اور بلمصر تک۔ آپ کے وہاں ڈاک خانہ والے سمجھ نہ پائے کہ یہ کیا ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ کسی افسرِ اعلیٰ سے استصواب

کیا گیا۔ اس لال بجھکڑ نے اس پر لکھ دیا Try Basrah یعنی بصرہ بھیج کے دیکھ لو۔ وہ غالباً بصرہ کو بغداد سمجھے بیٹھے تھے۔ چنانچہ خط بغداد پہنچ گیا۔ وہاں تو خیر سے زبان ہی عربی ہے اس لئے وہاں والوں نے اُسے یہاں بھیج دیا۔ یہ وجہ ہوئی تاخیر کی۔ مجھے یقین ہے کہ اگر آپ ریسرچ کریں تو یہ حضرت اسی قرمساق کے اخلاف میں سے ہوں گے جنہوں نے قبلہ نیاز کیشاں "کو کپتان" پڑھ کر غالب کو کالپی کی فوج میں داخل کر دیا تھا۔ بس خیریت اسی میں ہے کہ آئندہ ہمیشہ پتا انگریزی ہی میں لکھا جائے :

اس اطلاع پر کہ میں کچھ عرصے کیلئے مڈل ایسٹ آرہا ہوں ایک خط میں لکھتے ہیں :

"ہائے کاش کہ آپ میری موجودگی میں یہاں آتے تو چند دن مزے سے گزرتی۔ لیکن آپ نے آنے کا فیصلہ جب کیا ہے کہ یہاں چل چلاؤ کے سامان ہو رہے ہیں۔ اسکندریہ کے دس سالہ قیام کے بعد عدن جانا ایسا ہی ہے جیسے کسی نے کہا تھا "بھیجتے ہیں سبھی بنارس ہی"۔ قیام کے خرچ سے متعلق کیا کہوں۔ میرے خیال میں دو ڈھائی سو روپے ماہانہ میں اچھا اعلیٰ خرچ چل سکتا ہے بشرطیکہ آپ قیمتی کتابیں خریدنا نہ شروع کر دیں کیونکہ پھر دو ڈھائی ہزار بھی کفایت نہیں کرنے کے۔ اگر آپ فیصلہ کر لیں کہ کب تک آنا چاہتے ہیں تو ممکن ہے کہ میں بھی آپ کی سکونت میں کچھ مدد کر سکوں۔ یوں کچھ بچت ہو جائے گی۔ لیکن آپ کا یہاں آنے سے مقصد کیا ہے۔ اگر دارالکتب اور دوسرے کتب خانوں کی سیر مطلوب ہے تو یہ واقعی معقول بات ہے۔ لیکن اگر آپ چاہیں کہ یہاں آ کے کچھ علم حاصل کریں تو مجھے اس کا یقین نہیں۔ کہنے کو عربی یہاں کی زبان ہے لیکن کیسی عربی۔ مجھے یقین ہے کہ آپ ان کی دارجہ عربی سن کر ہنسیں گے۔ نہ تلفظ درست نہ لہجہ، نہ صرف و نحو، اِلّا ماشاءاللہ۔ چھوٹے بڑے، عالم و جاہل یہی زبان بولتے ہیں۔ البتہ لکھتے درست نحوی زبان ہیں .... ہاں کتب خانوں کی بات دوسری ہے۔ ایسی ایسی نادر کتابوں کے قلمی نسخے پڑے ہیں کہ دیکھنے سے دل و دماغ روشن ہو جائیں۔ لیکن پر افسوس ہے کہ ان سے استفادہ کرنے والا کوئی نہیں۔ اگر آپ کو سیر کا شوق ہو تو ضرور آیئے اور جلد :

مرغانِ قفس کو پھولوں نے اے شادؔ یہ کہلا بھیجا ہے
آنا ہے جو تم کو آجاؤ ایسے میں ابھی شاداب ہیں ہم "

میری یورپ سے واپسی کے وقت وہ دہلی میں مقیم تھے۔ ان کا خط آیا کہ علی گڑھ جاتے وقت مجھ سے ملتے ہوئے جانا۔ میں نے انہیں راستے ہی سے تار دیا اور دہلی کی آمد کے وقت سے انہیں مطلع کیا ہے۔ میرے جہاز کے پہنچنے سے پہلے وہ دہلی کے ایروڈروم پر موجود تھے۔ جب تک کسٹم وغیرہ کے جھگڑے نہ چک گئے وہ انتظار میں کھڑے رہے۔ گھر پہنچے ملنے کے کمرے میں بیٹھے۔ وہاں تمام کتابیں اور رسالے اٹے پڑے تھے۔ کچھ یورپ کی داستان سنی کچھ مڈل ایسٹ کا چرچا رہا۔ زیادہ تر وہ میرے علمی کاموں کے متعلق پوچھتے رہے، پھر اُن اساتذہ کے متعلق جن سے یورپ میں ملنے ملانے کے مواقع ملے۔ پھر ہندوستان سے بات دہلی تک پہنچی۔ شاعرِ انقلاب کی ہجرت"، عرش صاحب کی "خلافت" کا ذکر ہوتا رہا۔ پھر ڈاکٹر صاحب سے ملاقات کا حال اور انجمن ترقیٔ اُردو کی داستان سناتے رہے۔

کھانے کے بعد ہم لوگ صرف غالب پر گفتگو کرنے بیٹھے اور ہم دونوں نے بیک وقت پوچھنا اور سنانا شروع کیا کہ غالب کے متعلق اب تک کیا نئی اطلاعیں ہم لوگوں نے حاصل کی ہیں۔ کیا کیا نئے خطوط اور تحریریں ہم لوگوں نے ڈھونڈ نکالی ہیں اور کیا کیا نئی کتابیں مرتب کرنے اور شائع کرنے کے

پروگرام بناتے ہیں۔ معلوم نہیں کتنی رات تک یہ باتیں ہوتی رہیں اور اگر دوسری صبح انہیں دفتر اور مجھے علی گڑھ نہ پہنچنا ہوتا تو شاید صبح تک اسی طرح باتیں ہوتی رہتیں۔

صبح سویرے ہی بچیوں نے چائے پلائی۔ ان کی بڑی بیٹی ارشاد مجھے یاد تھی لیکن اور بچوں کے نام حافظے میں نہ تھے۔ ایک صاحبزادے آئے، سلام کر گئے۔ میں نے نام پوچھا۔ بولے، "اقبال"۔ دوسری صاحب زادی گزریں، آداب بجا لائیں، انہوں نے نام بشریٰ بتایا۔ مجھے اپنی سماعت پر یقین نہ آیا۔ مالک رام صاحب بھانپ گئے۔ بولے: "آپ کو کچھ تعجب ہوا ان ناموں پر؟" پھر خود ہی انہوں نے بتایا کہ ان کے یہاں لڑکیاں ہی لڑکیاں ہوتی تھیں۔ انہوں نے اسی زمانے میں ایک بزرگ کے ملفوظات میں پڑھا کہ اگر لڑکی کا نام صدقِ نیت سے بشریٰ رکھ دیا جائے تو پھر لڑکی کے بجائے لڑکا پیدا ہوگا۔ انہوں نے نومولود لڑکی کا نام بشریٰ رکھ دیا۔ اس کے بعد ان کے یہاں لڑکا ہی پیدا ہوا جس کا نام انہوں نے اقبال رکھا۔ مالک رام صاحب یہ نسخہ کئی اصحاب کو بتا چکے ہیں اور سب اس کے تیر بہدف ہونے کے قائل ہو گئے ہیں۔

وہ اس زمانے کا بہت دلچسپ لطیفہ سناتے ہیں۔ بیٹے کی پیدائش پر مالک صاحب کی والدہ آئیں۔ بچے کو دیکھ کر بہت خوش ہوئیں۔ پوچھا کیا نام رکھا ہے۔ بولے، "اقبال"۔ انہوں نے کچھ منہ بنایا اور کچھ حیرت کا اظہار کیا۔ کہنے لگیں، "یہ نام تو کچھ مسلمانوں جیسا لگتا ہے"۔ بولے: "اماں جان! آپ نے بھی تو میرا نام کچھ مسلمانوں ہی جیسا رکھا ہے"۔

لطیفہ اس وقت مکمل ہوا جب دہلی میں شاہ ابنِ سعود آئے۔ جس اسکول میں بشریٰ پڑھتی ہے اس میں بھی انہیں آنا تھا۔ شاہ کو ہار پہنانے کے لئے انہی کا انتخاب ہوا۔ ہار پہناتے وقت انہوں نے نہایت فصیح عربی میں انہیں خوش آمدید کہا۔ شاہ بہت حیران ہوئے۔ اور ان کی حیرت اور مسرت اس وقت اور بڑھ گئی جب انہیں معلوم ہوا کہ ان کا تعلق ایک ہندو خاندان سے ہے۔

اگر اردو فارسی اور عربی کی طرف ان کی بڑھتی ہوئی دلچسپی اور مسلمانوں سے دوستی اسی طرح قائم رہی تو وہ دن دور نہیں جب وہ مولوی سندر لال، مولوی مہیش پرشاد کی طرح وہ مولوی مالک رام ہو جائیں گے۔

احسان دانش

محمد وارث کامل

علم وفن کی دشوار گذار راہیں ان شہسواروں کی جولانگاہیں رہی ہیں جو اپنے اسلاف کے نقش قدم پر اس شان سے چلے ہیں کہ انکی انفرادیت نے منزل کے کسی موڑ پر بھی ان کا ساتھ نہیں چھوڑا —— یہ ہے روسو کے اس مقالہ کا نچوڑ جس پر ۱۷۵۰ء میں انجمن ڈیزان (Academy of Dijon) نے اسے انعام دیا تھا۔ روسو کی نظر میں انفرادیت ہی ایک ایسا جوہر ہے جس کے آئینے میں کسی شخص کی عظمت کے خدوخال نظر آسکتے ہیں۔ تاریخ کے صفحات پر جن شخصیتوں کے نقوش کچھ ابھرے ہوئے سے دکھائی دیتے ہیں یہ وہی منفرد شخصیتیں ہیں۔ جو زندگی کی تیرہ و تار راہوں میں ہر قدم پر روشنی کے مینار نصب کرتی رہی ہیں۔ ہر دور میں ایسی شخصیتوں کا سراغ ملتا ہے۔ لیکن کچھ تو زمانے کی قدرناشناسی کے باعث اور کچھ اس سبب سے کہ قدرت اپنے گنج گرانمایہ کی نمائش کے سلسلے میں کچھ زیادہ فیاض واقع نہیں ہوئی ہے، ایسی شخصیتیں جہاں کہیں اور جب کبھی منظرِ عام پر آئی ہیں تو اتنے پردوں میں لپٹی ہوئی آئی ہیں کہ عوام کی اچٹتی نگاہیں ان شخصیات کے ان خلوت کدوں میں بار نہیں پاسکیں جہاں کمالات کے دفینے گڑے ہوئے ہیں۔

آج جب میں یہ دیکھتا ہوں کہ احسان دانش کی تاریخ ساز شخصیت کا جوہر ہنگامہ خیز جلوتوں کے باوصف راز درون پردہ ہے تو میں کبھی کبھی ششدر رہ جاتا ہوں، میری حیرت میں کچھ اور اضافہ ہو جاتا ہے اس چیز سے کہ آسمان شہرت کے اس کوکب درخشاں کی تابانیوں پر ظلمتوں کے اتنے غلاف چڑھے ہوئے ہیں کہ اس کے حاشیہ نشین بھی کبھی اسے عریاں نہیں دیکھ سکے۔ احسان دانش کی پراسرار شخصیت دراصل نتیجہ ہے عوام کے ذوق تجسس میں کمی کا۔

احسان دانش کا مقدر کہ وہ اس دور کا انسان ہے جس دور میں مغز و پوست، عرض و جوہر، صورت و حقیقت، لفظ و معنی اور روح و مادہ ایک ہی پیمانے سے ناپے اور ایک ہی ترازو میں تولے جاتے ہیں، اس دور میں سطح پر تیرتے ہوئے خار و خس کی تو قدر و قیمت ہے لیکن گہر و نعمت نہیں تو اس گوہر شب چراغ کی نہیں جس کے دامن میں دریا کا اضطراب بھی محو ہو جاتا ہے۔

احسان دانش کے بارے میں اتنا تو سب جانتے ہیں کہ کاندھلہ (مظفر نگر یو پی) کا ایک شاعر مزدور ہے، ایک ایسا شاعر جس نے افلاس کی گود میں آنکھیں کھولیں اور ۱۹۱۴ء کی اس جنگ عظیم کے پر آشوب ایام میں سفر حیات شروع کیا۔ جس کے شعلے مشرق سے مغرب تک

بھڑک رہے تھے، یہ وہ زمانہ ہے جب ترکی کے مردِ بیمار پر سکرات کا عالم طاری تھا، اور ہندوستان کا کوئی مسلمان ایسا نہ تھا جس نے اس ملک کی حفظ و بقا کے لئے دعائیں نہ کی ہوں، دعائیں ایک طرف اس موقعہ پر ہندوستان کے مسلمانوں نے ترکی کی مالی امداد میں بھی کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں رکھا تھا۔ مولانا شبلی نعمانی کا یہ شعر اسی دور کی یادگار ہے۔ ؎

مراکش جا چکا فارس گیا اب دیکھنا یہ ہے
کہ جیتا ہے یہ ترکی کا مریضِ سخت جاں کب تک

یہ بات بھی ڈھکی چھپی نہیں ہے کہ احسان دانش نے شروع شروع میں اپنی گذر بسر کے لئے زندگی کی ان گندھی ہوئی پگڈنڈیوں پر بھی قدم رکھا ہے جن کا تصور بھی اپنے اندر کچھ کم ہولناکیاں لئے ہوئے نہیں ہے اس شاعر شہیر نے اینٹیں بھی ڈھوئیں، سڑکیں بھی کوٹیں، رہٹ بھی چلائے کھیت بھی جوتے، چپراسی بھی کی اور چوکیداری بھی۔ غرض نچ کا وہ کون سا کام ہے جو احسان دانش نے نہیں کیا۔ بلند معاشرت مخلوق کو اس چیز کا سان گمان بھی نہ تھا کہ یہ پستی جو سرک بلندی کا بار اپنے دوش پر لئے ہوئے ہے ایک دن اتنی بلند ہو جائے گی کہ بلندیاں اس کی گرد کو بھی نہیں پہونچ سکیں گی، اور پھر وہ لوگ جن کا نشیمن معاشرت کی بلندیوں پر رہا ہے یہ کہنے پر مجبور ہوں گے، ؎

اُن کی پرواز انہیں تا بہ فلک لے پہنچی
ہم یہی سوچ رہے ہیں کہ خیال اچھا ہے

ادبی دنیا احسان دانش سے متعارف ہے لیکن اس تعارف کا مدار صرف یہ ہے کہ احسان دانش کا شمار صفِ اوّل کے شعراء میں ہوتا ہے، نظم و نثر میں اس کی جو تخلیقات ہیں انہیں قبولِ عام کی سند مل چکی ہے۔ نوائے کارگر، چراغاں، آتشِ خاموش، جادۂ نو، زخم و مرہم، مقامات، گورستان، نفیرِ فطرت، شیرازہ نظم میں لغات الاصلاح، دستورِ اُردو، خضرِ عروض، روشنیاں اور طبقات، نثر میں احسان کے وہ ادبی کارنامے ہیں جن کی بدولت برِّصغیر ہند و پاک کے طول و عرض میں اس کا طوطی بول رہا ہے، ترقی پسند شعرا انہیں اپنی برادری کا شاعر سمجھتے ہیں اور یہ اس لئے کہ احسان دانش نے اپنی اکثر و بیشتر نظموں میں سماجی زندگی کے وہ گوشے اُجاگر کئے ہیں جن کے ڈانڈے اکثر ترقی پسند شعرا کے اشتراکی نظریات سے مل گئے ہیں، دوسرے اس لئے بھی کہ احسان کا اندازِ فکر شروع سے انقلابی رہا ہے، اصلاحی، تعمیری اور اخلاقی ادب کے علمبردار ادیب و شاعر بھی احسان کو اپنے زمرہ کا شاعر سمجھتے ہیں اور یہ اس لئے کہ احسان کے کلام کا غالب عنصر اصلاح تعمیر، اخلاق اور انسانیت کے موضوعات ہیں،

رجعت پسند شعرا، جن کا اوڑھنا بچھونا ادب برائے ادب ہے، احسان دانش کے کلام پر اس لئے سر دُھنتے ہیں کہ اس نے اُردو ادب کو ایسی اچھوتی بندشیں، ایسے انوکھے استعارات اور ایسی نرالی تشبیہات دی ہیں کہ نئی پود کے شعرا اور ادبا اس مجتہد شاعر کو جتنا بھی خراجِ تحسین ادا کریں تھوڑا ہے، عوام احسان دانش پر اس لئے جان چھڑکتے ہیں کہ اس کے اشعار میں خود ان کی زندگی بول رہی ہے، ایسے اَن پڑھ لوگ جو احسان دانش کے سیدھے سادے شعر بھی نہیں سمجھ سکتے ان پر احسان کے حنجرۂ غلطاں کا جادو چل جاتا ہے،

دیکھنے میں آیا ہے کہ احسان دانش کے پاس ہر مکتبۂ خیال اور ہر مدرسۂ فکر کے ادیبوں، شاعروں، صحافیوں، مفکروں اور فن کاروں کی نشست و برخاست رہتی ہے۔ زندگی کے دوسرے شعبوں سے تعلق رکھنے والے حضرات بھی آتے جاتے رہتے ہیں، ملاقاتیوں کا تانتا صبح سویرے سے لگتا ہے اور کافی رات گئے تک یہ سیلاب فرو نہیں ہو پاتا۔ پہلے پہل جب مجھے ملاقاتیوں کا یہ بے پناہ ہجوم دیکھنے کا اتفاق ہوا تو معاً یہ خیال آیا کہ احسان صاحب کی یہ ٹکتی فوج بڑے بڑے معرکے سر کرتی ہوگی اور آڑے وقت میں اس فوج کے سپاہی اپنے سپہ سالار کے ساتھ ہر قسم کا تعاون بھی کرتے ہوں گے۔ لیکن چند ہی روز کے تجربہ نے مجھ پر یہ حقیقت منکشف کر دی کہ حلقہ

خود غلط بود آنچہ ما پنداشتیم

مجھ پر یہ راز آشکارا ہو گیا کہ اس کٹی فوج کے بعض سپاہیوں کا نان نفقہ بھی اسی سپہ سالار کے ذمہ ہے۔ احسان دانش کے ملاقاتیوں میں زیادہ تعداد ان لوگوں کی ہوتی ہے جو کسی نہ کسی مقصد یا کسی نہ کسی غرض سے آتے ہیں اور جب تک ان کی غرض پوری نہیں ہو جاتی احسان صاحب کے سر پر آسیب کی طرح سوار رہتے ہیں۔ میں نے دیکھا ہے کہ احسان صاحب ہر ملاقاتی سے خندہ پیشانی کے ساتھ پیش آتے ہیں۔ اور پہلی ہی ملاقات میں کچھ اس بے تکلفی کے ساتھ باتیں کرنے لگتے ہیں کہ اسے اجنبیت و غیریت کا احساس نہیں ہونے پاتا لیکن یہ واضح رہے کہ ان ملاقاتیوں کے پیہم اصرار کے باوجود بھی یہ کبھی نہیں ہوتا کہ احسان صاحب انہیں اپنے کلام سے بھی محظوظ فرمائیں۔ خود ہی کوئی رو آجائے تو پھر بڑی سے بڑی نظم بھی سنانے میں انہیں مطلق کوئی تامل نہیں ہوتا۔ اگر کبھی طبیعت جولانیوں پر ہوتی ہے تو اپنے روایتی ترنم کا ساز بھی چھیڑ دیتے ہیں۔ احسان صاحب اپنی مرضی کے مالک اور اپنی دُھن کے پکے ہیں اگر کسی کی فرمائش پر کبھی ان کی زبان سے 'نہیں' نکل جائے تو کسی کی سفارش سے بھی بات نہیں بنتی۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ کراچی سے ایک ادھیڑ عمر کے بھاری بھرکم رئیس احسان صاحب سے ملنے آئے۔ احسان صاحب نے جیسا کہ ان کا عام قاعدہ ہے ان کی خاطر تواضع میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ لیکن تھوڑی دیر کے بعد جب انہوں نے کسی غزل یا نظم کی فرمائش کی تو احسان صاحب کے تیور بدل گئے۔ اور یہ فرمایا۔ کیا یہ باتیں جو ہو رہی ہیں کچھ کم اہمیت رکھتی ہیں۔ یہ کیا ضروری ہے کہ غزل یا نظم بھی سنائی جائے ایک اور صاحب نے اس رئیس کی دلدہی کی خاطر احسان صاحب پر اپنے لئے دیئے تعلقات جتائے اور ان پر بہت کچھ زور ڈالا لیکن کچھ پیش نہ چلی۔ احسان صاحب ٹس سے مس نہیں ہوئے۔ ٹھیک کہا ہے کسی نے ؎

نہیں منہ سے جو نکلی پھر کہاں 'ہاں'
خدا محفوظ رکھے اس 'نہیں' سے

احسان صاحب کو جن لوگوں نے بہت قریب سے دیکھا ہے ان کی معلومات کا حاصل یہ ہے کہ احسان صاحب کسی درسگاہ کے فارغ التحصیل نہیں۔ البتہ ۱۹۲۷ء میں انہوں نے پرائمری کا امتحان ضرور پاس کیا تھا۔ دیسی مکتب میں احسان صاحب نے قرآن پڑھا اور ایک جید عالم سید حافظ محمد مصطفےٰ سے پڑھا۔ پرائمری میں جب یہ زیر تعلیم تھے تو انہیں منشی عبد الرحیم جلال آبادی کی شاگردی کا شرف حاصل ہوا۔ یہ مؤخر الذکر استاد بھی اچھا خاصا علمی ذوق رکھتے تھے۔ قاضی محمد ذکی صاحب ذکی کاندھلوی کی توجہ سے احسان صاحب کے دل میں شعر گوئی کا ولولہ پیدا ہوا اور یہ بیداری کچھ اس انداز کی تھی کہ اس کی بدولت ان کی آنکھوں کے آگے سے ذہنی تاریکیوں کے پردے سرکتے چلے گئے اور یہاں تک کہ ایک وقت آیا جب اس جوہر قابل کی نکھار کے لئے قدرت نے ان کا دامن کہیں اساتذہ فن کی عباؤں سے اور کہیں کہنہ مشق ادباء کی قباؤں سے نتھی کر دیا۔ احسان صاحب نے اپنی شاعری کے ابتدائی دور میں خواجہ عزیز الحسن مجذوب کی آنکھیں دیکھیں۔ یہ شاعر بھی تھے اور صاحب دل مجذوب سالک بھی۔ ان کے اشعار میں بلا کا تیکھا پن ہوتا تھا۔ احسان صاحب پر ان کی نظر پڑی تو آنکھوں آنکھوں میں 'حریف مئے مرد افگن عشق' بنا دیا۔

اس دور میں شمس العلما علامہ تاجور نجیب آبادی نے ان کے اندر زبان و بیان کی شوخیاں سمو دیں۔ ان کی صحبت کا سب سے بڑا اثر احسان صاحب کی شاعری پر یہ ہوا کہ آہستہ آہستہ ان کے کلام کو شرف قبول کی سند مل گئی۔ لطف ادا، شوکت الفاظ، جودت فکر، معاملہ بندی اور نغز گفتاری کے جو محاسن احسان صاحب کے کلام میں پائے جاتے ہیں۔ ان پر بہت بڑی حد تک تاجور کے حسن نظر کی چھاپ ہے علامہ تاجور احسان صاحب سے کافی محبت کرتے تھے اور ان کے ہر قسم کے ناز نخرے بھی سہتے تھے۔ احسان صاحب علامہ تاجور سے کچھ اتنے بے تکلف ہو گئے تھے کہ بعض اوقات خود ان کے منہ پر انہیں کھری کھری سنا دیتے تھے لیکن اپنی اس افتاد طبع کے باوصف احسان صاحب نے فرق مراتب کا لحاظ ہمیشہ رکھا۔ اگر کبھی کسی نے احسان صاحب کی موجودگی میں علامہ تاجور کے خلاف زبان کھولی تو پھر ان سے رہا نہیں گیا

اور یہاں تک اس مخالفت پر بس ہے کہ آخر کار اسے معذرت طلب کرنی پڑی۔ علامہ تاجور کے دو بیٹوں کی ناگہانی وفات پر جس دلسوزی کیساتھ احسان صاحب نے مرثیہ کہا ہے، اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ احسان صاحب کے احساسات و جذبات رہین عقیدت تھے، باوجود اس پختہ یقینی کے کہ علامہ تاجور کا اس قدر کے قادر الکلام شعرا میں شمار ہوتا ہے۔ میں بلا خوف مبالغہ یہ کہہ سکتا ہوں کہ علامہ تاجور خود بھی اپنے بیٹوں کا مرثیہ لکھتے تو اس میں سوز و گداز کا وہ امرت نہ ہوتا جو احسان صاحب نے اس میں گھول دیا ہے۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ جہاں تک تاثرات و مشاہدات کا تعلق ہے۔ احسان صاحب اپنے اساتذہ اور دیگر پختہ فکر شعرا سے بھی بازی لے گئے ہیں۔ احسان صاحب کی شاعری میں جوش ملیح آبادی، محروم، پنڈت برجموہن کیفی کی توجہات کو بھی بہت کچھ دخل ہے۔

احسان صاحب کی نثر نگاری کا خمیر جن ادبا کی نظر کیمیا اثر نے اٹھایا ہے ان میں سر فہرست ڈاکٹر ذاکر حسین، ڈاکٹر عابد حسین، ل۔ احمد اکبر آبادی، مجنوں گورکھپوری، فراق گورکھپوری، آل احمد سرور، احتشام حسین کے نام آتے ہیں۔ احسان صاحب کی نظر میں ان کا ادب معیاری ادب ہے۔ احسان صاحب کی ملاقاتیں یوں تو برصغیر ہند و پاک کے تمام مشاہیر سے ہوئی ہیں بلکہ ان میں سے اکثر سے ان کے گہرے روابط بھی رہے ہیں اور ہیں لیکن جن مشاہیر کی ملاقاتوں پر احسان کو فخر ہے وہ ہیں زبدۃ المفسرین علامہ شبیر احمد عثمانی، علامہ سید سلیمان ندوی، مولانا عبد الماجد دریابادی، مولانا نیاز فتح پوری اور مولانا ابو الاعلیٰ مودودی۔ موخر الذکر سے احسان صاحب کی پہلی ملاقات میری معیت میں ہوئی تھی۔ اس ملاقات کی تحریک میرے ان الفاظ نے کی کہ احسان صاحب! دنیا آنی جانی ہے اور یہ زندگی ایک ڈھلتا سایہ ہے کیا ہی اچھا ہو کہ ہم جماعت اسلامی کے امیر مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی سے ملاقات کریں سننے میں آیا ہے کہ ان کی صحت جواب دے گئی ہے اور وہ آج کل گوال منڈی میں صاحب فراش ہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ بعد میں ہمیں کسی کا یہ شعر پڑھنا پڑے ؎

صبح دم وہ بھی نہ چھوڑی تونے اے بادِ صبا
یادگارِ رونقِ محفل تھی پروانے کی خاک

احسان صاحب لیت و لعل کے خوگر اور چون و چرا کے عادی نہیں ہیں فوراً اٹھ کھڑے ہوئے اور بولے چلئے مولانا ابھی چلتے ہیں۔ غرض ہم دونوں گوال منڈی پہنچے اور دفتر کوثر (اب یہاں دفتر ایشیا اور دفتر جماعتِ اسلامی ہیں) کے ایک کمرہ میں داخل ہوگئے۔ جہاں کچھ ستاروں کی جھرمٹ میں چاند کی چاندنی دعوت نظارہ دے رہی تھی۔ مولانا مودودی نے مسکراتے ہوئے ہونٹوں اور چمکتی ہوئی آنکھوں سے ہمارا خیر مقدم کیا۔ میں نے احسان صاحب کا تعارف کرایا تو مولانا بولے ان کے نام سے تو میں بہت پہلے سے متعارف ہوں البتہ کبھی دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ اچھا ہوا یہ خلا آج پر ہوگیا۔

باتوں باتوں میں بجٹ کا موضوع چھڑ گیا۔ احسان صاحب ٹھہرے اُونچے درجے کے بجٹی اس موضوع پر اتنا سیر حاصل تبصرہ کیا کہ سامعین (جن میں مولانا نصر اللہ خاں عزیز بھی شامل تھے) اور خود مولانا مودودی انگشت بدنداں رہ گئے۔

خامہ انگشت بدنداں کہ اسے کیا لکھئے
ناطقہ سر بگریباں کہ اسے کیا کہئے

علامہ سید سلیمان ندوی سے احسان صاحب کی ایک ملاقات بڑے عجیب عنوان سے ہوئی تھی۔ احسان صاحب اور علامہ دونوں ٹرین میں سفر کر رہے تھے اور بیٹھے بھی تھے پاس ہی پاس لیکن نہ معلوم احسان صاحب کن خیالات میں ڈوبے ہوئے تھے کہ انہیں علامہ کی موجودگی کا احساس بھی نہ ہو سکا۔ علامہ نے خود ہی مہر سکوت توڑی اور بولے، احسان صاحب، آخر اس نیازمند سے کیا خطا سرزد ہوگئی ہے۔ کہ اسے درخور اعتنا نہیں سمجھا جا رہا۔ احسان صاحب پر ان بولتے ہوئے نقوش سلیمانی کا یہ اثر ہوا کہ فوراً باادب ہو بیٹھے اور چلے معذرت

طلبی کے انداز میں اور پھر نہایت بے تکلفی کے ساتھ علامہ سے مصروف سخن رہے۔ علامہ کو تھانہ بھون کے سٹیشن پر اترنا تھا۔ تھوڑی دیر بعد گاڑی اس سٹیشن پر رکی تو علامہ رخصت ہوئے لیکن اس عالم میں کہ موسلادھار بارش ہو رہی تھی۔ علامہ نے پائنچے اوپر چڑھائے اور کھیتوں کی ڈنڈ ڈول اس بٹیا پر چلنے جو بل کھاتی ہوئی تھانہ بھون لے جاتی اور پھر وہاں سے اس جگہ پہنچا دیتی ہے جہاں اعتزال پسند علما کی تربیت گاہ کے سرپرست مولانا تھانوی کا بیمار وجود رازی و غزالی کی یاد تازہ کر رہا تھا۔ اور جن کی [illegible]ت دنیا کو یہ پیغام دے رہی تھی کہ

ایسے بھی ہیں کچھ اپنے سفینے میں مسافر
دریا کے تلاطم کو جو خاطر میں نہ لائیں

مولانا عبدالماجد دریابادی کے احسان صاحب سے اچھے خاصے مراسم ہیں۔ پچھلے دنوں جب مولانا لاہور آئے تو ان کی ملاقات احسان صاحب سے نہ ہو سکی مولانا کو اس چیز کا ملال رہا۔ چنانچہ انہوں نے اپنی سرگزشت لاہور میں خصوصیت کے ساتھ یہ لکھا کہ لاہور کی جن دو شخصیتوں سے نہ مل سکنے کی حسرت رہ گئی ان میں ایک حضرت احسان دانش ہیں اور دوسرے ڈاکٹر برہان احمد فاروقی۔ مولانا باز فتح پوری کی ناقدانہ یورشوں سے نہ علما و فضلا بچے ہیں اور نہ شعرا و ادبا لیکن یہ احسان صاحب کی خوش قسمتی ہے کہ مولانا انہیں اس دور کا شاعر شہیر تسلیم کرتے ہیں اور جب بھی ان سے ملے ہیں بڑی محبت اور خلوص کے ساتھ ملے ہیں۔

مولانا شبیر احمد عثمانیؒ بڑی جلالت مآب شخصیت کے مالک تھے علوم عربیہ میں انہیں جو کمال حاصل تھا۔ اس کا اعتراف خود مصر کے فضلائے کیا۔ صحیح مسلم کی شرح اور وہ بھی عربی میں مولانا نے اس تبحر علمی کے ساتھ کی ہے کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ مولانا تحریر و تقریر دونوں میں ید طولیٰ رکھتے تھے، احسان صاحب کی جب ان سے پہلی ملاقات ہوئی تو مولانا نے کلام کی فرمائش کی۔ احسان صاحب نے "گورستان" کے عنوان سے ایک تازہ نظم کہی تھی وہی سنانی شروع کر دی۔ ایک تو نظم تھی خود ان کے اپنے غمگین تاثرات کا نتیجہ اور پھر اس پر مستزاد یہ کہ احسان صاحب کے گلے کا سوز بھی قیامت ڈھا دیتا ہے مولانا شبیر احمد عثمانی پر رقت طاری ہو گئی اور نظم کے اختتام تک یہی کیفیت رہی۔

یہ تو یاد نہیں پڑتا کہ احسان صاحب کبھی مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی سے بھی ملے ہیں یا نہیں البتہ یہ بات ضرور ہے کہ مولانا بھی احسان صاحب سے اچھی طرح متعارف ہیں اور ان کے کلام سے بھی۔ مولانا نے ایک دفعہ "ماں کی محبت" کے موضوع پر مستورات کے ایک جلسہ میں تقریر کی تو ان کی زبان پر احسان صاحب کا یہ شعر بار بار آیا ؎

اس قدر کر دو ں گا ماؤں کی محبت کو بلند
دل کے ٹکڑوں کو شہادت کی دعا دینی پڑے

بہاول پور کے ایک عالم دین مولانا احمد یار بہاول پوری کسی بزم سماع میں شریک تھے۔ قوالوں نے احسان صاحب کی ایک مشہور غزل شروع کر دی۔ جب وہ اس شعر پر پہنچے ؎

زخم پہ زخم کھا کے جی اپنے لہو کے گھونٹ پی
آہ نہ کر لبوں کو سی عشق ہے دل لگی نہیں،

تو مولانا پر اس بلا کی وجدانی کیفیت طاری ہوئی کہ جاں بحق تسلیم ہو گئے۔

اوپر کی سطور میں جو کچھ میں نے تحریر کیا ہے یہ احسان صاحب کی زندگی کا عریاں پہلو ہے اس پر تھوڑی سی بھی واقفیت کے بعد ہر شخص کچھ نہ کچھ روشنی ڈال سکتا ہے لیکن ان کی وہ خصوصیات جن پر تہیں جمی ہوتی ہیں کہاں کسی کے علم میں آ سکتی ہیں۔ میں اس مضمون کے آخری حصہ میں رسم نقاب کشائی کا یہ اہم فریضہ سرانجام دینے کی جسارت کرتا ہوں۔

۱۔ احسان دانش جنہیں لوگ حضرت احسان دانش، احسان صاحب، بھیا احسان، بھائی احسان کہتے ہیں اپنی دانست میں ٹھیک ہی کہتے ہیں۔ لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ بہت کم لوگ یہ بات جانتے ہیں کہ احسان صاحب کا اصل نام قاضی احسان الحق کاندھلوی ہے۔ ان کے والد ملجد قاضی دانش علی اپنی بے علمی کے باوجود علمی ذوق رکھتے تھے اور اس ذوق کی تسکین کا ذریعہ خود احسان صاحب تھے۔ احسان صاحب عہد طفلی میں اردو کی مشہور کتابیں (فسانۂ آزاد، فسانۂ عجائب، آرائش محفل، باغ و بہار، وغیرہ) اپنے والد ماجد کو پڑھ کر اونچی آواز میں سنایا کرتے تھے، آس پاس کے دوسرے بزرگ بھی ذوق سماعت کا ثبوت دیتے تھے، غالباً یہی کتاب خوانی کا شغل بعد میں ان کی شاعری کا سبب بنا ایک دفعہ احسان صاحب کے نام کے سلسلہ میں ایک عجیب لطیفہ ہوا عشرت کرت پوری سے جو احسان صاحب کے بڑے عقیدت مند شاگرد ہیں، میں نے احسان صاحب کی موجودگی میں کہا۔ عشرت صاحب اگر نغزگو شاعر بننا چاہتے ہو تو قاضی احسان الحق کاندھلوی کے شاگرد بنو۔ یہ آپ کو ہفت خوان رستم طے کرادیں گے۔

عشرت صاحب بگڑ کر بولے۔ قاضی واضی میں نے بہت سے دیکھے ہیں۔ یہ جتنے قاضی قسم کے شاعر ہیں، میں انہیں برسوں تک شاعری کی تعلیم دے سکتا ہوں۔

میں نے نہایت متانت کے ساتھ کہا۔ برسوں کی بات تو چھوڑیئے آپ میرے اس قاضی کو (احسان صاحب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) ایک دو سیکنڈ ہی دیدیجئے اچھا ہے بیچارہ راہ راست پر آجائے جب عشرت صاحب پر یہ حقیقت منکشف ہوئی کہ احسان دانش ہی قاضی احسان الحق کاندھلوی ہیں تو ان پر گھڑوں پانی پڑگیا۔

۲۔ احسان صاحب کا شجرۂ نسب شیخ حسن زنجانی سے ملتا ہے اور شیخ کا سلسلہ حضرت ابوبکر صدیق رضؓ تک منتہی ہوتا ہے۔ اس نسب اور اس نسبت سے احسان صاحب شیخ صدیقی ہوتے ہیں۔ خاندان قضاۃ جس کی زنجانی شاخیں یو۔پی کے مغربی اضلاع میں پھیلی ہوئی ہیں ۹۲۳ھ سے ہندوستان کو اپنے علوم و فنون سے فیض یاب کررہا ہے وہ خاندان ہے جس کے ایک فرد خواجہ شہاب الدین سہروردی بانی سلسلۂ سہروردیہ اور دوسرے وہ امام سعد زنجانی ہیں جن کے حضور مشہور محدث خطیب بغدادی نے بھی زانوئے تلمذ کئے۔

قاضی عبدالشہید زنجانی رح جو امام سلسلۂ چشتیہ خواجہ نظام الدین بلخی رح کے پیر صحبت ہوتے ہیں اور جنہوں نے اکبر کے دین الٰہی کی شدید مخالفت کی تھی۔ زنجانی سلسلۂ قضاۃ کے مشاہیر میں سے تھے۔ قاضی شہاب الدین ثاقب جو علوم دینیات میں حجۃ الاسلام شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رح کے شاگرد اور مرید اور میر و سودا کے ہمعصر شاعر باکمال تھے۔ اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہیں تذکرۂ طبقات الشعراء میں قدرت اللہ شوقؔ نے ان کا تذکرہ کیا ہے۔ مولوی محمد یٰسین غرقؔ جو شوق دہلوی کے شاگرد اور صاحب دیوان شاعر ہوئے ہیں اپنے زمانے کے باکمال بزرگ تھے۔ ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری مرحوم بھی اس باغ دبہار خاندان کے گل رعنا ہیں (الحاج شجاعت علی صدیقی کنٹرولر پاک ملٹری اکاؤنٹس مرحوم ڈاکٹر بجنوری کے داماد ہیں) میر و سودا کے معاصر تاثم چاندپوری بھی قاضیوں کے خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ یو۔پی کے وزیر حافظ محمد ابراہیم اور مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی بھی اسی خاندان کے اخلاف ہیں مختصر یہ ہے کہ احسان صاحب یعنی قاضی احسان الحق کاندھلوی جو آج کل شاعری کے پردے میں چھپے ہوئے ہیں ایک ممتاز اور علم پرور خاندان کے فرد ہیں۔

۳۔ احسان صاحب کی شخصیت ایک چیستان بن کر رہ گئی ہے اور وہ اس لئے کہ یہ نہ صرف خلقی بلکہ خلقی اعتبار سے بھی مجموعۂ اضداد واقع ہوئے ہیں۔ احسان صاحب شاعر بھی ہیں اور اس کے ساتھ ہی ناثر بھی ہیں، ادیب بھی ہیں۔ لیکن ایسے ادیب کہ ان کے ادب پر نقد و نظر کا خول چڑھا ہوا ہے۔ کبوتر بازی کا چسکا بھی ہے اور حسن پرستی کی لت بھی۔ بنوٹ بھی ہیں اور گھر بنی بھی، طب، تصوف، اسلامیات فلسفہ، نفسیات، سائنس، انسانیت سے منطق جو ذخیرۂ علم و ادب ہے اس پر بھی ان کی دسترس ہے۔ ان کی پوری زندگی کردار ہی کردار

ہے۔ نظری اور نظریاتی انداز انہیں کبھی نہیں بھائے۔ ان کا بیشتر وقت دوسروں کے لئے وقف ہے یہی وجہ ہے کہ زندگی میں انہیں خاطر خواہ معاشی سہولتیں میسر نہیں آسکیں۔ امراء سے ان کی ملاقاتیں غربا پروری کے لئے ہیں نہ کہ خود اپنی ذاتی منفعت کے لئے۔ اس اسباب کی دنیا میں احسان صاحب قطع سبب کی زندگی بسر کر رہے ہیں اور اس بے سروسامانی کی حالت میں کہ اگر آج یہ اللہ کو پیارے ہو جائیں تو ان کے گھر سے ایک ماہ کا کرایہ بھی نہ نکلے۔ احسان صاحب کے دامن پر جذبۂ انتقام کی گرد کبھی نہیں پڑی۔ کچھ لوگوں نے گذشتہ سالوں میں احسان صاحب کو تحت الثریٰ میں پہنچا دینا چاہا۔ اگر احسان صاحب کی سخت جانی آڑے نہ آتی تو شاید احسان صاحب کبھی کے بول گئے ہوتے۔ سنہ ۱۹۳۲ء میں احسان صاحب نے سنتِ یوسفی بھی ادا کی ہے۔

احسان صاحب نقش پرست تو بے شک ہیں الفنس پرستی کے داغ سے ان کا دامن کبھی داغدار نہیں ہوا۔ حسن چاہے پھول کی پتی میں ہو چاہے گھاس کے تنکے میں، احسان صاحب کو اس سے فطرتی اور جذباتی لگاؤ ہے۔ موسیقی، مصوری، باغبانی، مجسمہ سازی ایسے ذوقی مشاغل سے بھی آپ کی دلچسپیاں وابستہ ہیں۔ احسان صاحب حد درجہ آزاد خیال واقع ہوئے ہیں لیکن یہ آزاد خیالی دینی بے راہ روی کا نتیجہ نہیں بلکہ پختہ یقینی کا ثمرہ ہے۔ ان کے ظاہر پر رندمشربی کا گمان ہوتا ہے لیکن ان کا باطن ایمان وعرفان کا گنجینہ ہے۔ قریب کے مطالعہ سے مجھے یہ اندازہ ہوا کہ احسان صاحب ایک زاہد مرتاض بھی ہیں اور ایک عابد شب زندہ دار بھی۔ خواب اور بیداری پر انہیں بلا کی قدرت ہے۔ جب اور جس جگہ ان کا دل چاہے سو رہتے ہیں۔ اور پھر اپنی مرضی اور اپنے اختیار سے بیدار بھی ہو جاتے ہیں کرسی پر بیٹھے بیٹھے، راستہ چلتے چلتے باتیں کرتے کرتے احسان صاحب نیند کے سمندر میں ڈبکیاں لگاتے ہیں بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ اس سمندر کے اچھے خاصے تیراک ہیں۔ رات کو جب ساری دنیا خراٹے لیتی ہے تو احسان صاحب کے کاروبار شوق کا دفتر کھلتا ہے۔ حقیقت میں بات بھی یہی ہے کہ دنیا میں جس نے بھی کچھ پایا ہے شب بیداری سے پایا ہے۔ دن کی ہنگامہ خیز مصروفیتوں میں ذہن کی گرہیں کچھ الجھی ہوئی سی رہتی ہیں اور انسان کوئی دماغی کام نہیں کر سکتا۔ ٹھیک کہا ہے کسی نے ؎

جب پچھلے پہر کا سناٹا آلودۂ شبنم ہوتا ہے،
اس وقت حقائق کھلتے ہیں ہر چیز نظر بن جاتی ہے

احسان صاحب کی زندگی کا انداز کچھ اتنا سادہ رہا ہے کہ انہیں آج تک قرض لینے کی نوبت نہیں آئی۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ وہ آج تک کسی تجارت میں کامیاب نہیں ہو سکے۔ کیونکہ اس دور میں جتنے بھی کاروبار ہیں وہ قرض کے بل چلتے اور پھلتے پھولتے ہیں۔ مکتبۂ دانش جس سے بظاہر اُن کی معاشی زندگی وابستہ ہے۔ اس سے اتنی یافت نہیں ہوتی کہ یہ اپنا گذر بسر کر سکیں۔ بلکہ میں جہاں تک سمجھتا ہوں یہ مکتبۂ دانش دل کا بہلاوا ہے یا دوسرے لفظوں میں اسے چند احباب کی نشست گاہ کہہ لیجئے۔ مکتبۂ دانش کی کتابیں غالباً مال وقف ہیں۔ اس لئے کہ دیکھنے میں آیا ہے کہ اکثر کتابیں اٹھالی جاتی ہیں اور اُن کے گرد پوش باقی رہنے دیئے جاتے ہیں۔

۴۔ جیسا کہ میں نے کہیں وسط مضمون میں کہا ہے کہ احسان صاحب عابد شب زندہ دار ہیں، اس کی مزید وضاحت اس سے ہو سکتی ہے کہ جب سے ان کا باطنی رابطہ حضرت حافظ تفضل حسین گھیروی رح سے قائم ہوا ہے ان کی زندگی اصحاب صفہ کی سی زندگی بن گئی ہے۔ فرش یا تخت پر سوتے ہیں۔ صرف ایک وقت کھانا کھاتے ہیں۔ اور وہ بھی بہت سادہ۔ ہر جمعرات کی صبح کو گورستان میانی جاتے ہیں۔ اور گھنٹوں مخصوص انداز میں ناتحخواں رہتے ہیں۔ شام کے وقت حضرت داتا گنج بخش رح کے مزار پر بلاناغہ حاضری دیتے ہیں۔ احسان صاحب کا عقیدہ یہ ہے کہ "میں زندہ مزارات کی عظمت کا قائل ہوں۔ پختہ مزارات کے ہجوم سے مجھے نفرت ہے۔ عورتوں کے مزار بھی میرے نزدیک وقعت نہیں رکھتے۔"

احسان صاحب باہمہ و بے ہمہ قسم کے انسان ہیں۔ لوگ اپنی وابستگی کی بنا پر انہیں اپنا دوست سمجھ بیٹھتے ہیں۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ دوسروں کے دوست تو کیا خود اپنے بھی دوست نہیں۔ کسی سے انہیں دشمنی بھی نہیں ہے بلکہ دشمنوں سے بھی دشمنی نہیں رکھتے۔ میرے مطالعہ اور میری تحقیق کا جہاں تک تعلق ہے۔ احسان صاحب کی سب سے بڑی کمزوری شاعر گری اور شاعر نوازی ہے۔ بہت سے نوجوان احسان صاحب کی اس عنایت کے شکار ہیں۔ دوسری کمزوری جس کا تعلق خود ان کی ذات سے ہے وہ ہے مغلظات کا استعمال۔ بات بات میں گالیاں دینا ان کی عادت میں داخل ہو چکا ہے۔ تیسری کمزوری ایک اور بھی ہے اور وہ یہ کہ احسان صاحب کے اندر مردم شناسی کا جوہر نہیں بعض اوقات غلط قسم کے لوگ ان سے مستفید ہوتے ہیں۔ اور جو ان کی توجہ کے مستحق ہیں انہیں ان کی بارگاہ میں کسی خاص نظر سے نہیں دیکھا جاتا۔ چوتھی کمزوری یہ ہے کہ احسان صاحب اگر کسی کی دعوت کرتے ہیں تو مہمان کی شامت آجاتی ہے اس کے لئے دسترخوان پر اس قسم کے کھانے چنے جاتے ہیں کہ اگر ایک ہفتہ کا بھوکا بھی ہو تو اس کی بھوک اڑ جاتی ہے۔

سنہ ۱۹۴۴ء میں ایک دفعہ مجھے افطار کی دعوت دی۔ میں منزلیں مارتا ہوا ان کے مکان پر پہنچا۔ اس زمانے میں یہ کوٹ عبداللہ شاہ (مزنگ) میں رہتے تھے۔ افطار کا نقارہ پٹا تو مٹی کے ایک لوٹے میں غیر معروف پانی اور ایک مٹی کا سکورا لئے ہوئے احسان صاحب برآمد ہوئے اور بولے پیجئے مولانا روزہ افطار کیجئے۔ میرے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ میں نے صبر کیا اور دل کو یہ دلاسا دیا کہ شاید نماز مغرب کے بعد پرتکلف خوان بچھے۔ لیکن ہوا یہ کہ ایک چنگیر میں دو گڑ کی روٹیاں اور ایک رکابی میں چنے کا ساگ لایا گیا۔ اور پھر ان الفاظ کے ساتھ مولانا بسم اللہ کیجئے کھانے کا حکم صادر کیا۔ گڑ کی روٹیاں اتنی سخت اور امینٹھی ہوئی کہ چباتے ہی منہ سے دانت باہر آجائیں اور چنے کے ساگ میں اتنی مرچیں کہ الامان الحفیظ! کھانا تو میں نے کھا لیا۔ لیکن ساتھ ہی دل میں یہ عہد کیا کہ احسان صاحب کی دعوت کبھی قبول نہیں کروں گا۔ چنانچہ آج تک اپنے عہد پر قائم ہوں۔

احسان صاحب میں پانچویں کمزوری یہ ہے کہ وہ کسی کی پوری بات کان دھر کر نہیں سنتے بلکہ بعض اوقات تو ستم ظریفی کا یہ عالم ہوتا ہے، کہ جب کوئی شخص ان کے سامنے اپنا دکھڑا جھینکتا ہے تو یہ اسے لفظ لفظ پر ٹوکتے اور زبان کی غلطیاں درست کرتے ہیں۔ جب وہ کہتا ہے، کہ احسان صاحب اصلاح کا یہ کون سا موقع ہے تو بڑی سنجیدگی سے فرماتے ہیں "اور کیا مرنے کے بعد زبان کی اصلاح کا وقت آئے گا۔ احسان صاحب زبان پر قدرت کے باوجود ٹکسالی کی بولی میں بات کرنے کے عادی ہیں اور ان کا یہ انداز گفتگو ان کے نئے ملاقاتیوں پر یہ نقش بٹھا دیتا ہے کہ یہ احسان صاحب جو ہم سے ہمکلام ہیں وہ حضرت احسان دانش نہیں ہیں جن کی زبان ادبا سے خراج تحسین وصول کر چکی ہے۔

ان کمزوریوں کے باوجود احسان صاحب بہت کچھ ہیں۔ اس دور کے بہت سے نغز گو شعرا اپنے کلام میں ان سے اصلاح لیتے رہے ہیں اور آج بھی ان سے مشورے لیتے ہیں۔ ان کے شاگردوں کی فہرست بہت طویل ہے۔

احسان صاحب کے تعلقات تمام شاگردوں سے دوستانہ ہیں۔ بلکہ یہ عجیب بات ہے کہ احسان صاحب کبھی اُن شعرا کو اپنا شاگرد نہیں بتلاتے اور جب ان سے اس کا سبب پوچھا جاتا ہے تو نظیری کا یہ شعر پڑھ دیتے ہیں ؎

طائرے نیست کہ از تار رغش بر پا نیست
صید یک مرغ نہ کردم ز کہن دامیھا

احسان صاحب اس دور کی شاگردی استادی کے قائل نہیں اور وہ اس لئے کہ اس دور کے شاگرد گرگٹ کی طرح رنگ بدلتے ہیں، اور اپنی زندگی کے ہر موڑ پر ایک نئے اُستاد سے اپنا رشتہ جوڑ لیتے ہیں۔ اس دور میں کالجوں اور سکولوں کی طرز تعلیم نے شاگردی کا معیار باقی رکھا ہے نہ اُستادی کا۔ جہاں وہ ہر سنہ کے بعد اُستاد بدلتے ہوں وہاں کیسی شاگردی اور کہاں کی اُستادی۔ شاگرد تو وہ ہوتے تھے جو عمر بھر کسی ایک اُستاد کے ہو رہتے اور نظر اٹھا کر بھی دوسری طرف نہ دیکھتے تاریخ میں ایسے شاگردوں اور ایسے استادوں کے واقعات شاہد ہیں جن کے رشتے اتنے مستحکم ہوتے تھے

کو دوئی کے تمام حجابات مرتفع ہو جاتے تھے۔ حکیم نابینا دہلوی مولانا رشید احمد گنگوہی کے شاگرد و مرید تھے انہیں اپنے استاد کا اتنا احترام تھا کہ دہلی سے دیوبند ہر جمعرات کو استاد کی خدمت میں پہنچتے اور علوم و معارف کے خزانے لوٹتے تھے۔ احسان صاحب اس گئے گزرے دور میں ایسے شاگردوں کے متمنی ہیں لیکن میرے خیال میں ان کا یہ خواب کبھی شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا۔

عبدالرزّاق کانپوری

ابوالخیر مودودی

انیسویں صدی کے آخری قرن کی یادگاروں میں تھے۔ ایسے ماحول میں پرورش پائی جس میں داستانِ امیر حمزہ، فتوح الشام، قصۂ چہار درویش، قصۂ حاتم طائی۔ اگلے وقتوں کی زندگی کی ایسی ہی حکایتیں اور روایتیں ذوق و شوق سے پڑھی سُنی جاتی تھیں۔ طبیعت میں ایک جوہر تھا۔ اس چیز نے بیان میں داستانی رنگ پیدا کردیا۔ شعور کی آنکھ ایسے ماحول میں کھلی جس میں زندگی کے نئے تقاضے ہمک رہے تھے، قصوں کا ذوق تاریخ کے مطالعے میں منتقل ہوگیا۔ طبیعت کی اُپج سے "البرامکہ" "الکمی" اور تاریخ نگاری کے نئے ادبی دور میں اپنی ایک جگہ پیدا کرلی۔ یہ کتاب ایسی ظالم نکلی کہ بیچاروں کو عبدالرزاق سے "البرامکہ" بنا دیا اور یہ عرف ان پر ایسا سوار ہوا کہ جب تک "نظام الملک طوسی" نہ لکھی نام بخشی نہ ہوئی۔

ان کے آباو اجداد فرخ آباد (صوبہ متحدہ) کے رہنے والے تھے۔ سن اٹھارہ سو ستاون کے ہنگامے کے بعد ان کے والد منشی الٰہی بخش نے کانپور کو وطن بنالیا۔ نسباً فاروقی تھے۔ بدلتے زمانے کا اثر اتنا قبول کیا کہ سراپا مغربی ہوگئے۔ انگریزی لکھنے بولنے پر قادر اور اپنے زمانے کے نامی گرامی منجم و رمّال تھے۔ اس تقریب سے انبالہ چھاؤنی ان کا مستقل مسکن تھا۔

عبدالرزاق صاحب اٹھارہ سو چھیاسٹھ میں پیدا ہوئے۔ ننہال رضوی سید تھے، فتح پور ہسوہ (الٰہ آباد) میں ان کی زمینداری تھی، اس تعلق سے نشوونما فتح پور ہی میں ہوئی۔ وہیں مکتب پڑھا اور عمر کی اٹھارہ منزلیں وہیں طے ہوئیں۔ کہتے تھے، فتح پور میں ایک نامور درویش صوفی میر حسن علی تھے، انہوں نے بسم اللہ پڑھائی، پھر انہی کے مکتب میں فارسی عربی پڑھی، یہ مکتب ان کے فرزند مولوی ظہور الاسلام نے قائم کیا تھا۔ وہ اس علاقے میں بڑے نامور اور باثر عالم تھے، جب ندوہ کی تحریک نے جنم لیا تو اس کے سربراہوں میں ان کو بھی شامل کیا گیا تھا۔ تحصیل اسکول میں فارسی کے ایک ادیب منشی امام علی تھے، سکندر نامے تک ان سے فارسی درسیات پڑھیں۔ عربی متوسطات سے فراغت پائی تھی کہ مولوی ظہور الاسلام صاحب نے اپنے مدرسے میں فارسی، حساب اور ابتدائی درجے کی عربی پڑھانے کا کام سپرد کردیا۔ والد نے یہ کہہ کر یہ تعلق منقطع کرا دیا کہ میں تم کو ملا بنانا نہیں چاہتا۔ اب [illegible] بنے کانپور آگئے۔ یہاں کلکٹری میں اہلمدی گلے پڑی۔ چھ سات برس یہ مصیبت بھگتی، پھر میونسپلٹی میں سررشتہ داری مل گئی اور دس برس گلے کا ہار رہی، ان کروہات میں منشی رحمت اللہ رعد مالک نامی پریس کی ذات دل چسپی کا واحد سہارا تھی، اس ملنے جلنے نے طبیعت میں شگفتگی پیدا کی۔ ندوۃ العلما کے ناظمِ اول مولوی محمد علی صاحب مونگیری سے تھوڑی سی حدیث پڑھی، اور مدرسۂ فیض عام

کے مشہور مدرس مولوی احمد حسن منقولی سے درس نظامی کی بقیہ کتابیں تمام کیں۔ ۱۸۹۰ء میں آب و دانے کی کشش بھوپال لائی، یہاں تحصیل داری مل گئی، فرصت نصیب ہوئی، دس برس سے نظام الملک طوسی کی دھن تھی، فراغت نے اس کی تکمیل کا موقع دیا۔ ۱۹۰۰ء میں یہ کتاب شائع ہوئی، ۱۹۱۱ء میں سرکار عالیہ نے بنظر قدردانی مستقل تاریخ اسلام سفر فرما دیا۔ "البرامکہ" سے قلم کے مسافر نے سفر شروع کیا تھا، اب تاریخ اسلام کا وسیع میدان ہے، خدا اتمام کی توفیق بخشے۔

اسی زمانے میں میری ان سے ملاقات ہوئی۔ بلند بالا اسپاہیانہ ہاڑ، خد و خال میں کتابیں پیوست گفتگو میں انشائی اسلوب، پرانے وقتوں کے قصے بڑے مزے سے بیان کرتے، وہ کم و بیش ایک صدی کی شنیدہ و دیدہ تاریخ تھے۔ پرانے معاشرے کا شیرازہ ان کے بلوغ شعور میں بکھر اتھا۔ نئے معاشرے کا شیرازہ ان کی آنکھوں کے سامنے بندھ رہا تھا۔ بزرگوں سے جو کچھ سنا یاد رکھا، اور آنکھوں سے جو کچھ دیکھا ذہن میں نقش کر لیا۔ نئی پرانی، دونوں باتیں ان میں ملی جلی موجود تھیں، جب کوئی پرانی بات چھڑ جاتی، یادوں کا چشمہ پھوٹ نکلتا۔

علی گڑھ تحریک سے بہت متاثر تھے۔ سید صاحب کے نورتن اور ان کی تعلیمی و ادبی تحریک کے بڑے چھوٹے سب لوگوں سے ان کی راہ و رسم رہی تھی۔ تاریخی ذوق کی وجہ سے زیادہ تعلق علامہ شبلی سے تھا۔ جب تک علامہ شبلی مدرسۃ العلوم میں پروفیسر رہے باہم آمد و رفت رہی، علی گڑھ میں یہ ان کے مہمان، کانپور میں وہ ان کے مہمان۔ بے تکلف دوستی تھی، اس عہد بے تکلفی کے قصوں کا پشتارہ جب کبھی کھل جاتا، علامہ شبلی سے ملاقات ہو جاتی سر سید کی خدمت میں بھی ان کو نیاز حاصل تھا، کہتے تھے کہ مجھ کو صحیح مطالعے کی راہ اسی تحریک نے دکھائی جس کا سر چشمہ سید کی ذات گرامی تھی۔ ۱۸۸۷ء میں لکھنؤ میں ایجوکیشنل کانفرنس کا دوسرا اجلاس تھا، اس میں شمس العلماء شبلی نعمانی نے مسلمانوں کی گزشتہ تعلیم پر لکچر دیا۔ اسی سے مجھ کو تاریخ اسلام کے مطالعے کا شوق ہوا، چند سال گزرے تھے کہ ہر دلئی سے حکیم محمد علی کا ناول "جعفر و عباسہ" نکلا، ناول کیا تھا ایک تیر تھا جو دل میں ترازو ہو گیا۔ جی میں آیا کہ اس کی تردید میں ایک مضمون لکھوں۔ مگر تاریخ نے مختصر سے تردیدی مضمون کو آل برمک کی پوری داستان بنا دیا۔ سچ پوچھو تو یہ اسی تحریک کا فیض تھا۔ میں نے کہا، اور شبلی صاحب کو بھی سید کے فیض نظر نے علامہ شبلی بنایا، ورنہ "اسکات المعتدی" لکھا کرتے!

عبدالرزاق صاحب دم بھر کو غور میں گئے، ذہن نے کچھ ڈھونڈا کر پیدا اور اس کو گفتگو میں گھول دیا۔ مجھ کو "اسکات المعتدی" سے وہ سارے مجادلانہ رسالے یاد آگئے۔ کیا مشغلے تھے ہمارے علماء کے! میرے دوست شمس العلماء شبلی نعمانی نے شروع زمانے میں خود اس بات کا اعتراف کیا تھا۔ کہ تاریخ کا ذخیرہ انہوں نے اول اول سید صاحب کے کتب خانے میں دیکھا، اور وہ کہتے تھے کہ اس بات کا تو وہم و گمان بھی نہ تھا کہ یورپ والوں نے ہمارے ذخیرۂ علوم سے استفادہ کیا ہوگا۔ میرے دوست نے اس سلسلے میں اپنا یہ واقعہ بیان کیا کہ میں حیرت زدہ نظروں سے یورپ کی مطبوعہ کتابیں نکال نکال کر دیکھ رہا تھا۔ سید صاحب اپنی میز پر کام میں مشغول تھے، ان کی آواز گونجی میں نے مڑ کے دیکھا کام جاری تھا اور فرما رہے تھے دیکھو! یہ تمہارے کرنے کے کام تھے جو یہ لوگ کر رہے ہیں۔ اور یہاں تم لوگوں کا مشغلہ کنوئیں میں جو یا گر جائے تو اس کے ڈول گننا ہے، یا استنجے کے ڈھیلے چٹانا اور تھپیاں مارنا! سید صاحب کی یہ بات سن کر میں زمین میں گڑ گیا ـــــ عبدالرزاق صاحب نے کہا: یہ مولوی شبلی صاحب کے جوہر کی بات تھی، کوئلے کو تو کوئی بھی جوہری ہیرا نہیں بنا سکتا۔

میں نے بطور تفنن عرض کیا، کلیسا کا سا حیرت زدہ احساس آپ نے بھی رسائل شبلی کے "میں اسلو" میں پڑھا ہوگا! ـــــ خوش مذاقی ان کے چہرے پر لہرائی ـــــ مگر یہ فطری بات تھی" عبدالرزاق صاحب نے کہا، جب آدمی اندھیرے سے دوپہر کی تیز روشنی میں دفعتاً آئے تو چکرا ہی جاتا ہے!

البرامکہ کا مصنف اپنے اصلی قد و قامت سے زیادہ بلند بالا ہو گیا۔ و ماغ نے اس کے لئے ایک جگہ مقرر کی ـــــ قدریں ان جگہوں کی حفاظت

لہ :- عبدالرزاق صاحب علامہ شبلی کو اکثر اسی لقب سے یاد کیا کرتے تھے۔

ہوتی ہیں، جن کے لئے دل کا یا دماغ کا دروازہ کھلتا ہے :

پچاس سال ادھر کی بات ہے، علی گڑھ سے مولوی وحید الدین سلیم "معارف" نام ایک رسالہ نکالتے تھے، اس میں ایک عجیب قصہ نظر سے گزرا تھا۔ پامر کی کتاب "الہارون" کے ترجمے پر ریویو کرتے ہوئے صاحب مضمون نے لکھا تھا کہ جب مولوی شبلی صاحب مدرسۃ العلوم میں آئے تو انہوں نے اپنا تصنیفی کام اس کتاب سے شروع کرنے کا ارادہ کیا تھا۔ یہ قصہ اس وجہ سے عجیب ترین تھا کہ علامہ ممدوح نے "المامون" پر مولوی حبیب الرحمان خاں شروانی کے تبصرے پر اپنے جوابی مضمون میں ہارون کی بہت مذمت کی تھی اور اس کے جرائم کی ایک لمبی فہرست تحریر فرمائی تھی۔ میں نے عبدالرزاق صاحب سے اس قصے کی اصلیت پوچھی۔ اسی زمانے میں ان کا بھی ایک سلسلۂ مضمون "آثار عجم" پر "معارف" کے کئی پرچوں میں نکلا تھا۔ عبدالرزاق صاحب نے کہا: "الہارون" کا ماجرا تو مجھ کو یاد ہے، لیکن میں دیکھ لوں کہ ریویو نگار نے کیا لکھا تھا۔ مبادا اس میں کوئی الگ بات ہو، یا میری معلومات سے نامدبات ہوا ور میں بے دیکھے بھالے تصدیق کر دوں" ——— عبارت پڑھی ——— ہاں! ٹھیک ہے۔ اس میں عجیب بات کیا ہے؟ یہ ۱۸۸۲ء کا قصہ ہے۔ میرے مرحوم دوست کو جب اس کتاب کا علم ہوا تو انہوں نے چند خاص طلبہ سے، جن سے کہ وہ مانوس تھے۔ اس کے ابواب کا ترجمہ کروایا۔ ان کا ارادہ تھا کہ اس کتاب کو اپنے حاشیوں سے مزین کریں۔ خوب چیز ہو جاتی اگر یہ کتاب ان کے حاشیوں کے ساتھ چھپتی۔ مجھ کو بھی یہ ترجمہ دکھایا تھا۔ اور یہ کہہ کر اپنے نور بصیرت سے بہرہ ور کیا تھا کہ دیکھو! ایک تو ہمارے ہاں تاریخیں لکھی جاتی ہیں، اور ایک ان لوگوں کی تاریخ نگاری کا ڈھنگ ہے۔ پامر نے ڈنک تو مارے ہیں، مگر دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ کہاں کہاں سے موتی اور خزف ریزے نکالے ہیں اور ان کو کس خوبی اور سلیقے سے لڑیوں میں پرویا ہے۔ مگر جب سید صاحب سے اس کا ذکر کیا تو انہوں نے فرمایا کہ تم ان لوگوں کو اپنی تاریخ میں جیسا بھی بنا کر چلنا چاہتے ہو، بیاگر یعنی لکھنے کا جو نیا ڈھنگ ہے وہ تم نے دیکھ لیا، اب اسی ڈھنگ پر تم خود لکھو اور مامون پر لکھو۔ ذہنی روشنی زیادہ اسی میں ہے، اور ہماری قوم کو زیادہ ضرورت اس وقت اس چیز کی ہے، تاکہ فکر کی آزادی پیدا ہو اور وہ نئے علوم سیکھے اور نئی روشنیاں حاصل کرے" ———

عبدالرزاق صاحب نے کہا: سنا نہیں کہ جائے استاد خالی است۔ سید صاحب نے ضرورت اور مصلحت سمجھا دی اور سمجھنے والے نے اس خوبی سے سمجھی کہ سمجھنے کا حق ادا کر دیا۔ یہی تو میرے دوست مرحوم شمس العلما شبلی نعمانی کا خاص جوہر تھا"

عبدالرزاق صاحب آدمی بڑے قرینے اور رکھ رکھاؤ کے تھے۔ واجبی احترام ملحوظ رکھتے تھے اور بات بے کم و کاست کہتے۔ نیک فہمی اور گھری قدر شناسی ان کی عام روش تھی، مشاہیر ادب میں بہتوں سے ان کے تعلقات تھے اور بہتوں کو انہوں نے دیکھا تھا، وہ ان سب کا ذکر یکساں احترام سے کرتے اور تنقیص و ترجیح سے دامن کش رہتے۔ بڑی جان دار خوبی ان میں یہ تھی کہ مشاہیر ادب سے تعلقات کے ہجوم میں جس کی دوستی پر ان کو عمر بھر فخر رہا وہ ان کی گم نامی کے زمانے کا دوست تھا! رحمت اللہ رعد! زندگی کے میدان میں وہ منزل بمنزل بڑھتے رہے، اور بحیثیت مصنف اس مرتبے کو پہنچے کہ عماد الملک بلگرامی نے قدر افزائی کی ——— جن کی قدر افزائی اس عہد کے بڑے بڑے علمی قدر آوروں کے لئے سرمایۂ افتخار تھی۔ لیکن اس قدر افزائی پر بھی ان کو اتنا فخر نہ تھا جتنا کہ رعد سے دوستی پر۔ گفتگو میں جب ان کا ذکر آجاتا، تو کیف خلوص سے آواز میں گھلاوٹ پیدا ہو جاتی۔

انہوں نے عمر بھر کتابوں سے آنکھیں لڑائیں اور مصنفوں سے آنکھیں ملائیں اور دفتر کے دفتر لکھے، تاریخ اسلام اور تاریخ جلالی اور سفرنامہ خسرو بلخی پر حاشیے اور منشی رحمت اللہ کی نامی حسنی کے لئے تاریخی مضامین کے انبار اور "نظام الملک طوسی" جس کو فاضل بلگرامی نے سراہا مگر ان کی بس دو کتابیں ہیں، اولین تصنیف "البرامکہ" اور آخری تصنیف یادِ ایام پر بیتی اور آپ بیتی۔ وہ بھی افسانہ یا فسانہ، یہ بھی افسانہ یا فسانہ! ——— ایک داستان میں کتنی داستانیں ہیں جو مسرا مسرا بھرتی چلی آئی ہیں۔ آپ بیتی کی ایک داستان میں افسانہ یا فسانہ ایک داستان ہے۔ نواب مرزا داغ کی صحبت میں تین گھنٹے ہیں نے اپنی

لے یادِ ایام اس وقت میرے سامنے نہیں ہے، چند پرچوں کے اوراق ۱۹۴۴ء میں مرحوم نے بھیجے تھے۔ ان میں سے کچھ دستی کاغذوں میں نکل آئے، یہ اقتباس انہی دستی صفحات سے ہے۔ یادِ ایام تقسیم سے تھوڑی مدت پہلے چھپی تھی، مرحوم نے لکھا تھا کہ یہ میری آخری یادگار ہے، یہ یادگاری نسخہ حیدرآباد میں آگیا تھا۔ وہیں رہا۔

زندگی کے سفر میں پچاس سال کے اندر ہندوستان کے مشاہیر شعراء کو دیکھا اور ان کی زبان سے ان کا کلام بھی سنا ہے۔ میرے والد منشی الٰہی بخش مفتوں رحیم بنارسی چونکہ خود شاعر تھے اور انہوں نے غالب و لکھنؤ کے باکمال شعرا کو دیکھا تھا۔ اور مشاعروں میں شریک ہو کر غزلیں پڑھتے تھے۔ اس لیے مجھے ہدایت تھی کہ ادبی مجالس سے استفادہ کروں۔ عجیب اتفاق ہے کہ تعلیم کے زمانے میں بھی ادب سے ہمیشہ دلچسپی رہی، لیکن شاعری کی طرف توجہ نہیں ہوئی، اور تمام عمر سماعت شعر میں گزری ———

اب سنئے کہ داغ تک کیسے رسائی ہوئی؟

دلّی میں حضور نظام کی کوٹھی شہر سے الگ تھی اور کئی ہزار گز افتادہ رقبہ کوٹھی سے متعلق تھا جس میں امرائے دولت کے خیمے اور بارگاہیں تھیں۔ صدر پھاٹک پر فوجی سپاہیوں کا پہرہ تھا، ایک کمرے میں پولیس افسر جمع تھے۔ ملاقات کا انتظام جس افسر کے سپرد تھا وہ ایک عرب تھا۔ جب میں نے مرزا داغ سے ملاقات کی خواہش کی تو اس نے دستی (ملاقات کا کارڈ) طلب کیا، چند کارڈ پیش کئے گئے اور جواب کے انتظار میں ٹھیرے رہے۔ ایک گھنٹے کے بعد مرزا صاحب کا چوبدار آیا اور ان کی ذاتی ذمہ داری پر کیمپ کے اندر جانے کی اجازت ہوئی۔ رستے میں صدہا خیمے نظر آئے جو ایک سے بڑھ کر ایک شاندار تھے، ہر خیمے کے دروازے پر شوخ زرد رنگ کی تختی پر سیاہ حروف میں صاحب بارگاہ کا نام لکھا تھا۔ پینتیس منٹ کے بعد نواب فصیح الملک مرزا داغ کا نام نظر آیا۔ ان بارگاہوں کے قریب ہی کوٹھی تھی جس میں حضور نظام خواب راحت میں تھے۔ میرے بوٹ کی چرچر کی آواز آ رہی تھی۔ ایک پہرہ دار دوڑتا ہوا آیا۔ اور شریفانہ انداز میں فہمائش کی۔ آہستہ آہستہ چلئے حضور نظام آرام میں ہیں، بوٹ کی آواز خواب گاہ تک کسی طرح نہیں جا سکتی تھی، تاہم حکم کی بسر و چشم تعمیل کی گئی۔ اس وقت مجھے صائب کا یہ شعر یاد آیا اور منشی رحمت اللہ رعد مالک نامی پریس کانپور کو مخاطب کر کے پڑھا ؎

اے صبا برگ ہائے غنچہ نہ آہستہ پا
پاسبان گلہا صائب خوابیدہ است

الحمد للہ، منزل ختم ہوئی اور داغ کی بارگاہ تک پہنچ گئے۔ صدر دروازے پر ایک چوبدار نے جس کی زرد مخملی وردی پر طلائی و نقرئی کام تھا چک اٹھائی اور ہم لوگ اندر داخل ہوئے۔ پہلے گول کمرے میں بٹھائے گئے جس میں ایرانی قالین کا فرش تھا اور کرسیاں سیاہ رنگ کی تھیں۔ چند منٹ کے بعد طلبی ہوئی۔ دو درجے طے کر کے جب تیسرے میں پہنچے تو دیکھا کہ ایک بزرگ قوی الجثہ تکیے کی چوب تھام کر ہمارے استقبال کو اٹھ رہے ہیں۔ چلنے میں معذور تھے اور پنڈلیوں پر گرم اونی پٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔ عرق النسا میں مبتلا تھے۔ جسامت بھری ہوئی، رنگ سیاہ اور چہرے پر خفیف سیتلا کے داغ تھے۔ بارگاہ کا یہ حصہ نہایت آراستہ تھا، ایک جانب چاندی کا پلنگ بچھا ہوا تھا۔ وسط میں قیمتی ایرانی قالین تھا، ذرا ہٹ کر چاندی کی ایک بڑی انگیٹھی میں آگ دہک رہی تھی، مرزا صاحب نے کھڑے ہو کر مصافحہ کیا، پھر ہمارے اصرار پر فرش پر بیٹھ گئے۔ کارڈ سے نام تو پہلے ہی معلوم ہو چکے تھے۔ اب نام بنام تعارف ہوا۔ بیٹھتے ہی میری طرف پیچوان بڑھایا، شغل فرمائیے۔ میں نے عرض کیا: پیر و مرشد! خدا نے اس آگ سے مجھے اب تک محفوظ رکھا ہے۔ فرمایا کہ اس کا نعم البدل بھی موجود ہے "اجازت ہو تو ایک جام پیش کیا جائے"۔ اس لطیفے پر خوب ہنسی رہی۔ میری کتاب البرامکہ ۱۸۹۲ء میں شائع ہو چکی تھی، اور مرزا صاحب پڑھ چکے تھے۔ اس کتاب کے مضامین پر گفتگو ہوتی رہی۔ اس کے بعد سلطان سنجر سلجوقی کے متعلق مجھ سے چند سوالات کئے، میں نے جواب عرض کیا، بہت خوش ہوئے اور حیدرآباد آنے کی دعوت دی۔ پھر فرمایا کہ اپنی تصویر کانپور پہنچ کر بھیجنا۔ میرے بعد منشی رحمت اللہ رعد سے مخاطب ہوئے اور فرمایا کہ جناب رعد! آپ تو میرے ہم مشرب ہیں کچھ اپنا کلام سنائیے۔ رعد نے معذرت کی کہ مسدس حالی پڑھنے کے بعد شاعری سے تائب ہو چکا ہوں، تاہم دو تین غزلیں سنائیں۔ اس کے بعد موجودہ شاعری پر مناظرہ شروع ہوا، ڈیڑھ گھنٹے کی بحث کے بعد [illegible]

کی ترقی کے لئے شاعری اور مشاعروں کا بقا ضروری ہے، البتہ اس امر کی ضرورت ہے کہ اردو کانفرنس قائم کر کے اس میں یہ مسئلہ پیش کیا جائے اور جو عیوب ہیں ان کی اصلاح کی جائے۔

جب یہ دلچسپ بحث ختم ہوئی تو میں نے دریافت کیا کہ مولوی سید احمد دہلوی نے تیس سال کی محنت میں فرہنگ آصفیہ لکھی ہے۔ تحقیقات لغات، محاورات اور زبان کی حیثیت سے اس کتاب کی نسبت جناب کی کیا رائے ہے؟ فرمایا: سید احمد عرب سرائے کے باشندے تھے۔ اور یہ کہہ کر خاموش ہوگئے۔ مکرر سوال کرنا ادب کے خلاف سمجھا اور اس جواب سے یہ نتیجہ نکالا کہ تحقیقات لغات میں کوئی اعتراض نہیں ہے۔ البتہ فرہنگ کی زبان ٹکسال باہر ہے۔ کیوں کہ عرب سرائے کی آبادی بیرون دہلی ہے۔ میں نے سید محترم کی جملہ کتابیں اور مضامین پڑھے ہیں۔ اگر چند غلطیاں ہوں تو قابل معافی ہیں۔ کیوں کہ انار کے چند دانے خراب ہوں تو پورے انار کی لطافت میں فرق نہیں آتا۔

چاندی کی ایک تپائی پر ریشمی بستے میں ایک کتاب رکھی تھی۔ منشی رحمت اللہ نے اجازت لے کر اس کو کھولا۔ اندر سے طلائی کام کی ایک جلد نکلی، رعد نے خیال کیا کہ یہ مصحف ہے، چاہتے تھے کہ آنکھوں سے لگائیں۔ اس پر مرزا صاحب کو ہنسی آگئی اور رعد بھی کچھ سمجھ گئے، سرورق کھولا تو "مہتاب داغ" کا جلوہ نظر آیا۔ یہ دکن کی پیداوار تھی۔ رعد اپنے تخلص کے اعتبار سے بلند آواز تھے۔ ایک غزل پڑھی۔ حاضرین مجلس نے بہت داد دی۔ لیکن جناب داغ کی موجودگی میں رعد کی یہ کڑک مجھے پسند نہ آئی۔ میں نے مرزا صاحب سے عرض کیا کہ مسافر نوازی کی یہ شان ہے کہ جناب خود ہی کچھ ارشاد فرمائیں۔ درخواست منظور ہوئی، رعد سے دیوان لے کر کئی غزلیں سنائیں، پڑھتے وقت یہ معلوم ہوتا تھا کہ گویا بیس سالہ نوجوان غزل پڑھ رہا ہے، آنکھیں پھڑکتی تھیں، ہاتھوں کو حرکت تھی، یہ محسوس ہو رہا تھا کہ متن کے ساتھ شارح تفسیر کرتا جاتا ہے میری زبان سے برجستہ نکلا کہ آج میں نے داغ سے نہیں بلکہ ذوق کی زبان سے یہ غزلیں سنی ہیں۔ ذوق کا نام آتے ہی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے۔

چائے کی کشتیاں آئیں، زرد پیالیوں کے سوا کل سامان نقرئی تھا۔ بسکٹ، کیک، مٹھائیاں، پھل ہر قسم کے تھے، خود شریک نہیں ہوئے۔ کیوں کہ ناشتہ کا وقت گزر چکا تھا۔ تین گھنٹے میں یہ پُر لطف صحبت ختم ہوگئی، چند اصحاب دہلی کے ملاقات کے لئے تشریف لائے، اب ہم رخصت ہوئے، مرزا صاحب نے مصافحہ کیا اور دعائے خیر کے بعد جانے کی اجازت دی۔ افسوس کہ میری یہی پہلی اور یہی آخری ملاقات تھی۔"

"برسبیل تذکرہ" ——— کہانی میں ایک کہانچہ:

"میرے مرحوم دوست شمس العلماء شبلی نعمانی نے خود برسبیل تذکرہ فرمایا کہ حیدر آباد میں عید کے دن میں داغ سے ملنے گیا، ادبیات پر گفتگو ہو رہی تھی کہ ملاقات کے کمرے میں یکایک ایک حسین سالہ نازنین آگئی جو کہ لباس اور زیور میں جنت الفردوس کی حور معلوم ہوتی تھی وہ اس طرح بے حجابانہ آئی کہ وہ پشت نے سے سرک گیا تھا جس کا مقیاس الشباب پر بھی اثر پڑ رہا تھا، اس پر اس درجہ بدحواسی چھا گئی کہ نقش دیوار بن کر رہ گئی نہ اس میں بیٹھنے کی جرأت تھی نہ واپس جا سکتی تھی، یکایک آ جانے سے مرزا صاحب بھی شرما گئے اور بولے: کم بخت! ذرا یہ بھی تو دیکھ لیا کرو کہ میرے پاس کوئی مولوی صاحب بیٹھے ہیں یہ سنتے ہی بجلی چمکی اور وہ پشت میں غائب ہوگئی قد آدم آئینہ سامنے تھا جس میں اس شوخ کا عکس پڑا اور داغ نے اس انفعال حالت پر ایک برجستہ شعر تصنیف کر دیا۔ افسوس ہے کہ میں وہ نادر شعر بھول گیا، مگر اس کا مضمون ابونواس کے اس شعر سے ملتا جلتا تھا۔

وقد سقط الرداء عن منکبیها ۔۔۔ من التخمیش والحل الازار

اس روایت سے ظاہر ہے کہ داغ کے کلام میں شوخی اور عشق و محبت کی رنگینیاں اسی قسم کے لوازم اور خارجی اسباب سے پیدا ہوئی تھیں۔ موصوف نے اپنے محبت کدے کو ایک پرستان بنا رکھا تھا قلعہ معلیٰ میں بچپن سے جوانی تک اسی ماحول میں پرورش پائی تھی، یہ بات دوسروں کو کہاں میسر ہو سکتی ہے وہ ایک مصور تھے جو ہر ادا کی تصویر بجلی کھینچ لیتے تھے" ایک داستان ہزاروں کتابوں سے اور ایک داستان مصنفوں سے! یہ تھے عبدالرزاق صاحب!۔ اور یہ تھی تیسری کہانی جو کہ حیدرآباد میں تھی میری ان کی ملاقات!۔

اصغر گونڈوی

صغیر احمد صدیقی

سنہ ۱۹۲۳ء کا ذکر ہے میں الٰہ آباد یونیورسٹی میں ایم۔ اے کا طالب علم تھا۔ میرا مضمون اردو ادب تھا۔ میں نے ایک مبسوط مضمون بعنوان "کلام چکبست پر ایک تنقیدی نظر" لکھا۔ احباب نے مشورہ دیا کہ یہ مضمون چھپ جائے۔ رائے ہوئی کہ الٰہ آباد ہی سے جو ایک مقتدر سرکاری رسالہ ہندوستانی نکلتا ہے، اسی میں چھپوایا جائے۔ اصغر مرحوم اس وقت اس رسالے کے مدیر تھے۔ میرے ایک دوست جو اصغر مرحوم سے واقف تھے مجھے ان کے پاس لے گئے۔ اس زمانے میں وہ شہر میں رہتے تھے ہم نے مکان پر پہنچ کر آواز دی اور بالاخانہ پر ان کی نشست گاہ میں بیٹھ کر انتظار کرنے لگے۔

تھوڑی دیر میں اصغر صاحب تشریف لائے۔ ادھیڑ عمر کے بزرگ صورت انسان۔ لانبا قد۔ قدرے کھلتا ہوا سانولا رنگ۔ پٹے سر پر، چہرے پر خوبصورت فرنچ کٹ داڑھی، آنکھوں میں ایک غیر معمولی چمک، لانبا کرتا اور چوڑی دار پاجامہ پہنے ہوئے روشن روشن، صاف صاف، نکھرے نکھرے، گردن اور شانوں میں ایک خفیف سا خم جو بقول رشید احمد صدیقی معلوم ہوتا تھا کہ نیکی اور شرافت کے بوجھ سے پیدا ہو گیا ہے۔ متانت اور وقار کے ساتھ چہرہ پر ایک تبسم نورانی پذیرائی لئے ہوئے۔ مختصر یہ کہ شخصیت میں وہ جذب اور کشش جو اجنبیت اور بیگانگی کے احساس کو مٹا دے۔

معمولی رسم تعارف کے بعد میں نے وہ مضمون ان کی طرف بڑھا کر درخواست کی کہ اپنے رسالے میں اس کو جگہ دیں۔ مضمون کو یہاں وہاں سے دیکھ کر بولے کہ یہ زبان اور طرزِ بیان آپ کے شعبۂ اردو کا نہیں معلوم ہوتا۔ میں نے عرض کیا "جی ہاں شعبے سے ابھی تک مستفید نہیں ہو سکا ہوں۔ جو کچھ آپ کے سامنے ہے اپنی کاوش کا نتیجہ ہے۔" کہنے لگے کہ "ہمارے یہاں تو بورڈ آف ایڈیٹرس ہے۔ وہ فیصلہ کرے گا کہ مضمون شائع کیا جائے یا نہیں۔ معاوضہ دیا جانا اب بند کر دیا گیا ہے۔ البتہ یہ تجویز ہے جو ابھی منظور نہیں ہوئی ہے کہ پھر معاوضہ دیا جائے۔ آپ چند روز بعد تشریف لائیے تو میں بتا سکوں گا کہ فیصلہ کیا ہوا۔"

میں چند روز بعد گیا تو انہوں نے کہا کہ مضمون اگر آپ چاہتے ہیں تو چھپ سکتا ہے مگر معاوضے کا مسئلہ ہنوز طے نہیں ہوا ہے۔ یہ کہہ کر انہوں نے مسکراتے ہوئے مضمون میری طرف بڑھایا۔ میں نے دیکھا تو معلوم ہوا کہ ایڈیٹوریل بورڈ کے ایک بزرگ نے جو مجھ سے بخوبی واقف تھے اور مجھ پر بڑی شفقت فرماتے تھے بعض حصوں کو حذف کرنے کے لئے نشانات لگا رکھے تھے۔ مجھے بہت ناگوار ہوا [illegible]

چہرے کو متغیر دیکھ کر مرحوم بولے "صغیر صاحب قوت نام ضبط کا ہے انتشار کا نہیں۔ یہ کیا ضروری ہے کہ آپ کا مضمون اسی رسالے میں چھپے۔ میں آپ کو مولوی عبدالحق صاحب کے نام خط دیتا ہوں۔ آپ اس کو رسالہ اردو کے لئے بھیج دیجئے۔ یہ رسالہ معاوضہ بھی دیتا ہے"۔ غرضیکہ وہ مضمون رسالہ اردو میں چھپ گیا اور اس کا معاوضہ بھی مجھے توقع سے زیادہ ملا۔ مگر اس مضمون سے زیادہ، وسیع اور اس معاوضہ سے کہیں گرانقدر وہ پہلا سبق تھا جو اصغر مرحوم سے مجھے ملا اور جسے میں ہمیشہ یاد رکھنے کی کوشش کرتا ہوں "قوت نام ضبط کا ہے انتشار کا نہیں"۔

مولانا اصغر حسین اصغر گونڈہ میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام مولوی تفضل حسین تھا جو قانون گو تھے۔ ابتدائی تعلیم کی تفصیل نہیں معلوم ہو سکی۔ اس کے باقاعدہ تعلیم حاصل نہ کر سکے۔ ویسے گورنمنٹ ہائی سکول گونڈہ میں داخل ہوئے تھے مگر آٹھویں جماعت کا امتحان نہ پاس کر سکے۔ ان کے ایک ہم جماعت جناب ڈاکٹر محمد حفیظ سید صاحب کا بیان ہے کہ امتحان میں ناکامیابی کے باوجود ان کی ذہانت و فطانت کے سب معترف تھے۔ اصغر مرحوم کو دل و دماغ کی جو صلاحیتیں فطرت نے ودیعت کی تھیں وہ درس و تدریس، آزمائش و امتحان کے رسوم و قیود کی کب متحمل ہو سکتی تھیں۔ چنانچہ باوجود اس کے کہ انہوں نے کوئی باقاعدہ تعلیم حاصل نہیں کی ان کے پاس اٹھنے بیٹھنے والوں کو کبھی بھی ان کی علمیت کی کمی کا احساس نہیں ہوا۔ ممکن ہے ان کا مطالعہ بہت وسیع نہ رہا ہو لیکن جتنا تھا عمیق تھا۔ وہ جو کچھ پڑھتے اس پر کافی غور کرتے اور نفس موضوع پر اپنی انفرادی رائے رکھتے تھے۔

اصغر صاحب کی ابتدائی زندگی باقاعدہ تعلیم و تربیت سے ناآشنا رہی۔ جوانی میں وہ بے راہ ہو گئے اور ملہیات میں بالکل ڈوب گئے۔ جو لوگ جانتے ہیں وہ بتاتے ہیں کہ انہوں نے کچھ نہیں چھوڑا۔ میں کہ ان کی زندگی کے آخری تین سالوں میں ان کو کافی قریب سے دیکھ چکا ہوں، آج بھی ان پر حیرت کرتا ہوں۔ وہ شگفتگی اور سنجیدگی کا بے مثل امتزاج، وہ فکر و عمل کی ہم آہنگی اپنے چاروں طرف طہارت و پاکیزگی کی ایک فضا لئے ہوئے ——— کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ یہ اپنے سینے سے واقعی اتنی "متاع داغ عصیاں" لگائے ہوئے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ جو گداز ان کے تقدس میں تھا اور جو درگذر اور رواداری ان کے مزاج میں تھی وہ شاید اسی سبب تھی کہ وہ خود لغزش کر کے سنبھل چکے تھے۔

قصہ مختصر ایک دن آیا جب اصغر نے محسوس کیا کہ جسمانی آسودگی روح کی تشنگی کو ناقابل برداشت حد تک تیز کر چکی ہے اور وہ سب کو چھوڑ چھاڑ بلا اطلاع شیخ کی تلاش میں روانہ ہو گئے۔ یہ سراغ میں تھے شیخ محمد عمر صاحبؒ کے جو قاضی عبدالغنی صاحبؒ کے پیر بھائی تھے اور تھانہ بھون میں رہتے تھے۔ مراد آباد پہنچ کر جو انہوں نے لوگوں سے پتہ پوچھا تو انہوں نے قاضی صاحب کی طرف اشارہ کیا کہ یہ شیخ محمد عمر کا صحیح پتہ بتا سکیں گے۔ قاضی صاحب اس وقت پلیٹ فارم کے ایک گوشہ میں نماز پڑھ رہے تھے۔ یہ ان سے پتہ پوچھ کر اپنی گاڑی کے ڈبہ میں آکر بیٹھ گئے۔ کوئی چیز خرید کر پیسے گن رہے تھے جو کچھ ہاتھ سے چھوٹ کر پلیٹ فارم پر گر پڑے ٹھیک اسی وقت قاضی صاحب ادھر سے گذرے انہوں نے نہایت بے تکلفی سے کہا کہ ذرا میرے پیسے اٹھا دیجئے۔ قاضی صاحب نے نہایت فراخ دلی سے یہ خدمت انجام دی۔ پیسے چن کر ان کے ہاتھ پر رکھے اور خود بھی اسی ڈبے میں بیٹھ گئے۔ گاڑی جب رڑکی پہنچی تو قاضی صاحبؒ اتر پڑے اور ساتھ ہی ساتھ اصغر صاحب بھی۔ قاضی صاحب نے کہا بھی کہ آپ کو تو آگے جانا ہے مگر اصغر صاحب نے جواب دیا کہ میں نے ارادہ بدل دیا ہے آپ کے ساتھ چلوں گا۔

میں سمجھتا تھا مجھ ان کی طلب ہے اصغر - کیا خبر تھی وہی لے لیں گے سراپا مجھ کو

قاضی صاحبؒ نے اسی وقت اپنے ایک مرید محمد علی صاحب تحصیلدار گونڈہ کو تار دیا کہ تفضل حسین صاحب کو مطلع کر دیں کہ ان کا لڑکا میرے پاس آگیا ہے۔

اصغر مرحوم نے قاضی عبدالغنی صاحبؒ کے ہاتھ پر بیعت کی اور ان کے مرید ہو گئے یہی واقعہ وہ نقطہ ہے جہاں سے اصغر کی زندگی مڑتی ہے قطعی طور پر اور ہمیشہ کے لئے۔

اب وہ زماں نہ وہ مکاں، اب وہ زمیں نہ آسماں!

تم نے جہاں بدل دیا آکے مری نگاہ میں!

ان قوتوں اور صلاحیتوں کا جو اصغر صاحب کو ممنوعات کی انتہائی پستیوں میں کھینچ لے گئی تھی کتنا مکمل اور شاندار ارتفاع ہوا اس کا اندازہ آج بھی "نشاطِ روح" اور "سرودِ زندگی" کے صفحات سے کیا جا سکتا ہے جن میں ایک شعر بھی ایسا نہیں جو تہذیب اور اخلاق کے پاکیزہ ترین معیار سے گرتا ہو۔ صرف "نظر" سے اتنے مکمل علاج کی کوئی اور نظیر کم از کم اردو ادب کی تاریخ میں نہیں مل سکتی۔ اصغر کی زندگی بدل گئی، ان کی شخصیت نے ایک نیا جامہ پہنا اور اپنی عمر کے آخری لمحہ تک وہ ہر حیثیت سے اور ہر معاملہ میں ایک صاحبِ ذوق و حال رہے۔

گزشتہ واپس ہوئے تو پھر ان کا دامن پکڑا گیا۔ وہ ترغیبیں اپنی پوری طاقت سے ان کو پھر اپنی طرف کھینچنے کے لئے تیار تھیں۔ کشاکش شروع ہوئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگ تائب ہو کر ان کی نئی زندگی کے شریک بن گئے۔

اصغر صاحب کو اپنے پیر سے والہانہ شیفتگی تھی اور اکثر حاضری دیا کرتے۔ قاضی صاحبؒ بھی ان کے ساتھ خصوصیت برتتے۔ ان کو بابو اصغر کہا کرتے تھے۔ ایک دن ان سے کہا کہ تہجد کے وقت تمہاری آواز نہیں سنائی دیتی۔ تم بھی اٹھ کر ذکر کیا کرو۔ چنانچہ دوسرے دن سے انہوں نے بھی اوروں کی طرح ذکر کرنا شروع کیا۔ مگر تھوڑی ہی دیر بعد آواز گلوگیر ہو گئی اور شدتِ گریہ سے مجبور ہو کر اٹھ آئے اور سو رہے۔ پھر جب کئی کوششوں کا یہی نتیجہ ہوا تو ذکر کرنا ترک کر دیا۔ ایک دن قاضی صاحبؒ نے پھر کہا کہ "بابو اصغر تمہاری آواز نہیں سنائی دیتی" تو جواب دیا "حضرت کیا کروں۔ مجھ پر رقت طاری ہو جاتی ہے اور میں ناکام رہ جاتا ہوں"۔ قاضی صاحبؒ نے کہا "اچھا تو تم ذکر نہ کیا کرو۔ میں مجبور ہوں فرض، واجب اور سنت کے ترک کی اجازت نہیں دے سکتا۔ لیکن ان کے علاوہ جملہ عبادات ترک کر سکنے کی اجازت دیتا ہوں"۔ یہی وجہ ہے کہ کبھی نے اصغر مرحوم کو کبھی اوراد و وظائف میں مستغرق نہیں پایا۔ وہ صوم و صلوٰۃ کے پابند ضرور تھے مگر اس میں کوئی غلو نہیں تھا اور نہ دوسروں سے اس معاملہ میں سخت گیری کرتے تھے۔ خود جتنی بھی عبادت کرتے ذوقِ محویت کی انتہائی گہرائیوں کے ساتھ۔

اپنی زندگی کے آخری زمانے میں جب فالج سے صاحبِ فراش تھے یہ آرزو تھی کہ منگلور جا کر قاضی صاحبؒ کے مزار پر حاضری دیں۔ طبیعت سنبھلی تو روانہ ہو گئے۔ مجھے ساتھ لے لیا۔ میری آزاد خیالی سے واقف تھے۔ راستے میں مسکرا کر بولے "چل تو رہے ہیں آپ مگر وہاں فضا صوم و صلوٰۃ کی ہے۔ آپ کیا کریں گے"؟ میں نے کہا "وہاں پہنچ کر پڑھنے لگوں گا"۔ کہنے کو تو میں کہہ گیا مگر کچھ متفکر سا ہو گیا۔ مسکرا کر بولے "کیا بات ہے"؟ میں نے دبی زبان سے پوچھا "فجر کی نماز وہاں کس وقت پڑھی جاتی ہے"؟ بہت ہنسے۔ کہنے لگے "فجر کے وقت"۔ میں نے عرض کی "ایک فجر کا وقت وہ سمجھا جاتا ہے جسے میں رات کا پچھلا پہر کہتا ہوں۔ جب تارے آسمان پر اپنی پوری تابانی سے جلوہ گر ہوتے ہیں۔ نیچے کافی اندھیرا ہوتا ہے۔ آنکھیں کھولئے تو مرچیں سی لگتی ہیں۔ پاؤں کہیں ڈالئے پڑتا کہیں ہے۔ دوسرا وقت وہ ہے جسے عوف عام میں صبح کہتے ہیں اور جو طلوعِ آفتاب سے کچھ قبل ہوتا ہے اور کچھ بعد تک بھی رہتا ہے"۔ ہنس کر بولے "آپ جماعت میں شامل ہوں طلوعِ آفتاب سے کچھ قبل ہی پڑھ لیں تو بہت بہتر"۔ بہر حال منگلور پہنچ کر ہوا یہ کہ اکتوبر کی خنک رات تھی۔ میں گہری نیند سو گیا اٹھا تو دن کافی چڑھ گیا تھا۔ مولانا سرہانے کھڑے ہنس رہے تھے۔ میں اپنا کمبل اوڑھے ہوئے تھا اور اس پر مولانا کا بھی کمبل پڑا ہوا تھا جو نماز کو جاتے ہوئے انہوں نے میرے اوپر ڈال دیا تھا۔ ادا داری یہاں تک تھی کہ خود میری صفائی میں کہا کرتے تھے کہ میں کوئی ناسمجھ [illegible] میں پڑھا سکتا۔ تربیت چھٹ چکنے کے بعد بھی [illegible] اپنے پیر کا انتہائی ادب و احترام کرتے تھے اور ان کا [illegible] ذکر بھی کرتے تھے۔ اپنے کلام میں بھی کہیں کہیں اصغر نے اشارے [illegible]

کیا ہے۔ بے تکلف احباب سے کبھی کبھی ان کے اوصاف کا ذکر کرتے تھے۔ مجھ سے ان کے جس وصف کا اکثر ذکر کرتے تھے وہ وہی تھا جسے کہتے ہیں "درویشی صفت باش و کلاہ تتری دار" قاضی صاحبؒ رئیسانہ شان سے رہتے تھے مگر اس کے باوجود مزاج فقیرانہ تھا۔ میرا خیال ہے کہ جو نفاست اصغر کی شخصیت میں تھی وہ بھی قاضی صاحبؒ کا طفیل تھا۔ بہت رکھ رکھاؤ سے رہتے تھے جس میں مزاجی خصوصیت زیادہ اور کوشش و التزام کا شائبہ کم پایا جاتا تھا۔ سر پر پٹے اور چہرہ پر فرنچ کٹ داڑھی موزوں و مناسب لباس پاکیزہ اور نفیس، کھانا بھی عمدہ کھاتے تھے اور عمدہ کھلاتے تھے اور بقول شوکت صاحب تکلف کرتے تھے مگر تکلف کی طرح نہیں۔ غرضکہ ان کے چاروں طرف سادگی، نفاست، پاکیزگی کی ایک فضا سی رہتی تھی جو ان کے جمالیاتی ذوق کی آئینہ دار تھی۔

اصغر مرحوم کے جذبات و خیالات میں توازن کے ساتھ، فکر و عمل میں بھی ربط تھا۔ وہ زندگی کو ایک مخصوص منفرد زاویہ نگاہ سے دیکھتے تھے اور فرسودہ قدروں سے ہمیشہ دامن بچاتے تھے۔ یہ چیزیں ان کی شاعری ہی میں نہیں ان کے ہر ردعمل میں ہوتی تھیں۔ زندگی کے ہر معاملے میں وہ ایک بلند کردار اور اونچی شخصیت کا ثبوت دیتے تھے۔ ریلوے انجینئرنگ کے دفتر میں ملازم تھے۔ ایک ٹھیکیدار نے نذرانہ دیا۔ ان کو لینے میں تکلف ہوا۔ احباب نے مشورہ دیا کہ لے لیجئے یہ رشوت نہیں بلکہ نذرانہ ہے۔ مگر ضرورت مند ہونے کے باوجود آپ کی طبیعت نے گوارا نہ کیا اور وہ روپیہ واپس کر دیا۔ نظم و نثر پر آپ کی یکساں قدرت دیکھ کر بعض اخبارات و رسائل آپ کی خدمات حاصل کرنا چاہتے تھے۔ مگر آپ اس خوف سے انکار کر دیا کرتے کہ اختیارات کلی نہ ہونے کے سبب ضمیر فروشی کرنی پڑے گی۔ انڈین پریس کے جس شعبہ میں ملازم تھے اس میں تخفیف کی جانے لگی تو چونکہ پریس کے مالک آپ کے کام سے خوش تھے آپ کی بجائے ان صاحب کو برطرف کرنا چاہتے تھے جو آپ سے پہلے سے ملازم تھے۔ آپ رضامند نہ ہوئے اور کہا کہ برطرف کیجئے تو پہلے مجھے کہ میں بعد میں اس شعبہ میں آیا ہوں۔ مجبوراً پریس کو دونوں ہی صاحبان کو رکھنا پڑا۔ رسالہ ہندوستانی کی ادارت کے امیدوار تھے۔ معاملہ صرف اس پر ٹھہرا تھا کہ آپ انگریزی بھی جانتے ہیں یا نہیں۔ انگریزی کی باقاعدہ تعلیم تو حاصل نہیں کی تھی۔ کیسے ہاں کہہ دیتے۔ انکار کر کے چلے آئے۔ بعد میں احباب نے اصرار کر کے سر تیج بہادر سپرو صدر انتخابیہ کمیٹی کے پاس سر شاہ محمد سلیمان مرحوم کا وہ خط بھیجا جس میں انہوں نے اپنی ایک انگریزی کتاب کا اردو میں ترجمہ کرنے پر اصغر مرحوم کو یوں داد دی تھی کہ "اگر میں بھی ترجمہ کرتا تو اس سے بہتر نہ ہو سکتا" ملازمت مل گئی مگر اس کو حاصل کرنے کے لئے مولانا کوئی ایسا دعا کیسے کر بیٹھتے جس کی اجازت ان کا ضمیر نہ دیتا ہو۔ معاملات زندگی میں تو انتہائی طفلانہ سادگی کا ثبوت دیتے تھے۔ سرود زندگی کی ایک ہزار جلدیں خود چھپائی تھیں۔ معاملہ کے تجارتی پہلو سے نا آشنائے محض ہونے کے سبب آٹھ سو جلدیں بیکار پڑی ہوتی تھیں۔ ایک مشہور فرم کے ایجنٹ کے حوالے کیں اور اس کو دوبارہ چھاپنے کی اجازت بھی دی یہ کہتے ہوئے کہ آپ جو مناسب سمجھیں کریں میں ان معاملات میں کوئی دخل نہیں رکھتا۔ اس سادگی کا جو نتیجہ ہوا ہوگا ظاہر ہے۔

اصغر کی شخصیت کے جو خدوخال اوپر نمایاں کئے گئے ہیں وہی بلا کم و کاست ان کے کلام میں بھی ملتے ہیں۔ زبان اور اسلوب میں ان کے مزاج کی نفاست اور پاکیزگی، موضوع اور مواد میں وہی مخصوص اور منفرد طرز نظر، وہی عام قدروں سے بچ نکلنے کی کوشش۔ اصغر کم گو تھے۔ غزل گو شعراء میں شاید ان کی واحد مثال ہے کہ جو سوچتے تھے اور محسوس کرتے تھے وہی اور اتنا ہی کہتے تھے۔ محض قافیہ و ردیف کے مطالبوں سے مجبور ہو کر یا مشق و مزاولت کے زعم میں وہ کبھی کچھ نہ کہتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام سے ان کا فلسفۂ زندگی بآسانی اخذ کیا جا سکتا ہے۔ جب کچھ نہ کہتے تو صرف اپنے کو برتتے رہتے۔

ان کے کلام کے مخصوص موضوع اور مضامین کی بنیادی ہم رنگی پر ایک صاحب نے کہا کہ مولانا آپ کے یہاں تنوع نہیں بلکہ ایک ہی قسم کی چیز ملتی ہے۔ جواب ملا "اس میں برائی کیا ہے جب تک وہ چیز معیار کے مطابق ملتی ہے۔ میری دکان ایک ہی نوع کا سامان

جو پہنچاتی ہے اور جب تک وہ سامان معیاری ہے دوکان کی ساکھ بڑھتی چاہیے۔ مثال البتہ میں مضامین کا کباڑی نہیں ہوں جس کی دوکان پر بھانت بھانت کی اچھی بری بکثرت قسم کی اشیاء ملتی ہیں۔

شاعری پیشہ کے طور پر نہ کرتے تھے اور نہ شاعر کی حیثیت سے اپنے کو پیش کرنا پسند کرتے تھے۔ مشاعروں میں شرکت کرنے سے گریز کرتے تھے۔ اور اگر کبھی شرکت کرتے بھی تھے تو معاوضہ لینا اپنی شاعرانہ وقعت و شان کے منافی سمجھتے تھے۔ دوسروں کو شاعری کی ترغیب دینے کے بجائے طرح طرح سے روکتے تھے۔ مشاعروں سے ان کی گریز پائی کا ایک ذاتی تجربہ مجھ کو بھی ہے۔ ۱۹۳۳ء کا مسلم ہوسٹل کا سالانہ مشاعرہ تھا۔ مولانا کو میں نے طرح بہم پہنچائی اور انہوں نے غزل بھی کہی۔ احباب کو یقین تھا کہ میری وساطت سے اصغر صاحب کی مشاعرہ میں شرکت ضرور حاصل ہو جائے گی۔ مگر جب وقت آیا۔ اور میں نے کہا کہ چلئے تو اصغر صاحب نے صاف انکار کر دیا اور ایسے سنجیدہ انداز سے جس میں شاعرانہ تکلف کا شائبہ بھی نہ تھا۔ میں اس انکار پہ بہت متحیر ہوا۔ پھر میں نے کہا کہ غزل آپ نے کیوں کہی تو بولے کہ بھئی یہ تصور غزل کا ہے مبرا نہیں۔ غزل لیتے جاؤ اسے کسی سے پڑھوا دینا۔ میں نے واپس آکر احباب کو جو خبر دی کہ اصغر صاحب نہیں آ رہے ہیں تو لوگوں کو بڑی مایوسی ہوئی اور مجھے طعنے دیئے گئے کہ بس رہ گئی صبح و شام کی حاضری اپنا سا منہ لے کے چلے آئے۔ میں واپس ہوا اور مولانا کی نشست گاہ میں پہنچ کر شیروانی کھونٹی پر ٹانگی اور کچھ اس انداز سے بیٹھا کہ مولانا کو پوچھنا پڑا کہ کیا ارادہ ہے میں نے نہایت سنجیدگی سے جواب دیا کہ دو تین دن بعد جب اس مشاعرہ کی یاد اور وہ سبکی جو اس سلسلے میں میری ہو رہی ہے لوگوں کو فراموش ہو جائے گی تب میں ہوسٹل میں واپس ہونگا۔ جب تک خدمت میں حاضر رہونگا۔ اصغر مرحوم بادل نخواستہ تیار ہو گئے۔ محفل میں آکر ڈائس کے پیچھے ایک بنچ پر بے پروائی سے بیٹھ گئے۔ جب ان کی باری آئی غزل جناب حفیظ جالندھری کو پکڑا دی۔ انہوں نے ڈائس پر کھڑے ہو کر مطلع پڑھا۔

وہ نغمہ بلبل رنگیں نوا اک بار ہو جائے
کلی کی آنکھ کھل جائے چمن بیدار ہو جائے

اک شور تحسین و آفرین محفل سے جو بلند ہوا تو حفیظ صاحب نے اس داد کو جو انہیں مخاطب کرکے دی جا رہی تھی دونوں ہاتھوں سے سمیٹ کر اصغر صاحب کی طرف پھینکنا شروع کیا۔ پھر کیا تھا لوگوں کا اصرار بڑھا اور صدر مشاعرہ سر تیج بہادر سپرو نے بھی درخواست کی کہ اصغر صاحب ڈائس پر تشریف لائیں۔ کشاں کشاں لائے گئے۔ بہت خاموشی اور وقار سے چہرے پر ایک خفیف سا تبسم لئے بیٹھے رہے۔ وہ شاعرانہ ادائیں کہ یہ شعر ملاحظہ کیجئے گا "ذرا غور کیجئے گا یہ شعر شاید کسی قابل ہو" ان میں کہاں۔ مرصع غزل تھی۔ ہر شعر پہ محفل جھوم جاتی تھی۔ یہ کبھی کبھی تسلیم کر لیتے مگر داد طلب انداز سے نہیں۔

اصغر مرحوم وسیع المشرب اور کثیر الاحباب تھے۔ ان کی صحبت میں ہندو بھی شریک ہوتے اور مسلمان بھی۔ آزاد خیال حضرات بھی اور بہت ہی متورع و متقشف قسم کے بزرگ بھی۔ سب کو ان کی ہم نوائی پہ ناز تھا۔ اپنے احباب سے بہت خلوص و محبت سے پیش آتے تھے۔ صحبتیں بہت دلچسپ اور مفید ہوتی تھیں۔ موضوعات گفتگو سنجیدہ اور وقیع ہوتے۔ مذہب و فلسفہ، شعر و ادب سبھی پر خیال آرائی ہوتی۔ اصغر مرحوم خوش مذاق کو کبھی ہاتھ سے نہ جانے دیتے۔ طبیعت بذلہ سنج پائی تھی اور گفتگو کا انداز بہت دل نشین تھا۔ خود ہنستے اور دوسروں کو بھی ہنساتے۔ ان کی صحبتوں کی فضا بہت شگفتہ و پرسکون ہوتی اور کوئی بے کیف نہ ہونے پاتا۔

ان کے احباب نے ان کو کبھی مایوس، پریشان، ملول یا افسردہ نہیں پایا۔ یہ بھی ناصح صاحبؒ کا فیض روحانی تھا کہ اصغر صاحب ہر حال میں آسودہ مطمئن اور شگفتہ رہتے تھے۔ یہی نہیں انکی طمانیت آسودگی اور سکون ان کے ہم نشینوں میں بھی منتقل ہو جاتا آپ کسی الجھن یا پریشانی میں ہو کے اگر اصغر صاحب کے پاس تھوڑی دیر بیٹھ کر چلے آئے تو دل و دماغ کی فضا بدل گئی حیرت تو اس پر ہے کہ باوجود اس کے کہ وہ خوش

حالت۔ تنگدستی نے ان کو تنگدست نہ پایا۔ صاف معلوم ہوتا تھا کہ مسرت و طمانیت داخلی کیفیات ہیں جن کو ایک صاحب دل بڑی حد تک خارجی حالات سے بے نیاز بنا رکھتا ہے۔

آخری زمانے میں پنڈت شری نرائن مصرا جو اس وقت شعبۂ انگریزی الہ آباد یونیورسٹی میں لکچرار تھے اور اب ساگر یونیورسٹی میں انگریزی کے پروفیسر ہیں ان کے بہت قریب آ گئے تھے۔ میں پنڈت جی موصوف کا شاگرد تھا اور اصغر صاحب کی خدمت میں بھی حاضر ہوتا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ دونوں ایک جان دو قالب ہیں۔ پنڈت جی ادب اور فلسفہ کے عالم متبحر ہیں اور شعر و سخن کا بہت سنجیدہ اور بلند مذاق رکھتے ہیں میرا خیال ہے کہ اصغر صاحب کے نظریہ شعر و ادب پر پنڈت جی کے خیالات کا بھی اثر پڑا ہے۔

اصغر مرحوم جب فالج کے مرض میں مبتلا ہوئے تو ان کی دیکھ بھال اور تیمارداری کی غرض سے پنڈت جی ان کو شہر کے مکان سے منتقل کرا کے اپنے قریب یونیورسٹی کے پڑوس میں لائے۔ بلویڈیر پریس کے احاطے میں ایک چھوٹی سی کوٹھی لے لی گئی۔ ۲۹ نومبر ۱۹۳۶ء کی شب میں جب فالج کا آخری دورہ پڑا پنڈت جی بلائے گئے۔ انہوں نے اصغر صاحب کو بیہوش پایا۔ پکارا تو آنکھ کھولی، مسکرائے اور پھر ہمیشہ کے لئے بند کر لی۔ صبح کو مجھے جب انتقال کی خبر ملی تو میں نے جا کر دیکھا۔ اس آخری تبسم کی جھلک چہرے پہ باقی تھی۔ معاً ان کا یہ شعر یاد آیا۔

کائناتِ دہر کیا روح الامیں بیہوش تھے
زندگی جب مسکرائی ہے قضا کے سامنے

اپنی وصیت کے مطابق مزار شاہ محب اللہ الہ آبادی کے پائنتی مدفون ہوئے۔

منشی محمد الدین فوق

محمد عبداللہ قریشی

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد دلی کے آسمانِ ادب کے چند ٹوٹتے ہوئے ستارے گردشِ روزگار کے ہاتھوں لاہور پہنچے ان میں مولانا الطاف حسین حالی۔ مولانا محمد حسین آزاد۔ مولانا فیض الحسن سہارنپوری اور مرزا ارشد گورگانی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ان بزرگوں نے دلی مرحوم کی یادیں یہاں بھی شعر و سخن کی محفلیں جمائیں اور اس طرح سرزمین پنجاب کے لوگ ان ادبی روایات اور تہذیبی و ثقافتی قدروں سے پہلی مرتبہ واقف ہوئے جو اس سے پیشتر دلی سے نکل کر اودھ۔ مرشد آباد۔ عظیم آباد (پٹنہ) اور حیدرآباد (دکن) میں اپنا گھر بنا چکی تھیں۔ یوں سمجھنا چاہئے کہ پنجاب میں پہلی نسل کے لوگوں نے تو حالی۔ آزاد۔ فیض اور ارشد وغیرہ کو اردو بولتے ہوئے سنا اور دوسری پشت میں ہمارے ہاں جو لوگ پیدا ہوئے ان میں سر عبدالقادر۔ علامہ اقبال۔ خان احمد حسین خان۔ مولوی ظفر علی خاں۔ چوہدری خوشی محمد ناظر۔ میر غلام بھیک نیرنگ۔ میاں شاہ دین ہمایوں۔ مولوی محبوب عالم۔ مولوی انشاء اللہ خاں۔ مولوی محرم علی چشتی۔ پنڈت شیو نرائن شمیم اور منشی محمد الدین فوق وغیرہ کا نام سرفہرست ہے۔ یہ بزرگ اس وقت بھی کمالِ فن کے اعتبار سے خداوندانِ سخن تھے۔ اور آج بھی اس میدان میں ان کا کوئی مدمقابل نظر نہیں آتا۔ مولانا ظفر الملک علوی مدیر الناظر لکھنؤ جو مئی یا جون ۱۹۳۵ء میں لاہور آئے پنجاب میں اردو کی حالت پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"اب سے پچیس تیس سال قبل منشی محمد الدین فوق اور میر غلام بھیک نیرنگ کے سوا شاید کوئی تیسرا پنجابی شاعر ایسا نہ تھا جس کا کلام زبان کی معمولی غلطیوں سے پاک اور جس کی انشا صحیح اردو میں شمار ہونے کے لائق ہو۔ مولوی ظفر علی خاں صاحب اس وقت اہلِ پنجاب میں شمار نہیں کئے جا سکتے تھے۔ مگر نئی نسل نے بہت سے ایسے اہلِ قلم پیدا کر دئے ہیں جن کی نظم و نثر اہلِ زبان کے معیار پر اگر نہیں تو زبان دانوں کے معیار پر ضرور پوری اترتی ہے اور آثار ظاہر بتاتے ہیں کہ ایسے اصحاب کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہوتا ہے۔"

(نیرنگ خیال لاہور بابت اگست ۱۹۳۵ء)

منشی محمد الدین فوق فروری ۱۸۷۷ء میں موضع کوٹلی ہرنارائن (ضلع سیالکوٹ) میں پیدا ہوئے اور [illegible]

پاگئے۔ انہوں نے ایک صحافی۔ ایک ادیب۔ ایک مورخ اور ایک شاعر کی حیثیت سے اُردو زبان کی قابلِ قدر خدمات انجام دیں۔ وہ اپنے پیچھے اپنے اتنے کارنامے چھوڑ گئے ہیں کہ دنیا انہیں مدتوں نہیں بھلا سکتی۔ ان کی تصانیف کے انمٹ نقوش کو اگر نکھارنے اور اجاگر کرنے کا موقع ملتا رہا تو وہ ہمارے ادب کا نہایت قیمتی سرمایہ ثابت ہوں گے اور منشی صاحب کے نام کو ہمیشہ زندہ رکھیں گے۔

منشی صاحب سے میرا خون کا کوئی رشتہ نہ تھا۔ محض دوستی تھی جس میں خود غرضی کا کوئی شائبہ نہ تھا۔ ان سے میری پہلی ملاقات کو بھی ایک اتفاق ہی سمجھنا چاہیئے۔ علامہ تاجور نجیب آبادی نے میسرز عطر چند کپور اینڈ سنز کے سرمایہ کی مدد سے اُردو مرکز کی بنیاد رکھ کر ہندوستان کی مقتدر ادبی شخصیتوں اصغر گونڈوی، یاس عظیم آبادی۔ جگر مراد آبادی اور سیماب اکبر آبادی وغیرہ کو لاہور بلایا۔ اپریل ۱۹۳۶ء میں علامہ سیماب کے نامور شاگرد ساغر نظامی نے مجھے یہ مژدہ سنایا کہ دفتر پیمانہ آگرہ سے مستقلاً لاہور منتقل کر دیا گیا ہے۔ چونکہ علامہ سیماب اور ساغر نظامی سے میرے نیازمندانہ تعلقات تھے۔ اس لئے ان کے لاہور آنے کی خبر میرے لئے مسرت انگیز تھی۔ ایک دن میں ان سے ملنے کے لئے گیا۔ وہ یکی دروازہ کے اندر ایک مکان میں اقامت گزین تھے یہ مکان اس حویلی کے بالکل قریب تھا جہاں سے کسی زمانے میں منشی ہرسکھ رائے پنجاب کا سب سے پہلا ہفتہ وار کوہ نور شائع کیا کرتے تھے۔ وہاں سیماب۔ ساغر اور منظر صدیقی کے علاوہ ایک اور بزرگ تشریف فرما تھے۔ دوہرا جسم۔ میانہ قد۔ کھلتا ہوا رنگ۔ بھرا ہوا صحت مند اور باوقار چہرہ۔ موزوں ترشی ہوئی داڑھی جس کے کالے بال کچھ کچھ بھیگ رہے تھے۔ سادہ لباس۔ سر پر ترکی ٹوپی۔ یہ ایسی شخصیت تھی جس نے مجھے غیر ارادی طور پر اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ تعارف کا مرحلہ آیا تو علامہ سیماب نے ان الفاظ میں ان کی جان پہچان کرائی "کیا آپ انہیں نہیں جانتے؟ یہ آپ کے لاہور کے مشہور اخبار نویس اور مورخ منشی محمد الدین فوق ہیں۔"

یہ میری اور منشی صاحب کی پہلی ملاقات تھی۔

اس کے بعد میں نے علامہ سیماب۔ ساغر نظامی اور منظر صدیقی کے اعزاز میں دعوت کی۔ جس میں چوہدری خوشی محمد ناظر۔ پروفیسر تاثیر۔ پروفیسر محمد علم الدین سالک۔ حکیم یوسف حسن اور دیگر دوستوں کے علاوہ منشی محمد الدین فوق بھی شریک تھے۔ اس محفل میں مختلف موضوعات پر جی بھر کر باتیں ہوئیں۔ سب نے اپنا اپنا کلام سنایا۔ اور پہلی ملاقات میں منشی محمد الدین فوق کے متعلق میرے دل میں جو تاثر پیدا ہوا تھا وہ اور گہرا ہو گیا۔ اور یہی تعلق خاطر مجھے آہستہ آہستہ ان کے قریب لے گیا۔

منشی صاحب شیرانوالہ دروازہ کے باہر رہتے تھے۔ جب تک اخبار کشمیری جاری رہا نیچے دفتر میں بیٹھتے تھے۔ اس کے بعد مکان کی پہلی منزل میں اپنی نشست کے لئے ایک کمرہ مخصوص کر لیا تھا۔ جس کی بڑی بڑی الماریوں میں ہر قسم کی کتابیں بھری رہتی تھیں۔ ان میں ان کی ذاتی مطبوعات بھی تھیں اور دوسری کتابیں بھی۔ منشی صاحب کو کتابیں جمع کرنے کا اتنا شوق تھا کہ لاہور کے تمام اخبار نویسوں میں مولوی محبوب عالم مدیر پیسہ اخبار اور مولانا ظفر علی خاں مدیر زمیندار کے بعد آپ ہی کی ذاتی لائبریری قابلِ ذکر تھی۔ جس میں ہر سال مفید کتابوں کا اضافہ ہوتا رہتا تھا۔

میرا معمول تھا کہ ہفتہ میں ایک بار ضرور ان کی خدمت میں حاضر ہوتا۔ پریشان و ملول جاتا تو ان کی صحبت سے ہشاش بشاش اٹھتا۔ جی گھبراتا تو وہاں جاتا اور ان کی پُرلطف باتوں سے غم غلط ہو جاتا۔ خالی الذہن جاتا تو معلومات کے ایسے نادر و لطیف نکتوں سے بہرہ مند واپس آتا جو شاید مشکل سے مطالعہ یا مشاہدہ سے حاصل نہ ہو سکتے۔ خوش ہوتا تو وہاں ضرور جاتا اور جب کبھی اور نہ جانا ہوتا تو وہاں جاتا۔ جب واپس آنے کی اجازت چاہتا تو اٹھنے نہ دیتے۔ چائے۔ لسی۔ شربت۔ غرض جو کچھ ہوتا اس سے تواضع کرتے اور اگر کسی وجہ سے میرے جانے میں ناغہ ہو جاتا تو دوسرے دن خود میرے ہاں تشریف لاتے اور نہ آنے کا سبب دریافت کرتے۔ ان کے اس معمول میں مرتے دم تک فرق نہ آیا۔

فوق صاحب کے پاس اٹھنے بیٹھنے سے کشمیر کی محبت میری رگ رگ میں سما گئی اور میں دن رات کشمیر کے خواب دیکھنے لگا۔ میں ہر سال کشمیر جاتا۔ پروفیسر محمد علم الدین سالک اکثر میرے ساتھ ہوتے۔ کبھی وہ نہ جاتے اور میں اکیلا ہوتا تو فوق صاحب مجھے ہوٹل کا کھانا نہ کھانے دیتے۔

گھر میں جو کچھ پکتا وہ باصرار کھلاتے۔ کسی عزیز یا دوست کے ہاں دعوت ہوتی تو گھر کے فرد کی طرح پیچھے شریک ہوتے۔ گاؤں جاتے تو اپنے ہمراہ لے کر جاتے۔ انڈا۔ مرغی۔ سیب۔ ناشپاتی۔ گنڈیریاں۔ انار۔ بادام۔ اخروٹ وغیرہ جی بھر کھلاتے۔ پھلوں کے لئے تو ان کے چچا منشی غلام محمد خادم کا وسیع باغ موجود تھا۔ انڈے مرغی کا انتظام وہ یوں کرتے کہ لاہور سے اپنی روانگی کے تین ماہ قبل کسی عزیز کو لکھ دیتے کہ میرے نام کی ایک دو مرغیاں خرید کر انڈوں پر بٹھائیں اور بچے نکلوائیں۔ اس طرح جب وہ وہاں پہنچتے تو دس بیس مرغیاں تیار ملتیں اور گوشت کی حاجت نہ رہتی۔ یہ ان کی دور اندیشی اور کفایت شعاری کی ایک ادنیٰ مثال تھی۔

فوق صاحب اپنے گھر میں نہایت سادہ زندگی بسر کرتے تھے۔ ان کے رہن سہن کے طریقوں میں کوئی خصوصیت نہ تھی۔ اس کے باوجود ان کی زندگی باقاعدہ اور باوقار نظر آتی تھی۔ عام طور پر علی الصبح بیدار ہو جاتے تھے صبح کی سیر کو جانا ان کی پختہ عادت تھی جسے انہوں نے مجبوری کے سوا کبھی ترک نہ کیا۔

لکھنے پڑھنے کے سلسلے میں بھی وہ کوئی خاص اہتمام نہ برتتے تھے۔ کبھی میز کرسی پر بیٹھ کر۔ کبھی چھوٹی سی پلنگڑی پر نیم دراز ہو کر اور کبھی تخت پوش یا زمین پر دری بچھا کر تصنیف و تالیف کا شغل جاری رکھتے تھے۔ البتہ ایک عادت قابل ذکر ہے کہ جب وہ کوئی کتاب یا رسالہ پڑھتے تو یونہی سرسری طور پر پڑھ کر ایک طرف نہ رکھ دیتے بلکہ اس میں سے قابل استعمال مواد پر نشان کرتے جاتے تھے۔ کس موضوع پر کونسی چیز کہاں استعمال ہو سکتی ہے؟ اس بارے میں ان کی نظر بہت گہری تھی۔ انہوں نے الگ الگ لفافے بنا رکھے تھے جن میں الگ الگ مضامین کے تراشے جمع کرتے رہتے تھے پھر جب کوئی کتاب لکھتے تو ان تراشوں اور یادداشتوں کی وجہ سے حوالے تلاش کرنے میں انہیں کوئی دشواری نہ ہوتی مہینوں کا کام دنوں ہی میں ختم ہو جاتا۔

گھر والوں سے ان کا سلوک بہت مشفقانہ تھا۔ انہوں نے تین شادیاں کیں۔ پہلی دونوں بیویاں صاحب اولاد تھیں۔ تیسری سے کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ یہ ایک ایسا معاملہ تھا جسے گھریلو جھگڑوں کے لئے معقول وجہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ فوق صاحب کی زندگی میں یہ جھگڑے نہایت زور شور سے سر اٹھاتے تھے۔ لیکن ان کا ذہنی توازن ایسے حالات میں برقرار رہتا تھا اور وہ ہر ایک کے ساتھ منصفانہ برتاؤ کرتے تھے۔

فوق صاحب ہنگامہ خیزیوں سے الگ اپنے گوشۂ عافیت میں رہ کر خاموش کام کرنے کے علاوہ خلوص و محبت۔ استقلال و ہمت ظرافت و شوخی اور جذبۂ ایثار و ذوق خدمت کی دولت سے مالا مال تھے ؎

بہت لگتا تھا جی صحبت میں ان کی   وہ اپنی ذات میں اک انجمن تھے

ان کی بذلہ سنجی۔ حاضر جوابی۔ خوش اخلاقی۔ خوش مذاقی اور خوش مزاجی کی وجہ سے ان کے پاس بیٹھنے اٹھنے میں خاص لطف حاصل ہوتا تھا۔

یہ باتیں کچھ میرے ساتھ ہی خاص نہیں تھیں۔ ان کے تمام دوست اور ملنے والے ان کی شگفتہ مزاجی سے متمتع ہوتے تھے۔ وہ بچپن ہی سے ہنس مکھ تھے ایسی بات بناتے اور اس قسم کے برجستہ فقرے چست کرتے تھے کہ بس مزا آ جاتا تھا۔ خود سنایا کرتے تھے کہ جب وہ گھرتل کا پرائمری سکول پاس کرنے کے بعد انگریزی تعلیم حاصل کرنے کے لئے قصبہ جاکے کے مڈل سکول میں داخل ہوئے تو بورڈنگ ہاؤس میں رہتے تھے۔ بورڈروں کی زندگی عام طور پر شرارتوں سے بھری ہوتی ہے۔ دن رات دل لگی تفریح اور ہنسی مذاق کے سینکڑوں پہلو نکلتے رہتے ہیں۔ لڑکے عجیب عجیب حرکتیں کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ استادوں سے دو دو ہاتھ کرنے سے بھی نہیں چوکتے۔

ایک رات بورڈنگ ہاؤس میں رہنے والے لڑکوں کو شرارت جو سوجھی تو انہوں نے ایک تماشا کیا۔ کوئی استاد بنا کوئی شاگرد۔ ایک لڑکے نے سبق سنانا شروع کیا اور غلط پڑھا۔ ماسٹر نے ٹوکا اس نے پھر غلط پڑھا۔ استاد نے مرغا بنا کر کھڑا کر دیا۔ اس کے بعد ایک طالب علم نے دوسرے طالب علم کو چھیڑا۔ اس نے ماسٹر سے شکایت کی۔ ماسٹر نے ایک کو جرمانہ کیا اور دوسرے کو [illegible]

ایک لڑکے نے بتایا کہ گھروں میں جا کر کس طرح جھوٹے بہانے بنائے جاتے ہیں۔ جیب خرچ کے لئے کس طرح پیسے طلب کئے جاتے ہیں۔ کسی نے سیدھے سادے درویش صفت ہیڈ ماسٹر بابو گنڈا مل کی نقل اتار کر میز پر ٹانگیں پھیلائیں۔ کسی نے بورڈنگ کا نگران بن کر بورڈنگ کا معائنہ کیا اور لنگر کی روٹیاں دیکھیں۔ غرض کسی نے کوئی حرکت کی اور کسی نے کوئی۔ سب اپنے اپنے جوہر دکھاتے۔ ہنستے اور شور مچاتے رہے اور یہ بھول گئے کہ ان کا کوئی نگران بھی ہے۔ ابھی یہ کھیل تماشہ ہو ہی رہا تھا کہ کسی نے چغلی کھا کر بورڈنگ کے سپرنٹنڈنٹ حافظ اللہ بخش کو اطلاع دی۔ وہ فارسی کے استاد مولوی غلام محی الدین کو ہمراہ لے کر وہاں آگئے۔ اب جس طرح ہوا کے آتے ہی مچھر غائب ہو جاتے ہیں اسی طرح استادوں کی شکلیں دیکھتے ہی لڑکے تتر بتر ہو گئے۔

ذوقؔ صاحب سکول کی چھت پر جا بیٹھے جو لڑکے قابو آ گئے ان کو پٹتے ہوئے دیکھتے رہے اور بغیر پٹے ہی کانپتے رہے۔ صبح ان کی بھی حاضری ہوئی۔ مولوی غلام محی الدین چھڑی لے کر اُٹھے۔ ذوقؔ صاحب نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ گو رات کو مار نہیں پڑی۔ لیکن خدا کی قسم مار پٹنے والوں سے زیادہ نادم ہوں اور ان سے زیادہ درد محسوس کر کے روتا رہا ہوں۔ مولوی صاحب نے پھر پوچھا۔ جب مار نہیں پڑی تو رونا کس طرح آیا؟ کہا۔ آپ ہی نے تو گلستاں میں پڑھایا ہے ؎

بنی آدم اعضائے یک دیگر اند	کہ در آفرینش ز یک جوہر اند
چو عضوے بدرد آورد روزگار	دگر عضوہا را نماند قرار

مولوی صاحب اس جواب سے ہنس پڑے اور آپ کو سزا سے نجات مل گئی۔ سچ کہا مولانا حالیؔ نے ؎

بڑھاپے کی دانائی لے کر کوئی	بدل دے وہ بچپن کی نادانیاں

سنہ ۱۸۹۷ء کا ذکر ہے ذوقؔ صاحب پیسہ اخبار کے دفتر میں ملازم تھے۔ تنخواہ اس وقت نو روپیہ ماہوار تھی۔ بعد میں تو انہوں نے اس سے کئی گنا زیادہ مشاہرے پر خود ملازم رکھے اور لاہور اور کشمیر میں بہت سی جائداد بھی پیدا کر لی۔ بہر حال جیسا کہ عام پرائیویٹ فرموں کا دستور ہے آٹھویں دسویں دن ہر ملازم کو روپیہ دو روپے بطور خرچ ملا کرتے تھے جو مہینہ کے آخر میں تنخواہوں سے وضع ہو جاتے تھے۔ ایک دفعہ اکونٹنٹ نے تمام ملازمین کے خرچ کی فہرست بنائی۔ اس میں ذوقؔ صاحب نے پانچ روپے اپنے نام لکھوائے حالانکہ جانتے تھے کہ زیادہ سے زیادہ دو روپے ملیں گے۔ اکونٹنٹ نے اعتراض کیا۔ ذوقؔ صاحب نے کہا۔ آپ لکھ دیجئے۔ مینجر صاحب منظور نہ کریں گے تو نہ سہی۔ مولوی محبوب عالم کے چھوٹے بھائی عبد العزیز مینجر تھے۔ ان کے پاس فہرست پیش ہوئی۔ وہ ذوقؔ صاحب کے نام پانچ روپے دیکھ کر چونک اُٹھے۔ انہیں بلایا اور کہا۔ آپ اس سے پہلے تین روپے لے چکے ہیں۔ اب یک مشت پانچ کس طرح مل سکتے ہیں۔ کیا کسی اور نے بھی پانچ روپے لکھوائے ہیں؟ اس وقت ایک روپیہ سے زیادہ نہیں ملے گا۔ ذوقؔ صاحب نے کہا۔ ایک روپیہ کیا۔ میں تو آٹھ آنے قبول کرنے کو بھی تیار ہوں۔ لیکن خواہش صرف یہ ہے کہ ایک مرتبہ زندگی میں پانچ روپے اکھٹے دیکھ لوں۔ منشی عبد العزیز صاحب ہنس پڑے اور ایک کی بجائے دو روپے دے دیئے۔ اس واقعہ سے بھی یہ پتہ چل سکتا ہے کہ ابتدا میں ذوقؔ صاحب کی مالی حالت کیا تھی اور کس چھوٹے درجے سے انہوں نے ترقی کی۔

لالہ دینا ناتھ حافظ آبادی جو ہندو اخبار نویسوں میں بڑے کامیاب اخبار نویس اور جرنلسٹ تھے۔ پیسہ اخبار کے دفتر میں ذوقؔ صاحب کے ساتھ کام کرتے تھے۔ انہوں نے سنہ ۱۹[illegible]ء میں اخبار ہندوستان جاری کیا جس سے ان کی بہت شہرت ہوئی۔ اس کے بعد انہوں نے ہمالہ اور ویش وغیرہ اخبار بھی نکالے۔ ایک روز ذوقؔ صاحب ان سے ملنے گئے۔ وہ ایک گول میز کے گرد چھ سات آدمیوں کے ساتھ بیٹھے خوش گپیاں کر رہے تھے۔ ان میں دو وکیل بھی تھے۔ گرمیوں کے دن تھے۔ ذوقؔ صاحب نے مزاج پرسی کے بعد پانی طلب کیا۔ لالہ دینا ناتھ نے کہا۔ پانی تو ہے مگر گھڑے کا جوٹھا ہے۔ ذوقؔ صاحب نے کہا۔ کوئی پروا نہیں۔ تمہارا جوٹھا تو نہیں۔ لالہ دینا ناتھ نے جب آپ

کو اس قسم کا جواب دیا تھا تو سب اہل مجلس حیران تھے کہ پانی کی طلب پھر اس کے مذاق کی کیا تک تھی۔ لیکن جب فوق صاحب نے جملے پر دوبارہ توجہ دلائی تو کھلکھلا کر ہنس پڑے اور سمجھ گئے کہ ان دونوں میں بے تکلفی کی وجہ سے باہم مذاق ہے اور دینا ناتھ بھی جو بڑے حاضر جواب تھے اس جواب پر نادم ہوئے اور انہوں نے فوق صاحب کے برجستہ اور لطیف فقرے کی داد دی۔

فوق صاحب سیر و سیاحت کے بڑے شوقین تھے۔ ان کی زندگی کا بہت بڑا حصہ سفر میں گزرا۔ کشمیر تو ان کا وطن ہی تھا۔ وہاں وہ ہر سال نہایت باقاعدگی سے جاتے۔ کئی کئی مہینے وہاں رہتے۔ گوشے گوشے میں گھومتے۔ قابل دید مقامات کی سیر کرتے۔ لوگوں کے حالات دریافت کرتے اور اپنے تجربات و مشاہدات سے اخبار بین حضرات کو فائدہ پہنچاتے۔

کشمیر کے علاوہ انہوں نے وسط ہند، راجپوتانہ اور کانگڑہ کی ریاستوں مثلاً متھرا۔ ناگر۔ دیہر۔ ریوال۔ سکیت۔ منڈی وغیرہ شملہ، لکھنؤ، دہلی، بھوپال، بنگال اور صوبہ سرحد کے بھی متعدد سفر کئے۔ جن سے ان کے دوستوں کا حلقہ وسیع ہو گیا اور اخبار کو بھی فائدہ پہنچا۔

فوق صاحب بڑے محنتی تھے۔ شعر و شاعری کا شوق تو انہیں قدرت کی طرف سے ودیعت ہوا تھا۔ جس کی وجہ سے پڑھائی کی طرف خیال بہت کم رہتا تھا۔ چنانچہ ۱۸۹۵ء میں مڈل کا امتحان دینے کے بعد جو اس وقت یونیورسٹی کا امتحان تھا۔ سیالکوٹ میں جا کر پٹوار کا کام سیکھنا شروع کر دیا۔ پھر وہاں سے کسی اور ملازمت کی توقع پر جموں کا رخ کیا اور کئی ماہ کی لگاتار کوششوں سے محکمہ پرمٹ و چونگی میں سردار ہری سنگھ رئیس ٹھیکیدار کے پاس ملازمت حاصل کی۔ جہاں قاضی فقیر علی عاقل کی ہم نشینی میسر آ جانے سے مجلسوں میں چند دن خوب شعر و شاعری کے چرچے رہے۔ جب چونگی کا ٹھیکہ ٹوٹ گیا تو بیکاری کے چند ماہ گھر ہی میں گزار کر ۳۱ جنوری ۱۸۹۶ء کو اپنے بڑے بھائی کے پاس لاہور چلے آئے۔ یہاں پیسہ اخبار کے دفتر میں ملازمت مل گئی جو چار سال تک رہی۔ اس عرصہ میں اخبار نویسی کی مزید مشق کے لئے اخبار بھارت سیوک جالندھر کی نامہ نگاری بھی کرتے رہے اور اخبار عام اور خالصہ بہادر میں مضامین بھی لکھتے رہے۔ ان کے علاوہ ہر ہفتہ مندرجہ ذیل چار اخبار خود مرتب کرتے رہے:

(۱) کوہ نور جو پنجاب کا سب سے پہلا اردو ہفتہ وار اخبار تھا اور جس کے آخری ایڈیٹر فوق صاحب تھے۔

(۲) گلزار ہند جو اگست ۱۹۰۱ء میں جاری ہوا۔

(۳) آفتاب پنجاب جو ۱۹۰۵ء یا ۱۹۰۶ء میں بند ہوا۔

(۴) بہاول گزٹ جو منشی محمد جان قریشی نے ہفتہ وار جاری کیا۔

اسی زمانے میں آپ نے شالامار باغ کی سیر ایک چھوٹی سی کتاب لکھی۔ اس سے حوصلہ اتنا بڑھا کہ کتابوں کی تصنیف و تالیف کا خیال دل میں چٹکیاں لینے لگا۔ چونکہ ان دنوں ناولوں کی گرم بازاری تھی۔ آپ نے بھی انار کلی۔ غم نصیب۔ عصمت آرا اور اکبر وغیرہ چند ناول لکھے جن سے شہرت پر لگا کر اڑنے لگی۔ اور مالی حالت بھی اچھی ہو گئی۔

اکتوبر ۱۹۰۱ء میں آپ نے پیسہ اخبار کی ملازمت ترک کر کے نومبر میں اپنا اخبار اور پریس جاری کیا۔ اس اخبار کا نام پنجہ فولاد تھا۔ پہلا پرچہ صرف پچیس تیس کی تعداد میں چھاپا گیا جس کا افتتاحیہ یہ تھا:

"خدا کے گھر پر سرکار کا قبضہ"

مضمون اس شاہجہانی مسجد کے متعلق تھا جو دائی انگہ کی مسجد کے نام سے مشہور ہے۔ اور لاہور ریلوے اسٹیشن کے قریب ہونے کی وجہ سے اس وقت محکمہ ریل کے قبضے میں تھی۔ ریل والوں نے اس میں ٹریفک سپرنٹنڈنٹ کا دفتر قائم کر رکھا تھا۔ اخبار کے آواز اٹھانے پر تمام اخبار نویس دنگ رہ گئے۔ آخر رفتہ رفتہ دیگر اخبارات بھی اس معاملے میں [illegible] اور ان کی کوششوں سے حکومت نے اس مسجد کو واگزار کر دیا۔ آج کل یہ مسجد آباد ہے اور اس پر محکمہ آثار قدیمہ کا بورڈ لگا ہوا ہے۔

پنجۂ فولاد کا مطبع ۔ کاغذ اور لکھائی چھپائی وغیرہ سب ادھار تھے ۔ گویا بغیر کسی سرمایہ کے کام شروع کیا گیا تھا ۔ تقریباً نصف پرچے اپنے دوستوں اور رشتہ داروں کو وی پی کئے گئے تھے ۔ باقی لاہور میں تقسیم ہوئے تھے جن کی اس قدر دھوم مچی تھی کہ پرچہ دوبارہ چھاپنا پڑا تھا۔ پہلے پرچے کی قیمتیں وصول ہو جانے پر دوسرا پرچہ پچاس کی تعداد میں چھاپا گیا ۔ اسی طرح دسمبر میں اس کی تعداد بڑھا کر سو کر دی گئی ڈیڑھ ماہ تک یہ اخبار پندرہ روزہ رہا ۔ جنوری ۱۹۰۲ء میں ہفتہ وار ہو گیا ۔ جولائی ۱۹۰۲ء میں اس کی اشاعت پانچ سو تک پہنچ گئی ۔ ۱۹۰۴ء میں سات سو ہو گئی ۔ اور رفتہ رفتہ اس کی اشاعت اتنی بڑھی کہ دسمبر ۱۹۰۴ء میں بارہ سو سے بڑھ گئی ۔ اتنی اشاعت اس زمانے میں بڑی کافی سمجھی جاتی تھی ۔ کیونکہ اخبار بینی کا مذاق آج کل کی طرح اتنا عام نہیں ہوا تھا ۔ اخبار کی پالیسی صلح کل تھی ۔ ہر مذہب و ملت کے لوگ اسے احترام کی نظر سے دیکھتے تھے ۔ اکثر والیان ریاست اور پولیٹیکل ایجنٹ اس کی سرپرستی کرتے تھے ۔ خریداروں میں مسلمانوں کے علاوہ ہندو، سکھ اور عیسائی بھی موجود تھے ۔ حضرت داغ دہلوی، احسان شاہجہانپوری اور علامہ اقبال نے اس کی تعریف میں نظمیں لکھیں لیکن افسوس کہ وسط ستمبر میں یہ اخبار ایک دوست نما دشمن کی مہربانی سے بند ہو گیا ۔ فوق صاحب کا اپنا بیان ہے :۔

"ایک شخص جو بڑا چالاک اور گرگ باراں دیدہ تھا ۔ چند دنوں کی آمد و رفت کے بعد میرا ہمدرد بن گیا ۔ وہ ہر سیر و سیاحت اور سفر و حضر میں میرے ساتھ ہوتا تھا اور ایک معمولی سا پرانے نام پندرہ روزہ اخبار نکال کر بہت فائدے میں رہتا تھا ۔ میں نے نے اس کی "ریش سفید" پر اعتبار کیا اور یہ نہ سمجھا کہ یہ شخص "ظلمت ذریب" سے بھری ہے ۔ میں اس کے چہرے کو صبح صادق سمجھتا رہا حالانکہ وہ محض "مکر چاندنی" کا مظہر تھا ۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ میں نے اخبار پر ٹکٹیں لگانے کا کام اس کے سپرد کیا ۔ اور پھر اخبار شماری بھی اسی کے رحم و کرم پر چھوڑ دی ۔ حالانکہ چاہئے یہ تھا کہ ٹکٹیں وہ لگاتا اور اخبار کو گننے والا کوئی اور ہوتا جو دیکھتا کہ اس نے جتنی ٹکٹیں لی تھیں اتنی لگائی بھی ہیں یا نہیں ۔ اس طریق سے وہ سفید ریش بزرگ سال بھر تک بیس روپے ماہوار کے ٹکٹ ہضم کرتا رہا ۔ جس کا اثر اخبار پر اس قدر پڑا کہ اس کی جان کے لالے پڑ گئے ۔ آخر میں نے مجبور ہو کر مطبع پنجۂ فولاد اور اخبار پنجۂ فولاد دونوں بند کر دیئے ۔ اسی زمانے کا ایک شعر ہے ؎

اخبار بند ہونے سے کہتے ہیں ناز میں ۔۔۔ اے فوق اب وہ پنجۂ فولاد کیا ہوا

۱۹۰۱ء یا ۱۹۰۲ء میں لالہ منشی رام اگروال نے ایک اخبار بنام "اردو اخبار" جاری کیا ۔ جس کی ادارت فوق صاحب کے سپرد تھی ۔ چنانچہ پنجۂ فولاد کے ساتھ اس اخبار کو بھی چار ماہ تک نہایت قابلیت سے چلاتے رہے ۔ مگر بعد میں اپنے کاروباری مشاغل سے مجبور ہو کر اس سے الگ ہو گئے ۔

۱۸۹۹ء میں میاں جان محمد گنائی نے کشمیری گزٹ کے نام سے ایک ماہوار رسالہ جاری کیا ۔ جسے تین سال تک فوق صاحب مدیر اعزازی کی حیثیت سے مرتب کرتے رہے ۔ آخر چودھری جان محمد گنائی کی وفات کے ساتھ اس رسالے کا تو خاتمہ ہو گیا ۔ البتہ اس کی داغ بیل پر ایک اور رسالہ کشمیری مخزن نکل آیا جس کے ایڈیٹر خواجہ کمال الدین بی اے مسلم مشنری انگلستان اور اسسٹنٹ ایڈیٹر فوق صاحب تھے ۔ یہ رسالہ ۱۹۰۵ء تک جاری رہا ۔ اس کے بند ہوتے ہی ۱۹۰۶ء میں آپ نے ماہنامہ کشمیری میگزین جاری کیا جو غالباً پنجاب کا سب سے پہلا رسالہ ہے جس نے ہاف ٹون بلاک کی تصاویر چھاپنے کے علاوہ خاص نمبر نکالنے کی جدت شروع کی ۔ چنانچہ اس کا ایڈیٹر نمبر جو اردو رسائل و جرائد کے ایڈیٹروں کے حالات زندگی سے متعلق شائع ہوا تھا اب تک ایک یادگار تاریخی پرچہ تصور کیا جاتا ہے ۔

۱۹۱۲ء میں کشمیری میگزین نے ماہوار سے ہفتہ وار اخبار کشمیری کی شکل اختیار کی ۔ اور اپنی مفید اور کارآمد تحریروں سے اہل خطہ میں علم و عمل کی روح پھونکی ۔ اس اخبار نے کشمیر میں بیگار کے مظالم کے خلاف آواز اٹھائی اور متواتر کئی سال تک پر زور مخالفت کر کے اس کی منسوخی

کے احکام جاری کرائے۔ ریاست جموں و کشمیر میں محکمہ امداد باہمی کا قیام۔ زمینداری سوسائٹیوں کا اجراء اور قانون انتقال اراضی کا نفاذ بھی اسی اخبار کی تحریک کا ثمرہ ہے۔ ۱۹۱۵ء میں جب سری نگر کی پتھر مسجد کے اندر تھانہ پولیس کے لئے پختہ عمارت بننے لگی تو اسی اخبار نے پبلک آواز پیدا کر کے اسے رکوایا۔ اب چند برس سے یہ مسجد مسلمانوں کو واپس مل چکی ہے۔ اسی اخبار کی کوششوں سے مسلمانوں کو حکومت کی طرف سے میڈیکل وظائف ملنے شروع ہوئے۔ کشمیر میں زبان اردو کی ترویج و اشاعت کے لئے بھی اس اخبار نے کچھ کم کام نہیں کیا۔ جب یہ جاری ہوا تو جتنے خطوط اس کے دفتر میں آتے تھے ان میں فیصدی پچاس خط عربی اور فارسی میں ہوتے تھے۔ اب ہر شخص اردو بولتا سمجھتا اور لکھتا ہے۔ لاہور کی انجمن کشمیری مسلمانان، مسلم کشمیری کانفرنس اور بیرونجات کی کشمیری انجمنوں کا قیام بھی فوق صاحب ہی کی تحریکوں کا نتیجہ ہے۔ اور جس آنے والے دور کی مدھم اور دھندلی سی تصویر وہ آج سے پچاس ساٹھ سال بیشتر لوگوں کو اپنی نظم و نثر میں دکھایا کرتے تھے وہ اب بڑا صاف اور روشن نظر آتا ہے۔

اخبار کشمیری کے ساتھ ساتھ فوق صاحب نے یکے بعد دیگرے طریقت اور نظام دو ماہانہ رسالے جاری کئے جو تین چار سال تصوف کی خدمت کر کے بند ہو گئے۔

فوق صاحب عملی ریاست میں عموماً حصہ نہیں لیتے تھے۔ لیکن قومی معاملات کے سلسلے میں ان کا احساس بہت گہرا تھا۔ وہ ان لوگوں میں تھے جو مسلمانوں کی زبوں حالی سے ہمیشہ پریشان رہتے تھے۔ بالخصوص کشمیری مسلمانوں کی پستی اور ڈوگرہ شاہی غلامی ان کے لئے سوہان روح کا باعث تھی۔ وہ نسلاً کشمیری تھے۔ اس لئے بھی انہیں کشمیر سے والہانہ عشق تھا۔ انہوں نے ساری عمر کشمیر اور کشمیریوں کی خدمت کی۔ کشمیری تعلیم میں پیچھے، اخلاق میں پست اور تہذیب و تمدن میں دنیا کے لوگوں سے بہت پیچھے تھے۔ فوق صاحب نے انہیں تعلیم کا شوق دلایا۔ ان کو دنیا کی ترقیوں سے آگاہ کیا۔ ان کی سوئی ہوئی قوتوں کو جگایا۔ اور ان کو ترقی یافتہ قوموں کے برابر لا کھڑا کرنے میں اپنی زندگی وقف کر دی۔

فوق صاحب اعتدال کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتے تھے۔ انہوں نے تخریبی کاموں میں الجھنے کو کبھی پسند نہ کیا۔ اختلاف عقائد کی بنا پر کسی فرقے کو برا بھلا نہ کہا۔ تمام عمر تعمیری اسکیموں کو چلانے میں مشغول رہ کر اپنے آپ کو ایک ایسا ثالث بالخیر ثابت کیا جو حاکم و محکوم کو بہتر سے بہتر مشورہ دے سکتا تھا۔ ان کا منشا صرف یہ تھا کہ کشمیر میں واقفیت عامہ ترقی کرے۔ اہل خطہ روشن خیال ہو جائیں اور واقعات عالم پر ان کی نظریں وسیع ہوں۔ خدا کا شکر ہے کہ یہ توقعات ان کی زندگی ہی میں پوری ہو گئیں۔ اور کشمیر میں ایک وسیع ذہنی، سیاسی اور مجلسی انقلاب پیدا ہو گیا۔

فوق صاحب نے کشمیر کے متعلق بہت سی کتابیں لکھیں جن میں تاریخ کشمیر، مشاہیر کشمیر، خواتین کشمیر، رہنمائے کشمیر، حکایات کشمیر، شباب کشمیر، تاریخ اقوام کشمیر، اور تاریخ بڈشاہی وغیرہ بہت مشہور ہیں۔ ان کتابوں کے ذریعے سے انہوں نے کشمیر کے بھولے ہوئے افسانے نوجوانوں کو سنائے۔ کشمیریوں کے شاندار کارناموں سے قوم کو روشناس کیا اور کشمیر کا نام ساری دنیا میں روشن کر دیا۔

اس ادبی اور تاریخی کام کے علاوہ فوق صاحب نے کشمیری مزدوروں کو منظم کرنے اور ان کی پریشانیاں دور کرنے کے سلسلے میں بھی قابل قدر خدمات انجام دیں۔ غالباً ان کی انہی بے لوث خدمات کا تاثر تھا کہ علامہ اقبال انہیں مجدد کشمیر کہا کرتے تھے۔

فوق صاحب کی دیانت فکر اور پابندی وضع کا پایہ اتنا بلند تھا کہ اگر وہ کشمیر کے بجائے کسی اور اپنے عہد ماثرہ کی طرف توجہ دیتے تو ہندوستان کے بہترین اخبار نویسوں اور مصنفوں کی صف میں شمار ہوتے۔ لیکن اس صورت میں بھی تاریخ کی تدوین کا کام معرض التوا میں پڑ جاتا کیونکہ اس دائرے میں بھی ان کا نعم البدل دستیاب ہونا مشکل تھا۔ پھر بھی جب ہم ان کی تصانیف لاہور عہد مغلیہ میں، تذکرہ علمائے لاہور، یادرفتگاں (تذکرہ صوفیائے لاہور) حیات داتا گنج بخش، تاریخ سیالکوٹ، تذکرۃ الصالحین، حیات جہانگیر، شالامار باغ، مآثر لاہور اور فاتح ملتان وغیرہ پر نظر ڈالتے ہیں۔ تو تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ لاہور اور پنجاب کی تاریخ کے متعلق بھی ان کی معلومات بڑی

وسیع تحقیق۔ تاریخ حریت اسلام و میدانی نشتر اور تاریخ کا روشن پہلو بھی اُن کی بڑی مقبول کتابیں ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ فوقؔ صاحب انگریزی زبان سے اچھی طرح واقف نہ تھے۔ چنانچہ ایک موقع پر اس کا اعتراف کرتے ہوئے خود ہی کہتے ہیں۔ ؎

انگلش زبان ہی سے جو ناآشنا تھے تم　　　اے فوقؔ ! پھر ایڈیٹر اخبار کیوں بنے

اور عربی و فارسی بھی بقدر ضرورت ہی جانتے تھے لیکن تجربہ اور مشق سے انہیں اخبار نویسی کا ڈھنگ خوب آتا تھا۔ معمولی معمولی واقعات میں انتہائی دلچسپی پیدا کر دینا ان کا ایک ادنیٰ سا کرشمہ تھا۔ تاریخ کے خشک واقعات بھی آپ اس خوبی اور ایسے انداز سے لکھتے تھے کہ پڑھنے والا پہروں مزے لیتا رہتا تھا۔ اس لحاظ سے انہیں تاریخ اور صحافت کا مجمع البحرین کہا جاتا تھا۔ حضرت احسانؔ شاہجہانپوری فرماتے ہیں ؎

فوقؔ کی مضمون نگاری میں کشش ہے حسن کی　　　خود فدا ہونے کو آتی ہے خبر اخبار پر

یہی وجہ ہے کہ آپ کا دفتر ہمیشہ اخبار نویسی سکھانے کا اسکول بنا رہا ہے۔ یوں تو آپ کے پرتوِ فیض سے سینکڑوں ذرے آسمانِ ادب و صحافت پر آفتاب و مہتاب بن کر چمکے۔ لیکن مندرجہ ذیل چند نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

(۱) چوہدری رحمت علی بی اے۔ جو بعد میں انگلستان چلے گئے اور جنہوں نے "پاکستان" کا لفظ وضع کر کے یورپ میں اس کا پراپاگنڈا کیا۔ (۲) نازش بدایونی (۳) ملک مقبول احمد (جو بعد میں رجسٹرار کوآپریٹو سوسائٹیز صوبہ کشمیر ہو گئے) (۴) سید حبیب مالک اخبار سیاست لاہور (۵) ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی جنہوں نے بعد میں اخبار پولیس ریویو جاری کیا اور آج کل انگلستان میں ہیں۔ (۶) میر نیاز کاشمیری (۷) مسٹر محمد حنیف عامر (جو نیرنگ خیال۔ شاہکار لاہور اور اخبار ریاست دہلی کے بھی ایڈیٹر رہے) (۸) ماسٹر محمد بخش مسلم بی اے (۹) رشید صحرائی (۱۰) بابو محمد الدین بی اے وغیرہ۔

فوقؔ صاحب محض تخلص ہی کے گنہگار نہ تھے۔ بلکہ فطری شاعر تھے اور غزل۔ نظم۔ قصیدہ۔ مرثیہ۔ رباعی وغیرہ تمام اصنافِ سخن پر حاوی۔ ان کے کلام کے دو مجموعے "کلام فوقؔ" اور "نغمہ گلزار" چھپ چکے ہیں۔ کلام فوقؔ کے محاسن پر اکبر الٰہ آبادی کی اس رائے کے ہوتے ہوئے ایک لفظ کا اضافہ کرنا بھی مشکل ہے :۔

"کلام فوقؔ بلاشبہ قابلِ داد ہے۔ جب خیالات اچھے ہوں تو کلام کیوں نہ اچھا ہو۔ کلام فوقؔ میں فطری آمد ویں بھی ہیں۔ شوخی کا اظہار بھی۔ قافیے برجستہ ہیں۔ بغیر تکلف کے کلام کا اکثر حصہ ہے۔ اور اثر پیدا کرنا ایسے ہی کلام کا کام ہے بعض اشعار سے دلچسپ مذاق رنگ قطرہ ہائے سے کی طرح ٹپک رہا ہے۔ کئی اشعار گنجینۂ معانی ہیں۔ اخلاقی و ہمت افزا اشعار کی بھی کمی نہیں۔ بعض اشعار پر تو جی چاہتا ہے کہ داد دوں اور لوٹوں۔ بہت سے اشعار میرے حسب حال ہیں۔ نیچرل کیفیتوں کے اظہار اور تشبیہ کے نظاروں میں خوب جوش دکھایا ہے اور نظموں کے شان نزول نے تو آپ کی جدتِ طرازی کا رتبہ بہت بلند کر دیا ہے۔"

محسن الملک

ڈاکٹر سید محمود

نواب محسن الملک کی شخصیت کو اچھی طرح سے سمجھنے کے لئے پہلے اس ماحول کا مختصر سا جائزہ ضروری معلوم ہوتا ہے جس میں ان کی ذہنی نشوونما ہوئی اور جو ان کے تمام کارہائے نمایاں کا پس منظر ہے۔ اس سلسلے میں ان شخصیتوں کا تذکرہ بھی ناگزیر ہے جن سے وہ متاثر ہوئے یا جن کو انہوں نے متاثر کیا۔ اس لئے کہ غیر معمولی شخصیتوں کو بنانے میں ان کے ذاتی صفات و خصوصیات کے علاوہ اس سیاسی فضا کا بھی زبردست ہاتھ ہوتا ہے جس میں وہ سانس لیتے ہیں اور جس میں رہ کر وہ اصول زندگی اور لائحہ عمل مرتب کرتے ہیں۔

نواب محسن الملک جن کا اصلی نام سید مہدی علی تھا ۹ دسمبر ۱۸۳۷ء مطابق ۱۲۵۳ھ کو اٹاوہ کے ایک مشہور سادات خاندان میں پیدا ہوئے۔ ان کے نانا مولوی محمود علی ایک زبردست عالم اور صدر الصدور کے عہدے پر فائز تھے، وہ ایک عرصہ تک ریاست ٹونک میں منصب وزارت پر بھی سرفراز رہے تھے۔

ان کی ابتدائی تعلیم اس زمانے کے دستور کے مطابق خانگی مکتب کے علاوہ علماء و فضلاء کے حلقہ درس میں ہوئی جہاں انہوں نے عربی، فارسی اور حدیث و تفسیر میں اچھی دستگاہ حاصل کر لی۔ انگریزی تعلیم انہوں نے باضابطہ نہیں حاصل کی تھی مگر اپنی غیر معمولی ذہانت اور مشق و مزاولت سے اچھی خاصی لیاقت پیدا کر لی تھی۔ یہاں تک کہ وہ انگریزی اخبار وغیرہ بے تکلف پڑھ اور سمجھ لیتے تھے۔

انہوں نے سترہ اٹھارہ برس کی عمر میں دس روپیہ ماہوار سے ملازمت شروع کی اور ۱۸۶۱ء تک نائب سررشتہ داری اور تحصیلداری کے منازل طے کرتے ہوئے ڈپٹی کلکٹری کے درجے تک پہنچ گئے جو اس وقت مسلمانوں کے لئے معراج ملازمت تھی۔ یہ ترقی اس قدر کم عرصے میں غیر معمولی تھی لیکن ان کے جیسے صاحب دماغ اور ماہر نظم و نسق کے لئے باعث فخر نہ تھی۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ ایک وقت میں ایلن آکٹیوین ہیوم ان کے بالادست افسر تھے جو بعد میں انڈین نیشنل کانگریس کے بانی ہوئے اور جنہوں نے ان کی قابلیت کے متعلق کہا تھا کہ باوجود ایسی اعلیٰ درجہ کی لیاقت اور کارگزاری اور ضلعے کیا صوبے کے انتظام کی صلاحیت رکھنے کے ابھی تک وہ ڈپٹی کلکٹری کے عہدے سے آگے نہیں بڑھ سکے ہیں۔

لیکن انہیں ابھی اپنے اصلی جوہر کو دکھلانے کا موقع کہاں ملا تھا؟ اس لئے ۱۸۷۴ء میں انگریزوں کی ملازمت سے مستعفی ہو کر سرکار نظام حیدرآباد کے یہاں ملازمت کر لی۔ انہوں نے وہاں پہنچ کر انتظامی امور میں ایسا درک دکھلایا کہ سر سالار جنگ جیسے کہنہ مشق [illegible] ان کے معترف اور

مدارج ہو گئے اور رفتہ رفتہ وہ محکمۂ سیاسیات اور خزانہ کے اہم صیغوں کے معتمد ہو گئے۔ اس طرح عملاً حکومت کی پوری طاقت ان کے ہاتھوں میں آگئی۔

۲۳ مارچ ۱۸۸۴ء میں ان کو منیر نواز جنگ بہادر کا خطاب دربار نوروزی کی تقریب پر ملا جس نے ان کی شہرت کو حیدرآباد کے حدود سے آگے بڑھنے میں مدد دی۔ وہ خود بھی محکمۂ سیاسیات کے معتمد ہونے کی وجہ سے اپنی نظر ہندوستان اور بیرون ہندوستان کے مسائل پر دوڑانے لگے لکھنے۔ چنانچہ انہوں نے ۱۸۸۵ء میں ہندوستان کی شمال مغربی سرحد پر روسی حملے کے آثار نمایاں دیکھ کر ایک سیاسی مکتوب شائع کیا جس کا عنوان تھا "مسلمان اور روسی خطرہ" جس میں انہوں نے مسلمانوں کی سلطنت برطانیہ سے وفاداری کے مسئلے پر بحث کی تھی، ساتھ ہی ساتھ انہوں نے برطانیہ کی اس پالیسی پر نکتہ چینی کی تھی کہ اس نے ترکی اور ایران سے اچھے تعلقات نہیں رکھے تھے۔ انہوں نے حیدرآباد کی ان تمام سازشوں کو جو ان کے زمانے میں ہوتی رہیں اس طرح ختم کر دیا کہ ان کے بعض مداحین کہا کرتے تھے کہ اگر یہ شخص یورپ میں پیدا ہوتا تو بسمارک اور ڈزریلی کا ہم پلہ ہوتا۔

انہیں نظام حیدرآباد نے ستمبر ۱۸۸۷ء میں دوبارہ محسن الدولہ محسن الملک کا خطاب مع تمام لوازمات خطاب کے گورنر جنرل کی سفارش اور منظوری سے دیا۔ جیسے جیسے وقت گذرتا گیا وہ اپنی قابلیت اور ایمانداری کا سکہ سبھوں کے دلوں میں بٹھاتے گئے جب سر آسمان جاہ وزیر اعظم ہوئے تو انہوں نے نواب محسن الملک کو ایک نازک اور اہم مشن پر لندن بھیجا یہ واقعہ ۱۸۸۸ء کا ہے جب ان کی عمر کوئی ۵۱ برس کی تھی۔ وہاں پہنچ کر انہیں اپنے کام کے سلسلے میں پارلیمان کی جوڈیشل کمیٹی کے سامنے بیان دینا پڑا جہاں انہوں نے اپنی قانونی دسترس کے جوہر دکھائے۔

ان کی صحت چونکہ خراب ہونے لگی اس لئے دوسرے قانونی مشیروں کو چھوڑ کر وہ اکتوبر میں واپس چلے آئے۔ قیام انگلستان کے دوران میں محسن الملک کو وہاں کے بڑے بڑے امراء اور سیاستدانوں مثلاً پرنس البرٹ وکٹر، سر جان اسٹریچی اور لارڈ ریپن وغیرہ سے ملنے کا اتفاق ہوا جنہوں نے ان کی بڑی آؤ بھگت کی اور ان کے ساتھ ان کی سیاسی حیثیت کے مطابق سلوک روا رکھا۔ وہاں انہوں نے کیمبرج کے ہندوستانی طلباء کی سوسائٹی میں تقریر کی اور پھر ہندوستانی طلبا کو نارتھ بروک کلب میں دعوت دی۔ انہی دنوں لارڈ لینسڈاؤن وائسرائے ہند مقرر ہوئے تھے ان کے اعزاز میں کی گئی متعدد تقریبوں میں وہ شریک ہوئے۔ ایک جلسے میں دادا بھائی نوروجی بھی شریک تھے جنہوں نے لندن میں مقیم ہندوستانیوں کی طرف سے ایک ایڈریس لارڈ لینسڈاؤن کو پیش کیا تھا۔

غرضکہ وہ وہاں کی سیاسی، تہذیبی اور سماجی زندگی سے ذاتی واقفیت لے کر ہندوستان لوٹے اور بعد میں یہی تجربات ان کے لئے مشعل راہ ثابت ہوئے۔

نظام حیدرآباد ان کو اب بڑی سے بڑی جگہ دینے کو تیار تھے کہ یک بیک حیدرآباد کی سیاسی فضا پلٹ گئی اور ریزیڈنسی کی طرف سے کی گئی سازشوں کی وجہ سے محسن الملک اور سر آسمان جاہ دونوں کو حیدرآباد کی ملازمت سے مستعفی ہونا پڑا۔ وہ حیدرآباد میں بسلسلہ ملازمت تقریباً بیس برس رہے۔

جب انہوں نے حیدرآباد چھوڑا تو خواص اور عوام دونوں کو اس کا بڑا ملال تھا۔ نواب میرزا داغ جو ان دنوں حیدرآباد میں ملک الشعراء تھے اپنے دلی جذبات پر قابو نہ پا سکے اور بے اختیار کہہ اٹھے ؎

مہدی کو اگر مہدیٔ زماں کہتے ہیں   یا محسن ملک اس کو یہاں کہتے ہیں
زیبا ہے کہیں محسن عالم اسے داغ   جو چاہئے کہنا وہ کہاں کہتے ہیں

اصل جوہر کا انسان کوئی ہو تو سہی   ذی مرتبہ ذی شان کوئی ہو تو سہی
ہر شخص کو ملحوظ ہے خاطر اپنی   یوں دل کا نگہبان کوئی ہو تو سہی

ایک طرف تو محسن الملک اپنی ملازمت کے سلسلے میں انتظامی امور میں دلچسپی اور حصہ لیتے رہے، دوسری طرف سر سید احمد خان سے ان کے تعلقات

گو ابتدائی منازل میں وہ سرسید کے مخالف تھے۔ شروع میں وہ سرسید کے خیالات اور طریقہ عمل سے اتفاق نہ رکھتے تھے لیکن سرسید کی شیریں اور نرم گفتاری نے ان کا دل موہ لیا اور بعد میں ان کے مشن کو آگے بڑھانے کا ایسا عہد کیا کہ آخری وقت تک اسی کام میں منہمک رہے۔

سرسید کی زندگی میں وہ ان کی طرح طرح سے امداد کرتے رہے، کبھی مالی امداد کی اور کبھی رسالہ تہذیب الاخلاق میں نہایت سلیس اور آسان زبان میں بہترین اصلاحی اور تحقیقی مضامین لکھ کر ان کے نقطۂ نظر کی وضاحت کی۔ سرسید ان کے زبردست تعاون سے اتنے مرعوب ہوئے کہ انہیں لکھا بھی "یعنی اپنا گوشت کھا جیا اور ان کے نام پر مہدی منزل بطور یادگار تعمیر کروایا جس کے کتبے میں ان کے محاسن اور امداد کا بڑی محبت سے ذکر موجود ہے۔

محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس میں ۱۸۹۰ء سے شرکت کرنی شروع کی اور ایسی معرکۃ الآرا تقریریں کیں اور ایسے پُرمغز اور تحقیقی مقالے [illegible] مسلمانان میں ہندوستان اور بیرون ہندوستان کے سیاسی مسائل کو سمجھنے کی صلاحیت پیدا ہونے لگی اور اس طرح سرسید اور محسن الملک کی ان تھک کوشش سے قومی بیداری کے ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔

وہ حیدرآباد سے ۱۸۹۳ء میں مستعفی ہونے کے بعد علی گڑھ ہی میں رہے تاکہ سرسید کے تعلیمی اور اصلاحی مشن میں مدد و معاون ہو سکیں اور ان کی زندگی ہی میں وہ کالج کے تقریباً سب سے اہم ٹرسٹی بن گئے۔

سرسید کا انتقال ۲۷ مارچ ۱۸۹۸ء کو ہوا۔ اس وقت کالج مالی پریشانیوں میں گھرا تھا جسے انہوں نے سرسید میموریل فنڈ قائم کر کے اپنی دانشمندی سے نجات دلائی اور کالج کو یونیورسٹی بنانے کا مسئلہ قوم کے سامنے پیش کر دیا۔

سرسید کے بعد ان کے صاحبزادے جسٹس سید محمود سیکرٹری ہوئے لیکن خرابیٔ صحت کے باعث اس عہدے سے علیحدہ ہو گئے اور ۱۸۹۹ء میں نواب محسن الملک کو یہ عہدہ سپرد کیا گیا۔

اس کے بعد سے ان کی حیثیت کل ہند مسلم رہنما کی ہو گئی اور ہر اعتبار سے وہ سرسید کے جانشین ہو گئے اور باوجود کبر سنی کے خدمت قوم میں جوش و خروش کے ساتھ لگ گئے۔

۱۹۰۰ء میں اردو ہندی کا قضیہ چھڑا جس نے یوپی، بہار اور دیگر علاقہ جات میں ہندو مسلم تعلقات میں تلخی پیدا کر دی۔

انہوں نے ایک طرف تو حکومت سے پہلی بار اس مسئلے پر کھلم کھلا ٹکر لی، دوسری طرف مسلمانوں کو صاف اور کھلے لفظوں میں سمجھایا کہ برادرانِ وطن کے فوائد اور اغراض کے خلاف کلّاً اور بالکل ہونے سے احتراز کرو۔ انہوں نے جو تاریخی میموریل تیار کر کے مسلمانوں کی طرف سے حکومت میں پیش کیا تھا وہ اس دور کی سیاسی بے چینی کی گویا عکسی تصویر ہے۔ نواب محسن الملک کی زندگی کا آخری دور ہندوستان کی تاریخ سیاست کا ایک اہم باب ہے اور ہندوستان کی جنگ آزادی کا ایک ایسا موڑ ہے جسے سمجھے بغیر کوئی آنے والی سیاسی تحریکوں کا صحیح تجزیہ نہیں کر سکتا۔

یہی زمانہ تھا جب میں علی گڑھ کے ہائی انگلش اسکول میں داخل کیا گیا۔ میں نے شروع ہی سے علی گڑھ کی سیاسی اور ادبی سرگرمیوں میں دلچسپی لینی شروع کر دی۔ کیونکہ میرا مطالعہ عمر کے لحاظ سے وسیع تھا اور میں مولانا حالی، شبلی نعمانی اور مولوی نذیر احمد کی بیشتر تصانیف پڑھ چکا تھا۔ مسدس حالی کا ایک بڑا حصہ اور بہت سی دوسری قومی نظمیں مجھے یاد تھیں۔ ان سب باتوں کے علاوہ میں آتے ہی یونین کلب کے مقابلے کی تقریروں میں شامل ہونے لگا جہاں پہلے ہی سال میں اسکول کے طلبا میں اول رہا اور کالج کلاسوں کو ملا کر پانچواں بہترین مقرر مانا گیا۔

یہی وجہ تھی کہ کالج کے لائق اور ممتاز طلبا ہی نہیں بلکہ اساتذہ بھی مجھے اپنی صحبتوں میں شرکت کا شرف بخشنے لگے اور جلدی میری رسائی نواب محسن الملک تک بھی ہو گئی۔

جو لڑکے ان دنوں کالج کے ممتاز طلبا میں تھے اور جن کے ناموں سے آج بھی علی گڑھ کی تاریخ روشن ہے ان میں عبدالرحمٰن بجنوری جو اس وقت اونچے درجے میں تھے، تصدق احمد خان شیروانی جو مجھ سے دو تین درجے آگے تھے، اور قاضی محمد حسین جو اس وقت کالج میں تھے خاص طور پر

قابلِ ذکر ہیں۔ قاضی صاحب بڑے سیاستدان سمجھے جاتے تھے اور کالج میں اردو کے سب سے بہتر مقرر تھے۔ اسی وجہ سے محسن الملک انہیں بہت عزیز رکھتے تھے اور ان کی عالمانہ تقریروں کی بہت تعریف کیا کرتے تھے۔ قاضی صاحب میرے سیاسی استاد بھی تھے اور انہی کی بدولت میں اوائل عمری میں کانگرس کی طرف مائل ہو گیا۔

ان بزرگ دوستوں کے ساتھ میں نواب محسن الملک کے یہاں حاضر ہوتا۔ اگر ہم لوگ ہفتہ دو ہفتہ ان کے یہاں حاضری نہ دیتے اور نواب صاحب کہیں راستے میں مل جاتے، کیونکہ ہر شام کو بلاناغہ وہ اپنی گاڑی میں بیٹھ کر سیر کو جاتے تو فوراً گاڑی روک کر ہم سبھوں کو اپنے ساتھ بٹھا لیتے اور نہایت شفقت آمیز الفاظ میں شکایت کرتے کہ تم سب اتنے دنوں سے کہاں تھے؟ کبھی کہتے "تم سب باغی ہو گئے ہو"۔۔۔۔ "باغی" کا لفظ وہ اس لئے استعمال کرتے کیونکہ ہم لوگ کبھی کبھی سیاست پر گفتگو کرتے تھے اور انگریزوں کو برا بھلا کہتے تھے اور چونکہ میں سب دوستوں میں چھوٹا تھا وہ چھیڑ چھیڑ کر مجھے انگریزوں کے خلاف بولنے پر مجبور کرتے اور کبھی ہنس کر فرماتے کہ یہ لڑکا ضرور کبھی نہ کبھی جیل جائے گا یا پھانسی چڑھے گا۔ کبھی ہم لوگوں کو بڑی شفقت سے سمجھاتے کہ تمہاری قوم ابھی ان خیالات کے لئے تیار نہیں ہے۔ اس وقت ہم لوگ زیادہ تر انگریزوں کی اسلام دشمنی کا ذکر کیا کرتے تھے۔ قاضی تلمذ حسین اور بجنوری نواب صاحب سے کبھی کبھی علمی گفتگو کرتے اور بعض وقت اسلام کے کسی مسئلے کے متعلق اعتراض کرتے۔ سمجھنے کی خاطر نواب صاحب سے الجھنے کی کوشش کرتے۔ اس وقت محسن الملک کی گفتگو سننے کے قابل ہوتی، وہ ایسی خوبی اور قابلیت کے ساتھ اعتراضات کا جواب دیتے کہ معلوم ہوتا جیسے ان کے منہ سے پھول جھڑ رہے ہوں۔ یہ بھی ہوتا کہ کبھی وہ جوش میں آجاتے۔

ان ہی دنوں یعنی ۱۹۰۲ء میں نواب صاحب نے مجوزہ یونیورسٹی فنڈ کی غرض سے رنگون کا سفر کیا اور اپنی معجز بیانی اور فصاحت لسانی اور بلند اخلاق و اعلیٰ کردار سے قومی تعلیم اور قومی یونیورسٹی کا خیال ہر مسلمان کے دل میں جاگزیں کیا۔ رنگون میں پہلے پہل کامیابی کا امکان نظر نہ آیا تو انہیں بڑی مایوسی ہوئی۔ لیکن ایک جلسے میں بڑی معرکۃ الآرا تقریر کی جس کا خلاصہ یہ تھا کہ ہم مسلمان علمی اور ملکی دونوں سلطنتیں کھو بیٹھے ہیں ملکی سلطنت کی نہ ہم کو سردست خواہش ہے اور نہ حاصل ہو سکتی ہے لیکن علمی سلطنت کی خواہش بھی ہے اور حاصل بھی ہو سکتی ہے۔ ملکی سلطنت کا آفتاب تو دہلی سے طلوع ہوا اور رنگون میں آکر غروب ہو گیا۔ کیا اہلِ رنگون اس کے بدلے میں علمی سلطنت کا آفتاب رنگون سے نکال کر علیگڑھ میں نہ غروب کریں گے؟۔۔۔۔۔ یہ تقریر کس موثر پیرایہ میں کی ہوگی اسی ایک خطیبانہ جملے سے ظاہر ہے۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ ایک بہت بڑی رقم اسی وقت جلسے میں جمع ہو گئی۔

۱۹۰۳ء میں جبکہ میں نویں درجے میں تھا علیگڑھ میں ایک خفیہ سوسائٹی قائم ہوئی جس کے بانیوں میں یہی لوگ تھے، یعنی عبدالرحمٰن بجنوری، تصدق احمد خان شیروانی، بدرالدین (بیادیہ بزرگ مولانا حفظ الرحمٰن جنرل سیکرٹری جمعیۃ العلماء ہند)، عزیز الرحمٰن اور راقم الحروف اور بعض دیگر حضرات۔ ان میں صرف عزیز الرحمٰن اور میں زندہ ہوں (عزیز الرحمٰن ان دنوں ضلع اناؤ (یو۔پی) میں گوشہ نشینی کی زندگی بسر کر رہے ہیں) اس سوسائٹی کا مقصد پین اسلامزم اور ہندوستان سے انگریزوں کو نکالنا تھا۔ طلباء کی یہ جماعت ہر ہفتے بڑی خاموشی کے ساتھ کسی ایک جگہ ملتی تھی۔ ایک آدمی کسی ایک موضوع پر کوئی مقالہ پڑھتا کبھی اس پر سنجیدگی سے بحث ہوتی کہ دنیا کے مسلمانوں کو کیونکر ایک پلیٹ فارم پر جمع کیا جا سکتا ہے اور انگریزوں کو ہندوستان سے باہر نکالنے کی کیا تدبیر ہو سکتی ہے؟ یہ جماعت زمانہ موجودہ کر کالج کے طلباء کے درمیان انگریزوں کے خلاف پروپیگنڈا کرتی رہی۔ ممبرانِ خفیہ انجمن نے آگے چل کر ایک موقع پر سرسید کی قبر پر جا کر اس بات کا حلف اٹھایا تھا کہ ہم لوگ جب تک انگریزوں کو ہندوستان سے نکال نہ لیں گے ہرگز دم نہ لیں گے اور ان میں سے تقریباً ہر ممبر اپنی قسم پر قائم رہا۔

مسٹر گاستا اس وقت ہیڈماسٹر تھے، یہ صاحب بہت بدزبان تھے اور ان کی بدزبانی کی وجہ سے طلباء ان سے بہت نالاں تھے۔ ایک روز طلباء کسی کام سے ان کے پاس گئے، انہوں نے طلباء کو (Herd of Pigs) (سؤر کے بچے) کہہ کر اپنے بنگلے سے نکلوا دیا۔ اس پر طلباء میں بڑی برہمی پھیلی، نواب صاحب تک شکایت پہنچی لیکن اس وقت کے حالات کے لحاظ سے وہ انگلش اسٹاف کو ناراض نہیں کرنا چاہتے تھے۔۔۔ آپس کے

اب جا کر وہ کسی قدر مسلمانوں سے صاف ہوتے ہیں اور مسلمانوں کو ہندوستان میں پیر رکھنے کی اجازت مل رہی ہے ۔"۔ وغیرہ ۔
اس طرح نواب محسن الملک مجھے اکثر مسلمانوں کی تباہی، ان کی سیاسی کمزوری اور سر سید کے قصے سنایا کرتے ۔

اس ڈیپوٹیشن کی تنظیم میں تقریباً دو مہینے صرف ہوئے انہوں نے اس درمیان میں زبردست تنظیمی صلاحیت کا ثبوت دیا۔ پہلے سر آغا خان ڈیپوٹیشن لے جانے پر راضی نہیں ہو رہے تھے لیکن نواب صاحب نے ایسا دل ہلا دینے والا تار انہیں یورپ بھیجا کہ انہیں یورپ سے واپس آنا پڑا اور ڈیپوٹیشن [illegible] انہوں نے منظور کر لیا۔

[illegible] سید کے بعد کالج کے لئے روپیہ جمع کرنے، علماء اور صوفیائے کرام کو کالج کی طرف متوجہ کرانے، عمارت بنوانے، امراء اور والیانِ ریاست، شہزادوں اور حکمرانانِ ملک کو کالج میں مدعو کر کے لانے، کالج میں طلباء کی تعداد بڑھانے کی جوان تھک کوششیں نواب صاحب نے کیں وہ علی گڑھ کی تاریخ میں ہمیشہ زندہ رہیں گی۔ اگر سر سید کی جانشینی اس وقت نواب محسن الملک کو نہ ملتی تو یہ کہنا شاید مبالغہ نہ ہو گا کہ علیگڑھ اس بام ترقی پر نہ پہنچتا، حکومت اور انگریزی حکام کی توجہ بھی انہوں نے کالج کی طرف پورے طور پر مبذول کرائی۔ مسٹر بیک کے مرنے کے بعد مسٹر ماریسن کو جو کالج چھوڑ کر ولایت چلے گئے تھے، جس طرح اصرار کر کے واپس بلایا اور کالج کا پرنسپل بنایا اس سے نواب محسن الملک کی مردم شناسی کا اندازہ ہوتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ کالج کو ترقی دینے، انگریزوں کے خیالات مسلمانوں کی طرف سے صاف کرنے، طلبا سے محبت آمیز اور مربیانہ برتاؤ کرنے اور دیگر انتظامی معاملات میں ماریسن صاحب نے بھی نہایت قابلیت کا ثبوت دیا۔ ان میں اور نواب صاحب میں آخر وقت تک دوستانہ تعلقات قائم رہے۔ اور شاید ہی کسی امر میں اختلاف ہوا ہو۔ ماریسن صاحب انگریز قوم کے ایک رکن تھے اور لازمی اور فطری طور پر وہ ہندوستان میں انگریز قوم کی بہبودی بھی چاہتے تھے۔

ماریسن صاحب کے جانے کے بعد ان کے جانشین کا مسئلہ نہایت سخت تھا۔ ماریسن صاحب آرنا صاحب کو پرنسپل بنانا چاہتے تھے اور ان کو عارضی طور پر چارج بھی دے کر چلے گئے تھے لیکن آرنا صاحب کی چونکہ سخت مخالفت تھی اس لئے نواب صاحب کو دوسرے پرنسپل کی تلاش ہوئی اور انہوں نے ایک سن رسیدہ، تجربہ کار اور تاریخ دان انگریز کیمبرج سے بلوایا جس کا نام آرچبولڈ تھا۔ یہ نیک مزاج آدمی تھے لیکن مزاج میں تھوڑا چڑچڑا پن بھی تھا۔ انہوں نے حتی الوسع مسٹر ماریسن کے نقشِ قدم پر چلنے کی کوشش کی لیکن ان کو ماریسن صاحب کا سا علیگڑھ کا تجربہ، مسلمانوں کے کلچر سے واقفیت اور اس درجہ ہمدردی کیسے ہو سکتی تھی؟ اس کے علاوہ ان میں ماریسن صاحب جیسی انتظامی قابلیت بھی نہ تھی، تبدیل شدہ حالات میں انگلش اسٹاف اور طلباء میں پہلے جیسا برتاؤ بھی باقی نہ رہا تھا۔ مسٹر آرنا کو پرنسپل نہ بنانے کا بھی انگلش اسٹاف پر خاصا اثر تھا۔ غرضکہ طلباء اور انگلش اسٹاف میں ایک کشیدگی پیدا ہو چکی تھی۔
اگرچہ علی گڑھ میں والیانِ ریاست، گورنر اور وائسرائے رسمی طور پر آیا کرتے تھے لیکن محسن الملک کی موقع شناسی کی بدولت علی گڑھ اس شعر کا مصداق بن گیا ؂

عاقبت مقبولی کالج بایں غایت رسید
زینت گاہ غریباں شد گذرگاہ شہاں

جب جارج پنجم اپنی ولی عہدی کے زمانے میں ہندوستان میں بغرضِ سیر و سیاحت آئے تو ٹرسٹیانِ کالج کی کوششوں کے باوجود علیگڑھ آنا ان کے پروگرام میں شامل نہ کیا گیا لیکن نواب صاحب نے سر آغا خان کے ذاتی اثر و رسوخ سے فائدہ حاصل کر کے آخر کار انہیں ۸ مارچ ۱۹۰۶ء کو علی گڑھ بلوا ہی لیا۔ ان کی آمد کی یادگار میں سائنس اسکول کے قیام کا اعلان ہوا اور ولی عہد کی موجودگی میں سر آدم جی پیر بھائی (بمبئی) نے ایک لاکھ دس ہزار روپے کا عطیہ دیا [illegible] اسٹریچی ہال اور کالج کلاسز کا معائنہ کر کے یکی پارک اور بورڈنگ ہاؤس کے چند کمروں کو بھی ملاحظہ فرمایا جس میں سے ایک کمرہ سجا ہوا تھا۔ اس میں شہنشاہ جرمنی اور کچھ ہندوستان کے سیاسی رہنماؤں کی تصویریں بھی تھیں۔ ولی عہد نے پوچھا کیا تم جرمنی کے بادشاہ کو پسند کرتے ہو؟ میں نے

جواب دیا " مجھی ایسا " وہ ہندوستان کے سیاسی رہنماؤں کی تصویریں دیکھتے رہے لیکن ان کے متعلق کچھ نہ پوچھا۔

پرنس آف ویلز کا یہ دورہ بظاہر بہت کامیاب رہا اور جب وہ واپس انگلستان گئے تو گلڈ ہال لندن میں دورۂ ہندوستان پر ایک تقریر فرمائی جس میں علیگڑھ کالج کا تذکرہ بہت شاندار طریقے پر کیا۔ لیکن اندرونی خبر یہ تھی کہ ان پر یہ اثر ہوا کہ یہ کالج بھی باغی مرکز بنے یا ہو جائے گا۔

دوسری اہم ہستی جس نے علی گڑھ میں قدم رنجہ فرمایا وہ امیر حبیب اللہ خان والی افغانستان کی تھی۔ ۱۶ جنوری ۱۹۰۷ء کو امیر افغانستان بغرض معائنہ تشریف لائے اور تنقیدی نظر لے کر آئے۔ ان کا استقبال مسلموں اور غیر مسلموں دونوں نے شاندار طریقے پر کیا۔ ابھی کالج کے صدر دروازے پر [illegible] بھی نہیں ہوا تھا کہ امیر افغانستان کا وہ مکالمہ شروع ہوا جس نے نواب صاحب کو سخت آزمائش میں مبتلا کر دیا۔ جب نواب صاحب نے [illegible] بتائی جا رہی تو شاہ نے فرمایا کہ "مشک آنست کہ خود ببوید نہ کہ عطار بگوید" اور یہ صاف ظاہر کیا کہ وہ کالج سے بدظن ہیں اور یہ بھی فرمایا کہ حضرت علی [illegible] ہے کہ سچ اور جھوٹ میں صرف چار انگل کا فاصلہ ہے جو آنکھ اور کان کے درمیان ہے۔ کان سے میں سن چکا ہوں، بس آنکھ سے دیکھنے آیا ہوں۔

نواب محسن الملک نے برجستہ عربی کے یہ اشعار پڑھے ؎

قیل ان الالٰہ ذو ولدٍ	قیل ان الرسول قد کھنا
(لوگوں نے خدا کو بھی صاحب اولاد کہا	اور رسول کو جادوگر)
ما نجی اللہ والرسول معاً	من لسان الوریٰ فکیف انا

(جب خدا اور رسول بدگویوں کی زبان سے نہ بچے تو ہم کیسے بچ سکتے ہیں)

امیر افغانستان نے فرمایا کہ کالج کے ملاحظہ کے بعد ہی میں اپنی رائے دے سکتا ہوں، اور نواب صاحب کو طلب فرما کر خاص کر تعلیم دینیات کے متعلق سوالات کئے اور دریافت کیا کہ وہ کالج کو بطور ممتحن دیکھیں یا بطور سیاح؟ نواب صاحب نے یہ عندیہ ظاہر کی کہ وہ بطور ممتحن کالج کو ملاحظہ فرمائیں۔

جب ٹرسٹیان نے امیر کو لنچ کی دعوت دی تو انہوں نے یہ کہہ کر انکار کیا کہ جب تک میری تشفی نہ ہو جائے میں تم لوگوں کے ساتھ شریک طعام نہیں ہو سکتا۔ اس جواب نے نواب صاحب کو انگشت بدنداں کر دیا۔

امیر افغانستان نے لنچ علیحدہ کھایا اور پہلے پچی پارک کی میں بورڈنگ دیکھی۔ انگلش ہاؤس میں پہنچ کر بچوں کے سونے، کھانے، نماز، غسل اور مطالعہ کے کمرے دیکھے اور فرمایا کہ لوگ مسلمان بچوں کے اس طرح رہنے سہنے پر کیوں معترض ہیں۔ اگر یہ بچے اسلامی عقائد سے واقف ہیں اور ارکان اسلام کے پابند ہیں تو چاہے جس طرح چاہیں سوئیں اور رہیں۔"

امیر کو جب وہ الماری دکھائی گئی جس میں قرآن پاک اور سپارے رکھے تھے تو کہنے لگے کہ میں کلام پاک کو بالائے طاق دیکھنے نہیں آیا ہوں میں اس کا متلاشی ہوں کہ بچے انہیں پڑھتے ہیں یا نہیں۔ اس بات پر چار لڑکے پیش کئے گئے تو کہنے لگے کہ میں آپ کے منتخب لڑکوں کا امتحان لینا نہیں چاہتا، طلبا میں خود لڑکوں کا انتخاب کروں گا۔ کالج کی مسجد میں انہوں نے نماز ظہر ادا کی اور اس کے بعد نظام جماعت پر طریق تعلیم ملاحظہ فرمایا اور پہلے ہی کمرے میں تشریف لائے کہ ایک طالب علم علی الدین نامی کو اپنے قریب بلا کر بٹھایا اور فرمایا کہ قرآن مجید میں سے جو کچھ یاد ہو سنائے۔ خدا کو بھلا کرنا منظور تھا کہ وہ لڑکا اتفاق سے قاری اور خوش الحان تھا، اس نے نہایت خوش گلوئی کے ساتھ بعد تعوذ و بسم اللہ سورۂ عمران کی یہ رکوع تلاوت کرنی شروع کی:

إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ ...... الخ

وہ چار ہی آیتوں کی تلاوت کے بعد ایک عجیب پُر اثر سماں بندھ گیا اور ہر شخص پر ایک وجد کی سی کیفیت طاری ہو گئی۔ امیر کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے اور [illegible] [illegible] ہوں اور داڑھی تک بہتے آئے۔ رکوع ختم ہونے تک ان کی رومال آنسوؤں سے تر ہو چکے تھے۔

امیر افغانستان [illegible] نہایت جوش میں [illegible] اور بار بار [illegible] اس کی [illegible]

کا گئی ہے سب غلط اور جھوٹ ہے "۔۔۔ "ہمہ دروغ است و کذب و بدگوئی"۔۔۔ They are liars "یا" میں بدگوؤں کی زبان بند کرنے کی کنجی ہوں گا"

نواب صاحب کی خوشی کی انتہا نہ تھی مفرطِ مسرت سے ان کا چہرہ روشن ہو رہا تھا اور ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ ان کی زندگی کا مقصد حاصل ہو گیا۔ امیر نواب صاحب سے مخاطب ہو کر کہہ رہے تھے کہ "ہم نے امتحان لے کر اپنی پوری تسلی کر لی ہے۔ ہر چیز اچھی اور لائقِ تعریف پائی"۔ وہ کچھ اور کہنا چاہتے تھے کہ نواب صاحب نے عرض کیا کہ اسٹریچی ہال میں تمام ہندوستان کے مسلمان جمع ہیں بڑی عنایت ہو اگر آپ وہاں قدم رنجہ فرما کر اپنے خیالات کا اظہار کریں۔ امیر نے بخوشی یہ پیشکش منظور کر لی۔

اس وقت سر ہنری میکموہن نے کہا:

No doubt your majesty is a good Mullah

(اس میں کوئی شک نہیں کہ عالی جناب ایک اچھے ملا ہیں)

اس کا امیر افغانستان نے برجستہ جواب دیا: 'yes! I am three things, I am a Mullah, I am a Soldier and I am a King'

(بلاشبہ میں تین چیز ہوں۔ میں ایک ملا ہوں، میں ایک سپاہی ہوں اور میں ایک بادشاہ ہوں)

اسٹریچی ہال میں ایڈریس پیش کیا گیا جہاں ہال تالیوں اور نعروں سے گونج رہا تھا۔

شاہ کی تقریر بہت مختصر تھی جس میں انہوں نے یہ بھی فرمایا کہ "اول کسے کہ دہن بدگویاں بہ زبان بند کند او من خواہم بود" اور علی گڑھ کے متعلق تاثرات مختصر طور پر بیان کئے۔ رات کی دعوت کے بعد شاہ نے ٹرسٹیوں کا شکریہ ادا کیا اور مولانا حالی کا قصیدہ سنا جس کا ایک شعر اوپر درج کیا جا چکا ہے وہیں انہوں نے بیس ہزار روپے یکمشت دینے اور چھ ہزار سالانہ وظیفہ کالج کے لئے مقرر کرنے کا اعلان کیا۔ دوسرے لوگوں نے بھی اس موقع پر گراں قدر عطیات دئے۔

ابھی جوش اور ولولہ کم نہیں ہوا تھا کہ مسٹر گوکھلے علیگڑھ تشریف لائے۔ اس وقت علیگڑھ میں مولانا محمد علی مرحوم بھی موجود تھے، انہوں نے مسٹر گوکھلے کو فوراً طلباء کی طرف سے کالج میں آنے کی دعوت دے دی۔ پرنسپل آرچبولڈ اس بات پر بہت چیں بہ جبیں ہوئے اور مسٹر گوکھلے کو لکھا کہ آپ کو طلباء نے بغیر میری اجازت کے مدعو کر لیا ہے، اس پر بھی آپ تشریف لائیں لیکن مجھے امید ہے کہ آپ صرف تعلیمی مسئلے پر گفتگو کریں گے۔ جب طلباء کو معلوم ہوا تو انہیں بہت غصہ آیا۔ مسٹر گوکھلے نے پرنسپل کو جواب دیا کہ آپ کے کہنے کے مطابق میں صرف تعلیمی مسائل پر طلباء سے گفتگو کروں گا۔ آپ مطمئن رہئے۔

طلباء میں ایسا جوش و خروش تھا کہ وہ چاہتے تھے کہ شہر جا کر جہاں مسٹر گوکھلے قیام پذیر تھے ان کی گاڑی خود کھینچ کر لائیں۔ بڑی مشکل سے انہیں اس بات سے روکا گیا لیکن جب مسٹر گوکھلے کی گاڑی کالج کے صدر دروازے پر آئی تو طلباء نے ان کی گاڑی کھینچی اور جس جوش و خروش کا اظہار کیا وہ قابلِ دید تھا۔ مسٹر گوکھلے کو مسلمان نوجوانوں کا سیاسی جوش دیکھنے کا یہ پہلا موقع تھا۔ ان کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور آواز بھرا اٹھی۔ ان کے ہر ہر لفظ سے قلبی جذبات کا اظہار ہو رہا تھا اور ہر ہر جملے پر تالیوں کی گونج اٹھتی تھی اور مشکل سے روکی جا سکتی تھی۔

مسٹر گوکھلے نے وعدے کے مطابق صرف تعلیمی مسائل پر گفتگو کی لیکن اس انداز سے گفتگو کی کہ ان کی ساری تقریر سیاست وقت کی تفسیر تھی۔ آخر میں انہوں نے کہا کہ ملک کے ایک خادم کی جو عزت افزائی علی گڑھ میں ہوئی ہے اس سے مجھے امید ہو گئی ہے کہ آزادی میں اب زیادہ دیر نہیں ہے اور انہیں معلوم نہ تھا کہ مسلمان نوجوان بیدار ہو چکے ہیں اور کیسی آگ ان کے سینوں میں چھپی ہوئی ہے۔

طلبا مسٹر گوکھلے پر پیچھے جاتے تھے اور گوکھلے زندہ باد، ہندوستان زندہ باد کے نعروں سے سارا کالج گونج اٹھا۔

اسٹریچی ہال میں مسٹر گوکھلے کا شکریہ ادا کرتے ہوئے نواب محسن الملک نے اپنی قومی پالیسی کی مختصر لفظوں میں وضاحت کی اور کہا کہ وہ سیاسی مسائل میں اختلاف رکھنے پر مجبور ہیں کیونکہ وہ اپنی قومیت کو نہیں چھوڑ سکتے مگر اہل ملک کے ساتھ دوستی رکھنا وہ اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ علیگڑھ آنے سے قبل لکھنؤ کے مشہور جلسے میں نواب صاحب نے اپنی سیاسی پوزیشن کی صفائی میں نہایت اہم تقریر کی تھی اور مسٹر گوکھلے کا خیر مقدم نہایت شاندار طور پر کر چکے تھے جس کا موضوع ہندو مسلم اتحاد تھا۔

پرنسپل اور انگلش اسٹاف کو طلباء کا یہ مظاہرۂ جوش بہت ناگوار ہوا اور انگلش اسٹاف اور طلباء کے تعلقات اور بھی زیادہ خراب ہوگئے۔
نواب محسن الملک نے بمبئی میں شملہ ڈیپوٹیشن کی تیاری کے وقت اپنے متعلق جو کچھ کہا تھا وہ مجھ کو یاد آ گیا۔ ظاہراً معلوم ہوتا تھا کہ نواب صاحب انگلش اسٹاف سے بہت مرعوب ہیں اور انگریزوں کے خلاف ایک لفظ بھی سننا پسند نہیں کرتے لیکن ان کی تربیت اور طور طریقے سے لڑکوں کو جیسے شہ مل رہی ہو اور روز بروز انگریز دشمنی کا جذبہ اور ملکی آزادی حاصل کرنے کا ولولہ بڑھتا جا رہا تھا۔

اوپر ذکر کیا گیا ہے کہ ۱۹۰۳ء میں ہم چند طلباء نے ایک خفیہ سوسائٹی قائم کی تھی جس کا مقصد یہ تھا کہ انگریزوں کو کسی صورت سے جلد ہندوستان چھوڑنے پر مجبور کیا جائے۔ اس سوسائٹی کے پروپیگنڈا کا چند ہی برسوں میں یہ اثر ہوا کہ ۱۹۰۵ء میں یونین کلب میں کانگریس اور ہندوؤں کو برا بھلا کہنا کسی بڑے سے بڑے مسلمان لیڈر کے لئے آسان بات نہ تھی۔

حکومت نے علیگڑھ کو بھی ہاتھ سے جاتا ہوا دیکھ کر بے ضابطہ طور پر یہ تجویز پیش کرائی کہ کالج کو ایک اورینٹل کالج بنایا جائے اور عربی تعلیم پر زور دیا جائے۔ یہ ۱۹۰۵ء کا واقعہ ہے۔ نواب محسن الملک کو جب یہ معلوم ہوا تو یونین کلب کے ایک مباحثے میں انہوں نے اس تجویز کی نہایت پرزور مخالفت کی اور شبہ ظاہر کیا کہ اس تجویز کا منشا سیاسی معلوم ہوتا ہے حکومت غالباً چاہتی ہے کہ علیگڑھ کو انگریزی تعلیم سے رفتہ رفتہ دور کر دیا جائے تاکہ مغربی علوم و فنون سے جو شورش ہندوستان میں برپا ہو گئی ہے اس کے اثر سے کم از کم علی گڑھ محفوظ رہ جائے۔ پرنسپل ماریسن نے ہر چند سمجھانے کی کوشش کی کہ حکومت کا یہ منشا نہیں ہے بلکہ حکومت اس کو ایک مکمل مسلمانوں کا دارالعلوم بنانا چاہتی ہے لیکن محسن الملک کی شدید مخالفت کے باعث یہ تجویز کچھ آگے نہ بڑھ سکی۔

ہم اپنے رفقاء کے ساتھ جب ان کی خدمت میں حاضر ہو کر مسائل حاضرہ پر بے دھڑک بحث شروع کر دیتے تو وہ ہماری گستاخانہ جرأتوں کو برداشت کرتے ہوئے فرماتے کہ گھبراتے کیوں ہو، بہت جلد یہاں کے طلباء تم لوگوں جیسے خیالات کو ماننے والے ہو جائیں گے۔ گو اس وقت شاید میں زندہ نہ رہوں گا۔ سرسید کا بھی دراصل یہی منشا تھا اور میرا بھی یہی ہے کہ یہاں ملک کے جانباز سپاہی پیدا ہوں لیکن آہستہ خرامی سے کام لینا ہی وقت اور مصلحت کا تقاضا ہے۔ ابھی تمہاری قوم میں تیز دوڑنے کی صلاحیت نہیں ہے۔

عجیب اتفاق کہ مسٹر گوکھلے کے جانے کے کچھ ہی دن بعد علیگڑھ کی نمائش میں ۹ رفروری ۱۹۰۷ء کو ایک ایسا واقعہ ہو گیا کہ اس نے طلباء کی صف میں ہیجان برپا کر دیا۔ راجہ غلام حسین سے جو کالج کے ایک ممتاز طالب علم تھے ایک پولیس کانسٹیبل کا جھگڑا ہو گیا۔ ایسے جھگڑے ہمیشہ ہی ہوا کرتے تھے مگر مسٹر ماریسن ہمیشہ طلباء کا ساتھ دیتے تھے اور ایسے معاملات رفع دفع کرا دیا کرتے تھے یہ بات کالج کی تقریباً روایت بن چکی تھی لیکن جب راجہ غلام حسین کے معاملے میں سپرنٹنڈنٹ پولیس نے پرنسپل آرچبولڈ سے شکایت کی تو انہوں نے بلا سوچے سمجھے راجہ غلام حسین کو کالج سے خارج کر دیا۔

انگلش اسٹاف اور طلباء میں کشیدگی تو پہلے ہی سے تھی۔ یہ واقعہ گویا کھلم کھلا جھگڑے کا شاخسانہ بن گیا۔ طلباء میں جوش اور غصہ کی لہر دوڑ گئی اور انہوں نے بہت شور اور شور کے ساتھ احتجاج کا نعرہ بلند کر دیا اور جلسے کرنے شروع کر دئے۔ اس پر کالج کے انگلش اسٹاف کا غصہ اور بڑھ گیا

ایک موقع پر جہاں طلباء کافی تعداد میں جمع تھے انہیں سخت سست کہا۔ بس پھر کیا تھا اس پر طلباء آپے سے باہر ہو گئے اور ان میں سے بعضوں نے انگلش اسٹاف کے خلاف بھی سخت الفاظ [illegible] کہے۔ نثار احمد خان شیروانی (جو ابھی حال تک یو پی میں منسٹر تھے) جن کے مزاج میں غصہ بہت تھا، ایک انگریز پروفیسر کے یہ کہنے پر کہ "ہم تم لوگوں کے ساتھ احسان کرتے ہیں اور تم ایسی گستاخی کرتے ہو" فوراً بول اٹھے کہ تم لوگ یہاں ہندوستان کی دولت لوٹنے آئے ہو کہ ہم لوگوں پر احسان کرنے؟

اس واقعے سے انگلش اسٹاف نے یہ سمجھ لیا کہ علیگڑھ کے طلباء بھی بنگال والوں کی طرح کھلم کھلا سرکار کے باغی ہو گئے ہیں اور تعجب نہیں کہ ہم سب [illegible] ہیں۔ چنانچہ گھبراہٹ میں انہوں نے پولیس کو اطلاع دے دی اور سب انگریزوں کے بنگلوں کی مسلح پولیس حفاظت کرنے لگی۔ طلباء کا انگریز پروفیسروں کو کسی طرح کی اذیت پہنچانے کا خیال بھی نہ تھا۔ یہ امر اتفاقی تھا کہ غصے کی حالت میں کچھ گستاخانہ گفتگو ہو گئی تھی۔ بہرحال اب تو طلباء کو باغی قرار دے دیا گیا تھا۔ چاروں طرف تار دوڑ گئے اور انگریزی اخباروں نے اور نمک مرچ لگا کر مضامین لکھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ طلباء نے اسٹرائک کر دی۔ پانچ مہینے وہ کالج میں جمع رہے مگر کلاسوں میں نہ گئے اور اپنے اسباب جمع کر کے ان میں آگ لگا دی۔

طلباء کے وفود مختلف مقامات کے لئے روانہ ہو گئے اور نواب وقار الملک کے علاوہ حکیم اجمل خان، مولوی ذکاء اللہ اور مولانا نذیر احمد کے پاس دہلی آئے تاکہ انہیں علی گڑھ لے جائیں۔ نواب وقار الملک خود دہلی تشریف لائے اور حکیم صاحب کو علی گڑھ لے گئے۔ مولوی نذیر احمد طلباء کے بیانات سے بہت متاثر ہوئے اور فرمایا کہ میں علی گڑھ ضرور چلوں گا اور تم لوگوں کی حمایت میں ایک لاکھ روپیہ تک جمع کر دوں گا۔ نواب محسن الملک تو مصلحت برتتے ہیں میں ہرگز کوئی مصلحت نہیں برتوں گا ـــــ طلباء کا وفد ان کے ساتھ علی گڑھ آیا اور ان کو نواب محسن الملک کی کوٹھی تک پہنچا دیا گیا۔

اپنی اس کامیابی پر طلباء بہت خوش تھے لیکن جب دوسرے روز مولوی نذیر احمد طلباء کے سامنے کالج میں آئے تو ان کو مصلحت کا نام لے کر سمجھانے لگے۔ طلباء نے ٹوک دیا کہ مولانا آپ پر بھی نواب محسن الملک کا جادو آخر چل ہی گیا۔

ایک خفیف واقعے سے طلباء، اسٹاف اور ٹرسٹیان کالج میں ہیجان پیدا ہو گیا تھا اور انگلش اسٹاف نے اس پر جو سیاسی رنگ چڑھا دیا تھا اس نے نواب محسن الملک کو بے انتہا متردد اور بے چین کر دیا تھا۔ بالآخر چند طلباء کالج سے نکالے گئے جن میں ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری، تصدق احمد خان شیروانی اور میں بھی تھا۔

ابھی طلباء کی اسٹرائک جاری تھی کہ ایک دن نواب صاحب نے ہم لوگوں کو طلب کیا اور کچھ ایسے دردناک لہجے میں گفتگو کی کہ طلباء کے لیڈر بہت متاثر ہوئے اور ان سے وعدہ کیا کہ ہم لوگ خاموشی سے کالج چھوڑ کر چلے جائیں گے اور اسٹرائک ختم کرنے کی کوشش کریں گے۔ اسی دن ہم بیں طلباء نواب صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان سے عرض کیا کہ طلباء کو سمجھانے کا ایک خط لکھ دیں۔ نواب صاحب اسی وقت میز کے سامنے بیٹھ گئے اور ایک لمبا خط اپنے ہاتھ سے تحریر کیا جس کی ابتدا "میرے نالائق فرزندو!" سے کی۔

اس فقرے نے اور اس خط کے پورے مضمون نے طلباء پر جادو کا اثر کیا۔ جب نواب صاحب نے وہ خط ختم کیا تو رات کے بارہ بج چکے تھے۔ طلباء اب تک دوران اسٹرائک میں ہی نواب صاحب سے خفا تھے اور ان پر الزام دھرتے تھے کہ انگلش اسٹاف کے ساتھ وہ کمزوری برتتے ہیں اور ہمت کو راہ نہیں دیتے ہیں لیکن ان کے دو خطوط نے حیرت انگیز طریقے پر طلباء کی قلب ماہیت کر دی۔ ان کی تحریر کے لفظ لفظ سے طلباء کے ساتھ ان کی محبت ٹپکتی تھی۔ اس خط سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ علم نفسیات کے کتنے بڑے ماہر ہیں۔ ان کے ان خطوط نے وہ کام کیا جو تمام ٹرسٹیوں اور نجانے کتنے بڑے شخصوں کی نصیحتیں نہ کر سکی تھیں۔

ظاہراً یہ طلباء کالج کی ایک اسٹرائک تھی لیکن حقیقتاً علی گڑھ کے طلباء کی یہ اسٹرائک مسلمان قوم کی سیاست کی سنگ بنیاد تھی۔ اس اسٹرائک کے بعد مسلم لیڈروں نے محسوس کر لیا کہ اب مسلمان نوجوان پرانی سیاسی پالیسی سے بیزار ہو چکے ہیں اور یہ ضروری ہو گیا ہے کہ ان کے لئے ایک سیاسی

پلیٹ فارم بنایا جائے۔ چنانچہ ڈھاکہ میں مسلم لیگ کی بنیاد رکھی گئی۔

اسٹرائک کے کچھ عرصہ بعد ایک دن ہم چند طالب علم صبح کے وقت ان کی کوٹھی پر گئے۔ اس وقت نواب صاحب نوکروں پر خفا ہو رہے تھے۔ نواب صاحب نے ہم لوگوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا "تم سب خود باغی ہو اور میرے نوکروں کو بھی باغی کر دیا ہے۔ نہ تم سب پیار کہا مانتے ہو اور نہ میرے نوکر میرا کہا مانتے ہیں"۔ ان سے پوچھا گیا کہ حضور کیا بات ہے تو فرمانے لگے کہ مجھے رات میں پاؤں دبوانے کی سخت عادت ہے۔ کل رات میرا مغلن ران کا پرانا نوکر، تھا جو اوگھ رہا تھا میں نے اس سے کہا کہ تو جا کر ذرا کالج کے اس بیرے کو جو میری کوٹھی میں رہتا ہے بھیج دے اور کہیں اس کو کچھ انعام دوں گا۔ میں نے اس بیرے کو دوبارہ بلوایا لیکن اس نے آنے سے صاف انکار کر دیا۔ تب مجھ کو غصہ آیا اور میں نے کہا کہ صبح میری کوٹھی سے نکل جاتے۔ آج صبح کو میرے نوکروں نے جب اس کو مکان سے نکل جانے کو کہا تو فرمایا کہ جاؤ سرکار سے کہو کہ کیا رات کی بات ان کو اب تک یاد ہے؟ ——— نوکر بھی تم سبھوں کی طرح مجھ کو کمزور سمجھتے ہیں"۔ جب ہم سبھوں نے پوچھا کہ پھر کیا ہوا؟ تو فرمایا کہ ہونا کیا میں چپ ہو گیا۔

اس ایک واقعے سے نواب صاحب کی مروت، نیکی اور شرافت کا پتہ چلتا ہے جس سے لوگ اکثر ناجائز فائدہ اٹھایا کرتے تھے۔

ان تھک محنتوں اور کالج کی اسٹرائک اور دیگر پیچیدگیوں سے ضعیفی میں نواب صاحب کو کافی صدمے پہنچے مگر باوجود ان تمام باتوں کے وہ قوم کے لئے جدوجہد کرنے سے باز نہ آئے اور ان کی آخری علالت کا واقعہ بھی اس امر کا کافی ثبوت ہے کہ انہوں نے خدمت قوم میں جان دے دی۔ آخر ستمبر ۱۹۰۷ء میں وہ دائسرائے سے اصلاحات کی اسکیم میں مسلمانوں کے حقوق کی توسیع وغیرہ کے لئے ملاقات کرنے شملہ تشریف لے گئے تھے وہیں وہ زبردست طور پر علیل ہوئے۔ وائسرائے نے اپنے خاص ڈاکٹر کو علاج کے لئے مامور کیا لیکن کوئی فائدہ نہیں ہوا اور ۱۶ اکتوبر ۱۹۰۷ء کو ۹ بجے شام اس حقیقی محسن الملک اور خادم قوم نے بارگاہ اقدس میں اپنی زندگی کا اجر حاصل کرنے کے لئے انتقال فرمایا کہ زبان وحی کا یہ قول صادق ہے کہ:

إِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيعُ أَجْرَ الْمُحْسِنِينَ (خدا نیکی کرنے والوں کا اجر ضائع نہیں کرتا)

حالی نے چند رباعیات میں نواب محسن الملک کی زندگی کی تصویر کھینچی ہے اس کو بھی سن لیجئے:

دم بھر نہ کبھی جسم و جاں کو آرام دیا — خدمت کے لئے قوم کی مر مر کے جیا
پیری بھی نہ سستی رہِ اس کی نہ مرض — صدیوں کا تھا جو کام وہ برسوں میں کیا

پیری میں جوانوں کو کیا مات اس نے — آرام پہ اپنے مار دی لات اس نے
تم سے محنت سے دکھا دی سب کو — کالج کی ترقی میں کرامات اس نے

مدراس میں سوتوں کو جگایا جا کر — غل علم کا بمبئی میں مچایا جا کر
چھائی ہوئی مردنی جہاں قوم میں تھی — واں آبِ حیات ان کو پلایا جا کر

مکتبہ چٹان کی ایک اور پیشکش

شورش کاشمیری کے قلم سے

سیّد عطاء اللہ شاہ بخاری

(نفسیاتی مطالعہ و سوانحی خاکہ)

اردو زبان کے سب سے بڑے عوامی خطیب کی سرسٹھ سالہ زندگی کے لیل و نہار کی سرگزشت جس میں نصف صدی کے سیاسی حالات کی لفظی تصویریں جگمگاتی نظر آتی ہیں

- شاہ جی کے خاندانی حالات
- شاہ جی کے ذاتی واقعات
- شاہ جی کے خطابی معرکے
- شاہ جی کے جماعتی کارنامے
- شاہ جی کے اسارتی ہنگامے

(خطیب کی کہانی ادیب کے قلم سے)

سوانحی خطوط کا نیا پیراہن ——— اور ——— سیاسی حالات کا نیا جائزہ

(زیر طبع)

مکتبہ چٹان - ۸۸ میکلوڈ روڈ - لاہور

سیدھی
اور مضبوط
اعضا
کے لئے
اپنے ننھے بچے کو
یہ خالص دودھ دیجئے
آسٹرملک
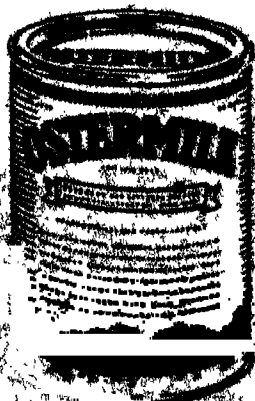
ان کی تندرستی اہم شے ہے
اسی وجہ سے میں ہمیشہ ڈالڈا سے کھانا تیار کرتی ہوں
اتنے ہی وٹامن جتنے کہ اصلی گھی میں
اب ڈالڈا برانڈ وناسپتی میں بہت زیادہ غذائیت ہے ڈالڈا کے ہر اونس میں وٹامن اے کی اتنی ہی مقدار موجود ہے جتنی کہ اچھے اور خالص گھی میں ہوتی ہے ڈالڈا میں وٹامن ڈی بھی موجود ہے آپ کے بچوں کی صحت مند پرورش کے لئے ان کی غذا میں ان دونوں وٹامنوں کی موجودگی ضروری ہے۔
ہمیشہ محفوظ اور پاک وصاف
ڈالڈا برانڈ وناسپتی کو عمدہ نباتی تیلوں سے تیار کرکے حفظان صحت کے اصولوں کے تحت سربمہر اور ہوابند ڈبوں میں بھرا جاتا ہے اسی وجہ سے یہ تازہ اور صاف ستھرا ہے اپنے تمام کھانے ڈالڈا سے تیار کیجئے اور اپنے گھر والوں کو صحت مند رکھئے۔
ڈالڈا برانڈ وناسپتی
کھانوں کو بہتر بناتا ہے